aazzamm@yahoo.com
موم کا آدم
علی سفیان آفاقی
راوی: مرزا اخلاق علی بیگ

ایک سربکف منچلے جیالے کی ایکشن سے بھرپور سرگزشت

موم کا آدم

پہلا حصہ

علی سفیان آفاقی

راوی: مرزا اخلاق علی بیگ

بار اول ——— ۲۰۰۶ء
مطبع ——— یوایندی پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ ——— الحرا کمپوزنگ سنٹر، لاہور
قیمت ——— ۶۰ روپے

موم کا آدم

ایک سر بکف منچلے جیالے انسان کی کہانی۔ وہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینے کا ہنر جانتا تھا۔ وہ ایک خوش جمال حسینہ کے خیال کا اسیر تھا اور اسے حاصل کرنے کے لیے آگ اور خون کے دریا میں کود پڑنے کو بے تاب تھا۔

ایک نذرِ جہاں گردِ ابنِ آدم کی آشفتہ سری کی داستان

اُس نے

رات میں نے پھر وہی خواب دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک پُر فضا باغ ہے جس میں رنگا رنگ پھول کھلے ہیں۔ ہر طرف خوشبو کی مہک ہے۔ پھولوں کی نرم و نازک شبنم سے بھیگی ہوئی پتیوں پر رنگین تتلیاں پَر پھیلائے منڈلا رہی ہیں۔ درختوں پہ پرندوں کی چہکار کا شور ہے۔ ہر طرف ایک رنگ و بُو کا عالم ہے۔ میں ایک پھولوں سے لدے ہوئے درخت کی چھاؤں میں سبز گھاس پر لیٹا ہوا منظر کی دلفریبیوں سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔ سرمستی آسودگی اور خوشی کا ایک احساس میرے رگ و پے میں بسا ہوا ہے۔ میں غنودگی کے عالم میں ہوں۔ کچھ سو رہا ہوں۔ کچھ جاگ رہا ہوں۔ فکرِ فردا ہے نہ غمِ امروز۔ عجیب آسودگی اور اطمینان کا احساس طاری ہے۔ رفتہ رفتہ میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہو کر بند ہونے لگتی ہیں۔ شاید میں سو گیا ہوں۔ میرا ذہن خوابوں کی وادی میں ڈوبتا جا رہا ہے۔ یکایک گرج کی ایک آواز مجھے چونکا دیتی ہے۔ میں گھبرا کر بیدار ہو جاتا ہوں۔ دیکھتا ہوں کہ ہر طرف گھپ اندھیرا چھا گیا ہے نہ چمن ہے نہ پھول۔ نہ پرندوں کی چہکار نہ کلیوں کی مہکار۔ رنگ و بُو کا سماں غائب ہو چکا ہے۔ چاروں طرف تاریکیوں نے دامن پھیلا رکھا ہے۔ آسمان پہ سیاہ بادل چھا گئے ہیں۔ گرج چمک کی خوفناک آوازوں کے سوا اور کوئی صدا نہیں ہے۔ یکایک بجلی کوندتی ہے۔ ایک لمحے کے لیے مجھے گلستان کی جھلک نظر آتی ہے اور پھر ایک دل دہلا دینے والی آواز کے ساتھ بجلی گرتی ہے۔ آگ اور بربادی کے سوا اور کوئی منظر سامنے موجود نہیں رہتا۔ درخت آتش بازی کی صورت جلنے لگتے ہیں۔ شعلے دیکھتے ہی دیکھتے آسمان سے باتیں کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ آناً فاناً ہر شے جل جاتی ہے۔ راکھ ہو جاتی ہے۔ مگر شعلوں کی تپش میں کمی نہیں ہوتی۔ شعلوں کی لپٹیں اب میری طرف بڑھ رہی ہیں۔ میں جان بچانے کے لیے اٹھ کر بھاگنا چاہتا ہوں۔ مگر ہاتھ پیر بے جان ہو چکے ہیں۔ ذہن میں ارادہ ضرور ہے لیکن جسم میں طاقت نہیں۔ میں سوچ سکتا ہوں مگر عمل کرنے کی قوت سے یکسر محروم ہو چکا ہوں۔ آگ کے شعلے مجھے جلانے کے لیے تیزی سے لپکتے ہوئے میری طرف بڑھ رہے ہیں۔ میں خوفزدہ ہو کر امداد کیلئے پکارنا چاہتا ہوں۔ مگر میرے حلق سے آواز نہیں نکلتی۔ میرا منہ کھلتا ہوا محسوس ہوتا ہے مگر کوئی آواز نہیں ہے۔ خوف دہشت اور آگ کی تپش کی

وجہ سے مَیں پسینے میں ڈوب چکا ہوں۔ شعلوں کی گرمی میرے جسم کو جھلسانے لگی ہے۔ مجھے احساس ہے کہ کچھ دیر بعد مَیں اس آگ میں زندہ جل مروں گا اور کسی کو میرے بارے میں علم بھی نہ ہو گا۔ میرا جسم راکھ بن چکا ہو گا اور اس راکھ کو ہوا اُڑا کر نہ جانے کہاں لے جائے گی۔ پھر روزی کا کیا ہو گا؟!

روزی ——! مجھے چاہنے والی، مجھ پر جان چھڑکنے والی بیوی۔ جو میرے بغیر ایک پل نہیں رہ سکتی۔ جس کی خوشیوں آرزوؤں اور اُمنگوں کا مرکز صرف میری ذات ہے۔ جس کی زندگی کا مقصد ہی میری پرستش کرنا ہے۔ جو اس کا شوہر بھی ہوں اور محبوب بھی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ ہمہ وقت پروانہ وار مجھ پر نثار ہونے کے لیے تیار رہی ہے۔ وہ تمام زندگی تو کیا، چند لمحے بھی میرے بغیر گزارنے کا تصور نہیں کر سکتی۔ وہ میرے بغیر کیوں کر جیے گی؟ کیسے اس عظیم صدمے کو برداشت کرے گی؟ خدایا۔ کیا روزی کی خاطر بھی تو اپنے ایک گناہ گار، خطاکار بندے کو نہیں بچا سکتا؟ تو قادرِ مطلق ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے لیے تو نے آگ کے شعلوں کو گل گلزار بنا دیا تھا۔ مانا کہ مَیں ایک حقیر اور گناہوں میں غلطاں انسان ہوں، کہاں ابراہیمؑ اور کہاں مجھ ایسا خاکی و خاطی گناہ گار بندہ۔ لیکن تیری رحمت اور قوت تو وہی ہے۔ تُو چاہے تو مجھے روزی کی خاطر اس آفت سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ پھر مَیں نے چشمِ تصور میں روزی کو دیکھا۔ اس کا حسین و شاداب چہرہ آنسوؤں میں بھیگا ہوا تھا۔ اس کی زلفیں پریشان تھیں اس کا لباس میلا اور مسلا ہوا تھا۔ وہ جو اپنی نفاست اور خوش لباسی کے لیے مشہور ہے، مایوسی اور گندگی کا ڈھیر بنی ہوئی فرش پر پڑی تھی۔ اسے یہ احساس بھی نہ تھا کہ مٹی اس کے بالوں کو اور اس کے لباس کو گندہ کر رہی ہے۔ اس کے چمکدار ریشم جیسے بال گرد و غبار میں اَٹے ہوئے ہیں مگر وہ اپنے گرد و پیش سے بے خبر اور بے پروا ہے۔ وہ سوگواری کا مرقع بنی ہوئی ہے۔ کیا وہ اس صدمے سے جاں بر بھی ہو سکے گی؟ میرے بعد کون ہے جو روزی کی خوشیوں کا خیال رکھے گا۔ اس کی ضرورتیں پوری کرے گا۔ اسے کوئی کمی محسوس نہیں ہونے دے گا؟ ایسا کون ہے؟! کون؟!

اور پھر اسی لمحے میرے یادداشت کے سکرین پر شوکت کی تصویر اُبھری۔ شوکت، جو میرا بہترین دوست، مخلص، ہمدرد اور جاں فروش ہے۔ کاش دُنیا میں سبھی لوگوں کو شوکت جیسے دوست میسر آ سکیں۔ شوکت جیسے دوستوں کے ہوتے ہوئے کسی اور مددگار اور محافظ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ میری کون سی مشکل ہے جو شوکت نے آسان نہیں کی؟ کون سا مسئلہ ہے جو شوکت نے حل نہیں کیا۔ مَیں اس کی وفاداری اور دیانت داری کی قسم کھا سکتا ہوں۔ فی زمانہ بے وفائی اور مکر و فریب کے اندھیروں میں وہ ایک روشن مینار کی حیثیت رکھتا ہے۔ تو کیا مَیں شوکت جیسے دوست سے بھی محروم ہو جاؤں گا؟ میرے بعد شوکت کا کیا حال ہو گا؟ وہ کیسے ایک بہترین دوست اور قابلِ اعتماد بزنس پارٹنر کی جُدائی کا صدمہ برداشت کرے گا؟ کیا وہ اس غم سے مر نہیں جائے گا؟ وہ جو ایک ہنس مکھ، لطیفہ باز اور ہر حال میں مست رہنے والا انسان ہے جو زندگی کی رگوں سے خوشیوں، رعنائیوں اور راحتوں کی ایک ایک بُوند تک نچوڑ کر نوشِ جان کر لینا چاہتا ہے۔ میرے بغیر اس کی زندگی بے معنی ہو کر نہیں رہ جائے گی؟

شوکت کا صحت مند، خوبصورت، تر و تازہ چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آیا تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور دل میں زندہ رہنے کی خواہش مچلنے لگی۔ شوکت جیسے دوستوں کی خاطر مرنے کا بھی مزہ ہے اور زندہ رہنے کا بھی۔ یہ خیالات چشم زدن میں میرے ذہن میں لہرا گئے۔ مگر میرے پاس سوچنے کی مہلت نہ تھی۔ آگ کے شعلوں نے، جن کی لپٹیں آسمان تک جا رہی تھیں مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ اپنی موت مجھے آنکھوں کے سامنے صاف نظر آ رہی تھی۔ شعلے موت کا رقص کرتے ہوئے مجھے اپنے گھیرے میں لینے کے لیے آگے بڑھ رہے تھے۔

یکایک میری آنکھ کھل گئی۔ ایک لمحے کے لیے مَیں کچھ بھی نہ سوچ سکا۔ سب کچھ غائب ہو چکا تھا، لیکن روزی کا پریشان چہرہ میری نگاہوں کے سامنے تھا وہ سہمی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے مگر میرے کان اس کی آواز سننے سے قاصر تھے۔ وہ تشویش بھری نظروں سے دیوانہ وار مجھے جھنجھوڑ رہی تھی۔ مگر مَیں مدہوشی کی کیفیت میں تھا اس نے میرے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ مَیں اس وقت چونکا جب ایک طمانچہ میرے رخسار پر لگا۔ اب مَیں اپنے ہوش و حواس میں آ چکا تھا۔ مَیں روزی کا آنسو بھرا چہرہ بھی دیکھ سکتا تھا اور اس کی آواز بھی سُن سکتا تھا۔ وہ بار بار میرا نام پکار رہی

تھی: "یوسف۔ یوسف۔ خدا کے لیے ہوش میں آؤ۔ یوسف۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟" ساتھ ہی وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ اُس کے آنسو میرے چہرے پر گرے تو میری باقی حسوں نے بھی کام شروع کر دیا۔ مَیں کہنیوں کے سہارے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ ہاتھ کانپ رہے تھے اور دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ابھی سینہ توڑ کر باہر نکل آئے گا۔

"روزی!" مَیں نے اُسے کمزور آواز میں پکارا۔ "مَیں ٹھیک ہوں فکر نہ کرو۔"

میری آواز سُن کر وہ ساکت رہ گئی۔ پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے تکتی رہی اور پھر یک لخت مجھ سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ روئی تو یوں روئی کہ اُسے چُپ کرانا مشکل ہو گیا۔ نہ اس کے آنسو تھمنے کا نام لیتے تھے نہ اُس کی آواز —— مجھے تو لینے کے دینے پڑ گئے۔ مَیں نے اُسے پیار سے تھپکا۔ محبت سے اُسے دلاسہ دیا۔ اس کے بہتے ہوئے آنسو پونچھے۔ بار بار اُسے یقین دلایا کہ مَیں بالکل ٹھیک ہوں۔ صحت مند ہوں۔ مجھے کچھ نہیں ہوا۔

"تو پھر وہ سب کیا تھا؟" اُس نے سسکیوں کے درمیان سوال کیا۔ "پہلے بھی کئی مرتبہ ایسا ہو چکا ہے۔ آپ مجھے بتاتے کیوں نہیں؟"

"مَیں نے پھر ایک خواب دیکھا ہے۔ ڈراؤنا خواب۔"

"کیا دیکھا تھا خواب میں جو یوں ڈر گئے؟ آپ تو بہت جی دار اور مضبوط آدمی ہیں۔ مَیں نے آپ کو کبھی کسی سے ڈرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ پھر خواب میں کیا دیکھ لیتے ہیں جو ڈر کر کانپنے لگتے ہیں۔ اور گھنٹوں بے چین رہتے ہیں۔"

"ارے خواب تو بس خواب ہی ہوتا ہے۔ اس میں بہادری کا کیا سوال ہے؟"

"پھر بھی۔ کیا دیکھتے ہیں خواب میں؟ یہ خواب ہے یا کوئی بیماری۔ آخر ڈاکٹر کو کیوں نہیں دکھاتے؟"

مَیں اس وقت بلاوجہ بات بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے موضوعِ سخن بدلنے کی خاطر کہا۔ "اُف وہ بھی خواب بھی بتا دوں گا۔ مَیں نے کوئی بات چھپائی ہے کبھی تم سے؟" مَیں نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "مگر تم اپنی حالت تو درست کر لو۔ ذرا آئینہ دیکھو۔ چہرہ بالکل سفید ہو رہا ہے۔ کاغذ کی طرح۔ آنکھوں میں وحشت ہے۔ منہ پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں۔ ہونٹ خشک ہو رہے ہیں۔ اپنے آپ کو سنبھالو۔"

"کیسے سنبھالوں؟" وہ روہانسی آواز میں بولی۔ "آپ کی عجیب حالت تھی۔ مَیں تو آپ پر ہلکے سے غم کا سایہ بھی نہیں دیکھنا چاہتی مگر آپ جب یہ خواب دیکھتے ہیں تو اپنے ہوش و حواس میں نہیں رہتے۔ آخر کب تک آپ ایسے خواب دیکھ کر میری زندگی ویران کرتے رہیں گے؟" اس کی آنکھوں میں پھر آنسو تیرنے لگے۔

روزی کے ساتھ میری شادی کو محض سات ماہ گزرے تھے۔ لیکن اس نے اپنے پیار، خدمت اور خلوص کی وجہ سے میرے دل میں جگہ بنا لی تھی۔ جب ہماری شادی ہوئی تو مجھے ڈر تھا کہ شاید مَیں روزی کو ذہنی اور روحانی طور پر قبول نہ کر سکوں۔ شادی کے پہلے ہی دن مَیں نے اُسے واضح طور پر بتا دیا تھا کہ اگر مَیں اپنے وجود کو مکمل طور پر اسے نہ سونپ سکوں تو وہ اُسے میری مجبوری سمجھ کر نظر انداز کر دے۔ لیکن جہاں تک شریکِ حیات کے طور پر اسے آسائش اور لوازمات فراہم کرنے کا تعلق ہے اس میں کوئی کوتاہی نہ ہو گی۔ روزی کو میری مجبوری کا علم تھا وہ جانتی تھی کہ میرا ذہن اور میری روح خود میرے اختیار میں بھی نہیں ہیں۔ ان پر کسی اور کا تسلط ہے۔ یہ بھی روزی کی عظمت اور پیار کی لگن ہی کا ثبوت تھا کہ وہ یہ جانتے ہوئے بھی میری شریکِ زندگی بننے پر آمادہ ہو گئی کہ میرے ذہن و دل پر کوئی اور قابض ہے۔

اس نے سادگی سے صرف اتنا کہا: "یوسف۔ چکور کو محض چاندنی سے مطلب ہوتا ہے۔ وہ چاند کی روشنی میں نہا کر ہی خوش ہو جاتا ہے چاند اس کو ملتا ہے یا نہیں اور وہ کبھی چاند تک پہنچ بھی سکے گا یا نہیں؟ اس سے چکور کو کوئی سروکار نہیں ہوتا۔"

مَیں نے کہا: "مگر روزی۔ مَیں خود اپنے آپ کو مجرم سمجھتا رہوں گا۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا رہے گا۔"

وہ اُداسی سے مسکرائی: "آپ کا ضمیر تو میں ہوں۔ اور میری زبان سے آپ کبھی کلماتِ محبت کے سوا اور کچھ نہیں سُنیں گے۔"
میں نے کنکھیوں سے سائیڈ ٹیبل پر رکھی ہوئی تصویر کی طرف دیکھا اور بے ساختہ روزی کی نظریں بھی میری نگاہوں کے تعاقب میں اِس تصویر تک پہنچ گئیں۔
وہ جذباتی انداز میں کہنے لگی "یقین کیجئے۔ میں آپ کے دل سے اِس تصویر کو مٹانے کی کوشش کبھی نہیں کروں گی یقین کیجئے مجھے اس لڑکی سے کوئی شکایت نہیں ہے بلکہ مجھے تو یہ دُکھ ہے کہ آپ کی منزل آپ کو نہ مل سکی۔"
میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ محبوبیت۔ محبت اور وفا کی اس سے اچھی تعبیر میں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ میں نے سوچا۔ کیا یہ میری خوش نصیبی نہیں ہے کہ مجھے روزی جیسی بیوی ملی ہے۔
"اچھا اب آپ سو جائیے۔ میں آپ کا سر دبا دیتی ہوں۔"
اُس کے نرم و ملائم ہاتھوں کا لمس میری پیشانی پر محسوس ہُوا تو میں نہ چاہتے ہوئے بھی عاشی کے متعلق سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ عاشی! جسے میں نے اپنی منزل سمجھ لیا تھا اور وہ خود بھی مجھے اپنے وجود کا ایک حصہ سمجھتی تھی جس نے مجھے جینے کا ایک نیا حوصلہ اور ارادہ بخشا تھا۔ جس نے میری ویران زندگی میں خوشیاں اور رنگینیاں بکھیر دی تھیں۔ جو بہار کا پہلا جھونکا بن کر میرے دل و دماغ پر چھا گئی تھی۔ وہ اِس وقت کہاں ہو گی؟ کیا کر رہی ہو گی؟ کیا وہ بھی مجھے یاد کرتی ہو گی؟ یا نقش بر آب کی طرح اُس نے مجھے یکسر فراموش کر دیا ہو گا؟ کیا وہ بے وفا تھی؟ اس خیال کے آتے ہی میں بے چینی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ روزی حیران نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ مگر میں دیوانہ وار ٹہل رہا تھا۔
"نہیں نہیں۔ عاشی بے وفا نہیں ہو سکتی۔ وہ تو خالص مشرقی عورت تھی۔ وفا۔ اخلاص اور ایثار کا نادر نمونہ۔ اُس کے دل میں تو محبت کا ایک آبشار بہہ رہا تھا۔ کبھی نہ ختم ہونے والا آبشار۔ جس نے مجھے بھی اپنے چھینٹیں اُڑاتے ہر کش پانی میں بھگو دیا تھا۔ سرابور کر دیا تھا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ بے وفا ہو؟ تو پھر وہ اچانک، اطلاع کے بغیر کہاں غائب ہو گئی؟ اس نے مجھے خط تک نہیں لکھا۔ کبھی اپنی خیریت سے مطلع کرنا بھی ضروری نہ سمجھا؟ کیا وہ کسی حادثے کا شکار ہو گئی؟ میں مضطرب ہو کر کھڑکی میں جا کھڑا ہُوا۔ نہیں۔ وہ زندہ سلامت ہے میرا دل گواہی دیتا ہے کہ وہ اِسی دُنیا میں موجود ہے ـــــ" میرے دل نے ایک بار پھر مجھے دلاسہ دینے کی کوشش کی۔
"وہ مجھے پھر سے کیوں نہیں ملی؟ مجھے اپنے بارے میں کیوں نہیں بتایا؟ مجھ سے اتنی بے تعلق اور بے پروا کیوں ہو گئی؟ مگر یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ مجبوریوں کا شکار ہو گئی ہو۔ ہمارے معاشرے میں لڑکیاں کتنی بے بس اور مجبور ہوتی ہیں؟ ہر قدم پر سمجھوتے کرتی ہیں۔ کتنی مجبوریوں کا زہر پیتی ہیں اور جیتی ہیں۔" میرے ذہن نے دلیل دی مگر عاشی تو اُن لڑکیوں میں سے نہ تھی۔ وہ ایک مضبوط ارادے کی مالک تھی۔ اسے کوئی مجبوری، کوئی جبر میرے پاس آنے سے نہیں روک سکتا تھا۔ وہ میری پہلی اور آخری آرزو تھی اور شاید میں بھی اس کی......"
"چائے؟" میں نے چونک کر دیکھا تو کھڑکی میں میرے برابر روزی بھاپ اُٹھتی ہوئی چائے کی گرم گرم پیالی لیے کھڑی تھی۔ نہ جانے کب سے کھڑکی کے پاس اپنی سوچوں میں گم کھڑا تھا اور نہ جانے کس وقت وہ کمرے سے رخصت ہو گئی تھی۔ دُور تک کا منظر آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ واقعی مجھے گرم چائے کی ایک پیالی کی ضرورت تھی۔ روزی میری خواہشات و ضروریات کو کتنی جلدی جان لیا کرتی ہے!؟ وہ پوچھے بغیر میرے ہر سوال کا جواب جانتی ہے۔ میں نے تشکرانہ انداز میں اُس کی طرف دیکھا اور چائے کی پیالی اس کے ہاتھ سے لے لی۔
"میں دوسرے کمرے میں جا رہی ہوں، کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بلا لیجئے گا۔" اس نے آہستگی سے کہا اور اُداسی سے خراماں خراماں کمرے سے باہر چلی گئی۔ میں نے اُسے کچھ نہیں بتایا تھا، لیکن وہ میری ذہنی اُفتاد سے واقف تھی۔ وہ میرے تواب کی تفصیلات سے واقف نہ تھی، لیکن میری دیوانگی سے آگاہ تھی۔ وہ خوب سمجھتی تھی کہ جب میں اچانک بولتے بولتے خاموش ہو جاتا

ہوں یا ہنستے ہنستے یکایک اُداس ہو جاتا ہُوں تو اس کا مطلب کیا ہے؟ دراصل میں ذہنی طور پر کہیں اور پہنچ جاتا ہوں۔ اپنے خیالوں کی ایک الگ دُنیا آباد کر لیتا ہوں۔ اس لمحے میرے لیے ساری دُنیا بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ میں صرف ایک ہستی کے خیال میں کھو جاتا ہُوں۔ تذبذب اور دیوانگی کا یہ عالم مجھ پر گھنٹوں اور کبھی کبھی دِنوں طاری رہتا ہے۔ ایسے وقت مجھے کسی کی تسلی کسی کی مدد کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میں صرف خاموشی چاہتا ہوں۔ تنہا رہنا چاہتا ہُوں۔ اپنے آپ میں گم رہنا چاہتا ہُوں اور روزی بڑے خلوص اور یگانگت سے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیتی ہے کسی شکوہ اور شکایت کے بغیر۔ ایسی بے لوث، بے غرض اور دُکھ درد بانٹنے والی بیوی بھلا اور کون ہو سکتی ہے؟ سب سے بڑی بات یہ کہ وہ اپنے شوہر کے ذہن و دل پر کسی دوسری عورت کے قبضے سے ناراض اور شاکی بھی نہیں ہے۔ اس کے معصوم اور پاکیزہ دل میں سوتیا ڈاہ جیسے نفرت بھرے جذبے کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ میں نے سوچا عورت ذات اپنے شوہر کی زندگی تو کیا اس کے چند لمحے بھی کسی دوسری عورت کو مستعار دینے کی روادار نہیں ہوتی۔ پھر یہ کیسی عورت ہے جو اپنے شوہر کے باسی اور بچے کھچے جذبات پر اکتفا کرتی ہے اور مُنہ سے اُف تک نہیں کرتی۔ جو شوہر کے پیار کی کھرچن ہی سے خوش اور مطمئن ہے۔ کاش میں بھی اپنے آپ کو روزی کے قابل بنا سکتا۔ وہ عظمت کی جس بلندی پر کھڑی ہے سمجھ بُوجھ کی سیڑھی لگا کر کم از کم وہاں تک پہنچنے کی کوشش تو کرتا۔ مگر دل پر کسے اختیار ہوا ہے جو مجھے ہو گا!؟۔
کمرے کا دروازہ کسی آواز کے بغیر بند ہو چکا تھا اور اب میں کمرے میں بالکل تنہا تھا۔ کوئی ذی نفس میرے ساتھ نہیں تھا لیکن یادوں کا ہجوم میرے آس پاس تھا۔ اپنی مایوسیوں، اپنے پچھتاووں کے ساتھ میں کمرے میں اکیلا تھا۔ یہ وہ لمحات تھے جن کو میں عزیز بھی رکھتا تھا مگر ان سے خائف بھی تھا۔ ان سے دامن بچانے کی کوشش بھی کرتا رہتا تھا۔ تلخ یادیں غموں اور دُکھوں کے سوا اور کیا دے سکتی ہیں؟
میں نے چند مہینے پہلے سگریٹ نوشی چھوڑ دی تھی مگر نگاہ اٹھا کے دیکھا تو سائیڈ ٹیبل پر مجھے اپنی پسندیدہ سگریٹ کا نیا پیکٹ رکھا ہُوا نظر آ گیا۔ نزدیک ہی سگریٹ لائیٹر بھی موجود تھا۔ یہ بھی روزی کے حُسن کارکردگی کی ایک ادا تھی۔ وہ بخوبی اس بات سے آگاہ تھی کہ تنہائی کا زہر سگریٹ کے بغیر میرے حلق سے نہیں اُتر سکتا۔ میں گھنٹوں سگریٹ پھونکتا اور دیوانوں کی مانند کمرے میں گھومتا رہتا ہُوں۔ وہ صبح آئے گی تو میں تھک کر سو چکا ہوں گا۔ وہ کمرے کی کھڑکیاں کھول کر کثیف دھوئیں کا غبار باہر نکالے گی۔ کمرے کو صاف کرے گی۔ فرش پر سے ماچس کی تیلیاں اور سگریٹ کے ٹکڑے سمیٹے گی۔ گلدانوں میں تازہ پھُولوں کے گلدستے سجائے گی تاکہ جب میں سو کر اُٹھوں تو کمرہ خوشبو سے مہک رہا ہو۔ اس خوشبو میں پھُولوں کے ساتھ ساتھ روزی کی مخصوص خوشبو بھی شامل ہُوا کرتی ہے۔ شکریہ روزی! میں تمہارا ممنون ہوں کہ تم ایک دیوانے کا اس قدر خیال رکھتی ہو، جو بے اعتنائی اور بے پروائی کے سوا تمہیں کچھ اور نہیں دے سکتا۔ روزی کی یہی خوبیاں تھیں جنھوں نے میرے دل کو موہ لیا تھا۔ میرے خیالات کو موم کر دیا تھا اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا سپاس گزار تھا۔ شاید وہ جانتی ہے کہ اظہارِ تشکر محبت کا پہلا زینہ ہے۔ روزی کتنی سُوجھ بُوجھ والی عورت ہے!!
میں نے کھڑکی کے شیشوں سے باہر جھانکا۔ دُور پہاڑوں پر کہر چھائی ہوئی تھی۔ سرد ہواؤں نے آفت ڈھائی ہُوئی تھی۔ میں اپنے گرم کمرے میں یخ بستہ خنکی اور ہڈیوں تک اُتر جانے والی سرد ہواؤں کی قیامت خیزیوں سے محفوظ تھا۔ اس لیے دُور پہاڑوں کی چوٹیوں پر بکھری ہُوئی دُھند سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ دُھند کے پردوں میں مجھے کچھ عکس، کچھ تصویریں نظر آ رہی تھیں۔ آج پھر میرے ماضی کی یادیں بڑی شدت سے مجھے ستا رہی تھیں۔ مجھے بیتے ہُوئے دن بے اختیار یاد آ رہے تھے۔
مجھے معلوم نہیں کہ میرے والدین کب مجھے چھوڑ کر اس دُنیا سے رخصت ہُوئے۔ جب کچھ ہوش سنبھالا تو میں نے اپنی پھوپھی کا مہربان اور شفیق چہرہ دیکھا۔ اُن کی ذات کے سوا دُنیا میں کوئی اور میرا نہ تھا۔ پھوپھی حمیدہ میرے ابّو کی چھوٹی بہن تھیں وہ مجھے بتایا کرتی تھیں کہ میرے ابّو اور خود وہ بھی بچپن ہی میں ماں باپ کے سائے سے محروم ہو گئے تھے۔ مگر ابّو نے بڑے حوصلے

اور مضبوط ارادے سے کام لیا۔ انھوں نے اپنی چھوٹی بہن کو کبھی ماں باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ دادا جان بنک میں کچھ سرمایہ اور سر چھپانے کے لیے ایک گھر چھوڑ گئے تھے۔ ابو نے کسی بزرگ کی سرپرستی کے بغیر ہی اپنی ساری توجہ تعلیم پر مرکوز رکھی پھوپھی حمیدہ بتایا کرتی تھیں کہ وہ پچھلی رات تک پڑھا کرتے تھے۔ تب ہی تو ہر جماعت میں اُن کی پہلی پوزیشن آیا کرتی تھی۔ وہ ایک ذہین، محنتی اور شوقین طالب علم تھے۔ انھوں نے میٹرک کا امتحان بہت اچھے نمبروں میں پاس کیا اور پھر بی کام میں بھی ممتاز پوزیشن حاصل کی۔ ابو پھوپھی حمیدہ کی تعلیم کی طرف سے بھی غافل نہیں ہوئے۔ اُس دور میں جبکہ لڑکیوں کی تعلیم کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاتی تھی، بلکہ اکثر گھرانے تو اس کے سخت مخالف تھے۔ ابو نے پھوپھی حمیدہ کو تعلیم کی طرف مائل کیا پھوپھی کو پڑھنے کا بالکل شوق نہیں تھا۔ گھر کے کاموں سے فرصت ملتی تو وہ گڑیاں کھیلتی رہتیں۔ انھیں گڑیوں سے کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ گڑیوں کا شوق تو بیشتر لڑکیوں کو ہوتا ہے مگر پھوپھی حمیدہ کو تو جیسے دیوانگی تھی۔ بچپن ہی سے وہ گڑیوں کو توڑ پھوڑ کر پھینکنے کی بجائے انھیں سنوارتیں، سجاتیں اور اپنے ساتھ ہی بستر پر سلایا کرتی تھیں۔ انھیں جو گڑیا بھی مل گئی وہ ہمیشہ اُن کے پاس صحیح سلامت اور محفوظ رہی۔ یہی وجہ ہے کہ جب میں نے ہوش سنبھال کر دیکھا تو ہمارا گھر اچھا خاصا گڑیا خانہ بنا ہوا تھا۔ ایک کمرہ تو خاصتاً گڑیوں کے لیے مخصوص تھا اور "گڑیا گھر" کہلاتا تھا۔ مگر دوسرے کمروں تک بھی گڑیاں سجی ہوئی نظر آتی تھیں۔ ابو نے پھوپھی حمیدہ کو پڑھائی کی طرف راغب کرنے کی بہت کوشش کی۔ سمجھایا بجھایا اور جب وہ مائل نہ ہوئیں تو دھمکی دی کہ نہ صرف اُن کے لیے مزید گڑیاں نہیں لائیں گے بلکہ اُن کی موجودہ گڑیاں بھی چھپا دیں گے اور اگر پھر بھی انھوں نے تعلیم حاصل نہ کی تو گڑیوں کو گھر سے باہر پھینک دیں گے یہ آخری دھمکی کارگر ثابت ہوئی۔ گڑیوں سے جدائی کا تصور ہی پھوپھی حمیدہ کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ مجبوراً انھوں نے پڑھنے کی طرف توجہ دی۔ مگر وہ بقول خود ان کے بہت پھسڈی طالبہ تھیں۔ انھوں نے کبھی تھرڈ ڈویژن سے زیادہ حاصل نہیں کی۔ مگر ابو کے لیے یہی اطمینان بہت تھا کہ وہ تعلیم حاصل تو کر رہی ہیں۔ بڑی مشکل سے پھوپھی حمیدہ نے میٹرک کا امتحان دو تین سال کی کوشش کے بعد پاس کیا اور ابو نے بہت خوشیاں منائیں۔ انھیں درجن بھر مختلف اقسام گڑیاں تحفے کے طور پر دیں اور وعدہ کیا کہ دُنیا کی ہر ملک کی گڑیا وہ انھیں منگوا کر دیں گے۔ بشرطیکہ وہ بی۔ اے بھی پاس کر لیں۔ بی۔ اے پاس کرنا پھوپھی حمیدہ کے نزدیک پہاڑ کھودنے سے زیادہ مشکل کام تھا لیکن گڑیوں کا لالچ بھی کم نہ تھا۔ چنانچہ انھوں نے فرسٹ ایئر میں داخلہ لے لیا۔ مگر ان کا زیادہ وقت یہ معلومات حاصل کرنے میں گزر جاتا کہ دُنیا کے کون سے مُلکوں میں کس قسم کی گڑیاں پائی جاتی ہیں۔ وہ ان گڑیوں کی فہرست تیار کرنے میں لگی رہتیں اور وقتاً فوقتاً ابو کو بھی یہ معلومات فراہم کر دیا کرتیں۔

ابو کی خواہش تو یہ تھی کہ وہ اپنی شادی کرنے سے پہلے پھوپھی حمیدہ کے ہاتھ پیلے کریں مگر ایک تو اس میں یہ امر مانع تھا کہ پھوپھی حمیدہ کی تعلیم پوری نہیں ہوئی تھی اور ابو چاہتے تھے کہ وہ شادی سے پہلے کم از کم بی۔ اے ضرور کر لیں۔ دوسرے وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ پھوپھی حمیدہ پر سے گھریلو ذمہ داریوں کا بھاری بوجھ ہٹ جائے۔ گھر میں ایک ماما ملازم تھی مگر پھر بھی گرہستی کا سارا بار پھوپھی حمیدہ پر تھا۔ چنانچہ ابو نے پھوپھی حمیدہ سے مشورہ کیا۔ اور ان کی اجازت اور فرمائش سے خود اپنے لیے شادی کے منصوبے بنانے لگے۔

ہمارے معاشرے میں شادی بیاہ کے معاملات خاندان کے بزرگ طے کرتے ہیں اور رشتہ تلاش کرنے کے فرائض بھی خاندان کی عورتیں سرانجام دیتی ہیں۔ مگر ابو کو یہ سہولت حاصل نہ تھی۔ ان کا تمام تر خاندان محض دو افراد پر مشتمل تھا اور پھر پھوپھی حمیدہ کی عمر اور تجربہ ایسا نہ تھا کہ وہ ابو کے لیے رشتے تلاش کرتیں۔ پھر یہ باتیں تو میل جول سے پیدا ہوا کرتی ہیں۔ اور پھوپھی حمیدہ کو تو گھریلو کاموں، پڑھائی اور گڑیوں کی دیکھ بھال ہی سے فرصت نہ تھی۔ وہ بھلا اپنے لیے بھابی کیسے اور کہاں سے تلاش کرتیں؟ مگر یہ مشکل بھی خود بخود حل ہوگئی۔ ہوا یہ کہ ابو جس دفتر میں منیجر تھے وہاں ٹائپسٹ کے طور پر ایک نئی لڑکی کا تقرر ہوا۔ لڑکی بہت شرمیلی اور سیدھی سادھی تھی۔ ہر وقت سہمی سہمی رہا کرتی۔ مردوں کے ساتھ میل جول اُسے بالکل پسند نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مردانہ ماحول میں کام کرنے کی گھبراہٹ اُس میں اتنی طاری رہتی کہ وہ اپنے کام میں غلطیاں کرنے لگی۔ ابو نے ایک بار اُسے بُلا کر سمجھایا

اور دوسری بار بھی وہی غلطیاں ہوئیں تو بلا کر ڈانٹا تو وہ رونے لگی۔ ابو بے چارے گھبرا گئے اور لگے معذرت کرنے۔ وہ جتنی معذرت کرتے ٹائپسٹ کے آنسو اتنی ہی شدت سے نکلتے۔ خدا خدا کرکے اس کا رونا کم ہوا تو ابو نے اسے چائے پلائی، تسلی دی اور نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی کہ اسے کام میں دھیان لگانا چاہیئے۔ جب تک وہ توجہ نہیں دے گی غلطیاں ہوتی رہیں گی۔ لڑکی نے دوبارہ رونا شروع کر دیا۔ بے چارے ابو کی سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر اُن سے کیا غلطی سرزد ہوگئی ہے اُدھر دفتر والوں نے کانا پھوسی شروع کر دی۔ تنگ آکر ابو نے اتنی زور کی ڈانٹ پلائی کہ لڑکی کا رونا دھونا ایک لخت بند ہو گیا۔ اب ابو بہت گھبرائے کہ اس کے بعد کیا کریں؟ پیار سے سمجھائیں گے تو وہ دوبارہ رونا شروع کر دے گی۔ ڈانٹ ڈپٹ کریں گے تو سہم کر نہ جانے کیا کر بیٹھے؟ چند لمحے کمرے میں خاموشی رہی اور ابو ٹہلتے رہے۔ پھر انہوں نے کہا "دیکھو سکینہ کل اپنے والد کو مجھ سے ملنے کے لیے بھیجنا"

"میرے والد نہیں ہیں۔"

"والدہ تو ہوں گی"

"جی نہیں"

"کوئی بھائی؟ یا بڑی بہن؟"

"وہ بھی نہیں ہے"

"تو پھر کوئی تو بزرگ ہوگا تمہارا؟" ابو نے پوچھا۔

"میرا کوئی نہیں ہے سر۔ ایک دُور کی رشتے دار نے مجھے پالا ہے۔ میرا نوکری کرنے کو بالکل دل نہیں چاہتا۔ گھر سے باہر نکلتی ہوں تو میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ مگر وہ مجھے نوکری کے لیے مجبور کرتی ہیں"

ابو سوچ میں پڑ گئے "کیا رشتہ ہے تمہارا اُن سے؟"

"رشتہ بھی کوئی نہیں ہے۔ بس انھوں نے مجھے پالا ہے"

"مگر تمہارے ماں باپ اور خاندان کے دوسرے لوگ؟"

"سر میں چھوٹی تھی تو گم ہو گئی تھی۔ میں کچھ نہیں جانتی کہ میرے ماں باپ کون ہیں۔ کہاں ہیں؟ میرا خاندان کیا ہے؟ میں دُنیا میں بالکل اکیلی ہوں سر" لڑکی کی آواز بھرا گئی اور اس نے پھر رونا شروع کر دیا۔ اس لڑکی کے بارے میں ابو نے فوری طور پر بہت کچھ سوچا اور آخر ایک نتیجے پر پہنچ گئے۔ انھوں نے اس سے شادی کر لی۔ یہی لڑکی میری ماں تھی۔

مگر یہ شادی آسانی سے نہیں ہوئی۔ پھوپھی حمیدہ نے مجھے بتایا تھا کہ جب ابو شادی کی تجویز لے کر امی کو پالنے والی عورت کے پاس گئے تو وہ آگ بگولہ ہو گئی۔ بہت ناراض ہوئی۔ ابو کے ساتھ ساتھ امی کو بھی خوب سنائیں "میں تو جانتی تھی تو ضرور کوئی چاند چڑھائے گی؟ تجھے اسی لیے پڑھایا تھا۔ نوکری کرائی تھی کہ جاتے ہی عشق بازی شروع کر دے"

امی نے تو حسب عادت رونا شروع کر دیا مگر ابو نے زبردست احتجاج کیا۔

"دیکھیے محترمہ۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ نے مجھ پر اور اس شریف لڑکی پر الزام لگایا ہے۔ آپ اپنے الفاظ واپس لیں"

"مجھے کوئی ضرورت نہیں پڑی ہے الفاظ واپس لینے کی۔ تم ابھی اور اسی وقت یہاں سے چلے جاؤ اور پھر دوبارہ ادھر کا رُخ نہ کرنا۔" پھر وہ موٹی بدمزاج عورت امی سے مخاطب ہو کر بولی "آج کے بعد تیری نوکری ختم۔ توبہ توبہ کیسا خراب زمانہ آگیا ہے۔ کان کھول کر سن لے اگر گھر سے قدم باہر نکالا تو ٹانگیں توڑ دوں گی"

ابو کو بہت بُرا لگا تھے تو وہ بہت کم گو اور شرمیلے۔ مگر انھیں اُس وقت جوش آگیا۔ بولے "دیکھئے محترمہ۔ آپ اس لڑکی کی کچھ بھی نہیں ہیں۔ آپ کو کوئی قانونی یا اخلاقی حق حاصل نہیں ہے کہ اس بے چاری کو حبس بے جا میں رکھیں"

موٹی عورت نے تو آسمان سر پر اٹھا لیا "خدا کی پناہ میں اس کی اب کچھ نہیں رہی۔ ارے میں ہی تو اس کی سب کچھ ہوں۔ میری مرضی کے بغیر یہ انگلی بھی نہیں ہلا سکتی"

ابّو نے نسائیت سے کہا: "یہ لڑکی عاقل ہے، بالغ ہے۔ اپنا بُرا بھلا خود سمجھتی ہے۔ اس کی رضامندی اور خواہش کے بغیر کوئی اسے پابند اور مجبور نہیں کر سکتا۔ مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ نے اسے زبردستی ڈرا دھمکا کر اپنے پاس رکھا ہے اور اس کی خواہش کے خلاف اس سے ملازمت کرانا چاہتی ہیں۔"

"کیوں نہ کراؤں؟" وہ گرجیں: "میں نے اس کی پرورش اور تعلیم پر پیسے خرچ کیے ہیں۔ وہ کہاں سے وصول کروں گی؟"

"کتنے پیسے خرچ ہوئے ہیں آپ کے؟" ابّو نے تنک کر پوچھا۔

"ہزاروں۔"

"پانچ ہزار، دس ہزار، کتنے ہزار؟"

"تم کیوں پوچھ رہے ہو۔ بڑے ہمدرد بنتے ہو۔ ادا کر دو گے مجھے؟"

ابّو نے کہا: "بالکل کر دوں گا۔"

"تو پھر دس ہزار روپے دے دو اور اس کو جہاں جی چاہے لے جاؤ۔ ٹھوکریں کھائے گی تو خود ہی سمجھ جائے گی۔"

ابّو نے امّی کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے اور نگاہوں میں التجا کہ مجھے اس ظالم عورت کے پاس چھوڑ کر نہ جاؤ ورنہ کل مجھے یہاں نہ پاؤ گے۔ ابّو نے ایک لمحہ سوچا اور پھر کہنے لگے۔

"میں سکینہ کو اسی وقت ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ رقم میں کل ادا کر دوں گا۔"

"واہ۔ مجھے بیوقوف سمجھا ہے، یہ بال میں نے دھوپ میں سفید نہیں کیے ہیں۔ خوب سمجھتی ہوں تم جیسے مردوں کی چالاکیاں۔ رقم وصول کیے بغیر یہ ہرگز یہاں سے نہیں جا سکتی۔"

ابّو کو بھی غصہ آ گیا۔ بولے: "دیکھو بڑی بی۔ جو ضمانت تم مانگو میں دینے کو تیار ہوں مگر اب اس لڑکی کو ایک پل کے لیے بھی یہاں نہیں چھوڑوں گا۔ محلے والوں کو بلاؤ تاکہ میں ان کے سامنے تم سے پکا فیصلہ کر لوں۔"

موٹی عورت کو شاید محلے والوں کو بلانا گوارا نہیں تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ محلے والے اس کا سلوک اور برتاؤ دیکھتے رہے تھے اور ہو سکتا ہے اس کی حمایت کرنے کے بجائے وہ اس کے خلاف فیصلہ دیتے۔ بہرحال ابّو نے امّی سے کہا: "سکینہ! اٹھو میرے ساتھ چلو۔"

"میں نے کہہ دیا۔ یہ نہیں جا سکتی۔" بڑی بی نے غصے سے کہا۔

"روک سکتی ہو تو روک لو۔ پولیس، کچہری جو چاہتی ہو کر لو۔ میں اس لڑکی کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ یہ میری ہونے والی بیوی ہے۔ اب اسے میں ایک منٹ کے لیے بھی تمہارے پاس نہیں چھوڑوں گا۔ اور کان کھول کر سن لو۔ اگر تم نے روکنے کی کوشش کی اور پھر بھی یہ میرے ساتھ چلی گئی تو پھر تمہیں ایک پائی بھی ادا نہیں کروں گا۔"

موٹی عورت نے ایک لمحہ سوچا اور پھر امّی کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر بھی اسے ایک مصمم ارادہ نظر آیا ہو گا۔ دوسری طرف ابّو کسی سمجھوتے پر آمادہ نہ تھے۔ اس کو خیریت اسی میں نظر آئی کہ ابّو سے وعدے قسمیں لے کر امّی کو ان کے حوالے کر دے ۔۔۔ کیونکہ امّی کی بدلی ہوئی آنکھیں وہ دیکھ چکی تھی۔ اس طرح ابّو، امّی کو لے کر اپنے گھر آ گئے۔

پھوپھی حمیدہ تو حیران رہ گئیں: "ارے بھائی جان۔ کیا سچ مچ یہ میری بھابی ہیں؟"

ابّو نے کہا: "ہیں تو نہیں، مگر ہو جائیں گی کل تک۔ یہ تمہاری مہمان ہیں حمیدہ۔ ان کے آرام کا خیال رکھنا۔"

پھوپھی حمیدہ ہونے والی بھابی کے صدقے واری جا رہی تھیں۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ اپنا دل نکال کر انہیں پیش کر دیں۔ ڈھونڈنے بِن مانگے ان کے دل کی مُراد پوری کر دی تھی۔ گھر بیٹھے بٹھائے انہیں اتنی اچھی بھابی بھیج دی تھی۔ دوسرے دن ابّو نے دس ہزار روپے کا بندوبست کیا اور امّی کو پالنے والی عورت بلقیس کو لے جا کر دے دیئے۔ اس کو شاید رقم ملنے کی اُمید ہی نہ تھی۔ اتنے ڈھیر سارے روپے یکجا دیکھے تو حیرت سے آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس نے ابّو کی بہت خاطر مدارت کی۔ پھر اُن کے دریافت کرنے

پر بتایا کہ پانچ سال کی عمر میں یہ اُسے ایک میلے میں ملی تھی۔ اُس نے اُس کے ماں باپ کا پتہ معلوم کرنے کی بہت کوشش کی، مگر لڑکی کا کوئی وارث نہ آیا۔ بذاتِ خود اس کے بھی کوئی اولاد نہ تھی۔ شوہر مر چکا تھا۔ تھوڑی بہت جائیداد تھی جس پر گزارہ ہو رہا تھا اُس نے بچی کو پال لیا۔ جب تک سکینہ چھوٹی تھی اس کی محبت بلے لوث رہی مگر جب سکینہ سمجھ دار ہوئی تو بلقیس کو لالچ پیدا ہو گیا، اسے یہ ڈر بھی پیدا ہو گیا کہ کہیں اس کے اصل وارثوں کو سکینہ کے بارے میں خبر نہ ہو جائے اور بلقیس کی ساری ریاضت اکارت چلی جائے۔ پھر وہ یہ بھی چاہتی تھی کہ سکینہ کو تعلیم دلائے تاکہ وہ ملازمت کرے اور بلقیس کی بقیہ عمر آرام اور بے فکری سے گزر جائے۔ چنانچہ وہ سکینہ کو لے کر اپنے گاؤں سے رخصت ہوئی اور ایک شہر میں آباد ہو گئی۔ سکینہ کو وہ خود کالج پہنچانے اور لینے کے لیے جاتی تھی۔ اب اسے کسی لڑکے تو کیا پڑوسن سے ملنے کی اجازت تک نہ تھی۔ بلقیس کے رویئے میں یہ اچانک تبدیلی کیوں پیدا ہوئی؟ شاید اس کی بڑھتی ہوئی عمر کسی سہارے کی عدم موجودگی اور خود اُسکی بے مائیگی کے خوف نے اُسے خود غرض اور سنگدل بنا دیا تھا۔ امّی نے ایف اے کا امتحان دیا تو اس نے انہیں نوکری پر لگانے کی کوشش شروع کر دی۔ وہ طبعاً شرمیلی اور کم گو تھیں۔ اس پر علیحدہ اور تنہا رہنے کی وجہ سے ان کی جھجک اور شرمیلے پن میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ نوکری کرنے کے خیال ہی سے لرز جاتی تھی۔ دُنیا کا انہیں کوئی عملی تجربہ نہ تھا مگر انہوں نے رسالوں اور کتابوں میں پڑھا تھا کہ بعض خود غرض اور سنگدل مرد لڑکیوں کی مجبوریوں اور ضرورت مندی سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ خود بلقیس نے بھی انہیں مردوں کی طرف سے برگشتہ اور بدگمان کر دیا تھا۔ جب اس نے انہیں نوکری کے لیے مجبور کیا تو انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ مگر بلقیس کے سامنے ایک نہ چلی اور انہیں بالآخر ہتھیار ڈالنے پڑے۔ خدا کو انہیں ابّو سے ملانا منظور تھا۔ اس لیے پہلی ہی نوکری انہوں نے ابّو کے دفتر میں کی اور اس طرح وہ دونوں زندگی بھر کے لیے ایک ہو گئے۔

ابّو کی شادی کیا ہوئی گھر میں بہار آ گئی۔ تین نیک اور معصوم انسانوں پر مشتمل یہ گھر جنت اور سکون کا نمونہ تھا۔ ہر وقت قہقہوں سے گونجتا رہتا۔ خوشیوں اور مسرتوں کا ایک سیلاب تھا جو اس چھوٹے سے گھر میں گھس آیا تھا۔ امّی نے گھر کا چارج سنبھالتے ہی پھوپھی حمیدہ کو گھریلو کاموں سے فارغ کر دیا اور اُن کی تعلیم پر توجہ دینے لگیں۔ وہ ابّو سے یہ بھی کہا کرتی تھیں کہ حمیدہ کو اتنا زیادہ پڑھنے کی ضرورت بھی کیا ہے اب اُس کی مانگ سجا دو۔ اپنے گھر جائے گی اور گھر والے کی مرضی ہو گی تو پڑھائے گا ورنہ کافی پڑھ چکی۔ مگر ابّو کی ضد تھی کہ جب تک پھوپھی حمیدہ کم از کم بی۔ اے نہیں کر لیں گی ان کی شادی کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہیے۔ وہ امّی سے کہا کرتے: "سکینہ زمانہ بہت خراب ہے۔ عورت کو اس قابل ہونا چاہیئے کہ بُرا وقت آن پڑے تو خود اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکے۔ دُنیا کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور نہ ہو جائے اور نہ ہی دوسرے لوگوں کی محتاج ہو کر اُن کے اشاروں پر رقص کرے۔ اور مجبوراً زندگی بسر کرے۔"

شادی کے ایک سال بعد میری پیدائش ہوئی۔ ابّو تو جیسے خوشی سے پاگل ہو گئے۔ جب نرس نے انہیں میری پیدائش کی اطلاع دی تو وہ مارے خوشی کے سجدے میں گر گئے۔ ان کے آنسو تھے کہ تھمنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ وہ بار بار پھوپھی حمیدہ سے کہتے: "حمیدہ اللہ نے ہماری سُن لی ہے۔ کتنا مہربان ہے وہ ہم پر۔ بول۔ اب ہمارے گھر میں کسی چیز کی کمی ہے؟"

پھر جب اُنہوں نے پہلی بار مجھے دیکھا تو پہلے تو دُور سے دیکھتے ہی رہ گئے۔

امّی مُسکراتی ہوئی آنکھوں سے اُن کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

پھوپھی نے کہا: "بھائی جان۔ پیار نہیں کریں گے مُنّے کو؟"

انہوں نے چونک کر پھوپھی حمیدہ کی طرف دیکھا۔ پھر کہنے لگے: "حمیدہ۔ یہ اتنا چھوٹا سا تو ہے۔ بہت نازک بھی لگتا ہے۔ مجھے تو اسے ہاتھ لگاتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے، کہیں اس کی ہڈی میں موچ نہ آ جائے۔"

امّی اور پھوپھی حمیدہ کا ہنسی کے مارے بُرا حال ہو گیا۔

پھوپھی نے کہا: "بھائی جان۔ اتنا نازک نہیں ہے آپ کا بیٹا۔ ایک بہادر کا بیٹا ہے۔ آپ ہی کا خون ہے۔ آپ ہی جیسی مضبوط

ہڈیاں ہیں اس کی۔ کچھ نہیں ہوگا۔ آپ اِسے پیار کرکے تو دیکھیں۔"

ابّو نے پہلے پھوپھی حمیدہ کی اور پھر امّی کی طرف دیکھا اور پھر ڈرتے ڈرتے آہستہ آہستہ میری طرف بڑھے۔ پہلے انہوں نے ڈرتے ڈرتے مجھے بہت نرمی سے اٹھایا۔ پھر میرے کان میں اذان دی۔ اذان کے بعد بہت دیر تک خاموشی سے مجھے دیکھتے رہے۔ اُن کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ پھر وہ امّی سے مخاطب ہوئے اور بولے "سکینہ ہم اپنے بیٹے کو بہت بڑا آدمی بنائیں گے۔"

پھوپھی نے پوچھا "کیا اِسے جج بنائیں گے؟"

ابّو کہنے لگے "نہیں، میرا بیٹا بہادر ہے۔ یہ فوج میں جائے گا۔ وطن کے لیے ایسے کارنامے سرانجام دے گا کہ دُنیا دیکھے گی۔"

یہ سب باتیں پھوپھی حمیدہ نے ہمیں بتائی تھیں۔ میں نے کبھی ابّو امّی کی شکل نہیں دیکھی نہ ان کی آواز سُنی۔ مگر یُوں لگتا تھا جیسے وہ دونوں میرے سامنے چل پھر رہے ہیں، ہنس رہے ہیں، جیسے میرے خیالوں میں جان پڑ گئی ہے اور ان کے تصور نے جیتے جاگتے انسانوں کا روپ دھار لیا ہے۔

جب میں نے ہوش سنبھالا اس وقت سے پھوپھی حمیدہ سوتے وقت مجھے لوری یا شہزادی اور بادشاہ کی کہانی کی جگہ ابّو اور امّی کی باتیں سنایا کرتی تھیں۔ وہ خود بھی یہ واقعات بیان کرتے ہوئے ان میں اتنی ڈوب جایا کرتی تھیں کہ لگتا تھا وہ خود بھی اپنی آنکھوں کے سامنے بیان کیے جانے والے مناظر کو متحرک دیکھ رہی ہیں۔ خوشی کی باتیں سناتیں تو بے اختیار ہنسنے لگتیں۔ میں بھی خوب ہنستا۔ اگر کوئی غمناک واقعہ بیان کرتیں تو ان کی آواز گلوگیر ہو جاتی اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ انہیں روتے ہوئے دیکھ کر میں بھی اُداس ہو جاتا اور اُن ہی کے آنچل سے اُن کے آنسو پونچھنے لگتا۔ کبھی کبھی وہ باقاعدہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیتیں۔ میں اُن کے گالوں پر بہتے ہوئے آنسو اپنے ننھے مُنے ہاتھوں سے صاف کرتا جاتا اور انہیں پیار کرکے تسلّی بھی دیتا جاتا "پھوپھی، روتی کیوں ہیں۔ اب رونے سے کیا فائدہ ابّو اور امّی تو اللہ میاں کو پیارے ہو گئے۔ وہ وہاں جنت میں بہت خوش ہوں گے۔ آپ کو روتے ہوئے دیکھ کر وہ کتنے اُداس ہوں گے۔ کیا آپ انہیں جنت میں اُداس کرنا چاہتی ہیں؟"

پھوپھی مجھے بے اختیار گلے سے لپٹا لیتیں اور میرا ماتھا چوم کر کہتیں "ہاں بیٹے۔ تیرے ابّو اور امّی جنتی تھے۔ اللہ نے اپنے کرم سے انہیں جنت میں جگہ دی ہوگی۔ خدا ہمیشہ انہیں وہیں رکھے۔"

میں اُن سے پوچھتا "مگر پھوپھی۔ اللہ میاں نے ابّو اور امّی کو اتنی جلدی اپنے پاس کیوں بُلا لیا؟ اوروں کے ماں باپ تو بہت دیر تک زندہ رہتے ہیں۔ سامنے والے عارف کو دیکھئے۔ اس کے ابا کتنے بوڑھے ہیں۔ اماں جی ہر وقت کھانستی رہتی ہیں۔ منہ پوپلا ہو گیا ہے مگر انہیں تو اللہ میاں نے ابھی تک اپنے پاس نہیں بلایا۔ ان کے بیٹے اور بیٹیاں کتنے بڑے ہو گئے ہیں بڑی بہن کی تو شادی بھی ہو گئی۔ اگر ابّو اور امّی بھی میری شادی تک زندہ رہتے تو اللہ میاں کا کیا نقصان تھا؟"

پھوپھی مجھے چُوم کر کہتیں "بیٹے۔ یہ سب اللہ کے کام ہیں۔ وہی جانتا ہے کہ کیا کرنا چاہیے۔ زندگی اور موت بھی اسی کے ہاتھ میں ہے۔ تم نے دیکھا نہیں، بہت سے بچے تو پیدا ہوتے ہی مر جاتے ہیں اور بہت سے لوگ بوڑھے ہو کر بھی نہیں مرتے۔ یہ سب اللہ میاں کی مرضی سے ہوتا ہے۔"

میں پوچھتا۔ "مگر پھوپھی اللہ میاں نے تو ابّو اور امّی کو نہیں مارا۔ آپ نے خود ہی تو بتایا ہے کہ ایک ٹرک والے نے انہیں کچل کر مار دیا تھا۔"

وہ مجھے سمجھاتیں "پگلے بیٹے۔ اللہ کے حکم کے بغیر تو ٹرک والا بھی انہیں نہیں مار سکتا تھا۔ کتنے بہت سے لوگ ٹرک اور بس سے ٹکرانے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔ بس اللہ میاں کی مرضی تھی۔ اُن کی جان لے لی۔"

"اب میں سمجھ گیا پھوپھی۔ موت کے فرشتے کو اللہ میاں نے ٹرک ڈرائیور بنا کر بھیجا تھا!" میں کہتا۔

پھوپھی حمیدہ بے اختیار ہنس پڑتیں "کتنا سمجھدار ہے میرا بیٹا۔"

میں ساڑھے چار سال کا ہُوا تو پھوپھی حمیدہ نے مجھے پڑھانا شروع کر دیا۔ میں پڑھائی سے دل چُراتا تو وہ مجھے لالچ دیتیں "بیٹے تھوڑی دیر پڑھو گے تو پھر میں تمہیں ابّو اور امّی کی بہت مزیدار بات سناؤں گی۔"

"سچ پھوپھی۔ بالکل نئی؟"

"ہاں۔ بالکل نئی۔"

اور میں ابّو اور امّی کا نیا قصہ سُننے کے شوق میں جھٹ پٹ گنتی یاد کر لیتا۔

ابّو اور امّی کے بے شمار واقعات ایسے تھے جو میں سینکڑوں بار سُن چکا تھا اور سب مجھے اَز بر یاد ہو گئے تھے۔ میں فرمائش کرتا "پھوپھی وہ والی کہانی سنائیں جب امّی چوہا دیکھ کر ڈر گئی تھیں۔"

پھوپھی خود بھی مسکرانے لگتیں "بھئی تمہاری امّی تھیں تو بہت اچھی مگر بہت ڈرپوک تھیں۔ برسات میں چھوٹا سا پروانہ بھی کمرے میں آ جاتا تو ڈر کے مارے کمرے سے باہر بھاگ جاتیں۔ نرم دل اتنی زیادہ تھیں کہ بات بات پر اُن کے آنسو نکل آتے تھے۔"

مجھے امّی کی بُزدلی پر بہت شرم آیا کرتی۔ میں کہتا "مگر پھوپھی، ابّو تو بہت بہادر تھے نا کسی سے نہیں ڈرتے تھے؟"

"کسی سے بھی نہیں۔ خدا کے سوا۔" اور پھر پھوپھی حمیدہ مجھے ابّو کی بہادری اور شجاعت کی داستانیں سنانے لگتیں جو میں نے بارہا سنی تھیں مگر جنہیں سُن کر کبھی میرا دل نہیں بھرتا تھا۔ وہ بتاتی تھیں کہ ابّو واقعی کسی چیز سے نہیں ڈرتے تھے۔ نہ کسی افسر سے، نہ طاقت ور سے، نہ چور سے، نہ ڈاکو سے۔ سانپ کو وہ دُم سے پکڑ کر اٹھاتے اور جھٹکا دے کر مار دیا کرتے۔ جنگلی جانوروں کو وہ خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ انہوں نے سُنایا کہ ایک بار ابّو کسی گھنے جنگل کے ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ گرمی زیادہ تھی اس لیے رات کو برآمدے میں پلنگ بچھوا کر لیٹ گئے۔ چوکیدار نے کہا بھی کہ صاحب باہر سونا خطرناک ہے۔ کبھی کبھی جنگلی جانور اِدھر آ جاتے ہیں مگر ابّو نے ایک بھی نہیں سُنی۔ کلمہ پڑھا اور لیٹ کر بے خبر سو گئے۔ صبح سویرے چوکیدار انہیں جگانے کے لیے پہنچا تو دیکھا کہ اُن کی چارپائی کے نیچے شیر سو رہا ہے۔ چوکیدار کی تو روح فنا ہو گئی۔ ڈر کے مارے گھگھی بندھ گئی۔ ہاتھ سے چائے کی پیالی چھوٹ کر زمین پر گری اور ٹوٹ گئی۔ پیالی کے ٹوٹنے کی آواز سے ابّو کی بھی آنکھ کھل گئی اور شیر کی بھی۔ ابّو کی نظر پہلے تو چوکیدار پر پڑی اور پھر اُن کی توجہ چارپائی کے نیچے لیٹے ہوئے شیر کی طرف گئی۔ شیر نیند سے بیدار ہو چکا تھا۔ ابّو پلنگ پر بیٹھ گئے اور شیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ہتھیار کوئی پاس نہ تھا۔ شیر بڑے آرام سے چارپائی کے نیچے سے نکلا ایک لمبی جمائی لی اور خاموشی سے جنگل کی طرف چلا گیا۔ ابّو خاموش اور مطمئن بیٹھے اسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ پھر بستر سے اٹھ کر چوکیدار کے پاس گئے۔ ابھی اس سے مخاطب بھی نہیں ہُوئے تھے کہ چوکیدار نے ایک دلدوز چیخ ماری اور دھڑام سے بے ہوش ہو کر زمین پر گر گیا۔

ابّو کی شجاعت اور جواں مردی کی اور بھی بہت سی کہانیاں پھوپھی حمیدہ نے مجھے سنائی تھیں۔ انہوں نے بتایا تھا کہ ابّو بہت صحت مند اور طاقت ور آدمی تھے۔ ایک بار بس میں سفر کر رہے تھے کہ سنسان سڑک پر دو مسلح ڈاکوؤں نے راستہ روک لیا۔ اور مسافروں کو لوٹنا شروع کر دیا۔ ابّو نے بھی دوسرے مسافروں کی طرح چپ چاپ اپنی گھڑی اور ساری نقدی نکال کر ڈاکوؤں کے حوالے کر دی۔ مگر جب ایک ڈاکو نے ایک مسافر عورت کے ساتھ بدتمیزی کی اور اس کے گلے کا ہار نوچنا چاہا تو ابّو سے برداشت نہ ہو سکا۔ انہوں نے ڈاکو کا ہاتھ جھٹک دیا اور ایسا گھونسہ رسید کیا کہ پستول اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ ابّو نے اس ڈاکو کو اُٹھا کر دوسرے ڈاکو پر پھینک دیا۔ دوسرے ڈاکو نے پستول سے فائر کیا مگر اتنی دیر میں دوسرے مسافروں نے جھپٹ کر اسے قابو میں کر لیا اور پستول اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ دونوں ڈاکو پکڑے گئے۔

جس عورت کو بچانے کے لیے ابّو نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال دیا تھا وہ اُن کا شکریہ ادا کرتے ہوئے نہیں تھکتی تھی جب اِسے معلوم ہُوا کہ ابّو کی کوئی بہن نہیں ہے تو اس نے انہیں مُنہ بولا بھائی بنانے کی خواہش ظاہر کی۔ ابّو نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا "محترمہ۔ مُنہ سے کہنے اور حقیقت میں اس کو نبھانے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ویسے بھی اسلامی شریعت کی رُو سے میں آپ کے لیے ایک غیر محرم ہوں۔ محض زبان سے کہہ دینے سے تو میں آپ کا حقیقی بھائی نہیں بن سکتا۔ لیکن یقین کیجیے میرے دل میں آپ کے لیے ہمیشہ وہی احترام رہے گا جو ایک بہن کے لیے ہو سکتا ہے۔"

وہ عورت ابّو کے کردار کی بلندی سے اتنی متاثر ہُوئی کہ ان سے گھر کا پتہ لے کر کچھ دنوں بعد اپنے بھائی کے ساتھ ابّو اور امّی

سے ملنے کے لیے گھر آئی۔ امی کو اس نے دوپٹہ بدل بہن بنا لیا۔ وہ ایک مالدار زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ امی کے لیے زیورات کا ایک سیٹ بھی لے کر آئی تھی مگر ابو اور امی دونوں نے لینے سے انکار کر دیا۔ امی نے رخصت کے وقت اسے کانوں کے طلائی بُندے بطورِ تحفہ دیے۔ اس نے انکار کیا تو امی نے کہا: "دیکھو۔ تم نے زبان سے میرے شوہر کو بھائی کہا ہے تو کیا بھائی کے گھر سے اس کی بہن خالی ہاتھ جائے گی؟"

ایسی ایسی اور نہ جانے کتنی کہانیاں تھیں جو حمیدہ پھوپھی مجھے سنایا کرتی تھیں۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ میں بھی بچپن ہی سے نڈر تھا۔ نہ اندھیرے سے ڈرتا تھا نہ جن اور بھوت سے۔ کیڑے مکوڑوں سے بھی مجھے کوئی خوف نہ تھا۔ ذرا بڑا ہُوا تو بھاگ دوڑ اور کھیل کود میں اگر چوٹ لگتی تو مُنہ سے اُف تک نہ کرتا۔ میری بے خوفی اور جسمانی مضبوطی کی وجہ سے مجھ سے بڑی عمر کے لڑکے بھی مجھ سے جھگڑا کرتے ہوئے ہچکچاتے تھے۔ جسمانی قوت کے مظاہروں سے مجھے قدرتی طور پر دلچسپی تھی۔ جان جوکھوں میں ڈالنے والے کھیل میرے پسندیدہ مشغلے تھے اور بڑا ہُوا تو کھیلوں میں دلچسپی لینے لگا۔ باکسنگ کا تو بچپن ہی سے دیوانہ تھا۔ ہر کسی کے ساتھ باکسنگ کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جاتا۔ اس کے بعد فٹ بال اور ہاکی سے وابستگی ہو گئی۔ ایک بار سکول میں انسپکٹر تعلیمات معائنے کے لیے آئے۔ انہوں نے اپنی تقریر میں اس بات پر زور دیا کہ ہمیں اپنے قومی کھیلوں کو بھی اپنانا چاہیے مثلاً کبڈی۔ بس پھر کیا تھا۔ میں کبڈی کے میدان میں کود پڑا۔ اس کھیل میں اتنی مہارت پیدا کی کہ سکول کی کبڈی ٹیم کے ساتھ دُور دُور جانے لگا۔ سکول والے مجھے کبڈی کا چیمپئن کہا کرتے تھے۔ ابھی میں سکول کا طالب علم ہی تھا کہ جوڈو کراٹے کا رواج شروع ہُوا۔ دراصل شروع شروع میں اداکار بروس لی کی فلموں کی وجہ سے جوڈو کراٹے کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ مارشل آرٹ زمانۂ قدیم سے جاپان اور مشرقِ بعید کے دوسرے ملکوں میں موجود تھا مگر اسے دُنیا بھر میں معروف اور مقبول بنانے میں اداکار بروس لی اور اس کی فلموں کا نمایاں حصہ ہے۔

ہمارے سکول میں ایک نئے فزیکل ٹریننگ کے ٹیچر مسٹر محمود آئے۔ وہ جوڈو کراٹے جانتے تھے۔ چھ سات سال جاپان اور ہانگ کانگ میں رہ چکے تھے اور انہوں نے یہ فن جاپانی اُستادوں سے سیکھا تھا۔ میں ایک دن اُن کے گھر پہنچ گیا اور درخواست کی کہ وہ مجھے سکول کے اوقات کے بعد بطورِ خاص جوڈو کراٹے سکھائیں۔ محمود صاحب نے میرا شوق دیکھا تو رضامند ہو گئے۔ سکول سے چھٹی ہونے کے بعد میں ان کے گھر چلا جاتا۔ اور وہ دن ڈھلے تک مجھے جوڈو کراٹے اور کنگ فو کی مشق کراتے۔ پھوپھی حمیدہ کو میرے دیر سے گھر آنے کا سبب معلوم ہُوا تو ماسٹر محمود کے گھر پہنچ گئیں۔ "ماسٹر جی، یہ آپ لڑکے کو کیوں دیوانہ بنا رہے ہیں؟ پڑھنے لکھنے میں اس کا دل نہیں لگتا۔ سارا سارا دن جوڈو کراٹے سیکھے گا تو پڑھے گا کس وقت؟"

ماسٹر محمود نے انہیں سمجھایا کہ بی بی یہ لڑکا اسی قسم کے مردانہ کھیلوں کے لیے پیدا ہُوا ہے۔ آپ اس کی حوصلہ شکنی کریں گی تو اس کی صحت پر بُرا اثر پڑے گا۔ میرا یقین نہیں تو کسی ڈاکٹر سے پوچھ لیجیے۔" کافی دیر کی بحث و تمحیص کے بعد پھوپھی نے بات مان لی۔ مگر یہ طے پایا کہ میں دو گھنٹے سے زیادہ دیر جوڈو کی مشق نہیں کروں گا۔ ماسٹر محمود نے واقعی کسی بہت اچھے استاد سے تربیت لی تھی جو انہوں نے مجھے منتقل کر دی۔ اُن سے حاصل کی ہوئی تربیت آگے چل کر عملی زندگی میں قدم قدم پر میرے کام آئی۔ آگے چل کر میں نے اپنی زندگی میں بہت سے بلیک بیلٹ اور ریڈ بیلٹ دیکھے اور اُن سے زور آزمائی کا موقع بھی ملا لیکن یہ حقیقت ہے کہ ماسٹر محمود کے جاپانی اُستاد نے اُنہیں جو گُر سکھائے تھے۔ وہ بہت سے بلیک بیلٹ بھی نہیں جانتے تھے۔

خدا خدا کر کے میں نے میٹرک کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ پھوپھی کو زیادہ خوشی نہیں ہوئی۔ دیر تک مجھے بتاتی رہیں کہ میرے ابو کس طرح ہمیشہ جماعت میں اوّل رہا کرتے تھے۔ "شاباش بیٹے، خوب باپ کا نام روشن کرو گے!"

میں نے ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ گود میں اٹھا کر دو تین چکر دیے تو لگیں شور مچانے: "ارے شریر کیا کرتا ہے؟ گر جاؤں گی۔" اس طرح جب ان کا غصہ کچھ کم ہُوا تو میں نے انہیں آرام سے پلنگ پر بٹھا دیا اور سمجھایا کہ دیکھو پھوپھی، ہر شخص ہر کام نہیں کر سکتا۔ مانا کہ ابو کی بہت سی خوبیاں میرے اندر موجود نہیں ہیں مگر ہو سکتا ہے میرے اندر بھی کچھ ایسی خوبیاں ہوں جن سے

میرے ابو محروم ہی رہے ہوں۔ اس کے باوجود میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں ابو کا نام روشن کرنے کی کوشش ضرور کروں گا، چاہے اس کوشش میں میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔

"خدا نہ کرے۔" وہ گھبرا گئیں: "کیسی بُری فال مُنہ سے نکال رہا ہے۔"

میں نے کہا: "پھوپھی۔ یاد ہے ابو کیا کہا کرتے تھے؟ وہ چاہتے تھے میں فوجی بنوں۔ وطن کی خاطر دشمنوں سے لڑوں۔ سرحدوں کی حفاظت کروں۔" پھوپھی پریشان ہو گئیں۔ منت سے کہنے لگیں۔

"میرے بیٹے ملک کی خدمت کرنے کے اور بھی بہت سے طریقے ہیں۔ تم فوج میں جانے کا خیال دل سے نکال دو۔"

کیا بتاؤں اِس موضوع پر کتنا جھگڑا ہُوا؟ میں نے بھوک ہڑتال کر دی۔ پھوپھی سے بات چیت بند کر دی۔ بس ایک ہی رٹ لگائے رکھی۔ "میں فوج میں جاؤں گا۔ نہیں تو بھوکا مر جاؤں گا۔" ظاہر ہے کہ پھوپھی اس لڑائی میں ہار گئیں۔ انہیں تو ہارنا ہی تھا۔ میری کوئی ضد وہ ٹال ہی نہیں سکتی تھیں۔ فوج سے انہیں ڈر لگتا تھا مگر میری خوشی بھی انہیں بہت عزیز تھی۔ دراصل اُنہیں یہ فکر نہیں تھی کہ فوج میں تو بہت جفاکشی اور سختی کی زندگی ہوتی ہے۔ میں بھلا کیسے یہ سختیاں جھیلوں گا؟ مزے کی بات یہ ہے کہ پھوپھی کو ایک لمحے کے لیے بھی خود اپنا خیال نہیں آیا۔ انہوں نے ایک پل کے لیے بھی یہ نہ سوچا کہ میں فوج کی نوکری پہ جاؤں گا۔ تو وہ تنہا کیسے رہیں گی؟ ان کی ضرورتیں کون پوری کرے گا۔ بڑھاپے میں کون اِن کا سہارا بنے گا۔ بس یہی تو پھوپھی کی صفت تھی۔ وہ اپنے بارے میں تو کبھی سوچتی ہی نہ تھیں۔ انہیں بس میری ہی فکر رہتی تھی۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہو چکا ہو گا کہ پھوپھی حمیدہ نے ساری زندگی شادی کی اور نہ ہی کبھی اپنی شادی کرنے کے بارے میں سوچا۔ اُنہوں نے تو اپنی زندگی، اپنی جوانی، اپنی تمام تر آرزوئیں اور اُمنگیں میرے لیے وقف کر دی تھیں۔ میرے سوا دُنیا کی کسی اور چیز سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا۔ چوبیس گھنٹے ان کے لبوں پر صرف ایک ہی دُعا تھی: "خدایا۔ میرے بچے کو خوش اور آباد رکھنا۔ اسے اپنی امان اور حفاظت میں رکھنا۔"

یکایک کمرے کے باہر بہت دُور سے بجلی کوندی اور پھر ایک زبردست دھماکہ ہُوا۔ میں چونک کر اپنے خیالات کی دنیا سے باہر نکل آیا۔ کھڑکی میں سے باہر کا منظر بالکل صاف نظر آ رہا تھا۔ گرج چمک کے بعد اچانک موسلا دھار بارش شروع ہو گئی تھی یقیناً سردی میں بھی بہت زیادہ اضافہ ہو گیا ہو گا۔ خیالات کے بھنور سے نکلا تو میں نے دیکھا کہ کمرے میں سگریٹ کے ٹکڑوں کا ڈھیر لگا ہُوا ہے۔ سگریٹ کا ایک پیکٹ نہ جانے کب ختم ہو گیا تھا اور روزی کسی وقت دوسرا پیکٹ بھی میز پر رکھ کر چلی گئی تھی۔ میں اپنے خیالوں میں اتنا گم تھا کہ اس کی آمد و رفت کا مجھے علم نہ ہو سکا اور اُس نے بھی حسبِ عادت مجھے ڈسٹرب کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ میرا کمرہ برقی ہیٹر کی حرارت کی وجہ سے خوشگوار حد تک گرم تھا لیکن ہر طرف سگریٹوں کا دُھواں پھیلا ہُوا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے پہاڑوں کی دُھند میرے کمرے میں بھی در آئی ہے۔ دھوئیں کی شدت سے خود میرا بھی دم گھٹنے لگا اور میں نے آگے بڑھ کر ایک عقبی کھڑکی کا پردہ ہٹایا اور ایک پٹ کھول دیا۔ سرد، یخ بستہ ہَوا کا ایک تیز تھپیڑا میرے چہرے پر لگا۔ مجھے احساس نہ تھا کہ باہر اتنی زیادہ سردی ہے۔ ایک لمحہ میں کمرہ برف خانہ بن گیا۔ میں نے پریشان ہو کر کھڑکی بند کرنے کا ارادہ کیا اور اسی وقت میری نظر میرے بنگلے کے گیٹ کے نزدیک درختوں سے ڈھکی پگڈنڈی پر کھڑی ایک سفید رنگ کی کار پر پڑی۔

میرے بنگلے کے اِردگرد دُور دُور تک کوئی اور مکان یا کوٹھی نہیں تھی تو پھر یہ کار کس کی ہے اور میرے گیٹ کے نزدیک کیوں کھڑی ہے؟ اتنے خراب اور تباہ کُن موسم میں کسی مہمان کی آمد کا امکان بھی خارج از بحث تھا۔ اور اگر کوئی مہمان میرے گھر آیا بھی تھا تو روزی نے مجھے مطلع کیوں نہیں کیا؟ ہو سکتا ہے وہ میرے خیالوں کی محفل کو درہم برہم نہ کرنا چاہتی ہو!!! میں نے عقبی کھڑکی کا پٹ دوبارہ مضبوطی سے بند کیا تاکہ سرد ہوا سے تحفظ مل سکے اور پھر خاموشی سے اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ گیلری سے گزر کر میں اُن چوبی سیڑھیوں تک پہنچ گیا جو نیچے ہال کمرے میں جاتی تھیں۔ ہال کمرہ تاریک تھا کوئی متنفس تو کیا روشنی کا ایک بلب بھی وہاں روشن نہ تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ اگر کوئی مہمان ہمارے گھر میں آیا بھی تھا تو وہ اب تک اپنے بیڈ روم میں پہنچ کر آرام کر رہا ہو گا۔ میں نے اُس کمرے کا رُخ کیا جو مہمانوں کے لیے مخصوص تھا۔ لیکن نہ صرف کمرہ تاریک تھا بلکہ مقفل بھی تھا۔

میں نے ایک دو بار دروازے پر دستک دی لیکن اندر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ کمرے میں کسی مہمان کے قیام کے کوئی آثار نہ تھے۔ میری تشویش میں اضافہ ہو گیا۔ میں دوبارہ ہال کمرے کی سیڑھیوں پر پہنچا۔ ایک نامعلوم خوف کے احساس نے میرے ذہن کو جکڑ لیا تھا۔ میں نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا اور روزی کو پُکارا۔

میں جانتا تھا کہ روزی اپنے کمرے میں جاگ رہی ہو گی۔ وہ میری پہلی آواز پر بھاگی ہوئی آ جاتی تھی۔ مگر میری آواز کے جواب میں میں نے کوئی صدا نہیں سُنی۔ میں تیزی سے سیڑھیوں سے اُترا اور روزی کے کمرے کی طرف بڑھا۔ روزی کا کمرہ میرے کمرے کے عین نیچے تھا۔ ہال کمرے میں پہنچ کر ایک مختصر سی گیلری سے گزرنے کے بعد روزی کے کمرے تک پہنچا جا سکتا تھا۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ گیلری بالکل تاریک تھی اور روزی کے کمرے میں بھی روشنی نہ تھی۔ میں ایک لمحہ کے لیے ٹھٹھک کر وہیں رُک گیا۔ میری چھٹی حس گھر میں تیسرے ذی روح کی موجودگی سے باخبر کر رہی تھی۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ روزی کی زندگی خطرے میں تھی۔

میں تیزی سے گیلری سے گزرتا ہوا روزی کے کمرے کی طرف بڑھا۔ وہ اپنے کمرے کے علاوہ کسی اور جگہ نہیں ہو سکتی تھی۔ یکایک مجھے اپنی پُشت پر ایک آہٹ سنائی دی۔ میں تیزی سے پلٹا مگر میرے پلٹ کر دیکھنے سے پہلے کوئی آہنی چیز میرے سر پر لگی۔ میں ٹھوکر کھا کر مُنہ کے بل گرا۔ مجھے بھاگتے قدموں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ میرے تجربے کی روشنی میں حملہ آور نے پستول کے دستے سے میرے سر کے پچھلے حصے پر ضرب لگائی تھی۔ کوئی اور ہوتا تو اس وقت خاک چاٹ رہا ہوتا۔ مگر میری سخت جانی میرے کام آئی۔ میں ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور ہال کمرے کے دروازے کی طرف لپکا۔ تاریکی کے باوجود مجھے ایک ہیولا دروازے کے باہر جاتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ میں بے تحاشہ اس کے تعاقب میں لپکا۔ ایک لمبی زقند کے بعد میں دروازے تک پہنچ چکا تھا۔ دروازہ بہت زور دار دھماکے کے ساتھ بند ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ شاید حملہ آور نے دروازہ باہر سے لاک کر دیا ہو۔ لیکن اس کے پاس بھی مہلت نہ تھی۔ وہ مجھ سے بھی زیادہ عجلت میں تھا۔ اسی لیے دروازہ لاک نہ کرنے کی حماقت اس سے سرزد ہوئی تھی۔ میں نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا اور اس کے ساتھ ہی بھیگی ہوئی تیز ہوا کا تھپیڑا میرے چہرے پر لگا۔ میری آنکھوں میں جلن سی ہونے لگی۔ باہر موسلا دھار بارش جاری تھی۔ لیکن اس کے باوجود میں نے ایک شخص کو گیٹ کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ گیٹ سے باہر نکل کر قریبی پگڈنڈی پر کھڑی ہوئی سفید کار کی طرف لپک رہا تھا۔ میرا ہاتھ بے اختیار اپنے نائٹ گاؤن کی جیب میں گیا۔ جہاں عادتاً ہر وقت ایک بھرا ہوا پستول موجود ہوتا ہے۔ پستول پر میری انگلیوں کی گرفت مضبوط تھی۔ رُکنے جانے کا نہ وقت تھا نہ موقع۔ میں نے پستول ہاتھوں میں تول کر نشانہ لیا مگر اس سے پہلے کہ فائر کرتا مجھ پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ کوئی وزنی شے میرے سر پر گری اور اپنی تمام تر قوتِ ارادی کے باوجود میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ اس وقت بھی جو پہلا خیال میرے خوابیدہ ذہن میں آیا وہ روزی کا تھا! روزی کہاں ہے؟ کیا وہ زندہ ہے؟ اگر زندہ ہے تو کس حال میں ہے؟!! پھر اس کے بعد مجھے کسی چیز کا ہوش نہیں رہا۔

نہ جانے کتنی دیر تک میں بے ہوش رہا۔ جب ہوش میں آیا تو میں نے روزی کا پریشان اور متفکر چہرہ اپنے اُوپر جھکا ہُوا پایا۔ اس کی حسین نیلی آنکھوں میں بے چینی اور تشویش کی لہریں تھیں۔ سُرخ و سفید رنگت پیلی پڑی ہوئی تھی۔ اس کی بکھری ہوئی سنہری زلفیں اس کے چہرے پر ہالہ کیے ہوئے تھیں۔ اس کی زُلف کی چند لٹیں میرے چہرے پر بھی سایہ فگن تھیں۔ میں دیکھ سکتا تھا، آوازیں سُن سکتا تھا لیکن ابھی سوچنے سمجھنے کی طاقت سے محروم تھا۔ مجھے کچھ یاد نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں اس سے پہلے میں کہاں تھا اور مجھ پر کیا بیتی تھی؟ لیکن رفتہ رفتہ میری حسیات نے کام کرنا شروع کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اب میں روزی کی زلفوں کی بھینی بھینی خوشبو اور اس کے جسم کی مخصوص مہک سونگھ رہا تھا۔ اس نے مجھے آنکھیں کھولتے ہوئے دیکھا تو خوشی کی روشنی اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ اس کی آنکھیں جگمگانے لگیں اور اس کے نیم وا خشک لب جو میرے چہرے پر محض چند انچ کے فاصلے پر تھے مُسکرا اُٹھے۔ "خُدا کا شکر ہے آپ ہوش میں آ گئے!" اس نے میرے ہاتھ اپنے نرم و نازک ہاتھوں میں تھام کر چُوم لیے اور اس کی آنکھوں سے گرم گرم آنسو بہہ کر میرے ہاتھوں کو تر کرنے لگے۔ شاید اس کے آنسوؤں نے ہی میرے

ہوش و حواس واپس لانے کا فریضہ ادا کیا۔ میری یادداشت اور سوچنے سمجھنے کی طاقت واپس آ رہی تھی۔ معاً مجھے یاد آ گیا کہ رات گئے میرے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا تھا۔ وہ پُراسرار سفید کار۔ ایک ہیولا! جو تاریکی میں میرے بنگلے سے نکل کر باہر جا رہا تھا۔ میں نے جب پستول سے فائر کرنا چاہا تھا تو میرے سر کے پچھلے حصے پر لگنے والی ضرب نے مجھے بے ہوش کر دیا تھا۔ بے ساختہ میری نگاہ اپنے ہاتھوں پر گئی پستول میرے ہاتھ میں نہ تھا۔ اس کی جگہ روزی کے ملائم ہاتھوں نے میرے ہاتھوں کو اپنی جکڑ میں لے رکھا تھا۔ وہ دیوانہ وار میرے ہاتھوں کو چُوم رہی تھی اور اس کی نیلی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ میں یکایک مسکرانے لگا۔ روزی مجھے مسکراتے ہوئے دیکھ کر فکرمند ہو گئی۔ شاید وہ میری ذہنی کیفیت کے بارے میں متفکر تھی۔ لیکن درحقیقت اس وقت میں خود اپنے ہی ایک خیال کو یاد کر کے مسکرایا تھا۔ میں روزی کی نیلی جھیل جیسی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کی سفید رنگت دیکھ کر اکثر مسکرایا کرتا تھا۔ اتنی گہری نیلی آنکھوں سے نکلنے والے آنسوؤں کا رنگ بھی نیلا یا آسمانی ہونا چاہیے۔

"آپ ٹھیک تو ہیں نا؟" اُس نے بے تابی سے پوچھا۔

میں نے سر ہلانا چاہا۔ مگر میرا سر سیسے کی طرح وزنی اور ٹھوس ہو رہا تھا۔ درد کی ایک لہر سر اور گردن سے گزرتی ہوئی میرے سارے جسم میں پھیل گئی۔ میں آہستہ سے آہ بھر کر رہ گیا۔

"کیا ہوا آپ کو؟ کہیں تکلیف ہے۔" اُس نے پوچھا۔ تشویش اُس کے چہرے پر پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے بولنے کی کوشش کی تو مجھے خود اپنی آواز بیگانی سی محسوس ہوئی۔ یہ ایک دبی ہوئی سرگوشی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں کسی اور کی آواز سُن رہا ہوں۔ "ٹھیک ہوں مگر....."

اب میں رفتہ رفتہ اپنے جسم میں توانائی محسوس کر رہا تھا۔ میں نے آنکھوں آنکھوں میں چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ اس وقت میں ڈرائنگ رُوم کے قالین پر دراز تھا۔ میرے شانے اور بالائی جسم روزی کے زانو پر تھا اور وہ خُدا جانے کب سے مجھ پر جھکی ہوئی پریشانی اور تشویش کا تن تنہا مقابلہ کر رہی تھی۔ اُس کی بھیگی ہوئی نیلی آنکھوں پر سایہ فگن لمبی پلکوں کی نمی مجھے ہمیشہ کسی جھیل پر جھکے ہوئے شبنم آلود پتوں کی یاد دلاتی ہے۔ اس وقت بھی میں اس شاعرانہ تصور سے باز نہ رہ سکا۔ دراصل قدرت نے میری سرشت میں مہم جوئی اور معرکہ آرائی کے ساتھ ساتھ شاعرانہ نرمی اور لطافت بھی شامل کر دی ہے۔ آتش و گُل کے اس امتزاج نے میری طبیعت میں ایک مسلسل بے سکونی اور بے اطمینانی پیدا کر رکھی ہے۔ میں ایک سادہ صفت انسان ہوں۔ ایک لمحہ کا سکون اور ٹھہراؤ بھی مجھے نصیب نہیں ہے اور نہ گوارا! شاید یہ کسی فقیر کی بددُعا کا اثر ہے۔ میرے دوست شوکت کا بھی یہی خیال ہے۔

میں ان خیالوں میں گم تھا اور غالباً روزی یہ سمجھ رہی تھی کہ میں اپنی قوتِ گویائی اور حافظہ کھو بیٹھا ہوں۔ اُس نے مجھے زور زور سے جھنجھوڑنا شروع کر دیا۔

"یوسف۔ یوسف۔ خُدا کے لیے ہوش میں آؤ۔ تم میری آواز سُن رہے ہو نا؟ تم مجھے دیکھ سکتے ہو یا نہیں؟ جواب دو۔ بولتے کیوں نہیں؟"

میں نے آہستہ سے جواب دیا "میں اب بہتر ہوں۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

یہ کہہ کر میں نے اپنے جسم کو سمیٹا اور کہنیوں کے بل اُوپر کی جانب اُٹھنے کی کوشش کی۔

مجھے اب احساس ہوا کہ صرف میرا سر ہی روزی کے زانو پر نہ تھا بلکہ اس نے تمام میرے جسم کا بوجھ اپنے نازک اور ملائم جسم پر سہار رکھا تھا۔ میں اُوپر کی طرف اٹھا تو میرا سر اُس کے سر کے متوازی آ گیا۔ اب میں معمول پر آ چکا تھا۔ سر میں ہلکے سے بوجھ اور درد کے علاوہ اب مجھے کسی قسم کی تکلیف محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

"رُکیے۔ میں آپ کے لیے گرم دُودھ لے کر آتی ہوں۔"

اُس نے نہایت نرمی سے میرے جسم کا بوجھ اپنے اُوپر سے ہٹانے کی کوشش کی۔ یوں جیسے میں شیشے کا بنا ہوا آدمی ہوں اور ذرا سی بھی ٹھیس لگی تو ٹوٹ کر بکھر جاؤں گا۔ یہ لڑکی خُدا جانے مجھے اتنا نرم و نازک کیوں سمجھتی ہے؟ وہ مُنہ ہی مُنہ میں کچھ کہتی ہوئی تیز رفتاری سے کچن کی طرف چلی گئی۔ میں اب اپنی کہنیوں کے سہارے نیم دراز تھا۔ روزی کا سہارا نہ رہا تو میں نے اپنے جسم کو جنبش دی اور محسوس کیا کہ میں بالکل صحیح سلامت ہوں۔ میں نے اپنی قالین پر پھیلی ہوئی ٹانگوں کو سمیٹا۔ دوبارہ پھیلایا اور پھر سمیٹ لیا۔ کھسک کر میں نے قریبی صوفہ

ٹیک لگائی اور پھر دونوں ہاتھ قالین پر ٹیک کر اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے خفیف سا چکر آیا مگر پھر گرد و پیش کا نظارہ ساکت ہو گیا۔ باوجود میرا سر بھی اب معمول پر آچکا تھا۔ درد میں کمی تھی لیکن ذہن میں کسی قسم کی سنسناہٹ اور خالی پن کا احساس بالکل نہ تھا۔ میں اپنے بازو ہوا میں گھماتے اور ٹانگیں دو تین بار دائروں کی صورت میں حرکت دی۔ میرے ذہن اور جسم نے مجھے مطلع کیا کہ میں بالکل ٹھیک ہو چکا ہوں۔ میں نے قالین پر چند پھیرے لگائے اور پھر صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ چاروں طرف دن کی روشنی پھیل چکی ہے۔ کھڑکیوں کے پردے ہٹا دیئے گئے تھے اور باہر دُور تک کا حسین منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ دیوار پر لگے ہوئے کلاک پر نظر پڑی جو ساڑھے نو بج رہے تھے۔ گویا میں قریب قریب تین گھنٹے تک بے ہوش رہا تھا۔ اس دوران میں کیا کچھ ہوا اور روزی پر کیا بیتی؟ اس کا مجھے علم نہ تھا۔ مگر ایک تنہا ویران گھر میں روزی نے یہ چند گھنٹے کس ذہنی اذیت کے ساتھ گزارے ہوں گے اس کا میں بخوبی اندازہ لگا سکتا تھا۔ اور خاص طور پر ایسی حالت میں جبکہ اسے میری طرف سے بھی تشویش اور پریشانی لاحق ہوگی۔ میں نے سوچا روزی غریب میری خاطر کیسے کیسے امتحانوں سے گزرتی ہے۔ مگر پھر بھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لاتی۔ ایک بار پھر میں احساسِ تشکر اور روزی کے بارِ احسان میں دب گیا۔

باہر کسی کار کے رُکنے کی آواز آئی اور پھر تیز قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ یکایک برقی گھنٹی کی آواز گونجی تو میں چونک پڑا۔ یہ کون ہو سکتا ہے؟ دوست یا دشمن؟ مگر میں نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے شوکت کھڑا تھا۔ میرا جگری دوست' بھائیوں سے زیادہ عزیز اور خونی رشتے داروں سے زیادہ مخلص اور بے لوث۔ اس کے چہرے پر تفکر کی لکیریں تھیں۔ عام طور پر وہ ایک خوش پوش اور نفاست پسند شخص ہے۔ اس وقت وہ سلیپنگ سُوٹ اور گون پہنے ہوتے تھا۔ اس کا شیو بڑھا ہوا تھا۔ لگتا تھا وہ فوری طور پر میرے بارے میں روزی کا فون سُن کر اُسی حالت میں تھا اُسی طرح چلا آیا ہے۔ "یوسف" وہ چلایا۔ اس نے سر سے پیر تک میرا جائزہ لیا اور پھر بے تحاشا مجھ سے لپٹ گیا۔ "کیا ہوگیا تھا تمہیں؟ کون تھا جو یہاں آیا تھا؟" پھر اس نے مجھے اپنے جسم سے علیحدہ کیا اور ایک بار پھر بغور میرا معائنہ کیا۔ "کہیں زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟ روزی نے فون پر بتایا تھا کہ تم بے ہوش ہو۔ وہ تو بہت زیادہ اپ سیٹ تھی:

میں اس کی بے تابی پر مسکرا دیا۔ اس کا والہانہ جذباتی پن مجھے ہمیشہ سے بہت پسند ہے۔ میں نے کہا: "مطمئن ہو جاؤ۔ میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔ اتنے ڈھیر سارے سوال ایک دم کر دیتے ہیں کہ میں جواب بھی نہیں دے سکتا۔ اندر تو آ کر بیٹھو۔" یہ کہہ کر میں اس کی گردن میں بازو ڈال کر اسے کھینچ کر صوفے تک لے گیا۔ اسی وقت روزی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں دُودھ کا مگ تھا اور چہرے پر سوال۔ مگر شوکت کو دیکھ کر اس کی تشویش اطمینان میں بدل گئی۔

"ہیلو روزی کیا حال ہے تمہارا۔ تم نے تو فون پر مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔" شوکت اس سے مخاطب ہوا۔ روزی ہمارے نزدیک آگئی۔ "پتہ بھی ہے یہاں کیا ہوگیا؟ خُدا کا شکر ہے کہ یوسف بالکل ٹھیک ہیں۔ ورنہ میں تو بالکل گھبرا ہی گئی تھی۔"

"بھئی گھبرانے کی بات بھی ہے۔" میں نے ماحول کی کشیدگی کو دُور کرنے کے لیے مزاحیہ لہجے میں کہا: "بالکل فلمی سچویشن پیش آئی ہے ہمارے ساتھ۔" پھر میں نے مختصراً شوکت کو رات کا واقعہ بتایا۔ ساتھ ہی میں گرم دُودھ کے گھونٹ بھی لیتا جا رہا تھا۔

"اب تم بتاؤ۔ تمہارا بیان کیا ہے؟" وہ روزی کی طرف متوجہ ہوا۔

"مجھے کچھ پتہ نہیں۔ میں اپنے کمرے میں کتاب پڑھ رہی تھی۔ اچانک مجھے ایک آہٹ سنائی دی۔ میں سمجھی کہ یوسف کو کسی چیز کی ضرورت پیش آئی۔ میں اُٹھ کر کمرے سے باہر آئی۔ مگر برآمدے میں پہنچی تو یکایک کسی نے میرے مُنہ پر مضبوطی سے ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے چیخنے کی کوشش کی مگر گرفت بہت کڑی تھی۔ میں نے اپنے آپ کو آزاد کرانے کے لیے جدوجہد کی۔ ہاتھ پیر مارے۔ اس کے ہاتھ کو کاٹنے کی کوشش کی مگر وہ کوئی غیر معمولی طاقت والا آدمی تھا۔ اس نے میری ناک پر ایک بدبودار رومال رکھ دیا۔ میرا ذہن سونے لگا اور چند ہی لمحے بعد مجھے ہوش باقی نہیں رہا۔ جب مجھے ہوش آیا تو اِن کی گیلری میں تاریکی تھی۔ ہر طرف خاموشی اور اندھیرا تھا۔ میں فرش پر لیٹی ہوئی تھی۔ ڈرتے ڈرتے چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ کوئی بھی موجود نہ تھا۔ میں نے اُٹھ کر روشنی جلائی۔ ڈرائنگ رُوم کی طرف جانے لگی تو فرش پر یوسف کو دیکھا۔ یہ اس انداز سے گرے ہوئے تھے کہ میرا دل دَھک سے رہ گیا۔ میرے مُنہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ میں لپک کر ان کے پاس گئی۔ ان کی سانس معمول کے مطابق تھی مگر یہ بے ہوش تھے۔ شکر ہے کہ جسم یا چہرے پر کوئی زخم نہیں تھا۔ میں نے انہیں جھنجھوڑ کر اُٹھانے کی کوشش کی مگر یہ بے سُدھ پڑے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کیا کروں؟" اتنا کہہ کر وہ پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی۔ میں نے اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ اور دلاسہ دینے کی کوشش کی۔ "فکر نہ کرو روزی۔ خُدا کا شکر ہے کہ ہم سب زندہ سلامت ہیں۔"

چند لمحے بعد اس نے اپنے جذبات پر قابو پایا تو بتایا کہ گھبرا کر اُسے اس کے علاوہ کچھ اور نہ سُوجھی کہ شوکت کو فون کر کے بلاتے۔ شوکت کسی کام کے سلسلے میں ایک قریبی شہر میں گیا ہوا تھا۔ اس کا مجھے اور روزی دونوں کو علم تھا۔ روزی نے ایک بڑے ہوٹل کا نمبر ملایا۔ اور خوش قسمتی سے شوکت وہاں مقیم تھا۔ اُس نے ٹوٹے پھُوٹے الفاظ میں شوکت کو فوراً گھر آنے کی تاکید کی اور فون بند کر کے میری طرف متوجہ ہوئی۔ میری سانسیں معمول کے مطابق تھیں۔ بظاہر میں بالکل ٹھیک تھا مگر ہوش سے قطعی بیگانہ۔ یہ چند گھنٹے روزی کے لیے مہینوں سے زیادہ بھاری تھے۔ وہ رو رہی تھی اور دُعائیں کر رہی تھی۔ اِس کے سوا اسے کچھ اور نہیں سُوجھ رہا تھا۔ جب مجھے ہوش آیا تو اُس کے دَم میں دَم آیا۔

یکلخت شوکت صوفے سے اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اُس کی تمام حسیات کام کرنے لگیں۔ اُس نے فضا میں کچھ سُونگھنے کی کوشش کی۔ پھر وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر اُوپر گیا۔ میں بھی اُس کے ہمراہ تھا۔ اوپر میرا کمرہ بالکل اِسی حالت میں تھا جس میں اسے میں نے گزشتہ رات چھوڑا تھا۔ سگریٹوں کے ٹوٹے کمرے میں بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے سوا کمرے میں کوئی اور خاص بات نظر نہ آئی۔ ہم لوگ دوبارہ گیلری میں آئے۔ ہال کمرے کا جائزہ لیا۔ کوئی علامت' کوئی نشانی ایسی نظر نہ آئی جو کسی غیر شخص کی موجودگی کا ثبوت فراہم کرتی ہو۔ نیچے گیلری میں ڈرائنگ روم کے باہر بھی کسی قسم کی کوئی علامت نہیں تھی۔ میں نے شوکت کو سفید رنگ کی کار کے بارے میں بتایا۔ ہم دونوں گھر سے باہر نکل کر درختوں کے جھنڈ کی طرف گئے جہاں رات گئے میں نے وہ پارک کھڑی ہوئی دیکھی تھی۔ پھر میں نے شوکت کو اُس ہیولے کے بارے میں بتایا جسے میں نے کار کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ شوکت اُس شخص کا حُلیہ اور قد و قامت معلوم کرنا چاہتا تھا۔

میں نے کہا: "حُلیہ تو ظاہر ہے کہ میں نہیں دیکھ سکا تھا۔ اتنے فاصلے سے قد و قامت اور جسامت کے بارے میں بھی کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ البتہ اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اس کا قد تمہارے برابر ہوگا۔"

شوکت سوچ میں پڑ گیا۔ وہ دیر تک مجھ سے سوالات کرتا رہا لیکن ہم دونوں کسی بھی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ گھر کی کوئی قیمتی شے بھی گم نہیں ہوئی تھی۔ روزی کی ڈریسنگ ٹیبل کی درازوں میں اُس کے زیورات کا ڈبہ بالکل حفاظت سے تھا۔ کسی نے اسے چھُوا تک نہ تھا۔ تو پھر وہ کون لوگ تھے اور یہاں کس لیے آتے تھے؟ ظاہر ہے کہ وہ ایک سے زائد اشخاص تھے۔ کیونکہ میں نے ایک شخص کو کار کی طرف لپک کر جاتے ہوئے دیکھا تھا اور جب میں نے اسے گولی کا نشانہ بنانا چاہا تو کسی شخص نے میرے سر پر بھرپور ضرب لگا کر مجھے بے ہوش کر دیا۔ ہو سکتا ہے وہ مجھے جان سے مار دینا چاہتا ہو؟ لیکن اگر اُس کا یہی ارادہ تھا تو پھر مجھے قتل کرنے کی راہ میں کون سی رکاوٹ حائل تھی۔ روزی کو وہ پہلے ہی بے ہوش کر چکے تھے۔ مجھے بھی انہوں نے بے دست و پا کر دیا تھا۔ پھر انہوں نے مجھے ہلاک کیوں نہیں کیا؟ نہ وہ روزی کو مارنا چاہتے تھے اور نہ ہی مجھ کو جان سے مارنے کے خواہاں تھے۔ تو پھر ان کا مقصد کیا تھا؟

کافی دیر تک ہم تینوں بیٹھے اس مسئلے پر غور کرتے رہے۔ اس دوران میں روزی ہمیں گرم گرم چائے اور کافی لا کر دیتی رہی۔ اس نے کھانے کی پیش کش بھی کی تھی۔ مگر بھوک ہم تینوں میں سے کسی کو بھی نہیں تھی۔ یہ ایک لاینحل مسئلہ تھا جو ہماری عقل و فہم سے بالاتر تھا۔ شوکت نے ابھی تک اپنی بیوی نسیم کو اپنے یہاں آنے کی اطلاع نہیں دی تھی۔ میرے زور دینے پر اس نے نسیم کو فون کر کے بُلا لیا اور لگ بھگ نصف گھنٹے بعد وہ بھی پہنچ گئی۔ نسیم ایک خوب رو لڑکی تھی۔ شوکت اور اُس کی شادی کو چار سال گزر چکے تھے۔ جب پہلی مرتبہ شوکت مجھے ملا تھا اس وقت بھی وہ شادی شدہ تھا۔ اُس نے مجھے بتایا تھا کہ نسیم اُس کی کزن تھی۔ بلکہ ایک لحاظ سے وہ شوکت ہی کے گھر میں پلی تھی۔ ماں باپ کی وفات کے بعد شوکت کے باپ نے نسیم کی اپنی اولاد کی طرح پرورش کی اور یہی وجہ ہے کہ اپنے باپ کی وصیّت اور خواہش کے مطابق شوکت نے نسیم سے شادی کر لی۔ اگر باپ کی وصیّت اور خواہش نہ ہوتی تب بھی شوکت کو نسیم کے ساتھ شادی کرنے میں کوئی عذر نہیں ہونا چاہیے تھا۔ نسیم ایک تعلیم یافتہ' ذہین اور خوش شکل لڑکی تھی۔ عمر میں وہ شوکت سے تین چار سال چھوٹی تھی لیکن دیکھنے میں کافی کم عُمر لگتی تھی۔ اس کا قد دراز اور جسم انتہائی متناسب تھا۔ اس پر ایک کم عُمر دوشیزہ کا گمان گزرتا تھا۔ اگرچہ وہ شوکت سے خاصی مانوس اور بے تکلف تھی۔ اس کے باوجود میں نے ہمیشہ ان دونوں کے مابین ایک فاصلہ اور دُوری محسوس کی۔ وہ شوکت کو ہمیشہ آپ سے مخاطب کرتی تھی۔ اُس کی ہر بات غور سے سنتی

اور اس کی تعمیل کرتی۔ عام طور پر میاں بیوی کے درمیان جس قسم کی گفتگو اور ہنسی مذاق ہوتا ہے میں نے کم از کم کسی دُوسرے کے سامنے اُن دونوں کو اس قسم کی گفتگو کرتے ہوئے کبھی نہیں سُنا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ تنہائی میں یہ فاصلے مٹا دیتے ہوں لیکن کسی تیسرے فرد کی موجودگی میں انہوں نے کبھی ایک خاص حد سے زیادہ بے تکلف ہونے کی کوشش نہیں کی۔ شادی کو چار سال گزر جانے کے باوجود وہ اولاد سے محروم تھے۔ اگرچہ نیم کو میں نے چھوٹے بچوں سے بہت زیادہ مانوس پایا۔ اُسے بچوں سے خاص لگاؤ تھا۔ بچوں کے شور و غل کو وہ پسند بھی کرتی تھی مگر وہ خود اولاد سے محروم تھی۔ اس بارے میں اس کا نظریہ بہت فلسفیانہ تھا۔ وہ ہنس کر کہتی "بچوں کا کیا ہے؟ جب اللہ میاں چاہے گا دے دے گا۔"

نیم اور روزی کو میں نے ذہنی طور پر ایک دُوسرے سے بہت نزدیک پایا۔ اکثر وہ بہت معنی خیز انداز میں ایک دُوسرے کو مخاطب کرتیں اور اُن کی نگاہوں کا باہمی تبادلہ بہت گہرا اور بامقصد ہوا کرتا تھا۔ میں نے بارہا انہیں ایک دُوسرے سے کانا پھوسی کرتے ہوئے دیکھا مگر مجھے دیکھ کر وہ خاموش ہو جایا کرتی تھیں۔ مجھے کبھی کبھی یوں لگتا جیسے ان دونوں کے مابین کوئی گہرا راز ہے جسے وہ دُوسروں سے چھپا کر رکھنا چاہتی ہیں۔ روزی کے سامنے میں اس خیال کا اظہار کرتا تو وہ ہنس پڑتی اور کہتی "آپ مرد بہت حاسد ہوتے ہیں۔ دو عورتوں کی باہمی دوستی کو بھی برداشت نہیں کرتے۔ عورتوں کی باتوں کے موضوع بے شمار ہوتے ہیں۔ اِن میں ایک بار دوستی کا رشتہ قائم ہو جائے تو اِن کے تمام باہمی راز مشترک ہو جاتے ہیں۔" پھر وہ شرارت سے مسکراتی اور اپنے مخصوص انداز میں دانتوں میں ہونٹ دبا کر کہتی "ٹھیک تو ہے۔ نیم کے اور میرے بیچ میں ایک بہت بڑا راز ہے جو میں نے آپ سے چھپا کر رکھا ہے۔ جس دن وہ راز آپ کو معلوم ہو گیا آپ مجھے کسی اور نظر سے دیکھنے لگیں گے۔"

میں جانتا تھا کہ یہ محض چھیڑ خانی ہے۔ ان دونوں کے مابین چند بے ضرر قسم کے احمقانہ رازوں کے سوا اور کیا راز ہو سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ وہ ایک دُوسرے کی قریبی سہیلیاں تھیں اور عورتوں کی سرشت کے مطابق ان کی باتیں کبھی ختم ہونے کا نام نہیں لیتی تھیں۔

شوکت کا خیال تھا کہ ہمیں اس واقعے کے بارے میں پولیس کو اطلاع دے دینی چاہیئے مگر میں اسے ایک غیر ضروری کارروائی سمجھتا تھا۔ پولیس اِس معاملے میں کیا مدد کر سکتی تھی؟ سوائے اس کے کہ اپنے سوالات اور تفتیش سے ہمارا ذہنی اور گھریلو سکون درہم برہم کر دے۔

"پھر بھی یہ بہت اہم اور خطرناک بات ہے۔" شوکت نے اصرار کیا "اس کا کوئی تو حل ہونا چاہیئے۔ وہ لوگ بلا مقصد تو یہاں نہیں آئے ہوں گے!"

"مگر ان کا مقصد کیا ہو سکتا ہے۔ انہوں نے چوری نہیں کی۔ کسی سامان کو ہاتھ نہیں لگایا۔ کسی کو نقصان نہیں پہنچایا۔"

"تو پھر انہوں نے روزی کو بے ہوش کیوں کیا؟" نیم کا سوال خاصا وزنی تھا "اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کوئی خاص ارادہ لے کر یہاں آئے تھے۔"

"مگر ان کے ارادے کی تکمیل کی راہ میں رکاوٹ کیا تھی؟ ہم دونوں تو بے ہوش ہو چکے تھے۔ وہ جو چاہے کر سکتے تھے۔"

اِس طرح یہ بحث دوبارہ زور و شور سے شروع ہو جاتی مگر ہم کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ روزی نے یہ اطلاع دے کر ایک اور تشویش پیدا کر دی کہ اُسے کبھی کبھی گمنام ٹیلی فون موصول ہوتے ہیں۔ فون کرنے والا لمبی سانسیں لینے کے علاوہ کوئی لفظ منہ سے نہیں نکالتا تھا۔ اس کے انکشاف پر مجھے یاد آیا کہ میں نے چند بار گھر میں داخل ہو کر روزی کو ٹیلی فون سنتے ہوئے پایا تھا۔ مگر میرے دریافت کرنے پر وہ یہی کہتی تھی رانگ نمبر مل گیا ہے۔ شاید وہ مجھے خواہ مخواہ پریشانی میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ویسے بھی ٹیلی فون پر گمنام کالیں ہمارے مُلک میں کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں ہے۔

"معلوم ہوتا ہے روزی کا کوئی بولتے فرینڈ ہے جو اِس کو تنگ کرتا رہتا ہے۔" نیم شرارت سے مسکرا کر بولی۔

"یہ کیوں نہیں کہتیں کہ روزی یوسف سے چھپ چھپ کر اپنے بولتے فرینڈ سے باتیں کرتی رہتی ہے اور یہ رانگ فون کال کا بہانہ کر دیتی ہے۔" شوکت نے بات بڑھائی۔

"لو پھر تو مسئلہ ہی حل ہو گیا۔" میں نے کہا "ظاہر ہے کہ رات کو بھی میں نے جسے دیکھا وہ روزی کا بولتے فرینڈ ہی ہو گا اور مُلاقات کے لیے آیا ہو گا۔"

روزی بھلا کیوں خاموش رہنے والی تھی۔ کہنے لگی "مگر آپ یہ بھول گئے کہ وہ اکیلا نہیں تھا۔ کوئی اور بھی اُس کے ساتھ تھا جس نے آپ

پر حملہ کیا تھا۔"

اس طرح ہم چاروں قیاس آرائیوں کے محل بناتے اور مسمار کرتے رہے۔ ظاہر ہے کہ جب کوئی سُود مند بات معلوم نہ ہو سکے تو ذہنوں کو سکون دینے کے لیے مسئلے کو مذاق ہی میں ٹالا جاتا ہے۔ ہم لوگ گہرے غور و خوض کے باوجود اس بات کی تہہ تک پہنچنے میں ناکام رہے تھے۔

دوپہر کا کھانا ہم چاروں نے ساتھ ہی کھایا اور اس کے بعد تاش کھیلتے رہے جو ہمارے معمول میں داخل تھا۔ عموماً چھٹی کے دن ہم چاروں اکٹھے ہو کر اسی طرح دن گزارہ کرتے تھے۔ رات کا سنگین واقعہ ایک بھولا ہوا خواب لگنے لگا۔ ہم ہنسی مذاق کرتے رہے اور شام کی چائے پینے کے بعد شوکت اور نسیم رخصت ہو گئے۔ شوکت تو جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ حفاظت کے طور پر رات میرے ساتھ ہی رہے مگر میں نے اس خیال کی مخالفت کی۔ رات کو جو کچھ بھی پیش آیا ظاہر ہے کہ بظاہر اس کے اعادے کا کوئی امکان نہیں تھا اور پھر اگلے دن صبح آٹھ بجے کی فلائٹ سے مجھے ایک ضروری کاروباری میٹنگ کے سلسلے میں روانہ ہونا تھا۔ جہاں کہیں سپلائی کے ایک بہت منافع بخش ایگریمنٹ پر دستخط کرنے تھے۔ اس سے پہلے یہ طے پایا تھا کہ شوکت جس جگہ گیا ہوا تھا وہیں سے بذریعہ کار روانہ ہو کر مجھے مل جائے گا۔ لیکن اب صورتِ حال مختلف تھی۔ کوشش کے باوجود ہم شوکت کے لیے ہوائی جہاز میں نشست حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ تو یہ تصفیہ ہوا کہ شوکت آج رات ہی بذریعہ کار روانہ ہو کر دوسرے دن صبح ہوٹل میں یا اس کمپنی کے دفتر میں مجھ سے ملاقات کرے گا جہاں ہمیں معاہدے پر دستخط کرنے تھے۔ اگر وہ رات کو میرے ساتھ قیام کرتا تو وہ کسی طرح بھی میرے ساتھ معاہدے پر دستخط کرنے نہیں پہنچ سکتا تھا۔ ہم دونوں بزنس پارٹنر تھے اس لیے کسی بھی معاہدے پر ہم دونوں کے دستخط ہونے لازمی تھے۔

"یار چھوڑو گولی مارو معاہدے کو۔" شوکت اپنے مخصوص لاپرواہی کے انداز میں بولا۔

"جان ہے تو جہان ہے۔ یار سلامت رہے۔ معاہدے ہزاروں ہو جائیں گے۔"

میں نے اس کے جذبے کو سراہا اور پھر اسے یقین دلایا کہ واقعی مجھے کسی قسم کا خطرہ نہیں ہے۔ اس نے مجھے گلے لگا کر بھینچا پیشانی کو بوسہ دیا اور پھر اپنے مخصوص انداز میں روزی کو اپنے قریب کر کے اس کا رُخسار تھپتھپایا۔ روزی کے ساتھ شوکت کا رویہ بالکل برادرانہ تھا۔ وہ دونوں ایک دُوسرے سے نہ صرف بے تکلف تھے بلکہ ان کے درمیان رسمی فاصلہ بھی نہ تھا۔ ان دونوں کے باہمی میل ملاپ اور پیار کو دیکھ کر میں بہت تقویت حاصل کرتا تھا۔ نسیم کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ مجھے یہ اطمینان تھا کہ روزی کو شوکت کی شکل میں ایک بھائیوں سے بھی زیادہ قریبی اور مخلص ہمدرد ملا ہوا ہے جو کسی بھی نازک موقعے پر اس کے لیے ڈھال بن سکتا ہے۔

شوکت اور نسیم کے رخصت ہونے کے بعد جب ہم دونوں ڈرائنگ روم میں گئے تو روزی کو گزشتہ رات کی یادوں نے آگھیرا۔ وہ میرے نزدیک آ بیٹھی۔

اُس کے حسین چہرے پر تفکرات کی لکیریں تھیں اور اُس کی نیلی آنکھیں سوچ میں ڈُوب کر اور زیادہ نیلی نظر آنے لگی تھیں۔ یہ روزی کی آنکھوں کا مخصوص انداز تھا۔ وہ جب بھی کسی گہری سوچ میں ڈوبتی اُس کی آنکھوں کی رنگت اور زیادہ گہری ہو جایا کرتی تھی۔ اُس کی آنکھوں کو میں نے جھیل سے تشبیہ دی ہے تو اس کا یہ بھی ایک سبب تھا۔ میں نے روزی کو اپنے بازوؤں کے حصار میں سمیٹ لیا۔ وہ سہمی ہوئی فاختہ کی طرح میرے سینے سے لگی ہوئی تھی اور میں اس کے دل کی دھڑکنوں کی آواز سُن بھی سکتا تھا اور محسوس بھی کر سکتا تھا۔ اس لمحے وہ مجھے اتنی بے بس اور بے سہارا نظر آئی کہ مجھے بے اختیار اس پر پیار سا آ گیا۔ میں دیر تک اسے تسلی دیتا رہا۔ اسے یقین دلاتا رہا کہ آئندہ اس قسم کا کوئی واقعہ پیش نہیں آئے گا۔ حالانکہ اپنے دل کی گہرائیوں میں مجھے خود بھی اس کا یقین نہ تھا۔ باہر سردی نے پھر رنگ دکھانا شروع کر دیا تھا۔ ہلکی ہلکی برف باری ہو رہی تھی۔ ہوا کی سائیں سائیں نے پس منظر موسیقی کی مانند ماحول پر سحر طاری کر دیا تھا۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ عجیب سی پُراسرار قسم کی رومانوی فضا نے ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ایسے میں روزی کا خوشبو میں ڈوبا ہوا جسم مجھے وارفتہ کرنے کے لیے کافی تھا۔ میں شادی کے بعد پہلی بار اپنے دل میں روزی کے لیے ایک لطیف جذبہ کروٹیں لیتا ہوا پا رہا تھا۔ آج تک اس کمزور اور نرم دل لڑکی کے ساتھ میں نے انصاف نہیں کیا تھا جبکہ وہ میرے لیے سرتاپا خلوص اور ایثار تھی۔ میں نے روزی کی آنکھوں میں جھانکا جہاں سپردگی اور پیار کے سوا کچھ اور نہ تھا۔ صبح ہونے میں دیر تھی اور میرے پاس روزی کے لیے کافی وقت تھا۔

علی الصبح سات بجے میں سفر کے لیے تیار تھا۔ روزی نے اصرار کر کے مجھے ہلکا سا ناشتہ کرا دیا تھا۔ رات کو ہماری نیندیں پوری نہ

ہو سکی تھیں اس کے باوجود وہ چاق و چوبند اور بالکل تر و تازہ تھی۔ میرے کوٹ کے کالر میں ایک خوش رنگ پھول اور بالائی جیب میں خوشبودار رومال لگانے کے بعد اس نے محبت پاش نگاہوں سے میرا جائزہ لیا اور پھر جیسے مطمئن ہو کر میرے بازو میں بازو ڈالی کر گھر سے باہر نکل آئی۔ رات کو برف باری زیادہ نہیں ہوئی تھی۔ موسم انتہائی دلفریب تھا۔ مکان کو لاک کرنے کے بعد ہم دونوں کار میں سوار ہوتے تو یوں لگا جیسے گزشتہ روز ہی ہماری شادی ہوئی ہے۔ روزی کا برتاؤ تو شروع سے ہی وارفتہ تھا لیکن آج پہلی مرتبہ میں بھی اپنے دل میں روزی کے لیے وہ جذبہ بیدار ہوتا ہوا محسوس کر رہا تھا جس کی وہ مستحق تھی۔ ایئرپورٹ پر روزی نے مجھے ڈراپ کیا تو ہوائی جہاز روانگی کے لیے تیار تھا۔ میں نے اسے تاکید کی کہ وہ واپسی میں نسیم کو لازمی طور پر اپنے ساتھ گھر لے جاتے۔ شام کو چار بجے کی فلائٹ سے میری نشست بُک تھی اور روزی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ نصف گھنٹے پیشتر ہی میری پذیرائی کے لیے کار سمیت ایئرپورٹ پر موجود تھی۔ ہوائی جہاز کی روانگی کا اعلان ہو رہا تھا۔ میں روزی سے رخصت ہو کر تیزی سے ڈیپارچر لاؤنج کی طرف بڑھا مگر بار بار مڑ کر روزی کو دیکھتا رہا۔ نہ جانے کیوں شادی کے بعد غالباً پہلی مرتبہ مجھے روزی پر پیار آ رہا تھا۔ اس تبدیلی پر میں خود حیران تھا۔ لاؤنج کے مین دروازے میں داخل ہونے سے پہلے میں نے آخری بار پلٹ کر دیکھا۔ روزی ابھی تک وہیں کھڑی ہوئی الوداع کہنے کے لیے بازو ہلا رہی تھی۔ گہرے عنابی رنگ کے لباس میں وہ حُسن و رعنائی کی تصویر نظر آ رہی تھی۔ اس کے گلے میں پڑا ہوا سفید سکارف تیز ہوا سے لہرا رہا تھا اور اس کی زلفیں ہوا کے جھونکوں کی وجہ سے بکھر کر اس کے چہرے کے گرد ہالہ کیے ہوئے تھیں۔ اس لمحے میں نے دل میں ایک فیصلہ کیا۔ میں آئندہ روزی کے ساتھ بے اعتنائی نہیں برتوں گا۔ اس کی وفاؤں کا اسے قرار واقعی صلہ دوں گا۔ اس کی محبت ایثار اور بے لوثی کی قدر کروں گا۔ یُونہی چلتا ہوا میں لاؤنج میں پہنچ کر مسافروں کی اُس قطار میں شامل ہو گیا جو طیارے میں سوار ہونے کے لیے کمربستہ تھی۔

یہ فضائی سفر محض سوا گھنٹے کا تھا۔ باہر موسم کی حشر سامانی کے باوجود فلائٹ بہت ہموار تھی۔ کافی کی ایک پیالی میرے ہاتھ میں تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ اچانک میرے اندر اس عظیم تبدیلی کی وجہ کیا ہے؟ میں یک بیک روزی کی طرف مائل کس طرح ہو گیا ہوں؟ کیا اس حادثے نے مجھے اس کے اتنا نزدیک کر دیا ہے؟ پھر مجھے شوکت کا خیال آیا۔ وہ اس وقت اپنی کار میں منزل مقصود تک پہنچ چکا ہو گا۔ ہم دونوں کو امپیریل ہوٹل میں یکجا ہونا تھا۔ معاہدے کے بارے میں ضروری کاغذات اور دوسری دستاویزات شوکت کی تحویل میں تھیں۔ اسی لئے میں اتنا ہلکا پھلکا ہو کر سفر کر رہا تھا کہ میرے ہاتھ میں ایک مختصر بریف کیس نہیں تھا۔ "اور کافی لیں گے؟" میں نے ایئرہوسٹس کی نرم آواز پر چونک کر دیکھا۔ میرے سر ہلانے پر اس نے پیالی میں مزید کافی ڈال دی۔ دودھ اور چینی سے میں نے انکار کر دیا۔ وہ مسکراتی ہوئی چلی گئی۔ بھاپ اڑاتی ہوئی سیاہ کافی میری نظروں کے سامنے تھی میں ایک تجارتی فضائی سفر کر رہا تھا۔ اور نہ جانے کیوں مجھے ایک اپنا اور فضائی سفر یاد آ گیا۔

یہ سفر سراسر مختلف نوعیت کا تھا۔ یہ چند سال پہلے کا واقعہ ہے جب فوج میں ملازمت اختیار کرنے کے بعد میں اپنے شوق مُہم پسندی اور سخت کوشی کی وجہ سے کمانڈو کے طور پر خدمات سرانجام دے رہا تھا۔ یہ میں آپ کو بتا ہی چکا ہوں کہ پھوپھی حمیدہ نے میرے اصرار پر نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے فوج میں جانے کی اجازت دے دی تھی۔ فوجی تربیت کا عرصہ پَر لگا کر گذر گیا میں نے ہر تربیتی کورس میں امتیازی کامیابیاں حاصل کی تھیں جب مجھے کمانڈو یونٹ میں شامل ہونے کا موقعہ ملا تو میں نے اسے نعمتِ غیر مترقبہ خیال کیا تھا۔ کمانڈو فوج کا ایک ایسا شعبہ ہے جس کا دوسرا نام جاں نثاری اور سرفروشی ہوتا ہے کمانڈو کو ہر قسم کے مشکل سے مشکل کام کی تربیت دی جاتی ہے بہت سے سخت جان لوگ اس تربیت کے دوران ہی ہمت ہار بیٹھتے ہیں اور کمانڈو بننے کا ارادہ ترک کر دیتے ہیں مگر مجھے کوئی مشکل درپیش نہیں ہوئی میرے ساتھیوں نے میرا نام DARE DEVIL (بے خوف شیطان) رکھا تھا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ میں خوف نامی کسی شے واقف نہ تھا۔ کمانڈو کی تربیت ختم کرنے کے چند ماہ بعد ہی مجھے اس ہنر کو استعمال کرنے کا نادر موقعہ بھی مل گیا۔ ایک ہمسایہ ملک نے کسی اعلان کیے بغیر ملک پر یلغار کر دی تھی اور ساری قوم متحد اور یک جان ہو کر دشمن کے مقابلے میں صف آرا تھی۔ ہر شخص اپنی جگہ اپنے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ میں ایک کمانڈو تھا۔ اس لئے میرے فرائض سب سے زیادہ کٹھن تھے۔

نی کمان نے مجھے اور میرے تین ساتھیوں کو دشمن کے علاقے میں اترنے کا حکم دیا تھا۔ ہمارے سپرد یہ کام کیا گیا تھا کہ ایک دشوار گذار جنگل سے گذرنے کے بعد دشمن کی ایک اہم اسلحہ فیکٹری کے محلِ وقوع کا مکمل جائزہ لیں اور اپنے حکام کو اس کے بارے رپورٹ پہنچائیں۔ اسی علاقے میں واقع ایک فوجی ہوائی اڈا تباہ کرنے کا فرض بھی ہمیں سونپا گیا تھا۔ ایک ٹرانسپورٹ ہوائی جہاز ہم چاروں کو لے کر دشمن کی سرحدوں کی طرف پرواز کر رہا تھا۔ ہمیں پیراشوٹ کے ذریعہ جنگل میں اترنا تھا۔ اس وقت ہم چاروں کافی کے آخری کپ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ جنگی مہمات سے عہدہ برآ ہونے کی خاطر میں نے یہ اصول بنالیا تھا کہ میں جنگ کے دوران کافی اور چائے میں دودھ اور چینی استعمال نہیں کروں گا۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ کسی مرحلے پر مجھے کافی پانے بھی میسر نہ ہو سکے بھوکے پیاسے رہنے کی ہمیں پوری تربیت دی گئی تھی۔ اور مجبوری کی صورت میں محض جڑی بوٹیاں کھا کر بھی ہم زندہ رہ سکتے تھے۔

میجر نے ہمیں اشارے سے بتایا کہ چند منٹ بعد آپ پیراشوٹ کے ذریعہ کودنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ سب سے پہلے مبارک کی باری تھی اس نے ہم سب کو خدا حافظ کہا اور طیارے سے باہر کود گیا اس کے بعد اسلم اور ظہیر نے چھلانگ لگائی۔ پھر میجر کے اشارے پر میں نے زیرلب کلمۂ شہادت پڑھا اور طیارے سے باہر چھلانگ لگادی۔ طیارہ زمین سے زیادہ بلندی پر نہ تھا۔ پھر بھی میرے اور زمین کے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ میں چند لمحے تیر کی طرح تیزی سے زمین کی طرف گرتا چلا گیا۔ اس کے بعد چھاتہ کھل گیا اور میری رفتار میں یک لخت کمی واقع ہو گئی۔ اب میں خود کو فضا میں تیرتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ زمین لمحہ بہ لمحہ مجھ سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ ہوا کے تیز جھونکے مجھے آہستہ سے اُڑا کر صراطِ مستقیم سے دور لے گئے تھے۔ ایک سنسنی سی میرے جسم میں پھیل گئی مگر مشکل یہ پیش آئی کہ میں کھلے میدان سے ہٹ کر اب گھنے درختوں کے اوپر آگیا تھا۔ اور اندیشہ تھا کہ کہیں درختوں کی شاخوں میں اُلجھ کر نہ رہ جاؤں۔ میرے دوسرے ساتھی مجھے نظر نہیں آرہے تھے اور مجھے ان کے انجام کے بارے میں کوئی علم نہ تھا۔ فی الوقت سب سے بڑا مسئلہ خود کو درختوں کی شاخوں سے محفوظ رکھنے کا تھا۔ میں نے جھولا جھولنے کے انداز میں چھاتے کو ہلکورے کھانے شروع کر دیے۔ تھوڑے فاصلے پر مجھے چھوٹے چھوٹے کھیت نظر آرہے تھے۔ جو چاروں طرف سے درختوں سے گھرے ہوئے تھے۔ میری کوششیں رائیگاں نہیں گئی تھیں۔ اور اب میں درختوں کی قطاروں سے ہٹ کر کھیتوں کی طرف جا رہا تھا۔ جب میرے پیروں نے زمین کو چھوا تو شکر ہے کہ میں کھیت کے آخری سرے پر تھا۔ اپنا توازن قائم کرکے میں نے اپنے جسم کو سیدھا کیا اور چھاتے کو کھینچنا چاہا۔ لیکن وہ کٹی ہوئی پتنگ کی ڈور کی طرح کسی جگہ اٹکا ہوا تھا۔ سر اٹھا کر دیکھا تو چھاتہ مجھے ایک درخت کی شاخوں میں الجھا ہوا نظر آیا۔ کئی جھٹکے دینے کے باوجود میں چھاتے کو شاخوں سے آزاد کرانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ ایک چھاتہ بردار کے لئے سب سے اہم امر یہ ہے کہ وہ فی الفور ہی چھاتے کو سمیٹ کر کسی محفوظ مقام پر ٹھکانے لگا دے تاکہ وہ کسی دشمن کی نظر میں نہ آسکے مگر میرا چھاتہ کوشش کے باوجود درختوں سے آزاد نہیں ہو سکا تھا۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا میرے لئے خطرہ بڑھتا جا رہا تھا۔ کسی وقت بھی کوئی کسان یا راہ گیر مجھے دیکھ سکتا تھا۔ میں نے تیزی سے اپنے بھاری فل بوٹ اتارے اور کود کر برق رفتاری سے درخت پر چڑھ گیا۔ جوتوں کے فیتے کھول کر میں نے انہیں اپنے گلے میں لٹکا لیا تھا۔ ایک تھیلا پہلے ہی میرے گلے میں موجود تھا۔ جس میں اشیائے خورد و نوش کا ہنگامی صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے دیگر ضروری سامان تھا۔ اونچے درخت کی چوٹی پر پہنچ کر میں نے چھاتے کو درخت کی شاخوں سے آزاد کرانے کا عمل شروع کر دیا۔

یکایک فضا کے سناٹے کو ایک فائر کی آواز نے درہم برہم کر دیا۔ میں جہاں تھا وہیں ساکت رہ گیا۔ فائر کی آواز زیادہ دور سے نہیں آئی تھی۔ میں نے اپنی سانس بھی روک لی۔ اور تمام حسیات کو اس آواز کی طرف مرکوز کر دیا۔ چند لمحے اور گذر گئے مگر دوسرے فائر کی آواز سنائی نہیں دی۔ فائر کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟ میرا کوئی ساتھی! یا دشمن کا کوئی فوجی! دونوں صورتیں تشویشناک اور پریشان کن تھیں اگرچہ یہ خالص میدانِ جنگ کا علاقہ نہ تھا پھر بھی ملحقہ تھا اور دفاعی اعتبار سے اہم تھا۔ مجھے درختوں کے پتوں

ر قدموں کی آواز سنائی دی اور میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔ قدموں کی آواز لمحہ بہ لمحہ نزدیک آرہی تھی۔ میں نے کمر سے بندھے ہوئے پستول کی طرف ہاتھ بڑھایا اور جب میری انگلیوں نے آہنی پستول کو محسوس کیا تو مجھے اپنے اندر ایک اعتماد اور توانائی محسوس ہوئی۔ قدموں کی آہٹ رفتہ رفتہ نزدیک آرہی تھی۔ یہاں تک کہ میں آنے والے کو واضح طور پر دیکھ سکتا تھا۔ یہ ایک فوجی تھا۔ اس کے سر پر فولادی خود تھا جس میں پتے اڑسے ہوئے تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ جنگی ڈیوٹی پر کوئی فوجی تھا۔ اس نے ہاتھوں میں مشین گن تھام رکھی تھی اور قدم پھونک پھونک کر رکھ رہا تھا جیسے ہر لمحے کسی دشمن کے نمودار ہونے کا منتظر ہو۔ وہ گرد و پیش کا جائزہ بھی لیتا جا رہا تھا اس کی حرکات اس بات کا اظہار کر رہی تھیں کہ اسے اپنے علاقے میں کسی غیر کی موجودگی کا یقین ہو چکا ہے۔ وہ آہستہ قدموں سے چلتا ہوا آگے بڑھا اور درخت کے نیچے آکر عین اس جگہ کھڑا ہو گیا جہاں چند منٹ پہلے میں موجود تھا۔ وہ اپنی سونگھنے اور دیکھنے کی تمام تر صلاحیتوں کو یکجا کر کے صورتِ حال کا جائزہ لے رہا تھا۔ اگر میں اپنے جوتے جلدبازی میں زمین پر چھوڑ آتا تو فوری طور پر وہ انہیں دیکھ لیتا۔ میں نے پستول کو اپنی انگلیوں میں تولا اور اس کا ہدف لے کر بلا تاخیر فائر کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ میرا نشانہ خطا نہیں ہو سکتا تھا مگر پرابلم یہ تھی کہ کیا میں اس پر گولی چلا کر دوسروں کو متوجہ نہیں کر لوں گا؟ بہت ممکن ہے کہ اس کے دوسرے ساتھی کہیں آس پاس ہی موجود ہوں میں اسے ہلاک تو کر سکتا تھا مگر سارے جنگل میں اس کا اعلان ہو جاتا۔ اس طرح میں نہ صرف خود اپنے لئے بلکہ اپنے تینوں ساتھیوں کے لئے بھی خطرہ مول لے سکتا تھا۔

اس کی زندگی اور موت کے درمیان محض یہی ایک خیال حائل تھا ہمیں تربیت کے دوران یہی بتایا گیا تھا اور نفسیاتی طور پر بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی کو تلاش کرتے ہوئے کوئی شخص بہت کم اوپر دیکھنے کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ میری نگاہیں اس فوجی پر جم کر رہ گئی تھیں جو مجھ سے بارہ تیرہ گز سے زیادہ دور نہیں تھا۔ یکایک میں نے اس کے جسم میں تناؤ کے آثار دیکھے شاید اس نے بھی خطرے کو اپنے سے بہت زیادہ نزدیک محسوس کر لیا تھا۔ اس نے تیزی سے ایک گول دائرے میں چکر لگایا اور یکایک اس کی نگاہیں آسمان کی طرف بلند ہو گئیں۔ درخت کی شاخوں کے درمیان اُلجھے ہوئے رنگین چھاتے کو دیکھ لینا کچھ مشکل نہ تھا۔ مگر اس سے پہلے ہم دونوں کی نظریں ٹکرائیں۔ اس نے مشین گن کا رخ میری طرف کر دیا۔ میرے پاس فوری فیصلہ کرنے کیلئے ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت تھا۔ میں نے یک لخت اس پر چھلانگ لگا دی یہ سب کچھ پلک جھپکنے میں ہو گیا۔ اس کی مشین گن کی نالی ابھی پوری طرح اوپر اٹھی بھی نہ تھی کہ میں اس پر جا پڑا۔ میرے داہنے ہاتھ کی ایک بھرپور ضرب سے مشین گن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ وہ توازن برقرار نہ رکھ سکا اور زمین پر جا گرا۔ میرے پاس مہلت نہ تھی میں بھوکے شیر کی طرح جھپٹا اور دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا تھام لیا۔ وہ ایک مضبوط اور طاقت ور فوجی تھا۔ مگر میں نے اسے سنبھلنے اور سوچنے کا کوئی موقع نہیں دیا تھا۔ اس کے بازو اور ہاتھ تناور درخت کے تنے کی طرح مضبوط تھے مگر گردن پر میرے بھرپور دباؤ کی وجہ سے اس کی گرفت مضبوط نہیں تھی۔ اس نے اندھا دھند ہاتھ پیر مارنے شروع کر دیے کبھی اس کی انگلیاں میرے چہرے کو نوچتیں کبھی وہ میری آنکھوں میں انگلیاں گھمانے کی کوشش کرتا کبھی وہ جوابی کارروائی کے طور پر میرا گلا دبانے کی کوشش کرتا۔ مگر اس کی یہ کوشش بے سود ثابت ہوئی۔ میری گرفت آہنی زنبور سے بھی زیادہ سخت تھی۔ اور اسے ہلاک کرنے کا ارادہ اس سے کہیں زیادہ مضبوط۔ چند لمحے بعد اس کی جدوجہد ہلکی پڑ گئی اور پھر وہ بے جان ہو کر زمین پر گر گیا۔ میں نے ایک جھٹکے سے اس کو چھوڑا اور کھڑا ہو کر مشین گن لینے لگا مگر خود میرے دل کی بلند آواز دھڑکنوں کے سوا کوئی اور آہٹ تک نہیں سنائی دی۔ میرے پاس زیادہ وقت نہ تھا ایک بار پھر میں بندر کی طرح تیزی سے درخت پر چڑھ گیا اور چھاتے کو درخت کی شاخوں سے نکالنے میں مصروف ہو گیا۔ چھاتے کو سمیٹ کر میں نے ایک بار پھر نیچے چھلانگ لگا دی۔ مردہ فوجی اور اس کی مشین گن میرے قدموں میں پڑی تھی اور چھاتہ میں نے سمیٹ کر اس کا گولہ بنا لیا تھا۔ مگر اب میرے سامنے محض چھاتے ہی کو چھپانے کا مسئلہ نہ تھا۔ مردہ فوجی کی لاش کو ٹھکانے لگانا بھی اتنا ہی ضروری تھا۔ میں نے چھاتہ کھول کر فوجی کی لاش کو مشین گن سمیت اس میں لپیٹا اور اسے گھسیٹتا ہوا گنجان درختوں کی طرف لے گیا۔ میں گھنے درختوں سے ڈھکے ہوئے محفوظ خطے کی تلاش میں تھا۔ جنگل خاصا گنجان تھا۔ یہ پہاڑی علاقہ تو نہ تھا مگر اس کے باوجود زمین ہموار

اور یکساں نہ تھی۔ جگہ جگہ گڑھے موجود تھے جو میری ضرورت کے عین مطابق تھے۔ ایک گہرے گڑھے میں چھاتے میں لپٹی لاش لاش ڈالنے کے بعد اسے مٹی اور پتوں سے ڈھانپ دینا چنداں مشکل نہ تھا۔ قریباً نصف گھنٹے بعد جب میں درختوں کے جھنڈ سے برآمد ہوا تو چھاتے اور دشمن کی لاش دونوں سے نجات حاصل کر چکا تھا۔

کافی دور تک میں درختوں کی اوٹ میں بڑھتا چلا گیا۔ مجھے کچھ اندازہ نہ تھا کہ یہ تنہا فوجی کہاں سے آیا تھا اور اس کے اور کتنے مددگار اور ساتھی اس علاقے میں موجود ہیں۔ مجھے اپنے تینوں دوستوں کو بھی تلاش کرنا تھا اور ساتھ ہی یہ اطمینان بھی کرنا تھا کہ میری طرح وہ بھی کسی دشمن کی نگاہ میں نہ آ گئے ہوں۔ اب شام کے سائے پھیلنے لگے تھے اور میرے لئے جنگل میں پناہ لینا آسان ہو گیا تھا۔ کھانے پینے کی خواہش تو نہیں تھی مگر میں ایک بڑے سے برگد کے درخت کے تنے سے ٹیک لگا کے لیٹ گیا۔ اور پانی کی چھاگل منہ سے لگا لی۔

یکایک ایک چیخ کی آواز سن کر میں چونکتا ہو گیا چیخ کی آواز دوبارہ سنائی دی اور اس بار مجھے اندازہ لگانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی کہ یہ کسی عورت کی آواز تھی۔ عام حالات میں ایک عورت کی چیخ سن کر مجھے فوراً اس کی امداد اور دستگیری کے لئے پہنچ جانا چاہیے تھا۔ مگر یہ وقت اور تھا میں نے آواز کی طرف سے توجہ ہٹانی چاہی مگر ایک بار پھر وہی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ایک بلند قہقہے کی آواز سنی۔ مردانہ قہقہے مسلسل بلند ہو رہے تھے جن میں زنانہ آواز دب کر رہ گئی تھی میرے اندر کا انسان رفتہ رفتہ بیدار ہونے لگا تھا پھر مجھے یہ بھی خیال آیا کہ اسی جنگل میں میرے تین اور ساتھی بھی کسی جگہ موجود ہیں جب تک میں ان آوازوں کا کھوج نہ لگا لوں ان تینوں کی مدد خود اپنی حفاظت کی طرف سے کس طرح مطمئن ہو سکتا ہوں۔ ہنسی کی آوازیں اب دور ہونے لگی تھیں۔ زنانہ آواز بھی غائب ہو گئی تھی۔ رفتہ رفتہ آوازیں بالکل معدوم ہو گئیں اور ایک بار سناٹا چھا گیا۔ میرے سامنے دو ہی راستے تھے یا تو ان آوازوں اور انسانوں سے دور ہو جاؤں یا پھر ان کے نزدیک جا کر ان کی حقیقت جاننے کی کوشش کروں۔ پہلی صورت میں مجھے یہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ کون لوگ ہیں؟ تعداد میں کتنے ہیں اور اس جنگل میں کیا کر رہے ہیں؟ کیا اپنے عقب میں ایک امکانی دشمن کو چھوڑ دینا عقلمندی کا تقاضا تھا؟ میں نے آوازوں کی سمت جانے کا فیصلہ کر لیا۔

جنگل میں سے گزرتا ہوا میں اپنے اندازے کے مطابق اس طرف بڑھتا رہا۔ جدھر سے وہ آوازیں سنائی دی تھیں۔ اب اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔

رات کی تاریکی میرے لئے زیادہ مفید ثابت ہو سکتی تھی مگر اس کے انتظار میں وقت ضائع کرنا بھی مجھے گوارا نہ تھا۔ پروگرام کے مطابق مجھے اور میرے ساتھیوں کو اب تک یکجا ہو جانا چاہیے تھا تاکہ ہم اپنی مہم کے دوسرے حصے کا آغاز کریں۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا میری بے چینی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ میرے قدم بے اختیار ایک سمت میں آگے بڑھ رہے تھے مگر میرا ذہن مجھے پیچھے کی طرف کھینچ رہا تھا۔ مجھے وہ لمحہ رہ رہ کر یاد آ رہا تھا جب ہم چاروں نے یکے بعد دیگرے ہوائی جہاز سے چھلانگیں لگائی تھیں وہ لمحہ میرے ذہن میں پیوست ہو کر رہ گیا تھا۔ اگر ہم چاروں ایک دوسرے کو تلاش نہ کر سکے تو ہمارے مشن کا کیا انجام ہو گا؟ میری یہ ذہنی مشکل خود بخود آسان ہو گئی جب میں نے کچھ فاصلے پر ایک روشنی چمکتی ہوئی دیکھی روشنی کی یہ کرن میرے لئے ایک اشارہ تھی میں نے اس روشنی کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ کچھ فاصلے پر درختوں کے درمیان ایک کھلا ہوا مختصر سا میدان تھا جس میں ایک چھوٹا سا خیمہ اور ایک چھولداری نصب تھی۔ چھولداری کے باہر ایک بانس سے لالٹین لٹکی ہوئی تھی جس کی روشنی مجھے دور سے نظر آئی تھی مگر میری نگاہیں لالٹین کی روشنی پر نہیں بلکہ ان انسانوں پر جم گئی تھیں جو خیمے اور چھولداری کے سامنے ایک چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ گنتی میں دو تھے۔ ان کے منہ کھلے ہوئے تھے اور وہ ٹکٹکی لگائے اپنے سامنے کھڑی ہوئی ایک عورت اور ایک مرد کو دیکھ رہے تھے چارپائی پر بیٹھے ہوئے دونوں آدمی فوجی تھے۔ ان کی مشین گنیں بان کی چارپائی سے لگی ہوئی ان کے نزدیک ہی رکھی ہوئی تھیں۔ یہ دونوں کہنیوں کے سہارے نیم دراز

تھے۔ چارپائی سے کچھ فاصلے پر ایک اور فوجی کھڑا ہوا تھا۔ اس لئے آس پاس مجھے کوئی گن نظر نہیں آئی۔ مگر اس وقت وہ شمشیر و سناں کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس سے چند قدم دور ایک عورت سمٹی سمٹائی زمین پر بیٹھی تھی۔ اور خوف زدہ نظروں سے اس فوجی کو تک رہی تھی۔ اس کے سیاہ لمبے لمبے بال شانوں تک بکھرے ہوئے تھے۔ یہ ایک جوان اور صحت مند عورت تھی ڈوبتے ہوئے سورج اور لالٹین کی ملی جلی روشنی میں اس کا سادہ چہرہ ایک ایسے شخص کا چہرہ نظر آ رہا تھا جسے سزائے موت سنائی جا چکی ہو۔ اس کے سامنے کھڑا ہوا فوجی چند لمحے خاموش اسے گھورتا رہا۔ پھر اس نے پتلون کی عقبی جیب میں ہاتھ ڈال کر شراب کی نصف سے زائد خالی چھوٹی بوتل نکالی کسی اور طرف دیکھے بغیر وہ ایک ہی سانس میں پوری بوتل پی گیا اور خالی بوتل اس نے زور سے اچھالی جو مجھ سے چند گز کے فاصلے پر آ کر گر گئی۔ میں اس وقت ایک درخت کی اوٹ میں تھا مگر اس وقت خالی بوتل کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنے کا ہوش کسے تھا؟ چھ نگاہیں زمین پر بیٹھی ہوئی عورت پر مرکوز تھیں جو ہر قسم کے احساس اور جذبات سے عاری چہرے کے ساتھ خاموش سہمی ہوئی تھی۔ شاید وہ چیخ چیخ کر تھک گئی تھی یا پھر اسے یقین ہو چکا تھا کہ ان میں سے کوئی شخص بھی اس کی فریاد سن کر نہیں پسیجے گا۔ اس کے سامنے کھڑا ہوا فوجی آہستہ قدمی سے اس کی طرف بڑھنے لگا۔ اس تمام عرصے میں اس نے ایک لمحے کے لئے بھی عورت پر سے نظر نہیں ہٹائی۔ دوسری طرف عورت بھی مسلسل اس کی نظروں سے نظریں ملائے بیٹھی تھی۔ ہو سکتا ہے وہ کوئی سفلی عمل پڑھ رہی ہو یا اس سنگدل کو بینا ٹائز کرنے کی کوشش میں مصروف ہو یا محض جبلی طور پر اپنے شکاری کی نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر جان بچانے کی کوئی گھات سوچ رہی ہو۔ فوجی نے جب نزدیک پہنچ کر اسے بازو سے تھام کر کھڑا کیا تو وہ ایک معمول کی طرح کھڑی ہو گئی۔ اس وقت وہ ایک بے جان اور بے حس و حرکت لاش کی طرح نظر آ رہی تھی۔ فوجی کے ہاتھ بڑھا کر اس کی میلی ساڑھی کا آنچل تھام لیا اور چارپائی پر بیٹھے ہوئے دونوں فوجیوں کی آنکھوں میں ایک حیوانی چمک پیدا ہو گئی۔ آہستہ آہستہ وہ کہنیوں کو اپنے جسموں کے بوجھ سے آزاد کر کے بیٹھ گئے اور اس تماشے کو دیکھنے کے لئے ہمہ تن نگاہ بن گئے جو عنقریب ان کے سامنے سٹیج کیا جانے والا تھا۔ عورت اپنی جگہ بدستور بے حس و حرکت کھڑی تھی لیکن فوجی اس کی ساڑھی کا پلو ہاتھ میں تھام کر آہستہ سے اس کے چاروں طرف گھوم رہا تھا اور پیاز کے چھلکوں کی طرح ساڑھی کے پرت اترتے جا رہے تھے۔ یہ ایک ایسا لمحہ تھا جو مجھے زندگی بھر نہیں بھولے گا۔ حوا کی آبرو، ممتا کا تقدس، ماں کی عظمت، عورت کی عصمت خطرے میں تھی اور تین بھیڑیے ہر قسم کے انسانی جذبات سے عاری ہو کر اس ناقابل معافی سنگین جرم کا ارتکاب کرنے والے تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ایک دم چھن گئی نہ مجھے یہ ہوش رہا کہ میں کس مقصد سے ایک دشمن ملک میں آیا ہوں۔ نہ یہ احساس باقی رہا کہ میری ایک معمولی سی لغزش نہ صرف میری اور میرے تینوں ساتھیوں کی زندگیوں کو خطرے میں ڈال دے گی بلکہ ہمارے مشن کو بھی صفر کر دے گی۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ گولیوں سے بھرا ہوا پستول میرے ہاتھ میں موجود بھی ہے یا نہیں مجھے صرف اتنا پتہ تھا کہ ایک پل بعد ساڑھی کا آخری بل بھی کھل جائے گا اور یہ عورت جو کسی کی ماں بیٹی بیوی یا بہن ہے ان غلیظ نگاہوں کے سامنے نیم عریاں ہو جائے گی۔

میں نے چلا کر کہا۔ "خبردار! رک جاؤ۔" ان تینوں نے یوں چونک کر آواز کی طرف دیکھا جیسے کسی سحر سے نکلے ہوں۔ انھیں سوچنے کی کوئی مہلت دیئے بغیر بھاگتا ہوا ان کے سروں پر پہنچ گیا۔ نیم تاریکی میں فوجی وردی میں ملبوس ایک شخص کو پہلی نگاہ میں وہ شاید کوئی اپنا ہم قوم ہی سمجھے ہوں گے۔ میری اچانک موجودگی نے انھیں چونکا کر رکھ دیا مگر جب میں روشنی میں پہنچا تو انھوں نے میری وردی کا فرق بھی دیکھ لیا اور انھیں پتہ چل گیا کہ میں ایک نا آشنا اور غیر چہرہ ہوں۔ عورت کے سامنے کھڑے ہوئے فوجی نے بے ساختہ اپنی مشین گن کی تلاش میں نگاہ دوڑائی۔ ساڑھی کا پلو اس کے ہاتھ سے چھوٹ چکا تھا۔ چارپائی پر بیٹھے ہوئے دونوں فوجیوں نے بھی بیک وقت چارپائی سے ٹکی ہوئی مشین گنوں کی طرف ہاتھ بڑھائے مگر میرے پستول سے نکلنے والی گولیاں ان سے زیادہ برق رفتار تھیں۔ گولی ایک کی کنپٹی پر لگی اور وہ الٹ کر چارپائی پر گر گیا۔ دوسری گولی اس کے ساتھی کی گردن کے پار ہو گئی میں نے ان دونوں پر دوسری نگاہ ڈالنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ اب میں شیر سے فوجی کی طرف

متوجہ تھا۔ اس کی مشین گن چھولداری کے عین سامنے زمین پر پڑی ہوئی تھی اور اس کا ہاتھ اس کے دستے تک پہنچ چکا تھا کہ میرے پستول کی گولی نے اسے جا لیا۔ پہلی گولی اس کی پشت پر لگی، دوسری سر پر اور اس کے بعد مجھے تیسری گولی چلانے کی حاجت نہ تھی۔ چند لمحوں کے اندر تینوں کی بے حس و حرکت لاشیں میرے سامنے پڑی تھیں۔ عورت ابھی تک خاموش اور بے حس و حرکت کھڑی تھی اور خالی خالی نظروں سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اس نے ان تینوں بے جان جسموں کو دیکھا اور پھر اس کی نظر میری طرف اٹھی تو اتنی دیر میں اس کی تمام حسیں زندہ ہو چکی تھیں اس کے ہاتھوں نے غیر ارادی طور پر ساڑھی سے جسم کو ڈھانپ لیا اور اس کی بے نور نگاہوں میں زندگی کے آثار جاگ اُٹھے میں اس سے کچھ فاصلے پر کھڑا ہوا تھا۔ پستول میرے ہاتھ میں تھا فوجی وردی میرے جسم پر بھی تھی مگر شاید اس کے ذہن نے یہ پیغام وصول کر لیا تھا کہ میں اس کا دشمن نہیں، محافظ ہوں۔ وہ پہلے تو خاموش کھڑی مجھے دیکھتی رہی پھر اچانک دوڑ کر میرے قدموں میں جھک گئی۔ دونوں ہاتھوں سے میرے پیر تھام لئے اور بلند آواز سے رونے لگی۔ اور مجھے اس وقت احساس ہوا کہ ابھی تک میرے بوٹ میری گردن میں لٹکے ہوئے تھے اور میں ننگے پاؤں جنگل میں سفر کر رہا تھا۔

اس کے گرم آنسو میرے ننگے پیروں کو تر کرنے لگے تو میں نے گھبرا کر اسے دونوں بازو تھام کر اٹھا لیا۔ الفاظ نے اُس کی زبان کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ وہ ہندوؤں کی روایتی عبادت کے انداز میں دونوں ہاتھ جوڑ کر میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔ آنسو مسلسل اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔

"چپ ہو جاؤ" میں نے نرمی سے کہا "اور مجھے بتاؤ کہ یہ سب کیا ہے؟"

میرے نرم اور ہمدردانہ الفاظ نے اس پر خاطر خواہ اثر کیا۔ پہلے تو کچھ دیر میں نے اسے جذبات پر قابو پانے کا موقعہ دیا اس کے بعد اس کا ہاتھ تھام اس کو چھولداری کے اندر بچھی ہوئی چارپائی پر بٹھا دیا۔ اور خود اس کے نزدیک ہی بیٹھ گیا۔ آنسو تھمے تو اس نے رُکتے رُکتے مجھے اپنی داستان سنائی۔ اُس کا نام شیلا تھا۔ وہ قریبی گاؤں میں رہنے والی ایک دیہاتی عورت تھی اور شادی شدہ تھی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ قریباً ایک ہفتے قبل چار فوجیوں نے اس مقام پر یہ کیمپ قائم کیا تھا ایک دو بار ایک جیپ پر سوار کچھ فوجی افسر بھی ان کے پاس آئے تھے۔ گاؤں یہاں سے دو میل کے فاصلے پر تھا اور جب شیلا نے پہلی بار ایک فوجی کو دیکھا تو وہ دوپہر کا وقت تھا۔ مختصر گاؤں چند جھونپڑیوں پر مشتمل تھا۔ دن کے وقت گھر کے مرد کھیتوں اور جنگلوں میں کام کے لئے چلے جاتے تھے۔ عورتیں گھریلو کاموں میں مصروف ہو جاتی تھیں۔ شیلا کپڑے دھونے کے لئے ندی پر گئی تو اس نے پہلی بار اس فوجی کو ایک ٹیلے سے اترتے ہوئے دیکھا۔ ظاہر ہے کہ اپنے ہم قوم مسلح فوجی کو دیکھ کر اسے مطلق خوف محسوس نہیں ہوا لیکن وہ اس کی آنکھوں سے جھانکتی ہوئی حیوانیت سے آگاہ نہیں ہو سکی۔ فوجی اس کے نزدیک پہنچ کر گاؤں اور گاؤں والوں کے بارے میں مختلف سوالات کرتا رہا۔ اس نے شیلا کو بتایا کہ جنگ شروع ہو چکی ہے اور ہم چار فوجیوں نے جنگل میں کیمپ لگایا ہے کچھ دن بعد اور فوجی بھی آئیں گے پھر اس نے شیلا کو اپنے کیمپ پر آنے کی دعوت دی۔ شاید اس کے ملیح سیاہ بالوں اور صحت مند جوان جسم دیکھ کر فوجی کی نیت خراب ہو گئی تھی۔ مگر شیلا جو ایک سادہ لوح دیہاتی عورت تھی اس سے بے خبر تھی اس کے بعد بھی اس نے کئی بار ان فوجیوں کو جنگل میں دیکھا۔ ایک دن تو اس کا گھر والا نین سکھ بھی اس کے ساتھ تھا۔ فوجیوں نے نین سکھ کو بھی کیمپ پر مدعو کیا اور اسے بتایا کہ وہ بہت اچھی قسم کی دارو بھی اسے پلائیں گے ثبوت کے طور پر انھوں نے اپنی پتلون کی جیب سے شراب کی ایک چھوٹی بوتل نکال کر دکھائی۔ نین سکھ دارو کے لالچ میں آ گیا اور اگلے روز شام کو ان کے کیمپ پہنچ گیا۔ اگلے دن وہ واپس لوٹا تو شیلا نے اس کے ساتھ جھگڑا کیا مگر وہ اپنے ساتھ شراب کی ایک بڑی بوتل بھی لے کر آیا تھا جو فوجیوں نے اسے بطور تحفہ پیش کی تھی۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے نین سکھ نے کام پر جانے کی بجائے دارو پینی شروع کر دی اور دوپہر تک بالکل مدہوش ہو کر چارپائی پر گر گیا۔ اس روز شیلا کپڑے دھونے کے لئے ندی پر گئی تو تین فوجی اس کی گھات میں بیٹھے تھے۔ وہ چیخی چلائی، فریاد کی، واسطے دیئے مگر ان پر کوئی اثر نہ ہوا انہیں معلوم تھا کہ جنگل میں دُور دُور تک کوئی اس کی آواز نہیں سنے گا اور نین سکھ کو انھوں نے جو نشہ پینے کے لئے دیا تھا اس کا خمار دوسرے

دن تک نہیں اتر سکتا تھا۔ یہی وہ آوازیں تھیں جو میں نے بھی سنی تھیں۔

اپنی کہانی سنانے کے بعد یکایک شیلا کو میرے بارے میں جاننے کا خیال آیا۔ میرے فوجی ہونے میں اسے کوئی شک نہیں تھا بلکہ اسے یہ گمان تھا کہ شاید میں ان فوجیوں کا چوتھا ساتھی ہوں۔ فوری طور پر مجھے بھی یہی کہانی مناسب لگی اور میں نے اعتراف کر لیا کہ میں ان ہی درندوں کا ساتھی ہوں مگر اب مشکل یہ تھی کہ میں شیلا کا منہ کس طرح بند رکھوں؟ ظاہر ہے کہ وہ گاؤں واپس جا کر خاموش نہیں رہ سکتی تھی۔

مجھے اچانک ایک خیال سوجھا میں نے کہا "دیکھو شیلا میں نے جوش اور غصے میں آ کر ان تینوں کو مار تو دیا ہے مگر تم جانتی ہو کہ قتل بہت بڑا جرم ہے خاص طور پر محاذِ جنگ پر لڑنے والے فوجی کے لئے اپنے ساتھی فوجی کو ہلاک کرنا سب سے بڑا جرم ہے فوج والے میرا کورٹ مارشل کریں گے اور مجھے گولی سے اڑا دیں گے" وہ یہ سن کر بے حد پریشان ہو گئی وہ ہر قیمت پر میری جان بچانا چاہتی تھی۔ خواہ اِس کے لئے اُسے خود اپنی جان ہی کیوں نہ داؤ پر لگانی پڑے

"دیکھو شیلا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ میں فوج سے بھاگ جاؤں اور کہیں بہت دُور جا کر ایک نئی زندگی شروع کر دوں۔ اگر فوج والوں کو میرا پتہ لگ گیا تو وہ مجھے ہرگز زندہ نہیں چھوڑیں گے"

"مگر تم بھاگ کر جاؤ گے کہاں؟" وہ پریشان ہو کر پوچھنے لگی۔

"یہ ملک بہت بڑا ہے میں کہیں دُور چلا جاؤں گا اور نام بدل کر رہنے لگوں گا"

"مگر تمہارے بیوی بچوں کا کیا ہو گا" وہ ایک حساس دل رکھنے والی گرہستی عورت تھی۔

"میری ابھی شادی نہیں ہوئی۔ ماں باپ بھی نہیں ہیں۔"

یہ سُن کر اسے قدرے اطمینان ہو گیا۔ پھر بھی وہ میری سلامتی کے بارے میں بہت تشویش ظاہر کرتی رہی۔ میرے لئے فوری طور پر مسئلہ ان فوجیوں کی لاشوں کو ٹھکانے لگانے کا تھا میں نے قریبی جنگل میں ایک بڑا سا گڑھا تلاش کیا شیلا لالٹین اٹھا لائی اور گڑھے کو گہرا کرنے میں میری مدد کرتی رہی۔ یہ غنیمت تھا کہ اس کا خاوند مدہوشی کے عالم میں گھر پر پڑا ہوا تھا اور گھر میں کوئی دوسرا اس کی غیر حاضری کے بارے میں دریافت کرنے والا نہیں تھا میں نے تینوں لاشوں کو ہتھیاروں سمیت گڑھے میں ڈال کر مٹی، ٹہنیوں اور پتوں سے چھپا دیا۔ لالٹین دوبارہ اسی جگہ لٹکا دی اور تنقیدی نگاہوں سے جائزہ لیا۔ یوں لگتا تھا جیسے کیمپ کے باسی ابھی اٹھ کر کہیں چلے گئے ہیں۔ فوجیوں کا جنگ کے زمانے میں کیمپ سے غائب رہنا کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ اس طرف سے مطمئن ہو کر میں نے مٹکے میں بھرے ہوئے پانی سے منہ ہاتھ دھویا، کپڑے صاف کئے اور جوتے گلے سے اتار کر پیروں میں پہن لئے۔ شیلا کی ذہنی کیفیت اب بہتر تھی۔ وہ میرے گلے میں لٹکے ہوئے جوتوں کو دیکھ کر ہنستی رہی۔ شیلا کا مشورہ تھا کہ میں اس کے ساتھ جا کر کھانا کھاؤں اور پھر اپنی راہ لوں مگر میں نے اسے بتایا کہ ایک ایک منٹ میرے لئے قیمتی ہے اس کا اسے بھی بخوبی اندازہ تھا میں نے اسے گاؤں تک پہنچا کر آنے کی پیشکش کی تو وہ ہنسنے لگی۔ "مجھے جنگل میں کسی کا ڈر نہیں ہے جن کا ڈر تھا وہ اب نہیں رہے راستے بھی میں اچھی طرح جانتی ہوں مجھے تو تمہاری چنتا ہے" میں نے اسے یقین دلایا کہ میں ایک سخت جان فوجی ہوں اور جنگل میں سفر کرنا میرے لئے بہت معمولی بات ہے۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا اس لئے میں نے شیلا سے رخصت چاہی وہ ایک دم ہی جذباتی ہو گئی۔ چند لمحے پہلے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی مگر رخصت کے وقت اس کی آنکھیں بھر بھر آنے لگیں۔ وہ روتی ہوئی مجھ سے لپٹ کر بولی "میرا کوئی دیر نہیں ہے تم میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں سب سے چھپا کر رکھوں گی۔ تمہاری خدمت کروں گی۔ تمہارے لئے بہت اچھا رشتہ تلاش کر دوں گی۔" پگلی بالآخر ایک عورت تھی۔ بے چاری یہ بھول گئی تھی کہ اگر میں واقعی اس کا ہم قوم فوجی ہوتا تب بھی وہ مجھے دنیا کی نظروں سے بچا کر نہیں رکھ سکتی تھی کہاں یہ کہ میں دشمن فوجی تھا۔ میرا دل بھی بھر آیا مگر جذباتی باتوں کا وقت نہ تھا۔ اسے روتا ہوا چھوڑ کر میں اپنے مشن پر روانہ ہو گیا مگر اس سے پہلے میں نے اسے نین سکھ کے سر کی سوگند دی کہ وہ مجھ سے ملاقات کے بارے میں کسی کو نہیں

بتانے کی بھول جائے گی کہ میں کبھی اسے مِلا تھا۔ خود اس کی بھلائی کے لیئے بھی ضروری تھا کہ وہ میرے اور فوجیوں کے بارے میں عمر بھر اپنی زبان بند رکھے۔

فوجیوں کی زندگی میں جذباتی باتوں کی گنجائش نہیں ہوتی۔ لیکن میں شاید اپنی فطرت سے مجبور تھا۔ شیلا کو انسان نما درندوں سے بچا کر مجھے ایک خاص قسم کی طمانیت حاصل ہوئی تھی مگر اندھیرے جنگل میں ایک میل پیدل چلنے کے بعد شیلا اور ہلاک ہونے فوجیوں کا خیال میرے ذہن سے یکسر غائب ہو گیا۔ میرے پاس کمپاس قسم کا کوئی آلہ نہ تھا جس سے سمت کا اندازہ لگا تا۔ شیلا سے میں زیادہ تفصیلی سوالات کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا اور پھر میں جس نوعیت کی معلومات حاصل کرنے کی فکر میں تھا وہ شیلا مجھے فراہم بھی نہیں کر سکتی تھی۔

میرا سفر خاصا پُرخطر تھا۔ ایک جگہ چیتے نے مجھ پر گھات لگائی۔ اگر مُردہ فوجی کی مشین گن میرے ہاتھ میں نہ ہوتی تو اس کا حملہ میرے لیے موت کا پیغام بن جاتا۔ مگر میں اندھیرے میں اس کی ہیروں کی طرح چمکتی ہوئی آنکھیں دیکھ چکا تھا اور اس کے چھلانگ لگانے سے پہلے مشین گن کی گولیوں نے اُسے بھُون کر رکھ دیا۔ ایک مقام پر میں نے قریباً تیس فٹ لمبے اژدہے کو دیکھا۔ اس نے میری طرف توجہ نہیں دی کیوں کہ وہ ایک زندہ ہرن کو نگلنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ میں چاہتا تو کسی درخت کی شاخ پر رات گزار سکتا تھا۔ مگر میرے لیے سب سے پہلے اپنے ساتھیوں کو تلاش کرنا ضروری تھا۔ یقیناً وہ بھی میری تلاش میں سرگرداں ہوں گے۔

کئی میل کی مسافت طے کرنے کے بعد مجھے کچھ فاصلے پر کھنڈروں اور جنگل کے درمیان گھری ہوئی ایک عمارت نظر آئی۔ یہ ایک پُرانی وضع کی وسیع دومنزلہ بلڈنگ تھی جس کے چاروں طرف اُونچے اُونچے ستونوں والے برآمدے تھے۔ دروازے اور کھڑکیاں بھی بلند و بالا تھے جن میں رنگین شیشے لگے ہوئے تھے۔ عمارت کے بعض حصّوں میں روشنی بھی نظر آ رہی تھی۔ ایک بار ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ہلکی ہلکی موسیقی کی آواز بھی آئی اور فضا میں گم ہو گئی۔ میں رُک کر سوچنے لگا۔ یہ کیا عمارت ہو سکتی ہے؟ آبادی سے دُور جنگلوں اور پہاڑیوں میں گھری ہوئی کسی راجہ کا محل ہے؟ یا کسی بڑے تعلقدار کی حویلی؟ یکایک ساری فضا روشنیوں سے جگمگا اٹھی۔ ہر طرف آنکھوں میں چکا چوند پیدا کرنے والی تیز دودھیا رنگ کی روشنی پھیل گئی۔ میں نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے مگر روشنی میرے وجود میں داخل ہوتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ پھر کوئی درخت پر سے زمین پر کُودا۔ میں تیزی سے پلٹا۔ ایک برین گن کی خوفناک نالی میری دونوں آنکھوں کے سامنے تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں موت کے بھیانک غار کے دہانے کو دیکھ رہا ہوں۔ چند بھاری فوجی قدموں کی چاپ سُنائی دی اور میری نگاہوں کے سامنے والی تیز سرچ لائٹ بجھ گئی۔ اب میں قدرے بہتر انداز میں دیکھ سکتا تھا۔ مگر جو کچھ میں نے دیکھا وہ نہ دیکھتا تو بہتر تھا۔ میرے پہلو میں ایک چھ فٹ لمبا فوجی برین گن سے نشانہ باندھے ہوا کھڑا تھا۔ دائیں اور بائیں جانب ایک درجن کے قریب مسلح فوجی تھے جن کے چہروں پر موت کا پیغام میں صاف اور واضح طور پر پڑھ سکتا تھا۔ پھر میری نظریں ان فوجیوں کے سامنے پڑے ہوئے ایک چھوٹے سے ڈھیر پر پڑیں۔ گونجدار آواز میں کسی نے ہدایت دی اور ایک مسلح فوجی نے آگے بڑھ کر اس ڈھیر کو ٹھوکر ماری۔ میرے تینوں ساتھیوں اسلم، مبارک اور ظہیر کی کھُلی ہوئی بے نُور آنکھیں مجھے تک رہی تھیں۔ میرے چاروں طرف دشمن کے خونخوار شکل فوجیوں کا نرغہ تھا جن کی گولیاں مجھ پر برس پڑنے کے لیے بے تاب تھیں۔

میں بے اختیار آگے بڑھا لیکن برین گن کی نالی میری پیشانی سے ٹکرائی اور میرے قدم توڑ بجوڑ رُک گئے۔ مگر میری نظریں بدستور اپنے ساتھیوں کی لاشوں پر تھیں۔ یہ انتہائی تربیت یافتہ نوجوان تھے جنہیں ایک بہت مشکل مُہم کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ اِن کا یوں موت کے گھاٹ اُتر جانا نہ صرف میرے لیے ایک چونکا دینے والا حوصلہ شکن نظارہ تھا بلکہ میں جس مشن پر بھیجا گیا تھا اس کی کامیابی کا انحصار بھی اِن ہی کے عزم و حوصلے پر تھا، لیکن وہ اپنے وطن کی خاطر اپنی جانوں کی قربانی دے کر بہت بڑے قرض سے آزاد ہو چکے تھے۔ اِن پر کون سی ناگہانی آفت نازل ہوئی جو یہ اتنی آسانی سے لقمۂ اجل بن گئے؟ مگر یہ لوگ آسانی

سے دُشمن کے قبضے میں آجانے والے ہرگز نہیں تھے پھر؟

تیز روشنی کی چکا چوند نے میری آنکھوں کو جھپکا دیا۔ بھاری فوجی بُوٹوں کی آواز سُنائی دی اور ایک فوجی کا چہرہ میری نظروں کے سامنے آکر ٹھہر گیا۔ اس نے لوہے کا ہیلمٹ پہن رکھا تھا۔ چہرے پر سب سے نمایاں چیز اُس کی گھنی اور نوک دار مونچھیں تھیں۔

"یہ تمہارے ساتھی ہیں؟" ایک گونجدار آواز نے مجھے مخاطب کیا۔

میں چونک پڑا۔ ایک لمحہ پہلے مایُوسی، صدمے اور حیرت کا جو جذبہ مجھ پر طاری ہو چکا تھا وہ میں نے ذہن سے جھٹک دیا۔ مجھے اس قسم کے صدمات اور حادثات سے عہدہ برآ ہونے کی تربیت دی گئی تھی۔ ایک فوری جذباتی اور نفسیاتی صدمے نے مجھے جس لپیٹ میں لے لیا تھا اب میں اس سے مکمل طور پر آزاد تھا۔

"میں انہیں نہیں جانتا۔" میرا جواب فوری اور دو ٹوک تھا۔

فوجی کی نوکدار مونچھیں پھڑ پھڑائیں اور اُس کی خوفناک سیاہ آنکھوں میں غیظ و غضب کی چمک نمودار ہوئی: "زیادہ چالاک بننے کی کوشش مت کرو۔ یہ تینوں مرنے سے پہلے ہمیں سب کچھ بتا چکے ہیں۔ اگر زندگی چاہتے ہو تو ہمارے ساتھ تعاون کرو۔"

مجھے معلوم تھا کہ یہ جھوٹ تھا۔ جب وہ مجھ سے مخاطب تھا اس دوران میں میری نگاہیں اسلم، مبارک اور ظہیر کی لاشوں کا تفصیلی جائزہ لے چکی تھیں۔ میں نے اُن کے جسموں پر اَن گنت گولیوں کے نشان دیکھ لیے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ مردانہ وار گولیاں چلاتے ہوئے شہید ہوئے ہیں۔ دشمن کو اُن سے پُوچھ گچھ کی مہلت ہی نہیں ملی تھی۔ میں نے کہا: "جب یہ سب کچھ بتا چکے ہیں تو پھر میرا کچھ کہنا لاحاصل ہے۔"

فوجی کا خونخوار چہرہ اور زیادہ بھیانک ہو گیا۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھایا اور اب میں اس کی گرم سانسیں اپنے چہرے پر محسوس کر رہا تھا۔ اس کا چہرہ اتنا نزدیک تھا کہ میں پھُونک مار کر اس کی نوکدار مونچھوں کے بَل نکال سکتا تھا۔ ایک لمحہ ہم دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے رہے۔ پھر اس نے مجھ پر سے نظر ہٹائے بغیر بلند آواز میں کہا: "بلونت سنگھ"

ایک فوجی تیزی سے آگے بڑھا اور ہم دونوں کے نزدیک آکر کھڑا ہو گیا۔

"اسے مہمان خانے کی سیر کراؤ۔ آسانی سے ماننے والا نہیں لگتا۔"

بلونت سنگھ کے کرخت ہاتھوں نے مجھے بازو سے تھام لیا۔ فوجی افسر ابھی تک میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا تھا اور میں بھی پلک جھپکے بغیر اسے تک رہا تھا۔

"چلو۔" بلونت سنگھ نے جھٹکے سے بازو پکڑ کر کھینچا اور میری نظریں بلونت سنگھ کی طرف اُٹھ گئیں۔ وہ ایک قد آور، مضبوط شخص تھا جس کے چہرے پر رحم و مہربانی کے آثار بالکل نہیں تھے۔ برین گن کی نالی جو پیشانی سے ہٹ کر میری گردن پر چبھ رہی تھی اب میری کمر میں پیوست ہو گئی۔ سامنے کھڑے ہوئے فوجیوں کی بندوقیں بھی مجھے اپنی زد میں لیے ہوئے تھیں۔ میں نے ایک نظر اپنے ساتھیوں کے بے گوروکفن لاشوں پر ڈالی۔ میں اُن کے نزدیک جا کر اُنہیں آخری الوداعی بوسہ بھی نہیں دے سکتا تھا اور نہ اُن کی مغفرت کے لیے دُعا کرنے کا موقع تھا۔ میں نے خاموش نظروں سے انہیں خدا حافظ کہا اور بلونت سنگھ کے ساتھ چل پڑا۔ پیچھے پیچھے برین گن کی آہنی نالی تھی اور چھ فوجی مجھے اپنی بندوقوں کے سائے میں لیے ہوئے ساتھ چل رہے تھے۔

ہم قدیم دومنزلہ عمارت کی مخالف سمت جا رہے تھے۔ خشک پتے ہمارے پیروں تلے چُرمُرا رہے تھے۔ اُونچے اُونچے درختوں نے ہمیں اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ ایک پگڈنڈی سے گزر کر ہم مختصر سے کھُلے میدان میں پہنچے اور ایک خستہ سی ایک منزلہ پرانی عمارت کے سامنے جا کر رُک گئے۔ ایک خیمے کے سامنے کھڑے ہوئے پہریدار نے اشارہ کیا اور حویلی کا اُونچا چوبی دروازہ کھُل گیا۔ اندر ایک خاصا بڑا صحن تھا۔ یہ ایک پُرانی وضع کی عمارت تھی جس کے وسیع صحن میں چاروں طرف برآمدے تھے۔ برآمدوں میں مسلح فوجی پہرہ دے رہے تھے۔ ایک برآمدے سے گزر کر ہم ایک ڈیوڑھی میں پہنچ گئے۔ سامنے ایک چھوٹی میز پر ٹانگیں پسارے ایک تنومند فوجی کرسی پر نیم دراز تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر خشونت آمیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"بلونت سنگھ۔ یہ کوئی نیا شکار ہے؟" وہ غرّایا۔ اِس کی آواز میں درندگی تھی۔

"میجر صاحب نے آپ کے حوالے کر دیا ہے۔" بلونت سنگھ ہنس کر بولا اور مجھے زور سے دھکا دیا۔ میں سنبھلنے کے باوجود میز سے جا ٹکرایا۔ میز پر بیٹھا ہوا فوجی پھرتی سے اُٹھا اور اُس نے ایک بھرپور تھپّڑ میرے چہرے پر رسید کیا جس کی آواز سے ساری عمارت گونج اُٹھی ہوگی۔

"نظر نہیں آتا تمہیں" وہ گرجا۔ پھر مجھے گھُور کر بولا۔ "کوئی بات نہیں۔ رام بھروسے تم جیسے مہمانوں کی سیوا کرنا خوب اچھی طرح جانتا ہے۔ کیا نام ہے تمہارا؟"

مَیں خاموش رہا۔ وہ مجھے گھُورتا رہا۔ پھر اچانک مُسکرایا۔ "کوئی بات نہیں' جو ہمارے پاس مہمان رہتا ہے وہ اپنا نام پتہ اور سارے خاندان کا کچّا چِٹھا بتا کر جاتا ہے۔" پھر اُس نے بلند آواز سے پُکارا "صوبیدار۔" ایک فوجی بھاگا ہوا آگیا۔ "اِسے بارہ نمبر کوٹھری میں بند کر دو۔" وہ میری طرف گھُورتے ہوئے گرجا۔ "چلو جوان" صوبیدار نے اپنی برین گن کی نالی میری کمر میں چبھو دی اور زور سے آگے کو دھکیلا۔

مَیں خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔ برآمدوں کے آگے متعدد کمرے بنے ہوئے تھے اور ایک چوڑی سی گیلری اِن کے درمیان سے گُزر کر عمارت میں کسی اور طرف جاتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ ایک دروازے کے سامنے پہنچ کر صوبیدار للکارا "ہالٹ" مَیں رُک گیا اور مَیں نے کنکھیوں سے اِردگرد کا جائزہ لیا مگر صوبیدار کو قابو میں کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ برآمدے اور گیلری کے سامنے متعدد مسلح فوجی چوکس تھے اور مجھے کینہ توز نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ صوبیدار کے اِشارے پر ایک سپاہی نے کمرے کا دروازہ کھول دیا اور صوبیدار کی برین گن کے ایک پُرزور دھکّے نے مجھے کوٹھری کے اندر دھکیل دیا۔ دروازہ دوبارہ بند ہوگیا اور ظاہر ہے کہ اس پر قفل بھی لگا دیا گیا جس کی آواز میں صاف اور واضح طور پر سُن سکتا تھا۔

مَیں نے اِس کمرے نما کوٹھری کا جائزہ لیا۔ اُونچی اُونچی دیواریں تھیں اور سترہ اُٹھارہ فٹ بلند چھت کے نیچے یہ ایک مختصر کمرہ تھا۔ کمرے میں صرف ایک ہی دروازہ تھا جس سے میں اندر آیا تھا۔ اس کے مقابل ایک روشندان تھا جس پر لوہے کی سلاخیں نصب تھیں۔ ایک اور روشندان بائیں دیوار میں تھا جو شاید برابر والے کمرے میں کھُلتا تھا۔ اِس میں شیشے کی جگہ لکڑی کے تختے جڑے ہوئے تھے۔ کمرے میں ایک چارپائی اور تپائی کے سوا کوئی اور فرنیچر موجود نہ تھا۔ چارپائی پر ایک گندا سا تکیہ اور کمبل پڑا ہوا تھا۔ مَیں چارپائی پر بیٹھ کر حالات پر غور کرنے لگا۔ اپنے تینوں ساتھیوں کی موت کے بارے میں اب میرا ذہن بالکل واضح تھا۔ انہوں نے دُشمنوں کی قید پر مردانہ وار موت کو ترجیح دی تھی۔ اُن کی زندگی میں وہ اُنھیں ہاتھ بھی نہیں لگا سکے تھے۔ انہوں نے مخالفین کے حصار میں گھِر جانے کے بعد یقیناً فائرنگ کی ہوگی اور جواب میں درجنوں گولیاں اُن کے جسموں میں پیوست ہوگئیں۔ جیسا کہ بعد میں مجھے معلوم ہوا وہ موت کو گلے لگانے سے پہلے دس بارہ دُشمنوں کو موت کے گھاٹ اُتارنے میں بھی کامیاب ہوگئے تھے مگر اب میرے مشن کا کیا ہوگا؟ میرے تین پُرعزم ساتھی میرا ساتھ چھوڑ چکے تھے اور مَیں دشمن کی قید میں تھا۔ چاروں طرف کڑا پہرا تھا جس سے رہائی کی کوئی صورت ممکن نہ تھی۔ تو کیا میرے مقدّر میں بھی ایک بزدلانہ موت لکھی ہوئی ہے؟ مَیں نے سوچا۔

اچانک عمارت دردناک چیخوں سے گُونج اُٹھی۔ صاف ظاہر تھا کہ کسی مظلوم کو تشدّد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ اُس کی آہیں چیخیں اور کراہیں ناقابلِ برداشت تھیں۔ چیخوں کی آواز بڑھتی جا رہی تھی۔ چند منٹ تک یہ شوروغُل جاری رہا اور اِس کے بعد سنّاٹا چھا گیا۔ کمرے میں ایک مدّھم بجلی کے بلب کی روشنی نے سوگوار اور اُداس ماحول پیدا کر رکھا تھا۔ اِس پر مستزاد یہ چیخیں اور آوازیں۔ میرے ذہن اور اعصاب اپنے ساتھیوں کی بے وقت اور اچانک جُدائی کی وجہ سے پہلے ہی مجروح اور متاثر تھے۔ پھر جن حالات سے میں گزر رہا تھا وہ بھی خاصے صبر آزما تھے۔ چیخوں کے بعد یکایک گہری خاموشی بھی خاصی اعصاب شکن تھی جس کی وجہ سے میرے ذہن میں انتشار اور بے چینی پیدا ہوگئی تھی۔ یکایک ایک بار پھر ایک طویل چیخ بلند

ہوئی اور مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دُشواری پیش نہیں آئی کہ اِس مرتبہ تشدّد کا مرکز میرے برابر والا کمرہ تھا۔ روشندان میں نصب لکڑی کے تختوں کے باوجود آوازیں صاف سُنائی دے رہی تھیں۔ پھر پہلی مرتبہ ایک خوفناک آواز میرے کانوں نے سُنی۔ آواز کی کرختگی اور لہجہ صاف کر رہا تھا کہ یہ شخص ہر قسم کے جذبۂ ترحّم اور انسانیت سے محرُوم ہے۔ "ہم تمہیں ایک بار پھر بولتا ہے کہ سچ سچ بتا دو نہیں تو تمہارے جسم کی بوٹیاں الگ کر کے کتّے بلّی کو راتب کھلا دیں گے۔ تمہاری ایک بھی ہڈّی باقی نہیں رہے گی مگر تمہارے جسم میں سے جان نہیں نکلے گی۔ بولو۔"

جواب میں ایک دھیمی اور دُکھی آواز سرگوشی کے انداز میں آئی۔ "مجھ سے قسم لے لو۔ مَیں اور کچھ نہیں جانتا۔ جو مجھے معلوم تھا مَیں نے تمہیں بتا دیا ہے۔ خُدا کے واسطے مجھ پر ترس کھاؤ۔"

"تم پر ضرور ترس کھائیں گے۔ ابھی تم کو معلوم ہو جائے گا۔ چلو شروع ہو جاؤ۔ چھِڑکو مرچیں اور نمک اِس کے زخموں پر۔"

اِس کے ساتھ ہی چیخیں دوبارہ بُلند ہونے لگیں۔ مَیں نے بے اختیار اپنے کانوں پر دونوں ہاتھ رکھ لیے مگر میرا ذہن ماؤف ہونے لگا تھا اور میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ مَیں نے زور سے بھینچ کر اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اپنے کانوں کو دونوں ہتھیلیوں سے اتنی زور سے دبایا کہ میری کنپٹی کی رگیں چٹخنے لگیں لیکن اِس کے باوجود میرے کان مظلوم کی آوازیں سن رہے تھے۔ خُدا جانے کتنی دیر تک ظلم وستم کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ میرا جسم پسینے میں بھیگ رہا تھا حالانکہ کمرے میں گرمی نہیں تھی۔ مجھے جو تربیت دی گئی تھی اِس میں تشدّد برداشت کرنے کا سبق ضرور شامل تھا لیکن دوسرے کو اذیّت اور عذاب میں مبتلا دیکھنے کی تربیت مجھے نہیں ملی تھی اور یہ غیر انسانی کارروائی میری قوّتِ برداشت سے باہر تھی۔ جب برابر والے کمرے میں سے آوازیں بند ہوئیں تو ایک بار پھر سکوت اور سنّاٹا چھا گیا مگر یہ خاموشی اُن آوازوں سے زیادہ اذیّت ناک اور سوہانِ رُوح تھی۔ مَیں ہر لمحہ کسی دردبھری چیخ کو سُننے کا منتظر تھا۔ انتظار کے یہ لمحات جتنے تکلیف دہ تھے اُن کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ نہ جانے خاموشی کب تک طاری رہی اور ایک بار پھر چیخ وپکار اور آہ وبکا کا سلسلہ جاری ہوگیا۔ یہ عمل ساری رات تھوڑے تھوڑے وقفے سے دُہرایا جاتا رہا۔ مَیں ایک لمحے کے لیے بھی سونا تو کیا پُرسکون بھی نہ ہو سکا۔ اگر خود مجھے تشدّد کا نشانہ بنایا جاتا تو شاید مَیں اتنے کرب اور عذاب کا شکار نہ ہوتا۔

صُبح کی علامت کے طور پر چڑیوں کے چہچہانے کی آوازیں آنے لگیں۔ پچھلا روشندان کسی باغ یا کھُلے میدان میں کھُلتا ہوگا کیونکہ چڑیوں کی چہچہاہٹ کے ساتھ روشنی بھی اِسی روشندان سے میرے کمرے میں داخل ہوئی۔ رات کی ہیبت ناک تاریکی نے جو پُرہول ماحول طاری کر دیا تھا چڑیوں کی معصوم آوازوں اور سورج کی مدّھم کرنوں نے اسے آہستہ آہستہ کم کر دیا۔ اُجالا بھی قُدرت کی کتنی بڑی نعمت ہے۔ کتنی تکلیفیں' کتنی ہی پریشانیاں محض سورج کی روشنی کی وجہ سے کم یا سرے سے غائب ہو جاتی ہیں۔ بیماروں کی تکلیف رات میں بڑھ جاتی ہے مگر دِن کی روشنی اِس تکلیف کو خود بخود کم کر دیتی ہے۔ روشنی بذاتِ خود ایک ڈھارس ہے' ایک حوصلہ ہے۔ کتنے ہی آلام اُجالا ہوتے ہی بے حقیقت محسوس ہونے لگتے ہیں۔ میرے اُوپر بھی دِن کی روشنی نے یہی اثر کیا۔ دِن نکلنے کا احساس میرے لیے سکوُن کا پیغام ثابت ہوا۔ مَیں اب تک چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا لیکن آہستہ آہستہ نیم دراز ہوگیا۔ تکیئے کی گندگی اور کمبل کی بدبُو میرے لیے بے معنی ہوگئی اور پھر نہ جانے کب مَیں نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ گذشتہ دن اور رات کی جسمانی' روحانی اور ذہنی تھکاوٹ نے چشم زدن میں مجھے گہری نیند کی وادیوں میں پہنچا دیا۔

میری آنکھ کھُلی تو ایک فوجی مجھ کو جھنجھوڑ رہا تھا۔ ایک لمحہ تو میں اِس کا چہرہ تکتا رہا اور پھر تیزی سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ کمرے کا دروازہ کھُلا ہوا تھا مگر باہر مجھے ایک بندوق بردار محافظ کھڑا ہوا نظر آرہا تھا۔ مجھے بیدار کرنے والے سپاہی نے تپائی کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔ "ناشتہ کھالو۔" پھر میرے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ کمرے سے چلا گیا اور دروازہ پھر بند ہوگیا۔ مَیں نے ایک لمبی جماہی لی۔ آنکھیں مَلیں۔ رات کے واقعات بالکل خواب وخیال معلوم ہو رہے تھے۔ ایک پیتل کے تھال میں دو روٹیاں اور اچار تھا۔ ساتھ ہی ایک گلاس میں چائے بھاپ اُڑا رہی تھی۔ کھانے کی مطلق خواہش نہ تھی اِس لیے مَیں نے محض چائے پینے پر اکتفا کیا۔ چائے گرم تھی اور اِس نے میرے ذہن اور اعصاب کو خاصی تقویت پہنچائی۔ سارے دن کسی نے پلٹ کر میری خبر نہیں لی۔

جب رات بھیگ گئی تو پھر وہی فوجی ایک تھال میں کھانا لے کر آیا۔ ناشتے والا تھال وہ اُٹھا کر واپس لے گیا۔ کھانے میں بھی دو روٹیاں اور آم کا اچار تھا۔ چائے کی جگہ ایک گلاس میں پانی تھا۔ بھوک نے بُرا حال کر دیا تھا۔ اِس لیے میں دونوں روٹیاں چٹ کر گیا اور پھر اس بات پر افسوس کرنے لگا کہ مَیں نے ناشتے والی دو روٹیاں بھی کیوں نہ کھالیں۔

یہ رات بھی پہلی رات کی طرح ہی کٹی۔ ظلم و تشدد کا شکار ہونے والوں کی چیخوں نے مجھے سونے نہیں دیا۔ اِس رات برابر والے کمرے کے علاوہ کچھ اور سمتوں سے بھی چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔ ساتھ ہی ڈانٹ ڈپٹ اور دھمکیوں کی آوازیں بھی سُنائی دیتی رہیں۔ یہ رات پچھلی رات کے مقابلے میں کہیں زیادہ اذیت ناک تھی۔ صبح کی روشنی پھیلی تو میرے لیے سکون کا پیغام بھی لے کر آئی۔ پھر وہ ناشتہ اور رات گئے کھانے میں دو روٹیاں اور اچار۔ کھانے کے بعد مَیں نے پانی کا گلاس ختم بھی نہیں کیا تھا کہ پھر چیخوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ رات مجھ پر بہت بھاری تھی۔ کبھی میں کانوں کو بند کرتا۔ کبھی اُٹھ کر بے چینی سے ٹہلتا۔ میرا بس نہیں چلتا تھا کہ کسی طرح کمرے کی دیواریں توڑ کر باہر نکل جاؤں۔ عذاب کی یہ رات اتنی لمبی تھی کہ کسی طرح اِس کی صبح ہونے میں نہیں آتی تھی مگر ہر چیز کبھی نہ کبھی اختتام کو پہنچتی ہے۔ یہی قدرت کا اصُول ہے۔

خدا خدا کر کے رات ختم ہوئی اور مَیں نے شکھ کا سانس لیا۔ رات بھر کے تھکے ہوئے پراگندہ اعصاب نے آرام لینے کی ٹھانی اور میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ مگر ابھی پُوری طرح سونے بھی نہ پایا تھا کہ دروازہ کھُلا اور وہی فوجی اندر داخل ہوا۔ مَیں نے بمشکل آنکھیں کھول کر اُسے دیکھا۔ اِس کے ہاتھ میں ناشتے کی تھالی موجود نہ تھی۔

"اُٹھ کر کھڑے ہو جاؤ۔" اُس نے میری چارپائی کو ٹھوکر ماری۔ مَیں نے اِس کے حُکم کی تعمیل کی۔ "میجر صاحب نے یاد کیا ہے۔" یہ کہہ کر اِس نے اپنی گن کا رُخ میرے سینے کی طرف کر دیا۔

مجھ سے آنکھیں تک نہیں کھولی جارہی تھیں۔ ذہن اور جسم تھکن اور دُکھن کا شکار تھا۔ مُسلسل بیٹھے رہنے کی وجہ سے ٹانگیں اکڑ رہی تھیں۔ ناکافی خوراک نے جسم میں کمزوری پیدا کر دی تھی مگر حُکم حاکم مرگِ مفاجات۔ مَیں لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے کمرے سے باہر نکلا تو برآمدے میں دو اور پہریداروں نے مجھے اپنی حفاظت میں لے لیا۔ مَیں ان تینوں کی معیت میں چل پڑا۔ برآمدے میں سورج کی تیز روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ مُسلسل نیم تاریکی میں رہنے کی وجہ سے یہ روشنی میری آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر رہی تھی اور میرے لیے پُوری طرح آنکھیں کھولنا دشوار تھا۔

برآمدوں اور گیلری سے گزر کر ہم ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ یہ خاصا وسیع اور کشادہ کمرہ تھا اور دفتر کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا۔ میجر رام بھروسے میز پر کاغذوں کا مطالعہ کر رہا تھا۔ میرے محافظوں نے سلیوٹ مارا تو اُس نے نظریں اُٹھا کر دیکھا اور اُنہیں جانے کا اشارہ کیا۔ دو محافظ باہر چلے گئے مگر جو شخص مجھے کھانا اور ناشتہ فراہم کرتا تھا۔ دروازہ بند کرنے کے بعد بندوق تھام کر کھڑا رہا۔ چند منٹ تک میجر کاغذوں کا مطالعہ کرتا رہا۔ پھر کرسی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور پُشت پر ہاتھ رکھ کر ٹہلنے لگا۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

مَیں خاموش رہا۔ وہ مجھے دیکھتے ہوئے ٹہلتا رہا۔ "عہدہ کیا ہے؟"

مَیں پھر خاموش رہا۔ وہ ٹہلتا ہوا میرے نزدیک آگیا۔ "کس مشن پر آئے تھے؟"

مَیں اِس بار پھر خاموش رہا۔ میری نگاہیں سامنے دیوار پر آویزاں ایک پینٹنگ پر جمی ہوئی تھیں۔ جو کسی دیوی اور دیوتا سے تعلق رکھتی تھی۔

"جانتے ہو ہم بند زبان کو کھُلوانا جانتے ہیں۔ ہمارے پاس ایسے آدمی ہیں جو گونگوں کو بھی بولنے پر مجبُور کر دیتے ہیں؟" وہ چند لمحے مجھے گھُورتا رہا پھر دوبارہ ٹہلنے لگا۔

"تم نوجوان ہو۔ تمہیں فیوچر بنانا ہے۔ تم نے ابھی زندگی میں کچھ بھی نہیں دیکھا۔ لاالف ایک ہی بار آدمی کو ملتی ہے۔ اس کی دلچسپیوں اور رنگینیوں کا تمہیں کوئی اندازہ نہیں ہے۔ زندگی کے مزے لینا ہر آدمی کا حق ہے۔ چاہے سویلین ہو یا

فوجی۔ زندگی صرف میدانِ جنگ میں لڑنے اور جان دینے کا نام نہیں ہے جوان میدانِ جنگ میں لڑنے والوں کو زیادہ آرام اور عشق کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو مرنا جانتا ہے وہ زندگی سے پُورا پُورا فائدہ اُٹھانے کا بھی حقدار ہے۔"

وہ میرے سامنے کمرے میں ٹہلتا رہا اور نرم آواز میں بولتا رہا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ خود اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہے مگر میرے کانوں تک اِس کی آواز پہنچ رہی تھی اور میرا ذہن وہ پیغام وصول کر رہا تھا جو وہ مجھ تک پہنچانا چاہتا تھا۔

پھر اچانک وہ رُک کر مجھے گھُورنے لگا۔ "تمہارے ساتھیوں نے ہمیں بہت سی باتیں بتا دی ہیں مگر وہ بیوقوف تھے۔ اگر کوآپریٹ کرتے تو ہم اُنہیں بہت مزے کراتے۔ اب وہ دوبارہ اِس دُنیا میں واپس نہیں آسکتے مگر تم ابھی اِس دُنیا میں ہو۔ اِس دُنیا کی ہر چیز تمہارے لیے ہے۔ تم اپنی زندگی کو اپنے لیے زیادہ مزیدار اور انجوائے ایبل بنا سکتے ہو۔ ہر چیز کا کوئی مطلب ہوتا ہے جوان۔ کوئی مینگ ہوتی ہے۔ تمہاری زندگی کا بھی کوئی مطلب ہے۔ بولو، زندگی سے پیار کرتے ہو؟"

اِس کے لہجے کی نرمی نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ پہلی ملاقات میں وہ جتنا ظالم اور کرخت نظر آتا تھا آج اِس کا رُوپ ہی بدلا ہوا تھا۔ وہ آسان لہجے میں کسی ماہرِ نفسیات کے انداز میں بول رہا تھا۔ اُس کا سلوک ایک مُشفق، ہمدرد اور مہربان جیسا تھا۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ ایک اکھڑ فوجی افسر ہے۔

مَیں اِس کے باوجود خاموش رہا۔ مَیں جانتا تھا کہ خاموشی ہی میں نجات ہے۔ ایک بار مَیں بول پڑا تو سوالات کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ یہ تو معلوم ہی ہے کہ وہ مجھے بھی اُسی گروپ کا ایک رُکن تصور کرتے ہیں جس سے تعلق رکھنے والے تین آدمیوں کو انہوں نے ہلاک کر دیا۔ اِس دوران میں انہوں نے علاقے کا کونہ کونہ چھان مارا ہوگا تاکہ میرے دوسرے ساتھیوں کو بھی ڈھونڈ نکالیں۔ بہت سے بے گناہ بھی اُن کے ظلم کا نشانہ بنے ہوں گے مگر اِس میں کسی شبے کی گنجائش نہیں کہ وہ مجھے ایک اہم شکار سمجھتے ہیں۔ یہ محبت بھرے الفاظ اور مہربانی کا انداز ایک چال ہے۔ وہ مجھ سے سارے راز اُگلوانا چاہتے ہیں اور مَیں نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ آخر دم تک زبان نہیں کھولوں گا۔ اِس کے نتیجے میں مجھ پر جو ستم ڈھائے جائیں گے مجھے ان کا بخوبی اندازہ ہو چکا تھا مگر میں ذہنی اور جسمانی طور پر اِس امتحان کے لیے بالکل تیار تھا۔

میرے چُپ رہنے سے وہ ناراض نہیں ہوا۔ مُسکرا کر بولا: "تم نوجوان ہو۔ دل میں اُمنگیں ہیں، جذبات ہیں، زندہ رہنے کی خواہش ہے۔ ایک طرف زندگی کا بُلاوا ہے اور دوسری طرف موت کا۔ مَیں جانتا ہوں کہ ایک فوجی کے لیے فیصلہ کرنا آسان نہیں ہے مگر یاد رکھو۔ میری بات مانو گے تو تمہیں پچھتانا نہیں پڑے گا۔ کون سی چیز ہے جو ہم تمہیں نہیں دے سکتے؟ تمہاری کم عمری پر مجھے ترس آتا ہے۔ ابھی تمہارے ہنسنے کھیلنے کے دن ہیں۔ جنگ کی کٹھن زندگی تمہارے لیے نہیں ہے جوان۔ مَیں تمہیں سوچنے کے لیے پُورا موقع دوں گا مگر میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ چوبیس گھنٹے بعد تمہیں زندہ رہنے کا ایک اور چانس دیا جائے گا۔ مجھے وشواس ہے کہ تم اسے کھونا پسند نہیں کرو گے۔"

اِس نے میرا شانہ تھپکا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مُسکرانے لگا۔ "کیوں؟ ہے نا ٹھیک بات؟" مَیں نے اپنی نظریں ہٹا کر دوبارہ سامنے والی تصویر پر جما دیں۔

اُس نے میز پر رکھی ہوئی گھنٹی پر ہاتھ مارا اور کمرے کا دروازہ کھول کر دونوں محافظ اندر آگئے۔ انہوں نے میجر کو سلیوٹ کیا اور اٹنشن کھڑے ہو گئے۔

اچانک میجر مجھ سے مخاطب ہوا: "تمہارا نام کیا ہے؟"

بے اختیار میرا نام میری زبان پر آتے آتے رہ گیا۔ مَیں نے عین وقت پر اُس کا یہ اچانک وار خالی کر دیا اور پھر خاموش کھڑا رہا۔

"خیر۔ ابھی تمہارا نام بارہ نمبر ہے۔" پھر وہ فوجیوں سے مخاطب ہوا۔ "بارہ نمبر کو کیپٹن کرشنا کے پاس لے جاؤ۔"

مَیں خاموشی سے اپنے محافظوں کے ساتھ کمرے سے باہر نکلا۔ ایک فوجی ہمارے آگے آگے چل رہا تھا۔ بوسیدہ عمارت کی بجائے اِس بار ہمارا رُخ دومنزلہ حویلی کی طرف تھا۔ حویلی کا بڑا پھاٹک کھلا ہوا تھا۔ ایک فوجی جیپ اِس میں سے باہر نکل کر دھول اُڑاتی ہوئی ایک طرف روانہ ہوگئی۔ ہم پھاٹک کے اندر داخل ہوئے تو پتہ چلا کہ وسیع اور کشادہ عمارت کے وسط میں ایک کافی بڑا باغ ہے۔ یہ کسی راجہ یا بڑے تعلقدار کی رہائش گاہ رہی ہوگی اور یہ باغ عمارت کا بائیں باغ ہوگا مگر باغ کی کس مپرسی سے ظاہر ہوتا تھا کہ اصل مکینوں کی غیر موجودگی میں اِس کی زیادہ دیکھ بھال نہیں کی جا رہی۔ ویسے بھی زمانۂ جنگ میں پھولوں اور باغوں کی نگہداشت پہ کون توجہ دیتا ہے۔ بائیں باغ کی پتھریلی پگڈنڈی سے گزر کر ہم ایک اُونچے اُونچے ستونوں والے برآمدے میں پہنچ گئے۔ یہ عمارت نسبتاً بہتر حالت میں تھی۔ دروازوں پر پالش چمک رہی تھی۔ سیاہ اور سفید پتھروں کا فرش بھی بہت اچھی حالت میں تھا۔ برآمدے میں کئی جگہ آئینے لگی ہوئی میزیں رکھی ہوئی تھیں۔ جن میں ٹوپیاں اور لباس لٹکانے کے لیے پیتل کی کھونٹیاں نصب ہوتی ہیں۔ پُرانے زمانے میں یہ فیشن میں داخل تھا مگر اب یہ فرنیچر متروک ہو چکا ہے۔ فوجیوں نے اِس عمارت کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا تو یہاں کی تمام چیزوں کو استعمال میں لے آئے۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ یہ وسیع اور شاندار عمارت نہ صرف اِن کا فوجی ہیڈ کوارٹر تھا بلکہ اِس کا ایک حصہ آفیسرز میس اور کلب کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ اِس کا اندازہ تو مجھے پہلے بھی تھا مگر جب میں محافظوں کی معیت میں ایک سیاہ چوبی دروازے سے گزر کر ایک وسیع اور کشادہ ہال میں داخل ہوا تو میرا شبہ یقین میں بدل گیا۔ ہال میں چوکور سیاہ اور سفید ماربل کا فرش تھا اور یہ ڈائننگ ہال کے طور پر بھی استعمال ہو رہا تھا۔ ایک طرف کاؤنٹر کے پیچھے مختلف برانڈز کی شرابوں کی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ سامنے کی میز پر قسم قسم کے گلاس اور پیمانے تھے۔ ایک سیاہ رنگ کا بارمین سفید ایپرن گلے میں ڈالے اِن پیالوں کو کپڑے سے چمکانے میں مصروف تھا۔ ہال میں چار وسیع اور بلند دروازے تھے اور درمیان سے کشادہ اور خوبصورت سیڑھیاں اُوپر جا رہی تھیں۔ ہال میں دیواروں کے ساتھ صوفے اور بید کی کرسیاں اور اُن کے سامنے لکڑی کی میزیں رکھی ہوئی تھیں۔ ہم سیڑھیوں پر چڑھ کر ایک اور وسیع گیلری میں پہنچے۔ گیلری میں قریباً نصف درجن دروازے تھے۔ ایک دروازے کے سامنے پہنچ کر محافظوں نے دستک دی۔ دروازہ ایک فوجی نے کھولا۔

"میجر صاحب نے کپتان صاحب کے پاس بارہ نمبر کو بھیجا ہے۔"

دروازہ پورا کھل گیا اور دروازہ کھولنے والے فوجی نے مجھے اپنی برین گن کی پناہ میں لے لیا۔ تینوں محافظ لوٹ گئے۔ ماربل کے فرش پر اُن کے فوجی بوٹوں کی کھٹ کھٹ دیر تک مجھے سُنائی دیتی رہی۔ میرے سامنے ایک کافی بڑا کمرہ تھا جس کے وسط میں ایک بڑی سیاہ لکڑی کی میز رکھی ہوئی تھی۔ کمرے میں اِس بڑی میز اور چند کرسیوں کے علاوہ کوئی اور فرنیچر موجود نہیں تھا۔ میز کی عقب والی دیوار میں دو لمبی فرنچ طرز کی کھڑکیاں تھیں جن کے شیشوں میں سے باہر باغ کا منظر نظر آ رہا تھا۔ اِن کھڑکیوں کے بالائی حصّے میں نیلے رنگ کے شیشے لگے ہوئے تھے۔ بڑی میز کے پیچھے بیٹھنے والی شخصیت کو دیکھ کر مَیں ایک لمحے کے لیے حیران رہ گیا کیونکہ یہ ایک قبول صورت عورت تھی جس نے فوجی وردی پہن رکھی تھی۔ شانوں پر لگے ہوئے فیتے ظاہر کر رہے تھے کہ وہ کیپٹن ہے۔ اِس کے بال مردانہ انداز میں ترشے ہوئے تھے اور اِس کے گندمی چہرے پر بھلے لگ رہے تھے۔ اُس کے سامنے میز پر کاغذات بکھرے ہوئے تھے اور اُس کی فوجی ٹوپی بھی میز پر رکھی ہوئی تھی۔

فوجی نے اُسے سیلوٹ مارا تو اُس نے اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اُٹھا کر ہماری طرف دیکھا اور پھر اُس کی نگاہیں میری نگاہوں سے ملیں۔ وہ بڑے دلآویز انداز میں مسکرائی اور کرسی سے اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ وہ ایک کشیدہ قامت اور نہایت متناسب جسم کی پختہ عورت تھی۔ فوج میں کیپٹن کے عہدے تک پہنچنے کے باوجود اُس میں نسوانیت باقی تھی۔ وہ زیرِ لب مسکراتی ہوئی میری طرف بڑھی اور نزدیک آ کر کھڑی ہوگئی۔

"ہوں۔ تو تم ہو نمبر بارہ؟"

میں خاموشی اُس کو دیکھتا رہا۔

"بیٹھو" اُس نے ہاتھ سے کُرسی کی طرف اشارہ کیا اور میں کُرسی پر بیٹھ گیا۔

"اردلی" وہ سنتری محافظ سے مخاطب ہوئی۔ "اچھی سی چائے بنا کر لاؤ" پھر وہ مجھ سے پُوچھنے لگی۔ "کچھ کھاؤ گے چائے کے ساتھ؟" اُس کا انداز دوستانہ تھا اور یوں لگتا تھا جیسے ہم ایک دوسرے سے مدت سے شناسا ہیں اور آج کافی دِن بعد ملاقات ہوئی ہے۔ میں نے جواب میں صرف اثبات میں سر ہلانا کافی سمجھا۔

"دیکھو۔ چائے کے ساتھ کچھ کھانے کا سامان بھی لانا۔ ٹھیک ہے؟" اردلی سلیوٹ مار کر رُخصت ہو گیا تو اُس نے ایک بار پھر مسکرا کر مجھے دیکھا: "کیا نام ہے تمہارا؟"

میں خاموش رہا۔ وہ پھر مسکرائی "بتانا نہیں چاہتے تو نہ بتاؤ۔ اچھا یہ بتاؤ۔ تم اُن تینوں کے ساتھ پیراشوٹ سے ڈراپ ہوئے تھے؟" اُس کا لہجہ بے تکلفانہ تھا۔

"میں اُنہیں نہیں جانتا" خاموش رہنا اب میرے بس سے باہر ہو گیا تھا۔

"کس لیے یہاں آئے ہو؟" وہ واپس جا کر دوبارہ اپنی کُرسی پر بیٹھ گئی۔ "کوئی تو مشن ہو گا تمہارا؟" اُس نے اپنی سیاہ بڑی بڑی آنکھیں پھیلا کر مجھے دیکھا۔

"دیکھئے کیپٹن......"

"میرا نام کیپٹن ٹی۔آر۔کرشنا ہے۔" وہ مسکرا کر بولی: "مس ٹی۔آر۔کرشنا۔"

"آپ سے مل کر خوشی ہوئی" میں نے اخلاقاً کہا۔

"ویری گڈ۔ تمہیں مینرز بھی آتے ہیں" وہ ہنس پڑی۔ اُس کے دانت ہموار، سفید اور چمکدار تھے۔ وہ ایک اچھی خاصی خوش شکل عورت تھی۔ ایسی عورت کا بھلا فوج میں کیا کام ہو سکتا ہے؟ میں نے سوچا وہ تو دوسرے محاذوں پر بھی فتوحات کرنے پر قادر تھی۔

"دیکھو نمبر بارہ۔ ہمارے مُلکوں کی فوجوں میں لڑائی ہو رہی ہے مگر میری تو تم سے کوئی لڑائی نہیں ہے نا! اس لیے مجھے اپنا دوست ہی سمجھو۔ ٹھیک ہے؟" اُس کا ٹھیک ہے کہنے کا مخصوص انداز تھا اور وہ گردن ایک طرف جُھکا کر فقرے کے آخر میں یہ جملہ کہنے کی عادی تھی۔

میں نے کہا: "مگر ہم دونوں کا تعلق بھی تو فوج سے ہے۔ فوجیوں کی آپس میں کوئی لڑائی نہیں ہوتی۔ فوجوں کی لڑائی ہوتی ہے اس لیے جب تک جنگ جاری ہے ہم دونوں بھی میدانِ جنگ میں ہیں۔"

"تعلیم یافتہ معلوم ہوتے ہو" وہ ہنسنے لگی۔ "کیا کالج کے زمانے میں ڈی بیٹ میں حصّہ لیا کرتے تھے؟"

میں نے سر ہلا دیا۔ "تب ہی تم نے جواب میں ایک تقریر جھاڑ دی۔ مگر یہ تو مانو گے کہ کم از کم یہ کمرہ میدانِ جنگ نہیں ہے۔ اس لیے سمجھو ہم دونوں کے بیچ سیز فائر ہے۔ ٹھیک ہے؟"

"ٹھیک ہے" میں کُرسی پر ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گیا۔ میں نے سوچا جو ہونا ہے وہ تو ہو گا ہی۔ پھر عدم تعاون اور خاموش رہنے سے فائدہ؟!

اردلی چائے کی ٹرے لے کر اندر آ گیا اور میز پر رکھ کر بنانے لگا۔ "نہیں۔ تم رہنے دو۔ میں تو دینا لوں گی۔ تم جاؤ" اردلی کمرے سے باہر چلا گیا تو وہ اُٹھ کر چائے کی ٹرے کے پاس پہنچ گئی۔ "چائے بنانا ہر کسی کو نہیں آتا اور فوج کے اردلی سے تو یہ اُمید رکھنا ہی بیکار ہے۔" اُس نے بسکٹوں سے بھری ہوئی پلیٹ اُٹھا کر میرے سامنے رکھ دی: "لو کھاؤ۔ شکر کتنی چمچ لو گے؟"

"دو چمچ" میں نے ایک بسکٹ اُٹھاتے ہوئے کہا۔ وہ چائے پیالیوں میں ڈالنے میں معروف تھی۔ میں نے اُس کا بھرپور جائزہ لیا۔ فوجی وردی اُس کے کشیدہ قامت پر سج رہی تھی۔ وہ ایسی عورت تھی جو ہر لباس میں سج سکتی تھی۔ کم از کم فوجی ملازمت اس کے لیے مناسب نہیں ہے۔ میں نے دوسرا بسکٹ چباتے ہوئے سوچا۔

اُس نے چائے کی پیالی میرے سامنے رکھ دی۔ "سوچ رہے ہو میں فوج میں کیوں آ گئی؟" وہ مسکرائی اور میرے سامنے والی پلیٹ میں سے ایک بسکٹ اُٹھا لیا۔ "مجھے فوجی وردی بہت اچھی لگتی ہے۔ میرے پتا جی بھی فوج میں تھے۔"

"مگر کیا یہ نازک عورتوں کے لیے سخت زندگی نہیں ہے؟" میں بھی اب گفتگو کے مُوڈ میں تھا۔

"عورتیں اتنی نازک نہیں ہوتیں جتنا کہ مرد سمجھتے ہیں۔ دُنیا کا ہر کام کر سکتی ہیں۔ ہمارے دیس تو بیک ورڈ ہیں۔ دوسرے مُلکوں میں دیکھو عورتیں کیا نہیں کرتیں! مگر میں لڑنے والی فوج میں نہیں ہوں۔ میں تو ڈاکٹر ہوں۔"

میں نے حیران ہو کر اُس کی طرف دیکھا۔ میجر رام بھروسے نے مجھے ایک ڈاکٹر کے حوالے کیوں کر دیا تھا! وہ اپنی چائے کی پیالی لے کر اپنی کُرسی پر بیٹھ گئی اور ہلکی ہلکی چسکیاں لے کر چائے پینے لگی۔ پھر ایک دم ہنس پڑی۔ "جب میں چھوٹی تھی تو پرچ میں ڈال کر چائے پیتی تھی، سُڑپ سُڑپ کر کے۔ سب لوگ مجھ پر خفا ہوتے تھے مگر پرچ میں چائے ڈال کر پینے میں بہت مزہ آتا ہے۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

میں نے اُس کی تائید کر دی۔ گرم چائے اور بسکٹوں نے میرے جسم میں حرارت اور توانائی پیدا کر دی تھی مگر پچھلے دِنوں کی تھکان اور نہ سونے کی وجہ سے میری آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔

اُس کی نظر مجھ پر پڑی تو پیالی اُٹھا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "ارے۔ تمہیں تو بہت نیند آ رہی ہے۔ رات جاگتے رہے ہو کیا؟"

میں اُسے کیا بتاتا کہ جس ماحول میں مجھے رکھا گیا تھا وہاں صرف مُردے ہی سو سکتے ہیں۔

"تم تھکے ہوئے بھی ہو" اُس نے میز پر رکھی ہوئی گھنٹی پر ہاتھ مارا۔ اردلی اندر آ کر اٹنشن ہو گیا۔ "دیکھو۔ انہیں گیسٹ ہاؤس میں لے جاؤ۔ ان کے آرام کا خیال رکھنا۔ ٹھیک ہے؟" اُس نے ایک بار پھر گردن ایک طرف جُھکا کر پُوچھا۔ جواب میں اردلی نے یس سر کا نعرہ مارا اور پھر مجھ سے کہا: "اُٹھیے سر" میں نے سوالیہ نظروں سے کیپٹن کرشنا کی طرف دیکھا: "جاؤ جاؤ آرام کرلو۔ پھر اس کے بعد باتیں کریں گے۔" میں چائے پہلے ہی ختم کر چکا تھا۔ دوسری پیالی پینے کی خواہش بھی تھی مگر وقت کا تقاضا کچھ اور تھا اس لیے چُپ چاپ اُٹھ کر اردلی کے پیچھے ہو لیا۔

ایک دو برآمدوں سے گزر کر ہم ایک چھوٹے سے برآمدے میں پہنچے جو حویلی سے ملحق تو تھا مگر انیکسی کی حیثیت رکھتا تھا۔ صاف سُتھری جگہ تھی۔ برآمدے میں چند گملے بھی رکھے ہوئے تھے۔ اردلی نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا اور مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ میں جھجکتا ہوا اندر داخل ہوا۔ یہ ایک آرام دہ کمرہ تھا۔ ایک طرف بیڈ تھا۔ سائیڈ میں ایک سنگھار میز رکھی اور اس کے سامنے سٹول رکھا ہوا تھا۔ بید کی دو آرام کُرسیاں بھی کمرے میں موجود تھیں۔ فرش پر رنگین دری بچھی ہوئی تھی۔ ابھی میرا جائزہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ اردلی نے دروازہ بند کر دیا اور پھر باہر سے قفل لگانے کی آواز آئی۔ گویا کیپٹن کرشنا کے تمام دوستانہ رویے کے باوجود میں ایک قیدی تھا۔ میں نے بیڈ پر بیٹھ کر کرشنا کے بارے میں کچھ سوچنے کی کوشش کی مگر نیند کا ایک شدید جھونکا آیا اور میں بستر پر گر گیا۔

دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز سے میری آنکھ کھلی۔ میں بہت گہری نیند سویا ہوا تھا۔ بمشکل آنکھیں کھلیں۔ اردلی نہ جانے کتنی دیر سے کھلے دروازے میں کھانے کی ٹرے لیے کھڑا تھا اور اندر آنے کی اجازت طلب کرنے کے لیے بندوق سے دروازہ بجا رہا تھا۔ میں تیزی سے اُٹھ کر بیٹھا تو وہ اندر داخل ہوا۔ کھانے کی ٹرے اُس نے سنگھار میز پر رکھ دی۔ "سر مُنہ ہاتھ دھونا ہو تو باتھ روم اُدھر ہے۔" اُس نے انگلی سے ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ میں کمرے میں داخل ہوتے ہی نیند کی وادی میں گُم ہو گیا تھا اس لیے میں نے کمرے سے ملحقہ باتھ روم کے دروازے کی طرف کوئی توجہ ہی نہیں دی تھی۔ یہ غسل خانہ بھی خاصا وسیع تھا۔ ایک طرف نہانے کا ٹب لگا ہوا تھا۔ فلش خاصے پُرانے زمانے کا تھا مگر ٹھیک کام کر رہا تھا۔ غسل خانے میں صرف ایک روشندان تھا جس پر لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ کہنے کو یہ گیسٹ روم تھا مگر قفس کی تیلیاں بھی صاف دیکھی جا سکتی تھیں۔ میں واپس کمرے میں گیا تو اردلی رخصت ہو چکا تھا۔ ٹرے میں مختلف قسم کی سبزیاں، دالیں اور پاپڑ رکھے

ہوئے تھے۔ روٹی کی جگہ پوریاں تھیں۔ سنگھار میز پر ایک تھرمس بھی رکھا ہوا تھا۔ مجھے علم نہیں کہ اردلی یہ ابھی رکھ کر گیا تھا یا وہ پہلے ہی وہاں موجود تھا۔ کئی دن کے بعد مَیں نے پیٹ بھر کر لذیذ کھانا کھایا۔ ابھی دو چار ڈکاریں ہی لی تھیں کہ دروازہ پھر کھلا اِس بار اردلی چائے کی پیالی لے کر آیا تھا۔ اُس نے برتن سمیٹنے ختم نہیں کیے تھے کہ مَیں نے چائے کی پیالی خالی کر دی اور دوبارہ بستر پر لیٹ گیا۔

"اور کوئی چیز سَر؟" اردلی نے جاتے جاتے مجھ سے پوچھا۔ مَیں نے انکار میں سَر ہلایا اور کروٹ لے کر سو گیا۔ نہ جانے کتنی دیر سوتا رہا۔ نیند اتنی گہری اور بے خبر تھی کہ کوئی خواب بھی نہ دیکھ سکا۔ جب نیند سے بیدار ہوا تو کمرے میں خوشبو پھیلی ہوئی تھی اور کوئی ملائم چیز میری گردن اور کانوں کو چھو رہی تھی۔ مَیں بے اختیار چونک کر اُٹھ گیا۔ رات ہو چکی تھی اور کمرے میں دو بلب روشن تھے جن کی صاف روشنی میں مجھے نہ صرف کمرے کی تمام چیزیں بالکل واضح طور پر نظر آ رہی تھیں بلکہ میں اضافی چیز کو بھی دیکھ رہا تھا۔ یہ اضافی چیز ایک طرح دار عورت تھی جو سُرخ پھولدار ساڑھی اور اسی رنگ کے بلاؤز میں ملبُوس تھی۔ بیدار ہوتے ہی مجھے جس خوشبو کا احساس ہوا تھا وہ اُس کے لباس سے بھی پھوٹ رہی تھی۔ مَیں چونک کر ایک دم اُٹھا تو اُس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا جو اِس سے پہلے میری گردن اور کان پر گدگدی کر رہا تھا۔ مجھے اُٹھتے دیکھ کر اِس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اور سیاہ سُرمگیں آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ مَیں جھٹ کر پیچھے ہٹ گیا۔

وہ دِلکش انداز میں مُسکرائی "میرا نام سُجاتا ہے۔ کیوں کیسا نام ہے؟" اُس نے پُوچھا میں خاموش حیران نظروں سے اُس کو دیکھتا رہا۔

"ایسے کیوں تک رہے ہو۔ پہلے کبھی عورت نہیں دیکھی؟" وہ لگاوٹ سے مُسکرائی۔ مَیں پھر بھی خاموش رہا تو وہ میری طرف کِھسک آئی اور ایک اچھے انگریزی سینٹ کی خوشبو نے میرے دماغ کو معطر کر دیا۔

"مجھے کرشنا نے تمہاری سیوا کے لیے بھیجا ہے۔ اپنے مہمانوں کی وہ بہت دیکھ بھال کرتی ہے۔" اُس نے اپنے شانوں پر بکھری ہوئی زُلفوں کو ایک جھٹکے سے گردن کے پیچھے پھینکتے ہوئے کہا۔ مَیں بیڈ سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"کہاں چلے؟" وہ بے ساختہ بول پڑی۔

"کہاں جا سکتا ہوں۔ غسل خانے میں ہاتھ منہ دھونے جا رہا ہوں۔" مَیں نے چڑچڑے لہجے میں جواب دیا۔

مَیں غسل خانے سے واپس آیا تو وہ سنگھار میز کے سامنے کھڑی آئینے میں اپنا سراپا دیکھ رہی تھی۔ "کیوں کیسی لگتی ہوں؟" اُس نے میری طرف پلٹے بغیر پُوچھا۔ مَیں نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ تیزی سے پلٹ کر میرے پاس آ گئی۔ "بولتے کیوں نہیں' ناراض ہو گیا؟"

"ناراض ہونے کی کیا بات ہے۔" مَیں نے تلخی سے کہا۔ اُس خوبصورت عورت نے خواہ مخواہ مجھے غصّہ دلا دیا تھا۔ مَیں اسے بالکل نہیں جانتا تھا مگر پھر بھی مجھے اُس پر غصّہ آ رہا تھا۔

"کھانے سے پہلے کچھ پیو گے؟" وہ اِٹھلائی اور سنگھار میز پر رکھی ہوئی شراب کی بوتل اُٹھا کر میری طرف بڑھی۔

"مَیں مسلمان ہوں۔ شراب نہیں پیتا۔" مَیں نے برہمی سے کہا۔

"بہت سے مسلمان پیتے ہیں۔" وہ معصومیت سے بولی۔

"بہت سے ہندو گائے کا گوشت بھی کھاتے ہیں۔" میرا غصّہ بڑھتا جا رہا تھا۔

ایک لمحہ وہ آنکھیں پھیلا کر مجھے دیکھتی رہی۔ پھر ہولے سے مسکرائی "خفا کیوں ہوتے ہو؟ نہیں پیتے تو زبردستی نہیں کروں گی۔" یہ کہہ کر اُس نے شراب کی بوتل کھولی اور میز پر رکھے ہوئے دو گلاسوں میں سے ایک گلاس میں تھوڑی شراب اُنڈیلی اور گھونٹ گھونٹ پینے لگی پھر ایک دم وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "آر یو شیور۔ بالکل نہیں پیو گے؟"

مَیں نے جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔ خاموشی سے ایک آرام کُرسی پر بیٹھ گیا۔ اُس نے چند گھونٹ میں گلاس خالی کر

دیا۔ خالی گلاس کو کچھ دیر انگلیوں میں گھما کر غور سے دیکھتی رہی پھر گلاس سنگھار میز پر رکھ کر میرے سامنے والی آرام کُرسی پر نیم دراز ہو گئی۔ اُس کی آنکھوں میں سُرخ ڈورے مجھے صاف نظر آ رہے تھے۔ لگتا تھا وہ اِس سے پہلے بھی شراب پیتی رہی ہے ورنہ چند گھونٹ اتنی جلدی ایسی کیفیت پیدا نہیں کر سکتے۔ وہ نیم وا آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی پھر سرگوشی کے انداز میں بولی: "شراب سے بالکل لگاؤ نہیں ہے؛ مگر اور چیزوں سے تو ہے نا؟" پھر وہ معنی خیز انداز میں مُسکرائی۔

وہ خاصی دِلفریب اور صحت مند عورت تھی مگر مجھے اُس کا وجود بالکل پسند نہیں آ رہا تھا۔ شاید اُس کی آوارہ مزاجی نے مجھے متنفر کر دیا تھا یا پھر میرے لاشعور نے مجھے وارننگ دے دی تھی۔ وہ میری آنکھوں کے سامنے مجسّم دعوت بنی بیٹھی تھی۔ مجھے کوفت محسوس ہونے لگی۔ مَیں ایک دم کُرسی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا مگر چلنے کے لیے اور جگہ نہ تھی۔ میں بلا ارادہ کمرے میں ٹہلنے لگا۔ سُجاتا کچھ دیر ادھ کھلی آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی اور پھر سنگھار میز کے پاس جا کر اُس نے گلاس میں شراب اُنڈیلنی شروع کر دی۔ مَیں بیزاری سے دیکھتا رہا۔ پھر غسل خانے کی طرف بڑھا۔ فی الحال نجات کی صرف یہی جگہ تھی میرے لیے۔ دروازے پر پہنچ کر میں پلٹا اور مَیں نے سُجاتا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "سنو۔ کیا تم مجھ پر ایک مہربانی کر سکتی ہو؟"

"مہربانی مت کہو۔ مَیں تمہاری داسی ہوں۔ حکم کرو۔"

"میرے کمرے سے چلی جاؤ۔"

اُس نے چونک کر مجھے دیکھا اور غصّے اور حیرت کے تاثرات اُس کے چہرے پر نمودار ہوئے۔

"مجھے اِن چیزوں میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ بڑی مہربانی ہو گی اگر تم یہاں سے چلی جاؤ۔ پلیز"

اُس کا جواب سُنے بغیر مَیں نے غسل خانے کے اندر جا کر دروازہ بند کر لیا۔ سامنے ٹب تھا۔ مجھے غسل کی ضرورت بھی تھی اور مَیں کچھ وقت بھی ضائع کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ کپڑے اُتار کر ٹب میں بیٹھ گیا۔ ٹب کا پائپ مَیں نے کھول لیا۔ پانی رفتہ رفتہ ٹب میں بھرنے لگا۔ مَیں نے نیم دراز ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ نیم گرم پانی نے میرے جسم اور دماغ پر آسودگی اور سکون کی چادر سی اُڑھا دی۔ نہ جانے کتنی دیر مَیں آنکھیں بند کئے غسل سے لُطف اندوز ہوتا رہا۔ ٹب لبالب بھر گیا اور پانی لبریز ہو کر اِس کے کناروں سے باہر گرنے لگا تو میں چونکا۔ دِن بھر کی گہری نیند نے مجھے وہ آرام اور سکون نہیں بخشا تھا جو اِس غسل سے مجھے حاصل ہوا۔ نہایت آہستگی اور کاہلی سے مَیں نے ٹب سے باہر نکل کر ایک بڑے تولئے سے اپنے جسم کو رگڑ رگڑ کر خشک کیا اور پھر اپنی میلی وردی زیب تن کر لی۔ اب میں ایک چُست و چالاک انسان تھا جس کا جسم اور ذہن دونوں تازہ دم ہو چکے تھے۔ غیر ارادی طور پر میری ہونٹوں سے سیٹی کی آواز نکلنے لگی۔ سارے رنج' سارے آلام' ساری تکلیفیں پل بھر میں غائب ہو چکی تھیں۔ فی الوقت مَیں ایک نارمل انسان تھا۔ اپنے گرد و پیش کے حالات سے بے پروا۔

غسل خانے کا دروازہ کھول کر مَیں کمرے میں داخل ہوا تو میری سیٹی کی آواز خود بخود بند ہو گئی۔ مَیں سمجھ رہا تھا کہ سُجاتا اب تک رُخصت ہو چکی ہو گی مگر میرا خیال غلط تھا۔ اِس کے برعکس سُجاتا جسے میں سنگھار میز کے سامنے کھڑی چھوڑ کر گیا تھا بستر پر دراز تھی۔ شراب کی بوتل نصف کے لگ بھگ خالی ہو چکی تھی اور گلاس فرش پر اِس کے قدموں کے پاس پڑا تھا۔ اُس کے بال بکھر کر شانوں اور جسم پر پھیل گئے تھے اور ساڑھی اِس نسبت سے سمٹ گئی تھی۔ وہ اپنی کاجل لگی نیم وا مدہوش آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی اور اِس کے بازو میری طرف پھیلے ہوئے تھے۔

مَیں دروازے میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ اُس نے زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا صرف میری طرف پھیلے ہوئے دونوں بازوؤں کو جھٹک کر مجھے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ مَیں آہستہ آہستہ اُس کی طرف بڑھا۔ بستر کے نزدیک پہنچ کر مَیں نے اُس کے بستر پر بکھرے ہوئے وجود کو دیکھا اور پھر اُس کے بازوؤں پر نگاہ کی اور پھر میری دبی ہوئی خواہش ایک دم بیدار ہو گئی۔ ایک تیز اور گرم لہر میرے جسم سے اُٹھی اور میرے دماغ تک دوڑ گئی۔ مَیں نے اُس کے دونوں بازوؤں کو تھام کر جھٹکا دیا اور وہ ایک سسکی کے ساتھ کھنچی چلی آئی۔ میرا غصّہ اور میری نفرت انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ مَیں نے اُس کے چہرے پر

ایک زور دار طمانچہ رسید کیا اور اتنی زور سے اُسے جھنجھوڑا کہ وہ سَر سے پیر تک لرز گئی۔ پھر میں اُسے گھسیٹ کر دروازے کی طرف لے گیا۔ دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو وہ باہر سے بند تھا۔ میں نے ایک ہاتھ سے حیران اور مدہوش سُجاتا کو تھاما اور دوسرے ہاتھ سے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ "دروازہ کھولو۔ کھولو دروازہ۔ کھولو۔" میری چیخیں سُن کر اردلی لپک کر آیا۔ دروازہ کھلتے ہی میں نے نفرت سے سُجاتا کو ایک جھٹکا دیا اور وہ اردلی کی بانہوں میں جا گری۔ وہ اِس اچانک حادثے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اگر قوی ہیکل فوجی نہ ہوتا تو اُس کے بوجھ سے گر جاتا۔ سُجاتا نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ غصّے اور نفرت کی شدّت سے اُس کا خوبصورت چہرہ مسخ ہو گیا تھا۔ اُس نے دانت پیس کر مجھے للکارا۔ "راکشش۔ وردھی۔ میں تجھے جان سے مار دوں گی!" وہ دیوانہ وار میری طرف لپکی۔ اُس کے پنجے کسی چڑیل کی طرح میرے چہرے کی طرف بڑھے۔ مگر میں نے اُس کی دونوں کلائیاں مضبوطی سے تھام کر اُسے ایک بار پھر جھنجھوڑ دیا۔ "چلی جاؤ یہاں سے۔ دفع ہو جاؤ۔ میں تم جیسی ذلیل عورتوں کی شکل بھی دیکھنا گوارا نہیں کرتا۔"

اُس نے کلائیاں چھڑانے کے لیے بہت زور لگایا۔ اِس وقت اُس کے نازک جسم میں ایک وحشیانہ قوّت پیدا ہو چکی تھی مگر میں نے اُس کی کلائیاں نہیں چھوڑیں۔ اُس نے دانتوں سے کاٹنے کے لیے اپنا چہرہ آگے بڑھایا مگر میں نے جھٹکے سے اُس کا جسم پیچھے کی طرف موڑ دیا۔ جب کوئی اور بس نہ چلا تو اُس نے میرے منہ پر تھوک دیا۔ میں نے اُسے دھکّا دیا اور وہ دوبارہ لڑکھڑاتی ہوئی اردلی پر جا گری۔ اِس سے پہلے کہ وہ دوبارہ مجھ پر جھپٹتی میں نے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔ اُس نے دروازے کو پیٹنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی وہ چلّا رہی تھی۔ "اوپن دی ڈور۔ یُو آر ایڈیٹ۔ آئی ہیٹ یُو۔ آئی ہیٹ یو۔ آئی ول کِل یُو۔"

شاید اردلی اُسے تسلّی دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ "مِس صاب۔ مِس صاب۔ بس کرو مِس صاب۔" اِس کے بعد آوازیں مدھم ہوتی چلی گئیں۔ ظاہر ہے کہ اردلی اُسے زبردستی گھسیٹ کر اپنے ساتھ لے گیا ہوگا۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ اِس ڈرامے کا اگلا سین کیا ہوگا؟ بہرحال جو بھی ہو میں اِس کے لیے پوری طرح تیار تھا۔

کچھ دیر بعد کسی نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر وہ میں نے اندر سے بند کر رکھا تھا۔ "کون ہے؟" میں نے بلند آواز میں دریافت کیا۔

"دروازہ کھولو صاب۔" یہ اردلی کی آواز تھی۔ میں نے اُٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ میرے سامنے بندوق بردار اردلی کھڑا ہوا تھا مگر وہ تنہا نہیں تھا۔ اُس کے پیچھے چار اور مسلّح فوجی میری طرف اِس طرح بندوقیں تانے کھڑے تھے جیسے مجھے فائرنگ سکوئڈ سے اُڑا دینے کا حکم ہوا ہے اور وہ اِس حکم کی تعمیل کے لیے آئے ہیں۔

"چلو۔" اردلی کے لہجے کی دُرشتی اور آواز کی کرختگی میں واضح طور پر محسوس کر سکتا تھا۔ اُس نے بندوق سے اِشارہ کیا اور میں خاموشی سے اِن لوگوں کے ساتھ چل پڑا۔ ہم اُن ہی راستوں سے گزرے جہاں سے ہو کر گیسٹ روم میں آئے تھے۔ حویلی کی دو منزلہ عمارت میں اِس وقت زندگی کے آثار نمایاں طور پر محسوس ہو رہے تھے۔ میں موسیقی کی اور ہنسنے بولنے کی آوازیں سُن سکتا تھا۔ پوری عمارت روشن تھی۔ ہمارا مختصر قافلہ ڈاکٹر کرشنا کے دفتر میں جا کر رُک گیا۔

کیپٹن کرشنا کمرے میں ٹہل رہی تھی۔ مگر اُس کے بُشرے سے بے چینی اور غصّہ نمایاں تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ تیزی سے میری طرف لپکی۔ "کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ آر یو میڈ؟" وہ بلند آواز میں چلّائی۔ میں خاموش رہا۔ وہ کچھ دیر مجھے خونخوار نظروں سے گھورتی رہی۔ مگر پھر رفتہ رفتہ اُس نے اپنے جذبات پر قابو پا لیا۔ "تم لوگ جاؤ۔" اُس نے محافظوں سے کہا۔ اردلی اپنی جگہ کھڑا رہا۔ "تم بھی جاؤ۔" اردلی نے سلیوٹ مارا اور رُخصت ہو گیا۔

وہ میری طرف بڑھی اور نرم آواز میں کہنے لگی۔ "کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ سُجاتا کے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہوئے تمہیں لاج نہیں آئی؟ میں تو تمہیں جنٹلمین سمجھتی تھی۔"

میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "لاج تو سُجاتا کو آنی چاہیے تھی کیپٹن۔ میں شریف آدمی ہوں۔ آوارہ عورتوں کی کمینی برداشت نہیں کر سکتا۔ آپ جانتی ہیں اُس نے کیا حرکتیں کیں میرے کمرے میں؟"

"اوہ۔ آئی ایم سوری۔" وہ مُسکرائی۔ "وہ ذرا آزاد خیال عورت ہے۔"

"مگر میں اتنا آزاد خیال نہیں ہوں۔ شراب پیتی ہوئی عورت کو دیکھ کر میرا لہو کھول اُٹھتا ہے۔ اور وہ..... وہ تو..... وہ تو....." میں کوئی مناسب لفظ تلاش کرنے لگا۔

وہ ہنس پڑی۔ "ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ میں سمجھ گئی۔" پھر وہ اپنی کرسی پر جا کر بیٹھ گئی۔ "دیکھو۔ تم جانتے ہو کہ آجکل ایک وار ہو رہی ہے میرے اور تمہارے دیش کے بیچ اور تم ہمارے علاقے میں پکڑے گئے ہو۔"

"یہ کون نہیں جانتا۔" میں نے جواب دیا۔

"تو پھر تم یہ بھی جانتے ہو گے کہ وار میں پکڑے جانے والے فوجیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے۔ میجر بہت غصّے میں ہے وہ تم سے پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہے مگر تم نے ابھی تک اپنا نام تک نہیں بتایا۔"

میں نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔

یکایک فوجی بوٹوں کے تیز تیز چلنے اور بلند آواز میں کسی کے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ چند لمحے بعد میجر رام بھروسے دروازے میں نمودار ہوا۔ چند فوجی اُس کے ساتھ تھے۔ وہ سب باہر ٹھہر گئے۔ میجر کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا اور مجھے گھورنے لگا۔ پھر وہ کیپٹن کرشنا کی طرف متوجہ ہوا جو کرسی سے اُٹھ کر اٹینشن کھڑی ہو گئی تھی۔

وہ غصّے میں بول رہا تھا۔ "یہ سب بکواس ہے۔ نان سنس۔ کیا رزلٹ نکلا ہے؟! زیرو فوجیوں پر سائیکالوجی آزمانے چلی ہو۔ مائی فُٹ۔ فوجی کی صرف ایک سائیکالوجی ہوتی ہے۔ بندوق۔"

پھر وہ میری طرف آیا اور گہری نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ "کون ہو تم؟ کیا نام ہے تمہارا؟ رینک کیا ہے؟"

میں خاموش رہا۔

"کس لیے آئے تھے یہاں۔ مِشن کیا ہے تمہارا؟ اُن تین آدمیوں کے علاوہ اور کون کون تمہارے ساتھ تھا؟"

میں خاموش رہا۔ اچانک بجلی سی کوندی اور اُس کا زبردست تھپڑ میرے منہ پر لگا۔ طمانچے کی ضرب سے میرا منہ پھر گیا اور چہرہ سنسنانے لگا۔

"بولو۔ جواب دو۔ کیا نام ہے تمہارا؟" وہ گرج کر بولا۔ مگر میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس کا ہاتھ دوبارہ بلند ہوا اور میرے چہرے پر فولادی گھونسے کی طرح لگا مگر اِس بار میں تیار تھا۔ اِس لیے چوٹ اتنی زیادہ محسوس نہیں ہوئی میرے خاموش رہنے پر وہ غصّے سے دیوانہ ہو گیا۔ اُس نے مجھ پر تھپڑوں اور گھونسوں کی بارش کر دی یہاں تک کہ اُس کی سانس پھول گئی اور وہ تھک گیا۔ "کون ہو تم؟ کیا نام ہے تمہارا؟" اُس نے میرا گلا پکڑ لیا۔ مگر میں نے بھی اپنے آپ سے نہ بولنے کا عہد کر لیا تھا۔ اُس کے ہاتھوں کی آہنی گرفت میرے گلے پر تنگ ہوتی گئی یہاں تک کہ میرے لیے سانس لینا دوبھر ہو گیا۔ لگتا تھا شاید دیوانگی کے جوش میں وہ میرا گلا گھونٹ کر مجھے مار ڈالے گا مگر جب میرے حلق سے خرخراہٹ کی آواز نکلنے لگی تو اُس نے ایک جھٹکے سے میرا گلا چھوڑ دیا۔ میں بے جان سا ہو کر فرش پر گر گیا مگر میجر کا غصّہ کم نہیں ہوا تھا۔ دیا پھر ہی لمحے وہ میرے سَر پر کھڑا تھا۔ "بولو۔ جواب دو۔ کون ہو تم؟ کیا نام ہے؟" اُس نے میری پُشت، پیٹ اور ٹانگوں کی اَہٹ ٹھوکریں مارنی شروع کر دیں مگر میں نے ضبط اور برداشت سے کام لیا۔ کچھ دیر میں مضبوطی سے ہونٹ بھینچے رہا مگر ہوش و حواس میرا ساتھ چھوڑنے لگے تھے۔ چند لمحے بعد میں بے ہوش ہو گیا۔

مجھے ہوش آیا تو میں بدستور فرش پر پڑا ہوا تھا۔ میں نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔ میرا سارا جسم پھوڑے کی طرح دُکھ رہا تھا۔ ہاتھ پیر کو حرکت دینے سے ٹیس سی اُٹھتی تھی۔ میں نے اُٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی اور بے اختیار میرے

کراہ نکل گئی۔ یہ کوئی اور کمرہ تھا۔ اس پُرانے کمرے میں کوئی فرنیچر نہ تھا۔ یہاں تک کہ فرش پر دری تک نہیں تھی۔ میں نہ جانے کتنی دیر بے ہوش رہا تھا مگر اتنا احساس ضرور ہوا کہ ابھی رات باقی تھی۔ میں نے اپنے ہاتھ پیروں کو پھیلانے کی کوشش کی اور بمشکل اپنی چیخوں کو ضبط کیا۔ کچھ دیر میں چھت سے لٹکے ہوئے گندے اور گرد آلود بلب کو دیکھتا رہا جسے مہینوں سے شاید کسی نے صاف کرنے کی تکلیف گوارا نہیں کی تھی۔ فرش پر بھی مٹی کی تہہ جمی ہوئی تھی جس نے میرے لباس کو اپنے رنگ میں رنگ لیا تھا۔ کچھ دیر تک میں بلب کو دیکھنے کی کوشش کرتا رہا مگر پھر میری آنکھیں دوبارہ بند ہوگئیں اور دماغ پر اندھیرا سا چھا گیا۔

دوبارہ ہوش آیا تو دن کی روشنی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ بلب بدستور روشن تھا مگر دن کی روشنی میں مدھم دیئے کی طرح لگ رہا تھا۔ میں نے اُٹھنے کی کوشش کی تو اس بار میرے جسم نے بھی دماغ کا ساتھ دیا۔ میں آہستہ سے اُٹھ کر بیٹھا اور پھر کھڑا ہوگیا۔ کمرے میں ایک دروازے اور ایک روشن دان کے سوا اندر آنے یا باہر جانے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ چھت پر مکڑی کے جالے لگے ہوئے تھے۔ نہ جانے کب سے اِس کمرے کی صفائی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے رات سے کھانا بھی نہیں کھایا تھا

اور اب مجھے سخت بھوک لگ رہی تھی۔ دروازے پر آہٹ سُنائی دی اور پھر دروازہ کھل گیا۔ میرے سامنے وہی صوبیدار کھڑا تھا جو گرفتاری کے بعد پہلی بار مجھے حویلی میں لایا تھا۔

"اچھا۔ تو تم ابھی زندہ ہو؟" اُس نے اپنی نوکدار مونچھوں کو مروڑا اور ہاتھ سے اشارہ کیا۔ تین آور فوجی اندر داخل ہوئے اُنہوں نے مجھے بازوؤں سے تھام لیا اور کھینچتے ہوئے کمرے سے باہر لے چلے تھکن اور چوٹوں کی تکلیف کی وجہ سے میرا بُرا حال تھا۔ قدم اُٹھانا بھی میرے لیے مُحال تھا مگر میں گھسٹتا ہوا اُن کے ساتھ چل رہا تھا۔ یہ لوگ مجھے گھسیٹتے ہوئے حویلی کے باہر لے گئے جہاں قریباً درجن بھر فوجی اسلحے سے لیس کھڑے تھے۔ میں نے دِل ہی دِل میں کلمۂ شہادت پڑھا۔ شاید مجھے فائرنگ سکواڈ کے سامنے لے جایا جا رہا تھا۔ میری زندگی کا آخری لمحہ نزدیک آچکا تھا۔ میں جان دینے کے لیے بالکل تیار تھا مگر فوجیوں کی تنی ہوئی بندوقوں کے سامنے سے گزر کر وہ لوگ مجھے ایک جیپ کے سامنے لے گئے اور اُٹھا کر مجھے جیپ میں پھینک دیا۔ میرے جسم کا جوڑ جوڑ جو پہلے ہی دُکھ رہا تھا ایک بار پھر تکلیف دینے لگا مگر میں اُن کے سامنے اپنی زبان سے تکلیف کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جیپ میں دو فوجی برین گنوں سے مسلح کھڑے تھے اور میں اُن کے قدموں میں لیٹا ہوا تھا۔ جیپ سٹارٹ ہوئی تو مجھے احساس ہوا کہ مجھے کسی اور جگہ منتقل کیا جا رہا ہے۔

گرد آلود کچے راستوں سے گزرتی ہوئی جیپ چند میل کے فاصلے پر ایک کھنڈر نما عمارت کے آگے رُکی اور دونوں فوجیوں نے بازو پکڑ کر مجھے بے دردی سے اِس طرح گھسیٹا تھا کہ میرے جسم کا ہر حصہ جیپ سے رگڑ کھاتا ہوا زمین پر جا گرا۔ "اُٹھ کر کھڑے ہو جاؤ۔" ایک آواز نے للکار کر کہا اور دوسرے ہی لمحے کسی نے مجھے ٹھوکر ماری۔ میں جانتا تھا کہ جب تک اُٹھ کر کھڑا نہیں ہو جاؤں گا ٹھوکریں کھاتا رہوں گا۔ اِس لیے ہونٹوں کو دانتوں تلے داب کر میں نے اپنی چیخوں کو ضبط کیا اور کھڑا ہوگیا۔ کھنڈر نما عمارت کے ایک انتہائی بوسیدہ کمرے میں ایک ٹوٹی پھوٹی میز اور دو لکڑی کے تختے جڑی ہوئی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ فوجیوں نے مجھے دھکا دے کر ایک کُرسی پر بٹھا دیا اور کمرے سے رُخصت ہوگئے۔ تیز تیز قدموں کی آواز سُنائی دی۔ میرے اندر سر اُٹھا کر رکھنے کی ہمت باقی نہیں رہی تھی مگر پھر بھی میں نے گردن موڑ کر دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ دروازے میں سُجاتا ایک فریم میں لگی ہوئی قد آدم تصویر کی طرح کھڑی ہوئی تھی۔ مگر اِس وقت وہ ایک بدلی ہوئی تھی۔ گیروے رنگ کی جگہ کو پھولدار ساڑھی کی جگہ اِس کے جسم پر فوجی وردی تھی اور اُس کی زُلفیں سمٹ کر فوجی ٹوپی کے اندر غائب ہوچکی تھیں۔ بیلٹ میں ایک پستول لٹکا ہوا تھا اور ہاتھ میں ایک چھڑی تھی۔ اُس کے عقب میں دو مسلح فوجی اپنی بندوقوں کا رُخ میری طرف کیے ہوئے کھڑے تھے۔

میں نے اپنی آنکھیں بند کیں اور دوبارہ کھولیں۔ میرا خیال تھا کہ شاید سُجاتا میری نظروں سے غائب ہو جائے گی مگر

وہ بدستور موجود تھی۔ اِس کا مطلب یہ تھا کہ میں خواب نہیں دیکھ رہا تھا بلکہ سُجاتا بنفسِ نفیس مجسّم نفرت اور انتقام بنی ہوئی میرے سامنے کھڑی تھی۔ وہ آہستگی سے ہاتھ میں تھامی ہوئی چھڑی کو اپنی ٹانگوں پر مارتی ہوئی آگے بڑھی۔ اُس کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں اور اِن میں چھپی ہوئی حریفانہ نفرت بھری چمک میں صرف محسوس کرسکتا تھا۔ اِن آنکھوں میں وہی کیفیت تھی جو شکار کرنے سے پہلے کسی درندے کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔

میرے پاس آکر اُس نے چھڑی کی نوک میرے سینے پر رکھ دی۔ "لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانا کرتے مہاشے" وہ ہنسی مگر اِس ہنسی میں ایک نفرت بھری وارننگ شامل تھی۔ "مجھے اِس رُوپ میں دیکھ کر حیران ہو رہے ہو؟" اُس نے غصّے سے بھنچی ہوئی آواز میں سوال کیا۔ میں اُسے خاموش دیکھتے رہنے کے سوا کچھ نہیں بولا۔

"مگر میرا یہ رُوپ بہت بھیانک ہے۔ اِس پہلے کہ میں کُتّوں سے تمہاری بوٹیاں کھلاؤں سیدھی طرح میرے سوالوں کا جواب دے دو۔" اُس نے اپنی چھڑی سے دھکا دیا اور میرا سر کُرسی کی پُشت سے جا ٹکرایا۔ "کون ہو تم؟ کیا نام ہے تمہارا؟"

اُس نے زہر بھری آواز میں پُوچھا۔ مگر میں بالکل خاموش رہا۔ اُس نے اپنی وردی کی قمیص کی اُوپر والی جیب کا بٹن کھولا اور ایک پتلی سی چمک دار چیز نکالی۔ چھڑی اُس نے فرش پر پھینک دی اور میں اُس کے ہاتھ میں چمکتا ہوا تیز باریک اور دھار دار چاقو صاف دیکھ سکتا تھا۔ وہ میرے نزدیک آگئی اور جب مجھ سے مخاطب ہوئی تو اُس کی آواز بہت نرم اور مدھم تھی مگر میرے جسم کا رواں رواں خوف سے کانپ اُٹھا۔ "کیا نام ہے تمہارا؟ تمہارا مشن کیا ہے؟"

میری خاموشی پر اُس کے ہاتھ میں حرکت ہوئی اور چاقو کی باریک نوک میری ران میں پیوست ہوگئی۔ میں بے اختیار تڑپ کر چیخ اُٹھا۔ مگر اُس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ چاقو کی نوک بدستور میری ران میں پیوست تھی اور میرا تمام جسم تکلیف اور خوف کی وجہ سے پسینے میں شرابور ہوچکا تھا۔ "مُورکھ مت بنو۔ دو دن بعد تمہارے جسم پر گوشت کی ایک بوٹی بھی باقی نہیں رہے گی۔ تم مرنے کی آس کرو گے۔ منّت کرو گے مگر میں تمہیں مرنے بھی نہیں دوں گی۔ جب تک تم ایک ایک بات نہیں بتلا دو گے میں تمہیں زندہ رکھوں گی۔ بولو۔ جواب دو۔ کیا نام ہے تمہارا؟ مشن کیا ہے تمہارا؟"

میں نے زور سے دانت بھینچ لیے اور آنکھیں بند کرلیں۔ اُس نے دباؤ ڈالا اور چاقو کی نوک میری ران کی ہڈی تک پہنچ گئی۔ گرم گرم خون اُبلنے لگا۔ میرا تمام جسم کانپنے لگا۔ قوتِ برداشت جواب دے گئی اور پھر مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں بدستور کُرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ مگر میرا جسم رسّیوں کے ساتھ کُرسی سے بندھا ہوا تھا۔ میری ران سے خون بہہ بہہ کر خود بخود بند ہوچکا تھا اور خشک ہوکر جم گیا تھا۔ میں نے اپنی زخمی ٹانگ کو حرکت دینے کی کوشش کی مگر جسم میں ایسی ٹیس اُٹھی کہ میں نے ارادہ ملتوی کر دیا۔ کمرے میں کوئی دوسرا شخص موجود نہ تھا اور دروازہ بند تھا۔ ظاہر ہے کہ باہر سے اِس پر تالا لگا ہوا ہوگا اور مسلّح فوجی پہرہ دے رہے ہوں گے۔ میں سوچنے لگا کہ یہ تشدّد اور ظلم و ستم آخر کب تک برداشت کرسکوں گا۔ مجھے جس عورت کے سپرد کیا گیا تھا وہ مجسّم ظلم تھی۔ اُس سے رحم یا کسی رعایت کی اُمید وابستہ کرنا حماقت کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ خدا نے ابھی تک مجھے اتنی ہمت اور طاقتِ برداشت دی تھی کہ میں نے اپنی زبان نہیں کھولی۔ مگر میری برداشت اور صبر و ضبط کا پیمانہ اب لبریز ہوچکا تھا۔

دروازے پر آہٹ سُنائی دی اور پھر تالا کھولنے کی آواز آئی۔ میں نے گردن موڑ کر دیکھنے کی ضرورت بھی محسوس نہ کی۔ جی کڑا کرکے خدا کو یاد کرنے لگا۔ آزمائش کی گھڑی ایک بار پھر میرے سر پر کھڑی تھی۔ خُدایا مجھے ہمت دے یا پھر آبرو مندانہ موت ہی دیدے۔ میں نے دِل ہی دِل میں دُعا کی۔ قدموں کی آہٹ میرے نزدیک آگئی مگر یہ فوجی بُوٹوں کی آہٹ نہ تھی۔ میرے کان اپنی طرف آتے ہوئے قدموں کی آہٹ سُنتے رہے۔ یہاں تک کہ دو پیر میرے سامنے آگئے۔ اِن پیروں میں فوجی بوٹوں کے بجائے چمڑے کے دیہاتی نوکدار جوتے تھے۔ پھر میری نظریں اور بُلند ہوئیں تو مجھے دو پنڈلیاں اور پھر لہنگا نظر آیا۔ میں نے حیران ہوکر آنے والے کو دیکھا اور مارے حیرت کے میرے مُنہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

میری نگاہوں کے سامنے شیلا کھڑی تھی: "شیلا۔ تم؟!"
اُس نے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور پھر اُونچی آواز میں بولی" لو۔ تمہارے لیے بھوجن لائی ہوں" میں نے اب تک اُس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھالی کو نہیں دیکھا تھا۔

"مگر میں کھاؤں گا کیسے؟" میں نے اپنے بندھے ہوئے ہاتھوں کی طرف اشارہ کیا۔
اُس نے پھر اُونچی آواز میں کہا "میں تمہارے ہاتھ کھول دیتی ہوں مگر کوئی شرارت مت کرنا۔ باہر سخت پہرہ ہے۔ بھاگ نہیں سکو گے۔"
اتنا کہکر اُس نے میری کلائیوں میں بندھی ہوئی رسّی کو کھول دیا اور کھانے کا تھال میری گود میں رکھ دیا۔ تکلیف کی ایک لہر میرے سارے جسم میں دوڑ گئی اور میرے منہ سے آہ نکل گئی۔ اس نے رحم بھری نگاہوں سے میری زخمی خون آلود ران کو دیکھا اور اُس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اُس کا سارا جسم کانپنے لگا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ بلند آواز میں پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دے گی۔ اُس نے مضبوطی سے اپنا منہ دونوں ہاتھوں سے دبا لیا اور سسکیاں لینے لگی۔ میں نے پریشانی سے کھلے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا مگر وہاں کوئی نہ تھا۔

"شیلا۔ حوصلہ کرو۔ رونا مت۔"

چند لمحے اُس پر وہی کیفیت طاری رہی مگر پھر رفتہ رفتہ اُس کے جسم کی لرزش میں کمی ہونے لگی لیکن آنسو بدستور اُس کی آنکھوں سے رواں تھے۔ بمشکل اپنی سسکیوں کو روک کر اُس نے اپنی چُنری کے آنچل سے آنسو پونچھے اور پھر کہنے لگی: "بھوجن کر لو۔ میں تھوڑی دیر میں برتن لے جاؤں گی۔" اتنا کہا اور تیزی سے پلٹ کر دوڑتی ہوئی باہر چلی گئی۔ کمرے کا دروازہ پھر بند ہو گیا۔ میں حیران بیٹھا سوچ رہا تھا۔ یہ میرا وہم تھا یا حقیقت؟ شیلا اور یہاں؟ ایک فوجی بیرک میں؟ وہ بھلا کس طرح اِس انتہائی اہم علاقے میں آگئی؟

بھوک کے مارے میرا بُرا حال تھا۔ کلائیوں کو کچھ دیر گھمایا تو خون کی روانی دوبارہ پیدا ہوئی اور میں اپنی اُنگلیاں کھولنے اور بند کرنے کے قابل ہو گیا۔ تھال پر پڑا ہوا کپڑا ہٹا کر میں نے دیکھا۔ چنے کی دو موٹی موٹی روٹیاں اور چنے ہی کا ساگ تھا۔ میں کسی فاقہ زدہ انسان کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ ایک روٹی ختم ہو گئی تو میں نے دوسری روٹی اُٹھائی، مگر یہ پہلی روٹی سے زیادہ موٹی اور بھاری تھی۔ نوالہ توڑا تو مجھے اُس کے وزنی پن کا راز معلوم ہو گیا۔ چنے کی موٹی روٹی کے اندر شیلا ایک تیز دھار دار چھری رکھ کر لائی تھی۔ میں نے گھبرا کر بند دروازے کی طرف دیکھا اور پھر نہایت پھرتی سے چھری نکال لی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے کہاں چھپاؤں؟ میں جس کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اُس کے سوا کوئی جگہ اِس کو چھپانے کی نہیں تھی۔ میں نے چھری کو اپنے نیچے کرسی کی سیٹ پر رکھ لیا اور روٹی توڑ توڑ کر کھانے لگا۔ خوشی اور گھبراہٹ کے مارے میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ چھری کتنا معمولی اور حقیر ہتھیار ہے۔ خصوصاً جنگ کے دنوں میں۔ بھاری بھرکم آٹومیٹک ہتھیاروں کے مقابلے میں اِس کی کیا حیثیت؟ لیکن اِس وقت یہ چھری بھی میرے لیے بریَن گن سے کم اہم نہ تھی۔ جذبات کی شدت سے چنے کی خشک روٹی میرے حلق سے نیچے نہیں اُتر رہی تھی مگر میں نے جیسے تیسے اسے ختم کر دیا اور شیلا کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد دروازہ دوبارہ کھلا اور شیلا چاروں طرف دیکھتی ہوئی تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ میرے سامنے دَھری ہوئی خالی پلیٹوں کو دیکھ کر اس کے چہرے پر اطمینان کے آثار پیدا ہو گئے۔ وہ بلند آواز میں مجھ سے مخاطب ہوئی "بھوجن ختم کر لیا؟ لو۔ پانی پی لو۔"
ہاتھ میں تھامی ہوئی پانی کی گڑوی اُس نے میری طرف بڑھائی جو میں غٹ غٹ کر کے چڑھا گیا۔ پھر اُس نے اُونچی آواز میں مجھے مخاطب کیا "ہاتھ اُوپر کرو۔ میں انہیں باندھے بغیر نہیں جاؤں گی۔"
میں نے دونوں ہاتھ اُوپر اُٹھا دیئے۔ اُس نے اپنے ہاتھوں میں میرے ہاتھوں کو تھام کر بے اختیار اپنی آنکھوں سے لگا لیا اور ایک بار پھر آنسو اُس کی آنکھوں سے بہہ نکلے۔ میں گزشتہ دنوں کے مظالم سہہ کر بھی جی کڑا کر کے بیٹھا ہوا تھا مگر شیلا کے محبت بھرے آنسوؤں کو دیکھ کر میرا بھی دل بھر آیا۔ واقعی محبت اور خلوص بھی کتنی بڑی طاقت ہے۔ پتھر سے پتھر دل انسان کو بھی پگھلا کر موم بنا دیتی ہے۔ کوئی تکلیف، کوئی پریشانی، کوئی آزمائش میری آنکھوں میں آنسو نہیں لا سکی تھی مگر شیلا کے آنسوؤں نے ضبط کے سارے بند توڑ کر رکھ دیئے۔ میں نے پیار سے اُس کے ہاتھوں کو دبایا اور دبی زبان میں کہا "شیلا۔ اپنے آپ پر قابو رکھو۔ ایسا نہ ہو کسی کو شبہ ہو جائے۔" مگر وہ اِسی طرح آنسو بہاتی رہی۔ رفتہ رفتہ اُس کے دل کو قرار آیا تو اُس نے میرے ہاتھ چھوڑ دیئے اور پیار بھرے لہجے میں بولی: "ویر۔ گھبرانا مت۔ تیری بہن تجھ پر جان وار دے گی۔ میرے ہوتے ہوئے کوئی تجھے اُنگلی بھی نہیں لگا سکتا۔" میں اُس کے پاگل پن پر دل ہی دل میں ہنس پڑا۔ یہ کمزور اور بے بس عورت ایک پوری فوج کے غیض و غضب سے مجھے

بھلا کیونکر بچا سکتی ہے؟!
پھر اُس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر سرگوشی کی: "میں پھر آؤں گی۔ میرا انتظار کرنا۔" اتنا کہہ کر اُس نے اپنی آنکھوں کو خشک کیا۔ برتنوں کی تھالی اُٹھائی اور تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی باہر چلی گئی۔ مجھے اُس کی آواز سُنائی دی: "تالا بند کر دو۔ میں برتن لے کر جا رہی ہوں۔" دروازے میں تالا لگنے کی آواز سُنائی دی اور پھر وہی خاموشی۔

میں حیران بیٹھا سوچتا رہا۔ یہ کون سی جگہ ہے؟ سُجاتا کہاں چلی گئی اور اب کب واپس آکر اپنا ظلم و ستم آزمائے گی؟ شیلا کا اِس جگہ آنا کیسے ممکن ہوا؟ کیا وہ جانتی تھی کہ میں یہاں قید ہوں؟ اگر نہ جانتی تو روٹی کے اندر چھپا کر چھری کیوں لاتی؟ میری عقل کچھ کام نہیں کرتی تھی۔ شاید صدموں اور تکلیفوں نے میرا ذہن ماؤف کر دیا تھا مگر وہ میری مدد کیسے کر سکے گی؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھے بچانے کی کوشش میں وہ خود ہی مصیبت کا شکار ہو جائے۔ عورت کا ایک رُوپ سُجاتا تھی اور دوسرا شیلا۔ کتنا زمین آسمان کا فرق ہے دونوں میں؟ مگر کہنے کو دونوں عورتیں ہیں۔ کافی دیر میں اِن خیالات میں کھویا رہا۔ پھر مجھے شیلا کے الفاظ یاد آئے۔ اُس نے کہا تھا: "میں پھر آؤں گی میرا انتظار کرنا۔" کافی وقت گزر چکا تھا اور میں ابھی تک سوچوں میں ڈوبا ہوا بیٹھا تھا، حالانکہ میرے ہاتھ آزاد تھے اور جسم پر بندھی ہوئی رسّیاں کاٹنے کے لیے شیلا مجھے چھری بھی دے گئی تھی۔ ایک دَم میرے جسم میں توانائی اور حرکت پیدا ہو گئی۔ دو منٹ بعد میرے جسم کی رسّیاں کٹ چکی تھیں اور میں آزاد تھا۔ کرسی سے اُٹھ کر کھڑا ہوا تو جسم کی چوٹیں اور ران کا زخم پھر تکلیف دینے لگا مگر میرے اندر ایک نیا جذبہ، عزم اور ولولہ پیدا ہو چکا تھا۔ یہ تکلیفیں اور زخم میرا راستہ نہیں روک سکتے تھے۔ یہ میرے لیے آزاد ہونے کا غالباً پہلا اور آخری موقعہ تھا۔ ورنہ...... ورنہ کیا ہو گا؟! یہ خیال آتے ہی میرا تمام جسم کانپ اُٹھا۔ نہیں۔ میں بُزدلوں کی موت نہیں مروں گا۔ مزید تشدد اور ظلم و ستم نہیں سہوں گا۔ میری مُنہ بولی بہن شیلا نے مجھے دوبارہ زندہ رہنے یا آبرومندی سے مر جانے کا بہترین موقعہ فراہم کیا تھا۔ میں اسے مایوس نہیں کروں گا۔ ارادے کی قوت نے میرے جسم میں بجلیاں بھر دیں۔ میں نے کمرے میں کھڑے ہو کر ہاتھ پیروں کو حرکت دی اور تھوڑی تھوڑی ورزش شروع کر دی۔ پہلے تو درد اور تکلیف نے بہت ستایا مگر آہستہ آہستہ درد میں کمی ہونے لگی۔ رفتہ رفتہ اپنے ہاتھ پیروں کو میں اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق حرکت دینے کے قابل ہو گیا۔ میں نے دبے قدموں سارے کمرے کا چکر لگایا۔ جُوڈو کراٹے کی چند مشقیں کیں اور جسم میں چستی اور توانائی پیدا کرنے کے لیے کچھ اور بھی مشقیں آزمائیں۔ میرے ران کے زخم سے تھوڑا تھوڑا خون رِسنے لگا تھا مگر خوش قسمتی یہ تھی کہ یہ بہت باریک زخم تھا اور جو خون اِس پر جم چکا تھا اِس کی وجہ سے زیادہ خون ضائع ہونے کا اندیشہ نہیں تھا۔ پھر بھی میں نے اپنی قمیص کا دامن پھاڑ کر مضبوطی سے اپنی ران پر پٹی کے طور پر باندھ لیا۔ چند منٹ بعد میں اپنے آپ کو پوری طرح چاق و چوبند محسوس کر رہا تھا۔ ایک ایک لمحہ میرے لیے ایک صدی کی حیثیت رکھتا تھا۔ وقت تھا کہ گزرنے ہی میں نہیں آتا تھا۔ دل کی دھڑکن تیز ہوتی جارہی تھی۔ جُوں جُوں وقت گزر رہا تھا آنے والے لمحات کا تصور میرے لیے سوہانِ رُوح ہوتا جا رہا تھا۔ وقت کی بند مُٹھی میں میرے لیے کیا ہے؟ آزادی یا موت؟ ذلّت یا عزّت؟!
کافی وقت اِسی طرح کٹ گیا۔ یہاں تک کہ مجھے دروازے پر آہٹ محسوس ہوئی۔ کسی نے تالا کھولا اور میرا تمام جسم تن گیا۔ ہو سکتا ہے آنے والی ہستی سُجاتا ہو۔ یہ خیال آتے ہی میں نے چھری کو مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا اور دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ میرا دِل اتنی زور زور سے دھڑک رہا تھا کہ مجھے ڈر تھا کہ کہیں باہر سے آنے والا اِس کی آواز نہ سُن لے۔ خُدا خُدا کر کے دروازہ کھلا اور میں چھری کو ہاتھ میں تول کر کھڑا ہو گیا۔ دروازے میں داخل ہونے والی ہستی میری مُنہ بولی بہن شیلا تھی۔ مجھے دروازے کے پاس آزاد اور چاق و چوبند دیکھا تو اُس کا چہرہ خوشی سے گُلنار ہو گیا۔ مُنہ سے کوئی لفظ کہے بغیر اُس نے میرا ہاتھ تھام کر مجھے باہر نکال لیا اور کمرے کے دروازے میں دوبارہ تالا لگا دیا۔ باہر ہر طرف تاریکی اور سناٹا تھا۔ دروازے کے باہر ایک لالٹین لٹکی ہوئی تھی جس کی روشنی چند فُٹ سے زیادہ آگے نہیں جارہی تھی۔
"پہریدار کہاں ہے؟" میں نے رُک کر سرگوشی میں پُوچھا۔

"اُس کی فکر نہ کرو۔ وہ بے ہوش پڑا ہے۔ جلدی سے آؤ میرے ساتھ۔" وہ میرا ہاتھ پکڑ کر دوڑنے لگی۔ سامنے درختوں کا جُھنڈ تھا۔ ہم دونوں رُکے بغیر وہاں تک بھاگتے ہوئے چلے گئے۔
ذخیرے میں پہنچ کر شیلا رُک گئی۔ تیز دوڑنے کی وجہ سے اُس کی سانس پھُول گئی تھی۔ وہ ایک درخت سے ٹیک لگا کر سستانے لگی۔

ساتھ ہی وہ رُک رُک کر مجھے اپنی کہانی بھی سُناتی رہی۔ ہُوا یہ کہ جس کھنڈر میں مجھے لایا گیا تھا یہ جگہ گاؤں سے زیادہ دُور نہیں تھی۔ دو منزلہ حویلی جو فوجی ہیڈکوارٹر کے طور پر بھی استعمال کی جا رہی تھی آج رات روشنیوں اور رنگ ترنگ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کسی محاذ پر فتح کی خوشی منانے کے لیے آج بڑے بڑے افسر فوجی میس میں اکٹھے ہوئے تھے۔ اِن مہمانوں کی دلبستگی اور قیام کے لیے حویلی کے تمام کمروں کو قیدیوں سے خالی کرایا گیا تھا۔ چند نیم جان قیدی تو ہلاک کر دیئے گئے اور کچھ لوگوں کو آس پاس کے علاقے میں بھیج دیا گیا۔ دو قیدی بستی میں شیلا کی جھونپڑی میں رات گزارنے کے لیے لائے گئے تھے اور اُن کے دو محافظوں کی زبانی ہی شیلا کو تمام حالات معلوم ہوئے تھے۔ جب اُس نے سُنا کہ ایک فوجی نوجوان جنگل میں پکڑا گیا ہے اور آج وہ قریبی کھنڈر میں رات بھر کے لیے رکھا جائے گا تو اس کا دل بے چین ہو گیا۔ اِسے معاً خیال آیا کہ یہ قیدی میرے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اُس نے کھنڈر میں رہنے والے قیدی اور پہرہ دینے والوں کے لیے رات کا کھانا پکا کر لے جانے کی پیشکش کی جو قبول کر لی گئی۔ اُن سے باتوں باتوں میں اُس کو یقین ہو گیا کہ ہو نہ ہو کھنڈر میں رکھا جانے والا قیدی اُس کا مُنہ بولا بھائی ہی ہے چنانچہ وہ خاص طور پر چنے کی دو روٹیاں پکا کر لائی تاکہ اگر محافظ دیکھنا بھی چاہے تو اندر چھپی ہوئی چھری اُس کی نظروں سے محفوظ رہے۔

"مگر شیلا" مَیں نے کہا: "اگر قیدی میری جگہ اور ہوتا تو تم کیا کرتیں؟"

وہ مسکرائی: "مَیں ایک روٹی کم کر کے واپس لے جاتی اور کیا کرتی؟" واقعی بہت آسان حل تھا۔

"مگر میرا پہرے دار کہاں ہے؟"

"وہ کھنڈر کے پیچھے بیہوش پڑا ہے۔ جب مَیں کھانا لے کر آئی تھی تو اس کے لیے بہت تیز دیسی دارُو کی بوتل بھی لے کر آئی تھی۔ دوبارہ آئی تو وہ نشے میں مست پڑا تھا۔ میں گھسیٹ کر اسے کھنڈر کے پیچھے ڈال آئی۔ یہ رہی اُس کی بندوق اور گولیاں۔"

اُس نے برین گن اور ایمونیشن مجھے دکھایا تو خوشی سے میرے ہاتھ پاؤں پھُول گئے: "جیتی رہو شیلا۔ تمہارا جواب نہیں ہے۔" مَیں نے برین گن کو چُوم لیا۔ پھر مجھے کچھ خیال آیا۔

"تمہارا گھر والا کہاں ہے؟"

وہ ہنس پڑی: "جیت کی خوشی میں دونوں فوجی دارُو کی بوتلیں ساتھ لے کر آئے ہیں۔ حویلی میں بڑے افسر خوشی منا رہے ہیں اور جھونپڑی میں وہ دونوں میرے گھر والے کے ساتھ پی پی کر موج منا رہے ہیں۔"

"دونوں قیدی کیسے ہیں۔ زیادہ زخمی تو نہیں ہیں؟"

اُس نے بتایا کہ وہ چلنے پھرنے کے قابل ہیں۔ اگرچہ وہ بہت زیادہ گھائل ہیں۔

"اچھا شیلا۔ یہ بتاؤ۔ تمہارا گھر کدھر ہے؟"

شیلا نے اِشارے سے مجھے بتا دیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ وہ جگہ یہاں سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر بھی نہیں ہے۔ میرے ذہن نے فوری طور پر ایک سکیم مرتب کر لی تھی۔ مَیں نے شیلا سے کہا: "اب تم گھر جاؤ۔ مَیں اپنی راہ جاتا ہوں۔"

"پہلے بھی ایک مصیبت میں پھنس گئے تھے۔ اب پھر کسی کے قابو آ جاؤ گے۔"

مَیں نے اُسے بتایا کہ مَیں دُشمن کے علاقے میں ہوں۔ یہاں کا ذرّہ ذرّہ میرے خون کا پیاسا ہے۔ یہاں کوئی بھی دوست یا ہمدرد نہیں ہے میرا۔ شیلا نے بڑے دُکھ بھرے انداز میں مجھے دیکھا اور بولی: "ویر۔ کیا مَیں تجھے نظر نہیں آتی؟"

"اری پگلی۔ تو ایک کمزور عورت ہے۔ تو بھلا کیا کر سکتی ہے؟"

ایک لمحے کے لیے وہ خاموش رہی۔ پھر جیسے اِسے کچھ یاد آ گیا: "لاؤ۔ تمہارے گھاؤ پر مرہم لگا دوں۔" مرہم وہ اپنے آنچل میں باندھ کر لائی تھی۔ میری باندھی ہوئی پٹی کھول کر اُس نے میرے زخم پر مرہم لگایا۔ ساتھ ہی وہ روتی بھی جاتی تھی اور گھاؤ لگانے والے کو بد دُعائیں بھی دے رہی تھی۔

میرے پاس وقت کم تھا۔ مَیں نے اُسے تسلی دی اور کہا کہ وہ اپنے گھر جا کر میرا انتظار کرے۔ مَیں کچھ دیر میں واپس آؤں گا اور اُس سے مُلاقات کئے بغیر واپس نہیں جاؤں گا۔ اُس نے مجھ سے وعدے لیے۔ یہاں تک کہ اپنے سر کی سوگند بھی دی کہ مَیں اُس سے ملنے ضرور آؤں گا۔ پوری

طرح اطمینان کر لینے کے بعد وہ مجھ سے رُخصت ہوئی اور مَیں نے فوجی ہیڈکوارٹر کی راہ لی۔

رات تاریک تھی۔ آسمان پر چاند کا نام و نشان تک نہ تھا۔ تاروں کی چمک البتہ راہ بری کے لیے موجود تھی۔ شیلا نے مجھے تمام صورتِ حال بتا دی تھی اور اب میں نہایت اطمینان اور اعتماد کے ساتھ فوجی ہیڈکوارٹر کی طرف رواں دواں تھا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ فوجی ہیڈکوارٹر میں موجود فوجی افسر اور جوان شراب کے نشے میں مدہوش ہیں۔ بیشتر فوجی جوان بھی خوشی میں شریک ہونے کی غرض سے مدہوش ہوں گے۔ ایسے موقعوں پر فوجی ڈسپلن اور رکھ رکھاؤ بھی کمزور ہو جاتا ہے گویا مجھے کھل کھیلنے کی پُوری آزادی تھی۔ میرے ہاتھ میں فوجی پہریدار سے چھینی ہوئی برین گن تھی اور لباس کے اندر دھار دار خنجر بھی محفوظ تھا جو شیلا مجھے روٹی میں رکھ کر پہنچا گئی تھی۔ گویا ہر اعتبار سے صورتِ حال میرے حق میں سازگار تھی۔ کیونکہ زیادہ چوکی پہرے کا اندیشہ نہ تھا اس لیے مَیں بے خوفی سے جنگل میں اور کچی پگڈنڈیوں پر اپنا سفر طے کرتا رہا۔ راستہ میں مجھے کوئی رُکاوٹ نہیں ملی سوائے ایک آوارہ کتے کے جو مجھے دیکھ کر زور زور سے بھونکنے لگا۔ مَیں نے اُسے خاموش کرانے کی بہت کوشش کی مگر اُس کی آواز اور جوش و خروش میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو اُسے ہلاک کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا۔ مگر مَیں جانتا تھا کہ اس وقت اُس کی آواز پر کوئی توجہ نہیں دے گا۔ اسی لیے اُس کی جان بخشی کر دی۔ وہ حلق پھاڑ پھاڑ کر بھونکتا رہا اور مَیں اپنا سفر طے کرتا رہا۔ یہاں تک کہ تاریکی میں مجھے ہیڈکوارٹر کی روشنیاں جھلملاتی ہوئی نظر آنے لگیں۔ اگرچہ زیادہ محتاط ہونے کی ضرورت نہیں تھی مگر پھر بھی مَیں نے رُک کر اطراف کا جائزہ لیا اور آزمائش کے طور پر درختوں کے جھنڈوں میں کچھ پتھر پھینکے مگر کسی طرف سے کوئی آواز نہیں سُنائی دی۔ درختوں کے تنوں کی آڑ لیتا ہوا مَیں ہیڈکوارٹر کی عمارت کی طرف بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ عمارت کی روشنیاں بالکل صاف نظر آنے لگیں۔ عمارت کے اندر سے آنے والی موسیقی، شور و غل اور قہقہوں کی آوازیں بھی میں سُن سکتا تھا۔ میری پُوری توجہ عمارت کی طرف تھی اور مَیں اُس طرف نظریں جمائے پھُونک پھُونک کر قدم اُٹھا رہا تھا۔ یکایک ایک درخت کے پیچھے سے ایک سایہ اُبھرا اور ایک شخص میرے بالمقابل آ کر کھڑا ہو گیا۔ میرے قدم اچانک رُک گئے اور یوں لگا جیسے میرے جسم کا رُواں رُواں تن گیا ہو۔ اس سے پہلے کہ مَیں کچھ سوچ سکتا وہ شخص لڑکھڑاتا ہوا چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ مدھم روشنی میں مجھے صاف نظر آ گیا کہ وہ ایک فوجی سپاہی تھا۔ اُس کے ہاتھ میں برین گن تھی اور سر پر فولادی ہیلمٹ ٹکا ہوا تھا۔ اُس کی برین گن کا رُخ میری طرف تھا۔

"ہالٹ" وہ چلّایا اور مَیں اپنی جگہ جم کر رہ گیا۔ اتنی مُہلت نہ تھی کہ مَیں اُس پر گولی چلاتا۔ ہمارے درمیان فاصلہ بھی اتنا زیادہ تھا کہ مَیں اُس پر حملہ نہیں کر سکتا تھا۔ اُس قدآور فوجی کی شکل میں موت میرے سامنے کھڑی تھی۔ منزل کے عین سامنے پہنچ کر منزل مجھ سے دُور ہو گئی تھی۔ مَیں جھنجھلاہٹ میں اپنی حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی پر پچھتانے لگا۔

"کدھر سے آتا ہے؟ کون ہے؟ پہچان کراؤ۔" وہ کڑک کر بولا۔ مگر اُس کی آواز میں شامل نشے کی آمیزش میں صاف طور پر محسوس کر سکتا تھا۔ پھر مَیں نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ وہ اپنے پیروں پر مضبوطی سے کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ ابھی مَیں کوئی مناسب جواب سوچنے نہ پایا تھا کہ اُس کی گرجدار آواز پھر گونجی۔

"جواب دو۔ ورنہ ہم شوٹ کر دے گا۔" اور میرے جواب کا انتظار کئے بغیر ہی اُس نے چار پانچ ہوائی فائر کر دیئے۔ خُدا جانے اُس نے برین گن کی نالی کا رُخ جان بوجھ کر آسمان کی طرف کیا تھا یا نشے میں اُس سے یہ حرکت سرزد ہوئی تھی۔

ایک لمحے کے لیے مَیں ساکت رہ گیا۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ کچھ فاصلے پر واقع ہیڈکوارٹر کی طرف سے موسیقی اور شور و شر کی ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں۔ اِس فائرنگ کی آواز دوسرے فوجیوں کے کانوں تک ضرور پہنچی ہو گی۔ چند ہی منٹ بعد وہ مجھے چاروں طرف سے گھیر میں لے لیں گے۔ میرا مشن، میرا مقصد مجھے خاک میں ملتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ مَیں نے اپنی برین گن کو تول کر ہاتھ کو حرکت دینے کی کوشش کی مگر اُس نے پھر لگاتار تین چار ہوائی فائر کر دیئے: "ڈیم فول۔ یُو ڈیم فول" کہتا ہوا وہ میری طرف بڑھا مگر مجھ تک پہنچنے سے پہلے ہی ایک درخت سے ٹکرا کر گر گیا۔ مَیں نے برین گن سے اُس کی طرف نشانہ باندھا اور چشم زدن میں اُس کے سر پر پہنچ گیا۔ میری اُنگلی لبلبی پر تھی اور مَیں اُس کی ذرا سی جُنبش پر فائر کھولنے کے لیے تیار تھا مگر اُس نے کوئی حرکت نہیں کی۔ وہ خاموش اور بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ برین گن اُس کے ہاتھ سے چھُوٹ کر گر گئی تھی اور وہ دُنیا و مافیہا سے بے خبر تھا۔ ظاہر ہے کہ فتحیابی کا جشن منانے کی خوشی میں وہ ضرورت سے زیادہ شراب چڑھا گیا تھا اور اُس کا شراب میں مدہوش ہونا ہی میری زندگی بچانے کا سبب بن گیا تھا۔ اُس کی طرف سے مطمئن ہو کر مَیں نے پھُرتی سے ایک درخت کے موٹے سے

تنے کی آڑلی اور دوسرے فوجیوں کی آمد کے انتظار میں ایک ایک پَل گننے لگا۔ محافظ سے حاصل کی ہوئی برین گن میری حفاظت کا واحد ذریعہ تھی۔ مَیں یہ بھی جانتا تھا کہ برین گن میں پورے راؤنڈ موجود ہیں۔ لیکن دشمن کی پُوری فوج سے مَیں کہاں تک مقابلہ کرسکتا تھا ؟ پھر بھی مَیں نے دل میں ٹھان لی تھی کہ مرنے سے پہلے دس بارہ دشمنوں کو ساتھ لے کر مروں گا۔ چند لمحے مکمل خاموشی رہی۔ ہلکی ہلکی موسیقی اور شوروغل کی آوازوں کے سوا جنگل میں کوئی اور آواز نہ تھی یا پھر میرے دل کے دھڑکنے کی صدا تھی جو اِن سب آوازوں پر حاوی تھی ـــــ کافی دیر گزر گئی مگر مجھے کوئی آہٹ سُنائی نہیں دی۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے کے باوجود مجھے کوئی ذی نفس نظر نہیں آیا۔ اَب اِس جگہ میرا کھڑا رہنا بے کار تھا بلکہ نقصان دہ ثابت ہوسکتا تھا۔ مَیں نے جھک کر بے ہوش فوجی کا ہیلمٹ اُتارا اور اپنے سَر پر رکھ لیا۔ اَب مَیں سَرتاپا فوجی وردی میں ملبوس دشمن کا ایک سپاہی نظر آرہا تھا اور کسی کی نظر پڑنے پر میرا پہچان لیا جانا مُشکل تھا۔

مَیں درختوں کی آڑ لیتا ہوا بڑھتا رہا یہاں تک کہ ہیڈکوارٹر کی دومنزلہ عمارت کے بالکل نزدیک پہنچ گیا۔ یہاں درختوں کی قطاریں ختم ہو گئی تھیں اور کُھلا میدان سامنے تھا۔ آس پاس کوئی محافظ نہیں تھا۔ مَیں نے جرأت پاکر آگے قدم بڑھائے اور حویلی کے بڑے دروازے کی طرف بڑھا۔ مگر دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی مجھے رُک جانا پڑا۔ اندر سے کچھ قدموں کی آوازیں میری طرف بڑھتی ہوئی سُنائی دیں۔ میرے لیے چھُپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی اور اُلٹے پیروں بھاگنا حماقت تھی۔ اِس لیے مَیں جی کڑا کرکے اپنی جگہ اَٹین شن ہوکر کھڑا ہوگیا مگر کسی خطرے سے عہدہ برآ ہونے کے لیے برین گن پر میری گرفت مضبوط تھی۔ دوسرے ہی لمحے دو عورتیں اور دو مرد اندر سے نمودار ہوئے۔ یہ سب فوجی وردیوں میں ملبوس تھے مگر انتہائی غیر فوجی مُوڈ میں نظر آرہے تھے۔ مَردوں نے اپنے بازو عورتوں کے شانوں کے گرد حائل کئے ہوئے تھے اور وہ جُھومتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب اعلیٰ افسر تھے۔ مَیں نے اپنی نگاہیں سامنے جمادیں اور جیسے ہی وہ میرے نزدیک پہنچے ایک فوجی سیلوٹ مارا۔ وہ لوگ مجھے اہمیت دیئے بغیر سامنے سے گزر گئے مگر اتنی دیر میں بھی مَیں نے کنکھیوں سے دیکھ لیا کہ اُن میں ایک عورت نجانا تھی جو میرے خون کی پیاسی تھی۔ وہ میرے سامنے سے گزر گئی۔ لیکن اگر اُس نے غور سے مجھے دیکھا ہوتا تو وہ اپنے شکار کو سامنے پاکر نہ جانے کیا کر بیٹھتی۔ اُن لوگوں کے قدموں کی آوازیں مدھم ہوتی گئیں یہاں تک کہ معدوم ہوگئیں۔ وہ چھوٹی عمارت کی طرف جاکر غائب ہوگئے۔ مَیں نے اطمینان کی سانس لی اور بے دھڑک بڑے دروازے میں داخل ہوگیا۔ اندر قدم رکھتے ہی تیز موسیقی کی آواز نے میرا خیر مقدم کیا۔ سامنے بڑے ہال میں روشنیاں جگمگا رہی تھیں اور مغربی موسیقی کی دُھن پر لوگ رقص کر رہے تھے۔ اِن میں خواتین کی تعداد بہت کم تھی زیادہ تعداد مردوں کی تھی جو فوجی وردیوں میں تھے۔ جبکہ خواتین نے ساڑھیاں زیب تن کر رکھی تھیں۔ چند لوگ کُھلے فرش پر ڈانس کر رہے تھے۔ باقیماندہ چاروں طرف بکھری ہوئی کُرسیوں پر براجمان تھے یا دیواروں اور میزوں کے سہارے کھڑے خوش گپیوں اور ہنسی مذاق میں مصروف تھے۔ سب کے ہاتھوں میں گلاس تھے جو اِس بات کا ثبوت تھا کہ اُن میں سے کوئی بھی ہوش میں نہیں ہے۔ یکایک میری نظریں کیپٹن ڈی آر کرشنا پر اٹک کر رہ گئیں۔ وہ ایک فوجی افسر کی باہوں میں باہیں ڈالے والہانہ انداز میں ڈانس کر رہی تھی۔ اُس کی نظریں میری طرف تھیں۔ ایک لمحہ کے لیے ہم دونوں کی نظریں ملیں اور اسی وقت یک لخت موسیقی بند ہوگئی۔ سب نے تالیاں بجائیں اور اپنی نشستوں کی طرف جانے لگے۔ کچھ لوگ شراب کے کاؤنٹر کی طرف چل دیئے۔ اِس مُہلت سے فائدہ اُٹھا کر مَیں جلدی برآمدے میں ہولیا۔ کیا کرشنا نے اتنی دُور سے رقص کرتے ہوئے ایک سرسری نظر میں مجھے پہچان لیا ہے ؟ شک و شبے نے مجھے گھیر لیا اور مَیں نے تیز قدمی سے ایک سائیڈ روم کا رُخ کیا۔ پردہ ہٹا کر مَیں اندر داخل ہوا مگر ٹھٹھک کر رُک گیا۔ بڑی دفتری میز پر جوڑا نیم دراز تھا۔ مرد فوجی وردی میں تھا جبکہ عورت نے سیاہ ساڑھی پہن رکھی تھی۔ میرے قدموں کی آواز سُن کر اُن دونوں نے میری طرف نظر اُٹھا کر دیکھا۔ عورت نے کچھ شرما کر دوسری طرف منہ پھیر لیا مگر مرد نے زور زور سے ہنسنا شروع کردیا۔ مَیں نے پلٹ کر باہر نکل جانے میں ہی عافیت سمجھی مگر میرے دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی مجھے نوجوان افسر کی آواز سنائی دی۔ "کم آن یُو سٹوپڈ فول" دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے میرے قدم رُک گئے۔

پھر مجھے اُس کی خاتون ساتھی کی آواز سُنائی دی: "ڈونٹ بی فولش' دیپ۔ جانے دو اسے۔" نوجوان افسر ہنستے ہنستے کھانسنے لگا۔ اِس موقع سے فائدہ اُٹھا کر مَیں تیزی سے باہر نکل گیا۔

برآمدے میں ایک اور مُصیبت میرے انتظار میں تھی۔ یہ تین فوجی جوان تھے جو ایک دوسرے کی گردن میں ہاتھ ڈالے رقص کرنے کے انداز میں میری طرف بڑھ رہے تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں مشین گنیں تھیں مگر اُن کے قدموں کی لڑکھڑاہٹ سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بھی مخمور

میں میرے سنبھلنے سے پہلے وہ میرے نزدیک پہنچ گئے۔ میں نے اُن کے پاس سے گزرنے کے لیے قدم بڑھائے مگر ایک مشین گن بردار ہاتھ نے میرا راستہ روک لیا۔ میں نے گھبرا کر دیکھا۔ وہ تینوں میری طرف متوجہ تھے۔

"کدھر جاتا ہے جوان؟" ایک فوجی نے مجھ سے سوال کیا۔

"گیٹ پر۔ ادھر ہماری ڈیوٹی ہے۔" مجھے اس کے سوا کوئی اور جواب نہیں سُوجھا۔

وہ زور سے قہقہہ مار کر ہنسا۔ "آج کوئی ڈیوٹی نہیں ہے۔ سب کی چھٹی ہے۔ دُشمن مار کھا کر بھاگ گیا ہے۔ تم بھی موج کرو جوان۔" یہ کہکر اُس نے اپنے ساتھی کی گردن میں حمائل کیا ہوا ہاتھ اپنی جیب کی طرف بڑھایا اور شراب کی ایک چھوٹی سی بوتل نکال کر میری طرف لہرائی۔ "لو۔ دو گھونٹ لگا لو۔" "تھینک یو" کہکر میں تیزی سے مخالف سمت میں بڑھا اور دُور تک اُن کے قہقہے میرا تعاقب کرتے رہے۔

میں برآمدے کے ایک موڑ سے گزر کر گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ میرا دماغ سنسنانے لگا اور میرے جسم کا رواں رواں کھڑا ہو گیا۔ قدرت نے میرے لیے یہ ایک نادر موقعہ فراہم کیا تھا۔ خدا جانے کس کی دعائیں میرے کام آ رہی تھیں۔ کہاں تو میں بے بسی سے دُشمنوں کی قید میں اذیت سہہ رہا تھا اور دردناک موت کا منتظر تھا اور کہاں یکایک حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ کامیابی اور کامرانی میرے سامنے بازو پھیلائے کھڑی تھی۔ ایسے مثالی حالات روز روز میسّر نہیں آیا کرتے۔ مگر اس موقعے سے فائدہ اُٹھانے کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے؟ خوشی سے میرے ہاتھ پیر پھول گئے تھے اور دماغ بھی فوری طور پر کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر تھا۔ دُشمن کا ہیڈکوارٹر اور اس کی تمام نفری میرے رحم و کرم پر تھی مگر اس اچانک صورتِ حال سے فائدہ اُٹھانے کے لیے میرے پاس کوئی منصوبہ نہیں تھا۔ میں ان ہی خیالات میں گم برآمدے سے گزر کر چھوٹی حویلی کی عمارت کی طرف گامزن رہا۔ اس عمارت کے اندرونی گیٹ پر دو سپاہی کھڑے پہرہ دے رہے تھے اور مجھے اُن کی مستعدی دیکھ کر اندازہ ہو گیا کہ وہ نشے میں بھی نہیں تھے۔ میں بے خوفی اور اعتماد کے ساتھ اُن کی طرف بڑھتا رہا اور اُن کے سامنے سے گزر کر عمارت کے برآمدے میں پہنچ گیا۔ انہوں نے مجھے روکنے یا پُوچھ گچھ کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ میری وردی اور خود اعتمادی انہیں دھوکہ دینے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

سامنے لکڑی کی کشادہ سیڑھیاں تھیں جو باہر سے نظر نہیں آتی تھیں۔ میں کچھ سوچے سمجھے بغیر سیڑھیوں پر چڑھنے لگا یہاں تک کہ دوسری منزل کی گیلری میں پہنچ گیا۔ اس میں چار کمروں کے دروازے تھے۔ فرش لکڑی کا تھا۔ بائیں جانب ایک مقفّل دروازہ تھا جس کے سامنے ایک چاق و چوبند فوجی مشین گن تھامے چوکنا کھڑا تھا۔ اس عمارت میں ہوش مند فوجیوں کی موجودگی اس بات کا ثبوت تھی کہ یہ ایک انتہائی اہم جگہ تھی۔ مگر اس کی اہمیت کیا ہو سکتی ہے؟ میں نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ واحد پہرے دار کے علاوہ برآمدے میں کوئی اور موجود نہیں تھا۔ یکایک میں نے ایک فیصلہ کیا اور کسی اور سمت جانے کی بجائے محافظ کی طرف بڑھنے لگا۔

"رُک جاؤ۔" اس نے آواز لگائی۔ "پاس ورڈ کیا ہے؟"

مگر میں اتنی دیر میں تیز رفتاری سے اس کے سر پر پہنچ گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ حرکت کرتا، میرا برین گن والا ہاتھ بلند ہوا اور میں نے اُس کی گردن پر بھرپُور ضرب لگائی۔ اُس کی آنکھوں میں حیرت کی چمک پیدا ہوئی مگر کچھ سوچنے سمجھنے سے پہلے وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح فرش پر گر گیا۔ میں نے جھپٹ کر اس کی ٹانگ پکڑی اور اسے گھسیٹتا ہوا برآمدے کے نسبتاً تاریک گوشے کی طرف لے گیا۔ اس اثنا میں میرے ہاتھ اُس کے لباس کی تلاشی لیتے رہے اور میں اُس کی جیب سے دو بڑی چابیاں نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ معلوم کرنے کا وقت تھا نہ فرصت کہ وہ مر چکا ہے یا محض بے ہوش ہوا ہے۔

برآمدے کے کنارے رکھے ہوئے بڑے گملوں کی آڑ میں اُس کو ڈالنے کے بعد میں پھرتی سے مقفّل دروازے کی طرف لپکا اور پہریداری کے انداز میں اُس کے سامنے ٹہلنے لگا۔ تقریباً پانچ منٹ گزر گئے مگر کوئی سامنے نہیں آیا۔ میں نے آگے بڑھ کر قفل میں چابی لگائی۔ پہلی کوشش ہی کامیاب ثابت ہوئی۔ لوہے کا بھاری بھرکم قفل کھلنے کے بعد بھی میں نے دروازہ کھولنے کی ضرورت نہیں سمجھی اور دوبارہ دروازے کے سامنے پہریداری کے انداز میں ٹہلنے لگا۔ کچھ فاصلے پر بڑی حویلی میں واقع ہیڈکوارٹر سے موسیقی اور ہنسنے گانے کی ہلکی ہلکی آوازوں کے سوا اور کوئی صدا نہیں تھی۔ یہاں تک کہ عمارت کے چھوٹے عقبی گیٹ پر موجود دو سپاہیوں کے قدموں کی آواز بھی معدوم تھی جس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اپنی جگہ بُت بنے کھڑے تھے۔ میرے سینے میں ایک ہیجان برپا تھا۔ ہاتھ فرطِ مسرت سے کانپ رہے تھے۔ مزید وقت

ضائع کئے بغیر میں دبے پاؤں دروازے کی طرف بڑھا اور بھاری لوہے کا قفل اُتار کر دونوں ہاتھوں سے دروازے کو کھولا اور حیرت و مسرت سے میری سانس رُک گئی۔ میرے سامنے علی بابا کے خزانے کا منظر تھا۔ یہ ایک وسیع و عریض کمرہ تھا۔ جو گولہ بارود کی پیٹیوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہر پیٹی پر اس میں موجود اسلحہ کی نوعیت درج تھی۔ اسلحہ اور گولہ بارود کا یہ ہلاکت خیز ذخیرہ ایک پوری فوج کو ہلاک کرنے کے لیے کافی تھا۔ کمرے میں بائیں دیوار پر ایک آہنی کھڑکی تھی جو مقفّل تھی۔ دائیں جانب ایک پُرانی وضع کا روشندان تھا جسے لکڑی کے تختے نصب کر کے مستقل طور پر بند کر دیا گیا تھا۔ میں نے برین گن کی آہنی نالی لکڑی کے تختوں کے درمیان پھنسا کر زور لگایا تو دو تختے اُکھڑ گئے۔ چند ہی لمحے بعد سارے تختے اُکھڑ چکے تھے اور کھلے روشندان سے جھانک کر میں آسمان کو دیکھ سکتا تھا۔ میں نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور پھر میری نگاہیں ایک بہت بڑی چوبی پیٹی کے گرد لپٹی ہوئی نائیلون کی ڈوری پر جم کر رہ گئیں۔ جیب سے شیلا کا دیا ہوا چاقو نکال کر ڈوری کاٹنے میں ایک منٹ بھی نہیں لگا۔ میں نے ڈوری کھینچ کر نکالی تو معلوم ہوا کہ اس کی لمبائی دس بارہ گز کے قریب ہے۔ اس ڈوری کا ایک سرا بارود کی بڑی پیٹی سے باندھنے کے بعد میں نے اُس کا دوسرا سرا روشندان میں سے باہر پھینک دیا۔ میں نے جوشِ اضطراب میں یہ جاننے کی کوشش بھی نہیں کی تھی کہ روشندان کی دیوار کے نیچے کیا ہے اور آیا ڈوری زمین تک پہنچی بھی گی یا نہیں؟ میرے ذہن میں کوئی تفصیلی اور باقاعدہ منصوبہ نہیں تھا۔ نائیلون کی ڈوری کو دیکھ کر میرے ذہن میں فوری طور پر جو بھی خیال آیا میں کر گزرا۔ کمرے کے اندر زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہ تھا اس لیے میں نے تیزی سے باہر نکل کر کمرے کا دروازہ دوبارہ بند کر دیا۔ قفل میں چابی گھمائی اور تالا بند کرنے کے بعد اطمینان کی لمبی سانس لے کر سر اُٹھایا تو اپنی جگہ ساکت رہ گیا۔ برآمدے کے دوسرے کنارے پر کیپٹن کرشنا کھڑی مجھے گھور رہی تھی۔ ہمارے درمیان میں زیادہ فاصلہ نہ تھا۔ برآمدے میں روشنی بھی کافی تھی۔ امکان یہی تھا کہ وہ مجھے پہچان چکی ہے۔ خلافِ توقع مجھے دیکھ کر حیرت کے آثار اُس کے چہرے پر نمودار ہوئے اور دوسرے ہی لمحے اُس نے اپنی کمر میں لٹکے ہوئے فوجی ریوالور کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ میرا ذہن پُوری طرح بیدار ہو چُکا تھا۔ فائر کرنا کسی طرح بھی مناسب نہ تھا کیونکہ نیچے والے برآمدے میں موجود فوجیوں کو میں دیکھ چُکا تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی احساس تھا کہ ممکن ہے اس عمارت میں کچھ اور ہوشمند فوجی بھی موجود ہوں۔ اس سے پہلے کہ کرشنا کا ریوالور پُوری طرح اُوپر اُٹھتا، بجلی کی سُرعت سے میرا بایاں ہاتھ حرکت میں آیا۔ بجلی سی کوندی اور شیلا کا بخشا ہوا خنجر سنسناتا ہوا کرشنا کی گردن میں پیوست ہو گیا۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ نہ وہ میرے ہاتھ کی حرکت کو دیکھ سکی اور نہ دھار دار خنجر کو۔ اُس کے چہرے پر خوف اور حیرت کا تاثر نمودار ہوا اور دوسرے ہی لمحے وہ بے جان ہو کر فرش پر گر گئی۔ مرنے سے پہلے شاید وہ یہ بھی نہیں جان سکی کہ اس کی موت کا سبب کیا ہے؟ اُس کے گرنے سے پیدا ہونے والی آواز کو روکنے کی غرض سے میں نے اپنے فوجی بوٹ زور سے فرش پر مارے اور تیز تیز قدموں سے اُس کی طرف بڑھا۔ میرے بھاری جوتوں کی آواز میں اُس کے گرنے کی آواز گُم ہو کر رہ گئی۔ جب میں نے جھک کر دیکھا تو اُس کی حیران مگر بے جان آنکھیں ابھی تک مجھے تک رہی تھیں۔ شاید ابھی تک اسے اپنی بصارت پر یقین نہیں آیا تھا۔ میں نے جھک کر بغور اُس کا جائزہ لیا۔ خنجر اُس کی شہ رگ میں پیوست تھا۔ اُس کی فوری موت کا سبب بھی یہی بنا تھا۔ میرے پاس زیادہ مُہلت نہ تھی۔ اس لیے خنجر نکال کر میں نے اُس کے لباس سے پُونچھا اور دوبارہ اپنی کمر میں اُڑس لیا۔ کرشنا جو ایک وقت میری جاں بخشی کے لیے مجھے لالچ دے رہی تھی آج بذاتِ خود میرے سامنے بے جان پڑی تھی اور میں ابھی تک زندہ تھا۔ کرشنا کی لاش کو اُٹھا کر فوجی پہریدار کے برابر ڈالنے میں مجھے کوئی دقت نہیں ہوئی۔ فوجی کے لباس کی تلاشی لینے پر مجھے اُس کی جیبوں سے ایک چھوٹی ٹارچ، ایک سگریٹ کی ڈبیا اور ایک لائٹر دستیاب ہوا۔ میں نے یہ تمام اشیاء اپنی جیبوں میں منتقل کر لیں۔ اب بڑا مسئلہ یہ تھا کہ نیچے پہرہ دینے والے دو مستعد اور چوکس فوجیوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کون سی ترکیب آزمائی جائے۔ کچھ دیر پہلے وہ مجھے بڑی خود اعتمادی کے ساتھ اپنے سامنے سے گزر کر اُوپر آتے ہوئے دیکھ چکے تھے اور اُنہوں نے مجھ سے کوئی سوال کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی۔ معاً ایک خیال میرے ذہن میں پیدا ہوا۔ کیپٹن کرشنا مرنے کے بعد میرے لیے کارآمد ثابت ہو سکتی تھی۔ میں نے کرشنا کے بے جان جسم کو اُٹھا کر کھڑا کرنے کی کوشش کی۔ ابھی تک اُس کے جسم میں اکڑاہٹ پیدا نہیں ہوئی تھی۔ جسم میں حرارت بھی موجود تھی۔ واحد پرابلم اُس کی گردن کا زخم تھا جس سے ابھی تک خون رس رہا تھا۔ اُس کی ساڑھی کا پلو گردن کے گرد لپیٹنے کے بعد میں اُس کی گردن کا زخم چھپانے میں کامیاب ہو گیا۔ ایک ہاتھ سے میں نے کیپٹن کرشنا کو تھاما، دوسرے ہاتھ میں برین گن سنبھالی، اور کرشنا کو اپنے ساتھ لے کر سیڑھیوں سے اُترنے لگا۔ چند سیڑھیاں اُترنے کے بعد ہی میں سامنے

کھڑے ہوئے دونوں فوجیوں کو اب وہ مجھے دیکھ سکتے تھے۔ کرشنا کی گردن ایک طرف ڈھلکی ہوئی تھی اور میں اسے یوں تھام کر لے جا رہا تھا جیسے وہ نشے میں مدہوش ہو۔ فوجیوں کے لیے غالباً یہ منظر نیا اور انوکھا نہیں تھا۔ شاید اپنی فتوحات کی خوشی میں اس قسم کی رنگ رلیاں منانا یہاں کا معمول تھا۔ یہی وجہ ہے کہ فوجیوں نے ایک سرسری نظر ہم دونوں پر ڈالنے کے بعد اپنی توجہ دوسری طرف منعطف کر دی۔ میں کرشنا کو سنبھالے ہوئے قدم قدم اُن کی طرف بڑھتا رہا۔ اُن کے سامنے سے گزرے بغیر عمارت سے باہر نکلنے کا کوئی اور راستہ نہ تھا۔

جوں جوں ہمارا درمیانی فاصلہ کم ہو رہا تھا میرے دل کی دھڑکن اور خون کی گردش میں اضافہ ہو رہا تھا۔ کرشنا کے جسم کا بوجھ زیادہ نہیں تھا۔ پھر بھی میری سانس پھول گئی۔ میرے دوسرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی برین گن پر میری گرفت ہر لمحہ مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ دونوں فوجی تن کر اٹینشن کھڑے ہوئے تھے۔ اُن کی نظریں سامنے کی طرف تھیں اور میری طرف سے وہ قریب قریب مطمئن اور بے خبر ہو چکے تھے۔ میرا اور اُن کا درمیانی فاصلہ جب تین فٹ رہ گیا تو اُن میں سے ایک کی توجہ اُس آواز کی طرف مبذول ہوئی جو فرش سے کیپٹن کرشنا کے پیر گھسٹنے کی وجہ سے پیدا ہو رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ کرشنا اپنے پیر اُٹھا کر خود چلنے سے قاصر تھی اور میں اُسے کندھے پر ڈال کر اُٹھا نہیں سکتا تھا ورنہ دیکھنے والوں کو شک ہو جاتا۔ فوجی نے حیران ہو کر کرشنا کی طرف دیکھا۔ اِس سے پہلے کہ وہ اصلیت جان سکتا، میں نے کرشنا کی لاش اُس پر پھینک دی۔ دوسرے سپاہی نے چونک کر حرکت کرنے کی کوشش کی مگر اتنی دیر میں میرا خنجر کام کر چکا تھا۔ اُس کے منہ سے ایک آہ نکلی اور وہ اوندھے منہ اپنے ساتھی پر گرا جو کرشنا کی لاش کو ہٹا کر اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ دوبارہ فرش پر گر گیا۔ میں نے چھلانگ لگائی اور برین گن پھینک کر دونوں ہاتھوں سے اُس کا گلا دبا دیا۔ چند لمحے اُس نے مزاحمت کی۔ اُس کا بندوق والا ہاتھ مجھ پر حملہ کرنے کے لیے بلند ہوا مگر پھر بے جان ہو کر گر گیا۔ چشم زدن میں میں اپنے دونوں دشمنوں سے نجات پا چکا تھا۔ کتنی ستم ظریفی تھی کہ کرشنا جو اپنی زندگی میں میری جان لینے پر تلی ہوئی تھی مرنے کے بعد میری جان بچانے کا فرض ادا کر رہی تھی۔ میری منہ بولی بہن شیلا کا عطا کیا ہوا خنجر ایک بار پھر کام دے گیا تھا۔ خنجر کو فوجی کی وردی سے صاف کرنے کے بعد میں نے دوبارہ اپنی کمر میں لگا لیا اور دل ہی دل میں شیلا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرش پر سے اپنی برین گن اُٹھالی۔ مرنے والے ایک سپاہی کی مشین گن بھی میں نے اپنے کندھے پر لٹکا لی۔ میرا مقابلہ ایک پوری فوج سے تھا اور محض ایک برین گن شاید اُس کے لیے کافی نہ ہوتی۔ میں نے چوکنا ہو کر چاروں طرف دیکھا۔ آس پاس کوئی بھی موجود نہ تھا مگر ان تینوں لاشوں کا برآمدے میں یوں پڑا رہنا بھی مناسب نہیں تھا۔ اِس لیے میں نے باری باری انہیں گھسیٹ کر برآمدے کے باہر جھاڑیوں کے پیچھے ڈال دیا اور پھونک پھونک قدم اُٹھاتا ہوا اُس دروازے کی طرف بڑھا جس کے سامنے وہ دونوں فوجی پہرہ دے رہے تھے۔ کمرہ مقفل تھا۔ اِس لیے مجھے چابیوں کی تلاش میں دوبارہ جھاڑیوں کے پاس جانا پڑا۔ ایک فوجی کی جیب سے چابیاں ڈھونڈ نکالنے میں مجھے زیادہ دقت نہیں لگی اور میں لپکتا ہوا دروازے پر پہنچ کر تالا کھولنے میں مصروف ہو گیا۔ پہلی ہی کوشش کامیاب ہوئی۔ دروازہ کھلا تو سامنے ایک ہال نما کمرہ تھا جو فرش سے چھت تک اسلحہ اور گولہ بارود سے بھرا ہوا تھا۔ بڑے چھوٹے لکڑی کے کریٹس اور گتے کے مضبوط ڈبے ترتیب کے ساتھ لگا کر رکھے گئے تھے۔ ایک طرف مشین گنوں اور دوسرے آتشیں اسلحہ کا بھی ذخیرہ تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ ہال نما کمرہ اور بالائی منزل کا کمرہ اسلحہ خانے کے طور پر استعمال ہو رہا تھا۔ ممکن ہے اِس عمارت میں اسلحہ اور گولہ بارود کا کوئی اور بھی ذخیرہ ہو مگر میں نے اسے تلاش کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ نہ میرے پاس اتنی مہلت تھی۔ جب میں نے اُس کمرے کو دوبارہ مقفل کیا تو شدتِ جذبات سے میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ خوشی سے میرا دل دھڑک رہا تھا اور میرے سامنے کامیابی مسکراتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

برآمدے سے گزر کر میں بڑے گیٹ کی طرف بڑھا۔ سامنے کچھ فاصلے پر گھنے درختوں کا ایک جھنڈ تھا جہاں سے سرگوشیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی نعمان پسند جوڑا تھا۔ اِس سے مجھے فی الحال کوئی خطرہ نہ تھا۔ اِس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ وہ اپنے راز و نیاز چھوڑ کر چھوٹی حویلی کی طرف آنے کی زحمت گوارا کریں گے۔ میں مضبوط قدموں سے ایک فوجی کے انداز میں چلتا ہوا آگے نکل گیا مگر اِس بار میرا رُخ ہیڈکوارٹر کی عمارت کے بجائے اِس کی مخالف سمت میں تھا جہاں مجھے چند جیپیں کھڑی نظر آ رہی تھیں۔ ان کی تعداد کم تھی۔ اِن جیپوں کے پاس کوئی شخص یا ڈرائیور موجود نہ تھا۔ میں نے جھک کر باری باری سب کے سٹیرنگ دیکھ ڈالے۔ خوش قسمتی یہاں بھی میرا ساتھ دے رہی تھی۔ ایک جیپ کے اگنیشن میں چابی لگی ہوئی تھی۔ میں کود کر جیپ میں آ بیٹھا اور آہستگی سے اسے سٹارٹ کرنے کے بعد کچی سڑک پر کافی فاصلے تک لے گیا۔ جیسا کہ پہلے بتا چکا ہوں یہ عمارتیں بلند و بالا درختوں سے گھری ہوئی تھیں اور کچھ فاصلے سے دیکھا

جائے تو عمارتوں کی موجودگی کا اندازہ لگانا ہی مشکل تھا۔ دو اطراف میں کچی سڑکیں تھیں اور بائیں جانب کھلا میدان۔ کسی زمانے میں یہ اجناس اُگانے والے کھیت ہوں گے مگر زمانۂ جنگ میں یہ لڑائی کے میدان میں تبدیل ہو گئے تھے۔ میدان کا ایک لمبا چکر کاٹ کر میں نے جیپ کو کچھ فاصلے پر درختوں کی اوٹ میں کھڑا کیا اور خود دوبارہ چھوٹی حویلی کی عمارت کی طرف لپکا۔ ابھی تک کسی فوجی یا کسی ذی نفس سے میری مڈبھیڑ نہیں ہوئی تھی۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ قدرت مجھ پر مہربان تھی۔ میں تیز قدموں سے چلتا ہوا عمارت کی طرف جا رہا تھا یکایک میرے سامنے والی جھاڑیوں میں جنبش ہوئی اور ایک ہیولا نمودار ہوا۔ اِس کے ساتھ ہی میں نے ایک زنانہ ہنسی کی آواز سنی اور پھر ایک نشے میں ڈوبی ہوئی مردانہ آواز سنائی دی: "کم آن۔ بوتل کی ضرورت نہیں ہے۔"

اِس اثناء میں ہیولا میرے نزدیک آ چکا تھا۔ پہلی نظر میں یہ فوجی وردی میں ملبوس ایک عورت تھی مگر دوسرے ہی لمحے میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ یہ سُجاتا تھی جو میری طرف بڑھ رہی تھی اور ہمارے درمیان اب صرف چند قدم کا فاصلہ تھا۔ میں سجاتا کو پہلے بھی ہیڈکوارٹر کی عمارت سے نکلتے ہوئے دیکھ چکا تھا مگر وہ اس جگہ میری موجودگی کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ یوں بھی سجاتا اِس سے پہلے جس جس رنگ اور روپ میں میرے سامنے آ چکی تھی اور میرے ساتھ جو بدتر سا سلوک کر چکی تھی۔ اِس کے بعد میرے لیے سجاتا کو بھلانا ممکن نہ تھا۔ سجاتا اِس حقیقت سے قطعی بے خبر تھی کہ اپنے جس شکار کو وہ نیم جان کر کے زنداں میں چھوڑ آئی تھی وہ اِس خودکشی کے موقعے پر رنگ میں بھنگ ڈالنے کے لیے پہنچ جائے گا۔

سجاتا کو اچانک اپنی نگاہوں کے سامنے دیکھ کر میں رُک گیا تھا مگر وہ بدستور میری طرف بڑھ رہی تھی۔ اُس کی چال میں لرزش اور مدہوشی تھی۔ وہ آپ ہی آپ مسکراتی اور گنگناتی میرے پاس پہنچی تو میں نے اسے سیلوٹ مارا اور راستہ چھوڑ کر ایک طرف کو ہو گیا۔ وہ ٹھٹک کر رُک گئی۔ سر سے پیر تک جائزہ لیا۔ مسکرائی بولی "اوہ تم ہو۔ جوان تم آج بھی ڈیوٹی پر ہو؟ ویری بیڈ۔" یکایک اُس کی نظریں میری نظروں سے ملیں۔ مدھم روشنی کے باوجود وہ مجھے پہچان گئی۔ اِس کے چہرے پر حیرت اور خوف کے آثار نمودار ہوئے اور پھر اُس کا ہاتھ تیزی سے کمر میں لٹکے ہوئے ریوالور کی طرف بڑھا مگر میں نے مہلت نہ دی۔ دوسرے لمحے اُس کی کلائی میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے ایک زور کا جھٹکا دے کر اسے اپنی طرف کھینچا اور اِس سے پہلے کہ وہ چیخ مارتی اپنی مشین گن زمین پر گرا کر میں نے مضبوطی سے دوسرے ہاتھ سے اُس کا منہ بند کر دیا۔ اُس نے میری گرفت سے آزاد ہونے کے لیے پوری قوت صرف کر دی مگر میری آہنی گرفت سے آزاد نہیں ہو سکی۔ مجھے یہ اندیشہ تھا کہ کسی بھی وقت اُس کا بوائے فرینڈ جھاڑیوں میں سے نمودار ہو سکتا تھا یا کوئی اور بھی ہم دونوں کو اِس طرح گتھم گتھا ہوتے ہوئے دیکھ کر مشکوک ہو سکتا تھا۔ وہ تھی تو ایک عورت لیکن ایک صحت مند مضبوط اور سخت جان عورت تھی۔ اسے اپنے قابو میں رکھنے کے لیے مجھے اپنی تمام تر طاقت صرف کرنی پڑ رہی تھی۔ اِس کا ایک ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا اور منہ پر میرے دوسرے ہاتھ کی مضبوط بندش تھی۔ خود کو چھڑانے کے لیے وہ ایک زخمی ناگن کی طرح بل کھا رہی تھی۔ پھر اُس نے اپنے فوجی بوٹوں سے مجھے ٹھوکریں مارنی شروع کر دیں۔ حالات خاصے مخدوش تھے اور میرے پاس وقت بھی بہت کم تھا۔ مجھے فوری طور پر کوئی فیصلہ کرنا تھا۔ اُس کی کلائی کو میں نے ایک جھٹکے سے مروڑ کر چھوڑ دیا اور اپنا ایک ہاتھ آزاد کرانے کے بعد اُس کی گردن پر کراٹے کی ایک ضرب لگائی۔ اُس کی تمام جدوجہد اور طاقت آزمائی یک لخت بند ہو گئی۔ زمین پر گرنے سے پہلے میں نے اسے اپنے بازوؤں میں روک لیا۔ جھک کر دوسرے ہاتھ سے زمین سے اپنی مشین گن اُٹھائی اور اسے بازو میں اُٹھائے مخالف سمت میں درختوں کے جھنڈ کی طرف چل پڑا۔ سانس کی ہلکی آمد و رفت کے سوا اُس میں زندگی کے کوئی اور آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ درختوں کے سائے میں پہنچتے ہوئے مجھے نہ تو دقت ہوئی اور نہ ہی دیر لگی۔ اسے آرام سے ایک موٹے سے درخت کے تنے کے ساتھ لٹا کر میں پلٹا اور اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب میں اُن جھاڑیوں کے سامنے سے گزرا جہاں سے سجاتا نکل کر آئی تھی تو وہاں سجاتا کا بوائے فرینڈ مدہوشی اور خود فراموشی کے عالم میں نہ جانے کیا کہہ رہا تھا۔ شاید وہ کوئی گیت گا رہا تھا یا سجاتا کو جلد واپس آنے کی تاکید کر رہا تھا مگر اُس کی آواز سجاتا تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ پہلے مجھے خیال آیا کہ اُس کو ٹھکانے لگا دوں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ سجاتا کی تلاش میں نکل کھڑا ہو اور دوسروں کو بھی خبردار کر دے مگر پھر اُس کی مدہوشی کے پیش نظر اندازہ ہوا کہ شاید وہ اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی حالت میں بھی نہ تھا۔ میں مزید وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اِس لیے اُس کی بڑبڑاہٹ کو نظر انداز کر کے برق رفتاری سے حویلی کی پچھلی جانب لپکا۔ اب تک ہر کام میری خواہش اور آسانی کے مطابق ہو رہا تھا لیکن کسی وقت بھی بنا بنایا کام بگڑتے ہوئے دیر نہیں لگتی۔ اِس سنہری موقعے سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے میں اب فوری طور پر اپنے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا چاہتا تھا۔ عمارت کے عقب میں ایک اُجڑا ہوا ویران باغیچہ تھا۔ میں نے وہاں کھڑے ہو کر نیم تاریکی میں ڈوبی ہوئی عمارت کی طرف نظر دوڑائی تو روشنی کی کمی کے باوجود مجھے وہ کھلا ہوا روشندان نظر آ گیا۔ جس میں سے نائیلون کی ڈوری میں نے باہر پھینکی تھی۔ شکر ہے کہ ابھی تک کسی اور کی نظر

اُس کھلے ہوئے روشندان پر نہیں پڑی تھی۔ جشن جیسے ماحول اور شراب کے گردش کرتے ہوئے پیالوں کی وجہ سے میرا کام بہت آسان ہوگیا تھا۔ بلکہ یُوں کہنا چاہیے کہ قدرت نے خود بخود میرے لیے مناسب اور موزوں حالات مہیا کر دیئے تھے۔ مَیں دبے پاؤں روشندان کے نیچے پہنچا اور نائیلون کی ڈوری تلاش کرنے لگا جو مجھے کہیں نظر نہیں آئی۔ چاروں طرف تاریکی اور خاموشی کا راج تھا۔ مَیں نے سرچ یادا باد کہہ کر اپنی جیب سے مُردہ فوجی کا لائٹر نکال کر روشن کیا اور چاروں طرف ڈوری کو تلاش کرنے لگا جو بالآخر مجھے مل گئی۔ وہ زمین سے قریباً چار فٹ اُونچائی پر لٹک رہی تھی اِس لیے پہلی نظر میں مجھے نظر نہ آسکی تھی۔ ڈوری کو آگ دکھانے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ اسے سُلگانے کے بعد مَیں پوری قوت سے بھاگا اور اُس جگہ پہنچ گیا جہاں جیپ گاڑیاں کھڑی تھیں۔ جس جیپ میں چابی لگی ہوئی تھی اسے مَیں نے بہت تیزی سے ریورس گیئر میں ڈال کر نکالا اور تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا عمارت سے دُور چلا گیا۔

سڑک کچی تھی اور ہموار بھی نہیں تھی مگر مَیں اُونچے نیچے گڑھوں، ہچکولوں اور دھچکوں سے بے نیاز تیزی سے جیپ دوڑاتا ہوا کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ دُور نکل جانا چاہتا تھا۔ میری نظریں سامنے ناہموار کچی سڑک پر تھیں کیونکہ اندھیری رات میں اِس خارجی سڑک پر ڈرائیو کرنا آسان نہ تھی مگر اِس کے باوجود میں کنکھیوں سے پُرانی عمارتوں کی طرف دیکھتا جاتا تھا جو لمحہ بہ لمحہ مجھ سے دُور ہوتی جارہی تھیں۔ اپنے اندازے کے مطابق ایک محفوظ فاصلے پر پہنچ کر مَیں نے درختوں کے ایک جھنڈ کے نیچے جیپ روک لی اور آنے والے واقعات کے انتظار میں عمارتوں کی طرف نظر ڈالی جو تاریکی اور بلند و بالا درختوں کے درمیان میں حائل ہو جانے کی وجہ سے اَب مجھے صاف نظر نہیں آرہی تھیں۔ یکایک ایک زوردار دھماکہ ہوا اور مجھے اُونچے درختوں کے عقب میں آتشبازی سی چلتی ہوئی نظر آئی۔ دھماکہ خاصا زور کا تھا اور جنگل کی تنہائی اور سناٹے نے اُس کی آواز کو اور زیادہ خوفناک اور بھیانک بنا دیا تھا۔ اِس کے بعد یکے بعد دیگرے کئی دھماکوں کی آوازیں بلند ہوئیں اور پھر آگ کے شعلے بلند ہوتے ہوئے نظر آنے لگے۔ مدھم شور کی کچھ انسانی آوازیں بھی اُس میں رلی ملی تھیں۔ مَیں چشمِ تصور میں اِس قیامت خیز افراتفری کو دیکھ رہا تھا جو ہیڈکوارٹر اور پُرانی حویلی کی عمارت میں مچی ہوگی۔ نشے میں چُور فوجی افسر اور سپاہیوں کو بھاگنے کی مہلت بھی نصیب نہیں ہُوئی ہوگی۔ عمارتوں کے اندر موجود محافظ اور جشن مناتے ہوئے فوجی افسروں اور اُن کی ہم جلیسوں کو تو شاید سوچنے کا موقعہ بھی نہیں ملا ہوگا مگر مجھے یقین تھا کہ عمارت کے آس پاس پہرہ کرنے والے فوجیوں اور اردگرد کی جھاڑیوں میں رنگین محفلیں سجانے والے جوڑوں کو بھی سنبھلنے کا موقعہ نہیں مل سکا ہوگا۔ آگ کے شعلے بلند ہوتے جا رہے تھے اور اس کے ساتھ ہی چھوٹے چھوٹے دھماکوں کی آوازیں بھی جاری تھیں۔ یکایک ایک رعدنما آواز فضا میں گونجی اور جنگل میں یُوں محسوس ہوا جیسے بے شمار بادل گرج رہے ہیں اور بجلیاں کوند رہی ہیں۔ مَیں نے دونوں ہاتھوں سے اپنے کانوں کو چھپا لیا اور غیرارادی طور پر جیپ کی سیٹ پر اوندھا ہوکر جُھک گیا۔ مَیں نے میدانِ جنگ میں توپوں اور بمباری کی آوازیں بھی سُنی تھیں مگر ایسی خوفناک آواز اِس سے پہلے کبھی نہیں سُنی تھی۔ یُوں لگتا تھا جیسے کوئی ایٹم بم پھٹ گیا ہو۔ گولے اور بارُود کے جو محفوظ ذخیرے مَیں نے اِس عمارت میں اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے اُن کے علاوہ بھی یہ عمارتیں شاید اسلحہ کے ڈپو کے طور پر استعمال ہو رہی تھیں۔ اِکا دُکا قیدیوں کو عذاب دینے کے لیے شاید ان عقوبت خانوں میں رکھا جاتا ہوگا، لیکن درحقیقت یہ اسلحہ کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ جو اتفاق سے مجھے نظر آگیا اور مَیں اُسے تباہ کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ دھماکوں کی آوازوں کے ساتھ ہی ویران اور تاریک جنگل کا ایک حصہ بقعۂ نُور بن گیا۔ اُن لوگوں کے جشن میں رنگ و نور اور آتشبازی کی جو کمی تھی وہ اِس آتشزدگی نے پُوری کر دی۔ آگ بڑھتی جا رہی تھی۔ یُوں معلوم ہوتا تھا جیسے آس پاس کے خُشک درختوں اور جھاڑیوں نے بھی آگ پکڑ لی ہے۔ مَیں نے مزید رُکنا لاحاصل جانا اور جیپ کو سٹارٹ کرکے بستی کی طرف روانہ ہوگیا جہاں ایک اور فرض میرا منتظر تھا مگر روانہ ہونے سے پہلے مَیں اُن بے گناہ قیدیوں کے لیے دُعائے مغفرت پڑھنا نہیں بھُولا جو ممکن ہے اِس وقت بھی اُن عمارتوں کے کسی گوشے میں موجود ہوں اور لقمۂ اجل بن گئے ہوں، لیکن بعض اوقات ایسی قربانیاں بھی دینی ہی پڑتی ہیں۔ خُدا کی مشیّت میں کسی کو چارہ نہیں ہے۔ اگر میرا کوئی ہم قوم اِس ہلاکت آفرینی کا شکار ہوا ہوگا تو یقیناً اسے خُدا کے حضور شہادت کا رُتبہ ملا ہوگا۔

شیلا کے بتائے ہوئے راستے پر اندھا دھند جیپ دوڑاتے ہوئے مَیں کئی بار بھٹکا۔ وجہ یہ تھی کہ اُس نے مجھے زبانی طور پر راستہ بتایا تھا۔ میرے لیے یہ علاقہ اجنبی اور غیرمانوس تھا۔ پھر تاریکی نے رہے سہے نشانات بھی آنکھوں سے اوجھل کر دیئے تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جذبات کی شدت نے بھی میرے دل و دماغ کو متاثر کیا تھا۔ ایک طرف مجھے یہ خُوشی تھی کہ مَیں دُشمن کی قید اور موت کے مُنہ سے بچ نکلا اور اِس کوشش میں دُشمن کے بہت بڑے ذخیرے کا پتہ لگانے اور اسے تباہ کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ دوسری طرف اِس خُوشی کے موقع پر مجھے رہ رہ کر اپنے اُن تین جاں باز ساتھیوں

کا خیال آرہا تھا جو اپنے مشن کے آغاز ہی میں اپنی جانوں کو مُلک اور قوم پر نثار کر بیٹھے۔ اَب مجھے یہ بھی معلوم ہوچکا تھا کہ اُنھوں نے بے جگری سے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دُشمنوں پر کوئی بھی مُلکی راز افشا کئے بغیر موت کو گلے لگایا تھا۔ اُن پر یہ الزام ایک تہمت سے زیادہ کچھ نہ تھا کہ وہ مرنے سے پہلے اپنے مشن کے بارے میں سب کچھ بتا چکے تھے۔ اگر یہ سچ ہوتا تو مجھ سے پُوچھ گچھ کے دوران وہ لوگ ضرور اُن کے بیان کردہ حقائق کا حوالہ دیتے۔ ایک اور فکر جو مجھے دامنگیر تھی وہ بستی میں پیش آنے والے واقعات کے بارے میں تھی۔ فوجی ہیڈکوارٹر کی تباہی نے سارے علاقے میں دُور دُور تک کے رہنے والوں کو خبردار کر دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ شیلا کی بستی تک بھی یہ روشنی اور آوازیں ضرور پہنچی ہوں گی۔ وہاں موجود فوجیوں اور دوسرے لوگوں پر اِس کا کیا ردِّعمل ہوا ہوگا اور کہیں انہوں نے اُن قیدیوں کو ہلاک تو نہ کر دیا ہوگا جو زنداں سے بستی میں رات گزارنے کے لیے منتقل کر دیئے گئے تھے مگر پھر مجھے اپنی مُنہ بولی بہن شیلا کا خیال آیا۔ میرا دِل یہ ماننے کو کسی طور آمادہ نہیں تھا کہ شیلا کے ہوتے ہوئے اُن بے بس قیدیوں پر کوئی آنچ آسکتی ہے۔

اپنے اندازے سے قریباً نصف گھنٹے تاخیر سے میں اُس بستی کے پاس پہنچ گیا جس کا پتہ نشان شیلا نے مجھے سمجھایا تھا۔ یہ ایک مختصر سی بستی نظر آتی تھی جس میں جھونپڑیوں کی تعداد کسی طرح بھی پندرہ سے زائد نہ ہوگی۔ اِس کا مطلب یہ تھا کہ بستی والے میری راہ میں رُکاوٹ بننے کی صلاحیت اور طاقت نہیں رکھتے تھے۔ زیادہ تر جھونپڑیاں ایک طرف کھلے میدان میں تھیں مگر دو جھونپڑیاں قدآور درختوں کے سائے میں بنی ہوئی تھیں جو شیلا اور اُس کی نند کی ملکیت تھیں۔ اِن جھونپڑیوں میں شیلا اُس کا شوہر، اُس کی نند، نند کا گھروالا اور ایک کمسن بچّے کے سوا اور کوئی نہیں رہتا تھا۔ شیلا کی اطلاع کے مطابق اُس کی نند کے خاندان سے فوجیوں نے ایک رات کے لیے اُن کی جھونپڑی خالی کرالی تھی۔ اُس میں قیدی رکھے گئے تھے جن کے دروازے کے باہر فوجی پہرہ تھا۔ شیلا کے گھر میں فوجی محافظوں نے ڈیرہ جمایا تھا جہاں بقول شیلا دلدّو کی موج بہار تھی۔ میرے اندازے کے مطابق تو اتنی دیر میں اُن سب کو مدہوش ہوجانا چاہیے تھا۔ بستی سے لگ بھگ ایک فرلانگ کے فاصلے پر مَیں نے جیپ روکی اور حالات کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ مَیں ابھی تک یہ فیصلہ بھی نہیں کر پایا تھا کہ مَیں اچانک جیپ لے کر بستی میں پہنچ جاؤں یا جیپ کو کسی پوشیدہ جگہ چھپا کر اکیلا ہی پیدل شیلا کے گھر جاؤں، مگر پھر مَیں نے جیپ میں سوار ہو کر جانے کا فیصلہ کیا۔ ایک مشین گن اور فالتو میگزین جیپ کے فرش پر تھا جبکہ دوسری مشین گن مَیں نے اپنے ہاتھ میں اِس طرح تھام رکھی تھی کہ ایک لمحہ کے نوٹس پر فائر کھول دوں۔ مَیں کسی متوقع حملے کے لیے پُوری طرح چوکنا اور تیار تھا۔

شیلا کے بتائے ہوئے گھر کے سامنے مَیں نے جیپ روکی تو وہاں پہلے سے ایک فوجی جیپ موجود تھی۔ اِس جیپ گاڑی میں کوئی موجود نہ تھا۔ مَیں نے پاس جاکر تصدیق کی۔ اسلحہ نام کی کوئی چیز اُس کے اندر نہیں تھی۔ مشین گن کو مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں تھام کر مَیں اپنی جیپ سے کُودا اور پھُونک پھُونک کر قدم اُٹھاتا ہوا جھونپڑی کی طرف بڑھا۔ میری ساری توجہ اور تمام حسیّات کا مرکز سامنے والی جھونپڑی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب دائیں جانب ایک بڑے درخت کی جانب سے ایک ہیولا میری طرف لپکا تو میرے جسم کے تمام رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ لاشعوری طور پر مَیں نے ایک دَم مشین گن کا رُخ اُس کی طرف موڑ دیا۔ میری اُنگلی حرکت میں آنے ہی والی تھی کہ مَیں نے سرگوشی میں ایک آواز سُنی: "بھیّا" اور مَیں جس حالت میں تھا وہیں ساکت رہ گیا۔ خُدا کا لاکھ لاکھ شُکر ہے کہ مَیں نے فائر کھولنے میں تاخیر کر دی تھی ورنہ مَیں اَن جانے میں شیلا کو بھُون کر رکھ دیتا۔

وہ دوڑتی ہوئی میرے پاس آئی۔ نیم تاریکی میں اُس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ "کہاں سے آرہے ہو؟ یہ دھماکوں کی آوازیں کیسی ہیں؟ کیا جنگل میں کہیں لڑائی ہورہی ہے یا بم گرے ہیں؟ تم نے اُس طرف دیکھا جدھر آگ کی لپٹیں نظر آرہی ہیں؟" اُس نے ایک ہی سانس میں ڈھیر سارے سوال کر دیئے۔ اُس کا اشارہ اُس سُرخی کی طرف تھا جو دُور جنگل میں شفق کی طرح درختوں کی اُونچی چوٹیوں کے اُوپر سے نظر آرہی تھی۔ اِس سے پہلے کہ مَیں کوئی جواب دیتا اُس نے میرے ہاتھوں، شانے اور سر کو نرمی سے چھُوا اور محبت بھرے لہجے میں پُوچھنے لگی "تم ٹھیک تو ہو نا؟ کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوگئی؟"

اُس کی پیار بھری آواز میں تشویش بھی شامل تھی۔ تمام کشیدگی اور پریشانی کے باوجود مَیں مُسکرائے بغیر نہ رہ سکا: "سب ٹھیک ہے۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔"

"کیا کہیں بم گرے ہیں؟" اُس نے دوبارہ سوال کیا۔

"بم نہیں گرے شیلا۔ وہ۔ وہ فوجی ہیڈکوارٹر تھا نا۔ اُس میں گولہ بارُود بھرا ہوا تھا۔ اُس حویلی میں آگ لگی اور ساری بلڈنگیں پٹاخوں کی طرح بیٹھ گئیں۔" میں اپنی آواز میں چھُپی ہوئی مسرّت کو پوشیدہ رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ یُوں لگا جیسے اُس کی چمکتی ہوئی آنکھوں کی روشنی ایک دَم ماند پڑ گئی۔

"ہائے دَیا" وہ دونوں ہاتھ کلیجے پر رکھ کر بے اختیار بولی۔ "وہاں تو بڑا نقصان ہوا ہوگا؟ سارے لوگ مر گئے ہوں گے!؟"

"ہاں اور کیا۔" میں نے کہا۔ "تم نے دیکھا نہیں، بھڑکتی ہوئی آتش بازی کی طرح شعلے اور چنگاریاں سلگے جنگل میں اُڑ رہی ہیں، وہاں کون بچا ہوگا۔"

شیلا ایک لمحہ خاموش کھڑی مجھے دیکھتی رہی۔ اُس کے چہرے پر رفتہ رفتہ ایک غضبناک تاثر پھیلنے لگا تھا۔ جب وہ بولی تو اُس کی آواز کانپ رہی تھی۔ "تم نے انہیں جلا دیا۔ سب کو مار دیا!؟"

میں اُس کے لہجے کی کرختگی پر حیران رہ گیا۔

"تم نے ایسا کیوں کیا۔ بولو؟ ایسا کیوں کیا تم نے؟"

مجھے کوئی اور جواب نہ سُوجھا "وہ میرے دُشمن تھے شیلا۔"

"مگر میں نے تو تمہیں آزاد کرا دیا تھا۔ پھر تم نے اُن سب کو کیوں برباد کر دیا؟"

میں نے کہا۔ "سمجھنے کی کوشش کرو شیلا۔ لڑائی میں سب کچھ جائز ہے اور یہی ہوتا ہے کہ جس کا داؤ چلتا ہے وہ اپنے دُشمن کو معاف نہیں کرتا۔ جنگ میں پہل کرنے والا ہی کامیاب رہتا ہے۔ اچھا چھوڑو یہ باتیں۔ یہ بتاؤ تمہارے مہمانوں کا کیا حال ہے؟"

مگر شیلا نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بدستور مجھے تک رہی تھی۔ میں اُس کی آنکھوں میں اُمڈتے ہوئے آنسو تو نہیں دیکھ سکا مگر اُس کی بھرائی ہوئی رقّت میں ڈوبی ہوئی آواز سے مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ رو رہی ہے۔ "بھیّا! تم نے اُن سب کو مار دیا؟ مٹا دیا؟ وہ میرے دیش کے لوگ تھے۔ میرے دیش کے سپاہی تھے۔" وہ اس کے آگے نہ بول سکی اور پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی۔ میں حیران ہو کر اُسے دیکھتا رہا۔ یکایک وطن اور قوم کی محبت کا جذبہ اُس کے دل میں پیدا ہو گیا تھا۔ یہ تبدیلی میرے لیے قطعی خلافِ توقع اور خطرناک تھی۔

"میں نے۔ میں نے تمہیں اس لیے تو نہیں بچایا تھا کہ تم ان سب کو مٹا دو۔ ملیامیٹ کر دو۔ میں نے تمہیں اپنا بھائی اس لیے تو نہیں بنایا تھا کہ تم میرے دیس کے بھائیوں کو ختم کر دو۔ وہ تمہارے دُشمن تھے۔ مگر میرے دیش کے سپوت تھے۔ میرے دیش کی رکھشا کرنے والے تھے۔ تم نے اُن سب کو ختم کر دیا!؟"

یکایک جذبات کی شدت سے مغلوب ہو کر اُس نے میرا گریبان پکڑ لیا اور مجھے جھنجھوڑنے لگی۔ "یہ تم نے کیا کر دیا۔ کیا کر دیا تم نے؟ تم ظالم ہو، خُونی ہو۔ قاتل ہو۔" اُس نے دیوانہ وار میرے سینے پر گھونسے مارنے شروع کر دیئے۔ میں نے اُس کے ہاتھ تھامنے کی کوشش کی مگر اُس پر دیوانگی کا عالم تھا۔ اُس کے چہرے پر میرے لیے نفرت تھی اور اُس کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی جو ظاہر ہے کہ میرے لیے خطرے کی علامت تھی۔ میں نے پہلے تو نرمی سے اُس کے ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی مگر اُس کی جنوں خیزی بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ اُس نے جھپٹ کر مشین گن کی نالی تھام لی اور میرے ہاتھ سے چھیننے کے لیے اسے جھٹکے دینے لگی۔ اب حالات قابو سے باہر ہونے لگے تھے۔ میں نے ایک جھٹکے سے مشین گن اُس کے ہاتھ سے چھڑائی اور زمین پر ڈال دی۔ وہ مشین گن کی طرف لپکی مگر میں نے ایک ہاتھ سے اُس کے دونوں ہاتھوں کو مضبوطی اور سختی سے گرفت میں لے لیا اور دوسرے ہاتھ سے اُس کے چہرے پر ایک تھپّڑ رسید کیا۔ اس کے باوجود اُس کی دیوانگی کم نہ ہوئی تو میں نے پے در پے کئی طمانچے اُس کے چہرے پر رسید کیے۔ شیلا ہوش میں آؤ۔ ہوش میں آؤ شیلا ورنہ بنا بنایا کام بگڑ جائے گا۔"

"نہیں۔ نہیں۔ تم نے میرے دیش کے رکھوالوں کو مارا ہے۔" وہ چلّائی۔

"بند کرو یہ بکواس۔" اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ "وہ تمہارے رکھوالے نہیں تمہاری عزّت کے دُشمن تھے۔ وہ بھیڑیے تھے جنہیں اپنے پرائے کی کوئی تمیز نہ تھی۔ بھُول گئیں وہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کرنے والے تھے؟ انہوں نے تمہاری عزّت اور تمہارے گھر والے کے بھروسے پر ڈاکہ ڈالا تھا۔ اپنی آبرو پر ڈاکہ ڈالنے والوں کو تم اپنا رکھوالا سمجھتی ہو؟ مت بھُولو کہ میں نے کسی غرض، لالچ اور مطلب کے بغیر اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر تمہیں اُن وحشیوں کے چنگل سے بچایا تھا۔ اُن کی نظروں میں انسانیت اور عورتوں کی عزّت کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ موقع ملتا تو وہ سب بھی

تمہارے ساتھ وہی سُلوک کرتے جو جنگل میں اُن کے ساتھی درندے کرنے والے تھے۔ پھر بھی تم انہیں اپنا بھائی کہتی ہو اور جسے اپنا بھیّا کہا تھا اُس کو اپنا دُشمن سمجھتی ہو؟ تم کیسی عورت ہو جسے اپنی عزّت آبرو کا بھی پاس نہیں ہے۔ جسے دُشمنوں کا احساس نہیں؟ میں تمہیں غلط سمجھا تھا شیلا۔ تمہاری پیار بھری باتوں کے دھوکے میں آگیا تھا۔ اگر تم مجھے ایسا ہی سمجھتی ہو جیسا تم نے کہا ہے تو پھر میں اس رشتے کی قید سے آزاد ہو گیا ہوں جو تم نے خود ہی میرے اور اپنے درمیان قائم کیا تھا۔" یہ کہہ کر میں نے اُسے اپنے سے دُور دھکیلا۔ وہ سنبھلنے کے باوجود زمین پر گر گئی۔ اُس کی سانسیں تیز تیز چل رہی تھیں اور وہ زمین پر سے سر اُٹھا کر میری طرف دیکھ رہی تھی۔ یُوں لگتا تھا جیسے وہ وقتی طور پر سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو گئی ہے۔ وہ خاموش مجھے گھُورتی رہی۔ یکایک مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ شیلا زمین پر جس جگہ مُنہ کے بل جا کر گری تھی وہاں اُس کے ہاتھوں کے پاس ہی میری مشین گن پڑی تھی۔ یکایک اُس نے ہاتھ بڑھا کر مشین گن کو اُٹھا لیا اور مجھے گھُورتی ہوئی آہستہ آہستہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اُٹھتے اُٹھتے بھی اُس نے مشین گن کو تھامے رکھا جس کا رُخ بدستور میری طرف تھا۔ اُس وقت اُس کی کیفیت ایک زخمی شیرنی جیسی تھی۔ وہ مشتعل تھی۔ غضبناک تھی۔ میں نے اُس کے جذبات کو مجروح کیا۔ اُس کے ہم وطنوں کو موت کے گھاٹ اُتارا تھا۔ میرے لیے اُس کی نظروں میں نفرت بھرے انتقام کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ میں اتنی مشکل سے جیتی ہوئی بازی ایک عورت کے مقابلے میں ہار گیا تھا۔ دُشمن کی اتنی بڑی قوت کو تن تنہا تباہ کر دینے والا شخص ایک مسلح عورت کی مشین گن کی زد میں تھا۔ وہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی اور اُس کی اُنگلی کا معمولی سا دباؤ میرے جسم کو چھلنی کر دینے کے لیے کافی تھا۔ میں اُس پر چھلانگ لگا سکتا تھا مگر مشین گن جیسے مُہلک اور جان لیوا ہتھیار کی مالک مجسّم آتش عورت کے سامنے یہ بھی ایک حماقت ہوتی۔ میرے بچ رہنے کے امکانات پانچ فیصد سے زائد نہ تھے مگر میں اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتا رہا۔ چند لمحے ہم دونوں میں سے کسی نے بھی پلک نہیں جھپکی مگر پھر اُس کی نگاہیں جھک گئیں اور ساتھ ہی مشین گن کی نالی کا رُخ بھی زمین کی طرف ہو گیا۔ اُس نے میری طرف سے مُنہ موڑ لیا اور سسکیوں کے ساتھ رونے لگی۔ وہ عورت جو کچھ دیر پہلے غیظ و غضب کی تصویر بنی ہوئی تھی اب ایک بے بس اور مجبور عورت کا نقشہ پیش کر رہی تھی۔ مجھے بے اختیار اُس پر ترس اور پیار آگیا۔ میں آہستہ سے اُس کے نزدیک گیا اور نرم آواز میں اُسے مخاطب کیا۔ "مجھے افسوس ہے کہ شیلا کہ میں غصّے میں بہک گیا تھا۔ مجھے تمہیں اس طرح مخاطب نہیں کرنا چاہیے تھا۔ نہ ہی میرا رویّہ مناسب تھا۔ اس کے لیے میں شرمندہ ہوں اور تم سے معافی کا طلبگار بھی ہوں۔"

اُس نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔

میں نے کہا۔ "یقین کرو شیلا۔ میں نے جو کچھ بھی ہیڈکوارٹر میں جا کر کیا وہ خلافِ توقع نہ تھا۔ تم بھی جانتی تھیں کہ میں ایک دُشمن سپاہی ہوں اور زمانۂ جنگ میں دُشمن کے علاقے میں پکڑا گیا ہوں۔ میں نے وہی کچھ کیا جو ایک سپاہی کی حیثیت سے میرا فرض تھا مگر میں نے تمہارے بارے میں جو الفاظ کہے میں انہیں واپس لینا چاہتا ہوں۔ یہ سچ ہے کہ میں نے تمہیں اُن جنگلی حیوانوں کی درندگی سے بچایا تھا مگر یہ تم پر کوئی احسان نہ تھا۔ ایک مسلمان اور انسان ہونے کی حیثیت میں یہ میرا فرض تھا۔ میں نے تمہارے بارے میں کچھ جانے بغیر بے اختیار وہ قدم اُٹھایا تھا۔ تمہاری جگہ کوئی اور معصوم اور مجبور عورت بھی ہوتی تو میرا وہی رویّہ اور فیصلہ ہوتا۔ یہ تم پر میرا کوئی ذاتی احسان نہیں ہے۔ ہاں البتہ تم نے میری جان بچا کر اور مجھے قید سے رہائی دلا کر مجھ پر احسان کیا ہے مگر میرا تم پر کوئی احسان تھا بھی تو تم اس کا بدلہ ادا کر چکی ہو۔ اگر میں نے تمہاری خاطر اپنی جان کو خطرے میں ڈالا تھا تو تم نے میرے لیے اس سے بھی بڑا خطرہ مول لیا۔ تمہارا احسان اس لحاظ سے بہت بڑا ہے کہ تم نے اپنے ہم وطنوں اور اپنے مُلک کے رکھوالوں کے خلاف میرا ساتھ دیا جس کے بارے میں تم بخُوبی جانتی تھیں کہ وہ ایک دُشمن قوم کا سپاہی ہے۔ تم بہت عظیم ہو۔ مجھے بھائی کہہ کر ہو سکتا ہے تمہیں پچھتاوا ہو رہا ہو مگر بخُدا میں تمہیں بہن بنا کر بالکل شرمسار نہیں ہوں۔ اگر تم مجھے بُرا بھلا کہو۔ مجھ سے نفرت کرو۔ مجھے جان سے مار دو تب بھی میں اپنا وہ رشتہ نہیں توڑوں گا جو ایک بار ہم دونوں کے درمیان قائم ہو چکا ہے۔" اتنا کہہ کر میں اُس کے پاس سے چند قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اپنے دونوں ہاتھ میں نے اُوپر اُٹھا لیے اور کہا۔ "شیلا۔ تمہارا مجرم تمہارے سامنے کھڑا ہے۔ اگر مجھے گولیوں کا نشانہ بنا کر تمہارے ضمیر اور دل و دماغ کو اطمینان اور سکون حاصل ہو سکتا ہے تو بے شک گولی چلاؤ۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہ ہوگی۔" میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ دل ہی دل میں کلمہ پڑھا اور موت کو گلے لگانے کے لیے تیار ہو گیا مگر مرنے سے پہلے مجھے یہ اطمینان ضرور تھا کہ میں نے اپنے تین جاں باز ساتھیوں کی موت کا انتقام لے لیا ہے۔ میں اپنے مشن کو پُورا کرنے میں کامیاب نہیں رہا تھا مگر پھر بھی میں دُشمن کی طاقت پر ایک کاری ضرب لگانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ موت برحق ہے ـــــ مگر میرے دل کو یہ تسلّی تھی کہ میں بُزدلوں کی موت نہیں مر رہا۔ بہادروں کی طرح دُشمن کے بے شمار فوجیوں کو مار کر جان دے رہا ہوں۔

میں فولادی آتشیں گولیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھا مگر گولیوں کی بجائے شیلا کے ہاتھ میرے جسم سے ٹکرائے۔ میں نے آنکھیں کھولیں اور دیکھا تو شیلا میرے سینے سے لگی کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ مشین گن اس نے زمین پر ڈال دی تھی اور میرے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ "میرا بھیا۔ میرا ویر" وہ رندھی ہوئی آواز میں روتی ہوئی بولی: "بھلا کوئی بہن اپنے بھائی پر بھی گولی چلا سکتی ہے؟ میرا دنیا میں کوئی بھائی نہیں تھا۔ بھگوان نے تم جیسا جیالا بھائی دے دیا ہے تو کیا میں اس پر گولی چلاؤں گی؟ اس سے پہلے تو مجھے موت آجائے تو اچھا ہے۔" میں نے اپنے اونچے اٹھے ہوئے ہاتھ نیچے کیے اور پیار سے شیلا کے شانے تھپکا مگر اس نے میرے دونوں ہاتھ تھام کر اپنی آنسو بہاتی ہوئی آنکھوں سے لگا لیے۔ پھر اس نے میرے دونوں ہاتھوں کو چومنا شروع کر دیا۔ "میرا ویر۔ میرا سُورما بھیا۔" وہ روتی جاتی تھی اور بار بار یہ الفاظ دوہرا رہی تھی: "بھیا مجھے معاف کر دو۔ میں ابھاگن ان جانے میں کیا پاگل پن کرنے لگی تھی۔ مجھے شما کر دو بھیا۔ میں نے بہت برا اپرادھ کیا ہے۔ تم پہ ہاتھ اٹھایا ہے۔ تمہارا دل دکھایا ہے۔ میرا یہ پاپ تو دوسرے جنم میں بھی ختم نہ ہوگا۔" وہ بے اختیار اور مسلسل روئے جا رہی تھی۔ آخر میں نے پیار سے اس کو جھنجھوڑا: "بس چپ ہو جا۔"

وہ چپ ہو کر سسکیاں بھرنے لگی تو میں نے پیار سے اس کو سمجھایا: "دیکھ غلطی انسانوں ہی سے ہوتی ہے۔ ہم دونوں بھی مٹی سے بنے ہوئے انسان ہیں۔ جذبات اور جوش میں آگئے تھے مگر ہمارے اندر جو اچھائی اور انسانیت ہے اس نے ہمیں بھٹکنے نہیں دیا۔ پگلی کہیں کی۔ ارے معافی تو مجھے مانگنی چاہیے تجھ سے۔ اپنی بہن کے دل کو دکھایا ہے میں نے۔ چل اب معاف کر دے اپنے بھیا کو۔" میں اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

اُس نے میرے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا اور بولی: "بھیا۔ میں بھی کتنی نادان ہوں۔ اپنے جھگڑے میں یہ تو بھول ہی گئی کہ تمہاری جان خطرے میں ہے۔ نہ جانے کس وقت تمہارے دشمن تمہاری کھوج میں یہاں پہنچ جائیں۔ نہ میں نے تمہیں کھانے پانی کو پوچھا۔ چلو۔ آؤ میرے ساتھ۔" وہ مجھے ہاتھ پکڑ کر اپنی جھونپڑی کی طرف لے جانے لگی۔

میں بھی اچانک جذبات کے تلاطم سے باہر نکل آیا۔ "پہرے والے فوجیوں کا کیا حال ہے؟" میں نے پوچھا۔

"چل کر دیکھ لو سب کے سب بے ہوش پڑے ہوئے ہیں؟"

"اور گاؤں کے دوسرے لوگ؟"

"مفت کی دارو پینے کو مل جائے تو انہیں پھر اور کیا چاہیے۔ گاؤں کے سارے لوگ، عورتوں سمیت نشے میں اوندھے پڑے ہوئے ہیں۔"

اسی اثنا میں ہم دونوں جھونپڑی کے دروازے پہ پہنچ گئے تھے۔ شیلا نے سچ ہی بتایا تھا۔ جھونپڑی میں چٹائی کے فرش پر دیسی شراب کی چند خالی بوتلیں لڑھک رہی تھیں اور اس کے آس پاس تین فوجی، شیلا کا خاوند اور تین دیہاتی دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑے خراٹے لے رہے تھے۔ نہ جانے اس وقت وہ نشے کی کون سی منزل میں تھے۔ لیکن یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ وہ اس وقت بے جان لاشوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔

"قیدی کہاں ہیں؟ وہ خیریت سے تو ہیں نا؟"

"آؤ میرے ساتھ۔" وہ بولی۔ "خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔" وہ مجھے لے کر ساتھ والی جھونپڑی کی طرف بڑھی مگر میرے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی دو جوان لالٹین کی مدھم روشنی میں دروازے سے باہر نکل رہے تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں مشین گنیں تھیں۔ جو صاف ظاہر ہے کہ انہوں نے مدہوش فوجیوں سے ہتھیائی ہوں گی۔ پاس آئے تو میں نے واضح طور پہ انہیں دیکھا۔ ان کی ڈاڑھیاں اور سر کے بال بڑھے ہوئے تھے۔ لباس بوسیدہ اور پھٹا ہوا تھا جس کے اصل رنگ کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ وہ دونوں زخمی بھی تھے۔ تشدد اور ظلم کے نشانات زخموں کی صورت میں ان کے جسموں پر موجود تھے۔ ان کی عمروں کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا بہت مشکل تھا مگر دوسرا جو چند قدم پیچھے چل رہا تھا نسبتاً کم عمر اور زیادہ پھرتیلا نظر آتا تھا انہوں نے مجھے دیکھ کر "السلام علیکم" کہا اور دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئے۔ وہ میرے بارے میں سب کچھ جانتے تھے۔ شیلا نے انہیں بہت کچھ بتا دیا تھا۔ اظہارِ محبت اور اپنائیت کا یہ انداز بھی انوکھا تھا۔ دراصل جذبات کی شدت نے ہم سب کی آوازیں سلب کر لی تھیں اور ہم ایک دوسرے کو لپٹا کر پیار کرنے اور آنسو بہانے کے سوا اور کچھ کرنے سے قاصر تھے۔ کچھ دیر یہی عالم رہا۔ پھر ہم نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اس دوران شیلا خاموش کھڑی ہمیں دیکھتی رہی۔ پھر کہنے لگی: "ٹھہرو۔ میں تمہارے لیے کھانا لاتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اپنی جھونپڑی

کی طرف چلی گئی۔

ہم تینوں نے آپس میں تعارف کی رسم ادا کی۔ معلوم ہوا کہ وہ دونوں سپاہی تھے۔ ایک کا نام مبارک تھا جبکہ دوسرا لیفٹیننٹ تھا۔ اس کا نام سجاد تھا اور بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ٹینکوں کی ایک لڑائی کے بعد دشمنوں کے گھیرے میں آ گیا تھا۔ اتنے مصائب اور ظلم و ستم سہنے کے باوجود وہ اپنی زندہ دلی اور مسکراہٹ سے محروم نہیں ہوا تھا۔ وہ دونوں ایک جھڑپ کے دوران زخمی ہو کر دشمن کے ہاتھ لگ گئے تھے۔ بعد میں قید کے دوران ان سے پوچھ گچھ کی گئی اور مزید تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ان کے دو ساتھی اور بھی تھے۔ جب ان سے کوئی کارآمد معلومات نہ اگلوا سکے تو انہیں فائرنگ سکواڈ نے گولیوں کا نشانہ بنا دیا۔ ان دونوں شہیدوں کا ذکر کرتے ہوئے مبارک کی آواز بھرا گئی: "وہ بہت جی دار اور ہمت والے تھے۔ کوئی ظلم، کوئی ستم ان کو لب کھولنے پہ مجبور نہ کر سکا۔ انہوں نے اپنی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا۔ چپ چاپ ہی جان دے دی۔" اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

میرا دل بھی بھر آیا میں نے اسے تسلی دی: "ملک اور قوم کی خاطر بڑی بڑی قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ یہ زندگی خدا کی امانت ہی تو ہے۔ ایک نہ ایک دن تو یہ امانت اسے لوٹانا ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو کسی بلند مقصد کی خاطر اپنی جان کا نذرانہ پیش کرتے ہیں۔" پھر اس کی توجہ ہٹانے کے لیے میں نے پوچھا: "یہ کہو۔ بستی میں تم پر کیا گزری؟"

وہ مسکرانے لگا: "ہمارے پہرے دار تو آتے ہی شراب کی بوتلیں سنبھال کر بیٹھ گئے تھے۔ ان کے پاس شراب کی بے شمار بوتلیں تھیں۔ سمجھ میں نہیں آتا جنگ کے دوران اسلحہ کی بجائے شراب کا اتنا بڑا ذخیرہ ان کے پاس کہاں سے آگیا۔؟"

میں نے کہا: "شاید تمہیں معلوم نہیں کہ ان کے ہاں اسلحہ کا اس سے بھی بڑا ذخیرہ ہے۔" مبارک اور سجاد نے پریشانی سے میری طرف دیکھا۔ میں مسکرایا: "اطمینان رکھو۔ اب نہ شراب ان کے کام آئے گی اور نہ ہی اسلحہ کا ذخیرہ۔ ابھی تم نے ادھر جنگل میں آتشبازی کی آوازیں سنی ہوں گی اور روشنی بھی دیکھی ہوگی۔"

مبارک نے ایک لمحہ کے لیے سوچا اور پھر اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی: "اوہ۔ سمجھ گیا۔ سر تو یہ آپ کی حرکت ہے؟"

میں نے معصومیت سے گردن ہلائی: "جی ہاں۔ میں ہی قصوروار ہوں۔"

مبارک اور سجاد ایک دم جوش میں آگئے: "تو کیا آپ نے تمام ذخیرہ تباہ کر دیا؟"

"نہ صرف ذخیرہ۔ بلکہ آس پاس کی عمارتیں، ہمارے سارے مہمان اور میزبان بھی پہرے دار فوجیوں سمیت آتشبازی کے ساتھ ہی پھلجھڑیوں کی طرح اُڑ گئے۔"

وہ دونوں اس بارے میں تفصیلات جاننا چاہتے تھے جو میں نے مختصر طور پر انہیں بتا دیں۔ ان کے لیے یہ امر نہ صرف حیرت کا باعث تھا، بلکہ مارے خوشی کے وہ دیوانے ہو گئے تھے کہ ان کو نہ صرف زندان سے آزادی مل چکی ہے بلکہ صیاد کا وہ آشیانہ بھی برق کا نشانہ بن کر نیست و نابود ہو چکا ہے جہاں مظلوموں پہ مشق ستم کی جایا کرتی تھی۔ وہ تو بہت کچھ پوچھنا چاہتے تھے مگر اس اثنا میں شیلا سامنے والی جھونپڑی سے کھانے کا تھال لے کر برآمد ہوئی اور میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

شیلا تھال میں دال، روٹی، پاپڑ، چاول، نہ جانے کیا کچھ اٹھا لائی تھی۔

"لو بھیا۔ جو بھی تھوڑا بہت کھانا ہے کھا لو۔"

"تھوڑا بہت؟" میں نے کھانے کی مقدار کو دیکھ کر کہا: "ارے پگلی۔ یہ تو ایک درجن آدمیوں کے لیے کافی ہے۔ اتنا ڈھیر کھانا آیا کہاں سے؟"

کہنے لگی: "فوجی مہمانوں کے لیے بنایا تھا مگر ان بیچاروں کو تو پینے پلانے سے ہی فرصت نہیں ملی۔ کھانے کا ہوش کسے تھا؟"

سجاد نے شیلا کا شکریہ ادا کیا اور مجھے بتایا کہ اس نے ان دونوں کی خاطر داری اور آسائش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ یہ ان کا ہمارے اوپر بہت بڑا احسان ہے۔

وہ غصے سے بولی: "احسان کیا؟ بہن اگر بھائی کی خدمت کرتی ہے تو اس میں احسان تو نہیں ہوتا۔ بھیا! انہیں منع کر دو۔ ایسی باتیں نہ کریں ورنہ میں خفا ہو جاؤں گی۔"

"نہ نہ۔ ایسا غضب مت کرنا۔ میں تیرے بارے میں انہیں بتا دوں گا کہ غصے کی بہت خراب ہے۔ بہت نخرے والی ہے میری بہن۔"

وہ ہنس پڑی: "ٹھہرو - میں پانی لے کر آتی ہوں۔"

اُس کے جانے کے بعد ہم تینوں نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا - سچ پوچھئے تو خدا جانے کتنے لمبے عرصے بعد گھریلو کھانے کا مزہ چکھا تھا پھر حالات نے جو خوشگوار پلٹا کھایا تھا اس کی وجہ سے بھی ہم سب کی بھوک خوب کھل گئی تھی۔

کھانے پینے سے فارغ ہوئے تو جان میں جان آئی- اب ہم نے یہ سوچنا شروع کیا کہ بستی میں جو دشمن فوجی مدہوش پڑے ہیں۔ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ اور پھر یہاں سے بھاگنے کی کیا ترکیب ہو؟ مُبارک کا مشورہ تو یہ تھا کہ سارے فوجیوں کو مار دیا جائے۔ وہ ان لوگوں کی قید میں کڑی سختیاں جھیل چُکا تھا اور اُس کا دل نفرت اور انتقام کی آگ سے بھرا ہوا تھا مگر سجاد کا خیال تھا کہ بے ہوش دشمنوں کو بے خبری میں ہلاک کرنا کوئی بہادری نہیں ہے۔ میں نے اس کی تجویز سے اتفاق کیا۔ پھر میں یہ بھی جانتا تھا کہ میری خاطر شیلا نے اپنے ہم وطنوں کی تباہی اور ہلاکت کا صدمہ جس صبر کے ساتھ برداشت کیا ہے وہ اسی کا حوصلہ ہے۔ اگر باقیماندہ فوجیوں کو ہلاک کرنے کا فیصلہ کیا گیا تو شاید وہ مُنہ سے کچھ نہ بولے مگر اس کے دل پر جو گزرے گی وہ میں خوب جانتا تھا۔ فیصلہ یہ کیا گیا کہ فوجیوں کو باندھ کر ڈال دیا جائے اور اُنہیں ہتھیاروں سے محروم کر دیا جائے۔ میں یہ اندازہ بھی لگا سکتا تھا کہ بعد میں ان فوجیوں سے فرض شناسی اور غفلت کے جُرم میں باز پُرس کی جائے گی اور فوجی قواعد کے مطابق سنگین سزائیں ملیں گی۔ چنانچہ ہم نے جلدی جلدی بے ہوش فوجیوں کو اکٹھا کیا اور باندھ کر ڈال دیا۔ وہ اپنے ساتھ ہونے والی کارروائی سے بالکل بے خبر تھے۔ بعض نے نشے میں مُنہ سے کچھ آوازیں بھی نکالیں جن کا مطلب ہماری سمجھ میں نہیں آسکا۔ گاؤں کے دوسرے مردوں اور عورتوں کو بھی ہم نے اکٹھا کر کے ایک جھونپڑی میں ڈال دیا اور دروازہ بند کر کے کُنڈی چڑھا دی۔ اس تمام کارروائی کے دوران میں شیلا خاموش، خالی خالی نظروں سے ایک طرف کھڑی سب کچھ دیکھتی رہی۔ شیلا اور اس کے گھر والے کو ہم نے ان کی اپنی جھونپڑی میں بند کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کا شوہر تو بے ہوش تھا مگر شیلا کو شک و شبہ سے محفوظ رکھنے کے خاطر کوئی مناسب بندوبست کرنا بہت ضروری تھا۔ میں نے شیلا کو یہ بات بتائی اور پھر یہ تجویز پیش کی کہ ہم اس کے ہاتھ پیر باندھ کر چھوڑ جائیں گے تاکہ اس کی بے گناہی ثابت ہو جائے۔ شیلا خاموش میری طرف دیکھتی رہی صرف اتنا بولی: "مجھے کچھ پتہ نہیں۔ جو تم ٹھیک سمجھتے ہو کرو۔"

اَب سب سے مُشکل مرحلہ پیش آیا۔ یعنی شیلا کو باندھ کر اس سے رُخصت ہونے کا۔ میں نے ایک رسّی سے شیلا کے ہاتھ اور پیر باندھ دیئے۔ وہ چُپ چاپ آنسو بھری نگاہوں سے مجھے تکتی رہی۔ پھر میں نے اسے آرام سے ایک چارپائی پر لٹا دیا اور کہا: "معاف کرنا بہن تمہاری حفاظت کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا۔ اَب مجھے اجازت دو۔ ہمیں بہت لمبا اور اَن جانا سفر طے کرنا ہے۔"

یہ کہہ کر میں نے ہمت سے اس کا سر تھپکا تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور وہ سسکیوں سے رونے لگی۔ میں نے اسے دلاسہ دیا۔ یہ تو کہہ نہیں سکتا تھا کہ اللہ نے چاہا تو پھر مُلاقات ہوگی۔ مجھے خود اپنی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں تھا اور پھر اگر قسمت نے ساتھ دیا اور بچ کر حفاظت سے اپنے وطن واپس پہنچ بھی گیا تو دوبارہ شیلا سے مُلاقات کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پھر بھی میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے اُس کے گاؤں اور آس پاس کے علاقے کا نام اور پتہ نشان دریافت کر لیا۔ میں یہ بھی جاننا چاہتا تھا کہ میں دُشمن کے مُلک میں کون سے علاقے میں ہوں اور مجھے واپسی کے لیے کون سا راستہ اختیار کرنا ہوگا۔ میں کسی مزید تاخیر کے بغیر رُخصت ہونا چاہتا تھا۔ شیلا کی سسکیوں کا سلسلہ ختم ہونے میں نہیں آرہا تھا۔ مجبوراً اس کو الوداع کہا اور پلٹ کر جانے لگا تو اُس نے مجھے پُکارا: "بھیا سُنو۔" میں رُک گیا۔ سوچا عورتوں کی عادت کے مطابق پھر روئے گی۔ مگر اُس کے نزدیک پہنچا تو اس کے چہرے پر سکون کے آثار نظر آرہے۔ بولی: "بھیا۔ تمہیں نہ جانے کتنا لمبا سفر کرنا ہوگا۔ تمہارے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

میں نے مشین گنوں کی طرف اشارہ کیا تو ہنس پڑی۔ "مگر ان کو کھا تو نہیں سکتے نا! اُوپر والی ٹوکری میں کپڑے ہٹا کر دیکھو۔ تھوڑے سے پیسے رکھے ہیں۔ وہ لے جاؤ۔"

"ارے بہن! پیسوں کی مجھے کیا ضرورت ہے۔"

"کون جانے کیا حالات ہوں، کیا ضرورت پڑ جائے۔ ساتھ رکھ لو شاید کام آ جائیں۔ اگر بچ گئے تو اپنی بچھڑی ہوئی بہن کی یادگار سمجھ کر رکھ لینا یا پھر کسی کو دان کر دینا۔ مجھے اس کا بدلہ بھگوان کے پاس سے مل جائے گا۔"

جی تو نہیں چاہتا تھا۔ مگر اُس نے جس پیار سے کہا تھا اس کے پیشِ نظر انکار کرتا تو اُس کا دل ٹوٹ جاتا۔ ٹوکری میں تین چار سو روپے سے زیادہ رقم نہیں تھی۔ نہ جانے کس طرح اُس نے کوڑی کوڑی جوڑ کر یہ پیسہ جمع کیا ہوگا جو اُس نے اپنے مُنہ بولے بھائی کی نذر کر دیا۔ چلتے چلتے میں نے ایک بار پھر شیلا کو محبت سے دلاسہ دیا۔ جھونپڑی کا دروازہ بند کیا تو وہ خاموش ڈبڈبائی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میرا دل بھی بھر آیا تھا مگر تیزی سے جھونپڑی کی کُنڈی چڑھانے کے بعد میں اپنے دونوں ساتھیوں کی طرف بڑھا جو جیپ کے پاس میرے مُنتظر کھڑے تھے۔ ان دونوں کو تمام حالات کا علم ہو چکا تھا اور اُنہیں میرے جذباتی لمحے کا پورا پورا احساس تھا۔ جیپ میں ہم نے فالتو مشین گنیں اور ایمونیشن بھی ڈال لیا تھا۔ میں نے سٹیرنگ سنبھالا اور جیپ رُخصت ہوئی تو میرا دل شیلا کی یاد میں غمگین ہو گیا۔ کاش میں دُنیا بھر میں اپنی واحد بہن کے پاس رہ سکتا یا اسے اپنے ساتھ لے جا سکتا۔ کہنے کو وہ مُنہ بولی بہن تھی مگر میں نے زندگی میں بہن اور بھائی کے رشتے کا پہلی بار مزہ چکھا تھا اور پھوپھی کے بعد یہ پہلی ہستی ملی تھی جو مجھ سے بے لوث اور بے اندازہ پیار کرتی تھی اور میری خاطر اپنی جان تک قربان کرنے پر آمادہ تھی۔ میں نے سوچا۔ کاش شیلا مجھے مختلف حالات میں اور مختلف مقام پر ملی ہوتی تو میں اپنی خوش نصیبی پر پھولا نہ سماتا۔ اس کے قدموں میں زمانے بھر کی خوشیاں ڈھیر کر دیتا۔ اسے آسائشوں سے لاد دیتا۔ دُنیا کا کوئی غم اس کے نزدیک نہ آنے دیتا۔۔۔ پھر میں نے شیلا کے شوہر کے بارے میں سوچا۔ یہ حقیقت ہے کہ شیلا کے بارے میں میرے جذبات ایک سگے بھائی سے زیادہ شدید تھے۔ مگر عجیب بات یہ تھی کہ اس کے شوہر سے میرا کوئی قلبی یا جذباتی تعلق قائم نہ ہو سکا تھا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میں نے نظر بھر کر غور سے اُس شخص کی صورت تک نہیں دیکھی تھی جو میری مُنہ بولی بہن کا سہاگ تھا۔ اِس انوکھے رشتے کے متعلق سوچ کر میں دل ہی دل میں مُسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

ہماری جیپ کچی پگڈنڈیوں پر سفر کر رہی تھی۔ رات کافی گزر چکی تھی۔ میں بے خوفی کے ساتھ جیپ کی روشنیاں جلا کر سفر طے کر رہا تھا۔ کیونکہ راستہ اَن جانا اور تاریک تھا۔ یوں بھی نواحی علاقے میں دُشمن کے فوجیوں کی موجودگی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ ہم تینوں نے دشمن کے فوجیوں کی وردیاں زیب تن کر رکھی تھیں اور ان ہی کی فوجی جیپ میں سوار تھے۔ دُشمن سے آمنا سامنا ہونے کی صورت میں ہمارا فوراً پکڑا جانا ممکن نہ تھا۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ پچھلی کامیابیوں اور کامرانیوں نے ہمارے حوصلے بہت بُلند کر دیئے تھے۔ ہم خود اعتمادی کے جذبے سے سرشار تھے۔

کافی راستہ طے کرنے کے بعد مجھے مبارک کی آواز سنائی دی: "صاحب آخر ہم کدھر جا رہے ہیں؟ کچھ پتہ بھی ہے؟"

میں چونک پڑا۔ واقعی اس کا سوال بہت اہم اور بروقت تھا۔ شیلا نے مجھے اس علاقے کے بارے جو کچھ بتایا تھا اس کے مطابق ہم اپنی سرحدوں سے کم از کم سو ڈیڑھ سو میل دُور تھے۔ لیکن درحقیقت ہم کس مقام پر تھے اور راہ میں کون کون سے اور کتنے مُشکل مقام آتے تھے اُس کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ سمت اور جگہوں کا تعین کرنے کے لیے میرے پاس نہ کوئی نقشہ تھا اور نہ کمپاس۔ دراصل جب ہمیں مشن پر بھیجا گیا تھا تو اُس علاقے کے بارے میں ہمارے پاس تمام ضروری معلومات اور کوائف موجود تھے جہاں ہمیں پیرا شوٹ کے ذریعے اُتارا گیا تھا مگر اس کے باوجود ہم پر جو گزری اور جس طرح ہم چاروں ایک دوسرے سے بچھڑ کر بھٹک گئے اس کی وجہ سے جائے وقوع کے بارے میں کچھ گڑبڑ پیدا ہو گئی تھی۔ رہی سہی کسر گرفتار ہونے کے بعد پوری ہو گئی۔ ہمارے کاغذات پہلے ہی تلف ہو چکے تھے۔ گرفتاری کے بعد ہمیں جن راستوں سے گزار کر اس مقام پر لایا گیا۔ اس کے متعلق بھی ہمیں کوئی علم نہ تھا۔ البتہ مجھے یہ علم ضرور تھا کہ آس پاس کے علاقے میں اسلحہ کی ایک فیکٹری اور ایک ائیر پورٹ بھی ہونا چاہیئے۔ مگر کہاں اور کس سمت میں؟ اِس بارے میں کچھ اندازہ نہ تھا۔ لیکن صورتِ حال کا تقاضا یہ تھا کہ ہم رات کے اندھیرے میں زیادہ سے زیادہ فاصلہ طے کر لیں اور اپنی سرحدوں کے نزدیک نہ پہنچ جائیں تاکہ دن کی روشنی میں اگر دُشمن سے سامنا بھی ہو جائے تو وہ ہمیں آسانی سے پہچان نہ سکے۔ اِس کے علاوہ گھر جانے کی صورت میں رات کے وقت بچ نکلنا زیادہ آسان تھا۔

مُبارک اور سجاد میری صورت تک رہے تھے اور میں ان خیالوں میں گم تھا۔ مُشکل یہ تھی کہ وہ دونوں بھی راستوں کے بارے میں میری راہنمائی کرنے سے قاصر تھے۔ بلکہ دیکھا جائے تو میں ان کے مقابلے میں کچھ زیادہ با خبر تھا۔ اُن دونوں کی خود اعتمادی اور بُلند مورال کو برقرار رکھنا بھی لازمی تھا اس لیے میں مُسکرایا اور بڑے اعتماد سے میں نے کہا: "دیکھو دوستو۔ راستوں کا صحیح اندازہ مجھے نہیں ہے لیکن اتنا محسوس کر سکتا ہوں کہ ہم دُرست سمت جا رہے ہیں۔ پھر یہ بھی نہ بھولو کہ قدرت ہم پر مہربان ہے۔ آج کے دن کامیابی اور نُصرت ہمارا مُقدر بن چکی ہے۔ چند گھنٹے پہلے ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ پانسہ اس طرح پلٹ جائے گا۔ اَب تو ہمیں خدا کے بھروسے پر ہی قدم اُٹھانا ہوگا۔"

وہ دونوں اُلجھن میں ضرور تھے لیکن فکرمند اور خوف زدہ ہرگز نہیں تھے۔ آخر کو وہ ہماری جری اور جاں باز فوج کے سپاہی تھے، جنہیں موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرانا آتا ہے۔

سجاد کہنے لگا۔ "آپ یہ نہ سمجھئے کہ ہم ڈر گئے ہیں۔ ارے صاحب جس اللہ نے ہمیں یہاں تک پہنچایا ہے اگر اس کی رضا ہوگی تو ہم اپنی منزل تک بھی پہنچ جائیں گے۔"

مُبارک بولا "صاحب۔ آپ نے سولہ آنے ٹھیک بات لوبی ہے۔ اللہ کی مرضی کے بغیر تو پتہ بھی نہیں ہلتا۔ اُس نے جو ہماری قسمت میں لکھ دیا ہے وہی ہو کر رہے گا۔ پھر پریشانی کس بات کی؟ اور پھر اللہ نے آپ کا جیسا بُلند اقبال آدمی ہماری مدد کے لیے بھیج دیا ہے تو پھر ڈر کس بات کا۔؟"

خدا پر اور اُس کے بعد مجھ پر اِن کا اعتماد اور بھروسہ حیرت انگیز حد تک غیر متزلزل تھا۔ دراصل وہ مجھ سے حوصلہ حاصل کر رہے تھے اور میں اُن سے۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔ ہم اپنے سفر پر روانہ ہوتے ہیں۔ منزل پر پہنچانا اُوپر والے کا کام ہے۔" یہ کہہ کر میں نے جیپ پھر سٹارٹ کر دی۔ رات، جنگل اور تنہائی کے اِس ماحول میں ہماری جیپ کی آواز کے سوا کوئی اور آواز نہ تھی۔ حد تو یہ ہے کہ جنگلی جانور بھی خاموش دبکے ہوئے بیٹھے تھے۔ میں نے سکوت توڑنے کے لیے بات چیت کرنے کی ٹھانی "سجاد۔ تمہارے کتنے بچے ہیں؟"

"ابھی تو میں خود بچہ ہوں۔" اس نے فوراً جواب دیا اور پھر خود ہی ہنس پڑا۔ "میری ابھی شادی نہیں ہوئی۔ اماں کا بس چلتا تو وہ چھ سال پہلے ہی مجھے دو چار بچوں کا ابّو بنا دیتیں۔"

"تم نے اپنی ماں کی آرزو کیوں نہیں پوری کی؟"

"وہ شوخی سے بولا "ارے صاحب۔ آدمی یا تو سپاہی بن جائے یا شوہر؟ یہ دونوں کام ایک ساتھ نہیں ہو سکتے۔ جس کو ایک پل کے لیے زندگی کا بھروسہ نہ ہو وہ دوسروں کی زندگی کیوں خراب کرے؟"

مُبارک سے خاموش نہ رہا گیا۔ بولا "معاف کرنا صاحب۔ میں زیادہ پڑھا لکھا نہیں ہوں۔ پر اتنا جانتا ہوں کہ موت برحق ہے۔ گھر میں بستر پر بھی آسکتی ہے اور جنگ کے میدان میں بھی۔ جس کی جتنی لکھی ہے وہ اسے گزارنی ہے۔ میرے گاؤں میں سو سو برس کے بوڑھے موجود ہیں جن کی ساری عمر فوج میں گزری ہے۔ جنگوں میں بھی گئے۔ زخمی بھی ہوئے مگر ابھی تک زندہ ہیں۔ گھر بار، پوتا، نواسہ، سبھی ہیں۔ اِن کے لیے اللہ نے گولی گولی نہیں بنائی تھی اس لیے بچ گئے۔ اِسی گاؤں کے کئی سوہنے جوان چٹ پٹ مر گئے۔"

"کیسے؟" میں نے سوال کیا۔

"کوئی گھوڑے سے گر کر مر گیا۔ کوئی نہر میں ڈوب گیا۔ کسی کو سانپ نے کاٹ لیا۔ میرا ایک دوست تھا۔ اچھا بھلا، جوان، خوبصورت، زمینداری کرتا تھا۔ کوئی فکر نہ فاقہ۔ مزے کرتا تھا۔ جس دن شادی ہونے والی تھی رات کو ہیضہ ہو گیا۔ دوسرے دن مر گیا۔ تو سر، زندگی اور موت کے بارے میں کون کہہ سکتا ہے؟"

میں اس کے فلسفے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ سجاد سے مخاطب ہوا "صاحب چھوٹا منہ اور بڑی بات ہے، پر میں یہی کہوں گا کہ اگر خدا زندگی دے اور خیر خیریت سے گھر واپس جاؤ تو اپنا گھر بسا لو۔" پھر وہ ٹھنڈی آہ بھر کر بولا "سر۔ کیا بات ہے اپنے گھر بار کی۔ انسان کے بیوی بچے نہ ہوں تو وہ کس کے لیے زندہ رہے؟ مولوی صاحب تو کہتے ہیں کہ جنازہ بھی جائز نہیں ہوتا کنواروں کا۔"

میں اور سجاد دونوں ہنس پڑے۔ مُبارک اَن پڑھ اور اُجڈ سپاہی سہی مگر بات پتے کی کہی تھی اُس نے۔

میں نے سجاد کو چھیڑا "کیوں، کوئی لڑکی وڑکی دیکھ رکھی ہے ماں نے؟ یا تم نے کوئی آنکھ مٹکا کر رکھا ہے؟"

سجاد خاموشی سے مسکراتا رہا۔ مگر جھینپی جھینپی سی ہنسی تھی اُس کی۔ میں نے معنی خیز انداز میں اسے دیکھا اور پوچھا۔ "کون ہے یار؟ ہمیں نہیں بتاؤ گے؟"

"میرے ماموں کی بیٹی ہے۔ ہم بچپن سے ساتھ کھیلتے ہیں۔ ہم دونوں نے عہد کیا ہے کہ اگر شادی کریں گے تو ایک دوسرے کے ساتھ، نہ زندگی بھر کنوارے بیٹھے رہیں گے۔"

مُبارک کہنے لگا "جی آپ ہی آپ تھیلے سے باہر نکل آئی۔ میری مانو تو کنوارے بیٹھنے کی ضرورت نہیں ہے صاحب۔ کیوں ظلم کرتے ہو اُس غریب کے ساتھ۔ اور خود اپنے ساتھ۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔" سجاد اس موضوع کو بدلنا چاہتا تھا۔

میں نے پوچھا "مُبارک۔ تمہاری شادی ہو گئی ہے؟"

"شادی؟ ارے صاحب میری تو بڑی بیٹی دو چار سال بعد شادی کے قابل ہو جائے گی۔"

سجاد نے اُسے غور سے دیکھا اور بولا۔ "اتنی بڑی عمر تو نہیں لگتی تمہاری۔"

"عمر بڑی نہیں ہے سر۔ چھوٹی عمر میں شادی ہو گئی تھی۔ چھ بچے ہیں میرے۔ دو لڑکیاں، چار لڑکے۔"

"تمہیں محبت نہیں ہے اُن سے؟" سجاد نے سوال کیا۔

اُس نے سرد آہ بھری۔ "محبت؟!! سر میرا بس چلے تو جان قربان کر دوں ان پر۔"

"یاد نہیں آتے تمہیں؟"

"ان ہی کی یاد کے اور اللہ کے سہارے تو زندگی کٹ رہی ہے سر۔" وہ زور سے ہنسا مگر پھر اچانک چُپ ہو گیا۔ میں اور سجاد بھی اُداس ہو گئے۔ واقعی۔ کیا گزرتی ہو گی مُبارک کے دِل پر اور اُس کے بیوی بچے اس کے بغیر کیوں کر دن کاٹتے ہوں گے؟

اُداسی کی چادر نے ہم تینوں کو وقتی طور پر اپنے اندر لپیٹ لیا۔ تینوں ہی اپنے اپنے بچھڑے ہوئے پیاروں کی یادوں میں کھو گئے۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ جیپ کی رفتار اور تیز ہو گئی تھی۔ ہم جس جگہ سے گزرتے ہمارے پیچھے گرد و غبار کا ایک بگولا آسمان کی طرف اُٹھتا ہوا نظر آیا۔ کبھی کبھی جیپ زور زور سے اُچھلتی اور ہچکولے کھانے لگتی۔ راستے میں گڑھے، چھوٹے چھوٹے نالے اور بنجر کھیت بھی ملے مگر میں نے رفتار کم نہیں کی۔ صرف ایک ہی دُھن سوار تھی کہ کس طرح جلد سے جلد اپنے وطن کی سرحد کے اندر پہنچ جائیں۔

یکایک مُبارک کے کان کھڑے ہو گئے۔ اُس نے ایک لمحہ تامّل کیا۔ پھر بولا "سر۔ آپ کوئی آواز سُن رہے ہیں؟"

مجھے کوئی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی مگر جب کان لگا کر سُنا تو ایک عجیب سی گونج محسوس ہوئی۔ میں نے جیپ کی رفتار ہلکی کر دی۔ آواز بہت دُور تھی مگر بھنبھناہٹ تھی ضرور۔

سجاد بھی غور سے سُن رہا تھا۔ یکایک بولا "کوئی آواز ضرور ہے۔ پر کس چیز کی؟ یہ پتہ نہیں چلتا۔"

پُراسرار آواز کی سمت اور ذریعہ جاننے کے لیے میں نے جیپ کو قریبی قد آور درختوں تلے روک دیا۔ بھنبھناہٹ کی آواز بڑھتی جا رہی تھی ——— مُبارک تو بہت توجہ سے کان لگائے سُن رہا تھا یکایک چیخ اُٹھا "سر۔ یہ تو ہیلی کاپٹر کی آواز ہے۔"

ہم تینوں نے معنی خیز انداز میں ایک دوسرے کو دیکھا۔ آواز بڑھتی جا رہی تھی اور ہمارے قریب آ رہی تھی۔ اَب واضح طور پر میں ہیلی کاپٹر کے پنکھوں کی پھڑپھڑاہٹ سُن سکتا تھا۔ "واقعی۔" میں نے کہا "یہ تو ہیلی کاپٹر ہے!"

ہم تینوں نے مشین گنیں سنبھال لیں اور آنے والے واقعات کے انتظار میں سانس روک کر بیٹھ گئے۔

آسمان پر بائیں جانب سے آواز اور پھر روشنی کا ایک دھبا ہماری طرف بڑھتا ہوا نظر آیا۔ اَب اُس کے خدوخال اور آواز بالکل واضح ہو گئی تھی۔ یہ ایک فوجی ہیلی کاپٹر تھا جو پرواز کرتا ہوا ہماری جانب آ رہا تھا۔

مجھے مبارک کی سرگوشی سنائی دی "سر۔ زیادہ اُونچائی پر نہیں ہے۔ لگاؤں نشانہ؟"

"نہیں۔ پہلے حالات کا جائزہ لو اور ہدایات کا انتظار کرو۔"

ہیلی کاپٹر اَب ہمارے سروں کے نزدیک آ گیا تھا۔ ہماری جیپ درختوں کے جُھنڈ تلے تھی۔ اگرچہ ہیلی کاپٹر کی بُلندی زیادہ نہ تھی مگر پھر بھی درختوں اور تاریکی نے ہمیں ایک محفوظ کور فراہم کر دیا تھا۔ ہماری مشین گنوں کے رُخ ہیلی کاپٹر کی جانب اور اُنگلیاں لبلبی پر تھیں۔

"گولی نہ چلانا" میں نے ہدایت دی "ہو سکتا ہے آس پاس دوسرے فوجی بھی موجود ہوں۔ فائرنگ کی آواز سُن کر چوکنا ہو جائیں گے۔"

ہیلی کاپٹر ہمارے سروں پر سے گزر گیا۔ اس کا رُخ ہیڈ کوارٹر کی طرف تھا۔ ہم تینوں اِس نئی صورت حال سے سوچ میں پڑ گئے۔ سجاد بولا۔

ں تو کہتا ہوں اللہ کا نام ہے کر اُڑا دو۔" یہ کہہ کر اس نے مشین گن کی نالی ہیلی کاپٹر کی اُٹھائی مگر اس سے پہلے کہ میں اُسے روکتا اس کا ہاتھ
رد بخود ساکت ہو کر رہ گیا۔ جس جانب سے ہیلی کاپٹر نمودار ہُوا تھا اسی طرف سے بھنبھناہٹ کی مزید آوازیں سُنائی دے رہی تھیں۔ ہم نے
تویش سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ چند ہی لمحے بعد ہیلی کاپٹر ہمارے نزدیک آ گئے۔ یہ تعداد میں چار تھے اور دو دو ایک ساتھ پرواز کر
ہے تھے۔ یکایک جنگل میں سُرخ روشنی پھیل گئی۔ یہ روشنی درمیان والے ہیلی کاپٹر سے پھینکی گئی تھی۔ شاید وہ لوگ روشنی کے بموں کے
لیعہ جنگل میں موجود ہر چیز کو دیکھنا چاہتے تھے۔ یہ ہمارے لیے پریشان کُن بات تھی اور خطرناک بھی ہو سکتی تھی مگر غا باً وہ ہمیں اور ہماری
پ کو نہ دیکھ سکے۔ ہیلی کاپٹر کی گڑگڑاہٹ کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو گئی مگر ہمارے جذبات میں تلاطم اور لرزش پیدا کر گئی۔

"اب کیا ہو گا؟" مبارک بولا۔

سجاد نے کہا: "معلوم ہوتا ہے اُنہیں ہیڈ کوارٹر کی تباہی کا عِلم ہو چکا ہے یا پھر وہ معمول کے حفاظتی مشن پر ہیں۔"

"اُنہیں ہیڈ کوارٹر کی تباہی کا عِلم نہ بھی ہو گا تو اب ہو جائے گا۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔ "فی الحال ہمارے لیے پناہ کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ نہ ہم
علاقے کے بارے میں کچھ جانتے ہیں۔ اس لیے صرف ایک ہی راستہ ہے ہمارے سامنے۔"

"وہ کیا؟" وہ دونوں ہم آواز ہو کر بولے۔

"ہمیں واپس بستی تک چلنا چاہیئے۔ وہاں ہمیں وقتی طور پر پناہ مل سکتی ہے اور مزید معلومات بھی حاصل ہو سکتی ہیں۔"

"موت کے مُنہ میں پھر واپس جاؤ گے؟" سجاد تیز آواز میں بولا۔

"اس کے سوا کوئی اور چارہ بھی نہیں ہے۔" میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "ہم جیپ لے کر بھاگیں گے تو وہ اُوپر سے دیکھ لیں گے
ی نظروں میں آ گئے تو ہم کتنی دُور اُن سے بھاگ سکتے ہیں؟ اگر اسی کھلی اور غیر محفوظ جگہ کھڑے رہے تو وہ دوبارہ واپس آئیں گے۔ اور ہمیں
ن کر رکھ دیں گے۔ یہاں چھپنے کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے اور پھر یہ مت بھُولو کہ ہمارے پاس کھانے پینے کا سامان بھی نہیں ہے۔ کھلے آسمان
نیچے کب تک اِن کی عقابی نظروں سے بچے رہیں گے؟ اور اگر درختوں کے ذخیرے میں چھپ بھی گئے تو بھُوکے پیاسے مر جائیں گے۔ ہمیں
ھر واپس چلنا چاہیئے۔"

اِن دونوں نے میری رائے سے اتفاق کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔ میں نے فوراً جیپ کو ریورس کیا اور پوری رفتار سے اُس راستے پر دوڑا
س سے ہم گزر کر آئے تھے۔ واپسی کے سفر میں ہم تینوں بالکل خاموش، اپنی سوچوں اور تفکرات میں گُم تھے۔ خدا جانے کتنی دیر ہم سفر کرتے رہے۔
ں لگا جیسے واپسی میں ہم نے راستہ جلدی طے کر لیا۔ سامنے بستی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ ہر چیز اُسی حالت میں تھی جس میں ہم چھوڑ کر گئے
تو بھی جیپیں کھلے میدان میں کھڑی تھیں۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میں نے اُن جیپوں سے ذرا ہٹ کر اپنی جیپ کھڑی کر دی اور کود کر بستی کی
بھاگا۔ جاتے جاتے سجاد اور مُبارک کو ہدایت کر گیا کہ وہ بدستور جیپ میں بیٹھے رہیں جب تک کہ میں واپس آ کر اُنہیں نہ بلاؤں یا انہیں بستی میں
ا اشارہ کروں۔

میں تیزی سے شیلا کی جھونپڑی کی طرف بڑھا۔ دروازے کی کُنڈی بدستور لگی ہوئی تھی۔ دروازے کے پٹ کھول کر اندر دیکھا تو منظر وہی تھا
پہلے دیکھ چکا تھا۔ شیلا رسیّوں سے بندھی نیم دراز تھی۔ کچھ فاصلے پر اُس کا شوہر پڑا ہوا تھا اور صاف ظاہر ہے کہ وہ ابھی مدہوش تھا۔
کھُلنے کی آواز پر شیلا نے گھبرا کر دیکھا مگر چہرہ کسی اور کی بجائے مجھے کھُلے دروازے میں کھڑا پایا تو اس کے چہرے پر خوشی کے تاثرات نمودار
میں لپک کر اُس کی طرف گیا۔ "کیا بات ہے؟" وہ میرے پریشان چہرے کو دیکھ کر بولی۔ "لوٹ کر کیوں آ گئے ہو؟"

میں نے مختصر الفاظ میں اُسے صورتحال سے آگاہ کیا۔ "ان لوگوں کو ہیڈ کوارٹر پہنچ کر سب کچھ معلوم ہو جائے گا اور پھر وہ ہماری تلاش میں سارا
جان مار دیں گے۔ ہو سکتا ہے وہ مزید فوجی امداد بھی بلا لیں۔"

شیلا ایک دم گھبرا گئی۔ "اب کیا ہو گا بھیا؟"

"اللہ مالک ہے۔" میں نے یہ فقرہ اُس سے زیادہ خود اپنے آپ کو تسلی دینے کے لیے کہا تھا۔ "اچھا سنو۔ آس پاس کوئی چھپنے کی جگہ ہے؟ کوئی
رت جس میں تہہ خانہ ہو؟ یا کوئی غار وغیرہ؟"

"الیسی تو کوئی جگہ نہیں ہے۔" وہ فکرمند ہو کر بولی۔ "اور پھر دن نکلنے تک تو ساری بستی جاگ جائے گی۔ فوجی سپاہی بھی ہوش میں آ جائیں گے۔ اتنے بہت سے لوگوں سے کیسے بچو گے؟"

واقعی اس کی بات معقول تھی۔ واپس بستی کا رُخ کرتے وقت میں نے یہ پہلو نظر انداز کر دیئے تھے۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے بلند آواز سے کہا۔ "ہمارا یہاں ٹھہرنا خطرناک ہے۔ خود ہمارے لیے بھی اور تیرے لیے بھی۔" یہ کہہ کر میں تیزی سے پلٹا۔

"کہاں جاؤ گے؟" اُس نے مجھے پکارا۔

اس سوال کا جواب تو خود میرے پاس بھی نہیں تھا۔ شیلا نے مجھے مزید پریشانی میں ڈال دیا تھا۔ "یہ جنگل کتنا گھنا ہے؟ اس میں ہم لوگ چھپ سکتے ہیں؟" میں نے رُک کر سوال کیا۔

"سامنے والا جنگل تو بہت گھنا ہے۔" وہ بولی۔ "پر وہ جب ڈھونڈنے آئیں گے تو بہت سارے فوجی ساتھ لائیں گے۔ میں نے تو سُنا ہے کر وہ شکاری کتے بھی لے کر آتے ہیں۔ ان سے بچنا بہت مشکل ہے۔"

میرا ذہن قریب قریب ماؤف ہو چکا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں؟ مجھے یہ بھی احساس تھا کہ میرے پاس مہلت زیادہ نہیں ہے۔ ہیڈکوارٹر پہنچ کر انہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ شیلا کا یہ خیال بھی غلط نہ تھا کہ وہ فوری طور پر مزید کمک منگائیں گے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ تباہی پھیلانے والے زیادہ دُور نہیں جا سکتے۔ وہ سرحدوں کی اور زیادہ مضبوطی سے ناکہ بندی کر دیں گے اور علاقے کا چپہ چپہ چھان ماریں گے۔ تباہی اور ناکامی کی جھنجلاہٹ انہیں چین نہ لینے دے گی جب تک کہ وہ اپنے مطلوبہ مجرموں کو کھوج نہ لیں۔

"شیلا۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ میری خود سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کہاں جاؤں گا۔ کیا کروں گا؟ مگر یہاں رُکنا بھی مناسب نہیں ہے۔ اپنے ساتھ تمہاری زندگی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا۔" یہ کہہ کر میں جانے کے لیے مڑا۔

"بھیا۔" اُس نے مجھے پکارا۔ "میرے ہاتھ پیر کھول دو۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔"

"کہاں؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"جہاں تم جاؤ گے۔"

"پگلی میری زندگی کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔"

"جیون مرن تمہارے ساتھ ہو تو اس سے بڑی بات اور کیا ہو گی؟ بھگوان کرے میری عمر بھی تمہیں لگ جائے۔ میں اپنی جان وار کر تمہیں لوں گی۔"

میں اس کی سادگی اور بے لوث پیار پر ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔ مجھے اُس پر اس قدر پیار آیا کہ میں دوبارہ اس کے پاس پہنچ کر دوزانو بیٹھ گیا۔ میں نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چومے۔ اُنہیں آنکھوں سے لگایا۔ میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ یوں لگا جیسے بس یہی زندگی کا مقصد ہے۔ یہی منزل ہے اور یہی انجام زِلیست۔ چاہے جو آفت آئے، قیامت آئے مگر مجھے بہن کی محبت کے سائے تلے بیٹھ جانا چاہیے۔ موت آئے گی تو ہم دونوں کو ساتھ ہی آئے گی۔ شیلا کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ نکلے۔ "سارے جیون میں ایک بھائی ملا۔ وہ بھی اتنی تھوڑی دیر کے لیے اور پھر میرا اور میرے دیس کا دشمن۔ میرے دیس والے اس کے خون کے پیاسے۔ ہائے بھگوان۔ یہ کیا انوکھا رشتہ بنایا ہے تو نے؟" وہ سسکیوں سے رونے لگی۔ بخدا۔ اُس وقت میرے جذبات نے مجھے بالکل اندھا کر دیا۔ جی چاہا زندگی کے جتنے بھی لمحات باقی ہیں اس مُنہ بولی بہن کے محبت بھرے سائے میں گزار دوں۔ موت آئے بھی تو اس کے آنچل کی چھاؤں میں۔ میرا دل بھر آیا۔ شیلا کے لیے میرے دل میں پیار نے اس شدت سے زور مارا کہ اگر میری سگی بہن بھی ہوتی تو شاید اس موقعے پر میرے جذبات اس سے زیادہ شدید نہ ہوتے۔ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "شیلا۔ میری بہن۔ تو مجھے اچانک اس طرح کیوں مل گئی۔ تو نے میرے وطن سے دُور کیوں جنم لیا؟ تیرا دیس، تیرا مذہب مجھ سے الگ کیوں ہے؟ ہم کیسے بھائی بہن ہیں کہ چاروں طرف سے دشمن کے خونی سمندر میں گھرے ہوئے ہیں۔ نہ تیرے پاس رہ سکتا ہوں، نہ تجھے اپنے ساتھ لے جا سکتا ہوں۔ نہ تو مجھے اپنے دامن میں پناہ دے سکتی ہے، نہ میں تیری جان بچا سکتا ہوں۔"

شیلا خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس کے چہرے پر ایسی ممتا، ایسا پیار تھا کہ نظر ہٹانے کو

جی نہیں چاہتا تھا۔ میں نے بے اختیار اس کو لپٹا لیا۔ یوں لگا جیسے میں اپنی ماں کی آغوش میں ہوں۔ ماں کی آغوش کی گرمی تو مجھے یاد نہیں تھی مگر دل نے کہا کہ وہ بھی اس سے مختلف نہیں ہو گی۔

یکایک باہر سے جیپ کے ہلکے ہارن کی آواز آئی اور میں چونک پڑا۔ ایسا محسوس ہُوا جیسے خواب سے بیدار ہو گیا ہوں۔ شیلا کے پاس آ کر میں یہ بھی بھول گیا تھا کہ باہر میرے دو اور ہم وطن فوجی میرے منتظر ہیں اور مجھے صرف اپنی ہی نہیں، اُن کی زندگی کی بھی فکر کرنی ہے۔ پھر مجھے مادرِ وطن کا خیال آیا جس نے مجھے گود میں کھلا کر پرورش کر کے اتنا بڑا کیا تھا۔ جس کا پیار میرے اور اپنے سارے بیٹوں کے لیے بے کراں تھا، لازوال تھا۔ اس کی مٹی سے میرا رشتہ خون کے تمام دوسرے رشتوں سے بالاتر تھا۔

میں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ شیلا کے سر کو تھپکا اور کھڑا ہو گیا۔ شیلا نے بھی غالباً میرے دل و دماغ میں پیدا ہونے والے خیالات کو بھانپ لیا تھا۔ ہمارے درمیان محبت کے رشتے بہت گہرے اور وسیع تھے مگر وہ اور میں دونوں جانتے تھے کہ ان کے درمیان ایک سرحد بھی ہے۔ جسے عبور کرنا ہم دونوں کے لیے ناممکن ہے۔ وہ خاموشی سے، آنسو بھری نگاہوں کے ساتھ مجھے دیکھتی رہی۔ پھر سرگوشی کے انداز میں اس کے ہونٹوں نے حرکت کی۔ "جاؤ بھیا۔ بھگوان تمہاری سہائتا کرے۔"

میں قریب قریب بھاگتا ہُوا اس کی جھونپڑی سے باہر نکلا۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر اس کے پاس ٹھہروں گا تو ڈانواڈول ہو جاؤں گا۔ کشمکش میں گرفتار ہو جاؤں گا۔ فیصلے اور عمل کی قوّت سے محروم ہو جاؤں گا، اس لیے شیلا پر دوسری نگاہ ڈالے بغیر میں اس کی جھونپڑی سے باہر نکل گیا مگر باہر نکل کر صدمے کی گُنڈی بند کرنا نہ بھولا۔ جھونپڑی کے باہر بالکل خاموشی تھی۔ ایک لمحہ رُک کر میں نے آہٹ لینے کی کوشش کی۔ خاموشی کی آواز کے سوا کوئی دوسری صدا نہ تھی۔ سوچنے کی صلاحیت پہلے ہی سلب ہو چکی تھی۔ میں ایک کھوئے ہوئے انسان کی طرح تاریکی میں کھڑا آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میرا ذہن سلیٹ کی طرح بالکل صاف تھا۔ انسان بھی عقل و شعور سے بہرہ مند ہونے کے باوجود بعض اوقات کتنا بے بس اور بے عقل ہو جاتا ہے۔ عقل و شعور اور دانش بھی ایک خاص منزل تک ہی ساتھ دیتے ہیں۔ شاید دیوانگی اسی کو کہتے ہیں!؟

میں نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ یکایک تاریکی سے ایک سایہ نمودار ہُوا اور دوسرے لمحے میں اس کی گرفت میں تھا۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ میں سنبھل نہ سکا اور زمین پر گر گیا۔ میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت یک دم لوٹ آئی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں اپنی مدافعت میں کوئی حرکت کرتا ایک نرم آواز میرے کانوں کے پاس سنائی دی۔ "رامو تو کتنا جھوٹا ہے۔ اتنی دیر ہو گئی، آیا کیوں نہیں؟"

اتنی دیر میں مجھے احساس ہو چکا تھا کہ آنے والا سایہ ایک عورت کا تھا۔ میں نے اُسے ہٹانا چاہا مگر نرم و ملائم ہونے کے باوجود اس کی گرفت میں بہت مضبوطی تھی۔

"ڈرتا کیوں ہے؟ اُدھر تو سب دارو کے نشے میں اُلٹے پڑے ہیں۔ میں کب سے تیرا انتظار کر رہی ہوں۔ چل اب مجھے موٹر میں سیر کرا۔"

یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ وہ مجھے محافظ فوجیوں میں سے ایک سمجھ رہی تھی۔ گاؤں کی عورتوں کے لیے فوجی وردی میں ایک نرالی کشش ہوتی ہے۔ یہ مختصر رومان پچھلے چند گھنٹوں کے دوران ہی چڑھا ہو گا۔ "ارے بولتا کیوں نہیں؟" اُس نے مجھے جھنجھوڑ دیا۔

"تو سوئی نہیں ابھی تک۔" مجھے اس کے سوا کوئی بات نہیں سُوجھی۔

"تو نے ملنے کا وعدہ کیا تھا سوتی کیسے؟ جسونت تو انا غیل ہو گیا پر بڑھیا کسی طرح سونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ بڑی ہوشیار نیند ہے اس کی۔ جب بھی میں بستر سے اُٹھتی وہ آواز مار دیتی۔ 'کون ہے؟ کہاں چلی ہے؟' میں بھلا پانی پینے کا بہانہ کب تک کرتی۔ بس اسے افیم کی ایک اور گولی دے کر آئی ہوں۔ اچھا۔ اب دیر نہ کر۔ کیا یہیں باتیں کرتے ہُوئے سویرا کر دے گا؟" یہ کہہ کر وہ اُٹھ کھڑی ہُوئی مگر میرا بازو ابھی تک اُس کی گرفت میں تھا۔ ایک جھٹکے سے اُس نے مجھے بھی کھینچ کر اُٹھا لیا۔ وہ ایک صحت مند اور قد آور عورت تھی۔ میں تاریکی میں اس کا چہرہ ٹھیک طرح نہیں دیکھ سکا اور نہ ہی وہ میرا چہرہ دیکھ سکی۔ ورنہ مجھے پہچان لیتی۔ مجھے خاموش اور پس و پیش میں دیکھا تو تیز آواز میں کہنے لگی۔ "رامو۔ تو نے دارو تو نہیں پی لی۔ تو نے تو مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اسے مُنہ بھی نہیں لگائے گا۔"

"نہیں نہیں۔" میں اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا تھا۔

"جھوٹے۔ ذرا اپنا مُنہ تو سونگھنے دے۔" اُس نے ایک جھٹکے سے میرا چہرہ اپنی طرف گھمایا۔ یہ حرکت اتنی خلافِ توقع تھی کہ میرے سنبھلنے سے

پہلے وہ اور میں ایک دوسرے کے رُوبرُو کھڑے تھے۔ میں نے دیکھا کہ وہ تیکھے نقوش کی ایک خوش شکل عورت ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ بھی میرا چہرہ دیکھ چکی تھی۔ ایک ثانیے کے لیے اس نے اپنی بڑی بڑی چمک دار آنکھوں سے مجھے دیکھا اور پھر اس طرح سٹ کر پیچھے ہٹی جیسے بجلی کا کرنٹ لگ گیا۔

"تم راموتو نہیں ہو۔ کون ہو تم؟" وہ غصیلی مگر دبی آواز میں بولی۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا اس کی آنکھوں میں شک وشبہ کی ایک برق سی لہرائی اور وہ چلاّ کر بولی "پہچان گئی۔ تم۔ تم قیدی ہو۔ میں نے دن کے وقت تمہیں دیکھا تھا" یہ کہہ کر وہ تیزی سے مجھ سے دُور ہو گئی اور پھر اُس جھونپڑی کی طرف بھاگی جہاں مجھے قید رکھا گیا تھا مگر میں تو خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ چند لمبے لمبے ڈگ بھر کر میں اس کے قریب پہنچ گیا۔ وہ مجھ سے زیادہ تیز نہیں بھاگ سکتی تھی میں نے اسے پکڑنا چاہا تو وہ چیخ کر بولی "مجھے مت چھونا میں شور مچا کر سب کو بلا لوں گی"۔

بستی والے بے ہوش اور نشے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اس کی چیخ کون سنتا۔ پھر بھی میں کسی قسم کا خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھا۔ میں نے اسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ مگر اس نے بے تحاشا چیخنا چلاّنا شروع کر دیا۔ ایک ہاتھ اس کے منہ پر جما کر میں نے اسے بے قابو کرنے کی کوشش کی۔

اُس نے پوری قوت سے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیئے پھر بھی اُس کا میرا کوئی مقابلہ نہ تھا۔ اس کی چیخوں کی آواز سن کر مبارک اور سجاد بھاگے ہوئے آئے۔ مجھے ایک عورت کے ساتھ گتھم گتھا ہوتے دیکھا تو ان کے قدم وہیں رُک گئے۔

"سر!" مبارک نے حیرت اور بے اعتباری سے مجھے دیکھا۔

"پکڑو اسے" میں نے اُسے حکم دیا "نہ جانے کہاں سے نکل کر آگئی ہے۔ ہمارے لیے کوئی نئی مصیبت نہ کھڑی کر دے"۔

مبارک نے آگے بڑھ کر عورت کو پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ بے اختیار ٹھوکریں اور لاتیں مار رہی تھی۔ میں نے اس کے منہ پر سے ہاتھ اُٹھایا تو اس نے مبارک کے ہاتھوں پر دانت گاڑ دیئے۔ ضبط کے باوجود اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ عورت کی جدوجہد تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوف کی جھلک صاف نظر آ رہی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ اب وہ اپنی عزت اور جان بچانے کے لیے ہاتھ پیر مار رہی تھی۔

مبارک تکلیف سے منہ بنائے اپنے زخمی ہاتھ کو دیکھ رہا تھا۔ سجاد کے منہ سے بے اختیار قہقہہ نکل گیا۔ واقعی صورتِ حال ہی کچھ ایسی تھی۔ یہ عورت ہم دو مردوں کے قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ آخر میں نے اس کی گردن پر کراٹے کی ایک ضرب لگائی اور وہ ایک دم بے جان ہو کر میرے بازوؤں میں جھول گئی۔

"سر۔ یہ مصیبت کون ہے۔ کہاں سے آگئی" مبارک نے مجھ سے پوچھا۔

"مجھے کیا معلوم" میں نے جھلا کر کہا "اس کے بارے میں میں بھی اتنا ہی جانتا ہوں جتنا تم جانتے ہو۔ اب اسے گھسیٹ کر کسی جھونپڑی کے سامنے ڈال دو۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے"۔

مبارک نے مستعدی سے میری ہدایت پر عمل کیا اور بے ہوش عورت کو ایک قریبی جھونپڑی کے دروازے پر ڈال دیا۔

"شیلا ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتی" میں نے انہیں بتایا۔ "اور خود اس کے لیے بھی ہمارا یہاں رہنا خطرے سے خالی نہ ہوگا"۔

"لیکن سر۔ آس پاس جنگلوں میں کوئی چھپنے کی جگہ تو ہو گی؟" مبارک نے پوچھا۔

"نہیں۔ ایسی کوئی جگہ نہیں ہے۔ اور پھر ہم قریبی جنگلوں میں کب تک پوشیدہ رہ سکتے ہیں؟" میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔ "دشمن زخمی سانپ کی طرح انتقام لینے کے لیے بیتاب ہے۔ وہ اس علاقے کا ایک ایک کونا چھان ماریں گے۔ بہتر یہی ہے کہ ہم جتنی جلدی ممکن ہو سکے یہاں سے رُخصت ہو جائیں"۔

"مگر جائیں گے کہاں؟" سجاد نے تشویشناک لہجے میں پوچھا۔

"خدا بہتر جانتا ہے۔ اگر زندگی ہوئی تو بچ جائیں گے ورنہ اس سے پہلے بھی تو ہم موت کے دہانے پر ہی کھڑے تھے"۔

"ٹھیک کہتے ہیں سر" مبارک فلسفیانہ لہجے میں بولا "جس خدا نے ہمیں اُن شیطانوں سے بچایا ہے اگر اسے ہماری زندگی منظور ہوئی تو پھر بچا لے گا ورنہ مرنا تو برحق ہے۔ مگر سر۔ خدا کی قسم۔ اپنے ساتھ کئی سو کو لے کر مریں گے"۔

"اچھا۔ چلو۔ اب وقت نہیں ہے ہمارے پاس۔ ہمیں جتنی جلدی ممکن ہو یہاں سے حتی الامکان بہت دُور پہنچ جانا چاہیئے"۔

ہم تیزی سے جیپ کی طرف لپکے۔ سجاد پُوچھنے لگا "ایک جیپ اور لے چلیں؟"

"وہ کس لیے؟" میں نے حیران ہو کر پُوچھا۔

وہ بولا "اتنی بہت سی جیپیں یہاں بیکار کھڑی ہیں۔ اور پھر ہو سکتا ہے ہمیں دوسری جیپ کی بھی ضرورت پڑے"۔

"دیکھو سجاد۔ ہم لوگوں کا یکجا رہنا ضروری ہے۔ علیحدہ علیحدہ ہو کر ہم کسی اَن جانی مُصیبت میں گرفتار ہو سکتے ہیں۔ جب جینا مرنا ساتھ ہی ہے تو پھر دو گاڑیوں میں سفر کرنے کی کیا تُک ہے؟"

"سر آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں مگر ناراض نہ ہوں تو ایک بات کہوں؟" مبارک نے سنجیدگی سے کہا۔

"ہاں ہاں۔ کہو"

"سر ہم نے اس جیپ میں بہت لمبا سفر کر لیا ہے۔ پٹرول کم ہو گیا ہو گا۔ اگر ہم دوسری جیپ لے لیں تو ٹھیک نہ ہوگا؟"

"بھئی مبارک۔ تمہیں بہت اچھی سوجھی ہے۔ میرا تو اس طرف دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ اس کے علاوہ دوسری جیپوں میں اگر پٹرول کے فالتو بھرے ہوئے ڈبے موجود ہوں تو ہمیں وہ بھی ساتھ رکھ لینے چاہیئیں"۔

تجویز معقول تھی۔ چنانچہ ہم نے فوراً اپنی مشین گنیں اور گولیوں کا ذخیرہ دوسری جیپ میں منتقل کر دیا۔ مبارک اور سجاد نے تلاش کر کے پٹرول سے بھرے ہوئے دو ڈبے بھی برآمد کر لیے۔ مبارک کا خیال تھا کہ ہمیں کھانے پینے کا کچھ سامان بھی ساتھ رکھ لینا چاہیئے مگر کھانا تو اس وقت دستیاب ہونے کا سوال ہی نہیں تھا۔ پانی رکھنے کے لیے ہمارے پاس کوئی بوتل یا تھرمس وغیرہ نہیں تھا۔ کسی جھونپڑی کے اندر جا کر کھانا یا پانی کے لیے برتن تلاش کرنا عقلمندی سے بعید تھا۔ ہم کسی مشکل میں پھنس سکتے تھے اور پھر ایک ایک منٹ ہمارے لیے قیمتی تھا۔

جب ہم اپنی نئی جیپ میں سوار ہو کر روانہ ہونے لگے تو میرا دل بے اختیار شیلا سے ایک بار پھر مُلاقات کرنے کو چاہا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اُسے اپنے پیچھے چھوڑنا مجھے کسی طرح گوارا نہ تھا۔ کتنی خواہش تھی کہ یا تو اُسے اپنے ساتھ لے چلوں یا پھر خود اس کے پاس ہی رہ جاؤں مگر ان دونوں میں سے کوئی بات ممکن نہ تھی۔ میری چھٹی حس مجھے اس کے بارے میں متفکر کر رہی تھی۔ مجبوراً صبر کا پتھر سینے پر رکھا اور جیپ سٹارٹ کر دی۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا سگی اور ماں جائی بہن کے لیے بھی بھائیوں کے دل میں ویسی ہی محبت اور کسک پیدا ہوتی ہے، جیسی میں اپنے سینے میں محسوس کر رہا تھا؟ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے کلیجہ مسل کر پھینک دیا ہو۔ مگر یہ بھی جانتا تھا کہ اس کے سوا کوئی دُوسرا چارۂ کار نہ تھا۔ "خدایا" میں سوچنے لگا "اگر تو انسانوں کے دلوں میں پیار کا ایسا لازوال جذبہ پیدا کرنے پر قادر ہے تو پھر اُن کو اتنا بے بس کیوں کر دیتا ہے کہ وہ اپنوں سے بچھڑ کر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں؟!"

جیپ نے سٹارٹ ہونے میں ذرا بھی دیر نہیں لگائی۔ ہمارے سامنے نہ کوئی راستہ تھا، نہ کوئی منزل۔ مگر پھر بھی ہمیں ان جانے راستوں اور اَن دیکھی منزل کی طرف گامزن ہونا تھا۔ ابھی ہم بستی سے زیادہ دُور نہیں گئے تھے کہ مبارک نے یکایک کان لگا کر غور سے کچھ سننے کی کوشش کی اور پھر اس کے چہرے پر تشویش کے آثار نمودار ہوئے۔

"سر۔ ذرا سنیئے"

میں اور سجاد دونوں سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہو گئے۔ مگر کوئی آواز سنائی نہ دی "سر۔ درختوں کے پیچھے جیپ روک دیجئے" مبارک بولا۔ میں نے جیپ درختوں کے ایک جھنڈ کے نیچے روک دی۔

"تمہارے تو خواہ مخواہ کان بجتے ہیں" سجاد جھلاّ کر مبارک سے مخاطب ہوا مگر میں نے اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ واقعی مبارک کا کہنا صحیح تھا۔ ایک بھنبھناہٹ کی آواز بہت فاصلے سے آتی ہوئی سنائی دے رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے مکھی بھن بھن کر رہی ہو۔ میں نے چونک

ہو کر اُن دونوں کی طرف دیکھا۔ اب سجاد نے بھی شاید آواز سُن لی تھی اور اس کے چہرے پر سنجیدگی طاری ہو گئی تھی۔

"یہ تو ہیلی کاپٹر ہے۔" میں نے کہا۔

"اور اسی طرف آ رہا ہے۔" سجاد بولا۔

"سر، یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا؟" مبارک نے پوچھا۔

"یہ وہی ہیلی کاپٹر ہیں جو ہمیں ہیڈ کوارٹر کی طرف جاتے ہوئے نظر آئے تھے۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔ "ہیڈ کوارٹر کے علاوہ دوسری جگہ یہی بستی ہی ہو سکتی ہے جہاں اُن لوگوں نے اپنے قیدی اور فوجی محافظ منتقل کر دیئے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ حالات کا اندازہ لگانے کے لیے بستی کی طرف آئیں گے۔"

مُبارک فوراً مشین گن اُٹھا کر ایکشن میں ہو گیا۔ "بس تو جی۔ مارنے مرنے کے لیے تیار ہو جانا چاہیئے۔"

مشین گن میں نے اور سجاد نے بھی سنبھال لی تھی۔ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ ہمیں بستی کے نزدیک رہ کر ہیلی کاپٹر میں سوار دُشمن کا مقابلہ کرنا چاہیئے یا جنگل میں دُور نکل جانا چاہیئے۔ ذہن فوری طور پر کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر تھا مگر فیصلہ خود بخود ہو گیا۔ اس لیے کہ ہیلی کاپٹر کی آواز نہایت تیزی سے ہمارے نزدیک آ رہی تھی اور بھاگ کر کہیں دُور جانے کی مہلت نہ تھی۔ میں نے جیپ کو درختوں کے ذخیرے میں اور آگے لیجا کر روک دیا۔ اب ہمارے اور بستی کے درمیان بہت سے درختوں کی شاخیں اور تنے حائل تھے۔ ہم بستی کو صاف طور سے دیکھ سکتے تھے مگر اُس طرف سے کسی کا ہمیں دیکھ لینا قریب قریب ناممکن تھا۔ تاریکی اور درختوں نے ہمیں ایک محفوظ پناہ گاہ فراہم کر دی تھی۔ اس اثنا میں ہیلی کاپٹر کی آواز بالکل نزدیک آ چکی تھی۔ یہاں تک کہ چند لمحے بعد ہم نے ہیلی کاپٹر کو بھی دیکھ لیا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ ہیلی کاپٹر میں موجود لوگ بہت عجلت میں ہیں اور جلد سے جلد فاصلہ طے کرنے کے خواہش مند ہیں۔ جب ہم نے بستی کی طرف آتے ہوئے ہیلی کاپٹروں کو ہیڈ کوارٹر کی طرف پرواز کرتے ہوئے دیکھا تھا تو اُن کی رفتار اتنی تیز نہ تھی۔

پہلے آسمان پر ہیلی کاپٹر کا ہیولا نمودار ہوا اور پھر ہیلی کاپٹر صاف نظر آنے لگا۔ مشین گنوں پر ہم تینوں کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ بستی کے سامنے کھیت اور کھلا میدان تھا جو ہیلی کاپٹر کے اُترنے کے لیے نہایت موزوں تھا اور ہیلی کاپٹر کے پائلٹ نے بھی بہت جلد اس خیال کی تصدیق کر دی۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ہیلی کاپٹر اُس میدان میں لینڈ کر گیا۔ کچھ دیر پنکھوں کا شور جاری رہا اور تیز ہوا آندھی کی طرح چاروں پھیل گئی۔ اس ہوا میں گرد و غبار کی آمیزش بھی تھی۔ ہمیں یوں محسوس ہُوا جیسے یک لخت آندھی اور طوفان نے ہمیں گھیر لیا ہے مگر پھر رفتہ رفتہ اس میں کمی واقع ہونے لگی۔ ہیلی کاپٹر کے پنکھوں کی رفتار کم ہو گئی مگر پنکھے بند نہیں ہُوئے۔ ہم سانس روکے آنے والے واقعات کا انتظار کر رہے تھے۔ کچھ دیر تک ہیلی کاپٹر میں سے کوئی باہر نہیں نکلا۔ شاید وہ لوگ آس پاس کے ماحول اور حالات کا جائزہ لے رہے ہوں گے۔ پھر ہیلی کاپٹر کا دروازہ کھلا اور اُس کے اندر سے یکے بعد دیگرے چار مسلح فوجی کُود کر باہر نکلے۔ باہر آتے ہی انہوں نے اپنی برین گنوں کو محتاط انداز سے سامنے تان لیا اور پھر چاروں نے چار مختلف سمتوں کی طرف چہرے کر لیے۔ وہ کسی بھی متوقع حملے کے لیے بالکل تیار تھے۔ اُدھر ہمارے اعصاب بھی تن کر ٹوٹنے کے نزدیک تھے۔ ایک اشارے کی دیر تھی اور ہماری مشین گنیں ان پر گولیوں کی بارش کر دیتیں۔ مبارک اور سجاد نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا مگر میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اُنہیں فائر کھولنے سے منع کر دیا۔

چاروں فوجیوں نے جب کسی طرف دُشمن کے آثار نہ پائے اور نہ کوئی مزاحمت نظر آئی تو وہ بستی کی طرف رُخ کر کے آگے پیچھے قطار کی شکل میں بستی کی طرف چل پڑے۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ ہیلی کاپٹر میں موجود پائلٹ نے ان کے ہمراہ باہر آنے کی کوشش نہیں کی۔ اتنی دُور سے یہ معلوم کرنا بھی ممکن نہ تھا کہ ہیلی کاپٹر میں اَب اور کتنے فوجی موجود ہوں گے۔ لیکن یہ فور سیٹر ہیلی کاپٹر تھا۔ پائلٹ کے علاوہ اس میں چار سے زائد افراد کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ پھر بھی محض اندازے کی بنا پر جوش و جذبات سے مغلوب ہو کر جلد بازی میں کوئی قدم اُٹھانا ہمارے حق میں خودکشی کے مترادف ہوتا۔ چاروں فوجی بڑے چوکس ہو کر بستی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یہاں تک کہ ایک جھونپڑی کے پاس رُک گئے۔

وہ مکمل حالتِ جنگ میں تھے اور پوری پوزیشن لیے ہوئے تھے۔ وہ جھونپڑی میں موجود امکانی دُشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے بالکل مستعد

اور تیار تھے مگر پھر کوئی آہٹ یا مزاحمت نہ پائی تو اُنہوں نے بُلند آواز میں پُکارنا شروع کر دیا۔ "اندر کون ہے باہر آ جاؤ۔"

اندر سے کوئی جواب نہ مِلا تو ایک فوجی نے کرخت لہجے میں پُکار کر کہا۔ "اندر جو کوئی بھی ہے باہر آ جاؤ۔ ورنہ جھونپڑی کو اُڑا کر رکھ دیں گے۔"

اندر پھر بھی خاموشی رہی تو ایک فوجی پھونک پھونک قدم رکھتا ہوا آگے بڑھا۔

یکایک اس کے مُنہ سے ایک آواز نکلی اور وہ رُک گیا۔ باقی تینوں فوجی فوراً زمین پر گر گئے۔ یہ غنیمت ہے کہ اُنھوں نے فائرنگ شروع نہ کر دی۔ سامنے والے فوجی نے جھک کر دیکھا اور پھر اپنے ساتھیوں کو آواز دے کر بُلایا۔ دراصل اس کو وہ بے ہوش عورت زمین پر پڑی ہوئی نظر آ گئی تھی جس سے ہم نے بمشکل جان چھُڑائی تھی۔ فوجیوں نے عورت کے پاس بیٹھ کر اس کا جائزہ لیا اور پھر حیرانی اور شک و شبہ سے آس پاس نظریں دوڑائیں۔

ایک فوجی نے آگے بڑھ کر جھونپڑی کے دروازے پر لگی ہوئی کُنڈی کھول دی اور پھر زور سے ٹھوکر مار کر دروازہ چوپٹ کھول دیا۔ اندر اسے مدہوش انسانوں کے سوا اور کیا نظر آ سکتا ہے۔ اُس نے اپنے ساتھیوں کو پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور خود جھونپڑی کے اندر داخل ہو گیا۔ دو فوجی لپک کر اُس کے پیچھے چلے گئے مگر تیسرا عورت کے پاس ہی کھڑا رہ گیا۔ شاید رات کی تنہائی میں ایک جوان اور صحت مند عورت کو یوں نظر انداز کر کے چلا جانا اُس غریب کیلئے آسان کام نہ تھا۔ اِس لیے وہ اُس کے پاس ہی رُک گیا اور جُھک کر اسے زیادہ غور سے دیکھنے کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔

جھونپڑی کے اندر جانے والے تینوں فوجی جلد ہی باہر نکل آئے۔ اُن میں سے ایک نے اشارہ کیا اور وہ سب کے سب آس پاس کی جھونپڑیوں کی طرف چل پڑے۔ مجبوراً چوتھا فوجی بھی بیہوش عورت کے پاس سے اُٹھ کر ایک جھونپڑی کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ شیلا کی جھونپڑی تھی۔ جھونپڑی کا دروازہ کھول کر ایک فوجی اندر داخل ہوا اور پھر چند لمحے بعد وہ دروازے پر دوبارہ نمودار ہوا اور زور زور سے اپنے ساتھیوں کو پُکارنے لگا۔

اُس نے جھونپڑی کے اندر مدہوش فوجیوں اور شیلا کے خاوند کو دیکھ لیا تھا مگر اس کے لیے سب سے زیادہ ہیجان خیز بات غالباً شیلا کی موجودگی تھی جو ہوش میں تھی۔ تینوں فوجی پلٹ کر شیلا کی جھونپڑی کی طرف لپکے اور اندر چلے گئے۔ جھونپڑی میں صرف ایک لالٹین روشن تھی جس کی مدھم روشنی میں میرے لیے اتنے فاصلے سے کچھ دیکھنا ناممکن تھا مگر میں قیاس کر سکتا تھا کہ جھونپڑی کے اندر کیا ہو رہا ہو گا؟ انہوں نے شیلا کو رسیوں سے آزاد کر دیا ہو گا اور وہ اُنہیں کوئی من گھڑت کہانی سُنا رہی ہو گی۔

مجھے معلوم تھا کہ شیلا اُن کو کافی دیر تک معروف رکھے گی۔ اسے معلوم تھا کہ جب تک وہ اُنہیں باتوں میں لگائے رکھے گی، ہم لوگ اُن کی دست بُرد سے محفوظ رہیں گے۔ پھر مدہوش فوجیوں کو ہوش میں لا کر اُن سے احوال سُننا بھی ضروری امر تھا۔ چنانچہ کچھ دیر کے لیے یہ سب لوگ ہماری طرف سے بے خبر ہو کر رہ گئے تھے اور اُن کی توجہ دوسرے امور کی طرف مبذول ہو چکی تھی۔ شیلا نے ہمیں جو موقعہ فراہم کیا تھا اُس سے فائدہ اُٹھانا اَب ہمارا فرض تھا۔ کیونکہ شیلا غالباً اِس حقیقت سے آگاہ نہیں تھی کہ مزید چار اور ہیلی کاپٹر بھی ہماری کھوج میں لگے ہُوئے ہیں جبکہ ہم اپنی آنکھوں سے اپنے ان دشمنوں کو دیکھ چکے تھے۔ کچھ خبر نہ تھی کہ کیا وہ چاروں یا ان میں سے کوئی ہیلی کاپٹر اس طرف آ جائے۔ اس صورت میں ہمارے لیے مشکلات میں اضافہ ہو جاتا۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ جب تک چاروں فوجی شیلا کی جھونپڑی میں مصروف ہیں ہمیں ضروری کارروائی کرنے سے بالکل گریز نہیں کرنا چاہیئے۔ ہیلی کاپٹر کے پنکھے ابھی تک ہلکے ہلکے حرکت کر رہے تھے اور پائلٹ نے بھی باہر نکلنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ شاید اسے ہیلی کاپٹر کے اندر ہی ہنگامی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے کمربستہ رہنے کا حکم ملا ہو گا۔ وقت کی ڈوری مختصر ہوتی جا رہی تھی اور فوری عمل کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ میں نے مبارک اور سجاد کو جیپ میں بیٹھنے کی ہدایت کی اور بذاتِ خود کود کر دبے پاؤں ہیلی کاپٹر کی طرف بڑھا۔ جنگل میں تاریکی کا راج تھا۔ ہیلی کاپٹر بھی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کے اندر بھی کوئی لائٹ روشن نہ تھی۔ کسی ممکنہ حملے کا مقابلہ کرنے کے لیے ضروری تھا کہ وہ روشنی کے ذریعہ دُشمن کو باخبر یا متوجہ کرنے سے باز رہیں۔ یہ امر میرے لیے بہت سودمند ثابت ہُوا۔ میں مشین گن تھامے ہُوئے بے آواز مگر تیز قدموں سے ہیلی کاپٹر کے عقب میں بڑھا۔ اِس مشن پر روانہ ہونے سے

پہلے میں نے سجاد کو جیپ میں اپنی جگہ آفیسر انچارج مقرر کر دیا تھا اور اُسے ہدایت کر دی کہ اگر صورتِ حال خراب ہو جائے تو وہ اپنی صوابدید اور قوتِ فیصلہ سے کام لے۔ مناسب سمجھے تو فائرنگ شروع کر دے ورنہ جیپ لے کر بھاگنے کی کوشش کرے۔ حالانکہ مجھے بخوبی علم تھا کہ سجاد اور مبارک میں سے کوئی بھی یہ گوارا نہیں کرے گا کہ مجھے دُشمنوں کے نرغے میں چھوڑ کر اپنی جان بچانے کی کوشش کرے پھر بھی میں نے اُنہیں اپنی طرف سے آزاد کر دیا تھا۔

میں ہیلی کاپٹر کے نزدیک پہنچ گیا۔ یہاں تک کہ مجھے اندر بیٹھے ہوئے پائلٹ کا سر نظر آنے لگا۔ اس کی نظریں اور تمام تر توجہ سلنے جھونپڑی کی طرف تھی۔ وہ ہمہ تن اپنی نگاہوں کے سامنے پیش آنے والے ڈرامے کو دیکھنے میں کھویا ہوا تھا۔ یہی میرے لیے نادر موقعہ تھا۔ میں احتیاط سے چلتا ہُوا ہیلی کاپٹر کے دروازے تک پہنچ گیا۔ ارد گرد کا جائزہ لیا اور پھر بھونچال کی طرح ہیلی کاپٹر میں داخل ہو گیا۔ پائلٹ اس اچانک اور خلاف توقع حملے سے اتنا لوکھلایا کہ چند لمحے کے لیے ساکت رہ گیا۔ مجھے بھلا اس سے اچھا موقعہ کہاں مل سکتا تھا۔ میں ایک ہی جست میں اس کے سر پہ پہنچ گیا۔ اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کے واپس لوٹنے سے پہلے میری مشین گن کی خوفناک نالی اس کی دونوں آنکھوں کے سامنے تھی۔ اس کے چہرے پہ پیدا ہونے والے حیرت کے آثار خوف میں تبدیل ہو گئے۔

"خبردار" میں نے دبی آواز میں اُسے متنبّہ کیا "اگر آواز نکالی یا حرکت بھی کی تو تمہارے جسم کی ایک بوٹی بھی سلامت نہیں رہے گی۔"

وہ ڈری ڈری نظروں سے مجھے دیکھنے لگا "ہاتھ اُوپر اُٹھاؤ" میں نے ہدایت کی جس کی تعمیل اُس نے میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی کر دی۔ دوسرے ہاتھ سے میں نے اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ اس کی جیبوں میں کوئی اسلحہ نہ تھا۔ پھر میں نے اُس کے سامنے بورڈ کو دیکھا۔ وہاں بھی چیونگم کے ایک پیکٹ کے سوا کوئی اور چیز نظر نہ آئی۔ پھر بھی میں نے آس پاس ہر چیز کو کھنگال ڈالا۔ کوئی خطرناک چیز وہاں نظر نہ آئی۔ اب میں پائلٹ کی طرف متوجہ ہُوا۔

"باقی چار ہیلی کاپٹر کہاں ہیں؟" میں نے اس سے پُوچھا۔

"اُدھر" وہ سہمی ہُوئی آواز میں بولا "وہ ہیڈکوارٹر کے پاس ہیں" ڈر کے مارے اس کے مُنہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

"کیا وہ بھی تمہارے پیچھے آئیں گے؟"

"ہمارے کو خبر نہیں۔ بائی گاڈ۔ اپن نہیں جانتا۔"

میں اس کی بُزدلی پہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ شاید ہماری اور اُن کی فوج میں سب سے بڑا فرق بُزدلی اور بہادری کا ہی تھا۔ وہ موت کو سامنے پا کر دہل کر رہ گیا تھا۔ جبکہ ہمارے فوجی موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُسے للکارنا جانتے تھے۔

"بائی گارڈ۔ ہمارا بھروسہ کرو۔" وہ گھگھیا کر بولا۔

"ٹھیک ہے" میں نے بے پرواہی سے کہا "وائرلیس اُٹھاؤ۔"

اُس نے مشینی انسان کی طرح میرے حکم کی فی الفور تعمیل کی۔

"ہیڈکوارٹر پہ موجود لوگوں کو خبردار کر دو کہ بستی میں سب ٹھیک ہے۔ سب قیدی موجود ہیں اور ہم تلاش کے لیے آگے جا رہے ہیں۔"

اُس نے حرف بحرف میرے احکام کی تعمیل کی اور میں نے محسوس کیا کہ اس کی یہ رپورٹ خاص متاثر کن تھی جس کسی نے بھی یہ رپورٹ وصول کی تھی اس نے اپنے آفیسر کو پہنچا دی ہو گی اور اُس نے بھی یقین کر لیا ہو گا۔

ہیلی کاپٹر کے دروازے پہ کھڑے ہو کر میں نے دونوں ہاتھ ہلائے۔ مبارک اور سجاد کی نظریں یقیناً اس طرف لگی ہوئی ہوں گی۔ اُنھوں نے جیپ سے باہر نکل کر ہیلی کاپٹر کی طرف لپکنے میں ایک لمحے کی دیر بھی نہیں کی۔ ہیلی کاپٹر تک پہنچنے کے لیے اُنھوں نے بھی عقبی راستہ ہی استعمال کیا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ ہیلی کاپٹر کے اندر موجود تھے۔

"کیا خیال ہے؟" میں نے سجاد سے پُوچھا "ہمیں ہیلی کاپٹر میں بیٹھ کر روانہ ہو جانا چاہیئے۔"

"بالکل" اس نے جواب دیا "یہ تو ہمیں اللہ تعالیٰ نے بہترین چانس دیا ہے۔"

"اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے سر" مبارک نے بھی اس کی مزید تصدیق کرنا ضروری جانی۔

"تو پھر دیر کاہے کی ہے؟" اور پھر میں پائلٹ سے مخاطب ہُوا "چلو پارٹنر۔ آج تو اپنے ہیلی کاپٹر کو جیٹ بنا کر دکھا دو۔"

وہ خوف زدہ ہو کر پُوچھنے لگا "ہماری جان تو بچ جانے گی نا سَر؟"

"پتہ نہیں" میں نے جواب دیا "اگر شکایت کا موقعہ نہیں دو گے تو شاید بچ جاؤ گے۔"

وہ مستعدی سے اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ کوئی حرکت کرتا اچانک ایک زنانہ چیخ کی آواز گونجی اور ہم سب کی توجہ اس چیخ کی طرف مبذول ہو گئی۔ چیخ کی آواز نمایاں طور پہ شیلا کی جھونپڑی کی طرف سے آئی تھی۔ اس سے پہلے کہ ہم کچھ سوچ سکتے یکے بعد دیگرے کچھ اور چیخیں بُلند ہوئیں۔ میں نے بلا تامّل ہیلی کاپٹر سے باہر چھلانگ لگا دی۔

ہیلی کاپٹر سے چھلانگ لگانے کے بعد وہ کسی احتیاط اور پیش بندی کے بغیر دیوانہ وار جھونپڑی کی طرف بھاگا۔ مُبارک اور سجاد کو اتنی مُہلت ہی نہ ملی کہ مجھے کہتے یا کچھ سمجھانے کی کوشش کرتے۔ شیلا کی جھونپڑی تک پہنچنے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ دروازے کے نزدیک پہنچ کر میرے قدم ٹھٹھک کر رہ گئے۔ سامنے لالٹین کی ہلکی روشنی کے باوجود جھونپڑی کا منظر میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ شیلا کا خاوند بدستور اوندھا پڑا ہوا تھا۔ اس کے پیروں کے نزدیک ایک فوجی مدہوشی کے عالم میں دراز تھا۔ شیلا جسے میں رسّی سے باندھ کر چارپائی پہ چھوڑ آیا تھا اس وقت بھی چارپائی پہ ہی تھی۔ وہ رسّیوں سے آزاد ہو چکی تھی مگر اس کے ساتھ ہی لباس کی قید سے بھی تقریب قریب آزاد ہونے والی تھی۔ چاروں فوجیوں میں سے کسی کے ہاتھ میں بھی گن نہیں تھی۔ ایک فوجی کے ہاتھ میں شیلا کی ساڑھی کا آنچل تھا۔ دوسرا اُس کے بازو تھامے ہوئے تھا۔ اس کے باوجود وہ اس کو بُرا بھلا کہہ رہی تھی اور پیروں سے اُنھیں ٹھوکریں لگا رہی تھی۔ باقی دو فوجیوں کے ہاتھوں میں شراب کی بوتلیں تھیں اور وہ اس گھات میں تھے کہ شیلا کی ٹھوکروں سے بچ کر اسے بے بس کر دیں۔ یکایک شیلا کی نظریں مجھ پر پڑیں۔ اس کے مُنہ سے آواز نکلنی بند ہو گئی اور ساتھ ہی آزاد ہونے کی جدوجہد بھی۔ اس کے چہرے پر یکبارگی حیرت، شرم اور خوشی کا تاثر نمودار ہوا۔ آنکھوں میں روشنی آ گئی۔ شاید اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس جذبے کا اظہار کرے۔ اس کے عین سامنے کھڑے ہوئے فوجی نے اس کے بدلتے ہوئے تاثرات دیکھ لیے اور دروازے کی طرف پلٹا۔ ساڑھی کا آنچل ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ ہم دونوں کی نظریں آپس میں ٹکرائیں اور ساتھ ہی میری مشین گن سے نکلنے والی گولیاں اس کے جسم کو چھلنی کر گئیں۔ سنّاٹے میں فائر کی آواز سے سارا جنگل گونج اُٹھا۔

باقی تینوں فوجیوں کو بھی میں نے سنبھلنے کی مُہلت نہیں دی۔ اس سے پہلے کہ وہ یہ جان سکتے کہ اُن پر کون سے آفتِ ناگہانی نازل ہو گئی ہے اُن کے خون میں ڈوبے ہوئے بے جان جسم فرش پر پڑے ہوئے تھے۔ ان چاروں کی ہلاکت کے بعد بھی میں بدستور دروازے کی چوکھٹ کے پاس ہی کھڑا رہا۔ میری سانس مشکل میرے سینے میں سما رہی تھی۔ غصّے اور نفرت کی شدّت نے مجھے قریب قریب دیوانہ کر دیا تھا۔ میں نے ان فوجیوں کو اس لیے ہلاک نہیں کیا تھا کہ وہ میرے دُشمن تھے۔ میری نفرت اور غیظ و غضب کا سبب یہ تھا کہ یہ بدبخت اس مُلک کے محافظ تھے۔ مُلک کے ساتھ ساتھ وطن کی بہو بیٹیوں کی آبرو کے بھی رکھوالے تھے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ وہ اپنی ہم وطن عورتوں کی طرف بُری نیت سے اُٹھنے والی ہر نگاہ کو گولی کا نشانہ بنا دیتے لیکن معاملہ اس کے برعکس تھا۔ اس سے پہلے بھی میں ہوس میں ڈوبے ہوئے فوجیوں کو شیلا سے بے عزتی کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ اب یہ دوسرا موقعہ تھا۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ وہ ایک فوجی مشن پہ تھے۔ ایک خطرناک اور چالاک دُشمن کی کھوج میں تھے جس نے کچھ دیر پہلے ان کے بہت بڑے فوجی مرکز کو راکھ اور اینٹوں کا ڈھیر بنا دیا تھا لیکن بستی میں پہنچ کر حالات کا گہری نظر سے جائزہ لینے اور فوری طور پر مؤثر اقدامات کرنے کی بجائے وہ رنگ رلیوں میں ڈوب گئے تھے۔ یہ کیسے انسان تھے؟ کیا انسان اتنا بھی گر سکتا ہے؟ اور خاص طور پر وہ انسان جس نے مُلک و قوم کے تحفظ کا حلف اُٹھایا ہو اور جس کی زندگی کا مقصد ہی ان کی رکھوالی کرنا ہو! بس چلتا تو میں ان درندوں کو ایک بار پھر زندگی کی دولت سے مالا مال کرنے کے بعد دوسری بار پھر یہی سزا دیتا۔ کاش یہ میرے اختیار اور قدرت میں ہوتا اور میں ان [illegible] کو بار بار زندہ کرتا اور بار بار انسانیت کی اس توہین پر موت کی سزا دیتا۔ لیکن میں ایک بے بس اور خاکی انسان تھا۔ یہ سب کچھ میرے قبضۂ قدرت سے باہر تھا۔ حیرانی اس بات پر تھی کہ تو لوگ میری گولیوں کا نشانہ بنے تھے وہ بذاتِ خود ایک ایسے مذہب کے پیرو تھے جو اس بات کا پرچار کرتا ہے کہ ہر شخص کو مرنے کے بعد بار بار جنم لینا پڑتا ہے اور زندگی میں وہ

جو کرم (اعمال) کرتا ہے مرنے کے بعد سزا یا جزا کے طور پر اُسے دوسرے جنم میں اِسی مناسبت سے تخلیق کیا جاتا ہے۔ اچھے کرموں والے دوسرے جنم میں بہتر مخلوق کی شکل میں پیدا ہوتے ہیں جب کہ گناہ گاروں کو جانور یا دوسری حقیر اور قابلِ نفرت مخلوق کی صورت اختیار کرنی پڑتی ہے مگر یہ لوگ اپنے مذہب کے اس فلسفے پر بھی کاربند نہ تھے اور اس میں تعجب کی کوئی بات بھی نہ تھی۔ اس لیے کہ سارے ہی مذاہب انسانوں کو بہتر اخلاق و عادات اختیار کرنے کی تعلیم دیتے ہیں اور اچھے اعمال کی صورت میں انعام اور بُرے اعمال کے نتیجے میں سزا کی خبر سُناتے ہیں۔ خود اسلام اس اعتبار سے ایک مکمل دین ہے اور اس نے انسانوں کی رہبری کے لیے جامع اصول متعیّن کر دیئے ہیں مگر ہم آئے دن دیکھتے ہیں کہ وہ مسلمان جو اسلام کے نام پر جان قربان کرنے کو تیار رہتے ہیں اسلام کی تعلیمات کے منافی اقدام کرنے سے باز نہیں رہتے۔ نہ جنت کی بشارت اُن پر کوئی اثر چھوڑتی ہے اور نہ ہی دوزخ کا عذاب اُنھیں غلط کاموں سے باز رکھتا ہے تو پھر دوسرے مذاہب کے ماننے والوں سے کوئی کیا شکایت کر سکتا ہے؟

میں اِن خیالات سے چونکا اور نظر اُٹھا کر دیکھا تو سامنے شیلا کو اپنی طرف دیکھتا ہوا پایا۔ وہ شاید ابھی تک اس اچانک صدمے اور خوشی کے تاثر سے سنبھل نہ سکی تھی اور ساکت و جامد کھڑی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ ہم دونوں کی نظریں ایک دوسرے سے ملیں تو شیلا کی نگاہیں از خود جُھک گئیں اور پھر وہ غیر ارادی طور پر اپنی ساڑھی کو اپنے جسم پر لپیٹنے لگی۔ اس لمحے مجھے اس پر اتنا ترس اور اتنا پیار آیا کہ بے اختیار میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، دل بھر آیا۔ ایک عورت کی تقدیس کو مٹی میں مِلانے والوں پر تو غصہ تھا ہی لیکن عورت ذات کی بے بسی اور مجبوری نے میرا دل ہلا دیا۔ خدایا۔ اتنی نازک ہستی کو تُو نے اپنی حفاظت کرنے کی طاقت سے کیوں محروم رکھا ہے؟ اور اگر انھیں صنفِ نازک ہی بنایا تھا تو مردوں کے دلوں میں ایسا جذبہ کیوں پیدا کیا ہے جو اس مُقدّس ہستی کے احترام کو مٹانے میں ذرا بھی نہیں ہچکچاتا!

شیلا دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ وہ خود بھی رو رہی تھی۔ کچھ دیر ہم دونوں خاموش، آنسوؤں کے راستے اپنے دِلوں کی بھڑاس نکالتے رہے۔ پھر وہ سنبھلی اور ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولی: "بھیا۔ تمہیں بھگوان نے پھر میری عزت کی رکھوالی کے لیے بھیج دیا؟ تم تو چلے گئے تھے۔ پھر کیسے واپس چلے آئے؟"

نہ چاہتے ہوئے بھی میں ہنس پڑا۔ میں نے کہا: "شیلا۔ تیرا بھگوان اور میرا خدا اتنا بے خبر نہیں ہے کہ وہ ایک شریف اور نیک عورت کی پارسائی کو برباد ہوتا دیکھ کر بھی خاموش رہے۔ اُس نے مجھے تیری حفاظت کی ذمہ داری سونپی ہے، تُو میری بہن ہے پگلی۔ کیا ایک بھائی کے ہوتے ہوئے یہ ممکن ہے کہ اس کی بہن کی طرف کوئی آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھے؟"

شیلا کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی مگر پھر اپنے مدہوش شوہر کی طرف دیکھ کر وہ زہریلے لہجے میں بولی: "میری عزت کا رکھوالا تو میرا گھر والا ہے بھیا۔ دیکھو۔ کیسے مزے سے پاؤں پھیلائے سو رہا ہے۔ جب جنگل میں اُن بھیڑیوں نے مجھ پر حملہ کیا تھا اور تم نے آکر مجھے اُن کے پنجوں سے بچایا تھا اُس وقت بھی یہ بے شرم اور بے غیرت پتی دارو کے نشے میں دھت پڑا ہُوا تھا۔ اور دیکھ لو آج بھی کیا ماست اور بے خبر ہے۔"

"تو پھر کیا ہُوا؟" میں نے اسے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ "تیری حفاظت کا بندوبست تو ہو گیا ہے نا؟" مگر پھر مجھے فوراً یہ احساس ہوا کہ شیلا نے ایک قابلِ غور بات کہہ دی ہے۔ ایک شرابی شوہر اور اپنے آس پاس بدمست و آوارہ فوجیوں کے ہجوم کے ہوتے ہوئے وہ کیوں کر اپنے آپ کو ان کی دست درازیوں سے محفوظ رکھ سکے گی اور کب تک!

معاً میں نے ایک فیصلہ کیا: "شیلا۔ تو میرے ساتھ چلے گی؟"

"کہاں؟" وہ اس خلافِ توقع سوال سے چونک کر بولی۔

"جہاں بھی میں جاؤں۔"

"مگر تم تو خود بھاگے پھر رہے ہو۔ اپنے وطن سے، اپنے گھر سے دُور دشمنوں میں گھرے ہوئے ہو۔ تمہاری تو اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ وہ لوگ شکاری کتوں کی طرح تمہاری خوشبو سُونگھتے پھر رہے ہیں اور موقعہ ملتے ہی تمہیں شکار کر لیں گے۔ پھر تم میرا بوجھ کیسے اُٹھاؤ گے؟"

بات اس نے دُرست کہی تھی مگر میرے اندر کا سویا ہوا برادرانہ جذبہ بیدار ہو چکا تھا۔ میں نے کہا: "شیلا۔ میں چلا جاؤں گا تو اس جنگل میں تیری حفاظت کون کرے گا! تیرا گھر والا نشے میں ڈوبا رہتا ہے۔ چاروں طرف مجھ کے دَرندوں کا راج ہے۔ اس ماحول میں تیرا رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ میں تمہیں یہاں نہیں چھوڑوں گا۔ چل میرے ساتھ۔"

میرے لہجے میں اتنا خلوص، پیار اور تحکم تھا کہ شیلا نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اپنی ساڑھی کے پلّو کو سمیٹ کر سر پر ڈالا۔ اپنے مدہوش شوہر اور جھونپڑی میں پڑی ہوئی چاروں لاشوں کو نفرت سے دیکھا اور میری طرف بڑھی: "چلو بھیا۔" اُس نے فیصلہ کرنے میں ذرا بھی تاخیر نہیں کی۔ نہ سوچ بچار کی ضرورت محسوس کی تھی۔

"چلو" میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور تیزی سے باہر کی طرف لپکا۔ شاید کچھ دیر کے لیے میں اپنے گرد و پیش سے بے گانہ ہو گیا تھا اور مجھے یاد ہی نہیں رہا تھا کہ میں دُشمن کے ہیلی کاپٹر میں اپنے دو ساتھیوں اور ایک دشمن کے پائلٹ کو منتظر چھوڑ کر آیا ہوں۔ ہیلی کاپٹر زیادہ دُور نہ تھا۔ اس کے پنکھے بدستور حرکت میں تھے اور صاف ظاہر تھا کہ پائلٹ ابھی تک سجّاد اور مبارک کے قابو میں ہے۔

ابھی میں اور شیلا ہیلی کاپٹر تک نہیں پہنچ پائے تھے کہ مجھے اپنے پیچھے سے ایک للکار سُنائی دی: "رُک جاؤ۔"

میرے قدم رُک گئے۔ شیلا بھی میرے ساتھ ہی تھم گئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک جھونپڑی کے دروازے میں وہی عورت کھڑی تھی جسے کچھ دیر پہلے فوجیوں نے گھسیٹ کر ایک جھونپڑی کے آگے ڈال دیا تھا۔ زیادہ تشویش اور خطرے کی بات یہ تھی کہ اُس کے ہاتھ میں ایک مشین گن بھی تھی جو غالباً اس نے کسی فوجی کے پاس سے اُٹھالی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے مشین گن تھامے گھٹنوں کے بل کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے بال بکھر کر شانوں پر پھیل گئے تھے۔ نیم تاریکی میں اُس کا وجود ایک آسیب نظر آتا تھا۔

"شیلا تجھے لاج نہیں آتی، دیش کے دُشمن کے ساتھ جا رہی ہے۔ اپنے دھرم کو، اپنے پتی کو، اپنے کنبے کو بھول گئی؟"

شیلا خالی خالی نظروں سے اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ شیلا کے ہونٹ کانپ کر رہ گئے مگر مُنہ سے کوئی آواز نہیں نکلی۔

"اور تُو" اس بار وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "راکشس۔ میں تجھے نشٹ کر دوں گی۔" اُس کے الفاظ سے آگ برس رہی تھی۔ نفرت سے اُس کا چہرہ بگڑ کر اور مسخ ہو چکا تھا۔ یہ وہی عورت تھی جو خود اپنی زبان سے کچھ دیر پہلے یہ اقرار کر چکی تھی کہ وہ چوری چھپے گھر سے باہر نکل کر جنگل میں ایک غیر مرد کا انتظار کرتی رہی تھی مگر اب یہی عورت ستی ساوتری کے روپ میں میرے سامنے کھڑی تھی اور شیلا کو گناہ اور ثواب کا مطلب سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

اُس نے مجھے دوسری طرف سوچنے کا موقعہ بھی نہیں دیا۔ الفاظ کے مُنہ سے نکلتے ہی اُس نے مشین گن پر اپنے ہاتھوں اور اُنگلیوں کا دباؤ بڑھا دیا۔ اُس کا اچانک نمودار ہونا میرے لیے ایک انتہائی خلافِ توقع واقعہ تھا۔ میں ابھی تک پُوری طرح اس سے پہلے رونما ہونے والے واقعات کے تاثر سے ہی نہیں سنبھل سکا تھا کہ یہ ایک دوسری آفت نازل ہو گئی۔ اُس نے مجھے اتنی مُہلت بھی نہیں دی کہ میں اپنے ہاتھ میں تھامی ہوئی مشین گن کی نالی کا رُخ اُس کی طرف موڑ سکتا۔ "تڑاتڑ" کی آواز نے جنگل کے سنّاٹے کو توڑ دیا۔ نہ جانے کس لمحے شیلا ایک قدم بڑھ کر میرے اور مشین گن کی گولیوں کے درمیان حائل ہو گئی تھی۔ جس وقت میرا دماغ سوچنے کے قابل ہُوا اور میں نے زمین پر لیٹ کر شیلا کو اپنے ساتھ ہی ایک جھٹکے سے گرایا اس وقت تک نہ جانے کتنی گولیاں شیلا کے جسم میں پیوست ہو چکی تھیں۔ ایک لمحہ کے لیے فائرنگ کی آواز بند ہوئی اور دوبارہ گونجی تو مجھے کامل یقین تھا کہ اس مرتبہ یہ فائرنگ میرے جسم کو چھلنی کر دے گی لیکن مشین گن کا برسٹ ختم ہونے کے بعد بھی میں محفوظ تھا۔ غالباً اس بار نشانہ پُوری طرح دُرست نہیں تھا؛ لیکن نہیں۔ میں نے اُس عورت کو مشین گن سمیت ایک کٹے ہوئے درخت کی طرح زمین پر گرتے دیکھا اور پھر ہیلی کاپٹر کے دروازے سے کُود کر سجّاد باہر نکلا۔ اُس نے عورت کی طرف دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔ وہ دیوانہ وار دوڑتا ہوا میرے نزدیک آیا: "سر، آپ ٹھیک تو ہیں؟" وہ دوزانو ہو کر جُھک گیا اور اس نے میرا ہاتھ تھام کر میرے جسم کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔

"میں بالکل محفوظ ہوں سجّاد۔" میں فوراً ہی کسی سہارے کے بغیر اُٹھ کر بیٹھ گیا: "تھینک یو فار سیونگ مائی لائف۔"

یہ کہہ کر میں شیلا کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ مجھ سے دُور نہیں تھی مگر پھر بھی بہت دُور جا چکی تھی۔ اتنی دُور جہاں تک نہ آواز جا سکتی ہے اور نہ ہی وہاں جا کر کوئی واپس لوٹ سکتا ہے۔ میں نے جُھک کر دیکھا۔ اُس کی سفید ساڑھی پر خود اس کے اپنے خون سے نقش و نگار بن گئے تھے۔ اس کا ایک ہاتھ میری جانب اُٹھا ہوا تھا اور دوسرا اس کے جسم کے نیچے دبا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ شاید وہ اپنے مُنہ بولے بھائی کے مرنے کا منظر دیکھنے کے لیے تیار نہ تھی۔ اس لیے اس نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ لیکن نہیں، یہ موت تھی جس نے اس کی آنکھیں

ہمیشہ کے لیے بند کر دی تھیں۔ وہ مر گئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ جس وقت مَیں نے اُسے جھٹکے سے اپنے ساتھ کھینچا تھا اس وقت بھی وہ زندہ تھی۔ مگر وہ اپنے منہ بولے بھائی پر نثار ہو گئی تھی۔ کچھ دیر پہلے مَیں اُس کی سلامتی اور اُس کی عزت و آبرو کے بارے میں فکرمند تھا۔ اب وہ میری سلامتی کا زندہ ثبوت بن کر میری آنکھوں کے سامنے تھی۔ مَیں بے اختیار اس پر جھک گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

نہ جانے کتنی دیر تک مَیں روتا رہا۔ مجھے گردو پیش کا کوئی ہوش تھا نہ احساس۔ جب مَیں اپنے ہوش و حواس میں واپس آیا تو سجاد مجھے تھامے ہوئے کھڑا تھا۔ "دیر نہ کیجیے۔ ہمیں پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے" وہ مدھم آواز میں مجھ سے مخاطب ہوا۔

"سجاد۔ یہ میری بہن ہے۔ منہ بولی بہن۔ دیکھا کس طرح میری جان بچانے کے لیے قربان ہو گئی؟ کیا مَیں اسے یہاں اسی حالت میں تنہا چھوڑ کر چلا جاؤں؟"

"وہ بہت عظیم عورت تھی۔" سجاد نے میرا شانہ دبایا۔ "خدا اُسے اس نیکی کا اجر دے گا۔ اُس نے ایک بھائی کی ہی نہیں ایک مجاہد کی بھی جان بچائی ہے۔ اللہ سب کچھ دیکھنے والا ہے۔ اب ہم اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ آئیے۔"

اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اُٹھانے کی کوشش کی مگر مَیں مچل گیا۔ بپھر کر بولا۔ "یہ نہیں ہو سکتا۔ مَیں اپنی بہن کی بے گور و کفن لاش کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔"

"سر۔ یہ نہ بھولیے کہ اُس نے آپ کی جان بچانے کی خاطر اپنی جان قربان کر دی ہے۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی بہن کی یہ عظیم قربانی رائیگاں چلی جائے۔ خدا کے کاموں میں ہم دخل نہیں دے سکتے۔ اُس کی رضا یہی تھی۔ آئیے۔ اُس کے لیے دعائے مغفرت کیجیے اور پھر واپس چلیے۔ یاد رکھیے ہم پر بہت بڑی ذمہ داری ہے۔" سجاد کے اِن فقروں نے میرے سلگتے ہوئے زخموں پر مرہم رکھ دیا۔ یوں لگا جیسے بے چین جذبات کو قرار آگیا ہو۔ وہ سچ ہی تو کہہ رہا تھا۔

مَیں نے آنسو بھری نگاہوں اور غم سے بوجھل دل کے ساتھ ایک آخری نظر شیلا پر ڈالی اور میرے ہاتھ بے اختیار دعا کے لیے اُٹھ گئے۔ وہ ایک غیر مسلم تھی مگر مَیں خدا سے اُس کی مغفرت کے لیے دعا کر رہا تھا۔ مَیں نے دیکھا تو سجاد بھی دعا میں میرے ساتھ شامل تھا۔ خدا جانے ہماری یہ حرکت مذہب اور شریعت کی رُو سے جائز تھی یا ناجائز مگر یہ ایک بے اختیار اور غیر ارادی عمل تھا۔ بعد میں بھی اکثر مَیں نے اس موضوع پر سوچا ہے اور ہر بار اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہو سکتا ہے خداوند تعالےٰ نے اُس بے گناہ اور نیک عورت کی رُوح کو اپنی رحمت کے صدقے میں بخش دیا ہو۔

مَیں جھکا اور ساڑھی کا آنچل شیلا کے چہرے پر ڈال دیا۔ یوں لگتا تھا جیسے میرے دل کو سکون اور قرار حاصل ہو چکا ہے۔ آنکھیں بھی خشک تھیں۔ آخری نظر اس پر ڈالی اور مَیں سجاد کے ہمراہ ہیلی کاپٹر کی طرف چل پڑا۔ مگر چلتے چلتے یہ سوچنا نہ بھولا کہ واقعی کارخانۂ قدرت بھی عجیب ہے۔ کوئی نہیں جان سکتا کہ پل بھر بعد کیا ہونے والا ہے؟ ایک وقت تھا جب مَیں یہ سوچ کر پریشان تھا کہ شیلا کا کیا ہو گا؟ مَیں اسے اپنے ساتھ لے تو جا رہا ہوں مگر اس کا مستقبل کیا ہے یا مَیں اس کی حفاظت کیونکر کر سکوں گا؟ یہ مسئلہ پلک جھپکنے میں خود بخود حل ہو چکا تھا۔ شیلا نے میرے لیے بوجھ بننا گوارا نہیں کیا تھا۔ اس کے برعکس وہ مرتے مرتے بھی مجھ پر ایک احسانِ عظیم کر گئی تھی۔ کتنی عظیم عورت تھی وہ جس نے اپنی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کی آبرو رکھ لی تھی۔ میری کوئی حقیقی بہن بھی ہوتی تو شاید میرے لیے اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکتی۔ جان قربان کر دینے سے زیادہ اور کوئی انسان کیا کر سکتا ہے!

شیلا کے بے جان جسم پر آخری نگاہ ڈالنے کے بعد مَیں ہیلی کاپٹر کے اندر داخل ہو گیا۔ مبارک ابھی تک پائلٹ کی کنپٹی سے مشین گن کی نالی لگائے ہوئے مستعد کھڑا تھا۔ اس کی توجہ ایک لمحے کے لیے بھی پائلٹ سے نہیں ہٹی تھی اسی لیے وہ ہیلی کاپٹر کے باہر وقوع پذیر ہونے والے واقعات سے بھی بے خبر ہی تھا مگر پائلٹ کی نظریں سامنے بھی ہوئی تھیں اور صاف ظاہر ہے کہ وہاں جو بھی ڈرامہ ہوا پائلٹ اس کی تمام تفصیل کا شاہد تھا۔ اُسے غالباً ابھی تک یقین نہ تھا کہ ہم اس کی جان بخشی کر دیں گے۔ اس لیے کہ جب مَیں نے اسے فوری طور پر ہیلی کاپٹر اُڑانے کا حکم دیا تو وہ دونوں ہاتھ باندھ کر گھگھیانے لگا اور جان بخشی کی التجائیں کرنے لگا۔ "فضول باتوں میں وقت ضائع نہ کرو۔ جتنی جلد ممکن ہو یہاں سے چلو اور یاد رکھو ہمارے حکم کی تعمیل ہی میں تمہاری زندگی کا راز پوشیدہ ہے۔"

ہیلی کاپٹر حرکت میں آیا اور فضا میں بلند ہونے لگا۔ گاؤں اور گاؤں کے لوگ ہم سے بتدریج دُور ہونے لگے یہاں تک کہ نگاہوں سے بالکل اوجھل ہو گئے۔ میرا ذہن اور دل انتہائی بوجھل ہو رہا تھا۔ سجاد نہ جانے کب سے مجھے مخاطب کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر مَیں خیالوں میں گم تھا۔ آخر اُس نے میرا بازو چھوا اور مَیں چونک پڑا۔ "کتنی دیر سے آپ کو مخاطب کر رہا ہوں مگر آپ دھیان ہی نہیں دے رہے۔"

"سوری! کہو۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"سر۔ سب سے پہلے تو پائلٹ کو یہ بتائیے کہ ہمیں جانا کدھر ہے؟"

مَیں سوچ میں پڑ گیا۔ یہ سوال فی الوقت میرے لیے بالکل اچانک اور غیر متوقع تھا۔ گذشتہ لمحات میں رُونما ہونے والے واقعات نے مجھے اس مسئلے پر سوچنے کی مہلت ہی نہیں دی تھی مگر اب میری تمام حسیات جاگ اُٹھی تھیں اور کام کر رہی تھیں۔ مَیں پائلٹ سے مخاطب ہوا۔ "تم نے ایک اسلحہ ساز فیکٹری اور ائرپورٹ کے بارے میں بتایا تھا۔ یہ دونوں یہاں سے کتنے فاصلے پر ہیں؟"

اُس کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق ائرپورٹ ہم سے قریباً ڈیڑھ سو میل کے فاصلے پر تھا اور وہاں موقع کی اہمیت کے اعتبار سے چاق و چوبند ہوا بازوں کا ایک دستہ ہمہ وقت چوکس رہتا تھا۔ یہ ایک اہم فضائی مرکز تھا جس کی موجودگی یا اہمیت سے ہمارے حکام ابھی تک باخبر نہیں تھے۔ اسلحہ ساز فیکٹری اس ائرپورٹ سے ساٹھ ستر میل کے فاصلے پر تھی۔ مشکل یہ تھی کہ یہ دونوں مقامات سرحدوں کے بہت زیادہ اندر واقع تھے اور اگر ہم وہاں جاتے تو اپنے ملک کی سرحدوں سے اور زیادہ دُور ہو جاتے لیکن اس خطرے کو مول لیے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔ چنانچہ مَیں نے پائلٹ کو ہدایت کی کہ وہ ہیلی کاپٹر کا رُخ ائرپورٹ کی طرف موڑ دے۔ ساتھ ہی مَیں نے اُسے یہ انتباہ بھی کر دیا کہ اگر اس نے ذرا بھی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو ہماری جانوں کو کوئی خطرہ لاحق ہونے سے پہلے ہی وہ خود اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ پائلٹ کو اپنی زندگی بہت زیادہ پیاری تھی۔ اُس نے کسی چون و چرا کے بغیر ہماری ہدایت پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی اس نے ہمیں اپنی وفاداری کا ایک بار پھر یقین دلایا اور ہیلی کاپٹر تیزی سے شمال مغرب کی سمت پرواز کرنے لگا۔ ہم زیادہ بلندی پر نہیں پرواز کر رہے تھے اس لیے نیچے کھیت کھلیان، کھلے میدان اور درختوں کے ذخیرے صاف نظر آ رہے تھے۔ کھیتوں میں ہمیں مویشیوں کے سوا کوئی ذی روح نظر نہ آیا۔ ویسے بھی یہ بیشتر علاقہ گنجان درختوں سے ڈھکا ہوا تھا اور جنگلات کا یہ خطہ فوجی کارروائیوں کے لیے بہت موزوں تھا۔ غالباً اسی لیے ہائی کمان نے ہماری گوریلا کارروائیوں کے لیے اس کا انتخاب کیا تھا۔

ائرپورٹ پہنچنے سے پہلے ہی ہمیں اپنی حکمتِ عملی طے کرنی تھی۔ ہم تینوں دُشمن کے فوجیوں کی وردی زیب تن کیے ہوئے تھے۔ ہمارے پاس ہتھیار بھی اِن ہی کے تھے اس لیے پہلی نظر میں ہماری اصلیت کا راز فاش ہونے کا مطلق اندیشہ نہ تھا۔ مزید احتیاط کے طور پر ہم نے پائلٹ سے اس علاقے خصوصاً ائرپورٹ کے ارد گرد کے مشہور مقامات کے نام دریافت کر کے یاد کر لیے۔ پائلٹ بہت زیادہ مددگار ثابت ہو رہا تھا اور ہمیں مطلوبہ معلومات سے کہیں زیادہ بتانے پر تُلا ہوا تھا۔

ابھی ہمیں پرواز کرتے ہوئے تین چار منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ فضا میں ہیلی کاپٹروں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ چند ہی لمحے بعد دو ہیلی کاپٹر نمودار ہوئے جو بہت تیزی سے پرواز کرتے ہوئے ہماری جانب بڑھ رہے تھے۔ انھوں نے وائرلیس کے ذریعے ہمارے پائلٹ سے بھی رابطہ قائم کیا۔ ایک ہیلی کاپٹر میں اُن کا گروپ کمانڈر بھی موجود تھا جو ہمارے پائلٹ سے یہ جواب طلبی کر رہا تھا کہ اس کی اجازت اور علم کے بغیر اس نے اپنا رُخ کیوں تبدیل کر لیا اور واپس پہنچ کر اسے رپورٹ کیوں نہیں دی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ہمارے ہیلی کاپٹر کے پائلٹ کو فوری طور پر اپنے پیچھے آنے کی ہدایت کی اور اُن دونوں جہازوں کا رُخ تبدیل ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ وہ تباہ شدہ ہیلی کاپٹر اور بستی کی طرف جا کر حقیقتِ حال معلوم کرنے کے خواہاں تھے۔ پائلٹ نے بے چارگی سے ہماری طرف دیکھا۔ یہ اطلاع وہ ہمیں پہلے ہی فراہم کر چکا تھا۔ یہ ہیلی کاپٹر مشین گنوں اور چھوٹی توپوں سے لیس تھے۔ مَیں نے اسے خاموشی سے اپنے گروپ کمانڈر کا حکم ماننے کی ہدایت کی اور ہمارا ہیلی کاپٹر تیزی سے اُن دونوں کے عقب میں پرواز کرنے لگا۔ ہمارا باہمی فاصلہ تیزی سے کم ہو رہا تھا۔ دو منٹ بعد ہم پھر اسی گھنے جنگل کے اُوپر پرواز کر رہے تھے۔ جس میں شیلا کی بستی واقع تھی اور اس امر میں شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی کہ بستی پہنچتے ہی گروپ کمانڈر کو تمام صورتِ حال کا علم ہو جائے گا اور ہم دوبارہ گرفتار کر لیے جائیں گے۔ مبارک اور سجاد خاموش تذبذب کے عالم میں کبھی مجھے اور کبھی ہمارے آگے جانے والے ہیلی کاپٹروں کو دیکھ رہے تھے۔ جوں ہی ہم گھنے

درختوں کے ذخیرے کے اُوپر پہنچے میں نے مُبارک اور سجّاد کو اشارہ کیا۔ مُبارک نے اپنی مشین گن کی نال پائلٹ کی کنپٹی پر رکھ دی اور سجّاد اپنی مشین گن سنبھال کر دروازے کے پاس چوکس ہو گیا۔ میں نے بھی اپنی مشین گن کا جائزہ لیا اور دوسرے ہی لمحے ہماری مشین گنوں سے گولیوں کی بارش ہونے لگی۔ آگے جانے والے ہیلی کاپٹر ہم سے زیادہ فاصلے پر نہ تھے۔ ہماری فائرنگ کی بوچھاڑ خلافِ توقع اور بالکل اچانک تھی، اس لیے انھیں سوچنے سمجھنے کا موقع بھی نہ مل سکا اور وہ دونوں ہیلی کاپٹر چشم زدن میں آگ کے گولوں کی شکل میں تبدیل ہو کر زمین پر گرتے ہوئے نظر آئے مجھے یقینِ کامل تھا کہ دونوں میں کوئی ایک شخص بھی جاں بر نہ ہو سکے گا۔ ہمارے پائلٹ کے لیے یہ تمام کارروائی ایکا ایکی عمل میں آئی تھی۔ وہ شاید دل ہی دل میں خوش ہوگا کہ اُس کی جاں بخشی کا وقت قریب آگیا اور بہت جلد ہم تینوں اُس کے ساتھیوں کے رحم و کرم پر ہوں گے۔ ہو سکتا ہے وہ چشمِ تصور میں ہمیں سزا بھگتتے ہوئے بھی دیکھ رہا ہو لیکن لے لبا آنند کر خاک شدہ۔ اُس کی حسرتیں خاک میں مل چکی تھیں۔ وہ جن پر تکیہ کئے بیٹھا تھا وہ آناً فاناً موت کی وادی میں پہنچ گئے تھے اور ایک بار پھر وہ ہمارے رحم و کرم پر تھا۔ سجّاد خوش ہو کر بولا " سر ہمیں جنگل میں اُتر کر اپنی تسلّی کر لینی چاہیئے کہ وہ سب کے سب ختم ہو چکے ہیں "۔

ہم وقت ضائع نہیں کر سکتے سجّاد " میں نے اُسے سمجھایا " اُن میں سے کوئی زندہ نہیں بچ سکتا اور اگر بچ بھی گیا تو وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ اس دورافتادہ ویران اور گھنے جنگل میں کسی سواری کے بغیر اُس کا اپنی منزل تک پہنچنا ممکن نہیں ہے۔ اتنی دیر میں ہم اپنے ٹارگیٹ پر پہنچ چکے ہوں گے "۔

" لیفٹ رائٹ سر " مُبارک پہلی بار انگریزی میں چہکا۔ خوشی کا تاثر اُس کی آواز سے موسیقی کی طرح پھُوٹا پڑ رہا تھا۔ اُس کا چہرہ کامرانی کی روشنی سے دَمک رہا تھا۔ اُس نے اپنی مشین گن سے پائلٹ کی کنپٹی کو سہلایا اور بولا " میرے بیٹے۔ واپس اُسی راستے پر ہو جاؤ جس طرف ہم پہلے جا رہے تھے "۔ پھر شاید اُسے خیال آیا کہ وہ میری موجودگی میں براہِ راست احکامات جاری کر رہا ہے۔ معذرت خواہانہ انداز میں وہ میری طرف متوجہ ہوا " سر یہ حکم میں نے آپ کی طرف سے دیا ہے "۔

میں ہنس پڑا۔ بہت دیر کے بعد بلکہ دیکھا جائے تو بہت عرصے بعد میں بے اختیار ہنسا تھا۔ دُشمن کے دو ہیلی کاپٹروں کی تباہی سے زیادہ مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ ہم ایک بار پھر اُن کے نرغے سے نکل کر آزاد ہو گئے تھے اور ایک بہت بڑی کارروائی کرنے جا رہے تھے۔ پائلٹ کا چہرہ ایک بار پھر مٹی کے رنگ کا ہو گیا۔ اُس کی آنکھوں سے خوف اور مایوسی جھانک رہی تھی اور اُس کے ہاتھ لرزتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ اُس نے مایوسی کے عالم میں ایک جھٹکے سے ہیلی کاپٹر کا رُخ ایک بار پھر ائرپورٹ کی جانب موڑ دیا۔ اس بار ہمارے ہیلی کاپٹر کی رفتار پہلے سے بھی زیادہ تھی۔ چند منٹ کی مسافت طے کرنے کے بعد اُس نے ہمیں بتایا کہ اب وہ ائرپورٹ سے بیس میل دُور ہے اور راڈار کی زد میں ہے۔ میری ہدایت پر اس نے ائرکنٹرول ٹاور سے رابطہ قائم کیا اور اپنی شناخت کرانے کے بعد لینڈ کرنے کی اجازت طلب کی۔ اس عرصے میں ہم گھنے جنگلوں سے گزر کر کھلے میدانوں اور کھیتوں والے علاقے میں پہنچ چکے تھے۔ درخت اور جنگل یہاں بھی تھے مگر اُن کے درمیان ایک ہموار خطۂ زمین بھی موجود تھا۔ یہ ائرپورٹ ہی نہیں ایک اہم فوجی اور فضائی مرکز بھی تھا کیونکہ عمارتوں اور دوسری تنصیبات کا سلسلہ کافی دُور تک پھیلا ہوا تھا۔ جگہ جگہ ہم نے طیارہ شکن توپیں بھی نصب دیکھیں۔ درختوں کے بعض جھُنڈوں میں زمین سے فضا میں مار کرنے والے میزائیل بھی مزید نصب ہوں گے۔ ہمارے بارے میں ذرا سا بھی شک پیدا ہونے کی صورت میں ایک اُنگلی کے ہلکے دباؤ سے ہمارا ہیلی کاپٹر صفحۂ ہستی سے مٹ سکتا تھا مگر پائلٹ کو اپنی زندگی عزیز تھی اور میرا پڑھایا ہوا سبق وہ طوطے کی طرح وائرلیس پر سُنا چکا تھا جس کے بعد اُن لوگوں کو ہماری طرف سے بدگمانی یا شک و شبہ پیدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پائلٹ نے انھیں مطلع کیا تھا کہ وہ گروپ کمانڈر جین سنگھ کی ہدایت پر ضروری معلومات فراہم کرنے کے لیے ائرپورٹ پر لینڈ کرنا چاہتا ہے۔ اس نے اپنی شناخت بھی کرادی تھی اور ائر ٹاور میں موجود ٹریفک کنٹرولر ذاتی طور پر بھی اُس کو جانتا تھا۔ اس کے بعد کسی قسم کا خطرہ درپیش ہونے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہ گئی تھی۔

اب ائرپورٹ کے رَن وے ہماری نگاہوں کے سامنے تھے۔ یہ ایک اہم فضائی مرکز تھا اور میلوں تک رَن وے کا مکڑی کے جالوں کی طرح جال بچھا ہوا تھا۔ کئی عمارتیں بھی تھیں جن میں سے اکثر ریت کی بوریوں سے گھری ہوئی تھیں۔ چند مقامات پر ہم نے زیرِ زمین مورچوں کی نشانیاں بھی دیکھیں۔ جگہ جگہ بھاری بکتربند گاڑیاں پوزیشن سنبھالے کھڑی تھیں۔ کئی مقامات پر ہم نے بھاری ٹینک بھی ایستادہ دیکھے۔ طیارہ شکن

توپوں اور میزائیلوں کی بھی بہتات تھی۔ اس کے بعد ہمیں ائرپورٹ ٹرمینل یا مرکزی آپریشن سنٹر کی عمارت نظر آئی۔ یہ ایک منزلہ عمارت کافی وسیع تھی اور دُور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اُوپر سے دیکھنے میں یہ بظاہر فوجی بیرکس نظر آتی تھیں مگر ہم جانتے تھے کہ یہ ایک اہم اعصابی مرکز ہے۔ اس عمارت سے تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر بمبار جنگی جہازوں کا ایک بیڑا کھڑا ہوا تھا۔ گنتے پر ان جہازوں کی تعداد پندرہ نکلی۔ پائلٹ ہمیں یہ پہلے ہی بتا چکا تھا کہ ان جہازوں کے پائلٹ چوبیس گھنٹے قریبی عمارت میں کمربستہ رہتے ہیں اور چند لمحوں کے نوٹس پر یہ بمبار جہاز موت کا خوفناک سایہ بن کر فضا میں پہنچ سکتے ہیں۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بظاہر گھنے جنگلوں سے گھرے ہوئے اس علاقے میں ایک اتنا بڑا اور اہم فضائی مرکز بھی موجود ہوگا۔ عمارت کے نزدیک جیپوں اور فوجی گاڑیوں کی ایک بہت بڑی تعداد بھی موجود تھی۔ میں نے بمبار طیاروں کے نزدیک کھلے گھاس کے میدان میں ہیلی کاپٹر اُتارنے کی ہدایت کی۔ پائلٹ اس حکم پر حیران تو ضرور ہوا ہوگا مگر اُس کے انداز اور چہرے کے تاثرات سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اب اپنی آزادی کو نزدیک تر دیکھ رہا تھا۔ تین افراد خواہ وہ کتنے ہی مہلک ہتھیاروں سے لیس کیوں نہ ہوں دُشمن کے ایک فوجی مرکز پر بے دست و پا ہی کیے جا سکتے ہیں۔ وہ چشمِ تصور میں ہماری بے بسی کا تماشا دیکھ رہا تھا اور ہماری اس حماقت پر دل ہی دل میں ہنس رہا تھا کہ ہم نے جانتے بُوجھتے موت کے مُنہ میں جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس سے پہلے یہ شخص اپنی جان بخشی کے عوض ہمیں یہ پیش کش بھی کر چکا تھا کہ اگر ہم رضامند ہوں تو وہ ہمیں اپنے مُلک کی سرحد کے نزدیک چھوڑ آئے گا۔ ایک اور تجویز اُس نے یہ بھی پیش کی تھی کہ اگر ہم اسے جنگی قیدی نہ بنانے کا یقین دلائیں تو وہ ہیلی کاپٹر سمیت ہمیں پاکستان کی سرحد کے پار لے جا سکتا ہے مگر ہم نے اُس کا کوئی مشورہ قبول نہیں کیا تھا۔ اب جب کہ ہم چاروں طرف سے دشمنوں کی ہلاکت خیزیوں میں گھرے ہوئے ایک مخصوص مقام پر ہیلی کاپٹر اُتارنے کا حکم دے رہے تھے تو اس کی آنکھوں میں اُمید اور فتحیابی کی چمک صاف دکھائی دے رہی تھی۔

ہمارا ہیلی کاپٹر زمین پر اُترا تو آس پاس کسی نے بھی اس طرف توجہ نہ دی۔ یہ ایک معروف ائرپورٹ اور فوجی مرکز معلوم ہوتا تھا۔ غالباً یہاں ہوائی جہازوں اور ہیلی کاپٹروں کی آمد و رفت کا سلسلہ ہر وقت جاری رہتا ہوگا۔ پھر جب خود اُن کی اپنی ہی فوج کا ایک ہیلی کاپٹر ائرکنٹرول ٹاور سے کلیرنس حاصل کرنے کے بعد زمین پر اُترا تو ظاہر ہے کہ کسی کو کیا اعتراض یا شک ہو سکتا تھا۔ میں نے پائلٹ کو ہدایت کی کہ وہ ہیلی کاپٹر کا انجن چالو رکھے۔ مُبارک کی مشین گن کی نالی اس وقت اُس کی کنپٹی پر نہیں تھی پھر بھی وہ مُبارک کی مشین گن کی زد میں تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ مُبارک کی اُنگلی کا معمولی سا دباؤ بھی اُس کے جسم کو چھلنی کر دے گا۔ اسے یہ علم نہیں تھا کہ ہم لوگ اپنی کارروائیوں کے بارے میں پہلے ہی فیصلہ کر چکے ہیں اور وہ جس لمحے کو اپنی نجات کا لمحہ سمجھ رہا ہے وہ دراصل اس کے لیے ایک نئی مصیبت کا پیش خیمہ ہے۔

ہیلی کاپٹر سے کُود کر میں باہر نکلا اور نزدیک ہی کھڑی ہوئی ایک جیپ کا رُخ کیا۔ اس کے ساتھ ہی سجّاد نے پائلٹ کو دوبارہ ہیلی کاپٹر اُڑانے کا اشارہ کیا تو وہ حیران رہ گیا۔ کچھ پس و پیش کے بعد اس نے سجّاد کے حکم کی تعمیل کی۔ میں اس اثنا میں جیپ کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔ ایک فوجی اس کے پاس کھڑا تھا۔ مجھے اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ کر مسکرایا مگر میں نے یوں ظاہر کیا جیسے بہت زیادہ عجلت میں ہوں۔

" جیپ کی چابی کہاں ہے؟ " میں نے اچانک سوال کیا۔

اُس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر چابی نکالی مگر جب میں نے چابی لینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا تو وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا اور بولا " سوری سر۔ مجھے چابی کسی کو دینے کا آرڈر نہیں ہے۔ میں آپ کو ہیڈکوارٹر پہنچا سکتا ہوں "۔

میں نے کسی تاثر کا اظہار کئے بغیر گردن ہلائی اور کُود کر جیپ میں سوار ہو گیا۔ اس نے سٹیرنگ سنبھالا اور جیپ کو سٹارٹ کرتے ہوئے پوچھنے لگا " کون سے فرنٹ سے آئے ہیں سر "۔

میں بلاوجہ سوال و جواب کی اُلجھن میں نہیں پھنسنا چاہتا تھا اس لیے مختصراً جواب دیا " تم اپنے کام سے کام رکھو۔ میرے پاس فالتو وقت نہیں ہے "۔

وہ خاموشی سے کان دبا کر جیپ کو موڑنے میں مصروف ہو گیا۔ اس لمحے میں نے ہیلی کاپٹر کو فضا میں بُلند ہو کر ہیڈکوارٹر کی عمارت کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ اس کی بلندی زیادہ نہ تھی اور رفتار بھی بہت کم تھی۔ اس رفتار سے ہیلی کاپٹر کو عمارت تک پہنچنے کے لیے بمشکل ایک منٹ
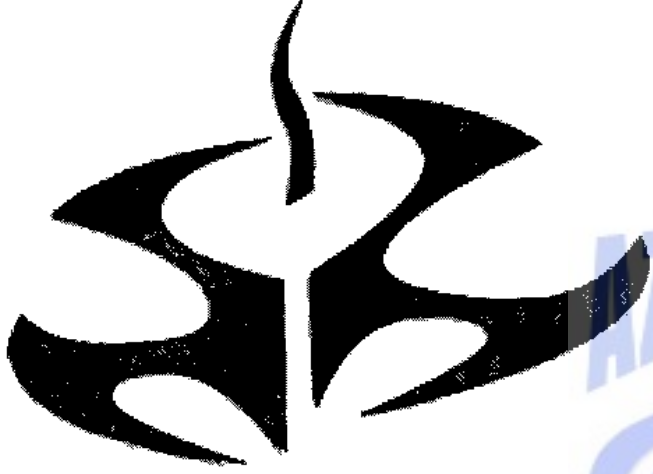
کا وقت درکار تھا۔ گویا میرے پاس بھی اس سے زیادہ مہلت نہ تھی۔ میں دل ہی دل میں مسکرایا اور جیپ ڈرائیور سے مخاطب ہوا: "دیکھو جیپ کو ادھر لے لو۔" میرا اشارہ جنگی طیاروں کی قطاروں کی طرف تھا۔

"وہ آؤٹ آف بونڈز ہے سر۔" وہ میرے برتاؤ کی وجہ سے مجھے اپنے سے بڑا افسر خیال کر کے مرعوب ہو گیا تھا۔

"آپ کو جانا کدھر ہے؟" یہ کہہ کر اس نے کنکھیوں سے میری طرف دیکھا۔ مگر میرا دھیان ہیلی کاپٹر کی طرف لگا ہوا تھا جو ائر ہیڈ کوارٹر کی عمارت کے نزدیک پہنچ چکا تھا اور اس کے سامنے والی کھلی جگہ میں لینڈ کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اب تک سارا کام منصوبے کے مطابق ہو رہا تھا۔ سکیم یہ تھی کہ عمارت کے سامنے پہنچ کر سجاد اور مبارک پاس کھڑے ہوئے آئیل ٹینکروں کو مشین گنوں کا نشانہ بنائیں گے اور پھر ہیلی کاپٹر لے کر تیزی سے روانہ ہو جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ اس اچانک آفت کی وجہ سے سب کی توجہ عمارت کی طرف ہو گی۔ اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر مجھے جنگی طیاروں کو نشانہ بنانا تھا۔ یہ بات ہم بھی جانتے تھے کہ یہ ایک طرح سے خودکشی کی مہم تھی جس میں بچنے کا صرف بیس فیصد امکان تھا۔ مگر میں یہ دیکھ کر ساکت رہ گیا کہ ہیلی کاپٹر زمین پر اترنے کی بجائے اُس سے تیس چالیس فٹ کی بلندی پر پرواز کرتا ہوا مسلسل ائر ہیڈ کوارٹر کی عمارت کی طرف بڑھ رہا تھا۔ معاً مجھے خیال گزرا کہ شاید پائلٹ نے اِن دونوں کے ارادے کو بھانپ کر کچھ پس و پیش اور گڑبڑ کرنے کی کوشش کی ہے۔ جلد ہی میرے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ مشین گن کے فائر فضا میں گونجے اور اس کے ساتھ ہی میں نے ایک انسانی جسم کو ہیلی کاپٹر سے نیچے گرتے ہوئے دیکھا۔ اب ہیلی کاپٹر اور عمارت کے درمیان صرف چند گز کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ فائرنگ کی آواز نے میری جیپ کے ڈرائیور کو بھی ہیلی کاپٹر کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔ میری طرح اُس نے بھی ایک انسانی جسم کو زمین پر گرتے ہوئے دیکھا تھا جس کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ پائلٹ کے سوا اور کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا تھا۔

جیپ ڈرائیور کے منہ سے آواز نکلی: "او مائی گاڈ۔ یہ کیا تماشہ ہے؟" مگر اس کی آواز مشین گن کی فائرنگ میں ڈوب کر رہ گئی۔ سجاد اور مبارک نے فائر کھول دیا تھا۔ ہیلی کاپٹر چلانا ان دونوں میں سے کسی کو نہیں آتا تھا مگر اُن کے پاس ڈولتے ہوئے ہیلی کاپٹر کی طرف توجہ دینے کا وقت ہی نہ تھا۔ اس لیے انھوں نے آئیل ٹینکروں پر گولیوں کی بوچھار شروع کر دی تھی جو فوراً ہی آگ پکڑ کر شعلوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ اتنی دیر میں ہیڈ کوارٹر پر موجود فوجیوں اور محافظوں کو بھی ہوش آ گیا تھا۔ بھاری آرمرڈ کاریں پوزیشن لے کر اپنی توپوں کے دہانے ہیلی کاپٹر کی طرف موڑ رہی تھیں اور شاید اس مرکز پر موجود تمام اسلحہ کا ٹارگٹ اس وقت وہ ہیلی کاپٹر ہی تھا۔ مگر ہیلی کاپٹر کو توپ، گولیوں یا میزائیلوں کا نشانہ بنانے کا مطلب یہ تھا کہ براہِ راست ائر ہیڈ کوارٹر کو بمباری کا نشانہ بنایا جائے۔ یہ ایک مشکل فیصلہ تھا جو فوری طور پر نہیں کیا جا سکتا تھا۔

میرے جیپ ڈرائیور کا حیران چہرہ اور دہشت سے پھٹی ہوئی آنکھیں اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ بھی اس خلافِ توقع واقع کی وجہ سے ائر ہیڈ کوارٹر پر موجود دوسرے لوگوں کی طرح بھونچکا رہ گیا ہے۔ میرے لیے یہ عمل موزوں ترین اور بہترین موقع تھا۔ میرا دایاں ہاتھ تیزی سے حرکت میں آیا اور یہ جانے بغیر کہ اُس پر کیا آفت ٹوٹ پڑی ہے۔ جیپ ڈرائیور کٹے ہوئے درخت کی طرح اوندھا اسٹیرنگ پر گر گیا۔ جیپ کی رفتار زیادہ نہ تھی اس لیے اسٹیرنگ کو سنبھالنا میرے لیے دشوار نہیں تھا۔ ایک جھٹکے سے میں نے اسے چلتی ہوئی جیپ سے باہر پھینکا اور اسٹیرنگ سنبھال لیا۔ اس اثنا میں سجاد اور مبارک کی مشین گنیں مسلسل آگ برسا رہی تھیں اور ائر پورٹ پر بے شمار آئیل ٹینکر اور ان سے ملحقہ دوسری گاڑیاں وغیرہ شعلوں کی لپیٹ میں آ چکی تھیں۔ ایک ٹینک تیزی سے ہیلی کاپٹر کو اپنی زد میں لیتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ ٹینک کے درمیانی دہانے کی توپوں سے چند فائر ہوئے مگر گولے ہیلی کاپٹر کی بجائے ائر پورٹ بلڈنگ پر گرے۔ اتنی دیر میں مبارک اور سجاد نے غالباً آخری جانفروشانہ فیصلہ کر لیا تھا۔ اُن کی مشین گنیں آگ برسا رہی تھیں مگر جلتی ہوئی گاڑیوں کے شعلوں نے خود ہیلی کاپٹر کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ میں ایک لمحے کے لیے ساکت رہ گیا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے ہیلی کاپٹر آگ میں لپٹے ہوئے ایک گولے کی صورت اختیار کر گیا اور آگ کا یہ گولا ائر ہیڈ کوارٹر کی عمارت سے ٹکرایا۔ ایک فلک شگاف دھماکا ہوا جس سے آس پاس کی فضا لرز کر رہ گئی۔ ائر پورٹ پر سب قیامت کا سماں تھا۔ میں نے دیکھا کہ عمارت سے کچھ پائلٹ دوڑتے ہوئے نکلے۔ اُن کا رُخ جنگی طیاروں کی طرف تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ اُن بیش قیمت ہوائی جہازوں کو آگ کا نشانہ بننے سے پہلے محفوظ مقام پر پہنچانا چاہتے تھے۔ ابھی میں مبارک اور سجاد کے شجاعانہ کارنامے

کی داد بھی نہ دینے پایا تھا، نہ ہی اُن کی شہادت پر میں نے فاتحہ پڑھی تھی لیکن ان باتوں کے لیے میرے پاس وقت نہیں تھا۔ میری جیپ اس وقت ایک بکتر بند گاڑی کے پاس سے گزر رہی تھی جس کا ڈرائیور اسے موڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے جیپ کی رفتار تیز کی اور خود جیپ سے باہر چھلانگ لگا دی۔ اس وقت میری جیپ کا رُخ ایک جنگی جہاز کی طرف تھا۔ بکتر بند گاڑی کے ڈرائیور نے ایک تیز رفتار جیپ کو براہِ راست ہوائی جہاز کی طرف لپکتے ہوئے دیکھا تو حیران ہو کر دیکھنے لگا۔ اتنی دیر میں میں زمین پر لوٹ لگا کر اس کی گاڑی کے پاس پہنچ چکا تھا۔ اس کے سنبھلنے سے پہلے میری مشین گن کی ضرب اس کی گردن پر لگی اور وہ خاموشی سے لڑھک گیا۔ میں نے بکتر بند گاڑی میں سوار ہو کر اس کا رُخ ہوائی جہازوں کی طرف موڑ دیا۔ بھاری میزائلوں سے لیس یہ آرمرڈ کار اس وقت میرے لیے ایک نعمت سے کم نہیں تھی۔ میں دھوئیں اور شعلوں کے درمیان پائلٹس کو بے تحاشہ ہوائی جہازوں کی طرف دوڑتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ ان میں سے ایک دو پائلٹ اپنے قریبی ہوائی جہازوں پر سوار ہوتے ہوئے بھی نظر آ رہے تھے۔ یہ سب ایک خواب جیسا منظر تھا مگر میں پائلٹس سے زیادہ چابکدست ثابت ہوا۔ بکتر بند گاڑی سے میزائل تیر کی طرح نکلا اور درمیان میں کھڑے ہوئے ایک ہوائی جہاز سے ٹکرایا۔ مجھے نشانہ لینے کا وقت بھی نہیں ملا تھا مگر یہ پہلی ضرب ہی بہت مؤثر ثابت ہوئی۔ ایک دھماکے کے ساتھ ہوائی جہاز کے پرخچے اُڑ گئے اور اس کے ساتھ ہی جیسے آتش بازی چھوٹنے لگی۔ قریب کھڑے ہوئے دوسرے جہاز بھی یکے بعد دیگرے آگ کے شعلوں اور دھماکوں کا نشانہ بننے لگے۔ کچھ پائلٹ اپنے جہازوں کے نزدیک پہنچ چکے تھے۔ کچھ تھوڑے فاصلے پر تھے۔ اس ناگہانی عذاب نے انھیں بھی سنبھلنے کا موقع نہیں دیا اور وہ دھماکوں کی لپیٹ میں آ گئے۔ دوسرا فائر کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔ سارے ائرپورٹ کے طول و عرض میں قیامت برپا تھی۔ نفسا نفسی کا عالم تھا۔ دھماکے، آتش زدگی، شعلے، دھواں، گولیوں کی آوازیں، زخمیوں اور مرنے والوں کی چیخیں، غرضیکہ جہنم کا منظر تھا۔ کسی کو کسی کی خبر تھی اور نہ کسی کا ہوش تھا۔ ہر ایک اپنی جان بچانے کی فکر میں تھا۔ میں نے بکتر بند گاڑی کو وہیں چھوڑ دیا کیوں کہ مجھے معلوم تھا کہ کچھ دیر بعد شعلے اس کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیں گے۔ میں نے جو جیپ ہوائی جہازوں کی طرف روانہ کی تھی وہ درمیان میں ہی کسی گاڑی یا ٹینک سے ٹکرا کر تباہ ہو گئی تھی۔ اب مجھے ایک اور جیپ کی تلاش تھی۔ اس دھواں دھار فضا میں جب کہ ہر طرف موت کا ہولناک کھیل جاری تھا اور ہر چیز دھماکوں اور شعلوں کی نذر ہو رہی تھی۔ ایک جیپ کی تلاش کچھ آسان کام نہ تھا۔ میں دیوانہ وار مقابلتاً محفوظ علاقے میں جیپ کی تلاش میں مصروف تھا مگر مجھے ایک بھی کارآمد جیپ نظر نہ آئی۔ اکثر موٹر گاڑیاں، جیپیں اور طیارے شعلوں کا شکار ہو کر جل رہے تھے۔ بعض ڈھانچوں کی صورت اختیار کر چکے تھے۔ ناگاہ میری نگاہ رن وے سے کچھ دور کھڑی ہوئی ایک جیپ گاڑی پر پڑی۔ دھوئیں کے مرغولوں، بارود اور تیل کی بدبو اور مسلسل بھاگ دوڑ کی وجہ سے میرا سانس سینے میں نہیں سما رہا تھا۔ فضا میں آکسیجن کی کمی پیدا ہو گئی تھی۔ جیپ کافی فاصلے پر تھی اور مجھے وہی میری واحد اُمید نظر آ رہی تھی۔ مجھے فی الفور اس جیپ کو اور خود اپنے آپ کو جتنی جلدی ممکن ہو اس قیامت سے بچا کر دُور لے جانا تھا۔ میں نے اپنی بچی کچھی طاقت یکجا کی اور جیپ کی طرف دوڑ لگا دی۔ میری آنکھوں کے سامنے سُرخ دائرے ناچ رہے تھے مگر میں جیپ کے پاس پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ بھی میری خوش قسمتی تھی کہ اگنیشن میں چابی بھی لگی ہوئی تھی۔ میں نے جیپ پر سوار ہو کر اسے پوری رفتار سے بھگانے میں ایک لمحہ کی تاخیر بھی نہیں کی۔ مجھے نہ سمتوں کا علم تھا نہ منزل کا پتہ تھا۔ مگر جس طرف بھی کھلی ہوئی فضا نظر آئی میں نے اسی طرف جیپ دوڑا دی۔ ہر منٹ قیمتی تھا کسی بھی لمحے کوئی آگ کا گولہ مجھ پر آ کر گر سکتا تھا یا کسی دھماکے سے اڑنے والے طیارے کا ٹکڑا قہر بن کر مجھ پر نازل ہو سکتا تھا مگر ان کی جینے کی خواہش اُسے ناقابلِ یقین مشکلات سے بھی نجات دلا سکتی ہے اور شاید میری قوتِ ارادی ہی تھی جس کی بنا پر میں بہت جلد اس آتش فشاں سے دُور پہنچ گیا۔ دھماکوں کی خوفناک آوازیں باقاعدگی سے آ رہی تھیں مگر میرے پاس نہ تو مُڑ کر دیکھنے کا وقت تھا اور نہ اس کی ضرورت تھی۔ قریباً نصف گھنٹے کی ڈرائیونگ کے بعد میں نے جیپ روکی اور اسٹیرنگ پر سر رکھ کر سستانے لگا۔ شدید اعصابی اور جسمانی جدوجہد نے مجھے انتہا سے زیادہ تھکا دیا تھا۔ اُدھر میری نیند بھی پوری نہیں ہوئی تھی۔ ان تمام چیزوں نے مجھ پر ایسا اثر کیا کہ دوسرے ہی لمحے میں غفلت کی نیند سو گیا۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر موت کا بھیانک کھیل جاری تھا اور خود میری اپنی زندگی بھی ہر آن خطرے میں تھی لیکن فوری خطرے سے محفوظ ہو جانے کے بعد میرے جسم اور اعصاب نے ہڑتال کر دی تھی اور میں ان عناصر کے سامنے بے بس ہو کر نیند کی آغوش میں پہنچ چکا تھا۔

میری آنکھ کھلی تو ابھی تک سورج کی روشنی باقی تھی۔ کچھ دیر تو میرے حواس قابو میں ہی نہ آئے پھر مجھے گزرے ہوئے واقعات کا خیال آیا!

تو ساری باتیں ایک بھولے بسرے خواب کی طرح یاد آئیں۔ گھڑی دیکھی تو تین بجے سہ پہر کا وقت تھا۔ نہ جانے کب سے مجھے کھانے کو کچھ نہ ملا تھا اور اب بھوک نے مجھے بے تاب کر دیا تھا۔ جیپ کی تلاشی لی تو پتہ چلا کہ وہاں بھی کھانے کا کوئی سامان موجود نہ تھا۔ سب سے زیادہ پریشان کن بات یہ تھی کہ میرے پاس اسلحہ کی فراوانی بھی نہیں رہی تھی۔ اس سے پہلے والی جیپ میں ہم نے کئی مشین گنوں کا ذخیرہ رکھا ہوا تھا مگر اب وہ تمام اسلحہ جیپ کے ساتھ ہی میرا ساتھ چھوڑ چکا تھا۔ فقط ایک ریوالور میری پیٹی میں لگا ہوا تھا۔ جنگل، بیابان، دشمن کا ملک، ہر قدم پہ جان جوکھوں کا معاملہ اور ان سب کے مقابلے کے لیے میرے پاس صرف ایک ریوالور اور کچھ گولیاں مگر یہ بھی بہت غنیمت تھا۔ بالکل نہتا ہونے کے مقابلے میں یہ ایک خوشگوار اور اطمینان بخش صورتِ حال تھی جس کے لیے میں نے ایک بار پھر خداوند تعالےٰ کا شکر ادا کیا۔

دُور سے دھماکوں کی آوازیں گاہے گاہے ابھی تک سُنائی دے رہی تھیں مگر اب میں ان سے بے پروا تھا۔ میرا مشن کامیاب ہو چکا تھا حالانکہ اس مہم میں میرے دو جاں باز اور قابلِ اعتبار ساتھی اپنی جان کا نذرانہ پیش کر چکے تھے۔ میری آنکھوں میں وہ سماں پھر گیا جب سجاد اور مبارک کا جلتا ہوا ہیلی کاپٹر ائرپورٹ کی مرکزی عمارت سے ٹکرا کر ایک بہت بڑے آگ کے گولے کی شکل میں تبدیل ہو گیا تھا۔ بے شک وہ بہت شجاع اور جیالے لوگ تھے جنھیں شہادت کا رتبہ حاصل ہو چکا تھا۔ پھر مجھے سجاد کا خیال آیا جس نے ابھی گھر بھی نہیں بسایا تھا۔ جس کے دوست، احباب اور رشتے دار اس کی شادی کے ارمان دل میں لیے بیٹھے تھے۔ مبارک کی بچیاں اب کس کے آسرے پر زندگی گزاریں گی؟ مگر انسانوں کو خدا کے سوا اور کس کا آسرا ہو سکتا ہے۔

جیپ آہستہ آہستہ سفر کر رہی تھی۔ میری نگاہیں آس پاس کے علاقوں پر تھیں، جہاں بے ثمر درختوں اور گھاس پھونس کے علاوہ اور کچھ موجود نہیں تھا۔ نہ جانے یہ بے منزل سفر کتنی دیر تک جاری رہے گا؟ کھانے کے لیے مجھے کچھ دستیاب بھی ہو سکے گا یا اتنی خطرناک اور جاں جوکھوں کی مہمات سے زندہ بچ رہنے کے بعد بھوک اور فاقہ کشی سے ہلاک ہونا میرا مقدر بن چکا تھا؟ زیادہ پریشان کن بات یہ تھی کہ مجھے اس علاقے کے بارے میں کوئی علم نہ تھا۔ نہ آس پاس کی بستیوں اور آبادیوں کا کوئی اندازہ تھا۔ میں نے اس خیال سے جیپ کی رفتار بڑھا دی کہ ممکن ہے رات ہونے سے پیشتر کسی آباد علاقے میں پہنچ جاؤں۔ کچھ دیر بعد جنگلوں کا سلسلہ کوہستانی علاقے میں تبدیل ہونے لگا۔ چھوٹے چھوٹے پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہو گیا جن پر گھنے درخت سر اُٹھائے کھڑے تھے۔ یہاں کوئی پکی سڑک بھی نہ تھی مگر میں چھوٹی موٹی رکاوٹیں عبور کرتا ہوا بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد شام ہونے والی تھی۔ میں نے پہلی بار جیپ کے میٹر پر نظر ڈالی تو پتہ چلا کہ پٹرول بھی زیادہ نہیں ہے۔ گاڑی میں موجود پٹرول بہ مشکل ساٹھ میل سے زائد مسافت کے لیے کافی نہیں ہو سکتا تھا۔ فالتو پٹرول کے لیے کوئی ڈبہ بھی جیپ میں موجود نہ تھا گویا کچھ دیر بعد جیپ بھی میرا ساتھ چھوڑنے والی تھی اور آس پاس آبادی کا کوئی نشان نہ تھا۔

میں ان ہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ اچانک ایک سنسناہٹ کی آواز سُنائی دی۔ میں نے جیپ کی رفتار کم کر دی اور یہ میرے حق میں بہتر ہی ہوا۔ کیونکہ تھوڑی دیر بعد جیپ کا ایک ٹائر بیٹھ چکا تھا۔ میں نے پریشانی کے عالم میں جیپ روکی اور کود کر باہر نکلا۔ پچھلے ٹائر کی ہوا نکل چکی تھی اور قریباً ڈیڑھ فٹ لمبا ایک تیر اس میں پیوست تھا۔ یہ ایک ناگہانی اُفتاد تھی۔ تیر کا بھلا آج کے دور میں کون استعمال کرتا ہے؟ میرے پاس کوئی فالتو ٹائر بھی موجود نہ تھا۔ گویا اب میں تیر اندازوں کے رحم و کرم پر تھا۔ میں نے تیر کو کھینچ کر ٹائر سے نکالا۔ وہ لکڑی کا بنا ہوا ایک انچ موٹائی کا ایک گول تیر تھا جس کا اگلا حصہ نہایت تیز نوک دار دھات کا بنا ہوا تھا۔ ابھی میں اس کا معائنہ ہی کر رہا تھا کہ سائیں سائیں کی چند اور آوازیں سُنائی دیں اور جیپ کے باقیماندہ تینوں ٹائروں اور اگلی سیٹ میں بھی تیر پیوست ہو گئے۔ میں غیر ارادی طور پر لپک کر جیپ کی آڑ میں ہو گیا اور ریوالور کو ہاتھ میں تھام لیا۔ مگر میری آنکھوں کے سامنے جو منظر تھا وہ کسی بھی شخص کے ہوش اڑانے کے لیے کافی تھا۔ پہاڑیوں کے دامن میں اُگے ہوئے اونچے درختوں کے عقب سے نیم برہنہ جنگلی نیزے اور تیر کمان سنبھالے میری طرف بڑھ رہے تھے۔ اُن کی یلغار چاروں اطراف سے تھی۔ انھوں نے کمانوں کے چلّوں میں تیر چڑھائے ہوئے تھے اور نیزہ بردار جنگلیوں نے ہاتھوں میں نیزے اس طرح پکڑ رکھے تھے جیسے ایک اشارے پر پھینک ماریں گے۔ وہ بالکل خاموش تھے۔ چہروں پر بھی جنگلی پن اور وحشت کے سوا کوئی اور تاثر نہیں تھا۔ انھوں نے پھٹے پُرانے کپڑوں یا کھالوں کے ٹکڑوں سے اپنے جسم کے درمیانی حصّے ڈھانپے ہوئے تھے۔ اس کے سوا ان کے جسموں پر کوئی اور لباس موجود نہیں تھا۔ پیروں میں جوتے تھے۔ میں نے ریوالور کو اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے تھام لیا مگر

گولی چلانے کا کوئی مقصد نہ تھا۔ وہ چاروں جانب سے میری طرف بڑھ رہے تھے۔ گولی چلانے کا مطلب یقینی ہلاکت کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ میں اگر دس بارہ جنگلیوں کو ہلاک کرنے میں کامیاب ہو بھی جاتا تو تب بھی اُن کی تعداد کم نہ ہوتی۔ اُن کی تعداد کے سامنے میں بے بس تھا چنانچہ خاموشی سے اپنے آپ کو اُن کے رحم و کرم پر چھوڑ دینے کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا۔ وہ سب اپنی رفتار کم کئے بغیر میری طرف بڑھتے رہے یہاں تک کہ سامنے والوں کے نیزوں کی نوکیں میرے چہرے سے ایک فٹ کے فاصلے پر رہ گئیں۔ ایک اَن جانے خوف نے مجھے گھیر لیا۔ کاش میں نے لڑ کر جان دینے کا فیصلہ کیا ہوتا اور مرنے سے پہلے کچھ جنگلیوں کو موت کے گھاٹ تو اُتار دیتا۔ اَب بے بسی اور بُزدلی کی موت میرا مُقدّر بن چکی تھی مگر اَب کوئی حرکت یا جدّوجہد کرنا لاحاصل اور بے معنی تھا۔ میں خاموشی سے اُن کو دیکھتا رہا اور اُن کے اگلے قدم کا منتظر رہا۔ وہ سب میرے نزدیک آ کر رُک گئے تھے اور مجھے گھُور رہے تھے۔ ان میں سے ایک ہٹا کٹا قدآور جنگلی دوسروں کو ہٹاتا ہوا میری طرف بڑھا۔ اس کے چہرے پر خشونت اور کرختگی تھی۔ اس نے اپنے نیزے کی اَنی میری شہ رگ پر رکھ دی اور جنگلی زبان میں مجھ سے مخاطب ہو کر کچھ کہا جو میں نہیں سمجھ سکا۔

نیزے کی نوک میری گردن میں چبھ رہی تھی مگر اس پر زیادہ دباؤ نہ تھا شاید وہ مجھے محض خوف زدہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ نہ جانے کیا کیا کہتا رہا جس کا ایک لفظ بھی میرے پلّے نہ پڑا۔ پھر اس نے دوسرے ہاتھ سے مجھے اشارہ کیا۔ غالباً وہ مجھ سے چُپ چاپ ہتھیار ڈالدینے کے لیے کہہ رہا تھا۔ میں نے ریوالور اپنی پیٹی میں رکھ لیا تو اس کی گرج چمک میں کچھ کمی ہوئی۔ اس کے اشارے پر میں نے قدم آگے بڑھائے۔ اس کا نیزہ میرے گلے پر سے ہٹ چُکا تھا مگر میں بدستور چاروں طرف سے جنگلیوں کے نرغے میں تھا۔ میں نے ایک آخری نگاہ جیپ پر ڈالی جو میرے لیے بیکار محض ہو کر رہ گئی تھی اور اپنی تقدیر پر شاکی جنگلیوں کے جلو میں پہاڑیوں اور درختوں کی طرف بڑھنے لگا۔

ہم دو تین گھنٹے تک مسلسل چلتے رہے۔ اس دوران میں کوئی ایک لفظ بھی نہ بولا۔ ہر طرف مہیب سنّاٹا اور خاموشی تھی۔ ہمارے قدموں کی چاپوں کے سوا کوئی دوسری آواز نہ تھی۔ اس اثنا میں سورج غُروب ہو چکا تھا۔ بُلند اور گھنے درختوں کی وجہ سے تاریکی سورج غروب ہونے سے پہلے ہی پھیلنے لگی تھی اور جب ہم پہاڑیوں کے دامن میں ایک کھُلے مقام پر پہنچے تو رات پڑ چکی تھی۔ یہ درختوں سے گھری ہوئی ایک جنگلی بستی تھی جو درختوں پتوں اور گھاس پھُوس سے بنی ہوئی تھیں۔ اُن کی چھتیں گنبدوں کی طرح گولائی میں تھیں۔ ایسی جھونپڑیاں اور ایسی بستی میں پہلے بھی دیکھ چُکا تھا مگر وہ کسی امریکی فلم کا ایک منظر تھا۔ جب کہ موجودہ نظارہ حقیقی تھا۔ جھونپڑیوں کے درمیان ایک مختصر مستطیل نما میدان میں لکڑی کے چند موٹے موٹے تنے کٹے ہوئے پڑے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ فرنیچر کے طور پر استعمال کئے جاتے ہیں۔ جھونپڑیوں میں چراغ اور دیئے جل رہے تھے مگر ایک بڑی جھونپڑی کے سامنے ایک مشعل روشن تھی جس کی دھیمی دھیمی روشنی چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ اس جھونپڑی کے اندر دوسری جھونپڑیوں سے زیادہ روشنی نظر آ رہی تھی۔ یہ قبیلے کے سردار کی جھونپڑی تھی۔ ہمارا قافلہ سردار کی جھونپڑی کے سامنے جا کر رُک گیا۔ وہ شخص جس نے نیزے کی اَنی میرے گلے پر رکھی تھی آگے بڑھا اور جھونپڑی کے دروازے کے نزدیک جا کر اس نے اپنی جناتی زبان میں بآوازِ بلند کچھ الفاظ کہے۔ چند لمحے بعد دروازے میں ایک شخص نمودار ہوا۔ اس پر ایک نظر ڈال کر ہی اِس امر کی تصدیق ہو جاتی تھی کہ وہ قبیلے کا سردار ہے۔ وہ دوسرے لوگوں سے زیادہ قدآور اور جسیم تھا۔ اُس کے جسم پر بھی دوسروں جیسا ہی لباس تھا مگر ایک اضافہ اس کے سَر پر لگے ہوئے پَروں کا تھا۔ وہ گندمی رنگ کا قوی ہیکل شخص تھا۔ رُعب و داب اور شان و شوکت کے اعتبار سے بھی وہ سردار ہی بننے کا مستحق تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے ہاتھ میں لالٹین تھامے ہوئے ایک عورت نمودار ہوئی۔ لباس اس کا بھی مردوں سے زیادہ مختلف نہ تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس کے جسم کے بالائی حصے پر بھی ستر پوشی کے لیے ایک کپڑا بندھا ہوا تھا مگر باقی جسم بے لباس تھا۔ یہ کھِلتی ہوئی سانولی رنگت کی ایک صحت مند اور خوش شکل عورت تھی اس کی آنکھیں سیاہ اور بڑی بڑی تھیں اور کھُلے ہوئے لمبے بال کمر تک پھیلے ہوئے تھے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ سردار کی گیارہ بیویوں میں سے ایک تھی۔

سردار نے جھونپڑی کے دروازے میں رُک کر سر سے پیر تک میرا جائزہ لیا۔ اُسے دیکھ کر تمام جنگلی تعظیماً سر جھکا کر کھڑے ہو گئے تھے۔ عورت ایک قدم بڑھ کر میرے اور نزدیک آ گئی اور اُس نے لالٹین کو اُونچا اُٹھا کر سردار کو یہ موقعہ فراہم کیا کہ وہ بخوبی میرا جائزہ لے سکے۔ میری توجہ سردار پر مرکوز تھی۔ وہ اپنی چھوٹی چھوٹی چمک دار آنکھوں سے مجھے گھُور رہا تھا اور اُس کی

آنکھیں مجھے اپنے جسم میں چُبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ کچھ دیر وہ خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا پھر اس جنگلی سے مخاطب ہُوا جو مجھے پکڑ کر لایا تھا۔ جواب میں اس نے میرے بارے میں خاصی لمبی گفتگو شروع کر دی۔ ظاہر ہے کہ وہ اسے تفصیلات بتا رہا ہوگا۔ اس کا بیان کافی دیر تک جاری رہا اور اس دوران میں سردار کی نظریں ایک بار بھی میرے سوا کسی اور طرف مُنتقل نہیں ہوئیں۔ ایک بار ہم دونوں کی نظریں بھی چار ہوئیں اور میں نے بے خوفی سے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں مگر اُس کے چہرے پر کوئی تاثر نمودار نہ ہُوا۔ جنگلی کی بات ختم ہُوئی تو سردار کے کرخت چہرے پر پہلی بار مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ براہِ راست مجھ سے مخاطب ہُوا ـــــ "تم فوجی ہو سُورما ؟"

اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ میری زبان جانتا تھا اور یہ خیال میرے لیے خاصا تقویت بخش تھا۔ میں نے سر ہلا کر تصدیق کی تو اُس کی مسکراہٹ قہقہے میں بدل گئی۔ اُس نے اپنا چہرہ آسمان کی طرف اُٹھایا اور زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا۔ پھر وہ بڑھ کر میرے نزدیک آ گیا اور دوستانہ انداز میں میرا ہاتھ تھام کر بولا "سردار لوگا، سرکار کا دوست۔ تمہارا دوست۔ تم ہمارا دوست" یہ کہا اور پھر قہقہے لگانے لگا۔ اس کی دیکھا دیکھی اس کے پاس کھڑے ہوئے جنگلیوں نے بھی زور زور سے قہقہے لگانے شروع کر دیئے۔ اس کی خوبرو بیوی بھی، جو لالٹین تھامے کھڑی تھی ان قہقہوں میں شامل ہو گئی۔ سارا جنگل قہقہوں کی آوازوں سے گُونج اُٹھا۔ پہلے تو کچھ دیر میں حیرت سے ان سب کو ہنستا ہوا دیکھتا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اس موقعے پر مجھے کیا کرنا چاہیئے مگر جب ان کے قہقہے بند ہونے میں ہی نہیں آتے تھے تو میں نے بھی ان کی آوازوں میں اپنی آواز شامل کرنا ہی مناسب خیال کیا اور ان کے ساتھ ہی فلک شگاف قہقہے لگانے شروع کر دیئے۔ کچھ دیر تک بے مقصد قہقہوں کا یہ سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ سردار غالباً تنگ آ گیا اور وہ یک لخت خاموش ہو گیا۔ دوسرے جنگلیوں نے بھی اُس کی پیروی کی اور مجھے بھی اپنے قہقہوں کو روکنے میں کوئی مُشکل پیش نہیں آئی۔ سردار نے مجھے گرفتار کر کے لانے والے کو مخاطب کیا اور پہلی بار مجھے پتہ چلا کہ اُس کا نام ڈونگا ہے۔ ڈونگا نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور پھر مُڑ کر دوسرے جنگلیوں سے کچھ کہا۔ وہ سب خاموشی سے اُس کے ساتھ رُخصت ہو گئے۔ سردار لوگا ان سے فارغ ہو کر پھر میری طرف متوجہ ہُوا "آ جاؤ۔ تم ہمارے مہمان ہو" بازو سے تھام کر وہ مجھے جھونپڑی کے اندر لے گیا۔

جھونپڑی خاصی کشادہ تھی۔ زمین پر چٹائیاں بچھی ہُوئی تھیں۔ درختوں کے کٹے ہوئے چند موٹے موٹے تنے بھی یہاں وہاں رکھے ہُوئے تھے جو غالباً فرنیچر کے طور پر استعمال کیے جاتے تھے۔ سردار ایک تنے پر براجمان ہو گیا اور مجھے ہاتھ کے اشارے سے دوسرے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ عورت لالٹین ایک کونے میں رکھ کر اس کے قدموں کے پاس چٹائی پر بیٹھ گئی اور سَر اُٹھا کر میری طرف دیکھنے لگی۔ سردار کے بدلے ہُوئے دوستانہ رویّے نے مجھے خوف اور فکر سے آزاد کر دیا تھا۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ وہ مجھے اس مُلک کا ایک فوجی سمجھ رہا تھا اور وقتی طور پر یہ میرے لیے بہت اطمینان بخش بات تھی۔

سردار نے مجھ سے سوال کیا "تم ادھر جنگل میں کیوں آئے ہو ؟"

میں نے اتنی دیر میں اُس کے متوقع سوالات کے جوابات سوچ لیے تھے۔ مجھے اس جگہ اور یہاں کے علاقوں کے ناموں سے کوئی واقفیت نہ تھی مگر اس کے سوال کا جواب دینا بھی ضروری تھا۔ میں نے کہا "سردار۔ میں تمہیں سلام کرتا ہوں۔ میں بھی تمہارا دوست ہوں" میں نے اپنا ہاتھ اُس کی طرف بڑھایا تو اس نے میرا ہاتھ تھامنے میں تامّل نہیں کیا "ہمارا زبان آپ جانتا۔ کیسے جانتا ؟"

سردار پھر مسکرایا "سردار لوگا اُدھر پڑھنے گیا تھا۔ لوگا شہر میں گیا۔ لوگا سب جانتا ہے" اُس کی بیوی نے بھی فخریہ انداز میں مسکرا کر سردار کی طرف دیکھا۔

میں نے اُسے بتایا کہ ہمارے ایئرپورٹ پر دُشمن نے حملہ کر دیا۔ سب کچھ برباد ہو گیا۔ زیادہ تر لوگ مارے گئے۔ میں ایک جیپ میں جان بچا کر بھاگا اور جنگل میں راستہ بھُول گیا۔ اس کے آدمیوں نے مجھے گھیر لیا میری جیپ کو بیکار کر دیا اور مجھے پکڑ کر اس کے پاس لے آئے۔ اب میں اُس کی پناہ میں ہوں اور اُسے اپنی وفاداری کا یقین دلاتا ہوں۔

میری گفتگو نے سردار کو متاثر کیا اور وہ مجھے ہمدردی کی نگاہ سے دیکھنے لگا۔ اُس کی بیوی بھی متاثر نظر آتی تھی۔ "لوگا سرکار کا دوست ہے۔" وہ اُٹھ کر میرے پاس آ گیا اور میرے شانے پر دوستانہ انداز میں ہاتھ مار کر بولا۔ "اَب تم ادھر ہمارے مہمان ہو۔ ہم تمہاری مدد کرے گا۔ تمہیں واپس بھیج دے گا۔"

یہ دلاسہ بھیجنے والی بات مجھے پسند نہ آئی مگر میں نے اس کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھا۔ سردار بوگا شہر میں آتا جاتا رہا تھا اس لیے شہری بول چال اور طور طریقوں سے واقف تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ اپنے باپ کی خواہش کے برعکس وہ شہر میں آتا جاتا رہا اور شہر کے لوگوں سے اس کا میل جول رہا۔ اُس نے تھوڑی بہت تعلیم بھی حاصل کی تھی مگر جو اُستاد اُسے پڑھانے کے لیے جنگل میں لایا گیا تھا ایک روز جنگلی زندگی سے نجات حاصل کرنے کی غرض سے اُس نے بستی سے بھاگنے کی کوشش کی اور ایک جنگلی پہریدار نے اُسے ہلاک کر دیا۔ اس طرح سردار بوگا کی تعلیم نامکمل ہی رہ گئی۔ اس کا بوڑھا باپ یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ جنگلی قبیلے کا ہونے والا سردار کسی شہری سکول میں تعلیم حاصل کرے۔ وہ یوں بھی تعلیم کے حق میں نہیں تھا اور اسے ایک بیکار اور فضول شے سمجھتا تھا۔ اس کے مقابلے میں وہ جنگل اور جنگلی زندگی کے مطالعے کو زیادہ ضروری اور اہم سمجھتا تھا۔ شجاعت کے کارنامے، تیر اندازی، جنگ و جدل اور اس قسم کے دوسرے مردانہ مشغلے اُس کے نزدیک تعلیم سے زیادہ ضروری تھے۔ سردار بوگا کے باپ جاچی کو مرے ہوئے تین سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اس کی بائیس بیویاں تھیں جو اس کے مرنے کے بعد جنگلیوں کے رواج کے مطابق اس کے بھائیوں میں تقسیم کر دی گئیں۔ بوگا کی ماں مر چکی تھی۔ وہ سردار جاچی کا سب سے بڑا بیٹا تھا اور ویسے بھی اپنی جواں مردی کے لیے مشہور تھا۔ اس لیے باپ کے مرنے کے بعد بوگا کو سردار بننے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ جس وقت بوڑھا سردار مرا اس وقت بوگا کی صرف دو بیویاں تھیں مگر یہ بات ایک جنگلی سردار کی شایانِ شان نہ تھی کہ وہ محض دو بیویوں پہ گزارہ کرے اس لیے اگلے دو سال میں اس کی بیویوں کی تعداد گیارہ ہو گئی۔ اپنی سرداری کا رعب داب بھرم رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ وہ کم از کم بائیس بیویوں کا شوہر ضرور بن جائے ورنہ جنگلی اس کو باپ کے مقابلے میں کمتر سمجھتے رہیں گے۔

کچھ دیر ہم دونوں آپس میں باتیں کرتے رہے اور اس دوران میں مجھے اس جنگلی قبیلے اور اس کے سردار کے بارے میں کافی معلومات حاصل ہوئیں۔ ہماری گفتگو کے دوران میں اس کی بیوی نیرا بالکل خاموش رہی۔ وہ ہماری باتیں سن رہی تھی مگر صاف ظاہر تھا کہ ایک لفظ بھی اُس کے پلے نہیں پڑ رہا تھا۔ وہ جنگلی بول چال کے علاوہ کوئی اور زبان نہیں جانتی تھی۔ دوسرے جنگلیوں کا بھی یہی حال تھا۔ سردار بوگا شہری زبان خاصی روانی سے بول لیتا تھا جو اُس کے اُستاد کی صحبت کا اثر تھا۔ اپنے شہری اُستاد کی شاگردی میں اُس نے شہر والوں کے بارے میں اور بھی بہت سی باتیں سُنی تھیں اور اُن کے بعض رواج بھی اپنائے تھے جس کی وجہ سے اس کے باپ کا خیال تھا کہ وہ بزدل اور کاہل ہو گیا ہے۔ بوڑھے سردار کو یقینِ کامل تھا کہ اگر بوگا کچھ اور شہری انداز سیکھ گیا تو پھر وہ سرداری کے قابل نہیں رہے گا۔ ہم باتیں کر رہے تھے مگر میرے پیٹ میں بھوک سے چوہے دوڑ رہے تھے۔ سردار بوگا نے مہمان سمجھ کر میرے ساتھ مہربانی کا سلوک کیا تھا۔ دوستوں کی طرح مجھ سے باتیں کی تھیں۔ مجھ سے یہ دریافت کیا تھا کہ مجھے کوئی چوٹ یا زخم تو نہیں آیا مگر کھانے کے بارے میں اُس نے ایک بار بھی دریافت نہیں کیا تھا۔ کچھ دیر بعد جب ہماری گفتگو ختم ہوئی تو سردار یکلخت اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا، "دوست۔ اب تم آرام کرو۔ نیرا تمہیں رہنے کی کُٹیا دکھائے گی۔" اس کے بعد اُس نے نیرا کو مخاطب کر کے جنگلی زبان میں کچھ کہا۔ وہ خاموشی سے اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ لالٹین اس کے ہاتھ میں تھی اور وہ اس بات کی منتظر تھی کہ میں اس کی رہبری میں چلوں۔ میں نے ایک بار پھر سردار کا شکریہ ادا کیا اور نیرا کے پیچھے پیچھے روانہ ہوا مگر دروازے کے پاس پہنچ کر مجھ سے رہا نہیں گیا اور میں نے رُک کر سردار کی طرف دیکھا۔ نیرا بھی رُک گئی تھی۔ سردار لمبے لمبے ڈگ بھر کر میرے پاس آ گیا اور سوال طلب نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا: "سردار۔ میں بہت بھوکا ہوں۔ کیا سونے سے پہلے کھانا ملے گا؟"

سردار مسکرایا اور پھر اس نے نیرا سے کوئی بات کی۔ اس کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اُس نے نیرا کو میرے سوال کے بارے میں بتایا ہے کیونکہ وہ بھی مجھے مسکرا کر دیکھنے لگی تھی۔

"تم نیرا کے ساتھ جاؤ۔" وہ مجھ سے مخاطب ہو کر نرمی سے بولا۔ "سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

نیرا کے ساتھ میں سردار کی جھونپڑی سے باہر نکل کر اُس طرف بڑھا جدھر چند اور جھونپڑیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ نیرا مجھے آخری کونے والی جھونپڑی کے پاس لے گئی۔ دروازے کے سامنے کھڑی ہو کر اُس نے لالٹین ہاتھ سے رکھ دی اور پرنام کرنے کے انداز میں دونوں ہاتھ جوڑ کر زیرِ لب چند الفاظ کہے۔ پھر وہ ایک طرف کو ہو گئی اور مجھے ہاتھ کے اشارے سے جھونپڑی کے اندر جانے کے لیے کہا۔ میں جھونپڑی میں داخل

ہوا تو نیرا لالٹین سمیت غائب ہو چکی تھی۔ میں نے جھونپڑی کا جائزہ لیا۔ یہ سردار کی جھونپڑی سے چھوٹی تھی مگر پھر بھی بستی کی دوسری جھونپڑیوں کے مقابلے میں کافی بڑی جھونپڑی تھی۔ فرش کچی مٹی کا تھا مگر ایک طرف چٹائی اور سرہانا بھی پڑی ہوئی تھی۔ درختوں کے تنے کا کوئی فرنیچر اس جھونپڑی میں موجود نہیں تھا۔ ایک طرف چند جانوروں کی کھالیں اور مٹی کے ایک دو برتن پڑے تھے۔ دوسرے گوشے میں کچھ اور سامان بھی پڑا ہوا تھا جو میرے نزدیک کاٹ کباڑ تھا مگر ہو سکتا ہے وہ اِن جنگلیوں کے لیے مفید اور کارآمد چیزیں ہوں۔ جھونپڑی کے ایک کونے میں ایک دیا ٹمٹما رہا تھا جو روشنی کا واحد ذریعہ تھا۔

میں چٹائی پر لیٹ گیا۔ کافی تھکا ہوا تھا اور ذہنی کشمکش میں مبتلا رہا تھا اس لیے اعصاب بھی تھک گئے تھے۔ شدید بھوک اور اجنبی مقام کے خطرات کے باوجود تھکن کی وجہ سے بہت جلد میری آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں اور میں نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

میں نہ جانے کتنی دیر سوتا رہا۔ یکایک جسم سے کسی ملائم چیز کے مَس ہونے سے میری آنکھ کھل گئی۔ میری نیند اتنی گہری اور بے خبری کی تھی کہ کچھ دیر تو مجھے یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ میں کہاں ہوں؟ مگر جب جھونپڑی کی چھت میری آنکھوں کے سامنے نظر آئی تو مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔ میں تیزی سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرے دائیں ہاتھ کے نزدیک ہی ایک سیاہ رنگ کی بلی کھڑی تھی۔ وہ بار بار اپنے روئیں دار جسم کو میرے ہاتھ سے رگڑ رہی تھی اور یہی وہ لمس تھا جس نے مجھے بیدار کر دیا تھا۔ پھر مجھے ایک زنانہ ہنسی کی کھنکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ میں نے چونک کر دوسری طرف سر اُٹھایا تو وہاں ایک سیاہ فام عورت نظر آئی جو اپنے ہاتھ میں مٹی کا ایک برتن اُٹھائے ہوئے کھڑی تھی۔ میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس کا رنگ بالکل ہی سیاہ تھا۔ سیاہ بال کمر تک پھیلے ہوئے تھے۔ آنکھوں کی سفید پتلیوں اور دانتوں کے سوا اس کے جسم کی ہر چیز سیاہ تھی۔ اس کے دانت موتیوں سے زیادہ آب دار اور خوبصورت تھے۔ وہ ہنس رہی تھی جس کی وجہ سے مجھے دانتوں کی لڑی چمکتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ وہ ایک دراز قامت اور متناسب جسم کی جوان عورت تھی اور نیرا ہی کی طرح کا جنگلی لباس پہنے ہوئے تھی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں نے اس سے پہلے ساری زندگی میں اتنی سیاہ فام مگر خوبصورت عورت نہیں دیکھی تھی۔ اس کے نین نقش تیکھے اور دلکش تھے اگر اس کا رنگ گورا یا سانولا ہوتا تو وہ دُنیا کی حسین ترین عورتوں میں شمار کی جا سکتی تھی مگر اس وقت بھی اس کی رعنائی اور دلکشی میں کوئی کلام نہیں تھا۔ میں حیرانی سے اسے تک رہا تھا۔ وہ کچھ دیر مترنم آواز میں ہنستی رہی اور پھر بلی کو ڈانٹنے کے انداز میں آگے بڑھی جو ابھی تک میرے آس پاس منڈلا رہی تھی اور اب اس کے منہ سے خرخر کی آوازیں بھی نکل رہی تھیں۔ سیاہ فام عورت نے ہاتھ میں تھامے ہوئے برتن میرے سامنے چٹائی پر رکھ دیئے اور مسکراتے ہوئے بلی کو گود میں اُٹھا کر سہلانے لگی۔ میرا دھیان عورت اور بلی سے زیادہ برتنوں کی طرف لگا ہوا تھا جس میں سے کھانے کی اشتہا انگیز خوشبو اُٹھ رہی تھی۔ بے اختیار ہو کر میں نے ان پر ڈھکے ہوئے پتے ہٹا دیئے۔ ایک برتن میں بھنا ہوا گوشت تھا اور دوسرے میں کوئی ترکاری قسم کی چیز تھی۔ اس کے سوا روٹی یا کوئی اور چیز موجود نہ تھی۔ میں کھانے پر پل پڑا اور اُس وقت تک کسی اور طرف نظر اُٹھا کر نہیں دیکھا جب تک کہ برتنوں میں کھانا ختم نہیں ہو گیا۔ اس کام میں چند منٹ سے زیادہ دیر نہیں لگی۔ عورت پھر مسکراتی ہوئی آگے بڑھی۔ اُس نے جھک کر فرش پر سے خالی برتن اُٹھائے اور جنگلی زبان میں مجھ سے مخاطب ہو کر کچھ کہا۔ میں اُس کا مطلب تو نہ سمجھ سکا مگر اتنا ضرور جان گیا کہ وہ شرارتاً میرے بے تحاشہ کھانے پر کوئی فقرہ چست کر رہی تھی۔ بلی کو اس نے گود سے اُتار دیا تھا اور وہ پھر میرے گرد منڈلا رہی تھی۔ یکایک دروازے پر آہٹ ہوئی۔ پہلے نیرا لالٹین کے ساتھ نمودار ہوئی اور اُس کے بعد سردار کا باوقار سراپا نظر آیا۔ اُس نے سیاہ فام عورت سے کچھ کہا اور اس کا جواب سُن کر مسکرایا۔ پھر وہ میری طرف متوجہ ہوا۔ "پیٹ بھر گیا؟"

میں نے سر ہلایا اور اُس کا شکریہ ادا کیا۔

"کھانا اچھا تھا؟" اُس نے پوچھا۔

میں نے کھانے کی تعریف میں بخل سے کام نہیں لیا۔ یہ سچ ہے کہ اتنی شدید بھوک میں کھایا ہوا یہ کھانا مجھے دُنیا کی لذیذ ترین خوراک محسوس ہوئی تھی۔ سردار نے دونوں ہاتھ ہلا کر اشارہ کیا۔ نیرا اور وہ عورت دونوں جھونپڑی سے باہر چلی گئیں۔ ان کے پیچھے سیاہ بلی بھی کاہلی سے دُم ہلاتی ہوئی رُخصت ہو گئی۔ سردار نے جھونپڑی کے ایک کونے میں رکھا ہوا مٹی کا پیالہ اُٹھا کر ایک برتن میں سے پانی انڈیل کر مجھے پیش کیا اور پھر میرے برابر بیٹھ گیا۔

مَیں نے کہا: "سردار لوگا۔ کھانا بہت مزیدار تھا۔ آپ کی نوکرانی نے پکایا تھا؟"

وہ زور زور سے ہنسنے لگا: "دوست۔ اِدھر جنگل میں نوکر لوگ نہیں ہوتا۔ سب لوگ اپنا کام خود کرتے ہیں۔"

"مگر آپ کا کام کون کرتا ہے؟" مَیں نے پُوچھا۔ "آپ تو سردار ہیں۔"

"ہمارا بیوی لوگ کرتا ہے۔ تم جانتے ہو۔ ہماری گیارہ بیویاں ہیں۔"

مَیں سر ہلا کر رہ گیا۔ یہ بات وہ پہلے بھی مجھے بتا چکا تھا۔

"نیرا کو تم نے دیکھ لیا۔ گوچی بھی ہمارا بیوی ہے۔ یہ کھانا اُس نے بنایا تھا۔"

"گوچی؟" مَیں نے حیران ہو کر پُوچھا۔

"ہاں۔ یہ گوچی تھی۔ اس کی بلّی ہر وقت اِس کے ساتھ رہتی ہے۔" یہ کہہ کر وہ پھر ہنسنے لگا۔ "گوچی بھی بلّی جیسی ہے۔ کالی کالی ——— کومل کومل۔"

پھر وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ مَیں بھی احتراماً اُس کے ساتھ ہی اُٹھ کھڑا ہُوا۔ "دوست۔" اُس نے اچانک پُوچھا: "تمہارا نام کیا ہے؟"

مَیں اِس اچانک سوال کے لیے تیار نہیں تھا اس لیے سٹپٹا کر رہ گیا۔ "میرا نام؟ میرا نام راجو ہے۔" مجھے اس کے سوا کوئی اور نام جلدی میں نہیں سُوجھا۔

"دیکھو راجو۔" وہ دوستانہ انداز میں میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا: "تم ہمارے مہمان ہو۔ اِدھر ہم جنگل لوگ مہمان پر اپنی جان بھی وار دیتے ہیں۔ ہماری ہر چیز مہمان کے لیے ہے۔ اَب تم آرام کرو گے؟"

ظاہر ہے۔ اِس وقت میری سب سے بڑی خواہش یہی تھی۔ مَیں نے ایک بار پھر سردار لوگا کا شکریہ ادا کیا کہ اُس نے مجھے پناہ دی اور میری مہمان داری کی۔

"یہ تو تمہارا ادھیکار ہے دوست۔ مہربانی کی بات نہیں ہے۔" وہ دروازے کی طرف رُخ کیے ہُوئے کھڑا تھا۔ یکایک اُس نے دونوں ہاتھ بلند کیے اور تالی بجائی۔ دوسرے ہی لمحے جھونپڑی میں ایک بھونچال سا آ گیا۔ پہلے نیرا اندر داخل ہوئی۔ اِس کے بعد ایک اور عورت آئی۔ تیسرے نمبر پر گوچی آئی۔ اس کے بعد ایک ایک کر کے اور بھی عورتیں آئیں۔

وہ تعداد میں کُل گیارہ تھیں۔ مَیں اُنہیں دلچسپی اور حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ وہ سب اندر آ کر میرے اور سردار کے سامنے کھڑی ہو گئیں۔ میرے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ وہ سب سردار لوگا کی بیویاں تھیں۔ سردار نے باری باری ان میں سے ہر ایک کا نام بتا کر تعارف کرانا شروع کر دیا۔ مَیں اِن کے چہرے دیکھ رہا تھا۔ کہنے کو وہ سب جنگلی تھیں مگر رنگ اور ناک نقشے کے اعتبار سے ایک دوسرے سے کافی مختلف تھیں۔ نیرا سانولے رنگ کی تھی۔ جبکہ گوچی سیاہ فام تھی۔ دو عورتیں خاصے گورے رنگ کی تھیں۔ تین عورتیں دیکھنے میں نیپالی یا بھوٹانی لگتی تھیں۔ باقی کے نقش و نگار چینی، جاپانی اور فلپائنی ٹائپ کے تھے۔ ان کی رنگت بھی زردی مائل سُرخ تھی۔ چہرے چوڑے ناک چپٹی اور آنکھیں چھوٹی چھوٹی مگر چمکدار ——— اگرچہ ان سب کے انداز الگ الگ تھے مگر ایک بات اِن سب میں مشترک تھی۔ وہ سب دیکھنے میں خوش شکل، صحت مند اور دلکش عورتیں تھیں اور خوش مزاج بھی معلوم ہوتی تھیں اس لیے کہ اس دوران میں وہ ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر شوخی سے مُسکراتی اور قہقہے بازی کرتی رہیں۔ سردار ایک ایک کا نام مجھے بتاتا رہا اور مَیں احتراماً سر جھکا کر سلام کرتا رہا۔ میرے اس انداز پر بھی وہ مُسکراتی رہیں۔ تعارف کی رسم ختم ہوئی تو کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی مگر بائیس آنکھیں مجھ پر جمی ہُوئی تھیں۔ مَیں نے پریشان ہو کر سردار کی طرف دیکھا۔ وہ مُسکراتا ہوا میری طرف بڑھا اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر دوستانہ لہجے میں بولا: "راجو۔ تمہیں کون اچھی لگتی ہے؟"

مَیں کیا جواب دیتا۔ اخلاقاً بولا: "سبھی اچھی ہیں سردار۔ تم بہت قسمت والے ہو۔ تمہیں اتنی اچھی بیویاں ملی ہیں۔"

"ہمارا باوا ہم سے زیادہ قسمت والا تھا۔ اُسے مجھ سے زیادہ بیویاں ملی تھیں اور سب بہت اچھی تھیں۔ پرارتھنا کرو کہ میرے کو باقی بیویاں بھی اچھی ملیں۔"

مَیں نے ہنس کر کہا: "میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔"

"تمہاری آشیرواد سے اور بھی ملیں گی دوست۔ اچھا تم بولو۔ کون سی تمہیں سب سے بڑھ کر اچھی لگی ہے۔ وہی تمہاری سیوا کیلئے جھونپڑی میں رہے گی۔"

مَیں نے حیرت اور بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ "میری سیوا کے لیے؟"

"ہاں۔ یہ ہمارا رواج ہے راجو۔ مہمان کی سیوا کے لیے بیوی بھی بھینٹ کر دیتے ہیں۔ جب تک تم مہمان رہو گے تم جسے چاہو گے وہ تمہاری ہر ضرورت کا خیال رکھے گی۔"

مَیں نے نیپال کے بعض علاقوں کے قبائل کے متعلق تو یہ ضرور سُنا تھا کہ وہ اپنے مہمانوں کی خاطر کے لیے اپنی بیوی بھی پیش کر دیتے ہیں۔ ٹنڈرا کے بعض ایسکیمو لوگوں میں بھی ایسا ہی رواج ہے مگر یہ جان کر میری حیرت کی انتہا نہیں رہی کہ اس جنگلی قبیلے میں بھی ایسا رواج ہے۔ سردار اور اُس کی بیویاں خاموش مجھے تک رہی تھیں۔ وہ سب میرے جواب کے منتظر تھے۔

مَیں نے کہا: "نہیں سردار لوگا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"کیا کہا ہے؟" ——— سردار غصّے بھری آواز میں گرجا اور پھر ناراضگی سے جنگلی زبان سے اپنی بیویوں سے مخاطب ہُوا۔ اِن سب کے چہروں پر بھی خفگی اور غصّے کے تاثرات نمودار ہو گئے۔

"راجو۔" سردار بُلند آواز میں بولا: "تم سردار لوگا کا اَپمان کر رہے ہو۔ کیا میری بیویاں اچھی نہیں ہیں۔ سُندر نہیں ہیں۔؟"

"یہ بات نہیں ہے سردار لوگا۔ تمہاری سب بیویاں بہت اچھی ہیں۔"

"تو پھر تم اُنہیں سویکار کیوں نہیں کرتے؟"

"دیکھو سردار۔ ہمارے ہاں شہروں میں یہ بہت بڑی بات سمجھی جاتی ہے۔ ہم جس کے گھر مہمان ہوتے ہیں اُس کی بیوی اور ماں بہنیں ہماری اپنی ماں بہنوں کی طرح ہوتی ہیں۔ عزت کے قابل ہوتی ہیں۔"

"مگر یہ تمہاری ماں بہنیں نہیں ہیں۔ یہ سردار لوگا کی بیویاں ہیں اور تم ہمارے مہمان ہو۔ ہمارے جنگل کا چلن دوسرا ہے راجو۔ سردار کے لیے اس سے بڑا اپمان اور کوئی نہیں ہے کہ اُس کا مہمان اُس کی کسی بیوی کو سیوا کے لیے سویکار نہ کرے۔ جب دوسرے لوگ سُنیں گے تو بہت بڑی بات ہو گی۔ سردار لوگا اور اُس کی بیویاں کسی کو مُنہ نہیں دکھا سکیں گی۔ یاد رکھو۔ مَیں تمہیں اَپمان کی اچھیا نہیں کرنے دوں گا راجو۔ مَیں نے تمہیں اپنا دوست کہا ہے۔ پر تم میرے ویری بن جاؤ گے۔"

مَیں حیرت اور پریشانی سے اس کا مُنہ تک رہا تھا۔ خدایا کس مصیبت میں پھنس گیا۔ سردار کی مہمانداری تو ایک عذاب بن گئی۔

"راجو۔ کیا سوچتے ہو۔" وہ برہمی سے پُوچھنے لگا: "اپنی جان پیاری نہیں ہے تمہیں؟" اس کا ہاتھ کمر میں بندھے ہُوئے خنجر کی طرف بڑھنے لگا۔

"نہیں نہیں۔ مَیں تمہیں ناراض نہیں کروں گا سردار۔ یہ تو میری عزت افزائی ہے۔ میری خوش قسمتی ہے۔ میرے کرم کُھل گئے ہیں۔ مجھے معاف کر دو۔ مَیں نے اپنے مُلک کے رسم و رواج کی وجہ سے تمہارا دل دُکھایا۔"

سردار بے اختیار ہنسنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی بیویوں نے بھی ہنسنا شروع کر دیا۔ کچھ دیر تک وہ سب ہنستے رہے اور مَیں تصویر حیرت بنا انہیں دیکھتا رہا۔ سردار کی ہنسی رُکی تو اُس نے سامنے کھڑی ہُوئی گیارہ بیگمات کی طرف اُنگلی سے اشارہ کیا اور پُوچھنے لگا: "تم ان میں سے کسے سویکار کرو گے؟"

مَیں نے گھبرا کر نیرا کی طرف اُنگلی اُٹھا دی۔ سردار نے مطمئن ہو کر مجھے دیکھا اور تیزی سے جھونپڑی سے باہر چلا گیا۔ نیرا سمیت اُس کی تمام بیویاں بھی اُس کے پیچھے پیچھے رُخصت ہو گئیں اور جھونپڑی میں سناٹا چھا گیا۔ اب مَیں تھا اور میری تنہائی۔ یا پھر یہ تصور کہ اب کیا ہو گا؟ کافی دیر گزر گئی۔ مَیں پہلے جھونپڑی میں بے چینی سے ٹہلتا رہا۔ پھر چٹائی پر نیم دراز ہو گیا۔ مجھے رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ شاید یہ سب ایک ڈرامہ ہی تھا اور غالباً سردار کو میری آزمائش مقصود تھی۔ یہ سوچ کر مَیں نے سکون کی ٹھنڈی سانس بھری اور اپنی دانائی اور طبعی شرافت پر اپنے آپ کو داد دی کہ مَیں سردار کی آزمائش پر پُورا اُترا۔ اگر مَیں فوری طور پر سردار کی پیشکش قبول کر لیتا تو ہو سکتا ہے کہ اُس کی آنکھوں میں اپنی وقعت کھو

بیٹھتا اور بہت ممکن ہے کہ جان سے بھی ہاتھ دھونے پڑتے۔ چہار سُو خاموشی کا راج تھا سوائے جنگلی جانوروں کی آوازوں کے جو گاہے بگاہے جنگل کے سکوت میں خلل انداز ہو جاتی تھیں ورنہ جھینگروں کی آوازوں اور ہَوا کی سنسناہٹ کے علاوہ کوئی اور آواز نہیں تھی۔ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا، میرے دل میں یہ خیال مضبوطی سے جاگزیں ہوتا جا رہا تھا کہ سردار نے واقعی میرا امتحان ہی لیا تھا یا مجھ سے عملی مذاق کیا تھا۔ رفتہ رفتہ میرے اعصاب اور ذہن مکمل طور پر پُرسکون ہو گئے۔ کافی عرصے کی بُھوک اور جسمانی اور ذہنی مشقت کے بعد پیٹ بھر کر روٹی اور ذہنی سکون میسر آیا تھا۔ اس لیے ایک بار پھر میرا دماغ اور آنکھیں بوجھل ہونے لگیں اور میں دبے پاؤں نیند کی وادیوں میں گامزن ہونے لگا مگر ابھی پوری طرح سو نے نہ پایا تھا کہ پہلے ایک سرگوشی اور پھر پاؤں کی آہٹ نے مجھے چونکا دیا۔ میں ہڑبڑا کر چٹائی سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ جھونپڑی کے دروازے میں ایک سایہ سا لہرایا اور پھر ایک انسانی ہیولا نمودار ہُوا۔ میں یک لخت تیزی سے اُچھل کر کھڑا ہو گیا اور میرا ہاتھ بے اختیار ریوالور کی طرف گیا۔ اس سے پہلے کہ میں ریوالور نکالتا جھونپڑی میں داخل ہونے والا ہیولا انسانی پیکر اختیار کر چکا تھا —— میرے سامنے نیرا کھڑی تھی۔ سردار بوگا کی بیوی نیرا، جسے میں نے سردار کی جھونپڑی سے لالٹین تھام کر سردار کے ساتھ باہر نکلتے ہُوئے دیکھا تھا مگر اس وقت وہ ایک مختلف عورت تھی۔ سادہ اور میلے کچیلے لباس کی جگہ وہ اب صاف ستھرا چمکدار لباس زیب تن کیے ہُوئے تھی۔ لباس بدستور دو حصوں میں منقسم تھا مگر یوں لگتا تھا جیسے وہ بطور خاص بطور خاص جگمگاتا ہُوا لباس پہن کر آئی ہے۔ اس کے بال اب بھی کمر تک پھیلے ہُوئے تھے مگر اس وقت بالوں میں تیل کی چمک زیادہ نمایاں تھی، جس کی وجہ سے ان میں گہری سیاہی پیدا ہو گئی تھی۔ آنکھوں میں کاجل کی لکیریں دُور ہی سے نظر آ رہی تھیں۔ اُس نے اپنے گلے میں پھولوں کا ایک ہار پہن رکھا تھا جبکہ بازوؤں پر سیاہ چمڑے کی تنگ پٹیاں بندھی ہُوئی تھیں اور بازوبند کا تاثر دے رہی تھیں۔ کچھ دیر پہلے کی سادہ میلی سی نیرا اور اس وقت کی سجی بنی نیرا میں بہت فرق تھا۔ اس کی چال میں چلبلا پن اور زیادہ پیدا ہو گیا تھا۔

جھونپڑی میں داخل ہو کر وہ ایک لمحے کے لیے رُک گئی اور ہاتھ میں پکڑے ہُوئے بڑے بڑے سبز پتوں کی ٹوکری میں سے گیندے نما پھول نکال کر اُس نے اپنے اور میرے درمیان بکھیر دیئے۔ پھر وہ دلفریبی سے مسکرائی اور آہستہ آہستہ میری طرف بڑھنے لگی۔ میں غیر ارادی طور پر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کی آنکھوں میں استعجاب کی جھلک پیدا ہوئی اور وہ اپنی جگہ رُک گئی۔ میرا ذہن بہت تیزی سے پلٹیاں کھا رہا تھا، جسم میں عجیب قسم کی سنسناہٹ پیدا ہو گئی تھی۔ خوف، پریشانی، گھبراہٹ اور بے یقینی کی ملی جُلی کیفیت نے مجھے بوکھلا دیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں؟ میرے سامنے نیرا مجسّم میزبان بنی کھڑی تھی اور میرا وہ اندازہ غلط ثابت ہو چکا تھا کہ سردار بوگا نے محض میرے کردار اور خلوص کی آزمائش کے لیے اپنی کسی ایک بیوی کی خدمات پیش کی تھیں۔ نیرا کے چہرے کا تبسم غائب ہو چکا تھا اور اُس کی جگہ غصّہ اور جھلاہٹ کا تاثر نمودار ہو رہا تھا۔ میں نے اپنے جذبات اور پریشانی پر قابو پانے کی کوشش کی۔ میں نیرا کو اور اُس کے ذریعے سردار کو ناراض کرنے کی حماقت نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ میں اپنے دل پر جبر کرتے ہُوئے جواباً مسکرایا اور نیرا کا خیر مقدم کرنے کے لیے جھک گیا۔ اس کی کھوئی ہوئی مسکراہٹ پھر لوٹ آئی۔ وہ ہنستی ہُوئی میری طرف بڑھی اور میرے نزدیک آ کر کھڑی ہو گئی۔ پہلی بار مجھے ایک خوشبو کا احساس ہُوا جو نیرا کے بدن یا لباس سے اُٹھ رہی تھی۔ یہ پسینے اور پھولوں کی ملی جُلی خوشبو تھی۔ اِس میں شاید سر کے تیل کی خوشبو بھی شامل تھی۔ ہم متمدن علاقوں کے رہنے والوں کے لیے وہ خوشبو نہ تھی مگر جنگل کے معیار کے مطابق نیرا اس وقت قیمتی خوشبوؤں میں نہائی ہوئی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ اسے مخاطب کرنا بھی مُشکل تھا کیونکہ ہم دونوں ایک دوسرے کی بولی سے نابلد تھے۔ اس کے باوجود نیرا نے عورتوں کی روایات کے مطابق مجھ سے گفتگو کا سلسلہ شروع کر دیا۔ وہ جنگلی زبان میں کچھ کہہ رہی تھی۔ اُس کے لہجے میں سوال کا عنصر زیادہ تھا۔ شاید وہ مجھ سے کوئی سوال دریافت کر رہی تھی یا ممکن ہے وہ مجھ سے یہ پُوچھنا چاہتی ہو کہ مجھے کسی چیز کی حاجت تو نہیں ہے۔ میں چُپ چاپ اس کا چہرہ تکتا رہا اور پھر چٹائی پر بیٹھ گیا۔ وہ خاموش کھڑی مجھے دیکھتی رہی اور پھر بڑھ کر میرے نزدیک بیٹھ گئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور ایک دوسرے کے دل کی دھڑکن سُنتے رہے۔ کاش ہم ایک دوسرے کی زبان سے واقف ہوتے اور میں اسے سمجھا سکتا کہ مہمان داری کے مہذب طریقے کیا ہوتے ہیں؟

آہستہ آہستہ میں چٹائی پر دراز ہو گیا۔ میرے سر میں ہلکا ہلکا درد شروع ہو گیا تھا اور میں عجیب قسم کی بے کلی اور بے چینی محسوس کر رہا تھا۔

نیرا خاموشی سے کھسک کر میرے نزدیک آ گئی اور اُس نے اپنا ہاتھ بڑھا کر میرے سر پر رکھ دیا۔ شاید عورتوں کی مخصوص حس نے اسے یہ بتا دیا تھا کہ میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ اس کا ہاتھ گرم تھا، مگر نرم نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ جنگل کی سخت کوشی اور محنت مشقت سے بھرپور زندگی گزارنے والی عورت کا ہاتھ شہر کی آرام طلب اور سنگھار کرنے والی عورتوں کی مانند ملائم اور شگفتہ کیوں کر ہو سکتا تھا۔ اُس نے پہلے میرا سر سہلایا اور پھر آہستہ سے میری پیشانی اور کنپٹی سہلانے لگی۔ بے شک وہ ایک جنگلی عورت تھی۔ مگر سر دبانے کے فن سے پوری طرح آشنا تھی۔ یکایک وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے کنکھیوں سے دیکھا تو وہ بڑھ کر مٹی کے دیئے کے پاس پہنچ گئی۔ ایک ہاتھ سے دیئے کو اُٹھا کر اُس نے دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی میں تھوڑا سا تیل اُنڈیلا اور پھر میرے پاس آ گئی۔ جب اُس نے میرے سر پر تیل لگایا تو وہ نیم گرم تھا۔ اس کے باوجود مجھے سکون اور طمانیت پہنچا رہا تھا۔ اب وہ میرے سر میں دونوں ہاتھوں کی اُنگلیوں اور پوروں سے مالش کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ نیم وا آنکھوں سے مجھے دیکھ دیکھ کر زیرِ لب مسکرائی بھی جا رہی تھی۔ کبھی کبھی اس کے مُنہ سے ہلکی سی آواز بھی نکلتی جیسے کوئی گیت گنگنا رہی ہو۔ یہ تمام چیزیں مل کر مجھ پر ہپناٹزم کا اثر مرتب کر رہی تھیں۔ ایک بار پھر مجھے غنودگی کا احساس ہونے لگا اور میں رفتہ رفتہ نیند کی آغوش میں گُم ہو گیا۔ نہ جانے یہ کیفیت کتنی دیر باقی رہی۔ اچانک ایک دبی دبی چیخ کی وجہ سے میری آنکھ کُھل گئی۔ میں نے دیکھا کہ نیرا ایک دم اُٹھ کر کھڑی ہو گئی ہے اور سہمی ہوئی نظروں سے باہر کی طرف دیکھ رہی ہے۔ اس کے چہرے پر خوف نے ڈیرہ جما لیا تھا اور وہ ڈری ہوئی جنگلی ہرنی کی طرح بے تابی سے جھونپڑی میں گھوم رہی ہے۔ کبھی وہ دروازے کی طرف بڑھتی اور پھر خود ہی رُک جاتی۔ میری طرف دیکھ کر کچھ کہنے کی کوشش کرتی اور دوبارہ میرے نزدیک آ کر کھڑی ہو جاتی۔ وہ مجھے باہر کی طرف متوجہ کرنا چاہتی تھی۔ میں نے خاموشی سے کان لگا کر سُنا تو نہایت مدھم آہٹوں کی آواز سنائی دی۔ یوں لگا جیسے بہت دُور ڈھول بج رہے ہوں۔ مجھے کان لگا کر سُنتے ہوئے پایا تو نیرا میرے نزدیک آ کر بیٹھ گئی اور میرا چہرہ تکنے لگی۔ میری تمام تر توجہ اس آواز کی طرف تھی جو رفتہ رفتہ بڑھتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ میں کافی فاصلے پر ڈھول کی واضح آوازیں سُننے کے قابل ہو گیا۔

ایک دم فضا میں مختلف آوازیں گونجنے لگیں۔ لوگوں کے بولنے کی، ایک دوسرے کو پُکارنے کی اور اطلاع دینے کی آوازیں اگرچہ میں سمجھ نہیں سکتا تھا مگر میں ان کی نوعیت کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ سارا جنگل جو کچھ دیر پہلے خاموشی کی چادر میں لپٹا ہُوا تھا ایک بیک جاگ اُٹھا۔ نیرا کی بے تابی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ بار بار جھونپڑی کے دروازے کی طرف جاتی اور پھر رُک جاتی۔ پلٹ کر میرے نزدیک آتی اور مجھے مخاطب کر کے کچھ بتانے کی کوشش کرتی۔ میں صرف اتنا اندازہ لگا سکا کہ وہ کسی پریشان کُن بات کی طرف مجھے متوجہ کرنا چاہتی ہے۔ پھر وہ میرے پاس آ کر میرا ہاتھ تھام کر مجھے باہر کی طرف کھینچنے لگی۔ میں حیرت سے اس کو دیکھ رہا تھا اور چُپ چاپ اس کی خواہش کے مطابق آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ ابھی ہم دونوں جھونپڑی سے باہر نہیں نکلنے پائے تھے کہ تیز تیز قدموں کی آوازیں سنائی دیں اور سردار بوگا جھونپڑی میں داخل ہُوا۔ وہ بے حد مضطرب اور پُرجوش نظر آ رہا تھا۔

"راجو۔ کچھ سُنا تم نے۔ وہ کاٹُر آ رہے ہیں۔ وہ ہمارے جنم جنم کے بیری ہیں!"

میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا: "کون آ رہے ہیں؟"

"جنگلی آدم خور۔"

"آدم خور؟!" میں نے تعجب سے اُس کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔ وہ بہت دُور جنگل میں رہتے ہیں۔ وہ بہت کٹھور لوگ ہیں۔ وہ آدمی کا گوشت کھاتے ہیں۔ جنگلی جانوروں سے بھی زیادہ ظالم ہیں۔"

اس اثناء میں نیرا سردار کے اشارے اور حکم پر جھونپڑی سے باہر چلی گئی تھی۔ سردار نے اپنی زبان میں جلدی جلدی اسے کچھ ہدایات دی تھیں جنہیں سُن کر وہ دوڑتی ہوئی باہر نکل گئی تھی۔ میں سردار کی اس اطلاع پر حیران کھڑا اُس کی شکل دیکھ رہا تھا۔ اُس نے میرا بازو تھام لیا اور کہنے لگا۔ "راجو۔ تم ہمارے مہمان ہو۔ ہمارے لیے تم اپنی جان خطرے میں مت ڈالو۔ میں ایک جوان تمہارے ساتھ کر دیتا ہوں۔ تم ادھر سے بھاگ کر چلے جاؤ۔" یہ کہہ کر اُس نے زور سے تالی بجائی اور کسی کو پُکارا۔ ایک جنگلی اندر داخل ہُوا۔ اُس کے ہاتھ میں تیز دھار والا بھالا تھا۔

تیر کمان اُس کے کندھے سے لٹک رہا تھا اور وہ بھی کچھ گھبرایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ سردار نے تیزی سے اسے کچھ ہدایات دیں جن کے جواب میں وہ سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ پھر میری طرف بڑھا اور میری کلائی پکڑ کر مجھے اپنی طرف گھسیٹنے لگا۔

"سردار یہ سب کیا تماشا ہے؟" میں نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور سردار کی طرف بڑھا۔ "مجھے بتاتے کیوں نہیں یہ کیا گڑبڑ ہو رہی ہے۔ مجھے تم کہاں بھیجنا چاہتے ہو؟"

"بہت دُور جدھر تمہاری جان بچ جائے گی۔"

"مگر میری جان کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ میں ایک فوجی سپاہی ہوں۔ اپنی حفاظت خود کر سکتا ہوں۔ اپنے دشمن سے لڑ سکتا ہوں۔"

"وہ دشمن خونی ہیں راجو۔ وہ لوگ بھیڑیے سے زیادہ ڈراؤنے ہیں۔"

میرے اصرار پر سردار نے مختصر طور پر مجھے بتایا کہ کافی فاصلے پر گھنے جنگلوں میں ایک قبیلہ تورائی رہتا ہے۔ یہ لوگ محض نام کے انسان ہیں۔ انسانوں والی کوئی عادت اور خصلت ان میں نہیں پائی جاتی۔ وہ جانوروں اور انسانوں سب کا شکار کرتے ہیں اور انہیں کھا جاتے ہیں۔ جب بھی انہیں موقع ملتا ہے وہ آس پاس کے جنگلوں میں رہنے والے قبائل پر حملہ کرتے ہیں۔ اُن کی بستیاں جلا دیتے ہیں۔ ان کا سامان لوٹ لیتے ہیں۔ ان کے مویشیوں اور تندرست جوان عورتوں پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ جوان مردوں، بچوں اور بوڑھوں کو ہلاک کر دیتے ہیں اور پھر انہیں خوراک کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اس بار کئی سال کے بعد انہوں نے اِدھر کا رُخ کیا ہے۔ ان سے محفوظ رہنے کیلئے جنگلیوں نے پہریداری کا نظام قائم کر رکھا ہے ساتھ ہی جنگلوں میں جگہ جگہ ایسے مخبر بھی چھوڑ رکھے ہیں جو ان کی آمد سے خبردار کر دیتے ہیں اگر دن کی روشنی ہو تو وہ آگ جلا کر دھوئیں کے ذریعے خبردار کر دیتے ہیں اور اگر رات کا وقت ہو تو وہ ڈھول بجا کر اطلاع پہنچاتے ہیں۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر موجود پہریدار جواب میں خود بھی ڈھول بجاتے ہیں اور اس طرح یہ خبر سارے جنگل میں بستی اور آبادی تک پہنچ جاتی ہے مخبر کی زندگی ہر دم خطرے میں رہتی ہے اور اکثر اوقات سب سے پہلے یہی لوگ ان آدم خوروں کا نشانہ بنتے ہیں۔

میں حیرت سے سردار لوگا کی بیان کی ہوئی داستان سُن رہا تھا اور مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ آج کے مہذب اور ترقی یافتہ دور میں شہروں اور تہذیب یافتہ بستیوں اور آبادیوں سے کچھ فاصلے پر ایسے قبائل کی موجودگی ہی میرے لیے کم حیرت انگیز نہ تھی لیکن آدم خوروں کے بارے میں یہ داستان سُن کر تو میں ساکت ہی رہ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سردار سے کیا کہوں؟ اسے تسلّی دوں یا ان جنگلوں کو خیرباد کہہ کر کہیں اور جا کر آباد ہونے کا مشورہ دوں؟

بالآخر جب میری قوتِ گویائی بحال ہوئی تو میں نے پُوچھا۔ "سردار لوگا تم شہر میں رہ چکے ہو، وہاں آتے جاتے بھی رہتے ہو۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ تم اس جنگل میں کیوں رہتے ہو؟ حیوانوں جیسی زندگی کیوں بسر کرتے ہو؟ شہر میں کیوں آباد نہیں ہو جاتے؟"

سردار کا جواب بہت مختصر تھا۔ "جوان تم بہادر ہو۔ اتنی بات کیوں نہیں سمجھتے۔ سردار لوگا اپنے قبیلے کے لوگوں کو چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہے؟"

"تم ان لوگوں کو بھی اپنے ساتھ کیوں نہیں لے جاتے؟ یہ بھی کوئی زندگی ہے جو یہ لوگ بسر کر رہے ہیں۔ آج کے زمانے میں انسانوں نے بہت ترقی کر لی ہے۔ انسان فلک اور چاند تک پہنچ گیا ہے۔ تم ان جنگلوں میں جانوروں کی طرح کیوں رہتے ہو۔ ان سب کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ شہروں میں یہ زیادہ اچھی زندگی گزار سکتے ہیں۔"

سردار لوگا سخت پریشانی اور اضطراب کے عالم میں تھا مگر میری یہ بات سُن کر بے اختیار ہنسنے لگا۔ "راجو۔ یہ سب جنگلی لوگ ہیں۔ اُنہوں نے تو شہر بھی نہیں دیکھا۔ یہ جنگل اور ادھر کی زندگی ہی ان کے لیے سب کچھ ہے۔ یہ اس جنگل کو چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے۔ یہ تو اپنی جھونپڑی کو چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتے۔ جنگل کو کیسے چھوڑیں گے؟ اور پھر شہر میں جا کر یہ کیا کریں گے؟ شہر والوں کے لیے تو یہ جانور ہیں نا بابا۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ سردار لوگا ان کا سردار ہے۔ ان کو چھوڑ کر کبھی نہیں جائے گا۔ یہ میرے جیون مرن کے ساتھی ہیں۔"

جنگل اور قبائلی رسم و رواج اور ذہنیت کا یہ رُخ میرے لیے بالکل نیا اور انوکھا تھا۔ اتنی دیر میں باہر سے شور کی آوازیں زیادہ بلند ہونے لگی تھیں۔ دو تین جنگلی جو مقامی ہتھیاروں سے پوری طرح لیس اور چاق و چوبند تھے جھونپڑی میں داخل ہوئے اور سردار سے مخاطب

ہو کر کچھ کہتے رہے۔ غالباً وہ اسے اپنی تیاریوں کی اطلاع دے رہے تھے اور اس کی مزید ہدایات کے خواہاں تھے۔ سردار نے تیزی سے انہیں کچھ ہدایات دیں اور اُن کے رخصت ہونے کے بعد خود بھی باہر جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھا۔

"تم ابھی اس کے ساتھ چلے جاؤ۔ یہ تمہیں بہت دُور لے جائے گا۔ تم آدم خوروں سے بچ جاؤ گے۔"

میں بڑھ کر جھونپڑی کے دروازے میں کھڑا ہو گیا اور سردار کا راستہ روک لیا۔ اُس نے غصّے سے گھور کر مجھے دیکھا۔

"دیکھو سردار لوگا۔ تم بہادر آدمی ہو۔ اپنے مہمان کی جان بچانا چاہتے ہو مگر میں بھی ایک سپاہی ہوں۔ ڈرپوک اور بھگوڑا نہیں ہوں تم نے میری مدد کی ہے تو میں تمہیں مصیبت میں چھوڑ کر کیسے چلا جاؤں۔ میں بھی تمہارے ساتھ ہی رہوں گا۔ میرا جینا مرنا بھی تمہارے ساتھ ہے۔"

سردار بھونچکا ہو کر میری بات سُن رہا تھا۔ "نا۔ راجو۔ نا۔ تمہیں جانا ہو گا۔ ہمارے لیے تم کو جان خطرے میں ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

مگر میں نے ضد کی اور اپنی بات پر اَڑ گیا۔ سردار کے پاس زیادہ وقت نہ تھا۔ جب میں اس کی بات ماننے پر رضامند نہ ہوا تو اس نے بھی بے کار بحث میں وقت ضائع کرنا فضول جانا۔ "تمہاری مرضی" کہہ کر وہ بھونچال کی طرح جھونپڑی سے باہر نکل گیا۔ وہ جنگلی جو میری رہبری اور راہنمائی کے لیے آیا تھا۔ چند لمحے حیرت سے کھڑا میرا مُنہ تکتا رہا اور پھر جھونپڑی سے باہر چلا گیا۔ اب میرا جھونپڑی کے اندر رہنا بھی بے مقصد تھا اس لیے میں بھی اُن کے پیچھے پیچھے جھونپڑی سے باہر نکل گیا۔

باہر نکل کر میں نے جو سماں دیکھا وہ اس کے منظر سے یکسر مختلف تھا جو میں نے اس بستی میں آ کر دیکھا تھا۔ اس وقت ہر طرف مشعلیں روشن تھیں۔ لوگ تیزی سے مختلف کاموں اور تیاریوں میں مصروف تھے۔ تیر کمان سنبھالے جا رہے تھے۔ نیزے اور بھالے تیز کیے جا رہے تھے۔ ہر طرف چہل پہل تھی۔ سردار لوگا ان سب کے درمیان ہدایات دینے اور دوسرے انتظامات کا جائزہ لینے میں مصروف تھا اور تیزی سے ایک طرف سے دوسری طرف جا رہا تھا۔ اس وقت وہ جھونپڑی جس میں سب سے پہلی بار میں نے سردار لوگا کو برآمد ہوتے ہوئے دیکھا تھا تمام سرگرمیوں کا مرکز تھی۔ نہ صرف سردار کی گیارہ بیویاں بلکہ بستی کی دوسری عورتیں اور چھوٹے چھوٹے بچے بھی یہاں اکٹھے ہو گئے تھے۔ ان کے چہروں پر خوف اور بے یقینی کے تاثرات نمایاں تھے مگر میں نے کسی کی آنکھ میں آنسو نہیں دیکھا۔ میرے دیکھتے دیکھتے وہاں عورتوں اور بچوں کا جمگھٹا ہو گیا۔ ایک جنگلی ایک بُوڑھی عورت کو کاندھوں پر اُٹھائے ہوئے ایک طرف سے نمودار ہوا۔ شاید وہ اُس کی ماں تھی۔ بُوڑھی عورت اپنی زبان میں نجانے کیا کہہ رہی تھی۔ ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہیں آیا مگر اتنا ضرور اندازہ ہوا کہ وہ بہت غصّے میں ہے اور ناراضگی کا اظہار کر رہی ہے۔ سردار نے چیخ کر کچھ پوچھا اور ایک نوجوان کا جواب سُن کر چلّا چلّا کر عورتوں، بُوڑھوں اور ان کے اردگرد کھڑے چار جنگلیوں کو احکامات جاری کرنے لگا جب کہ بعد میں پتہ چلا وہ انہیں یہ بتا رہا تھا کہ اگر ان لوگوں کو حملہ آوروں کے مقابلے میں شکست ہو جائے تو وہ بلا تامّل بچّوں اور بوڑھوں کو ہلاک کر دیں اور تمام نوجوان عورتوں کو سردار کی بڑی جھونپڑی میں یکجا کر کے نذرِ آتش کر دیا جائے۔ اس اعلان کو سب نے خاموشی سے سُنا۔ وہ لوگ کسی بھی تاثر سے عاری نظر آ رہے تھے۔ البتہ سردار کی بیویوں میں سے نیرا اور چوگائی نے آگے بڑھ کر سردار کی پیشانی کو بوسہ دیا اور پھر واپس جا کر اپنی جگہ کھڑی ہو گئیں جہاں دوسری عورتیں بھی موجود تھیں۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ ان لوگوں میں خوف و ہراس کے باوجود بدنظمی اور انتشار نہیں تھا۔ وہ سب خاموشی سے خُدا کی رضا پر راضی برضا اور اپنے سردار کی ہدایات پر سر جھکا کر عمل پیرا ہونے کے لیے تیار تھے۔

ڈھولوں کی صدائیں اب اور زیادہ بُلند ہو چکی تھیں اور لمحہ بہ لمحہ نزدیک تر آتی جا رہی تھیں۔ اتنی دیر میں جنگجو اپنی تیاریاں مکمل کر چکے تھے۔ سردار نے بُلند آواز سے کچھ کہا۔ وہ سب قطار در قطار اس کے پیچھے کھڑے ہو گئے اور پھر عورتوں اور بچّوں کی طرف دیکھے بغیر چلّاتے اور نعرے لگاتے ہوئے بستی سے باہر کی طرف چل پڑے۔ سردار لوگا ایک ہاتھ میں بھالا اور دوسرے میں کلہاڑا لیے ہوئے ان کے آگے آگے تھا۔ وہ جراَت مندی اور بہادری کا نشان نظر آ رہا تھا اور اُس کی بے خوفی کی وجہ سے دوسرے جنگلیوں کا حوصلہ بھی بُلند تھا۔ سردار غالباً مجھے بھول چکا تھا یا پھر اُسے مجھ سے مخاطب ہونے کی فرصت ہی نہ تھی۔ اس لیے وہ میری طرف نگاہ اُٹھائے بغیر مورچہ بندی کے لیے چل پڑا اور میں گومگو کے عالم میں اپنی جگہ کھڑا رہ گیا۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس نازک موقعے پر مجھے کیا کرنا چاہیئے؟ یہاں سے فرار ہو جانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بھالوں اور تیر کمان کے استعمال کا مجھے تجربہ نہ تھا۔ میرے ریوالور میں چھ گولیاں موجود تھیں

اور تین درجن گولیاں میری کمر کی پیٹی میں بندھی ہوئی تھیں۔ ظاہر ہے کہ کُل ۴۴ گولیوں سے میں خونخوار آدم خوروں کی فوج کو نہیں روک سکتا تھا۔

اتنی دیر میں نیرا آگے بڑھ کر میرے پاس آئی اور اپنی زبان میں بُلند آواز سے کچھ کہنے لگی۔ سردار کی دوسری بیویاں بھی میرے نزدیک آگئیں اور میں ان کے نرغے میں پھنس گیا۔ وہ نہ جانے مجھ سے کیا کہہ رہی تھیں۔ ان میں سے بعض عورتیں بار بار ہاتھوں سے سردار کی جھونپڑی اور عورتوں اور بچوں کے جم غفیر کی طرف اشارہ کر رہی تھیں جبکہ نیرا گفتگو کرتے ہوئے جنگل کی طرف اشارے کر رہی تھیں۔ وہ چار جنگجو عورتوں کی حفاظت پر مامور تھے خاموش بُت بنے اپنی اپنی جگہ کھڑے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے پتھر کے مجسمے ایستادہ ہیں۔ میں نے تنگ آکر بُلند آواز میں ان سب عورتوں کو خاموش ہونے کے لیے کہا اور دوسرے ہی لمحے وہ سب بالکل خاموش کھڑی ہوگئیں۔ میں ان کے گھیرے میں سے نکل کر اس طرف دوڑا جس طرف سردار اپنے جاں بازوں کو لے کر گیا تھا۔

سردار اور اس کے سُورماؤں کو تلاش کرنے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ سردار نے ایک چھوٹی سی ندی کے کنارے اپنے جنگجوؤں کو جمع کر دیا تھا اور وہ سب تیر کمانیں اور دوسرے ہتھیار سنبھالے حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کے لیے بالکل کمر بستہ کھڑے تھے۔

سردار بوگا

شہر میں تھوڑے عرصے ضرور رہا ہوگا۔ یہ اُس کی باتوں اور طور طریق سے بھی ظاہر تھا۔ دوسرے جنگلیوں کے مقابلے میں وہ کہیں زیادہ عقلمند، ذہین اور تجربہ کار تھا۔ لیکن آخر کار جنگلی تھا اور اس وقت بھی اُس نے حملہ آوروں کے مقابلے کے لیے جو تیاری کی تھی اس میں حربی صلاحیت کا شائبہ تک موجود نہ تھا۔ دو تین ٹکڑیوں میں اس کے جاں باز تیر کمان، بھالے اور نیزے سنبھالے ہوئے کھڑے تھے تاکہ دشمن کے نمودار ہوتے ہی اُس پر ٹوٹ پڑیں۔ یہ لوگ بستی سے زیادہ دُور بھی نہ تھے جو جنگی اصولوں کے اعتبار سے بالکل غلط اور نقصان دہ ثابت ہو سکتا تھا کیونکہ ایک ہی ہلّے میں دشمن اُن کی بستی تک پہنچ سکتا تھا، چنانچہ میں نے صورتِ حال کو سنبھالنے کی کوشش کی اور سردار بوگا کے پاس گیا۔ "سردار! وقت بہت کم ہے اور میں تم سے ایک چھوٹی سی بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"کہو؟" اُس نے حیران ہو کر جواب دیا۔

"سردار! میں فوجی سپاہی ہوں۔ ساری زندگی جنگ لڑنے کی ترکیبیں سیکھی ہیں میں نے۔ اگر تم بُرا نہ مانو تو میں تمہیں ایک رائے دوں؟"

سردار نے گھور کر مجھے دیکھا۔ "دیکھو جوان۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ یہاں سے دُور چلے جاؤ۔ اگر وہ راکشس لڑائی میں جیت گئے تو پھر سب کے ساتھ تمہاری بھی جان خطرے میں پڑ جائے گی۔ تم نے میری بات نہیں مانی اور اب مجھے وچار دینے آگئے ہو۔"

"سنو سردار، اب تو جو تمہارا حال ہوگا وہی میرا بھی ہوگا۔ ہماری تقدیر ایک ہوگئی ہے۔ اس لیے غصہ تھوک دو۔ بولو۔ میری بات مانو گے؟"

"بولو۔ کیا کہتے ہو۔ وقت کم ہے۔ تم ڈھول کی آوازیں سن رہے ہو کس قدر قریب آگئی ہے۔"

سردار کو رضا مند پا کر میں نے فوراً اُسے میدانِ جنگ کی تربیت دینے کا منصوبہ بتانا شروع کر دیا۔ سب سے پہلے تو میں نے یہ کہا کہ ان لوگوں کو اپنے دفاعی مورچے بستی سے دُور بنانے چاہئیں۔ بستی کی حفاظت کے لیے دو چار اور لڑاکے بھی چھوڑے جا سکتے ہیں۔ ہمیں جلد سے جلد بستی سے بہت آگے اور دُور جا کر دشمن کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ سردار ایک لمحہ سوچنے کے بعد راضی ہوگیا۔ اُس نے چار اور جنگلیوں کو بستی کی حفاظت پر مامور کیا اور پھر میری ہدایت کے مطابق سب لوگ قریباً ایک فرلانگ آگے بڑھ گئے۔ ہمارے پیچھے بستی تھی اور بہت گھنے جنگل تھے۔ میرے کہنے کے مطابق جنگل میں درختوں پر تیر انداز بٹھا دیے تھے۔ اِن لوگوں کے نشانے بہت اچھے تھے اور اُن کے تیر زہر میں بُجھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ہر تیر انداز کے پاس چھ تیروں کا ذخیرہ تھا۔ وہ کُل تعداد میں سات تھے اور تھوڑے تھوڑے فاصلے سے گھنے درختوں کے پتوں میں چھپے بیٹھے تھے۔ گویا ضرورت پڑنے پر وہ چالیس بیالیس دُشمنوں کو ہلاک کر سکتے تھے۔ اس کے بعد ہم نے کچھ اور آگے بڑھ کر اپنے ساتھیوں کو تین اطراف میں بکھیر دیا۔ وہ درختوں اور پتوں کی آڑ لے کر خاموش، سانس روک کر کھڑے ہوگئے۔ سردار نے میرے کہنے کے مطابق اُنہیں تاکید کر دی تھی کہ جب تک حملہ آور اُن کے بالکل نزدیک نہ آجائیں وہ اپنی جگہ نہ چھوڑیں۔ پہلے تیروں کا اور پھر بھالوں کا استعمال کریں اور جب وہ بالکل اُن کے نزدیک پہنچ جائیں تو دست بدست لڑائی کے لیے تیار ہو جائیں۔

جنگلیوں کے لیے یہ اندازِ جنگ بالکل انوکھا تھا۔ اُن کی لڑائی کا طریقہ بالکل سادہ تھا۔ جب وہ دُشمن کو سامنے دیکھتے تھے تو تیر کمان بھالے سنبھال

کر شور مچاتے ہوئے اس پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ اُدھر دُشمن بھی تیزی سے اُن کی طرف بڑھتا تھا اور بہت جلد وہ دست بدست لڑائی میں مصروف ہو جاتے تھے۔ شور مچانے کا ایک نقصان یہ بھی تھا کہ دُشمن کو ان کے آنے کی پوزیشن کا صحیح علم ہو جاتا تھا۔ اس طریقۂ جنگ میں جس کی تعداد زیادہ ہوتی تھی وہ جیت جاتا تھا مگر میں نے اُنہیں جو طریقہ بتایا تھا اس کے مطابق اُنہیں دُور ہی اپنی جگہ چھپ کر دُشمن کو تیروں کا اور پھر بھالوں کا نشانہ بنانا تھا اور جب تک وہ بالکل سامنے نہ پہنچ جائے نہ تو منہ سے آواز نکالنی تھی اور نہ ہی اُس پر حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھنا تھا۔ سردار بوگا نے تو زیادہ لیت و لعل نہیں کیا مگر دوسرے جنگلی یہ ہدایات سُن کر حیران رہ گئے مگر سردار کے حکم کے آگے لاچار تھے۔ اس طرح بہت جلد وہ تین ٹولیوں میں بٹ کر تین اطراف میں درختوں کے پیچھے چُھپ کر بیٹھ گئے۔ سردار کی حکم عدولی اُن کے لیے گناہ کی حیثیت رکھتی تھی اور یوں بھی حکم عدولی کی سزا موت تھی۔ اس لیے ان احکامات کو ماننے کے سوا ان کے پاس کوئی اور چارہ نہ تھا۔

میں اور بوگا ایک درخت کے موٹے سے تنے پر چڑھ کر بیٹھ گئے اور حملہ آوروں کے نمودار ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ ڈھولوں کی آوازیں اب جنگل میں ہمارے بالکل نزدیک سے گونج رہی تھیں۔ بعض ڈھول خاموش بھی ہو گئے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ دُشمنوں نے اُن کا کھوج لگا کر اُنہیں ہلاک کر دیا تھا۔ جنگلی دستور کے مطابق ڈھول بجانے والے مُخبر کی ڈیوٹی جدید فوج کے اوپی کی طرح تھی اور ان کا فرض تھا کہ آخر وقت تک اپنی جگہ پر قائم رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ڈھول کی آواز کی وجہ سے حملہ آوروں کو اُن کے نزدیک پہنچ کر اُنہیں تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی۔ ڈھول کی آواز ہی ان کی نشان دہی کے لیے کافی تھی۔ چنانچہ اکثر حالات میں یہ ڈھول بجانے والے ہی سب سے پہلے دُشمن کی ہلاکت خیزی کا نشانہ بنا کرتے تھے۔

اب ہمیں حملہ آور جنگلیوں کے شور کی آوازیں بھی صاف سنائی دے رہی تھیں۔ جنگلی آدابِ جنگ کے مطابق وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر شور مچاتے ہوئے اپنے شکار کی طرف بڑھ رہے تھے۔ سردار بوگا نے ایک تنبنگ نما چیز نکال کر مُنہ سے بجائی۔ اس کی آواز کسی جنگلی پرندے کے مشابہ تھی اور اس کا مطلب یہ تھا کہ اپنی جگہ بالکل تیار رہو اور جیسی ہدایات دی گئی ہیں ان کے مطابق عمل کرو۔

زیادہ دیر نہیں گزری کہ ہمیں حملہ آوروں کا جتھا نظر آگیا۔ وہ جسیم اور قد آور لوگ تھے۔ ان کے ہاتھوں میں ڈنڈے، بھالے اور نوکدار گرز نما ہتھیار تھے۔ اُن کے جسم رنگ برنگے تھے اور لباس کے نام پر ایک بڑی دھجی کے سوا کوئی اور لباس ان کے جسم پر نہ تھا۔ وہ دیکھنے میں ہی خونخوار اور بے رحم نظر آرہے تھے۔ ان کے آگے آگے ایک بہت اُونچا، لمبا تڑنگا شخص تھا جس کے سر پر ایک اونچی سی ٹوپی تھی جس میں پرندوں کے رنگین پَر سجے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ اُن کا سردار تھا۔ جنگلیوں کی یہ ادا مجھے پسند آئی کہ جنگ کے دوران میں جان جوکھوں کے وقت سردار سب سے آگے ہُوا کرتا ہے۔ پُرانے زمانے کی جنگوں میں بھی بادشاہ یا سپہ سالار فوج میں سب سے آگے کی صف میں ہُوا کرتا تھا اور جنگ میں باقاعدہ شامل بھی ہوا کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شجاعت اور جنگی مہارت ہی بادشاہت یا قیادت کے لیے ایک لازمی صلاحیت سمجھی جاتی تھی۔ آجکل کی جنگوں میں اس کے برعکس ہوتا ہے۔ سپہ سالار یا افسر دُور بیٹھ کر فوج کو جنگ کرنے کے لیے ضروری ہدایات جاری کرتا ہے۔ فوجی ہلاک ہوتے ہیں مگر سپہ سالار ہلاکت سے محفوظ رہتا ہے۔ آدم خوروں کے سردار کو یوں بے محابا اور بے جگری سے بڑھتے ہوئے دیکھا تو سردار بوگا کے بازوؤں کی مچھلیاں بھی پھڑکنے لگیں۔ اگر میں بازو پہ ہاتھ رکھ کر اسے نہ روکتا تو وہ بھی نعرے لگاتا ہُوا کُود کر آگے بڑھ جاتا۔ اس نے مُنہ سے ہلکی سی آواز نکالی جو کسی پرندے کی آواز کے مُشابہ تھی اُدھر تین اطراف سے زہر بھرے تیروں کی بارش ہوگئی۔ پہلے ہی وار میں کم از کم تیس حملہ آور زخمی ہو کر گر پڑے۔ خوش قسمتی سے کوئی تیر اُن کے سردار کو نہ لگا مگر بعد میں مجھے سردار بوگا نے بتایا کہ جنگلی لوگ سرداروں کو نشانہ بنانے سے احتراز کرتے ہیں اور اُن کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ سردار کو آخری وقت تک ہلاک نہ کیا جائے بلکہ زندہ گرفتار کیا جائے ہاں اگر سردار دست بدست لڑائی کے دوران میں کسی پہ حملہ کرے تو ایسی صورت میں وہ جوابی حملہ کر سکتا ہے اور آمنے سامنے کی لڑائی میں سردار پہ حملہ کرنے میں کوئی تامل نہیں کرتا، مگر اس ضمن میں بھی یہ اصول مدِ نظر رکھا جاتا ہے کہ سردار سے ایک وقت میں ایک ہی جنگجو نبرد آزما ہو اس پر پُشت کی جانب سے حملہ کرنے کا تو تصور ہی نہیں ہے۔ عام طور پر دونوں لشکروں کے لوگ یہ موقعہ دیتے ہیں کہ دونوں سردار ایک دوسرے کے مدِ مقابل بنیں۔

کسی آواز کے بغیر نہایت خاموشی سے تیروں نے تیس دُشمنوں کو شکار کر لیا تھا اور یہ بات حملہ آوروں کے لیے حیرت ناک تھی کہ مقابل

سنے نہ تو جنگی نعرے لگائے، نہ شور مچایا اور نہ حملہ آور سامنے نمودار ہوئے۔ گرنے والوں کی جگہ لینے کے لیے اتنے جنگلی اور آگے بڑھے مگر اس بار پھر وہ تیروں کا نشانہ بن گئے، لیکن وہ کم بخت ہر قسم کے خوف سے بالاتر تھے۔ مرنے والوں کی جگہ لینے کے لیے ایک دوسرا ہجوم موجود تھا۔ مجھے پہلی بار اندازہ ہُوا کہ حملہ آوروں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ سردار لوگا کا اندازہ دُرست تھا۔ اس کے جاں باز حملہ آوروں کو مارتے مارتے تھک جاتے مگر ان کی تعداد میں کمی نہ آتی۔ وہ سینکڑوں کی تعداد میں آئے تھے اور جانیں ہتھیلی پر رکھ کر نکلے تھے۔ انہیں مرنے یا زخمی ہونے کا کوئی خوف نہ تھا۔ نئے حملہ آوروں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی اور وہ تیروں کی بارش کے باوجود آگے بڑھ رہے تھے۔ مرنے یا زخمی ہونے والوں کے انجام سے بے خبر انہیں صرف ایک ہی دُھن تھی کہ آگے بڑھ کر دُشمن پر قبضہ کر لیا جائے مگر ان کی بڑھتی ہوئی تعداد سے عہدہ برآ ہونے کے لیے سردار لوگا کے خفیہ ٹھکانوں پر محفوظ جاں باز موجود تھے۔ اب اُن پر تین سمتوں سے تیروں کی بارش ہو رہی تھی جس سے وہ بوکھلا گئے تھے۔ پھر ان کے لیے یہ اندازہ لگانا بھی مشکل تھا کہ رات کی تاریکی میں نہایت خاموشی سے کس طرف سے تیر آ رہے تھے۔ دُشمنوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو ہلاک کرنے اور اپنا مطلق جانی نقصان نہ ہونے کی بنا پر سردار لوگا اور اُس کے قبیلے والوں کی ہمتیں بڑھ گئی تھیں۔ جنگل میں ایک عجیب ہنگامہ سا برپا ہو گیا تھا۔ حملہ آوروں کے پُرجوش جنگی نعروں اور زخمیوں اور مرنے والوں کی چیخ و پکار نے مل جل کر رات کے سنّاٹے میں بڑی بھیانک فضا قائم کر دی تھی۔ لُطف کی بات یہ ہے کہ حملہ آور اپنے ساتھ مشعلیں بھی لے کر آئے تھے جس کی وجہ سے انہیں نشانہ بنانا انتہائی آسان تھا۔ ان کی بہت بڑی تعداد زہریلے تیروں کا نشانہ بن چُکی تھی اور یہ امر بھی یقینی ہے کہ جن لوگوں کے جسموں میں تیر پیوست ہُوئے تھے ان کا جاں بر ہونا ممکن نہ تھا۔ زہر میں بجھے ہُوئے یہ تیر سُرعت سے اثر کرتے تھے اور زخم چاہے کتنا ہی چھوٹا ہو، چند منٹوں کے اندر زخمی موت کے گھاٹ اُتر جاتا تھا۔

حملہ آور اپنے انجام سے بے خبر دلیرانہ وار بڑھتے رہے۔ گرتے رہے۔ مرتے رہے مگر ان کے قدم آگے ہی آگے بڑھ رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ درختوں میں چھپے ہُوئے سردار لوگا کے سورماؤں کے نزدیک پہنچ گئے۔ اب بھالوں اور نیزوں سے دست بدست جنگ شروع ہو گئی۔ حملہ آوروں کا سردار بدستور ان کی قیادت کر رہا تھا اور وہ اپنے چوڑے تیر نما بھالے سے کئی جنگلیوں کو ہلاک بھی کر چُکا تھا۔ سردار لوگا بے تابی اور بے چینی سے بل کھا رہا تھا مگر میں نے اسے اپنی پناہ گاہ چھوڑنے کی اجازت نہیں دی تھی۔

"یہ بہادری نہیں ہے وہ لوگ یہ سوچیں گے کہ سردار لوگا ڈر کر چھپ گیا ہے۔"

"سوچنے سے کچھ نہیں ہوتا سردار۔" میں نے اسے سمجھایا: "اصل چیز جیت ہار ہوتی ہے۔ چُپ چاپ دیکھتے رہو۔ وہ تعداد میں تم سے بہت زیادہ ہیں۔ کھُلی جنگ میں تم ان کا مقابلہ نہیں کر سکو گے۔"

جنگ کا ہنگامہ اور شور اب حد سے زیادہ بڑھ چُکا تھا۔ تیر انداز اپنی کمین گاہوں سے نکل کر دوبدو لڑائی میں شامل ہو چکے تھے اور ہر طرف قیامت کا سماں تھا۔ یکایک میں نے دُشمنوں کے سردار کو چند گز کے فاصلے پر دیکھا۔ وہ سر سے پیر تک خون میں ڈوبا ہُوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں خون آلود تیر تھا اور وہ چیخ چیخ کر جنگلی زبان میں کچھ کہہ رہا تھا۔ میں اس کی بے خوفی اور نڈرپن سے متاثر ہُوئے بغیر نہ رہ سکا۔ میری توجہ دوسری طرف منعطف ہُوئی تو اس موقعے سے فائدہ اُٹھا کر سردار لوگا پھُرتی سے درخت سے کُودا اور مخالف سردار کے سامنے جا کھڑا ہُوا۔ اب وہ دونوں ایک دوسرے کو خونخوار نظروں سے گھُور رہے تھے اور للکار رہے تھے۔ لوگا کا جسم صاف اور بے داغ تھا۔ وہ حریف کے مقابلے میں تازہ دم بھی تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے اور تابڑ توڑ حملے کرنے لگے۔ سردار لوگا کی قوت اور توانائی بھی بے مثال تھی اور پھر وہ تھکا ہُوا بھی نہیں تھا۔ فتح کی اُمید نے بھی اسے حوصلہ دیا تھا۔ تھوڑی دیر میں وہ اپنے حریف پر بھاری پڑنے لگا۔ اُس نے مقابل کو زخمی کر دیا تھا مگر پھر بھی اُس کی توانائی اور شدت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ حریف نے اس کے سر کا نشانہ لیا مگر پھر اس کی کمر پر وار کیا۔ لوگا نے بچنے کی کوشش کی مگر پھر بھی دھار دار تیر نے اس کی کمر میں گھاؤ ڈال دیا۔ لوگا غضب ناک ہو کر پلٹا اور مخالف پر ٹوٹ پڑا۔ اس کے تابڑ توڑ حملوں نے چند لمحوں میں فیصلہ کر دیا اور پھر اس کا نیزہ دُشمن کی گردن کے پار ہو گیا ــــ مخالف سردار کے مُنہ سے ایک دلدوز چیخ نکلی اور وہ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ دوسرے ہی لمحے اس کا جسم ساکت ہو چُکا تھا۔ آس پاس کے جنگلی حملہ آور جو اس لڑائی کا نظارہ کر رہے تھے ایک لمحے رُکے بغیر چیختے اور شور مچاتے ہُوئے مُڑے اور واپس بھاگنے لگے۔ سردار لوگا نے چلّا کر کوئی ہدایت

دی اور اُس کے جاں باز ان کے تعاقب میں روانہ ہو گئے۔ چند لاشوں کے سوا وہاں کچھ اور موجود نہ تھا۔ یا پھر آدم خوروں کے سردار کی لاش تھی۔ سردار لوگا لاش کی طرف بڑھا اور انتہائی نفرت اور حقارت سے اس کو دیکھ کر اُس پر تھوک دیا۔ پھر وہ میری طرف متوجہ ہُوا: "دوست۔ تم نے ہماری جان بچائی ہے۔ ہماری جیت تمہاری وجہ سے ہُوئی ہے۔"

میں نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔ وہ میری طرف بڑھا اور میرا بازو تھام کر بولا: "لوگا تمہارا دوست رہے گا۔ جیون بھر تمہارا دوست رہے گا۔ تمہارے کارن ساری دُنیا سے لڑے گا۔"

میں نے گرمجوشی سے سردار کا ہاتھ تھام لیا اور اُس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں خلوص، احسان مندی اور دوستی کے جذبات دیکھ کر میرے دل کو ڈھارس بندھی۔ اس دُور دراز ویران جنگل میں سردار لوگا جیسے بہادر، مخلص اور جاں باز دوست کا مل جانا میرے لیے خوش قسمتی کی علامت تھی۔ وہ اب دُشمنوں کی طرف سے مطمئن ہو چُکا تھا۔ اس لیے میرا ہاتھ تھامے ہُوئے بستی کی طرف چل پڑا۔ دراصل یہ لڑائی سردار لوگا اور اس کے ساتھیوں کے لیے ایک عجیب و غریب تجربہ تھا۔ اس بار ان کا ایک بھی جانی نقصان نہیں ہُوا تھا۔ نہ ہی ان کی بستی جلائی گئی تھی۔ ان کے قبیلے کی کوئی عورت بھی دُشمنوں کے قبضے میں نہیں آئی تھی جبکہ دُشمنوں کے اتنے سُورما ہلاک ہُوئے تھے کہ کوئی گنتی نہ تھی۔ اس بار وہ لوگ بیشتر لاشوں کو چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ حملہ اتنا شدید تھا کہ انہیں جانیں بچانے کی اتنی فکر تھی کہ وہ اپنی لاشوں کو اُٹھانے کی مہلت نہ پا سکے۔ سردار نے بستی کی طرف لوٹتے ہُوئے مجھے بتایا کہ ایسا کبھی نہیں ہُوا کہ آدم خور انہیں بھاری نقصان پہنچائے بغیر واپس لوٹے ہوں۔ وہ بے شمار لاشیں اور زخمی اُٹھا کر ساتھ لے جاتے تھے جو اُن کی خوراک کے کام آتے تھے۔ بے شمار نوجوان لڑکیاں بھی ان کے ہاتھ لگتی تھیں۔ بستی کو وہ جلا کر راکھ کر دیا کرتے تھے اور بچے کھُچے مفرور جو کسی طرح جنگل میں بھاگ کر جان بچانے میں کامیاب ہو جاتے تھے بڑی مشکل سے اکٹھے ہو کر ایک ایک تنکا اکٹھا کر کے دوبارہ بستی بساتے اور پھر کچھ عرصے بعد آدم خوروں کے حملے کا انتظار کرنے بیٹھ جاتے۔ یہ ان لوگوں کی زندگی کا چلن اور معمول تھا مگر اس بار صورتِ حال یکسر مختلف تھی۔ دُشمن بھاری نقصان اُٹھا کر بھاگا تھا۔ اُن کا سردار بھی مارا جا چُکا تھا اور اب عرصۂ دراز تک اس بات کا امکان نہ تھا کہ وہ اِدھر رُخ کریں گے۔

"دوست۔ تمہارے وِچار میں کتنے دُشمن مرے ہوں گے؟" سردار نے پُوچھا۔

میں نے کہا: "سینکڑوں۔" پھر میں مُسکرایا: "مگر سردار لوگا ابھی ان میں سے بہت سے جنگلی اپنے ٹھکانے پر جا کر بھی مر جائیں گے۔"

"وہ کیسے؟" وہ حیران ہو کر بولا۔

میں نے اُسے سمجھایا: "ان کے جو لوگ مارے گئے ہیں ان میں سے اکثر زہریلے تیروں کا نشانہ بنے ہیں اور جب وہ ان کی لاشوں کو کھائیں گے تو یہ زہر اُنہیں بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

سردار لوگا ایک لمحے تو حیرت اور بے یقینی سے میرا چہرہ دیکھتا رہا۔ پھر بے اختیار بُلند آواز میں قہقہے لگا کر ہنسنے لگا۔ وہ بار بار خوشی سے اپنی رانوں پر ہاتھ مارتا اور کلکاریاں مارتا۔ پھر وہ مجھے محبت سے اپنے گلے لگاتا اور میرا ہاتھ چومتا۔

"راجو۔ راجو۔ تم سردار لوگا کا پکا دوست ہو گیا۔ جنم جنم کا ساتھی۔ اب ہم تمہیں کبھی واپس نہیں جانے دے گا۔"

اس اثنا میں ہم بستی میں پہنچ گئے تھے جہاں محافظ چاق و چوبند اور کمر بستہ تھے۔ بُوڑھے، عورتیں اور بچے جھونپڑی کے اندر دبکے بیٹھے تھے مگر سردار کی آواز سُن کر وہ سب باہر نکل آئے اور اُس کے آس پاس جمع ہو گئے۔ اس نے مختصراً اُنہیں فتح کی داستان سنائی اور وہ خوشی سے ناچنے لگے۔ عورتوں نے مجھے اپنے گھیرے میں لے لیا اور بے اختیار شور مچانے اور گانے لگیں۔ اِن میں سے ہر ایک میرا جسم چھُو کر اظہارِ تشکّر کرنا چاہتی تھی مگر سردار نے ہاتھ بُلند کر کے اُنہیں روک دیا۔ پھر اُس نے اُنہیں بتایا کہ جب پیچھا کرنے والے سُورما واپس آ جائیں گے تو جیت کی خوشی میں بہت بڑا جشن منایا جائے گا۔ سب لوگ اِس جشن کی تیاریاں کریں۔ یہ کہہ کر وہ مجھے بازو سے تھام کر اپنی جھونپڑی میں لے گیا۔ وہ عقیدت، احترام اور محبت کی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا اور بار بار میرا ماتھا چوم رہا تھا۔

جھونپڑی کے اندر جاتے ہی اس نے مجھے ایک برتن میں سے کوئی مشروب نکال کر پیش کیا۔ مجھے متامل دیکھ کر اس نے بتایا کہ یہ جڑی بوٹیوں کا رس ہے اور ہر قسم کی تھکان دُور کر دیتا ہے۔ پھر وہ شوخی سے ہنسا اور بولا: "ابھی ہم تمہیں ایک اور رس پلائے گا۔ سوم رس۔"

"وہ کیا ہوتا ہے؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا "کوئی نشہ تو نہیں ہے؟"

"داڑو نہیں ہوتا۔" وہ ہنس کر بولا۔ "یہ داڑو کا بھی باپ ہوتا ہے۔ اُدھر شہر کا لوگ اس کو بالکل نہیں جانتا مگر ہم کو بہت ڈھیر سارا دے گا۔ اچھا اب تم آرام کرو۔ ہم ابھی تمہیں جشن کے لیے لینے آئے گا۔"

وہ ہنستا ہوا چلا گیا۔ میں نے اس کا پیالہ منہ سے لگایا۔ اُس کا ذائقہ کھٹ میٹھا تھا۔ کسی قسم کی خوشبو یا بدبو اس میں نہیں تھی۔ پھر میں چٹائی پر لیٹ کر آئندہ کے حالات کے بارے میں سوچنے لگا۔ اتنا میں جانتا تھا کہ سردار اب میرا بندۂ بے دام بن چکا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے قبیلے کے لوگ بھی میرے پرستار ہو گئے ہیں اگر میں اشارہ کرتا تو وہ سب سردار کی جگہ مجھے اپنا سردار بنانے پر ایک منٹ کی دیر بھی نہ کرتے مگر میرا مدعا یہ نہیں تھا۔ میں عارضی طور پر اس جنگل میں آ پھنسا تھا اور یہاں سے جتنی جلدی ممکن ہو مجھے رخصت ہو جانا چاہیے تھا، لیکن جنگلیوں کی اس احسان شناسی اور مہمانداری کی روایات کے تحت مجھے یہ بہت مشکل نظر آ رہا تھا۔ خاص طور پر اب جبکہ میں ان کا نجات دہندہ بھی بن چکا تھا۔

نہ جانے کتنی دیر میں ان خیالوں میں کھویا رہا۔ میں سمجھتا تھا رات کافی گزر چکی ہے اور میں کچھ دیر بعد سو جاؤں گا مگر نیند کا کوسوں نشان نہ تھا۔ میں بالکل تازہ دم تھا بلکہ لگتا تھا جیسے میں ابھی ابھی سو کر اُٹھا ہوں۔ دروازے پر آہٹ ہوئی اور سردار اندر داخل ہوا۔ اس کا لباس تبدیل ہو چکا تھا۔ کمر میں اس نے چیتے کی کھال لپیٹ رکھی تھی اور اس کے گلے اور بازوؤں میں موٹے موٹے دانوں کی مالائیں پڑی ہوئی تھیں۔ خدا جانے یہ موتی یا جواہرات تھے یا کچھ اور۔ اس کا چہرہ بھی رنگا ہوا تھا اور سر پر رنگ برنگے پروں کی تعداد میں کافی اضافہ ہو گیا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ شاہانہ رسمی لباس میں تھا۔ گویا جشن کا آغاز ہونے والا تھا۔

"راجو۔ میرے دوست آؤ میرے ساتھ۔" اس نے میری طرف ہاتھ پھیلائے۔ میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ مجھے بازو تھام کر باہر لے گیا مگر ہمارا رُخ بڑے میدان کی طرف نہیں تھا۔ وہ مجھے ایک قریبی جھونپڑی میں لے گیا جو خوشبو سے مہک رہی تھی۔ میں نہیں جان سکا کہ یہ خوشبو عود و لوبان کی تھی یا پھولوں کی۔ جھونپڑی میں ایک چٹائی پڑی ہوئی تھی اور اس کے نزدیک ایک بڑے منہ کا گھڑے نما بڑا سا برتن رکھا ہوا تھا۔ سردار نے جھونپڑی کے اندر پہنچ کر تالی بجائی اور پچھلے دروازے سے چھ سات نوجوان لڑکیاں اندر آ گئیں۔ وہ سب صحت مند اور مضبوط جسم کی تھیں۔ لباس ان کا حسبِ معمول ہی دو ٹکڑوں پر مشتمل تھا۔ سردار مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

"راجو۔ بہت بڑا جشن ہو گا۔ یہ تمہیں جشن کے لیے تیار کریں گی۔" اتنا کہہ کر اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر باہر چلا گیا۔ لڑکیاں میری طرف بڑھیں اور میرا لباس اُتارنے لگیں۔ میں نے پریشان ہو کر انہیں دیکھا اور پھر سردار کو پکارا۔

"سردار لوگا۔ اِنہیں روکو۔"

مگر سردار جا چکا تھا۔ میں نے لڑکیوں کو روکنے کی کوشش کی۔ انہیں منع کیا۔ ڈانٹا۔ بُرا بھلا کہا مگر ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ میری تمام کوشش رائیگاں چلی گئی اور انہوں نے میرا لباس جسم سے علیحدہ کر دیا مگر زیرِ جامہ ابھی تک میرے جسم پر تھا۔ میں سچ مچ غصے سے چلایا۔ "خبردار رُک جاؤ ورنہ بہت بُرا ہو گا۔" وہ میری ڈانٹ سے سہم کر رہ گئیں۔ لڑکی نے دبی زبان میں کچھ کہا مگر میں نے گھونسہ تان لیا اور چلا کر کہا "میں تمہیں جان سے مار دوں گا۔ یہ کیا بے حیائی ہے؟"

انہوں نے بے بسی اور مجبوری سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ میرا انداز انتہائی جارحانہ تھا اور انہیں یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ میں کسی قیمت پر ان کی کوشش کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ انہوں نے آپس میں مشورہ کیا اور پھر سر ہلا کر کسی بات پر متفق ہو گئیں۔ سانولے رنگ اور بھرے بھرے جسم کی ایک لڑکی آگے بڑھی اور اس نے مجھے چٹائی پر لیٹ جانے کا اشارہ کیا۔ انکار کی گنجائش نہ تھی۔ مرتا کیا نہ کرتا میں چٹائی پر لیٹ گیا۔ لڑکیوں نے برتن میں سے بھیگے ہوئے نرم پتے نکالے اور میرے جسم پر پھیرنے لگیں۔ آہستہ آہستہ میرے جسم کا کھچاؤ دور ہونے لگا اور میں سکون اور راحت محسوس کرنے لگا۔ سارے جسم کو پتوں سے دھونے کے بعد انہوں نے ایک اور چھوٹے برتن کا ڈھکنا کھولا اور ساری جھونپڑی خوشبو میں نہا گئی۔ یہ مرہم یا کریم جیسی کوئی شے تھی۔ انہوں نے میرے جسم پر اس کی مالش شروع کر دی۔

یہاں تک کہ وہ میرے جسم میں جذب ہو گئی۔ میرے انگ انگ سے خوشبو پھوٹنے لگی۔ یہ انتہائی دلآویز اور مسحور کن خوشبو تھی۔ میں اس خوشبو کے سمندر میں ڈوب گیا اور مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ چند لمحے بعد انہوں نے میرا جسم تھپ تھپایا تو میں گڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ وہ سب

میری گھبراہٹ پر ہنسنے لگیں۔ ایک لڑکی آگے بڑھی۔ اس کے ہاتھ میں جانور کی کھال تھی اور مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ مجھے لباس کے طور پر یہ کھال اپنی کمر کے گرد باندھنی ہو گی۔ میں نے کھال کا ٹکڑا اُس کے ہاتھ سے چھین لیا اور ان سب کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ انہوں نے پہلے تو توقف کیا مگر پھر جھونپڑی سے باہر چلی گئیں۔ میں نے زیرِ جامہ کے اُوپر ہی وہ کھال جسم پر لپیٹ لی اور اس میں لگے ہوئے تسموں کی مدد سے مضبوطی سے کمر میں باندھ لی۔ اتنی دیر میں لڑکیاں پھر اندر آ گئی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں رسی کی بنی ہوئی ایک پگڑی نما چیز تھی جس میں بہت سے رنگین پر لگے ہوئے تھے یہ میرا آرائشی رسمی یا تاج تھا۔ ایک خوبصورت لڑکی نے آگے بڑھ کر وہ تاج نما چیز میرے سر پر رکھ دی اور دونوں ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئی۔ باقی لڑکیاں بھی ہاتھ باندھ کر جھک گئیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ انہیں کیسے منع کروں۔ یہ مشکل سردار لوگا کی آمد کی وجہ سے آسان ہو گئی۔ اُس نے تعریفی نگاہوں سے میرا جائزہ لیا اور پھر بڑھ کر مجھے گلے لگا کر میرا ماتھا چوم لیا۔ لڑکیاں اس کی ہدایت پر باہر جا چکی تھیں۔

"راجو، میرے دوست۔ تم تو بالکل سردار لگ رہے ہو۔ بولو، سردار بنو گے؟ میری جگہ تم سردار بن جاؤ۔ مجھے بہت خوشی ہو گی۔"

میں ہنس پڑا۔ "سردار لوگا۔ تمہاری بہت مہربانی۔ مگر یہ میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ مجھے واپس جانا ہے۔"

"اچھا یہ باتیں پھر ہوں گی۔ آؤ باہر جشن کے لیے سب تمہارا بابٹ (انتظار) تک رہے ہیں۔"

ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے باہر نکلے تو کھلے میدان میں بستی کی ساری آبادی اکٹھی تھی۔ بوڑھے، بچے، عورت، مرد غرضیکہ قبیلے کا کوئی ایسا فرد نہ ہو گا جو اس وقت وہاں موجود نہیں تھا۔ ہم دونوں کو دیکھتے ہی انہوں نے نعرے لگانے شروع کر دیے اور پھر سجدے میں گر گئے۔ میں گھبرا گیا۔ "سردار۔ اِنہیں روکو۔ یہ مجھے سجدہ نہ کریں۔"

"ارے یہ تو پرا اعتنا کر رہے ہیں۔"

میری زبان پر یہ الفاظ آتے آتے رہ گئے کہ ہمارے مذہب میں انسانوں کے لیے انسانوں کو سجدہ کرنا گناہ ہے مگر پھر مصلحتاً خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ ہم میدان کے درمیان میں ایک اونچے چبوترے پر جا کر بیٹھ گئے۔ ہر طرف مشعلیں روشن تھیں جن کی وجہ سے سارا میدان روشن ہو رہا تھا۔ ایک دلکش لڑکی ہاتھ جوڑ کر آگے بڑھی اور اُس نے ایک مٹی کا برتن ہم دونوں کے سامنے رکھ دیا۔ سردار نے برتن اٹھا کر میری طرف بڑھایا۔ "تم ہمارے مہمان ہو۔ ہمارے رکھوالے ہو۔ پہلے تم پیو۔"

میں برتن اٹھا کر منہ کی طرف لے گیا مگر اس کی بدبو سے اندازہ لگا لیا کہ وہ شراب یا اسی قسم کی کوئی شے ہے۔ میں نے برتن سردار کو واپس لوٹا دیا۔ وہ حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے کہا "سردار۔ میں داڑو نہیں پیتا۔"

"داڑو نہیں پیتے" وہ بولا حیرت سے مجھے تکنے لگا جیسے میں نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہے۔ "پر کس لیے۔ کیا کارن ہے؟"

میں اتنی دیر میں جواب سوچ چکا تھا "سردار۔ میں نے اپنی ماں کو وچن دیا تھا کہ کبھی داڑو نہیں پیوں گا۔"

سردار کے چہرے پر حیرانی کے آثار نمودار ہوئے۔ پھر زور زور سے قہقہے لگانے لگا۔ اس کو ہنستا ہوا دیکھ کر سارے لوگوں نے ہنسنا شروع کر دیا۔ وہ سمجھے کہ شاید میں نے سردار کو کوئی لطیفہ سنایا ہے۔ سارا میدان قہقہوں کے شور سے گونج اُٹھا۔ سردار نے کہا "تم اچھے آدمی ہو۔ اپنا وچن نبھاتے ہو۔ بہادر ہو۔" یہ کہہ کر اس نے برتن کو منہ لگایا اور غٹ غٹ کر کے سارا برتن خالی کر دیا۔ حاضرین نے بھی اس کی پیروی کی۔ ان میں سے ہر ایک کے سامنے برتن دھرے ہوئے تھے۔ ان سب نے اپنے اپنے برتن اٹھا کر منہ سے لگا لیے اور اس طرح فتح کے اس جشن کا آغاز ہوا۔

ڈھول بجنے لگے اور ڈھول کی تھاپ پر ناچتی ہوئی چند لڑکیاں نمودار ہوئیں۔ وہ دیوانہ وار رقص کر رہی تھیں۔ رفتہ رفتہ ڈھول کی رفتار تیز ہوتی گئی۔ اسی رفتار سے لڑکیوں کے رقص میں بھی تیزی پیدا ہو گئی۔ جس سے میں بہت زیادہ محظوظ ہوا۔ ان کے رقص میں ایک عجیب طرح کی حیوانیت، دیوانگی اور والہانہ پن تھا۔ وہ رقص کے ساتھ ساتھ گلے سے چیخ چیخ کر آوازیں بھی نکالتی جا رہی تھیں جسے گانا تو نہیں کہا جا سکتا۔ شاید وہ خوشی کا اظہار کرنے کے لیے ایسا کر رہی تھیں۔ حاضرین بھی ان کی آوازوں میں آوازیں ملا کر چیخ رہے تھے اور اتنا شور تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ کچھ دیر بعد کچھ اور لڑکیاں اور مرد بھی رقص میں شامل ہو گئے۔ یہاں تک کہ سردار لوگا کی بیویوں نے

بھی اُٹھ کر ناچنا شروع کر دیا۔ جو لوگ ناچ نہیں رہے تھے وہ دارو پی پی کر شور مچا رہے تھے۔ کافی دیر تک یہ ہنگامہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ ناچنے والے تھک گئے۔ سردار نے تالی بجائی اور ناچ گانا بند ہو گیا۔ سردار میرا ہاتھ پکڑ کر کھڑا ہوا اور اس نے میرا ہاتھ اُونچا کر دیا۔ سب لوگوں نے شور مچا کر میری عزت افزائی کی۔ جس کے بعد سردار نے جنگلی زبان میں ایک مختصر سی تقریر کی۔ جواب میں پھر ویسا ہی شور مچا۔ سردار میرا ہاتھ تھام کر اپنی جھونپڑی میں لے گیا اور کہنے لگا: "دیکھو راجو۔ یہ ہمارے جیون کا بہت بڑا دن ہے۔ اس سے بڑی خوشی ان لوگوں کو کبھی نہیں ملی ہے۔ آج یہ سب خوشی منائیں گے۔ ناچیں گے۔ گائیں گے۔ مزے کریں گے۔ ہر ایک کو آزادی ہے کہ وہ اپنی پسند کے ساتھی کے ساتھ موج منائے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے حیران ہو کر کہا۔

"مطلب یہ کہ آج کسی پہ کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ کوئی جس طرح چاہے موج منائے۔"

میں نے حیرت سے اس کا چہرہ دیکھا اور پوچھا: "ہر عورت کسی نہ کسی کی بیوی یا رشتے دار ہوتی ہے سردار لوگا۔ کوئی شخص اپنی بیوی کو یہ اجازت کیسے دے سکتا ہے؟"

سردار لوگا نے سنجیدگی سے مجھے دیکھا اور پھر بولا: "سنو راجو! یہ شہر نہیں ہے، جنگل ہے۔ ہم جنگلیوں کے رواج تم لوگوں سے الگ ہوتے ہیں۔ ہمارے لوگوں میں میاں بیوی کا سمبندھ کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ جس کے بازو میں طاقت ہے اور شکار مار سکتا ہے وہ من پسند لڑکی سے بیاہ کر سکتا ہے۔ اس کی بیوی کو اگر کوئی دوسرا مرد پسند آ جائے تو وہ اپنے گھر والے کو چھوڑ کر اس کے ساتھ بیاہ کر لیتی ہے۔ جب کبھی جشن یا تہوار ہوتا ہے تو سب لوگ دارو پی کر ناچتے ہیں اور موج اُڑاتے ہیں۔ اس روز کسی مرد اور عورت پر کوئی روک ٹوک نہیں ہوتی۔ تمہارے لوگوں میں مرد بہت سے بیاہ کر لیتے ہیں۔ ہمارے جنگل میں عورت بھی ایک بار میں کئی بیاہ کر سکتی ہے۔ اگر اُس کو اپنے مرد کی آ گیا ہو تو پھر اُسے کوئی روک نہیں سکتا اور پھر آج کا دن تو بہت شبھ دن ہے راجو۔ ایسی جیت تو ہمارے قبیلے کو کبھی نہیں ملی۔ جنم جنم تک ہم سب اسے یاد رکھیں گے۔ تم نے ہماری رکھشا کی ہے۔ تم ہمارے لیے دیوتا بن کر آئے ہو۔ تمہارے لیے تو ہم ہر طرح کی بھینٹ دے سکتے ہیں۔"

میرے لیے سردار کا شکرانہ اور احسان مندی کا جذبہ بجا تھا۔ مگر اس نے اپنے قبیلے کے رسم و رواج کے بارے میں جو کچھ بتایا وہ ایک انوکھی اور تعجب انگیز بات تھی مگر ہر ملک، شہر اور سماج کے اپنے اپنے دستور ہوتے ہیں۔ سب اپنے قاعدوں اور قوانین کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں۔ میرے لیے یہ سب باتیں کتنی ہی انوکھی سہی، ان لوگوں کے لیے بالکل نارمل اور قدرتی تھیں۔ خدایا! میں نے سوچا میں کہاں پھنس گیا؟ اس مشکل سے کب اور کیسے نجات ملے گی۔

سردار نے مجھے سوچ میں گم دیکھا تو زور سے ہنسا اور کہنے لگا: "راجو دوست۔ تم تو ہماری جان بھی مانگو گے تو کوئی نا نہیں کرے گا۔ جس کی طرف اشارہ کر دو وہ اپنے ہاتھ سے اپنی گردن کاٹ کر دے دے گا تمہیں، کہو تو ابھی آزما لو۔"

"ارے نہیں سردار۔ مجھے کسی بدلے یا قربانی کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارے جذبات کے لیے میں تمہارا بہت شکریہ ادا کرتا ہوں۔"

"تمہیں بھوک تو نہیں لگی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"بالکل نہیں۔ بس اب میں سونا چاہتا ہوں۔ تم لوگ جشن مناؤ۔ عیش کرو۔"

سردار ہنس پڑا: "یہ سونے کا سمے نہیں ہے راجو۔ یہ تو جاگنے کی گھڑی ہے۔ تم نے ہم پہ جو کرپا کی ہے اس کا بدلہ ایسے تو نہیں اُترے گا۔ ہمیں بھی سیوا کی آگیا دو۔"

"مگر سردار......؟"

"دیکھو اب تم کچھ نہیں بولو گے۔ پورن ماشی کی رات آنے تک ہم سب جشن منائیں گے اور تم بھی ایسا ہی کرو گے۔ ان ہتھیاروں کے آ جانے کے کارن ہم تمہاری سیوا ابھی نہیں کر سکے۔ اب تم ہمارے مہمان بنو گے۔ جب تک پورنماشی ہو گی۔ اب مجھے آگیا دو۔"

"مگر میں سوؤں گا کیسے؟"

وہ ہنس پڑا: "تمہیں نیند نہیں آئے گی دوست۔ تمہیں سوم رس پلائیں گے جس سے تم کو سونے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ نہ تم تھکو گے۔ نہ تمہاری شکتی کم ہو گی۔ یہ سوم رس دیوتاؤں کی دین ہے۔ ہم جب کبھی بہت بڑا جشن مناتے ہیں تو سردار کو یا اس کے مہمان کو یہ رس پلاتے ہیں۔

پر تم تو خود دیوتا بن کر آئے ہو ہمارے لیے۔"

ابھی میں جواب بھی نہیں دینے پایا تھا کہ وہ جھونپڑی سے باہر چلا گیا۔ باہر سے شور و غل، ہنسی اور قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ لوگ کس طرح زندگی کی خوشیوں کو اپنے دامن میں سمیٹ رہے ہوں گے مگر سردار کی باتوں نے مجھے اُلجھن میں ڈال دیا تھا۔ سوم رس کیا بلا ہے اور اس کے پینے سے کیا ہوتا ہے؟ اتنا تو میں جان گیا تھا کہ بہت خاص مواقع پر اپنے خاص مہمانوں کی خدمت میں یہ تحفہ پیش کیا جاتا ہے مگر میں دیوتاؤں کی بخشی ہوئی اس نعمت کو قبول کروں یا نہ کروں؟

شور و غل کے ساتھ ساتھ ہنسی اور قہقہوں کی آوازیں اور وحشیانہ نعروں کی آوازیں بدستور جاری تھیں۔ ان میں عورت اور مرد دونوں کی آوازیں شامل تھیں۔ چند لمحے بعد آہٹ ہوئی اور جھونپڑی میں دو لڑکیاں داخل ہوئیں۔ ان کے ہاتھ میں نرم کھالوں سے بنا ہوا ایک بستر تھا جو انہوں نے خاموشی سے جھونپڑی کے بیچوں بیچ بچھا دیا۔ پھر انہوں نے جھک کر مجھے تعظیم دی اور باہر چلی گئیں۔ گویا سردار مجھے وی۔ آئی۔ پی ٹریٹمنٹ دے رہا ہے۔ میں نے سوچا۔ باہر سے پھر لڑکیوں کی گنگناتی ہوئی آوازیں سنائی دیں اور پھر ساری جھونپڑی اُن سے بھر گئی۔ یہ سب سردار لوگا کی بیویاں تھیں۔ وہ سب بناؤ سنگھار کیے ہوئے تھیں۔ ان کے چہرے خوشی سے تمتما رہے تھے۔ آگے بڑھ کر انہوں نے ڈنڈوت کے انداز میں جھک کر مجھے تعظیم دی اور پھر رقص کے انداز میں میرے ارد گرد حرکت کرنے لگیں۔ نیرا ان میں پیش پیش تھی۔ اس کے سر پر ایک تھالی تھی جس میں مٹی کا ایک برتن رکھا ہوا تھا۔ وہ ایک ماہر رقاصہ کے انداز میں جسم کو ہلکورے دے رہی تھی مگر تھالی میں رکھے ہوئے برتن کا رس ایک قطرہ بھی نہیں گرا تھا۔ اتنا تو میں جان گیا تھا کہ وہ سردار کے کہنے کے مطابق سوم رس ہے مگر یہ ہے کیا بلا؟ سردار نے بتایا تھا کہ یہ دیوتاؤں کا تحفہ ہے اور یہ دارو نہیں ہے۔ نیرا جسم کو بل دیتی ہوئی آگے بڑھی اور میرے سامنے دلنواز انداز میں سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں خمار کی سی کیفیت تھی اور ایک التجا بھی۔ سردار کی دوسری بیوی آگے بڑھی اور میرے آگے دونوں ہاتھ جوڑ کر رقص کے انداز میں کھڑی ہو گئی۔ پھر اس نے تھالی میں رکھا ہوا برتن اُٹھا کر میری طرف بڑھایا۔ میں ابھی تک لیس و پیش میں تھا۔ جب کافی دیر تک میں نے پیالہ اُٹھانے کی کوشش نہیں کی تو ان میں آپس میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ ایک پری نقش و نگار اور گداز جسم کی عورت نے آگے بڑھ کر اپنی زبان میں کچھ کہنا شروع کیا جس کا ایک لفظ بھی میرے پلے نہیں پڑا۔ میں بدستور خاموش تھا۔ آخر ان میں سے ایک تیزی سے دوڑ کر باہر چلی گئی۔ وہ سب تعجب سے ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جنگلی ہونے کے باوجود وہ سب رعنائی اور دلکشی میں کم نہیں تھیں۔ ظاہر ہے کہ قبیلے کے سردار کے لیے جنگل کی منتخب لڑکیاں ہی چنی جاتی ہوں گی یا پھر لڑائیوں میں ہار جانے والے قبیلوں کی خوبصورت ترین لڑکیاں سردار کے حصے میں آتی ہوں گی۔ یہ حقیقت ہے کہ ان کی ملاحتوں نے جھونپڑی میں ایک چمن سا کھلا دیا تھا۔

یکایک تیز تیز قدموں کی آوازیں سنائی دیں اور پھر سردار لوگا اندر داخل ہوا۔ وہ عورت جو اُسے بُلا کر لائی تھی اس کے پیچھے تھی۔ سردار کے چہرے پر پریشانی اور اُلجھن کے آثار تھے۔

"راجو دوست۔ کوئی دوش ہو گیا ہے ہم سے؟"

"نہیں تو سردار۔ یہ تم نے کیسے سوچا؟"

"تو پھر سیوا کو سویکار کیوں نہیں کر رہے ہو۔ سوم رس تو ہر منش کی قسمت میں نہیں ہوتا۔ یہ دیوتاؤں کے لیے ہوتا ہے یا پھر کوئی قسمت والا مہان سردار ہوتا ہے جسے یہ ملتا ہے۔ پر تم کیوں نہیں پی رہے؟"

میں نے کہا: "میں نے تو تمہیں بتایا ہے ناں کہ دارو نہیں پیوں گا؟"

"یہ دارو نہیں ہے دوست۔ تم نے اپنی ماں کو جو وچن دیا ہے میں اُسے نہیں توڑوں گا۔"

"تو پھر یہ کیا ہے؟"

اس کی آنکھوں میں مستی اور خمار کے سائے لہرا گئے۔ آواز میں ایک نشے کی سی کیفیت پیدا ہو گئی: "سنو راجو۔ آکاش کے دیوتا جب جشن مناتے ہیں تو انہیں یہ سوم رس پینا ہوتا ہے۔ دیوتاؤں کا جشن جلدی تو ختم نہیں ہوتا۔ ان کا سمے تو گزرتا ہی نہیں۔ [illegible] کا ایک دن ہمارے ایک سال کے برابر ہوتا ہے۔ وہ کئی کئی دن اپنی گپھا سے باہر نہیں نکلتے۔ اس کارن وہ سوم رس پیتے ہیں۔ اس کے پینے سے ان کی شکتی [illegible]

جاتی ہے۔"

میں نے حیران ہو کر اُس کی طرف دیکھا۔

وہ بولا: "راجو۔ تم نے ہم پر بہت کرپا کی ہے۔ تم نے وہ کام کیا ہے جو دیوتا ہی کر سکتے ہیں ہم تو تمہارا دینا نہیں دے سکتے میرا بس چلے تو اپنی جان بھی تمہیں بھینٹ دے دوں۔ من چاہتا ہے تمہیں آکاش پہ بٹھا دوں۔ باہر سب بستی والے جشن منا رہے ہیں۔ تمہارے کارن انہیں یہ جیت ملی ہے۔ تم بھی جشن مناؤ۔ دیوتاؤں کی طرح اپنی منو کامناؤں کو پورا کرو۔ یہ سب تمہاری دیوداسیاں ہیں۔ یہ تمہاری سیوا میں رہیں گی۔ تمہیں خوشی سے مالا مال کر دیں گی۔"

میں دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ میرے لیے یہ بالکل انوکھی صورتحال تھی۔ "سردار تم نے ٹھیک کہا۔ ہر جگہ کا رواج الگ ہے۔ پر تم مجھے اپنا رواج اپنانے کے لیے کیوں مجبور کرتے ہو۔"

سردار حیرت اور بے یقینی سے میری صورت تک رہا تھا: "دیکھو راجو دوست۔ تم سردار لوگا کا اپمان مت کرو۔ ہم جنگلی لوگ اپنی آن پہ جان دینا بھی جانتے ہیں۔ کوئی ہماری بے عزتی نہیں کر سکتا۔ اگر تم نے ہم پر اتنا بڑا احسان نہ کیا ہوتا تو اب تک سردار لوگا تمہاری طرف سے اتنی بڑی بے عزتی برداشت نہیں کرتا۔"

"بے عزتی؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"یہ بے عزتی نہیں تو اور کیا ہے؟ اگر تم نے ان کی سیوا کو سویکار نہیں کیا تو یہ جنگل تمہاری جان لے لیں گے۔"

میں بوکھلا گیا: "مگر سردار لوگا......"

"راجو۔" وہ میری بات کاٹ کر نرم لہجے میں بولا: "کیا ان کی سندرتا میں کھوٹ ہے؟ ان کی طرف دیکھو۔ یہ آکاش کی اپسراؤں سے کم نہیں ہیں۔ کوئی سادھو، سنت، جوگی بھی ہو تو اُن کو دیکھ کر پاگل ہو جائے۔ پر تم کیسے آدمی ہو؟"

"تم تو شہر میں رہ چکے ہو سردار لوگا۔ ہمارے سماج میں یہ پاپ ہے۔"

"پر ہمارے سماج میں یہ پُن ہے۔ ثواب ہے۔ اس سمے تم اپنے شہر میں نہیں ہمارے جنگل میں ہو۔ تمہیں وہی کرنا ہوگا جو ادھر کا رواج ہے۔"

پھر اُس نے ایک نگاہ اپنی بیویوں کی قطار پر ڈالی جو خاموش کھڑی حیرت سے ہم دونوں کو دیکھ رہی تھیں۔ ہماری گفتگو کا ایک لفظ بھی ان کے پلے نہیں پڑ رہا تھا مگر وہ اتنا ضرور جان گئی تھیں کہ میں ان کی خدمات کو قبول کرنے سے انکار کر رہا ہوں۔ ان کے چہروں کی مایوسی اور اُداسی اس بات کا مظہر تھی۔ وہ التجا آمیز نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ اس وقت وہ پوری طرح بن سنور کر آئی تھیں۔ ہر ایک نے ایک دوسری سے بڑھ چڑھ کر بناؤ سنگھار کیا تھا۔ ان کے جسموں سے خوشبو کی لپٹیں آ رہی تھیں۔ آنکھوں میں کاجل اور بالوں میں تیل لگا ہوا تھا۔ اُنہوں نے اپنے ہاتھوں اور گلوں میں پھولوں اور لکڑی کے ٹکڑوں کے گجرے اور ہار پہن رکھے تھے۔ لباس بھی ان کے زرق برق تھے۔ شاید شادی کے موقعے پر یہاں کی دُلہنیں اسی طرح سجتی اور سنورتی ہوں گی اور پھر وہ سب تو سردار کی بیویاں تھیں۔ جو سارے علاقے کا انتخاب تھیں جنہیں اپنی حیثیت اور شکل و صورت پر ناز تھا۔ شاید جنگل کا ہر شخص دل ہی دل میں اُنہیں اپنانے کی حسرت رکھتا ہوگا مگر وہ ہر ایک کی دسترس سے باہر تھیں، اس لیے کہ وہ سردار لوگا کی بیویاں تھیں مگر ان کے سامنے ایک ایسا شخص کھڑا ہوا تھا جو اُن کی جانب ذرا بھی ملتفت نہ تھا اور جو ان کی خدمات کو قبول کرنے سے انکار کر رہا تھا۔ عورتیں بہت زیادہ حساس ہوتی ہیں وہ حالات اور معاملات کو بہت جلد بھانپ لیتی ہیں اور حقیقت کی تہہ تک پہنچ جاتی ہیں۔ اسی لیے وہ غصے اور مایوسی سے ہم دونوں کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ ان کے چہروں پر ٹھکرائے جانے کا صدمہ صاف پڑھا جا سکتا تھا۔

سردار لوگا اس اثنا میں اپنا فیصلہ سُنا چکا تھا اور مجھ پر یہ واضح ہو چکا تھا کہ میں کسی صورت بھی جنگل کے قانون کو نہیں توڑ سکتا۔ اس نے مجھے سمجھا دیا تھا کہ اگر مدہوش جنگلیوں کے کانوں میں اس بات کی بھنک بھی پڑ گئی کہ میں نے سردار کی بیویوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے تو وہ سب کچھ بھول کر میری تکا بوٹی کر دیں گے۔

میں نے ایک لمبی آہ بھری اور مایوسی سے اس کی طرف دیکھا۔ پھر میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی: "سردار لوگا۔ تم کہتے ہو تو میں تمہاری خواہش پوری کرنے سے انکار نہیں کروں گا مگر میری خدمت کے لیے ایک ہی کافی ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے راجو۔" سردار نے پریشانی سے کہا: "اپنی بے عزتی تو ان میں سے کوئی بھی سہ نہیں سکے گی اور پھر جشن تو بہت دن تک جاری رہے گا۔"

مجھے تاریکی میں روشنی کی ایک کرن نظر آئی: "ٹھیک ہے جشن تو پورن ماشی تک جاری رہے گا۔ مجھے تمہاری یہ بات بھی منظور ہے مگر تم جانتے ہو کہ ہم شہر کے لوگ ایک وقت میں ایک سے زیادہ بیوی کی موجودگی گوارا نہیں کرتے۔ میں نے تمہاری آگیا کا پالن کیا ہے۔ اب تم بھی میری ایک بات مان لو۔ ان میں سے ایک کو یہاں رہنے دیں۔ صبح دوسری اُس کی جگہ لے لے گی اور اس طرح تمہاری مرضی بھی پوری ہو جائے گی اور کسی کو ناراضگی کا موقعہ بھی نہیں ملے گا۔"

سردار نے مایوس اور جھلاہٹ سے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھائے جیسے کہہ رہا ہو کہ بھگوان ہم تم سے سمجھے مگر اسے بھی یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ چاہے کچھ ہو جائے میں اُس کے ہر حکم اور ہر خواہش کی تکمیل نہیں کروں گا۔ مجبوری سے اُس نے اپنی بیویوں کی طرف دیکھا اور پھر دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھائے اور جانے کیا بڑبڑایا۔

میں نے کہا: "سردار۔ انہیں بھی جشن میں حصّہ لینا ہے۔ ان کو تم اپنے ساتھ کیوں نہیں لے جاتے؟"

"تمہارے جیسے مہان کے ہوتے ہوئے ان پہ میرا حق نہیں ہے۔" وہ سادگی سے بولا۔ پھر اُس نے اپنی بیویوں سے مخاطب ہو کر جنگلی زبان میں کچھ کہنا شروع کر دیا۔ ان سب کے چہروں پر غصے اور مایوسی کے جذبات صاف نظر آ رہے تھے۔ وہ مجھے یوں گھور رہی تھیں جیسے کچا ہی چبا ڈالیں گی۔ ان کی اس سے بڑی توہین شاید کبھی نہیں ہوئی ہو گی۔ سردار نے سمجھانے کے انداز میں ان سے کچھ کہا اور ان کے چہروں سے ناخوشگی کے تاثرات رفتہ رفتہ کم ہونے لگے۔

سردار نے نیرا کی طرف اُنگلی اُٹھائی اور چند الفاظ کہے۔ اس کے اشارے اور ہدایت پر نیرا کے سوا تمام دوسری بیویاں جھونپڑی سے باہر چلی گئیں۔ نیرا کے چہرے پر خوشیوں کے پھول کھل رہے تھے۔ سردار نے درست کہا تھا۔ اس وقت میری حیثیت ایک دیوتا جیسی تھی اور دیوتا کی خدمت کا موقع ملنے کی سعادت حاصل کرنا ان عورتوں کے لیے کوئی معمولی بات نہ تھی۔ سردار نے ایک بار پھر میری طرف دیکھا اور پھر منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا ہوا جھونپڑی سے باہر چلا گیا۔

اب میں اور نیرا جھونپڑی میں بالکل تنہا تھے۔ وہ دوسرے کونے میں خاموش کھڑی میری طرف دیکھ رہی تھی اور اس بات کی منتظر تھی کہ میں اسے کوئی ہدایات دوں۔ چند لمحے اسی طرح گزر گئے۔ میں اضطراب اور غصے کے عالم میں ٹہلتا رہا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس مسئلے کو کیوں کر حل کروں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس اچانک اُفتاد نے مجھے حواس باختہ کر دیا تھا۔ بہرحال یہ بھی غنیمت تھا کہ سردار کی بیگمات کی فوج جھونپڑی سے رخصت ہو چکی تھی اور اب مجھے صرف ایک عورت سے نمٹنا تھا۔ میں سوچتا رہا اور جھونپڑی میں ٹہلتا رہا۔ نیرا کچھ دیر تو خاموش کھڑی مجھے تکتی رہی پھر وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی جھونپڑی کے وسط میں پہنچ گئی۔ وہ بار بار مٹی کے اُس برتن کی طرف دیکھ رہی تھی جس میں سردار کے بیان کے مطابق مقدس سوم رس تھا۔ میں نے بے دھیانی سے سر کھجایا اور پھر نرم کھال کے بستر پر بیٹھ گیا۔ نیرا مسکرائی اور مٹی کا برتن اُٹھا کر میرے نزدیک آ گئی۔ اس نے اپنی زبان میں کچھ پوچھا اور پھر مٹی کے برتن کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر میں نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے روک دیا۔ وہ اُلجھی اُلجھی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ باہر شور و غل اور ہنسنے بولنے کی آوازوں میں کوئی کمی نہیں آئی تھی بلکہ کچھ اضافہ ہی ہو گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ساری بستی اس موج میلے میں شریک تھی مگر افسوس کہ سردار کی بیویاں اس خوشی سے محروم تھیں۔ وہ سب سردار کی جھونپڑی میں میرے حکم کی منتظر بیٹھی ہوئی تھیں۔

نیرا نے مجھے سوچ میں ڈوبا ہوا دیکھ کر کہنی سے ٹہوکا دیا اور میں چونک پڑا۔ میرا ذہن کوئی کارگر ترکیب نہیں سوچ سکا تھا مگر اب میں نسبتاً زیادہ پُرسکون اور پُراعتماد تھا۔ وقتی طور پر میں نے سوچنے سمجھنے اور فیصلہ کرنے کے لیے کچھ مہلت حاصل کر لی تھی۔ وہ تیز تیز آواز میں مجھ سے نہ جانے کیا کہہ رہی تھی۔ وہ بار بار سوم رس کے برتن کی طرف اشارہ بھی کر رہی تھی۔ میں نے ہاتھ اُٹھا کر اُسے

خاموش کر دیا۔

"دیکھو نیرا" میں اس سے مخاطب ہوا۔ "نہ تم میری زبان سمجھتی ہو نہ میں تمہاری بولی جانتا ہوں۔ اس لیے اپنی پرابلم تمہیں نہیں سمجھا سکتا۔ جب تمہارا شوہر نامدار ہی میری بات نہ سمجھ سکا تو تم کیا خاک سمجھو گی۔"

وہ حیرانی سے میرے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔

"تم میرے لیے قابل احترام ہو۔ سردار نے مجھ پر مہربانی کی ہے۔ میری جان بچائی ہے۔ مجھے پناہ دی ہے۔ اپنے محسن کی بیوی میرے لیے تعظیم کی مستحق ہے مگر بابا تمہارے جنگل کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ تم اُلٹی کھوپڑی کے لوگ ہو۔ تمہارے دستور بھی اُلٹے ہیں کیوں جناب؟" یہ کہہ کر میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ بھی مسکرائی اور میرے قریب کھسک آئی۔ پھر اُس نے اپنی نرم اور ملائم آواز میں مجھے مخاطب کیا۔ میں ایک لفظ بھی نہیں سمجھ سکا مگر اس کے لہجے کی مٹھاس نے مجھے حیران کر دیا۔ جنگلی لوگوں کی زبان اور لہجہ اتنا نرم اور میٹھا بھی ہو سکتا ہے۔ یہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "تم بھی شاید ٹھیک ہی کہتی ہو مگر مشکل یہ ہے کہ میں تمہاری بات نہ سمجھ سکتا ہوں اور نہ مان سکتا ہوں۔ تم سمجھتی کیوں نہیں ہو؟"

وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی اور بے تکلفی سے میرے سامنے کھال پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ وہ خوش شکل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دلچسپ باتونی خوش مزاج اور ہنس مکھ عورت بھی تھی۔ وہ ہنستی رہی اور اپنی زبان میں نہ جانے کیا کیا کہتی رہی۔ پھر اُس نے جھک کر میرے پیروں کی طرف ہاتھ بڑھائے۔ میں نے تیزی سے اپنے پیر کھینچ لیے۔ "نہ بابا۔ قدم چھونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میری ٹانگ کھینچنے کی کوشش مت کرو۔"

جواب میں اُس نے اپنی بڑی بڑی حیران سیاہ آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ میں نے کہا۔ "اب تم اطمینان سے وہاں میرے سامنے بیٹھ جاؤ اور اپنے بارے میں سب کچھ مجھے بتا دو۔ یہ بتاؤ کہ اپنی سوکنوں کے ساتھ تمہاری کیسی نبھ رہی ہے۔ سردار لوگا کی لاڈلی بیوی کون ہے۔ تم نوک ایک میں لڑائی جھگڑا تو نہیں کرتی ہو؟ کھانا دانا کون پکاتا ہے؟"

میں نے آرام سے نیم دراز ہو کر دونوں ہاتھ اپنے سر کے پیچھے رکھ لیے اور اس کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ وہ ایک بار پھر کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ غالباً اب اس کو بھی اس تماشے میں لطف آنے لگا تھا۔ جواب میں اس نے ایک لمبی تقریر جھاڑ دی۔ وہ تیزی سے اپنے دونوں ہاتھ ہلا رہی تھی۔ اس کی گردن اور آنکھیں بھی حرکت میں تھیں۔ کبھی وہ جوش میں آکر دو زانو کھڑی ہو جاتی، کبھی بیٹھ کر نرم لہجے میں پوچھتی اور آپ ہی آپ ہنسنے لگتی۔ میں بظاہر اس کی گفتگو پوری توجہ اور دلچسپی کے ساتھ سُن رہا تھا مگر میرا دھیان کسی اور طرف تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ مجھے شاید اب اس جنگل سے بھاگ نکلنے کا کوئی موقعہ نہیں ملے گا۔ نیرا کو بہلا پھسلا کر جھونپڑی سے باہر نکل جانا میرے لیے کوئی مشکل کام نہ تھا۔ سارا قبیلہ جشن منا رہا تھا اور مدہوشی کے طلسم میں گرفتار تھا۔ فرار ہونے کا اس سے بہتر موقعہ بھلا کیا ہو سکتا تھا مگر بھاگ کر جاؤں گا کہاں؟ اس گھنے اور انجان جنگل کے بارے میں مجھے کچھ بھی پتہ نہیں تھا اور میں اس پناہ گاہ کو چھوڑ کر جنگلی درندوں یا آدم خوروں کا شکار ہونے کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔ نیرا کی باتوں کا سلسلہ جو ایک بار شروع ہوا تو مُڑ کے نہ جاری رہا۔ وہ نہ جانے کیا کیا قصّے سنا رہی تھی۔ کبھی ہنستی تھی۔ کبھی مُنہ بناتی تھی۔ کبھی اس کے چہرے پر غصّے کے تاثرات نمودار ہو جاتے تھے۔ میرا دل گھبرا گیا۔ میں ایک دم کھڑا ہوا تو وہ یک لخت خاموش ہو گئی۔ حیرت سے اُس نے میری طرف دیکھا اور پھر خود بھی کھڑی ہو گئی۔ وہ سہم گئی تھی۔ شاید اس کا خیال تھا کہ میں کسی بات سے ناراض ہو گیا ہوں وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"پریشانی کی بات نہیں۔ میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔ بس دل گھبرا گیا ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے باہر تازہ ہوا کھانے کے لیے جانا چاہتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں جھونپڑی سے باہر چلا گیا۔ باہر فضا میں ایک عجیب مستی اور مدہوشی کا عالم تھا۔ سارا جنگل اَن جانی خوشبوؤں سے مہک رہا تھا جشن منانے والوں کے شور و غل اور چہل پہل نے جنگل میں منگل کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ وہ سب خوشیاں منا رہے تھے۔ گا نے گا رہے تھے۔ رقص کر رہے تھے۔ ڈھول کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ کبھی کسی نغمے کی تان بھی سنائی دیتی تھی مگر میں ان سب سے بے پروا اپنے خیالات میں

گم تھا۔ نہ جانے سوچوں میں کھویا ہوا میں کتنی دُور چلا گیا یہاں تک کہ شور و غل کی آوازیں بہت مدھم ہو گئیں۔ یکایک مجھے اپنے پیچھے کوئی آہٹ سنائی دی۔ چونک کر پلٹا اور میرا ہاتھ بے اختیار ریوالور پر پہنچ گیا مگر پھر میری بے اختیار ہنسی چھوٹ گئی۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر نیرا کھڑی ہوئی تھی۔ سوم رَس کا برتن اُس نے گھڑے کے انداز میں اپنے سر پر اُٹھایا ہوا تھا اور وہ نہ جانے کب سے نہایت خاموشی اور سعادت مندی کے ساتھ دبے پاؤں میرے پیچھے پیچھے چلی آ رہی تھی۔ میرے یکدم پلٹنے سے وہ ٹھٹھک کر رُک گئی تھی مگر میری ہنسی نے اُس کا خوف دُور کر دیا۔ وہ مسکراتی ہوئی میرے نزدیک آگئی۔ اس کا یہ انداز دیکھ کر مجھے اپنے گاؤں کی پنہاریں یاد آگئیں۔ کنوئیں یا پن گھٹ سے پانی بھرنے کے لیے جب وہ مٹی کے گھڑے اپنے سروں پر اُٹھا کر چلتی ہیں تو یہی منظر پیش کرتی ہیں۔ فرق صرف لباس کا تھا یا پھر ماحول کا۔

"بھئی تم کس خوشی میں میرا پیچھا کر رہی ہو اور یہ گھڑا تم نے کیوں اُٹھا رکھا ہے۔ بابا میں کہیں بھاگا تو نہیں جا رہا ہوں!"

وہ پھر ہنس پڑی اور جواب میں اپنے نرم و ملائم لہجے میں اُس نے مجھ سے کہا اور سر پر دھرا ہوا برتن اُتارنے کا ارادہ کیا۔

"ارے ارے۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ وہ پھر سہم کر رہ گئی۔ "تم تو ذرا ذرا سی بات پر سہمی ہوئی فاختہ کی طرح ڈر جاتی ہو۔ تم کیسی جنگلی عورت ہو۔ تم نے تو شہر کی نرم و نازک عورتوں کو بھی مات کر دیا ہے۔ اچھا۔ اب آ ہی گئی ہو تو چپ چاپ چلتی رہو۔ ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالنا۔ میں سوچ رہا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر اُسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ اس نے سر ہلا کر تعمیل کی اور خاموشی سے میرے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ اس طرح آگے پیچھے چلتے ہوئے ہم دونوں کافی دُور نکل گئے۔ اب گھنے جنگل کا سلسلہ کم ہو رہا تھا اور یوں لگتا تھا کہ کچھ فاصلے پر کھلی جگہ موجود ہے۔ موسیقی اور شور و غل کی آوازیں قریب قریب معدوم ہو چکی تھیں اور جنگل کا سناٹا دل کو بھاتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اب میں پرندوں اور جنگلی جانوروں اور جھینگروں کی ہلکی اور نازک آوازیں بھی سُن سکتا تھا۔ پھر میں نے کچھ فاصلے پر آبشار کے گرنے کی آواز سُنی۔ اس جنگل میں آبشاروں اور ندیوں کی کمی نہیں تھی۔ یہ میں اپنی گرفتاری کے بعد سردار کی بستی تک پہنچتے وقت ہی دیکھ چکا تھا۔ چند قدم اور آگے بڑھ کر دیکھا تو مجھے آبشار کا سفید چمکدار پانی چاندی کی دھار کی طرح گرتا ہوا نظر آگیا۔ آبشار زیادہ بڑا نہیں تھا مگر اس کے باوجود یہ منظر اتنا دلکش اور سحر آفریں تھا کہ میں اس میں کھو گیا۔ یکایک میں نے اپنے پیچھے ایک آہٹ سُنی اور پھر چیخ کی آواز۔ تیزی سے پلٹ کر دیکھا تو نیم تاریکی میں ایک جنگلی کا ہیولا نظر آیا۔ وہ مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہ تھا۔ اس نے نیرا کی گردن کے گرد اپنا بازو پھیلایا ہوا تھا اور مجھ پر بھالا پھینکنے کے لیے اس کا بازو بلند ہو چکا تھا۔ ایک لمحے کی اور تاخیر ہو جاتی تو اُس کا زہر آلود بھالا میرے جسم میں پیوست ہو چکا ہوتا مگر نیرا کی چیخ نے مجھے بروقت خبردار کر دیا۔ میرے پاس جوابی کارروائی کرنے کا وقت نہ تھا اس لیے میں فوراً زمین پر بیٹھ گیا۔ بھالا سنسناتا ہوا تیزی سے میرے سر کے اُوپر سے گزر گیا۔ میں نے حملہ آور کو سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر زمین پر بیٹھے بیٹھے کمر سے خنجر نکال کر پھینکا جو اس کی گردن میں پیوست ہو گیا۔ یہ خنجر جنگلی لباس کے ساتھ مجھے ملا تھا اور اس وقت بہت کارآمد ثابت ہوا اگرچہ ریوالور بھی میرے پاس موجود تھا مگر ریوالور سے نشانہ لینے کا وقت نہ تھا۔ اس کے علاوہ ریوالور کی آواز جنگل کے سناٹے میں بہت دُور تک گونج سکتی تھی اور اس طرح حملہ آور کے دوسرے ساتھیوں کو بھی یہ علم ہو جاتا کہ میں کس جگہ موجود ہوں۔ اپنی فوجی تربیت کو کام میں لاتے ہوئے میں نے تیزی سے زمین پر لوٹ لگائی اور چشم زدن میں جنگلی اور نیرا کے پاس پہنچ گیا۔ میں اسپرنگ کی طرح اُچھل کر کھڑا ہو گیا اور یہ بہت اچھا ہوا کہ میں نے ذرا بھی وقت ضائع نہیں کیا۔ کیونکہ قوی ہیکل جنگلی کا مضبوط بازو نیرا کی نرم و نازک گردن کے گرد پھانسی کا پھندا بن گیا تھا۔ وہ عالم سکرات میں تھا اور اس وجہ سے نیرا کی گردن کے گرد اس کی گرفت تنگ ہوتی جا رہی تھی۔ نیرا کی دونوں آنکھیں اُبل پڑی تھیں اور منہ کھل گیا تھا۔ چند اور سیکنڈ کے بعد وہ مر جاتی۔ میں نے ایک جھٹکے سے جنگلی کا دوسرا ہاتھ مروڑا اور نیرا کی گردن کے گرد لپٹے ہوئے ہاتھ کو تھام کر اپنی طرف کھینچا۔ وہ غالباً زندگی کے آخری سانس لے رہا تھا لیکن اس کے باوجود اس کی طاقت بے پناہ تھی۔ چند لمحے کی کشمکش کے بعد اس کا جسم بے جان ہو گیا اور جب وہ زمین پر گرا تو نیرا اس کی گرفت سے آزاد ہو چکی تھی۔ میں نے نیرا کو کھینچ کر زمین پر بٹھا دیا اور خود درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ لے کر چاروں طرف کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ کافی دیر گزر گئی۔ کسی قسم کی آہٹ یا آواز سنائی نہیں دی۔ میں نے احتیاطاً ریوالور اپنے ہاتھ میں تھاما اور دوبارہ نیرا کی طرف بڑھا۔ وہ ایک مضبوط اور توانا جنگلی عورت تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس حملے کو برداشت کر گئی ورنہ کوئی اور عورت ہوتی تو کبھی کی گردن ٹوٹنے کے باعث مر چکی ہوتی۔ اس کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں

تھیں مگر وہ آرام سے سانس لے رہی تھی۔ وہ زمین پر پیر پھیلائے بیٹھی تھی اور دونوں ہاتھوں سے اپنی گردن سہلانے میں مصروف تھی۔ مگر یہ دیکھ کر میں اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکا کہ سوم رس کا برتن ابھی تک اس کے سر پر رکھا ہوا تھا۔ شاید یہ کسی تربیت کا نتیجہ تھا ورنہ اس تمام جدوجہد اور کشمکش کے دوران میں برتن کا اس کے سر پر برقرار رہنا ایک حیرت انگیز بات تھی جس کی توقع کسی شعبدہ باز ہی سے کی جا سکتی ہے۔ نیرا کو محفوظ و مامون پانے کے بعد میں نے جنگلی کی لاش کا جائزہ لیا۔ وہ خوفناک شکل کا ایک لمبا تڑنگا آدمی تھا۔ اس کے چہرے پر رنگین لکیروں سے نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ تیر کمان اس کے کاندھے سے نکل کر زمین پر گر گیا تھا۔ اس کو بغور دیکھنے کے بعد مجھے یہ جاننے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہوئی کہ وہ اس آدم خور جنگلی قبیلے کا ایک فرد تھا جنہوں نے سردار لوگا کی بستی پر حملہ کیا تھا۔ حالانکہ سردار لوگا کے ساتھیوں نے جنگل میں بہت دور تک پسپا ہونے والوں کا پیچھا کیا تھا اور بے شمار دشمنوں کو ہلاک بھی کر دیا تھا مگر یہ جان باز اور بے خوف شخص کسی نہ کسی طرح بچ نکلا اور اپنی جان پر کھیل کر مقابلے کے لیے آمادہ ہو گیا۔ اس کی جرأت اور بہادری بلاشبہ قابلِ تعریف تھی اگر مجھے ایک لمحے کی بھی دیر ہو جاتی تو نہ صرف نیرا بلکہ خود میں بھی ہلاکت کا نشانہ بن جاتا اور شاید اس آدم خور جنگلی کی خوراک بھی۔

نیرا بدستور زمین پر پھسکڑا مارے یوں اطمینان سے بیٹھی تھی جیسے اپنے گھر میں بیٹھی ہو۔ اب اس کا خوف زائل ہو چکا تھا۔ اس کی نگاہوں میں میرے لیے ستائش تھی اور وہ ہولے ہولے مسکرا رہی تھی۔ میں اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا "شکر ہے جان بچ گئی۔ یہ بتاؤ تمہاری گردن کا کیا حال ہے؟" میں نے اس کی گردن کی طرف اشارہ کیا تو اس نے اپنی گردن کو سہلاتے ہوئے کچھ کہا جس کا مطلب غالباً یہ تھا کہ اب وہ ٹھیک ہے پھر اس نے سوم رس کا برتن اپنے سر پر سے اتارنے کی کوشش کی۔ وہ مجھ سے کچھ کہہ رہی تھی۔ اس کے لہجے میں خوشامد اور التجا تھی۔ شاید وہ مجھ سے درخواست کر رہی تھی کہ وہ جس بوجھ کو اٹھائے پھر رہی ہے مجھے اب اسے ہلکا کر دینا چاہیے۔

"دیکھو۔ اگر یہ بہت اچھی چیز ہے تو میری طرف سے تمہیں اجازت ہے کہ اس کو تم پی لو۔" ساتھ ہی میں نے اسے اشارے سے پینے کے لیے کہا۔

وہ مسکرانے لگی اور انکار میں سر ہلانے لگی۔ پھر مجھے کچھ سمجھانے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ بار بار خود اپنی طرف اشارہ کر کے انکار میں سر ہلا رہی تھی اور بار بار مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر شاید مجھے یہ بتانا چاہتی تھی کہ یہ رس محض مرد ہی پی سکتے ہیں۔ پھر وہ کھسک کر میرے اور نزدیک آ گئی۔ وہ ایک بے تکلف، خوش مزاج اور خوش شکل عورت تھی اور ایک دوسرے کی زبان سے ناواقف ہونے کے باوجود ہم دونوں کے درمیان ایک قسم کی یگانگت اور اپنائیت پیدا ہو چکی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم بہت عرصے سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔

اس نے سوم رس کا برتن سر سے اتار کر زمین پر رکھ دیا اور اپنے ہاتھ سے گھاس کے فرش کو صاف کرنے لگی۔ جھاڑ جھنکار کو ہٹا کر وہ بیٹھنے کی جگہ بنانا چاہتی تھی۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوئی اور مجھے دونوں بازوؤں سے تھام کر اس نے زمین پر لٹا دیا۔ اس نے میرا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ جب میں نے اٹھنے کا ارادہ کیا تو اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر چپ چاپ لیٹے رہنے کی ہدایت کی۔ وہ میرے ساتھ ایسا برتاؤ کر رہی تھی جیسے کہ میں ایک چھوٹا سا بچہ تھا۔ اس نے اپنا گھٹنا ہلانا اور گنگنانا شروع کر دیا۔ یہ کوئی رومانی نغمہ تھا یا ہو سکتا ہے لوری قسم کی کوئی چیز ہو۔ اس نے اشارے سے مجھے بتایا کہ وہ مجھے تھوڑا سا رس پلانا چاہتی ہے مگر میرے انکار پر مسکرانے لگی اور سر ہلا کر رہ گئی۔ اس نے میرا سر دبانا شروع کر دیا۔ ایک جنگلی عورت ہونے کے باوجود اس کے ہاتھ حیرت انگیز حد تک نرم و ملائم تھے۔ ہو سکتا ہے کہ سردار کی لاڈلی بیوی ہونے کی وجہ سے اسے کوئی کام کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی ہو۔

سارے دن کی بھاگ دوڑ اور تھکان کے بعد مجھے اس لمحہ بہت آرام محسوس ہو رہا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ جنگل کی پراسرار تنہائی، رات کی تاریکی اور نیرا جیسی دلکش عورت کی موجودگی کے باوجود میرے دل میں کوئی جنسی جذبہ بیدار نہیں ہوا تھا۔ رفتہ رفتہ میری آنکھیں بند ہونے لگیں اور پھر میں نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ نہ جانے کتنی دیر تک سوتا رہا۔ آنکھ کھلی تو نیرا بدستور کوئی گیت گنگنا رہی تھی اور میرا سر سہلا رہی تھی۔ اس کی گرم اور نرم انگلیاں میرے تھکے ہوئے دماغ کو فرحت اور سکون پہنچا رہی تھیں۔ مجھے آنکھیں کھولتے ہوئے دیکھا تو وہ مسکرائی اور جھک کر نرم آواز میں کچھ کہا۔

نہ جانے وہ کیا کہہ رہی تھی۔

میں بھی خوابیدہ آنکھوں سے اس کو دیکھتا رہا۔ پھر مسکرا کر میں نے کہا۔ "نیرا کتنی عجیب بات ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی زبان سے ناآشنا ہونے کے باوجود نہ جانے کتنی دیر سے مصروف گفتگو ہیں۔ تم اپنی ہانکے جا رہی ہو۔ میں اپنی سنائے جا رہا ہوں مگر وقت بہت اچھا گزر رہا ہے۔"

جواب میں اس نے کچھ کہا اور ہنسنے لگی۔ وہ تیکھی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ جن میں شوخی بھی تھی اور اپنائیت بھی۔

اس وقت میرے کانوں نے ایک آواز سنی اور میں تیزی سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگی۔ میرے کان اور تمام توجہ اس موہوم سی آواز کی طرف تھی جو انہیں دُور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ چند لمحے میں خاموشی سے سنتا رہا۔ پھر اچانک کھڑا ہو گیا نیرا بھی حیرانی سے مجھے دیکھتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ شاید اس کے کانوں نے وہ آواز نہیں سُنی تھی مگر مجھے چوکنا پا کر اس نے خوف زدہ ہرنی کی طرح چاروں طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ میرا خیال دُرست تھا۔ یہ ایک ہیلی کاپٹر کی آواز تھی۔ میری سماعت اس کو سُننے اور جانچنے میں غلطی نہیں کر سکتی تھی۔ شروع میں یہ بھنبھناہٹ کی طرح تھی مگر پھر رفتہ رفتہ آواز واضح ہوتی چلی گئی۔ ہیلی کاپٹر کے پنکھوں سے نکلنے والی آواز کو شناخت کرنے میں اب کوئی شبہ نہیں رہا تھا۔ میں نے پریشانی سے چاروں طرف دیکھا اور پھر نیرا کو قریبی درختوں کے سائے میں بیٹھنے کا اشارہ کر کے تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ "دیکھو نیرا۔ جب تک میں واپس نہ آ جاؤں تم یہیں بیٹھو گی۔ بالکل حرکت نہ کرنا۔ سُن لیا نا؟"

وہ شاید میری بات کا مفہوم سمجھ گئی تھی اور سر ہلا کر اس نے اس کی تصدیق کر دی کہ وہ میری ہدایات کے مطابق ہی عمل کرے گی۔ میں تیزی سے دبے پاؤں آگے کی طرف بھاگا۔ مجھے یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ کھلا میدان ہم سے زیادہ دُور نہیں ہے اور میرا خیال صحیح نکلا۔ جنگلوں کا سلسلہ تھوڑے فاصلے کے بعد ہی ختم ہو گیا تھا اور میرے سامنے ایک کھلا میدان تھا۔ یہ کافی وسیع میدان تھا جس کے ایک طرف جنگل تھا اور دوسری طرف چھوٹے چھوٹے پہاڑ۔ ایک پہاڑی پر سے خوبصورت آبشار گرتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ میں نے قریبی درخت کی آڑ لے لی اور ہیلی کاپٹر کی آمد کا انتظار کرنے لگا جو کسی بھی لمحے نمودار ہو سکتا تھا۔

تقریباً ایک منٹ کے بعد مجھے ہیلی کاپٹر بھی نظر آ گیا۔ ہیلی کاپٹر کے پائلٹ نے بھی غالباً کھلے میدان کو دیکھ لیا تھا اور تیزی سے چپٹ کرتا ہوا میدان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ہیلی کاپٹر پر بنے ہوئے نشانات بالکل واضح تھے۔ یہ دُشمن کا ہیلی کاپٹر تھا اور اس بات میں کوئی شُبہ کی گنجائش نہیں تھی کہ وہ میرے ہی کھوج میں نکلا تھا اور سردار لوگا کے علاقے میں پوچھ گچھ کرنے کے لیے آیا تھا۔

میں نے پلٹ کر جنگل کی طرف دیکھا۔ میری ہدایت کے برعکس نیرا پوشیدہ ہونے کی بجائے ایک بڑے سے درخت کے تنے پر چڑھ کر بیٹھ گئی تھی اور اُسے دیکھ لینا کچھ مشکل نہ تھا۔ میرا ذہن نہایت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ ہو سکتا ہے اس ہیلی کاپٹر کے پیچھے کچھ اور ہیلی کاپٹر بھی آنے والے ہوں یا اس کی اطلاع پر دُشمن اس سارے علاقے کو اپنے گھیرے میں لے لے۔ یہ بڑی خطرناک اور پریشان کُن صورتِ حال تھی میں نے فی الفور ایک فیصلہ کیا اور پلٹ کر نیرا کی طرف بھاگا جو حیرت اور دلچسپی سے آسمان پہ پرواز کرتے ہوئے ہیلی کاپٹر کو دیکھ رہی تھی جو نیم تاریکی میں ایک بڑے آسمانی پرندے کی مانند نظر آ رہا تھا۔ نیرا کے پاس پہنچ کر ابھی میں اسے مخاطب کرنے بھی نہیں پایا تھا کہ مجھے زنانہ آوازوں میں ہنسی کی جھنک سنائی دی اور یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہیں رہی کہ سردار لوگا کی دوسری بیویاں بھی نیرا سے کچھ فاصلے پر درختوں کی ٹہنیوں پہ بیٹھی، ہنس رہی تھیں۔ وہ غالباً ہم دونوں کے پیچھے پیچھے چلی آئی تھیں اور نہ جانے کب سے ہمارے تعاقب میں لگی ہوئی تھیں۔ ظاہر ہے کہ ان کو سردار کی طرف سے میری کسیوا کرنے کا حکم ملا تھا اور وہ ہر قیمت پر اس حکم کو بجا لانا چاہتی تھیں۔ ان سب کی نظریں بھی آسمان پہ ہیلی کاپٹر کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ جنگل کے خوبصورت اور پُرسکون ماحول میں یہ سبھی بنی خوبصورت عورتیں کسی اور ہی دُنیا کی مخلوق نظر آ رہی تھیں۔ اگر میں اس وقت زندگی اور موت کی کشمکش میں مُبتلا نہ ہوتا تو شاید اس دلکش منظر سے لُطف اندوز ہوتا مگر میری تو جان پہ بنی ہوئی تھی۔ ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ دُشمن سُونگھتا ہُوا اور کھوج لگاتا ہُوا میری تلاش میں اس دُور دراز جنگل علاقے تک پہنچ چکا تھا۔ وہ میرے بارے میں کتنا جانتے ہوں گے؟ اس کا مجھے کچھ اندازہ نہ تھا مگر اس کی مستعدی اور مستقل مزاجی یقیناً قابلِ تعریف تھی۔

میں نیرا کے پاس پہنچا تو وہ ہنس رہی تھی اور ہیلی کاپٹر کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے کچھ کہہ رہی تھی۔ خدا جانے اس نے پہلے بھی

کبھی ہیلی کاپٹر دیکھا تھا یا یہ ان سب کی زندگی میں پہلا موقع تھا۔

"نیرا۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ چھپ جاؤ۔ پھر تم یہاں آ کر کیوں بیٹھ گئیں؟" میں نے غصے سے پوچھا۔ وہ میری بات نہیں سمجھ سکی مگر آواز اور چہرے پر غصے کے آثار دیکھ کر اسے اندازہ ہو گیا کہ میں کسی بات پہ ناراض ہوں۔ جواب میں اس نے کچھ کہا جو حسبِ معمول میرے پلّے نہیں پڑا۔ "اور یہ سب یہاں کیا کر رہی ہیں؟" میں نے کچھ فاصلے پہ کھڑی ہوئی سردار لوگا کی دوسری بیویوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "انہیں بستی میں اپنی جھونپڑی میں رہنا چاہیے تھا۔"

نیرا میرے اشاروں کا مطلب کچھ اور سمجھی۔ نتیجہ یہ کہ اس نے پکار کر ان عورتوں کو آواز دی اور وہ سب ہنستی، ٹھٹھول کرتی ہوئی ہماری طرف بھاگی آئیں۔ انہوں نے ہم دونوں کو گھیر لیا اور چٹر چٹر باتیں شروع کر دیں۔ وہ اس سارے واقعے کو ایک کھیل تماشا ہی سمجھ رہی تھیں اور بار بار نیرا کو چھیڑنے کے انداز میں مخاطب کر رہی تھیں۔ ایک عورت نے نیرا کو گدگدی شروع کر دی اور بڑے معنی خیز انداز میں دھیمے لہجے میں باتیں کرنے لگی۔ جواب میں نیرا کی شرمائی ہوئی نگاہیں جھک گئیں۔ اس نے زیرِ لب آہستگی سے کچھ کہا اور وہ سب کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ انہیں دل لگی سوجھ رہی تھی اور میری جان پہ بنی ہوئی تھی۔ میرا دھیان ہیلی کاپٹر کی طرف تھا جو چند چکّر لگانے کے بعد اب کھلی جگہ میں زمین پر اتر رہا تھا۔ اب میرے پاس ضائع کرنے کے لیے ذرا بھی وقت نہیں تھا۔ نیرا اور اس کی ہم جولیوں کو ایک بار پھر خاموشی سے بیٹھے رہنے کا اشارہ کر کے میں ہیلی کاپٹر کی طرف بھاگا۔

اس اثنا میں ہیلی کاپٹر زمین پر لینڈ کر چکا تھا۔ آس پاس کے درخت اس کے پنکھوں سے پیدا ہونے والی ہواؤں سے جھوم رہے تھے اور شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اب نیرا اور دوسری عورتوں کی توجہ بھی ہیلی کاپٹر کی طرف تھی اور وہ خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھیں جیسے اچانک کسی غیر متوقع واقعے یا تماشے کے ظہور پذیر ہونے کے انتظار میں ہوں۔ میں ہیلی کاپٹر کی طرف بڑھتا رہا میرے ہاتھوں میں سوم رَس کا پیالہ تھا اور میں اپنے طریقِ کار کے بارے میں حتمی فیصلہ کر چکا تھا۔ اس "سوم رَس" کو میں ایک مہلک اور مؤثر ہتھیار کے طور پہ استعمال کرنے کا تہیہ کر چکا تھا۔ ہیلی کاپٹر کچھ دیر شور مچاتا اور آس پاس کی زمین کی خاک اُڑاتا رہا۔ ایک آندھی کا سماں پیدا ہو گیا تھا۔ پھر اس کا دروازہ کھلا اور اس کے اندر سے یکے بعد دیگرے تین فوجی سٹین گنیں ہاتھوں میں تھامے ہوئے کُود کر باہر نکلے۔ وہ پورے جنگی لباس میں تھے اور پوری طرح چوکنے نظر آ رہے تھے۔ کسی بھی اچانک یا غیر متوقع دُشمن سے نمٹنے کے لیے وہ مستعد اور چوکس تھے۔ انہوں نے تین سمتوں میں اپنے رُخ کر لیے اور پوزیشنیں سنبھال لیں۔ چند لمحے وہ اپنی اپنی جگہوں پہ کھڑے حالات کا جائزہ لیتے رہے۔ اتنی دیر میں اُن کی نظریں مجھ پہ پڑیں اور ان کے جسم تن سے گئے مگر پھر ایک نہتے جنگلی کو سامنے پا کر انہوں نے سٹین گنوں کی لبلبی پہ اپنی گرفت ڈھیلی کر دی اور میری طرف بڑھے۔ وہ بوقتِ ضرورت اپنی سٹین گن کو استعمال کرنے کے لیے بالکل تیار تھے۔ میں خاموشی اور معصومیت سے انہیں دیکھتا رہا۔ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پہ پہنچ کر وہ رُک گئے۔ گہری نظروں سے میرا سر سے پیر تک جائزہ لینے کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا کہ میں ان کے لیے ایک بے ضرر انسان ہوں۔ ایک فوجی نے اکھڑ لہجے میں مجھے للکارا۔ "کون ہو تم؟ کیا نام ہے تمہارا؟"

میں خاموشی سے اس کا چہرہ تکتا رہا۔

"شاید ہماری زبان نہیں سمجھتا۔" دوسرا فوجی بولا۔ وہ آگے بڑھا اور بالکل میرے نزدیک پہنچ کر رُک گیا۔ "سنو" وہ بولا۔ "تم ہمیں اپنے سردار کے پاس لے جا سکتے ہو؟"

میں پھر خاموش رہا اور ان کے چہرے تکتا رہا۔

"یار اس سے اشاروں کی بات کرو۔" تیسرے فوجی نے مشورہ دیا۔ پھر وہ اپنی سٹین گن زمین پہ ٹکا کر کھڑا ہو گیا اور اشاروں میں مجھ سے پوچھنے لگا کہ میرا سردار کہاں ہے اور یہ کہ میں انہیں اپنے سردار کے پاس لے چلوں۔

میں نے یوں گردن ہلائی جیسے ان کی بات سمجھ گیا ہوں اور پھر اشارے سے انہیں بتایا کہ سردار بستی میں ہے۔

"ہم تمہارے دوست ہیں۔ ہم سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" پہلے فوجی نے زبان کے ساتھ ساتھ اشاروں کی مدد لیتے ہوئے مجھے بتایا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ ہونٹوں سے لگا کر چومے اور پھر گلے لگنے کے انداز میں سینے سے لگا لیے۔ میں ایک دم مسکرایا اور خاموشی سے آگے

بڑھ کر میں نے اپنی دوستی کے ثبوت کے طور پر سوم رَس کا برتن اس کی طرف بڑھایا۔

"یہ کیا ہے؟" دوسرے فوجی نے بے صبری سے برتن میرے ہاتھ سے قریب قریب چھین لیا اور پھر اسے سُونگھا: "اوھو۔ بڑی مزیدار اور خوشبو دار معلوم ہوتی ہے۔" اس نے اپنے نتھنے پھیلائے اور سُونگھنے کے بعد خوشبو کو پسند کرتے ہوئے گردن ہلائی۔ پھر اس نے میرے جواب کا انتظار کیے بغیر برتن سے مُنہ لگا کر ایک گھونٹ بھرا اور خوشی سے جھوم اُٹھا۔ "لیکر سنگھ۔ ارے یہ تو غضب کی چیز ہے پیارے!" اس نے ایک اور گھونٹ بھرا اور پھر اسے مُنہ میں لیکر اس کا مزہ لینے کی کوشش کی۔ پھر وہ اپنے ہونٹ چاٹتے ہوئے کہنے لگا: "اوئے یارا، یہ تو بڑی سٹرانگ ہے!" میں ان لوگوں کی ذہنیت سے واقف تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ شراب اور نشہ ان لوگوں کی بہت بڑی کمزوری ہے جس کے آگے وہ کسی چیز کو خاطر میں نہیں لاتے۔

دوسرے فوجی نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے برتن چھین لیا اور ایک بڑا گھونٹ بھرا۔ کچھ سوچ کر اُس نے ایک اور گھونٹ لیا اور خوش ہو کر شور مچانے لگا۔ "ویری گڈ۔ ویری گڈ۔ نو ڈاؤٹ" ایک دو گھونٹ اس کے لیے کافی تھے۔ وہ شراب کے رسیا معلوم ہوتے تھے مگر غالباً یہ شراب بہت زیادہ تیز تھی۔ اس لیے اُنہوں نے دو تین گھونٹ پینے کے بعد توقف کرنا ضروری سمجھا تھا ورنہ بہت ممکن تھا کہ پہلا فوجی ہی برتن کو خالی کر دیتا۔ تیسرے فوجی نے بھی کسی تامّل اور تکلف کے بغیر اپنا حصہ چکھا اور تینوں آپس میں اس شراب کی تیزی، نشے کی شدت اور مزیداری کے بارے میں تبادلۂ خیال کرنے لگے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اس وقت اپنا یہاں آنے کا مقصد ہی بھول بیٹھے ہیں اور شاید شراب سے لطف اندوز ہونے کی خاطر ہی یہاں آئے تھے۔ برتن خاصا بڑا تھا اور بھرا ہُوا تھا۔ ان تینوں نے تھوڑی ہی دیر میں اسے آدھا خالی کر دیا اور میں نے ان کی آوازوں میں لرزش محسوس کی۔ اس دوران میں ہیلی کاپٹر کے پنکھے بدستور حرکت میں تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ ہیلی کاپٹر میں کم از کم ایک پائلٹ ضرور موجود ہے۔ اس کے ساتھ اور کتنے فوجی ہیں؟ یہ جاننا مشکل تھا مگر یہ تینوں فوجی فی الوقت ہیلی کاپٹر کو اور اس میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو مطلق فراموش کر بیٹھے تھے۔

تیز شراب اُن کے رگ و پے میں تیزی سے سرایت کر گئی تھی اور ان پر خمار اور مدہوشی کی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔ گویا میری کارروائی کا مطلوبہ نتیجہ برآمد ہو رہا تھا۔ میں بظاہر خاموش اُنہیں دیکھ رہا تھا مگر دل ہی دل میں خُدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ میری سکیم کامیاب ہوتی نظر آ رہی ہے۔ وہ ابھی شراب ہی کے لُطف میں ڈوبے ہوئے تھے کہ اچانک ان کے کانوں میں گھنٹیاں سی بجنے لگیں۔ انھوں نے چونک کر چاروں طرف دیکھا۔ میری نگاہیں بھی پیچھے جنگل کی طرف اُٹھ گئیں۔ سردار لوگا کی بیویاں کھڑی ہنس رہی تھیں۔ اُنہیں یہ تو معلوم ہو چکا تھا کہ ہیلی کاپٹر ان کے لیے بالکل انوکھی شے نہیں ہے اور اس سے پہلے بھی وہ ہیلی کاپٹر دیکھ چکی ہیں۔ تینوں فوجیوں نے دس حسین جنگلی عورتوں کو دیکھا تو ان کا سرُور دو چند ہو گیا مگر اتنی دیر میں نیرا جو تیزی سے بھاگتی ہوئی آ رہی تھی ہمارے نزدیک آ گئی۔ وہ سخت برہم اور خفا سی نظر آتی تھی۔ پہلے تو اُس نے اُن فوجیوں کو قطعی طور پر نظر انداز کر دیا اور غصّے میں مجھے ڈانٹنے لگی۔ وہ تینوں ایک خوش جمال عورت کو اپنے نزدیک پا کر بھونچکے رہ گئے تھے اور حیرت سے کبھی اس کو اور کبھی مجھے دیکھ رہے تھے۔ نیرا نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور فوجی کے ہاتھ سے سوم رَس کا برتن چھین لیا۔ پھر اُس نے جنگلی زبان میں تیزی سے مجھ سے مخاطب ہو کر کچھ کہا اور برتن کو یوں سنبھال کر کھڑی ہو گئی جیسے اب کسی اور کو اس میں سے ایک بُوند بھی نہیں چکھنے دے گی۔ میں سمجھ گیا۔ وہ یہ کہہ رہی تھی کہ "سوم رَس" محض میرے پینے کے لیے مخصوص تھا کسی اور شخص کو اس پر کوئی حق نہیں تھا بلکہ بہت ممکن ہے کہ یہ ان لوگوں کی دانست میں بہت بڑی گستاخی اور گناہ کے مترادف ہو۔ فوجیوں نے اس کی بات کی طرف توجہ نہیں دی۔ ان کی گستاخ نگاہیں اس کے سراپا کی طرف تھیں اور وہ معنی خیز انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ نیرا نے "سوم رَس" کا برتن بڑی حفاظت اور احتیاط سے سنبھالنے کے بعد مجھے اپنے ساتھ واپس چلنے کا اشارہ کیا مگر میں اپنی جگہ کھڑا رہا۔ وہ خفگی سے مجھے دیکھ کر مُنہ ہی مُنہ میں کچھ بڑبڑائی اور برتن کو سر پر رکھ کر واپس لوٹ گئی۔ اس کی چال میں ایک عجیب دلنوازی اور بانکپن تھا۔ خصوصاً فوجیوں کے دِلوں پر تو اُس نے قیامت ہی ڈھا دی ہو گی۔ ایک تو سوم رَس جیسے مشروب کا سرور اور اس پر سے نیرا جیسی بیباک اور وحشی عورت کا نشہ۔ پھر اُنھوں نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ کچھ فاصلے پر حسن و رعنائی کا ایک بڑا خزانہ بھی موجود ہے۔ نیرا نے ایک بار پلٹ کر غصّے سے میری طرف دیکھا اور کچھ کہا۔ شاید وہ کہہ رہی تھی: "اب وہاں جم کر کیوں رہ گئے۔ آتے کیوں نہیں ہو میرے ساتھ؟"

سردار لوگا کی باقی ماندہ دس بیویاں اب زور زور سے کھلکھلا کر ہنس رہی تھیں۔ جب نیرا ان کے پاس پہنچی تو وہ چُپ ہو گئیں۔ نیرا نے اُنہیں کچھ کہا اور وہ سب پلٹ کر بستی کی طرف چل پڑیں۔ فوجیوں نے سرمستی کے عالم میں نعرے لگائے اور ان کے پیچھے چل پڑے وہ ماحول، حالات اور موقع کی نزاکت کو یکسر فراموش کر چکے تھے۔ شراب و شباب کے دو آتشہ نشے نے انھیں مست و بے خود کر دیا تھا۔ انھوں نے اپنی سٹین گنیں اُٹھا کر کاندھوں پر رکھیں اور لیکر سنگھ نامی فوجی نے خالص فوجی انداز میں پکارا: "اٹین شن" وہ سب اٹین شن ہو کر کھڑے ہو گئے، پھر لیکر سنگھ کی مخمور آواز گونجی: "ڈبل مارچ" اور اُن تینوں نے تیزی سے عورتوں کے تعاقب میں دوڑنا شروع کر دیا۔ نیرا اور دوسری عورتوں نے اُن کو اپنے پیچھے آتے ہوئے دیکھا تو اور تیزی سے چلنا شروع کر دیا۔ فوجیوں پر "سوم رَس" کے اثرات اب میں نمایاں طور پر دیکھ رہا تھا۔ ان کے قدموں کی ہلکی سی لڑکھڑاہٹ اور آواز کی لرزش میرے لیے اطمینان بخش تھی۔ کچھ دیر کے بعد وہ عورتیں اور تینوں فوجی میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ مجھے معلوم تھا کہ اب وہ بستی تک پہنچ کر ہی دم لیں گے کیونکہ جنگلی عورتیں وحشی ہرنیوں کی طرح تیز رفتار ہوتی ہیں اور اس عالم میں جب کہ مدہوشی اور خُمار نے فوجیوں کی رفتار کو خاصا سُست کر دیا تھا وہ عورتیں ان کی دسترس سے باہر تھیں اور پھر میں یہ اندازہ بخوبی لگا سکتا تھا کہ جنگل میں پہنچنے کے بعد ان کی مدہوشی کے نتیجے میں سردار لوگا اور اس کے ساتھی اُن کے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟ مگر فی الحال یہ میرا مسئلہ نہیں تھا۔

میری تمام تر توجہ اب ہیلی کاپٹر کی طرف تھی۔ ہیلی کاپٹر کے پنکھے بدستور حرکت میں تھے اور شور کی وجہ سے کان پڑی آواز سُنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں ہیلی کاپٹر کی طرف بڑھا لیکن چند گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد میرے قدم خود بخود تھم گئے۔ ہیلی کاپٹر کے کھلے ہوئے دروازے میں سے ایک سٹین گن کی نالی جھانک رہی تھی۔ اس نالی کے پیچھے کھڑا ہوا فوجی پائلٹ بھی اب مجھے صاف نظر آنے لگا تھا۔ وہ ایک قد آور اور مضبوط آدمی تھا جس کے چہرے پر گھنی اور موٹی مونچھوں کی وجہ سے مزید رُعب داب پیدا ہو گیا تھا۔ میرا رُکنا قطعی غیر ارادی تھا۔ چند لمحے بعد میں نے پھر آگے قدم بڑھائے اور بے خوفی سے چلتا ہوا ہیلی کاپٹر کے بالکل نزدیک پہنچ گیا۔ جُوں جُوں میں ہیلی کاپٹر کی طرف بڑھ رہا تھا، دروازے کی اوٹ سے جھانکتی ہوئی سٹین گن کی نالی کا رُخ بھی میرے ساتھ ساتھ سمت بدل رہا تھا۔ یہ ایک احمقانہ اقدام تھا کیونکہ نروس ہو کر پائلٹ گولی بھی چلا سکتا تھا۔ لیکن میرے لیے یہ خطرہ مول لینا ضروری تھا۔ اس کے سوا میری نجات کا کوئی اور راستہ نہ تھا۔

میں ہیلی کاپٹر کے دروازے کے سامنے پہنچ کر رُک گیا۔ اب میں فوجی کو اور وہ مجھے صاف طور پر دیکھ سکتا تھا۔ اس کے چہرے پر خشونت اور کرختگی کے تاثرات تھے لیکن وہ مجھ سے خوف زدہ نہیں تھا۔ میں جنگلیوں کے لباسِ فاخرہ میں ملبوس تھا۔ جیسا کہ پہلے بیان کر چکا ہوں۔ یہ خلعت سردار لوگا نے تحفے کے طور پر مجھے عطا کی تھی۔ میرا جسم ابھی تک اُن جڑی بُوٹیوں کی خوشبوؤں سے مہک رہا تھا جن سے میری میزبان اور مہربان خواتین نے مجھے معطّر کر دیا تھا۔ میری کمر میں خنجر لٹک رہا تھا۔ سَر اور پیروں سے میں ننگا تھا۔ یقیناً وہ فوجی مجھے ایک ٹھیٹ اور آدم بیزار جنگلی ہی سمجھ رہا ہو گا۔

چند لمحے ہم دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو گھُورتے رہے۔ نہ میں نے آنکھ جھپکی اور نہ ہی اُس نے پلک جھپکائی۔ جس طرح دو شہ زور پہلوان مقابلہ شروع کرنے سے پہلے ایک دوسرے کو نگاہوں سے تولتے ہیں، وہی صورتِ حال اس وقت بھی کارفرما تھی۔ میرا چہرہ ہر طرح کے تاثرات سے قطعاً خالی تھا۔ جب کہ وہ قدرے دلچسپی اور تجسّس کے ساتھ مجھے دیکھ رہا تھا۔ رفتہ رفتہ اُس کی نگاہوں میں نرمی کی جھلک نمودار ہوئی اور اس کا تنا ہوا چہرہ ہلکی سی مُسکراہٹ سے ملائم اور شگفتہ ہو گیا۔ جواباً میں نے بھی اپنی بتیسی کھول دی۔ یہ گویا ایک طرح سے صلح اور دوستی کا اعلان تھا۔

وہ مُسکرایا اور زور سے چیخ کر بولا۔ "اے جنگلی جناور! تم کو یہ سُندر سُندر کپڑا کدھر سے ملا؟"

پھر وہ میرے جواب کا انتظار کیے بغیر آپ ہی آپ کہنے لگا: "مگر تم میری بولی کیسے سمجھو گے۔ تمہیں تو گیدڑ اور بھیڑیوں کی زبان ہی آتی ہو گی۔" یہ کہہ کر وہ زور زور سے قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔

میں خاموش کھڑا اس کو تکتا رہا۔

وہ پھر ہنسا اور بولا۔ "ہمارے جوڑی داروں کو تم نے کدھر بھیج دیا اُستاد؟ یار تم نے تو اندر کا اکھاڑا بتایا ہوا ہے اِدھر۔ تھوڑی کرپا ہم پر بھی کرو۔ پریم کا کھیل ہم بھی کھیلنا جانتے ہیں۔"

میں پھر بھی خاموش رہا۔ وہ چند قدم آگے بڑھ کر بیلی کا پٹر سے باہر آگیا۔ شین گن کی نالی اُس نے میرے سینے میں چبھو دی اور کہنے لگا۔ "تم نے تو اُن کو سورگ کا راستہ دکھا دیا ہے اب اُنھیں اُدھر سے واپس کون لے کر آئے گا۔"

میں نے پہلی بار زبان کھولی۔ "آپ اُدھر جانا چاہتے ہیں تو میں آپ کو بھی لے چلوں گا۔"

اگر اس پر بم گر جاتا تو بھی شاید وہ اتنا حیران اور ہکا بکا نہ ہوتا۔ چند لمحے وہ بے اعتباری سے مجھے دیکھتا رہا۔ اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آرہا تھا۔ جس شخص کو وہ نیرا جنگلی اور حیوان سمجھ رہا تھا اس کو صاف ستھری شہری زبان میں باتیں کرتے ہوئے سُن کر شاید اس کے ہوش اُڑ گئے تھے۔ میں نے اُسے زیادہ حیران کرنا ضروری نہ سمجھا۔

"اچنبھے کی بات نہیں ہے دوست۔ میں جنگلی ہوں تو کیا ہوا؟ میں اُدھر شہر میں بھی رہتا تھا۔ میں نے سکول میں پڑھا ہے۔"

"آخر تم کون ہو؟ کیا اس جنگل کے سردار ہو؟ یا اس جنگل بیابان میں تم جیسے اور بھی لوگ رہتے ہیں۔"

میں نے صفائی سے جھوٹ بولا۔ "اس جنگل میں انسان بھی رہتے ہیں مہاراج۔ بہت سے لوگ میری طرح شہر سے پڑھ کر آئے ہیں۔"

"تم پھر بھی ان جنگلیوں کے ساتھ رہتے ہو؟" اس نے پُوچھا۔

"یہ اپنی برادری ہے۔ یہ سب اپنے لوگ ہیں۔ اپنوں کو چھوڑ کر کوئی کیسے جا سکتا ہے۔"

"ونڈرفل" وہ استعجاب سے کہنے لگا۔ "ہم کو تو کسی نے بتایا تھا کہ اِدھر سارے جنگلی اور آدم خور لوگ رہتے ہیں۔"

"آدم خور بھی رہتے ہیں۔" میں نے سادگی سے کہا۔

وہ اچانک دو قدم پیچھے ہٹ گیا اور مجھے یُوں دیکھنے لگا جیسے میں ابھی جھپٹ کر اسے شکار کر لوں گا۔ شین گن کے ٹریگر پر اس کی اُنگلیوں کی گرفت اور مضبوط ہو گئی۔

"صاحب! آدم خور لوگ اِدھر سے بہت دُور ہیں پر جب داؤ لگتا ہے وہ ہماری بستی پر حملہ کرتے ہیں اور بڑی گڑبڑ کرتے ہیں۔ بچوں اور بُوڑھوں کو مار کر کھا جاتے ہیں، عورتوں کو پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ جس پر دیوتا کرپا کرتا ہے بس وہی ان سے بچ سکتا ہے۔ آج رات کو بھی انھوں نے ہماری بستی پر چڑھائی کی تھی پر ہم سب مقابلے کے لیے تیار تھے۔ ہم نے انھیں مار کر بھگا دیا۔ بہت لوگ اور مُردے چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں وہ۔"

فوجی کسی قدر خوف سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ پھر اُس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور پھر کہنے لگا: "تم سچ کہتے ہو؟"

"جھوٹ مارنے کی کیا ضرورت ہے مہاراج۔ ہم جنگلی لوگ شہر والوں کی طرح جھوٹ نہیں بولتے۔"

وہ ناراض ہونے کی بجائے ہنس پڑا۔ "تو نے کی طرح بولتے ہو۔ اس ویران جنگل میں تمہارے جیسے آدمی سے ملنے کی آشا نہیں تھی۔ اچھا یہ بتاؤ۔ وہ فوجی جوان کدھر گئے ہیں؟"

"اُدھر بستی میں موج میلہ ہو رہا ہے صاحب۔ آدم خوروں کو ہرانے کی خوشی میں خوب ناچ گانا اور دارُو چل رہا ہے۔"

اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ "اچھا! تو وہ لوگ موج منانے گئے ہیں اُدھر؟"

"آپ بھی موج منائیں مہاراج۔ چلیں گے میرے ساتھ؟ بڑی سُندر عورتیں ہوتی ہیں اس جنگل میں۔ آپ رم پیئیں گے تو سارے سنسار کو بھول جائیں گے۔"

وہ ہچکچا کر بولا: "وہ تو ٹھیک ہے۔ پر میں ہیلی کاپٹر چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہوں؟"

"تو پھر چنتا نہ کریں۔ آپ کے یار بیلی واپس آجائیں گے تو میں آپ کو بھی اُدھر کی سیر کرا دوں گا۔"

وہ بڑی مایوسی سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا جیسے اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر میرے ساتھ چل پڑے مگر

بے چارہ ڈیوٹی سے مجبور تھا۔

"تم سگریٹ پیتے ہو؟" اُس نے اپنا بایاں ہاتھ جیب میں ڈالتے ہوئے مجھ سے سوال کیا۔

میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔

وہ مُسکرایا۔ "ارے بھائی! تمہیں یہاں خالص دیسی دارُو مل جاتی ہے پھر تمہیں سگریٹ پی کر جی جلانے کی کیا ضرورت ہے؟"

ایک سگریٹ اُس نے ہونٹوں سے کھینچ کر پیکٹ سے باہر نکالی اور پھر پیکٹ جیب میں ڈال کر ایک سگریٹ لائٹر نکال لیا مگر ابھی وہ لائٹر جلانے بھی نہیں پایا تھا کہ ایک سنسناہٹ کی آواز سنائی دی اور کوئی چیز ہیلی کاپٹر کے دروازے سے ٹکرا کر زمین پر گری۔ یہ ایک نوکدار تیر تھا اور ظاہر ہے کہ زہر میں بجھا ہوا ہوگا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے ایک دھکے سے فوجی کو پرے دھکیلا اور خود بھی زمین پر لیٹ گیا۔ اتنے عرصے میں دو اور تیر سنسناتے ہوئے ہمارے سروں پر سے گزر کر دروازے سے ٹکرائے۔ پائلٹ فوجی پہلے تو میری اس حرکت کا مطلب نہیں سمجھ سکا اور غصے سے مجھے گھورنے لگا مگر دو اور تیروں کو دیکھنے کے بعد اس پر تمام بات واضح ہو گئی۔ وہ شین گن ہاتھ میں تھامے ہوئے پوزیشن لے کر کہنیوں کے بل جنگل کی طرف مُڑا۔ میں نے بھی فرش سے سر اُٹھا کر دیکھا۔ کچھ دیر پہلے جہاں میں سردار کی بیویوں کے ساتھ کھڑا تھا اَب وہاں دو خونخوار آدم خور جنگلی کھڑے تھے۔ اپنے تین نشانے خطا جاتے دیکھ کر وہ سخت برہم تھے اور ایک بار پھر کمانوں میں تیر چڑھا رہے تھے لیکن پائلٹ نے اُنھیں اس کا موقع نہیں دیا۔ یکے بعد دیگرے چند فائر ہوئے۔ ایک جنگلی چیخ مار کر اوندھے منہ زمین پر گر گیا جب کہ دوسرے نے زخمی شیر کی طرح ایک چھلانگ لگائی اور جنگلی زبان میں ایک نعرہ بُلند کرتے ہوئے ہماری طرف لپکا۔ جنگلیوں کی شجاعت اور بے جگری کا میں پہلے ہی قائل ہو چکا تھا جب میں نے سردار بوگا کے قبیلے کو آدم خوروں کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے دیکھا تھا لیکن اس وقت تو میں دل سے ان کی بہادری کا لوہا مان گیا۔ ایک خوفناک آتشیں ہتھیار سے اپنے ساتھی کو مرتا ہوا دیکھنے کے باوجود دوسرا آدم خور بھالا ہاتھ میں تھامے ہوئے ہم پر حملہ آور ہو رہا تھا۔ اُس نے ہمیں سوچنے اور سنبھلنے کے لیے زیادہ مُہلت نہیں دی۔ ایک زقند میں وہ کئی گز کا فاصلہ طے کر چکا تھا اور دوسری بار جب اُس نے اپنا جسم تول کر چھلانگ لگائی تو اس کا نشانہ ہم دونوں تھے۔ اپنے جسم پر اس کا کنٹرول قابلِ تعریف تھا اور وہ ہوا میں یُوں اُچھلا تھا جیسے ٹپک خرام ہرنیاں لمبی لمبی زقندیں لگاتی ہیں مگر میرے پاس اس کی پھرتی اور چابکدستی کی داد دینے کے لیے زیادہ وقت نہ تھا۔ چند لمحوں میں وہ بھالے سمیت مجھ پر آکر گرنے والا تھا لیکن میں نے زمین پر تیزی سے لوٹ لگا کر جگہ خالی کر دی۔ وہ ہوا میں اپنے جسم کو پلٹا نہیں سکا اور دونوں پیروں کے بل ٹھیک اُسی جگہ آکر گرا جہاں ایک لمحہ پہلے میں لیٹا ہوا تھا۔ اُس کے بھالے کی تیز نوک زمین سے ٹکرائی اور میں نے اپنی بروقت پھرتی اور حاضر دماغی پر خدا کا شکر ادا کیا۔ لیکن اس نے زمین سے قدم ٹکانے کے بعد ان ہی پیروں پر دوبارہ اُچھل کر چھلانگ لگائی۔ یُوں لگتا تھا جیسے اس کے پیروں میں اسپرنگ لگے ہوئے ہیں۔ مگر اس بار میں نے اُسے پلٹنے اور ہوا میں اُچھلنے کا موقع نہیں دیا۔ میں نے جھپٹ کر اس کا ایک پیر مضبوطی سے تھام لیا۔ اس کے بھالے کی نوک میرے سینے کی طرف تھی لیکن میں نہایت برق رفتاری سے اپنی جگہ چھوڑ چکا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اگر میں نے اس کو سنبھلنے کی مُہلت دے دی تو پھر میری جان کی خیر نہیں ہوگی۔

یہ میری اور اس کی پھرتی اور مستعدی کا مقابلہ تھا۔ اس کے دوبارہ زمین پر گرنے سے پہلے میرے ایک زوردار جھٹکے کی وجہ سے اس کا توازن خراب ہو گیا اور وہ بے ڈھب انداز میں زمین پر گرا۔ اُس نے تیزی سے زمین پر لیٹ کر دوسری جانب لوٹ لگانی چاہی مگر میں اس بار اس سے زیادہ پھرتیلا ثابت ہوا۔ اتنی دیر میں میرا خنجر میرے ہاتھ میں آچکا تھا۔ زمین سے اُٹھتے اُٹھتے میرا ہاتھ حرکت میں آیا اور خنجر اس کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ اس کے باوجود اس کی سخت جانی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کا بھالے والا بازو دوبارہ بُلند ہوا مگر مشین گن کے ایک برسٹ نے اُسے گھائل کر دیا اور اس کا بازو اُٹھا کا اُٹھا رہ گیا اور جب وہ زمین پر گرا تو بے جان ہو چکا تھا۔

فوجی زمین سے اُٹھ کر اپنے کپڑے جھاڑ رہا تھا۔ میں کیونکہ اپنے اکلوتے ہتھیار سے دستبردار نہیں ہونا چاہتا تھا اس لیے لپک کر میں آدم خور کے مُردہ جسم کے پاس پہنچا اور اپنا خنجر اس کے جسم سے کھینچ لیا۔ اس نے ایک نہایت مختصر لنگوٹی باندھ رکھی تھی مگر خون

آلود خنجر صاف کرنے کے لیے وہ اُٹھ کر اُدھر گیا تھا، شاید وہ بہت کافی تھی۔

پائلٹ اس اثناء میں ہیلی کاپٹر کے دروازے تک پہنچ چکا تھا۔

"بابا تمہارا یہ جنگل بہت خطرناک ہے۔" اس نے لمبی لمبی سانسیں لیتے ہوئے کہا۔ "یہ تو بہت ڈراؤنا آدمی ہے۔"

میں نے خنجر کو دوبارہ گلے میں لٹکاتے ہوئے جواب دیا: "بھگوان کی کرپا ہے کہ ہم ان کے قابو میں نہیں آئے۔ یہ آدم خور لوگ ہیں زندہ انسانوں کو چبا کر کھا لیتے ہیں۔"

پائلٹ کے جسم میں ایک جھرجھری آئی اور وہ اس تصور سے ہی کانپ کر رہ گیا۔

"ہے بھگوان، کہاں پھنس گئے۔" اس نے ایک سرد آہ بھری پھر جنگل کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا: "لڑائی کے میدان میں جنگ کرنا آسان ہے پر جنگل میں چھپے ہوئے آدم خور جنگلیوں سے لڑائی کرنا تو بہت جوکھوں کا کام ہے۔"

جنگل میں اس کے ساتھیوں کو گئے ہوئے بہت دیر ہو چکی تھی۔ مجھے یہ فکر دامن گیر تھی کہ کچھ دیر بعد وہ لوگ شاید زندہ لوٹ کر آجائیں یا ہو سکتا ہے کہ سردار لوگا اور اس کے قبائلی ان کی کھوج لگاتے ہوئے ہیلی کاپٹر تک آ پہنچیں۔ ایسی صورت میں میری اصلیت کا راز فاش ہونے کا خطرہ تھا۔ اس لیے مناسب یہ تھا کہ جتنی جلد بھی ممکن ہو سکے میں ہیلی کاپٹر پر قبضہ جما کر یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کروں مگر پے در پے ایسے واقعات رونما ہو رہے تھے کہ میں اپنے کسی منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے قابل نہ ہو سکا تھا۔ اگر آدم خوروں کے حملوں نے صورت حال کو سنگین نہ کر دیا ہوتا تو میں شاید اب تک کوئی ترکیب آزما چکا ہوتا۔ مجھے یہ بھی علم نہیں تھا کہ اس وقت اور کتنے آدم خور جنگلی اس گھنے اور خوفناک جنگل میں بکھرے ہوئے ہیں اور ان کا اگلا قدم کیا ہوگا۔ آدم خوروں کو یوں تو مکمل شکست ہو چکی تھی مگر گزشتہ واقعات سے ثابت ہو چکا تھا کہ ان کے بچے کھچے جنگجو جنگل میں موجود ہیں اور چھاپہ مار سرگرمیوں کو اپنا کر اپنی شکست کا بدلہ چکانا چاہتے ہیں۔ یہ بات تو طے تھی کہ وہ اب اپنے دشمن پر فتح نہیں پا سکتے تھے مگر جنگلیوں کے جنگی جنون سے اب میں واقف ہو چکا تھا۔ ان لوگوں کا طریقۂ جنگ ہم مہذب لوگوں سے قطعی مختلف تھا۔ کسی حد تک آپ اسے حریت پسند مجاہدین کے طریقۂ واردات سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ حریت پسند بھی اپنی زندگی اور موت سے بے پروا ہو کر اپنی کارروائیوں میں حصہ لیتے ہیں۔ وقتی فتح یا شکست ان کے نزدیک بے معنی چیز ہے۔ وہ اس بات کو بھی اہمیت نہیں دیتے کہ اس کارروائی میں وہ زندہ بھی بچ سکیں گے یا نہیں؟ ان کا مقصد اولین محض دشمن کو نقصان پہنچانا ہوتا ہے خواہ اس کوشش میں انھیں اپنی زندگی سے ہاتھ ہی کیوں نہ دھونے پڑیں۔ یہی اصول جنگلی قبائل کا بھی ہے۔ چاہے وہ امریکہ کے ریڈ انڈین ہوں یا افریقہ کے دور دراز علاقوں میں بسنے والے وحشی اور اُجڈ جنگلی قبائل۔ جب وہ حملہ آور ہوتے ہیں تو نتائج سے بے پروا ہو کر جان پہ کھیل جاتے ہیں۔ یہی صورت حال اس وقت بھی میرے سامنے تھی۔ آدم خوروں کے جو اکا دُکا لڑاکا باقی بچ گئے تھے وہ محض جان لینے اور جان دینے پر تُلے ہوئے تھے۔ اس سے انھیں کیا حاصل ہوگا یہ سوچنے کی انھیں ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ ایسے دشمن از حد خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں کیونکہ ان سے لڑائی کے کسی باضابطہ اصول کی توقع نہیں رکھی جا سکتی۔ یہی وجہ تھی کہ ہیلی کاپٹر کا پائلٹ بھی از حد پریشان اور فکرمند نظر آ رہا تھا۔ اس کی بے چینی اور اضطراب میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اس خطرناک جنگل سے فوری طور پر نکل جانا چاہتا تھا جہاں کسی بھی درخت کی اوٹ میں موت اس کی گھات لگائے کھڑی تھی۔

اس نے ایک اور سگریٹ سلگالی تھی اور بے چینی سے چاروں طرف نظریں دوڑا رہا تھا۔ میں آہستگی سے اس کے نزدیک چلا گیا۔

"تم نے میرے ساتھیوں کو کہاں بھیج دیا ہے؟ آخر میں کب تک یہاں ان کا انتظار کروں گا؟ ہو سکتا ہے وہ لوٹ کر ہی نہ آئیں۔"
وہ چڑچڑے انداز میں مجھ سے مخاطب ہوا۔

"کون جانے" میں نے مختصر جواب دیا۔ "میں نے انھیں کہیں نہیں بھیجا صاحب۔ وہ خود ہی اُن عورتوں کا پیچھا کرتے ہوئے جنگل میں چلے گئے۔" پھر میں نے بات کا رُخ تبدیل کرنے کے لیے کہا: "آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آپ لوگ اس موت کے جنگل میں کس لیے آئے ہیں؟ آپ کو گھومنے پھرنے کے لیے کوئی اور جگہ نہیں ملی تھی۔"

"بکواس" وہ جھلا کر بولا۔ "بیوقوف ہم گھومنے پھرنے یہاں نہیں آئے۔ اس جنگل میں تفریح کی بھلا کیا چیز ہو سکتی ہے۔"
میں نے اسے مزید کریدا: "تو پھر اور کس لیے آئے ہیں؟"

اس نے مجھے گھور کر دیکھا تو میں نے جلدی سے فقرہ پورا کر دیا: "یہ جنگل اتنا بُرا بھی نہیں ہے صاحب۔ اندر جا کر دیکھیں۔ بڑی سُندر جگہ ہے۔ دریا ہیں، جھرنے ہیں، مچھلیاں ہیں۔ شکار کے لیے ہر طرح کے جنگلی جانور بھی ہیں۔"

وہ تلخی سے بولا "اور خوبصورت عورتیں بھی ہیں جو ہر آنے والے کا دل بہلانے کے لیے تیار رہتی ہیں۔"

"جی۔ بہت سُندر لڑکیاں ہیں اور جب کبھی تہوار ہوتا ہے تو خوب ناچ گانا اور موج میلہ ہوتا ہے۔ آج بھی سردار نے بستی میں سبھا جائی ہے۔ آپ کے ساتھی بھی اُدھر بیٹھ گئے ہوں گے ـــــ آپ کی مرضی ہو تو آپ کو بھی اُن کے پاس لے چلوں؟"

وہ بدمزاجی سے بولا "یہ بات تمہاری جنگلی کھوپڑی میں نہیں آئے گی۔ ہم اتنی دُور ناچ گانا دیکھنے نہیں آئے اور اگر میں بھی تمہارے ساتھ چلا گیا تو اس کی حفاظت کون کرے گا؟" اس نے ہاتھ سے ہیلی کاپٹر کی طرف اشارہ کیا۔

"اس کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے۔ نہ کوئی اسے توڑ سکتا ہے۔ نہ اسے اُٹھا کر لے جا سکتا ہے۔ یہ تو دیوتاؤں کی بنائی ہوئی ایسی چیز ہے جسے جنگل میں کوئی ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔ تھوڑی دیر آپ بھی دل بہلا لیں۔ ہمارا سردار مہمانوں کی بہت سیوا کرتا ہے۔"

"یار کیوں کان کھا رہے ہو۔" وہ قریب قریب ڈانٹ کر کہنے لگا: "تم اور تمہارا سردار جائیں بھاڑ میں۔ ہم اِدھر ایک بہت خطرناک دشمن کی تلاش میں آئے ہیں۔ کھیل تماشہ دیکھنے نہیں آئے۔"

میں نے حیران ہو کر اسے دیکھا: "آپ کا دشمن اور اس جنگل میں؟ ہم جنگلیوں سے آپ کی دشمنی کیسے ہو سکتی ہے صاحب۔"

"وہ جنگلی نہیں ہے۔ ہمارے دشمن مُلک کا فوجی ہے۔ بہت بہادر اور بے خوف سپاہی ہے۔ اس نے ہمیں بہت نقصان پہنچایا ہے۔ وہ اسی علاقے میں کہیں بھاگ کر آ گیا ہے۔" پھر وہ یکایک پوچھنے لگا: "سنو! تم نے اس طرف کوئی فوجی آدمی تو نہیں دیکھا؟"

"آپ کے اور آپ کے ساتھیوں کے سوا اور کوئی فوجی ہم نے نہیں دیکھا صاحب" میں نے معصومیت سے جواب دیا۔ "اور کوئی اکیلا فوجی تو اس جنگل میں آ بھی نہیں سکتا۔ اگر آ بھی جائے تو زندہ نہیں رہ سکتا۔ آپ نے دیکھا نہیں۔ یہاں پگ پگ پر آدم خور جنگلی پھیلے ہوئے ہیں۔"

"ہاں۔ یہ تو ٹھیک کہتے ہو۔" اس نے مجھ سے اتفاق کیا۔ "بُرا ہی کان کو کون سمجھائے۔ سچ کہتے ہو تم۔ اگر وہ سُسرا اِدھر آیا بھی ہوگا تو اب تک آدم خوروں کے پیٹ کا ایندھن بن چکا ہوگا۔" وہ خاصا مطمئن نظر آنے لگا۔

"وہ اکیلا آدمی اتنا خطرناک کیسے ہو گیا صاحب۔" میں نے اُسے باتوں میں لگانے کے لیے پوچھا اور آہستگی سے اس کی طرف بڑھنے لگا: "کیا اس کے پاس بھی توپ ہے؟ ہوائی جہاز ہے؟"

"اس کے پاس دماغ ہے۔"

"دماغ؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "دماغ کیا ہوتا ہے صاحب؟ کیا کوئی بہت خطرناک توپ ہوتی ہے یہ؟"
بدمزاجی کے باوجود وہ اچانک ہنس پڑا۔ "دماغ نہیں جانتے؟ وہ جو اِدھر سر کے اندر ہوتا ہے جس سے انسان سوچتا ہے، غور کرتا ہے۔" اس نے انگلی اپنی پیشانی پر مارتے ہوئے کہا۔ "یہ سب توپیں، ہوائی جہاز، خطرناک ہتھیار کسی نے دماغ سے سوچ کر ہی بنائے ہیں۔ اگر انسان کے پاس دماغ نہ ہوتا تو وہ بھی جانوروں کی طرح رہتا۔" پھر اس نے میری طرف دیکھا میرے جنگلی لباس پر تحقیر آمیز نظر ڈالی اور مسکرایا: "تمہاری طرح رہتا۔ جنگلوں میں بھٹکتا پھرتا۔ اپنی زندگی یوں ہی ضائع کر دیتا۔"

"کیا انسان ہم جنگلیوں سے زیادہ دماغ والا ہوتا ہے؟" میں نے بڑی معصومیت سے سوال کیا۔ میں اس اثناء میں اس کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے اچانک ہاتھ بڑھا کر اپنی سٹین گن اُٹھالی اور چوکنا ہو گیا۔ شاید اسے اچانک یاد آ گیا تھا کہ وہ ایک فوجی تھا اور ہر دم مستعد اور نادیدہ دشمن سے ہوشیار رہنا اس کے فرض کا ایک حصہ تھا۔ کیا اُس نے میرے ذہن کو پڑھ لیا ہے اور میری طرف سے مشکوک

ہو چکا ہے؟ میں نے سوچا مگر بظاہر وہ میری طرف سے مطمئن نظر آ رہا تھا۔

میں احتیاط کے طور پر اس سے کچھ دُور ہٹ کر کھڑا ہو گیا اور جنگل کی طرف دیکھنے لگا۔ ہمارے تین اطراف گھنا جنگل تھا۔ صرف ایک جانب کافی دُور تک کھلا میدان چلا گیا تھا۔ شاید اسی لیے ان لوگوں نے اپنا ہیلی کاپٹر اُتارنے کے لیے اس مقام کا انتخاب کیا تھا۔

ہیلی کاپٹر کے پنکھے بدستور حرکت میں تھے اور اس سے پیدا ہونے والے شور کی وجہ سے ہم دونوں بہت بلند آواز میں چیخ چیخ کر باتیں کرنے پر مجبور تھے۔ ہیلی کاپٹر کے پنکھوں کے شور کے سوا جنگل میں ہر طرف مکمل سناٹا تھا۔ ہیلی کاپٹر کا پائلٹ اب دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا تھا اور سگریٹ کے پیکٹ میں سے ایک اور سگریٹ نکال رہا تھا۔ اس کے پیکٹ سے سگریٹ نکالنے کا طریقہ وہی تھا جو اُس نے اس سے پہلے اختیار کیا تھا۔ ایک ہاتھ سے پیکٹ کھول کر اُس نے پیکٹ کو آگے کی طرف جھٹکا اور ایک سگریٹ ہونٹوں سے پکڑ کر باہر نکال لی۔ سگریٹ کے پیکٹ کو دوبارہ جیب میں رکھنے کے بعد اُس نے سگریٹ لائٹر نکالا اور سگریٹ کو سُلگانے لگا۔ اس نے دائیں ہاتھ میں سٹین گن کو مضبوطی سے تھاما ہوا تھا۔ مختصر سے وقفے میں جنگل میں جو واقعات پیش آ چکے تھے اُن کے پیشِ نظر اس کا چوکنا اور ہوشیار رہنا ایک قدرتی عمل تھا لیکن میرے لیے ہر لمحہ قیمتی تھا۔ کسی بھی لمحے کوئی ایسا واقعہ رونما ہو سکتا تھا جو میرے مفرور ہونے کے اس نادر موقع کو ضائع کر دیتا۔ لہٰذا میں نے فوری طور پر عملی اقدام اُٹھانے کا منصوبہ بنایا۔ میں آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھا اور میں نے کہا "سنو! کیا تم اُوپر والے پنکھے بند نہیں کر سکتے؟"

اُس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ "تمہیں کیا تکلیف ہے؟"

میں دو قدم اور اُس کی طرف بڑھ گیا "مجھے تو کوئی تکلیف نہیں ہے مگر یہ مت بھولو کہ ان کی آواز سُن کر جنگل میں دُور دُور تک یہ خبر پھیل جائے گی اور اگر کچھ اور آدم خور لوگ آس پاس ہوں گے تو وہ سب اس طرف آ جائیں گے۔"

"تو پھر کیا ہوا؟" وہ لاپروائی سے بولا۔

"تم نہیں جانتے۔ یہ جنگلی لوگ جب چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں تو بچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ تم اپنے ساتھ مجھے بھی مروا دو گے۔"

خوف کے آثار اس کے چہرے پر نمودار ہوئے مگر وہ بظاہر مطمئن تھا۔ "فکر مت کرو۔ میرے پاس یہ سٹین گن موجود ہے۔ جنگلی کیا چیز ہیں اس سے تو ہم بڑی بڑی فوجوں سے مقابلہ کر کے انھیں بھگا دیتے ہیں۔"

"اور اگر وہ سیکڑوں ہزاروں کی تعداد میں ہوئے تب کیا ہو گا؟"

وہ غصّے میں میری طرف پلٹا "تم مجھے کیا سمجھتے ہو؟ میں ان ننگ دھڑنگ جنگلیوں سے ڈر جاؤں گا؟ میں نے بہت سی لڑائیوں میں حصّہ لیا ہے۔ مجھے تمغے بھی ملے ہیں۔ یہ دیکھو!" اس نے اپنے سینے پر لگے ہوئے نشانوں کی طرف اشارہ کیا "مگر تم انہیں کیا سمجھو گے؟ شہر میں رہنے کے باوجود تم ہو تو بالکل جنگلی......"

یکایک وہ بولتے بولتے خاموش ہو گیا۔ میں نے نگاہیں اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا تو اُس کی نظریں میری گردن اور سینے پر تھیں۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل رہا تھا اور سٹین گن پر اس کی اُنگلیوں کی گرفت زیادہ مضبوط ہو گئی تھی۔ غیر ارادی طور پر میری نظر فوراً اپنے سینے کی طرف چلی گئی اور میں اس کی تشویش کا سبب جان گیا۔ میرے گلے میں پڑی ہوئی سونے کی زنجیر میں لٹکا ہوا لفظ "اللّٰہ" بالکل نمایاں طور پر اس کو نظر آ رہا تھا۔ یہ زنجیر میں کسی وقت ایک لمحے کے لیے بھی گلے سے نہیں اُتارتا تھا۔ جنگل میں پناہ لینے کے بعد بھی میں نے اسے جنگلیوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی تھی اور اس وقت بھی مجھے پورا یقین تھا کہ یہ میرے لباس میں چھپی ہوئی ہے لیکن پچھلے چند گھنٹوں کی بھاگ دوڑ اور جنگ و جدل کے دوران میں وہ اب نمایاں ہو گئی تھی۔ محض سونے کی زنجیر ہوتی تو شاید کوئی فکر کی بات نہ تھی، لیکن اس کے عین درمیان میں نمایاں طور پر لکھا ہوا لفظ "اللّٰہ" اس کو چونکانے اور مشکوک کر دینے کے لیے بہت کافی تھا۔ میں نے پریشانی سے لفظ "اللّٰہ" کو اور پھر دوبارہ اپنے سامنے کھڑے ہوئے فوجی کو دیکھا۔ وہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر تھا اور اس کی سٹین گن کی نالی کا رُخ زمین کی طرف تھا، لیکن میں چاہے کتنی بھی برق رفتاری سے اس کی طرف لپکتا، میرے اُس تک پہنچنے سے پہلے اس کی سٹین گن کی گولیاں میرے جسم میں لاتعداد سوراخ پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔

"تم......؟" اس نے سگریٹ پھینکتے ہوئے انگلی سے میری طرف اشارہ کیا مگر دوسرے ہی لمحے بجلی کی طرح میرا ہاتھ خنجر کو نکال کر اُس کی طرف اُچھال چکا تھا۔ ہمارے مابین فاصلہ بہت کم تھا اور نشانہ خطا ہونے کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی مگر میرا ہاتھ بے ڈھب تھا نہ میرے پاس اتنا وقت اور مہلت تھی کہ اپنے جسم اور ہاتھ کو تھوڑی سی جنبش دے کر صحیح زاویہ بنا لیتا۔ خنجر پھینکنے کی رفتار بھی زیادہ نہیں تھی اور شاید وہ میرے ہاتھ کو حرکت کرتے ہوئے دیکھ کر میرا ارادہ بھانپ چکا تھا۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے تیزی سے ایک طرف ہٹ کر میرا وار خالی کر دیا اور اب تمام پتے اس کے ہاتھ میں تھے۔ اس کی سٹین گن کی نالی بلند ہو کر میرے سینے کا نشانہ لے چکی تھی۔ مجھے بخوبی اندازہ تھا کہ اُس نے قریباً پونے انچ مربع سونے کے ٹکڑے کو اپنے نشانے کی زد پر لیا تھا جس پر لفظ "اللّٰہ" کندہ تھا۔ اب مجھے اس کی گولیوں کی بوچھاڑ اور موت سے بچانے والا اللّٰہ کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔

"کون ہو تم؟" اُس نے کرخت لہجے میں پُوچھا "سچ بتانا۔ اگر جھوٹ بولنے کی کوشش کی تو چھلنی کر دوں گا۔" وہ مجسّم موت بن کر میرے سامنے تنا کھڑا تھا۔ اُس نے مجھے سچ بولنے کو کہا تھا اور اس کی نظروں نے لفظ "اللّٰہ" کو بھی دیکھ لیا تھا جو میرے دل کے اندر بھی تھا اور باہر بھی۔ معاً میرے دل میں خیال آیا کہ اس آخری وقت میں جھوٹ بول کر اپنی جان بچانے کی کوشش نہ صرف مذہبی اور اخلاقی طور پر غلط ہو گی بلکہ اس طرح میں اپنی جان بھی نہ بچا سکوں گا۔ اس کو میرے جھوٹ پر یقین نہیں آئے گا اور پھر سچ جاننا اس کے لیے ویسے بھی مشکل نہیں تھا۔

چنانچہ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور بے خوفی سے کہا "میں وہی ہوں جو تم مجھے سمجھ رہے ہو۔ جس کی تلاش میں تم اور تمہارے ساتھی جنگل جنگل گھوم رہے ہیں۔ جس نے تمہاری فوج کو تتر بتر کر دیا ہے جس نے تن تنہا تمہاری فوجی طاقت کے پرخچے اُڑا کر رکھ دیے ہیں۔ میں تمہارا دشمن ہوں۔"

وہ میری صاف گوئی پر حیران رہ گیا۔ پھر ہنسا اور بولا "بہادر آدمی ہو۔ کیا تمہیں اپنی زندگی سے پیار نہیں ہے؟"

میں نے کہا "زندگی سے زیادہ مجھے اپنے وطن سے اور اپنے فرض سے پیار ہے۔ اور پھر اگر میری موت تمہارے ہاتھوں لکھی ہوئی ہے تو پھر میں چاہے کتنے ہی جھوٹ بولوں۔ دُنیا کی کوئی طاقت میری جان نہیں بچا سکتی۔"

وہ دو قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا اور گہری نظروں سے میرا جائزہ لینے لگا۔ پھر بولا "تم شاید نہیں جانتے کہ تم ہمارے لیے کتنے مہنگے آدمی ہو۔ تمہاری جان نہیں بچ سکتی مگر یہ کام اس اکیلے اور سنسان جنگل میں میرے ہاتھوں سے نہیں ہو گا۔ تمہیں ہائی کمان کے سامنے پیش کر کے میں تمغے لوں گا اور پھر وہ تم سے ضروری معلومات حاصل کریں گے۔ اُس کے بعد تمہاری زندگی ختم کرنے کا فیصلہ کیا جائے گا۔"

گویا ابھی موت کا لمحہ مجھ سے دُور تھا اور اس تصور نے میرے اندر ایک خاص قسم کی دلکشی اور توانائی پیدا کر دی۔ میری خود اعتمادی جو ایک پل کے لیے میرا ساتھ چھوڑ گئی تھی اس کے ایک جملے سے فوراً واپس آ گئی۔ فی الحال وہ مجھے ہلاک نہیں کر سکتا اور یہ خیال میرے لیے انتہائی فرحت بخش اور خوش آئند تھا۔

"اب یہ بتاؤ کہ تم اس جنگل میں کیا کر رہے تھے اور تم نے ہمارے جوانوں کو کہاں بھیجا ہے؟"

میری شوخی اور ظرافت کی حس پھڑک اُٹھی۔ میں نے کہا "میں اس جنگل میں فوج بھرتی کر رہا تھا اور میں نے جنگلیوں کی کافی بڑی فوج بنا لی ہے۔ اُن کے پاس زہریلے ہتھیار بھی ہیں۔ اس جنگل میں دُشمن کی بڑی سے بڑی فوج بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ تمہارے ساتھیوں کو میں نے موت کی راہ پر چلتا کر دیا۔ وہ تو اب تک آدم خوروں کی خوراک بن چکے ہوں گے۔ اس لیے تم ان کی واپسی سے نااُمید ہو جاؤ۔"

"یو باسٹرڈ"۔ وہ غصّے سے بے قابو ہو کر چلّایا "دھوکے باز تمہیں اُن کی موت کا حساب چکانا ہو گا۔"

"حساب تو بہت لمبا ہے دوست۔" میں نے ٹھنڈی آواز میں اطمینان سے کہا "کس کس ساتھی کی موت کا حساب لو گے مجھ سے؟ درجنوں نہیں سیکڑوں بلکہ ہزاروں کو میں نے جہنم رسید کیا ہے۔ تم ایک اکیلے آدمی ہو۔ اتنا لمبا چوڑا حساب کرنا تمہارے بس

کی بات نہیں ہے۔"

میں اسے مشتعل کر کے کسی اضطراری فعل پر اکسا رہا تھا تا کہ اس سے فائدہ اٹھا سکوں۔ میرے الفاظ زہر میں بجھے ہوئے تیروں کی طرح اس کے دل میں پیوست ہو گئے۔ وہ دانت پیستے ہوئے مجھے دیکھ رہا تھا۔ ایک منٹ کے لیے مجھے خیال گزرا کہ شاید وہ اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکے گا اور مجھ پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دے گا مگر وہ محض دانت پیس کر رہ گیا۔ اس نے انگریزی میں مجھے موٹی موٹی غلیظ گالیاں دے کر اپنے دل کی بھڑاس نکالی اور پھر سٹین گن کی نالی لہرا کر بولا: "فوراً ہیلی کاپٹر میں سوار ہو جاؤ ایک منٹ کی بھی دیر نہ کرنا۔ میں تمہیں جان سے نہیں ماروں گا مگر تمہیں معذور کر دوں گا۔ تم شاید اپنے ہاتھوں اور پیروں سے محروم ہونا پسند نہیں کرو گے؟"

اس کی بات میں سچائی تھی۔ بھلائی اسی میں تھی کہ میں چپ چاپ اس کے حکم کی تعمیل کر دوں ورنہ وہ یقیناً اپنی دھمکی کو سچا کر دکھائے گا۔ یہ سوچ کر میں آگے بڑھا۔ مسلح ہونے کے باوجود وہ چونک کر پھرتی سے چند قدم اور پیچھے ہٹ گیا۔ میرا خوف اور رعب اس پر پوری طرح حاوی تھا۔ مجھے اپنے دشمن پر نفسیاتی برتری ضرور حاصل تھی۔

میں ہیلی کاپٹر پر سوار ہونے کے لیے آگے بڑھا مگر اسی لمحے میری پشت کی جانب آہٹ سنائی دی۔ غیر ارادی طور پر میں نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ اس کی نظریں بھی جنگل کی طرف اٹھ گئیں جہاں چار جنگلی آدم خور اچانک نمودار ہو گئے تھے۔ ان میں سے دو کے ہاتھوں میں بھالے تھے جو انہوں نے ہوا میں اوپر اٹھائے ہوئے تھے۔ باقی دو جنگلی اپنی کمانوں میں تیر چڑھا رہے تھے اور اس بات میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی کہ ان کے تیر زہر میں بجھے ہوئے تھے مگر اس بار فوجی پائلٹ ضرورت سے زیادہ پھرتیلا ثابت ہوا۔ ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر اس نے سٹین گن کا رخ جنگلیوں کی طرف موڑ دیا۔ فائرنگ کی آواز گونجی اور وہ چاروں زمین پر ڈھیر ہو گئے۔ میرے لیے یہ نادر موقع تھا۔ میں نے دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔ میں تیزی سے مڑا اور دوڑ کر پوری طاقت سے اپنا جسم اس کے جسم سے ٹکرا دیا۔ مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ میں اس کے جسم کے کون سے حصے کو نشانہ بناؤں گا مگر جب میرا جسم اس سے ٹکرایا تو وہ لڑکھڑا گیا۔ سٹین گن اس کی گرفت سے چھوٹ کر فضا میں اچھلی اور دور جھاڑیوں میں جا گری مگر اس اقدام نے خود مجھے بھی غیر متوازن کر دیا اور میں چند گز دور جا گرا۔ پائلٹ نے سٹین گن کو تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ غالباً وہ میری شہرت اور شخصیت سے مرعوب تھا اور مجھ سے دو بدو مقابلہ کرنے کا رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔ اس کی پھرتی واقعی دیکھنے کے قابل تھی۔ اس سے پہلے کہ میں زمین سے اٹھ کر کھڑا ہوتا۔ اس نے چھلانگ لگائی اور ہیلی کاپٹر کے اندر داخل ہو گیا۔ اس میں بلا کی تیزی آ گئی تھی۔ میرے اٹھتے اٹھتے اس نے ہیلی کاپٹر پر اپنا کنٹرول سنبھال لیا اور جب میں زمین سے اٹھ کر کھڑا ہوا تو ہیلی کاپٹر جو اس تمام عرصے میں سٹارٹ ہی رہا تھا حرکت کرتا ہوا میری طرف بڑھ رہا تھا۔ شکر ہے کہ اس کی رفتار کم تھی ورنہ میرا قیمہ بن چکا ہوتا۔ میں دوبارہ زمین پر گرا اور لوٹ لگا کر دور چلا گیا۔ میرا مقصد سٹین گن پر قبضہ کرنا تھا لیکن اس طرف جانے کی مہلت نہ تھی اس لیے مخالف سمت میں لوٹ پوٹ ہو کر جب میں اپنے پیروں پر کھڑا ہوا تو ہیلی کاپٹر پھر میری نظروں کے سامنے تھا اور ایک مہیب عفریت کی طرح میری طرف بڑھا آ رہا تھا۔ میرے پاس فیصلہ کرنے کے لیے زیادہ مہلت نہ تھی۔ سٹین گن مجھ سے مخالف سمت میں کافی فاصلے پر پڑی تھی اور خود رو گھاس اور جھاڑیوں میں اسے تلاش کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ دوسری طرف گھنا جنگل تھا۔ میں جنگل کی طرف بھاگ کر ہیلی کاپٹر کی زد سے محفوظ ہو سکتا تھا لیکن ایسی حالت میں جب کہ میرے پاس ہتھیار نام کی کوئی چیز موجود نہ تھی۔ قدم قدم پر آدم خوروں سے بھرے ہوئے جنگل میں پہنچ جانا میرے لیے موت کا پیغام بن سکتا تھا۔ ایسی صورت میں نجات اور بچاؤ کی محض ایک ہی صورت باقی رہ گئی تھی اور وہ یہ کہ میں چوتھی سمت میں کھلے میدان کی طرف نکل جاؤں۔ یہاں میں ہیلی کاپٹر سے محفوظ نہیں تھا لیکن پھر بھی اس کے سوا میرے پاس کوئی اور چارہ کار نہ تھا۔ چنانچہ آناً فاناً یہ فیصلہ کرنے کے بعد میں نے ہوا میں چند قلابازیاں لگائیں اور اپنی طرف بڑھتے ہوئے ہیلی کاپٹر کی زد سے باہر نکل کر کھلے میدان کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ ہیلی کاپٹر سے میرے اوپر کوئی فائر نہیں ہوا تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ پائلٹ کے پاس کوئی اور آتشی ہتھیار موجود نہیں تھا۔ یا پھر وہ پائلٹ کے طور پر اپنے فرائض سرانجام دیتے ہوئے مجھ پر فائر کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

میں بے تحاشا میدان میں بھاگا جا رہا تھا جس کے دوسرے کنارے پر ٹیلے اور چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں۔ اگر میں وہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاؤں تو کم از کم ہیلی کاپٹر کے حملوں سے محفوظ ہو سکتا ہوں۔ پلٹ کر دیکھا تو ہیلی کاپٹر بدستور میرے تعاقب میں تھا اور اس بار زیادہ تیز رفتاری سے مجھ پر چڑھا آ رہا تھا۔ آس پاس چھپنے کی کوئی جگہ نہ تھی اور زمین بھی خاصی ہموار تھی۔ میں پھرتی سے زمین پر لیٹ گیا لیکن پائلٹ بھی میرا ارادہ بھانپ گیا تھا۔ اس نے ہیلی کاپٹر کو اور نیچا کر لیا اور جب وہ خوفناک شور کے ساتھ میری طرف بڑھا تو ایک بار پھر مجھے اپنی موت سامنے نظر آنے لگی۔ میں بالکل زمین سے چپک کر نشیب کے بل چت لیٹا ہوا تھا مگر خبیث پائلٹ ہیلی کاپٹر کو مزید نیچے لے آیا تھا اور مجھے کچلنے کا تہیہ کر چکا تھا۔ مجھے جتنی بھی دعائیں یاد تھیں وہ از خود میری زبان پر رواں ہو گئیں۔ موت اور خدا مجھے بیک وقت یاد آ رہے تھے۔ شاید میرا آخری وقت آ چکا تھا اور میرے خدا نے مجھے اپنے پاس بلانے کا حکم دے دیا تھا۔ موت کا تو ایک وقت متعین ہوتا ہی ہے۔ اگر میری موت اس آہنی ہیلی کاپٹر سے کچل کر لکھی ہے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت مجھے نہیں بچا سکتی۔ یہ سوچنے کے باوجود میں اپنی فوجی تربیت اور آخر دم تک مقابلہ اور مدافعت کرنے کی عادت سے مجبور تھا اس لیے کھلی آنکھوں سے ہیلی کاپٹر کو موت کا پیغام بن کر اپنے اوپر نازل ہوتا ہوا دیکھنے کے باوجود آخری دم تک مزاحمت کے لیے تیار تھا۔

مجھ سے چند گز کے فاصلے پر پہنچ کر ہیلی کاپٹر کی رفتار یکایک کچھ اور تیز ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی وہ اتنا نیچا ہو گیا کہ گھاس اور خود رو پودے اس آہنی پنجے سے ٹکرانے لگے جنہیں ہیلی کاپٹر کی ٹانگیں سمجھ لیجیے کیونکہ ان ہی ٹانگوں پر ہیلی کاپٹر زمین پر کھڑا ہوتا ہے۔ ہیلی کاپٹر دوسرے ہی لمحے میرے سر پر پہنچ گیا۔ میں نے اپنے آپ کو زمین سے اور زیادہ چپکا لیا۔ اگر پائلٹ ہیلی کاپٹر کو اتنی نیچائی پر لائے گا تو خود اپنی جان کو خطرے میں ڈالے بغیر یہ مقصد پورا نہیں کر سکتا۔ صرف یہی ایک خیال میرے لیے آخری آس کی حیثیت رکھتا تھا۔

ہیلی کاپٹر ایک دیوزاد آہنی پرندے کی طرح مجھ تک پہنچ گیا۔ اس کے پنکھوں کی ہوا کی شدت سے آس پاس کے پودے اور درخت جھوم رہے تھے۔ خود میں بھی کوشش کے باوجود پوری طرح اپنی آنکھیں کھول کر رکھنے میں سخت دشواری محسوس کر رہا تھا مگر میں موت کو آخری سانسوں تک اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا تہیہ کر چکا تھا۔ ہیلی کاپٹر مہیب آواز کے ساتھ مجھ تک پہنچا۔ مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ پائلٹ کی تمام تر کوشش کے باوجود اس کی اونچائی اتنی تھی کہ وہ مجھے کچل نہیں سکتا تھا۔ میرے حواس پوری طرح میرے قابو میں تھے اور میں نے اسی لمحے ایک اور فیصلہ کر لیا۔ ہیلی کاپٹر کی ٹانگیں میرے جسم اور چہرے سے محض ایک یا دو انچ کے فاصلے پر تھیں۔ میں نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے، ٹانگوں کو بالکل سیدھا پھیلایا اور آہنی جنگلے کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ہیلی کاپٹر تیز رفتاری سے آگے بڑھا اور میرا جسم اور ٹانگیں اس کے ساتھ ہی زمین پر گھسٹنے لگیں۔ خود پائلٹ بھی زیادہ دیر تک ہیلی کاپٹر کو اتنی کم اونچائی پر رکھنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ دوسرے یہ کہ وہ میرا انجام دیکھنے کا بھی خواہش مند تھا۔ دوسرے ہی لمحے ہیلی کاپٹر فضا میں بلند ہونے لگا اور اس کے ساتھ ہی میں بھی اوپر اٹھنے لگا۔ میں نے لوہے کے جنگلے پر اپنی گرفت اور مضبوط کر دی۔ اگر دشمن آہنی تھا تو میرا عزم بھی آہنی تھا۔

جب ہیلی کاپٹر فضا میں کچھ اور بلند ہوا تو میں اس کو پکڑے ہوئے اس کے نیچے لٹک رہا تھا۔ پائلٹ نے پلٹ کر اس جگہ دیکھا ہو گا جہاں کچھ دیر پہلے تک میں لیٹا ہوا تھا مگر مجھے وہاں موجود نہ پا کر اسے جو حیرت اور پریشانی ہوئی ہو گی اس کا اندازہ لگانا میرے لیے مشکل نہ تھا۔ اتنی شدید پریشانی اور خطرے کے باوجود میں پائلٹ کی متوقع حیرانی پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ پائلٹ نے کھلے میدان میں ایک دو اور چکر لگائے مگر میرا وجود اسے نظر نہ آیا۔ اس نے جھانک کر نیچے دیکھا اور غالباً میری فضا میں لہراتی ہوئی ٹانگیں اسے نظر آ گئیں۔ اس نے ہیلی کاپٹر کی رفتار اور تیز کر دی اور اسے تیزی سے دائیں بائیں حرکت دینے لگا۔ میرا جسم فضا میں ہلکورے کھا رہا تھا مگر میری گرفت بدستور مضبوط تھی۔ پائلٹ نے بھی غالباً صورت حال کو بھانپ لیا۔ فضا میں ہیلی کاپٹر کو چند تیز جھٹکے اور قلابازیاں دینے کے باوجود جب وہ مجھے زمین پر گرانے میں کامیاب نہ ہو سکا تو اس نے یکلخت ہیلی کاپٹر کو اونچائی پر لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ہیلی کاپٹر تیزی سے آگے بڑھتا رہا۔ کھلا میدان بہت جلد میری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا اور ایک بار پھر جنگل کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ علاقہ قدرے سنگلاخ تھا۔ اونچے نیچے پہاڑی ٹیلے اور یہاں وہاں پتلی پتلی ندیاں مجھے صاف طور پر نظر آ رہی تھیں۔ ہیلی کاپٹر خاصی تیز رفتاری سے پرواز کر رہا تھا اور میں اس سے ابابیل کی طرح لٹکا ہوا تھا۔ پائلٹ کو میری سخت جانی کا پورا علم تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے ایک لمحے کے لیے بھی

جھانک کر یہ تصدیق کرنے کی کوشش نہیں کی کہ آیا میں بدستور ہیلی کاپٹر سے چمٹا ہوا ہوں یا جنگل میں کہیں گر چکا ہوں۔ میں اس کو یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو چکا تھا کہ اس کے جو ساتھی جنگل کے اندر داخل ہوئے تھے وہ اب تک موت کا نوالہ بن چکے ہوں گے اور ان کی واپسی کا مطلق کوئی امکان نہیں ہے۔ ان کی واپسی کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد وہ جلد سے جلد مجھے زندہ سلامت اپنے ہیڈ کوارٹر پر لیجا کر سرخروئی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اسے یہ بھی علم تھا کہ اس نے کس قدر نایاب اور قیمتی شکار پکڑا ہے وہ مجھے بتا چکا تھا کہ میری سرگرمیوں کی وجہ سے دشمنوں کی صفوں میں مجھے کتنی اہمیت دی جانے لگی ہے۔

ہیلی کاپٹر کا سفر کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آرہا تھا۔ اپنی کٹھن فوجی تربیت کے باوجود اب یوں فضا میں لٹکا رہنا میرے لیے دشوار ہوتا جا رہا تھا۔ مسلسل لٹکے رہنے کی وجہ سے میرے بازو قریب قریب شل ہو چکے تھے۔ میری انگلیاں آہنی جنگلے پر بدستور جمی ہوئی تھیں مگر میرے جسم کے بوجھ اور ہوا کے مسلسل دباؤ کی وجہ سے اب وہ جواب دیتی جا رہی تھیں۔ ہیلی کاپٹر کی بلندی کافی زیادہ ہو چکی تھی اور اس کی رفتار بھی بہت تیز تھی۔ پائلٹ جلد سے جلد اپنا سفر طے کر کے منزل پر پہنچنے کی دُھن میں تھا۔ نیچے جنگلوں کا سلسلہ ختم ہو چکا تھا اور دُور دُور تک پھیلے ہوئے سرسبز کھیتوں کے درمیان یہاں وہاں کچے مکانات اور جھونپڑیاں نظر آنے لگی تھیں۔ جب ہم کھیتوں اور گاؤں پر سے گزرے تو بچے اور کسان، مرد اور عورتیں سر اٹھا کر حیرت سے یہ نظارہ دیکھتے کہ ہیلی کاپٹر سے ایک شخص لٹکا ہوا ہے۔ وہ اس منظر کو دیکھ کر لطف اندوز ہو رہے تھے۔ شاید وہ اس کو بھی فضائی مظاہرے اور مشق کا ایک حصہ سمجھ رہے تھے۔ وہ انگلیاں اٹھا اٹھا کر میری طرف اشارے کرتے اور ایک دوسرے سے مخاطب ہو کر باتیں بھی کرتے۔ میرا زمین سے فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ اس لیے ان کے چہرے تو بالکل واضح نہیں تھے مگر میں ان کے اشارے بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ میری جان پر بنی ہوئی تھی اور وہ اسے محض ایک تماشا اور فضائی کرتب سمجھ رہے تھے۔

پائلٹ بھی غالباً اس تماشے سے یکساں طور پر لطف اندوز ہو رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ مگن ہو کر کبھی ہیلی کاپٹر کو فضا میں زیادہ اُونچا اُٹھا لیتا اور کبھی اسے نیچائی پر لے جاتا۔ میں چشمِ تصور سے اس کا خوش و خرم اور دمکتا ہوا چہرہ صاف طور پر دیکھ سکتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی بستیاں اور دیہاتی آبادیاں، کھیت کھلیان اور دریا میری نظروں کے سامنے تیزی سے گزرتے جا رہے تھے۔ کبھی ہم ویران علاقوں اور جنگلوں پر سفر کرنے لگتے اور پھر ایکا ایکی کھیت اور گاؤں نظر آنے لگتے مگر یہ بات تو طے شدہ تھی کہ جنگلی قبائل کے علاقے کو ہم کہیں بہت دُور چھوڑ آئے تھے اور اب مہذب علاقے پر پرواز کر رہے تھے۔ ایک بار پائلٹ نے کھیتوں پر سے پرواز کرتے ہوئے ہیلی کاپٹر کو اتنا پست کر دیا کہ میں کوشش کرتا تو کھیتوں میں چرتے ہوئے مویشیوں کو اپنی ٹانگوں سے چھو سکتا تھا۔ ایک سبزی کے کھیت پر سے گزرے تو ایک من چلے کسان نے اپنی لاٹھی گھما کر مجھ پر حملہ کیا اور اگر میں بروقت اپنی ٹانگیں سمیٹ کر اُوپر نہ اُٹھا لیتا تو یقیناً ٹانگیں تڑوا لیتا۔ ایک بستی میں چند بچے پتنگ بازی میں مصروف نظر آئے۔ میں نے ٹانگیں ہلا کر ایک کٹی ہوئی پتنگ کی ڈور کو اپنے پیروں میں بھی لپیٹ لیا جو کافی فاصلے تک ہمارے ہیلی کاپٹر کے ساتھ ساتھ اُڑتی رہی۔ اس اثنا میں کھیتوں میں موجود لڑکے شور مچاتے ہوئے ہمارے تعاقب میں دوڑتے رہے۔ ان میں سے بعض نے اُچھل اُچھل کر میری ٹانگیں پکڑنے کی کوشش بھی کی۔

اس دلچسپ منظر نے میری تھکن اور بوریت کو کسی حد تک کم کر دیا اور کچھ دیر کے لیے میں بھی اس تماشے سے لطف اندوز ہونے لگا لیکایک ایک شریر دیہاتی بچے نے پوری قوت سے اپنی غلیل کھینچ کر میری طرف نشانہ باندھا اور اس کا غلہ میرے چہرے کے نزدیک سے ہو کر نکل گیا۔ اگر وہ میری آنکھ یا پیشانی پر لگ جاتا تو خطرناک زخم بھی آسکتا تھا۔ پائلٹ نے یکلخت ہیلی کاپٹر کو زمین سے اُونچا کر دیا اور میں ان لوگوں کی زد سے باہر نکل گیا۔

اب یہ سب کچھ رفتہ رفتہ میری برداشت سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔ میرے بازو قریباً سُن ہو چکے تھے اور اب میرے حق میں یہی بہتر تھا کہ میں فوری طور پر کوئی فیصلہ کر کے اس پر عمل کر ڈالوں ورنہ میری قوتِ برداشت کے جواب دے جانے کی صورت میں کوئی حادثہ پیش آسکتا تھا اور میں کسی بھی جگہ گر سکتا تھا۔ مجھے یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ ہمارا سفر مزید کتنی دیر جاری رہے

گا میں نے یکایک ایک فیصلہ کیا اور ایک مقام پر جب ہم ایک ندی کے اُوپر سے گزر رہے تھے میں نے اللہ کا نام لے کر ہیلی کاپٹر کے آہنی جنگلے کو چھوڑ دیا۔ اپنی ٹانگیں یکجا کر کے سمیٹیں اور پانی میں کود گیا۔ یہ میرے لیے کوئی نئی اور انوکھی بات نہ تھی۔ اپنی فوجی تربیت کے زمانے میں اس قسم کی مشقیں میں بارہا کر چکا تھا مگر فرق صرف یہ تھا کہ وہ تربیت ہمارے اپنے علاقے میں ہوا کرتی تھی اور میں اس کے لیے بالکل تازہ دم ہوا کرتا تھا جبکہ اس وقت صورت حال اس کے برعکس تھی۔

پانی میں گرنے کے بعد میں نے لمبا غوطہ لگایا اور ندی کی تہہ میں بیٹھتا چلا گیا۔ یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ میں پائلٹ کی نظروں سے اوجھل رہوں اور اگر آس پاس کوئی شخص مجھے دیکھ رہا ہو تو میں آسانی سے اس کے قابو میں نہ آجاؤں۔ ندی کا پانی ٹھنڈا تھا مگر اس کی گہرائی بہت زیادہ نہ تھی۔ چند منٹ کے بعد میرے پیر ندی کی سطح سے ٹکرائے تو میں نے دونوں بازو سمیٹ کر آگے کی جانب پیراکی شروع کر دی۔ پانی کے اندر تیرتا ہوا میں کافی دُور نکل گیا یہاں تک کہ پانی کے اندر سانس روکے رکھنا میرے لیے ناممکن ہو گیا۔ میں نے جسم کو سمیٹ کر اُوپر کی جانب حرکت دی اور میں اس بار کسی کاوش کے بغیر پانی کی سطح پر پہنچ گیا۔ میں نے چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ ہر طرف ویرانی اور خاموشی تھی۔ دُور دُور تک چند بھینسوں اور گائے بیلوں کے سوا کوئی ذی نفس موجود نہیں تھا۔ میں حد سے زیادہ تھکا ہوا تھا مگر احتیاط کا تقاضا یہ تھا کہ میں کچھ دیر زیرِ آب اور لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہوں۔ چنانچہ ایک لمبی سانس لینے کے بعد میں دوبارہ پانی کے اندر غائب ہو گیا اور میں نے پانی کے بہاؤ کے رُخ تیرنا شروع کر دیا۔ یہ ایک دانش مندانہ ترکیب تھی جس کی وجہ سے مجھے زیادہ ہاتھ پیر مارنے اور جسمانی مشقت کرنے کی ضرورت نہیں پیش آئی۔ اسی طرح میں پانی کے اندر تیرتا رہا اور فاصلہ طے کرتا رہا۔ جب تازہ ہوا کی ضرورت محسوس ہوتی میں ندی کی سطح پر آ جاتا۔ پیراکی میں مہارت میرے کام آرہی تھی۔ پانی کا بہاؤ بھی میرا مددگار تھا۔ جس کی وجہ سے میرا سفر بہت تیزی سے گزرا اور تھوڑے عرصے میں میں نے کافی فاصلہ طے کر لیا۔ مگر اب میرے ہاتھ پیر جواب دینے لگے تھے اور سانس بھی سینے میں نہیں سما رہا تھا۔ چنانچہ مجبوراً میں نے پانی سے باہر نکلنے کا فیصلہ کر لیا۔

وہ ایک پُرفضا مقام تھا۔ چاروں طرف ہریالی اور قد آور پھلدار درختوں کا سایہ تھا۔ غالباً یہ کوئی باغ تھا۔ ندی سے باہر نکل کر کچھ دیر میں کنارے پر لیٹا لمبے لمبے سانس لے کر اپنے آپ کو تازہ دم اور بحال کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ سانس قابو میں آئی تو میں نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ ہر طرف خاموشی اور سناٹا تھا اور باغ میں اس وقت کوئی رکھوالا بھی موجود نہ تھا۔ میں سر جھکائے ہوئے بھاگا اور میں نے درختوں کے سائے میں اپنے آپ کو گرا دیا۔ پھر مجھے اپنی کوئی سُدھ نہ رہی۔ گزشتہ کئی گھنٹوں کی اعصاب شکن کشمکش اور جسمانی تھکن نے مجھے چُور چُور کر دیا تھا۔ لیٹتے ہی میں نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔ نیند جو قدرت کا بہت بڑا عطیہ اور انعام ہے ہم کو اس بات سے آگاہی نہیں ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ گہری نیند بے شمار تکالیف اور بیماریوں کا علاج ہے۔ یہ اتنی بڑی نعمت ہے جس کا اندازہ انسانوں کو اُس وقت ہوتا ہے جب وہ اس سے محروم ہو جاتے ہیں یا اُس میں کمی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس وقت احساس پیدا ہوتا ہے کہ قدرت کی طرف جو راحت بے مول اور بن مانگے مل رہی تھی اس سے محروم ہونے کے بعد زندگی کتنی دشوار بلکہ وبال ہو جاتی ہے۔

خدا جانے کتنی دیر میں سوتا رہا۔ آنکھ کھلی تو شام کے سائے پھیلنے لگے تھے۔ اُونچے اُونچے درختوں کے گھنے پتّوں اور شاخوں نے سائبان سا تان دیا تھا۔ کچھ دیر میں بے حس و حرکت پڑا۔ اپنے ہوش و حواس مجتمع کرتا رہا۔ کچھ دیر سو لینے کی وجہ سے میں اپنے جسم میں تازگی اور توانائی محسوس کر رہا تھا لیکن اب بھوک نے ستانا شروع کر دیا تھا۔ میں کروٹ بدل کر اُٹھ بیٹھا اور چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ باغ میں کوئی نہ تھا۔ خدا جانے یہاں کوئی مالی یا رکھوالا ہوتا بھی ہے یا نہیں؟ یہ سوچ کر میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میرے آس پاس پھلوں کے درخت تھے لیکن فی الوقت میرے لیے سب سے کار آمد امرود ہو سکتے تھے۔ درخت چھوٹے بڑے امرودوں سے لدا ہوا تھا۔ میں نے درخت پر چڑھ کر امرود کھانے شروع کر دیئے۔ امرود بہت لذیذ تھے۔ اس وقت تو اگر بدمزہ بھی ہوتے تو لطف دے جاتے۔ امرود ایک ایسا پھل ہے جو شکم پُری بھی کرتا ہے اور لذیذ بھی ہے۔ کافی دیر کا بھوکا تھا اور درخت پر
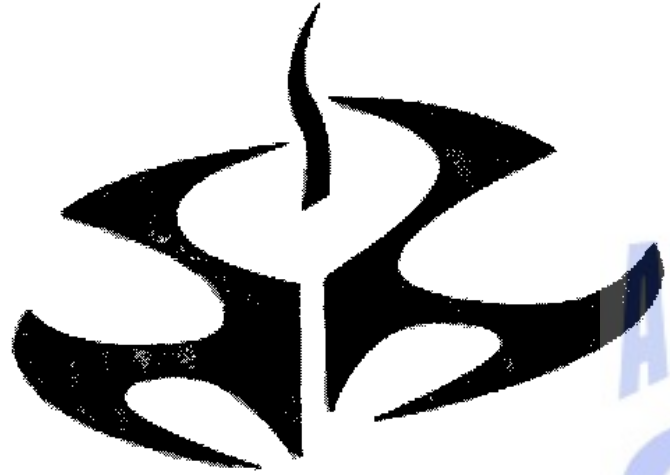
امرودوں کی کمی نہ تھی اس لیے یہ سلسلہ دراز ہوتا گیا۔ مَیں کافی دیر تک اپنا پیٹ بھرتا رہا یہاں تک کہ پیٹ بھی بھر گیا اور نیت بھی اب جھپٹتا ہوا چلا تھا۔ کہیں دُور سے مغرب کی اذان کی آواز سنائی دی تو مجھے اندازہ ہوا کہ آبادی اس جگہ سے زیادہ دور نہیں ہے۔ لیکن کیا اس وقت اور اس حُلیے میں بستی میں جانا میرے لیے سُود مند ہوگا؟ مَیں نے سر سے پیر تک اپنا جائزہ لیا۔ مَیں ابھی تک جنگلیوں کا عجیب و غریب لباس پہنے ہوئے تھا۔ ماحول کی تبدیلی سے ہر چیز ہی بدل جاتی ہے۔ یہ لباس جو جنگلی سردار کی خلعتِ فاخرہ تھی شہر کے ماحول میں آنے کے بعد ایک مضحکہ خیز چیز نظر آ رہی تھی۔ ویسے بھی مجھے جتنی جلد ممکن ہو اس لباس سے چھٹکارا حاصل کر لینا ضروری تھا۔ میرے دُشمن بدستور میری کھوج میں تھے اور وہ کسی بھی لمحے اپنا شکاری دائرہ تنگ کر کے میری زندگی دوبھر کر سکتے تھے مگر اس لباس سے نجات کیوں کر حاصل ہو۔

ان ہی سوچوں میں گم مَیں درخت سے نیچے اُترا۔ میرے سامنے فی الحال نہ کوئی منصوبہ تھا اور نہ کوئی منزل۔ کوئی راستہ نہیں سُوجھ رہا تھا۔ یکایک کچھ آوازوں نے مجھے چونکا دیا۔ یہ دو انسانوں کے بولنے کی آوازیں تھیں اور رفتہ رفتہ نزدیک آتی جا رہی تھیں۔ مَیں نے پریشان ہو کر ایک درخت کے موٹے سے تنے کے پیچھے پناہ لی اور چھُپ کر انتظار کرنے لگا۔ آوازیں بتدریج واضح ہوتی جا رہی تھیں۔ اب مَیں صاف طور پر ایک مرد اور ایک عورت کی آوازیں سُن سکتا تھا۔ مرد دھیمی مگر گہری اور بھاری آواز میں گفتگو کر رہا تھا جبکہ عورت کی آواز بہت مضطرب اور بلند تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی بات پر ناراض ہو رہی ہے یا رو رہی ہے۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں مجھے نظر بھی آ گئے۔ واقعتاً وہ ایک مرد اور عورت تھے۔ مرد دیہاتی لباس پہنے ہوئے تھا اور لمبا تڑنگا سانولے رنگ کا جوان تھا۔ عورت بھی دراز قد اور خوب رُو تھی۔ وہ سیاہ شلوار اور قمیص پہنے ہوئے تھی اور پاؤں سے ننگی تھی سر پر دوپٹے کی جگہ اس نے ایک سیاہ رنگ کی چادر ڈال رکھی تھی۔ وہ بے حد ناراض اور برہم معلوم ہو رہی تھی۔ مَیں نے اپنے آپ کو اور زیادہ احتیاط سے چھُپا لیا۔ میرے سامنے کھُلا میدان اور ایک پگڈنڈی سی بنی ہوئی تھی۔ درختوں سے کچھ فاصلے پر ایک پختہ چبوترہ بنا ہوا تھا جو ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ وہ دونوں اُس چبوترے پر بیٹھ گئے۔

مرد نے رسانی سے کہا: "دیکھ شاداں۔ مَیں تجھے پہلے بھی بتا چکا ہوں۔ میرا باپ اور گھر والے مانیں یا نہ مانیں مَیں تیرے سوا کسی اور سے شادی نہیں کروں گا۔"

شاداں نے غصّے سے اس کو گھُورا اور بولی: "جھُوٹی تسلیاں مت دیا کر مجھے۔ باپ کے بغیر تیری حیثیت کیا ہے۔ اسی کی زمینداری اور پیسے پر تو عیش کرتا ہے۔ اس کو ناراض کر کے تُو کیسے رہ سکتا ہے۔ وہ تجھے روٹی کے لیے محتاج کر دے گا۔"

مرد غصّے سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "تو مجھے کیا سمجھتی ہے؟ میرے بازوؤں میں بھی دم ہے۔ کیا میں باپ کی دولت کے بغیر خود روزی نہیں کما سکتا؟ مَیں دس جماعت پڑھا ہُوا ہوں۔ تندرست اور مضبوط ہوں۔ محنت مزدوری کر سکتا ہوں۔"

"وہ بھلا تمہیں محنت مزدوری کرنے دیں گے؟" شاداں کی آواز میں طنز نمایاں تھا۔ "ان کی اُونچی ناک کٹ نہیں جائے گی؟"

"مجھے ان کی پرواہ نہیں ہے۔ اگر زیادہ تنگ کریں گے تو مَیں شہر چلا جاؤں گا۔ ہم وہاں اپنا گھر بنائیں گے ان لوگوں سے، ان کی زمینوں سے، ان کی دولت سے کوئی واسطہ نہیں رکھیں گے۔"

شاداں خاموش رہی مگر صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ رو رہی ہے۔

مرد اس کے پاس بیٹھ گیا اور سمجھانے کے انداز میں بولا۔ "دیکھو شاداں۔ تُو مانتی کیوں نہیں میری بات۔ مَیں ابا کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ وہ میرے بغیر نہیں رہ سکتے۔"

شاداں چمک کر بولی: "یہی تو مَیں بھی کہتی ہوں۔ وہ تجھے کبھی نہیں جانے دیں گے۔ وہ تجھے اپنے سے الگ نہیں کریں گے۔ منظور۔"

"اری پگلی۔ وہ میرے ماں باپ ہیں۔ مَیں انہیں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ تھوڑے ضدی اور غصّے والے ضرور ہیں مگر میرے بغیر وہ کبھی خوش نہیں رہ سکیں گے۔ تھوڑے دن ناراض رہیں گے مگر پھر ہار مان کر مجھے واپس لے آئیں گے اور تجھے اپنی

بھی مان لیں گے۔"

"اگر وہ تجھ سے اتنا ہی پیار کرتے ہیں اور تیری ہر بات مان لیتے ہیں تو پھر وہ اس بیاہ پر کیوں راضی نہیں ہوتے؟ تو بہت ڈرپوک ہے منظور۔ تو تو اپنے ابا کے سامنے بول ہی نہیں سکتا۔ میرے لیے ضد کیسے کرے گا؟ یہ سب دل خوش کرنے کی باتیں ہیں۔ تیرے اندر اتنی ہمت نہیں ہے کہ انہیں چھوڑ کر شہر چلا جائے اور جب وہ تجھے ڈھونڈتے ہوئے آئیں گے تو ایک منٹ میں سیدھا ہو جائے گا۔ ان کے ایک اشارے پر مجھے چھوڑ کر ان کے پیچھے پیچھے چلا آئے گا۔"

"تجھے یقین ہی نہیں آتا تو پھر میں کیا کروں؟" منظور جھنجلا کر بولا۔

"کیسے یقین کروں تیرا۔ تو تو بھیگی بلی بن جاتا ہے اُن کے سامنے۔ باپ ہی کیا تو تو ماں اور بہنوں تک سے ڈرتا ہے۔ بالکل موم کی ناک ہے۔ نہ بابا۔ تیرے جیسے ڈرپوک کی باتوں میں آ کر میں اپنی زندگی برباد نہیں کروں گی۔"

منظور ایک بار پھر غصے سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "صاف صاف کیوں نہیں کہتی کہ تو ملک یعقوب کے بیٹے سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ اُنہوں نے تیرے بابا کو لالچ بھی دیا ہے اور قرضہ اُتارنے کے لیے رقم بھی دینے کو تیار ہیں۔ تیرا بابا ان سے راضی ہے تو اس کے سامنے سر نہیں اُٹھا سکتی۔"

"کتنی جلدی میرے اُوپر الزام رکھ دیا ہے تو نے اور کمزوری کا طعنہ بھی مار دیا ہے۔ ارے جب تو مرد اور اکلوتا بیٹا ہو کر اپنے باپ کے آگے کچھ نہیں بول سکتا تو پھر میں تو ایک کمزور اور غریب لڑکی ہوں۔"

منظور لاجواب ہو کر چپ ہو گیا۔ شاداں بھی اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "تجھے لالچی اور دھوکے باز سمجھتا ہے؟" منظور کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

منظور نے نگاہیں دوسری طرف پھیر لیں۔

"میرا باپ غریب ہے۔ اس کا دل امیروں کی طرح پتھر نہیں ہے منظور۔ تو نے ٹھیک سُنا ہے۔ ملک یعقوب نے اُسے بہت لالچ دیئے ہیں۔ اُسے پیسوں کی ضرورت بھی ہے۔ پر وہ میری خوشیوں کا مول کبھی نہیں کرے گا۔ اگر ایسا ہوتا تو اب تک وہ ہزار بار ہاں کر چکا ہوتا اور میری شادی بھی کر دی ہوتی۔ پر وہ مجھ سے پیار کرتا ہے۔ میری خوشیوں اور زندگی کو اپنی ضرورت پر قربان نہیں کرنا چاہتا۔ پر تو ہی بیچ منجدھار میں چھوڑ دے گا تو پھر اور کیا ہو گا؟ کیا میں ساری عمر کنواری بیٹھی رہوں گی؟ اور پھر یہ بتا کہ ملک یعقوب کے بیٹے میں خرابی کیا ہے؟ پیسے والا ہے۔ زمین ہے مویشی ہیں۔ نیک طبیعت ہے سارا گاؤں اس کی شرافت کی تعریف کرتا ہے۔ اگر اس کا باپ مجھ ایسی غریب لڑکی کو اپنے گھر کی بہو بنانا چاہتا ہے تو یہ تو اس کی بڑائی ہے۔ تعریف کی بات ہے۔ ایسے لوگ آس پاس کے گاؤں دیہات میں اور کتنے ہیں؟ بول؟"

منظور خاموش اسے گھورتا رہا۔ صاف ظاہر ہے کہ اس کے پاس اُس سچائی کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ ایک کمزور شخص تھا جو کسی مقصد کے لیے تن کر کھڑا ہونے کی خوبی سے محروم تھا۔ پھر بھی وہ سارا الزام ایک کمزور لڑکی کے سر تھوپ رہا تھا جو اُس سے کہیں زیادہ دلیر، جرأت مند اور سمجھدار تھی۔

شاداں ایک لمحہ اُسے دیکھتی رہی۔ پھر مُڑتے ہوئے بولی "اب میں چلوں گی۔ رات ہونے لگی ہے۔"

منظور نے پُکارا: "پھر کب ملے گی؟"

"کبھی نہیں۔" شاداں تیزی سے جاتے ہوئے بولی۔

منظور لپک کر اس کے پاس پہنچ گیا اور دُکھ بھرے لہجے میں کہنے لگا "کیا کہہ رہی ہے شاداں؟ ہم دونوں بچپن کے ساتھی ہیں۔"

"بچپن کے ساتھی ضرور ہیں پر جیون ساتھی نہیں بن سکتے۔ دیکھ منظور۔ میرا باپ بہت شریف اور نیک ہے۔ وہ مجھ سے پیار بھی ڈھیر سارا کرتا ہے تو پھر میرا بھی فرض ہے کہ اسکی عزت کو بٹہ نہ لگاؤں۔ اب میرا تجھ سے چھپ چھپ کر ملنا ٹھیک

نہیں ہے۔ غریبوں پر لوگ بڑی جلدی الزام لگا دیتے ہیں۔"

منظور اس کے ساتھ چلنے لگا۔ وہ بے چین اور پریشان نظر آ رہا تھا۔ "شاداں کیا ہم ہمیشہ کے لیے الگ ہو جائیں گے؟"

"یہ فیصلہ کرنا تیرا کام ہے اور کان کھول کر سُن لے منظور۔ اگر مجھ سے شادی کرنی ہے تو اپنے باپ سے صاف صاف بات کر۔ اسے بتا دے کہ میرے سوا کسی اور سے شادی نہیں کرے گا۔ جو باتیں مجھ سے کہتا رہتا ہے وہ اپنے باپ کے سامنے بھی کرنے کی ہمت پیدا کر اور اگر ایسا نہیں کر سکتا تو پھر میرا اور تیرا راستہ الگ الگ ہے۔"

شاداں مضبوط آواز اور مستحکم لہجے میں اپنا فیصلہ سُنا چکی تھی اور صاف ظاہر تھا کہ اس نے جو کچھ کہا ہے اس پر عمل بھی کرے گی۔ منظور کے قدموں میں شکست خوردگی پیدا ہو گئی تھی۔ یوں لگتا تھا وہ سوچ رہا ہے۔ غور کر رہا ہے۔ شاداں کے الفاظ نے اس کے دل و دماغ پہ اثر کیا ہے اور وہ یہ محسوس کر رہا ہے کہ وہ بالکل حق بجانب اور سچی ہے۔

مجھے اس وقت منظور پر بے اختیار ترس آ گیا۔ وہ کمزور ارادے کا آدمی تھا لیکن صاف ظاہر ہے کہ شاداں سے سچی محبت کرتا تھا۔ باپ کی سخت گیری کے باعث وہ مُنہ نہیں کھول سکتا تھا، لیکن وہ دل کی گہرائیوں سے شاداں کو چاہتا تھا اور اس سے علیحدہ زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے لہجے کا خلوص اور درد اس کے جذبے کی گہرائیوں کا مظہر تھا۔ کاش وہ عملی آدمی ہوتا اور ایک جواں مرد کی طرح آگے بڑھ کر شاداں کا ہاتھ تھام لیتا اور ساری دُنیا کو للکار کر بتا دیتا کہ وہ اپنی خوشیوں کا مول کسی قیمت پر بھی نہیں کرے گا۔

یکایک گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں سنائی دیں۔ منظور اور شاداں تو ٹھٹک کر رک ہی گئے تھے خود مجھے بھی اپنے جسم میں سردی کی لہر سی دوڑتی محسوس ہونے لگی۔ خدایا۔ کیا کوئی نئی آفت نازل ہونے والی ہے؟ میں نے سوچا۔

دوسرے ہی لمحہ درختوں کے پیچھے سے چار گھوڑ سوار نمودار ہوئے۔ اُنہوں نے ڈھاٹے باندھ رکھے تھے اور سیاہ کپڑوں میں ملبوس تھے۔ ان کے ہاتھوں میں بندوقیں ظاہر کر رہی تھیں کہ وہ جرائم پیشہ لوگ ہیں۔ شاداں بے اختیار سمٹ کر منظور کے نزدیک پہنچ گئی جو حیرانی سے سواروں کو دیکھ رہا تھا۔ شہسوار ان دونوں کے نزدیک پہنچ کر رک گئے اور پھر ان میں سے ایک شخص گھوڑے سے کود کر نیچے اُترا۔

"کون ہے تو؟" اس نے درشتی سے سوال کیا۔ اس کے سوال کا رُخ شاداں کی طرف تھا۔

"میں شاداں ہوں اور تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟"

شہسوار نے سر سے پیر تک شاداں کا جائزہ لیا اور پھر ہنسا۔ "ہمارا نام بادل ہے۔ کبھی سُنا ہے؟"

شاداں سہم کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ منظور نے غیر ارادی طور پر اپنا بازو اس کے شانے کے گرد رکھ دیا۔ "بادل ڈاکو؟" بے ساختہ اس کے مُنہ سے نکلا۔

بادل زور سے قہقہہ لگا کر ہنسا پھر اس نے اپنے چہرے پہ بندھا ہوا ڈھاٹا کھول دیا۔ وہ درمیانی عمر کا ایک کرخت اور بدشکل آدمی تھا۔ اس کے چہرے پر بڑی بڑی مونچھوں اور بائیں رُخسار پر زخم کے ایک نشان کی وجہ سے اس کا چہرہ مزید بدصورت اور ڈراؤنا ہو گیا تھا۔

"ٹھیک پہچانا۔" وہ مونچھوں پر تاؤ دے کر بولا۔ "آج ہم نے اس باغ میں ڈیرا لگانے کا فیصلہ کیا ہے۔ قدرت کی مہربانی دیکھو کہ دل بہلانے کا سامان بھی یہاں پہنچا دیا۔"

یہ کہہ کر وہ پُر زور آواز میں قہقہہ لگا کر ہنسا۔ اس کے باقی تین ساتھی بھی ہنس رہے تھے۔ وہ تینوں بھی گھوڑوں سے نیچے اُتر آئے اور گھوڑوں کی لگامیں تھامے ہوئے شاداں اور منظور کی طرف بڑھے جو تیز نظروں سے اس کو گھور رہا تھا۔

"ارے یہ کون ہے؟" بادل نے منظور کی طرف بندوق سے اشارہ کر کے پوچھا۔

"میرا نام منظور ہے۔ گاؤں کے چوہدری کا بیٹا ہوں۔"

"پھر تو بڑی قیمتی شے ہے بھئی۔ ٹھنڈی ہے ٹھنڈی۔ ٹھیک ہے۔ تجھے بھی ہم بھُنائیں گے۔" یہ کہہ کر اُس نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ دو ڈاکوؤں نے آگے بڑھ کر منظور کے دونوں بازو تھام لیے۔

"لے جاؤ اسے۔" بادل گرج کر بولا۔

مگر منظور نے ایک جھٹکے سے اپنے بازو چھڑا لیے اور غصّے سے بولا "میں اسے چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔"

"بہت پیارا ہے اس سے؟" بادل نے طنزیہ انداز میں پوچھا اور پھر منظور کے جواب کا انتظار کیے بغیر اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا "بھئی یہ آج کا مجنوں ہے۔ میرا تو خیال تھا کہ غیرت والا ہوگا۔ پر یہ تو ادھر سے جانا ہی نہیں چاہتا۔ ٹھیک ہے بے چارے بھی تماشا دیکھنے دو۔ اسے سامنے والے درخت سے باندھ دو۔"

دو ڈاکو منظور کی طرف بڑھے مگر وہ پھرتی سے اُچھل کر اُن سے دُور پہنچ گیا اس سے پہلے کہ چوتھا ڈاکو چوکنا ہو سکتا منظور اس پر آندھی کی طرح ٹوٹ پڑا۔ اس نے پوری قوت سے اس کے سینے پر اپنے سر سے ضرب لگائی اور وہ توازن قائم نہ رکھ سکا اور زمین پر گر پڑا۔ اس دوران میں ڈاکو کی بندوق منظور کے ہاتھ میں پہنچ گئی تھی۔ وہ بندوق تانے سینہ سپر ہو کر کھڑا ہو گیا اور بے خوفی سے بادل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا "بادل۔ تُو نے مجھے غلط طعنہ دیا ہے۔ میں بے غیرت نہیں ہوں نہ بُزدل ہوں۔ یہ لڑکی میری ہونے والی بیوی ہے۔ اس کو ہاتھ لگانے سے پہلے تجھے میری لاش پر سے گزرنا پڑے گا۔"

بادل اس اچانک اور غیر متوقع حملے سے ہکّا بکّا رہ گیا تھا اور آنکھیں پھاڑے منظور کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک نمودار ہوئی۔ اس سے پہلے کہ کوئی اپنی جگہ سے حرکت کرتا وہ چشم زدن میں شاداں کے نزدیک پہنچ گیا۔ اس کی بندوق کی نالی شاداں کی پتلی کمر پر ٹِک گئی اور وہ خونخوار لہجے میں بولا "تمہاری جان بخشی میں کر سکتا ہوں مگر اس البیلی نار کو نہیں جانے دوں گا۔ بندوق زمین پر پھینک دو اور چُپ چاپ چلے جاؤ۔ میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔"

"بکواس بند کرو۔" منظور گرجا۔ اس وقت وہ یکسر ایک مختلف انسان نظر آ رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے میں نے جس نرم گفتار اور مصلحت بین منظور کو دیکھا تھا وہ نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ "میں نے بتایا ہے کہ یہ میری ہونے والی بیوی ہے اور کوئی آدمی اپنی بیوی کو تم جیسے جانوروں کے حوالے کر کے نہیں جا سکتا۔"

"تم بھول رہے ہو منظور۔ خاموشی سے چلے جاؤ گے تو تمہاری جان بھی بچ جائے گی اور تمہاری دلڑیا کی بھی۔ ورنہ ضد کرو گے تو تم دونوں کی لاشیں یہاں پڑی نظر آئیں گی۔ تمہارے حرکت کرنے سے پہلے میری گولی اس کے جسم کے پار ہوگی اور اس کے بعد تمہاری باری ہے۔"

منظور غصّے سے تن کر کھڑا ہو گیا۔ وہ ڈاکو جس کی بندوق اس نے چھین لی تھی اُٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا اور منظور کی طرف بڑھ رہا تھا۔ منظور بجلی کی سی سُرعت سے گھوما اور اس کی بندوق کی نال آگے بڑھتے ہوئے ڈاکو کے سر سے ٹکرائی۔ اگر اُس نے سر پر پگڑی نہ باندھ رکھی ہوتی تو یقیناً اس کا سر ٹوٹ جاتا مگر پھر بھی اس کی ضرب سے وہ لڑکھڑایا اور دوبارہ زمین پر گر گیا۔ پھر وہ بادل ڈاکو سے مخاطب ہوا "یاد رکھو۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا مگر اپنی آنکھوں کے سامنے بے عزت ہوتے ہوئے بھی نہیں دیکھوں گا۔ عورت کی آبرو ہی اس کا زیور ہوتا ہے۔ اس کے بغیر اس کی زندگی بیکار ہے۔ میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ اپنی آنکھوں کے سامنے شاداں کو مرتے ہوئے دیکھنا منظور ہے مگر یہ مت بھولو کہ مرنے سے پہلے تم میں سے بھی ایک دو کو ساتھ لے کر جاؤں گا۔"

اس دوران میں منظور کی تمام تر توجہ بادل اور شاداں کی طرف مبذول تھی۔ بادل کے باقی دو ساتھیوں میں سے ایک نے اس ایک لمحے کی غفلت سے فائدہ اُٹھایا اور ہوا میں چھلانگ لگا دی۔ یوں لگا جیسے وہ فضا میں پرواز کرتا ہوا منظور پر جا گرا ہو۔ ظاہر ہے کہ منظور اس اچانک حملے کے لیے مطلق تیار نہ تھا۔ بندوق اس کے ہاتھ سے گر گئی اور وہ اپنے قدموں پر کھڑا نہ رہ سکا۔ زمین پر گرنے والی بندوق اسی ڈاکو نے اُٹھائی جس سے منظور نے چھینی تھی۔ اب منظور بے سہارا اور نہتا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ

زمین سے اُٹھ کر کھڑا ہوتا ایک ڈاکو کی ٹھوکر نے اُسے دوبارہ زمین پر اُلٹا دیا اور بندوق کی نال اس کے سینے پر رکھ دی۔ اب صورتِ حال بالکل تبدیل ہو چکی تھی۔ منظور بے دست و پا اور بے قابو ہو چکا تھا۔ شاداں بادل کے رحم و کرم پر تھی اور اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ بادل کے بھیانک قہقہے نے جنگل کے سنّاٹے کو توڑ دیا۔ وہ بے تحاشا اور بے اختیار ہنس رہا تھا۔ اب اُس نے بایاں ہاتھ آگے بڑھا کر شاداں کا بازو بھی مضبوطی سے تھام لیا تھا اور وہ اس کی گرفت سے آزاد ہونے کے لیے پوری طاقت استعمال کر رہی تھی مگر ایک صحت مند اور مضبوط دیہاتی لڑکی ہونے کے باوجود وہ بادل ڈاکو جیسے دیو قامت اور طاقت ور شخص کے سامنے بالکل بے بس نظر آ رہی تھی۔ بادل کے تینوں ساتھی بھی اپنی مکروہ آواز وں کے ساتھ اس کے قہقہے میں شامل ہو گئے تھے۔ منظور کے اُوپر کھڑے ہوئے ڈاکو نے اپنی بندوق اُٹھائی اور پوری قوت کے ساتھ منظور کے سینے پر دے ماری۔ منظور کے مُنہ سے بے اختیار ایک چیخ نکل گئی۔ شاداں تڑپ کر اس کی طرف بڑھی مگر وہ بادل ڈاکو کی آہنی گرفت میں محض تھرتھرا کر رہ گئی۔ ڈاکو نے دوبارہ ضرب لگانے کے لیے بندوق اٹھائی اور شاداں کے لبوں سے ایک چیخ کی آواز نکلی۔

اب میرے حرکت میں آنے کا وقت آ گیا تھا۔ میں درخت کی اوٹ سے نکل کر آہستگی سے آگے بڑھا اور برق کی طرح بادل ڈاکو کے سر پر پہنچ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھل سکتا اُس کی بندوق میرے ہاتھوں میں منتقل ہو چکی تھی اور اس کی نالی بادل کے سینے پر تھی۔ سب لوگ اپنی اپنی جگہ حیران اور ہکّا بکّا رہ گئے۔

میں نے انتظار کیے بغیر بادل کے چہرے پر ایک بھرپور گھونسہ رسید کیا اور وہ لڑکھڑا کر دُور جا گرا۔ اس نے اُٹھنے کی کوشش کی مگر میری بھرپور ٹھوکر نے اسے دوبارہ زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے ساتھی اس اثنا میں سنبھل چکے تھے اور پوزیشنیں سنبھال کر میری طرف بڑھ رہے تھے۔ میں نے اپنی بندوق کی نالی بادل کے سینے پر ماری اور وہ بلبلا کر رہ گیا۔ پھر میں اس کے ساتھیوں سے مخاطب ہوا جو اپنی اپنی جگہ رُک کر کھڑے ہو گئے تھے "اگر کسی نے اپنی جگہ سے ایک اِنچ بھی حرکت کی تو بادل زندہ نہیں بچے گا۔ اگر اس کی خیر چاہتے ہو تو اپنی اپنی بندوقیں زمین پر پھینک دو۔"

وہ اتنے مرعوب اور خائف ہو چکے تھے کہ انہوں نے بلا تامّل میری ہدایت پر عمل کیا۔ اتنی دیر میں منظور بھی زمین سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس بار میں اس سے مخاطب ہُوا "منظور۔ ان لوگوں کے پاس مضبوط لمبی سی رسّی ضرور ہوگی۔ رسّی نکال کر ان سب کو مضبوطی سے باندھ دو۔"

منظور نے ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر میری ہدایت پر عمل کیا۔ رسّی ایک گھوڑے کی کاٹھی سے بندھی ہوئی تھی سان چاروں کو یکجا کر کے مضبوطی سے باندھنے کے بعد منظور میری طرف متوجہ ہوا۔ اب ڈاکوؤں کی نگاہیں بھی مجھ پر لگی ہوئی تھیں اور شاداں بھی قدرے حیرانی سے میرے لباس کو اور مجھے دیکھ رہی تھی۔

میں منظور کے پاس گیا اور میں نے کہا "منظور ایک گھوڑا تم کھول کر آزاد کر دو اور تم دونوں دو گھوڑے لے کر چلے جاؤ۔"

"مگر ہمارا گاؤں یہاں سے زیادہ دُور نہیں ہے۔"

"پھر بھی تم دونوں گھوڑوں پر سوار ہو کر جاؤ اور تھانے میں پہنچ کر رپورٹ لکھوا دو۔ مناسب سمجھو تو شاداں کو راستے میں اس کے گھر چھوڑ دینا۔"

منظور نے ایک لمحے مجھے دیکھا۔ پھر جذباتی لہجے میں بولا "آپ کون ہیں جو فرشتہ بن کر ہماری مدد کو آ گئے۔"

میں ہنسا "اللہ تعالیٰ نے مجھے تمہاری مدد کے لیے بروقت بھیج دیا، مگر میں فرشتہ نہیں ہوں۔" پھر میں شاداں سے مخاطب ہُوا "شاداں۔ تم نے کچھ دیر پہلے منظور سے جو باتیں کی تھیں وہ میں نے سُن لی ہیں۔ اس میں واقعی اخلاقی جرأت کی کمی ہے۔ یہ اپنے باپ کے سامنے سر اُٹھانے کی ہمت نہیں رکھتا مگر تم نے دیکھ لیا کہ یہ تمہاری خاطر کتنی بے خوفی سے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑا ہو گیا۔ تم نے اسے ڈرپوک ہونے کا طعنہ دیا تھا مگر یہ ڈرپوک نہیں ہے۔ اس کی قدر کرنا اور اگر ہو

سکے تو اس کا ساتھ دینا۔"

شاداں اور منظور کی آنکھوں میں حیرانی تھی اور پھر وہ آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ ان دونوں نے آبدیدہ ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور بے اختیار ایک دوسرے سے لپٹ کر رونے لگے۔ یہ منظر میرے لیے بھی متاثر کن تھا مگر وقت زیادہ نہیں تھا، اس لیے میں نے غیر جذباتی لہجے میں کہا۔ "دیر نہ کرو۔ ابھی مجھے اور بھی بہت سے کام کرنے ہیں۔"

وہ دونوں خاموشی سے آگے بڑھ کر گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ تیسرے گھوڑے کی لگام بھی منظور نے اپنے ہاتھ میں لے لی۔ ذرا دیر کے لیے انہوں نے رک کر میری طرف دیکھا۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ پھر کچھ بولے بنا وہ رخصت ہو گئے۔ میں انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ اُن کے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں بہت دُور چلی گئیں۔ اب تاریکی پھیل چکی تھی مگر رات زیادہ اندھیری نہیں تھی۔

میں بادل ڈاکو کی طرف بڑھا۔ وہ خاموش کھڑا بڑی بے بسی سے مجھے گھور رہا تھا۔ "تم اپنے آپ کو ڈاکو کہتے ہو۔ کتنے بزدل اور کمینے ہو تم؟ اُچکے ہو۔ اکیلی عورتوں کی عزت لوٹنے پہ تل جاتے ہو۔ بے غیرتی اور بے شرمی تمہارے خون میں رچی ہوئی ہے۔ تمہیں اپنے آپ کو ڈاکو کہتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔"

"مگر تم خدائی فوجدار کون ہو اور کہاں سے آ گئے ہو؟" وہ بدتمیزی سے غرّایا۔

میں نے جواب میں ایک بھرپور تھپڑ اس کے مکروہ چہرے پر رسید کیا جس کی آواز سارے جنگل میں گونج اٹھی۔ "بکو مت مجھے خدائی فوجدار ہی سمجھ لو۔ مجھے خدا نے اُن معصوموں کی مدد کے لیے بھیجا ہے۔ تمہاری بہادری میں دیکھ چکا ہوں۔ اب میں تمہاری بزدلی دیکھ رہا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے اس کے جسم کے ارد گرد لپٹی ہوئی رسی ڈھیلی کر دی۔ "آگے آؤ اور اپنے ان تینوں ساتھیوں کو مضبوطی سے دوبارہ باندھ دو۔"

اس کے پاس میرا حکم ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ خاموشی سے اس نے میری ہدایت پر عمل کیا اور پھر میری طرف دیکھنے لگا۔

"اب اپنے کپڑے اُتار دو۔"

"کیا؟" وہ چونک کر بے اعتباری سے بولا۔

"اپنے کپڑے اُتار دو۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "اگر دیر کی تو یہ بندوق دیکھ رہے ہو؟"

اس نے ڈرتے ہوئے میری ہدایت پر عمل کیا۔ اگرچہ اندھیرا تھا پھر بھی وہ سمٹ کر زمین پر بیٹھ گیا۔ میں نے اس کا لباس سمیٹ کر اٹھا لیا اور گھوڑے کی طرف بڑھا۔ "آگے آ کر اس گھوڑے پر سوار ہو جاؤ۔"

اس نے پریشانی اور خوف سے مجھے دیکھا مگر میرے حکم کی تعمیل میں مطلق دیر نہیں لگائی۔ میں اس کے پیچھے گھوڑے پر بیٹھ گیا اور گھوڑا میرے اشارے پہ دوڑنے لگا۔ باغ سے نکل کر ہم کھیتوں میں آ گئے۔ مجھے سمتوں کا کوئی اندازہ نہیں تھا اور نہ ہی راستوں کا علم تھا مگر بس ایک جانب گھوڑا دوڑاتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک دو میل آگے چل کر پھر درختوں کا ایک ذخیرہ نظر آ گیا۔ میں نے گھوڑا روکا اور نیچے اُتر آیا۔ بادل ڈاکو اب پوری طرح سہما ہوا تھا اور انتہائی خوفزدہ نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ "گھوڑے سے اُتر جاؤ۔"

وہ کود کر اتر تو گیا مگر دونوں ہاتھ جوڑ کر دو زانو بیٹھ گیا اور گھگھیا کر بولا۔ "بھگوان کے لیے مجھے معاف کر دو۔ مجھے جان سے نہ مارو۔ میرے اُوپر رحم کرو۔"

میں ایک لمحے اسے دیکھتا رہا۔ یہ شخص جو کچھ دیر پہلے فرعون بے سامان بنا ہوا تھا۔ اس وقت کتنا بزدل اور حقیر نظر آ رہا تھا۔ "فکر نہ کرو بادل۔ میں تم جیسے بزدل کے خون سے ہاتھ نہیں رنگوں گا۔"

وہ بے اعتباری سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔ "اٹھو کر کھڑے ہو جاؤ اور سامنے درختوں کے ذخیرے میں چلے جاؤ جب

تک پولیس تمہاری کھوج میں نہ آئے تم یہیں چھپے رہنا۔ ظاہر ہے کہ اپنے پیدائشی لباس میں تم کہیں اور جانا پسند نہیں کرو گے۔"

وہ خاموش ڈری ہوئی نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔ "دیر مت کرو۔ بھاگو۔ تیزی سے بھاگو۔" وہ بے اختیار درختوں کے جھنڈ کی طرف بھاگا مگر پھر یکایک رُک کر میری طرف دیکھنے لگا۔ وہ بذاتِ خود ایک بزدل اور دغاباز انسان تھا اسے ڈر تھا کہ کہیں میں پیچھے سے اس پر گولی نہ چلا دوں۔

"میں نے کہا ہے نا کہ میں تم جیسے بزدل کتوں کے خون سے ہاتھ نہیں رنگوں گا۔ تیزی سے بھاگو۔" شاید اسے میری بات کا یقین نہیں آیا تھا پھر بھی وہ تیزی سے دوڑتا ہوا درختوں کی طرف چلا گیا یہاں تک کہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

میں نے اطمینان کا لمبا سانس لیا اور گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد میں نے گھوڑے سے اُتر کر اپنا جنگلی لباس اُتار کر بادل ڈاکو کا لباس زیب تن کر لیا۔ اپنا لباس میں نے اُچھال کر دُور پھینکا اور دوبارہ اپنی اَن جانی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ بادل ڈاکو کی طرف سے میں مطمئن تھا۔ وہ لباس کے بغیر درختوں کے ذخیرے سے باہر آنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ جب تک منظور پولیس لے کر آئے اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کر لے وہ بھی یقیناً اسی جگہ چھپے رہنے پر مجبور تھا۔ منظور اور شاداں کی پیار کہانی کا کیا انجام ہو گا؟ میں نے یہ فیصلہ بھی خدا پر چھوڑ دیا تھا۔ اب میں ایک بار پھر اپنے بارے میں سوچ رہا تھا۔ یہ کون سا علاقہ ہے؟ اور میں کتنی دیر تک اپنی تلاش کرنے والوں سے محفوظ رہ سکتا ہوں؟

گھوڑا تیز رفتار تھا۔ اس نے بہت جلد مجھے میلوں آگے پہنچا دیا۔ ابھی تک راہ میں مجھے کوئی آبادی نظر نہیں آئی تھی۔ یہ ایک پتھریلا پہاڑی علاقہ تھا۔ کافی فاصلے پر مجھے بلند پہاڑوں کی چوٹیاں بھی دھندلی نظر آ رہی تھیں۔

یکایک موٹر انجن کی آواز میرے کانوں میں آئی اور میں نے گھوڑے کی لگامیں کھینچ لیں۔ آس پاس ایک ٹیلے کے سوا کوئی اور چھپنے کی جگہ نہ تھی۔ میں نے گھوڑے کو موڑا اور ٹیلے کی اوٹ میں پہنچ گیا۔ انجن کی آواز قریب تر آ گئی اور مجھے گاڑیوں کی روشنیاں چمکتی ہوئی صاف نظر آنے لگیں۔ اب میں جان چکا تھا۔ یہ دو جیپیں تھیں جو تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھیں مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں گھوڑا بے چین ہو کر کوئی آواز نہ نکالے۔ میں نے گھوڑے کو پیار سے چمکارا اور آہستگی سے اس کے جسم کی مالش کرنے لگا۔ میں جانتا تھا کہ گھوڑے کو رشوت دینے کا اس سے بہتر طریقہ کوئی اور نہیں تھا۔

جیپ گاڑیاں تھوڑے فاصلے سے میرے سامنے سے گزر کر اُسی طرف چلی گئیں جدھر سے میں آیا تھا۔ یہ فوجی گاڑیاں تھیں۔ ہر گاڑی میں ڈرائیور کے علاوہ تین اور فوجی بھی سوار تھے اور وہ پوری طرح مسلح تھے۔ جیپیں میرے سامنے سے گزر کر چلی گئیں مگر مجھے پریشانی اور فکر میں مبتلا کر گئیں۔ اس دُور دراز دیہاتی علاقے میں رات کے وقت فوجی جیپ گاڑیاں کس طرف اور کس لیے مصروفِ سفر تھیں۔ کیا اُن لوگوں کو میری تلاش تھی؟!

جیپوں کی آواز دُور ہو گئی یہاں تک کہ معدوم ہو گئی تو میں ٹیلے کی اوٹ سے نکلا اور گھوڑے پہ سوار ہو گیا۔ جس طرف سے جیپ گاڑیاں نمودار ہوئی تھیں اُس طرف جانا بھی خطرے سے خالی نہ تھا اس لیے میں نے ایک تیسری سمت سفر کرنے کا قصد کیا۔ گھوڑا اشارے کا منتظر تھا۔ ایڑی کے ایک ہی اشارے پہ ہوا ہو گیا۔ نہ جانے کتنی دیر میں سفر کرتا رہا یہاں تک کہ کچھ فاصلے پہ مجھے اونچائی پہ ایک بنگلہ نما گھر نظر آیا۔ پہلے تاریکی میں اس کا ہیولا نظر آیا اور اس کے بعد مدھم روشنی بھی ٹمٹماتی ہوئی نظر آنے لگی۔ میں نے گھوڑے کو روک لیا اور دُور سے اس واحد عمارت کا جائزہ لینے لگا مگر مجھے سوچنے اور فیصلہ کرنے کے لیے زیادہ مہلت نہ مل سکی۔ ہیلی کاپٹر کی جانی پہچانی آواز ایک بار پھر میرے کانوں میں گونجنے لگی۔ میں نے فوری طور پہ ایک فیصلہ کیا اور گھوڑے سے اُتر کر اس کی پیٹھ پہ ایک زوردار ہاتھ رسید کیا۔ گھوڑا تڑپ کر اُچھلا اور تیر کی طرح ایک طرف کو روانہ ہو گیا۔

میں نے ٹیلوں پر چڑھ کر بنگلے تک پہنچنے کا ارادہ کر لیا۔ یہ ایک وسیع و عریض بنگلہ تھا جس کے آس پاس دُور دُور تک باغ اور میدان پھیلا ہوا تھا۔ ایک خاردار تار کے ذریعے اس کی حدود کی حد بندی کر دی گئی تھی۔ میں نے خاردار تار کو پھلانگ کر

جیسے ہی بنگلے کی حدود میں قدم رکھا، تاریکی میں سے ایک قدآور اور خوفناک کتا بھونکتا ہوا میری طرف لپکا اور میری رُوح فنا ہو گئی۔ کتا مجھ سے قدرے فاصلے پر تھا مگر جس برق رفتاری سے وہ میری طرف لپکا ہوا آرہا تھا اس سے صاف ظاہر تھا کہ چند لمحے بعد وہ میرے سر پر پہنچ چکا ہوگا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور بنگلے کی عمارت کی طرف دوڑ لگا دی۔ مجھے اپنے تیز دوڑنے پر ناز تھا لیکن کتا ہرن کی طرح چھلانگیں لگاتا ہوا تیزی سے میری طرف بڑھ رہا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ میرے نزدیک پہنچ گیا۔ اب اس کا سامنا کرنا لازمی تھا۔ وہ تیزی سے لپکا ہوا آرہا تھا۔ میں اچانک رُکا اور تھوڑا سا راستہ کاٹ کر اس کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ کتا اپنی تیزی میں چند قدم آگے نکل گیا مگر پھر تیزی سے پلٹا اور اس بار غرّاتا ہوا مجھ پر حملہ آور ہوا تو میں نے بندوق کا بٹ گھما کر مارا۔ ایک چیخ کی آواز اس کے منہ سے نکلی اور وہ چلاتا ہوا زمین پر گر گیا۔ میں اتنی دیر میں اس کا جائزہ لے چکا تھا۔ وہ ایک جسیم اور بھاری بھرکم کتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے جسم سے ٹکرانے کے بعد بندوق میرے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری تھی۔ کتے کو بھی چوٹ آئی ہوگی مگر میں اس نسل سے واقف تھا۔ جب تک جان میں جان رہے گی وہ اپنے شکار کا پیچھا ہرگز نہیں چھوڑے گا۔ یہ اس قسم کا کتا تھا جو زمیندار شکار کے لیے پالتے ہیں اور یہ اس قدر خونخوار اور بے جگر ہوتے ہیں کہ آمنا سامنا ہونے پر بھیڑیوں اور چیتوں تک سے لڑ پڑتے ہیں مگر ان کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ میں نے اس کے اُٹھنے کا انتظار کیے بغیر پوری طاقت سے بنگلے کی جانب دوڑ لگائی مگر وہ بلائے بے درماں کی طرح میرے تعاقب میں تھا۔ بنگلے کے چاروں طرف ایک برآمدہ تھا اور عین سامنے ایک پھلدار درخت لگا ہوا تھا۔ میرے پاس زیادہ مہلت نہ تھی اس لیے میں نے درخت کا رُخ کیا اور نہایت تیزی سے اس پر چڑھنا شروع کر دیا۔ کتا مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ وہ اپنے دانت نکالتے ہوئے میرے پیچھے درخت پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا اس کے دانت اور گرم سانس میں نے اپنے پیروں کے نزدیک محسوس کی مگر میں اس سے زیادہ پھرتیلا ثابت ہوا۔ اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ مجھ پر حملہ آور ہوتا میں نہایت تیزی سے درخت پر چڑھ گیا۔ کتا اپنے شکار کو ہاتھ سے نکلتے ہوئے دیکھ کر غصے سے بے قابو ہو کر بے تحاشا بھونک رہا تھا اور اُچھل اُچھل کر درخت پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اگر خالق نے کتوں کو بھی اپنی طرح درختوں پر چڑھنا سکھا دیا ہوتا تو اس وقت میرا کیا حشر ہوتا؟ یہ سوچ کر میرے جسم کا رُواں رُواں کھڑا ہو گیا۔ مگر فی الوقت میں اس کی ظالمانہ پہنچ سے باہر تھا اور اپنی سانسیں درست کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کتے کا غیض وغضب دیدنی تھا۔ اس کی آواز اتنی بھاری اور بلند تھی کہ یقیناً آس پاس کے علاقوں تک پہنچ رہی ہو گی۔ رات کی تنہائی اور سناٹے میں اس کی آواز نے دُور دُور تک کے رہنے والوں کو میری آمد سے باخبر کر دیا ہوگا۔

بنگلے کی جانب مکمل خاموشی تھی۔ نہ جانے اس میں کوئی موجود بھی تھا یا نہیں، لیکن اتنی دیر میں تو گہری سے گہری نیند سوئے ہوئے لوگ بھی اُٹھ سکتے تھے۔ میرے لیے اس درخت پر زیادہ دیر تک موجود رہنا کسی طرح بھی مناسب اور محفوظ نہ تھا۔ کسی لمحے بھی کوئی نمودار ہو سکتا تھا اور اس خوفناک کتے کی موجودگی میں میرا پکڑا جانا یقینی تھا۔ یہ سوچ کر میں نے درخت اور بنگلے کی چھت کے درمیانی فاصلے کا جائزہ لیا جو دس بارہ فُٹ کے لگ بھگ تھا۔ کوئی دوسرا چارہ نہ پا کر میں نے اپنے جسم کو تولا اور اللہ کا نام لے کر بنگلے کی کھپریل کی چھت کی جانب چھلانگ لگا دی۔ لمبی چھلانگیں میں کالج کے زمانے میں بھی لگاتا رہا تھا اور پھر فوجی تربیت کے زمانے میں بھی لمبی چھلانگوں کی مزید تربیت حاصل کر چکا تھا۔ مگر یہ میری زندگی کی سب سے اہم اور دُشوار ترین چھلانگ تھی۔ کتا میری طرف دیکھتا ہوا لپکا۔ وہ اس بات کا منتظر تھا کہ میں زمین پر گروں اور وہ میری تکا بوٹی کر ڈالے مگر میری قوتِ ارادی ایک بار پھر کام آئی اور میں بنگلے کی چھت پر پہنچ گیا مگر ابھی اطمینان کی سانس بھی نہیں لینے پایا تھا کہ چھت کے کھپریل اپنی جگہ سے ہٹنے لگے اور میں نیچے کی جانب پھسلنے لگا۔ میں چھت کو پکڑنے کی کوشش میں جتنے ہاتھ پیر مارتا تھا کھپریل اسی قدر زیادہ تیزی سے پھسلتے تھے۔ یہ چند لمحے میری زندگی کے سب سے اذیت بخش اور فیصلہ کُن لمحے تھے۔ میں اپنی جان بچانے کی جدوجہد کر رہا تھا اور اتنے بہت سے مُشکل مراحل سے بچ نکلنے کے بعد خونخوار کتے کے ذریعے جان دینا مجھے قطعی گوارا نہیں تھا۔ میں نے ایک بار پھر چھت کو مضبوطی سے تھامنے کے لیے کوئی سہارا تلاش

کرنے کی کوشش کی مگر بے سُود۔ اس بار میں تیزی سے پھسلتا ہوا نیچے کی طرف جا رہا تھا۔ اب کتے سے محفوظ رہنے کے لیے میرے پاس کوئی صورت نہ تھی۔ میری ٹانگیں اور نچلا دھڑ چھت پر سے نیچے لٹک چکا تھا۔ محض بالائی دھڑ چھت پر تھا۔ کتے کے غضب ناک انداز سے بھونکنے اور غرّانے کی آوازیں اب مجھے کہیں دُور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ چند لمحوں بعد میں اس خونخوار کتے کے دانتوں اور جبڑوں کا نشانہ بننے والا تھا۔ خدا کے سوا اب مجھے اس سے بچانے والا کوئی اور نہ تھا، لیکن میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ نہتا ہونے کے باوجود آسانی سے اس کا نشانہ نہیں بنوں گا۔

میرے قدم فرش سے ٹکرائے اور میں اپنے تمام حواسوں اور جسم کی توانائیوں کو اکٹھا کر کے اس درندے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا مگر یکایک میں نے محسوس کیا کہ کتے کے بھونکنے کی آواز رُک چکی ہے اور ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ خونخوار اور وحشی کتا مجھے ایک طرف بیٹھا نہایت شرافت سے دُم ہلاتا ہوا نظر آیا۔ اس کے نزدیک ہی دو پتلون میں لپٹی ہوئی ٹانگیں تھیں اور پھر نظریں کچھ اور اُوپر اُٹھیں تو میں نے ان ٹانگوں کے مالک کے جسم کا بقیہ حصہ بھی دیکھ لیا۔ وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ اس کے بال شانوں تک تراشے ہوئے تھے۔ رنگ سُرخ و سفید تھا اور چہرے کے نقوش انتہائی دلکش اور تیکھے۔ وہ اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے خاموش کھڑی مجھے تک رہی تھی۔ سر پہ سیاہ پگڑی تھی۔ میں اس حلیے میں نہ جانے کیسا نظارہ پیش کر رہا تھا۔ اب میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے پوری طرح بہرہ ور ہو چکا تھا اور اُس سیاہ تراشے ہوئے بالوں والی لڑکی کا تراشا ہوا جسم دیکھ کر قدرت کی صناعی کو داد دے رہا تھا۔ اتنی خوبصورت صحت مند، متناسب اور رعنا لڑکی میں نے زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی اور یہ بھی حقیقت ہے کہ میں اپنی زندگی میں بیشمار مختلف قسم کی لڑکیاں دیکھنے کا شرف حاصل کر چکا تھا۔ مگر یہ نمونہ بالکل الوکھا اور نرالا تھا اور انتہائی دلکش بھی۔

وہ لڑکی دونوں ہاتھ اپنی پتلی کمر پر رکھے ہوئے کھڑی مجھے یوں دیکھ رہی تھی جیسے میں انسان نہیں، دُنیا کا آٹھواں عجوبہ تھا ہم دونوں کی نگاہیں پل بھر کے لیے ملیں، وہ بے باکی سے آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مجھے دیکھتی رہی مگر میں اُن سیاہ کٹورہ جیسی بڑی بڑی خوشنما آنکھوں کی تاب نہ لا سکا جن پر لمبی لمبی سیاہ پلکیں جھکی ہوئی تھیں اور میری آنکھیں خودبخود جھک گئیں۔ ایک سنسنی خیز لہر سر سے پیر تک میرے سارے جسم میں دوڑ گئی۔ ایسی ہستی پہلے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہُوا تھا۔

ایک کھنکتی ہوئی رسیلی آواز میرے کانوں تک پہنچی۔ "کون ہو تم؟ اور چھت پر کیا کر رہے تھے؟"

مجھے کچھ دیر تو جواب ہی نہ سُوجھا تو دوسری بار اس نے غصے سے پوچھا "جواب کیوں نہیں دیتے چور ہو؟"

میں نے آہستگی سے جواب دیا "نہیں۔"

"پھر کون ہو اور وہاں چھت پر کیوں چڑھے تھے؟"

"میں راہ گیر ہوں۔ کھانے پینے کی تلاش میں اندر آیا تھا مگر یہ کتا میرے پیچھے پڑ گیا۔"

"مگر چھت پر تم کیسے پہنچ گئے؟"

"کتے سے جان بچانے کے لیے" میں نے سادگی سے مختصر جواب دیا۔

وہ خاموش مجھے گھورتی رہی پھر بے ساختہ ہنس پڑی۔ اس کے دانت موتیوں کی طرح ہموار اور سفید تھے۔ ہنستی ہوئی وہ اور بھی زیادہ اچھی لگ رہی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ اب اندر آ جاؤ" یہ کہہ کر وہ مُڑی اور برآمدے کی طرف چل پڑی۔ میں اُس دیو قامت کتے کی موجودگی سے بے پروا اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ کتا بھی اُٹھ کر کھڑا ہو گیا مگر لڑکی نے ڈانٹ کر کہا "جبرے۔ تم وہیں بیٹھے رہو"۔ کتا خاموشی سے دُم ہلاتا ہوا دوبارہ بیٹھ گیا۔ اسکی اطاعت اور سمجھداری پر حیران ہوتا ہوا میں لڑکی کے پیچھے برآمدے کی طرف چل دیا۔ اُس نے برآمدے میں پہنچ کر دروازہ کھولا جو مقفل نہیں تھا۔ جبرے جیسے وفادار اور خونخوار کتے کے ہوتے ہوئے دروازے کو مُقفّل کرنے کی چنداں ضرورت بھی نہیں تھی۔ لڑکی نے ایک بار بھی مُڑ کر نہیں دیکھا اور دروازہ کھلا چھوڑ

کر اندر چلی گئی۔ بنگلے کے اندر داخل ہونے سے پہلے میں نے گردن موڑ کر فرش پر بیٹھے ہوئے جبرے کو دیکھا اور پھر کچھ فاصلے پر کھڑی ہوئی سیاہ رنگ کی پرانی سی کار پر نظر پڑی جو غالباً اسی لڑکی کی ملکیت تھی۔ کتے کے بے پناہ شور و غل اور اپنی پریشانی کی بنا پر میں گاڑی کے آنے کی آواز نہیں سن سکا تھا۔ اب مجھے یہ بھی پتہ چل گیا کہ وہ حسین لڑکی اچانک کیوں کر نمودار ہو گئی تھی۔

دروازے کے اندر داخل ہونے کے بعد ایک گیلری سے گزرتے ہوئے ہم دونوں ایک کمرے میں پہنچ گئے جو غالباً ڈرائنگ روم تھا۔ کمرے میں بید کے صوفے اور کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ دیواروں پر کچھ تصویریں لگی ہوئی تھیں جن میں مختلف پہاڑی مناظر کی عکاسی کی گئی تھی۔

کمرے کے وسط میں پہنچ کر وہ رک گئی اور بولی: "بیٹھ جاؤ۔ میں تمہارے لیے کھانا لے کر آتی ہوں۔" اس بار اس کی آواز اور لہجے میں نرمی تھی۔ وہ فوراً ہی کمرے سے رخصت ہو گئی اور میں ایک گدے دار صوفے پر بیٹھ کر دیوار پر لگی ہوئی تصویروں کو دیکھنے لگا مگر حیران تھا کہ یہ خوبصورت لڑکی کون ہے اور اس ویران اور الگ تھلگ مقام پر تنہا کیوں رہتی ہے؟

کچھ دیر بعد وہ دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی تو اس کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی جو اس نے درمیان میں پڑی ہوئی بید سے بنی ہوئی میز پر رکھ دی۔ "اس وقت تو بس یہی کچھ ہے کھاؤ۔"

وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولی اور ہتھیلی پر ٹھوڑی ٹکا کر سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ اتنا شفاف اور دبلا پتلا تھا کہ میں اپنی بھوک کو بھول کر اسے تکنے میں مصروف ہو گیا۔

"اب کھاؤ نا۔ کھاتے کیوں نہیں؟" اس نے تیز آواز میں کہا تو میں نے چونک کر کھانے کا جائزہ لیا۔ ایک پلیٹ میں سادہ چاول تھے اور دوسری میں آلو کا سالن۔ میں کھانے پر ٹوٹ پڑا اور وہ خاموشی سے میرا جائزہ لیتی رہی۔ پھر وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "تم کھانا کھاؤ میں پانی لے کر آتی ہوں۔"

وہ کمرے سے چلی گئی تو کمرہ اچانک خالی خالی اور تاریک نظر آنے لگا اور مجھے پہلی بار محسوس ہوا کہ کمرے میں جلنے والا بلب اسے روشن کرنے کے لیے ناکافی ہے۔

"یہ لڑکی کون ہے؟" میں نے نوالہ چباتے ہوئے سوچا۔ "کیا یہاں تنہا رہتی ہے؟ اسے کسی چیز سے ڈر نہیں لگتا۔ ایک اجنبی مرد کو رات کے وقت اپنے گھر میں مدعو کرتے ہوئے وہ ذرا بھی نہیں گھبرائی اور نہ ہچکچائی۔ اتنی خوبصورت اور اکیلی لڑکی اور اتنی بے پروا؟!" اتنی دیر میں وہ پانی کا گلاس لے کر واپس آ چکی تھی۔ کھانا میں نے ختم کر دیا تھا اس لیے شکریے کے ساتھ گلاس اس کے ہاتھ سے لے کر غٹاغٹ چڑھا گیا۔ وہ کسی حیرت یا ناگواری کے بغیر مجھے دیکھتی رہی۔ میں اس وقت جو لباس پہنے ہوئے تھا اس کے پہننے والے سے وہ اسی قسم کی حرکتوں کی توقع رکھتی ہو گی۔

"کیا آپ یہاں اکیلی رہتی ہیں؟" میں نے گلاس ٹرے میں رکھ دیا۔

"نہیں۔ میرے چچا اور ان کے گھر والے بھی یہیں رہتے ہیں مگر آج وہ سب لوگ کہیں مہمان گئے ہوئے ہیں۔" اس نے سادگی سے کہا۔

"کمال ہے۔" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ "آپ کو اکیلے میں ڈر نہیں لگتا؟"

"ڈر کس بات کا؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"میرا مطلب ہے اس ویران جگہ پر رات کے وقت بالکل اکیلی....."

"تم چلے گئے ہو گے؟" وہ میری ادھوری بات سن کر کھڑی ہو گئی۔

"اگر مل جائے تو بڑی مہربانی ہو گی۔"

"مہربانی کی اس میں کیا بات ہے۔ یہ بتاؤ کہ کیا تم یہاں تک پیدل آئے ہو؟" "جی ہاں۔"

"کہاں سے آئے ہو؟"

میں بوکھلا گیا۔ "پتہ نہیں جی۔ میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ میں اجنبی ہوں۔ اس علاقے سے ناواقف ہوں۔"

"تو پھر یہاں آئے کیوں ہو؟"

میں اس سوال کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ "جی وہ۔ دراصل میرے ایک عزیز رہتے ہیں گلشی پور میں۔"

"گلشی پور میں؟" وہ حیران ہو کر بولی۔ "یہاں تو اس نام کی کوئی جگہ نہیں ہے۔"

"جی ہاں یہی تو بات ہے۔ پتہ نہیں کس نے مجھے ادھر کا راستہ بتا دیا۔ صبح سے ادھر ادھر بھٹک رہا ہوں۔"

"تم آئے کہاں سے ہو؟"

"بہت دور سے۔" میں نے بے ساختہ جواب دیا۔ "میرا مطلب ہے کہ..... وہ....."

مجھے کوئی جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔ مجھے قطعی یہ پتہ نہیں تھا کہ یہ کون سا علاقہ ہے..... اس کا نام کیا ہے۔ اس کے آس پاس کون سے شہر ہیں مگر اب لڑکی کا دھیان میری طرف نہیں تھا۔ وہ کان لگا کر دور سے آتی ہوئی آواز سن رہی تھی۔ میں نے بھی دور سے آتی ہوئی آواز کی طرف توجہ دی اور مجھے یہ جاننے میں دیر نہیں لگی کہ یہ آوازیں جیپ گاڑیوں کے انجنوں سے بلند ہو رہی تھیں۔ گاڑیاں تعداد میں کئی معلوم ہوتی تھیں۔ میرے کان کھڑے ہو گئے۔ بظاہر میں ان آوازوں سے بے پروا بنا ہوا تھا لیکن میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ اس ویران اور غیر آباد علاقے میں یہ جیپیں میری تلاش میں آئی تھیں۔ لڑکی کا چونکنا بھی اس بات کا ثبوت تھا کہ اس طرف عام طور پر جیپوں کا رخ نہیں ہوتا۔ لڑکی نے بے اعتباری سے باہر کی طرف دیکھا اور بولی: "جیپ کاریں؟! یہ آج اس طرف کیوں آئی ہیں؟"

"جیپ گاڑیاں تو ہر جگہ پھرتی رہتی ہیں۔" میں نے ٹوہ لینے کی غرض سے کہا۔

"نہیں۔ ہمارے علاقے میں جیپ گاڑیاں کسی مطلب کے بغیر نہیں آتیں اور یہ تو پورا کا قافلہ معلوم ہوتا ہے۔"

میں آگے بڑھ کر کشادہ کھڑکی کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ دور دور تک کا منظر میری نگاہوں کے سامنے تھا اور اونچے نیچے ٹیلوں پر بہت فاصلے پر میں تاک آڈی ترچھی دیکھ سکتا تھا لیکن اب مجھے پریشان کرنے کے لیے ان آوازوں میں ایک اور آواز کا بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ یہ ہیلی کاپٹر کی آواز تھی جسے سننے اور شناخت کرنے کے معاملے میں میرے کان مطلق دھوکہ نہیں کھا سکتے تھے۔

لڑکی بھی اب کھڑکی کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی تھی اور گرد و غبار کے بگولوں کو دیکھ رہی تھی۔ "اوہ! گاڈ" بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ "بات کیا ہے؟"

پھر وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوئی اور اس کے تیز کانوں نے ہیلی کاپٹر کی آواز بھی سن لی۔ ایک سیٹی کی آواز اس کے ہونٹوں سے نکلی اور وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "بہت عرصے کے بعد فوجی آپریشن ہو رہا ہے۔"

"فوجی آپریشن؟" میرے منہ سے نکلا۔

وہ ہنس پڑی اور اس کے ہموار دانتوں کی لڑیاں موتیوں کی طرح جگمگا اٹھیں۔ "یہ ڈاکٹروں والا آپریشن نہیں دوسری قسم کا آپریشن ہوتا ہے۔ جب فوجی لوگ کسی خاص کام کے لیے جاتے ہیں تو اسے ملٹری آپریشن کہتے ہیں مگر یہ باتیں تم جیسے دیہاتی کی سمجھ میں نہیں آئیں گی۔"

میں مسکرایا اور دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ میں دیہاتی کپڑوں میں ملبوس تھا مگر میرا یہ خیال محض ایک جھوٹا دلاسہ تھا۔ میرے دشمنوں نے بالآخر میرا کھوج لگا لیا تھا اور اب وہ بلائے بے درماں کی طرح مجھے شکار کرنے کے لیے یہاں پہنچنے والے تھے۔ لڑکی کے چہرے پر تفکر کے آثار تھے مگر وہ زیادہ پریشان نہیں معلوم ہو رہی تھی۔ میں نے قریب سے اس کا بغور جائزہ لیا اور اس کے حسن و جمال کے بارے میں میرا پہلا اندازہ بالکل صحیح ثابت ہوا۔ اس کے تراشے ہوئے بال اسکے

شانوں پہ لہرا رہے تھے اور اس کے جسم سے بھینی بھینی مہک سی اُٹھ رہی تھی۔ وہ ایک صحت مند دراز قد اور مضبوط جسم کی لڑکی تھی۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ خطرے کی صورت میں اس کے ساتھ کیا سلوک روا رکھوں؟ اور کیا میں اپنے دشمنوں سے محفوظ رہنے کے لیے اس پہ بھروسہ کر سکتا ہوں؟ مگر وہ میری مدد کرنے پر کیوں آمادہ ہو گی؛ جبکہ میں اُس کے ملک کا دشمن اور مطلوب و مفرور سپاہی ہوں، میری نظریں لڑکی پہ جمی ہوئی تھیں مگر ذہن کہیں اور تھا۔ یکایک مجھے محسوس ہوا کہ وہ بھی بڑی گہری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے معاً نظریں چُرا لیں اور باہر کی جانب دیکھنے لگا۔ لڑکی کے مُنہ سے ایک استعجابی آواز نکلی اور وہ تیزی سے کچھ دور ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اور بے یقینی کے آثار پیدا ہوئے اور اس کا چہرہ ایک دم سُرخ ہو گیا۔ اس کی نگاہیں میرے گلے پہ پڑے ہوئے لاکٹ پر جمی ہوئی تھیں جو بھاگ دوڑ کے دوران میں میرے کُرتے کے گریبان سے باہر نکل آیا تھا۔

"تم!؟" اس کی حیرت بھری آواز بلند ہوئی اور اُس نے اُنگلی سے میری جانب اشارہ کیا۔ "خاموش رہو" میں نے آہستہ مگر تحکمانہ آواز میں اسے متنبہ کیا۔ "اگر تمہارے مُنہ سے کوئی آواز نکلی تو وہ تمہاری آخری آواز ہو گی۔" اور اس کے ساتھ ہی میں نے تیزی سے جھپٹ کر اس کا بازو تھام لیا۔ شاید یہ میری سب سے بڑی غلطی اور بھُول تھی۔ وہ بجلی کی طرح پلٹی اور اُس نے مجھے اپنی کمر پہ لاد کر فرش پر پھینک دیا۔ اس کا یہ حملہ قطعی غیر متوقع اور ناقابل یقین تھا۔ ایک خوبصورت نازک اندام دوشیزہ سے میں اس قسم کے عمل کی اُمید نہیں کر سکتا تھا۔ فرش پہ گرتے ہی میں نے پلٹ کر قلابازی کھائی اور اُٹھنا چاہا، مگر اس کی ٹھوکر میری کنپٹی پہ پڑی اور میرے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا مگر ایک لڑکی کے ہاتھوں یہ ذلت مجھے گوارا نہ تھی۔ میں نے دونوں ہاتھ فرش پہ ٹکا کر دوبارہ جست لگانے کی کوشش کی اور اس بار اُس نے کراٹے کا ایک ہاتھ میری گردن پہ رسید کیا اور پھر اس کے بعد مجھے کوئی ہوش نہیں رہا۔ تاریکی نے میرے ذہن کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا اور دوسرے ہی لمحے میں ہر قسم کی تکلیف کے احساس سے بے نیاز ہو چکا تھا۔

میری آنکھ کھلی تو چاروں طرف اندھیرا تھا۔ میں ایک بستر پہ سیدھا لیٹا ہوا تھا۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ میرے ہاتھ پیر آزاد تھے۔ میں نے سَر اُٹھانے کی کوشش کی مگر درد کی ایک لہر سے پاؤں تک دوڑ گئی اور میں تکلیف سے آہ بھر کر رہ گیا۔ دوسری کوشش میں اُٹھ کر بیٹھا اور چاروں طرف نظر دوڑائی تو معلوم ہُوا کہ میں ایک مختصر سے تاریک کمرے میں ہوں۔ ایک بستر کے سوا اس میں کوئی اور سامان موجود نہیں تھا۔ ایک چھتے سے روشندان کے راستے برقی روشنی کی ہلکی سی لکیر اندر داخل ہو رہی تھی اور کمرے میں اتنا اُجالا تھا کہ میں سب کچھ بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ میں نے کھڑے ہونے کا ارادہ کیا تو میرا سر بے اختیار چھت سے ٹکرایا اور میں آہ بھر کر رہ گیا۔ اس کمرے کی چھت بہت نیچی تھی۔ جس کا میں نے پہلے اندازہ نہیں کیا تھا۔ سر جھکا کر میں اُٹھ کر کھڑا ہوا تو ٹانگوں اور سارے جسم میں اینٹھن اور ہلکے ہلکے درد کا احساس ہونے لگا۔ گزشتہ مہم کے دوران میں مجھے بے شمار دشمنوں سے واسطہ پڑ چکا تھا اور میں نے درجنوں سخت جان لوگوں سے طاقت آزمائی کی تھی مگر میری یہ دُرگت اس سے پہلے کسی نے نہیں بنائی تھی جو ایک نازک لڑکی نے بنائی۔ اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ وہ میری توقع سے زیادہ مستعد اور پھرتیلی ثابت ہوئی کیونکہ میں اس کی جانب سے قطعی بے پروا تھا۔ اس لیے اس نے میری غفلت کا فائدہ اٹھایا۔ دوسری بات یہ تسلیم کرنی پڑی کہ وہ حقیقتاً ایک بہادر اور مارشل آرٹس میں تربیت یافتہ لڑکی تھی۔ میں نے اسے مالِ غنیمت سمجھ کر پکڑنا چاہا مگر اُس نے مجھے اپنا قیدی بنا لیا۔

میری کنپٹی کی انتہائی نازک اور حساس جگہ پہ اُس کے جوتے کی نوکدار ٹھوکر کی ضرب نے میری رہی سہی کسر بھی پوری کر دی تھی۔ گردن پہ اس کا وار اتنا مؤثر نہ تھا کیونکہ اگر یہ چوٹ نہ کھاتا پھر بھی میں بیہوش ہو جاتا۔ غیر ارادی طور پہ میرا ہاتھ اپنی کنپٹی پہ چلا گیا جہاں ایک حصے کا گوشت پھُول کر گومڑے کی صورت اختیار کر چُکا تھا۔ اسے اُنگلی سے چھُوتے ہی درد کی ایک لہر پھر میرے تمام جسم میں دوڑ گئی۔ تکلیف برداشت کرتے ہوئے میں سر جھکائے روشندان کے پاس پہنچا اور باہر جھانکنے کی کوشش

کی۔ باہر کھُلا میدان تھا اور تاروں بھرا آسمان نظر آ رہا تھا لیکن یہ روشندان اتنا چھوٹا اور تنگ تھا کہ اس میں سے میرا جسم تو کیا سر بھی باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ یہ کمرہ قریباً سات فٹ لمبا اور پانچ فٹ چوڑا تھا۔ روشندان کے بالمقابل ایک کھڑکی نُما مختصر دروازہ تھا جس کی لمبائی بمشکل ساڑھے تین فٹ اور چوڑائی سوا دو فٹ ہو گی۔ دروازہ بہت مضبوط تھا۔ محض ہاتھوں کی مدد سے اسے توڑنا ممکن نہیں تھا۔ اب مجھے خیال آیا کہ دراصل یہ کمرہ نہیں تھا بلکہ ایک مختصر دو چھتی نما سٹور روم تھا جو بعض مکانوں میں چھت اور سیڑھیوں کی درمیانی جگہ کو بامصرف بنانے کی غرض سے بنا لیا جاتا ہے۔ عموماً اس میں چھوٹا موٹا گھریلو سامان، بستر لحاف اور کتابیں وغیرہ رکھی جاتی ہیں۔ مگر حیرت انگیز بات یہ تھی کہ میرے ہاتھ پیر آزاد تھے۔

ابھی میں دروازے کو ٹٹول کر اس کی مضبوطی کا اندازہ لگانے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ دروازے کے باہر قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں نے فوجی بوٹوں کی آواز پہچاننے میں بالکل دیر نہیں لگائی۔ وہ تعداد میں تین چار معلوم ہوتے تھے اور کرخت آوازوں میں گفتگو کرتے ہوئے جا رہے تھے۔ میں دروازے سے پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا اور دروازہ کھُلنے کا انتظار کرنے لگا۔ میری جسمانی کمزوری اور اسلحے سے محرومی کے پیشِ نظر اتنے بہت سے فوجیوں سے بیک وقت نمٹنا اس وقت ایک مسئلہ تھا مگر اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ جدید ترین آٹومیٹک اسلحے سے مسلح تھے مگر جدوجہد کیے بغیر بزدلوں کی طرح جان دے دینا میرے مسلک، اصول، تربیت اور مزاج کے خلاف تھا۔ چنانچہ میں مرنے سے پہلے ایک دو دشمنوں کو جہنم واصل کرنے کے ارادے سے مستعد اور کمربستہ ہو گیا مگر فوجیوں نے دروازے کے باہر رُکنے کی ضرورت محسوس نہیں کی وہ باتیں کرتے اور ایڑیاں بجاتے ہوئے دروازے کے سامنے سے گزر کر چلے گئے۔ میں نے وقتی طور پہ اطمینان کی سانس لی مگر یہ بھی احساس تھا کہ بکرے کی ماں آخر کب تک خیر منائے گی۔ مجھے انہوں نے بے بال و پَر کر کے قفس میں بند کر دیا تھا اور کسی بھی لمحے مجھے شکار کر سکتے تھے۔

کچھ دیر خاموشی رہی اور پھر مجھے فائرنگ کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے چوکنا ہو کر روشندان میں سے دیکھنے اور سُننے کی کوشش کی مگر میری نگاہوں کے سامنے کچھ بھی نہیں تھا۔ اب میرے اس خیال کی تصدیق ہو گئی کہ میں زمین کی سطح سے قدرے بُلندی پہ ایک دو چھتی نما کمرے میں قید تھا جہاں سے فرار کا راستہ کوئی نہیں تھا مگر اتنی آسانی سے ہار مان لینا میری سرشت میں نہیں تھا اس لیے میں دوبارہ بستر پہ جا گرا اور صورتِ حال کی سنگینی پہ غور کرنے لگا مگر ذہن اتنا تھکا ہوا اور مجروح تھا کہ میں سوچنے کی صلاحیت سے بھی محروم تھا۔ میں نے بہتیرا دماغ پہ زور ڈالا مگر ذہن میں کوئی کوندا نہیں لپکا۔ مجبور ہو کر میں نے بستر پہ لیٹ کر آرام کر کے اپنی جسمانی اور ذہنی توانائیوں کو مجتمع کرنے کا فیصلہ کیا ہلکی سی غنودگی چھا گئی اور میں ایک بار پھر خواب کی وادی میں پہنچ گیا۔

ایک کھٹکے نے مجھے بیدار کر دیا۔

آواز دروازے کی جانب سے آ رہی تھی۔ کوئی شخص آہستگی سے دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے خاموشی سے بستر سے اُٹھ کر دروازے کے نزدیک پوزیشن سنبھالی اور آنے والے کے استقبال کے لیے تیار ہو گیا کیونکہ دروازہ چھوٹا تھا اس لیے اندر داخل ہونے والے کے لیے لازم تھا کہ وہ سر جھکا کر اندر داخل ہو۔ میرے بچاؤ کے لیے یہی ایک نکتہ اُمید افزا تھا۔ تھوڑی دیر کے مزید آرام کے بعد میں کافی بہتر محسوس کر رہا تھا اور کسی بھی صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ دروازہ کھُلنے کا عمل کچھ طویل ہو گیا تھا۔ شاید وجہ یہ تھی کہ دروازے کی چٹخنی کافی پرانی اور زنگ آلود ہو چکی تھی اور کھولنے والے کی کوشش یہ تھی کہ آواز پیدا نہ ہو۔ میں سانس روکے کھڑا رہا یہاں تک کہ تقریباً ایک منٹ گزر گیا۔ ایک منٹ کا یہ وقفہ میرے لیے انتہائی طویل اور صبر آزما تھا۔ اس قسم کی صورتِ حال میں جس اعصابی کشمکش اور ذہنی دباؤ کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہیں کبھی اس قسم کے حالات کا سامنا کرنا پڑا ہو۔

بالآخر چٹخنی کھُل گئی اور آنے والے نے دروازے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا۔ دروازہ آہستگی سے بے آواز کھُلنے لگا۔ میں اس بات پہ حیران تھا کہ اس قدر خاموشی اور رازداری کے ساتھ دروازہ کھولنے کی کیا ضرورت تھی مگر ہو سکتا ہے کہ نہتا اور بے دست و پا ہونے کے باوجود میری گزشتہ کارروائیوں کی وجہ سے وہ لوگ میری طرف سے زیادہ محتاط ہو گئے ہوں، لیکن اگر وہ سمجھتے تھے کہ

بے خبری کے عالم میں مجھے بے قابو کر لیں گے تو یہ ان کا خیالِ خام تھا۔ میں اُن کا استقبال کرنے کے لیے دروازے پر موجود تھا۔

دروازہ پوری طرح کھل چکا تھا اور ایک سراس کے اندر داخل ہو رہا تھا۔ یہ میرے لیے آئیڈیل موقع تھا۔ میں نے ہاتھ کو کلہاڑا کی شکل میں ہتھیار میں تبدیل کر لیا اور ایک ہلکی سی ضرب لگائی۔ اس سے پہلے کہ وہ زمین پر گرتا میں نے پھرتی کے ساتھ اسے تھام کر اندر کھینچ لیا اور بستر پر ڈال دیا۔ اب میں دوسرے آدمی کے اندر آنے کا منتظر تھا مگر جب اس کے بعد کوئی اور اندر نہیں آیا تو میں اپنے شکار کی طرف متوجہ ہُوا۔ بستر کے نزدیک پہنچا تو ایک مانوس بھینی بھینی خوشبو نے میرا خیر مقدم کیا۔ میں نے حیرت اور بے یقینی سے دیکھا۔ بستر پر کسی فوجی کی بجائے وہی لڑکی بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھی۔ جس نے مجھے گھائل کیا تھا۔

رات کے پچھلے پہر اس قدر خاموشی سے پُراسرار انداز میں اسکا یوں آنے کا مقصد میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اس کے تراشیدہ بال اس کے شانوں اور بستر پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ ابھی تک وہی لباس پہنے ہوئے تھے جس میں میں نے پہلی بار اسے دیکھا تھا۔ میں نے فوراً اس کی جیبوں کی تلاشی لی مگر کوئی ہتھیار یا پستول موجود نہیں تھا۔ وقت بہت کم تھا۔ اس لیے میں نے اسے اسکی تمام رعنائیوں سمیت اسی جگہ چھوڑا اور تیزی سے دبے قدموں دروازے کی طرف بڑھا۔ قدرت نے مجھے اس پنجرے سے آزاد ہونے کا بہترین موقع فراہم کر دیا تھا جس سے فائدہ نہ اُٹھانا سراسر احمقانہ فعل ہوتا۔ میں دروازے سے سر جُھکا کر باہر نکلا تو سامنے ایک برآمدہ تھا جس کے دوسرے سرے پر چوبی سیڑھیاں نظر آ رہی تھیں۔ میں نے سیڑھیوں کی طرف قدم بڑھائے اور زینہ بہ زینہ نیچے اُترنے لگا۔ یکایک فوجی بوٹوں کے آپس میں ٹکرانے کی مانوس مگر کرخت آواز نے مجھے ٹھٹھک کر رُکنے پر مجبور کر دیا۔ پھر بندوق کو کندھے پر رکھنے اور اس پر ہاتھ مارنے کی آواز سنائی دی۔ صاف ظاہر تھا کہ کوئی فوجی اپنے افسر کو سیلوٹ کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی تیز تیز قدموں سے چلنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ میں دونوں طرف سے پھنس چکا تھا۔ سیڑھیوں پر اُوپر اور نیچے دونوں جانب سے فوجی نازل ہونے والے تھے۔ میں دوبارہ لپک کر اپنی کوٹھری کی طرف گیا دروازے کے اندر داخل ہونے سے پہلے میری نظر دیوار پر پڑی۔ یہ ایک چوبی دیوار تھی اور دروازے کے سامنے لکڑی کا ایک تختہ لگا ہوا تھا جو اس وقت کھلا ہوا تھا۔ میں نے تختے کو دیوار سے لگایا تو دیوار برابر ہو گئی۔ گویا اس کوٹھری کا دروازہ لکڑی کی اس دیوار کے پیچھے چھپا ہوا تھا اور گہری تلاش اور جستجو کے بغیر کوئی یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ لکڑی کی یہ دیوار مسلسل نہیں ہے اور اس کے پیچھے ایک دروازہ اور مختصر سا کمرہ بھی موجود ہے۔ قدموں کی آوازیں نزدیک آتی جا رہی تھیں۔ میں لکڑی کا تختہ ہٹا کر جُھک کر دوبارہ کھلے ہوئے دروازے میں داخل ہُوا۔ کھینچ کر دیوار کو برابر کیا اور پھر دروازہ بھی بند کر دیا۔ ابھی میں سانس بحال نہیں کرنے پایا تھا کہ فوجی قدموں کی آوازیں پھر دروازے کے نزدیک آ گئیں۔ میں نے اپنی سانس روک لی مگر کسی نے دیوار اور دروازے کے سامنے رُکنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ظاہر ہے کہ یہ کھسکنے والی دیوار اور چھوٹا سا دروازہ ان کی نگاہوں سے اوجھل تھا۔ جب وہ دروازے کے سامنے سے گزرے تو میں نے اندازہ لگایا کہ وہ پانچ چھ آدمی تھے۔ ان میں سے دو سیڑھیوں پر اوپر کی جانب سے نیچے کی طرف جا رہے تھے اور غالباً چار نیچے سے اوپر کی جانب گامزن تھے۔ میں سانس روکے خاموش بیٹھا دل کی دھک دھک کو قابو کرنے کی کوشش کرتا رہا یہاں تک کہ وہ سب گزر کر چلے گئے۔

میں نے دروازہ تو بھیڑ دیا تھا مگر اندر سے اسے بند یا مقفل کرنے کا کوئی بندوبست نہ تھا۔ یوں بھی میں اسے بند کرنے کی ضرورت سے بے نیاز تھا۔ میرے لیے سب سے پہلے بستر پر لیٹی ہوئی لڑکی کا جائزہ لینا ضروری تھا۔ وہ ابھی تک بے ہوش تھی مگر اب اس کی سانس کی آمدورفت ہموار اور معمول کے مطابق ہو گئی تھی۔ میں نے جُھک کر اس کی نبض تھامی جو بالکل نارمل تھی۔ اچانک اس کے اندر زندگی کے آثار پیدا ہونے لگے۔ اس نے لمبی لمبی سانسیں لیں اور کروٹ بدلی اور پھر اچانک آنکھیں کھول دیں۔ میں بھی تک اس پر جُھکا ہوا تھا مگر گزشتہ تلخ تجربے کے پیش نظر پوری طرح چوکس اور مستعد تھا۔ اس کی نگاہ مجھ پر پڑی تو اس نے بے اختیار کروٹ لے کر اُٹھنے کی کوشش کی مگر میں نے مضبوطی سے اس کے دونوں بازو مروڑ کر اسے بے بس کر دیا۔ ایک ہلکی سی کراہ اس

اس کے ہونٹوں سے نکلی مگر میں اس کے ساتھ ذرا سی بھی رعایت کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس نے میری گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کی اور مجھے پہلی بار اندازہ ہُوا کہ ایک نازک اندام اور حسین لڑکی ہونے کے باوجود وہ کس قدر مضبوط اور طاقت ور تھی اگر میری طرف سے تھوڑی سی غفلت یا کوتاہی ہوتی تو شاید ایک بار پھر وہ مجھے زیر کرنے میں کامیاب ہو جاتی۔ چند لمحے وہ پورے جی جان کے ساتھ آزاد ہونے کے لیے کشمکش کرتی رہی مگر میری گرفت آہنی تھی۔ مایوس اور مجبور ہو کر اُس نے جدّوجہد ترک کر دی۔

"چھوڑو۔ مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔" وہ دبی آواز میں بولی۔

"آواز بلند نہ کرنا ورنہ میں تمہاری گردن دبا دوں گا۔" میں نے بھی سرگوشی میں کہا مگر میرا لہجہ انتہائی خوفناک تھا۔

"بے وقوف۔ وقت ضائع مت کرو ورنہ یہاں سے کبھی نہیں نکل سکو گے۔" اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"اس بار میں تمہاری چال میں نہیں آؤں گا۔"

"تم سمجھتے کیوں نہیں۔ میں تمہاری دشمن نہیں ہوں۔ دوست ہوں۔ میں نے اُن لوگوں کے یہاں پہنچنے سے پہلے تمہیں اس محفوظ جگہ پہ چُھپا دیا تھا ورنہ اس وقت تک وہ تمہاری تِکا بوٹی کر چکے ہوتے۔"

اس بار میں واقعی سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ اس کے بازوؤں پر میری گرفت ہلکی ہو گئی اور اُس نے موقعے سے فائدہ اُٹھانے میں ذرا بھی تاخیر نہیں کی۔

اس کے جسم کو ہلکی سی جنبش ہوئی اور دوسرے ہی لمحے وہ مچھلی کی طرح تڑپ کر میری گرفت سے آزاد ہو چکی تھی۔ میں نے اس کی ٹانگ پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ برق رفتاری سے دوسری جانب کِھسک گئی۔ کمرہ انتہائی تنگ اور مختصر تھا جس میں کافی جگہ پلنگ اور بستر نے گھیر رکھی تھی۔ دروازے کے سامنے میں کھڑا ہُوا تھا۔ اس کے لیے روشندان کے برابر والے کونے میں پناہ لینے کے سوا کوئی اور جگہ نہ تھی۔ وہ میرے سامنے کھڑی مجھے گھور رہی تھی۔ جسمانی کشمکش کے باعث اس کی سانسیں ایک بار پھر بے ترتیب ہو گئیں۔ اس انتہائی سنگین اور خطرناک ماحول اور نازک ترین موقعے سے دوچار ہونے کے باوجود میں اس کی دلکشی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

چند لمحے ہم دونوں ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ پھر اُس نے ایک لمبی سانس لی اور سر کو جھٹک کر اسی جگہ فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ میں بھی پلنگ کے آخری کنارے پر بیٹھ گیا مگر پوری طرح چوکنا اور ہوشیار تھا۔

"سنو۔" وہ اس بار بے تکلفانہ لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "کیا تمہارے بھیجے میں بالکل عقل نہیں ہے۔ تمہیں دوست اور دشمن کی پہچان نہیں ہے۔ میں تمہاری ہمدرد ہوں۔ دوست ہوں۔"

"مگر کیوں؟ تمہیں مجھ سے اتنی ہمدردی کیوں ہے؟"

"اس لیے کہ ان فوجیوں کی زبانی مجھے تمہارے بارے میں سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ تم ایک جی دار مغرور سپاہی ہو۔ تم نے اکیلے ہی اپنے تمام دشمنوں کو ناک چنے چبوا دیئے ہیں۔"

"اور اسی لیے تم میری دوست بن گئیں۔ حالانکہ میں تمہارے ملک اور قوم کا دشمن ہوں اور یہاں کا بچہ بچہ میرے خون کا پیاسا ہے۔" میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"ہاں۔ یہاں کا چپّہ چپّہ تمہارے خون کا پیاسا ہے۔" وہ جِھلّا کر بولی۔ "مگر میں تمہاری دوست ہوں۔ اس لیے کہ میں تمہاری ہم وطن اور ہم قوم ہوں۔"

میں نے حیران ہو کر اسکی طرف دیکھا۔ وہ سر ہلا کر بولی۔ "بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ اگر مجھے تمہارے گلے کا لاکٹ نظر نہ آتا تو شاید میں تمہیں اُن لوگوں کے حوالے کر دیتی۔"

اطمینان اور خوشی کی ایک لہر میری رگ و پے میں دوڑ گئی۔ بالآخر دشمن کی اس وسیع سرزمین پہ مجھے ایک ایسی ہستی مل

گئی تھی جسے میں اپنا کہہ سکتا تھا۔

"اب تو یقین آگیا نا؟" اُس نے پوچھا۔

میں نے سر ہلا کر ہاں کہا مگر میرا ہاتھ بے اختیار میری زخمی کنپٹی پہ رینگ گیا۔ وہ ہنس پڑی اور کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ اس کی مسکراہٹ اور ہنسی اتنی ہی روشن اور خوش کُن تھی۔

"سوری!" وہ شانے اُچکا کر بولی "میرے پاس زیادہ وقت نہ تھا اور تمہیں بچانے کا اس کے سوا کوئی اور طریقہ مجھے نہیں سوجھا۔"
میں بھی اس کی صاف گوئی اور سادگی پہ ہنس پڑا۔ کمرے میں کشیدگی اور بے اعتمادی کی فضا اب ختم ہو چکی تھی اور اپنائیت اور دوستی کا ماحول پیدا ہو گیا تھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"عاشی!" اس نے سادگی سے جواب دیا۔

"عاشی!" میں نے اس کا نام اپنی زبان سے دوہرایا۔ اور ایک مٹھاس سی میرے منہ میں گھل گئی "یہ بتاؤ، تم یہاں کیا کر رہی ہو؟ اور ہاں، بائی دی وے یہ علاقہ کون سا ہے؟"

وہ ایک بار پھر ہنسی مگر پھر اس نے بچوں کی سی معصومیت سے بے اختیار اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ "میں یہاں اپنے رشتہ داروں سے ملنے آئی ہوئی ہوں۔ اس وقت وہ سب شادی پہ گئے ہوئے ہیں۔"

"تمہیں اکیلے میں ڈر نہیں لگتا؟" میں نے کہنی بستر پہ ٹکا کر اس کی طرف دیکھا اور مسکرایا۔

"جب تمہیں چپے چپے پہ پھیلے ہوئے کروڑوں دشمنوں سے ڈر نہیں لگتا تو میں بھی تو اسی قوم کی بیٹی ہوں۔" اس کی سادہ سی دلیل نے مجھے لاجواب کر دیا۔

"اچھا دیکھو۔ تمہارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ دو گھنٹے بعد صبح ہو جائے گی اور وہ لوگ دوبارہ تمہاری تلاش شروع کر دیں گے۔ انہوں نے بھی تمہیں پکڑنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ اس وقت تمہارے فرار ہونے کا بہترین موقع ہے۔ میں یہی بتانے تمہارے پاس آئی تھی۔" وہ کھسیانی ہو کر سر کھجانے لگی۔ مجھے بھی ہنسی آگئی۔

"مگر وہ ہیں کتنے؟" میں نے پوچھا۔

"بہت ہیں۔ مگر تمہیں اس سے کیا؟" پھر وہ مسکرا کر بولی "جو لوگ کسی مقصد کے لیے نکلتے ہیں وہ اپنے دشمنوں کی گنتی نہیں کرتے۔"

"اچھا فلسفہ ہے۔ پھر بھی معلوم تو ہو۔"

"تین جیپیں، فوجیوں سے بھری ہوئی اس بنگلے میں کھڑی ہیں۔ آس پاس کا علاقہ بھی ان سے پُر ہوا ہے۔"

"تو پھر میں نکلوں گا کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ تم مجھ پہ چھوڑ دو۔" یہ کہہ کر اُس نے فرش پہ پڑی ہوئی پوٹلی اُٹھائی اور مجھے پہلی بار یہ احساس ہوا کہ وہ اپنے ساتھ کچھ لے کر بھی آئی تھی۔ وہ بولی "اس میں فوجی وردی ہے اور ایک پستول بھی ہے۔ تم جلدی سے لباس تبدیل کر لو۔ میں باہر تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔"

میں پوٹلی سنبھال کر کھڑا ہو گیا "مگر یہ علاقہ کون سا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تم اپنے ملک کی سرحد سے تیس میل دور ہو۔ میں راستے میں تمہیں سب کچھ سمجھا دوں گی۔" یہ کہہ کر وہ خوشبو کی طرح باہر نکل گئی۔ مگر کمرہ اس کی بھینی بھینی خوشبو سے مہک رہا تھا۔

میں نے جلدی جلدی لباس تبدیل کیا۔ جرابیں اور بوٹ پہنے۔ سر پہ ٹوپی جمائی اور کمر میں پستول لٹکا لیا۔ دبے پاؤں جھک کر دروازے سے باہر نکلا تو سامنے سیڑھیوں کے نزدیک وہ سراپا انتظار بنی کھڑی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پہ ایک شوخ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور سیڑھیوں سے اُوپر کی جانب چل دی۔ میں پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا اس کے پیچھے

پیچھے چلنے لگا۔ ہر لمحے یہ خدشہ تھا کہ کہیں کوئی حریف سامنے نمودار نہ ہو جائے۔ سیڑھیاں طے کر کے ہم ایک مختصر سی گیلری میں پہنچ گئے۔ جس کے کونے پر ایک کمرے کا دروازہ تھا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی خوشبوؤں اور رنگینیوں نے میرا خیر مقدم کیا۔ وہ مسکرا کر بولی "یہ میرا کمرہ ہے۔"

"وہ تو ظاہر ہے۔" میں نے کہا پھر بولا "بہت خوبصورت ہے بالکل تمہاری طرح۔"

وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ اس کی نگاہوں میں حیرت اور تعجب تھا مگر پھر اس کی آنکھیں حیا سے جھک گئیں۔ میں خود بھی اپنی اس نادانستہ جسارت پہ کچھ حیران اور شرمسار ہو گیا۔

وہ لپک کر کھڑکی کے نزدیک گئی اور اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا۔ کھڑکی خاصی کشادہ تھی اور زمین سے زیادہ بلندی پہ نہ تھی۔

"وہ دیکھو۔" وہ سرگوشی میں بولی "وہاں سامنے درختوں کے نیچے دو جیپیں کھڑی ہیں۔ تم ان میں سے ایک جیپ لے کر سامنے والی کچی سڑک پر چلے جاؤ۔ مشرق کی سمت چلتے رہنا۔ تیس میل بعد وطن کی زمین پر پہنچ جاؤ گے۔"

اس نے یوں کہا جیسے یہ سب نہایت آسان کام ہو۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے پوچھا "مگر میں نیچے کیسے جاؤں گا؟"

"اس پرنالے کے ذریعے۔" اس نے کھڑکی سے سر باہر نکال کر مجھے دیوار کے ساتھ لگا ہوا موٹا سا پائپ دکھایا "اب دیر نہ کرو۔ خدا حافظ۔"

میں نے ایک بار پلٹ کر اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ اب بھی مسکرا رہی تھی۔ حالانکہ تشویش کی پرچھائیاں بھی اس کے خوبصورت چہرے پر صاف نظر آ رہی تھیں۔ "خدا حافظ عاشی۔" میں نے نرمی سے کہا "بہت بہت شکریہ۔"

"شکریہ کس بات کا؟"

"ایک بار میری جان بچانے کا اور دوسری بار پھر موت کے منہ میں دھکیلنے کا۔" میں نے شرارت سے کہا تو وہ بے اختیار مسکرا دی۔ "اچھا۔ خدا حافظ۔ زندگی رہی تو پھر ملیں گے۔"

"انشاءاللہ" اس نے بڑے وثوق کے ساتھ کہا اور میرا شانہ تھپکا "ڈرنا مت۔ اچھے بچوں کی طرح سیدھے گھر پہنچ جانا۔ شاباش۔"

پائپ کے راستے نیچے اُترنا میرے لیے چنداں دشوار نہ تھا۔ میرے اور درختوں کے سائے تلے کھڑی ہونے والی جیپوں میں کم از کم دو سو فٹ کا فاصلہ تھا مگر رات کی تاریکی میری معاون تھی۔ میں نے سر جھکایا اور بگٹٹ جیپوں کی طرف بھاگتا ہوا قریبی جیپ کے پاس پہنچ کر میں رُک گیا۔ جیپوں میں کوئی موجود نہیں تھا مگر دستور کے مطابق ہنگامی حالات میں استعمال کرنے کی غرض سے چابیاں اگنیشن میں لٹکی ہوئی تھیں۔ ایک جیپ میں سوار ہونے کے بعد میں نے گردن گھما کر کھڑکی کی جانب دیکھا۔ کمرے میں اندھیرا تھا مگر اس کے باوجود میں عاشی کو کھڑکی کی چوکھٹ سے ٹیک لگائے کھڑا ہوا دیکھ سکتا تھا۔ میں نے اپنا ہاتھ فضا میں لہرایا اور جیپ اسٹارٹ کر دی۔ لائٹ آن کی تو عاشی کے بیان کے مطابق سامنے کچی سڑک نظر آ رہی تھی۔ میں نے جیپ کو ریورس کیا اور تیزی سے کچے راستے پر دوڑا دیا۔ اسی لمحے فضا میں کرخت آوازیں گونجنے لگیں۔ خالص فوجی انداز میں "ہولٹ" "ویئر" اور "ہالٹ" کے احکام میرے کانوں سے ٹکرائے مگر سننے اور رُکنے کی فرصت کہاں تھی۔ دوسرے ہی لمحے فضا آٹومیٹک فائر کی آوازوں سے گونجنے لگی۔ کسی جگہ سے جیپ اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور کچھ سائے فائر کرتے اور دوڑتے ہوئے اس جیپ کی طرف بڑھنے لگے جسے میں اپنے پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ گولیاں بارش کی بوندوں بلکہ اولوں کی طرح میرے آس پاس برس رہی تھیں مگر میں ان سے بے نیاز پوری رفتار سے جیپ دوڑا رہا تھا۔ آغازِ سفر سے پہلے ہی مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ مجھے ان مراحل سے گزرنا ہو گا اور میں ذہنی طور پہ ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے پوری طرح تیار اور مستعد تھا۔

کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد درختوں اور اونچے نیچے ٹیلوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ سڑک پختہ نہیں تھی اور خاصی خراب

حالت میں تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھی مگر تعاقب کرنے والوں کی روشنیاں مجھ سے کافی دُور تھیں۔ میں نے کچی سڑک چھوڑ کر شمالی راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ عاشی نے مجھے بتا دیا تھا کہ قریباً تیس میل مشرق کی جانب میرے وطن کی سرزمین تھی۔ میں کشاں کشاں اس کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ میری منزلِ مقصود میرے سامنے تھی اور مجھے یقین تھا کہ اس کی کشش مجھے خود بخود اپنی طرف کھینچ لے گی۔ جیپ ناہموار زمین پہ ہچکولے کھا رہی تھی۔ اُچھل رہی تھی۔ بعض اوقات میرے لیے سٹیرنگ سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا۔ پہاڑ۔ درخت۔ ندی۔ نالے راستے میں جو کچھ بھی تھا مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ مجھے تو بس اپنی منزل پر پہنچنے کی دُھن تھی۔ چند میل اس طرح سفر کرنے کے بعد سامنے ایک اونچا پہاڑ میری راہ روکے کھڑا تھا۔ مجھے چکر کاٹ کر دوسری جانب جانا تھا۔ میں نے بلا تاخیر جیپ کا رُخ بائیں جانب موڑ دیا۔ جیپوں کی روشنیاں اور آٹومیٹک ہتھیاروں کی فائرنگ میرے تعاقب میں تھی مگر وہ مجھ سے کافی فاصلے پر تھے۔ یکایک میرے سامنے ایک جیپ کی لائٹ روشن ہوئی اور چکا چوند کی وجہ سے مجھے جیپ کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ جیپ روکے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔ مجبوراً میں نے بریک لگا دیئے اور گاڑی کی لائٹیں بجھا دیں۔ سامنے والی جیپ جو ایک درخت کے نیچے کھڑی تھی حرکت میں آ گئی تھی اور میری طرف بڑھ رہی تھی۔ اس جیپ میں ایک ڈرائیور کے علاوہ دو اور فوجیوں کے ہیولے میں واضح طور پہ دیکھ سکتا تھا۔ وہ ریگن مشین گنیں سنبھالے ہوئے کھڑے تھے۔ جیپ بہت تیزی سے میری جانب بڑھ رہی تھی۔ ان لوگوں سے بچنے کا یہی طریقہ ہو سکتا تھا کہ میں بالکل سامنے سے ان کی گاڑی سے اپنی گاڑی ٹکرا دیتا۔ مگر اتنی دیر میں ان کے اسلحہ سے نکلنے والی گولیاں میرا جسم چھلنی کر دیتیں۔ جیپ تیزی سے میری طرف بڑھی آ رہی تھی اور میرا ذہن اس سے بھی زیادہ تیزی سے کام کر رہا تھا۔

اچانک مجھے ترکیب سُوجھ گئی۔ جیپ مجھ سے قریباً سو فٹ کے فاصلے پر تھی۔ جب وہ اور نزدیک آئی تو میں نے اچانک فل لائٹس آن کر دیں۔ ڈرائیور اور دونوں فوجی اس کے لیے مطلق تیار نہیں تھے۔ ان کے ساتھ ہی میں نے تیزی سے اپنی جیپ کو دائیں جانب موڑ لیا۔ سامنے والی جیپ کچھ اور نزدیک آ گئی تھی اور ان سے ہونے والی فائرنگ کی بعض گولیاں سنسناتی ہوئی میرے سر کے پاس سے گزری تھیں۔ مجھے ان کی کوئی پروا نہ تھی۔ مجھے اب تک یہ بھی اندازہ ہو چکا تھا کہ دشمن کے فوجیوں کو خاص طور پہ یہ ہدایت دی گئی ہے کہ جس طرح بھی بن پڑے مجھے زندہ گرفتار کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ابھی تک کوئی گولی میرے جسم میں پیوست نہیں ہوئی تھی۔

لیکن جب چاروں طرف سے گولیوں کا مینہ برس رہا ہو تو کوئی بھی یہ اندازہ نہیں لگا سکتا کہ کون سی گولی قدرت نے اس کی زندگی ختم کرنے کے لیے بنائی ہے۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے بھی یہ میرا ایمان تھا اور فوجی تربیت کے دوران میں ہمیں بار بار ہمارے استادوں نے یہ بات سمجھائی تھی کہ موت کا ایک وقت معین ہے اور جو گولی تمہارے لیے بنی ہے، خواہ فولادی پردوں میں بھی چھپ کر بیٹھ جاؤ وہ تمہیں ضرور تلاش کرے گی۔ مگر اب میرے لیے زیادہ عرصے اس جیپ میں بیٹھ کر اپنے دُشمنوں کا انتظار کرنے کا موقع نہ تھا۔ مجھے فوری طور پہ کوئی فیصلہ کرنا تھا جو میں نے کر لیا۔

میں نے جیپ کی روشنیاں بجھا کر آہستگی سے موڑا اور اسے بائیں جانب کے قدرے کھلے میدان کی طرف ڈال دیا۔ چاروں طرف تاریکی تھی اور گولیوں کی مسلسل فائرنگ کی آوازوں کے باعث میری جیپ کے انجن کی آواز میرے تعاقب کرنے والوں کو سنائی نہیں دے سکی تھی۔ جوں جوں میری آنکھیں تاریکی کی عادی ہوتی گئیں! میں نے جیپ کی رفتار میں اضافہ کر دیا یہاں تک کہ میں خاصے فاصلے تک پہنچ گیا۔ مدیں اثنا میں نے ایک زبردست دھماکے کی آواز سُنی اور آگ اور روشنی کا ایک بہت بڑا گولہ اُس جگہ نمودار ہوا جہاں کچھ دیر پہلے میری جیپ کھڑی ہوئی تھی۔ یہ کوئی راکٹ تھا جو کافی فاصلے سے پھینکا گیا تھا۔ راکٹ نے خاصی تباہی پھیلائی مگر میں اس کی زد سے محفوظ تھا۔ البتہ وہ جیپ اور اس میں سوار مسافر جو پوری قوت کے ساتھ درخت سے ٹکرا کر اُلٹ گئی تھی۔ اس حملے کا نشانہ بنی ہو گی اور ان لوگوں کی راکھ کے سوا وہاں کچھ باقی نہ رہا ہو گا۔

مجھے محسوس ہوا کہ راستہ ناہموار ہو گیا ہے یکایک ایک بہت گہرا کھڈ سامنے نمودار ہوا۔ میری جیپ کی رفتار خاصی تیز تھی۔ ادھر

کھڈ اور جیپ کے درمیان کا فاصلہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ جیپ زور سے اُچھل اور اس کے اگلے پہیے کھڈ میں گر گئے۔ لیکن میرے حواس بھی پوری طرح حاضر تھے۔ میں نے برق رفتاری سے جیپ کی پچھلی نشست پر چھلانگ لگائی اور میں دوسری جہت میں جیپ سے باہر اُچھل کر فضا میں جسم کو خم دے رہا تھا۔ انتہائی نازک مرحلہ تھا لیکن قدرت میرے ساتھ تھی۔ چند لمحے کی تاخیر سے میں کھڈ کی گہرائیوں میں ہمیشہ کے لیے گم ہو سکتا تھا مگر اب میں ایک پتھریلے فرش پر کولہوں اور کہنیوں کے بل گرا ہوا تھا۔ چوٹ زیادہ نہیں تھی، لیکن اگر زیادہ ہوتی تب بھی میرے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت نہ تھا۔ زمین پر گرتے ہی میں دوبارہ گیند کی طرح اُچھلا اور چند فٹ دُور جا کر قدموں کے بل کھڑا ہو گیا۔ معاً مجھے جیپ کے کھڈ میں گرنے کی آواز سنائی دی جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ اس موت کے غار کی گہرائی کتنی زیادہ ہے۔ جیپ کے بارے میں سوچنا لاحاصل تھا اس لیے میں نے پلٹ کر اس طرف دیکھا جہاں اب گولیوں کے ساتھ ساتھ راکٹ بھی برس رہے تھے اور سارا علاقہ بقعۂ نور بن گیا تھا۔ شاید وہ مجبوری اور مایوسی کے عالم میں اب مجھے موت کے گھاٹ اُتارنے کا فیصلہ کر چکے تھے مگر مارنے والے سے بچانے والا زیادہ طاقت ور ہے۔ میں آگ اور آہن کے اس طوفان کی زد سے محفوظ تھا اور اب بائیں جانب ٹیلوں اور پہاڑیوں پر دوڑ رہا تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں زندگی میں اس سے پہلے کبھی اتنا تیز دوڑا ہوں گا۔ نہ ہی اس کے بعد اس برق رفتاری کی حد کو چھو سکا۔ چند ہی لمحوں میں پہاڑیوں نے مجھے اپنے کھردرے اور سنگین دامن میں سمیٹ لیا اور میں دُشمنوں کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ میرے بھاگنے کی رفتار میں بھی کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ میری سانس پھول گئی، ٹانگوں نے میرے جسم کا بوجھ سہارنے سے انکار کر دیا، مگر کوئی نادیدہ طاقت مجھے دھکیلتی ہوئی لیے جا رہی تھی اور میں کشاں کشاں آگے بڑھا جا رہا تھا۔ اگرچہ ہر قدم پر یوں محسوس ہو رہا تھا کہ بس اب دوسرا قدم نہ اٹھا سکوں گا اور تھکن سے چور ہو کر گر جاؤں گا۔ نہ جانے جسم و دماغ کی یہ کشمکش کتنی دیر تک جاری رہی اور میں ان جانے راستوں پر آگے ہی آگے بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ قوتِ ارادی نے بھی جواب دے دیا اور میں بے دم ہو کر سنگریزوں پر گر گیا۔ پھر مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔

قریباً نصف گھنٹے بعد میری آنکھ کھلی تو آسمان پہ یہاں وہاں تارے چمک رہے تھے جیسے کسی دوشیزہ کے دھانی دوپٹے پر سلمہ ستارا ٹنکا ہوا ہو۔ میں تھوڑی دیر تک زمین پر لیٹا آسمان کے حسن میں کھویا رہا۔ کہیں کہیں سیاہ بادلوں کے ٹکڑے بھی آوارہ گردی کرتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ہوا میں خنکی اور زندگی کی لطافت کا احساس ہوا تو میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اب میں اپنے گرد و پیش سے پوری طرح آگاہ اور باخبر ہو چکا تھا۔ کان لگا کر سُننے کی کوشش کی مگر ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میرے دُشمنوں کی جیپیں توپیں اور بندوقیں اب خاموش ہو چکی تھیں۔ یا تو وہ مجھے مُردہ سمجھ کر واپس لوٹ گئے تھے یا پھر میری تلاش کی نئی راہیں ڈھونڈنے میں مصروف تھے۔

ہوا کی تازگی نے مجھے نئی زندگی اور حوصلہ بخشا اور میں معمولی سی کوشش کے بعد اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میرے لیے ہر سمت انجان اور ہر راستہ گمنام تھا۔ پھر بھی مجھے سفر طے کرنا تھا۔ بلا سوچے سمجھے میں نے اپنی بائیں جانب چلنا شروع کر دیا۔ تھکن اور بھوک کے مارے بہت بُرا حال تھا، لیکن میں زندگی، خوراک اور رہائی کی جستجو میں آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اچانک میں نے ایک پہاڑی کی اوٹ میں روشنی چمکتی ہوئی دیکھی اور وہیں ٹھٹک کر رُک گیا۔ اس کی مخالف سمت سے بھی روشنی کا جھماکا ہُوا۔ یوں لگا جیسے ٹارچ کی روشنی کے ذریعے کچھ لوگ آپس میں پیغامات یا اشاروں کا تبادلہ کر رہے ہیں۔ میرے قدم رُک گئے۔ یہ کون سی جگہ ہے؟ اور یہ لوگ کون ہو سکتے ہیں؟ فوجی بھی ہو سکتے ہیں جو میری تلاش میں سرگرداں ایک دوسرے کو اطلاعات فراہم کر رہے ہیں یا پھر......

اس سے زیادہ سوچنے کی مجھے مہلت نہ مل سکی یوں لگا جیسے میرے سر پہ پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ میں بے اختیار مُنہ کے بل اوندھا گر گیا اور ایک بار پھر میرا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔ یہ کیفیت نہ جانے کتنی دیر طاری رہی۔ آنکھ کھلی اور دوبارہ دُنیا دیکھنے کی توفیق ہوئی تو میں نے اپنے آپ کو ایک خچر پر مضبوطی سے بندھا ہوا پایا۔ خچر تیز رفتاری سے رواں دواں تھا اس کی ٹاپوں کی آواز خاموش فضا کے سکوت کو توڑ رہی تھی، لیکن اس میں ایک اور آواز بھی شامل تھی۔ یہ زمین سے کسی سخت چیز کے ٹکرانے کی آواز

تھی۔ساتھ ہی کوئی چیز زمین سے گھسیٹی بھی جا رہی تھی۔ میں نے سر اٹھا کر آس پاس دیکھنے کی کوشش کی مگر رسی کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ البتہ میں اپنی آنکھوں کے سامنے پتھریلی اور پہاڑی زمین دیکھ سکتا تھا جو خاصی تیزی سے میری نگاہوں کے سامنے سے گزرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ نہ جانے اس بار میں کس کی قید میں تھا؟ میں خود کو نفریں کرنے لگا۔ اتنی بڑی فوج اور اتنے بڑے بڑے مرحلوں سے کامیابی کے ساتھ گزرنے کے باوجود میں اتنی آسانی سے دشمنوں کی سازش کا شکار ہو کر ان کے چنگل میں پھنس گیا تھا۔ پھر یکایک مجھے عاشی کا خیال آیا جس نے جان ہتھیلی پر رکھ کر مجھے دشمنوں کے نرغے سے بچایا تھا اور آزادی اور زندگی کے راستے پر لا کر چھوڑ دیا تھا ــــ کیا وہ بھی میرے بارے میں سوچ رہی ہو گی؟ کیا اسکی نیندیں بھی اُچٹ گئی ہوں گی اور وہ خیریت کے ساتھ میرے منزلِ مقصود پر پہنچنے کی دُعا کر رہی ہو گی؟ یہ خیال آتے ہی میں اپنے اندر ایک توانائی اور جذبہ محسوس کرنے لگا۔ کوئی میرے لیے بھی دُعا گو تھا۔ میری زندگی اور حفاظت کا خواہاں تھا۔ اس کا خوبصورتی سے سجا ہوا کمرہ خوشبوؤں سے مہک رہا ہوگا۔ اس کے ترشے ہوئے بال اس کے حسین چہرے کے گرد ہالہ کیے ہوں گے اور وہ شاید سو رہی ہو گی؟

یا ہو سکتا ہے جاگ رہی ہو اور میرے بارے میں سوچ رہی ہو؟ عاشی کے تصور نے میرے اندر ایک نئی رُوح پھونک دی۔ مایوسی کے اندھیرے دُور ہونے لگے اور روشنی کی کرنوں نے میرے دل و جان کو منور کر دیا۔ اس کے بال، اس کی آنکھیں، اس کا چہرہ، اس کا دراز قد، اس کا متناسب اور مضبوط صحت مند جسم جو مجھ جیسے سخت جان کو بھی زمین چٹا چکا تھا۔ وہ کتنی عجیب، کتنی حسین اور کتنی انوکھی لڑکی تھی۔ میری زندگی میں بہت کم لڑکیاں داخل ہوئی تھیں، مجھے لڑکیوں نے کبھی متوجہ اور متاثر نہیں کیا تھا۔ مگر عاشی!! اس کی تو بات ہی اور تھی۔

ایک کرخت آواز نے مجھے جھٹکے کے ساتھ خیالات کے گرداب سے نکال دیا۔

"رُک جاؤ" کی آواز پر ہم لوگ اپنی جگہ ساکت ہو کر رہ گئے۔ یہ ایک پہاڑی جگہ تھی۔ اُونچے نیچے ٹیلے چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ سبزہ اور درخت بھی تھے مگر بہت زیادہ نہیں۔ جغرافیائی حالات سے پتہ چلتا تھا کہ ہم لوگ ایک نیم پہاڑی علاقے میں داخل ہو چکے ہیں۔ اسے پہاڑوں کا آغاز ہی کہا جا سکتا ہے۔ دُور کافی فاصلے پر اُونچے اونچے پہاڑ بھی فخر سے سر اٹھائے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ہم سے کچھ فاصلے پر ایک چھولداری نما خیمہ لگا ہوا تھا جس کے سامنے آگ جل رہی تھی۔ کوئی شخص اس آگ کے سامنے بیٹھا ہوا کچھ بھون رہا تھا۔ ہم لوگوں کو دیکھ کر وہ ہماری طرف متوجہ ہوا اور ایک ہی جھٹکے میں پتھر سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب میں اس کا بلند و بالا قد اور مضبوط اور طاقت ور جسم واضح طور پر دیکھ سکتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں مرغی یا کسی اور پرندے کی ایک ٹانگ تھی جسے وہ آگ پر بھون رہا تھا۔ وہ ہم لوگوں کی طرف خاموش سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"سردار۔ کوئی نہیں ملا۔ بس ایک یہ ملا ہے!" یہ کہہ کر مجھے گھیر کر لانے والے نے مجھے زوردار دھکا دیا اور میں قریب قریب لڑھکتا ہوا سردار کے قدموں کی طرف چلا گیا۔ زمین پر لیٹے لیٹے سردار کو دیکھا تو آسمان کی بلندیوں کے پس منظر میں وہ کچھ اور زیادہ لمبا اور بھیانک نظر آیا۔ اس کے چہرے پر موٹی موٹی کالی مونچھیں تھیں اور شیو بھی بڑھی ہوئی تھی۔ چہرے پر جا بجا زخموں کے نشان بھی تھے جن کی وجہ سے وہ اور زیادہ ڈراؤنا ہو گیا تھا۔

"کون ہو تم؟" وہ بارعب کرخت آواز میں بولا اور آگے بڑھ کر اس نے میرے اوپر اپنا پیر رکھ دیا۔ "سچ سچ بتانا اور جلدی جلدی۔ میرے پاس وقت نہیں ہے۔" اس کا بھاری جوتا میرے پیٹ میں چبھنے لگا۔

"میں راہ گیر ہوں۔ مسافر ہوں۔"

"کہاں سے آئے ہو۔ کہاں جاؤ گے؟"

میں جواب میں خاموش رہا۔ اس علاقے کے بارے میں مجھے کوئی علم نہیں تھا۔ میری خاموشی پر اس نے ایک ٹھوکر مجھے رسید کی۔ اگر میں نے اپنے تربیت یافتہ جسم کو پہلے ہی اس کے لیے تیار نہ کر لیا ہوتا تو یہ میرے لیے مہلک ثابت ہو سکتی تھی۔

"جواب دو۔ اور جھوٹ مت بولنا۔" وہ مجھ پر جھک کر بولا۔ "پولیس والے ہو؟"

"نہیں۔ میں پولیس والا نہیں ہوں۔ میں تو مسافر ہوں راستہ بھول گیا ہوں۔ پہلے اس بڑے جنگلے میں پہنچ گیا جہاں بڑا سا گنٹھ ہے۔ وہاں سے نکلا تو آپ کے آدمیوں نے مجھے پکڑ لیا۔"

"ہوں!" وہ غصے سے ہنکارا۔ پھر مجھے ٹھوکر مار کر بولا۔ "کھڑے ہو جاؤ۔"

میری دونوں کلائیاں مضبوطی کے ساتھ رسی سے بندھی ہوئی تھیں اس لیے کسی کی مدد کے بغیر میرا اُٹھ کر کھڑا ہونا دشوار تھا۔ پھر بھی میں نے کوشش کی اور لڑکھڑاتا ہوا گھٹنوں کے بل کھڑا ہو گیا۔

"کون ہو۔ کہاں سے آئے ہو۔ کس نے بھیجا ہے تمہیں ہمارا کھوج لگانے کو؟"

"میں نے بتایا تو ہے کہ مجھے کسی نے بھیجا نہیں۔" میں نے بے بسی سے کہا۔ یکایک میری گردن پر ایک زوردار گھونسہ لگا اور میں دوبارہ زمین پر گر گیا۔

"سردار کے ساتھ تمیز سے بات کرو۔" ایک محافظ درشتی سے بولا۔ اب تک میں سمجھ چکا تھا کہ یہ ڈاکوؤں کا گروہ ہے اور یہ لوگ مجھے پولیس کا آدمی سمجھ کر چوکنے ہو گئے ہیں۔

میں نے دوبارہ کھڑے ہونے کی کوشش کی اور کافی جدوجہد کے بعد سرو قد کھڑا ہو گیا۔ میرا پیٹ اور گردن ان بے رحم ضربوں کی وجہ سے دُکھنے لگے تھے۔

"اب بولو۔" سردار نے مجھے پوری طرح کھڑے ہونے کا موقع دیا اور اس دوران میں وہ خاموشی سے میری جدوجہد دیکھتا رہا تھا۔

"میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ میں پولیس کا آدمی نہیں ہوں۔ تم لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہو۔" میں نے اپنی صفائی پیش کی۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ ہم تمہیں پولیس والا سمجھ رہے ہیں؟"

"تم نے خود ہی تو مجھ سے سوال کیا تھا۔" میں نے تکلیف ضبط کرتے ہوئے جواب دیا۔ "اور پھر تم جیسے ڈاکوؤں کو پولیس کے سوا اور کس کا ڈر ہو سکتا ہے۔"

"بہت ڈھیٹ معلوم ہوتے ہو۔" سردار غرا کر بولا۔ پھر اس نے اپنے ایک آدمی کو اشارہ کیا۔ اس نے آگے بڑھ کر میرے منہ اور جسم پر چند گھونسے رسید کیے۔ میرا سر گھومنے لگا۔ ذرا توقف کے بعد اس نے دوبارہ مجھے اپنے گھونسوں پر رکھ لیا۔ میں اپنا بچاؤ کرنے سے قاصر تھا۔ چپ چاپ مار کھانے اور برداشت کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

"بس بس۔" سردار ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "مر جائے گا۔ اس سے پوچھ گچھ کرنا بہت ضروری ہے۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "اب کچھ یاد آیا تمہیں؟"

"مجھے سب کچھ یاد ہے۔" میں نے تکلیف برداشت کرنے کے لیے اپنی سانس روک لی۔

سردار نے پھر اس شخص کو اشارہ کیا۔ وہ اب مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا، سردار کے حکم کا منتظر تھا۔ مگر اب میں خاموشی سے مار کھانے کے لیے تیار نہ تھا۔ پہلے ہی وہ میری کافی درگت بنا چکے تھے اور یہ حقیقت ہے کہ اگر میں ایک سخت جان، تربیت یافتہ فوجی نہ ہوتا تو نہ جانے میرا کیا حال ہوتا۔

اس سے پہلے کہ ڈاکو میرے نزدیک پہنچتا میں نے اپنے پیروں کو تولا اور جسم کو اوپر اُٹھایا۔ میرا جسم ایک راکٹ کی مانند زمین سے اُونچا اٹھا اور دُوسرے ہی لمحے میں فضا میں قلابازیاں کھا رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ حیران ڈاکو کچھ سمجھ سکتا میری فلائنگ کک نے اُسے جا لیا۔ وہ توازن قائم نہ رکھ سکا اور زمین پر گر گیا۔ دُوسرے ڈاکوؤں نے جو اتنی دیر میں کافی تعداد میں اکٹھے ہو گئے تھے بندوقیں میری طرف تان لیں۔ مگر سردار نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں فائر کرنے سے روک دیا۔ پھر اُس نے زمین سے اُٹھتے ہوئے ایک شخص کو اشارہ کیا جو دانت پیستا ہوا میری طرف جھپٹا مگر اس بار میں اُچھلا اور اس پر جا گرا۔ وہ اس بار تیار تھا اور جھکائی دے کر میرا پیر پکڑنے کا ارادہ کر رہا تھا مگر میں اس کے اس ارادے کو پہلے ہی بھانپ چکا تھا۔ اس لیے میں نے ہوا میں

ایک اور پلٹی کھائی اور میری ٹھوکر اس بار اس کی ٹھوڑی پر لگی۔ اس کے منہ سے ایک آہ نکلی اور وہ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ اس اثناء میں دوسرے ڈاکو مجھ پر ٹوٹ پڑنے کے لیے تیار تھے۔ سردار نے ان میں سے ایک کو اشارہ کیا اور وہ مجھ پر حملہ آور ہو گیا میں نے تیزی سے جھک کر اور دوسری جانب ہٹ کر راستہ دیا اور وہ اپنی جھونک میں تیزی سے آگے نکل گیا مگر جب وہ مجھ سے دو قدم کے فاصلے پر تھا میرا پیر حرکت میں آیا اور میری ٹھوکر اس کی کنپٹی پر لگی۔ وہ ایک چیخ مار کر گر گیا اور بے ہوش ہو گیا۔ اب ڈاکوؤں کے چہروں پر غصہ اور نفرت کے سائے صاف نمودار ہو گئے تھے اور بندوقوں کی نالیوں پر ان کی گرفت اور زیادہ مضبوط ہو گئی تھی۔ اگر ان کا بس چلتا تو وہ میری تکا بوٹی کر دیتے اور اس مقصد کے لیے وہ اپنے سردار کے حکم اور اشارے کے لیے بے تاب نظر آ رہے تھے لیکن سردار ہی ایک ایسا شخص تھا جو خاموش کھڑا ہوا مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر غصے کی جگہ حیرت اور ستائش کے آثر نمایاں نظر آ رہے تھے۔

وہ ایک لمحہ بدستور خاموش اور بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ پھر اس کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی اور وہ دھیمی آواز میں بولا۔ "بہت اچھے۔ بہت اچھے تم بہادر آدمی ہو۔ خاموشی سے ہار نہیں مانو گے۔" پھر وہ اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا۔ "کون ہے جو اس کا مقابلہ کرے گا۔"

جواب میں تین چار آدمی للکارتے ہوئے آگے بڑھے مگر سردار کے ہاتھ کے اشارے نے انہیں روک دیا۔ "مقابلے کے لیے اس کے ہاتھ کھولنے ہوں گے اور ایک وقت میں ایک ہی اس سے لڑے گا۔" ان میں سے ایک آدمی اپنی بندوق پھینک کر کھڑا ہو گیا۔ سردار کے اشارے پر وہ نفرت سے پھنکارتا ہوا آگے بڑھا اور جیب سے چاقو نکال کر اس نے میرے ہاتھوں کو رسّی کی مضبوط بندش سے آزاد کر دیا۔ میرے ہاتھ مسلسل اور سختی کے ساتھ بندھے رہنے کی وجہ سے قریب قریب سُن ہو چکے تھے۔ یہ تو میری ڈھٹائی اور سخت جانی تھی جو اب تک خاموشی سے یہ تکلیف برداشت کرتا رہا تھا ورنہ حقیقت یہ ہے کہ میرے ہاتھوں میں مضبوطی سے پیوست ہونے والی رسّی نے خون کی گردش روک دی تھی اور ان میں شدید درد شروع ہو چکا تھا۔

میں نے مٹھیاں کھول کر اور بند کر کے ہاتھوں کی ورزش کی اور پھر کلائیوں کو بل دے کر بازوؤں کو ہوا میں گھمایا۔ کچھ دیر بعد میرے ہاتھوں میں سکت پیدا ہو گئی۔ اگرچہ دُکھن اور تکلیف ابھی تک باقی تھی مگر میں ان کو استعمال کرنے کے قابل ہو گیا تھا۔ اس تمام عرصے میں سردار اور اس کے ساتھی خاموش کھڑے مجھے گھورتے رہے۔ میرے ساتھ لڑنے کا ارادہ رکھنے والا شخص بھی چپ کھڑا تھا۔ لیکن اس کے چہرے پر میں اپنے لیے تعریف کے جذبات لکھے ہوئے پڑھ سکتا تھا اور یہ میری نصف جیت تھی جب آپ کا مقابل آپ کی ستائش اور تعریف پر مجبور ہو جائے تو سمجھئے کہ نفسیاتی طور پر آپ نے اس پر برتری حاصل کر لی ہے۔

یکایک سردار کی مضبوط اور بھاری آواز گونجی۔ "تم لڑنے کے لیے تیار ہو؟"

"تیار ہوں۔" میں نے اپنے اردگرد پھیلے ہوئے ڈاکوؤں پر نظر ڈالی جن کی تعداد اب درجنوں تک پہنچ چکی تھی۔ وہ سب کے سب میرے خون کے پیاسے نظر آ رہے تھے۔ مجھے ان سب سے باری باری مقابلہ کرنا تھا جو ایک مشکل بلکہ ناممکن کام نظر آنے لگا تھا۔ میں کتنا ہی سخت جان اور تربیت یافتہ سہی، بالآخر ایک انسان ہی تو تھا۔ جسمانی قوت میرے اندر بھی اتنی ہی تھی جتنی ایک عام انسان میں ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ مسلسل اور متواتر تربیت اور مشق نے مجھے زیادہ مضبوط اور مستعد انسان بنا دیا تھا۔ یہ پھرتی اور مستعدی آخر کہاں تک کام دے سکتی تھی۔ میرا مقابلہ جنگلی اور وحشی سورماؤں سے تھا جو کٹھن اور جان جوکھوں کا کام کرنے کے عادی تھے میں کب تک۔ اور کہاں تک ان سے لڑ سکوں گا اور شکست کی صورت میں مجھے اپنا انجام صاف نظر آ رہا تھا۔

اس اثناء میں میرا مقابل بڑھ کر مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر پہنچ چکا تھا اور مجھ پر حملہ آور ہونے کے لیے پر تول رہا تھا۔ میرے ہاتھوں میں بندھی ہوئی رسّی کاٹنے کے بعد اس نے اپنا چاقو ابھی تک ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ جب اس نے چاقو کو بند کر کے جیب میں رکھنے کا ارادہ کیا تو سردار نے اسے ٹوک دیا۔ "رُک جا گاموں۔"

گاما اس کا نام گامو تھا۔ کم از کم مجھے یہ تو پتہ چلا کہ میں جس شخص کے ساتھ زندگی اور موت کی لڑائی لڑنے والا ہوں اس

کا نام کیا ہے۔

"چاقو مت پھینک۔ یہ لڑائی میں تیرے پاس رہے گا۔"

گامو کے چہرے پر مسرت کے آثار نمودار ہوئے۔ اس نے معنی خیز انداز میں اپنے ساتھیوں کو اور پھر مجھے دیکھا۔ وہ چاقو کو دوبارہ کھول کر اور اپنا جسم تول کر تن کر کھڑا ہو گیا۔ چاقو پر اس کی گرفت صاف بتا رہی تھی کہ وہ اس لڑائی کے فن سے آگاہ ہے۔ وہ جھپٹ کر مجھ پر حملہ آور ہوا مگر میں اس کا وار روکنے کے لیے تیار تھا۔ میں نے پینترا بدل کر بائیں جانب جھکائی دی۔ اس نے ایک کا رُخ کیا مگر اس اثناء میں میں نے اپنے تربیت یافتہ جسم کو یکایک دائیں جانب جھٹکا دیا تھا۔ اس کے حملے میں بےیقینی اور کمزوری پیدا ہو گئی۔ یہی وجہ تھی کہ جب اس کا ہاتھ میرے نزدیک آیا تو میں اس کو تھام کر جھٹکا دینے اور موڑنے میں ذرا بھی دقت نہ ہوئی۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا میں نے اس کی کلائی پر اپنی گرفت کو مضبوط کر کے جھٹکا دیا ایک کھٹکے جیسی آواز پیدا ہوئی اور اس کے منہ سے بے اختیار ایک چیخ نکل گئی۔ میں نے اس کی کلائی چھوڑ کر ہلکا سا دھکا دیا اور وہ چلّاتا ہوا دور جا گرا۔ ڈاکوؤں کے گروہ میں بھی بھنبھناہٹ سی پیدا ہوئی۔ ایک اور شخص بندوق پھینک کر چاقو کھولتا ہوا میری طرف بڑھنے لگا۔ یہ قد و قامت میں دوسرے ڈاکوؤں سے زیادہ تھا اور اس کے قدموں کی مضبوطی سے اس کے جسم کی طاقت اور پھرتی کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ وہ غصے سے ہانپ رہا تھا اور یہ اس کا کمزور ترین پہلو تھا۔ نفرت اور غصے نے اس کی نصف انرجی پہلے ہی ختم کر دی تھی اور میں جان گیا کہ اس پر غلبہ حاصل کرنے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگے گی۔

مگر اس سے پہلے کہ وہ میرے نزدیک پہنچتا سردار کی آواز ایک بار پھر گونجی۔ "یوں نہیں۔" سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔ سردار نے زمین پر پڑا ہوا چاقو اُٹھایا اور میری طرف اُچھال دیا جسے میں نے فوراً ہی دبوچ لیا۔

"لڑائی برابر کی ہونی چاہیئے۔" سردار نے کہا۔ وہ ایک بہادر اور جری آدمی تھا کیونکہ صرف بہادر انسان ہی اتنا منصف اور فراخ دل ہو سکتا ہے۔

مگر اب میرے تیور بدلے ہوئے تھے۔ میں نے سردار کی نفسیات اور فطرت کا مطالعہ کر لیا تھا اور مجھے یہ پتہ چل گیا تھا کہ مجھے کہاں ضرب لگانی چاہیئے۔

سردار نے کہا۔ "دیکھو۔ تم دونوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے سے رعایت نہیں کرے گا۔ مقابلہ برابر کا ہے۔"

اب میں سردار کا مطلب بھی سمجھ گیا۔ ہم دونوں کے ہاتھوں میں چاقو دینے کا مطلب واضح تھا۔ لڑائی کے دوران میں ہم لازماً ایک دوسرے کو زخمی کریں گے اور اس طرح میری قوت اور توانائی ہر مقابلے کے ساتھ کم ہوتی جائے گی۔ سردار میری شجاعت اور مہارت کا قائل ضرور تھا لیکن وہ میری جان بخشی کرنے کو آمادہ نظر نہیں آتا تھا۔

"سردار۔" میں نے اس بار اسے براہِ راست مخاطب کیا۔ "یہ تماشا تو دو دن بھی جاری رہ سکتا ہے۔ لڑائی چاہتے ہو تو اس کا کوئی انجام بھی ہونا چاہیئے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ تم انصاف پسند اور بہادر آدمی ہو مگر یہ انصاف نہیں ہے کہ میں اگر جیت بھی جاؤں تو دوسرے آدمی سے لڑوں اور جب تک ان میں سے ایک بھی باقی ہے لڑتا رہوں۔ یہ تازہ دم ہوں گے اور میں تھک چکا ہوں گا ہو سکتا ہے میں زخمی بھی ہو جاؤں۔"

"تو پھر؟" وہ برہمی سے منہ بگاڑ کر بولا۔

"تو پھر اس کا فیصلہ جھٹ پٹ ہونا چاہیئے اور دیکھو۔ ان بے چاروں کو کیوں مارتے ہو۔ لڑائی تم مجھ سے کرنا چاہتے ہو۔ اگر تمہیں اپنی طاقت پہ اتنا مان ہے تو انہیں مروانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ تم خود مجھ سے کیوں نہیں لڑتے؟"

"کیا؟" وہ غصے سے دھاڑا۔ "میں تم سے لڑوں گا۔ ایک سردار ایک قیدی سے لڑے گا۔"
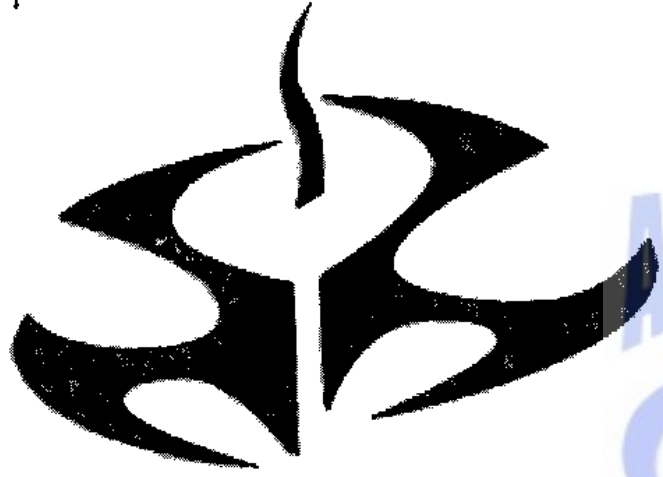
"کیوں نہیں لڑو گے۔ اگر تمہارے ساتھی مجھ سے لڑ سکتے ہیں تو تم بھی لڑ سکتے ہو۔ سردار کا مطلب تو یہ ہے کہ وہ دوسروں سے زیادہ بہادر ہو۔ تمہیں ان پر یہی برتری حاصل ہے کہ تم ان سب سے زیادہ طاقت ور اور طاقتور ہو۔ ورنہ یہ تمہیں اپنا سردار کیوں بناتے؟"

سردار نے مجھے گھورا پھر اپنے ساتھیوں کا جائزہ لیا۔ وہ چپ چاپ کھڑے تھے مگر ان کے دلوں کے اندر میری اس بات نے یقیناً ہلچل پیدا کر دی ہوگی۔ یہ ڈاکوؤں اور مجرموں کی نفسیات ہے کہ وہ دوسروں کے سامنے چیلنج اور للکار کو نظر انداز نہیں کرتے ورنہ وہ دنیا کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے ضروری ہے کہ مسلسل اور متواتر دوسروں پر اپنی جسمانی اور ذہنی برتری ثابت کرتے رہیں ورنہ ایک چوک، ایک بھول بھی انہیں ان کے مقام سے گرا سکتی ہے۔۔

"سردار!" اس کو تذبذب میں دیکھ کر میں نے کہا: "میں تمہیں چیلنج کر رہا ہوں۔ اگر ہمت ہے تو خود مجھ سے مقابلہ کرو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر ہار گیا تو تمہیں اپنے بارے میں سب کچھ بتا دوں گا۔"

یہ براہِ راست مقابلے کی دعوت تھی جسے مسترد کرنا اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ میں نے ایک اور چوٹ لگائی: "اور اگر تم ہار گئے تو پھر تمہیں مجھ کو کسی شرط کے بغیر آزاد کرنا ہوگا اور میں جو رعایت اور سہولت مانگوں گا وہ تم مجھے دو گے۔"

"بکواس!" وہ دہاڑا۔ "تم زندہ بچو گے تو کوئی رعایت مانگو گے نا؟ بجلی سے لڑنے والا زندہ نہیں رہتا۔"

"تو پھر مجھے تمہاری موت کا افسوس ہے۔" میں نے اس پر ایک اور نفسیاتی ضرب لگائی: "بڑے افسوس کی بات یہ ہے کہ تم کسی وجہ کے بغیر ہی میرے ہاتھوں مارے جاؤ گے مگر اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہوگا۔"

اب سردار کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ وہ غراتا ہوا آگے بڑھا۔ میدان میں کھڑے آدمی کو اس نے دھکا دے کر ایک طرف ہٹا دیا اور قمیص کی جیب میں ہاتھ ڈال کر چاقو نکال لیا۔ یہ ایک کمانی دار چاقو تھا اور اس کے کھلنے کی آواز ہی کمزور دل لوگوں کے لیے خاصی ہیبت ناک تھی۔ اس تمام عرصے میں اس نے ایک لمحے کے لیے بھی اپنی نظریں میرے چہرے سے نہیں ہٹائیں جس سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ ایک تربیت یافتہ چاقو باز ہے۔ چاقو پر اس کی گرفت ماہرانہ اور مضبوط تھی۔ وہ ایک دیوہیکل شخص تھا اور اس کے چہرے پر موجود زخموں کے نشانات اس کی جنگجوئی اور بہادری کا ثبوت تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے پر ایک بے رحم مسکراہٹ ہر دم رقصاں رہتی تھی جسے مسکراہٹ بھی نہیں کہا جا سکتا لیکن یہ امر طے شدہ تھا کہ وہ ایک معاف نہ کرنے والا شخص تھا۔ خصوصاً دشمن کو اس سے کسی بھی لگ یا رعایت کی توقع نہیں رکھنی چاہیے تھی۔

ہمارے اردگرد کافی کھلی جگہ تھی مگر ڈاکوؤں نے خاص طور پر پیچھے ہٹ کر مزید جگہ پیدا کر دی۔ یہ ایک ہموار جگہ تھی اور اس کا رقبہ اتنا زیادہ تھا کہ یہاں کبڈی کھیلی جا سکتی تھی۔

سردار نے مجھے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ ایک نعرہ مار کر وہ مجھ پر حملہ آور ہوا۔ فضا میں اس کا بھاری بھرکم جسم ایک بے وزن چیز کی طرح بلند ہوا اور مجھ تک پہنچتے پہنچتے اس نے ہوا میں دو تین پلٹیاں کھائیں۔ دراصل وہ میرے جسم کی جنبش سے اندازہ لگا چکا تھا کہ میں کس طرف حرکت کرنے کا ارادہ کر رہا ہوں اور یہ اس کی مہارت کا مکمل ثبوت تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر گرتا میں نے اس کی خلافِ توقع مختلف سمت میں چھلانگ لگا دی۔ اس کا چاقو میرے جسم سے چند انچ کے فاصلے سے سنسناہٹ کی آواز پیدا کرتا ہوا گزرا۔ اگر میرے اندازے میں معمولی سی غلطی بھی ہو جاتی تو وہ چاقو میرے سینے میں گھاؤ ڈال دیتا۔ اس سے پہلے کہ وہ زمین پر قدم رکھتا اس نے پنجوں کے زور پر دوبارہ چھلانگ لگا دی اور میں اس کی پھرتی اور چستی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس بھاری بھرکم جثے کے مالک کا یوں بلا توقف ہوا میں چھلانگ لگا دینا بہت مشکل کام ہے مگر وہ اپنے فن میں ماہر تھا۔ اس بار وہ جھکائی دے کر بائیں جانب سے میرے اوپر حملہ آور ہوا۔ میرے پاس ہٹ جانے کا وقت نہ تھا اس لیے میں نے چاقو والا ہاتھ بلند کیا اور اس کے وار کو اپنے بازو پر روک لیا۔ میرا تمام جسم اس ضرب کی وجہ سے جھنجھنا کر رہ گیا۔ اس نے مجھے سنبھلنے یا دم لینے کا موقع نہیں دیا اور پے در پے وار شروع کر دیئے۔ یہ حقیقت ہے کہ میرے لیے اس کے پیہم حملوں سے محفوظ رہنا ایک دشوار امر تھا۔ میں غیر ضروری طوالت میں جائے بغیر

اتنا کہوں گا کہ وہ ایک بے جگر اور ان تھک آدمی تھا اور چاقو زنی کے فن میں کسی ماہر استاد سے اس نے تربیت حاصل کی تھی۔ وہ دس پندرہ منٹ تک مجھ پر حملے کرتا رہا مگر اس کے انداز میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ بدستور تازہ دم اور پُر اعتماد تھا۔

میرا خیال تھا کہ میں اسے تھکا کر اپنے حملے کا آغاز کروں گا لیکن یہ خیال غلط ثابت ہوتا جا رہا تھا وہ کسی طرح تھکنے کا نام نہیں لے رہا تھا بلکہ اس کے حملے اور بھی زیادہ خوفناک اور خطرناک ہوتے جا رہے تھے یہاں تک کہ ایک بار اس کے چاقو کی نوک میرے کاندھے پر لگی۔ میں نے پھرتی سے جسم کو پیچھے جھکایا مگر چاقو میرے جسم پر خراش ڈالتا ہوا پیٹ تک پہنچ گیا۔

اس کا دوسرا جان لیوا حملہ میں نے اپنی کلائی پر روکا اور جب اس نے چاقو کو جھٹکا دے کر کھینچا تو میری کلائی خون میں نہا گئی۔ اس کے چہرے پر ایک طمانیت آمیز مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ مسلسل حملوں کے باوجود وہ تازہ دم تھا۔ یہاں تک کہ اس کے چہرے پر پسینے کا ایک قطرہ تک نظر نہیں آ رہا تھا۔

اب اس لڑائی کا طول کھینچنا میرے حق میں کسی طرح بہتر اور مناسب نہ تھا مگر سردار ایسا مد مقابل تھا جسے اپنی خواہش اور مرضی کے مطابق ٹھکانے لگانا بھی ممکن نہ تھا لیکن خوش قسمتی نے میرا ساتھ دیا اور اس نے بذات خود مجھے ایک موقع فراہم کر دیا۔ وہ بائیں جانب جھکائی دے کر میری طرف لپکا اور اس اثناء میں اس نے چاقو کو بھی بڑی پھرتی سے بائیں ہاتھ میں لے لیا۔ جب وہ میرے نزدیک پہنچا تو میں اس کے لیے تیار تھا۔ حالانکہ اس کی یہ چال کسی عدو کو بوکھلا دینے کے لیے کافی تھی مگر میں نے اس آرٹ کی باقاعدہ تربیت حاصل کی تھی۔ جونہی اس کا بایاں ہاتھ ہوا میں لہرا کر میری گردن کی طرف آیا۔ میں نے دو قدم ہٹ کر ٹانگ چلا دی۔ ضرب اس کی دائیں کلائی پر لگی مگر وہ فوری طور پر سنبھلا اور فضا میں پلٹ کر دوبارہ مجھ پر باز کی طرح گرا۔ وہ یہ بھول گیا تھا کہ اسی کا داؤ میں بھی استعمال کر سکتا ہوں۔ بجلی کی طرح میں نے بھی چاقو کو اپنے دائیں ہاتھ سے بائیں میں منتقل کیا اور ترچھا کر کے اس کی کمر پر حملہ کیا۔ وہ حسب توقع پلٹا مگر یہ بھول گیا کہ چاقو اب میرے دوسرے ہاتھ میں پہنچ چکا تھا۔ اس کا بھاری جسم میرے چاقو سے ٹکرایا اور اس کی نوک سردار کے سینے میں اترتی چلی گئی۔ میں اس کی جان لینے کا مطلق خواہاں نہ تھا۔ میں نے فوراً ہی چاقو کو واپس کھینچ لیا مگر اس اثناء میں اس کے جسم کا بوجھ میرے چاقو کو نصف سے زیادہ جسم کے اندر پیوست کر چکا تھا۔ ایک جھٹکے سے میں نے چاقو کھینچا اور دو قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ سردار کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور وہ اوندھے منہ زمین پر گر گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ بے جان تھا۔

میں اس اچانک اور خلاف امید واقعے کے لیے بالکل تیار نہ تھا مگر جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ میرے ہاتھوں ہلاک ہو چکا تھا۔ میں نے چاقو کی طرف دیکھا۔ وہ خون سے سرخ ہو چکا تھا۔ دوسری نظر سامنے زمین پر ڈالی جہاں سردار کا بے جان جسم ایک ڈھیر کی طرح پڑا تھا۔ میں ایک ثانیے کے لیے تو سوچنے اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت سے بالکل عاری ہو گیا مگر پھر یہ خیال مجھے ہوش میں لانے کے لیے کافی تھا کہ میں جو کہ ڈاکوؤں کے سردار کا قاتل تھا ان مسلح خونخوار لوگوں کے سامنے قریب قریب نہتا کھڑا تھا۔ میرے ہاتھ میں صرف ایک چاقو تھا اور میرے مقابلے میں جو لوگ تھے وہ بندوقوں، پستولوں اور خنجروں سے پوری طرح لیس تھے۔

کچھ دیر سناٹا رہا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس واقعے نے ان سب کو ساکت اور بے جان کر دیا ہے۔ میں جانتا تھا کہ اس فوری صدمے سے سنبھلنے کے بعد وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے مگر میں کہیں بھاگ کر بھی نہیں جا سکتا تھا۔ ایک نہتا شخص اتنے بہت سے مسلح لوگوں سے بچ کر کہاں تک بھاگ سکتا ہے جبکہ وہ نشانے کے بھی پکے تھے۔

میری حالت ایک ایسے شکار جیسی تھی جو چاروں طرف سے شکاریوں کے نرغے میں پھنس چکا ہو اور جس کی جان بچنے کا کوئی بھی امکان باقی نہ ہو۔ میں ان نامساعد حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے بھی بالکل تیار تھا۔ مقابلے کے بغیر ہار مان لینا میری سرشت میں شامل نہیں تھا۔ بدترین حالات میں بھی میرے ہوش و حواس قائم رہتے تھے جو کہ خدا کی طرف سے ایک عطیہ تھا۔ مجھے اپنے اللہ پر مکمل ایمان تھا۔ شاید اسی لئے وہ بظاہر ناممکن حالات میں بھی میرے بچنے کے سامان پیدا کر دیتا تھا۔

لیکن اس وقت صورت حال بالکل مختلف تھی۔ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی خونخوار ڈاکوؤں کے سردار کو قتل کر دیا تھا۔ اس کی لاش میرے سامنے پڑی تھی اور چاروں اطراف سے اس کے وحشی ساتھیوں نے مجھے گھیر رکھا تھا۔ ابتدائی لمحات جنہوں نے ڈاکوؤں کو ہکا بکا کر دیا تھا گزر چکے تھے۔ اب ان کی نگاہوں میں مجھے اپنے لئے نفرت اور انتقام کے شعلے بھڑکتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ان کی نظریں آگ برسا رہی تھیں اور ان کے چہروں پر غیض و غضب کے آثار نمایاں تھے۔ ان سب نے اپنے ہتھیاروں پر اپنی گرفت مضبوط کر لی تھی۔ وہ میرے چاروں طرف گھیرا ڈال کر کھڑے تھے لیکن اب وہ اچانک صدمے کے اثر سے آزاد ہو چکے تھے اور ان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت واپس آ چکی تھی۔ ان کے چہرے دیکھ کر ہی میں ان کے ارادوں کا اندازہ کا بخوبی اندازہ لگا سکتا تھا۔

''موت، موت اور صرف موت۔''

ہر ایک کے چہرے پر صرف یہی عبارت لکھی نظر آ رہی تھی۔ یکا یک ان کے ساکت جسموں میں حرکت شروع ہوئی اور وہ آہستہ آہستہ میری جانب بڑھنے لگے۔ میرے اردگرد ان کا گھیرا تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ ان میں سے ہر ایک میرے لئے موت کا فرشتہ تھا۔ میں موت کے ان فرشتوں کے درمیان میں تنہا کھڑا تھا۔ میرے ہاتھ میں ایک چاقو کے سوا کچھ نہیں تھا۔ یہ وہی چاقو تھا جو کہ ان کے سردار کی موت کا سبب بنا تھا۔ ان میں سے ہر ایک بندوقوں اور پستولوں سے مسلح تھا اور وہ سب مجھے اپنی گولیوں سے بھون ڈالنے کے لیے بے تاب تھے۔

میں نے موت کو بار بار اپنے روبرو دیکھا تھا لیکن موت کے اتنے بہت سے فرشتوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کا یہ پہلا ہی اتفاق تھا۔ میں چاروں طرف سے ان کے نشانے پر تھا۔ نہ کوئی پناہ گاہ تھی اور نہ ہی عقبی دیوار جو پیچھے ہٹنے کے لیے میری مددگار ثابت ہوتی۔ ہر طرف موت کا موجیں مارتا ہوا سمندر تھا جس کی لہریں لحہ بہ لحہ مجھے غرق کرنے کے لئے بڑھی آ رہی تھیں۔

اب ان سب نے اپنی بندوقوں اور پستولوں کی نالیں میری جانب تان لی تھیں۔ ان سب کی انگلیاں لبلبی پر تھیں۔ اس بار موت سے دامن بچانے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں کلمہ پڑھا اور مرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس بار میں بے بسی اور لاچاری کے عالم میں جان دینے والا تھا۔ جان بچانے کا تو کوئی راستہ نہ تھا لیکن میں مرنے سے پہلے اپنے کسی ایک حریف کو بھی موت کے گھاٹ اُترنے سے قاصر تھا۔ محض ایک چاقو کی مدد سے میں مدافعت کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ بس ایک لمحے کی دیر تھی کہ میرا جسم گولیاں سے چھلنی ہونے والا تھا۔

موت برحق ہے۔ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے یہ بھی میرا ایمان تھا کہ آپ کی موت جب، جیسے اور جس جگہ لکھ دی گی ہے اس سے مفر ممکن نہیں ہے۔ شاید میری موت اسی طرح لکھ دی گئی تھی۔ پہلا موقعہ تھا جب میں کسی مدافعت کے بغیر اپنے دشمنوں کا چارہ اور نشانہ بننے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو چکا تھا۔ خون آلود چاقو کے دستے پر میری گرفت مضبوط ہونے کی بجائے کمزور ہو گئی تھی۔ وہی مثل تھی کہ۔

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب
کیا کسی کا گلہ کرے کوئی

گولیوں کی بوچھار سننے کے لیے میں بالکل تیار تھا مگر میرے عزم وارادے میں کوئی کمی نہیں پیدا ہوئی تھی۔ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مرنا بھی کسی کسی کے نصیب میں ہی ہوتا ہے۔ اب اس طرح کی موت میرا مقدر بن چکی تھی۔

بندوقوں اور پستولوں کی نالیں بلند ہو چکی تھیں اور آگ برسانے والی ہی تھیں کہ اچانک ایک آواز اس سناٹے میں گونجی

''رک جاؤ''

سناٹا اس قدر مکمل تھا کہ موت کے قدموں کی چاپ کے سوا کوئی اور آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس خاموشی میں گونجنے والی اس آواز نے ہم سب کو چونکا کر رکھ دیا۔ سب کی نگاہیں اس جانب مڑ گئیں جدھر سے یہ آواز آئی تھی۔

میرے سامنے ایک لمبی تڑنگی، مضبوط عورت کھڑی تھی۔ اس نے سیاہ قمیض اور سیاہ شلوار پہن رکھی تھی۔ سیاہ بال اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ کھلتے ہوئے گندمی رنگ کی عورت تھی لیکن سیاہ لباس میں اس کا چہرہ چمکتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی جسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ وہ دوپٹے سے بے نیاز تھی جس کی وجہ سے اس کا بھرپور تندرست سراپا کچھ اور نمایاں ہو گیا تھا۔ اس قد و قامت اور ڈیل ڈول کے باوجود اس کی شخصیت میں ایک سحر انگیز مرعوب کن کشش تھی۔ اس کے ہاتھوں میں ایک آٹومیٹک رائفل تھی۔

میں اس کی آواز سن کر چونک گیا تھا مگر جب اس کے چہرے اور سراپا پر نظر ڈالی تو میری حیرت اور استعجاب میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ اس نے چند قدم آگے بڑھائے تو اس کی شخصیت کچھ اور نمایاں ہو گئی۔

میں نے ڈاکوؤں کی جانب دیکھا۔ وہ سب اپنی اپنی جگہ پر ساکت رہ گئے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے پتھر کے بے جان مجسمے ہوں۔

عورت کی آواز ایک بار پھر گونجی۔

''سردار مر گیا۔ مگر میں تو ابھی زندہ ہوں۔ میری اجازت اور حکم کے بغیر تمہیں کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار کس نے دیا ہے؟''

''بندیا مائی۔ اس آدمی نے سردار کو چاقو سے، مار دیا ہے۔'' ڈاکوؤں میں سے ایک ہٹا کٹا جوشیلا نوجوان آگے بڑھ کر بولا۔

اس فقرے سے میں نے اندازہ لگایا کہ اس عورت کا نام بندیا ہے اور وہ سردار کی بیوی تھی جو کہ اب بیوہ ہو چکی ہے۔

بندیا کی نظریں سامنے پڑی ہوئی سردار کی لاش پر جم کر رہ گئیں۔ اس نے بندوق ہاتھ سے پھینک دی اور بے اختیار دوڑ کر لاش کے پاس پہنچ گئی۔ سردار کے جسم سے چاقو باہر کھینچ لینے کے بعد خون بے تحاشہ بہہ نکلا تھا۔ جس نے اس کے مردہ جسم کے علاوہ آس پاس کی زمین کو بھی سرخ کر دیا تھا۔

وہ لاش کے پاس دو زانو بیٹھ گئی۔ سردار کا سر اس نے اپنے زانو پر رکھ لیا اور اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لے کر دیکھا۔ اس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ شاید اسے یقین ہو گیا تھا کہ اس مردہ جسم میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں رہی۔

اس نے بے اختیار سردار کی پیشانی کو چوم لیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ وہ ایک جی دار اور مضبوط قسم کی عورت تھی۔ ظاہر ہے کہ ڈاکوؤں کے سردار کی بیوی کے نرم دل ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس نے اپنی آنکھوں

سے درجنوں بلکہ سینکڑوں انسانوں کو مرتے ہوئے دیکھا ہو گا، ممکن ہے خود اس کے ہاتھ بھی بہت سے انسانوں کے خون سے رنگین ہوں۔ اس لیے موت اور خون کا یہ کھیل یقیناً اس کے لیے نیا نہیں تھا مگر اس سے پہلے وہ بیگانوں کو موت کا ایندھن بنتے ہوئے دیکھتی تھی۔ آج پہلی بار اس کا محبوب شوہر موت کی آغوش میں چلا گیا تھا۔ اس کے آنسو اور چہرے کے تاثرات سے صاف ظاہر تھا کہ وہ درحقیقت اپنے شوہر سے بے پناہ محبت کرتی تھی۔

چند لمحے کے لیے ہر طرف خاموشی طاری ہو گئی۔ صرف بندیا کی سسکیوں کی آواز تھی اور سناٹا۔

اس نے بہت جلد اپنے جذبات پر قابو پا لیا۔ سردار کا سر اس نے بہت احتیاط اور محبت سے اپنے زانو سے ہٹایا اور زمین پر رکھ دیا۔ ہاتھوں سے اپنے آنسو پونچھے اور پھر اٹھ کر کھڑی ہو گی۔ اس کے چہرے پر غم و غصہ کے ملے جلے تاثرات تھے۔ اس نے جب میری جانب خون آلود نگاہوں سے دیکھا تو میں اس کی آنکھوں سے نکلنے والے شعلوں کی حدت محسوس کر رہا تھا۔

بندیا نے جھک کر زمین پر پڑی ہوئی بندوق اٹھائی اور میری جانب قدم بڑھا کر رک گئی۔

اس نے بلند آواز میں پوچھا ''رحمو یہ سب کیسے ہوا؟''

رحمو وہی ڈاکو تھا جس نے پہلے اس کو مخاطب کیا تھا۔

رحمو نے مختصر طور پر تمام واقعہ اس کو سنا دیا۔ وہ ایک اکھڑ اور صاف گو ڈاکو تھا۔ اس نے کسی مبالغے یا جھوٹ کے بغیر تمام داستان من و عن بیان کر دی کہ سردار کی موت کس طرح واقع ہوئی۔

بندیا خاموشی سے سنتی رہی۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا اور دو ٹوک الفاظ میں پوچھا۔ ''سچ سچ بتاؤ۔ کیا تم پولیس کے مخبر ہو؟''

''نہیں۔'' میں نے مضبوط آواز میں جواب دیا۔ ''میں سردار سے بھی کہتا رہا مگر اس نے میری بات کا یقین نہیں کیا۔ پھر میں نے اسے روبرو مقابلے کے لیے للکارا تو وہ فوراً تیار ہو گیا۔ میں اپنی بچانے کے لیے مقابلہ کر رہا تھا لیکن میں نے جان بوجھ کر سردار کو قتل نہیں کیا۔ اس کا چاقو ہم دونوں کے جسم کے درمیان آ گیا اور کسی ارادے یا کوشش کے بغیر سردار کے جسم میں پیوست ہو گیا۔ یہ سب کچھ اچانک اور اتفاقیہ ہو گیا ہے۔ میں سردار کا قاتل نہیں ہوں۔ وہ ایک بہادر آدمی تھا۔ اگر اپنی جان بچانے کے لئے مجھے مجبوراً اس کو قتل کرنا پڑتا تو میں بلا جھجک اسے قتل کر دیتا مگر جس طرح وہ مرا ہے اس میں کوشش یا ارادے کا کوئی دخل نہیں ہے''۔

یہ کہہ کر میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑا ہو گیا۔

میری جرأت اور بے خوفی نے اسے متاثر کیا تھا۔

اس نے کہا۔ ''تم جانتے ہو قتل کی سزا کیا ہوتی ہے؟''

''جانتا ہوں۔'' میں نے بے خوفی سے جواب دیا۔ ''لیکن میں نے اسے قتل نہیں کیا۔ اگر وہ میری بات پر یقین کر لیتا تو شاید یہ سب کچھ نہ ہوتا اور وہ اس وقت زندہ ہوتا۔''

بندیا مجھے گھور کر دیکھ رہی تھی۔ ڈاکوؤں کی خاموشی ٹوٹ چکی تھی اور وہ سب کے سب بولنے لگے تھے۔ ان کی آوازیں آپس میں گڈمڈ ہو گئی تھیں مگر میں اتنا سمجھ سکتا تھا کہ وہ سب میرے لئے موت کا مطالبہ کر رہے تھے۔

یکا یک بندیا نے ایک ہاتھ اونچا اٹھایا تو سب خاموش ہو گئے۔

بندیا نے رحمو کی طرف دیکھا جو سب سے زیادہ جوشیلا اور بڑھ بڑھ کر بولنے والا تھا۔ ''رحمو تم کیا کہتے ہو؟''

رحمو غالباً سردار کے بعد گروہ کا سب سے زیادہ اہم رکن تھا۔

"بندیا مائی۔" رحمو نے کرخت آواز میں جواب دیا۔ "خون کا بدلہ خون ہوتا ہے۔ اس نے ہمارے سردار کا خون کیا ہے۔ اس کے خون سے ہی ہمارا دل ٹھنڈا ہوگا۔"

بندیا نے ایک لمحہ اس کی جانب اور پھر دوسرے ڈاکوؤں کو دیکھا۔ ان سب کے چہروں پر ایک ہی جواب لکھا ہوا نظر آ رہا تھا۔

"اس کا خون کون کرے گا؟" بندیا نے سوال کیا۔

"میں۔" رحمو نے فوراً جواب دیا مگر ہر ڈاکو "میں" کی آواز بلند کر رہا تھا۔

"سردار نے اس کو مقابلہ کرنے کا موقعہ دیا تھا۔ کسی بھی آدمی کو ہم عدالت کچہری کی طرح موت کی سزا نہیں دے سکتے۔ ہمارے قانون کے مطابق اس کو مقابلہ کرنے کا موقعہ دیا جائے گا۔"

سب ڈاکو ایک دم خاموش ہو گئے۔

بندیا ایک معاملہ فہم ٹھنڈے مزاج کی عقلمند عورت معلوم ہوتی تھی۔ اس قدر جذباتی اور ہنگامی حالات کے باوجود اس کا دماغ صحیح طور پر کام کر رہا تھا۔

بندیا نے گہری نظروں سے سب ڈاکوؤں کا جائزہ لیا پھر اس کی آواز بلند ہوئی۔

"بولو۔ اس سے مقابلہ کون کرے گا؟"

ایک لمحہ خاموشی طاری رہی۔ پھر ڈاکوؤں نے باہمی طور پر دبی زبان میں ایک دوسرے سے مشورہ شروع کر دیا۔

بندیا نے کہا۔ "رحمو، تم سردار کے سب سے زیادہ بھروسے کے آدمی تھے۔ اپنی طاقت اور بہادری پر بھی تمہیں ناز ہے۔ کیوں نہ تم اس کے ساتھ زور آزمائی کرو؟"

رحمو اس اچانک تبدیلی سے قدرے پریشان نظر آ رہا تھا لیکن اب اس کے تمام ساتھیوں کے سامنے اس کے وقار کا مسئلہ پیدا ہو چکا تھا۔ بندیا نے جس انداز میں اسے مخاطب کیا تھا اس میں قدرے طنزیہ عنصر بھی شامل تھا۔ غالباً رحمو کی بڑھ بڑھ کر بولنے اور ڈینگیں مارنے کی عادت سے بندیا ناخوش تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے کھلے عام رحمو کو ایک چیلنج کا سامنا کرنے کے لیے مجبور کر دیا تھا۔

"ٹھیک ہے۔" رحمو نے کرخت لہجے میں کہا۔ "میں تیار ہوں۔" سب ڈاکوؤں نے اسے ستائشی نظروں سے دیکھا۔

بندیا بولی۔ "یہ فیصلہ ابھی اور اسی وقت ہو جانا چاہیے۔" یہ کہہ کر اس نے ایک ڈاکو سے کہا۔ "سردار کی لاش اٹھا کر احترام سے ایک طرف رکھ دو۔ اس بات کا فیصلہ ہونے کے بعد ہم اپنے سردار کو مٹی کے سپرد کر دیں گے۔"

چند ڈاکو آگے بڑھے۔ انہوں نے سردار کے مردہ جسم کو بہت احتیاط اور احترام کے ساتھ اٹھا کر ایک جانب رکھ دیا۔ اس پر ایک چادر ڈالی دی گئی۔

رحمو چند قدم آگے بڑھ کر میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی نگاہوں میں میرے لئے نفرت کے الاؤ سلگ رہے تھے۔

بندیا نے ہم دونوں پر نظر ڈالی پھر کہا۔ "مقابلہ چاقو سے ہوگا یا کلہاڑی سے؟" یہ کہہ کر ہم دونوں کو دیکھنے لگی۔

میں ایک ایسی صورت حال سے دوچار ہو چکا تھا جس پر میرا کوئی اختیار نہیں تھا۔ مجھے اپنی جان بچانے کے لیے بہرصورت مقابلہ کرنا تھا۔

مجھے یکایک جس قسم کے حالات سے دوچار ہونا پڑ گیا تھا اس میں زندگی کے امکانات بہت کم تھے۔ اگر بندیا

بروقت آ کر اس معاملے میں مداخلت نہ کرتی تو شاید میرا جسم اب تک برہم اور غضب ناک ڈاکوؤں کی گولیوں سے چھلنی ہو چکا ہوتا۔ وقتی طور پر میری جان بچ گئی تھی لیکن مجھے ابھی ایک اور امتحان سے گزرنا تھا۔ اس کے بعد اور کتنی آزمائشیں میری منتظر تھیں میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ میرے زندہ بچ جانے کا امکان صرف ایک فیصد تھا اس لیے میں ہر قیمت پر جان کی بازی لگانے پر مجبور اور آمادہ تھا۔

رحمو نے بندیا کی طرف دیکھا۔ "میں کلہاڑی سے مقابلہ کروں گا۔"

بندیا نے میری جانب دیکھا۔

میں نے جواب دیا۔ "مجھے منظور ہے۔"

ظاہر ہے کہ کلہاڑی کا ہتھیار ہو یا چاقو کا۔ مجھے بہرصورت اپنی جان بچانے کے لئے مقابلہ کرنا تھا۔

بندیا کے اشارے پر ایک ڈاکو دو کلہاڑیاں لے آیا۔ ان میں سے ایک مجھے اور دوسری رحمو کو دے دی گئی۔ میں نے کلہاڑی کو اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد تولا۔ اس کی دھار کو انگلی چھو کر محسوس کیا۔ وہ چاقو کی طرح تیز اور دھار دار تھی۔ یقیناً رحمو کی کلہاڑی بھی ایسی ہی تھی۔

ہم دونوں کلہاڑیاں ہاتھ میں تھام کر ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ ڈاکوؤں کا مجمع قدرے پیچھے ہٹ چکا تھا تاکہ مقابلے کے لئے زیادہ جگہ میسر آ جائے۔

بندیا البتہ ابھی تک اپنی جگہ کھڑی تھی۔ اس نے ہماری لڑائی کے دوران میں بھی اپنی جگہ سے جنبش تک نہیں کی حالانکہ کئی بار ہم دونوں کلہاڑیوں سے ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتے ہوئے اس کے بالکل نزدیک بھی پہنچ گئے تھے۔ وہ بہت عجیب نڈر اور انوکھی عورت تھی۔

بندیا کے اشارے پر ہم دونوں حرکت میں آ گئے۔ پہلے چند لمحے ہم کلہاڑیاں تھامے ایک دوسرے کو تولتے اور ایک دائرے میں حرکت کرتے رہے۔ پھر اچانک رحمو بجلی کی طرح لپک کر مجھ پر حملہ آور ہو گیا۔ میں نے اس کا بھرپور وار ایک طرف جھکائی دے کر بے اثر کر دیا۔ میں کسی بھی قسم کے خوف سے قطعی بے نیاز تھا حالانکہ کلہاڑی سے جنگ کرنے کا یہ میری زندگی میں پہلا موقعہ تھا۔

رحمو بہت پھرتیلا اور طاقتور انسان تھا۔ اس نے فوراً ہی مجھ پر دوسرا حملہ کر دیا اور پھر تابڑ توڑ کئی حملے کئے جن میں سے کچھ حملوں کو میں نے کلہاڑی پر روکا۔ کچھ حملوں کو تیزی سے اپنی جگہ سے ہٹ کر خالی جانے دیا۔

رحمو کو غالباً میری جانب سے اتنی طویل مزاحمت کی توقع نہیں تھی اس لیے لمحہ بہ لمحہ اس کے جوش اور غصے میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اپنے وار خالی جاتے ہوئے دیکھے تو اس کی جارحیت میں اور اضافہ ہو گیا مگر میں نے اپنے جذبات پر مکمل قابو رکھا، نہ تو میں مشتعل ہوا نہ ہی غصے میں آیا۔ حملہ آور رحمو تھا اس لیے جسمانی مشقت بھی اسی کے حصے میں آئی تھی۔ میں معمولی حرکت کے ذریعہ اس کے وار بچا رہا تھا۔

بندیا اور دوسرے لوگ خاموشی اور دلچسپی سے یہ مقابلہ دیکھ رہے تھے میرا پُرسکون چہرہ اور مطمئن انداز ان کے لیے حیران کن تھا۔ ان کا خیال تھا کہ میں چند منٹ بھی رحمو کا مقابلہ نہیں کر سکوں گا اور شکست یا موت میرا مقدر بن جائے گی لیکن صورت حال ان کی توقعات کے برعکس تھی۔

رحمو جسمانی مشقت اور پیہم حرکت کرنے کی وجہ سے ہانپنے لگا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے جوش اور غیظ و غضب میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ میری بے پروائی اور پُرسکون مدافعت کی وجہ سے اس کے جوش میں اضافہ ہو گیا تھا۔ مسلسل حملوں کی تھکن اس کے چہرے پر نظر آنے لگی تھی۔ ابھی تک میں نے اس پر ایک بھی حملہ نہیں کیا تھا۔ محض دفاع

کرنے میں مصروف تھا۔

رحمو جھلایا ہوا تھا مگر تھک بھی چکا تھا اس لئے وہ دم لینے کے لیے رک گیا لیکن اس کی خونخوار نظریں بدستور میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے اس کو ہانپتے ہوئے دیکھا تو مسکرا کر کہا۔ ''رحمو، اتنی جلدی تھک گئے؟ آؤ، اپنا ہر ارمان پورا کرلو۔'' یہ کہہ کر میں نے ہاتھ سے اس کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔

رحمو انتہائی اشتعال میں آ کر بے اختیار دانت پیستا ہوا میری جانب لپکا۔ کلہاڑی کو اس نے دونوں ہاتھوں میں تھام کر اونچا اٹھا رکھا تھا اور ایک بپھرے ہوئے سانڈ کی مانند میری طرف لپکا آ رہا تھا۔

اس نے کلہاڑی بلند کی اور ایک بھرپور حملہ کیا لیکن زمین کی ناہمواری کی وجہ سے اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ اس نے کلہاڑی کا جو وار مجھ پر کیا تھا وہ بھرپور نہ تھا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر میں نے اپنی کلہاڑی پوری طاقت سے اس کی کلہاڑی کے دستے پر ماری۔ کلہاڑی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر بہت دور جا گری۔ وہ خود بھی لڑکھڑایا۔ جتنی دیر میں وہ سنبھلتا میں اس کے سر پہ جا پہنچا تھا۔ میں نے گرانے کا ایک داؤ آزمایا اور میری کک پوری قوت سے اس کے سینے پر لگی تو وہ کوشش کے باوجود اپنے قدموں پر کھڑا نہ رہ سکا۔ دوسرے لمحے میں وہ چاروں شانے چت زمین پر پڑا ہوا تھا۔

اس نے پھرتی کے ساتھ پلٹی مار کر زمین سے اٹھنے کی کوشش کی مگر میں نے اس کی مہلت نہ دی۔ میری ایک بھرپور ٹھوکر اس کے منہ پر لگی اور وہ دوبارہ زمین پر گر گیا۔ اس کے منہ سے خون جاری ہو گیا تھا۔ میں نے اسے سنبھلنے کا کوئی موقع نہیں دیا اور اس کو اپنی ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ اب وہ ان تابڑ توڑ حملوں کی تاب نہ لا کر نیم جان ہو کر میرے سامنے پڑا ہوا تھا۔

میں نے ایک پیر اس کی چھاتی پر رکھ دیا۔ اب وہ حرکت کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس کے منہ سے خون جاری تھا اور وہ بے بسی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ مقابلے کے اصول کے مطابق غالب آنے والے کو مغلوب کو ہلاک کر دینا چاہئے تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں میں تھام کر اپنی کلہاڑی اوپر اٹھائی اور ضرب لگانے سے پہلے اپنے اردگرد کھڑے ہوئے حیران و پریشان ڈاکوؤں پر نظر ڈالی۔ وہ سہمے ہوئے تھے اور تشویشناک انداز میں یہ سب منظر دیکھ رہے تھے۔

میں نے نگاہیں پھیر کر بندیا کو دیکھا جو بدستور اپنی جگہ پر جمی ہوئی کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر حیرت اور ستائش کا تاثر تھا۔ رحمو ان کے گروہ کی آن تھا مگر چند لمحوں میں وہ ریت کی دیوار کی طرح گر چکا تھا اور میرے قدموں میں پڑا ہوا تھا۔

میں نے بندیا کو دیکھا۔ میری نظروں میں ایک سوال اٹھا کہ اب اس شخص کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ مجھے پوری طرح احساس تھا کہ میں اس گروہ میں تنہا ہوں۔ ان وحشی اور اجڈ لوگوں سے دشمنی مول لے کر زندہ رہنا میرے لئے ممکن نہیں تھا لیکن میں جن حالات سے دوچار تھا، ان سے عہدہ برآ ہونا بہت مشکل تھا۔ میں احتیاط سے بہت پھونک پھونک کر قدم اٹھانا چاہتا تھا۔

بندیا نے مضبوط آواز میں کہا۔ ''یہ تمہارا شکار ہے۔ ہمارے قانون کے مطابق تم اس کو جان سے مار سکتے ہو۔''

اس کی سنگدلی اور بے رحمی میرے لئے حیران کن تھی۔ رحمو اس کے گروہ کا ایک اہم بلکہ سب سے زیادہ اہم رکن تھا مگر اس نے بہت بے نیازی سے مجھے اس کو قتل کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ اس کی اصول پرستی اور منصفی قابل داد تھی۔

میں نے ایک بار پھر ڈاکوؤں کی جانب دیکھا۔ وہ سب خاموش کھڑے تھے۔ کسی میں بندیا کے حکم کے خلاف آواز اٹھانے کی جرأت نہ تھی۔ پھر میں نے اپنے قدموں میں پڑے ہوئے رحمو کو دیکھا۔ اس کا چہرہ خود اسی کے خون سے لہولہان ہو چکا تھا۔ وہ ایک چاروں طرف سے گھر جانے والے شکار کی طرح مجھے بے بسی سے دیکھ رہا تھا۔

میرا ذہن بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ ممکن ہے رحمو کی جان بخشی کر کے میں ان وحشیوں کی خوشنودی حاصل کر لوں۔ یہ خیال آتے ہی میں نے اپنا پیر رحمو کی چھاتی پر سے اٹھا لیا اور اپنے ہاتھ کی کلہاڑی کو دور پھینک کر بندیا کی جانب بڑھا۔ وہ حیرت اور بے یقینی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

میں نے اسے مخاطب کیا۔ ''میں قاتل نہیں ہوں، نہ ہی بننا چاہتا ہوں۔ سردار کی موت ایک حادثہ تھی۔ قدرت کو یہی منظور تھا۔ مگر میں جانتے بوجھتے ہوئے کسی کی جان نہیں لے سکتا۔''

یہ کہہ کر میں رحمو کے پاس سے ہٹ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ رحمو بھی زمین پر سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا تیزی سے چند ڈاکو اس کی جانب بڑھے اور اس کو سہارا دے کر اٹھا لیا۔ وہ اس کو لے کر ایک طرف چلے گئے۔ دوسرے ڈاکو بھی ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ صرف دو ڈاکو کھڑے رہ گئے۔

بندیا سر سے پیر تک میرا جائزہ لے رہی تھی۔ موقعہ پا کر میں نے بھی گہری نظروں سے سر سے پیروں تک اسے دیکھا۔ وہ ایک مضبوط، دراز قد لیکن پُرکشش عورت تھی جس کے چہرے سے حاکمانہ شان کا اظہار ہو رہا تھا۔

اب اس کے چہرے کی خشونت اور برہمی ختم ہو چکی تھی۔ ان کی جگہ اب اس کے چہرے پر نرمی کے آثار نظر آ رہے تھے۔

''تم ایک بہادر بندے ہو۔'' اس نے نرم لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔ ''تم جھوٹے نہیں ہو سکتے۔''

''شکریہ۔'' میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''تم پولیس کے آدمی نہیں ہو؟'' اس نے مزید تصدیق کے لیے پوچھا۔

''نہیں۔''

''تو پھر اس جنگل میں کیا کر رہے ہو؟''

''میں اپنے دشمنوں سے جان بچا کر بھاگا تھا کہ تمہارے گروہ کے قابو میں آ گیا۔ مجھے سردار کی موت کا بے حد افسوس ہے۔ کاش انہوں نے میری بات کا یقین کر لیا ہوتا۔''

وہ خاموش کھڑی دانتوں سے اپنے ہونٹ دباتی رہی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ آنسو روکنے کی کوشش کر رہی ہے۔

''ہمارا سات سال کا ساتھ تھی۔'' وہ بولی تو اس کی آواز میں سوگواری تھی۔ ''مگر اوپر والے کی مرضی، اس سے کون لڑ سکتا ہے۔''

اتنا کہہ کر اس نے سامنے کھڑے ہوئے دونوں ڈاکوؤں کی طرف دیکھا۔

''دیکھو موجو، یہ ہماری پناہ میں ہے۔ اس کے رہنے کھانے پینے کا بندوبست کرو۔ ہمیں ابھی سردار کے کفن دفن کا بھی انتظام کرنا ہے۔''

یہ کہہ کر وہ مڑی اور تیزی سے ایک جانب چلی گئی۔

''آؤ۔'' ایک ڈاکو نے اپنی بندوق سے اشارہ کر کے مجھے مخاطب کیا۔ میں خاموشی سے ان دونوں کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ اب میں مطمئن تھا۔ مجھے یقین تھا کہ بندیا اپنے قول کی پکی ہے اور اب ڈاکوؤں کے اس گروہ سے مجھے کوئی خطرہ نہیں ہے۔

پہاڑیوں کے اندر چوٹیوں اور ٹیلوں سے گھری ہوئی اس پناہ گاہ میں کچے مکانات بنے ہوئے تھے۔ مجھے جس کمرے میں مہمان بنایا گیا وہ بہت مختصر کمرہ تھا۔ ایک چارپائی اور چادر کے سوا وہاں کسی قسم کا فرنیچر یا ضرورت کا سامان نہیں تھا۔ میں نے کمرے کے اندر داخل ہو کر اس کا جائزہ لیا۔ دروازے کے علاوہ ایک جانب چھوٹی سی کھڑکی بھی تھی۔

''تم یہاں رہو گے۔'' ایک ڈاکو نے قدرے بیزاری سے مجھے مخاطب کیا۔ وہ مجھ سے سخت ناخوش معلوم ہوتا تھا۔ ''بندیا مائی نے تمہیں معاف کر کے مہمان بنالیا ہے مگر ایک بات یاد رکھنا۔ جب تک کوئی فیصلہ نہ ہو جائے تم قیدی مہمان رہو گے۔ یہاں سے بھاگنے کی کوشش کی تو تمہارے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی جائے گی۔''

یہ کہہ کر وہ اپنے ساتھی کے ساتھ مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا رخصت ہو گیا۔ اس کے بیان کے مطابق میں مہمان قیدی تھا۔ شاید اسی لئے میری کوٹھری کا دروازہ بند کرنے یا مقفل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی۔ ویسے بھی یہاں سے فرار ہونا بہت مشکل بلکہ ناممکن تھا جبکہ یہ سارا علاقہ ڈاکوؤں سے بھرا ہوا تھا۔ میں بالکل تنہا تھا اور یہاں کے راستوں سے قطعی ناواقف بھی تھا۔ اگر بھاگنے کی کوشش بھی کرتا تو کس برتے پر؟

میں چارپائی پر لیٹ گیا۔ تکیے کی جگہ اپنا بازو استعمال کیا۔ بہت زیادہ تھکا ہوا تھا اس لیے چارپائی پر لیٹتے ہی گہری نیند نے مجھے اپنی پُرشفقت آغوش میں سمیٹ لیا۔

ایک کرخت مردانہ آواز سن کر میں جاگا۔ سامنے ایک ڈاکو کھانے کی تھالی لئے کھڑا تھا اور مجھے بیدار کرنے کے لیے آوازیں دے رہا تھا۔

''اٹھو، کھانا کھالو۔'' یہ کہہ کر اس نے تھالی چارپائی پر رکھ دی۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ میں کتنی دیر سوتا رہا تھا لیکن شام کے گہرے ہوتے سایوں سے اندازہ ہوا کہ رات ہونے والی ہے۔

نیند لینے کے بعد میں تازہ دم ہو گیا تھا۔ ڈاکو تھالی رکھ کر جا چکا تھا اس تھالی میں پانی سے بھرا ہوا جست کا ایک بڑا گلاس، مکئی کی دو موٹی موٹی روٹیاں اور چنے کی دال تھی۔ روٹیوں پر مکھن بھی لگا ہوا تھا۔ غالباً یہ مہمانداری کی انتہا تھی۔ نہ جانے کب سے بھوکا پیاسا تھا۔ مکئی کی روٹیاں اور چنے کی دال میرے لئے اس وقت دنیا کی سب سے بڑی نعمت تھی۔ کھانا کھانے کے بعد میں نے پانی پیا اور اللہ کا شکر ادا کیا جس نے مجھے ایک نئی زندگی دی تھی اور اس جنگل بیابان میں رزق کا بندوبست بھی کر دیا تھا۔

کچھ دیر تک میں خاموش بیٹھا سوچتا رہا کہ آنے والا وقت میرے لئے اپنے دامن میں کیا سمیٹ کر لانے والا ہے۔ کرنے کے لیے کوئی کام تھا نہ بات چیت کے لیے کوئی ذی روح۔ مجھ پر ایک بار پھر سستی اور نیند کا غلبہ طاری ہونے لگا۔ اس وقت نیند ہی میرے لیے سب سے بڑی تفریح اور ضرورت تھی۔ میں دوبارہ بستر پر لیٹ گیا اور بہت جلد گہری نیند نے مجھے آلیا۔

میری آنکھ کھلی تو سورج چمک رہا تھا۔ رات بھر کی نیند نے میرے اندر ایک نیا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ مایوسی کے بادل خود بخود چھٹ چکے تھے۔ میں اب ایک پُرامید انسان تھا۔

صبح کے وقت کم از کم منہ ہاتھ دھونا بہت ضروری تھا۔ حوائج ضروریہ سے فراغت حاصل کرنے کی حاجت بھی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اپنے کوٹھری نما کمرے سے باہر نکل کر ماحول کا جائزہ لیا۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک دیسی ٹوائیلٹ موجود تھا۔ پانی کے لیے ہینڈ پمپ تھا۔ غسل خانے کے اندر ایک پرانی بالٹی بھی رکھی ہوئی تھی۔ میں نے فوراً غسل خانے کا دروازہ بند کیا اور کچھ دیر بعد جب میں تازہ پانی سے نہا کر باہر نکلا تو بالکل تازہ دم ہو چکا تھا۔ میرا لباس میلا ہو چکا تھا مگر کوئی دوسرا لباس دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے میں اسی کو پہننے پر مجبور تھا۔

میں اپنی کوٹھری میں واپس لوٹا تو چارپائی پر ناشتہ رکھا ہوا تھا۔ اس بار بیسن کی دو روٹیاں اور اچار سے تواضع کی گئی تھی۔ جست کے ایک گلاس میں بدنما سی چائے بھی تھی جس نے اس وقت بہت مزہ دیا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر میں دوبارہ چارپائی پر لیٹ گیا۔ اس کے سوا کوئی اور مصروفیت بھی نہیں تھی لیکن مجبوری تھی

نیند کا کوسوں پتہ نہیں تھا مگر میں چارپائی پر کروٹیں بدلتا رہا۔

یکایک دروازے کے باہر آہٹ سنائی دی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ سامنے ایک خونخوار شکل کا ڈاکو کھڑا تھا۔

''چلو، مائی بندیا نے بلایا ہے۔'' اس نے پتھریلی آواز میں کہا میں چپ چاپ اس کے ساتھ ہولیا۔

بندیا گھنے درختوں سے گھری ہوئی ایک وادی میں میری منتظر تھی۔ اس کی سوجی ہوئی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ روتی رہی ہے۔ سردار کی تکفین ہو چکی تھی۔ مجھے ماحول میں ایک کھنچاؤ اور کشیدگی محسوس ہو رہی تھی۔ بندیا کالے لباس میں تھی۔ اس کی پیشانی پر بھی ایک سیاہ رومال بندھا ہوا تھا۔ اس سیاہ لباس اور سوگواری کے عالم میں وہ کہیں زیادہ دلکش اور پُرکشش نظر آ رہی تھی۔ گذشتہ روز کے ڈھیلے ڈھالے بے ڈھنگے لباس کی بجائے وہ ایک معقول شلوار قمیض میں ملبوس تھی۔ اس لباس میں اس کی نسوانی رعنائیاں نمایاں ہو گئی تھیں۔ اس کے آس پاس چند مسلح ڈاکو باادب کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ غالباً وہ لوگ میرے بارے میں ہی گفتگو کر رہے تھے چونکہ مجھے دیکھتے ہی بہت خاموش ہو گئے اور ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگے۔

''آپ نے مجھے بلایا ہے؟'' میں نے بندیا کو مخاطب کیا۔

اس نے گلابی آنکھوں سے مجھے دیکھا جو کچھ عرصے پہلے رونے کی وجہ سے سرخ ہوں گی۔ ایک نظر اپنے گروہ کے افراد پر ڈالی اور پھر بولی۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟''

میں نے حیران ہو کر اسے دیکھا اور پھر اپنا نام بتا دیا۔

اس نے کہا۔ تم نے ہم سب کو بڑی الجھن میں ڈال دیا۔

''میں نے؟''

''ہاں تم نے۔ دیکھو بابو صاحب۔ ہمیں تمہاری بات اور زبان پر بھروسہ ہے مگر میرے دوسرے ساتھی اندھا بھروسہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ میں تو چاہتی ہوں کہ تم کو جانے دیا جائے۔ تم بھی آرام سے رہو اور ہم بھی بے فکر ہو جائیں۔ مگر رحمو کچھ اور کہتا ہے۔''

''رحمو کیا کہتا ہے؟'' میں نے رحمو کی طرف دیکھا جس کا چہرہ ابھی تک سوجا ہوا اور داغوں سے پُر تھا۔ اس نے اپنے سر پہ پٹی بھی باندھ رکھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے شدید نفرت تھی۔

''ہم پرائے لوگوں پر کیسے بھروسہ کر لیں؟ یہ ہم سب کی زندگی کا سودا ہے۔ گر تم نے یہاں سے جا کر مخبری کر دی تو ہم برباد ہو جائیں گے۔ کہیں کے نہیں رہیں گے۔''

''تمہارا خیال درست ہے رحمو۔'' میں نے کہا۔ ''تم خود تنگدل اور شکی مزاج ہو اس لیے دوسروں پر بھی شک کرتے ہو۔ میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ میں صاف اور کھرا آدمی ہوں۔ زبان کا پکا ہوں۔ جو کہتا ہوں اسے پورا کرتا ہوں کھلی دشمنی اور دوستی کرتا ہوں۔''

رحمو جوش میں آ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے میری طرف بندوق تان لی۔

''تم مجھے نہیں جانتے؟ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

''حیرت کی بات ہے۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''یہ تم کہہ رہے ہو جسے میں نے ترس کھا کر زندہ چھوڑ دیا تھا۔''

رحمو کچھ بولنے والا تھا کہ بندیا نے اپنا ہاتھ اونچا کر کے اسے روک دیا۔

''رحمو۔ تمہیں دوسری زندگی ملی ہے اور تمہارا دوسرا جنم اسی بندے کی مہربانی سے ہوا ہے۔ تم احسان فراموش ہی نہیں بزدل بھی ہو۔ کیا بندوق ہاتھ سے رکھ کر تم اس سے مقابلہ کرنے کو تیار ہو۔'' رحمو ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا مگر

غصے سے اس کا چہرہ مزید مسخ ہو گیا تھا۔

''بندیا مائی۔ ایک غیر اور انجان آدمی کے لیے تم اپنے پرانے آدمی کی بے عزتی کر رہی ہو۔''

بندیا نے غصے سے کہا۔ ''رحمو! بندہ اپنی عزت اور بے عزتی خود کراتا ہے۔ تم اپنی عزت کرانے کے قابل ہی نہیں ہو۔''

''مائی۔'' رحمو بے اختیار چیخ اٹھا۔

''آواز نیچی رکھو اور آنکھیں بھی۔'' بندیا نے غصے سے کہا۔ ''تمہارے سردار کے ساتھ ہمارے اصول نہیں مر گئے۔ یہ نہ بھولو کہ تم کس سے بات کر رہے ہو۔ میں تمہارے سردار کی نشانی اور اس کی جانشین ہوں۔ آج کے بعد اس طرح مجھ سے بات نہ کرنا ورنہ......''

بندیا کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔ اس نے بمشکل اپنے غصے پر قابو پایا تھا۔ رحمو نے چاروں طرف دیکھا مگر سب نے نگاہیں نیچی کر لی تھیں۔

''میں سمجھ گیا مائی۔'' اس نے میری طرف نفرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اب تمہیں میری ضرورت نہیں ہے۔ جسے میری ضرورت تھی وہ جو میری قدر کرتا تھا اب وہ دنیا میں نہیں ہے۔ اپنے ایک پرانے وفادار کو بھلا دیا اور سردار کے قاتل پر بھروسہ کر لیا۔ ٹھیک ہے۔ یہاں کسی کو میری ضرورت نہیں ہے۔ کسی کو میری ضرورت نہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔ وہ پلٹ کر واپس جانے لگا۔ تمام ڈاکو خاموشی سے کھڑے دیکھ رہے تھے۔

یکا یک۔ بندیا کی آواز گونجی۔ ''رک جاؤ رحمو۔''

رحمو کے قدم وہیں رک گئے۔

''ادھر آؤ۔ میرے پاس۔''

رحمو بندیا کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

''دیکھو۔ تم ہمارے پرانے ساتھی ہو۔ سردار کو بھی تم پر بہت بھروسہ تھا اور میں بھی تم پر بھروسہ کرتی ہوں۔ تم نے ایک معمولی بات کو اتنا بڑھا لیا ہے۔ دنیا میں انسان کو ہر طرح کے حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کوشش کرنی چاہیے کہ بات کو جلدی ختم کر دیا جائے۔ سردار نے اگر پردیسی کی بات کو اتنا زیادہ نہ بڑھایا ہوتا تو آج وہ ہمارے ساتھ ہوتے اور ہم سب خوش رہتے۔ بہت زیادہ شک کرنا بھی ٹھیک نہیں ہوتا۔ میں تمہیں اور دوسرے سب ساتھیوں کو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ ہمیں پچھلی باتیں بھلا کر نئی زندگی شروع کرنی ہے۔ بہت سوچ سمجھ کر کام کرنا ہے۔ ہوشیار بھی رہنا ہے۔ مگر بلا وجہ کسی جھگڑے میں بھی نہیں پڑنا چاہیے۔ اسی طرح ہم خوش رہ سکتے ہیں۔ اگر تمہیں میری بات کا یقین ہے تو رک جاؤ۔ ہمارے ساتھ رہو۔ ہم سب پہلے کی طرح مل جل کر رہیں گے۔ اگر اپنے دل کی مرضی کرنی ہے تو پھر وہی کرو۔ میں تمہیں نہیں روکوں گی۔''

رحمو نے ایک لمحہ سوچا پھر نظریں جھکا کر بولا۔ ''آپ ٹھیک کہتی ہو مائی۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ آگے جیسا کہو گی وہی ہی ہوگا۔''

بندیا کے چہرے پر اطمینان بھری مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''تو پھر پردیسی بابو سے ہاتھ ملاؤ اور دل صاف کر لو۔''

رحمو نے جھجکتے ہوئے میری طرف ہاتھ بڑھایا جو میں نے گرمجوشی سے تھام لیا۔

تمام ڈاکوؤں کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔ ظاہر ہے کہ صورتِ حال جو رخ اختیار کرتی جا رہی تھی اس کی وجہ سے وہ سب بھی پریشان تھے۔

اچانک میرے کانوں میں ایک ہلکی مانوس آواز سنائی دینے لگی۔ میں اس آواز سے بخوبی واقف تھا۔ یہ ہیلی کاپٹر کی آواز تھی جو کہ میری تلاش میں تھا۔

میں نے کہا۔ ''لو وہ پھر آ گیا۔''

''کون آ گیا؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''ہیلی کاپٹر۔ یہی لوگ میرے دشمن ہیں اور مجھے تلاش کر رہے ہیں۔ ان ہی سے چھپ کر اور جان بچا کر میں اس جنگل میں آ گیا تھا مگر سردار مجھے مخبر ہی کہتا رہا۔''

ہیلی کاپٹر کی آواز اب قریب آ گئی تھی اور صاف طور پر سنائی دے رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''آڑ میں چھپ جاؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو وہ ہمیں دیکھ لیں۔'' یہ کہہ کر میں نے ایک چھلانگ لگائی اور گھنی جھاڑیوں کے جھنڈ میں پناہ گزیں ہو گیا۔ بندیا اور دوسرے ڈاکوؤں کو بھی موقعے کی نزاکت کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ سب بھی مناسب پناہ گاہوں میں چھپ گئے تاکہ ہیلی کاپٹر والے ہمیں نہ دیکھ سکیں۔

ہیلی کاپٹر اب نزدیک آ گیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہمارے سروں پر پہنچ گیا مگر اتنی بلندی سے وہ لوگ ہمیں دیکھ نہیں سکتے تھے۔ ہیلی کاپٹر کچھ دیر فضا میں چکر کھاتا رہا پھر ایک طرف کو چلا گیا۔

کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد ہم سب اپنی اپنی پناہ گاہوں سے نکل کر باہر آ گئے۔

میں نے کہا۔ ''میرا یہاں رہنا تم سب کے لیے اچھا نہیں ہے۔ میری تلاش میں یہ لوگ آس پاس منڈلاتے رہیں گے۔ اگر میری بات کا یقین آ گیا ہو تو بہتر ہے کہ مجھے یہاں سے جانے کی اجازت دے دی جائے۔ یہ میرے لئے بھی بہتر ہے اور تم لوگوں کے لئے بھی۔''

بندیا خاموش سوچ میں گم تھی۔ سب ڈاکوؤں کی نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ بندیا مجھے دیکھ کر مسکرائی۔ ''تم ٹھیک کہتے ہو۔ تمہارا یہاں سے جانا ہی بہتر ہے۔''

میں نے خوش ہو کر اس کو دیکھا۔ ''تو کیا میں یہاں سے جا سکتا ہوں؟''

''نہیں''

میں نے حیران ہو کر بندیا کو دیکھا۔ ''تم جا سکتے ہو۔ مگر اکیلے نہیں۔ تم اس جنگل اور پہاڑوں میں بھٹکتے رہ جاؤ گے۔'' پھر وہ رحمو سے مخاطب ہوئی۔ ''رحمو۔ تم پردیسی بابو کو اس کی راہ پر ڈال کر آؤ گے۔''

رحمو نے خاموشی سے سر جھکا دیا۔

کچھ دیر بعد میں جانے کے لیے تیار تھا۔ میرے ساتھ کھانے پینے کا سامان بھی تھا۔ بندیا نے مجھے رخصت کرتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو۔ میں نے تم پر بھروسہ کیا ہے۔ ایسا نہ ہو مجھے پچھتانا پڑے۔''

''ایسا نہیں ہوگا۔ یہ ایک مرد کا وعدہ ہے۔''

یہ کہہ کر میں رخصت ہو گیا۔ رحمو میرے ساتھ تھا۔ ہم جنگلوں اور پہاڑوں میں سفر کرتے رہے۔ کافی طویل راستہ تھا مگر ہم دونوں بالکل خاموش تھے۔ نہ اس نے مجھے مخاطب کیا۔ نہ میں نے اس سے بات کی۔

کئی گھنٹوں کی مسافت طے کرنے کے بعد بالآخر ہم ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں سے ایک پتلی مگر پختہ سڑک نظر آ رہی تھی۔

رحمو نے کہا۔ ''اس سڑک پر تمہیں کوئی سواری مل جائے گی۔ رب راکھا۔''

یہ کہہ کر وہ تیزی سے پلٹ کر چلا گیا۔ بندوق اس کے کاندھوں پر لٹکی ہوئی تھی۔ اس نے ایک بار بھی مڑ کر میری

طرف نہیں دیکھا۔

بندیا نے سفر خرچ کے لیے ازراہ کرم مجھے کچھ رقم بھی دے دی تھی۔ میں نے چھوٹا سا بیگ سنبھالا اور سڑک کی طرف چل پڑا، لیکن میں پوری طرح محتاط تھا۔ میں نے سڑک پر کھڑے رہنے کی بجائے درختوں اور ٹیلوں کی آڑ میں چھپ کر انتظار کرنا مناسب سمجھا تھا۔

کافی دیر گزر گئی مگر کوئی سواری نظر نہیں آئی۔ آخر میں نے ایک گاڑی کی آواز سنی۔ یہ کوئی بھاری گاڑی تھی۔ آواز قریب آئی تو مجھے اندازہ ہوگیا کہ یہ کسی بس یا ٹرک کی آواز ہے، پھر ٹرک بھی سامنے نمودار ہوگیا۔ وہ درمیانی رفتار سے چل رہا تھا۔ میں نے تقدیر آزمانے کا فیصلہ کیا اور جھاڑیوں سے نکل کر سڑک کے کنارے جا کھڑا ہوا۔ ٹرک تیز رفتاری سے نہیں آ رہا تھا۔ مگر پھر بھی احتیاطاً میں سڑک کے وسط میں جا کر کھڑا ہوگیا اور ٹرک کو روکنے کے لئے اشارے کرنے لگا۔

ٹرک کی رفتار کم ہوگئی اور پھر وہ مجھ سے چند گز کے فاصلے پر رک گیا۔

میں نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ ٹرک میں ایک ڈرائیور کے سوا کوئی نہ تھا۔ ٹرک ڈرائیور مضبوط جسم کا مضبوط اور طاقتور آدمی تھا اور مجھے سوالیہ نظروں سے گھور رہا تھا۔ میں اس کے نزدیک چلا گیا۔ وہ کلین شیو تھا مگر بڑی بڑی مونچھیں اس کے چہرے کو خوفناک بنا رہی تھیں۔

"مجھے کسی قریبی قصبے یا شہر تک لفٹ مل سکتی ہے؟"

"کون ہو تم۔ کہاں سے آ رہے ہو۔ کہاں جا رہے ہو؟ یہاں ویران جنگل میں کیا کر رہے ہو؟" اس نے تابڑ توڑ کئی سوالات کر دیئے۔

"میں مختلف لوگوں سے لفٹ لیتا ہوا یہاں تک پہنچا ہوں۔ بالکل بے ضرر آدمی ہوں۔ میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں۔ لو دیکھ لو۔" میں نے اپنے دونوں ہاتھ سر سے اونچے اٹھا دیئے۔

وہ ہنسنے لگا۔ "اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تم جو کوئی بھی ہو مصیبت زدہ لگتے ہو۔ آؤ۔ ٹرک میں بیٹھ جاؤ"۔

میں نے خوش ہو کر ٹرک کا دروازہ کھولا اور اس کے اندر داخل ہوگیا۔ ہر طرف تمباکو کی تیز بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ اس وقت بھی ایک سستا سا سگریٹ اس کے منہ میں دبا ہوا تھا۔ اس نے قریب سے میرا جائزہ لیا۔

میں نے کہا۔ "میرے پاس کچھ رقم بھی ہے۔ کہو گے تو تمہیں ادا کر دوں گا۔"

وہ پھر ہنسنے لگا۔ "بابو جی۔ یہ بس نہیں ٹرک ہے اور اس وقت میں اس کا ملک ہوں۔ قیمت اپنے پاس رکھو۔ بس مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا۔"

ٹرک ڈرائیور کافی باتونی اور دلچسپ آدمی تھا۔ اس کی زبان قینچی کی طرح بلا رکے چلتی رہی۔ وہ نہ جانے کہاں کہاں کے قصے سنا رہا تھا جن میں مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں تھکا ہوا تھا۔ ٹرک کے ہچکولوں نے لوری اور پنگوڑے کا کام کیا اور میری آنکھ لگ گئی۔

نہ جانے میں کتنی دیر سویا رہا۔ یکا یک ڈرائیور نے مجھے جھنجھوڑا۔ شاید اس سے پہلے بھی وہ مجھ آوازیں دیتا رہا تھا۔

"لو جی۔ دینہ آگیا۔ اب مجھے رات تک ادھر ہی ٹھہرنا ہے۔ تم اپنی کہو کیا صلاح ہے؟"

"بہت مہربانی بڑے بھائی۔ میں تمہارا احسان ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ بس اب میں چلوں گا۔ رب راکھا۔"

اس نے بڑے خلوص سے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ میں ٹرک سے اترا اور بس سٹینڈ کی طرف بڑھ گیا جہاں ٹیکسیاں بھی کھڑی ہوئی تھیں۔

دو دن بعد میں اپنے شہر میں تھا۔

سیدھا شوکت کے پاس واپس پہنچا۔ دروازے پر دستک دیئے بغیر میں کمرے میں داخل ہوا تو وہ مجھے دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ پھر ایک دم اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور مجھے گلے لگا لیا۔

"تم ایک دم کہاں سے آگئے۔ اتنی دیر تک کہاں رہے؟ خبر کیوں نہیں دی؟"

میں ہنستے ہوئے کرسی پر بیٹھ گیا۔ "شکر کرو کہ آگیا ہوں۔ کئی بار موت کے منہ میں جاتے جاتے بال بال بچا ہوں۔"

اس نے سر سے پیر تک مجھے دیکھا۔ "حلئے سے تو ایسے ہی لگتے ہو جیسے دوسرے جہاں سے آئے ہو۔ اپنی حالت تو دیکھو۔ بڑھی ہوئی شیو بے ترتیب بال۔ انتہائی خستہ اور میلا لباس۔"

"بس یار۔ میں فوراً نہا کر اور کھانا کھا کر سونا چاہتا ہوں اور دیکھو جب تک میں خود نہ اٹھوں مجھے ہرگز نہ جگانا۔"

"فکر نہ کرو۔" شوکت ہنسنے لگا۔ "دوسری دنیا سے آئے ہو۔ ابھی تو جیٹ لیگ سے بھی گزرنا پڑے گا۔ تمہیں کوئی نہیں جگائے گا۔ چلو، گھر چلتے ہیں۔" وہ فوراً اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ فون پر سیکرٹری کو کچھ ہدایات دیں اور بریف کیس سنبھال کر میرے ساتھ چل پڑا۔

گھر وہی تھا۔ ہر چیز وہی تھی۔ میں بھی وہی تھا اور شوکت علی بھی وہی پھر بھی یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے بہت کچھ بدل گیا ہے۔

مجھے غسل خانے میں دھکیل کر شوکت نے باورچی کو کھانے کے بارے میں ضروری ہدایات دیں۔ کافی عرصے بعد غسل خانے میں شاور کا گرم و سرد پانی نصیب ہو رہا تھا۔ میں بہت دیر تک نہاتا رہا۔

باہر سے شوکت نے پکارا۔ "یار اب باہر نکل آؤ۔ کیا نہاتے نہاتے ہی خرچ ہو جاؤ گے۔"

اپنا باتھ روم، اپنا بیڈ روم اور اپنا کمرہ، یہ سب چیزیں گزشتہ دنوں کے واقعات کے بعد بہت بڑی نعمت لگ رہی تھیں۔

کھانا بہت اشتہا انگیز تھا۔ بھوک بھی بہت زور کی لگ رہی تھی۔ میں فاقہ زدوں کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ جب کافی کی پیالی سامنے آئی تو میں ایک نارمل انسان بن چکا تھا۔ اب غم اور غمِ جاناں دونوں کا مجھے احساس تھا۔

میں نے شوکت سے بے تابی سے پوچھا۔ "عاشی کے خط تو آتے ہوں گے؟ میں اس کے سارے خطوط ایک ساتھ پڑھنا چاہتا ہوں۔"

شوکت علی نے کوئی جواب نہیں دیا بس خاموشی سے سر جھکا لیا۔

"کیا بات ہے شوکت؟ خیریت تو ہے؟" میں نے بیتابی سے پوچھا۔

"ہاں۔ خیریت ہی سمجھ لو۔"

"سمجھ لو کیا مطلب؟"

"انگریز کہتے ہیں کہ نو نیوز از گڈ نیوز۔ عاشی کی طرف سے کوئی خط یا پیغام نہیں ملا۔ میں نے اسے بہت ڈھونڈا۔ بہت خطوط لکھے۔ ٹیلی گرام بھی دیئے مگر اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ سمجھ میں نہیں آتا وہ خطوں اور ٹیلی گرام کا جواب کیوں نہیں دیتی۔ جب کوئی خیر خبر نہیں ملی تو میں خود اس کی تلاش میں انڈیا چلا گیا مگر وہ لوگ اپنا گھر چھوڑ کر جا چکے تھے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں گئے ہیں اور کس حال میں ہیں۔"

میں یہ واضح کر دوں کہ اگر عاشی میری پہلی اور آخری محبت تھی تو شوکت دنیا میں میرا بہترین اور قابل اعتماد دوست تھا۔ میرے ہر غم اور ہر خوشی میں شریک تھا۔ میں جانتا تھا کہ میری خاطر وہ اپنی جان کی بازی بھی لگا دے گا۔ اس کا

ثبوت اس نے عملی طور پر فراہم کر دیا تھا۔ اس کو بخوبی احساس تھا کہ میں عاشی کو دیوانہ وار چاہتا ہوں۔ جنون کی حد تک اس سے محبت کرتا ہوں۔ جب عاشی کے خطوط کی آمد بند ہوگئی تو شوکت میری حالت زار دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔ مجھے زندگی کے کسی مشغلے میں دلچسپی نہیں رہی تھی۔ میں ایک پژمردہ اور مایوس انسان تھا جس کے لیے دنیا اندھیر ہو چکی تھی۔

شوکت نے میرے دکھ کا اندازہ لگا لیا تھا۔ اس نے اپنے طور پر عاشی سے رابطہ کرنے اور اسے تلاش کرنے کی پوری پوری کوشش کی تھی۔ یہاں تک کہ وہ اس کو ڈھونڈنے کے لیے بذات خود جعلی پاسپورٹ حاصل کر کے بھارت چلا گیا تھا۔ وہ ایک سابق فوجی تھا جس کی وجہ سے آسانی سے بھارت کا ویزا حاصل نہیں کر سکتا تھا لیکن اس نے میری خاطر جعل سازی سے بھی پرہیز نہیں کیا۔ پھر یہ خوف بھی تھا کہ اگر وہ بھارت میں پکڑا گیا تو اس کا بہت برا حشر ہوگا، لیکن اس نے میرے پیار اور دوستی کی خاطر اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔ ایسے مخلص اور محبت کے پروانے دوست کسی خوش قسمت کو ہی ملتے ہیں اور مجھے احساس تھا کہ میں اس معاملے میں واقعی خوش نصیب انسان ہوں۔

شوکت بھارت سے بے نیل و مرام واپس لوٹ آیا تھا جس کی وجہ سے میری بے تابی، مایوسی اور غم والم میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ عجیب عجیب وسوسے مجھے تنگ کرتے رہتے تھے۔ آیا عاشی زندہ بھی ہے یا اس دنیا میں نہیں رہی ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر اس نے مجھ سے رابطہ کیوں قطع کر دیا ہے۔ کیا اس نے میری محبت کو بھلا کر کسی اور کے پیار میں پناہ لے لی ہے؟ یہ تصور ہی میرے لئے انتہائی تکلیف دہ اور سوہان روح تھا۔

میں دنیا سے قطعی بے تعلق اور کنارہ کش ہو چکا تھا۔ میرا بیشتر وقت خاموشی سے خلا میں گھورنے میں صرف ہوتا تھا۔ راتوں کی نیند میری آنکھوں سے رخصت ہو چکی تھی۔ دن کا چین میرے نصیب میں نہیں رہا تھا۔ نہانے، لباس تبدیل کرنے اور کھانے پینے کا مجھے کوئی ہوش نہ تھا۔ میں ہر چیز سے بیگانہ ہو چکا تھا۔ دنیا میرے لئے ایک بے معنی شے اور زندگی ایک بے مقصد تضیع اوقات بن کر رہ گئی تھی۔ میری شیو عام طور پر بڑھی رہتی تھی۔ لباس تبدیل کرنے کا بھی ہوش نہ تھا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ میں ایک زندہ لاش بن کر رہ گیا تھا۔

شوکت کے لیے میری یہ حالت انتہائی پریشان کن تھی۔ میں اس کے جذبات سے بخوبی واقف تھا لیکن مجھے خود اپنے آپ پر قابو نہیں رہا تھا۔ میں چاہتے ہوئے بھی اس کی پریشانی اور تفکر کو دور کرنے میں ناکام تھا۔

جب حالات انتہائی بدترین شکل اختیار کر گئے تو شوکت نے میری توجہ عاشی کی جانب سے ہٹانے اور دوسری دلچسپیوں میں شامل ہونے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا۔

ایک روز اس کے پُرزور اصرار پر میں شیو بنا کر اور نہا دھو کر اس کے ساتھ باہر جانے کے لیے رضامند ہو گیا۔ اس نے میرے لئے بہترین لباس کا انتخاب کیا تھا اور بے حد اصرار کے بعد مجھے وہ لباس پہننے پر مجبور بھی کر دیا تھا۔

ہم ایک بارونق اور مشہور کلب میں چلے گئے جہاں ہر طرف رنگ و نور اور حسن و شباب کی فراوانی تھی۔ حسین طرحدار حسینائیں بھی تھیں اور رومانی، خوابناک ماحول بھی موجود تھا مگر میرے لئے ان چیزوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

شوکت نے کھانے کا آرڈر دیا۔ وہ میری پسند کے بارے میں پوچھ رہا تھا مگر میں نے سب کچھ اس پر چھوڑ دیا تھا۔

کھانا آنے میں ابھی کچھ وقت تھا اس لئے ہم ٹھنڈا مشروب منگوا کر اس سے لطف اندوز ہونے لگے۔

یکا یک ایک ریشمی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

پلٹ کر دیکھا تو ایک دلکش اور پُرکشش لڑکی سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ میں نے اسے زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ پھر اس بے تکلفی کا اظہار کیا معنی؟ بعد میں پتہ چلا کہ وہ دراصل شوکت سے مخاطب تھی۔ شوکت اس کو دیکھتے ہی کرسی

سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

''آؤ روزی۔ بہت عرصے بعد نظر آئی ہو؟'' شوکت نے بے تکلفی سے کہا۔

''ہاں۔ میں ملک سے باہر گئی ہوئی تھی۔ کچھ بزنس اور کچھ سیر و سیاحت، کافی اچھا وقت گزر گیا۔''

اس اثنا میں میری نگاہیں اس لڑکی کا جائزہ لے رہی تھیں جسے شوکت نے روزی کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ وہ ایک دراز قد، متناسب جسم اور انتہائی حسین نقش رکھنے والی گوری رنگت کی لڑکی تھی۔ اس کے ترشے ہوئے سنہری بال اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ ایک خوبصورت جدید لباس میں ملبوس تھی۔ مجھے تسلیم کرنا پڑا کہ وہ درحقیقت ایک پُرکشش اور خوبصورت لڑکی تھی۔

''یوسف ان سے ملو۔'' شوکت نے مجھے مخاطب کیا۔ ''یہ مس روزی ہیں۔ بہت بڑے اور دولت مند خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ صورت شکل تم دیکھ ہی رہے ہو مگر یہ سوچ کی بھی بہت اچھی ہیں۔ میری پرانی واقف کار ہیں بلکہ دوست کہہ سکتے ہو۔'' پھر وہ روزی سے مخاطب ہوا۔ ''کہو روزی میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا؟''

''بالکل نہیں۔'' وہ دلنوازی سے مسکرائی اور سر کو جھٹکا دیا۔ اس کی سنہری زلفیں اس کے چہرے کے گرد لہرا کر رہ گئیں۔

''روزی۔ ان سے ملو یہ میرے بہترین دوست بلکہ بھائیوں سے بھی بڑھ کر ہیں۔ مسٹر یوسف۔''

روزی نے بے تکلفی سے مسکراتے ہوئے میری جانب ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے اس کا نرم و گرم ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھاما تو ایک برقی رو میرے جسم میں دوڑ گئی۔

''آپ سے مل کر بہت خوش ہوئی۔'' اس نے سر سے پیر تک میرا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''شوکت پہلے بھی آپ کے بارے میں باتیں کرتے رہے ہیں اور آپ کی بے حد تعریف کرتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''یہ تو محبت ہے ان کی۔''

''مگر انہوں نے صحیح بندے سے محبت کی ہے۔'' روزی شرارت سے مسکرائی۔

''روزی! اگر کوئی اور مصروفیت نہ ہو تو ہمارے ساتھ کھانا کھا سکتی ہو؟''

''بڑی خوشی سے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ پھر میری طرف دیکھ کر کہنے لگی۔ ''اگر مصروفیت ہوتی بھی تو ایسی خوبصورت کمپنی کی خاطر اسے ملتوی کر دیتی۔''

اس کی شریر نگاہیں مسکرا رہی تھیں میں ان خاموش مسکراتی ہوئی آنکھوں کا پیغام بخوبی سمجھ گیا تھا۔

روزی واقعی ایک دلچسپ دلکش اور ذہین لڑکی تھی۔ جتنی دیر بھی ہم ساتھ رہے وہ مختلف موضوعات کے بارے میں باتیں کرتی رہی۔ اس کی معلومات بہت زیادہ تھیں۔ زندگی کی ہر حسین چیز میں اسے دلچسپی تھی۔ وہ زندگی کو بھرپور انداز میں گزارنے کی قائل تھی۔

''دیکھیے نا مسٹر یوسف۔ زندگی تو صرف ایک ہی بار ملتی ہے۔ پھر اسے جی بھر کر کیوں نہ انجوائے کیا جائے؟'' اس نے مجھ سے سوال کیا۔

''آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ مگر بعض لوگ اسی زندگی کو کسی ایک کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔''

''دنیا بہت بڑی اور رنگین جگہ ہے۔ اس کو ایک یا چند چیزوں تک محدود نہیں رکھنا چاہیے۔'' وہ شوخی سے مسکرائی۔

میں نے کوئی جوب دینا مناسب نہ سمجھا۔ صرف مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

وہ دن ہم نے ایک ساتھ ہی گزارا اور مجھے احساس ہوا کہ روزی ایک زندہ دل اور خوش باش لڑکی ہے۔ وہ زندگی

کے ہر لمحے سے لطف اٹھانے کی قائل تھی۔

ہم رخصت ہوئے تو روزی کی شخصیت مجھے کافی حد تک متاثر کر چکی تھی۔

شوکت کے ذریعے ہماری ملاقاتیں ہونے لگیں اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی روزی کے ساتھ وقت گزارنے لگا، لیکن اس میں جذبات کا کوئی تعلق نہ تھا۔ شوکت نے بھی باتوں باتوں میں اسے عاشی کے ساتھ میری دیوانہ وار محبت کے بارے میں بتا دیا تھا۔ وہ میرا سرد مہری کا رویہ بھی دیکھ چکی تھی یہاں تک کہ ایک بار ہم نے ''محبت'' کے موضوع پر کافی تفصیل سے گفتگو کی تو میں نے اس کو عاشی سے اپنی دیوانگی کی حد تک محبت کے بارے میں بتا دیا۔

''دنیا ایک انسان تک محدود نہیں ہے اور نہ ہی زندگی کسی ایک کے نام پر گزاری جا سکتی ہے۔ آپ کے پیار کی شدت کا مجھے احساس ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے اپنی آنکھوں سے ایک ایسے شخص کو دیکھ لیا جن کے بارے میں اب تک کہانیاں ہی پڑھتی آئی ہوں۔''

دو دن بعد شوکت نے بہت سنجیدگی سے مجھے بتایا کہ روزی مجھ سے شادی کی خواہش مند ہے۔

میں نے چونک کر اسے دیکھا ''مگر شوکت......''

اس نے میری بات کاٹ دی۔ ''وہ تمہارے اور عاشی کے بارے میں سب کچھ جانتی ہے اور تمہارے جذبات اور وفا پرستی کی معترف ہے، لیکن اس کے باوجود وہ تمہیں اپنا شریک حیات بنانا چاہتی ہے۔''

میں نے اس بارے میں اگلے دن روزی سے کھل کر بات کی۔ مجھے بخوبی احساس تھا کہ شوکت میری بے کیف زندگی میں رنگ بھرنے کے لیے یہ سب جتن کر رہا تھا۔ مجھے اس کے خلوص اور دوستی کا پاس تھا، لیکن عاشی کو بھلانا میرے بس میں نہ تھا۔

روزی نے کہا۔ ''یوسف۔ مجھے فخر ہے کہ تم جیسا وفادار سچا اور مخلص انسان میری زندگی میں آیا ہے۔ مجھے تم سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ میں صرف تمہاری زندگی کا ایک مختصر سا حصہ مانگ رہی ہوں۔ اگر اس کے بعد بھی تم عاشی کو بھلانے میں کامیاب نہ ہوئے تو بھی مجھے تم سے کوئی شکایت نہ ہوگی۔''

شوکت کا بھی یہی اصرار تھا کہ میں اپنی زندگی سایوں کے پیچھے بھاگتے ہوئے ضائع نہ کروں۔ میں نے بہت پس پیش کی۔ عذر پیش کیے مگر بالآخر ایک دوست کے اصرار اور روزی کے پیار کی انتہا کے آگے ہار ماننے پر مجبور ہو گیا۔

ایک دن روزی میری شریک حیات بن گئی۔ اس نے اپنا تمام کاروبار اور دولت میرے قدموں میں ڈال دی مگر مجھے ان کی ضرورت نہیں تھی۔ البتہ شوکت ہمارے کاروبار کو وسعت دینے کے لیے روزی کو بزنس پارٹنر بنانے کے حق میں تھا۔ مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لئے خاموش رہا۔

روزی ایک ایسی عورت تھی جسے پا کر انسان کو کسی اور چیز کی تمنا نہیں کرنی چاہئے۔ مگر میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔ اس کی وفا، اس کی خدمت، اس کا بے پناہ پیار۔ اس کے ناز و ادا کسی بھی شخص کو دنیا کا خوش نصیب ترین انسان بنانے کو کافی تھے۔ مگر میرے سر سے عاشی کی محبت کا بھوت نہ اتر سکا۔

روزی ایک بے مثال محبوبہ اور لاجواب بیوی تھی لیکن عاشی کے ساتھ یہ معاملہ تھا۔

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہوں جسے

یہ روزی کی عظمت تھی کہ وہ عاشی کی یادوں کی سوکن کے ساتھ بھی ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے کو تیار تھی۔ اس نے مجھے زندگی کی طرف لوٹانے کے لیے ہر ممکن جتن کیا اور میں کافی حد تک آدم بیزاری اور دنیا سے بیگانگی کے تاثر سے باہر نکل آیا، لیکن عاشی کی محبت کو اپنے دل سے کھرچنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

روزی کو اس پر کوئی شکوہ تھا نہ پچھتاوا۔ کبھی کبھی تو میں خود اپنی جگہ شرمندہ ہو کر رہ جاتا تھا لیکن میری حالت ایک بے بس معمول جیسی تھی جسے اپنے اوپر اپنے دل پر مطلق اختیار نہیں ہوتا۔

اس دوران میں شوکت نے بزنس کو اور بھی زیادہ وسعت دے دی تھی۔ آہستہ آہستہ اس نے مجھے بھی کاروباری مصروفیات میں شامل کر لیا تھا۔

ایک روز ایک اہم کاروباری بات چیت کے مسئلے میں شوکت نے مجھے بتایا کہ وہ ضروری مصروفیات کے باعث شہر چھوڑنے سے معذور ہے اس لیے میں فی الحال دوسری پارٹی سے معاہدے کے سلسلے میں بروقت شیخ برکت سے مذاکرات شروع کرنے کے لیے پہنچ جاؤں وہ پہلی فرصت میں ہوٹل امپیریل پہنچ جائے گا۔ شیخ برکت کے ساتھ ایک بہت بڑے منصوبے کے سلسلے میں کچھ عرصے سے ہماری بات چیت چل رہی تھی جس میں شوکت حسب معمول پیش پیش تھا۔ سارا کاروبار عملی طور پر شوکت ہی نے سنبھال رکھا تھا اس لیے میں بے فکر اور بے تعلق تھا۔

شوکت نے میری بکنگ کرانے کے بعد ٹکٹ بھی میرے حوالے کر دیا تھا۔ اسے فوری طور پر اسلام آباد جانا تھا جہاں سے وہ میرے پاس پہنچنے والا تھا۔ وہ میری روانگی سے ایک دن پہلے ہی رخصت ہو چکا تھا۔ اس نے بتایا کہ امپیریل ہوٹل میں میرے اور اس کے کمروں کی بکنگ ہو چکی ہے اور بہت ممکن ہے کہ وہ جلد فارغ ہو کر مجھ سے پہلے ہی امپیریل ہوٹل پہنچ جائے۔

اگلی صبح میں جب ائرپورٹ پہنچا تو روزی حسب معمول مجھے خدا حافظ کہنے کے لیے میرے ہمراہ تھی۔

اس نے کہا۔ ''دیکھئے بلاوجہ دیر نہ لگائیے گا۔ کام سے فارغ ہوتے ہی چلے آئیے گا۔ میں آپ کی منتظر رہوں گی۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی شربتی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔

''پاگل مت بنو۔'' میں نے اس کا گال تھپک کر کہا۔ ''تم جانتی ہو کہ میں کسی اور جگہ بلا ضرورت ایک لمحے بھی نہیں رہ سکتا۔ میں بہت جلد لوٹ آؤں گا۔''

وہ بہت دیر تک کھڑی ہاتھ ہلا کر مجھے خدا حافظ کرتی رہی۔

ہوائی جہاز میں سوار ہوتے ہی میں نے معاہدے کی دستاویزات کا مطالعہ شروع کر دیا۔ یہ ایک بہت جامع اور فائدہ مند منصوبہ تھا۔ شوکت کی خواہش تھی کہ یہ جلد سے جلد پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے۔

ہوٹل امپیریل

ایک شاندار اور آرام دہ ہوٹل تھا جہاں زیادہ تر غیر ملکی اور مقامی دولت مند لوگ ہی قیام پذیر ہوا کرتے تھے۔ عملے میں لڑکیوں کی خاصی تعداد تھی جو خاصی خوش شکل اور خوش اطوار تھیں۔ میں نے ریسیپشن پر کھڑی لڑکی سے شوکت کے بارے میں گفتگو کرنے کی کوشش کی۔ میرا خیال تھا کہ ہو سکتا ہے اس طرح میں شوکت علی کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کر سکوں۔ شوکت نے واضح طور پر مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس ہوٹل میں میرے لیے بھی کمرہ بک کرا دے گا اور خود بھی ہر صورت یہاں پہنچ جائے گا۔ شوکت کا مجھ سے پہلے پہنچنا اس لیے بھی ضروری تھا کہ ہمارے ایک مقامی کمپنی کے ساتھ کافی عرصے سے مذاکرات چل رہے تھے اور کچھ دن قبل ہی ہم نے باہمی معاہدہ کرنے کے سلسلے میں ضروری معاملات طے کیے تھے۔ یہ ایک منافع بخش معاہدہ تھا جس کے ذریعے ہم آئندہ چھ ماہ میں کم از کم بارہ لاکھ روپیہ منافع حاصل کر سکتے تھے۔ اس لیے بھی شوکت کا نہ پہنچنا میرے لیے حیرت کا باعث تھا۔

میں ریسیپشن میں موجود دراز قد اور سمارٹ لڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔

''جی فرمائیے۔'' وہ مسکراتے ہوئے میرے نزدیک آئی۔

''دیکھئے۔ میرے ایک دوست شوکت علی کو یہاں پہنچ کر میرے لیے بھی کمرہ بک کرانا تھا، لیکن آپ کی دوسری ساتھی نے

مجھے بتایا ہے کہ شوکت علی نام کے کوئی مہمان اس ہوٹل میں مقیم نہیں ہیں اور نہ ہی محمد یوسف کے نام پر کسی کمرے کی بکنگ کرائی گئی ہے، لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ ایک بار پھر مزید تصدیق کر لیں۔ ہو سکتا ہے شوکت نے میرے نام سے دونوں کمروں کی بکنگ کرائی ہو۔ اگر زحمت نہ ہو تو میری مدد کر دیجئے۔"

وہ مسکرائی "سر، یہ تو میرا فرض ہے۔ آپ چند منٹ انتظار فرمائیں۔ میں آپ کو تمام معلومات حاصل کر کے بتاتی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ دوسرے گوشے کی طرف چلی گئی۔ اس نے مہمانوں کی بکنگ کے تمام کاغذات چیک کیے۔ اپنے ساتھیوں سے دریافت کیا۔ ایک دو ٹیلی فون کیے اور پھر چند لمحے بعد میرے نزدیک آئی تو بدستور مسکرا رہی تھی۔ استقبالیہ کے عملے کو غالباً ہر صورت میں مسکرانے کی ہدایت ہے کیونکہ چاہے کتنی ہی خراب خبر وہ آپ کو کیوں نہ سنائیں اُن کے چہرے کی مسکراہٹ میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔

"سوری سر" وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "میں نے پوری طرح چیک کر لیا ہے۔ ہمارے ہوٹل میں اس نام کے کوئی مہمان نہیں ٹھہرے اور نہ ہی اُنہوں نے اپنے یا آپ کے نام سے کوئی کمرہ بک کرایا ہے، لیکن اگر آپ فرمائیں تو میں آپ کے لیے کمرہ بک کرا دوں؟"

ظاہر ہے کہ میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ ایک تو مجھے رات بہر صورت یہاں گزارنا تھی۔ دوسرے میں شوکت کا انتظار بھی کرنا چاہتا تھا۔ ممکن ہے وہ بعض نامعلوم وجوہات کی بنا پر وقتِ مقررہ پر نہ پہنچ سکا ہو اور کسی قدر تاخیر سے آئے۔ چنانچہ میں نے نہ صرف اپنے لیے کمرہ حاصل کر لیا بلکہ احتیاطاً ساتھ والا کمرہ بھی شوکت کے نام پر ریزرو کروا لیا۔ اُن دنوں ہوٹل میں مہمانوں کا بہت زیادہ رش تھا اور میں یہ چانس نہیں لینا چاہتا تھا کہ شوکت آئے تو اسے ہوٹل میں کوئی اچھا کمرہ نہ ملے۔ لڑکی نے پانچ سو سترہ نمبر کی چابی لوڈر کے حوالے کی اور اُسے ہدایت کی کہ مجھے سامان سمیت کمرے میں پہنچا دیا جائے۔ پانچ سو انیس نمبر شوکت کے لیے مخصوص تھا جس کی چابی میں نے استقبالیہ میں ہی چھوڑ دی تھی۔

کمرہ نمبر پانچ سو سترہ خاصا شاندار اور آرام دہ تھا۔ اگرچہ ہوٹلوں میں قیام عارضی ہوتا تھا، لیکن اس کے باوجود میری ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ اچھے سے اچھا کمرہ حاصل کیا جائے اور اس سلسلے میں ذرا بھی بخل سے کام نہ لیا جائے۔ کاروبار کے سلسلے میں آئے دن مجھے اور اکثر میرے ساتھ شوکت کو بھی سفر کرنے کی ضرورت پیش آتی رہتی تھی، لیکن میری ہمیشہ یہی کوشش اور خواہش ہوتی تھی کہ اگر محض ایک رات کے لیے بھی کمرہ حاصل کیا جائے تو وہ تمام تر آسائشوں سے آراستہ ہو۔ ہوٹل اور گھر میں یہی تو فرق ہے کہ گھر سے آپ مانوس ہو جاتے ہیں اور اگر آپ کی پسند کے خلاف کچھ چیزیں ہوتی بھی ہیں تو اُن کے ساتھ گزارہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ ہوٹل میں اس قسم کی کوئی پرابلم نہیں ہوتی۔ ہوٹل میں اگر آسائش اور بہترین سروس نہ ہو تو پھر گھر اور ہوٹل میں فرق ہی کیا رہ جائے گا۔ مسکراتے ہوئے چہرے، مستعد عملہ، حکم بجالانے والے ویٹر اور دوسرے لوگ باادب باملاحظہ قسم کا چوکیدار اور پھر رنگ و روشنی کی بہتات۔ اِن تمام چیزوں ہی کے لیے تو لوگ محض ایک دن کے قیام کے لیے ہوٹلوں میں اتنا خرچ کر دیتے ہیں جو گھر میں ان کے نصف مہینے کا خرچہ ہوتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ خوش اور مطمئن رہتے ہیں۔ لوڈر ایک نوجوان لڑکا تھا۔ میرا سامان ایک طرف رکھنے اور کھڑکیوں کے پردے ہٹا دینے کے بعد اُس نے چابی میز پر رکھ دی اور مؤدب لہجے میں پُوچھا "کسی اور چیز کی ضرورت تو نہیں ہے سر؟"

میں نے ایک نوٹ جیب سے نکال کر اس کے حوالے کیا اور وہ شکریہ ادا کرتا ہوا چلا گیا۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا شام کے چار بج رہے تھے۔ میں شیخ برکت سے فون پر رابطہ قائم کر سکتا تھا مگر شوکت کے بغیر معاہدے پر دستخط نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لیے میں نے شیخ برکت کو فون کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

میں نے ٹیلی فون اُٹھایا اور اپنے گھر کا نمبر ملانے کی درخواست کی۔ نمبر فوراً ہی مل گیا۔ چند بار گھنٹی بجی اور پھر روزی کی سُریلی آواز میرے کانوں میں گونجی۔

"ہیلو روزی" میں نے کہا۔

"ہیلو" روزی کی کمزور سی آواز سنائی دی۔ یوں لگا جیسے میرا ٹیلی فون سن کر کچھ حیران رہ گئی ہے۔ شاید وہ اس وقت میرے فون کی توقع نہیں کر رہی تھی۔ "کیسے ہیں آپ؟" اُس نے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں۔ یہ بتاؤ کہ شوکت یہاں کیوں نہیں پہنچا۔ تمہیں کوئی پیغام تو نہیں دیا اُس نے؟"

"بالکل نہیں" وہ ایک دم پریشان سی ہو گئی۔ "کیوں۔ کیا ہوا؟"

"ہوتا کیا۔ نہ وہ ہوٹل میں ہے اور نہ اُس کا کوئی پیغام یا پتہ ہے۔ میرے لیے کمرہ بھی بک نہیں کرایا اُس نے۔ اب میں پریشان بیٹھا ہوں کہ کیا کروں؟ گھر فون کر کے معلوم کر رہا ہوں؟"

"اس کی ضرورت نہیں ہے" وہ بات کاٹ کر بولی۔ "نسیم ابھی میرے پاس سے گئی ہے۔ سارے دن میرے ساتھ رہی اگر شوکت یہاں ہوتے تو اُسے خبر نہ ہوتی؟"

"یہ بھی ٹھیک ہے" میں نے کہا۔ "تو پھر وہ کہاں چلا گیا؟ کہیں راستے میں کوئی حادثہ تو پیش نہیں آ گیا۔ وہ کار ہی سے آ رہا تھا نا؟"

وہ بولی "یہ تو میں نے نسیم سے نہیں پوچھا۔ اگر انہوں نے آپ کو کار سے پہنچنے کا بتایا تھا تو کار ہی سے گئے ہوں گے۔"

"بھئی میں تو پریشان ہو گیا ہوں۔ خدا جانے وہ کہاں چلا گیا۔ یا راستے میں گاڑی خراب ہو گئی۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں؟"

"ان کا انتظار کیجئے۔ ویسے آپ ٹھہرے کہاں ہیں؟" اس نے کہا۔

"وہیں۔ میرا مطلب ہے امپیریل ہوٹل میں۔ پانچ سو سترہ نمبر کا کمرہ ہے میرا۔ اس کے لیے بھی ایک کمرہ ریزرو کرا لیا ہے میں نے۔"

"یہ آپ نے اچھا کیا۔ اگر مجھے ان کے بارے میں کچھ معلوم ہوا تو آپ کو فون کر کے بتا دوں گی۔ ویسے آپ واپس کب آ رہے ہیں؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں" میں نے کہا۔ "جب تک شوکت نہیں آئے گا میں شیخ برکت سے معاہدہ سائن نہیں کر سکتا ———— معاہدے پر دستخط کرنے کے لیے ہم دونوں کی موجودگی ضروری ہے۔ اب کل صبح میں شیخ برکت سے بات کروں گا اچھا روزی خدا حافظ۔"

"خدا حافظ" اُس نے جواب میں کہا۔ "آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں۔ فکر نہ کرو۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے فون بند کر دیا اور سوچنے بیٹھ گیا کہ آخر شوکت کو ہو کیا گیا؟ اس سے پہلے کبھی شوکت نے ایسی غیر ذمہ داری کا ثبوت نہیں دیا تھا۔ وقت اور اپائنٹمنٹ کا وہ بہت پابند تھا بلکہ مجھے بھی تاکید کرتا رہتا تھا۔ پھر مجھے یہ بھی احساس تھا کہ شیخ برکت کو ایک دو روز کے اندر ملک سے باہر چلا جانا تھا۔ اگر ہم نے مقررہ وقت کے اندر معاہدے پر دستخط نہ کیے تو پھر یہ معاہدہ کھٹائی میں پڑ سکتا تھا۔ بہرحال۔ اب اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ میں اس کا انتظار کرنے کے سوا اور کیا کر سکتا تھا؟

میں نے غسل کر کے لباس تبدیل کیا اور کمرے میں بور ہونے کی بجائے ہوٹل کی لابی میں جانے کا فیصلہ کیا۔ وقت گزاری کے لیے فی الحال کوئی اور پروگرام میرے پیش نظر نہیں تھا۔

ہوٹل کی لابی میں خوب چہل پہل اور گہما گہمی تھی۔ زیادہ تعداد غیر ملکی مردوں اور عورتوں کی تھی۔ یہ غیر ملکی عموماً بچوں کے بغیر سیر و تفریح کو نکلتے ہیں۔ اس وقت بھی لابی میں مجھے ایک بھی بچہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ نوجوان جوڑے البتہ کافی تعداد میں تھے یا پھر بڑی عمر کے بوڑھے تھے۔ نوجوانوں کی بڑی تعداد خوش گپیوں اور ہنسی مذاق میں مصروف تھی۔ ان کے چہروں پر مسکراہٹ تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے انہیں دُنیا میں کسی قسم کی فکر نہیں ہے۔ میں ایک گوشے میں جا کر صوفے پر بیٹھ گیا اور کافی کا آرڈر دیا۔

کوشش کے باوجود میں شوکت کی غیر حاضری کے مسئلے کو فراموش نہیں کر سکا تھا۔ نہ جانے کیوں میں، ایک اَن جانے خوف اور وسوسے کا شکار ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی اہم واقعہ رونما ہونے والا ہے۔ شوکت کاروباری معاملات میں بہت ہوشیار بلکہ کسی حد تک لالچی تھا۔ میں یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ شوکت تاخیر سے پہنچ کر بلاوجہ بارہ لاکھ روپے کے منافع سے ہاتھ دھونا پسند کرے گا۔ میں جانتا تھا کہ وہ کسی بھی قیمت پر اس منافع سے محروم ہونا گوارا نہیں کرے گا اور ہر صورت میں معاہدے پر دستخط کرنے کے لیے بروقت پہنچ جائے گا۔ معاہدے پر سائن کرنے کے لیے دراصل آج کا دن متعین تھا لیکن کوئی فلائیٹ ایسی نہیں تھی جو مجھے دفتری اوقات میں منزلِ مقصود تک پہنچا دیتی اسی لیے شوکت نے کار کے ذریعہ سفر کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ پروگرام یہ طے پایا تھا کہ وہ مجھ سے پہلے پہنچ کر شیخ برکت سے بات کرے گا اور پھر ہم دونوں اگلے روز معاہدے پر دستخط کر کے اسے قانونی شکل دے دیں گے۔

یکایک مجھے محسوس ہوا جیسے کوئی مجھے دیکھ رہا ہے۔ میں نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور میری نگاہ کچھ فاصلے پر بیٹھے ہوئے ایک غیر مُلکی پر پڑی جو بغور میری طرف دیکھ رہا تھا لیکن جب میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے نظریں چرا لیں۔ ایک اخبار اس کے ہاتھ میں تھا جیسے ہی میں نے اسکی طرف دیکھا اس نے ایک دم اخبار اپنے چہرے کے سامنے رکھ لیا جیسے اخبار بینی میں مصروف ہے۔ اس کا یہ اضطراری عمل میرے لیے تعجب انگیز تھا۔ بھلا وہ کون شخص ہو سکتا تھا؟ اگر وہ میری طرف دیکھ رہا تھا تو میرے دیکھنے پر گھبرا کیوں گیا تھا۔ ویٹر کافی لیکر آیا اور میرے سامنے میز پر رکھ کر خاموشی سے رُخصت ہو گیا۔ میں نے کافی بنائی، لیکن ایک عجیب سی اُلجھن نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ میں نے ذرا گہری نظروں سے اس غیر مُلکی کا جائزہ لیا۔ وہ ایک صحت مند، بُلند قامت اور مضبوط جسم کا مالک تھا اس کے بال بھورے اور آنکھیں پیلے رنگ کی تھیں۔ بظاہر دیکھنے میں وہ ایک عام غیر مُلکی نظر آتا تھا، لیکن اس کی اس حرکت نے مجھے خواہ مخواہ مشکوک کر دیا تھا۔ اب وہ میری طرف سے بالکل بے نیاز اور بے پرواہ بیٹھا ہوا تھا جیسے میں ہال میں موجود ہی نہیں ہوں۔ میں نے گرم کافی کا گھونٹ بھرا تو ایک آسودگی بخش طمانیت میری رگ وپے میں دوڑ گئی۔ ہو سکتا ہے یہ محض ایک اتفاق ہی ہو اور اس کی یہ حرکت دانستہ نہ ہو۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے بارے میں سوچنے پر مجبور تھا۔ یکایک اس نے اخبار کو تہہ کر کے سامنے کی میز پر رکھ دیا اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے بارے میں میرا پہلا اندازہ بالکل دُرست تھا۔ وہ ایک تنومند اور جسیم آدمی تھا۔ میری جانب نگاہ ڈالے بغیر وہ ہوٹل کے بیرونی دروازے کی طرف چلا گیا مگر مجھے ایک اُلجھن اور کشمکش و پیچ میں ڈال گیا۔

"سر۔ آپ کا نام یوسف علی ہے؟" ویٹر نے مؤدب انداز میں میرے پاس آکر پوچھا۔

"ہاں کیا بات ہے؟"

"آپ کے لیے فون ہے ۔ اُدھر ریسپشن پر!"

ہو نہ ہو یہ شوکت کا فون ہو گا۔ یہ سوچکر میں تیزی سے اُٹھا، لیکن شوکت نے فون کہاں سے کیا ہے؟ ہو سکتا ہے وہ راستے میں کار کی خرابی یا کسی اور اُفتاد کی وجہ سے کہیں رُکنے پر مجبور ہو گیا ہو۔ یا پھر وہ کسی اور ہوٹل میں قیام پذیر ہو۔

"ہیلو۔ میں یوسف بول رہا ہوں۔" میں نے ٹیلی فون اُٹھا کر کہا۔

"ہیلو۔ مسٹر یوسف۔ آپ کے لیے میرے پاس ایک پیغام ہے۔" ایک زنانہ اور انتہائی سُریلی آواز نے مجھے مخاطب کیا۔

"جی فرمائیے۔" میں اپنی حیرانی پر قابو نہیں پا سکا تھا۔

"آپ آج رات کو آٹھ بجے ویسٹ اینڈ روڈ کے بنگلہ نمبر دو سو بارہ میں پہنچ جائیں۔"

"لیکن آپ کون بول رہی ہیں اور یہ پیغام کس نے دیا ہے؟"

جواب میں اسکی مترنم ہنسی کی آواز مجھے سنائی دی۔ "مجھے آپ نہیں جانتے اس لیے نام بتانے سے کوئی فائدہ نہ ہو گا لیکن

اتنا یاد رکھیے کہ اگر آٹھ بجے اس پتے پر نہ پہنچے تو آپ کو نقصان ہو سکتا ہے۔"

"مگر مجھے وہاں کس نے بُلایا ہے اور کس سلسلے میں؟"

"یہ تو میں نہیں جانتی۔" وہ پھر آہستہ سے ہنسی۔ شاید بات کرتے ہوئے ہنسنا اسکی عادت تھی ورنہ میرے سوال میں ہنسی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ "مجھے صرف اتنا ہی پیغام دینے کو کہا گیا تھا۔ خدا حافظ۔"

میں "ہیلو ہیلو" کہتا رہ گیا مگر دوسری طرف سے ٹیلی فون کا سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔ میں نے مجبوراً فون کا ریسیور نیچے رکھا تو سامنے وہی خوش اندام افسر مہمانداری کھڑی مسکرا رہی تھی۔ جواب میں اخلاقاً میں بھی مسکرایا، مگر پھر مجھے فون پر ملنے والا پیغام یاد آگیا۔ میں اس شہر سے زیادہ واقف نہ تھا اور نہ ہی مجھے یہاں کی سڑکوں اور مختلف علاقوں کے بارے میں ـــــ کچھ علم تھا۔

"سنیے۔" میں اس لڑکی سے مخاطب ہوا۔

"فرمایئے۔!" جواب میں اس کا مُسکراتا ہوا چہرہ مجسّم سوال بن گیا۔

میں نے پہلی بار نوٹ کیا کہ جب وہ مسکراتی تھی تو اس کے دونوں گالوں میں خوشنما گڑھے پڑ جاتے تھے جن کی وجہ سے اسکی مسکراہٹ اور زیادہ دلکش ہو جاتی تھی۔ میں اس کے گالوں میں پڑنے والے خوبصورت گڑھوں کو دیکھنے میں ایسا محو ہوا کہ اسے دوبارہ مجھ سے پوچھنا پڑا۔ "سر۔ آپ مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتے تھے؟"

"ہاں ہاں۔" میں چونک پڑا۔ کسی لڑکی کو یوں گھورنا صریحاً بد تہذیبی میں داخل تھا اور میں نے پہلے کبھی ایسی حرکت نہیں کی تھی۔ "میں آپ سے یہ دریافت کرنا چاہتا تھا کہ ویسٹ اینڈ روڈ شہر کے کس علاقے میں ہے اور یہاں سے کتنی دُور ہے؟"

"ویسٹ اینڈ روڈ۔" وہ ہولے سے مسکرائی اور اپنے گال پر ایک اُنگلی رکھ کر سوچنے لگی۔ پھر بولی۔ "جی ہاں۔ یاد آگیا ہے ویسٹ اینڈ روڈ ریس کورس کے پاس ہے۔ اس علاقے میں زیادہ تر ایسے بنگلے ہیں جن میں ریس کے سیزن میں ریس کے گھوڑے رکھے جاتے ہیں اور اسی کاروبار سے تعلق رکھنے والے لوگ ان بنگلوں میں اقامت پذیر ہوتے ہیں۔"

"مگر آج کل تو ریس کا سیزن نہیں ہے؟"

"جی نہیں اس لیے اکثر بنگلے خالی ہو جاتے ہیں۔ ملازموں اور چوکیداروں کے سوا وہاں اور کوئی نہیں رہتا۔ مگر بعض بنگلوں میں ایسے خاندان بھی رہتے ہیں جن کا ریس سے کوئی تعلق نہیں ہے اور وہ ان بنگلوں کے مستقل مکین ہیں۔"

"یہاں سے کتنے فاصلے پر ہو گی یہ ویسٹ اینڈ روڈ؟" میں نے پوچھا۔

"تقریباً چار میل کے فاصلے پر۔ آپ فرمائیں تو میں آپ کے لیے پرائیویٹ ٹیکسی کا انتظام کر دوں؟" وہ پھر مسکرائی۔

"شکریہ۔ مجھے ابھی جلدی نہیں ہے۔ ضرورت پڑی تو آپ کو ضرور تکلیف دوں گا۔" میں استقبالیہ سے ہٹ کر دوبارہ اپنے صوفے کی طرف گیا تو میری اُلجھن میں ایک اور اضافہ ہو چکا تھا۔ یہ سُریلی اور دلکش آواز کس خاتون کی تھی؟ وہ کون تھی اور مجھ سے کیا چاہتی تھی؟ وہ کون شخص ہے جو رات کو آٹھ بجے بنگلہ نمبر دو سو بارہ میں مجھ سے ملنے کا خواہش مند ہے؟ پھر مجھے شوکت پر غصّہ آنے لگا۔ اگر وہ مجھے یہاں مل گیا ہوتا تو میں شاید ان واقعات سے دوچار نہ ہوتا اور اگر ہوتا بھی تو ہم دونوں مل کر ان معموں کا کوئی حل تلاش کر لیتے مگر فی الحال میں اس شہر میں اکیلا تھا اور ان ہونے واقعات بہت تیزی سے رونما ہو رہے تھے۔ بل پر سائن کرنے کے بعد میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اپنے مقصد ٹہلنے لگا مگر میرا ذہن مجھ سے زیادہ تیزی سے حرکت کر رہا تھا۔ وہ پُراسرار آواز کس کی تھی؟ اور وہ کون ہے جو بنگلہ نمبر دو سو بارہ میں مجھ سے ملاقات کا خواہاں ہے۔ اس نے مجھے اپنا نام بتانے کی ضرورت کیوں محسوس نہیں کی؟ ہو سکتا ہے یہ سب مذاق ہو مگر ایسا انوکھا مذاق میرے ساتھ کون کر سکتا ہے! اور اسے مذاق کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی ہے؟ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ میں اس شہر میں بالکل نوارد تھا۔ مجھے ہوٹل میں کمرہ لیے ہوئے بمشکل ایک گھنٹہ گزرا ہو گا۔ پھر کسی شخص کو میرے نام اور کمرے کے بارے میں کیوں کر علم ہو سکتا ہے؟۔

میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ شام کے پانچ بج رہے تھے۔ رات کے آٹھ بجنے میں ابھی تین گھنٹے باقی تھے مگر کیا میرا

اُس پُراسرار ملاقاتی کے پاس جانا مناسب بھی ہوگا؟ کافی سوچ بچار کے باوجود میں اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر پایا۔ ایک طرف یہ خیال تھا کہ بہت ممکن ہے اس تمام واقعے میں شوکت کی شرارت کو دخل ہو۔ وہ بعض اوقات پریکٹیکل مذاق بھی کیا کرتا تھا، حالانکہ اس قسم کا کوئی مذاق اس نے پہلے کبھی کم از کم میرے ساتھ نہیں کیا تھا۔ اگر یہ فون شوکت نے نہیں کرایا تو پھر کس نے کرایا ہوگا؟ شیخ برکت؟ مگر نہیں۔ شیخ برکت کو تو میرے یہاں پہنچنے کی اطلاع ہی نہیں تھی اور پھر وہ یہ کیسے جان سکتا تھا کہ میں امپیریل ہوٹل میں موجود ہوں۔ اس کے علاوہ شیخ برکت کو اتنا سسپنس پیدا کرنے کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے۔ اگر وہ مجھ سے ملنے کا خواہش مند تھا تو براہِ راست فون کر کے اپنی اس خواہش کا اظہار کر سکتا تھا۔ یہ سب ڈراما کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

خدا جانے انہی سوچوں میں کھویا ہوا میں کب ہوٹل کی لابی سے نکل کر صدر دروازے تک پہنچ گیا تھا۔ ہوٹل کا باوردی چوکیدار سر جھکائے میرے سامنے کھڑا تھا۔

"ٹیکسی سر؟!"

"ہاں" میں نے بلا سوچے سمجھے سر ہلا دیا۔ اس کے اشارے پر ایک ٹیکسی فوراً میرے سامنے آکر رُک گئی۔ چوکیدار نے انتہائی شائستگی کے ساتھ آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور میں ٹیکسی میں سوار ہو گیا۔

"کہاں جائیں گے سر؟" چند لمحے تک جب میں نے کوئی ہدایت جاری نہیں کی تو ٹیکسی ڈرائیور نے تنگ آکر مجھ سے سوال کیا۔

"کہاں جاؤں گا؟" یہ تو میں نے فیصلہ ہی نہیں کیا تھا مگر ٹیکسی میں سوار ہونے کے بعد کہیں نہ کہیں جانا بھی ضروری تھا۔

"تم ٹیکسی آہستہ آہستہ چلاؤ۔ میں تمہیں سوچ کر بتاتا ہوں۔" ٹیکسی ڈرائیور نے عجیب نظروں سے میری طرف دیکھا اور پھر ٹیکسی حرکت میں آگئی۔ تیزی سے سوچنے کے باوجود میں ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ مجھے کہاں جانا چاہیے؟ جانے کے لیے جگہ بھی کون سی تھی؟ میں اس شہر کے کسی مقام سے واقف نہ تھا۔ نہ ہی یہاں میرا کوئی دوست اور شناسا تھا تو پھر میں ٹیکسی ڈرائیور کو کیا بتاؤں؟ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ میں واپس ہوٹل جا کر اپنے کمرے میں ٹیلی ویژن پر ان موم مووِیز سے دل بہلاؤں؟ مگر ٹیکسی ڈرائیور میرے بارے میں کیا سوچے گا؟

مگر شاید اس اثنا میں ٹیکسی ڈرائیور میرے بارے میں بہت کچھ سوچ چکا تھا۔ مجھے اگلی سیٹ سے اس کی آواز سنائی دی۔

"سر۔ میرے لیے کیا حکم ہے؟"

"دیکھو بھئی۔ میں اس شہر میں اجنبی ہوں اور میرے پاس تھوڑا سا وقت فالتو ہے۔ تمہارے خیال میں کون سی جگہ مناسب ہوگی جہاں میں دو تین گھنٹے گزار سکوں؟"

"میں سمجھ گیا سر جی!" ٹیکسی ڈرائیور کی آواز میں ایک دم چمک پیدا ہو گئی۔ "یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ میں آپ کے دل بہلانے کا بندوبست کر دوں گا۔"

"مگر" میں نے کچھ کہنا چاہا۔

"آپ فکر ہی نہ کیجیے سر جی۔"

ٹیکسی کی رفتار میں اچانک تیزی آگئی۔ میں نے بھی بلاوجہ سوچنا غیر ضروری سمجھا اور پچھلی نشست سے سر ٹیک کر آنکھیں بند کر لیں۔ میں کچھ دیر کے لیے بالکل خالی الذہن ہو گیا۔ یہ ایک ارادی کوشش تھی۔ مجھے فوجی ملازمت کے دوران میں یہ تربیت بھی دی گئی تھی کہ ذہنی اُلجھن اور تفکرات کے ہجوم سے بچنے کے لیے میں کچھ وقت کے لیے بالکل خالی الذہن ہو کر اپنے جسم و اعصاب کو سکون پہنچا سکتا تھا۔ اس مقصد کے لیے میں نے کڑی مشقیں کی تھیں اور مجھے اس عمل پر عبور حاصل ہو چکا تھا۔ چاہے کتنی بھی پریشانیاں اور مسائل ہوں میں جب اور جہاں بھی چاہوں ان سے وقتی طور پر نجات حاصل کر کے اپنے ذہن،

جسم اور اعصاب کو سکون پہنچانے کی قدرت رکھتا تھا۔

میں اس عالم میں نہ جانے کتنی دیر رہا اور اس وقت چونکا جب ٹیکسی ڈرائیور نے مجھے دو تین بار پکار کر ہوشیار کرنے کی کوشش کی۔ وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ میری آنکھ لگ گئی ہے۔ اسی لیے بہت دھیمی آواز میں مجھے بیدار کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو وہ دانت نکالنے لگا۔ بولا "معاف کرنا سر جی۔ میں نے آپ کی نیند خراب کر دی۔"

"کوئی بات نہیں ہے۔" میں نے ایک لمبی جمائی لی۔ "کیا بات ہے؟"

"اُتریں سر جی۔ آپ کا سٹیشن آگیا ہے۔"

"سٹیشن؟" میں نے حیران ہو کر چاروں طرف دیکھا۔ ٹیکسی ایک صاف ستھری کشادہ سڑک پر فٹ پاتھ کے ساتھ کھڑی تھی۔ آس پاس شاندار دو منزلہ مکانات تھے جن کی حالت دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ ان کے مکین خاصے خوشحال ہیں۔

"آیئے سر جی!" اس نے ٹیکسی کا دروازہ کھول کر ہاتھ سے سامنے والے مکان کی طرف اشارہ کیا۔

"مگر یہ کون سی جگہ ہے؟ تم مجھے کہاں لے آئے ہو؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"یہ تو آپ کو خود ہی معلوم ہو جائے گا۔ آیئے۔ میرے ساتھ آجایئے۔"

میں بلا ارادہ اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا ایک مکان کے دروازے پر پہنچ گیا جس کے سامنے چھوٹا سا خوبصورت لان تھا۔ پھولدار پودے اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ اتنی دیر میں ڈرائیور دروازے پر لگی گھنٹی بجا چکا تھا۔

جس وقت میں دروازے پر پہنچا اُسی وقت دروازہ کھلا اور سامنے ایک سفید وردی پوش بیرے نے مؤدب ہو کر ہمیں سلام کیا۔ ٹیکسی ڈرائیور کو دیکھ کر اس کے چہرے پر شناسائی کی ایک کیفیت پیدا ہوئی اور پھر اُس نے اشارے سے مجھے سلام کرتے ہوئے دروازہ پورا کھول دیا۔

"اندر آجایئے سر؟" اُس نے نرمی سے مجھے دعوت دی۔

"میرے لیے کیا حکم ہے سر جی؟ مجھے فارغ کریں گے یا میں آپ کا انتظار کروں؟"

ابھی میں جواب دینے نہ پایا تھا کہ باوردی بیرے نے تحکمانہ لہجے میں کہا "تم جاؤ۔ دو گھنٹے بعد صاحب کو لینے کے لیے آجانا۔"

ٹیکسی ڈرائیور کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ مجھے اشارے سے سلام کرتا ہوا رُخصت ہو گیا۔ میں احمقوں کی طرح کھلے دروازے کے سامنے کھڑا اُن دونوں کو دیکھتا رہ گیا۔

"آجایئے سر" بیرے کی آواز میں بے چینی آگئی تھی۔ شاید وہ ہر ہر قدم پر میرے رُک جانے کی وجہ سے اُکتاہٹ محسوس کر رہا تھا۔

میں نے سوچا کہ دروازے کے اندر داخل ہونے سے پہلے یہ تو معلوم کرنا چاہیے کہ یہ کون سی جگہ ہے؟ ہو سکتا ہے یہ کوئی پرائیویٹ کلب ہو جہاں مجھ ایسے پردیسی کچھ دیر کے لیے وقت گزارنے آجاتے ہوں مگر مکان پر ایسی کوئی علامت دیکھنے میں نہیں آرہی تھی جس سے اندازہ ہو کہ وہ کوئی کلب یا تفریح گاہ ہے، البتہ سامنے والے دروازے پر انگریزی میں ایک تختی لگی ہوئی تھی جس پر "پرائیویٹ" لکھا ہوا تھا۔

میں نے پوچھا "یہ کون سی جگہ ہے۔ کیا کوئی پرائیویٹ کلب ہے؟"

"جی ہاں سر۔ یہ بہت ہی پرائیویٹ کلب ہے۔ آپ میرے ساتھ اِس طرف آیئے سر۔"

میں اس کے کہنے کے مطابق دروازے میں داخل ہوا تو میرے پیچھے دروازہ خود بخود بند ہو گیا۔ سامنے ایک مختصر [illegible] اور اس کے دونوں اطراف گیلریاں تھیں جن میں دروازے تھے۔ فرش پر سُرخ رنگ کا قالین بچھا ہوا تھا۔ باوردی [illegible] قدموں سے چلتا ہوا ایک گیلری کی طرف بڑھا۔ جب میں لابی سے گزرا تو میرے کانوں میں کچھ مردوں اور عورتوں کے ہنسنے اور

باتیں کرنے کی آوازیں آئیں ۔ وہ لوگ سرگوشی میں گفتگو کر رہے تھے ۔ کبھی کبھار کوئی بلند آواز سے بے اختیار ہنس پڑتا تھا ۔ ایک گیلری سے گزر کر ہم ایک محراب نما دروازے میں پہنچے ۔ یہ نیچے جانے والی سیڑھیوں کا راستہ تھا ۔ گویا اس مکان میں ایک زیرِ زمین تہہ خانہ بھی تھا ۔ ویسے بھی باہر سے یہ مکان جتنا بڑا نظر آتا تھا اندر داخل ہونے کے بعد اس سے کہیں زیادہ وسیع اور کشادہ ثابت ہوا ۔ سیڑھیوں پر بھی سُرخ قالین بچھا ہوا تھا اور فضا میں مختلف قسم کی ملی جلی خوشبو پھیلی ہوئی تھی ۔ سیڑھیوں سے اُتر کر ہم پھر ایک مختصر سی لابی میں پہنچے جس میں مختلف سمتوں میں دروازے تھے ۔ بیرے نے ایک بند دروازے پر دستک دی اور پھر آہستہ سے دروازہ کھول کر مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا ۔ میں دروازے کے اندر داخل ہوا تو بیرے نے باہر سے دروازہ بند کر دیا ۔ اب میں ایک کمرے کے اندر تھا جس میں ہلکی ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی ۔ پہلے تو مجھے خیال گزرا کہ شاید میں کمرے میں اکیلا ہوں مگر جب آنکھیں اس مدھم روشنی سے مانوس ہوئیں تو پتہ چلا کہ میرے علاوہ اس کمرے میں کوئی اور بھی موجود تھا ۔ اس کمرے میں دیوار تا دیوار قالین بچھا ہوا تھا ۔ فرنیچر کے نام پر ایک چھوٹی میز ، کرسی اور ایک دو نشستی صوفے کے سوا کوئی اور چیز موجود نہیں تھی ۔ میں میز کی طرف بڑھا تو مجھے میز کے سامنے بیٹھی ہوئی عورت بھی نظر آ گئی ۔

وہ تیس بتیس سال کی ایک خوش جمال خاتون تھی جس نے چُست سفید لباس پہن رکھا تھا ۔ بظاہر دیکھنے میں اس پر کسی ہسپتال کی نرس کا گمان گزرتا تھا ۔ مجھے اپنے نزدیک پا کر وہ دلنوازانہ انداز میں مسکرائی اور پھر مجھے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا ۔ میں خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گیا ۔ اب میں واضح طور پر کمرے کی ہر چیز دیکھ سکتا تھا ، لیکن اس طرح دار عورت کے سوا کوئی اور دیکھنے کی چیز اس کمرے میں موجود نہ تھی ۔ دیواریں ہر قسم کی آرائش سے محروم تھیں ۔ کمرے کی واحد کھڑکی پر کوئی پردہ نہیں تھا ۔ کوئی تصویر ، پینٹنگ ، گلدان قسم کی شے اس کمرے میں نہیں تھی ۔ بس ایک صوفہ تھا جس پر میں بیٹھا ہوا تھا یا وہ میز اور کرسی تھی جس پر نرس نما خاتون براجمان تھی ۔

" آپ کس قسم کی تفریح پسند کریں گے ؟ " اس عورت نے مجھے مخاطب کیا ۔ تو میں چونک پڑا ۔ اس سے پہلے کمرے میں مکمل خاموشی کا راج تھا ۔ اس کی آواز نے خاموشی کے اس طلسم کو توڑ دیا تھا ۔ اس کی آواز باریک نہیں تھی ، لیکن بھاری ہونے کے باوجود اس میں ایک خاص قسم کی گھلاوٹ تھی اور اس آواز کو بار بار سُننے کو جی چاہتا تھا ۔

" آپ کے ہاں کون کونسی تفریح ہے ؟ " میں نے جواب میں دریافت کیا ۔

وہ خالص کاروباری انداز میں بولی : " آپ ٹرکش باتھ لینا پسند کریں گے یا مساج کرائیں گے ؟ آپ کے ذہنی اور جسمانی سکون کے لیے دوسرے طریقے بھی ہیں ۔ "

اوہو ۔ یہ تو کوئی مساج گھر ہے ۔ میں نے سوچا ۔ بیرونی ملکوں میں اس قسم کے فیشن ایبل مساج گھروں کا تو مجھے علم تھا ، لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ خود ہمارے مُلک میں بھی اس قسم کی تفریح گاہیں موجود ہیں ۔ کیا حرج ہے اگر مساج کرانے کا تجربہ بھی حاصل ہو جائے ۔ یہ خیال کر کے میں نے اُسے بتایا " میں مساج کرانا پسند کروں گا ۔ "

اُس نے میز پر لگا ہُوا کوئی بٹن دبایا اور مکان میں کہیں ایک مترنم گھنٹی کی آواز گونجی ۔ دوسرے ہی لمحے ایک اور نرس نما عورت کمرے میں داخل ہوئی ۔ وہ ایک لمبی تڑنگی ، صحت مند عورت تھی جو سفید فراک پہنے ہوئے تھی ۔ اس کے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے ۔

" دیکھو لوسی ۔ مہمان کو مساج کے لیے لے جاؤ ۔ کون سا کمرہ خالی ہے ؟ "

" گیارہ نمبر " لڑکی نے مختصر جواب دیا ۔ پھر وہ میری طرف متوجہ ہوئی اور نہایت شُستہ انگریزی میں کہنے لگی " کیا آپ میرے ساتھ آنا پسند کریں گے ؟ "

میں خاموشی سے اُٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑا ۔ ہم دوبارہ لابی میں پہنچے اور وہاں سے گیلری میں داخل ہوئے ۔ ایک بند دروازے کے سامنے پہنچ کر لوسی رُک گئی ۔ میں بھی جو اس کی بل کھاتی ہوئی چال کو دیکھتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا

یکلخت رُک گیا ۔ اس نے دروازہ کھول کر مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا اور میرے اندر داخل ہونے کا انتظار کیے بغیر خاموشی سے آگے بڑھ گئی ۔

یہ مناسب سائز کا کمرہ تھا جس میں ایک طرف آرام دہ دیوان رکھا ہوا تھا ۔ کمرے کی دیواروں کا رنگ ہلکا نیلا تھا ۔ کمرے میں موجود دیوان اور اس پر پڑی ہوئی ریشمی چادر بھی نیلے رنگ کی تھی ۔ کمرے میں خاص روشنی تھی ، لیکن ایک جانب رکھے ہوئے خوبصورت لیمپ میں ایک نیلا بلب بھی روشن تھا ۔ فرش پر ہلکے نیلے رنگ کا پھولدار قالین تھا ۔ ایک جانب مختصر سی سنگھار میز رکھی ہوئی تھی اور سامنے باتھ روم کا دروازہ تھا ، کیونکہ بیٹھنے کے لیے کوئی اور فرنیچر نہیں تھا اس لیے میں دیوان پر نیم دراز ہو گیا ۔ کمرے میں ہلکی ہلکی خوشبو پھیلی ہوئی تھی ۔ دیوان پر نیم دراز ہونے کے بعد میری نظر اس ٹیلی ویژن اور وی سی آر پر پڑی جو سامنے کی دیوار کے ساتھ رکھا ہوا تھا ۔ یکایک سرسراہٹ سی سنائی دی اور پھر کمرے کا دروازہ کھلا ۔ دروازے میں جو لڑکی داخل ہوئی تھی اسے دیکھ کر میں اُٹھ کر بیٹھ گیا ۔ وہ ایسا لباس پہنے ہوئی تھی جو مغربی خواتین غسل کے لیے ساحلِ سمندر پر پہنتی ہیں ، بلکہ یہ لباس کچھ اور بھی زیادہ مختصر تھا ۔ اس کے بازو پر ایک نیلے رنگ کا تولیہ لٹک رہا تھا ۔ کمرے میں داخل ہو کر اس نے دروازہ بند کر دیا اور پھر میری طرف دیکھ کر مسکرائی ۔ میں ابھی تک حیران نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا ۔ اس نے آگے بڑھ کر تولیہ دیوان کے سرہانے رکھ دیا اور پھر فراخدلی سے مسکراتی ہوئی میری طرف بڑھی ۔

" آپ مساج کرائیں گے ؟ " اس نے مجھ سے سوال کیا ۔

میں نے سر ہلا کر اثبات میں جواب دیا ۔

وہ پھر مسکرائی اور بولی : " ظاہر ہے کہ آپ لباس پہن کر مساج نہیں کرا سکتے اس لیے لباس اُتار دیں ۔ میں اتنی دیر میں تیاری کرتی ہوں ۔ " یہ کہہ کر وہ ٹی وی کی طرف بڑھی اور اُس نے ایک سوئچ آن کر دیا ۔ یکایک ٹیلی ویژن میں جان پڑ گئی اور پھر ایک انتہائی بے ہودہ اور عُریاں فلم چلنے لگی ۔

" بند کر دو یہ فلم " میں نے بے اختیار چلّا کر کہا ۔ وہ اُچھل پڑی اور حیران نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی ۔

" سنا نہیں تم نے ۔ بند کر دو یہ فلم " میں نے دوبارہ غصّے میں کہا ۔

اُس نے ٹیلی ویژن بند کر دیا اور انتہائی حیران نظروں سے مجھے دیکھنے لگی " آپ مساج نہیں کرانا چاہتے ؟ " اُس نے بڑی معصومیت سے مجھ سے دریافت کیا ۔

" شکریہ " میں دیوان سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا " مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہاں اس قسم کا مساج ہوتا ہے " اسے حیران کھڑا چھوڑ کر میں کمرے سے باہر نکل گیا ۔ وہ بدستور حیران ، پریشان اور ساکت کھڑی پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے تک رہی تھی ۔

میں لابی میں پہنچا تو باوردی بیرا سیڑھیوں کی طرف جاتا ہوا نظر آیا ۔ " سنو " میں نے اُسے پکارا اور وہ نہایت ادب کے ساتھ رُک کر مجھے دیکھنے لگا ۔

" مجھے اپنے آفس لے چلو ۔ "

" آفس ؟ " اُس نے حیران ہو کر دیکھا اور پھر سر ہلا کر بولا " آپ مس نشاط کے پاس جانا چاہتے ہیں جن کے پاس میں آپ کو لے کر گیا تھا ۔ "

" ہاں ۔ مجھے وہیں لے چلو ۔ "

وہ خاموشی سے ایک طرف چل پڑا اور میں نے اس کی پیروی کی ۔ مس نشاط کے دروازے پر پہنچ کر اُس نے دروازے پر دستک دی ، لیکن میں نے انتظار گوارا نہ کیا اور بے دھڑک کمرے کے اندر داخل ہو گیا ۔ کمرہ جوں کا توں تھا اور مس نشاط بھی بدستور اپنی جگہ پر تشریف فرما تھیں ۔ مجھے سامنے دیکھا تو وہ پریشان ہو گئیں ۔

" کوئی گڑبڑ ہو گئی کیا ؟ " اُس نے انگریزی میں مجھ سے سوال کیا ۔
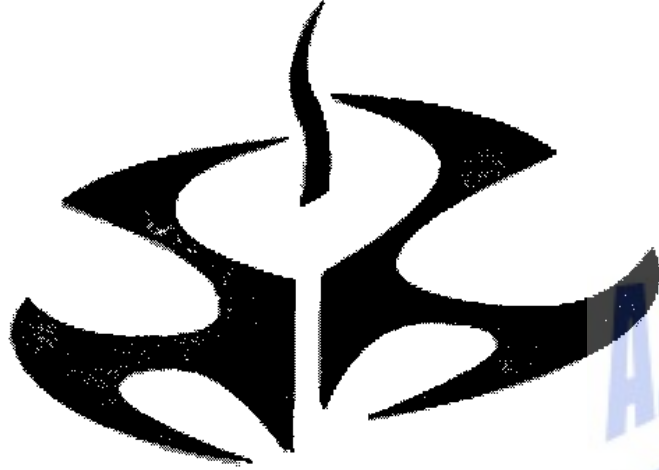
"یہ کس قسم کا مساج گھر ہے" میں نے غصے میں کہا۔ "تم لوگ شریف آدمیوں کو بے وقوف بناتے ہو۔ میں تمہاری شکایت کروں گا۔"

"شکایت؟" وہ آنکھیں جھپک کر معصومیت سے بولی "کس بات کی؟"

میں نے کہا۔ "تم لوگوں نے یہاں غیر قانونی طور پر فحاشی کا اڈہ قائم کر رکھا ہے۔"

وہ خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی۔

"مگر یاد رکھو میں ایسا آدمی نہیں ہوں۔ میں آوارگی کے لیے یہاں نہیں آیا تھا۔ میں تو وقت گزاری کے لیے آیا تھا۔"

"ہم اپنے گاہکوں کو پوری طرح مطمئن رکھتے ہیں سر، کیا کوئی ناخوشگوار واقعہ رونما ہو گیا ہے؟" اُس نے انگریزی میں مجھ سے پوچھا۔ "یہ ایک انتہائی پرائیویٹ کلب ہے جہاں صرف آپ جیسے شریف اور معزز لوگوں ہی کو آنے کی اجازت دی جاتی ہے۔"

"معاف کرنا۔ میں اس قسم کا معزز آدمی نہیں ہوں جیسے لوگ تمہارے کلب میں آتے ہیں۔ میں جا رہا ہوں مگر لوگوں کو گناہ کے جال میں پھنسانے سے پہلے تمہارا فرض اوّلین ہے کہ اُنہیں اپنے کلب کے بارے میں پوری معلومات فراہم کر دو۔"

یہ کہہ کر میں واپسی کے لیے مُڑا، مگر ابھی دروازے تک بھی نہیں پہنچا تھا کہ اسکی ملائم آواز سنائی دی: "مجھے افسوس ہے سر کہ آپ کو ہمارا کلب پسند نہیں آیا مگر کیا میں اُمید رکھوں کہ آپ جانے سے پہلے پانچ ہزار روپے فیس ادا کر دیں گے؟"

"پانچ ہزار؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا "کس بات کے پانچ ہزار روپے؟ میں تمہاری سہولتوں سے فائدہ اُٹھائے بغیر واپس جا رہا ہوں۔"

"معافی چاہتی ہوں سر، لیکن ایک بار جو شخص کلب کے اندر قدم رکھ لے اُس پر یہ فیس واجب ہو جاتی ہے۔"

"جہنم میں جاؤ۔" میں نے غصے میں کہا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا، لیکن ابھی گیلری تک ہی پہنچا تھا کہ سامنے والا دروازہ آہستگی سے کھلا اور اُس میں سے دو دیو قامت آدمی برآمد ہوئے۔ وہ دونوں انتہائی جسیم اور بلند قامت تھے اور ان کی قمیصوں کی آدھی آستینوں میں سے ان کے مضبوط پٹھے ہوئے جسم جھانک رہے تھے۔ ان کے چہروں پر بے رحمانہ مسکراہٹ تھی اور ان میں سے ایک کے ہاتھ میں لوہے کا پنجہ تھا جسے وہ بار بار اپنے دوسرے ہاتھ پر مار رہا تھا۔

"معاف کرنا سر۔" ان میں سے ایک اپنی گرجدار مکروہ آواز میں بولا۔ "آپ فیس ادا کرنا بھول گئے ہیں۔"

"میں نے تمہاری کسی سہولت سے فائدہ نہیں اُٹھایا" میں نے غصے میں کہا۔ "اس لیے میں فیس دینے کا پابند نہیں ہوں۔"

"یہاں جو بھی ایک بار آ جاتا ہے وہ فیس کی رقم ادا کیے بغیر باہر نہیں جا سکتا اور کیونکہ آپ نے ہمارے کلب کی توہین بھی کی ہے اس لیے آپ کو پانچ ہزار روپے جرمانہ بھی ادا کرنا ہو گا۔ یعنی ٹوٹل دس ہزار روپے دیئے بغیر آپ یہاں سے نہیں جا سکتے۔"

میرا غصہ لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا تھا۔ "کون روکے گا مجھے؟" میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

"اگر آپ نے سیدھی طرح رقم ادا نہیں کی تو پھر ہمیں دوسرے طریقے استعمال کرنے پڑیں گے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے دائیں ہاتھ میں پہنے ہوئے آہنی پنجے کو اپنے دوسرے ہاتھ پر مارا جو صاف اور واضح طور پر میرے لیے ایک دھمکی تھی۔ دوسرے لفظوں میں وہ یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ اگر میں نے ان کا مطالبہ منظور نہیں کیا تو وہ تشدد کا راستہ اختیار کریں گے۔ یہ زبردستی مجھے کسی طرح بھی گوارا نہیں تھی۔ میرا غصہ بتدریج بڑھتا جا رہا تھا مگر میں بلاوجہ کوئی ناخوشگوار صورت پیدا کرنے سے گریز کر رہا تھا۔

"دیکھو۔" میں نے اپنی آواز کو نارمل رکھنے کی پوری کوشش کی تھی۔ "مجھے دھوکہ دے کر یہاں لایا گیا ہے۔ میں اپنی مرضی اور خواہش سے یہاں نہیں آیا تھا۔ بہرحال۔ یہ ایک غلط فہمی تھی جس کے لیے میں کسی کو الزام دینا ضروری نہیں سمجھتا لیکن میں اس فریب کے جال میں پھنس کر کوئی رقم ادا کرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہوں۔ میرا راستہ چھوڑ دو اور مجھے واپس جانے دو۔" یہ کہہ کر میں آہستگی سے آگے بڑھا۔

دیو قامت آدمیوں میں سے ایک دو قدم آگے بڑھ کر میرے نزدیک آگیا۔ وہ قد میں مجھ سے اونچا اور بہت زیادہ تنومند تھا۔ اپنا ایک فولادی ہاتھ بڑھا کر اُس نے میرا گریبان پکڑنے کی کوشش کی، لیکن گریبان تک پہنچنے سے پہلے میں نے دونوں ہاتھوں میں اُسکی کلائی تھام لی اور ایک جھٹکا مارا۔ ہڈی چٹخنے کی آواز سنائی دی اور وہ دوسرے ہاتھ سے کلائی تھام کر زمین پر گر پڑا مگر اُس اثنا میں دوسرا دیو ہیکل غنڈہ ایک طوفانی آفت کی طرح مجھ پر ٹوٹ پڑا تھا۔ اس کا ایک گھونسہ میں نے جھکائی دے کر خالی جانے دیا۔ اس نے میرے چہرے کو نشانہ بنایا تھا، لیکن اگر وہ میرے چہرے پر پڑ جاتا تو یقیناً میرا حلیہ بگڑ جاتا۔ میرے جھکتے جھکتے بھی وہ گھونسہ میرے بائیں کندھے کو چھوتا ہوا نکل گیا۔ وہ اپنی جسامت کے مقابلے میں کہیں زیادہ سبک اور پھرتیلا تھا۔ کیونکہ دوسرے ہی لمحے وہ پلٹ کر اپنے آہنی پنجے سے مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس بار بھی اس کا نشانہ میرا چہرہ ہی تھا۔ اس کا چہرہ غصّے کی وجہ سے اور زیادہ بھیانک ہو گیا تھا اور وہ ہر صورت میں مجھے کچل کر رکھ دینا چاہتا تھا۔ میرے پاس بچاؤ کے لیے فوری طور پر کوئی صورت نہیں تھی سوائے اس کے کہ میں دیوار کی طرف ہٹ کر اسکا وار خالی کر دوں لیکن میرے حرکت کرنے سے پہلے وہ اپنا رُخ بدل کر مجھ پر حملہ آور ہو چکا تھا۔ وہ بہت تیزی سے میری طرف لپکا مگر فرش پر پڑے ہوئے اس کے ساتھی کے جسم سے ٹھوکر کھا کر اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور جھونک میں آ کر اوندھے منہ گر گیا اور اُس کا آہنی پنجہ پوری قوت سے قالین میں پیوست ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اُٹھنے کی کوشش کرتا میں اس پر ٹوٹ پڑا۔ میری ایک ٹھوکر اس کے چہرے پر پڑی اور دوسری پسلیوں پر۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنا بایاں پیر بڑھا کر اس کے آہنی پنجے والے ہاتھ پر رکھ دیا اور پورے جسم کا زور اُس پر ڈال دیا۔ وہ تکلیف سے چلّایا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ دوبارہ مجھ پر حملہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ اس لیے اس کو وہیں چھوڑ کر میں نے اطمینان کے ساتھ دروازے کا رُخ کیا۔ یکایک میرے بائیں جانب کا دروازہ کھلا اور اُس میں سے مس نشاط کا سدا مسکراتا ہوا چہرہ نمودار ہوا، لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ وہ دونوں قوی ہیکل دیو قامت غنڈوں کو فرش پر تکلیف سے بلبلاتا ہوا دیکھ کر حیران رہ گئی۔ ہم دونوں کی نظریں ملیں اور اُس نے پھُرتی سے دروازہ بند کر دیا۔

میں اس عمارت سے باہر نکلا تو ٹیکسی ڈرائیور کا دُور دُور تک پتہ نہیں تھا۔ پروگرام کے مطابق اسے دو گھنٹے بعد آنا تھا اور شاید اس اثنا میں وہ کوئی اور شکار تلاش کرنے چلا گیا تھا۔ کچھ دُور تک میں پیدل چلتا رہا۔ کچھ کاریں اور ٹرک نہایت تیز رفتاری کے ساتھ میرے برابر سے گزر گئے۔ اس علاقے میں ٹیکسی کا حصول خاصا دشوار نظر آ رہا تھا اس لیے میں نے وقت کی بچت کی خاطر کسی کار والے سے لفٹ لینے کا ارادہ کر لیا۔ میں بدستور پیدل چلتا رہا لیکن اس دوران میں نزدیک سے گزرنے والی کاروں سے اشارے سے لفٹ بھی طلب کرتا رہا۔ اب شام خاصی بھیگ چکی تھی اور فضا میں اندھیرے پھیلنے لگے تھے۔ یکایک ایک کار تیزی سے میرے برابر سے گزری لیکن کچھ فاصلے پر جا کر بریک چلّائے اور کار ڈرائیور نے کار کو روک لیا۔ ہمارا درمیانی فاصلہ زیادہ نہ تھا اس لیے میں تیزی سے چند قدم اُٹھانے کے بعد کار تک پہنچ گیا۔ کار کا سٹیئرنگ کے ساتھ والا اگلا دروازہ کھلا اور میں "تھینک یو" کہتا ہوا اندر بیٹھ گیا۔ میں نے دروازہ بند کیا اور اپنے محسن کی طرف متوجہ ہوا جو پہلے ہی میری طرف متوجہ تھا۔ ہم دونوں کی نگاہیں ملیں اور دونوں حیران و ششدر رہ گئے۔ میری نگاہوں کے سامنے وہ چہرہ تھا جسے کوشش کے باوجود میں بھلانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ جس کی تلاش اور جستجو میں میں نے ملک کا گوشہ گوشہ چھان مارا تھا مگر اس کا پتہ حاصل کرنے میں ناکام رہا تھا۔ جو میری آرزوؤں کا مرکز، میری خواہشوں اور تمناؤں کی منزل تھا۔ یہ چہرہ عاشی کا تھا۔ ایک طویل عرصے کے بعد یوں اچانک عاشی کو اپنی نگاہوں کے سامنے پا کر میں ساکت رہ گیا تھا۔ خود عاشی بھی حیرانی اور بے یقینی کے ساتھ مجھے دیکھ رہی تھی۔ ہماری ملاقات کافی طویل عرصے کے بعد ہوئی تھی لیکن اس میں ذرا برابر تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ پہلے ہی کی طرح خوبصورت، پُرسکون اور تر و تازہ تھی۔ اس کے نرم و ملائم سیاہ بال اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں فرطِ حیرت سے پھیل کر کچھ اور بڑی ہو گئی تھیں۔ اس کے چہرے کی دلکشی اور رعنائی میں ذرا بھی کمی نہ آئی تھی۔ وہ میرے خوابوں کی تعبیر تھی۔ میری آرزوؤں کی معراج تھی۔ وہ ایک ایسی لڑکی تھی

جو میری پہلی اور آخری محبت تھی۔ روزی سے شادی کے باوجود میں عاشی کو ایک لمحے کے لیے بھی فراموش نہیں کر سکا تھا اور اس حقیقت سے روزی بھی پوری طرح باخبر تھی۔ ہماری شادی سے پہلے میں نے اس سے کوئی بات چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ خود شوکت بھی عاشی کے بارے میں میری دیوانگی سے پوری طرح واقف تھا اور یہ اس کی تجویز تھی کہ اس کو بھلانے کے لیے میں روزی سے شادی کر لوں، اگرچہ مجھے ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال نہیں تھا کہ میں عاشی کو بھلانے میں کامیاب ہو جاؤں گا مگر شوکت میرا بہترین دوست تھا۔ وہ دنیا میں میرا سب سے بڑا ہمدرد اور بہی خواہ تھا۔ میری زندگی سے عاشی کے نکل جانے کے بعد صرف شوکت ہی ایک ایسا شخص تھا جس نے مجھے جینے کا سہارا بخشا تھا۔ عاشی کی تلاش میں اس نے میرے ساتھ زمین آسمان ایک کر دیا تھا۔ جب اچانک عاشی کے خطوط آنے بند ہو گئے تو شوکت نے نہ صرف ہندوستان میں اپنے دوستوں کو عاشی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی ہدایت کی بلکہ بذاتِ خود بھی جعلی پاسپورٹ کے ذریعے سرحد پار چلا گیا اور میری خاطر اس نے اپنی زندگی اور عزّت کو بھی داؤ پر لگا دیا۔ وہ فوجی رہ چکا تھا اور اس اعتبار سے اس کے لیے ہندوستان کا ویزا حاصل کرنا قریب قریب ناممکن تھا لیکن اس کے باوجود اس نے محض میری دوستی اور خوشی کی خاطر ایک جعلی نام سے پاسپورٹ اور ویزا حاصل کیا اور عاشی کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ اس کے باوجود ہم عاشی کو تلاش کرنے میں ناکام رہے۔ اس کی گمشدگی نے مجھے حواس باختہ کر دیا تھا۔ میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت یکسر مفقود ہو گئی تھی اور یوں لگتا تھا جیسے اگر حالات اسی طرح رہے تو کچھ عرصے بعد میں ہوش و حواس سے مکمل طور پر بیگانہ ہو جاؤں گا میری دیوانگی شوکت کو گوارا نہ تھی۔ وہ میرا غم بٹانے کی پوری پوری کوشش کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ ایک دن اس کے اور اس کی بیوی نسیم کے توسط سے میری ملاقات روزی سے ہوئی اور میرے حالات سے آگاہی حاصل کرنے اور میری دیوانگی جاننے کے باوجود روزی نے میری شریکِ حیات بننا گوارا کر لیا۔ میں اس شادی کے حق میں نہ تھا۔ میں جانتا تھا کہ ساری عمر کوئی دوسری لڑکی میری زندگی میں کبھی بھی عاشی کی جگہ نہیں لے سکے گی۔ میں اپنی باقیماندہ زندگی عاشی کی تلاش اور یاد میں بسر کرنے کا خواہش مند تھا لیکن شوکت کا دوستانہ اصرار اور روزی کی بے لوث محبت کے آگے ایک دن میں نے ہتھیار ڈال دیئے اور اس طرح روزی بیوی بن کر میری زندگی میں داخل ہو گئی لیکن مجھے سکونِ قلب پھر بھی حاصل نہ ہو سکا۔ یہ احساس ایک لمحے کے لیے بھی مجھ سے جدا نہیں ہوا کہ روزی سے شادی کرنے میں عاشی سے بے وفائی کا مرتکب ہوا ہوں۔ اگرچہ اس کے ملنے کا ایک فیصد امکان بھی باقی نہیں رہا تھا لیکن اس کے باوجود نہ جانے کیوں میں اپنی زندگی اور اپنے دل میں کسی اور کو عاشی کی جگہ براجمان کرنے کے حق میں نہ تھا لیکن شوکت کی ضد اور روزی کی محبت کے آگے ایک دن مجھے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ اس کے باوجود عاشی کی یاد دل کو میں اپنے دل سے جدا نہیں کر سکا تھا۔ شوکت نے مجھے اپنے ساتھ بزنس میں شامل کر لیا جس کے لیے روزی نے سرمایہ فراہم کیا تھا۔ میں اس تجویز کے حق میں نہیں تھا لیکن اُن دونوں کی دلیل یہ تھی کہ جب تک میں ذہنی طور پر اپنے آپ کو مصروف نہیں کروں گا میری دیوانگی میں کمی نہیں آئے گی۔ پھر ویسے بھی فوجی ملازمت چھوڑنے کے بعد مجھے زندگی گزارنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا اور شوکت کے ساتھ مل کر کاروبار کرنا میرے لیے ایک نادر موقع تھا۔

یہ تمام خیالات پل بھر میں میرے ذہن میں آ کر رخصت ہو گئے۔ میری بے تاب نگاہیں بدستور عاشی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں جس پر اب خوشی اور حیرانی کی جگہ ناخوشی اور بیزاری کے تاثرات نمودار ہو رہے تھے۔ مجھے اچانک غیر متوقع طور پر اپنے سامنے دیکھ کر اس کے چہرے پر جو بے کراں مسرّت جلوہ گر ہوئی تھی وہ اس بات کا کھلا ثبوت تھی کہ چاہے زمانے نے ہمارے ساتھ کوئی بھی چال چلی ہو وہ مجھے فراموش کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی اور پہلی محبّت کی چنگاریاں ابھی تک راکھ میں تبدیل نہیں ہوئی تھیں۔

جب میں کچھ دیر کے بعد اپنے ہوش و حواس میں واپس آ کر اور بولنے کے قابل ہوا تو میرے منہ سے نکلا "عاشی تم! میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ تم سے یوں اچانک ایک دن ملاقات ہو جائے گی اور تم اتنی آسانی سے مجھے مل جاؤ گی۔"

عاشی خاموش تھی۔ اس کی نظریں سامنے سٹیئرنگ پر جمی ہوئی تھیں اور صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش

میں معروف ہے۔ وہ مجھے خلافِ توقع اپنے سامنے پاکر بکھری گئی تھی اور اب اپنے آپ کو مجتمع کرنے کی جدّوجہد میں معروف تھی۔ چند اور طویل لمحے اسی طرح گزر گئے اور وہ مُنہ سے کچھ نہ بولی۔

مَیں نے کہا "عاشی، آخر تم کہاں چلی گئی تھیں۔ اچانک کہاں غائب ہوگئی تھیں۔ اگر تم اس ملک میں واپس آگئی تھیں تو تم نے مجھے خبر کیوں نہیں کی؟"

وہ شکایت بھری نظروں سے مجھے دیکھتی رہی پھر آہستگی سے بولی: "ڈرامہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یوسف! تم اس وقت جہاں بھی جانا چاہتے ہو مَیں تمہیں وہاں پہنچا دوں گی۔" یہ کہکر اس نے کار سٹارٹ کردی۔ وہ خاموشی سے کار چلا رہی تھی اور اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے بال ہوا کے جھونکوں کے ساتھ اُڑ رہے تھے۔ بالکل ویسا ہی منظر تھا جو مَیں اس سے پہلے بھی بارہا دیکھ چکا تھا۔ عالمِ خواب وخیال میں بھی مَیں بارہا عاشی کو اسی طرح کار چلاتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ یہ نظارہ میری آنکھوں اور حافظے میں ثبت ہوکر رہ گیا تھا۔ مَیں نے ایک دو بار پھر کچھ پوچھنے کی کوشش کی مگر وہ خاموش رہی۔ اس کے گلابی نازک ہونٹ مضبوطی کے ساتھ ایک دوسرے پر جمے رہے۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ خاموش رہنے کے لیے کافی کوشش اور جدّوجہد کر رہی ہے۔ اس کی مسلسل اور دانستہ خاموشی نے مجھے بھی خاموش کردیا۔ مَیں چُپ چاپ اس کی طرف دیکھتا رہا اور دل میں سوچتا رہا کہ اگر تقدیر میرا ساتھ دیتی تو یہ نظارہ مستقل طور پر میرا مقدر بن گیا ہوتا اور میری زندگی یوں بے معنی اور بے کیف ہوکر نہ رہ جاتی۔ کاش عاشی اچانک ہندوستان نہ جاتی۔ کاش وہ میرے خطوں کا باقاعدگی سے جواب دیتی رہتی۔ کاش وہ یوں گم نہ ہوتی۔ کتنے بہت سے کاش میری زندگی کا ایک حصّہ بن کر رہ گئے تھے۔ کاش کتنا معمولی اور سادہ سا لفظ ہے لیکن کس قدر سنگدل اور بے رحم ہے۔ اس ایک لفظ نے بے شمار زندگیوں کو تباہ وبرباد کرکے رکھ دیا ہے۔ کاش یہ لفظ ہم انسانوں کی زندگی میں شامل نہ ہوتا تو یہ دُنیا کتنی حسین اور خوشیوں سے معمور ہو جاتی!

کچھ دیر ہم دونوں خاموشی سے سفر کرتے رہے۔ یہاں تک کہ شہر کے بارونق حصّے میں پہنچ گئے۔

"کہاں اُتاروں تمہیں؟" عاشی نے انتہائی سرد اور رسمی لہجے میں دریافت کیا۔ مَیں اُس کی بے تکلفی اور بے نیازی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اتنے گہرے دیرینہ رابطے اور تعلق کے بعد دو انسان یوں بھی ایک دوسرے سے دُور اور اجنبی ہوسکتے ہیں؟

"عاشی۔" مَیں نے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔ "کیا تم میرے لیے چند منٹ بھی نہیں نکال سکو گی؟ مَیں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"کہنے کے لیے اب باقی کیا رہ گیا ہے؟" اسکا لہجہ اور آواز برف میں لگا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

"کہنے کے لیے تو بہت کچھ ہے مگر شاید تم سُننے کے لیے تیار نہیں ہو۔ پھر بھی میری درخواست ہے کہ کسی جگہ چل کر چند لمحے میرے ساتھ گزار دو۔"

"اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے یوسف۔" وہ بے رخی سے بولی۔ "اور پھر یہ مت بھولو کہ اب تم ایک شادی شدہ آدمی ہو۔ مجھ سے تمہارا کوئی واسطہ نہیں ہے۔"

"کیا شادی شدہ آدمی کو کسی سے بات کرنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ عاشی۔ مَیں تمہیں گزرے ہوئے لمحوں کا واسطہ دیتا ہوں۔ اُن بیتے ہوئے دِنوں کی قسم جب ہم ایک دوسرے سے نزدیک ترین تھے۔ خدا کے لیے مجھے مایوس نہ کرنا عاشی بلیز۔" میری آواز شدّتِ جذبات سے کانپنے لگی۔ اگر کچھ دیر اور گزر جاتی تو شاید میری آنکھوں سے آنسو جاری ہوجاتے۔

"صرف چند لمحے!؟"

"ٹھیک ہے۔" وہ انتہائی سرد لہجے میں بولی۔ "لیکن یاد رکھو۔ اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے کار کا رُخ ساحلِ سمندر کی طرف موڑ دیا۔

یہ نہایت پُرفضا مقام تھا۔ موسم بھی انتہائی خوشگوار ہو رہا تھا۔ اس نے کار پارک کی اور ہم دونوں کار سے باہر نکلے تو مجھے وہ سماں یاد آگیا جب ایسے ہی ایک مقام پر ہم دونوں دوسری بار ملے تھے۔

"کہیے آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔" اُس نے یخ بستہ آواز میں پُوچھا۔ "میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

خدایا۔ میرے کانوں کو یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ اسی عاشی کی آواز ہے جو کسی زمانے میں میرے لیے رُوح پرور کی ساماں تھی۔

"سنو عاشی۔" مَیں نے اچانک اس کا ہاتھ تھام لیا۔

وہ کانپ کر رہ گئی اور اس نے اپنا ہاتھ یوں کھینچا جیسے اسے بجلی کا کرنٹ لگ گیا ہو۔

"خدا کے لیے عاشی اتنی غیریت کا برتاؤ نہ کرو میرے ساتھ۔" مَیں نے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آواز میں کہا: "اگر تمہیں خدا پر یقین ہے تو اسی کی قسم کھا کر مَیں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جس وقت سے تم مجھ سے جدا ہوئی ہو بخدا کوئی ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گزرا جب مَیں نے تمہیں یاد نہ کیا ہو اور تمہاری تلاش میں سرگرداں نہ رہا ہوں۔"

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ کیا یہ غلط ہے کہ تم نے میرے خطوط کا جواب نہیں دیا۔ میرے ٹیلی گرامز کے جواب میں چپ سادھے رہے؟"

"یہ غلط ہے عاشی۔ یقین کرو یہ جھوٹ ہے۔ مَیں نے تمہیں سینکڑوں خط بھیجے۔ درجنوں ٹیلی گرامز روانہ کیے یہاں تک کہ جب تمہاری طرف سے کوئی رسید نہیں ملی تو مَیں نے اپنے عزیز اور مخلص ترین دوست شوکت کی جان کو خطرے میں ڈال کر تمہیں ڈھونڈنے کے لیے ہندوستان بھیجا۔ تمہارے بتلائے ہوئے پتے پر اس نے تمہاری کھوج لگانے کی کوشش کی مگر تمہاری خبر نہیں ملی۔"

"حیرت انگیز!!" عاشی کی آواز میں پوشیدہ بے یقینی صاف ظاہر ہو رہی تھی۔ اُس نے کہا۔ "اور کیا یہ بھی جھوٹ ہے کہ تم نے دولت کی لالچ میں ایک امیر غیر ملکی لڑکی سے شادی کرلی جس نے تمہیں کاروبار کے لیے سرمایہ دیا اور اس طرح تم نے اپنے آپ کو اس کے ہاتھ فروخت کر دیا۔"

"جھوٹ ہے۔ بخدا یہ جھوٹ ہے۔ صرف اتنا سچ ہے کہ مَیں نے ایک لڑکی سے شادی کرلی جو ہر قیمت پر مجھے حاصل کرنا چاہتی تھی مگر صرف اس وقت جب مَیں تمہاری طرف سے مایوس ہوچکا تھا۔ مگر مَیں نے تمہارے بارے میں اس سے کچھ بھی نہیں چُھپایا۔ وہ جانتی ہے کہ تم ہی میری پہلی اور آخری محبت ہو۔ یہ درست ہے کہ مَیں نے اپنے دوست کے ساتھ مل کر کاروبار شروع کیا ہے جس کے لیے سرمایہ میری بیوی نے فراہم کیا، لیکن مَیں نے اس کے ساتھ کوئی سودا نہیں کیا۔ اگر مجھے تمہارے زندہ سلامت رہنے کا علم ہوتا تو تم سے ملنے کی ایک فیصد بھی آس ہوتی تو مَیں ایسا کبھی نہ کرتا۔ خدا کی قسم مَیں عمر بھر تمہارا انتظار کرسکتا تھا، لیکن مجھے بتایا گیا تھا کہ تم لاپتہ ہو اور تمہیں تلاش کرنا بے سُود ہے۔"

وہ خاموش نظروں سے مجھے گھورتی رہی، لیکن اس کے چہرے پر پیدا ہونے والے تاثرات سے میں یہ اندازہ لگاسکتا تھا کہ اسے میری باتوں پر یقین آنے لگا ہے۔

"عاشی۔ یقین جانو تمہارے بغیر ہر سانس ایک عذاب ہے اور ہر لمحہ اذیت۔ کاش مَیں تمہیں اپنی ذہنی اور دلی کیفیت دکھا سکتا۔"

وہ بدستور اپنی گود میں ہاتھ رکھے خاموش بیٹھی رہی۔ یہ اس کا مخصوص انداز ہے۔ جب وہ کچھ سوچتی ہے تو اسی طرح چپ چاپ بیٹھ جاتی ہے۔ مَیں نے اس کے آگے کچھ اور کہنا مناسب نہیں سمجھا، بلکہ اس کے بعد میرے پاس کہنے کے لیے اور رہ بھی کیا گیا تھا؟ مَیں نے اسے حالِ دل سنا دیا تھا۔ اب مَیں اس کی عدالت میں سر جھکائے فیصلہ سُننے کا منتظر تھا۔

کچھ دیر بعد وہ گویا ہوئی تو اُس کی آواز نہایت مدّھم تھی اور ہلکی سی لرز رہی تھی: "یوسف۔ مَیں اتنا جانتی ہوں کہ تم جھوٹے نہیں ہو۔ چلو مَیں نے تمہاری باتوں کا اعتبار کرلیا۔"

میں خوشی سے بے قابو ہوکر کھڑا ہوگیا۔ "عاشی۔ تو کیا تم نے واقعی مجھے معاف کر دیا ہے۔"

"جب تم نے کوئی قصور ہی نہیں کیا تو معافی کس بات کی؟" وہ ہولے سے بولی "تقدیر نے ہمارے ساتھ عجیب مذاق کیا ہے۔ قصور نہ تمہارا ہے اور نہ میرا۔ پھر بھی ہم دونوں ہی سزا بھگت رہے ہیں۔"

میں فرطِ جوشِ جذبات سے کانپنے لگا۔ الفاظ میرے ذہن سے نکل گئے اور کوشش کے باوجود میرے لبوں سے کوئی آواز نہ نکل سکی۔ عاشی کا یوں اچانک مل جانا اتنا آسان ہوگا اور اس کو اپنے احوال کا قائل کرنا اس سے بھی آسان تر ہوگا یہ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟ ہندوستان سے کب واپس آئیں۔ تمہارے بھائی منصور کا کیا حال ہے؟" میں نے پے در پے کئی سوال کر ڈالے۔

وہ اُداسی سے مسکرا کر بولی "تم نے تو ایک سانس میں بے شمار سوال کر ڈالے۔ میں تو چھ مہینے بعد ہی ہندوستان سے واپس آگئی تھی۔ تم سے ملنے گئی تو تم وہ گھر کیا شہر ہی چھوڑ چکے تھے۔"

"اوہ میں نے کتنی بڑی حماقت کر دی۔ کاش میں کچھ عرصہ اور صبر کرتا اور اپنا گھر اور شہر نہ چھوڑتا۔" مارے تاسف اور پشیمانی کے میرا جی چاہتا تھا کہ اپنا منہ نوچ ڈالوں۔

"جو ہونا تھا ہو چکا۔ قسمت کو یہی منظور تھا۔"

"اتنی جلدی ہار مان گئیں؟" میں نے کہا "قسمت نے ہمیں دوبارہ خلاف توقع ایک دوسرے کے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قسمت دوبارہ ہم پر مہربان ہو گئی ہے!"

"تم ہمیشہ کی طرح خوش فہم ہو۔" وہ غمگین آواز میں بولی۔ "بگڑے ہوئے کام اور ٹوٹے ہوئے رشتے اتنی آسانی سے دوبارہ نہیں بنتے۔"

"نہیں عاشی۔ اگر تم میرا ساتھ دو تو۔۔۔۔"

"شیخ چلی کی طرح مت سوچو۔" اس نے میری بات کاٹ دی اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی "اب ہم دونوں کی راہیں الگ ہو گئی ہیں۔ میں نے بھی حالات سے سمجھوتہ کر لیا ہے۔"

معاً ایک شکستہ تیر کی طرح میرے دل میں پیوست ہو گیا "عاشی!" میں نے بے صبری سے پوچھا "تم نے شادی تو نہیں کر لی؟"

جواب میں وہ خاموش رہی ایک معصوم سی مسکراہٹ اس کے خوبصورت ہونٹوں کے کناروں پر مچل کر رہ گئی۔

"عاشی!!" میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

"سنو یوسف۔ زندگی گزارنے کے کئی طریقے ہیں۔ کئی ڈھنگ ہیں۔ عقلمند لوگ وہی ہوتے ہیں جو حالات سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔"

"نہیں نہیں نہیں" میں بے اختیار چلایا "یہ ظلم ہے۔ ناانصافی ہے۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا!"

وہ آہستہ سے اپنی کار کی طرف چلنے لگی۔ میں نے اس کی پیروی کی۔ یہاں تک کہ ہم کار کے پاس جا کر رک گئے۔ چند لمحے وہ خاموش کھڑی رہی پھر میری طرف دیکھ کر کہنے لگی "یوسف۔ مجھ سے ایک وعدہ کرو۔"

"ایک نہیں۔ ہزار وعدے کرنے کو تیار ہوں۔"

"وعدہ کرو کہ تم مجھے اپنی زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکال دو گے۔"

"عاشی!" میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔

"وعدہ کرو کہ مجھے تلاش کرنے کی کوشش نہیں کرو گے۔ میرا پیچھا نہیں کرو گے۔ اپنی موجودہ زندگی کے ساتھ مصالحت کر لو گے۔"

وفورِ جذبات سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جی چاہا کاش سانس رک جائے۔ دم نکل جائے۔ "اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو میں تم سے ناراض ہو جاؤں گی۔ بولو۔ وعدہ کرو گے نا؟" میں نے نگاہیں اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھا جو آج بھی اتنی رعنائی، شادابی اور دلکشی میں یکتا تھا۔ اُن آنکھوں میں جھانکا۔ جو جھیل سے زیادہ گہری اور خوبصورت تھیں۔

"بولو بولتے کیوں نہیں؟"

"میں وعدہ کرتا ہوں عاشی۔" میری آواز خود میرے کانوں کو بالکل اجنبی لگ رہی تھی "مگر تمہیں بھی مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔"

"کیسا وعدہ؟"

"اگر زندگی کے کسی موڑ پر مجھے تمہاری مدد کی ضرورت پڑی تو تم مجھے مایوس نہیں کرو گی۔"

"اگر تمہیں ضرورت پڑی اور ساری دنیا نے تمہارا ساتھ چھوڑ دیا۔ پھر بھی تم مجھے اپنا ہمدرد پاؤ گے۔" اس نے انتہائی نرم لہجے میں کہا اور پھر اپنی کار کا دروازہ کھول کر کھڑی ہو گئی "یہاں سے تمہیں ٹیکسی مل جائے گی اس لیے خدا حافظ۔ شاید ہم زندگی میں دوبارہ نہ مل سکیں۔" میں ساکت کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے پرس میں ہاتھ ڈال کر ایک کارڈ نکالا جس پر ایک فون نمبر لکھا ہوا تھا "یہ میرا فون نمبر ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ تمہیں اس کے استعمال کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

اس نے کار سٹارٹ کی اور ایک بار پھر میری طرف دیکھے بغیر رخصت ہو گئی۔ میں ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح وہیں کھڑا رہ گیا۔ میری حالت اس بچے کی طرح تھی جس سے اچانک ڈھیر سارے کھلونے دے کر واپس چھین لیے جائیں۔

یکایک کسی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا "ٹیکسی سر!!" میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو وہی ٹیکسی ڈرائیور میرے سامنے کھڑا تھا جو مجھے پرائیوٹ کلب لے گیا تھا۔ مگر اس وقت وہ تنہا نہیں تھا۔ کچھ فاصلے پر تین قد آور غنڈے کھڑے نمبردوں کی طرح مجھے دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں لمبا شکاری چاقو تھا۔

"مجھے بلاوجہ تنگ نہ کرو۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

"تنگ تو تم نے ہمیں کیا ہے۔" وہ یکسر بدلے ہوئے درشت لہجے میں بولا "میڈم نے تمہیں پکڑ کر لانے کا حکم دیا ہے۔ سیدھی طرح چلو گے یا زبردستی کرنی پڑے گی۔"

میں سخت اُکتایا ہوا تھا اور میرے پاس فضول اور فالتو وقت بھی نہیں تھا چنانچہ میں نے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر چھوٹا سا پستول نکال لیا۔ میرے پہلے فائر پر چاقو والے غنڈے کے ہاتھ سے چاقو زمین پر گر گیا اور وہ اپنا زخمی ہاتھ تھام کر رہ گیا۔

دوسرے دو فائر میں نے دونوں غنڈوں کے پیروں کے پاس کیے اور انہیں وہاں سے نو دو گیارہ ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ اس کے بعد میں ٹیکسی ڈرائیور کی طرف متوجہ ہوا جو خوف سے پیلا پڑ چکا تھا۔ مجھ سے نظر ملی تو وہ خوفزدہ نظروں سے دیکھتا ہوا پیچھے ہٹنے لگا۔

"میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔" میں نے گھڑی دیکھی جس میں سات بج رہے تھے "اب تم آ ہی گئے ہو تو مجھے ہوٹل تک پہنچا دو۔"

اس نے بے اعتباری سے میری طرف دیکھا مگر اس کے پاس کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ زخمی غنڈے پر ایک نظر ڈالنے کے بعد اس نے ادب سے ٹیکسی کا دروازہ کھول دیا۔

ساحل سمندر سے ہوٹل تک کا سفر پُرسکون تھا۔ میں نشست کی پشت سے سر لگائے عاشی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں واقعی عاشی سے ملا ہوں۔ اس سے باتیں کی ہیں۔ تمام واقعہ ایک خواب سا لگ رہا تھا۔ عجیب سا لگ رہا تھا۔ عجیب سوتے جاگتے کا عالم تھا۔ ہوٹل پہنچ کر میں نے پچاس روپے کا ایک نوٹ نکال کر ٹیکسی ڈرائیور کے حوالے کیا اور اس کی طرف دیکھے بغیر ہوٹل میں داخل ہو گیا۔

گالوں میں ڈمپل والی لڑکی ابھی تک ڈیوٹی پر موجود تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے میرے کمرے کی چابی میرے حوالے کی اور میں لفٹ کی بجائے سیڑھیوں کے راستے اپنے کمرے کی طرف روانہ ہوا لیکن کمرے کا دروازہ کھولتے ہی میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ کمرے کا سارا سامان بے ترتیب اور الٹا ہوا پڑا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے بہت عجلت میں سامان کی تلاشی لی ہے۔ سوٹ

کیس میں کپڑے اور نقدی موجود تھی۔ مَیں نے یہ جاننے کے لیے ہر طرف نظریں دوڑائیں کہ کوئی چیز غائب تو نہیں ہے۔ آئینے والی میز کے سامنے رکھا ہوا میرا بریف کیس جس میں تمام ضروری کاغذات تھے غائب تھا۔

فون کی اچانک بجنے والی گھنٹی کی آواز سے مَیں چونک کر اُچھل پڑا۔ فون پر دوسری طرف وہی پُراسرار زنانہ آواز تھی "ہیلو"۔ وہ سرگوشی کے لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "سویٹ ہارٹ، تمہارا آٹھ بجے ایک ضروری اپائنٹ منٹ ہے۔ یاد ہے نا؟؟"

"مَیں انجان لوگوں سے ملنا پسند نہیں کرتا۔" مَیں نے غصّے میں جھلّا کر کہا۔ "آخر تم بتاتی کیوں نہیں ہو کہ تم کون ہو؟ اور وہ کون شخص ہے جو ولیسٹ اینڈ روڈ پر مجھ سے ملنا چاہتا ہے؟"

"اچھے بچے ضد نہیں کیا کرتے۔" وہ نیم مزاحیہ انداز میں بولی۔ "یاد رکھو اگر وہاں نہیں پہنچو گے تو پچھتاؤ گے۔" اس کے ساتھ ہی ٹیلی فون کا رابطہ کٹ گیا۔

مَیں حیران کھڑا سوچتا رہ گیا کہ کیا مجھے اس پُراسرار ملاقاتی سے ملنے کے لیے جانا چاہیئے یا نہیں۔؟"

لیکن اس سے پہلے مجھے ایک عدد مسئلہ حل کرنا تھا۔ میرے غائب ہونے والے بریف کیس میں دوسرے ضروری کاغذات کے علاوہ ایگریمنٹ کا ڈرافٹ بھی موجود تھا جسکی نقل شوکت کے پاس بھی نہیں تھی۔ اس ڈرافٹ کی گمشدگی کی صورت میں ملک برکت سے معاہدہ سائن کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ معاہدے پر غور کرنے کے لیے میرے پاس اگلی صبح تک کا وقت تھا۔ اب فی الحال مجھے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ دو سو بارہ ولیسٹ اینڈ روڈ جانا میرے لیے سُود مند ہوگا یا نقصان دہ؟

ایک اَن دیکھے مقام پر کسی مکمل انجان شخص سے ملنے کی ضرورت تو نہیں تھی، لیکن پھر میری مہم جُو اور خطر پسند فطرت نے مجھے اُکسایا اور مَیں نے فون اُٹھا کر استقبالیہ کا نمبر ملایا اور فوری طور پر ایک ٹیکسی طلب کرنے کی ہدایت کی۔ اپنے کھلے ہوئے سُوٹ کیس کو دوبارہ مقفل کر کے مَیں کمرے سے باہر نکل گیا، لیکن یہ بات میرے لیے حیرت انگیز تھی کہ سوٹ کیس میں رکھی ہوئی رقم کو کسی نے ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ تلاشی لینے والے کو روپے پیسے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ کسی اور چیز کی تلاش میں تھا۔ کیا اسے ایگریمنٹ کے کاغذ کی ضرورت تھی۔ لیکن کسی کو اس ایگریمنٹ کے کاغذات سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ یہی سوچتا ہوا مَیں لابی سے گزر کر ٹیکسی تک پہنچ گیا۔

ٹیکسی ڈرائیور

درمیانی عُمر کا ایک دُبلا پتلا آدمی تھا جو دیکھنے میں ایک کاہل اور سست الوجود شخص نظر آتا تھا۔ جب اس نے بڑھ کر میرے لیے ٹیکسی کا دروازہ کھولا تو مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ ایک ایسا شخص ہے جو ہر کام مطمئن ہو کر سکون کے ساتھ کرنے کا عادی ہے اور کوئی بڑی سے بڑی ایمرجنسی بھی اسے تیز رفتار نہیں بنا سکتی۔ اس کی ٹیکسی بھی پُرانے ماڈل کی ایک بیکارڈ کار تھی جو اپنی لمبائی اور چوڑائی کی وجہ سے خاصی بارُعب تھی اور اس کے اندر بیٹھنے کے بعد پتہ چلا کہ اس کی دیکھ بھال بھی کافی سلیقے سے کی گئی تھی۔

"کہاں جانا ہے صاحب؟" ڈرائیور نے سٹیرنگ سنبھالتے ہوئے دریافت کیا۔

"دو سو بارہ ریس کورس روڈ۔"

گاڑی خاصی تیز رفتاری سے ایک جھٹکے کے ساتھ چلنا شروع ہوئی جو ٹیکسی ڈرائیور کے ظاہری حُلیے کے بالکل برعکس تھا۔ بعض اوقات لوگوں کے حُلیے اور شکل و صُورت بھی ان کی اصلیت سے کتنے متضاد ہوتے ہیں۔

"سنو!" مَیں نے ٹیکسی ڈرائیور کو مخاطب کیا۔ "یہ جگہ یہاں سے کتنی دُور ہے؟"

"زیادہ دُور نہیں ہے جناب۔ دس بارہ منٹ کا راستہ ہے۔"

اس کا مطلب یہ تھا کہ مَیں وقتِ مقررہ پر وہاں پہنچ سکتا تھا۔ اگرچہ مَیں ایک انجان اور ان دیکھے مُلاقاتی سے ملنے کے لیے جا رہا تھا لیکن پھر بھی اپنی عادت کے مطابق وقت کی پابندی کرنا چاہتا تھا۔ مَیں نے اپنا سر ٹیکسی کی آرام دہ پچھلی

نشست سے ٹیکا دیا اور ہوٹل میں پیش آنے والے واقعات کے بارے میں سوچنے لگا۔ میرا سامان اپنی جگہ موجود تھا اور بریف کیس کے سوا کوئی اور چیز گم نہیں ہوئی تھی لیکن اوّل تو یہ بات بذاتِ خود تشویشناک تھی کہ کسی کو میرے سامان کی تلاشی لینے کی ضرورت ہی کیوں پیش آئی۔ دوسری قابلِ غور بات یہ تھی کہ میرے بریف کیس کو چوری کرنے سے کوئی شخص کیا حاصل کر سکتا تھا۔ اس میں کاغذات اور معاہدے کے مسوّدے کے علاوہ کوئی اور قابلِ ذکر چیز نہ تھی۔ معاہدہ میرے لیے بہت اہم تھا لیکن کسی دوسرے آدمی کے لیے اس کی کیا اہمیت ہو سکتی تھی؟ بریف کیس میں موجود دوسرے کاغذات بھی کسی اور کے کسی کام کے نہ تھے۔ جو شخص بریف کیس اُٹھا کر لے گیا ممکن ہے وہ اس اُمید پر لے گیا ہو کہ اس کے اندر قیمتی اشیاء اور نقد روپیہ ہوگا لیکن اس کے برعکس میرے سوٹ کیس میں رکھے ہوئے نقد روپے کو اس نے کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ اگر وہ پیسے کا متلاشی ہوتا تو سوٹ کیس سے حاصل ہونے والا نقد روپیہ بھی اس کے لیے کم نہیں تھا گویا جو شخص بھی میرا بریف کیس اُٹھا کر لے گیا تھا وہ لازمی طور پر اس سے کوئی فائدہ یا مقصد حاصل کرنے کا خواہش مند تھا۔

مَیں نے اس تمام واقعے کی اطلاع ہوٹل انتظامیہ کو نہیں دی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوتا کہ لامحالہ پولیس تک بات پہنچتی اور مجھے پولیس کی تفتیش کے باعث اپنے قیام کو طُول دینا پڑتا جس کے لیے میں تیار نہیں تھا۔ اوّل تو گم شدہ بریف کیس کی دستیابی کی ہی سرے سے کوئی اُمید نہ تھی اور اگر بفرضِ محال پولیس یہ بریف کیس حاصل کرنے میں کامیاب ہو بھی جاتی تو اس میں رکھے ہوئے کاغذات ہرگز دستیاب نہ ہوتے۔ یہی سب کچھ سوچ کر مَیں نے بہتر یہی سمجھا کہ ہوٹل انتظامیہ کو اس کیس میں ملوث نہ کروں۔

مَیں بظاہر بہت مطمئن اور پُرسکون نظر آ رہا تھا لیکن میرے ذہن کے اندر ایک ہنگامہ برپا تھا۔ ہوٹل میں پیش آنے والے واقعے کے علاوہ ایک انجان اور گمنام شخص سے مُلاقات کا تصوّر بھی میرے لیے پریشانی اور اُلجھن کا سبب تھا۔ وہ شخص کون ہو سکتا ہے اور کیا اس سے مُلاقات کرنا میرے لیے ضروری تھا؟ کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ مَیں ہوٹل کے کمرے میں آرام کرتا اور شوکت کی آمد کا منتظر رہتا۔ شوکت کی طرف سے بھی مجھے فکر لگی ہوئی تھی لیکن اَب اس میں ایک اور اضافہ ہو گیا تھا۔ شوکت اگر آ بھی جائے تب بھی بریف کیس میں رکھے ہوئے معاہدے کے مسوّدے کی غیر موجودگی میں ہم ملک برکت سے ایگریمنٹ سائن نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ دوبارہ عدالتی کاغذات حاصل کر کے نئے سرے سے معاہدہ لکھا جائے۔ معاہدے میں بعض ایسے اعداد و شمار بھی درج تھے جو مجھے زبانی یاد نہیں تھے۔ گویا معاہدے کی تیاری کے لیے مجھے دوبارہ واپس جا کر اپنے کاغذات کا مطالعہ کرنا پڑتا۔ غرضیکہ ایک عجب گورکھ دھندا تھا جس نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

میری سوچوں کا سلسلہ اس وقت منقطع ہوا جب اچانک ٹیکسی ایک جھٹکے سے رُک گئی۔ ہمارے سامنے ایک بلند و بالا آہنی دروازہ تھا جو اپنی مضبوطی کے اعتبار سے کسی قلعے کا دروازہ لگتا تھا۔ اس سیاہ رنگ کے آہنی دروازے کے پیچھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ رات کی تاریکی نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا اور یوں بھی اتنے اونچے دروازے اور چار دیواری کے ہوتے ہوئے دوسری طرف دیکھنا ممکن نہ تھا۔ کار کے ہارن کے جواب میں ایک طرف چھوٹی سی کھڑکی کھلی اور ایک چوکیدار نے باہر جھانک کر دیکھا۔

"کون ہے؟"

مَیں نے کھڑکی سے باہر سر نکالا اور اسے نزدیک آنے کا اشارہ کیا۔ اس نے انکار میں سر ہلایا اور بولا۔ "ہم کو باہر آنے کا آرڈر نہیں ہے سر۔ آپ اپنا شناخت بتاؤ۔"

مَیں اپنی شناخت کیا بتاتا۔ مجھے تو یہ بھی علم نہیں تھا کہ اس دروازے کے پیچھے کون رہتا ہے نہ مَیں اپنی آمد کا کوئی سبب بیان کر سکتا تھا۔ پھر بھی کچھ نہ کچھ بتانا تو ضروری تھا

"اُن کو بولو امپیریل ہوٹل سے یوسف صاحب آئے ہیں۔" مَیں نے اُونچی آواز میں پکار کر کہا۔ تبھی کھڑکی بند ہو گئی اور دروازہ

پھر تاریکی میں ڈوب گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے بیزاری سے میری طرف دیکھا اور پھر اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیاں چٹخانے میں مصروف ہو گیا۔ چند منٹ خاموشی رہی اور پھر بڑا آہنی دروازہ کسی آواز کے بغیر آہستگی سے کھلنے لگا۔ میں نے ڈرائیور کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا اور ہماری ٹیکسی دروازے کے اندر داخل ہو کر ایک بل کھاتی ہوئی لمبی سی ڈرائیو وے پر چلنے لگی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ آہنی دروازہ دوبارہ بند ہو چکا تھا اور وہاں تاریکی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ ہمارے سامنے بھی تاریکی ہی تھی۔ یہ ایک پختہ راستہ تھا جس کے دونوں طرف باغ تھا اور اونچے اونچے درخت ایستادہ تھے۔ اس سڑک پر روشنی کا کوئی بندوبست نہ تھا۔ ٹیکسی کی روشنی میں ہم اس طویل راستے پر آگے بڑھتے رہے لیکن یہ پُراسرار ماحول اب میرے لیے پریشانی کا سبب بن گیا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور بھی اس ماحول سے خوش نظر نہیں آتا تھا۔ جب کچھ اور نہ سوجھی تو وہ بےتابی سے پوچھنے لگا: "سر ابھی ہمیں کتنی دور اور جانا ہے؟"

"بھائی میں بھی تمہاری طرح پہلی بار یہاں آیا ہوں۔ تم رفتار ذرا تیز کر دو۔ عمارت اب یہاں سے زیادہ دور نہیں ہو گی۔"

اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ ٹیکسی نے ایک موڑ کاٹا اور ہم اچانک مہذب اور بارونق دنیا میں پہنچ گئے۔ ہمارے سامنے ایک پُرشکوہ اور خوبصورت دو منزلہ عمارت تھی جس کے کشادہ برآمدوں میں بجلی کے قمقمے جل رہے تھے۔ برآمدے کے سامنے شاندار پورچ تھا جس میں دو قیمتی کاریں کھڑی ہوئی تھیں۔ پورچ کے سامنے ایک خوشنما لان تھا جسے روشن کرنے کے لیے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر خوشنما دودھیا روشنیاں لگی ہوئی تھیں۔ یہ تمام ماحول بے حد خوابناک اور دلکش تھا اور کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ باہر سے ویران اور بے رونق نظر آنے والی یہ جگہ اندر سے اس قدر دلکش اور نظر فریب ہو گی۔ پورچ کے سامنے ہماری ٹیکسی رُک گئی۔ نہ جانے کہاں سے ایک سفید وردی پوش ملازم برآمد ہوا اور اس نے ٹیکسی کا دروازہ کھول کر مجھے سلام کیا۔ ملازم سمارٹ اور نوجوان شخص تھا اور اس نے سفید وردی کے ساتھ اپنے ہاتھوں میں بھی سفید دستانے پہن رکھے تھے۔

میں نے ٹیکسی سے باہر نکل کر عمارت کا جائزہ لیا۔ یہ ایک قدیم عمارت تھی لیکن اس کی نگہداشت اس طرح کی گئی تھی کہ یہ قدیم طرز کی بالکل نئی تعمیر شدہ عمارت نظر آتی تھی۔ کشادہ اور اونچے اونچے برآمدوں میں بید کے صوفے ترتیب اور قاعدے کے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ ایک طرف اونچی سی سنگھار میز تھی جس پر ٹوپیاں اور کوٹ لٹکائے جا سکتے تھے۔ پہلی نظر میں اس پر کسی نواب یا راجہ کی رہائش گاہ کا گمان گزرتا تھا۔

ابھی میں نے قدم آگے نہیں بڑھایا تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور کی آواز نے میرے اٹھتے ہوئے قدم روک لیے۔

"سر میرے لیے کیا حکم ہے؟" وہ مجھ سے دریافت کر رہا تھا۔ "مجھے فارغ کر دیں گے یا میں آپ کا انتظار کروں؟"

یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب خود مجھے بھی معلوم نہیں تھا۔ میں نے ایک لمحہ توقف کیا۔ یکایک مجھے ایک خیال سوجھا۔ ٹیکسی کا یہاں کھڑا رہنا مناسب نہ تھا اور میں اس دور دراز علاقے میں رات کی تاریکی میں سواری کے لیے کسی دوسرے کا محتاج رہنا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ میں نے کن انکھیوں سے باوردی ملازم کو دیکھا جو تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا مجھ سے کافی آگے جا چکا تھا۔ ٹیکسی کے پاس جا کر سو سو روپے کے پانچ نوٹ میں نے ڈرائیور کے حوالے کیے تو حیرت اور خوشی کے مارے اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"تھینک یو سر۔" اس نے بڑی کوشش سے اپنی آواز نکالی: "مگر....."

"یہ تمہارا کرایہ بھی ہے اور انعام بھی۔" میں نے دبی زبان میں کہا: "تم جاؤ اور بڑے گیٹ سے کچھ فاصلے پر کسی درخت کی آڑ میں ٹیکسی کھڑی کر کے میرا انتظار کرو۔ یہ خیال رہے کہ سڑک پر سے گزرنے والوں کی نظر تمہاری ٹیکسی پر نہ پڑے۔"

"کتنی دیر تک انتظار کروں سر؟" اس نے پوچھا۔

"ہو سکتا ہے تمہیں ساری رات وہاں کھڑا رہنا پڑے۔ میں اس سے پہلے بھی فارغ ہو سکتا ہوں۔ بہرصورت جب

تک میں تمہارے پاس نہ پہنچوں تمہیں میرا انتظار کرنا ہے۔ واپسی پر میں تمہیں اتنی ہی رقم اور دوں گا۔"

اسے مزید لالچ میں مبتلا کرنے کے بعد اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر میں اسے حیران و پریشان کھڑا چھوڑ کر برآمدے کی طرف چل پڑا جہاں وردی پوش ملازم میرا منتظر تھا۔ میرے نزدیک پہنچنے پر اس نے آگے بڑھ کر چوبی دروازہ کھولا اور مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ میں بلا جھجک دروازے میں داخل ہو گیا۔ دروازہ میرے پیچھے بے آواز بند ہو گیا اور ملازم دروازے کے باہر ہی رہ گیا۔ میرے سامنے ایک وسیع اور خوبصورت ہال کمرہ تھا جس کی دیواروں پر قیمتی پینٹنگز اور تصاویر سجی ہوئی تھیں۔ لکڑی کے خوبصورت فرش پر یہاں وہاں قیمتی قالین بچھے ہوئے تھے اور اس ہال کمرے کے فرنیچر کو دیکھ کر قدیم زمانے کی انگریزی فلموں کے سیٹ یاد آ جاتے تھے۔ میں اس عالیشان کمرے کا جائزہ لینے میں مصروف تھا اور کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب مجھے کس طرف جانا ہے۔ میری یہ مشکل ایک بغلی دروازے سے اندر داخل ہونے والی خاتون نے حل کر دی۔ یہ سیاہ لباس میں ملبوس گورے رنگ اور متناسب جسم کی ایک خوش شکل عورت تھی جو سر پر انگریز خادماؤں کی طرح سفید کپڑے کی ٹوپی پہنے ہوئے تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر کوئی تاثر پیدا نہیں ہوا۔ اس نے اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور پھر اس کی مترنم آواز میرے کانوں میں گونجی: "کیا میں مسٹر یوسف سے مخاطب ہوں؟"

"ظاہر ہے۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا: "اتنے کڑے چوکی پہرے کے اندر اور کون داخل ہو سکتا ہے؟"

"میرے ساتھ آئیے۔" اس نے میری شگفتہ گفتگو کا نوٹس لیے بغیر سنجیدگی سے کہا اور میرے آگے آگے چل پڑی۔ اگر اس کمرے میں تیز روشنی نہ ہوتی تو اس عورت پر کسی روح کا گمان گزرتا۔ وہ بالکل بے آواز قدموں کے ساتھ لچکتی ہوئی قیمتی قالینوں پر چل رہی تھی۔ سیاہ لباس اور سفید چہرے کی وجہ سے وہ کوئی پُراسرار آسمانی مخلوق نظر آ رہی تھی۔ اس کا دراز قد اور متناسب جسم سیاہ لباس میں اور زیادہ دلآویز نظر آ رہا تھا۔ اس نے ایک بار بھی مڑ کر پیچھے میری طرف دیکھنے کی تکلیف گوارا نہیں کی۔ طویل کمرے سے گزر کر ہم ایک راہداری میں پہنچے اور ایک مختصر سے زینے پر چڑھنے لگے۔ راہداری کے علاوہ سیڑھیوں کی دیواروں پر بھی قیمتی اور خوبصورت تصاویر آویزاں تھیں جن سے مکان کے مالک کی خوش ذوقی اور امارت کا اظہار ہوتا تھا۔ سیڑھیوں پر ہلکے نیلے رنگ کا قالین بچھا ہوا تھا۔ دس بارہ سیڑھیاں چڑھنے کے بعد وہ بائیں جانب ایک گیلری میں مڑ گئی۔ جو زیادہ کشادہ نہیں تھی لیکن بہت دور تک چلی گئی تھی۔ مگر شکر ہے کہ اس نے مجھے گیلری کے آخری سرے تک لے جانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ گیلری میں تیسرے دروازے کے سامنے پہنچ کر وہ رُکی اور دروازہ کھول کر مجھے اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا۔ میں جھجکتا ہوا اندر داخل ہوا تو وہ میرے ساتھ ہی اندر آ گئی۔ دروازہ دوبارہ بند ہو گیا۔ اب ہم ایک وسیع اور خوبصورت بیڈ روم میں تھے۔ اسے بیڈ روم کہنا صرف اس لیے مناسب تھا کہ ایک جانب بہت کشادہ بیڈ موجود تھا۔ ورنہ اس کمرے کے سائز اور وہاں موجود قیمتی اور بے اندازہ فرنیچر کی موجودگی کی وجہ سے وہ ڈرائنگ روم بھی کہلا سکتا تھا۔ یہ کمرہ بھی قالینوں، پردوں اور تصاویر سے آراستہ تھا۔ کمرے میں صرف دو فرانسیسی طرز کی کھڑکیاں تھیں جن پر فی الوقت سفید باریک پردے پڑے ہوئے تھے۔ اس بیڈ روم کی آرائش جدید طرز کی تھی اور اس میں بیس سے زائد افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ قابلِ ذکر بات یہ تھی کہ بیڈ روم کے ایک گوشے میں کاؤنٹر بنا ہوا تھا جس کے پیچھے سجی ہوئی شراب کی بوتلیں اس بات کا ثبوت تھیں کہ اس جگہ کو بار کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ چھت پر قیمتی جھاڑ اور فانوس لگے ہوئے تھے اور دودھیا روشنی کی وجہ سے کمرے میں ایک عجیب طلسمی ماحول پیدا ہو گیا تھا۔

میں ابھی کمرے کا جائزہ لینے سے فارغ نہیں ہوا تھا کہ میری راہبر نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ وہ انتہائی نرم اور شیریں آواز میں مجھ سے مخاطب تھی۔

"سر، آپ کے آرام کی ہر چیز یہاں موجود ہے اس کے باوجود اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو سامنے بیل موجود ہے۔"

وہ جب مجھ سے مخاطب ہوئی تو پہلی بار اس کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی جو بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی۔

"مجھے صرف ایک چیز کی ضرورت ہے۔" میں نے صوفے میں دھنستے ہوئے کہا۔
"فرمائیے؟"
"اس شخص کی جو مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے اور نہ ہی میں آرام کرنے کے لیے یہاں آیا ہوں۔ شاید تمہیں علم ہو گا کہ میرا یہاں آٹھ بجے ایک اپائنٹ منٹ ہے۔"
"سوری سر۔ میں نہیں جانتی مجھے یہی ہدایت ملی ہے کہ آپ کے آرام کا بندوبست کر دوں۔ اب مجھے اجازت دیجئے۔"
یہ کہکر اس نے سر جھکا کر سلام کیا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ میں تیزی سے صوفے سے اُٹھا اور دروازے پر پہنچ کر اسے کھولنے کی کوشش کی۔ میری توقع کے برعکس دروازہ مقفل نہیں تھا۔ دروازہ کھول کر میں نے باہر گیلری میں جھانکا تو وہاں کوئی بھی موجود نہ تھا۔ اتنے کم وقت میں وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھی۔ میرے سامنے صرف یہی ایک گیلری نہیں تھی۔ چاروں سمتوں میں مختلف گیلریاں تھیں اور متعدد دروازے۔ خدا جانے اس پُراسرار محل نما عمارت میں کتنے کمرے اور کتنی گیلریاں اور راہداریاں تھیں۔ میں کچھ دیر دروازہ کھول کر کھڑا رہا لیکن مجھے کوئی نظر نہ آیا۔ مجبوراً میں نے دوبارہ کمرے میں داخل ہو کر بیڈ روم کا دروازہ بند کر لیا۔ میرے قدم کھڑکیوں کی طرف بڑھے۔ سفید باریک پردوں کے پیچھے ایک خوبصورت لان نظر آ رہا تھا۔ تاریکی کے باعث میں اس کے نقش و نگار دیکھنے سے قاصر تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ یہ بھی عمارت کے باقیماندہ حصوں کی طرح قابلِ دید ہو گا۔ کھڑکی کی بلندی زمین سے زیادہ نہیں تھی۔ میں کھڑا یہ اندازہ لگاتا رہا کہ اگر مجھے اس کھڑکی کے راستے فرار ہونے کی ضرورت پیش آئی تو کیا مجھے زیادہ مشکل پیش آئے گی؟ لیکن کھڑکی کے باہر پہنچنے کے بعد بھی اس قلعہ نما عمارت سے باہر نکلنا کچھ آسان نہ تھا یقیناً اس کی حفاظت کا بھی مناسب بندوبست ہو گا اور خدا جانے کتنے محافظ اس کی نگرانی پر مامور ہوں گے۔
ایک مترنم ہنسی کی آواز نے میرے خیالات کے تسلسل کو توڑ دیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ بار کے کاؤنٹر کے پیچھے ایک خوش جمال عورت کھڑی مسکرا رہی تھی۔ دیکھنے میں وہ غیر ملکی نظر آتی تھی۔ اس کے بال سنہرے اور آنکھیں نیلی تھیں۔ وہ ایک خوشنما مغربی لباس پہنے ہوئے تھی اور اس کے تراشیدہ سنہرے بال اس کے شانوں پر سونے کے تاروں کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھا جو بدستور بند تھا۔ اگر دروازہ کھول کر کوئی اندر داخل ہوتا تو یقیناً مجھے اس کا احساس ہو جاتا لیکن اگر یہ عورت کمرے کے اندر موجود تھی تو مجھے اس کا علم تک نہ ہو سکا تھا۔
وہ میری حیرت کا اندازہ لگا کر محظوظ ہو رہی تھی۔ ایک دلکش مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی تھی اور اس کی نیلی آنکھیں بلور کے ٹکڑوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ میرے منہ سے کوئی لفظ نہیں نکلا لیکن میرے پیر مجھے کشاں کشاں اس کے پاس لے گئے۔
وہ جب مجھ سے مخاطب ہوئی تو اس کا لب و لہجہ خالص دیسی تھا اور اس میں غیر ملکی زبان اور لہجہ کا شائبہ تک نہ تھا۔
"مسٹر یوسف مجھے اپنے سامنے دیکھ کر آپ حیران ہو رہے تھے!"
"ظاہر ہے" میں نے بے تکلفی سے جواب دیا۔
وہ دلکشی سے اپنے بالوں کو جھٹک کر مسکرائی اور الماری سے ایک گلاس اُٹھاتے ہوئے بولی: "آپ کس چیز سے شوق فرمائیں گے۔ آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ اس الماری میں دُنیا بھر کی مشہور و معروف شرابیں موجود ہیں۔"
"جی ہاں۔ بوتلوں کی تعداد سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے لیکن مجھے ان کی اقسام کا علم نہیں ہے۔ شراب کے بارے میں میری معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔"
وہ دوبارہ مسکرائی: "یہاں ہر قسم کی شراب کے ساتھ ان کے بارے میں معلومات بھی پیش کی جاتی ہیں۔ جب آپ یہاں

سے رُخصت ہوں گے تو آپ کی یہ کمی دُور ہو چکی ہو گی۔" یہ کہکر اس نے ایک بوتل اُٹھالی۔
میں نے کہا "شاید آپ بھول رہی ہیں مس کہ میں یہاں شراب نوشی کرنے یا شراب کے بارے میں معلومات حاصل کرنے نہیں آیا ہوں۔ میں ایک معروف اور کاروباری آدمی ہوں۔ میرے پاس زیادہ وقت بھی نہیں ہے۔ مہربانی ہو گی اگر مجھے جلد فارغ کر دیا جائے۔"
"آپ بہت جلدی میں نظر آتے ہیں۔" وہ ایک دلآویز مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھ کر بولی: "لیکن کیا ہمارے مشرقی آداب اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ کسی معزز مہمان کی خاطر مدارات کے بغیر اسے رُخصت کر دیا جائے۔"
"مجھے افسوس ہے کہ میرے پاس ان فضول روایات کے لیے فالتو وقت نہیں ہے۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں میں بہت معروف آدمی ہوں اور ضروری بات چیت کے بعد جلد سے جلد اس جگہ سے رُخصت ہونا چاہتا ہوں۔" پھر میں نے رُک کر اس کے سراپا پر نظر ڈالی۔ وہ ایک شاداب اور تندرست عورت تھی اور دیکھنے میں اس پر کسی مغربی عورت کا گمان گزرتا تھا یا نی دی وے" میں نے اسے مخاطب کر کے کہا "کیا میں پُوچھ سکتا ہوں کہ مجھے یہاں آٹھ بجے بلانے کا مقصد کیا ہے اور کون صاحب مجھ سے ملنا چاہتے ہیں؟"
"ہو سکتا ہے وہ کوئی صاحب نہ ہوں بلکہ صاحبہ ہوں۔" وہ شرارت سے مسکرائی "اور پھر آپ یہ کیوں کر یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ جو کوئی آپ سے مُلاقات کا خواہش مند تھا وہ میں نہیں ہوں۔"
میں اس کے اندازِ گفتگو سے حیران رہ گیا۔ وہ پہیلیوں میں باتیں کر رہی تھی اور خواہ مخواہ بات کو طُول دینا چاہتی تھی۔
"چلیئے۔ مان لیا کہ آپ ہی مجھ سے مُلاقات کے لیے بے تاب تھیں۔ کیا اب آپ مجھے اس مُلاقات کی غرض و غایت بتانا پسند کریں گی۔" "آپ جیسے لوگ مجھے اچھے لگتے ہیں۔ میں کچھ وقت آپ کی کمپنی میں گزارنا چاہتی تھی اور پھر سُنا ہے کہ آپ کی زندگی حوادث اور حیرت انگیز واقعات سے بھری پڑی ہے۔ کیا آپ اپنی کسی مُہم کا قصہ سُنانا پسند کریں گے؟"
میں غصے سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا: "دیکھئے محترمہ، ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ میں یہاں مذاق کا نشانہ بننے کے لیے نہیں آیا ہوں۔ نہ میں کوئی داستان گو ہوں جو قصے کہانیاں سُنا کر اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں نے یہاں آ کر غلطی کی ہے۔ مجھے اجازت دیجئے۔" یہ کہکر میں تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا لیکن جب میں نے دروازہ کھولنا چاہا تو یہ دیکھ کر ٹھٹک کر رہ گیا کہ دروازہ باہر سے مقفل تھا۔ حالانکہ کچھ دیر پہلے میں اسی دروازے کو کھول کر باہر گیلری میں جا چکا تھا۔ میں نے برہمی سے پلٹ کر دیکھا تو وہ بار کے کاؤنٹر پر کھڑی فاتحانہ انداز میں مسکرا رہی تھی۔
"مجھے افسوس ہے مسٹر یوسف" وہ شانے ہلا کر بولی: "میں نے پہلے ہی آپ سے کہا تھا کہ ہمیں مہمان نوازی کا موقعہ دیئے بغیر آپ یہاں سے رُخصت نہیں ہو سکیں گے۔"
"اس کا مطلب کیا ہے۔" میں نے برہمی سے پُوچھا "کیا میں یہاں قیدی ہوں؟"
"ارے ارے۔ آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ آپ اور قیدی؟ یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ تو ہمارے معزز مہمان ہیں۔ اب آپ کچھ دیر کے لیے آرام اور سکون سے بیٹھ کر ہمیں اپنی خاطر تواضع کرنے کا موقعہ دیں۔"
یہ کہکر اس نے ایک بٹن دبایا اور کمرہ گھنٹی کی نقرئی آواز سے گونج اُٹھا۔ ایک باوردی مُلازمہ کمرے میں داخل ہو کر مؤدب کھڑی ہو گئی۔
"مہمان کے لیے کافی لاؤ۔ مگر بہت اچھی۔" اس نے مُلازمہ کو حکم دیا اور وہ خاموشی سے سر جھکا کر چلی گئی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کے پیچھے دروازہ پھر باہر سے مقفل ہو چکا ہو گا۔
بار کے پیچھے کھڑی ہوئی عورت آہستگی سے چلتی ہوئی میرے نزدیک آگئی: "آپ تشریف رکھئے مسٹر یوسف۔ کچھ دیر

بعد آپ یہاں سے جانے کے لیے آزاد ہوں گے۔"

مَیں غصّے کو ضبط کرتے ہوئے دوبارہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہ تھا۔ یکایک مجھے خیال آیا کہ مجھے اپنی حکمتِ عملی میں تبدیلی پیدا کرنی چاہیے۔ اب جبکہ مَیں خود کو ایک محبوس قیدی محسوس کر رہا تھا یہ ضروری تھا کہ مَیں ان لوگوں کو دُرست بنانے کی کوشش کروں۔ مَیں نے صوفے کی پُشت سے ٹیک لگائی اور مُسکرا کر پُوچھا: "حیرت کی بات ہے کہ آپ نے اب تک اپنا نام نہیں بتایا؟"

"آپ نے پُوچھا ہی نہیں تو کیسے بتاتی۔" اس نے برجستہ جواب دیا۔

"چلیئے۔ اَب تو پُوچھ لیا۔" مَیں نے مُسکرا کر کہا۔

"تو چلیئے ہم بھی بتانے دیتے ہیں۔" وہ دلکش انداز میں اُوپر کے ہونٹ کو دانتوں میں دبا کر مُسکرائی: "مجھے صبوحی کہتے ہیں۔" مجھے فقرہ چُست کرنے کا موقعہ مل گیا۔ مَیں نے کہا: "تو پھر صبوحی ہی رہیں۔ رات کے وقت لوگوں کو مخمور بنانے کی کوشش نہ کیا کریں۔"

وہ خاموشی سے مُسکراتی رہی۔

مَیں نے کہا۔ "غالباً آپ کے والدین کو یہ احساس ہوگیا تھا کہ بڑی ہو کر آپ میخانہ بدوش ہو جائیں گی۔ تب ہی تو انھوں نے آپ کا نام صبوحی رکھا۔"

اس نے میری بات کا مطلق بُرا نہیں منایا۔ کہنے لگی۔ "نام تو محض نام ہی ہوتے ہیں مسٹر یوسف۔ ورنہ آپ کے والدین آپ کا نام یوسف نہ رکھتے۔"

"کیوں؟" مَیں نے بُرا ملنے کے انداز میں کہا۔ "کیا کمی ہے مجھ میں۔ صورت شکل سے یوسف نہیں لگتا؟"

"بہت غلط فہمی ہے آپ کو اپنے بارے میں۔" وہ شوخی سے بولی۔ اس اثناء میں دروازہ ایک بار پھر کھلا اور ملازمہ ایک ٹرے میں کافی لے کر اندر داخل ہوئی۔ "میز پر رکھ دو۔" صبوحی نے کہا: "ہم خود بنا لیں گے۔"

ملازمہ کے جانے کے بعد وہ میز کے پاس جا کر کافی بنانے لگی۔ اس طرح کہ اس کی پُشت میری طرف تھی اور کافی کی ٹرے میری نظروں سے اُوجھل ہوگئی تھی۔

"کتنی چینی" اس نے چہرہ گُھما کر میری طرف دیکھا۔

"دو چمچے۔"

"اتنی زیادہ چینی پیتے ہیں۔ شاید اسی لیے اتنی مٹھاس ہے آپ کی باتوں میں۔" وہ میری پیالی میں چینی ڈالتے ہوئے بولی۔

مَیں صوفے سے اُٹھ کر میز کے پاس چلا گیا اور مَیں نے اپنی کافی کی پیالی ہاتھ میں اُٹھا لی۔ اس نے اپنی پیالی میں بھی دو چمچے اُنڈیلے اور مجھے دیکھ کر مسکرانے لگی۔ مَیں گول شیشے کی میز کے پاس قالین ہی پر بیٹھ گیا۔ وہ شرارت سے بولی: "ارے ارے۔ آپ تو قدموں میں ہی بیٹھ گئے۔ مَیں اتنی زیادہ عزّت کی مستحق تو نہیں ہوں۔"

مَیں نے کہا: "ہو سکتا ہے مَیں ٹانگ کھینچنے کے لیے بیٹھا ہوں۔"

وہ زور سے قہقہہ مار کر ہنسی تو اسے اچانک اُچھو ہوگیا۔ پیالی کو میز پر رکھ کر وہ غسل خانے کی طرف لپکی۔ اس موقعے سے فائدہ اُٹھا کر مَیں نے اپنی پیالی اس کی پیالی سے بدل لی۔ یہ بات نہیں کہ مَیں نے اسے پیالی میں کچھ ملاتے ہوئے دیکھ لیا تھا بلکہ مَیں اپنی احتیاط پسند عادت سے مجبور تھا۔ چند لمحے بعد وہ واپس آئی تو اس کا چہرہ سُرخ انار کی طرح ہو رہا تھا۔ اُچھو نے اس کی سُرخ و سفید رنگت کو کچھ اور زیادہ نکھار دیا تھا۔ مَیں اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ ایک خوبصورت اور طرح دار عورت کو اس طرح ضائع ہوتے دیکھ کر مجھے واقعی افسوس ہونے لگا تھا۔ مَیں نے آہستگی سے اپنی کافی کی پیالی

اُٹھائی اور اسے اپنے مُنہ تک لے گیا۔ لیکن پھر مَیں نے چمچہ ہلانے کے بہانے کافی کا گھونٹ لیے بغیر پیالی کو واپس میز پر رکھ دیا۔ میری نگاہیں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں لیکن اس کے چہرے کے تاثرات سے کسی ہیجان یا اضطراب کا اظہار نہیں ہوا۔ یا تو وہ بے گناہ اور معصوم تھی اور یا پھر وہ ایک اعلیٰ درجے کی اداکارہ تھی۔ اس کے طرزِ عمل کے پیشِ نظر اس کے علاوہ کوئی اور رائے قائم نہیں کی جاسکتی تھی۔ وہ مُسکراتی ہوئی قالین پر میرے پاس ہی بیٹھ گئی اور اس نے اپنی پیالی اُٹھا کر ہونٹوں سے لگا لی۔ اس کے چہرے کے تاثر میں کسی قسم کی تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی۔ چند گھونٹ میں اس نے کافی کی پیالی خالی کر دی۔ پھر میری طرف دیکھا اور حیرت سے بولی: "ارے۔ کیا آپ کو کافی پسند نہیں آئی؟"

"یہ بات نہیں ہے۔" مَیں نے بہانہ کیا "مَیں دراصل کافی اور چائے کو ٹھنڈی کر کے پینے کا عادی ہوں۔"

"بہت چالاک ہیں آپ۔" اس نے قالین سے اُٹھنے کی کوشش کی مگر ایک لمبی سی جماہی لے کر دوبارہ بیٹھ گئی۔ میرے دیکھتے دیکھتے اس نے بلّی کی طرح دو تین جماہیاں لیں اور پھر میز پر اپنا سَر رکھ دیا۔ چند لمحے بعد وہ بے خبر سو رہی تھی۔ اس کی سانس کی آمد و رفت بالکل نارمل تھی۔ اس کے تراشے ہوئے سنہرے بال اس کے شانوں اور میز پر پھیلے ہوئے تھے اور وہ اپنے ایک ہاتھ پر اپنا رخسار ٹکائے محوِ خواب تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ کسی سریع الاثر بیہوشی کی دوائی کی برکت تھی جو یقیناً میرے لیے تیار کی گئی تھی۔ اگر مَیں اپنی احتیاط پسندی کے پیشِ نظر کافی کی پیالیاں نہ بدل لیتا تو اس وقت اس کی جگہ میں میز پر سَر رکھے سویا ہوتا لیکن وہ مجھے بے ہوش کیوں کرنا چاہتی تھی! اور وہ کون شخص تھا جس نے مجھے محض بیہوشی کی دوا پلانے کے لیے یہاں مدعو کیا تھا؟ مجھے بیہوش کرنے سے اسے کیا حاصل ہو سکتا تھا؟ یہ سوالات میرے ذہن میں کُلبلا رہے تھے لیکن مَیں ان کا جواب نہیں پا سکا تھا۔

کمرے میں مکمل خاموشی تھی۔ مَیں دبے پیر دروازے کی طرف گیا اور دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر وہ باہر سے مقفل تھا۔ کھڑکی کا جائزہ مَیں پہلے ہی لے چکا تھا۔ یہ کھڑکی زمین سے زیادہ اُونچائی پر نہ تھی اور کھڑکی سے باہر کُودنا بھی دُشوار نہیں تھا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ اس پُر اسرار محل نما مکان کے باہر اور کون کون سی قیامتیں میری منتظر تھیں؟ اور کیا مَیں اتنی آسانی سے اس محل نما زنداں سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو سکتا تھا!

ابھی مَیں کھڑکی کے نزدیک کھڑا سوچ ہی رہا تھا کہ ایک آہٹ نے مجھے چونکا دیا۔ مَیں لپک کر بار کاؤنٹر کے نزدیک پہنچ گیا۔ بار کے عقبی حصّے کی دیوار کھسکتی ہوئی نظر آئی اور وہاں ایک چھوٹا سا دروازہ نمودار ہوگیا۔ گویا یہی وہ دروازہ تھا جس میں سے صبوحی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ میرے لیے حرکت کرنے کا موقعہ باقی نہیں رہا تھا اس لیے مَیں نے دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑا ہونے میں ہی عافیت جانی۔ دروازے کے اندر پہلے ایک مردانہ سَر نمودار ہوا اور پھر ایک ہٹا کٹا مرد اس میں داخل ہوا۔ وہ مسلح تھا۔ اس نے ہاتھ میں ایک پستول تھام رکھی تھی۔ کمرے میں داخل ہو کر اس کی نظر سب سے پہلے سامنے والی میز پر پڑی جس پر سَر رکھے ہوئے صبوحی مدہوش پڑی ہوئی تھی۔ صبوحی کو اس عالم میں دیکھ کر وہ بے اختیار آگے بڑھا اور اس نے کسی اور طرف دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ اگر وہ گردن موڑ کر دیکھ لیتا تو تھوڑے ہی فاصلے پر مَیں اسے تنہا اور بے سہارا کھڑا ہوا نظر آجاتا۔ لیکن اس کی تمام تر توجہ صبوحی کی طرف مبذول تھی اور یہ میرے لیے ایک نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہ تھا۔ وہ اپنی جسامت کے اعتبار سے کہیں زیادہ پھرتیلا اور چُست تھا۔ کسی سپرنگ دار گیند کی طرح اُچھلتا ہوا وہ صبوحی کے نزدیک جا پہنچا اور جُھک کر اس کو دیکھنے لگا۔ یہی موقعہ تھا جس کی مجھے تلاش تھی۔ مَیں نے ہوا میں چھلانگ لگائی اور جس وقت اسے میری موجودگی کا احساس ہوا مَیں اس کے بالکل نزدیک پہنچ چُکا تھا۔ مَیں نے اسے پلٹنے کی مُہلت نہیں دی۔ میرے کھڑے ہاتھ کی ضرب اس کی گردن پر لگی اور وہ ڈھیر ہوگیا۔ مَیں نے تیزی سے مُڑ کر اس دروازے کی جانب دیکھا جس میں سے وہ کمرے میں داخل ہوا تھا۔ دروازے میں کوئی اور نہیں تھا لیکن اس دروازے کے راستے میرا باہر جانا کسی طرح بھی قرینِ عقل نہ تھا۔ یہ راستہ یقیناً ان لوگوں کے جمگھٹے تک جاتا ہوگا اور میرا اس راستے سے باہر جانا کسی طرح بھی سودمند ثابت

نہیں ہوسکتا تھا۔ مَیں لپک کر دروازے کی طرف گیا اور مَیں نے دروازہ بند کر دیا۔ تلاش کرنے پر پچھلے حصے میں مجھے ایک کھٹکا بھی نظر آگیا جسے لاک کرنے سے یہ دروازہ اندر سے بند ہوسکتا تھا۔ مَیں فی الحال کسی اور نووارد کی آمد کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا اس لیے دروازہ بند کرنے کے بعد مَیں بے ہوش آدمی کے پاس پہنچا اور اس کا پستول اپنے قبضے میں کر لیا۔ یہ پستول بھرا ہوا تھا اور بوقتِ ضرورت میرے لیے مددگار ثابت ہوسکتا تھا۔

مَیں صبوحی کے پاس ہی فرش پر بیٹھ گیا اور اپنے فرار کے منصوبے پر غور کرنا شروع کر دیا۔ یکایک مجھے ایک ترکیب سُوجھی۔ مَیں نے برقی گھنٹی کا بٹن دبایا۔ کہیں دُور نقرئی گھنٹیاں بجنی شروع ہوگئیں۔ کچھ دیر بعد کمرے کا مین دروازہ کھُلا اور سیاہ چست لباس میں ملبوس خادمہ اندر داخل ہوئی۔ اس نے کمرے کا جائزہ لیا مگر جب اس کی نظر مجھ پر اور میرے پستول پر پڑی تو حیرت اور خوف سے اس کا سانس رُک گیا۔ مَیں نے اس کے مُنہ پر احتیاطاً ہاتھ رکھ دیا تاکہ وہ چیخ مار کر سب کو ہوشیار نہ کر دے۔ اس نے ذرا بھی جدوجہد نہیں کی۔ دروازے کو اندر سے لاک کرنے کے بعد مَیں نے اس کا جائزہ لیا۔ وہ خوفزدہ نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"سَر" وہ ڈرتے ڈرتے بولی۔ "آپ مجھ سے ناراض کیوں ہوگئے؟"

مَیں نے اس کے مُنہ پر سے ہاتھ اُٹھا لیا۔ "ابھی تو ناراض نہیں ہوں لیکن اگر تم نے آواز نکالی یا کوئی چالاکی کی تو میری یہ ناراضگی کا اظہار کرنے کے لیے کافی ہے۔"

وہ پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے چُپ چاپ دیکھتی رہی۔

"یہ بتاؤ کہ حفاظت اور اطمینان کے ساتھ اس گھر سے باہر جانے کا راستہ کون سا ہے اور مَیں اس عمارت کی چار دیواری کے باہر کیسے جاسکتا ہوں؟"

وہ مجھے یوں دیکھ رہی تھی جیسے اسے میری دماغی حالت پر شک ہو۔ مَیں نے پستول کی نالی اس کی پسلیوں میں چبھو دی تو وہ اُچھل پڑی۔ "جلدی بولو۔ مَیں باہر جانا چاہتا ہوں۔ مَیں ایسا راستہ چاہتا ہوں جہاں کسی کی نظر مجھ پر نہ پڑ سکے۔"

"آیئے میرے ساتھ" وہ دبی زبان میں بولی اور مَیں اس کی متوالی چال دیکھتا ہوا اس کے پیچھے چل پڑا۔ اس نے دروازے کا لاک کھولنا چاہا تو مَیں نے اسے روک دیا۔ "یہ کیا کرتی ہو۔ باہر خطرہ ہے۔"

"باہر اس طرف کوئی نہیں ہے سَر" اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ "مجھ پر بھروسہ رکھئے اور میرے ساتھ آیئے۔"

مَیں نے اس کے چہرے اور آنکھوں میں سچائی کی تحریر پڑھ لی تھی۔ اس لیے خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑا۔ دروازے سے باہر نکل کر ہم گیلری میں پہنچے اور وہاں سے زینہ اُتر کر بڑے ہال کی طرف جانے لگے۔ ابھی تک ہمارا کسی اور سے سامنا نہیں ہوا تھا لیکن مَیں ہر لمحہ ہوشیار تھا۔ اچانک جنوبی سمت کا ایک دروازہ کھُلا اور مجھے اتنی مُہلت بھی نہ مل سکی کہ چھُپنے کی جگہ تلاش کرتا۔ میرے قدم اسی جگہ ٹھٹک کر رہ گئے اور پستول پر میری گرفت مضبوط ہوگئی۔ دروازے سے اندر آنے والا ایک تنومند اور جسیم محافظ تھا جو ہتھیاروں میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کی کمر میں دو پستول لٹک رہے تھے۔ ہاتھ میں سٹین گن تھی۔ پتلون کی پیٹی میں دو دستی بم بھی مجھے نظر آگئے تھے۔ اس شخص نے مجھے اور خادمہ کو دیکھا اور نظریں جھکالیں پھر وہ ادب سے سر جھکا کر سامنے والے ایک دروازے میں غائب ہوگیا۔ ایک لمحہ کے لیے میرے قدموں اور ہاتھ پیروں نے میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ میرے ہاتھ پیر بالکل بے جان اور سرد ہوگئے تھے۔ اگر وہ شخص گڑبڑ پر آمادہ ہوجاتا تو میرے لیے جان بچانے کی گنجائش بہت کم تھی۔ لیکن وہ مجھے نظر انداز کر کے یوں گزر گیا جیسے اس نے مجھے دیکھا ہی نہیں ہے۔ اس کا یہ رویہ میرے لیے حیرانی کا باعث تھا لیکن خادمہ نے مجھے مزید غور کرنے کی مُہلت نہیں دی اور مجھے ادب سے اشارہ کر کے دوبارہ میرے آگے آگے چلنے لگی۔ دو تین کمروں اور گیلریوں سے گزرنے کے بعد ہم بڑے برآمدے میں آگئے۔ یہ وہی برآمدہ تھا جس کے سامنے کچھ دیر پہلے دو تین قیمتی کاریں کھڑی ہوئی تھیں۔ اس وقت وہاں صرف ایک کار موجود تھی۔ چوکیدار قسم

کی کوئی چیز آس پاس موجود نہ تھی۔ خادمہ نے مجھے کار کے پاس پہنچا کر چھوڑ دیا اور خود پلٹ کر واپس جانے لگی۔

"رُک جاؤ۔" میں نے اسے پستول کی زد میں لے لیا۔ "تم ابھی نہیں جا سکتیں جب تک کہ میں گھر سے باہر نہ پہنچ جاؤں۔"

اتنا کہہ کر میں نے اسے کار میں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی سٹیرنگ سنبھال کر بیٹھ گیا۔ چابی کار کے اندر ہی لگی ہوئی تھی۔ خادمہ کسی پس و پیش کے بغیر کار کی اگلی سیٹ پر براجمان ہو گئی تھی۔ اس کا پُرسکون اور مطمئن انداز میرے لیے حیرت کا باعث تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ مجھ سے قطعاً خوف زدہ نہیں ہے۔ اس کے چہرے سے حیرانی کا اظہار ہو رہا تھا۔ میں نے ابھی گاڑی سٹارٹ بھی نہیں کی تھی کہ برآمدے میں ایک دروازہ کھلا اور بٹلر نما ملازم نکل کر باہر آیا۔ وہ سیدھا کار کی طرف آیا۔

میں اس موقعہ پر کسی کی مداخلت اور کسی بھی قسم کی تاخیر برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے میں نے کار سٹارٹ کر کے تیزی سے آگے بڑھائی۔ بٹلر کار کے نزدیک آ چکا تھا لیکن میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر اس نے میری راہ میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی تو میں بلا دریغ اس پر کار چڑھا دوں گا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن جب کار تیزی سے اس کی طرف بڑھی تو وہ خوفزدہ ہو گیا اور کُود کر ایک طرف ہٹ گیا۔ اگر اس نے چند لمحے کی بھی تاخیر کر دی ہوتی تو وہ یقیناً کار کی زد میں آ جاتا لیکن اس نے مجھے روکنے یا شور مچانے کی کوشش بالکل نہیں کی۔ بلکہ حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔

کار تیزی سے مین گیٹ کی طرف جا رہی تھی اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر چوکیدار نے دروازہ کھولنے میں پس و پیش کیا تو میں اس کے ساتھ کیا سلوک کروں گا؟ چوکیدار پُوری طرح مسلح تھا اور اسے راستے سے ہٹانے کے لیے پستول کا استعمال ضروری تھا لیکن جب کار مین گیٹ کے نزدیک پہنچی تو میں نے چوکیدار کو دیکھا جو جھانک کر کار میں سوار مسافروں کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے ہم دونوں کو دیکھنے کے بعد کسی تاخیر کے بغیر خاموشی سے دروازہ کھول دیا۔ یہ مرحلہ اتنا آسان ہو جائے گا میں نے سوچا بھی نہ تھا۔ شاید یہ میرے برابر بیٹھی ہوئی خادمہ کی موجودگی کی برکت تھی کہ بٹلر اور چوکیدار دونوں نے بلا روک ٹوک ہمیں جانے کی اجازت دے دی تھی۔ مین گیٹ سے باہر پہنچ کر میں نے ایک دم کار کی رفتار میں اضافہ کر دیا۔ لیکن سامنے سے آنے والی کاروں کی تیز روشنیوں کو دیکھ کر مجھے رُک جانا پڑا۔ میں نے احتیاط کے طور پر اُب تک کار کی روشنیاں نہیں جلائی تھیں اور یہ میرے لیے سودمند ثابت ہوا۔ میں نے تیزی سے کار کو ایک طرف موڑ کر سڑک سے نیچے اُتارا اور درختوں کی آڑ میں کھڑا کر دیا۔ پستول پر میری گرفت اور زیادہ مضبوط ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے خادمہ کو وارننگ دینا بھی ضروری سمجھا۔ "دیکھو۔ کان کھول کر سُن لو۔ اگر تم نے ذرا بھی حرکت کی یا آواز نکالنے کی کوشش کی تو تمہاری جان کی خیر نہیں ہے۔"

خادمہ نے بڑی بڑی حیران آنکھوں سے مجھے دیکھا اور اثبات میں سَر ہلا دیا۔ کچھ دیر بعد سامنے سڑک پر سے دو پولیس کاریں تیزی سے گزریں اور اس عمارت کی طرف غائب ہو گئیں جہاں سے میں ابھی آیا تھا۔ پولیس کا اس پُرسکون اور پُر شوکت محل نما مکان میں کیا کام ہو سکتا تھا اور اسے کس نے اور کس غرض سے طلب کیا تھا؟ یہ سوچنا ضروری تھا لیکن میں وقت ضائع کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اس لیے اپنی کار کو اسی جگہ چھوڑ کر میں باہر نکلا۔ میں نے کار کے ایک پہیے کی ہوا نکال دی اور پھر خادمہ سے مخاطب ہوا۔ "جب تک میں دوبارہ نہ آؤں تم خاموشی سے اسی جگہ بیٹھی رہنا۔ اگر میری ہدایت کی خلاف ورزی کی تو تم کو اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ سمجھ گئیں۔"

"جی سَر۔" وہ سَر ہلا کر بولی۔ "لیکن سَر یہ آپ کیا کر رہے ہیں اور......"

"بکواس مت کرو۔" میں نے اسے ڈانٹا اور وہ سہم کر رہ گئی۔ میں نے پستول ہاتھ میں مضبوطی سے تھام لیا اور تیزی سے سڑک کے کنارے اس طرف بڑھا جہاں میری ہدایت کے مطابق ٹیکسی کو ہونا چاہیے تھا۔ ایک بار یہ خیال بھی آیا کہ ہو سکتا ہے اس ٹیکسی ڈرائیور نے میری بات کو اہمیت نہ دی ہو اور واپس چلا گیا ہو۔ ایسی صورت میں عقلمندی کا تقاضا یہی تھا کہ میں کار کو استعمال کروں لیکن پولیس کو دیکھ کر میں نے اس فیصلے پر نظرِ ثانی کر ڈالی۔ پولیس چوری کی کار کو تلاش کرتی ہوئی

میرے تعاقب میں آ سکتی تھی جب کہ ٹیکسی میں سوار ہونے کی صورت میں میرے پولیس کی نظروں میں آنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ چنانچہ میں نے یہ رِسک لینے کو ترجیح دی۔ کار سے کچھ فاصلے پر پہنچنے کے بعد میں نے بھاگنا شروع کر دیا۔ میں ذرا سا بھی وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ زیادہ دُور نہیں گیا تھا جب میری تیز نظروں نے ایک طرف درختوں کی اوٹ میں کھڑی ہوئی ٹیکسی کو دیکھا اور میں خوش ہو کر ٹیکسی کی طرف بڑھا۔ ٹیکسی اندھیرے میں کھڑی ہوئی تھی اور سڑک پر سے گزرنے والوں کے لیے اس کو دیکھنا قریب قریب ناممکن تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور تمام شیشے چڑھائے ہوئے گہری نیند سو رہا تھا۔ اس کو جگانے کے لیے مجھے زور زور سے شیشوں پر دستک دینی پڑی۔ وہ گھبرا کر بیدار ہو گیا مگر جب ہوش و حواس بحال ہوئے اور مجھے دیکھا تو اس نے مسکرا کر پچھلا دروازہ کھول دیا۔

"فوراً۔ بہت تیزی سے ہوٹل واپس چلو۔" میں نے پچھلے شیشے میں سے جھانکتے ہوئے اسے ہدایت دی اور وہ دوسرے ہی لمحے ہَوا ہو گیا۔ شاید وہ بھی اَب میری پُراسرار حرکات سے لطف اندوز ہونے لگا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ٹیکسی چلاتے ہوئے اس کے چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ رقصاں تھی۔

میں بار بار مُڑ کر پیچھے دیکھتا رہا مجھے ڈر تھا کہ کہیں پولیس کی کار ہمارے تعاقب میں نہ آ رہی ہو لیکن یہ معمّہ ابھی تک میری فہم سے باہر تھا کہ آخر پولیس کو کس نے طلب کیا تھا اور اس کا مقصد کیا تھا؟ ہو سکتا ہے کہ گھریلو ملازموں یا بٹلر نے پولیس کو فون کر کے بُلایا ہو مگر اتنے کم وقت میں پولیس کا وہاں پہنچ جانا بھی کسی معجزے سے کم نہ تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہم غیر آباد اور ویران راستوں سے گزر کر شہر کے بارونق نواح میں داخل ہو گئے۔ ایک ریسٹورنٹ کی چمکتی ہوئی روشنی دیکھ کر میں نے ٹیکسی روکنے کی ہدایت کی اور ریسٹورنٹ کے اندر چلا گیا۔ مجھے گرم چائے یا کافی کی شدید طلب محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے علاوہ ہوٹل میں براہِ راست پہنچنے سے پہلے میں یہ بھی معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہاں جانے میں میرے لیے کوئی خطرہ تو نہیں ہے! پہلی ہی بَل پر ڈیسک والی لڑکی نے فون اُٹھا لیا۔ "ہیلو ہوٹل امپیریل۔" میں نے اپنا تعارف کرایا اور پُوچھا کہ کوئی مجھ سے ملنے تو نہیں آیا۔

وہ کھنکتی ہوئی آواز میں بولی۔ "سَر ہوٹل سے آپ کے چیک آؤٹ ہونے کے بعد کوئی آپ سے ملنے نہیں آیا۔ نہ کوئی فون آیا۔"

"چیک آؤٹ سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

وہ ہنس پڑی۔ "چیک آؤٹ سے کیا مطلب ہو سکتا ہے سَر۔ آپ کے دوست آپ کا بل ادا کر کے آپ کا سامان لے گئے تھے۔ میں نے آپ کو باہر کار میں بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ آپ کم از کم خدا حافظ کہنے ضرور آئیں گے مگر شاید آپ جلدی میں تھے۔"

اس کی شوخ آواز میں شکایت تھی لیکن اس وقت اس کی شکایت سے مجھے کوئی سروکار نہ تھا۔ میرے لیے یہ خبر بہت اہم تھی کہ کوئی شخص میرا دوست بن کر ہوٹل سے میرا سامان لے کر رخصت ہو گیا تھا اور وہ ہوٹل والوں کو یہ تاثر دینے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ میں بذاتِ خود باہر کار میں موجود ہوں لیکن وہ کون شخص ہو سکتا ہے؟ کیا یہ وہی آدمی ہے جس نے ہوٹل میں میرے کمرے کی تلاشی لی تھی اور میرا بریف کیس لے کر رخصت ہو گیا تھا۔ یا یہ کوئی دوسرا کیریکٹر تھا؟ لیکن کسی شخص کو ہوٹل سے میرا سامان لے جانے کی کیا ضرورت ہو سکتی تھی۔ سوٹ کیس میں کچھ رقم موجود ضرور تھی لیکن اس رقم کی خاطر کوئی شخص اتنا بڑا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

"ہیلو سَر۔ آر یو آن دی لائن؟" لڑکی کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"ہاں ہاں۔ آف کورس۔" میں نے چونک کر جواب دیا۔

"میں سمجھی تھی آپ نے فون بند کر دیا۔ اگر ہم لوگوں سے کوئی شکایت ہے تو ہمیں معاف کر دیں سَر۔ اگلی بار ہم آپ کی شکایت

دُور کرنے کی کوشش کریں گے۔" وہ کھنکھناتی ہوئی آواز میں مجھ سے مخاطب تھی۔
"اوہ نہیں۔ بالکل نہیں۔ شکایت کی کوئی بات نہیں ہے۔ دراصل مجھے فوری طور پر واپس جانا پڑ رہا ہے اس لیے ....."
"آپ کے دوست نے بھی یہی کہا تھا سَر۔ ان کے ہاتھ میں تو رات کی فلائیٹ کے ٹکٹس بھی تھے۔"
میرا دوست؟ فلائٹ کے ٹکٹس!! میرے فوری واپس جانے کا بہانہ؟! میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ بہرحال، رسمی گفتگو کے بعد میں نے ٹیلی فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ وہ لڑکی مجھ سے خاصی بے تکلف ہو کر باتیں کر رہی تھی لیکن میرا ذہن کسی اور گورکھ دھندے میں اُلجھا ہوا تھا۔

فون بند کرنے کے بعد میں نے کافی کا آرڈر دیا اور گذشتہ چند گھنٹوں میں پیش آنے والے واقعات کے بارے میں سوچنے لگا۔ شوکت کا وقتِ مقررہ پر نہ پہنچنا۔ ہوٹل میں میرے کمرے کی تلاشی اور بریف کیس کا غائب ہو جانا۔ پُراسرار ٹیلی فون کال اور اس پُراسرار محل نما مکان میں جانے کی دعوت۔ اُس گھر میں مجھے کافی میں ڈال کر بیہوشی کی دوا پلانے کی کوشش اور پھر ہوٹل سے میرے دوست کے بہروپ میں کسی کا میرا سامان لے کر چلا جانا۔ یہ سب مسائل غور طلب تھے لیکن باوجود کوشش کے میرا ذہن ان کا کوئی حل تلاش کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ ان میں سے کسی سوال کا بھی میرے ذہن کے پاس جواب نہیں تھا۔ گرم کافی کی دوسری پیالی پینے کے بعد بھی میرا ذہن رواں نہیں ہوا تو میں نے سوچنے کی کوشش ہی بند کر دی۔

ٹیکسی والا کاہلی کے ساتھ میرا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے دیکھا تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ مجھے نہ جانے کس قسم کا آدمی سمجھ رہا تھا۔ ہو سکتا ہے میں اس کے خیال میں کوئی سی۔آئی۔ڈی افسر تھا یا پھر کوئی جرائم پیشہ شخص کیونکہ میرا تمام برتاؤ پُراسرار اور غیر معمولی تھا۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر پانچ سو روپے نکالے اور اس کی طرف بڑھا دیئے۔

"تھینک یو سَر" وہ خوش ہو کر چہکا: "اب میرے لیے کیا حکم ہے؟" اتنی معقول رقم وصول کرنے کے بعد وہ میرے لیے ہر خدمت بجا لانے کو کمربستہ نظر آ رہا تھا۔
"مجھے کسی ہوٹل میں چھوڑ دو۔" میں نے پُرسکون آواز میں کہا
"مگر سَر۔ آپ کا وہ ہوٹل۔"
"فضول سوالات مت کرو۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی: "تمہیں کس نے بتایا کہ میں اُس ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں؟"
وہ بوکھلا گیا: "کسی نے بھی نہیں سَر۔ یوں ہی میرا خیال تھا۔"
"اپنے خیالات اپنے پاس رکھو اور مجھے کسی درمیانے درجے کے ہوٹل میں پہنچا دو!" میں نے ڈانٹ کر کہا۔
"بہتر ہے سَر۔" وہ مؤدب ہو کر بولا۔

اور ہم نے دوبارہ آبادی کی طرف سفر شروع کر دیا۔ یکایک دو کاریں نہایت تیزی کے ساتھ برابر سے گزریں اور اچانک ہماری ٹیکسی کے سامنے پہنچ کر رُک گئیں۔ اگر ٹیکسی کی رفتار کم نہ ہوتی اور ڈرائیور پُوری طرح چوکنا نہ ہوتا تو ہماری ٹیکسی یقیناً کاروں سے ٹکرا جاتی۔ میں نے غصے سے جھانک کر باہر دیکھا۔ کاروں میں سے چار انتہائی تنومند اور طاقت ور آدمی باہر نکلے اور تیزی سے ٹیکسی کی طرف آئے۔ ان میں سے دو کے پاس پستول اور ایک کے پاس سٹین گن تھی۔
"باہر نکلو" ان میں سے ایک نے دُرشت لہجے میں کہا "جلدی کرو۔"
میرا ایک ہاتھ جیب میں رکھے ہوئے پستول کی طرف بڑھنے لگا لیکن پھر میں نے ارادہ بدل دیا۔ سٹین گن کی نالی میرے چہرے سے محض چند فٹ کے فاصلے پر تھی اور میری ذرا سی حرکت بھی اس خونخوار درندے کو مشتعل کر سکتی تھی۔ ایسی صورت میں میرے بچنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔
ٹیکسی ڈرائیور سہم کر دُبکا ہوا بیٹھا تھا۔ میں چُپ چاپ ٹیکسی سے باہر نکل کر کھڑا ہو گیا اور اس کے اشارے پر

خاموشی سے ایک کار کی طرف چل پڑا۔ مجھے اس نے کار میں بیٹھنے کا حکم دیا اور میں نے اس کی تعمیل میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کیا۔ میرے بیٹھنے کے فوراً بعد سٹین گن والا میرے برابر بیٹھ گیا لیکن اس طرح کہ اس نے سٹین گن اپنے گھٹنوں پر رکھ لی اور جیب سے ایک پستول نکال کر میرے پہلو سے لگا دیا۔ دوسرا پہلوان نما آدمی بھی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا تو تیسرے نے کار کا سٹیرنگ سنبھالا اور ہماری کار تیزی سے چل پڑی۔ چوتھے آدمی نے دوسری کار میں ہمارا تعاقب شروع کر دیا۔ میں چُپ چاپ بیٹھا اس نئی آفتِ ناگہانی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ یہ لوگ کون ہو سکتے ہیں اور انھیں میری ضرورت کیوں پیش آ گئی؟ وہ تینوں بالکل خاموش پتھر کے بتوں کی طرح بیٹھے ہوئے تھے
"آپ کے پاس سگریٹ ہو گی؟" میں نے اپنے برابر والے سے پُوچھا۔
اس نے انکار میں سَر ہلا دیا۔ باقی دو بالکل خاموش رہے۔ انھیں مخاطب کرنے کے لیے میری پہلی کوشش ناکام ہو گئی۔
"تم لوگ مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟" میں نے دوبارہ گفتگو کا سلسلہ چھیڑنے کی کوشش کی لیکن اس بار بھی کسی نے جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ کار کی رفتار خاصی تیز تھی اور اگر میں کسی طرح کار کا دروازہ کھول کر چلتی گاڑی سے باہر کودنے میں کامیاب ہو بھی جاتا تب بھی میرے شدید زخمی ہونے کا امکان تھا اور بفرضِ محال اگر کوئی معجزہ مجھے زخمی ہونے سے بچا لیتا پھر بھی پیچھے آنے والی کار سے بچ نکلنا خاصا دشوار بلکہ ناممکن نظر آتا تھا۔ میں ان لوگوں کو باتوں میں لگا کر ان سے کچھ نہ کچھ معلومات حاصل کرنے کی فکر میں تھا اس لیے کہ اب تک میں اس کارروائی کے بارے میں کچھ بھی نہیں جان سکا تھا اور نہ مجھے یہ معلوم ہو سکا تھا کہ آخر وہ کون لوگ ہیں جو مجھے زبردستی اغوا کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اس حرکت کا سبب جاننا بھی میرے لیے ضروری تھا۔
"دیکھو بھائی" میں نے ایک بار پھر اپنے پاس بیٹھے ہوئے آدمی کو مخاطب کیا: "معلوم ہوتا ہے کہ تم لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں اس شہر میں بالکل اجنبی ہوں۔ میں یہاں کسی سے واقف نہیں ہوں۔ نہ کسی سے میری دوستی ہے اور نہ دشمنی۔ شاید تم نے مجھے کسی اور کے دھوکے میں پکڑ لیا ہے۔"
اتنی لمبی تقریر کے جواب میں بھی خاموشی کے سوا مجھے کچھ اور نہ ملا۔ فی الحال ان کے چُنگل سے نکلنے کے تمام راستے مسدود نظر آ رہے تھے اور مجھے فرار کی کوئی راہ نہیں سُوجھ سکی تھی۔ میں نے ذرا آگے کو جُھک کر یہ ٹوہ لگانے کی کوشش کی کہ پستول کی نالی سے میں کس حد تک محفوظ رہ سکتا ہوں۔ میرے حرکت کرتے ہی میرے برابر بیٹھے ہوئے ڈراؤنی شکل کے آدمی نے اپنے دوسرے ہاتھ کو حرکت دیئے بغیر اپنی کہنی میرے پیٹ میں ماری اور یہ ضرب اتنی شدید تھی کہ تکلیف سے دوہرا ہو گیا۔ میں نے ایک تکلیف دہ آہ کو بہت مُشکل سے اپنے ہونٹوں سے خارج ہونے سے روکا۔ میں ان پر اپنی کمزوری کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کہنی کی یہ ضرب انتہائی زوردار اور مُہلک تھی۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ اگر میں نے ذرا بھی حرکت کرنے کی کوشش کی تو وہ لوگ مجھے معاف نہیں کریں گے۔ ان حالات میں میرے پاس اس کے سوا کوئی اور چارہ کار نہ تھا کہ چُپ چاپ اپنی قسمت پر صابر و شاکر ہو کر بیٹھ جاتا اور آنے والے واقعات کا انتظار کرتا۔ اور میں نے ایسا ہی کیا۔

کار مختلف سڑکوں پر سے گُزر رہی تھی جن میں سے کچھ بارونق تھیں اور کچھ ویران۔ قریباً دس منٹ تک سفر کرنے کے بعد کار ایک نسبتاً کم آباد اور ویران راستے پر پہنچ گئی۔ میں نے اپنی گردن گھما کر دیکھنے کی کوشش نہیں کی لیکن مجھے بخوبی علم تھا کہ ہمارے پیچھے دوسری کار بھی ایک مناسب فاصلے سے آ رہی ہے۔ چند اور ہیر پھیر کے راستوں سے گزرنے کے بعد ہم ایک ایسی سڑک پر پہنچے جس کے دونوں طرف حدِّ نظر تک سرسبز کھیت لہلہا رہے تھے اور اُونچے اُونچے درخت گویا پاسبانی کے لیے ایستادہ تھے۔ یہ سڑک کچھ دُور جانے کے بعد سبزہ زار میدانوں کے درمیان گھر گئی۔ یہاں تک کہ کچھ فاصلے پر مجھے ایک بلند و بالا پتھروں کی بنی ہوئی وسیع و عریض حویلی نما عمارت کے آثار نظر آنے لگے۔ اس عمارت

کے آس پاس دُور دُور تک سبزہ زار اور ہرے بھرے گھاس کے میدان پھیلے ہوئے تھے۔ کوئی اور عمارت دُور دُور تک نظر نہیں آ رہی تھی۔ پختہ پتھروں اور اینٹوں کی سڑک پر سے ہوتے ہوئے ہماری کار عمارت کے صدر دروازے کے سامنے جاکر ٹھہر گئی۔ پچھلی سیٹ پر میرے ساتھ بیٹھے ہوئے دونوں آدمی پھرتی سے کُود کر باہر نکلے۔ اب ان میں سے ایک نے سٹین گن سنبھال لی تھی۔ دوسرے کے ہاتھ میں بدستور پستول تھا۔ مَیں نے بچاؤ کی آخری کوشش کے طور پر پستول والے دیوہیکل شخص کو نشانہ بنانے کا فیصلہ کرلیا۔ کار سے نکل کر جب ہم عمارت کی طرف بڑھے تو مَیں ان کے آگے آگے تیز رفتاری سے چل رہا تھا۔ پستول والا شخص مجھ سے پانچ قدم پیچھے تھا۔ یکایک مَیں چلتے چلتے رُک گیا اور اس ناگہانی افتاد کی وجہ سے میرے پیچھے آنے والا بے ساختہ مجھ سے ٹکرا گیا۔ مَیں نے اپنی داہنی کہنی کو حرکت دی اور وہ اس کے پیٹ میں پیوست ہوگئی۔ اسے سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر مَیں نے اس کے پیٹ میں تین چار زبردست گھونسے رسید کیے اور پھر اس کے جبڑے پر کراٹے کا ہاتھ رسید کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر اتنی دیر میں سٹین گن والا آدمی میرے پاس پہنچ چکا تھا۔ اس کا ہاتھ بلند ہوا سٹین گن کا دستہ پُوری طاقت سے میری گردن پر لگا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ مَیں نے سنبھلنے کی کوشش کی مگر ایک سیاہ اور سُرخ پردہ میری نگاہوں کے سامنے آویزاں ہوگیا اور مَیں بے ہوش ہوکر زمین پر گرگیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو مَیں ایک شاندار اور نفاست سے سجے ہوئے وسیع کمرے کے ایک صوفے پر دراز تھا۔ آنکھ کھلتے ہی میری نظر چھت سے لٹکے ہوئے ایک شیشے کے فانوس پر پڑی جو اپنی سجاوٹ اور خوبصورتی کے اعتبار سے لاجواب تھا۔ فانوس میں بلب روشن تھے جس سے مجھے فوراً یہ احساس ہوا کہ مَیں کافی دیر بیہوش رہنے کے بعد رات کے وقت ہوش میں آیا تھا۔ مَیں فوراً صوفے پر سے اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ میری گردن میں ہلکی سی دُکھن اس بات کی یاد دہانی کرا رہی تھی کہ مجھے کسی نے زور دار ضرب لگائی تھی لیکن اس کے سوا مجھے کوئی اور تکلیف محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میرا لباس صاف ستھرا تھا اور جُوتوں پر گرد کا نام و نشان تک نہ تھا گویا ان لوگوں نے مجھے نہایت حفاظت اور احترام کے ساتھ اس جگہ لاکر لٹا دیا تھا۔ کمرہ خاصا وسیع اور کشادہ تھا اور جدید ترین آرائش اور فرنیچر کی خوشنما ترتیب نے اس کی دلکشی میں مزید اضافہ کردیا تھا۔ فرش پر بیش قیمت قالین بچھے ہوئے تھے اور دیواروں پر قیمتی تصاویر آویزاں تھیں۔ ایک جانب بیڈ نما کوچ بھی پڑی ہوئی تھی۔

میرے اُٹھ کر کھڑے ہوتے ہی ایک عقبی دروازہ کھلا اور ایک مُلازمہ کمرے میں اس طرح داخل ہوئی جیسے کسی ریموٹ کنٹرول کی مدد سے اسے میرے ہوش میں آنے کا علم ہوچکا ہو۔ وہ سر سے پیر تک سفید لباس میں ملبوس تھی اور ایک تندرست اور خوبصورت عورت تھی۔ وہ مؤدب انداز میں آگے بڑھی اور میرے سامنے آکر کھڑی ہوگئی: "سر۔ آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو فرمائیں۔ مَیں آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہوں۔"

اس کا یکایک یوں نمودار ہونا اور پُرتکلف زبان میں گفتگو کرنا مجھے اتنا مضحکہ خیز معلوم ہوا کہ اس سنگین صورتِ حال کے باوجود مَیں اپنی ہنسی پر قابو نہ رکھ سکا۔ وہ حیرت سے اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں کھول کر مجھے دیکھتی رہی۔ جب میرا قہقہہ رُکا تو وہ دوبارہ مجھ سے مخاطب ہوئی: "سر۔ مَیں آپ کی کیا خدمت کرسکتی ہوں۔ آپ کو جس چیز کی ضرورت ہو حکم کریں وہ آپ کی خدمت میں حاضر کردی جائے گی۔"

مَیں نے ایک لمحہ اسے دیکھا پھر کہا: "مجھے تمہارے مالک کی فوری ضرورت ہے۔ انھیں فوراً میری خدمت میں حاضر کرو۔"

وہ پہلے تو مجھے حیرت سے دیکھتی رہی پھر سَر جھکا کر سلام کیا اور کمرے سے رُخصت ہوگئی۔ مَیں دیواروں پر لگی ہوئی بیش قیمت تصاویر دیکھنے لگا۔ ان میں دُنیا کے مختلف عظیم مصوروں کی بنائی ہوئی پینٹنگز تھیں۔ کچھ تصاویر مناظر سے متعلق تھیں اور کچھ میں خوبصورت خواتین کی تصویرکشی کی گئی تھی لیکن یہ بات قابلِ ذکر تھی کہ زیادہ تر تصاویر نیم عُریاں تھیں۔ اگرچہ انھیں آرٹ کا نمونہ کہا جاسکتا ہے لیکن وہ کھُلم کھُلا فحاشی کے ضمن میں آتی تھیں۔ بعض تصاویر اتنی جامع اور مکمل تھیں کہ ان

پر حقیقت کا گمان گزرتا تھا۔ مَیں ان تصاویر کو دیکھنے میں اتنا منہمک تھا کہ مجھے ایک بار پھر عقبی دروازہ کھلنے کی آواز سُنائی نہیں دی۔ خوشبوؤں سے بھرا ہوا ایک جھونکا کمرے میں داخل ہوا اور چاروں طرف پھیل گیا۔ خوشبو بہت نفیس تھی۔ مَیں نے پلٹ کر دیکھا تو اپنے سامنے ایک حسین اور طرح دار عورت کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ وہ درحقیقت ایک بے حد خوبصورت اور دلکش عورت تھی۔ عمر اس کی تیس بتیس کے لگ بھگ ہوگی۔ لیکن عمر نے اس کے سراپا میں ایک وقار پیدا کردیا تھا۔ وہ سیاہ ساڑھی میں ملبوس ایک مجسمے کی طرح میرے سامنے ایستادہ تھی۔ سیاہ لباس میں اس کا سنگِ مرمر جیسا سفید پیکر ایک دلفریب منظر پیدا کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک ہلکی سی مُسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں دوستانہ تاثرات کا پرتو۔ اس کے کٹے ہوئے سنہری بال اس کے شانوں پر پڑے ہوئے تھے جنہیں وہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ایک ہاتھ سے سمیٹنے کی کوشش کرتی تھی اور اس کوشش میں اس کے بال مزید بکھر جاتے تھے۔ زیور کے نام پر اس کے گلے میں ایک سیاہ موتیوں کے لاکٹ کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ بائیں ہاتھ میں ایک سیاہ گھڑی تھی۔ اس کی مُسکراتی ہوئی آنکھوں کی رنگت شربتی تھی۔ وہ ایک سحر آفریں خوشبو میں بسی ہوئی تھی جس سے تمام کمرہ مہک اُٹھا تھا۔

وہ چند قدم آگے بڑھی اور پُوچھنے لگی: "کہئے آپ کا معائنہ مکمل ہوگیا؟ کتنے نمبر ملے ہیں مجھے؟"

اس کی آواز میں ایک انوکھی قسم کی مٹھاس مگر بھاری پن تھا۔ وہ باریک آواز نہ تھی لیکن اس کے باوجود اس میں ایک دلکشی اور کشش تھی۔ اپنے انداز اور طرزِ گفتگو سے وہ ایک آزاد خیال اور خود مختار عورت معلوم ہوتی تھی جو عام طور پر حکم جاری کرنے میں یقین رکھتی ہیں اور کسی دوسرے کے حکم کی تعمیل کرنے کی عادی نہیں ہوتیں۔

"آپ سے مِل کر خوشی ہوئی۔" مَیں نے اخلاقاً کہا۔

"مَیں جانتی تھی مُلاقات پر ایسا ہی ہوگا۔ ظاہر ہے تمہیں مجھ سے مِل کر خوشی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوسکتا۔" یہ کہتے ہوئے وہ آگے بڑھی اور ایک ریشمی صوفے پر براجمان ہوگئی۔ جب وہ چند قدم چلی تو مجھے اندازہ ہوا کہ اس کی چال بھی اس کے باقی سراپا کی طرح دلکش اور خوبصورت تھی۔ وہ ایک حسین عورت تھی لیکن اس کے باوجود اسے نازک اندام نہیں کہا جاسکتا تھا۔ اس کا متناسب جسم کسی اتھلیٹ کے جسم کی طرح سرو قامت اور مضبوط تھا اور اس کی رنگت کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ آؤٹ ڈور زندگی کی عادی ہے اور کافی وقت آسمان کے نیچے کھُلے میدانوں میں گزارتی ہے۔ مَیں بعض ایسی عورتوں کو بھی جانتا تھا جو کھیلوں میں دلچسپی لیا کرتی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک ایسی عورت کے بارے میں بھی مجھے علم تھا جو شکار کی شوقین تھی۔ یہ خاتون بھی مجھے اسی قماش کی نظر آ رہی تھی۔

"کیا تم سمجھتے ہو کہ مَیں تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔" اس نے مُسکراتے ہوئے پُوچھا۔

مَیں خاموش اسے دیکھتا رہا۔

وہ بولی: "اس شہر میں تمہاری آمد کے ساتھ ہی مجھے خبر مِل گئی تھی۔ تمہاری مصروفیات کے بارے میں بھی مجھے پَل پَل کی خبر ہے۔ مجھے حیرت یہ تھی کہ تم نے ہوٹل میں قیام کرنے کا فیصلہ کیوں کیا جب کہ تمہیں یہ بھی علم ہے کہ تم وہاں زیادہ محفوظ نہیں رہو گے۔"

"ہوٹل میں نہ ٹھہرتا تو اور کہاں جاتا؟"

"اچھا۔ تو یہ بات ہے۔" وہ شرارت سے ہونٹ کو دانتوں میں داب کر مُسکرائی: "ہوٹل کے سوا تمہیں کوئی اور رہنے کی جگہ نہ سوجھی۔" اس نے کمرے کا جائزہ لیا اور پھر کہنے لگی: "اس گھر کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

وہ مجھے "تم" سے مخاطب کر رہی تھی جب کہ مَیں نے اسے آپ کہہ کر خطاب کیا تھا۔ اس کا یہ انداز مجھے پسند نہیں آیا۔

"گھر تو بُرا نہیں ہے۔" مَیں نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا: "مگر دُور بہت ہے۔"

"دُوریاں خود بخود ختم ہو جاتی ہیں۔" وہ پھر مُسکرائی: "کوشش کرے انسان تو کیا نہیں ہوسکتا اور پھر آج کے جدید

زمانے میں تو فاصلہ انسانوں کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ انسان چاند ستاروں تک پہنچ چکا ہے۔ وہ کونسا فاصلہ ہے جو آج کا انسان طے نہیں کرسکتا۔" وہ صوفے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور اپنے بالوں کو جھٹک کر بولی "کیا پیو گے؟ کافی، چائے، کوکا کولا یا کوئی ہارڈ ڈرنک؟"

"میرے لیے کوک ہی کافی ہے۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"بچوں کے مشروب پینے کے شوقین کب سے بن گئے؟" یہ کہتے ہوئے اس نے صوفے کے ساتھ فرش پر لگا ہوا بٹن اپنے پیر سے دبایا۔

مجھے اس کی گفتگو سے یہ احساس ہو چکا تھا کہ وہ میرے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار ہے۔ وہ مجھ پر کسی اور کا گمان کر رہی تھی لیکن جب تک مجھے تمام حالات و کوائف کا علم نہ ہو جائے میرے لیے یہی مناسب تھا کہ اس کی غلط فہمی قائم رہے۔

وہی ملازمہ اندر داخل ہوئی جسے میں نے مالک کمرہ بلانے کا حکم دیا تھا۔ "سینا۔" وہ اس سے تحکمانہ اور بارعب انداز میں مخاطب ہوئی۔ "جاشی کو بھیجو۔"

ملازمہ ادب سے سر جھکا کر رخصت ہوگئی۔ اب وہ پاس ہی گملے میں لگے ہوئے ایک خوبصورت اور بیش قیمت درخت کے پتے نوچ رہی تھی اور انھیں ایک ایک کرکے توڑ کر قالین پر پھینکتی جاتی تھی۔

"مجھے تم سے اس برتاؤ کی توقع نہ تھی۔" وہ شکایت آمیز لہجے میں بولی۔ "میرا خیال تھا کہ یہاں پہنچ کر تم سب سے پہلے مجھ ہی سے رابطہ قائم کرو گے۔"

"میرا بھی یہی خیال تھا۔" میں نے مصلحتاً بات کو بڑھایا۔ "مگر بعض ضروری کاموں میں مصروف ہوگیا۔"

"میرے ہوتے ہی تمہیں کوئی پرابلم نہیں ہونی چاہیے۔ ہر کام محض حکم دینے سے ہو جائے گا۔ بولو، کیا کام ہے تمہیں؟"

میں بات ٹالنے کے لیے مسکرانے لگا۔ اس دوران میں میں اپنے ذہن پر زور دے کر یہ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ آخر یہ عورت کون ہوسکتی ہے اور مجھے کیوں کر جانتی ہے؟ اگر میں اس سے مل چکا ہوں تو کہاں ملا تھا اور اگر نہیں تو آخر وہ کون شخص ہے جس کی غلط فہمی میں اس نے مجھے یہاں بلایا ہے۔

"کام اتنا اہم نہیں ہے۔" میں نے مختصراً جواب دیا۔

"زبان سے تو کہو۔ ہم کم اہم کام بھی کرا دیتے ہیں پارٹنر۔" وہ بے تکلفی بلکہ قدرے بے باکی سے ہنسی۔ "صرف تمہارے زبان ہلانے کی دیر ہے۔"

میرے جواب دینے سے پہلے کمرے کا گیلری میں کھلنے والا دروازہ کسی آواز کے بغیر کھلا اور ملازمہ نے اسے پورا کھول دیا۔ اس کے بعد کمرے میں جو چیز داخل ہوئی اسے دیکھ کر میں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں کرسکا۔ یہ ایک پستہ قد آدمی تھا جو اپنے چاروں ہاتھوں پیروں کی مدد سے چوپائے کی طرح چلتا ہوا کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ اس نے سیاہ پتلون اور سفید قمیص پہن رکھی تھی اور اس کے کالر میں سیاہ بو لگی ہوئی تھی۔ حیرت انگیز بات اس کا جانوروں کی طرح ہاتھ پیروں کے بل چلنا تھا۔ مگر اس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس کی چوڑی کمر پر ایک ٹرے رکھی ہوئی تھی جس میں کوک کا ایک گلاس، ایک خالی گلاس، ایک وہسکی کی چھوٹی بوتل اور ایک شیشے کا پیالہ نما برتن تھا جس میں برف کی خوبصورت ترشی ہوئی قاشیں رکھی ہوئی تھیں۔ وہ نہایت نپے تلے انداز میں ہاتھ پیروں کے بل چلتا ہوا آگے بڑھا اور اس عورت کے صوفے کے پاس جاکر ٹھہر گیا۔ اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ محض سر اٹھا کر عورت کی طرف دیکھا۔ اس لمحے وہ مجھے ایک گھریلو پالتو کتے کی طرح نظر آیا۔ اس میں صرف ایک دم کی کمی تھی۔

"جاشی۔" عورت نے مسکرا کر کہا۔ "تم تمیز بھول گئے ہو۔ پہلے مہمانوں کی خاطر کی جاتی ہے۔" وہ میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"سوری میڈم۔" اس کے منہ سے ایک بھرائی ہوئی آواز نکلی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اس کی آواز ہی اس قسم کی تھی۔ وہ پیروں اور ہاتھوں کے بل چلتا ہوا میری طرف بڑھا اور میرے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ خاص بات یہ تھی کہ وہ اتنی نپی تلی اور ہموار انداز میں چلتا تھا کہ اس کی کمر پر رکھی ہوئی مشروبات کے گلاسوں اور بوتلوں میں سے ایک قطرہ بھی چھلک کر نہیں گرتا تھا۔ وہ اپنے انداز کا ماسٹر تھا۔ میرے صوفے کے سامنے کھڑے ہونے کے بعد اس نے اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھا اور بولا۔ "شوق فرمائیے سر۔" یہ کہتے ہوئے وہ دو قدم بڑھ کر ٹرالی کی طرح میرے صوفے کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ وہ گندمی رنگ کا شخص تھا جو چہرے کے نقوش سے جنوب مشرقی ایشیا کی کسی نسل کا باشندہ معلوم ہوتا تھا۔ مگر اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور سیاہ تھیں جب کہ اس علاقے کے لوگوں کی آنکھیں عام طور پر بڑی نہیں ہوا کرتیں۔

اپنے سامنے ایک اشرف المخلوقات کو چوپایوں اور جانوروں کے انداز میں دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ میں خاموش اسے دیکھتا رہا۔ اس دوران میں وہ بے حس و حرکت میرے سامنے کھڑا اپنی سیاہ آنکھوں سے مجھے دیکھتا رہا۔ بالآخر میں نے کوکا کولا کا گلاس ہاتھ میں اٹھا لیا۔

"برف سر۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں سرگوشی کی تو مجھے بالکل یوں لگا جیسے کوئی حیوان بول پڑا ہو۔

میں نے چمٹا اٹھایا اور برف کے چند ٹکڑے اپنے گلاس میں ڈال لیے۔ وہ اسی سبک رفتاری اور یکسانیت سے چلتا ہوا عورت کے سامنے پہنچ گیا اور سر اٹھا کر پالتو جانوروں کی طرح اسے دیکھنے لگا۔ عورت نے ہاتھ بڑھا کر ایک پیگ بنایا اور گلاس ٹرے سے اٹھا لیا لیکن جاشی پھر بھی ایک بے جان میز کی طرح اس کے سامنے بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ میرے لیے یہ نظارہ انوکھا اور ناقابل یقین تھا۔ مگر شاید ابھی کچھ اور منظر بھی مجھے دیکھنے تھے۔

میں نے کوک کا گلاس ہونٹوں سے لگایا ہی تھا کہ دروازے پر قدرے شور و غل محسوس ہوا۔ دروازہ ایک بار پھر کھلا۔ اس بار ایک نیم زخمی آدمی اس دروازے میں سے یوں اندر آیا جیسے کسی نے اسے دھکا دے کر پھینکا ہو۔ وہ شخص دھکے کے زور میں قالین پر اوندھے منہ گر گیا۔ اس کے پیچھے دو اور آدمی اندر داخل ہوئے جو نہایت طاقت ور مضبوط اور قد آور تھے اور چہرے ہی سے جرائم پیشہ لگ رہے تھے۔ ان کے چہروں پر زخموں کے نشان تمغوں کی طرح سجے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک نے فرش پر پڑے ہوئے آدمی کو ایک ٹھوکر رسید کی اور وہ بلبلا کر اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ وہ درمیانی عمر کا ایک تندرست اور توانا آدمی تھا لیکن اس کے جسم اور چہرے پر موجود چوٹوں کے نشانات اس بات کی علامت تھے کہ اس پر تشدد کیا گیا ہے۔ وہ ایک نیکر اور آدھی آستینوں کی میلی کچیلی قمیص پہنے ہوئے تھا۔ اس کی ڈاڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے اور چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔

عورت کو دیکھ کر اس کا چہرہ خوف سے زرد پڑ گیا۔ وہ سہم کر پیچھے ہٹا مگر دوسرے مسلح محافظ نے اسے دوبارہ دھکیل کر عورت کے صوفے کے سامنے پھینک دیا۔ وہ خوبصورت عورت اس تمام واقعے سے یوں بے خبر اور بے تعلق بیٹھی ہوئی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔ اس نے بڑے سکون اور اطمینان کے ساتھ مشروب کے چند گھونٹ بھرے اور پھر گلاس دوبارہ انسانی ٹرالی پر دھر دیا۔ اس کے بعد بھی اس نے بدحال قیدی کی طرف نظر ڈالنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ خاموشی سے اس نے برابر کی میز پر رکھا ہوا سگریٹ کا ڈبہ اٹھا کر بڑی نزاکت کے ساتھ اس میں سے ایک سگریٹ نکالی اور اپنے سرخ ہونٹوں میں دبالی۔ ایک نے آگے بڑھ کر لائٹر کی مدد سے سگریٹ جلا دی اور دھوئیں کا ایک چھوٹا سا بادل کمرے میں پھیل گیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک عجیب قسم کی خوشبو بھی کمرے میں بکھر گئی۔ مجھے اندازہ لگانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ کوئی عام سگریٹ نہ تھا بلکہ اس کے اندر نشہ آور ماری جوانا بھی بھری ہوئی تھی۔ کسی عورت کو سگریٹ نوشی کرتے ہوئے دیکھنا ہی ایک عجیب منظر ہوتا ہے لیکن یہاں تو حیرت پر حیرت زدہ کرنے والی باتیں رونما ہو رہی تھیں۔ یہ بظاہر ایک مہذب اور خوبصورت عورت نہ صرف سگریٹ نوشی کر رہی تھی بلکہ دخترِ رز سے بھی لطف اندوز ہو رہی تھی اور اس نے محض تمباکو والے سگریٹ پر

اکتفا نہیں کیا تھا۔

کمرے میں لایا جانے والا قیدی اَب گھٹنوں کے بَل اس کے سامنے سرنگوں تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ معافی طلب کرنے کے انداز میں چہرے کے سامنے بندھے ہوئے تھے۔ "میڈم۔" وہ گڑگڑا کر بولا۔ "مجھے معاف کر دیجیے۔ مجھ سے غلطی ہوگئی مگر مجھے اس کی کافی سزا مل چکی ہے۔ خدا کے لیے مجھے ایک بار معاف کر دیجیے۔ پھر دوبارہ آپ کو شکایت کا موقعہ نہیں ملےگا۔"

میڈم نے تمسخر آمیز نگاہوں سے اسے دیکھا اور جب بولی تو اس کی دلکش آواز نفرت اور حقارت میں ڈوبی ہوئی تھی: "زندگی صرف ایک بار ہی ملتی ہے پیٹر، اور انسان مرتا بھی صرف ایک ہی بار ہے۔ دُنیا میں کوئی اہم کام دوسری بار نہیں ہوتا۔"

"مجھے معاف کر دیجیے میڈم۔" وہ گڑبڑا کر بولا۔

"معاف کر دوں؟ تمہیں؟ ایک نمک حرام اور غدّار کو؟ کیا تم جانتے نہیں تھے کہ مَیں اپنے مُلازموں کا ہر جُرم معاف کر سکتی ہوں مگر غدّاری کبھی قابلِ معافی نہیں ہوسکتی۔"

"مجھ سے غلطی ہوگئی میڈم۔"

"تو پھر اس کی سزا بھی بھگتو۔" پھر وہ محافظوں سے مخاطب ہوئی: "لے جاؤ اسے۔ کل صبح اس کا فیصلہ کر دو۔"

پیٹر گھگھیاتا ہوا گھٹنوں کے بَل چلتا ہوا میڈم کے صوفے کے نزدیک پہنچ گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور وہ ہٹا کٹا مضبوط آدمی بچوں کی طرح بلک رہا تھا۔

"مجھے صرف ایک موقعہ اور دیجیے میڈم۔" اس نے روتے ہوئے میڈم سے درخواست کی۔ وہ عورت اپنی خوبصورت شوخ آنکھوں سے ایک لمحہ اسے دیکھتی رہی پھر اس نے محافظ کو اشارہ کیا جس نے مضبوطی سے پیٹر کو تھام کر باہر لے جانے کے لیے گھسیٹنا شروع کر دیا مگر پیٹر شاید زندگی کی آخری بازی لگانے کی کوشش میں تھا۔ وہ دوبارہ صوفے کے سامنے سرنگوں ہو گیا اور معافی کے لیے درخواستیں کرنے لگا۔

میڈم بے تعلق اور بے نیازی سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر یکایک اس کا سگریٹ والا ہاتھ حرکت میں آیا اور اس نے جلتی ہوئی سگریٹ کو پیٹر کے بازو پر مسل کر بُجھا دیا۔ پیٹر کے مُنہ سے ایک چیخ نکلی اور وہ تڑپ کر صوفے سے دُور ہوگیا۔ محافظوں نے اسے دونوں بازؤں سے تھام لیا اور چیختے چِلّاتے، معافیاں طلب کرتے ہوئے پیٹر کو زبردستی اُٹھا کر کمرے سے باہر لے گئے۔ اس کی چیخیں باہر سے بھی سُنائی دے رہی تھیں۔ اَب کمرے میں سینٹ کی خوشبو اور عاری جوانا کی ناگوار بدبُو کے ساتھ ساتھ انسانی گوشت کے جلنے کی بُو بھی پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا لیکن وہ عورت جسے پیٹر نے میڈم کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ نہایت سکون اور بے نیازی کے ساتھ اَب گلاس سے شغل کر رہی تھی۔ اس کے صوفے کے آگے چاشی ایک چار پیروں والے جانور یا چار پائے والی میز کی طرح بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ یُوں لگتا تھا جیسے وہ انسان نہیں ایک چوبی اور بے جان میز ہے۔

اس منظر نے مجھے اتنا بدمزہ کیا کہ مَیں بے اختیار صوفے سے اُٹھ کر کھڑا ہوگیا اور سامنے والی کھڑکی کے قریب جا کر باہر لان کا نظارہ کرنے لگا۔ یہ ایک سرسبز اور تراشا ہوا خوبصورت لان تھا جس میں بیڈمنٹن اور ٹینس کے کورٹس بنے ہوئے تھے۔ ٹینس کورٹ میں ایک عورت کسی مرد کے ساتھ ٹینس کھیل رہی تھی۔ مَیں خاموشی سے یہ منظر دیکھتا رہا لیکن دراصل مَیں اپنے دل اور دماغ پر قابو پانے کی جدّوجہد میں مصروف تھا۔

یکایک خوشبو کے جھونکوں نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ گردن موڑ کر دیکھا تو میڈم میرے نزدیک کھڑی باہر لان میں دیکھ رہی تھی۔

"یہ میری نئی سیکرٹری میگی ہے۔" وہ سامنے دیکھتے ہوئے بولی: "ٹینس کی اچھی کھلاڑی ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ بہت اچھی اور بھروسے کے قابل سیکرٹری ہے۔"

"اس کے ساتھ کون کھیل رہا ہے؟" مَیں نے یوں ہی سوال کیا۔

وہ مسکرائی: "حیرت ہے۔ تمہیں خوبصورت لڑکیوں کی موجودگی میں مردوں کے بارے میں سوالات کرنے کی عادت کب سے ہوگئی ہے۔" اتنا کہہ کر وہ شرارت سے مُسکرائی اور میرے اور قریب کھسک آئی۔

"تم اَب میرے مہمان رہوگے۔" وہ گلاس کو گھما کر دیکھتے ہوئے بولی: "تمہارا کہیں اور قیام کرنا میرے لیے توہین آمیز ہے اور ہوٹل میں ٹھہرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

یکایک مَیں نے کچھ سوچ کر پوچھا: "تو کیا میرے ہوٹل سے میرا سامان تم ہی نے منگایا ہے؟"

"بالکل نہیں۔" وہ جلدی سے بولی: "جب میرے آدمی تمہارے ہوٹل میں پہنچے تو تم اور تمہارا دوست سامان لے کر رُخصت ہو چکے تھے۔ اُنھوں نے تمہارا پیچھا کیا اور آخرکار تمہیں میرے پاس لے ہی آئے۔"

مجھے اپنی گردن پر لگنے والی ضرب یاد آگئی: "معاف کرنا یہ کسی مہمان کو بُلانے یا لانے کا مہذّب طریقہ نہیں ہوتا۔" مَیں نے اپنی گردن کی پُشت سہلاتے ہوئے کہا۔

وہ شوخی سے ہنس پڑی: "جب مہمان ہی آنکھیں بدل لیں تو پھر کبھی کبھی زبردستی بھی کرنا پڑتی ہے۔ اچھا۔ اب یہ بتاؤ کہ تم کہیں چلنا پسند کروگے یا آرام کروگے۔"

مَیں نے سامنے لان میں تیز دن کی طرح روشن بلبوں کی چمک میں میگی اور اس کے ساتھی کو کھیلتے ہوئے دیکھا اور پھر کہا: "مَیں تھکا ہوا ہوں۔ اگر آرام کرنے کا موقعہ مِل جائے تو مہربانی ہوگی۔"

وہ مُسکرانے لگی اور اس لمحہ وہ ایک انتہائی دلکش اور نرم دِل عورت نظر آرہی تھی۔ کچھ دیر پہلے رونما ہونے والا واقعہ اگر مَیں نے خود اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہوتا تو شاید مَیں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ مجسّم نزاکت اور رعنائی کا پیکر اتنا سنگدل اور ظالم بھی ہوسکتا ہے۔

"اچھا۔ تم آرام کرو، صبح مُلاقات ہوگی۔" اس نے گلاس چاشی کی کمر پر رکھے ہوئے ٹرے پر رکھ دیا۔ اسی عرصہ میں چاشی بے آواز پیروں ہاتھوں کے بَل چلتا ہوا نہ جانے کب ہمارے پاس آکر ٹھہر گیا تھا۔

"او کے پارٹنر۔" اس نے دلنواز انداز میں ہاتھ ہلایا: "صبح تک کے لیے گڈ بائے۔" اور لچکتی ہوئی چال چلتی ہوئی کمرے سے رُخصت ہوگئی۔ اس کے پیچھے پیچھے چاشی بھی کسی پالتو وفادار جانور کی طرح چلتا ہوا رُخصت ہوگیا۔ دونوں میں سے کسی نے بھی ایک بار مڑ کر میری طرف نہیں دیکھا۔ وہ کیسی بھی عورت تھی لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس کے کمرے سے رُخصت ہوتے ہی رنگ و بُو کا طوفان بھی رُخصت ہوگیا اور کمرہ خالی خالی اور بے رونق لگنے لگا۔

مَیں نے کھڑکی کے باہر دیکھا۔ میگی اور اس کا ساتھی بھی کھیل ختم کر کے ہنستے بولتے رُخصت ہو رہے تھے۔ میگی کے ہاتھ میں ریکٹ تھا جسے وہ شوخی سے اپنے ساتھی کے بازؤں پر مار رہی تھی۔ وہ لوگ میرے کمرے کی جانب ہی آرہے تھے۔ کچھ اور نزدیک آئے تو مَیں نے تفصیل سے ان دونوں کا جائزہ لیا۔ میگی واقعی ایک رعنا اور خوبصورت لڑکی تھی۔ اس کا جسم کھلاڑیوں کی طرح متناسب اور دلکش تھا اور چہرہ بھی جسم کی مناسبت سے دلکش اور حسین تھا۔ اس کا ساتھی سفید نیکر اور جرسی میں ملبوس ایک باوقار اور خوبصورت نوجوان تھا۔ جب وہ ہنستا تو اس کے دانت موتیوں کی طرح چمکنے لگتے تھے۔ وہ دونوں ہنستے اور باتیں کرتے ہوئے میرے سامنے سے گزرتے ہوئے ایک سمت میں چلے گئے۔ انھوں نے ایک بار بھی سَر اُٹھا کر میری طرف نہیں دیکھا شاید وہ سفید باریک پردے کے پیچھے میری موجودگی سے یکسر بے خبر تھے۔

چند لمحے بعد ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ باہر لان میں بجلی کے قمقمے ابھی تک جگمگا رہے تھے لیکن لان میں کوئی کھیلنے والا موجود نہ تھا۔ وسیع و عریض کمرہ اَب بالکل خاموش اور تنہا تھا۔ میڈم نے مجھے آرام کرنے کے لیے کہا تھا مگر میرا ذہن انتہائی تیزی سے سوچنے میں مصروف تھا۔ سب سے پہلا مسئلہ تو یہی تھا کہ یہ میڈم کون تھی اور میرا اس سے کیا تعلق تھا؟

اگر اسے میرے بارے میں غلط فہمی ہو رہی ہے تو پھر وہ آخر مجھے سمجھ کیا رہی ہے؟ اور جب اسے میری حقیقت کا علم ہوگا تو وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرے گی؟ وہ ایک حسین اور نازک عورت ہونے کے باوجود کس قدر ظالم اور پتھر دل تھی اس کا مظاہرہ میں دیکھ چکا تھا۔ میڈم کوئی بھی تھی لیکن ایک بات طے تھی کہ یہ عورت "انڈر ورلڈ" سے تعلق رکھتی تھی اور مجرمانہ اور خلافِ قانون سرگرمیوں میں مصروف تھی لیکن اسے بھلا میرے ساتھ کیا کام اور واسطہ ہو سکتا تھا؟

پھر میرا ذہن چاشی کی طرف مبذول ہو گیا۔ وہ کون تھا اور میڈم کے پاس اس طرح غیر انسانی زندگی کیوں گزار رہا تھا۔ کیا وہ محض چوپایہ بن کر رہ گیا تھا کہ انسانوں کی طرح دو ٹانگوں پر کھڑا ہونے کی صلاحیت بھی رکھتا تھا؟ چہرے سے وہ جاپان، کوریا، ویت نام یا تھائی لینڈ میں سے کسی ملک کا باشندہ معلوم ہوتا تھا لیکن اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور سیاہ رنگ کی تھیں۔ پھر سب سے قابلِ ذکر بات اس کا صبر اور سکون تھا۔ وہ خاموشی اور بے زبانی سے گھنٹوں بے جان میز کی طرح بے حس و حرکت کھڑا رہنے پر قادر تھا۔ کوئی چوپایہ بھی ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ اسے دیکھ کر فوری طور پر ایک پالتو جانور کا تصور ذہن میں پیدا ہوتا تھا اور اسے واقعی ایک انتہائی وفادار پالتو جانور کی طرح سدھایا گیا تھا۔

پھر مجھے میگی کا خیال آیا۔ وہ ایک خوش شکل اور خوش اندام لڑکی تھی۔ تعلیم یافتہ اور مہذب بھی معلوم ہوتی تھی۔ پھر وہ اس ماحول میں کیا کر رہی تھی؟ یہی سب کچھ سوچتے ہوئے میں نرم و گداز بستر پر جا لیٹا۔ اس ماحول اور یہاں کے کرداروں نے مجھے عجیب سی الجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔ مگر میری ذاتی پرابلم بدستور اپنی جگہ موجود تھی۔ میں جس کاروباری معاہدے پر دستخط کرنے کے لیے یہاں آیا تھا اس کا مسودہ میرے بریف کیس کے ساتھ گم ہو چکا تھا۔ کسی نے میرے سامان کی تلاشی لے کر بعد میں مجھے اپنے سامان سے بھی محروم کر دیا تھا۔ سب سے قابلِ تشویش بات یہ تھی کہ میرا ساجھے دار دوست اور معتمد شوکت کا کوئی پتہ نہ تھا۔ شوکت کو کیا حادثہ پیش آیا کہ وہ پروگرام کے مطابق امپیریل ہوٹل میں نہیں پہنچ سکا لیکن اگر شوکت نہیں پہنچ سکا تھا تو ہوٹل ریسپشنسٹ کے بیان کے مطابق میرا وہ دوست کون تھا جو میرے نام پر میرا سامان بھی لے کر غائب ہو گیا تھا اور پھر یہ بات بھی قابلِ غور تھی کہ میرے سامان میں اس شخص کو کیا حاصل ہو سکتا تھا ماسوائے چند ہزار روپے کیش کے۔ وہ جو کوئی بھی تھا صاف ظاہر تھا کہ محض چند ہزار روپے کے درپے نہ تھا۔ اس کا مقصد کچھ اور تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ صبح بیدار ہونے کے بعد سب سے پہلے ملک برکت کے دفتر جاؤں گا یا اگر جانے کا موقع نہ مل سکا تو اس سے فون پر رابطہ قائم کروں گا۔ اس پُراسرار مکان سے اپنے گھر یا شوکت کے گھر فون کرنا میرے نزدیک مناسب نہ تھا۔ اس لیے یہی منصوبے بناتا ہوا اور مختلف سوچوں میں الجھا ہوا میں نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

رات کو نہ جانے کس وقت اچانک میری آنکھ کھلی۔ میں عجیب قسم کی بے چینی اور بے سکونی محسوس کر رہا تھا۔ گھڑی دیکھی تو دو بجے تھے۔ کچھ دیر بستر پر کروٹیں بدلتا رہا مگر نیند نہ آئی تو اُٹھ کر کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ رات تاریک تھی لیکن سامنے پھیلے ہوئے لان اور باغیچے میں بجلی کے قمقموں کی وجہ سے روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ہر طرف خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔ درخت۔ پودے۔ پھول سبھی خاموشی سے نیند کی آغوش میں کھوئے ہوئے لگتے تھے۔ اچانک ایک چیخ کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ ایک کے بعد ایک دیگرے کئی اور چیخیں سناٹے میں گونجیں جنہوں نے ماحول میں تلاطم پیدا کر دیا۔ یہ کسی عورت کی چیخوں کی آواز تھی اور صاف محسوس ہوتا تھا کہ وہ کسی خطرے سے دوچار ہے۔ میں کھڑکی سے ہٹ کر بستر کی طرف چلا گیا۔ یہ تمام چیزیں میرے لیے انجانی اور عجیب و غریب تھیں۔ مجھے بلاشبہ ان باتوں کی طرف توجہ دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ سوچ کر میں بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ نیند بھی آنکھوں سے دور تھی۔ کمرے میں مطالعے کے لیے کوئی کتاب بھی موجود نہیں تھی۔ سگریٹ کے سوا اور کوئی ساتھی نہیں تھا۔ اس لیے میں نے سگریٹ سلگا لی۔ لیکن وہی آواز پھر سنائی دی اور اس بار یہ اتنی دلخراش تھی کہ نہ چاہتے ہوئے بھی میں بے اختیار اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میرے قدم مجھے کشاں کشاں دروازے کی طرف لے گئے۔

دروازہ خلافِ توقع مقفل نہیں تھا۔ دونوں اطراف میں گیلریاں پھیلی ہوئی تھیں اور میرے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ میں کس طرف جاؤں مگر میری یہ مشکل چیخوں کی آواز کی وجہ سے آسان ہو گئی۔ آوازیں بائیں جانب سے آ رہی تھیں۔ میں نے تیزی سے اسی طرف کا رُخ کیا۔ آوازیں اب مسلسل ہو گئی تھیں۔ میں آوازوں کی سمت میں چلتا رہا۔ نہ جانے میں نے کتنی راہداریاں اور گیلریاں طے کیں۔ اگر چیخیں میری راہنمائی نہ کرتیں تو شاید میں راستے میں بھٹک جاتا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ چیخیں متواتر عمارت میں گونج رہی تھیں، لیکن مکان میں میرے سوا کوئی دوسرا متنفس ایسا نہ تھا جس نے ان پر کان دھرا ہو۔ یوں لگتا تھا جیسے ساری عمارت میں کوئی اور ذی روح موجود ہی نہیں ہے۔

متعدد گیلریوں سے گزر کر میں ایک دروازے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ چیخوں کی آوازیں اسی کمرے کے اندر سے آ رہی تھیں۔ ابھی میں کوئی فیصلہ بھی نہیں کرنے پایا تھا کہ ایک دھماکے کی آواز سنائی دی۔ ایک قیم شحیم محافظ جس کے ہاتھ میں آٹومیٹک بندوق تھی کود کر میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس کے سر پر پگڑی تھی اور موٹی گھنی مونچھوں کی وجہ سے اس کا چہرہ اور زیادہ خوفناک نظر آ رہا تھا۔ وہ میرے اور بند دروازے کے درمیان سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ اور غصے بھری آواز میں بولا۔

"تم اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟ چلے جاؤ ادھر سے۔"

میں نے کہا۔ "تم کون ہو اور تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

اسی لمحے کمرے کے اندر سے زنانہ چیخ کی آواز پھر سنائی دی جو کافی جگر خراش تھی۔ میں نے محافظ کو سامنے سے ہٹا کر دروازے کی طرف بڑھنے کی کوشش کی مگر وہ اپنے بھاری ڈیل ڈول سمیت میری راہ میں حائل تھا۔ "ہم بولا تم چلے جاؤ۔ ورنہ ہمارے ہاتھ سے تمہاری بے عزتی ہو جائے گی۔" اس کا لہجہ انتہائی حقارت بھرا تھا۔ یہ دھمکی دینے کے بعد اس نے بندوق والا ہاتھ اُٹھا کر میرے سامنے دروازے پر ٹیک دیا اور مجھے گھورنے لگا۔

چیخوں کی آواز پھر سنائی دی اور میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں نے اپنا دائیاں ہاتھ آگے بڑھا کر اس کی کلائی تھام لی اور ایک زوردار جھٹکا دیا۔ اس کی کلائی کی ہڈی چٹخنے کی آواز سنائی دی اور بندوق اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر گئی اور کوئی ہوتا تو تکلیف سے دوہرا ہو کر زمین پر گر جاتا۔ مگر وہ ایک سخت جان آدمی تھا۔ اس نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر پوری قوت سے میرے سینے پر اپنے سر سے ٹکر مارنے کی کوشش کی۔ مگر میں تیزی سے اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ میری بجائے وہ پوری قوت سے دروازے سے ٹکرایا۔ اس کے منہ سے ایک دبی ہوئی چیخ کی آواز نکلی اور وہ زمین پر گر گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولنے کی کوشش کی جو کسی زور آزمائی کے بغیر ہی کھل گیا۔ کمرے میں روشنی پھیلی ہوئی تھی اور میں بآسانی سب کچھ دیکھ سکتا تھا۔ میری آنکھوں نے جو منظر دیکھا وہ انتہائی حیرت انگیز تھا۔ یہ ایک کشادہ بیڈ روم تھا جس کے ایک کنارے پر ڈبل بیڈ تھا۔ بیڈ کے سامنے سُرخ رنگ کے قالین پر ایک لڑکی گھٹنوں کے بل کھڑی تھی۔ اس کا لباس جگہ جگہ سے مسلا اور پھٹا ہوا تھا۔ اس کے لمبے بال بکھر کر اس کے چہرے اور شانوں پر پھیلے ہوئے تھے اور وہ بے تحاشہ چیخیں مار رہی تھی۔ اس کی چیخوں کا سبب بھی میری نگاہوں کے سامنے موجود تھا۔ یہ وہی حیوان نما انسان چاشی تھا جسے میں نے میڈم کے سامنے ایک بے جان اور بے زبان شے کی طرح چاروں ہاتھوں پیروں کے بل کھڑا ہوا دیکھا تھا۔ اُس وقت اُس کی پشت پر مشروبات کی ٹرے رکھی ہوئی تھی لیکن اس وقت جو چاشی میری نگاہوں کے سامنے تھا وہ ایک مختلف مخلوق تھا۔ وہ ایک وحشی جانور کی طرح غراتا ہوا لڑکی کی طرف بڑھ رہا تھا اور یہ اندازہ لگانا دشوار نہ تھا کہ لڑکی کی اس حالت کا بھی وہی ذمہ دار تھا۔ کمرے میں میری موجودگی کا علم پہلے لڑکی کو ہوا اور وہ دیوانہ وار بھاگ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کے منہ سے بے اختیار چیخیں نکل رہی تھیں۔ مجھ سے لپٹ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "مجھے بچا لو۔ مجھے بچا لو۔" اس سے زیادہ وہ مجھ سے کچھ نہ کہہ سکی۔

اس اثنا میں جاشی بھی مجھے دیکھ چکا تھا۔ وہ اس وقت بھی کسی چوپائے کی طرح چاروں ہاتھوں پیر کے بل کھڑا تھا۔ لیکن اس وقت وہ کسی پالتو، سدھائے ہوئے بے ضرر جانور کی بجائے ایک خونخوار درندے کی مانند نظر آ رہا تھا۔ مجھے سامنے دیکھا تو اس کی نگاہوں میں وحشیانہ چمک پیدا ہو گئی اور وہ اپنے منہ سے غرّاہٹ کی آوازیں نکالتا ہوا میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ چند لمحے ہم دونوں ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ پھر اس کے منہ سے ایک حیوانی آواز نکلی "ہٹ جاؤ۔ چلے جاؤ۔"

مجھے پہلی بار پتہ چلا کر وہ انسانوں کی طرح بول بھی سکتا ہے۔ لڑکی اب خاموش ہو گئی تھی مگر اس کی سسکیوں کی آواز کمرے میں گونج رہی تھی۔ یہ تمام منظر میرے لیے غیر حقیقی سا تھا اور میں ابھی تک یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ یہ سب کیا اور کیوں ہو رہا ہے؟ یہ لڑکی کون ہے اور جاشی اس کمرے میں کیسے دَر آیا؟ پھر دروازے کے باہر ایک محافظ کی موجودگی کے باوجود لڑکی کو اس حیوان کے رحم و کرم پر کیوں چھوڑ دیا گیا؟

لڑکی میرے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ "خدا کے لیے مجھے اس جانور سے بچا لو۔ میں تمہارے ہاتھ جوڑتی ہوں، مجھے یہاں سے لے چلو۔"

جاشی غصے میں بھرا ہوا دو قدم آگے بڑھ کے میرے بالکل سامنے جم کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنا سر اُٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں انتہائی وحشیانہ کیفیت ناچ رہی تھی۔ لیکن مجھے کم از کم یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ جاشی ہمہ وقت چوپائے کی طرح چلنے پھرنے پر مجبور ہے اور وہ انسانوں کی طرح دو پیروں پر کھڑے ہونے کی صلاحیت سے محروم ہے۔

"چلے جاؤ یہاں سے۔" اس کے منہ سے پھر ایک غرّاہٹ نما آواز نکلی "چلے جاؤ۔" یہ کہہ کر وہ لڑکی کی طرف بڑھا اور پلک جھپکنے میں اس نے لڑکی کی ایک ٹانگ پکڑ کر اس زور سے جھٹکا دیا کہ وہ فرش پر گر گئی۔ لڑکی کے منہ سے بے اختیار ایک چیخ نکل گئی اور اس نے پلٹ کر فرش پر سے اُٹھنا چاہا مگر جاشی اتنی دیر میں اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اب یہ سب کچھ میری برداشت سے باہر ہو چکا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر جاشی کے گھنے بالوں کو اپنے ہاتھوں میں جکڑ کر ایک جھٹکا دیا اور وہ تکلیف سے چلا کر میری طرف پلٹ پڑا۔ اپنے بال میری گرفت سے آزاد کرانے کے لیے اس نے اپنے سر کو زور زور سے جھٹکنا شروع کر دیا۔ اس کے بال ۔۔۔ چکنائی کے باعث میری گرفت سے آزاد ہو گئے اور دوسرے ہی لمحے وہ ایک بھوکے جانور کی طرح مجھ پر لپکا اور اس سے پہلے کہ میں سنبھل سکتا وہ میری دونوں ٹانگیں پکڑ کر زور زور سے جھٹکے دینے لگا۔ میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور زمین پر گر گیا۔ اس نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، وہ جھپٹ کر میرے اُوپر آیا اور دونوں ہاتھوں سے میرا گلا پکڑ کر دبانے لگا۔ اس کا چہرہ میری آنکھوں سے چند انچ کے فاصلے پر تھا۔ غصے میں اس کے دانت بھنچے ہوئے تھے اور وہ پوری قوت سے میری گردن کو توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ ایک مضبوط جسم کا آدمی تھا اور مجھے پہلی بار یہ اندازہ ہوا کہ اس کے ہاتھوں میں کتنی قوت ہے۔ اس کی گرفت آہنی تھی اور اس کی اُنگلیاں فولادی سلاخوں کی طرح میری گردن میں پیوست ہوئی جا رہی تھیں۔ میں اس ناگہانی حملے کے لیے تیار نہیں تھا اس لیے چند لمحے اس کے رحم و کرم پر رہا۔ پھر جب میرے ہوش و حواس مجتمع ہوئے تو میں نے دونوں گھٹنے سمیٹ کر اس کے پیٹ پہ ضرب لگائی۔ اس کی گرفت میں کسی قسم کی کمزوری پیدا نہیں ہوئی۔ پے در پے تین چار بار اس کے پیٹ کو نشانہ بنانے کے بعد میں اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا۔ اس کی گرفت کمزور پڑی تو میں نے دونوں کلائیوں کو اس کے ہاتھوں پہ مارا اور پوری قوت سے اسے پیچھے دھکا دیا اور وہ لڑھکتا ہُوا دُور جا گرا۔ میں اتنی دیر میں اُٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا، لیکن اس نے مجھے سنبھلنے کی مہلت نہیں دی۔ وہ جنگلی بھیڑیئے کی طرح اُچھل کر مجھ پہ حملہ آور ہُوا۔ اس کے دونوں پنجے میری آنکھوں کو نشانہ بنانا چاہتے تھے۔ میرے لیے کسی جانور نما انسان سے جنگ آزما ہونے کا یہ پہلا اتفاق تھا اور میں نے فوری طور پہ یہ فیصلہ کیا کہ اس سے اسی طرح پیش آنا چاہیئے جس طرح کسی جنگلی جانور سے برتاؤ کیا جاتا ہے۔ اتنی دیر میں اس کا جسم پوری قوت

کے ساتھ مجھ سے ٹکرایا اور میں ایک بار پھر لڑکھڑا کر گر گیا، لیکن اس کے مجھ تک پہنچنے سے پہلے ہی میں لوٹ لگا کر دوسری سمت میں چلا گیا۔ وہ جست لگا کر جب اس جگہ پہنچا تو میں بیڈ کے ساتھ کھڑا ہو کر اس کے دوسرے حملے کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ تیزی سے میری جانب مڑا۔ اس کے بال جنگلیوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ دانت خونخوار انداز میں نمایاں تھے اور آنکھوں میں وحشت ناچ رہی تھی۔ وہ اس لمحے سرتاپا ایک جنگلی درندہ معلوم ہو رہا تھا جو اپنے شکار کو ہر قیمت پہ حاصل کرنا چاہتا ہو۔ مشکل یہ تھی کہ جب تک وہ میرے سامنے سرِ دقد کھڑا نہ ہوتا اس وقت تک میں اس سے مقابلہ کرنے کی کوئی تدبیر نہیں کر سکتا تھا۔ اُدھر وہ پھرتی کے ساتھ سنبھل کر ایک بار پھر مجھ پر حملہ آور ہونے کے لیے تیار تھا۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھے ہوئے پیتل کے بھاری گلدان پہ نظر پڑی تو میں نے لپک کر اسے اُٹھا لیا۔ اتنی دیر میں وہ چیتے کی طرح چھلانگ لگا کر میرے نزدیک پہنچ چکا تھا۔ میں نے بائیں جانب ہٹ کر پوری قوت سے بھاری گلدان اس کے سر پہ دے مارا۔ میرا خیال تھا کہ گلدان کی ضرب سے اس کا سر پاش پاش ہو جائے گا۔ لیکن وہ نجانے کس مٹی کا بنا ہوا تھا۔ اس کا سر تو صحیح سلامت رہا البتہ اس بھرپور ضرب نے اسے بے ہوش کر دیا اور وہ ایک زوردار آواز کے ساتھ فرش پر گر کر بے حس و حرکت ہو گیا۔ اس کے باوجود میں احتیاطاً اپنی جگہ کھڑا رہا کہ مبادا وہ پھر حملہ کر دے۔ لیکن اس بار وہ بالکل ساکت ہو چکا تھا۔

میں اس لڑائی کے دوران لڑکی کی طرف سے بالکل غافل ہو چکا تھا۔ جو سہمی ہوئی ہرنی کی طرح کمرے کے ایک گوشے میں سمٹی کھڑی تھی۔ میں اس کی طرف متوجہ ہُوا تو وہ خوف زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ جاشی کا حشر دیکھ کر وہ مطمئن ضرور تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے انجام کے ڈر سے لرز رہی تھی۔ میں اس کی طرف بڑھا اور میں نے نرمی سے پوچھا "تم کون ہو؟ کیا نام ہے تمہارا؟"

"میرا نام نازی ہے جی۔ میں گامی کی بیوی ہوں۔"

"گامی!!" یہ نام میرے لیے بالکل اجنبی تھا۔ "وہ کون ہے؟"

"وہ میرا خاوند ہے۔" اس نے معصومیت سے جواب دیا۔

"مگر وہ ہے کہاں؟ کیا کرتا ہے؟"

جواب میں وہ رونے لگی۔ میں نے تسلی آمیز لہجے میں پھر پوچھا "ڈرو نہیں نازی۔ مجھے بتاؤ۔ کہاں ہے تمہارا خاوند اور تم یہاں کیسے پہنچ گئیں۔"

اس نے اپنے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے لباس پر ایک نظر ڈالی اور سمٹ گئی۔ میں نے قالین پر سے اس کا دوپٹہ اُٹھا کر اس کے سر اور شانوں پہ ڈال دیا۔ وہ حیرانی اور بے یقینی سے مجھے دیکھتی رہی۔ وہ ایک صحت مند اور خوش شکل عورت تھی اور اس خراب حلیئے کے باوجود اس کی دلکشی میں کمی نہیں آئی تھی۔ میں نے دوبارہ اپنا سوال دُہرایا تو جواب میں اس نے مجھ سے سوال کیا۔ "تم کون ہو جی اور یہاں کیا کر رہے ہو؟"

ظاہر ہے کہ وہ مجھے اپنا رازدار اور ہمدرد بنانے سے پہلے یہ اطمینان کرنا چاہتی تھی کہ میں اس کی مدد بھی کر سکوں گا یا نہیں۔

"میرے بارے میں فکر مت کرو۔" میں نے اُسے بتایا "میں اس گھر میں مہمان ہوں۔ ان لوگوں سے میرا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اگر میں تمہاری کچھ مدد کر سکا تو ضرور کروں گا۔ اب تم جلدی جلدی اپنے اور گامی کے بارے میں مجھے بتا دو ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو کوئی اور اس طرف آ نکلے۔"

جواب میں نازی نے مجھے جو بتایا وہ ایک ناقابلِ یقین اور تحیّر خیز داستان تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کا شوہر گامی میڈم کا پُرانا ملازم اور نمک خوار ہے۔ میڈم کے لیے اس نے کئی بار اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر بہت مشکل کارنامے انجام دیئے۔ وہ ہر قسم کی غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث رہا اور میڈم کے لیے مختلف فرائض ادا کرتا رہا۔ چند روز قبل

میڈم کو یہ اطلاع ملی کہ گامی اس کے ایک مخالف گروہ سے مل گیا ہے اور اُنہیں میڈم کی سرگرمیوں کے بارے میں اطلاعات فراہم کرتا ہے۔ میڈم نے گامی کو قید کر کے اُس پر ظلم اور تشدد شروع کر دیا۔ گامی نے اپنے جرم کا اقرار تو کیا لیکن اپنے دوسرے ساتھیوں کے بارے میں کچھ بتانے سے انکار کر دیا۔ میڈم کا تشدد اور ظلم بھی اس کی زبان نہ کھلوا سکا تو میڈم نے اس کی بیوی کو بھی اپنے ظلم کا نشانہ بنایا۔ وہ چاہتی تھی کہ نازی کو گامی کی سرگرمیوں کے بارے میں جو کچھ معلوم ہے وہ بتا دے اور اُن لوگوں کے نام بھی ظاہر کرے جو گامی کے ساتھ ملے ہوئے تھے، لیکن نازی کو فی الحقیقت اس بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ میڈم نے گامی کو دھمکی دی کہ اگر وہ بدستور اپنی زبان بند رکھے گا تو اس کی بیوی کو بھی معاف نہیں کیا جائے گا۔ اتنا کہنے کے بعد اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

"مگر تم اس کمرے میں کیسے آگئیں؟ اور چاشی یہاں کیا کر رہا تھا؟"

"یہ چاشی کا کمرہ ہے جی۔" اس نے مجھے مطلع کیا۔ میں نے حیران ہو کر کمرے پر نظر دوڑائی۔ یہ ایک خوبصورتی سے سجا ہوا آرام دہ کمرہ تھا جس میں آسائش کی تمام چیزیں موجود تھیں۔

"چاشی اس کمرے میں رہتا ہے؟"

"ہاں جی۔ میڈم اس پر بہت مہربان ہے۔"

"مگر چاشی ہے کون؟ یہ اس طرح جانوروں کی طرح کیوں چلتا ہے؟ کیا یہ سیدھا کھڑا نہیں ہو سکتا؟"

"چاشی کی بھی ایک کہانی ہے جی۔ سُنا ہے کہ چاشی ایک مالدار آدمی شناور کا بیٹا ہے۔ وہ سمگلروں اور مجرموں کا بادشاہ تھا۔ میڈم کو اس راستے پر ڈالنے والا بھی وہی تھا۔ کئی سال پہلے کی بات ہے کہ میڈم کے باپ سے اس کی دشمنی ہو گئی تو اس نے اس کو قتل کرا دیا اور میڈم کو اغوا کر لیا۔ شناور نے میڈم پر بہت ظلم کیے۔ وہ اسے اپنے کلب میں ناچنے پر مجبور کرتا تھا۔ وہ میڈم کی خوبصورتی پر مرمٹا تھا اور ہر قیمت پر اسے اپنا بنانا چاہتا تھا، لیکن اس کی کوئی زبردستی میڈم کا دل نہیں جیت سکی۔ مگر کچھ عرصے بعد میڈم نے ہار مان لی اور اُس کے ساتھ مجبوراً شادی کر لی۔ شناور اپنی جیت پر بہت خوش تھا مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس نے ایک زہریلی ناگن کو اپنایا ہے جو کبھی انتقام لینے سے باز نہیں رہتی۔ شناور کو اپنی اداؤں کے جال میں پھنسا کر میڈم نے آہستہ آہستہ اسے اپنے قابو میں کر لیا۔ ایک وقت ایسا آیا جب وہ میڈم پر پورا بھروسہ کرنے لگا۔ اپنا سارا کاروبار اُس نے میڈم کو سونپ دیا مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ میڈم اسے سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق نشے کا عادی بنا رہی ہے یہاں تک کہ وہ بالکل ناکارہ ہو کر رہ گیا۔ اب سارے کاروبار اور گروہ پر میڈم کا قبضہ تھا۔ شناور کو اپنے نشے کے سوا کسی اور چیز سے سروکار نہ تھا۔ اس طرح اسے ناکارہ بنانے کے بعد میڈم نے اس کے بیٹے چاشی کو اپنے انتقام کا نشانہ بنایا۔ چاشی کے گلے میں اس نے زنجیر باندھ دی اور اسے کتوں کی طرح زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا۔ وہ جہاں بھی جاتی چاشی کتے کی طرح زنجیر میں بندھا ہُوا اس کے ساتھ جاتا۔ اسے جانوروں کی طرح کھانا دیا جاتا تھا۔ اگر وہ کبھی اپنے پیروں پہ کھڑا ہونے کی کوشش کرتا تو اسے سخت سزا دی جاتی۔ یہاں تک کہ آہستہ آہستہ وہ جانوروں کی زندگی بسر کرنے کا عادی ہو گیا۔ وہ پالتو جانور کی طرح ہر وقت میڈم کے سامنے حاضر رہتا۔ کبھی مہربان ہو کر وہ اس کی طرف کھانے کی کوئی چیز پھینکتی تو وہ جانوروں کی طرح اُسے کھانے لگتا۔ میڈم کے لیے یہ نظارہ بہت دلچسپ ہوتا تھا اور وہ ہنسی سے بے قابو ہو جاتی۔

اذیت پہنچانے کے لیے میڈم یہ تماشا شناور کو بھی دکھایا کرتی تھی، لیکن اس بدنصیب کو تو ہوش ہی نہیں تھا۔ ایک سال پہلے شناور کے دل میں درد اُٹھا اور وہ مر گیا۔ اس طرح میڈم نے اس کی جگہ لے لی اور اب وہی ہر چیز کی مالک ہے۔ چاشی ایک وفادار جانور کی طرح اس کا تابعدار ہے اور میڈم کا انتقام پورا ہو گیا ہے۔"

یہ حیرت انگیز کہانی میرے لیے ناقابلِ یقین تھی، لیکن اس پر یقین کیے بغیر چارہ بھی نہ تھا۔ جو کچھ میں اب تک اپنی

آنکھوں سے دیکھ چکا تھا وہ اس کہانی کو باور کرانے کے لیے کافی تھا۔ اس روح فرسا کہانی کا کچھ حصہ میں یہاں آنے کے بعد اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ میڈم کے کمرے میں جس شخص کو تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا تھا وہ نازی کے شوہر گامی کے سوا اور کوئی نہ تھا۔

میں نے پُوچھا "مگر تم چاشی کے کمرے میں کیوں آئی تھی؟"

"میں خود نہیں آئی تھی جی۔ میڈم نے مجھے زبردستی یہاں بھجوایا تھا۔"

"میڈم نے زبردستی بھجوایا تھا؟" میں نے حیران ہو کر پُوچھا "وہ کیوں؟"

نازی کی نگاہیں جھک گئیں اور چہرہ شرم سے سُرخ ہو گیا "میڈم جن عورتوں سے ناراض ہوتی ہے اور اسے سزا دینا چاہتی ہے اُنہیں چاشی کے کمرے میں بھجوا دیتی ہے۔" اس کی آواز نہایت مدھم تھی، لیکن اس کا مفہوم بالکل واضح تھا۔

میڈم کون تھی؟ یہ میں ابھی تک نہیں جان سکا تھا۔ اس نے مجھے زبردستی یہاں بُلا کر کیوں قید کیا تھا؟ یہ بھی مجھے معلوم نہیں تھا، لیکن میڈم کی گھناؤنی اور غیر انسانی زندگی کا ایک اور گوشہ مجھ پر عیاں ہو گیا تھا۔

"تم جانتی ہو کہ گامی کہاں قید ہے؟" میں نے اس سے پُوچھا۔

وہ تیزی سے گردن ہلانے لگی "وہ کمرہ یہاں سے دُور نہیں ہے جی۔ کیا تم مجھے اس کے پاس لے جا سکتے ہو؟" اس نے اُمید بھرے لہجے میں مجھ سے سوال کیا۔

"چلو میرے ساتھ۔ مجھے اس کمرے تک لے چلو۔"

نازی نے خوش ہو کر مجھے دیکھا اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی مگر پھر چاشی کی طرف دیکھ کر اس کے قدم رُک گئے جو قالین پہ بے ہوش پڑا تھا۔

میں نے اسے تسلی دی "اس کی فکر نہ کرو۔ وہ ابھی ہوش میں نہیں آئے گا۔"

ہم دونوں کمرے سے نکلے تو میں نے کمرے کا دروازہ باہر سے مقفل کرنے سے پہلے مسلح محافظ کو بھی گھسیٹ کر کمرے کے اندر ڈال دیا۔ میں نے اس کی بندوق اُٹھا لی اور نازی کو آگے چلنے کا اشارہ کیا۔ اس کے پیروں میں جیسے بجلی کی رفتار پیدا ہو گئی تھی۔ وہ قریب قریب بھاگتی ہوئی میرے آگے چل رہی تھی۔ چند گیلریوں سے گزرتے ہوئے ہم ایک راہداری کے سامنے پہنچ گئے۔ یہاں پہنچ کر نازی اچانک رُک گئی۔ ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر اس نے مجھے بالکل خاموش ہونے کا اشارہ کیا اور میرے نزدیک کھسک آئی۔

اُس نے سرگوشی میں کہا "گامی کا کمرہ سامنے ہے مگر وہاں ایک پہریدار ہر وقت کھڑا رہتا ہے۔"

میں نے اُسے وہیں ٹھہرنے کو کہا اور خود دبے پاؤں آگے بڑھا۔ راہداری کے موڑ پر رُک کر میں نے گردن آگے بڑھا کر دیکھا تو سامنے مجھے پہریدار نظر آگیا۔ وہ ایک کرسی پر ٹانگیں پسارے نیم دراز تھا اور اس وقت سویا ہُوا تھا۔ میں دبے پاؤں دروازے کی طرف بڑھا۔ پہریدار کے نزدیک پہنچ کر میں نے مزید تسلی کرنے کے لیے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ دُور دُور تک کوئی ذی روح موجود نہ تھا۔ سب سے پہلے میں نے پہریدار کی بندوق اُٹھا کر اپنے قبضے میں کر لی جو کرسی سے ٹکی ہوئی رکھی تھی۔ وہ سو ضرور رہا تھا مگر ہوشیار اور چوکس تھا۔ میرے قدم آگے بڑھنے سے پہلے اُس نے اپنی آنکھیں کھولیں اور مجھے اپنے سر پر دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ حیرت کے سمندر میں سے نکل کر مجھ پر حملہ آور ہوتا میں نے اُس کی گردن پر ایک ضرب لگائی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ دروازہ باہر سے مقفل تھا، لیکن اس کی چابی پہریدار کی جیب میں موجود تھی۔ میں دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا تو میری نظریں گامی پر پڑیں جو کمرے کے آخری گوشے میں ایک کرسی سے بندھا ہوا تھا۔ اسکے ہاتھ اسکی کمر پر بندھے ہوئے تھے اور ٹانگیں کرسی کے دونوں پایوں سے۔ یہ وہی شخص تھا جسے میں نے

میڈم کے کمرے میں دیکھا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر اس ظلم کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا جو ان لوگوں نے اُس پر روا رکھا تھا۔ وہ اپنی بے رونق اور بے جان آنکھوں سے مجھے دیکھتا رہا اور حرکت کرنے کی مطلق کوشش نہیں کی۔ میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر اسے رسیوں کی گرفت سے آزاد کیا۔ اس کے ہاتھ اور ٹانگیں اتنے اکڑ گئے تھے کہ وہ سیدھا کھڑا بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ بمشکل اس کا ہاتھ تھام کر میں اسے قریباً گھسیٹتا ہوا دروازے کی طرف لے گیا اور دوسرے ہی لمحے ہم راہداری میں تھے۔ باہر نازی ہماری منتظر تھی۔ اپنے شوہر کو دیکھتے ہی وہ بے اختیار دوڑ کر اس سے لپٹ گئی اور آنسو بہانے لگی۔ مگر یہ ان باتوں کا وقت نہ تھا۔ اس لیے میں نے اُسے عمارت سے باہر نکلنے کا راستہ بتانے کے لیے کہا۔ وہ آنسو پونچھ کر تیزی سے ہمارے آگے آگے چلنے لگی۔ گامی کو سہارا دے کر لے چلنے کی ذمہ داری مجھ پر تھی۔ میں نے تنگ آ کر اسے اپنی کمر پر سوار کرلیا اور تیز قدموں سے نازی کے پیچھے چلنے لگا۔ نہ جانے کتنی گیلریوں اور دروازوں سے گزر کر ہم بیرونی حصے میں پہنچ گئے۔ ابھی تک ہماری راہ روکنے والا ہمیں کوئی نہیں ملا تھا، لیکن مجھے اندیشہ تھا کہ عمارت کے باہر حفاظت کا کوئی انتظام ضرور ہوگا۔ نازی کی معلومات یہاں بھی کام آئیں۔ وہ ایک ایسے عقبی راستے سے واقف تھی۔ جو باغ میں سے ہوکر گزرتا تھا اور ہمیں بلند حفاظتی دیوار کے باہر پہنچا سکتا تھا۔ ہم ابھی باغ میں پہنچے ہی تھے کہ مجھے کسی کے ہنسنے کی آواز سنائی دی اور ہمارے قدم جہاں تھے وہیں رُک گئے۔ یہ کسی عورت کے ہنسنے اور ایک مرد کے بولنے کی آواز تھی اور رفتہ رفتہ ہمارے نزدیک آرہی تھی۔ میرے پاس سوچنے اور فیصلہ کرنے کے لیے بہت کم وقت تھا، لیکن میں نے اس میں تاخیر نہیں کی۔

میں نے نازی سے سرگوشی میں کہا: "باہر کا راستہ یہاں سے کتنی دور ہے؟"

"زیادہ دُور نہیں ہے۔"

"اچھا غور سے سنو۔ ہم سب کا بیک وقت باہر جانا بہت مشکل ہے۔ تم گامی کو لے کر باہر جاؤ اور جتنی جلد ممکن ہوسکے زیادہ سے زیادہ دُور چلی جاؤ۔ ہوسکتا ہے کچھ فاصلے پر تمہیں ایک ٹیکسی کھڑی ہوئی ملے گی۔ وہ درختوں کی اوٹ میں ہوگی لیکن تم اسے تلاش کرسکتی ہو۔ ٹیکسی ڈرائیور سے کہنا کہ تمہیں ہوٹل والے صاحب نے بھیجا ہے اور یہ پانچ سو روپے اسے دے دینا۔ پھر تم جہاں کہو گی وہ تمہیں پہنچا دے گا۔" میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پانچ نوٹ نکال کر اس کے حوالے کر دیئے۔ وہ حیرت سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ گامی کے ہاتھ پیر اب کچھ بہتر حالت میں تھے اور وہ ہماری تمام گفتگو غور سے سن رہا تھا۔

"دیر نہ کرو۔" میں نے تاکید کی۔ "میں اس سے زیادہ تمہارے لیے کچھ اور نہیں کرسکتا۔ اس کے بعد تمہاری تقدیر۔ اب چلی جاؤ۔" ان دونوں نے تشکر آمیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ زبان سے کچھ نہیں کہا، لیکن ان کی خاموش نگاہیں بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔ پھر وہ پلٹ کر تیزی سے باڑھ کے پیچھے غائب ہوگئے۔ میں ان کی طرف سے مطمئن ہوکر کھڑا سوچتا رہ گیا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیئے؟ اتنی دیر میں ہنسی اور قدموں کی چاپوں کی آواز اور نزدیک آگئی تھی۔ محافظ کی بندوق میں نے زمین پر ڈال دی اور پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر ٹہلنا شروع کردیا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ آگے چل کر میرا کیا انجام ہوگا، لیکن نازی اور اُس کے شوہر کی جان بچا کر مجھے رُوحانی مسرت حاصل ہوئی تھی۔ حالانکہ مجھے ابھی تک پوری طرح یہ یقین نہیں تھا کہ اُن دونوں کی جانیں بچ بھی سکیں گی یا نہیں؟

سامنے والی پگڈنڈی پر دو انسانی ہیولے نمودار ہوئے اور جب وہ نزدیک آئے تو میں نے دیکھا کہ وہ میگی اور وہی شخص تھا جسکو میں نے میگی کے ساتھ بیڈمنٹن کھیلتے ہوئے دیکھا تھا۔ مرد کا ہاتھ میگی کی نازک کمر کے گرد تھا اور وہ ہنس ہنس کر باتیں کررہے تھے۔ مجھے سامنے پاکر وہ دونوں ٹھٹک کر رُک گئے اور میگی کی کھنکتی ہوئی ہنسی خاموشی میں بدل گئی۔ میگی نے کہنی سے ٹہوکا دیا اور اس شخص نے میگی کی کمر پر سے اپنا ہاتھ ہٹالیا۔

میں جیبوں میں ہاتھ ڈال کر اطمینان سے کھڑا انہیں دیکھتا رہا۔

"گڈ ایوننگ سر۔" میگی نے اپنے آپ کو سنبھال رکھا اور مسکرانے کی کوشش کرنے لگی۔ "آپ اور اس وقت یہاں.... باغ میں.....؟"

"یہی سوال میں تم سے بھی پوچھ سکتا ہوں۔" میں نے بارُعب آواز میں کہا۔ "تم میگی ہو نا؟"

"یس سر۔" وہ کچھ پریشان ہوکر بولی۔

"اور یہ تمہارا دوست ہے۔ شاید میڈم نے تمہیں اتنی رات گئے اس طرح گھومنے کی اجازت نہیں دی ہے۔"

وہ دونوں سٹپٹا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

میں نے موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کہا: "اپنے دوست سے کہو کہ یہاں سے فوراً چلا جائے۔"

میگی نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا جو ابھی تک اپنے ہاتھ میں اُس کا ہاتھ تھامے ہوئے تھا۔ اس نے میگی کا ہاتھ چھوڑ کر رُخصت ہونے میں ذرا بھی دیر نہیں لگائی۔ میں اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر میں نے میگی پر نظر ڈالی۔ وہ ایک سفید رنگ کا نائٹ گون پہنے ہوئے تھی۔ سنہری بال اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے اور میں نے پہلی بار کھڑکی سے دیکھ کر اس کے بارے میں جو رائے قائم کی تھی اس کی اب تصدیق ہوگئی تھی۔ وہ ایک طرح دار عورت تھی۔ اس کے گالوں پر سُرخی پھیلی ہوئی تھی جو یقیناً شرمانے کی وجہ سے نہیں تھی۔ میں اس کے نزدیک گیا تو مجھے پتہ چل گیا کہ وہ ہلکے ہلکے سرور کے عالم میں تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ دونوں جس طرح گھبرا گئے تھے اس کے پیشِ نظر میں نے یہ اندازہ لگایا کہ میڈم کی طرف سے انہیں اس طرح ایک دوسرے سے ملنے کی اجازت نہیں تھی اور وہ اپنی چوری پکڑے جانے پر گھبرا گئے تھے۔ میں نے اس صورتِ حال سے فائدہ اُٹھانے کا فیصلہ کرلیا۔

"میگی بتاسکتی ہو اس وقت میڈم کہاں ہیں؟"

وہ پریشان ہوگئی: "سر۔ وہ مکان سے باہر گئی ہوئی ہیں۔ کل صبح واپس آئیں گی۔"

"اسی لیے تم ان کی غیر موجودگی میں موج اُڑا رہی ہو۔" میں نے رُعب سے کہا۔

وہ گھبرا گئی: "جی سر۔ میں تو..... ٹی۔ جے میڈم کے دوست ہیں۔ میں تو ان کا دل بہلا رہی تھی۔"

"کیا اس کے لیے تمہیں میڈم نے کہا تھا؟"

"جی نہیں۔ مگر....."

میں نے ایک تیر چلایا: "میگی۔ تم جانتی ہو کہ ٹی۔ جے کے بارے میں میڈم کے جذبات کیا ہیں۔ کیا وہ اس سے تمہارا گھل مل جانا پسند کریں گی؟"

اس کا چہرہ خوف سے سفید پڑ گیا: "سر۔ میں مجبور تھی۔ مسٹر ٹی۔ جے نے مجھے خود اپنے پاس بلوایا تھا۔ اگر ان کا حکم نہ مانتی تو وہ ناراض ہوجاتے۔"

"تمہیں میڈم سے زیادہ ٹی۔ جے کی ناراضی کا خیال ہے؟ تم محض میڈم کی سیکرٹری ہو۔ تمہیں ان کی غیر موجودگی میں ان کے مہمانوں سے بے تکلف ہونے کا حق حاصل نہیں ہے۔"

"آئی۔ ایم سوری سر۔" وہ سہم کر بولی۔ پھر وہ میرے بالکل نزدیک آگئی۔ چند لمحے مجھے اپنی سحر آگیں نگاہوں سے دیکھتی رہی پھر دھیمی آواز میں بولی: "سر۔ فارگاڈ سیک۔ میڈم کو اس بارے میں کچھ نہ بتانا۔ پلیز۔"

اس کی آواز میں لجاجت اور سپردگی تھی۔ میں نے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک حسین اور پُرکشش عورت تھی اور میڈم کے پاس اس کی موجودگی اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ کوئی معصوم اور الھڑ عورت نہیں ہوسکتی۔ وہ یقیناً ہوشیار اور چالاک ہوگی، لیکن اس وقت صورتِ حال نے اسے بے بس کردیا تھا۔

اس نے میری خاموشی سے کوئی اور مطلب اخذ کیا اور لگاوٹ کے ساتھ میرے اور قریب کھسک آئی۔ "ٹی جے میڈم

کے منظورِ نظر ہیں۔ مجھے ان کے پاس نہیں جانا چاہیے تھا۔ میڈم اس معاملے میں بہت زیادہ جذباتی اور حساس ہیں۔ اگر اُنہیں معلوم ہو گیا تو......تو......" اُس کی آواز گھُٹ کر رہ گئی۔ لیکن مَیں اس کا مفہوم سمجھ چکا تھا۔ یک لخت میرے ذہن میں ایک خیال کلبلایا اور مَیں نے موقع سے فائدہ اُٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔

"سنو میگی" مَیں نے رومانٹک لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ "مَیں بھی میڈم کا مہمان ہوں۔ مجھے نیند نہیں آ رہی اور تنہائی نے پریشان کر دیا ہے۔ کیا تم میرے ساتھ تھوڑا وقت گزارنا پسند کرو گی؟"

اس کا چہرہ خوشی سے کھل اُٹھا "سر۔ آپ کی خدمت کر کے مجھے خوشی ہو گی۔"

"تو پھر ہم لوگ گھومنے کے لیے سمندر کے ساحل پر چلتے ہیں۔"

وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگی "ساحل سمندر پر اس وقت؟!" گھڑی میں اس وقت رات کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔

"تو پھر کیا ہُوا" مَیں نے اپنی آواز میں اور زیادہ مٹھاس پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "سمندر کا ساحل اور وہ بھی رات کے وقت میری کمزوری ہے۔ مجھے وہاں جا کر سکون ملتا ہے۔ خوشی ملتی ہے۔ فکر نہ کرو۔ ہم صبح کی روشنی پھیلنے سے پہلے واپس آجائیں گے۔" وہ خاموش سوچ رہی تھی۔ مَیں نے اس کا ہاتھ تھام لیا "بھروسہ رکھو۔ میڈم کو بالکل پتہ نہیں چلے گا۔" میرے لہجے میں پوشیدہ دھمکی بالکل واضح تھی۔ اس نے ایک لمحہ سوچا پھر مسکرا کر مجھے دیکھا اور بالوں کو جھٹک کر بولی "چلیں۔ آپ کو خوش رکھنا ہمارا فرض ہے۔"

اب تک ہر کام میری مرضی اور آسانی کے مطابق ہو رہا تھا اور مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس زنداں سے باہر نکلنا میرے لیے اس قدر آسان ہو جائے گا۔ میڈم گھر میں موجود نہیں تھی۔ چاشی اور دونوں محافظ کمروں کے اندر بے ہوش پڑے تھے۔ میگی میرے اشاروں پر چل رہی تھی۔ ایسے میں میدان بالکل صاف نظر آ رہا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ علی الصبح ساڑھے چھ بجے ایک فلائیٹ یہاں سے روانہ ہوتی ہے۔ اگر تقدیر یاوری کرے تو مَیں ان تمام اُلجھنوں سے نجات حاصل کر کے صبح سویرے آزادی کی منزل کی طرف روانہ ہو سکتا تھا۔

مَیں نے مسکرا کر میگی کی طرف دیکھا اور اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ اپنی آنکھوں میں دُنیا بھر کا خمار بھرے ہُوئے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"کوئی ہمیں اس وقت باہر جانے سے روکے گا تو نہیں؟" مَیں نے اپنے خدشات دُور کرنے کی غرض سے پُوچھا۔

"مَیں میڈم کی سیکرٹری ہوں سر۔ مجھے بھلا کون روکنے کی جرأت کر سکتا ہے؟"

"ویری گڈ۔ تو پھر دیر کس بات کی ہے؟" مَیں نے اپنے دھڑکتے دِل کو قابو میں کرتے ہوئے کہا۔

"بس مجھے چند منٹ کی اجازت دیجئے۔ مَیں ابھی آئی۔ آپ یہیں ٹھہریں" وہ ایک ادائے دلبرانہ کے ساتھ مجھے دیکھ کر تیزی سے عمارت کے اندر چلی گئی اور مَیں تنہا کھڑا اسکو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ مَیں اس کی طرف سے مشکوک تھا۔ کوئی عجب نہیں تھا کہ وہ مجھے کسی جال میں پھنسانے کی سازش کر رہی ہو! لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ میرے لیے اس کا انتظار کرنے کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا۔ مجھے نازی اور اس کے شوہر گامی کا خیال آیا۔ خدا جانے وہ اس چاردیواری سے باہر نکلنے میں کامیاب بھی ہوئے یا نہیں؟ اگر ٹیکسی ڈرائیور خوش قسمتی سے اُنہیں مل گیا ہوگا تو وقتی طور پر اُن کا بچ نکلنا یقینی تھا۔ گامی کے بارے میں اُس کی بیوی نے مجھے جو کچھ بتایا تھا۔ اسکی روشنی میں وہ بذاتِ خود ایک بے ضمیر، جرائم پیشہ اور سنگدل انسان تھا۔ لیکن اس کی بیوی کی مظلومیت نے مجھے اس پر بھی ترس کھانے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ خدا اور قانون کا مجرم تھا۔ اسے سزا یا جزا دینا بھی ان ہی کے اختیار میں تھا۔ مَیں ان ہی سوچوں میں گم بیرونی برآمدے میں ٹہلتا رہا۔ یکایک اونچی ایڑی کی آواز میرے کانوں میں آئی۔ کوئی عورت تیزی سے بھاگتی ہوئی آ رہی تھی۔ یہ میگی تو نہیں ہو سکتی۔

اس لیے کہ وہ اونچی ایڑی کے سینڈل نہیں پہنے ہوئے تھی۔ تو پھر یہ کون ہو سکتی تھی؟ ہو سکتا ہے میگی نے مجھے میڈم کے بارے میں غلط بتایا ہو اور یہ وہی ہو! بہرحال۔ ہر چہ بادا باد۔ اب کیا ہو سکتا تھا۔ مَیں ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھا۔ ٹپ ٹپ کی آواز بالکل نزدیک آگئی اور پھر مَیں نے میگی کو نہایت تیزی سے دوڑ کر اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا وہ اس وقت بدلے ہوئے لباس میں تھی۔ سفید نائٹ گون کی جگہ اب وہ ایک بغیر آستین کا چُست فراک پہنے ہوئے تھی۔ اس کی سینڈل بھی سفید تھی۔ بجلی کی دودھیا روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ بھاگتے ہوئے اس کے تراشیدہ بال ہوا میں لہرا رہے تھے اور اس لباس میں وہ کوئی آسمانی مخلوق نظر آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک سفید رنگ کا بیگ تھا۔ وہ تیزی سے دوڑتی ہوئی میرے نزدیک آئی تو اُس کی سانس بے ترتیب تھی اور چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں ستاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔

"سر" وہ اپنے سانس کو قابو میں کرتے ہوئے بولی۔ "مَیں نے آپ کو زیادہ انتظار تو نہیں کرایا؟"

مَیں نے مسکرا کر اسے دیکھا "اچھے وقت کا انتظار کرنے میں کوئی حرج نہیں ہوتا میگی۔"

اس نے آگے بڑھ کر اپنا بازو میرے بازو میں حائل کر دیا۔ اب وہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ نڈر اور بے باک نظر آ رہی تھی اور اس کا سبب مجھے اسکی سانسوں میں بسی ہوئی مہک نے بتا دیا تھا۔ اپنے کمرے میں جا کر اُس نے لباس تبدیل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو مشروب کی چُسکی لگا کر تازہ دم بھی کر لیا تھا۔

"کم آن مائی ڈیئر سر" اُس نے چہکتی ہوئی آواز میں کہا اور مجھے لیے ہوئے پورٹیکو میں کھڑی ہوئی سُرخ رنگ کی کھُلی چھت کی کار کی طرف چل پڑی۔ میرے لیے اس نے اگلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا اور پھر خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر سٹیرنگ سنبھال لیا۔

لمبی بل کھاتی ہوئی ڈرائیو وے کسی طرح ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ آخر خدا خدا کر کے ہم بلند و بالا آہنی گیٹ تک پہنچ گئے۔ محافظوں نے کار کو دیکھتے ہی دروازہ کھول دیا تھا اور اس سے گزرتے ہوئے میگی نے کار کی رفتار کم کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔

عمارت کے گیٹ سے باہر نکلنے کے بعد اس نے کار کی رفتار اور تیز کر دی یہاں تک کہ وہ ۸۰ میل فی گھنٹہ تک پہنچ گئی۔ اس کے بعد بھی اس نے ایکسی لیٹر پر اپنے پیر کا دباؤ کم نہیں کیا۔ وہ مدہوش کُن تیز خوشبو میں بسی ہوئی تھی۔ ٹھنڈی اور تیز ہوا اس کی زُلفیں اُڑا رہی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی تیز رفتاری نے میرے ہوش بھی اُڑا دیئے تھے۔ مَیں بظاہر مطمئن اور بے خوف بیٹھا ہوا تھا، لیکن مجھے اپنے اعصاب اور خوف پر قابو پانے کے لیے بہت جدّوجہد کرنی پڑ رہی تھی۔ مجھے کار کی بڑھتی ہوئی رفتار سے اتنا ڈر نہیں تھا جتنا اس خیال سے تھا کہ وہ اس وقت خمار کے عالم میں تھی اور رات کی شبنم میں بھیگی ہوئی ٹھنڈی ہوا لمحہ بہ لمحہ اس کے خمار میں اضافہ کر رہی تھی۔ ایسے عالم میں تیز رفتار کار کو قابو میں رکھنا خاصا مشکل ہو سکتا تھا۔

مَیں نے اسے باتوں میں لگانے کے لیے پُوچھا "ساحل یہاں سے کتنی دُور ہے؟"

"صرف پچاس میل" اُس نے بے پرواہی سے جواب دیا۔ "بس ہم ابھی وہاں پہنچ جائیں گے۔" اس کے بعد اس نے بے تحاشا ہنسنا شروع کر دیا۔ "سر۔ آپ کو ڈر تو نہیں لگ رہا؟"

"ڈرنے کی کیا بات ہے" مَیں نے جی کڑا کر کے جواب دیا "مگر تم کار کی رفتار پر قابو رکھو۔"

"اس وقت تو آپ کے سمیت ہر چیز میرے قابو میں ہے سر" وہ بے تکلفی سے بولی۔ پھر ہنسی "کیوں۔ کیا غلط کہتی ہوں؟"

مَیں نے خاموش رہنا بہتر سمجھا۔ سڑک سنسان اور ویران تھی، لیکن کار کی بڑھتی ہوئی رفتار میرے لیے پریشان کُن تھی۔ مَیں محسوس کر سکتا تھا کہ میگی کے ہوش و حواس رفتہ رفتہ اس کا ساتھ چھوڑ رہے تھے اور وہ بہکنے لگی تھی۔ اس کا ثبوت اس

کی گفتگو تھی۔ وہ نہ جانے کیا کیا باتیں کر رہی تھی، لیکن اب اس کی آواز میں ہلکی سی لڑکھڑاہٹ پیدا ہو گئی تھی اور اس کی باتوں میں ربط اور معنی کی کمی ہو گئی تھی۔

یکایک سمندر کی بھیگی ہواؤں نے موجوں کا پیغام سنایا اور مجھے احساس ہو گیا کہ ہم ساحل کے نزدیک پہنچ گئے ہیں۔ چند لمحے بعد دور سے سمندر کی جھلک بھی نظر آنے لگی جو رفتہ رفتہ قریب تر ہو رہا تھا، لیکن میگی نے کار کی رفتار کم نہیں کی میں نے اسے ٹوکا۔ "میگی۔ ہم ساحل پر پہنچ گئے ہیں۔ کار روک دو۔"

مگر میگی کسی اور ہی دنیا میں پہنچ چکی تھی۔ میں نے قریب ہو کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں نیم وا تھیں۔ اور وہ شاید نیم خوابی کے عالم میں تھی۔

"میگی میگی" میں نے اسے جھنجھوڑا۔ "کار روکو۔"

اس نے اچانک مجھے یوں چونک کر دیکھا جیسے خواب سے جاگی ہو۔ اس کی نگاہیں میری طرف تھیں اور ان جانے میں ہاتھ سٹیرنگ پر حرکت کر رہے تھے۔ تیز رفتار کار نے یک لخت رخ بدلا اور میں نے چیخ کر اسے مطلع کیا۔ "میگی۔ میگی۔ سامنے دیکھو۔"

میگی نے بہت مشکل سے اپنی نظریں میرے چہرے سے ہٹا کر سامنے دیکھا مگر اس وقت بہت دیر ہو چکی تھی۔ کار پوری تیز رفتاری سے درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میگی نے گھبرا کر دیکھا اور پوری قوت سے بریک پیڈ دبا ڈالا۔ کار نے زور زور سے چند جھٹکے لیے، دو تین چکر کھائے اور پھر اچھل کر قلابازیاں کھاتی ہوئی ایک طرف کو لڑھکنے لگی۔ میگی کے منہ سے ایک لمبی چیخ کی آواز نکلی اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیلنے لگا۔ موت مجھے صاف طور سے اپنی نظروں کے سامنے دکھائی دے رہی تھی۔

میری آنکھ کھلی تو میری نگاہوں کے سامنے آسمان تھا جس پر بادل کے ٹکڑے تیر رہے تھے ہلکے چاند کی روشنی ان بدلیوں میں سے جھانکتی ہوئی بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ ساحل سمندر کی بھیگی ہوئی خنک ہوا میرے جسم کو گدگدا رہی تھی اور میرا جی چاہتا تھا کہ اسی طرح چپ چاپ سکون کے ساتھ آسمان پر بدلیوں کا یہ رقص دیکھتے دیکھتے سو جاؤں، لیکن پھر مجھے یاد آیا کہ میں ایک کار کے حادثے کا شکار ہو گیا تھا۔ میں پریشانی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ شکر ہے کہ جسم پر کوئی کاری ضرب نہیں آئی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ جب کار نے قلابازیاں لگانی شروع کیں تو میں اچھل کر ساحل کی نرم نرم ریت پر جا گرا۔ میں نے اپنے آس پاس کا جائزہ لیا۔ میگی اور اس کی کار کو تلاش کرنا بھی ایک ضروری امر ہے۔ پھر مجھے یہ بھی احساس نہیں تھا کہ میں کتنی دیر بیہوش رہا تھا۔ میرے اردگرد نہ تو کار اور اس کے تباہ شدہ ڈھانچے کے کوئی آثار تھے اور نہ میگی کا کوئی نشان تھا۔ میں نے اپنے جسم کو ٹٹولا اور یہ اطمینان کر لیا کہ جسمانی طور پہ میں بالکل محفوظ اور فٹ تھا۔ میرے سامنے حد نظر تک سمندر موجیں مار رہا تھا۔ اسکی پُرشور مہیب موجیں ساحل سے ٹکرا ٹکرا کر بے نیل و مرام غصے میں جھاگ اڑاتی ہوئی واپس لوٹ رہی تھیں۔ ہلکی چاندنی میں سمندر کا نیلا جھاگ اڑاتا ہوا پانی ایک عجیب منظر پیش کر رہا تھا، لیکن میگی کہاں تھی؟ اور اس کی کار کہاں غائب ہو گئی تھی؟

اپنی مکمل خیریت کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے قدم آگے بڑھائے۔ سمندر کی طرف جانا بے کار تھا۔ ساحل پر کسی قسم کی دیوار یا حد بندی نہیں تھی۔ یہ ایک بہت خوبصورت اور قدرتی بیچ تھی۔ اس لیے میں دیکھ سکتا تھا کہ سمندر میں میگی یا اسکی کار کی موجودگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بائیں جانب درختوں کے جھنڈ اور باغات کا سلسلہ تھا۔ یہ اجاڑ اور ویران قسم کے باغ تھے۔ بلکہ انہیں جنگل کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ میں نے

بائیں جانب کے درختوں کی طرف رخ کیا اور کافی دور تک چلا گیا۔ یہ گھنا جنگل نہ تھا، لیکن پھر بھی درختوں کے سائے پھیلے ہوئے تھے اور اس مدھم روشنی بلکہ نیم تاریکی میں دور سے کسی چیز کو تلاش کر لینا آسان کام نہ تھا۔ جہاں سے درختوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا وہاں ایک سایہ دار مقام پر میں نے میگی کی کار کو تلاش کر لیا۔ کار نہ جانے کتنی قلابازیاں کھانے کے بعد اب پہلو کے بل پڑی ہوئی تھی۔ کچھ دیر پہلے یہ ایک چمکدار اور قیمتی کار تھی، لیکن اب اس کی حیثیت کباڑ سے زیادہ نہ تھی۔ میں تیزی سے کار کی طرف بڑھا۔ نزدیک پہنچ کر معلوم ہوا کہ کار بالکل تباہ ہو چکی ہے۔ اس کے اندر اگر کوئی موجود ہوتا تو اس کی ہڈیاں تک سرمہ بن گئی ہوتیں، لیکن کار خالی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میگی کو بھی کار نے میری طرح اچھال کر کہیں دور پھینک دیا تھا۔ کار کو جس نوعیت کا حادثہ پیش آیا تھا اس کے پیش نظر اس میں آگ لگ جانی چاہیئے تھی جبکہ وہ آتش زدگی سے بھی محفوظ رہی تھی۔ یہ تمام باتیں اس امر کی نشاندہی کر رہی تھی کہ میگی بھی اس حادثے میں ہلاک نہیں ہوئی ہے اور قدرت کے معجزے کے طور پہ زندہ سلامت بچ گئی ہے، لیکن وہ تھی کہاں؟

میں نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور پھر درختوں کے جھنڈ میں جا کر دیکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ قریباً آدھ فرلانگ گیا ہوں گا کہ میرے قدم ٹھٹھک کر رہ گئے۔ درختوں کے اس سلسلے کے بعد پھر ساحل شروع ہو جاتا تھا۔ ساحل پر میں کچھ فاصلے پر ایک موٹر بوٹ کا ہیولا صاف طور پہ دیکھ سکتا تھا۔ اس کے نزدیک ہی ایک اور چھوٹی بوٹ بھی موجود تھی، لیکن کوئی ذی روح نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں ابھی تک بے خوف و خطر اور بے دھڑک آگے بڑھ رہا تھا، لیکن اب احتیاط لازم تھی۔ چنانچہ میں نے ایک درخت کی آڑ میں کھڑے ہو کر حالات کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔

چند لمحے بھی نہیں گزرے تھے کہ میں نے بڑی موٹر بوٹ کی طرف سے کچھ آوازیں سنیں اور پھر ایک فائر کی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی ایک انسانی چیخ ابھری اور اس کی آواز سناٹے کو چیرتی ہوئی دور تک پھیل گئی —

میں دبے پاؤں موٹر بوٹ کی طرف بڑھا، لیکن پھر میرے قدم جیسے زمین نے تھام لیے۔ چھوٹی موٹر بوٹ سے ٹیک لگائے ہوئے ایک لمبا تڑنگا آدمی کھڑا ہوا تھا۔ اس کے سر پہ بڑا سا ہیٹ تھا اس کے ہاتھ میں ایک خودکار مشین گن تھی اور وہ عقابی نظروں سے چاروں طرف کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ میرے ریت میں چلنے اور سمندر کے شور کی وجہ سے وہ میرے قدموں کی آہٹ نہیں سن سکا تھا ورنہ اس کے لیے مجھے نشانہ بنانا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ بڑی بوٹ کی طرف سے ایک بار پھر چیخ کی آواز سنائی دی، مشین گن بردار نے اس طرف توجہ دینا ضروری نہیں سمجھا، لیکن مجھے یہ جاننے میں دیر نہیں لگی کہ بوٹ سے آنے والی آواز ایک زنانہ آواز تھی۔ میں نے ایک لمبا چکر کاٹا اور پہریدار کے عقب میں جا پہنچا۔ اس کے کان موٹر بوٹ کی طرف لگے ہوئے تھے اور نگاہیں ساحل کی طرف نگراں تھیں۔ پھر سمندر کی موجیں اور ساحل کی پُرشور ہوائیں بھی میری مددگار رہیں۔ میں اس کے سر پہ پہنچ گیا، لیکن اسے احساس تک نہ ہوا۔ جب ایک سوکھے ہوئے پتے کے چرچرانے کی آواز پر وہ برق رفتاری سے مڑا تو اس وقت بہت دیر ہو چکی تھی۔ میرا دایاں ہاتھ پوری طاقت سے اس کی گردن کے پچھلے حصے پر لگا اور وہ کوئی آواز نکالے بغیر کٹے ہوئے شہتیر کی طرح اوندھے منہ ریت پر گر گیا۔ میں نے اس کی مشین گن پر قبضہ جمانے کے بعد پہلے یہ تصدیق کرنے کی کوشش کی کہ وہ تنہا ہی تھا یا اس کا کوئی اور ساتھی بھی آس پاس موجود تھا۔ لیکن وہ درحقیقت تنہا تھا اور شاید اسی وجہ سے اتنی آسانی سے میرا شکار بن گیا تھا۔ اس غیر آباد اور ویران ساحل پہ دو پُراسرار موٹر بوٹس کی موجودگی اس بات کا ثبوت تھی کہ یہ لوگ غیر قانونی سرگرمیوں

میں ملوث تھے۔ اب میرے لیے دو ہی راستے تھے۔ یا تو چپ چاپ اپنی راہ لیتا یا پھر موٹر بوٹ پر جا کر یہ کھوج لگانے کی کوشش کرتا کہ آخر یہ لوگ کون تھے اور اس جگہ کیا کر رہے تھے؟ پھر شاید مجھے میگی کے بارے میں بھی کوئی اطلاع مل سکتی تھی۔ اگرچہ میگی کی خبر گیری نہ تو میرے فرائض میں شامل تھی اور نہ ہی میں اس کی خاطر اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالنے کا کوئی ارادہ رکھتا تھا، لیکن پھر کچھ سوچنے کے بعد میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ مجھے موٹر بوٹ پر جانا ضرور چاہیے۔ خدا جانے موٹر بوٹ پر کتنے لوگ موجود تھے اور ان کے ارادے کیا تھے؟ ہو سکتا ہے کہ ان کے خطرناک ساتھی اردگرد بھی موجود ہوں اور میں بے خبری میں ان کا نشانہ بن جاؤں۔ پھر میرے پاس کوئی سواری موجود نہ تھی۔ اگر وہ لوگ مجھے گرفتار کرنے پر تل جاتے تو میں ان سے بھاگ کر زیادہ دور نہیں جا سکتا تھا۔ اس لیے میں نے اس مقولے پر عمل کیا کہ بہترین دفاع یہ ہے کہ جارحانہ حملہ کر دیا جائے، لیکن موٹر بوٹ پر جانے سے پہلے میں نے پہریدار کی خاکی بش شرٹ اور بڑا سا ہیٹ اپنے قبضے میں کر لیا اور انہیں زیب تن کرنے کے بعد مجھے یہ احساس ہوا کہ نیم اندھیرے میں مجھے پہلی نظر میں کوئی بھی نہیں پہچان سکے گا۔ بش شرٹ میں نے اپنی قمیص کے اوپر ہی پہن لی اور پہریدار کو مزید بے عمل رکھنے کی غرض سے میں نے اس کی گُدّی پر ایک اور ہلکی سی ضرب لگا دی۔ "سوری بھائی۔" میں نے اُسے مخاطب کرکے کہا۔ "مگر میں حفاظتِ خود اختیاری کے تحت بے ہوشی کے عالم میں بھی تم پر ہاتھ اٹھا رہا ہوں۔ معاف کر دینا۔"

اس کے ہیٹ اور مشین گن پر قابو پانے کے بعد میں اپنے آپ کو بڑا اعتماد محسوس کرنے لگا تھا۔ میں نے اس کے بے ہوش بھاری بھر کم جسم کو دھکیل کر ایک درخت کی آڑ میں لٹا دیا اور خود اُسی کے انداز میں چھوٹی موٹر بوٹ سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ دُور سے دیکھنے پر کوئی اندازہ بھی نہیں لگا سکتا تھا کہ پہلا پہریدار اس وقت ساتویں آسمان کی سیر کر رہا ہے اور اس کی جگہ کوئی اور شخص لے چکا ہے۔ میرا ذہن تیزی سے سوچنے میں مصروف تھا۔ ساحل پر کوئی سواری موجود نہ تھی سب سے مجھے اس علاقے اور اس جگہ کے بارے میں کوئی علم نہ تھا۔ نہ میں ان لوگوں کے بارے میں جانتا تھا جن کی صف میں میں دانستہ طور پر شامل ہو گیا تھا۔ اس الجھن سے نجات حاصل کرنے کا میرے پاس کوئی راستہ نہ تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ میڈم کی آرام دہ اور پُر آسائش مہمان داری سے منہ موڑ کر میں نے کوئی مصیبت گلے لگا لی ہے؟ پھر مجھے یہ فکر بھی کھائے جا رہی تھی کہ شوکت کی غیر موجودگی اور معاہدے پر پُراسرار انداز میں دستخط ہو جانے کے بعد میرا پہلی فرصت میں گھر واپس پہنچنا ضروری تھا جبکہ فی الحال اس گورکھ دھندے سے نکلنے کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔

میرے خیالوں کے تسلسل کو ایک نہایت طویل اور دل خراش چیخ نے توڑ دیا۔ اب میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ یہ کسی عورت کی ہی چیخ تھی اور موٹر بوٹ کی طرف سے اس کی آواز آئی تھی۔ میرے قدم بے اختیار اور بے ارادہ مجھے موٹر بوٹ کی طرف لے چلے۔ چند لمبے ڈگ بھر کر میں موٹر بوٹ کی سیڑھیوں تک پہنچ گیا۔ اسی لمحے چیخ کی آواز دوبارہ آئی اور میرے قدموں میں اور زیادہ تیزی ہو گئی۔ میں قریب قریب بھاگتا ہوا موٹر بوٹ کے اوپر پہنچ گیا۔ چوبی سیڑھیاں نیچے کی طرف جاتی تھیں اور اسی طرف سے باتوں اور چیخوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ تیز تمباکو کی خوشبو کے جھونکوں نے بھی مجھے مطلع کر دیا کہ نیچے ایک سے زائد آدمی موجود ہیں۔ بالائی حصے میں کوئی آدمی موجود نہیں تھا۔ اس لیے میں نے دبے پاؤں سیڑھیوں سے اُتر کر نیچے جانے کا ارادہ کر لیا۔ لکڑی کی سیڑھیوں پر دباؤ پڑا تو وہ "چُوں چرُوں" کی آواز دینے لگیں لیکن میں دل کڑا کر کے چند سیڑھیاں اُتر گیا۔ نیچے ایک بڑا سا کمرہ تھا۔ جس میں ایک چرمی صوفے پر ایک دیو قامت انسان دوسری کرسی پر پیر پھیلائے نیم دراز تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پائپ تھا جس کو وہ مسلسل پی رہا تھا اور دوسرے ہاتھ میں ایک لمبی نال والا پستول تھا۔ اس کے جسم پر ایک نیکر

کے سوا کوئی اور لباس نہ تھا۔ اس کے سر اور ڈاڑھی کے کھچڑی بال جنگلیوں کے انداز میں بکھرے ہوئے تھے۔ وہ انسانوں سے مختلف کوئی غیر انسانی مخلوق نظر آ رہا تھا۔ اس کی بڑی بڑی سُرخ آنکھیں ایک کونے میں سمٹی ہوئی میگی پر جمی ہوئی تھیں۔ میگی کا قیمتی گاؤن جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ اس کے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے اور وہ ایک سہمے ہوئے بے بس شکار کی طرح خوف زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ دیو نما انسان سے کچھ فاصلے پر ایک اور شخص ہاتھ میں ہنٹر تھامے ہوئے کھڑا تھا۔ اگرچہ وہ بذاتِ خود ایک قد آور آدمی تھا لیکن اُس دیو کے مقابلے میں وہ بچہ نظر آتا تھا۔ وہ لباس سے ملاح نظر آتا تھا۔ اس کا لباس میلا کچیلا اور بوسیدہ تھا سر پر ایک اونی ٹوپی رکھی ہوئی تھی جسے وہ اپنے بائیں ہاتھ سے بار بار سر پر جمانے کی کوشش کر رہا تھا۔ سامنے لکڑی کے فرش پر ایک شخص بے حس و حرکت پڑا تھا اور صاف ظاہر تھا کہ وہ مر چکا ہے۔ خون اس کے آس پاس بکھرا ہوا تھا۔ میگی کبھی کبھی خوف زدہ نظروں سے اس لاش کی طرف دیکھ لیتی تھی۔ باقی دونوں آدمی اس لاش سے قطعی بے پروا اور بے تعلق نظر آتے تھے۔

"میگی بے بی!" جب دیو قامت انسان بولا تو اس کی بھاری بھر کم آواز کمرے میں بادلوں کی گرج کی طرح گونجنے لگی۔ "سچ سچ بتا دو یہ آدمی کون تھا اور تمہیں میڈم نے کس مشن پر اِدھر بھیجا تھا؟"

میگی نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ "یقین کرو داور۔ میں اس آدمی کو نہیں جانتی۔ تم نے ایک بےگناہ شخص کو غلط فہمی میں جان سے مار ڈالا۔ میں نے اس کو پہلے کبھی نہیں دیکھا اور نہ ہی یہ میڈم کا آدمی ہے۔"

"مجھے بہلانے کی کوشش مت کرو۔ پہلے یہ بتاؤ کہ اُس چڑیا کو ہمارے یہاں آنے کی خبر کس نے دی۔"

"بائی گاڈ۔ مجھے کچھ معلوم نہیں ہے۔" میگی گڑگڑائی۔ "مجھے یہاں کسی نے نہیں بھیجا۔"

"تو پھر تم اتنی رات گئے اس ویران علاقے میں کیوں آئی ہو؟"

میگی خاموش اس کو دیکھتی رہی۔ وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ "کہہ دو کہ تم ساحل پر ہوا کھانے آئی تھی۔"

"یہ بالکل سچ ہے داور۔" میگی نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

"میں یہاں کسی مشن پر نہیں آئی۔ میں تو محض گھومنے کے لیے آئی تھی۔"

"گھومنے کے لیے۔" داور نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "اتنی رات گئے اور وہ بھی اکیلی۔؟"

"میں اکیلی نہیں تھی۔" وہ گڑگڑائی۔ "میرے ساتھ ایک آدمی بھی تھا۔"

"آدمی؟" داور پھر ہنسنے لگا۔ "کون آدمی؟ تمہارا بوائے فرینڈ؟"

"نہیں۔ وہ میڈم کا خاص مہمان ہے۔"

"اوہو اوہو۔" داور صوفے سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور پہلی بار مجھے اس کے حیرت انگیز قد و قامت کا اندازہ ہوا۔ اس کا قد پونے سات فٹ سے کسی صورت کم نہ ہوگا۔ قد کے ساتھ ساتھ اس کا جسم بھی اس کے مطابق ہی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک لحیم شحیم دیو قد نظر آ رہا تھا۔ میگی اور دوسرا شخص اس کے سامنے بونے نظر آنے لگے تھے۔ "میگی۔ یہ تو میں جانتا ہوں کہ وہ چڑیل اپنی خوبصورت ملازماؤں کو بڑی فراخ دلی سے لوگوں کے حوالے کر دیتی ہے، لیکن تمہاری یہ مجال کیسے ہوئی کہ اس کے مہمانِ خاص کے ساتھ رات کے سناٹے میں سیر و تفریح کے لیے نکل جاؤ۔ وہ اپنے خاص مہمانوں کیساتھ کسی کی بے تکلفی ہرگز برداشت نہیں کرتی۔"

"میرا اس میں کوئی قصور نہیں ہے داور۔ یہ مہمان کی خواہش تھی بلکہ اس کا حکم تھا اور تم جانتے ہو کہ میڈم یہ بھی پسند نہیں کرتی کہ اس کے مہمانوں کی حکم عدولی کی جائے۔"

"چلو مان لیتے ہیں۔" داور نے لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے ٹہلنا شروع کر دیا۔ "مان لیا کہ تم میڈم کے خاص آدمی

کو سیر کرانے کے لیے نکلی تھیں مگر یہ میگی۔ وہ مہمان ہے کہاں ؟"
وہ میرے ساتھ کار ہی میں تھا۔ جب کار کا ایکسیڈنٹ ہوا تو وہ میرے برابر والی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے بعد مجھے کچھ پتہ نہیں کہ کیا ہوا ؟ وہ کہاں چلا گیا ؟ خدا جانے وہ زندہ بھی ہے یا مر گیا ؟"

"اگر زندہ ہوتا تو ہماری نظروں کے سامنے ہوتا۔" داور نے پستول اپنی نیکر میں اُڑس لیا اور پائپ سُلگانے لگا۔ "اگر مر گیا ہوتا تو اس کی لاش مل جاتی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ بھوت کی طرح تمہاری برابر والی سیٹ سے اچانک غائب ہو گیا۔ تم نے فرضی کہانی اچھی سنائی ہے بے بی۔" اُس نے پائپ کے لمبے لمبے کش لگانے شروع کر دیئے اور کمرہ دھوئیں سے بھر گیا۔ "سمندر کے کنارے ہمیں صرف یہ شخص ملا تھا جس کی لاش تمہارے سامنے پڑی ہوئی ہے۔"

"میرا یقین کرو داور......"

"یقین اور تمہارا ؟!" داور کے فلک شگاف قہقہوں سے سارا کمرہ لرزنے لگا۔ "بے بی۔ میں تمہیں اور تمہاری میڈم کو خوب اچھی طرح جانتا ہوں۔ زہریلی ناگن پر یقین کیا جا سکتا ہے مگر تم لوگوں پر یقین کرنے والا دُنیا کا سب سے بڑا بیوقوف شخص ہوگا۔" پھر اس نے جھک کر صوفے کے ہتھے پر رکھا ہوا پستول اُٹھا لیا۔ یہ ایک بڑے سائز کا بھاری بھر کم پستول تھا، لیکن داور کے لمبے چوڑے ہاتھ میں ایک کھلونا معلوم ہوتا تھا۔

"تمہاری میڈم کو اپنے بارے میں بہت زیادہ غلط فہمی ہو گئی ہے میگی۔ اس نے دوسروں کے معاملات میں بھی ٹانگ اڑانی شروع کر دی ہے۔ شاید وہ اس خیال میں ہے کہ شیرو واپس آ کر اس کے ساتھ دوستی کا ایگریمنٹ کرے گا مگر اس کی یہ حسرت کبھی پوری نہیں ہوگی۔ کبھی پوری نہیں ہوگی۔" اس نے دوبارہ کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا اور اس کے بھاری بھر کم قدموں کے نیچے لکڑی کا فرش صدائے احتجاج بلند کرنے لگا۔ چند لمحے وہ خاموشی سے ٹہلتا اور سوچتا رہا۔ پھر وہ میگی کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا اور اُسے گھورنے لگا۔ میگی نے اپنی نظریں جھکا لیں۔

"بے بی۔ یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تمہارے بغیر میڈم زیادہ دن نہیں رہ سکتی اور وہ تم سے زیادہ کسی اور پر بھروسہ نہیں کرتی۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے ہماری کھوج لگانے کا فرض بھی تم ہی کو سونپا ہے۔"

"داور۔" میگی منت آمیز لہجے میں بولی۔ "تم یقین کیوں نہیں کرتے کہ میں تمہاری کھوج لگانے نہیں آئی تھی۔ میں تو میڈم کے مہمان کے ساتھ ساحل کی سیر کے لیے آئی تھی۔"

"تو پھر وہ مہمان کہاں غائب ہو گیا۔" داور نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ اس کا کوئی نام و نشان نظر نہیں آ رہا۔ کار کا ڈھانچہ موجود ہے مگر اس کا تو ڈھانچہ اور انجر پنجر تک نظر نہیں آتا۔ آخر وہ گیا کہاں۔"

جواب میں میگی پریشانی سے اپنے ہاتھ مسلنے لگی۔

"تم سر یکا میری آنکھوں میں دھول جھونک رہی ہو میگی اور چاہتی ہو کہ میں تمہارے جھوٹ پر یقین کر لوں۔ میں جانتا ہوں کہ تمہاری میڈم ایک چالاک اور خطرناک عورت ہے۔ وہ ہماری کمزوریاں معلوم کرنا چاہتی ہے۔ وہ ہماری سرگرمیوں سے باخبر ہونا چاہتی ہے تاکہ جب چاہے ہمیں بلیک میل کر سکے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اتنی رات گئے اس سنسان اور دُور دراز علاقے میں وہ اپنی ہمراز سیکرٹری کو ہرگز نہ بھیجتی اور پھر کیا یہ بھی اتفاق ہے کہ تم ساحل کی سیر کرنے عین اُس وقت پہنچیں جب ہماری کشتیاں یہاں مال اُٹھانے کے لیے آئی تھیں۔"

"مجھے ان کشتیوں کی خبر نہیں تھی۔ میں تو خود حیران ہوں کہ میڈم کا مہمان کہاں غائب ہو گیا۔ ورنہ وہ میرے بیان

کی گواہی دے دیتا۔"

ہنٹر والا ملاح جو اس اثنا میں خاموش کھڑا اپنی ٹوپی سے کھیل رہا تھا، بے صبری سے بولا۔ "باس۔ یہ اس طرح نہیں مانے گی۔ میں اس کی زبان سے سچ اُگلوا سکتا ہوں۔ بس آپ کی اجازت کی دیر ہے۔" وہ ہنٹر کو ہوا میں جھٹکتے ہوئے دو قدم آگے بڑھ گیا۔

داور کی نگاہیں میگی پر جمی ہوئی تھیں۔ یکایک ان میں ایک خاص قسم کی چمک پیدا ہوئی اور وہ معنی خیز انداز میں کہنے لگا۔ "تم بیوقوف ہو جابر ــــ میگی جیسی خوبصورت اور نرم و نازک عورتیں ضائع کرنے کے لیے نہیں ہوتیں۔ انہیں تو بہت احتیاط سے رکھنا چاہیئے۔ یہاں ہمارا کام ختم ہو گیا ہے اب ہمیں ایک لمبا سمندری سفر کرنا ہے۔ میڈم سلے اپنی مہربانی سے میگی جیسی لڑکی کو ہمارا ہمسفر بننے کے لیے بھیج دیا ہے تو ہمیں اس کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے۔ تم جا کر کھانے کا بندوبست کرو۔ ہم لوگ کھانے کے بعد روانہ ہو جائیں گے اور ہاں۔ کھانے سے پہلے کچھ پینے پلانے کا بھی سامان لا دو۔ تم جانتے ہو کہ میگی اس کے بغیر کھانا نہیں کھا سکتی۔"

جابر نے مایوسی سے میگی کو اور پھر داور کو دیکھا اور پھر اپنے ہنٹر کو اپنی ٹانگوں پر مارتا ہوا سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ میں تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر اُوپر عرشے پر پہنچ گیا اور برق رفتاری سے اسی جگہ جا کر کھڑا ہو گیا جہاں میں نے محافظ کو مستعد کھڑا پایا تھا۔ میں نے نیم تاریکی میں جابر کو عرشے پر سے گزر کر ایک کیبن کی طرف جاتے دیکھا۔ یہ تو مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ داور ایک جرائم پیشہ اور قانون شکن گروہ سے تعلق رکھتا ہے اور ان لوگوں کی میڈم کے ساتھ دشمنی ہے۔ داور کو یقین تھا کہ میڈم نے میگی کو محض اس کی سرگرمیوں کا کھوج لگانے کے لیے ساحل سمندر پر بھیجا تھا۔ میگی کے بیان پر اُسے یقین نہیں آ رہا تھا اور آتا بھی کیسے ؟ میگی اپنی سچائی کے ثبوت میں میڈم کے مہمان کو پیش نہیں کر سکتی تھی۔ میری جگہ ساحل پر موجود کوئی اور بدقسمت اجنبی داور کے ہتھے چڑھ کر ہلاکت کا نشانہ بن گیا تھا۔

میں اپنی جگہ کھڑا یہ سوچ رہا تھا کہ موجودہ حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیئے ؟ صاف ظاہر تھا کہ داور میگی کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ مجھے اس کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کی ضرورت تھی اور نہ خواہش۔ مجھے میگی سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ وہ جس قسم کے ماحول میں کام کر رہی تھی۔ وہاں اس قسم کے واقعات سے دوچار ہو جانا کوئی حیرت انگیز اور خلافِ توقع بات نہیں تھی۔ اس وقت بظاہر معصوم اور بے سہارا نظر آنے والی میگی جرائم کی دنیا میں پروان چڑھی تھی اور میڈم کے سائے سے محروم ہونے کے بعد داور کے قبضے میں چلا جانا اس کے لیے کوئی زیادہ اَن ہونی بات نہ ہوتی، لیکن سوال یہ تھا کہ ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیئے ؟ بلا وجہ پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑانا میرے لیے کسی طرح بھی سود مند نہ تھا۔ یکایک میری توجہ سمندر میں ایک ہیولے کی طرف مبذول ہو گئی جو تیزی سے ہماری طرف بڑھا آ رہا تھا۔ مجھے یہ جاننے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ یہ ایک موٹر بوٹ تھی جس کا سائز داور کی بوٹ کے برابر تھا۔ اس بوٹ میں کوئی روشنی نہیں تھی اور وہ خاموشی کے ساتھ خاصی تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی سمندر کی پُرشور ہوا میں رلی ملی ایک اور آواز نے بھی مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ یہ آواز ساحل کی طرف سے آ رہی تھی۔ میں تیزی سے بوٹ کے پاس سے ہٹ کر درختوں کی اوٹ میں ہوتا ہوا جنگل کی طرف بڑھا۔ اب میری آنکھیں تاریکی سے مانوس ہو چکی تھیں اور میں دور سے آتی ہوئی دو جیپ گاڑیوں کو بخوبی دیکھ رہا تھا۔ یہ دونوں جیپیں بھی خاصی تیز رفتاری سے اسی طرف بڑھی آ رہی تھیں۔ داور کی موٹر بوٹ پر مکمل خاموشی تھی۔ اس کی وجہ بھی مجھے معلوم تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ جابر کچن میں کھانے کا بندوبست کرنے میں مصروف تھا جبکہ داور کی دلبستگی کے لیے میگی جیسا کھلونا موجود تھا۔ اس لیے وہ دونوں اپنے آس پاس رونما ہونے والے

واقعات سے قطعی بے خبر تھے۔ میری چھٹی حس نے مجھے آنے والے خطرے سے آگاہ کر دیا اور میں درختوں کی آڑ لیتا ہوا موٹر بوٹ اور ساحل سے مخالف سمت میں بڑھنے لگا۔ جیپ گاڑیوں کی روشنیاں بجھی ہوئی تھیں۔ جو اس بات کی علامت تھیں کہ وہ لوگ موٹر بوٹ میں موجود لوگوں کو اپنی آمد سے بے خبر رکھنا چاہتے تھے۔ جیپ گاڑیاں اب واضح نظر آنے لگی تھیں یہاں تک کہ وہ ساحل سے کچھ فاصلے پر پہنچ کر رُک گئیں ان سے پانچ مسلح افراد کود کر باہر نکلے اور چاروں طرف پھیل گئے۔ انہوں نے آس پاس درختوں کے سائے میں پناہ لے لی۔ وہ کچھ دیر خاموش سے رُکے رہے پھر انہوں نے تیزی سے داور کی بوٹ کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ اب یہ بات بالکل واضح ہو چکی تھی کہ یہ لوگ مخالف گروہ سے تعلق رکھتے تھے اور داور کی بوٹ پر شب خون مارنے کے ارادے سے آئے تھے۔

مجھے سکول کے زمانے میں پڑھی ہوئی نظم یاد آگئی کہ ۔

جب کر دو کھوڑیوں میں ہو کھٹ پٹ   اپنے بچنے کی فکر کر جھٹ پٹ

چنانچہ میں نے فوری طور پر جیپ گاڑیوں کی طرف بڑھنے کا فیصلہ کیا۔ شاید انہیں اس ویران اور غیر آباد مقام پر قدرت نے میری نجات کے لیے ہی بھیجا تھا اور میں قدرت کی اس مہربانی سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔

وہ پانچوں مسلح افراد مختلف سمتوں سے موٹر بوٹ کی طرف بڑھ رہے تھے جبکہ سمندر میں نمودار ہونے والی موٹر بوٹ بھی داور کی بوٹ سے کچھ دور پہنچ کر رُک گئی تھی۔ یکایک اس کی تمام لائٹیں روشن ہو گئیں اور سامنے کا علاقہ روشنی میں نہا گیا۔ داور کی موٹر بوٹ اور دوسری چھوٹی کشتی اب روشنی میں نمایاں نظر آنے لگی تھیں۔ وہ تو غنیمت ہے کہ میں بروقت وہاں سے ہٹ گیا تھا ورنہ ان کے نرغے میں آجاتا۔ سمندر میں کھڑی ہوئی موٹر بوٹ سے اور فائر ہوئے جن کی گونج دُور دُور تک پھیل گئی۔ اسی وقت میں نے داور کی موٹر بوٹ میں جابر کو عرشے پر نمودار ہوتے دیکھا۔ اس کے فوراً بعد داور کا دیو قامت جسم نظر آیا۔ وہ اپنے ہاتھ میں ایک مشین گن تھامے ہوئے تھا۔

لاؤڈ سپیکر پر ایک کرخت آواز بلند ہوئی: "تم ہر طرف سے گھیر لیے گئے ہو۔ بھلائی اسی میں ہے کہ ہتھیار پھینک کر اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو۔" اس کے ساتھ ہی چھوٹی گنوں کے دو اور دھماکے ہوئے اور داور کی موٹر بوٹ کے آس پاس بم گرنے کی وجہ سے پانی اچھل کر دُور دُور تک پھیل گیا۔ داور لپک کر آڑ میں غائب ہو گیا۔ اب جیپ گاڑیوں سے اُترنے والے لوگ بھی موٹر بوٹ کے نزدیک پہنچ گئے تھے اور درختوں کے سایوں میں پوزیشن لیے آگے بڑھنے کے لیے بالکل تیار تھے۔ ان سب کی توجہ موٹر بوٹ پر کھڑے داور اور جابر کی طرف مبذول تھی۔ یہ میرے لیے بہترین موقع تھا۔ میں نے تیزی کے ساتھ جیپ گاڑیوں کی طرف بڑھنا شروع کر دیا، لیکن میں پوری طرح چوکنا تھا۔ میں یہ اندازہ نہیں کر سکا تھا کہ جیپوں میں کوئی اور بھی موجود ہے یا نہیں۔ اس کے علاوہ دل ہی دل میں یہ دُعا بھی مانگ رہا تھا کہ چابیاں بھی ان میں موجود ہوں ورنہ میری ساری جدّوجہد رائیگاں چلی جائے گی۔ میری تمام تر توجہ جیپوں کی طرف تھی اور جب میں قریب قریب دوڑتا ہوا ان کے نزدیک پہنچا تو مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ ایک جیپ کے اندر ڈرائیور موجود تھا اور مجھے اپنے سامنے دیکھ کر وہ کھلی جیپ سے کود کر باہر نکل آیا تھا اگر اس کی نظریں اور توجہ موٹر بوٹ کی طرف نہ ہوتی تو اس سے پہلے ہی وہ مجھے دیکھ چکا ہوتا اور میں نہایت آسانی سے اس کی گولی کا نشانہ بن گیا ہوتا، لیکن قدرت کو مجھے بچانا مقصود تھا اس لیے ہر کام میری خواہش اور ضرورت کے مطابق ہو رہا تھا۔ جیسے ہی وہ جیپ سے باہر نکلا اس نے اپنی کمر میں لٹکے ہوئے پستول کی طرف ہاتھ بڑھا کر پستول نکال لیا۔ اس کا فائر میرے سر کے پاس سے گزر گیا۔ میں فوراً زمین پر گر گیا اور تیزی سے ریت پر قلابازیاں کھاتا ہوا دوسری جانب پہنچ گیا۔ یکے بعد دیگرے دو فائر ہوئے اور گولیاں میرے جسم کے نزدیک ریت میں پیوست ہو گئیں۔ اب میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ جواب میں فائر کروں۔ محافظ سے چھینی ہوئی سٹین گن میرے

ہاتھ میں تھی اور انگلی کا معمولی سا دباؤ میرے مخالف کا جسم چھلنی کر سکتا تھا مگر میں خواہ مخواہ کسی کی جان لینے کا خواہشمند نہیں تھا۔ خاص طور پر ایسی صورت میں جبکہ میری اس کے ساتھ کوئی ذاتی دشمنی بھی نہیں تھی، لیکن بعض اوقات صورت حال ایسی ہو جاتی ہے کہ انسان نہ چاہتے ہوئے بھی بہت سے اقدامات کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ وہ ایک بار پھر مجھے نشانہ بنانے کے لیے پستول تان رہا تھا، لیکن میں نے اُسے موقع نہیں دیا۔ سٹین گن سے ایک گولی نکلی اور پستول اس کے ہاتھ سے اُچھل کر دُور جا گرا۔ اس نے بے اختیار اپنی کلائی کو دوسرے ہاتھ سے تھام لیا۔ میں اتنی دیر میں اس کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر حملہ آور ہوتا میں نے اس کا بازو موڑ کر اسے بالکل بے بس کر دیا۔ ہم ساحل سے کافی فاصلے پر تھے اور پھر ساحل سے ٹکراتے جھونکوں کے شور کے باعث بھی فائرنگ کی آوازیں دوسرے لوگوں تک نہیں پہنچ سکی تھیں۔ وہ ایک طاقتور اور سخت جان آدمی تھا۔ شدید زخمی ہونے کے باوجود اس نے میری گرفت سے آزاد ہونے کے لیے ہاتھ پیر مارنے شروع کر دیے۔ میں نے اس کے بازو پر دباؤ ڈالا۔ ایک خفیف سا جھٹکا اس کے بازو کو توڑ سکتا تھا۔ اس کی جدّوجہد ہلکی پڑ گئی۔

"کون ہو تم؟" میں نے سرگوشی میں پوچھا: "یہاں کیوں آئے ہو؟ اور تمہارے ساتھی کون لوگ ہیں؟"

جواب میں وہ خاموش رہا۔ شاید وہ مجھے بھی داور کا ساتھی سمجھ رہا تھا۔ میں نے پوچھا: "کیا تم میڈم کے آدمی ہو اور میگی کی مدد کے لیے آئے ہو؟"

وہ حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اس کا شک دور کرنے کی کوشش کی: "میں میڈم کا مہمان ہوں۔ ان کا دشمن نہیں ہوں۔ میگی کے ساتھ سمندر کی سیر کے لیے آیا تھا۔ کار کا ایکسیڈنٹ ہو گیا اور وہ لوگ میگی کو پکڑ کر لے گئے۔"

اس کی جدّوجہد بالکل بند ہو گئی: "سوری سر" وہ شائستہ لہجے میں بولا: "میں نے آپ پر گولی چلائی۔ مگر میں آپ کو جانتا نہیں تھا۔"

میں نے اس کا بازو اپنی گرفت سے آزاد کر دیا۔

"کیا تم لوگ میگی کو آزاد کرانے آئے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ مس میگی داور کی بوٹ پر موجود ہیں۔ دراصل ہمارے مخبروں نے اطلاع دی تھی کہ داور ہمارے علاقے میں مال اُتار رہا ہے ہم لوگ اس کو گھیرنے کے لیے آئے ہیں۔"

"اور سمندر میں وہ بوٹ کس کی ہے؟"

"وہ بھی ہماری ہے سر۔ ہم نے داور کے بھاگنے کے سارے راستے روک دیے ہیں۔ میڈم کے علاقے میں کسی کو کارروائی کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ جو ایسی حرکت کرتا ہے وہ اس کی سزا بھی بھگتتا ہے۔"

میڈم کے کارندوں کی ہوشیاری اور مستعدی نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ اس عورت نے اپنے گروہ کو انتہائی منظم اور باعمل بنا دیا تھا جو میرے لیے ایک انکشاف تھا۔ ساحل کی طرف سے فائرنگ کی آوازیں اب مسلسل آرہی تھیں۔ ان میں گنوں کی گھن گرج بھی شامل تھی۔

"سر! مجھے اُن لوگوں کو خبر کر دینی چاہیے کہ داور کی بوٹ پر مس میگی بھی موجود ہیں۔ ایسا نہ ہو وہ موٹر بوٹ کو تباہ کر دیں اور مس میگی کی جان بھی خطرے میں پڑ جائے۔"

"واقعی۔ میگی کی حفاظت کے لیے یہ ضروری ہے۔" میں نے اس کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ اس وقت اس کا ساحل کی طرف چلا جانا خود میرے لیے فائدہ مند تھا۔ اس نے بلا تاخیر زمین پر گرا ہوا پستول اُٹھایا اور بھاگتا ہوا موٹر بوٹ کی طرف چلا گیا۔ میرے لیے اب میدان صاف تھا۔ دونوں جیپ گاڑیاں میرے سامنے کھڑی ہوئی تھیں اور مجھے روکنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ میں لپک کر ایک جیپ میں سوار ہو گیا۔ چابی اس میں لگی ہوئی تھی۔ میں نے اس دوران

میں اپنا لائحہ عمل سوچ لیا تھا۔ جیپ کو سٹارٹ کرنے سے پہلے مَیں نے سٹین گن اُٹھائی اور دوسری جیپ کے چاروں ٹائر بیکار کر دیئے۔ ان جیپ گاڑیوں کے مسافر اس وقت یہاں سے دُور اپنے دُشمن سے جنگ کرنے میں معروف تھے۔ تک شاید میری فائرنگ کی آواز بھی نہیں پہنچی ہوگی۔ سٹین گن مَیں نے وہیں ڈال دی اور جیپ کو سٹارٹ کر کے اس طرف کا رُخ کیا جدھر سے میرے اندازے کے مطابق وہ لوگ آئے تھے۔ روانہ ہونے سے پہلے مَیں نے ایک بار مُڑ کر ساحل کی طرف دیکھا جہاں سے مسلسل فائرنگ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اب جوابی کارروائی کے طور پر غالباً دادر کی بوٹ سے بھی فائرنگ کی جا رہی تھی۔ مجھے ان لوگوں میں سے کسی سے بھی کوئی ہمدردی یا دلچسپی نہیں تھی۔ البتہ یہ خیال ضرور تھا کہ میگی پر نہ جانے کیا بیتے گی؟ اس کو ساحل تک لانے کے لیے مَیں نے ہی اُکسایا تھا۔ میں اس موقعے سے فائدہ اُٹھا کر میڈم کی قید سے فرار حاصل کرنا چاہتا تھا۔ مجھے وہ موقع مل گیا تھا لیکن میگی کی زندگی خطرے میں تھی۔ مجھے یہ بھی اندازہ تھا کہ یہ مقابلہ کافی دیر تک جاری رہے گا۔ اس وقت صبح کے ساڑھے چار بج رہے تھے۔ میری منزل مقصود ائیر پورٹ تھی۔ میری جیب میں میرا پرس اور کچھ پیسے موجود تھے۔ پہلی فلائیٹ سوا سات بجے کے قریب روانہ ہوتی تھی۔ اَب مسئلہ صرف یہ تھا کہ اگر مَیں اس ویران ساحلی علاقے سے نکل کر کسی سڑک پر نکل جاؤں اور بروقت ائیر پورٹ پہنچ جاؤں تو پہلی فلائیٹ پکڑ سکتا تھا۔

مَیں اپنے اندازے کے مطابق تیزی سے جیپ دوڑاتا رہا۔ مجھے یہ اطمینان تھا کہ ان لوگوں میں سے کوئی میرا تعاقب نہیں کرے گا۔ ان کے پاس اس مقصد کے لیے کوئی سواری نہیں تھی۔ گویا مَیں اس لحاظ سے بالکل محفوظ اور مامون تھا۔ ساحلی علاقے کی ریتلی زمین پر کاروں کے نشان بھی باقی نہیں رہتے۔ ورنہ میں ان ہی سے راہنمائی حاصل کر لیتا۔ قریباً بیس منٹ کے بعد مجھے ساحلی علاقہ ختم ہونے کے آثار نظر آئے اور بالآخر مَیں ایک پختہ سڑک پر پہنچ گیا۔ سامنے سے گزرنے والے ایک ٹرک کو روک کر مَیں نے ڈرائیور سے ائیر پورٹ کا راستہ پوچھا اور اسے ذہن نشین کرنے کے بعد آگے روانہ ہو گیا۔ اُس کی اطلاع کے مطابق مَیں ایک گھنٹے میں ائیر پورٹ پہنچ سکتا تھا۔ میرے ذہن میں واپسی کے سوا کوئی اور خیال نہیں تھا۔ اس شہر میں وارد ہونے کے بعد مجھے پے در پے جن ڈرامائی اور افسوسناک واقعات سے دوچار ہوا پڑا تھا۔ مَیں نے اس وقت ان کے بارے میں بھی سوچنا مناسب نہیں سمجھا۔ ملک برکت، میڈم، میگی غرضیکہ ہر چہرہ دُھند میں چھپ چکا تھا۔ اَب مَیں صرف اور صرف اپنی واپسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ روزی، اس انتظار میں میرے غائب ہو جانے کی وجہ سے کتنی پریشان ہوگی؟ پھر مجھے شوکت کی طرف سے بھی خاصی فکر تھی۔ اس کا بروقت میرے پاس نہ پہنچنا اور اس کی طرف سے کسی اطلاع کا نہ ملنا بھی میرے لیے پریشانی کا باعث تھا۔ خدا کرے وہ کسی حادثے سے دوچار نہ ہوا ہو۔ روزی غریب کو تو مَیں فون پر بھی اپنے بارے میں کچھ نہیں بتا سکا تھا۔ وہ میری طرف سے کس قدر فکر مند اور پریشان ہوگی اس کا اندازہ لگانا مُشکل نہ تھا۔ وہ ایک مثالی بیوی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے شوہر کی پہلی محبت کوئی اور تھی اور مَیں ابھی تک اسے بھلا نہ سکا تھا۔ اس کے باوجود اسے مجھ سے کوئی شکوہ نہ تھا۔ مَیں اسے جتنا بھی جذباتی احساس فراہم کر سکا تھا وہ اسی پر بالکل قانع تھی۔ عاشی کو فراموش کر دینا میرے لیے قطعی ممکن نہ تھا لیکن اسے کھونے کے بعد روزی جیسی وفاشعار محبت کرنے والی اور خدمت گزار بیوی کا مل جانا بھی میری خوش قسمتی تھی۔

صبح کی ٹھنڈی ہوا مجھے شاد کام اور ترو تازہ کر رہی تھی۔ اَب ہوا میں نمی کا احساس باقی نہیں رہا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ مَیں سمندر سے دُور ہوتا جا رہا تھا۔ پَو پھٹ رہی تھی اور سویرا قدم بہ قدم پھیل رہا تھا۔ سڑک پر ٹریفک زیادہ نہیں تھی اس لیے مجھے جیپ کو تیز رفتاری سے چلانے میں کوئی دِقت پیش نہیں آ رہی تھی۔ ان چند حیرت انگیز ایام میں مجھ پر جو کچھ بیت چکی تھی مَیں اس کی طرف سے قطعی بے نیاز تھا۔ مَیں ان دنوں کو ایک ناخوشگوار خواب سمجھ کر بھول جانا

چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اپنے گھر اور دوستوں کی پُر سکون دُنیا میں واپس پہنچ کر مَیں پھر اپنے روزمرہ کے معمولات میں منہمک ہو جاؤں گا۔ البتہ عاشی کا اچانک سامنا اور اس کے ساتھ مُلاقات کا واقعہ میرے ذہن اور دِل میں ایک ہلچل مچا دینے کا سبب ضرور بن گیا تھا۔

کہتے ہیں کہ وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔ بڑے سے بڑے اور گہرے سے گہرے زخم کو بھر دیتا ہے لیکن وقت کا یہ مرہم میرے دِل کے اُس گھاؤ کو بھرنے میں قطعیً ناکام رہا تھا جو عاشی کی جدائی کا نتیجہ تھا اور اب جب کہ عرصۂ دراز کے بعد عاشی سے ایک حادثاتی مُلاقات نے تمام پرانی یادوں کو تازہ کر دیا تھا۔ مَیں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ مستقبل کی زندگی میرے لیے زیادہ اذیت بخش اور بے چینی سے بھرپور ہوگی یا اس ملاقات سے میرے دِل کو سکون حاصل ہوگا۔ عاشی سے ملنے کے بعد مَیں پے در پے حادثات سے دوچار ہوتا رہا تھا اس لیے مَیں یکسوئی سے اس کے بارے میں غور نہیں کر سکا تھا۔ پھر بھی اس ملاقات نے پُرانی یادوں کو تازہ اور پُرانے زخموں کو ہرا کر دیا تھا۔

اب شہر کا بارونق علاقہ شروع ہو چکا تھا اور سڑکوں پر ٹریفک میں اضافہ ہو گیا تھا لیکن مَیں ائیر پورٹ سے زیادہ دُور نہیں تھا۔ مزید دس منٹ بعد مَیں اپنی منزل تک پہنچ سکتا تھا۔ یکایک مجھے محسوس ہوا جیسے ایک کار میرا تعاقب کر رہی ہے۔ میری جیپ کی رفتار بہت تیز تھی اس کے باوجود یہ کار مسلسل میرے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ یہ ایک سیاہ رنگ کی پُرانے ماڈل کی کار تھی۔ درمیانی فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ مَیں اس میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھ نہیں سکتا تھا اس لیے یہ اندازہ لگانا مُشکل تھا کہ اس میں کتنے لوگ سوار تھے۔ مَیں نے اپنے شُبہ کی تصدیق کرنے کی غرض سے جیپ کو ایک سائیڈ روڈ پر موڑ دیا۔ سیاہ کار بھی میرے پیچھے اس سڑک پر مُڑ گئی۔ اَب تک اس کار نے مجھ سے آگے نکلنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ لیکن اب اس بات میں شُبے کی گنجائش نہیں تھی کہ وہ لوگ میرے تعاقب میں تھے۔ وہ کون لوگ تھے اور کیا چاہتے تھے؟ مَیں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا لیکن اتنا مجھے یقین تھا کہ وہ میڈم کے آدمی نہیں ہو سکتے تھے تو پھر وہ کون تھے اور ان کا مقصد کیا تھا؟ مَیں نے جان بُوجھ کر اپنا راستہ تبدیل کیا تھا۔ اس لیے کہ وہ خواہ کوئی بھی تھے مَیں انھیں اپنے پیچھے ائیر پورٹ تک لے جانے کے لیے تیار نہیں تھا۔

مَیں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی وقت کم رہ گیا تھا۔ مَیں ہر قیمت پر ائیر پورٹ پہنچ کر پہلی فلائیٹ پر سوار ہونا چاہتا تھا مگر اَب یہ سیاہ کار میری راہ میں رُکاوٹ بنتی نظر آ رہی تھی۔

مَیں نے بہت تیزی سے جیپ کو دو تین سڑکوں اور گلیوں میں گھمایا۔ مَیں زیادہ رسک بھی نہیں لے سکتا تھا کیونکہ اس شہر کی سڑکیں میرے لیے انجان تھیں۔ مجھے یہ ڈر بھی تھا کہ کہیں انھیں گمراہ کرنے کی کوشش میں خود ہی ائیر پورٹ کے راستے سے نہ بھٹک جاؤں۔ ایک مشکل یہ بھی تھی کہ سڑکوں پر ٹریفک بہت کم تھی، ورنہ میرے لیے اس تعاقب سے نجات حاصل کرنا آسان ہو جاتا۔ مگر میری یہ مشکل ایک ریلوے کراسنگ نے آسان کر دی۔ میری جیپ ہوا کی رفتار سے بڑھتی ہوئی ریلوے کراسنگ تک پہنچی تو اس کا آہنی دروازہ بند ہو رہا تھا۔ میرے لیے یہ نادر موقعہ تھا۔ مَیں نے ایکسیلیٹر کو دبایا اور جیپ ریلوے کراسنگ کو پار کر گئی۔ مَیں نے عقبی شیشے میں دیکھا تو ریلوے کراسنگ کا پھاٹک بند ہو چکا تھا اور سیاہ کار کراسنگ کے دوسری طرف پہنچ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ مَیں نے اس بروقت غیبی امداد پر خدا کا شکر ادا کیا اور ایک دو سڑکوں سے گزرنے کے بعد دوبارہ ائیر پورٹ جانے والی سڑک پہ پہنچ گیا لیکن اس پر گامزن ہونے سے پہلے مَیں نے ایک جگہ جیپ روک کر تصدیق کرنی ضروری سمجھی کہ مَیں صحیح سمت جا رہا ہوں۔

ائیر پورٹ کی عمارت سامنے نظر آ رہی تھی لیکن مَیں احتیاط کے طور پر اس جیپ گاڑی کو ائیر پورٹ لے جانے کے حق میں نہیں تھا۔ مَیں نے ائیر پورٹ کے نزدیک ایک وسیع عمارت کے گیٹ میں جیپ داخل کر دی اور درختوں کے

نیچے اسے پارک کر دیا۔ تیزی سے چلتا ہوا بلکہ دوڑتا ہوا میں ایئر پورٹ کی طرف لپکا۔ تعاقب کرنے والوں سے نجات حاصل کرنے میں میرا کافی وقت ضائع ہو چکا تھا۔ کاؤنٹر کے سامنے مسافروں کی ایک لمبی قطار لگی ہوئی تھی۔ جب کہ مجھے ابھی ٹکٹ بھی خریدنا تھا۔ میں ریٹرن ٹکٹ لے کر آیا تھا لیکن بدقسمتی سے وہ ٹکٹ بھی میرے بریف کیس کے ساتھ ہی میرا ساتھ چھوڑ چکا تھا۔ اب مجھے نیا ٹکٹ بھی حاصل کرنا تھا۔ کاؤنٹر پر میرا واسطہ ایک خوش مزاج اور خوش شکل لڑکی سے پڑا۔ وہ سورج کی پہلی کرن کی طرح دمک رہی تھی۔ اس نے مسکرا کر میرا خیر مقدم کیا۔

وہ اس قدر خوش اخلاقی اور گرمجوشی سے پیش آئی جیسے ہم کافی عرصے سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں لیکن جب میں نے اپنا مقصد بیان کیا تو اس کے پاس حرفِ معذرت کے سوا میرے لیے کچھ اور نہ تھا۔ اس نے بدستور مسکراتے ہوئے مجھے بتایا کہ اس فلائیٹ پر ایک بھی سیٹ خالی نہیں ہے۔ چانس پر بھی ایک درجن مسافر پہلے ہی قسمت آزمائی کرنے کے لیے پہنچے ہوئے تھے۔ اگلی فلائیٹ چار گھنٹے بعد روانہ ہو گی۔ لیکن اس میں بھی کوئی سیٹ خالی نہیں ہے البتہ تیسری فلائیٹ پر قسمت آزمائی کی گنجائش ہے۔ وہ مسکرا رہی تھی اور میرے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ میں اسے کیا بتاتا کہ میں کن مراحل سے گزر کر ایئر پورٹ پہنچا ہوں اور اگر میں اس فلائیٹ سے روانہ نہیں ہو سکا تو مجھے کتنے جانے اور انجانے خطرات سے دوچار ہونا پڑے گا اور اگر بتا بھی دیتا تو اس کی مسکراہٹ میں کوئی فرق نہ آتا۔ وہ میرا مسئلہ حل نہیں کر سکتی تھی۔ میرے اعصاب جواب دینے لگے اور پیشانی پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔ شاید اس نے بھی میرے بدلتے ہوئے تاثرات کو محسوس کر لیا اور پہلی بار اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ اس نے تشویش سے پوچھا "آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے سر؟"

"ہاں ہاں، ٹھیک ہے دراصل اس فلائیٹ سے میرا جانا بے حد ضروری ہے میری والدہ شدید بیمار ہیں۔ ان کی حالت نازک ہے۔"

اس نے سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لیا۔ میرے پاس کوئی سامان نہ تھا اور غالباً پہلی بار اسے احساس ہوا کہ میں بے سروسامان کیوں نظر آ رہا تھا۔

"مجھے آپ سے بہت ہمدردی ہے سر لیکن میں مجبور ہوں۔ اس فلائیٹ پر سیٹ ملنا ممکن نہیں ہے۔" اس کی آواز ہمدردی سے بھرپور تھی اور اس کا مسکراتا ہوا چہرہ تشویش میں ڈوبا ہوا تھا۔

میں اس کا شکریہ ادا کر کے کاؤنٹر سے چلا آیا۔ لاؤڈ سپیکر پر ہوائی جہاز کے مسافروں سے مسافر لاؤنج میں تشریف لے جانے کی درخواست کی جا رہی تھی لیکن چیک ان ہونے والے کاؤنٹر پر اب بھی ایک خاصی لمبی قطار موجود تھی۔ میں خالی الذہن ہو کر بلا ارادہ اُس قطار میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ حالانکہ میرے پاس ٹکٹ تک نہیں تھا لیکن وقتی طور پر میرا ذہن بالکل ماؤف ہو چکا تھا۔ میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے یکسر محروم ہو گیا تھا۔

کاؤنٹر پر ایک درمیانی عمر کے شخص نے بورڈنگ کارڈ حاصل کیا اور قطار سے نکل کر باہر آ گیا۔ مجھے اس شخص کی خوش قسمتی پر رشک آ رہا تھا۔ میری نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں جو ہاتھ میں تھامے ہوئے سیاہ رنگ کے بریف کیس کو ہلاتا ہوا مسافروں کی قطار سے دُور جا رہا تھا۔ اس نے اطمینان کی ایک لمبی سانس لی اور ہال میں چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے مسافر لاؤنج میں جانے کی کوئی جلدی نہیں ہے۔ وہ بار بار اپنی کلائی کی گھڑی کو اور پھر بیرونی دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ شاید اسے کسی کا انتظار تھا۔ چند لمحے وہ ایک جگہ کھڑا رہا پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس طرف چلا گیا جہاں ٹوائیلٹس بنے ہوئے تھے۔ میں بدستور قطار میں کھڑا ہوا تھا۔ حالانکہ یہ ایک بے معنی حرکت تھی۔ ٹکٹ کے بغیر مسافروں کی قطار میں کھڑے رہنے کا کوئی مقصد نہیں تھا۔ پھر بھی میں قطار میں سب سے آخر میں کھڑا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں؟ واپس چلا جاؤں یا ایئر پورٹ ہی پر ٹھہر کر اگلی فلائیٹ کے لیے

قسمت آزمائی کروں؟ اچانک میری نگاہ ایئر پورٹ کے بیرونی شیشے پر پڑی اور میں ٹھٹھک کر رہ گیا۔ میرا تعاقب کرنے والی سیاہ کار ایئر پورٹ کے پارکنگ لاٹ سے نکل کر آہستہ آہستہ ایک طرف کو جا رہی تھی۔ اب میں کار میں سوار لوگوں کو بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ ڈرائیور کے علاوہ اس میں دو اور تنومند آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان لوگوں کا دھیان پارکنگ لاٹ کی طرف تھا۔ غالباً وہ وہاں کھڑی ہوئی گاڑیوں میں میری جیپ کو تلاش کر رہے تھے۔ میرے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ میری چھٹی حس نے ایک بار پھر میری راہنمائی کی تھی۔ میں نے جیپ کو ایئر پورٹ تک نہ لا کر دانش مندی کا ثبوت دیا تھا لیکن ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ فاصلے پر عمارت میں کھڑی ہوئی جیپ کو دیکھ لیں اور مجھے تلاش کرتے ہوئے اندر آ جائیں۔ میں بالکل نہیں جانتا تھا کہ وہ کون لوگ تھے۔ کیا چاہتے تھے اور میرا پیچھا کیوں کر رہے تھے لیکن یہ بات طے تھی کہ وہ میری کھوج میں تھے اور ان کی وجہ سے میں اَن جانی مشکلات کا شکار ہو سکتا تھا۔ اب میرا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا تھا۔ خطرات سے دوچار ہونے کے بعد میں زیادہ باعمل اور مستعد ہو جاتا ہوں۔ میری یہ عادت ہمیشہ میرے کام آتی ہے۔ اس وقت بھی ایسا ہی ہوا۔ میں نے فوری طور پر ایک فیصلہ کیا اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے چل پڑا۔

میرا رُخ غسل خانوں کی طرف تھا۔ غسل خانے میں داخل ہو کر میں نے چاروں طرف دیکھا۔ دوسرے کنارے پر واقع ایک بُوتھ میں مجھے ایک شخص کے پیر اور جوتے نظر آ رہے تھے اس کے سوا غسل خانے میں کوئی اور موجود نہ تھا اور میرے لیے نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھا۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا بوتھ کی طرف چلا گیا۔ مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ بوتھ کا دروازہ کھلا اور اس میں سے وہی مسافر برآمد ہوا۔ اس نے ایک بار پھر اپنی گھڑی کی طرف دیکھا اور بریف کیس سنبھالے ہوئے تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ میری نظروں سے نظریں ملیں تو اس کے چہرے سے ایک مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ عام طور پر دو انجانے لوگ ازراہ اخلاق نگاہیں ملنے پر مسکرا تے ضرور ہیں۔ چنانچہ جواب میں مجھے بھی مسکرانا پڑا۔ وہ میرے پاس سے گزرا تو میرا ہاتھ بلند ہوا اور میں نے اس کی گردن پر ایک ہلکی سی ضرب لگائی۔ اس سے پہلے کہ وہ زمین پر گرتا میں نے اسے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ میرے ہاتھ تیزی سے اس کے کوٹ کی اندرونی جیب کی طرف بڑھے اور میں نے اس کا ٹکٹ اور بورڈنگ کارڈ نکال کر اپنی پتلون کی جیب میں رکھ لیا۔ پھر میں اس کے دونوں بازوؤں کے نیچے ہاتھ ڈال کر اسے گھسیٹتا ہوا دوبارہ اُسی بُوتھ کی طرف لے گیا۔ اس کا بریف کیس میں نے اپنے بائیں ہاتھ میں تھام لیا تھا۔ بوتھ کا دروازہ کھول کر میں نے اسے اندر گھسیٹا اور اسے کموڈ پر بٹھا کر اس کا سر فلش کی ٹنکی سے ٹکا دیا۔ اس کا بریف کیس میں نے دیوار سے لگا کر کھڑا دیا اور بوتھ سے باہر آ کر چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ غسل خانے میں میرا سوا کوئی اور موجود نہ تھا اور میرا یہ آپریشن کامیاب رہا تھا۔ اسی وقت میں نے لاؤڈ سپیکر پر اناؤنسمنٹ کی آواز سنی جو مسافروں کو ہوائی جہاز پر سوار ہونے کی ہدایت کر رہی تھی برق رفتاری سے چلتا ہوا میں غسل خانے سے باہر نکل کر مسافر لاؤنج کی طرف بڑھا۔ میں نے کنکھیوں سے اپنے پیچھے دیکھا۔ سیاہ کار میں سوار دونوں آدمی مسافر کاؤنٹر کی طرف جا رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ مڑ کر مجھے دیکھتے میں تلاشی کے علاقے میں داخل ہو چکا تھا۔ اس کے بعد میں نے مڑ کر دیکھنا مناسب نہیں سمجھا اور دھڑکتے دل مگر مضبوط قدموں کے ساتھ چلتا ہوا اُس قطار میں شامل ہو گیا جو ہوائی جہاز پر جانے والے مسافروں پر مشتمل تھی۔ خطرہ قریب قریب ٹل چکا تھا۔ جب اپنا بورڈنگ کارڈ دکھا کر میں ہوائی جہاز میں داخل ہوا تو پہلی بار مجھے یہ احساس ہوا کہ میں اب ہر فکر و آلام سے محفوظ ہوں اور بخیریت واپس اپنے گھر پہنچ جاؤں گا۔ سیٹ پر بیٹھنے کے بعد میں نے بیلٹ باندھی اور نشست کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ طویل عرصے کے اعصابی کھچاؤ اور کشیدگی کے بعد سکون ملا تو میں اپنے آپ کو تھکا ماندہ محسوس کرنے لگا۔ میں نیند کی آغوش میں کھو گیا۔

کسی کے مخاطب کرنے سے میری آنکھ کھلی تو نگاہوں کے سامنے ایئر ہوسٹس کا شاداب اور مسکراتا ہوا چہرہ تھا۔ وہ

میرے سامنے ناشتے کی ٹرے لیے کھڑی تھی۔ میں کچھ بھوک بھی محسوس کر رہا تھا لیکن نیند کی خواہش زیادہ شدید تھی۔ مُسکرا کر اس کا شکریہ ادا کرنے کے بعد میں ایک بار پھر گہری نیند کی آغوش میں کھو گیا۔ ایک طویل نیند سے بیدار ہونے کے بعد میں نے کافی کی ایک گرم پیالی طلب کی اور خاموشی سے ہوائی جہاز میں سوار لوگوں کا جائزہ لینے لگا۔ خیالات کا ہجوم میرے ذہن میں کھلبلی مچانے کے لیے تیار تھا مگر میں کچھ عرصے کے لیے خود کو بالکل خالی الذہن رکھنا چاہتا تھا تاکہ اعصابی اور ذہنی سکون اور یکسوئی حاصل کر سکوں۔ میں پردیس میں بیتے ہوئے اِن دنوں کو بالکل فراموش کر کے یکسوئی اور سکون کے ساتھ اپنی روزمرّہ کی زندگی کا سلسلہ دوبارہ اسی جگہ سے جوڑنا چاہتا تھا جہاں سے ٹوٹا تھا۔ فضائی سفر کے دوران میں کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش نہیں آیا اور میں اخبار مُنہ پر رکھ کر سوتا جاگتا رہا۔ یہاں تک کہ ہوائی جہاز کے لینڈ کرنے کا اعلان ہونے لگا۔

میرے عزیز شہر کا ایئرپورٹ حسبِ معمول زندگی سے بھرپور اور پُر رونق تھا۔ میرے پاس کیونکہ کوئی سامان نہ تھا اس لیے انتظار کی زحمت اُٹھائے بغیر میں باہر نکل گیا جہاں ٹیکسی والوں کا ایک ہجوم میری بوٹیاں نوچنے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ ان میں سے ہر ایک مجھے کھینچ کر اپنی ٹیکسی میں بٹھانے کا خواہش مند تھا۔ بمشکل ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کے بعد میں نے ٹیلی فون بُوتھ کا رُخ کیا اور اپنے گھر کا فون نمبر گھمایا۔

"ہیلو۔" دوسری طرف روزی کی میٹھی اور زندگی سے بھرپور آواز سنائی دی۔ کئی دن کے بعد یہ آواز کان میں پڑی تو میں نے خوشی کی ایک لہر اپنے جسم میں دوڑتی ہوئی محسوس کی۔

"ہیلو۔" میں نے شرارت بھرے لہجے میں کہا۔

"آپ کو کس سے ملنا ہے؟" اس نے سوال کیا۔

"آپ ہی سے۔ آپ ملنا پسند کریں گی؟" میں نے پُوچھا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے ٹیلی فون بند کر دیا۔ بات میں نے غلط کی تھی لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ میری آواز پہچان جائے گی۔ جس طرح میں اس کی آواز پہچان گیا تھا، مگر شاید وہ میری آواز نہیں پہچان سکی تھی اور ایک اجنبی کی جانب سے یہ بے تکلفی اسے گوارا نہیں تھی۔

میں نے دوبارہ نمبر ملایا۔ اس بار میرے بولنے سے پہلے اس کی آواز سُنائی دی۔ "ہیلو!"

"ہیلو، روزی!" میں نے جذبات سے بھرپور آواز میں کہا۔

"کون بول رہا ہے؟" اس کی آواز میں اجنبیت تھی۔

"ذرا پہچانو تو۔" میں نے نرمی اور محبت سے کہا۔

"میرے پاس فضول باتوں کے لیے وقت نہیں ہے۔" اس نے برہمی سے کہا۔ "آپ کون بول رہے ہیں اور آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟"

"بھئی کیا بات ہے روزی، تم مجھے پہچانی نہیں؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"پہیلیاں بجھوانے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ بیزاری سے بولی۔ "میرے پاس فضول باتوں کے لیے وقت نہیں ہے، آخر آپ بتلاتے کیوں نہیں کہ آپ کون ہیں اور کس سے بات کرنا چاہتے ہیں؟"

"روزی، میں یوسف بول رہا ہوں۔"

"یوسف؟" اس کی آواز میں حیرت صاف نمایاں تھی۔ "کون یوسف؟"

اس بار میرے حیران ہونے کی باری تھی۔ میں نے تنگ آکر جھنجھلائی ہوئی آواز میں کہا "کیا تم مجھے نہیں پہچانتیں؟ میں یوسف ہوں ڈارلنگ۔ تمہارا یوسف۔"

"شٹ اپ۔" دوسری طرف سے اس کی غصّے بھری آواز آئی اور اس نے فون بند کر دیا۔ اس بار مجھے واقعی غصّہ آگیا۔ میں اس کی اس حرکت کا سبب سمجھنے سے قاصر تھا۔ یہ ممکن نہ تھا کہ وہ میری آواز نہ پہچان سکی ہو۔ میں بھی اس کی آواز واضح طور پر پہچان چکا تھا۔ تو پھر اس کے اس روّیے کا کیا مطلب تھا۔ ہو سکتا ہے وہ مجھے پریشان کرنا چاہتی ہو لیکن اتنے دن کی غیر حاضری کے بعد میں واپس آیا تھا اور میرے ساتھ اس کا یہ سلوک میرے لیے ناقابلِ فہم تھا۔

میں نے ایک بار پھر ٹیلی فون پر اپنے گھر کا نمبر ملایا۔ دو بار گھنٹی بجی اور اس کے بعد روزی نے فون اُٹھا لیا۔ "ہیلو!"

"روزی میری بات سنو۔ یہ کیا مذاق ہے۔ میں ایئرپورٹ سے بول رہا ہوں۔"

"ایئرپورٹ سے۔" اس کی آواز میں حیرت نمایاں تھی۔ "تو پھر میں کیا کروں؟"

معاً مجھے خیال آیا کہ ممکن ہے وہ مجھ سے ناراض ہو۔ میں نے اتنے دن میں ایک بار بھی اس سے فون پر رابطہ قائم نہیں کیا تھا۔ شاید وہ مجھ سے رُوٹھ گئی تھی۔

"روزی سنو۔ میں مجبور تھا۔ افسوس ہے کہ میں اِن دنوں میں تم کو فون نہیں کر سکا، مگر میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا تو تمہاری ناراضی ختم ہو جائے گی۔ اب غصہ تھوک دو اور کار لے کر ایئرپورٹ آجاؤ۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

"سُنیے جناب۔" وہ بولی تو اس کی آواز میں برہمی نمایاں تھی۔ "بہت ہو چکی۔ اب یہ بے ہودگی ختم کیجیے۔ آخر آپ مجھے تنگ کیوں کر رہے ہیں۔ آپ کون اور کیا چاہتے ہیں؟"

"میں یوسف ہوں، تمہارا شوہر۔ تم اب بھی مجھے نہیں پہچانیں!"

"تم جو کوئی بھی ہو تمہیں شریف عورتوں سے بات کرنا بھی نہیں آتا۔"

فون پر مجھے دُور سے کسی کی آواز سنائی دی۔ "روزی کون ہے فون پر؟"

"نہ جانے کون بدتمیز ہے؟" اس نے بگڑ کر کہا۔ "کہتا ہے میں یوسف بول رہا ہوں۔" پھر وہ فون پر مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "دیکھو، میں نے بہت دیر تک تمہاری بدتمیزی برداشت کی ہے۔ اب اس کے بعد مجھے فون مت کرنا، سمجھے۔" اور فون ایک بار پھر بند ہو گیا۔ میں تعجب اور بے یقینی کے ساتھ ریسیور کو دیکھتا رہ گیا۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اتنے دن کے بعد میری آواز سُن کر روزی خوشی سے اُچھل پڑے گی اور فوراً کار لے کر ایئرپورٹ آئے گی۔ لیکن میرے لیے سب سے زیادہ حیران کُن بات یہ تھی کہ وہ مجھے پہچاننے ہی سے مُنکر تھی۔ وہ مجھے اپنا شوہر یوسف تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھی۔ میں بالکل صاف اور واضح طور پر اس کی آواز سُن رہا تھا تو پھر وہ میری آواز سُن کر مجھے پہچاننے میں کیوں تامل کر رہی تھی؛ اس کی آواز میں جو اجنبیت بلکہ غیریت اور بے تعلقی تھی وہ اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ مجھے یقیناً کوئی اور شخص سمجھ رہی تھی۔ کوئی ایسا آدمی جو بلاوجہ فون پر اسے پریشان کر رہا تھا۔ یہ حرکت میرے لیے ناقابلِ فہم تھی لیکن اس نے فون پر اب تک میرے ساتھ جو برتاؤ کیا تھا اس کے بعد اسے ایک بار پھر فون کرنا لاحاصل تھا۔ میں نے بالآخر فون کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور تنگ آکر ٹیکسی ڈرائیوروں کے ہجوم کا رُخ کیا۔

گھر تک ٹیکسی کا سفر تکلیف دہ تھا۔ میرا ذہن یہ تسلیم کرنے کے لیے کسی طرح تیار نہ تھا کہ روزی میری آواز کو پہچان نہیں سکی تھی۔ تو کیا یہ بھی مجھے ستانے اور سزا دینے کا ایک طریقہ تھا؛ لیکن ستانے کی بھی کوئی حد ہونی چاہیئے۔

گھر کے سامنے ٹیکسی سے اُتر کر میں نے اسے منہ مانگا کرایہ ادا کیا اور خود گھر کے دروازے کی طرف بڑھا۔ میں نے اطلاعی گھنٹی بجائی۔ چند لمحے بعد دروازہ کُھلا اور میرے سامنے روزی کا تر و تازہ اور خوبصورت چہرہ تھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی، مگر مجھ پر نظر پڑی تو اس کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ اس کی جگہ اس کے چہرے پر پہلے حیرانی اور پھر برہمی کے آثار نمودار ہو گئے۔

وہ مجھے ٹکٹکی لگا کر دیکھ رہی تھی جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس کے چہرے پر حیرانی کا تاثر تھا۔ شاید وہ

میرے اچانک چلے آنے کی وجہ سے حیران رہ گئی تھی۔

"روزی" میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ "یہ تمہاری کیا حرکت ہے؟ تم نے فون کیوں بند کر دیا تھا؟ اور تم مجھے لینے ایئرپورٹ پر کیوں نہیں آئیں؟"

اس کا چہرہ ایک نقاب کی طرح بے تاثر ہو گیا۔ "اچھا! تو وہ تم تھے" اس نے غصے بھری آواز میں کہا۔ "جو مجھے بار بار فون کر رہے تھے۔"

"ظاہر ہے" میں نے بے تکلفی سے کہا۔ "میرے سوا اور کون ایسا کر سکتا تھا۔ یہ بتاؤ کہ تم میری آواز کیوں نہیں پہچانیں اور میری آواز سن کر بار بار فون کیوں بند کر دیتی تھیں؟"

"دیکھو مسٹر" وہ سرد لہجے میں بولی۔ "میں تو تمہیں اس وقت بھی نہیں پہچانتی ہوں۔ آخر تم ہو کون اور کیا چاہتے ہو؟"

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل سنجیدہ تھی مگر اس کا یہ عملی مذاق اب میری برداشت سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔ "دیکھو روزی" مجھے سچ مچ غصہ آ گیا۔ "مذاق کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ اب یہ ڈرامہ ختم کرو۔"

"ڈرامہ میں کر رہی ہوں یا تم؟"

"اتنے دنوں بعد گھر لوٹا ہوں اور تم میرے ساتھ ایسا سلوک کر رہی ہو۔ ٹھیک ہے اگر میرے اطلاع نہ دینے پر ناراض ہو تو میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔ میں مجبور تھا۔ بجائے اس کے کہ اظہار ہمدردی کرو، تم الٹی ناراض ہو رہی ہو" اتنا کہہ کر میں نے گھر میں داخل ہونے کے لیے آگے قدم بڑھایا۔ وہ تن کر میرے سامنے کھڑی ہو گئی اور اس نے دروازہ یوں تھام لیا جیسے ابھی میرے منہ پر بند کر دے گی۔ اس کی آنکھیں غصے اور شرارت سے چمک رہی تھیں۔ شاید میرا فون سننے کے بعد اس نے لباس تبدیل کر کے میرے استقبال کے لیے ہلکا سا میک اپ بھی کیا تھا۔ اس کے لباس سے اس کی مخصوص اور پسندیدہ خوشبو کی مہک آ رہی تھی۔ اس نے اپنے بال کھول کر شانوں پر بکھرائے ہوئے تھے اور اس وقت میرے سامنے دروازے میں کھڑی ہوئی وہ فریم میں لگی ہوئی کسی خوبصورت تصویر کی طرح خوبصورت لگ رہی تھی۔

"اگر تم نے ایک بھی قدم آگے بڑھایا تو اچھا نہ ہو گا" اس کی آواز میں غصے کے ساتھ ساتھ دھمکی بھی تھی۔

"کیا مطلب؟" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"مطلب یہ کہ میں نے تمہاری بدتمیزی کو بہت دیر تک برداشت کیا ہے۔ میرے اخلاق سے تم ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہو۔ یاد رکھو۔ میں تمہیں ٹھیک کر دوں گی۔ تم جیسے لوگوں کا علاج کرنا میں بخوبی جانتی ہوں۔"

اس بار میرے کانوں نے کوئی دھوکا نہیں کھایا اور میرے احساس نے بھی مجھے پہلی بار جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے لہجے میں سنجیدگی تھی اور اس کے چہرے پر بھی مذاق کا کوئی تاثر موجود نہ تھا۔ مجھے پہلی بار یہ احساس ہوا کہ وہ واقعی غصے میں ہے اور جو کچھ کہہ رہی ہے اس کا وہی مطلب ہے جو الفاظ سے ظاہر ہے۔ وہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر میرے گھر کے دروازے کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر بے تعلقی اور ناراضی کا تاثر تھا اور وہ بہت شدید غصے کے عالم میں مجھے گھور رہی تھی۔ آخر اس کے رویّے کا مطلب کیا تھا اور وہ ایسا کیوں کر رہی تھی۔ میں اپنی الجھن میں پڑ گیا تھا۔ یکبارگی مجھ پر یہ منکشف ہوا تھا کہ یہ روزی وہ روزی نہیں ہے جسے میں رخصت ہوتے وقت گھر میں چھوڑ کر گیا تھا۔ وہ ایک بدلی ہوئی شخصیت لگ رہی تھی۔ میں نے بہت غور سے اس کا جائزہ لیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ روزی ہی تھی، مگر میری روزی اور اس روزی میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ روزی کبھی اونچی آواز سے میرے سامنے بات کرنے کا تصور نہیں کر سکتی تھی۔ میرے مزاج کو پہچانتی تھی۔ میری خواہش اور مرضی کے مطابق کام کرنے کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا مقصد سمجھتی تھی۔ مجھے خوش اور مطمئن رکھنے کے لیے اپنے آرام کو تج دیا کرتی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے میرے ساتھ اس قسم کا مذاق کیا تھا اور اگر یہ مذاق نہیں تھا تو اور بھی زیادہ حیران کن

تھا۔ روزی میرے ساتھ ایسا برتاؤ کرے گی۔ یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میری آواز سنتے ہی وہ خوشی سے پاگل ہو جائے گی۔ جذباتی ہو کر رو پڑے گی۔ شکایت کرے گی کہ میں نے اتنے دن تک اپنی خیر کیوں نہیں دی۔ میری خیریت دریافت کرے گی اور فوراً کار لے کر دوڑی دوڑی ایئرپورٹ آ جائے گی۔ اس سے پہلے میں جب کبھی سفر سے واپس آتا تھا، خواہ وہ کتنا ہی مختصر سفر کیوں نہ ہو۔ روزی میرے سامنے آنکھیں بچھا دیا کرتی تھی۔ مجھ سے لپٹ کر روتی تھی۔ خوشی کے مارے عجیب عجیب حرکتیں کیا کرتی تھی۔ چند دنوں کی جدائی میں اس پر کیا بیتی ہے اسکا حال بیان کرتی تھی۔ کبھی ہنستی تھی، کبھی روتی تھی۔ اس ایک ایک لمحے کی تلافی کرنے کی کوشش کرتی تھی جو میں نے اس سے دور رہ کر گزارا ہوتا تھا۔ اپنی محبت، اپنی وفاؤں کا بے تابانہ اظہار کرتی تھی یہاں تک کہ میں اپنے آپ کو مجرم سمجھنے لگتا تھا کہ میں اسے چھوڑ کر کیوں گیا تھا — لیکن سامنے جو عورت کھڑی تھی اس کا لہجہ اور رویّہ یکسر بدلا ہوا تھا۔ وہ بظاہر دیکھنے میں روزی ہی نظر آتی تھی، لیکن وہ میری روزی نہیں ہو سکتی تھی۔

اچانک اس کی غصہ بھری آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ تیز اور بلند آواز میں کہہ رہی تھی۔ "اب جاتے ہو یا میں بلاؤں کسی کو۔ معلوم ہوتا ہے دھکے کھائے بغیر تم نہیں جاؤ گے۔"

"خدایا — میرے کان یہ کیا سن رہے ہیں؟! روزی مجھ سے اس انداز میں مخاطب ہو سکتی ہے؟!" میں حیرانی سے ساکت کھڑا اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ میرا دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اس سے کیا کہوں۔ میں مسلسل ٹکٹکی لگائے اُسکے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ اس کے بعد اس نے اونچی اور غصیلی آواز میں مجھ سے کچھ اور بھی کہا لیکن میں اس کو سن نہیں سکا۔ میرے کانوں نے ان الفاظ کو نہیں سنا۔ نہ ہی میرے ذہن نے ان کا کوئی نوٹس لیا۔ میں بدستور خاموش اور بے حس و حرکت کھڑا ایک معمول کی طرح اسے دیکھتا رہا۔ وہ شاید میرے اس رویّے سے تنگ آ گئی اور اس نے ہاتھ بڑھا کر دروازے کو بند کرنے کا ارادہ کیا۔

یکایک ایک مردانہ آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ "ڈارلنگ۔ تم وہاں کیوں کھڑی ہو؟ باہر کون آیا ہے؟"

روزی نے گردن موڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ میری نظریں بھی اس کی نگاہوں کے تعاقب میں گئیں۔ اس سے پہلے کہ روزی کوئی جواب دیتی ایک شخص سامنے آ کر روزی کے برابر کھڑا ہو گیا۔ اس کی نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اور اب میں اسے تک رہا تھا۔ میری تمام حسیات سمٹ کر میری آنکھوں میں آ گئی تھیں۔ وہ حیرت جو مجھے روزی کے بدلے ہوئے رویّے کو دیکھ کر ہوئی تھی اب غائب ہو چکی تھی۔ اس کی جگہ ایک نئی حیران کن حقیقت نے مجھے اپنے دائرے میں لے لیا تھا بلکہ اسے حیرانی کی جگہ SHOCK کی کیفیت کہنا زیادہ درست ہو گا۔ میں بے یقینی اور بے اعتمادی کے عالم میں اپنے سامنے آ کر کھڑے ہونے والے آدمی کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں نے جلدی جلدی آنکھیں جھپکیں بلکہ دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھوں کو مسل کر بھی دیکھ لیا، لیکن یہ میرا وہم یا تصور نہیں تھا۔ یہ جیتا جاگتا انسان تھا جو میرے سامنے کھڑا ہوا تعجب سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ جہاں تک استعجاب اور حیرت کا تعلق ہے میرا خیال ہے کہ مجھے دیکھ کر اسے بھی اتنی ہی حیرت ہو رہی ہو گی جتنی مجھے اس کو دیکھ کر ہوئی تھی۔ ہم دونوں خاموش کھڑے، حیرت سے آنکھیں پھاڑے ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔ اس ناقابل یقین حیرت کا سبب یہ تھا کہ جو شخص اس وقت میرے سامنے کھڑا تھا وہ ہو بہو میری تصویر تھا۔ اسے میرا ہمشکل اور ہمزاد کہنا زیادہ درست ہو گا۔ ہم دونوں کے قد و قامت اور چہروں میں ذرا بھی فرق نہیں تھا وہ میری تصویر تھا اور میں اس کا عکس۔

چند لمحے جو بے حد طویل محسوس ہوتے تھے، اسی عالم میں گزر گئے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو اور روزی ہم دونوں کو دیکھنے میں محو تھی۔ اس کی نظریں نہایت تیزی سے کبھی میری جانب اور کبھی اس شخص کی جانب جا رہی تھیں جواب اس

کے برابر کھڑا تھا۔ روزی کے چہرے پر بھی حیرت اور بے یقینی کا وہی تاثر تھا جو ہم دونوں کے چہروں پر تھا۔

وہ شخص جو میرا ہم شکل تھا ایک قدم آگے بڑھ کر روزی کے پہلو میں پہنچا۔ اب میں نے پہلی بار دیکھا کہ وہ میرا ہی ایک پسندیدہ سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ کوٹ، پتلون، قمیص، ٹائی جیبی رومال یہاں تک کہ جوتا بھی میرا ہی تھا۔ میں اپنی ان اشیاء کو پہچاننے میں غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اس نے موزے بھی میرے ہی پہن رکھے ہوں گے۔

وہ روزی کی طرف متوجہ ہوا اور جب بولا تو مجھے یوں لگا جیسے میں خود اپنی ہی آواز سن رہا ہوں: "ڈارلنگ یہ کون ہے؟"

روزی نے چونک کر اسے دیکھا اور بولی: "یہ وہی آدمی ہے جو ٹیلی فون پر مجھے تنگ کر رہا تھا۔ اب یہ یہاں بھی آگیا ہے اور کہہ رہا ہے کہ یہ میرا شوہر ہے۔"

وہ شخص یہ سن کر غصے سے مجھ سے مخاطب ہوا: "اے مسٹر پوچھ سکتا ہوں تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟ میری بیوی کو پریشان کرنے کا تمہیں کیا حق ہے؟"

"تمہاری بیوی؟!" بے اختیار میری زبان سے نکلا۔ "خبردار۔ یہ لفظ دوبارہ اپنی زبان پر نہ لانا۔ یہ میری بیوی ہے۔ میں اس کا شوہر ہوں۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم کون ہو اور میرے گھر میں کیا کر رہے ہو؟ تمہیں میرا لباس پہننے کی اجازت کس نے دی؟"

پہلے تو اس کی پیشانی پر غصے کی لکیریں نمودار ہوئیں مگر پھر وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔ اس کے ہنسنے کا انداز بھی بالکل میری ہی طرح تھا۔ "تم جو کوئی بھی ہو خاصے دلچسپ آدمی معلوم ہوتے ہو۔ مگر میں تمہیں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ عملی مذاق مجھے پسند نہیں آیا۔ میرے ہم شکل ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم میری بیوی کو پریشان کرو اور میرے منہ لگو شاید تم جانتے نہیں کہ یہ جرم ہے۔ اس کے علاوہ کوئی شخص یہ پسند نہیں کرے گا کہ تم مذاق میں خود کو اسکی بیوی کا شوہر کہو۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ تم اب یہاں سے نو دو گیارہ ہو جاؤ۔ تم جو بد تمیزی اب تک کر چکے ہو میں اسے بھول جاؤں گا، لیکن مجھے اس سے زیادہ آزمائش میں ڈالنے کی کوشش نہ کرنا۔ سمجھے؟!"

میرے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ روزی سے مخاطب ہوا: "مجھے افسوس ہے ڈارلنگ کہ تمہیں خواہ مخواہ پریشانی اٹھانی پڑی مگر تم اس مسخرے کی باتوں کو سنجیدگی سے مت لینا۔ یہ ہے تو سزا کا مستحق لیکن میں اس بات کو بڑھانا نہیں چاہتا۔ آؤ!" اتنا کہہ کر اس نے روزی کے بازو میں اپنا بازو ڈال دیا اور مڑ کر گھر کے اندر جانے لگا۔

میری قوت برداشت جواب دے گئی۔ میں غصے سے بے قابو ہو کر آگے بڑھا اور میں نے زور سے دھکا دے کر اسے روزی سے علیحدہ کر دیا۔ میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔

"خبردار۔" میں نے گرجدار آواز میں کہا: "اگر تم نے میری بیوی کے نزدیک جانے کی کوشش کی تو میں تمہارا خون کر دوں گا، بہروپیے۔ تم ہو کون اور میرے گھر میں کیا کر رہے ہو۔ میں تمہیں صرف ایک منٹ کی مہلت دیتا ہوں۔ فوراً مجھے اپنے بارے میں سب کچھ سچ سچ بتا دو ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔"

وہ میرے اس غیر متوقع اقدام سے گھبرا گیا اور میرے دھکیلنے کی وجہ سے زور سے جا کر گیلری کی دیوار سے ٹکرایا۔ روزی بھی اس اچانک حملے سے گھبرا کر سہمی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

میں اس کے پاس پہنچ گیا: "فکر نہ کرو ڈارلنگ۔ میں اس فراڈ کو پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ اس کی جرأت کیسے ہوئی کہ میرے گھر میں داخل ہو کر اس نے تمہیں دھوکہ دینے کی کوشش کی۔ مجھے یہ بتاؤ کہ یہ کب سے یہاں موجود ہے؟"

روزی مجھے جواب دینے کی بجائے سہم کر مجھ سے دور ہو گئی وہ خوف زدہ نظر آ رہی تھی: "مجھ سے نہ ڈرو روزی۔ میں یوسف ہوں تمہارا یوسف۔ فکر نہ کرو۔ اب میں واپس آگیا ہوں۔ اس بہروپیے کو تو میں ایسا سبق سکھاؤں گا کہ یہ زندگی بھر

یاد رکھے گا۔"

اتنا کہہ کر میں غضب ناک ہو کر اپنے ہم شکل کی طرف بڑھا اور میں نے اس کے کوٹ کا کالر پکڑ لیا: "بتاؤ تم کون ہو اور یہاں کیوں آئے ہو؟ فوراً اپنے بارے میں سب کچھ بتا دو ورنہ بہت برا ہوگا۔"

اس نے دونوں ہاتھ میرے بازوؤں کے اندر ڈال کر زور سے جھٹکا دیا اور میری گرفت سے آزاد ہو گیا۔ دوسرے ہی لمحے اس کا ایک زوردار گھونسہ میرے چہرے سے ٹکرایا اور میں چکرا گیا۔ وہ صرف شکل و صورت اور قد و قامت ہی میں میری طرح نہیں تھا۔ قوت اور پھرتی میں بھی وہ میرا ہمسر معلوم ہوتا تھا۔ اب ہم دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے بھوکے درندوں کی طرح ایک دوسرے کو گھور رہے تھے۔ میں نے قدم آگے بڑھایا مگر اچانک سیاہ بجلی سی کوندی اور اس نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ یہ دراصل میرا کتا ٹائیگر تھا جو بلا آواز نکالے اچانک بلائے ناگہانی کی طرح لپک کر مجھ پر حملہ آور ہوا تھا۔ میں اس حملے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ پوری قوت سے میرے جسم سے ٹکرایا اور میں لڑکھڑا کر فرش پر گر گیا۔ وہ تو غنیمت ہے کہ فرش پر قالین بچھا ہوا تھا ورنہ مجھے کافی چوٹ آتی۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھل کر کھڑا ہوتا ٹائیگر غراتا ہوا خونخوار انداز میں دانت نکالے میری طرف بڑھا اور میرے سر کے نزدیک کھڑا ہو گیا۔ وہ حد سے زیادہ غضبناک اور برہم تھا اور دانت نکالے مجھے یوں دیکھ رہا تھا جیسے مجھے پھاڑ کھائے گا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میرے ہی گھر میں میرا اپنا پالتو کتا ٹائیگر مجھ پر حملہ آور ہو جائے گا۔

"ٹائیگر۔" میں نے اسے پکارا۔ "ٹائیگر۔ یہ میں ہوں۔ تم مجھے نہیں پہچانتے؟" مگر ٹائیگر کی برہمی اور وحشت میں کمی نہیں آئی۔ وہ بدستور میرے سرہانے کھڑا خوفناک انداز میں غراتے ہوئے مجھے گھورتا رہا۔ اس کی سانسیں مجھے اپنی گردن پر محسوس ہو رہی تھیں۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ ایک سدھایا ہوا کتا ہے۔ اگر میں نے ذرا بھی حرکت کرنے کی کوشش کی تو وہ میرا نرخرہ چبا ڈالے گا۔ دشمنوں کو زیر کرنے کے لیے اس قسم کی تربیت میں نے بذات خود ٹائیگر کو دلائی تھی، لیکن یہ بات میری فہم سے بالا تھی کہ ٹائیگر جو میرا ذاتی پالتو کتا تھا مجھے پہچان کیوں نہیں رہا تھا۔ کتا ایک ایسا جانور ہے جو شکلوں اور ظاہری حلیوں سے دھوکا نہیں کھاتا۔ وہ خوشبو پہچانتا ہے اور اپنے مالک کی خوشبو تو وہ ہزاروں لاکھوں میں بھی پہچان سکتا ہے۔ لیکن میرا اپنا ٹائیگر بھی دھوکا کھا گیا تھا اور میرے ہم شکل بہروپیے کے اشارے پر دانت نکالے مجھے شکار کرنے کے لیے تیار تھا۔

میرا ہم شکل پہلے تو غصے اور نفرت سے مجھے گھورتا رہا مگر پھر اس کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی: "اب بولو۔ کیا اب بھی تمہیں اس بات پر شک ہے کہ یہ میرا گھر ہے۔ یہ بے زبان کتا تک مجھ سے وفادار ہے اور مجھے پہچانتا ہے۔ تم انسانوں کو تو بہکا سکتے ہو مگر کتے کو دھوکا نہیں دے سکتے۔ کہو تو ٹائیگر کو ایک اشارہ کروں۔ وہ ایک منٹ میں تمہاری تکا بوٹی کر دے گا!"

ٹائیگر کے بدلے ہوئے رویے اور خونخوار انداز کے پیش نظر اس کی بات بالکل درست تھی۔ موت اس لمحے میری شہ رگ کے بالکل نزدیک تھی۔ میں بے حس و حرکت زمین پر پڑا ہوا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر میں نے ذرا سی بھی جنبش کی تو ٹائیگر بھوکے شیر کی طرح مجھ پر ٹوٹ پڑے گا۔ وہ بے مروت اور بے وقوف کتا نہ جانے کیوں دھوکہ کھا گیا تھا اور مجھے پہچان نہیں سکا تھا۔ وہ بدستور میرے سرہانے کھڑا ہوا انتہائی خونخوار طریقے پر غرا رہا تھا۔

ایک مردانہ آواز نے میری نگاہوں کو ٹائیگر کی طرف سے ہٹا کر دوسری طرف متوجہ کر دیا: "بھئی تم لوگوں نے اتنی دیر کیوں لگا دی۔ یہاں کیا گڑبڑ ہو رہی ہے؟"

اور میرے سامنے میرا دوست شوکت نمودار ہو گیا۔ وہ مکان کے اندرونی حصے سے نکل کر آیا تھا اور اس وقت ڈنر سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ روزی اور میرا ہم شکل بھی کہیں باہر جانے کے لیے ڈریس اپ ہو کر

تیار نظر آتے تھے۔

"ارے!" شوکت کے منہ سے نکلا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ کون ہے؟" پھر وہ چند قدم آگے بڑھ کر میرے نزدیک آگیا اور جھک کر مجھے دیکھنے لگا۔ یکایک اس کے چہرے پر حیرت اور پھر شناسائی کے آثار نمودار ہونے۔ میں خوشی سے بے قابو ہو کر ٹائیگر کی موجودگی کو بھی فراموش کر بیٹھا اور بے اختیار چلایا: "شوکت۔ یہ میں ہوں۔ تمہارا دوست یوسف۔ اچھا ہوا تم آگئے۔ تم یقیناً مجھے پہچان لوگے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس دھوکے باز نے تمہیں بھی فریب دے دیا ہے۔"

میں نے اٹھنے کی کوشش کی مگر ٹائیگر کی خوفناک غراہٹ نے مجھے پھر ساکت کر دیا، لیکن میری نگاہیں شوکت پر جمی ہوئی تھیں جو بہت غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میرا جگری اور پرانا دوست تھا یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ کسی بہروپیے سے دھوکہ کھاتا۔ خاص طور پر اس حالت میں جبکہ میں بھی بذاتِ خود اس کے سامنے موجود تھا۔

"او مائی گاڈ!" شوکت کے منہ سے نکلا۔ "ہو بہو تمہاری شکل!" پھر وہ میرے ہمشکل سے مخاطب ہوا۔ "یہ کون ہے؟ کیا تم اسے جانتے ہو یوسف؟"

مگر اس کے بولنے سے پہلے میں چیخ اٹھا: "شوکت۔ جسے تم یوسف سمجھ رہے ہو وہ فراڈ ہے۔ دھوکے باز اور فریبی ہے۔ تمہارا دوست میں ہوں۔ میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔ تم ذرا ٹائیگر کو میرے پاس سے ہٹاؤ۔"

میرا ہمشکل بے اختیار قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا: "تم جو کوئی بھی ہو آدمی دلچسپ ہو۔ ارے بھئی اگر تم یوسف ہو تو پھر ٹائیگر کو بھی خود ہی سمجھا لو۔ شوکت کی مدد کیوں حاصل کرتے ہو۔ ٹائیگر بھی تو تمہارا ہی کتا ہے۔"

میری توجہ ایک بار پھر ٹائیگر کی طرف مبذول ہو گئی جو ابھی تک میری خوشبو نہیں پہچان سکا تھا اور دشمنی کے انداز میں مجھ پر کسی بھی لمحہ حملہ آور ہونے کے لیے بالکل تیار کھڑا تھا۔ غصے سے اس کی کمر کے بال کھڑے ہو گئے تھے اور اس وقت وہ ایک انتہائی بھیانک اور خونخوار درندے کی تصویر پیش کر رہا تھا۔ ٹائیگر کا یہ روپ میرے لیے قطعی خلافِ توقع اور حیرت انگیز تھا مگر اس نے مجھے بالکل بے بس اور بے عمل بنا کر رکھ دیا تھا۔

شوکت جو جھک کر اور گھٹنوں پر ہاتھ دھر کر مجھے دیکھ رہا تھا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایک بار روزی اور میرے ہمشکل کی جانب دیکھا اور مجھے یقین ہو گیا کہ وہ مجھے پہچان گیا ہے اب وہ روزی کو بھی میرے بارے میں بتا دے گا اور میرے حق میں گواہی دے گا۔ لیکن میری توقع نقش بر آب ثابت ہوئی۔ شوکت نہایت دوستانہ انداز میں میرے ہمشکل کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا: "یار کچھ بھی ہو یہ ہے بالکل تمہارا ہمشکل۔ ہو بہو تمہاری تصویر ہے۔ ایک کو چھپاؤ، دوسرے کو نکالو۔ کوئی ایک منٹ کے لیے بھی نہیں شناخت کر سکتا۔ اچھا اب ذرا ٹائیگر کو اس کے پاس سے ہٹاؤ۔ ذرا اس سے دو دو باتیں ہو جائیں۔"

میرا ہمشکل فاتحانہ انداز میں ہنسا اور اس نے چٹکی بجا کر ٹائیگر کو پکارا: "ٹائیگر کم ہیئر۔"

یہ بالکل وہی انداز تھا جس طرح میں ٹائیگر کو بلایا کرتا تھا۔ اس کی آواز سنتے ہی ٹائیگر نے میرے پاس سے ہٹنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگائی۔ وہ لپک کر میرے ہمشکل کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا اور دُم ہلانے لگا۔ اس نے ٹائیگر کے سر پر اپنا ہاتھ رکھا تو ٹائیگر نے اسے چاٹنا شروع کر دیا۔ یہ اس کی محبت اور وفاداری کا کھلا مظاہرہ تھا۔ میں ٹائیگر کی اس بے رُخی پر حیران رہ گیا۔ زندگی میں پہلی بار میں نے کسی کتے کو اپنے مالک سے بے وفائی کرتے ہوئے دیکھا تھا۔

شوکت میرے نزدیک آ کر کھڑا ہو گیا اور میری طرف ہاتھ بڑھا کر کہنے لگا: "اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

میں اس کا ہاتھ تھام کر فرش سے اٹھ کھڑا ہوا۔ شوکت کے ہاتھ کے لمس نے میرے اندر ایک نیا یقین اور

ولولہ پیدا کر دیا تھا۔ شاید اس قسم کے جذبات اس کے دل میں بھی پیدا ہوئے ہوں گے اور مجھے چھونے کے بعد اس کے لیے مجھے پہچان لینا یقیناً مشکل نہ ہوگا۔ یہ سوچ کر میں اس کی طرف بڑھا اور میں نے کہا: "شوکت تم اپنے وعدے کے مطابق وہاں کیوں نہیں پہنچے تھے؟ میں نے تمہارا اتنا انتظار کیا مگر نہ تمہارا پیغام ملا اور نہ ہی تم خود آئے۔ کیا بتاؤں میں وہاں کن مشکلات میں پھنس گیا تھا۔ میرا سامان چوری ہو گیا تھا جس میں ایگریمنٹ کا مسودہ بھی موجود تھا۔ تمہیں کیا بتاؤں کہ کن حادثات سے بچ کر یہاں آیا ہوں تو اس بہروپیے کو اپنے گھر میں دیکھ کر میرا خون کھولنے لگا ہے۔"

شوکت خاموشی سے میرے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ جب میں خاموش ہوا تو میں نے اس کے چہرے پر الجھن اور پریشانی کے تاثرات دیکھے۔ وہ میرے ہمشکل سے مخاطب ہو کر بولا: "یہ آدمی کیا کہہ رہا ہے؟" پھر وہ میرے نزدیک آیا اور ہمدردانہ لہجے میں پوچھنے لگا: "بھائی۔ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟ تم کسی پاگل خانے سے بھاگ کر تو نہیں آئے ہو؟"

"او شوکت!" میں نے اپنا سر تھام لیا۔ "خدا کے لیے تم تو ایسی باتیں مت کرو۔ میں پہلے ہی کافی پریشانیاں اٹھا چکا ہوں۔ کم از کم تم تو ایسا نہ کہو دوست۔ جانتے ہو ہوٹل سے میرا سامان اور بریف کیس چوری ہو گیا۔ اسی بریف کیس میں اس ایگریمنٹ کا ڈرافٹ بھی تھا جو ہمیں ملک برکت سے سائن کرانا تھا۔ پھر مجھے ایک پُراسرار شخص کے آدمیوں نے اغوا کر لیا۔ بڑی مشکل سے ان لوگوں سے نجات ملی تو میڈم کے جال میں پھنس گیا۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ وہ ایک دن گھر پر نہیں تھی تو اس کی سیکرٹری کی وجہ سے میں اس کی قید سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا ورنہ ابھی تک اسی کی قید میں ہوتا اور خدا جانے میرا کیا حشر ہوتا۔"

میں شوکت سے مخاطب تھا لیکن اس دوران میں میری نگاہیں روزی کے چہرے سے ایک پل کے لیے بھی نہیں ہٹی تھیں۔ اس کے چہرے پر الجھن، حیرانی اور بیزاری کے آثار تھے۔ وہ کسی کشمکش کا شکار نظر نہیں آ رہی تھی۔ غالباً اس کو میری باتوں پر یقین آ رہا تھا۔ میرا ہمشکل روزی کے نزدیک ہی کھڑا ہوا تھا۔ وہ بے پروائی اور بے نیازی سے میری باتیں سن رہا تھا اور اس کے چہرے پر ایک تمسخرانہ تاثر تھا جیسے وہ میری باتوں کا مذاق اڑا رہا ہو۔ میری بات ختم ہوئی تو شوکت نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہنے لگا: "بھائی۔ تمہاری کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ تم نجانے کہاں کہاں کی باتیں کر رہے ہو۔ یہ سب چھوڑو۔ اب مجھے سچ سچ اور صاف صاف بتا دو کہ آخر تم ہو کون؟ اس گھر کا پتہ تمہیں کس نے بتایا اور تم نے ہم سب لوگوں کے بارے میں اتنی معلومات کہاں سے اور کیونکر حاصل کیں؟"

"شوکت۔ تم سمجھتے کیوں نہیں۔ میں تمہارا دوست یوسف ہوں۔ میں آخر تمہیں کیسے یقین دلاؤں؟"

"تمہارا دعویٰ ہے کہ تم یوسف ہو اور اس گھر کے مالک ہو؟" اس نے پوچھا۔

"دعویٰ نہیں یہ حقیقت ہے۔"

"یہاں کی ہر چیز تمہاری ہے؟" اس نے سوال کیا۔

"ظاہر ہے۔"

"تو پھر یہ کتا ٹائیگر بھی تمہارا ہی کتا ہے۔ مگر یہ تمہیں پہچانتا کیوں نہیں؟ کتے تو کسی طرح اپنے مالک کو نہیں بھولتے۔ اس معاملے میں ہم انسان دھوکہ کھا سکتے ہیں مگر کتے کسی طرح دھوکہ نہیں کھا سکتے۔ مگر تمہارا کتا تمہارا دشمن ہو گیا۔"

"یہی تو میں حیران ہوں۔" میں نے کہا۔ "آخر اس کا سبب کیا ہے؟"

"سبب یہ ہے کہ تم جھوٹے ہو۔ فراڈ ہو۔ دھوکے باز ہو۔" میرا ہمشکل بالآخر خاموش نہ رہ سکا اور بول پڑا: "اگر تمہاری

بات میں صداقت ہوتی تو کم از کم یہ بے زبان تم پر حملہ آور نہ ہوتا۔"

"ٹھہرو۔ خواہ مخواہ باتوں اور بحث میں وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔" شوکت نے درمیان میں مداخلت کی۔ "مجھے ان صاحب سے چند باتیں کر لینے دو۔" اتنا کہہ کر وہ میرے نزدیک آ گیا اور بولا۔ "دیکھو بھائی۔ تم جو کوئی بھی ہو یہ بتاؤ کہ سیدھی طرح یہاں سے جاؤ گے یا پولیس کو بلانا پڑے گا۔"

"ضرور بلاؤ پولیس کو۔" میں نے تنگ آ کر کہا۔ یہ تجویز میرے مطلب کی تھی اور اس طرح میرا مسئلہ آسانی کے ساتھ حل ہو سکتا تھا۔ "میں تو خود یہی چاہتا ہوں کہ تم پولیس کو بلاؤ تا کہ اصلیت کا پتہ چل جائے۔"

"کیوں یوسف۔ کیا خیال ہے؟" شوکت میرے ہم شکل سے مخاطب ہوا۔ "ارے یار چھوڑو۔ کس فضول چکر میں پڑ گئے ہو۔" وہ بیزاری سے بولا۔ "اس مسخرے کی باتوں میں آ گئے ہو۔ بلا وجہ ہمیں کیا ضرورت پڑی ہے پولیس کو بلانے کی۔"

"یہ ٹھیک کہتے ہیں۔" روزی بولی۔ "خواہ مخواہ ساری دُنیا کو تماشہ دکھانے کی کیا ضرورت ہے۔" پھر وہ میری طرف دیکھ کر غصے سے بولی "بھئی آخر تم ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو۔ تمہیں کس نے ہمارے پیچھے لگایا ہے"

میں دو قدم اس کی طرف بڑھا تو وہ بے اختیار پیچھے سمٹ گئی۔ مجھے حیرت اس بات کی تھی کہ میری شریکِ حیات بھی مجھے پہچاننے سے قاصر تھی، حالانکہ مجھے روزی کے بارے میں یقین تھا کہ وہ تو کم از کم مجھے پہچاننے میں تامل نہیں کرے گی۔

"روزی۔" میں نے اپنے مخصوص لہجے میں اسے پکارا۔ "تم بھی مجھے نہیں پہچان سکیں۔ تمہیں تو دھوکہ نہیں کھانا چاہیے۔ تم یہ برداشت کر لو گی کہ تمہارے دھوکے میں کوئی غیر اور اجنبی میری جگہ لے لے۔ تم یقین کیوں نہیں کرتیں میرا؟ آخر میں کیسے تمہیں بتاؤں کہ میں ہی تمہارا یوسف ہوں۔ ذرا مجھے غور سے دیکھو۔ میرے نزدیک آؤ۔ میری آنکھوں میں جھانکو۔ میرے دل کی دھڑکنیں سننے کی کوشش کرو۔ تمہیں میرے پاس سے اپنے شوہر کی مانوس خوشبو آئے گی۔ میرا تو خیال تھا کہ تم میرے لیے بے تاب ہو گی۔ میرا انتظار کر رہی ہو گی۔ مجھ سے اتنی دیر غیر حاضری کا سبب دریافت کرو گی اور میں تمہیں ان مشکلات کے بارے میں بتاؤں گا جو مجھے وہاں پیش آ چکی ہیں اور جن سے بمشکل نجات حاصل کر کے میں تمہارے پاس آیا ہوں مگر تم ایک فریبی کی باتوں میں آ کر سب کچھ بھول گئیں۔ کیا تمہارا دل گواہی نہیں دے رہا کہ میں ہی تمہارا شوہر ہوں۔ تمہارا یوسف ہوں......" میں جذبات کی رَو میں بہہ کر بے اختیار روزی کی طرف بڑھا۔ یکایک میرا ہم شکل آگے بڑھ کر میرے اور روزی کے درمیان حائل ہو گیا۔ وہ دانت پیس کر بولا۔

"خبردار۔ اگر اس کے آگے ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو میں تمہاری زبان کھینچ لوں گا۔ میں تمہاری بدتمیزیاں بہت دیر سے برداشت کر رہا ہوں، لیکن اب میں تمہیں اپنی بیوی سے مخاطب ہونے کی ہرگز اجازت نہیں دوں گا۔"

اس کو مجھ پر برستے ہوئے دیکھا تو ٹائیگر بھی جو اس کے نزدیک کھڑا ہوا تھا غصے میں غرّانے لگا۔

روزی بے اختیار میرے ہم شکل کے کندھے سے سر لگا کر کھڑی ہو گئی اور روہانسی آواز میں بولی۔ "ڈارلنگ۔ خدا کے لیے اس آدمی کا کوئی علاج کرو۔ یہ تو میرے اعصاب پر سوار ہو گیا ہے، اگر یہ کچھ دیر اور یہاں موجود رہا تو میں پاگل ہو جاؤں گی۔ اس کو کہو کہ یہاں سے چلا جائے۔ فوراً اسی وقت میری نگاہوں سے دور ہو جائے۔"

"سُن لیا تم نے۔" میرا ہم شکل میری طرف گھورتا ہوا چلّایا۔ "اب تم ایک لمحہ بھی اس گھر میں نہیں رہ سکتے۔ فوراً یہاں سے چلے جاؤ ورنہ میں ٹائیگر کو زیادہ دیر تک نہیں روک سکوں گا۔ وہ میرے ایک اشارے کا منتظر ہے۔"

اتنا کہہ کر اس نے ٹائیگر کی طرف دیکھا اور میری طرف بڑھا۔ اس کا انداز اتنا جارحانہ اور خطرناک تھا کہ میں بے اختیار پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے اسے پچکارنے کی کوشش کی۔ "ٹائیگر، ٹائیگر۔ مجھے پہچانو ٹائیگر۔ میں تمہارا

مالک ہوں۔"

جواب میں وہ دانت نکال کر میری طرف لپکا۔ اس وقت وہ ایک خونخوار درندہ بن گیا تھا۔ وہ اُچھل کر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں نے بے اختیار اپنا ہاتھ اُٹھا دیا اور میرے کوٹ کی آستین اس کے منہ میں آ گئی۔ اس نے ایک زور کا جھٹکا دیا اور میں نے بمشکل اپنے آپ کو زمین پر گرنے سے بچایا مگر میں لڑکھڑا کر دیوار سے ٹکرا گیا۔ ٹائیگر دوبارہ میری طرف لپکا اور اُچھل کر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس بار میں نے قریبی میز پر رکھا ہوا ایک پیتل کا گلدان اُٹھا کر اپنا دفاع کیا۔ گلدان سے اس کا منہ ٹکرایا اور وہ ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔ لیکن وہ بارہ غراتا اور بگڑتا ہوا مجھ پر اُچھلا۔ میں نے اس بار پھر گلدان کی مدد سے اپنا دفاع کیا لیکن اس کے دانتوں کی وکمیں میرے کوٹ کی آستین میں پیوست ہو گئیں۔ میں جانتا تھا کہ ٹائیگر ایک انتہائی طاقتور غصیل اور خونخوار جانور ہے اور میں نہتا زیادہ دیر تک اس سے مقابلہ نہیں کر سکوں گا۔ اس سے پہلے کہ وہ ایک بار پھر مجھ پر ٹوٹ پڑتا روزی کی تیز آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ ٹائیگر کو پکار رہی تھی۔ "ٹائیگر، رُک جاؤ ٹائیگر۔" مگر ٹائیگر نے روزی کی آواز پر کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ غصے سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس کی کمر کے بال کھڑے ہو گئے تھے۔ دانت خوفناک انداز میں باہر نکلے ہوئے تھے اور وہ میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے بھی گلدان کو اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے تھام لیا۔ میری نگاہیں ٹائیگر پر جمی ہوئی تھیں لیکن موقع پا کر میں نے کنکھیوں سے آس پاس نظریں دوڑائیں۔ میں اپنے بچاؤ کے لیے کسی مناسب ہتھیار کی جستجو میں تھا۔

"پلیز" روزی نے میرے ہم شکل کو ملتجیانہ انداز میں مخاطب کیا۔ "یوسف! یہ کیا تماشہ ہے۔ بند کرو یہ سب۔"

میرے ہم شکل نے ٹائیگر کو آواز دی۔ "ٹائیگر!" اور یوں محسوس ہوا جیسے ایک دم ٹائیگر کو بریک لگ گئے ہوں۔ وہ مجھ پر اُچھل کر حملے کے لیے اپنے جسم کو تول رہا تھا مگر اس کی آواز سنتے ہی ایک دم اسی جگہ رُک گیا۔

"اِدھر آؤ میرے پاس۔" اس ہدایت پر ٹائیگر پلٹ کر میرے ہم شکل کے نزدیک چلا گیا اور دُم ہلانے لگا لیکن اس کے باوجود وہ میری طرف دیکھ کر غرانے سے باز نہیں آیا۔

میں ٹائیگر کی اس حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین تبدیلی کو دیکھ کر خود اپنی آنکھوں اور کانوں پر بھروسہ کرنے سے قاصر تھا۔ میرا اپنا پالتو اور وفادار کتا میری آنکھوں کے سامنے ایک غیر اور اجنبی شخص کے اشارے پر خود مجھ پر حملہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا تھا!! اس بہروپیے نے نہ صرف انسانوں کو بلکہ کتے کو بھی اپنی سازش کے جال میں پھانس لیا تھا۔ وہ ان سب کی نگاہ میں معتبر بن بیٹھا تھا اور مجھے خود اپنے ہی گھر میں اس نے ایک اجنبی اور ناقابلِ برداشت شخصیت میں بدل کر رکھ دیا تھا۔

میرا ہم شکل چند لمحے مجھے غصے اور نفرت سے گھورتا رہا۔ پھر وہ ایک قدم آگے بڑھا تو ٹائیگر بھی اس کا ہم قدم تھا۔ "اگر تم فوراً اس گھر سے باہر نہیں نکلے تو پھر میں اس بار ٹائیگر کو نہیں روکوں گا اور اپنے انجام کے تم خود ذمہ دار ہو گے۔"

میں نے ان انتہائی ہیجان خیز لمحات میں بھی ٹھنڈے دل سے غور کیا۔ ٹائیگر میرے لیے کوئی بڑی پرابلم نہیں تھا۔ میں نے اپنی فوجی زندگی میں اس سے بھی زیادہ خطرناک دشمنوں کا سامنا کیا تھا۔ کمانڈو کے طور پر مجھے خونخوار درندوں سے مقابلہ کرنے کی تربیت بھی دی گئی تھی۔ میں ایک ہی وار میں ٹائیگر کی گردن توڑ سکتا تھا لیکن میں اپنے چہیتے اور پسندیدہ کتے کے ساتھ یہ سلوک کرنے کے لیے کسی طور بھی تیار نہیں تھا۔ نہ جانے اس پر کیا جادو کیا گیا تھا کہ وہ بے زبان اور وفا شعار بھی میرے ہم شکل کے اشاروں پر ناچ رہا تھا لیکن میں خود اپنے ہاتھوں سے اس معصوم اور بے گناہ جانور کو موت کی سزا دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کے علاوہ روزی اور شوکت بھی میرے حریف کے

سحر کا شکار تھے۔ اگر میں ٹائیگر کو جان سے مار بھی دیتا پھر بھی میں اُن لوگوں کو اپنی اصلیت کا یقین نہیں دلا سکتا تھا۔ وہ دونوں میرے ہم شکل کے جادو میں گرفتار ہو چکے تھے۔ انھیں اس سحر سے باہر نکالنے کے لیے کوئی اور ترکیب استعمال کرنا ضروری تھی۔ چنانچہ میں نے فی الفور یہ فیصلہ کیا کہ گھر سے باہر چلا جاؤں۔

روزی اور شوکت سے کچھ کہنا لاحاصل تھا۔ اس لیے میں نے ایک غضب آلود نگاہ اپنے ہم شکل پر ڈالی اور خاموشی سے گھر سے باہر نکل گیا۔ میں نے اپنے پیچھے نقلی یوسف کے ہنسنے اور ٹائیگر کے غرّانے کی آوازیں سُنیں لیکن پلٹ کر دیکھنا مناسب نہ سمجھا۔ اس کم بخت کے ہنسنے کا انداز بھی ہُو بہُو میری طرح تھا۔ وہ ہر لحاظ سے میرا ڈبل کیٹ تھا۔ ہم دونوں میں بظاہر کوئی امتیاز کرنا ممکن نہیں تھا۔ اگر روزی اور شوکت اس کے فریب میں آگئے تھے تو یہ کوئی حیرت انگیز اور تعجب خیز بات نہیں تھی لیکن ٹائیگر کا دھوکا کھا جانا واقعی ایک اَن ہونی بات تھی۔

گھر سے باہر نکل کر میں نے اپنے کوٹ کی آستین کو دیکھا۔ وہ شکستہ ہوگئی تھی لیکن اس کی وجہ سے میرا ہاتھ زخمی ہونے سے بچ گیا تھا۔ باہر ہوا میں خنکی تھی جس نے مجھے فرحت پہنچائی۔ گیٹ سے باہر نکل کر میں کھڑا ہوگیا۔ میرے سامنے کوئی نصب العین، کوئی منزل نہیں تھی۔ میرا ذہن سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکا تھا۔ میں کہاں جاؤں، کیا کروں؟ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا لیکن پھر بھی میرے لیے یہ تصور انتہائی تکلیف دہ اور ناقابلِ برداشت تھا کہ روزی، میری بیوی ایک قطعاً غیر شخص کو اپنا شریکِ حیات سمجھ رہی تھی۔ میرا گھر میرا کاروبار، میرا اثاثہ سب کچھ ایک اَن جان اجنبی شخص کے قبضے میں تھا۔ لیکن سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ میری بیوی کا قرب بھی حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ یہ خیال آتے ہی میرا خون کھولنے لگا۔ میری غیرت اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ میں روزی کو ایک لمحے کے لیے بھی اس فریب کا شکار رہنے دوں لیکن وہ خود بھی میری بات پر کان دھرنے اور میرا یقین کرنے کو تیار نہیں تھی۔ اس فریب کار نے ایسی چال چلی تھی کہ سبھی کو اپنا حامی بنا لیا تھا۔ میں نے سوچا۔ تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیے

اب رات کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ خود میری آنکھوں کے سامنے بھی اندھیرا آگیا تھا۔ مجھے اپنی دنیا تاریک نظر آرہی تھی۔ کبھی مجھے اس قسم کی صورتِ حال کا بھی سامنا کرنا پڑے گا، یہ تو میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔

یکایک پولیس کار کے سائرن کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ پولیس کی گشت کرنے والی گاڑی روشنیاں چمکاتی اور سائرن بجاتی ہوئی سامنے سے آرہی تھی۔ میں بے اختیار بڑھ کر سڑک کے درمیان میں کھڑا ہوگیا اور میں نے کار کو رُکنے کا اشارہ کیا۔ کار میرے نزدیک آکر رُک گئی۔ سائرن کی آواز بند ہوگئی لیکن کار کی چھت پر نصب سُرخ روشنی بدستور گول دائرے کی شکل میں چکر کھاتی رہی۔

"کیا بات ہے۔" گاڑی میں سے ایک پولیس والے نے سَر باہر نکالا۔

"پلیز میری مدد کیجیے۔" میں اس کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکا۔

"کیا بات ہے؟ چوری ہوگئی یا کسی نے تمھیں لُوٹ لیا؟"

"مجھے ایک شخص نے لُوٹ لیا ہے۔ میرا سب کچھ چھین لیا ہے اور وہ اس وقت بھی میرے گھر میں بیٹھا ہوا ہے۔"

پولیس والا اب گاڑی سے باہر نکل آیا۔ وہ ایک قدآور اور مضبوط جسم کا آدمی تھا۔ اس کی کمر میں پستول لٹکا ہوا تھا۔ "کہاں ہے تمہارا گھر؟ یہ واقعہ کب ہوا، کیسے ہوا؟" وہ میرے پاس آکر کھڑا ہوگیا اور چبھتی ہوئی نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔ میرا معقول لباس اور معزز شخصیت دیکھ کر اس کے لہجے میں نرمی پیدا ہوگئی: "آپ رہتے کہاں ہیں؟"

"وہاں" میں نے اپنے مکان کی طرف اشارہ کیا۔

اتنی دیر میں دوسرا پولیس والا بھی، جو کار چلا رہا تھا گاڑی سے باہر نکل کر ہمارے پاس آگیا۔ ان دونوں نے نگاہیں اُٹھا کر میرے گھر کی طرف دیکھا جس کی بیرونی روشنیاں اب روشن ہو چکی تھیں۔

"ابھی تو زیادہ رات بھی نہیں ہوئی ہے۔" پہلا پولیس مین حیرت سے بولا: "آپ کے گھر میں اور کوئی موجود نہیں تھا؟ میرا مطلب ہے کوئی نوکر یا چوکیدار وغیرہ۔"

"میں آپ کو کیا بتاؤں، کیسے بتاؤں۔ میرے ساتھ بہت عجیب و غریب واردات ہوئی ہے۔" میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے کیوں کر بتاؤں۔

"پھر بھی۔" دوسرا اپنی مونچھوں پر انگلی پھیرتے ہوئے بولا: "کچھ تو بتائیں جناب۔ آپ کو رپورٹ درج کرانے کے لیے تھانے لے چلیں یا آپ پہلے موقع دکھائیں گے۔"

"یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ پہلے آپ میری بات سُن لیں اور اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کریں۔"

"سُنائیں جناب۔ ہم تو آپ کے خادم ہیں۔" وہ گاڑی سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ "مگر ذرا جلدی جلدی۔ ہمیں گشت پر بھی جانا ہے۔"

"دیکھیے۔" میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کہاں سے آغاز کروں۔ "بات یہ ہے کہ میں ایک کام کے لیے شہر سے باہر گیا تھا۔ اب آج واپس آیا ہوں تو میرے گھر پر کسی اور شخص نے قبضہ کر لیا ہے۔"

"اچھا!" مونچھوں والے نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا۔ "وہ اکیلا ہے یا اس کے اور بھی ساتھی ہیں۔"

"آپ سمجھے نہیں۔" میں نے دوبارہ گفتگو کا آغاز کیا: "دراصل گھر میں میری بیوی موجود تھی اور وہ اب بھی گھر ہی میں ہے۔"

"میں سمجھ گیا۔" وہ فوراً سیدھا کھڑا ہو گیا: "اس نے آپ کی بیوی کو یرغمال بنا لیا ہے۔ کیا وہ مسلح ہے؟"

"اس نے زبردستی نہیں کی۔ دھوکے سے کام لیا ہے۔"

"وہ کس طرح؟"

"بات یہ ہے کہ وہ شخص بالکل میرا ہم شکل ہے۔ جب میں باہر گیا تو وہ میرے گھر میں آگیا اور میری بیوی یہ سمجھ رہی ہے کہ وہی اس کا اصلی شوہر ہے۔ میرا ایک پرانا دوست بھی اس وقت گھر کے اندر موجود ہے مگر وہ بھی اس کے دھوکے میں آگیا ہے۔"

دونوں پولیس والے بڑے غور سے میری بات سُنتے رہے۔ وہ مجھے اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے میں انھیں کوئی فرضی داستان سُنا رہا ہوں۔ بے اعتباری ان کے چہرے پر لکھی ہوئی تھی اور بہت ممکن ہے کہ وہ میری ذہنی حالت پر بھی شُبہ کر رہے ہوں۔

"بڑی عجیب کہانی سُنائی ہے جناب آپ نے۔" مونچھوں والے نے دوسرے پولیس والے کی طرف دیکھ کر کہا: "مگر ایسا ہو تو نہیں سکتا جناب کہ آپ کی بیوی بھی آپ کو نہ پہچانے۔ کوئی کتنا ہی ہم شکل ہو بندے کی ذات تو چھپی نہیں رہ سکتی۔ اور وہ بھی بیوی سے۔"

اس سے پہلے کہ وہ مزید شکوک کا اظہار کرتے میں نے انھیں تجویز پیش کی: "دیکھیے۔ وہ سامنے ہی تو میرا گھر ہے شاید میں زبانی آپ کو ساری بات نہ سمجھا سکوں۔ آپ میرے ساتھ چلیے اور اس شخص کو فریب دہی کے الزام میں گرفتار کر لیجیے۔"

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات دوسرے حصے میں ملاحظہ فرمائیں

aazzamm@yahoo.com
موم کا آدم
علی سفیان آفاقی
راوی: مرزا اخلاق علی بیگ

ایک سربکف منچلے جیالے کی ایکشن سے بھرپور سرگزشت

موم کا آدم

دوسرا حصہ

علی سفیان آفاقی

راوی: مرزا اخلاق علی بیگ

بار اول ـــــــــ ۲۰۰۶ء

مطبع ـــــــــ یو اینڈی پرنٹرز، لاہور

کمپوزنگ ـــــ الحرم کمپوزنگ سنٹر، لاہور

قیمت ـــــــــ ۶۰ روپے

موم کا آدم

ایک سربکف منچلے جیالے انسان کی کہانی۔ وہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینے کا ہنر جانتا تھا۔ وہ ایک خوش جمال حسینہ کے خیال کا اسیر تھا اور اسے حاصل کرنے کے لیے آگ اور خون کے دریا میں کود پڑنے کو بے تاب تھا۔

ایک نڈر جہاں گرد ابنِ آدم کی آشفتہ سری کی داستان

انہوں نے ایک دوسرے کی جانب استفہامیہ نظروں سے دیکھا پھر پہلا پولیس والا بے دلی سے بولا: "چلئے جناب آپ کے ہم شکل کو بھی دیکھ لیتے ہیں وہ کون بندہ ہے اور کیا چاہتا ہے۔"

وہ اپنی گاڑی میں سوار ہوگئے جب کہ میں دوبارہ پیدل ہی اپنے گھر کی طرف ان کی راہنمائی کرنے لگا۔ دروازے پر پہنچ کر میں رک گیا۔ وہ دونوں بھی گاڑی سے اتر کر میرے پاس آگئے۔ اطلاعی گھنٹی کے جواب میں دروازہ کھلا۔ اس بار میرا ہم شکل دروازے میں نمودار ہوا۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر برہمی کے آثار پیدا ہوئے مگر پھر پولیس والوں پر نظر پڑی تو وہ مسکرانے لگا۔ "چلو یہ بھی اچھا ہوا کہ تم پولیس کو خود ہی لے آئے۔ آئیے جناب مجھے آپ ہی کی ضرورت تھی۔" اس نے دروازہ کھول کر پولیس والوں کو اندر آنے کا اشارہ کیا مگر وہ دونوں حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھے۔ شاید انھوں نے زندگی میں پہلی بار ایک دوسرے سے اتنی مشابہت رکھنے والے دو آدمی دیکھے تھے وہ باری باری کبھی مجھے اور کبھی میرے ہم شکل کو دیکھ رہے تھے جو دروازے میں کھڑا بڑی ڈھٹائی کے ساتھ مسکرا رہا تھا۔ اس کا اطمینان اور سکون قابلِ دید تھا اور کیوں نہ ہوتا۔ فی الوقت صورتِ حال مکمل طور پر اس کے قابو میں تھی۔ وہ کوئی انتہائی پختہ کار مجرم معلوم ہوتا تھا کیونکہ پولیس والوں کو دیکھنے کے باوجود اس کے چہرے پر گھبراہٹ یا پریشانی کے آثار نمودار نہیں ہوئے تھے۔ کچھ دیر وہ خاموش کھڑا رہا پھر بولا۔ "آپ اندر آئیں گے یا باہر ہی سے تفتیش کریں گے؟"

وہ دونوں چونک کر دروازے کی طرف بڑھے تو میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ ہم گیلری سے گزر کر سامنے لاؤنج میں پہنچ گئے جہاں ایک صوفے پر شوکت نیم دراز تھا۔ برابر والی کرسی پر روزی بیٹھی ہوئی کسی میگزین کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ مجھے دیکھا تو وہ بے اختیار کرسی سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ "تم! تم پھر آگئے؟!" اس کی آواز میں حیرت کے ساتھ ساتھ غصہ بھی تھا۔

"ہاں، اس بار پولیس لے کر آئے ہیں۔" میرے ہم شکل نے بڑے اطمینان سے کہا اور پھر پولیس والوں کو صوفوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں اب اپنی حیرت پر قابو پا چکے تھے اور گھر کی آرائش اور روزی کی آب و تاب دیکھنے میں مصروف تھے۔

"اب فرماؤ جناب: مونچھوں والا مجھ سے مخاطب ہوا: "آپ کو کیا تکلیف ہے؟!"
مَیں نے جواب میں وہی بات ذرا تفصیل کے ساتھ دوہرا دی۔ تمام کہانی سُننے کے بعد وہ دونوں میرے ہم شکل کی طرف متوجہ ہوئے: "اب آپ فرماؤ جناب، آپ اپنی صفائی میں کیا کہتے ہیں؟"
میرا ہم شکل مُسکراتا ہوا ان کے پاس جا کھڑا ہوا: "اس شخص کی صورت مجھ سے مزید ملتی ہے مگر یا تو یہ کوئی مسخرا اور بہروپیا ہے یا پھر اس کے دماغ میں کوئی خلل ہے۔ دیکھیے، یہ میرا گھر ہے۔ یہ میری بیوی ہے۔ یہ میرا دوست ہے۔ میرا کُتا اندر ہے۔ ابھی بُلاتا ہوں اس کو۔" یہ کہہ کر اس نے پکارا: "ٹائیگر۔" اور ٹائیگر سیڑھیوں سے اتر کر اس کے پاس جا کھڑا ہوا اور دُم ہلانے لگا: "ٹائیگر۔" اس نے میری طرف اشارہ کیا اور ٹائیگر غُراتا ہوا میری طرف بڑھا، مگر اس نے ٹائیگر کو چمکار کر روک لیا۔
"اب بولیے۔ یہ سب چیزیں میری ہیں۔ میرا نام یوسف ہے۔ یہ میرا ڈرائیونگ لائسنس ہے اور یہ رہا میرا شناختی کارڈ۔" یہ کہہ کر اس نے دونوں چیزیں پولیس والوں کے حوالے کر دیں۔ وہ دونوں بغور ان کا معائنہ کرنے میں مصروف ہو گئے اور پھر میری طرف دیکھنے لگے۔
میرا ہم شکل بولا: "اب ان سے پوچھیے کہ ان کے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہ اصلی یوسف ہیں؟"
"ہاں جی۔ اب آپ فرماؤ۔" مونچھوں والے نے بلند آواز میں مجھ سے پوچھا۔ وہ دونوں میرے ہم شکل کے بیان اور شخصیت سے کافی متاثر معلوم ہوتے تھے۔
"آپ اپنا لائسنس اور شناختی کارڈ دکھائیے۔"
مَیں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا مگر پھر مجھے خیال آیا کہ یہ دونوں چیزیں میرے بریف کیس میں رکھی ہوئی تھیں جو چوری ہو چکا تھا۔ مجھے تذبذب میں دیکھ کر پولیس والے نے کہا: "نکالو نا جناب۔"
"بات یہ ہے کہ ہوٹل سے میرا سامان اور بریف کیس وغیرہ چوری ہو گیا تھا اور ساتھ ہی یہ کاغذات بھی چوری ہو گئے۔"
وہ دونوں بے اعتباری کے انداز میں میری طرف دیکھتے رہے۔ پھر وہ روزی سے مخاطب ہوئے: "بیگم صاحبہ! معاف کرنا، مگر یہ ہماری ڈیوٹی میں شامل ہے۔ یہ جو بندہ ہمارے ساتھ آیا ہے آپ اسے پہچانتی ہیں؟"
"بالکل نہیں۔" روزی چمک کر بولی: "مَیں نے تو اس شخص کو آج پہلی بار دیکھا ہے۔ پہلے یہ ٹیلی فون پر مجھے تنگ کرتا رہا اور اب میرے گھر آ گیا ہے۔ یہ بہت ڈھیٹ اور کمینہ آدمی معلوم ہوتا ہے۔ یہ اس طرح نہیں مانے گا۔ آپ اسے تھانے لے جائیے تو خود ہی ساری بات پتہ چل جائے گی۔"
دونوں پولیس والوں کو یہ مشورہ بہت پسند آیا، مگر انھوں نے شوکت کا بیان لینا بھی ضروری سمجھا۔ شوکت نے انھیں بتایا کہ میں صبح سے اپنے دوست کے ساتھ ہوں اور یہ آدمی نہ جانے کون ہے کہاں سے آیا ہے۔ کیا چاہتا ہے۔ مَیں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ پولیس والوں نے مزید تصدیق کے لیے ٹائیگر کی طرف دیکھا جو بہت غصّے سے مجھے دیکھ رہا تھا۔
میرا ہم شکل پولیس والوں سے کہنے لگا: "آپ کہیں تو ٹائیگر کا بیان بھی دلوا دوں! ایک اشارہ کروں گا تو یہ اس جعل ساز کی تکا بوٹی کر دے گا۔"
پولیس والے ٹائیگر کا برہم مزاج اور میرے ساتھ اس کا مخاصمانہ رویّہ دیکھ چکے تھے: "نہیں جناب۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ دونوں اٹھ کر کھڑے ہو گئے: "معاف کرنا جناب آپ کو ہم نے تکلیف دی۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے: "اُٹھو۔ چلو ہمارے ساتھ۔" اب ان کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔ صاف ظاہر ہے کہ انھیں میرے ہم شکل کے بیان پر یقین آ چکا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہوں؟ مَیں خاموشی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب

کوئی مزید صفائی پیش کرنے یا الزام عائد کرنے کا موقع نہیں تھا۔ بازی میرے ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ میرے اپنے گھر کی ہر شئے میری دُشمن بن چکی تھی اور میرے خلاف گواہی دے رہی تھی۔ یہاں تک کہ میری بیوی اور میرا پالتو کُتا بھی میرے خلاف ہو چکا تھا۔ میرے پاس اپنی اصلیت اور شناخت کا کوئی ثبوت موجود نہیں تھا۔ اب اس کے سوا کوئی اور چارہ کار نہ تھا کہ مَیں وہاں سے رخصت ہو جاتا۔
ہم گھر سے باہر نکلے تو دونوں پولیس والوں نے مجھے گھیر لیا۔ "یہ کیا معاملہ ہے؟ تم کون ہو آخر اور ان لوگوں کو پریشان کیوں کر رہے ہو۔"
مونچھوں والے نے تجویز پیش کی: "اسے تھانے لے چلو۔ خود ہی ٹھیک ہو جائے گا وہاں جا کر۔"
"ٹھیک ہے وہاں تو بڑے بڑے ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ چلو ہمارے ساتھ گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔"
مَیں نے پلٹ کر اپنے گھر کے بند دروازے کی طرف دیکھا اور پھر سوچا کہ اگر پولیس کے ہتھے چڑھ گیا تو پھر اس کے چنگل سے نجات حاصل کرنا مُشکل ہو جائے گا۔ یکایک میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ فی الحال میرے لیے سب سے بڑا مسئلہ پولیس سے نجات حاصل کرنا تھا۔
"سنیے بھائی صاحب۔" مَیں نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی: "اصل بات مَیں آپ کو بتا دیتا ہوں۔"
"اچھا۔ وہ کیا ہے؟"
"بات یہ ہے کہ مَیں ابھی تھوڑے دن پہلے اس علاقے میں رہنے کے لیے آیا ہوں۔ میرا گھر یہاں سے زیادہ دُور نہیں ہے۔ اپنے ہم شکل آدمی کو دیکھا تو مَیں نے سوچا کہ ان سے مذاق کرنا چاہیے۔ مَیں تو صاحب ذرا ہنسی مذاق کر رہا تھا۔ میرا کوئی اور مقصد نہیں تھا۔"
"یہ کیسا مذاق ہے جی۔" پولیس والا برہمی سے بولا: "شریف آدمیوں کے گھروں میں گھس کر اُن پر جھوٹے الزام لگاتے ہو۔ ان کی بیوی کو اپنی بیوی بتلاتے ہو۔ ان کے گھر بار پر قبضہ جمانا چاہتے ہو اور پھر کہتے ہو کہ یہ مذاق تھا۔ یہ مذاق ہے؟ یہ تو ہم تُم سے تھانے چل کر پوچھیں گے۔ چلو، سیدھی طرح گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔"
"میری بات تو سُنیے۔ دیکھیے، مَیں نے ان سے کچھ وصول تو نہیں کیا، صرف زبانی بات چیت ہی تو کی ہے۔ مجھے پتا تھا کہ وہ کبھی میری بات نہیں مانیں گے اور پھر انھوں نے میرے خلاف کوئی رپورٹ بھی تو درج نہیں کرائی ہے۔ بلکہ پولیس کو تو مَیں خود ان کے گھر لے گیا تھا۔ پھر مقدمہ کیسا؟"
وہ دونوں میری بات سے لاجواب ہو کر ایک دوسرے کو تکنے لگے۔ مَیں نے موقع مناسب سمجھ کر کہا: "اگر مجھے ہیرا پھیری کرنی ہوتی تو مَیں سیدھا ان کے پاس کیوں نہ چلا جاتا۔ شکل سے فائدہ اُٹھا کر کوئی اور فراڈ نہ کرتا؟ اور پھر مَیں پولیس کو اپنے ساتھ لے کر کیوں جاتا۔ اسی سے اندازہ لگائیے کہ میری نیت خراب نہیں تھی۔"
ان کے پاس میری منطق کا کوئی جواب نہیں تھا۔ مگر وہ پولیس والے تھے ان کے پاس اختیارات کی لاٹھی تھی۔ مونچھوں والے نے ایک لمحہ سوچا پھر بولا: "ہم تمہیں نقضِ امن میں گرفتار کر لیں گے۔"
مگر اس کی آواز میں زیادہ زور نہیں تھا۔
"تم نے ہمارا قیمتی وقت بھی برباد کیا ہے۔"
مَیں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ نوٹ نکالے اور ان کی طرف بڑھائے: "دیکھیے۔ آپ کو تو مَیں نے خود ہی اپنے مذاق میں شامل کیا تھا۔ آپ اپنی چائے کافی کے لیے یہ دوستی کا نذرانہ رکھ لیجیے۔"
وہ اچنبھے کے ساتھ میری صورت دیکھنے لگے۔
"میرا گھر یہاں سے زیادہ دُور نہیں ہے۔ مَیں ابھی گھر چلا جاتا ہوں۔ صبح مَیں اپنی بیوی کے ساتھ آ کر ان لوگوں

سے معافی مانگ لوں گا اور انھیں راضی کرلوں گا۔"

ان دونوں نے میرے الفاظ اور بیان کی معقولیت کا اندازہ لگایا۔ میری مٹھی میں تھامے ہوئے نوٹوں کو دیکھا اور پھر میری پُراثر شخصیت کا جائزہ لیا۔ آخر میں انھوں نے فیصلہ میرے حق میں دے دیا: "ٹھیک ہے بھائی جی۔ آپ اپنے گھر جاؤ مگر یاد رکھو۔ پھر کبھی ایسا مذاق کسی شریف آدمی اور اس کی بیوی سے مت کرنا۔ وہ تو کوئی بہت شریف بندہ ہے میرے جیسا ہوتا تو تمہاری ہڈی پسلی بھی توڑ دیتا اور جیل کی ہوا بھی کھلاتا۔ اگر دوبارہ آس پاس کہیں دیکھا تو اندر کر دیا جائے گا۔"

"کوئی بات نہیں، مَیں ان کے بارے میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ اسی لیے تو یہ مذاق کیا تھا۔ وہ میرے ایک دوست کے قریبی عزیز بھی ہیں۔ کل صبح سارا معاملہ صاف ہو جائے گا۔ اچھا خدا حافظ۔" انھیں کچھ کہنے اور سوچنے کا موقع دیئے بغیر ہی مَیں ایک طرف کو تیز تیز قدموں سے چل پڑا۔ وہ کچھ دیر مجھے دیکھتے رہے۔ پھر گاڑی میں سوار ہو گئے۔ گاڑی کی روشنیاں ابھی تک روشن تھیں۔ اب سائرن بھی بجنے لگا اور پولیس کی کار رخصت ہو گئی۔ اس نیم تاریک اور سنسان سڑک پر مَیں تنہا کھڑا رہ گیا۔ یکایک مایوسی، محرومی اور بے بسی کے شدید احساس نے مجھے اپنے تسلّط میں لے لیا۔ مجھے اپنی ٹانگیں بے جان محسوس ہونے لگیں۔ میرا دماغ سائیں سائیں کرنے لگا۔ میرے دل کی دھڑکنیں ایک دم تیز ہو گئیں اور مَیں پسینے میں ڈوب گیا۔ مَیں بے انتہا کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ میرے لیے اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہنا بھی دُوبھر ہو گیا۔ بمشکل لڑکھڑاتا ہوا مَیں ایک طرف کو بڑھا اور سڑک کے کنارے ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ مجھ پر غنودگی یا نیم بے ہوشی کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ کافی دیر تک میرے اُوپر یہی کیفیت طاری رہی۔ مَیں نے زندگی میں پہلے کبھی اس قسم کی کیفیت محسوس نہیں کی تھی لیکن زندگی میں پہلے کبھی مَیں اس قسم کی صورتِ حال سے بھی تو دوچار نہیں ہوا تھا۔ گزشتہ چند روز مَیں مسلسل ذہنی اُلجھن، کشمکش اور اعصابی ہیجان کا شکار تھا۔ خیال تھا کہ اپنے گھر پہنچ کر مانوس فضا اور ہمدرد اور محبت کرنے والے لوگوں کی صحبت میں ان تکالیف کا ازالہ ہو جائے گا لیکن یہاں صورتِ حال اُس سے بھی زیادہ اُلجھی ہوئی بلکہ انتہائی تشویشناک اور ناقابلِ برداشت تھی۔ میرے گھر میں ایک شخص رہ رہا تھا جسے میری بیوی اپنا شوہر سمجھ رہی تھی۔ میرا دوست سے اپنا جگری دوست سمجھ رہا تھا۔ دوست کی غلط فہمی میرے لیے اتنی زیادہ پریشان کُن نہیں تھی۔ مجھے یقین تھا کہ مَیں موقع پانے پر اس کی غلط فہمی دور کر دوں گا۔ اس کی غلط فہمی میرے لیے نقصان دہ بھی نہیں تھی۔ یہ درست ہے کہ وہ میرا کاروباری رفیق بھی تھا لیکن اس کی میری طرف سے بدگمانی زیادہ عرصے قائم نہیں رہ سکتی تھی اور پھر دوست سے علیحدہ رہ کر کچھ عرصہ گزارنا اس قدر ناقابلِ برداشت بھی نہیں تھا لیکن یہ تصوّر ہی میرے لیے روح فرسا تھا کہ میرے گھر میں اور میری بیوی کی زندگی میں ایک غیر اور اجنبی شخص میری جگہ لے چکا تھا اور وہ اسے اصلی سمجھ رہی ہے۔ خدایا یہ کس قدر عذاب ناک صورتِ حال تھی!

کچھ دیر مَیں گومگو کے عالم میں بیٹھا رہا۔ رفتہ رفتہ تھکن اور بے بسی کی وہ کیفیت دُور ہونے لگی۔ ویسے بھی خدا نے انسان کو یہ صلاحیت دی ہے کہ وہ بڑے سے بڑے صدمے جھیل سکتا ہے اور اپنے آپ کو ہر صورتِ حال کے مطابق ڈھالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

مَیں یہ تماشہ خاموش تماشائی بن کر دیکھتا رہوں یا مجھے اس کا تدارک کرنے کے لیے اقدامات بھی کرنے چاہئیں؟ مَیں یہ فیصلہ کرنے میں مصروف تھا۔ حالات خواہ کتنے ہی ناقابلِ برداشت اور مایوس کُن تھے لیکن مجھے اس صورتِ حال کا کوئی نہ کوئی حل ضرور تلاش کرنا تھا لیکن کیسے؟! میری عقل اس گتھی کو سُلجھانے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ یکایک میری غیرت کا احساس پیدا ہونے لگا۔ میرے اندر کا سویا ہوا باغی اور جنگجو انسان مجھے

جھنجوڑنے لگا۔ اپنے مکان کی روشنی مجھے کچھ فاصلے پر نظر آ رہی تھی لیکن یہ دروازہ فی الحال مجھ پر بند ہو چکا تھا۔ اور اس بند دروازے کے پیچھے ایک فریبی اور غاصب میری ہر چیز پر قبضہ جمائے بیٹھا تھا۔ بعض اوقات انسان فوری طور پر صورتِ حال کا کوئی حل نہیں سوچ سکتا لیکن وہ غیر ارادی اور غیر شعوری طور پر کچھ کر گزرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ مَیں بھی اسی مرحلے میں تھا۔ مَیں آہستہ آہستہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب میرا ذہن زیادہ صاف تھا۔ میرے جسم میں بھی ناتوانی اور بے بسی کی کیفیت باقی نہیں رہی تھی۔ میرے قدم کشاں کشاں مجھے اپنے گھر کی طرف لے جانے لگے۔ یہ جانے بغیر کہ وہاں پہنچ کر مَیں کیا کروں گا؟

یکایک ایک گاڑی کی نہایت تیز روشنی سامنے والی سڑک سے میری جانب آتی ہوئی نظر آئی۔ گاڑی زیادہ تیز رفتار سے نہیں آ رہی تھی لیکن اس کا اور میرا درمیانی فاصلہ رفتہ رفتہ کم ہو رہا تھا۔ سڑک نیم تاریک تھی لیکن گاڑی کی تیز روشنیوں نے میری نگاہوں کے سامنے کے حصّے کو جگمگا دیا تھا۔ مَیں سڑک کے کنارے ہو لیا اور اپنے خیال میں مگن چلتا رہا۔ گاڑی میرے نزدیک پہنچ کر اچانک رُک گئی۔ اس کی تیز روشنیاں میرے چہرے اور آنکھوں پر پڑ رہی تھیں جن کی وجہ سے مَیں گاڑی میں سوار لوگوں کو دیکھنے سے قاصر تھا۔ پھر گاڑی آہستہ سے آگے بڑھی اور میرے برابر پہنچ کر رُک گئی۔ گاڑی کی روشنیاں بُجھ گئیں۔ میری نگاہیں چند لمحے بعد دیکھنے کے قابل ہوئیں تو مَیں نے دیکھا کہ یہ ایک جیپ نما نہایت مضبوط گاڑی تھی جو عام طور پر شکاری لوگ شکار کے لیے یا کٹھن سفر کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ گاڑی میں ایک چوڑے چہرے اور مضبوط کندھوں اور بازوؤں والا نوجوان شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ ڈاڑھی مونچھ سے محروم تھا لیکن اس کے بائیں رُخسار پر ایک کافی بڑا نشان تھا جو کسی زخم یا آتشزدگی کا نتیجہ ہو سکتا تھا۔ اس کے لمبے لمبے سیاہ بال اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے اور وہ خاموش لیکن معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

"ہیلو۔" وہ اپنے مُنہ میں دبے ہوئے بن جلے سگار کو چباتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا: "مجھے پہچانتے نہیں؟"

مَیں نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا جو میرے لیے قطعی غیر مانوس تھا۔

"اتنے دن کہاں غائب رہے؟" اس نے دوستانہ لہجے میں سوال کیا۔

"بس مَیں ذرا شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔" مَیں نے جواب دیا۔

"وہ تو مَیں جانتا ہوں۔ مجھے پتہ چل چکا ہے کہ تم کہاں گئے تھے اور کس کام میں مصروف رہے لیکن تمہیں اکیلے یہ سب پاپڑ بیلنے کی کیا ضرورت تھی؟ مجھے تو حیرت ہے کہ تم نے اپنے ہم جیسے دوستوں سے مدد کیوں نہیں لی۔ آخر ہم پر بھی تو تمہارا کوئی حق ہے۔"

مَیں نے پریشانی اور حیرت سے اس کو دیکھا۔ شاید وہ مجھے کوئی اور سمجھ کر مجھ سے دُوری کی شکایت کر رہا تھا۔

"دیکھو۔" مَیں نے تھکی ہوئی آواز میں کہا: "مَیں بہت تھکا ہوا ہوں فی الحال مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔"

"ہنہ۔ حال پر چھوڑ دوں؟" وہ طنزیہ انداز میں ہنسا۔ "کب تک تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ دوں؟ تمہیں بھی تو دوسروں کے حال کی کچھ خبر ہونی چاہیے۔ دوستوں کو یوں بھول جانا اچھا نہیں ہوتا۔"

مَیں نے بات کو طول دینا ضروری نہیں سمجھا اور کہا: "سنو بھائی۔ تمہیں میرے بارے میں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے مجھ پر کسی اور شخص کا شبہ ہوا ہے۔ مَیں تمہیں بالکل نہیں جانتا۔ تمہیں مَیں نے زندگی میں پہلی بار دیکھا ہے اور دوسری بار دیکھنے کا خواہش مند نہیں ہوں۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دوں تو بڑی مہربانی ہوگی۔ مَیں پہلے ہی کافی دُکھ اُٹھا چکا ہوں اور پریشانیوں میں مبتلا ہوں۔" یہ کہہ کر مَیں نے اپنا قدم آگے بڑھایا۔ اس کا دایاں ہاتھ یکایک حرکت میں آیا اور کار کی کھڑکی کے سامنے آگیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چمکتا ہوا پستول تھا۔ یہ کسی دھات سے بنا ہوا تھا

اور خاصا بڑا تھا جسے دیکھ کر ہی ڈر محسوس ہوتا تھا۔

"رُک جاؤ اور یہ ڈرامہ ختم کرو۔ اَب تم اس طرح نہیں جا سکتے۔ گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔" آخری جملہ اس نے خاصے تحکمانہ انداز میں کہا۔

"میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔" مَیں آگے بڑھا مگر اس نے پستول کی نال میرے سینے سے لگا دی۔

"اور میرا ارادہ تمہیں چھوڑنے کا نہیں ہے۔ سیدھی طرح گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ ورنہ پھر مجھ سے شکایت نہ کرنا۔"

ایک تو پہلے ہی دماغ بھنّا رہا تھا۔ اس پر اس کا یہ اندازِ کلام مجھے بالکل پسند نہیں آیا۔ مَیں پلٹ کر گاڑی کی کھڑکی کے پاس چلا گیا: "تم میرے ساتھ زبردستی کرو گے؟" مَیں نے اپنی آواز کو معمول پر رکھنے کی کوشش کی۔

"اگر ضرورت پڑی تو ضرور ــــ" وہ ہنسا اور اس کے چہرے کے زخم کا نشان کچھ اور واضح ہو گیا۔ "تمہاری ضد کرنے کی عادت نہیں گئی۔ بیٹھ جاؤ اور میرے ساتھ چلو۔"

مَیں کوئی سخت لفظ کہنے ہی والا تھا کہ یکایک سنسان سڑک پر ایک پولیس سائرن کی آواز گونجی جو خاصے فاصلے سے آتی ہوئی سنائی دے رہی تھی۔ معاً مجھے اُن پولیس والوں کا خیال آیا جن سے مَیں نے بمشکل چھٹکارا حاصل کیا تھا۔ اگر انھوں نے مجھے دوبارہ مکان کے آس پاس دیکھ لیا تو مجھے بلا تامّل پکڑ کر تھانے لے جائیں گے جو میرے لیے کسی طرح بھی فائدہ مند نہ تھا۔ پولیس کار کی آواز اب ہمارے قریب آتی جا رہی تھی بلکہ اب تو اس کی گھومتی ہوئی روشنی بھی نظر آ رہی تھی۔ مَیں نے فوراً فیصلہ کیا اور دروازہ کھول کر گاڑی میں سوار ہو گیا۔

"چلو۔ لیکن ذرا جلدی کرو۔"

وہ پھر خوفناک انداز میں مُسکرایا اور معنی خیز انداز میں بولا: "پولیس سے ڈرتے ہو؟ تمہیں ڈرنا بھی چاہیئے۔ اَب آئے نا راہِ راست پر۔"

"وقت ضائع مت کرو۔" مَیں نے ڈانٹ کر کہا۔ "جلدی چلو یہاں سے۔"

اس نے مُسکرا کر گاڑی سٹارٹ کر دی۔ وہ معنی خیز انداز میں میری طرف کنکھیوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب طنزیہ تاثر تھا۔ پولیس گاڑی کے سائرن کی آواز اَب زیادہ نزدیک آگئی تھی اور سامنے والی سڑک پر مجھے پولیس کار اپنی جانب آتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

"اپنا سَر نیچا کر لو۔ وہ تمہیں دیکھ نہیں سکیں گے۔"

مَیں نے اس کے کہنے پر عمل کیا اور ہماری گاڑی پولیس کار کی طرف رواں دواں ہو گئی۔ مَیں نے اپنا سَر جُھکا لیا اور باہر سے دیکھنے والوں کو اس گاڑی میں ڈرائیور کے سوا کوئی اور شخص نظر نہیں آ سکتا تھا۔

گاڑی ایک جھٹکے سے سٹارٹ ہوئی اور آگے چل پڑی۔ مَیں نے اپنی سانس روک لی۔ مَیں اس موقع پر پولیس کے قابو میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ مَیں جانتا تھا کہ اگر پولیس والوں نے مجھے دیکھ لیا اور محض پوچھ گچھ کے لیے بھی تھانے لے گئے تو پھر میرے لیے اپنی بے گناہی اور اصلیت ثابت کرنا مشکل ہو جائے گی۔ میرا سب سے پہلا مسئلہ اپنے گھر اور روزی کو اُس بہروپیئے اور فریب کار کے چنگل سے نجات دلانا تھا۔ جو کوئی انتہائی ماہر اور ہوشیار مُجرم معلوم ہوتا تھا ورنہ اتنی مہارت سے صورتِ حال پر قابو نہ پا لیتا۔

مَیں نے گاڑی میں بیٹھنے کے بعد اپنے میزبان کا قریب سے جائزہ لیا۔ وہ ایک مضبوط اور صحت مند نوجوان تھا۔ اور چہرے مُہرے سے کسی مُجرمانہ گروہ سے متعلق نظر آتا تھا۔ پستول اَب اُس نے اپنی جیب میں رکھ لیا تھا لیکن مَیں اسے صاف طور پر دیکھ سکتا تھا۔ مَیں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اگر پولیس والوں نے اس گاڑی کو روک کر مجھے تھانے لے جانے کی کوشش کی تو مَیں بلا دریغ اپنے میزبان کے پستول پر قبضہ کر کے ہنگامہ برپا کر دوں گا۔ میری نجات کا صرف یہی

راستہ تھا۔ کیونکہ ایک بار پولیس کے نرغے میں گھر جانے کے بعد یہ بھی ممکن تھا کہ مَیں جیل سے باہر ہی نہ نکل سکوں۔ پولیس سائرن کی آوازیں بالکل نزدیک آگئیں اور پھر پولیس کار کی چمکتی ہوئی رنگین روشنیاں بھی نظر آنے لگیں۔ مَیں نے سانس روک لیا اور جتنا نیچے کھسک سکتا تھا کھسک گیا۔ اس طرح مَیں اپنے میزبان کے اور نزدیک ہو گیا۔ اس کے کوٹ کی جیب میں رکھا ہوا پستول اب مَیں ہاتھ بڑھا کر آسانی سے نکال سکتا تھا۔

پولیس کار ہمارے نزدیک آگئی اور پھر رُکے بغیر ہی آگے نکل گئی۔ گویا پولیس والوں نے ہماری گاڑی کی طرف توجہ ہی نہیں دی تھی۔ میرا میزبان بھی انتہائی نارمل انداز میں گاڑی چلاتا رہا جیسے ایک عام قانون کا پابند شہری کرتا ہے۔ جب تک پولیس سائرن کی آواز رفتہ رفتہ معدوم نہ ہو گئی مَیں بدستور اپنی سیٹ پر سَر جُھکائے بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ میرے کانوں میں کار چلانے والے کی آواز آئی: "بس۔ اُٹھ کر بیٹھ جاؤ پارٹنر۔ خطرہ ٹل گیا ہے۔"

مَیں نے سَر اُونچا کر کے اطمینان کی سانس لی۔ وہ میری طرف دیکھ کر مُسکرایا اور بولا: "مان گئے نا جانی کو۔ کیسا بچایا ہے تمہیں پولیس سے۔"

اس کا لہجہ معنی خیز اور پُراعتماد تھا۔ مجھے حیرت اس بات کی تھی کہ اسے یہ کیونکر معلوم ہوا کہ مَیں پولیس والوں کی نظروں سے بچنا چاہتا تھا۔ "مجھے پولیس سے بچنے کی بھلا کیوں ضرورت تھی؟" مَیں نے گویا اپنے آپ کو تسلی دینے کے لیے کہا۔

"اگر پولیس سے تم نہیں چھپو گے تو کیا پھر مَیں چھپوں گا۔" وہ مُسکرا کر بولا: "سارے مُلک کی پولیس اس وقت تمہاری تلاش میں لگی ہوئی ہے۔"

"میری تلاش میں؟"

"اَب مذاق چھوڑو اور مطلب کی بات کرو۔" اس نے اپنا بن جلا سگار لائٹر کی مدد سے سُلگا لیا: "یہ بتاؤ کہ مال کہاں رکھا ہے تم نے؟"

"مال؟" مَیں نے چونک کر اسے دیکھا: "کون سا مال؟"

"مَیں نے کہا ہے نا، مذاق بند کرو۔ جب سے سُنا ہے کہ تم اس شہر میں آگئے ہو مَیں تمہیں ڈھونڈ رہا ہوں۔ کب سے تمہارے آنے کا انتظار کر رہے تھے ہم لوگ۔"

مَیں تو سمجھ رہا تھا کہ تم سیدھے کاٹج پر آؤ گے۔ تارہ بھی یہی سمجھ رہی تھی۔ اسی دن سے تمہارا انتظار کر رہی ہے جب سے مَیں نے اسے تمہارے واپس آنے کا بتایا تھا۔

"تارہ!" مَیں نے حیرت اور پریشانی سے اس کو دیکھا "وہ میرا انتظار کر رہی ہے؟"

اس نے سگار مُنہ سے نکال کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا اور تلخ لہجے میں بولا: "مذاق کو زیادہ بڑھانا اچھا نہیں ہوتا۔ اب تم تارہ سے بھی انجان بن رہے ہو۔"

"مَیں کسی تارہ کو نہیں جانتا۔" مَیں نے کہا۔

"تم تارہ کو نہیں جانتے؟ جس کے ساتھ تم نے محبّت کی۔ شادی کا وعدہ کیا۔ جھوٹے سچّے وعدے کیے جس کو تم زندگی میں سب سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ اب کہتے ہو کہ مَیں تارہ کو نہیں جانتا۔ مجھے تو پہلے ہی شبہ تھا کہ دولت سمیٹ لینے کے بعد تم کہیں بدل نہ جاؤ۔ تمہاری سوچ تبدیل ہو جائے اور تم شاید ایسا ہی کرنا چاہتے ہو۔ مگر کان کھول کر سُن لو۔ مَیں تمہیں ہرگز اس کی اجازت نہیں دوں گا۔ تمہیں سارے مال کا بھی حساب دینا ہو گا اور تارہ سے کیے ہوئے وعدے بھی پورے کرنے پڑیں گے۔ ورنہ۔" اُس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر پستول باہر نکال

لیا اور بڑے ماہرانہ انداز میں اسے اپنی انگلیوں میں گھمانے لگا۔

"دیکھو بھائی جانی۔" میں نے بالآخر اسے سب کچھ صاف صاف بتانے کی کوشش کی: "مجھے نہیں معلوم کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ تم غلطی سے مجھے کوئی اور شخص سمجھ رہے ہو۔ یقین کرو میں وہ نہیں ہوں۔ میں نہ کسی مال کے بارے میں کچھ جانتا ہوں اور نہ تارہ کے بارے میں۔ بلکہ میں نے تو تمہیں بھی زندگی میں پہلی بار دیکھا ہے پہلے تو تم اپنا تعارف کراؤ اور بتاؤ کہ آخر تم ہو کون اور مجھے کیا سمجھ رہے ہو۔"

میری آواز کی سنجیدگی اور لہجے کے اعتماد نے اسے ایک لمحہ کے لیے پریشان کر دیا۔ اس نے گھور کر مجھے دیکھا چند لمحے غور سے میرا جائزہ لیتا رہا اور پھر بولا: "اگر یہ مذاق ہے تو بہت بھونڈا مذاق ہے، لیکن اگر تم سمجھتے ہو کہ اس طرح جانی کی آنکھوں میں دھول جھونک سکتے ہو تو یہ تمہارا خیال خام ہے۔ تمہاری نیت اور ارادوں کی طرف سے مجھے کبھی اطمینان نہیں ہوا۔ میں شروع سے ہی جانتا تھا کہ تم خود غرض، مطلبی، لالچی اور جھوٹے آدمی ہو۔ تم نے ہمارے ساتھ جو وعدے کیے وہ سب جھوٹے تھے۔ تارہ کو تم جو خواب دکھا رہے تھے وہ بھی تمہاری ایک چال تھی، لیکن صرف تارہ کی خاطر میں نے ہمیشہ تمہارے ساتھ رعایت کی ہے۔ تمہاری بہت سی خامیوں کو نظرانداز کرتا رہا ہوں۔ تمہاری کمینگی کو یہ سمجھ کر برداشت کرتا رہا ہوں کہ رفتہ رفتہ تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔ میں نے ہر معاملے میں تمہارا ساتھ دیا ہے۔ ہر مشکل وقت میں تمہارے کام آیا ہوں۔ یہ سب کچھ میں نے تارہ کی خاطر ہی کیا تھا کیونکہ ہمیں اپنی بہن کو ہر حال میں خوش رکھنا ہے۔ صرف اسی کی خاطر میں نے تمہارے ساتھ ہر کام میں تعاون کیا اور کان کھول کر سن لو۔ تمہارے دوسرے گناہ تو میں معاف کر سکتا ہوں، لیکن اگر تم نے تارہ کے ساتھ بے وفائی کرنے کی کوشش کی تو میں تمہیں جان سے مار دوں گا۔" وہ سخت غضبناک تھا اور اس کے لہجے میں تلخی اور شکایت بھری ہوئی تھی۔ اس کا ایک ایک لفظ یہ ظاہر کر رہا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے۔ اس پر عمل کرنے کا ارادہ بھی رکھتا ہے۔

"لیکن جانی۔" میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"لیکن ویکن میں کچھ نہیں جانتا۔ میں نے تمہارا ہمیشہ بہت لحاظ کیا ہے، لیکن اب ایسا نہیں ہوگا۔ یہ فیصلہ آج ہی ہو جائے گا۔ اگر تم نے مال کا ٹھکانہ نہیں بتایا اور ہمیں اس میں شامل نہیں کیا تو پھر تارہ بھی تمہیں میرے ہاتھ سے نہیں بچا سکے گی۔"

خدا جانے وہ مجھے کیا سمجھ رہا تھا اور بار بار کس مال کا تذکرہ کر رہا تھا۔ لیکن اس کے لہجے میں سختی اور گفتگو کا فیصلہ کن انداز دیکھ کر میں نے وقتی طور پر اس سے بحث کرنی ضروری نہیں سمجھی۔ جو کچھ اب تک میرے ساتھ ہو چکا تھا اور جو کچھ ہونے والا تھا، نہایت حیرت انگیز اور ناقابل یقین تھا۔ خدا جانے اچانک میرے ستارے کیوں گردش میں آگئے تھے کہ ہر کام بگڑنے لگا تھا۔ اپنے گھر میں میرے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا وہی میرے لیے کچھ کم پریشان کن نہ تھا کہ اب یہ ایک نئی مصیبت منہ کھولے میرے سامنے کھڑی تھی۔ بہتری اسی میں تھی کہ میں چپ چاپ آنکھیں کھول کر سارے معاملات کا جائزہ لوں اور حالات اور موقع کے مطابق ضروری قدم اٹھاؤں ہو سکتا ہے مجھے نجات کا کوئی راستہ مل جائے چنانچہ میں نے جانی سے کچھ اور کہنا یا بات کو بڑھانا مناسب نہ سمجھا۔ فی الحال خاموشی ہی بہتر تھی۔

گاڑی اب خاصی تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی۔ میں نے پہلی بار اپنے اطراف کا جائزہ لیا۔ ہم شہری آبادی سے دور نکل آئے تھے۔ دونوں طرف درختوں، کھیتوں اور باغوں کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا نظر آرہا تھا۔ جانی مجھے کہاں لے جا رہا ہے اور اس کا مقصد کیا ہے؟ میں بالکل نہیں جانتا تھا۔ نہ ہی مجھے یہ معلوم تھا کہ آنے والا وقت

میرے لیے اپنے دامن میں اور کتنے خلافِ توقع اور تحیر انگیز واقعات سمیٹے ہوئے ہے۔

"کیوں اب بولتے کیوں نہیں؟" مجھے خاموش پا کر جانی نے درشت لہجے میں پوچھا۔

"کیا بولوں؟" میں نے مختصراً جواب دیا اور آنکھیں بند کر کے نشست سے ٹیک لگالی۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ اسی قدر کشیدہ اور پریشان کن حالات میں بھی مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ خدا جانے یہ مسلسل جاگنے کا سبب تھا یا ایک طویل اعصابی کشمکش کا نتیجہ تھا۔ میں بے اختیار نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ رکی تو میری آنکھ کھل گئی۔ میں غالباً دس پندرہ منٹ ہی سویا تھا۔ میں نے آس پاس کا جائزہ لیا یہ چاروں طرف سے درختوں میں گھرا ہوا ایک مختصر سا کوٹھی نما مکان تھا۔ اسے جدید حویلی یا پرانی وضع کا بنگلہ کچھ بھی کہا جا سکتا تھا۔ اس کے سامنے ایک چھوٹا سا برآمدہ تھا اور پچھلی جانب بھی ایسا ہی ایک برآمدہ تھا۔ سامنے کچی سڑک تھی جس سے گزر کر ہم یہاں تک آئے تھے۔ پچھلی جانب چھوٹے سے کھلے میدان کے بعد ہر سو اونچے درختوں کے جھنڈ کھڑے ہوئے تھے۔

جانی نے گاڑی روک کر ہارن بجایا اور ہارن کی آواز رات کے سناٹے میں دور تک گونجنے لگی۔ سامنے والے بنگلے کے صرف ایک کمرے میں روشنی جل رہی تھی۔ ہارن کی آواز کے بعد ایک اور کمرہ بھی روشن ہو گیا اور پھر ایک سایہ برآمدے میں نمودار ہوا۔ برآمدے کی روشنی جل گئی تو میں نے دیکھا کہ ایک نوجوان اور خوبصورت لڑکی، بکھرے ہوئے بالوں کے ساتھ برآمدے میں کھڑی تھی۔ ہم اس سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھے، لیکن تاریکی کے سبب وہ جانی کے ساتھ آنے والے شخص کو پہچان نہیں سکی تھی اور گردن کو خم دے کر دیکھنے اور پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔

"چلو اترو۔" جانی نے دبی زبان میں کہا: "اور میری بات یاد رکھنا۔" میں گاڑی سے باہر نکلا اور جانی کے پیچھے چل پڑا۔ ہم برآمدے کے نزدیک پہنچے تو جانی نے بلند آواز میں کہا: "تارہ۔ دیکھ اپنے ساتھ کس کو لایا ہوں؟"

اب میں روشنی تک پہنچ چکا تھا اور اپنے سامنے کھڑی ہوئی بے انتہا دلکش اور پرکشش لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہیں بھی مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ یقین، بے یقینی اور عجیب سی مسرت کے عالم میں مجھے تک رہی تھی۔

"ٹونی!" وہ بے اختیار خوشی سے چیخ مار کر میری طرف لپکی اور مجھ سے لپٹ گئی۔ پہلے تو میں اس اچانک حملے کی وجہ سے بوکھلا کر پیچھے ہٹا مگر اس نے مضبوطی سے مجھے تھام رکھا تھا۔ وہ دیوانگی کے عالم میں مجھ سے لپٹی ہوئی نہ جانے کیا کیا کہہ رہی تھی۔ الفاظ اس کے منہ سے نہایت تیزی سے، غیر مربوط اور بلا کسی تسلسل کے نکل رہے تھے میرے پلے کچھ نہیں پڑا کہ آخر وہ کیا کہہ رہی ہے لیکن اتنا اندازہ ضرور ہوا کہ وہ خوشی کے مارے قریب قریب پاگل ہوگئی ہے۔ وہ مجھے پا کر اپنے ہوش و حواس کھو چکی تھی۔ میرے یوں اچانک مل جانے پر وہ خوشی کا اظہار کر رہی تھی — اور ساتھ ہی شکوے شکایت بھی کرتی جا رہی تھی۔ چند لمحے یہی کیفیت رہی۔ پہلے تو میں اسے خود سے علیحدہ کرنے کی کوشش کرتا رہا مگر پھر مجبور اور مایوس ہو کر میں نے خود کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ مجھے یہ اندازہ بھی نہیں تھا کہ اس نازک اندام اور خوبصورت لڑکی میں اتنی طاقت ہوگی۔ اس کے منہ سے الفاظ موسلادھار بارش کی طرح نکل رہے تھے۔ پھر اچانک اسکی آنکھوں سے آنسو بھی جاری ہو گئے۔ اس نے باقاعدہ رونا شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ اسکی گرفت ہلکی پڑتی گئی۔ اب اس نے میرے کندھے پر اپنا سر رکھ دیا اور زار و قطار رونے لگی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں؟ اسے کیسے تسلی دوں اور اگر تسلی دوں تو کیا کہوں؟ مجھے نہ اس کے خوش ہونے کا سبب معلوم تھا اور نہ ہی بے اختیار رونے کا۔ کچھ دیر وہ روتی رہی اور میں خاموش کھڑا اسکی خوبصورت کالی کالی آنکھوں سے آنسوؤں کو بہتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اسکی آنکھوں کا کاجل بھی آنسوؤں کے اس سیلاب میں بہہ گیا تھا اور اس کے

سُرخ و سفید رخساروں پر آنسوؤں کے ساتھ ساتھ کاجل کی ہلکی کالی لکیریں نمودار ہو گئی تھیں۔ اس دوران جب کہ میں اس بھونچال کی زد میں تھا جانی کچھ دیر تو خاموش کھڑا رہا اور اسکو روتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے سر کو جھٹکا دیا۔ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑایا اور کمرے میں چلا گیا۔

خدا خدا کر کے جب آنسوؤں کا یہ طوفان تھما تو اسکے رونے میں بھی کمی آنے لگی۔ یہاں تک کہ وہ ہلکی ہلکی سسکیاں لینے لگی۔ پھر وہ سسکیاں بھی بند ہو گئیں اور خاموشی چھا گئی۔ مگر اس کا سر ابھی تک میرے کندھے پر رکھا ہوا تھا۔ جب یہ ہنگامی حالات ختم ہوئے اور مجھے سوچنے سمجھنے کا موقع ملا تو میں نے سوچنا شروع کیا کہ اب میرا آئندہ قدم کیا ہوگا۔ اسکے جسم اور بالوں کی بھینی بھینی خوشبو خاصی مسحور کن تھی۔ وہ جو کوئی بھی تھی، اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بہت خوبصورت اور پرکشش لڑکی تھی اور اس نے اپنی حرکتوں سے یہ بھی ظاہر کر دیا تھا کہ وہ بے انتہا مخلص باوفا اور جذباتی بھی ہے۔ لیکن وہ میرے لیے قطعاً اجنبی اور غیر مانوس تھی۔ حالانکہ اُس کے نزدیک میں اس کی رگِ جاں سے بھی قریب تھا۔ کم از کم اس کے برتاؤ سے ایسا ہی ظاہر ہو رہا تھا۔

رونے دھونے سے فرصت ملی تو اس نے میرے کندھے پر رکھے ہوئے سر کو اُٹھایا اور لمبی اور خوبصورت گردن موڑ کر میری طرف دیکھا۔ ہم دونوں کی نگاہیں ملیں تو وہ بے اختیار مسکرا دی۔ اس کا رونا میں دیکھ چکا تھا۔ اب اس کی دلکش مسکراہٹ بھی دیکھ لی۔ یہ مسکراہٹ اتنی خالص اور بے اختیار تھی کہ خواہ مخواہ میں بھی مسکرانے لگا۔

"سنو!" اس نے سرگوشی میں کہا "تم اتنے دن سے کہاں تھے؟ سیدھے یہاں کیوں نہیں آئے؟"

یہ ایسا سوال تھا جسکا جواب میرے پاس نہیں تھا۔

"میں تو اسی دن سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں جب سے میں نے تمہاری واپسی کی خبر سنی ہے پہلے تو جانی تمہارا انتظار کرتا رہا۔ پھر کہنے لگا کہ وہ ہمیں بھول گیا ہے۔ وہ اب ہمارے پاس نہیں آئے گا مگر میرا دل کہتا تھا کہ ایسا ممکن نہیں ہے۔ میرا لوٹی ایسا نہیں ہے۔ وہ اپنی تارہ کے لیے ضرور آئے گا۔ تم کسی مشکل میں تو نہیں پھنس گئے تھے؟"

"ہاں!" میں نے پہلی بار جواب دیا اور یہ سچ بھی تھا۔

"تمہیں اُن لوگوں نے بہت زیادہ تنگ تو نہیں کیا؟ تکلیف تو نہیں پہنچائی؟" خدا جانے اس کا اشارہ کن لوگوں کی طرف تھا مگر یہ حقیقت ہے کہ مجھے کچھ لوگوں نے بہت زیادہ تنگ کیا تھا اور مجھے تکلیف بھی پہنچائی تھی۔ میں نے خاموشی سے سر ہلا کر اقرار کیا۔ اس نے میرا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور پیار سے کافی دیر تک میری جانب خاموشی سے دیکھتی رہی پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی "مگر اب تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچا سکے گا۔ کبھی نہیں!"

اتنی دیر میں جانی دوبارہ برآمدے میں نمودار ہوا۔ اُس نے اپنا لباس تبدیل کر لیا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک سیب تھا جسے وہ چبا چبا کر کھا رہا تھا۔ "اب یہ ڈرامہ کب تک ہوتا رہے گا۔ باقی باتیں گھر کے اندر بھی ہو سکتی ہیں!" وہ بیزاری سے بولا۔

تارہ نے پیار سے میرے بازو میں اپنا بازو ڈالا اور مسکراتی ہوئی مجھے لے کر برآمدے سے گزر کر کمرے کی طرف بڑھی۔ باہر سے ایک اُجاڑ اور فضول سا ویران بنگلہ نظر آتا تھا لیکن ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو پتہ چلا کہ آرائش کی ہر چیز وہاں موجود تھی۔ اسے بڑے سلیقے اور اہتمام سے سجایا گیا تھا۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر دبیز اور رنگین پردے پڑے ہوئے تھے۔ فرش پر قیمتی قالین تھا، صوفے، میزیں اور کوچے وغیرہ بھی خاصے مہنگے اور قیمتی نظر آتے تھے۔

ہم دونوں کمرے کے اندر داخل ہوئے تو جانی سامنے ایک صوفے پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھا تھا۔ سیب اس نے ختم کر دیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک موٹا سگار تھا۔ وہ اس کے کش لے رہا تھا اور سارا کمرہ سگار کے تمباکو کی خوشبو سے مہکا ہوا

تھا۔ یہ وہ تمباکو تھا جسکی خوشبو مجھے بھی ہمیشہ سے پسند رہی ہے۔

تارہ نے میرا ہاتھ ابھی تک نہیں چھوڑا تھا۔ وہ والہانہ انداز میں دیوانوں کی طرح مجھے تکے جا رہی تھی۔ اس تمام عرصے میں اسکی نظریں ایک لمحے کے لیے بھی میرے چہرے سے نہیں ہٹی تھیں۔ ان نگاہوں میں پرستش کے جذبات تھے۔ ایک والہانہ پن تھا۔

"ارے تم تو بھوکے ہو گے؟" یکایک تارہ کو یاد آیا۔ میں نے سر ہلا کر ہاں کہا تو وہ میرا ہاتھ چھوڑ کر کھڑی ہو گئی "توبہ توبہ۔ میں بھی کتنی پاگل ہوں۔ اتنی دیر سے پوچھ ہی نہیں رہی ہوں کہ تم بھوکے تو نہیں ہو؟ تمہیں دیکھ کر مارے خوشی کے میں تو سبھی کچھ بھول گئی۔ ٹھہرو۔ میں تمہارے لیے کھانا لے کر آتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے ایک طرف کو چل پڑی۔ مگر پھر چند قدم چل کر رُکی اور پھر میرے پاس آ گئی۔ اس نے سر سے پیر تک میرا جائزہ لیا۔ "تم تھک گئے ہو گے۔ پہلے غسل کر لو!"

مگر مجھے بھوک نے زیادہ پریشان کر رکھا تھا اس لیے بے ساختہ میری زبان سے نکل گیا "نہیں پہلے کھانا لے آؤ۔"

"ٹھیک ہے آرام سے کھانا کھا لو پھر غسل کر لینا اور ہاں۔ تم اپنے ساتھ کپڑے تو نہیں لائے ہو گے؟ خیر کوئی بات نہیں تم جانی کے کپڑے پہن سکتے ہو۔" اس طرح آپ ہی آپ سوال جواب کرنے کے بعد وہ تیزی سے رُخصت ہو گئی۔

اب کمرے میں ہم دونوں اکیلے رہ گئے۔ جانی اور میں۔ اس اثنا میں جانی کی نظریں بھی مجھ پر سے ایک لمحے کے لیے نہیں ہٹی تھیں۔ وہ گہری نظروں سے مجھے گھور رہا تھا مگر جہاں تارہ کی نظروں میں پرستش اور محبت تھی۔ وہاں اس کی نگاہوں میں سرد مہری بلکہ نفرت تھی۔ اس کے برتاؤ نے بھی یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ مجھے بالکل نہیں پسند کرتا بلکہ اس کا بس چلے تو شاید میرا کام ہی تمام کر دے۔ اس کی جیب سے پستول بھی جھانک رہا تھا۔

"ملاقات تو ہو گئی!" وہ طنزیہ انداز میں بولا "اب آرام سے بیٹھ کر میرے ساتھ بات کرو!"

میں نے خاموشی سے ایک صوفے پر بیٹھ کر ٹانگیں پھیلا لیں۔ اس طرح مجھے آرام اور سکون محسوس ہوا۔

جانی کچھ دیر مجھے گھورتا اور سگار کے کش لیتا رہا۔ پھر اُٹھ کر میرے نزدیک آ کر بیٹھ گیا "دیکھو لوٹی۔ میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ یہ پگلی تمہارے انتظار میں کس طرح دن گزارتی رہی ہے۔ بس اسکو تمہارے ہی نام کی رٹ لگی ہوئی تھی، ہر وقت تمہارے لیے دعائیں کرتی رہتی تھی۔ اتوار کو باقاعدہ سے گرجا جاتی تھی اور نہ جانے کیا کیا منتیں مانتی تھی۔ تم نے اب تک اس کے ساتھ خلوص اور محبت کا سلوک نہیں کیا۔ وہ تو نہیں سمجھتی مگر میں جانتا ہوں کہ تم کبھی بھی اس کے ساتھ مخلص نہیں تھے، لیکن اب خدا کے لیے بدل جاؤ۔ دیکھو تم نے پچھلے سالوں میں بہت تکلیفیں برداشت کی ہیں۔ بہت دُکھ جھیلے ہیں تمہاری وجہ سے تارہ بھی بے چین اور دکھی تھی۔ تم اندازہ نہیں لگا سکتے کہ اس کی کیا حالت تھی۔ کوئی لمحہ ایسا نہ تھا جب وہ تمہارے بارے میں نہ سوچتی رہی ہو۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ میں نے کبھی تمہاری مدد کرنے میں پس و پیش نہیں کی۔ تمہاری خاطر کتنی بار اپنی جان پہ بھی کھیل گیا۔ یہ سب میں نے محض پیسے اور حصے داری کے لیے نہیں کیا۔ صرف تارہ کی خوشیوں کی خاطر کیا۔" اس نے سگار ایش ٹرے میں مسل دیا اور اُٹھ کر ٹہلنے لگا۔ پھر وہ میرے نزدیک آ کر قالین پر دو زانو بیٹھ گیا اور لجاجت آمیز لہجے میں بولا "لوٹی پلیز۔ تارہ میری ایک ہی بہن ہے اور مجھے بہت پیاری ہے۔ وہ میری زندگی ہے، میری روح ہے۔ اس کو دکھی دیکھتا ہوں تو میرا دل خون کے آنسو رونے لگتا ہے۔ اس کی خاطر اب اپنے آپ کو بدل دو۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہیں کبھی پچھتاوا نہیں ہو گا۔ تم نے اپنے دوسرے ساتھیوں اور دوستوں کو بھی آزما لیا۔ اب مجھے آزما کر دیکھو۔ میں تمہیں ہر فکر سے نجات دلا دوں گا۔"

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ میرے پاس ان باتوں کا جواب بھی کیا تھا؟ تارہ کی محبت اور وفا کا

نمونہ میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا اور یہ بھی سچ ہے کہ اس لڑکی کے خلوص اور وفا نے میرے دل کو متاثر کیا تھا وہ ایک پیار کرنے والی کھری لڑکی تھی، لیکن میری جھولی میں اس کے لیے مایوسیوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ میں جو بذاتِ خود ایک دل شکستہ اور آشفتہ حال انسان تھا اس کے درد کا درماں کیوں کر کر سکتا تھا؟ وہ نہ جانے کس لڑکی کے تغافل کا شکار ہوئی تھی۔ میں اس معاملے میں بھلا اس کی کیا مدد کر سکتا تھا۔ میں تو اسے جھوٹی تسلی بھی نہیں دے سکتا تھا۔ وہ میرے اندر ایک ایسے شخص کا عکس دیکھ رہی تھی جسے خود میں بھی نہیں جانتا تھا، لیکن میرے ذہن کے ایک گوشے میں اپنے اس ہمشکل کا تصور بھی کلبلا رہا تھا جو میرے گھر کے اندر خود میرا بہروپ بنے بیٹھا تھا کہیں یہ نادان لڑکی بھی اسی کے ظلم و ستم اور فریب کا شکار تو نہیں ہوئی؟

یکایک جانی نے میرے کندھے کو جھنجھوڑ کر مجھے چونکا دیا۔

"دیکھو ٹونی!" وہ دھیمی آواز میں کہہ رہا تھا۔ "تم سمجھتے کیوں نہیں کہ تمہیں حالات کا سامنا کرنے کے لیے کچھ ساتھیوں کی ضرورت ہے۔ تم اکیلے حالات کا مقابلہ نہیں کر سکو گے اور پھر تم یہ بھی جانتے ہو کہ تمہارے کتنے مخالف اور دشمن تمہاری کھوج میں لگے ہوئے ہیں۔ تمہیں مضبوط اور قابلِ اعتماد ساتھیوں کی ضرورت ہے۔ تمہیں اپنے چاروں طرف بکھرے ہوئے دشمنوں سے مقابلہ کرنے کے لیے ایک مضبوط قلعے کی چار دیواری چاہیئے۔ ان بازوؤں کو دیکھو۔ یہ تمہارے لیے لوہے کی دیوار بن سکتے ہیں۔"

اس کی آواز میں خلوص کی گرمی تھی۔ وہ یوں تو کوئی اچھا آدمی نہیں معلوم ہوتا تھا، لیکن اس کی گفتگو میں سچائی کی خوشبو تھی۔ کم از کم وہ اپنی بہن کے لیے بے حد سنجیدہ اور مخلص تھا اور اس واسطے سے میرے لیے بھی اس کے دل میں پیار کا ایک سمندر موجزن ہو گیا تھا اگر میرے بس میں ہوتا تو میں اس کی بات ضرور مان لیتا، حالانکہ مجھے اس بات کی حقیقت کا مطلق علم نہیں۔ پھر بھی میں بہن کے لیے اس کے جذبات کا اظہار سن کر متاثر ہو گیا تھا۔ دنیا بھر کے ساتھ وہ بیشک غیر مخلص اور بددیانت ہو گا لیکن اپنی بہن کے ساتھ وہ بالکل سچا اور دیانت دار تھا مگر میرے اختیار میں تو کچھ بھی نہیں تھا۔

میری مسلسل خاموشی کو غالباً اس نے میری ہٹ دھرمی سمجھ لیا اور اس کا غصہ دوبارہ عود کر آیا۔ "دیکھو ٹونی۔ تمہیں بتانا ہو گا کہ تم نے وہ اتنی بڑی رقم کہاں چھپائی ہے۔ میں تمہارے ساتھ چل کر اسے واپس لانے کا بندوبست کروں؟"

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس سوال کا جواب میرے پاس تھا بھی نہیں۔

"آخر بولتے کیوں نہیں؟" وہ بیزاری سے بولا۔ "میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے اور نہ میں زیادہ دیر تک صبر کر سکتا ہوں۔ اور یہ بھی مت بھولو کہ اگر تم نے جلد سے جلد کوئی بندوبست نہیں کیا تو دوسرے لوگ بھی تمہاری تلاش میں ہیں۔ جلدی کرو۔ کھانا کھا کر ہم دونوں یہاں سے چلے جائیں گے اور سب کچھ سمیٹ لائیں گے۔ میں نے ملک سے روانگی کا بندوبست بھی کر لیا ہے۔ پھر ہمارا اس ملک میں رہنا مناسب بھی نہ ہو گا۔ دیکھ لو۔ میں نے تمہاری غیر موجودگی میں تمہارے لیے سارا بندوبست مکمل کر لیا ہے۔" اس کی آواز میں نرمی آ گئی۔ "تم اتنے خاموش کیوں ہو؟ ہر بات کے جواب میں سوچ میں کھو جاتے ہو؟ آخر بات کیا ہے؟ کہیں تمہاری نیت تو نہیں بدل گئی؟!"

اس نے میرا کندھا پکڑ کر جھنجھوڑا۔ "آخر بولتے کیوں نہیں کچھ تو بولو۔"

میں کرسی پر نیم دراز ہو گیا۔ اب وہ میرے سامنے ٹانگیں پھیلائے کھڑا تھا۔ اچانک مجھے اس صورتِ حال پر ہنسی آ گئی۔ میں ہنسا تو اس نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا۔ اس کی حیرت پر مجھے اور زیادہ ہنسی آئی اور میں نے قہقہہ لگا کر ہنسنا شروع کر دیا۔

"کیا بات ہے؟" وہ حیرانی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ "ہنسنے کی کیا بات ہے؟"

میں اُسے کیا بتاتا کہ میں اس کی حماقتوں پر ہنس رہا ہوں۔ تارہ کی سادگی پر ہنس رہا ہوں اور خود اپنی حالت پر ہنس رہا ہوں۔ قدرت کی ستم ظریفی پر ہنس رہا ہوں۔ گزشتہ چند روز میں مجھے خلاف توقع جن حالات سے دوچار ہونا پڑا تھا اُن پر ہنس رہا ہوں، لیکن میں نے اسے کچھ نہیں بتایا۔ صرف ہنستا رہا۔ نہ جانے کب سے میں اعصابی کشمکش اور ذہنی اُلجھن میں مبتلا ہوں۔ سنجیدگی اور خاموشی سے وہ مصائب برداشت کر رہا تھا جو مجھ پر ایک کر کے نازل ہو رہے تھے۔ اب جو میں نے ہنسنا شروع کیا تو مجھے خود معلوم نہیں تھا کہ میں کیوں ہنس رہا ہوں۔

میں بے اختیار ہنس رہا تھا، بے تحاشا ہنس رہا تھا۔ پاگلوں کی طرح، دیوانہ وار قہقہے لگا رہا تھا۔

جانی پریشانی سے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر وہ مجھے جھنجھوڑنے لگا۔

"کیا ہو گیا تمہیں۔ پاگل تو نہیں ہو گئے؟"

مگر میں نے اس کی بات پر کان نہیں دھرا، بدستور ہنستا رہا یہاں تک کہ میرے قہقہوں کی آواز سن کر تارہ بھی گھبرا کر کمرے میں آ گئی اور حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگی۔

"کیا بات ہے، کس بات پر ہنس رہے ہو؟"

جانی نے کہا: "مجھے نہیں معلوم۔ پتہ نہیں کیوں پاگلوں کی طرح ہنس رہے ہیں۔"

تارہ نے میرے ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیے۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔ وہ سچ مچ میری اس حالت کو دیکھ کر گھبرا گئی تھی۔ رفتہ رفتہ میرے قہقہوں کی آواز بند ہو گئی۔ ہنستے ہنستے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے جنہیں میں نے اپنے ہاتھوں سے پونچھ لیا۔

"کیا بات ہے؟" تارہ نے میرے نزدیک آ کر نرمی سے پوچھا۔ "ٹھیک تو ہو نا؟"

"ہاں۔" میں نے تھک کر آنکھیں بند کر لیں۔

"ہائے اللہ۔ میں تو سمجھی تھی نہ جانے کیا ہو گیا؟"

"ہونا کیا تھا۔" جانی بے زاری سے بولا۔ "جو ہونا چاہیے تھا وہ تو ابھی تک نہیں ہوا۔" وہ میرے سامنے قالین پر بیٹھ گیا۔ "یہ سب تو ہو گیا۔ اب میری بات کا جواب دو۔"

پھر وہ تارہ سے مخاطب ہوا۔ "تارہ جلدی سے جا کر کھانے کا بندوبست کر۔ بہت بھوک لگ رہی ہے۔ اتنی دیر میں ہم کچھ ضروری باتیں کر لیتے ہیں۔"

تارہ نے مجھ پر ایک نظر ڈالی اور پھر خاموشی سے واپس چلی گئی۔ اب جانی تھا اور میں تھا۔ میں جانتا تھا کہ ایک بار پھر وہ مجھ سے اسی سوال کی تکرار کرے گا۔ جس کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔

"لوٹی۔ دیکھو۔ وقت بہت نازک ہے۔ ہمارے پاس زیادہ مہلت بھی نہیں ہے۔ سارا زمانہ ہمارا دشمن ہو رہا ہے۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ کتنے لوگ تمہاری واپسی کے منتظر تھے اور وہ تمہارے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ ہمارا ایک ایک منٹ قیمتی ہے۔ وہ سب تمہاری کھوج میں ہیں اور تم جانتے ہو کہ اگر ایک بار تم نے اُنہیں مال کا پتہ بتا دیا تو وہ تمہیں راستے سے ہٹا دیں گے۔ ہم دونوں نے ایک ایک پل گن کر تمہاری راہ دیکھی ہے اور کچھ نہیں تو تارہ ہی کا خیال کرو۔ کیا تم اسے خوشیاں دینا نہیں چاہتے؟ وہ بے چاری کب سے تمہاری آس میں بیٹھی ہے۔"

میں چپ چاپ اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ وہ میرے کچھ اور قریب کھسک آیا۔ "لوٹی۔ مجھے بتا دو۔ ہم دونوں ابھی جا کر مال لے آئیں گے۔ مجھ پر بھروسہ کرو۔ میں تمہارا پرانا دوست ہوں اور پھر تارہ کے ہوتے ہوئے میں تمہارے ساتھ دھوکہ بھی تو نہیں کر سکتا۔ بس تھوڑا سا حصہ چاہتا ہوں۔ آخر میں نے بھی تو بہت کشٹ جھیلا ہے اور ابھی تو نہ جانے آگے اور کیا کیا مصیبت اٹھانی پڑے گی تمہارے لیے۔"

میں صوفے سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس کے پاس قالین پر جا بیٹھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور کہا: "جانی۔ مجھے نہیں معلوم تم کون ہو۔ لوٹی کون ہے اور اس سے تمہارا کیا تعلق ہے۔ میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تم مجھے جو کچھ سمجھ رہے ہو میں وہ نہیں۔ تمہاری شکل میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھی ہے۔ لوٹی نامی کسی آدمی کو میں نہیں جانتا نہ میرا کبھی اُس سے واسطہ پڑا ہے۔ تم جس مال کی بات بار بار کر رہے ہو مجھے نہیں معلوم کہ وہ مال کون سا ہے، کس کا ہے اور کہاں ہے؟"

جانی ایک دم اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ غصے سے اس کے لب پھڑپھڑا لیے گئے۔ "تم چاہتے کیا ہو آخر؟" وہ غرّایا۔

"میں کچھ نہیں چاہتا۔ صرف تمہیں یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میں لوٹی نہیں ہوں؟"

"میری آنکھیں دھوکہ نہیں کھا سکتیں لوٹی۔" وہ غصے سے بھڑک کر بولا۔ "یہ کیوں نہیں کہتے کہ تمہاری نیت بدل گئی ہے یا پھر تمہیں کسی اور نے سبز باغ دکھا دیا ہے۔ تم مجھے حصہ دینا نہیں چاہتے۔ اتنی بڑی رقم کو اکیلے ہی ہضم کرنا چاہتے ہو۔"

"مگر وہ رقم ہے کہاں؟"

"یہی تو میں بھی پوچھتا ہوں۔ آخر تم نے وہ رقم رکھی کہاں تھی؟ دیکھو۔ کان کھول کر سن لو۔ وہ جہاں کہیں بھی رکھی ہے تم اکیلے اسے قابو میں نہیں کر سکتے۔ قدم قدم پر تمہیں مشکلیں اُٹھانی پڑیں گی۔ ہر طرف تمہارے دشمن بکھرے ہوئے ہیں۔ ہر ایک نظر اسی مال پر ہے۔"

میں تنگ آ کر چلا پڑا۔ "میں کچھ نہیں جانتا اس بارے میں۔ آخر تم میرا یقین کیوں نہیں کرتے؟"

"کیسے یقین کر لوں۔ مجھے تم اتنی آسانی سے بیوقوف نہیں بنا سکتے۔"

"تمہیں بنانے کی ضرورت نہیں ہے تم تو بنے بنائے ہو۔"

وہ دانت پیس کر میری طرف بڑھا۔ "تم نے ابھی میری دشمنی نہیں دیکھی ہے یاد رکھو۔"

اسی وقت تارہ کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ ایک ٹرالی ساتھ لے کر آئی تھی جس میں رکھے ہوئے کھانے کی اشتہا انگیز خوشبو کمرے میں پھیل گئی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے۔" وہ حیران ہو کر بولی۔ "جانی۔ تم باز نہیں آؤ گے؟ میں نے کہا نہیں ہے کہ بلا وجہ تنگ نہ کرو لوٹی کو۔"

"تم کو کیا معلوم۔ یہ بدل گیا ہے تارہ۔ یہ مال کے بارے میں کچھ بتانا نہیں چاہتا۔ یہ ہماری آنکھوں میں دھول جھونکنا چاہتا ہے۔ یہ وہ لوٹی نہیں ہے جسے ہم جانتے ہیں۔ جو ہمارا لوٹی تھا۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ "میں وہ کیا کوئی سا بھی لوٹی نہیں ہوں۔ مجھے تنگ نہ کرو۔ ورنہ میں ابھی چلا جاؤں گا یہاں سے۔"

اس سے پہلے کہ جانی کچھ بولتا تارہ اس کا بازو تھام کر اسے دوسرے کمرے میں لے گئی۔ مجھے اُن دونوں کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

"یہ بالکل بدل گیا ہے۔" جانی غصے میں چلایا۔

"سنو جانی۔" تارہ کی نرم آواز آئی۔ "یہ بھی تو ہو سکتا ہے اسے کوئی حادثہ پیش آ گیا ہو یا تشدد کی وجہ سے اس کا دماغ متاثر ہو گیا ہو۔ تم صبر کیوں نہیں کرتے۔ خدا جانے اس نے کتنے دکھ جھیلے ہیں۔ اسے سنبھلنے کا موقع تو دو۔ رفتہ رفتہ وہ نارمل ہو جائے گا۔ تم نے تو بس مال کی رٹ لگا رکھی ہے جیسے ہمیں لوٹی سے مال کے سوا اور کوئی مطلب ہی نہیں ہو سکتا ہے تمہاری خودغرضی اسے پسند نہ آئی ہو۔"

جواب میں مجھے جانی کی بڑبڑاہٹ سنائی دی۔

"یہ تو بتاؤ یہ تمہیں ملا کہاں؟" تارہ پوچھ رہی تھی۔

"اتفاق سے مل گیا۔ اگر میں اسے نہ مل جاتا تو یہ کبھی ہمارے پاس نہ آتا۔ اُس وقت سے یہی کہے جا رہا ہے کہ میں لوٹی نہیں ہوں۔"

"دیکھا۔ یہی تو میں بھی کہتی ہوں۔ وہ اس وقت نارمل حالت میں نہیں ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ دو چار دن میں بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔ اچھا اب چلو اور اچھے بچّوں کی طرح کھانا کھالو۔" اور وہ اسکو ساتھ لے کر باہر آگئی۔

اس نے ہم دونوں کے ہاتھوں میں خالی پلیٹیں تھما دیں اور پھر میری پلیٹ میں اپنے ہاتھ سے کھانا نکال کر ڈالنے لگی۔ وہ بے حد پیار اور عقیدت کے ساتھ مجھے کھانا کھلاتی رہی۔ کبھی کبھی کوئی ہنسی کی بات بھی کر لیتی، لیکن اس دوران میں جانی بالکل خاموش رہا۔ البتہ کبھی کبھی وہ مجھے گھور کر دیکھ لیتا تھا۔ اس نے کھانا بھی جلد ہی ختم کر دیا اور پھر کمرے سے رُخصت ہو گیا۔ تارہ میرے نزدیک آکر بیٹھ گئی۔ "اس کی باتوں کا خیال نہ کرنا۔ تم تو جانتے ہو کہ یہ جلد باز اور غصّے کا خراب ہے مگر دل کا بُرا نہیں ہے اور میرے سامنے تو بول ہی نہیں سکتا۔ کوئی بھائی اپنی بہن سے اتنا پیار نہیں کرتا ہو گا جتنا پیار یہ مجھ سے کرتا ہے۔ بس کبھی کبھی غصّے کا دورہ پڑ جاتا ہے اس پر۔ ارے تم رُک کیوں گئے۔ کھاتے کیوں نہیں؟"

"بہت پیٹ بھر گیا۔" میں نے جواب دیا۔ "بالکل گنجائش نہیں رہی۔"

"کیسا کھانا بنایا ہے میں نے؟" وہ اپنا چہرہ میرے مُنہ کے پاس لاکر پوچھنے لگی۔

"بہت اچھا۔" اور یہ حقیقت بھی تھی۔

"اطمینان رکھو۔ اب ہر روز تمہیں اس سے بھی اچھا کھانا پکا کر کھلایا کروں گی۔ ساری کسر پوری کر دوں گی اتنے دنوں کی۔" وہ ہونٹ کو دانتوں میں دبا کر مسکرائی۔ "کافی تو تم ضرور پیو گے کھانے کے بعد۔"

"ہاں۔ اگر مل جائے تو۔"

"ابھی حکم کریں آپ۔ ملے گی کیوں نہیں۔ جو مانگو گے یہاں ملے گا۔" وہ معنی خیز انداز میں ہنسی اور تڑالی کو کھینچ کر کمرے سے رُخصت ہو گئی۔

جانی کمرے میں دوبارہ داخل ہو گیا تھا اور مجھے گھور کر دیکھ رہا تھا۔ میں صوفے پر پیر پسار کر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ وہ ٹہلتا ہوا میرے نزدیک آگیا۔ "لوٹی۔" اس نے دھیمی آواز میں مجھے مخاطب کیا۔ "تارہ کا خیال ہے کہ تم اپنی یادداشت کھو بیٹھے ہو۔ کیا یہ درست ہے؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"میں ان افسانوی باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔ ایسے واقعات صرف فلموں میں رونما ہوتے ہیں یا پھر تارہ جیسی بیوقوف لڑکیاں اپنے دل کو تسلّی دینے کے لیے ان کا سہارا لیتی ہیں، لیکن اگر تم سمجھتے ہو کہ میں تمہارے ان ڈھکوسلوں میں آ جاؤں گا تو تمہارا یہ اندازہ غلط ہے۔"

وہ قالین پر گھٹنے ٹیک کر میرے پاس بیٹھ گیا۔ "لوٹی۔ آخر بات کیا ہے۔ تم یہ سب ڈرامہ کیوں بنا رہے ہو؟"

تنگ آکر میں نے کہا۔ "جانی۔ میں آخر تمہیں کس طرح سمجھاؤں۔ تم لوگوں کو میری کسی بات کا یقین ہی نہیں ہے تو میں کیا کروں۔"

"سنو۔" وہ میرے کان کے پاس منہ کر کے بولا۔ "کیا تم کسی سے خوفزدہ ہو؟ کسی نے تمہیں دھمکی دی ہے؟"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"تو پھر کیا بات ہے۔" "تم اتنے پُراسرار اور بدلے ہوئے کیوں ہو؟"

"میں واقعی بدلا ہوا ہوں جانی۔ بالکل بدل گیا ہوں۔ میں وہ شخص نہیں ہوں جو تم مجھے سمجھ رہے ہو۔"

وہ ایک لمحہ مجھے دیکھتا رہا۔ پھر دانت پیس کر کہنے لگا۔ "میں نے ٹھیک سُنا ہے۔ تمہاری نیّت بدل گئی ہے۔ تم نے کسی اور کے ساتھ سودا کر لیا ہے۔ اس لیے تم ہم لوگوں سے ملنے نہیں آئے۔ تم کو باہر آئے ہوئے اتنے دن گزر گئے لیکن تم نے تارہ کی خبر نہیں لی۔ اگر اس وقت میں تمہیں اتفاق سے نہ دیکھ لیتا تو شاید تم میرے ہاتھ بھی نہ آتے۔"

"تم جو چاہے سمجھ لو۔" میں نے بیزار ہو کر کہا۔

"تو پھر تم بھی یہ بات سمجھ لو لوٹی کہ میں نہ تمہیں مال اکیلے ہضم کرنے دوں گا اور نہ کسی اور کے ساتھ بانٹنے کی اجازت دوں گا۔"

"تم آخر چاہتے کیا ہو؟" میں ــــ تنگ آکر صوفے سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "تم نے تو میری زندگی عذاب بنا دی ہے۔ تم میرا پیچھا چھوڑ دو ورنہ میں خود یہاں سے چلا جاتا ہوں۔" اتنا کہہ کر میں بیرونی دروازے کی طرف چل پڑا۔

اسی وقت تارہ کافی کی ٹرے لے کر آگئی۔ "ارے۔ ارے۔ یہ کیا؟" وہ میری طرف دیکھ کر بولی۔

"میں جا رہا ہوں۔" میں نے غصّے سے کہا۔ "میں اب ایک منٹ بھی یہاں نہیں رُکوں گا۔ اس شخص نے میری زندگی وبال کر دی ہے۔ تنگ آگیا ہوں میں اس کے احمقانہ سوالوں سے۔"

"جانی۔ میں نے تم سے کہا ہے نا کہ بلاوجہ تنگ نہ کرو انہیں۔ آخر تم میری بات سُنتے کیوں نہیں؟"

"تارہ۔ یہ شخص......"

"فضول باتوں کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ بات کاٹ کر بولی۔ پھر وہ میری طرف مُڑی اور محبت بھری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ "میری آنکھیں دھوکہ نہیں کھا سکتیں۔ نہ میرا دل مجھے غلط بتا سکتا ہے۔ یہ کبھی نہیں بدل سکتے۔" اس نے بھاپ اُڑاتی ہوئی کافی کی ایک پیالی میرے ہاتھ میں دے دی اور کہنے لگی۔ "تمہاری پسند کی کافی ہے۔ ایک چمچ چینی اور کریم۔"

"شکریہ۔" میں نے مختصراً جواب دیا۔

اس نے دوسری پیالی جانی کو دے دی جو اس نے بدمزاجی سے لے کر میز پر رکھ دی۔ میں نے ایک گھونٹ بھرا واقعی اچھی اور لذیذ کافی تھی۔

تارہ جانی کے پاس جاکر اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگی۔ "جانی۔ میرے بھیّا۔ آخر تمہیں اتنی جلدی اور بے تابی کیوں ہے۔ لوٹی ہم سے دُور کہاں جائے گا۔ کس کے پاس جائے گا؟"

"تم بیوقوف ہو۔" وہ گرج کر بولا۔ "تارہ۔ اس کی نیّت خراب ہو گئی ہے۔"

وہ بگڑ کر بولی۔ "تم اپنے ہوش میں نہیں ہو شاید۔ کان کھول کر سُن لو جانی۔ اگر تم نے پھر لوٹی کو کچھ کہا تو میں تم سے ناراض ہو جاؤں گی۔"

جانی ایک لمحہ گھور کر ہم دونوں کو دیکھتا رہا۔ پھر کافی کی پیالی وہیں چھوڑ کر غصّے سے پیر پٹختا ہوا کمرے سے چلا گیا۔

"اس کو تو تم جانتے ہو۔ سدا کا پگلا ہے۔ اس کی باتوں کا کچھ خیال نہ کرنا۔"

وہ میرے برابر آکر صوفے پر بیٹھ گئی۔ "کیسے دن گزرے تمہارے میرے بغیر؟"

اب میں اسے کیا جواب دیتا۔ اس نے جھک کر میرا ہاتھ اُٹھایا اور آنکھوں سے لگا لیا۔ "کیا بتاؤں۔ تمہارے بغیر یہ ڈیڑھ سال کیسے گزارا ہے میں نے۔ اچھا۔ اب جلدی جلدی کافی ختم کرو۔ میں نے تمہارے لیے سلیپنگ سوٹ نکال دیا ہے۔"

میں نے پریشانی کے عالم میں کافی ختم کی تو وہ مجھے گھسیٹ کر سامنے والے کمرے میں لے گئی جو بیڈروم تھا۔ یہاں

بھی آرائش کی ہر چیز موجود تھی۔ بیڈ پر ایک سلیپنگ سوٹ تہہ کیا ہوا رکھا تھا۔

"لو جلدی سے پہن لو۔ میں ابھی آتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ غائب ہوگئی۔ میں گومگو کے عالم میں کھڑا رہ گیا۔ میری عقل حیران تھی۔ حواس کام نہیں کر رہے تھے۔ خدایا میں کس مشکل میں پھنس گیا ہوں اور اس سے چھٹکارا کیوں کر ہوگا؟ یہ کون لوگ ہیں۔ کیا چاہتے ہیں؟ مگر میں نے اتنا اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ مجھ پر کسی اور شخص کا گمان کر رہے تھے۔ مگر وہ کون تھا اور کہاں تھا؟

اتنی دیر میں کپڑوں کی سرسراہٹ سنائی دی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ میرے سامنے گلابی رنگ کے نائٹ ڈریس میں ملبوس تارہ کھڑی تھی۔ اس کے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے پر دلآویز مسکراہٹ تھی اور وہ دونوں بازو پھیلائے میری طرف بڑھ رہی تھی۔ یکایک وہ رُک گئی۔ "ارے تم نے تو ابھی کپڑے بھی نہیں بدلے۔ کیا ہوگیا ہے تمہیں۔ کس سوچ میں ہو؟"

"کچھ نہیں۔" میں اس کے حسن و جمال کی رعنائیوں کو دیکھ کر بجائے خوش ہونے کے پریشان ہو رہا تھا۔

"آج ہم کتنے عرصے بعد یکجا ہوئے ہیں؟" اس نے لگاوٹ سے میرے گلے میں باہیں ڈال دیں اور خوشبو سے سارا کمرہ مہک اٹھا۔ وہ میرے بالکل نزدیک تھی۔ اس کی زُلفیں میرے چہرے پر لہرا رہی تھیں اور وہ خمار آلود نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"تم تو میرے لیے کوئی تحفہ نہیں لے کر آئے۔ مگر میرے پاس تمہارے لیے بہت انمول تحفہ ہے۔ ٹھہرو۔ ابھی لے کر آتی ہوں۔" اتنا کہہ کر وہ لہراتی ہوئی کمرے سے رُخصت ہوگئی۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے اور میں اس عجیب و غریب صورتِ حال سے کیونکر عہدہ برآ ہو سکتا ہوں۔ میں ٹہلتا ہوا ——— کشادہ کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ یہ بنگلے کا پچھلا حصہ تھا۔ سامنے ایک لان پھیلا ہوا تھا اور اس کے بعد حدِ نظر تک درختوں کا جھنڈ تھا۔ چاند کی آخری تاریخیں تھیں اور چاندنی کی دھندلی دھندلی ملگجی سی روشنی۔ بلند و پست پر پھیلی ہوئی تھی۔ پرانی طرز کی کشادہ کھڑکی کے ساتھ ہی ایک دروازہ تھا جو پچھلے برآمدے میں کھلتا تھا۔ آہٹ سن کر میں پلٹا۔ میرے سامنے تارہ مجسم تابندگی بنی کھڑی تھی۔ خوشی اور تفاخر کا تاثر اس کے انگ انگ سے پھوٹا پڑتا تھا۔ وہ بڑی شان سے چلتی ہوئی میرے نزدیک آئی۔ اس کے ہاتھوں میں کپڑے میں لپٹی ہوئی کوئی چیز تھی۔ میرے سامنے پہنچ کر اس نے کپڑا اُلٹ دیا اور میں اس کی آغوش میں سوئے ہوئے معصوم اور خوبصورت بچے کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ "یہ..... یہ....."

"یہ تمہارا بچہ ہے لوٹی۔ ہمارا بچہ۔" اس نے ناز سے کہا اور پھر سوئے ہوئے بچے کی پیشانی چوم لی۔ "کیوں۔ پیارا ہے نا ——؟"

میں ہکا بکا کھڑا بچے کو اور کبھی تارہ کو دیکھ رہا تھا۔

"تمہیں بچے کو دیکھ کر خوشی نہیں ہوئی ——؟" اس نے ناراض ہو کر پوچھا۔ "تم تو کہا کرتے تھے کہ بچے تمہاری کمزوری ہیں اور تم کم از کم ایک درجن بچوں سے اپنا گھر بھر لینا چاہتے ہو۔"

"بہت پیارا بچہ ہے۔" میرے منہ سے نکلا۔

"تم اسے پیار نہیں کرو گے۔" اس نے گود میں تھاما ہوا بچہ میری طرف بڑھا دیا۔ بچے تو سبھی پیارے ہوتے ہیں۔ مگر یہ خاص طور پر بہت خوبصورت بچہ تھا۔ میں نے اس کی پیشانی چوم لی۔

"بس ٹھیک ہے۔ باقی ملاقات کل ہوگی۔" یہ کہہ کر وہ بچے سمیت کمرے سے رُخصت ہوگئی۔ میں پریشانی کے عالم میں کھڑا سوچتا رہ گیا۔ میں ابھی تھوڑی دیر پہلے اپنا گھر اور خاندان چھوڑ کر آیا تھا اور اب ایک نیا گھر اور نیا خاندان میرے لیے چشم براہ تھا۔ مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں کسی اور کی بیوی کو کیونکر اپنی بیوی کہہ سکتا ہوں۔ میرا ضمیر مجھے ہرگز اس کی اجازت نہ دیتا۔

برابر والے کمرے سے جانی کی غصہ بھری آواز آ رہی تھی۔ "بس بس بہت ہو چکی۔ اب میں اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتا۔ آخر وہ ماں کی بات کیوں نہیں کرتا؟"

"مال لے کر وہ کہاں جائیں گے؟ وہ تھکے ہوئے اور پریشان ہیں۔ دیکھتے نہیں کتنے بدلے بدلے نظر آ رہے ہیں۔ صبح تک انتظار کر لو۔ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

جواب میں جانی کی بڑبڑاہٹ کی آواز آئی اور پھر تارہ بادِ نسیم کی طرح سرسراتی ہوئی دوبارہ کمرے میں داخل ہوگئی۔ مجھے دیکھ کر وہ چلائی۔ "کیا مصیبت ہے تم کپڑے کیوں نہیں تبدیل کرتے۔ کیا ان ہی کپڑوں میں سونے کا ارادہ ہے۔ تم جانتے ہو کہ یہ عادت مجھے پسند نہیں ہے۔"

وہ میرے پاس چلی آئی اور میرے کوٹ کے بٹن کھولنے لگی۔ "سنو لوٹی۔ کیا مجھ سے ناراض ہو۔ دیکھو۔ جانی کی باتوں کا خیال مت کرنا۔ وہ ذرا جلد باز ہے۔"

میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تو وہ چونک کر مجھے حیرت سے دیکھنے لگی۔

"میری بات سنو تارہ۔" میں نے نرم آواز میں اسے سمجھانا چاہا۔ "تم لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ تم یقین کرو کہ....." ساتھ والے کمرے سے بچے کے رونے کی آواز سنائی دی اور تارہ سب کچھ بھول کر بے تابی سے مڑی۔ "میں ابھی بنی کو سلا کر آتی ہوں۔ پھر تمہاری باتیں سنوں گی۔ باتوں کے لیے تو ساری رات پڑی ہے کب سے تمہاری باتیں سننے کے لیے کان ترس رہے ہیں۔" وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی دوبارہ کمرے سے رُخصت ہوگئی اور میں کھڑا سوچتا رہ گیا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ یہ لوگ کسی صورت بھی میری بات نہیں مانیں گے۔ میرا یقین نہیں کریں گے کہ میں لوٹی نہیں ہوں بلکہ ایک ستایا ہوا انسان ہوں جسے خود اپنی منزل کا پتہ نہیں ہے، لیکن آخر یہ لوٹی کون ہے اور کہاں ہے؟

یکایک میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا اور آنکھوں کے سامنے پڑے ہوئے پردے یک لخت ہٹ گئے۔ لوٹی۔ کون ہے؟ اتنی معمولی سی بات اس سے پہلے میری سمجھ میں کیوں نہ آسکی؟ لوٹی میرا ہم شکل ہے۔ اتنا زیادہ میرے مشابہ ہے کہ جانی اور تارہ میرے بارہا یقین دلانے کے باوجود یہ ماننے کو تیار نہیں ہیں کہ میں لوٹی نہیں ہوں۔ میری شکل کا ایک اور شخص وہ ہے جو میرے گھر میں میری جگہ لیے بیٹھا ہے۔ جس نے میری بیوی اور بہترین دوست تک کو یہ باور کرا دیا ہے کہ وہی یوسف ہے۔ انہیں اس حد تک یقین دلا دیا ہے کہ اصلی یوسف کو سامنے پا کر بھی وہ اصل اور نقل میں شناخت نہ کر سکیں۔ میری ٹانگوں نے میرا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا۔ یوں لگا جیسے وہ ربڑ کی بن گئی ہیں ——— میں بے اختیار بیڈ پر بیٹھ گیا۔ "خدایا!" میں نے سوچا۔ "لوٹی وہ شخص ہے جو میرے گھر میں میرا روپ دھارے بیٹھا ہے۔ اور یہاں میں اس کی جگہ ایک اور مشکل صورت سے دوچار ہو رہا ہوں۔ بلکہ ایک شدید آزمائش میں پڑ گیا ہوں، لیکن اسے یہ کیونکر پتہ چلا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے ہمشکل ہیں اور اس نے میرے گھر میں داخل ہونے کا منصوبہ کیوں بنایا؟ میرا ذہن اب رفتہ رفتہ کام کرنے لگا تھا۔ میری سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتیں واپس لوٹ رہی تھیں۔ میں ٹھنڈے دل سے حالات اور واقعات کی گتھیاں سلجھانے کے قابل ہو چکا تھا۔ اب تک کے واقعات سے یہ صاف ظاہر ہے کہ لوٹی ایک جرائم پیشہ شخص ہے جس نے کوئی بہت بڑا جرم کیا ہے اور کافی عرصے کے بعد اب کہیں سے واپس لوٹ کر آیا ہے تو اس کے دوستوں اور دشمنوں میں کھلبلی مچ گئی ہے اور وہ اسکی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ اب جانی کی بے چینی، بے یقینی اور جھنجلاہٹ کا سبب بھی مجھے معلوم ہوگیا اور تارہ کی والہانہ محبت اور خلوص کا راز

بھی مجھ پر منکشف ہو گیا۔ لوٹی نے تارہ کو محبت کا سبز باغ دکھایا تھا۔ اس سے جھوٹے سچے وعدے کیے تھے۔ ہو سکتا ہے اس سے شادی بھی کر لی ہو۔ وہ غریب محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر گزشتہ ڈیڑھ سال سے اس کی منتظر تھی کہ اب وہ میری شکل میں اُسے نظر آیا تو اپنے سارے دُکھ اور گلے شکوے فراموش کر کے وہ مجھے اپنی کھوئی ہوئی منزل سمجھ بیٹھی۔ بالکل اسی طرح جس طرح میری بیوی روزی مجسم فریب کا شکار ہو گئی اور اس بہروپیے کو اپنا شوہر سمجھ بیٹھی۔ میں نے بیڈ پر رکھا ہوا سلیپنگ سوٹ پہن کر بستر پر تکیے سے ٹیک لگا لی اور شطرنج کی چالوں کے بارے میں سوچنے لگا جو لوٹی نے اب تک چلی تھیں۔ وہ جرائم پیشہ تھا۔ اپنے مجرم ساتھیوں اور دُشمنوں کو مطلوب تھا۔ ہو سکتا ہے پولیس کو بھی اس کی تلاش ہو۔ ان حالات میں اس کے لیے اس سے بہتر کوئی اور ترکیب نہ تھی کہ وہ ایک شریف اور معزز شہری کا روپ دھار کر اس کی جگہ لے لے۔ اس نے نہ صرف میری جگہ لے لی بلکہ میری بیوی اور عزیز ترین دوست کو بھی یہ شک نہیں ہونے دیا کہ وہ اصلی یوسف نہیں ہے بلکہ اپنے سامنے اصلی یوسف کو دیکھنے کے باوجود وہ اسے نہ پہچان سکے۔ ہماری اتنی زیادہ مشابہت کو دیکھ کر وہ محض معمولی سی حیرت کا اظہار کر کے رہ گئے۔ میری تمام اپیلیں اور دلیلیں انہیں یہ یقین دلانے میں ناکام رہیں کہ وہ جسے یوسف سمجھ رہے ہیں وہ دراصل ایک فریب کار شخص ہے حیرت اور دُکھ کی بات تو یہ ہے کہ روزی تک مجھے نہ پہچان سکی، لیکن تانیگر کا مجھے نہ پہچاننا ایک ایسا معمہ تھا جو مجھ سے حل نہ ہو سکا۔ روزی اور شوکت کی غلط فہمی تو قابلِ فہم تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ میں پولیس کے سامنے بھی کوئی ایسا ثبوت پیش کرنے سے قاصر رہا تھا جو مجھے اصلی یوسف ثابت کر سکے۔ اس کے مقابلے میں میرے ہمشکل نے انہیں دستاویزات اور حقائق کے ساتھ یقین دلا دیا تھا کہ وہی اصلی شخص ہے۔ قدرت کی ستم ظریفی سے ہم دونوں نے ایک دوسرے کی جگہ لے لی تھی۔ لوٹی میرے گھر میں یوسف بنا بیٹھا تھا اور حالات نے مجھے اس کے ٹھکانے پر پہنچا دیا تھا جہاں نہ صرف مجھے اس کی جگہ لینی تھی بلکہ اس کے دوستوں اور دُشمنوں کے ساتھ بھاری رقم کا حساب بھی چکانا تھا۔ لوٹی جو کوئی بھی تھا بے حد ذہین شخص تھا۔ ہو سکتا ہے قدرت نے بھی اس کی مدد کی تھی لیکن اس نے بساطِ زندگی پر ایک ایسی چال چلی تھی جسے میرے لیے شہ اور مات قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس نے تمام تحفظات اور آسانیاں اپنے لیے سمیٹ لی تھیں اور میرے دامن میں اپنے تمام مسائل، مشکلات اور جرائم کا ڈھیر ڈال دیا تھا۔ مجھے اب یہ احساس ہوا کہ میں کس قدر سنگین صورتِ حال سے دوچار تھا۔ میرے چاروں طرف مصائب کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا اور میں بالکل تن تنہا اس میں غوطہ زن تھا۔

کچھ دیر میں تارہ دوبارہ واپس آگئی۔ وہ سرتاپا التفات بنی ہوئی تھی۔ خوبصورت شب خوابی کے لباس نے اس کی رعنائیوں میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ وہ مسکراتی ہوئی میرے نزدیک آگئی اور اس کے ساتھ ہی خوشبو کے ایک جھونکے نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ "مجھے ذرا دیر ہو گئی۔" وہ بے تکلفی سے اور اپنائیت سے بیڈ پر میرے قدموں کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی: "ببلی ذرا بے آرام ہو رہا تھا۔ اُسے سُلانے میں مشکل ہوئی۔ آپ نے دیکھا ببلی کو....؟"

"ہاں ہاں۔" میں نے اپنے خیالات سے چونکتے ہوئے اسے دیکھا۔

"بالکل آپ کی شکل ہے۔ وہی رنگ۔ وہی ناک نقشہ۔ ہو بہو آپ کی تصویر ہے۔ جب آپ نہیں تھے تو میں ببلی کو دیکھ دیکھ کر آپ کو یاد کر لیا کرتی تھی۔" پھر وہ پیر سمیٹ کر میرے اور نزدیک کھسک آئی اور اس کے ہاتھوں کا دباؤ میں نے اپنی ٹانگوں پر محسوس کیا تو فوراً پیر کھینچ لیے۔ وہ بے اختیار ہنس پڑی: "کیا ہوا۔ آپ تھکے ہوئے ہیں۔ آپ کے پیر دبا دیتی ہوں۔"

"نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے مختصر جواب دیا، لیکن میرا ذہن مجھے آنے والے واقعات سے خبردار کر رہا تھا۔

"لوٹی۔ کیا بات ہے؟" "تم اتنے بدلے ہوئے کیوں ہو؟ اتنے عرصے کے بعد ہم ملے ہیں اور تم دُور بھاگ رہے ہو۔ تم تو میرے بغیر ایک لمحہ بھی نہیں رہ سکتے تھے۔ اب تمہیں کیا ہو گیا ہے۔" اس نے اپنی شاخِ گل جیسی باہیں میرے گلے میں حائل کر دیں۔ "کیا ناراض ہو؟ میں نے کوئی غلطی کر دی ہے یا جانی سے خفا ہو گئے ہو؟ اگر کوئی قصور ہو گیا ہے تو مجھے سزا دے دو۔ مگر خدا کے لیے مجھ سے اس طرح نہ روٹھو۔" اس کی آواز بھرا گئی اور بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ میں تو اس کے قرب ہی سے پریشان تھا، اب اسے رونے پر آمادہ دیکھا تو اور گھبرا گیا۔ بچوں اور عورتوں کے آنسو مجھ سے دیکھے نہیں جاتے۔

"پلیز۔ رو مت تارہ۔" میں نے ہمدردی سے کہا۔

اس نے روٹھ کر دوسری طرف کروٹ بدل لی اور سسکیاں لینے لگی۔ ایک محبت کرنے والے اور مدت سے بچھڑے ہوئے شوہر کو ایسے موقعے پر کیا کرنا چاہیے؟ ظاہر ہے کہ اسے بھرپور محبت کا اظہار کرتے ہوئے بیوی کو پیار سے منانے کی کوشش کرنی چاہیے، لیکن میرا ضمیر مجھے اس کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔ یہ مانا کہ تارہ ایک مجسم رعنائی اور انتہائی پُرکشش عورت تھی۔ وہ ایک ایسی دلکش عورت تھی جسے دیکھ کر جذبات پر قابو پانا مشکل تھا، لیکن وہ کسی اور شخص کی بیوی تھی۔ یکایک ایک اور خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں کوند گیا: تارہ ایک ایسے شخص کی بیوی تھی جو مجھے زبردستی میرے گھر سے بے دخل کر کے میری ہر چیز کا مالک بن بیٹھا تھا کیا اس کے ضمیر اور اخلاق نے بھی اسے کسی ضابطۂ اخلاق کا پابند کیا ہو گا؟" یہ خیال ایک شیطانی وسوسے کی طرح میرے دماغ میں داخل ہوا اور میرے جذبات میں ہلچل مچا دی۔ میں نے ایک نظر اپنے اُس دُشمن کی بیوی کو دیکھا جس نے میرا سب کچھ چھین لیا تھا۔ وہ کروٹ لے کر میری طرف سے منہ موڑے ہوئے لیٹی تھی۔ ہلکی ہلکی سسکیوں سے اس کے جسم میں مدوجزر کی کیفیت پیدا ہو رہی تھی اور اس کا یہ انداز بھی دلفریب اور ترغیب انگیز تھا۔ میرے دل میں اَفعی کی طرح پھن اُٹھا کر بیٹھے ہوئے جذبۂ انتقام نے سر اُٹھایا اور نفرت و انتقام کی ایک زہریلی لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔ میں نے تارہ کی طرف ہاتھ بڑھایا، لیکن اسی وقت رات کے سناٹے میں برقی گھنٹی کی تیز آواز گونجی جس نے نہ صرف مجھے چونکا دیا بلکہ تارہ بھی یکایک چونک کر کھڑی ہو گئی۔ باہر کوئی گھنٹی پر مسلسل انگلی رکھے اسے بجا رہا تھا۔ ہم دونوں سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔

"اتنی رات گئے یہ کون آگیا؟" تارہ نے جیسے خود اپنے آپ سے سوال کیا۔

"جانی کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"شاید وہ گھر میں نہیں ہے ورنہ اب تک دروازہ کھول دیتا۔ میں جا کر دیکھتی ہوں۔" وہ دروازے کی طرف بڑھی لیکن میں نے اسے روک دیا: "ٹھہرو۔ میں جا کر دیکھتا ہوں۔"

میں ڈرائنگ روم سے گزر کر دروازے تک پہنچا مگر اس دوران میں گھنٹی کی آواز مسلسل گونجتی رہی۔ رات کے پُرسکون ماحول میں یہ آواز انتہائی ناگوار معلوم ہو رہی تھی۔ میں نے جھٹکے سے دروازہ کھولا۔ میرے سامنے ایک لمبا تڑنگا بڑی بڑی مونچھوں والا درمیانی عمر کا شخص کھڑا تھا جس کی ایک انگلی برقی گھنٹی کے بٹن پر رکھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھنے کے بعد بھی اس نے بٹن سے انگلی نہیں ہٹائی۔ اس کی نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور وہ انتہائی نفرت بھرے، خونخوار انداز میں مجھے گھور رہا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی چمکدار آنکھیں کسی ایسے درندے کی طرح چمک رہی تھیں جو اپنے شکار پر گھات لگا کر بیٹھا ہوا اور کسی وقت بھی حملہ آور ہو جائے۔

"کیا بات ہے؟" میں نے دھیمی آواز میں پوچھا: "اتنا شور کیوں مچا رہے ہو؟"

اس نے بٹن پر سے اپنی انگلی ہٹالی اور برآمدے کی دیوار سے ایک ہاتھ کی ہتھیلی ٹیک کر کھڑا ہو گیا۔ چند لمحے خاموش رہی — "کون ہو تم؟" میں نے بیزاری سے پوچھا: "کیا چاہتے ہو؟" اس کے چہرے پر ایک حقارت آمیز تاثر ابھرا اور

جب وہ بولا تو اُس کی بھاری آواز کسی جنگلی درندے کی غرّاہٹ کے مانند تھی۔

"مَیں کون ہوں؟ تم مجھے نہیں جانتے؟" پھر اس نے انگوٹھے سے پیچھے کی جانب اشارہ کیا اور بولا: "شاید تم اس کو بھی نہیں جانتے۔" اس کی آواز سُن کر ایک سایہ نیم تاریکی میں آگے بڑھا اور قریب آنے پر مَیں نے دیکھا کہ وہ ایک نوجوان لڑکی تھی۔ جو جینز اور چست سُرخ جرسی پہنے ہُوئے تھی۔ اس کے ترشے ہوئے بال شانوں پر بکھرے ہُوئے تھے۔ اس کے خوبصورت چہرے پر شکایت آمیز اُداسی تھی۔ وہ ہولے ہولے قدم اُٹھاتی ہُوئی تاریکی میں سے نکل کر روشنی میں آکر کھڑی ہو گئی۔ اسکی نظریں ایک بار میرے چہرے کی طرف اُٹھیں اور پھر جھک گئیں۔

"کہہ دو کہ تم اسے بھی نہیں جانتے؟" وہ شخص پھر غرّایا۔

اس اثنا میں میرے پیچھے آہٹ ہوئی۔ مَیں نے پلٹ کر دیکھا تو تارہ اپنے بیڈروم سے نکل کر ڈرائنگ روم میں آگئی تھی۔ نوواردمرد اور عورت کو دیکھ کر اس کے چہرے پر ناراضگی کے تاثرات پیدا ہُوئے اور وہ نفرت بھرے لہجے میں بولی: "چارلی۔ تم یہاں کیوں آئے ہو؟ تمہیں یہاں آنے کی جرأت کیسے ہُوئی؟" پھر اُس نے لڑکی کو دیکھا تو اس کے چہرے کے خطوط اور زیادہ کرخت ہو گئے: "اس کو یہاں کیوں لے کر آئے ہو؟"

"تارہ تم چپ رہو۔ یہ مردانہ باتیں ہیں۔ تمہیں ان میں دخل دینے کی ضرورت نہیں ہے:" اس نے تارہ کی طرف دیکھے بغیر کہا اور پھر مجھ سے مخاطب ہُوا: "تو تُم اب بھی پہچانتے نہیں تو تعارف کرادوں؟ یہ میری بہن نجی ہے جسے تم نے محبت اور شادی کا جھانسا دیا تھا۔ اب تم یہاں چھُپ کر بیٹھے ہو اور وہ ساری دُنیا میں تمہیں تلاش کر رہی ہے۔"

مَیں نے حیرانی سے نجی کی طرف دیکھا وہ ایک رعنا عورت تھی۔ اس نے بھی اپنی اُداس آنکھیں اُوپر اُٹھا کر ایک بار میری طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔ مَیں نے اس عورت کو زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔

"کہو۔ اب تو پہچان گئے نا؟" چارلی نے طنزیہ انداز میں پوچھا: "تم اسے پہچانو یا نہ پہچانو۔ ہم تمہیں پہچان گئے ہیں تمہیں اس سے شادی کرنی ہو گی۔ ابھی اور اسی وقت۔ مَیں تمہیں لینے آیا ہوں۔ کوئی بہانہ نہیں سنوں گا۔"

"بکواس بند کرو اور یہاں سے چلے جاؤ۔ اگر جانی آگیا تو تمہاری لاش ہی واپس جائے گی یہاں سے؟" تارہ نے غصّے میں کہا۔

"یہ تو اُس کے آنے کے بعد ہی پتہ چلے گا کہ لاش کس کی جائے گی، لیکن بہتر ہے کہ تم درمیان میں دخل نہ دو۔" پھر وہ میری طرف دیکھ کر غصیلی آواز میں بولا: "تم مجھ سے بات کرو گے یا عورتوں کے سکرٹ کے پیچھے چھُپ کر بیٹھو گے؟"

اب اس شخص کی بدتمیزی پر مجھے غصّہ آنے لگا تھا۔ پھر بھی مَیں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی: "تمیز سے بات کرو اور بہتر ہے کہ اس وقت یہاں سے چلے جاؤ۔"

"مَیں تمہیں اپنے ساتھ لیے بغیر نہیں جاؤں گا۔ اگر تم رضامند ہو گے تو مَیں زبردستی لے جاؤں گا۔ زندہ نہیں چلو گے تو مَیں تمہاری لاش اُٹھا کر لے جاؤں گا۔"

تارہ تیزی سے لپک کر آگے بڑھی اور اس نے ایک طمانچہ چارلی کے مُنہ پر رسید کر دیا: "تم اپنی اوقات بھول گئے ہو۔ نکل جاؤ میرے گھر سے۔"

چارلی نے تارہ کی طرف نگاہ اُٹھا کر دیکھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ وہ ایک قدم بڑھ کر میرے نزدیک آگیا "بولو۔۔۔ کیا جواب ہے تمہارا؟"

"تارہ نے تم سے جو کچھ کہا ہے وہ کافی ہے۔" مَیں نے درشت لہجے میں کہا، لیکن میرا جملہ پورا ہونے سے پہلے اس کا بھرپور گھونسہ میرے پیٹ پر پڑا اور مَیں درد سے دوہرا ہو گیا۔ اس کا دوسرا گھونسہ میرے جبڑے پر لگا اور مَیں لڑکھڑا کر پیچھے دیوار سے ٹکرا گیا۔ وہ ایک جاندار اور طاقت ور شخص تھا اور اُس کے گھونسوں میں فولادی قوت تھی۔

"اب کیا جواب ہے تمہارا؟" اس نے دانت پیس کر مجھ سے سوال کیا۔

مَیں نے ایک لمبی سانس لے کر اپنے پیٹ کے درد کو کم کرنے کی کوشش کی اور دیوار سے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

"خود چلو گے یا تمہیں لے جانا پڑے گا؟" وہ گھُور کر بولا۔

"چارلی۔ مَیں جو کچھ تمہیں بتاؤں گا اس وقت تم اس پر یقین نہیں کرو گے۔ اس لیے بہتر ہے کہ اس وقت چلے جاؤ۔ مَیں تم سے پھر کسی وقت بات کر لوں گا۔"

"مَیں تمہیں ساتھ لیے بغیر نہیں جاؤں گا۔" وہ فیصلہ کن انداز میں بولا: "اس آوارہ لڑکی نے تمہیں اپنے جال میں پھنسا لیا ہے۔ مگر مَیں تمہیں نجی کی حق تلفی کرنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ چلو میرے ساتھ۔" وہ گھونسہ تان کر میری طرف بڑھا۔ لیکن اس بار مَیں تیار تھا۔ اس نے لپک کر میرے چہرے پر گھونسہ رسید کیا، لیکن مَیں نے سر نیچا کر لیا اور اس کا گھونسہ پوری قوت سے دیوار پر جا لگا۔ ایک دھماکے کی آواز سنائی دی اور اس نے درد سے اپنا ہاتھ تھام لیا۔

مَیں ہٹ کر کچھ دُور چلا گیا اور خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ بلا کا پھُرتیلا شخص تھا۔ بجلی کی تیزی سے پلٹ کر اس نے مجھ پر دوبارہ حملہ کیا لیکن مَیں نے اس کی کلائی کو اپنی کلائی پر روکا اور جواب میں اس کو پے در پے دو تین گھونسے رسید کر دیے۔ وہ ان سے متاثر ہُوئے بغیر تن کر کھڑا ہو گیا۔ دوسری بار جب اس نے مجھ پر حملہ کیا تو وہ جوڈو کراٹے کا داؤ تھا۔ مَیں اس کا وار روکنے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ میرا جوابی حملہ کھڑے ہاتھ کی ضرب کی صورت میں اس کے شانے پر لگا اور درد سے اسکی آہ نکل گئی، لیکن وہ ایک نئے عزم کے ساتھ دوبارہ مجھ پر حملہ آور ہوا۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ جوڈو کراٹے کے فن سے بخوبی واقف تھا اور اگر میری تربیت مکمل نہ ہوتی تو شاید وہ چند منٹ کے اندر مجھے زیر کر لیتا۔ ہم دونوں اب لڑتے ہُوئے برآمدے میں نکل آئے تھے اور ایک دوسرے پر تابڑ توڑ حملے کر رہے تھے۔ اس کے حملوں میں کچھ دیر تک انتہائی تیزی رہی لیکن رفتہ رفتہ اس کا جارحانہ انداز دھیما پڑنے لگا۔ مَیں نے نہ صرف اسکو تھکا دیا بلکہ ایسی چوٹیں بھی لگائی تھیں جن کی وجہ سے وہ لڑکھڑانے لگا تھا۔ یہ لڑائی زیادہ دیر تک جاری نہیں رہی۔ گردن کے پچھلے حصّے میں لگنے والی ضرب نے فیصلہ کن کردار ادا کیا اور وہ کھڑے قدے فرش پر گر گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ بے ہوش ہو چکا ہے اس لیے مَیں نے اپنا ہاتھ روک لیا۔

نجی اور تارہ اب تک خاموش لیکن تشویش اور تذبذب کے ساتھ یہ لڑائی دیکھ رہی تھیں۔ چارلی کے گرنے کے بعد چند لمحے خاموشی رہی اور پھر مجھے پھنکاریں سنائی دیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ مَیں اطمینان سے برآمدے کے ستون سے پُشت لگا کر کھڑا ہو گیا اور تماشہ دیکھنے لگا۔ پہلا حملہ تارہ نے کیا اور نجی کے بال پکڑ کر کھینچنے شروع کر دیئے اور وہ دونوں آپس میں گتھم گتھا ہو گئیں۔ وہ جنگلی بلیوں کی طرح ایک دوسرے کو نوچ کھسوٹ رہی تھیں اور دانتوں سے بھی کام لے رہی تھیں۔ اونچی اونچی سانسوں کے سوا ان کے مُنہ سے کوئی اور آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ کار کی آواز نے مجھے چونک کر ڈرائیو وے کی طرف متوجہ کر دیا۔ جانی واپس آگیا تھا اور اپنی پک اپ سے باہر نکل رہا تھا۔ برآمدے میں یہ ہنگامہ برپا دیکھا تو وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ فرش پر پڑے ہوئے بے ہوش چارلی کو اور مصروف جنگ نجی کو دیکھنے کے بعد وہ غالباً ساری بات سمجھ گیا۔ اس نے نفرت سے چارلی کو ایک ٹھوکر لگائی اور پھر اس کو اُٹھا کر کچھ فاصلے پر کھڑی ایک اور پک اپ کی طرف چل پڑا۔ بے ہوش چارلی کو پک اپ میں ڈالنے کے بعد جانی واپس آیا اور دونوں لڑتی ہوئی لڑکیوں پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالتا ہُوا بے تعلقی سے گھر کے اندر چلا گیا۔ اس کا انداز بتاتا تھا کہ یہ سب اس کے لیے غیر متوقع اور انوکھا نہیں تھا۔ مَیں بھی ڈرائنگ روم میں چلا گیا جہاں جانی میز پر سے ایک بوتل اُٹھا کر گلاس میں اُنڈیل رہا تھا۔ اس نے نگاہ اُٹھا کر میری طرف دیکھا لیکن زبان سے کچھ نہیں کہا۔ اس نئے واقعے نے مجھے مزید پریشان کر دیا تھا۔ موقع غنیمت جان کر مَیں بیڈروم میں چلا گیا اور کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔ مَیں نے فوری طور

پر ایک فیصلہ کر لیا تھا اور اس پر بلا تاخیر عمل کرنا چاہتا تھا۔ میں نے جلدی جلدی سلیپنگ سوٹ اتار کر اپنا لباس پہنا اور بیڈروم کی پچھلی جانب لان میں کھلنے والے دروازے سے باہر نکل گیا۔ یہاں صورتِ حال بے حد پیچیدہ اور پریشان کن ہوگئی تھی اور اس وقت جبکہ جانی اور تارہ کی توجہ دوسرے امور کی طرف منعطف ہوگئی تھی میں چاہتا تھا کہ موقع سے فائدہ اٹھا کر اس زندان سے بچ نکلنے کی صورت تلاش کروں۔ میں پچھلے لان میں نکلا تو خوشگوار تازہ ہوا نے میرا خیر مقدم کیا۔ لان کے پیچھے جنگل کا سلسلہ حدِ نگاہ تک پھیلا ہوا تھا۔ حالات نیم تاریک تھی۔ میں جنگل میں جا تو سکتا تھا لیکن اگر جانی میری تلاش میں آ جائے تو کیا میں اس کی پہنچ اور رسائی سے بھی دور ہو سکتا تھا؟

میرے کانوں نے دور سے ایک مانوس آواز سنی اور میں چونکنا ہو کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ ایک ہیلی کاپٹر کی آواز تھی۔ میری سماعت اس معاملے میں دھوکا نہیں کھا سکتی تھی۔ چند ہی لمحے بعد آواز اور واضح ہوگئی اور پھر میں نے مشرقی سمت سے نمودار ہونے والے ہیلی کاپٹر کو دیکھا جو تیزی سے اسی جانب آ رہا تھا۔ غیر ارادی طور پر میں نے بھاگ کر گھنے جنگل میں پناہ لینا مناسب سمجھا لیکن میری نظریں ہیلی کاپٹر کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ جانی کے بنگلے کے سامنے کھلے میدان کے اوپر پہنچ کر ہیلی کاپٹر چند ساعتوں کے لیے فضا میں معلق رہا اور پھر اسی کھلے میدان میں اتر گیا۔ اس کے پنکھے چلتے رہے۔ چند لوگ اس کے اندر سے کود کر تیزی سے باہر نکلے۔ وہ دیو ہیکل لوگ تھے اور ان کے ہاتھوں میں خودکار مشین گنیں تھیں ان کا رخ بنگلے کی جانب تھا۔ انہوں نے چیخ کر بلند آواز میں پکار کر کہا "جانی۔ لوٹی کو فوراً ہمارے حوالے کر دو۔"

جواب میں کچھ دیر خاموشی رہی اور پھر میں نے بنگلے کی طرف سے پے در پے فائرنگ کی آوازیں سنیں۔ جواب میں آنے والوں نے مشین گنوں کے فائر کھول دیے۔ پھر میں نے ایک شخص کو جیب میں ہاتھ ڈال کر کوئی چیز نکالتے ہوئے دیکھا جو اس نے بنگلے کی طرف اچھال دی۔ ایک دھماکہ ہوا اور شعلے بلند ہونے لگے۔ یہ دستی بم کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا؟ جواب میں بنگلے کی طرف سے چیخ و پکار اور فائرنگ کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔

میں نے بلا توقف جنگل میں مخالف سمت میں بھاگنا شروع کر دیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون لوگ تھے مگر مجھے یہ پتہ چل گیا تھا کہ وہ لوٹی کی، دوسرے لفظوں میں میری ہی کھوج میں تھے۔ بنگلے میں موجود لوگوں میں سے کوئی میرا دوست اور ہمدرد نہ تھا۔ اگرچہ تارہ اور اس کے بچے کے بارے میں سوچ کر میں ایک لمحے کے لیے اداس اور فکرمند ہوگیا تھا۔ لیکن میں جو ایک نہتا، بے سہارا اور بالکل تنہا شخص تھا میرے لیے اس کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا کہ ان سب جرائم پیشہ لوگوں سے جتنی جلدی ممکن ہو زیادہ سے زیادہ دور ہو جاؤں۔ میں نے اندھا دھند تیزی سے جنگل میں بھاگنا شروع کر دیا۔ فائرنگ، چیخ و پکار اور دھماکوں کی آوازیں رفتہ رفتہ مجھ سے دور ہونے لگیں۔ نہ جانے میں کتنی دیر تک دیوانہ وار تیز رفتاری سے دوڑتا رہا یہاں تک کہ ایک آواز نے مجھے رکنے پر مجبور کر دیا۔ یہ ایک سایہ تھا جو کچھ فاصلے پر میرے سامنے کھڑا تھا۔

"کون ہو تم؟" ایک کرخت مردانہ آواز میرے کانوں میں آئی "رک جاؤ۔"

میرے قدم بے اختیار رک گئے اور میں اپنے آپ کو اس نئی آفت کا سامنا کرنے کے لیے تیار کرنے لگا۔

میرے نہ جانے کتنی دور سے بے تحاشہ بھاگتا ہوا آ رہا تھا۔ ذہن میں بے شمار سوالات اور ان گنت مسائل تھے، لیکن فی الوقت مجھے اپنی زندگی بچانے کی فکر تھی اس لیے میری تمام تر توجہ جانی اور اس کے بنگلے سے بہت دور چلے جانے پر مرکوز تھی۔ اتنے دور جہاں میرے کانوں تک گولیوں اور دھماکوں کی آوازیں بھی نہ پہنچ سکیں اور نہ ہی جو لوگ میری کھوج میں جانی کے گھر تک پہنچ گئے تھے انہیں میرے بارے

میں کچھ علم ہو سکے۔ میری سانس پھولی ہوئی تھی اور ذہن چکرا رہا تھا۔ میں خالی الذہن ہو کر بھاگتا چلا جا رہا تھا، لیکن یکلخت اس آواز نے مجھے رکنے پر مجبور کر دیا۔ چند لمحے میری آنکھوں کے سامنے دھند سی چھائی رہی۔ ذہن میں کوئی خیال نہ آیا، لیکن یہ محض چند ساعتوں کی بات تھی۔ قدرت نے انسانی ذہن کو دنیا کا بہترین کمپیوٹر بنایا ہے اور اس کے سوچنے اور عمل کرنے کی رفتار غالباً دنیا کی ہر مشین سے زیادہ تیز ہے چنانچہ چند لمحے بعد میں دیکھنے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتوں سے بہرہ ور ہو چکا تھا۔ ایک دراز قد، دبلا پتلا مگر مضبوط، درمیانی عمر کا آدمی ہاتھ میں ڈنڈا تھامے ہوئے میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی بڑی بڑی نوک دار مونچھیں تھیں اور داڑھی بھی بڑھی ہوئی تھی۔ وہ سانولے رنگ کا ایک قبول صورت آدمی تھا، لیکن بوسیدہ لباس اور بکھرے ہوئے گرد آلود بالوں اور داڑھی کی وجہ سے وہ غریب اور معمولی آدمی نظر آ رہا تھا جس پر دوبارہ نگاہ ڈالنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی میں اسے کسی اور موقعے پر کہیں اور دیکھتا تو شاید نظر انداز کر دیتا، لیکن اس وقت وہ میری نگاہوں کا مرکز بن چکا تھا۔ ہمارے آس پاس گھنا جنگل تھا جس کے درمیان میں صرف ایک ہی ذی روح مجھے نظر آیا تھا اور وہ بھی بالکل اچانک اور خلافِ توقع۔ پھر میں جن حالات سے دوچار ہو چکا تھا اور جن سے فرار حاصل کرنے کے لیے بھاگا تھا ان کے پیشِ نظر یہ خیال بہت اہم تھا کہ کہیں میں دوبارہ ان ہی لوگوں کے چنگل میں تو نہیں پھنس جاؤں گا۔ یہی وجہ ہے کہ رکتے رکتے بھی میں نے اپنے بدن کو آنے والے خطرات کے لیے تیار کر لیا تھا۔ میں مداخلت اور مزاحمت کے لیے پوری طرح مستعد اور چوکس تھا۔

وہ شخص گہری نظروں سے میرا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں سر سے پیر تک میرے جسم پر رینگ رہی تھیں۔ اس نے اپنی ڈانگ نما لکڑی کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں لیا اور دوبارہ سوال کیا۔

"تم کون ہو اوئے؟ ادھر کیا کر رہے ہو اس وقت؟"

میں اب ذہنی اور جسمانی طور پر پوری طرح تیار ہو چکا تھا۔

"مسافر ہوں۔" میں نے کہا۔ "جنگل میں راستہ بھول گیا ہوں۔"

وہ ایک لمحہ مجھے گھورتا رہا۔ اس وقت میں جنگل میں جس مقام پر تھا وہاں فائرنگ یا دھماکوں کی کوئی آواز نہیں پہنچ رہی تھی۔ یا تو فائرنگ کا سلسلہ ختم ہو چکا تھا یا پھر میں اس جگہ سے اتنی دور نکل آیا تھا کہ وہ آوازیں بالکل معدوم ہو چکی تھیں۔ یہ میں نے اس پر چھوڑ دیا تھا کہ اگلا سوال وہ فائرنگ کے بارے میں پوچھتا ہے یا کہ نہیں۔

"تم تو مجھے چور ڈاکو لگتے ہو اوئے۔" وہ بدتمیزی سے بولا۔ "کس کو مار کر بھاگے ہو؟ ابھی فائرنگ کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ تمہارے دوسرے ساتھی کہاں ہیں؟"

"فائرنگ کی آوازیں تو میں نے بھی سنی تھیں جی۔" میں نے جلدی سے بات بنائی۔ "اس لیے تو میں اور زیادہ ڈر گیا۔ میں ادھر پردیسی اور اجنبی ہوں جی۔ راستے سے بھٹک گیا ہوں۔ اس علاقے میں کسی کو جانتا بھی نہیں۔ سوچا کہیں بے موت نہ مارا جاؤں۔ اس لیے بھاگ کر آ گیا ہوں جی۔"

میری گھبراہٹ اور پریشان حالی میرے بیان کا ثبوت تھی۔ شاید اسی لیے اس نے مجھ پر یقین کر لیا مگر اسکی نگاہوں میں تھوڑی سی بے اعتمادی پھر بھی جھلک رہی تھی۔

"دیکھئے جی۔ اگر ڈاکو یا ان کا ساتھی ہوتا تو وہاں سے بھاگ کر کیوں آتا؟ اور پھر میرے ہاتھ میں بندوق تو کیا چاقو چھری بھی نہیں ہے۔ یہ دیکھو۔" میں نے اپنے دونوں ہاتھ اسے دکھائے۔

"ٹھیک ہے۔" وہ مطمئن ہو کر بولا۔ "اب کہاں جاؤ گے؟"

"میں کیا بتاؤں جی۔ کچھ پتہ ہو تو بتاؤں؟ رات کے اندھیرے میں تو جانے پہچانے راستے بھی یاد نہیں رہتے

عشقِ مجازی، عشقِ حقیقی میں کیسے بدلتا ہے!

علیم الحق حقی کے قلم سے گزشتہ صدی کی عظیم ترین کہانی

ناشر: علی میاں پبلی کیشنز

20 عزیز مارکیٹ اُردو بازار لاہور۔فون: 7247414

اتنی رات گئے میں کہاں کہاں بھٹکوں گا جی ؟ رات کو کہیں ٹھہرنے کا ٹھکانہ مل جائے تو بڑی مہربانی ہوگی جی۔ پھر وسد رکھیے۔ صبح ہوتے ہی چلا جاؤں گا۔"

"ہوں"۔ وہ اپنی نوکدار مونچھوں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے سوچنے لگا۔ "ٹھیک ہے۔ میرے ساتھ ساتھ آجاؤ۔" اس کا لہجہ خاصا اکھڑ تھا۔ وہ کوئی اَن پڑھ اور اُجڈ دیہاتی معلوم ہوتا تھا۔ میں اس کے ساتھ چل پڑا۔

"یہ کون سی جگہ ہے جی ؟ اور آپ اس جنگل میں کیا کرتے ہو؟" میں نے بات کا سلسلہ شروع کیا۔

"یہ چھنگ کا جنگل ہے اِدھر ڈاک بنگلے کا چوکیدار ہوں میں۔"

"اس جنگل میں بھی ڈاک بنگلہ ہے ؟ یہاں کون آتا ہوگا ؟"

"بیوقوفی کی باتیں مت کرو اوئے۔" وہ جھڑک کر بولا۔

"ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے۔ بہت خوبصورت جگہ ہے یہ۔ صاحب لوگ اور ان کے مہمان سیر اور آرام کرنے کے لیئے یہاں آتے ہیں۔"

"آتے ہوں گے جی۔" میں نے کہا۔ "بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ہوتی ہیں۔ مجھ سے کوئی کہے تو کبھی اس جنگل میں نہ آؤں۔"

وہ ہنس پڑا۔ "بیوقوف نہیں تو۔ ارے تجھے کیا پتہ یہاں کی دُنیا کیسی ہے۔ یہ بڑی اعلیٰ جگہ ہے اوئے۔ بڑی اعلیٰ۔" وہ خود ہی اس اعلیٰ جگہ کی عمدگی سے لُطف اندوز ہوتا ہوا نظر آرہا تھا۔ "پر یہ بتاؤ تم ہو کون ؟ جانا کہاں ہے تمہیں ؟"

میں اس سوال کے لیے تیار نہیں تھا مگر خاموشی بھی مناسب نہ تھی۔ "میں ایک چھوٹا موٹا دکاندار ہوں جی۔ اپنی بیوی کی تلاش میں نکلا ہوں۔"

"بیوی کی تلاش میں۔" وہ حیران ہو کر بولا۔ "کہاں گم ہو گئی تیری بیوی ؟"

"گم نہیں ہوئی جی۔ اس پر کسی نے قبضہ کر لیا ہے۔"

وہ چلتے چلتے یکدم رُک گیا اور بغور مجھے دیکھنے لگا۔ "آدمی تو تم ٹھیک ٹھاک لگتے ہو۔ ہاتھ پاؤں بھی مضبوط لگتے ہیں۔ پھر بیوی پر کسی نے قبضہ کیسے کر لیا اوئے ؟"

"یہ بڑی لمبی کہانی ہے۔ کہیں گے تو پھر کبھی سنا دوں گا۔ بہت تھک گیا ہوں۔ اگر ایک گلاس چائے اور آرام کرنے کو ٹھکانہ مل جائے تو میری جان میں جان آجائے گی۔"

"ٹھیک ہے پہلوان۔" وہ ہنسا۔ "چائے اور ٹھکانہ بھی مل جائے گا۔ پھر تمہاری کہانی سنیں گے۔ پر ایک بات تو بتاؤ۔ بیوی پر کسی نے زبردستی قبضہ کر لیا ہے یا وہ خود ہی چلی گئی ؟"

"اس میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔" میں نے احوال واقعی بیان کر دیا۔ "بس جی۔ وہ نرغے میں آگئی ہے دشمنوں کے۔"

"اللہ رحم کرے۔" وہ متاثر ہو کر بولا۔ پھر سامنے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ میری جھونپڑی ہے۔ اس کے پاس ہی ڈاک بنگلہ ہے۔" بظاہر اس گھنے اور ویران جنگل میں کسی آبادی کا امکان تک نہیں تھا لیکن دُور سے ہلکی ہلکی قندیلیں جھلملاتی ہوئی نظر آرہی تھیں اور پتہ چلتا تھا کہ وہاں کوئی آبادی ہے۔ "یہ بڑا تماشہ ہے ڈاک بنگلہ ہے پہلوان۔" وہ مسکرایا۔

"کیا ؟"

"اوئے سمجھا کرو۔ بڑے لوگوں نے تماش بینی کا اڈا بنا رکھا ہے۔ ویسے کوئی اور کام نہیں ہوتا ادھر۔"

"یہ کس محکمے کا ہے ؟" میں نے پوچھا۔

"ارے پڑھے لکھے کا نہیں ہے۔ بڑے لوگوں نے تفریح اور آرام کے لیے بنایا ہے۔ ڈاک بنگلہ تو بس یوں ہی نام رکھ دیا ہے اس کا۔ بڑے لوگ انسانوں اور جانوروں کی طرح گھروں کے بھی نام رکھ لیتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی نام تو رکھنا ہی تھا اس کا۔"

روشنیاں اب ہمارے نزدیک آ گئی تھیں ۔۔ ایک پگڈنڈی سے گزر کر ہم دائیں جانب مڑے تو چند گز کے فاصلے پر ایک کچا سا مکان نظر آیا جو چوکیدار کے بقول اُس کا جھونپڑا تھا۔

"یہی ہے تمہارا گھر؟" میں نے پوچھا۔

"گھر کہاں ہے۔ بس سر چھپانے کی جگہ ہے۔ شہر سے دُور ہیں مگر بہت سے جھگڑوں سے بھی دُور ہیں۔"

"ہر جگہ کے الگ الگ جھگڑے ہوتے ہیں بھائی۔ شہر کے اور ہوتے ہیں۔ دیہات کے اور ہوتے ہیں۔ مشکل تو ہر جگہ ہوتی ہے۔"

"پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہو۔" وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔ "اللہ بچائے ان پڑھے لکھوں سے۔"

اتنی دیر میں ہم جھونپڑی کے سامنے پہنچ گئے تھے۔ یہ دراصل دو کمروں کا ایک چھوٹا سا کچا مکان تھا۔ کمروں کے سامنے ایک چھوٹا سا دالان اور صحن بھی تھا۔ لکڑی کے دروازے پر جا کر چوکیدار نے ڈنڈا مار کر اپنے آنے کی اطلاع دی اور دروازہ کسی آواز کے بغیر کھل گیا۔ سامنے ایک کشیدہ قامت۔ متناسب اعضا عورت کھڑی تھی جسکی عمر ۲۵۔۲۶ سال کے لگ بھگ ہوگی۔ اس کے سیاہ بالوں کی دو موٹی موٹی چوٹیاں اس کے سینے پر پڑی ہوئی تھیں۔ سر پر ایک ہلکے رنگ کی چادر تھی۔ وہ اسی ہلکے نیلے رنگ کا کرتہ اور لاچا پہنے ہوئی تھی۔ چوکیدار کو دیکھ کر اس کے چہرے پر ایک محبت بھری مسکراہٹ دوڑ گئی۔ "ارے جیرے آج اتنی جلدی واپس آ گیا۔؟"

پھر اس کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ سمٹ کر رہ گئی۔ اس نے چادر کو اپنے شانوں پر سمیٹا اور اپنی بڑی بڑی کاجل بھری سیاہ آنکھیں پٹ پٹا کر میرا جائزہ لینے لگی۔ شہر کی کوئی لڑکی ہوتی تو شرما کر نظریں جھکا کر کھڑی ہو جاتی۔ یہی فرق ہے شہر اور دیہات کی لڑکیوں میں۔

"چل چل تو اندر جا کر گڑ کی چائے بنا کر لا جلدی سے۔ یہ پردیسی ہے۔ راستہ بھول گیا ہے۔ رات کو ہمارے گھر ہی رہے گا۔"

لڑکی دروازے سے ہٹ کر کھڑی ہو گئی اور میں جیرے کے پیچھے پیچھے صحن میں داخل ہو گیا۔ لڑکی تیزی سے چلتی ہوئی برآمدے کی طرف چلی گئی جہاں ایک کونے میں چولھا بنا ہوا تھا۔ یہ ان کا باورچی خانہ تھا۔

"ہم اندر بیٹھے ہیں۔ ذرا جلدی کر جلدی۔ نہ جانے کب بلاوا آ جائے۔" جیرے نے کندھے پر لٹکے ہوئے رومال کو زور سے جھٹکا اور مجھے اشارہ کرتے ہوئے سامنے والے کمرے میں داخل ہو گیا۔ کمرہ درمیانی سائز کا تھا۔ ایک طرف دو پلنگ بچھے ہوئے تھے جن پر رنگین چادریں پڑی ہوئی تھیں۔ دیوار پر کھونٹیوں میں کپڑے لٹکے ہوئے تھے۔ ایک طرف بغیر پٹ والی الماری میں کچھ پیتل اور ایلومینیم کے برتن رکھے تھے۔ کمرے میں ایک بڑا سا لکڑی کا اور ایک ٹین کا صندوق بھی تھا جن پر کپڑوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔

"لو کمر سیدھی کر لو اوئے" جیرے نے ایک چارپائی پر دراز ہوتے ہوئے مجھے دعوت دی۔ میں دوسری چارپائی پر نیم دراز ہو گیا۔

"تم یہاں گھر والی کے ساتھ اکیلے رہتے؟" میں نے باتوں کا سلسلہ جاری رکھنے کی غرض سے پوچھا۔

"گھر والی؟!" وہ چونک کر اٹھ بیٹھا۔ ایک لمحہ مجھے گھورتا رہا۔ پھر دوبارہ لیٹتے ہوئے کہنے لگا۔ "ٹھیک ہے گھر والی ہی سمجھ لو۔ ہم دونوں یہاں اکیلے ہی رہتے ہیں۔"

میں اس کے جواب سے شش و پنج میں پڑ گیا تھا۔ گویا یہ تیکھے نقوش والی سانولی سلونی لڑکی اسکی بیوی نہیں تھی۔ تو پھر وہ کون تھی؟ اور اس کے ساتھ کیوں رہتی تھی؟

اس نے شاید میرے چہرے پر لکھے ہوئے سوالوں کو پڑھ لیا۔ زور سے قہقہہ مار کر ہنسا اور بولا۔ "اوئے۔ تمہارا نام کیا ہے اوئے؟"

میں نے بلا جھجک کہا "بشیر۔"

"سنو بشیرے۔ اب تم میرے گھر میں آ گئے ہو تو سمجھو بیلی ہو گئے ہو میرے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا دوستی اور رشتہ ہو سکتا ہے؟ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

"بالکل۔ جو اس کا نام جالاں ہے۔ اس لڑکی کا جسے ابھی تم نے دیکھا ہے۔"

"اچھا" میں نے مختصراً جواب دیا۔

"یہ میری کوئی بھی نہیں لگتی ہے۔ پر بہت کچھ لگتی بھی ہے۔"

"اچھا؟" میں نے پھر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

میری بے اعتنائی اور لاپروائی اسے پسند نہیں آئی بے چینی سے اُٹھ کر پھر سمٹ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ "کیوں! کیسی لڑکی ہے؟" اس نے اچانک سوال کیا۔

میں نے بوکھلا کر اسے دیکھا۔

"اوئے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے کہ اچھی خوب صورت لڑکی ہے نا؟"

"ہاں ہے تو خوبصورت۔"

"بس یہی اس کی مشکل ہے۔" وہ ہاتھ پر ہاتھ مار کر بولا۔ میں نے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔ لیکن اب جیرے کے لیے چپ رہنا مشکل تھا۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا اور پھر دبی آواز میں کہنے لگا: "یہ کسی قصبے کی رہنے والی ہے۔ چار جماعت پڑھی بھی ہے۔ گھرداری۔ سینا پرونا بھی جانتی ہے۔"

"اچھا۔" میں نے پھر سر ہلا دیا۔

"تم پوچھو گے۔ میرے گھر میں کیسے آ گئی؟"

"جی چاہے تو بتا دو۔"

وہ اُٹھ کر میری چارپائی پر آ گیا اور سرگوشی میں بولا۔ "بڑی عجیب کہانی ہے اس لڑکی کی۔ اس کے ماں باپ اس کی شادی ایک دولت مند بڈھے سے کرنا چاہتے تھے۔ پیسے لے کے۔ اس نے انکار کر دیا۔ انہوں نے مارا پیٹا اور زبردستی کی۔ نکاح سے پہلے یہ گھر سے بھاگ گئی۔"

"اچھا" میں نے لقمہ دیا۔

"اچھا اچھا کہے جاؤ گے اوئے۔ تمہیں کوئی ڈرامہ نہیں لگتا اس کہانی میں؟"

"ہاں۔ کہانی تو فلموں جیسی ہے۔"

"یہی تو میں کہتا ہوں اوئے۔ گھر سے بھاگی تو جانے کہاں کہاں ٹھوکریں کھاتی رہی۔ اکیلی عورت ذات ہو اور رنگ و روغن کی بھی اچھی ہو تو اسے عزت بچانی مشکل ہو جاتی ہے پر یہ بڑی دلیر اور ہمت والی لڑکی ہے۔ بڑے بڑے مگرمچھوں اور بھیڑیوں سے جان اور عزت بچا کر نکل ہے۔ کیوں ہے نا جان دار؟"

"ہاں۔ ہے تو۔ مگر۔۔۔۔"

"پہلے پوری بات تو سن لو اوئے۔" وہ اِدھر اُدھر دیکھ کر بولا۔ "پتہ ہے یہ داؤ پیچ بھی جانتی ہے۔ جوڈو کراٹے

دیکھا ہے کبھی فلموں میں ؟" "ہاں"

"یہ وہ بھی جانتی ہے۔ بڑی کاریگر لڑکی ہے۔ اسی لیے تو بھیڑیوں سے بچی ہوئی ہے اب تک۔ مجھے ڈاک بنگلے میں ملی تھی۔ ایک سیٹھ صاحب نوکری دلانے کا جھانسہ دے کر لے آئے تھے۔ بڑی زوردار محفل تھی۔ چار پانچ بندے دو تین زنانیاں۔ پر دوسری عورتیں اچھی نہیں تھیں۔ میں تو اسے بھی پہلے طوائف ہی سمجھا تھا۔ پر یہ تو نگینہ نکل اوئے۔"

"اچھا ؟ وہ کیسے ؟"

"پی پلا کر اُنہوں نے ناچ گانا شروع کیا تو یہ گھبرا گئی۔ کہتی تھی میں تو نوکری کے لیے آئی ہوں۔ یہ بے شرمی پسند نہیں ہے مجھے۔ پر وہ کہاں سننے والے تھے۔ جب زبردستی کی کوشش کی تو اس نے اُن سب کو وہ چھینٹی لگائی کہ زندگی بھر یاد کریں گے۔ بڑے بڑے بے عزت اور پتھر دل لوگ پڑے ہیں اس دُنیا میں۔ کیوں نا ؟"

"بالکل ٹھیک کہتے ہو۔" میں نے تائید کی۔

"ایک تو وہ سب نشے میں تھے اوپر سے یہ نہیں جانتے تھے کہ یہ لڑکی تو بلا ہے بلا۔ ٹارزن کی بیٹی بن کر اُن پر پل پڑی۔ سب کو اَدھیڑ کر رکھ دیا اِس شیر کی بچی نے۔ پھر وہاں سے بھاگی اور کہا کہ ابھی پولیس کو لے کر آتی ہوں۔ ارے اُس نے پولیس کو کہاں سے لانا تھا۔ پولیس تو اِدھر دس دس کوس تک نظر نہیں آتی۔ پر وہ نشے میں تھے ڈر کر بھاگ گئے۔ وہ تو اُن طوائفوں کو بھی چھوڑ کے جا رہے تھے مگر میں نے اُنہیں گاڑیوں میں ڈال دیا۔ دیکھو نا۔ کیا میں نے یہاں ان کا اچار ڈالنا تھا اوئے ؟"

"ٹھیک کیا تم نے۔" میں نے سچے دل سے کہا۔

"یہ جنگل میں بھاگ گئی۔ مجھے پتہ تھا بھٹکتی رہے گی۔ بھوکی پیاسی مر جائے گی۔ یا کوئی جانور کھا لے گا۔ ڈھونڈتا ہُوا گیا اِس کے پیچھے۔ بڑی مشکل سے یقین دلایا کہ میں تیرا ہمدرد ہوں۔ یہ تو جنگلی ہرنی کی طرح بدک رہی تھی مگر پھر حالات دیکھے تو مان گئی۔ اُس دن سے اِدھر ہی رہتی ہے میرے ساتھ۔"

"ہوں۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"تم کچھ اور نہ سمجھ لینا اوئے۔ کوئی گڑبڑ والی بات نہیں ہے ہمارے بیچ میں۔ ایک بندہ اپنا پستول چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ وہ پستول ہر وقت اپنے پاس رکھتی ہے یہ شیرنی۔ اور میں بتاؤں۔ یہ تو پستول کے بغیر بھی نری بارود ہے۔ اس کے ماتھے لگ کر مرنا ہے کسی نے ؟"

وہ آپ ہی آپ کچھ سوچ کر مسکرایا۔

"تم نے شادی کیوں نہیں کر لی ۔ ؟"

"ارے وہ تو پٹھے پہ ہاتھ نہیں رکھنے دیتی۔ کہتی ہے چار جماعت پاس ہوں تو جاہل جٹ ہے۔ شادی کیسے ہو سکتی ہے جب تک پانچ جماعت نہیں پاس کرے گا شادی کا نام بھی مت لینا۔"

"اچھا۔ مگر اس طرح ہمارے ساتھ اسکا رہنا۔۔۔۔۔"

"اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ جان ہتھیلی پہ رکھ کر پھرتی ہے۔"

دروازے پر دستک ہوئی تو ہم دونوں سنبھل کر بیٹھ گئے۔ جالاں ہاتھ میں تھال لیے لچکتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی تو کمرہ اور روشن ہو گیا۔ تھال میں دو لوٹی سی پیالیاں تھیں اور ایک رکابی میں بیسن کی مکھن لگی روٹی ۔۔

"میں نے سوچا مہمان بھوکا ہو گا۔ اس لیے ایک روٹی بھی ڈال لائی۔"

"جواب نہیں ہے تیرا اوئے۔" جیرے نے خوش ہو کر نعرہ لگایا۔ جالاں نے تھال چارپائی پر رکھتے ہوئے اسے گھور کر دیکھا اور بولی۔

"بات کرنے کی تمیز تو سیکھو زنانیوں سے اس طرح تھانے داروں کی طرح نہیں بولا کرتے ۔"

جیرا کھسیانہ ہو کر ہنسا اور میری طرف دیکھ کر بولا۔ "دیکھا تم نے پوری ماسٹرنی ہے یہ تو۔ بڑے بڑوں کو پڑھا سکتی ہے۔"

"مگر تمہیں تو پڑھا نہیں سکی آج تک۔" وہ جل کر بولی۔ "الف کے نام ب بھی نہیں پڑھ سکتے ہو اور بنے پھرتے ہو چوکیدار ۔"

"ارے چوکیدار ہی تو ہوں کوئی حوالدار تو نہیں ہوں۔ چوکیدار کے لیے تعلیم کی کیا ضرورت ہے اوئے ؟" پھر بات بنانے کے لیے کہنے لگا۔ "پتہ ہے یہ اپنا مہمان پڑھا لکھا بھی ہے۔ کیوں بھئی۔ کتنی جماعت پاس ہو۔ ذرا بتاؤ تو اسے۔"

جالاں نے اپنی چمکدار سیاہ آنکھیں میرے چہرے پر جما دیں تو میں بوکھلا کر رہ گیا۔ "یہ سچ کہہ رہا ہے ؟"

"ہاں۔ تھوڑا بہت پڑھ لیا ہے میں نے۔"

"کتنی جماعت پاس ہو ؟"

"دس جماعت" میں نے قدرے جھجک کر مناسب جواب دیا۔ اس کی آنکھوں میں یکایک روشنی سی چمک گئی۔ "سچ !" وہ دونوں ہاتھ اپنی ٹھوڑی کے نیچے رکھ کر میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔ "پھر تو تم بابو ہو پورے۔" مجھے تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے اُس نے چائے کی کم لوٹی پیالی میری طرف بڑھا دی۔ "لو چائے پیو بابو اور یہ روٹی بھی کھاؤ اور مکھن لگا دوں اِس پر ؟"

"نہیں۔ میں نے کھانا کھا لیا ہے۔" "یہ بات بھی درست تھی۔" "تو پھر چائے پیو۔ دیکھو اور میٹھے کی ضرورت تو نہیں ہے۔"

میں نے ایک گھونٹ بھرا۔ خوب میٹھی اور گرم چائے تھی۔

"کیوں۔ کیسی ہے ؟" اس نے بے تابی سے پوچھا۔

"بہت اچھی۔"

"تو پھر ایک پیالی اور پی لے نا۔ میں نے اپنے حصے کی الگ رکھی ہے۔"

جیرے نے اپنی پیالی مُنہ سے لگا لی تھی۔ یہ فقرہ سُن کر اسے اُچھو ہوتے ہوتے رہ گیا۔ ہم دونوں کو اسکی موجودگی کا احساس پہلی بار ہوا ورنہ جالاں مجھ سے گفتگو کرنے میں اتنی کھوئی ہوئی تھی جیسے ہم دونوں کے سوا کمرے میں کوئی اور موجود ہی نہیں ہے۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔" جیرا ناراضی سے بولا۔ "تم دونوں پڑھے لکھے تعلیم یافتہ ہو۔ میرے جیسے اَن پڑھ کا یہاں کیا کام ؟" وہ بگڑ کر چائے کی پیالی سنبھال کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

"ارے نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ سنو تو یار۔" میں نے اُسے روکنے کی کوشش کی مگر جالاں کے چہرے پر کوئی پریشانی یا پشیمانی نظر نہیں آئی۔ شاید وہ اِس کے ایسے ردِ عمل کی عادی ہو چکی تھی۔

"پڑھے لکھوں کی تو ساری دنیا عزت کرتی ہے۔ میں نے اگر ان کی عزت کی تو کیا ہو گیا۔ تم بھی پانچ جماعت پڑھ لو۔ تمہاری بھی عزت ہو جائے گی۔ ارے انگوٹھا لگانے والا بھی کوئی انسان ہوتا ہے۔ جانور کے پنجے پر سیاہی لگا کر کسی کاغذ پر چھاپ لگا دو تو کیا دستخط ہو جائیں گے۔" اسکی آواز میں تیزی بھی تھی اور طنز بھی۔ تھی تو وہ معمولی تعلیم یافتہ مگر باتیں بہت عقل اور سلیقے کی کرتی تھی۔

"بیٹھ جاؤ جیرے۔ کوئی بات نہیں ہے۔ عورتوں کی کڑوی باتیں بھی برداشت کر لینی چاہیئں۔"

"ایک بات کہوں انصاف کی" جالاں کمر پہ ہاتھ رکھ کر بولی۔

"ہاں کہو۔"

"دیکھو بابو— بندہ تو یہ اَن پڑھ ہے پر برداشت اور شرافت بہت زیادہ ہے اس میں۔ آدمی نہیں فرشتہ ہے نیکی کا۔"

جیرا اپنی تعریف سُن کر انکساری سے ہنسنے لگا۔ "بس دو نخرے بول کے پگڑی اُچھال دیتی ہے اور جب چاہے دو فقروں سے خوش کر دیتی ہے یہی تو فائدہ ہے پڑھائی کا۔"

"تو پھر پڑھ لو تم بھی۔ یہی تو مَیں بھی کہتے کہتے تھک گئی ہوں۔" وہ بڑی ہمدردی اور لگاوٹ سے بولی۔

"پڑھنا ہی پڑے گا اب تو۔" وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔ "یہ روز روز کی بے عزّتی برداشت کرنا اپنے بس کی بات نہیں ہے۔"

"دیکھ لوں گی قول کے کتنے پکے ہو۔" وہ دلرُبائی سے مسکرائی اور کمرے سے رخصت ہو گئی۔

جیرا ہنسنے لگا۔ "دیکھ لیا تم نے اوئے۔ یہ جالاں کیا شئے ہے بھئی۔"

"بات سولہ آنے ٹھیک کہتی ہے۔"

"یہ بات تو پکّی ہے۔" وہ سر جھکا کر بولا۔

کچھ دیر تک ہم جالاں کی باتیں کرتے رہے۔ جیرے نے بتایا کہ شروع شروع میں تنہا گھر میں جالاں جیسی طرحدار اور نوجوان لڑکی کے ساتھ رات دن اکیلا رہنا بہت سوہانِ روح تھا۔ بڑی بڑی آزمائش سے گزرنا پڑتا تھا۔ ایک رات منہ زور جذبات کی شدت سے مجبور ہو کر وہ جالاں کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ بے خبر سوئی ہوئی تھی۔ مگر جیسے ہی جیرا اسکی چارپائی کے نزدیک پہنچا۔ اسکی آنکھ کھُل گئی۔ اس نے ایک چھلانگ لگائی اور دونوں لاتوں سے جیرے کے سینے پر ایسی ضرب لگائی کہ وہ اُلٹ کر قلابازی کھا گیا۔ اس پر بس نہیں کی۔ ہاتھوں اور ٹانگوں سے مار مار کر اس نے جیرے کا حلیہ بگاڑ دیا۔ اس کو تو بچاؤ کی مہلت بھی نہیں ملی۔ "ایسے اٹھا اٹھا کر پھینکا اُسے جیسے مزدور بوریاں پھینکتے ہیں ٹرک میں۔" اس نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ جب اس پر بھی جی نہیں بھرا تو سرہانے سے پستول نکال لائی اور گولی مارنے کی دھمکی دینے لگی۔ جیرے نے خوشامد کی۔ معافی مانگی ہاتھ جوڑے۔ آئندہ کبھی ایسی گستاخی نہ کرنے کی قسمیں کھائیں تب کہیں جا کر اس نے پستول ہٹایا مگر اپنا سامان پوٹلی میں باندھ کر رخصت ہونے کے لیے تیار ہو گئی، بلکہ گھر سے باہر نکل گئی۔ جیرا اسکی منتّیں کرتا ہُوا دو تین میل تک پیچھے گیا۔ مری ہوئی ماں کی قسمیں کھا کر یقین دلایا۔ خدا اور رسول کا واسطہ دیا تب کہیں جا کر جالاں اس کے ساتھ واپس لوٹی۔ وہ دن اور آج کا دن پھر کبھی جیرا نے اسے بُری نیت سے نہیں دیکھا۔

"پر ایک بات بتاؤں۔ چنگی بڑی لگتی ہے۔ اس سے شادی کرنے کو جی چاہتا ہے۔"

"تو پھر پانچ جماعت پاس کر لو۔"

"اوئے ربا۔ کس امتحان میں ڈال دیا ہے اس بندے کو؟" اُس نے آسمان کی طرف سر اُٹھا کر فریاد کی۔ "یہ بڑی مشکل شرط ہے۔ جیسے شہزادے کے لیے گُل بکاؤلی لانے کی شرط لگائی گئی تھی۔ وہ تو لے آیا تھا۔ پر مَیں نے پانچ جماعت مت پاس کی اوئے۔"

مجھے اسکی صاف گوئی۔ سادگی اور بے چارگی پر ہنسی آ گئی۔

مَیں نے پوچھا۔ "اس کے ماں باپ۔ بہن بھائی اور رشتہ داروں نے بھی اس کی خبر نہیں لی کبھی؟"

"رب جانے کہاں ہیں وہ۔ ڈھونڈتے پھر رہے ہوں گے۔ پر اُس کو تو ایسی نفرت ہو گئی ہے کہ کبھی نام بھی لو

تو کاٹنے کو پڑتی ہے۔ کسی رشتے دار کے بارے میں کچھ نہیں بتاتی۔"

"پر غیر اور جوان لڑکی کے ساتھ اکیلے رہنا ٹھیک بات تو نہیں ہے۔" مَیں نے کہا۔ "یہ تو مَیں بھی جانتا ہوں۔ پر کیا کروں کبھی اس کا خیال آتا ہے۔ انسانی بھیڑیوں کے اتنے بڑے جنگل میں کہاں رہے گی؟ کیا کرے گی؟ وہ تو اس کی بوٹیاں نوچ لیں گے۔ ساتھ رکھوں تو شادی پر رضامند نہیں ہوتی۔ سب یہی جانتے ہیں کہ میری گھر والی ہے پر کسی کو شک پڑ گیا تو بڑی آفت آ جائے گی اوئے۔" وہ پریشانی سے ڈاڑھی کھجانے لگا۔ "اور ایمان کی بات کہوں؟ مجھے بھلی بہت لگنے لگی ہے یہ بے ایمان۔ کیوں۔ خوبصورت ہے نا؟"

"ہے تو۔"

"اور پڑھی لکھی بھی ہے۔ سارے کام جانتی ہے گھر کے۔" اور پھر وہ اپنا جسم دباتے ہوئے کہنے لگا۔ "جوڈو کراٹے تک تو جانتی ہے اوئے۔"

مجھے ہنسی آ گئی۔ "شادی کر بھی لی تو مار کھاتے رہو گے ہمیشہ۔"

"ایسی سوہنی بیوی ہو۔ ایسے گُنوں والی ہو تو بے شک جان لے لے۔" وہ بڑے خلوص سے بولا۔ "سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ یہ جگہ ٹھیک نہیں ہے۔ مجھے تو کوئی اور نوکری ملے تو چھوڑ دوں۔"

"یار ٹھیک تو ہے۔ عیش کرتے ہو۔ کام بھی زیادہ نہیں ہے۔ بس کبھی کبھار ضرورت پڑتی ہو گی۔"

"ضرورت تو پڑتی رہتی ہے۔ آتے رہتے ہیں سیٹھ لوگ۔ پر زیادہ تر بدمعاش اور تماش بین ہوتے ہیں۔ انسان کو انسان نہیں سمجھتے۔ بکاؤ مال سمجھتے ہیں اور عورت۔" اس نے نفرت اور حقارت سے زمین پر تھوک دیا۔ "عورت تو بس دل بہلانے کا کھلونا ہے ان کی نگاہوں میں جب کوئی پارٹی ادھر آتی ہے میری تو جان پر بن جاتی ہے۔"

"وہ کیوں؟"

"سمجھا کرو اوئے۔ ایسی جوان، سوہنی لڑکی گھر میں ہے۔ کسی کی بدنظر پڑ گئی تو میری تو شامت آ جائے گی۔"

"مگر تم تو اسے اپنی گھر والی بتاتے ہو!"

"ارے یہ بے دیدا اور بے غیرت لوگ ہوتے ہیں۔ ان کے لیے کسی کی ماں بہن۔ بیٹی بیوی سب کھلونے ہوتے ہیں۔ خدا غارت کرے ان بے ایمان بدمعاشوں کو۔"

واقعی۔ بات وہ دُرست کہہ رہا تھا۔ جس قماش کے لوگ اس ڈاک بنگلے میں تفریح اور دل بستگی کے لیے آتے ہیں ان کے نزدیک کسی غریب عورت کی عزت یا کسی غریب ملازم کی جوان اور خوبصورت بیوی کی بھلا کیا حرمت ہو سکتی ہے۔ ان دونوں کے حالات سُن کر اور ان سے واقف ہونے کے بعد مَیں وقتی طور پر اپنی پرابلمز بھول گیا۔ ان سے ہمدردی ہو گئی تھی مجھے۔ دُنیا میں اللہ نے کیسے کیسے لوگ بنائے ہیں اور وہ کیسی کیسی ویران اور دُور دراز جگہوں پر رل جاتے ہیں۔ ایسے بے ریا۔ سادہ اور اصول پرست لوگ اونچی سوسائٹی اور اعلیٰ تعلیم یافتہ حلقوں میں کبھی دیکھے نہ سنے۔

جالاں ایک دری جھاڑتی ہُوئی اندر آ گئی۔ "جیرے بابو کے لیے میں چارپائی پر یہ دری ڈال دوں۔ ذرا آرام سے سو جائے گا۔ ہماری طرح اَن پڑھ جٹ نہیں ہے۔"

جیرے کے چہرے پر ناگواری کے آثار پھیل گئے۔ "قالین لا کر بچھا دے اس کے لیے۔ آسمان سے تخت منگا دے سونے چاندی کا۔" وہ جل کر بولا۔

"ارے سڑتا کیوں ہے۔ جیرے پڑھے لکھوں کی عزت کرنی چاہیئے۔ انہیں سر پہ اور آنکھوں پر بٹھانا چاہیئے

اللہ اور رسول نے بھی علم حاصل کرنے والوں کو بڑی عزت اور اونچا درجہ دیا ہے۔"

"خدا رسول کی کسی اور بات پر بھی دھیان دے لیا کرا وئے۔" وہ جھلاہٹ میں اُٹھ کر کھڑا ہوگیا اور باہر کی طرف جانے لگا۔ جالاں پر اس کے غصے اور برہمی کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ بڑے اطمینان سے ایک چارپائی پر دری بچھا کر اس پر ایک سخت تختے کا تکیہ رکھ رہی تھی۔ ساتھ ہی وہ کن انکھیوں سے جیرے کی طرف دیکھ کر دانتوں میں ہونٹ دبا کر مسکراتی بھی جاتی تھی۔

"اس کی باتوں کا بُرا مت منانا بابو۔ چٹا ان پڑھ ہے۔ چار پانچ جماعت پڑھ گیا ہوتا تو بندہ بن جاتا۔"

جیرے نے بہت زور سے غصے میں اپنا بڑا رومال جھٹکا اور سر جھٹک کر باہر چلا گیا۔

"تم نے خواہ مخواہ اسے ناراض کر دیا۔" میں نے جالاں سے کہا۔

"یہ تو دن بھر میں سو بار ناراض ہوتا ہے جی۔ اسکی ناراضگی کا کیا ہے، تھوڑی دیر میں آپ ہی ٹھیک ہوجائے گا۔ اس نے بستر ٹھیک کرنے کے بعد سر اُٹھایا تو اس کا چہرہ خون کی سُرخی سے دمک رہا تھا اور نگاہوں میں بجلیاں سی کوندرہی تھیں۔ صحت مندی اور سادگی نے اُسے قدرتی حسن و رعنائی کا مجسمہ بنا دیا تھا۔ وہ جھجکی ہُوئی میری نگاہوں کے سامنے بڑے ہوشربا انداز میں کھڑی تھی۔ لیکن اس جمال میں بھی ایک پاکیزگی تھی۔ وہ ایک خود اعتماد اور صاف دل لڑکی تھی۔ اس کا دل ہر قسم کے میل کچیل اور کھوٹ سے پاک تھا۔ اسی لیے اسے یہ احساس تک نہ تھا کہ وہ ایک دل رُبا نوجوان لڑکی ہے اور میں ایک نوجوان اجنبی مرد۔ وہ ہر قسم کے دنیاوی ملمع سے پاک تھی۔

"ہے تو ان پڑھ پر بہت اچھا ہے۔ ایسے بندے بہت کم ہوتے ہیں دُنیا میں۔"

"تمہاری جیسی لڑکیاں بھی تو بہت کم ہوتی ہیں جالاں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور تن کر سیدھی کھڑی ہوگئی۔ وہ ایک کشیدہ قامت اور توانا لڑکی تھی۔ اسکی قربت کا احساس کسی مرد کے دل کی دھڑکنوں کو بے قابو کرنے کے لیے کافی تھا۔

"تمہیں جیرے نے سب کچھ بتا دیا میرے بارے میں؟" اُس نے تیز لہجے میں پوچھا۔

"ہاں۔"

"بہت بے ایمان ہے وہ۔ دیکھو نا بابو۔ ابھی آپ سے ملے ہُوئے دو گھنٹے بھی نہیں ہُوئے اور سارا کچا چٹھا بتا دیا۔ عورتیں تو ناحق بدنام ہیں۔ یہ مرد لوگ بھی پیٹ کے بہت ہلکے ہوتے ہیں۔" پھر وہ کچھ سوچ کر شرم سے سُرخ ہوگئی۔

"کیا کیا بتایا اس نے تمہیں؟"

"ایسے ہی۔ بس تمہارے بارے میں میں نے پوچھا تو تھوڑا بہت تو بتانا ہی تھا۔"

"کیا پوچھا تھا تم نے؟"

"میں سمجھا..... میں سمجھا تھا کہ تم....."

"ہاں ہاں۔ بولو نا۔"

"میں سمجھا تھا کہ تم اس کی گھر والی ہو۔"

وہ بے اختیار ہنسنے لگی۔ ہنستے ہنستے وہ چارپائی پر گر گئی۔ کچھ دیر بعد ہنسی کم ہوئی تو اُٹھ کر بیٹھ گئی اور کہنے لگی۔ "بس اتنے سے سوال پر اُس نے ساری کہانی سنا دی۔ شروع سے آخر تک۔ بیوقوف نہ ہو تو۔"

اچانک کچھ فاصلے پر کاروں کے آنے کی آوازوں سے میں چونک پڑا اور بے اختیار چارپائی سے اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ میں نے لپک کر دروازے کا رُخ کیا۔ کچھ فاصلے پر دو کا۔ ں کی روشنیاں چمک رہی تھیں۔ پھر ایک بارن

سنائی دیا۔ جیرا جو دوسرے کمرے میں تھا تیزی سے نکل کر باہر آیا اور کاروں کی روشنی دیکھ کر بولا: "بیڑا غرق۔ پھر آگئے خانہ خراب۔"

"کون آگئے؟ تم انہیں جانتے ہو؟"

"ارے وہی شیطان پارٹی ہوگی اور کون آئے گا یہاں۔" وہ تیز تیز قدموں سے صحن کے دروازے کی طرف بڑھا۔ "دیکھو، جب تک میں نہ آؤں تم کمرے سے باہر نہ نکلنا۔ جالاں کو بھی منع کر دینا۔ سمجھ گئے اوئے؟"

میں نے سر ہلا دیا۔ وہ قریب قریب بھاگتا ہوا ڈاک بنگلے کی جانب چلا گیا۔ جس طرف سے اب کاروں کے رُکنے اور اُن کے دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں فکرمند ہوکر سوچ میں پڑ گیا تھا۔ یہ کون لوگ ہوسکتے ہیں؟ ہوسکتا ہے یہ انہی مجرموں کے ساتھی ہوں؟ یا پھر پولیس کے لوگ ہوں؟ میں تو مجرموں سے بھی اور پولیس سے بھی دونوں سے خوف زدہ تھا۔ اتنی دیر میں جالاں بھی صحن میں آکر میرے نزدیک کھڑی ہوگئی۔ میں اپنی سوچوں میں گُم تھا۔ اسکی موجودگی کا احساس مجھے اس کے جسم کی خوشبو سے ہُوا۔ وہ بھی ڈاک بنگلے کی طرف دیکھ رہی تھی اور اس کے چہرے پر ناگواری اور نفرت کے آثار تھے۔ "دُنیا بھر کے چھٹے ہوئے بدمعاش اکٹھے ہو جاتے ہیں یہاں۔ اُنہیں دُنیا میں اور کوئی کام نہیں ہے۔ نہ کمانے کی فکر ہے نہ بیوی بچوں کا خیال ہے نہ خدا رسول کا ڈر ہے۔ پتہ نہیں اللہ میاں ایسے لوگوں کو اتنے ڈھیر سارے پیسے کیوں دے دیتا ہے؟"

میں خاموشی سے کمرے کے اندر چلا گیا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا خیال اسی طرف لگا ہُوا تھا۔

"اور چائے پیو گے؟" جالاں پھر میرے پاس آگئی۔

میں نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ چائے کی اتنی خواہش نہیں تھی۔ مگر میں کچھ دیر کے لیے تنہائی اور یکسوئی کے ساتھ سوچنا چاہتا تھا۔ وہ گنگناتی ہُوئی لپک کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ میرا دھیان کسی اور طرف تھا مگر برآمدے میں سے اس کے گنگنانے کی رسیلی آواز مجھے سنائی دے رہی تھی۔ "مجھے کیا کرنا چاہیئے؟" میں نے سوچا۔ "فوراً یہاں سے رُخصت ہو جاؤں یا آنے والے واقعات کا انتظار کروں؟ اگر آنے والے لوگ میری تلاش میں ہُوئے تو ان دونوں معصوم بے گناہوں کی زندگی بلاوجہ خطرے میں پڑ جائے گی۔" مگر پھر مجھے خیال آیا کہ ہوسکتا ہے یہ وہی تفریح اور عیش کے دلدادہ لوگ ہوں جو عموماً اس ڈاک بنگلے میں عیش و طرب کی محفلیں سجانے آتے رہتے ہیں۔

یکایک تیز تیز قدموں کی آواز سنائی دی اور پھر جیرے کی آواز آئی۔ وہ جھڑکی آمیز لہجے میں دبی آواز میں بول رہا تھا۔ اس کی آواز میں غصہ نمایاں تھا: "بند کر اپنی بکواس۔ میں تجھے خاموش رہنے کو کہتا ہوں اور تُو گائے جا رہی ہے۔ تجھے کب عقل آئے گی آخر؟" پھر وہ جالاں کو بازو سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا اندر کمرے میں لے آیا۔

"اسے کچھ سمجھاؤ اوئے۔ کچھ تو عقل کرے۔ ایسی نادان بچّی بھی نہیں ہے۔"

جالاں نے جھٹک کر بازو چھڑا لیا اور خاموشی سے اسے گھورنے لگی۔

"یہ کون لوگ ہیں؟" میں نے بے تابی سے سوال کیا۔

"ارے وہی چنڈال چوکڑی ہے۔" وہ غصّے سے بولا۔ "تین بندے ہیں اور تین زنانیاں ہیں۔ پتہ نہیں کہاں سے پکڑ کرلے آتے ہیں۔ ان کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ بھی نہیں ہوتا۔" حالات کی سنگینی کے باوجود مجھے اس کے فقرے پر ہنسی آگئی۔

"ہنسنے کی بات نہیں ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔ "نہ جانے کیوں اللہ نے ان بدمعاشوں کی رسّی دراز کی ہوئی ہے۔ ساری دنیا کا عیش ان کی قسمت میں لکھ دیا ہے۔ جتنے زیادہ گناہ کرتے ہیں اتنی ہی ان کی دولت بڑھتی جاتی ہے۔"

"اللہ کی مصلحتیں وہی بہتر جانتا ہے۔" میں نے فلسفیانہ انداز میں اسے سمجھایا۔ "کون جانے اس نے ان کے لیے کیا

عذاب اور کون سی سزا مقرر کی ہے۔"

"پتہ نہیں کب ان پر عذاب آئے گا۔ ابھی تو جنت کے مزے لوٹ رہے ہیں سُسرے۔" پھر وہ جالاں سے مخاطب ہو کر بولا۔ "دیکھ! کان کھول کر سُن لے میری بات۔ اگر تیری آواز مجھے باہر سُنائی دی یا تیرا سایہ بھی گھر سے باہر نظر آیا تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔"

"ہنہ" جالاں برہمی سے مُنہ بنا کر باہر چلی گئی۔

جیرا ایک ٹھنڈی آہ بھر کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ "عورت ذات کی تو عقل ہی گٹوں میں ہوتی ہے۔ ذرا خود سوچو۔ جوان اور خوبصورت عورت ہے اگر یہاں آنے والے بدمعاشوں میں سے کسی کی نیت خراب ہوگئی تو مَیں کیا کروں گا۔ اسے تو خود ہی بچ کر رہنا چاہیے۔"

"تم خواہ مخواہ بگڑ رہے ہو اس پر۔ وہ خود بہت محتاط ہے۔" مَیں نے اسے تسلی دی۔ "اچھا! اب یہ بتاؤ کہ ان لوگوں کا پروگرام کیا ہے؟"

"پروگرام کیا ہوتا ہے۔ ایک دو روز یہاں گند مچائیں گے۔" پھر وہ یکایک سوچ کر بولا۔ "سنو! تم ان کی ڈیوٹی کیوں نہیں کر لیتے؟"

"کیا مطلب؟" مَیں نے چونک کر اسے دیکھا۔ "ان کو شراب پلاؤں؟"

"ارے نہیں، شراب وہ خود ہی پی لیں گے۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو انھیں لا کر دے دینا۔"

"نہ بابا۔ مجھ سے یہ کام نہیں ہوگا۔" مَیں نے صاف جواب دے دیا۔ "سُنو! تمہیں گاڑی چلانی آتی ہے؟"

"ہاں ہاں۔ خوب آتی ہے۔"

"یہ تو اچھی بات ہے ان کم بختوں کو قصبے یا شہر سے کچھ سامان منگوانے کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ کسی چیز کی ضرورت پڑ گئی تو تم لا دو گے؟"

مجھے اُمید کی کرن نظر آگئی۔ "کیوں نہیں۔ ایک منٹ میں لا کر دے دوں گا۔"

"تو پھر مَیں اُن سے گاڑیوں کی چابیاں لے لوں گا۔ تم کون سی گاڑی چلا سکتے ہو؟ دو گاڑیاں ہیں اُن کے پاس۔"

مَیں ہنس پڑا۔ "جسے ڈرائیونگ آتی ہو وہ سب گاڑیاں چلا سکتا ہے۔ تم ان سے چابیاں لے آؤ اور کام بھی پُوچھ آؤ۔"

"مَیں چلتا ہوں مگر تم اس اُلّو کی پٹھی کا خیال رکھنا۔" وہ تیزی سے قدم اُٹھاتا ہوا باہر چلا گیا اور مَیں دُعا کرنے لگا کہ کاش ان لوگوں کو فوری طور پر کوئی چیز منگوانے کی ضرورت پیش آجائے۔ اس جگہ سے فرار اختیار کرنے اور جنگل سے باہر جانے کی اس سے بہتر ترکیب اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ گویا ان لوگوں کو خدا نے میرے لیے فرشتۂ رحمت بنا کر بھیج دیا تھا۔

جالاں کمرے میں داخل ہوئی تو اس کا مُنہ پھُولا ہوا تھا۔ "دیکھا تم نے اس پینڈو کو کیسی باتیں کرتا ہے؟" اس نے شکایت کی۔

"جالاں۔ وہ ٹھیک ہی تو کہتا ہے۔" مَیں نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "یہاں آنے والے لوگ ایک نمبر کے بدمعاش ہوتے ہیں اگر تم پر کسی کی نظر پڑ گئی تو مشکل آجائے گی۔"

"ارے کیا مشکل آجائے گی۔ مَیں کوئی حلوہ نہیں ہوں کہ جو چاہے کھا لے۔"

"پھر بھی احتیاط تو کرنی چاہیے۔ کوئی اور بڑی عُمر کی عورت ہوتی تو کوئی بات نہیں تھی مگر ــــــ"

"مگر کیا؟" اس نے مجھے اپنی کاجل بھری بڑی بڑی چمکدار آنکھوں سے گھُورا۔ مَیں اس کو دیکھتا رہ گیا۔ سادہ

سے ملگجے لباس کے باوجود وہ بے حد دلکش لگ رہی تھی۔ اس کی دونوں موٹی موٹی چوٹیاں اس کی گردن کی حرکت کے ساتھ سانپوں کی طرح بل کھا رہی تھیں۔ وہ حقیقت میں ایک خوش جمال عورت تھی جس کا شاید خود اس کو احساس نہیں تھا۔ اس ویران اور غیر آباد دُور دراز جنگل میں اس کا رہنا کسی طرح بھی محفوظ نہ تھا۔ جیرے کو یہی فکر پریشان کرتی رہتی تھی۔ لیکن وہ اللہ کی بندی اس حقیقت سے بے پروا اور بے خبر معلوم ہوتی تھی۔

جیرا دوبارہ کمرے میں آگیا۔ اس کے ہاتھ میں کاروں کی چابیاں تھیں۔ "لو ان کو تو آتے ہی ضرورت پڑ گئی اوئے۔ تکّے کباب، مٹھائی، شراب، کھانے کا سامان، پنیر، مکھن، انڈے، جام سبھی کچھ چاہیئے ہے انھیں اور کہتے ہیں کہ ابھی چاہیئے۔"

"کوئی بات نہیں۔ مَیں ابھی لا دوں گا، مگر مجھے قریبی آبادی کا راستہ معلوم نہیں ہے۔"

"مَیں چلی جاؤں ان کے ساتھ۔" میرا فقرہ ختم ہونے سے پہلے ہی جالاں بے تابی سے بولی۔

"تو چُپ کر۔" جیرے نے ڈانٹ کر کہا تو وہ مایوس ہوگئی۔ "آؤ میرے ساتھ۔ مَیں تمہیں سمجھا دیتا ہوں۔" وہ مجھے ساتھ لے کر باہر نکل گیا۔ ڈاک بنگلہ زیادہ دُور نہیں تھا۔ یہ ایک پُرانی کوٹھی اور حویلی کی ملی جُلی شکل کی عمارت تھی جس کے دونوں جانب اُونچے اُونچے برآمدے تھے۔ کمروں کے اندر روشنیاں جل رہی تھیں اور برآمدے کے سامنے دو کاریں کھڑی ہوئی تھیں۔ نئے ماڈل کی قیمتی گاڑیاں تھیں۔ "تم انھیں چلا لوگے نا؟" جیرے نے ایک بار پھر تصدیق کی۔

"ارے تم فکر مت کرو۔ بس مجھے پتہ بتا دو آبادی کا۔" مَیں نے اسے یقین دلایا۔

"ڈاک بنگلے سے باہر نکلو گے تو صرف ایک ہی کچی سڑک تمہیں ملے گی جو بل کھاتی ہوئی بہت دُور تک چلی گئی ہے۔ تین چار میل کے بعد ایک اور راستہ نظر آئے گا مگر تم سیدھے اسی پر چلتے رہنا۔ دو میل جا کر کھیت اور کچے مکان نظر آجائیں گے۔ بس سامنے ہی آبادی ہے۔ چھوٹا سا قصبہ ہے مگر ضرورت کی سب چیزیں مل جاتی ہیں وہاں۔ یہ لو کاغذ۔ اس پر سب چیزوں کی فہرست ہے اور یہ لو چار سو روپے۔ حساب بعد میں دے دینا۔" اس نے روپے اور ایک کاغذ مجھے تھما دیا۔

"چوکیدار۔ چوکیدار۔ یہ کہاں مر گیا؟" ڈاک بنگلے کے اندر سے کسی مرد کے پکارنے کی آواز آئی۔ جیرے نے نفرت سے مُنہ بنایا۔ "میرا بس چلے تو ان سب کو گولی مار دوں مگر روزی سے مجبور ہوں۔ اچھا اب تم جاؤ اوئے۔ مَیں ان کو دیکھتا ہوں۔" وہ غصے میں بڑبڑاتا ہوا ڈاک بنگلے کی طرف چلا گیا۔ مجھے اس شخص پر ہنسی بھی آرہی تھی اور ترس بھی۔ سیدھا سادہ نیک دل آدمی تھا مگر کس قسم کی نوکری میں پھنس کر رہ گیا تھا۔

مَیں نے سفید رنگ کی ٹیوٹا کار کا دروازہ کھولا تو خوشبو اور بدبُو کی ملی جُلی مہک نے میرا استقبال کیا۔ زنانہ سینٹ کی خوشبو کے ساتھ ساتھ شراب کی بدبُو بھی گاڑی میں پھیلی ہوئی تھی۔ بڑے واہیات اور بدقماش لوگوں سے واسطہ پڑ گیا تھا۔ مَیں نے کار اسٹارٹ کی اور سامنے کچی سڑک پر ڈال دی۔ میرے فرار ہونے کے لیے یہ بہترین موقع تھا لیکن نہ جانے کیوں میرا بھاگنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ ایک خیال یہ بھی تھا کہ فی الحال بھاگ کر جاؤں گا بھی کہاں؟ ہر طرف لوگ میری کھوج میں لگے ہوئے تھے۔ اس لحاظ سے یہ ایک محفوظ و مامون جگہ تھی جہاں بیٹھ کر مَیں مستقبل کی منصوبہ بندی کر سکتا تھا۔ سب سے بڑی فکر مجھے روزی کی طرف سے تھی۔ مَیں جاننا چاہتا تھا کہ اس غریب پر کیا گزر رہی ہے۔ ایک خطرناک جرائم پیشہ شخص کے ساتھ اس کے رہنے کا تصور تک میرا خون کھولا دینے کے لیے کافی تھا۔ پہلے میرا ارادہ ہوا کہ سب کام چھوڑ کر سیدھا اپنے گھر جاؤں۔ مگر گھر کا راستہ مجھے معلوم نہ تھا اور پھر یوں بلا سوچے سمجھے گھر پہنچ جانا خطرناک بھی تھا۔ اس لیے مَیں نے پہلے موقع پا کر فون پر حالات سے آگاہی حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ قریباً آدھے گھنٹے بعد مَیں آبادی میں پہنچ گیا۔ یہ ایک اچھا خاصا بڑا قصبہ تھا۔ ریلوے سٹیشن کا

پتہ معلوم کرنے میں مجھے کوئی دُشواری پیش نہیں آئی۔ مَیں وہاں پہنچا اور ڈیوٹی پر موجود سٹیشن ماسٹر سے درخواست کی کہ وہ مجھے میرے گھر کا فون ملا دے۔ سو کا ایک نوٹ بھی مَیں نے اس کی نذر کر دیا۔ بھلا اُسے کو کیا تامّل ہو سکتا تھا۔ اتفاق سے لائین بھی جلدی مل گئی۔ مَیں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ رلیسیور سنبھالا "ہیلو؟"
دوسری طرف سے روزی کی سُریلی آواز سُنائی دی تو جیسے ساری پریشانی اور کلفت دُور ہو گئی۔
"مجھے یوسف صاحب سے بات کرنی ہے۔" مَیں نے دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے بات بنائی۔
"وہ تو گھر پر نہیں ہیں۔ شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں۔"
"کب گئے ہیں اور کب واپس آئیں گے؟" مَیں نے دلی خوشی کو دباتے ہوئے پوچھا۔
"دو دن ہو گئے۔ کل شام واپسی ہے ان کی۔"
روزی کے اس بیان نے مجھے تازہ زندگی بخش دی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جس دن مَیں گھر سے آیا تھا اسی رات میرا ہم شکل گھر سے چلا گیا تھا۔ ایک طمانیت بخش مسرّت کی لہر میرے سارے جسم میں دوڑ گئی۔
"آپ کون ہیں؟ کیا کام ہے آپ کو؟" مجھے خاموش پا کر روزی نے سوال کیا۔
احوالِ واقعی سُنانے اور روزی کو اصلیت سے آگاہ کرنے کا یہ بہترین موقعہ تھا۔ مَیں نے کہا: "روزی، مَیں یوسف بول رہا ہوں۔"
"کون یوسف؟" اس نے چونک کر پوچھا۔
"تمہارا شوہر۔ اصلی شوہر۔ دیکھو روزی فون بند مت کرنا۔ خدا کے لیے میری بات سُن لو۔ وہ شخص جو یوسف بنا ہوا ہے وہ ایک مُجرم اور آوارہ آدمی ہے۔ تم اس کی طرف سے ہوشیار رہو۔ وہ تمہیں دھوکہ نہ دینے پائے......"
دوسری طرف سے کسی جواب کے بغیر ہی فون کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ روزی مجھے وہی پہلے والا بہروپیا سمجھ رہی تھی اور میری بات سننے کی روادار تک نہ تھی۔ دوبارہ فون ملانا مشکل تھا لیکن مجھے اطمینان ضرور ہو گیا کہ روزی اس شیطان کے سائے سے محفوظ تھی اور اگلے دن تک اس کی واپسی کا کوئی امکان نہیں تھا۔
مَیں نے ایک دُکان پر تکّے اور کباب بنانے کا آرڈر دیا۔ انڈے اور مکھن بھی مل گیا مگر دوسری کوئی چیز نہیں مل سکی۔ رات کافی گزر چکی تھی اور اس قصبے میں کوئی ایسا سٹور نہیں تھا جو رات گئے کھانے پینے کا وہ سامان مہیا کر سکتا۔ تکّوں کا آرڈر دینے کے بعد مَیں اس چھوٹے سے ریستوران نما دُکان میں ایک طرف بیٹھ گیا اور سامنے میز پر پڑا ہوا اخبار اُٹھا کر دیکھنے لگا۔ سب سے پہلے میری نظر میری تصویر پر پڑی جو ایک دو کالمی خبر کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔ مَیں نے جلدی جلدی خبر پڑھی۔ رپورٹر نے لکھا تھا کہ یہ شخص جو ایک خطرناک مُجرم اور قاتل ہے اور بہت بڑی ڈکیتی کے سلسلے میں جیل میں تھا فرار ہو گیا ہے۔ اس نے ایک شریف اور معزز شہری یوسف کے ہم شکل ہونے کا فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی مگر گھر کے لوگ اس کے دھوکے میں نہیں آئے اور اصل یوسف صاحب نے اسے پولیس کے حوالے کرنے کی دھمکی دی تو وہ فرار ہو گیا۔ یوسف صاحب اس کی حقیقت سے بے خبر تھے اس لیے وہ ان کی اور پولیس والے کی آنکھوں میں دُھول جھونک کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ اس شخص کو گرفتار کرانے والے کو ۲۵ ہزار روپے انعام دینے کا اعلان کیا گیا تھا۔
خبر پڑھ کر مَیں نے اخبار اُلٹا کر کے رکھ دیا۔ میرا جسم پسینے میں ڈوب گیا اور دل کی دھڑکن چند لمحے کے لیے رُکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ خدایا۔ مَیں کس قدر تشویشناک اور خطرناک صورتِ حال سے دوچار تھا۔ میرے ہم شکل نے مجھے جان بُوجھ کر پولیس کے حوالے نہیں کیا تھا۔ اس طرح اسے اندیشہ ہو گا کہ ممکن ہے مَیں پولیس کو اپنی اصلیت کا یقین دلانے میں کامیاب ہو جاؤں۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے مجھے کھُلا چھوڑنے کو ترجیح دی تاکہ حریف جرائم پیشہ دشمنوں

کے گروہ میرا کام تمام کر دیں اور وہ اطمینان سے میری جگہ لینے میں کامیاب ہو جائے۔ یکایک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے سب لوگوں کی نگاہیں مجھے گھور رہی ہیں۔ مَیں نے کنکھیوں سے اِس پاس دیکھا۔ گنتی کے چند لوگ وہاں موجود تھے اور بظاہر ان میں سے کسی نے بھی میرا نوٹس نہیں لیا تھا۔ یوں بھی میری بڑھی ہوئی ڈاڑھی میرے لیے کافی مددگار تھی۔ اگر کوئی بہت غور سے مجھے نہ دیکھے تو اس کے لیے میری شناخت کرنا خاصا دشوار تھا۔
پہاڑی لڑکے نے تکّے اور کباب لا کر میرے حوالے کر دیئے۔ مَیں نے بل ادا کیا اور نظریں چُرا کر باہر نکل آیا۔ مجھے پہلی بار صورتِ حال کی نزاکت کا احساس ہوا تھا۔ اب پولیس اور جرائم پیشہ لوگوں کے علاوہ ہر شریف اور ذمّہ دار شہری بھی میری تلاش میں تھا۔ میرے گرد سازش کا گھیرا بے حد تنگ ہو چکا تھا۔ ان حالات میں وقتی طور پر میرا ڈاک بنگلے کی عافیت گاہ میں رہنا ہی مفید تھا۔ مَیں نے کم رفتار سے کار چلاتے ہوئے گزرے ہوئے واقعات کا جائزہ لینا شروع کیا تو اسرار کے پردے خودبخود میری نگاہوں کے سامنے سے ہٹنے شروع ہو گئے۔ جب مَیں معاہدے پر دستخط کرنے کے لیے دوسرے شہر گیا تھا اور ہوٹل میں شوکت کا منتظر تھا وہاں پیش آنے والے تمام واقعات کی کڑیاں جوڑنا اب مشکل نہیں تھا۔ ہوٹل کے کمرے میں میرے سامان کی تلاشی، میرے بریف کیس کی چوری جس میں میری شناخت سے متعلق کاغذات موجود تھے اور پھر میرے بغیر ہی معاہدے پر دستخط ہو جانا میرے خلاف ترتیب دی ہوئی سازش ہی کا حصہ تھا لیکن مَیں یہ معمّہ حل کرنے سے قاصر تھا کہ میرے اور شوکت کے بغیر اُس معاہدے پر دستخط کس نے کئے؟ کیا اُن لوگوں نے کوئی جعلی شوکت بھی تشکیل کر لیا تھا؟ ان سے یہ بعید بھی نہیں تھا۔ مجھے جس شاندار محل نما مکان میں بچا کر رکھا گیا تھا اس کا راز بھی اب سربستہ نہیں رہا تھا۔ وہاں ہر شخص مجھ سے واقف اور مانوس تھا۔ یہاں تک کہ جب مَیں نے وہاں سے باہر نکلنے کی کوشش کی تب بھی کسی نے مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ وہ میرے ہم شکل مُجرم کا گھر تھا اور اس کے مُلازم وغیرہ مجھے اپنا مالک ہی سمجھتے رہے تھے۔ مَیں اپنے حریف اور دشمن کی دانائی اور منصوبہ بندی کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکا۔ جب مَیں اُس گھر سے خلافِ توقع نکلا تو پولیس کی گاڑیاں سائرن بجاتی ہوئی گھر کی طرف جا رہی تھیں۔ ان کو یقیناً کسی گمنام شخص نے اطلاع دی ہو گی کہ ان کا مطلوبہ مفرور مُلزم اُس گھر میں موجود ہے۔ اگر مَیں کچھ دیر اور وہاں سے نہ نکلتا تو یقیناً پولیس مجھے گرفتار کرنے میں کامیاب ہو جاتی اور اس طرح اس کے راستے کا کانٹا خود بخود دُور ہو جاتا۔ پھر میڈم کا مجھ پر مہربان ہونا اور مجھے اشتراکِ عمل کی دعوت دینا اور میری ناز برداری میں حد سے بڑھ جانا بھی بالکل واضح ہو گیا۔ گویا میڈم بھی میری شکل سے دھوکا کھا گئی تھی اور مجھے جرائم پیشہ ٹونی ہی سمجھتی رہی تھی۔
اس چالاکی کے ساتھ پھیلائے ہوئے جال سے میرا بچ نکلنا ایک معجزہ ہی تھا۔ اب صورتِ حال یہ تھی کہ ایک طرف ٹونی کے پُرانے دوست اور رفیق مجھے ڈھونڈ رہے تھے تاکہ مَیں چُرائی ہوئی دولت میں سے انھیں بھی حصّہ دوں۔ جانی کے مطالبے کا سبب اور مطلب اب مجھ پر عیاں ہو رہا تھا۔ اس کی بہن تارہ کے حسنِ سلوک اور پھر دوسری عورت اور اس کے بھائی کی آمد اور مجھ پر اپنا حق جتانا بے سبب اور بلاوجہ نہیں تھا۔ جہاں تک تارہ کا تعلق ہے اسے ٹونی سے سچ مُچ محبت تھی اور وہ اس کے دکھائے ہوئے سبز باغ کو فراموش نہیں کر سکی تھی۔ اس غریب کے ساتھ خدا جانے ٹونی نے کیا کیا وعدے کیے تھے اور کیسے فریب دیئے ہوں گے۔ اس کا بھائی جانی ٹونی کی دولت کا حریص تھا لیکن جہاں تک تارہ کا تعلق ہے وہ ٹونی سے سچی محبت کرتی تھی۔ اس کا معصوم اور خوبصورت بچّہ اس کی محبت کی یادگار تھا۔ جانی کے ساتھ ساتھ اُن دونوں کا جو حشر ہوا اس کا مجھے بے حد صدمہ تھا۔ لیکن ان کے اس انجام کو روکنا یا تبدیل کرنا میرے اختیار میں نہیں تھا۔
ٹونی کے بارے میں رفتہ رفتہ اسرار کے پردے میری نگاہوں کے سامنے سے ہٹتے جا رہے تھے اور اس کے

بت نئے رُوپ میرے سامنے جلوہ گر ہو رہے تھے۔ عین اس وقت جب مَیں جانی کے گھر سے چپ چاپ بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک اور مسلح گروہ کا وہاں نمودار ہو کر ٹونی کو اُن کے حوالے کرنے کا مطالبہ کرنے کے معنی یہ تھے کہ ٹونی کے کسی اور حریف کو بھی اس کی تلاش اور جستجو تھی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ میڈم کے کارندے ہوں۔ میڈم بھی ٹونی سمجھ کر ہی میری آؤ بھگت اور پذیرائی کرتی رہی تھی۔ جب مَیں وہاں سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تو میڈم کی جھنجھلاہٹ اور ناراضی خلافِ توقع نہیں تھی۔ اپنی دانست میں وہ مجھے اصلی ٹونی سمجھتی رہی تھی اسی لیے بار بار مجھے اشتراکِ عمل کی دعوتیں پہنچتی رہی تھیں لیکن جب مَیں اس کے بچھائے ہوئے جال سے نکل جانے میں کامیاب ہو گیا تو اس کا غیظ و غضب دیدنی ہو گا۔ بہت زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ جانی کے گھر پر حملہ کرنے والے میڈم ہی کے خونی گروہ کے لوگ ہوں گے اور میڈم نے انھیں حکم دیا ہو کہ مجھے زندہ یا مُردہ پکڑ کر اس کے سامنے پیش کریں؟۔ مَیں یہ گتھیاں سلجھاتا ہوا ڈاک بنگلے کی طرف سفر کرتا رہا۔ کچھ عرصے پہلے عالم یہ تھا کہ مَیں موقع پا کر اس ڈاک بنگلے سے بھاگ نکلنے کی فکر میں تھا لیکن اب صورتِ حال نے جو نیا پینترا بدلا تھا اُس کی روشنی میں مجھے یہ دور افتادہ اور غیر آباد ڈاک بنگلہ ہی اپنے لیے موزوں ترین اور بہترین پناہ گاہ لگ رہا تھا۔

مَیں ڈاک بنگلے پہنچا تو کمروں کی روشنیاں جل رہی تھیں۔ مَیں نے گاڑی برآمدے کے سامنے کھڑی کی اور خود سامان کا تھیلا اُٹھا کر ڈاک بنگلے کی طرف بڑھا۔ مَیں اُن لوگوں کے سامنے جاتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ میری کوشش یہ تھی کہ اگر جیرا مل جائے تو اس کے ہاتھ یہ ساز و سامان ان کے پاس بھجوا دوں لیکن جیرے کا دُور دُور پتہ نہ تھا۔ مَیں برآمدے سے گزر کر ایک کمرے کے دروازے پر پہنچا تو قہقہوں کی آواز سُن کر ٹھٹک کر رہ گیا۔ اندر سے ملی جلی زنانہ اور مردانہ آوازیں آ رہی تھیں۔ ایک عورت گانے کی کوشش کر رہی تھی اور دو مرد اس کے گانے کا مذاق اُڑانے میں مصروف تھے۔ اس کے باوجود اس عورت کی مستقل مزاجی قابلِ داد تھی۔ دروازے کے پاس پہنچ کر میرے قدم رُک گئے۔ کیا میرا اس طرح اُن لوگوں کے سامنے جانا مناسب تھا؟ خاص طور پر اس حالت میں کہ یہ لوگ بھی کسی ایسی جگہ سے آئے ہوں گے جہاں اخبار میں میری تصویر ان کی نظروں سے گزری ہو گی۔ وہ نشے میں مدہوش تھے لیکن نشے میں ڈوبے ہوئے لوگوں کے ساتھ ایک مشکل یہ ہوتی ہے کہ جو بات ان کے دماغ میں ایک بار جاگزیں ہو جائے وہ اس سے باہر نہیں نکلتی۔ اگر انھوں نے مجھے پہچان لیا تو میرا انجام کیا ہو گا۔ یہ سوچ کر مَیں نے کمرے کے اندر جانے کا ارادہ تبدیل کر دیا اور تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا جیرے کے مکان کی طرف چل پڑا۔ رات خاصی گزر چکی تھی۔ چاند کی روشنی برائے نام ہی تھی اور دُور دُور تک سائے پھیلے ہوئے تھے۔ مَیں جیرے کے کچے مکان کے پاس پہنچا تو مجھے میری چھٹی حس نے خبردار کر دیا۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی اَن ہونی بات ہو گئی ہے۔ کچے مکان سے کچھ فاصلے پر مجھے ایک ڈھیر سا نظر آیا۔ نزدیک جا کر دیکھا تو وہ جیرا تھا۔ وہ ہاتھ پیر پھیلائے ہوئے اوندھے منہ زمین پر گرا ہوا تھا۔ مَیں نے تیزی سے قریب جا کر دیکھا وہ بے حس و حرکت تھا۔ ہاتھ لگا کر دیکھنے پر میرے شبے کی تصدیق ہو گئی۔ جیرا مر چکا تھا۔ اُس کے سینے پر ایک زخم کا نشان تھا اور اس کا کُرتہ خون میں بھیگا ہوا تھا۔ نہ جانے کب وہ موت کی وادی میں چلا گیا تھا مگر اس کو قتل کرنے والا کون تھا اور اس کی اس غریب سے کیا دشمنی تھی؟ جیرا میری کسی بھی قسم کی امداد سے بے نیاز ہو چکا تھا اس لیے مَیں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میری نظریں اس کے کچے مکان کی طرف تھیں۔ مکان میں جالاں اب تنہا تھی۔ خدا جانے اسے جیرے کی موت کا علم ہوا تھا یا نہیں! بہرحال اُس کو میری امداد کی ضرورت تھی۔ مَیں تیزی سے بھاگتا ہوا جیرے کے کچے مکان کی طرف گیا۔ صحن کا دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ میرا ماتھا ٹھنکا اور مَیں سامنے والے برآمدے کی طرف بڑھا۔ برآمدے میں سامان بکھرا پڑا تھا۔ دونوں کمروں کے دروازے بھی کھلے ہوئے تھے۔ دونوں کمروں کی روشنیاں جل رہی تھیں مگر وہاں کوئی موجود نہ

تھا۔ مَیں نے بلند آواز میں جالاں کو پکارا مگر کوئی جواب نہیں ملا اور ملتا بھی کیسے؟ وہ وہاں ہوتی تو جواب دیتی۔ ایک لمحے کے لیے میں سوچتا رہ گیا کہ جیرے اور جالاں پر کیا بیتی ہو گی؟ آخر وہ کس کی دُشمنی کی بھینٹ چڑھ گئے؟ اور ان دونوں بے ضرر اور غیر اہم انسانوں کے ساتھ کسی کو کیا دُشمنی ہو سکتی تھی؟

یکایک ایک خیال بجلی کی مانند میرے ذہن میں کوند گیا۔ مَیں نے واپس پلٹ کر ڈاک بنگلے کا رُخ کیا۔ جو سامان مَیں خرید کر لایا تھا وہ مَیں نے راستے میں پھینک دیا تھا۔ میرے دل میں جالاں کی حفاظت کے سوا اور کوئی خیال نہیں تھا۔ ڈاک بنگلے میں ہاؤ ہو کی محفل بدستور جمی ہوئی تھی۔ دروازے کے میلے شیشے میں سے اندر جھانکا تو مجھے دو مرد اور تین عورتیں نظر آئیں۔ وہ سب کے سب قریب قریب مدہوش تھے ان کے جسموں پر لباس تو تھا لیکن وہ ستر پوشی میں ناکام تھا۔ ایک شخص قالین پر لیٹا ہوا گا رہا تھا۔ دوسرا میز پر چڑھ کر رقص کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ دو عورتیں بستر پر نیم دراز لیٹی تالیاں بجا رہی تھیں جب کہ تیسری عورت قالین پر بیٹھی گا رہی تھی۔ وہ یوں بھاؤ بتا رہی تھی جیسے کوئی پیشہ ور گانے والی یا طوائف ہو۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی محفلوں میں طوائفیں اور پیشہ ور گانے والیاں ہی شریک ہو سکتی تھیں۔ کمرے میں ان پانچوں کے سوا اور کوئی موجود نہ تھا۔ مَیں نے پلٹ کر دوسرے کمرے کا رُخ کیا۔ اس کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو کمرے میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اندر کوئی موجود نہیں تھا۔ مَیں نے تیسرے کمرے کا رُخ کیا جس کا دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ اس کمرے میں سوائے تھوڑے سے فرنیچر کے اور کچھ نہ تھا اب اس جگہ ٹھہرنا وقت ضائع کرنے کے مترادف تھا۔ مَیں ڈاک بنگلے سے باہر نکلا اور جیرے کے گھر کی طرف بڑھا۔ رات اب قریب قریب اندھیری ہو چکی تھی۔ یکایک ایک جانب سے مجھے چیخ کی آواز سنائی دی۔

میں ٹھٹک کر رُک گیا اور پھر آواز کی سمت بھاگا۔ واضح طور پر یہ کسی عورت کی آواز تھی۔ مَیں آواز کی سمت بھاگتا چلا گیا۔ سامنے سوائے جنگل کے کچھ نہ تھا لیکن تھوڑی دُور جانے کے بعد جب درختوں کا سلسلہ قدرے کم ہوا تو مجھے ایک بوسیدہ عمارت نظر آ گئی۔ یہ کھنڈر نما عمارت تھی جس کے چاروں طرف اُونچے اونچے درخت سر اُٹھائے کھڑے تھے۔ بظاہر یہ پُرانے زمانے کے اصطبل کی عمارت معلوم ہوتی تھی۔ نزدیک پہنچنے پر اس کی تصدیق ہو گئی۔ تین چار کمروں کے آگے ایک برآمدہ تھا جو اب قریب قریب کھلے صحن کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ دو کمروں کی چھتیں گر چکی تھیں۔ صرف ایک کمرہ باقی تھا جس میں کوئی دروازہ نہیں تھا۔ ابھی مَیں وہاں تک پہنچا بھی نہیں تھا کہ ایک اور چیخ کی آواز نے اس بات کی نشاندہی کر دی کہ جالاں اسی کمرے میں موجود تھی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے ایک کرخت مردانہ جھڑکی کی آواز سنائی دی اور پھر یوں لگا جیسے اندر کچھ لوگوں میں کشمکش ہو رہی ہے۔ دوسرے ہی لمحے مَیں اس بوسیدہ کمرے کے دروازے پر پہنچ چکا تھا۔

کمرہ توقع کے مطابق ایک کھنڈر کا نمونہ پیش کر رہا تھا۔ فرش پر اینٹوں اور مٹی کا ڈھیر پڑا ہوا تھا۔ ایک طرف خشک گھاس بھی تھی جس سے اس بات کی تصدیق ہوتی تھی کہ یہ عمارت کسی زمانے میں اصطبل کے طور پر استعمال ہوتی رہی ہے۔ مٹی کے ڈھیر پر جالاں دیوار کا سہارا لیے ہوئے کھڑی ہانپ رہی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور لباس جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک اینٹ کا بہت بڑا ٹکڑا تھا جسے وہ سامنے کھڑے ہوئے شخص کی طرف پھینکنے کے لیے تیار تھی۔ اس سے چند قدم کے فاصلے پر ایک بدوضع قوی ہیکل شخص دونوں ہاتھ اپنے گھٹنوں پر رکھ کر کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ قمیص پتلون میں ملبوس تھا۔ قمیص کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور اس کی آستین بھی پھٹ کر لٹک گئی تھی۔ اس کے چہرے پر خراشوں کے نشان تھے جو یقیناً جالاں کے ناخنوں نے پیدا کئے تھے۔ یہ منظر اس بات کا ثبوت تھا کہ اب تک جالاں نے اس سے مردانہ وار مقابلہ کیا ہے اور اس کے عزائم کو ناکام بنانے میں کامیاب رہی ہے۔ جالاں ایک اُونچی لمبی، مضبوط جسم کی صحت مند لڑکی تھی لیکن

ایک قوی ہیکل آمادۂ فساد شخص سے اس طرح مقابلہ کرنا اس کی ہمت۔۔ ناقابلِ شکست قوّت حوصلہ کا بیّن ثبوت تھا۔

وہ دونوں میری آمد سے بے خبر تھے۔ جالاں نے اینٹ کا ٹکڑا پوری قوّت سے پھینکا مگر اس کے مقابل نے پھرتی سے ایک طرف ہٹ کر اس کا وار خالی جانے دیا۔ اب وہ بے بس اس کے سامنے کھڑی تھی لیکن اس کی نگاہیں چنگاریاں برسا رہی تھیں۔ مرد اب آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے پتلون کی جیب سے ایک بڑا چاقو نکال کر کھول لیا تھا اور اسے مضبوطی سے ہاتھ میں تھامے جالاں کو گھورتا آ رہا تھا۔ اس کی حریصانہ نظریں جالاں پر سے ایک لمحے کے لیے بھی اِدھر اُدھر نہیں ہٹی تھیں۔ جالاں بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑی تھی۔ لیکن اس کی حیثیت ایک ایسے بے بس شکار جیسی تھی جو ہزار کوشش کے باوجود شکاری کے قابو میں آچکا ہو لیکن اس کی مدافعت نے ابھی دم نہیں توڑا تھا۔

"اگر باز نہیں آئی تو ایک ہزار ٹکڑے کر دوں گا۔" مرد کی بھیانک آواز کمرے میں گونجی۔ وہ جسمانی طاقت کے ذریعے سے زیر کرنے میں ناکام رہنے کے بعد اب مہلک ہتھیاروں کی مدد لینے پر مجبور ہو گیا تھا۔ جالاں نے جواب میں نفرت سے زمین پر تھوک دیا اور سنبھل کر کھڑی ہو گئی۔ ساتھ ہی وہ کنکھیوں سے اپنے دائیں بائیں دیکھتی بھی جا رہی تھی۔ مرد نے اچانک چھلانگ لگائی اور اس کے پاس پہنچ کر حملہ کرنے کے لیے چاقو اوپر اٹھایا۔ اس سے پہلے کہ چاقو نیچے آتا میں اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ میں نے اس کی کلائی تھام کر ایک جھٹکا دیا اور چاقو اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ وہ غصے میں تیزی سے مڑا لیکن میرا گھونسہ اس کے جبڑے پر لگا اور وہ لڑکھڑاتا ہوا دیوار سے جا لگا۔ میں نے اُسے سنبھلنے کا موقعہ نہیں دیا اور گھونسوں اور لاتوں پر رکھ لیا۔ نفرت اور غصے نے مجھے بے دم بنا دیا تھا۔ اس کی درندگی پر میں اپنے ہوش و حواس کھو چکا تھا۔ وہ ایک بے بس معصوم لڑکی کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کی کوشش میں ایک نیک اور اچھے انسان کو موت کے گھاٹ اُتار چکا تھا اور اپنے مکروہ عزائم میں ناکام رہنے کے بعد اب ایک پاکباز لڑکی کی جان لینے پر تُلا ہوا تھا۔ یہ شخص انسان کے درجے سے گر چکا تھا اور بڑی سے بڑی سزا کا مستحق تھا۔ دو منٹ کے اندر کسی مزاحمت کے بغیر وہ نیم جان ہو کر لڑکھڑانے لگا۔ میری ایک لات اس کے پیٹ پر لگی اور وہ اپنا توازن کھو کر زمین پر گر گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اُٹھنے کی کوشش کرتا جالاں بجلی کی سی تیزی سے اس کی طرف لپکی۔ میں نے نیم تاریکی میں چاقو کا چمکتا ہوا پھل دیکھا اور پھر ایک چیخ سنائی دی۔ جالاں نے صرف ایک ہی ضرب پر اکتفا نہیں کی بلکہ پے درپے کئی وار کیے اور جب میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روکا تو وہ اپنے دشمن کو ہلاک کر چکی تھی۔

"یہ تم نے کیا کر دیا؟" میں نے خون آلود چاقو اس کے ہاتھ سے چھینتے ہوئے کہا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مجھ پر ایک نگاہ ڈالی اور زمین پر بیٹھ کر رونے لگی۔ یہ صورت حال میرے لیے بالکل غیر متوقع تھی۔ میرے سامنے ایک شخص کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ باہر بھی کچھ فاصلے پر ایک لاش موجود تھی جبکہ ڈاک بنگلے میں تین عورتیں اور مرد محفل طرب بپا کیے ہوئے تھے۔ میرے سامنے ایک بے عقل اور بے سہارا نوجوان لڑکی تھی جس نے میری آنکھوں کے سامنے ایک شخص کو قتل کیا تھا۔ اِدھر میں ایک مفرور اور مطلوب شخص تھا جس کے لیے دُنیا بھر میں کوئی جائے پناہ نہ تھی۔ پولیس اور جرائم پیشہ غنڈوں کے گروہ میری تلاش میں سرگرداں تھے اور مجھے بچانے والا خدا کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔

میں نے جالاں کے پاس بیٹھ کر اسے تسلی دی تو وہ پھوٹ پھوٹ کر ہچکیوں کے ساتھ رونے لگی۔

"جالاں" میں نے گھبرا کر کہا۔ "خدا کے لیے ہوش سے کام لو۔ اگر کسی نے تمہاری آواز سن لی تو ہماری خیر

نہیں ہے۔"

"مجھے مر جانے دو بابو۔" وہ روتی ہوئی بولی۔ "مجھے مر جانے دو۔ اب جی کر بھی کیا کروں گی؟ کیا فائدہ ہے اس زندگی کا؟"

"کم از کم میرا ہی خیال کرو۔" میں نے حکمتِ عملی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "تمہاری وجہ سے میں بھی بے گناہ مارا جاؤں گا۔"

"وہ بھی بے گناہ تھا بابو۔ جیرے نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔ ایسے شریف لوگ آجکل ہوتے کہاں ہیں۔ وہ تو ہیرا تھا ہیرا۔ پر اس ظالم نے اسے مار دیا۔ وہ مجھے بچاتے ہوئے مرا ہے بابو۔"

"تم نے بھی تو اس کے قاتل سے بدلہ لے لیا۔ دیکھو جالاں۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ تمہیں ضبط اور ہوش سے کام لینا پڑے گا۔ ورنہ میں بھی جیرے کی طرح بے موت مارا جاؤں گا۔"

جالاں ایک دم خاموش ہو گئی۔

"سنو۔ ہمیں جلد سے جلد ان دونوں لاشوں کو ٹھکانے لگانا ہوگا۔ آؤ میرے ساتھ۔"

وہ ایک معمول کی طرح چپ چاپ میرے ساتھ چل پڑی۔ ہمیں جیرے کی لاش تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ اس کو بے گور و کفن یوں پڑا ہوا دیکھ کر جالاں پر پھر رقت طاری ہو گئی مگر اس نے مضبوطی سے اپنے منہ کو بند کر لیا تاکہ آواز نہ نکلنے پائے۔ میں نے بمشکل جیرے کی لاش کو اٹھایا اور اصطبل کے کھنڈر کی طرف چل پڑا۔ لاش کافی بھاری تھی۔ ابھی میں دو قدم بھی نہیں چلا تھا کہ اندھیرے میں ایک سایہ سا لہرایا اور پھر ایک مردانہ آواز نے مجھ سے پوچھا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟ کون ہو تم؟"

میں نے گھبرا کر دیکھا۔ یہ اُن دو مردوں میں سے ایک تھا جنہیں میں نے ڈاک بنگلے میں دیکھا تھا۔ جالاں مجھ سے کچھ فاصلے پر کھڑی رو رہی تھی۔ میں سٹپٹا کر رہ گیا۔ کیونکہ میں موجودہ صورتِ حال کا سامنا کرنے کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔

وہ میرے نزدیک آگیا تو اُس کے منہ سے پیدا ہونے والی شراب کی بدبو نے مجھے اطلاع دے دی کہ وہ پوری طرح ہوش میں نہیں ہے۔ "ارے کون ہو تم؟ بولتے کیوں نہیں ہو؟ یہ کیا ہو رہا ہے یہاں؟" اُس نے جالاں کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"یہ چوکیدار کی گھر والی ہے سر۔ چوکیدار اچانک بیمار ہو گیا ہے۔ اسے لے کر حکیم کے پاس جا رہا ہوں۔"

"اچھا۔" اُس نے جالاں کو گھورا۔ "یہ ہے چوکیدار کی بیوی؟"

"ٹھیک ہے۔ تم حکیم کے پاس جاؤ۔ یہ ہمارے ساتھ جا کر ڈاک بنگلے میں کام کرے گی۔"

وہ جالاں کا پُرکشش حُسن دیکھ کر اپنے ساتھی کو بھی فراموش کر بیٹھا تھا جسکی تلاش میں وہ یہاں تک آیا ہوگا۔ اسکی ندیدی نظریں جالاں کے جسم سے ہٹنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ "چوکیدار کا تم علاج کراؤ۔ شاباش۔" وہ بدستور جالاں کی طرف دیکھتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا۔ "اس کی بیوی کو ہم سنبھال لیں گے۔" وہ جالاں کے اور قریب ہو گیا۔ میں نے جیرے کے جسم کو فرش پر لٹا دیا اور آنے والے کی طرف بڑھ کر اس کے اور جالاں کے درمیان کھڑا ہو گیا۔ وہ مجھے گھورنے لگا۔

"تو کیا چیز ہے بھئی؟" اسکی حقارت آمیز آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ "ہٹ جا سامنے سے۔"

"میں چوکیدار کا دوست ہوں جی۔" میں نے غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"تو پھر لے جا اُسے حکیم کے پاس۔ اس لڑکی کو یہیں چھوڑ جا۔"

"یہ میرے ساتھ جائے گی۔"

"تو اُس کا ماما لگتا ہے؟" اس نے مجھے جھڑکا۔ پھر اُسے گمشدہ ساتھی کا خیال آیا۔ "اور ہمارا یار کدھر گیا؟ ہوا کھانے کے لیے باہر نکلا تھا۔"

وہ نشے میں تھا اور اسے سمجھانا بجھانا ممکن نہ تھا۔ ابھی میں کوئی مناسب ترکیب سوچنے بھی نہیں پایا تھا کہ جالاں اُس کی پشت پر نمودار ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک بہت بڑے پتھر کا ٹکڑا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ پلٹ کر دیکھتا۔ جالاں نے پتھر سے وار اس کے سر پر کیا اور وہ کوئی آواز نکالے بغیر زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

جالاں نے بے اختیار بلند آواز سے ہنسنا شروع کر دیا۔ وہ اپنے قدموں میں پڑے ہوئے آدمی کو دیکھ رہی تھی اور زور زور سے قہقہے لگا رہی تھی۔ "میں نے جیرے کا بدلہ لے لیا۔ بدلہ لے لیا۔" اس سے پہلے کہ اسکی ہسٹریائی آواز اور بلند ہوتی میں نے اُس کا منہ دبوچ کر اسکی آواز کو پھیلنے سے روک لیا۔ اس نے بالکل مزاحمت نہیں کی لیکن ہنسی کی شدت سے اس کا پورا جسم ہل رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا ہو۔ معاً مجھے یہ خیال آیا کہ کہیں یہ اپنا ذہنی توازن تو نہیں کھو بیٹھی؟ یہ ایک انتہائی تشویشناک صورتِ حال تھی اور میری مشکلات میں اضافہ کا سبب بن سکتی تھی۔ لیکن چند ہی لمحے بعد جالاں کی ہنسی کم ہوتے ہوتے بالکل بند ہو گئی اور اسکی جگہ آنسوؤں نے لے لی۔

وہ چپ چاپ آنسو بہاتی رہی مگر اب اس کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ میں نے اسے احتیاط سے تھام کر ایک درخت کے تنے سے ٹکا کر بٹھا دیا اور خود زمین پر گرے ہوئے آدمی کی حالت کا جائزہ لینے کی غرض سے اس کے پاس جا کر جھک کر دیکھا۔ بھاری پتھر کی ضرب نے اس کا بھیجا نکال دیا تھا اور وہ مر چکا تھا۔ پریشانی اور خوف کے مارے میرا جسم پسینے پسینے ہو گیا۔ لیکن اب میرے پاس پریشان ہونے کی مہلت بھی نہیں تھی۔ جالاں کو خاموشی سے روتے ہوئے چھوڑ کر میں اپنے کام میں لگ گیا۔ جیرے اور دونوں اجنبی مہمانوں کی لاشوں کو اصطبل کے کھنڈر میں پہنچا کر میں نے مٹی۔ کوڑے کرکٹ اور خشک گھاس کے ڈھیر سے انہیں ڈھانپ دیا۔ اس ویران اور مسمار شدہ کھنڈر میں وہ تینوں سب کی نگاہوں سے محفوظ تھے۔ افسوس صرف اس بات کا تھا کہ میں جیرے کے لیے ان لوگوں سے علیحدہ کوئی قبر نہیں بنا سکا تھا حالانکہ وہ ایسے بُرے لوگوں کے ساتھ آخری آرام گاہ میں رہنے کا مستحق نہ تھا۔ لیکن میں مجبور تھا۔

قریباً ڈیڑھ گھنٹے کی مشقت کے بعد میں اس کام سے فارغ ہوا تو تھک کر چور ہو چکا تھا۔ جالاں ابھی تک اسی جگہ بے حس و حرکت بیٹھی ہوئی تھی جہاں میں اسے چھوڑ کر گیا تھا۔ اب میرے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ ڈاک بنگلے میں موجود لوگوں سے کیوں کر عہدہ برآ ہونے کی کوشش کروں اور ان دونوں کی ہلاکت پر کیسے پردہ ڈالوں؟ جیرا مجھے بتا چکا تھا کہ یہ لوگ جب بھی ڈاک بنگلے میں آیا کرتے ہیں۔ دو چار دن موج میلہ مناتے ہیں۔ میں اسی نکتے کو اپنا ذریعۂ نجات بنانا چاہتا تھا۔

جالاں کو میں نے ہاتھ تھام کر اُٹھایا اور کوارٹر میں لے گیا۔ اسے کمرے میں چھوڑ کر میں نے صحن میں جا کر غسل کیا اور جیرے کے کپڑے میرے کام آ گئے۔ اس طرح تازہ دم ہونے کے بعد میں نے ڈاک بنگلے کا رُخ کیا۔ وہاں کمرے میں ابھی تک روشنی جل رہی تھی۔ مسلسل دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد اندر سے ایک خوابیدہ آواز نے مجھے بُرا بھلا کہتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ یہ اُن کا تیسرا ساتھی تھا اور نشے اور نیند کے خمار میں ڈوبا ہوا تھا۔

"کیا بات ہے؟" اُس نے اَدھ کھلی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے ڈانٹا۔

"سر۔ وہ دونوں صاحب لوگ گاڑی میں بیٹھ کر چلے گئے ہیں۔ اُنہوں نے کہا ہے کہ وہ پرسوں صبح واپس آئیں گے۔"

"چلے گئے ہیں؟" اس نے حیرت سے سوال کیا۔ "مگر کیوں؟"

"کہتے تھے کوئی ضروری کام یاد آگیا ہے" میں نے معصومیت سے بہانہ بنایا۔
"پیسے بنانے کے سوا انہیں اور کیا کام ہے۔ بغنے کی اولاد۔ کبھی آرام سے عیش نہیں کرتے۔ ہر وقت بزنس۔ ہر وقت بزنس۔ جہنم میں ڈالو۔ چلے گئے تو چلے گئے۔ تم بھی دفع ہو جاؤ۔" اتنا کہہ کر اس نے دروازہ بند کر دیا ٹھیک یہ ترکیب کارگر ثابت ہوئی تھی اور اس رات پہلی بار مجھے سکون اور خوشی کا احساس ہوا۔

جالاں بدستور کمرے میں خاموش بیٹھی سامنے تک رہی تھی۔ بڑی مشکل سے میں اسے ہوش و حواس کی حقیقی دنیا میں لایا۔ وہ وقتی صدمے کے اثر سے نکلی تو اس نے تمام واقعہ سنایا۔ جیرے نے اسے گھر سے باہر نکلنے سے سختی کے ساتھ منع کیا تھا مگر وہ اسکے باوجود باہر نکل گئی۔ وہ باغ میں تازہ ہوا کھانے گئی تھی جہاں ایک بدمعاش کی نگاہ اس پر پڑ گئی اور وہ جالاں کو حاصل کرنے پر تل گیا۔ اسی اثنا میں جیرا آگیا اور بدمعاش کے قہر و غضب کا نشانہ بن گیا۔ جالاں نے بھاگنا چاہا مگر وہ اس کے پیچھے لگا رہا۔ اس نے جی جان سے اسکا مقابلہ کیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ میں جانتا تھا۔

اب میں تھا اور جالاں۔ میں نے وقتی طور پر ڈاک بنگلے میں موجود لوگوں کی توجہ دوسری طرف منعطف تو کرا دی تھی لیکن سوال یہ تھا کہ اب کیا ہوگا؟ دونوں گاڑیوں کی چابیاں میرے پاس تھیں جو میں نے جیرے سے حاصل کی تھیں۔ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ سامنے کوئی راستہ نظر نہیں آرہا تھا لیکن فی الحال سب سے بڑا مسئلہ یہاں سے نکلنا تھا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ جالاں کو ان حالات میں تنہا کیسے چھوڑ دوں؟ اور اگر اسے ساتھ لے جاؤں تو کیسے؟ سب سے پہلے میں نے جالاں کو نہا کر لباس تبدیل کرنے پر مجبور کیا۔ وہ بمشکل آمادہ ہوئی۔ کچھ دیر بعد وہ اچھے کپڑے پہن کر تیار تھی۔

جالاں کو میں نے کار میں بٹھایا تو اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا نہ کوئی سوال پوچھا۔ دوسری گاڑی کے دو پہیوں کی ہوا نکالنے کے بعد میں نے گاڑی کا سٹیئرنگ سنبھالا اور کچی سڑک پر گاڑی ڈال دی۔ قصبے تک کا راستہ میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ لیکن آبادی میں جانا میرے لیے انتہائی خطرناک تھا۔ ہرچہ بادا باد کہہ کر میں اس انجانے سفر پر گامزن ہو گیا۔ ہم دونوں خاموش سفر کرتے ہوئے اس جگہ پہنچ گئے جہاں سے ایک راستہ قصبے کو جاتا تھا۔ میں نے بلا سوچے سمجھے دوسری سڑک کا انتخاب کیا حالانکہ مجھے مطلق علم نہیں تھا کہ یہ راستہ کہاں جاتا ہے؟ کافی دور تک یہ سڑک ویران اور سنسان تھی لیکن بس کے بعد آبادی کے آثار نظر آنے لگے۔ اب صبح کی سپیدی پھیلنے لگی تھی اور آس پاس کا منظر واضح ہونے لگا تھا۔ غور سے دیکھنے پر میں اس راستے کو پہچاننے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ اس شہر کا نواحی علاقہ تھا جہاں میرا گھر تھا۔ جہاں میری بیوی تھی۔ جہاں میرا کاروبار تھا۔ جہاں میرا جگری دوست تھا۔ لیکن اب ان میں سے کوئی بھی میرا نہیں رہا تھا۔ سب اجنبی اور بیگانے بن گئے تھے۔ وہ سب ان جانے میں ایک مجرم کی سازش کا شکار ہو گئے تھے اور میرا فرض تھا کہ انہیں اس سے آگاہ کروں۔ خود میری اپنی بقا کے لیے یہ ضروری تھا کہ انہیں صحیح صورتِ حال اور اصلیت کا علم ہو لیکن کیسے؟ یکایک ایک بجلی سی کوندی اور ایک خیال نے میرا ذہن روشن کر دیا۔ میرا ہم شکل اس وقت گھر پر موجود نہ تھا اور روزی اکیلی تھی۔ یہ میرے لیے بہترین موقعہ تھا۔ مجھے اس کا خیال پہلے کیوں نہ آیا؟ مگر مجھے مہلت ہی کب ملی تھی۔ پے در پے ناگہانی آفات نے مجھے بوکھلا کر رکھ دیا تھا لیکن جالاں میرے ساتھ تھی۔ اس کو ساتھ لے کر میں روزی کے پاس نہیں جا سکتا تھا۔ جیسے جیسے میرا ذہن الجھ رہا تھا کار کی رفتار خود بخود آہستہ ہونے لگی تھی۔ یکایک میں نے ایک قدرے بلند جگہ پر ایک ہوٹل کا بورڈ دیکھا اور بے اختیار کار کا رُخ اس عمارت کی طرف ہو گیا۔ یہ لبِ سڑک دس بارہ کمروں پر مشتمل ایک مختصر سا ہوٹل تھا جو خاص طور پر کار کے ذریعے سفر کرنے والوں کے آرام لینے کے لیے بنایا گیا تھا۔ عمارت کے سامنے دو تین کاریں کھڑی ہوئی تھیں۔ میں نے بھی

ایک درخت کے نیچے کار روک دی۔ جالاں اس دوران میں سو گئی تھی۔ میں نے ناقدانہ نگاہوں سے اس کا جائزہ لیا۔ وہ پھولدار شلوار اور قمیص پہنے ہوئے تھی اور اس کے بال جو پوری طرح خشک نہیں ہوئے تھے۔ شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کا دُھلا دُھلا چہرہ صبح کاذب کی روشنی میں انتہائی جاذبِ نظر تھا۔ اسے بے خبری سے سوتے ہوئے دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ گزشتہ چند گھنٹوں میں وہ کیسی اذیت اور پریشانیوں سے دوچار ہو چکی ہے۔ وہ ہر چیز سے بے نیاز بالکل بے خبر سو رہی تھی۔

میں کار سے نکل کر ہوٹل کے اندر گیا چھوٹے سے کمرے میں ایک بیرہ نما آدمی میز پر سر رکھے سو رہا تھا۔ میں نے جھنجھوڑ کر اسے جگایا اور ایک خالی کمرے کے بارے میں پوچھا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ میز کی دراز سے ایک چابی نکال کر وہ ایک معمول کی طرح میرے آگے آگے چل پڑا۔

"آپ اکیلے ہیں سر جی؟" اس نے سوئی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"نہیں میری مسز بھی ساتھ ہیں۔"

"کوئی بات نہیں جناب۔ ہمارے ہوٹل میں فیملیوں کے لیے بہت اچھا انتظام ہے سر جی۔ یہ دیکھیے آپ کا کمرہ" وہ ایک کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔ کمرہ معمولی سا تھا۔ صفائی بھی زیادہ اچھی نہیں تھی مگر اطمینان کی بات یہ تھی کہ اس میں دو الگ الگ بیڈ تھے۔ "وَن نمبر کمرہ ہے سر جی۔ آپ کا سامان کدھر ہے؟"

"اس کی فکر مت کرو اور چابی مجھے دو۔"

وہ میرے لہجے کی کرختگی سے گھبرا گیا اور چابی میرے حوالے کر دی۔ "رجسٹر بھی پُر کر دیں" وہ ڈرتے ڈرتے بولا۔

"اس وقت بہت نیند آرہی ہے۔ میں کہیں بھاگ تو نہیں رہا۔ صبح کر دوں گا اور دیکھو۔ جب تک میں خود نہ بلاؤں کوئی مجھے نہ جگائے۔ سن لیا؟"

"بالکل سر جی۔" وہ خاصا مرعوب ہو چکا تھا۔ واپس جاتے ہوئے بھی وہ مڑ مڑ کر مجھے دیکھتا رہا۔ میں برآمدے کے دوسرے دروازے سے باہر نکلا۔ کار زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ جالاں کو جگانے کے لیے مجھے خاصی محنت کرنی پڑی۔ جب میں اس کا بازو تھام کر کمرے کی طرف لے گیا۔ اس وقت بھی وہ قریب قریب سو رہی تھی۔

کمرے میں ایک بیڈ پر اسے لٹانے کے بعد میں نے اس کا جائزہ لیا۔ وہ فوراً گہری نیند میں کھو گئی تھی اور دنیا و مافیہا سے بے خبر اور بے سُدھ لیٹی ہوئی تھی۔ وہ واقعی ایک دلکش اور خوش اندام لڑکی تھی اور یہی اس کی سب سے بڑی بدنصیبی تھی۔ اس کا گداز اور متناسب جسم جو اس کی خوبی بن سکتا تھا اس کے لیے بہت بڑا عذاب بن گیا تھا۔ مخالف صنف کا اسے دیکھ کر بہک جانا تعجب انگیز نہ تھا۔ میں نے بستر سے چادر اٹھا کر اسے اُوڑھا دی۔ مجھے اطمینان تھا کہ وہ کم از کم پانچ گھنٹے سے پہلے بیدار نہیں ہو گی۔ پھر بھی اس جیسی فتنہ ساماں لڑکی کو ایک اجنبی مقام پر تنہا چھوڑ کر جانا مناسب نہ تھا، لیکن اس کے سوا کوئی اور چارہ بھی نہ تھا۔ خاموشی سے کمرے سے باہر نکلنے کے بعد میں نے باہر سے دروازہ مقفل کر دیا اور دبے پاؤں چلتا ہوا کار تک پہنچ گیا۔ ہوٹل کا بیرہ نما منیجر یقیناً دوبارہ میز پر سر رکھ کر سو گیا ہو گا۔ اس نے میری کار بھی نہیں دیکھی تھی۔ نہ وہ میری روانگی سے واقف تھا۔ میں نے کار کو تیزی سے ریورس کیا اور پختہ سڑک پر جانے بوجھے راستے پر روانہ ہو گیا۔ بیس منٹ کے بعد میں اپنے گھر کے گرد و نواح میں تھا۔ یہ وہی راستے تھے جن پر سے میں بارہا گزرا تھا، لیکن آج میں ایک اجنبیت اور بے چینی سی محسوس کر رہا تھا۔ میرے گھر کا گیٹ میری نگاہوں کے سامنے تھا۔ میں نے کار ایک سمت روک دی۔ جی تو چاہتا تھا کہ بے اختیار کود کر گھر میں داخل ہو جاؤں مگر پھر کار کو کچھ فاصلے پر ایک درخت تلے روک کر میں اپنے گھر کی طرف بڑھا۔ علی الصبح کا وقت تھا اور اس علاقے میں اتنے سویرے مکین عموماً سوتے رہتے ہیں۔

اس لیے میرا کسی سے سامنا نہیں ہُوا۔ مَیں تیزی سے گیٹ کھول کر اندر داخل ہُوا مگر اچانک ٹھٹھک کر رُک گیا سامنے مالی ایک کیاری کو دُرست کرنے میں مصروف تھا۔

"سلام صاحب جی" اس نے مُسکرا کر کہا تو میرے دَم میں دَم آیا۔

ظاہر ہے کہ وہ مجھے مکان کا اصلی مالک سمجھ رہا تھا۔ وہ صبح کے وقت پارٹ ٹائم کام کر کے چلا جاتا تھا اور اسے شاید یہ علم بھی نہیں تھا کہ گھر کا مالک کہیں باہر گیا ہُوا ہے۔ مَیں نے سر ہلا کر سلام کا جواب دیا اور پورچ کی طرف بڑھ گیا۔ میری کار موجود نہیں تھی، لیکن شوکت کی کار کو پورچ میں دیکھ کر مجھے حیرت سی ہُوئی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ شوکت بھی گھر کے اندر موجود تھا۔ ایک لحاظ سے یہ بہتر بھی تھا۔ روزی اور شوکت دونوں کو مَیں اصلیت سے آگاہ کرنے کا خواہش مند تھا، لیکن ان دونوں کو فرداً فرداً ہم خیال بنانا زیادہ آسان ہوتا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ ممکن ہے شوکت اندر موجود نہ ہو۔ اسکی عادت تھی کہ وہ بارہا اپنی کار میرے گھر پہ چھوڑ کر چلا جایا کرتا تھا۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ وہ میرے ہم شکل کے ساتھ شہر سے باہر گیا ہُوا ہو؟ پھر بھی احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ مَیں عام راستے سے اندر نہ جاؤں۔ مکان کی پچھلی جانب پہنچ کر مَیں عقبی لوہے کی گول سیڑھیوں کی مدد سے اوپر پہنچا تو پچھلا دروازہ بند تھا۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ دروازے اور چوکھٹ کے درمیان میں مختصر فاصلہ ہے جس میں انگلی یا قلم ڈال کر مَیں بارہا چٹخنی کھول چکا تھا۔ اس بار بھی مَیں نے یہی طریقہ اختیار کیا۔ چٹخنی کسی آواز کے بغیر کُھل گئی اور مَیں آہستگی سے دھڑکتے ہُوئے دل کے ساتھ مکان کے اندر داخل ہو گیا۔ ایک مختصر سے برآمدے سے گزرنے کے بعد میرا کمرہ تھا جبکہ روزی کا بیڈ روم نیچے تھا۔ گیلری نما برآمدے سے گزر کر مَیں ڈرائنگ روم کی سیڑھیوں پہ پہنچ گیا۔ یہ میرا اپنا گھر تھا، لیکن میرا دل نہایت تیزی سے دھڑک رہا تھا اور ٹانگوں میں لرزش سی تھی۔ ایک انجانے خوف کے تحت میں پھونک پھونک کر قدم اُٹھاتا ہُوا کشادہ سیڑھیوں سے اُتر کر ڈرائننگ روم میں پہنچ گیا۔ مختصر سی راہداری عبور کرنے کے بعد روزی کا کمرہ تھا۔ روزی، جو میری بیوی تھی۔ جو میری ہمراز اور شریکِ غم تھی۔ جو میری بہترین دوست اور ساتھی تھی۔ جو میری تمام خامیوں کمزوریوں اور مجبوریوں کے باوجود مجھ سے بے پناہ پیار کرتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ جس وقت مَیں اس کے سامنے پہنچوں گا اور اپنی آپ بیتی سُناؤں گا تو وہ مچل جائے گی۔ پشیمانی سے آنسو بہائے گی اور مجھے اپنی بانہوں میں سمیٹ کر اُن تکلیفوں اور عذابوں کی تلافی کرنے کی کوشش کرے گی جو نادانستگی میں وہ مجھے پہنچا چکی تھی۔

میرے دِل کی دھڑکن قابو سے باہر ہوتی جا رہی تھی۔ میرے قدم کانپ رہے تھے۔ جسم سُن ہو رہا تھا۔ دبے قدموں سے چلتا ہُوا مَیں روزی کے بیڈ روم کے دروازے تک پہنچ گیا۔ چند لمحے مَیں نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی اور پھر دستک دینے کے لیے اپنا کانپتا ہُوا ہاتھ اُٹھایا۔ اچانک کمرے کے اندر سے روزی کی کھلکھلاتی ہُوئی ہنسی کی آواز بلند ہُوئی اور میرا ہاتھ فضا میں معلق رہ گیا۔ ناگاہ مجھے اپنی حماقت کا احساس ہُوا۔ مَیں محض ایک مفروضے کے تحت اتنا بڑا خطرہ مول لے کر یہاں تک آ گیا تھا اور مَیں نے یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی کہ بہت ممکن ہے اس اثناء میں میرا ہمشکل واپس آ چکا ہو۔ روزی کی بے ساختہ کھلکھلاتی ہوئی رسیلی ہنسی کی آواز اسی وقت بلند ہوتی تھی جب وہ مجھ سے باتیں کرتی تھی۔ ظاہر ہے کہ اندر وہ اپنے نام نہاد شوہر کے ساتھ ہنسنے بولنے میں مصروف ہے کیونکہ تنہا عورت کو اتنی زور زور سے قہقہے لگانے کی کیا ضرورت پیش آ سکتی ہے؟ میرے شُبے کی تصدیق بھی دوسرے ہی لمحے ہو گئی جب ایک مردانہ آواز بھی روزی کی ہنسی میں شامل ہو گئی۔ مگر یہ میرے ہم شکل ٹونی کی آواز نہیں تھی۔ تو پھر وہ کون شخص تھا جو روزی کے بیڈ روم میں موجود تھا؟

مَیں نے کی ہول سے جھانکنے کی کوشش کی اور میری آنکھوں نے جو منظر دیکھا، اس کا مَیں کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کمرے کے اندر روزی اور شوکت انتہائی بے تکلفانہ ماحول میں یکجا تھے۔ مَیں سناٹے میں رہ گیا مجھے اپنی

آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس وقت مجھے پہلی بار اپنی حماقتوں کا احساس ہُوا۔ برف باری کی وہ رات مجھے یاد آئی جب مَیں نے رات کے وقت کسی سائے کو اپنے ڈرائنگ روم سے باہر نکلتے ہُوئے دیکھا تھا اور ایک سفید کار میرے گھر کے باہر کھڑی تھی۔ میری نگاہوں کے سامنے سے تمام پردے ایک ایک کر کے ہٹنے شروع ہو گئے۔ روزی اور شوکت اُس وقت بھی میری آنکھوں میں دُھول جھونک رہے تھے اور میری بے خبری اور بے خیالی کے علاوہ میرے اعتبار کا فائدہ اُٹھاتے ہُوئے پیار کا ناٹک کھیل رہے تھے۔ وہ سایہ جو میرے گھر سے نکلا تھا شوکت کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر یہ عقدہ بھی حل ہو گیا کہ جب مَیں نے اس نامعلوم شخص کا تعاقب کرنے کی کوشش کی تو میری گردن پر کسی بھاری چیز سے ضرب لگا کر مجھے بیہوش کرنے والی ہستی میری عزیز ترین بیوی روزی کے سوا اور کوئی نہیں تھی۔ وہ شخص جسے مَیں اپنے بہترین دوست، ساتھی اور بھائی کی طرح عزیز رکھتا تھا۔ دراصل مارِ آستین تھا۔ وہ چُپکے چُپکے میرے اعتبار کی مضبوط دیوار میں نقب لگا رہا تھا اور میری محبوب بیوی روزی اس جُرم میں اس کے ساتھ برابر کی شریک تھی۔ ان دونوں کی باہمی قربت دیکھ کر کوئی یہ اندازہ بھی لگا سکتا تھا کہ وہ عرصہ دراز سے ایک دوسرے کے قریب نہیں ہیں۔ ان کی ہر حرکت سے ایک والہانہ پن ہویدا تھا۔ روزی پیار کے نشے میں ڈوبی ہُوئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ زندگی میں صرف ایک ہی شخص کے لیے پیدا ہُوئی ہے اور وہ اس وقت اس کے نزدیک موجود تھا۔

روزی نے لگاوٹ سے ایک انگڑائی لی اور ہنسی میں ڈوبی ہوئی آواز میں شوکت سے مخاطب ہُوئی: "وہ دونوں اپنے آپ کو بہت چالاک اور عقلمند سمجھتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کو یقین ہے کہ مَیں صرف اسی کے لیے بنی ہوں۔ مگر ان کے فرشتوں کو بھی پتہ نہیں لگ سکا کہ یہ سب مقصد کو حاصل کرنے کا ایک ذریعہ تھا۔ ہم دونوں کا پیار امر ہے شوکت۔"

شوکت نے کروٹ لی اور اُٹھ کر بیٹھ گیا "روزی۔ سیانا کوا ہی گندگی پر گرتا ہے۔ ٹونی نے ساری دُنیا کو لُوٹا اور بیوقوف بنایا مگر وہ احمق آج تک یہ نہیں جان سکا کہ اسے آج تک مَیں نے ہی اپنا آلۂ کار بنایا ہے۔"

روزی پھر ہنس پڑی اور اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر بولی "شوکی ڈیئر۔ تم نے بہت لمبا پلان بنایا۔ پہلے ٹونی سے دوستی نکالی۔ پھر اس کا ہم شکل ڈھونڈا۔ دولوں کے پیسے کتے کے ایک جیسے دو پلّے حاصل کیے۔ ایک کو ٹونی نے پالا اور دوسرا یوسف کے پاس۔ پھر تم نے بڑی کامیابی سے یوسف کو میری محبت کے جال میں پھانسا اور اس گدھے کو میری وفا اور پیار کا یقین دلایا۔"

"وہ پھر بھی نہیں مانتا تھا۔ اگر مَیں نے عاشی کا پتہ نہ کاٹ دیا ہوتا تو وہ کبھی تمہارے قابو نہ آتا۔"

"وہ تو آج بھی عاشی کا دَم بھرتا ہے۔ اس ڈیم فول کو یہ خبر ہی نہیں ہُوئی کہ مَیں نے اس سے محبت اور وفا کا ڈھونگ رچایا ہُوا ہے۔"

"عاشی اور یوسف کے درمیان بدگمانی اور فاصلہ پیدا کرنا بہت مشکل تھا روز ڈارلنگ، لیکن جب تک تم اس کی زندگی میں داخل نہ ہوتیں وہ ہمارے قابو نہیں آ سکتا تھا۔ اُدھر ٹونی کو اگر تمہارے لَو کا یقین نہ ہوتا تو وہ بھی ہمارے جال میں نہ آتا۔ مَیں نے دو سال پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ یوسف کی جگہ ٹونی کو دِلا کر ہم عمر بھر عیش کر سکتے ہیں۔"

"مگر اب یوسف ہے کہاں اس کا بنے گا کیا؟" روزی نے لاڈ سے پوچھا۔

"یا تو کسی گینگ کے ہاتھوں مارا جائے گا۔ یا پولیس کے چنگل میں پھنس جائے گا۔ اور جب اس کا کانٹا نکل جائے گا تو ہم ٹونی کو بھی....." اُس نے ہنستے ہُوئے ہاتھ سے قتل کر دینے کا اشارہ کیا۔ روزی خوشی سے بے قابو ہو کر ہنستی ہُوئی اس پہ گر گئی۔

"تم ماسٹر مائنڈ ہو ڈارلنگ۔ تمہاری عقل کی تعریف دُشمن بھی کرتے ہیں۔"
شوکت سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور سنجیدگی سے بولا "روزی یہ سب کچھ ٹھیک ہے۔ کامیابی ہمارے قدموں میں ہے۔ دُشمن ہماری ٹھوکر پہ ہیں۔ مگر تم اندازہ لگا سکتی ہو کہ تمہیں لوٹی یا یوسف کے پہلو میں دیکھ کر میرے دِل پہ کیا گزرتی ہو گی۔"

"بائی گاڈ۔ اس سے بڑی ہمت اور کیا ہو سکتی ہے۔"

"اور بے غیرتی بھی۔" مَیں نے دِل ہی دل میں دُہرایا۔

روزی اور شوکت کی اصلی شکل و صورت میرے سامنے آگئی تھی۔ خدایا۔ مَیں کتنا بڑا احمق ہوں۔ کتنا سادہ لوح اور کم عقل تھا۔ مَیں کھرے کھوٹے میں تمیز نہیں کر سکا۔"

یکایک میری چھٹی حس نے مجھے کسی خطرے سے خبردار کر دیا تو مَیں بے اختیار کی ہول سے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ سامنے سیڑھیوں پر نظر پڑی تو میرے جسم کے تمام رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ سیڑھیوں پہ نہایت خونخوار انداز میں دانت نکالے ہُوئے ٹائیگر کھڑا غرّا رہا تھا۔ یہ میرا ٹائیگر نہیں تھا۔ وہ ٹائیگر تھا جسے لوٹی نے پالا تھا۔ وہ میرا نہیں لوٹی کا وفادار تھا۔ اس خوفناک کتّے کے سامنے مَیں نہتا کھڑا تھا اور وہ مجھ پر جَست لگانے کے لیے تیار تھا۔ ہم دونوں چند لمحے ایک دوسرے کے آمنے سامنے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑے رہے۔ پھر اچانک اس کا بھاری بھرکم جسم حرکت میں آیا اور اس نے بھونکتے ہُوئے سیڑھیوں پر سے مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ مَیں پھُرتی سے دوسری طرف ہو گیا اور وہ ایسے زوردار دھماکے کے ساتھ قالین پر گرا کہ سارا مکان لرز اُٹھا۔ اندر سے روزی کی چیخ کی آواز سنائی دی۔ مَیں دیوار سے پیٹھ لگائے کھڑا تھا اور ٹائیگر بے تحاشا بھونکتا ہُوا میری طرف لپک رہا تھا۔ مَیں نے کارنس پر رکھا ہُوا کانسی کا بھاری مجسّمہ اُٹھایا اور ٹائیگر پر دے مارا۔ اگر اس کے سر پہ لگتا تو وہ پاش پاش ہو جاتا مگر ٹائیگر اپنی جگہ سے اُچھل چکا تھا اس لیے مجسّمہ اس کے جسم کے پچھلے حصّے سے ٹکرایا۔ وہ تکلیف سے بلبلا اُٹھا۔ اتنی دیر میں روزی کے بیڈ روم کا دروازہ کھُلا۔ وہ گاؤن پہنتی ہُوئی شوکت کے عقب میں نمودار ہُوئی مگر اتنی دیر میں مَیں نے دیوار پہ سجی ہُوئی بندوق اُتار کر اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ ٹائیگر پھر مجھ پر حملہ آور ہونے کے لیے بڑھ رہا تھا۔ یہ راز صرف مَیں ہی جانتا تھا کہ اس بندوق میں ایک گولی ہمیشہ محفوظ رہتی ہے۔ مَیں نے اتفاقی حادثات کا مقابلہ کرنے کے لیے یہ ترکیب سوچی تھی جو آج میرے کام آگئی۔ ٹائیگر اُچھل کر میری طرف آیا مگر زوردار دھماکہ ہُوا اور بندوق کی گولی اس کے جسم کے پار ہو گئی۔ وہ درمیان ہی میں فضا سے فرش پر گر گیا۔ روزی اور شوکت حیرت زدہ یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ اُنہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ میری آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا۔ مَیں نے بندوق تان کر دوبارہ فائر کیا، لیکن بندوق میں صرف ایک ہی گولی تھی جس نے ٹائیگر کا کام تمام کر دیا تھا۔ مَیں جوشِ غضب میں یہ حقیقت فراموش کر بیٹھا تھا۔ مَیں نے خالی بندوق کی طرف دیکھا اور اسی موقعے سے فائدہ اُٹھا کر اُن دونوں نے کمرے میں گھُس کر دروازہ لاک کر لیا۔ مَیں دیوانہ وار دروازے کی طرف لپکا مگر اتنی دیر میں مکان میں جاگ پڑ گئی تھی۔ نوکروں کے بولنے اور شور مچانے کی آوازیں میرے کانوں میں آرہی تھیں۔ چند ہی لمحوں میں وہ مجھ تک پہنچنے والے تھے۔ بندوق سنبھالے ہُوئے مَیں سیڑھیوں کی طرف لپکا اور تیزی سے اسی عقبی راستے کی طرف بھاگا جس سے اندر داخل ہوا تھا۔

نوکر اس وقت ڈرائنگ روم میں پہنچے جب مَیں چکّردار آہنی سیڑھی سے نیچے اُتر رہا تھا۔ یہ سب لوٹی کے رکھے ہُوئے ملازم تھے۔ اُس نے میرے تمام نوکروں کو جواب دے کر اپنے آدمی متعیّن کیے تھے۔ سیڑھیوں سے اُتر کر مَیں کار کی طرف بھاگا۔ اسی وقت ایک مستعد چوکیدار نما ہٹا کٹا مسلّح شخص نمودار ہُوا اور للکارتا ہوا میری طرف بڑھا۔

مَیں اس کی طرف پلٹا تو وہ ٹھٹھک کر رہ گیا۔ غالباً وہ مجھے لوٹی سمجھا تھا۔ یہی ایک لمحہ میرے لیے کافی تھا۔ مَیں نے نالی کی طرف سے پکڑ کر بندوق گھمائی جو اس کے سر سے ٹکرائی۔ کسی چیز کے چٹخنے کی آواز اور اسکی چیخ کی آواز آپس میں یکجا ہو گئیں۔ مَیں نے اس کو گرتے ہُوئے بھی نہیں دیکھا اور گولی کی طرح کار تک پہنچ گیا۔ جب تک دوسرے ملازم مکان سے باہر نکلے میری کار اگلے چوراہے تک پہنچ چکی تھی۔ وہ شوکت کی کار کی چابیاں ہی ڈھونڈتے رہ گئے ہوں گے۔ مگر مَیں وقت سے فائدہ اُٹھا کر مختلف موڑ کاٹتا ہُوا دوبارہ اُسی ہوٹل کی طرف اُڑا جا رہا تھا۔ یہ راستے میرے جانے پہچانے تھے۔ اس لیے ہیر پھیر کے ساتھ اس علاقے سے صاف بچ کر نکل جانے میں مجھے ذرا بھی دقّت پیش نہیں آئی۔

مَیں ہوٹل پہنچا تو وہاں کسی قسم کی گہما گہمی ابھی تک پیدا نہیں ہوئی تھی۔ صبح کے چھ بجے ایسے ہوٹلوں میں لوگ سو کر نہیں اُٹھتے۔ دراصل لمبے سفر کی وجہ سے تھکے ہُوئے ہوتے ہیں اس لیے آرام سے سو کر اُٹھتے ہیں۔ اگلا سفر بھی اُنہیں اپنی سواری کے ذریعہ ہی کرنا ہوتا ہے اس لیے وقت کی پابندی بھی ضروری نہیں ہوتی۔ بہرحال یہ خاموشی اور ویرانی میرے لیے مُفید ثابت ہوئی۔ مَیں نے آرام سے کار درخت کے نیچے پارک کی اور سائیڈ کے دروازے سے گزر کر برآمدے میں پہنچ گیا۔ یہ گیلری بھی سنسان تھی۔ چنانچہ کمرے کا تالا کھول کر مَیں اندر داخل ہوا تو یہ امر اطمینان بخش تھا کہ یہاں کسی کو میری آمدورفت کا علم نہیں ہو سکا تھا۔ جالاں اسی کروٹ سوئی ہوئی تھی جس طرح مَیں اُسے چھوڑ کر گیا تھا بلکہ سوتے میں اس نے اپنے بازو چادر سے باہر نکال لیے تھے اور رعنائی کی تصویر بنی سو رہی تھی۔ مَیں بر اَبر کے بیڈ پہ گر گیا۔ جسمانی سے زیادہ ذہنی اور اعصابی جدوجہد نے مجھے تھکا دیا تھا۔ آج جو انکشافات ہُوئے تھے اُنہوں نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ مَیں جس بیوی کے لیے پریشان تھا وہی میرے تمام مصائب و آلام کا سبب تھی۔ میرا بہترین دوست جس پہ مَیں نے خود اپنی ذات سے زیادہ بھروسہ کیا تھا۔ میرا بدترین دشمن نکلا تھا۔ یہ وہ شخص تھا جس نے میرے لیے بربادی، رسوائی اور ذلت کا سامان فراہم کیا تھا۔ جس عورت کو مَیں مہر و وفا کی پتلی سمجھ رہا تھا۔ وہ حقیقت میں ایک بیسوا سے بھی زیادہ سستی اور آوارہ پیشہ ور نکلی تھی۔ مجھے عاشی سے جانے بُوجھے منصوبے کے تحت دُور کیا گیا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ مَیں روزی کی تمام تر اداکاری کے باوجود عاشی کا تصوّر اور اس کا پیار اپنے دل سے نہیں نکال سکا تھا۔ مجھ سے اس کو جو شکایت تھی وہ ان میں بالکل حق بجانب اور سچّی تھی۔ روزی اور شوکت کی ملی بھگت نے میری آنکھوں پر پٹّی باندھ دی تھی اور لوتا اور لوٹی جو جرائم کی دُنیا کا بادشاہ اور اوّل درجے کا چالاک شخص تھا وہ بھی اِن دونوں کی سازش کا شکار ہو چکا تھا۔ اگرچہ مَیں جس مقصد سے اپنے گھر گیا تھا وہ پورا نہیں ہو سکا تھا لیکن میرا یہ سفر میری زندگی کا مُفید ترین کارنامہ ثابت ہوا تھا۔ آج اگر مَیں وہاں نہ جاتا تو یہ تمام حقائق مجھے شاید زندگی بھر معلوم نہ ہوتے۔

مَیں نے اپنے جذبات کو سنبھالنے کی کوشش کی اور موجودہ صورتِ حال کا جائزہ لیا۔ مَیں اس وقت ایک ایسا شکار تھا جس کے لیے سارے جنگل میں کوئی جائے پناہ نہیں تھی۔ خونخوار جنگلی درندوں کے علاوہ شکاریوں کی ایک ٹولی بھی جس کی گھات میں تھی۔ میرے لیے اتنی بڑی دُنیا میں کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ نہ کوئی میرا ہمدرد اور دوست تھا۔ غسلخانے میں جا کر مَیں نے تازہ شاور سے غسل کیا اور بہت عرصے بعد نماز کے لیے خدا کے حضور میں سربسجود ہو گیا۔ مَیں خواہ کتنا ہی گنہگار، قصوروار اور مذہب سے برگشتہ انسان تھا۔ پھر بھی رسولؐ کی اُمّت میں تھا اور خداوند تعالےٰ کا حقیر بندہ تھا۔ نماز پڑھ کر مجھے دلی سکون اور طمانیت کا احساس ہُوا۔ مَیں نے آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ میرے چہرے پر شیو بڑھ آیا تھا اور میلے کچیلے شلوار قمیص میں مجھ پر ایک گھٹیا سے مزدور کا گمان گزرتا تھا۔ میری جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں تھا۔ سب سے پہلے مجھے اپنا حلیہ اور لباس بدلنا تھا اور اس کے

بعد کچھ رقم کا بندوبست بھی ضروری تھا۔ مستقبل میں کون سے واقعات اور آزمائشیں میری منتظر ہیں؟ اس کا مجھے مطلق علم نہ تھا۔ اس لیے بھی ضروری تھا کہ میرے پاس کچھ نقد روپیہ ہو۔ پھر جالاں کی اضافی ذمہ داری بھی مجھ پر عائد ہو گئی تھی۔ سوچتے سوچتے میں بستر پر لیٹ گیا اور چند ہی لمحے بعد میری آنکھ لگ گئی۔ بیدار ہوا تو دن کے ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ گویا میں قریباً ڈھائی گھنٹہ سویا تھا، لیکن بیدار ہوتے ہی میں نے آئندہ لائحہ عمل سوچ لیا تھا۔ نو بجے تک آدھا گھنٹہ میں نے انتہائی بے چینی کے عالم میں گزارا۔ نو بجتے ہی میں نے اپنے دفتر فون ملوایا اور اپنی سیکرٹری مس نزہت سے بات کی۔ وہ ٹھیک نو بجے اپنی میز پہ پہنچ جاتی ہے اور اس وقت بھی چاق وچوبند اور مستعد وہاں موجود تھی۔

"ہیلو نزہت۔ کیسی ہو؟"

وہ میری آواز پہچان گئی: "تھینک یو سر۔ آپ کب واپس آئے؟"

"رات ہی پہنچا ہوں" میں نے بات بنائی: "اچھا دیکھو نزہت۔ مجھے فوری طور پہ پندرہ بیس ہزار روپیہ چاہیئے۔ نقد۔ ابھی مل سکتا ہے؟"

"سر آپ کو تو معلوم ہے کہ اب شوکت صاحب کے پاس لاکر کی چابی ہوتی ہے۔ جب تک وہ نہ آجائیں.....؟"

"کوئی بات نہیں" میں نے بظاہر بے پروائی سے کہا ـــ "تم ایک چیک بنا کر بھیج دو....."

"سوری سر۔ آپ بھول گئے: پرسوں سے بنک اکاؤنٹ پر آپ دونوں کے دستخط ضروری ہو گئے ہیں۔ اس کے لیے بھی شوکت صاحب کی آمد کا انتظار کرنا پڑے گا"

میں دانت پیس کر رہ گیا۔ شوکت نے اپنا تسلط اور قبضہ مکمل کر لیا تھا۔

"سر" نزہت کی آواز سنائی دی: "جیسے ہی شوکت صاحب دفتر آتے ہیں آپکو کیش بھجوا دوں گی"

"ٹھیک ہے" میں نے فون بند کرنے کا ارادہ کیا۔

"سوری سر۔ ایک بات اور کہنی تھی"

"ہاں کہو"۔

"سر پچپن ہزار کا جو چیک کل ہم نے بنک بھجوایا تھا۔ وہ انہوں نے کیش نہیں کیا۔ شوکت صاحب کے سائن تو ٹھیک ہیں مگر وہ آپ کے دستخط دوبارہ کروانا چاہتے ہیں"

"چیک اُنہوں نے واپس بھجوا دیا ہے؟" میں نے اپنی خوشی پر قابو پانے کی کوشش کی۔

"جی نہیں۔ میں آج واپس منگوا لوں گی"

"نہیں۔ تم رہنے دو۔ میں منیجر سے بات کر لوں گا۔ اوکے؟" یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا اور قریب قریب بھاگتا ہوا کمرے سے نکل کر کار کی طرف دوڑا۔ میرا بنک یہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ دس منٹ بعد میں منیجر کے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر کھڑا ہو گیا:

"گڈ مارننگ سر۔ آج اتنے سویرے سویرے....."

"قریشی صاحب کتنے افسوس کی بات ہے کہ آپ نے میرے دستخطوں پر اعتراض کر دیا" میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"سوری سر۔ ہم نئے قاعدوں کے پابند ہیں۔ کوئی افسر یہ ذمہ داری لینا نہیں چاہتا۔ میں آپ سے معافی چاہتا ہوں لیکن آپ بھی پلیز ذرا احتیاط کیا کریں۔ وہ چیک میں واپس بھجوا رہا ہوں"

"اس کی ضرورت نہیں ہے" میں نے بڑے سکون سے کرسی سے ٹیک لگا دی: "چیک منگوائیے۔ میں ابھی دوبارہ

سائن کر دیتا ہوں"

مجھے معلوم تھا کہ ٹونی یا شوکت ابھی میرے دستخطوں کی مکمل نقل کرنے میں سو فیصد کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔ منیجر نے میرے لیے کافی منگوائی اور میں نے چیک پر دوبارہ سائن کر دیئے۔ دو منٹ بعد پچپن ہزار روپے میرے سامنے رکھے ہوئے تھے۔ جو موجودہ حالات میں میرے لیے لاکھوں سے زیادہ قیمتی اور کارآمد تھے۔

"معافی چاہتا ہوں سر۔ کوشش کروں گا آئندہ آپ کو شکایت کا موقع نہ ملے" منیجر نے دروازے تک رُخصت کرتے ہوئے ایک بار پھر معذرت کی اور میں اپنی خوش نصیبی اور اس حُسنِ اتفاق کے لیے خدا کا شکر ادا کرتا ہوا بنک سے باہر نکل گیا۔

راستے میں اپنے لیے کچھ کپڑے، جالاں کے لیے چند ریڈی میڈ لباس جوتے۔ ضروری سامان اور ایک چھوٹا سوٹ کیس خریدنے کے بعد میں ہوٹل پہنچا تو جالاں بدستور سو رہی تھی۔ میں نے سوٹ کیس میز پر رکھ دیا اور اسے جگانے کے لیے پکارا۔ مگر وہ بے سدھ سوئی پڑی تھی۔ میں نے نزدیک جا کر اسے پکارا۔ خدا جانے یہ حالات کا فرق تھا یا میری ذہنیت کا۔ ہر بار مجھے جالاں پہلے سے زیادہ حسین اور پُرکشش معلوم ہوتی تھی۔ اس وقت وہ کسی مصوّر کی تصویر کا نمونہ پیش کر رہی تھی۔ جس پر "حُسنِ خوابیدہ" کا عنوان بالکل موزوں اور مناسب ہوتا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اسے چھُوا تو وہ بیدار ہو گئی۔ کچھ دیر وہ اجنبیوں کی طرح مجھے تکتی رہی پھر ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گئی بے اختیار اس نے چادر اپنے جسم کے گرد سمیٹ لی اور خود بھی سمٹ گئی۔ اس کے بکھرے بکھرے بال اور سُرخی مائل بڑی بڑی آنکھیں اس کے کھلتے ہوئے گندمی رنگ پر بہت بھلی لگ رہی تھیں۔

"بہت دیر ہو گئی۔ اب تم جلدی سے تیار ہو کر کپڑے بدل لو"

"کپڑے!" اُس نے مجھے یوں دیکھا جیسے میں اپنا ذہنی توازن کھو چکا ہوں۔

"میں تمہارے لیے نئے لباس لے آیا ہوں۔ وہ دیکھو" میں نے سوٹ کیس کی طرف اشارہ کیا۔ وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگی پھر اُٹھ کر سوٹ کیس کو کھولا اور اس کے مُنہ سے حیرت اور خوشی کی ملی جلی ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

"یہ کہاں سے آئے؟" اُس نے بچّوں کی طرح پُوچھا۔

"میرے قبضے میں جنّات بھی ہیں۔ ان ہی سے منگوائے ہیں۔ اب تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ پھر ناشتہ کریں گے۔ وہ رہا غسل خانہ۔ اگر تم کہو تو میں باہر چلا جاؤں؟"

وہ مسکرائی: "کیوں؟ باہر جانے کی کیا ضرورت ہے۔ میں ابھی تیار ہو کر آئی" اس نے اپنائیت سے کہا اور ایک لباس اُٹھا کر جھپاک سے غسل خانے میں چلی گئی۔ میں سوچتا رہ گیا کہ ریڈی میڈ لباس کی وجہ سے ہمارے کتنے بہت سے مسائل حل ہو گئے ہیں۔ میں نے گھنٹی بجا کر بیرے کو بُلایا اور دو ناشتے لانے کا آرڈر دیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے صورتِ حال کا نئے سرے سے جائزہ لیا۔

اچھی خاصی رقم میری جیب میں تھی۔ جو فی الحال میں مزید ایک روز کسی خطرے کے بغیر استعمال کر سکتا تھا۔ تمام رازوں پر سے پردے ہٹ چکے تھے۔ اب صحیح صورتِ حال آئینے کی طرح میرے سامنے تھی۔ اب مجھے کیا کرنا چاہیئے؟

غسل خانے کا دروازہ کھُلا اور جالاں تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح باہر نکلی۔ اس ماڈرن لباس میں وہ انتہائی دلکش اور شاداب نظر آ رہی تھی۔ یہ تصور بھی دشوار تھا کہ یہ وہی جالاں ہے جسے میں نے جیرے کے کوارٹر نما جھونپڑی میں دیکھا تھا۔

"کیوں۔ کیسی لگ رہی ہوں؟" اُس نے بچّوں کی طرح چاروں طرف گھُوم کر داد چاہی۔

"بہت اچھی.....: بہت اچھا لباس ہے" میں نے سنبھل کر جواب دیا۔

"اور مَیں؟" وہ دلکشی سے مسکرائی۔
میرے جواب دینے سے پہلے دروازے پر دستک ہُوئی۔ ہم دونوں چوکنا ہوگئے۔
"کون ہے؟" مَیں نے ڈانٹ کر پُوچھا۔
"ناشتہ سر۔"
مَیں نے دروازہ کھولا اور بیرا ناشتے کی ٹرے لے کر اندر آگیا۔
"سلام بیگم صاحبہ۔" اُس نے ناشتے کی ٹرے میز پر رکھ دی۔ مگر بیگم صاحب کہہ کر پُکارنے پر جالاں کا شرم سے گلنار چہرہ نہ دیکھ سکا۔ "باہر بڑی گڑبڑ ہے سر۔" وہ میز پر برتن لگاتے ہوئے بولا۔
"کیسی گڑبڑ؟"
"اجی غنڈوں بدمعاشوں کا زمانہ ہے۔ ایک پارٹی بندوقیں لے کر آئی ہے۔ کسی آدمی کو تلاش کررہے ہیں۔ پتہ نہیں کس کی شامت آتی ہے؟"
مَیں اپنی جگہ ساکت رہ گیا اور جالاں کا چہرہ بھی سفید پڑ گیا۔
"اور کچھ سر؟" اس نے رسماً سوال کیا۔
"نہیں تم جاؤ۔" مَیں نے چونک کر کہا اور وہ سلام کرکے رُخصت ہوگیا۔
"وہ کون لوگ ہیں کس کو تلاش کررہے ہیں؟" جالاں نے مجھ سے پوچھا "کہیں ڈاک بنگلے والے...."
"ارے نہیں۔ وہ ابھی یہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔ شاید یہ لوگ میری کھوج میں ہیں۔ تم ٹھہرو۔" مَیں دروازے کی طرف بڑھا۔ مگر بہت سے قدموں کی آوازسُن کر ٹھٹھک کر رہ گیا۔ مَیں نے پردہ ہٹایا اور سر اُونچا کرکے دروازے کے شیشے میں سے جھانک کر دیکھا۔ چار ہٹے کٹے مسلح آدمی جو صورت ہی سے غنڈے نظر آتے تھے برآمدے کی طرف آرہے تھے۔ اِن کے ساتھ ایک مریل سا آدمی تھا۔ جو ظاہر ہے کہ ہوٹل کا منیجر ہوگا۔ مَیں نے اِن میں سے ایک شخص کو پہچان لیا۔ وہ ٹولی کے ملازموں میں سے ایک تھا جسے مَیں نے بندوق کا بٹ مار کر گرادیا تھا۔ اس کے سر پر پٹی بندھی ہُوئی تھی۔ بریَن گن اُس کے ہاتھ میں تھی اور وہ ان سب سے آگے آگے تھا۔
"ہمیں ایک آدمی کی تلاش ہے۔ یاد رکھو اگر اسے کسی نے چھپایا تو اس ہوٹل کو ملیامیٹ کردیں گے۔ باہر ہمارے آٹھ اور آدمی جیپوں میں کھڑے ہیں۔"
مَیں نے پردہ گرا دیا اور پلٹ کر جالاں کو دیکھا جو سہمی ہُوئی کھڑی مجھے تک رہی تھی۔ باہر برآمدے میں بھاری قدموں کی آوازیں نزدیک تر آتی جارہی تھیں۔

"اب کیا ہوگا؟" جالاں نے سہمی ہوئی آواز میں پُوچھا۔ خوف اُس کی آنکھوں سے چھلک رہا تھا۔ اس نے باہر والے غنڈے کی کرخت آواز سُن لی تھی اور مَیں نے اسے یہ بھی بتا دیا تھا کہ وہ لوگ میری تلاش اور جستجو میں ہیں۔ اس کی نگاہوں میں بے شمار سوالات تھے۔ وہ غریب تو بذاتِ خود حالات کا شکار تھی۔ اس پر پے درپے مصائب ٹوٹے تھے۔ اس نے جس نیک دل انسان کا سہارا لیا تھا وہ اس کی آنکھوں کے سامنے ہلاکت کا شکار ہوچکا تھا۔ اس کی پناہ گاہ سے رُخصت ہوکر اسے نئی پناہوں کی تلاش تھی۔ وہ ایک بے کس اور بے سہارا تنہا لڑکی تھی جس کا فی الوقت کوئی محفوظ ٹھکانہ نہیں تھا۔ اس کے باوجود وہ مردانہ وار حالات کا مقابلہ کررہی تھی لیکن اُسے یہ پہلی بار علم ہوا تھا کہ جس شخص کو وہ اپنا مُونس اور سہارا سمجھ رہی ہے وہ اس سے زیادہ مصائب و آلام میں گھرا ہوا ہے۔ اس کی گھات میں دُشمن لگے ہوئے ہیں۔ وہ ایک زخمی شکار کی طرح پناہ ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔ یہ تمام معلومات اس کے لیے بالکل غیر متوقع اور اچانک ہی تھیں اور اب خطرہ اس کے

دروازے کے باہر منڈلا رہا تھا۔ مَیں بالکل نہتا تھا۔ جب کہ وہ اندازہ لگا سکتی تھی کہ میرے دُشمنوں کے پاس خطرناک اسلحہ بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان واقعات نے اسے بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ سہمی ہوئی خوف زدہ ہرنی کی طرح چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی ہمّت قابلِ داد تھی۔ اس کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو شاید ہوش و حواس کھو بیٹھی ہوتی لیکن وہ اپنے اعصاب پر قابو رکھے ہوئے تھی۔ بھاری قدموں کی آوازیں بتدریج قریب تر آرہی تھیں۔
"یہ کون لوگ ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟" اس نے دھیمی لیکن لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔
"یہ مَیں تمہیں پھر بتاؤں گا۔ اس وقت تمہیں ایک کام کرنا ہے۔ جب مَیں تمہیں اشارہ کروں تم دروازہ کھول دینا اور معصومیت کے ساتھ ان لوگوں کی طرف مُسکرا کر دیکھنا۔ اُن کے سوالات کے جواب میں میری طرف سے انجان بن جانا۔ اپنے آپ کو ایک شادی شدہ عورت ظاہر کرنا اور کہنا کہ میرے شوہر باہر گئے ہوئے ہیں۔"
میرا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی قدموں کی آوازیں دروازے کے باہر آکر رُک گئیں۔
"یہی ان کا کمرہ ہے؟" ایک کرخت اور بھاری آواز نے پوچھا۔
"یس سر۔" یہ غالباً مریل سے منیجر کی آواز تھی۔
"تم نے اُنھیں دیکھا تھا؟"
"جی نہیں سر۔ رات کو مَیں ڈیوٹی پر نہیں تھا۔ بیرے نے انھیں کمرے کی چابی دی تھی۔ وہ شادی شدہ لوگ ہیں اور خاصے پیسے والے لگتے ہیں۔"
"یوسف تو چھڑا ہے۔ اس کی بیوی کہاں سے آگئی؟" ایک آواز نے سوال کیا۔ "ہوسکتا ہے یہ کوئی اور ہو!"
"ابھی پتہ لگ جائے گا" دروازے کو کسی نے بھاری چیز سے ضرب لگائی اور جالاں کا رنگ زرد پتّے کی مانند ہوگیا۔ اس نے میری جانب سوال آمیز نظروں سے دیکھا۔ مَیں نے جواب میں ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔
"اندر کون ہے؟ دروازہ کھولو!" باہر سے پھر ایک کرخت آواز آئی۔
میرے اشارے پر جالاں نے پوچھا "کون ہے؟"
"ہوٹل کا منیجر۔ دروازہ کھولو۔"
مَیں اتنی دیر میں دروازے کے عقب میں جا کھڑا ہوا۔ اس طرح کہ دروازہ کھلنے پر مَیں اس کی آڑ میں چھپ جاتا۔
"کیا کام ہے آپ کو؟" میرے کہنے پر جالاں نے بُلند آواز میں دریافت کیا۔
"دروازہ تو کھولو کام بھی بتا دیں گے۔" آواز کی بے صبری اب صاف نمایاں تھی۔
مَیں نے اشارہ کیا اور جالاں نے تھوک نگل کر سہمے ہوئے قدموں سے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔
دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور مَیں نے اس کے پیچھے اپنی سانس روک لی۔ لیکن جالاں کو مَیں اب بھی دیکھ سکتا تھا۔
"کیا بات ہے؟ تم کون لوگ ہو؟" جالاں اب اپنے خوف و ہراس پر قابو پاچکی تھی اور اس کی آواز میں ناراضی اور برہمی صاف نمایاں تھی۔
جواب میں چند لمحے خاموشی رہی۔ خلافِ توقع ایک حسین اور خوش لباس عورت کو سامنے دیکھ کر شاید آنے والے سبھی لوگ متحیّر رہ گئے تھے۔

"معاف کرنا بیگم صاحبہ۔" وہی کرخت آواز اب قدرے معذرت خواہانہ تھی۔ "ہم آپ کے شوہر سے مل سکتے ہیں؟"

"نہیں۔" جالاں نے غصے سے کہا۔ "وہ اس وقت کمرے میں نہیں ہیں۔ باہر گئے ہوئے ہیں۔"

"مگر میڈم آپ کی گاڑی تو باہر کھڑی ہوئی ہے۔" یہ مریل منیجر کی مریل اور منحنی سی آواز تھی۔

"تو پھر۔" جالاں نے جھڑک کر کہا۔ "کیا باہر گاڑی کھڑی کرنا منع ہے؟" وہ رفتہ رفتہ اپنے اعصاب پر مکمل قابو پانے میں کامیاب ہو چکی تھی۔

"یہ بات نہیں ہے میڈم۔ میرا مطلب یہ ہے کہ گاڑی کے بغیر تو صاحب جی باہر نہیں جا سکتے۔" منیجر نے کہا۔ اب اس کے ساتھ آنے والے غنڈہ ٹائپ لوگ خاموش ہو گئے تھے۔

"کیوں نہیں جا سکتے۔ کیا ان کی ٹانگیں نہیں ہیں؟"

"وہ تو ٹھیک ہے میڈم۔" میں نے دروازے کی جھری میں سے جھانکا تو منیجر کا حیران چہرہ میرے سامنے تھا۔ وہ پریشانی سے بریں گن والے غنڈے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ شخص بھی ایک قدم بڑھا کر آگے آیا تو میں نے اسے واضح طور پر دیکھ لیا۔ یہ یقیناً وہی شخص تھا جو میری بندوق کے بٹ کا نشانہ بنا تھا۔ اس کا چہرہ خشونت بھرا اور خوفناک تھا۔ اس کے بائیں رخسار پر ایک زخم کا نشان تھا اور وہ چہرے ہی سے عادی اور خطرناک مجرم نظر آ رہا تھا۔

بریں گن والا آدمی جالاں کو گھور رہا تھا۔ اس کے چہرے پر اُلجھن کے آثار نمایاں تھے۔ ان لوگوں نے کار کے ذریعے میرا کھوج لگا لیا تھا اور یہ ان کی مہارت کا ثبوت تھا۔ انھوں ہوٹل کے منیجر سے یہ معلومات بھی حاصل کر لی تھیں کہ اس کار کا مالک ایک شادی شدہ شخص ہے جو رات گئے ہوٹل میں وارد ہوا تھا۔ میرے بارے میں یہ تصور ان کے لیے ناقابلِ یقین تھا کہ میرے ساتھ میری بیوی بھی ہو سکتی ہے اور جالاں کو مجسم قہر سامنے دیکھ کر تو ان لوگوں کی حیرت دوچند ہو گئی تھی۔ جالاں ماڈرن اور جدید فیشن کے لباس میں ایک حسین تعلیم یافتہ اور شائستہ عورت نظر آ رہی تھی اور اس پر یہ ستم کہ اس کی خوبصورتی نے ان لوگوں کو واقعی بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ حسین چہرہ بذاتِ خود ایک حیران کُن شے ہے اور پھر بالکل خلافِ توقع ایک غلط مقام پر کسی خوش شکل اور خوش قامت عورت کو دیکھ لینا ان کے ہوش اُڑا دینے کا مکمل سامان تھا۔

"سُنیئے بیگم صاحبہ" بریں گن والے شخص نے اپنی ڈراؤنی آواز میں جالاں کو مخاطب کیا۔ "آپ کے گھر والے کا نام کیا ہے؟"

"کیوں؟" جالاں نے تڑخ کر پوچھا۔ "تمہیں ان سے کیا کام ہے؟"

"جی۔ وہ...... ہم ان سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"وہ اس وقت نہیں ہیں۔ تھوڑی دیر بعد آئیں گے۔"

یہ کہکر جالاں نے کمرے کا دروازہ بند کرنا چاہا مگر ایک مردانہ پیر راہ میں حائل ہو گیا۔

"ٹھہرو۔ ہم خود کمرے میں دیکھیں گے۔"

جالاں پہلے تو ہکا بکا رہ گئی۔ یہ اس کے لیے قطعی انوکھی پوزیشن تھی۔ مگر پھر اُس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ "دیکھو۔ اکیلی عورت کے کمرے میں تم نہیں آ سکتے۔ اگر تم نے بدتمیزی کی تو میں پولیس میں رپورٹ کرا دوں گی۔ میں کوئی ایسی ویسی عورت نہیں ہوں۔ سمجھے؟"

اس بار وہ غنڈہ سچ مچ اس کے رُعب میں آ گیا اور اس کا پیر دروازے میں سے ہٹ گیا۔ "ٹھیک ہے۔ میں کمرے کے باہر انتظار کرتا ہوں۔" پھر وہ مریل سے منیجر سے مخاطب ہوا۔

"اس کمرے سے باہر جانے کا کوئی دوسرا راستہ تو نہیں ہے؟"

"بالکل نہیں سر۔"

میرے اشارے پر جالاں نے تیزی سے دروازہ بند کر دیا۔ تھوڑی دیر باہر خاموشی رہی۔ پھر وہی کرخت آواز سنائی دی۔ "دیکھو۔ تم لوگ باہر جا کر انتظار کرو۔ وہ جدھر سے بھی آئے اس پر نظر رکھنا میں یہیں انتظار کرتا ہوں۔"

"مگر بالے یہ تو کوئی اور بندہ لگتا ہے۔" ایک اور آواز سُنائی دی۔

"بکواس مت کرو۔ باہر والی گاڑی وہی ہے جو یوسف لے کر گیا تھا۔ تم اندھے ہو کیا؟ تم نے نہیں دیکھی تھی گاڑی؟"

"گاڑی تو وہی ہے مگر......"

"بکواس بند کرو یار۔ باہر جا کر نگرانی رکھو۔"

"بالے۔" یہ کسی اور شخص کی آواز تھی۔ "کسی اور مصیبت میں نہ پھنسوا دینا۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یوسف ان کی گاڑی لے کر بھاگ گیا ہو۔"

"لگ جائے گا پتہ۔" بالے کی آواز میں تذبذب تھا۔ "اس بندے کو تو واپس آنے دو۔ اب تم سب پھُٹّا کھاؤ۔"

بہت سے قدم برآمدے میں واپس جانے کی آوازیں سُنائی دیں اور خاموشی چھا گئی۔ جالاں نے میری طرف دیکھا اور اشارے سے پوچھا کہ اب کیا کریں گے؟ میں نے اُس کو چُپ چاپ رہنے کا اشارہ کیا لیکن خود میرا ذہن بھی ابھی تک اس سوال کا کوئی معقول جواب نہیں سوچ سکا تھا۔ کوئی راہِ فرار نہیں تھی اور کمرے کے باہر بالے کے روپ میں میری موت بریں گن تھامے کھڑی تھی۔

اتنا تو میں بھی جان چکا تھا کہ بالے کو اس بات کا پورا یقین ہے کہ میں اس وقت کمرے میں موجود نہیں ہوں لیکن اسے یہ بھی بھروسہ تھا کہ ہو نہ ہو یہی کمرہ میری عارضی رہائش گاہ بلکہ پناہ گاہ ہے اور میں کچھ دیر بعد یہاں واپس ضرور آؤں گا اور بے خبری میں پکڑا جاؤں گا۔ جالاں کی موجودگی ان لوگوں کے لیے حیرت انگیز ضرور تھی لیکن انھوں نے جو کھوج لگائی تھی اس کے مطابق یہی وہ کمرہ ہو سکتا تھا جہاں ان کا شکار چھپا بیٹھا تھا اب تک لُوٹی نے مجھے کھلا چھوڑ رکھا تھا۔ غالباً اس کی سکیم یہ تھی کہ میں خود بخود اس کے راستے سے ہٹ جاؤں گا۔ یا تو پولیس کے ہتھے چڑھ جاؤں گا یا پھر لُوٹی کے دشمنوں کا نشانہ بن جاؤں گا جو مجھے دراصل لُوٹی ہی سمجھ رہے تھے۔ مجھ مجھے گزشتہ چند دنوں کے تجربات سے یہ حقیقت بھی معلوم ہو گئی تھی کہ لُوٹی کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی میری حیات میں ہیں اور لُوٹی سمجھ کر اُس دولت میں حصہ دار بننا چاہتے ہیں۔ جو لُوٹی نے بنک سے لُوٹ کر کہیں پوشیدہ کر رکھی تھی۔ اس کا ایک ثبوت مجھے جانی اور اس کی بہن نے بھی فراہم کر دیا تھا۔ جانی اور خصوصاً اس کی وفاشعار بہن کا خیال آیا تو میں غمگین ہو گیا۔ وہ دونوں اَن دیکھی موت کا شکار بن چکے تھے لیکن سب سے زیادہ المناک بات اُس معصوم اور کمسن بچے کی ہلاکت تھی جو دراصل لُوٹی کا بچہ تھا اور جسے وہ لوگ میرا بچہ سمجھ کر میری گود میں ڈالنا چاہتے تھے۔ بہرحال قدرت کے قانون نرالے ہوتے ہیں۔ اس کے ہاں سزا اور جزا کے طریقے بھی مختلف ہوتے ہیں اور گناہ اور بے گناہی کے پیمانے بھی الگ ہیں۔ خدا جانے اُن تینوں کو کس گناہ کی سزا ملی تھی جس کی پاداش میں وہ سب کے سب خطرناک اور پُرتشدد موت کا نشانہ بن گئے۔

مجھے خیالات کی دنیا سے جالاں نے جھنجھوڑ کر باہر نکالا وہ کچھ دیر تو خاموشی سے میری اگلی ہدایت کا انتظار کرتی رہی مگر وہ مجھے سوچوں میں گُم دیکھ کر خاموش نہ رہ سکی۔ وہ اشارے سے پُوچھ رہی تھی کہ اب کیا کرنا چاہئے میرا دماغ ابھی تک کوئی مناسب ترکیب نہیں سوچ سکا تھا لیکن جالاں کے پریشان چہرے اور بکھرتے ہوئے

بالوں پر نگاہ پڑی تو اس کی جاذبیت اور دلکشی کی صورت میں مجھے ایک راہِ فرار نظر آ گئی۔ میرا تجربہ شاہد تھا کہ جرائم پیشہ اور بد اطوار لوگ عام طور پر حُسن پرست ہوتے ہیں اور خوبصورت لڑکیاں ان کے لیے کمزوری کا درجہ رکھتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ مطلب نکلنے کے بعد انھیں بے دردی اور بے حسی کے ساتھ راہ میں چھوڑ دیتے ہیں لیکن ایک بار تو خوبصورت جسم اور حسین چہرے انھیں اپنی جانب کھینچنے میں ضرور کامیاب ہو جاتے ہیں۔ میں نے ایک نئے رُخ سے جالاں کے سراپا کا جائزہ لیا۔ میری نگاہیں اس کے بکھرے اور اُلجھے ہوئے بالوں سے گزرتی ہوئی اس کے پُرکشش اور متناسب جسم تک پہنچیں تو معاً مجھے راہِ نجات سُوجھ گئی۔ میں خوشی سے مسکرانے لگا۔ جالاں جو بغور میری طرف دیکھ رہی تھی۔ پہلے تو میری بھٹکی ہوئی نگاہوں کا مفہوم نہ سمجھ سکی اور پھر جب میرے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی تو اس کی حیرت اُنتہا کو پہنچ گئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اتنے مشکل اور کٹھن بلکہ جان جوکھوں کے حالات میں مَیں مُسکرانے کی جرأت بھی کر سکتا ہوں۔

"جالاں" مَیں نے سرگوشی میں اسے مخاطب کیا "تم ایکٹنگ کر سکتی ہو؟"

"ایکٹنگ؟" وہ حیران ہو کر بولی۔

"میرا مطلب ہے اداکاری۔ سنو۔ تم نے کبھی فلم دیکھی ہے؟"

"ہاں"

"تو پھر تم نے دیکھا ہو گا کہ فلم کی ہیروئین اپنے ہیرو کے ساتھ کتنی لگاوٹ اور محبت کے ساتھ پیش آتی ہے۔ اس کے سامنے گانے گاتی ہے، ناچتی ہے اور پیار بھری باتیں کرتی ہے۔"

"ہاں۔ تو پھر؟" وہ اُلجھے ہوئے لہجے میں بولی۔

"بس۔ آج تمہیں بھی فلم کی ہیروئین کی طرح کرنا پڑے گا۔"

"کیا؟!" وہ چونک کر یوں پیچھے ہٹی جیسے بجلی کا کرنٹ اُسے چھُو گیا ہو۔ اس کی آواز اتنی اُونچی تھی کہ مَیں نے بے اختیار اس کے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"سنو جالاں۔ جان بچانے کے لیے انسان مجبوری کی حالت میں سبھی کچھ کر گزرتا ہے۔ اس وقت بھی ہماری جان خطرے میں ہے اور اپنی حفاظت کے لیے تمہیں بھی میری مدد کرنا ہو گی۔"

"مگر مَیں کیا کروں؟" اس نے تنگ آ کر پوچھا۔

"دیکھو۔ وہ لوگ سمجھ رہے ہیں کہ مَیں کمرے میں موجود نہیں ہوں اور تم اس کمرے میں اکیلی ہو۔ وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ تم میری ساتھی ہو اور مَیں کچھ دیر بعد یہاں ضرور آؤں گا۔ اسی لیے وہ گھات لگا کر باہر میرے منتظر ہیں۔ میرے پاس کوئی مؤثر ہتھیار نہیں ہے جب کہ وہ سب مہلک اور خطرناک ہتھیاروں سے مسلح ہیں۔ ان کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے اور وہ ہوٹل کے باہر گھیرا ڈال کر بیٹھے ہیں۔ اس مشکل کا صرف ایک ہی حل ہے جو تمہاری مدد کا محتاج ہے۔"

میری اتنی لمبی چوڑی تقریر اس نے سُن تو لی مگر شاید وہ اس کا مطلب اور مفہوم سمجھنے سے قاصر تھی۔ بڑے دلکش انداز میں اس نے پلکیں جھپکائیں اور گردن ٹیڑھی کر کے وضاحت طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"مگر مَیں کیا کروں۔ بتاؤ تو؟" وہ بے تابی سے بولی۔

"تم وہ کرو جو مَیں کہتا ہوں۔ کوئی سوال نہ کرنا اور نہ انکار کرنا۔ یاد رکھو مَیں تمہارا ہمدرد اور دوست ہوں اور پھر اس وقت ہم دونوں کی جان کو برابر کا خطرہ ہے۔ اس لیے ہمیں ایک جان ہو کر کام کرنا ہو گا۔ مجھ پر بھروسہ رکھو اور خدا سے دُعا کرو کہ وہ ہماری مدد کرے۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے معصومیت سے گردن ہلائی۔

"تو پھر غور سے سُنو۔" میں نے اسے مختصر طور پر جلدی جلدی ضروری ہدایات دیں کیونکہ میں زیادہ تاخیر سے باہر کے لوگوں کو بے چین اور مشکوک نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جالاں نے تمام باتیں غور سے سُنیں اور پھر بڑی بڑی حسین آنکھیں پھیلا کر مسکرائی۔

"باؤ جی۔ تم فکر مت کرو۔ بس جو تم نے کہا ہے ویسا ہی کروں گی۔"

میں نے دروازے سے باہر جھانک کر بالے کو دیکھنے کی کوشش کی اور سُن گُن لی لیکن باہر سے کوئی آہٹ تک سُنائی نہیں دی۔ لیکن میں بخوبی جانتا تھا کہ وہ عقابی نظروں سے اس دروازے کو تک رہا ہے اور اس کی توجہ ایک لمحے کے لیے بھی کسی اور طرف منعطف نہیں ہوئی ہوگی۔ میرے اشارے پر جالاں نے اپنے بکھرے ہوئے بالوں کو سمیٹ کر شانوں پر پھیلا لیا اور دوپٹے کا آنچل شانے پر سے ڈھلکا کر تصدیق طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اب وہ ایک بے باک اور بے جھجک لڑکی نظر آ رہی تھی۔ اس نے دو قدم آگے بڑھ کر دروازے کا کھٹکا کھول کر آہستہ سے دروازہ کھولا اور گردن نکال کر باہر جھانکا۔ پھر اس نے آہستگی سے دروازہ پورا کھول دیا۔ میں دروازے کے عقب میں مستعد اور چاق و چوبند کھڑا تھا اور اس کی ہر حرکت میری نگاہوں کے سامنے تھی۔ دروازہ کھول کر جالاں نے یکایک حیرت سے چونک کر سامنے دیکھا اور پھر تعجب انگیز لہجے میں بولی۔ "ارے۔ آپ ابھی تک گئے نہیں؟"

میں نے بالے کی آواز سُنی۔ "میں ذرا انتظار کر رہا تھا۔ آپ کے خاوند کا۔"

"میرے خاوند تو نہ جانے کب آئیں گے۔ وہ جب جاتے ہیں تو پھر اپنی مرضی سے ہی واپس آتے ہیں۔ مگر یہ تو بتائیے کہ آپ کو ان سے کیا کام ہے؟"

"بس۔ ذرا ملنا تھا۔ ایک ضروری کاروباری بات کرنی ہے۔" پھر وہ رُک کر بولا۔ "آپ کے خاوند کا نام کیا ہے؟"

"ان کا نام اختر ہے۔"

"صورت شکل کیسی ہے؟"

میں نے جواب میں جالاں کی مسکراہٹ دیکھی۔ وہ کچھ شرمیلے انداز میں کہنے لگی۔ "صورت تو اچھی ہے۔ پر مزاج کے بہت خراب ہیں۔ کیا آپ اُن کے دوست ہیں؟"

بالے اس اچانک سوال سے بوکھلا کر بولا۔ "دوست؟! ہاں ہاں۔ بس دوست ہی سمجھ لو۔"

"ارے تو آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔" جالاں نے لگاوٹ کے انداز میں کہا۔ "پھر آپ باہر کیوں کھڑے ہیں۔ اندر آ بیٹھیے۔" بالے اس دعوت کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ "میں؟"

"ہاں ہاں"

"مگر آپ کے خاوند؟!"

"ارے ان کا کچھ ٹھیک وقت نہیں ہے۔ پتہ نہیں کب آئیں؟ وہ تو جب جاتے ہیں تو مجھے بھول ہی جاتے ہیں بس اکیلی بیٹھی گھبرا جاتی ہوں۔" جالاں نے تھکاوٹ اور بیزاری کے انداز میں جماہی لی اور میں اس کی دلکش اور پُرکشش اداکاری دیکھ کر حیران رہ گیا۔ "آئیے۔ اندر آ جائیے نا۔ میں آپ کے لیے چائے منگاتی ہوں۔"

بالے شاید تذبذب کا شکار تھا۔

جالاں نے لپک کر دو قدم آگے بڑھائے اور میٹھی بے تکلف آواز میں کہنے لگی۔ "اب آ بھی جائیں یا آپ کو زبردستی اندر لانا ہوگا۔"

میں بالے کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا مگر اس کے تاثرات کا بخوبی اندازہ کر سکتا تھا۔

"آ بھی جائیے نا۔" جالاں نے اصرار بھرے لہجے میں کہا اور اس کی آواز میں ایک عجیب قسم کی مٹھاس پیدا ہو گئی۔ بالے جیسے آدمی کے لیے ایک خوبرو عورت کی طرف سے اتنی اپنائیت اور بے تکلفی کا اظہار غالباً غیر متوقع اور غیر معمولی تھا۔ خوشی سے اس کی باچھیں کھل گئیں۔ پھر اس کی متذبذب آواز آئی۔ "مگر۔ مگر آپ کے خاوند آ گئے اور انھوں نے مجھے کمرے کے اندر بیٹھا ہوا دیکھ لیا تو......"

"ارے ان کی فکر نہ کریں۔" جالاں نے اس کی بات کاٹی۔ "انھیں میں خوب جانتی ہوں۔ آئیے۔ میں آپ کے لیے چائے منگاؤں یا ٹھنڈا؟"

بالے کے قدموں کی آہٹ سنائی دی اور پھر وہ کمرے کے دروازے میں داخل ہوا۔ برین گن بے پروائی سے اس کے بائیں ہاتھ میں لٹکی ہوئی تھی اور وہ کمرے میں کسی دوسرے شخص کی موجودگی سے قطعاً بے خبر تھا۔ جوں ہی اس نے کمرے میں قدم رکھا میں نے آہستگی سے اس کا شانہ تھپکا۔ وہ بہت تیزی سے مڑا اور غیر ارادی طور پر اس کا برین گن والا ہاتھ اُوپر کو اُٹھا۔ میری صورت دیکھ کر اس کی آنکھوں میں حیرت اور شناسائی کی کیفیت نمودار ہوئی لیکن دوسرے لمحے میرے کھڑے ہاتھ کی ضرب اس کی گردن پر لگی اور وہ کٹے ہوئے درخت کی مانند فرش پر گر گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر برین گن اس کے ہاتھ سے لے لی اور جالاں کی طرف دیکھا جو داد طلب نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"بہت خوب جالاں۔ تم نے تو کمال کر دیا۔"

"مگر اب کیا ہوگا؟" اس نے معصومیت سے آنکھیں گھما کر پوچھا۔

"بس خاموشی سے میرے ساتھ چلی آؤ۔" میں نے چھوٹا سُوٹ کیس اُٹھایا اور چند کپڑے باہر نکال کر اس میں برین گن رکھ دی۔ پھر میں نے نوٹ گن کر اپنی جیب میں ڈالے۔ بیہوش بالے کو گھسیٹ کر ایک طرف ڈالا اور جالاں کو باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔ کمرے سے باہر نکل کر میں نے دروازہ بھیڑ دیا اور تیز قدموں سے موٹیل کی پچھلی جانب چل پڑا۔ جالاں مُنہ اور سر پر چادر ڈال کر میرے ساتھ چل دی تھی۔ موٹیل کا پچھلا حصہ غیر آباد اور سنسان تھا۔ لیکن میں کچھ فاصلے پر کچی سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی ایک جیپ گاڑی کو دیکھ چکا تھا۔ جیپ سے ٹیک لگائے ہوئے ایک لمبا تڑنگا آدمی کھڑا تھا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ بالے کے دوسرے ساتھی موٹیل کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں اور بظاہر یہ واحد شخص ہی میرا بہترین شکار بن سکتا ہے۔ میں نے جالاں کو آگے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی جیپ کی طرف چل پڑی۔ میرے اندازے کے عین مطابق جیپ کے پاس کھڑے ہوئے شخص نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا اور حریصانہ نگاہوں سے دیکھتا رہ گیا۔ جب جالاں نصف چہرے کو چادر سے چھپائے ہوئے بل کھاتی، لچکتی ہوئی اس کے سامنے سے گزری تو اُس کا رُخ بھی جالاں کی طرف ہو گیا۔ میں اسی موقع کا متلاشی تھا۔ ایک چھلانگ لگا کر میں اس کے قریب پہنچا۔ آہٹ پر وہ تیزی کے ساتھ پلٹا مگر میرا گھونسہ اُس کی ٹھوڑی سے پُوری قوت سے ٹکرایا اور وہ مُنہ سے کوئی آواز نکالے بغیر زمین پر گر گیا۔ میں نے پھُرتی سے اس کی جیبوں کی تلاشی لی اور جیپ کی چابی نکال لی۔ چاروں طرف نظر ڈالی تو دُور دُور تک کوئی متنفس نہیں تھا۔ میں کُود کر جیپ میں سوار ہو گیا۔ جالاں نے بھی اگلی سیٹ سنبھال لی اور دوسرے ہی لمحے ہماری جیپ برق رفتاری کے ساتھ کچی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ میں نے پلٹ کر موٹیل کی عمارت کی طرف دیکھا۔ بالے کے ساتھی غالباً موٹیل کے سامنے والے حصے میں چھاؤنی ڈال کر کھڑے ہوئے تھے اور انھیں یقین تھا کہ میں بے خبری کے عالم میں جب موٹیل کے سامنے پہنچوں گا تو ان کے جال میں پھنس جاؤں گا۔ یہی وجہ ہے کہ عقبی حصے میں انھوں نے صرف ایک محافظ تعینات کرنے پر اکتفا کیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا

کہ ابھی کافی دیر تک انھیں میرے اور جالاں کے غائب ہونے کی خبر نہیں لگ سکتی تھی۔ جیپ تیزی سے دوڑ رہی تھی۔ تیز ہوا سے جالاں کے چہرے پر سے چادر ہٹ گئی تھی اور اس کی شانوں پر بکھری ہوئی زلفیں لہرا رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر ایک ایسے بچے جیسا تاثر تھا جو کوئی شرارت کرنے کے بعد اس سے لطف اندوز ہو رہا ہو۔ کچھ دیر ہم خاموش رہے۔ پھر جالاں نے اپنے بالوں کو سمیٹ کر پوچھا: "اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"پتہ نہیں۔" میرا جواب تھا۔ "یہ تو میں خود بھی نہیں جانتا۔"

"کیا وہ ہمارا پیچھا نہیں کریں گے؟" جالاں نے پوچھا۔

"فی الحال ہمارے پاس کافی وقت ہے۔" میں نے جواب دیا۔ مگر میرا ذہن نہایت تیزی کے ساتھ آئندہ اقدامات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں نے ایک طرف درختوں کی اوٹ میں جیپ کھڑی کی اور کود کر اتر گیا۔ جالاں میرے ساتھ تھی۔ جب ہم دونوں سوٹ کیس سنبھالے قدم سے قدم ملائے شاہراہ تک پہنچے تو دیکھنے والوں کو یہی گمان ہو رہا ہوگا کہ ایک شادی شدہ جوڑا سفر پر روانہ ہوا ہے۔ میری اگلی مشکل خود بخود حل ہو گئی جب میں نے کچھ فاصلے پر ایک بس کو آتا ہوا دیکھا۔ غیر ارادی طور پر میرے ہاتھ اٹھ گئے اور بس ہمارے نزدیک پہنچ کر رک گئی۔ ہم دونوں بس میں سوار تو ہو گئے مگر مجھے بالکل علم نہیں تھا کہ یہ بس کہاں سے آ رہی ہے اور کہاں جائے گی۔ مگر مجھ ایسے لوگوں کے لیے جن کی کوئی منزل مقصود ہی نہ ہو یہ کوئی مسئلہ نہ تھا۔ بس میں ڈرائیور کے پیچھے دو سیٹیں خالی تھیں جہاں ہم جا کر بیٹھ گئے۔ اب میں نے بس کے مسافروں کا جائزہ لیا۔ اکثریت دیہاتی مردوں کی تھی۔ چند عورتیں اور دو بچے بھی مسافروں میں شامل تھے اور قریب قریب سبھی اونگھ رہے تھے۔ ڈرائیور لمبی لمبی مونچھوں والا ایک دبلا پتلا آدمی تھا۔ اس نے کنکھیوں سے ہماری طرف دیکھا اور جالاں کا روشن چہرہ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہو گئی۔ اس نے ہاتھ آگے بڑھا کر سامنے لگے ہوئے ٹیپ ریکارڈر کی آواز کچھ اور بلند کر دی جس پر کسی پنجابی فلم کا مقبول گانا لگا ہوا تھا۔ اس کی یہ غیر شریفانہ حرکت مجھے اچھی نہیں لگی، مگر خاموش رہنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ اسی وقت ایک لمبا تڑنگا اور قدرے میلا کچیلا سا شخص آ کر ہمارے پاس کھڑا ہو گیا۔

"کہاں کا ٹکٹ دیدوں بابوجی؟" اس نے مجھ سے سوال کیا مگر اس کی نظریں جالاں کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ظاہر ہے کہ وہ بس کا کنڈکٹر تھا۔ اس نے ایک ہاتھ میرے سامنے پھیلا رکھا تھا۔ غصہ تو مجھے بہت آیا لیکن میں نے ضبط کر لیا۔ میں خواہ مخواہ کوئی پرابلم پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پھر بھی میں نے اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ کو تھام کر جھٹکا دے کر اپنی طرف متوجہ کیا تو وہ یوں چونک پڑا جیسے اچانک خواب سے جاگا ہو۔ میرے چہرے پر ناگواری کے تاثرات دیکھ کر وہ کھسیانہ پن سے مسکرایا اور سر کھجانے لگا۔

"کہاں کا ٹکٹ کاٹوں بابوجی؟"

"یہ بس کہاں جا رہی ہے؟"

وہ تمسخر کے انداز میں ہنسا۔ "جانے بغیر ہی بس میں بیٹھ گئے۔ واہ جی واہ"

"بابوجی بہت جلدی میں لگتے ہیں بشیرے۔" یہ ڈرائیور کی آواز تھی۔ جو کنکھیوں سے ہماری طرف دیکھ کر مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا۔ اب مجھے واقعی غصہ آنے لگا تھا مگر اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا بس کے پچھلے حصے میں سے شور کی آواز بلند ہوئی اور ساتھ ہی ایک فائر کی آواز گونجی۔ ہم سب نے مڑ کر دیکھا۔ دو موٹے تازے بے ہنگم سے آدمی پستولیں ہاتھ میں لیے کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نے فائر کیا تھا اور گولی نے بس کی چھت میں سوراخ کر دیا تھا۔

"بس روک دو۔" ان میں سے ایک گرج کر بولا اور ڈرائیور کی انگلیاں جو مونچھوں کو تاؤ دے رہی تھیں کانپنے لگیں۔ اس نے یک لخت بریک لگایا اور بس ایک جھٹکے سے رک گئی۔ وہ دونوں بھی لڑکھڑائے لیکن پھر سنبھل کر اپنے قدموں

پر مضبوطی سے کھڑے ہو گئے۔

"دیکھو جی۔ میں بہت خطرناک آدمی ہوں۔ میرا نام ہے گھمن ڈاکو۔ بارہ قتل کئے ہیں میں نے۔ بندے کو مکھی کی طرح مار دیتا ہوں۔ جو کچھ بھی کیسے میں ہے چپ چاپ نکال دو۔ زنانیاں اپنے زیور اتار کر سامنے رکھ دیں۔ کوئی جوان مردی نہ دکھائے ورنہ گولیوں سے چھلنی کر دوں گا۔ کیا سمجھے؟" اس نے اپنی ڈراؤنی اور بے ہنگم آواز میں بس والوں کو ہدایات دیں۔ کچھ دیر تو سناٹا چھایا رہا مگر پھریوں لگا جیسے سب جسموں میں ایک دم جان پڑ گئی ہے۔ لوگوں نے جلدی جلدی اپنی جیبیں خالی کرنی شروع کر دیں۔ یکایک ایک اور شخص مسافروں میں سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کپڑے کی بڑی سی جھولی پھیلا کر مسافروں کے سامنے پہنچ گیا۔ گویا یہ ان کا تیسرا ساتھی تھا۔ لوگ پھرتی کے ساتھ اپنی جیبیں خالی کر رہے تھے۔ انگوٹھیاں اور گھڑیاں جھولی میں ڈال رہے تھے۔ عورتیں بھی خاموشی مگر بے بسی کے ساتھ اپنے زیور اتار اتار کر جھولی کی نذر کر رہی تھیں۔

وہ دونوں مسلح ڈاکو بدستور اپنی جگہوں پر جمے ہوئے تھے اور عقابی نظروں سے چاروں طرف کا جائزہ لے رہے تھے۔ بس میں بعض طاقت ور مرد بھی سوار تھے لیکن وہ سب کے سب مسلح ڈاکوؤں کے سامنے مجبور نظر آ رہے تھے یا پھر وہ اپنی بزدلی کی وجہ سے ان کے حکم کی تعمیل کر رہے تھے۔ بس کا ڈرائیور اپنی جگہ سہما ہوا بیٹھا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ٹیپ ریکارڈر بند کر دیا تھا جس کی وجہ سے بس میں کچھ سکون پیدا ہو گیا تھا۔

جھولی والا شخص ہمارے نزدیک آیا تو کنڈکٹر نے اپنے چمڑے کے بیگ سے ساری رقم نکال کر اس کی جھولی میں ڈال دی۔ اب میری اور جالاں کی باری تھی۔ میری جیب میں ایک بھاری رقم موجود تھی جب کہ سوٹ کیس میں بلے سے چھینی ہوئی برین گن رکھی ہوئی تھی۔ میں نے فوری طور پر فیصلہ کیا اور رقم نکالنے کے لیے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔ اتنی دیر میں جھولی والا جالاں کے سامنے جا کھڑا ہوا تھا اور اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"سوہنیے۔" وہ اس سے بھونڈے انداز میں مخاطب ہوا۔ "تم بھی کچھ خیرات دے دو اپنی خوبصورتی کی۔"

میرا ہاتھ جیب کے اندر ہی بیخ ہو گیا۔ جالاں نے اپنے سڈول اور گندمی ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیئے اور بولی۔

"میرے پاس کوئی زیور نہیں ہے۔ خود دیکھ لو۔"

"دیکھنے سے کام نہیں چلے گا سوہنیو۔" وہ عامیانہ انداز میں بولا۔

"تلاشی لینی پڑے گی تمہاری۔" یہ کہہ کر وہ ہاتھ بڑھائے جالاں کی طرف بڑھا۔ وہ سہم کر پیچھے کو سمٹ گئی اور اس کے ساتھ ہی اس کی نگاہیں میری جانب اٹھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ ہاتھ جالاں کے گلے یا کانوں تک پہنچتے میں نے بیٹھے بیٹھے جھولی والے کے گھٹنے کے پیچھے ایک لات رسید کی۔ وہ چیخ مار کر آگے کی طرف گرا اور بس میں خوف اور دہشت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ گھمن ڈاکو نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا اور وہ پستول تان کر میری طرف بڑھا۔

"تو کون ہے اوئے؟" اس نے حقارت اور غصے سے پوچھا "کھڑا ہو جا۔" میں اپنی سیٹ پر سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"یہ تیری کون لگتی ہے؟" اس نے جالاں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا اور اس کا ہاتھ جالاں کے شانے کی طرف بڑھا۔ ایک لمحے کے لیے اس کی نظر میری نظروں سے ہٹی اور میں نے جھپٹ کر اس کے پستول والے ہاتھ پر ہاتھ مار دیا۔ پستول اس کے ہاتھ سے گرا تو ہم دونوں بیک وقت اسے اٹھانے کے لیے جھکے۔ میں نے جھکتے جھکتے پوری قوت سے اس کے منہ پر ایک گھونسہ رسید کیا اور وہ چیخ مار کر اوندھا گر گیا۔ غالباً یہ سب کچھ گھمن کی برداشت سے باہر ہو چکا تھا۔ اس نے فائر جھونک دیا مگر میں پہلے ہی اس کی توقع کر رہا تھا۔ اس لیے برق رفتاری سے اپنی جگہ سے ہٹ چکا تھا۔ میرا رخ اب گھمن کی طرف تھا جو دوسرا فائر کرنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ میں نے اٹھتے اٹھتے ایک سیٹ پر رکھا ہوا تھیلا گھمن کی طرف اچھال دیا۔ اس کا فائر چھت کی طرف گیا مگر اس

سے پہلے کہ مَیں اس کی طرف لپک کر اسے دبوچ لیتا میرے پیچھے سے اس کے ایک ساتھی نے میری گردن کے پچھلے حصّے پر پوری طاقت سے ضرب لگائی۔ مَیں نے سنبھلنے کی کوشش کی مگر دوسرے بھرپور وار نے مجھے ہوش و حواس سے بے گانہ کر دیا۔

مجھے ہوش آیا تو مَیں ایک پتھریلی زمین پر پڑا ہوا تھا۔ مَیں نے آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا اور اُٹھنے کی کوشش کی۔ مَیں ایک کھنڈر نما عمارت میں تھا اور مجھ سے کچھ فاصلے پر ایک کرخت شکل کا آدمی بندوق لیے بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے حرکت کرتے ہوئے دیکھا تو وہ اُچھل کر کھڑا ہو گیا اور بندوق کا رُخ میری طرف کر دیا۔ یہ عمارت کا کوئی ہال کمرہ تھا جو بالکل ٹوٹا پھوٹا اور ہر قسم کے سامان اور فرنیچر سے محروم تھا۔ ہال میں تین اطراف دروازے تھے جبکہ چوتھی سمت میں ایک برآمدہ تھا جو شکست و ریخت کا شکار ہو چکا تھا۔ ہر طرف خاموشی کا راج تھا اور یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ آس پاس کچھ اور لوگ بھی موجود ہیں یا ہم دونوں کے سوا کوئی اور نہیں ہے۔

"چُپ چاپ بیٹھے رہو۔ اگر حرکت کرو گے تو چھلنی کر دوں گا۔"

وہ مجھے ہوشیار اور بیدار دیکھ کر چلّایا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنانے میں کوئی تامّل نہیں کرے گا۔ اس لیے میں اپنے گھٹنوں کے گرد بازو باندھ کر خاموش بیٹھ گیا۔ وہ چند قدم آگے بڑھا مگر پھر وہیں تھم کر کھڑا ہو گیا۔

مجھے جالاں اور گھمّن ڈاکو اور اس کے ساتھی کا خیال آیا تو خاموش نہ رہ سکا۔ مَیں نے بے تابی سے پوچھا: "میری ساتھی عورت کہاں ہے؟"

"کون ہے وہ تیری؟" اس نے تمسخرانہ انداز میں پوچھا: "بیوی ہے یا بہن؟"

اس کا لہجہ اس قدر تحقیر آمیز تھا کہ میرا خون کھول اُٹھا۔ میرے قدموں کے پاس اُکھڑی ہوئی اینٹ کا ایک ٹکڑا پڑا ہوا تھا۔ اس کے سوچنے اور سنبھلنے سے پہلے میرا ہاتھ حرکت میں آیا اور اینٹ کا وہ ٹکڑا بندوق کی گولی کی طرح اس کی طرف لپکا اور اس کے سینے سے ٹکرایا۔ وہ بے اختیار ایک آہ بھر کر زمین پر گر گیا۔ مَیں نے اُسے اُٹھنے کا موقع نہیں دیا۔ دوسرے ہی لمحے میں اپنے پیروں پر اُچھل کر اس پر جا پڑا اور مَیں نے ایک جھٹکے سے اس کی بندوق چھین لی۔ بندوق کے دستے کی ایک اور ضرب نے اسے کافی دیر کے لیے بے ہوش کر دیا۔

اب مَیں نے اپنے آس پاس کا جائزہ لیا۔ اس کے بے ہوش جسم کو گھسیٹ کر ایک دروازے کے اندر ڈال اور خود برآمدے کی طرف چل پڑا۔ برآمدہ خاصا بوسیدہ تھا۔ اس میں چند کمروں کے دروازے تھے مگر اب وہ کمرے بے در و دیوار تھے۔ مَیں دبے قدموں سے آگے بڑھتا رہا، یہاں تک کہ برآمدہ ختم ہو گیا۔ سامنے کچھ فاصلے پر ایک اور پرانی عمارت تھی۔ جس کی حالت اس کھنڈر سے قدرے بہتر تھی۔ مَیں قریب قریب دوڑتا ہوا اس عمارت کی طرف گیا۔ اس کا بڑا پھاٹک بند تھا لیکن ایک ہی دھکّے میں وہ زور دار آواز کے ساتھ کھل گیا۔ کمرے میں نیم تاریکی تھی۔ اس لیے مَیں کچھ دیکھ نہیں سکا مگر میری تمام حسیات پوری طرح بیدار ہو چکی تھیں۔ نیم تاریکی کے باوجود مَیں نے کمرے کے ایک گوشے میں شعلہ سا لپکتا ہوا دیکھا جو یقیناً پستول کا فائر تھا مگر مَیں فوری طور پر زمین پر گر کر لوٹ لگاتا ہوا اسی جانب بڑھا۔ میرا جسم کسی شخص کے مضبوط قدموں سے پوری طاقت کے ساتھ ٹکرایا اور وہ اپنا توازن قائم نہ رکھنے کی وجہ سے مجھ پر گر گیا۔ وہ کوئی انتہائی پھرتیلا شخص تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ایک ہاتھ سے میرا گلا دبوچ لیا اور دوسرے ہاتھ میں تھامے ہوئے پستول کو اُوپر اُٹھایا لیکن مَیں بھی غافل نہیں تھا مَیں نے ایک زوردار جھٹکے کے ساتھ اس کا پستول والا ہاتھ موڑنے کی کوشش کی۔ اس اثنا میں ٹرائیگر پر اس کی اُنگلی کا دباؤ پڑ چکا تھا۔ فائر کی آواز آئی اور گولی اس کے سینے میں پیوست ہو گئی۔ مَیں تیزی سے

اس کے جسم کے دباؤ سے نکلا اور اس کے دوسرے حملے کے لیے تیّار ہو گیا لیکن گولی شاید اس کے دل میں پیوست ہو گئی تھی اور کسی تاخیر کے بغیر اس کی موت واقع ہو چکی تھی۔ اب میری آنکھیں کمرے کی نیم تاریکی کی عادی ہو چکی تھیں اور مَیں اپنے قدموں میں پڑے ہوئے بے جان شخص کا چہرہ دیکھ سکتا تھا۔ وہ گھمّن ڈاکو کا ساتھی تھا جو بس میں اُس کے ساتھ پستول تھامے کھڑا تھا۔ اب مَیں نے کمرے میں چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ دو لکڑی کی بوسیدہ کرسیوں کے سوا یہ ہر قسم کے فرنیچر سے محروم تھا۔ کرسیوں کے سامنے ایک ٹوٹا ہوا اسٹول پڑا ہوا تھا یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ یہ مقام عام طور پر لوگوں کے استعمال میں نہیں رہتا ورنہ رہن سہن کا کوئی سامان ضرور نظر آتا۔ مجھے جالاں کی فکر تھی جس کا کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ خدا جانے وہ کہاں اور کس حال میں ہو گی؟ یہ خیال میرے لیے خاصا سوہانِ روح تھا لیکن دوڑتے ہوئے بھاری قدموں کی آواز نے مجھے ہوشیار اور چوکنّا کر دیا۔ ظاہر ہے کہ پستول کے فائروں کی آوازوں کی گونج دُور تک پہنچی ہو گی اور اگر اطراف میں ان کا کوئی اور ساتھی موجود تھا تو وہ خبر لینے کی غرض سے آ رہا تھا۔ مَیں نے جھک کر ہلاک ہونے والے شخص کا پستول اُٹھا لیا اور لپک کر برآمدے کی جانب بڑھا۔ جدھر سے بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز لحظہ بلحظہ نزدیک ہوتی جا رہی تھی۔ مَیں اور آنے والا قریب قریب ایک ہی وقت میں برآمدے کے سامنے پہنچے۔ مجھے اس پر یہ سبقت حاصل تھی کہ میری آنکھیں اب نیم تاریکی میں دیکھنے کے قابل ہو چکی تھیں۔ جب کہ وہ تیز روشنی میں سے آ رہا تھا اور کمرے کے اندر کی چیزوں کو صاف اور واضح طور پر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میرا پستول والا ہاتھ جو پہلے ہی اُونچا اُٹھا ہوا تھا پُوری قوت سے اس کی گردن اور شانے کے جوڑ پر لگا اور وہ کسی آواز کے بغیر زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ وہ ایک لمبا چوڑا اور مضبوط آدمی تھا اور اس کے ہاتھ میں بندوق تھی۔ بندوق پر اس کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ بیہوش ہونے کے باوجود وہ بدستور اس کے ہاتھ میں تھی۔ مَیں نے اسے زیادہ غور سے دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں اور تیز قدموں کے ساتھ برآمدے کے بیرونی حصّے کی جانب بڑھا۔

یہ اس پُرانی عمارت کا عقبی حصہ تھا اور غالباً کسی زمانے میں ملازموں کے رہنے کے لیے استعمال ہوا کرتا تھا۔ یہ چند کمروں اور ان سے متصل ایک اصطبل پر مشتمل تھا۔ یہ حصہ ابھی تک کھنڈر میں تبدیل نہیں ہوا تھا اور قدرے بہتر حالت میں تھا۔ مَیں نے رُک کر چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ چاروں طرف خاموشی اور ویرانی تھی۔ مَیں نے عمارت کے اس حصّے کی طرف قدم بڑھایا۔ میدان نما جگہ سے گزر کر مَیں اصطبل میں پہنچ گیا جس میں سوکھی ہوئی گھاس کے ڈھیر پڑے ہوئے تھے۔ گھاس نہ صرف اصطبل بلکہ اس کے باہر بھی پھیلی ہوئی تھی جس کی وجہ سے میرے قدموں کی آہٹ خود بخود کم ہو گئی تھی۔ مَیں اصطبل کے برآمدے سے گزرتا ہوا ایک کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا۔ اس دروازے کے بالائی شیشے ٹوٹ چکے تھے۔ اور ان کی جگہ لکڑی کے تختے استعمال کئے گئے تھے۔ مَیں نے دروازے کے پاس ٹھٹھک کر اندر جھانکا اور سامنے کے منظر دیکھتے ہی پستول کے دستے پر میری گرفت مضبوط ہو گئی۔ اس کمرے میں گھاس کے سوا اور کسی قسم کا سامان موجود نہیں تھا۔ کمرے کے درمیان میں ایک لکڑی کا شہتیر چھت تک نصب تھا۔ اس شہتیر کے ساتھ جالاں رسی سے بندھی ہوئی کھڑی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ لباس جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ چہرے پر خراشوں کے نشان تھے اور اس کے مُنہ پر ایک کپڑا بندھا ہوا تھا اس کے باوجود وہ آزاد ہونے کے لیے کشمکش میں مصروف تھی۔ اس سے ایک قدم کے فاصلے پر گھمّن کھڑا جھوم رہا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ نشے میں ہے۔ اس کی مزید تصدیق فرش پر پڑی ہوئی شراب کی بوتلوں نے کر دی۔ ان میں سے بیشتر خالی ہو چکی تھیں۔ گھمّن کے چہرے پر ایک خباثت آمیز مسکراہٹ تھی اور ایک ہاتھ میں وہ شراب کی بوتل تھامے ہوئے تھے۔ ان دونوں سے کچھ فاصلے پر فرش پر ایک اور آدمی بیٹھا ہوا مرغ کی ٹانگ کو دانتوں سے نوچ

نوچ کر کھانے میں مصروف تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے بس میں جھولی سنبھال کر مسافروں سے نقدی اور زیورات بٹورے تھے۔ وہ بڑی دلچسپی کے ساتھ کھانے میں مصروف تھا لیکن اس کی نگاہیں جالاں کے جسم پر جمی ہوئی تھیں۔ گھمن نے ایک قہقہہ لگایا اور خالی بوتل لاپرواہی سے دور پھینک دی۔ اب اس کی تمام تر توجہ جالاں پر مرکوز ہو گئی تھی۔ اپنے دونوں بازو پھیلا کر وہ اسے آغوش میں سمیٹنے کے لیے آگے بڑھا۔ جالاں کے ستے ہوئے چہرے پر ایک نفرت وکراہت آمیز تاثر نمایاں تھا۔ اس نے اپنے جسم کو آزاد کرنے کی بھرپور کوشش کی لیکن صرف بل کھا کر رہ گئی۔ گھمن معنی خیز انداز میں ہنسا اور اس نے ایک ہی جھٹکے میں جالاں کی قمیص کی ایک آستین نوچ کر پھینک دی۔ جالاں کے منہ سے دبی دبی آوازیں نکلیں۔ وہ بولنے سے معذور تھی لیکن اپنی دانست میں کسی غیبی طاقت کو مدد کے لیے پکار رہی تھی۔ جالاں کی بے بسی پر گھمن نے ایک زوردار فرمائشی قہقہہ لگایا اور اس کا ہاتھ ایک بار پھر جالاں کی طرف بڑھا۔ یہ سب کچھ اب میری برداشت سے باہر ہو چکا تھا۔ میں نے پوری قوت سے دروازے پر ایک لات رسید کی اور وہ چرچراہٹ کے ساتھ کھل گیا۔ گھمن اور اس کے ساتھی نے بے اختیار پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا جہاں میں پستول تانے ہوئے کھڑا تھا۔ ان دونوں کے چہروں پر حیرت اور خوف کا تاثر نمودار ہوا۔ وہ اچانک مجھے اپنے سامنے پاکر ششدر رہ گئے تھے اور بے یقینی سے مجھے یوں دیکھ رہے تھے جیسے انھیں اپنی بصارت پر بھروسہ نہ ہو۔ جالاں کا دکھی چہرہ مجھے دیکھ کر خوشی سے جگمگا اٹھا اور اس کے منہ سے بے ساختہ موہوم سی آواز نکلی لیکن میری تمام تر توجہ گھمن اور اس کے ساتھی پر مرکوز تھی۔ جو رفتہ رفتہ ابتدائی حیرت کے اثر سے باہر نکل کر اب خونخوار نظروں سے مجھے گھور رہے تھے۔ گھمن نے اپنے ساتھی کی طرف چور نگاہوں سے دیکھا جس کا ہاتھ آہستہ آہستہ نزدیک پڑی ہوئی بندوق کی طرف رینگ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ بندوق اٹھاتا میری پستول کی گولی اس کے بازو سے گزر گئی اور وہ چیخ مار کر فرش پر لوٹنے لگا۔ گھمن اب سہمی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ وہ بالکل نہتا تھا لہٰذا ایک بزدل انسان کی طرح ہتھیار اور طاقت کے بغیر وہ اپنے آپ کو انتہائی کمزور اور بے سہارا محسوس کر رہا تھا۔ میں نے ایک پل کے لیے بھی اپنی نظریں اس کے چہرے سے نہیں ہٹائی تھیں۔ کچھ دیر پہلے میری نگاہوں کے سامنے وہ ایک ظالم اور بے رحم درندے کے روپ میں موجود تھا لیکن وہی شخص اب دیکھتے ہی دیکھتے بھیگی بلی کی طرح مظلوم اور خوفزدہ نظر آنے لگا تھا۔ اس کا نشہ ہرن ہو چکا تھا اور عیش وطرب کا جو خواب اس نے دیکھا تھا وہ چکنا چور ہو کر رہ گیا تھا۔ اب وہ ایک سہما ہوا انسان تھا اور مکمل طور پر میرے رحم وکرم پر تھا۔ گھمن جیسے سنگدل لوگ کسی رعایت کے مستحق نہیں ہوتے۔ دنیا کا کوئی مذہب، کوئی قانون، کوئی معاشرہ ایسے لوگوں پر ترس کھانے کی تلقین نہیں کرتا۔ اس کے ظالمانہ کرتوت میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ جی تو چاہتا تھا کہ اس کے گناہگار جسم کو گولیوں سے چھلنی کر دوں۔ بے بس اور کمزور انسانوں پر اٹھنے والے اس کے مضبوط ہاتھوں کی ہڈیاں توڑ کر رکھ دوں۔ اسے ایسا مزہ چکھاؤں کہ وہ عمر بھر یاد رکھے۔ پستول کی شکل میں قانون میرے قبضے میں تھا۔ اس کے جرائم کا میں بذات خود چشم دید گواہ تھا اور اب منصف کا کردار بھی مجھ ہی کو ادا کرنا تھا۔ غصے کی ایک لہر میرے سارے جسم میں دوڑ گئی تھی لیکن رفتہ رفتہ میں جذبات پر قابو پانے میں کامیاب ہو گیا۔ مجرم کو سزا دینے کا اختیار مجھے کسی قانون نے نہیں بخشا تھا۔ وہ لاکھ گناہگار سہی لیکن مجھے کسی نے منصب کی گدی پر فائز نہیں کیا تھا۔ اس کے علاوہ کسی نہتے انسان کی جان لینا مجھے یوں بھی گوارا نہیں تھا۔ میرے اندر کا سویا ہوا انسان آہستہ آہستہ بیدار ہو چکا تھا۔ اگر میں نے گھمن اور اس کے ساتھی کی جان لے لی پھر اس میں اور مجھ میں کیا فرق باقی رہ جائے گا؟ لیکن کیا اس کو یوں ہی آزاد چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ معصوم

اور بے گناہ شہریوں کے جان ومال کو نقصان پہنچانے کے لیے دندناتا رہے؟ یہ خیالات تیزی سے میرے ذہن میں گھوم رہے تھے اور اس اثنا میں میرے قدم رک رک کر آگے بڑھ رہے تھے۔ جیسے جیسے میں آگے بڑھتا جا رہا تھا گھمن سہمے ہوئے انداز میں پیچھے ہٹ رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ دیوار سے جا لگا۔ میں نے جالاں کے پاس پہنچ کر اس کے منہ پر بندھا ہوا کپڑا اتارا تو وہ چیخیں مار مار کر رونے لگی۔

"یہ ظالم ہے بابو جی۔ اس نے۔ اس نے....." اس کے آگے وہ کچھ اور نہ کہہ سکی۔ اسکی آواز رندھ گئی اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اس نے ایک نظر جگہ جگہ سے اپنے لباس سے جھلکتے جسم پر ڈالی اور اسکی نگاہیں جھک گئیں۔ وہ بے اختیار بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ رونے لگی۔ اس لمحے وہ مجھے اتنی معصوم، اتنی خوبصورت اور اتنی پاکیزہ لگی کہ مجھے بے ساختہ اس پر پیار آ گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے دلاسہ دیا اور تسلی آمیز انداز میں اس کا سر تھپکنے لگا۔ میری یہ محبت اور ہمدردی اس کے لیے تازیانہ ثابت ہوئی اور اس کی گریہ زاری میں اضافہ ہو گیا۔ میں جانتا تھا کہ اس کے دل پر اس وقت کیا کیفیت گزر رہی ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اسے خاموش کرانے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ میں نے ایک لمحے کے لیے بھی اپنی توجہ گھمن اور اس کے زخمی ساتھی پر سے نہیں ہٹائی، لیکن یہ غیر ضروری تھا۔ وہ بزدل اب کسی جارحانہ جوابی کارروائی کے قابل ہی نہیں رہے تھے۔ کچھ دیر بعد جالاں کا رونا کم ہوا۔ رونے کی آواز رفتہ رفتہ سسکیوں میں تبدیل ہو گئی اور اس کا جسم ہولے ہولے کانپنے لگا۔ یہاں تک کہ وہ پوری طرح پرسکون ہو گئی۔

وہ ایک جی دار اور بہادر لڑکی تھی۔ اس کا تجربہ مجھے پہلے بھی ہو چکا تھا اور میں جانتا تھا کہ اگر اس کا بس چلتا تو وہ اپنی جان دے دیتی، لیکن ان درندوں کو اپنے جسم کو چھونے کی اجازت ہرگز نہ دیتی پھر بھی یہ خیال میرے لیے تسکین بخش تھا کہ اسکی آبرو ابھی تک محفوظ تھی۔ شاید خدا کو یہی منظور تھا۔ اگر میں کچھ دیر اور وہاں نہ پہنچتا تو نہ جانے اس پر کیا کچھ بیت جاتی۔ بہرحال میں نے اس کے جسم پر مضبوطی سے بندھی ہوئی رسیاں کھول کر اسے آزاد کر دیا۔

اسے اتنی مضبوطی اور بے دردی کے ساتھ رسی سے جکڑا گیا تھا کہ وہ حرکت کرنے کے قابل بھی نہیں رہی تھی۔ آزاد ہوتے ہی وہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح لپک کر گھمن کے پاس گئی اور اس کے چہرے پر بے تحاشا طمانچے اور گھونسے مارنے لگی اس پر ایک دیوانگی کا عالم طاری تھا۔ گھمن اس کے حملوں سے محفوظ رہنے کے لیے اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے چھپانے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن جالاں کے ناخنوں سے اس کا چہرہ لہولہان ہو گیا تھا۔ پھر بھی اس کے غیظ وغضب میں کمی نہیں پیدا ہوئی تھی۔ یکایک وہ پلٹ کر میرے پاس آئی اور جھپٹ کے میرے ہاتھ سے پستول چھین لیا۔ اس نے پستول کا رخ گھمن کی طرف موڑ کر فائر کر دیا۔ اگر میں عین وقت پر اس کا بازو نہ تھام لیتا تو پستول سے نکلی ہوئی گولی گھمن کی زندگی کا خاتمہ کر دیتی، لیکن گولی پاس والی دیوار میں پیوست ہو گئی تھی۔ گھمن کا چہرہ خوف سے بالکل سفید ہو گیا تھا اور وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر جالاں کے سامنے کھڑا تھا۔

"خدا کا واسطہ مجھے جان سے نہ مارو۔ مجھے معاف کر دو۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ تمہارے پیر پکڑتا ہوں۔" وہ گھگھیا رہا تھا۔ وہ ایک ایسی عورت سے معافی اور رحم کی بھیک مانگ رہا تھا جس کے لیے چند لمحے پیشتر اس کے پاس ظلم وتشدد کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ جالاں مجھ سے اپنا بازو چھڑانے کے لیے جدوجہد کر رہی تھی لیکن میں نے زبردستی پستول اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔

"رہنے دو جالاں۔ اس کے ناپاک خون سے اپنے ہاتھ رنگین نہ کرو۔"

"نہیں" وہ غصے میں چلائی "میں اس کمینے کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔"

مگر میں نے اپنی گرفت کمزور نہیں ہونے دی۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ ہیجانی کیفیت ختم ہوگئی اور وہ معمول پر آگئی۔

"سنو جالاں۔ انسان کو بُرے لوگوں کے ساتھ خود بھی بُرا نہیں بن جانا چاہیئے۔ ان لوگوں کو قانون کے حوالے کر دینا ہی بہتر ہوگا تاکہ وہ انہیں ان کے سنگین جرائم کی سزا دے سکے۔ لو تم یہ پستول تھام لو۔ میں ان دونوں کو رسّی سے باندھتا ہوں۔"

میں نے پستول جالاں کے ہاتھ میں واپس دیا تو گھمن اور اس کے ساتھی کے چہرے خوف سے پیلے پڑ گئے وہ کسی بھی لمحے اپنی موت کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو چکے تھے لیکن میں جانتا تھا کہ جالاں اب اپنے ہیجانی جذبات اور اعصاب پر قابو پانے میں پوری طرح کامیاب ہو چکی ہے اور میرے اعتماد کو کسی طرح بھی ٹھیس نہیں پہنچائے گی۔ میں نے رسّی اُٹھا کر پہلے گھمن کو اور پھر اس کے ساتھی کو مضبوطی کے ساتھ جکڑ دیا۔ اس کے ساتھی کا زخم مہلک نہیں تھا، لیکن خون کافی بہہ جانے کی وجہ سے وہ خاصا کمزور ہو چکا تھا۔ میں نے نزدیک ہی پڑے ہوئے جالاں کے دوپٹے کی ایک پٹی پھاڑ کر مضبوطی سے اس کے زخم پر باندھ دی۔ ان دونوں میں سے کسی نے ذرا بھی مزاحمت نہیں کی۔ ان کی تمام سرکشی، رعونت اور بہادری رفو چکر ہو چکی تھی۔ اس کے بعد میں جالاں کی طرف متوجہ ہوا جو بڑے پُرسکون انداز میں پستول کا رُخ ان دونوں کی طرف موڑے ہوئے کھڑی تھی۔

"جالاں۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ یہ بتاؤ کہ ان لوگوں کے پاس کوئی سواری بھی ہے یا نہیں؟"

"ان کے پاس ایک ویگن ہے جو یہاں سے تھوڑے فاصلے پر کھڑی ہوئی ہے۔ بس کو لُوٹنے کے بعد سارا سامان اور ہم دونوں کو یہ اُسی ویگن میں یہاں لے کر آئے تھے۔"

جالاں کے تذکرہ کرنے پر میں نے پہلی بار کمرے کے ایک کونے میں پڑے ہوئے اپنے سوٹ کیس اور دوسرے سامان کو دیکھا۔ ان میں دو بڑی کپڑے کی پوٹلیاں تھیں۔ ظاہر ہے کہ ان میں مظلوم مسافروں سے لُوٹا ہوا ساز و سامان اور زیور ہوگا۔ میں نے اپنا سوٹ کیس کھول کر دیکھا تو اس میں کپڑے وغیرہ بالکل محفوظ تھے۔ میری رقم بھی اسی سوٹ کیس میں رکھی ہوئی تھی جسے پا کر میں نے اطمینان اور سکون کا سانس لیا کیونکہ ان نامساعد اور غیر یقینی ہنگامی حالات میں مجھے ہر دم نقد روپے کی ضرورت پیش آسکتی تھی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ کپڑے اور نقد رقم مجھے باحفاظت مل گئے تھے۔ ان کی ویگن عمارت سے کچھ فاصلے پر جھاڑیوں کے پیچھے کھڑی تھی۔ میں نے پہلے اس میں سامان لادا اور پھر اُن دونوں کو بھی لے جا کر ویگن کے پچھلے حصے میں بٹھا دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اب وہ دونوں زہر نکالے ہوئے سانپ کی طرح قطعی بے ضرر ہیں۔ اتنی دیر میں جالاں نے مٹی کے گھڑے میں رکھے ہوئے پانی سے مُنہ ہاتھ دھو کر سوٹ کیس میں رکھا ہوا اپنا دوسرا لباس پہن لیا تھا۔ اس کے چہرے پر اب رونق اور خوشی کے آثار دوبارہ پیدا ہو چکے تھے اور وہ کچھ دیر پہلے والی جالاں کے مقابلے میں ایک یکسر مختلف عورت نظر آ رہی تھی۔ جالاں کو میں نے ویگن کی اگلی سیٹ پر اپنے برابر بٹھایا اور اس ویران جگہ سے رخصت ہو گئے۔ سب سے پہلا مسئلہ گھمن اور اُس کے ساتھی کو ٹھکانے لگانے کا تھا۔ میں نے ان دونوں کے لیے ایک حل سوچ لیا تھا جس پر عمل کرنا بھی زیادہ مشکل نہ تھا۔ ہم ایک غیر آباد علاقے میں پختہ سڑک پر سفر کر رہے تھے۔ آبادیوں اور قصبوں کے ناموں کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ میں اپنے شہر اور گھر سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ اگرچہ یہ علاقہ میرے لیے اجنبی اور غیر مانوس تھا، لیکن میں اتنا ضرور جانتا تھا کہ کس سمت میں سفر کرنے کے بعد میں اپنی منزل پر پہنچ جاؤں گا۔ یہ کیفیت اس سے پہلے والی بے یقینی کی کیفیت سے بہتر تھی جب ہم بس میں سفر کر رہے تھے اور یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟ اس سڑک پر ٹریفک زیادہ نہ تھا، لیکن مسافر بسیں تھوڑے تھوڑے وقفے کے

ساتھ گزرتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ دس بارہ میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد مجھے وہ جگہ نظر آگئی جس کی مجھے تلاش تھی۔ یہاں سڑک کے کنارے دور تک باغوں اور جنگلوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ میں نے سڑک چھوڑ کر درختوں کے ذخیرے کا رخ کیا اور چند سو گز آگے جا کر ویگن سے اتر گیا۔ اپنا سوٹ کیس سنبھالنے کے بعد میں نے ویگن کی چابی اپنی جیب میں ڈالی۔ سوٹ کیس سنبھال کر جالاں کو ساتھ لیا اور پختہ سڑک کی طرف روانہ ہو گیا۔ جانے سے پہلے میں ویگن کے دروازوں کو احتیاطاً مقفل کرنا نہیں بھولا تھا۔ جالاں اگرچہ اس وقت ایک شائستہ شہری دوشیزہ کے روپ میں تھی، لیکن حقیقت میں تو وہ ایک جفاکش دیہاتی لڑکی تھی۔ اس لیے میرے ساتھ پیدل سفر کرتے ہوئے اسے کسی قسم کی دشواری محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ ہم جیسے ہی سڑک پر پہنچے ہمیں شہر کی طرف جانے والی ایک بس مل گئی۔ قریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد ہم شہر پہنچ گئے۔ بس سٹاپ کے نزدیک ہی ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں کمرہ بک کرنے کے بعد ہم کمرے میں داخل ہوئے تو جالاں بڑی بے تکلفی سے بستر پر نیم دراز ہو گئی۔ تھکن اس کے چہرے اور انگ انگ سے نمایاں تھی۔

"تم تھوڑی دیر آرام کرلو۔ میں ایک دو ضروری کام کر کے ابھی واپس آتا ہوں۔" اس کا جواب سننے سے پہلے ہی کمرے سے باہر نکل گیا۔

ہوٹل کی لابی میں ایک گوشے میں ٹیلی فون بوتھ تھا جہاں پہنچ کر میں نے سامنے چسپاں فہرست میں سے پولیس سٹیشن کا نمبر تلاش کر کے فون ملایا اور آواز بدل کر انہیں اس علاقے کا پتہ نشان بتانے کے بعد اطلاع دی کہ وہاں ایک مطلوبہ مجرم اپنے ساتھی اور لوٹ کے سامان کے ساتھ ویگن میں بند ہے۔

"آپ کون بول رہے ہیں؟"

میں نے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا مگر میں جانتا تھا کہ کچھ دیر بعد پولیس گھمن تک پہنچ جائے گی اور اخبارات میں پولیس کی کارکردگی تصاویر کے ساتھ شائع ہوگی۔ فی الحال جالاں کی طرف سے میں بے فکر تھا اس لیے اپنے ذاتی مسائل کی طرف توجہ دے سکتا تھا۔ سب سے پہلا مسئلہ یہ تھا کہ اپنے ہم شکل ٹونی کے بارے میں مجھے کچھ علم نہ تھا کہ اس نے گزشتہ دنوں میں اور کیا کیا کارنامے سرانجام دیئے ہیں اور مجرم ٹونی کے روپ میں میرے سر اور کتنے الزام تھوپے گئے ہیں۔ روزی کی طرف سے مجھے جو خلش رہا کرتی تھی وہ اب دور ہو چکی تھی اور میں جان گیا تھا کہ وہ سرتاپا ایک زہریلی ناگن ہے جو ایک طرف تو ٹونی کو دھوکہ دیتی رہی اور دوسری طرف اپنی وفاداری اور محبت کی اداکاری سے مجھے اپنے جال میں پھانسے رہی۔ حالانکہ وہ اس دوران میں ہم دونوں کو آلہ کار بنا رہی تھی اور اس کا حقیقی محبوب اور رفیق شوکت تھا۔ شوکت جس پر میں بطور دوست دنیا کی ہر چیز سے زیادہ بھروسہ کرتا تھا اور جو مجھے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز تھا۔ اس شوکت کے چہرے سے اب نقاب ہٹ چکا تھا اور مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ مجھے عاشی سے دور کر کے روزی کے جال میں پھنسانے کا ذمہ داری صرف شوکت تھا جس نے اپنی اس سازش کے ذریعے میری زندگی میں ایسا زہر گھول دیا تھا کہ میں جیتے جی مر گیا تھا۔ بہرحال اب میں تقدیر کی گردش کا شکار ہو کر اپنی بقا کے لیے جدوجہد کرنے کی خاطر دنیا میں بالکل تنہا رہ گیا تھا۔ یکایک مجھے اپنے نہایت قریبی اور عزیز دوست عارف کا خیال آیا اور اندھیروں میں روشنی کی ایک کرن جگمگاتی ہوئی نظر آنے لگی۔

عارف میرا بچپن کا دوست اور کلاس فیلو تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ایک کامیاب وکیل بھی تھا، جس کی صلاحیتوں اور تجربے کی مجھے اس وقت سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ عارف سے میری ملاقات بہت زیادہ نہیں ہوا کرتی تھی پھر بھی

ہمارے درمیان دوستی اور اعتماد کا ایک رشتہ قائم تھا۔ میں حیران تھا کہ مجھے اس کا خیال پہلے کیوں نہ آیا۔ وہی ایک ایسا شخص تھا جو اس مشکل میں میری مدد کر سکتا تھا۔

سہ پہر کا وقت تھا اور اس وقت عارف عموماً اپنے گھر پر آرام کیا کرتا تھا۔ شام کو دفتر جانا اور رات دیر تک وہاں مصروف رہنا اس کا معمول تھا۔ میرے لیے اس سے گھر میں ملاقات کرنا ہی قرین مصلحت تھا۔

ہوٹل کی لابی سے باہر نکل کر میں نے ایک ٹیکسی تلاش کی اور اس میں سوار ہو کر عارف کے بنگلے کا رخ کیا جو ایک فیشن ایبل علاقے میں واقع تھا۔ اس سے پہلے میں نے ہوٹل میں ایک گفٹ شاپ سے دھوپ کی عینک بھی خرید کر اپنے چہرے پر سجالی تھی تاکہ پہلی ہی نظر میں مجھے دیکھ کر کوئی پہچان نہ سکے۔

میری خوش قسمتی کہ عارف گھر پر ہی موجود تھا۔ گھنٹی کی آواز پر ایک ملازم نے باہر نکل کر میرا نام دریافت کیا اور دوسرے ہی لمحے عارف دروازے پر نمودار ہو گیا وہ مسکراتا ہوا میری طرف بڑھا "ارے بھئی آج تو کچھ تقسیم کرنا چاہیئے۔ تم بھی آج راستہ بھول پڑے" یکایک اس کی نظر ٹیکسی پر پڑی اور اس کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہو گئی "ٹیکسی میں آئے ہو کاریں کہاں چلی گئیں؟" اس نے حیران ہو کر دریافت کیا۔

"اندر چلو۔ سب کچھ بتا دوں گا" میں نے مختصراً جواب دیا اور اندر کا رخ کیا۔ وہ میرے ساتھ چلنے لگا لیکن اس کے چہرے سے الجھن اور حیرت کے آثار ہویدا تھے۔

ڈرائنگ روم میں پہنچ کر میں ایک صوفے پر بیٹھ گیا مگر وہ بدستور کھڑا رہا اور مجھے گھورتا رہا۔

"سنو عارف" میں نے نرمی اور اعتماد کے لہجے میں بات شروع کی "تم ایک ذہین آدمی ہو اور میں جانتا ہوں کہ اس وقت کیا سوچ رہے ہو، لیکن مجھے یقین ہے کہ شاید تم میری بات کا یقین کر لو گے کیونکہ تم مجھے بچپن سے جانتے ہو"

وہ خاموشی سے میرے سامنے بیٹھ گیا۔

"تم نے پچھلے دنوں اخبارات میں سب حالات پڑھ لیے ہوں گے۔ وہ درست ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ جو شخص یوسف کا روپ دھار کر میرے گھر پر قبضہ کیے ہوئے بیٹھا ہے وہ جعل ساز اور بہروپیا ہے۔ اس نے سازش اور منصوبے کے تحت میری جگہ سنبھال لی ہے اور اس کے پاس بظاہر تمام ثبوت اور تمام دلائل بھی موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں تمہارے پاس آیا ہوں۔ صرف تم ہی ایسے شخص ہو جو میری راہنمائی اور مدد کر سکتے ہو"

"تو۔ تو تم یوسف نہیں ہو" وہ اچانک صوفے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا مگر پھر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور بولا "میرا مطلب ہے کہ وہ شخص جس نے تمہاری جگہ لی ہے تم وہ نہیں ہو؟"

"ہاں۔ میں وہ نہیں ہوں۔ اس لیے کہ میں اصلی یوسف ہوں اور جیسا کہ تم نے تفصیل سے اخبارات میں پڑھ لیا ہو گا بظاہر میرے پاس اپنے اس دعوے کو ثابت کرنے کا کوئی طریقہ موجود نہیں ہے۔ تمہارے پاس اسی لیے آیا ہوں کہ تم مجھے اس مشکل سے نکلنے کی ترکیب بتاؤ"

عارف دوبارہ صوفے پر بیٹھ گیا لیکن وہ بدستور الجھن کا شکار نظر آ رہا تھا۔ ایک دم پردہ ہٹا اور اس کی خوبصورت بیوی فوزیہ کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی خوشبو کا ایک جھونکا بھی اندر آیا۔ فوزیہ کالج میں عارف کی کلاس فیلو تھی اور اب وہ دونوں پُرسکون اور مطمئن زندگی گزار رہے تھے۔

"اوہ۔ یوسف بھائی۔ کیسے یاد آ گئی ہماری؟" وہ مسکراتی ہوئی میری طرف بڑھی "روزی کے بغیر ہی آ گئے۔ آج کیسے اجازت مل گئی؟" اس نے شرارت بھری آواز میں مجھے چھیڑا۔

اس سے مل کر مجھے ہمیشہ مسرت ہوا کرتی ہے۔ اس بار بھی اس کا شگفتہ اور مہربان چہرہ دیکھ کر مجھے ذہنی اور روحانی تسکین سی محسوس ہوئی۔

"فوزیہ..... یہ..... یہ..." عارف کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

فوزیہ نے حیرانی سے اسکو دیکھا پھر مجھ سے مخاطب ہوئی "آجکل آپ سب ہی کو کچھ ہو گیا ہے۔ آپ کی خبروں اور کارناموں سے اخبار بھرے رہتے ہیں۔ ویسے یوسف بھائی۔ آپ اپنی کہانی لکھ ڈالیے۔ اس پر تو ایک فلم بن سکتی ہے"

کافی عرصے بعد میرے چہرے پر بھی بے ساختہ مسکراہٹ آ گئی اور میں نے کہا "اور اس فلم میں ہیروئن کا کردار تم کو ادا کرنا ہو گا"

"منظور ہے" وہ خوشی سے بولی "بشرطیکہ ہیرو عارف ہوں۔ مگر آپ اور روزی خود بھی تو ہیرو ہیروئن بن سکتے ہیں۔ کیا کمی ہے آپ میں؟"

"بس تو پھر فلم بنانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ سرمایہ تم ہی کو لگانا ہو گا"

"ارے بھئی چائے کافی کو تو پوچھا نہیں اور باتیں شروع کر دیں۔ دیکھو۔ پہلے بہت اچھی سی کافی پلاؤ اور ہاں تم جو سموسے بناتی ہو وہ بھی ضرور بنانا" عارف بات کاٹ کر بولا۔

"سموسے بنانے میں تو دیر لگ جائے گی اور بہت سی چیزیں ہیں کھانے کے لیے"

"نہیں۔ اس وقت تمہارے ہاتھ کے سموسے کھانے کا موڈ ہے۔ یوسف کو بھی بہت پسند ہیں۔ کیوں یوسف؟" اس نے مجھ سے تصدیق چاہی۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ بشرطیکہ زیادہ دیر نہ لگ جائے"

"ارے بس یوں جائے گی اور یوں آ جائے گی۔ چلو فوزیہ۔ شروع ہو جاؤ" اس کا مخصوص شگفتہ انداز رفتہ رفتہ واپس لوٹ آیا تھا۔ فوزیہ مسکراتی ہوئی اندر چلی گئی اور عارف اٹھ کر میرے برابر آ کر بیٹھ گیا "اب سناؤ۔ یہ سب معاملہ کیا ہے؟ یہ سارے عجیب و غریب اتفاقات تمہارے ساتھ ہی کیوں پیش آئے؟"

"بس شامت اعمال سمجھ لو" میں نے آہ بھری۔

"مگر یار حیرت کی بات تو یہ ہے کہ تمہیں روزی بھی نہیں پہچان سکی۔ حد تو یہ ہے کہ تمہارے کتے نے بھی تم پر حملہ کر دیا"

"یہ بہت لمبی کہانی ہے، سنو گے تو تمہیں پتہ چلے گا کہ مجھے کس طرح سازش کا شکار بنایا گیا ہے۔ روزی کی تو بات ہی نہ کرو۔ وہ تو خود اس سازش میں شریک ہے"

"کیا؟" حیرت سے اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ روزی....."

"اب پتہ چلا ہے کہ دنیا میں سب کچھ ہو سکتا ہے۔ یہاں تو کسی پر بھی بھروسہ نہیں کر سکتے"

عارف صوفے پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا "اور شوکت وغیرہ کے بارے میں کیا خیال ہے؟ کیا وہ بھی اس سازش میں شریک ہیں؟"

"رونا تو یہی ہے کہ جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے۔ شوکت ہی تو سارے فساد کی جڑ ہے"

عارف بے یقینی سے میرا چہرہ تک رہا تھا "یار شوکت جیسا دوست۔ روزی جیسی بیوی۔ دونوں ہی دشمن نکلے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے تمہارے پاس اس کا کیا ثبوت ہے؟"

"ثبوت ہی تو نہیں ہے ورنہ اس حالت میں ٹھوکریں کھاتا ہوا پناہ کیوں تلاش کرتا پھرتا۔ دیکھو عارف۔ میں

نے تم پر بھروسہ کیا ہے۔ میرا یقین کرو اور میری مدد کرو۔ مجھے چند دن کے لیے پناہ کی ضرورت ہے۔ قانون اور جرائم پیشہ لوگ سبھی میری کھوج میں ہیں۔ مجھے سوچنے اور عمل کرنے کے لیے کچھ مہلت چاہیئے اگر یوں ہی چھپا پھرا تو میں بے گناہ مارا جاؤں گا۔"

"کوئی بات نہیں ہے ساری پریشانی بھول جاؤ۔ اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم آرام سے بیٹھو میں تمہارے لیے کافی کا بندوبست کر کے ابھی آیا۔ پھر تمہاری کہانی اطمینان سے سنوں گا۔" وہ اُٹھ کر چلا گیا۔

مجھے اب اُمید کی کرن نظر آنے لگی تھی۔ عارف ایک ذہین اور کامیاب وکیل تھا۔ اس کے اور فوزیہ کے دوستانہ اور مخلصانہ رویئے نے میری حوصلہ افزائی کی تھی اور کافی دنوں کے بعد میں پہلی مرتبہ اپنے آپ کو محفوظ خیال کر رہا تھا۔ میرے اعصاب اور ذہن پر چھایا ہوا بوجھ اب ہلکا ہونے لگا تھا۔ میں بے ساختہ مسکرانے لگا۔ میرا دل زور زور سے قہقہے لگانے کو چاہنے لگا۔ منہ ہاتھ دھو کر تازہ دم ہونے کی غرض سے میں نے غسل خانے کا رُخ کیا۔ میں عارف کے گھر میں بے تکلفی اور اپنائیت کے ساتھ ہر جگہ جانے کے لیے آزاد تھا۔ ہمارے تعلقات کی نوعیت ہی کچھ ایسی تھی۔

ڈرائنگ روم سے گزر کر میں ایک گیلری میں پہنچا اور عارف کے بیڈروم کی طرف بڑھا مگر پھر ٹھٹھک کر رہ گیا۔ مجھے دبی آوازیں باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیں۔ میری توقع کے برعکس عارف اور فوزیہ کچن کی بجائے اپنے بیڈروم میں تھے۔

"یہ جعل ساز اور فریبی ہے۔" عارف کی آواز آئی۔ "سب سے بڑا ثبوت تو یہ ہے کہ وہ روزی اور شوکت کو بھی اپنا دُشمن بیان کر رہا ہے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟"

"مگر عارف۔ تم نے دیکھا نہیں وہ بالکل یوسف بھائی کی طرح باتیں کر رہا ہے۔" فوزیہ نے کہا۔

"یہی تو اسکی چالاکی اور عیاری ہے۔ فوزیہ۔ یہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ نہایت اونچے درجے کا مجرم ہے تم نے اخبار میں اس کے کرتوت نہیں پڑھے؟"

فوزیہ کی دھیمی آواز سنائی دی: "میری تو عقل حیران ہے!"

عارف نے کہا: "بات ہی کچھ ایسی ہے۔ اچھا اب سنو۔ میں یوسف اور روزی کو فون کر کے بتاتا ہوں...!"

میرا تمام جسم سنسنانے لگا۔ یوں لگا جیسے جسم سے جان نکلی جا رہی ہے۔

"مگر انہیں بتانے کا کیا فائدہ ہوگا" عارف کی آواز دوبارہ آئی "بہتر ہو کہ میں پولیس کو فون کر دوں۔ اب تو اس کے گرفتار کرانے پر دو لاکھ روپے کا انعام ہے۔"

"عارف۔" فوزیہ بولی "دو لاکھ روپے کی خاطر تم اپنے بہترین دوست کو پولیس کے حوالے کر دوگے؟"

"وہ میرا دوست نہیں ہے فوزیہ۔ وہ بہروپیا ہے۔ جعل ساز ہے اس کو گرفتار کرانا ہی میرے دوست کے حق میں بہتر ہوگا۔ تم ایسا کرو کہ کچن میں جا کر سموسے تیار کرو۔ میں نے یہ مشورہ اس لیے دیا ہے تاکہ اسے دیر تک یہاں ٹھہرانے کا بہانہ مِل جائے۔ میں فون کر کے اس کے پاس جاؤں گا۔ ابھی تو وہ بے فکر بیٹھا ہے۔"

میری چھٹی حس نے مجھے ایک بار پھر خطرے سے بروقت آگاہ کر دیا تھا۔ میں تیزی سے دبے پاؤں واپس لوٹا اور دوسرے ہی لمحے ڈرائنگ روم سے باہر تھا۔ میں برآمدے سے باہر نکلا مگر ٹیکسی وہاں موجود نہ تھی۔ میں قریباً بھاگتا ہوا بنگلے کے گیٹ سے باہر نکلا اور کچھ فاصلے پر کھڑی ہوئی ایک ٹیکسی کو دیکھ کر تیزی سے دروازہ کھول کر اس میں سوار ہو گیا۔

"امپیریل ہوٹل چلو۔ مگر بہت جلدی۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے خاموشی سے گاڑی سٹارٹ کر دی اور میری ہدایات کے مطابق ٹیکسی کو دوڑانے لگا۔ میں کھڑکی سے پلٹ پلٹ کر باہر دیکھتا رہا لیکن ہمارے پیچھے کوئی نہیں لگا ہوا تھا۔ ایک لمبی آہ بھر کر میں نے سیٹ کی پشت سے سر ٹکا دیا۔

ٹیکسی تیز رفتاری سے فاصلہ طے کر رہی تھی۔ یکایک میری چھٹی حس نے ایک بار پھر مجھے جھنجھوڑ دیا۔ میں نے سر اُٹھا کر ٹیکسی ڈرائیور کی طرف دیکھا اور ڈرائیور کی جگہ بالے کے ساتھی کو دیکھ کر میرے ہوش اُڑ گئے۔ پھر میں نے پچھلی سیٹ پر نظر ڈالی جہاں بالا پستول ہاتھ میں لیے بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ پستول کی نال کا رُخ میرے سر کی جانب تھا اور اسکی انگلی لبلبی پر تھی۔

مجھے بخوبی علم تھا کہ میں ایک بار پھر ان کے قابو میں آ چکا ہوں۔ مایوسی کے ساتھ میں نے دوبارہ سیٹ کی پشت سے سر ٹکا دیا اور اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا اور آنکھیں موند لیں۔

ٹیکسی خاصی تیز رفتاری سے سفر کرتی ہوئی بالآخر ایک جگہ رُک گئی۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ یہ ایک کوٹھی کی عمارت تھی جس کے اِرد گرد دُور تک باغ اور درختوں کا سلسلہ تھا۔ ڈرائیور نے اُتر کر میرے لیے دروازہ کھولا تو میں نے خاموشی سے اُتر جانے ہی میں عافیت جانی۔ بالا مضبوط قدموں کے ساتھ مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر چل رہا تھا۔ ایک اونچے اونچے ستونوں کے برآمدے سے گزر کر ہم ایک کمرے میں داخل ہوئے جو قدیم طرز کے فرنیچر سے آراستہ تھا۔ سامنے ایک وکٹوریہ انداز کے صوفے پر جالاں آرام سے ٹانگ پر ٹانگ رکھے ہوئے بیٹھی تھی مجھے اس طرح بے دست و پا ہو کر کمرے میں داخل ہوتے دیکھا تو وہ بے اختیار مسکرانے لگی۔ وہ اس لباس میں ملبوس تھی، میں جس میں اسے ہوٹل کے کمرے میں چھوڑ کر آیا تھا۔ وہ نہایت آرام اور سکون کے ساتھ صوفے سے ٹیک لگا کر بیٹھی ہوئی تھی اور مسکراتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

جالاں کا یہ نیا روپ دیکھ کر میرے قدم رک گئے۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

جالاں کو اس بالکل نئے اور انوکھے روپ میں دیکھ کر میں ٹھٹھک کر رہ گیا۔ میرے قدم بے اختیار رُک گئے۔ اس انداز میں جالاں کو دیکھنے کا میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ وہ انتہائی بے باک اور بے خوف انداز میں صوفے پر بڑے سٹائل کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں اور اس کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ کروٹیں لے رہی تھی۔ یکایک ایک زوردار لات میری کمر پر لگی اور میں بے خبری کے عالم میں لڑکھڑا کر جالاں کے قدموں کے پاس فرش پر گر گیا۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ فرش پر نرم اور قیمتی قالین بچھا ہوا تھا ورنہ کافی چوٹیں آتیں۔ میں نے غصّے میں پلٹ کر اپنے پیچھے کھڑے ہوئے مسلح پہریدار کو اور پھر جالاں کو دیکھا۔ وہ بدستور اُسی مطمئن انداز میں بیٹھی ہوئی تھی اور مسکراہٹ اس کے چہرے سے ایک لمحے کے لیے بھی رُخصت نہیں ہوئی تھی۔ اس کی فریب کاری اور دغا بازی پر غصّے کے مارے میرا پارہ ایک دم چڑھ گیا۔ وہ میری حالتِ زار سے بے تعلق نظر آ رہی تھی بلکہ یہ کہنا زیادہ دُرست ہوگا کہ مجھے اس حالت میں دیکھ کر وہ مسرور نظر آ رہی تھی لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ جالاں مجھے کبھی اتنی طرح دار اور خوبصورت نظر نہیں آئی تھی جتنی اس وقت نظر آ رہی تھی۔ اس وقت وہ میرے ہی خرید کر لائے ہوئے شلوار قمیص میں ملبوس تھی۔ ہلکی دھاریوں والا سبز رنگ کا باس اس کے کھلتے ہوئے گندمی رنگ پر بہت بھلا لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی رنگت بھی آج پہلی بار مجھے سبزی مائل نظر آئی۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ اس سے پہلے میں نے کبھی اسے اتنے نزدیک سے اور اتنے غور سے نہیں دیکھا تھا۔ آج سے پہلے وہ میری پناہ میں آئی ہوئی ایک بے بس اور لاچار دوشیزہ تھی۔ جس کی حفاظت میں نے اپنے اُوپر ایک
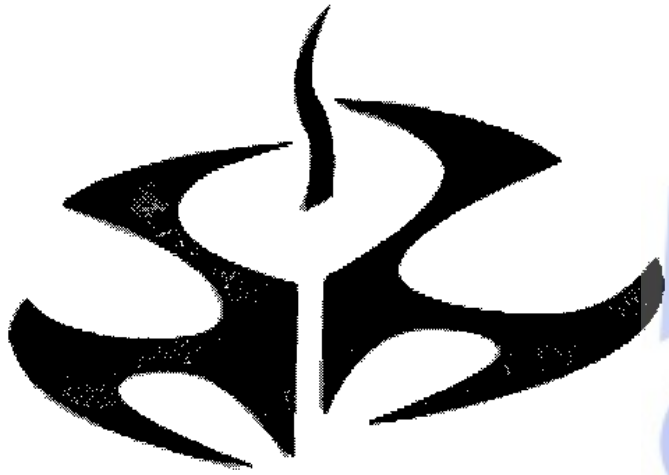
فرض کے طور پر عائد کر لی تھی اور سچ تو یہ ہے کہ وہ میرے لیے بذاتِ خود ایک مسئلہ بن چکی تھی۔ میں اس کی وجہ سے اتنا فکرمند اور پریشان تھا کہ وقتی طور پر خود اپنے مسائل اور مصائب کو فراموش کر بیٹھا تھا۔ میں اُس وقت کو یاد کر رہا تھا جب میں نے پہلی بار جالاں کو دیکھا تھا۔ کاش میں نے اسے نہ دیکھا ہوتا۔ اس سے نہ ملا ہوتا۔ اس کی حفاظت اور ذمّہ داری کے بوجھ نے مجھے خود اپنے ذاتی مسائل سے بے خبر اور بے پروا نہ کر دیا ہوتا۔ اگر جالاں کی حفاظت کی ذمّہ داری کا بوجھ مجھ پر نہ آن پڑتا تو یقیناً میں اپنے بچاؤ کے بے شمار طریقے سوچ چکا ہوتا۔ اب تک میں نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہوتا۔ محض اس کی حفاظت کے پیشِ نظر میں نے خود اپنے مسائل پسِ پُشت ڈال دیئے تھے اور اسے ایک مقدس بوجھ سمجھ کر اس کو سنبھال کر کسی مناسب ٹھکانے تک پہنچانے کی کوشش اور جدّوجہد میں مصروف رہا تھا۔ حالانکہ مجھے جن ذاتی مسائل سے دوچار ہونا پڑا تھا وہ بذاتِ خود اتنے گھمبیر اور توجہ طلب تھے کہ مجھے سب طرف سے اپنی توجہ ہٹا کر محض اسکی طرف دھیان دینا چاہیئے تھا۔ اور پھر میں یہ بھی جانتا تھا کہ جوں جوں دن گزرتے جا رہے تھے میرے گرد دشمنوں کا دائرہ تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ ایک طرف لوُنی تھا جو میرا سب سے بڑا دشمن تھا۔ وہ میرے مکان' کاروبار' مال و متاع یہاں تک کہ بیوی تک پر قبضہ جمائے بیٹھا تھا۔ اگرچہ اب مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ جس عورت کو میں اپنی وفا شعار بیوی سمجھے ہوئے تھا دراصل وہ عورت کے روپ میں ایک بے وفا اور زہریلی ناگن تھی جس نے نہ صرف اپنا زہر میرے رگ و پے میں سرایت کر دیا تھا بلکہ لوُنی کو بھی ڈس لیا تھا۔ یہ اطلاع میرے لیے انتہائی سکون بخش تھی۔ جب تک مجھ پر روزی کی اصلیت ظاہر نہیں ہوئی تھی محض یہ تصور ہی میرے لیے انتہائی سوہانِ روح تھا کہ میری بیوی ایک بہروپیے کے جال میں گرفتار ہو کر اس کو اپنا شوہر سمجھنے پر مجبور ہے۔ اپنی دولت' مکان اور کاروبار پر لوُنی کے قبضہ جمانے سے مجھے اتنی تکلیف نہیں پہنچی تھی جتنی اذیت اس خیال سے ہوئی تھی کہ میرا ناموس غیروں کے تسلط میں ہے لیکن خدا کا ہزار شکر ہے کہ میری آنکھوں پر سے روزی کے فریب کی پٹی ہٹ چکی تھی اور یہ حقیقت ہے کہ اپنی تمام تر دوسری پریشانیوں میں بدستور مبتلا رہنے کے باوجود میں ایک قسم کا ذہنی سکون اور روحانی تسکین محسوس کر رہا تھا۔ اگر مجھ پر میری جعل ساز بیوی روزی کی اصلیت آشکارا نہ ہو چکی ہوتی تو شاید میں نے محض اس تصور سے نجات حاصل کرنے کی خاطر ہی اپنے آپ کو ختم کر لیا ہوتا بہرحال اللہ تعالیٰ نے بے شمار مسائل سے دوچار کر دینے کے باوجود مجھے یک گونہ اطمینان بھی بخش دیا تھا۔ لیکن میں چاروں طرف سے محصور ہو چکا تھا۔ لوُنی اور اس کے غنڈوں کی ٹولی میرے خون کی پیاسی تھی۔ دوسری طرف لوُنی کے جرائم پیشہ دشمنوں کا گروہ تھا جو دراصل مجھے لوُنی سمجھ کر مجھے ٹھکانے لگانے کی فکر میں تھا۔ لوُنی نے سب سے کامیاب اور کارگر چال یہی چلی تھی کہ مجھے اپنے دشمنوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر خود نہایت اطمینان سے میری جگہ عافیت سے بیٹھا ہوا تھا۔ پھر جرائم پیشہ لوگوں کے مختلف گروہوں کے علاوہ جن کی تعداد مجھے خود اب تک معلوم نہ ہو سکی تھی' قانون کے محافظ اور پولیس بھی میری تلاش میں سرگرداں تھی۔ بظاہر میرے گرد اغیار کا نرغہ تنگ ہوتا جا رہا تھا اور نجات کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ ان تمام مشکلات اور ناقابلِ برداشت اذیتوں کے باوجود میں نے جالاں کو ایک بےبس اور لاچار مگر معصوم لڑکی کے روپ میں سرِ راہ پایا تو اس کو کسی محفوظ مقام تک پہنچانے کی کوشش میں مصروف ہو گیا اور اپنے تمام مسائل کو پسِ پُشت ڈال دیا۔ وہی جالاں اس وقت میرے سامنے مجسّم قہر و غضب بنی ہوئی موجود تھی۔ مجھے اپنے قدموں میں گرا ہوا پایا تو اس نے اپنے پیر سمیٹ لیے مگر اس کے چہرے کی حقارت اور نفرت میں کوئی کمی پیدا نہیں ہوئی۔ وہ نہایت فاخرانہ انداز سے مجھے دیکھ کر مسکرا رہی تھی جیسے میری حالت پر ہنس رہی ہو۔ میری حماقت پر خندہ زن ہو۔ اور مجھے اس وقت احساس ہو رہا تھا کہ مجھ سے بڑا احمق اور بیوقوف بھی شاید ہی کوئی ہو گا۔

"کہو یوسف!" جالاں متبسم ہو کر مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "کیا حال ہیں؟ مجھے یہاں دیکھ کر تمہیں حیرت تو ہوئی ہوگی؟"

میں اپنے بازوؤں کے سہارے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اب میں اس کے سامنے قالین پر دوزانو بیٹھا ہوا تھا۔ میرا وہ فطری جذبہ جو انتہائی غیظ و غضب اور نفرت کے باعث مجھے عجیب قسم کی تقویت دیتا ہے، ایک بار پھر میرے کام آیا تھا اور میں یکایک اپنے آپ کو پُرسکون اور مطمئن محسوس کرنے لگا تھا۔

میں نے کہا۔ "حیرت تو ضرور ہوئی لیکن تمہیں دیکھ کر نہیں بلکہ اپنی اس نادانی پر کہ میں تمہاری معصومیت کے دھوکے میں کیوں آگیا؟ دراصل میں نے عورت کا جو روپ پچھلے چند گھنٹوں میں دیکھا ہے وہ میرے تصوّر اور خیال سے بھی ماورا ہے۔ میں نے کبھی سوچا تک نہ تھا کہ عورت جیسی معصوم اور مقدس ہستی اس قدر مکار اور فریب کار بھی ہو سکتی ہے۔ جالاں، تم دوسری عورت ہو جس نے میری نگاہوں میں عورت ذات کو پستی اور ذلت کی گہرائیوں میں گرا دیا ہے۔ تم عورت نہیں، عورت ذات کے لیے گالی ہو......"

یکایک اس کی ٹانگ حرکت میں آئی اور اس کا پاؤں پوری قوت کے ساتھ میرے منہ پر لگا۔ میں اس حملے کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔ وہ خیریت ہوئی کہ جالاں کے پیر میں جوتا نہ تھا ورنہ مجھے اپنے چہرے کی مرمت پر کافی وقت اور پیسہ صرف کرنا پڑتا۔ پھر بھی اس کے پیر کی ضرب نے مجھے پیچھے کی جانب الٹ دیا۔ میں غصّے سے بل کھا کر اٹھا اور تیزی سے اس کی طرف بڑھنے لگا لیکن میرے پیچھے کھڑے ہوئے بالے کی بریَن گن کی نالی میری پُشت میں پیوست ہو گئی۔

"خبردار!" مجھے اس کی خونخوار آواز سنائی دی۔ "ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو چھلنی کر دوں گا۔"

میں رُک گیا اور اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ گرم گرم خون کی ایک باریک سی دھار میری باچھوں سے نکل کر ٹھوڑی سے بہتی ہوئی میری قمیص پر گری، تو مجھے چوٹ کی شدّت کا احساس ہوا۔ میں نے اپنے ہاتھ کی پُشت سے منہ کا خون صاف کیا اور میرا ہاتھ بھی خون میں لہولہان ہو گیا۔ جالاں بدستور نہایت اطمینان کے ساتھ میرے سامنے صوفے پر بیٹھی ہوئی مسکرا رہی تھی۔

"بالے" وہ اپنی نرم اور ملائم آواز میں بالے سے مخاطب ہو کر بولی۔ "ایک منٹ کے لیے بھی غافل نہ ہونا ورنہ تمہاری خیر نہیں ہوگی۔ یہ کوئی معمولی شخص نہیں ہے۔ میں اس کی دلیری اور بے خوفی دیکھ چکی ہوں۔" پھر وہ بالے کے ساتھ کھڑے ہوئے مسلح آدمی سے کہنے لگی۔ "آگے بڑھ کر اس کی تلاشی لو۔ مگر ذرا ہوشیاری سے۔"

دیکھنے میں وہ ایک دیہاتی اور بیوقوف آدمی نظر آرہا تھا لیکن اس نے جس مہارت سے میرے جسم کی تلاشی لی وہ میرے لیے حیران کُن تھی۔

"کچھ نہیں ہے۔" وہ سر ہلا کر بولا اور میں دل ہی دل میں مسکرانے لگا۔ مگر جالاں بھی مسکرا رہی تھی۔

"تم گدھے ہو۔" وہ بدستور دھیمی آواز میں اس سے مخاطب ہو کر بولی۔ "شلوار کا پائنچہ اٹھا کر دیکھو تمہیں پنڈلی کے ساتھ بندھا ہوا چھوٹا سا چاقو نظر آ جائے گا۔"

میری مسکراہٹ ہونٹوں پر منجمد ہو کر رہ گئی۔ جالاں کو یہ راز کیونکر معلوم ہوا؟ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ انتہائی نازک اور مشکل وقت کے لیے میں یہ چھوٹا چاقو اپنی پنڈلی میں ٹیپ سے باندھ کر رکھتا تھا اور کئی بار یہ کھلونا نما چاقو میرے لیے انتہائی مفید ہتھیار ثابت ہو چکا تھا لیکن جالاں کو بھی یہ راز معلوم ہوگا؟ یہ خود میرے لیے بھی ایک چونکا دینے والا انکشاف تھا۔

دوسرے ہی لمحے چاقو برآمد ہو گیا۔ وہ شخص اس ننھے منّے چاقو کو دیکھ کر بے اختیار ہنسنے لگا۔ "یہ بھی کوئی ہتھیار

ہے؟ یہ تو بچوں کے کھیلنے کی چیز ہے۔"

"تم یوسف کو نہیں جانتے۔" جالاں میرے سراپا کا جائزہ لے کر بولی۔ "یہ کھلونا اس کے ہاتھ میں بے حد خطرناک ہتھیار بن جاتا ہے۔" اس نے ہاتھ آگے بڑھا کر چاقو لے لیا اور اسے کھول کر دیکھنے لگی۔ اس چاقو کا پھل ڈھائی انچ سے زیادہ نہیں تھا لیکن میں جانتا تھا کہ مختلف اوقات میں یہ چاقو کس طرح میرے کام آیا تھا۔ چند بار تو اس نے بازی ہی الٹ دی تھی اور میں بظاہر ناممکن صورتِ حال پر قابو پانے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی میں اس کی ہوشیاری اور چالاکی کا معترف بھی ہو گیا تھا۔ وہ بظاہر سیدھی سادی اور معصوم دکھائی دینے والی لڑکی کس قدر خطرناک اور چالاک تھی یہ عقدہ مجھ پر اب کُھلا تھا۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو وہ ایک بے مثال اداکارہ تھی۔ جس نے سب کو دھوکہ دے دیا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں اس کا موازنہ روزی سے کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ روزی کے مقابلے میں جالاں کہیں زیادہ بڑی اداکارہ تھی۔ روزی نے تو محض ایک وفا شعار اور مخلص بیوی کی اداکاری کی تھی، لیکن جالاں نے اپنے اوپر جس چالاکی سے معصومیت اور سادگی کا خول چڑھایا تھا۔ وہ حیرت ناک تھا لیکن جالاں کی حقیقت کیا تھی؟ وہ کس مقصد سے ایک ویران اور دور دراز ڈاک بنگلے میں ایک دیہاتی چوکیدار کے ساتھ رہنے پر مجبور ہو گئی تھی؟ اس کے ساتھ میری ملاقات محض اتفاقیہ تھی یا کسی جانے بوجھے منصوبے کا حصّہ تھی؟ یہ سوالات میرے ذہن میں کُلبلانے لگے۔ غالباً جالاں نے بھی بھانپ لیا کہ میں اس وقت کیا سوچ رہا ہوں۔ اس لیے کہ اس نے بڑے لطیف انداز میں اپنی ایک ٹانگ اٹھا کر دوسری ٹانگ پر رکھ لی اور بالے سے کہنے لگی: "بالے، تم ذرا یوسف صاحب سے میرا تعارف کرا دو۔ یہ مجھے کچھ اور ہی سمجھ رہے ہیں۔"

بالے نے بریَن گن کی نالی میری کمر میں چبھاتے ہوئے پہلے تو مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کی ہدایت کی اور پھر اپنے ساتھیوں کو مشورہ دیا کہ اپنی بندوقوں اور پستولوں کا رُخ مستقل میری طرف رکھیں اور ایک لمحے کے لیے بھی میری طرف سے لاپروا نہ ہوں کیوں کہ بقول اس کے میں "انسان نہیں چھلاوہ ہوں۔ چھلاوا۔"

پھر وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر خود بھی قالین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ "سنو بادشاہو۔ اپنی جالاں بی بی جو ہے نا یہ بڑی وڈّی شئے ہے۔ میں نے جب اس کو ہوٹل میں تمہارے کمرے میں دیکھا تھا تو بالکل نہیں پہچانا تھا۔ یہ جو چاہے روپ بدل سکتی ہے۔ اپنی شکل بدل سکتی ہے۔ اپنا بھیس بدل سکتی ہے۔ یہ کوئی معمولی عورت نہیں ہے۔ یہ جالاں نہیں ہے۔ بجلی ہے۔ چھلاوہ ہے۔ شیطان ہے۔ اس کے بہت سے نام ہیں۔ اس کے روپ بھی بہت سے ہیں۔ یہ کوئی ایک عورت نہیں ہے۔ اسے تو سمجھنا ہی بہت مشکل ہے۔ کیوں نا بی بی جی؟ میں کوئی غلط بات تو نہیں کہہ رہا ہوں؟" اس نے تصدیق کے لیے جالاں کی طرف دیکھا۔

جالاں سر ہلا کر مسکرائی اور بولی۔ "بولتے رہو۔ بولتے رہو غلط کہو گے تو ٹوک دوں گی۔"

"یوسف صاحب! یہ بڑی وڈّی شے ہے جناب۔ اس کا کاٹا ہوا تو پانی بھی نہیں مانگتا۔ پھر تم تو کوئی چیز ہی نہیں ہو۔"

بالے کی تمہید نے مجھے اُکتا دیا۔ "سنو جالاں" میں نے براہِ راست اس سے کلام کا آغاز کیا۔ "یہ ساری تعریفیں اور تعارف رہنے دو۔ مجھے صرف اتنا بتا دو کہ تمہاری اصلیت کیا ہے اور تم اس دیہاتی ڈاک بنگلے میں ایک چینڈو چوکیدار کے ساتھ کیوں رہ رہی تھیں؟"

جالاں نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا دی اور نہایت بازاری اور عامیانہ انداز میں اپنی ایک ٹانگ ہلانے لگی۔ "یوسف صاحب، تم کیا تیس مار خاں بنے پھرتے ہو۔ کبھی آس پاس بھی دیکھ لیا کرو۔ تمہارے سوا اور بھی بہت لوگ ہیں دنیا میں، اور بھی لوگ ہیں پولیس جن کی کھوج میں ہے۔ میری طرف دیکھو۔ میں ایک عورت ہوں۔ سیدھی سادی بھولی بھالی نظر آتی ہوں مگر آٹھ شہروں کی پولیس مجھے ڈھونڈ رہی ہے۔ پولیس کا ہر افسر مجھے گرفتار کرنے کی حسرت

رکھتا ہے۔ اگر مَیں گرفتار ہو جاؤں گی تو گرفتار کرنے والے کو بھاری انعام ملے گا۔ تم چاہو تو یہ پیسہ تمہیں بھی مل سکتا ہے۔ بڑی آسانی سے کما سکتے ہو۔" اتنا کہہ کر اُس نے بڑے ناز کے ساتھ گردن ترچھی کر کے مجھے دیکھا اور پھر کہنے لگی "میری طرف دیکھو۔ مَیں تمہیں کیسی لگتی ہوں؟"

مَیں واقعی اسی کی طرف دیکھ رہا تھا اور وہ مجھے اس وقت بہت پیاری اور پُرکشش لگ رہی تھی۔ اگرچہ اُس کا بدلا ہوا رُوپ میرے لیے حیران کُن اور نفرت انگیز تھا لیکن اُس کے باوجود وہ ایک طرح دار اور خوش شکل عورت تھی۔ گاؤں میں اسے پہلی بار دیکھا تو وہ انتہائی معمولی شکل و صورت کی عورت نظر آئی تھی مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی خوبصورتی میں اضافہ ہونے لگا۔ شاید یہ اُس لباس کا اثر تھا جو مَیں نے اسے لا کر دیا تھا۔ یا پھر اب مَیں اس کو دیکھنے کا عادی ہو چکا تھا اور اُس کی نقل و حرکت اور ادائیں میرے دل پہ نقش ہونے لگی تھیں۔ یا پھر وہ درحقیقت تھی ہی خوبصورت اور مَیں نے ہی آغاز میں اسے انتہائی سرسری انداز میں دیکھا تھا۔

بہرحال، جو کچھ بھی سبب تھا۔ اُس کی شخصیت کے پرت ایک ایک کر کے اُترتے جا رہے تھے اور ہر تبدیلی کے بعد وہ ایک نئے روپ اور نئے انداز میں جلوہ گر نظر آتی تھی۔ جو اُس کے پہلے روپ سے کہیں زیادہ نظر فریب ہوتا تھا۔ مَیں خاموشی سے اس کے بارے میں دل ہی دل میں سوچتا رہا لیکن زبان پہ ایک لفظ بھی نہیں لایا۔ ایک طرح سے یہ میری ندامت کا اظہار بھی تھا۔ مَیں جو کہ اپنے آپ کو بہت ہوشیار، چالاک اور زمانہ ساز سمجھتا تھا۔ ایک معمولی سی عورت کے ہاتھوں شکست کھا چکا تھا۔

"عجیب کیوں ہو؟" وہ طنزیہ انداز میں مسکرا کر بولی۔ "کچھ پوچھو گے نہیں؟ اور کچھ نہیں تو غصّہ ہی کرو، مجھے بُرا بھلا کہو۔"

"اُس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔" مَیں نے ٹھنڈے دل سے جواب دیا۔ "تم جو کچھ بھی ہو یہ ماننا پڑے گا کہ بہت چالاک اور فریبی۔ اب یہ بھی بتا دو کہ اُس جنگلی ریسٹ ہاؤس میں تم کیا کر رہی تھیں؟" میرے اس سوال کا یوں تو کوئی مقصد نہیں تھا لیکن دراصل میں گفتگو کو طول دینا چاہتا تھا تاکہ اس اثناء میں موجودہ صورتِ حال کا ٹھنڈے مزاج سے جائزہ لینے کے بعد یہاں سے چھٹکارے کی کوئی سبیل پیدا کروں۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے سب کچھ بتا دوں گی۔" وہ مسکرا کر بڑی لگاوٹ سے بولی۔ "سچّی بات یہ ہے کہ مَیں پولیس سے چھپنا چاہتی تھی۔ مَیں نے اپنے ایک دُشمن کو اس کے گاؤں میں جا کر مار دیا تھا۔ مَیں نے گولی چلائی تو وہ بھاگ کر اپنے گھر میں گھس گیا مگر میرا دُشمن مجھ سے کہیں بھی بچ کر نہیں جا سکتا۔ مَیں نے اس کے پیچھے جا کر گولیوں کی بارش کر دی۔ اس کے گھر کے پانچ اور آدمی بھی گولیاں لگنے سے مارے گئے۔ اب دیکھو نا یوسف بابو۔ میرا اس میں کیا قصور تھا؟ وہ خود ہی اپنے گھر والوں کا بیری ہو گیا تھا تو مَیں کیا کرتی؟ اسے بہادروں کی طرح سامنے رہ کر مقابلہ کرنا چاہیے تھا۔ مگر وہ اوّل نمبر کا ڈرپوک آدمی تھا۔ سامنے ایک عورت کو بریں گن کے ساتھ دیکھا تو اس کی ساری بہادری غائب ہو گئی۔ بس۔ مَیں پولیس سے بچنے کے لیے وہاں سے بھاگی۔ سب سے اچھی اور حفاظت والی جگہ مجھے وہ ڈاک بنگلہ ہی نظر آیا جہاں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک دیہاتی چوکیدار کے ساتھ رہنے والی عورت اتنی بڑی مجرم ہو سکتی ہے۔ ڈاک بنگلے میں آنے والے لوگ مجھے دیکھ ہی نہیں پاتے تھے۔ یا اگر کوئی دیکھ بھی لیتا تھا تو مجھے چوکیدار کی بیوی سمجھ کر دھیان نہیں دیتا۔ تم بھی اسی خیال میں چکر کھا گئے اور مجھ سے ہمدردی کرنے لگے۔"

"میری ہمدردی اور امداد کا بہت اچھا بدلہ دیا ہے تم نے۔" مَیں نے طنزیہ انداز میں کہا تو وہ بے ساختہ ہنسنے لگی۔ "غصّہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے بابو۔ میری جیسی اکیلی جوان اور سوہنی لڑکی کو دیکھ کر سبھی مردوں کو ہمدردی ہو جاتی

ہے۔ تم بھی ان سب سے الگ تو نہیں ہو۔"

مَیں اسے نفرت اور حقارت سے گھورنے کے سوا اور کیا کر سکتا تھا۔

وہ بالے کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور کہنے لگی۔ "بالا تمہارے پیچھے جانے سے پہلے ہوٹل پر آیا اور اُس نے مجھے گھیر لیا۔ وہ تمہارے بارے میں تصدیق کرنا چاہتا تھا۔ مَیں نے اس کو تمہاری اصلیت بتا دی مگر ساتھ ہی اپنی شناخت بھی کرا دی۔ مَیں چاہتی تھی کہ وہ میرے ہاتھوں غلط فہمی میں بے گناہ ہی نہ مارا جائے۔ کیوں بالے۔ مَیں نے ٹھیک کہا نا؟"

"بالکل بالکل"۔ بالا گردن ہلا کر بولا۔ "دیکھو نا جی۔ ہم تو چھوٹے موٹے کارندے ہیں۔ ہمیں تو جو رقم دیتا ہے اس کی خدمت میں لگ جاتے ہیں۔ مجھے تو ٹونی صاحب نے یوسف کو پکڑنے کے لیے بھیجا تھا۔ مَیں اُن کا نمک کھاتا ہوں اس لیے اُن کا حکم بھی مانتا ہوں۔ تم سے تو میری کوئی دُشمنی نہیں ہے نا بی بی۔ اور پھر تم تو خود ہی ہماری برادری کی ہو ——— بلکہ ہماری سردار ہو۔ ہم تو چاکری کرتے ہیں تم جیسے لوگوں کی۔ پیسے دے کر جو چاہے ہماری محنت خرید لے۔"

"اب یہ بتاؤ یوسف بابو کے لیے تمہارے پاس کیا حکم ہے؟" وہ بات کاٹ کر بولی۔

"ٹونی صاحب ابھی واپس نہیں آئے۔ ان کے لوٹنے تک یوسف بابو ہمارے مہمان رہیں گے۔ ان کی خدمت کریں گے۔ مہمانداری کریں گے۔ ان کا فیصلہ تو ٹونی صاحب ہی واپس آ کر کریں گے۔ اگر وہ حکم دیں گے تو ہم انھیں بھی ٹھکانے لگا دیں گے۔ کہیں گے تو سر پر بٹھا لیں گے۔ ابھی اپنا کیا ہے۔ ہم تو تابعدار ہیں مالک کے۔ جو پیسے دے گا ہمیں خرید لے گا۔"

"تو پھر اپنے مہمان کو سنبھالو اور ان کے ساتھ جو چاہے سلوک کرو اور سُنو جب تک تمہارے مالک واپس نہیں آ جاتے کیا مَیں اس جگہ رہ لوں؟" جالاں نے پوچھا۔

"ابھی آپ کا گھر ہے بی بی جی۔ ٹونی صاحب ایک دو دن میں واپس آ رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تم سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔ بڑے دل پھینک اور عاشق مزاج ہیں وہ۔"

"پھر تو بڑی خوشی کی بات ہے بالے۔" جالاں نے اطمینان سے اپنی دونوں ٹانگیں قالین پر پھیلا دیں۔ "مَیں اپنے کسی عاشق کو زندہ نہیں چھوڑتی۔ یہی اصول ہے میرا۔ تم بھی اپنے ٹونی صاحب کے لیے دُعا کرو۔"

مَیں حیرت زدہ نگاہوں سے اس عورت کے بدلے ہوئے روپ کو دیکھ رہا تھا۔ اس وقت وہ اتنی بے باک اور بے پروا نظر آ رہی تھی کہ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی معصوم جالاں ہے جسے مَیں نے چند دن پہلے ڈاک بنگلے میں دیکھا تھا اور اس کی سادگی اور بھولپن پر ترس کھا کر خود اپنی زندگی کو اس کی خاطر خطرے میں ڈال دیا تھا۔ وہ انتہائی بازاری انداز میں میرے سامنے دونوں ٹانگیں پسارے بیٹھی ہوئی باتیں بنا رہی تھی اور اس کو مطلق یہ احساس نہیں تھا کہ وہ اتنے بہت سے مردوں کی محفل میں تنہا اور خوبصورت عورت ہے۔

بالے نے دیوار پر لگی ہوئی برقی گھنٹی دبائی اور ایک میلا کچیلا ملازم دروازے میں نمودار ہو گیا۔ "گامے" وہ جالاں کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ "ان بی بی جی کو مہمان خانے میں لے جاؤ۔ یہ اسی جگہ مہمان رہیں گی تھوڑے دن تک۔"

"اور ان بابو جی کو؟" ملازم پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھتا ہوا بولا۔

"ان کی فکر مت کر۔ ان بابو صاحب کو ہم سنبھال لیں گے۔ بس اب تُو بھاگ کر جا اور مہمان خانے والا کمرہ صاف کر دے۔"

ملازم جس تیزی سے نمودار ہوا تھا اسی تیزی سے غائب ہو گیا۔

"لو جی۔ آپ کا تو بندوبست ہو گیا۔" وہ جالاں سے مخاطب ہو کر بولا۔ "اب رہ گئے اپنے بالو صاحب۔ تو اب ہم انھیں بھی ٹھکانے لگا دیں گے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی برین گن اُٹھا کر کندھے سے لگا لی۔ اس کے دونوں مسلح ساتھی بھی مستعد ہو کر کھڑے ہو گئے۔

یکایک ایک شخص کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور وہ خاصا ہٹا کٹا اور خوفناک شکل کا آدمی تھا۔ "استاد بالے۔" وہ پھولی ہوئی سانسوں کو سنبھالتے ہوئے بالے سے مخاطب ہوا۔ "وہ بندہ تو کچھ نہیں بول رہا ــــ اس پر سارے گُر آزما لیے ہیں۔ اب کیا کرنا ہے اس کا؟"

بالے نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ "میں نہ کہتا تھا کہ وہ منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکالے گا۔ بڑی ڈھیٹ ہڈی ہے وہ۔ اس کا نام جاگر ہے جاگر۔ بڑے بڑے طرّم خاں پولیس والوں نے اس کی زبان کھلوانے کی کوشش کی مگر تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ لگتا ہے اس کے منہ میں تو زبان ہی نہیں ہے۔"

"پھر اب کیا کریں؟"

"کچھ مت کرو۔ تم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ٹونی صاحب کا انتظار کرو۔ اب وہی آ کر بتائیں گے کہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرنا ہے؟ اسے اب آرام سے رہنے دو۔ مار پیٹ سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔"

جالاں نے اپنی ٹانگیں سمیٹ کر صوفے پر رکھ لیں اور پوچھنے لگی۔ "کیا شئے ہے یہ جاگر؟"

"بڑی وڈی شئے ہے۔" بالے نے وضاحت کی۔

"میڈم ایکس کا بندہ ہے۔ ہمارے قابو آ گیا ہے۔ ٹونی صاحب کا خیال ہے کہ وہ اُن کی کھوج میں لگا ہوا تھا۔ وہ میڈم کی سکیموں کے بارے میں اس سے پوچھنا چاہتے ہیں پر میں اسے خوب اچھی طرح جانتا ہوں۔ چاہے اس کی بوٹی بوٹی کاٹ دو۔ اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلے گا۔"

"اچھا۔ تو بہت ڈھیٹ ہڈی ہے یہ جاگر؟" جالاں نے کہا۔

بالے بولا۔ "بس سمجھو پتھر کی دیوار ہے۔ چاہے جتنا سر ٹکراؤ۔ دیوار تو کچھ بولتی نہیں ہے۔"

جالاں زور زور سے ہنسنے لگی۔ ہم سب نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔ "کیسے مرد ہو تم لوگ؟ ایک آدمی کی زبان نہیں کھلوا سکتے؟"

بالے نے کہا۔ "وہ انسان نہیں جن ہے۔"

"اور جو میں اس کی زبان کھلوا دوں تو؟"

بالے حیرت زدہ ہو کر اسے دیکھنے لگا۔ میں نے بھی جالاں کے پُر اعتماد چہرے کو دیکھا۔

"تین گھنٹے کے اندر سب کچھ بک دے گا۔" جالاں نے بڑے اطمینان سے کہا۔ "چلو مجھے بھی دکھاؤ کیا چیز ہے جاگر۔" یہ کہہ کر وہ صوفے سے اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "چلو۔ ابھی تماشہ دکھاتی ہوں تمہیں۔" وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

بالے بے اختیار اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ اس کے دونوں ساتھیوں نے بندوق کی نالی سے مجھے ٹھوکا دیا اور میں بھی ساتھ ہو لیا۔

"کیا ترکیب کرو گی تم؟" بالے نے برآمدے سے گزرتے ہوئے جالاں سے پوچھا۔ "ٹونی صاحب نے کہا تھا کوئی ٹوٹ پھوٹ نہیں ہونی چاہیئے اس کی۔"

"بس تم دیکھتے رہو کیا ہوتا ہے۔ میں اُنگلی بھی نہیں لگاؤں گی؟ اور تھوڑی دیر میں سب کچھ اُگل دے گا۔" جالاں بڑے پنے تلے قدموں سے خبر لانے والے شخص کے پیچھے چل رہی تھی اور ہم سب کا قافلہ اس کے پیچھے تھا۔ پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ واقعی جالاں کے پاس تسخیر کر لینے اور دوسروں کو اپنے پیچھے لگا لینے کی طاقت تھی۔

ایک دروازے کے سامنے جا کر ہم رُک گئے۔ دروازے کے سامنے ایک بندوق بردار پہریدار کھڑا ہوا تھا۔ بالے کے اشارے پر اُس نے دروازہ کھول دیا اور جالاں بے پرواہی سے دروازے میں داخل ہوئی تو اس کا انداز دیکھ کر پہریدار بھی مرعوب ہو گیا۔ میں دروازے پر ٹھٹھک کر رُک گیا مگر میرے پیچھے پیچھے آنے والے مسلح آدمیوں نے بندوق کی زد میں لے کر مجھے آگے دھکیلنا شروع کیا تو میں بھی کمرے کے اندر داخل ہو گیا۔

وہ ایک خاصا وسیع کمرہ تھا جس میں تین بید کی کرسیوں کے علاوہ اور کوئی فرنیچر نہ تھا۔ ایک کرسی پر رسی سے بندھا ہوا ایک تنومند اور مضبوط جسم کا ادھیڑ عمر آدمی بڑی لاپرواہی سے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے کے نقوش کھردرے تھے اور اس کی آنکھیں تیندوے کی طرح حرکت کر رہی تھیں۔ وہ دیکھنے میں بھی مضبوط ارادے اور ناقابلِ تسخیر قوتِ برداشت کا مالک نظر آ رہا تھا۔ اس کے سر پر بالوں کی تعداد بہت کم تھی لیکن سیاہ گھنی مونچھیں خاصی رعب دار تھیں۔ بالے کو دیکھ کر وہ مسکرایا اور اس کے سفید اور مضبوط دانتوں کی قطار نمایاں ہو گئی۔

"آؤ بالے پہلوان۔" وہ بے فکری اور بے تکلفی سے بولا۔ "بڑی دیر سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ تمہارے یہ چیلے چانٹے تو فیل ہو گئے۔ آؤ۔ اب تمہاری باری ہے۔" وہ قہقہہ مار کر ہنسا اور بالے کے اس خیال کی تصدیق ہو گئی کہ وہ واقعی بے حد ڈھیٹ اور سخت جان شخص تھا۔ اگرچہ پچھلے چوبیس گھنٹے میں اس پر خاصا ظلم اور تشدد کیا جا چکا تھا لیکن اس کے انداز سے یوں ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ دوستوں کی محفل میں بیٹھا ان کی میزبانی کا لطف اُٹھا رہا ہے۔ بالے اس کی کرسی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا اور خاموشی سے اسکو دیکھنے لگا۔

جالاں نے اپنے دونوں ہاتھ کمر پر رکھ لیے اور جاگر کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے پوچھنے لگی۔ "اچھا۔ تو یہ ہے وہ جی دار مرد کا بچہ؟"

جاگر نے پہلی بار جالاں کو دیکھا اور پسندیدگی کا تاثر اس کے چہرے پر پھیل گیا۔ "آؤ سوہنیو۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "ان منحوس شکلوں کو دیکھ دیکھ کر میں بھی تھک گیا تھا۔ تمہیں دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی ہو گئی ہیں۔"

"فکر نہ کرو۔ اب یہ منحوس شکلیں تمہیں نظر نہیں آئیں گی۔" جالاں نے مسکرا کر کہا۔

"اچھا۔" وہ ہنس کر بولا۔ "کیا اب تم میری مہمانداری کرو گی؟"

جالاں خاموش مگر چبھتی ہوئی نظروں سے اس کا جائزہ لینے میں مصروف رہی۔

جاگر پھر ہنسا اور بولا۔ "اچھی طرح غور سے دیکھ لو۔ سوہنی عورتیں مجھے بہت پسند کرتی ہیں۔ کہو تمہارا کیا خیال ہے سوہنیو؟"

جالاں نے اس کو بالکل نظر انداز کر دیا اور بالے سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔ "یہ ہے وہ جی دار جس کی تم تعریف کر رہے تھے؟ اطمینان رکھو۔ تین گھنٹے کے اندر اگر اس کو بکری نہ بنا دیا تو میرا نام بدل دینا۔"

جاگر نے دلچسپی سے اُسے دیکھا مگر منہ سے کچھ نہیں بولا۔

بالا بے یقینی سے جالاں کو دیکھ رہا تھا۔ "یہ بول پڑے گا؟ کیا سچ مچ؟"

"بالکل فر فر بولے گا۔ طوطے کی طرح۔" اُس نے اطمینان سے جواب دیا۔

"کیا کرو گی؟ بولو کس چیز کی ضرورت ہے تمہیں؟ اس پر اب کونسا گُر آزماؤ گی؟ سب کچھ تو کر کے دیکھ لیا ان لوگوں نے۔"

"ایک ٹین کا بڑا ڈبہ ہے تمہارے پاس اور ایک سُتلی؟" جالاں نے پوچھا۔

بالے نے حیرت سے جالاں کو دیکھا پھر ایک شخص کو اشارہ کیا جو فوراً کمرے سے رُخصت ہو گیا۔ جالاں جاگر سے مخاطب ہوئی۔ "دیکھو جوان۔ تم کو ایک بار پھر موقعہ دے رہی ہوں۔ جو کچھ یہ لوگ پوچھ رہے ہیں سیدھی طرح بتا دو۔ ورنہ بعد میں پچھتاؤ گے اور تمہاری بہادری کا بھی پول کھل جائے گا۔"

جاگر نے ہنستی ہوئی آنکھوں سے اسکو دیکھا اور عامیانہ لہجے میں بولا۔ "حسینوں کے ستم کا ہم بُرا نہیں مانتے۔ سوہنیو۔ تم بھی آزما لو۔"

"تیر پر تیر چلاؤ تمہیں ڈر کس کا ہے؟"

اتنی دیر میں ملازم ایک ٹین کا بڑا ڈبہ اور سُتلی لے کر کمرے میں داخل ہُوا۔ جالاں کی ہدایات کے مطابق ٹین کے ڈبے کے اوپری حصے میں دو سوراخ کر کے اسے سُتلی کی مدد سے بالٹی کی طرح بنا دیا گیا۔ پھر جالاں نے چھت میں لگے ہُوئے پنکھے میں سُتلی کی ڈوریاں باندھ کر ڈبے کو فرش سے پانچ فٹ کی اونچائی پر لٹکانے کا حکم دیا۔ کمرے میں موجود سارے لوگ حیران ہو کر یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ پھر جالاں کی ہدایت پر ٹین کے ڈبے کے پیندے میں ایک انتہائی باریک سوراخ کر دیا گیا۔ اس کے بعد جالاں نے ملازم کو بالٹی میں پانی لانے کا حکم دیا اور ٹین کے ڈبے کو پانی سے بھر دیا گیا۔ ڈبے کے پیندے میں سوراخ اتنا باریک تھا کہ اس میں سے کچھ دیر بعد پانی کی ایک بوند نکل کر فرش پر گر گئی۔ تقریباً دو تین منٹ بعد پانی کی دوسری بوند بھی ٹپک پڑی۔

جالاں نے مطمئن ہو کر ڈبے کو اور پھر جاگر کی طرف دیکھا جو اس تمام عرصے میں بڑی بے تکلفی لیکن دلچسپی کے ساتھ یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ "نوجوان" جالاں نے کہا۔ "اب بھی بک دو ورنہ تیار ہو جاؤ۔"

ایک زوردار قہقہہ جاگر کے مُنہ سے بلند ہوا۔ گویا جالاں کی بات کا اس کے پاس یہی جواب دیا۔

بالے نے پوچھا "اب کیا کریں؟"

"جاگر کی کرسی کھینچ کر ڈبے کے نیچے رکھ دو۔"

کمرے میں موجود لوگوں نے بالے کی ہدایت کا انتظار کیے بغیر ہی جاگر کو کرسی سمیت ڈبے کے نیچے لیجا کر رکھ دیا۔ جالاں کی ہدایت پر ایک اور رسی کی مدد سے جاگر کو خوب اچھی طرح کس کر کرسی کے ساتھ اس طرح باندھا گیا کہ وہ کوشش کے باوجود سر یا جسم کے کسی حصے کو ذرا بھی حرکت دینے سے قاصر تھا۔ پھر دو آدمیوں نے کرسی کو ڈبے کے نیچے اس طرح رکھ دیا کہ ڈبے سے رسنے والی بوند جاگر کے سر پر عین تالو کی جگہ پر گرنے لگی۔ چار پانچ منٹ کے دوران میں دو تین بوندیں ٹپک کر جاگر کے سر پر گریں تو وہ مسکرانے لگا اور اطمینان سے آنکھیں بند کر کے بیٹھ گیا۔

اب کیا کریں؟" بالے نے اس طرح پوچھا جیسے اب وہ کسی شعبدے کا منتظر تھا۔

"اب کچھ مت کرو۔" جالاں نے تمام انتظامات کا جائزہ لینے کے بعد مطمئن ہو کر کہا۔ "ایک آدمی اس کمرے میں چھوڑ دو اور سب لوگ اپنا کام کرو۔"

جالاں کے اس فیصلے سے سبھی کو مایوسی ہوئی مگر بالے کے اشارے پر سب لوگ کمرے سے رُخصت ہو گئے جالاں اور بالے نے بھی باہر کا رُخ کیا اور اپنے محافظ کی ہدایت پر میں نے بھی ان کے عقب میں قدم بڑھائے۔ ہم برآمدے میں پہنچے تو بالے نے ایک بار پھر جالاں سے پوچھا۔ "اب کیا ہو گا بی بی؟ تم نے اس کا کوئی بندوبست

تو کیا نہیں۔"

"جو ہو گا تم خود دیکھ لو گے۔ اب مجھے میرا کمرہ دکھاؤ اور خود بھی اپنے کمرے میں جا کر گم ہو جاؤ۔"

"انہیں مہمان خانے میں لے جاؤ۔" اس نے اپنے ایک ساتھی سے کہا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "اور تم میرے ساتھ آؤ۔"

جالاں میری طرف دیکھے بغیر۔۔۔ مسلح پہریدار کے پیچھے چل گئی اور میں بالے اور دو محافظوں کی معیت میں برآمدے کی مخالف سمت میں چل پڑا۔

یہ ایک بہت شاندار اور وسیع قدیم عمارت تھی۔ دو تین اونچے برآمدوں سے گزرتے ہُوئے ہم لوگ ایک نسبتاً تاریک حصے میں پہنچ گئے۔ بالے کے اشارے پر اس کے ایک ساتھی نے کمرے کا تالا کھولا اور بالے نے مجھے کمرے کے اندر جانے کا اشارہ کرتے ہُوئے کہا۔

"تم اِدھر رہو گے بابو یوسف۔ جب تک لوٹی صاحب واپس نہیں آئیں گے تم آرام سے رہو۔ اس کے بعد تمہارا اللہ مالک ہے۔ پر ایک بات یاد رکھنا۔ اس جگہ سے بھاگنے کی کوشش مت کرنا نہیں تو بہت پچھتاؤ گے۔ اس بلڈنگ میں آنے کا ایک ہی راستہ ہے اور جانے کا بھی ایک ہی راستہ ہے جو ہماری مرضی سے کھلتا ہے۔ کوئی اور راستہ ڈھونڈو گے تو مارے جاؤ گے۔" اتنا کہہ کر اس نے برین گن کی نال سے مجھے دھکا دیا اور میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی دروازہ بند ہو کر مقفل ہو گیا۔

میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ یہ خاصا کشادہ کمرہ تھا۔ ایک گھِسا ہوا پُرانا قالین فرش پر بچھا ہُوا تھا۔ کمرے کے عین وسط میں ایک مسہری نما پلنگ تھا جس پر خاصا آرام دہ بستر لگا ہوا تھا۔ ایک طرف ایک پرانی وضع کی سنگھار میز رکھی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ دو آرام کرسیاں بھی کمرے میں موجود تھیں۔ کرسیوں کے سامنے چوبی میز پر ایک بہت پرانا سا گلدان رکھا ہوا تھا جس پر کاغذ کے کچھ پھُول تھے۔ میں نے ایک لمبی اور ٹھنڈی آہ بھری اور ایک آرام کرسی پر نیم دراز ہو گیا۔ آنکھیں بند کر کے میں نے گزشتہ چند گھنٹوں میں رونما ہونے والے واقعات کا جائزہ لیا تو یوں لگا جیسے میں نے کوئی خواب دیکھا ہو۔ خاص طور پر جالاں نے جس انداز سے اپنا رویہ بدلا تھا۔ وہ ایک افسانہ ہی معلوم ہوتا ہے۔ مگر میں بخوبی جانتا تھا کہ وہ کوئی افسانہ یا خواب نہیں تھا۔ ٹھوس اور تلخ حقیقت تھی۔ ایک بظاہر معصوم اور بے بس عورت کی حفاظت کرتے ہُوئے میں ایک بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہو گیا تھا جس سے نجات کی فی الحال کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔

میں نے جالاں کو فراموش کر کے خود اپنی ذات کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ انگریزی محاورے کے مطابق خرگوش خود باورچی خانے میں داخل ہو گیا تھا۔ لوٹی میری تلاش میں تھا اور میں ہر قیمت میں زندہ یا مُردہ اسکو مطلوب تھا۔ اس کا منصوبہ بالکل صاف اور سادہ تھا۔ وہ میرا بھیس بدل کر میرے گھر میں بالکل محفوظ تھا جبکہ میں اپنی شناخت فراہم کرنے میں ناکام رہا تھا اور ساری دُنیا کی نظروں میں وہ یوسف اور میں لوٹی تھا۔ پولیس ایک جرائم پیشہ اور مفرور شخص سمجھے ہُوئے میری کھوج میں تھی۔ اگر میں پکڑا گیا تو لوٹی کے جرائم کی فہرست بہت طویل تھی اب مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ وہ چوری۔ غبن۔ ڈاکے۔ اغوا۔ نقب زنی یہاں تک کہ قتل تک کے الزامات میں ماخوذ تھا اور پولیس کے قابو میں آ جانے کی صورت میں مجھے اسکی جگہ کم از کم تیس چالیس سال کا عرصہ جیل کی قید بامشقت میں گزارنا تھا۔ اس اعتبار سے یہ میری زندگی کا اختتام تھا۔ میری زندگی کے بہترین سال قید و بند کی صعوبتوں کی نذر ہو جانے کے بعد میرے پاس باقی کیا رہ جاتا؟ دوسری طرف لوٹی میرے ساتھ چوہے اور بلی کا کھیل کھیل رہا تھا۔ اگر میں پولیس کے ہاتھ آ جاؤں تو طویل قید میری منتظر تھی اور اگر لوٹی کے مخالف جرائم پیشہ گروہوں کے

ہاتھ لگ جاؤں تو وہ بھی میری تکا بوٹی کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ گویا۔ دونوں صورتوں میں موت یا تباہی میرا مقدر بن چکی تھی۔ لوٹی کو میرے خلاف انگلی تک اُٹھانے کی زحمت کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ لوٹی واپس آکر میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا یہ مجھے معلوم تھا۔ وہ مجھے پولیس کے حوالے کر دے گا یا پھر مجھے گولی کا نشانہ بنا کر میری لاش کسی گندے نالے میں پھینکوا دے گا اور پولیس یہ سمجھے گی کہ میں اپنے مخالف گروہوں کی دشمنی کا نشانہ بن گیا ہوں۔ ایسی صورت میں ایک خطرناک اور جیل سے بھاگے ہوئے مجرم کی موت پر کس کو اس سے ہمدردی ہو سکتی تھی؟

میرے مرنے پر لوٹی کو زندگی بھر کا تحفظ بھی حاصل ہو جاتا اور ایک باعزت شہری کا درجہ بھی وہ ایک معزز شہری کے بھروپ میں اپنی مجرمانہ کارروائیاں جاری رکھنے کے لیے بالکل آزاد ہو گا۔ پھر مجھے روزی اور شوکت کا خیال آیا۔ شوکت نے ایک دوست کے اعتماد کو دھوکہ دیا تھا اور روزی نے ایک شوہر کے ساتھ دغا کیا تھا۔ اگر لوٹی اس خیال میں تھا کہ مجھے اپنے راستے سے ہٹانے کے بعد وہ اطمینان اور چین کی زندگی گزارے گا تو یہ اس کی غلط فہمی تھی۔ کیونکہ روزی اور شوکت اس کے ساتھ بھی مخلص نہیں تھے۔ ان کی منصوبہ بندی میں خود اپنے کانوں سے سن چکا تھا، لیکن یہ تصور میرے لیے ذرا بھی اطمینان بخش نہ تھا کہ مجھے ٹھکانے لگانے کے بعد خود لوٹی کا انجام بھی اچھا نہیں تھا۔

میں بے چینی سے کرسی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس زنداں نما کمرے میں میرا دم گھُٹ رہا تھا، لیکن فرار کا کوئی راستہ نظر نہیں آرہا تھا۔ بالے نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ اُن لوگوں نے اس عمارت کے چپے چپے کی حفاظت اور نگرانی کا انتظام کیا ہو گا۔ میرے لیے فی الحال کوئی راہِ نجات نہیں تھی۔ جالاں جس کی خاطر میں نے اپنی جان کو خطرے میں ڈالا تھا۔ بذاتِ خود ایک مجرم اور قانون کو مطلوب عورت تھی۔ اس کا نیا روپ میں دیکھ ہی چکا تھا۔ وہ درحقیقت اپنی کینچلی بدل چکی تھی۔ اس کے اندر دوسروں کو مرعوب و مسحور کر کے اپنے پیچھے چلانے کی پوری صلاحیت موجود تھی جس کا وہ کامیاب عملی مظاہرہ کر چکی تھی۔ بالے جیسا شخص اس کی شخصیت سے مرعوب ہو کر اس کے اشارے پر ناچنے لگا تھا۔ وہ اس قدر خطرناک اور چالاک عورت ہو گی۔ یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

دروازے پر آہٹ ہوئی اور میں رُک کر دروازے کو تکنے لگا۔ دروازہ آہستگی سے کھلا اور پہریدار نے گردن اندر ڈال کر جھانکا۔ اس کا سر غائب ہو گیا۔ قدموں کی آہٹ سنائی دی اور پھر دروازے میں جالاں نمودار ہوئی۔ میں اسے سامنے دیکھ کر حیران زدہ رہ گیا۔ ایک اور مسلح شخص اس کے پیچھے پیچھے نہایت مودبانہ انداز میں چل رہا تھا۔ کمرے میں داخل ہونے کے بعد جالاں نے پلٹ کر پہریدار کو واپس جانے کا اشارہ کیا اور اس نے باہر جا کر دروازہ بند کر دیا۔ اب ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

صید اور صیاد آمنے سامنے کھڑے تھے۔ ایک لمحے کے لیے وہ خاموش کھڑی رہی پھر بے اعتنائی کے ساتھ آگے بڑھی اور انتہائی بے تکلفی سے آرام کرسی پر نیم دراز ہو گئی۔ اس نے دونوں بانہیں اُٹھا کر انگڑائی لی اور مسکرانے لگی۔ میں بدستور اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔

"سناؤ کیا حال ہے یوسف بابو؟" اس نے لگاوٹ سے پوچھا۔

میں نے کوئی جواب دینا مناسب نہیں سمجھا اور خاموشی سے دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔

"یہ لوگ اپنے آپ کو بہت چالاک سمجھتے ہیں۔ مگر اوّل نمبر کے بدھو ہیں۔" وہ بڑے پُرسکون لہجے میں بول رہی تھی۔ "تم ان کے پھندے میں پھنس گئے ہو اور یہاں سے چھٹکارا اب آسان نہیں ہے۔ مجھے سب پتہ چل گیا ہے یہ تو کب سے تمہاری تلاش میں تھے اور تم خود ہی ان کے جال میں پھنس گئے۔"

اس کے تجاہل پر میں دل ہی دل میں عش عش کر اُٹھا۔ میں ان لوگوں کے جال میں محض اس کی وجہ سے پھنسا تھا اور وہ کتنی معصومیت کے ساتھ مجھے یوں بتا رہی تھی جیسے اس تمام واقعے میں اس کا کوئی دخل ہی نہیں تھا۔

میں نے کہا: "میری بدبختی تھی کہ تم جیسی عورت سے ہمدردی کر بیٹھا۔"

وہ مسکرائی: "ہمدردی یا پیار؟ اکیلی، جوان اور خوبصورت عورت کے ساتھ سبھی مرد ہمدردی کرنے لگتے ہیں تم بھی اپنی ذات کے مردوں سے الگ تو نہیں ہو۔"

"بکواس مت کرو۔" میں نے غصے میں اسے ڈانٹا۔ "تم اچھی طرح جانتی ہو کہ عورت کے طور پر مجھے تم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔"

"کس دل سے کہہ رہے ہو؟" وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگی۔ "ذرا میری طرف دیکھ کر تو کہو۔"

میں نے اسے گھورا۔ "جالاں۔ تم کو معلوم ہے کہ میرے دل میں تمہارے متعلق کبھی ایسا خیال نہیں آیا۔ تم میرے خلوص کی توہین کر رہی ہو۔"

وہ ہنسنے لگی: "کہتے تو ٹھیک ہو۔ شروع شروع میں تو تم نے مجھے عورت ہی نہیں سمجھا تھا اور یقین کرو تمہاری یہ بات مجھے زہر لگی تھی۔ کوئی عورت یہ گوارہ نہیں کرتی کہ مرد اس کو عورت کے طور پر کوئی اہمیت ہی نہ دے۔ اُسے پسند ہی نہ کرے۔ عورت کے لیے اس سے بڑی بے عزتی کوئی اور نہیں ہے۔"

"خود کو عورت کہہ کر دوسری عورتوں کی توہین نہ کرو۔ دنیا میں سبھی عورتیں تمہاری طرح بے شرم اور بے غیرت نہیں ہوتیں۔ عورت تو ایک پاک اور مقدس ہستی کا نام ہے۔ وہ ماں ہے بہن ہے۔ بیٹی ہے۔ تم جیسی عورتوں کو عورت کہنا تو اس لفظ کو گالی دینے کے برابر ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر برہمی سے کہا۔

وہ ایک پل مجھے دیکھتی رہی پھر اُداسی سے ٹھنڈی آہ بھری اور کہنے لگی۔

"تم نے کتنی آسانی سے اتنی بڑی بات کہہ دی۔ ایک منٹ میں فیصلہ کر دیا۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہر عورت پیدا تو ایسی ہی ہوتی ہے جیسی تم بتا رہے ہو۔ پھر بعد میں تم جیسے مرد اس عورت کو کھلونا بنا دیتے ہیں اور وہ اس نام کے لیے گالی بن کر رہ جاتی ہے۔ پھر الزام بھی اسی پر آتا ہے۔ کبھی تم نے ٹھنڈے دل سے یہ سوچا کہ عورت کو ایسا بننے کے لیے کون مجبور کرتا ہے؟ وہ بھی مرد ہی ہوتے ہیں جو اس کی مجبوری سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ اس کی بے بسی کو بہانہ بنا کر اسے بے آبرو کر دیتے ہیں۔ میں بھی کسی وقت ایسی ہی عورت تھی جیسی تم بتا رہے ہو۔ مگر پھر میں جالاں بن گئی۔ ایک گورکھ دھندہ بن کر رہ گئی۔ تم میرے بدلتے ہوئے روپ دیکھ کر شاید حیران تو ہو گے مگر تمہیں یہ نہیں معلوم کہ مجھے رنگ بدلنے پر مجبور کس نے کیا؟ کس نے میرے سر سے شرم اور حیا کی چادر کھینچ کر مجھے بے حیا اور بے عزت بنایا ہے؟ سنو گے یہ کہانی؟!"

میں نے بیزاری سے اس کو دیکھا اور بولا: "بس رہنے دو۔ ایسی کہانیاں میں بہت سن اور پڑھ چکا ہوں۔ ہر خراب عورت کے پاس ایسی ایک کہانی ہوتی ہے جو وہ اپنی خرابیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے سنا دیتی ہے۔"

"مگر یہ کہانی نہیں حقیقت ہے۔ بالکل سچی داستان ہے۔ اگر تمہیں یقین نہیں آئے گا تو میں تمہارے سامنے ثبوت پیش کر دوں گی۔ میں جانتی ہوں کہ تم میری بدلی ہوئی شکل اور روپ دیکھ کر حیران بھی ہو اور مجھ سے نفرت بھی کرنے لگے ہو۔ مگر یہ کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے اب دُکھ سہنے اور ذلت برداشت کرنے کا گُر سیکھ لیا ہے۔ تم ایک اچھے آدمی ہو۔ تم نے مجھ پر ترس بھی کھایا اور مجھ سے ہمدردی کر کے میری مدد بھی کی۔ تمہاری نظروں میں مجھے وہ بھوک اور خواہش بھی نظر نہیں آئی جو مجھے دیکھنے والوں کو بے چین کرتی رہی ہے۔ تم نے میری

بے بسی اور مجبوری سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش بھی نہیں کی اور نہ ہی تنہائی میں کبھی شرافت کی دیوار کو پھاندنے کی کوشش کی۔ یقین کرو بابو یوسف۔ ساری زندگی میں تم مجھے اکیلے مرد ملے ہو جو اتنا بھلا مانس اور سیر چشم ہے۔ تمہارے دل میں مجھے دیکھ کر کوئی لالچ پیدا نہیں ہوا۔ حالانکہ اگر تم کبھی میرے اکیلے پن سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتے تو تمہیں میرا اصلی روپ نظر آ جاتا۔ مگر تم نے کبھی ایسا ارادہ نہیں۔ میں تمہاری شرافت کو سلام کرتی ہوں اور تمہارے لیے میرے دل میں بہت عزت اور قدر ہے۔"

"اسی لیے تم نے مجھے دھوکا دے کر ان دشمنوں کے حوالے کر دیا جو میرے خون کے پیاسے ہیں؟" میں نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

"میں وقت اور موقع کی تلاش میں تھی۔ میں کب تک تمہارے اوپر بوجھ بنی رہتی۔ جب بالے اور اس کے ساتھی تمہاری تلاش میں دوبارہ ہوٹل میں آئے تو میں نے انہیں تمہارے اور اپنے بارے میں سب کچھ سچ سچ اور صاف صاف بتا دیا۔"

"اور انہیں تمہاری باتوں کا یقین بھی آ گیا؟"

"کیوں نہ آتا؟ تمہاری اصلیت تو پہلے ہی جانتے تھے۔ صرف میرے بارے میں انہیں معلوم نہیں تھا کہ میں کون ہوں اور تمہارے ساتھ میرا کیا رشتہ ہے۔ وہ خود بھی مجرموں کے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لیے میرے کارناموں کے بارے میں انہوں نے بہت کچھ سن رکھا ہے۔ میں نے تمہیں بتایا نہیں کہ میں کئی بار جیل سے فرار بھی ہو چکی ہوں۔ یہ بات بالے اور اس کے ساتھیوں کو بھی معلوم ہے۔ صرف وہ میری صورت سے آشنا نہیں تھے مگر ہر آدمی اپنی پہچان خود ہوتا ہے۔ اپنی پہچان بھی میں نے انہیں کرا دی جب ان کے دو بدمعاشوں کو میں نے جوڈو کراٹے کی چوٹ لگا کر بے ہوش کر دیا اور ایک منٹ میں دونوں کے ہتھیاروں پر بھی قبضہ کر لیا۔ یہ رنگ دیکھ کر تو بالے بھی میرا مُرید ہو گیا۔"

وہ بڑے فخر سے یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد مسکرائی اور کہنے لگی۔

"بس تم ہی بھولے ہو جو مجھے نہ پہچان سکے اور بے بس، لاچار لڑکی سمجھ کر مجھ پر ترس کھاتے رہے۔ تمہاری یہ بات مجھے بہت پسند آئی ہے بابو یوسف۔ یقین کرو مجھے مرد ذات سے نفرت ہے۔ تم پہلے آدمی ہو جسے میں نے نفرت سے نہیں دیکھا۔ مگر ایک بات تمہیں بتاتی چلوں۔ یہ تم ہمیشہ یاد رکھنا۔ تمہارے بھی کام آئے گی۔ جس طرح پیسے والے لوگ اپنے فائدے کے لیے بڑے سے بڑے رشتے کو قربان کر دیتے ہیں، اسی طرح ہم مجرم لوگ بھی وقت آنے پر سب کچھ بھلا دیتے ہیں۔ تم خود دیکھ لو۔ وقت پڑنے پر میں نے تمہاری ہمدردی کا بھی کچھ لحاظ نہیں کیا اور تمہیں تمہارے دشمنوں کے حوالے کر دیا۔"

"واقعی تم نے بہت بڑا اور تعریف کا کام کیا۔" میں نے مسکرا کر کہا تو وہ میرے طنز کا بالکل بُرا نہیں مانی بلکہ مسکرا کر رہ گئی۔

"تم نے اپنے بارے میں بہت کچھ بتایا ہے کہ تم کتنی بڑی اور خطرناک مجرم ہو۔ مگر تم اس سے بھی بڑی اداکارہ ہو۔ تمہاری ایکٹنگ کی داد دینی پڑتی ہے۔ یقین کرو اگر تم فلموں میں کام کرو تو ملک کی سب سے بڑی ایکٹریس مان لی جاؤ اور بڑے سے بڑا ایوارڈ حاصل کر لو۔"

"تعریف اور حوصلہ افزائی کا شکریہ۔" وہ ہنستے ہوئے کرسی سے اُٹھ کر ٹہلنے لگی۔ "مگر اب وقت گزر چکا ہے تم نے یہ مشورہ بہت دیر سے دیا ہے۔"

میں اس کے اطمینان اور خود اعتمادی کو دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ وہ جیسی بھی تھی۔ درحقیقت ایک ہمت والی اور جیدار عورت تھی۔ میں نے ایسی عورت پہلے نہیں دیکھی تھی۔ خود اعتماد، بہادر، پل پل میں گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والی اور ہر رنگ مکمل اور بھرپور۔ وہ بڑی لاپروائی سے میرے سامنے کمر پر ایک ہاتھ رکھ کر ٹہل رہی تھی اور اس لمحے وہ ایک طرح دار اور خوبصورت عورت نظر آ رہی تھی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کا جرم سے بھی کوئی تعلق ہو سکتا ہے۔ میں اس کی دلکشی اور رعنائی دیکھ کر اس کی خوبصورتی کا معترف ہو گیا۔ اگر اس نے اپنے لیے جرم کا راستہ نہ اپنایا ہوتا تو وہ کسی بھی اعتبار سے دلوں کو جیتنے والی عورت بن سکتی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"مگر تم جیسی خوبصورت اور نازک لڑکی جرم کی راہ پر کیوں چل پڑی؟"

"میری خوبصورتی ہی میرے لیے وبال بن گئی۔ کسی بھی عورت کے لیے خوبصورتی سب سے بڑی نعمت بھی بن سکتی ہے اور سب سے بڑی مصیبت اور لعنت بھی۔ مگر دنیا میں بہت کم ایسی عورتیں ہوتی ہیں جو اپنی خوبصورتی کا فائدہ اُٹھاتی ہیں۔ زیادہ تر عورتیں تو خوبصورتی کے ہاتھوں مصیبت میں گرفتار ہو جاتی ہیں۔"

وہ ٹہلتے ٹہلتے مسہری پر بیٹھ گئی اور پھر اس کی پشت سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئی۔ اپنا ایک ہاتھ اٹھا کر اس نے مسہری کی پشت سے ٹکا دیا اور آنکھیں موند لیں۔ اس کے بال اس کے خوبصورت چہرے کا گھیرا کیے ہوئے تھے اور اس لمحے وہ بہت پُرکشش اور دلکش نظر آ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ تھک کر سو گئی ہے یا سوچوں میں گُم ہے۔ پھر وہ آہستہ آہستہ دھیمی آواز میں آپ ہی آپ بولنے لگی جیسے مجھ سے نہیں، خود اپنے آپ سے مخاطب ہے۔

"میں گاؤں کی ایک الھڑ اور سیدھی سادی لڑکی تھی۔ اپنے گاؤں اور گھر والوں کے سوا دنیا کی کسی اور چیز کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔ ہمارا گاؤں ایک پتھریل پہاڑی کی گود میں تھا۔ ہریالی بہت کم نظر آتی تھی مگر ان پہاڑوں کی اپنی خوبصورتی تھی۔ پہاڑوں میں رہنے بسنے والے لوگ بھی پتھروں کی طرح سخت جان اور محنتی ہوتے ہیں۔ ہمارے گاؤں والوں کا بھی یہی حال تھا۔ مگر سخت محنت کے باوجود وہ بہت غریب تھے۔ رُوکھی سوکھی بھی کھانے کو مشکل ہی سے ملتی تھی۔ میرا باپ لوہار تھا۔ اس لیے اسے دوسروں سے زیادہ سخت کام کرنا پڑتا تھا۔ میری ماں میرے بچپن میں ہی مر چکی تھی۔ بھائی بہن کوئی نہیں تھا۔ بس ایک میں تھی اور ایک میرا باپ۔ ہم دونوں کی ساری خوشیاں، ساری محبتیں ایک دوسرے کے لیے تھیں۔ بس ایک دوسرے کو دیکھ کر جیتے تھے۔ باپ مجھ سے اتنا پیار کرتا تھا کہ اگر بس چلتا تو چاند ستارے بھی آسمان سے توڑ کر میری جھولی میں ڈال دیتا مگر گرم لوہے کے سوا اس کا کسی اور چیز پر بس نہیں چلتا تھا۔ رات دن محنت کرنے کے بعد بھی ہم دونوں مشکل سے اپنا پیٹ پالتے تھے۔ ہمارے علاقے میں نہ کوئی سکول تھا نہ ہسپتال۔ تھا بھی ہم سے میلوں دور تھا۔ مگر مجھے نہ جانے کیوں پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ باپ نے اپنی لاڈلی کی فرمائش پوری کرنے کے لیے پاس کے گاؤں میں ایک ریٹائرڈ اور بوڑھے سکول ماسٹر کو ڈھونڈ نکالا اور کسی نہ کسی طرح انہیں مجھے پڑھانے پر بھی رضامند کر لیا۔ بوڑھے ماسٹر جی کا بھی دنیا میں کوئی اور باقی نہیں رہ گیا تھا۔ اکیلی جان تھی۔ ان سے پڑھنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ ایک شاگرد ملی تو انہیں تو جیسے کھلونا مل گیا۔ بڑے شوق اور لگن سے مجھے پڑھانا شروع کر دیا۔ قاعدہ اور کتابیں بھی خود ہی تلاش کر لائے۔ لکھنے کے لیے سلیٹ اور تختی بھی ڈھونڈ لائے۔ اس طرح میں میرا بابا اور ماسٹر جی اپنی چھوٹی سی دنیا میں مگن ہو گئے۔ ماسٹر جی کے پاس جو تھوڑی بہت کتابیں اور معمولی سا علم تھا وہ انہوں نے مجھے سونپ دیا۔ یوں میں نے پڑھنا لکھنا سیکھ لیا اور پھر ماسٹر جی کے پاس جو بھی کتابیں ملیں انہیں بار بار پڑھ کر خوش

ہوئی اور وقت گزارتی رہی۔ اس طرح زندگی کے سولہ سترہ سال گزر گئے اور میں جوانی کی عمر میں پہنچ گئی۔ صورت شکل جیسی بھی ہے تم دیکھ رہے ہو۔ اوپر سے نئی نئی جوانی آئی تو سارے گاؤں میں دھوم مچ گئی۔ ہمارے علاقے میں لوگ ہی بہت کم تھے۔ جوان اور خوبصورت لڑکیاں تو بس کہانیوں میں ہوا کرتی تھیں۔ پھر میں تو لکھنا پڑھنا بھی جانتی تھی۔ کھیل کود اور بھاگ دوڑ کی وجہ سے صحت مند بھی تھی اور بابا نے مجھے بندوق چلانی بھی سکھا دی تھی۔ گھوڑے کی سواری بھی کر لیتی تھی۔ پہاڑی گاؤں میں رہنے والی لڑکیوں میں اتنے گن کہاں رکھے ہوتے ہیں۔ بس میرا تو ہر طرف چرچا ہونے لگا اور یوں میری بدقسمتی کے دن آ گئے۔"

میں خاموش پوری توجہ سے اس کی کہانی سن رہا تھا۔ اس کے سنانے کے انداز میں دھیما پن اور روانی تھی۔ آواز میں نرمی اور مٹھاس تھی جس کی وجہ سے ایک سماں بندھ گیا تھا۔ یکایک اس نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا اور مسکرانے لگی۔ "کیوں بابو یوسف کیسی کہانی ہے؟ پسند آ رہی ہے کہ نہیں؟"

"کہانیاں تو سبھی دلچسپ ہوتی ہیں مگر آپ بیتی کی بات ہی اور ہوتی ہے۔"

"لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ سچی کہانی سے زیادہ دلچسپ اور کوئی کہانی نہیں ہوتی۔ کیونکہ سنانے والے لوگ تو خود ہی کہانی بن گئے ہوتے ہیں۔ بس میں بھی ایک کہانی بن کر رہ گئی ہوں۔"

اتنا کہہ کر وہ اداس سی ہو کر چپ ہو گئی اور پھر جیسے خیالوں میں گم ہو گئی۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔ میں نے بھی اسے مخاطب کرنا مناسب نہ سمجھا۔ چند لمحے بعد وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور بولی۔

"میں تو اپنی ہی دنیا میں مگن تھی۔ آس پاس کی چیزوں پر کبھی دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ اس لیے مجھے اپنے علاقے کے بارے میں بھی کچھ پتہ نہیں تھا۔ جب پہلی بار مجھے ایک رسم کا پتہ چلا تو میں ہکا بکا رہ گئی۔ تھوڑی سی کتابیں بھی پڑھ لی تھیں اس لیے سوچنے سمجھنے کے قابل بھی تھی۔ گاؤں کی ایک لڑکی کا بیاہ ہونے لگا تو مجھے معلوم ہوا کہ سینکڑوں سال سے ہمارے علاقے میں یہ رواج ہے کہ ہر لڑکی کی دو بار شادی ہوتی ہے۔ ایک شادی تو اس شخص سے ہوتی ہے جس سے گھر والے رشتہ طے کرتے ہیں مگر اس سے ایک دن پہلے اس کی ایک اور شادی ہوتی ہے اور وہ ایک دن کے لیے علاقے کے سردار کی دلہن بنائی جاتی ہے جو اگلے دن اسے طلاق دے کر دوسری شادی کے لیے آزاد کر دیتا ہے۔ گاؤں کے بڑے بوڑھوں نے بتایا کہ انہوں نے بھی جب ہوش سنبھالا تو یہی رواج دیکھا؛ ورنہ سنا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اس پر عمل نہ ہوا ہو۔ نہ کبھی ایسا ہوا کہ کسی سردار نے اپنی ایک دن کی دلہن کو زندگی بھر کے لیے اپنا لیا ہو۔ اس رسم کو علاقے کے لوگوں نے زندگی کا ایک حصہ سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔ اور کبھی کسی لڑکی یا اس کے باپ نے اس پر اعتراض نہیں کیا تھا۔ نہ ہی لڑکی کے ہونے والے شوہر نے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ مگر میں دوسری لڑکیوں کی طرح ان پڑھ نہیں تھی۔ لکھنا پڑھنا جانتی تھی۔ سوچ سمجھ سکتی تھی اور خود کو بھیڑ بکری نہیں سمجھ سکتی تھی یا میری فطرت میں ہی بغاوت تھی۔ وجہ جو بھی ہو مگر تقدیر نے میرے لیے فیصلہ کر دیا تھا کہ میں اس رسم کے خلاف آواز اٹھاؤں۔ میں نے یہ بات سنی تو پہلے تو مجھے یقین ہی نہیں آیا مگر بعد میں جب اس کی تصدیق ہو گئی تو میرے لیے تو یہ ایک عذاب ہو گیا۔ یہ خیال ہی میرے لیے ناقابل برداشت تھا کہ شادی سے پہلے مجھے ایک جھوٹی شادی بھی کرنی پڑے گی۔ شادی کا تو صرف نام تھا۔ مقصد کچھ اور تھا۔ علاقے کے سرداروں نے اپنی دلبستگی کے لیے یہ رسم بنائی تھی۔ خدا جانے کس زمانے سے یہ رسم چلی آ رہی تھی۔ باہر کی دنیا بدل گئی تھی مگر ہمارے علاقے کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ نہ لوگوں میں تعلیم تھی نہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت۔ باہر کی دنیا سے لوگ ہمارے علاقے میں نہ آتے تھے۔ نہ ہی ہمارے علاقے کے لوگ اپنی چھوٹی سی دنیا سے نکل کر کہیں باہر جاتے تھے۔ ماسٹر جی ایک واحد آدمی تھے جو اپنے بچپن ہی میں گھر سے بھاگ کر چلے گئے تھے

اور اس وقت واپس لوٹے جب بڑھاپے نے انہیں قبر کے کنارے پہنچا دیا تھا۔ ان کے بیوی بچے کبھی کے مر کھپ چکے تھے اور اب وہ دنیا میں بالکل اکیلے رہ گئے تھے۔ بچپن کی یادوں نے زور مارا تو وہ اپنی زندگی کے آخری دن اپنی جنم بھومی میں گزارنے چلے آئے تھے۔ وہ عمر کی اس منزل میں تھے جب انہیں اللہ اللہ کرنے کے سوا کسی اور چیز سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس لیے انہوں نے بھی اس رسم کے بارے میں کچھ نہیں سوچا تھا۔ جب میں نے ڈرتے ڈرتے، دبی زبان میں ان سے اس کے بارے میں بات کی اور اس رسم کے خلاف نفرت کا اظہار کیا تو انہیں بھی پہلی بار اس کے گھناؤنے پن کا احساس ہوا۔ مگر ان کے خیال میں اس کے خلاف آواز اٹھانے سے کچھ حاصل نہیں تھا اور کوئی اس کو برا سمجھ کر اس کے خلاف آواز اٹھانے اور سردار کی ناراضگی مول لینے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ علاقے کے سردار کہیں دور رہا کرتے تھے۔ گاؤں والوں نے کبھی نہ ان کی شکل دیکھی تھی اور نہ کبھی ان کی آواز سنی تھی۔ ان کا واسطہ تو بس سال میں ایک بار ان کے کارندوں ہی سے پڑا کرتا تھا جو گھوڑوں پر سوار بندوقیں اور چمڑے کے کوڑے لیے ہوئے آتے تھے اور لوگوں سے مال اور مویشی وصول کر کے لے جاتے تھے۔ ان کی خوفناک اور ڈراؤنی صورتیں دیکھ کر کبھی کسی نے ان کا راستہ روکنے کی جرأت بھی نہیں کی تھی۔ لڑکی کی شادی کے موقع پر انہیں اطلاع دینی ضروری تھی اور ماں باپ اس رسم کی ادائی کے لیے اپنی بیٹی کو بھی ان کے حوالے کر دیا کرتے تھے جو لمبے سفر کے بعد ایک دن کی دلہن کو طلاق کے کاغذ کے ساتھ واپس لا کر ماں باپ کے حوالے کر دیا کرتے تھے۔

"بابا نے میری شادی کافی دور ایک اور گاؤں میں رہنے والے لوہار کے بیٹے سے ٹھہرائی تو سردار کے کارندوں کو بھی اس کی خبر کر دی گئی۔ مجھے ایک ان پڑھ لوہار سے شادی کرنے پر کوئی اعتراض نہیں تھا اس کو تو میں نے قبول کر لیا تھا، لیکن سردار کی عارضی دلہن بننا مجھے کسی طور بھی منظور نہیں تھا۔ جوں جوں میری شادی کے دن قریب آتے گئے میری بے چینی اور بے کلی بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ ایک دن میں نے بابا کو اپنا فیصلہ سنا دیا۔ بابا تو میری بات سن کر سناٹے میں رہ گیا۔ اس نے مجھے سمجھانے کی کوشش مگر میرا فیصلہ اٹل تھا۔ بابا میری ضدی طبیعت سے واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں نے جو بات ایک بار سوچ لی ہے وہ بدل نہیں سکتی۔ بابا سیدھا سادا دیہاتی لوہار تھا۔ وہ کسی اصول اور جذبات کی بات نہیں سمجھ سکتا تھا مگر اس کی لاڈلی بیٹی جو کچھ کہہ رہی تھی اس کے لیے وہ بہت کافی تھا۔

میں نے گاؤں کے ایک آدمی کے ہاتھ اپنے ہونے والے شوہر کو پیغام بھیجا کہ میں تو سردار کی بنائی ہوئی رسم کے خلاف ہوں۔ اس کو بھی میرا ساتھ دینا چاہیئے۔ اگر وہ ہمت کرے تو ہم دونوں سردار کو بتائی ہوئی تاریخ سے پہلے ہی شادی کر کے کہیں دور جا سکتے ہیں۔ جہاں سردار کے بنائے ہوئے قانون اور اس کے کارندے ہم تک نہ پہنچ سکیں گے۔ مگر وہ بزدل اور بے غیرت نکلا۔ وہ سردار سے ٹکرانے اور اس کی حکم عدولی کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے اس کی بزدلی پر بہت غصہ آیا۔ دراصل اسکی لاعلمی اور جہالت نے اسے ڈرپوک بنا دیا تھا۔ اس کے اندر غیرت باقی نہیں رہی تھی۔ اگر وہ میرا ساتھ دینے کا وعدہ کرتا تو آج حالات ہی کچھ اور ہوتے۔

شادی کی تاریخ نزدیک آئی تو مجھے سردار کی دلہن بنا کر تیار کیا گیا اس کے کارندے مجھے لینے کے لیے پہنچ گئے۔

مجھے میرے باپ نے رخصت کیا۔ مجھے معلوم تھا یہ اسکی اور میری آخری ملاقات ہے۔ کیونکہ اسی رات بابا نے پہاڑ کی اونچی چوٹی سے کود کر اپنی جان دے دی تھی۔"

میں سردار کی اونچی پتھروں والی حویلی میں لے جائی گئی جہاں وہ سب سامان موجود تھا جو میں نے دیکھا تک

نہیں تھا اور نہ ہی کبھی اس کے بارے میں سُنا تھا۔ میرے لیے وہ ایک بالکل نئی اور انوکھی دنیا تھی۔ سردار کے نوکروں نے مجھے سجا بنا کر ایک کمرے میں بٹھا دیا۔ سردار کمرے میں آیا تو مَیں نے دیکھا کہ وہ درمیانی عمر کا ایک مضبوط آدمی ہے۔ وہ دولہا کے لباس میں نہیں تھا بس عام سے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے پر نوکدار مونچھیں اور چھوٹی سی ڈاڑھی تھی۔ وہ دروازہ کھول کر اندر آیا تو مَیں پلنگ سے اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ دُلہن کو یوں بے باکی سے کھڑے ہوئے دیکھ کر وہ حیران رہ گیا مگر اصل حیرت اسے تب ہوئی جب مَیں نے اسے بتایا کہ وہ رعایا کی بیٹیوں کی عزت سے کھیلنے والی اس بیہودہ اور شرمناک رسم کو ختم کر دے۔ مَیں نے اس سے یہ بھی کہا کہ مَیں اس جھوٹی شادی کے لیے راضی نہیں ہوں اور اسکو بھی چاہیئے کہ یہ ڈھونگ نہ رچائے اور مجھے واپس بھجوا دے۔ پہلے تو وہ ہکا بکا رہ گیا۔ پھر اس کے ہوش ٹھکانے آئے تو وہ غصّے سے لال ہو گیا۔

اس نے کہا کہ وہ میری بے شرمی اور بے حیائی کو دیکھ کر شرم سے پانی پانی ہو گیا ہے وہ اپنے بزرگوں کی بنائی ہوئی رسم کو کسی قیمت پر بھی نہیں چھوڑے گا۔ اُس نے مجھے اور میرے باپ والوں کو بدتمیزی کا مزہ چکھانے کی دھمکی بھی دی۔ وہ میری طرف بڑھا اور جب میرے نزدیک آیا تو مَیں نے بڑے آرام سے اپنے دوپٹے میں چھپایا ہوا خنجر اس کے سینے میں اُتار دیا۔ اسکو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ لہٰذا مجھے بے یقینی سے دیکھتے دیکھتے ہی وہ اللہ کو پیارا ہو گیا۔

مرتے مرتے بھی اسکی آنکھوں میں حیرت اور ایک حسرت تھی۔ مَیں نے خنجر اس کے سینے میں اٹکا ہوا چھوڑا اور فوراً حویلی سے بھاگنے کی کوشش کی مگر پکڑی گئی۔ میری جگہ اگر کوئی مرد ہوتا تو سردار کے نوکر اور رشتے دار اس کی تکا بوٹی کر دیتے مگر کیونکہ میں عورت تھی اسلئے علاقے کے دستور کے مطابق کسی نے مجھے انگلی تک نہیں لگائی اور مجھے پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ چند مہینے مقدّمہ چلا اور پھر مجھے دس سال قید بامشقت کی سزا سنا دی گئی مگر مَیں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جیل میں ہرگز نہیں رہوں گی۔ دو ہفتے بعد مَیں دھوبی کے میلے کپڑوں کی گٹھڑی میں چھپ کر جیل سے بھاگنے میں کامیاب ہو گئی۔ وہ میری سب سے پہلی سزا اور جیل سے فرار تھا۔ جیل سے نکلی تو میرا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ دنیا بھر میں میرا صرف ایک ہی سہارا تھا جو اب زندہ نہیں رہا تھا۔ اپنے گاؤں تو کیا اُس علاقے میں جانا بھی میرے لیے خطرناک تھا اور وہاں جا کر کرتی بھی کیا؟ وہاں میرا کون بیٹھا تھا؟ جب تک جیل کے اندر رہی مَیں بہت سی مصیبتوں سے بچی ہوئی تھی۔ باہر تو آ گئی مگر اب میری حفاظت کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ جیل میں ایک قیدی عورت سے میری اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ وہ اپنے آشنا کو مارنے کے جُرم میں سزا کاٹ رہی تھی جس نے شادی کا وعدہ کر کے اسے بے آبرو کر دیا تھا۔ اس نے مجھے اپنے بھائی کا پتہ بتایا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا تھا کہ وہ چور اور رسّہ گیر ہے۔ مَیں جیل سے نکل کر کسی نہ کسی طرح اس کے بھائی کے پاس پہنچ گئی۔ اس نے میری بہت آؤ بھگت کی۔ مَیں تھوڑے عرصے اس کے گھر میں رہی پھر اس نے میری شادی کر دی..... میرا نیا شوہر بھی چور تھا مگر اوّل درجے کا بے غیرت۔ علاقے کے تھانیدار کو خوش کرنے کے لیے گھر میں اکیلا چھوڑ کر غائب ہو گیا۔ تھانیدار میرے ساتھ بہت نرمی اور مہربانی سے پیش آئے مگر جب ان کی مہربانیاں زیادہ بڑھنے لگیں تو مَیں نے جھاڑو اُٹھا کر ان کی خوب مرمّت کی۔ وہ ناراض ہو کر چلے گئے اور دوسرے دن چھاپے میں ہم دونوں میاں بیوی پکڑے گئے۔ میری اصلیت بھی پوچھ گچھ کے دوران میں انہیں معلوم ہو گئی۔ اس طرح مجھے دوبارہ اور زیادہ سزا کے ساتھ جیل بھیج دیا گیا۔ بس اس کے بعد مَیں جیل سے باہر اور اندر ہی آتی جاتی رہی۔ جیل ہی میں میری دوستی مجرموں کے رشتہ داروں سے ہو گئی۔ جب بھی مَیں باہر آتی تھی ان ہی کے پاس جا کر پناہ لیتی تھی۔ بُری صحبت میں انسان اچھا تو نہیں رہ سکتا۔ اس لیے میں بھی آہستہ آہستہ اُن کے رنگ میں رنگ گئی۔ مَیں نے دھیرے دھیرے سبھی کچھ سیکھ لیا۔ کبھی ڈاکوؤں کے

ساتھ رہی تو کبھی قاتلوں کے ڈیرے میں دن گزارے۔ ایک بار میری ایک سہیلی اور اس کے بھائی نے مجھے کلب میں ڈانسر بنا دیا۔ وہ لوگ سمگلنگ کرتے تھے مگر دیکھنے میں بہت بڑے کاروباری اور عزت دار لوگ تھے۔ ان کے پاس بہت فیکٹریاں تھیں۔ ہوٹل تھے۔ جائیدادیں تھیں۔ ایک ہوٹل میں اُنہوں نے مجھے ڈانسر رکھ لیا۔ وہ میری خوبصورتی سے فائدہ اُٹھانا چاہتے تھے اور مجھے اپنی حفاظت کے لیے ان کی ضرورت تھی۔

ناچنا تو مجھے آتا نہیں تھا مگر ایک کرسچین ڈانسر نے تھوڑا بہت سکھا دیا۔ بس جسم کو ہلا لیتی تھی اور لوگ اسی کو دیکھ کر پاگل ہو جاتے تھے۔ بڑے بڑے لوگ میری محبت کا دم بھرنے لگے اور میرے مالک کا کام بھی خوب چمک گیا۔ کون سا بڑا افسر تھا جو اس کے ہوٹل میں آ کر جوا نہیں کھیلتا تھا یا عیش نہیں کرتا تھا؟ اسکی ملاقات بہت اونچے لوگوں سے تھی اور اس میں ہوٹل کے کاروبار کا بھی بڑا دخل تھا۔ ایک بار ہی تھانیدار ہوٹل میں ناچ دیکھنے آیا۔ اور مجھے پہچان گیا۔ اب وہ ایس پی ہو گیا تھا۔ میرے مالک کے سامنے اس نے بس ایک ہی مانگ رکھی کہ وہ مجھے حاصل کرنا چاہتا ہے مگر میں نے صاف انکار کر دیا۔ مالک اور اس کی بہن نے مجھے بہت سمجھایا بجھایا۔ لالچ دیا۔ ڈرایا دھمکایا مگر مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا تو اُنہوں نے ایک دن مجھے نیند کی دوائی پلا دی اور مجھے پولیس والے کے حوالے کر دیا۔ مجھے ہوش آیا تو اس منحوس کو سامنے دیکھا تو میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ میز پر رکھے ہوئے اسی کے پستول سے میں نے اسے ختم کر دیا اور اس طرح ایک بار پھر جیل پہنچ گئی۔ مگر اب میں اپنے کام میں پکی ہو چکی تھی۔ میرا نام جیل میں سب جاننے لگے تھے اور مجھے ماننے بھی لگے تھے۔ بس اس طرح زندگی کٹتی رہی۔ میں نے اور بھی کئی خون کیے مگر یقین کرو میں نے سارے قتل اپنی عزت لوٹنے والوں کے۔ یا عزت بچانے کے لیے کیے۔

میرا سب سے بڑا جرم شاید یہی ہے کہ میں اپنی آبرو بچانا چاہتی تھی۔ اگر کوئی عزت آبرو کی حفاظت کرنے والا ہوتا تو میں پہلا قتل ہی کیوں کرتی ___؟

اتنا بول کر وہ خاموش ہو گئی۔ میں بھی خاموش بیٹھا اس کا چہرہ تک رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اب تک میں نے اس کے بارے میں جتنے بھی اندازے قائم کیے وہ سب غلط نکلے تھے۔ پہلے میں اسے بھولی بھالی معصوم لڑکی سمجھا جو غلط تھا۔ پھر میں نے اسے قابلِ نفرت اور خراب عورت سمجھا۔ وہ بھی غلط نکلا۔ دیکھا جائے تو وہ کتنی مصیبت زدہ۔ لاچار اور مظلوم عورت تھی۔ وہ کسی کھوٹ کے بغیر ایک سچی اور کھری عورت تھی جو اپنی عزت کی خاطر آج تک بڑی سے بڑی قربانی دیتی آئی تھی۔ اگر کسی عورت کے لیے اپنی آبرو کی حفاظت کرنا جرم ہے تو وہ درحقیقت بہت بڑی مجرم تھی۔

"یوسف بابو" اسکی آواز نے مجھے اپنے خیالوں سے چونکا دیا۔ "میں اس وقت تمہارے پاس ایک سودا کرنے آئی ہوں۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ تم بے گناہ ہو مگر تمہارے بچاؤ کی کوئی صورت نہیں ہے یہی حال میرا بھی ہے۔ میں زیادہ دیر تک قانون سے نہیں بچ سکتی۔ اس طرح ہم دونوں ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔ اب اگر تم میرا ساتھ دو تو ہم دونوں کے لیے بچنے اور زندہ رہنے کا صرف ایک راستہ باقی ہے۔"

"وہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ یہ ہے کہ ہم دونوں ایک ہو جائیں۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔ تم میرا ساتھ دو تو میں لوٹی کو شیشے میں اُتار سکتی ہوں۔ میرے لیے مردوں کو اور خاص طور سے لوٹی جیسے لوگوں کو دیوانا بنا دینا کوئی مشکل نہیں ہے میں اسے اپنے جال میں پھانس کر راستے سے ہٹا دوں گی اور تم اس کی جگہ لے لینا۔" اتنا کہہ کر وہ پھر چُپ ہو گئی۔

"پھر؟" میں نے بے چینی سے سوال کیا۔

"پھر اس کے بعد تم ساری دنیا کے لیے یوسف بن جاؤ گے۔ مگر تم لوٹی کے آس پاس کے لوگوں پر یہ ظاہر نہیں ہونے دو گے کہ تم لوٹی نہیں ہو۔ تم اسی طرح رہو گے جس طرح پہلے رہا کرتے تھے۔ کسی کو شبہ نہیں ہوگا کہ تم بدل گئے ہو مگر تم دراصل لوٹی بن کر زندہ رہو گے۔ تم مجرموں کی دُنیا کے بے تاج بادشاہ بن کر رہو گے اور میں تمہاری ملکہ بنوں گی۔"

میں نے چونک کر اسکی طرف دیکھا: "کیا مطلب؟"

وہ مسکرائی: "مطلب یہ کہ تم مجھ سے شادی کر لو گے اور ہم دونوں مجرموں کے بڑے بڑے گروہوں کو اپنا تابعدار بنا لیں گے میں تمہیں سارے گُر سکھا دوں گی۔ تمہاری بہادری اور میری چالاکی کا کوئی توڑ نہیں ہو سکتا۔ ہم دونوں ایک ساتھ مل کر ہر مشکل کو آسان کر سکتے ہیں۔ میں اپنے تمام دُشمنوں سے ایک ایک کر کے بدلہ لوں گی۔ وہ سب لوگ جنہوں نے مجھے تکلیف پہنچائی۔ اُن سب کو میں گن گن کر دوسری دنیا میں پہنچا دوں گی اور ہم دونوں پر کوئی الزام نہیں آئے گا۔ تم یوسف بن کر رہو گے اور میں تمہاری گھریلو بیوی بن کر....."

"مگر تم روزی کو بھول گئی ہو....." میں نے کہا۔

وہ ہنس کر بولی: "روزی کو بھی ہماری بات ماننی پڑے گی ورنہ اس کا بھی دوسری دنیا کا ٹکٹ کٹا دیں گے۔"

میں حیرت سے اس کے خوبصورت چہرے کو دیکھ رہا تھا جس پر سادگی اور معصومیت سایہ فگن تھی لیکن اس حسین جسم کے اندر کس قدر بدصورت اور کریہہ عورت موجود تھی۔ یہ مجھے پتہ چل چکا تھا۔

"کہو۔ تمہیں منظور ہے....؟ فیصلہ کرنے میں زیادہ دیر مت لگانا اس لیے کہ لوٹی کل تک یہاں پہنچنے والا ہے اگر تم نے میرا ساتھ نہیں دیا تو پھر مجبوراً مجھے لوٹی کے ساتھ یہ معاہدہ کرنا ہوگا اور پھر تمہارا جو انجام ہوگا وہ تم خود ہی جانتے ہو۔ بولو:"

میرے جواب دینے سے پیشتر دروازے پر آہٹ ہوئی اور وہ اچانک کھُل گیا۔ بالے دروازے میں نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں اس وقت بھی برین گن تھی اور اس کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔

"جالاں بی بی۔ چلو میرے ساتھ۔" وہ چلّایا۔

"کہاں؟"

"جاگر کے پاس۔ اُٹھو جلدی کرو۔"

ہمارے اُٹھنے کا انتظار کرنے سے پہلے وہ اُلٹے پاؤں واپس چلا گیا۔ جالاں بھی اسکے پیچھے چل پڑی اور اس نے مجھے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ میں کمرے سے باہر نکلا تو دو مسلح پہریداروں نے مجھے اپنے گھیرے میں لے لیا مگر جالاں کے اشارے پر وہ دو قدم پیچھے ہٹ کر میرے ساتھ چلنے لگے۔

جاگر کو جس کمرے میں رکھا گیا تھا اس کے نزدیک پہنچے تو کمرے کے اندر سے چیخنے چلّانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ان میں نمایاں آواز جاگر کی تھی۔ وہ اپنی موٹی اور بے ہنگم آواز میں کچھ کہہ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی کی منت سماجت کر رہا ہے۔ بالے نے جالاں کی طرف دیکھا جو بڑے معنی خیز انداز میں مسکرا رہی تھی۔ ہم لوگ کمرے میں داخل ہوئے تو میری آنکھوں نے ایک عجیب تماشا دیکھا۔ جاگر ابھی تک اپنی کرسی پر مضبوطی سے جکڑا ہوا تھا اور کرسی اُسی جگہ رکھی ہوئی تھی جس جگہ میں نے آخری بار اسے دیکھا تھا لیکن جاگر جو اس سے پہلے کسی تشدد سے مرعوب نہ ہوا تھا اور بقول بالے کے ہر بات اور ظلم پر قہقہے لگاتا رہتا تھا اس وقت بچوں کی طرح پھُوٹ پھُوٹ کر رو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار بہہ رہی تھی اور وہ اپنے سامنے کھڑے ہوئے مسلح محافظ سے گڑگڑا کر کچھ کہہ رہا تھا۔

ہم لوگ کمرے میں داخل ہوئے تو اس نے بالے اور جالاں کو دیکھ کر چلانا شروع کر دیا "خدا کا واسطہ مجھے اس عذاب سے بچالو۔ میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔ کچھ بھی نہیں چھپاؤں گا۔"

جالاں نے فاتحانہ انداز میں بالے کو اور مجھے دیکھا، پھر دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر بڑے عامیانہ انداز میں کھڑی ہو گئی "دیکھا؟ میں نہ کہتی تھی کہ بالکل بکری ہو جائے گا، تین گھنٹے کے اندر۔" پھر اس نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولی "ارے۔ یہ بےچارہ تو ڈھائی گھنٹے بھی نہیں نکال سکا۔"

"ارے ظالمو۔ خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو۔ تمہیں اللہ کا واسطہ یہ مصیبت میرے سر پر سے ہٹا لو۔"

اس کی خوفزدہ نظریں اس کے سر پر بندھے ہوئے ٹین کے ڈبے کو دیکھنے کی کوشش کر رہی تھیں مگر وہ اتنی مضبوطی سے جکڑا ہوا تھا کہ اپنے سر کو ذرا بھی حرکت نہیں دے سکتا تھا "بس۔ بس۔ اب یہیں روک لو اسے۔ میں تمہیں ایک ایک بات بتا دوں گا۔ جو پوچھو گے سب بتاؤں گا۔ میرے ٹکڑے کر دو۔ مجھے جان سے مار دو۔ مگر یہ عذاب میرے اوپر سے ہٹا لو۔" وہ ایک بار پھر بےبسی سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ یہ نظارہ خود میرے لیے بھی انتہائی حیرت انگیز تھا۔ میں یہ دیکھنے کے لیے آگے بڑھ کر اس کے قریب گیا کہ آخر وہ کون سا ٹارچر ہے۔ جس نے جاگر جیسے سخت جان اور جی دار آدمی کو لاچار کر دیا ہے۔ اس کے سر پر لٹکے ہوئے ٹین کے ڈبے میں سے ایک پانی کی بوند ٹپک کر جاگر کے سر پر عین تالو کے اوپر گری اور وہ بے اختیار چلانے اور فریاد کرنے لگا۔ میں نے غور سے دیکھا تو پانی ننھے سے باریک سوراخ میں سے دوبارہ بے حد کم مقدار میں نکل کر ڈبے کے پیندے میں جمع ہو رہا تھا۔ اس کو قطرہ بننے میں کم از کم دو منٹ ضرور لگتے ہوں گے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہر دو یا تین منٹ کے بعد پانی کی ایک بوند ٹپک کر جاگر کے تالو پر گرتی تھی اور اس کی مسلسل ضربوں نے اسے مہلک اور خوفناک ہتھیاروں سے زیادہ گھائل اور مجبور کر دیا تھا۔ اب وہ پھر چیخ رہا تھا "معاف کر دو مجھے۔ اس آفت سے بچالو۔ میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔ مجھے اس مصیبت سے نجات دلا دو۔ تمہیں اللہ کا واسطہ۔"

"بولو۔" جالاں نے ہم سب کی طرف دیکھا "اور کیا چاہیے تمہیں؟"

"مان گئے بی بی۔ تو بڑی وڈی شے ہے۔ تیرا یہ کمال بھی دیکھ لیا۔ ارے یہ دیوس تو کسی قیمت پر مانتا ہی نہیں تھا۔ ہر طرح کی سختیاں کر کے دیکھ لیا مگر اس کے منہ سے ایک لفظ تک نہیں نکلا۔ بلیڈ، چاقو، جلتا ہوا سگریٹ دہکتا ہوا انگارہ، برف کی سل، مسلسل جاگ، کوئی چیز بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکی مگر پانی کے ایک چھوٹے سے معمولی قطرے نے اسے بندہ بنا دیا ہے۔ واہ بھئی واہ۔ تیری خیر ہو بی بی جالاں۔ تو تو واقعی مردوں کی مرد ہے بہت دماغ ہے تیرے بھیجے کے اندر۔"

"اچھا اچھا۔ بک بک بند کرو۔" جالاں اس کی بات کاٹ کر جھڑکنے کے انداز میں کہنے لگی۔ "اگر اس سے کچھ پوچھنا ہے تو کھول دو اس کو اور جو پوچھنا چاہو پوچھ لو۔ اس وقت وہ تمہارے قابو میں ہے۔"

بالے کو جیسے اچانک ہوش آ گیا۔ اپنے کارندوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا "اوئے پاگل کے پترو۔ دیکھتے کیا ہو۔ کھول دو اس زنانے کو!" اس کی آواز میں بہت حقارت تھی۔

ایک کارندے نے آگے بڑھ کر اپنی جیب سے بڑا سا چاقو نکالا اور اسے کھول کر جاگر کی طرف بڑھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید جاگر کی نگاہوں میں خوف کی جھلک نظر آ جاتی مگر اس وقت اس کے لیے سب سے بڑی پرابلم پانی کے قطروں والے ٹارچر سے نجات حاصل کرنا تھی۔ اس لیے وہ یکایک فریاد کرتے کرتے خاموش ہو گیا اور ملتجیانہ نظروں سے محافظ کی طرف دیکھنے لگا۔ جس نے اس کے جسم کو کرسی کے ساتھ جکڑنے والی رسیاں اپنے چاقو سے کاٹنی شروع کر دی تھیں، کیونکہ رسی کی گرفت ایسی تھی کہ اگر وہ اسے کھولنے کی کوشش کرتا تو شاید

اس کام میں کئی گھنٹے لگ جاتے۔ چند لمحے میں رسی کٹ کر فرش پر گر گئی۔ جاگر آزاد ہوتے ہی بجلی کی سی تیزی سے جھپٹ کر اٹھا اور پانی کے ڈبے کی زد سے نکل کر چند قدم کے فاصلے پر کھڑا ہو گیا۔ اچھی خاصی سردی کے باوجود وہ پسینے میں ڈوبا ہوا تھا اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا تھا اور یوں ڈول رہا تھا جیسے گرنے ہی والا ہو۔ مگر وہ گرنے کی بجائے زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھوں سے اپنی کنپٹیاں اور ماتھا سہلانے اور دبانے لگا۔

"تم تو بڑی کانٹے دار عورت ہو بی بی جالاں۔" بالے تعریفی نگاہوں سے جالاں کو دیکھ کر بولا۔ "ایسا دماغ کہاں سے ملا ہے تمہیں۔ تم تو سب کو آگے لگا سکتی ہو کیوں نا؟"

"بے کار باتوں میں وقت ضائع مت کرو۔ اس سے جو کچھ پوچھنا ہے جلدی جلدی پوچھ لو۔ اس وقت وہ بالکل بوکھلایا ہوا ہے۔"

بالے نے فرش پر اکڑوں بیٹھے جاگر کی طرف دیکھا اور پھر اپنے ایک کارندے سے مخاطب ہوا "اوئے الو کے کان۔ دیکھ کیا رہا ہے پانی شانی لا کر پلا اس دیوس کو اور تھوڑا سا دودھ بھی لے آ تاکہ اس کے دماغ میں تراوٹ ہو جائے اور سب کچھ یاد آ جائے اس کو۔"

ایک مسلح آدمی دوڑتا ہوا اس کے حکم کی تعمیل کرنے کے لیے چلا گیا۔

"اب بولو جاگر بیٹے۔ بڑے مرد بنتے تھے تم تو۔ ارے بزدل، ایک عورت سے ہار مان لی؟ ڈوب مرنے کا مقام ہے۔" وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔

"ڈوب کے مرنا بھی مجھے منظور ہے۔ پر یہ تکلیف میری برداشت سے باہر تھی۔ بندے کو مرنا ہو تو بس ایک ہی بار مر جانا چاہیے۔"

اس کے لہجے میں بڑی گہرائی اور سچائی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اس مصیبت سے نجات حاصل کر کے خوش بھی ہے لیکن ہار ماننے سے اسکی جو سبکی ہوئی ہے اس پر شرمسار بھی ہے کہ اتنے معمولی سے ٹارچر سے گھبرا کر ہتھیار پھینک دیے۔ خود میں بھی حیران تھا کہ پانی کی ایک مختصر سی بوند نے ایسا کیا غضب ڈھایا کہ جاگر جیسا خبیث اور سخت جان شخص بھی توبہ توبہ کرنے لگا۔

جاگر اب فرش سے اٹھ کر دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا تھا اور بڑی نفرت اور حقارت بھری نظروں سے جالاں کو دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ آپ ہی آپ تلخ لہجے میں کہنے لگا: "یہ عورت ذات بڑی زہریلی ہوتی ہے۔ خدا اس سے آدمیوں کو بچائے۔"

"تمہاری مالکن بھی تو عورت ہی ہے جس کی تم غلامی کرتے ہو۔" جالاں نے طنز کی۔

"یہی تو مشکل ہے۔" اس نے ایک لمبی آہ بھری "مگر کیا کروں میں نے بڑے بڑے مردوں کے ساتھ کام کیا ہے، لیکن میڈم والی بات کسی میں نہیں دیکھی۔ بڑی جی دار اور ہوشیار عورت ہے وہ۔ ہزار مردوں پر اکیلی بھاری ہے ــــ؟"

"ایسا نہ ہوتا تو تمہیں اپنا غلام کیسے بنا لیتی؟" جالاں پھر گویا ہوئی "جی دار تو وہ ہے پر سنا ہے دل پھینک بھی بہت ہے۔ اپنے کارندوں کو قابو میں رکھنے کے لیے حسن کی خیرات بانٹتی رہتی ہے۔ کہو۔ تمہارے حصے میں بھی کچھ آیا ہے کہ نہیں؟" وہ جاگر کو دیکھ کر مسکرائی۔

یکایک جاگر دانت پیس کر اس کی طرف جھپٹا اور چشم زدن میں اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ اس سے پہلے کہ کمرے میں موجود لوگ سنبھل سکتے جاگر نے زوردار جھٹکے سے ایک محافظ کے ہاتھ سے بندوق چھین لی اور اس کا

رُخ جالاں کی طرف کر کے لبلبی پر انگلی رکھ دی، لیکن اس وقت تک دوسرا محافظ چوکنا ہو چکا تھا۔ اس کے پستول سے پے در پے کئی گولیاں نکلیں اور جاگر اچھل کر زمین پر گر گیا۔ میں اور بالے ایک ساتھ اسکی طرف لپکے مگر وہ آناً فاناً دم توڑ گیا۔ اس کے خون سے کمرے کا فرش بھر گیا۔ بندوق اب تک اس کی مضبوط گرفت میں تھی اور لبلبی پر اس کی انگلی کا دباؤ بھی بدستور تھا۔ اگر لبلبی تھوڑی اور دب جاتی تو اس وقت جاگر کی جگہ جالاں اپنے خون میں نہائی ہوئی فرش پہ پڑی ہوتی۔ جاگر کے اچانک حملے نے سب کو بھونچکا کر دیا تھا۔ جس محافظ سے اس نے بندوق چھینی تھی وہ فرش پر سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا اور جالاں بالکل خاموشی اور سکون سے کھڑی جاگر کی لاش کو دیکھ رہی تھی جس کے جسم سے اب بھی خون جاری تھا۔

بالے نے مڑ کر پستول سے جاگر کو ہلاک کرنے والے محافظ کو دیکھا اور اُلٹے ہاتھ کا ایک تھپڑ پوری قوت سے اس کے چہرے پر مارا۔ وہ اس غیر متوقع حملے اور تھپڑ کی قوت کے باعث اپنے پیروں پر کھڑا نہیں رہ سکا اور لڑکھڑا کر جاگر کی لاش پر جا گرا۔

بالے نے غضب ناک ہو کر اسکو گھورا اور چلّایا: "او بے کھوتے، یہ کیا کر دیا تُو نے۔ وہ سب کچھ بکنے کو تیار ہو گیا تھا اور تُو نے اُسے مار دیا۔ خدا کی قسم اگر تیری وفاداری کا خیال نہ ہوتا تو تجھے بھی جاگر کے پاس دوسری دُنیا میں پہنچا دیتا۔" اتنا کہہ کر وہ دوسرے محافظ کی طرف مخاطب ہوا۔ "کیا تیرے بازو میں جان نہیں ہے جو اپنی بندوق اپنے باپ کے ہاتھ میں تھما دی؟ تم سب کے سب حرام خور ہو۔ بس اب اس کو ٹھکانے لگا دو۔ تم سے میں بعد میں پوچھوں گا۔"

اس کے حکم کی تعمیل میں دو کارندے تیزی سے آگے بڑھے اور جاگر کی لاش کو ٹانگ سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے کمرے سے باہر لے گئے۔ اب کمرے کے دروازے میں صرف ایک محافظ چوکنا کھڑا ہوا باقی رہ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سب مشین گن تھی اور اس کی انگلی اس انداز سے لبلبی پر جمی ہوئی تھی کہ محض ایک اشارے پر وہ گولیوں کی بوچھاڑ کرنے کے لیے بالکل تیار ہے۔

جالاں سوچ میں گم چند لمحے کمرے میں ٹہلتی رہی پھر ایک بید کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی: "جاگر اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا بالے۔ وہ بہادر اور جان پر کھیل جانے والا آدمی تھا۔ دیکھ لو۔ تم اس کو زبان کھولنے پر مجبور نہیں کر سکے۔ اُس نے مالک سے غداری پر موت کو ترجیح دی۔ مجھ پر حملہ کرنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ فوری طور پر کچھ سوچے سمجھے بغیر کوئی پہریدار اس پر گولی چلا دے۔ اس نے کسی کو سوچنے کی مہلت بھی نہیں دی۔ اس کے پاس خودکشی کرنے کے لیے اس کے سوا کوئی اور ترکیب نہیں تھی۔ وہ بہت کام کا بندہ تھا۔"

بالے تعریف کے انداز میں کہنے لگا۔ "وہ بہت بہادر تھا۔ وفادار تھا، ہوشیار اور چالاک تھا اور ایک یہ ہمارے بندے ہیں۔ ایک دم بے کار اور بے وقوف۔ مجھے تو اس کی بدنصیبی پر رونا آتا ہے۔ ان کے گینگ میں کوئی بھی کام کا بندہ نہیں ہے۔ سب کے سب اُلو کے پٹھے ہیں۔"

جالاں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس معنی خیز اور شریر نظروں سے بالے کو دیکھ کر مسکراتی رہی۔ وہ اس کی مسکراہٹ کا مطلب سمجھ گیا اور کھسیانا ہو کر تیزی سے کمرے سے باہر چلا گیا۔ دروازے پر موجود محافظ نے اپنی جگہ سے مطلق حرکت نہیں کی اور نہ ہی مجھ پر سے اپنی نظریں ہٹائیں۔ بالے کے بھاری قدموں کی آواز دُور ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ بالکل معدوم ہو گئی۔ وہ دونوں محافظ جو جاگر کی لاش کو گھسیٹ کر لے گئے تھے دوبارہ کمرے میں واپس آ گئے تھے اور کمرے میں ایک جانب اپنی برین گنیں سنبھالے کھڑے تھے۔

"اس کا نام جاگر تھا یا یوسف۔ میں نے تو تمہیں بتایا تھا کہ وہ مرتے مر جائے گا پر اپنے مالک کا کوئی راز نہیں

کھولے گا۔ دیکھ لو۔ اُس نے ان لوگوں کو مجبور کر دیا کہ وہ اس کو گولی چلا کر جان سے مار دیں۔ وہ بہت دل گُردے والا بندہ تھا۔"

جس شخص نے جاگر پر فائرنگ کی تھی وہ یکایک اپنی کرخت آواز میں بول پڑا: "ہمارے لیے کیا حکم ہے؟ ہمیں اس مہمان کو اس کے کمرے میں لے جانے کا آرڈر ملا ہے۔"

"معلوم ہے کہ تم حکم کے غلام ہو۔ ایک منٹ کمرے سے باہر جا کر ٹھہرو۔ پھر میں تمہیں بتاؤں گی کہ کیا کرنا ہے۔" جالاں نے رعب سے جواب دیا۔

وہ تینوں خاموشی سے باہر چلے گئے۔ کمرے کا دروازہ بدستور کھلا ہوا تھا۔ جالاں نے ایک نظر کھلے ہوئے دروازے پر ڈالی اور پھر میرے نزدیک آ کر دھیمی آواز میں بولی: "بولو۔ تم نے کیا سوچا ہے؟ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ میری شرط تمہیں منظور ہے یا نہیں۔"

"مجھے افسوس ہے جالاں۔ تم اتنے دن میرے نزدیک رہ کر بھی مجھے نہیں پہچان سکیں۔ میں جرم اور گناہ کی زندگی پر لعنت بھیجتا ہوں اور کسی قیمت پر بھی اپنے ضمیر کے خلاف کوئی کام نہیں کروں گا۔"

"زیادہ ضمیر ضمیر کرو گے تو مارے جاؤ گے۔"

"کوئی حرج نہیں۔" میں نے مسکرا کر کہا: "تم نے سلطان ٹیپو شہید کا مقولہ نہیں سُنا کہ گیدڑ کی سو دن کی زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی ہزار درجہ بہتر ہے۔ اور پھر موت تو برحق ہے ایک مسلمان کی حیثیت سے میرا ایمان ہے کہ میری موت کا جو وقت مقرر ہے وہ کسی طرح ٹل نہیں سکتا۔"

جالاں کے چہرے پر ناراضی کے آثار نمودار ہونے لگے۔ وہ برہمی سے سر کو جھٹک کر کہنے لگی: "یوسف مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم اتنے ضدی اور بیوقوف انسان ہو۔ میں نے تمہیں زندہ رہنے کا موقع دیا تھا۔ جس سے تم خوشی سے بھرپور زندگی گزار سکو۔"

"مہربانی کا شکریہ۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "مگر تم کیوں بھول گئیں کہ زندگی اور موت تمہارے نہیں، خدا کے ہاتھ میں ہے۔"

وہ انتہائی غصے کے عالم میں دانت پیستی ہوئی میری طرف بڑھی مگر پھر کچھ سوچ کر پلٹی اور زمین پر پیر پٹختی ہوئی کمرے سے رُخصت ہو گئی۔ اس کے جاتے ہی تینوں مسلح محافظ کمرے میں داخل ہوئے اور ان میں سے ایک برین گن کی نالی سے اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے بولا: "چلو۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔"

میں خاموشی سے چل پڑا۔ برآمدوں سے گزرتے ہوئے ہم اس کمرے تک پہنچ گئے جہاں مجھے رکھا گیا تھا۔ میں نے ایک لمحہ رُک کر اپنے پہریداروں کو دیکھا اور پھر کمرے میں داخل ہو گیا۔

ان میں سے ایک بولا۔ "اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو گھنٹی بجا دینا۔"

یکایک عمارت میں گھنٹیاں بجنے لگیں۔ یوں لگتا تھا جیسے چار پانچ برقی گھنٹیاں یکے بعد دیگرے بج رہی ہیں۔ خاموش ماحول میں ان تیز گھنٹیوں کی آواز خاصی گونجدار تھی۔ میں نے حیرت سے اپنے محافظوں کی طرف دیکھا۔ وہ خود بھی پریشان ہو کر ایک دوسرے کی شکل دیکھ رہے تھے۔ پھر گھنٹیوں کی آواز یک لخت بند ہو گئی اور بھاری قدموں کی آوازیں سنائی دیں جو تیزی سے اسی طرف آ رہی تھیں۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے برآمدے کی مخالف سمت سے بالے چار مسلح آدمیوں کے ساتھ نمودار ہوا۔ وہ بہت جوش اور جلدی میں معلوم ہوتا تھا۔ میرے پاس سے گزرتے ہوئے اُس نے اپنی رفتار آہستہ کی اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

"باس آ گیا ہے۔ اب تمہارا فیصلہ بھی ہو جائے گا۔" اس کے پہریداروں کو میری حفاظت اور نگرانی کی تاکید کر کے

وہ برآمدے کے دوسرے کنارے پر غائب ہو گیا۔ میں ہکا بکا کھڑا رہ گیا تھا، لیکن ایک پہریدار نے مجھے دھکا دے کر کمرے کے دروازے کے اندر پہنچا دیا اور کمرے کا دروازہ بند ہو گیا۔

میں اس اچانک اُفتاد کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ باس سے بالے کی مُراد لُوٹی تھا اور لُوٹی کا یوں اچانک اس جگہ پہنچ جانا میرے لیے ایک اچانک سانحہ ہی تھا۔ وہ میرے خون کا پیاسا اور سب سے بڑا رقیب اور سب سے زیادہ جانی دُشمن تھا۔ وہ میری ہر چیز پر قابض ہو چُکا تھا۔ اب اسے صرف میری زندگی اور جسمانی وجود پر قبضہ کرنے کی کوشش تھی۔ اس کے یوں اچانک آ جانے کی خبر نے مجھے بھونچکا کر دیا تھا اور میرا دماغ وقتی طور پر بالکل ماؤف ہو چُکا تھا۔ کچھ دیر پہلے اس سے مقابلہ کرنے اور اس مشکل سے نجات حاصل کرنے کی غرض سے جالاں نے مجھے جو پیش کش کی تھی وہ میں مسترد کر چُکا تھا، لیکن اس کی اچانک آمد نے مجھے اتنی مہلت بھی نہیں دی کہ میں اپنی حفاظت اور آزادی کا کوئی اور طریقہ سوچ سکتا۔

جالاں کی پیش کش کسی صورت بھی میرے لیے قابلِ قبول نہیں تھی، لیکن اسے یکسر مسترد کر کے غالباً میں نے شدید غلطی کی تھی۔ مجھے چاہیئے تھا کہ مصالحت کا کم سے کم ایک راستہ ضرور کھُلا رکھتا تاکہ جالاں میرے ساتھ تعاون کے لیے آمادہ ہو جاتی۔ یہ بھی ایک تلخ حقیقت تھی کہ اب تک میرے زندہ رہنے کا ایک بڑا سبب بھی خود جالاں ہی تھی۔ وہ میرے ساتھ سودے بازی کرنے کی خواہاں تھی اور بالے وغیرہ اس سے بے حد مرعوب بلکہ خوفزدہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ابھی تک میرے ساتھ انہوں نے کوئی سختی یا بدسلوکی نہیں کی تھی بلکہ درحقیقت مجھے رعایت اور مہربانی کا مستحق سمجھا گیا تھا۔

مجھے بخوبی علم ہو چُکا تھا کہ یہ عمارت جہاں مجھے قید کیا گیا تھا حفاظت اور نگرانی کے اعتبار سے انتہائی مستحکم اور ناقابلِ تسخیر تھی۔ اس کے ایک ایک چپّے پر مسلح افراد موجود تھے اور خدا جانے اس کی نگہداشت اور حفاظت کے لیے اُن لوگوں نے کیا کیا انتظامات کر رکھے تھے، لیکن یہ بات طے تھی کہ یہاں سے کسی شخص کا زندہ بچ نکلنا ممکن نہیں تھا۔ ایسی صورت میں میرے بچاؤ کا واحد ذریعہ جالاں ہی ہو سکتی تھی جس کے تعاون اور دوستی کی پیش کش کو میں نے ٹھکرا کر اُسے بھی اپنا دُشمن بنا لیا تھا۔ وہ کس قدر خطرناک چالاک اور ضرر رساں عورت تھی۔ اس کا ثبوت پچھلے چند گھنٹوں میں مجھے مل چُکا تھا۔ کیا اسے یوں اپنا مخالف بنانا میرے لیے مناسب تھا؟ یہ مانا کہ اسکی پیش کش اور دوستی کے لیے اسکی شرط میرے لیے ہرگز قابلِ قبول نہ تھی، لیکن پھر بھی مصلحت اور وقت کا تقاضا یہ تھا کہ میں اسے باتوں اور بہلاوں میں اُلجھائے رکھتا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا؟ اپنی نادانی، سادگی اور جلد بازی کی بنا پر میں اس کی دوستی اور ہمدردی سے محروم ہو چُکا تھا۔ بقول اس کے وہ لُوٹی کو دوست بنا کر بہت کچھ حاصل کر سکتی تھی اور مجھے احساس تھا کہ وہ کچھ عرصے تک اپنی چالاکی اور مکاری کے ساتھ اپنے حُسن و جمال اور دوسری خوبیوں کی وجہ سے لُوٹی کے دل و دماغ پر بھی چھا جانے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

لُوٹی کو میری تلاش تھی۔ میرا زندہ یا مردہ ہاتھ آنا اس کے لیے مسرّتوں اور اطمینان کا پیغام تھا۔ وہ مجھے خود حاصل کرنے یا دوسروں کے جال میں پھنسانے کی کوششوں میں مصروف تھا اور یہ میری حماقت کی انتہا تھی کہ میں بذاتِ خود اس کے جال میں گرفتار ہونے کے لیے آ گیا تھا۔ کیا مجھے اس روز اپنے گھر نہیں جانا چاہیئے تھا؟ میں نے سوچا۔ نہ میں وہاں جاتا اور نہ بالے سے میرا سامنا ہوتا اور نہ ہی وہ لوگ میری تلاش میں سرگرداں ہو کر جالاں تک پہنچتے۔ لیکن یہ سب خیالات اب بعد از وقت تھے۔ جو ہونا تھا ہو چُکا تھا، لیکن آئندہ کیا ہونے والا تھا؟ یہ خیال میرے لیے انتہائی تشویشناک اور پریشان کُن تھا۔ ان لوگوں کی سنگدلی اور ان کے اختیارات کی وسعت کا مجھے بخوبی اندازہ ہو چُکا تھا۔ لُوٹی کے ہاتھ آ جانے کا مطلب ہی موت تھا۔ وہ مجھے مار کر کسی بھی فرضی کہانی کے ساتھ میری لاش

پولیس کے سامنے پیش کر سکتا تھا اور پولیس ریکارڈ کے مطابق وہ میرے ساتھ کوئی بھی سلوک کرنے میں بالکل حق بجانب تھا۔ اگر وہ مجھے زندہ پولیس کے حوالے کر دے تب بھی پولیس اسکی ممنون ہو گی اور پھانسی کا پھندا میرا مقدر ہو گا۔ یا پھر وہ بہت بڑی رقم کے عوض مجھے اپنے (دوسرے معنوں میں اب میرے) دُشمنوں کے حوالے کر کے بھی مجھ سے نجات حاصل کر سکتا تھا۔

میں کچھ دیر اسی کشمکش و پیچ اور اُلجھن میں گرفتار رہا، لیکن پھر رفتہ رفتہ میں نے اپنی پریشانی پر قابو پانے کی کوشش کی اور اس میں کسی حد تک کامیاب بھی ہو گیا۔ یکایک مجھے شدید تھکن کا احساس ہونے لگا۔ میں نے غسل خانے کا رُخ کیا جو انتہائی کشادہ اور جدید سامانِ ضروریات سے آراستہ تھا۔ اُجلے دُھلے ہُوئے تولیے نہایت سلیقے کے ساتھ لٹکے ہوئے تھے۔ نہانے کے لیے ٹب، شاور اور خوشبودار صابن بھی موجود تھا۔ میں نے ہر طرف سے توجہ ہٹا کر خود کو تازہ دم کرنے کے لیے غسل کا فیصلہ کیا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ جب کچھ دیر بعد میں نہانے کے بعد غسل خانے سے باہر نکلا تو خود کو تر و تازہ محسوس کر رہا تھا۔

غسل نے مجھے جسمانی فرحت بہم پہنچائی تھی۔ غسل کرنے کے بعد میں نے اندازے سے قبلہ کی سمت کا تعین کیا اور قالین پر نماز کے لیے سجدہ ریز ہو گیا۔ نماز کی ادائیگی نے حسبِ معمول مجھے سکون اور اطمینان کی دولت سے مالا مال کر دیا اور میں ایک بار پھر خود کو ہلکا پھُلکا اور خوش و خرم محسوس کرنے لگا۔ یہ میرا تجربہ ہے کہ کسی مشکل اور پریشانی کے وقت خدا کے سامنے سربسجود ہونے سے نہ صرف روحانی تسکین ملتی ہے بلکہ ذہنی سکون بھی حاصل ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے اپنے تمام مسائل خدا کی مرضی پر چھوڑ کر ہر طرح کی فکر سے آزادی حاصل ہو گئی ہو۔ کچھ دیر پہلے میں فکر و آلام میں گرفتار تھا، لیکن اب مجھے کسی چیز کی پروا نہیں تھی۔ میں نے اپنے معاملات اپنے رب کے سپرد کر دیئے تھے۔

میں نے کمرے کا جائزہ لیا تو دیوار کے ساتھ لگی ہوئی الماری میں کتابیں سجی ہوئی نظر آئیں۔ ان میں سے بیشتر انگریزی کی کتابیں تھیں جن میں اکثریت جاسوسی اور جرائم کے موضوع سے تعلق رکھنے والے ناولوں کی تھی۔ کچھ غیر ملکی میگزین بھی تھے جو عریاں اور نیم عُریاں تصاویر سے پُر تھے۔ بیڈ کے سرہانے رکھی ہُوئی چھوٹی میز پر برقی لیمپ کے برابر دو تین انگریزی کی بے ہودہ کتابیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ قصہ مختصر یہ کہ کمرے میں موجود کتابیں اس گھر میں رہنے والوں کی ذہنیت اور آوارہ مزاجی کا ثبوت فراہم کرنے کے لیے کافی تھیں۔ یہ وہ میگزین اور کتابیں تھیں جن کی درآمد یوں تو ملک میں ممنوع ہے، لیکن وسائل اور سرمایہ رکھنے والوں کے لیے ان کا حصول انتہائی آسان ہے اور یہ قابلِ اعتراض مواد فراوانی کے ساتھ بڑے لوگوں کے گھروں میں دستیاب ہے۔ میرے مطالعے کے لیے کوئی مناسب کتاب یا میگزین نہ مل سکا تو میں نے کچھ دیر سو کر وقت گزارنے کا فیصلہ کیا اور حیرت کی بات یہ ہے کہ اس قدر پریشان کُن حالات میں مبتلا ہونے کے باوجود چند ہی لمحوں میں نیند کی دیوی نے مجھے خوابوں کی دنیا میں پہنچا دیا جہاں میں ہر قسم کی فکر و پریشانی سے محفوظ تھا۔

نہ جانے میں کتنی دیر سویا کہ کمرے کے باہر سے آنے والی آوازوں نے مجھے نیند سے ہوشیار کر دیا۔ میری آنکھ کھُلی تو کمرے کا دروازہ چوپٹ کھُل چُکا تھا اور اس میں وہ شخص داخل ہو رہا تھا جو فی الوقت روئے زمین پر میرا سب سے بڑا مخالف اور دُشمن تھا۔ دروازے میں داخل ہو کر لُوٹی ایک لمحے کے لیے ٹھٹک کر رُک گیا۔ شاید اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو گا کہ میں ایسے نازک وقت بے فکری سے سو رہا ہوں گا۔ اس کے عقب میں بالے اور دو مسلح افراد صاف نظر آ رہے تھے جن کے ہاتھوں میں تھامے ہُوئے ہتھیار ذرا سے اشارے پر گولیاں اُگلنے کے لیے بے تاب تھا۔ میں بستر پر اُٹھ کر بیٹھ گیا اور ہم دونوں نے ایک دوسرے کی نگاہوں میں نگاہیں
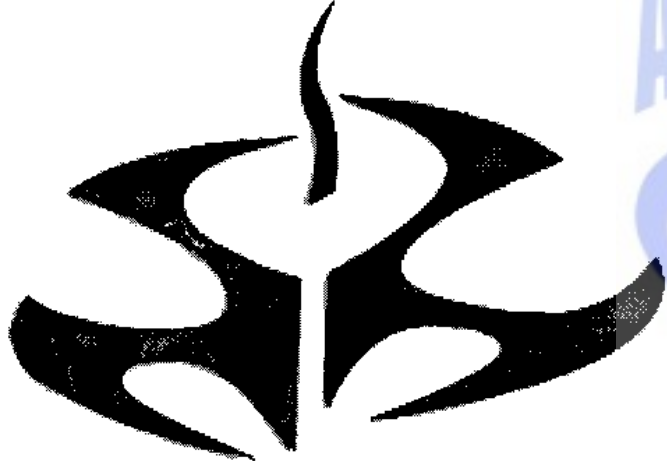
ڈال دیں۔ وہ شرربار اور خونخوار نظروں سے مجھے گھور رہا تھا جبکہ میری نگاہیں بھی نفرت کے شعلے برسا رہی تھیں ٹونی کی شکل میں گویا میرا ہمزاد میرے سامنے کھڑا تھا۔ جسمانی اور ظاہری طور پر ہم دونوں میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں تھا۔ عام طور پر وہ جیسا بھی لباس پہننے کا عادی ہو، لیکن ان دنوں چونکہ وہ یوسف کے روپ میں تھا۔ اس لیے دُنیا والوں کے سامنے خوش لباسی اور خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرنا اس کے لیے ضروری تھا۔ وہ قیمتی کپڑے کے بہترین سِلے ہوئے سوٹ میں ملبوس میرے سامنے کھڑا تھا۔ چند لمحے ہم دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے رہے لیکن پھر اس کی نظریں جُھک گئیں۔ مَیں زیرِ لب مسکرا کر بستر سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ کچھ سٹپٹا سا گیا تھا۔ اس نے گردن موڑ کر بالے اور ساتھیوں کو دیکھا اور بارُعب آواز میں بولا۔ "تم لوگ جاؤ۔ میں کچھ دیر یہاں ٹھہروں گا۔" وہ تینوں فوراً مودبانہ انداز میں رُخصت ہو گئے۔ ٹونی نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور میری طرف بڑھا۔

مَیں بدستور اپنی جگہ کھڑا محتاط انداز میں اسے دیکھتا رہا۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر وہ رُک گیا اور ہم دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو نگاہوں میں تولتے رہے۔ وہ خدا جانے کیا سوچ رہا تھا لیکن میرا ذہن اب پوری طرح بیدار تھا۔ اور نہایت تیزی سے مصروفِ عمل تھا۔ ظاہر ہے کہ نہ اس کے پاس مجھ سے کہنے کے لیے کچھ تھا اور نہ ہی میرے پاس اس سے بات کرنے کے لیے کوئی موضوع تھا۔ جب پہلی بار ریلوے سٹیشن سے اپنے گھر پہنچا تھا اور پولیس افسر کو اپنے ساتھ لے کر دوبارہ وہاں گیا تھا اس کے بعد یہ ہم دونوں کی پہلی ملاقات تھی۔ درمیان میں کئی دنوں کا ایک طویل فاصلہ تھا جن کے دوران میں مجھے شدید مصائب اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ وہ مجھے مصیبتوں کے سمندر میں دھکیل کر اطمینان اور سکون کے ساتھ میرے گھر میں بیٹھا ہوا تھا جبکہ مَیں دربدر کی خاک چھاننے اور اپنی زندگی کی حفاظت کے لیے خطرات سے نبرد آزما ہونے کے لیے اس وسیع و عریض دنیا میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس وقت جب کہ ہم دونوں یعنی اس کمرے میں ایک دوسرے کے روبرو تھے ہم دونوں کی حیثیت اور حالات میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ حالات پر اس کی

مکمل گرفت تھی۔ جب کہ میرے لیے تمام راستے مسدود اور تمام دروازے بند ہو چکے تھے۔ صرف پھانسی کے تختے اور جیل تک پہنچنے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس اعتبار سے وہ ایک مطمئن اور آسودہ شخص تھا جب کہ میں ایک مایوس و نامراد انسان تھا جس کے لیے انگریزی کا لفظ DESPERATE سب سے موزوں تھا۔ مَیں اس کو تک رہا تھا لیکن میرے ذہن کا کمپیوٹر برق رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ چند لمحوں کے اندر میرے ذہن نے کئی منصوبے سوچے اور پھر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی جس نے اُسے سخت اُلجھن میں ڈال دیا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید اس ملاقات کا فائدہ اُٹھا کر مَیں اس کے سامنے گڑگڑاؤں گا' معافی مانگوں گا۔ جاں بخشی کی التجائیں کروں گا اور اس کے عوض اسے مختلف لالچ دوں گا۔ یا پھر مشتعل اور غضبناک ہو کر اسے بُرا بھلا کہوں گا۔ گالیاں دوں گا۔ الزام دوں گا۔ لیکن میرا خوش مزاجی کا مظاہرہ اس کے لیے یکسر خلافِ توقع تھا۔ اس پر میرا یوں مسکرانا تو یقیناً اس کے لیے ناقابلِ یقین ہو گا۔ اس سے چند گز کے فاصلے پر میں رُک گیا۔ اب ہم دونوں ایک دوسرے کے مقابل تھے۔ اگر لباس کا فرق نہ ہوتا تو مجھے لگتا جیسے مَیں آئینے میں اپنا عکس دیکھ رہا ہوں۔ میرے چہرے کی مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی اور اس کی حیرت میں اضافہ ہو گیا۔ یہ میرے لیے بہترین موقعہ تھا جس سے مَیں نے فوری فائدہ اٹھایا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی پتلون کی جیبوں سے ہاتھ باہر نکالتا مَیں بلائے بے درماں کی طرح اُس پر ٹوٹ پڑا۔

میرا پہلا گھونسہ اس کے جبڑے پر لگا اور بیک وقت دوسرا گھونسہ اس کی پیشانی پر پڑا۔ وہ لوکھلا کر رہ گیا۔ وہ ایک مضبوط اور سخت جان آدمی تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ مدافعت یا جارحیت کے لیے کوئی حرکت کرتا اس کے چہرے پر گھونسوں کی بارش ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی میری دائیں ٹانگ حرکت میں آئی اور اس کے پیٹ پر لگنے والی ضرب نے اسے پیٹ پکڑ کر آگے کی طرف جھکنے پر مجبور کر دیا۔ ایک ماہر باکسر کی مانند میرے دونوں ہاتھ حرکت میں آگئے اور میرے گھونسے دائیں بائیں ناک اور پیشانی پر، کنپٹی اور جبڑے پر انتہائی تیز رفتاری اور بے رحمی سے برسنے لگے۔ اسے سنبھلنے اور سانس لینے کا موقع بھی نہ مل سکا اور اندازاً دو منٹ بعد وہ کوئی آواز نکالے بغیر میرے قدموں میں بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ میں نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں کسی قسم کی حرکت یا آواز نہیں تھی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ پہریدار اور محافظ احتراماً کمرے سے کچھ فاصلے پر کھڑے تھے اور کمرے کے اندر رونما ہونے والے واقعات سے بالکل بے خبر تھے۔ میں نے جھک کر اس کی سانس کی آمد و رفت اور دل کی حرکت کا جائزہ لیا اور پھر انتہائی تیزی سے اس کا لباس اتارنا شروع کر دیا۔ کچھ دیر بعد وہ میرے لباس میں اور میں اس کے لباس میں منتقل ہو چکا تھا۔ میں نے بڑے آرام سے اسے اٹھا کر بیڈ پر ڈال دیا اور جھک کر دوبارہ اس کا جائزہ لیا۔ فوجی تربیت کے دوران میں مجھے ہر قسم کے حالات سے نمٹنے کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ ٹونی کو بستر پر لٹانے کے بعد میں نے اس کی دونوں کنپٹیوں کو انگوٹھے اور انگشت شہادت کی مدد سے رگڑا اور اب مجھے پوری طرح اطمینان تھا کہ وہ کم از کم بارہ گھنٹے تک ہوش میں نہیں آئے گا۔ کمرے کا گہری نظروں سے جائزہ لینے کے بعد میں نے پتلون کی جیبوں میں دونوں ہاتھ ڈالے اور آہستہ قدموں سے چلتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ میرے اندازے کے عین مطابق بالے اور اس کے دونوں ساتھی برآمدے میں کافی فاصلے پر منتظر کھڑے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ باادب ہو گئے۔ میں نے سر کے اشارے سے ایک محافظ کو بلایا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے جاگر کو پستول کی گولیوں سے چھلنی کر دیا تھا اور میرے اندازے کے مطابق یہ ان تینوں میں سب سے زیادہ احمق تھا۔ وہ بھاگتا ہوا میرے پاس آیا۔

"دروازے کو لاک کر دو۔" میں نے اپنی قدرتی آواز میں حکم دیا جو بالکل ٹونی کی آواز سے مشابہ تھی۔ "جب تک میں خود نہ کہوں دروازہ مت کھولنا۔ نہ کسی کو اندر جانے دینا۔"

اس نے سر جھکا کر تعمیل کا وعدہ کیا اور تیزی سے کمرے کا قفل بند کر کے چابی اپنی جیب میں ڈال لی۔

"اب میں آرام کروں گا۔" میں نے بالے کو مخاطب کیا اور آگے قدم بڑھایا۔ وہ تیز قدمی سے مجھ سے آگے اور دوسرا مسلح پہریدار میرے پیچھے چلنے لگا۔ اگرچہ مجھ میں اور ٹونی میں صد درجہ مشابہت تھی اور ہم دونوں کے درمیان تمیز کرنا ہر ایک کے لیے مشکل تھا لیکن آسانی یہ تھی کہ ان لوگوں نے ٹونی سمجھ کر مجھے ایک بار بھی نظر بھر کر دیکھنے کی جرأت نہیں کی تھی۔ اس لیے اس بات کا قطعی امکان نہیں تھا کہ وہ میری اصلیت جان سکیں گے۔

مختلف برآمدوں اور گیلریوں سے گزرتا ہوا بالے ایک کمرے کے دروازے کے سامنے رک گیا جو ظاہر ہے کہ ٹونی کے بیڈروم کا دروازہ تھا۔ اس نے بڑے ادب کے ساتھ دروازہ کھولا اور ایک جانب ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ میں خاموشی سے کمرے میں داخل ہوا مگر پھر پلٹ کر میں نے بالے اور اس کے ساتھی پر ایک سرسری نظر ڈالی اور کہا۔ "تم لوگ جا سکتے ہو۔"

یہ کہہ کر میں نے کمرے کے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔ ان کے قدموں کی چاپ مجھے سنائی دیتی رہی اور پھر غائب ہو گئی۔ میں نے اطمینان کا ایک لمبا سانس لیا اور اپنے نئے قفس کا جائزہ لینے لگا۔ یہ ایک انتہائی پُر آسائش اور مغربی انداز میں خوبصورتی سے سجا ہوا کشادہ کمرہ تھا جو جدید ترین فرنیچر سے آراستہ تھا۔ ہر طرف قیمتی

ساز و سامان کی فراوانی تھی۔ ایک جانب مختصر لیکن خوبصورت کاؤنٹر تھا۔ میں نے پاس جا کر جوں ہی اس کی سطح پر ہاتھ رکھا۔ سامنے والی دیوار میں ایک الماری نمودار ہو گئی جو بیش قیمت اور انتہائی نایاب شراب کی بوتلوں سے بھری ہوئی تھی۔ ابھی میں بوتلوں کو پوری طرح دیکھ بھی نہیں پایا تھا کہ سامنے ہی کی دیوار میں ایک ڈیڑھ فٹ چوڑا دروازہ نمودار ہوا اور اس میں سے ایک انتہائی حسین اور طرحدار لڑکی مسکراتی ہوئی کاؤنٹر پر آگئی وہ نیم عریاں مغربی لباس پہنے ہوئے تھی جیسا کہ عام طور پر یورپ کے شراب خانوں میں بار گرلز پہنا کرتی ہیں۔ اس کے ترشے ہوئے بال اس کے شانوں پر لہرا رہے تھے اور اس کے ہونٹوں پر ایک دلآویز مسکراہٹ رقصاں تھی۔

"یس باس؟" وہ ایک ادا سے مسکرائی اور سر جھٹک کر مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "کون سی ڈرنک پسند کریں گے؟"

میں ابھی تک سحر زدہ انداز میں یہ طلسمی واقعات دیکھ کر مبہوت کھڑا تھا۔ اس کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے یوں ظاہر کیا جیسے میں کسی سوچ میں گم تھا۔ "کچھ نہیں۔" میں نے مختصر جواب دیا۔ "موڈ نہیں ہے۔" یہ کہہ کر میں نے بار کی طرف سے پلٹ کر کمرے کے وسط میں رکھے ہوئے قیمتی صوفہ سیٹ کی جانب دیکھا۔ کمرے کے شمالی جانب ایک انتہائی کشادہ اور مخملیں بیڈ لگا ہوا تھا جس کی دونوں جانب سائیڈ ٹیبلوں پر خوبصورت گلدانوں میں رنگین اور خوشبودار پھول سجے ہوئے تھے۔ میں غیر ارادی طور پر بیڈ کی طرف بڑھ گیا اور اس کے سرہانے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔ ساقی گری کا فرض سرانجام دینے والی لڑکی اب بار کے پیچھے سے نکل آئی تھی اور ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ سجائے میری طرف بڑھ رہی تھی۔

"باس۔ آج آپ کچھ اپ سیٹ ہیں؟" وہ لگاوٹ کے ساتھ مسکرائی اور میرے نزدیک آگئی۔ اس کے عقب میں چمکنے والی تیز روشنیوں کے پس منظر میں اس کا متناسب اور صحت مند جسم ایک رنگین اور دلکش ہیولے کا منظر پیش کر رہا تھا۔ مجھے ابھی بہت کچھ سوچنا اور کرنا تھا۔ یہ درست ہے کہ میں وقتی طور پر ٹونی پر قابو پانے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن اگلا قدم کیا ہوگا؟ اور کیا میں اس زنداں سے باہر نکلنے میں کامیاب بھی ہو سکوں گا یا نہیں؟ یہ بذات خود میرے لیے ایک پریشان کن اور قابل غور مسئلہ تھا جس پر غور و خوض کرنے کے لیے مجھے مکمل تنہائی اور یکسوئی کی ضرورت تھی۔ لیکن یہ بن بلائی مہمان کسی کوہ قاف کی طلسماتی پری کی طرح اچانک نمودار ہو کر میرے لیے پریشانی کا سبب بن گئی تھی۔ میں یہ اندازہ کرنے سے قاصر تھا کہ ٹونی ذاتی زندگی میں اور خصوصاً فرصت کے اوقات میں کس قسم کے مزاج اور عادات و اطوار کا مظاہرہ کرتا تھا اور کہیں کوئی غلط بات یا غلط رویہ میری اصلیت کا بھانڈا تو نہیں پھوڑ دے گا؟ یہی وجہ ہے کہ میں موجودہ صورت حال کی ناپسندیدگی کے باوجود اسے برداشت کرنے پر مجبور تھا۔

اتنی دیر میں وہ ہوش رُبا دوشیزہ تیک رفتاری سے چلتی ہوئی میرے بالکل نزدیک پہنچ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس نے جھک کر سائیڈ ٹیبل پر لگا ہوا ایک بٹن دبایا اور کمرے میں مدھم مغربی موسیقی کی لہریں پھیل گئیں۔ ہلکی ہلکی طرب آمیز موسیقی نے ماحول کو ایک دم خوشگوار اور خواب آلودہ بنا دیا تھا۔ اب وہ مخمور نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ غالباً شراب کی کمی وہ اپنی آنکھوں کے خمار سے پوری کرنے کی خواہش مند تھی۔ اس کے نیم وا لبوں پر اس وقت بھی مسکراہٹ تھی، اس کے سرخ کھلتے ہوئے ہونٹوں کے درمیان میں اس کے سفید اور ہموار دانت موتیوں کی طرح چمکتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ وہ بیڈ پر میری جانب جھکی پیار بھرے انداز میں دیکھ رہی تھی۔

خدایا۔ کس مصیبت میں گرفتار ہو گیا؟ میں ایک دم بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا اور وہ فوراً پیچھے ہٹ گئی۔ اس کے

چہرے کی مسکراہٹ غائب ہوگئی اور اب وہ پریشان اور خوفزدہ نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی ۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ بطور ٹونی میری ذراسی بھی برہمی یا بدمزاجی برداشت نہیں کرسکتی تھی ۔ میں دل ہی دل میں مسکرایا اور سرد لہجے میں کہا ۔ "کیا تم مجھے تنہا نہیں چھوڑ سکتیں ؟!" میرے لہجے کا چڑچڑا پن اور آواز کی تلخی اسے مرعوب کرنے کے لیے کافی تھی ۔ وہ جھٹک سے دو قدم پیچھے ہٹ کر کھڑی ہوگئی ۔

"اوکے باس ! جیسے آپ کی مرضی !" اس نے انگریزی میں جواب دیا اور پھر مجھے تعظیم دے کر لہراتی، بل کھاتی ہوئی اسی طرف چلی گئی جدھر سے آئی تھی ۔ میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا ۔ وہ بار کے پیچھے گئی اور پھر اسی تنگ دروازے میں غائب ہوگئی جس میں سے نکل کر آئی تھی ۔ دوسرے ہی لمحے وہ دروازہ بھی خود بخود بند ہوگیا اور سامنے والی دیوار بالکل برابر ہوگئی ۔ یہ دراصل لکڑی کا پردہ تھا اور کیونکہ کمرے کی تمام دیواریں لکڑی کی تھیں اس لیے یہ اندازہ لگانا دشوار تھا کہ اس کے پیچھے کوئی دروازہ یا الماری بھی ہوسکتی ہے ۔ دوسرے ہی لمحے بار کے عقب والی دیوار بھی خود بخود حرکت میں آگئی اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے نوع بہ نوع شرابوں کی بوتلوں سے بھری ہوئی الماری نگاہوں سے اوجھل ہوگئی ۔

اب میں پھر ٹونی کے اس طلسم کدے میں تنہا بیٹھا اپنے مستقبل اور فرار کے بارے میں سوچ رہا تھا ۔ ٹونی دوسرے کمرے میں بیہوش پڑا ہوا تھا اور مکمل اس کی جگہ موجود تھا لیکن ہر طرف سے دشمنوں کے نرغے میں گھرا ہوا ۔ میری معمولی سی غلطی بھی سارے کئے کرائے پر پانی پھیر سکتی تھی ۔ میں نے وقتی طور پر ٹونی کو زیر کرلیا تھا لیکن ابھی تک میں اس کے قبضے میں تھا ۔ ہر قدم پر جال پھیلے ہوئے تھے اور مجھے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے ابھی خدا جانے آگ اور خون کے کتنے دریا پار کرنے تھے ؟ اس جگہ پر ایک ایک پل میرے لیے قیامت سے کم نہ تھا ہر قدم انتہائی سوچ بچار اور غور و فکر کے بعد اٹھانا ضروری تھا ۔ ایک معمولی سی کوتاہی بھی مجھے موت کے منہ میں پہنچا سکتی تھی ۔ فی الحال سب سے اولین مسئلہ یہ تھا کہ ٹونی کے ہوش میں آنے سے پہلے کیونکر باہر جانے کی کوشش کی جائے ؟ یہ تو مجھے اندازہ ہوچکا تھا کہ یہاں ہر شخص ٹونی کا غلام اور اس کے اشاروں پر رقصاں تھا ۔ لیکن مجھے یہ قطعی علم نہ تھا کہ ٹونی ان لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کرتا تھا اور مختلف موقعوں پر اس کا رویہ کیا ہوتا تھا ۔ اس میں بھی کوئی شک نہ تھا کہ یہ سب انتہائی چالاک اور جاں نثار لوگ تھے اور میری بہتری اور سلامتی اسی میں تھی کہ انھیں مجھ پر مطلق شک نہ ہونے پائے ۔

ان ہی سوچوں میں گم میں نے دوبارہ بیڈ کے آرام دہ سرہانے سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کرلیں ۔ ماحول انتہائی خواب آگیں اور پُرسکون تھا لیکن اطمینان اور سکون مجھ سے کوسوں دور تھا اور میرے ذہن میں حد درجہ انتشار اور بے سکونی تھی ۔ میرے لیے سب سے بڑی پرابلم جالاں تھی ۔ وہ انتہائی چالاک اور مکار عورت تھی اور مجھ پر اس کی خوبیاں رفتہ رفتہ ظاہر ہو رہی تھیں ۔ جالاں کے ہوتے ہوئے میں ایک لمحے بھی غافل نہیں رہ سکتا تھا ۔ پھر مجھے اب تک یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ جالاں کی موجودگی کے بارے میں ٹونی کو اطلاع دی جاچکی ہے یا نہیں اور کیا جالاں اور ٹونی کی کوئی ملاقات بھی ہوچکی ہے یا نہیں ؟

دروازے پر آہستہ سے دستک ہوئی اور میں چونک کر بیٹھ گیا ۔ مگر پھر میں نے اپنے آپ کو ٹونی ہونے کا یقین دلایا اور دوبارہ بستر سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہوگیا ۔

"کون ہے ؟" میں نے بلند آواز سے کہا ۔ "اندر آؤ ۔"

دروازہ آہستگی سے کھلا اور ایک دمکتا ہوا چہرہ اور مہکتا ہوا وجود سامنے دیکھ کر میں غیرارادی طور پر بستر سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا ۔ دروازے میں جالاں کھڑی تھی لیکن کس عالم میں ؟ وہ اس وقت مکمل میک اپ کے ہوئے

تھی ۔ اس کا چہرہ حسن و جمال کی تصویر بنا ہوا میری نگاہوں کے سامنے تھا ۔ وہ ایک دلآویز سُرخ لباس میں ملبوس تھی ۔ جسے شب خوابی اور مغربی لباس کے بین بین کوئی نام دیا جاسکتا ہے ۔ اس کی پتلی کمر ایک سیاہ ریشمی پیٹی کی وجہ سے اور بھی پتلی نظر آرہی تھی اور وہ سراپا جمال تھی ۔ اس کی زلفیں اس کے چہرے کو گھیرے میں لیے ہوئے تھیں ۔ اس کے ہاتھ میں ایک گلدستہ تھا اور اس کا جسم انتہائی مدہوش کن خوشبو سے مہک رہا تھا ۔ کمرے میں اس کے قدم رنجہ ہوتے ہی خوشبو کا سیلاب سا آگیا اور یوں لگا جیسے چپکے سے بہار آگئی ہو ۔

اس نے سُرمگیں انداز میں مجھے دیکھا اور گردن کو ایک جانب موڑ کر شیریں آواز میں کہا "اجازت ہے ؟"

میں نے بوکھلا کر بے ساختہ کہا "کیوں نہیں ؟"

وہ مسکرائی اور اپنے لباس کو دونوں ہاتھوں سے سنبھالتی ہوئی نہایت دلکش چال سے میری طرف بڑھی ۔ میں اس کے بدلے ہوئے حسین رُوپ سے زیادہ اس بات سے حیران تھا کہ کیا یہ وہی لڑکی ہے جسے میں نے ایک دُور دراز دیہاتی علاقے کے ریسٹ ہاؤس میں ایک خالص دیہاتی لڑکی کے رُوپ میں دیکھا تھا اور اسے چوکیدار کی بے زبان اور بھولی بھالی بیوی خیال کیا تھا ۔ یوں تو جالاں کے مختلف بدلے ہوئے رُوپ پچھلے دنوں میری نگاہوں سے گزر چکے تھے لیکن اس کا یہ تازہ ترین بہروپ انتہائی خیرہ کن تھا ۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کوئی عورت اتنے بہت سے بہروپ اتنی کامیابی اور مہارت کے ساتھ بدل سکتی ہے ۔

اس اثنا میں وہ خوشبو کے جھونکوں کی طرح میرے نزدیک پہنچ چکی تھی ۔ اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور ایک شوخ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوگئی ۔ وہ بولی ۔ "کتنا سہانا اور سُندر سماں ہے ۔ یوں لگتا ہے جیسے میں خوابوں کی دنیا میں آگئی ہوں ۔"

میں اتنی دیر میں سنبھل چکا تھا ۔ میں نے متبسم کے ساتھ کہا ۔ "اس خواب کی دُنیا میں جو کمی تھی وہ اب تمہارے آنے سے پوری ہوگئی ہے ۔"

وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی اور اس کی مترنم آواز نے مجھے ایک بار پھر حیرت زدہ کردیا ۔ وہ لگاوٹ، دلکشی کا نمونہ بنی ہوئی تھی اور اس کی اداکاری اس قدر مکمل اور ماہرانہ تھی کہ کوئی بھی اس کی رعنائیوں کے بھرپور وار سے محفوظ نہیں رہ سکتا تھا ۔

وہ میرے نزدیک پہنچ کر رُک گئی اور میرے سراپا پر ایک نظر ڈالنے کے بعد بولی ۔ "کاش میں تم سے پہلے ملی ہوتی ۔" اس نے ایک آہ بھری اور اس کے چہرے پر ایسا تاثر پیدا ہوا جیسے اس کو واقعی اس بات کا شدید احساس ہے ۔

"پہلے ملتیں تو کیا ہوتا ؟" میں نے گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لیا ۔

"ہوتا کیا ؟" وہ بل کھا کر بیڈ پر بیٹھ گئی ۔ "میں کبھی تمہیں کسی اور عورت کا نہ بننے دیتی ۔ چاہے اس کے لیے مجھے کچھ بھی کیوں نہ کرنا پڑتا ۔"

میں خاموش رہا ۔

"مگر اب بھی کیا فرق پڑا ہے ؟" وہ پھر مسکرانے لگی ۔ "روزی تمہاری سچ مچ کی بیوی تو نہیں ہے ۔" وہ یہ کہکر بڑی لگاوٹ کے انداز میں مجھے دیکھنے لگی ۔ اس وقت اس کی اداکاری ایسی غضب کی تھی کہ اسے ہالی ووڈ کی صف اوّل کی اداکارہ کے مقابلے میں پیش کیا جاسکتا تھا ۔ سانپ کی طرح لچکیلی بدن یہ زہریلی ناگن مختلف انداز میں اپنے رُوپ دکھا رہی تھی اور سچ تو یہ ہے کہ اس کا ہر انداز مکمل اور انوکھا تھا ۔ میں دل ہی دل میں اس کی اداکاری اور ہُنرمندی پر عش عش کرنے لگا ۔

"میرے بارے میں تو باسے نے تمہیں سب کچھ بتا ہی دیا ہوگا۔ یا میں خود اپنی زبان سے بتاؤں؟" وہ میرے اور نزدیک کھسک آئی۔ "مگر اپنے منہ میاں مٹھو بننا مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا۔"

"بولتی تو مٹھو ہی کی طرح ہو۔" میں نے اسے چھیڑا۔ رفتہ رفتہ میرا اعتماد بحال ہوتا جا رہا تھا۔ وہ جو کچھ بھی تھی میں اس کی اصلیت سے پوری طرح واقف ہو چکا تھا اور اب یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ مجھے اپنے دام میں لا سکتی۔

"کوئل کہدیتے تو کیا فرق پڑ جاتا؟" وہ لاڈ سے اِٹھلائی۔

"فرق تو بہت ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "کہاں کالی کوئل اور کہاں تم، بالکل سیب کی طرح سُرخ و سفید۔ ایسی گوری چٹی کوئل تو میں نے کبھی نہیں دیکھی۔"

"ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے؟" وہ بڑے ناز بھرے لہجے میں مسکرائی۔ "مجھے غور سے دیکھو گے تو سب کو بھول جاؤ گے۔" اس کی آواز سرگوشی کے انداز میں میرے کانوں میں لہرائی۔

وہ جوں جوں باتیں کرتی جا رہی تھی ہم دونوں کے درمیان فاصلہ سمٹتا جا رہا تھا اور مدہوش کر دینے والی خوشبو مشامِ جاں کو معطر کئے دے رہی تھی۔ یہ جالاں کا بالکل انوکھا رُوپ تھا۔ صنفِ مخالف کو لبھانے کے فن میں وہ اتنی کامل ہوگی یہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کی مہربانیاں بڑھتی جا رہی تھیں اور آواز سرگوشی بن چکی تھی۔ لیکن میں اس وقت اس خوبصورت بلا سے چھٹکارا حاصل کرنے کا خواہش مند تھا۔ میرے پاس وقت کم تھا۔ صرف آج کی رات درمیان میں تھی۔ اس کے بعد میری اصلیت کا راز فاش ہو جانے والا تھا۔ ویسے جہاں تک اس کی رعنائی اور لبھانے کا تعلق تھا اس کی ہر ادا اس کے خلاف میری نفرت میں اضافہ کر رہی تھی۔ اگر میرا بس چلتا تو میں اس کا گلا گھونٹ دیتا لیکن حالات کی وجہ سے مجبور تھا اس سے پہلے کہ ہمارے درمیان تمام فاصلے مٹ جاتے یکایک ٹیلی فون کی مترنم اور موسیقی بار گھنٹی نے ہم دونوں کو چونکا دیا۔ خوبصورت سنہری ٹیلی فون بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اُٹھا کر اپنے کان سے لگا لیا۔ "یس؟" دوسری طرف جو آواز سنائی دی اسے سُن کر ریسیور میرے ہاتھ سے چھُٹ کر نیچے گرتے گرتے رہ گیا۔

ریسیور کے دوسرے سرے پر روزی کی جانی پہچانی آواز میرے کانوں میں رس گھول رہی تھی۔ اس آواز کی مٹھاس اور دلکشی میں آج تک نہیں بھُلا سکا تھا۔

"ہیلو ڈارلنگ!" وہ بڑے دُلار سے کہہ رہی تھی۔

"اتنی دیر بعد واپس لوٹے ہو اور فوراً ہی بزنس کے لیے چلے گئے۔ حالانکہ جانتے ہو کہ تمہارے بغیر میرا ایک ایک پل کتنی مشکل سے کٹتا ہے؟!"

میں ساکت اس کی آواز سُن رہا تھا۔

"ہیلو ہیلو۔ بولتے کیوں نہیں؟"

"ہاں ہاں۔ سُن رہا ہوں۔"

"ڈارلنگ۔ میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں جو بھی کام کر رہے ہو چھوڑ کر ابھی آ جاؤ۔"

"لیکن روزی۔ میں......"

"بس۔ میں کچھ نہیں سُنوں گی۔" اس نے پیار بھرے لہجے میں ڈانٹا۔ "فوراً۔ اسی وقت اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ۔ میں تمہیں باہر منتظر ملوں گی۔ اوکے۔ بائی۔" اس نے فون بند کر دیا۔ وہ نرم آواز میں بول رہی تھی لیکن اس کے باوجود اس کی آواز جالاں کے کانوں تک پہنچ گئی تھی۔ وہ زبان سے تو کچھ نہیں بولی تھی لیکن اس کے چہرے کی مسکراہٹ اور نرمی غائب ہو چکی تھی اور وہ خشمگیں نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میرا جسم سُن ہونے لگا اور دماغ

میں آندھیاں سی چلنی شروع ہو گئیں۔

"سوری۔" میں نے سرد نگاہوں سے اسے دیکھا۔ "تم سے پھر ملاقات ہوگی مگر ذرا اطمینان اور فرصت کے ساتھ۔" میرے آخری جملے پر وہ تلملا کر رہ گئی۔ اس وقت میرے یوں چلے جانے کو وہ اپنی ذاتی توہین سمجھ رہی تھی۔ میں نے دروازے کی طرف قدم بڑھایا۔ پلٹ کر دیکھا تو وہ ابھی تک بیڈ پر نیم دراز مجھے خاموشی سے دیکھ رہی تھی۔ میرے دروازہ کھولتے ہی ایک محافظ اندھیرے میں سے نمودار ہو گیا۔ "گاڑی منگاؤ۔" میں نے مختصر طور پر کہا۔ "مجھے اسی وقت گھر جانا ہے۔"

وہ تیز تیز قدموں سے میرے آگے آگے چلنے لگا۔

نیم تاریک پورچ میں سیاہ مرسڈیز کار کھڑی تھی۔ میں کار کی طرف بڑھا تو دوسری جانب سے ایک وردی پوش شوفر بھاگتا ہوا آیا اور کار کا پچھلا دروازہ کھولنے کے لیے بڑھا لیکن میں نے ہاتھ کے اشارے سے اس کو روک دیا۔ "میں خود کار چلاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "تم یہیں ٹھہرو۔" وہ اپنی جگہ منجمد ہو کر رہ گیا۔

میں نے سٹیرنگ سنبھالا تو عقب سے ایک جیپ آکر میری کار کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ جیپ میں بابے اور اس کے تین مسلح ساتھی سوار تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ میرے ساتھ جانے کے لیے کمربستہ تھے۔ لیکن میں نے انھیں بھی منع کر دیا۔ "تم لوگوں کی ضرورت نہیں ہے۔"

کار سٹارٹ کر کے میں طویل ڈرائیو وے پر چل پڑا۔ جب کار بڑے گیٹ سے باہر نکلی تو مسلح چوکیدار نے بڑے زبردست سلیوٹ کے ساتھ مجھے رخصت کیا۔ میں نے کار کی رفتار آہستہ آہستہ بڑھانی شروع کر دی۔ بیک ویو میرر میں دیکھا تو دور دور تک میرے پیچھے کسی کار کی روشنی نہیں تھی۔ میں خوشی میں جھوم اٹھا۔ اتنے مشکل مقام سے فرار اس قدر آسان ہوگا؟ میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اپنی خوش قسمتی اور خدا کی مہربانی پر میں جتنا بھی خوشی کا اظہار کرتا کم تھا۔ اب میں آزاد تھا۔ پرندے کی طرح آزاد اور اپنی مرضی کا مالک۔ میرا سب سے بڑا دشمن ایک کمرے میں بیہوش پڑا ہوا تھا اور کم از کم دن چڑھے تک اُن لوگوں کے لیے میرے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنا دشوار تھا۔ اور پھر میرے فرار کا بہانہ بھی روزی کا فون بنا تھا جو مجھے موجودہ حالت تک پہنچانے کی ذمہ دار تھی۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر ریکارڈ پلیئر آن کرنا چاہا لیکن یکایک ایک ٹھنڈی سی سخت چیز میری گردن سے ٹکرائی اور ایک زنانہ آواز نے مجھے بڑی نرمی سے مخاطب کیا: "کار آہستہ کرو اور جس طرف میں کہوں چلتے رہو۔ ورنہ میرے پستول میں چھ گولیاں موجود ہیں اور میرا نشانہ اتنے کم فاصلے سے کبھی خطا نہیں ہوتا۔"

یہ ملائم اور میٹھی آواز ایک تازیانے کی طرح مجھے گھائل کر گئی۔ لہجے کی سختی اور شدت سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اگر کہنے کے مطابق عمل نہ کیا تو میری مخاطب اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنانے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ سے کام نہیں لے گی۔

میں نے نظریں اٹھا کر بیک ویو میرر میں دیکھا۔ کتابی چہرہ، سیاہ چمکیلے بالوں اور چمکیلی سیاہ آنکھوں والی ایک گندمی رنگ کی لڑکی مجھے گھور رہی تھی۔ پستول پر اس کی گرفت مضبوط تھی اور اس کی گرم سانسیں میری گردن سے ٹکرا رہی تھیں۔

میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"تم کون ہو؟" میں نے سٹیرنگ پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا چاہتی ہو؟"

اس کے چہرے پر ایک طنز آمیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "تم مجھے نہیں جانتے؟ اب مجھے اپنی پہچان بھی کرانی پڑے گی؟"

میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اس لیے تیزی سے اپنے ذہن میں حافظے کے ورق الٹنے لگا مگر خاصی تلاش کے باوجود میں اس کی ذات اور چہرے سے ناآشنا ہی رہا۔

"اگلے چوراہے سے گاڑی بائیں جانب موڑ لو۔" اس نے بڑے ترش لہجے میں مجھے ہدایت دی۔ میرے لیے اس کے حکم کی تعمیل کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ چند لمحے بعد کار کا رُخ بائیں جانب ہو گیا۔ یہ ایک نیم پختہ سڑک تھی اور گزشتہ رات کی شدید بارش کی وجہ سے اس کی حالت اور زیادہ خراب ہو چکی تھی۔ جگہ جگہ گڑھوں میں پانی اکٹھا ہو گیا تھا جو کار کی تیز رفتاری کے باعث بڑی تیزی سے دونوں طرف فواروں کی شکل میں پھیل جاتا تھا۔ اس سڑک پر روشنی کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ فقط کار کی روشنیوں کے سہارے میں ڈرائیونگ کرنے پر مجبور تھا۔ ویسے بھی یہ سڑک میرے لیے اجنبی اور بالکل نئی تھی۔ اس کے دونوں اطراف بڑے بڑے گھنے سایہ دار درخت تھے۔ شاید دن کی روشنی میں اس سڑک پر سفر کرنا خوشگوار ہوتا ہوگا، لیکن تاریکی میں پانی سے لبریز اس کچی سڑک پر کار چلانا میرے لیے ایک تکلیف دہ تجربہ تھا۔ سڑک پر روشنی نہ ہونے کی وجہ سے اب کار کے اندر بھی تاریکی چھا چکی تھی اور اس لڑکی کا چہرہ میں شیشے میں بھی نہیں دیکھ سکتا تھا، لیکن پستول کی سرد نالی اور اس کی سانسوں کی آمد و رفت مجھے یہ احساس دلا رہی تھی کہ وہ میری طرف سے ذرا بھی غافل نہیں ہے۔

ہم کچھ دیر خاموشی سے سفر کرتے رہے پھر اچانک کار کی چھت پر بجلی ہوا روشنی "کڑاک" کی آواز سے جل اٹھی بیک ویو مرر میں اس کا غصے سے تنا چہرہ اب پھر میں بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ اپنے جذبات اور غصے پر قابو پانے کی کوشش میں بار بار اپنے ہونٹ کو دانتوں میں دبا رہی ہے۔

میں نے اسے باتوں میں لگانے کی کوشش کی۔ "تم نے بتایا نہیں کہ تم کون ہو؟"

"خاموش رہو۔" وہ غصے بھری آواز میں چلائی۔ "ورنہ پچھتاؤ گے۔ میں اب تمہاری باتوں میں نہیں آؤں گی۔ نہ اب تم مجھے چالاکی سے کوئی نیا فریب دے سکو گے۔"

"میں نے تمہیں کبھی فریب نہیں دیا۔"

"تو پھر وہ شادی کے وعدے اور محبت کی قسمیں کیا تھیں؟"

میں بے ساختہ ہنس پڑا۔ "کاش تم مجھے پہلے ملی ہوتیں تو واقعی میں تم سے شادی کا وعدہ ضرور کر لیتا۔ کون بدذوق انسان ہوگا جو تم جیسی لڑکی سے شادی کرنے کا وعدہ کر کے مکر جائے گا؟"

وہ خاموش اپنے ہونٹ چباتی رہی۔

میں نے گاڑی کی رفتار اور تیز کر دی اب اچانک بارش بھی ہونے لگی تھی جس کی وجہ سے مجھے ڈرائیونگ میں خاصی دقت پیش آ رہی تھی، لیکن پھر بھی میں اس انجانے اور تاریک راستے کو جلد سے جلد طے کرنا چاہتا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس کے اختتام پر میں کہاں پہنچوں گا؟ لیکن فی الحال میرے حق میں بہتر یہی تھا کہ کسی اچھی اور مناسب سڑک پر پہنچ جاؤں۔ لیکن حالات ساز گار نہیں تھے۔ بارش کی تیزی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور کچی سڑک پر موجود پانی کی مقدار میں بھی مزید اضافہ ہو رہا تھا۔

"یہ سڑک اس موسم میں رات کو سفر کرنے کے لیے مناسب نہیں ہے۔" میں نے اسے پھر باتوں میں لگانے کی کوشش کی۔ "میرا خیال ہے کہ ہمیں کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔"

"زیادہ چالاک بننے کی کوشش مت کرو۔" وہ ڈانٹ کر بولی۔ "تم خوب اچھی طرح جانتے ہو کہ میں تمہیں کہاں لے جا رہی ہوں۔"

میں نے معصومیت سے کہا۔ "یہی تو میں پوچھنا چاہتا ہوں۔" یکایک کار سامنے ایک گڑھے میں سے گزری اور پانی

اُچھل کر چاروں طرف پھیل ۔پانی کا ایک ریلا ونڈسکرین پر بھی آیا اور وقتی طور پر سامنے نظر آنا بند ہوگیا۔ میں نے کار روک دی اور وائپر پورے کھول دیئے۔ میری نگاہوں کے سامنے سڑک پانی میں ڈوبی ہوئی تھی اور مزید بارش کا پانی اس میں اضافہ کر رہا تھا۔

"گاڑی کیوں روک دی۔ آگے چلو" اس نے پستول کی ناک میری گردن میں چبھو دی۔

"دیکھتی نہیں ہو۔ سامنے کیا حال ہے۔ ہوسکتا ہے آگے پانی اور زیادہ ہو اور ہم گاڑی سمیت اندھیرے جنگل میں کہیں پھنس کر رہ جائیں۔"

وہ خود بھی فکرمندی سے سامنے دیکھ رہی تھی اور اس کشمکش میں تھی کہ آیا مجھے سفر جاری رکھنے پر مجبور کرے یا کار موڑ کر واپس لے جانے کی ہدایت دے؟

ہماری یہ مشکل دفعتاً بائیں جانب سے نمودار ہونے والے ایک شخص نے آسان کر دی۔ وہ ایک برساتی نما لمبا کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں بندوق تھی اور دوسرے ہاتھ میں اس نے ایک ٹارچ تھام رکھی تھی۔ وہ ہماری کار کی جانب تیزی سے بڑھا آرہا تھا۔ اس نے ٹارچ روشن کی تو ہماری آنکھیں چکاچوند ہوگئیں۔ لڑکی نے بے اختیار اپنا پستول میری گردن پر سے ہٹا لیا۔ میرے لیے فوری طور پر یہ فیصلہ کرنا دشوار تھا کہ میں کار کو تیزی سے آگے بڑھا کر لے جاؤں یا اس نئی مصیبت کا انتظار کروں۔ اتنی دیر میں وہ شخص لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا کار کے نزدیک پہنچ گیا۔ اس نے اپنی ٹارچ بجھا دی اور کار کے اندر کی روشنی میں ہم دونوں کا جائزہ لینے کے لیے گردن آگے بڑھائی۔ اس کا بندوق والا ہاتھ اوپر اٹھا اور اس نے ہمیں زد میں لے لیا۔

"کون ہو صاحب؟" اس نے کرخت اور اکھڑ آواز میں سوال کیا۔ مگر اس کی حیران نگاہیں مجھ سے پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی لڑکی کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔ جو پیچھے کی جانب کھسک کر بیٹھ گئی تھی۔

میں نے اپنی آواز اور ہوش و حواس کو قابو میں رکھتے ہوئے کہا۔ "بھائی یہ سڑک تو بہت خراب ہے۔ کیا آگے جا کر راستہ صاف ملے گا؟"

"آگے تو یہ اور بھی خراب ہے صاحب۔ اُدھر نہر کا پُل بھی ٹوٹ گیا ہے اور پانی چاروں طرف پھیل گیا ہے۔ آپ کدھر جائیں گے؟"

"مگر تم کون ہو۔" لڑکی نے بارعب آواز میں پوچھا۔ "اور اس وقت یہاں کیوں گھوم رہے ہو؟"

وہ مسکرایا اور بولا۔ "ارے صاحب ہم تو چوکیدار ہیں ڈاک بنگلے کے۔ اِدھر سے جانے والوں کو خبردار کرتے ہیں۔ آگے جا کر تو آپ کی گاڑی پانی میں ڈوب جائے گی اور وہاں کوئی مدد کرنے والا بھی نہیں ملے گا۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔" میں نے موقعے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ "ہم واپس چلتے ہیں۔"

"بالکل نہیں" لڑکی تیز آواز میں بولی۔ "ہم واپس نہیں جائیں گے۔"

"تو پھر۔ کیا آگے جا کر پانی میں ڈوب جائیں؟"

"ڈاک بنگلہ یہاں سے کتنی دور ہے؟" لڑکی نے مجھے نظرانداز کر کے چوکیدار سے سوال کیا۔

"زیادہ دوری پر نہیں ہے بیگم صاحب آپ بولیں تو ہم لے چلیں آپ کو وہاں؟"

"ٹھیک ہے۔" لڑکی نے فوراً فیصلہ سنا دیا۔ "ہم ڈاک بنگلے چلیں گے۔ تم ہمیں راستہ دکھا دو۔"

"میرے پیچھے آجائیں صاحب۔" اس نے اپنی برساتی کی ٹوپی پر سے بہتے ہوئے پانی کو صاف کرتے ہوئے کہا اور مڑ کر ہمارے آگے آگے چلنے لگا۔

میں نے ایک لمحہ تذبذب کیا تو پستول کی نالی دوبارہ میری گردن کو چھونے لگی۔ "دیر مت کرو۔ سیدھی طرح ڈاک

بنگلے چلو۔"

میرے جی میں تو آئی کہ ایک تھپڑ مار کر اس کے ہاتھ سے پستول چھین لوں مگر پھر ارادہ بدل دیا۔ خاموشی سے گاڑی کو تھوڑا پیچھے کر کے میں نے اس کا رُخ اس طرف موڑ دیا جس طرف چوکیدار تیز تیز قدموں سے جا رہا تھا۔ اس طرف کوئی سڑک نہیں تھی۔ لیکن زمین کی سطح سڑک سے اونچی تھی۔ اس لیے پانی بھی کم تھا۔ کچھ فاصلے پر ڈاک بنگلے کا ہیولا بھی نظر آنے لگا تھا جس پر اس سے پہلے ہماری نظر ہی نہیں پڑی تھی۔ راستے میں جابجا پانی تھا جس کی وجہ سے کار کی رفتار کافی ہلکی کرنی پڑی مگر کچھ دیر بعد ہم ڈاک بنگلے کی عمارت تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ یہ ایک پرانی سی عمارت تھی جس کے آگے کھپریلوں کا ایک برآمدہ تھا۔ ڈاک بنگلے کے سامنے ایک اور گاڑی بھی کھڑی ہوئی تھی۔ چوکیدار جو ہماری راہنمائی کرتا ہوا ہم سے پہلے ہی برآمدے میں پہنچ گیا تھا۔ اس نے اپنی برساتی اور ٹوپی اُتار کر برآمدے میں بچھی ہوئی لکڑی کی بنچ پر ڈال دی تھی اور اب ہمارا منتظر تھا۔

میں نے کار کو دوسری کار سے کچھ فاصلے پر کھڑا کر دیا۔ لڑکی نے ہاتھ بڑھا کر کار کی چھت والی روشنی بجھا دی اور تقریباً سرگوشی کے لہجے میں مجھ سے بولی۔ "کسی قسم کی شرارت کرنے کی کوشش کی تو یاد رکھنا کہ پستول میرے ہاتھ میں ہے۔ چُپ چاپ میرے کہنے پر عمل کرتے رہو۔"

میں کار سے اُتر کر تیزی سے برآمدے کی طرف بڑھا مگر اتنی دیر ہی میں تیز بارش نے مجھے بھگو دیا تھا۔ لڑکی بھی قریب قریب دوڑتی ہوئی میرے ساتھ ہی برآمدے میں داخل ہوئی۔ اس نے اپنے دوپٹے کو اچھی طرح اپنے جسم پر لپیٹ لیا تھا۔ اور یہ صرف میں ہی جانتا تھا کہ دوپٹے کے اندر اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹے سائز کا پستول بھی موجود تھا۔

برآمدے میں پہنچ کر میں پانی کے قطروں کو اپنے کپڑوں پر سے جھٹکنے لگا مگر لڑکی نے اس قسم کا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا۔ وہ خاموش کھڑی مجھے گھور رہی تھی جیسے نظروں ہی نظروں میں مجھے انتباہ کر رہی ہو کہ ذرا سی بھی چالاکی کرو گے تو پچھتانا پڑے گا۔

میں چوکیدار سے مخاطب ہوا۔ "تمہارے ڈاک بنگلے میں کمرے وغیرہ خالی بھی ہیں یا رات برآمدے ہی میں گزارنی پڑے گی؟"

"بہت جگہ ہے صاحب۔" وہ مسکرایا۔ "آپ کو تو ایک ہی کمرے کی ضرورت ہے نا۔ وہ مل جائے گا آپ کو۔"

"کیا اور بھی لوگ یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں؟" لڑکی نے محتاط انداز میں پوچھا۔

"ویسے تو ادھر نہر کے افسروں کے سوا کوئی نہیں آتا صاحب۔ پر برسات اور ٹوٹی ہوئی نہر کی وجہ سے آج کل رونق ہو جاتی ہے۔" پھر وہ ایک دروازے کی طرف بڑھا۔ "آیئے آپ کا سامان میں نکال لاؤں گا۔"

"سامان وہیں رہنے دو۔" لڑکی نے تیزی سے کہا۔ "بس ہمیں کمرہ دکھا دو۔"

کمرہ خاصا آرام دہ تھا۔ ایک جانب ایک بڑی مسہری پڑی ہوئی تھی۔ دوسری جانب ایک پرانی وضع کی سنگھار میز تھی۔ لڑکی کی نظریں غیرارادی طور پر سنگھار میز کے آئینے کی طرف اٹھ گئیں جس میں میرا عکس بھی نظر آرہا تھا۔ ہماری نظریں ملیں تو اس کی نگاہیں خود بخود جھک گئیں۔

"کھانے پینے کو کچھ لاؤں صاحب؟" چوکیدار کی آواز نے ہم دونوں کو چونکا دیا۔

"نہیں" میرے جواب دینے سے پہلے ہی لڑکی بول پڑی۔ "اب تم جا سکتے ہو۔"

چوکیدار خاموشی سے باہر چلا گیا تو لڑکی نے دوپٹے کے اندر سے اپنا ہاتھ باہر نکال لیا۔ پستول بدستور اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ سنگھار میز کے سامنے پڑے ہوئے لکڑی کے سٹول پر بیٹھ گئی۔ میں نے ایک طویل انگڑائی لی اور مسہری کی جانب بڑھا۔ "مجھے تو بہت نیند آرہی ہے۔" مسہری پر دراز ہو کر میں نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے غصے سے

گھور رہی تھی۔ "اب آرام سے بیٹھ کر بتاؤ کہ تم چاہتی کیا ہو؟"

"ایکٹنگ مت کرو۔" وہ دانت پیس کر بولی: "یہ بتاؤ کہ تم اتنے عرصے سے مجھ سے ملنے کیوں نہیں آئے؟ اور وہ عورت کون ہے جو ابھی اس گھر میں تھی۔"

میں بے اختیار زور زور سے ہنسنے لگا: "اوہ تو تم بھی مجھے غلط سمجھ رہی ہو! میں بھی حیران تھا کہ آخر میں نے تمہارا بگاڑا کیا ہے؟"

وہ سٹول پر سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی: "تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"دیکھو لڑکی۔ تم مجھے جو کچھ سمجھ رہی ہو میں وہ نہیں ہوں۔ تم مجھے ٹونی سمجھ رہی ہو نا؟"

"تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم ٹونی نہیں ہو؟"

"کہنا نہیں چاہتا۔ حقیقت بھی یہی ہے۔"

"میں تمہاری کسی چال میں نہیں آؤں گی۔ یاد رکھو۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ اگر تم نے مجھے دھوکہ دیا تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔"

میں مسہری سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس ڈرامے کو میں مزید طول نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے بڑے سکون سے اس کو مخاطب کیا: "دیکھو لڑکی۔ یقین کرو۔ میں نے آج تمہیں زندگی میں پہلی بار دیکھا ہے۔ میں تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ میں تو تمہارا نام تک نہیں جانتا۔ تم مجھے ٹونی سمجھ رہی ہو مگر میں وہ نہیں ہوں۔ میرا جرم صرف یہ ہے کہ میں اس کا ہم شکل ہوں۔"

وہ ایک دم مسہری کے سرہانے بیٹھ گئی: "تو کیا۔ کیا تم..... تم؟؟!!!"

"ہاں۔ تم نے اخباروں میں پڑھا ہو گا۔ میں وہی ہوں جس کے گھر اور کاروبار پر ٹونی نے قبضہ جما لیا ہے۔ ساری دنیا مجھے ٹونی سمجھتی ہے اور وہ بڑے آرام سے میرے گھر میں میری ہر چیز کا مالک بنا بیٹھا ہے۔ اپنے حصے کے سارے دکھ، سارے مصائب، ساری پرابلمز اس نے میری جھولی میں ڈال دی ہیں۔ پولیس تو میری تلاش میں ہے ہی مگر اس کے ملنے دشمن بھی میری جان کے دشمن ہو گئے ہیں اور میرے خون کے پیاسے ہیں۔ مثال کے طور پر خود اپنے آپ کو دیکھ لو۔"

وہ بے اعتباری سے مجھے تک رہی تھی: "تو پھر تم وہاں کیا کر رہے تھے اور اس کی کار میں کہاں جا رہے تھے۔"

میں نے ایک سرد آہ بھری: "میں اس کے غنڈوں کے قبضے میں آ گیا تھا۔ بڑی مشکل سے ٹونی سے پیچھا چھڑا کر بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ مگر تم راہ میں حائل ہو گئیں۔ ٹونی اس وقت بھی اس گھر کے ایک کمرے میں بے ہوش پڑا ہے۔ کل صبح تک اس کے کارندوں کو بھی پتہ نہیں چل سکے گا کہ ان کا شکار جال سے نکل گیا ہے۔ اگر تمہیں ٹونی کی تلاش ہے تو واپس چلی جاؤ۔ مجھے اپنے راستے پر جانے دو۔"

"تو تم ٹونی نہیں ہو!" اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ اس کو میری بات پر یقین آنے لگا ہے۔

"بالکل نہیں۔ تم جس طرح چاہو تمہیں یقین دلانے کو تیار ہوں۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ میرے پاس کوئی ٹھوس ثبوت موجود نہیں ہے ورنہ اب تک پولیس کو اور دنیا والوں کو اپنی اصلیت کا یقین دلانے میں کامیاب ہو چکا ہوتا۔"

"میں نے اخباروں اور ریڈیو میں تمہارے بارے میں پڑھا اور سنا ہے مگر میں تو یہی سوچ کر ٹونی کے خفیہ ٹھکانے پر گئی تھی کہ وہ وہاں ضرور آئے گا۔"

"وہ وہیں موجود ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر تم میری مدد کرو تو اس وقت اس کو گرفتار کرانے کا بہت اچھا موقع ہے۔"

"نہیں نہیں۔" وہ بے اختیار چلائی: "میں ٹونی کو گرفتار نہیں ہونے دوں گی۔"

"تم پہلے ہی بہت دھوکے کھا چکی ہو۔ تم ہی نہیں ایک دنیا اس کے ظلم و ستم اور فریب کی زخم خوردہ ہے۔ وہ تمہارا تو کیا کسی کا بھی نہیں ہو سکتا۔ اسے اپنی ذات اور اپنے فائدے سے غرض ہے۔ کوئی رشتہ، کوئی جذبہ، کوئی اصول اس کے پاؤں میں زنجیر نہیں ڈال سکتا۔ وہ انسان کے بھیس میں شیطان ہے۔ اس جیسے انسانوں کا آزادی سے گھومنا پھرنا سب کے لیے خطرناک ہے۔ اگر اس کو گرفتار نہیں کرایا گیا تو وہ خدا جانے اور کتنی معصوم لڑکیوں کی زندگی برباد کرے گا۔ کتنے بے گناہوں کے گھر اجاڑے گا۔ کتنے لوگوں کو دھوکہ دے گا۔ کتنے انسانوں کے خون سے ہاتھ رنگے گا۔ اس نے درجنوں لڑکیوں کی زندگی خراب کی ہے۔ بے شمار لڑکیوں سے شادی کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ ان میں سے کچھ تو اس کے فریب کا شکار ہو کر اس کے بچے کی ماں بھی بن گئیں۔ مگر وہ اُن سب کو فراموش کر بیٹھا ہے۔"

"مگر روزی....." اس نے بولنا چاہا مگر میں نے بات کاٹ دی۔ "روزی کہنے کو میری بیوی ہے لیکن وہ ٹونی کی سازش میں شریک تھی۔ ان دونوں نے ایک اور شخص شوکت کے ساتھ مل کر میرے ہم شکل سے فائدہ اٹھانے کے لیے بہت بڑا منصوبہ بنایا تھا۔ جس میں وہ کامیاب ہو گئے۔ لیکن جس طرح وہ خود کسی سے مخلص نہیں ہے۔ اسی طرح روزی بھی اس کی وفادار نہیں ہے۔ اب مجھے سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ روزی اور شوکت بھی ٹونی کو اسی طرح فریب دے رہے ہیں جس طرح وہ ان دونوں کو فریب دے رہا ہے۔ میں ان دونوں کی باتیں خود اپنے کانوں سے سن چکا ہوں جب وہ لوگ مجھ سے نجات حاصل کر لیں گے اور ٹونی میری تمام دولت کے ساتھ ساتھ میرا نام اور مقام بھی حاصل کر لے گا تو پھر روزی اور شوکت اس سے چھٹکارا حاصل کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگائیں گے۔ وہ ایک زہریلا سانپ ہے جس کے زہر سے کوئی بھی محفوظ نہیں رہ سکتا۔ ان کا سر کچلنا بہت ضروری ہے۔ خدا کے لیے اس کام میں میری مدد کرو۔"

لڑکی بوتے ہوئے کانپ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پستول بھی لرز رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی حسرت اور مایوسی تھی۔ چہرہ سفید پڑ گیا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی فیصلے پر پہنچ چکی ہے مگر وہ فیصلہ کیا ہے؟ یہ جاننا بہت مشکل تھا۔

میں اس سنہری موقعے کو ہاتھ سے نہیں گنوانا چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے لوہا گرم دیکھ کر اس پر فیصلہ کن ضرب لگانے کا فیصلہ کر لیا۔

"تمہارا نام کیا ہے اور تمہارا ٹونی سے کیا واسطہ ہے؟"

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور تلخی سے بولی: "میرا نام جان کر تمہیں کچھ حاصل نہ ہو گا۔ میں گمنام ہی رہنا چاہتی ہوں۔ لیکن تمہاری باتیں سن کر مجھے یقین ہو گیا ہے کہ ٹونی ایک بدخصلت انسان ہے۔ اس نے مجھ ہی کو نہیں اور بھی بے شمار لوگوں کو دھوکہ دیا ہے۔ پھر میں اس کے فریب میں کیوں آ گئی؟" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"دیکھو لڑکی۔" مجھے اس پر ترس آ رہا تھا۔ "جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔ لیکن اگر تم میرے ساتھ تعاون کرو تو آئندہ یہ شخص خلقِ خدا کو نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ مجھے بتاؤ۔ کیا تم اس کی اصلیت سے واقف ہو؟ اس کے بارے میں تمہارے پاس کوئی ثبوت موجود ہیں؟"

وہ اچانک روتے روتے خاموش ہو گئی اور پھر فیصلہ کن انداز میں کہنے لگی۔ "میں اس کی پور پور سے واقف ہوں۔ اس کی تصویریں، اس کے خطوط، اس کے کاغذات میرے پاس موجود ہیں۔"

میں خوشی سے اچھل پڑا۔ "واقعی؟! مگر کیا کوئی ایسی نشانی بھی ہے جس سے اس کے اور میرے درمیان تمیز ہو سکے؟"

اس نے ایک لمحہ آنسو بھری نظروں سے مجھے دیکھا پھر کہنے لگی: "اس کی شناخت کوئی مشکل نہیں ہے۔ موقع آنے پر میں سب کچھ بتا دوں گی۔"

میرے صبر و ضبط کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ "تو پھر دیر کس بات کی ہے؟۔ چلو۔ ہم اسی وقت یہاں سے چلتے ہیں۔ تمہارے پاس جو چیزیں ہیں وہ تم مجھے دے دو۔ یقین کرو آج کے بعد یہ زہریلا ناگ کسی اور کو نہیں ڈس سکے گا۔"

میرے لیے اب ایک ایک پل بھاری تھا۔ مَیں اسے سوچنے کا موقع بالکل نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس لیے فوراً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے رونا بند کر دیا تھا لیکن اس کا جسم ابھی تک ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ مَیں نے نرمی سے اس کا بازو پکڑا اور دروازے کی طرف چل پڑا۔ وہ ایک معمول کی طرح میرے ساتھ چل پڑی۔

ڈاک بنگلے کا بنگلہ نیم تاریک تھا۔ بارش بدستور ہو رہی تھی مگر اب اس میں پہلی سی شدت نہیں رہی تھی۔ یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ آس پاس کوئی موجود نہیں ہے مَیں لڑکی کو لے کر کار کی طرف بڑھا۔ ہم ابھی برآمدے کی چوبی سیڑھیاں اُتر رہے تھے کہ ایک کار کی آواز سنائی دی اور پھر یک لخت کار کی تیز روشنیوں نے ہم دونوں کو اپنے حصار میں لے لیا۔ دو کاریں نہایت تیزی سے آ کر ہمارے سامنے رُک گئیں۔ مَیں انتہائی تیز روشنی کے باعث کچھ بھی دیکھنے سے قاصر تھا۔ روشنیوں کے پیچھے سے مجھے ایک تحکمانہ اور بارُعب آواز سنائی دی اور مَیں نے اُس کو پہچاننے میں ایک لمحے کی تاخیر بھی نہیں کی۔ مَیں بھلا خود اپنی اور اپنے ہمزاد کی آواز کو کیسے نہ پہچانتا۔

"جہاں کھڑے ہو وہیں رُک جاؤ اور اپنے ہاتھ سر کے اوپر رکھ لو۔"

لوُنی کی سرد مگر نفرت اور غصے میں ڈوبی ہوئی آواز نے مجھ سے زیادہ لڑکی پر جادو کا اثر کیا اور وہ ہسٹریائی انداز میں چلائی "لوُنی۔ لوُنی!" اور بے اختیار کار کی طرف لپکی۔ مَیں نے موقعہ غنیمت جان کر دوسری جانب چھلانگ لگائی اور اس کے ساتھ ہی فضا کے سناٹے میں فائرنگ کی آواز گونجنے لگی۔ دونوں کاروں کے انجن اور روشنیاں بند ہو گئی تھیں، لیکن آتشیں اسلحہ کے دہانے کھل گئے تھے۔

مَیں اندھا دھند قلا بازیاں لگاتا ہوا برآمدے کے اندرونی حصے کی طرف جا رہا تھا اور میرے دائیں بائیں گولیوں کی بارش ہو رہی تھی۔

اگر وہ لوگ کاروں کی روشنیاں بند نہ کرتے تو اس وقت تک میرا جسم گولیوں سے چھلنی ہو چکا ہوتا۔ لیکن اُنھیں غالباً یہ اندیشہ تھا کہ مَیں پوری طرح مسلح ہوں اور اگر انھوں نے روشنیاں بند نہ کیں تو بہت آسانی سے ان سب کو اپنے آتشیں ہتھیاروں کا نشانہ بنا لوں گا۔ ان کو اگر یہ علم ہوتا کہ اسلحہ کے نام پر میرے پاس ایک معمولی پستول تک نہیں ہے تو صورتِ حال بالکل مختلف ہوتی۔ بہرحال ان کی غلط فہمی وقتی طور پر میری جان بچنے کا سبب بن گئی تھی۔ لڑکی نے مجھے لوُنی کی اصلیت کے بارے میں ثبوت فراہم کرنے کا جو وعدہ کیا تھا اس کے باعث مَیں انتہائی اضطراری اور ہیجان انگیز کیفیت سے دوچار ہو گیا تھا اور جوشِ جذبات میں آ کر کمرے میں رکھا ہوا واحد پستول بھی اپنے ساتھ نہیں لایا تھا۔ یہ وہی پستول تھا جس کے بل پر لڑکی نے مجھے کار کا رُخ تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا تھا وہ لڑکی جو چند لمحے قبل مجھے اپنی نجات دہندہ نظر آ رہی تھی اب میری موت کا سامان بھی بن سکتی تھی۔ کاش وہ مجھے نہ ملتی اور مَیں اس موقعے سے فائدہ اُٹھا کر لوُنی کے رُوپ میں اپنے گھر پہنچ جاتا جہاں روزی میری منتظر تھی۔ لوُنی کو مَیں وقتی طور پر اپنے راستے سے ہٹا چکا تھا اور ایسے وقت میں بہت ممکن تھا کہ مَیں روزی کو ذرا دھمکا کر یا لالچ دے کر اس بات پر آمادہ کر لیتا کہ وہ لوُنی کے مقابلے میں میرا ساتھ دینے پر راضی ہو جاتی۔ لیکن یہ محض ایک اُمید موہوم سی تھی۔ روزی اور شوکت اس سازش میں جس حد تک اُلجھ چکے تھے اس کے بعد یہ توقع کرنا فضول ہی تھا کہ وہ لوُنی کا ساتھ چھوڑ کر مجھے اپنا لیتے لیکن پھر بھی روزی کو مکان پر تنہا پا کر مَیں اپنی بے گناہی کا ثبوت فراہم کر سکتا تھا۔ مگر یہ سب خواہشات اب نقش بر آب ثابت ہو رہی تھیں، چند لمحے پیشتر وہ لڑکی میرے لیے تاریکی میں روشنی کا پیغام اور میری تمام

مشکلات کو حل کرنے کا سبب بن سکتی تھی۔ لیکن اب صورتِ حال یکسر تبدیل ہو چکی تھی۔ خدا جانے مجھے ابھی اور کن کن آزمائشوں سے گزرنا تھا!!

یہ تمام خیالات میرے ذہن میں گڈمڈ ہو رہے تھے اور میں برق رفتاری کے ساتھ دوڑتا ہوا اور گولیوں کی بارش سے بچنے کے لیے کبھی دائیں اور کبھی بائیں جانب قلابازیاں لگاتا ہوا اس ڈاک بنگلے کے اندرونی حصے کی طرف جا رہا تھا۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ مَیں ڈاک بنگلے کے اندرونی حصے میں پہنچ کر ان لوگوں سے کیوں کر محفوظ رہ سکوں گا لیکن میرے لاشعور نے مجھے صرف اتنا بتایا تھا کہ وہاں کمرے کے اندر ایک پستول موجود ہے جو ایک نہتے انسان کے لیے بہت بڑا آسرا بن سکتا ہے۔ لوُنی اور اس کے ساتھی ہر طرح کے مہلک اسلحہ سے لیس ہوں گے جب کہ میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا جس کی مدد سے ان کا مقابلہ کر سکتا۔ یہی خیال مجھے کشاں کشاں اس کمرے کی طرف لے جا رہا تھا جس سے میں چند لمحے پیشتر نکل کر اس لڑکی کے ساتھ باہر آیا تھا جو کسی وقت لوُنی کی محبت میں گرفتار ہو کر اس پر جان چھڑکتی تھی لیکن اب اس کی بے وفائیوں اور کج ادائیوں سے تنگ آ کر اس کی جان لینے کے درپے ہو گئی تھی۔

تاریکی نے میری حفاظت کی اور مَیں دیواروں سے ٹکراتا ہوا اس کمرے میں پہنچ گیا۔ جہاں سینٹر ٹیبل پر پستول پڑا ہوا تھا۔ مَیں کمرے کی روشنی جلانے کی حماقت نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے مَیں نے اندازے سے ٹٹول کر پستول تلاش کیا اور جب اس کے سرد اور آہنی دستے پر میری گرفت مضبوط ہوئی تو اچانک میرے اندر خود اعتمادی اور تحفظ کا ایک نیا احساس پیدا ہو گیا۔ مَیں جانتا تھا کہ پستول گولیوں سے بھرا ہوا تھا۔ مَیں یہ بھی دیکھ چکا تھا کہ میرے دشمن تعداد میں چار اور اسلحہ سے پوری طرح لیس ہیں، اس کے باوجود یہ ننھا سا پستول میری حفاظت کا واحد ذریعہ بن سکتا تھا۔ خدا کے بعد اگر میرے بچاؤ کا کوئی ذریعہ تھا تو وہ بھی پستول تھا۔

مَیں پستول ہاتھ میں تھام کر خاموش کھڑا ہو گیا۔ اب میری نگاہیں تاریکی میں کچھ کچھ دیکھنے کی عادی ہو چکی تھیں۔ باہر ایک دم خاموشی چھا گئی تھی اور فائرنگ بالکل بند ہو گئی تھی۔ لیکن اچانک مَیں نے ڈاک بنگلے کے دوسرے حصے میں روشنیاں جلتی ہوئی دیکھیں۔ شاید اس حصے میں لوگ فائرنگ کا سبب جاننا چاہتے ہوں گے اور ان کی خواہش بالکل فطری اور قدرتی تھی۔ مَیں دروازے کی اوٹ میں کھڑا ہو کر آس پاس کا جائزہ لینے لگا۔ تاریک ماحول میں اچانک روشنی ہونے کے سبب سے آنکھوں میں چکاچوند پیدا ہو گئی تھی لیکن میں دیکھنے کے قابل تھا۔ بائیں جانب کے برآمدے میں ایک تنومند شخص نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں بندوق تھی اور وہ پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ حملہ آور جو اندھیرے میں تھے اس کی ایک ایک نقل و حرکت کو دیکھ رہے تھے۔

"کون ہے؟" اندر سے نکلنے والے شخص نے بھاری آواز میں پوچھا۔ جواب میں ایک گولی چلی جو اس کے شانے کے پاس سے گزر گئی۔ وہ خوف زدہ ہو کر واپس بھاگا۔ حالات کی سنگینی کے باوجود مَیں اس کے یوں ڈر کر بھاگنے پر ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ سب کچھ کسی انگریزی کامیڈی فلم کا ایک حصہ نظر آ رہا تھا۔ پھر مَیں نے زور سے دروازہ بند ہونے کی آواز سنی۔ بندوق لے کر باہر نکلنے والا شخص اپنے کمرے میں بند ہو چکا تھا لیکن اس نے روشنی بجھانا ضروری نہیں سمجھا۔ جس کی وجہ سے مَیں نے ڈاک بنگلے کے سامنے کھڑی ہوئی جیپ اور کار کو دیکھ لیا۔ مَیں اس میں سوار لوگوں کے چہرے واضح طور پر تو نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن ان کی گنتی ضرور کر سکتا تھا۔ لوُنی سمیت ان کی تعداد چار تھی اور ان میں بابے بھی شامل تھا۔ لوُنی کے ہاتھ میں ریوالور تھا جب کہ باقی تینوں برین گنوں سے مسلح تھے۔ ان میں سے دو جیپ سے اُتر کر اس کی آڑ لے کر کھڑے ہوئے تھے جب کہ لوُنی کار کے عقب میں جھکا ہوا تھا۔ بابے اس سے کچھ فاصلے پر کھڑا عقابی نظروں سے ڈاک بنگلے کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ سب خاموش دَم سادھے ہوئے تھے۔ غالباً انھیں یہ معلوم نہیں تھا کہ اس وقت میرے ساتھ کتنے لوگ ہیں اور مَیں خود کتنا مسلح ہوں؟ یہی وجہ ہے کہ ان کی پیش قدمی رُک گئی تھی۔ اگر انھیں صحیح صورتِ حال کا علم ہوتا تو شاید اس وقت تک وہ مجھے

گولیوں سے بھون چکے ہوتے۔

یکایک مَیں نے ایک ستون کے پیچھے ایک ہیولے کو حرکت کرتے ہوئے دیکھا اور پستول سے نشانہ لے کر بالکل مستعد ہوگیا۔ شاید یہ ان کا ایک اور ساتھی تھا جسے مَیں اب تک دیکھ نہیں سکا تھا اور جو بے خبری میں میرے لیے سب سے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ لیکن دوسری نگاہ بغور ڈالی تو مَیں نے دیکھا کہ وہ ٹونی کا کوئی ساتھی نہیں تھا بلکہ وہ لڑکی تھی جو میرے لیے بے گناہی ثابت کرنے کی آخری اُمید تھی۔ وہ چُپ چاپ ستون کے پیچھے سمٹی ہوئی کھڑی تھی۔ میرے ساتھ ہونے والی گفتگو کے بعد اسے یہ یقین ہو چکا تھا کہ مَیں ٹونی نہیں ہوں بلکہ ایک بے گناہ شہری ہوں جب کہ ٹونی میری جگہ میری ہر چیز پر قابض ہو کر بیٹھا ہوا ہے۔ پھر ٹونی کا ہرجائی پن اور اسکی بے وفائی بھی اب اس کے لیے محتاجِ ثبوت نہیں رہی تھی۔ اس نے میرے ساتھ تعاون کا جو وعدہ کیا تھا اسے پُورا کرنے کے سلسلے میں وہ پُوری طرح سنجیدہ اور میری امداد کے لیے کمربستہ تھی۔ ٹونی کا فریب اس پر آشکار ہو چکا تھا۔ اب اسے مزید ثبوت کی ضرورت نہیں تھی۔ مَیں بخوبی جانتا تھا کہ اب وہ ٹونی کے خلاف آخری انتہا تک بھی جانے میں مطلق ہچکچاہٹ سے کام نہیں لے گی کیونکہ یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ دُنیا میں بے وفائی کا شکار ہونے والی عورت سے زیادہ خطرناک اور خونخوار کوئی اور چیز نہیں ہوتی۔ عورت ذات کی نفسیات کا یہ رُخ نہایت عجیب وغریب اور انوکھا ہے۔ عورت کہاں تو وفا اور قربانی کے ساتھ ساتھ نرمی ونزاکت کا مجموعہ ہے لیکن دوسری طرف یہی عورت جب فریب خوردہ ہونے کے بعد انتقام لینے پر آتی ہے تو وہ ناگن سے زیادہ زہریلی اور مُہلک ہو جاتی ہے۔ اس لڑکی کا بھی یہی معاملہ تھا۔ اس نے ٹونی کو اپنی محبت کا مرکز بنایا تھا لیکن اب جب کہ اُسے ٹونی کی بے وفائی اور کمینگی کا یقین ہو چکا تھا تو وہ ٹونی سے انتقام لینے پر تُل گئی تھی اور اب دُنیا کی کوئی طاقت ٹونی کو اس کے غیظ وغضب کا شکار ہونے سے نہیں بچا سکتی تھی۔ اپنی مختصر ملاقات کے دوران مَیں اس پُراسرار لڑکی کا نام تک نہیں جان سکا تھا لیکن مجھے اتنا ضرور یقین تھا کہ اب ٹونی کے خلاف میری جدّوجہد میں وہ ایک پُراعتماد اور قابلِ اعتبار ساتھی ثابت ہوگی۔

مَیں نے تاریکی میں لڑکی کو برآمدے کے ستون کے پیچھے سے آہستہ آہستہ جیپ گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا۔ ٹونی اب تک ڈاک بنگلے میں اس لڑکی کی موجودگی سے بے خبر تھا اور اسے یہ علم تک نہ تھا کہ وہ اب ٹونی کی اصلیت سے واقف ہو چکی ہے اور ہر قیمت پر اس کے خلاف میرا ساتھ دینے کو تیار ہے۔ مَیں نے ٹونی کے ہیولے کو کار کی اوٹ میں آگے سرکتے ہوئے دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی میری نگاہوں نے ٹونی کے دو ساتھیوں کو ڈاک بنگلے کے بائیں حصّے کی جانب رُخ کرتے ہوئے دیکھا۔ ڈاک بنگلے میں مقیم دوسرے مسافر نے بندوق کے ساتھ برآمدے میں نمودار ہو کر ٹونی اور اس کے ساتھیوں کو مخمصے میں ڈال دیا تھا۔ اور وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ مَیں ڈاک بنگلے میں تنہا نہیں ہوں بلکہ کچھ اور مسلح لوگ بھی میرے ساتھ موجود ہیں۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اندھا دھند میرا پیچھا کرنے سے گریز کیا تھا اور یہ اتفاق میرے حق میں مفید ثابت ہوا تھا۔ اب اُن چاروں میں سے دو کا رُخ ڈاک بنگلے کی دوسری جانب تھا جب کہ ٹونی اور بابے اُس سمت بڑھ رہے تھے جہاں مَیں محض ایک چھوٹے سے پستول کی مدد سے اپنا دفاع کرنے کے لیے تیار تھا۔ ڈاک بنگلے میں موجود دوسرا مسافر میرے لیے قطعی اجنبی تھا اور یہ امر میرے لیے خاصا پریشان کُن تھا کہ وہ شخص اَن جانے میں ایک بہت بڑے خطرے سے دوچار ہو گیا تھا۔ حالانکہ وہ اس تنازعے سے یکسر بے خبر اور بے تعلق تھا۔ اب صورتِ حال یہ تھی کہ ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر قریب قریب ساکت تھا اور اپنے مخالف کی حرکت اور سرگرمی کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ بارش اب بالکل بند ہو چکی تھی لیکن ماحول میں نمی موجود تھی اور موسم خاصا خوشگوار ہو گیا تھا۔ ٹونی جس بے خوفی اور بے پروائی کے ساتھ میرا تعاقب کرتے ہوئے ڈاک بنگلے تک پہنچا تھا اور جس انداز میں اس نے مجھے للکارا تھا اس سے صاف ظاہر تھا کہ اس کے اندازے کے مطابق ڈاک بنگلے میں میرے سوا کوئی اور موجود نہیں تھا لیکن جب اُن لوگوں نے ایک اور مسلح شخص کو سامنے پایا تو ان کے ارادوں میں کمزوری پیدا ہو گئی۔ اب غالباً وہ پچھتا رہے ہوں گے کہ انھوں نے زیادہ لوگوں کو اپنے ساتھ کیوں نہ رکھا۔ وہ واضح

طور پر تذبذب کا شکار نظر آ رہے تھے۔ کیونکہ وہ اب اپنے مخالف کی طاقت کے متعلق کشمکش میں گرفتار ہو گئے تھے۔ اگرچہ وہ چاروں پُوری طرح مسلح تھے اور مجھے بخوبی اندازہ تھا کہ برین گنوں کے علاوہ ان کی گاڑیوں میں دوسرا مہلک اسلحہ بھی موجود ہوگا لیکن جب کہ عام طور پر جرائم پیشہ لوگوں کا رویہ ہوتا ہے وہ اپنے مخالف کو بے بس اور کمزور پا کر شیر ہو جاتے ہیں لیکن اگر انھیں مقابل کی طرف سے بھرپور مدافعت کا ڈر ہو تو پھر ان کی بہادری اور شیر دلی ہَوا ہو جاتی ہے۔

غیر ارادی طور پر مَیں دبے پاؤں پیچھے ہٹتا ہوا برآمدے کی آخری دیوار تک پہنچ چکا تھا لیکن ڈاک بنگلے کے سامنے کا منظر ستونوں کی آڑ سے ابھی تک میرے سامنے تھا۔ یکایک مجھے اپنے پیچھے آہٹ سنائی دی۔ مَیں بجلی کی تیزی سے پلٹا اور میرا پستول والا ہاتھ بے اختیار اُوپر اُٹھ گیا۔ اندھیرے میں میرے سامنے ایک شخص کھڑا ہوا تھا جس کے ہاتھ میں بندوق تھی اور اس کی نالی کا رُخ میری طرف تھا۔ میرا پستول والا ہاتھ اُوپر اُٹھا ہوا رہ گیا۔ مَیں شاید اپنی تمام تر توجہ سامنے مرکوز رکھ کر اپنے عقب سے بے خبر ہو گیا تھا اور اس اثناء میں دُشمن کا ایک کارندہ مجھے اپنا شکار بنانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ گولی چلانے کا وقت تھا اور نہ ہی موقع تھا۔ گولی کی آواز سُن کر وہ سب مجھ کو بھون کر رکھ دیتے۔ اس لیے مَیں نے قوت کے بَل پر اپنے سامنے والے آدمی کو زیر کرنے کا ارادہ کر لیا۔ میرے پیر سُرعت کے ساتھ حرکت میں آئے اور مَیں نے ہوا میں اُچھل کر اپنے مدِمقابل کے سینے پر لات رسید کرنے کا منصوبہ بنایا لیکن وہ پہلے ہی میرے ارادے کو بھانپ کر بائیں جانب ہو گیا اور اس سے پہلے کہ مَیں زمین پر گرتا اُس نے ایک ہاتھ میں بندوق تھام کر اپنے دوسرے ہاتھ سے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا اور اس طرح مَیں زمین پر گرنے سے بچ گیا۔ میرا پستول والا ہاتھ اس کے سر پر ضرب لگانے کے لیے پھُرتی سے بلند ہوا لیکن ہوا ہی میں معلق رہ گیا۔ میری نگاہوں کے سامنے ڈاک بنگلے کے چوکیدار کا چہرہ تھا۔ جس نے مجھے زمین پر گرنے سے محفوظ رکھ کر دُشمنوں کی زد میں آنے سے بھی بچا لیا تھا۔ اس نے آہستگی سے اپنے ہونٹوں پر ایک انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کی ہدایت کی اور پھر سرگوشی میں بولا: "دوست اور دُشمن میں تمیز تو کیا کریں صاحب۔ آپ نے تو مجھے بھی مروا دیا ہوتا۔" مَیں نے شرمندگی سے اس کو دیکھا۔

"یہ کون لوگ ہیں صاحب کیا ڈاکو ہیں؟" اس نے دوبارہ سرگوشی کی۔

"نہیں یہ بہت خطرناک مجرم ہیں اور میری تلاش میں یہاں آئے ہیں۔" مَیں نے مختصراً جواب دیا۔

"اب کیا ہوگا۔" وہ پریشانی سے بولا۔ "وہ تو بہت زیادہ ہیں۔"

"وہ صرف چار آدمی ہیں۔ ہم آسانی سے ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔"

"پستول اور بندوق سے ہم ان کا مقابلہ کیسے کریں گے۔" اس کی آواز میں تشویش تھی۔ "ان کے پاس تو برین گنیں ہیں۔"

مَیں نے کہا: "تم ہوشیاری سے انھیں دُور ہی رکھو۔ انھیں یہ معلوم نہیں ہے کہ ڈاک بنگلے میں میرے کتنے ساتھی ہیں۔ اس لیے وہ آگے بڑھنے سے ہچکچا رہے ہیں۔ یہ لوگ زیادہ دیر یہاں نہیں ٹھہر سکیں گے۔ تم ان پر نظر رکھو، مَیں کوئی ترکیب نکالتا ہوں۔"

وہ پریشان ضرور تھا لیکن بُزدل نہیں تھا۔ میری ذرا سی ہمت افزائی نے اس میں ایک نیا ولولہ پیدا کر دیا اور وہ پُرعزم لہجے میں کہنے لگا: "مَیں فوجی بندہ ہوں صاحب۔ جنگ میں لڑ چکا ہوں۔ ان سے ڈرنے والا نہیں ہوں۔"

"شاباش! دیکھو۔ تم اس ستون کے پیچھے پوزیشن لے کر کھڑے رہو۔ کوئی آگے بڑھنے کی کوشش کرے تو بے دریغ گولی کا نشانہ بنا دینا۔"

"ٹھیک ہے۔" اس کی مہم جو طبیعت یکایک جولانی میں آ گئی تھی۔ "پر آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"وہ لڑکی جو میرے ساتھ یہاں آئی تھی نا؟ اس کی زندگی خطرے میں ہے۔ وہ لوگ اس کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ وہ باہر ہی رہ گئی ہے۔ مَیں اسے لینے کے لیے جا رہا ہوں۔ تم ہوشیار رہنا۔"

اس کو مزید کوئی سوال کرنے کا موقع دیئے بغیر ہی مَیں تیزی سے بے آواز قدموں سے کھسکتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ یکایک ڈاک بنگلے کے دوسرے مسافر کی جانب سے ایک فائر کی آواز آئی۔ نہ جانے اس کو فائر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ہو سکتا ہے اضطراری طور پر اس کی بندوق چل گئی ہو لیکن اس ایک فائر کے ساتھ ہی ٹونی اور اس کے ساتھیوں کی جانب سے گولیوں کا مینہ برسنا شروع ہو گیا۔ میرے پاس صرف ایک پستول تھا جس کی گولیوں کو مَیں انتہائی حفاظت سے رکھنا چاہتا تھا اس لیے میری جانب سے تو فائرنگ کا امکان ہی نہیں تھا لیکن چوکیدار نے جوش میں آ کر ایک فائر داغ دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ڈاک بنگلے کا دوسرا حصہ بھی حملہ آوروں کی گولیوں سے چھلنی ہو گیا۔

مَیں اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر آگے بڑھا۔ مَیں نے جیپ کے پاس والے ستون کے پاس اس لڑکی کا سایہ دیکھ لیا تھا اور بہت ممکن ہے کہ دوسرے لوگوں کی نظر بھی اس پر پڑ جاتی لیکن اس لمحہ چوکیدار کی بندوق سے ایک گولی چلی اور برآمدے میں لٹکا ہوا تنہا بلب گل ہو گیا۔ اَب ہر طرف اندھیرا چھا چکا تھا۔ صرف گاہے گاہے برین گنوں سے اگلنے والی گولیوں کی آتشیں چنگاریاں کبھی کبھی نظر آ جاتی تھیں۔ ٹونی اور اس کے ساتھی اب دو ٹکڑیوں میں بٹ گئے تھے اور بڑی آہستگی اور ہوشیاری کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ انھیں ابھی تک یہ اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ ڈاک بنگلے کے اندر میرے کتنے ساتھی موجود ہیں لیکن وہ کچھ گھبرائے ہوئے سے تھے۔ خلافِ توقع انھیں شدید مدافعت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا جب کہ وہ مجھے بالکل تن تنہا سمجھ کر آئے تھے۔ اگر انھیں شک ہوتا کہ میرے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ہوں گے تو وہ ایک بڑا لشکر لے کر آ سکتے تھے اور ایسی صورت میں نہ صرف بہت بڑے پیمانے پر تباہی اور قتل و غارت کا سامنا کرنا پڑتا بلکہ مجھے بھاگنے کا کوئی راستہ بھی نہ ملتا۔ راستہ تو اب بھی کوئی نہیں تھا لیکن قدرت میری مدد کر رہی تھی اور میرا دل کہہ رہا تھا کہ حالات میرے حق میں ہیں۔

مَیں اندھیرے میں ٹٹولتا ہوا برآمدے کے ستون کے نزدیک پہنچ گیا جہاں کچھ دیر پہلے وہ لڑکی کھڑی ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ تاریکی سے فائدہ اٹھا کر کچھ اور آگے جا چکی تھی لیکن آخر اس کا مقصد کیا ہے؟ اس کی منزل کون سی ہے اور وہ کیا کرنا چاہتی ہے؟ ٹونی اندھیرے کے سمندر میں گم ہو چکا تھا اور وہ ڈاک بنگلے میں اس لڑکی کی موجودگی سے قطعی بے خبر تھا۔ مَیں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر ٹونی نے اپنی محبوبہ کو اچانک ڈاک بنگلے میں دیکھ لیا تو اس کا تاثر کیا ہوگا؟ وہ اسے میرا ساتھی اور ہمدرد سمجھ کر ہلاک کرنے کی کوشش کرے گا یا اپنے پیار کی دیوانی سمجھ کر اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے کوشاں ہوگا؟ مَیں اس اثنا میں جیپ گاڑی کے پاس پہنچ چکا تھا جو اَب بالکل خالی تھی۔ مَیں چپکے سے جیپ میں داخل ہوا اور مَیں نے دونوں ہاتھوں سے چاروں طرف ٹٹولا تو میرے ہاتھوں نے مزید اسلحہ کی ٹھنڈک اور فولاد کی سختی محسوس کرنے میں ذرا بھی غلطی نہیں کی۔ وہ لوگ جیپ کو اسلحہ خانہ بنا کر لائے تھے۔ مَیں نے ٹٹول کر ایک مشین گن اُٹھا لی اور خاموشی سے اس کو چیک کیا۔ مشین گن گولیوں سے بھری ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ ان لوگوں نے ہنگامی حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے مشین گن کو پوری طرح لوڈ کر کے رکھا تھا۔ مشین گن کے سرد فولاد کا لمس میرے ہاتھوں نے محسوس کیا تو اچانک میرے اندر توانائی اور خود اعتمادی کا احساس جاگ اُٹھا اور مَیں جو کچھ دیر پہلے تک خود کو بے بس اور خطرے میں گھرا ہوا محسوس کر رہا تھا اچانک قوت اور طاقت کے احساس میں سرشار ہو گیا۔ ٹونی اور اس کے ساتھی اب مجھے کیڑے مکوڑے محسوس ہونے لگے تھے۔ ہتھیاروں کی طاقت اپنی جگہ ایک نشہ آور کیفیت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زیادہ ہتھیار خواہ وہ کسی شخص کے پاس ہوں یا کسی قوم کے، ہمیشہ فتنہ و فساد کا سبب بنتے ہیں۔

جیپ میں آہٹ سی محسوس ہوئی اور یوں لگا جیسے کوئی اس میں سوار ہو رہا ہے۔ وہ جیپ کا ڈرائیور یا ٹونی کا کوئی ساتھی بھی ہو سکتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ٹونی بذاتِ خود کسی چیز کی تلاش میں جیپ تک آ پہنچا ہو۔ مَیں نے پستول کو اپنے پتلون کی پیٹی میں اُڑس لیا اور مشین گن کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر بالکل مستعد ہو کر بیٹھ گیا۔ یکایک ایک مانوس بھینی بھینی خوشبو میری ناک میں بس گئی اور حالات کی سنگینی کے باوجود مَیں مسکرانے لگا۔ یہ ہستی اُس لڑکی کے

سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ مَیں نے احتیاطاً مشین گن کو بالکل صحیح پوزیشن میں رکھتے ہوئے سرگوشی کی۔

"ڈرنا نہیں مَیں یوسف ہوں۔ تمہارا دوست جس کے ساتھ تم — ڈاک بنگلے میں آئی تھیں۔" اُسے چھوئے بغیر ہی مَیں اس کے جسم اور اعصاب کے تناؤ کو محسوس کر سکتا تھا۔

"اگر جھوٹ بولا تو بہت بُرا ہوگا۔" اس نے جواب میں سرگوشی کی۔

ڈاک بنگلے کی عمارت کی جانب سے فائرنگ کی آواز بدستور آ رہی تھی۔

"ہمارے لیے یہاں سے فرار ہونے کا بہت اچھا موقع ہے وہ لوگ اس وقت دوسری طرف مصروف ہیں۔" مَیں نے اندھیرے میں اسے دیکھنے کی پوری کوشش کی مگر اس کو دیکھنے میں ناکام رہا۔ البتہ مَیں اس کا وجود محسوس کر سکتا تھا۔

"ٹونی میری آنکھوں کے سامنے ہو اور مَیں فرار ہو جاؤں؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ مَیں تو اس کی تلاش میں تھی۔ وہ خود بخود میرے پاس آ گیا ہے۔" اس کی آواز جوش اور جذبات کی شدت سے کانپ رہی تھی۔ میرا جسم یکایک بالکل تن گیا اور اعصاب جھن جھنا اُٹھے۔ مجھے اب تک یہ احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ وہ لڑکی میری نہیں، ٹونی کی تلاش میں سرگرداں تھی۔ اور اب جب کہ اسے ٹونی کی بے وفائی اور دغا بازی کا علم ہو چکا تھا وہ بھلا اسے چھوڑ کر میرے ساتھ کیوں کر جا سکتی تھی؟ مَیں انجانے میں ایک بہت بڑی غلطی کر بیٹھا تھا۔

"سنو۔" مَیں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "ٹونی سے بدلہ چکانے کے لیے یہ وقت مناسب نہیں ہے۔ اطمینان رکھو وہ مجھ سے بچ کر کہیں نہیں جا سکے گا۔ اس وقت تم میرے ساتھ چلو۔ مَیں تمہیں وعدہ ٹونی کے پاس لے جاؤں گا۔"

یکایک آسمان پر بادل زور سے گرجے اور بجلی چمکنے لگی۔ روشنی کے پے در پے دو تین جھماکے ہوئے اور مَیں نے اور لڑکی دونوں نے بیک وقت برآمدے کے بائیں حصے کے ستون کے پاس کھڑے ہوئے دیکھ لیا۔ "وہ رہا ٹونی" وہ جذبات سے نڈھال آواز میں بولی اور بے اختیار جیپ سے باہر جانے کے لیے اس نے اپنا قدم پائیدان پر رکھ دیا۔

"نہیں" مَیں نے اس کا بازو تھام لیا: "تمہارا اس کے پاس جانا مناسب نہیں ہے۔ دیکھتی نہیں ہو وہ اس وقت انتقام اور خوں ریزی کے موڈ میں ہے اور کسی کی بھی رعایت نہیں کرے گا۔"

مگر لڑکی پر اب یک لخت دیوانگی کی کیفیت طاری ہو گئی تھی اور مَیں اس کے جسم کو شدت سے کانپتے ہوئے محسوس کر سکتا تھا۔ "مَیں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ اس نے میری زندگی برباد کر دی ہے۔ وہ انسان نہیں بھیڑیا ہے۔" اس کی آواز بھرّا گئی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ مَیں نے گھبرا کر اس کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور پریشانی سے چاروں طرف دیکھا۔

"خدا کے لیے آواز اُونچی نہ کرنا ورنہ بنا بنایا کام بگڑ جائے گا۔" مَیں نے اس کے منہ پر ہاتھ کا دباؤ بڑھاتے ہوئے التجا آمیز لہجے میں کہا۔ اس کی آواز اب خود بخود کم ہو گئی تھی لیکن سسکیوں سے اس کا جسم رہ رہ کر کانپ جاتا تھا۔

مَیں نے ڈاک بنگلے کی طرف دیکھا جہاں سے فائرنگ کی آوازیں تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد بلند ہو جاتی تھیں۔ میری نظر برآمدے کے بائیں جانب بنے ہوئے ایک لکڑی کے جنگلے پر پڑی اور وہیں اٹک کر رہ گئی۔ میرا دشمن ٹونی لکڑی کے جنگلے کے پاس ریوالور ہاتھ میں لیے کھڑا تھا۔ اس کی تمام تر توجہ ڈاک بنگلے کی جانب تھی جہاں اس کے اندازے کے مطابق میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ موجود تھا۔ ٹونی کا فاصلہ مجھ سے بمشکل ساٹھ ستر گز ہوگا۔ بھری ہوئی سٹین گن میرے ہاتھ میں تھی اور میرا جانی دُشمن میری زد میں تھا۔ مَیں نے برین گن کو اُونچا اٹھایا لیکن پھر میرا ہاتھ خود بخود نیچے گر گیا۔ اگر ٹونی کو مَیں مار بھی دوں تو اپنی بے گناہی اور اصلیت کا ثبوت کہاں سے لے کر آؤں گا؟ اس کی حمایت میں روزی اور شوکت موجود تھے۔ وہ کسی طرح بھی مجھے یوسف نہیں تسلیم کریں گے۔ ٹونی کو راستے سے ہٹانے کے بعد اُن کا اگلا نشانہ مجھ ہی کو بننا تھا۔ برین گن کی لبلبی پر میری انگلی کا دباؤ کم ہو گیا۔ محض ٹونی کو جان سے مار دینا ہی میرے مسائل

کا حل نہیں تھا۔ کچھ دیر پہلے میں یہی مشورہ اُس لڑکی کو دے رہا تھا لیکن اب جوشِ انتقام میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑنے لگا تھا۔ میں نے فی الوقت ٹونی کی جان بخشی کرنے کا فیصلہ کیا کہ موجودہ حالات میں یہی میرے لیے مناسب تھا۔ ٹونی اتنی دیر میں لکڑی کے جنگلے کو پھلانگ کر برآمدے میں داخل ہو چکا تھا جہاں اس وقت بالکل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ لڑکی کا رونا اب بہت کم ہو چکا تھا اسی لیے میں نے اس کے منہ پر سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔ یہ میرے لیے فرار ہونے کا بہترین موقع تھا۔ لڑکی جو میری بے گناہی کا ثبوت فراہم کرنے کا وعدہ کر چکی تھی، جیپ میں میرے ساتھ تھی اور اب بظاہر میرا راستہ روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ اس لیے میں نے فوری طور پر اس جگہ سے رخصت ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ تاریکی میں میرے ہاتھوں نے جیپ کے ڈیش بورڈ کا جائزہ لیا اور مجھے معلوم ہو گیا کہ چابیاں اگنیشن میں ہی لگی ہوئی تھیں۔ میں نے چپکے سے لڑکی سے کہا "دیکھو۔ اب ہم یہاں سے چل رہے ہیں۔"

وہ خاموش رہی۔

"تمہیں پستول چلانا آتا ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

اس نے سر ہلا کر اقرار کیا تو میں نے اپنی بیلٹ میں لگا ہوا پستول نکال کر اس کے حوالے کر دیا۔ یہ اسی کا پستول تھا جو میں نے بوقتِ ضرورت استعمال کرنے کے لیے اپنے ساتھ رکھ لیا تھا۔ اب جب کہ برین گن میرے پاس تھی اور جیپ میں کچھ اور اسلحہ بھی موجود تھا تو میں نے پستول لڑکی کے حوالے کرنے کی ٹھان لی تھی۔ میں نے جیپ سٹارٹ کی اور یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ اس کی آواز نے دوسروں کو چوکنا تو نہیں کر دیا لیکن اسی وقت ڈاک بنگلے کے مختلف حصوں سے فائرنگ کی آوازیں آنی شروع ہو گئیں اور اس طرح میرے فرار کی راہ ہموار ہو گئی۔

میں نے نہایت تیزی سے جیپ کو تھوڑا سا ریورس کیا اور پھر اسے کچی سڑک پر ڈال دیا۔ ہمارے پیچھے فائرنگ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں لیکن مجھے یقین تھا کہ کچھ دیر بعد جب ٹونی کو پتہ چلے گا کہ میں ڈاک بنگلے میں موجود نہیں ہوں اور جن لوگوں سے وہ برسرِ پیکار ہے وہ میرے ساتھی نہیں ہیں تو وہ خود بھی وہاں وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھے گا اور اس سے پہلے ہی مجھے یہاں سے بہت دُور پہنچ جانا چاہیے تھا۔

جیپ کچی سڑک پر ہچکولے کھاتی ہوئی چل رہی تھی۔ جگہ جگہ گڑھوں میں پانی اکٹھا ہو گیا تھا۔ ہلکی ہلکی بارش دوبارہ شروع ہو چکی تھی۔ اس سفر کے لیے جیپ سے بہتر کوئی اور سواری نہیں تھی۔ کوئی اور کار کسی وقت بھی پانی، کیچڑ یا گڑھوں میں پھنس کر رک سکتی تھی۔ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے ایک جیپ ہاتھ آ گئی تھی۔ ہم تاریک راستے پر فل لائیٹ کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ البتہ کبھی کبھی گیدڑوں اور جھینگروں کے شور مچانے کی آوازیں سُنائی دیتی تھیں۔ میں اس بات پر بھی خدا کا شکر کر رہا تھا کہ ٹونی نے اس لڑکی کو نہیں دیکھا تھا۔

"سنو" میں نے یکایک لڑکی کو مخاطب کیا جو اب خاموش کسی خیال میں گُم بیٹھی ہوئی تھی۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

"صوفیہ" اس نے مختصر جواب دیا اور اور پھر چُپ ہو گئی۔

میں نے لڑکی کا جائزہ لیا۔ اس سے پہلے بھی میں ڈاک بنگلے میں اس کو دیکھ چکا تھا۔ وہ کسی پڑھے لکھے، دولت مند خاندان کی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ لباس اور انداز سے ظاہر تھا کہ وہ کرسچین ہے۔ میں نے اس سے پوچھا "کیا تم کرسچین ہو؟"

"ہوں؟"

"ٹونی سے تمہاری ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی؟"

لڑکی نے دوبارہ رونا شروع کر دیا۔ فی الحال اس کے رونے سے کسی قسم کا خطرہ نہیں تھا اس لیے میں نے اسے خاموش کرانے کی کوشش نہیں کی۔ رونے سے اس کے دل کا غبار کم ہو سکتا تھا اس لیے میں کچھ دیر چپ چاپ گاڑی چلاتا رہا اور وہ روتی رہی۔ یہاں تک کہ اس کی سسکیوں کی آواز بھی بند ہو گئی تو میں نے اپنا سوال پھر دُہرایا۔

صوفیہ کے بارے میں میرا اندازہ دُرست نکلا۔ وہ ایک متوسط کرسچین گھرانے کی لڑکی تھی۔ اس کا باپ ایک بنک میں مینجر تھا اور یہی اس کی بدقسمتی کا سبب بن گیا۔ وہ اپنے بھائی کے ساتھ ایک کلب میں ٹونی سے ملی تھی اور اس کی شخصیت سے بہت متاثر ہوئی تھی۔ ٹونی بھی اس کے ساتھ بہت زیادہ توجہ اور مہربانی سے پیش آیا۔ کیونکہ آزاد خیال اور فیشن ایبل گھرانا تھا اس لیے بہت جلد میل جول بڑھ گیا اور ٹونی نے آزادانہ اس کے گھر آنا شروع کر دیا۔ گھر والوں کو بھی ٹونی پسند تھا۔ صوفیہ کے گھر والوں کو اس نے یہ تاثر دیا تھا کہ وہ ایک دولت مند بزنس مین ہے اور ابھی تک کنوارا ہے۔ صوفیہ اور اس کے گھر والے اس کے دھوکے میں آ گئے۔ خصوصاً جب اس نے یہ بتایا کہ وہ کسی مناسب رشتے کی تلاش میں ہے۔ ان کی ملاقاتیں بڑھتی گئیں اور وہ گھر سے باہر بھی ملنے لگے۔ چند بار صوفیہ کے ساتھ شہر سے باہر پہاڑی مقامات پر سیر و تفریح کے لیے بھی گئی اور اس طرح ان دونوں کو جسمانی طور پر بھی ایک دوسرے کے نزدیک آنے کا موقع مل گیا۔ ٹونی نے صوفیہ کو شادی کا یقین دلا دیا تھا اور اس کے گھر والے بھی اس فریب کا شکار ہو گئے تھے۔ لیکن ٹونی کا مقصد کچھ اور تھا۔ صوفیہ کے باپ سے تعلقات استوار کر کے اس نے بنک کے چند بہت بڑے کھاتے داروں کے دستخط حاصل کر لیے تھے اور ان کے جعلی دستخط بنانے کی مشق بھی کر لی تھی۔ لیکن اس نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ صوفیہ کی مدد سے اس نے بنک لاکرز کی ماسٹر کی تک رسائی حاصل کر لی اور اس کا نقش حاصل کر کے دوسری چابی بھی بنالی۔ یہ تمام کام وہ انتہائی سکون اور مکمل منصوبہ بندی کے ساتھ کرتا رہا۔ اس دوران میں صوفیہ اور اس کے گھر والوں کے ساتھ اس کا میل جول انتہا کو پہنچ گیا۔ اس نے ایک کرسچین باوقار اور معزز جوڑے کو اپنے والدین کے طور پر متعارف کرا کے اس تعلق کو پائیدار بنانے کی تصدیق بھی حاصل کر لی تھی۔ اس کا جال انتہائی مضبوط اور پُرکشش تھا۔ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اس نے جعلی دستخطوں کی مدد سے چیکوں کے ذریعے دو دن کے اندر لاکھوں روپے کی رقوم اس بنک سے نکلوائیں اور پھر ایک رات اپنے ساتھیوں کے تعاون سے بنک پر ڈاکہ ڈالا۔ چوکیدار نے مزاحمت کی تو اسے گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا اور بنک لاکرز کی جعلی چابیوں کی مدد سے بڑے اطمینان اور سکون کے ساتھ بنک کو خالی کر کے تمام نقدی اور قیمتی زیورات سمیٹ کر غائب ہو گیا۔ صوفیہ کے باپ نے سنگین مقدمات کا سامنا کرنے کے مقابلے میں موت کو ترجیح دی اور خودکشی کر لی۔ کچھ عرصہ بعد ٹونی اس بنک کو لوٹنے کے علاوہ دوسرے مختلف مقدمات کے سلسلے میں گرفتار ہوا تو صوفیہ کو پہلی بار پتہ چلا کہ وہ کتنے بڑے جرائم پیشہ گروہ کا سرغنہ تھا۔ اس کے سنگین اور گھناؤنے جرائم کے باوجود صوفیہ خلوصِ دل سے اس کو چاہنے لگی تھی۔ وہ ایک سادہ دل، باوفا اور مستقل مزاج عورت تھی اور یہ نہیں جانتی تھی کہ ٹونی نے اس کے ساتھ محبت کے جو وعدے کیے وہ سب جھوٹے تھے اور ٹونی کبھی بھی اس کے ساتھ مخلص نہیں تھا۔ وہ ملاقاتیں، وہ باتیں، وہ وعدے سب ڈھونگ تھے۔ ٹونی کی گرفتاری کے بعد صوفیہ نے جیل میں اس سے ملاقات کی تو اُس نے صوفیہ کو پہچاننے سے صاف انکار کر دیا اور بالکل انجان بن گیا۔ لیکن صوفیہ دل کے ہاتھوں مجبور تھی۔ وہ مختلف جیلوں سے ٹونی سے ملنے کی کوشش کرتی رہی لیکن ٹونی نے اس سے کبھی سیدھے منہ بات نہیں کی۔ غریب صوفیہ یہ نہیں جانتی تھی کہ اُس وقت ٹونی، روزی اور شوکت کی مدد سے ایک نیا ڈرامہ کھیلنے میں مصروف تھا جس کا مرکزی کردار میری ذات تھی۔ صوفیہ ایک سادہ لوح لڑکی تھی اور اپنی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر ٹونی کی ہر غلطی کو معاف کرنے کے لیے تیار تھی لیکن میری زبانی ٹونی کی صحیح تصویر دیکھنے کے بعد اسے یقین ہو چکا تھا کہ وہ ایک انتہائی خودغرض اور سنگدل انسان ہے جس کے نزدیک دنیا کا کوئی رشتہ اور کوئی جذبہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ٹونی کو وہ بے وفا تو سمجھتی تھی لیکن اسے یہ علم نہیں تھا کہ وہ اوّل نمبر کا ہرجائی اور مطلب پرست بھی ہے اور صوفیہ کی طرح بے شمار سیدھی سادی لڑکیوں کو محبت کے سبز باغ دکھا کر ان کی زندگی برباد کر چکا ہے۔ میں صوفیہ کے دل میں ٹونی کے خلاف نفرت اور انتقام کے جذبات پیدا کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا اور یہ میری آئندہ زندگی کے لیے انتہائی اہم تبدیلی تھی۔ کیونکہ صوفیہ ہی وہ لڑکی تھی جو ٹونی کے خلاف مجھے

مجھے دستاویزی ثبوت فراہم کر سکتی تھی اور یہ شہادت دے سکتی تھی کہ میں ہی دراصل یوسف ہوں۔

سڑک کے دو طرفہ گھنے درختوں کا سلسلہ اب ختم ہونے لگا تھا اور ایک جگہ ہم ایک ایسے موڑ پر پہنچ چکے تھے جہاں سے تین سڑکیں مختلف اطراف کو جاتی تھیں۔ صوفیہ میری راہبر تھی۔ اس کے اشارے پر میں نے ایک نسبتاً پتلی سڑک پر جیپ ڈال دی۔ یہ سڑک بہتر حالت میں تھی اس لیے جیپ رفتار اب تیز ہو گئی تھی، لیکن چند میل کا سفر طے کرنے کے بعد ہمیں گاڑی روکنی پڑی۔ درخت کا ایک بہت موٹا تنا سڑک پر اس طرح پڑا ہوا تھا کہ گاڑی کا گزرنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے زور سے بریک لگا کر جیپ روک دی اور اس کے ساتھ ہی سڑک کے دونوں طرف سے چھ سات مسلح، بلند قامت آدمی نمودار ہوئے۔ درخت کے تنے کے پیچھے سے بھی دو اُٹھ کھڑے ہو گئے۔ میں نے جھک کر فرش پر پڑی ہوئی برین گن کو سنبھال لیا اور بلند آواز میں پوچھا: "کیا بات ہے؟ کون ہو تم؟ ہمارا راستہ کیوں روکا ہے؟"

ان میں سے ایک تنومند شخص جس کے چہرے پر گھنی ڈاڑھی تھی اور جس نے اپنے منہ پر ڈھاٹا باندھ رکھا تھا آگے بڑھ کر جیپ کے نزدیک آیا۔ میں نے دبی زبان میں صوفیہ کو پستول سنبھالنے کے لیے کہا، لیکن اپنا برین گن والا ہاتھ کھڑکی سے نیچے ہی رہنے دیا۔

وہ شخص جیپ سے ایک فٹ کے فاصلے پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ ہم دونوں کا جائزہ لیا اور پھر بدتمیزی سے ہنسنے لگا۔ "بڑا اچھا مال ہے۔ چلو۔ کچھ دل بہلانے کا سامان تو ملا۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "تو کون ہے صاحب اتنی رات گئے سنسان راستے پر کیوں جا رہے ہو؟"

"میں تو اپنے کام سے جا رہا ہوں مگر تم اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"ہم بھی اپنا کام کر رہے ہیں صاحب۔" اُس نے کچھ فاصلے پر کھڑے ہوئے مسلح لوگوں کی طرف اشارہ کیا اور بولا: "یہ سب مزدور لوگ ہیں صاحب۔ جان جوکھوں میں ڈال کر حق حلال کی روزی کماتے ہیں۔ اب آپ بھی گاڑی سے اُتر کر نیچے آ جاؤ۔ جو کچھ مال آپ کے پاس ہے وہ ہمارے حوالے کر دو۔" یہ کہہ کر وہ بھونڈے پن سے صوفیہ کی طرف دیکھ کر ہنسا اور اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ "یہ مال ہم بڑے پیار سے رکھیں گے صاحب۔"

میں نے برین گن والا ہاتھ تیزی سے اُٹھایا اور اس کے بڑھتے ہوئے ہاتھ پر دے مارا۔ تکلیف سے اس کی چیخ نکل گئی اور دوسرے ہاتھ سے بندوق چھوٹ کر نیچے گر گئی۔ اس نے مجھے ایک موٹی سی گالی دی اور بندوق اُٹھانے کے لیے جھکا مگر میرا ہاتھ دوبارہ حرکت میں آ چکا تھا۔ اس بار میری برین گن کی نالی اس کے جھکے ہوئے سر پر لگی اور وہ کسی آواز کے بغیر اوندھے منہ زمین پر گر گیا۔ اس سے پہلے کہ دُور کھڑے ہوئے اس کے ساتھی کچھ جان سکتے میری برین گن نے گولیاں اُگلنی شروع کر دیں۔ دو اور ڈاکو زخمی ہو کر گرے اور باقی حفاظت کے خیال سے زمین پر گر گئے۔ میں نے پہلا برسٹ مارنے کے بعد فائرنگ روک دی اور بلند آواز میں کہا۔

"سڑک پر سے درخت ہٹا کر راستہ صاف کر دو ورنہ ایک آدمی بھی بچ کر نہیں جا سکے گا۔"

جواب میں ان میں سے ایک ڈاکو نے لیٹے لیٹے ہی گولی چلائی جو مجھ سے کافی فاصلے سے ہو کر نکل گئی، لیکن دوسرے ہی لمحے برین گن سے نکلنے والی گولیوں نے اسے بندوق پھینک کر چیخنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے برین گن کا ایک اور برسٹ مارا۔ گولیاں ان سب کے نزدیک سے مٹی اور کیچڑ ہوا میں اُچھالتی ہوئی نکل گئیں۔

"راستہ صاف کر دو ورنہ کوئی ایک بھی بچ کر نہیں جائے گا۔"

اب وہ خاصے سہمے ہوئے تھے۔ تین ڈاکو زخمی ہو چکے تھے۔ باقی لوگ خاموشی سے اُٹھ کر درخت کو سڑک پر سے ہٹانے کے کام میں مصروف ہو گئے۔ میری تمام تر توجہ سامنے سڑک پر مرکوز تھی۔ اچانک صوفیہ کی چیخ فضا میں گونجی۔ میں نے چونک کر اپنے برابر کی سیٹ کی طرف دیکھا۔ زخمی ہو کر اوندھے منہ زمین پر گرنے والا ڈاکو میری عدم توجہ سے

فائدہ اٹھا کر نہ جانے کس وقت جیپ کا چکر کاٹ کر صوفیہ کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اس وقت صوفیہ کی گردن اس کے ہاتھ میں تھی۔ دوسرے ہاتھ میں اس نے بندوق تھام رکھی تھی جسکی نالی کا رُخ میری طرف تھا اور انگلی لبلبی پر تھی۔ یہ ایک بے بسی کا لمحہ تھا اور اس یک لخت حملے نے ہم دونوں کو بالکل بوکھلا کر رکھ دیا تھا میں نے سوچنے میں ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا۔ میرے ہاتھ کی ایک ضرب نے بندوق کی نالی کا رُخ پھیر دیا اور پھر میرے ہاتھوں نے ڈاکو کو تھام کر ایک جھٹکا دیا۔ وہ جیپ کے دروازے میں کھنچتا چلا گیا، لیکن اس کی بندوق سے ہونے والے فائر نے اسی کے ایک ساتھی کو گھائل کر دیا۔ جو یہ موقعہ غنیمت جان کر تیزی سے جیپ کی طرف لپکا آ رہا تھا۔ برین گن کی نالی ڈاکو کے سر سے ٹکرائی اور اس کے ہاتھوں سے صوفیہ کی گردن چھوٹ گئی۔ میں نے زور سے دھکا دے کر اسے دوبارہ باہر دھکیل دیا اور وہ سامان کی بوری کی طرح سڑک پر گر گیا۔ اس کے ساتھی جو غالباً اس کے حملے سے شہہ پا کر جیپ پر ٹوٹ پڑنے کو تیار تھے۔ دوبارہ خاموشی سے درخت کے تنے کو سڑک پر سے ہٹانے کے کام میں مصروف تھے۔ صوفیہ اس اچانک حملے سے سہم گئی تھی۔ اسے چوٹ تو نہیں آئی تھی لیکن ذہنی طور پر وہ سخت متاثر اور خوف زدہ ہو گئی تھی۔ سڑک صاف ہوتے ہی میں نے احتیاطاً برین گن کا ایک برسٹ فضا میں داغ دیا جس سے خوفزدہ ہو کر ڈاکو دوبارہ سے اوندھے مُنہ زمین پر گر گئے اور میں تیزی سے جیپ کو لے کر آگے نکل گیا۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد میں نے صوفیہ کو تسلی دینے کی کوشش کی، لیکن اب وہ اس فوری تاثر سے آزاد ہو چکی تھی۔

"اگر آپ بروقت کارروائی نہ کرتے تو میرا کیا حشر ہوتا؟" وہ سہمی ہوئی آواز میں بولی۔

"جو ہو چکا ہوا اس پر افسوس کرنا اور جو ہوتے ہوتے رہ گیا اس کے بارے میں سوچ کر پریشان ہونا عقلمندی کی نشانی نہیں۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ ہمارا سفر اور کتنا باقی رہ گیا ہے؟!"

"آدھے گھنٹے بعد ہم گھر پہنچ جائیں گے۔" اس نے اپنی گردن سہلاتے ہوئے کہا۔

دس پندرہ منٹ کے سفر کے بعد سڑک کے کناروں پر آبادی کے آثار نظر آنے لگے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے سے مکانات بنے ہوئے تھے جن میں سے اکثر تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ہم صوفیہ کے بنگلے کے سامنے پہنچے تو رات آدھی سے زیادہ گزر گئی تھی۔ بنگلے کے احاطے کا گیٹ صوفیہ نے اُتر کر کھولا۔ برآمدہ میں تاریکی تھی لیکن صوفیہ نے روشنی جلا کر اطلاعی گھنٹی بجائی اور چند منٹ بعد ایک ملازم نے دروازہ کھولا اور اتنی رات گئے ہم دونوں کو برآمدے میں موجود پا کر حیران رہ گیا۔ صوفیہ کی رہنمائی میں ڈرائنگ روم تک پہنچ کر میں ایک آرام دہ صوفے پر نیم دراز ہو گیا تھکاوٹ اور بھوک کے مارے بُرا حال تھا۔ صوفیہ نے ملازم کو کھانے کا سامان لانے کی ہدایت کی اور لباس تبدیل کرنے کی غرض سے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ میں نے آنکھیں موندلیں اور سوچنے لگا کہ اب میرا اگلا قدم کیا ہونا چاہیے۔

یکایک کسی نے جھٹکے سے میرا ہاتھ چہرے پر سے ہٹا دیا۔ چونک کر دیکھا تو میری نظر سامنے ایک بلند قامت اور مضبوط جسم نوجوان پر پڑی جو شعلہ بار نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ "تمہیں یہاں آنے کی جرأت کیسے ہوئی؟"

میں نے حیران ہو کر اسکی طرف دیکھا۔ اس سے پہلے میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"بے غیرت۔ دھوکے باز۔ میں نے تمہیں اس گھر میں قدم رکھنے سے منع کیا تھا۔ نکل جاؤ یہاں سے ورنہ...." اس نے غصے میں میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور مجھے اُٹھا کر کھڑا کر دیا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے اور چہرہ غصے سے سُرخ ہو رہا تھا۔

"مگر۔ مگر اس بدتمیزی کی کوئی وجہ؟...."

میری بات ختم ہونے سے پہلے ہی اس کا ہاتھ گھوما اور ایک انتہائی بھرپور گھونسہ میرے جبڑے پر لگا میں لڑکھڑا کر صوفے پر گر گیا۔ وہ ایک طاقت ور اور مضبوط شخص تھا اور اپنی طاقت کو استعمال کرنا جانتا تھا۔ میں نے دوبارہ کھڑے

ہونے کی کوشش کی لیکن اس نے جھک کر میری گردن پر وار کیا۔ اگر میں تیزی سے بائیں جانب نہ جھکتا تو یہ دوسرا بھرپور گھونسہ یقیناً میرے لیے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا دوبھر کر دیتا۔ پہلے گھونسے کی ضرب سے میرا چہرہ ابھی تک درد کر رہا تھا۔ اس کے اگلے حملے سے پہلے میں اُچھل کر صوفے سے کھڑا ہو گیا۔ اس بار وہ کراٹے کے انداز میں دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے میری جانب بڑھ رہا تھا۔ میں نے پیچھے ہٹنا چاہا لیکن گنجائش نہیں تھی۔ مجبوراً میں نے اس کا وار اپنی کلائی پر روکا اور مجھے یوں لگا جیسے دو آہنی ہتھوڑے میری کلائی سے ٹکرائے ہیں۔ اس کے ابتدائی حملے انتہائی پُر قوت اور بھرپور تھے اور اس نے مجھے سنبھلنے کا بہت کم موقعہ دیا تھا۔ اتنی چوٹیں کھا لینے کے بعد میں پہلے سے زیادہ چوکس اور چوکنا ہو چکا تھا۔ اسے مزید حملوں کا موقعہ دینا میرے حق میں انتہائی خطرناک ثابت ہو سکتا تھا چنانچہ اگلے حملے سے پہلے ہی میں ہوا میں اُچھلا اور صوفوں کو پھلانگتا ہوا کمرے کے عین وسط میں کھلی جگہ پر پہنچ کر مستعد کھڑا تھا۔ وہ میری توقع سے زیادہ پھرتیلا ثابت ہوا اور میرے تعاقب میں ہوا میں تیرتا ہوا میری جانب آیا۔ میں نے بائیں جانب جھکائی دے کر اس کی زد سے نکلنا چاہا مگر اس نے فضا ہی میں پلٹا کھایا اور اپنا رُخ دائیں جانب کر لیا۔ اسکی ٹانگیں فرش سے ٹکرانے سے پہلے ہی اس کی دونوں کلائیاں آہنی سلاخوں کی طرح میرے ہاتھوں سے ٹکرائیں جو میں نے اپنے دفاع کے لیے چہرے کے سامنے بلند کر لیے تھے اور میرے جسم کی تمام ہڈیاں جھن جھنا کر رہ گئیں۔ اسکی قوت اور تکنیک قابل تعریف تھی اور انداز سے ظاہر تھا کہ وہ جوڈو اور کراٹے کے فن میں طاق ہے۔ مجھے اپنی مہارت پر ناز ہے، لیکن محض چند منٹ کے مقابلے میں مجھے احساس ہو گیا تھا کہ میں ایک ایسے حریف کے مقابل ہوں جو میری ذرا سی غفلت یا کمزوری سے بھی پورا پورا فائدہ اُٹھانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس نے کسی توقف کے بغیر اپنا دایاں پیر اُٹھایا اور ایک زوردار ضرب میرے سینے پر لگائی اور میرے سنبھلنے سے پیشتر اس کا بایاں گھٹنہ میرے پیٹ سے ٹکرایا اور میں دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ تھامنے پر مجبور ہو گیا۔ اگر میں نے شدید تربیت کے تحت اپنے پیٹ کے مَسل اکڑا نہ لیے ہوتے تو شاید ضرب مجھے اوندھے مُنہ گر کر زمین چاٹنے پر مجبور کر دیتی۔ پے در پے چند بھرپور وار کرنے کے بعد وہ سانس لینے کو رُکا۔ غالباً وہ میری سخت جانی پر حیران بھی ہو رہا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے ایسے چیدہ چیدہ حملے کیے تھے کہ میری جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو ہزیمت خوردہ ہو جاتا۔ اس کا ایک لمحے کا وقفہ میرے لیے انتہائی کارآمد ثابت ہوا۔ میں اپنا پیٹ پکڑے ہوئے جھکا ہوا تھا اور وہ اس توقع میں تھا کہ میں سر نہ اُٹھا سکوں گا اور اوندھے مُنہ فرش پر گر جاؤں گا، لیکن میں نے اپنا بھاری جوتے میں لپٹا ہوا پیر اُٹھا کر اس کے پنجوں پر دے مارا۔ وہ بے اختیار چلّایا اور پیر پکڑ کر چاروں طرف گھوم گیا۔ جیسے ہی اس کا رُخ میری طرف ہوا میں نے ایک دایاں اور پھر بایاں گھونسہ پوری قوت سے اس کے جبڑے پر رسید کیا اور پھر میری کہنی اس کی پسلیوں سے ٹکرائی اور وہ تکلیف سے دوہرا ہو گیا۔ میں نے اسے ذرا بھی مہلت نہیں دی۔ اس کا بازو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر ایک جھٹکے کے ساتھ اسے اُچھالا اور وہ ہوا میں پرواز کرتا ہوا ڈرائنگ روم کی دیوار سے ٹکرایا۔ دیوار میں سجی ہوئی بیش قیمت تصویریں چکنا چور ہو کر گئیں اور وہ خود بھی ان کے ساتھ دیوار کے ساتھ ڈھیر ہو گیا۔ اسکی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں، لیکن وہ حیران نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ میں تیزی سے اس کی طرف لپکا اور میں نے اسے ٹھوکر مارنے کے لیے اپنا دایاں پیر اُٹھایا، لیکن اپنے عقب میں صوفیہ کی چیخ سُن کر رک گیا۔ صوفیہ چائے کی ٹرے کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ ٹرے اس کے ہاتھ سے زمین پر گر گئی اور وہ دوڑتی ہوئی ہماری جانب آئی۔ "رُکیے۔ یہ کیا کرتے ہیں آپ؟" اتنا کہا اور وہ دیوار کے ساتھ سر ٹکائے ہوئے نیم دراز شخص کے پاس دوزانوں بیٹھ گئی۔ "بھیا۔ بھیا۔ فوزی بھیا۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھپ تھپایا جس کا فوری اثر یہ ہوا کہ اس نے زور سے اپنا سر جھٹکا

اور تیزی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی غضب ناک نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ دانت پیستا ہوا میری طرف لپکا مگر صوفیہ ہم دونوں کے درمیان آگئی۔

"فومی بھیا۔ یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ مہمان کے ساتھ یہ سلوک کیا جاتا ہے؟" اُس نے غصّے بھرے لہجے میں کہا۔

"یہ مہمان نہیں میرا دشمن ہے۔ اس نے ہم سب کو تباہ کر دیا ہے۔ اسے اس گھر میں آنے کی جرأت کیسے ہوئی؟" وہ دھاڑا۔

"اسے میں اپنے ساتھ لائی ہوں" صوفیہ نے تنک کر کہا۔

"تمہاری بیوقوفی پہلے بھی ہمیں رُلا چکی ہے۔ مگر اب میں یہ برداشت نہیں کروں گا۔ آج یہ اس گھر سے بچ کر نہیں جا سکتا" وہ گھونسہ تان کر مجھ پر لپکا۔

میں اپنا دفاع کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھا، لیکن صوفیہ میرے سامنے آ کر تن گئی "رُک جاؤ" وہ چلّائی "یہ لوٹی نہیں ہے۔ یہ لوٹی نہیں ہے!"

فومی کے قدم بے اختیار رُک گئے۔ اس نے حیران ہو کر صوفیہ کو اور پھر مجھے دیکھا "یہ لوٹی نہیں ہے؟!" اس کے منہ سے نکلا۔

"ہاں۔ یہ اس کا ہم شکل ہے۔"

"جس کی لوٹی اور پولیس کو تلاش ہے؟" وہ مسکرایا "بہت اچھا ہوا کہ تم اسے یہاں لے آئیں"

"بھیا۔ یہ بے قصور ہے۔ لوٹی نے ہماری طرح ان کا بھی سب کچھ چھین لیا ہے۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے کی مدد کی ضرورت ہے۔"

فومی ہونقوں کی طرح اسکی شکل تکنے لگا۔

"ادھر آؤ۔ میں تمہیں بتاتی ہوں" صوفیہ اس کا ہاتھ تھام کر صوفے کی طرف لے گئی اور مجھے مخاطب کر کے کہنے لگی "سوری یوسف۔ بھیا کو بھی میری طرح دھوکہ ہو گیا۔ آؤ۔ یہاں بیٹھ جاؤ۔"

میں سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا اور صوفیہ نے مختصر طور پر اپنے بھائی فومی کو میرے اور لوٹی کے بارے میں بتایا۔ فومی خاموش بیٹھا مجھے گھور رہا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ فوری طور پر وہ اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا۔ "فومی" صوفیہ نے اسے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ "کیا یہ اچھا نہیں ہو گا کہ ہم یوسف کو تمام ڈاکومنٹری ثبوت مہیا کر دیں تاکہ لوٹی کی اصلیت سب کو معلوم ہو جائے اور وہ اپنے گناہوں کی سزا پا لے۔"

فومی بیزاری سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور تلخ لہجے میں بولا "صوفی۔ تم نے پہلے جو فیصلہ کیا تھا وہ بھی میری مرضی اور مشورے کے بغیر کیا تھا یہ اور بات ہے کہ اس کے تلخ نتائج مجھے بھگتنے پڑے۔ میں نے لوٹی کے ساتھ تمہاری دوستی کو کبھی پسند نہیں کیا تھا اور ڈیڈی کو بھی ٹوکتا رہا تھا کہ یہ شخص بہت بدخصلت اور کمینہ معلوم ہوتا ہے، لیکن تم اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھیں اور ڈیڈی تمہاری محبت کے سامنے کچھ نہیں بول سکتے تھے۔ تم نے ٹھوکر کھائی، ذلت اٹھائی، خاندان کی رسوائی اور ڈیڈی کی موت کا سبب بنیں۔ البتہ یہ کان کھول کر سُن لو کہ لوٹی کی محبت کا بخار تمہارے سر سے اُتر جانا چاہیئے۔ میں اپنی بدنامی اور ذلت کا بدلہ اس سے ضرور لوں گا۔ جب بھی موقع ملا میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا کمرے سے رُخصت ہو گیا۔ جاتے جاتے اس نے راستے میں پڑی ہوئی میزوں کو ٹھوکریں رسید کر کے اُلٹ دیا جو اس کے اُبلتے ہوئے جذبات کا کھلا اظہار تھا۔

میں چُپ چاپ بیٹھا دیکھتا رہا، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ فومی جسے میں ایک بدمعاش اور بگڑا ہوا نوجوان

سمجھتا تھا، اس معاملے میں حق بجانب تھا۔ اگر اسکی جگہ میں بھی ہوتا تو اسی ردِّعمل کا مظاہرہ کرتا۔ لوٹی نے ایک بے عقل اور جذباتی اور رومان پسند لڑکی کی حماقتوں سے فائدہ اُٹھایا تھا۔ اس قسم کی لڑکیاں عام طور پر بہکے ہوئے جذبات کے دھارے میں بہہ جاتی ہیں اور نہ صرف خود اپنی بلکہ اپنے گھر والوں اور اہل خاندان کی رسوائی اور بربادی کا سبب بھی بنتی ہیں۔ یہی انجام صوفیہ کا اور اس کے اہل خاندان کا ہوا تھا اور اس کی تمام تر ذمہ داری صوفیہ پر ہی تھی۔

صوفیہ کو بھی اس صورتِ حال کا احساس تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نادم اور شرمسار نظر آ رہی تھی۔ اپنے بھائی کی تلخ کلامی کے جواب میں اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا تھا جو اس کے احساسِ شکست کا کھلا ثبوت تھا۔ چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر صوفیہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی اور بولی "میں آپ کے لیے دوسری چائے بنا کر لاتی ہوں"

"نہیں صوفیہ" میں نے اسے روک دیا "مجھے چائے کی خواہش نہیں ہے۔ میں صرف وہ ثبوت دیکھنا چاہتا ہوں جن کی مدد سے میں انصاف حاصل کر سکتا ہوں اور لوٹی کی اصلی حقیقت دُنیا پر ثابت کر سکتا ہوں"

وہ دوبارہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ اگرچہ وہ اس وقت حزن ملال کی تصویر بنی ہوئی تھی، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک خوش اندام اور دلکش عورت تھی۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو لوٹی خوش قسمت تھا۔ میں نے اس کی زخم خوردہ جتنی بھی لڑکیوں کو دیکھا تھا۔ وہ سب کی سب خوبصورتی اور رعنائی کا پیکر تھیں اور وہ سب لوٹی کے فریب میں آ کر اپنا سب کچھ یہاں تک کہ جان بھی گنوا بیٹھی تھیں۔

"میرے پاس لوٹی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے خطوط ہیں۔ اس کی تصاویر ہیں وہ تمہارے دستخط اور ہینڈ رائٹنگ کی چاہے کتنی مشق کر لے، لیکن جب لوٹی کے طور پر اس سے تحریر لکھوائی جائے گی تو وہ اس کی اصل تحریر کے مشابہ ہو گی جبکہ لوٹی اور تمہاری تحریر میں بہت فرق ہو گا۔"

میں فرطِ اضطراب میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا "ہاں تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ حیرت ہے کہ مجھے اس بات کا پہلے خیال کیوں نہیں آیا؟"

وہ اُداسی سے مسکرائی "اس کے علاوہ میری ڈائری میں اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں بہت سی تفصیل باتیں درج ہیں۔ اس کے قریبی دوستوں اور رشتے داروں کے پتے اور ٹیلیفون نمبر ہیں جن کے ذریعے لوٹی کے فریب کا پردہ چاک کیا جا سکتا ہے....."

"کہاں ہے وہ ڈائری اور خطوط؟" میں اس کی بات کاٹ کر بولا "خدا کے لیے مجھے لا دو۔"

"اتنی بے صبری کا مظاہرہ مت کرو" وہ انگریزی میں کہنے لگی۔ "ذرا مجھے بھی اپنے آپ کو سمیٹ لینے دو۔ میرے فراہم کیے ہوئے ثبوت لوٹی کو پھانسی کے تختے پر پہنچا دیں گے اور وہ خواہ کتنا ہی خراب کیوں نہ ہو میرا محبوب رہ چکا ہے۔"

میں نے پریشانی سے اس کی طرف دیکھا۔ عورت ذات کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ یہ گھڑی گھڑی گرگٹ کی طرح رنگ بدلتی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر صوفیہ بھی اپنے ارادے سے پھر جائے؟!

وہ سوچوں میں گُم ہو گئی تھی جو میرے حق میں حد درجہ خطرناک بات تھی۔ "صوفیہ" میں نے اسے آواز دی تو وہ چونک پڑی "تم نے یقیناً اس سے پیار کیا ہے، لیکن وہ شیطان صفت انسان اس کا مستحق نہیں تھا۔ اس نے صرف تمہارے ہی نہیں دوسرے معصوم خاندانوں کو بھی برباد کیا ہے۔ کتنی ہی لڑکیوں کی زندگی خراب کی ہے اور پھر پلٹ کر ان کی خبر تک نہیں لی۔ وہ کسی بھی اعانت اور نرم دلی کا مستحق نہیں ہے۔ ذرا یہ تو سوچو کہ وہ زہریلا ناگ اور کتنی بے گناہ لڑکیوں اور کتنے شریف خاندانوں کو ڈسے گا"

وہ مسکرائی اور بولی "فکر نہ کرو یوسف۔ میں ایک بار جو ارادہ کر لوں اس کو اتنی آسانی سے نہیں بدلتی، لیکن پھر بھی

آخر عورت ہوں نا۔ فریب کھانے اور نقصان اُٹھانے کے باوجود پہلی محبت کے نقوش میرے دل سے اتنی آسانی سے نہیں مٹیں گے۔" پھر وہ میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھ کر کہنے لگی۔ "کیا تمہیں بھی اپنی بیوی سے محبت ہے؟"

میں اس اچانک اور خلافِ توقع سوال سے بوکھلا گیا۔ "میں ایک وفا شعار شوہر کے طور پر اس کو پسند کرتا تھا۔ مگر وہ میرے ساتھ بیوفائی کر رہی تھی۔"

"شاید یہی وجہ ہے کہ تمہیں اپنی اصلیت ثابت کرنے میں مشکل پیش آ رہی ہے۔ اگر تمہاری بیوی اس سازش میں لوٹی کے ساتھ شریک نہ ہوتی تو تم ایک منٹ میں یہ ثابت کر سکتے تھے کہ لوٹی کون ہے اور یوسف کون ہے؟"

"وہ کس طرح؟" میں نے پوچھا۔

اس کا چہرہ شرم سے سُرخ ہو گیا۔ نگاہیں جھکا کر بولی۔ "یوسف میاں بیوی کا رشتہ دُنیا کا قریب ترین رشتہ ہے۔ کوئی آپس میں چاہے کتنا بھی ہم شکل ہو اس کی بیوی سے یہ راز چھپا نہیں رہ سکتا۔ بیوی اپنے شوہر کی ہر عادت ہر انداز اور ہر حرکت سے واقف ہوتی ہے۔ وہ یہ بھی جانتی ہے کہ اس کے شوہر کے جسم پر علامتی نشان کس کس جگہ اور کیسے ہیں؟"

میں بے تابی سے اس کے نزدیک چلا گیا۔ "اوہ صوفیہ، صوفیہ۔ کاش تم مجھے پہلے مل جاتیں تو میں اتنی ٹھوکریں نہ کھاتا۔ خدا کے لیے اب میرے صبر و ضبط کا زیادہ امتحان نہ لو۔ مجھے بتاؤ ڈائری اور خطوط کہاں ہیں۔ پھر ہم ابھی فوری طور پر وکیل کے پاس چلیں گے۔"

وہ آہستہ سے بولی۔ "تم اطمینان سے بیٹھو۔ میں نے وہ سب چیزیں بہت احتیاط سے سیف میں رکھ چھوڑی ہیں ابھی لے کر آتی ہوں۔" وہ آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی کمرے سے رُخصت ہو گئی یا شاید مجھ ہی کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ چوں کی چال سے چل رہی ہے۔ اطمینان سے بیٹھنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا میں بے چینی اور بے قراری سے کمرے میں چکر لگانے لگا۔ ہر لمحہ مجھے انتہائی طویل محسوس ہو رہا تھا۔ صوفیہ ڈرائنگ روم سے گزر کر راہداری کی سیڑھیوں کے راستے اوپر کی منزل میں چلی گئی اور میں ایک بے چین روح کی طرح کمرے میں چکر لگاتا رہا۔ مارے خوشی کے میرے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میری ٹانگیں سیسے کی بن گئی ہوں۔ میرے لیے قدم اُٹھانا تک مشکل ہو رہا تھا۔ آخرکار میں بے بسی سے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ میرے دل کی دھڑکنیں انتہائی تیز ہو گئی تھیں۔ لگتا تھا جیسے دل سینے سے باہر نکل جائے گا۔ یکایک زنانہ چیخ کی ایک تیز آواز نے مجھے متحرک کر دیا۔ آواز اوپری منزل سے آئی تھی۔ میں بے تحاشا دوڑتا ہوا سیڑھیاں چڑھتا ہوا ایک لاؤنج میں جا پہنچا۔ سامنے ایک کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں لپک کر دروازے میں پہنچا اور ٹھٹک کر رہ گیا۔ کمرے میں ایک آہنی الماری کے دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے اور صوفیہ اس کے برابر والے بیڈ پر اوندھی پڑی ہوئی تھی۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ صوفیہ کی جانب لپکا۔ "صوفیہ" میں نے اسے پُکارا اور مجھے احساس ہی نہیں ہوا کہ میں نے بہت بلند آواز میں اس کا نام لیا ہے۔ معاً مجھے خیال گزرا کہ وہ مر چکی ہے، لیکن نزدیک جانے پر پتہ چلا کہ وہ زندہ تھی۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا مُنہ ڈھانپ رکھا تھا اور ہولے ہولے سسکیاں لے رہی تھی۔

"صوفیہ" میں نے اپنی آواز کو نارمل کرنے کی کوشش کی۔ "کیا بات ہے؟!"

"یوسف" وہ تھکے تھکے انداز میں اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ "میری ڈائری....."

"کیا ہوا ڈائری کو؟"

"ڈائری تصویریں اور سارے کاغذات غائب ہیں۔"

میں نے پلٹ کر الماری کی طرف دیکھا جس کے اندر ایک سیف نما خانہ کھلا ہوا صاف نظر آ رہا تھا۔ میں تیزی سے

سیف کے پاس گیا۔ چند کاغذات اور زیورات کے سوا اس میں کچھ نہیں تھا۔ صوفیہ بیڈ پر لُٹے پٹے انداز میں بیٹھی حیران آنکھوں سے مجھے تک رہی تھی۔

"تم نے آخری بار ان چیزوں کو کب دیکھا تھا؟"

وہ بھرّائی ہوئی آواز میں بولی۔ "ڈیڈی کے مرنے کے بعد میں نے یہ سیف کبھی نہیں کھولا۔ مگر... مگر..." وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "اب تو میرے پاس بھی کچھ نہیں بچا۔" وہ دوبارہ ہاتھوں سے مُنہ ڈھانپ کر تکیے پر گر گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے پیاسے کے سامنے سے پانی ہٹا لیا گیا ہو۔ میرے تمام خواب، تمام آرزوئیں پل بھر میں خاک میں مل چکی تھیں۔ صوفیہ کے لیے رونے کا مقام نہیں تھا۔ وہ تو صرف ایک بے وفا محبوب کی یادگاروں سے محروم ہوئی تھی۔ دراصل ماتم تو مجھے کرنا چاہیے تھا جس کی آخری اُمید بھی سراب ثابت ہوئی تھی۔ اُمید کی جو کرن کچھ دیر پہلے جگمگائی تھی اب نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی اور میرے لیے گھُپ اندھیروں کے سوا اور کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ لوٹی ایک چالاک مجرم تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنے جُرم کا ہر نشان مٹانے پر تُلا ہوا تھا۔ اُس نے بہت بڑا جوا کھیلا تھا۔ اور اپنی زندگی داؤ پر لگا دی تھی۔ ایسا عیار اور مکار شخص اپنے جرائم کے ثبوت کسی دوسرے کے قبضے میں کیوں کر رہنے دیتا۔

میں نے صوفیہ کو تسلی دینے کی کوشش کی۔ تھرماس سے نکال کر اسے پانی پلایا اور دلاسہ دیا۔ "پریشان کیوں ہوتی ہو۔ اپنے ذہن پر زور ڈالو۔ تمہیں اور بہت سی باتیں یاد آ جائیں گی۔" میں اسے دلاسہ دے رہا تھا مگر خود مجھے بھی احساس تھا کہ میرے الفاظ کتنے کھوکھلے اور بے معنی تھے۔ اس نے جو خزانہ کھو دیا تھا اب اس کا عشرِ عشیر بھی واپس نہیں مل سکتا تھا۔ اُس نے لوٹی سے نفرت کا اظہار ضرور کیا تھا، لیکن اس کی محبت کی نشانیوں سے محروم ہونے کا صدمہ اس کے دل پر شدت سے اثر انداز ہوا تھا۔ یہ نقصان لاشعوری طور پر اس کے لیے نقصانِ عظیم تھا۔ بالآخر وہ ایک عورت تھی اور اس جذباتی نقصان کا احساس اسے تہی دامن کر گیا تھا۔ کچھ دیر تک وہ اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی اور پھر رفتہ رفتہ پُرسکون ہو گئی۔ صوفیہ کی ڈائری، لوٹی کے خطوط اور تصاویر کی گمشدگی کے بعد میرے لیے فکر کی یہ بات تھی کہ میں جس مقصد سے صوفیہ کے ساتھ آیا تھا وہ اب کیونکر پورا ہو سکتا تھا؟

تمام دستاویزی ثبوت غائب ہو چکے تھے، لیکن ابھی صوفیہ کا وجود میری مدد کے لیے موجود تھا۔ صوفیہ کے بیانات کی مدد سے میں لوٹی کی اصلیت ثابت کر سکتا تھا، لیکن کس طرح؟ یہ ایک انتہائی مشکل اور پیچیدہ مسئلہ تھا اور پھر میرا واسطہ جس دُشمن سے پڑا تھا وہ انتہائی عیار اور محتاط تھا۔ اس نے اپنے خلاف کوئی امکانی ثبوت بھی باقی نہیں چھوڑا تھا۔ میرا دماغ اس اچانک ناکامی کی وجہ سے قریب قریب مفلوج ہو چکا تھا۔ میں سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتوں سے فی الوقت محروم ہو چکا تھا، لیکن سوال یہ تھا کہ اگر میں کسی وکیل سے اس بارے میں مشورہ کروں تو کس سے؟ میرا اپنا وکیل حالات کی ناسازگاری کے باعث میرا ساتھ دینے پر تیار نہ ہوتا، بلکہ اس کے پاس جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ میرے قریبی اور عزیز دوستوں نے بدنصیبی کے حالات میں میرے ساتھ جس بے رُخی اور بے اخلاقی کا برتاؤ کیا تھا۔ اس کے بعد میں کسی اور پر بھروسہ کر کے خود کو ایک نئی مصیبت میں گرفتار نہیں کرانا چاہتا تھا۔ قابلِ اعتماد دوستوں کا طرزِ عمل اور رائج دیکھنے کے بعد اب کسی اور پر اعتماد کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا مگر اپنی مشکل آسان کرنے کے لیے ضروری تھا کہ میں کسی نہایت اعلیٰ پائے کے وکیل کی خدمات حاصل کروں۔ صوفیہ میرے لیے ایک اُمید بھری کرن کے طور پر نمودار ہوئی تھی۔ میرا دل کہتا تھا کہ میں اس کے ذریعے اس گتھی کو سُلجھانے میں کامیاب ہو سکتا ہوں۔ مایوسی اور نااُمیدی کے اندھیروں میں ڈوب کر بالکل دل شکستہ ہو چکا تھا۔ مگر یکایک ایک روشنی سی

چمکی اور میرا دماغ روشن ہو گیا۔ میرے چہرے پر مسکراہٹ اور دل میں کامیابی کی اُمنگ پیدا ہو گئی۔

عاشی!۔۔۔ وہ عاشی جو میری بے وفائی اور بے اعتنائی کے زخم سہنے کے باوجود میری محبت کو اپنے دل سے نہیں نکال سکی تھی۔ وہی عاشی میرے مصائب کا حل تلاش کر سکتی ہے۔ اتنے عرصے کی دُوری اور ایک دوسرے سے لاتعلقی کے باوجود نہ جانے کیوں میرا دل گواہی دیتا تھا کہ عاشی ہی میرا ہاتھ تھام کر مجھے اس مشکل سے نجات دلا سکتی ہے۔ آخری بار جب میری اس سے ملاقات ہوئی تھی تو تمام تر ناراضی اور شکوے شکایات کے باوجود اس کا رویہ حوصلہ شکنی کا نہ تھا۔ اس کی برہمی بجا تھی، لیکن میں نے یوں محسوس کیا تھا جیسے اسے میری ذات پر یقین ہے اور میں نے اپنی صفائی میں جو کچھ کہا تھا اُس نے اس پر یقین بھی کر لیا تھا۔ عاشی ہی میری راہنمائی کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ اس کا ٹیلیفون نمبر مجھے یاد تھا۔ رات کافی گزر چکی تھی۔ چند پہر باقی تھا۔ اس کے بعد دن کا سورج طلوع ہونے والا تھا۔ میں صبح کا انتظار بھی کر سکتا تھا، لیکن میری بے چینی نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں وقت اور موقعے کی مصلحت کو پیشِ نظر رکھے بغیر فوراً اسے فون کروں اور پھر نہ جانے کیوں میرا دل کہہ رہا تھا کہ مجھے صوفیہ کے گھر پر زیادہ دیر نہیں رُکنا چاہیئے۔ خدا جانے یہ میرا وہم تھا یا خوف اور احتیاط، لیکن میری چھٹی حس مجھے مجبور کر رہی تھی کہ میں اس گھر سے رُخصت ہو جاؤں۔ چنانچہ صوفیہ سے اجازت لے کر میں نے ڈوبتے دل کانپتے ہاتھوں سے عاشی کا نمبر ملایا۔ کچھ دیر گھنٹی بجتی رہی اور میں اُمید و بیم کے عالم میں ریسیور تھامے چپ چاپ کھڑا رہا۔ ہو سکتا ہے مجھے درست فون نمبر یاد نہ رہا ہو؟ ممکن ہے عاشی مکان میں موجود نہ ہو؟ یا اس کا فون خراب ہو؟ اور پھر اتنی رات گئے ایک لڑکی کو یوں ٹیلی فون کر دینا کہاں تک مناسب ہے؟ کبھی خیال آتا کہ فون بند کر دوں، لیکن پھر کوئی طاقت مجھے مجبور کر دیتی کہ اُمید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑوں۔ کئی گھنٹیوں کے بعد میں مایوس ہو کر فون بند کرنے ہی والا تھا کہ دوسری جانب سے کسی نے فون اُٹھایا اور ایک نیند میں ڈوبی ہوئی مدہوش آواز سنائی دی: "ہیلو؟"

یہ مختصر سا لفظ ہی میرے تمام جسم میں سنسنی پیدا کرنے کے لیے کافی تھا۔ میں اس کی آواز لاکھوں آوازوں میں پہچان سکتا تھا۔ وہ عاشی ہی تھی۔ میری عاشی۔

"ہیلو؟ کون ہے بھئی؟" اُس نے میری خاموشی سے تنگ آکر تنک لہجے میں پوچھا۔

"عاشی!" میں نے بڑی کوشش کے بعد کہا اور دوسری جانب مجھے اُس کی طویل سانس لینے کی آواز سنائی دی: "کون؟ یوسف؟!"

میں کہ آلامِ روزگار اور گردشِ زمانہ کے ہاتھوں ستایا ہوا، اُکتایا ہوا ایک دل شکستہ انسان تھا۔ اس کا یہ فقرہ سُن کر خوشی سے جھُوم اُٹھا۔ وہ مجھے پہچان گئی۔ وہ مجھے بھولی نہیں ہے۔

"ہاں عاشی۔ یہ میں ہوں یوسف۔!" میری آواز حلق میں اٹکنے لگی۔

"اتنی رات گئے؟!" اسکی آواز میں حیرت اور سرد مہری کی آمیزش تھی۔

"مجھے تمہاری ضرورت ہے۔" میں نے منت بھرے لہجے میں التجا کی۔ "تم جانتی ہو کہ میں کتنی مصیبت میں گرفتار ہوں۔ دنیا میں میرا کوئی دوست اور مددگار نہیں ہے۔ کیا تم کسی ایسے وکیل کو جانتی ہو جو میری بات پہ یقین کر لے اور دھوکہ نہ دے۔"

"بات کیا ہے؟" اس کے لہجے میں ہمدردی کا عنصر جھلکنے لگا۔

"یہ میں فون پہ نہیں بتا سکتا۔ کیا میں تم سے مل سکتا ہوں؟"

"ابھی۔ اس وقت؟!"

"جتنی جلد ممکن ہو سکے۔ ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔"

وہ سوچ میں پڑ گئی۔

"بولو عاشی۔ چپ کیوں ہو گئیں۔ کیا تم بھی میرا ساتھ چھوڑ دو گی؟"

جواب میں اسکی آواز سرد تھی۔ "میں تمہارا ساتھ دینے کی پابند نہیں ہوں، لیکن تم سے صرف ایک بار مل سکتی ہوں۔ کل صبح تم سنٹرل پارک کے مغربی دروازے پر آ جانا۔ میں نو بجے تمہارا انتظار کروں گی۔"

میں نے کہا: "میں سُرخ رنگ کی کار میں آؤں گا۔" اُس نے جواب دیئے بغیر فون بند کر دیا۔

نہ جانے کیا بات تھی کہ عاشی سے بات کرتے ہی میرے دل کو سکون آ جاتا تھا۔ لگتا تھا اب کوئی مشکل، کوئی مصیبت مجھے درپیش نہیں ہو گی۔ شاید یہ اعتماد اور گہری محبت کا نتیجہ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں نے اس سے ٹوٹ کر محبت کی تھی۔ عشق کیا تھا۔ اس عشق میں کبھی کمی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ میرے اس جذبے کا اسے بھی احساس ہو۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بھی کوشش کے باوجود مجھ سے نفرت نہیں کر سکی تھی۔ میں نے صوفیہ کی طرف دیکھا جو صوفے میں گم صم بیٹھی خلاء میں تک رہی تھی۔ وہ غریب اپنے ہی دکھوں میں مبتلا تھی۔ اس کے شکستہ دل اور مجروح جذبات کا میں بخوبی اندازہ کر سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں اس کے غم سے خود کو بھی افسردہ محسوس کرنے لگا تھا۔

"صوفیہ۔" میں نے اسے پکارا تو وہ چونک پڑی۔ "تمہارے کاغذات کی چوری اس بات کا ثبوت ہے کہ لوٹی کو تم پر بھروسہ نہیں ہے اور وہ تمہیں اپنے لیے خطرناک سمجھتے ہوئے کسی وقت بھی راستے سے ہٹا سکتا ہے۔"

صوفیہ کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ "تو پھر میں کیا کروں؟"

"تمہارا اس مکان میں رہنا مناسب نہیں ہے۔ کیا کوئی ایسا دوست یا رشتہ دار ہے جہاں تم پناہ لے سکتی ہو؟" میں نے کہا۔

وہ سوچنے لگی۔ "ہاں۔ ایک دُور کی خالہ ہیں جو ایک گاؤں میں رہتی ہیں۔"

"لوٹی اُن کے بارے میں جانتا ہے۔" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ ان کے بارے میں تو فومی بھی نہیں جانتا۔ ہم لوگوں کا ان سے زیادہ میل جول نہیں رہا۔ مگر میں ان کے گھر جا چکی ہوں۔"

"یہ بہت اچھی بات ہے۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔ "تم ضرورت کی چیزیں سمیٹ لو۔ ہم اسی وقت یہاں سے رخصت ہو جائیں گے۔"

"اِس وقت؟" وہ حیران ہو گئی۔ "مگر۔ مگر فومی کو تو خبر کرنی چاہیئے۔"

"فومی خدا جانے کہاں گیا ہے اور کب آئے گا۔ تم فومی سے بعد میں بھی رابطہ قائم کر سکتی ہو۔ چلو بس اب دیر نہ کرو۔ ہمارے پاس زیادہ مہلت نہیں ہے۔"

صوفیہ اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی اور میں یہ حساب لگانے میں مصروف ہو گیا کہ آیا میں صبح نو بجے تک عاشی کے شہر پہنچ بھی جاؤں گا یا نہیں۔ فاصلہ پونے دو سو میل کا تھا۔ اگر ہم لوگ فوراً روانہ ہو جائیں اور مناسب رفتار سے سفر کریں تو آسانی کے ساتھ وہاں پہنچ سکتے تھے، لیکن میں بلاوجہ رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔ میری چھٹی حس مجھے متواتر خبردار کر رہی تھی کہ اس مقام پر مزید قیام کرنا ہمارے حق میں اچھا نہیں ہو گا۔ میں بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ غالباً صوفیہ کو بھی معاملے کی سنگینی کا احساس ہو چکا تھا۔ کیونکہ چند منٹ بعد ہی وہ ایک چھوٹا سوٹ کیس سنبھالے ہوئے آ گئی اور کہنے لگی: "ہم فومی کے لیے پیغام چھوڑ دیں؟"

"بالکل نہیں۔" میں نے اسے ٹوکا۔ "فی الحال تمہارے بارے میں فومی کو بھی کوئی خبر نہیں ہونی چاہیئے۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ وہ تشدد کے ذریعے اس سے تمہارا پتہ معلوم کر لیں۔"

میں نے اس کے ہاتھ سے سوٹ کیس لے لیا اور ہم دونوں تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے باہر کی طرف جانے لگے۔ یکایک صوفیہ رُک گئی "اوہو۔ میں کیس تو ساتھ لینا بھول ہی گئی۔ تم گاڑی میں بیٹھو۔ میں ابھی آئی" وہ تیزی سے اندر کی طرف لوٹ گئی۔ میں برآمدے سے گزر کر کار تک گیا اور چھوٹا سوٹ کیس پچھلی سیٹ پر ڈال دیا۔ ابھی میں دروازہ بند کرنے بھی نہ پایا تھا کہ ایک فائر اور چیخ کی آواز آئی۔ میں بے تحاشا اندر کی طرف دوڑا۔ پے در پے تین فائر ہوئے اور پھر خاموشی چھا گئی۔

میں دوڑتا ہوا ڈرائنگ روم میں داخل ہوا اور اوپر جانے والی لکڑی کی سیڑھیوں کے نزدیک صوفیہ کو قالین پر گرا ہوا دیکھ کر ٹھٹک کر رہ گیا۔ وہ بے حس وحرکت پڑی تھی۔ میں اس کی طرف لپکا مگر پھر ایک فائر ہوا اور گولی میرے کان کے پاس سے سنسناتی ہوئی نکل گئی۔ میں چھلانگ لگا کر ایک بڑے صوفے کی آڑ میں پہنچ گیا، لیکن اس سے پہلے ایک اور گولی میرے کاندھے کے نزدیک سے گزر گئی۔ یہ گولی دوسری سمت سے چلائی گئی تھی۔ جس کا صاف مطلب یہ تھا کہ اس وقت گھر میں کم از کم دو قاتل موجود تھے۔ صوفے کے پیچھے رُکا رہنا میرے لیے خطرے کا سبب بن سکتا تھا۔ اس لیے میں نے چاروں طرف دیکھ کر ایک بڑے چوبی سائیڈ بورڈ کے عقب میں پناہ لینے کا ارادہ کیا اور ایک قلابازی لگا کر سائیڈ بورڈ کے پیچھے پہنچ گیا، لیکن اس دوران میں تین اور فائر ہو گئے مگر خوش قسمتی سے نشانہ خطا گیا۔ ڈرائنگ روم کا خوبصورت فانوس روشن تھا اور اس کی روشنی میں دو مخالفوں کی گولیوں سے محفوظ رہنا میرے لیے آسان نہیں تھا۔ میں نے اپنی پیٹی میں اُڑسا ہوا پستول نکال کر پہلا فائر فانوس کی رسی پر کیا اور فانوس چھت پر سے زمین پر گر کر زبردست شور کے ساتھ ٹوٹ گیا۔ اب کمرے میں مکمل تاریکی چھا گئی۔ میرے فائر کے ساتھ ہی دو فائر ہوئے اور گولیاں سائیڈ بورڈ کی مضبوط لکڑی میں پیوست ہو گئیں، لیکن میں نے ایک فائر کا شعلہ دیکھ لیا تھا اندازے سے نشانہ باندھ کر میں نے گولی چلا دی اور چیخ کی آواز نے تصدیق کر دی کہ میری گولی نشانے پر بیٹھی ہے۔

گویا اب ہم دو حریف باقی رہ گئے تھے اور گنتی کے اعتبار سے مقابلہ برابر کا تھا مجھے یہ بھی احساس تھا کہ کچھ دیر بعد کمرے کی تاریکی رفتہ رفتہ کم ہو جائے گی اور ہم دونوں ہی دیکھنے کے قابل ہو جائیں گے میں نے اس مختصر سے وقت کا فائدہ اُٹھا کر ہاتھ پیروں کے سہارے چوپایوں کی طرح باہر جانے والے دروازے کی طرف چلنا شروع کر دیا، لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ کوئی میز یا کرسی مجھ سے نہ ٹکرا جائے۔ میں ہاتھوں سے اپنے آگے ٹٹولتا ہوا اندھوں کی طرح آہستہ آہستہ باہر کی طرف بے آواز رینگ رہا تھا۔

کچھ دیر کے بعد ہوا کے جھونکے نے مجھے احساس دلایا کہ بالآخر میں بیرونی دروازے کے نزدیک پہنچ چکا ہوں۔ میں سانس لینے اور آس پاس کا جائزہ لینے کی غرض سے رُک گیا اور پھر مطمئن ہو کر میں نے ٹٹولنے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا جو کسی چیز سے ٹکرا گیا مگر یہ کوئی فرنیچر نہیں، ایک انسانی ہاتھ تھا۔ ہم دونوں نے بیک وقت ایک دوسرے کو محسوس کر لیا اور دونوں کی گرفت ایک دوسرے کے پنجے پر مضبوط ہو گئی۔ میں نے مخالف کے پنجے کو مضبوطی سے اپنی گرفت میں لے کر پوری قوت سے جھٹکا دیا اور اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ میں اس کے ہاتھ کو تھامے ہوئے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور دوسرے ہاتھ سے ایک زوردار گھونسہ رسید کیا جو اس کے منہ سے ٹکرایا۔ اس کا پنجہ ابھی تک میری گرفت میں تھا جس کی وجہ سے وہ درد سے بے قابو ہو کر چلا رہا تھا۔ اس کے پنجے کو دائیں ہاتھ میں تھامے ہوئے میں نے اپنا پستول والا ہاتھ فائر کرنے کے لیے اوپر اُٹھایا۔ مگر ٹھیک اسی وقت اُس نے بھی فائر داغ دیا۔ اگر میں سیدھا کھڑا ہوتا تو گولی یقیناً میرے سینے کے پار ہو جاتی۔ میں نے سوچے سمجھے بغیر فائر داغ دیا اور میرا نشانہ خطا نہیں ہوا۔ ایک چیخ کی آواز سنائی دی اور میرے مخالف کا جسم زمین پر گرنے لگا۔ میں نے اس کا پنجہ ہاتھ سے چھوڑ دیا اور خود انتہائی تیزی سے زمین پر لوٹ لگا کر دوسری جانب چلا گیا۔ کچھ دیر بالکل

خاموشی رہی۔ میں آہستہ آہستہ دیوار کی طرف بڑھنے لگا، لیکن پستول پر میری گرفت مضبوط رہی ہاتھ سے ٹٹول کر میں نے روشنی جلا دی اور خود احتیاطاً انتہائی پھرتی سے اپنی جگہ سے ہٹ گیا، لیکن یہ غیر ضروری تھا کیونکہ میرا مخالف بے جان ہو چکا تھا۔ وہ قمیص پتلون میں ملبوس ایک درمیانی عمر کا مضبوط شخص تھا۔ اس سے کچھ دُور فرش پر صوفیہ کا بے جان جسم پڑا ہوا تھا۔ میں آہستہ آہستہ اسکی جانب بڑھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور وہ یوں تک رہی تھی جیسے مجھ سے معذرت کر رہی ہو۔

صوفیہ کے ساتھ ہی اس کی محبت، اس کا جذبۂ انتقام اور میری نجات کا امکان سبھی کچھ ختم ہو چکا تھا۔ میں مایوسی سے سر پکڑ کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ صوفیہ کی جوان اور المناک موت کا ماتم کروں یا اپنی بدنصیبی کا؟ میری بے گناہی کا واحد ثبوت بھی اس کے مرنے کے ساتھ ہی ناپید ہو چکا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا اور ذہن بالکل ماؤف ہو کر رہ گیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ اس دلدل سے کیوں کر باہر نکلوں جس میں ہر جدوجہد کے ساتھ میں مزید دھنستا جا رہا تھا۔ میری ہر کوشش مجھے اس میں اور زیادہ غرق کر رہی تھی۔ شاید خدا کو یہ منظور نہیں تھا کہ میں ایک بار پھر باعزت اور پُرسکون زندگی بسر کروں۔ خدا جانے مجھے کن گناہوں کی سزا مل رہی تھی؟!

یہ کیفیت کافی دیر تک مجھ پر طاری رہی، لیکن پھر جدوجہد کے ایک نئے جذبے نے میرے دل میں کروٹ لی اور میں ایک نئی اُمید کی جستجو میں نکل پڑا۔ اب میری منزل سینٹرل پارک تھی جہاں ایک نئی اُمنگ عاشی کی شکل میں میرا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے کار کی رفتار اور تیز کر دی۔ ذہن انتہائی تیزی سے کام کر رہا تھا، لیکن کسی طرف اُمید کی کوئی کرن نظر نہیں آ رہی تھی۔

اب ساری دنیا میں اگر کوئی میرا ہمدرد اور غمگسار تھا تو وہ عاشی کی ذات تھی، لیکن میں جن مسائل سے دوچار تھا ان کو حل کرنا عاشی کے بس میں بھی نہیں تھا۔ اگر صوفیہ زندہ رہتی تو شاید میں گوہر مقصود حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا، لیکن اس بارے میں میرے اندازے درست نکلے۔ ٹونی اس کو کسی قیمت پر بھی زندہ نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ کاغذات حاصل کرنے کے بعد اس کے کارندے کہیں آس پاس ہی صوفیہ کی واپسی کے منتظر رہے ہوں گے اور موقع پاتے ہی اُنہوں نے راستے کا یہ کانٹا دور کر دیا۔ روانگی سے قبل میں نے اُن دونوں کی خوب اچھی طرح تلاشی لی تھی مگر اُن کے پاس سے کوئی کاغذ برآمد نہیں ہوا۔ صاف ظاہر تھا کہ ان کے کچھ اور ساتھی وہ قیمتی اور ضروری کاغذات قبضے میں لے کر پہلے ہی رُخصت ہو گئے تھے۔ کاش صوفیہ مجھے کچھ عرصہ پہلے مل گئی ہوتی؟ کاش ٹونی کے بھیجے ہوئے قاتل کچھ دیر اور وہاں نہ آتے تو میری زندگی کی تاریکیاں چھٹ جاتیں مگر خدا کو یہ منظور نہیں تھا۔

اسی قسم کے خیالات میں اُلجھا ہوا میں مصروفِ سفر رہا۔ کس وقت سویرا ہوا اور سورج کی روشنی پھیلی مجھے کچھ اندازہ نہیں۔ بس میں کار چلاتا رہا اور سوچتا رہا اب میری توجہ کا مرکز صرف اور صرف عاشی تھی۔ جسے میں نے سینٹرل پارک میں نو بجے ملنے کا وقت دیا تھا۔ حالانکہ جس مقصد کے لیے میں اس سے ملنا چاہتا تھا اب وہ باقی نہیں رہا تھا مگر اتنے عرصے بعد عاشی سے ملاقات بذاتِ خود ایک یادگار موقع تھا۔ یہ اور بات تھی کہ اس ملاقات میں آخر ہم ایک دوسرے سے کیا کہیں گے؟ اور اس ملاقات کا انجام کیا ہوگا؟ ہو سکتا ہے وہ مجھے کوئی راہ سجھا دے۔ وہ میرے ساتھ مخلص تھی، میری ہمدرد تھی، ذہین تھی۔ اس کا ذہن کوئی ایسا منصوبہ سوچ سکتا تھا جو میری زندگی کا رُخ بدل کر رکھ دے؟! لیکن اگر کوئی اُمید ہی باقی نہ رہے تو انسان کیوں اور کس طرح زندگی گزارے؟! اس حقیقت کا احساس و ادراک مجھے اب ہو رہا تھا۔

عاشی کے شہر کے در و دیوار نظر آنے لگے تھے۔ میں نے کلائی میں بندھی ہوئی گھڑی کی طرف نظر ڈالی۔ نو بجنے میں

دس منٹ باقی رہ گئے تھے۔ میں پانچ منٹ بعد سینٹرل پارک پہنچنے والا تھا۔ جوں جوں منزل قریب تر آ رہی تھی میرے دل کی دھڑکن تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔

سینٹرل پارک شہر کے وسط میں ایک نہایت وسیع و عریض باغ تھا۔ میں اور عاشی کسی زمانے میں اس باغ میں انتہائی خوشگوار اور رنگین لمحات گزار چکے تھے جن کی یادیں ناقابلِ فراموش تھیں۔ اُس وقت مجھے مستقبل تابناک اور خوشیوں سے معمور نظر آتا تھا، لیکن اب؟!

چند لمحوں بعد پارک میری نگاہوں کے سامنے تھا۔ دُور دُور تک پھیلا ہوا سبزہ زار، رنگین اور خوبصورت پھولوں کے تختے اور کیاریاں، ہوا میں رقص کرتے ہوئے خوش وضع درخت، پانی اُچھالتے ہوئے فوارے سب کچھ وہی تھا۔ صرف ہمارے حالات بدل گئے تھے۔ بڑے اور سیاہ رنگ کے آہنی گیٹ کے سامنے میں نے اپنی کار روکی تو نو بجنے میں صرف ایک منٹ باقی رہ گیا تھا۔ میں نے فٹ پاتھ کے ساتھ درختوں کے سائے میں کار روک کر چاروں طرف دیکھا۔ یہیں کہیں خوشیوں اور اُمیدوں کو دامن میں سمیٹے، میری نگاہوں کے لیے زمانے بھر کی رنگینیاں اور رعنائیاں لیے ہوئے عاشی میری منتظر تھی۔

میں ماضی کے طربناک، خوشبوؤں سے مہکتے ہوئے یادگار لمحوں کے جھولوں میں جھولنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ یکایک ایک سفید رنگ کی کار عقب میں آ کر مجھ سے کچھ فاصلے پر رُک گئی۔ سفید رنگ کی اس فوکس ویگن کار میں صرف ایک شخص موجود تھا جسے پہچاننے میں مجھے ذرا بھی دقت نہیں ہوئی۔ اس چہرے اور اس شخصیت کو میں کیونکر فراموش کر سکتا تھا؟ کسی زمانے میں وہ میرے نزدیک ترین اور میرا محبوب ترین دوست تھا۔ اس لیے کہ وہ عاشی کا بھائی تھا۔ عاشی کا بھائی —— کبھی ایسا بھی وقت تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوا کرتے تھے، لیکن اب ہمیں ایک دوسرے سے ملے ہوئے ایک زمانہ بیت گیا تھا۔ عاشی کا مجھے وقت دے کر خود نہ آنا اور اپنے بھائی کو بھیجنا تعجب انگیز تھا۔ ہو سکتا ہے وہ کسی مصلحت یا مجبوری کی وجہ سے خود آنا مناسب نہ سمجھتی ہو اور اُس نے اپنے بھائی کو میری راہنمائی اور راہبری کے لیے بھیج دیا ہو؟ لیکن اس کے بھائی کے میرے بارے میں تاثرات اور جذبات اب کیا ہو سکتے تھے ان کے پیشِ نظر اس کا اس موقعے پر میرے پاس چلا آنا قابلِ غور بلکہ قابلِ فکر تھا۔

وہ کار سے نکل کر میری طرف بڑھا تو میں نے اس کے چہرے پر نفرت اور خشونت کے آثار صاف اور واضح طور پر دیکھ لیے۔ وہ کسی محبت یا دوستی کے جذبے سے میری کار کی طرف نہیں بڑھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر لکھی ہوئی تحریر میں بخوبی پڑھ سکتا تھا۔

وہ چند قدم کا درمیانی فاصلہ طے کر کے میری کار کے نزدیک آ گیا۔ اسٹیئرنگ پر میری گرفت از خود سخت اور مضبوط ہو گئی۔ میں ماحول میں یک لخت پھیل جانے والی کشیدگی کو محسوس کرنے لگا تھا۔

"یوسف"۔ اس کی زبان سے میرا نام ایک نفرت انگیز گالی بن کر نکلا اور میں کانپ کر رہ گیا۔ "تماشا ختم ہو چکا ہے۔ تمہارے لیے تمام راستے مسدود ہو چکے ہیں۔ پولیس نے چاروں طرف سے تمہیں گھیرے میں لے لیا ہے۔ اب کسی چالاکی یا حماقت کی گنجائش نہیں ہے۔ یقین نہیں تو خود اپنے اطراف دیکھ لو ——" اس کا طنز اور نفرت بھرا لہجہ مجھے گھائل کر گیا۔

لیکن میں نے مسکراتے ہوئے اس سے پوچھا "...... ایک لمبے عرصے کے بعد تمہیں دیکھ کر مجھے خوشی ہو رہی ہے تمہارے ساتھ گزرے ہوئے خوشگوار لمحات کو میں فراموش نہیں کر سکا ہوں"۔ اس کا چہرہ ایک دم سیاہ پڑ گیا۔ "لیکن تمہیں اچانک اور خلافِ توقع یہاں دیکھ کر مجھے حیرت ہو رہی ہے۔ مجھے یاد نہیں آ رہا کہ میں نے تمہارے ساتھ ملاقات کا وقت مقرر کیا ہے؟"

"میں نے تمہاری اور عاشی کی تمام گفتگو ٹیلی فون پر سن لی تھی۔ اس وقت عاشی خواب آور گولیوں کے نشے میں گھر پر سوئی پڑی ہے اور اس کی جگہ پولیس تمہارا استقبال کرنے کے لیئے وہاں موجود ہے۔ ذرا اپنے آس پاس تو دیکھو"۔

میں اس کے کہنے سے پہلے ہی چاروں طرف کا جائزہ لے چکا تھا۔ پولیس کی ایک جیپ تقریباً تیس چالیس گز کے فاصلے پر میری کار کے پیچھے کھڑی تھی۔ جس وقت میں عاشی کے بھائی سے باتوں میں مصروف تھا غالباً یہ اُسی وقت پہنچی ہو گی۔ اس جیپ میں بیٹھے ہوئے مسلح سپاہی میں صاف طور پر دیکھ رہا تھا۔ وہ سب مستعد اور چاق و چوبند بیٹھے تھے۔ بیک ویو مرر میں ان سپاہیوں کو دیکھنے کے بعد میں نے اپنے سامنے دیکھا جہاں مخالف سمت سے ایک اور جیپ آ کر بیس گز کے فاصلے پر رُک گئی تھی۔ ظاہر ہے یہ سب مجھے گرفتار کرنے آئے ہیں۔

میگا فون پر مجھے ایک تحکمانہ آواز سنائی دی "لوٹی۔ تم بازی ہار چکے ہو۔ فرار ہونے کا کوئی راستہ نہیں ہے چاروں طرف پولیس کا گھیرا تنگ ہو چکا ہے۔ خود کو پولیس کے حوالے کر دو"۔

واقعی۔ میرے لیے فرار کی تمام راہیں مسدود ہو چکی تھیں۔ میرے آگے اور پیچھے مسلح سپاہیوں سے بھری ہوئی پولیس گاڑیاں تھیں اور چند قدم کے فاصلے پر عاشی کے بھائی کا انتقام بھرا چہرا مسکرا رہا تھا۔ مجھے بے بس اور مجبور دیکھ کر اسے کو جتنی مسرت ہو رہی تھی وہ اس کے چہرے سے ظاہر تھی۔ ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو وہ اپنے اس طرزِ عمل میں حق بجانب تھا۔ میں نے اس کی اکلوتی، لاڈلی اور انتہائی معصوم بہن کو دھوکہ دیا تھا۔ ایسا غم دیا تھا جو آج بھی زہر بھرے تیر کی مانند عاشی کے سینے میں پیوستہ تھا۔ وہ وفا شعار میری طرف سے بے وفائی کے یقین کے باوجود مجھے نہیں بھلا سکی تھی۔ اپنی پیاری بہن کو غمگین اور دل شکستہ دیکھ کر اس کے بھائی پر جو قیامت ٹوٹی ہو گی اس کا اندازہ لگانا مشکل نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس دامِ ہمرنگ زمیں میں پھنس جانے کے باوجود میں اس سے ناراض نہیں تھا اور نہ ہی اسے موردِ الزام ٹھہرا رہا تھا۔ میرے سامنے صرف ایک ہی راستہ کھلا ہوا تھا جو موت کی وادی کی طرف جاتا تھا دن کی تیز روشنی کے باوجود دنیا میری آنکھوں میں تاریک ہو چکی تھی۔ پولیس افسر ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ میں بازی ہار چکا تھا۔ زمانہ جیت گیا تھا۔ زندگی کی شطرنج پر میں نے اب تک جتنے بھی داؤ لگائے تھے وہ رائیگاں گئے تھے۔ پانسہ میرے حق میں نہیں پڑا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ہر بازی میں ہار میرا مقدر بن چکی تھی۔ سورج کی چمک، پھولوں کی مہک، سبزے کی ہریالی، دُنیا کی رنگینی اور رونق سب کچھ میرے لیے بے کار تھا۔ کیا بالآخر یہی میری جدوجہد کا انجام تھا؟

لیکن نہیں۔ میرے سوئے ہوئے عزم نے ایک بار پھر جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا۔ میرا نام یوسف تھا۔ میں لوٹی نہیں تھا۔ میں نے شکست قبول کرنا نہیں سیکھا تھا۔ میں آخری دم تک، آخری سانس تک جنگ کرنے والا انسان تھا۔ مجھے ایک آخری داؤ ضرور لگانا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ میری زندگی کا آخری داؤ ہو، لیکن میں زیست کے قمار خانے میں آخری داؤ آزمائے بغیر ہار نہیں مان سکتا تھا۔

میں نے کن انکھیوں سے اپنی کار کے پائیدان کی طرف دیکھا۔ کار کے فرش پر لوٹی اور اس کے ساتھیوں نے چھینے ہوئے اسلحہ کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ میں نے آہستگی سے ہاتھ بڑھایا اور ایک برین گن کے دستے کو مضبوطی سے تھام لیا۔ اس کے ساتھ ہی کار کے اسٹیئرنگ پر میرے دوسرے ہاتھ کی گرفت اور مضبوط ہو گئی۔

عاشی کا بھائی نپے تلے قدموں کے ساتھ میری کار کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کا مسکراتا ہوا چہرہ مجھ سے نزدیک ہوتا جا رہا تھا اور اس کی آواز میرے کانوں میں زہر گھولتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی "یاد رکھو یوسف۔ یہ میری بہن کی زندگی برباد کرنے کا انتقام ہے۔ میرے سوا اس وقت کوئی نہیں جانتا کہ تم لوٹی نہیں ہو، لیکن تم کبھی اپنی اصلیت ثابت نہیں کر سکو گے۔ عاشی تو شاید تمہیں معاف کر دے، لیکن یاد رکھو میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔ کبھی نہیں —— خدا حافظ"۔

اتنا کہہ کر وہ تیزی سے مڑا اور اپنی کار کی طرف جانے لگا۔ میرے آگے اور پیچھے کھڑی پولیس کی گاڑیوں میں کوئی حرکت نہیں ہوئی مگر میگا فون پر مجھے پولیس افسر کا اعلان صاف سنائی دے رہا تھا "ہتھیار پھینک دو لوٹی اور کار سے باہر نکل کر خود کو پولیس کے حوالے کر دو۔ تمہارے لیے اب کوئی راستہ باقی نہیں ہے۔"

مگر اہلِ عمل اپنے لیے راستہ خود پیدا کرتے ہیں۔ میں اس اثنا میں ذہنی طور پر مصمم ارادہ کر چکا تھا۔ عاشی کا بھائی جس کی مخبری پر پولیس مجھے گرفتار کرنے یہاں پہنچی تھی اپنی کار کے پاس جا کر بونٹ سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو چکا تھا اور بڑی دلچسپی اور اشتیاق سے آئندہ رونما ہونے والے تماشے کا منتظر تھا۔ میں نے یکایک برق جیسی تیزی سے برین گن اٹھائی اور سامنے کھڑی ہوئی پولیس گاڑی کی طرف رُخ کر کے ایک برسٹ مار دیا۔ ماحول کے سناٹے میں اچانک برین گن کی فائرنگ کی آواز گونج اُٹھی۔ عاشی کا بھائی اس ناگہانی آفت سے گھبرا گیا اور بدحواسی کے عالم میں باغ کی طرف بھاگا۔ میں نے سامنے والی جس جیپ پر گولیاں برسائی تھیں اس میں سوار سپاہی اس ایکشن کے لیے ہرگز تیار نہیں تھے۔ دانستہ طور پر میں نے جیپ کے ٹائروں کو نشانہ بنایا تھا جن کے پھٹنے کی آوازوں سے مزید دھماکے ہوئے اور جیپ میں سوار سپاہی اپنی گاڑی سے کود کر بے تحاشا پناہ لینے کے لیے جھاڑیوں اور درختوں کی طرف دوڑ پڑے۔ میں نے کسی توقف کے بغیر برین گن کا رُخ پیچھے کھڑی ہوئی جیپ کی طرف موڑ دیا اور گولیوں کی بارش کر دی وہ لوگ سامنے والی جیپ پر فائرنگ سے بوکھلائے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں سوچنے اور ہتھیار اُٹھانے کی مہلت نہیں دی اور برین گن کا ایک اور برسٹ جیپ کے آس پاس کی زمین کو اُدھیڑتا ہوا گزر گیا۔ ان کے سنبھلنے یا ہوش میں آنے سے پہلے میں نے برین گن برابر والی سیٹ پر پھینکی اور ایکسی لیٹر پر اپنے پاؤں کا دباؤ ڈالا۔ کار میں نے بدستور اسٹارٹ رکھی ہوئی تھی جس کی وجہ سے میرا کام اور آسان ہو گیا تھا۔ ایکسی لیٹر پر دباؤ پڑتے ہی میری کار گولی کی طرح سامنے کی طرف لپکی۔ جہاں پولیس کی جیپ میری راہ میں حائل تھی۔ اس جیپ کے تمام سپاہی کود کود کر بھاگ چکے تھے۔ صرف ایک فرض شناس اور بہادر سپاہی اس میں موجود رہ گیا تھا۔ جو اس اچانک حملے کے ابتدائی اثرات سے سنبھل چکا تھا اور اپنی بندوق کا رُخ میری طرف کر رہا تھا، لیکن اس سے پہلے کہ وہ فائر کرتا میری کار آناً فاناً اس کے سر پر پہنچ چکی تھی۔ وہ بے اختیار جیپ میں اوندھا لیٹ گیا اور اسی لمحہ میری کار نے جیپ کے داہنے حصے پر زوردار ٹکر رسید کی۔ میں اس تصادم کے لیے بالکل تیار تھا۔ اس لیے پُرزور جھٹکے کے باوجود جم کر بیٹھا رہا، لیکن سامنے والی جیپ ایک پھرکی کی طرح گھوم گئی اور اس کا رُخ بدل گیا البتہ اب وہ میری راہ میں حائل نہیں تھا۔ میں اتنی دیر میں گیئر بدل چکا تھا اور میری کار کی رفتار میں اضافہ ہو گیا تھا۔ بیک ویو مرر میں مجھے شور مچاتے اور بھاگ دوڑ کرتے ہوئے سپاہی نظر آ رہے تھے جو بوکھلائے ہوئے کسی مقصد کے بغیر اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ ان کا انچارج زمین پر سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا اور دونوں ہاتھوں میں میگا فون تھامے کوئی اعلان کر رہا تھا لیکن میں ان تمام باتوں سے بے پروا ایکسی لیٹر پر اپنے پیر کا دباؤ بڑھانے میں مصروف تھا اور میری کار نے اب اسپیڈ پکڑ لی تھی۔ باغ والی سڑک کو طے کر کے میں نے بائیں جانب ایک چوڑی سڑک پر تیزی سے موڑ کاٹا اور میری کار کے ٹائر چیخ و پکار کرنے لگے۔ اس وقت سڑک پر زیادہ ٹریفک موجود نہیں تھا۔ گزرتی ہوئی چند گاڑیوں والوں نے حیران ہو کر دیکھا اور احتیاطاً اپنی گاڑیاں ایک جانب کر لیں۔ میں ان راستوں سے پوری طرح واقف نہیں تھا نہ یہ جانتا تھا کہ یہ سڑک مجھے کہاں لے جائے گی؟ لیکن میرے پیشِ نظر محض ایک ہی مقصد تھا۔ وہ یہ کہ جتنی جلد ممکن ہو سکے اس شہر سے دُور نکل جاؤں۔ مجھے اطمینان تھا کہ پولیس کی جیپ گاڑیاں میرا تعاقب کرنے کے لیے ناکارہ ہو چکی ہیں، لیکن کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد میں نے پچھلی جیپ کو تیز رفتاری سے اپنا تعاقب کرتے ہوئے پایا تو فکرمند ہو گیا۔ اگلی جیپ کے ٹائر بیکار ہو چکے تھے، لیکن میں یہ بھول گیا تھا کہ پیچھے والی جیپ کے ٹائر میری فائرنگ سے بالکل محفوظ رہے تھے اور وہی جیپ اس وقت میرا پیچھا کر رہی تھی اگرچہ مجھے آواز نہیں سنائی دے رہی تھی، لیکن میں اُس جیپ میں بیٹھے ہوئے پولیس افسر کی جھلک صاف دیکھ

سکتا تھا جو میگا فون ہاتھ میں تھامے کوئی اعلان کرنے میں مصروف تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ مجھے نصیحت کر رہا ہوگا کہ خود کو پولیس کے حوالے کر دوں۔

پولیس والوں نے میرا تعاقب شروع کرنے سے پیشتر دوسرے متعلقہ لوگوں کو بھی مطلع کیا تھا یا نہیں؟ اس بارے میں مجھے کوئی علم نہیں تھا، لیکن اگر دوسرے علاقوں کی پولیس نے بھی میرا پیچھا کرنا شروع کر دیا تو میری گرفتاری یقینی تھی۔ یہ سوچ کر میں نے اپنی کار کو انتہائی تیز رفتاری سے دوڑانا شروع کر دیا۔ اس کوشش میں ایک دو بار میں ایکسیڈنٹ سے بھی بچا اور کچھ دوسروں نے خود ہی میری راہ سے ہٹ کر اپنی جان بچائی۔ پلٹ کر دیکھا تو پولیس کی جیپ بدستور میرے پیچھے اُڑی چلی آ رہی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ اب میرے اور اُس کے درمیان فاصلہ زیادہ ہو گیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں ہم شہری آبادی سے باہر نکل آئے اور جس سڑک پر ہماری ریس جاری تھی وہ کھیتوں، ٹیلوں، سبزہ زاروں اور جنگلوں کے درمیان سے گزرتی تھی اور یہاں ٹریفک بھی برائے نام ہی تھا۔ یہ ایک انتہائی طویل اور قریب قریب سیدھی سڑک تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ موقع پا کر کوئی دوراہا یا چوراہا ملنے پر کسی اور سڑک پر نکل جاؤں گا اور اس طرح پیچھا کرنے والوں کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہو جاؤں گا، لیکن مجھے ایسا موقع نہ مل سکا۔ یہ سڑک کیونکہ ویران تھی اس لیے پولیس والوں نے موقع غنیمت جان کر مجھ پر فائرنگ بھی شروع کر دی تھی۔ ان کی گولیاں کافی فاصلے سے گزر رہی تھیں، لیکن ان میں سے کوئی گولی میرے ٹائر یا شیشے پر بھی لگ سکتی تھی۔ اس لیے میرے حق میں بہتر تھا کہ کوئی سڑک یا پگڈنڈی ایسی مل جائے جہاں میں اپنی کار کو پولیس کی فائرنگ سے محفوظ کر سکوں۔ یکایک کچھ فاصلے پر مجھے ایک کچی سڑک بائیں جانب مڑتی ہوئی نظر آ گئی۔ یہ سڑک ایک کھلے میدان سے گزرتی تھی، لیکن کچھ فاصلے پر آگے جا کر درختوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ خدا جانے یہ سڑک جاتی کہاں تھی۔ لیکن فی الوقت میرے لیے یہ ایک نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں تھی۔ پولیس کی جیپ مجھ سے کم از کم دو سو گز کے فاصلے پر تھی اور اس میں سے فائرنگ کا سلسلہ بھی بدستور جاری تھا۔ میں نے فوری طور پر فیصلہ کر کے اپنی کار کو یک لخت اس کچی سڑک پر ڈال دیا اور مجھے بہت جلد اس فیصلے کے فوائد کا اندازہ ہو گیا۔ یہ سڑک کچی اور ناہموار تھی اس لیے پولیس والوں کے لیے اس سڑک پر چلتی جیپ سے فائرنگ کرنا خاصا دشوار تھا۔ جیپ بھی میرے پیچھے مڑ گئی لیکن میری کار سے اُڑنے والی دھول کی وجہ سے میں ان کی آنکھوں سے قریب قریب اوجھل ہو گیا تھا اور یہ میرے لیے انتہائی خوشگوار بات تھی۔ یہی وجہ ہے کہ پولیس کی فائرنگ کا سلسلہ بند ہو گیا اور مجھے ایک بہت بڑے خطرے سے نجات مل گئی تھی۔

کچھ دُور درختوں اور باغوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ یہاں مجھے دائیں بائیں کچھ اور کچے راستے بھی نظر آ رہے تھے۔ مٹی اور گرد و غبار کے طوفان کے باوجود پولیس کی جیپ میرے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ یہ اور بات تھی کہ اس کی رفتار میں کمی آ گئی تھی۔ یکایک مجھے ایک پانی کی جھیل نظر آئی۔ دراصل یہ برسات کا پانی تھا جو نشیبی علاقے میں جھیل کی صورت میں جمع ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک کچی سڑک بل کھاتی ہوئی درختوں کے ایک گھنے ذخیرے کی طرف مُڑ رہی تھی۔ میں نے موقع غنیمت جان کر اپنی کار کو اس پر ڈال دیا۔ بریک لگانے کی وجہ سے گرد کا ایک گولہ سا بلند ہوا مگر یہ میرا مسئلہ نہیں تھا۔ پولیس جیپ کے ڈرائیور نے بھی بڑی تیزی سے یہ موڑ کاٹا، لیکن سامنے صحیح طور پر نظر نہ آنے کی وجہ سے جیپ نہایت تیز رفتاری کے ساتھ جھیل کی طرف بڑھی۔ اس سے پہلے کہ ڈرائیور صورتِ حال کا اندازہ لگا کر جیپ کو روکنے کی کوشش کرتا ایک بڑے چھپاکے کی آواز کے ساتھ پولیس کی جیپ خاصی اونچائی سے جھیل کے پانی میں جا گری۔ میں نے اپنا سفر جاری رکھا لیکن میں اپنے پیچھے صاف طور پر دیکھ سکتا تھا۔ جھیل میں پانی کی گہرائی زیادہ نہیں تھی۔ پھر بھی جیپ اس پانی اور کیچڑ میں پھنس کر کم از کم میرا تعاقب کرنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ کچھ سپاہی جیپ میں سے پانی میں کود رہے تھے۔ ان کا افسر ایک ہاتھ سے میگا فون کو اُونچا اُٹھائے ہوئے کھڑا تھا لیکن

اس ہنگامی حالت میں بھی ایک سپاہی سنے گن سیدھی کر کے میری طرف گولیوں کی بارش کر دی جن کی زد سے میں قطعی محفوظ تھا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ میں تعاقب کرنے والوں کے چنگل سے بچ کر نکل چکا تھا۔ یہ کچا راستہ جگہ جگہ مڑتا اور بل کھاتا ہوا درختوں کے جھنڈ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے اپنا سفر جاری رکھا۔ کچھ میل کا سفر طے کرنے کے بعد ایک جگہ مجھے تین چار مختلف سمتوں میں جاتے ہوئے راستے نظر آئے اور میں نے کسی توقف کے بغیر ان میں سے ایک راستے پر کار ڈال دی۔ اب میں اور زیادہ محفوظ ہو چکا تھا۔

کار کے میٹر پر نظر پڑی تو معلوم ہوا کہ اس میں پٹرول ختم ہونے کے قریب ہے۔ یوں بھی مجھے اب اس کار سے چھٹکارا حاصل کر لینا چاہیے تھا کیونکہ یہ گرفتاری کے لیے میری سب سے بڑی پہچان تھی۔ اس تمام سفر کے دوران مجھے کوئی انسان یا سواری نظر نہیں آئی۔ خدا جانے یہ کون سا علاقہ تھا اور میں کس طرف جا رہا تھا؛ درختوں کے جھنڈ کچھ دیر بعد کم ہونے لگے یہاں تک کہ ایک بار پھر میدانی علاقہ شروع ہو گیا۔ یہ ایک بنجر اور غیر آباد علاقہ تھا۔ دُور دُور تک کھیتی باڑی کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے لیکن تین چار میل بعد مجھے زرعی زمینیں نظر آ گئیں اور پھر میں نے ایک باغ کے اندر بنے ہوئے ایک چھوٹے سے کچے مکان کو بھی دیکھ لیا۔ میں اپنے آپ کو خاصا محفوظ تصور کر رہا تھا اور کھانے پینے کی ضرورت بھی محسوس ہو رہی تھی۔ اس لیے میں نے اس کچے گھر سے کچھ دُور اپنی کار ایک درخت کے سائے میں روک دی اور بے خوف و خطر اُس مکان کی طرف بڑھا۔ لیکن میرے دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی ایک دیہاتی شخص مکان کے پچھواڑے سے برآمد ہوا اور مجھے دیکھ کر ٹھٹک کر رہ گیا۔ میں نزدیک پہنچا تو اُس نے بوکھلا کر مجھے سلام کیا۔

"یہاں تم رہتے ہو؟" میں نے رعب سے پوچھا۔

"جی ملک صاحب۔" وہ مرعوب ہو کر بولا۔

"سنو۔ کچھ کھانے کو مل سکتا ہے؟"

"کیوں نہیں جی۔ جو دال روٹی ہم کھاتے ہیں وہ آپ کو بھی مل جائے گی۔ آپ اِدھر آ جائیں میرے ساتھ۔" اس نے مکان کی طرف میری راہنمائی کی۔

دروازے کے اندر گئے تو ایک چھوٹا سا صحن نظر آیا جس میں دو کمرے بنے ہوئے تھے۔ صحن میں ایک چارپائی کھینچ کر اس نے میرے لیے پیش کر دی۔ "بیٹھو جناب۔ دال ٹکڑا ابھی آ جائے گا۔" اس نے بڑے خلوص سے کہا اور ایک کمرے میں غائب ہو گیا۔

میں اپنے بازوؤں کا تکیہ بنا کر بان کی کھردری چارپائی پر لیٹ گیا۔ پاؤں پھیلا کر ایک لمبی انگڑائی لی تو سکون اور آسودگی کا ایسا احساس ہوا کہ میں نے آنکھیں موند لیں۔ چند ہی لمحے بعد آنکھ لگ گئی۔ ایسا اتفاق پہلے کبھی نہیں ہوا تھا کہ لیٹتے ہی سو جاؤں۔ مگر خدا جانے یہ طویل اعصابی تھکن کا اثر تھا یا اس پُرسکون اور سادہ ماحول کا سبب کہ میں بے خبر سو گیا۔ آنکھ کھلی تو میں نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا اور تیزی سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ گھڑی دیکھی تو پتہ چلا کہ میں تقریباً دو گھنٹے سوتا رہا تھا۔

ابھی میں حیرانی سے چاروں طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ سامنے والے کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک عورت باہر نکل کر آئی۔ مجھے چارپائی پر بیٹھے دیکھا تو وہ ٹھٹک کر رُک گئی۔ وہ ایک صحت مند جوان عورت تھی جس کا گندمی چہرہ تندرستی اور سخت کوشی کے باعث تانبے کی طرح دمک رہا تھا۔ وہ سیاہ رنگ کی شلوار اور قمیص پہنے ہوئے تھی۔ پہلے تو چند لمحے حیرت بھری، بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی۔ پھر بڑی دلکشی سے مسکرائی اور دوپٹے کا آنچل سنبھالتی ہوئی میری طرف بڑھی۔ "سلام ملک جی، آپ نے نیند پوری کر لی اپنی؟ میں نے تو آپ کے لیے تازہ تازہ بیسن کی روٹی پکائی

تھی۔ ساگ بھی گرم کیا تھا۔ پر دیکھا تو آپ بے خبر سو رہے تھے۔ کبیرو تو کہتا تھا ملک جی کو جگا دو پر مَیں نے کہا کوئی گل نہیں۔ تھکے ہوئے ہیں آرام کرنے دو۔ اب آپ نے آرام کر لیا؟ مَیں مُنہ ہاتھ دھونے کے لیے پانی لے آتی ہوں پھر روٹی اور ساگ لے آؤں گی۔ آپ لسی پیئں گے یا دودھ؟" ایک ہی سانس میں اس نے اتنی لمبی تقریر کر ڈالی مَیں اس کی سادگی اور حسن کو دیکھتا رہ گیا۔

"بولتے کیوں نہیں جی؟ آپ تو یوں حیران ہو رہے ہیں جیسے پہلے کبھی کوئی عورت نہیں دیکھی" وہ آنکھیں گھما کر مُسکرائی۔

"واقعی تم جیسی باتونی عورت مَیں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔" مَیں سنبھل کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔

وہ کہنے لگی: "کبیرو بھی یہی کہتا ہے۔ اس کے یار بیلی بھی ایسا ہی کہتے ہیں پر مَیں زیادہ تو نہیں بولتی ملک صاحب اور پھر اس ویران جنگل میں بولنے چالنے کے لیے کون بیٹھا ہے؟ کبھی کبھی کوئی مہمان آ جاتا ہے تو دو باتیں کر لیتی ہوں۔ کبیرو کو تو مجھ سے بات کرنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ صبح نکلتا ہے تو دوپہر کو کھانے کے لیے آتا ہے۔ پھر آرام کر کے جاتا ہے تو رات گئے لوٹتا ہے۔ کبھی کبھی تو رات کو بھی نہیں لوٹتا۔ اب مَیں بات چیت کروں تو کس کے ساتھ؟ کوئی پڑوسن کوئی سہیلی بھی نہیں کہ ہنس بول کر دل بہلا لوں۔" وہ بولتی ہوئی بڑھی اور بے تکلفی سے چارپائی کے دوسرے کونے پر بیٹھ گئی قریب سے دیکھ کر میرے پہلے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ وہ دیہاتی حسن کا مکمل نمونہ تھی۔ جب وہ مسکراتی تو اُس کے سفید اور مضبوط دانت موتیوں کی لڑیوں کی طرح چمکنے لگتے اور اُس کا چہرہ اور زیادہ روشن ہو جاتا۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور گہری سیاہ رنگت کی تھیں اور جب وہ باتیں کرتے ہوئے اپنی آنکھوں کی پُتلیوں کو حرکت دیتی تو اس کے چہرے پر ایک انوکھی دلکشی پیدا ہو جاتی تھی۔

مَیں خاموشی سے اس کو تکتا رہا۔ یکایک اسے بھی احساس ہوا اور وہ چارپائی سے اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "معاف کرنا ملک صاحب مَیں آپ کے برابر بیٹھ گئی۔ بڑی بڑی معافی چاہتی ہوں جی۔ بس جی مجھے تمیز نہیں ہے نا۔ بڑے لوگوں کے ساتھ ملنا جُلنا جو نہیں ہوتا۔ تو پھر ادب اور تمیز کہاں سے سیکھوں گی؟ کبیرو کو تو خود ہی کچھ پتہ نہیں ہے۔ اس کے ملنے والے اس سے بھی زیادہ پینڈو ہیں۔ آپ اگر انھیں دیکھ لیں تو کان پکڑ کر توبہ کرنے لگ جائیں کہ یا ربا! یہ بھی تیرے بندے ہیں؟ پر بندے بشر تو ہر طرح کے اللہ نے بنائے ہیں اس کی مرضی کے آگے کون بول سکتا ہے؟"

یہ طولانی تقریر کرتے کرتے وہ بے خیالی میں دوبارہ چارپائی کی پٹی پر ٹک گئی۔

یکایک کبیرو بیرونی دروازے سے اندر داخل ہوا اور ایک ہی نگاہ میں سارا معاملہ سمجھ گیا۔ اس کے چہرے پر ایک پیار بھری مسکراہٹ نمودار ہوئی مگر وہ غصے سے بولا۔ "اری حنیفاں۔ شروع کر دی تُو نے اپنی بک بک۔ کچھ کھانے پینے کو بھی دیا ملک صاحب کو یا بک بک میں لگی ہوئی ہے؟"

حنیفاں فوراً اٹین شن کھڑی ہو گئی۔ اور پھر تیزی سے کمرے کی طرف چلی گئی۔ کبیرو نے اپنے چہرے سے پسینہ صاف کرتے ہوئے معذرت کے انداز میں کہا: "اس کی باتوں کا کچھ خیال مت کرنا ملک جی، یہ بدتمیز عورت ہے۔ جنگلی ہے بالکل جنگلی۔ بولتی زیادہ ہے۔ سوتے میں بھی باتیں کرتی رہتی ہے۔"

"کوئی بات نہیں" مَیں نے نرمی سے کہا۔ "یہ تمہاری بیوی ہے؟"

"ہاں جی۔ میری گھر والی ہے۔ بختاور تھا جو اس جیسی بیوی مل گئی۔ یہ تو میرے مقابلے میں شہزادی ہے۔ کسی بڑے گھر میں ہوتی تو بالکل چوہدرائن لگتی۔"

مَیں نے کبیرو کا جائزہ لیا۔ وہ اُدھیڑ عمر کا آدمی تھا لیکن صحت خاصی اچھی تھی۔ صورت شکل بھی کوئی خاص نہیں تھی۔ یہ سچ ہے کہ اس جیسی حیثیت اور شکل کے آدمی کے لیے حنیفاں جیسی بیوی ایک نعمت سے کم نہیں تھی۔

"تم یہاں کیا کرتے ہو؟" مَیں نے اسے باتوں میں لگانے کے لیے پوچھا۔ دراصل مَیں یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ میرے خیالات کا بھید جان لے۔

"بس جی چوکیدار ہوں اور زمینوں کی دیکھ بھال کرتا ہوں۔ چوہدری کرم دین کی مہربانی سے یہاں پڑا ہوا ہوں۔ وہ مربعے بیچ دیں گے تو اپنا پھر اللہ مالک ہے۔"

وہ بے تکلفی سے مٹی کے فرش پر بیٹھ گیا۔ یکایک کچھ سوچ کر وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا: "ملک صاحب۔ معاف کرنا مَیں نے تو آپ سے پوچھا ہی نہیں۔ آپ زمینیں دیکھنے تو نہیں آئے ہیں؟"

اب تک کی گفتگو سے مَیں اندازہ لگا چکا تھا کہ ان زمینوں کا مالک انھیں فروخت کرنا چاہتا ہے اور غالباً کبیرو مجھے وہ شخص سمجھ بیٹھا ہے جس کے ساتھ زمینوں کا سودا ہو رہا ہے۔

"یہی سمجھ لو۔" مَیں نے گول مول جواب دیا۔ پھر اس سے سوال کیا: "یہ زمینیں کیسی ہیں کبیرو۔ کوئی خاص کاشت تو نہیں ہوتی نظر آتی؟"

"بس جی۔ زیادہ پیدا نہیں ہے پر بہت قیمتی زمین ہے۔"

مَیں نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا: "کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ جی بارڈر جو ساتھ لگتا ہے۔" اس نے معنی خیز انداز میں مجھے دیکھا۔ اور مجھے پہلی بار یہ معلوم ہوا کہ یہ سرحدی علاقہ ہے۔

"ادھر تو زیادہ آبادی بھی نہیں ہے۔" مَیں نے بات بڑھائی۔

"بس جناب۔ سرحد کا معاملہ جو ہوا۔" کبیرو کا اندازِ گفتگو کافی معنی خیز تھا اور رفتہ رفتہ مجھ پہ یہ حقیقت منکشف ہو رہی تھی کہ وہ اتنا سیدھا سادا اور بیوقوف نہیں ہے جتنا مَیں نے اسے دیکھ کر اندازہ لگایا تھا۔ ابھی مَیں اگلا سوال کرنے نہیں پایا تھا کہ آندھی اور طوفان کی طرح حنیفاں نازل ہو گئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا تھال تھا اور اس نے صحن میں قدم رکھتے ہی بولنا شروع کر دیا تھا۔ "ملک صاحب جی۔ روٹی گرم کر کے اس پر دوبارہ گھی لگا دیا ہے مَیں نے، ساگ تو گرم کرنا ہی تھا۔ لسی بنانے میں دیر ہو گئی۔ آپ کو نمکین لسی اچھی لگتی ہے؟"

"ٹھیک ہے۔" مَیں نے مختصر جواب دیا اور نظریں جھکا لیں۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ یہ دیہاتی عورت مجھے آہستہ آہستہ اور زیادہ پُرکشش نظر آنے لگی تھی اور میرے اندر کا آدمی مجھے ورغلانے لگا تھا۔ نہ جانے یہ اُس کا جارحانہ انداز تھا یا ملاوٹ اور بناوٹ سے پاک جنگلی ہرنی جیسا گھبرایا ہوا حُسن جو میرے دل کو اس کی طرف کھینچ رہا تھا۔ اتنی دیر میں اس نے تھال میرے سامنے چارپائی پر رکھ دیا۔ ایک کٹورے میں ساگ تھا جس میں سے سوندھی سوندھی خوشبو اور بھاپ اُٹھ رہی تھی۔ ایلومونیم کی ایک پلیٹ میں بیسن کی تین موٹی موٹی روٹیاں گھی میں تر بتر رکھی ہوئی تھیں۔ ساتھ ہی ایک ایک بڑا سا لسی سے بھرا ہوا گلاس تھا۔ میری اشتہا یک بیک بے حد تیز ہو گئی اور مَیں کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ حنیفاں کا پکایا ہوا ساگ بھی خود اس کی طرح چٹ پٹا۔ نمکین اور مزیدار تھا۔ مجھے اس طرح بھوکوں کی طرح کھانے پر ٹوٹتے دیکھا تو کبیرو زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ اُٹھ کر چلا گیا۔ جاتے جاتے اس نے حنیفاں کو اشارہ کیا اور وہ بھی اس کے پیچھے چلی گئی۔ کچھ دیر بعد جب میں ساری روٹیاں چٹ کر چکا تھا وہ دوبارہ نمودار ہوئی۔ اس بار وہ ایک پلیٹ میں بیسن کی مزید دو روٹیاں پکا کر لے آئی تھی۔ مَیں نے دیکھتے ہی دیکھتے وہ بھی ختم کر دیں اور لسی کا گلاس ایک ہی سانس میں خالی کر کے ایک لمبی سی زوردار ڈکار لی۔ یکایک مجھے احساس ہوا کہ میرا طرزِ عمل کس قدر غیر مہذب اور جنگلی ہو چکا تھا۔ کھسیانہ ہو کر مَیں نے حنیفاں کی طرف دیکھا تو وہ بھی معنی خیز نظروں سے دیکھ کر مسکرا رہی تھی جیسے آنکھوں کی زبانی کہہ رہی ہو کہ مسٹر۔ تم بظاہر جو کوئی بھی ہو۔ آخر ہو تو ایک وحشی انسان۔

"بھئی بہت زور کی بھوک لگی ہوئی تھی۔" مَیں نے اپنی صفائی پیش کی۔

"اور لسّی لاؤں؟" اس نے برتن سمیٹتے ہوئے پوچھا۔

"ہو تو لے آؤ۔ اور تھوڑا سا پانی بھی لے آنا۔"

وہ لپک جھپک چلی گئی اور دوبارہ لسّی کا گلاس بھر لائی۔ اس بار کیرو بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس نے پیروں میں چمڑے کے جوتے پہن لیے تھے اور ایک بڑی سی چادر کاندھوں پر ڈال لی تھی۔

"ملک جی، مجھے ساتھ والے پنڈ کام جانا ہے۔"

"اوہ۔ بھئی معاف کرنا۔" مَیں نے چارپائی سے اُٹھتے ہوئے کہا: "مجھے بھی اجازت دو۔ کھانے اور مہمان نوازی کا بہت شکریہ۔"

"ارے نہیں جناب۔ مَیں نے آپ کو تو کچھ نہیں کہا۔ آپ بیٹھو آرام کرو۔ مَیں دو تین گھنٹے میں واپس آ جاؤں گا۔ حنیفاں آپ کو آس پاس کے مربع دکھا دے گی۔" پھر وہ حنیفاں سے مخاطب ہوا۔ "دیکھ۔ ملک صاحب زمین خریدنے آئے ہیں کیا خبر اب یہی ہمارے مالک بن جائیں۔ ان کے آرام کا خیال رکھنا مَیں جلدی واپس آ جاؤں گا۔" یہ کہہ کر وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔

"ارے ارے، سُنو تو۔" مَیں نے اسے آواز دی مگر وہ اَن سُنی کر کے چلا گیا۔ مَیں حیرت سے کھڑا اسکو جاتے ہوئے دیکھتا رہ گیا۔ حنیفاں کی طرف دیکھا تو وہ اپنے مخصوص انداز میں کھڑی مسکرا رہی تھی۔ "ملک صاحب کھانے کے بعد آرام کروگے؟ یا زمینیں دیکھنے چلوگے؟" اس نے دریافت کیا۔

میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ مَیں پریشانی سے اس کو دیکھ رہا تھا۔ "نہیں حنیفاں۔ بس میں بھی چلوں گا۔ کیرو تو چلا گیا ہے۔ مَیں اب یہاں رُک کر کیا کروں گا؟"

"تو پھر کیا ہوا ملک صاحب۔" وہ سادگی سے بولی: "جس کام کے لیے آئے ہو وہ بھول گئے ہو؟"

"کام؟"

"ہاں جی۔ آپ تو زمین خریدنے آئے ہیں نا؟ کیرو نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے وہ مجھ سے کوئی بات نہیں چھپاتا۔ بہت پیار کرتا ہے مجھ سے۔ سب کہتے ہیں کہ میرے پیچھے لگا ہوا ہے جورُو کا غلام ہے۔ پر یہ بات نہیں ہے۔ گھر والی سے پیار کرنا تو اچھی بات ہے نا ملک جی؟ اس کا خیال تو رکھنا ہی چاہیے۔ کیوں نا؟ آپ بھی اپنی گھر والی کی بات مانتے ہو؟ پر نہ۔ مجھے آپ سے یہ بات نہیں پوچھنی چاہیے۔" اس نے توبہ کرنے کے انداز میں دونوں ہاتھ اپنے کانوں سے لگائے تو مَیں بے اختیار ہنس پڑا۔

"پوچھنے میں کوئی حرج نہیں ہے حنیفاں۔ میری گھر والی نہیں ہے۔"

"نہیں ہے؟!" اس نے حیران ہو کر اپنی سیاہ آنکھیں گھمائیں: "کیا بات ہے جی؟ خیر تو ہے نا؟ یا آپ نے ابھی تک گھر ہی نہیں بسایا؟"

"ہاں" مَیں ہنسا "مَیں نے شادی نہیں کی ہے اب تک؟"

"ارے۔ تو پھر آپ کا جنازہ کیسے جائز ہو گا ملک جی۔" بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ مگر وہ پھر اپنے دونوں گالوں پر طمانچے مارتی ہوئی بولی۔ "توبہ توبہ۔ غلطی ہوگئی جی۔ آپ اس کا کچھ خیال مت کرنا۔ میری زبان میرے قابو میں نہیں ہے۔"

خاصی دلچسپ عورت تھی وہ۔ دلچسپ اور دلکش۔

"تمہاری شادی کب ہوئی تھی؟" مَیں نے سوال کیا۔

"بس جی دو سال بھی نہیں ہوئے۔ کیرو کی پہلی بیوی مرگئی تھی۔ ایک بچہ تھا وہ اس کے ننھیال والے لے گئے۔

یہ بیچارہ اکیلا رہ گیا۔ میرے ماں پیو کو ترس آ گیا۔ ویسے بھی میری اور اس کی عمر میں تو فرق ہے پر بندہ بہت چنگا ہے۔ بہت خیال رکھتا ہے میرا؟"

"اور تم؟" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا اور اس کا مسکراتا ہوا چہرہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ اداسی کی ایک گھٹا سی اس کے مکھڑے پر لہرائی مگر پھر وہ سنبھل گئی۔ بولی: "ہم عورتوں کا کیا ہے جناب۔ ہمیں تو گھر والے کا خیال رکھنا ہی پڑتا ہے۔" اس کا جواب خاصا ڈپلومیٹک تھا۔

"مگر تمہاری پسند تو یہ بھی ہوگی تمہارے ماں باپ نے؟"

"توبہ کریں جی۔ ایسی باتیں گاؤں میں نہیں ہوتیں۔ میرے گھر والوں کی مرضی تھی۔ کیرو نے پیسہ بھی اچھا دیا تھا میرے پیو کو۔"

"کیرو بہت پیسے والا ہے کیا؟"

"بس جی۔ اللہ کی بڑی مہربانی ہے۔"

وہ ایک سرد آہ بھر کر خاموش ہو گئی۔ مَیں نے چھیڑا۔ "حنیفاں، اس ویرانے میں تمہیں ڈر نہیں لگتا؟ جب کیرو تمہیں اکیلا چھوڑ کر چلا جاتا ہے تو پھر؟"

"ڈرنے کی کیا بات ہے جی۔ مَیں کسی سے نہیں ڈرتی۔ میرا کوئی کیا بگاڑ لے گا۔ میرے پاس کیا رکھا ہے؟"

اس کی سادگی پر مَیں دل ہی دل میں ہنس دیا۔ حسن کی جو دولت اس کے پاس تھی وہ ہر ایک کو کہاں نصیب ہوتی ہے؟

"آپ کو زمینوں پر چلنا ہے یا آرام کرنا ہے؟"

یکایک باہر سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی اور مَیں چوکنا ہو گیا۔ تیزی سے لپک کر صحن کے دروازے پر پہنچ کر مَیں نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ شمال کی جانب درختوں کے ایک جھنڈ کے پیچھے سے تین گھڑ سوار نمودار ہوئے۔ ان کا رُخ اسی مکان کی طرف تھا۔ مَیں نے حنیفاں کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرائی "کیرو کے جاننے والے ہیں فکر کی کوئی بات نہیں۔"

ابھی مَیں کوئی فیصلہ کرنے بھی نہیں پایا تھا کہ وہ تینوں کچھ فاصلے پر کھڑی میری کار کے پاس پہنچ گئے۔ کار کو دیکھ کر انھوں نے آپس میں کچھ باتیں کیں اور پھر چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ ان میں سے ایک شخص نے اپنا گھوڑا میری کار کی طرف بڑھایا تو مَیں تیزی سے آگے بڑھا اور انھیں پکارا۔ "اے جوان۔ مَیں اِدھر ہوں۔" ان تینوں نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور پھر بڑے محتاط انداز میں اپنے گھوڑوں کو میری طرف بڑھایا۔ میرا مقصد بھی یہی تھا۔ مَیں نہیں چاہتا تھا کہ وہ کار کے پاس جا کر اُس میں پڑا ہوا اسلحہ کا ڈھیر دیکھ لیں۔ انھیں اپنی طرف آتے ہوئے دیکھ کر میری جان میں جان آ گئی۔ تینوں شہسوار مکان کے نزدیک آکر رُک گئے۔ وہ تینوں مضبوط اور قد آور لوگ تھے۔ چہروں پر گھنی مونچھیں تھیں اور سروں پر انھوں نے پگڑیاں باندھ رکھی تھیں۔ قابلِ ذکر بات یہ تھی کہ انھوں نے اپنے شانوں پر سٹین گنیں لٹکائی ہوئی تھیں۔ چہرے مُہرے سے وہ انتہائی کرخت اور جابر لوگ نظر آ رہے تھے۔ لیکن مَیں نے جب حنیفاں کی جانب نگاہ کی تو وہ ان سے قطعی مرعوب یا خوف زدہ نظر نہیں آ رہی تھی بلکہ اس کے چہرے پر ایک خوشگوار مسکراہٹ سی پھیل گئی تھی۔ چند لمحے وہ تینوں مجھے گھورتے رہے۔ پھر ان میں سے ایک شخص کُود کر گھوڑے سے اُتر کر میری طرف بڑھا۔ وہ حنیفاں سے مخاطب ہوا لیکن اس کی نظریں ایک لمحے کے لیے بھی میرے چہرے سے نہیں ہٹی تھیں۔

"یہ کون سجن ہیں کُڑیے؟!" اس کی آواز بھاری اور رُعب دار تھی۔

"ارے یہ اپنے ملک صاحب۔ وہی جو چوہدری صاحب سے ان زمینوں کا سودا کر رہے ہیں۔ زمین دیکھنے آئے ہیں یہاں وہ دیکھو سامنے ان کی گاڑی کھڑی ہے۔ بہت اچھے آدمی ہیں۔" حنیفاں نے بڑی بے تکلفی کے ساتھ اس کے سوال کے جواب

میں ایک لمبی تقریر کر دی۔ زمین خرید لیں گے تو ہم بھی ان کے چاکر ہو جائیں گے۔"

"پھر تو بڑے اچھے وقت پر آ گئے۔ اگر یہ اچھے آدمی ہیں تو ہم بھی بہت چنگے بندے ہیں۔ تُو نے انھیں بتایا نہیں کہ ہم کتنے کام کے بندے ہیں؟" پھر وہ بڑی رُعب دار چال سے میری طرف بڑھا۔ "ملک جی، ہم خادم ہیں آپ کے۔ اشارہ کر دو گے تو جان قربان کر دیں گے۔" پھر وہ حنیفاں کی طرف متوجہ ہوا۔ "کبیرا کدھر ہے؟"

"کہیں کام پر نکلا ہے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ ہم ذرا اندر بیٹھ کر آرام کرتے ہیں۔" وہ سُرخ سُرخ آنکھوں سے مجھے گھورتا ہوا کمرے کی طرف بڑھا۔ تو اس کے دونوں ساتھی بھی گھوڑوں سے کُود پڑے۔ انھوں نے اس کے گھوڑے کی لگام بھی تھام لی اور انھیں باندھنے کے لیے چل پڑے۔ حنیفاں نے کہا: "میری ضرورت تو نہیں ہے تمھیں۔ مَیں ذرا ملک صاحب کو علاقہ دکھا آؤں؟"

اتنی دیر میں وہ شخص جو کمرے کے دروازے پر پہنچ کر اس کی کُنڈی کھول رہا تھا۔ رُک کر بولا: "ضرورت تو تیری ہر وقت رہتی ہے پر یہ کام بھی ضروری ہے۔ تُو ملک صاحب کو فارغ کر دے۔ اچھا ملک جی، رب راکھا۔" وہ کمرے میں داخل ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ حنیفاں اپنی شوخ اور روشن آنکھوں سے مجھے دیکھ کر مسکرائی: "ملک جی، بس مجھے پانچ منٹ کی اجازت دو۔ تم گاڑی میں چل کر بیٹھو۔ میں ان کو ٹھکانے لگا کر ابھی آئی۔" اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ بھی سامنے والے کمرے کی طرف جا کر دروازے کے اندر غائب ہو گئی۔ میرے لیے یہ موقع بہت غنیمت تھا۔ مَیں تیزی سے کار کی طرف بڑھا۔ اسلحہ اس میں کُھلا پڑا تھا۔ اگر وہ لوگ چند قدم اور آگے بڑھ جاتے تو انھیں کار میں پڑا ہوا اسلحہ کا ذخیرہ باآسانی نظر آ جاتا۔ مَیں نے تیزی سے بڑھ کر کار کی ڈِکّی کھولی اور چاروں طرف کا جائزہ لینے کے بعد جلدی جلدی سیٹوں اور کار کے پائیدان پر پڑی ہوئی سٹین گنیں ڈِکّی میں رکھ دیں۔ جس وقت میں ڈِکّی بند کر رہا تھا حنیفاں تیزی سے کمرے سے نکل کر میری طرف آئی۔ اس کے رخسار گلابی ہو رہے تھے اور سانس پھُولی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ بہت دُور سے بھاگی ہوئی آئی ہے۔

"لے تو ملک جی۔ مَیں فارغ ہوں اب آپ کی خدمت کے لیے۔ چلیں۔ میں آپ کو ذرا آس پاس کا علاقہ دکھا دوں؟" وہ کار کی طرف بڑھتی ہوئی بولی۔

زمینیں یا علاقہ دیکھنے کی خواہش کس کافر کو تھی۔ مَیں تو بس خواہ مخواہ پھنس گیا تھا۔ بہتر یہی تھا کہ مَیں جلد سے جلد اس جگہ سے نکل جاؤں لیکن حنیفاں مُصر تھی کہ مَیں زمینیں ضرور دیکھوں۔ دوسری طرف میرے ذہن میں بھی ان لوگوں کے بارے میں اُلجھن پیدا ہو گئی تھی۔ سوچا اس بہانے شاید کچھ کارآمد معلومات حاصل ہو جائیں۔ چنانچہ مَیں نے کار کا دروازہ کھول کر حنیفاں کو اگلی سیٹ پر بٹھایا اور چند لمحے بعد ہم کچّی سڑک پر رواں دواں تھے۔ وہ بڑی تفصیل کے ساتھ مجھے زمینوں کے بارے میں بتا رہی تھی لیکن میرا ذہن کبیرو، حنیفاں اور بعد میں آنے والے تینوں مہمانوں میں اُلجھا ہوا تھا۔ یہ تینوں شخص کون ہیں اور کبیرو اور اس کی بیوی کے ساتھ ان کی اس قدر بے تکلّفی کا سبب کیا ہو سکتا ہے؟ ممکن ہے وہ علاقے کے زمیندار کے آدمی ہوں۔ سرحدی علاقوں میں زمینداروں کو اپنے تحفّظ اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ آس پاس کے لوگوں پر رُعب داب رکھنے کے لیے زمینداروں کو مسلّح اور مضبوط لوگوں کی مدد لینی ہی پڑتی ہے لیکن حنیفاں اور کبیرو کا معاملہ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ وہ ایک بے تکلّف اور سادہ دل عورت تھی لیکن شوہر کی غیر موجودگی میں غیر مردوں کے ساتھ اس کا یہ کُھلا میل جول حیرت انگیز تھا۔ کبیرو بھی اس کی طرف سے بے پروا اور بے فکر نظر آتا تھا ورنہ یوں ویرانے میں اسے اکیلا چھوڑ کر کیوں چلا جاتا۔ ہم دونوں کافی دیر تک کچّی سڑکوں پر گشت کرتے رہے۔ اُس نے مجھے زمینیں اور باغ دکھانے اور بارڈر کی نشان دہی بھی کی۔ کہیں کھیت تھے، کہیں نالے اور جنگل تو کہیں بنجر زمین پڑی ہوئی تھی۔ کاشتکاری کے لیے یہ علاقہ زیادہ منفعت بخش نہیں تھا لیکن حنیفاں کا اصرار تھا کہ مَیں یہ زمین ضرور خرید لوں۔ مَیں نے کہا "مگر اس کا فائدہ کیا ہوگا؟ فصلیں تو یہاں زیادہ اچھی نہیں ہوتی ہوں گی۔"

"فصلوں کا کیا ہے ملک جی۔ یہ تو دیکھئے کہ یہ بارڈر کا علاقہ ہے۔ بارڈر بالکل ساتھ لگتا ہے۔"

"یہ تو اور بھی پریشانی کی بات ہے۔"

وہ مسکرائی: "آپ جیسے جیدار لوگوں کے لیے کیا پریشانی ہے جی؟ ہاتھ پیر بھی مضبوط ہیں، دل بھی بڑا ہے۔ اِدھر بڑا مزہ ہے ملک صاحب۔ دیکھا نہیں آپ نے کتنا اچھا علاقہ ہے۔ آپ کو ادھر کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ آپ کی موٹر گاڑی میں سیر بھی کر لیا کروں گی۔ مجھے گاڑی میں بیٹھنے کا بہت شوق ہے ملک صاحب۔" وہ بے تکلّفی سے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر بڑی لگاوٹ سے مسکرائی۔ مجھے اتنی دیر میں یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ اس کے بھولپن میں بھی ایک ہوشیاری اور دنیا داری ہے۔ وہ بالکل ہی انجان اور سادہ لوح دیہاتی عورت نہیں تھی۔ پھر بھی اس کا طرزِ عمل خاصا جارحانہ اور بے باک تھا۔ باتوں باتوں میں اس نے مجھے یہ بھی جتا دیا تھا کہ اگر مَیں نے یہاں کی زمین خریدنے کا فیصلہ کیا تو وہ مجھ پر خاصی مہربان رہے گی جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ پُرکشش ہونے کے ساتھ ساتھ زمانہ ساز بھی تھی اور اسکو اپنی اس خوبی کا پورا احساس تھا۔ راستے بھر اس نے بے شمار باتیں کی تھیں لیکن کبیرو کا نام ایک بار بھی اس کی زبان پر نہیں آیا تھا۔ یکایک مجھے احساس ہوا کہ شام کے سائے گہرے ہو گئے ہیں اور چاروں طرف اندھیرا پھیلتا جا رہا ہے۔

مَیں نے کار کی روشنیاں جلائیں۔ "اوہو یہ تو رات ہو گئی۔ ہمیں باتوں میں پتہ ہی نہیں چلا۔"

"اسی لیے تو کہتی ہوں کہ یہ زمینیں خرید لو ملک صاحب۔ بہت اچھا وقت گزرے گا آپ کا۔" وہ میری طرف جُھک کر مسکرائی۔

"مگر میرا کیا ہو گا؟" مَیں نے اس کی بے تکلّفی کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا: "تمھارے گھر پہنچتے پہنچتے بالکل رات ہو جائے گی۔ مجھے تو اس علاقے کے راستے بھی معلوم نہیں ہیں۔ مَیں رات کے وقت کہاں بھٹکتا پھروں گا!"

"بھٹکیں آپ کے دُشمن۔" وہ بڑی لگاوٹ سے مسکرائی۔ "آپ رات کو یہیں کیوں نہیں رہ جاتے؟"

مَیں نے کہا: "مگر۔ مگر تمھارے گھر میں جگہ کہاں ہے؟ پھر وہ مہمان بھی آ گئے ہیں۔"

"ارے مہمانوں کی خیر ہے۔" وہ ہنسی۔ "وہ تو آتے جاتے رہتے ہیں۔ اب تک تو وہ چلے بھی گئے ہوں گے۔"

اس کی ہدایات کے مطابق مَیں کار چلاتا رہا۔ وہ دعوت نہ بھی دیتی پھر بھی میرے لیے رات وہاں گزارنے کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا۔ لیکن پولیس کے تعاقب کا اندیشہ مجھے بے چین کر رہا تھا۔ ان کا مکان دُور سے اندھیرے میں ڈوبا ہوا نظر آ رہا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ اس کے مہمان لازماً چلے گئے ہیں۔ ہم جس سمت سے آئے تھے اُدھر کچّی سڑک کے ساتھ ساتھ قدآور درخت ایستادہ تھے اور تاریکی میں وہ عجیب پُراسرار اور خوفناک لگ رہے تھے۔ رات اور کچے راستے کی وجہ سے مَیں نے کار کی رفتار بہت آہستہ کر لی۔ ابھی ہم مکان سے دو تین سو گز کے فاصلے پر تھے کہ میں نے مکان کے سامنے ایک جیپ کھڑی دیکھی۔ مَیں نے اچانک زور سے بریک لگایا اور حنیفاں بے خبری میں سامنے کی طرف جُھک گئی۔ شکر ہے کہ اس کا سر نہیں ٹُوٹا۔ مَیں پریشان ہو گیا۔ کیا اس کا مطلب یہ تھا کہ پولیس میری کھوج میں یہاں تک پہنچ گئی تھی؟!

کار رُکتے ہی ایک فائر ہوا اور گولی سنسناتی ہوئی کار کے پاس سے گزر گئی۔ مَیں نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ یکایک نزدیکی درخت سے ایک شخص کُود کر کار کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں سٹین گن تھی اور وہ شلوار قمیص میں ملبوس تھا۔ مَیں نے فوری طور پر فیصلہ کیا کہ اس پر گاڑی چڑھا دی جائے۔ اسے روند ڈالنے کے خیال سے مَیں نے کار کو ریس دی لیکن کار کے رفتار پکڑنے سے پہلے آس پاس کے درختوں سے بھی فائرنگ ہونے لگی اور مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ

شخص تنہا نہیں تھا۔ میں چاروں طرف سے دشمنوں کے نرغے میں گھر چکا تھا۔ لیکن اب تک مجھے یہ پتہ نہیں چل سکا تھا کہ وہ لوگ کون ہیں؟ سادہ لباس میں پولیس کے سپاہی ہیں؟ توفی کے کارندے ہیں؟ یا اس کے مخالف گروہ یا میڈم کے اہلکار ہیں؟

سامنے والا شخص میری کار کی طرف بڑھا۔ اب وہ کار کی روشنی میں تھا اور مجھے صاف طور پر نظر آرہا تھا۔ اس نے اپنا چہرہ ڈھاٹے میں چھپا رکھا تھا اور اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی سٹین گن کی گرفت سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اس کا استعمال بھی جانتا ہے۔

"باہر نکلو" اس نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ میرے پاس اس کے حکم کی تعمیل کرنے کے سوا کوئی اور چارہ نہیں تھا۔ ناچار میں کار سے باہر نکل کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی گن کا رُخ میری طرف کیا لیکن اس کے فائر کرنے سے پہلے حنیفاں تیر کی طرح نکلی اور ہم دونوں کے درمیان میں بازو پھیلا کر کھڑی ہو گئی۔

"رُک جا بوٹے" وہ چلّائی۔ اسے دیکھتے ہی سٹین گن کی نالی کا رُخ زمین کی طرف ہو گیا۔ چاروں طرف سے اس کے دوسرے ساتھی بھی نمودار ہو گئے اور ہماری طرف بڑھنے لگے۔ لگتا تھا جیسے وہ سب اچانک زمین میں سے اُگ آئے ہیں۔

میں ابھی معاملے کی نزاکت پر غور ہی کر رہا تھا کہ سامنے والے مکان کا دروازہ چوپٹ کھل گیا اور یکایک باہر کے علاقے میں گھر کے اندر کی تیز روشنی پھیل گئی۔ اندر سے چار پانچ اونچے لمبے لوگ باہر نکل کر ہماری طرف بڑھے۔ وہ میرے لیے بالکل اجنبی اور نامانوس تھے۔ اس لیے کہ وہ سکھ تھے۔ آگے آگے آنے والے قد آور سکھ نے حنیفاں کو دیکھا تو بہت زور سے ہنسا اور مجھے قطعاً نظر انداز کر کے دونوں بازو پھیلا کر حنیفاں کی طرف بڑھا۔ "اوئے تیری خیر ہووے کلونت کورے۔" اس نے خوشی سے بھرپور آواز میں ایک زور دار نعرہ مارا اور جواب میں حنیفاں جو درحقیقت کلونت کور تھی ہنستی ہوئی آگے بڑھ کر اس کے بازوؤں میں سما گئی۔

یہ سب کچھ مجھے ایک خواب کے منظر کی طرح نظر آرہا تھا۔

وہ دراز قد، صحت مند اور خوبرو عورت جو چند لمحے پہلے تک حنیفاں تھی اور کبیرو چوکیدار کی بیوی تھی میرے دیکھتے ہی دیکھتے کلونت کور بن گئی تھی۔ بوٹا سنگھ نے ایک گڑیا کی مانند اسے اپنے بازوؤں میں اُٹھا لیا تھا اور مسرت کے عالم میں زور زور سے قہقہے لگاتے ہوئے اسے چاروں طرف گھما رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ مارے خوشی کے بلند آواز میں نعرے بھی لگا رہا تھا اور کلونت کور بھی کھکھلا کر ہنس رہی تھی۔ ان دونوں کے آس پاس کھڑے ہوئے مسلح لوگ جنہوں نے میرا راستہ روک کر فائرنگ کی تھی خوش ہو کر بلند آواز میں قہقہے لگا رہے تھے اور ایک عجیب کال تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ سب لوگ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے ہیں۔ ان کی فلک شگاف آوازیں سن کر گھر کے اندر سے برآمد ہونے والے سکھ بھی نکل کر باہر آ گئے تھے اور وہ بھی خوب زور زور سے ہنس رہے تھے۔ وہ سب خوشی سے سرشار تھے۔ معلوم ہوتا تھا جیسے ان میں قہقہے لگانے کا میچ شروع ہو گیا ہے اور ہر شخص دوسرے سے بڑھ چڑھ کر شور مچانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں یہ منظر خاموش کھڑا ہوا دیکھ رہا تھا اور یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ آخر ان سب کے لیے اس قدر خوش ہونے کا سبب کیا ہے؟ میں اپنی ہی حیرانی میں گم تھا۔ حنیفاں کے یک لخت کلونت کور بن جانے کا واقعہ میرے لیے انتہائی حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین تھا۔ اس نے خود مجھے بتایا تھا کہ وہ گاؤں کے ایک غریب کسان کی بیٹی تھی اور جب کبیرو نے اپنی پہلی بیوی کے مرنے کے بعد اس کے چچا سے رشتے کی درخواست کی تو اس نے بلا پس و پیش یہ درخواست قبول کر لی تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ گاؤں کے ایک غریب مسلمان کسان کی بیٹی اور ایک مسلمان چوکیدار کی بیوی اچانک سکھ کیسے بن گئی؟

بوٹا سنگھ نے کئی چکر گھمانے کے بعد کلونت کور کو زمین پر کھڑا کر دیا۔ ان سب کے قہقہے رک گئے تھے اور بوٹا سنگھ سمیت سب کی نظریں مجھ پر جم کر رہ گئی تھیں۔ میں نے اپنے خیالات سے چونک کر بوٹا سنگھ کو بغور دیکھا۔ وہ ایک اونچا، لمبا، تنومند اور انتہائی طاقت ور شخص تھا۔ اس کی آنکھیں اس کی ڈاڑھی کے بالوں کی طرح بالکل سیاہ تھیں لیکن ان میں ایک وحشیانہ چمک تھی۔ سارے لوگ خاموش کھڑے میری طرف دیکھ رہے تھے اور اس طرح میں ان سب کی توجہ کا مرکز بن کر رہ گیا تھا۔ اب بوٹا سنگھ کے چہرے پر ایک خشونت آمیز سنجیدگی چھا گئی اور وہ محتاط نظروں سے میرا جائزہ لے رہا تھا جیسے وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے تول رہا ہے۔ میرے بارے میں اندازے لگا رہا ہے۔ چند قدم بڑھ کر وہ میرے اور نزدیک آگیا۔ اس کی نگاہیں بدستور مجھ پر جمی رہیں، لیکن اس نے کلونت کور کو مخاطب کیا۔ "بلے بلے۔ یہ بندہ کون ہے کلونت؟"

جواب میں کلونت کور مسکراتی ہوئی لہراتی چال سے آگے بڑھی اور بوٹا سنگھ کے پہلو میں جا کھڑی ہوئی۔ "بوٹے۔ یہ بہت کام کے بندے ہیں۔ بہت اچھا ہو کہ تُو آگیا اور ان سے تیری ملاقات ہو گئی۔ یہ ملک صاحب ہیں اور چوہدری کرم دین کی زمینیں خریدنے آئے ہیں"۔

"اوہو ہو۔" بوٹا سنگھ بھاری آواز میں زور زور سے ہنسا۔ پھر میرے نزدیک آکر اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ "بہت بہت مبارکاں ہوون ملک جی۔" میرا ہاتھ اپنے بھاری اور مضبوط ہاتھ میں تھام کر اس نے زور زور سے اس کو ہلانا شروع کر دیا۔ "اب تو ہمارا اور آپ کا جوڑ پڑے گا کیوں نا کلونت؟"

کلونت بڑی لگاوٹ سے مسکرائی۔ "یہی تو میں بھی ملک صاحب کو سمجھا رہی ہوں کہ یہ زمین سونا ہے سونا۔ اسے خرید کر بہت فائدے میں رہیں گے"۔

"تو سمجھائے گی تو پھر یہ کیسے نہیں سمجھیں گے پگلی۔" وہ میری طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں ہنسا۔ "تیرا کاٹا ہوا تو پانی بھی نہیں مانگتا سوہنئے۔ یہ تو پھر اپنے ملک صاحب ہیں۔" ہنستے ہنستے اس نے اپنی ایک آنکھ دبا کر مجھے اشارہ کیا۔ "کیوں۔ کیا سمجھے ملک جی؟"

"ساری باتیں ادھر ہی ختم کر لوگے کیا۔ ملک جی کو اندر تو بیٹھنے دو۔" کلونت نے بے تکلفی سے میرا دوسرا ہاتھ تھام لیا۔ "چلو ملک جی۔ اس کی باتیں تو کبھی ختم نہیں ہوں گی۔" کلونت کور میرا ہاتھ تھام کر ایک طرف چل پڑی۔ میں نے بوٹا سنگھ کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ آزاد کرانا چاہا مگر اس نے اسے مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ میں نے بھی زیادہ زور نہیں لگایا۔ اس طرح ایک جانب سے بوٹا سنگھ اور دوسری جانب کلونت کور کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے میں مکان کی طرف چل پڑا۔ اسٹین گنوں سے مسلح لوگ دفعتاً غائب ہو گئے تھے۔ کمرے کے اندر سے جو پانچ سکھ نکل کر باہر آئے انہیں بوٹا سنگھ نے سر کے اشارے سے کوئی ہدایت دی اور وہ مکان کے صحن ہی میں رُک کر ہم تینوں کو اندر جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ اب بوٹا سنگھ نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا تھا اور میں اور کلونت کور اس کے آگے آگے دروازے کی جانب رواں تھے۔ کلونت کور نے مسکرا کر دوسرے ہاتھ سے دھکیل کر دروازہ کھول دیا جہاں ایک اور حیرت میری منتظر تھی۔ جنگل بیابان میں واقع چوکیدار کے اس بظاہر معمولی سے مکان کے اندرونی حصے کے بارے میں کوئی اندازہ بھی نہیں لگا سکتا تھا کہ وہ اس قدر شاندار اور قیمتی سازوسامان سے آراستہ ہوگا۔ یہ ایک خاصا کشادہ کمرہ تھا جس کے فرش پر سُرخ رنگ کا قیمتی پھولدار قالین بچھا ہوا تھا۔ ایک جانب کشادہ بیڈ تھا جس پر رنگین پھولوں سے مرصّع مخملیں بیڈ کور پڑا ہوا تھا۔ دوسری جانب اسی رنگ کا صوفہ سیٹ تھا۔ درمیان میں ایک شیشے کی لمبی سی سینٹر ٹیبل تھی جس پر چند گلاس رکھے ہوئے تھے۔ کمرے کے اندر بیڈ کے عقب میں صرف ایک دروازہ تھا۔ جو غالباً غسل خانے کا دروازہ تھا۔ اس سجے ہوئے خوبصورت

کمرے کی دلیواروں پر کوئی تصویر یا آرائش کی چیز نہیں تھی، لیکن ایک جانب کراس کی صورت میں دو بندوقیں لٹکی ہوئی تھیں میں کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی ٹھٹھک کر رہ گیا تھا۔ جب کلونت کور نے میرا ہاتھ کھینچا تو میں چونک کر آگے بڑھا۔ یہ ماحول انتہائی خوابناک اور فرحت بخش تھا۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ باہر سے یہ معمولی سا کچا دیہاتی مکان اندر سے اسی قدر پُر شوکت اور آرام دہ ہوگا۔ کمرے میں پہنچ کر پہلی بار مجھے اندازہ ہوا کہ یہ مکان لمبائی میں دُور تک پھیلا ہُوا تھا اور یہ تین چار کمروں پر مشتمل تھا۔ میں نے کمرے کا جائزہ مکمل کیا ہی تھا کہ بوٹا سنگھ بھی اندر آ گیا۔

"بیٹھو ملک جی۔ کلونت کور۔ ملک صاحب کی خاطر مدارت نہیں کرے گی؟"

کلونت کور نے بڑے ناز سے مجھے دھکا دے کر ایک صوفے پر گرا دیا اور خود ـــــ مسکراتی ہوئی لمبی سی سینٹر ٹیبل پر بیٹھ گئی۔ "بولو ملک جی۔ کیا خاطر کروں آپکی؟" وہ بڑی لگاوٹ سے مسکرائی۔

میں نے بوکھلا کر پوچھا۔ "کبیرو کہاں ہے؟"

میرے اس غیر متوقع سوال پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "پوچھو کھیت کی۔ جواب ملے کھلیان کا۔ ارے اس وقت کبیرو کا خیال آپ کو کیوں آ گیا؟"

میں خود اپنے بے اختیار دریافت کیے جانے والے سوال پر شرمندہ سا تھا۔ کھسیانا ہو کر بولا۔ "میرا مطلب ہے کہ وہ بہت دیر سے نظر نہیں آیا۔"

"وہ میرے اشارے پر نظر آتا ہے اور میرے چٹکی بجانے پر غائب ہو جاتا ہے۔ وہ خود بخود کچھ نہیں کر سکتا ملک جی کیا سمجھے؟" کلونت مسکرائی۔

"کبیرو ہی کیا اس کی چٹکی پر تو بڑے بڑے آدمی غائب ہو جاتے ہیں۔ یہ بڑی جادوگر عورت ہے ملک جی تھوڑے دن میں خود ہی اس کے بھید جان جاؤ گے۔" بوٹا سنگھ نے میرے برابر والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا اور نہایت بدتمیزی سے اپنی ٹانگیں اٹھا کر میز پر رکھ دیں۔ اس طرح کہ اس کی ٹانگ کلونت کور کی گود میں رکھی ہوئی تھی۔

"یہ کلونت کور اس علاقے کی بادشاہ ہے ملک جی۔ جو چاہے کر سکتی ہے۔ یہاں پر اسی کا حکم چلتا ہے۔ اس کی مرضی کے بغیر ادھر پتہ بھی نہیں ہلتا۔ پر یہ خود میرے اشارے پر ناچتی ہے۔" اس نے پیار بھرے انداز میں کلونت کور کو ٹہوکا دیا اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس عورت کی ہنسی بھی خود اسی کی طرح دلکش اور بے باک تھی۔ جس طرح وہ خود باتونی اور بے تکلف تھی اسی طرح اس کی ہنسی بھی کچھ کہتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ بوٹا سنگھ سچ ہی کہتا تھا وہ واقعی مردوں کے دلوں پر حکومت کرنے والی عورت نظر آتی تھی اور ان کو اپنے اشاروں پر رقص کرانے کا فن جانتی تھی۔ اس کی ہر ادا، ہر انداز دل موہ لینے والا تھا۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس سے پہلے مجھے اس کی سحر انگیز شخصیت کی دلآویزی کا اندازہ کیوں نہیں ہو سکا تھا۔

"اسکی باتوں میں مت آ جانا ملک جی۔ وہ کھلکھلاتی ہوئی آواز میں بولی۔ "یہ بہت جھوٹا ہے۔ میری اس کے سامنے کیا ہستی ہے۔ اس علاقے میں بوٹا سنگھ کا راج ہے۔ اسی کا حکم چلتا ہے۔ میں تو اس کی ایک معمولی خدمت گار ہوں۔"

"اچھا تو پھر اُٹھ کر خدمت کر۔ کوئی کھانے پینے کا بندوبست کر۔ محفل کو گرم کرتا کہ ہم بھی موج میں آ کر کوئی کام دھندے کی بات کریں۔"

وہ بل کھا کر میز سے ایک جھٹکے کے ساتھ یوں اُٹھی کہ بوٹا سنگھ کی ٹانگ میز سے نیچے گر گئی۔ سامنے والی الماری کے اندر سے اُس نے قیمتی ولایتی شراب کی ایک بوتل نکالی اور میز پر لا کر رکھ دی پھر اپنی چمکدار سیاہ آنکھوں سے مجھے دیکھ کر بولی۔ "یہ ٹھیک ہے نا ملک جی؟"

میں نے انکار میں سر ہلایا۔ بوٹا سنگھ زور سے ہنسا۔ "یہاں کسی چیز کی کمی نہیں ہے ملک جی۔ ہر طرح کی شراب تمہیں مل

جائے گی۔" پھر وہ کلونت سے مخاطب ہُوا۔ "دیکھتی کیا ہے ملک جی کو دوسری بوتل نکال دے۔"

"نہیں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔ "میں شراب نہیں پیتا۔"

وہ دونوں متحیر ہو کر مجھے تکنے لگے۔ پھر بوٹا سنگھ تشویش بھرے انداز میں کلونت کور سے مخاطب ہوا۔ "ملک جی تو مولوی آدمی ہیں کلونت۔ ان کے ساتھ اپنا گزارہ کیسے ہوگا؟"

کلونت میرے صوفے کے بازو کے قریب آ کر قالین پر دوزانو بیٹھ گئی اور اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے دیکھ کر بولی۔ "شراب نہیں پیتے یا اور سب چیزوں سے پرہیز ہے؟" وہ معنی خیز انداز میں میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرائی۔

"شراب میں نے بہت پی ہے کلونت۔ ایک وقت میرے جسم میں خون سے زیادہ شراب ہوتی تھی مگر پھر ایک واقعے کے بعد میں نے شراب بالکل چھوڑ دی۔ اب میں اسے ہاتھ بھی نہیں لگاتا۔"

"نہ لگانا ہاتھ۔ میں اپنے ہاتھوں سے تمہیں پلا دوں گی۔" وہ شوخی سے بولی۔ "کیوں ٹھیک ہے نا؟"

"بک بک مت کر۔" بوٹا سنگھ سنجیدگی سے بولا۔ "ملک جی جو کہتے ہیں وہی کرنے والے لگتے ہیں۔ مجھے پتہ ہے وہ نہیں پیئں گے۔ تو میری سیوا کر۔" اور وہ صوفے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔ وہ خاصا جہاندیدہ اور سمجھدار آدمی تھا اور فضول باتوں میں وقت ضائع کرنے کا قائل نہیں معلوم ہوتا تھا۔

کلونت کور نے بوٹا سنگھ کے لیے شراب کا جام بھر دیا اور پھر بائیں جانب والے دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازہ کھلا تو میرے لیے حیرت کا ایک اور سامان تھا۔ یہ ایک ماڈرن کچن تھا جس میں سفید ٹائلیں لگے ہوئے تھے۔ جدید ضرورت کا ہر سامان وہاں موجود تھا۔ ایک جانب قدآدم ریفریجریٹر تھا جس میں سے کلونت کور نے برف کے ترشے ہوئے ٹکڑے نکال کر ایک پیالے میں ڈالے اور بوٹا سنگھ کے سامنے میز پر لا کر رکھ دیئے۔ پھر وہ فرج میں سے کچھ تازہ پھل اُٹھا لائی۔ میں خاموشی اور حیران یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ کلونت کور دوبارہ کچن کے دروازے میں غائب ہو گئی تو بوٹا سنگھ نے شراب کا جام اٹھا کر اپنے ہونٹوں سے لگایا اور ایک لمبے گھونٹ میں آدھا خالی کر دیا۔ "حیران کیوں ہوتے ہو ملک جی۔ میں نے کہا نہیں کہ یہ عورت بڑی جادوگر ہے۔ ابھی تو تم نے اس کا چمتکار نہیں دیکھا۔ بڑی شے ہے یہ کلونت کور۔" اور اس نے دوسرے گھونٹ میں باقی گلاس بھی خالی کر دیا۔ ظاہر ہے کہ وہ انتہائی بلانوش آدمی تھا۔ ہاتھ بڑھا کر ایک ہاتھ سے شراب کی اور دوسرے ہاتھ سے پانی کی بوتل اُٹھائی اور دونوں کو ایک ساتھ اپنے گلاس میں اُنڈیل لیا۔ اپنے ہاتھ کی پشت سے ہونٹوں کو صاف کرتے ہوئے وہ بڑی سنجیدگی سے میری طرف متوجہ ہو گیا اور بولا۔ "ملک جی کلونت ٹھیک کہتی ہے۔ یہ زمین سونا ہے۔ دولت اگلتی ہے یہاں کی مٹی۔ درختوں میں نوٹ لگتے ہیں یہاں۔ چوہدری کرم دین بیوقوف ہے جو یہ زمینیں بیچ رہا ہے۔ پر ہر بندہ اپنی مرضی کا مالک ہوتا ہے۔ اپنا نفع نقصان اچھی طرح سمجھتا ہے۔ اگر وہ بیوقوفی کرتا ہے تو اس میں آپ کا فائدہ ہے۔ ایک منٹ کی دیر کیے بغیر سودا کر لو۔ بوٹا سنگھ تمہارے ساتھ ہے تو دُنیا تمہارے ساتھ ہے۔" وہ اس وقت انتہائی فہمیدہ کاروباری شخص کے انداز میں گفتگو کر رہا تھا۔ "چوہدری نے کتنا مال مانگا ہے ـــ؟"

میں نے بات گول کرنے کی کوشش کی۔ "ابھی قیمت کی بات نہیں ہوئی۔"

"قیمت کوئی چیز نہیں ہے ملک جی۔ یہ زمین تو ان مول ہے۔ جو بھی مانگے دے دینا اور پھر ساری زندگی جھولیاں بھر بھر کر مال سمیٹتے رہنا۔ جینے کا مزہ آ جائے گا تمہیں۔"

اتنی دیر میں کلونت کور بھی پلٹ کر آ گئی تھی۔ اس بار اس کے ہاتھ میں بھنے ہوئے گوشت کی پلیٹ تھی جو اس نے ہمارے سامنے میز پر رکھ دی۔ "آپ کے لیے کچھ چائے ٹھنڈا لاؤں؟" اس نے مجھے دعوت دی۔

"نہیں۔ میں پھل کھا لوں گا۔" میں نے انگوروں کا ایک خوشہ اٹھا لیا۔

"پہلے کدھر کام کیا ہے ؟" لوٹا سنگھ نے اپنی بات جاری رکھی "کبھی دیکھا نہیں تمہیں نہ کسی سے نام سُنا ؟ ورنہ کوئی بندہ ہم سے چھپا ہوا نہیں ہے اس کام میں ۔"

"ملک جی باہر سے آئے لگتے ہیں" کلونت کور نے لقمہ دیا۔

"ہاں ۔ میں باہر کے دھندے میں تھا مگر اب سوچا اس علاقے کی طرف بھی دھیان دینا چاہیئے ۔"

"کیوں نہیں ۔ اور یہ جگہ جہاں تم بیٹھے ہو سمگلروں کی جنت ہے ۔ مال پیسے کی کوئی کمی نہیں ہے ۔ ہر طرح کا دھندہ ہوتا ہے ادھر ۔ یہ بولو ۔ آدمی کتنے ہیں تمہارے پاس ؟"

اس اچانک سوال نے مجھے پریشان کر دیا "آدمیوں کی کیا پرابلم ہے ؟"

"اگر ہو گی تو لوٹا سنگھ کس کام آئے گا ؟" کلونت کور نے لوٹا سنگھ کی طرف دیکھ کر کہا جو شراب کا دوسرا گلاس بھی خالی کر کے میز پر رکھ رہا تھا۔

"لوٹے کے پاس پوری فوج ہے ملک جی" وہ ہنسا "جتنے بندوں کی ضرورت ہو لوٹے کے پاس مل جائیں گے اور سب ایک سے بڑھ کر ایک جی دار ۔ ایک اشارے پر جان دینے کو تیار ۔ چوہدری کرم دین سے پوچھ لینا ۔ وہ سب بتا دے گا تمہیں ۔"

اچانک کمرے کے دروازے پر کسی نے ہاتھ سے دوبار دستک دی اور لوٹا سنگھ ایک دم صوفے سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا ۔ سامنے اس کا ایک ساتھی کھڑا ہوا تھا ۔ ان دونوں نے خاموشی سے ایک دوسرے سے آنکھوں ہی آنکھوں میں تبادلۂ خیال کیا اور لوٹا سنگھ تیزی سے پلٹ کر ہم لوگوں کی طرف آیا "میرا بلاوا آ گیا ہے ملک ۔ تم سے پھر ملاقات ہو گی ۔ رب راکھا ۔ میرا مشورہ یاد رکھنا ۔" اس نے بیڈ پر پڑی ہوئی سٹین گن اُٹھائی اور دروازے کی طرف بڑھا۔

"پھر کب آؤ گے ؟" کلونت نے اس کا راستہ روک لیا مگر اسکی طرف دیکھے بغیر لوٹا سنگھ نے اسے دھکیل دیا اور وہ بیڈ پر جا گری ۔

"ہزار بار کہا ہے کہ راستہ مت کاٹا کر میرا ۔ جب ضرورت ہو گی آ جاؤں گا ۔" وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا اور تاریکی میں غائب ہو گیا ۔ چند لمحے بعد گاڑی سٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی اور پھر خاموشی چھا گئی ۔ کلونت کور ابھی تک بیڈ پر نیم دراز تھی ۔ لوٹا سنگھ جس طرح اچانک نمودار ہوا تھا اسی طرح غائب ہو گیا تھا مگر اس کی وجہ سے مجھے بہت سی ایسی باتیں معلوم ہو گئی تھیں جو شاید اس کے بغیر میں نہ جان سکتا تھا ۔ میں اَن جانے میں ایک ایسے علاقے میں پہنچ گیا تھا جو بقول لوٹا سنگھ کے سمگلروں کی جنت تھا ۔ میرے وطن کے دشمنوں کے ساتھ مل کر خود میرے ہم وطن انتہائی بے دردی سے اپنی دھرتی کو لوٹنے میں مصروف تھے ۔ دولت کے لالچ نے انہیں ہر قسم کی غیرت ، خودداری اور حب الوطنی کے احساس سے بیگانہ کر دیا تھا ۔

کلونت کور اس اثناء میں میرے پاس صوفے پر آ کر بیٹھ گئی تھی وہ غور سے میری جانب دیکھ رہی تھی جیسے چہرے کے ذریعے میرے دل کا بھید جاننے کی کوشش کر رہی ہو ۔ یہ خوبصورت عورت میرے لیے بہت کارآمد ثابت ہو سکتی تھی اس کے ذریعے میں بہت سے رازوں سے باخبر ہو سکتا تھا ۔ میں یہ اندازہ لگا چکا تھا کہ اس تمام کاروبار میں کلونت کور کو ایک کلیدی حیثیت حاصل تھی ۔ اس کے لباس کی خوشبو نے مجھے اسکی طرف متوجہ کیا ۔ وہ اپنی سیاہ ، چمکدار اور بڑی بڑی آنکھوں سے مجھے تک رہی تھی "کیا سوچنے لگے ملک جی ؟"

"تمہارے بارے میں سوچ رہا ہوں ؟"

"میرے بارے میں ؟" وہ اشتیاق سے میرے اور نزدیک ہو گئی "ہائے میری قسمت ۔ آپ بھی میرے بارے میں

سوچتے ہیں ملک جی ؟" اُس نے بڑی معصومیت سے آنکھیں جھپکائیں ۔

"یہ کیا گورکھ دھندہ ہے کلونت ۔" میں نے پہلی بار اسے بے تکلفی سے مخاطب کیا "تم حنیفاں سے کلونت کور کیسے بن گئیں ۔ کبیر دے سے تمہارا کیا رشتہ ہے ؟"

"ارے آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں ملک جی ۔ تھوڑے دن میں سب کچھ خود ہی پتہ چل جائے گا ۔"

"کیا تم مجھے اپنا رازداں نہیں بنانا چاہتیں ؟" میں نے شکایت آمیز لہجے میں کہا ۔ "مجھ کو بھروسے کے لائق نہیں سمجھتیں ؟"

"ارے نہیں ۔" وہ ہنس پڑی ۔ "ملک جی آپ بہت اچھے ہیں ۔ میں نے تو جب پہلی بار آپ کو دیکھا تھا اس وقت بھی اپنے اپنے سے لگے تھے اور پھر اب تو ہمارا ساتھ رہے گا ۔ کیوں نا ؟"

"اگر تم جیسی عورت کا ساتھ مل جائے تو پھر اور کیا چاہیئے کسی کو ؟" میں نے عورت کی خوشامد پسند فطرت کے پیش نظر اسے شہہ دی "مگر مجھے سانجھے داری کی عادت نہیں ہے ۔"

"سانجھے داری ؟" اُس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کاروبار میں سانجھے داری ہو سکتی ہے کلونت مگر جس عورت کو میں اپنا سمجھوں اس کی طرف کوئی اور نظر اُٹھا کر بھی دیکھے تو میں برداشت نہیں کر سکتا ۔" میں نے سنجیدہ اداکاری کی ۔

وہ خوشی اور بے یقینی کے ساتھ مجھے دیکھنے لگی ۔ "کیا ؟ ملک جی تم مجھے اپنی عورت سمجھتے ہو ؟ واقعی مجھے اپنا سمجھتے ہو ؟"

"تم بہت ہوشیار عورت ہو کلونت ۔ کیا میری آنکھوں میں تمہیں کچھ نظر نہیں آیا ؟"

وہ ایک دم اُٹھ کر کھڑی ہو گئی اور دونوں ہاتھ مَلتے ہوئے خوشی سے بولی "ملک جی ۔ کیا تم سچ سچ ..... ؟"

"ہاں کلونت ۔ میں تمہیں دل و جان سے پسند کرنے لگا ہوں ۔ مگر میں تمہیں کھلونا نہیں بناؤں گا ۔ تمہاری جگہ میرے دل میں اور میرے گھر میں ہو گی ۔ تم میری گھر والی ہو گی ، مگر پھر تمہیں اور سب سے رشتے توڑنے پڑیں گے اور یہ بھی سُن لو کہ اس طرح تم گھاٹے میں نہیں رہو گی ۔ تمہیں یہ اندازہ ہی نہیں ہے کہ میرے پاس کتنی دولت اور طاقت ہے ۔ لوٹا سنگھ جیسے درجنوں کارندے ہیں میرے پاس ۔ ساری دنیا میں وہ میرے لیے کام کرتے ہیں ۔ جس علاقے کی تم بات کرتی ہو یہ تو میری نظروں میں بالکل بے وقعت ہے مگر کیونکہ تم نظروں میں بس گئی ہو ۔ اس لیے میں یہ سارا علاقہ خرید لوں گا ۔ یہ میری طرف سے تمہارے لیے مُنہ دکھائی کا تحفہ ہو گا ۔"

وہ آنکھیں پھاڑے مجھے تک رہی تھی ۔ اس کا منہ حیرت اور خوشی کے مارے کھلا کا کھلا رہ گیا تھا "کیا ؟ تم شادی کرو گے مجھ سے ؟"

"ہاں شادی کروں گا تم سے اور اتنی دولت دوں گا تمہیں کہ کبھی تم نے سوچا بھی نہ ہو گا ۔"

وہ بے اختیار کھسک کر میرے نزدیک آ گئی اور پیار سے میرے رخسار کو چھو کر بولی "ملک جی ۔ اطمینان رکھو تمہیں اس پر کبھی پچھتاوا نہیں ہو گا ۔ تم نے ساری دُنیا دیکھی ہو گی پر کلونت کور جیسی عورت کبھی نہیں دیکھی ہو گی ۔" جوشِ جذبات میں اس کی آواز کانپ رہی تھی ۔

"کلونت ۔ یہ زندگی بھر کا رشتہ ہے کوئی دو چار مہینے کی بات نہیں ہے ۔ تم میرے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی ہو ، مگر میں تمہیں یہ بتا دوں کہ میری پیدائش سنگاپور میں ہوئی تھی ۔ باپ کے پاس بزنس تھا مگر میں نے ہوش سنبھالتے ہی اس کو لپیٹ کر بند کر دیا اور خود اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا ۔ کالے دھندوں میں کوئی میرا مقابلہ نہیں کر سکتا میں نے دُور دور ملکوں تک اپنی دھاک بٹھا دی ہے ۔ زندگی میں بہت سی عورتیں آئیں مگر شادی آج تک نہیں کی ۔ تم میری پہلی اور آخری بیوی ہو گی ۔" میں نے اس کے شانے کو تھپکتے ہوئے ایک اور سبز باغ دکھایا ۔

"ملک جی۔ تم کتنے بڑے دل کے بندے ہو۔" اس نے بے اختیار میرے گلے میں بازو ڈال دیے۔ "تم نے کلونت کو خرید لیا ہے۔ نوکر ہوں میں آج سے تمہاری۔ میں تو تمہیں دیکھتے ہی جان گئی تھی کہ تم کوئی معمولی بندے نہیں ہو۔ پر یہ نہیں جانتی تھی کہ پارس پتھر کی طرح مجھے بھی چھو کر سونا بنا دو گے۔"

"سونا ہو یا چاندی۔ جو بھی ہو تم اب میری ہو۔" میں نے بڑے خلوص سے یقین دلایا۔

"اب ہمارے بیچ کوئی پردہ نہیں رہنا چاہیئے ملک جی۔ مگر ایک بات کہوں میری کہانی سن کر مجھ سے نفرت تو نہیں کرنے لگو گے؟ میں کوئی شریف اور نیک عورت نہیں ہوں۔"

"وہ تو میں جان گیا ہوں۔ مگر جو ہونا تھا ہو چکا۔ میں تمہاری پچھلی زندگی کو بھلا دوں گا اور سمجھوں گا کہ بس تم نے آج ہی جنم لیا ہے۔"

"تو سنو۔" وہ صوفے سے اُٹھ کر قالین پر میرے قدموں تک بیٹھ گئی۔ "میں حسیناں ہوں۔ اس سے پہلے میں ریشماں تھی۔ اس سے پہلے راجکماری تھی۔ اس سے پہلے میرا نام گل رخ تھا۔ جتنے سال کی میری عمر ہے اس سے زیادہ میرے نام ہیں۔ مگر میرا اصلی نام کلونت کور ہے۔ باقی سارے نام تو میں ضرورت کے وقت رکھ لیتی ہوں۔ جیسا موقع اور ضرورت ہو ویسا ہی نام بھی ہو جاتا ہے۔ میں نے ایک سکھ گھرانے میں آنکھ کھولی تھی۔ پر میں ان کی بیٹی بھی نہیں تھی۔ انہوں نے مجھے جنگل سے اُٹھایا تھا۔ پتہ نہیں میرے ماں باپ کون تھے شاید میں اپنے ماں باپ کے گناہ کی یادگار تھی۔ وہ ہندو تھے، مسلمان تھے، سکھ تھے یا عیسائی تھے؟ میں کچھ نہیں جانتی۔ پر ہوش سنبھال کر میں کلونت کور بن گئی۔ میرے منہ بولے ماں باپ نے مجھے بہت ساری محبت دی۔ پڑھایا، لکھایا۔ بہت اچھا کھلایا پلایا۔ بڑے آرام سے رکھا۔ ان کی میرے سوا کوئی اور اولاد نہیں تھی۔ شاید اسی لیے انھوں نے مجھے بہت زیادہ پیار دیا۔ میری کوئی بات انہوں نے نہیں ٹالی۔ ہم لوگ ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ میں جوان ہوئی تو سارے علاقے میں میری دھوم مچ گئی۔ جسے دیکھو میرا دیوانہ تھا۔ بڑے بڑے بھیلے گھبرو مجھے دیکھ دیکھ کر ٹھنڈی سانسیں بھرتے تھے۔ وہ جو کسی کے سامنے نہیں جھکتے تھے میرے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ بڑے بڑے زمیندار، جاگیردار، پیسے والے لوگ میرے باپو سے میری مانگ کرتے تھے۔ باپو میری مرضی کے بغیر میرا ہاتھ کسی کے ہاتھ میں پکڑانے کو تیار نہیں تھا اور میں اپنی ہی ترنگ میں مگن تھی۔ کوئی میری نظروں میں جچتا ہی نہیں تھا۔ میری سہیلیاں مجھے چھیڑا کرتی تھیں کہ کیا تیرے لیے آسمان سے دیوتا اُتریں گے؟ اور میں سچ مچ کسی دیوتا کی آس میں بیٹھی تھی اور پھر ایک دن مجھے اپنے سپنوں کا دیوتا نظر آ گیا۔ ایک دیہاتی میلے میں میرا اس سے سامنا ہوا۔ وہ بڑا بانکا سجیلا۔ بڑا بہادر، بہت دلیر تھا۔ گھوڑوں کی دوڑ میں، کبڈی میں، کشتی میں، نشانہ بازی میں کوئی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے جس مقابلے میں حصہ لیا اسے جیت لیا۔ میں ہی کیا ساری لڑکیاں اس پر لٹو ہو گئی تھیں۔ کوئی نہیں جانتا تھا وہ کون تھا۔ کہاں سے آیا تھا۔ پر وہ جو بھی تھا اس کا کوئی جوڑ نہیں تھا۔ وہ اپنے جیسا بس ایک ہی تھا۔ میں نے بھی اسے اپنے دل میں بسا لیا۔ میلے میں گھومتے پھرتے لڑکوں کی ایک ٹولی نے مجھے تاڑ لیا اور میرا پیچھا کیا۔ بھرے بازار میں انھوں نے مجھے چھیڑا۔ میں نے جھڑک دیا تو بادل سنگھ نے بڑھ کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ بادل قریب کے گاؤں کے زمیندار کا بیٹا تھا۔ بہت اکھڑ اور ضدی اور بلا کا ہتھ چھٹ۔ علاقے کے نوجوانوں کی ٹولی اس کے ساتھ تھی۔ کوئی اس سے متھا نہیں لگاتا تھا۔ جس نے اس کو للکارا اسے پچھتانا پڑا۔ لڑائی جھگڑے میں وہ سب سے آگے تھا۔ بلکہ ایک دو قتل بھی کر چکا تھا اور جیل بھی ہو آیا تھا۔ بھلا ایسے خطرناک آدمی کے منہ کون آ سکتا تھا۔ اس نے میرا بازو پکڑا تو میں نے اسے بہت بُرا بھلا کہا۔ دو تین تھپڑ بھی مارے مگر اس پر کیا اثر ہوتا۔ ڈھیٹ بنا ہنستا رہا۔ بولا۔

"سندری۔ میں جس کا ہاتھ تھام لیتا ہوں پھر نہیں چھوڑتا۔ بڑی دیر سے تجھ پر میری نظر ہے۔ آج بھرے میلے میں تیرا بازو پکڑا ہے۔ اب یہ مرتے دم تک نہیں چھوڑوں گا۔"

میں نے ڈانٹا۔ "بکواس مت کر۔ اگر میرے باپ نے سن لیا تو تیرا خون کر دے گا۔"

وہ ہنسنے لگا۔ "اپنے باپ کا ڈر دکھایا ہے تو پھر سن لے۔ پہلے سوچا تھا تیرا ہاتھ مانگنے تیرے باپ کے پاس جاؤں گا۔ پر اب تجھے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ تیرے باپ میں دم ہو گا تو تجھے واپس لے آئے گا۔" اتنا کہہ کر اس نے مجھے گھسیٹ کر اپنے گھوڑے پر ڈال لیا۔ میں بہت چیخی چلائی۔ سب کو مدد کے لیے پکارا۔ پر سب آس پاس کھڑے چپ چاپ دیکھتے رہے۔ کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ آگے بڑھ کر بادل سنگھ کو روکتا۔ اس کے ساتھیوں نے لاٹھیاں اور بندوقیں تان لیں۔ ان کے تیور دیکھ کر سب دم سادھے کھڑے دیکھتے رہے۔ میرے پیار کا دم بھرنے والے اور میری خاطر جان دینے کا وعدہ کرنے والے بھی نظریں چرا کر چلے گئے۔ بادل اور اس کے ساتھی کچھ دیر وہیں کھڑے للکارتے رہے مگر جب کوئی آگے نہیں بڑھا تو ہنستے ہوئے بادل نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی پر گھوڑا زور سے اچھل کر رہ گیا۔ میں پھسل کر زمین پر گر گئی۔ چوٹ تو کوئی نہیں آئی۔ نہ مجھے اس سے چوٹ کی پروا تھی۔ اُٹھ کر دیکھا تو بادل سنگھ کے گھوڑے کی لگام تھام کر وہی جوان کھڑا تھا۔ بادل نے گھوڑے کو ایڑ لگائی پر اس نے لگام ہاتھ سے نہیں چھوڑی۔ کہنے لگا۔ "تو نے اس میلے کے سارے مردوں کی بہادری کو للکارا ہے۔ میں تجھے یوں آسانی سے نہیں جانے دوں گا۔"

بادل کے ساتھی اسکی طرف بڑھے پر اس نے پلک جھپکنے میں چھلانگ لگائی اور بادل کے گھوڑے پر اس کے پیچھے سوار ہو گیا۔ پستول نکال کر اس نے بادل کی کمر سے لگا دیا اور گرج کر بولا۔ "خبردار۔ اگر کسی نے حرکت کی تو اس کی لاش ملے گی۔"

بادل کی تو روح خشک ہو گئی۔ اس کے کہنے پر اس کے ساتھیوں نے لاٹھیاں اور بندوقیں پھینک دیں۔ بادل کو اس نے اپنے ساتھ گھوڑے سے نیچے گرا لیا اور اپنا پستول ڈب میں رکھ کر کہنے لگا۔

"بادل سنگھ۔ اگر مرد کا بچہ ہے تو اکیلا مجھ سے مقابلہ کر لے۔" دونوں میں بڑی گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ بادل سنگھ بھی مٹی کا بنا ہوا تھا۔ پر اس کے سامنے ریت کی بوری کی طرح بیٹھ گیا۔ مکوں اور لاتوں سے اس نے بادل کا حلیہ بگاڑ دیا۔ سب خاموش کھڑے دیکھتے رہے۔ کسی نے بادل کو چھڑانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ جب بادل سنگھ بے ہوش ہو کر گر گیا تو اس نے بادل کے گھوڑے پر مجھے بٹھایا اور کہنے لگا۔ "اس سوہنی کو میں اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ یہ میری جیت ہے۔ کسی میں ہمت ہو تو روک لے؟"

اور تو کس میں دم تھا کہ اسے روکتا۔ بادل کے ایک ساتھی نے بندوق اُٹھا کر فائر کرنا چاہا پر اس کے گولی چلانے سے پہلے ہی پستول کی گولی نے اس کے ہاتھ سے بندوق نیچے گرا دی۔ باقی کسی نے آنکھ اُٹھانے کی جرأت بھی نہیں کی۔ گھوڑے کی باگیں اُٹھا کر اس نے اعلان کیا۔ "میرا نام لوٹا سنگھ ہے۔ میں ڈھیرو پنڈ میں رہتا ہوں۔ اس لڑکی کو میں اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ بادل سنگھ کا گھوڑا بھی لے جا رہا ہوں جس مائی کے لال میں طاقت ہو واپس لے آئے۔" یہ کہہ کر اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور وہ سرپٹ ہو گیا۔ راستے میں اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ میں بھی چپ رہی۔ گھنے جنگلوں سے گھرے ہوئے ایک پہاڑی علاقے میں اس نے ایک حویلی کے سامنے گھوڑا روکا اور مجھے گڑیا کی طرح اُٹھا کر زمین پر کھڑا کر دیا۔ یہ لوٹا سنگھ کی حویلی تھی جہاں اور کوئی اسکی اجازت کے بغیر نہیں پہنچ سکتا تھا۔ حویلی میں نوکر چاکر تھے۔ حفاظت کے لیے بندوقوں والے بہت سے آدمی تھے۔ لوٹا سنگھ نے مجھے بڑے کمرے میں لے جا کر بٹھایا اور بتایا کہ اس حویلی میں میرے سوا کوئی اور عورت نہیں ہے۔ میں خوف اور پریشانی

ایک ہندو جوگی کی پُر اسرار داستان جس نے ہر طرف اپنے سحر کا جال پھیلا رکھا تھا۔

وہ ایک اللہ والے کی تسبیح حاصل کر کے ساری دنیا کے عاملوں سے مہان بننا چاہتا تھا۔

انوار صدیقی کے سحر انگیز قلم سے ایک انوکھی داستان

جوگی

کے مارے رونے لگی۔ وہ بولا۔ "جب رونا ختم ہو جائے تو نوکر کو بتا دینا۔ وہ تمہیں کھانے پینے کا سامان لا دے گا۔"

اس طرح بُوٹا سنگھ میری زندگی میں آیا۔ مَیں اس کی شکل و صورت اور سبھاؤ پر دل دے بیٹھی تھی۔ وہ بھی مجھے پسند کرتا تھا مگر مجھ سے شادی کرنے کو تیار نہیں تھا۔ کئی ہفتے گزر گئے اور رفتہ رفتہ مجھ پر بوٹا سنگھ کی اصلیت کھلنے لگی۔ وہ کالے دھندوں میں پڑا ہوا تھا۔ چوری چکاری۔ ڈاکے۔ رسّہ گیری۔ سمگلنگ۔ کون سا بُرا کام تھا جو وہ نہیں کرتا تھا۔ دُور دُور تک کے علاقے میں اس کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ پر مجھے اس کے دھندوں سے کوئی مطلب نہیں تھا۔ مَیں خوش تھی، لیکن ایک دن اس نے مجھے بتایا کہ مجھے سرحد پار ایک زمیندار کے گھر جانا ہوگا اور میرا نام ریشماں ہوگا۔ مَیں ریشماں بن کر وہاں رہوں گی اور بُوٹا جو کچھ کہتا رہے گا وہ کرتی رہوں گی۔ مَیں حیران ہو کر اس کا منہ تکنے لگی۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" مَیں نے غصّے میں کہا۔ "مَیں اور اس مسلمان کے گھر میں رہوں گی۔ کبھی نہیں۔ مَیں اپنی جان دے دوں گی پر ایسا غلط کام نہیں کروں گی۔ مَیں ایک شریف عورت ہوں۔ تمہاری ہونے والی بیوی ہوں۔"

وہ ہنستے ہنستے پاگل ہوگیا۔ پھر کہنے لگا۔ "بیوقوف عورت۔ نہ مَیں شریف آدمی ہوں نہ تُو شریف عورت ہے اور یہ کس نے کہا ہے کہ تُو میری بیوی ہے؟ ہم دونوں ساجھے اور بیوپاری لوگ ہیں۔ تُو میری ساجھے دار ہے۔ ہم اچھے بُرے وقتوں میں ایک دوسرے کے کام آئیں گے۔ دنیا کی ساری نعمتیں مَیں تیرے قدموں میں لا کر ڈال دوں گا۔ تیری طرف کوئی آنکھ بھی اُٹھا کر دیکھے گا تو مَیں اس کی آنکھیں نکال لوں گا۔ ہر ایک پر تیرا حکم چلے گا۔ سوائے بُوٹا سنگھ کے۔ تجھے بُوٹا سنگھ کی ہر بات ماننی ہوگی۔ اس کی ہر خوشی پوری کرنی ہوگی۔ تو مہارانی بن کر راج کرے گی۔ یوں سمجھ لے کر تُو میری ساجھے دار ہوگی۔ کام کاج اور دھندے میں بھی اور عیش و آرام میں بھی۔ بول تجھے منظور ہے؟"

مجھے وہ پہلے ہی بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ بہادر اور طاقت ور تھا۔ قول کا پکا تھا۔ میرا دیوانہ تھا اور مجھے کیا چاہیے تھا۔ مَیں نے بے اختیار خوش ہو کر اقرار کر لیا۔ "مجھے منظور ہے بُوٹے۔ مگر تُو مجھ سے بیاہ کب کرے گا؟"

"بیاہ" وہ حیران ہوگیا۔ "بیاہ کی تو مَیں نے بات ہی نہیں کی ہے۔"

اب میرے حیران ہونے کی باری تھی۔ "تُو ہر کام میں مجھے ساجھے دار بنائے گا۔ میرے ساتھ پیار نبھائے گا۔ میرے نخرے اُٹھائے گا۔ میرے عیش و آرام کا خیال رکھے گا۔ ہم ساتھ رہیں گے تو پھر بیاہ کے بغیر یہ سب....؟"

وہ ہنس پڑا۔ "تُو بالکل اناڑی ہے۔ پگلی۔ مَیں تجھ سے پیار کرتا ہوں۔ تجھے پسند کرتا ہوں۔ آج کے بعد تجھے اپنے دھندے میں شریک کر رہا ہوں مگر مَیں تجھ سے بیاہ نہیں کروں گا۔ بیاہ تو مَیں کسی سے بھی نہیں کروں گا اور پھر ساجھے اور بیوپار کا بیاہ سے کیا تعلق ہے؟ بیوی تو گھر والی ہوتی ہے۔ نہ وہ مجبور ہوتی ہے نہ دوست اور حصّے دار ہوتی ہے۔ مَیں نے بتایا کہ تُو دھندے میں میرا ہاتھ بٹائے گی۔ ہماری زندگی خطرے سے خالی نہیں ہوگی۔"

"پر کیسے؟ مَیں نے تو کبھی کوئی بیوپار کیا ہی نہیں؟"

"فکر نہ کر مَیں تجھے سب سکھا دوں گا۔" وہ میرے برابر آ کر بیٹھ گیا اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر بولا۔ "کلونت تجھے دیکھتے ہی میرے دل نے کہا کہ یہی وہ عورت ہے جس کا مجھے انتظار تھا۔ تیرے بغیر مَیں ادھورا رہ جاؤں گا۔"

"پر تمہارا دھندہ کیا ہے؟" مَیں نے پوچھا۔

"ہمارا دھندہ ہے سمگلنگ۔ بدمعاشی۔ چوری۔ ڈاکے۔ رسّہ گیری۔ سارے ناجائز دھندے ہمارے دھندے ہیں۔"

مَیں پریشان ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

"پگلی۔ آجکل اس سے بڑا کاروبار اور کوئی نہیں ہے۔ دنیا میں اس کے بغیر بڑا نہیں بنا جا سکتا۔ تجھے آہستہ آہستہ سب چیزوں کا پتہ لگ جائے گا۔ میرا کام سرحد پار تک پھیلا ہوا ہے۔ بڑے بڑے لوگ میرے ساجھے دار ہیں۔

ان کی مدد کے بغیر میں یہ سارے کام نہیں کر سکتا ہوں۔ پولیس میں بھی میرے تنخواہ دار لوگ ہیں۔ بڑے بڑے افسر اور نیتا میرے ساتھ شامل ہیں۔ تُو میرے ساتھ کام کرے گی تو یہ سب دھندے کرنے ہوں گے۔ تجھے ضرورت کے وقت سرحد پار بھی جانا ہو گا۔ مطلب نکالنے کے لیے دوست، دُشمن، سب کے ساتھ راستی کی پینگیں بڑھانی ہوں گی۔"

میں ایک دم اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "تمہارا مطلب ہے۔ میں۔ میں اپنی عزت بیچوں گی؟" مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ سچ مچ مجھے گناہ کی دعوت دے رہا تھا۔

اس نے میرا بازو تھام کر مجھے بٹھا لیا۔ "چھی چھی چھی۔ یہ کون کہتا ہے؟ ارے تُو تو کاروبار کرے گی۔ جیسا موقع ہو گا ویسا ہی کام تجھے کرنا ہو گا۔ صرف میرے لیے تُو کلونت ہو گی۔ باقی ساری دُنیا کے لیے تیرا کوئی نام نہیں ہو گا۔ نہ کسی سے تیرا کوئی رشتہ ہو گا۔ کبھی تجھے کسی کی بیٹی بننا پڑے گا۔ کبھی گھر والی اور کبھی محبوبہ۔۔۔۔ کبھی تو مسلمان ہو گی۔ کبھی سکھ کبھی ہندو اور عیسائی۔ جیسا موقع ہو گا ویسا ہی تیرا نام ہو گا۔ ویسا ہی تیرا کام ہو گا۔ ہم دونوں مل کر سکیم بنایا کریں گے اور پھر اس پر کام کیا کریں گے۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لے۔ اگر منظور نہیں ہے تو مجھے بتا دے۔ میں خود تجھے واپس تیرے گاؤں چھوڑ آؤں گا۔"

واپس گاؤں جانا میرے لیے بہت مشکل تھا۔ میں کسی کو مُنہ دکھانے کے قابل نہیں رہی تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ لوٹا سنگھ کی وجہ سے میں نے بہت سے لوگوں سے دُشمنی مول لے لی تھی۔ میرے مُنہ بولے ماں باپ مجھے دوبارہ قبول کرنے کو تیار نہ ہوتے۔ اگر وہ تیار ہو جاتے تو گاؤں اور برادری والے میرا جینا دوبھر کر دیتے۔ دنیا کے طعنے اور گالیاں میرا مقدر بن جاتے۔

لوٹا سنگھ نے میرے دل کی بات سے اندازہ لگا لیا۔ کہنے لگا۔ "اگر تجھے ذلت اور غریبی کی زندگی منظور ہے تو مجھے بتا دے۔ لوگوں کی گالیاں اور طعنے پسند ہیں تو واپس چلی جا۔ اچھی طرح سوچ لے۔ غور کر لے۔ اگر راج کرنا چاہتی ہے تو سب کچھ بھول کر لوٹا سنگھ کے اشارے پر کٹھ پُتلی بن جا۔ ایسی عیش اور آرام بھری زندگی تجھے دوبارہ نہیں ملے گی۔ اوپر والے نے تجھ پہ بڑی مہربانی کی ہے جو تجھے مل گئی ہے۔"

"پر لوٹے۔ یہ تو دین دھرم کے خلاف ہے۔ یہ تو پاپ ہے۔"

لوٹا سنگھ میری نادانی پہ ہنسنے لگا۔ بولا۔ "باؤلی ہوئی ہے۔ اری پگلی۔ یہ دین دھرم۔ پاپ اور پُن سب بیکار باتیں ہیں۔ لوگوں کو بہکانے کے لیے بنائی گئی ہیں۔"

"مگر تجھے غیرت نہیں آئے گی جب میں مطلب نکالنے کے لیے کسی اور کے پاس جاؤں گی؟"

وہ ڈھٹائی سے ہنسا اور کہنے لگا۔ "میری غیرت کو کیا ہوا؟ بے غیرتی تو وہ ہے جب کوئی میری مرضی یا اجازت کے بنا تیری طرف آنکھ اُٹھائے۔ ایسے آدمی کا تو میں خون پی جاؤں گا۔ جو کام بندہ اپنی مرضی خوشی سے کرتا ہے اس میں غیرت اور عزت کا کچھ نہیں بگڑتا۔ جس کے ہاتھ میں طاقت اور پیسہ ہو اسکی کوئی بے عزتی نہیں کر سکتا۔ میری یہ بات اپنے پلّے باندھ لے۔ پھر بھی میں تجھے سوچنے کا موقع دے رہا ہوں۔ اچھی طرح غور کر لے۔ میری طرف سے کوئی پابندی یا زبردستی نہیں ہے۔ میری بات منظور نہیں ہے تو میں تجھے ایک منٹ بھی یہاں نہیں روکوں گا۔ تجھے خود لے جا کر واپس چھوڑ آؤں گا۔"

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

میں نے دو دن تک کھانا نہیں کھایا۔ روتی اور سوچتی رہی۔ لوٹا سنگھ نے بھی میری خبر نہیں لی۔ وہ جانے کس وقت تھوڑی دیر کے لیے حویلی میں آتا اور مجھے خبر تک نہ ہوتی۔ میں نے عقل سے کام لیا تو اس کی باتوں کی سچائی معلوم ہوئی وہ مجھے مجبور نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ مجھے پسند کرتا تھا۔ مجھ سے پیار کرتا تھا۔ وہ مجھے اپنے جیسا بنانا چاہتا تھا۔ مجھے اپنے جیون میں اور اپنے کاروبار میں ساجھے دار بنانا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اس کے رنگ میں رنگ جاؤں اپنا

سب کچھ اُسے سونپ دوں۔ اس کے مقابلے میں دوسری طرف غریبی اور مصیبت کی زندگی تھی۔ میرا مُنہ بولا باپ بوڑھا اور کمزور آدمی تھا۔ اس کے بازوؤں میں اتنا دم نہیں تھا کہ مجھے دنیا والوں کی میلی نظروں اور باتوں سے بچاتا۔ لوٹا سنگھ کے ساتھ آ جانے کے بعد کوئی مجھے بے گناہ اور معصوم نہیں سمجھتا۔ میں نے سوچا گھر واپس جانے کے بعد بدنامی۔ ذلت اور پریشانی کے سوا مجھے کچھ اور نہیں ملے گا۔ دُوسری طرف لوٹا سنگھ کا پیار اور اس کے مضبوط بازوؤں کی حفاظت کی دیوار تھی۔ یہ سچ ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے کوئی میری طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ لوٹا سنگھ کے سوا دوسرے سب میرے سامنے سر جھکائیں گے۔ میرا ہر حکم پورا کریں گے۔ دولت میری باندی ہو گی۔ رہ گئی عزّت تو خالی میلی عزّت کو میں کیا کروں گی؟ ویسے بھی ایک خوبصورت اکیلی اور کمزور عورت کا اپنی عزّت بچا کر رہنا مشکل ہے۔ یہی سوچ سوچ کر آخر میں نے کڑوا گھونٹ پی لیا اور لوٹا سنگھ کے ساتھ ساجھے داری کر لی۔ یہ سچ ہے کہ لوٹا سنگھ نے اپنی ایک ایک بات سچ کر دکھائی۔ اب وہ میرا غلام ہے۔ میرے اشاروں پہ چلتا ہے۔ میری مرضی کے آگے اس کے سارے آدمی سر جھکاتے ہیں۔ پر میری اپنی کوئی ہستی نہیں ہے۔ میرے نام بدلتے رہتے ہیں۔ جہاں ضرورت پڑتی ہے وہ مجھے بہروپ اور نام بدل کر بھیج دیتا ہے۔ کبھی مجھے کسی راجکماری کا روپ دھارنا پڑتا ہے۔ کبھی گاؤں کی لڑکی کا۔ کبھی چوکیدار کی بیوی بن کر رہتی ہوں تو کبھی جاگیردارنی بن کر راج کرتی ہوں۔ لوٹا سنگھ ہر جگہ مجھ سے ملنے کے لیے آ جاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ وہ میرے بنا نہیں رہ سکتا۔ مگر۔۔۔۔مگر۔۔۔"

وہ یکایک چُپ ہو گئی اور اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ "مگر اب کیا ہُوا؟" میں نے نرمی اور ہمدردی سے پُوچھا۔

وہ بے اختیار پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی۔ میں نے بھی اُسے چُپ کرانے کی کوشش نہیں کی۔ کچھ دیر بعد اس کے آنسو تھمے تو میں نے تسلی آمیز لہجے میں پُوچھا۔ "اب تمہیں کیا دُکھ ہے کلونت؟"

"دُکھ یہی ہے کہ یہ بے غیرتی کی زندگی اب میں نہیں گزار سکتی۔ میں نے غلط سوچا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ عورت کو ایک گھر اور اپنے بچوں کے سوا کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہوتی۔ روز روز کے بہروپ، رنگ رنگ کے آدمی نئے نئے گھر اور خاندان۔ یہ بھی کوئی جیون ہے؟" وہ پھر آب دیدہ ہو گئی۔ "صرف پیسے کے لیے جینا بہت مشکل کام ہے ملک صاحب۔ ایسے جینے سے تو مر جانا اچھا۔"

بالآخر اس کے اندر کی عورت بیدار ہو گئی تھی۔ اسے اپنے آپ سے اور اپنے ماحول اور کاروبار سے نفرت ہو گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب میں نے اسے بیاہ کرنے کی پیش کش کی تو وہ موم کی طرح پگھل گئی۔ اب اس کے نزدیک زندگی کا سب سے بڑا مقصد ایک گھریلو عورت بن کر رہنا تھا۔ وہ گھریلو زندگی کے لیے سب کچھ تج دینے کو تیار تھی۔ "ملک صاحب۔ یہ کوئی زندگی نہیں ہے۔ یہ تو طوائفوں سے بھی بدتر ہے۔ بلکہ وہ بھی اچھی ہوتی ہیں۔ ان کا کوئی ایک نام اور نشان تو ہوتا ہے۔ میرا تو کوئی ایک نام بھی نہیں ہے۔"

میں صوفے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔ "تو پھر اب تم کیا کرنا چاہتی ہو؟" میں نے پُوچھا۔

"میں نوکرانی بن کر تمہاری خدمت کروں گی۔ تم مجھ سے بیاہ کر لو۔ بس مجھے اپنے گھر کے ایک کونے میں پڑے رہنے کی اجازت دے دو۔"

"مگر کلونت۔ تمہارا اور میرا مذہب الگ الگ ہے۔"

"میرا کوئی مذہب نہیں ہے۔ اب تو جو تم کہو گے میں وہی بن جاؤں گی۔"

میں نے چُبھتا ہوا سوال کیا۔ "اور لوٹا سنگھ کا کیا ہو گا؟ کیا وہ تمہیں اس کی اجازت دے گا؟" وہ سوچ میں پڑ گئی۔ میں نے کہا۔ "وہ تو میری جان کا دُشمن بن جائے گا اور پھر تمہیں بھی چین سے نہیں بیٹھنے دے گا۔ تم اس کی بھیدی ہو اس کے

سارے راز جانتی ہو۔ اس کے علاوہ اب وہ تمہیں جنم جنم کے لیے اپنا ساتھی سمجھ بیٹھا ہے۔ تم پر بھروسہ کرتا ہے۔ وہ کیسے برداشت کرے گا کہ تمہیں یوں آسانی سے کسی اور کے حوالے کر دے؟"

"اگر انسان سوچ لے تو دُنیا میں ساری مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں۔" اُس نے فلسفہ جھاڑا۔ "کیا تم بُوٹا سنگھ سے ڈرتے ہو؟"

"ڈرنے کی بات نہیں ہے مگر بلاوجہ اس سے دُشمنی مول لینا بھی ٹھیک نہیں ہے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔" وہ پُرعزم لہجے میں بولی۔ "میں نے تمہیں غلط سمجھا تھا ملک صاحب مجھے کوئی اور مضبوط سہارا ڈھونڈنا پڑے گا اور شاید ویسے بھی تم مجھ ایسی عورت سے شادی کر کے ساری زندگی پچھتاؤ گے۔ جو عورت دوسروں کا کھلونا بنتی رہی ہو اسے کوئی شریف اور عزت دار آدمی اپنی گھر والی کیسے بنا سکتا ہے؟ یہ مجھے پہلے ہی سوچ لینا چاہیے تھا۔"

"ایک بات بتاؤ۔ کیا میرے سوا کوئی اور بھی تمہاری اصلیت جانتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کوئی نہیں جانتا۔ میں نے کبھی کسی کو اپنی اصلیت نہیں بتائی۔ نہ جانے تمہیں دیکھا تو تم پر بھروسہ کرنے کو کیوں جی چاہ گیا میرے روپ کے تو سبھی دیوانے ہیں۔ پر مجھے سہارا دینے اور اپنانے کو کوئی تیار نہیں ہے۔"

مجھے اس عورت پر ترس آ رہا تھا۔ وہ ایک سیدھی سادی عورت تھی۔ حالات نے اسے کسی اور راستے پر ڈال دیا تھا لیکن اس کے اندر کی عورت ابھی تک زندہ تھی اور اس بات کا ثبوت یہ تھا کہ وہ ایک عام گھریلو عورت کی زندگی اپنانے کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار تھی۔ میں اپنے ہی مسائل میں اُلجھا ہوا تھا۔ میرے لیے ایک جھنجھٹ مول لینا ممکن نہیں تھا۔ یہ درست ہے کہ بُوٹا سنگھ کی سرگرمیوں اور اس کے ساتھ اپنے ایک بااثر ہم وطن کے اشتراک کی اطلاع نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا، لیکن میرے پاس فی الحال نہ وقت تھا اور نہ مہلت کہ اس جھگڑے میں پڑ جاتا۔ دوسری طرف کلونت کور کی بے بسی اور بے چارگی نے بھی میرے دل پر اثر کیا تھا، لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اس کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟ اور کیسے کر سکتا ہوں؟ یکایک میرے کانوں نے کار کے انجن کی آواز سُنی۔ آواز بہت دُور سے آ رہی تھی، لیکن لمحہ بہ لمحہ نزدیک ہوتی جا رہی تھی۔

یہ ایک سے زیادہ کاریں تھیں۔ اس دُور اُفتادہ اور ویران علاقے میں اتنی رات گئے کون آ سکتا ہے؟ ہو سکتا ہے پولیس میرے تعاقب میں آ رہی ہو؟ یہ سوچ کر میں بے چینی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ کلونت کور نے حیران ہو کر مجھے دیکھا۔ میں اضطرابی عالم میں کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ پھر میں بے تابی سے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا اور باہر نکل کر صحن میں چلا گیا۔ میرا اندازہ درست تھا۔ دو کاروں کی روشنیاں اس طرف بڑھتی ہوئی نظر آ رہی تھیں اور ان میں ایک جیپ گاڑی تھی۔ اگر یہ پولیس والے تھے تو میرے لیے فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ یقیناً انہوں نے چاروں طرف سے گھیرا ڈال لیا تھا۔ میری گاڑی تاریکی میں کھڑی نظر آ رہی تھی، لیکن میرے پاس اتنی مہلت نہیں تھی کہ اس میں سوار ہو کر راہِ فرار اختیار کرتا۔ وہ اس علاقے میں میری موجودگی کا کھلا اور واضح ثبوت تھی۔ میں نے پہلے تو فیصلہ کیا کہ جو ہو سو ہو، کار کے ذریعے فرار ہونے کی کوشش ضرور کرنی چاہیے، لیکن پھر یہ فیصلہ تبدیل کر دیا۔ آس پاس گھنے جنگلات کا سلسلہ تھا۔ کار کے لیے ممکن ہے مجھے کوئی کچا راستہ بھی نہ ملے، لیکن اگر میں پیدل نکلنے کی کوشش کروں تو اندھیرا جنگل مجھے پناہ فراہم کر سکتا تھا اور میں راتوں رات کافی دُور نکل سکتا تھا۔ یہ سوچ کر میں نے قدم آگے بڑھایا۔ کلونت جو میری بے چینی اور پریشانی بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ پوچھنے لگی: "کیا بات ہے ملک جی؟"

نہ جانے کیوں اس عورت کو اعتماد میں لیتے ہوئے مجھے ذرا بھی پس و پیش نہیں ہوا۔ میں نے کہا: "سنو کلونت۔ میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ میں کالے بازار اور کالے دھندوں کا بادشاہ ہوں۔ اس لیے پولیس کے ساتھ میری آنکھ مچولی چلتی رہتی ہے مجھے یوں لگتا ہے کہ پولیس میرا پیچھا کرتے ہوئے یہاں آ گئی ہے اور اُس نے مجھے گھیر لیا ہے۔"

وہ ہنسنے لگی: "بس۔ اتنی سی بات پر گھبرا گئے؟ ارے ملک جی۔ ہماری بھی پولیس سے آنکھ مچولی ہوتی رہتی ہے۔ پر

یہاں سے پولیس کو کبھی کچھ ہاتھ نہیں لگتا۔ پریشان کیوں ہوتے ہو۔ میرے ساتھ آؤ۔ پولیس کو ٹالنا میرا کام ہے۔" یہ کہہ کر اُس نے میرا ہاتھ تھاما اور واپس کمرے کے اندر لے گئی۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند کرنے کے بعد اُس نے مجھے کچن کے دروازے پر پہنچا دیا۔ "دیکھو۔ باورچی خانے کا پچھلا دروازہ جنگل میں کھلتا ہے۔ میں انہیں باتوں میں لگا کر رکھوں گی۔ اگر تمہیں خطرہ محسوس ہو تو یہ دروازہ کھول کر باہر چلے جانا۔ باہر سے اس کو بند کر دینا۔ میں دس پندرہ منٹ تک انہیں تمہارے پیچھے جانے کا موقع نہیں دوں گی۔ اتنی دیر میں تم اپنا کوئی بندوبست کر لینا۔" اس نے کچن کے اندر دھکیل کر دروازہ بند کر لیا۔ "یہ دروازہ بھی تم اندر سے بند کر لو۔ میں آواز دوں گی تو کھولنا ورنہ اسے بند ہی چھوڑ کر پچھلے دروازے سے نکل جانا۔"

میں نے کچن کے پچھلے دروازے کو دیکھا اور معاً مجھے خیال آیا کہ کہیں میں اس چوہے دان میں گرفتار تو نہیں ہو گیا ہوں۔ کچن سے باہر نکلنے کا صرف ایک راستہ تھا۔ اگر یہ باہر سے مقفل ہے تو پھر میں کسی طرح بھی اس قید خانے سے باہر نکلنے میں کامیاب نہیں ہو سکوں گا۔ لپک کر میں نے دروازے کا کھٹکا کھولا اور ایک جھٹکے سے دروازے کو باہر دھکیلا۔ دروازہ کھلتے ہی ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اندر آیا۔ کلونت کے کہنے کے مطابق باہر گھنا جنگل تھا جس میں ایک آدمی تو کیا بہت سے آدمی غائب ہو سکتے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کلونت میرے ساتھ مخلص تھی اور اس کی طرف سے فریب کا کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ میں نے دروازے کو احتیاط سے بند کیا اور کچن میں پڑے ہوئے ایک سٹول پر بیٹھ گیا۔ کچن بالکل ماڈرن اور خاصا کشادہ تھا۔ اس دُور دراز جنگل میں اس قدر جدید ترین کچن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

باہر کاروں کی آوازیں بالکل نزدیک آ گئی تھیں۔ پھر میں نے کاریں رُکنے اور دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں سُنیں۔ بھاری قدموں کی آوازوں سے رات کا سکوت درہم برہم ہو گیا۔ یہ کم از کم پانچ چھ آدمیوں کے قدموں کی آوازیں تھیں۔ اور ان کی چال سے اعتماد کا اظہار ہوتا تھا — یقیناً یہ پولیس کے لوگ تھے۔ سوال یہ تھا کہ کیا کلونت انہیں دھوکہ دینے میں کامیاب ہو جائے گی؟ جبکہ گھر کے سامنے کھڑی ہوئی کار میرے اس علاقے میں آنے کا واضح ثبوت تھی۔ اس قدر ٹھوس ثبوت کی موجودگی میں کلونت کور کس طرح اُن کی آنکھوں میں دھول جھونک سکے گی؟

باہر کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی اور پھر ایک بھاری آواز سنائی دی: "کبیرو۔"

جواب میں کلونت کی آواز آئی: "کبیرو نہیں ہے۔ کون ہے جی؟"

"جیناں دروازہ کھولو چوہدری جی آئے ہیں۔"

دروازہ کھلنے کے بعد جیناں کی آواز سُن کر میرے دم میں دم آ گیا: "ارے چوہدری جی آپ؟ خبر دیے بغیر کیسے راستہ بھول پڑے؟"

اس کے جواب میں ایک بارعب ہنسی سنائی دی اور پھر کسی نے بڑی پُراعتماد آواز میں کہا: "یہاں ہم راستہ بھول کر نہیں آتے جیناں۔ تم سے ملنے آتے ہیں۔ اور آج رات ہم یہیں رہیں گے۔"

جیناں کی آواز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ پس و پیش میں مبتلا تھی: "چوہدری جی آج۔ آج تو کبیرو بھی ادھر ہی ہے تھوڑی دیر میں واپس آ جائے گا۔"

چوہدری کا قہقہہ بہت معنی خیز تھا: "تو پھر کیا ہوا؟ ہمیں دیکھ کر واپس چلا جائے گا۔" پھر اچانک اس نے سوال کیا: "یہ باہر کس کی گاڑی کھڑی ہے؟"

"یہ گاڑی۔ یہ گاڑی۔ وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے بُوٹا سنگھ آیا تھا۔"

"اور اپنی نشانی چھوڑ گیا؟!" چوہدری نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ پھر کہنے لگا: "میں نے یہ گاڑی پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ سوچا کوئی نیا مہمان تو نہیں آ گیا اور تیرے گھر مہمانوں کی کیا کمی ہے؟!" اس کی آواز سے تضحیک اور حقارت جھلک رہی تھی: "ٹھیک ہے۔ کوئی بات نہیں۔ تم ہمارے کھانے پینے کا بندوبست کرو۔ کھانے کا نہیں صرف پینے

کا۔ ہو ہو ہو۔ چوہدری نے پھر زوردار قہقہہ لگایا۔

مَیں اب تک چوہدری کی آواز کو غور سے سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ آواز مَیں نے پہلے بھی کہیں سُنی ہے ؟ کہاں سُنی ہے ؟ یہ مانوس سی آواز کس شخص کی ہے ؟ مَیں نے تیزی سے اپنے ذہن اور حافظے کے ورق اُلٹنے شروع کر دیے۔

باہر والے کمرے سے چوہدری کی آواز پھر سنائی دی۔ "سارے ہاتھ پر ہاتھ دھرے کیوں بیٹھی ہے ؟ ہماری خاطر داری نہیں کرے گی ؟"

"چوہدری جی۔ آپ نے ٹھیک سمجھا ہے۔ بُوٹا سنگھ ایک مہمان کو یہاں چھوڑ گیا ہے۔ اس لیے تو مَیں نے آپ سے کہا تھا کہ......"

"مہمان!؟" وہ حیرت زدہ ہو گیا تھا۔ "کون مہمان؟ کہاں ہے؟"

"وہی جو آپ سے زمینوں کا سودا کر رہے ہیں۔ وہ ملک صاحب اِدھر آئے ہوئے ہیں۔ مَیں نے انھیں سارا علاقہ دِکھا دیا ہے۔ اچھا ہوا کہ آپ بھی آ گئے۔"

"زمینوں کا سودا ؟ ! ارے کون سے ملک کی بات کر رہی ہے ؟ کہاں ہے وہ ملک ؟"

حنیفاں نے کچن کے دروازے پر آکر مجھے آواز دی۔ "ملک جی۔ آ جائیں باہر۔ یہ تو اپنے چوہدری صاحب ہیں۔"

مَیں حالات کے اچانک یوں رُخ بدل جانے کی وجہ سے گھبرا سا گیا۔ میرے لیے اب دو ہی راستے تھے۔ یا تو باہر نکل کر چوہدری کا سامنا کروں یا پھر کچن کے پچھلے دروازے سے باہر نکل جاؤں۔ باہر نکلنے کے مقابلے میں چوہدری کا سامنا کرنا زیادہ محفوظ اور مناسب تھا۔ میں نے کلونت سے یہ نہیں کہا تھا کہ میری چوہدری سے بالمشافہ ملاقات ہو چکی ہے۔ اس لیے مَیں اس بارے میں کوئی بھی مناسب اور معقول بہانہ تراش سکتا تھا۔ چنانچہ مَیں نے چوہدری سے ملاقات کرنے کو ترجیح دی اور کچن کا دروازہ کھول کر دوسرے کمرے میں پہنچ گیا۔ دروازے کے سامنے کلونت کھڑی تھی اور بیڈ پر ایک شخص دراز تھا۔ میری اس پر نظر پڑی تو مَیں ٹھٹھک کر رہ گیا۔ اس کی نظریں اسی طرف لگی ہوئی تھیں۔ وہ تیزی سے اُٹھ کر بیٹھ گیا اور اس کا ہاتھ تیزی سے اس کی کمر میں لٹکے ہوئے پستول کی طرف گیا۔ دوسرے ہی لمحے پستول اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ بیڈ پر سے اُٹھ کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔

"تو یہ تم ہو ؟!" وہ طنز بھرے لہجے میں بولا۔ "ملک صاحب ؟! مجھ سے زمینوں کا سودا کرنا چاہتے ہو؟"

مَیں اپنی جگہ پر ساکت کھڑا رہ گیا۔ میرے سامنے ٹونی کا رفیق کار "بالا" پستول تانے ہوئے کھڑا تھا۔ اس کے جسم پر قیمتی لباس تھا اور ہاتھ میں پستول جس کی لبلبی پر اس کی اُنگلی کا دباؤ مَیں صاف محسوس کر سکتا تھا۔ ہم دونوں بالکل خلافِ توقع ایک دوسرے کو اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔ مجھے یہ جاننے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی کہ ٹونی نے خلافِ قانون سرگرمیوں کا جو جال بچھا رکھا ہے یہ بھی اسی کا ایک حصہ تھا۔ اس کا ملازمِ خاص بالا ایک دولت مند اور با اثر زمیندار کے روپ میں اس علاقے میں سمگلنگ کے دھندے میں مصروف تھا اور یہاں کے لوگ اسے ایک دولت مند اور با اختیار زمیندار کے طور پر جانتے تھے۔ گویا ٹونی کے ہاتھ بہت دُور تک پھیلے ہوئے تھے۔

کلونت حیرت سے باری باری ہم دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ "چوہدری جی۔ آپ ان کو جانتے ہیں ؟!"

"خوب اچھی طرح۔" بالا مسکرایا۔ "مجھ سے زیادہ انھیں اور کوئی نہیں جانتا۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "کھڑے کیوں ہیں؟ تشریف رکھیئے ملک صاحب۔" مَیں آگے بڑھ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ "مجھے تو خود آپ کی تلاش تھی ملک صاحب۔ اچھا ہوا آپ سے اتنی جلدی پھر ملاقات ہو گئی۔"

مَیں نے پریشانی اور بے بسی سے کلونت کور کی طرف دیکھا۔ وہ ایک جہاں دیدہ عورت تھی اور کافی عرصے تک مجرموں

کے ساتھ رہنے کی وجہ سے کم از کم یہ ضرور بھانپ گئی تھی کہ بالا میرا دوست نہیں ہے۔ "یہی تمہارے معزز مہمان ہیں حنیفاں ؟ جن کی وجہ سے تم مجھے اپنا مہمان نہیں بنانا چاہتی تھیں ؟"

کلونت کور پریشانی سے سر ہلا کر رہ گئی۔

بالا خباثت سے مسکرایا۔ "تمہارے ہی نہیں یہ تو ہمارے بھی مہمان ہیں۔ ہمیں ان کا بہت بے چینی سے انتظار تھا۔ ہم انھیں اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ اب یہ ہمارے مہمان ہیں۔" اس کے چہرے پر نفرت اور غیظ و غضب کے تاثرات صاف طور پر دیکھے جا سکتے تھے۔ کلونت کور اپنی جگہ خاموش کھڑی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس موقعہ پر اسے کیا کرنا چاہیئے ؟

"اُٹھیئے ملک صاحب۔" بالے نے پستول سے مجھے اشارہ کیا۔ "چلیئے۔ آپ کے ساتھ زمینوں کی خریداری کے بارے میں بات چیت کر لیتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ مَیں بھی صوفے سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ "میرے آگے چلیئے تو بہتر ہو گا۔ اس لیے کہ آپ ہمارے مہمان ہیں۔" اس نے دانت پیس کر کہا اور مَیں خاموشی سے کلونت پر ایک نگاہ ڈال کر دروازے کی طرف بڑھا۔ مَیں نے بہت تیزی سے قدم آگے بڑھائے لیکن دروازے کے پاس پہنچ کر ایک دم تیزی سے پلٹا اور میرا گھونسہ پوری قوت کے ساتھ بالے کے مُنہ پر لگا۔ وہ اس اچانک حملے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا۔ مَیں نے اس کے پستول والے ہاتھ پر پوری طاقت سے کھڑے ہاتھ کی ضرب لگائی اور پستول اس کے ہاتھ سے نیچے گر گیا۔ مَیں نے اسے سنبھلنے کا موقعہ دیئے بغیر مزید دو تین تابڑ توڑ گھونسے رسید کئے اور وہ دیوار کے پاس جا گرا۔ اس کے مُنہ سے خون کی لکیر بہہ نکلی جسے اس نے ہاتھ کی پُشت سے پونچھا اور پھر دیوار سے سہارا لگا کر بیٹھ گیا۔

"اب فرمائیے چوہدری صاحب۔ زمینوں کے سودے کے بارے میں آپ نے کیا سوچا ہے ؟ بات چیت یہیں کریں گے یا کہیں اور چلیں گے ؟"

وہ خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا۔ اس کی نگاہیں قہر آلود تھیں لیکن وہ بے بس نظر آ رہا تھا۔

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ تمہارے ہاتھ اتنی دُور تک پہنچے ہوئے ہیں اور تم کتنی محنت اور مشقت سے پیسہ کماتے ہو۔ تمہارے پارٹنر کون لوگ ہیں ؟ تمہاری زندگی کا یہ پہلو میری نظروں سے اوجھل تھا۔ چلو اچھا ہوا کہ مزید تعارف ہو گیا۔ اب تمہیں پہچاننے میں کبھی غلطی نہیں ہو گی۔"

یہ کہہ کر مَیں فرش پر پڑے ہوئے پستول کو اُٹھانے کے لیے جُھکا۔ "رُک جاؤ یوسف" بالے کی سرد آواز نے مجھے اپنی جگہ جامد کر دیا تھا۔ وہ بدستور دیوار سے سہارا لگائے ہوئے بیٹھا تھا۔ لیکن اب اس کے ہاتھ میں ایک پستول اور چہرے پر نفرت آمیز مسکراہٹ تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ اس نے اپنے لباس میں ایک اور پستول بھی چھپا کر رکھا تھا جسے نکالنے میں اسے کوئی دُشواری پیش نہیں آئی۔ "دروازے کے پاس سیدھے کھڑے ہو جاؤ ورنہ اتنے کم فاصلے سے میرا نشانہ خطا نہیں ہو گا۔ اپنے دونوں ہاتھ اُوپر اُٹھا لو۔"

مَیں نے اس کے کہنے کے مطابق دروازے کے پاس پہنچ کر دونوں ہاتھ اُوپر اُٹھا لیے۔ وہ پھرتی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور پستول کی نالی کا رُخ میری طرف کئے ہوئے کلونت سے مخاطب ہوا۔ "حنیفاں۔ پستول فرش پر سے اُٹھا لو۔"

کلونت جو اس ڈرامے کو حیرت زدہ ہو کر دیکھ رہی تھی اس کی آواز پر یک لخت چونک پڑی۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ وہ اصلیت کا اندازہ لگا چکی ہے اور جان چکی ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے پرانے دشمن ہیں۔ اس نے تیزی سے جُھک کر پستول فرش پر سے اُٹھا لیا اور بالے پر فائر کر دیا۔ میرے لیے اس کی یہ حرکت بالکل خلافِ توقع تھی لیکن غالباً بالے اس کی طرف سے مشکوک ہو چکا تھا اور پوری طرح چوکنا تھا۔ اس نے

دائیں جانب جھک کر خود کو بچایا اور کلونت پر گولی چلا دی۔ پستول کلونت کور کے ہاتھ سے گر گیا۔ وہ سینے کو پکڑ کر ایک لمحے لڑکھڑائی اور پھر اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے مجھے دیکھتی ہوئی ایک لفظ زبان سے ادا کیے بغیر میرے قدموں کے پاس گر گئی۔ میں نے بے اختیار قدم آگے بڑھایا مگر بالے کی سرد آواز نے مجھے اپنی جگہ رکنے پر مجبور کر دیا۔ "تم بازی ہار چکے ہو یوسف۔ ذرا بھی چالاکی کرو گے تو میں کوئی رعایت نہیں کروں گا۔ وہیں کھڑے رہو۔"

اس کے سوا میں اور کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ کلونت کور زمین پر گرتے ہی مر چکی تھی اور اس کو میری امداد کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ باہر سے بھاگتے ہوئے بھاری قدموں کی آوازیں سنائی دیں اور تین چار مسلح سِکھ آدمی زور سے دروازہ کھول کر اس تیزی سے اندر داخل ہوئے کہ اگر میں ان کے راستے سے نہ ہٹ جاتا تو وہ یقیناً مجھ سے ٹکرا جاتے۔ ان لوگوں نے مشین گنیں ہاتھوں میں تھامی ہوئی تھیں اور فائر کھولنے کے لیے بالکل تیار نظر آ رہے تھے۔ کمرے کے اندر داخل ہو کر انھوں نے مجھے اور پھر فرش پر پڑی ہوئی کلونت کی لاش کو دیکھا۔ پھر ان کی نظریں بالے کی طرف اٹھیں جو پستول ہاتھ میں لیے مجھے گھور رہا تھا۔ بالے کو زندہ سلامت دیکھ کر ان کے چہروں پر اطمینان کے آثار پیدا ہوئے اور پھر وہ دروازے کے سامنے پوزیشن لے کر کھڑے ہو گئے۔ ان کی مشین گنوں کا رُخ میری جانب تھا اور ان کے چہرے ہر قسم کے تاثرات سے عاری نظر آ رہے تھے۔ وہ صرف بالے کے حکم اور ہدایت کے منتظر نظر آ رہے تھے۔ کلونت کی زمین پر پڑی ہوئی لاش کو دیکھ کر بھی ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ یوں لگتا تھا جیسے ان کے نزدیک کمرے میں جو کچھ ہوا معمول کے مطابق اور نارمل تھی۔ ان میں کوئی چہرہ ایسا نہیں تھا جسے میں نے اس سے پہلے ٹونی اور بالے کے ساتھ دیکھا ہو۔ شاید سمگلنگ کے دھندے کے لیے ان لوگوں نے علیحدہ عملہ اور مختلف لوگ رکھے ہوئے تھے۔ جن کے نزدیک بالے واقعی ایک بااثر اور دولت مند زمیندار تھا۔ ٹونی کی منصوبہ بندی اور دُور اندیشی کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا تھا جیسے جیسے اس کی ذات کے بارے میں میری معلومات میں اضافہ ہو رہا تھا بطور قانون شکن مجرم میں اس کی صلاحیتوں اور قوت کا قائل ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے ذہن رسا ——— کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا تھا۔

بالے نے اپنے ساتھیوں کو گھور کر دیکھا۔ کچھ سوچا اور پھر قالین پر پڑی ہوئی کلونت کور کی لاش کو دیکھا۔ "اس اُٹھا کر جنگل میں دفن کر دو اور قالین بالکل صاف کر دو۔ اگر کیسرو واپس آ جائے تو اسے کچھ مت بتانا۔ اس کام سے فارغ ہو کر فوراً حویلی پہنچ جاؤ۔ تین آدمی یہاں ٹھہریں گے اور باقی میرے ساتھ چلیں گے۔"

یہ کہہ کر اس نے مجھے پستول کے اشارے سے باہر چلنے کو کہا۔ میں نے خاموشی سے اس کا حکم ماننے ہی میں عافیت جانی۔ باہر صحن میں رات کی تاریکی پھیلی ہوئی تھی اور ہوا میں خنکی تھی۔ یہ ایک پُر بہار اور دل کو لبھانے والی رات تھی۔ لیکن میرا دل بے حد غمزدہ اور سوگوار تھا۔ کلونت کور جو کچھ دیر پہلے تک میرے لیے قطعی اجنبی اور انجان تھی میری خاطر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی۔ وہ اپنی تنہا ہوں بھری زندگی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے خواب دیکھ رہی تھی لیکن بالے کے پستول کی گولی نے اسے زندگی کی قید ہی سے آزاد کر دیا تھا۔ اس کے دل و دماغ میں جو انقلاب رونما ہو چکا تھا اور وہ جس زندگی کے خواب دیکھ رہی تھی اس کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے۔ خدا نے اس کے تمام مسائل حل کر دیئے تھے لیکن پھر بھی یہ احساس کہ اس نے مجھے بچانے کی خاطر اپنی جان قربان کر دی تھی میرے دل کو بوجھل کرنے کے لیے کافی تھی۔ جس سنگدلی اور بے حسی سے بالے نے اسکو ہلاک کیا تھا اس سے یہی توقع کی جا سکتی تھی لیکن میرے دل نے بالے کے خلاف نفرت کبھی اتنی شدت سے محسوس نہیں کی تھی۔ نفرت اور انتقام کی آگ کا ایک سرد الاؤ میرے وجود کو سُلگا رہا تھا مگر میں بے دست و پا اور مجبور تھا۔

بالے کے ایک ساتھی نے مشین گن سے دھکا دے کر مجھے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ مکان سے کچھ فاصلے پر ایک کھلی جگہ ایک کار اور ایک جیپ گاڑی کھڑی تھی۔ بالے نے اپنے تین ساتھیوں سے کہا: "ہم گاڑی میں چلیں گے۔ جیپ ان لوگوں کے لیے چھوڑ دو۔"

ہمارا مختصر قافلہ سامنے پارک کی ہوئی گرد آلود کار کی طرف بڑھا۔ میں نے کار کے پاس پہنچ کر پلٹ کر مکان کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں کلونت کور کا شکریہ ادا کیا۔

"کیا سوچ رہے ہو ملک صاحب۔" بالے کی طنز آمیز آواز نے مجھے چونکا دیا۔ "مرنے والی بہت یاد آ رہی ہے کیا؟" وہ زور سے ہنستے ہوئے بولا۔ "ویسے غضب کی عورت تھی یہ خفیفاں۔ یاد تو مجھے بھی بہت آئے گی۔" نفرت اور غصے کی ایک لہر سر سے پیر تک میرے وجود میں دوڑ گئی۔ بے اختیار میرے جی میں آئی کہ اس کا منہ توڑ دوں لیکن اس کے ہاتھ میں پستول ابھی تک موجود تھا اور اس کے تینوں ساتھی مشین گنیں تانے ہوئے سامنے کھڑے تھے۔ میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ مکان کے اندر سے اس کے باقی تینوں ساتھی باہر نکلے۔ ان میں سے ایک نے کلونت کور کی لاش کاندھے پر اُٹھائی ہوئی تھی اور دو مشین گنیں تھامے ہوئے ان کے پیچھے چل رہے تھے۔ ان کا رُخ عقبی جنگل کی طرف تھا۔ ایک شخص نے اپنے ہاتھ میں پھاوڑہ بھی سنبھال رکھا تھا۔

میرا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ "چلو گاڑی کے اندر بیٹھو۔ یا اس کی فاتحہ پڑھ کر چلو گے؟" بالے کی ہنسی انتہائی زہر آلود تھی۔

"سنو بالے۔" میں نے یکایک اسے مخاطب کیا۔ "اس نے مجھے بچانے کی کوشش میں اپنی جان دی ہے۔ میں اس کی لاش کو بے کفن نہیں دیکھنا چاہتا۔"

"تو پھر کیا کرو گے؟ اس کے لیے اس وقت کفن کہاں سے لاؤ گے؟"

"میری گاڑی میں کچھ چادریں رکھی ہوئی ہیں۔ ایک چادر میں لپیٹ کر اسے دفن کر دو۔" یہ کہہ کر میں کچھ فاصلے پر کھڑی ہوئی اپنی کار کی طرف بڑھا۔ میں چاہتا تھا کہ کار کی ڈکی کھول کر اس میں سے ہتھیار نکال لوں مگر بالے نے مجھے روک دیا۔ "تم یہیں کھڑے رہو۔ گاڑی کی چابی لا دے کو دیدو۔" میں بالکل ساکت رہ گیا۔ میری نجات اور بچاؤ کے آخری موقعے کو بھی میں نے نہ صرف کھو دیا تھا بلکہ خواہ مخواہ ان کی توجہ گاڑی کی ڈکی کی طرف مبذول کرا دی تھی۔ میں اپنے ہونٹ کاٹ کر رہ گیا اور پچھتانے لگا۔ مگر اب میرا انکار بالے کو مزید مشکوک کر دیتا۔ "دیکھ کیا رہے ہو۔" اس نے قریب قریب ڈانٹ کر کہا۔ "گاڑی کی چابی نکال کر دو۔ ہم ساری رات تو یہاں نہیں کھڑے رہیں گے۔"

میں نے مجبور ہو کر جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ یکایک رات کے سناٹے کو کار کی آواز نے توڑ دیا۔ میرے کان کھڑے ہو گئے۔ مگر مجھ سے پہلے بالا چوکنا ہو کر آواز کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھی بھی ہوشیار ہو گئے تھے۔ وہ تین آدمی جو کلونت کور کو اُٹھا کر جنگل میں لے جانے والے تھے وہ بھی اپنی جگہ تھم کر رہ گئے تھے۔ گاڑی کی روشنیاں نظر آنے لگیں، وہ بہت تیز رفتاری سے اسی جانب آ رہی تھی۔ میں اپنی جگہ ساکت کھڑا تھا۔ بالے اور اس کے ساتھی بھی بے حس و حرکت کھڑے سامنے سے آنے والی گاڑی کو دیکھ رہے تھے۔ ہماری توقع سے پہلے ہی گاڑی ہمارے پاس پہنچ گئی اور بالے کی جیپ اور کار کے پاس آ کر رک گئی۔ جیپ میں سے لڑا سنگھ برآمد ہوا۔ اس کے ساتھ ہی چار اور مسلح سکھ بھی کود کر اُتر آئے۔ اپنی جیپ کی روشنیوں میں اس نے بالے اور اس کے ساتھیوں کو دیکھ لیا تھا۔

"بچے بھئی بلّے۔" اس نے زور دار آواز میں نعرہ لگایا۔ "یہ تو اپنے چوہدری صاحب ہیں۔" پھر اس کی نظر مجھ پر پڑی "ملک جی۔ تمہاری ملاقات ہو گئی؟"

بالے اس کی اچانک آمد سے پریشان اور بوکھلایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ میرے لیے یہ ایک نادر موقع تھا۔ بالے

کے نزدیک اس کے ہاتھوں ہلاک ہونے والی عورت محض ایک چوکیدار کی بیوی اور ان لوگوں کی دل بستگی کا ذریعہ تھی لیکن یہ راز میں ہی جانتا تھا کہ کلونت کور کی اصلیت کیا تھی۔ وہ بوٹا سنگھ کی محبوبہ اور پارٹنر تھی جسے وہ محض چارے کے طور پر اپنی کاروباری مصلحتوں کے لیے استعمال کیا کرتا تھا۔

میں نے وقت گنوائے بغیر بوٹا سنگھ کو مخاطب کیا: "بوٹا سنگھ۔ بالے نے کلونت کور کو گولی ماردی ہے۔"

بوٹا سنگھ نے حیرت سے میری جانب دیکھا۔ بالا بھی مجھے تک رہا تھا۔

"وہ سامنے اس کی لاش ہے جسے یہ جنگل میں دفن کرنے کے لیے لے جارہے ہیں وہ دیکھو۔" میں نے کچھ فاصلے پر کھڑے بالے کے تین ساتھیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ان میں سے ایک شخص نے کلونت کور کی لاش اپنے کاندھے پر اٹھا رکھی تھی۔

بوٹا سنگھ کی نگاہیں شعلے برسانے لگیں "کیوں اوئے؟ یہ تو نے کیا کردیا؟" اس کے ساتھ ہی ایک جھٹکے سے اس نے اپنی سٹین گن اٹھا کر اس کا رُخ بالے کی طرف کردیا۔ بالا اس کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ اس کے پستول سے فائر ہوا لیکن نشانہ خطا ہوگیا۔ بوٹا سنگھ نے لپک کر اپنی جیپ کی آڑ میں پناہ لی۔ اس کے ساتھی بھی اِدھر اُدھر بکھر گئے اور ان کی گنیں گولیاں برسانے لگیں۔ بالا اور اس کے ساتھی بھی اس اثنا میں گاڑی اور جیپ کے پیچھے پناہ لے چکے تھے۔ میں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور تیزی سے پناہ لینے کے بہانے اپنی کار کی طرف دوڑا۔ ایک دو گولیاں سنسناتی ہوئی میرے آس پاس سے نکل گئیں مگر میں اپنی کار کے عقب میں پہنچ چکا تھا۔ چاروں طرف یکایک میدانِ جنگ کا سماں پیدا ہوگیا تھا۔

ایک دو گولیاں نشانے پر بھی پہنچ گئیں۔ پہلا نشانہ بننے والے بالے کے وہ تین ساتھی تھے جو کچھ فاصلے پر کھڑے ہونے کی وجہ سے اس اچانک افتاد کی نوعیت نہیں سمجھ سکے تھے اور انھیں محفوظ مقام پر پناہ لینے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ حالانکہ ان کے بالکل نزدیک وہی جنگل تھا جو ان کے لیے بہت محفوظ مورچے کا کام دے سکتا تھا۔ گولیاں کاروں اور جیپوں کو چھلنی کیے دے رہی تھیں اور صاف ظاہر تھا کہ دونوں فریق زیادہ دیر تک ان کی پناہ میں نہ رہ سکیں گے۔ میں نے جھپٹ کر ڈکی کھولی اور اندر سے ایک سٹین گن نکال لی۔ اب میرے اندر خود اعتمادی اور تحفظ کا بے پناہ احساس پیدا ہوگیا تھا۔ میں اب خود کو بے بس اور لاچار محسوس نہیں کررہا تھا۔

یکایک بالے کی آواز سنائی دی: "بوٹا سنگھ۔ فائر روک دو اور میری بات سنو۔ یہ آدمی ہم دونوں کا دشمن ہے یہ پولیس کا مخبر ہے۔"

"بکواس بند کرو۔" بوٹا سنگھ غرّایا: "تو نے کلونت کور کو مارا ہے۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"میں نے اپنی جان بچانے کے لیے اسے مارا ہے۔ وہ مجھ پر فائر کررہی تھی۔"

"اس سے تو بچ گیا پر بوٹا سنگھ سے نہیں بچ سکے گا۔" اس کے ساتھ ہی اس نے سٹین گن کا ایک برسٹ مارا۔

"سنو بوٹا سنگھ۔ میرے اور تمہارے ساتھی بے قصور ہیں۔ لڑائی ہم دونوں کی ہے۔ ہمیں آپس میں فیصلہ کرلینا چاہیے۔ اگر بہادر ہو تو اکیلے باہر نکل کر میرا مقابلہ کرو۔ لو میں آرہا ہوں۔"

اس کے ساتھ ہی بالے کی ٹوپی اس کی جیپ کے پیچھے نظر آئی۔ اس سے پہلے کہ میں بوٹا سنگھ کو اس کی مکاری سے آگاہ کرتا وہ تیزی سے اپنی جیپ کے پیچھے سے نکل کر باہر آگیا اور ہاتھ میں سٹین گن لہراتے ہوئے للکارا: "اوئے گولی سے لڑے گا یا ہاتھوں سے مقابلہ کرے گا!"

مگر اس کا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی گولیوں کی بوچھار نے اسے چھلنی کردیا۔ اس نے آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر پھر وہیں ڈھیر ہوگیا۔ سادہ لوح اور سادہ دل سکھ اپنے دشمن کے جال میں پھنس کر اپنی جان گنوا بیٹھا تھا۔ اس

کے تینوں ساتھی بے اختیار اس کی طرف بڑھے مگر دوسرے ہی لمحے گولیوں کا نشانہ بن کر زمین پر گر گئے۔ فائرنگ یکایک بالکل رُک گئی۔ چند لمحے کوئی حرکت نہیں ہوئی اور پھر بالا اپنی جیپ کے پیچھے سے نمودار ہوا۔ اس کا رُخ میری کار کی طرف تھا اور اس نے اب ایک مشین گن اپنے ہاتھ میں پکڑ لی تھی۔

"یوسف۔ باہر نکل آ۔ میں تجھے ایسے سزا دوں گا کہ تیری نسلیں بھی یاد کریں گی۔"

میں نے آہستگی سے کار کے پیچھے سے اپنا سر اونچا کیا۔ بالے اور اس کے ساتھی کچھ فاصلے پر مشین گنیں تانے ہوئے کھڑے تھے۔

"لڑنی تجھے زندہ پکڑنا چاہتا تھا مگر افسوس کہ تیری عمر ختم ہوچکی ہے۔ تیار ہوجا۔ تیرا آخری وقت آگیا ہے۔"

اس نے بڑے اطمینان سے مشین گن اوپر اٹھائی مگر اس سے پہلے میری مشین گن حرکت میں آچکی تھی۔ وہ گولیوں کا شکار ہوکر لڑکھڑایا۔ اس کے ساتھیوں کو بھی میری گولیوں نے بھون ڈالا تھا۔ بالے کے ہاتھ سے مشین گن چھوٹ کر زمین پر گر گئی اور اس کے بعد وہ خود بھی اوندھے منہ وہیں گر گیا۔ تاریکی کے باوجود میں اس کی آنکھوں میں حیرت اور بے اعتباری کا تاثر دیکھ سکتا تھا۔ غالباً آخر وقت تک وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ ایک نہتے شخص کے پاس اچانک سٹین گن کہاں سے آگئی؟!

فضا میں ایک بار پھر سناٹا چھا گیا۔ ایک سوگواری اور اُداسی ہر طرف چھائی ہوئی تھی۔ بوٹا سنگھ اور بالے اپنے ساتھیوں سمیت دوسری دنیا کے سفر پر روانہ ہوچکے تھے۔ میرے پاس اپنی جان بچانے کے لیے اس کے سوا کوئی اور چارہ نہیں تھا۔ ان کی جیپیں اور کاریں بھی ناقابلِ استعمال اور تباہ و برباد ہوچکی تھیں لیکن میری کار بالکل صحیح حالت میں تھی اس کو اور مجھے ایک خراش تک نہیں آئی تھی۔

میں نے دل ہی دل میں ایک بار پھر کلونت کور کا شکریہ ادا کیا اور خاموشی سے کار میں سوار ہوگیا۔ میں نے کار کو کچے راستے پر ڈال دیا۔ میرا دماغ حال ہی میں رونما ہونے والے واقعات نے ماؤف کردیا تھا۔ کار چل رہی تھی مگر مجھے نہ راستے کا علم تھا اور نہ ہی منزل کا پتہ۔ ایک بار پھر میں یکہ و تنہا بے راہ رو بن کر رہ گیا تھا۔ ایک بار پھر وہی مسائل تھے وہ تفکرات اور وہی اپنی جان اور پہچان بچانے کی دُھن!

میں دل ہی دل میں اپنے نصیبوں کے بارے میں غور کررہا تھا۔ میری زندگی میں کئی عورتیں داخل ہوچکی تھیں جن میں سے بعض مجھے ناپسند بھی نہیں تھیں۔ لیکن میں نے حقیقت میں اگر کسی سے پیار کیا تھا، کسی کو چاہا تھا تو وہ عاشی تھی۔ لیکن قسمت نے مجھے عاشی سے ملنے نہیں دیا۔ فلکِ کج رفتار نے ہم دونوں کے درمیان لامتناہی فاصلے حائل کردیے۔ حالانکہ بظاہر ہم دونوں کے درمیان میں کوئی فاصلہ، کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ ایک دوسرے کے ساتھ زندگی گزارنے پر آمادہ تھے۔ ایک دوسرے کے لیے جان قربان کرنے اور جینے مرنے کے وعدے کرچکے تھے اور ان میں انتہائی مخلص بھی تھے۔ لیکن اس کے باوجود حالات نے ایسا رُخ اختیار کیا کہ ہم جدا ہوگئے۔ غلط فہمیوں نے ہمیں ایک دوسرے سے دُور کردیا۔ عرصۂ دراز کے بعد عاشی مجھے ملی بھی تو اس انداز میں کہ میری صورت تک دیکھنے کی روادار نہیں تھی۔ اب آخری بار جب میں نے اس کے دامنِ عافیت میں پناہ لینی چاہی تو میری زندگی کے لالے پڑ گئے۔ میں عاشی سے ملنے اس کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دینے کے لیے گیا تھا، لیکن وہاں پولیس میری گھات میں تھی۔ مجھے علم تھا کہ اس میں عاشی کا کوئی قصور نہ تھا۔ یہ سب کیا دھرا اس کے بھائی کا تھا۔ جو میری طرف سے بدستور بدگمان تھا اور اپنی بہن کی زندگی تباہ کرنے کے

جرم میں مجھے پھانسی کے تختے تک پہنچانا چاہتا تھا۔ قسمت نے یاوری کی اور میں وہاں سے بھاگ نکلا۔ مگر عاشی کی جانب سے دانستگی یا نادانستگی میں مجھے دکھوں اور صدموں کے سوا اور کچھ نہ مل سکا۔

دوسری عورت جسے میں نے پسند کیا، جسے چاہا اور اپنی بیوی بنا لیا، روزی تھی۔ عاشی کو میں فراموش کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا، لیکن اس زخم پر روزی کی محبت نے مرہم رکھ دیا تھا۔ میری بے اعتنائی اور ہر دم عاشی کے خیال میں کھوئے رہنے کے باوجود وہ مجھے چاہتی تھی۔ میرے ایک اشارے پر حرکت میں آ جاتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ مجھ سے دیوانہ وار محبت کرتی ہے۔ عاشی کی محبت میرے دل سے نہ نکل سکی، لیکن یہ سچ ہے کہ روزی نے اپنی خدمت اور بے لوث محبت کی وجہ سے میرے دل میں ایک جگہ پیدا کر لی تھی اور میں نے زندگی کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا تھا۔ عاشی کے تصور کے علاوہ ہم دونوں کے درمیان کبھی کوئی اور عورت نہیں آ سکتی تھی، لیکن انجام کیا ہوا؟ روزی نے میرے پیار اور اعتماد کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے مجھے دھوکا دیا اور مجھے ایک ایسی مصیبت میں پھنسا دیا جس کو دلدل سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ اس مصیبت سے باہر نکلنے کے لیے میں جتنی جد و جہد کرتا، اس میں اور زیادہ دھنستا چلا جاتا۔ میں اپنا نام، اپنی جائیداد، اپنی دولت، اپنی آزادی، اپنی پہچان یہاں تک کہ اپنی بیوی تک سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ پولیس میری تلاش میں تھی۔ دوسرے جرائم پیشہ گروہ میری گھات میں تھے۔ میں ہر طرف سے آفات میں گھرا ہوا تھا اور یہ سب روزی کی مہربانیوں کا نتیجہ تھا۔ اس کی وجہ سے میں اپنی پہچان تک کھو بیٹھا تھا۔

ہر روز ایک نئی آزمائش سے دوچار ہونا پڑتا تھا ہر لمحے موت میری کھوج میں رہتی۔ میں اب تک کس طرح زندہ اور سلامت تھا؟ یہ بھی ایک معجزہ ہی تھا۔ میں اگر اس وقت سخت جان نہ ہوتا تو اب تک نہ جانے کب کا قبر کی گود میں جا چکا ہوتا یا پھر جیل کی سلاخوں کے پیچھے اپنے ناکردہ گناہوں کی پاداش میں سزائے موت کا منتظر ہوتا۔ میں لمحہ بہ لمحہ، پل بہ پل زندگی گزار رہا تھا۔ کوئی بھروسہ نہیں تھا کہ دوسرے لمحے کون سی مصیبت میری تاک میں ہے اور میں اس سے نجات حاصل بھی کر سکوں گا یا موت کے منہ میں پہنچ جاؤں گا، اور یہ سب کرم فرمائی ایک عورت کی تھی۔ ایک ایسی عورت کی جسے میں نے خوشیوں، آسائشوں اور شفقت کے سوا اور کچھ نہیں دیا تھا۔

اس کے برعکس میری زندگی میں ایسی عورتیں بھی آئی تھیں جو میرے لیے اجنبی اور ناآشنا تھیں، جن کے لیے میرے دل میں کوئی نرم گوشہ نہیں تھا۔ جنہیں میں نے کبھی جھوٹے منہ بھی اپنی محبت کا یقین نہیں دلایا تھا۔ اس کے باوجود وہ میری خاطر اپنی جانوں پر کھیل گئی تھیں۔ تازہ ترین مثال عنیتاں عرف کلونت کور کی تھی۔ وہ ایک غیر مذہب کی عورت تھی۔ زندگی میں ہم دونوں پہلی بار ایک دوسرے سے ملے تھے۔ میں نے اسے اپنی محبت یا خلوص کا یقین نہیں دلایا تھا۔ اس کے باوجود وہ مجھ کو بچانے کے لیے اپنی جان پر کھیل گئی تھی اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر کلونت کور نہ ہوتی تو میں بالا اور اس کے ساتھیوں کے قابو میں آ چکا ہوتا اور وہ میرا جو حشر کرتے اس کے بارے میں اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔

ایک بار پھر ایک انجان حسین عورت نے مجھے نئی زندگی بخشی تھی۔ میں اس کا ممنونِ احسان تھا۔ میری موجودہ زندگی اسی کی بخشی ہوئی تھی، لیکن میں اس عورت کو دو گز زمین بھی نہ دے سکا۔ قدرت کے کھیل بھی کتنے عجیب ہوتے ہیں۔ وہ ایک غیر ملکی، غیر مذہب سے تعلق رکھنے والی عورت تھی۔ پھر بھی اس نے اپنی جان دے کر مجھے ایک نیا جنم بخشا تھا۔ شکریہ کلونت کور۔ تجھ جیسی مہربان، نرم دل اور محبت کرنے والی عورتیں ہی اس زمین کا سنگھار ہیں۔ شاید تجھ جیسی عورتوں کے دم قدم سے ہی یہ دنیا قائم ہے!؟

اچانک کار ایک جھٹکے سے رک گئی اور میرے خیالات کا تسلسل بھی ٹوٹ گیا۔ میں نے چونک کر اپنے ارد گرد دیکھا۔ خدا جانے میں کتنی دیر سے سفر کر رہا تھا اور کس راستے پر نکل آیا تھا؟ اپنی سوچوں میں گم ہونے کے بعد مجھے یہ بھی اندازہ نہیں رہا تھا کہ میں کتنی دور نکل آیا ہوں۔ اب آس پاس دیکھا تو معلوم ہوا کہ میں ایک سرسبز علاقے میں پہنچ گیا ہوں۔ یہ پہاڑی علاقہ تو نہ تھا، لیکن کچھ فاصلے پر پہاڑوں کی چوٹیاں فخر سے سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ فضا میں خنکی اور ہوا میں ایک خوشبو سی تھی، جیسی کہ عام طور پر پہاڑی علاقوں میں محسوس ہوتی ہے۔ دوسری جانب درختوں کا سلسلہ تھا اور میرے سامنے ایک بل کھاتی ہوئی پتھروں کی سڑک دور تک جاتی ہوئی نظر آتی تھی۔ یہ کون سی جگہ تھی؟ کون سا علاقہ تھا؟ اور یہ سڑک کہاں تک جاتی ہے۔ اس کے بارے میں مجھے قطعاً کوئی اندازہ نہیں تھا۔ بہر حال میرا پہلا مسئلہ کسی جگہ پہنچنا تھا جہاں مجھے پناہ اور سر چھپانے کی جگہ مل جائے۔ میں نے کار سٹارٹ کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ محض آواز نکال کر رہ گئی۔ خدایا۔ اس جنگل بیابان میں کار کو درست کرنے کے لیے کاریگر اور ورکشاپ کہاں سے ملیں گے؟ کار میں بظاہر کوئی خرابی نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے اپنی سی تمام کوشش کر دیکھی، لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔

یکا یک میری نظر سامنے پٹرول بتانے والے میٹر پر پڑی تو مجھے معلوم ہوا کہ کار کی ٹنکی میں پٹرول ختم ہو چکا ہے یہاں تک کہ بے دھیانی اور بے خبری کے عالم میں مسلسل کار چلاتے رہنے کی وجہ سے ٹنکی میں محفوظ پٹرول کا ذخیرہ بھی صرف کر چکا تھا۔ اس دور دراز علاقے میں جہاں انسانوں اور عمارتوں تک کی شکل نظر نہیں آتی تھی بھلا کسی پٹرول پمپ کی موجودگی کا کیا امکان ہو سکتا تھا۔ میں کار سے باہر نکل آیا۔ غصے میں کار کی چابیاں میں نے دور پھینک دیں اور خود کار کے بونٹ سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ یہ چابیاں اب میرے لیے قطعی بے کار تھیں، لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اب کیا کیا جائے؟ اس اجنبی علاقے میں ایک بے آسرا اور لاوارث آدمی کے طور پر میں بلا مقصد کار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا اور میرا ذہن یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ میرا اگلا قدم کیا ہو گا۔؟ میری یہ مشکل بہت جلد آسان ہو گئی جب میرے کانوں نے کسی کار کے آنے کی آواز سنی۔ یہ پتھریلا علاقہ تھا اور یہاں گرد و غبار زیادہ نہ تھا اس کے باوجود میں نے اپنے سامنے سڑک پر ہلکا سا غبار دیکھا اور پھر ایک جیپ نظر آئی۔ اس جیپ کے عقب میں ایک اور جیپ بھی تھی۔ وہ دونوں گاڑیاں تیز رفتاری سے میری جانب آ رہی تھیں۔ اب دن کی روشنی پھیلنے لگی تھی، لیکن اس کے باوجود میں یہ اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ یہ کہیں پولیس کی گاڑیاں تو نہیں ہیں؟ اس کا قوی امکان تھا، کیونکہ پولیس بدستور میرے تعاقب میں لگی ہوئی تھی اور اب میں ایک بے بس اور مجبور پرندے کی طرح پولیس کے پھندے سے بچ نکلنے کی تگ و دو میں تھا۔ پولیس کے قابو میں آ جانے کا مطلب سزائے موت کے سوا کچھ اور نہ تھا۔ اس بات کا بھی کوئی امکان نہ تھا کہ محض مجھے عمر قید کی سزا دی جاتی کیونکہ میرے ہم شکل ٹونی کی نوازشات کے باعث میں بے شمار سنگین جرائم میں ملوث تھا جن میں متعدد قتل بھی شامل تھے۔ ایسے خطرناک اور مفرور مجرم کے ساتھ قانون بھلا کیا اعانت کر سکتا تھا؟ میرے بچنے کی صرف ایک ہی صورت تھی اور وہ یہ کہ میں اصل ٹونی کو پولیس کے حوالے کر دوں اور اپنی اصلیت ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاؤں، لیکن یہ میرے اختیار میں نہ تھا بلکہ بظاہر ناممکن نظر آ رہا تھا۔ میرے لیے پولیس سے مقابلہ کرنے کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا۔ اسی میں میری عافیت تھی۔ یہ سوچ کر میں نے تیزی سے کار کی ڈگی میں رکھی ہوئی سٹین گن نکالنے کا فیصلہ کیا۔ اب میرے بچاؤ کا یہی واحد راستہ تھا۔

کار سے چابیاں لے کر میں نے ڈگی کا رخ کرنا چاہا، لیکن یاد آیا کہ چابیاں تو میں کچھ دیر پہلے مایوسی اور جھلاہٹ کے عالم میں دور پھینک چکا تھا۔ میری نگاہوں کے سامنے اونچی نیچی زمین تھی جس میں یہاں وہاں سبزہ اگا ہوا تھا چابیاں زیادہ دور جا کر نہیں گری ہوں گی، لیکن ان کو تلاش کرنا آسان کام نہ تھا۔ خصوصاً اس عالم میں کہ میرے پاس وقت بہت

کم تھا۔ پھر بھی کوشش کرنا ضروری تھا۔ کیونکہ اسی میں میری عافیت تھی۔ میں تیزی سے آگے بڑھا اور چابیاں تلاش کرنے لگا۔ دھات کے بنے ہوئے ایک ہی رنگ میں محض دو چھوٹی چھوٹی چابیاں بھلا کیوں کر نظر آسکتی تھیں؟ میں نے پریشانی کے عالم میں تیزی سے نزدیک آنے والی جیپ گاڑیوں کی طرف نگاہ ڈالی اور پھر مایوسی کے عالم میں اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر کھڑا ہو گیا۔ جیپ گاڑیاں مجھ سے تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر تھیں۔ میرے آس پاس کوئی پناہ گاہ نہیں تھی۔ اگر میں درختوں کی جانب بھاگنے کی کوشش کرتا تب بھی درختوں تک پہنچنے سے پہلے ہی اُن کی گولیوں کا نشانہ بن جاتا۔ پس وپیش کے عالم میں اس کے سوا مجھے کچھ اور نہ سُوجھی کہ جس جگہ کھڑا تھا وہیں کھڑا رہوں اور اپنے مستقبل کا فیصلہ خدا پر چھوڑ دوں۔ غیر ارادی طور پر میرے قدم کار کی جانب اُٹھ گئے۔ اب جو کچھ پیش آئے اس کا سامنا کرنا ہی تھا۔ یہی سوچ کر میں وقتی طور پر مطمئن اور پُرسکون ہو کر اپنی کار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

جیپ گاڑیاں اس اثناء میں بالکل نزدیک آگئیں اور مجھے پہلی مرتبہ اس میں بیٹھے ہوئے لوگ نظر آئے جو یقیناً پولیس کی وردی میں نہیں تھے۔ اطمینان اور مسرت کی ایک لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔ گویا میں پولیس سے محفوظ تھا، لیکن دوسرے ہی لمحے میری خوشی کافور ہو گئی۔ یہ لوگ بالے یا بوٹا سنگھ کے ساتھی بھی ہو سکتے ہیں؟ اگلی جیپ میں بیٹھے ہوئے کرخت چہرہ لوگوں کو اب میں واضح طور پر دیکھ رہا تھا۔ ان کے سروں پر پگڑیاں بندھی ہوئی تھیں اور ان کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں۔ اب سوچنے سمجھنے یا عمل کرنے کا کوئی موقع نہ تھا۔ اس لیے میں بدستور جیبوں میں ہاتھ ڈالے خاموش کھڑا رہا۔ جیپ میرے نزدیک آکر رُک گئی۔ اس کے پیچھے آنے والی جیپ بھی رُک گئی۔ میں خدا کی مرضی پر راضی چپ چاپ کھڑا رہا۔ اگلی جیپ سے دو مسلح اور تنومند آدمی کُود کر باہر نکلے اور میری طرف بڑھے۔

اپنی وضع قطع سے وہ خطرناک قسم کے لوگ نظر آتے تھے۔ قریب سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ ان کے ہاتھوں میں بندوقیں نہیں بلکہ مشین گنیں تھیں جن کا رُخ انھوں نے میری جانب کر رکھا تھا۔ مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ وہ کون لوگ تھے اور کیا چاہتے تھے؟ میں اپنے بچاؤ کی ترکیب سوچنے میں مصروف تھا، لیکن میرا ذہن قریب قریب ماؤف ہو چکا تھا۔ مجھ سے چند گز کے فاصلے پر آکر وہ دونوں رُک گئے۔ ان کی خونخوار نظریں مجھے گھور رہی تھیں اور وہ اپنی مشین گنوں سے فائر کرنے کے لیے بالکل تیار تھے۔ میں نے دل ہی دل میں کلمہ پڑھا اور مرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ موت کو میں اس سے پہلے بھی کئی بار اپنے سامنے دیکھ چکا تھا اور بار بار آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے للکار چکا تھا، لیکن اس قدر بے بسی اور بے چارگی کے عالم میں اس سے پہلے کبھی میں دُشمنوں سے دوچار نہیں ہوا تھا۔ دو مسلح شخص میرے سامنے تھے اور سامنے ہی دونوں جیپوں میں ان کے کئی اور مسلح ساتھی بھی موجود تھے۔

پچھلی جیپ سے ایک اور شخص کُود کر باہر آیا اور میری جانب بڑھا۔ بھاری جوتوں کی آواز پر میں نے سیاہ شکاری فُل بُوٹ اور خاکی برجس میں ملبوس دو ٹانگیں دیکھیں اور پھر میری نظریں آہستگی سے اوپر اُٹھیں تو حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اپنے سامنے کھڑی ہوئی شخصیت کو دیکھ کر میں بھونچکا رہ گیا تھا۔ وہ ایک عورت تھی اور عورت بھی انتہائی دلکش اور نظر فریب۔ اس کے قد کی درازی کا یہ عالم تھا کہ اس کے برابر کھڑے ہوئے قد آور مرد بھی اس سے کچھ زیادہ بلند نظر نہیں آرہے تھے۔ وہ مضبوط اور متناسب جسم کی ایک صحت مند اور چاق و چوبند عورت تھی۔ جس کے ترشے ہوئے بال اس کے کندھوں پر لہرا رہے تھے اور اسکی آنکھیں دھوپ کی سیاہ عینک کے پیچھے پوشیدہ تھیں، لیکن اس کے تیکھے نقوش اور کھِلتے ہوئے گندمی رنگ کے پیشِ نظر یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ باقی جسم کی طرح اس کی آنکھیں بھی خوبصورت ہوں گی۔ اس کی پتلی کمر میں چمڑے کی ایک پیٹی کے ساتھ پستول لٹکا ہوا تھا۔ اگر وہ کوئی راہزن یا ڈاکو تھی تو اس قدر حسین ڈاکو اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ مضبوط قدموں سے چلتی ہوئی میری جانب بڑھی اور دونوں مسلح آدمیوں کے درمیان میں پہنچ کر رُک گئی۔ میں بدستور کار سے ٹیک لگائے کھڑا اس کی رعنائیوں کا جائزہ

لیتا رہا۔ اس نے دونوں ہاتھ اپنی کمر پر رکھ لیے اور اسکی نگاہیں سر سے پیر تک میرا جائزہ لینے میں مصروف ہو گئیں۔ چند لمحے ہم دونوں یوں ہی ایک دوسرے کو دیکھتے اور نگاہوں میں تولتے رہے۔ میری نگاہوں میں حیرت تھی اور اسکی نگاہوں میں ستائش۔ اس نے اپنے سر کو زور سے جھٹکا اور اس کے بل کھاتے ہوئے سیاہ بال لہروں کی صورت میں اس کے کتابی چہرے کے گرد بکھر گئے۔ وہ جو کوئی بھی تھی اس وقت جمال اور رعنائی کی ایک بھرپور تصویر نظر آرہی تھی۔ لیکن وہ کون تھی جو در میں اس سے اپنے بارے میں کس قسم کے سلوک کی توقع رکھ سکتا تھا؟

"کون ہو تم؟" کچھ دیر اپنی نگاہوں سے مجھے ٹٹولنے کے بعد اس نے مجھ سے سوال کیا۔

اس کی آواز بھاری اور رَگی رَگی سی تھی۔ اس میں ایک خوابیدگی کی سی کیفیت تھی، لیکن وہ کانوں کو بھلی لگتی تھی اور جسم میں کسی تار کو جھنجھنا دیتی تھی۔ مغربی ملکوں میں ایسی آوازوں کو خوبصورت اور قابلِ تعریف سمجھا جاتا ہے۔ مشرقی عورتوں کے ساتھ نازک، باریک اور سُریلی آواز کا تصور وابستہ ہے، لیکن بعض وجود مختلف آوازوں کے ساتھ بھلے لگتے ہیں۔ اور یہ بھی ان ہی میں سے ایک تھی۔ میرے جواب دینے سے پہلے اس نے مشکوک انداز میں چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور جب اطمینان ہو گیا کہ میرے ساتھ کوئی اور موجود نہیں ہے تو اس نے دوبارہ میری طرف توجہ دی اور بولی: "یہاں اکیلے کیوں کھڑے ہو۔ کیا کسی کا انتظار ہے؟"

اس کے ماہتابی چہرے اور دلکش سراپا کو دیکھ کر میرے دل میں چھپی ہوئی شوخی نے سر اُٹھایا اور میں نے مختصر جواب دیا: "شاید!"

"مگر یہاں تو کوئی نہیں ہے اور نہ ہی کوئی اس طرف آتا ہے۔ پھر تم کو کس کا انتظار ہے کہ اتنے اطمینان سے ویرانے میں کار سے ٹیک لگائے کھڑے ہو؟"

"ہو سکتا ہے مجھے آپ ہی کا انتظار ہو۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

اس کے چہرے پر غصے کے سائے لہرا گئے۔ "کیا مطلب؟ جانتے ہو میں کون ہوں؟"

"اگر نہیں جانتا تو اب جان جاؤں گا۔" میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ "اور کسی کا انتظار کرنے کے لیے اسے جاننا تو ضروری نہیں۔" میں آہستہ سے مسکرایا۔

وہ میری اس ڈھٹائی پر کچھ بوکھلا سی گئی۔ پریشانی سے اپنے ساتھ والوں کو دیکھا اور پھر سرد مہری سے پوچھا: "تم میرا انتظار کر رہے تھے؟"

"شاید۔" میں نے کہا۔ "بلکہ اب تو یقیناً۔"

"کس لیے؟" وہ مجھے گھور کر غرّائی۔

"مدد کے لیے۔" میں نے معصومیت سے جواب دیا۔ "میری کار کا پٹرول ختم ہو گیا ہے۔ جنگل میں بے یار و مددگار رہ گیا ہوں۔ راستے سے بھی واقف نہیں ہوں۔ کوئی دوست یا سہارا بھی نہیں ہے۔"

اس نے کمر پر سے ایک ہاتھ اٹھا لیا۔ "اور اس لیے تم میرا انتظار کرنے لگے؟" پھر وہ غرور سے سر اونچا کر کے میری جانب بڑھی۔ "بولو۔ کس لیے انتظار تھا میرا؟ کیا کام ہے تمہیں مجھ سے؟"

"کام کیا ہو سکتا ہے سوائے اس کے کہ مجھے کسی محفوظ جگہ پہنچا دو۔"

وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگی۔

"میں انجان اور اجنبی مسافر ہوں۔ بھٹک گیا ہوں۔ میں جانتا تھا کہ کوئی نہ کوئی اللہ کا نیک بندہ ضرور میری مدد کے لیے آئے گا اور میری مشکل آسان ہو جائے گی مگر یہ نہیں جانتا تھا کہ بندے کی جگہ ایک بندی آجائے گی۔"

سخت غصّے اور ناراضی کے عالم میں بھی وہ بے اختیار ہنس پڑی۔ "تو یوں کہو مدد کی تلاش میں کھڑے تھے ویسے

یہ بھی تم نے ٹھیک ہی جانا۔ اس علاقے میں ہمارے سوا کوئی اور تمہاری مدد کر بھی نہیں سکتا۔ یہ کہو تم کون ہو اور یہاں کیوں آئے ہو؟"

"شاید میری کم بختی مجھے یہاں کھینچ لائی ہے ورنہ میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔"

وہ اب دلچسپی سے مجھے دیکھ رہی تھی مگر اس کی نگاہوں میں شک و شبہ کے سائے اب بھی موجود تھے۔ "یہ ہم لوگوں کی زمینیں ہیں۔ آس پاس دور دور تک ہماری اجازت کے بغیر یہاں کوئی نہیں آتا اور یہاں صرف وہی لوگ آتے ہیں جو کسی مزدوری کام سے آتے ہیں یا پھر جنہیں ہم بلاتے ہیں۔"

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" میں اپنے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔

"مگر تم ہو کون؟ نام کیا ہے تمہارا؟ کس سے ملنے آئے ہو؟" اسنے تابڑ توڑ سوالات کر ڈالے۔ میں ابھی تک کوئی مناسب اور معقول جواب تلاش نہیں کر سکا تھا اس لیے اِدھر اُدھر کی باتوں میں وقت ضائع کرنا چاہتا تھا۔

"اگر میں کہوں کہ میں آپ ہی سے ملنے آیا تھا تو؟" میں نے کہا۔

"مجھ سے؟!" وہ بے یقینی سے دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اب اس کا ایک ہاتھ اس پھرے کی طرف اور دوسرا پستول پر تھا۔ "تم مجھ سے ملنے کے لیے آئے ہو، بولو؟" اس کی آواز میں غصہ جھلک رہا تھا۔ اس کا بدلا ہوا لہجہ اور رویہ دیکھ کر دونوں اسٹین گن والوں نے بھی دو قدم پیچھے ہٹ کر مجھے اپنی زد میں لے لیا۔ میں نے کنکھیوں سے جیپوں کی طرف دیکھا۔ خدا جانے ان میں اب کتنے اور کیسے لوگ موجود تھے لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ سب بھی ایسے ہی جابر کرخت اور مسلح ہوں گے۔ فضا میں اچانک کشیدگی اور تناؤ پیدا ہو گیا تھا۔ اب میری ذہانت کی آزمائش کا وقت آ پہنچا تھا اور مجھے کوئی معقول بہانہ نہیں سوجھ رہا تھا۔ پریشانی میری رگ و پے میں اتر گئی تھی لیکن میں نے دل کڑا کیے رکھا اور چہرے کی مسکراہٹ معدوم نہیں ہونے دی۔

"بڑے افسوس کی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ اپنے مہمانوں سے ایسا سلوک کرتی ہیں؟"

"مہمان؟!" وہ حیران ہو گئی۔

"اور کیا۔" میں نے معصومیت سے سر ہلایا۔

"بلے بی۔ میں کہوں یہ ملک صاحب تو نہیں ہیں؟" اسکا ایک ساتھی بول پڑا۔

"کون ملک صاحب؟"

"اجی وہی جو زمین خریدنا چاہتے ہیں اپنے چوہدری صاحب سے۔"

اس نے مجھے غور سے دیکھا۔ میں نے جلدی سے پھر سر ہلا دیا۔ قدرت نے مجھے ایک اور موقع فراہم کر دیا تھا۔ یہ لوگ مجھے وہی شخص سمجھ رہے تھے جو چوہدری صاحب سے اس علاقے کی زمینوں کا سودا کرنے کے لیے آنے والا تھا۔ کوثر کو بھی مجھ پر یہی گمان گزرا تھا۔ لوٹا سنگھ بھی مجھے ملک صاحب سمجھ بیٹھا تھا۔ اب وہ دونوں میری شناخت کے لیے موجود نہیں تھے۔ ایسے میں بڑی آسانی سے وہی روپ دھار سکتا تھا۔ موجودہ شکل سے چھٹکارا پانے کی یہ سب سے مناسب اور معقول صورت تھی۔

یکایک اس کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور چہرے پر ایک روشنی سی پھیل گئی۔ وہ مسکراتی اور ہنستی ہوئی بہت بھلی لگتی تھی اور یکسر ایک مختلف شخصیت نظر آتی تھی۔ "اچھا!" وہ "اے" کو بہت لمبا کر کے معنی خیز انداز میں بولی۔ "تو آپ ہیں ملک منصور صاحب جن کا ہم سب کو انتظار تھا!؟"

"بالکل ٹھیک پہچانا آپ نے۔" میں خوش ہو کر مسکرایا۔ "میں نے بھی تو یہی کہا تھا مگر آپ ناراض ہو گئی تھیں سن کر۔"

"ہمیں آپ نے بتایا جو نہیں تھا کہ آپ کون ہیں مگر آپ کے اتنی جلدی آجانے کی اُمید نہیں تھی۔"
"بس جی۔ کبھی کبھی جلدی کرنی بھی پڑتی ہے۔ بات ہی ایسی بن جاتی ہے۔"
اس بار وہ بلند آواز سے کھلکھلا کر ہنسی اور سر کو پیچھے کرنے کی وجہ سے اس کے بالوں کا ریشم پھر اس کے چہرے پر بکھر گیا۔ "ٹھیک کہتے ہیں آپ۔ کبھی کبھی بات ایسی ہی بن جاتی ہے۔ آپ کو میرا انتظار تھا اور ہمیں آپ کا۔ چلیے اب ہم دونوں مل گئے۔ اب اور کس کا انتظار ہے؟"
"آپ سے ملنے کے بعد کوئی احمق ہی کسی اور کا انتظار کر سکتا ہے۔" میں نے ایک اور فقرہ پھینکا۔ تیر نشانے پر بیٹھا اور وہ کچھ جھینپ سی گئی مگر پھر اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔ "دیکھو۔ میں ملک صاحب کو لے کر فارم پر جا رہی ہوں۔ تم ان کی گاڑی لے کر پیچھے آؤ۔" یہ کہا اور جیپ کی طرف بڑھ گئی جس میں سے وہ برآمد ہوئی تھی۔ میں اپنی جگہ متفکر کھڑا رہ گیا۔ اوّل تو مسئلہ یہ تھا کہ وہ اس جنگل بیابان میں میری کار میں ڈالنے کے لیے پٹرول کہاں سے لائیں گے اور پھر چابیوں کے بغیر کار کو سٹارٹ کیسے کریں گے؟ مگر سب سے پریشان کن سوال یہ تھا کہ اگر انھوں نے میری کھوئی ہوئی چابیاں تلاش کر لیں تو پھر وہ کار کی ڈگی میں رکھے ہوئے اسلحہ سے بھی واقف ہو جائیں گے جو میرے لیے سخت تشویشناک بلکہ خطرناک مسئلہ بن سکتا تھا۔
"سُنیے۔" میں نے لڑکی کو مخاطب کیا۔ "آپ چلیے میں ان لوگوں کے ساتھ مل کر چابیاں تلاش کرتا ہوں۔ ورنہ ان کے لیے گاڑی چلانا مشکل ہو جائے گا۔ اس وقت پٹرول بھی نہیں مل سکے گا۔"
"پٹرول کی آپ فکر نہ کیجئے۔" وہ خوش اخلاقی سے بولی۔ "اور نہ ہی کار کی چابیوں کی طرف سے پریشان ہوں۔ یہ لوگ آپ کا کام کر لیں گے۔"
"مگر کیسے؟" میں نے اصرار کیا۔
اس نے تنگ آکر مجھے دیکھا۔ "اگر یہ پٹرول ڈالنا چاہیں گے تو وہ ان کے پاس ڈبے میں موجود ہے۔ ورنہ یہ دوسری جیپ میں سے بھی پٹرول اس میں ڈال سکتے ہیں مگر اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"
"کیا مطلب؟" میں نے بے اختیار کہا۔ "یہ پٹرول کے بغیر ہی کار چلا لیں گے؟ مگر چابی کے بغیر کار کیسے چلائیں گے؟"
"چابی ان کے لیے کوئی پرابلم نہیں ہے۔" اس نے مجھے یقین دلایا۔ "مگر فی الحال یہ آپ کی کار جیپ سے باندھ کر کھینچ لائیں گے۔ جیسے ہم اب آپ کو کھینچ کر لے جائیں گے۔" یہ کہہ کر وہ بڑی لگاوٹ سے مسکرائی اور پچھلی جیپ کی طرف چل پڑی۔ اپنے کشیدہ قامت اور متناسب جسم کی وجہ سے اس کی چال میں ایک دلکش لچک تھی جس کا غالباً خود اُس کو بھی احساس تھا۔ جیپ کی جانب جاتے ہوئے اُس نے ایک بار مُڑ کر میری طرف دیکھا۔ میں تو پہلے ہی کشاں کشاں اس کی جانب کھنچا چلا جا رہا تھا۔
ہم جیپ کے پاس پہنچے تو اس میں بیٹھے ہوئے دو مسلح آدمی فوراً کود کر باہر نکل آئے اور مؤدب کھڑے ہو گئے لیکن ڈرائیور جو ایک تنومند آدمی تھا بدستور اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔
"باز خاں۔ نیچے اُترو۔" اُس نے چٹکی بجا کر ڈرائیور کو مخاطب کیا۔ اور وہ فوراً جیپ سے باہر نکل آیا۔ باز خاں واقعی دیکھنے میں عقاب کی مانند تھا۔ اس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور چمک دار تھیں۔ چہرہ ستا ہوا تھا اور ناک آگے سے طوطے کی طرح مُڑی ہوئی تھی۔ چہرے کے مقابلے میں اس کا جسم بہت زیادہ پھیلا ہوا اور مضبوط تھا۔ خاص بات یہ تھی کہ اُس نے ایک پستول اپنی کمر سے باندھ رکھا تھا اور دوسرا کندھے سے لٹکا ہوا تھا۔ کمر کی پیٹی میں ایک خنجر بھی اُڑسا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر بھولی بھولی نوکدار مونچھیں تھیں اور جب وہ مسکراتا تھا تو اس کے سامنے کے دو ٹوٹے ہوئے دانت نظر آتے تھے۔ اپنے لچک دار جسم کو خم دے کر وہ ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اس کا اشارہ پا کر

میں برابر کی سیٹ پر براجمان ہو گیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا، نہ انہیں کوئی مزید ہدایت دی۔ بس جیپ سٹارٹ کی اور وہ اچانک ایک جھٹکے کے ساتھ چل پڑی۔ دوسرے ہی لمحے اس کی رفتار ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ تیز ہوا کی وجہ سے اس کے بال اُڑ کر چہرے کے آس پاس بکھر گئے، لیکن اس نے ایک بار بھی انہیں سنبھالنے یا سمیٹنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے بال کبھی میری آنکھوں سے بھی ٹکرا جاتے۔ جن سے بچنے کے لیے میں دوسری جانب کھسک گیا۔ اس نے کنکھیوں سے میری طرف دیکھا اور کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "کیا میرے بالوں سے زیادہ چوٹ لگی ہے؟" اُس نے مزاحیہ انداز میں پوچھا۔
"میں لڑکیوں کی زلفوں سے دُور ہی رہنا چاہتا ہوں۔" میں نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔
"پھر بھی اس زنجیر سے بچ نہیں سکتے۔" اس نے فقرہ چُست کیا۔
"ابھی تک تو بچا ہوا ہوں۔" میرے مُنہ سے بے ساختہ نکلا۔
اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ "میں نے تو سُنا ہے تم شادی شدہ ہو؟"
مجھے معاً اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ مجھے خود معلوم نہیں تھا کہ یہ ملک منصور شادی شدہ آدمی تھا یا کنوارہ؟ لیکن اب بات بنانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ "اجی ہر شادی تو خانہ آبادی نہیں ہوتی۔"
وہ پھر مسکرائی۔ "مردوں کی ذات بھی عجیب ہوتی ہے۔"
"بہت بُرے ہوتے ہیں نا؟" میں نے پوچھا۔
"اور کیا۔"
"مگر پھر بھی ان کے بغیر گزارہ نہیں ہے۔" میں نے کہا۔
"بہت چالاک ہو۔" اس نے تیزی سے ایک موڑ کاٹا اور میں سنبھلنے کی کوشش کے باوجود اس سے ٹکرا گیا۔ اب ایک پتھریلا راستہ شروع ہو چکا تھا جو خاصا خم دار تھا۔ آس پاس سبزہ اور درخت تھے اور چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کے باعث یہ سڑک نشیب و فراز سے گزرتی تھی اور کیونکہ جیپ کی رفتار بھی خاصی تیز تھی اس لیے ہم ہچکولے اور جھٹکے کھا رہے تھے اور جھٹکوں کی وجہ سے بار بار ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے تھے۔ میں اس تصادم سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ لڑکی بالکل بے پروا اور بے نیاز تھی۔
"کیوں کیسا لگ رہا ہے؟" اس نے مسکراتے ہوئے شرارت سے پوچھا۔
"کیا؟ آس پاس کا منظر۔ جھٹکے یا سفر؟"
"ہمسفر کو بھی اس میں شامل کر لو۔" اس نے قطعاً نارمل لہجے میں کہا۔
"ہمسفر اچھا ہو تو سبھی کچھ اچھا لگنے لگتا ہے۔" میں نے کہا۔
"تم نے اب تک میرا نام نہیں پوچھا۔" اس نے بات بدلی۔ "نہ یہ جاننے کی کوشش کی کہ میں کون ہوں؟"
"نام سے کیا فرق پڑتا ہے۔" میں نے شیکسپیئر کا فقرہ دوہرا دیا۔ "گلاب کو جس نام سے بھی پکارو وہ گلاب ہی رہتا ہے۔ اور لڑکیوں کے متعلق زیادہ جاننے کی کوشش کرو تو انہیں غلط فہمی ہو جاتی ہے۔"
"شاید تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے اپنے بارے میں۔" وہ ناراض ہو کر بولی۔
"شاید نہیں، یقیناً۔" میں نے چھیڑا۔
کچھ دیر وہ خاموش رہی پھر بولی۔ "میں چوہدری کی بیٹی ہوں۔"
"وہ تو نظر ہی آ رہا ہے۔"
"کیا نظر آ رہا ہے؟" وہ تنک کر بولی۔

"یہی کہ چوہدری کی اولاد کا ہی یہ ٹھاٹ باٹ ہو سکتا ہے۔ یہ گاڑیاں۔ ملازم۔ یہ رُعب۔ یہ نخرے صرف اسی کے ہو سکتے ہیں جس کا باپ چوہدری ہو ۔ اور پھر یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ بیٹا نہیں بیٹی ہو۔ کیوں تم لڑکی ہی ہو نا؟" میں نے اس کے مصنوعی غصّے کو دیکھتے ہوئے آخر میں ایک فقرہ بڑھا دیا "اب اپنا نام بھی بتا دو۔"

"اتنے چالاک اور ہوشیار ہو سب کچھ جان گئے ہو تو نام بھی تم ہی بتا دو۔"

میں سوچنے لگا "ریشماں؟!! نہیں۔ بشیراں؟! صنیفاں؟ رشیدہ؟ حمیدہ؟ لالی؟......"

"بس بس رہنے دو۔" اس نے جھڑک کر کہا "یہ تو نوکروں اور مزارعوں کی لڑکیوں کے نام ہیں۔ چوہدری کی بیٹی کا نام ایسا ہوتا ہے؟"

"تو پھر کیسا ہوتا ہے؟" میں نے بھولپن سے کہا "ابھی پہلے کبھی کسی چوہدری کی بیٹی سے ملا جو نہیں۔ پھر میں کیسے جان سکتا ہوں؟"

"میرا نام ہے شیریں۔ فرہاد والی شیریں۔"

"بہت اچھا نام ہے، مگر مٹھاس کے بغیر....اور....." میں چپ ہو گیا۔

"اور کیا؟" اس نے غصّے سے پوچھا۔

"اور فریاد کے بغیر۔" وہ بے ساختہ ہنس پڑی "بہت چالاک ہو۔"

"میرا نام نہیں پوچھو گی؟"

"وہ تو مجھے پتہ ہے۔ تم ملک منصور ہو۔" مجھے یک لخت یاد آ گیا کہ میں اس وقت ملک منصور کے روپ میں ہوں "وہ دیکھو۔" اس نے سامنے کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ "ہمارا فارم آ گیا۔"

یہ ایک سرسبز نیم پہاڑی علاقہ تھا۔ ہر طرف درختوں کے پہریدار سروقد کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان میں ایک اونچا سا پتھر کا بڑا دروازہ تھا جس کے چاروں طرف پتھروں کی چاردیواری تھی۔ اس چاردیواری کے اندر ایک پتھروں کی بنی ہوئی بڑی سی دومنزلہ حویلی نما کوٹھی تھی۔ کوٹھی کے چاروں طرف کافی وسیع میدان۔ لان اور باغ تھا۔ ہماری جیپ دروازے کے نزدیک پہنچی تو اس کے موٹے موٹے آہنی پٹ کھل گئے۔ دو مسلح پہریدار یہاں بھی مستعد کھڑے تھے جنھوں نے زوردار انداز میں سلام کیا۔ ایک چھوٹے چھوٹے پتھروں کی سڑک دُور تک اندر چلی گئی تھی۔

ایک اونچی چھت والے برآمدے کے سامنے جیپ رُکی اور نہ جانے کہاں سے دو تین مسلح ملازم دوڑتے ہوئے آکر ادب سے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ شیریں اور میں باری باری جیپ سے اُترے۔ "ڈیڈی کہاں ہیں؟" شیریں نے پوچھا۔

"گول کمرے میں ہیں بے بی۔ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

وہ تیزی سے برآمدے کی طرف چلی اور میں وہیں کھڑا رہ گیا۔ اس نے مُڑ کر دیکھا اور بولی "وہاں کیوں رُک گئے۔ میرے ساتھ آؤ۔"

میں اس کے پیچھے چل پڑا۔ برآمدے میں ایک بڑے دروازے میں سے ہم اندر داخل ہوئے۔ یہ ایک خاصی کشادہ گیلری تھی جس پر قالین کا فرش تھا اور سلیقے سے کرسیاں اور صوفے بھی رکھے ہوئے تھے۔ پرانی وضع کی چوبی کام کی میزوں پر پیتل کے بڑے بڑے گلدان رکھے ہوئے تھے۔ اور دیواروں پر پہاڑی مناظر کی تصاویر لٹکی ہوئی تھیں۔ گیلری میں دونوں طرف کمروں کے دروازے تھے۔ چند دروازوں کے سامنے سے گزر کر شیریں ایک کمرے میں داخل ہوئی۔ میں اس کے ہم قدم تھا۔ یہ ایک گولائی میں بنا ہوا خاصا بڑا ڈرائنگ روم تھا جس کے قالینوں سے

لے کر دیوار و پردوں تک ہر چیز ہلکے نیلے رنگ کی تھی۔ آہٹ سُن کر ایک بڑے دیوان پر بیٹھے ہوئے شخص نے مُڑ کر ہمیں دیکھا۔ شیریں کو دیکھ کر اس کے چہرے پر اطمینان کی مسکراہٹ نمودار ہوئی، لیکن مجھ پر نظر پڑی تو دیوان سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ درمیانی عمر کا ایک مضبوط اور توانا شخص تھا۔ اس کے شانے مضبوط۔ چھاتی چوڑی اور قد اونچا تھا۔ اس کے سر کے بال کھچڑی ہو چکے تھے، لیکن چہرے کی سُرخی اور شادابی بدستور قائم تھی۔ وہ مسکرایا تو اس کے مضبوط سفید دانت موتیوں کی طرح چمکنے لگے۔ وہ سوالیہ نگاہوں سے مجھے اور شیریں کو دیکھ رہا تھا۔

شیریں آگے بڑھ کر اس سے لپٹ گئی "ڈیڈی۔ جانتے ہو کسے لائی ہوں؟ یہ ملک منصور ہیں۔"

"ملک منصور؟!" چوہدری کے مُنہ سے نکلا اور وہ حیرت سے مجھے تکنے لگا "یہ تمہیں کہاں مل گئے؟" صاف ظاہر تھا کہ میری اچانک آمد اس کے لیے غیر متوقع اور ناخوشگوار تھی۔

"ان کی کار کا پٹرول ختم ہو گیا تھا۔ میں ساتھ لے آئی۔"

"یہ تو بہت اچھا ہوا۔" پھر وہ میری طرف بڑھا "بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔"

ہم نے مصافحہ کیا تو اس کے ہاتھ کی مضبوط گرفت نے مجھے مزید حیران کر دیا۔ اس نے کہا "اتفاق دیکھئے کہ آپ کی بیگم بھی ہمارے پاس مہمان ہیں۔"

یہ فقرہ مجھ پر زلزلے کی طرح نازل ہوا اور میں دم بخود کھڑا رہ گیا "ان کی بیگم؟" شیریں بھی حیران تھیں "وہ یہاں کیسے پہنچ گئیں؟"

چوہدری ہنسنے لگا۔ اس کے مضبوط دانتوں کی لڑیاں نمایاں ہو گئیں "بیٹے سُنا نہیں تم نے۔ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ جیسے ملک صاحب یہاں پہنچ گئے ویسے ہی قسمت نے ان کی بیگم کو بھی یہاں پہنچا دیا۔ کیوں نا ملک صاحب؟"

"مگر۔ میری بیگم ___؟.... میرا مطلب وہ یہاں....."

"گھبرانے کی کیا بات ہے۔ سب کچھ پتہ چل جائے گا، بلکہ بہتر ہو کہ آپ ان سے مل لیں۔ وہ خود ہی آپ کو سب کچھ بتا دیں گے۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ چوہدری نے صوفے پر پڑے ہوئے برقی گھنٹی کے بٹن کو دبایا۔ ایک نوجوان اور خوش لباس ملازمہ نمودار ہو کر ادب سے کھڑی ہو گئی۔ "صغراں۔ دیکھو ملک صاحب کو ان کی بیگم کے کمرے میں لے جاؤ۔ اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو پوچھ لینا۔ انہیں کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہیے ہماری حویلی میں۔"

"آئیے میرے ساتھ۔" صغراں نے سرگوشی میں کہا اور ایک دروازے کی طرف چل پڑی۔ میں بھی بادلِ نخواستہ اس کے ساتھ چل پڑا۔ شیریں پر نظر پڑی تو وہ حیرت اور ناپسندیدگی سے میری طرف دیکھ رہی تھی مگر چوہدری صاحب کے چہرے پر ایک دلآویز مسکراہٹ تھی۔ میں نے خاموشی سے صغراں کے پیچھے جانے میں ہی عافیت سمجھی۔

صغراں نہ جانے کتنی گیلریوں، راہداریوں، کمروں اور سیڑھیوں سے گزر کر میرے آگے آگے چلتی رہی اور میں ماؤف ذہن کے ساتھ اس اُدھیڑبُن میں تھا کہ ملک منصور کی بیوی کا میں کیوں کر سامنا کروں گا جب کہ میں اس کا شوہر بھی نہیں ہوں۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وقتی طور پر ایک مشکل سے نجات حاصل کرنے کے لیے میں نے جس شخص کا روپ دھار لیا تھا اس کی بیوی یوں مجھے اچانک مل جائے گی۔ وہ میرا سامنا کرنے کے بعد کیا سوچے گی اور میرے ساتھ کیا سلوک کرے گی؟ لیکن اس سے بڑھ کر پریشانی کی بات یہ تھی کہ جب میری اصلیت چوہدری اور شیریں کو معلوم ہو گی تو وہ میرے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے یہ فاصلہ کبھی طے نہ ہو گا۔

خدا خدا کر کے صغراں ایک دروازے کے سامنے جا کر رُکی اور اس پر دستک دی۔ اندر سے ایک نرم و شیریں آواز آئی "کون ہے؟"

"بی بی جی، میں صغراں ہوں۔ دیکھئے کس کو لے کر آئی ہوں۔"

دروازہ کھلتے ہی میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ میرے سامنے سیاہ شلوار قمیص میں ملبوس ایک خوبصورت اور باوقار عورت کھڑی تھی۔ اس نے پہلے صغراں کو اور پھر مجھ کو دیکھا اور اس کے چہرے پر ایک سوال نمودار ہو گیا۔

"چوہدری صاحب نے آپ کے میاں جی کو آپ کے پاس بھیجا ہے۔ کسی اور خدمت کی ضرورت ہو تو گھنٹی بجا کر مجھے بلا لینا۔"

صغراں یہ کہہ کر رخصت ہو گئی اور ہم دونوں ایک دوسرے کو اجنبیوں کی طرح دیکھنے لگے۔ چند لمحے خاموشی رہی اور فضا اتنی کشیدہ ہو گئی جیسے دھار دار آرے سے کٹ کر دو ٹکڑے ہو جائے گی۔ ان لمحات میں ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے اور جائزہ لیتے رہے۔ اس کی نظریں تیزی سے میرے سراپا پر حرکت کر رہی تھیں۔ ان میں کسی قسم کا تاثر نہیں تھا سوائے ناراضی اور ناپسندیدگی کے۔ اور ظاہر ہے کہ اسے اپنے شوہر کی جگہ اس کے روپ میں کسی اور کو دیکھ کر ناراض ہی ہونا چاہیے تھا۔ میں پہلے ذہنی دھچکے سے عہدہ برآر ہو چکا تھا اور اب گہری نگاہوں سے اس کو ناپ تول رہا تھا۔ اُس نے سیاہ ریشمی شلوار اور قمیص پہن رکھی تھی۔ گلے میں ایک پتلا سا سفید رنگ کا دوپٹہ پڑا ہوا تھا جس نے اس کے لباس کی جاذبیت میں اضافہ کر دیا تھا۔ وہ ایک دراز قد، خوش اندام اور خوبصورت عورت تھی۔ اس کا رنگ کھلتا ہوا گندمی تھا اور سیاہ لباس کے باعث گورا نظر آ رہا تھا۔ ناک نقشہ تیکھا تھا اور آنکھیں سیاہ اور بڑی بڑی تھیں۔ غصے اور برہمی کے عالم میں وہ یقیناً اور زیادہ دلکش نظر آ رہی تھی۔ مجھے ملک منصور فرض کر لیا گیا تھا لیکن مجھے ابھی تک یہ بھی علم نہیں تھا کہ ملک منصور کی عمر کیا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق اسے ایک ادھیڑ عمر شخص ہونا چاہیے تھا لیکن میرے سامنے ایک نوجوان اور کشیدہ قامت عورت کھڑی تھی۔ وہ متناسب جسم کی مالک تھی اور اس کا رکھ رکھاؤ اور انداز باوقار تھا۔ دیکھنے میں واقعی کسی رئیس خاندان سے تعلق رکھنے والی عورت نظر آ رہی تھی۔

"کون ہو تم؟" چند لمحے بعد جب حیرت اور جستجو کا پہلا تاثر ختم ہوا تو اس نے ڈپٹ کر مجھ سے پوچھا۔ اس کی آواز شیریں تھی لیکن اس میں تحکم جھلک رہا تھا۔ اس نے یہ فقرہ خاصی بلند آواز میں ادا کیا تھا۔ میں نے گھبرا کر ارد گرد نظر ڈالی کہ کہیں کوئی آس پاس موجود تو نہیں ہے۔ لیکن صغراں ہم دونوں کو کمرے میں ایک دوسرے کے مقابل چھوڑ کر جا چکی تھی اور دروازے کے سامنے والی گیلری سنسان تھی۔ جواب دینے کی بجائے میں مڑ کر کمرے کے دروازے کی طرف گیا اور اُسے بند کر کے مقفل کر دیا۔

"یہ تم کیا کر رہے ہو؟" اُس کی آواز گونجی۔ اس بار اس میں تحکم کے ساتھ ساتھ ایک لرزش بھی تھی۔ آخر کار وہ ایک عورت تھی اور ایک اجنبی اور مشکوک مرد کے ساتھ کمرے میں تنہا رہنا اسے گوارا نہ تھا۔ "بولتے کیوں نہیں؟" وہ چلا کر بولی: "یہ نہ سمجھنا کہ میں تم سے ڈر جاؤں گی یا تمہاری چال میں آ جاؤں گی۔ تم جیسے جرائم پیشہ اُٹھائی گیروں سے میں بخوبی نمٹنا جانتی ہوں۔" وہ غصیلی شعلہ بار نگاہوں سے مجھے گھور رہی تھی۔

میں نے کہا: "میں نے دروازہ اس لیے بند کیا ہے تاکہ تمہیں مجھ سے نمٹنے میں زیادہ آسانی ہو جائے اور تنہائی میں تم اطمینان سے یہ فریضہ ادا کر سکو۔" اس کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے میں نے آگے قدم بڑھایا تو وہ بے اختیار سمٹ کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس کی یہ ادا خاصی نظر فریب تھی۔ اگر میں اس قدر سنگین اور خطرناک صورتِ حال سے دوچار نہ ہوتا تو یقیناً میرے دل میں اس کے لیے ایک نرم گوشہ پیدا ہو جاتا۔ مگر حالات خاصے تشویشناک تھے۔ اس لیے میں نے اس کے جلال و جمال کو خاطر میں نہ لانا ہی مناسب سمجھا۔ میرا پہلا کام یہ تھا کہ اس کی خود اعتمادی کو متزلزل کر دوں ورنہ وہ دانستہ یا نادانستہ مجھے نقصان پہنچا سکتی تھی۔

"ٹھنڈے دل سے میری بات سنو۔" میں نے قدرے رعب دار آواز میں کہا: "شور مچانے کی ضرورت نہیں ہے ورنہ نقصان اٹھاؤ گی۔ زیادہ ہوشیار اور بہادر بننے کی کوشش بھی مت کرنا۔ میں بہت خطرناک آدمی ہوں، سمجھ گئیں؟!" میں نے سخت لہجے میں اپنی آواز میں کرختگی پیدا کرتے ہوئے اسے مرعوب کرنے کی کوشش کی۔

وہ بے اختیار دو قدم اور پیچھے ہٹ گئی یہاں تک کہ پیچھے رکھے ہوئے بید کے صوفے سے ٹکرا گئی۔ اس کی نظروں سے خوف و ہراس جھلک رہا تھا اور وہ خاصی مظلوم اور پریشان نظر آنے لگی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر میں دل ہی دل میں ہنسا لیکن میرے چہرے کے غضبناک تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں پیدا ہوئی۔ "تم کون ہو۔" وہ پیچھے ہٹنے کی کوشش میں گرتے گرتے بچی: "کیا چاہتے ہو؟ تمہارا مقصد کیا ہے؟"

"میں زیادہ سوالات سننے کا عادی نہیں ہوں۔" میں نے پھر اُسے گھُرکا: "میں جو پوچھتا ہوں اس کا ٹھیک ٹھیک جواب دو۔ ورنہ پچھتاؤ گی۔" یہ کہہ کر میں نے آنکھوں کو اس طرح حرکت دی کہ وہ حلقوں سے اُبلنے لگیں۔ وہ جہاں کھڑی تھی وہیں ہاتھوں سے ٹٹول کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ اُس نے چند لمحے پہلے اپنی شخصیت پر جو بارعب لبادہ پہن رکھا تھا اب وہ تار تار ہو چکا تھا اور وہ سو فیصدی ایک بے بس، کمزور اور قابلِ رحم عورت نظر آنے لگی تھی۔ میں اطمینان سے اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"رضیہ۔" وہ سہم کر بولی۔

"سنو رضیہ۔ تم یہاں کیسے آئی ہو اور تمہارے شوہر ملک منصور کہاں ہیں؟ وہ تمہارے ساتھ کیوں نہیں آئے؟"

وہ کسمسا کر بولی: "میں خود نہیں آئی مجھے تو چوہدری صاحب کے آدمی زبردستی لے آئے ہیں۔"

"کیا مطلب۔" میں صوفے پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ "تم اپنی مرضی سے یہاں نہیں آئیں؟ یہ لوگ تمہیں تمہاری مرضی کے خلاف لائے ہیں؟"

"ہاں۔" وہ روہانسی ہو کر بولی: "میں حویلی میں اکیلی تھی۔ باہر دو ملازم تھے۔ چوہدری کے آدمی ملک صاحب کو پوچھتے ہوئے آئے اور جب پتہ چلا کہ وہ نہیں ہیں تو زبردستی بندوقیں دکھا کر مجھے اپنے ساتھ لے آئے۔"

میں سنجیدگی سے سوچنے لگا۔ اس کارروائی کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟ کیا ان دونوں کی پرانی دشمنی ہے یا حال ہی میں ان کے مابین کوئی وجۂ نزاع پیدا ہو گئی ہے۔ "تم چوہدری کو پہلے سے جانتی ہو۔ ان کا تمہارے گھر آنا جانا رہا ہے؟"

"نہیں تو۔ ملک صاحب کبھی کبھی ان کا ذکر ضرور کیا کرتے تھے لیکن میں نے کبھی اس سے پہلے انھیں نہیں دیکھا تھا۔"

"ملک صاحب سے تمہاری شادی کو کتنے سال ہوئے؟"

"ایک ہی سال ہوا ہے۔" وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔

"تمہارے بچے کتنے ہیں؟"

"بچوں کا کیا سوال ہے۔" اس نے بے ساختہ کہا، پھر جیسے کچھ سوچ کر بولی: "کوئی بچہ نہیں ہے۔"

اس کا رویہ خاصا پُراسرار تھا۔ ملک صاحب کے تذکرے پر اُس نے کسی پُرجوش جذبے کا اظہار نہیں کیا تھا۔ "سمجھ گیا۔" میں نے اسے ٹٹولنے کے لیے اندھیرے میں تیر پھینکا: "تمہاری شادی مرضی کے خلاف ہوئی ہے؟"

وہ چوکنا ہو کر مجھے دیکھنے لگی: "تمہیں کس نے بتایا؟"

"تم نے۔"

"میں نے؟" وہ حیران ہو کر اُونچی آواز میں کہنے لگی۔ "میں نے تو تمہیں کچھ بھی نہیں بتایا۔"

"سنو رضیہ میں نجومی ہوں ستاروں کا علم جانتا ہوں اور لوگوں کے چہروں سے ان کے حالات کا اندازہ لگا لیتا ہوں۔

مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم اس شادی سے خوش نہیں ہو۔ تم ملک منصور کو پسند نہیں کرتیں۔"

اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں "اور تم میرے بارے میں کیا جانتے ہو؟" اس نے بچوں کی طرح بے اختیار اپنا ہاتھ میرے سامنے پھیلا دیا۔ "ذرا میرا ہاتھ دیکھ کر مجھے قسمت کا حال بتاؤ۔ پچھلی باتوں کو چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ میرا مستقبل کیا ہے؟"

میں نے بلا تامّل اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ وہ ایک نرم و نازک اور ملائم ہاتھ تھا۔ جسے چھو کر اور دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے کبھی مشقت کا کوئی کام نہیں کیا ہے۔ اس کی انگلیاں پتلی اور پُر گوشت تھیں مجھے نہیں معلوم کہ ایسی انگلیوں سے کیا مُراد لی جاتی ہے۔ اس لیے کہ دست شناسی کے بارے میں میرا علم بھی اتنا ہی تھا جتنا خود اس کا ہوگا لیکن میں نے چند لمحے اس کے ہاتھ کی لکیروں کا مطالعہ کیا۔ اس دوران میں اس کا گداز ہاتھ مختلف جگہوں سے دباتا بھی رہا۔ پھر میں نے اسکا انگوٹھا موڑنے کی کوشش کی لیکن وہ ذرا بھی خم نہ کھا سکا۔ اتنا میں نے سُن رکھا تھا کہ ایسے انگوٹھے والے لوگ ضدی اور ہٹ دھرم ہوتے ہیں۔ "تم اوّل نمبر کی ضدی لڑکی ہو۔ بچپن سے گھر والوں کی لاڈلی رہی ہو۔ ہر شخص تمہیں پسند کرتا رہا۔ جب بڑی ہوئیں تو مرد ذات کی توجہ اور نگاہوں کا مرکز بن گئیں۔ گھر والوں نے تمہاری ہر بات مانی۔ لیکن تم پھر بھی خوش نہیں ہو۔ ملک منصور کے ساتھ تمہاری شادی تمہاری مرضی کے خلاف ہوئی ہے کیونکہ تم کسی اور کو پسند کرتی ہو۔"

اس نے یک لخت اپنا ہاتھ اضطراری طور پر میرے ہاتھ سے کھینچ لیا اور حیران و مضطرب نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی: "تم تو سب کچھ جانتے ہو؟" اس کی سانسیں تیز ہو گئیں۔ "واقعی تم تو قسمت کا حال جانتے ہو۔ اب بتاؤ کہ میری شادی کب ہوگی؟ اور کیا میری مرضی کے مطابق ہوگی یا نہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے دوسری شادی؟" میرے منہ سے نکلا۔

"دوسری؟ کیا میری دو شادیاں ہوں گی؟" اس نے پریشان ہو کر دریافت کیا۔

میں سمجھ گیا کہ مجھ سے چوک ہو گئی ہے۔ مگر کہاں؟ لیکن پھر اپنا بھرم رکھنے کے لیے میں نے ایک بار پھر اس کے ہاتھ کو اُلٹ پلٹ کر دیکھنا شروع کر دیا۔ "بھئی جہاں تک میرا علم کہتا ہے تمہاری دو شادیاں ہوں گی، یا ہو سکتا ہے ایک شادی اور دوسری منگنی ہو۔ اس لیے کہ ہاتھ کی لکیروں میں شادی کے بارے میں تو نہیں لکھا ہوتا۔ لیکن ہو سکتا ہے تم کسی شخص سے اتنی نزدیک ہو جاؤ کہ شادی کی نوبت آ جائے۔"

"تمہارا علم سو فیصدی ٹھیک کہتا ہے۔" وہ پُر جوش آواز میں بولی: "میری یہ شادی سچ مچ کی شادی نہیں ہے ہم دونوں آج تک میاں بیوی نہیں ہیں، نہ کبھی ہوں گے۔"

میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور اطمینان سے صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔ "دیکھو رضیہ، میں علم غیب تو نہیں جانتا۔ اب اس کی تفصیل تم خود مجھے بتاؤ۔"

اس نے مجھے جو کچھ بتایا وہ سُن کر میں حیران رہ گیا۔ اس نے بتایا کہ وہ ایک چھوٹے سے قصبے کے ایک دُکاندار کی اکلوتی بیٹی ہے۔ بچپن ہی سے ماں باپ کی لاڈلی رہی ہے۔ اس کی ناز برداری میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی گئی جب وہ بڑی ہوئی تو پہلے سکول میں اور پھر کالج میں پڑھنے لگی جہاں وہ ہر قسم کی سرگرمیوں اور کھیلوں میں حصّہ لینے کی وجہ سے ایک ممتاز طالبہ تھی۔ اس نے جوڈو کراٹے کی کلاسیں بھی اٹینڈ کیں۔ والدین اس کی کوئی فرمائش نہیں ٹالتے تھے۔ ہر کوئی اسے پسند کرتا تھا۔ پڑوس میں رہنے والا ایک نوجوان بچپن ہی سے اس میں دلچسپی لیا کرتا تھا۔ سکول کے راستے میں کھڑا ہو جاتا اور خاموشی سے اس کو دیکھتا رہتا۔ پھر جب رضیہ نے کالج جانا شروع کیا تو وہ سائیکل پر اس کے تانگے کے ساتھ ساتھ جانے لگا۔ وہ اچھی صورت شکل کا لڑکا تھا۔ خود بھی کالج میں پڑھتا تھا

مگر نہ جانے کس طرح رضیہ کے کالج جاتے وقت وہ ضرور اس کے تانگے کا پیچھا کیا کرتا تھا۔ اس نے کبھی کوئی بدتمیزی نہیں کی، کوئی نازیبا حرکت نہیں کی۔ بس خاموشی سے سائیکل پر تانگے کا پیچھا کرتا اور رضیہ کے کالج سے واپس چلا جاتا۔ رفتہ رفتہ رضیہ بھی اس سے متاثر ہو گئی اور اسے پسند کرنے لگی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی باہمی محبت میں اضافہ ہونے لگا یہاں تک کہ رضیہ موقعہ پا کر کالج سے نکل کر اس سے ملاقات کرنے لگی۔ زندگی بھر ساتھ رہنے کے وعدے ہوئے۔ محبت نبھانے کی قسمیں کھائی گئیں مگر قسمت کو کچھ اور منظور تھا۔ کالج کی ایک تقریب میں ملک منصور کو صدارت کے لیے بلایا گیا تھا۔ انھوں نے رضیہ کی تقریر سُنی۔ اسے گانا گاتے ہوئے سُنا اور اس کی خوبیوں اور صلاحیتوں کا تذکرہ سُنا تو اس کی حوصلہ افزائی کی اور شاباش دی لیکن دوسرے ہی دن انھوں نے رضیہ کے باپ کے پاس شادی کا پیغام بھی بھیج دیا۔ ملک منصور علاقے کا دولت مند اور بااثر شخص تھا۔ سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصّہ لیا کرتا تھا بلکہ اسمبلی کا ممبر بھی رہا تھا۔ سرکاری دربار میں بھی اس کا رسوخ تھا۔ کمی صرف یہ تھی کہ وہ عمر میں رضیہ سے دوگنا تھا۔ ماں باپ سر جوڑ کر بیٹھے اور اس رشتے کے بارے میں غور کرنے لگے۔ بیٹی سے رائے لی تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ باپ نے ملک صاحب سے معذرت طلب کی مگر ملک صاحب کہاں ماننے والے تھے۔ پہلے انھوں نے مختلف ایلچی بھیجے۔ لالچ دیئے اور پھر دھمکیوں پر اُتر آئے۔ جب اس کے باوجود رضیہ ٹس سے مس نہ ہوئی تو ایک روز کالج سے واپسی پر دو موٹر کار سواروں نے اسے زبردستی اُٹھا کر کار میں ڈال لیا اور ملک صاحب کے ایک دیہاتی مکان میں پہنچا دیا۔ ماں باپ نے بہت تلاش کیا۔ پولیس میں رپورٹ کی۔ کالج والوں نے بھی بہت شور مچایا۔ قصبے کے لوگوں نے جلوس نکالے اور لڑکی کو برآمد کرنے کا مطالبہ کیا لیکن پولیس نے لڑکی کے بارے میں لاعلمی ظاہر کی۔ کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ لڑکی کو کس نے اغوا کیا ہے اور وہ کہاں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ملک صاحب پر جب رضیہ کے باپ نے شبہ کا اظہار کیا تو پولیس نے ملک صاحب سے بھی پوچھ گچھ کی لیکن پھر مطمئن ہو کر بیٹھ گئی۔

ملک صاحب کا دیہاتی مکان ایک قلعہ نما حویلی تھی جو دور دراز علاقے میں واقع تھی اور آس پاس کوئی آبادی نہیں تھی جو لوگ بھی تھے وہ ملک صاحب کی رعایا تھے یا اُن کے کارندے۔ ظاہر ہے کہ رضیہ کی موجودگی کے بارے میں کسی کو علم نہیں ہو سکتا تھا اور اگر ہو بھی جاتا تو کون آواز اُٹھاتا؟ رضیہ کو کار میں ڈالنے کے بعد بے ہوشی کی دوا سُونگھا دی گئی تھی۔ جب اُسے ہوش آیا تو اس نے خود کو اس شاندار حویلی میں پایا۔ کچھ دیر بعد ملک صاحب

بھی پذیرائی کے لیے تشریف لے آئے اور رضیہ کو سمجھانے کی کوشش کرنے لگے کہ اگر وہ ملک صاحب سے شادی پر رضامند ہو جائے گی تو اس کی زندگی سنور جائے گی۔ رضیہ کے پاس انکار کے علاوہ کوئی اور جواب نہ تھا۔ ملک صاحب نے اسی شام قاضی صاحب کو بلوا کر نکاح پڑھوا لیا۔ رضیہ کو دلہن بنانے کے لیے جو عورتیں اور ملازمائیں بھیجی گئی تھیں رضیہ نے انھیں مار پیٹ کر اور گالیاں دے کر بھگا دیا۔ رات کو ملک صاحب دُلہن سے ملاقات کے لیے گئے تو رضیہ کی جوڈو کراٹے کی تربیت کام آئی اور اس نے ملک صاحب کے ساتھ جوڈو کراٹے کا ایسا مظاہرہ کیا کہ اگلے تین روز تک ملک صاحب بستر پر دراز رہے۔ لیکن کسی کو یہ راز پتہ نہیں تھا کہ ان کی بیماری کیا ہے؟ صحت مند ہونے کے بعد ملک صاحب نے پھر رضیہ کو طلب کیا اور بہت ڈرایا دھمکایا لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ رضیہ نے صاف کہہ دیا کہ اگر ملک صاحب نے جبر یا زبردستی سے کام لیا تو وہ اپنی جان دے دے گی۔ ملک منصور اس کی ضد اور ہٹ دھرمی کا مظاہرہ دیکھ چکے تھے اس لیے وقتی طور پر چُپ ہو گئے۔ انھیں معلوم تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ رضیہ کے ارادے کی دیواروں میں بھی روزن پیدا ہو جائیں گے۔ ایسی خوبصورت اور منہ زور لڑکی ان کی زندگی میں پہلی بار داخل ہوئی تھی اور وہ اس کے لیے انتظار کرنے کے لیے تیار تھے۔ شب و روز یوں ہی گزرتے رہے۔ دن ہفتوں میں اور

ہفتے مہینوں میں بدلتے رہے، یہاں تک کہ ایک سال کا عرصہ گزر گیا۔ ملک منصور گاہے گاہے رضیہ کو راضی کرنے کی غرض سے حویلی میں آتے رہتے تھے۔ اس کو دنیا کی ہر نعمت مہیا تھی۔ بہترین خوراک، قیمتی لباس، خدمت کے لیے نوکر چاکر۔ وہ شہزادیوں کی طرح زندگی گزار رہی تھی لیکن اس کی زندگی غم والم اور مایوسی کا مجموعہ تھی۔ اس کو باہر کی دنیا کے بارے میں کچھ علم نہ تھا۔ ہاں ایک بار ملک منصور نے اسے یہ ضرور بتایا تھا کہ اس کے ماں باپ نے اب رضیہ کی گمشدگی کے واقعے پر صبر کر لیا ہے اور اس کی زندگی سے مایوس ہو گئے ہیں۔ پھر ایک دن ملک صاحب نے اسے بتایا کہ رضیہ کے محبوب، سلیم کو انھوں نے اعلیٰ تعلیم کے لیے اخراجات ادا کر کے امریکہ بھجوا دیا ہے۔ رضیہ نے یہ سُنا تو ہکا بکا رہ گئی۔ پہلے تو اسے یہی حیرت ہوئی کہ سلیم کے بارے میں ملک منصور کو پتہ کیسے چلا۔ لیکن یہ کام ملک منصور کے جاسوسوں اور سراغ رسانوں کا تھا جو رضیہ کے محلے میں کھوج لگانے کے لیے بھیجے گئے تھے۔ دراصل ملک صاحب رضیہ کی کمزوریوں سے واقفیت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ایک کھوجی عورت بالآخر سلیم اور رضیہ کی محبت کا حال جاننے میں کامیاب ہو گئی جسے ان دونوں نے سارے زمانے سے چھپا کر رکھا تھا۔ ملک منصور نے سلیم کے معمولی وسائل رکھنے والے والدین پر اپنی انسان دوستی اور خیر خواہی کا رعب جمایا اور پھر ان کے بیٹے کے شاندار مستقبل کی خاطر اسے اپنے خرچ پر امریکہ بھجوا دیا۔ قصبے بھر میں ملک منصور کی فیاضی کا چرچا ہو گیا یہاں تک کہ اخباروں میں بھی ان کے اس کارِ خیر کی خبریں شائع ہو گئیں لیکن یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس انسان دوستی کے پردے میں ملک صاحب کون سا مقصد حاصل کرنا چاہتے تھے۔ سلیم کے بارے میں رضیہ کو بتانے کے بعد ملک صاحب نے اسے ایک بار پھر یاد دلایا کہ اس کے پاس اس کے سوا کوئی اور چارہ نہیں ہے کہ وہ اس کی پیشکش کو قبول کر لے اور مثالی عیش و آرام کی زندگی بسر کرے۔ سلیم کی روانگی کی خبر نے رضیہ کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ نہ جانے کیوں وہ اس آس پر بیٹھی تھی کہ ایک نہ ایک دن سلیم کو اس کے بارے میں حالات کا علم ہو جائے گا اور وہ اسے ملک منصور کی قید سے آزاد کرانے کے لیے پہنچ جائے گا لیکن وہ تو ملک منصور کا زیرِ بارِ احسان ہو کر چار سال کے لیے ملک سے باہر چلا گیا تھا۔ وقتی طور پر رضیہ کی رہی سہی آس بھی ٹوٹ گئی۔ پھر ایک دن جب وہ حویلی کے پائیں باغ میں ٹہل رہی تھی تو چوہدری کے آدمیوں نے ملک منصور کی غیر موجودگی میں حویلی پر ہلّہ بول دیا اور رضیہ کو گاڑی میں ڈال کر لے آئے۔ اس طرح میری اس سے ملاقات ہو گئی۔

رضیہ کی داستان خاصی دلچسپ اور حیرت انگیز تھی اور میں تو توقع بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ملک منصور کی بیوی کے روپ میں میری ملاقات ایک مظلوم اور ستائی ہوئی لڑکی سے ہوئی ہے۔ رضیہ نے غالباً حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ اور اسے کافی حد تک صبر بھی آ گیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو تقدیر کے حوالے کر کے راضی برضا ہو گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بڑے سکون اور ٹھہراؤ کے ساتھ مجھے یہ داستان سنانے کے باوجود ایک بار بھی جذبات کی رَو میں نہیں بہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی اور کی کہانی سُنا رہی ہے۔

میں سوچ رہا تھا کہ ملک منصور اور چوہدری ایک ہی نوع کے لوگ ہیں۔ ایک ہی قسم کے کاروبار اور سرگرمیوں میں ملوث ہیں۔ ایک ہی قسم کی ذہنیت کے مالک ہیں۔ پھر ان کے درمیان کیا وجہ مخالفت و مخاصمت ہو سکتی ہے کہ چوہدری نے ملک منصور کی بیوی کو اغوا کرا لیا اور پھر جب حسنِ اتفاق سے میں منصور ملک کے روپ میں اس کے پاس پہنچا تو اس نے مجھ سے یہ بات چھپانے کی بھی مطلق کوشش نہیں کی بلکہ نہایت کشادہ دلی سے مجھے میری بیگم کے پاس بھیج دیا۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں کے مابین کوئی دشمنی یا اختلاف ضرور تھا جس نے دو موذیوں کو ایک دوسرے کے مقابل کھڑا کر دیا تھا لیکن سوال یہ تھا کہ اب ملک منصور بن کر چوہدری کے ساتھ کیا رویّہ اختیار کروں؟ اور اس کے ساتھ معاملات کیوں کر طے کروں؟ پھر یہ بھی قابلِ غور بات تھی کہ بیوی کے اغوا پر ملک منصور جیسا بااختیار اور طاقت ور

شخص ہرگز خاموش نہیں بیٹھے گا۔ یہ اس کی توہین اور بے غیرتی کا سب سے بڑا ثبوت تھا اور اس قسم کے جرائم کی سرپرستی کرنے والے لوگ اگر یوں دوسرے کی برتری قبول کر لیں تو وہ اپنے کاروبار میں نہیں رہ سکتے۔ بلکہ ان کی زندگی دشوار اور دوبھر ہو جاتی ہے۔ ملک منصور کا اگلا قدم کیا ہو گا اور جب چوہدری کو پتہ چلا کہ میں اصلی ملک منصور نہیں ہوں تو وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟

"تم کیا سوچنے لگے؟" رضیہ کی آواز نے مجھے خیالوں کی دُنیا سے نکال کر حقیقت کی بستی میں پہنچا دیا۔

"سوچ رہا ہوں کہ خدا نے بیٹھے بٹھائے ایک خوبصورت بیوی کا شوہر بنا دیا ہے۔ میں اس کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں؟" میں نے مسکرا کر اس کو دیکھا۔ میری نگاہوں میں ناچتی ہوئی شرارت نے اسے چوکنا کر دیا: "دیکھو رضیہ۔ یہ لوگ ہمیں شوہر اور بیوی سمجھتے ہیں اور ہمیں ان کے اس خیال کی تصدیق کرنی چاہیے ورنہ یہ جگہ ہم دونوں کے لیے قبرستان بن جائے گی اور یہاں سے نکل بھاگنے کا امکان ایک فیصد بھی نہیں رہے گا۔"

"تو پھر؟" وہ دونوں ہاتھوں پر ٹھوڑی ٹکا کر بولی۔

"تو پھر یہ کہ ہمیں میاں بیوی کی مکمل ایکٹنگ کرنی ہو گی۔" یہ کہہ کر میں صوفے سے اُٹھ کھڑا ہوا اور اس کی طرف بڑھا۔ وہ ایک دم کھڑی ہو گئی اور تنبیہ کے انداز میں بولی۔

"دیکھو! اگر تم نے میری مجبوری سے ذرا بھی فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی تو بہت نقصان اُٹھاؤ گے۔ میں کوئی معمولی لڑکی نہیں ہوں۔ ملک منصور جیسا آدمی بھی مجھ پر قابو پانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔"

میں نے سوچا کہ آئندہ تو خدا جانے کیا پیش آنے والا ہے لیکن فی الحال ضروری ہے کہ سب سے پہلے رضیہ کے ساتھ کوئی انڈرسٹینڈنگ پیدا کی جائے اور اس کی صرف ایک ہی صورت تھی جس پر میں نے عمل پیرا ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کی تادیب کے باوجود میں بے پروائی سے اس کی طرف بڑھتا رہا۔ وہ خوف زدہ ہرنی کی طرح پیچھے ہٹنے لگی۔ یہاں تک کہ بالکل دیوار سے جا لگی۔ جب میرے اور اس کے درمیان صرف تین فٹ کا فاصلہ رہ گیا اور میری پیش قدمی بدستور جاری رہی تو وہ یکدم تن کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے بدن میں چستی کی ایک لہر سی دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس کی خوفزدہ نگاہوں میں یکایک چمک پیدا ہو گئی اور وہ اپنے قدموں پر مضبوطی سے جم کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے چہرے پر مصمم ارادہ کی تحریر میں واضح طور پر پڑھ سکتا تھا۔

"دیکھو۔ وہیں رُک جاؤ" اس نے تحکمانہ اور مضبوط آواز میں ڈانٹا۔ "اس کے بعد ایک قدم بھی آگے نہ بڑھانا"

"ورنہ کیا ہو گا۔" میں نے بے پروائی سے سوال کیا اور ایک قدم مزید آگے بڑھ گیا۔

یکایک یوں لگا جیسے میری نگاہوں کے سامنے بجلی سی کوندگئی۔ وہ اچانک انتہائی تیزی سے حرکت میں آئی اور اس کے دونوں ہاتھ میری گردن کے دونوں جانب آہنی سلاخوں کی طرح ٹکرائے۔ کچھ دیر پہلے جن ملائم ہاتھوں کو میں نے اپنے ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔ یہ ہاتھ ان سے بالکل مختلف تھا۔ مجھے سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر اس نے جمپ لگائی۔ اور اس کے دونوں پیر پوری قوت کے ساتھ میرے سینے سے ٹکرائے۔ یہ دونوں حملے اچانک اور بے خبری میں ہوئے تھے جن سے مدافعت کے لیے میں مطلق تیار نہ تھا۔ میں لڑکھڑا کر فرش پر بچھے ہوئے قالین پر گر گیا۔ اس کی نس نس میں جیسے بجلی بھر گئی تھی۔ وہ ایک بار پھر اپنی جگہ سے اُچھلی اور اگر میں تیزی سے پلٹ کر اپنی جگہ سے ہٹ نہ جاتا تو اس کے دونوں پیر میرے پیٹ سے ٹکراتے۔ اگرچہ اس کا وار خالی گیا تھا لیکن اس نے ایک لمحہ کی تاخیر کے بغیر پھر حرکت کی اور اس کی دائیں ٹانگ پوری طاقت کے ساتھ میرے چہرے کی طرف بڑھی۔ اگر میں تیزی سے جھک نہ گیا ہوتا تو شاید میرا جبڑا ٹوٹ جاتا۔ اس کا پیر میرے کاندھے میں لگا اور میں اس کی قوت اور مہارت کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ ایک نرم و نازک اور دلکش عورت کا یہ پَل پَل میں بدلتا ہوا روپ میرے لیے انتہائی حیران کن

تھا۔ اس نے دوسری لات چلائی اور اس کی بائیں ٹانگ میری کنپٹی کی طرف بڑھی لیکن اب میں بھی تیار تھا۔ میں نے ذرا سا پیچھے ہٹ کر اس کا پیر دونوں ہاتھوں میں تھام کر جھٹکا دیا اور وہ سنبھلنے کی کوشش کرنے کے باوجود میرے اوپر آگری۔ لیکن وہ ایک آفت کی پرکالہ تھی۔ اس سے پہلے کہ میں اسے اپنے بازوؤں میں جکڑتا وہ لوٹ مار کر فرش پر دُور پھسلتی چلی گئی اور دوسرے ہی لمحے میں نے اسے ایک بار پھر قدموں پر کھڑے ہوئے پایا۔ فرش پر پڑے رہنا میرے لیے کسی طرح بھی سودمند نہیں ہو سکتا تھا اس لیے میں بھی اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اب ہم دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ ہماری نظریں ملی ہوئی تھیں اور ہمارے جسم کا ایک ریشہ مقابلہ آرائی کے لیے تیار تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اتنی جسمانی مشقت کے باوجود اس کی سانس بے ترتیب نہیں ہوئی تھی۔ اس کے جسم میں ایک ٹھہراؤ سا تھا البتہ اس کے بالوں کی لٹیں بکھر کر چہرے پر جھومنے لگیں تھیں اور اس عالم میں وہ اور بھی زیادہ حسین نظر آ رہی تھی۔ ایک عورت ہونے کے ناطے میں نے اس پر حملہ کرنا مناسب نہ سمجھا اور اس کے اگلے حملے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ میری نگاہوں میں نگاہیں ڈالے کھڑی گھورتی رہی اور پھر اچانک ہوا میں اُچھلی۔ میرا خیال تھا کہ وہ میرے سینے پر ٹکّر لگائے گی مگر اس نے پیروں کو ہوا میں حرکت دینے کے بعد اچانک خود کو روک لیا اور اس کا بایاں بازو بڑی تیزی سے میرے چہرے کی طرف آیا۔ میں نے سر پیچھے کر کے اس کا وار خالی دیا۔ وہ جھونک کھا کر آگے کو جھکی تو میں نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ دوسرے ہاتھ سے میں نے اس کے بائیں بازو کو جکڑ لیا۔ اب وہ قریب قریب بے بس ہو کر رہ گئی تھی لیکن اس کا جسم سانپ کی طرح بَل کھا رہا تھا۔ اس کا گھٹنا اُوپر کی جانب آیا اور اس کی بھرپور ضرب میرے پیٹ پر لگی لیکن اب میں پوری طرح ہوشیار اور مدافعت کے لیے تیار تھا۔ اپنے پیٹ کے عضلات کو بروقت لوہے کی طرح مضبوط کرنے کی وجہ سے میں اس چوٹ کو بڑی آسانی سے سہہ گیا۔ وہ مچلتی اور زور لگاتی رہی لیکن میری گرفت مضبوط تھی۔ چند لمحے میں اس کی سانس پھُول گئی اور چہرے پر پسینے کے قطرے نمودار ہونے لگے۔ میں بڑے سکون اور اطمینان سے اس کی جدّوجہد کا تماشا دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں اس کی پھُرتی، چُستی اور ہمّتِ مردانہ کی داد دے رہا تھا۔ مسلسل زور آزمائی کی وجہ سے اس کی زلفیں بکھر کر اس کے چہرے کے ساتھ ساتھ میرے چہرے پر بھی بکھر گئی تھیں لیکن اس کی کوئی پیش نہیں چل رہی تھی۔ یہاں تک کہ اسے اپنی لاچاری کا احساس ہو گیا اور اس کی کشمکش کم پڑنے لگی۔ "چھوڑ دو مجھے" وہ زیرِ لب دانت پیس کر بولی: "میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔"

"بڑے شوق سے۔" میں نے مسکرا کر اسے مزید غصّہ دلایا: "بشرطیکہ میری جان لینے کے لیے تمہارے ہاتھ آزاد ہو جائیں۔" اتنا کہہ کر میں نے پھونک مار کر اس کی زلف کی ایک لٹ کو اپنے منہ سے ہٹا دیا۔ وہ کسمسا کر رہ گئی لیکن بے بس تھی۔

یکایک دروازے پر دستک ہوئی اور ہم دونوں اپنی جگہ بالکل ساکت رہ گئے۔ "کون ہے؟" میں نے بلند آواز میں پوچھا۔

"میں ہوں ملک صاحب۔ صغراں" میں نے رضیہ کو اپنی گرفت سے آزاد کر دیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے علیحدہ ہوتی دروازہ کھُلا اور صغراں نمودار ہوئی۔ ہم دونوں پر نظر پڑی تو وہ ٹھٹک کر رہ گئی۔ رضیہ کے بکھرے ہوئے بال اور بے ترتیب سانسیں، تپتا ہوا چہرہ اور میرے چہرے پر کشمکش کی وجہ سے سُرخی کی جھلک دیکھ کر غالباً اس نے کوئی اور نتیجہ اخذ کیا اور زیرِ لب مسکرا کر بولی: "وہ جی۔ میاں جی آپ کو چائے پینے کے لیے بُلا رہے ہیں۔"

رضیہ اس اثنا میں اپنے بکھرے ہوئے بالوں کو سنبھالتی ہوئی بیڈ پر بیٹھ گئی تھی اور صغراں کی معنی خیز مسکراہٹ نے اس کے غصّے میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ "تمہیں معلوم ہے کہ میں اس وقت چائے نہیں پیتی۔" وہ تڑخ کر بولی۔

"اجی میں آپ کو بلانے تو نہیں آئی۔ میں تو ملک جی کو بُلانے آئی ہوں۔" اتنا کہا اور صغراں تیزی سے پلٹ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ مگر میں صاف اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ اپنی ہنسی روکنے کی کوشش میں باہر گئی ہے۔ میں نے ایک لمبی سانس لی اور رضیہ کی جانب دیکھا جو غصّے میں پیچ و تاب کھا رہی تھی: "اچھا۔ باقی لڑائی میری واپسی تک ملتوی۔

میں چوہدری صاحب کے ساتھ چائے پی کر آتا ہوں۔"

کمرے سے باہر نکل کر میں نے گیلری میں وہی راستہ اختیار کیا جس سے میں آیا تھا لیکن میں نے آتے ہوئے اس بات پر دھیان نہیں دیا تھا کہ گیلری میں کچھ فاصلے کے بعد دو مختلف راستے تھے اور مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ میں کس راستے سے آیا تھا۔ دونوں گیلریاں دیکھنے میں یکساں تھیں۔ اپنی یاد داشت پر بھروسہ کرتے ہوئے میں نے بائیں گیلری کا رُخ کیا۔ چند قدم چلنے کے بعد سامنے ایک لکڑی کا زینہ تھا۔ جس وقت میں رضیہ کے کمرے میں پہنچایا گیا تھا اس وقت یہ زینہ مجھے نظر نہیں آیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں نے غلط راستہ اختیار کیا تھا۔ چنانچہ میں نے پلٹ کر دوبارہ اسی گیلری کا رُخ کیا جس سے گزر کر میں آیا تھا۔ یکایک بائیں جانب کمرے کا دروازہ کھُلا اور خوشبو کا ایک جھونکا تمام گیلری کو مہکا گیا۔ قریباً خوشبو کے ساتھ ہی ایک ہیولا سا برق رفتاری کے ساتھ نمودار ہوا اور اس سے پہلے کہ میں سنبھلتا مجھ سے ٹکرا گیا۔ میرے سامنے شیریں کھڑی تھی۔ وہ سیاہ جینز اور سُرخ قمیص میں ملبوس تھی اور اس نے اپنے بالوں میں ہیئر بینڈ لگا کر انھیں پیچھے کی جانب سمیٹ لیا تھا۔ اس کے چہرے پر ہلکا سا میک اپ تھا اور آنکھوں میں غالباً کاجل کی سیاہی۔ اس وقت وہ بالکل مختلف شخصیت نظر آ رہی تھی، کم از کم اس کا یہ روپ پہلی ملاقات کے مقابلے میں بالکل مختلف تھا۔ اس وقت اس پر مجھے ایک مرد کا شبہ گزرا تھا۔

"سوری۔" اس کی بھاری لیکن دلآویز آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ "مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ ٹکرانے کے لیے میرے کمرے کے سامنے کھڑی ہیں۔"

"سوری تو مجھے کہنا چاہیئے۔" میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "مجھے بھی معلوم نہیں تھا کہ آپ مجھے ٹکّر مارنے کے لیے میری ہی منتظر تھیں۔"

وہ ہنس پڑی اور اس کے سفید دانتوں کی لڑی نمایاں ہو گئی۔ وہ ایک قد آور اور دلکش لڑکی تھی اور اس لباس میں اس کی رعنائی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔ "مل لیے اپنی بیگم سے؟" اس نے قدرے طنزیہ انداز میں پوچھا: "اسی لیے اتنے خوش نظر آ رہے ہیں۔"

"ظاہر ہے۔" میں نے مختصر جواب دیا۔ "اور اب آپ سے بھی مل لیا۔ دوسری ملاقات میں آپ پہلے سے زیادہ خوبصورت لگ رہی ہیں۔" اس کے لیے یہ فقرہ خلافِ توقع تھا۔ اس لیے کچھ جھینپ سی گئی۔

"کہاں جا رہے ہیں اتنی جلدی میں۔" وہ بات بدل کر بولی۔

"آپ کے ڈیڈ نے چائے پینے کے لیے یاد کیا ہے۔ مگر میں راستہ بھول گیا۔"

"راستہ نہ بھولتے تو مجھ سے کیسے ٹکراتے۔" اس کی خود اعتمادی اور شوخی واپس آنے لگی تھی۔

"خدا جانے اس ٹکّر کا نقصان کسے ہو گا؟" میں نے معصوم چہرہ بنا کر کہا۔

وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی میں ایک بے ساختگی تھی اور بھرپور زندگی کا اظہار تھا۔ وہ جب ہنستی تھی تو محض اس کی آنکھیں ہی نہیں پورا چہرہ ہنستا اور دمکتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

"آیئے۔ میں آپ کو ڈیڈ کے پاس گول کمرے میں لے چلتی ہوں۔ اگر دوبارہ راستہ بھولنے کا ڈر ہو تو میری اُنگلی پکڑ لیجیے۔" اس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا اور میں نے غیر ارادی طور پر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کو خود بھی اس بات کا گمان نہ تھا اس لیے اس نے اپنا ہاتھ فوراً واپس کھینچ لیا: "کیوں؟ انگلی نہیں پکڑائیں گی؟" میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

"بعض لوگ انگلی پکڑنے کے بعد پہنچا بھی پکڑ لیتے ہیں۔" وہ ہنسی۔

"آپ کو اس پر کوئی اعتراض ہے؟" میں نے پوچھا۔ ایک لمحے کے لیے وہ سٹپٹا سی گئی: "چلیے۔ ڈیڈ چائے پر

انتظار کر رہے ہوں گے۔" اس نے بات کو ٹالنے کے لیے کہا اور میرے آگے چل دی۔ "میرے پیچھے پیچھے چلے آئیں تو راستہ نہیں بھولیں گے۔" اس کی چال میں دلکشی تھی۔ شاید اس لیے کہ اس وقت وہ فل بوٹ کی بجائے ایک نازک سی زنانہ سینڈل پہنے ہوئے تھی اور یہ حقیقت ہے کہ سینڈل کی وجہ سے عورتوں کی چال میں ایک تمکنت اور خوبصورتی پیدا ہو جاتی ہے۔

میں اس کے نقشِ قدم پر چلتا ہوا گول کمرے میں پہنچ گیا۔ یہ کمرہ گول بالکل نہیں تھا لیکن ایک زمانے میں ڈرائنگ روم کو گول کمرہ کہنے کا رواج بہت عام تھا اور چوہدری صاحب ایک ماڈرن بیٹی کے باپ ہونے کے باوجود پرانے زمانے کے آدمی تھے۔ یہ کمرہ بیش قیمت اور خوبصورت قالینوں سے آراستہ تھا۔ یہ قالین اتنے دبیز تھے کہ ان پر چلتے ہوئے پیر دھنس جاتے تھے۔ یہ اتنا وسیع و عریض کمرہ تھا کہ اس میں نہایت آسانی سے بیڈ منٹن کا میچ کھیلا جا سکتا تھا۔ دیواروں پر بیش قیمت مصوری کے شاہکار لگے ہوئے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ چوہدری صاحب کو ان کی اہمیت یا قدر و قیمت کا بالکل احساس نہیں ہوگا۔ وہ صرف ان کی اونچی قیمتوں سے متاثر ہو کر ان پینٹنگز کو خرید لائے ہوں گے۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر مخملیں پردے پڑے ہوئے تھے اور اسے انتہائی آرام دہ اور دیدہ زیب فرنیچر سے سجایا گیا تھا۔ کمرے میں نقش و نگار والی چوبی میزیں رکھی ہوئی تھیں جو یقیناً چوہدری صاحب کسی قدیمی نوادر کی دکان سے خرید کر لائے ہوں گے۔ چھت پر دلآویز اور قیمتی فانوس لٹکے ہوئے تھے جو غیر ملکی درآمدہ مال نظر آ رہے تھے۔ غرض یہ کہ چوہدری صاحب کا گول کمرہ ایک دولت مند آدمی کا ڈرائنگ روم کہلانے کا صحیح معنوں میں مستحق تھا۔

"یہ لیجیے ڈیڈ، میں آپ کے ملزم کو پکڑ لائی ہوں۔" شیریں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی نعرہ مارا اور چوہدری صاحب جو کمرے میں تنہا بیٹھے ہوئے تھے چونک کر کھڑے ہو گئے۔ بیٹی کو دیکھا تو ان کا چہرہ مسرت سے دمکنے لگا لیکن مجھ پر نظر پڑی تو سنجیدہ ہو گئے۔ "آؤ آؤ۔ اچھا ہوا تم ملک صاحب کو بھی ساتھ لے آئیں۔"

"ڈیڈ، یہ تو راستہ بھول گئے تھے۔ میں نے انھیں راستہ دکھایا ہے۔" شیریں اِٹھلا کر بولی اور ملک صاحب کے پاس ہی صوفے پر جا کر بیٹھ گئی۔

"میں نے بھی انھیں اسی لیے بُلایا ہے۔ چلو اچھا ہوا کہ آغاز تم نے کر دیا۔ اُمید ہے کہ ملک صاحب بہت جلد راہِ راست پر آ جائیں گے۔" چوہدری صاحب میری طرف کنکھیوں سے دیکھ کر معنی خیز انداز میں گویا ہوئے۔ میں خاموش کھڑا رہا۔ "ملک صاحب تشریف رکھیے نا۔" انھوں نے برابر والے ایک صوفے کی طرف اشارہ کیا اور میں حکم کی تعمیل میں اس پر بیٹھ گیا۔

"ڈیڈ، آپ ان کی خاطر داری کیجیے اور اپنی ضروری باتیں کیجیے۔ میں رائیڈنگ کے لیے جا رہی ہوں۔ اچھا ملک صاحب آپ سے پھر کسی گیلری میں ملاقات ہو گی۔ ٹاٹا۔" وہ ہاتھ ہلاتی ہوئی رخصت ہو گئی۔

چوہدری صاحب چند منٹ خاموش کھڑے اس کو رخصت ہوتے دیکھتے رہے اور پھر ایک طویل آہ بھر کر میری طرف مخاطب ہوئے۔ "مجھے یقین ہے کہ آپ کو اپنی بیگم سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہو گی۔"

"ظاہر ہے۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

وہ بولے: "میں نے آپ کی اجازت کے بغیر ان کی میزبانی کا شرف حاصل کیا ہے امید ہے آپ مجھے معاف کر دیں گے۔"
میں اس شخص کی ڈھٹائی پر حیران تھا۔ ایک شریف آدمی کی بیوی کو اس کے گھر سے جبریہ اغوا کرانے کے بعد وہ کس قدر اطمینان اور سکون سے اس کا تذکرہ کر رہا تھا!

"دیکھیے ملک صاحب۔ مجھے آپ کی بیگم مل گئیں اور میری بیٹی کو آپ، کیا عجیب اتفاق ہے بلکہ اسے تو حسنِ اتفاق کہنا چاہیے۔ اب آپ پہلے یہ بتائیے کہ آپ دونوں کو یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟" وہ سراپا میزبان بن کر پوچھ

رہے تھے۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور مزید کچھ کہنے سے احتراز کیا۔ "لو بیٹے گرم پئیں گے یا ٹھنڈا۔" وہ سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئے۔

"جو بھی مل جائے۔" میں اپنی زبان کھولتے ہوئے بہت محتاط تھے۔ انھوں نے صوفے کے نزدیک قالین پر پڑی ہوئی برقی گھنٹی دبائی اور فوراً ہی ایک ملازمہ نمودار ہو گئی۔ یہ پختہ عمر اور مضبوط جسم کی ایک قبول صورت عورت تھی۔ مجھے یہ ماننا پڑا کہ چوہدری صاحب نے ہر چیز کے انتخاب کے سلسلے میں شکل و صورت کو خاصی اہمیت دی تھی۔ اسے چائے لانے کا حکم دے کر چوہدری صاحب میری طرف متوجہ ہوئے۔ "دیکھیے ملک صاحب میں سیدھا سادا جٹ قسم کا آدمی ہوں۔ بہت لمبی چوڑی اور گھما پھرا کر بات کرنے کا عادی نہیں ہوں اس لیے صاف اور سیدھی بات کرتا ہوں۔ آپ کے بارے میں بہت کچھ سُنا ہے حالانکہ ملاقات پہلی بار ہوئی ہے۔ آپ کو میں نے کئی بار پیغام بھی بھیجے۔ لیکن شاید آپ کی مصروفیات بہت زیادہ تھیں۔ اس لیے میں نے سوچا کہ تھوڑے دن آپ کی میزبانی کا شرف حاصل کیا جائے۔ میرے آدمی آپ کی حویلی پر گئے تھے لیکن آپ موجود نہیں تھے۔ وہ آپ کی بیگم کو مہمانداری کے لیے لے کر آ گئے۔ مجھے اُمید تھی کہ اس بہانے آپ بھی ضرور آئیں گے۔ لیکن یہ خیال نہیں تھا کہ آپ اتنی جلدی اور اس قدر خاموشی سے آ جائیں گے۔ بہرحال، یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ آپ نے بات کو خواہ مخواہ طول دینے کی کوشش نہیں کی ورنہ نقصان آپ ہی کا تھا۔" یہ طولانی تقریر ختم کرنے کے بعد وہ کھنکار کر اپنا گلا صاف کرنے لگے۔ میں نے بولنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ منتظر رہے کہ میں کب لب کھولوں گا۔ لیکن میں اپنے ہونٹ بھینچے ہوئے بیٹھا رہا تو وہ پھر بولے: "مجھے یقین ہے کہ آپ مجھ سے ناراض نہیں ہیں۔ کیوں میرا خیال درست ہے نا؟"

"اگر میری جگہ آپ ہوتے تو کیا کرتے؟" میں نے کھُردرے لہجے میں پوچھا۔

"میری بات چھوڑیے۔" وہ مسکرائے۔ "اس لیے کہ میں کبھی آپ کی جگہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ میں آپ سے سیدھی اور صاف بات کروں گا۔ آپ بھی اسی طرح جواب دیجیے تو معاملہ آسانی سے اور جلدی ختم ہو جائے گا۔"

"جی۔" میں نے انھیں گھورتے ہوئے کہا۔

"آپ جانتے ہیں کہ میں کئی سالوں سے اس علاقے میں کاروبار کر رہا ہوں لیکن آپ نے مجھ سے مشورہ کیے بغیر اپنا دھندہ شروع کر دیا اور غضب یہ کہ میرے علاقے میں بھی پاؤں پھیلانے شروع کر دیے۔ میں نے آپ کو کئی پیغام بھیجے مگر آپ کو شاید ملے نہیں۔ ورنہ رسید تو ضرور دیتے۔"

اس کے لب و لہجے میں پوشیدہ طنز اور حقارت آمیز اندازِ بیان میرے لیے خاصا تکلیف دہ تھا۔ میں نے کہا۔ "شاید قسمت میں آپ کے گھر کا آب و دانہ تھا اس لیے قدرت خود بخود مجھے یہاں لے آئی۔"

"ٹھیک کہا آپ نے۔" وہ سرپرستانہ انداز میں بولے۔ "قدرت کے کام بھی نرالے ہیں۔ خیر تو اب آپ یہ بتلائیے کہ ایک جنگل میں دو شیر اور ایک میان میں دو تلواریں رہ سکتی ہیں کیا؟"

"بالکل نہیں۔"

"تو پھر یہ مسئلہ کیسے حل ہو گا۔ آپ میرے لیے جگہ خالی کریں گے یا میں آپ کے لیے سب کچھ چھوڑ کر پیچھے ہٹ جاؤں؟" اس کے لہجے کی کاٹ اور تُرشی میں صاف محسوس کر سکتا تھا۔

"جیسے آپ مناسب سمجھیں۔" میں نے پُرسکون انداز میں کہا۔ "آپ ویسے بھی میرے بزرگ ہیں۔ عقل اور تجربے میں بھی مجھ سے زیادہ ہیں۔ میں آپ کے آگے بولتا ہوا اچھا لگوں گا؟" میں نے برخوردارانہ لہجے میں کہا۔ وہ مسکرانے لگا۔ شاید اپنی فتح کے خیال سے خوش ہو گئے۔ ہو سکتا ہے میرا ضرورت سے زیادہ مصالحانہ رویہ ان کے لیے خلافِ توقع ہو۔ یہی وجہ ہے کہ وہ یک لخت بے حد خوش اور مطمئن نظر آنے لگے تھے۔

"ذرا آیئے میرے ساتھ۔" وہ اپنے صوفے سے اُٹھتے ہوئے بولے اور ایک گوشے میں رکھی ہوئی چوکور تاشوں کی میز کے پاس پہنچ گئے (اس میز پر سبز رنگ کا کپڑا لگا ہوا تھا اور ایک جانب تاشوں کی گڈیوں کے ساتھ چند کاغذ ایک پلندے کی صورت میں رکھے تھے۔ انھوں نے کاغذ کے پلندے کو کھول کر میز پر بچھا دیا۔ یہ ایک نقشہ تھا کاغذ تھا جس پر چند مقامات کے نام لکھے ہوئے تھے اور بعض ناموں پر سُرخ روشنائی سے نشانات بھی لگے ہوئے تھے۔

"ذرا اس پر ایک نظر ڈالیے۔" انھوں نے ایک پنسل اُٹھا کر نقشے پر رکھ دی: "یہ ہے وہ علاقہ جہاں میں سالہا سال سے اپنے کام میں مصروف ہوں۔ اس بارڈر ایریا کی دیکھ بھال اور یہاں آپریشن پر میں لاکھوں روپیہ خرچ کر چکا ہوں۔ آس پاس کی ساری زمینیں مہنگے داموں خرید چکا ہوں۔ سرحد کے اُس پار اُن پار کے اہلکاروں اور دہ لوگوں کو باقاعدگی سے ماہانے ادا کرتا ہوں۔ کئی بار چند سر پھرے افسروں کی وجہ سے اس علاقے میں مقابلے بھی ہوئے اور میرے کئی آدمی مارے گئے، بہت سے گرفتار ہو کر جیل پہنچ گئے جن کے خاندان والوں کو میں باقاعدگی سے ماہانہ وظیفہ دیتا ہوں۔ اگر اس کے باوجود کوئی اس علاقے میں دخل اندازی کرنے لگے تو آپ خود ہی بتایئے کہ میرے دل پہ کیا گزرتی ہو گی؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میری نظریں ان نقشوں پر جمی ہوئی تھیں جو ملک کے انتہائی حساس اور اہم سرحدی علاقے سے تعلق رکھتے تھے۔ اور بقول چوہدری صاحب کے عرصۂ دراز سے ان کی خلافِ قانون اور ملک دُشمن سرگرمیوں کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ اس عرصے میں خدا جانے ان بے غیرت لوگوں نے وطن کو کس قدر نقصان پہنچایا تھا۔ میرا خون کنپٹیوں میں اکٹھا ہو گیا اور میرا جی چاہا کہ اس بدبخت انسان کا گلا گھونٹ دوں، لیکن مصلحتاً خون کے گھونٹ پی کر خاموش رہا۔

چوہدری صاحب نے پنسل کی نوک سے اُن نشان زدہ حصوں کی طرف اشارہ کیا جن پر نیلی روشنائی سے نشاندہی کی گئی تھی۔ "یہ رہے وہ علاقے جو ابتداء میں آپ نے اپنے کام کے لیے منتخب کیے تھے مگر پھر آپ نے پیر پھیلانے شروع کر دیئے اور میرے علاقے میں دست اندازی شروع کر دی۔ بتایئے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے جناب ملک صاحب؟" چوہدری کی آواز غصے سے بھاری ہو گئی اور وہ مجھے یوں گھور رہا تھا جیسے میرا جواب سُنتے ہی مجھے موت کی سزا سُنا دے گا۔

میں نے بمشکل اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا: "دیکھئے چوہدری صاحب۔ اوّل تو میں اس قسم کی بات چیت کے لیے تیار نہیں تھا۔ دوسرے یہ نقشے پوری طرح میری سمجھ میں بھی نہیں آتے ہیں۔ اس لیے جب تک بغور ان کا مطالعہ نہ کر لوں۔ میں آپ کو بھلا کیا جواب دے سکتا ہوں۔ اس لیے مجھے کچھ مہلت تو ملنی چاہیئے۔"

چوہدری صاحب شاید میری زبان سے کوئی تلخ بات سُننے کے منتظر تھے۔ اس نرم جواب پہ کچھ پسیج گئے اور کہنے لگے: "آپ کا عذر بالکل معقول ہے۔ آپ یہ کاغذات اپنے پاس رکھیے۔ اس مسئلے پر اچھی طرح غور کیجئے اور پھر مجھے جواب دیجئے۔ اس اثنا میں آپ میرے مہمان رہیں گے۔" اس فقرے میں پوشیدہ دھمکی بالکل واضح تھی۔ یعنی جب تک میں ان کے مطالبات تسلیم نہیں کروں گا بمعہ اپنی نقلی بیوی کے ان کا قیدی رہوں گا۔

"شکریہ" میں نے کاغذات سنبھال کر پلندہ بنا لیا۔ اب چوہدری صاحب قدرے پُرسکون اور مطمئن نظر آنے لگے تھے۔ غالباً انہیں مجھ سے ایسے رویئے کی اُمید نہ تھی۔ پہلی بار ان کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ بولے: "تاشوں کی ایک بازی کے متعلق کیا خیال ہے؟"

"اس وقت تو موڈ نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "اور پھر میرے پاس رقم بھی نہیں ہے۔"

"ارے رقم کی فکر نہ کیجیے۔ مجھے آپ پر پورا بھروسہ ہے۔" انہوں نے فراخ دلی سے پیش کش کی۔

"اگر آپ اجازت دیں تو ذرا آس پاس کی سیر کر لوں؟"

"ارے بخوشی ــ آپ کی اپنی جگہ ہے۔ شکار کا شوق ہو تو بندوق منگواؤں؟" وہ میری خاطر داری میں لگے ہوئے تھے۔

"جی بس ویسے ہی گھوموں گا۔"

"بیگم صاحب کے ساتھ؟"

"جی نہیں۔ وہ کچھ تھکی ہوئی ہیں۔ آرام کریں گی ذرا۔"

انہوں نے گھنٹی بجائی دوبارہ ملازمہ کو طلب کیا: "ملک صاحب علاقے کی سیر کو جائیں گے۔ شیرو سے کہو ان کے لیے گھوڑا تیار کرے اور انہیں اگر کسی ساتھی کی ضرورت ہو تو وہ مہیا کر دے۔" یہ کہہ کر انہوں نے دانت نکال کر میری طرف دیکھا اور ہاتھ سے رُخصت ہونے کا اشارہ کیا۔

گول کمرے کے باہر بلند ستونوں والا برآمدہ تھا۔ بلکہ یہ برآمدہ اس وسیع عمارت کے تین اطراف میں پھیلا ہوا تھا۔ سامنے لان اور آس پاس باغات کا سلسلہ تھا۔ میں باہر نکل گیا اور بجری کی سڑک پر پیدل چلتا ہوا گھنے درختوں کے ذخیرے کی جانب چل پڑا۔ یکایک پیچھے سے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ پلٹ کر دیکھا تو ایک انتہائی خوبصورت اور شاندار سفید رنگ کی گھوڑی کو ایک سائیس پکڑے ہوئے تھا۔ میں اس کی جانب بڑھا، لیکن اسی وقت برآمدے میں سے شیریں نمودار ہوئی۔ اس کے ساتھ باز خان تھا۔ شیریں اب گھڑ سواری کے لباس میں تھی اور اس لباس میں اس کی شان ہی الگ تھی۔ اس کے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے اور وہ کسی بات پہ ہنستی ہوئی باہر نکل تھی۔ مجھ پر نظر پڑی تو رُک گئی۔ باز خاں کا ہنستا ہوا چہرہ بھی بالکل سنگین ہو گیا۔ "ارے!" اس نے کہا: "آپ؟ آپ یہاں کیا کر رہے ہیں ملک صاحب؟"

"ذرا سیر کر رہا تھا۔ آپ کے علاقے کی۔ چوہدری صاحب کی اجازت سے۔"

وہ ہنسنے لگی۔ "آپ کو اجازت کی کیا ضرورت ہے؟ اجی آپ تو مہمان ہیں ہمارے۔ ہاں۔ میں آپ سے ضرور اجازت لوں گی۔ میری گھوڑے کی سواری کا ٹائم ہے۔"

"کیوں نہیں۔" میں نے خوش خلقی سے کہا: "بڑے شوق سے۔ میں آپ کے پروگرام اور مشاغل میں حائل نہیں ہونا چاہتا۔"

یہ کہتے ہوئے میں نے باز خاں کی جانب دیکھا۔ جس کا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے عاری تھا۔ میں نے پہلی بار اس کا گہری نگاہوں سے جائزہ لیا۔ وہ ایک بلند قامت اور وجیہہ انسان تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ سُرخ و سفید تھا اور سیاہ نوکدار بھاری مونچھوں کی وجہ سے اس کے چہرے میں مزید جاذبیت اور رُعب پیدا ہو گیا تھا۔ شیریں گھوڑے کی طرف بڑھی تو باز خان نے آگے بڑھ کر اسکی کمر میں بازو ڈال کر اسے نہایت آسانی سے ایک گڑیا کی طرح اُٹھا کر گھوڑے پر بٹھا دیا۔ شیریں نے ہنستے ہوئے ہاتھ میں تھامی ہوئی چھڑی ایک لگاوٹ کے انداز میں اس کے شانے پر ماری اور گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ چشم زدن میں وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ باز خاں خاموش کھڑا اسے جاتے ہوئے ــــ دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کی مُسکراہٹ تھی جو اس بات کی علامت تھی کہ ان دونوں کے درمیان خاصی بے تکلفی اور یگانگت ہے۔ یکایک اس کی نظریں مجھ پر پڑیں تو اس کے چہرے کی نرمی یکسر غائب ہو گئی۔ پتھریلی آنکھوں سے اُس نے مجھے گھورا! اور پھر تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا حویلی کی جانب چلا گیا۔ اتنی دیر میں شیرو ایک چتکبرے گھوڑے کی لگام تھامے ہوئے آ گیا۔

"سلام میاں جی!" اس نے لجاجت بھرے لہجے میں کہا: "میرا نام شیرو ہے جناب۔ چتکبرا آپ کی خدمت میں حاضر

ہے جنابِ عالی۔ یہ ذرا منہ زور گھوڑا ہے سرکار۔ مگر جانور بڑے ٹور کا ہے۔ اگر حکم ہو تو دوسرا گھوڑا لے آؤں؟"

"نہیں نہیں۔ مَیں اسی پر سواری کروں گا۔" مَیں نے گھوڑے کی لگام تھامتے ہوئے اُسے تھپکا اور چھلانگ لگا کر اس پر سوار ہو کر۔ شیرو نے درست کہا تھا۔ میرے سوار ہوتے ہی وہ شریر زور سے ہنہنایا اور دونوں اگلے پیر اُٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے شہسواری کا خاصا تجربہ تھا۔ مَیں نے زور سے لگام کو جھٹکا دیا اور ایڑیوں پر ہلکا سا دباؤ ڈالا۔ اُس نے پھر زور سے آواز نکالی اور یک دم سرپٹ ہو گیا۔ چتکبرے کی شرارت کسی بھی معمولی سوار کی زندگی کو خطرے میں ڈال سکتی تھی۔ کیا یہ گھوڑا بطورِ خاص میری سواری کے لیے منتخب کیا گیا تھا؟ یا محض اتفاقاً شیرو نے مجھے ایسے گھوڑے پر سوار ہونے کا موقعہ دیا تھا؟ لیکن یہ سچ ہے کہ چتکبرے پر سواری ایک پُرلطف تجربہ تھا۔ مَیں اس پر سوار تھا اور خود وہ ہوا کے گھوڑے پر سوار تھا۔ آس پاس کے مناظر کو بھلا مَیں کیا دیکھتا جب کہ اس کی رفتار اتنی تیز تھی کہ پاس سے گزرتی ہوئی ہر شے انتہائی تیزی سے پیچھے کی طرف بھاگتی ہوئی نظر آتی تھی۔ قریباً نصف گھنٹے بعد مَیں نے حویلی کی جانب واپس جانے کا ارادہ کیا تو مجھے پہلی بار یہ احساس ہُوا کہ مَیں راستے سے ناواقف ہوں۔ گھوڑا مجھے لے کر خدا جانے کہاں سے کہاں نکل گیا تھا اور مَیں شہسواری کے لُطف اور سنسنی خیزی میں یہ بھول گیا تھا کہ یہ علاقہ میرے لیے اجنبی ہے اور مجھے حویلی واپس بھی جانا ہے۔ کافی دیر تک مَیں اِدھر اُدھر بھٹکتا رہا۔ یہ علاقہ جنگل درختوں۔ باغات اور بنجر زمین پر مشتمل تھا۔ کاشتکاری کا نام و نشان تک نظر نہیں آتا تھا۔ اس لیے کسی انسان سے ملاقات کا سوال بھی خارج از امکان تھا۔ مجھے تو یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ آیا مَیں حویلی کی جانب سفر کرتا رہا ہوں یا اُس سے مخالف سمت میں جا رہا ہوں، لیکن اتنا مجھے معلوم تھا کہ اس علاقے پر چوہدری صاحب کے آدمیوں کی کڑی نگرانی ہو گی اور اُن کے احاطہ اختیار سے باہر نکلنا کسی طرح بھی ممکن نہ تھا۔ آگے درختوں کے ایک جھنڈ میں ایک پُرانی سی عمارت نظر آئی تو مَیں نے گھوڑا اُس طرف موڑ دیا۔ چتکبرا کافی لمبا سفر طے کر چکا تھا لیکن ابھی تک تازہ دم تھا جو اس کے اصیل اور اعلیٰ نسل ہونے کا سب سے بڑا ثبوت تھا۔ عمارت کے پاس پہنچ کر مَیں گھوڑے سے اُترا اور اُس کی لگام ایک درخت کی شاخ میں اٹکانے کے بعد عمارت کے اندر داخل ہو گیا۔ یہ کسی پُرانی حویلی کی عمارت تھی۔ ابھی کھنڈر تو نہیں بنی تھی، لیکن صاف ظاہر تھا کہ عرصۂ دراز سے غیر آباد ہے۔ کمرے اور برآمدے بالکل خالی اور ویران پڑے تھے۔ عجیب سنسان اور اُجاڑ جگہ تھی۔ خدا جانے یہاں کتنے عرصے سے کسی نے [illegible] نہیں رکھا تھا۔ مَیں عمارت کے پچھلے حصّے کی جانب نکلا تو کچھ فاصلے پر ایک چھوٹا سا کچا مکان نظر آیا۔ میری چھٹی حِس نے مجھے بتایا کہ اس گھر میں یقیناً کوئی رہتا ہے۔

مکان کا دروازہ اندر سے بند تھا جس سے میرے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ مَیں نے دروازے میں لٹکی ہوئی زنجیر سے دستک دی تو چند لمحے بعد اندر سے قدموں کی آواز سنائی دی اور پھر ایک زنانہ آواز نے سوال کیا۔

"کون ہے ــــ؟"

"مَیں ایک مسافر ہوں۔ راستہ بھول گیا ہوں۔"

دروازہ کھُلا تو میرے سامنے ایک ادھیڑ عمر کی سُرخ و سفید رنگ کی عورت کھڑی تھی۔ وہ دیہاتی وضع کے لباس میں تھی۔ سر پر موٹی سیاہ رنگ کی چادر تھی۔ اس نے گہری نظروں سے مجھے دیکھا اور پھر جیسے مطمئن ہو کر بولی۔ "آؤ۔ اندر آ جاؤ۔"

اندر ایک مختصر صحن سا تھا جس میں ایک چارپائی پڑی ہوئی تھی۔ "بیٹھو"۔ اس نے کہا اور مَیں چارپائی پر بیٹھ گیا۔ "بھوکے ہو گے۔ کچھ کھانے کو لاؤں؟"

"نہیں مَیں تھوڑی دیر پہلے حویلی سے ناشتہ کر کے نکلا تھا۔"

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ "حویلی سے آئے ہو؟ مہمان ہو؟"
میں نے سر ہلا کر اقرار کیا۔
"کس کے مہمان ہو؟" اُس نے کھُردری آواز میں پوچھا۔ پھر آپ ہی آپ جواب بھی دے دیا: "ضرور شیریں کے مہمان ہو گے۔"
"یہ آپ نے کیسے جان لیا؟"
"تم جیسے خوبصورت جوان اسی کے مہمان ہوتے ہیں۔" وہ تلخ لہجے میں بولی۔
"اور خوبصورت عورتوں کی مہمان داری چوہدری خود کرتا ہے۔ دونوں باپ بیٹی حسن پرست ہیں۔" وہ سامنے بچھے ہوئے ایک سٹول پر بیٹھ گئی۔
"کیا تم بھی چوہدری کے کارندے ہو؟" اس نے سوال کیا۔
"ارے نہیں۔ میری تو ان سے پہلی ملاقات ہے۔"
"اللہ تم پر رحم کرے۔" وہ سپاٹ آواز میں بولی۔ "پانی لسی لے کر آؤں؟"
"جی نہیں شکریہ۔" میں نے کہا۔ پھر آس پاس کا جائزہ لے کر پوچھا: "آپ اس ویرانے میں اکیلی رہتی ہیں؟"
"نہیں میرا بیٹا بھی میرے ساتھ رہتا ہے۔"
"کہاں ہے وہ۔" میں نے پوچھا۔ "کیا کرتا ہے؟"
"اس علاقے میں چوہدری کی چاکری کے سوا کوئی اور کیا کر سکتا ہے؟ اس کی اجازت اور حکم کے بغیر تو یہاں پتہ بھی نہیں ہلتا۔ میرا بیٹا بھی اس کا غلام ہے۔ نوکری اور چھوکری کے لالچ نے اُسے اندھا کر دیا ہے۔ میرا کام تو سمجھانا تھا سو سمجھا دیا۔ آگے اس کی مرضی اور نصیب۔ کوئی کیا کر سکتا ہے؟ اس کے لہجے اور آواز کی تلخی چھپی نہ رہ سکی تھی۔
"تم ملے ہو میرے بیٹے سے؟" اُس نے یکایک پوچھا۔
"کون ہے آپ کا بیٹا؟ کیا نام ہے اس کا؟"
"باز خان۔ تم نے ضرور دیکھا ہو گا۔ بڑا سجیلا جوان ہے۔ اپنے باپ کی طرح جی دار بھی ہے۔ پر اس کا باپ اتنا لالچی اور بے غیرت نہیں تھا۔ اللہ جانے یہ کس پہ چلا گیا۔" اُس نے ناپسندیدگی سے مُنہ بنا کر کہا: "اس کا کوئی قصور بھی نہیں ہے۔ یہاں تو جو آتا ہے دیوانہ ہو جاتا ہے۔ کسی کو پیسے کی جھنکار لُبھا لیتی ہے اور کسی کو شیریں کی مہکار۔ اللہ بچائے اس سے تو۔" اس نے اپنے دونوں کانوں کو ہاتھ لگائے۔ پھر مجھے بغور ۔۔۔ دیکھ کر بولی: "تم بھی بانکے سجیلے جوان ہو۔ ذرا بچ کر رہنا اس زہریلی ناگن سے۔" پھر آپ ہی آپ بولی: "مگر بچو گے کیسے؟ اس سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ بس اللہ ہی وارث ہے تمہارا بھی۔" وہ واقعی مجھ پر ترس کھانے لگی تھی۔
"سُنیے۔ آپ مجھے حویلی واپس جانے کا راستہ بتا سکیں گی؟"
"مگر تمہیں راستہ کیسے بتاؤں؟ یہاں سڑکیں اور گلیاں تو ہیں نہیں۔ درختوں کی نشانیوں کو تم کیسے پہچانو گے؟"
واقعی اس کی بات درست تھی۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ پھر پوچھا۔ "باز خان یہاں کب آئے گا؟"
وہ طنزیہ انداز میں ہنسی: "جب جی چاہتا ہے آ جاتا ہے مگر اس کا جی زیادہ نہیں چاہتا۔ دو چار دن میں پھیرا لگا لیتا ہے۔ کیا تم پیدل آئے ہو؟"
"نہیں۔ چنکبرے گھوڑے پر۔۔۔۔"
"ارے تو پھر پریشانی کس بات کی ہے۔" وہ میری بات کاٹ کر کہنے لگی: "چتکبرے کی لگام ڈھیلی چھوڑ دو۔ وہ

تمہیں آپ ہی حویلی واپس لے جائے گا۔"
ترکیب واقعی اچھی تھی۔ تعجب ہے کہ یہ میرے ذہن میں کیوں نہ آ سکی۔ چتکبرا جس قسم کا گھوڑا تھا اس سے یہ توقع بالکل حق بجانب تھی کہ وہ مجھے از خود واپس حویلی پہنچا دے گا۔ میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا: "آپ کی بہت مہربانی اب مجھے اجازت دیجیے۔ حویلی سے نکلے ہوئے مجھے بہت دیر ہو چکی ہے۔ وہ لوگ منتظر ہوں گے۔" باز خاں کی ماں سے رخصت ہو کر میں باہر آیا اور چتکبرے کے پاس پہنچا تو وہ جیسے میرا ہی منتظر تھا۔ میں نے پیار سے اس کی گردن تھپکی اور کہا: "دیکھو بیٹے، میں راستہ بھول گیا ہوں۔ اب مجھے حویلی تک پہنچانا تمہارا کام ہے۔"
جواب میں وہ ہنہنایا اور میرے سوار ہوتے ہی ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ میں نے بھی اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا۔ شاید میں بھٹک کر کافی دُور نکل گیا تھا کیونکہ واپسی کا سفر طے کرتے ہوئے مجھے قریب ایک گھنٹہ لگ گیا۔ مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ اس طویل سفر کے دوران میں میری ملاقات باز خاں کی ماں کے سوا کسی اور سے نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ مجھے کوئی ذی روح نظر ہی نہیں آیا تھا۔ اس سے دو باتیں واضح تھیں۔ ایک تو یہ کہ اس علاقے میں چوہدری نے کاشت وغیرہ کا جھنجھٹ ہی نہیں پالا تھا تاکہ اسے اپنے غیر قانونی سرگرمیوں کے لیے آزاد ماحول میسر آ جائے اور دوسرے یہ کہ وہ اپنے حفاظتی انتظامات کے بارے میں پوری طرح پُر اعتماد اور مطمئن تھا۔ اسی لیے اس نے مجھے کھُلی چھُوٹ دے رکھی تھی یا شاید اسے یہ گمان تھا کہ اپنی بیوی کو یرغمال کے طور پر اس کی تحویل میں چھوڑ کر میں فرار ہونے کی حماقت نہیں کروں گا۔ میں راستے بھر خیالوں میں کھویا رہا۔ چوہدری کی دھمکی قابلِ غور تھی۔ اگرچہ وہ میرے لیے نہیں بلکہ اصلی ملک منصور کے لیے تھی لیکن فی الحال تو میں ہی اس کے لیے ملک منصور تھا۔ پھر یہ بات بھی انتہائی پریشان کُن تھی کہ بیوی کے اغوا پر ملک منصور کا ردِ عمل کیا ہو گا؟ ظاہر ہے وہ اس توہین اور بے غیرتی کو برداشت نہیں کرے گا اور اگر اس نے کسی بھی طرح چوہدری سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی تو میرا بھید یوں کھُل جائے گا۔ ایسی صورت میں میرا کیا انجام ہو گا۔
پھر میرا دھیان باز خاں کی ماں کی طرف چلا گیا۔ وہ ایک صاف گو عورت تھی جس نے لگی لپٹی رکھے بغیر میرے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کر دیا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ نہ چوہدری کو پسند کرتی نہ اس کی بیٹی شیریں کو۔ دونوں کے طرزِ عمل اور عادات و اطوار سے اسے شکایت تھی۔ چوہدری اور شیریں کے بارے میں اس نے اگرچہ بہت محتاط الفاظ میں اظہارِ خیال کیا تھا، لیکن ان دونوں کا کردار مجھ پر بالکل واضح اور عیاں ہو گیا تھا۔ اسے اپنے بیٹے باز خاں سے بھی شکایت تھی جو اس کے بیان کے مطابق شیریں کے حُسن و جمال کے جال میں پھنس چکا تھا اور چوہدری کا آلۂ کار بن گیا تھا۔ خود چوہدری کے کردار کے بارے میں اس نے رائے ظاہر کی تھی وہ اگرچہ غیر متوقع نہیں تھی، کیونکہ چوہدری جیسے لوگوں سے اس پست کرداری کے سوا اور کسی چیز کی اُمید رکھنا بے کار ہے، لیکن مجھے یہ احساس ہونے لگا تھا کہ ملک منصور کی بیوی رضیہ چوہدری کی حویلی میں محفوظ و مامون نہیں ہے۔
چتکبرا مجھے لے کر حویلی پہنچا تو شام ہونے لگی تھی۔ میرے پہنچتے ہی شیرو کہیں سے نمودار ہو کر گھوڑے کی لگامیں تھامنے کے لیے تیار نظر آیا۔ اُس نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا نہ کوئی بات کی۔ میں پسینے میں شرابور گھوڑے سے اُترا تو دیکھا کہ چتکبرا بھی پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بہت اعلیٰ نسل کا تربیت یافتہ گھوڑا تھا اور کسی معمولی سوار کے قابو میں آنے والا گھوڑا نہیں تھا۔ گھوڑے سے اُتر کر میں نے برآمدے کا رُخ کیا۔ ایک ملازم نے بڑا چوبی دروازہ کھول دیا اور مؤدب ہو کر مجھے سلام کیا۔ اندر پھر گیلریوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور میں ان بھُول بھُلیوں میں ایک بار پھر گُم ہو گیا۔ چند راہداریوں سے گزرنے کے بعد مجھے اپنے گم کردہ راہ ہونے کا احساس ہوا۔ میں نے رُک کر اپنی یادداشت کے بل پر صحیح سمت جاننے کی کوشش کی، لیکن یقینی طور پر کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکا۔ یکایک بائیں جانب

ایک دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک ملازمہ دو تین بڑے سائز کے سفید تولیے لیے ہوئے باہر نکلی۔ مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹک کر رہ گئی مگر پھر جب میرا حلیہ دیکھا تو بڑے ادب سے پوچھنے لگی "میاں جی۔ آپ نہانا پسند کریں گے؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا "غسل خانے میں نہائیں گے یا نہانے کے تالاب میں؟" اس نے سوال کیا۔

میں حیران ہو کر اس کا چہرہ تکنے لگا۔ نہانے کے تالاب سے اس کی کیا مراد ہو سکتی ہے؟ "کیا یہاں کوئی سوئمنگ پول بھی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جی۔ آیئے میرے ساتھ" وہ راہبری کے لیے مجھ سے چند قدم آگے چل پڑی۔ دو تین گیلریوں اور چند چھوٹے بڑے قدیم انداز سے سجے ہوئے کمروں سے گزر کر میں ایک پائیں باغ یا صحن نما جگہ پر پہنچ گیا۔ آگے قدم بڑھایا تو سامنے ایک انتہائی کشادہ اور خوبصورت سوئمنگ پول نظر آیا۔ اس کا پانی صاف شفاف اور نیلا تھا۔ سوئمنگ پول کے ارد گرد لان تھا جس میں آرام دہ کرسیوں کے ساتھ ساتھ نہانے کے بعد آرام کرنے والی طویل کرسیاں بھی موجود تھیں۔

ملازمہ نے رک کر مجھے دیکھا اور پوچھنے لگی "آپ کے پاس نہانے کے کپڑے ہیں جی؟"

"میں ابھی گھوڑے کی سواری کر کے سیدھا آ رہا ہوں۔ نہانے کا لباس کہاں سے لا سکتا ہوں؟" میں نے بدمزاجی سے کہا۔

"ٹھہریئے۔ میں آپ کے لیے بندوبست کرتی ہوں" وہ پھرتی سے ایک جانب جا کر غائب ہو گئی۔

میں اس دور دراز دیہاتی علاقے میں ایک انتہائی دلکش اور خوبصورت سوئمنگ پول کی موجودگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا جو ہر قسم کی جدید آسائشوں سے مزین تھا۔ اس پر شہر کے کئی فائیو سٹار ہوٹل کے سوئمنگ پول کا گمان گزرتا تھا فرق صرف یہ تھا کہ اس سوئمنگ پول میں فرنگی حسیناؤں کی تیراکی کا منظر نہیں تھا۔ میں آس پاس کے خوش منظر ماحول اور فضا کا جائزہ لیتے ہوئے سوئمنگ پول کی طرف بڑھا تو میں نے پانی میں حرکت سی محسوس کی۔ یوں لگا جیسے کوئی سوئمنگ پول میں موجود تھا۔ چند لمحے بعد مجھے پول کی گہرائی سے ایک ہیولا تیزی سے سطح کی طرف آتا ہوا نظر آیا۔ اس سے پہلے کہ میں اسے پوری طرح دیکھ سکتا اچانک میرے عقب میں آہٹ سی ہوئی۔ پلٹ کر دیکھا، مگر مجھے کچھ دیکھنے کا موقعہ ہی نہیں ملا۔ ایک زوردار گھونسہ میرے چہرے پر لگا اور میں چکرا کر رہ گیا۔ میرا منہ گھوم کر سوئمنگ پول کی مخالف سمت میں ہو گیا، لیکن میں حملہ آور کو دیکھنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ وہ ایک قوی ہیکل مرد تھا جو خاکی وردی نما لباس پہنے ہوئے تھا۔ میرے پلٹنے سے پہلے ایک بھاری بھرکم ضرب میری گدی پر لگی اور مجھے دن میں تارے نظر آنے لگے۔ میں اوندھے منہ زمین پر گر گیا۔ حملہ آور نے کود کر مجھ پر حملہ کیا، لیکن میں اس اثنا میں اپنے ہوش و حواس سنبھالنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ لان پر کروٹ لے کر میں دوسری طرف کھسک گیا اور ایک زوردار دھاکے سے زمین سے ٹکرایا۔ میرے لیے اتنی مہلت کافی تھی۔ میں اپنے پیروں پر اچھل کر کھڑا ہو چکا تھا اور اپنے حریف کے زمین سے اٹھنے کا منتظر تھا۔ وہ جیسے ہی کھڑا ہوا میرا بھرپور گھونسہ اس کے جبڑے پر لگا۔ یہ ضرب اس قدر شدید تھی کہ میرا ہاتھ جھن جھنا کر رہ گیا۔ اس نے اچھل کر سینے میں لات مارنے کی کوشش کی، لیکن میں برق کی رفتار سے ایک جانب جھک گیا اور وہ نہایت تیزی کے ساتھ ہوا میں تیرتا ہوا سوئمنگ پول کی طرف جا کر زور کی آواز کے ساتھ پانی میں جا گرا۔ وہ دونوں پیروں کے بل پانی میں گرا تھا اور تیزی سے سوئمنگ پول کی گہرائی میں ڈوبتا چلا گیا۔ میں نے اطمینان کی سانس لی مگر اطمینان کا یہ لمحہ نہایت مختصر تھا۔ اس بار دو اور خاکی وردی والے عقب سے مجھ پر ٹوٹ پڑے تھے اور میری عدم توجہ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میری پٹائی کرنے میں مصروف تھے۔ اُن میں سے ایک نے اپنی کمر میں بندھی ہوئی پیٹی میں لگا ہوا پستول نکال کر مجھ پر فائر کر دیا۔ میں نے اس سے بچنے کے لیے ایک جانب چھلانگ لگائی مگر اس طرف سوئمنگ پول تھا۔ نتیجہ یہ کہ میں ایک چھپاکے سے سوئمنگ پول میں جا کر گر گیا جہاں میرا پہلا حریف اتنی دیر میں سوئمنگ

پول کی تہہ سے باہر آ گیا تھا اور میرا منتظر تھا۔ ابھی میں پوری طرح سنبھلا بھی نہیں تھا کہ اس نے مجھ پر تابڑ توڑ حملے شروع کر دیئے۔ اُدھر پول کے باہر کھڑے ہوئے دشمن نے ایک اور فائر داغ دیا۔ گولی ہم دونوں کے نزدیک ہی پانی میں لگی اور غائب ہو گئی۔ اس سے پہلے کہ حالات مزید بگڑتے ایک مانوس آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ "رک جاؤ۔ فائر بند کر دو۔ یہ کیا کر رہے ہو تم لوگ؟"

اس آواز کے ساتھ ہی تمام سرگرمیاں یک لخت بند ہو گئیں۔ میں نے آواز کی سمت دیکھا تو آنکھوں میں بجلی سی کوند گئی۔ شیریں ایک جدید تراش کے سوئمنگ کاسٹیوم میں ملبوس اس طرح سوئمنگ پول میں کھڑی تھی کہ اس کا نصف دھڑ پانی سے باہر تھا۔ اس کے بھیگے ہوئے بالوں سے پانی کے قطرے ٹپک کر چہرے اور آنکھوں پر بہہ رہے تھے اور وہ بار بار ہاتھ سے پانی کو صاف کر رہی تھی۔ وہ مجھ سے زیادہ سے زیادہ دو گز کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ میں ممبد ہونقوں کی طرح حیران ہو کر اسے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ وہ اچانک سوئمنگ پول میں جل پری کی مانند کیسے نمودار ہو گئی؟ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ہیولا جو میں نے پانی کی تہہ سے سطح کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا تھا وہ شیریں ہی تھی۔

"ارے؟" مجھے دیکھ کر اور پہچان کر وہ متعجب ہو کر بولی۔ "تم یہاں کیسے پہنچے؟"

"ان لوگوں نے مجھے پانی میں پھینک دیا" میں شکایت آمیز لہجے میں بولا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے" اس نے میرے سامنے کھڑے ہوئے قوی ہیکل آدمی کو ڈانٹا۔ "جانتے نہیں ہو یہ ہمارے مہمان ہیں؟"

"معافی چاہتا ہوں بی بی جی۔ میں سمجھا کوئی آوارہ آدمی ہے"

میں ہنس پڑا اور خود شیریں بھی قہقہہ لگائے بغیر نہ رہ سکی "سٹوپڈ۔ کوئی آوارہ آدمی سوئمنگ پول پر کیسے پہنچ سکتا ہے۔ معافی مانگو ان سے اور دفع ہو جاؤ"

"معافی چاہتا ہوں سر" وہ گھگھیا کر بولا "مجھے معلوم نہیں کہ آپ مہمان ہیں"

"مجھے بھی معلوم نہیں تھا کہ یہاں مہمانوں کے ساتھ ایسا سلوک کیا جاتا ہے" میں نے شیریں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"مہمانوں کو بھی خدا کا خوف کرنا چاہیے۔ اگر سوئمنگ کرنی تھی تو کسی نوکر سے کہا ہوتا!" اُس نے مجھے سرزنش کی۔

"جان کی امان پاؤں تو عرض کروں کہ یہاں تک مجھے ایک نوکرانی ہی لے کر آئی تھی۔"

"کون سی نوکرانی" اس نے چاروں طرف دیکھا "کہاں ہے وہ؟"

"وہ میرے لیے نہانے کا لباس تلاش کرنے گئی ہے"

"اچھا اچھا" وہ سر ہلا کر بولی "لالی ہو گی۔ پر وہ غائب کہاں ہو گئی تم کو اس مصیبت میں پھنسا کر؟"

اتنی دیر میں لالی واپس آ گئی تھی اور چاروں طرف متلاشی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ صاف ظاہر ہے کہ اسے میری تلاش تھی کیونکہ اس کے ہاتھ میں ایک مردانہ ٹرنک تھا جو وہ کہیں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر میرے لیے لائی تھی۔

"میں یہاں ہوں لالی" میں نے پکار کر کہا تو وہ حیران ہو کر مجھے اور شیریں کو دیکھنے لگی "شکریہ اب مجھے نہانے کے لباس کی ضرورت نہیں ہے"

"تمہیں شاید معلوم نہیں۔ یہ پورا لباس پہن کر ہی سوئمنگ کرتے ہیں" شیریں نے ہنستے ہوئے کہا۔ لالی کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ وہ حیران نظروں سے کبھی مجھے اور کبھی شیریں کو دیکھ رہی تھی۔ شیریں مجھ سے مخاطب ہوئی "ابھی سوئمنگ کریں گے یا لباس تبدیل کریں گے؟"

"شکریہ" میں نے جواب دیا "آج کے لیے یہی بہت ہے۔ باقی پھر کبھی سہی" یہ کہہ کر میں نے پول کے کنارے

کی طرف تیرنا شروع کر دیا۔ اس اثناء میں تینوں خاکی پوش جو دراصل محافظ تھے۔ نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔ شیریں بھی آہستہ آہستہ تیرتی ہوئی کنارے پر پہنچ گئی جہاں لالی ایک بڑا تولیہ پھیلائے اُس کی منتظر تھی۔

"اے میاں صاحب جی!" لالی نے مجھے پکارا۔ "ذرا دوسری طرف مُنہ کر لیں۔ بی بی جی پانی سے باہر آ رہی ہیں۔"
اس کی سادگی پر میں بے ساختہ ہنس پڑا اور خود شیریں بھی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس دیہاتی عورت کو یہ پتہ نہیں تھا کہ جو لڑکی مغربی سوئمنگ کاسٹیوم پہن کر کھلے عام — تیراکی کر سکتی ہے۔ بھلا اسے پردہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ بہر حال۔ میں نے دوسری طرف مُنہ موڑ لیا اور سوئمنگ پول سے باہر نکل کر ایک لمبی کرسی پر لیٹ گیا۔ میں پانی میں بالکل شرابور تھا۔ لیکن ٹھنڈے اور تازہ پانی میں غوطے کھانے کی وجہ سے چستی اور تازگی محسوس کر رہا تھا۔
شیریں بڑا سا تولیہ جسم کے گرد لپیٹتی ہوئے میرے پاس آ گئی۔ لالی نے ایک چھوٹا تولیہ اسکی طرف بڑھایا جس کی مدد سے وہ اپنے بال خشک کرنے لگی۔

"لالی۔" شیریں لالی سے مخاطب ہوئی۔ "میاں صاحب جی کو بھی ایک تولیہ لا دو۔"
لالی کے ہاتھ میں ابھی ایک بڑا تولیہ لٹکا ہوا تھا۔ اُس نے میری طرف سے مُنہ موڑ لیا تولیہ میری جانب بڑھا دیا۔ "لیں جی۔" اس کی یہ ادا بھی خاصی دلچسپ تھی۔

"اتنی شرما کیوں رہی ہو۔" شیریں نے اُسے ڈانٹا۔ "وہ تو پورے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔" لالی نے ایک بار مُنہ پھیر کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں حیا کی لکیر اُبھری اور وہ جسم چُرا کر تیزی سے عمارت کی طرف چلی گئی۔
"مائنڈ نہ کرنا۔" شیریں بولی۔ "یہ بیوقوف اور دیہاتی لڑکی ہے۔"
"مائنڈ کرنے کی کیا بات ہے۔" میں نے کہا۔ "عورتوں کو ایسا ہی شرمیلا ہونا چاہیئے۔"
"آپ کا مطلب ہے کہ میں بے شرم ہوں؟!" شیریں نے مصنوعی غصے سے پوچھا۔ وہ تولیے سے بھیگے بالوں کو جھٹک رہی تھی۔
"تمہارے بارے میں تو میں نے کچھ نہیں کہا۔" میں نے معذرت پیش کی۔ "دراصل عورتیں دو ہی قسم کی ہوتی ہیں اور دونوں ہی اپنی اپنی جگہ اچھی ہوتی ہیں۔"
"تمہیں کیسی عورتیں اچھی لگتی ہیں؟" اس نے شرارت سے پوچھا۔ "مجھ جیسی یا لالی جیسی؟!"
میں سوچ میں پڑ گیا، مگر میری یہ مشکل بازخان کی آمد نے آسان کر دی۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا ہمارے نزدیک آ کر کھڑا ہو گیا اور ناراضی سے مجھے گھورنے لگا۔
"لیجئے۔ ایک اور نمونہ آ گیا۔" میں اسکی برہمی کو نظر انداز کرتے ہوئے شیریں سے مخاطب ہوا۔ "تم نے بھی ہر طرح کے جمع کر رکھے ہیں۔"

بازخان

غضبناک نگاہوں سے گھورتا ہوا میری طرف بڑھا۔ یوں لگا جیسے وہ مجھ پر حملہ کر دے گا۔ اس کی مٹھیاں بند تھیں اور چہرے پر نفرت اور حقارت کے آثار تھے۔ میں اپنی جگہ مقابلہ کرنے کے لیے بالکل تیار ہو گیا۔ "بازخان۔" شیریں نے نرم آواز میں اُسے مخاطب کیا اور بازخاں کے اُٹھے ہوئے قدم وہیں جم کر رہ گئے۔ اس نے خونخوار نظروں سے مجھے دیکھا اور پھر شیریں پر نظر ڈالی۔ شیریں نے تادیبی انداز میں آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے سرزنش کی اور وہ اپنے سر کو زور سے جھٹک کر بھاری قدموں کے ساتھ واپس چلا گیا۔ شیریں خاموشی سے اس کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "ملک تم مائنڈ نہ کرنا۔ یہ ذرا جنگلی ہے۔"
"ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ جنگلی جانوروں کو بھی سدھا لیا جاتا ہے۔" میں نے سرد مہری سے جواب دیا۔ "حیرت ہے تم نے ابھی تک اسے انسان بنانے کی کوشش نہیں کی۔ کم از کم اس کو مہمانوں کے ساتھ بات کرنے کا طریقہ تو بتا دینا

چاہیے۔"
وہ ہنس پڑی۔ کہنے لگی۔ "تم تو واقعی ناراض ہو گئے۔ چلو غصہ تھوک دو۔ تھوڑی سی سوئمنگ کر لو۔ دماغ ٹھنڈا ہو جائے گا۔"
"سوری۔" میں نے معذرت کی۔ "میرا لباس بھیگ گیا ہے۔ میں ذرا کپڑے تبدیل کروں گا۔" یہ کہہ کر میں نے گیلری کا رُخ کیا۔ شیریں نے منہ بنا کر مجھے دیکھا۔ ظاہر ہے میری یہ بات اُسے پسند نہیں آئی تھی۔ ویسے بھی وہ اپنی بات منوانے کی عادی معلوم ہوتی تھی۔ گیلری سے باہر مجھے لالی نظر آ گئی جو تولیے ہاتھ میں لٹکائے سوئمنگ پول کی جانب جا رہی تھی۔ "سنو لالی۔" میں نے اُسے روک لیا۔ "مجھے ذرا میرے کمرے تک پہنچا دو۔ ورنہ میں پھر راستہ بھول جاؤں گا۔"
لالی نے سوالیہ نگاہوں سے شیریں کی طرف دیکھا جو پانی میں ایک غوطہ لگانے کے بعد باہر نکلی تھی اور واقعی جل پری لگ رہی تھی۔ "ٹھیک ہے۔ تم ان کے ساتھ جاؤ لالی۔ تولیے یہاں کرسی پر رکھ دو۔ ذرا دیکھو۔ ان کی انگلی تھام لینا۔ ورنہ یہ کہیں راستے میں ہی گُم نہ ہو جائیں۔" اس کے طنزیہ لہجے سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اسے میرا یوں اس کی دعوت کو ٹھکرا کر چلا جانا بہت ناگوار گزرا تھا۔
لالی نے تولیے کرسی پر رکھ دیئے اور خاموشی سے میرے آگے آگے چل پڑی۔ گیلریوں میں قدرے اندھیرا تھا۔ کیونکہ رات نہیں ہوئی تھی اس لیے روشنیاں بھی نہیں جلائی گئی تھیں۔ میں اس کے نقشِ قدم پر چلا جا رہا تھا اور وہ تیزی سے مختلف گیلریوں، راہداریوں اور کمروں سے گزرتی ہوئی یوں جا رہی تھی جیسے یہ راستہ اسے زبانی یاد ہے۔ حالانکہ مجھے یقین ہے کہ دو چار دن قیام کے بعد بھی میں ان بھول بھلیوں سے نہیں نکل سکتا تھا۔
"آپ نے بہت دیر لگا دی میاں جی۔" لالی چلتے چلتے مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "بیگم صاحبہ کھانے پر آپ کا انتظار کر رہی تھیں۔"
"کون بیگم صاحبہ؟" میرے منہ سے نکلا۔ لیکن پھر مجھے رضیہ کا خیال آیا جو فی الحال میری بیگم کا پارٹ پلے کر رہی تھی۔ "اچھا اچھا۔ رضیہ کی بات کر رہی ہو؟" میں نے بات بنائی۔ "ٹھیک ہے۔ انھیں میرے بغیر کھانا کھانے کی عادت ہے۔"
آخر کار ہم اُس علاقے میں پہنچ گئے جہاں میرا کمرہ تھا۔ دروازے پر پہنچ کر لالی رُک گئی۔ "یہ رہا آپ کا کمرہ۔"
میں نے غور سے کمرے کو دیکھا۔ بظاہر یہاں ہر کمرے کا دروازہ ایک ہی جیسا تھا اور ان پر نمبر وغیرہ بھی درج نہیں تھے۔ اس لیے تصدیق کرنے کے لیے میں نے دروازے پر دستک دی۔
"کون ہے؟" اندر سے رضیہ کی سہمی ہوئی آواز آئی۔
"میں ہوں ملک منصور۔" میں نے بلند آواز میں کہا۔ دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔ شاید وہ بڑی بے تابی سے میری منتظر تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر کچھ کہنے ہی والی تھی کہ لالی کو سامنے موجود پا کر رُک گئی۔
"شکریہ لالی۔" میں نے کمرے کے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔
"مجھے تنہا چھوڑ کر تم کہاں چلے گئے تھے؟ اور اتنی دیر کیوں لگا دی؟" وہ شکایت آمیز غصے سے بولی۔
"آرام سے بات کرو۔ تم نہ میری سچ مچ کی بیوی ہو اور نہ میں تمہارا اصلی شوہر ہوں۔ اس لیے جواب طلبی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
"مگر مجھے بتایا تو ہوتا۔ یہ جگہ۔ یہ لوگ۔ یہ سب چیزیں مجھے پاگل کر دیں گی۔ پاگل کر دیں گی۔" وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر ہسٹریائی انداز میں چیخی۔
میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ "کیا ہوا؟ کسی نے کچھ کہا ہے تم سے؟"

جواب میں اس نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھا مگر منہ سے کچھ نہیں بولی۔ میں نے تشویش سے اس کو دیکھا۔ یقیناً کوئی ناگوار واقعہ پیش آیا تھا جبھی وہ اس قدر پریشان اور غمگین تھی۔

"بات کیا ہے آخر؟" میں نے ہمدردی سے پوچھا تو وہ باقاعدہ آنسوؤں سے رونے لگی۔

"میں یہاں نہیں رہوں گی۔ میں یہاں نہیں رہنا چاہتی۔ ایک منٹ کے لیے بھی۔ مجھے... مجھے یہاں سے باہر لے چلو۔"

"رضیہ تم جانتی ہو کہ یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ ہم ان کے قبضے میں ہیں اور وہ کیا چاہتے ہیں یہ کم از کم میں تو نہیں جانتا۔ اگر جانتا بھی ہوتا تو اس سلسلے میں بے بس ہوں اس لیے کہ تمہارے اصلی شوہر ہی اُن کے مطالبات منظور کر سکتے ہیں۔" پھر میں اس کے برابر صوفے پر بیٹھ گیا اور ہمدردانہ لہجہ میں پوچھا: "مگر ہوا کیا ہے جو تم اس قدر پریشان ہو؟"

"کیا نہیں ہوا؟" وہ روتے ہوئے بولی۔ "انھوں نے میری توہین کی ہے۔ اس سے تو اچھا تھا کہ میں مرجاتی۔ آخر وہ مجھے سمجھتے کیا ہیں؟"

"کون؟!" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"وہی چوہدری اور اس کے چمچے۔ ایک عورت میرے پاس آئی تھی۔ یہ بتانے کہ چوہدری صاحب کو میں بہت پسند آگئی ہوں اور اگر میں منصور کو چھوڑ کر انھیں قبول کر لوں تو وہ مجھے دنیا کی سب سے خوش نصیب عورت بنا دیں گے۔"

"پھر تم نے کیا کہا؟"

"میں نے اسے ڈانٹ دیا۔ گالیاں دے کر بھگا دیا۔ اس کی یہ جرأت کیسے ہوئی؟!"

"چلو۔ تو حساب برابر ہو گیا۔ پھر پریشان ہونے اور رونے کی کیا ضرورت ہے؟"

"وہ مجھے دھمکی دے کر گئی ہے۔" اس نے آنسو پونچھتے ہوئے خوف زدہ لہجے میں کہا۔ "وہ مجھے صاف الفاظ میں بتا گئی ہے کہ چوہدری صاحب جو چاہتے ہیں حاصل کر لیتے ہیں۔ اس پورے علاقے پر ان کی حکمرانی ہے۔"

"دیکھو بھئی۔ مجھے تم سے پوری ہمدردی ہے اور جو کچھ میرے بس میں ہوگا میں تمہارے لیے کروں گا۔ لیکن تم جانتی ہو کہ میں خود بے بس اور لاچار ہوں اور ان کی قید میں ہوں۔ وہ مجھے ملک منصور سمجھ رہے ہیں اور جب تک وہ اس غلط فہمی میں مبتلا رہیں گے اس وقت تک تم اور میں دونوں کافی حد تک محفوظ رہیں گے۔ اسی لیے میں نے تم سے کہا تھا کہ جب تک یہ راز نہ کھلے ہمارے حق میں بہتر ہے۔ میں اس اثنا میں کوئی ترکیب سوچوں گا۔"

"ترکیب کیا سوچو گے؟" وہ جھنجلا کر بولی۔ "جانتے بھی ہو کہ آس پاس ہر طرف ان کی حکومت ہے۔ ہر طرف چوکی پہرہ ہے۔ چوکیدار، محافظ اور کتے ہر وقت گھومتے رہتے ہیں۔ ان کی مرضی کے خلاف تو شاید یہاں کوئی سانس بھی نہیں لے سکتا۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "لیکن یاد رکھو کہ قدرت نے ہر مشکل حل کرنے کا کوئی ذریعہ اور کوئی طریقہ بھی بنایا ہے۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔ وہ ضرور ہماری مدد کرے گا۔" یہ کہہ کر میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

وہ سمٹ کر پیچھے ہٹ گئی اور شعلہ بار نگاہوں سے مجھے دیکھ کر بولی: "خبردار میرے نزدیک آنے کی کوشش نہ کرنا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ ان ہمدردی کے بولوں سے تم مجھے بہلا کر کوئی فائدہ اٹھا لوگے؟"

"کم از کم ایک بیوی کے لیے شوہر سے ایسا برتاؤ مناسب نہیں ہے رضو۔" میں نے اسے چھیڑنے کو کہا۔

ابھی وہ غصے میں کچھ کہنے ہی والی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ "کون ہے؟" میں نے بلند آواز میں دریافت کیا۔

"باز خان!"

ہم دونوں چونکنا ہو گئے۔ ایک لمحہ خاموشی رہی اور پھر میں نے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے باز خان حسبِ معمول غیض و غضب کا مجسمہ بنا کھڑا تھا۔ یہ شخص غالباً ہنسی مذاق اور خوش اخلاقی سے بالکل محروم ہی تھا۔

"چلو۔ تمہیں چوہدری صاحب یاد کرتے ہیں۔" اس نے کرخت اور تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"سوری" میں نے شائستگی سے جواب دیا۔ "ان سے کہنا انھوں نے مجھے بہت بے وقت یاد کیا ہے۔ میں تھکا ہوا ہوں اور آرام کرنا چاہتا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد اگر وہ مناسب سمجھیں تو اجازت لے کر میرے پاس خود ہی آ جائیں۔"

اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ "کیا؟ تم چوہدری صاحب کا حکم ماننے سے انکار کرو گے؟" وہ دھاڑا۔

"کروں گا نہیں۔ کر رہا ہوں۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "اور اپنی حیثیت مت بھولو۔ آئندہ مجھے تم نہیں آپ کہہ کر مخاطب کیا کرو۔"

"ورنہ کیا کرو گے؟" اس نے دانت پیس کر پوچھا۔

"یہ تمہیں وقت آنے پر خود ہی پتہ چل جائے گا۔"

"تو پھر تم اسی وقت بتا دو مجھے۔ میں تمہیں "تم" ہی کہوں گا۔ بلکہ "تُو" کہوں گا اور میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔" وہ غصے میں تیزی سے بڑھ کر میرے نزدیک آگیا۔

"کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا؟" میں نے نرمی سے دریافت کیا۔

"آج تک باز خان کا کچھ بگاڑنے والا پیدا نہیں ہوا۔" اس نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔

"تو پھر آج وہ پیدا ہو گیا ہے۔" میں نے نرمی سے جواب دیا اور ایک بھرپور گھونسہ اس کی ٹھوڑی پر رسید کر دیا۔ گھونسہ پوری قوت سے اس کی ٹھوڑی پر لگا اور وہ الٹ کر پیچھے جا گرا اور اپنا سر جھٹکنے لگا۔ شاید اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا تھا اور جبڑا اپنی جگہ سے ہل گیا تھا۔

"دیکھو باز خان،" میں نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔ "ابھی تو میں نے صرف تمہارا چہرہ بگاڑا ہے اس کے بعد میں اور بھی بہت کچھ بگاڑ سکتا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں ہاتھ جھاڑتا ہوا مڑ کر رضیہ کی طرف متوجہ ہوا جو پریشانی سے صوفے پر سہمی بیٹھی تھی۔ مگر میں نے باز خان کے بارے میں غلط اندازہ لگایا تھا۔ بھرپور ضرب کے باوجود وہ دوسرے ہی لمحے ربڑ کی گیند کی طرح اچھل کر اپنے دونوں پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا اور وہ مجھے کھا جانے والے انداز میں گھور رہا تھا۔ اس کے ٹیڑھے جبڑے نے اس کے چہرے کو اور زیادہ بدنما اور خوفناک بنا دیا تھا۔ وہ آگے بڑھا اور اس نے بائیں ہاتھ سے ایک گھونسہ اپنے جبڑے پر رسید کیا۔ ایک کڑاکے کی آواز آئی اور اس کا جبڑا اپنی جگہ پر واپس آگیا۔ "دیکھا تم نے؟" وہ گرج کر بولا۔ "تم نے میرا یہی کچھ بگاڑا تھا نا؟ اب تم اپنی خیر مناؤ اور دیکھو کہ میں تمہارا کیا کچھ بگاڑتا ہوں۔" اتنا کہہ کر وہ رضیہ سے مخاطب ہوا: "بیگم صاحبہ! اگر آپ کمزور دل کی عورت ہیں تو ذرا باہر چلی جائیں۔ میں آج آپ کے شوہر کو مزہ چکھا کر ہی جاؤں گا۔"

رضیہ نے اپنی جگہ کوئی حرکت نہیں کی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ بذاتِ خود جوڈو کراٹے سے واقف ہے اور اس قسم کے جھگڑے کسی گھریلو لڑکی کو تو متاثر کر سکتے ہیں رضیہ جیسی عورت پر ان کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔

"جیسی آپ کی مرضی۔" وہ نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا میری جانب بڑھا۔ میں نے اس کی نظروں میں نظریں ڈال دیں۔ وہ بھی پوری طرح محتاط تھا۔ یکایک اس نے بائیں جانب جھکائی دی اور انتہائی تیزی سے دائیں جانب سے مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ یہ ایک پرانی ترکیب ہے جس کا میں کئی بار سامنا کر چکا تھا۔ اس لیے اس سے نمٹنے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ اس کا جسم مجھ سے ٹکرانے کی بجائے اپنی جھونک میں آگے چلا گیا اور وہ پورے زور شور سے اوندھے منہ فرش پر جا گرا۔ لیکن پلٹ کر اس نے کروٹ بدلی اور چشم زدن میں وہ میری ٹانگوں میں تھا۔ ایک زوردار جھٹکے سے اس نے میری بائیں ٹانگ پر ضرب لگائی اور میں نے تکلیف سے ٹانگ اوپر اٹھا لی۔ اس کی دوسری کھڑے ہاتھ کی

ضرب میری دوسری پنڈلی پر لگی اور میں فرش پر گر گیا۔ وہ سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا مجھ سے لپٹ گیا اور ہم دونوں آپس میں گتھم گتھا ہو گئے۔ وہ ایک انتہائی طاقت ور اور پھرتیلا آدمی تھا۔ اس کی دونوں ہاتھوں کی ضربوں نے میری گردن اور کنپٹیوں کو اپنی زد میں لے لیا اور پھر اس کے دونوں ہاتھ میری گردن کی طرف بڑھے۔ میں نے دونوں ہاتھ کو آپس میں ملا کر پوری قوت سے پھیلایا اور اس کے دونوں ہاتھ علیحدہ کر دیئے۔ میرے ہاتھ کی ضرب اس کی پیشانی پر اور پھر ناک پر پڑی اور اس کی ناک سے خون جاری ہو گیا۔ اس کے باوجود وہ مجھے چھوڑنے پر تیار نہ تھا۔ اس نے اپنے بازو میری کمر کے گرد لپیٹ کر مجھے پٹخنے کی کوشش کی مگر اس سے پہلے میں اس کی گرفت سے مچھلی کی طرح پھسل کر نکل گیا تھا اور اب اپنے پیروں پر کھڑا ہو چکا تھا۔ اس کے زمین سے اٹھ کر کھڑے ہونے سے پہلے میری ٹھوکر اس کے چہرے پر لگی اور وہ الٹ کر پیچھے کی جانب گر گیا۔ میں نے اسے سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر پے در پے چند اور ٹھوکریں لگائیں اور وہ تکلیف سے کراہتا ہوا تیزی سے پیچھے کی طرف کھسکتا ہوا دیوار تک پہنچ گیا مگر وہ انتہائی پھرتیلا شخص تھا۔ کوئی وقت ضائع کئے بغیر وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا اور خون آلود نظروں سے گھورتا ہوا میری طرف بڑھا۔ لیکن اس بار بھی میں نے اسے حملہ کرنے کا کوئی موقع نہیں دیا۔ چند تابڑ توڑ گھونسوں کے بعد میں نے ایک بھرپور گھونسہ پوری قوت سے اس کے چہرے پر رسید کیا اور وہ لڑکھڑاتا ہوا کمرے کے دروازے سے باہر گیلری میں جا گرا۔ اس کی ناک سے بہتے ہوئے خون کو اس نے اپنی آستین سے پونچھا اور اس کا ہاتھ تیزی سے اس کی پیٹی کی طرف بڑھا۔ اس نے برق رفتاری سے اپنی کمر میں لٹکا ہوا پستول نکالا اور فوراً ہی مجھ پر فائر داغ دیا۔ اگر میری چھٹی حس نے مجھے آگاہ نہ کر دیا ہوتا تو گولی یقیناً مجھے لگتی۔ میں صوفے پر گرا اور فوراً ہی اچھل کر صوفے کے پیچھے پہنچ گیا۔ اس کی دوسری گولی صوفے پر اس جگہ لگی جہاں کچھ دیر پہلے میں گرا تھا۔ دونوں فائر خالی جاتے ہوئے دیکھ کر وہ فرش سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور نہایت محتاط انداز میں پستول تھامے ہوئے دوبارہ کمرے کے دروازے کی طرف قدم بڑھانے لگا۔ نشانہ لیے بغیر اس نے پے در پے دو فائر اور کر دیئے لیکن میں صوفے کے پیچھے محفوظ تھا۔ اس نے بلند آواز میں مجھے للکارا اور تیسرے فائر کے لیے پستول اونچا کیا لیکن اسی وقت ایک ضرب نے پستول اس کے ہاتھ سے گرا دیا۔ اس نے غصے اور حیرت سے پلٹ کر دیکھا۔ میں بھی صوفے کے پیچھے سے جھانک رہا تھا۔ شیریں اس کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ ابھی تک پیراکی کے لباس میں تھی اور اس کے بال بھی پوری طرح خشک نہیں ہوئے تھے۔ وہ دونوں ہاتھ اپنی کمر پر رکھ کر کھڑی ہو گئی اور غصہ بھری نظروں سے بازخاں کو دیکھ کر بولی۔ "بازخاں یہ تم کیا کر رہے ہو اور کس کی اجازت سے کر رہے ہو؟"

"اس نے چوہدری صاحب کی شان میں گستاخی کی ہے اور مجھ پر ہاتھ اٹھایا ہے۔ میں اسے سبق سکھائے بغیر نہیں رہوں گا۔" وہ برہمی سے بولا۔

شیریں نے ایک ہی نگاہ میں اس کے خون آلود چہرے اور بگڑے ہوئے حلیہ کا جائزہ لیا اور تادیبی لہجے میں بولی۔ "سزا دینے کا اختیار ڈیڈ کو ہے تمہیں نہیں۔ تم ان کی اجازت کے بغیر کسی کو سزا دینے کے مختار نہیں ہو اور مجھے تو یہ نظر آ رہا ہے کہ سبق سکھانے کی بجائے تم نے خود ہی سبق سیکھ لیا ہے۔"

بازخاں غصے سے بل کھا کر رہ گیا۔ "آپ میرے راستے میں نہ آئیں" وہ غرّایا "میں آج اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"یہ فیصلہ کرنا بھی تمہارا کام نہیں ہے۔" وہ نرمی سے بولی۔ "لیکن اگر اس کے باوجود تم اپنا انتقام لینا چاہتے ہو تو پستول کے بغیر مقابلہ کر دیا پھر دوسرا پستول اپنے دشمن کو بھی دے دو۔" اس نے جھک کر فرش پر سے پستول اٹھا لیا۔ "ویسے بھی تم اب تک کافی گولیاں ضائع کر چکے ہو۔ میرے خیال میں تمہیں پستول کے بغیر ہی کام چلانا چاہیے۔" اس نے بھولپن سے بازخاں پر طنز کیا۔

بازخاں ایک زخمی درندے کی طرح بل کھا کر رہ گیا۔ اس نے غضب ناک نظروں سے مجھے اور پھر شیریں کو دیکھا اور تیزی سے پلٹ کر تیز تیز قدموں سے رخصت ہو گیا۔ شیریں نے پستول کو کھول کر گھمایا اور یہ دیکھا کہ اس میں کتنی گولیاں باقی ہیں۔ پھر وہ مسکرائی اور کہنے لگی۔ "ملک منصور۔ تمہارے بارے میں بہت سی باتیں سُنی تھیں۔ آج پتہ چلا کہ وہ غلط نہیں تھیں۔ تم واقعی جی دار اور ہمت والے آدمی ہو۔" وہ بڑی دلآویز مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف بڑھی مگر پھر اس کی نگاہ رضیہ پر پڑی جو اس تمام ہنگامے کے دوران میں صوفے سے اٹھ کر دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ رضیہ کو دیکھ کر شیریں کے چہرے پر ناگواری اور ناپسندیدگی کے آثار پیدا ہوئے اور وہ اپنی جگہ رک گئی۔

"مگر تم نے ڈیڈ کی توہین کر کے اچھا نہیں کیا۔ وہ اسے کبھی برداشت نہیں کریں گے۔"

"دیکھو شیریں۔ وہ کیا برداشت کریں گے اور کیا برداشت نہیں کریں گے یہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔" اب مجھے واقعی غصہ آ گیا تھا۔ "میں ان کا ملازم ہوں نہ کارندہ نہ مزارع۔ میں ان کا مہمان ہوں اور خود بھی ایک معزز اور صاحب حیثیت شخص ہوں۔ اگر میں تمہارا مہمان بن گیا ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میرے ساتھ نوکروں اور رذیلوں کی طرح برتاؤ کیا جائے۔ بازخاں جیسے دو دو پیسے کے پالتو کتے میں نے بھی بہت پال رکھے ہیں۔ میں بھی صاحب عزت اور خود دار آدمی ہوں۔ اپنے ڈیڈ سے کہہ دو اور خود بھی یاد رکھو کہ میں کبھی کسی قیمت پر اپنی توہین اور بے عزتی برداشت نہیں کروں گا۔"

وہ میری یہ جوشیلی تقریر سُن کر ساکت اور حیران رہ گئی۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر خاموشی سے سر جھکا کر مڑی اور کمرے سے رخصت ہو گئی۔ رضیہ جو اس اثنا میں خاموش تماشائی بنی رہی تھی آگے بڑھ کر میرے نزدیک آ گئی اور تشویش بھرے لہجے میں پوچھنے لگی۔ "کہیں زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟"

"آئی بھی ہے تو تمہیں کیا؟" میں نے تلخی سے جواب دیا۔ "تم اپنے کام سے کام رکھو۔ میرا اور تمہارا واسطہ ہی کیا ہے سوائے اس کے کہ ہم دونوں کو حالات اور وقت نے کچھ دیر کے لیے یکجا کر دیا ہے۔" یہ کہہ کر میں غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔ اس تمام جسمانی مشقت اور لڑائی جھگڑے کے بعد میں غسل کر کے تازہ دم ہونے کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔

گرم اور سرد پانی نے میرے ذہن اور جسم کو پُرسکون کرنے میں کافی مدد دی لیکن نہانے کے بعد نرم تولیے سے جسم خشک کرتے ہوئے مجھے یاد آیا کہ میرے پاس تو پہننے کے لیے کوئی دوسرا لباس ہی نہیں تھا اور میں استعمال شدہ میلے کچیلے لباس کو دوبارہ پہننا نہیں چاہتا تھا لیکن کوئی چارہ نہ تھا۔ میں غسل خانے سے باہر نکلا تو رضیہ پُرسکون انداز میں ایک صوفے پر بیٹھی تھی۔ میری طرف دیکھے بغیر بولی۔ "میں نے چائے منگائی ہے۔" مگر جب مجھ پر نظر پڑی تو ایک حیرت کی لمبی سی آواز اس کے منہ سے نکل گئی۔ "ارے؟" اس نے غیر ارادی طور پر بے اختیار دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ "کپڑے پہنے بغیر ہی کمرے میں آ گئے۔ یہ کیا بدتمیزی ہے؟"

میں مسکرایا۔ "بدتمیزی نہیں محترمہ۔ مجبوری ہے۔ کیا کروں؟ میرے پاس کوئی دوسرا لباس نہیں ہے اور پھر اتنے تکلف کی ضرورت بھی کیا ہے۔ آخر ہم دونوں میاں بیوی ہیں۔" میں نے اسے چھیڑا۔

وہ غصے سے اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ "خبردار جو مجھے اپنی بیوی کہا۔"

"کہنے میں تو کوئی ہرج نہیں ہے۔" میں نے خوش اخلاقی سے جواب دیا۔ "بلکہ یہاں تم خود سب کے سامنے تسلیم کر چکی ہو کہ میں تمہارا شوہر ہوں۔ اگر ناراض ہو تو بتا دو۔ میں انھیں بتا دوں گا کہ میں تمہارا شوہر نہیں ہوں۔"

دروازے پر دستک ہوئی اور میں نے اپنا فقرہ نامکمل چھوڑ دیا۔ "یس!" اور ملازمہ ٹرالی میں چائے اور بسکٹ وغیرہ لیے ہوئے اندر آئی۔ خاص بات یہ تھی کہ اس حویلی میں تمام ملازمائیں خوش شکل تھیں۔ خدا جانے یہ اتفاق تھا کہ گھر کے مالکوں نے جان بوجھ کر اس معاملے میں اپنی خوش ذوقی سے کام لیا تھا۔ مجھے تولیہ لپیٹے دیکھا تو ملازمہ سر جھکا کر

مسکرائی اور رضیہ کا چہرہ غصّے اور شرم سے سُرخ ہوگیا۔

"بی بی جی، چائے بنا دوں؟"

"نہیں، تم جاؤ۔" وہ تُرشی سے قریب قریب جھڑک کر بولی۔ "میں خود بنا لوں گی۔" ملازمہ دوسرا لفظ منہ سے نکالے بغیر رخصت ہوگئی۔

"اس بے چاری کو جھڑکنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کا قصور کیا تھا؟"

وہ خاموشی سے اُٹھ کر چائے کی ٹرالی کے پاس چلی گئی اور پیالیوں میں چائے ڈالنے لگی۔ "کتنی چینی اور دودھ؟" اس نے برہمی سے پوچھا۔

"بڑے افسوس کی بات ہے۔ ایک بیوی ہونے کے ناطے تمہیں کم از کم یہ تو معلوم ہونا چاہیئے۔"

"پھر وہی بدتمیزی۔" وہ دانت کر بولی۔

"دیکھو رضیہ۔" میں سنجیدگی سے اس سے مخاطب ہوا۔ "یاد رکھو کہ تمہیں اس حویلی میں یہ کردار پوری سچائی اور دیانت داری کے ساتھ ادا کرنا ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ چوہدری تم پر مہربان ہے۔ یہ بھی دیکھ لیا ہے کہ میں نے ان لوگوں کی بے عزّتی کر دی ہے۔ اب تم خود سوچ لو کہ اگر انھیں ذرا بھی شُبہ ہوگیا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں تو یہ ہمارے اور خاص طور پر تمہارے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟"

"تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟" وہ تُرخ کر بولی۔ "میں تمہیں شوہر کے تمام حقوق دے دوں جو میں نے آج تک ملک منصور کو بھی نہیں دیئے؟"

میں نے سمجھاتے ہوئے کہا "میں یہ نہیں چاہتا۔ صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم بیوی کی مکمل اداکاری کرو۔ اسی میں ہم دونوں کی بھلائی ہے۔" پھر میں اسے دیکھ کر مسکرایا۔ "اور مجھے یقین ہے کہ تم اچھی خاصی اداکاری کر سکتی ہو۔" وہ مجھے گھور کر رہ گئی۔ غالباً میری بات کی سچائی اور وزن کا اسے بھی احساس اور اندازہ ہوگیا تھا۔ چائے کی پیالی بنا کر وہ میرے پاس لائی۔ "کچھ کھاؤ گے؟"

"اس طرح نہیں۔" میں نے شرارت سے کہا۔ "ذرا نرمی، محبت اور اخلاق سے پوچھو۔"

وہ غصّے سے بل کھا کر رہ گئی مگر منہ سے کچھ نہیں بولی۔ بسکٹوں کی پلیٹ لے کر وہ میرے پاس آکھڑی ہوئی۔ "لو۔"

"اوں ہوں۔" میں نے شوخی سے اسکو دیکھا۔ "یوں نہیں، اپنے ہاتھ سے کھلاؤ۔"

"کیا بدتمیزی ہے؟" وہ سچ مچ ناراض ہوگئی۔

"بھئی اکیلے میں ریہرسل بھی تو کرنی چاہیئے۔ تاکہ دوسروں کے سامنے کوئی غلطی نہ ہو جائے۔"

وہ سوچ میں پڑ گئی مگر پھر اس نے ایک بسکٹ اُٹھا کر میرے منہ کی طرف بڑھا دیا۔ میں مسکرایا۔ اسی وقت یکایک دروازہ زور کی آواز کے ساتھ کُھلا اور ہم دونوں چونک کر دیکھنے لگے۔ دروازے میں چوہدری کھڑا تھا۔ وہ سخت برہم اور غضبناک نظر آرہا تھا۔ اس کے عقب میں مجھے بازخاں کا زخمی اور سُوجا ہوا چہرہ بھی نظر آیا تو اس کے غصّے کی وجہ بھی معلوم ہوگئی۔ وہ خاموشی سے تیز تیز پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ مجھے گھورنے لگا۔

"آیئے چوہدری صاحب۔" میں نے مسکرا کر پیشکش کی۔ "بہت اچھے وقت پر آگئے۔ چائے پیجیے۔" پھر میں نے رضیہ سے کہا۔ "رضّو، چوہدری صاحب کو بھی چائے بنا کر دو۔"

"سنو ملک۔" وہ غصّے سے کانپتی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔ "تمہیں یہ حق کس نے دیا کہ میری ہی حویلی میں میری بے عزّتی کرو اور میرے ملازموں پر ہاتھ اُٹھاؤ۔"

"چوہدری صاحب۔ اچھا ہوا آپ نے یہ سوال خود ہی کر لیا۔" میں نے چائے کی پیالی میز پر رکھ دی۔ "یہی سوال

میں بھی آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر میں آپ کی حویلی میں مہمان ہوں تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ آپ کے دو ٹکے کے نوکر میری بے عزّتی کریں۔ مجھ سے گستاخی کریں۔ مجھ پر ہاتھ اُٹھانے کی جرأت کریں۔ یہ بتایئے کہ اگر آپ میری جگہ ہوتے تو کیا یہ سب کچھ برداشت کرتے؟"

وہ شاید ایسے جواب کے لیے تیّار نہ تھا۔ کچھ سِٹپٹا کر اس نے اپنے پیچھے کھڑے ہوئے بازخاں کو دیکھا۔

"آپ کا یہ ملازم ہوسکتا ہے آپ کا منہ چڑھا ہو۔ مگر یہ انتہائی گستاخ اور بدتمیز آدمی ہے۔ اس کو یہ سکھایئے کہ مجھ جیسے لوگوں سے کس طرح بات کرنی چاہیئے۔ اور میں نے اس پر ہاتھ نہیں اُٹھایا۔ یہ گستاخی اسی نے کی کہ مجھ پر حملہ کیا اور جب میں نے اس کی مرمت کر دی تو پستول نکال کر فائر کرنے لگا۔ اس کی گواہ خود آپ کی بیٹی شیریں ہے جس نے بازخاں کو ڈانٹا بھی تھا۔ شاید اس نے آپ کو یہ بات بھی نہیں بتائی ہوگی۔"

چوہدری صاحب نے پلٹ کر غصّے سے بازخاں کی جانب دیکھا تو اس نے سر جُھکا لیا۔

"اور میں آپ کو ایک دوستانہ مشورہ اور دوں گا۔ اس قسم کے نکمّے اور کمزور ملازم آپ جیسے آدمی کے پاس زیب نہیں دیتے۔ اگر آپ کہیں تو میں آپ کو کچھ اچھے اور بھروسے کے کارآمد آدمی بھجوا دوں؟" چوہدری اس طنز پر تلملا کر رہ گیا۔ ظاہر ہے کہ بازخاں اس کا بہترین، سب سے جی دار اور سب سے قابلِ اعتماد کارندہ تھا۔ وہ اس کا بہت منہ چڑھا تھا اور جہاں تک میرا اندازہ تھا وہ شیریں کی قربت کا اعزاز بھی حاصل کر چکا تھا۔

چوہدری وقتی طور پر لاجواب ہوگیا۔ مگر پھر برہم ہو کر بولا۔ "میں نے تمہیں بلایا تھا ملک....."

میں نے اس کی بات کاٹ کر تصحیح کی۔ "ملک نہیں، ملک صاحب۔ اور شاید میری ابھی آپ سے اتنی بے تکلفی بھی نہیں ہوئی ہے کہ ایک دوسرے کو 'تم' کہہ کر مخاطب کریں۔"

اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہے۔ "اور آپ تو بہت معزز اور خاندانی آدمی ہیں چوہدری صاحب۔ آپ کو یہ تو معلوم ہوگا کہ اپنے مہمانوں کو نوکر بھیج کر طلب نہیں کیا جاتا بلکہ شائستگی اور اخلاق کے ساتھ انھیں مدعو کیا جاتا ہے۔ یا پھر میزبان خود مہمان کے پاس چلا جاتا ہے جس طرح اب آپ میرے پاس تشریف لے آئے ہیں۔"

چوہدری میری ڈپلومیسی اور چالاکی پر تلملا تو رہا تھا لیکن بظاہر میں نے کوئی ایسی بات نہیں کہی تھی۔ جس پر اسے مجھ سے جھگڑا کرنے کا بہانہ مل جاتا۔

"آپ تشریف نہیں رکھیں گے۔ ہماری عزّت افزائی ہوگی اگر آپ ہمارے ساتھ چائے کی ایک پیالی پئیں۔"

اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ اس نے سَر کے اشارے سے بازخاں کو جانے کے لیے کہا اور خود بڑھ کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا مگر وہ سخت پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ "رضیہ۔" میں نے مسکرا کر رضیہ سے کہا۔ "چوہدری صاحب کے لیے چائے بناؤ۔ ہاں۔ یہ ضرور پُوچھ لینا کہ یہ مٹھاس کتنی پسند کرتے ہیں۔"

"میں چینی نہیں استعمال کرتا۔" چوہدری نے سرد مہری سے کہا۔

"اگر کر لیا کریں تو بہتر ہوگا۔" میں نے خوش مزاجی سے کہا۔ "اور اب فرمایئے کہ آپ نے مجھے کس لیے یاد فرمایا تھا۔ کیا ہم اس وقت وہ بات کر سکتے ہیں۔"

اس نے پہلے رضیہ کی طرف دیکھا۔ پھر ناراض لہجے میں کہنے لگا۔ "وقت تیزی سے گزرتا جا رہا ہے ملک..... صاحب۔ مجھے اور بھی کئی منصوبے بنانے ہیں۔ آپ نے ابھی تک میری پیشکش کا جواب نہیں دیا۔"

"ارے چوہدری صاحب۔ یہ اہم معاملات ہوتے ہیں۔ سوچ سمجھ کر ہی فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔ مجھے کچھ مہلت تو دیں۔"

"اس کے لیے میرے پاس گنجائش نہیں ہے۔" اس کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

"تو پھر میرا جواب انکار میں ہے۔" میں صوفے سے اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے غصّے سے گھور کر مجھے دیکھا۔ اس کی

نظریں آگ برسا رہی تھیں۔" اور میں آپ کو اتنا بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر میں آپ کے قبضے میں ہوں تو اس کا مطلب نہیں ہے کہ آپ من مانی کر لیں گے۔ میں اتنا بے سہارا اور یتیم بھی نہیں ہوں۔ آپ میرے ساتھ جو سلوک چاہیں کر سکتے ہیں لیکن یہ نہ بھولیے کہ میری ایک تنظیم ہے۔ ایک لابی ہے۔ ایک پورا گروہ اور حلیف ہیں۔ حکومت میں بھی میری رسائی ہے۔ مجھے ختم کر دینے سے آپ کا راستہ صاف نہیں ہو گا۔"

رضیہ کی پیش کی ہوئی چائے کی پیالی کو اس نے چھوا بھی نہیں۔ تیزی سے اٹھا اور جانے کے لیے مڑا۔ پھر پلٹ کر بولا۔ "ملک۔ تمہیں بہت زعم ہے۔ شاید تم غلطی کر رہے ہو۔"

"شاید تم بھی غلطی کر رہے ہو چوہدری۔" میں نے جان بوجھ کر اُسے چھیڑا۔

ہم دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گھورتے رہے نہ اس نے پلک جھپکائی نہ میں نے یکایک گیلری میں تیز تیز قدموں کی آواز سنائی دی اور پھر ایک مسلح آدمی کمرے میں داخل ہوا۔ "چوہدری جی۔ ہم نے ساکے کو پکڑ لیا ہے۔" چوہدری کے چہرے پر یکایک مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے مجھے دیکھا اور فاتحانہ انداز میں بولا۔ "سنا تم نے تمہارا سب سے بڑا کارندہ بھی ہمارے قبضے میں آگیا ہے۔ اب بولو۔ کیا خیال ہے؟"

میں ساکے کو بالکل نہیں جانتا تھا مگر اس کے تعارف کے لیے چوہدری کا بیان کافی تھا۔ "بڑی مشکل سے قابو آیا ہے میاں جی۔" کارندہ اپنی کارگزاری بیان کرنے لگا۔ "ڈیڑھ گھنٹے تک پیچھا کیا۔ فائرنگ ہوئی۔ مقابلہ ہوا۔ ان کے دو چار آدمی بھی مارے گئے۔ ہمارے بھی تین مرے اور چھ زخمی ہوئے۔ ساکا بھی زخمی ہو گیا ہے مگر ہم نے اس پر قابو پالیا اب اس کے لیے کیا حکم ہے جناب؟"

"بہت خوب۔" وہ مسکرایا۔ گویا۔ انسانوں کے مرنے یا زخمی ہونے کی خبر سے اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ "وہ جس حالت میں بھی ہے تم اسے یہاں لے آؤ۔ میں ذرا ملک صاحب کو بھی ان کے کارندوں کا تماشا دکھا دوں۔" اس کے لہجے کی تلخی اور طنز نے مجھے اتنا پریشان نہیں کیا جتنا اس خیال نے کہ ساکا سامنے آتے ہی فوراً مجھے پہچان لے گا کہ میں ملک منصور نہیں ہوں۔ اس کے بعد کیا ہو گا؟ میں سوچنے سے قاصر تھا۔

"سنو چوہدری۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "وہ بہت کام کا بہادر آدمی ہے دشمن کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرنا چاہیے پہلے اس کی مرہم پٹی کراؤ۔ اسے ذرا آرام کرنے دو۔ اس کے بعد جو چاہے کر لینا۔"

"میں نے دشمنوں کو آرام دینا سیکھا ہی نہیں ملک صاحب۔" وہ ہنسا۔ "مجھے ان کو تکلیف اور دکھ پہنچا کر ہی سکون ملتا ہے۔ قاسم۔ وہ کہاں ہے؟"

"جناب وہ دریا والی میں ہے۔"

"اسے فوراً پیش کرو۔" چوہدری نے حکم دیا اور آپ ہی آپ مسکرانے لگا۔ جیسے اسے حالات کے اس بدلتے ہوئے رُخ سے بہت خوشی اور تسلی ہوئی ہے۔

"جی بہتر ہے جناب۔" قاسم تسلیم کر کے چلا گیا۔ چوہدری نے ایک زور دار قہقہہ لگایا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔ "اب بولو ملک" وہ طنزیہ لہجے میں بولا "اب کیا خیال ہے؟"

میرا ذہن تیزی سے سوچنے میں مصروف تھا لیکن نجات کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ جیسے ہی ساکا ہمارے سامنے آیا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ میرا تو خیر جو انجام ہو گا لیکن رضیہ کے ساتھ وہ لوگ خدا جانے کیا سلوک کریں گے! بعض اوقات انسان اتنا مجبور اور بے بس ہو جاتا ہے کہ اسے خدا کی قدرت اور قوت کے آگے سر جھکائے نہیں بنتی۔ شاید بڑے سے بڑے فرعون نے بھی ایسے لمحات میں خداوند ذوالجلال کی عظمت اور برتری کو ضرور تسلیم کیا ہو گا۔

چوہدری کے فلک شگاف قہقہے ایک دم رُک گئے۔ جیسے کسی نے یک لخت آواز کا سوئچ آف کر دیا ہو۔ وہ خاموش

ہو کر کان لگا کر کچھ سننے گا۔ مجھے بھی دھماکوں اور فائرنگ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں جو کافی فاصلے سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ چوہدری نے کھڑے ہو کر ٹہلنا شروع کر دیا۔ دھماکے اور فائرنگ کی آواز اب زیادہ صاف سنائی دے رہی تھی۔ چوہدری نے دیوار پر لگی ہوئی برقی گھنٹی بجائی اور ایک مسلح ملازم نمودار ہو گیا "یہ فائرنگ کہاں ہو رہی ہے؟ کون فائرنگ کر رہا ہے؟"

"جناب میں تو اسی جگہ ڈیوٹی پر کھڑا ہوں۔" وہ ادب سے بولا۔

"کھڑے مت رہو گدھے۔ بھاگ کر جاؤ اور مجھے اطلاع دو۔" وہ — فوراً نو دو گیارہ ہو گیا مگر چوہدری کی بے چینی میں کوئی کمی پیدا نہ ہوئی۔ دھماکوں اور فائرنگ کی آوازوں میں شدت پیدا ہو گئی اور اب وہ زیادہ قریب سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ چوہدری نے اب اضطراب کے عالم میں کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا تھا۔ وہ بار بار گیلری کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں اور رضیہ دونوں بالکل خاموش تھے اور ایک تذبذب کے عالم میں تھے۔ ہم خود نہیں جانتے تھے کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے اور ہمارے حق میں یہ واقعات فائدہ مند ثابت ہوں گے یا نقصان دہ؟

گیلری میں باز خاں نمودار ہوا اور تیزی سے چوہدری کی طرف بڑھا۔ "چوہدری صاحب۔ ملک کے آدمیوں نے حملہ کر دیا ہے آپ فائرنگ کی آوازیں سن رہے ہیں نا! یہ اسی کے آدمیوں کی ہیں۔"

چوہدری نے گھور کر میری طرف دیکھا پھر باز خاں سے سوال کیا "کتنے آدمی ہیں؟"

"صحیح پتہ نہیں ہے مگر وہ کم از کم تین چار جیپوں میں ہیں اور تیزی سے جنگل میں آگے بڑھ رہے ہیں۔"

چوہدری غصے اور اشتعال کے عالم میں چلایا: "ان کی یہ جرأت!! انھیں بھون کر رکھ دو۔ ملیا میٹ کر دو۔ شاید وہ یہ نہیں جانتے کہ ان کا مالک اس وقت میری مٹھی میں ہے اور اس کی خوبصورت بیوی بھی میرے رحم و کرم پر ہے۔ انھیں اپنے ارمان پورے کر لینے دو۔ میں ان دونوں کے ساتھ وہ سلوک کروں گا کہ یہ زندگی بھر یاد رکھیں گے۔ چلو میرے ساتھ۔" وہ تیزی سے باہر کی طرف بڑھا۔ پھر رک کر باز خاں سے مخاطب ہوا۔ "سالے کو کوٹھری میں رہنے دو۔ اس سے میں بعد میں بات کر لوں گا۔ میں دیکھوں گا کہ ان دونوں کے بغیر اس کے بہادر کتنی دیر تک مقابلہ کرتے ہیں۔" وہ بھاری قدم اٹھاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

"اب کیا ہو گا؟" رضیہ نے سہمی ہوئی آواز میں سوال کیا۔ "اب تو بچاؤ کی کوئی صورت بھی نہیں رہی۔"

"بچانے والا مارنے والے سے زیادہ طاقت ور ہے رضیہ۔" میں نے اسے تسلی دی: "ہو سکتا ہے حالات ہمارے حق میں بدل جائیں۔ اور اگر ایسا نہ بھی ہوا تو صبر کے سوا چارہ کیا ہے؟ جو ہماری قسمت میں لکھا ہے وہ تو ہو کر ہی رہے گا۔ خدا کی رضا سے کون لڑ سکتا ہے؟"

وہ سسکیاں لینے لگی: "خدایا۔ میں کیا کروں! یہ مجھے کن گناہوں کی سزا مل رہی ہے!"

اس وقت وہ ایک بے بس، کمزور اور لاچار لڑکی نظر آ رہی تھی۔ مجھے اس پر بہت ترس آیا۔ میں نے پاس جا کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "خدا پر بھروسہ رکھو رضیہ۔ اور پھر میں بھی تو تمہاری حفاظت کے لیے موجود ہوں۔ یقین رکھو میری زندگی میں کوئی تمہاری طرف آنکھ بھی نہیں اٹھا سکتا۔" اس نے آنسو بھری آنکھوں سے مجھے دیکھا اور پھر بے اختیار روتی ہوئی مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے اس کے بالوں کو تھپکا "حوصلہ رکھو۔ تم تو بہت بہادر عورت ہو۔"

"کتنی بھی بہادر ہوں مگر ہوں تو ایک عورت۔ میں ڈرتی ہوں۔ مجھے خوف آ رہا ہے۔" اس نے سختی سے میرا بازو بھینچ لیا۔ "میرا اب دنیا میں کوئی نہیں ہے۔"

"فی الحال میں تو ہوں۔" میں نے سادگی سے کہا۔

"میں تو تمہارا نام تک نہیں جانتی۔ تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟"

میں مسکرایا: "میں تمہارا شوہر ہوں۔ ملک منصور۔" وہ بے اختیار سمٹ کر مجھ سے دور ہونے لگی مگر میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا: "میں جانتا ہوں کہ وہ تمہارا شوہر نہیں ہے رضیہ صرف نام کا شوہر ہے اور نہ کبھی تم اسے ذہنی طور پر قبول کرو گی۔ مگر اس نازک وقت میں اس کا نام بھی ہمارے لیے بہت مفید اور کار آمد ثابت ہو گا۔"

اس نے ایک لمحے کے لیے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور چہرے پر معصومیت اور بے چارگی کا ایسا امتزاج تھا کہ میرا دل بھی پسیج گیا۔ وہ دوبارہ مجھ سے لپٹ گئی "مجھے تنہا نہ چھوڑنا۔ میں مر جاؤں گی تمہارے بغیر۔" وہ آہستہ آہستہ سسکیاں لے رہی تھی جس کی وجہ سے اس کے جسم میں ہلکی سی لرزش تھی، جس نے مجھے بھی لرزا دیا تھا۔

"بہت خوب۔" ہم دونوں نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا۔ ہم دروازہ بند کرنا بھول گئے تھے اور کھلے دروازے میں شیریں مغربی لباس پہنے ہوئے کھڑی تھی۔ "بہت اچھا رومانٹک سین ہو رہا ہے۔ میں معافی چاہتی ہوں مگر دروازہ کھلا ہوا تھا اس لیے میں سمجھی کہ شاید آپ لوگوں کو کسی کے دیکھ لینے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔" وہ بہت تیزی سے لباس تبدیل کرنے کی عادی معلوم ہوتی تھی۔

رضیہ بے ساختہ مجھ سے دور ہو گئی اور منہ پھیر کر اپنی آنکھیں پونچھنے لگی۔ شاید وہ شیریں کو یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ وہ رو رہی تھی۔

"یہ دھماکے اور فائرنگ کیسی ہے؟" مجھے اس سے بات کرنے کے لیے کوئی اور موضوع نہیں سوجھا۔

"ایسے پٹاخے تو یہاں چلتے ہی رہتے ہیں۔ کچھ دیر میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔" پھر وہ رضیہ سے مخاطب ہوئی: "اگر آپ کی اجازت ہو تو میں تھوڑی دیر کے لیے آپ کے میاں صاحب کو ساتھ لے جاؤں۔ مجھے ان سے ایک ضروری بات کرنی ہے؟"

رضیہ نے بے اختیار انکار میں سر ہلا کر میری طرف دیکھا مگر میں نے آنکھوں کے اشارے سے اسے سمجھانے کی کوشش کی: "کوئی بات نہیں رضیہ۔ میں ابھی آ جاؤں گا۔ چلیے۔"

شیریں نے احساس فتح مندی کے تفاخر کے ساتھ رضیہ کو دیکھا اور میرا بازو تھام کر باہر لے چلی۔ رضیہ کے چہرے پر غصے اور ناراضی کے تاثرات میں واضح طور پر دیکھ سکتا تھا۔ مگر مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ میں شیریں کے ذریعے معاملات اور مسائل کو سمجھنے کی کوشش کروں۔ شیریں تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی چند گیلریوں سے گزر کر ایک راہداری میں اور پھر ایک کشادہ اور خوبصورت سے سجے ہوئے کمرے میں داخل ہو گئی۔ یہاں دیواروں پر مغربی مصوروں کی نیم عریاں تصاویر لگی ہوئی تھیں۔ پردے، فرنیچر، قالین اور آسائش کا دوسرا سامان بھی بے حد بیش قیمت اور شاندار تھا۔

"کیوں۔ پسند آیا کمرہ؟" اس نے لگاوٹ سے پوچھا: "یہ میرا کمرہ ہے۔ ویسے میرا ایک اور کمرہ بھی ہے۔ مگر خاص خاص مہمانوں کو میں اسی کمرے میں لاتی ہوں۔"

"شکریہ عزت افزائی کا۔" میں نے مختصر جواب دیا۔ "اب وہ ضروری بات بھی بتا دیجیے۔"

"بیٹھو گے نہیں۔" اس نے کاندھوں سے دھکیل کر مجھے گداز مخملیں صوفے پر بٹھا دیا۔ "بولو۔ کیا خاطر کروں تمہاری؟"

اس کی نگاہوں میں پوشیدہ جذبات کو میں نے سمجھنے میں ذرا بھی دیر نہیں کی۔

"یہ خاطر مدارات کا وقت نہیں ہے۔ حویلی سے باہر گولیاں چل رہی ہیں اور دوسرے کمرے میں رضیہ میرا انتظار کر رہی ہے۔"

"ارے گولی مارو رضیہ کو اور نو بیل ود فائرنگ۔ میں تمہیں ایک آفر دینے کے لیے یہاں لائی ہوں!"

"کیسی آفر؟"

تمہارے کام کی ہے۔ دیکھو ملک۔ ڈیڈ کے اثر و رسوخ اور طاقت کا تمہیں پوری طرح اندازہ نہیں ہے۔ ان کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ بہت دُور دُور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ تم ان کی بات مان لو۔ بلکہ بہتر ہو کہ تم ڈیڈ کے ساتھ مل جاؤ۔ یہ تم دونوں کے لیے اچھا ہوگا۔ بلکہ میں تو کہوں گی کہ تم جلد ہی ڈیڈ سے یہ فیصلہ کر لو اور اسی جگہ آ جاؤ۔ ہم دونوں کی اچھی نبھے گی۔" وہ لگاوٹ سے مسکراتی ہوئی میرے پاس بیٹھ گئی۔

"مگر کب تک۔" میں نے چٹکی لی۔ "تم مستقل مزاج لڑکی نظر نہیں آتی ہو۔ لگتا ہے کہ تمہارے ارادے اور تمہارے ٹیسٹ بدلتے رہتے ہیں۔"

"ہاں۔" اس نے ہاں کو بہت لمبا کر دیا۔ "ایسا ہوتا تو رہا ہے مگر اس وقت تک مجھے تم جیسا کوئی نہیں ملا تھا۔"

"شکریہ پسندیدگی کا۔" میں نے اخلاقاً کہا۔ "مگر رضیہ کا کیا ہوگا؟"

"رضیہ؟!!" اس نے یوں دہرایا جیسے وہ رضیہ کی موجودگی سے بالکل بے خبر ہے۔ "اچھا۔ وہ؟! تمہاری بیوی؟!" میں نے سر ہلا دیا۔

"نہیں ایک بات بتاؤں ملک۔ رضیہ ڈیڈ کو پسند آ گئی ہے۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ تم بھی اسے بہت زیادہ پسند نہیں کرتے۔ کیوں نہ تم رضیہ کو طلاق دے دو۔ وہ میری سوتیلی ماں بن جائے گی اور یہ ساری پرابلم ہی حل ہو جائے گی۔ کیوں، کیسی بات ہے؟" وہ گردن ٹیڑھی کرکے مجھے دیکھنے لگی۔ اتنی بڑی بات اس نے اس آسانی اور سادگی سے کہہ دی تھی جیسے کہہ رہی ہو کہ تم چائے کے بدلے کافی پی لو۔ کیا خیال ہے؟"

"سنو شیریں۔" میں کھڑا ہو گیا۔ اس کا یہ سرپرستانہ اور مالکانہ رویّہ مجھے بالکل پسند نہیں آیا تھا۔ "رضیہ میری بیوی نہ بھی ہوتی تو اس کی مرضی کے خلاف ایسا نہیں ہو سکتا تھا اور مجھے معلوم ہے کہ وہ تمہارے ڈیڈ کو ناپسند کرتی ہے۔"

"کیوں؟" وہ تیز آواز میں چلائی۔ "ڈیڈ میں کس چیز کی کمی ہے؟"

"کمی تو کوئی نہیں ہے۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ وہ رضیہ کے قابل نہیں ہیں۔"

شیریں ایک لمحہ ساکت کھڑی مجھے گھورتی رہی۔ غصّے کی ایک لہر اس کے چہرے پر نمودار ہوئی اور پھر اچانک غائب ہو گئی۔ "مگر میں تو تمہارے قابل ہوں نا؟ کیا خیال ہے؟" آگے بڑھ کر اس نے میرے گلے میں باہیں ڈال دیں اور پیار بھری نظروں سے مجھے دیکھ کر مسکرانے لگی۔

میں نے بڑے اطمینان سے اس کے بازو اپنی گردن سے الگ کر دیئے۔ "ابھی میں نے اس بارے میں سوچا نہیں ہے اور پھر شیریں۔ میں ہر جائی لڑکیوں کو پسند بھی نہیں کرتا۔" اگر میں اس کے چہرے پر تھپڑ مار دیتا تب بھی شاید اس پر یہ اثر نہ ہوتا جو اس فقرے کو سُن کر ہوا۔ اس نے دانت بھینچ کر مجھے ایک زوردار تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ اُٹھایا مگر میں نے اس کی کلائی تھام لی۔ "اور میں لڑکیوں سے مار کھانا بھی پسند نہیں کرتا۔ چاہے وہ کسی کی بھی لڑکی ہو۔" میں نے ایک جھٹکے کے ساتھ اسے صوفے پر پھینک دیا اور اس کی طرف دیکھے بغیر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے غرّانے اور ناراض ہونے کی آوازوں نے کچھ دُور تک میرا تعاقب کیا مگر میں اس کو نظر انداز کرکے اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔

اس بار میں نے اپنے کمرے کا راستہ یاد رکھنے کی پوری کوشش کی تھی اور اس بار واقعی میں اپنے کمرے تک پہنچنے میں کامیاب بھی ہو گیا۔ دروازے پر دستک دی تو وہ اندر سے لاک تھا۔ "کون ہے؟" رضیہ نے محتاط آواز میں سوال کیا۔

"دروازہ کھولو رضیہ۔" اس نے میری آواز پہچان کر فوراً دروازہ کھول دیا۔ میرے چہرے پر غصّے اور بدمزگی کے آثار اس نے بھانپ لیے مگر کچھ بولی نہیں۔ فائرنگ کی آوازوں میں اب مزید شدت پیدا ہو گئی تھی اور یوں لگتا تھا کہ اس مقابلے میں کچھ اور لوگ بھی شامل ہو گئے ہیں۔ میں خاموشی سے صوفے پر نیم دراز ہو گیا اور موجودہ حالات پر غور کرنے لگا۔ میں نے غصّے میں شیریں اور چوہدری کی توہین تو کر دی تھی لیکن یہ حقیقت تھی کہ میں اصل حالات و واقعات سے

بالکل بے خبر تھا اور مجھے کچھ نہیں معلوم تھا کہ آئندہ چند گھنٹوں میں کیا رونما ہونے والا ہے؟ رضیہ آہستگی سے چلتی ہوئی میرے پاس آ کر بیٹھ گئی اور نرمی سے میرے بازو پر ہاتھ رکھ کر پوچھنے لگی: "خیریت تو ہے نا؟ تم پریشان ہو۔"

"کوئی خاص بات نہیں ہے۔ ویسے حالات تمہارے سامنے ہیں۔" وہ میرے شانے سے چہرہ ٹکا کر بیٹھ گئی مگر منہ سے کچھ نہیں بولی۔ شاید وہ بھی میری طرح خیالوں میں کھو گئی تھی اور سوچ رہی تھی کہ آنے والا وقت اپنے دامن میں ہمارے لیے کیا سمیٹ کر لا رہا ہے۔ نہ جانے کتنی دیر ہم دونوں یوں ہی خاموش بیٹھے رہے۔ اس کے پاس بیٹھنے کی وجہ سے مجھے اطمینان اور سکون محسوس ہو رہا تھا اور رفتہ رفتہ میری پریشانی میں کمی ہونے لگی تھی۔ "کیا کہہ رہی تھی شیریں؟" اس نے یکایک سوال کیا۔

میں مسکرایا: "شادی کی پیشکش کر رہی تھی؟"

"شادی؟" وہ حیران ہو کر بولی۔ "کس کی شادی؟"

"اس کی اپنی شادی۔ میرے ساتھ۔"

رضیہ ایک جھٹکے سے اُٹھ کر کھڑی ہو گئی: "پھر تم نے کیا جواب دیا؟"

"میں نے کہا سوچ کر جواب دوں گا اور اپنی بیوی سے مشورہ کروں گا۔"

"بیوی؟" "اوہ۔ اچھا۔" رضیہ دانت پیس کر بولی۔ "کتنی ڈھیٹ اور بے شرم لڑکی ہے۔ کیا یہ نہیں جانتی کہ..... میرا مطلب ہے چاہے جھوٹ ہی سہی۔ اس کی نظر میں تو ہم دونوں میاں بیوی ہی ہیں۔"

"تمہارے لیے بھی اس کے پاس ایک تجویز ہے۔" میں نے اُسے چھیڑا۔

"کیا؟"

"کہتی ہے رضیہ ڈیڈ کو پسند آ گئی ہے۔ ان دونوں کی شادی کرا دو۔"

رضیہ کا چہرہ غصّے سے سُرخ ہو گیا، مگر وہ مُنہ سے کچھ نہیں بولی۔

"کیا خیال ہے؟" میں نے سنجیدگی سے کہا: "تم تو ویسے بھی اپنے شوہر کو پسند نہیں کرتی ہو۔"

وہ مجھے شکایت آمیز نظروں سے دیکھ کر رہ گئی۔ یکایک باہر سے شین گنوں کے مسلسل فائر کی آواز آئی اور ہم دونوں چوکنا ہو کر گیلری کی طرف دیکھنے لگے۔ کچھ لوگوں کے دوڑنے بھاگنے اور دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں آئیں اور پھر کچھ کاروں کے رُکنے کی آوازیں سنائی دیں۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ ہم دونوں خاموش کھڑے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ پھر قدموں کی آہٹ سنائی دی اور شیریں سامنے گیلری میں نمودار ہوئی۔ وہ مسکرا رہی تھی: "مبارک ہو ملک منصور۔ تمہارے سارے آدمیوں کا صفایا ہو گیا ہے۔ ایک بھی باقی نہیں رہا۔ اب وہ سوچ سمجھ کر ہی اِدھر کا رُخ کریں گے۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چُپ چاپ اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔

اسی وقت بازخان باہر سے آیا۔ اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی: "لو ملک جی۔ بس اتنی سی بات تھی۔ آپ کے سارے آدمیوں کو ٹھکانے لگا دیا ہے۔ وہ تو چھپ کر حویلی کے پاس آ گئے تھے۔"

میں کیا جواب دیتا۔ میرے پاس کوئی جواب تھا بھی نہیں۔ وہ طنز اور حقارت آمیز نگاہوں سے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر بولا: "آپ کو چوہدری صاحب نے یاد کیا ہے۔"

"بہت شکریہ۔ ان سے کہنا یاد کرتے رہیں۔" میں صوفے پر بیٹھ گیا۔

"انھوں نے آپ کو بلایا ہے۔"

"میں اس وقت نہیں جانا چاہتا۔ بہت تھک گیا ہوں اب آرام کروں گا۔"

"جب چوہدری صاحب کسی کو بلاتے ہیں تو اسے جانا ہی پڑتا ہے۔" وہ دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔

"تو پھر لے جاؤ اگر لے جا سکتے ہو۔" میں صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔

بازخاں نے ایک بار گھور کر شیریں کی جانب دیکھا۔ "ہاں۔ لے جاؤ انھیں بازخاں۔ مجھے بھی ذرا رضیہ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

رضیہ ایک دم پھٹ پڑی۔ "مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی۔ تم جا سکتی ہو۔"

شیریں غصے سے بے قابو ہو کر آگے بڑھی اور اس نے رضیہ کے بال پکڑ لیے۔

رضیہ نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر اپنے بال چھڑا لیے۔ شیریں نے غضبناک ہو کر تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ مگر رضیہ نے ایک جھٹکے سے اس کے بازو کو موڑ دیا۔ اس کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ بازخاں تیزی سے آگے بڑھا۔ میں نے اس کا راستہ روک دیا۔ "رک جاؤ بازخاں۔ عورتوں کے جھگڑے میں مردوں کو مداخلت نہیں کرنی چاہیے۔ انھیں خود ہی فیصلہ کر لینے دو۔" اتنی دیر میں رضیہ نے شیریں کو دھکا دے کر ایک صوفے پر پھینک دیا تھا۔

وہ تیزی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ مگر دوسرے ہی لمحے رضیہ نے اسے اپنی کمر پر لاد کر قالین پر دے مارا۔ شیریں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ساتھ ہو کیا رہا ہے۔ اس نے ایک بار پھر اٹھ کر رضیہ کو لات مارنے کی کوشش کی مگر اس نے اس کی ٹانگ پکڑ کر ایک چکر دیا اور وہ بڑے زور سے بیڈ پر جا گری۔ اس کو رضیہ نے اٹھنے کا موقع نہیں دیا۔

دو تین کھڑے ہاتھ اس کی گردن پر رسید کیے اور وہ بے ہوش ہو کر سیدھی سیدھی لیٹ گئی۔

رضیہ دونوں ہاتھ جھاڑ کر اطمینان سے بازخاں سے مخاطب ہوئی "اسے اٹھا کر لے جاؤ یہاں سے۔"

بازخاں تیز قدموں سے آگے بڑھا لیکن شیریں کی طرف نہیں بلکہ رضیہ کی جانب۔

"رُک جاؤ بازخاں۔" میں نے اسے پھر مشورہ دیا۔ "عورتوں کے معاملے میں مردوں کو نہیں بولنا چاہیے۔"

مگر بازخاں غیظ و غضب میں اندھا ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں اسے روکتا وہ رضیہ کے پاس پہنچ چکا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ بڑھا کر رضیہ کو پکڑنا چاہا مگر رضیہ کے دونوں ہاتھوں کی ضرب اس کی کلائیوں پر پڑی اور وہ بلبلا کر رہ گیا۔ رضیہ نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ اس کی ٹانگ کی ضرب بازخاں کے گھٹنے پر لگی اور وہ لڑکھڑا کر رہ گیا۔ اس نے پاس پڑی ہوئی کرسی کا سہارا لینا چاہا مگر رضیہ کی ایک زوردار ٹھوکر نے کرسی کو دور پھینک دیا اور بازخاں اوندھے منہ فرش پر گر گیا۔ مجھے رضیہ سے ایسی مہارت کی توقع نہیں تھی۔ اس نے کسی اچھے استاد سے تربیت لی تھی اور اس کی پھرتی اور خود اعتمادی قابلِ تعریف تھی۔

وہ بازخاں سے مخاطب ہوئی۔ "اب اس کو اٹھا کر لے جاؤ ورنہ تمہیں لے جانے کے لیے بھی کسی اور کو بلوانا پڑے گا۔"

بازخاں نے خوں خوار نگاہوں سے اس کو گھورا مگر پھر بے بسی سے سر جھٹک کر رہ گیا۔ اس نے ایک لمبی سانس لی اور جھک کر شیریں کو اٹھا کر اپنے کاندھے پر ڈال لیا۔ جاتے جاتے بھی وہ کھا جانے والی نظروں سے مجھے اور رضیہ کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے جانے کے بعد رضیہ تھکی تھکی سی صوفے پر بیٹھ گئی۔ "اب کیا ہوگا۔ خدا جانے؟!" وہ زیرِ لب بڑبڑائی۔

"بہت خوب رضیہ۔ مجھے تم سے یہ اُمید نہیں تھی۔ تم تو واقعی بہت کام کی چیز ہو۔" وہ اُداسی سے مسکرا کر رہ گئی اور میں سوچنے لگا کہ میں نے اس بظاہر نازک سی لڑکی کے بارے میں کتنے غلط اندازے قائم کیے تھے۔

رضیہ نے جس مہارت اور ہنرمندی کے ساتھ شیریں کو ٹھکانے لگایا تھا اس پر مجھے خوشگوار حیرت ہوئی۔ اس نے تذکرۃً مجھے یہ بتایا ضرور تھا کہ کالج کے زمانے میں وہ مختلف کھیلوں میں حصہ لیتی رہی ہے اور اس نے جوڈو کراٹے کی تربیت بھی حاصل کی ہے، لیکن میں نے اس بات کو محض ایک وارننگ تصور کیا تھا، مگر جب میری آنکھوں کے سامنے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے چند لمحوں کے اندر شیریں کو بالکل بے بس کر کے رکھ دیا تو مجھے یہ تسلیم کرنا پڑا کہ واقعی وہ جوڈو کراٹے جانتی ہے۔ ورنہ شیریں جیسی صحت مند، قد آور اور لڑاکا قسم کی لڑکی کی یہ دُرگت نہ بناتی۔ شیریں بذاتِ خود ایک مضبوط اور زور آور لڑکی تھی جس کی تربیت دیہات

کی کھلی فضا میں ہوئی تھی۔ وہ بہت اچھی شہسوار تھی۔ سیر و شکار اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ ہر قسم کے مردانہ کھیلوں میں حصہ لینا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ اس لیے اس کو یوں منٹوں میں زیر کر لینا واقعی ایک قابلِ تعریف کارنامہ تھا۔ شیریں کو اس نے حملہ کرنے کا موقع دیا تھا نہ دفاع کرنے کا۔ تابڑ توڑ حملوں سے اس نے شیریں کو بوکھلا دیا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ کوئی تدبیر کرتی رضیہ نے اس کو ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیا۔ شیریں یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایک بظاہر سیدھی سادی، گھریلو سی عورت مارشل آرٹس میں ایسی مہارت رکھتی ہو گی اور شاید اسی زعم میں اس نے رضیہ پر دست درازی بھی کی تھی۔ جس کا خمیازہ اسے بھگتنا پڑا۔

شیریں کو زیر کرنے کے بعد رضیہ بڑی بے پروائی سے ہاتھ جھاڑ رہی تھی۔ اس کی نظریں شیریں کے بے حس و حرکت جسم کی طرف تھیں۔ اس لیے جب بازخاں اس کی طرف بڑھا تو رضیہ کی توجہ بازخاں کی طرف نہیں تھی، لیکن میں نے اس مختصر سے مقابلے کے دوران اپنی تمام تر توجہ بازخان پر مرکوز رکھی تھیں۔ وہ ایک کمینہ خصلت انسان تھا۔ اس سے پہلے بھی جب شیریں اور رضیہ کی باہمی کشمکش کا آغاز ہوا تھا تو اس نے شیریں کی حمایت میں رضیہ کی طرف بڑھنے کی کوشش کی تھی، لیکن میں اس کی راہ میں حائل ہو گیا تھا۔ اب دوبارہ اس نے رضیہ کی طرف قدم بڑھایا تو میری برداشت کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ ابھی وہ رضیہ سے چند قدم کے فاصلے پر ہی تھا کہ میں نے اس کا بازو تھام لیا۔ وہ خونخوار نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔

"کیا چاہتے ہو؟" میں نے نرم آواز میں پوچھا۔ "کیا اب عورتوں کے ساتھ بھی طاقت آزمائی کرو گے؟"

وہ غضب ناک انداز میں دھاڑا۔ "ہٹ جاؤ میرے راستے سے۔ شیریں بی بی کی بے عزتی کرنے والا زندہ نہیں رہ سکتا۔"

"تو پھر پہلے مجھ سے نمٹ لو۔ رضیہ کی باری تو بعد میں آئے گی۔" یہ کہہ کر میں نے اس کے زخمی چہرے پر لگاتار گھونسوں کی بارش کر دی۔ اس نے مدافعت میں دونوں ہاتھ اٹھائے مگر وہ میرے حملوں کو روکنے میں ناکام رہا۔ چند لمحے بعد وہ بھی فرش پر شیریں کے برابر بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے مکمل طور پر ناک آؤٹ کر دیا تھا۔ شاید غصے کی وجہ سے میرے گھونسوں میں زیادہ قوت پیدا ہو گئی تھی ورنہ وہ اتنا کمزور حریف بھی نہیں تھا۔ اس نے رضیہ پر ہاتھ اٹھانے کا ارادہ ظاہر کر کے مجھے مشتعل کر دیا تھا، لیکن اب سوچنا یہ تھا کہ اگلا قدم کیا ہو؟

یہ مجھے معلوم تھا کہ ملک منصور کے کارندوں نے چوہدری کے ٹھکانے پر حملہ کیا تھا اور بقول بازخاں وہ لوگ بھاری جانی نقصان اٹھانے کے بعد پسپا ہو گئے تھے۔ اس حملے میں یقیناً چوہدری کے آدمیوں کا بھی نقصان ہوا ہوگا۔ اور اب جبکہ وہ اپنے دشمنوں پر قابو پانے میں کامیاب ہو چکا تھا اس کا پارہ اور اونچا چڑھ چکا ہوگا۔ اسی لیے تو اس نے بازخاں کے ذریعے مجھے طلب کیا تھا۔ اس کی دانست میں فی الحال میں ایک شکست خوردہ اور بے سہارا انسان تھا، لیکن یہاں صورتحال یہ تھی کہ اس کی نازوں کی پلی لاڈلی بیٹی مار کھا کر بے ہوش پڑی ہوئی تھی جبکہ اس کا منہ چڑھا دستِ راست بازخاں بہت ناگفتہ بہ حالت میں ہوش و حواس سے بے گانہ ہو چکا تھا۔ ظاہر تھا کہ چوہدری اس صورتحال کو دیکھ کر مزید غضب ناک اور مشتعل ہوتا اور غیظ و غضب کے عالم میں خدا جانے ہمارے بارے میں کیا فیصلہ کرتا۔ رضیہ نے جتنی کم مدت میں شیریں کو زیر کیا تھا میں نے بازخان کو ناک آؤٹ کرنے میں ——— اس سے بھی کم وقت صرف کیا تھا۔ اب ہم دونوں اپنے حریفوں کے بے ہوش جسموں کو دیکھ رہے تھے اور یہ سوچ رہے تھے کہ ہماری یہ فتح ہمارے لیے اب کون سی آفت لانے کا موجب بنے گی۔؟

میں نے آگے بڑھ کر کمرے کا دروازہ بند کر دیا تاکہ کسی اچانک آنے والے کی نظر بے ہوش شیریں اور بازخاں پر نہ پڑ سکے۔ پھر میں نے صوفے پر اطمینان سے بیٹھ کر صورتِ حال کا جائزہ لینا شروع کیا۔ وقت بہت کم تھا۔ اگر میں

چوہدری کے پاس نہ پہنچا تو وہ یقیناً آگ بگولا ہو کر خود ہی آ جائے گا اور موجودہ نقشہ اُسے کسی صورت میں بھی پسند نہیں آئے گا۔ رضیہ بڑی معصومیت سے آکر صوفے پر میرے برابر بیٹھ گئی تھی اور کوئی اندازہ بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس معصوم سی بھولی بھالی لڑکی نے کچھ دیر پہلے مارشل آرٹ کا قابل دید مظاہرہ پیش کیا تھا۔

"اب کیا کریں؟" وہ بے تکلفی سے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر پوچھنے لگی۔

حالانکہ یہی سوال میں اس سے دریافت کرنے والا تھا۔ میں جواب میں اس کو خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگا۔

"ملک نے مجھے آزاد کرانے کے لیے اپنے بندے بھیجے ہوں گے۔" اس نے گویا بلند آواز میں سوچنے کی کوشش کی۔

"ہاں یہ بہت ممکن ہے۔ دیکھو نا۔ وہ اپنی بیوی کو کسی غیر کے قبضے میں کیوں کر دیکھ سکتا ہے جبکہ وہ اسے اپنا مضبوط اور طاقت ور حریف بھی سمجھتا ہے۔ ظاہر ہے وہ اس بات سے بے خبر ہے کہ یہاں ملک منصور کے بہروپ میں کوئی اور شخص بھی موجود ہے۔"

"ملک منصور ایک غیرت مند آدمی ہے۔" رضیہ بولی۔ "وہ یہ بے عزتی بھی گوارہ نہیں کرے گا۔ اس کے آدمی دوبارہ حملہ کریں گے اور ہو سکتا ہے اس بار وہ خود بھی اُن کے ساتھ آئے۔"

"لیکن کب؟" میں نے سوال کیا۔ "ظاہر ہے وہ فوری طور پر تو یہ کارروائی نہیں کرے گا۔ اس اثناء میں یہ لوگ ہمارے ساتھ جو سلوک کریں گے اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے اور اب تو اپنی فتح کی وجہ سے ان کے حوصلے اور زیادہ بلند ہو چکے ہیں۔"

رضیہ خاموش ہو گئی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ بھی میرے خیال سے متفق تھی۔

"فی الحال ایک ہی ترکیب ہو سکتی ہے۔" میں نے اچانک اسے مخاطب کیا۔

"وہ کیا؟"

"ہم چوہدری کو ناراض نہ ہونے دیں اور مناسب وقت اور موقعے کا انتظار کریں۔"

وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ "کیسی باتیں کرتے ہو۔ اپنی بیٹی اور ملازمِ خاص کو اس حالت میں دیکھنے کے بعد بھلا وہ ناراض نہ ہو گا؟"

"یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں۔ اسے ان لوگوں کی حالت کے بارے میں فی الحال پتہ ہی نہیں چلنا چاہیئے۔"

اس نے اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں سوالیہ انداز میں میری طرف اُٹھائیں۔ "وہ کیسے؟"

"اگر باز خاں واپس نہ پہنچا تو وہ خود یہاں آئے گا۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ میں اس کے آنے سے پہلے خود ہی وہاں چلا جاؤں۔"

رضیہ نے پریشانی سے شیریں اور باز خاں کی جانب دیکھا۔

"ان کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔" میں نے صوفے سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "تمہارے پاس کوئی مضبوط ازار بند ہو گا؟"

"ازار بند؟" وہ حیران ہو کر بولی۔ مگر پھر میرا مطلب سمجھ گئی اور اپنے سوٹ کیس کی طرف بڑھی۔ اس نے دو ریشمی ازار بند میرے حوالے کیے جو اس وقت میرے لیے آہنی زنجیروں سے زیادہ کارآمد تھے۔ میں نے پہلے تو باز خاں کے ہاتھ مضبوطی سے کس کر باندھے اور پھر دوسرے ازار بند سے شیریں کے بازو کس دیے۔ ان کے منہ میں کپڑا اٹھونسنے کے بعد میں نے ان دونوں کا جائزہ لیا۔ وہ ابھی تک بیہوش تھے اور ان کے جلد ہوش میں آنے کا کوئی امکان بھی نہیں تھا۔ پھر بھی یہ کارروائی میں نے احتیاط کے طور پر کی تھی۔ مجھے یہ اطمینان تھا کہ اگر ان دونوں میں سے کسی نے ہوش میں آنے کے بعد پیروں سے چل کر کمرے سے باہر جانے کی کوشش کی تو رضیہ انہیں روکنے کی قدرت رکھتی ہے۔

"دیکھو رضیہ۔" میں نے اسے ہدایات دیں۔ "ان کی آواز نہ نکلنے پائے۔ اگر یہ اُٹھ کر باہر جانے کی کوشش کریں تو تم جو سلوک مناسب سمجھو ان کے ساتھ کرنا۔ باہر سے کوئی دروازہ کھولنے کے لیے کہے تو میرے سوا کسی اور کے لیے ہرگز دروازہ نہ کھولنا۔ اگر میں آدھے گھنٹے تک واپس نہ آیا تو سمجھ لینا کہ کسی مصیبت سے دوچار ہو گیا ہوں۔ پھر تم اپنی حفاظت اور سلامتی کے لیے جو فیصلہ کرنا چاہو اس کے لیے آزاد ہو گی۔"

اس کی آنکھوں میں پریشانی کے سائے لہرانے لگے اور پھر اس کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ صورت حال کی سنگینی کا اُسے بھی احساس تھا، لیکن میں نے جس انداز سے اسے مستقبل کے امکانات سے آگاہ کیا تھا اس کے پیش نظر اس کی تشویش میں اضافہ ہونا لازمی تھا۔ وہ بے اختیار میرے قریب آ گئی۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور بولی۔ "مجھے یہاں ڈر لگے گا۔ مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔" اس وقت وہ ایک سہمی ہوئی معصوم اور بے بس بچی نظر آ رہی تھی۔ مجھے اس پر بے اختیار ترس اور پیار آ گیا۔ عام حالات میں وہ ایک بہادر اور بے خوف عورت تھی۔ اس میں خود اعتمادی کی بھی کمی نہیں تھی، لیکن موجودہ حالات میں کوئی آہنی اعصاب رکھنے والا مرد بھی ریزہ ریزہ ہو سکتا تھا۔ وہ تو پھر ایک عورت تھی۔

"سنو رضیہ۔" میں نے اس کا ہاتھ پیار سے تھپک تھپایا۔ "تم جانتی ہو کہ میں تمہیں اس وقت اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔ میں خود نہیں جانتا کہ مجھے وہاں کن حالات سے دوچار ہونا پڑے گا اور پھر میرے خیال میں اس کمرے میں تم فی الحال محفوظ ہو۔" اس وقت مجھے اپنے پاس اسلحہ کی غیر موجودگی کا بہت شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ "خدا پر بھروسہ رکھو۔ میں تمہاری حفاظت کی گارنٹی تو نہیں دے سکتا لیکن یقین رکھو جہاں تک میرے بس میں ہو گا میں تمہیں محفوظ رکھنے کی کوشش کروں گا۔ اب پریشانی چھوڑ دو۔ مجھے مسکرا کر رُخصت کرو اور یہ نہ بھولو کہ اس وقت ہم دونوں ایک ہی کشتی میں سوار ہیں اور یکساں خطرات سے دوچار ہیں۔"

میری اس مختصر سی تقریر نے اس کا مورال بلند کرنے میں کافی مدد کی۔ وہ بے ساختہ مسکرانے لگی حالانکہ اس کی خوبصورت سیاہ آنکھوں میں آنسوؤں کے موتی بھی جھلملا رہے تھے۔ اس لمحہ وہ مجھے بے حد پیاری اور معصوم لگی۔

"اچھا۔ میرا زیادہ دیر یہاں رُکنا مناسب نہیں ہے۔ خدا حافظ۔" میں اس سے اپنا ہاتھ چھڑا کر تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ باہر نکلنے ہی والا تھا کہ اسکی نرم آواز نے مجھے رُکنے پر مجبور کر دیا۔

"سنو۔" وہ تیزی سے لپکتی ہوئی میرے نزدیک آ گئی۔ "خدا جانے اس کے بعد ہم ملیں یا نہ ملیں، لیکن یہ نہ بھولنا کہ میں جب تک زندہ رہوں گی تمہیں یاد رکھوں گی۔ تم ایک شریف اور بہادر انسان ہو۔ میں نے تمہاری طرح کا آدمی اس سے پہلے نہیں دیکھا۔"

میں خاموشی سے اس کے چہرے کو تکتا رہا۔

"ملک منصور سے میری شادی ضرور ہوئی ہے، لیکن صرف کاغذی حد تک۔ مجھے وہ کبھی پسند نہ تھا اور نہ میں اس کے ساتھ زندگی گزارنا پسند کرتی ہوں۔ اگر کبھی مجھے انتخاب کرنے کا حق اور موقعہ ملا تو میں تمہیں اپنا جیون ساتھی بنانا پسند کروں گی۔"

اس کا یہ اعلان میرے لیے قطعی خلافِ توقع تھا۔

"اب تم جاؤ۔" اس نے مسکرا کر اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کی۔ "اور ہاں۔ جانے سے پہلے اپنا نام تو بتا جاؤ۔"

"میرا نام یوسف ہے۔" میں نے کہا۔ "میں ایک بدنام آدمی ہوں اور تم نے جس قدر تعریف کی ہے اس کا مستحق نہیں ہوں پھر بھی شکریہ۔" میں تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ اپنے پیچھے میں نے کمرے کا دروازہ مقفل ہونے کی آواز سنی۔ میں

جانتا تھا کہ اب یہ دروازہ میرے سوا کوئی اور بہت مشکل سے کھلوا سکے گا۔

گیلری میں پہنچ کر چند قدم چلنے کے بعد میں ٹھٹک کر رُک گیا۔ اس بھول بھلیاں میں چوہدری کے کمرے تک پہنچنا میرے لیے بالکل ناممکن تھا۔ اس مسئلے پر میں نے غور ـــــ ہی نہیں کیا تھا۔ میں چند لمحے خاموش کھڑا سوچتا رہا۔ گیلری بالکل سنسان تھی۔ آس پاس کسی کی موجودگی کے آثار نہیں تھے۔ میرا چوہدری کے پاس بلا تاخیر پہنچنا بھی ضروری تھا لیکن مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ چوہدری کا کمرہ مشرق میں ہے یا مغرب میں؟ قدموں کی ہلکی سی چاپ سنائی دی اور میں چونک کر کھڑا ہو گیا۔ کوئی نہایت سُبک قدموں سے آ رہا تھا۔ میرا گیلری میں بے مقصد کھڑا رہنا بھی مناسب نہیں تھا اس لیے میں نے آہستگی سے اس جانب چلنا شروع کر دیا جس طرف سے قدموں کی آہٹ سنائی دے رہی تھی۔ یکایک گیلری کے ایک موڑ سے لالی نمودار ہوئی۔ اسکے ہاتھ میں ایک زنانہ لباس تھا۔ مجھے اچانک سامنے دیکھ کر وہ رُک گئی۔

"آپ؟" اس کو اُمید نہیں تھی کہ میں اس طرح اسے تنہا گیلری میں گھومتا ہوا نظر آ جاؤں گا۔

"لالی۔ اچھا ہوا تم مل گئیں۔" میں نے مسکرا کر اپنی شخصیت کی تمام ترکشش استعمال کی "مجھے چوہدری صاحب کے کمرے میں جانا ہے۔ اور تم جانتی ہو کہ میں ان راستوں میں بھٹک جاتا ہوں۔"

اسے میری اس کمزوری کا بخوبی علم تھا۔ ہنستے ہوئے بولی "ملک صاحب۔ آپ اکیلے تو ایک سال تک بھی وہاں نہیں پہنچ سکتے۔ چوہدری جی نے کسی کو آپ کو بلانے کے لیے تو بھیجا ہو گا۔"

"بھیجا تو تھا۔" میں نے حاضر جوابی سے کام لیا۔ "بازخان ان کا پیغام لے کر آیا تھا مگر اس وقت میں غسل خانے میں تھا مجھے یاد ہی نہیں رہا کہ میں تو راستہ بھول جاتا ہوں ورنہ اسے روک لیتا۔"

وہ خوش دلی سے مسکرائی "آیئے میرے ساتھ۔ آپ کو تو انگلی پکڑ کر چلانا چاہیئے ملک صاحب۔" وہ ایک شوخ و چنچل لڑکی تھی اور خاصی دلکش اور بے تکلف بھی تھی۔ غالباً شیریں کے قریب ہونے کی وجہ سے اسے حویلی میں ایک خصوصی حیثیت حاصل تھی۔ ویسے بھی حویلیوں کی چار دیواری میں پلنے اور رہنے والی خوبصورت ملازمائیں عموماً مُنہ چڑھی اور شوخ و شریر ہوتی ہیں۔ لالی بھی ان ہی میں سے تھی۔ خدا جانے وہ تعلیم یافتہ تھی یا نہیں، لیکن وہ بہرحال ایک تمیز دار اور تہذیب یافتہ لڑکی تھی۔ شیریں کی قربت کی وجہ سے اس نے بہت سی اچھی اور پسندیدہ عادتیں سیکھ لی تھیں یہی وجہ ہے کہ اس سے گفتگو کرنے کے بعد فرحت کا احساس ہوتا تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ روزِ اوّل ہی سے مجھ پر مہربان تھی اور موقعہ پانے پر اپنی مسکراہٹیں بکھیرنے سے باز نہیں آتی تھی۔ اس وقت بھی وہ مسکراتی لچکتی اور ہنستی ہوئی میرے ساتھ چل رہی تھی۔ اس کی چال میں بھی اس کی آواز کی طرح شائستگی اور دلکشی تھی۔ چوہدری کی حویلی میں جہاں بازخان جیسے بدتمیز اور اُجڈ ملازم بھی موجود تھے لالی جیسی نوکرانی کا ہونا خاصا تعجب خیز تھا۔

چلتے چلتے اس نے اپنی رفتار کم کی اور سرگوشی کے انداز میں مجھ سے مخاطب ہوئی "ملک صاحب۔ شیریں بی بی بھی آپ سے ملنے کے لیے گئی تھیں۔ کیا وہ آپ کی بیگم صاحب کے پاس ہیں؟"

اس اچانک سوال نے مجھے گھبرا دیا "شیریں؟! وہ میرے کمرے میں آئی تو تھیں مگر پھر بازخان کے ساتھ ہی چلی گئیں۔"

لالی کے چہرے پر سُرخی کی جھلک نمودار ہوئی۔ اس نے کنکھیوں سے میری جانب دیکھا۔ اس کے لب کانپ کر رہ گئے، یوں لگا جیسے وہ کچھ کہتے کہتے رُک گئی ہے۔

میں نے اپنائیت کے لہجے میں کہا "جو کہنا چاہتی ہو کہہ دو لالی۔ میں تمہاری کسی بات کا بُرا نہیں مناؤں گا۔"

اس نے اپنی رفتار اور کم کر دی اور آس پاس دیکھ کر سرگوشی میں کہنے لگی "ملک صاحب۔ کیا آپ کی ایک ہی بیوی ہے ـــ؟"

میں اس سوال کی نوعیت سے بھونچکا رہ گیا۔ اس قسم کی گفتگو کا نہ تو موقعہ محل تھا اور نہ ہی اس قسم کا کوئی موضوع

زیرِ بحث تھا۔

"تم یہ سوال کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"آپ ناراض تو نہیں ہو جائیں گے نا؟" اس نے رازداری سے پوچھا۔

"بالکل نہیں۔ میں نے کہا نا کہ میں تمہاری کسی بات کو ناپسند نہیں کروں گا۔"

"وہ جی۔ بات تو اچھی نہیں ہے مگر بتائے بغیر بھی گزارہ نہیں ہے ملک جی۔ ہماری شیریں بی بی کی ابھی تک شادی نہیں ہوئی ہے۔"

"اچھا؟!" میں نے بے نیازی سے کہا۔

"انہیں کوئی رشتہ پسند ہی نہیں آتا۔ بڑے بڑے لوگ ان سے شادی کرنے کی آس میں بیٹھے ہیں پر ان کی نظروں میں کوئی نہیں جچتا۔ مگر ملک صاحب۔ آپ ان کو پسند آ گئے ہیں۔"

میں چلتے چلتے اچانک رُک گیا۔ یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ اس کا یہ انکشاف میرے لیے انتہائی حیرت کا باعث تھا۔

"ایمان سے سچ کہہ رہی ہوں۔ اگر آپ ان سے بیاہ کر لیں تو کتنا اچھا ہو۔ یہ ساری جائیداد۔ زمینیں۔ کاروبار سب کی مالک شیریں بی بی کو ہی ہونا ہے ایک دن۔ چوہدری جی تو ان کی کسی بات کو رد نہیں کرتے۔"

"سنو لالی۔ تم نے صاف بات کی ہے تو میں بھی تم سے صاف بات کروں گا۔ تمہاری شیریں بی بی بہت خودسر، ضدی اور ہٹ دھرم ہیں۔ دولت اور بے جا لاڈ نے اس کو بگاڑ دیا ہے۔ وہ کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتیں۔ ہر ایک کو اپنے اشارے پر چلانا چاہتی ہیں۔ انہیں شوہر کی نہیں ایک تابعدار ملازم کی ضرورت ہے۔ جو ان کے ہر حکم پر سر جُھکا دے ـــــ جیسے بازخان۔"

میرے آخری فقرے نے اُسے چونکا دیا۔ اُس نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا اور بولی "آپ کو کس نے بتایا؟"

"کیا کس نے بتایا؟"

"کہ بازخاں اور شیریں بی بی....."

"میں نے دُنیا دیکھی ہے لالی۔ اُڑتی چڑیا کے پَر گن کر بتا سکتا ہوں اور بازخاں اور شیریں کو دیکھ کر تو کوئی اندھا ہی ہو گا جو ان کے آپس کے تعلقات کو نہ جان سکے۔"

"میں نے تو بہت منع کیا ملک صاحب۔" وہ شکایت بھرے لہجے میں بولی "پر شیریں بی بی کسی کی سنتی ہیں بھلا۔"

"اور تم اُنہیں میری بیوی بنانا چاہتی ہو؟"

وہ شرمندہ سی ہو گئی۔ نظریں جُھکا کر بولی "میں تو..... میں نے یہ بات اپنی طرف سے نہیں کہی ملک جی۔ شیریں بی بی کے اشارے پر بات چھیڑی ہے۔ ان کی طبیعت کڑوی اور سخت ہے۔ وہ اپنی بات منوائے بغیر بھی نہیں رہتیں۔ جو پسند آ جائے اسے بے دھڑک اپنا بھی لیتی ہیں۔ پر ایک بات میں آپ کو بتا دوں۔ آپ میں جو بات ہے وہ کسی اور میں نہیں دیکھی۔ آپ سچ مچ شیریں بی بی کے من کو بھا گئے ہیں۔ انہوں نے کبھی کسی کی بات نہیں سُنی۔ ذرا سی خلافِ مرضی بات بھی برداشت نہیں کرتیں۔ وہ تو چوہدری صاحب کی اونچی آواز بھی نہیں سنتیں مگر آپ میں نہ جانے کیا بات ہے کہ آپ کی کڑوی کسیلی بھی سُن کر برداشت کر لیتی ہیں۔ جس طرح سرکس کے لوگ شیروں کو سُدھا لیتے ہیں آپ بھی اسی طرح شیریں بی بی کو سیدھا کر سکتے ہیں۔"

"دیکھو لالی۔ نہ میں سرکس کا مالک ہوں اور نہ مجھے شیرنیاں پالنے کا شوق ہے اور پھر میں ہرجائی اور دل پھینک عورتوں کو پسند بھی نہیں کرتا۔ مجھے تو صرف وہی عورت بھاتی ہے جو میرے سوا کسی اور کے لیے سوچے بھی نہیں۔"

اس نے مایوسی سے سر ہلایا اور کہنے لگی "میں تو پہلے ہی جانتی تھی۔ میں نے بی بی سے کہا بھی تھا کہ ان تلوں میں تیل

نہیں ہے پر وہ کب سُنتی ہیں کسی کی۔ آپ سچے اور کھرے مرد ہیں۔ آپ بھلا ایسا رشتہ کیسے پسند کر سکتے ہیں؟" پھر کچھ سوچ کر بولی "ایک بات کہوں ملک صاحب؟"

"کہو۔"

"شیریں بی بی کو کبھی کسی نے نہیں ٹھکرایا۔ وہ زہریلی ناگن بن کر آپ سے بدلہ لیں گی ـــــ ہار ماننی تو اُنہیں آتی ہی نہیں۔"

"ٹھیک کہتی ہو۔" میں نے مختصراً جواب دیا۔

"اور آپ باز خاں سے بھی ہوشیار رہیں۔ وہ بہت کینہ پرور اور کمزور آدمی ہے۔ آپ نے اس کی جو بے عزتی کی ہے ساری حویلی میں اس کی خبر مشہور ہو گئی ہے۔ وہ تو کسی کو مُنہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔ آج تک کبھی کسی نے اس کو نیچا نہیں دکھایا تھا۔"

اُس نے تعریف بھری نظروں سے مجھے دیکھا اور میرے قریب آ گئی "آپ بہت جی دار بندے ہیں ملک صاحب۔ جس کا آپ جیسا مرد ہو اسے اور کیا چاہیئے۔"

اس کی آواز میں لرزش سی تھی جو اس کے جذبات کی عکاس تھی۔ یہ بیوقوف مجھ سے کچھ زیادہ ہی مرعوب او[ر متاثر] ہو گئی تھی۔ مجھے اُس کی جانب سے کوئی خطرہ بھی نہیں تھا۔ بلکہ وہ ضرورت کے وقت میرے کام آ سکتی تھی۔ اس لیے میں نے اُس کی دل شکنی کرنا خلافِ مصلحت سمجھا۔ میں نے مسکرا کر اسکی طرف دیکھا اور پوچھا "چوہدری صاحب کا کمرہ کتنی دُور ہے لالی۔ یوں لگتا ہے جیسے ہم کسی دوسرے گاؤں جا رہے ہیں؟"

وہ یوں چونکی جیسے کوئی خواب دیکھ رہی تھی۔ پھر ارد گرد دیکھ کر کہنے لگی "مجھے تو دھیان ہی نہیں رہا تھا چوہدری جی کا کمرہ تو دوسرے برآمدے میں ہے۔ آئیے۔"

وہ پلٹی اور تیز تیز قدموں سے چلنے لگی۔ یوں لگا جیسے اس کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا کہ وہ غیر ضروری طور پر بعض نہ کہنے والی باتیں بھی مجھ سے کہہ گئی تھی۔ اُس نے مجھ سے جو باتیں کی تھیں وہ میرے لیے انجانی نہیں تھیں، لیکن پھر بھی لالی کی زبان سے وہ حقیقتیں سُن کر مجھے یک لخت ایک توانائی اور سکون کا سا احساس ہونے لگا۔ نہ جانے کیوں میرا دل کہہ رہا تھا کہ اس اجنبی اور غیر مانوس ماحول میں اگر کبھی کسی سہارے کی ضرورت پیش آئی تو لالی میرا سہارا بن سکتی ہے۔

چوہدری کے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر لالی رُک گئی۔ "یہ رہا چوہدری جی کا کمرہ۔ اب تو آپ اپنی منزل تک پہنچ جائیں گے نا؟" وہ شوخی سے مسکرائی اور رُخصت ہو گئی۔

میں نے دروازے پر دستک دینے سے پہلے اپنے آپ کو نئی صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کیا اور پھر دروازہ کھٹکھٹانے کے لیے ہاتھ بڑھایا، لیکن اس سے پہلے ہی دروازہ اچانک کھل گیا اور میرا ہاتھ اُٹھے کا اُٹھا رہ گیا۔ دروازہ کھولنے والا ایک ہٹا کٹا، خوفناک صورت کا آدمی تھا جس کے کاندھے پر لٹکی ہوئی بندوق میں صاف طور پر دیکھ سکتا تھا۔ وہ بہت جلدی میں نظر آتا تھا۔ مجھے دیکھا تو اس کے کرخت چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ پیچھے کی جانب مُنہ موڑ کر بلند آواز میں بولا "لیجئے چوہدری صاحب۔ آپ کے مہمان خود ہی آ گئے ہیں۔" میں کمرے میں داخل ہُوا تو بائیں جانب ایک بڑے سے ریشمی صوفے پر بیٹھا ہُوا چوہدری مجھے نظر آ گیا۔ وہ صوفے پر دونوں ٹانگیں پھیلا کر نیم دراز تھا۔ برابر میں پیچوان رکھا ہوا تھا جس کی نَے اس کے ہاتھ میں تھی۔ کمرے میں اُن دونوں کے سوا کوئی تیسرا نہ تھا۔ میرے داخل ہوتے ہی بندوق والے کرخت چہرہ شخص نے دروازہ بند کر دیا اور اس کے سامنے جم کر کھڑا ہو گیا۔ چوہدری نے مجھے دیکھنے کے بعد بھی اپنی ٹانگیں نہیں سمیٹیں۔ اس کے چہرے پر غصّے اور برہمی کے آثار صاف نمایاں تھے۔

"بہت دیر کر دی ملک تم نے۔" وہ بگڑ کر بولا "میں نے باز خاں سے کہا تھا کہ تمہیں فوراً لے کر آئے۔"

اُس کے اس پُر رعونت طرزِ عمل نے میرے سارے جسم میں چنگاریاں سی بھر دیں، لیکن میں نے ضبط کیا اور اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا "میں ذرا مصروف تھا چوہدری اور شاید تم بھی اپنے نقصان کا اندازہ لگانے میں مصروف ہو گئے۔"

اس نے یک لخت ٹانگیں سمیٹ لیں اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ "ملک شاید تم مجھ سے واقف نہیں ہو۔ ورنہ اس انداز میں بات نہ کرتے۔ نقصان کا حساب تو تمہیں لگانا پڑے گا۔ بشرطیکہ تم یہاں سے اپنے گھر واپس پہنچ جاؤ۔ تمہارے بھگوڑے بھاری نقصان اُٹھا کر گئے ہیں۔ اپنی لاشیں بھی ساتھ لے گئے ہیں۔ مگر ان کی تعداد دس بارہ سے کم نہیں ہے۔ انہوں نے اپنے دل کی حسرت پوری کر لی۔ اب میری باری ہے۔"

"کیا تم میری حویلی پر حملہ کرو گے چوہدری؟" میں نے انجان بن کر پوچھا "مگر میں تو یہاں موجود ہوں۔ وہاں تمہارے ہاتھ کیا آئے گا؟"

"ٹھیک کہتے ہو۔" وہ زہر بھرے انداز میں ہنسا "جس چیز کی مجھے ضرورت ہے وہ تو یہیں موجود ہے۔ میری حویلی میں۔ بلکہ تمہاری ساری کائنات اس وقت میری مُٹھی میں ہے۔ تم خود۔ تمہاری سوہنی بیوی۔ تمہارا سب سے نامی گرامی بدمعاش ساکا۔ باقی جو رہ گیا ہے وہ تو نرا گھاس پھوس ہے۔" پھر وہ دروازے میں کھڑے پہریدار سے مخاطب ہُوا "گامے ملک کو بتا۔ کتنا نقصان ہوا ہے اس کے بندوں کا۔"

گامے نے دانت نکال کر فاتحانہ انداز میں کہا "بس جی۔ اب کبھی ادھر آنے کی غلطی نہیں کریں گے۔"

"اور ساکے کا کیا حال ہے؟ وہ بھی بتا دے۔"

"توبہ توبہ کر رہا ہے چوہدری جی۔ کہتا ہے لعنت بھیجتا ہوں ملک منصور پر۔ وہ تو کہتا ہے میں چوہدری کا غلام بننے کو تیار ہوں۔"

میں اطمینان سے صوفے پر بیٹھ گیا اور میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا "تو پھر اپنی غلامی میں لے لو چوہدری بہت کام کا بندہ ہے۔ خدمت کرے گا تمہاری اس عمر میں۔"

چوہدری میرے جملے کا مطلب سمجھ گیا۔ غصّے سے تن تناتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھیں شعلے برسانے لگیں اور وہ گرج کر بولا "ملک۔ تیری یہ مجال۔ میری ہی حویلی میں میری بے عزتی کر رہا ہے؟"

"میں نے کیا کہا ہے چوہدری؟" میں نے معصومیت سے کہا "غلامی والی بات تو گامے نے کی تھی۔"

"گامے۔" چوہدری دھاڑا۔ "اس کو مزہ چکھا دے۔"

گامے نے بندوق کندھے سے اُتار کر ایک صوفے پر رکھ دی اور بازو پھیلا کر میری طرف بڑھا "اُٹھ جا اوئے۔ کھڑا ہو جا۔" وہ اپنی اصلیت پر آ گیا تھا۔

میں اس جگہ مطمئن بیٹھا تھا اور اس کے ڈیل ڈول کے پیشِ نظر یہ اندازہ لگانے میں مصروف رہا کہ وہ کتنا پھرتیلا ہو سکتا ہے۔ اس کی چال میں مست ہاتھی کی طرح ٹھہراؤ تھا۔ وہ ایک تنومند اور بھاری بھرکم آدمی تھا اور اس کے جسم میں چستی اور پھرتی کا نام و نشان تک نہ تھا۔

"اوئے اُٹھ۔ کھڑا ہو جا۔ میں نے کیا کیا ہے؟ سُنا ہے تو نے؟" وہ بڑھتا ہوا میرے صوفے کے برابر آ گیا تھا اور یہی اُس کی دوسری غلطی تھی۔ پہلی غلطی اُس نے یہ کی تھی کہ اپنی بندوق اُتار کر صوفے پر رکھ دی تھی جو میری پہنچ سے زیادہ دُور نہیں تھی۔ میں نے بیٹھے ہی بیٹھے اپنی دائیں ٹانگ گھمائی اور اس کے چہرے پر دے ماری۔ وہ اس حملے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا ایک زوردار دھماکے کی آواز آئی اور وہ اُلٹ کر قالین پر جا گِرا۔ اس کے اُٹھنے سے ـــــ چند ہی لمحے پہلے میں اپنی جگہ سے چھلانگ لگا چکا تھا اُچھل کر میں پورے وزن کے ساتھ اُس کی کمر پر جا

گرا اور اس کے مُنہ سے زوردار چیخ نکل گئی۔ شاید اس کی کمر کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ مَیں اسے بلبلاتا ہوا چھوڑ کر سامنے والے صوفے کی طرف لپکا اور دوسرے ہی لمحے اس کی بندوق میرے ہاتھ میں تھی۔ یہ ایک سٹین گن تھی اور مَیں نے یہ چیک کرنے میں ذرا بھی تاخیر نہیں کی کہ وہ گولیاں برسانے کے لیے پوری طرح بھری ہوئی تھی۔ سٹین گن کو ہاتھوں میں تولتا ہوا مَیں دوبارہ چوہدری کی جانب بڑھا جو حیرت سے آنکھیں پھاڑے بیٹھا تھا۔ اس کا مُنہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ شاید اُسے اپنی بصارت پر یقین نہیں آرہا تھا۔ پلک جھپکنے میں بازی پلٹ گئی تھی اور اب طاقت کا توازن میرے حق میں ہو گیا تھا۔ مَیں اس کے سامنے والے صوفے پر جا کر بیٹھ گیا۔

"اب کہو چوہدری۔ کیا کہنا چاہتے تھے؟"

چوہدری اب تک اپنے اعصاب پر قابو پانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا اور پلک جھپکائے بغیر مجھے تک رہا تھا۔ "تمہارے یہ پالتو کُتّے صرف بھونکنے والے کُتّے ہیں۔ میری مانو تو اچھی قسم کے شکاری کُتّے رکھو۔ کہو تو مَیں اعلیٰ نسل کا ایک جوڑا تمہیں بھجوا دوں؟"

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہے۔ وہ صرف تھوک نگل کر رہ گیا۔

"میرا خیال ہے بات چیت کا فیصلہ کرنے کے لیے یہ بہت اچھا موقع ہے۔" مَیں نے اپنی دونوں ٹانگیں صوفے پر پھیلا دیں۔ "تم جانتے ہو کہ ایک میان میں دو تلواریں اور ایک جنگل میں دو شیر نہیں رہ سکتے۔ اس علاقے میں بھی دو چوہدری اور دو ملک نہیں رہ سکتے۔ یہاں ہم دونوں میں سے کوئی ایک ہی رہ سکتا ہے۔ اس لیے اپنی زمین اور جنگل فروخت کرنے کے بارے میں کیا خیال ہے تمہارا؟"

وہ غصّے سے بَل کھا کر اُٹھ کھڑا ہُوا۔ "کیا بک رہے ہو؟"

"بکنہیں رہا، فرما رہا ہوں اور تمہیں میرا مشورہ ہے کہ اس کے بعد جو بھی بولو سوچ کر بولنا۔ ایسا نہ ہو دوبارہ بولنے کے قابل ہی نہ رہو۔" مَیں نے سٹین گن اٹھا کر اپنی رانوں پر رکھ لی اور معنی خیز انداز میں اس پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ چوہدری کے چہرے پر خوف کے آثار نمودار ہو گئے۔ وہ اس وقت ایک ہارے ہوئے جواری کی حیثیت میں تھا اور جانتا تھا کہ فی الوقت وہ شو کرانے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔

چشمِ زدن میں وہ جیتی ہوئی بازی ہار گیا تھا۔ اس نے بڑے طمطراق سے مجھے طلب کیا تھا۔ وہ اپنی شرائط مجھ سے منوانا چاہتا تھا۔ میری بے بسی اور شکست کا مذاق اُڑانا چاہتا تھا۔ مجھے ذلیل و خوار کرنے کا خواہش مند تھا، لیکن اُسے تقدیر کے فیصلے کا علم تھا نہ میری صلاحیتوں کا اندازہ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اب بیوقوفوں کی طرح بیٹھا میری شکل دیکھ رہا تھا۔

"سُنا ہے تم میری بیوی سے شادی کرنا چاہتے ہو؟" مَیں نے طنزیہ انداز میں سوال کیا۔ "اور تم نے اسے دھمکی دی ہے کہ تم جو چاہتے ہو حاصل کر لیتے ہو؟"

وہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ اس کے پاس میرے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا اور وہ اس وقت میرے سامنے اپنے سوال دہرانے کی جرأت بھی نہیں رکھتا تھا۔ مجھے اس کو اذیت پہنچا کر اور ذلیل کر کے ایک عجیب قسم کی مسرّت کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ جو کچھ دیر پہلے مختارِ مطلق تھا اور جس کے ایک اشارے پر اس تمام علاقے میں ہر چیز زیر و زبر ہو سکتی تھی۔ ہر شخص اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا تھا۔ ہر شخص کی قسمت کا فیصلہ اس کے قبضۂ قدرت میں تھا۔ اب وہ ایک سہما ہُوا بے بس انسان تھا جو مجھ سے رحم کا طالب تھا۔ قدرت نے انسانوں کو کس قدر قوت اور اختیار عطا کیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس کو کتنا بے بس اور کمزور بھی بنایا ہے۔ شاید یہ ثابت کرنے کے لیے کہ انسان کو ہر چیز، ہر طاقت، ہر اختیار، ہر قوت و قدرت صرف خدائے ذوالجلال کی مہربانی سے حاصل ہوتی ہے۔ وہ بذاتِ خود ایک کمزور اور بے اختیار مخلوق ہے۔ اس کو اپنی یہ حقیقت کبھی نہیں فراموش کرنی چاہیئے۔ اس کے باوجود چوہدری جیسے بعض کم ظرف لوگ اپنی اوقات

اور حیثیت بھول جاتے ہیں۔ خدا کی قدرت ہر روز ہم انسانوں کو یہ تماشہ دکھاتی ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ہدایت کرتا ہے کہ عیش میں خوفِ خدا کو اور طیش کے عالم میں خدا کی رضا کو نہ بھولو۔ مگر ہم میں سے کتنے ہیں جو اس کو یاد رکھتے ہیں؟

چوہدری جس رعونت اور فرعونیت کا مظاہرہ کرتا رہا تھا اس کے پیشِ نظر اس وقت اس کو اپنے سامنے بے بس اور مجبور پا کر مَیں ایسی روحانی اور دلی طمانیت محسوس کر رہا تھا۔ جیسا کہ مَیں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں، اپنی قبیل کے دوسرے رعونت اور مغرور انسانوں کی طرح چوہدری بھی درحقیقت ایک انتہائی بزدل اور پست ہمّت انسان تھا۔ ایسے لوگوں کی بہادری محض قوت، اختیار کی محتاج ہوتی ہے۔ اگر یہ چیزیں ان کے پاس نہ رہیں تو ان کی قابلِ رحم حالت قابلِ دید ہوتی ہے۔

مَیں نے سٹین گن کی نالی چوہدری کی ٹھوڑی سے لگائی اور وہ کانپ کر رہ گیا۔ مَیں نے مُسکرا کر کہا۔ "چوہدری۔ تم نے میری بیوی کو شادی اور محبت کا پیغام بھیجا تھا اور ساتھ ہی دھمکی بھی دی تھی کہ اس علاقے میں تم جو چاہتے ہو حاصل کر لیتے ہو۔!"

چوہدری سہمی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھ کر رہ گیا۔ قوّتِ گویائی اس کا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ الفاظ اس کے مُنہ سے نہیں نکل رہے تھے۔ مَیں نے کہا۔ "لیکن تمہاری شوقین بیٹی نے ایک اور تجویز بھی پیش کی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ مَیں اپنی بیوی کو طلاق دے کر شیریں سے شادی کر لوں اور تمہاری شادی رضیہ سے کر دی جائے۔ اس تجویز کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟"

چوہدری ایک بار پھر بے چینی سے پہلو بدل کر رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میری اس چبھتی ہوئی بات کا کیا جواب دے۔ اگرچہ میرا لہجہ نرم اور شائستہ تھا، لیکن اس نرمی کے پردے میں لپٹی گرمی اور حدّت کو وہ صاف طور پر محسوس کر سکتا تھا۔ "بولو۔ جواب کیوں نہیں دیتے؟"

وہ کیا جواب دیتا۔ اس کو تو سانپ سونگھ گیا تھا۔ مَیں اس کی حالت کا بخوبی اندازہ لگا سکتا تھا، لیکن خود میری حالت بھی کچھ اچھی نہ تھی۔ وقتی طور پر مَیں نے چوہدری کو بے بس اور بے قابو ضرور کر دیا تھا، لیکن مجھے معلوم تھا کہ یہ حویلی اور اس کے آس پاس کے علاقے کا چپہ چپہ چوہدری کے مسلح آدمیوں سے بھرا پڑا ہے۔ چوہدری ایک بہت بڑا زمیندار، کاروباری اور اس سے بھی زیادہ بڑا سمگلر تھا۔ ایسے لوگ طاقت کا استعمال بھی جانتے ہیں اور صرف طاقت کی زبان ہی سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اپنے اردگرد قوت اور اسلحہ کا انبار رکھنا پسند کرتے ہیں۔ اگر یہ مسلسل طاقت کا مظاہرہ نہ کریں تو ان کے پیشے میں موجود دوسرے لوگ ان کو کچل کر رکھ دیں۔ یہی وجہ ہے کہ جنگلی درندوں کی طرح یہ لوگ مسلسل قوت اور اختیار کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔ ان کی ذرّہ داری کمزوری ان سے ان کی زندگی اور ان کی حیثیت چھین سکتی ہے۔ اب سوال یہ تھا کہ چوہدری کو وقتی طور پر تو مَیں نے بے بس کر دیا تھا اور وہ سہما ہوا میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا، لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس کمرے کے باہر چوہدری کی تمام قوت پورے اہتمام اور تزک و احتشام کے ساتھ موجود تھی۔ مَیں ایک تنہا شخص اس بے پناہ قوت سے کیوں کر مقابلہ کر سکوں گا؟

یکایک مَیں نے چوہدری کے چہرے پر اطمینان کی ایک جھلک محسوس کی۔ اس کی نگاہوں میں خوف زدہ ہرنی کی طرح جو کیفیت پیدا ہو گئی تھی اس میں بتدریج کمی آرہی تھی۔ شاید وہ وقتی صدمے سے رفتہ رفتہ عہدہ برآ ہو رہا تھا اور اس کی ذہنی صلاحیتیں واپس لوٹ رہی تھیں۔ پھر اس کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ میری چھٹی حس نے مجھے یک لخت خبردار کر دیا، لیکن جب مَیں نے پلٹ کر دیکھا اس وقت کافی دیر ہو چکی تھی۔ چوہدری کے دو مسلح کارندے میری پُشت پر نہایت بے آواز طریقے سے پہنچ گئے تھے اور ان کی مشین گنوں کا رُخ میری جانب تھا۔ گامے کو بے ہوش کرنے کے بعد مَیں نے کمرے کے دروازے کو مقفل نہیں کیا تھا اور یہی میری حماقت تھی۔ وہ دونوں میرے انتہائی نزدیک

پہنچ چکے تھے ماسوائے کہ ان کی سٹین گنیں میری گردن سے دو چار انچ کے فاصلے پر تھیں۔ میرے ذہن نے پلٹتے پلٹتے منصوبہ سوچ لیا تھا۔ اپنی گردن کے ساتھ ہی میں نے اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامی ہوئی سٹین گن کو بھی پوری سے گھمایا۔ وہ دونوں اس کے لیے قطعی تیار نہ تھے۔ میری سٹین گن کی نالی پوری قوت کے ساتھ ایک شخص کی کنپٹی ٹکرائی اور وہ چیخ مار کر اس طرح گرا کہ اس کے برابر کھڑا ہوا دوسرا ساتھی بھی اس کی زد میں آ کر زمین پر گر گیا۔ لیکن گرتے اس نے فائر کھول دیا۔ میں اسی لمحے کود کر دروازے کی طرف پہنچ چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا میں نے گن کا ایک برسٹ مارا۔ گولیاں کسی کو نہیں لگیں، لیکن ان لوگوں میں افراتفری فوراً پھیل گئی۔ چوہدری چیخ مار کر صوفے کود کر دوسری طرف گر گیا اور سٹین گن بردار غیر ارادی طور پر پناہ کی تلاش میں غوطہ مار کر ایک بڑے صوفے کی آڑ میں پہنچ گیا۔ میں اس اثنا میں دروازے کے پاس پہنچ چکا تھا۔ ایک ہی چھلانگ میں دروازے کو عبور کر کے میں نے باہر سے مقفل کر دیا اور تیزی سے اس جانب بھاگا جس طرف سے لالی مجھے لے کر آئی تھی۔ میرے ہاتھ میں سٹین گن تھی، لیکن حویلی میں فائرنگ کی آواز گونج چکی تھی جس نے چوہدری کے تمام محافظین کو خبردار کر دیا ہوگا۔ اب ایک ایک لمحہ میرے لیے قیمتی تھا۔ کسی بھی لمحے گیلری کے کسی حصے یا کسی کمرے سے کوئی مسلح شخص یا گروہ نمودار ہو کر نشانہ بنا سکتا تھا۔ میں اندھا دھند بھاگ رہا تھا۔ مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں اور مجھے کس طرف جانا چاہیے؟

یکایک دائیں جانب کی راہداری سے بہت سے قدموں کی گونج سنائی دی۔ وہ یقیناً تیزی سے بھاگتے ہوئے آدمیوں کے قدموں کی آوازیں تھیں۔ میں نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا اور اپنے قریبی دروازے میں داخل ہو گیا۔ خیریت ہوئی دروازہ مقفل یا اندر سے بند نہ تھا۔ یوں بھی اس حویلی میں ان گنت راہداریاں اور بے شمار کمرے تھے۔ خدا جانے یہاں رہنے والے ان کی شناخت کیوں کر کرتے ہوں گے تو پھر مجھ ایسے نو وارد کے لیے تو یہ بھول بھلیاں ہونے کے لیے بہت کافی تھی۔

میرے دروازے میں داخل ہوتے ہی راہداری میں سے بھاگتے ہوئے قدم تیزی سے گزر گئے۔ وہ بلند آواز میں کچھ باتیں بھی کرتے جا رہے تھے جو میں نہ سن سکا۔ کمرے کا دروازہ اندر سے مقفل کرنے کے بعد میں نے پلٹ کر اس کا جائزہ لیا جو میری پناہ گاہ تھا، لیکن میرے لیے زنداں بھی بن سکتا تھا۔ یہ ایک وسیع کمرہ تھا۔ پرانی وضع کی اونچی اونچی دیواریں۔ زمین پر دری کا فرش۔ فرنیچر بھی زیادہ قیمتی نہیں تھا۔ کمرے میں کیونکہ روشنی کا گزر کم ہوتا تھا اس لیے روشنی جل رہی تھی۔ اس کمرے کے آگے ایک اور کمرہ نظر آ رہا تھا۔ میں نے دروازہ بند کرتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ کمرے کی روشنی بجھا دی اور دوسرے کمرے کی جانب لپکا۔ یہ ایک نسبتاً زیادہ آراستہ کمرہ تھا۔ میں نے اس میں داخل ہو کر یہاں کی روشنی بھی بجھا دی۔ اب کمرے میں یکلخت نیم تاریکی چھا گئی، لیکن کیونکہ میں روشنی سے نکل کر آیا تھا اس لیے میں وقتی طور پر دیکھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ میں اُلٹے قدموں پیچھے کی طرف چلنے لگا۔

اچانک ایک ٹھنڈی اور سخت چیز میری گردن سے ٹکرائی اور میں نے ایک سرگوشی سنی: "خبردار وہیں رک جاؤ۔ ورنہ گولی چلا دوں گی۔"

ظاہر ہے یہ آواز کسی عورت کی تھی اور میری گردن سے چھونے والی چیز بندوق یا پستول کی نالی تھی۔ میں اپنی جگہ منجمد ہو کر رہ گیا۔

"تمہاری یہ حسرت کبھی پوری نہیں ہوگی چوہدری۔ میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا ہے کہ میں اپنی جان دے دوں گی مگر عزت نہیں دوں گی مگر تم باز نہیں آتے۔ آج میں تمہیں زندہ نہیں جانے دوں گی۔ اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے بے شرم، بے غیرت انسان، لو مرنے کو تیار ہو جاؤ۔"

اس کے ساتھ ہی ایک کلک کی آواز سنائی دی۔ دوسرا لمحہ موت کا لمحہ تھا۔ میں نے فیصلہ کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگائی اور جہاں کھڑا تھا — فوراً وہیں بیٹھ گیا۔ کمرے میں فائر کی آواز گونجی۔ اگر میں کھڑا ہوتا تو یہ گولی میری گردن یا بھیجے کے پار ہو چکی ہوتی۔ فائر کرنے والی کوئی عورت تھی اور خاصی مشتعل تھی۔ اس کو علم ہو چکا تھا کہ اس کی گولی رائیگاں گئی ہے۔ اس نے نال کا رُخ زمین کی طرف کر دیا مگر اس کے فائر کھولنے سے پہلے میں لوٹ لگا کر اس کے قدموں میں پہنچ چکا تھا۔ اس کی ٹانگ کو کھینچ کر میں نے جھٹکا دیا اور وہ فرش پہ گر گئی: "میں تمہیں نہیں چھوڑوں گی۔ جان سے مار دوں گی۔" وہ ہذیانی انداز میں چلا رہی تھی۔ میں اپنی سٹین گن چھوڑ کر اس کا پستول چھیننے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھی۔ بالآخر ایک عورت تھی اور میرا اس نے کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ اس لیے میں اسے جسمانی گزند نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ میں نے پستول چھیننے کے لیے اسے اپنی گرفت میں لینا چاہا۔ وہ ایک گداز مگر مضبوط جسم کی عورت تھی اور اس وقت بے پناہ جسمانی قوت اور مدافعت کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ اس نے پھر ایک فائر کر دیا مگر وہ شاید چھت پر کسی جگہ جا کر لگا ہوگا۔ چند لمحے ہم کشمکش میں مصروف رہے، لیکن وہ آخر کار ایک عورت تھی۔ میں اس پر قابو پانے میں کامیاب ہو گیا مگر اس کی کشمکش اور جدوجہد میں کمی واقع نہیں ہوئی۔ "نہیں نہیں چھوڑ دو مجھے۔ میں جان دے دوں گی مگر تمہارے آگے نہیں جھکوں گی بے غیرت۔ بے شرم۔" وہ نہ جانے کیا اول فول بک رہی تھی اور مسلسل زور آزمائی کرنے میں مصروف تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیونکر سمجھاؤں کہ میں ایک اجنبی ہوں اور وہ جس شخص سے جنگ کر رہی ہے، میرا اس سے کوئی واسطہ نہیں ہے، لیکن جس زور شور سے وہ مقابلہ کر رہی تھی اور میرے قابو سے نکلنے کی کوشش کر رہی تھی اس کی وجہ سے مجھے اپنی تمام تر توجہ اس پر مرکوز کرنی پڑی تھی۔ وہ ایک زور آور عورت تھی لیکن اس کے باوجود کچھ دیر بعد تھک کر ہانپنے لگی اور اس کی جدوجہد بھی کمزور پڑ گئی۔ میں اسے گھسیٹ کر دیوار کے پاس لے گیا اور ایک ہاتھ سے اس کو اپنی گرفت میں رکھتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے میں نے ٹٹول کر دیوار میں بجلی کا سوئچ آن کر دیا۔ کمرہ یکایک روشنی سے بھر گیا اور ہم دونوں کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ بصارت معمول پر آئی تو ہم دونوں ہی یکساں حیران تھے۔ کیونکہ میرے بازوؤں کی گرفت میں اس وقت لالی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرہ مسلسل جدوجہد کی وجہ سے سرخ پڑ گیا تھا لباس بے ترتیب تھا اور وہ کسی وقت بھی دوبارہ زور آزمائی کرنے کے لیے اپنے آپ کو تیار کر رہی تھی۔

"ارے لالی!" میرے منہ سے بے اختیار نکلا اور میری گرفت کمزور ہوتے ہی وہ تڑپ کر مجھ سے دور ہو گئی۔ اس نے بے اعتباری سے سر سے پیر تک میرا جائزہ لیا اور تعجب سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی: "ملک صاحب۔ آپ!! اور....." پھر وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی: "ملک صاحب! آپ بھی دوسروں کی طرح ہی نکلے۔ آپ نے بھی مجھے ایک بکاؤ عورت سمجھ کر من مانی کرنے کی ٹھان لی۔ آپ سے تو مجھے یہ امید نہ تھی۔ میں تو سمجھی تھی..... میں سمجھی تھی کہ چوہدری صاحب ہیں۔"

یہ انکشاف میرے لیے نیا تھا۔ "یقین کرو لالی، مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کمرے میں تم ہو۔ میں تو اس حویلی کے راستے بھی نہیں جانتا۔ تمہارے کمرے میں کیسے پہنچ سکتا ہوں۔"

وہ سنجیدگی سے میری بات پر غور کرنے لگی: "ٹھیک تو ہے ملک جی آپ تو میرا کمرہ جانتے ہی نہیں۔"

"اور نہ ہی میں کسی بری نیت سے اس کمرے میں آیا تھا۔ تم کو میرے بارے میں یہ غلط فہمی کیوں ہو گئی؟" میں نے کہا۔

اس نے نظریں جھکا لیں، آہستگی سے بولی: "ملک صاحب۔ میں اس حویلی کی ملازم ہوں۔ میرا سارا خاندان ان کا نمک کھاتا رہا ہے۔ اس گھر کی خدمت کرنا ہمارا پیدائشی فرض ہے لیکن آپ تو جانتے ہیں کہ حویلی کے لوگ ہم عورتوں کو مویشیوں کی طرح اپنی ذاتی جاگیر سمجھتے ہیں۔ چوہدری صاحب بھی ایسے ہی ہیں مگر مجھے میری ماں نے بتایا تھا کہ میری رگوں میں ایک شریف باپ کا خون ہے۔ اس نے میری ماں سے شادی تو نہیں کی تھی لیکن اس کو اپنی بیوی ہی سمجھتا

تھا۔ اس لیے میں نے کبھی اپنی عزت کا سودا نہیں کیا۔ شیریں بی بی کی مہربانی سے کوئی اور تو میری طرف دیکھ بھی نہیں سکتا۔ مگر چوہدری صاحب اپنی مہربانیوں سے باز نہیں رہتے۔ کئی بار پہلے بھی وہ کوشش کر چکے ہیں۔ میں سمجھی کہ شاید.... شاید وہی آ گئے ہیں۔ آپ نے لائٹ بھی تو بجھا دی تھی نا۔ بس میں دھوکا کھا گئی۔"

لالی کو میں قدرتی طور پر پہلے ہی پسند کرتا تھا لیکن اس کے کردار کا یہ پہلو میرے علم میں نہیں تھا۔ اس بات سے اس کی قدر و منزلت میری نگاہوں میں اور زیادہ ہو گئی۔

"مگر لالی۔" میں نے پوچھا: "چوہدری صاحب اگر تمہیں اپنانا چاہتے ہیں تو تمہیں انکار کیوں ہے۔ یہ تو حویلی کے نوکروں کے لیے بڑی عزت کی بات ہوتی ہے۔"

"عزت کی نہیں، ڈوب مرنے کی بات ہے، ملک جی۔ میں نے تو ان سے کہا تھا کہ مجھ سے نکاح کر لیں مگر وہ بھلا ایک نوکرانی سے وہ نکاح کیسے کر سکتے ہیں۔ ہاں۔ وہ اس کے بچوں کے باپ ضرور بن سکتے ہیں۔" وہ زہریلے طنز بھرے لہجے میں بولی۔ پھر اچانک اسے میرا خیال آیا۔ میں نے اتنی دیر میں سٹین گن فرش سے اٹھا لی تھی۔ پوچھنے لگی: "آپ اس وقت یہاں کیسے؟ اور یہ سٹین گن آپ کو کہاں سے ملی؟"

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے اپنا راز دار بناؤں یا نہیں مگر اس وقت وہ حویلی میں غالباً میری واحد طرف دار اور حمایتی تھی۔ اس لیے میں نے اس کے سامنے پتے کھول کر رکھ دیے: "لالی تم نے فائرنگ کی آواز نہیں سنی تھی؟ وہ"

"اجی۔ وہ تو حویلی والوں کے لیے نئی بات نہیں ہے۔ ایسے پٹاخے تو یہاں چلتے ہی رہتے ہیں۔ ملک صاحب تم نہیں پل کر جوان ہوئی ہوں۔ گولیاں، قتل، حملے۔ یہ سب روز کی باتیں ہیں۔ ہم لوگ ان کے عادی ہو گئے ہیں۔"

"وہ فائرنگ میں نے کی تھی۔" میں نے قصہ مختصر کرنے کے لیے کہا۔ "چوہدری نے مجھے گھیر لیا تھا اور کوئی راستہ باقی نہیں رہا تھا۔ میں نے گامے کی سٹین گن چھین کر ایک دو اور آدمیوں کو بھی نشانہ بنا دیا۔ اب وہ سب میری تلاش میں ہیں۔ یہ بتاؤ۔ وہ اس کمرے میں تو نہیں آ جائیں گے؟"

وہ ہنس پڑی: "وہ سب جگہ جا سکتے ہیں ملک جی مگر دو کمروں میں نہیں جا سکتے۔ ایک شیریں بی بی کا کمرہ اور دوسرا میرا کمرہ۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا: "مگر میرے کمرے میں رضیہ اکیلی ہے۔ وہاں شیریں اور باز خاں بھی زخمی اور بے ہوش پڑے ہوئے ہیں۔ چوہدری کے آدمی تھوڑی دیر بعد وہاں ضرور جائیں گے۔ رضیہ کو کیسے بچایا جا سکتا ہے؟"

وہ پریشانی سے سوچنے لگی: "ایک تو مشکل یہ ہے کہ آپ نے سب کو اپنا دشمن بنا لیا ہے۔ نہ چوہدری کی بات مانتے ہیں نہ شیریں بی بی کا دل رکھتے ہیں۔ ایسے کیسے کام چلے گا؟"

وہ دانتوں میں انگلی داب کر سوچنے لگی۔

"لالی۔ نہ جانے کیوں میرا دل کہتا ہے کہ تم میری ہمدرد ہو۔ مجھے تم پر بھروسہ ہے۔ میری مدد کرو۔ رضیہ کو کسی طرح اس کمرے سے نکال لو۔ اور ہم دونوں کو کسی محفوظ جگہ پہنچا دو۔ اس کے بعد یہاں سے باہر نکلنے کی بھی سوچ لیں گے۔"

وہ یکایک کھڑی ہو گئی: "آپ یہاں ٹھہرو۔ رضیہ بی بی کے کمرے میں جا کر دیکھتی ہوں۔ موقع ہوا تو ان کو ساتھ لے آؤں گی ورنہ سارا ماجرا دیکھ کر آؤں گی اور آپ کو بتا دوں گی۔ پھر اللہ مالک ہے۔ دیکھی جائے گی۔" وہ مجھے یوں ہی کھڑا چھوڑ کر تیزی سے کمرے سے باہر چلی گئی۔ میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ خاصا بڑا کمرہ تھا۔ فرنیچر بھی معقول تھا۔ ظاہر ہے چوہدری صاحب اس لڑکی پر مہربان تھے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ ان کے قابو میں نہیں آئی تھی۔ پھر بقول اس کے وہ شیریں کی بھی منہ چڑھی تھی۔ دو بڑے کمرے تھے جن کے دونوں طرف برآمدہ تھا۔ ایک بڑا غسل خانہ بھی تھا۔ یہ پرانے زمانے کی عمارت تھی مگر ٹوٹ پھوٹ سے محفوظ تھی اور اسے خاصی اچھی حالت میں رکھا گیا تھا۔

غسل خانے کا بیرونی دروازہ غالباً کسی اور برآمدے میں کھلتا تھا۔ ایک تو اس حویلی میں برآمدے، گیلریاں اور راہداریاں بہت زیادہ تھیں۔ خدا جانے اس عمارت کو بھول بھلیاں بنانے میں کیا مصلحت تھی؟ یا شاید غیر قانونی سرگرمیوں کے سلسلے میں پناہ حاصل کرنے اور دشمنوں کے حملوں سے محفوظ رہنے کے لیے یہ عمارت بنائی گئی تھی۔ کوئی نووارد تو اس میں داخل ہو کر عمر بھر باہر ہی نہیں نکل سکتا تھا۔ اس اعتبار سے چوہدری کی ذہانت واقعی قابلِ داد تھی۔

میں نے بے چینی سے کمروں میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ اگرچہ لالی نے بتایا تھا کہ اس کمرے میں کوئی داخل نہیں ہوگا۔ پھر بھی احتیاطاً میں نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا اور روشنی بجھا دی تھی۔ میں کسی بھی قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ ملک منصور کے حملے کو پسپا کرنے کے بعد چوہدری کی ہمتیں اور بلند ہو گئی تھیں۔ اب میں تھا اور اس کی پوری سپاہ۔ پھر ستم یہ کہ میں نے اسے ذلیل کرنے میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اس وقت وہ کسی زخمی درندے کی طرح بے چینی سے میرے خون کا پیاسا ہو رہا تھا۔

نہ جانے کتنے لمحے گزر گئے کچھ دیر بعد میں نے غسل خانے کے دروازے پر ایک آہٹ اور پھر ہلکی سی دستک سنی۔ سٹین گن تھام کر میں غسل خانے میں چلا گیا۔ یہ غسل خانہ سائز کے اعتبار سے کمرے سے کم نہ تھا۔ پرانے زمانے کے دو پٹ والے دروازے تھے جن میں اوپر رنگین شیشہ لگا ہوا تھا۔ دروازے پر پھر دستک ہوئی اور لالی کی سرگوشی سنائی دی: "کھولو۔"

میں نے لپک کر دروازے کی کنڈی کھول دی۔ سامنے لالی کھڑی تھی اور اس کے پہلو میں رضیہ۔ وہ دونوں تیزی سے اندر آ گئیں: "تمہیں کسی نے دیکھا تو نہیں؟" میں نے سوال کیا۔

"نہیں۔ میں ایسے راستے سے آئی ہوں جو صرف غسل خانے صاف کرنے والی جمعدارنیاں ہی استعمال کرتی ہیں۔"

چوہدری کے آدمی ابھی تک میری تلاش میں اس کمرے تک نہیں پہنچے تھے۔ شیریں اور باز خاں کے بارے میں رضیہ نے بتایا کہ وہ ابھی تک بے ہوش ہیں: "اب کیا ہوگا؟" وہ پریشانی سے پوچھ رہی تھی۔

میں نے لالی کی طرف دیکھا۔ وہی ہماری آخری امید اور پناہ گاہ تھی۔ ایک نازک سی لڑکی اس وقت ہماری امیدوں کا مرکز بن گئی تھی: "ہم کب تک اس کمرے میں محفوظ رہیں گے؟" میں نے لالی سے پوچھا: "وہ تو ہماری تلاش میں چپہ چپہ چھان ماریں گے۔"

"ساری حویلی کی تلاشی لینے میں انھیں کم از کم چار گھنٹے لگیں گے۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

"اور چار گھنٹے کے بعد کیا ہوگا؟" رضیہ نے پوچھا۔

"اللہ مالک ہے۔" وہ بہت مطمئن نظر آ رہی تھی۔

"اس کمرے میں دو چار دن رہ سکتے ہو۔ بشرطیکہ شیریں بی بی ادھر نہ آ جائیں۔"

یکایک مجھے شیریں کا خیال آ گیا: "شیریں کا کیا ہوگا؟ وہ لوگ ہمارے کمرے میں گئے تو شیریں کو دیکھ لیں گے اور وہ انھیں سب کچھ بتا دے گی۔"

برآمدوں میں بہت سے بھاری قدموں کی آوازیں اور لوگوں کی باتیں کرنے کی آوازیں بلند ہونے لگی تھیں۔ رضیہ سہم کر میرے نزدیک آ گئی۔ لالی کی گرفت بھی اس کے پستول پر مضبوط ہو گئی لیکن وہ لوگ گزر کر چلے گئے۔

لالی بولی: "آپ یہاں ٹھہریے میں باہر جا کر دیکھتی ہوں کیا ہو رہا ہے؟ یہاں ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے میرے سوا کوئی آئے تو دروازہ نہ کھولنا۔" وہ تیزی سے باہر چلی گئی۔

رضیہ پریشانی کے عالم میں کچھ اور زیادہ حسین لگ رہی تھی لیکن یہ حسن کو سراہنے کا وقت نہیں تھا۔ ہم دونوں زندگی اور موت کے دوراہے پر کھڑے تھے: "یوسف۔" وہ میرے نزدیک آ کر بولی: "کیا ہم یہاں سے باہر نکل سکیں گے؟"

"اللہ مالک ہے۔" میں نے کہا، لیکن میرے لہجے میں مایوسی کا عنصر صاف محسوس کیا جا سکتا تھا۔

اچانک گولیوں کی آوازیں گونجنے لگیں اور پھر کچھ دھماکے بھی سنائی دیئے۔ ہم دونوں پریشانی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ رضیہ بے اختیار خوفزدہ ہو کر مجھ سے لپٹ گئی: "یا اللہ مدد" وہ مسلسل ورد کر رہی تھی۔ میں نے حوصلہ افزائی کے لیے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور کہا: "دیکھو رضیہ۔ اللہ پر ہر حالت میں بھروسہ رکھنا چاہیے۔ جو ہماری قسمت میں ہے وہ ہو کر رہے گا۔ بہادری سے مقابلہ کرو۔ تم تو بہت ہمت والی اور جی دار عورت ہو۔"

میں اس کے نرم و گداز جسم کی لرزش محسوس کر سکتا تھا۔ وہ درحقیقت انتہائی خوف زدہ تھی۔ حالانکہ اگر اس کی جگہ کوئی اور عام عورت ہوتی تو شاید ان حالات میں ڈر کر بے ہوش ہو گئی ہوتی۔

دھماکے اور فائرنگ کی آوازیں پھر بلند ہوئیں اور پھر اچانک خاموشی چھا گئی۔ کچھ دیر بعد لوگوں کے چلنے پھرنے کی آوازیں سنائی دیں اور پھر چوہدری کی آواز آئی: "کم بختو۔ نالائقو۔ خدا تمہیں غارت کرے۔ یہ تم نے کیا کر دیا۔ میں کسی ایک کو بھی نہیں چھوڑوں گا۔" آواز دور ہوتی چلی گئی اور پھر خاموشی چھا گئی۔

ہم دونوں گومگو کے عالم میں کھڑے تھے۔ یکایک رضیہ زمین پر بیٹھ گئی۔ شاید اس کے اعصاب اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ میں بھی اس کے نزدیک ہی فرش پر بیٹھ گیا اور میں نے ہمت افزائی کے خیال سے اس کا ہاتھ تھام لیا جو بالکل پسیجا ہوا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ وہ سرتاپا پسینے میں ڈوبی ہوئی ہے۔ مجھے اس پر بے انتہا ترس آیا مگر میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ غسل خانے کے دروازے پر پھر دستک ہوئی اور لالی کی آواز سنائی دی۔ میں نے لپک کر دروازہ کھولا۔ لالی کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں اور چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ بے اختیار مجھ سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رضیہ نے جلدی سے دروازہ بند کیا۔ میں نے اُسے چپ کرانے کی کوشش کی تو وہ اور زیادہ آنسو بہانے لگی۔ مجبوراً مجھے اس کے منہ پر ہاتھ رکھنا پڑا۔ میرے اشارے پر رضیہ پانی کا گلاس لے کر آ گئی اور ہم نے لالی کو پانی پلا کر تسلی آمیز انداز میں تھپکنا شروع کر دیا۔ کچھ دیر بعد وہ بولنے کے قابل ہوئی تو اس نے بڑی المناک خبر سنائی۔ چوہدری کے کارندے میری تلاش میں کمرے تک پہنچے تو انہیں ڈر تھا کہ میں بھی مشین گن سے مسلح ہوں۔ اس لیے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے انہوں نے مجھے للکارا اور ہتھیار پھینک کر باہر نکلنے کی دعوت دی۔ جب کوئی جواب نہ ملا تو انہوں نے کمرے پر دستی بموں سے حملہ کر دیا اور مشین گنوں سے گولیوں کی بارش کر دی۔ درحقیقت انہیں بہت دیر بعد معلوم ہوا کہ اندر کمرے میں بیہوش شیریں اور باز خاں ان کے حملے کا نشانہ بن کر بیہوشی کے عالم میں ہی موت کا شکار ہو گئے۔ کچھ دیر بعد چوہدری بھی وہاں پہنچ گیا۔ کمرے کے اندر کا نظارہ دیکھ کر وہ ہوش و حواس کھو بیٹھا اور اول فول بکنے لگا۔ اب وہ لوگ فی الحال میری فکر بھول کر چوہدری کی دیکھ بھال اور شیریں کی موت کا سوگ منانے میں مصروف ہو گئے ہیں۔ یہ واقعہ سن کر کچھ دیر کے لیے تو میں بالکل ساکت رہ گیا۔ یہ سچ ہے کہ مارنے والے سے بچانے والا کہیں زیادہ طاقت ور ہوتا ہے۔ ورنہ چوہدری اور اس کے آدمیوں نے مجھے اور رضیہ کو ٹھکانے لگانے کے لیے جو جال بچھایا تھا اس کے پھندے میں پھنس کر شیریں اور باز خاں اپنی زندگیوں سے محروم نہ ہوتے۔

اگرچہ یہ غم ناک صورتِ حال تھی لیکن میرے لیے بہت حوصلہ افزا کہی جا سکتی تھی۔ حویلی میں افراتفری کا عالم تھا اور کہرام مچا ہوا تھا۔ میں نے لالی سے کہا: "لالی میں تمہارے غم میں برابر کا شریک ہوں۔ شیریں جیسی بھی تھی تمہارے حق میں بہت اچھی تھی۔ تم پر مہربان تھی۔ تم سے محبت کرتی تھی۔ مگر خدا کو یہی منظور تھا۔ صبر کرو۔"

وہ مسلسل روئے جا رہی تھی۔ بولی: "ملک جی، اب میرا اس حویلی میں کون بیٹھا ہے! یہاں تو سارے بھیڑیے ہیں۔ وہ تو میری تکا بوٹی کر ڈالیں گے۔ اب میں یہاں کیسے رہوں گی۔ چوہدری سے مجھے محفوظ رکھنے والی صرف شیریں بی بی ہی تھیں۔"

"تم فکر نہ کرو لالی۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "اگر ہم یہاں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تو تم ہمارے ساتھ چلنا۔ یہاں سے آزاد ہونے کے بعد تم جہاں جی چاہے جا سکتی ہو۔"

وہ ایک دم روتے روتے چپ ہو گئی اور رضیہ کی طرف دیکھ کر بولی: "بی بی۔ کیا آپ دونوں مجھے اپنی خدمت کے لیے رکھ لیں گے؟"

اب تک وہ رضیہ کو میری بیوی ہی سمجھ رہی تھی۔ میں نے بھی فی الحال صورتِ حال کی وضاحت ضروری نہیں سمجھی۔ "کیوں نہیں لالی۔" رضیہ نے پیار سے اس کو تھپکا۔ "میں تمہیں ہمیشہ اپنے ساتھ رکھنے کو تیار ہوں۔"

لالی کے بے سکون دل کو جیسے قرار آ گیا۔ وہ یکایک اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور پھر بولی: "ملک جی۔ کالو مجھے بتا رہا تھا کہ آپ کے آدمی پھر حملہ کریں گے وہ آرام سے نہیں بیٹھیں گے۔ ان لوگوں نے بھی توپوں بندوقوں سے پوری تیاری کر لی ہے۔ اگر لڑائی ہوئی تو بہت خوفناک ہو گی۔ ایک بار پہلے بھی حویلی پر چوہدری کے دشمنوں نے توپوں اور ہوائی جہازوں سے حملہ کیا تھا۔ بڑی تباہی ہوئی تھی۔"

میں حیرت سے اس کا منہ تک رہا تھا: "جنگ ہوئی تھی؟" "توپوں اور ہوائی جہازوں سے؟"

"ہاں ہاں۔ دو دن تک لڑائی ہوتی رہی۔ پھر وہ لوگ بھاگ گئے۔" پھر وہ سرگوشی میں بولی: "چوہدری کے پاس پوری فوج ہے ملک جی۔ آپ کے آدمیوں نے حملہ کرنے کی غلطی کی تو بہت نقصان اٹھائیں گے۔"

"ملک منصور کو تم کیا سمجھتی ہو؟" رضیہ کی رگِ حمیت پھڑکی: "اس کے پاس بھی فوج ہے۔ گولہ بارود ہے۔ گولے پھینکنے والے مارٹر ہیں۔ ہیلی کاپٹر بھی ہیں۔"

میں حیران ہو کر ان دونوں کے انکشافات سن رہا تھا مگر پھر غور کیا تو سوچا کہ یہ بعید از امکان بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ دونوں بین الاقوامی سمگلروں کے گروہ میں شامل ہیں اور سرحدوں پر بہت وسیع پیمانے پر سمگلنگ کے کاروبار میں ملوث ہیں۔ پھر ان کے رابطے غیر ملکی سمگلروں سے بھی ہیں۔ یہ بظاہر دیہاتی اور سیدھے سادے نظر آنے والے لوگ کس قدر وسیع رابطوں اور تعلقات کے مالک ہیں اور ان کی رسائی کہاں کہاں تک ہے؟ یہ سوچ کر میرے جسم میں جھرجھری پیدا ہو گئی۔

لالی میں اب پھرتی آ گئی تھی۔ کہنے لگی: "ہم لوگ اس کمرے میں نہیں رہیں گے۔ میں آپ کو تہہ خانے میں لے چلتی ہوں۔ وہاں سے ہم باہر نکلنے کی کوئی ترکیب بھی سوچ سکتے ہیں۔"

واقعی یہ اچھی تجویز تھی جس پر ہم نے بلاتاخیر عملدرآمد شروع کر دیا۔ کچھ دیر بعد ہم تینوں جب لالی کے کمرے سے باہر نکلے تو ہمارے پاس کھانے کا کچھ سامان (جو لالی لے کر آئی تھی) اور کپڑوں کی ایک گٹھری بھی تھی۔ لالی نے اپنا ایک جوڑا رضیہ کو پہنا دیا تھا۔ دیہاتن کے روپ میں رضیہ واقعی ایک جٹی لگ رہی تھی۔ صحت مند، دراز قد، مضبوط جسم اور خوبصورت۔ اس نے پیروں میں دیہاتی جوتے اور پائل پہن لیے تھے اور اس لباس میں اس کو بغور دیکھنے کے بعد ہی کوئی پہچان سکتا تھا۔ میرے لیے لالی نے باز خاں کا ایک ملیشیا کا جوڑا فراہم کر دیا تھا جو میں نے ابھی استعمال کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

ہم تینوں کا قافلہ خاموشی سے غسل خانے کے راستے نکلا اور ہم لالی کی قیادت میں مختلف تنگ راستوں اور راہداریوں سے ہوتے ہوئے ایک طویل راستے پر چلتے رہے۔ ملازموں اور خاکروبوں کے استعمال کے لیے حویلی میں علیحدہ راستے بنائے گئے تھے جو ہمارے حق میں بے حد مفید ثابت ہوئے۔ ان راستوں کو عام طور پر دوسرے لوگ استعمال نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم حفاظت اور خیر و عافیت سے مختلف بھول بھلیوں سے گزرتے ہوئے ایک چھوٹے سے دروازے تک پہنچ گئے جو بظاہر ایک روشندان نظر آ رہا تھا۔ لالی نے کنڈی میں لگا ہوا بڑا سا تالا ایک چابی کی مدد سے کھول دیا۔ جو وہ شیریں کے کمرے سے لے کر آئی تھی۔ تنگ دروازے میں داخل ہونے کے بعد ہم نے دروازہ دوبارہ اندر سے بند کر لیا۔ سامنے ایک نیم تاریک سی کوٹھڑی تھی لیکن اس کوٹھڑی کا بوسیدہ سا دروازہ کھولا تو ہم پر چودہ طبق روشن ہو گئے۔ ہمارے سامنے ایک نہایت وسیع اور کشادہ جدید ترین انداز کا بڑا ہال تھا۔ جو لوہے کی الماریوں اور میز کرسیوں سے سجا ہوا تھا۔ ایک

جانب بنکوں کے لاکرز کے انداز میں آہنی الماریاں بنی ہوئی تھیں۔ دوسری جانب ایک کمرہ تھا جس میں مختلف آلات اور مشینیں لگی ہوئی تھیں۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ یہ وائرلیس روم تھا اور بیرونی رابطوں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ اس ہال کے بائیں جانب ایک جدید ترین خود کار لفٹ لگی ہوئی تھی۔ میں اس انتظام کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ہم نے چھوٹا سا تنگ دروازہ تو اندر سے بند کر لیا تھا لیکن اس خود کار برقی لفٹ سے آنے جانے والوں کو روکنا کس کے بس میں تھا؟

لالی یکایک اُٹھ کر کھڑی ہو گئی اور بولی: "ملک جی۔ آپ کی خدمت میں تو میری جان بھی چلی جائے تو کوئی بات نہیں ہے۔ آپ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ آپ کی بات کو میں کبھی انکار نہیں کروں گی۔" اس کی آنکھوں کی چمک اور گالوں کی سُرخی سے میں اس کے الفاظ کا مطلب سمجھ سکتا تھا۔ گویا یہ اس بات کی دعوت تھی کہ چوہدری کے جس مطالبے کو وہ ٹھکراتی چلی آئی ہے اگر میں نے بھی وہی خواہش کی تو اسے کوئی عذر نہ ہوگا۔ مجھے شروع ہی سے اس بات کا احساس تھا کہ وہ مجھے پسند کرتی ہے اور لگاوٹ کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ وہ ایک قبول صورت لڑکی تھی لیکن میں نے کبھی اسے اپنانے کی خواہش نہیں کی تھی۔

"آپ دونوں آرام سے بیٹھیں۔ میں ذرا باہر جا کر خبر لے کر آتی ہوں کہ اُوپر کیا ہو رہا ہے اور وہ لوگ آپ کو تلاش کرنے کے لیے کیا کر رہے ہیں؟" یہ کہہ کر وہ پلک جھپکتے اسی راستے سے باہر چلی گئی جدھر سے ہمیں لے کر آئی تھی۔

میں نے اپنے چاروں طرف نظر ڈالی اور اس جدید ترین سٹور روم کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ واقعی چوہدری کی سرگرمیاں بہت بڑے پیمانے پر جاری تھیں اور اس کے ہاتھ بہت دُور تک پھیلے ہوئے تھے۔ ان حالات میں اگر بالادستی اور اجارہ داری کے لیے اس کی ملک منصور کے ساتھ رقابت اور دُشمنی ہو گئی تھی تو یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں تھی۔ اتنے بڑے کاروبار، اقتدار اور اثر و رسوخ کو حاصل کرنے کے لیے وہ دونوں جو کچھ بھی کرتے وہ کم نہیں تھا۔ اس تہہ خانے میں چوہدری نے ایک زمینی دُنیا آباد کر رکھی تھی۔ یہ آہنی الماریاں یقیناً سمگلنگ کے سامان اور ہیروئن کو محفوظ رکھنے کے کام آتی ہوں گی۔ زیادہ حیرانی کی یہ بات تھی کہ بظاہر اس دُور دراز دیہاتی علاقے میں اس نے زیر زمین ایک جدید کامپلیکس قائم کر رکھا تھا۔ خاص طور پر آلات اور خود کار لفٹ کو دیکھ کر میں اس کے کاروبار کی وُسعت کا معترف ہو گیا تھا۔

یکایک ایک عجیب سی آواز سُن کر میں چونک پڑا۔ چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ کوئی سبب سمجھ میں نہیں آیا لیکن پھر میری نگاہ لفٹ کی طرف گئی تو یہ راز بھی معلوم ہو گیا۔ لفٹ حرکت میں آگئی تھی اور نیچے کی طرف یعنی تہہ خانے کی جانب رواں تھی۔ میں نے رضیہ کو ایک آہنی الماری کے پیچھے چھپنے کا اشارہ کیا اور خود سٹین گن سنبھال کر ایک دوسری آہنی میز کے پیچھے دُبک گیا۔ لفٹ کا دروازہ کھلا اور اس میں سے دو مسلح آدمی باہر نکلے۔ انھوں نے اپنے ہاتھوں میں پلاسٹک کے دو بڑے بڑے تھیلے اُٹھا رکھے تھے۔ تھیلوں کو لے کر وہ ایک آہنی الماری کے پاس گئے۔ چابی لگا کر اسے کھولا تو میں نے اس الماری کو پلاسٹک کے تھیلوں سے اٹا اَٹ بھرا ہوا پایا۔ یہ جاننا مشکل نہ تھا کہ یہ ہیروئن کے تھیلے تھے اور بین الاقوامی مارکیٹ میں اس تمام مال کی قیمت اربوں روپے تھی۔ الماری کو دوبارہ بند کر کے انھوں نے لفٹ کا رُخ کیا اور اس میں داخل ہو کر رُخصت ہو گئے۔

میں نے رضیہ کو باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔ وہ بھی صورتِ حال کو سمجھ گئی تھی مگر اس نے زیادہ حیرت یا پریشانی کا اظہار نہیں کیا تھا: "رضیہ، تم نے دیکھا؟"

وہ اطمینان سے بولی: "میرے لیے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ملک منصور بھی ایسے ہی کام کرتا ہے۔"

ملک منصور کے ذکر پہ مجھے وہ شخص یاد آگیا جو اس خوش شکل اور خوش اطوار عورت کا نام نہاد شوہر تھا لیکن ان دونوں کے مابین کوئی ذہنی یا جسمانی رشتہ قائم نہیں ہو سکا تھا۔ ان کی سوچ کا انداز مختلف تھا اور وہ دو مختلف نظریات کے

حامل لوگ تھے۔ پھر بھی حالات اور تقدیر نے انھیں نہ صرف یکجا کر دیا تھا بلکہ ایک دوسرے کا جیون ساتھی بھی بنا دیا تھا۔ یہ ستم ظریفی ہی تو تھی۔

لفٹ میں دوبارہ زندگی پیدا ہوئی اور ہم دونوں پھر ایک آہنی الماری کے عقب میں چھُپ گئے۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ لفٹ مسلسل حرکت اور استعمال میں رہتی ہے۔ ان حالات میں ہمارا زیادہ عرصے تک یہاں پوشیدہ رہنا ممکن نہیں تھا۔ اس بار لفٹ کے اندر سے برآمد ہونے والی شخصیت لالی کی تھی۔ اس نے ہمیں تلاش کرنے کے لیے چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور ہم اپنی پناہ گاہ سے باہر نکل آئے۔

"بہت بُرا حال ہے ملک جی۔ چوہدری تو جیسے پاگل ہو گیا ہے۔ ہر جگہ وہ لوگ آپ دونوں کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ کہتا ہے اگر نہ ڈھونڈا تو کسی کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

مجھے چوہدری سے اسی ردِ عمل کی توقع تھی۔

"ایک بات اور مجھے کالو نے بتائی ہے۔"

"کالو کون؟"

"وہ باز خاں کا نائب ہے۔ بہت کام کا آدمی ہے۔ مجھ پر وہ بھی مرتا ہے۔" وہ تلخی سے مسکرائی۔ "اُس نے بتایا ہے کہ حویلی میں خطرہ ہے۔ بہت جلد لڑائی شروع ہونے والی ہے۔ مجھ سے کہتا تھا کہ تھوڑے دن کے لیے دریا والی حویلی میں چلی جا۔"

"خطرہ کس بات کا؟" میں نے تشویش سے پوچھا۔

"آپ کے آدمی آرام سے تو نہیں بیٹھیں گے۔ وہ کہتا ہے اس روز بھی ان کا زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ وہ سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق واپس گئے ہیں مگر چوہدری کو اس کے خوشامدیوں نے بتایا ہے کہ ان کا بہت بھاری نقصان ہوا اور وہ شکست کھا کر بھاگ گئے ہیں۔"

اس بات کی صداقت کا مجھے اور رضیہ دونوں کو اندازہ تھا۔ یہ خلافِ توقع بات نہیں تھی۔ کیونکہ ہم دونوں ہی جانتے تھے کہ اصلی ملک منصور نہ صرف زندہ اور آزاد ہے بلکہ وہ چوہدری سے اپنی اغوا شدہ بیوی واپس چھیننے اور اسے مزہ چکھانے کے لیے بھی موقعہ کی تلاش میں ہے۔ یہ صرف اس کی بیوی ہی کا سوال نہیں تھا۔ اس کی خود داری، غیرت اور قوت کا بھی سوال تھا۔ جرائم کے اس خونی جنگل میں صرف وہی سر اُونچا کر کے رہ سکتا تھا جو دوسروں پر اپنے طاقت اور بڑائی کا سکہ جمائے۔ اگر وہ رضیہ کے اغوا پر خاموش رہا تو اس کی ساکھ خاک میں مل جائے گی اور رفتہ رفتہ اُسے میدان سے بھاگنا ہوگا۔ جبکہ اس کے برعکس چوہدری اس گمان میں تھا کہ اس نے رضیہ کے ساتھ ساتھ ملک منصور کو بھی گرفتار کر کے اپنے قابو میں کر لیا ہے اور اس کا خیال تھا کہ ملک منصور کی غیر موجودگی میں اس کے آدمی زیادہ دیر مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رکھتے۔

"کالو کہتا ہے کہ وہ لوگ پوری تیاریاں کر رہے ہیں۔" لالی نے مزید اطلاع دیتے ہوئے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے۔" میں نے کہا: "مگر لالی یہاں تہہ خانے میں تو ہر وقت آنا جانا لگا رہتا ہے اور یہاں زیادہ دیر تک چھُپ کر رہنے کی کوئی جگہ بھی نہیں ہے۔ ہم یہاں کب تک اور کیسے رہ سکتے ہیں؟"

وہ بڑی دلنوازی سے مسکرائی۔ بولی: "ملک جی۔ لالی کو آپ کیا سمجھتے ہیں۔ آپ کو یہاں تک لائی ہوں تو آپ کی اپنی جان سے بڑھ کر حفاظت کروں گی اور پھر میں جانتی ہوں کہ اس تہہ خانے سے باہر جانے کا کوئی اور راستہ بھی موجود ہے۔"

"یہ لفٹ کہاں جاتی ہے؟" میں نے پُوچھا۔

"یہ تو بڑے کمرے میں جاتی ہے۔ وہاں تو ہر طرف چوکی پہرہ رہتا ہے کوئی وہاں سے نکل کر نہیں جا سکتا۔ پر مجھے ایک بار چوہدری نے بتایا تھا کہ اِدھر سے ایک راستہ باہر بھی جاتا ہے۔ ٹھہرو۔ مجھے سوچنے دو۔" وہ اطمینان سے ایک لوہے کی میز پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔

باہر سے اچانک دھماکوں کی آوازیں سنائی دیں۔ دھماکے اتنے زوردار تھے کہ ساری عمارت لرز گئی۔ تہہ خانے کے اندر ہم لوگ بھی لرز کر رہ گئے۔ پھر فائرنگ کی آوازیں سنائی دیں۔ یوں لگا جیسے بم باری ہو رہی ہے۔ مَیں نے پریشان ہو کر لالی کو دیکھا۔ وہ بولی: "لگتا ہے آپ کے لوگ آ گئے ہیں۔ لڑائی چھڑ گئی ہے۔"

"مگر یہ بم باری۔ یہیں تہہ خانے میں ہماری قبر نہ بن جائے؟"

"اس سے زیادہ حفاظت کی جگہ اور کوئی نہیں ہے۔" وہ اطمینان سے بولی۔

لفٹ میں پھر حرکت پیدا ہوئی اور ہم لوگ پھر چھپ گئے۔ اس بار لفٹ میں سے پانچ آدمی برآمد ہوئے۔ وہ بہت ہیجان میں تھے۔ "جلدی کرو۔ مارٹر کے گولے نکالو۔ پوری طرح تیاری کر لو۔ لمبی تیاری ہو گی۔"

ان میں سے ایک بولتا رہا۔ باقی اِدھر اُدھر بھاگ کر مختلف الماریوں سے اسلحہ اور گولہ بارود کے تھیلے نکالتے رہے۔ گویا یہ تہہ خانہ محض ہیروئن کا سٹور روم ہی نہیں اسلحہ خانہ بھی تھا۔ وہ جلدی جلدی سارا ضروری سامان سمیٹ کر لفٹ کے ذریعہ اُوپر چلے گئے۔

"اب ہمیں بھی باہر نکلنا چاہیے۔" مَیں نے دھماکوں کے بڑھتے ہوئے شور کے پیشِ نظر چلّا کر کہا: "لالی، یاد کرو، باہر جانے کا راستہ کدھر ہے؟"

لالی میرے کہنے سے پہلے ہی تہہ خانے کے مختلف حصّوں میں جا کر دیکھ رہی تھی۔ ایک الماری کے پاس جا کر وہ رُک گئی اور کان لگا کر سُننے کی کوشش کرتی رہی۔ اس عرصے میں باہر سے گولہ باری، دھماکوں اور فائرنگ کی آوازوں میں کئی گنا اضافہ ہو چکا تھا۔ اُس نے الماری کا ہینڈل گھمایا اور دروازہ کھُل گیا۔ مگر اس الماری میں خانے نہیں تھے۔ نہ سامان رکھا تھا۔ اس کے اندر ایک اور آہنی دروازہ تھا۔ لالی زور لگاتی رہی مگر وہ دروازہ نہ کھلا۔ مَیں بھاگ کر اس کے پاس گیا۔

"ملک جی۔ یہی باہر جانے کا راستہ ہے۔ دیکھئے۔ اس الماری میں سامان بھی نہیں ہے۔"

"مگر یہ کھُلے گا کیسے؟" مَیں نے پریشانی سے پوچھا۔ لفٹ میں دوبارہ زندگی کے آثار پیدا ہو رہے تھے۔ وقت کم تھا۔ مَیں نے شین گن اٹھائی اور الماری کے تالے پر فائرنگ شروع کر دی۔ سارا تہہ خانہ فائرنگ کی آواز سے گونج اُٹھا مگر الماری کا تالا کھُل گیا۔ زور لگانے سے دروازہ تھوڑا سا کھُلا اور تازہ ہوا کا جھونکا اندر داخل ہوا۔ مارے خوشی کے ہم لوگ دیوانے ہو گئے۔ یہ بہت بڑی دریافت تھی مگر خوشی کی شدّت میں ہم لفٹ کو بھول گئے۔ لفٹ کا دروازہ یک لخت کھُل گیا تھا اور اس کے اندر سے تین مسلّح خوفناک صورت والے لوگ باہر نکل رہے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی انھوں نے اپنی گنوں کا رُخ ہماری طرف کر دیا۔ ان کے کچھ جاننے سے پہلے ہی وہ گولیوں سے چھلنی ہو کر گر گئے۔

"میرا خیال ہے اس لفٹ کو ناکارہ بنا دیں۔" رضیہ نے مشورہ دیا۔ بہت مناسب اور بروقت تجویز تھی۔ مَیں لپک کر لفٹ کے پاس گیا۔ یہ ایک سٹین لیس سٹیل کے فریم کی جدید لفٹ تھی۔ مَیں نے لفٹ کے اندر نظر آنے والے تمام آلات اور بٹنوں کو شین گن کی گولیوں سے چھلنی کر دیا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کا سسٹم عمل کے قابل نہیں رہا تھا۔ اُوپر سے لفٹ کو استعمال کرنے والوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ مکینک کو پکار رہے تھے۔ مَیں نے رضیہ اور لالی کو اشارہ کیا اور ہم دیوانہ وار بھاگتے ہوئے آہنی الماری میں سے باہر کی طرف نکلنے والے راستے کی طرف دوڑے۔ احتیاط کے طور پر مَیں نے ایک مرے ہوئے مسلّح محافظ کی شین گن بھی اُٹھا کر اپنے شانے سے لٹکا لی اور رضیہ اور لالی کو باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔

ہمیں اس عقوبت خانے سے باہر نکلنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ ہم ایک باغ نما مقام پر تھے جس کے چاروں طرف کھُلا میدان تھا۔ آس پاس کچھ پُرانی سی عمارتیں بھی نظر آ رہی تھیں۔ بظاہر یہ ایک غیر آباد گاؤں نظر آ رہا تھا۔

ہم نے اطمینان کی سانس لی لیکن ہم یہ نہیں جانتے تھے کہ اس حویلی سے ہم کتنی دُور ہیں۔ یہ بھی اندیشہ تھا کہ چوہدری کے کارندے یہاں حفاظت کے لیے ضرور مامور ہوں گے۔ مارٹر کے گولے ہمارے سروں پر سے ہو کر گزر رہے تھے۔ فائرنگ

دھماکے، چیخیں۔ بالکل جنگ کا سا سماں تھا۔ یکایک ایک ہیلی کاپٹر کی آواز عین ہمارے سروں پر سُنائی دی اور دوسرے ہی لمحے ایک ہیلی کاپٹر ہماری آنکھوں کے سامنے کھُلے میدان میں اُتر کر کھڑا ہو گیا۔ ہیلی کاپٹر کے اندر سے پہلے دو مسلّح سیاہ وردی پوش آدمی نکلے اور پھر ایک سفاری سوٹ میں ملبوس درمیانی عمر کا شخص برآمد ہوا۔ مسلّح آدمیوں نے ہمیں دیکھ لیا تھا اور وہ اپنی بریٹ گنوں کا رُخ ہماری طرف کر چکے تھے۔ سُوٹ میں ملبوس آدمی لمبے لمبے قدم اُٹھاتا ہوا ہماری طرف بڑھا۔ وہ ایک پُراعتماد شخص نظر آ رہا تھا۔ مَیں لالی اور رضیہ سے چند قدم آگے تھا اور ان کے چہروں کے تاثرات نہیں دیکھ سکتا تھا۔ لیکن میرے چہرے کا رنگ اس وقت یقیناً فق ہو رہا ہو گا۔ میرے پاس شین گنیں سنبھالنے کا موقعہ بھی نہیں تھا۔ میری ذرا سی حرکت بھی رضیہ اور لالی کو موت کے مُنہ میں پہنچا سکتی تھی۔

مَیں خاموش کھڑا رہا۔ سوٹ میں ملبوس آدمی چند لمبے لمبے ڈگ بھر کر میرے نزدیک پہنچ گیا: "تم کون لوگ ہو؟" اس نے رُعب دار آواز میں پُوچھا۔

"جی... جی ہم تو مزارعے ہیں جناب۔ کیا آپ کوئی سرکاری افسر ہیں؟" مَیں نے لجاجت سے پوچھا۔

وہ زور زور سے ہنسنے لگا: "سرکاری افسر کا یہاں کیا کام؟ میرا نام منصور ہے۔ ملک منصور ــــــ"

مَیں سکتے کے عالم میں اسے دیکھتا رہ گیا۔

وہ ملک منصور تھا جس کا بہروپ میں دھارے ہوئے تھا۔ چوہدری کا کاروباری رقیب اور دشمن اور رضیہ کا شوہر۔ ملک منصور۔ شین گن میرے کاندھے سے لٹکی ہوئی تھی لیکن میرے ہاتھوں میں اسے بلند کرنے کی سکت نہیں تھی اور نہ ہی اس کا موقعہ تھا۔ میرے سامنے وہ شخص کھڑا تھا جس کا بھیس بدل کر مَیں نے اپنی جان بچائی تھی اور چوہدری کی نفرت اور دشمنی بھی مول لی تھی۔ وہی ملک منصور اس وقت میرے سامنے کھڑا تھا اور چاروں طرف جنگ جاری تھی۔ گولیوں، دھماکوں اور چیخوں کی آوازوں کے پس منظر میں یوں لگتا تھا جیسے ہم کسی بڑی جنگ کے محاذ پر پہنچ گئے ہیں۔ اور واقعی یہ جنگ ہی تھی۔ دو شیطانی طاقتوں اور ملک و قوم اور قانون کے دشمنوں کے درمیان ان دونوں کی شکلیں مختلف تھیں لیکن ذہن و دماغ یکساں تھے۔ ان کی مجرمانہ ذہنیت میں کوئی فرق نہیں تھا۔ دونوں ہی بہت بڑے پیمانے پر سمگلنگ اور قانون شکن کارروائیوں میں مصروف تھے۔ دونوں ہی ہیروئن کا زہر ہلاہل فروخت کر کے اپنی دولت، قوت اور اختیار میں اضافہ کر رہے تھے۔ وہ بذاتِ خود حکومت کے اندر ایک حکومت تھے۔ ان کی طاقت کا نمونہ میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ ان کی سپاہ بے اندازہ تھیں اور وہ جدید ترین آلات اور اسلحہ سے لیس بھی تھیں۔ وہ ایک دوسرے کو معدوم کرنے کے لیے نبرد آزما تھے۔ حالانکہ فی الوقت یہ ٹکراؤ ایک جذباتی اور رومانی بُنیاد کے سبب رونما ہوا تھا۔ ٹرائے کی روایتی ہیلن کی خاطر ایک ہزار جنگی بحری جہاز چڑھ دوڑے تھے۔ وہ تھی ہی اس قدر حسین اور دلفریب۔ اب رضیہ کے خوبصورت مکھڑے کی خاطر ملک منصور چوہدری کے ٹھکانے پر حملہ آور ہوا تھا۔ اگرچہ اس یلغار کا ایک سبب ملک منصور کی غیرت کی حفاظت کرنا بھی تھا۔ وہ علاقے کی ایک طاقت ور ہستی تھا اور اس کی بیوی کو اس کا ایک حریف زبردستی اُٹھا کر لے گیا تھا۔ جرائم کی دُنیا میں بھی جنگل کی طرح طاقت کا قانون ہی چلتا ہے۔ وہی راج کرے گا جو زیادہ طاقت ور ہو گا۔ چنانچہ ایک طرح سے یہ اُن دونوں کے مابین طاقت کا مظاہرہ بھی تھا جس کے بعد زیادہ طاقت ور اور زیادہ با اختیار شخص کے بارے میں فیصلہ ہونا تھا۔

مَیں خاموش کھڑا ملک منصور کو تک رہا تھا اور میری پُشت پر وہ حسینہ تھی جس کے نام پر یہ جنگی کارروائی ہو رہی تھی یہ بھی غنیمت تھا کہ رضیہ لالی کی طرح دیہاتی عورتوں کے لباس میں تھی اور ملک منصور نے ایک بار بھی اس کی طرف نگاہ اُٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ پھر بھی یہ صورتِ حال میرے لیے سخت تشویشناک اور پریشان کُن تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں رضیہ نہ بول پڑے اور ملک منصور کو حقیقت کا علم ہو جائے۔ یہ اندیشہ بھی تھا کہ لالی جو اب تک مجھے ملک منصور سمجھ رہی تھی

بے اختیار ہو کر کوئی ایسی بات اپنے مُنہ سے نہ نکال دے جس سے ملک منصور کو اصلیت کا علم ہو جائے۔ دراصل ملک منصور کی موجودگی میرے لیے قطعی غیر متوقع اور بالکل اچانک تھی اس لیے مَیں بالکل دم بخود ہو کر رہ گیا تھا۔ اس تمام صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے مجھے تھوڑی مہلت درکار تھی۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ مَیں اس وقت مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں مطلق نہیں تھا۔ ملک منصور کے عقب میں اس کے دو قوی ہیکل محافظ خود کار بندوقیں تانے کمر بستہ کھڑے تھے جن کا رُخ میری طرف تھا اور میری ذرا سی حرکت بھی نہ صرف مجھے بلکہ میری پشت پہ کھڑی رضیہ اور لالی کو چھلنی کر سکتی تھی۔ مَیں ایک عجیب مخمصے کے عالم میں تھا۔ میرے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل سکا اور مَیں لب بستہ کھڑا ملک منصور کو دیکھتا رہا۔

چند لمحے اس نے میری لب کشائی کا انتظار کیا مگر جب میں خاموش رہا تو وہ خود گویا ہوا: "تم کون ہو؟ کہاں سے آ رہے ہو۔ چوہدری سے تمہارا کیا تعلق ہے؟"

اس نے مجھے بولنے کے لیے ایک مناسب بہانہ فراہم کر دیا تھا۔ مَیں نے کہا: "جناب۔ مَیں ایک کسان ہوں۔ اپنے گھر والوں کے ساتھ گھر جا رہا ہوں۔ چوہدری صاحب کا مزارع ہوں۔"

"مزارع ہو یا کچھ اور؟" اس نے تیز آواز میں سوال کیا۔ "تمہارے پاس یہ سٹین گن کہاں سے آئی ہے؟"

مَیں اس سوال سے بوکھلا گیا۔ لیکن اس کا اظہار میرے حق میں زہرِ قاتل ثابت ہو سکتا تھا۔ اس لیے مَیں نے فوراً جواب دیا۔ "یہ بندوق تو میرے بھائی کی ہے جناب۔ وہ چوہدری صاحب کے پاس ملازم ہے۔ تھوڑے دن پہلے بھی علاقے میں لڑائی ہوئی تھی۔ چوہدری صاحب کے دشمنوں نے حملہ کر دیا تھا۔ اس لیے میرے بھائی نے حفاظت کے لیے یہ بندوق مجھے دیدی تھی۔ دیکھئے نا جناب، عورتوں کی حفاظت بھی تو کرنی ہی پڑتی ہے۔ ان کی عزّت پر تو ہم گاؤں والے جان دے دیتے ہیں۔"

ملک منصور کو میرا یہ سادہ اور کھرا جواب پسند آگیا۔ اس کی نگاہوں میں نرمی پیدا ہو گئی۔ چہرے کی سختی بھی یکایک کم ہو گئی اور ایک مسکراہٹ سی اس کے لبوں پر نمودار ہوئی۔

"تم مجھے جانتے ہو۔ مَیں کون ہوں؟" اس نے سوال کیا۔

"آپ ملک منصور ہیں جناب۔ میرا بھائی بتا رہا تھا کہ آپ چوہدری جی کی زمینیں خریدنا چاہتے ہیں۔ یہ علاقہ بہت اچھا ہے جناب۔ مگر لڑائی دنگا بہت ہوتا رہتا ہے۔ جب دیکھو گولیاں چلتی ہیں۔ مَیں تو جی کسی دوسرے گاؤں میں جا کر رہنے کی سوچ رہا ہوں۔ اِدھر تو زندگی کا کوئی پتہ نہیں ہے۔ ہر وقت جان سُولی پر ٹنگی رہتی ہے۔ اب یہ دیکھ لیجئے۔ کیسی گھمبیر لڑائی ہو رہی ہے۔ کسی دن ایسے ہی بے موت مارے جائیں گے ہم سب۔" مَیں نے ایک سادہ لوح کسان کی ایکٹنگ جاری رکھی تھی۔

لیکن ملک منصور کی توجہ کسی اور طرف تھی۔ اس کے عقب میں دو جیپ گاڑیاں نمودار ہو کر ہماری طرف بڑھ رہی تھیں۔ منصور کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے تشویش کے تاثرات نمودار ہوئے لیکن جیپ گاڑیوں کو بغور دیکھنے کے بعد وہ مطمئن ہو گیا۔ جیپیں پیلی کا پٹر کے قریب پہنچ کر رُک گئیں اور اُن میں سے چھ سات مسلح آدمی نکل کر ہماری طرف بڑھے۔

"گھیرا بہت مضبوط ہے ملک صاحب۔" اُن میں سے ایک گھنی مونچھوں اور خوفناک صورت والا نزدیک آ کر ملک منصور سے مخاطب ہوا: "اگر چوہدری نے ہار نہیں مانی تو حویلی کو ملبہ اور اس کا مقبرہ بنا دیں گے۔"

"ساکا کی کوئی خبر ملی؟" ملک نے پوچھا۔

"وہ تو حویلی کے کسی تہہ خانے یا قید خانے میں ہو گا جی جب تک حویلی کے اندر نہ جائیں اس کا نشان کیسے ملے گا جناب۔"

"دیکھو یونس،" ملک منصور سنجیدگی سے تحکمانہ انداز میں بولا۔ "وہ ہمارا وفادار آدمی ہے۔ بڑا جی دار آدمی ہے۔ ہم چاہتے ہیں اس کو خطرے میں نہ ڈالو۔"

"وہ تو ٹھیک ہے جناب۔" یونس بے تکلفی سے گویا ہوا۔ "پر ابھی تو اس غریب کی جان کو خطرہ ہی خطرہ ہے۔ ہماری گولیوں اور گولوں سے بھی خطرہ ہے اور چوہدری کے آدمیوں سے بھی خطرہ ہے۔ کوئی پتہ نہیں جی وہ اب تک زندہ بھی ہے یا چوہدری نے گرمی کھا کر اسے مار ہی دیا ہے۔"

ملک منصور کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ "اگر ایسا ہوا تو چوہدری کے لیے اس کا انجام بہت بُرا ہو گا۔"

مَیں اس اثنا میں ملک منصور کا جائزہ لے چکا تھا۔ وہ متوسط قد و قامت اور درمیانی عُمر کا ایک شخص تھا۔ اس کا رنگ کھلتا ہوا تھا اور آنکھوں سے ذہانت کا اظہار ہوتا تھا۔ اس کے ہاتھوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا جیسے اس نے زندگی بھر کوئی مشقت کا کام نہیں کیا ہے۔ بظاہر دیکھنے میں وہ ایک خوشحال، آرام طلب، دولت مند آدمی نظر آتا تھا۔ چوہدری کے برعکس وہ ایک مہذب اور تعلیم یافتہ انسان ہونے کا تاثر دیتا تھا۔ وہ ایک سفاری سوٹ میں ملبوس تھا اور اس کے پاس کسی قسم کا اسلحہ نہیں تھا۔ اس نے یونس کی بات سُننے کے بعد آس پاس نظریں دوڑا کر حالتِ جنگ کا جائزہ لیا اور بڑے اطمینان اور سکون سے بُش شرٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ کی ڈبیا نکال لی۔ سگریٹ ہونٹوں میں دبانے کے بعد اس نے دوسری جیب سے ایک سنہری لائٹر نکال کر سگریٹ سلگائی اور بے تعلق اور بے فکری کے انداز میں اس طرف دیکھنے لگا جدھر سے ایک زوردار دھماکے کی آواز آئی تھی۔ چوہدری کے مقابلے میں وہ زیادہ ہوشیار اور زیادہ مضبوط اعصاب کا مالک دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے سراپا سے شہری ہونے کا تاثر ملتا تھا۔ جب کہ چوہدری ایک خالص زمیندار اور جاگیر دار نظر آتا تھا۔ اتنی دیر میں گولیوں اور مارٹر کی آوازوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ دُور سے گاڑیوں کے انجنوں کی ملی جلی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ اس سے پہلے جو دھماکہ ہوا تھا اس سے یہ اندازہ ہوتا تھا جیسے بارود کا کوئی ذخیرہ پھٹا ہو۔ ملک منصور نے لائٹر اور سگریٹ کا پیکٹ جیب میں واپس ڈال کر سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا اور پہلی بار اس نے غور سے اُن دو عورتوں کو دیکھا جو میرے عقب میں گھونگٹ لٹکائے اور سر جھکائے کھڑی ہوئی تھیں۔ ملک منصور کے بارے میں جو بھی خیالی تاثر مَیں نے قائم کیا تھا وہ اسے دیکھ کر بالکل باطل ثابت ہوا تھا۔ وہ ایک نرم لباس اور خوش اطوار انسان ہونے کے علاوہ انتہائی پُرسکون اور متحمل آدمی تھا۔ چاروں طرف جنگ و جدل کا بازار گرم تھا۔ وہ اپنی اغوا شدہ بیوی کو واپس لینے کے لیے پورے کروفر کے ساتھ آیا تھا اور اپنے ایک طاقت ور حریف کے ساتھ نبرد آزما تھا۔ اس کے باوجود وہ انتہائی مطمئن اور کسی ہیجان کے بغیر نظر آ رہا تھا۔ اس کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شکار کھیلنے یا سیر و تفریح کرنے کی غرض سے یہاں آیا ہے اور اپنے پروگرام سے پوری طرح لُطف اندوز ہو رہا ہے۔ وہ کسی بھی طرح جلدی یا گھبراہٹ میں مُبتلا نہیں تھا۔ اس کو دیکھ کر مَیں دل ہی دل میں حیران ہو رہا تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ آخر کیا سبب ہے کہ رضیہ اس کو ناپسند کرتی ہے اور اس کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے آمادہ نہیں ہے!

ملک منصور نے سرسری نظر دونوں عورتوں پر ڈالی اور میری روح فنا ہو گئی۔ مَیں دل ہی دل میں دُعا کر رہا تھا کہ وہ ان عورتوں پر اپنی توجہ مرکوز نہ کرے لیکن شاید اس وقت میرے لیے قبولیت کا وقت نہیں تھا۔ کیونکہ ملک منصور کا دھیان اب رضیہ اور لالی کی طرف لگ گیا تھا۔

"یہ عورتیں کون ہیں؟" اس نے سگریٹ کا دھواں ناک سے خارج کرتے ہوئے پوچھا۔

مَیں نہ تو اس صورتِ حال کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھا اور نہ ہی اس سوال کے لیے۔ اس موقعہ پر میرا سچ بھی

تباہ کن ثابت ہو سکتا تھا اور جھوٹ بھی۔ میں بھلا اس کو اس کی بیوی کے بارے میں کیا بتاتا اور کیسے بتاتا کہ وہ پچھلے دنوں دُنیا کے سامنے میری بیوی بن کر رہی ہے اور میں ملک منصور کا رُوپ دھارے رہا ہوں لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ اس سوال کے جواب میں اگر میں نے تامّل کیا تو وہ خواہ مخواہ میرے بارے میں شک و شبہ کا شکار ہو جائے گا۔ اس لیے میں نے اس کے سوال کا جواب دینے میں ذرا بھی دیر نہیں لگائی اور کہا: "جناب! یہ میری گھر والی ہے۔" میں نے ہاتھ سے رضیہ کی طرف اشارہ کیا جو سر جھکائے خاموش کھڑی تھی۔

"اور یہ؟" ملک منصور نے رضیہ کے بارے میں پوچھا۔

اب میری ذہانت اور حاضر جوابی کی آزمائش کا موقعہ تھا۔ ایک پل کے لیے تو میں گھبرا گیا لیکن بظاہر میں نے بڑے اعتماد سے جواب دیا: "میں اسے نہیں جانتا جناب۔ یہ تو ابھی ابھی ہمیں جنگل میں مل گئی ہے۔ بہت پریشان نظر آ رہی تھی اس لیے لالی نے اسے اپنے ساتھ لے لیا۔"

نہ جانے ملک منصور نے میرا جواب سُنا یا نہیں سُنا کیونکہ اس کی نگاہیں اب رضیہ پر جمی ہوئی تھیں اور ان میں ایک مخصوص قسم کی چمک میں صاف طور پر دیکھ سکتا تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھوں کی چمک کا سبب بھی مجھے معلوم ہو گیا۔ گھونگٹ اور دیہاتی لباس سے گزر کر ملک منصور کی نظریں ایک جگہ رُک گئی تھیں۔ وہ رضیہ کے ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا جو دوپٹے سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ اس کے بائیں ہاتھ میں دوسری اُنگلی میں ایک ہیرے کی انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ رضیہ کی یعنی اس کی بیوی کی انگوٹھی تھی اور بہت ممکن ہے کہ یہ انگوٹھی خود اُسی نے تحفے کے طور پر اپنی بیوی کو پیش کی ہو۔ وہ اس انگوٹھی کو اور پھر ذرا غور سے دیکھنے کے بعد اس نازک اور ملائم ہاتھ کو پہچان گیا تھا جو کسی طور بھی ایک سخت جان دیہاتی عورت کا ہاتھ نہیں ہو سکتا تھا۔ ملک منصور کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ لیکن معلوم ہوا کہ اسے اپنے اعصاب اور جذبات پر مکمل کنٹرول تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور شخص ہوتا تو غصے، خوشی یا حیرت و استعجاب کے تاثرات کا بھرپور اظہار کر دیتا لیکن ملک بالکل پُرسکون اور نارمل نظر آ رہا تھا۔

اس نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے سامنے کھڑے ہوئے مسلح لوگوں کو دُور جانے کا اشارہ کیا۔ اس حکم کی فوری طور پر تعمیل کی گئی۔ ملک منصور چند قدم آگے بڑھا اور مجھے اور لالی کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے رضیہ کا ہاتھ تھام لیا۔ رضیہ نے بے اختیار سر اُٹھا کر دیکھا اور اس کے چہرے پر سے گھونگٹ ہٹ گیا۔ یوں لگا جیسے بادلوں میں سے چاند نکل آیا ہو۔ ملک منصور نے ایک شک بھری نگاہ مجھ پر اور لالی پر ڈالی اور پھر رضیہ سے مخاطب ہوا: "تم؟! اور اس لباس میں؟ اور ان لوگوں کے ساتھ؟!"

لالی خوف سے لرز کر رہ گئی لیکن رضیہ نے اپنی سیاہ بڑی بڑی آنکھیں پھیلا کر منصور کو دیکھا اور پُراعتماد لہجے میں بولی۔

"یہ لباس میں نے حویلی سے فرار ہونے کے لیے ایک نوکرانی سے لے لیا تھا۔ وہاں تو لڑائی شروع ہو گئی تھی اور سب لوگ اس میں مصروف تھے۔ میں نے موقعہ پا کر ایک نوکرانی سے یہ لباس لیا اور غسل خانے کے پچھلے دروازے سے باہر نکل آئی۔ وہاں جنگل میں یہ لوگ مل گئے۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ شکر ہے کہ لالی میرے بیان پر خاموش رہی تھی اور رضیہ نے بہت معقول بہانہ تراش لیا تھا۔ ملک منصور کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ سگریٹ کا کش لے کر بولا: "بڑی دلچسپ بات ہے۔ مگر تم اتنی دیر سے خاموش کیوں کھڑی ہو؟" پھر وہ ذرا رُک کر طنزیہ انداز میں کہنے لگا: "کیا تم نے مجھے پہچانا نہیں تھا؟" رضیہ کی آواز میں غصے کی ہلکی سی جھلک سنائی دی: "پہچانا کیوں نہیں تھا؟ مگر میں سب کے سامنے تمہارا اور اپنا تماشہ نہیں بنانا چاہتی تھی۔ خاص طور پر تمہارے نوکروں کے سامنے۔ میرا یہ حلیہ ایسا نہیں ہے جس میں وہ اپنی مالکن کو دیکھنا پسند کریں گے۔" وہ بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں گفتگو کر رہی تھی لیکن اس کی آواز میں برہمی اور چہرے

پر شکایت کی جھلک واضح طور پر دیکھی جا سکتی تھی۔ رضیہ کی شخصیت پرت در پرت مجھ پر کھل رہی تھی۔ پہلے مجھے پتہ چلا کہ وہ جوڈو کراٹے کی ماہر اور ایک بہادر عورت ہے اور اب مجھ پر یہ راز کھلا کہ وہ انتہائی ذہین اور موقعہ شناس ہونے کے ساتھ ساتھ دلیل تراشنے کی بھی ماہر ہے۔ اس نے میرے جھوٹ کو نبھاتے ہوئے جو فی البدیہہ جواب دیا تھا اس کی معقولیت کا میں بھی قائل ہو گیا۔

ملک منصور نے ہاتھ اُٹھا کر کہا: "اوکے۔ اوکے۔" اور اس کا ہاتھ چھوڑ دیا: "آئی ایم سوری۔" اس نے ملائمت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا اور پھر پلٹ کر کچھ دُور کھڑے ہوئے آدمیوں کی طرف متوجہ ہوا: "بادل!" اس نے بلند آواز میں کہا اور ایک قوی ہیکل بندوق بردار محافظ آگے بڑھ کر مؤدبانہ اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"ان لوگوں کو جیپ میں بٹھا کر کوٹھی لے جاؤ۔ مگر پوری حفاظت کے ساتھ۔ چاہو تو اپنے ساتھ کچھ اور لوگ بھی لے جا سکتے ہو۔" یہ کہہ کر وہ جانے لگا۔

میں نے پریشانی سے ملک منصور کو دیکھا: "مگر جناب۔ یہاں میرا گھر ہے میری نوکری ہے۔"

"چُپ چاپ بادل کے ساتھ جاؤ۔" وہ ڈانٹ کر بولا: "اس جگہ کو بھول جاؤ۔ تمہیں اس سے اچھا گھر اور کام مل جائے گا۔" یہ کہہ کر وہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا اس طرف بڑھا جدھر سے فائرنگ اور دھماکوں کی آوازیں آ رہی تھیں اور لمحہ بہ لمحہ ان میں اضافہ ہو رہا تھا۔

"چلو۔" بادل نے بھاری بھرکم اور کھردری آواز میں حکم دیا۔

میں نے خاموش نگاہوں سے رضیہ کو دیکھا جو آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے بادل کے ساتھ چلنے کی ہدایت دے رہی تھی۔ اب لالی کے چہرے سے بھی گھونگٹ ہٹ گیا تھا اور وہ سہمے ہوئے انداز میں کبھی مجھے اور کبھی رضیہ کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے لالی کا بازو تھپک کر کہا: "فکر مت کر لالی۔ ملک صاحب بھی ہمارے مائی باپ ہیں۔ ہم ان کے پاس یہاں سے بھی زیادہ آرام سے رہیں گے۔" میں نے بازو تھام کر اسے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا اور وہ چُپ چاپ میرے ساتھ چل پڑی۔ رضیہ پہلے ہی چل پڑی تھی اور ہم سے دو قدم آگے جا رہی تھی۔ خدا جانے بادل نے رضیہ اور ملک منصور کے درمیان میں ہونے والی باتیں سُنی تھیں یا نہیں لیکن اس نے ہم سب کو جس انداز سے مخاطب کیا تھا اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ رضیہ کی اصلیت اور حیثیت سے ناواقف ہے۔ رضیہ بھی لالی کی طرح معمولی دیہاتن عورت کے لباس میں تھی لیکن اس کی چال کی تمکنت اسے لالی سے ممتاز کر رہی تھی۔ بادل کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کے آقا کی بیوی بھی اس کی تحویل میں ہے لیکن رضیہ کی باوقار شخصیت نے اسے مرعوب کر دیا تھا۔ وہ سٹین گن کاندھے پر رکھے ہم تینوں سے چند قدم پیچھے چل رہا تھا۔ اس کے اشارے پر دو اور مسلح افراد بھی اس گروہ کو چھوڑ کر ہماری طرف آ گئے تھے اور اب یہ مختصر سا قافلہ سامنے کھڑی ہوئی جیپوں کی طرف رواں دواں تھا۔

گولیوں اور دھماکوں کی آوازوں میں اچانک اضافہ ہو گیا تھا۔ چند دھماکے ہمارے نزدیکی درختوں کے ذخیرے کے پاس بھی ہوئے تھے لیکن بادل انھیں نظر انداز کرتا ہوا تیز رفتاری سے جیپ کی طرف چلتا رہا۔ جیپ کے پاس پہنچ کر میں بھی رُک گیا۔ یہ جیپ کیا تھی اچھا خاصا اسلحہ خانہ تھی۔ اس کی پچھلی جانب سٹین گنوں اور ایمونیشن کا ڈھیر موجود تھا۔ جو بادل اور اس کے دو ساتھیوں نے پھرتی سے پاس ہی کھڑی ہوئی دوسری جیپ میں منتقل کر دیا۔ دوسری جیپ میں مجھے ایک مارٹر پھینکنے والی توپ بھی نظر آ گئی۔ یہ ایک چھوٹے سائز کی مارٹر توپ تھی جسے ایک شخص اپنے کاندھے پر بھی اُٹھا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ملک منصور اپنے حریف چوہدری کے ساتھ ایک فیصلہ کن جنگ کرنے کی نیت سے آیا تھا اور مجھے یقین تھا کہ آج ان دونوں میں سے کسی ایک کی برتری کا فیصلہ ہو جائے گا۔ بادل نے جیپ کے اندر سے جو اسلحہ اُتارا تھا وہ دوسرے ساتھیوں نے برابر والی جیپ میں رکھ دیا تو بادل نے رضیہ کو ہاتھ کے اشارے سے جیپ

کی اگلی سیٹ پر بیٹھنے کی دعوت دی۔ رضیہ نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی اور خاموشی سے جیپ میں سوار ہو گئی۔ بادل نے مجھے اور لالی کو پچھلی جانب بیٹھنے کے لیے کہا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس کے دونوں مسلح ساتھی کود کر ہمارے ساتھ ہی جیپ پر سوار ہو گئے اور جیپ ایک جھٹکے سے سٹارٹ ہو کر چوہدری کی حویلی سے مخالف سمت میں دوڑنے لگی۔ ابھی ہم کچے راستے پر زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ سامنے سے گرد اڑتی ہوئی دکھائی دی۔ بادل اور اس کے ساتھی چوکنا ہو گئے۔ اور پچھلی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے دونوں آدمیوں نے اپنی سٹین گنیں اٹھا لیں۔ چند لمحے بعد دھول کے بادل چھٹے تو سامنے سے ایک جیپ تیزی سے ہماری جانب آتی ہوئی نظر آئی۔ بادل نے اپنی جیپ کو تیزی سے ایک طرف موڑ کر درختوں کی آڑ میں کھڑا کر دیا۔ اور اس کے دونوں ساتھیوں کے ساتھ ساتھ اس نے بھی مورچہ سنبھال لیا لیکن چند ہی لمحے بعد ماحول کی کشیدگی اچانک ختم ہو گئی۔ بادل نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور چلایا "خیر دینا۔ خیر ہو تیرے میرے شیر۔"

سامنے سے آتی ہوئی جیپ میں ڈرائیور سمیت چار افراد سوار تھے اور وہ چاروں اسلحے سے لیس تھے۔ ان میں سے ایک تنومند شخص مشین گن سنبھالے ہوئے کھڑا تھا۔ باقی اپنی جگہوں پر شین گنیں تانے براجمان تھے۔ کھڑے ہوئے شخص نے پُرجوش انداز میں ہاتھ ہلایا اور ان کی جیپ خاک اڑاتی ہوئی تیزی سے ہمارے سامنے سے گزر گئی۔ ظاہر ہے کہ یہ ملک منصور کے حملہ آوروں کے لیے مزید کمک آئی تھی۔ اس سے پہلے کتنی جیپوں میں بھر کر ملک منصور کے مسلح آدمی چوہدری کی حویلی پر حملہ آور ہوئے تھے؛ اس بارے میں مجھے کوئی علم تھا اور نہ اندازہ۔ لیکن اتنا مجھ پر واضح ہو چکا تھا کہ ملک منصور آج کے معرکے میں شکست کا ذرا سا بھی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھا اور اس نے اپنے کاروباری حریف کو راستے سے ہٹانے کے لیے ہر طرح کی تیاری مکمل کر لی تھی۔

ہم ایک کچی سڑک پر سفر کر رہے تھے جو قطعی غیر ہموار تھی لیکن بادل نہایت تیز رفتاری اور مہارت سے گاڑی چلا رہا تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ نہ صرف ان علاقوں اور راستوں سے بخوبی واقف ہے بلکہ یہاں جیپ چلانے کا بھی کافی تجربہ رکھتا ہے۔ اگلی سیٹ پر اس کے برابر میں رضیہ بیٹھی ہوئی تھی جو بالکل خاموش اور بے حس و حرکت تھی۔ پچھلے حصے میں لالی اور میں بھی مہر بلب تھے۔ ملک منصور کے دونوں مسلح کارندے بھی بے زبان مخلوق کی طرح کوئی آواز پیدا کیے بغیر اپنی خودکار بندوقیں سنبھالے بالکل چوکنا تھے۔ ہر طرف خاموشی اور سناٹا تھا۔ جیپ کے علاوہ کوئی اور آواز کسی سمت سے بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ چند میل کے بعد بادل نے جیپ کو بائیں جانب ایک پگڈنڈی نما راستے پر ڈال دیا۔ کسی نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ لیکن وہ خود ہی وضاحت کرنے کی خاطر کہنے لگا: "یہ راستہ چھوٹا ہے ہم جلدی کوٹھی پہنچ جائیں گے۔" جواب میں کوئی بھی نہیں بولا اور جیپ کچھ فاصلے طے کرنے کے بعد ایک پہاڑی قسم کے علاقے میں داخل ہو گئی۔ یہ ایک سنگلاخ اور اونچا نیچا علاقہ تھا۔ پتھریلی سڑک خاصی پیچ دار تھی اور خم کھاتی ہوئی چھوٹی چھوٹی پہاڑی ٹیلوں کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ اب یہاں درختوں کی تعداد بھی زیادہ ہو گئی تھی اور بعض جگہوں پر تو خاصے گھنے اور بلند سایہ دار درخت بھی تھے۔ اگرچہ یہ زیادہ بلند پہاڑی علاقہ نہیں تھا پھر بھی غالباً درختوں کی وجہ سے یہاں موسم نسبتاً ٹھنڈا تھا۔ پتھریلے اور خم دار راستے پر پہنچ کر جیپ کی رفتار خود بخود کم ہو گئی اور ہم مسافروں نے بھی جیپ کے ساتھ ساتھ اچھلنا اور ایک دوسرے سے ٹکرانا شروع کر دیا۔ لالی میرے برابر بیٹھی ہوئی تھی اور جب بھی بادل تیزی سے کوئی موڑ کاٹتا تو وہ مجھ پر گر جاتی حالانکہ وہ سنبھلنے کی کافی کوشش بھی کرتی تھی۔ اس کے باوجود ایک دوسرے سے ٹکرانے اور ایک دوسرے پر گرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ کوئی خوشگوار موقع ہوتا تو شاید میں اس خوبصورت "حادثے" سے لطف اندوز ہوتا لیکن ان کشیدہ اور پُرخطر حالات میں اس کا بار بار مجھ پر گرنا مجھے ناگوار گزر رہا تھا جس کا غالباً اسے بھی اندازہ ہو گیا تھا لیکن وہ مجبور اور بے بس تھی۔ پچھلے حصے میں موجود دونوں مسلح کارندے غالباً ایسے سفر کے عادی معلوم ہوتے تھے اس لیے وہ جیپ کے ساتھ زیادہ حرکت نہیں کر رہے تھے۔ انھوں نے مضبوطی سے

جم کر بیٹھنے کی غرض سے اپنی بندوقوں کو اپنے زانوں پر رکھ لیا تھا اور اتنے زیادہ مستعد نہیں رہے تھے جتنے کہ سفر کے آغاز میں تھے۔

یکایک جیپ نے ایک خطرناک موڑ کاٹا اور ایک تنگ پتھریلی سڑک پر مڑ گئی۔ اب ہمارے آس پاس پہاڑی ٹیلوں اور بلند اور گھنے درختوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا۔ راستہ اتنا تنگ تھا کہ یہاں سے دو گاڑیاں بیک وقت نہیں گزر سکتی تھیں۔ بادل نے جیپ کی رفتار میں اور کمی کر لی تھی۔ اس کے باوجود وہ بیس پچیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کر رہا تھا۔ اچانک اس نے زور سے بریک لگائے اور جیپ میں سوار سب لوگ بوریوں کی طرح گڈمڈ ہو گئے۔ ہمارے ساتھ بیٹھے ہوئے دونوں کارندوں کے سر بہت زور کی آواز کے ساتھ ایک دوسرے سے ٹکرائے اور اس جھٹکے سے ان میں سے ایک کی خودکار بندوق جو اس کی گود میں رکھی ہوئی تھی۔ زمین پر گر گئی۔ اس نے زور سے ایک نعرہ مارا: "روکو روکو گڈی روکو۔ بندوق گر گئی ہے۔"

بادل نے تو پہلے ہی بریک مار دیا تھا اور جیپ ایک زوردار جھٹکا لینے کے بعد بالکل ساکت ہو گئی تھی۔ دیکھا جائے تو کارندے کی شور مچانے والی حرکت قطعی غیر ضروری تھی لیکن بے اختیار اس کے منہ سے یہ آوازیں نکل گئی تھیں۔ دونوں کارندے جیپ سے کود کر باہر نکل گئے۔ میں نے سامنے دیکھنے کی کوشش کی تو بادل کے اچانک بریک لگانے کا سبب بھی معلوم ہو گیا۔ تنگ پتھریلی سڑک کے عین درمیان ایک پتھر کا بہت بڑا ٹکڑا اس طرح پڑا ہوا تھا کہ جیپ کے گزرنے کے لیے راستہ باقی نہیں رہا تھا۔ پتھر خاصا وزنی اور بڑے سائز کا تھا۔ جس پر سے جیپ کا گزر جانا ممکن نہیں تھا۔ بادل نے پتھر کی شان میں با آوازِ بلند گستاخی کی اور اپنے پیچھے کھڑے ہوئے دونوں ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ پتھر کو دھکیل کر راستہ صاف کر دیں۔ وہ دونوں اپنی بندوقیں زمین پر چھوڑ کر پتھر کی طرف بڑھے اور اسے ہٹانے کے لیے زور لگانا شروع کر دیا۔ بادل کی توجہ ان کی طرف مرکوز تھی اور ہم سب بھی غور سے ان کی کوششوں کو دیکھ رہے تھے۔ یکایک اوپر سے ایک شخص کود کر بادل پر گرا اور اسے اپنی لپیٹ میں لیتا ہوا جیپ سے باہر زمین پر گر گیا۔ وہ دونوں آپس میں گتھم گتھا ہونے لگے۔ اسی اثنا میں آس پاس کے ٹیلوں سے چھلانگیں لگا کر تین اور مسلح افراد پہنچ گئے۔ وہ سب کے سب ڈھاٹے باندھے ہوئے تھے۔ ملیشیا کی شلوار قمیص میں ملبوس تھے اور خاصے ہٹے کٹے اور تنومند نظر آ رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں کلاشنکوف بندوقیں تھیں اور ان کا انداز بتاتا تھا کہ وہ ان کا استعمال بھی بخوبی جانتے ہیں۔ انھوں نے زمین پر قدم رکھتے ہی بادل کے دونوں ساتھیوں کو اپنی زد میں لے لیا۔ ان میں سے ایک شخص نے جیپ کی طرف رُخ کیا اور ہماری طرف بندوق تان لی۔ رضیہ اور لالی اس اچانک افتاد سے خاصی پریشان اور گھبرائی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ میں خاموش اور بے تعلق بیٹھا معصومیت سے یہ سب تماشا دیکھ رہا تھا۔ اس شخص نے ہمارے نزدیک آ کر ہم سب کو جیپ سے باہر نکلنے کا اشارہ کیا اور ہم نے بلا چون چرا اس کے حکم کی تعمیل کی۔ اس اثنا میں بادل اور حملہ آور بدستور ایک دوسرے سے زور آزمائی کرنے میں مصروف تھے۔ جب کہ اس کے ساتھیوں نے اپنے تمام حریفوں کو بے بس اور بے قابو کر دیا تھا۔ ایک شخص نے جھک کر زمین پر سے بادل کے دونوں ساتھیوں کی سٹین گنیں اٹھا لی تھیں جو اس وقت اپنے دونوں ہاتھ سروں کے پیچھے رکھے سر جھکائے ہوئے کھڑے تھے۔ بادل کے مدمقابل نے ایک زوردار ٹکر بادل کے سینے پر ماری اور بادل لڑھکتا ہوا دور جا گرا۔ اس نے اٹھ کر کھڑے ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔ لیکن جب وہ اپنے دونوں پیروں پر کھڑا ہوا تو اس نے میدانِ جنگ کا نقشہ دیکھ لیا اور اسے پتہ چل گیا کہ اس کے تمام ساتھی حملہ آوروں کے سامنے بے دست و پا ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان حالات میں اس کا تن تنہا جنگ کیے جانا لاحاصل تھا۔ چنانچہ اس نے بھی صلح کی سفید جھنڈی دکھا دی اور اپنے دونوں ہاتھ سر سے اونچے اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ گویا اب میدانِ جنگ مکمل طور پر حملہ آوروں کے ہاتھ تھا۔ جو شخص بادل کے ساتھ دست و گریبان ہو رہا تھا اس نے آگے بڑھ کر جیپ میں رکھی ہوئی بادل کی سٹین گن بھی اٹھا کر اپنے قبضے

میں کرلی اور اب ان لوگوں کا تسلط مکمل ہو گیا۔ یہ شخص ان لوگوں کا سربراہ معلوم ہوتا تھا کیونکہ وہ سب بلا پس و پیش اس کے حکم کی تعمیل کر رہے تھے۔ بادل کی سٹین گن اپنے کندھے سے لٹکا کر وہ ہم قیدیوں کی طرف متوجہ ہوا جنھیں اس کے ساتھیوں نے ایک قطار میں صف آرا کر دیا تھا۔ اس نے تمام مردوں کا بڑے خشونت بھرے انداز میں جائزہ لیا مگر جب اس کی نظر لالی اور رضیہ پر پڑیں تو اس کے چہرے کے تنے ہوئے اعصاب کچھ ڈھیلے پڑ گئے۔ اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے وہ بولا۔

"باندھ دو انہیں اور لے چلو۔"

اس کے ایک ساتھی نے خدا جانے کہاں سے ایک رسی پیدا کی اور تمام مردوں کے ہاتھ ان کی پشت پر مضبوطی سے باندھ دیے۔ عورتوں کو انہوں نے آزاد چھوڑ دیا۔ ہم سب کے ہاتھ باندھنے کے بعد اُس نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا اور انہوں نے ہم سب کو مویشیوں کی طرح ہانکنا شروع کر دیا۔ عورتیں آزاد تھیں لیکن اُنہیں بھی ہمارے پیچھے پیچھے آنے کا حکم دے دیا گیا۔ ان لوگوں نے جیپ کو اسی جگہ چھوڑ دیا اور پگڈنڈی نما راستے پر پیدل چل پڑے۔ ان کا رُخ چڑھائی کی جانب تھا۔ راستہ خاصا دشوار گزار تھا۔ خاص طور پر عورتوں کے لیے اس پر چڑھنا آسان نہ تھا لیکن وہ بھی خاموشی سے ہمارے ساتھ چل رہی تھیں اور کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد ہانپنے لگی تھیں۔ ہمارے آگے آگے چلنے والے لوگ نہایت تیزی اور مہارت کے ساتھ یہ سفر طے کر رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ان راستوں پر چلنے کے عادی تھے۔

ہم تقریباً دو گھنٹے تک چلتے رہے۔ اس دوران میں ہم میں سے کسی نے ایک لفظ بھی اپنے مُنہ سے نہیں نکالا تھا۔ لالی اور رضیہ کا تھکن کے مارے بُرا حال تھا، لیکن وہ بھی چُپ چاپ ان چڑھائیوں پر چڑھ رہی تھیں۔ ہمارے ارد گرد درختوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا۔ یہ بڑے بڑے تنوں کے قد آور اور سرسبز درخت تھے اور ان کے پیچھے چھپ جانے والوں کا نظر آنا قریب قریب ناممکن تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ہمیں گرفتار کرنے والے کون لوگ ہو سکتے ہیں؟ یہ چوہدری کے آدمی ہیں یا کسی اور گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اور ہم لوگوں کو اس طرح گرفتار کرنے کا مقصد کیا ہو سکتا ہے؟ اگر وہ چوہدری کے آدمی ہیں تو ہمیں چوہدری کی حویلی میں لے جانے کی بجائے انجان پہاڑی پر کیوں لے جا رہے ہیں؟ اور اگر کوئی اور لوگ ہیں تو انہیں ہمارے ساتھ کیا دُشمنی ہے اور وہ ہمیں پکڑ کر کیا مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

یہ تو ثابت ہو چکا تھا کہ وہ لوگ ملک منصور کے کارندوں کے لیے قطعی انجان اور اجنبی تھے۔ جس راستے سے ہم اوپر چڑھ رہے تھے اسے پگڈنڈی بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ ہم ایسے راستے سے پہاڑ کی اونچائی کی جانب گامزن تھے جہاں سے چڑھنا ممکن تھا، لیکن پھر بھی جن لوگوں کو پہاڑوں پر چڑھنے کا تجربہ نہ ہو ان کے لیے یہ ایک تکلیف دہ اور دشوار گزار سفر تھا۔ ہم لوگ تو خیر مرد تھے، لیکن لالی اور خاص طور پر رضیہ نے جس اُولعزمی اور ہمت کا ثبوت دیا تھا وہ قابلِ تعریف تھی۔ وہ دونوں کوئی شکایت لب پر لائے بغیر ہمارے قدم سے قدم ملا کر چلنے کی کوشش کر رہی تھیں حالانکہ ان کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔ دیہاتی لباس کی بدولت وہ خالص دیہاتی عورتیں لگ رہی تھیں۔ ان کے بال بکھرے ہوئے تھے چہرے تمتما رہے تھے اور گرد و غبار سے ان کے بال اٹے ہوئے تھے۔ یہ گرد ہمیں جیپ میں سفر کے دوران نصیب ہوئی تھی۔

اس مشکل پہاڑی راستے سے گزرنے کے بعد ہم ایک کھلی جگہ پہنچ گئے۔ یہ ایک خاصا وسیع میدان تھا جس کے چاروں طرف اونچے اونچے درخت سر اٹھائے کھڑے تھے۔ اس میدان کے عین وسط میں ایک پرانی حویلی ٹائپ کی عمارت تھی جس کی حالت خاصی شکستہ تھی۔ بظاہر یہ سالہا سال سے ایک غیر آباد اور غیر استعمال شدہ عمارت نظر آتی تھی جس پر عرصۂ دراز سے سفیدی وغیرہ نہیں ہوئی تھی۔ ہمارے نگران ہمیں کشاں کشاں اس عمارت کے پاس لے گئے۔ عمارت

کے سامنے ایک خاصا طویل پرانی وضع کا برآمدہ تھا۔ گولی اور اونچے ستونوں والا یہ برآمدہ کسی زمانے میں بے حد خوبصورت اور دلکش ہوگا۔ آج بھی اس کی دلکشی برقرار تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ استدادِ زمانہ اور دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے اس کی حالت ناگفتہ بہ ہوگئی تھی۔ چھت سے چھوٹے چھوٹے گملے زنجیروں کے ساتھ لٹکے ہوئے تھے۔ کسی زمانے میں ان گملوں میں پھولدار پودے لہلہاتے ہوں گے، لیکن فی الحال ان میں خشک مٹی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ جگہ جگہ خود رو گھاس اُگی ہوئی تھی۔ دروازوں کا رنگ و روغن شاید برسوں سے نہیں ہوا تھا۔ اس کے باوجود یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ کسی زمانے میں یہ عمارت یقیناً کسی صاحبِ ذوق رئیس کی رہائش گاہ رہی ہوگی۔

برآمدے سے گزر کر ہم کو ایک بڑے ہال کمرے میں لے جایا گیا۔ بادل اور اُس کے دونوں ساتھی ہمارے آگے آگے تھے۔ ان کے پیچھے میں، رضیہ اور لالی تھے۔ ہمیں کمرے میں پہنچانے کے بعد وہ لوگ رُخصت ہوگئے۔ انہوں نے دروازے کو بند کرنا بھی ضروری نہ سمجھا۔ ظاہر ہے کہ اس عمارت کے آس پاس پہریدار متعین ہوں گے اور ویسے بھی اس دور دراز پہاڑی علاقے سے فرار ہونا کسی انجان شخص کے لیے ممکن نہیں تھا۔ میں نے ہال کمرے کا جائزہ لیا تو میرے اس خیال کی تصدیق ہوگئی کہ یہاں کسی زمانے میں خوشحال اور باوضع لوگوں کی رہائش تھی۔ ہال کمرے میں بوسیدہ فرنیچر بکھرا ہوا تھا۔ بلکہ اب تو اسے فرنیچر کا ڈھانچہ کہنا زیادہ درست ہوگا۔ فرش پر قالین بچھے ہوئے تھے، لیکن اب یہ قالین بدرنگ اور مٹیالے فرش کی صورت اختیار کرچکے تھے۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر کہیں کہیں پردے جھول رہے تھے لیکن ان کی رنگت بھی اُڑ چکی تھی اور یہ پھٹے ہوئے بدرنگ کپڑوں کی صورت اختیار کرچکے تھے۔ بادل اور اُس کے ساتھیوں نے ہال کے شمالی حصّے میں ڈیرہ جمایا اور بے سُدھ ہوکر فرش پر گر گئے۔ تھکے ہوئے تو ہم لوگ بھی بہت زیادہ تھے، لیکن اس گندے فرش پر بیٹھتے ہوئے عار محسوس ہو رہی تھی۔ مجبوراً دو صوفہ نما چیزوں کو جھاڑ پونچھ کر بیٹھنے کے قابل بنایا گیا ایک پر میں بیٹھ گیا اور دوسرے پر رضیہ نیم دراز ہوگئی۔ لالی البتہ قالین پر بے تکلفی سے لیٹ گئی۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔ ہم سب اپنی اپنی سانس درست کرنے میں معروف رہے۔ کچھ دیر بعد ذرا حواس بجا ہوئے تو رضیہ نے پہلے لالی کی طرف اور پھر میری جانب دیکھا۔ لالی محنت کش طبقے سے تعلق رکھتی تھی اور بے جا تکلفات اور لوازمات کی عادی نہیں تھی۔ اس لیے وہ ایک سیدھی سادی دیہاتی عورت کی مانند قالین پر لیٹتے ہی سو گئی تھی اور اب آہستہ آواز میں خراٹے لے رہی تھی۔ رضیہ لوٹتے ہوئے صوفے پر اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ بادل اور اس کے ساتھی ہال کمرے کے دوسرے حصّے میں تھے۔ اور وہ بھی غالباً نیم غنودگی کے عالم میں تھے۔ رضیہ نے دھیمی آواز میں مجھے مخاطب کیا اور بولی۔ "یہ لوگ کون ہیں اور ہمیں کہاں لے جارہے ہیں؟"

میں جواب میں ہنس پڑا تو اُس نے غصّہ بھری نگاہوں سے مجھے گھورا۔ "رضیہ بیگم۔ آپ کی طرح میرے لیے بھی یہ لوگ قطعی اجنبی ہیں، بلکہ بادل اور اس کے ساتھیوں کے لیے بالکل انجان ہیں تو پھر میں بھلا کیسے جاسکتا ہوں۔"

رضیہ کہنے لگی "میرے خیال میں تو یہ چوہدری کے آدمی ہیں۔"

"چوہدری کے آدمی ہوتے تو ہمیں چوہدری کی حویلی میں لے جاتے۔ یہاں لے کر نہ آتے اور پھر چوہدری کی حویلی پر بھرپور لڑائی ہو رہی ہے۔ اگر یہ اُس کے ساتھی ہیں تو پھر اُنہیں بھی حویلی میں ملک منصور کے خلاف صف آرا ہونا چاہیے تھا۔"

"تو پھر یہ کون لوگ ہیں؟ یہ تو منہ سے بھی کچھ نہیں بولتے۔"

رضیہ کے اس سوال کا جواب بادل کی آمد نے ہم تک پہنچا دیا۔ وہ ایک مسلح آدمی کے ساتھ دروازے میں داخل ہو رہا تھا۔ ہم سب پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے کے بعد اُس نے بلند آواز میں کہا۔

"اُٹھو۔ کھڑے ہوجاؤ۔ سب کے سب۔"

اس کی گونج دار آواز خالی ہال میں اور زیادہ گونج رہی تھی۔ ایک ہی آواز پر سب لوگ ہوشیار ہوگئے اور اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ بادل نے ہاتھ کے اشارے سے ہم سب کو اپنے پیچھے آنے کے لیے کہا اور واپس چل پڑا۔ رضیہ کا دوسرا سوال اس کی زبان تک بھی نہ آسکا۔ ہم خاموشی سے اُٹھ کر بادل کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔

بادل برآمدے سے نکل کر اُجاڑ سے لان کا چکر کاٹتا ہوا عمارت کے عقب میں پہنچ گیا۔ یہاں ایک چھوٹے سے کمرے کے سامنے تنگ سی سیڑھیاں نیچے کی طرف جاتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ سیڑھیوں کے نزدیک چند لوگ کھڑے ہوئے تھے وہ سب کے سب مسلح تھے اور صورت ہی سے جرائم پیشہ اور خطرناک نظر آرہے تھے۔ ہمیں انھوں نے بہت غور سے دیکھا۔ خاص طور پر عورتوں کا انہوں نے گہری نظروں سے جائزہ لیا اور ان کی آنکھوں میں ایسی چمک پیدا ہوئی جیسی خونخوار درندوں کی آنکھوں میں اپنے شکار کو دیکھ کر پیدا ہوتی ہے۔ ہم ان کے پاس سے گزر کر بادل کے پیچھے چلتے ہوئے سیڑھیوں تک پہنچ گئے جو نیچے کی طرف جاتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کسی تہہ خانے کا راستہ تھا اور یہ لوگ ہمیں وہاں قید کرنا چاہتے تھے۔ لیکن حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ ہم سب چُپ چاپ سر جھکائے ہوئے سیڑھیوں سے اُترتے ہوئے ایک چوبی دروازے تک پہنچے جو اَب کُھل چکا تھا۔ دروازے کے اندر ایک ڈیوڑھی نما کمرہ تھا۔ اس کے دروازے کے اندر قدم رکھا تو ہم نے توقع کے خلاف کچھ اور ہی منظر دیکھا۔ یہ ایک وسیع اور کشادہ ہال تھا جس کے ایک کنارے پر تخت پوش اور کُرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ فرش پر قالین بچھا ہوا تھا۔ تخت پوش اور کرسیوں پر کافی لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ تخت پوش کے سامنے پہنچ کر ہمیں گرفتار کرنے والے نے جُھک کر سلام کیا اور ہم لوگوں کی طرف اشارہ کیا۔ تخت پوش پر ایک شخص گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔ ہم لوگوں کو دیکھ کر وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ کمرے میں موجود دوسرے لوگ جو باتوں میں مصروف تھے یکایک خاموش ہوگئے اور ان سب کی نگاہیں ہم پر جم گئیں۔ تخت پوش پر بیٹھے ہوئے آدمی نے ہم سب کو ایک نظر دیکھا اور پھر پوچھا "طافے۔ یہ کون ہیں۔ کہاں سے لایا ہے یہ تحفے؟"

ہمیں لانے والے شخص نے جس کا نام ہمیں پہلی بار معلوم ہوا تھا مسکرا کر ہماری طرف داد طلب نظروں سے دیکھا اور پھر کہنے لگا۔ "سردار۔ ان کو میں نے ایک جیپ روک کر پکڑا ہے۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے مگر یہ ہیں کون۔ ان کی تعریف کیا ہے بھئی؟"

سردار ایک چست چالاک اور طاقت ور آدمی تھا جس کی سب سے نمایاں چیز اس کی گھنی اور بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ اس کی آنکھیں سیاہ اور ڈراؤنی تھیں۔ اس کی آواز میں ایک عجیب قسم کا تحکّم اور دھمک سی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ حکم چلانے اور اپنے حکم کی تعمیل کرانے کا عادی ہے۔

طافے نے ہمارے بارے میں جو معلومات سردار تک پہنچائیں ان پر خود مجھے حیرت ہوئی۔ نہ جانے اس نے یہ کہاں سے اور کس وقت حاصل کی تھیں۔

"یہ عورتیں اس بندے کے ساتھ ہیں سائیں اور یہ تین بندے ان تینوں کے ساتھ ہیں۔"

"بکواس نیئں کراوئے" سردار نے ڈانٹ کر کہا۔ "بیوقوفی کی باتیں مت کیا کر طافے۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

"تم بولو جوان تم کون ہو؟"

"جی میں تو ایک مزارع ہوں۔ محنت مزدوری کرکے پیٹ پالتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے تم مزارع ہو اور یہ دونوں عورتیں کون ہیں؟ کیا لگتی ہیں تمہاری؟"

طافے نے زبان کھولی۔ "یہ والی جو عورت ہے نا سائیں......"

سائیں نے اسے ڈانٹ کر چُپ کرادیا۔ "بک بک نئیں کراوئے۔ تمہاری باری ختم ہوگئی۔ اب ان کو بولنے دو۔

ہاں جوان۔ یہ زنانیاں بھلا کیا لگتی ہیں تمہاری؟"

میرے پاس گھڑا گھڑایا جواب موجود تھا: "یہ والی جو ہے نا سائیں۔ اس کا نام لالی ہے۔ یہ میری گھر والی ہے۔"

اس جواب پہ لالی نے اپنا چہرہ گھونگھٹ سے ڈھانپ لیا۔ نہ جانے اسے شرم آگئی تھی یا وہ ہنسی روکنے کی کوشش کر رہی تھی یا ہو سکتا ہے وہ اپنے دلی جذبات چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔

"ٹھیک ہے بھئی۔ یہ تیری گھر والی ہے۔ اور یہ والی کون ہے تیری؟" اس نے رضیہ کی طرف اشارہ کر کے پوچھا جو سر جھکا کر خاموش کھڑی تھی۔

"یہ لالی کی بہن ہے سائیں۔" میں نے ایک جھوٹ اور گھڑ لیا۔

"گھر والی کی بہن۔ اچھا ٹھیک ہے بھئی ٹھیک ہے۔ یہ بولو نا کر سالی ہے۔ آدھی گھر والی ہے۔"

رضیہ نے غصے سے سر اٹھا کر سردار کی طرف دیکھا جو بڑی دلچسپی کے ساتھ سر سے پیر تک رضیہ کا جائزہ لے رہا تھا۔ ان دونوں کی نگاہیں ملیں۔ رضیہ کی شرربار نگاہوں کی حدت کی تاب نہ لاتے ہوئے سردار نے اپنی نگاہیں طافے کی طرف پھیر لیں اور کہا: "اور وہ تین بندے کون ہیں بھئی؟"

طافے نے کہا: "یہ مجھے نہیں معلوم سائیں۔ میں نے ان سے نہیں پوچھا۔ کیوں بھئی۔ کون ہو تم؟ کیا تعریف ہے تمہاری؟"

بادل نے جواب میں کہا: "میں ملک منصور کا بندہ ہوں اور یہ دونوں بھی ان ہی کے چاکر ہیں۔ ہمیں گرفتار کر کے تم نے اچھا نہیں کیا سائیں۔ تم بہت نقصان اٹھاؤ گے۔"

"وہ کس طرح بھئی؟"

"ملک منصور تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔" طافے نے جوشیلے انداز میں کہا۔

"تو پھر کیا ہو گا بھئی؟ ہم کہاں ہیں۔ وہ کہاں ہے؟ ہم اپنے حال میں مگن ہیں۔ وہ اپنے حال میں مگن ہے۔ وہ معاف نہیں کرے گا تو ہمارا کیا بگاڑ لے گا بھئی۔ کیوں سائیں؟" اس نے آخری الفاظ طافے کو مخاطب کرتے ہوئے کہے تھے۔

"ہمارا کوئی کیا بگاڑے گا سائیں۔ ایسا سوچنے والا خود ہی بگڑ جائے گا۔"

سردار نے داد طلب نظروں سے طافے کو دیکھا۔ اپنی گھنی اور بڑی بڑی مونچھوں پہ الٹا ہاتھ پھیرا اور پھر مسکرا کر بولا۔ "طافے انہیں بتا دے بھئی کہ ہم کون ہیں؟"

طافے نے گلا صاف کر کے کہا۔ "تمہیں کون نہیں جانتا سائیں۔ تم سے تو بڑے بڑے پولیس افسر ڈرتے ہیں۔"

"بک بک نئیں کرا دے۔" وہ بیزاری سے بولا۔ "ٹھیک ٹھیک بتا دے بھئی۔"

"تو سن لو جناب۔ یہ ہیرا سائیں ہیں۔" طافے نے بڑے فخریہ لہجے میں کہا۔

"ہیرا سائیں نہیں۔ ہیرا ڈاکو۔۔۔" یہ کہہ کر وہ پھر معنی خیز انداز میں مسکرایا اور پھر اپنی مونچھوں پر الٹے ہاتھ سے تاؤ دینے لگا۔ یہ شاید اس کی عادت تھی۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات تیسرے حصے میں ملاحظہ فرمائیں
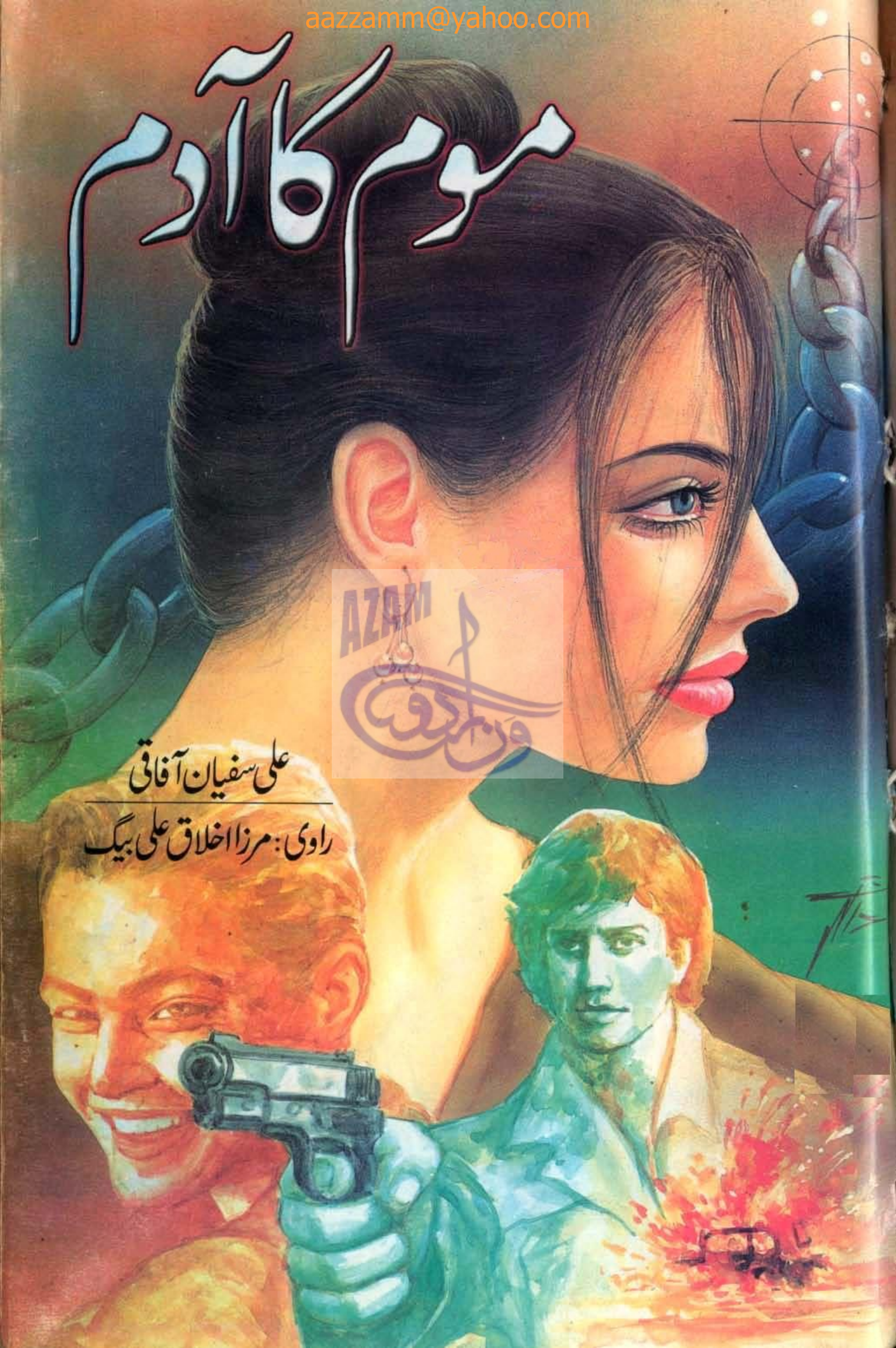
aazzamm@yahoo.com
موم کا آدم
علی سفیان آفاقی
راوی: مرزا اخلاق علی بیگ

ایک سربکف منچلے جیالے کی ایکشن سے بھرپور سرگزشت

موم کا آدم

تیسرا حصہ

علی سفیان آفاقی

راوی: مرزا اخلاق علی بیگ

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

بار اول ــــــــــ ۲۰۰۶ء

مطبع ــــــــــ یو اینڈ می پرنٹرز، لاہور

کمپوزنگ ــــ الحرا کمپوزنگ سنٹر، لاہور

قیمت ــــــــــ ٦٠ روپے

موم کا آدم

ایک سربکف منچلے جیالے انسان کی کہانی۔ وہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینے کا ہنر جانتا تھا۔ وہ ایک خوش جمال حسینہ کے خیال کا اسیر تھا اور اسے حاصل کرنے کے لیے آگ اور خون کے دریا میں کود پڑنے کو بے تاب تھا۔

ایک نذر جہاں گردِ ابنِ آدم کی آشفتہ سری کی داستان

ہیرا ڈاکو کا نام سن کر سب ہی چونک پڑے۔ پچھلے چند مہینوں میں ہیرا ڈاکو نے کافی شہرت حاصل کی تھی۔ وہ ایک گوالا تھا، لیکن خاندانی دشمنی کی بناء پر مخالفوں نے اس کے تمام خاندان کو تہہ تیغ کر دیا اور خود اس کو بھی قتل اور ڈکیتی کے بے شمار مقدمات میں اُلجھا دیا۔ مخالفین بااثر اور دولت مند لوگ تھے۔ جب ہیرا کو کہیں سے انصاف اور امن و سکون نہ مل سکا اور اس پر زندگی کی آسائشیں حرام کر دی گئیں تو ایک رات وہ حوالات سے بھاگ نکلا۔ کہیں سے ہتھیار حاصل کیے اور اپنے دشمنوں کے گاؤں میں پہنچ کر ان سب کو گولی کا نشانہ بنا دیا اس نے اُن کے مکانوں کو نذرِ آتش کر دیا۔ مویشیوں کو ہلاک کر دیا اور ایسی تباہی پھیلائی کہ اس کا خوف اور رعب اس ایک ہی واردات کے بعد قائم ہو گیا۔ اس واردات کے بعد ہیرا گوجر سے ہیرا ڈاکو بن گیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کا ایک گروہ بنا لیا اور لوٹ مار کو اپنا پیشہ بنا کر علاقے کے لوگوں کے لیے خوف و دہشت کی علامت بن گیا۔ ہیرا کے بارے میں مشہور تھا کہ اس کا ٹھکانہ جنگلوں اور پہاڑوں میں ایسی جگہ ہے جہاں آج تک پولیس نہیں پہنچ سکی ہے اور نہ ہی کسی کو اس کا پتہ نشان مل سکا ہے۔ اس کا کوئی ساتھی کبھی پولیس کے قبضے میں نہیں آیا تھا وجہ یہ تھی کہ وہ جب یہ سمجھتا کہ گرفتاری کے سوا کوئی اور چارہ کار نہیں ہے تو اس کا حکم تھا کہ خودکشی کر لی جائے۔ ایک بار اس کے ایک ساتھی نے اس اصول سے انحراف کرتے ہوئے خود کو پولیس کے حوالے کر دیا، لیکن دوسرے ہی دن اسکو حوالات میں کسی نے گولی مار کر ہلاک کر دیا اور اس طرح پولیس اُس سے ہیرا کے ٹھکانے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میں ناکام رہی تھی۔ ہیرا ایک خطرناک اور بے رحم ڈاکو مشہور تھا۔ اس کی داستانیں دیہات میں مشہور تھیں اور وہ غریب اور بے بس دیہاتیوں کے لیے ہیرو کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ سنا تھا کہ وہ محض دولت مندوں ہی کو لوٹتا ہے اور غریبوں کی مدد کرتا ہے۔ اس نے بے شمار غریب لڑکیوں کی شادیوں کے لیے ان کے ماں باپ کو روپیہ دیا تھا۔ ساہوکاروں اور سود خوروں کے چنگل سے بہت سے مفلسوں کو آزاد کرایا تھا۔ وہ غریبوں کے ہمدرد کی علامت بن کر اُبھرا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پولیس اس کو گرفتار کرنے یا اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میں ناکام رہی تھی۔ دیہاتی اُس کو پناہ دینے میں خوشی محسوس کرتے تھے اور قانون ساز اداروں کے مقابلے میں ہیرا ڈاکو کی مدد کیا کرتے تھے۔

ہیرا ڈاکو نے بڑے شہروں میں بھی ڈاکے ڈالے تھے اور گھروں کے علاوہ بنکوں کو بھی لوٹا تھا، لیکن پچھلے چند

مہینوں سے اُس نے دولت مند اور بااثر لوگوں یا اُن کے رشتہ داروں کو اغوا کرنے کا طریقہ بھی اپنا لیا تھا۔ انہیں وہ بھاری تاوان کی رقم وصول کرنے کے بعد رہا کرتا تھا۔ پولیس ہزار کوشش کے باوجود اس کا کھوج لگانے یا کسی اغوا شدہ کو بازیاب کرانے میں ناکام رہی تھی۔ اس کی یہ سرگرمیاں محض دیہات تک ہی محدود نہ تھیں۔ وہ آباد اور پُر رونق شہروں میں سے بھی لوگوں کو اغوا کر لیا کرتا تھا۔ ایک بہت بڑے اور مشہور سیٹھ کو اُس نے اغوا کیا اور اس کی رہائی کے عوض دس لاکھ روپے کی رقم طلب کی۔ سیٹھ کے رشتے داروں نے اپنے رسوخ کی بنا پر پولیس سے رجوع کیا اور اعلیٰ حکام کی طرف سے پولیس پر زور ڈالا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک روز شہر میں اُسی سیٹھ کے باغ میں اس کی لاش پائی گئی۔ اس ایک واقعے کے بعد کبھی کسی اغوا ہونے والے کے رشتہ داروں نے اس کا مطالبہ رد کرنے کی جرأت نہیں کی اور وہ بلا چوں و چرا اسے تاوان کی رقم ادا کر دیا کرتے تھے۔

اس وقت یہی ہیرا ڈاکو ایک تخت پوش پر میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے ذرا گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔ دیکھنے میں وہ ایک عام سادہ سا، صحت مند اور تنومند دیہاتی نظر آتا تھا۔ اس کے چہرے پر گھنی اور موٹی موٹی مونچھوں کے سوا کوئی اور علامت ایسی نہیں تھی۔ جس کی بنا پر اس کا چہرہ خوفناک یا بہت زیادہ رُعب دار ہو۔ اگر اس کی مونچھیں نہیں ہوتی تو وہ ایک معمولی بے ضرر کسان نظر آتا۔ قد و قامت میں بھی وہ زیادہ نہیں تھا۔ دیہات میں اس کی جسامت کے لوگ عام طور پر دیکھنے میں آتے ہیں۔ سب سے زیادہ قابل ذکر بات یہ تھی کہ ہیرا ڈاکو کے چہرے پر کرختگی اور بے رحمی کے کوئی آثار بھی نہیں پائے جاتے تھے۔ اسکی گفتگو میں بھی درشتی نہیں تھی۔ اسے دیکھ کر یقین نہیں آتا تھا۔ کہ یہی وہ خوفناک ڈاکو ہے جس کے نام ہی سے لوگ خوف کھاتے ہیں۔

بادل جو کچھ دیر پہلے بڑے اعتماد اور سکون سے گفتگو کر رہا تھا یکایک مرعوب اور خوفزدہ نظر آنے لگا۔ اس کے ساتھی بھی سہم گئے تھے، لیکن رضیہ اور لالی پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ شاید وہ ہیرا ڈاکو کی اصلیت سے واقف نہیں تھیں یا پھر انہیں یہ یقین اور اعتماد تھا کہ ہیرا ڈاکو ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔

ہیرا نے بادل اور اُس کے دونوں ساتھیوں کی طرف اور پھر ہم لوگوں کی طرف دیکھا اور مونچھوں پر اُلٹے ہاتھ سے بل دیتے ہوئے پوچھا۔ "اوئے طلفے۔ یہ گھاس پھوس کہاں سے اٹھا لایا ہے؟ ان کا کیا ہم اچار ڈالیں گے؟ ایسے اس کوڑا کرکٹ کے بدلے تو کوئی پھوٹی کوڑی بھی نہیں دے گا۔" پھر وہ بادل سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ "کیوں بھئی کچھ غلط کہا ہے میں نے؟ تمہیں چھڑانے کے لیے تمہارے ملک صاحب کتنا مال خرچ کر سکتے ہیں؟"

بادل پریشان نظروں سے اسکو دیکھتا رہا۔ زبان سے کچھ نہیں بولا۔ ہیرا بڑے حقارت آمیز انداز میں مسکرایا اور پھر اُس کی نگاہیں مجھ پر سے گزرتی ہوئی لالی اور پھر رضیہ کے چہرے تک پہنچ کر رُک گئیں۔ وہ دانت نکالتے ہوئے تخت پوش سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور دونوں عورتوں کے سامنے جا کر ٹھہر گیا۔ اس نے پہلے لالی کو گھور کر دیکھا اور پھر رضیہ کا بغور جائزہ لیا۔ اسکی نظریں رضیہ کے سراپا پر اٹک کر رہ گئیں۔ رضیہ نے غصیلی نگاہوں سے ہیرا کو دیکھا مگر چند لمحے بعد وہ اپنی نظریں جھکانے پہ مجبور ہو گئی۔ کچھ بھی ہو۔ آخر وہ ایک عورت تھی اور زیادہ دیر تک کسی مرد کی بے باک نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر نہیں دیکھ سکتی تھی۔ ہیرا نے بلند آواز سے قہقہہ لگایا اور بولا۔ "ہاں اِدھر کوئی بات بن سکتی ہے۔"

میرے ساتھ ساتھ رضیہ اور لالی نے بھی چونک کر اس کو دیکھا۔ ہیرا مسکراتا ہوا میرے نزدیک آگیا۔ "دیکھو سائیں تم تو ہو ایک غریب مزارعے۔ تمہاری کسی کو کیا فکر ہو گی؟ اور تمہارے بدلے تمہارا کوئی رشتہ دار مجھے کیا دے گا؟ اور یہ ہے تمہاری گھر والی۔ اس کے پاس بھی مال نہیں ہو گا۔ اس لیے تم دونوں تو میرے لیے بالکل بیکار ہو۔ تمہیں اپنے پاس روکنا مجھے بہت مہنگا پڑے گا۔ ہاں۔ تمہاری سالی ہمارے پاس رہ کر ہماری خدمت کر سکتی ہے۔"

رضیہ کا چہرہ غصے سے سُرخ ہو گیا اور اسکی نگاہیں آگ برسانے لگیں۔ "کیا بک رہے ہو؟ میں تمہاری خدمت کروں گی؟ کبھی نہیں۔ مر جاؤں گی مگر یہاں نہیں رہوں گی۔"

میں نے بے چارگی اور بے بسی سے دونوں ہاتھ باندھ کر ہیرا کو مخاطب کیا۔ "سائیں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہو گی اگر آپ ہم غریبوں کو اپنے گھر واپس جانے کی اجازت دے دیں۔ آپ ٹھیک ہی کہتے ہیں جناب! ہم غریب لوگ ہیں۔ ہمارا اُدھر کون بیٹھا ہے؟ اور اگر کوئی دُور پَرے کا رشتہ دار ہے بھی تو اس میں اتنی طاقت کہاں ہے کہ چار یا پانچ ہزار روپیہ دے کر ہمیں لے جائے۔ میری بیوی کی بہن شروع ہی سے ہمارے پاس رہتی ہے سائیں۔ ہم سب پر مہربانی کرو۔ آپ کی غریب پروری کی بہت دھوم سنی ہے ہم نے۔ ہم غریب لوگ بھی آپ کو دعا دیں گے۔"

ہیرا کے چہرے پر نرمی اور غور و فکر کے آثار پیدا ہونے لگے۔ "ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔" وہ دونوں ہاتھ اُٹھا کر بولا۔ "تم کہتے ہو تو ہم تمہیں واپس بھیج دیں گے۔"

اس کا نائب بالم جواب تک خاموشی سے باتیں سُن رہا تھا تیزی سے آگے بڑھا اور کہنے لگا۔ "سردار یہ انصاف نہیں ہے۔ اس کی گھر والی کو جانے دو پر ساتھ والی کو میں تم سے مانگنا چاہتا ہوں۔ ابھی اس کی شادی بھی نہیں ہوئی ہے۔ میں اس سے شادی کروں گا۔"

رضیہ برہمی سے بے اختیار آگے بڑھی اور ڈانٹ کر بولی۔ "کیا بک رہے ہو؟ میں اور تم سے شادی کروں گی۔ یہ نہیں ہو سکتا۔"

"کیوں نہیں ہو سکتا؟" اس نے جواب میں ڈپٹ کر پوچھا۔

"اس لیے کہ میں۔" یکایک وہ کہتے کہتے رُک گئی۔ غالباً وہ یہ کہنے والی تھی کہ میں پہلے ہی شادی شدہ ہوں۔ لیکن پھر اس نے اپنا ارادہ بدل دیا اور کہنے لگی۔ "اس لیے کہ میں اپنی بہن کے ساتھ واپس جاؤں گی۔"

"دیکھو لڑکی۔ زیادہ باتیں کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم نے یہاں جنگل میں یتیم خانہ نہیں کھول رکھا ہے۔ ہم غریبوں کے ساتھ بے انصافی نہیں کرتے پھر ہمارے ڈیرے کا بھی کوئی قانون ہے۔ بالم ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تم اُسکی لُوٹ ہو۔ اسکی مرضی کے بغیر ہم تمہیں نہیں جانے دیں گے۔"

"ہمارے پر ترس کھاؤ سائیں۔" میں نے لجاجت سے ہاتھ باندھ کر کہا۔

ہیرا نے نظر بھر کر میری طرف دیکھا اور پھر بولا۔ "دیکھو سائیں۔ ہم بے انصافی نہیں کرتے۔ کیا تم اپنی سالی کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہو؟"

"جی سائیں۔" میں نے منت آمیز لہجے میں کہا۔

"تو پھر تمہیں اس کے لیے بالم کے ساتھ مقابلہ کرنا پڑے گا۔ وہ اس لڑکی سے شادی بنا لے گا۔ تمہیں اس کا گھر تو لبسانا ہی ہے۔ اس سے اچھا رشتہ نہیں ملے گا۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

میں نے کہا۔ "ٹھیک تو ہے سائیں۔ پر میں لڑائی جھگڑا نہیں جانتا۔" "مجھے تو معاف ہی رکھو۔ ہمارا لڑائی بڑائی سے کیا واسطہ؟ یہ لڑکی ہمیں بہت پیاری ہے سائیں۔ اس کی بہن رو رو کے مر جائے گی اس کے بنا۔"

"یہ بات ہے تو پھر تم بھی اِدھر ہی رہ جاؤ۔ تمہاری اُدھر کون سی جاگیر جائیداد ہے سائیں۔ محنت کر کے پیٹ بھرتے ہو۔ مجھے اچھے جاندار آدمی لگتے ہو۔ اِدھر ہمارے ساتھ رہو۔ تمہاری گھر والی بھی تمہارے ساتھ رہے گی۔ بالم بہت کام کا آدمی ہے۔ مال بھی بہت ہے اُس کے پاس۔ خوش رکھے گا تمہاری سالی کو۔"

"نہیں بالکل نہیں۔ اس کی بات مت ماننا۔ میں اس پہ تھوکتی بھی نہیں ہوں۔"

بالم غضبناک ہو کر آگے بڑھا اور اُس نے غصّے میں رضیہ کی کلائی تھام لی "بک بک مت کر۔ سردار نرم دل بندہ ہے۔ پر حلوہ بھی نہیں ہے۔ تو میری لُوٹ ہے چل میرے ساتھ نہیں تو اُٹھا کر لے جاؤں گا" یہ کہہ کر اُس نے ایک جھٹکے سے رضیہ کو اپنی طرف کھینچا۔ رضیہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ اُس نے اپنے دائیں ہاتھ کی ایک ضرب اُس کے ہاتھ پر لگائی جس کی وجہ سے اُس کی کلائی آزاد ہو گئی۔ اُس کے نزدیک آ کر رضیہ نے جھک کر داؤ لگایا اور اُسے اپنے شانے پر سے دوسری جانب پھینک دیا۔ ایک لمحے کے لیے کسی کو اپنی بصارت پر یقین نہیں آیا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک عورت بالم جیسے قوی ہیکل جنگجو مرد کو اس طرح اُٹھا کر پھینک دے گی۔ سب لوگ حیرت زدہ رہ گئے تھے۔ خود بالم بے یقینی سے کبھی رضیہ کو اور کبھی خود کو زمین پر پڑا ہوا دیکھ رہا تھا۔ سب سے زیادہ حیرت زدہ ہیرا ڈاکو تھا۔ اس کا لیفٹیننٹ ایک عورت کے داؤ سے چت ہو کر زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اور تمام ساتھی بھونچکے رہ گئے تھے۔

کچھ دیر ہال کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ میرے سوا یہ نظارہ ہر ایک کے لیے ناقابلِ یقین تھا۔ مَیں رضیہ کی مہارت کا ایک بار پہلے ہی مظاہرہ دیکھ چکا تھا جب اُس نے بازخاں جیسے خونخوار شخص کو چند لمحوں میں بے دست و پا کر کے ڈال دیا تھا۔ لیکن اس وقت جو کچھ ہُوا وہ خود میری توقع سے بھی زیادہ تھا۔ جن حالات سے ہم لوگ دوچار تھے اُن میں رضیہ کو اپنے غصّے اور مزاج پر قابو رکھنا چاہیے تھا۔ اُس نے جوشِ غضب میں ایک ایسی کارروائی کر دی تھی جس کا موقع اور محل نہیں تھا۔ میری کوشش یہ تھی کہ خود کو بے بس اور معصوم، سیدھا سادہ دیہاتی ظاہر کر کے مناسب موقعے پر اپنی حربی صلاحیت کو کام میں لاؤں اور اس سے پہلے ان لوگوں کو اسی تاثر میں رکھوں کہ مَیں ایک قطعی بے ضرر اور صُلح پسند انسان ہوں جس کا لڑائی جھگڑے سے دُور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ لیکن رضیہ نے ایک مشکل صورتِ حال سے دوچار کر دیا تھا۔

بالم چند لمحے تو فرش پر پڑا رہا مگر پھر اس نے اپنے ہوش و حواس پر قابو پا لیا اور غصّے کے ساتھ قہر کے آثار بھی اُس کے چہرے پر نمودار ہونے لگے۔ وہ پھرتی سے زمین سے اپنے کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھا اور اس سے پہلے کہ کوئی مُنہ سے بولتا وہ رضیہ کے پاس پہنچ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ نظروں ہی نظروں میں رضیہ کو تولتا رہا۔ دوسری طرف رضیہ بھی بے خوفی سے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑی تھی۔ بالم نے دانت پیس کر رضیہ کو گھُورا اور بولا "اب تو مَیں تجھے کسی قیمت پر نہیں چھوڑوں گا۔ تُو مجھے جانتی نہیں ہے"۔

رضیہ اپنے دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر کھڑی ہو گئی اور نڈر ہو کر بولی "تُو بھی مجھے نہیں جانتا ہے۔ مَیں حلوہ نہیں ہوں۔ میرے ساتھ زبردستی کرے گا تو پچھتائے گا"۔

بالم نے غضب ناک ہو کر قدم آگے بڑھایا۔ اُس کے دونوں ہاتھ آگے پھیلے ہوئے تھے۔ شاید وہ رضیہ کو اپنی باہوں میں جکڑنا چاہتا تھا لیکن رضیہ اس کی توقع سے کہیں زیادہ پھُرتیلی ثابت ہوئی۔ وہ تیزی سے ایک جانب جھُک کر اُس کے ہاتھوں کے حصار سے نکل گئی اور جب بالم پلٹ کر اُس کی جانب بڑھا تو اُس سے پہلے ہی رضیہ حرکت میں آ چکی تھی۔ اُس نے اُچھل کر اپنی جگہ چھوڑی اور ایک بھرپور فلائنگ کِک بالم کے سینے پر رسید کی۔ وہ دوبارہ پیچھے کی جانب گِرا اور اُٹھنے کے لیے کروٹ لینے کا ارادہ کیا لیکن رضیہ اُس کے سر پر پہنچ چکی تھی۔ اس نے ایک زوردار ٹھوکر اُس کے پیٹ پر اور دوسری اُس کے مُنہ پر لگائی۔ بالم کے مُنہ سے بے اختیار ایک کراہ نکلی اور وہ اُس کی ضرب سے بچنے کے لیے کروٹ لے کر اوندھا ہو گیا۔ اُس سے پہلے کہ وہ دونوں ہتھیلیاں زمین پر ٹیک کر اُٹھتا رضیہ ربڑ کی گیند کی طرح اُچھلی اور دونوں پیروں کے بل اُس کی کمر پر جا کُودی۔ بالم نے تڑپ کر آہ بھری اور دوسری جانب کروٹ بدلنی چاہی، لیکن رضیہ دوبارہ اُچھل کر بالم کی کمر پر اُس زور سے

گِری کہ بالم کے مُنہ سے ایک زوردار چیخ نِکل گئی۔ رضیہ چھلانگ لگا کر اُس کی کمر پر سے اُتر گئی اور بے تکلفی سے اپنے دونوں ہاتھ جھاڑنے لگی۔ رضیہ کا حُلیہ اُس وقت قابلِ دید تھا۔ اُس کے خوبصورت بال بکھر کر اُس کے غصّے اور جوش سے تمتماتے ہوئے چہرے کے آس پاس پھیل گئے۔ اس کی سانس بے ترتیب تھی جس کی وجہ سے جسم میں زیروبم کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اس وقت قہر اور دلکشی کا مرقع بنی ہوئی تھی۔ اس کا یہ روپ مَیں تو پہلے بھی دیکھ چکا تھا مگر یہاں پر موجود لوگوں کے لیے یہ انوکھا اور ناقابلِ یقین مظاہرہ تھا۔ وہ دوبارہ اپنے دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر کھڑی ہو گئی اور بے پرواہی سے بالم کو دیکھنے لگی جو فرش پر پڑا ہوا مچل رہا تھا اور کراہ رہا تھا۔ کمر کی ہڈی پر لگنے والی ضرب نے اسے بے بس کر دیا تھا اور وہ مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا لیکن سب کی نظریں بالم پر نہیں بلکہ رضیہ پر مرکوز تھیں جو شعلۂ جوالہ بنی ہر ایک کے تاثر سے بے نیاز کھڑی تھی اور زمین پر مچلنے والے بالم کو یوں دیکھ رہی تھی جیسے اس کو موجودہ حالت تک پہنچانے میں اس کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اور وہ بھی دوسروں کی طرح محض ایک تماشائی ہے۔ اس وقت جبکہ سب کی نگاہیں رضیہ پر جمی ہوئی تھیں میں ہیرا ڈاکو کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کا ردِعمل ہم سب کے لیے بنیادی اہمیت رکھتا تھا۔ وہ بھی رضیہ کو دیکھ رہا تھا، لیکن اپنے دستِ راست کی درگت بننے پر اُسے کوئی غصہ یا افسوس نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر ناراضی کی جگہ پسندیدگی کے آثار تھے اور اُس کی آنکھوں میں تحسین اور محبت کے ملے جُلے جذبات کا عکس میں واضح طور پر دیکھ سکتا تھا۔ وہ تعریفی نظروں سے دیکھتا ہوا رضیہ کی طرف بڑھا اور نرمی سے بولا۔ "واہ ری شیر کی بچّی۔ جیتی رہ۔ دِل خوش کر دیا"۔ پھر وہ ہال میں موجود دوسرے لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا "کیوں ٹھیک ہے نا؟" جواب میں کسی نے ایک لفظ بھی نہ نکالا تھا۔

لیکن مَیں جانتا تھا کہ ہیرا ڈاکو کی یہ داد خطرے کی گھنٹی کی علامت تھی۔ ہم لوگوں کے وجود کو پہلی بار خطرہ لاحق ہوا تھا۔ رضیہ نے اپنی بہادری، مہارت اور خوبصورتی سے ہیرا ڈاکو جیسے سنگدل اور کٹھور شخص کا دل جیت لیا تھا۔ ہال میں موجود تمام لوگوں کو یہ علم ہو چکا تھا۔ صرف رضیہ ہی ایک ایسی شخصیت تھی جو ابھی تک ہیرا ڈاکو کے جذبات کا اندازہ نہیں لگا پائی تھی۔

ہیرا ڈاکو نے ایک حقارت بھری نظر زمین پر پڑے بل کھاتے ہوئے بالم پر ڈالی اور پھر ہاتھ کے اشارے سے اسے اٹھا کر لے جانے کی ہدایت کرتا ہوا دوبارہ تخت پوش پر جا کر بیٹھ گیا اور ستائش اور پیار کی نگاہوں سے رضیہ کو دیکھنے لگا۔ رضیہ کو اب یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ اُس کا مدِ مقابل مقابلہ کرنے سے معذور ہو چکا ہے۔ چنانچہ وہ بڑے اطمینان سے دوبارہ لالی کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ اُس وقت وہ ایک معصوم اور لاچار لڑکی نظر آ رہی تھی اور کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی لڑکی ہے جس نے کچھ دیر پہلے بالم جیسے آہنی اور سخت جان انسان کو زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ہیرا ڈاکو کے حکم پر دو آدمی بالم کو اُٹھا کر لے گئے تھے اور اب حاضرین سسپنس کے عالم میں اس ڈرامے کا اگلا منظر دیکھنے کے منتظر تھے۔

ہیرا ڈاکو نے دونوں ہاتھوں سے تالی بجائی اور سب اُس کی طرف متوجہ ہو گئے "سائیں۔ یہ لڑکی تو بڑی دلیر ہے" وہ مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا "اس کی جگہ کھیتوں کھلیانوں میں نہیں ہے۔ یہ نوکرانی بنانے کے قابل نہیں ہے۔ یہ تو راج ـــــ کرنے کے لیے ہے۔ ایسی بہادر لڑکی تو ہیرا نے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ بس سائیں۔ تم لوگ اب ادھر ہمارے مہمان رہو گے"۔

رضیہ نے چونک کر ہیرا کو دیکھا اور پہلی بار اسے صورتِ حال کی نزاکت کا احساس ہوا۔ مَیں مجبوری سے اپنے ہونٹ کاٹ کر رہ گیا۔ مَیں اس وقت کچھ بول بھی نہیں سکتا تھا۔ ہیرا ڈاکو سے کچھ کہنے کے لیے یہ موقع بالکل مناسب نہیں تھا۔ اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ ہزار دل و جان سے رضیہ پر فریفتہ ہو گیا ہے اور اب کسی قیمت پر رضیہ کو واپس جانے کی

اجازت نہیں دے گا۔

ہیرانے اپنے پاس کھڑے ہوئے ایک شخص کو ہاتھ کے اشارے سے اپنے پاس بلایا اور کہا "جنگو۔ انہیں لے جاکر ان کے رہنے سہنے کا بندوبست کر دو۔ دیکھو۔ یہ ہمارے مہمان ہیں۔ انہیں کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہیے"۔

جنگو نے کہا باہم کے لجداس کا برد وبھا۔ وہ ایک اونچا لمبا اور طاقت ور درمیانی عمر کا شخص تھا۔ اس کے چہرے پر گھنی مونچھیں اور ڈاڑھی تھی اور سر پر اُس نے ایک بڑی سی پگڑی لپیٹ رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں خودکار رائفل دی ہوئی تھی جسے وہ بار بار اپنی رانوں پر مارنے کا عادی تھا۔

"چلو سائیں لوگ" اس نے مجھے، لالی اور رضیہ کو مخاطب کیا۔ رضیہ کے لیے ہیرا ڈاکو کی پسندیدگی اب کسی کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہی تھی اور میں نے محسوس کیا کہ رضیہ کو مخاطب کرتے ہوئے جنگو کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں اور وہ خاصا مؤدب ہو گیا تھا۔

"جاؤ جوان۔ اس کے ساتھ جاؤ اور بے فکری سے آرام کرو۔ تم سب ہمارے مہمان ہو" ہیرانے مسکراتے ہوئے مجھ سے کہا لیکن اس کی نگاہیں ایک لمحے کے لیے بھی رضیہ کے تمتمائے ہوئے حسین چہرے سے نہیں ہٹ سکی تھیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ وہ رضیہ پر پوری طرح لٹو ہو چکا تھا "دیکھو جنگو۔ ان لوگوں کو ذرا بھی تکلیف نہ ہو۔ ڈیرے میں سب کو بتادو۔ یہ ہیرا کے مہمان ہیں۔ کیوں۔ ٹھیک ہے نا؟"

"ٹھیک ہے سردار" جنگو سر ہلا کر بولا "اور ان تینوں کے لیے کیا حکم ہے سردار؟" اس نے ملک منصور کے آدمیوں کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

ہیرانے کہا "انہیں دفع کرو۔ اس کباڑ کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں ہے" پھر وہ براہ راست اُن سے مخاطب ہو کر بولا "تم لوگ واپس جا سکتے ہو۔ تم غریب آدمی ہو۔ تم سے میری کوئی لڑائی نہیں ہے۔ نہ تمہاری وجہ سے مجھے کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ کیوں بھئی ٹھیک ہے نا؟"

ان لوگوں کے چہرے خوشی سے دمک اُٹھے۔

"مگر یاد رکھو" ہیرانے انہیں وارننگ دی۔ "اگر تم نے ہمارے بارے میں کسی کو ایک لفظ بھی بتایا تو تمہاری خیریت نہیں ہے۔ یہ مت بھولنا کہ ہیرا ڈاکو کے ہاتھ بہت لمبے ہیں اور وہ موت کا فرشتہ بن کر ہر جگہ پہنچ سکتا ہے۔ اس کا راستہ کوئی نہیں روک سکتا۔"

اس طرح ہمیں برخاست کر دیا گیا۔ جنگو کی راہنمائی میں ہم تہہ خانہ کی سیڑھیاں چڑھ کر باہر نکل آئے۔ اُس نے عمارت کی بالائی منزل کی طرف جانے کی بجائے بائیں جانب ایک درختوں کے ذخیرے کا رُخ کیا اور ہم اس کے پیچھے چلتے رہے۔ میں نے آس پاس کے ماحول کا جائزہ لیا۔ جنگو ہمیں عمارت سے دُور لے جا رہا تھا۔ چاروں طرف درختوں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہم درختوں کے ایک ذخیرے میں داخل ہو کر قریباً دو سو فٹ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد پھر ایک کھلی جگہ پہنچ گئے جہاں ایک اور پرانی حویلی نما عمارت بنی ہوئی تھی۔ یہ عمارت کھلے میدان کے بالکل آخری کنارے پر تھی۔ اس کے عقب میں کھڈا اور کھائیاں تھیں۔ "یہ مہمان خانہ ہے سائیں" جنگو نے ہمیں مخاطب کرتے ہوئے اطلاع دی۔ "سردار کے مہمانوں کو ادھر ہی رکھتے ہیں۔"

ایک سیمنٹ کے خوبصورت فرش سے گزر کر ہم اس حویلی کی ڈیوڑھی میں پہنچ گئے۔ اس عمارت کی طرزِ تعمیر بھی پہلی عمارت سے زیادہ مختلف نہیں تھی۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ دونوں عمارتیں ایک ہی شخص نے کسی زمانے میں بنائی ہوں گی۔ اس مہمان خانے کی حالت پہلی عمارت سے بہتر تھی۔ ہم جس برآمدے سے گزرے اس میں ایک جانب کمروں کے دروازے تھے اور ان میں سے ایک بھی شکستہ اور دیمک زدہ نہیں تھا۔ ایک بڑے سے چوبی دروازے کے اندر داخل

ہو کر ہم ایک وسیع اور کشادہ ہال کمرے میں پہنچ گئے۔ یہاں چند کرسیوں کے علاوہ اور کوئی سامان موجود نہیں تھا۔ بل کھاتا ہوا وسیع زینہ ہال میں سے اُوپر کی طرف جاتا تھا جبکہ گیلری میں دائیں جانب مڑے ایک زینہ نیچے کی طرف جاتا ہوا بھی نظر آ گیا۔ گویا تہہ خانہ اس عمارت میں بھی موجود تھا۔ اس ہال کا فرش سفید سنگ مرمر کا بنا ہوا تھا۔ قالین کے نام پر یہاں کوئی چیز موجود نہیں تھی۔ جنگو بڑے ہال سے گزر کر سیڑھیوں پر سے چڑھ کر ایک اور برآمدے میں پہنچ کر رُک گیا۔ ایک کمرے کا دروازہ کھول کر اُس نے ہمیں اندر جانے کا اشارہ کیا اور پھر خود پلٹ کر وہاں سے رُخصت ہو گیا۔

ہم جس کمرے میں داخل ہوئے وہ خاصا وسیع اور سجا ہوا تھا۔ سامنے ایک بہت بڑی اور کشادہ کھڑکی تھی جس پر نیلے رنگ کا پھولدار پردہ پڑا ہوا تھا۔ کمرے میں دو مسہریاں تھیں جن پر صاف ستھرا بستر بھی بچھا ہوا تھا۔ فرش پر ایک ہلکے نیلے رنگ کا قالین تھا اور مسہریوں کے علاوہ ایک بید کا صوفہ سیٹ اور ایک سنگھار میز بھی یہاں موجود تھی۔ میں نے دروازے کی طرف پلٹ کر دیکھا تو جنگو وہاں موجود نہیں تھا۔ دروازہ مقفل کرنا تو رہا ایک طرف اُس نے کمرے کا دروازہ بند کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی۔ میں نے فوراً بڑھ کر دروازہ بند کیا اور اندر کی جانب سے چٹخنی لگا دی۔ ایک قابل ذکر بات یہ تھی کہ اس تمام سفر میں ہمیں کسی جگہ بھی کوئی محافظ یا پہریدار نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس عمارت کے باہر بھی کوئی چوکیدار یا پاسبان قسم کی چیز نہیں تھی۔ دونوں حویلیوں کے درمیان میں بھی ہمارا کسی محافظ یا پہریدار سے واسطہ نہیں پڑا تھا اور یہ ایک حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین بات تھی۔ اس سے ہیرا ڈاکو کی پُراعتمادی ظاہر ہوتی تھی۔ پہریدار کا نہ ہونا اس بات کا ثبوت تھا کہ ہیرا ڈاکو کو یقین تھا کہ اوّل تو کوئی شخص یہاں سے فرار ہونے کی حماقت ہی نہیں کرے گا اور بفرضِ محال اگر کسی نے یہ غلطی کر بھی دی تو وہ ہیرا ڈاکو کے چنگل سے بچ کر نہیں نکل سکے گا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی رضیہ ایک صوفے پر اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اس نے اب تک بڑی بہادری اور ہمت بلکہ جوانمردی کا ثبوت فراہم کیا تھا۔ لیکن آخر وہ تھی تو ایک عورت ہی۔ کمرے کی چار دیواری میں اپنے آپ کو محفوظ و مامون سمجھ کر اس کے صبر و ضبط کا بند ٹوٹ گیا اور اس نے رونا شروع کر دیا۔ لالی بھی اب تک بالکل خاموش اور کسی حد تک سہمی ہوئی تھی لیکن رضیہ کو روتے ہوئے دیکھا تو اس کے پیروں کے پاس بیٹھ کر اسکے پیر دبانے لگی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب ہمیں کیا فیصلہ کرنا چاہیے۔ رضیہ کو آنسو بہاتے دیکھا تو میں اور زیادہ پریشان ہو گیا۔ میں نے اس کے برابر بیٹھ کر ہمدردی سے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا اور کہا:

"رضیہ۔ ہمت سے کام لو۔ تم تو بہت بہادر اور حوصلہ مند عورت ہو۔ ہمیں ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ اس طرح ہمت ہار بیٹھیں تو اس قید خانے سے نجات حاصل کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں رہے گا۔"

رضیہ نے تسلی اور ہمدردی کے بول سنے تو اس کی گریہ زاری میں مزید اضافہ ہو گیا اور وہ میرے شانے سے ٹیک لگا کر کافی دیر تک روتی رہی۔ کمرے میں پینے کے پانی کا کوئی بندوبست نہیں تھا، لیکن مجھے یقین تھا کہ اس کمرے میں کوئی غسل خانہ بھی ضرور ہوگا۔ چنانچہ میں نے سامنے والے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لالی سے کہا کہ اگر وہ غسل خانہ ہے تو وہاں سے تھوڑا سا پانی لے کر آئے۔ وہ بھاگی بھاگی گئی اور غسل خانے میں سے ایک پلاسٹک کے مگ میں پانی لے کر آ گئی۔ تھوڑا پانی پی کر اور چہرے پر چھینٹے مار کر رضیہ کی حالت کچھ سنبھلی اور اس کا رونا سسکیوں میں تبدیل ہو گیا یہاں تک کہ رفتہ رفتہ وہ بالکل خاموش اور پُرسکون ہو گئی۔ کچھ دیر کمرے میں بالکل خاموشی رہی۔ پھر لالی نے اپنی زبان کھولی اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''میاں جی۔ میں تو آپ کو ملک منصور سمجھ رہی تھی اور رضیہ بی بی کو آپ کی بیگم۔ مگر آپ تو کوئی اور نکلے۔ اب تو مجھے بتا دیجئے کہ آپ ہیں کون اور چوہدری کی حویلی میں کیسے پہنچے تھے؟''

میں نے کہا۔ ''دیکھو لالی۔ جو ہو چکا اسے بھول جاؤ۔ تم خاصی سمجھدار عورت ہو۔ اتنا تو معلوم ہو جانا چاہیے کہ میں

اپنی مرضی سے چوہدری کی حویلی میں نہیں گیا تھا۔ وہ لوگ مجھے ملک منصور سمجھ کر لے گئے تھے اور مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ میں انہیں اصل صورتِ حال نہ بتاؤں۔ رضیہ کو بھی اس بات کا علم ہے، لیکن ہم دونوں کی سلامتی اور بھلائی اسی میں تھی کہ چوہدری کی غلط فہمی دور نہ ہو۔ اب تمہیں حقیقت معلوم ہو چکی ہے بلکہ اب ہمیں حالات نے ایک عدد ناٹک کھیلنے پر مجبور کر دیا ہے۔ ملک منصور سے بچنے کے لیے مجھے ایک اور جھوٹ بولنا پڑا اور میں نے خود کو مزارع اور تمہیں اپنی بیوی بنا کر جان بچائی۔ اب ہم کو ایک نیا ڈرامہ کھیلنا پڑ رہا ہے۔ ہیرا ڈاکو کی نظروں میں تم میری بیوی ہو اور رضیہ تمہاری بہن ہے۔ یاد رکھو اگر اسے شک بھی ہو گیا کہ ہم نے اس سے جھوٹ بولا ہے اور اسے دھوکہ دیا ہے تو ہم تینوں کی خیر نہیں۔"

میری اس طویل تقریر کے جواب میں لالی معنی خیز انداز میں مسکرائی اور بولی۔ "آپ جو کوئی بھی ہیں بہت بہادر اور ہمت والے آدمی ہیں۔ میں نے ملک منصور سمجھ کر آپ کی مدد نہیں کی تھی۔ میرے دل نے کہا تھا کہ آپ کی مدد کروں اور آپ کی خدمت کروں۔ میری طرف سے آپ اطمینان رکھیئے میں جان دے کر بھی آپ پر آنچ نہیں آنے دوں گی۔"

"اب میری بات تم دونوں غور سے سنو۔" میں نے موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔ "میرا نام منگو ہے اور میں چوہدری رحمت کا مزارع ہوں۔ تم لالی ہو اور میری گھر والی ہو۔"

لالی کی آنکھوں میں خوشی کی چمک لہرانے لگی اور مسرت بھرے لہجے میں بولی۔ "منگو.....!؟ یہ نام بہت اچھا ہے اور رشتہ بھی مجھے اچھا لگا ہے۔ پر میاں جی۔"

میں نے اسے ٹوک دیا۔ "میاں جی نہیں۔ منگو کہو۔"

"منگو" وہ خوابیدہ لہجے میں کہنے لگی۔ "مجھے تو یوں لگ رہا ہے جیسے میں کوئی خوبصورت سپنا دیکھ رہی ہوں۔ کہاں آپ اور کہاں میں؟ اللہ کرے یہ خواب کبھی ختم نہ ہو۔ ہم سب اس طرح ساری زندگی بسر کر دیں۔"

"بکواس مت کرو۔" میں نے اسے ڈانٹا۔ "حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ سارے رشتے ناطے تو صرف جان بچانے کے لیے ہم نے بنائے ہیں۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔" اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور حسرت سے مجھے دیکھا۔ "اپنی ایسی قسمت کہاں؟"

مجھے لالی کے جذبات و احساسات کا اندازہ تھا۔ اس لیے میں نے اس سے مزید کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا اور رضیہ کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ اب قریب قریب نارمل ہو گئی تھی اور اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کو پھیلائے ہم دونوں کی باتیں سن رہی تھی اور اس کے تاثرات سے یہ بھی ظاہر تھا کہ وہ لالی کی باتوں سے لطف اندوز بھی ہو رہی تھی۔ رضیہ نے مجھے اپنی طرف متوجہ پایا تو سنبھل کر بیٹھ گئی اور اس کے چہرے پر شرم اور ندامت کے آثار پیدا ہو گئے۔ غالباً اپنے چند لمحے پہلے والے رویے کو یاد کر کے وہ شرمسار ہو گئی تھی۔

"رضیہ! تم نے غصے اور جوش میں آ کر ایسی حماقت کر دی ہے جس کی وجہ سے ہم سب مشکل میں پڑ گئے ہیں۔"

"مشکل میں تو میں پڑ گئی ہوں۔" وہ سادگی سے بولی۔ "اب کیا ہو گا یوسف؟"

"یوسف نہیں۔ میرا نام منگو ہے اور میں تمہاری بہن کا گھر والا ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے تصحیح کی۔

"یہ مذاق چھوڑو۔ ٹھیک ٹھیک بتاؤ اب کیا ہو گا؟"

"ہو گا کیا۔" میں نے صو... بات ٹال دی۔ "ہیرا ڈاکو سے تمہاری شادی ہو جائے گی۔"

اس نے بے اختیار میرے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ "دوبارہ پھر کبھی ایسی بات مت کہنا۔"

مجھے احساس ہوا کہ درحقیقت میں نے ایک نازیبا اور نامناسب بات کہہ دی تھی۔ وہ جس قسم کی عورت تھی اس کے معیار پر تو ملک منصور جیسا شخص پورا نہیں اترا تھا۔ بھلا ہیرا ڈاکو جیسے مجرم اور مفرور کو وہ کہاں خاطر میں لا سکتی تھی۔ پھر مجھے یہ بھی لحاظ رکھنا چاہئے تھا کہ وہ ایک شادی شدہ عورت ہے۔ میں نے شرمندگی سے اس کو دیکھا۔ "آئی ایم سوری۔ معاف کر دو آئندہ ایسی غلطی نہیں ہو گی۔"

وہ بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ میں نے اسے پہلی بار یوں کھل کر ہنستے ہوئے دیکھا تھا اور اس کی چھنکتی ہوئی ہنسی کی آواز مجھے بہت مترنم اور دلکش لگی۔

"منگو۔ تم نے انگریزی کہاں سے سیکھ لی؟ تم تو چوہدری رحمت کے مزارع ہو۔" اس نے سیاہ مسکراتی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے یاددہانی کرائی تو مجھے احساس ہوا کہ میں کتنی بڑی غلطی کر بیٹھا تھا۔

"انسان غلطیوں کا پتلا ہوتا ہے۔ ہم سب ہی غلطیاں کرتے ہیں۔ اب دیکھو نا۔ تمہاری ایک ذرا سی غلطی نے خود تمہیں اور ہم سب کو کتنی پریشانی میں ڈال دیا ہے؟"

"لیکن ہو سکتا ہے یہ غلطی ہماری جان بچانے کا سبب بن جائے۔" اس نے کہا۔

"وہ کیسے؟" میں نے پوچھا۔

وہ کہنے لگی۔ "یہ میں نہیں جانتی۔ مگر ہمیں فی الحال سوچنے کا موقعہ تو مل گیا ہے۔"

اس کی بات بھی درست تھی۔ اگر ہیرا ڈاکو رضیہ پر مائل نہ ہو جاتا تو خدا جانے ہمارا کیا حشر کرتا۔ لیکن اب ہمیں فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگانی چاہیے۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ ہیرا ایک بے چین اور مضطرب انسان ہے۔ سوال یہ ہے کہ اب اس سے جان کیسے بچائی جائے؟

اچانک دروازے پر کسی نے زور زور سے دستک دی اور ہم سب ہی اس خلافِ توقع شور سے چونک پڑے۔ میں نے ان دونوں کو بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا اور خود آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ میرے سامنے ایک مسلح ملازم کپڑے سے ڈھکی ہوئی ٹرے لیے ہوئے کھڑا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی وہ اندر آ گیا اور صوفوں کے سامنے رکھی ہوئی میز پر ٹرے رکھ کر خاموشی سے واپس پلٹ گیا۔ میں نے سرپوش ہٹا کر دیکھا تو ٹرے میں کھانے کا سامان اور پھل تھے۔ کھانے کی اشتہا انگیز خوشبو سارے کمرے میں پھیل گئی تھی۔ ہم تو نہ جانے کب سے بھوکے تھے۔ فوراً کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ اتنی دیر میں ایک اور مسلح آدمی پانی کا جگ اور ایک گلاس لیے ہوئے اندر داخل ہوا اور میز پر جگ اور گلاس رکھ کر کچھ بولے بغیر واپس چلا گیا۔ ان دونوں میں سے کسی نے بھی کمرے کا دروازہ بند کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

کھانے میں مرغ کا سالن اور ماش کی دال تھی۔ ساتھ میں موٹی روٹیاں تھیں۔ اچار اور چٹنی بھی ایک پیالی میں موجود تھی۔ کھانا خاصا لذیذ تھا۔ اور ہم نے اس کے ساتھ پوری طرح انصاف کیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر ہم نے گلاس سے باری باری پانی پیا اور خدا کا شکر ادا کیا۔ کھانے کے بعد ہم سب کی جسمانی اور ذہنی توانائی بحال ہو گئی تھی۔ اور اب ہم پر مایوسی اور پریشانی کا وہ عالم طاری نہیں تھا۔ جس میں کچھ دیر پہلے تک ہم مبتلا تھے۔ رضیہ اور لالی نے ایک طویل پہاڑی سفر طے کیا تھا اس لیے تھکی ہوئی تھیں۔ لالی قالین پر ہی لیٹ گئی اور ایک محنت کش سادہ دیہاتی عورت کی مانند چند لمحے کے اندر ہی نیند کی آغوش میں سو گئی۔ رضیہ ابھی تک صوفے پہ بیٹھی ہوئی تھی لیکن اس کے چہرے سے بھی تھکن کے آثار نمایاں تھے۔

میں نے کہا۔ "رضیہ۔ نیند آ رہی ہے تو تم بھی سو جاؤ۔ ہمیں اپنی [illegible] اور قوت محفوظ رکھنی چاہیے۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ ہمیں آگے چل کر اور کن مشکل مرحلوں سے گزرنا ہو گا۔"

وہ صوفے پر نیم دراز ہو گئی لیکن میں نے اسے بستر پر آرام کرنے کا مشورہ دیا "مگر آپ ؟" وہ میرے سامنے بستر پر لیٹتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔

"میں ذرا باہر جا کر آس پاس کے حالات کا جائزہ لینے کی کوشش کرتا ہوں۔ ہمیں ابھی تک محافظوں اور پہریداروں سے واسطہ نہیں پڑا ہے۔ میں یہ اندازہ کرنا چاہتا ہوں کہ یہاں پر ان لوگوں نے حفاظت کا کیا بندوبست کیا ہے۔"

رضیہ صوفے پر سے اُٹھ کر بستر پر چلی گئی۔ اس نے ایک تو بہ شکن انگڑائی لی اور کہنے لگی "میرا خیال کہ بیرا کو یہ مان ہے کہ کوئی شخص اس کے ڈیرے پر سے بھاگ جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔"

"ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یہ بہت مشکل اور دشواریوں سے بھرا ہوا راستہ ہے نئے آنے والوں کو تو یہاں سے باہر نکلنے کے راستے بھی معلوم نہیں ہوں گے۔ اس لیے بیرا کو بھی یقین ہے کہ اگر کوئی یہاں سے فرار ہونے کی حماقت کرے گا بھی تو راستے میں بھٹک کر رہ جائے گا۔"

رضیہ نے ایک لمبی سی جمائی لی اور مسہری کے سرہانے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں سُرخ ڈورے نمایاں نظر آ رہے تھے۔ نہ جانے یہ جاگنے کی وجہ سے تھے آنسو بہانے کی وجہ سے تھے یا وہ کچھ اور سوچ کر جذباتی ہو گئی تھی۔ کمرے میں چند لمحے بالکل خاموشی رہی۔ سوائے لالی کے ہلکے ہلکے خراٹوں کے اور کوئی آواز نہیں تھی۔ لالی بالکل بے سُدھ سو رہی تھی اور ہو سکتا ہے کوئی خوشگوار خواب بھی دیکھ رہی ہو۔ آغاز میں وہ کروٹ سے سُکڑ کر لیٹی تھی لیکن

اب وہ بے پروائی اور بے تکلفی سے قالین پر دراز تھی۔ لالی کہنے کو ایک دیہاتی ملازمہ تھی لیکن اس کا رنگ روپ دلکش تھا۔ چوہدری کی حویلی میں شیریں جیسی فیشن ایبل اور ماڈرن لڑکی کی رفاقت نے اسے تہذیب اور تمیز بھی سکھا دی تھی۔ وہ ایک جاذبِ نظر اور متاثر کرنے والی عورت تھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بقول اس کے چوہدری جیسا شخص بھی اس کے پیار کا طالب تھا۔ مجھے اب یہ بخوبی علم ہو چکا تھا کہ میرے بارے میں لالی کے جذبات کیا ہیں؟ شروع میں وہ مجھے پسند کرتی تھی لیکن میرا اندازہ تھا کہ رفتہ رفتہ پسندیدگی شدید جذباتیت کا روپ دھارنے لگی۔ یہ سچ ہے کہ اگر لالی ہماری مدد نہ کرتی تو ہم دونوں کا چوہدری کی حویلی سے زندہ بچ کر نکلنا قطعی ممکن نہیں تھا۔ میں لالی کو ستائشی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور تہہ دل سے اس کا شکر گزار تھا۔

رضیہ کی شرارت بھری آواز نے مجھے چونکا دیا۔ "کیا سوچ رہے ہو؟ لالی کو اتنی غور سے کیوں دیکھ رہے ہو؟ معاملہ کیا ہے؟"

اس کے لہجے کی شوخی نے مجھے بھی شوخ بنا دیا۔ میں نے کہا: "ایک شوہر اپنی خوبصورت بیوی کو محوِ خواب دیکھ کر کیا سوچ سکتا ہے؟ وہی میں بھی سوچ رہا تھا۔"

وہ جھینپ گئی اور بولی "مگر یہ خیال رہے کہ یہ رشتہ اصلی نہیں ہے۔ عارضی ہے۔ بلاوجہ اپنی نیت خراب نہ کرنا۔"

میں نے مسکرا کر جواب دیا: "مشکل تو یہی ہے کہ جتنے خوبصورت اور رنگین رشتے قائم ہو رہے ہیں وہ سب کے سب نقلی اور عارضی ہیں۔ دیکھو نا۔ یہ کتنی ناانصافی اور زیادتی ہے۔ پہلے ایک خوش جمال اور خوش ادا بیوی ملی تھی۔ مگر اسے صرف دور دور سے دیکھنے کی اجازت دی تھی۔ اب ایک اور البیلی ناز بیوی کے روپ میں ملی ہے تو وہ بھی اصلی رشتہ نہیں ہے۔ ہماری تو تقدیر ہی خراب ہے۔" میں نے ایک سرد آہ بھری۔

وہ شرارت سے پوچھنے لگی: "اتنا زیادہ اُداس اور مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ کہو تو لالی سے سچ مچ شادی کرا دوں؟"

میں نے اسے گہری نظروں سے دیکھا اور اس نے اپنی نظریں جھکا لیں۔

"تمہارا دل کیا کہتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کس سلسلے میں؟"

"شادی کے سلسلے میں؟"

وہ ہنس کر کہنے لگی: "میری مانو تو اس سے شادی کر لو۔ بہت اچھی بیوی بنے گی۔ صورت شکل بھی اچھی ہے وفادار اور جاں نثار بھی ہے۔ ساری زندگی خدمت کرے گی تمہاری۔"

"تم کہتی ہو تو کر لیتا ہوں۔ بیرا سائیں نے تو ہمیں شادی کے بعد یہاں رہنے کی دعوت دے ہی دی ہے۔"

وہ چونک کر یوں بیٹھ گئی جیسے کسی زہریلے کیڑے نے کاٹ لیا ہو۔ تلملا کر بولی: "تمہیں شرم نہیں آتی ایسی باتیں کرتے ہوئے۔ تم کیا سمجھتے ہو؟ میں اس جنگلی اور وحشی ڈاکو سے شادی کروں گی؟" وہ شرربار نگاہوں سے مجھے گھورنے لگی۔

"کتنی بُری لگی ہے میری بات!" میں ہنس پڑا۔ "دوسروں سے جب بات کرتی ہو تو اس وقت یہ بھی سوچ لیا کرو کہ ان کے بھی جذبات ہیں۔"

وہ خاموش ہو کر دانتوں سے اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔

"اچھا ایک بات تو بتاؤ۔ تمہیں بھلا اتنا غصہ کرنے اور اپنی بہادری کا مظاہرہ کرنے کی کیا ضرورت پڑی تھی؟ اُس بے چارے کو خواہ مخواہ جھلک دکھا کر دیوانہ بنا دیا۔" میں نے چھیڑ خانی کی۔

رضیہ نے پہلے تو مجھے غصے سے گھور کر دیکھا مگر پھر مسکرانے لگی۔ بولی: "جہاں جاتی ہوں ہر ایک شادی کی آفر دے دیتا ہے۔ آخر کوئی کہاں تک برداشت کرے۔"

"تو اس میں اُن بے چاروں کا کیا قصور ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا: "تم نے شخصیت ہی اتنی دل آویز پائی ہے۔"

اس نے نظریں جھکا کر کہا: "مگر تم پر تو کوئی اثر نہیں ہوا۔"

اس کے لہجے میں اتنی بے ساختگی، سادگی اور شکایت تھی کہ میں بے اختیار ہنس پڑا۔ اس نے غصے سے گردن موڑ کر مجھے دیکھا مگر پھر دوبارہ نگاہیں جھکا لیں۔ اسے اب یہ احساس ہو رہا تھا کہ وہ بے اختیار اَن جانے میں کتنی بڑی بات کہہ گئی ہے۔

میں آہستگی سے چلتا ہوا اس کے پاس گیا اور نرمی سے کہا: "رضیہ۔ کیا تم واقعی یہ سمجھتی ہو کہ مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا ہے؟ کیا تم مجھے اتنا ہی بے حس سمجھتی ہو؟"

اس نے ایک نگاہِ غلط انداز مجھ پر ڈالی اور پھر دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔

باہر کہیں سے ایک موٹر گاڑی کے انجن کی آواز سنائی دی اور فضا کا سناٹا ایک دم ختم ہو گیا۔ میں نے چونک کر آواز کی طرف کان لگائے: "میں باہر جا کر دیکھتا ہوں۔ اندھیرا ہونے سے پہلے میں آس پاس کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔"

میں تیز قدموں سے چلتا ہوا برآمدے میں پہنچا اور سیڑھیاں اُتر کر ہال کمرے سے گزرتا ہوا حویلی کے بیرونی برآمدے میں پہنچ گیا۔ کچھ فاصلے پر ایک لینڈ روور کھڑی ہوئی تھی جس میں چار آدمی سوار تھے۔ میرے دیکھتے دیکھتے وہ چاروں نیچے اُترے۔ ان میں سب سے آگے سفاری سوٹ میں ملبوس ایک شخص تھا جسے دیکھ کر میں ساکت رہ گیا۔ وہ ملک منصور تھا جو اپنے تین مسلح آدمیوں کے ساتھ لینڈ روور سے نکل کر چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ میں برآمدے کے گول ستون کے پیچھے چھپ گیا اور میں نے اپنا سانس روک لیا۔ ملک منصور کی نظریں اسی حویلی کی طرف تھیں۔ چند لمحے وہ اسی جگہ کھڑا عمارت کا جائزہ لیتا رہا اور پھر برآمدے کی طرف بڑھا۔ اس کے تینوں مسلح اور چاق و چوبند کارندے

اپنے ہتھیار سنبھالے اس کے عقب میں چل رہے تھے۔ یہ لمحہ میرے لیے قیامت کا لمحہ تھا میرے لیے فرار کا کوئی راستہ باقی نہیں رہا تھا۔ ملک منصور کی آمد نہ صرف میری موت کا پروانہ تھی بلکہ ہم نے اب تک جتنے جھوٹ بولے تھے ان سب کا پول کھلنے کا وقت آگیا تھا۔ ایک طرف ملک منصور کا قہر تھا اور دوسری طرف ہیرا ڈاکو کا غضب اور ان دونوں کے درمیان میں بالکل تنہا۔ بے بس اور نہتا کھڑا ہوا تھا۔ حالات کی اس اچانک تبدیلی نے میرا ذہن بالکل ماؤف کردیا تھا۔ نہ میرے دماغ میں سوچنے کی طاقت رہی تھی اور نہ ہی میرے ہاتھ پیر میں حرکت کرنے کی سکت تھی۔ بے اختیار جتنی دعائیں مجھے یاد تھیں وہ میری زبان پر آگئیں۔ شاید اتنے خلوصِ دل اور خشوعِ قلب سے میں نے اپنے رب کو پہلے کبھی یاد نہیں کیا تھا۔

کہتے ہیں کہ دعا کی قبولیت کا بھی ایک وقت ہوتا ہے۔ جب خداوند تعالیٰ کی رحمت کا دروازہ اپنے گناہگار بندوں کے لیے کھل جاتا ہے۔ شاید یہ وہی قبولیت کا لمحہ تھا کیونکہ یکایک عقب میں بھاری قدموں کی آوازیں سنائی دیں اور ملک منصور کے حویلی کی جانب بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ وہ آوازوں کی طرف پلٹا اور اس کے ساتھیوں نے اپنی خودکار رائفلوں کو تان لیا اور گولیاں برسانے کے لیے تیار ہو گئے۔ درختوں کے جھنڈ میں سے بھاگ کر آنے والوں میں سب سے آگے ہیرا ڈاکو کا دستِ راست جنگو تھا۔ وہ اپنے چار ساتھیوں کے ہمراہ درختوں سے نمودار ہوا۔ ملک منصور کے ساتھیوں نے بندوقیں تان لیں لیکن جنگو اور اس کے ساتھیوں نے اپنی رائفلوں کا رخ ان کی طرف نہیں کیا۔ میں ملک منصور کی جرأت اور آہنی اعصاب کا قائل ہوگیا۔ وہ اس وقت بھی بالکل پُرسکون اور مطمئن نظر آرہا تھا۔

جنگو اس کے نزدیک آکر کھڑا ہو گیا اور سوالیہ نگاہوں سے اس کو دیکھنے لگا۔

"میرا نام ملک منصور ہے۔" منصور نے شائستگی سے نرم لہجے میں کہا۔ "کیا تم ہیرا ڈاکو ہو؟"

"سائیں ہیرا ڈاکو سے کیا کام ہے آپ کو؟" جنگو نے پوچھا۔

ملک منصور نے جواب میں کہا۔ "یہ میں ہیرا کو ہی بتاؤں گا۔ مجھے ان سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔" اس کی آواز اور لب و لہجہ میں کوئی تبدیلی نہیں پیدا ہوئی تھی۔

جنگو نے سر سے پیر تک غور سے ملک منصور کو دیکھا اور پھر بولا "میرے ساتھ آجاؤ سائیں۔" وہ پلٹ کر درختوں کے ذخیرے کی طرف چل پڑا جس سے گزر کر دوسری حویلی میں جانا ہوتا تھا۔ ملک منصور کے ساتھی بندوقیں تانے فوری ایکشن کے لیے بالکل تیار تھے۔ ملک نے انھیں ہاتھ سے بندوقوں کی نالیاں جھکانے کا اشارہ کیا اور بڑے سکون اور اطمینان سے اپنی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈال کر جنگو کے پیچھے چل پڑا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ملک منصور غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ اس کی شخصیت متاثر کرنے والی تھی اور وہ خراب سے خراب حالات میں بھی اپنے اعصاب اور جذبات پر قابو رکھنے والا آدمی تھا جو بذاتِ خود ایک نایاب خوبی کہی جاسکتی ہے۔ میں سانس روکے ہوئے برآمدے کے ستون کے پیچھے کھڑا ہوا تھا۔ شکر ہے کہ ملک کے برآمدے تک پہنچنے سے پہلے ہی جنگو اور اس کے ساتھی وہاں پہنچ گئے ورنہ میں اس کی اور اس کے مسلح اور خونخوار کارندوں کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا تھا۔ ہیرا ڈاکو وہ شخصیت تھی جس سے دولت مند اور بااثر لوگ پناہ مانگتے تھے۔ وہ انھیں اغوا کرکے اپنے ڈیرے پر لاتا اور منہ مانگی رقوم لے کر انھیں رہا کرتا تھا۔ آج تک کوئی اس کے ڈیرے کا پتہ نہیں معلوم کرسکا تھا۔ لیکن ملک منصور نہ صرف اس کی پناہ گاہ سے واقف تھا بلکہ وہ بلا توقف اس کے اڈّے پر بنفسِ نفیس پہنچ گیا تھا۔ یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اس تک یہ اطلاع پہنچ چکی ہوگی کہ اس کی بیوی (جس کا علم دوسرے لوگوں کو نہیں تھا) اور اس کے کارندوں کو ہیرا ڈاکو کے آدمی اغوا کرکے لے گئے ہیں اور وہ آندھی اور طوفان کی طرح دندناتا ہوا ہیرا ڈاکو کے ڈیرے پر پہنچ گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ وہ اپنے پرانے حریف چوہدری کو ملیامیٹ کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا یا پھر

اس کو یقین ہو چکا تھا کہ چوہدری کی مداخلت زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکے گی۔ بہرحال دونوں صورتوں میں چوہدری پر اس کی برتری بالکل واضح تھی۔ اب سوال یہ تھا کہ وہ ہیرا ڈاکو کے پاس کیوں آیا ہے؟ آیا وہ اسکو رضیہ کی اصلیت بتلانے اور رضیہ کو اپنے ساتھ لے جانے آیا ہے یا ہیرا کے ساتھ اس کا کوئی اور رابطہ بھی ہے؟ ایک اور خیال جو میرے لیے سخت پریشان کن تھا وہ یہ تھا کہ کہیں ملک منصور کو چوہدری کی حویلی میں میرے بارے میں علم تو نہیں ہو گیا؟ اب اگر مجھے رضیہ اور لالی کو اس کے سامنے پیش کیا گیا تو میری پوزیشن کیا ہوگی اور میرا انجام کیا ہوگا؟

میرے پاس وقت بہت کم تھا۔ اس سے پہلے کہ ملک منصور کی ہیرا ڈاکو سے ملاقات ہو مجھے کوئی ترکیب سوچ کر اس پر عمل کر لینا چاہیئے تھا ورنہ پھر نجات کی کوئی راہ میرے لیے باقی نہیں تھی۔

میں پلٹ کر تیزی سے بھاگتا ہوا ہال کمرے میں پہنچا اور سیڑھیاں طے کر کے بیڈ روم میں جا کر میں نے رضیہ کو جھنجوڑ کر بیدار کر دیا۔ اس کی شاید کچھ دیر پہلے ہی آنکھ لگی تھی۔ میرے جھنجوڑنے پر وہ گھبرا کر گہری نیند سے جاگ پڑی۔ اور پریشانی سے مجھے دیکھنے لگی۔

"رضیہ۔ ملک منصور یہاں پہنچ گیا ہے۔ ہمیں فوراً یہاں سے رخصت ہونا ہے۔ جلدی کرو۔ لالی کو بھی جگا دو۔"

رضیہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ میری شکل تکتی رہی۔ میں لپک کر لالی کے پاس گیا۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر سو رہی تھی اور ہلکے ہلکے خراٹے لے رہی تھی۔ میں نے اس کو زور زور سے ہلایا تو وہ بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی: "کیا بات ہے؟ کیا ہوا؟ خیریت تو ہے؟"

"خیریت نہیں ہے لالی۔ ہمیں فوراً یہاں سے چلنا ہے۔ ابھی اسی وقت۔ ایک ایک منٹ قیمتی ہے۔" لالی اپنے بکھرے ہوئے بالوں کو سمیٹتی ہوئی فوراً اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور اپنے لباس کو درست کرنے میں مصروف ہو گئی۔

"مگر ہم جائیں گے کہاں؟" رضیہ نے اٹھتے ہوئے سوال کیا: "اور کیسے جائیں گے؟"

"اللہ مالک ہے۔ تم میرے ساتھ آؤ۔" یہ کہہ کر میں نے تیز رفتاری سے باہر کا رخ کیا۔ ہم بیرونی برآمدے میں پہنچ کر رک گئے۔ ہر طرف خاموشی اور ویرانی کا راج تھا۔ دور دور تک کوئی محافظ نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے ایک لمحے برآمدے کے ستونوں کے پیچھے کھڑے ہو کر چاروں طرف کا جائزہ لیا اور پھر لالی اور رضیہ کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے تیزی سے بھاگتا ہوا کچھ فاصلے پر کھڑی ہوئی لینڈ روور کے پاس پہنچ گیا۔ میں اس دوران میں خدا سے دعا کر رہا تھا کہ وہ لوگ گاڑی کی چابی اسی کے اندر چھوڑ کر چلے گئے ہوں ورنہ اسے ڈائریکٹ سٹارٹ کرنے میں مزید تاخیر کا امکان تھا۔ لیکن کھڑکی کے پاس جاتے ہی میری تشویش اور پریشانی دور ہو گئی۔ کھڑکی کا شیشہ اترا ہوا تھا اور سامنے اگنیشن میں ایک لوہے کے رنگ کے ساتھ لٹکتی ہوئی چمکدار چابی مجھے صاف نظر آ رہی تھی۔ خوشی سے بے قابو ہو کر میں نے رضیہ اور لالی کو فوراً گاڑی میں سوار ہونے کے لیے کہا اور خود سٹیرنگ سنبھال لیا۔ چابی گھما کر میں نے گاڑی سٹارٹ کرنے کی کوشش کی۔ گاڑی کا انجن فوراً ہی بول پڑا۔ اتنی دیر میں رضیہ اور لالی بھی اس کے اندر بیٹھ چکی تھیں۔ میں نے گیئر لگانے کا ارادہ کیا مگر گاڑی کی کھڑکی پر آہٹ سن کر میری نظریں اس طرف اٹھ گئیں۔ ایک پستول کی چمکدار نالی مجھ سے دو فٹ کے فاصلے پر چمک رہی تھی۔ میں نے پستول تھامنے والے ہاتھ کو دیکھا اور پھر میری نظروں نے رفتہ رفتہ پوری شخصیت کا احاطہ کر لیا۔ مجھ سے دو تین قدم کے فاصلے پر بھرپور جسم کی ایک خوبصورت اور صحت مند لڑکی کھڑی اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے مجھے گھور رہی تھی۔

اس نے سیاہ شلوار اور قمیص پہنی ہوئی تھی۔ اس کے پیروں میں چمڑے کی تلے دار جوتی تھی اور ہاتھ میں پستول، جس کا رخ میری طرف تھا۔ دیکھنے میں وہ ایک سیدھی سادی دیہاتی لڑکی نظر آتی تھی، لیکن اس کے بھنچے ہوئے ہونٹ اور آگ برساتی ہوئی آنکھیں اور انداز بتا رہے تھے کہ وہ ایک سیدھی سادی معمولی لڑکی نہیں ہے۔ پھر اس کے ہاتھ

میں تھامے ہوئے پستول نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی تھی۔ وہ قہر و غضب کا مجسمہ بنی ہوئی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ خوش جمال دوشیزہ اچانک کیسے اور کہاں سے نمودار ہو گئی۔ رضیہ اور لالی بھی اسے پریشان ہو کر دیکھ رہی تھیں۔ رضیہ میرے برابر والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی جبکہ لالی اس کے پہلو میں تھی۔ فوری طور پر پہلا خیال میرے ذہن میں یہ پیدا ہوا کہ تیزی سے گاڑی چلا کر وہاں سے بھاگ نکلوں، لیکن یہ اتنا آسان نہیں تھا کیونکہ اس کے پستول کی نالی اور میرے سر کے درمیان دو ڈھائی فٹ سے زیادہ فاصلہ نہ تھا اور اس کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر یہ اندازہ لگانا دشوار نہ تھا کہ وہ پستول کا استعمال بھی جانتی ہے اور نشانہ بھی لگا سکتی ہے۔ میرے گیئر بدلنے تک جتنی دیر لگتی اتنی دیر میں اس کے پستول سے نکلنے والی گولی میرے سر میں سوراخ کر سکتی تھی۔ بفرضِ محال اگر میں گاڑی بھگا کر لے جانے میں کامیاب ہو بھی جاتا۔ تب بھی اس کے پستول کی گولیاں لینڈ روور کے ٹائر پھاڑ سکتی تھیں جس کے بعد میرے فرار کا منصوبہ بالکل نامکمل ہو جاتا اور یہ خطرہ میں کسی بھی قیمت پر مول لینے کو تیار نہ تھا۔ اس لیے بہتری اسی میں تھی کہ اسے دھوکہ دیکر بھاگنے کا خیال ترک کر کے اس کا مقصد دریافت کیا جائے۔

لیکن میرے لب کھولنے سے پہلے اس نے پستول کی نالی سے اشارہ کرتے ہوئے مجھے گاڑی سے باہر نکلنے کا حکم دیا۔

میں نے پریشانی سے رضیہ اور لالی کو دیکھا، لیکن وہ مجھ سے بھی زیادہ بے بس اور لاچار تھیں اس لیے ان سے کسی قسم کی امداد کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ لڑکی کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ اور چڑھی ہوئی تیوری کے پیشِ نظر میں نے اس کی بات ماننے ہی میں عافیت جانی اور دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر کھڑا ہو گیا۔ میرے حرکت کرنے سے پیشتر ہی وہ چند قدم اور پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اسکی احتیاط پسندی اور ہوشیاری قابلِ تعریف تھی۔

"کون ہو تم؟" اس کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی: "کہاں سے آئے ہو اور کہاں جا رہے ہو؟"

میں نے حیران ہو کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور یہ جان کر اطمینان کا ایک لمبا سانس لیا کہ وہ کم از کم میری اصلیت سے واقف نہیں تھی اور نہ ہی مجھے فرار سے باز رکھنے کی غرض سے اس نے میرا راستہ روکا تھا۔ یعنی وہ محافظوں میں سے نہیں تھی نہ ہیرا کے ساتھیوں میں۔

"میں تو مسافر ہوں۔ اپنے گھر والوں کے ساتھ سفر کر رہا ہوں حویلی دیکھی تو پناہ اور آرام کے لیے ادھر چلا آیا۔ مگر یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔ اس لیے واپس اپنے راستے پر جا رہا ہوں۔" میں نے بھولے پن سے کہا۔

اس کی سیاہ چمکیلی آنکھیں میرے جسم پر جمی ہوئی تھیں، لیکن وہ گاہے گاہے آنکھوں کی پتلیوں کو حرکت دے کر میرے عقب میں گاڑی میں بیٹھی ہوئی رضیہ اور لالی کو بھی دیکھ لیتی تھی۔

"تم کون ہو؟" میں نے سوال کیا: "اور کیا چاہتی ہو؟"

اس کے چہرے پر اطمینان کے آثار نمودار ہو گئے۔ "تم ہیرا کے آدمی نہیں ہو؟" اس نے بے یقینی سے پوچھا۔

"بالکل نہیں۔"

"تو پھر گاڑی میں بیٹھ جاؤ اور جتنی تیزی سے گاڑی بھگا سکتے ہو بھگا کر یہاں سے بہت دور چلو۔" یہ کہتے ہوئے وہ اچھل کر خود بھی لینڈ روور میں سوار ہو گئی۔ میں اس کے طرزِ عمل پر حیران تھا، لیکن یہ اظہارِ حیرت کا موقع نہیں تھا۔ خود میرے لیے ایک ایک لمحہ قیمتی تھا اس لیے میں فوراً سٹیرنگ پر بیٹھ گیا اور مزید کوئی سوال پوچھے بغیر میں نے گاڑی کو موڑ کر کچی سڑک پر ڈال دیا۔ یہ وہی راستہ تھا جس سے ملک منصور یہاں تک پہنچا تھا اور اگرچہ میں اس راستے سے بالکل ناواقف تھا، لیکن یہ طے شدہ بات تھی کہ راستے پر چل کر ہم ہیرا ڈاکو کے ڈیرے سے دور ضرور نکل سکتے تھے۔ گاڑی کی رفتار تیز کرنا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ سڑک حالانکہ پختہ نہیں تھی پھر بھی پتھریلی اور ہموار تھی اور اس پر لینڈ روور کو دوڑانا مشکل نہیں تھا۔ میں نے ہر طرف سے بے پروا ہو کر اپنی ساری توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز کر دی۔ چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں

وہ ٹیلے انتہائی تیزی سے پیچھے کی جانب بھاگنے لگے اور ہر لمحے ہماری گاڑی اور ہیرا ڈاکو کے ڈیرے کے درمیان فاصلہ برق رفتاری سے بڑھنے لگا۔ گاڑی میں موجود تینوں خواتین بھی بالکل خاموش بیٹھی رہیں۔ اُن میں سے کسی نے لب کشائی کی کوشش نہیں کی۔ جو ایک انتہائی حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین بات تھی۔ کسی گاڑی میں تین عورتیں سوار ہوں اور ایک ڈیڑھ گھنٹہ تک ان میں سے کوئی ایک لفظ بھی نہ بولے، یہ ایک اَن ہونی بات تھی، لیکن شاید حالات اور واقعات کے سبب ان کو بھی مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

قریب قریب دو گھنٹے تک میں تیزی سے گاڑی دوڑاتا رہا۔ اس عرصے میں ہم نے مختلف قسم کے علاقوں کو طے کیا۔ کہیں پہاڑیاں تھیں، تو کسی جگہ درختوں کے جھنڈ تھے۔ کوئی علاقہ بالکل بنجر اور بے آب وگیاہ تھا۔ راہ میں کئی مقامات پر سڑک دو شاخوں میں بٹ جاتی تھی۔ دونوں سڑکیں ایک جیسی تھیں۔ ناپختہ اور پتھریلی۔ لگتا تھا کہ ان کچی سڑکوں پر موٹر گاڑیوں وغیرہ کی آمدورفت برائے نام ہی ہوتی تھی اور یہ اندازہ لگانا بھی مشکل تھا کہ ہم جن راستوں پر سفر کر رہے تھے۔ وہ ہمیں ہیرا کے علاقے سے دُور لے جا رہے تھے یا ہم پھر چکر کاٹ کر وہیں پہنچنے والے تھے۔ آس پاس کے مناظر قریب قریب یکساں تھے اور علاقہ میرے لیے قطعی نامانوس اور نیا تھا۔ اس لیے خود میرے لیے بھی راستے کے بارے میں کچھ جاننا ممکن نہیں تھا۔ ایک دوراہے پر پہنچ کر میں نے ایک دم بریک لگا دیئے اور پریشانی سے اپنے ہمسفروں کو دیکھا۔ گاڑی رُکی تو انھوں نے بھی سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھنا شروع کر دیا۔

پستول بردار لڑکی اب بالکل خاموش، سمٹی سمٹائی بیٹھی تھی اور پستول اُس نے اپنے زانو پر رکھ لیا تھا۔ میں نے اُسی جانب دیکھا اور سوال کیا "تم ان راستوں سے واقف ہو؟"

اُس نے زور سے سر ہلا کر انکار میں جواب دیا۔

"تو پھر اب کیا کریں؟ کس طرف جائیں؟" میں نے باآوازِ بلند سوال کیا مگر میرا مخاطب کوئی بھی نہ تھا۔

"تمہیں جانا کہاں ہے؟" اجنبی لڑکی نے تیز آواز میں سوال کیا جس سے بیزاری اور برہمی کا اظہار ہو رہا تھا۔

"بھئی ہمیں اس علاقے سے دُور کسی آبادی میں جانا ہے۔"

"تو پھر تمہیں روکا کس نے ہے۔ جس راستے سے یہاں آئے تھے اُسی راستے سے واپس چلو۔"

مجھے اچانک یاد آیا کہ میں نے اس لڑکی کو اپنے بارے میں غلط اطلاع دی تھی۔ وہ یہ توقع رکھنے میں حق بجانب تھی کہ میں ان راستوں سے بخوبی واقف ہوں۔

میں نے بات بنائی۔ "بھئی میں نے کہا تو ہے کہ میں راستہ بھول گیا ہوں ورنہ اس حویلی میں کیوں پہنچتا۔"

"تو پھر میری بات مانو۔" وہ بڑے اطمینان سے بولی۔

"کیا؟"

"جتنی تیزی سے گاڑی چلا سکتے ہو چلاتے رہو اور یہاں سے جتنی دور جا سکتے ہو چلے جاؤ۔ ورنہ اگر ہیرا کے آدمیوں کے ہتھے چڑھ گئے تو کہیں کے نہیں رہو گے۔"

تجویز نہایت معقول تھی اس لیے میں نے فوراً گاڑی کو وہیں بائیں جانب والی سڑک پر موڑ دیا اور ایکسی لیٹر پر میرے پیر کا دباؤ بڑھنے لگا۔ یہاں تک کہ لینڈ روور ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ اب پھر گاڑی کے اندر خاموشی چھا گئی۔ ہر درخت، میدان اور پہاڑیاں انتہائی تیزی سے پیچھے کی جانب بھاگنے لگیں اور اندر بیٹھے ہوئے لوگوں کے خیالات بھی اسی قدر تیزی سے نہ جانے کہاں کہاں بھٹکنے لگے۔

رفتہ رفتہ شام ڈھلنے لگی۔ جس رفتار سے میں نے لینڈ روور کو بھگایا تھا۔ اس کے مطابق ہیرا ڈاکو کے ڈیرے سے ہم کم از کم دو ڈھائی سو میل دُور پہنچ گئے تھے۔ یہ خیال آتے ہی میں بے ساختہ ہنس پڑا اور پھر بلند آواز سے

قہقہے لگانے شروع کر دیئے۔

گاڑی میں بیٹھی ہوئی عورتوں نے حیرت اور پریشانی سے مجھے دیکھا۔ بظاہر ہنسنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ البتہ [illegible] پریشانی سے عاری [illegible] بار بار زور زور سے قہقہے مار کر ہنسنا ان سب کے لیے حیران کن تھا۔ انھوں نے پہلے حیرت سے مجھے دیکھا اور جب میری ہنسی رُکنے کی بجائے اُس میں مزید اضافہ ہو گیا تو ان کے چہروں پر تشویش کے آثار نمودار ہونے لگے۔ شاید انھیں میری دماغی حالت کے بارے میں شبہ پیدا ہو گیا تھا۔

"کیا بات ہے؟" لڑکی نے [illegible] پوچھا۔ "تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟"

میں نے جواب میں اور زیادہ [illegible] شروع کر دیا۔ میری ہنسی اور قہقہے کسی طرح بند ہونے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

"بس کرو، چپ ہو جاؤ۔ ورنہ میں گولی مار دوں گی۔" لڑکی کے ضبط کا پیمانہ بھی غالباً لبریز ہو گیا تھا۔

میں نے ہنستی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھا مگر میرے قہقہوں کی شدت بدستور قائم تھی بلکہ اس میں بتدریج اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ بے تحاشا ہنستے ہنستے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے اور سامنے کا منظر دھندلا سا گیا تھا۔ میں نے [illegible] گاڑی کو ایک طرف درختوں کے جھنڈ کی طرف موڑا اور بریک لگا دیا۔ گاڑی رُکتے ہی میں [illegible] ہنسی کو روکنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں خود حیران تھا کہ یک لخت اس قدر ہنسنے کا [illegible] کیا تھا۔ لیکن [illegible] گزشتہ دنوں کے مسلسل اعصابی تناؤ اور کشیدگی کے بعد قدرے اطمینان اور سکون ملا تو میں اپنے اعصاب پر قابو پانے میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ بہرحال رفتہ رفتہ میرے قہقہوں میں کمی واقع ہونے لگی یہاں تک کہ وہ بالکل بند ہو گئے۔

میں گاڑی کے بونٹ پر [illegible] بیٹھ گیا اور اپنے بکھرے ہوئے اعصاب کو یکجا کرنے کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔ تینوں عورتیں کچھ دیر تو خاموشی سے گاڑی میں بیٹھی رہیں۔ پھر وہ بھی گاڑی سے نکل کر باہر آ گئیں۔ سب سے پہلے رضیہ گاڑی سے نکلی اور تشویش بھری نظروں سے مجھے دیکھتی ہوئی میرے نزدیک آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے بعد لالی [illegible] آ گئی۔ سب سے آخر میں اجنبی لڑکی نے گاڑی سے قدم باہر نکالا۔ پستول اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا لیکن [illegible] نال کا رخ زمین کی طرف تھا اور وہ بظاہر اس کی موجودگی سے بھی بے خبر معلوم ہو رہی تھی۔

"کیا بات ہے؟" رضیہ نے نرمی سے پوچھا۔ "طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"فکر نہ کرو۔" میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "میں بالکل ٹھیک ہوں۔ دراصل خود اپنے آپ پر بے ساختہ ہنسی آ گئی تھی۔"

لالی کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر کھڑی تھی۔ "میاں جی۔ یہ ہنسی کی کوئی بات بھی تو ہو۔ میں نے تو آپ کو پہلی مرتبہ ہنستے ہوئے دیکھا ہے اور وہ بھی چھپر پھاڑ کر۔"

اجنبی لڑکی نے کوئی سوال نہیں کیا، لیکن اس کی بڑی بڑی سیاہ چمکیلی آنکھیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"پریشانی میں کبھی کبھی انسان عجیب عجیب حرکتیں کر بیٹھتا ہے۔" میں نے وضاحت کی۔ "ہیرا ڈاکو کا ڈیرہ سامنے جنگل [illegible] تو پھیلا ہوا نہیں ہے۔ ہم زیادہ سے زیادہ آدھ گھنٹے بعد اس کے علاقے سے باہر نکل گئے ہوں گے لیکن اس کے باوجود ہم مسلسل تیزی سے گاڑی بھگاتے رہے جیسے وہ ہمارے تعاقب میں آ رہا ہو۔ دراصل انجانا خوف اور ذہنی دباؤ غیر ارادی طور پر ہمارے کاموں پر اثر ڈالتا ہے اور ہمیں اس بات کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ ہم کیا کر رہے ہیں اور کیوں کر رہے ہیں؟"

تینوں عورتیں خاموشی سے میرا چہرہ تک رہی تھیں۔ میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ تھوڑی دیر بعد رات ہونے والی

وہ یک ٹک مجھے دیکھتا رہا۔ پھر مسکرایا اور بولا۔ "ناچ گانا تمہارا پیشہ ہے۔ پھر انکار کیسا؟"

میں نے جواب دیا "تمہارے ساتھیوں نے ہمارا روپیہ، زیور اور دوسرا سب کچھ چھین لیا ہے۔ ناچ گانا تو میں [illegible] ہوں جو کوئی مال دے کر نہیں [illegible] روزی [illegible]۔"

میری بات سن کر ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ میری نائیکہ اور سازندوں کی تو جان ہی نکل گئی۔ وہ ڈر اور خوف سے تھر تھر کانپنے لگے۔ وہ تو سمجھ رہے تھے کہ ہیرا ڈاکو مہربان ہو گیا تو ہمیں واپس جانے کی اجازت مل جائے گی مگر [illegible] کر دو ہم سب کا کیا حشر کرے گا؟ یہ سوچ کر ان کی روح فنا ہو گئی۔

ہیرا کو جیسے خود بھی اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ [illegible] نائیکہ ہمت کر کے آگے بڑھی اور اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بولی "سرکار۔ اسے معاف کر دیجیے۔ یہ نادان ہے۔ [illegible] نہیں سمجھتی کہ آپ کی کیا ہستی ہے۔ اس کی طرف سے میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑ کر منت کرتی ہوں۔ میں اسے سمجھا بجھا کر راضی کر لوں گی۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔" اس کے بعد وہ غصے سے میری طرف پلٹی اور بولی "[illegible] تو کیا پاگل ہو گئی ہے؟ جانتی ہے سامنے کون کھڑا ہے؟ کچھ سوچ سمجھ کر بولا کر۔ [illegible] ہمارا تو دھندا ہی ناچ گانا ہے۔ ان کے سامنے بھلا کیوں [illegible]"

ہیرا ڈاکو ابھی تک چپ چاپ کھڑا مجھے تک رہا تھا۔ ایک دم [illegible] پھر اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا "ان لوگوں کا مال [illegible] واپس [illegible] ہمارے سامنے لا کر رکھ دیں۔"

"[illegible] تمہارا سارا مال اسی کے اندر ہے یا [illegible] مجھے شادی کے کوٹھے انعام ملنے والا سارا زیور اور روپیہ ان پوٹلیوں [illegible]"

"جگ جگ جیو میرے سرکار۔ اللہ بھاگ لگائے آپ کو۔ آپ جیسے شریف [illegible] کوئی بھی ہو تو آپ جیسا ہو۔" نائیکہ ہیرا کی خوشامد میں مصروف ہو گئی۔ پھر [illegible] اور ان کا شکریہ ادا کر۔ انہوں نے تو ہمیں خرید لیا ہے۔ بس جھٹ پٹ تیار ہو جا مجرے کے لیے۔"

میرا مغز [illegible] پھر گیا تھا۔ میں نے غصے سے نائیکہ کو اور پھر ہیرا کو دیکھا اور بولی "[illegible] دیکھنا ہو وہ پہلے میرے کوٹھے پر آئے۔ میں کوئی گری پڑی طوائف نہیں ہوں کہ [illegible] ہاتھ بڑھا کر [illegible] لے۔"

میں نے کہا "یہ تو تم نے بڑی جرأت کی۔ پھر کیا ہوا؟"

وہ کہانی سناتے ہوئے بولی۔

"ہیرا کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں اس کی شان میں ایسی گستاخی کروں گی بلکہ کبھی اس کے سامنے کسی نے ایسی باتیں کہنے کی ہمت ہی نہیں کی ہو گی۔ وہ انکار اور ہٹ دھرمی کا عادی نہیں تھا۔ اس کے دوسرے ساتھی بھی بل کھا کر رہ گئے۔ پر ہیرا نے میری بات کا زیادہ برا نہیں منایا۔ کہنے لگا "راجی بائی۔ تم فکر نہ کرو۔ جتنا مال تم شادی کے گھر سے سمیٹ کر لائی ہو اس سے زیادہ میں تمہیں دوں گا۔ تمہیں مالا مال کر دوں گا۔ پھر زندگی بھر تمہیں کسی کے سامنے ناچنے گانے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ تم جانتی نہیں ہو۔ ہیرا ڈاکو جب کسی پر مہربان ہو جائے تو اس کے دن پھر جاتے ہیں۔" پھر وہ اپنے نائب سے کہنے لگا "بالم۔ آج رات بڑے دھوم دھام کی دعوت کا بندوبست کرو۔ ایسا جشن پہلے کبھی نہیں ہوا ہو گا اس جنگل میں۔ آج تو بس جنگل میں منگل ہو جائے۔"

سازندے ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے کھڑے ہو گئے اور اس کی جتنی تعریفیں ہو سکتی تھیں، بیان کرنے لگے۔ وہ بولا۔

"اطمینان رکھو۔ تم سب کو بھی میں اتنا انعام دوں گا کہ ساری زندگی یاد رکھو گے۔"

وہ اس کی جان و مال کو دعائیں دینے لگے۔

نائیکہ نے اس کی بلائیں لیں اور پھر میرے پاس آ کر کہنے لگی "راجی۔ ایسے قدردان روز روز نہیں ملتے۔ بس سمجھ تیرے دن پھر گئے۔ تقدیر تجھ پر اور ہم سب پر مہربان ہو گئی ہے۔"

مجھ پر نہ جانے کیوں بھوت سوار ہو گیا تھا۔ اتنا کچھ سننے کے بعد بھی میرے دماغ کی خرابی دور نہیں ہوئی۔ میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا "دیکھو ماں جی۔ اگر یہ تمہارا ناچ دیکھنا چاہتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ تم خوب جی بھر کر ناچو۔ گاؤ۔ ان کا دل بہلاؤ۔"

"مگر جب میں نے کہہ دیا ہے کہ میں مجرا نہیں کروں گی تو بس نہیں کروں گی۔ چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے۔ جسے ضرورت پڑی ہے وہ میرا مجرا دیکھنے کے لیے میرے کوٹھے پر آ جائے۔"

یہ کہہ کر میں سب کی طرف سے منہ موڑ کر کھڑی ہو گئی۔ نائیکہ نے یہ بات سنی تو اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ ادھر سازندے طوطوں کی طرح رٹا رٹایا خوشامد اور تعریف کا سبق دوہرا رہے تھے۔ ان کی بھی بولتی بند ہو گئی۔ ہیرا ڈاکو کی طرف میری پیٹھ تھی اس لیے مجھے معلوم نہیں کہ اس پر کیا بیتی۔ مگر اس کا نائب بالم تلملاتا ہوا میرے سامنے آن کھڑا ہوا اور گرج کر بولا "دو پیسے کی چھوکری۔ ٹکے ٹکے پر ناچنے والی، روپے کی جھنکار پر جسم بیچنے والی عورت تو اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہے؟ میں تیری زبان گدی سے کھینچ لوں گا۔ تیرا نام و نشان باقی نہیں رہنے دوں گا۔" پھر وہ ہیرا کے سامنے جا کر بولا "سردار۔ مہربانی اور پیار کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ اس زبان دراز اور بدتمیز لڑکی کے سامنے ہم سب کو کیوں ذلیل کرتے ہو۔ بڑے بڑے لوگ تمہارے سامنے زبان کھولتے ہوئے تھرتھراتے ہیں۔ تمہارے ایک اشارے پر ہر کوئی سر جھکانے کو تیار ہے۔ اور یہ ہے کہ سر پر چڑھتی جاتی ہے۔ یہ اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہے آخر؟ اشارہ کرو تو اسے چھٹی کا دودھ یاد دلا دوں۔ ایسا سبق سکھاؤں کہ ساری زندگی یاد رکھے۔ ساری دنیا کو اس کا ننگا ناچ دکھاؤں۔ اس کی بوٹیاں چیل کوؤں کو کھلاؤں؟"

خوف کی ایک لہر سر سے پیر تک میرے جسم میں دوڑ گئی۔ میں خود نہیں جانتی تھی کہ آخر میری کھوپڑی کیوں الٹ گئی تھی۔ میں نے زندگی بھر دوسروں کی خواہشات اور حکم کے سامنے سر جھکایا تھا۔ کبھی کسی کے سامنے سرتابی کی جرأت نہیں کی تھی۔ پھر کیا وجہ تھی کہ ہیرا ڈاکو کی ہر بات کے جواب میں انکار کر رہی تھی۔ بالم کی زبان سے اتنی بڑی دھمکیاں سن کر بھی نہ جانے کیوں میری ضد نہیں ختم ہوئی بلکہ میرا ارادہ اور زیادہ مضبوط ہو گیا۔ میں نے کبھی معمولی سے معمولی شخص کے آگے بھی زبان نہیں کھولی تھی مگر اس روز خدا جانے میرے اندر اتنا جوش اور غصہ کس طرح بھر گیا تھا۔ مجھے کسی بات کی بھی پروا نہیں تھی۔ میں نے غصے میں بالم کو گھورا اور کہا "اتنے بڑھ بڑھ کر بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں دو پیسے کی طوائف ہوں، ناچنے والی آوارہ عورت ہوں، دو دو ٹکے پر جسم بیچتی ہوں۔ اس لیے ذلیل ہوں۔ مگر تم خود کون سے شریف اور بڑے خاندان والے ہو؟ نہ جانے کس خاندان سے تعلق رکھتے ہو۔ دھوبی ہو۔ نائی ہو۔ گھسیارے ہو؟ یا مراثی ہو۔ تمہارے اندر کون سی تعریف ہے سوائے اس کے کہ کمزوروں کو لوٹتے ہو۔ ان کا سامان چھین لیتے ہو۔ بے گناہوں کو جان سے مار دیتے ہو۔ اور اسے اپنی بہادری سمجھتے ہو۔ میں کم از کم تم سے تو اچھی ہوں۔ محنت کر کے کماتی ہوں۔ لوٹ مار اور قتل و غارت نہیں کرتی۔ بھرے پرے گھروں کو نہیں اجاڑتی بلکہ لوگوں کا دل بہلاتی ہوں۔ پھر تم کس برتے پر مجھے کمتر سمجھتے ہو؟ اگر کوئی زبردست مل گیا یا پولیس کے گھیرے میں آ گئے تو ساری بہادری اور اکڑ فوں دھری کی دھری رہ جائے گی اور کتے کی موت مارے جاؤ گے۔ کوئی تمہاری موت پر آنسو بہانے والا بھی نہیں ہو گا۔ یا پھر پکڑے جاؤ گے تو پھانسی کا پھندہ گلے میں ڈال کر مرو گے۔ تم چاہے کچھ بھی کر لو۔ مگر میری طرف سے کان کھول کر سن لو۔ میں تم سے اور تمہارے

سردار سے ڈرنے والی نہیں ہوں۔ اگر یہ ڈاکو ہے تو میں طوائف ہوں۔ اگر سینکڑوں لوگ ان سے ڈرتے ہیں تو ہزاروں مجھ پر بھی مرتے ہیں۔ میں ان سے اور تم سے ہار ماننے والی نہیں ہوں۔"

ہیرا ڈاکو ابھی تک چپ چاپ کھڑا تھا۔ میں نے اس کی طرف نگاہ اُٹھائی تو دیکھا کہ وہ غصے سے آگ بگولہ ہو رہا تھا۔ ایسی بے عزتی اور اتنی توہین تو کبھی اُس کی کسی نے نہیں کی ہوگی اور وہ بھی اس کے ساتھیوں کی آنکھوں کے سامنے۔ وہ گرج کر بولا۔ "دیکھ لوں گا تیری تڑپاہٹ۔ لے جاؤ اسے لے جا کر بند کردو۔ یہ مال و زیور اُٹھا کر واپس رکھ دو ان مجروں کو اور اس بڑھیا کو دھکے دے کر نکال دو۔" وہ غصے میں تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا میرے سامنے آیا اور کہنے لگا۔ "راجی، تو نے ہیرا ڈاکو کا غصہ نہیں دیکھا۔ اس کی ہٹ نہیں دیکھی۔ اب جب تک تو خود میرے آگے ہاتھ نہیں جوڑے گی میں تیرا مجرا نہیں دیکھوں گا اور مجھے معلوم ہے کہ وہ دن بہت جلدی آ جائے گا۔" یہ کہکر وہ آگ کے گولے کی طرح باہر نکل گیا۔ نائکہ اور سازندوں نے رونا شروع کر دیا مگر ڈاکوؤں نے انھیں دھکیل کر باہر نکال دیا اور خدا جانے کس طرح انھیں واپس چھوڑ آئے۔ ظالم نے میری کلائی پکڑ کر جھٹکا دیا اور گھسیٹتا ہوا باہر لے چلا۔ اُس حویلی سے مجھے کھینچتا ہوا وہ دوسری حویلی میں لے گیا جہاں تم مجھے ملے تھے۔ حویلی کے نیچے والے تہہ خانے میں مجھے پھینک کر وہ تن تناتا ہوا چلا گیا۔ اس بات کو پندرہ دن گزر چکے ہیں۔"

اتنی لمبی داستان سنانے کے بعد وہ سستانے کے لیے گاڑی کے مڈگارڈ پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔ رضیہ اور لالی بھی بڑی دلچسپی سے یہ قصہ سن رہی تھیں۔ لالی کی آنکھیں حیرانی سے پھٹی ہوئی تھیں۔ وہ راجی کو یوں تک رہی تھی جیسے وہ کوئی عجائب مخلوق ہو۔ جب اُس سے رہا نہ گیا تو وہ بے تاب ہو کر راجی کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ میں خاموشی سے راجی کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ وہ ایک دراز قامت پُرکشش اور بھرپور عورت تھی بلکہ اسے عورت کہنا بھی درست نہیں تھا۔ اس کی عمر بیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کے جسم میں لوچ تھا۔ حالانکہ اس کا تندرست جسم قدرے موٹاپے کی طرف مائل تھا۔ لیکن لمبے قد اور متناسب اعضا کی بنا پر وہ موٹی نہیں لگتی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس نے جو کہانی سنائی ہے اس میں سچ کتنا ہے اور جھوٹ کی ملاوٹ کتنی ہے۔

لالی بڑی حیرت اور عقیدت سے آنکھیں پھاڑ کر اُسے دیکھ رہی تھی۔ آخر خاموش نہ رہ سکی اور پوچھنے لگی: "یہ بتاؤ کہ ان ظالموں نے تم پر ظلم تو نہیں کیا؟"

"بالکل نہیں۔" راجی مسکرا کر بولی۔ "مجھے وہاں کسی قسم کی تکلیف نہیں تھی۔ دونوں وقت کھانا اور صبح کے وقت ناشتہ مل جاتا تھا۔ لیکن میرے لیے سب سے بڑی مصیبت تنہائی تھی۔ اس حویلی میں دور دور تک کوئی انسان نظر نہیں آتا تھا مگر مجھے گھومنے پھرنے کی پوری آزادی تھی۔ شاید وہ سمجھتے تھے کہ میں وہاں سے نکل کر بھاگنے کی غلطی اور ہمت نہیں کروں گی۔ اس لیے وہ بہت مطمئن تھے۔ کسی انسان کی شکل مجھے اس وقت نظر آتی تھی جب کوئی میرے لیے کھانا اور ناشتہ لے کر آتا تھا۔ قید کے دوسرے ہی دن میرے پہننے کے لیے کپڑے بھی آ گئے۔ میں جب چاہتی حویلی کے اندر ہی گھوما کرتی اور کبھی کبھی آس پاس کے جنگل میں بھی چلی جاتی۔ ظالموں نے مجھے قید تنہائی کی سزا دی تھی۔"

میں نے سوال کیا۔ "مگر تمہارے پاس یہ پستول کہاں سے آ گیا تھا؟"

وہ بڑے ناز سے مسکرائی اور کہنے لگی: "ہمارا تو کام ہی ناز و انداز دکھانا اور مردوں کو بیوقوف بنانا ہے۔ جو ڈاکو مجھے کھانا ناشتہ لے کر آتا تھا اُسے میں نے باتوں میں لگا کر رام کر لیا اور وہ میرے پیار کا دم بھرنے لگا۔ وہ تو میری خاطر جان دینے کو بھی تیار تھا۔ کہتا تھا کسی دن موقع ملا تو مجھے لے کر بھاگ جائے گا۔ میں نے ایک دن اس سے کہا کہ مجھے اتنی بڑی حویلی اور ویران جنگل میں اکیلے ڈر لگتا ہے۔ کہنے لگا کس کی مجال ہے کہ ادھر آئے۔ یہ

ہیرا ڈاکو کا ڈیرا ہے۔ اس کا نام سنکر ہی بڑے بڑوں کا دم نکل جاتا ہے۔ میں نے لگاوٹ سے کہا۔ "انسانوں نے تو تمہارے سردار کا نام سن رکھا ہے مگر کیا جانوروں اور درندوں پر بھی اس کا رُعب ہے؟ ابھی کل ہی میں نے ایک بہت موٹا سا کالا سانپ کمرے میں دیکھا تھا۔ یہاں تو کوئی ایسا آدمی بھی نہیں ہے کہ سانپ کو مار دے یا کوئی جنگلی جانور آ جائے تو اُسے بھگا دے۔ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو تم کیا کرو گے؟"

وہ ایک منٹ میں پگھل کر موم ہو گیا۔ تھوڑی دیر سوچتا رہا اور پھر کمر سے پستول نکال کر میرے حوالے کیا اور کہنے لگا: "اسے بہت حفاظت سے چھپا کر رکھنا۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو میری اور تمہاری دونوں کی خیر نہیں ہوگی۔" میں نے پستول کو اپنے بستر کے اندر چھپا کر رکھا تھا۔ مجھے کچھ پتہ نہیں کہ تم لوگ اُس حویلی میں کب آئے تھے اور کون تمہیں لے کر آیا تھا۔ صبح میرا دل گھبرایا تو آس پاس جنگل میں سیر کرنے چلی گئی تھی۔ واپس آئی تو تمہیں اس گاڑی میں سوار ہوتے ہوئے دیکھا۔ سوچا کہ اگر تمہیں پستول دکھا کر ڈرا لیا تو تم لوگوں کے ساتھ میں بھی یہاں سے نکل جاؤں گی۔"

راجی کی داستان خاصی دلچسپ اور حیرت انگیز تھی لیکن اس کی سچائی میں بھی کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس نے جس بے ساختگی اور سادگی سے دریافت کئے بغیر اپنے بارے میں تمام تفصیلات بیان کر دی تھیں وہ بذاتِ خود اس کی صداقت کا ثبوت تھا۔ وہ اگرچہ خود کو ایک پیشہ ور طوائف بتا چکی تھی لیکن اس کے باوجود بظاہر اس میں بناوٹ اور پیشے بازاری پن کی کوئی علامت موجود نہیں تھی۔ رضیہ اور لالی جو اس کی داستان کو انتہائی شوق اور انہماک سے سن رہی تھیں اب اسے قدرے احترام اور ستائش کی نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ ظاہر ہے ایک تن تنہا اکیلی عورت جو ہیرا ڈاکو کے ڈیرے میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کی مخالفت کرنے کی جرأت کر سکتی ہے، وہ کوئی معمولی عورت نہیں ہو سکتی اور خاص طور پر ایسی حالت میں جب کہ وہ ایک نازک نسائی عورت تھی اور اپنے دفاع کے لیے اس کے پاس حسن کی اداؤں کے سوا اور کوئی ہتھیار بھی نہیں تھا۔

میں نے اس بار ذرا غور سے راجی کا جائزہ لیا۔ وہ ایک کشیدہ قامت اور متناسب جسم کی عورت تھی۔ کھلتے ہوئے گندمی رنگ کے ساتھ اس کے چہرے کے نقوش میں ایک تیکھا پن اور دلکشی بھی تھی۔ اس کی آواز میں سُریلا پن تو نہیں تھا مگر پھر بھی ایک جاذبیت ضرور تھی جو سننے والے کے جذبات کو اُکسانے کا موجب تھی۔ لیکن اس کے سراپا میں سب سے زیادہ تیکھی اور نمایاں چیز اس کی آنکھیں تھیں جو دوسروں کو مسحور کرنے اور ان سے اپنی بات منوانے کی قوت سے معمور تھیں۔ ساتھ ہی اس کے چہرے پر بے خوفی اور بے پروائی کے تاثرات بھی نمایاں تھے۔

میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ رات ہونے میں زیادہ وقت نہیں تھا اور بہتر یہی تھا کہ ہم اندھیرا ہونے سے پہلے شب بسری کے لیے کوئی ٹھکانہ تلاش کر لیتے۔ اس لیے میں نے ان تینوں کو دوبارہ گاڑی میں سوار ہونے کی ہدایت کی اور ہمارا سفر ایک بار پھر شروع ہو گیا۔ اجنبیت کی دیوار اگرچہ باقی نہیں رہی تھی پھر بھی ان تینوں کے درمیان قربت اور اپنائیت پیدا نہیں ہو سکی تھی۔

"راجی!" میں نے گاڑی کی رفتار تیز کرتے ہوئے پوچھا: "تم نے خود ہی بتایا ہے کہ تم کو ابتدا ہی سے دوسروں کا حکم ماننے کی تربیت دی گئی ہے۔ اس کے باوجود تم نے ہیرا ڈاکو جیسے خونخوار اور خوفناک شخص کی بار بار حکم عدولی کیوں کی؟ کیا تمہیں اندازہ نہیں تھا کہ وہ ظلم و تشدد اور زبردستی سے بھی تم سے اپنی بات منوانے پر قادر ہے؟"

وہ مسکرائی اور کہنے لگی: "پتہ نہیں کیوں مجھے بھی ضد ہو گئی تھی کہ اس کی بات نہیں مانوں گی۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کی آنکھوں نے مجھے یہ پیغام دیا تھا کہ ہیرا ڈاکو میری زلفوں کا اسیر ہو چکا ہے اور اگر وہ چاہے بھی تو مجھ پر ظلم نہیں کر سکتا۔ میں نے آپ کو بتایا نا کہ ہم لوگ مردوں کی نظریں پہچانتے ہیں۔"

میں نے داد کی نگاہوں سے اس کو دیکھا۔ اُس نے کسی سکول یا کالج میں انسانی نفسیات کے بارے میں علوم کی تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ اس کے باوجود وہ انسانی نفسیات کے گُرّوں سے بخوبی واقف تھی بلکہ ان میں مہارت رکھتی تھی۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ خود اعتمادی کی دولت سے مالا مال تھی۔ ایک اکھڑ اور بے پروا سی لڑکی کی یہ صلاحیت خداداد تھی۔

میں خاموشی سے سوچتا رہا اور گاڑی چلاتا رہا۔ میرا ذہن میرا ڈاکو کے ڈیرے کی طرف چلا گیا۔ ملک منصور کی میرا سے ملاقات میں کیا واقعات رونما ہوئے ہوں گے اور ان انکشافات پر ملک منصور کا کیا ردِّعمل ہوا ہوگا اور اب وہ آئندہ کیا اقدام اُٹھائے گا؟ یہ سب باتیں قابلِ غور اور فکرمندی کا سبب تھیں۔ لیکن فی الحال اس بارے میں کچھ سوچنا اس لیے بیکار تھا کہ میں ان کا کوئی تدارک نہیں کر سکتا تھا۔ بلکہ مجھے تو یہ بھی علم نہیں تھا کہ ملک منصور پر ان کا ردِّعمل کیا ہوا ہوگا! پھر یوں بھی گزشتہ ہفتوں میں مجھے وقتی طور پر اچانک رونما ہونے والے واقعات سے عہدہ برآ ہونے کا تجربہ بھی ہو چکا تھا۔ اس لیے مجھے پہلے سے کسی قسم کی منصوبہ بندی کی نہ عادت رہی تھی اور نہ ہی موجودہ حالات میں اس کی ضرورت تھی۔

تقریباً پندرہ بیس میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد دائیں جانب پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہم جس علاقے میں سفر کر رہے تھے یہ مجموعی طور پر ایک کوہستانی علاقہ تھا۔ ان پہاڑیوں میں غاروں کھنڈروں یا رات گزارنے کے لیے مناسب مقامات کے ملنے کا زیادہ امکان تھا۔ اس لیے میں نے گاڑی کی رفتار قدرے ہلکی کر لی۔

اچانک فضا ایک خاص قسم کی بھن بھناہٹ سے مرتعش ہو گئی۔ میں نے گاڑی کی رفتار مزید کم کر کے پوری توجہ سے آواز پر کان لگا دیئے۔ یہ کسی ہیلی کاپٹر کی آواز معلوم ہوتی تھی۔ میرے اندازے کی تصدیق چند لمحے بعد ہی ہو گئی۔ ایک چھوٹا ہیلی کاپٹر فضا میں نمودار ہوا۔ اس کی رفتار زیادہ نہیں تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ہیلی کاپٹر میں سوار لوگوں کو سفر طے کرنے کی کوئی جلدی نہیں ہے بلکہ وہ کسی کھوج میں ہیں مگر یہ ہیلی کاپٹر کہاں سے آیا تھا اور اس میں کون لوگ موجود تھے؟ یہ سوال میرے لیے خاصا تشویشناک تھا۔

ہیلی کاپٹر

ہم سے کافی فاصلے پر تھا اور جنگلوں گھنے درختوں سے ڈھکے ہوئے کچے راستے پر رواں دواں لینڈ روور ابھی تک ان لوگوں کی نظروں سے محفوظ ہی رہی ہو گی اس لیے میں نے بلا تاخیر گاڑی کا رُخ اونچے اونچے درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف موڑ دیا اور اُن کی چھاؤں میں پہنچ کر گاڑی کا انجن بند کر دیا۔ وہ تینوں مجھے تشویش اور پریشانی سے دیکھ رہی تھیں اور ظاہر ہے کہ میری طرح وہ بھی یہ جاننے سے قاصر تھیں کہ اس ہیلی کاپٹر میں کون لوگ سوار ہیں اور ان کا مقصد کیا ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ صنفِ نازک سے تعلق رکھنے کے باوجود وہ تینوں اپنی جرأت اور مہم پسندی کی خصوصیات کے پیشِ نظر بہت سے مردوں سے بھی زیادہ دل والی اور قابلِ اعتماد تھیں۔ اس کے باوجود میری طرح وہ بھی بلاوجہ کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتی تھیں۔

کچھ دیر بالکل خاموشی رہی اور ہیلی کاپٹر کی آواز سے ہمیں اندازہ ہوتا رہا کہ رفتہ رفتہ وہ ہمارے نزدیک آ رہا ہے لیکن مجھے یہ اطمینان تھا کہ ہماری لینڈ روور اُن لوگوں کی نگاہوں سے بالکل محفوظ تھی۔

میرے لیے قابلِ غور بات یہ تھی کہ اس غیر آباد اور ویران علاقے میں اچانک یہ ہیلی کاپٹر کہاں سے آ گیا اور اس میں کون لوگ سوار ہیں؟ پل بھر میں بے شمار وسوسے اور خطرے میرے ذہن میں گھوم گئے۔ یہ ہیلی کاپٹر پولیس کا بھی ہو سکتا تھا۔ جسے میری تلاش اور جستجو تھی۔ یا پھر چوہدری یا ملک منصور کے کارندے بھی ہماری کھوج میں لگے ہوئے تھے۔ ہو سکتا ہے انھوں نے ہماری گرفتاری کے لیے یہ ہیلی کاپٹر بھیجا ہو؟ ان کے علاوہ خود میرا

جانی دشمن اور ہشتل لوٹی بھی میری کھوج میں لگا ہوا تھا اور یوں اچانک میرا اس کی نظروں سے اوجھل ہو جانا اس کے لیے خطرے کا سبب بن سکتا تھا۔ وہ بڑے اطمینان سے مجھے بے گھر اور بے آسرا کرنے کے بعد میری ہر چیز پر قبضہ جمائے بیٹھا تھا لیکن جب تک میں مجرم سمجھ کر گرفتار نہ کر لیا جاؤں یا ہلاک نہ ہو جاؤں وہ اطمینان اور سکون سے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ میرا کانٹا ہمیشہ کے لیے صاف کر دیا جائے۔ وہ ایک بااثر اور بااختیار مجرم تھا۔ جس کے ہاتھ بہت لمبے تھے۔ میری تلاش میں اپنے کارندے روانہ کرنا اس کی مقصد براری کے لیے ضروری تھا۔ اس کے علاوہ اور لوگ بھی میرے خون کے پیاسے اور جان کے دشمن تھے حالانکہ میں نے اُن کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ مگر حالات نے اُنھیں میرا مخالف بنا دیا تھا۔ ان میں سے ایک تو لوٹی کے مخالف جرائم پیشہ لوگوں کا گروہ تھا جو مجھے لوٹی سمجھ کر میری گھات میں تھے اور میرے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ پھر بیسہ گروہ لوٹی کے پرانے دوستوں اور ساتھیوں پر بھی مشتمل تھا جن کے نزدیک لوٹی نے (یعنی میں نے) انھیں دھوکا دیا تھا اور ایک بہت بڑی رقم ہضم کئے بیٹھا تھا۔ وہ اپنا حصہ وصول کرنے کے لیے مجھے لوٹی سمجھ کر میرے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ اُن کے علاوہ میڈم ایکس کا گینگ بھی لوٹی سمجھ کر مجھے اپنے جال میں پھانسنے کے لیے کوشاں تھا یہ تمام سب خود بہت بڑی ستم ظریفی تھی کہ نہ چاہنے کے باوجود میں کئی جرائم پیشہ لوگوں کے گروہوں کا ہدف بن گیا تھا اور فی الحال ہزار کوشش کے باوجود اُن کے چنگل سے آزاد ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ حالانکہ میں بالکل بے گناہ تھا۔

میرا ذہن تیزی سے مختلف امکانات کا جائزہ لیتا رہا۔ اس اثنا میں ہیلی کاپٹر ہمارے سروں پر سے گزرتا ہوا مخالف سمت چلا گیا اور اس کی آواز کم ہوتے ہوتے بالکل غائب ہو گئی۔ ایک بار پھر جنگل میں سناٹا چھا گیا تھا اور صرف اُن پرندوں کی چہچہاہٹ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں جو بسیرا لینے کے لیے درختوں کی جانب آ رہے تھے۔

سب سے پہلے رضیہ نے زبان کھولی اور پوچھنے لگی: "یہ ہیلی کاپٹر کس لیے آیا تھا؟"

لالی نے سادگی سے کہا: "ہمیں ڈھونڈنے آیا ہو گا۔"

راجی سے بھی خاموش نہیں رہا گیا۔ کہنے لگی: "کہیں یہ میرا ڈاکو نے تو نہیں بھیجا تھا؟"

میں نے خاموشی سے لینڈ روور سٹارٹ کر دی اور دوبارہ کچی سڑک پر سفر شروع کر دیا۔ میری نگاہیں کوئی ایسی جگہ تلاش کر رہی تھیں جہاں ہم لوگ محفوظ طریقے پر رات گزار سکیں۔ رات کی تاریکی پھیلنے میں زیادہ دیر باقی نہیں رہ گئی تھی اور ابھی تک میں یہ بھی نہیں اندازہ لگا سکا تھا کہ ہم جس سڑک پر سفر کر رہے ہیں وہ ہمیں اپنے دشمنوں سے دُور لے جا رہی ہے یا قریب تر! یہ میرے لیے قطعی نیا اور اجنبی علاقہ تھا جہاں سمتوں کا اندازہ لگانا بہت دشوار تھا۔ خاص طور پر ایسی صورت میں جب کہ ہم کچے اور ٹیڑھے میڑھے راستوں پر سفر کر رہے تھے اور بار بار جنگل میں اپنا رُخ بدلتے رہے تھے۔ اگر وہ ہیلی کاپٹر ہماری تلاش میں تھا تو کچھ دیر کے بعد اس کا واپس آنا خارج از امکان نہیں تھا کیونکہ کچھ دیر بعد رات کے اندھیرے میں ان لوگوں کے لیے کچھ دیکھنا ممکن نہ ہوتا۔ اس لیے مناسب یہی تھا کہ میں درختوں کی آڑ میں کسی ایسے مقام تک پہنچ جاؤں جہاں اطمینان سے رات گزاری جا سکے اور ہماری گاڑی دیکھنے تلاش کرنے والوں کی نگاہوں سے بھی اوجھل رہے۔

راجی سے نہ رہا گیا "بولتے کیوں نہیں آخر؟" راجی نے مجھے ٹھوکا دیا۔

"کیا بولوں؟" میں نے تنگ آ کر جواب دیا: "بھئی میں کوئی نجومی تو ہوں نہیں۔ تمہاری طرح میں بھی صرف اندازہ ہی لگا سکتا ہوں۔"

"تو پھر کیا اندازہ لگایا تم نے؟" رضیہ نے بے تابی سے پوچھا۔
میں بے اختیار ہنس پڑا۔ "بتا دوں؟"
"ہاں ہاں۔ بتائیں نا!" ان تینوں نے پُر زور آواز میں سوال کیا۔
"تو پھر سنو" میں نے بڑے اطمینان سے گاڑی کی رفتار ہلکی کرتے ہوئے کہا۔ "میرا اندازہ یہ ہے کہ یہ ہیلی کاپٹر یا تو ہمارے دشمنوں کا تھا یا پھر اس میں کوئی اور لوگ ہوں گے جو اپنے کام سے جا رہے ہوں گے۔"
"لو بھلا۔ یہ کیا بات ہوئی!" لالی ناک پہ انگلی رکھ کر بولی۔ "اس وقت جنگل میں کسی کو کیا کام ہو سکتا ہے جی؟"
"تم تو اوّل نمبر کی بیوقوف ہو۔" میں نے اسے جھلتے ہوئے کہا۔ "ہیلی کاپٹر جب آسمان میں اُڑتا ہے تو وہ جنگلوں پر سے گزرتا ہے۔ کھیتوں اور دریاؤں کو بھی عبور کرتا ہے اور پہاڑوں کے اوپر بھی پرواز کرتا ہے۔ اگر اتفاق سے اس کی راہ میں یہ جنگل بھی آ گئے تو کون سا حرج ہو گیا؟"

لالی نے سر ہلا کر میری بات کی تصدیق کر دی لیکن چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ میرے جواب سے مطمئن نہیں ہے۔ یہی حال رضیہ اور راجی کا بھی تھا لیکن وہ جان گئی تھیں کہ مزید سوال کرنا بیکار تھا۔ کیونکہ میں انھیں کوئی معقول جواب دینے کے قابل نہیں تھا۔ چنانچہ انھوں نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا اور ایک بار پھر بالکل خاموشی چھا گئی۔ میں نے لینڈ روور کی رفتار اور زیادہ تیز کر دی تھی کیونکہ میں رات پڑنے سے قبل ہی کسی معقول ٹھکانے پر پہنچنا چاہتا تھا حالانکہ میں یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ میرا ٹھکانہ کہاں ہے! شام کے سائے ڈھلنے لگے تھے اور ہم جس کچی سڑک پر سفر کر رہے تھے کیونکہ وہ درختوں سے گھری ہوئی تھی اس لیے روشنی اور بھی کم محسوس ہوتی تھی۔ میری نظریں آس پاس کے علاقوں کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں لیکن ابھی تک مجھے کوئی مناسب جگہ رات گزارنے کے لیے نظر نہیں آئی تھی۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ شاید ہمیں درختوں کی چھاؤں میں ہی رات گزارنی ہو گی۔ اس صورت میں ضروری تھا کہ مجھے کوئی سنگلاخ اور بلند جگہ مل جائے تاکہ وہاں ہم کم از کم زہریلے کیڑے مکوڑوں سے تو محفوظ رہ سکیں۔ کچی سڑک نے یک لخت ایک لمبا سا ٹرن لیا اور پھر ایک نیم دائرے کی شکل میں گھومتی چلی گئی۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنی تیز رفتار گاڑی کو قابو میں کیا۔ میں نے گیئر بدلے بغیر ہی موڑ کاٹنے کی کوشش کی تھی کیونکہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ موڑ اس قدر لمبا ہو گا کہ مجھے سٹیئرنگ پر کنٹرول قائم رکھنے میں بھی مشکل پیش آئے گی۔ سڑک کے ساتھ گھومتے ہوئے قریب قریب 90 ڈگری کے زاویے پر پہنچتے پہنچتے ہماری نگاہوں کے سامنے ایک نیا منظر اور نیا ماحول تھا۔ یہ قدرے پہاڑی اور پتھریلا علاقہ تھا۔ یہاں وہاں درختوں کے جھنڈ بھی تھے اور اونچے نیچے ٹیلے بھی۔ سڑک ان ٹیلوں اور درختوں کے درمیان سے بل کھاتی ہوئی گزر رہی تھی۔ میرے لیے یہ بات اطمینان بخش تھی کہ میدانی علاقے کے مقابلے میں ہم لوگ اس سنگلاخ علاقے میں کسی ٹیلے پر حفاظت سے رات گزار سکتے تھے۔ اب درختوں کے سائے بھی کم ہو گئے تھے اس لیے روشنی کچھ زیادہ ہو گئی تھی لیکن یہ بات طے تھی کہ ہم زیادہ سے زیادہ نصف گھنٹہ اور سفر کر سکتے تھے۔ اس کے بعد رات پڑنے والی تھی۔ پتھریلے راستے کی وجہ سے یہاں گرد و غبار بھی کم تھا اور گاڑی میں زیادہ جھٹکے بھی نہیں لگ رہے تھے۔

یکا یک اپنے دائیں جانب ایک بلند مقام دیکھ کر میں نے لینڈ روور کی رفتار کم کر دی۔ یہ ایک ٹیلہ نما جگہ تھی جس کے آس پاس بلند و بالا درخت دست بستہ کھڑے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے درختوں نے چاروں اطراف سے پردہ کرنے کی غرض سے اونچی اونچی دیواریں کھڑی کر دی تھیں۔ تاکہ آس پاس کے لوگوں کی نگاہیں اس ٹیلے پر قیام کرنے والوں کو نہ دیکھ سکیں۔ اس ویرانے میں اس سے زیادہ محفوظ اور مناسب جگہ دستیاب ہونا بہت مشکل تھا اس لیے میں نے اسی مقام پر

رات گزارنے کا فیصلہ کر لیا اور لینڈ روور کو ٹیلے کے پاس لے جا کر روک دیا۔ کچھ کہے سنے بغیر میری ہم سفر خواتین کو بھی میرے ارادے کا علم ہو گیا تھا چنانچہ جیسے ہی گاڑی رکی وہ دروازہ کھول کر باہر کود گئیں۔ راجی اور لالی نے تو ایک لمحے کی تاخیر بھی نہیں کی لیکن رضیہ نے اس قدر بے تابی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ وہ خاموشی سے میرے برابر والی سیٹ پر بیٹھی رہی۔
میں نے کہا۔ "کیا خیال ہے۔ یہ جگہ رات بسر کرنے کے لیے مناسب ہے؟"
"ہوں۔" اس نے ہنکارا بھرا لیکن کوئی جواب نہیں دیا۔
"چلو اوپر چل کر دیکھتے ہیں۔" اور میں بھی گاڑی سے باہر نکل کر ٹیلے کی طرف بڑھا۔ لالی اور راجی ایک اونچی سی جگہ پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی تھیں اور بیزاری سے اردگرد کے ماحول کا جائزہ لے رہی تھیں۔ رضیہ ابھی تک گاڑی کے اندر ہی بیٹھی تھی۔ میں تیز تیز قدموں سے ٹیلے پر چڑھنے لگا۔ دیکھنے میں یہ اتنا بلند نہیں لگتا تھا لیکن جب چڑھنا شروع کیا تو اندازہ ہوا کہ اس کی بلندی اچھی خاصی ہے۔ یہاں ہوا میں بھی ٹھنڈک اور تازگی تھی۔ فرش پتھریلا ہونے کی وجہ سے خاصا صاف نظر آ رہا تھا۔ یہاں کیڑے مکوڑوں کی موجودگی کا بھی زیادہ امکان نہیں تھا۔ لمبے لمبے قدموں سے فاصلہ طے کرنے کے بعد میں ٹیلے کی چوٹی پر پہنچ گیا۔ یہاں ایک چھوٹا سا میدان تھا جس کو چاروں طرف سے اونچے اونچے پرانے درختوں نے گھیر رکھا تھا۔ ساتھ ہی ایک جانب بڑے بڑے پتھروں نے ایک دیوار سی بنا دی تھی جس کی وجہ سے یہ جگہ دو اطراف سے بالکل محفوظ ہو گئی تھی۔ ایک چٹان کا بڑا سا ٹکڑا اس انداز میں آگے نکلا ہوا تھا کہ چھت یا سائبان کا کام دے رہا تھا۔ میں نے فوراً فیصلہ کر لیا کہ رات گزارنے کے لیے اس سے زیادہ مناسب اور محفوظ جگہ دستیاب نہیں ہو سکتی۔ ایک عجیب بھیگی بھیگی اور مشامِ جاں کو نکھارنے والی خوشبو ہوا میں بسی ہوئی تھی جس نے چند ہی لمحوں میں مجھے تازہ دم کر دیا۔ واقعی ماحول اور فضا کی خوبصورتی اور ہوا کی تازگی انسانوں پر بہت گہرا اثر ڈالتی ہے۔ میری ساری تھکن اور بیزاری پل بھر میں دور ہو گئی تھی اور ایک سرور انگیز کیفیت نے دل و دماغ کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا تھا۔ جی چاہتا تھا ہنسوں، گاؤں، شور مچاؤں اور سارے تفکرات اور پریشانیوں کو بھول جاؤں۔ یہی وجہ ہے کہ واپسی کے وقت میری چال میں نہ صرف تیزی اور چستی پیدا ہو گئی تھی بلکہ میں کودتا اور چھلانگیں لگاتا ہوا ٹیلے سے نیچے اُتر رہا تھا۔

مجھے اس والہانہ اور بے فکر انداز میں چھلانگیں لگاتا ہوا دیکھ کر راجی اور لالی آپس میں باتیں کرتے کرتے رُک گئیں اور حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگیں۔ رضیہ بھی اتنی دیر میں لینڈ روور سے باہر نکل آئی تھی اور آس پاس کے منظر کو دیکھ کر لطف اندوز ہو رہی تھی۔ مجھے قلانچیں بھرتے دیکھا تو وہ بھی ٹھٹک کر رہ گئی۔ میں جب اُن لوگوں کے پاس پہنچا تو مجھے یک لخت اپنی وارفتگی کا احساس ہوا اور میرے قدم اچانک رُک گئے۔ وہ تینوں حیرانی سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔
"وہاں اوپر بہت اچھی جگہ ہے۔ ہم آرام سے رات گزار سکتے ہیں۔" میں نے اپنے سانسوں کو قابو میں کرتے ہوئے کہا۔
"کیا کوئی مکان ہے؟" راجی نے سوال کیا۔
"پھر تو وہاں بستر وغیرہ بھی ہو گا۔" لالی نے قیاس آرائی کی۔
"بالکل صحیح اندازہ لگایا ہے آپ لوگوں نے۔" میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "اتفاق سے وہاں ایک فائیو سٹار ہوٹل مل گیا ہے مجھے۔"
راجی تو خاموش ہو گئی لیکن لالی پوچھے بنا نہ رہ سکی۔ "کیا مل گیا ہے جی؟"
رضیہ بے اختیار ہنس پڑی۔ پھر کہنے لگی۔ "وہاں رات گزارنے کے لیے کوئی اچھی جگہ دیکھ کر آئے ہیں۔ یہاں کوئی گھر تو ہے نہیں کہ سونے کے لیے بستر بھی مل جائے۔ دیکھا نہیں ہر طرف ویران جنگل ہے۔"

"اچھا اب آپ لوگ اُوپر چلیں۔ سامنے اُس درخت کی طرف چڑھتی جائیں۔ اُوپر ایک کھلی جگہ آجائے گی۔ بس وہیں ڈیرہ ڈالنا پڑے گا۔ مَیں اتنی دیر میں اس گاڑی کی تلاشی لیتا ہوں۔ ہو سکتا ہے ہمیں ضرورت کا کچھ سامان مل جائے۔"

لالی اور راجی نے کچھ کہے بنا اُوپر کی جانب چڑھنا شروع کر دیا۔ راجی کو اپنے اُونچی ایڑی والے فل بُوٹ کی وجہ سے پہاڑی راستے پر چلنے میں مشکل پیش آ رہی تھی مگر اس کے باوجود وہ پھرتی سے ہرنی جیسی اُوپر بازو ہلاتی ہوئی تیزی سے رواں دواں تھی۔ وہ ایک چست اور سمارٹ لڑکی تھی۔ جینز اور قمیص پہن کر وہ اور زیادہ چاق و چوبند اور دلکش نظر آ رہی تھی۔ اس کے سیاہ بال اس کے شانوں پر لہرا رہے تھے۔ وہ ماحول سے بے نیاز بڑے کھلنڈرے انداز میں اُوپر جا رہی تھی۔ اسے دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے کالج کی کوئی شوخ و طرار لڑکی پکنک منانے کے لیے آئی ہوئی ہے۔ اُس کے مقابلے میں لالی شلوار قمیص میں ملبوس تھی۔ وہ بھی ایک کشیدہ قامت اور دبلی پتلی پھرتیلی لڑکی تھی اور راجی کے پیچھے یوں تیزی سے جا رہی تھی جیسے دونوں میں یہ مقابلہ ہو رہا ہو کہ پہلے کون اُوپر ٹیلے پر پہنچے گا۔ مَیں چند لمحے اُن دونوں کے ہیولوں کو ٹیلے کی جانب جاتے ہوئے دیکھتا رہا پھر ایک طویل سانس لے کر مَیں نے لینڈ روور کی طرف توجہ دی۔ جیسا کہ سبھی جانتے ہیں یہ ایک قیمتی اور مضبوط گاڑی ہوتی ہے اور دولت مند زمیندار اور جاگیردار اس گاڑی کو اپنے شوق اور مشغلے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ کچھ لوگ اس کو شکار کے لیے کام میں لاتے ہیں۔ کچھ اپنے دشمنوں اور مخالفوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک ہتھیار بند مسلح گاڑی کے طور پر اس سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ ملک منصور نے بھی یقیناً اس لینڈ روور کو محض مسافر گاڑی کے طور پر استعمال نہیں کیا ہوگا۔ خاص طور پر ایسی حالت میں جب کہ وہ ایک مانے ہوئے بے جگر اور خطرناک ڈاکو کے ٹھکانے پر اپنے مسلح ساتھیوں کے ہمراہ اس میں سوار ہو کر آیا تھا۔

یہ اندازے قائم کرتے ہوئے میں نے باقاعدہ اور منظم طریقے پر لینڈ روور کی تلاشی لینے کا ارادہ کیا۔ مَیں نے اپنے کام کا آغاز اگلی سیٹوں سے کیا۔ میرے اندازے کے عین مطابق اگلی سیٹوں کے نیچے خالی جگہوں میں اسلحہ پوشیدہ تھا۔ جس میں ایک مشین گن اور ایک برین گن کے علاوہ ایک بھاری ریوالور بھی شامل تھا۔ دوسری سیٹ کے نیچے گولیوں کا ذخیرہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی چار دستی بم بھی ایک میلے سے کپڑے میں لپٹے ہوئے تھے۔ ایک بظاہر بے ضرر سی گاڑی میں اسلحہ کے اتنے بڑے ذخیرے کی موجودگی میرے لیے قطعی حیرت انگیز نہیں تھی۔ بلکہ یہ تمام اشیاء میری توقعات کے عین مطابق تھیں۔

لینڈ روور کی پچھلی جانب سیٹوں کے نیچے خاص طور پر خالی جگہیں بنائی گئی تھیں۔ ان میں چادریں، دو تکیے، ایک کمبل کے علاوہ ایک تیل کا چولہا اور مٹی کے تیل سے بھرا ہوا ایک پلاسٹک کا گیلن والا ڈبہ بھی تھا۔ ایک اور سیٹ کے نیچے کھانے کا سامان تھا۔ خشک میوہ، چاول، آٹا، دالیں، بھنے ہوئے چنے، مونگ پھلی، بسکٹ کے ڈبے اور ٹین کے ڈبوں میں سربمہر پھلوں کے ڈبے۔ اُبلے ہوئے مٹر کا ایک بند ڈبہ۔ اچار کی ایک چھوٹی بوتل، خشک دودھ، چائے کا ڈبہ اور سبزی ترکاری کے چند سربند ٹین کے ڈبے۔ گویا ہنگامی حالات میں کئی افراد کے کھانے پینے اور آرام کرنے کا پورا ساز و سامان اس لینڈ روور میں موجود تھا۔ پچھلی جانب فالتو پہیے کے ساتھ پلاسٹک کے ایک بڑے ڈبے میں جو دراصل پٹرول کا ڈبہ تھا، پینے کا پانی بھرا ہوا تھا۔ اسی سائز کے دو اور ڈبوں میں پٹرول تھا جو ہنگامی ضرورت کے لیے سٹور کیا گیا تھا۔ مَیں نے خوشی سے بے قابو ہو کر سیٹی بجائی اور یہ سوچنے لگا کہ اس خزانے کو جو لینڈ روور میں پوشیدہ تھا کس طرح محفوظ کروں؟ اب جب کہ گاڑی کے اندر موجود ساز و سامان اور اسلحہ کے بارے میں مجھے علم ہو چکا تھا۔ مَیں یہ سوچ کر فکرمند ہو رہا تھا کہ گاڑی کی حفاظت کا ایسا انتظام کیسے کروں کہ یہ سب سامان بحفاظت ہے

...ن دوسرے کے ہاتھ نہ لگ جائے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس قدر قیمتی گاڑی کو تنہا چھوڑ دینے کو میرا جی نہیں چاہتا تھا۔ ...ن یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ مَیں سارا اسلحہ اور کھانے پینے کا تمام سامان اس میں سے نکال کر اپنے ساتھ ٹیلے پر لے جاؤں۔ ...بہترین طریقہ یہ تھا کہ مَیں لینڈ روور ہی میں رات گزاروں۔ لیکن ایسی صورت میں تین نوجوان عورتوں کو کھلے آسمان ...ے چھوڑ دینا بھی مناسب نہیں تھا۔ مَیں نے گاڑی کے مڈگارڈ سے ٹیک لگا لی اور اس مسئلے کا حل سوچنے لگا۔ اچانک ...ے عقب میں آہٹ ہوئی اور میں چونک کر تیزی سے پلٹا۔ راجی سے لیا ہوا پستول مَیں نے چشم زدن میں جیب سے ...ال کر ہاتھ میں تھام لیا اور ایک لمحے کے نوٹس پر گولی چلانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اپنا رُخ بدلنے کے ساتھ ہی میں ...م زدن میں لینڈ روور کے بھاری بھرکم مڈگارڈ کے پیچھے پناہ بھی لے چکا تھا۔ میرے اس ایکشن کے جواب میں مجھے ایک ...رزدہ چیخ سنائی دی اور رضیہ میری نگاہوں کے سامنے دونوں ہاتھ اُوپر اُٹھاتے ہوئے چلّائی: "مَیں ہوں۔ رضیہ۔" اسے ...یہ ڈر تھا کہ کہیں مَیں بے اختیار گولی نہ چلا دوں۔ شکر ہے کہ مَیں نے لبلبی پر اُنگلی سے دباؤ نہیں ڈالا تھا ورنہ ...نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا۔

رضیہ کو سامنے دیکھ کر مَیں نے اطمینان کا سانس لیا اور پستول کو واپس قمیص کی جیب میں ڈال لیا۔ چند لمحے تو وہ ...ب کے عالم میں رہی لیکن پھر اچانک ہنس پڑی اور میری طرف بڑھتے ہوئے بولی: "آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔"

"سوری۔" مَیں دوبارہ لینڈ روور کے مڈگارڈ پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ "دراصل ڈرانے والی تو تم ہو۔ اس طرح خاموشی سے ...ے پیچھے سے نمودار ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ تم دوسری جانب سے بھی آ سکتی تھیں۔"

"میرا خیال تھا آپ نے مجھے دیکھ لیا ہے۔ مگر شاید آپ کسی گہری سوچ میں کھوئے ہوئے تھے۔" وہ بھی میرے پاس ...گاڑی کے دوسرے مڈگارڈ پر چڑھ کر بیٹھ گئی اور اپنی ٹانگ ہلاتے ہوئے شوخی سے بولی۔ "پوچھ سکتی ہوں کس ...خیال میں گم تھے؟"

"یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے۔" مَیں نے بھی شرارت آمیز لہجے میں جواب دیا۔ "ظاہر ہے تین خوبرو عورتوں کی موجودگی میں یہ ...غیر فطری اور انہونی بات بھی نہیں ہے۔"

"اچھا۔" وہ بہت خوشگوار موڈ میں تھی۔ "تو گویا آپ کو بھی عورتوں کی موجودگی اور اُن کی خوبصورتی کا احساس ہو گیا؟"

"کیوں نہ ہوتا۔" مَیں نے چھیڑا۔ "آخر مَیں بھی ایک صاحبِ دل اور صاحبِ نظر انسان ہوں۔ لینڈ روور کی طرح بے ...جان تو نہیں ہوں۔" یہ پہلا موقع تھا کہ ہم دونوں نے آپس میں یوں ہلکی پھلکی اور دلچسپ گفتگو کی تھی۔ ورنہ اس سے ...پہلے تو عام طور پر ایک کشیدگی کی فضا ہی قائم رہی تھی۔

"مذاق چھوڑیں اور یہ بتائیں کہ آپ کیا سوچ رہے تھے؟" اس نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

مَیں نے چند لمحے کے اندر یہ فیصلہ کر لیا کہ رضیہ جیسی عورت کو اعتماد میں لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ وہ ایک ...دار اور جی دار عورت تھی جس کا نمونہ میں ہیرا ڈاکو کے اڈّے پر دیکھ چکا تھا۔ مَیں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر رازداری ...انداز میں کہا۔ "رضیہ یہ لینڈ روور ہمارے لیے بہت کارآمد ہے۔"

"ظاہر ہے۔ سفر کے لیے یہ ہماری مددگار ہے۔" اس نے کہا۔

"یہ محض ٹرانسپورٹ ہی نہیں ہے اچھا خاصا اسلحہ خانہ اور کھانے پینے کے سامان کا سٹور بھی ہے۔" مَیں نے ...ے گاڑی میں موجود اسلحہ اور اشیائے خوردنی کے بارے میں تمام معلومات فراہم کر دیں۔ وہ خوشی سے مسکرانے لگی اور ...ں: "مگر اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟"

"پریشانی تو کوئی نہیں ہے۔" مَیں نے کہا: "لیکن اب اس گاڑی کی حفاظت کا معاملہ پہلے سے کہیں زیادہ توجہ ...طلب ہے۔ ہم اس چلتے پھرتے قلعے کو کسی اور کے حوالے کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ مَیں یہ سوچ رہا تھا کہ

حفاظت کے لیے میں گاڑی کے پاس رات گزاروں لیکن وہاں کھلے جنگل میں تین نوجوان عورتوں کو تنہا چھوڑ دینا بھی مناسب نہیں ہے۔ مشکل یہ ہے کہ یہ گاڑی وہاں ٹیلے کے اوپر نہیں جا سکتی اور ہم چاروں اس گاڑی کے اندر سما کر رات نہیں گزار سکتے۔ تو پھر کیا کیا جائے!"

"آپ اس کی فکر نہ کریں۔" وہ تسلی آمیز لہجے میں بولی۔ "یہ پستول میرے حوالے کر دیجیے۔ میں اوپر ان دونوں کی حفاظت کر لوں گی۔"

"مگر رضیہ۔ تمام رات تین عورتوں کا تنہا....."

اس نے میری بات کاٹ دی۔ "میں نے کہا نا کہ بالکل بے فکر ہو جائیں۔ میرا نشانہ خطا نہیں ہوتا۔ میرے ہوتے ہوئے وہ بالکل محفوظ رہیں گی۔" پھر وہ زیر لب مسکرا کر بولی۔ "اگر زیادہ خطرہ پیش آیا تو میں آپ کی مدد لے لوں گی۔"

میں نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے تمہاری ہر بات کا بھروسہ ہے کیونکہ میں اپنی آنکھوں سے تمہاری بہادری اور بے جگری کا ماہرانہ مظاہرہ دیکھ چکا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے راجی سے لیا ہوا پستول جیب سے نکال کر اس کے حوالے کیا اور لینڈ روور میں موجود "اسلحہ خانے" سے ریوالور نکال کر اپنی جیب میں اڑس لیا۔ پھر میں نے دو چادریں اور دو تکیے بھی نکال کر رضیہ کے ہاتھ میں تھما دیئے اور ہم دونوں چڑھائی کی طرف چل پڑے۔

ٹیلے پر کھلی جگہ میں راجی اور لالی دونوں بہت خوش اور مطمئن نظر آ رہی تھیں۔ طویل عرصے تک محبوس رہنے اور سہمی ہوئی زندگی بسر کرنے کے بعد انھیں کھلی فضا میں آزادی سے گھومنے کا موقع ملا تھا۔ شاید اسی وجہ سے وہ خود کو آزاد اور بے فکر محسوس کر رہی تھیں۔ خاص طور پر راجی بہت پُر جوش اور مسرور نظر آ رہی تھی۔ اندرونی مسرت اس کے چہرے اور آنکھوں کی چمک سے بھی ظاہر ہو رہی تھی اور وہ ایک زندگی سے بھرپور، چلبلی لڑکی کے روپ میں ایک جانب سے دوسری جانب دوڑتی پھر رہی تھی۔ جب رضیہ کو تکیوں اور چادروں سمیت دیکھا تو اس کی خوشی دوبالا ہو گئی۔ "پھر تو بہت مزہ آئے گا۔" اس نے جھپٹ کر ایک تکیہ اور چادر رضیہ کے ہاتھ سے چھین لی اور فوراً اس جگہ بچھا کر اس پر بیٹھ گئی جہاں پہاڑی کی ایک محفوظ دیوار سی بن گئی تھی۔

"ہم تینوں یہاں سوئیں گے۔" اس نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا

"ان کے لیے اُدھر مردانہ ڈبے میں چادر بچھا دو۔" اس نے دیوار کے دوسرے کنارے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

رضیہ نے جب دوسری چادر بھی اس کی چادر کے ساتھ ہی بچھا دی اور دوسرا تکیہ بھی وہاں رکھ دیا تو وہ حیرانی سے کبھی رضیہ کو اور کبھی مجھے دیکھنے لگی۔ "کیا مطلب" وہ پریشان ہو کر پوچھنے لگی۔ "کیا یہ بھی ہمارے ساتھ ہی---؟"

"کیوں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟" میں نے شرارت بھرے لہجے میں پوچھا۔ "میں اتنی دُور اکیلا نہیں سوؤں گا تو مجھے ڈر نہیں لگے گا؟"

"مرد ہو کر بھی تمہیں ڈر لگے گا۔" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔ "لیکن اس طرح یہاں ہم لوگوں کے ساتھ سوتے ہوئے تمہیں اچھا لگے گا؟"

"اچھا نہیں، بہت اچھا لگے گا۔" میں آلتی پالتی مار کر وہیں چادر پر بیٹھ گیا۔

"تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے جی!" لالی میری حمایت پر آمادہ تھی۔ "اس جنگل میں ہم سب کو ایک جگہ ایک ساتھ ہی رہنا چاہیے اور ملک جی تو بہت اچھے بندے ہیں۔" پھر اس نے تصدیق کے لیے رضیہ کی طرف دیکھا۔ رضیہ خاموش کھڑی آسمان کی طرف دیکھتی رہی۔ "کتنا صاف آسمان ہے۔ تارے چمک رہے ہیں۔" وہ انداز بے نیازی سے آسمان کو دیکھ کر بولی۔

راجی نے خود کو تنہا پایا تو مجبوراً خاموش ہو گئی۔

میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ اب ہم سب کو سو جانا چاہیے تاکہ تازہ دم ہو جائیں۔ نہ جانے صبح ہمیں کتنا لمبا سفر کرنا پڑے یا اور کن مشکلات کا سامنا ہو۔ چلو جلدی سے سو جاؤ۔ اچھے بچوں کی طرح۔ شاباش۔"

لالی نے کونے کی جگہ سنبھالی۔ اس کے برابر راجی بیٹھی ہوئی تھی۔ ظاہر ہے اس کے ساتھ رضیہ کی جگہ تھی۔ اس طرح مجھے کسی آخری کنارے پر ہی سونا چاہیے تھا۔ راجی خاموش مگر چمکیلی سوال طلب نظروں سے مجھے دیکھتی رہی گویا پوچھ رہی ہو کہ جناب اب بتلایئے، آپ کہاں سوئیں گے؟

"اچھا بھئی۔ خدا حافظ اور شب بخیر" میں یکا یک اپنی جگہ سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "تم لوگ سونے کی تیاری کرو۔ میں چلا۔"

لالی اور راجی نے حیرت سے میری طرف آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ میں نے انھیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔ آپ لوگ بے فکر رہیں۔ میں نیچے گاڑی میں سوؤں گا۔"

"مگر کیوں۔ وہ تو یہاں سے بہت دُور ہے۔" لالی نے سوال کیا۔

"گاڑی کی حفاظت بھی بہت ضروری ہے۔ اگر کوئی لے گیا تو اس جنگل میں ہمارا کیا حشر ہو گا؟" یہ کہہ کر میں ان تینوں سے رخصت ہو کر چل پڑا۔

اس وقت موسم خاصا خوشگوار ہو گیا تھا اور ٹھنڈی ٹھنڈی تازہ دم کر دینے والی ہوا بھی چل رہی تھی لیکن لینڈ روور کے اندر کھڑکیوں کے شیشے چڑھا کر سونا بہت مشکل اور تکلیف دہ تھا۔ میں نے اگلی سیٹوں پر نیم دراز ہو کر سونے کا ارادہ کیا اور گاڑی کے ایک دروازے کا شیشہ اُتار کر اس میں اپنے پیر اٹکا لیے۔ یہ خاصا آرام دہ نادیہ تھا۔ یہ اور بات ہے کہ تمام رات اس انداز سے سونا زیادہ خوشگوار نہیں تھا لیکن مجبوری تھی۔ کافی تھکا ہوا تھا اور خود کو آئندہ واقعات کا سامنا کرنے کے لیے تیار بھی کرنا چاہتا تھا اس لیے مجھے نیند آ گئی۔ نہ جانے میں کتنی دیر سویا تھا کہ اپنے نزدیک ہی کسی کی موجودگی کے احساس نے مجھے اچانک چونکا کر دیا۔ میں تیزی سے اُٹھ کر بیٹھ گیا اور میں نے ریوالور اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ رات زیادہ اندھیری نہیں تھی اس لیے مجھے چند قدم کے فاصلے پر ایک انسانی ہیولا دیکھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ میں نے ریوالور کا رُخ اس طرف کرتے ہوئے تیزی سے دوسری جانب سے لینڈ روور کا دروازہ کھولا اور پھسل کر باہر نکل آیا۔ اب م[illegible]ے اور آنے والے کے درمیان میں لینڈ روور کی مضبوط آہنی رکاوٹ حائل ہو گئی تھی۔

"خبردار۔ رُک جاؤ۔" میں نے ڈپٹ کر کہا۔ "ورنہ گولی چلا دوں گا۔" اس کے ساتھ ہی میرا ریوالور گولیاں اگلنے کے لیے تیار ہو گیا۔

"گولی نہ چلانا۔" ایک سہمی ہوئی نرم سرگوشی مجھے سنائی دی اور وہ ہیولا میری جانب بڑھا۔ میرے نزدیک پہنچنے پر مجھے راجی کو پہچاننے میں ذرا بھی تامل نہیں ہوا۔

"راجی تم؟" میں نے گاڑی کی اوٹ سے نکلتے ہوئے کہا اور حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے اور وہ سوئی سوئی سی نظر آ رہی تھی۔ "کیا بات ہے؟" میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "کوئی خطرہ ہے؟!! وہ دونوں کہاں ہیں؟" میں نے پریشان ہو کر تابڑ توڑ کئی سوال داغ دیئے۔

جواب میں وہ مسکراتی ہوئی میرے نزدیک آ گئی۔ بالوں کو سر کے ایک جھٹکے سے چہرے پر سے ہٹایا اور بولی۔ "پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ سب خیریت ہے۔ وہ دونوں بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں اور بے خبر پڑی سو رہی ہیں۔"

"تو پھر؟"

"مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔" وہ لگاوٹ بھرے انداز میں بولی۔ "بہت کوشش کی مگر نہ جانے کیوں نیند کو ان آنکھوں سے دشمنی ہو گئی ہے۔ سوچا تمہارے پاس چل کر باتیں کروں۔"

"اوہ" میں نے لمبی سانس لی۔ "تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔"

"کیوں۔" وہ دلفریب انداز میں گردن جھکا کر مجھے دیکھنے لگی۔ "کیا میں اتنی بدشکل ہوں؟" وہ میرے بالکل نزدیک آکر کھڑی ہو گئی۔ "ذرا غور سے دیکھ کر بتاؤ۔ کیا میں بدصورت اور ڈراؤنی ہوں؟"

"ارے نہیں راجی۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ تم اچانک ہی اندھیرے میں دبے پاؤں چلی آئیں میں سمجھا شاید کوئی اجنبی یا دشمن آگیا ہے۔"

"میں نہ اجنبی ہوں اور نہ دشمن۔" وہ دھیمی آواز میں کہنے لگی۔ "دبے پاؤں اس لیے آئی ہوں کہ دوسروں کو میرے آنے کی خبر نہ ہو۔" وہ گاڑی کے دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ "کیا تمہیں بھی نیند نہیں آرہی تھی؟"

"میں تو آرام سے سو رہا تھا۔ آہٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔ ظاہر ہے اس جنگل میں چوکنا رہنا بہت ضروری ہے۔ ہزاروں قسم کے خطرات ہو سکتے ہیں۔"

"سب سے بڑا خطرہ تو فی الحال میں ہوں۔" اس نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔ "اب کیا ہم ساری رات یہاں باہر کھڑے ہی باتیں کرتے رہیں گے۔" آس پاس نظریں دوڑانے کے بعد اس نے ایک لمبی سانس لی اور بولی۔ "یہاں تو بیٹھنے کی کوئی جگہ بھی نہیں ہے سوائے گاڑی کے۔" وہ کھلے ہوئے دروازے میں داخل ہو کر اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ "تم باہر کیوں کھڑے ہو۔ تم بھی اندر آجاؤ۔" اس نے اپنے برابر والی سیٹ کو تھپکتے ہوئے کہا۔

میں اس کے طرزِ عمل میں ایک عجیب قسم کی بے قراری اور نیا پن محسوس کر رہا تھا۔ اس کا انداز کچھ بدلا بدلا سا تھا۔ آنکھوں میں نیند کا خمار بھرا ہوا تھا لیکن اس کا بیان تھا کہ اسے نیند نہیں آرہی تھی حالانکہ وہ سرتاپا نشے میں ڈوبی ہوئی نظر آرہی تھی۔

"کیا سوچ رہے ہو۔ ابھی تک مجھ سے ڈر لگ رہا ہے کیا؟" اس نے دھیمی آواز میں پوچھا۔ "اندر کیوں نہیں آجاتے؟"

میں خاموشی سے گاڑی میں داخل ہو کر اس کے برابر بیٹھ گیا۔

"جگہ تو یہاں کافی کھلی ہوئی ہے۔" وہ خوابیدہ آواز میں مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "اگر چاہیں تو ہم دونوں یہاں سو سکتے ہیں۔" اس کی آواز اور انداز میں پوشیدہ دعوت کا مجھے پہلی بار احساس ہوا۔ میں اس کے بالکل نزدیک بیٹھا ہوا تھا اور اس کے جسم کی حرارت اور اس کے بالوں اور جسم سے اُٹھنے والی خوشبو کو محسوس کر سکتا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سُرخ ڈورے اور تمتماتے ہوئے رخسار پہلی بار میری توجہ کا مرکز بنے تھے۔ میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ میں نے کہا۔ "راجی۔ یہ جگہ تو ایک آدمی کے سونے کے لیے بھی پوری نہیں ہے۔ بھلا دو آدمی یہاں کیسے سو سکتے ہیں؟"

"چلو مان لیا۔" وہ اپنی گردن کو جھٹک کر مسکرائی۔ "دو آدمی اس جگہ میں نہیں سو سکتے۔ مگر رات تو گزار سکتے ہیں۔"

میں نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ اس کی مسکراتی ہوئی نگاہیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ "مگر راجی۔ ہم دونوں۔ اکیلے یہاں؟!"

"حیران کیوں ہوتے ہو؟" اس نے دلآویز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا اور ایک بازو میرے کاندھے پر رکھ دیا۔ "یہ کوئی انوکھی اور اَن ہونی بات تو نہیں ہے۔ میں نے جب سے تمہیں دیکھا ہے مجھے یہ احساس ہو رہا ہے کہ تم ایک اچھے اور قابلِ اعتماد آدمی ہو۔ میرا دل کہتا ہے کہ میں تم پر بھروسہ کر سکتی ہوں۔ تمہارا سہارا لے سکتی ہوں۔ تم مجھے پناہ

دے سکتے ہو۔" اس نے اپنا نرم اور گرم ہاتھ میرے شانے پر پھیرا اور پھر جیسے مطمئن ہو کر کہا: "سچ مچ تم ایک بہادر آدمی لگتے ہو۔" وہ میرے قریب کھسک آئی۔

"یہ تمہیں کیسے اندازہ ہوا کہ میں بہادر اور بھروسے کے قابل ہوں؟" میں بے اختیار پیچھے کھسکنے لگا: "اور پھر ہم سب کو نیند کی ضرورت ہے۔ خدا جانے کل ہمیں کن حالات کا سامنا کرنا پڑے؟"

"کل کس نے دیکھا ہے۔" وہ اندازِ سپردگی سے مسکرائی۔ "زندگی بس آج ہی کا نام ہے۔ بلکہ اس وقت کا جو ہماری مٹھی ہے۔ کل کیا ہوگا؟ یہ کوئی نہیں جانتا۔ تو پھر کل کا انتظار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ کل کی فکر مت کرو۔ آج سے کام رکھو کیوں۔ میں کوئی غلط کہہ رہی ہوں کیا؟" اس نے سرگوشی میں کہا۔ میں نے دور ہٹنا چاہا مگر میرے کاندھے پر اس کے ہاتھ کی گرفت مضبوط ہوگئی۔ "سنو۔ تمہارا نام کیا ہے؟" اس نے میرے کان کے پاس ہونٹ لا کر پوچھا۔

"نام سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

اس نے میری بات کاٹ دی۔ "ٹھیک کہتے ہو۔ نام سے کیا فرق پڑتا ہے؟ تمہارا کوئی بھی نام ہو۔ مجھے تم اچھے لگتے ہو۔"

میں اس کے نرم و گداز جسم کے بوجھ کو اپنے شانے پر محسوس کر رہا تھا۔

"مگر راجی۔ میں....."

"سنو۔" وہ میرے اور نزدیک آگئی۔ "میں کوئی گری پڑی عورت نہیں ہوں۔ نہ ہی مجھے کوئی آسانی سے حاصل کر سکتا ہے مگر تمہیں دیکھ کر جی چاہا کہ تمہیں اپنا لوں۔" اس کی آواز بوجھل ہو رہی تھی۔ "تم اگر چاہو تو میں ساری زندگی تمہارے ساتھ گزار سکتی ہوں۔ میرے پاس بہت پیسہ ہے۔ میں دھندا چھوڑ دوں گی اور ہم دونوں کسی دوسرے ملک میں جا کر آرام سے رہیں گے۔ کیوں۔ کیا خیال ہے؟" اس نے اپنے جسم کا سارا بوجھ مجھ پر ڈال دیا۔ اس کی بے ترتیب سانسوں اور بکھرے ہوئے بالوں کی مہک گاڑی میں ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا مطلب بالکل واضح تھا۔ کیونکہ اب اس کا دوسرا بازو بھی میری گردن میں حمائل ہوگیا تھا۔ "بڑے بڑے لوگ میری آرزو کرتے ہیں۔ میری نظرِ کرم کے منتظر رہتے ہیں۔ ہیرا ڈاکو جیسا درندہ بھی میرا شیدائی تھا میرے پیار کا طالب ہے مگر مجھے آج تک کوئی اچھا نہیں لگا۔ تم مجھے اچھے لگے ہو۔" یہ کہہ کر وہ میری طرف جھکی۔ میں نے آہستہ سے اس کے دونوں بازو پکڑ کر اسے پیچھے ہٹا دیا۔ وہ حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگی۔

"سنو راجی۔ اب میری بات بھی سن لو۔ میں بھی کوئی گرا پڑا انسان نہیں ہوں جسے تم جب چاہو جس طرح چاہو استعمال کر لو۔ میں اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں جو تم جیسی خوبصورت عورتوں کے اشاروں پر ناچتے ہیں اور جنہیں تم جب چاہو اپنا سکتی ہو اور جب چاہو دھتکار سکتی ہو۔ میں ایک معمولی سا آدمی ہوں۔ تمہارے طلب گاروں اور چاہنے والوں کی فہرست میں میرا نام سب سے آخر میں بھی نہیں لکھا جا سکتا۔ مگر میں ایک غیرت مند اور خوددار آدمی ہوں۔ مجھے دوسروں کی جائز اور ناجائز خواہشوں کی تکمیل کرنے کی عادت نہیں ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ تم نے میرے بارے میں بالکل غلط رائے قائم کی ہے۔ میں بکاؤ مال نہیں ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے اسے دھکیل کر دور کر دیا اور گاڑی سے باہر نکل گیا۔ وہ بھونچکی رہ گئی۔ شاید وہ یہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ رات کی تاریکی اور تنہائی میں کوئی شخص اسے مسترد بھی کر سکتا ہے۔ وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتی رہی۔

"تمہیں میرے بارے میں اندازہ لگانے میں غلطی ہوئی ہے۔ میں ایسا آدمی نہیں ہوں۔" میں نے سرد لہجے میں کہا اور گاڑی کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا۔ یہ حقیقت ہے کہ راجی کا یہ طرزِ عمل نہ صرف خلافِ توقع تھا بلکہ جس انداز سے اس نے مجھے دعوتِ نشاط دی تھی۔ اس کو میں نے سبکی اور اپنی توہین خیال کیا تھا۔ اس کا انداز بالکل پیشہ وارانہ تھا اور

اس کا یہ تصور کہ وہ جس شخص کو بھی اشارہ کرے وہ اس کی خواہش کے مطابق رقص کرنے لگے گا۔ کم از کم میرے لیے قابلِ قبول نہیں تھا۔ یہ سچ ہے کہ وہ ایک پُرکشش اور خواہش انگیز عورت تھی اور دل لبھانے کے گُر بھی جانتی تھی۔ لیکن اس نے جس سستے اور بازاری انداز میں خود کو پیش کیا تھا۔ اسکی وجہ سے میں متنفر ہوگیا تھا۔ میرے جواب اور طرزِ عمل نے اُسے حیران کر دیا تھا۔ وہ چند لمحے مجھے دیکھتی رہی پھر ایک موہوم سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر نمودار ہوئی کچھ دیر مجھے خاموشی دیکھتی رہی پھر میرے اور نزدیک آگئی اور آنکھیں گھما کر بولی۔

"کیسے بھی ہو مگر ہو تو آدمی، اور میں نے کوئی آدمی ایسا نہیں دیکھا جس کے دل کی دھڑکنیں مجھے اپنے قریب پا کر تیز نہ ہوگئی ہوں۔"

"بیکار وقت ضائع مت کرو۔" میں نے کرخت آواز میں کہا۔ "میرا خیال ہے کہ تم نے آج تک کوئی خوددار اور شریف آدمی دیکھا ہی نہیں۔ ورنہ انسانوں کے بارے میں تمہاری یہ رائے نہ ہوتی۔ بہتر ہے کہ تم چپ چاپ وہاں اوپر جا کر سو جاؤ۔ ہم سب کو آرام کی ضرورت ہے اور پھر یہ تو سوچو کہ اگر رضیہ اور لالی میں سے کسی کی آنکھ کھل گئی تو وہ کیا سوچیں گی؟"

"مجھے ان کی پروا نہیں ہے۔" وہ برہمی سے بولی۔

"مگر مجھے تو ہے۔ مجھے اپنی عزت جان سے بھی پیاری ہے۔" میں نے بیرحمی سے جواب دیا اور گاڑی سے باہر نکل کر کھڑا ہوگیا۔ "اب اور وقت ضائع مت کرو۔ خاموشی سے چلی جاؤ۔"

میرے دیکھتے ہی دیکھتے راجی کا خوبصورت چہرہ بگڑ گیا اور اس کی چمکیلی خوبصورت آنکھیں جو چند لمحے قبل خمار سے جھکی جا رہی تھیں ایک دم چنگاریاں برسانے لگیں اس کا جسم غصے اور توہین کے احساس سے لرزنے لگا اور جب وہ مجھ سے مخاطب ہوئی تو غصے کی شدت سے اس کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ "تم.....!" اس نے بڑی حقارت سے مجھے دیکھا۔ "تم اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو؟ تم ایک بے حس اور بے حیثیت انسان۔ جس میں شرافت اور احساس کا شائبہ بھی نہیں ہے۔ تم جانتے نہیں ہو کہ میری توہین کر کے تم نے اپنی زندگی ختم کر لی ہے۔ تم نے مجھے ٹھکرایا ہے؟! راجی کو ٹھکرایا ہے جو آج تک سینکڑوں مردوں کو ٹھکراتی رہی ہے۔ اُنہیں ٹھوکریں لگاتی رہی ہے۔ اُنہیں ذلیل کرتی رہی ہے۔ تمہارا یہ برتاؤ میں زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔"

"راجی۔" میں نے بڑے سکون سے کہا۔ "آج تک تمہارا واسطہ عیش طلب ضرور تمندوں ہی سے پڑا ہے جن کو دیکھنے کی تم عادی ہوگئی ہو۔ تم نے جس ماحول میں آنکھ کھولی ہے اور جس قسم کے لوگوں سے تمہارا میل جول رہا ہے وہ سب کے سب تمہارے خریدار تھے یا تمہارے طلب گار۔ اس لیے تمہیں یہ اندازہ ہی نہیں تھا کہ ایک عام مرد کیسا ہوتا ہے۔ اس کے جذبات کیا ہوتے ہیں۔ اگر تم ایک عام عورت ہوتیں تو تمہارے جذبات، احساسات اور خیالات بالکل مختلف ہوتے، لیکن تم جس طبقے سے تعلق رکھتی ہو وہاں انسانیت، شرافت اور مردانگی کا معیار بالکل مختلف ہے اور جہاں تک تمہاری خوبصورتی کا تعلق ہے میری زندگی میں تم سے کہیں زیادہ حسین اور پُرکشش عورتیں آئی ہیں۔ میں ایسا ندیدہ بھی نہیں ہوں کہ تمہیں دیکھ کر اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھوں۔"

جواب میں وہ دانت پیس کر زیرِ لب بڑبڑائی مگر میں اس کی آواز نہیں سن سکا۔ گردن کے ایک جھٹکے سے اس نے اپنے چہرے پر بکھرے ہوئے بالوں کو ہٹایا اور گاڑی سے نکل کر ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی تیز تیز قدموں سے ٹیلے کی جانب چلی گئی۔ میں چپ چاپ گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا دیکھتا رہا اور دل ہی دل میں سوچتا رہا کہ اس کے ساتھ میرا برتاؤ اور رویہ کس حد تک درست اور مناسب تھا، وہ غصے میں بھری ہوئی تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی جا رہی تھی۔ پتھریلے راستے پر وہ کئی بار لڑکھڑائی اور گرتے گرتے بچی، لیکن بالآخر وہ اُوپر پہنچنے میں کامیاب ہوگئی۔ جب اس نے بڑے سے ٹیلے پر پہنچ کر بائیں جانب رُخ کیا تو میری نظر رضیہ پر پڑی جو ایک درخت کے خشک تنے

سے ٹیک لگائے بالکل بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ راجی اس کے نزدیک پہنچ کر ایک لمحے کے لیے رُکی اور پھر سر کو جھٹک کر تیز قدموں سے چلتی ہوئی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ اب میری نظریں اس نیم تاریکی میں دیکھنے کی عادی ہو چکی تھیں اس کے باوجود میں رضیہ کے چہرے کے تاثرات نہیں دیکھ سکتا تھا مگر جب وہ بھی واپس جانے کے لیے پلٹی تو مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ وہ سخت برہم اور ناخوش تھی۔ شاید اُس کو میرے اور راجی کے اس طرزِ عمل سے مایوسی ہوئی تھی اور وہ ہمارے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہو گئی تھی۔ لہٰذا ہر وہ اپنے اس ردِ عمل میں پوری طرح حق بجانب تھی۔ اس نے ایک خوبرو اور نوجوان عورت کو رات کی تاریکی میں چوری چھپے میرے پاس آتے ہوئے اور پھر واپس جاتے ہوئے دیکھا تھا اور اس نے میرے بارے جو بھی رائے قائم کی تھی حالات اور واقعات اس کی تصدیق کر رہے تھے۔ میں نے ایک ٹھنڈی اور لمبی آہ بھری اور دوبارہ گاڑی میں گھس کر بیٹھ گیا مگر نیند میری آنکھوں سے غائب ہو چکی تھی۔ کچھ دیر پہلے میں جس سنسنی خیز اور ہیجان انگیز تجربے سے دوچار ہوا تھا اس کا اثر ابھی تک میرے ذہن و دل پر باقی تھا۔ راجی نے خود ہی بتایا تھا کہ وہ اربابِ نشاط کے طبقے سے تعلق رکھتی ہے لیکن پھر بھی اُس نے آج رات جو طرزِ عمل اختیار کیا وہ قطعی خلاف توقع تھا ایک اور پریشان کن بات یہ تھی کہ رضیہ نے رات گئے راجی کو میرے پاس سے واپس جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور نہ جانے کیوں میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ رضیہ میرے بارے میں کوئی غلط رائے قائم کرے۔ کچھ دیر میں انہی خیالات میں کھویا رہا اور پھر نہ جانے کس وقت میری آنکھ لگ گئی۔

میں بیدار ہوا تو دن نکل آیا تھا اور سورج کی کرنیں بُلند و پست کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے تھیں۔ دن کی روشنی میں یہ سماں اور بھی زیادہ خوبصورت اور دلفریب نظر آ رہا تھا۔ میں پھرتی سے گاڑی سے باہر آیا۔ ہوا میں تازگی اور قدرے نمی سی تھی جو اس بات کا اعلان تھا کہ کہیں آس پاس ہی کوئی جھیل یا دریا موجود ہے۔ پہاڑی ٹیلے کی مخالف سمت مختصر سا فاصلہ طے کر کے ہی میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ میری نظروں کے سامنے ایک خوبصورت جھیل کا منظر تھا۔ جھیل کے آس پاس ہرے بھرے قدآور درختوں کی قطاروں نے اس کے حسن میں چار چاند لگا دیے تھے۔ میں نے جھیل کے کنارے پہنچ کر اس کے ٹھنڈے پانی سے ہاتھ منہ دھویا اور اس ٹھنڈے اور تازہ پانی نے مجھے بالکل تر و تازہ بنا دیا۔ تھوڑا سا پانی پی کر میں نے خدا کا شکر ادا کیا جس نے اپنی قدرت اور رحمت سے بے شمار نعمتیں انسانوں کو مفت ہی عطا کر دی ہیں حالانکہ وہ اپنی قدر و قیمت کے اعتبار سے اَن مول ہیں۔ جھیل کے کنارے چند پتھروں پر بیٹھ کر میں سامنے کے منظر سے لطف اندوز ہونے لگا۔ اب سورج کچھ بلندی پر آ گیا تھا اور اُس کی روشنی سے زمین پر سائے پڑنے لگے تھے۔ میں روشنی اور سایوں کی ترتیب کو دیکھ کر ذہنی طور پر عجیب و غریب فنّی نمونے بنانے میں مصروف ہو گیا۔ اچانک میری نگاہ اپنے سامنے ایک انسانی سائے پر پڑی جو پھونک پھونک کر قدم اُٹھاتا ہوا میری جانب بڑھ رہا تھا۔ بغور دیکھنے پر یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وہ ایک عورت تھی جس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں ایک موٹا سا ڈنڈا تھام رکھا تھا اور اس انداز سے میری جانب بڑھ رہی تھی جیسے میں ہی اس کا نشانہ ہوں۔ میں نے پلٹ کر پیچھے دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اور حسبِ سابق بیٹھا اپنے سامنے پڑنے والے سائے کو دیکھتا رہا جس کی لمبائی میں قدم بہ قدم اضافہ ہو رہا تھا۔ میرے عین سر کے اوپر پہنچ کر اُس عورت نے دونوں ہاتھوں میں پکڑا ہوا ڈنڈا اوپر اُٹھایا اور پوری قوت سے میرے سر پر مارا۔ میں اس حملے کا منتظر تھا۔ میں نے پھرتی سے بائیں جانب قلا بازی لگائی اور چند فٹ تک لڑھکتا چلا گیا۔ پھر میں اُچھل کر اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا اور پہلی بار میں نے حملہ آور کا چہرہ دیکھا تو مجھے اپنی بصارت پر یقین نہیں آیا۔ میرے سامنے راجی اس عالم میں کھڑی ہوئی تھی کہ اس کے بال چہرے پر بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے پر وحشت اور درندگی کے تاثرات تھے اور وہ دیوانگی کے عالم میں مجھ پر دوسرا حملہ کرنے کے لیے خود کو تیار کر رہی تھی۔ مجھے اپنے حملے سے محفوظ دیکھا تو دانت پیستی ہوئی دوبارہ ڈنڈا تھامے ہوئے میری طرف لپکی، لیکن اب اس پر قابو پانا میرے لیے ذرا بھی مشکل نہیں رہا تھا۔ میں نے تیزی سے دائیں جانب جھک کر اپنا سر بچایا اور اس کے ساتھ ہی میرے بائیں ہاتھ نے ڈنڈے کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ راجی نے ڈنڈے کو چھڑانے کے لیے پورے جسم کی طاقت لگا دی۔

وہ جس جنونی کیفیت سے دوچار تھی اس کے پیشِ نظر اس کی طاقت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا، لیکن پھر بھی وہ میرا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں تھی۔ میں نے چند لمحوں میں اسکے ہاتھ سے ڈنڈا چھین کر دُور پھینک دیا۔ وہ وہ دیوانہ وار جھپٹی اور مجھ سے لپٹ گئی۔ میں اس حملے کے لیے قطعی تیار نہیں تھا۔ اس لیے جب وہ پوری طاقت کے ساتھ مجھ سے ٹکرائی تو میں اپنا توازن قائم نہیں رکھ سکا اور پتھریلی زمین پر گر گیا۔ وہ اُچھل کر مجھ پر سوار ہو گئی اور ناخنوں سے مجھے نوچنا کھسوٹنا شروع کر دیا۔ میں نے اس کے دونوں ہاتھوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا، لیکن پھر بھی میرے چہرے اور گردن پر اس کے تیز دھار دار ناخنوں نے خراشیں ڈال دی تھیں وہ غیظ و غضب کے عالم میں نہ جانے کیا کیا اول فول بک رہی تھی اور میری گرفت سے اپنی کلائیاں آزاد کرانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے جسم میں کوئی غیر مرئی طاقت حلول کر گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں آسانی سے اس پر قابو پانے میں ناکام رہا تھا۔ ہم دونوں آپس میں گتھم گتھا ہو کر زمین پر ایک طرف سے دوسری طرف لڑھک رہے تھے۔ اس کے بھنچے ہوئے دانت اور آگ برساتی آنکھوں سے درندگی ٹپک رہی تھی اور وہ بار بار اپنے بکھرے ہوئے بالوں کو اپنے چہرے سے ہٹانے کیلئے زور زور سے سر جھٹک رہی تھی، لیکن اسکے ساتھ ہی میری گرفت سے اپنے ہاتھوں کو آزاد کرانے کیلئے بھی زور آزمائی میں مصروف تھی۔ جب اسے اپنے ہاتھ بے قابو محسوس ہوئے۔ تو اس نے اپنے دانتوں سے کام لینا چاہا اور مجھے کاٹنے کے لیے منہ آگے بڑھایا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اس کا منہ میرے جسم تک پہنچ جاتا تو وہ میری بوٹی کاٹ لیتی۔ میں نے پوری طاقت سے اس کو جھٹکا دیا اور دُور پھینک دیا۔ وہ زمین پر گرتے ہی دوبارہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور بھوکی شیرنی کی طرح میری طرف لپکی۔ میں اس بار اس کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ میں نے اس کی دونوں کلائیاں مضبوطی سے ایک ہاتھ میں تھام لیں تو اس نے اپنے نوک دار جوتوں سے میری پنڈلیوں میں ٹھوکریں مارنی شروع کر دیں۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو کر کسی حیوان کا روپ دھار چکی ہے۔ میں نے اپنے آزاد ہاتھ سے پوری طاقت سے اس کے چہرے پر ایک طمانچہ رسید کیا۔ اور وہ ایک لمحے کے لیے ساکت رہ گئی۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے چہرے پر پے در پے کئی زوردار طمانچے مارے اور ساتھ ہی ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "راجی ہوش کرو۔ پاگل پن چھوڑ دو"

طمانچوں کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا اور اس کی ہیجانی کیفیت میں یک دم تبدیلی پیدا ہو گئی۔ چند لمحے تو وہ بے یقینی سے مجھے تکتی رہی اور پھر دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا کر بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں نے اس کی کلائیوں کو اپنی گرفت سے آزاد کیا تو وہ بالکل بے جان ہو کر زمین پر گر پڑی۔ اس کے رونے میں مزید شدّت پیدا ہو گئی تھی اور وہ چیخیں مار مار کر رو رہی تھی۔ میں چند قدم ہٹ کر کھڑا ہو گیا اور یہ تماشہ دیکھنے لگا۔ اس کے رونے کی آواز جنگل کی تنہائی اور ویرانی میں دُور دُور تک گونج رہی تھی اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر آس پاس کچھ لوگ موجود ہوں گے تو وہ یقیناً یہ آواز سن کر کھنچے چلے آئیں گے اور ایسا ہی ہوا۔ دوڑتے ہوئے قدموں کی آہٹ سن کر میں نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا اور اپنی قمیص کی جیب سے ریوالور نکال کر ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ میں نے تیزی سے اِرد گرد کا جائزہ لیا۔ پناہ لینے کے لیے —— چند گز کے فاصلے تک کوئی پتھریلی چٹان یا درخت موجود نہیں تھا۔ میرے سامنے راجی زمین پر دوزانو بیٹھی دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے رونے میں مصروف تھی۔ اگر میں خود کو بچانے کے لیے کسی درخت کی آڑ لے بھی لیتا تو راجی حملہ

آوروں کا نشانہ بن جاتی۔ اس لیے میں نے اپنی جگہ کھڑے رہ کر آنے والی مصیبت کا مقابلہ کرنے کی ٹھانی اور ریوالور نکال کر حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے بالکل تیار کھڑا ہو گیا۔ دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں نزدیک تر آگئی تھیں اور پھر ایک جانب سے میں نے رضیہ اور لالی کو نمودار ہوتے ہوئے دیکھا۔ رضیہ دو قدم آگے تھی اور بالکل چوکس تھی۔ اس کے ہاتھ میں راجی کا وہ پستول تھا جو میں نے گزشتہ رات پہریداری کے لیے رضیہ کے حوالے کیا تھا۔ مجھ پر نظر پڑی تو وہ دونوں رک گئیں اور حیرانی سے مجھے اور پھر میرے سامنے سمٹی ہوئی اور گریہ زاری کرتی ہوئی راجی کو دیکھنے لگی۔ میرا حلیہ دیکھ کر ان دونوں کو یقیناً حیرت ہوئی ہو گی کیونکہ میرے بکھرے ہوئے بالوں اور گرد آلود لباس کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ میں کسی غیر معمولی واقعے سے دوچار ہوا ہوں۔ پھر میرے چہرے پر لگی ہوئی خراشیں بھی خاصی معنی خیز تھیں۔ رضیہ نے گہری نظروں سے مجھے اور پھر راجی کو دیکھا اور چند قدم آگے بڑھ کر اس کے نزدیک پہنچ کر اس پر جھک گئی اس نے راجی کے پاس بیٹھ کر اس کے شانوں پر نرمی سے دونوں ہاتھ رکھ دیے اور ہمدردی سے کہنے لگی۔

"راجی۔ راجی۔ ہوش میں آؤ۔ اپنے آپ کو سنبھالو۔"

راجی کے رونے کی آواز ایک دم بند ہو گئی، لیکن اب وہ سسکیاں لے رہی تھی جس کی وجہ سے اس کے جسم میں لرزش سی پیدا ہو رہی تھی۔ لالی اب تک حیران کھڑی ہوئی تھی۔ وہ اُن دونوں پر نظر ڈال کر میری طرف آئی اور بولی "ملک جی کیا ہو گیا ہے۔ آپ کی حالت بھی ٹھیک نہیں ہے اور راجی بھی بین کر رہی ہے۔ خیریت تو ہے نا؟"

فوری طور پر مجھے کوئی معقول عذر نہیں سوجھا اس لیے جو بات فوراً میرے ذہن میں آئی میں نے اُگل دی "راجی پر آسیب کا سایہ ہو گیا ہے۔ وہ اپنے ہوش میں نہیں ہے۔"

لالی سہم کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی اور خوفزدہ نظروں سے راجی کی طرف دیکھنے لگی۔ رضیہ نے بھی میری بات سُن لی تھی اور سر اُٹھا کر حیرانی اور غصے سے میری جانب دیکھ رہی تھی۔

"یہ کیسے ہو گیا میاں جی؟" لالی کی سمجھ میں ابھی تک یہ بات نہیں آئی تھی کہ مجھے کس نام سے پکارے اس لیے کبھی ملک جی، کبھی چوہدری جی اور کبھی میاں جی کہہ کر مجھے مخاطب کیا کرتی تھی۔ میرے منہ سے بے اختیار جو فقرہ نکل گیا تھا میری دانست میں وہ موجودہ صورتِ حال کو سنبھالنے کے لیے بہترین عذر بن سکتا تھا۔ اس لیے میں نے رضیہ کی گھورتی ہوئی نظروں کی پرواہ کیے بغیر لالی کو مخاطب کیا "بھئی جنگلوں اور ویرانوں میں آسیب اور بدروحیں تو ہوتی ہی ہیں نا؟"

وہ بے اختیار سر ہلانے لگی۔

"اسی لیے تو نوجوان اور خوبصورت لڑکیوں کو کھلے آسمان کے نیچے اکیلے گھومنے پھرنے کو منع کیا جاتا ہے۔ بس راجی پر بھی کسی آسیب کی نظر پڑ گئی اور وہ اس پر مہربان ہو گیا۔" میں نے کہا۔

"ہائے اللہ" کہہ کر لالی سمٹ کر میرے نزدیک آگئی۔

"بس راجی کی حالت خراب ہو گئی۔ وہ بھاگتی ہوئی اور چیخیں مارتی ہوئی آئی اور جھیل میں کودنے لگی۔ میں نے روکنے کی کوشش کی تو دیکھو میرا کیا حال بنا دیا ہے؟" میں نے اپنے لباس اور چہرے کی خراشوں کی طرف اشارہ کیا۔

لالی نے سہمی ہوئی نظروں سے راجی کی طرف دیکھا جس کی سسکیاں اب بند ہو چکی تھیں۔ رضیہ اس کے پاس سے اُٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی اور کمر پر دونوں ہاتھ رکھے مجھے گھور رہی تھی۔

"جب کسی لڑکی پر آسیب آجاتا ہے تو اس میں کئی مردوں سے بھی زیادہ طاقت آجاتی ہے۔" لالی نے اپنی معلومات کا ذخیرہ لٹاتے ہوئے کہا۔ "اسکی چیخیں تو ہم نے بھی سُنی تھیں اسی لیے تو بھاگی ہوئی آئی ہیں۔ دراصل میری اور بھابی کی آنکھ ذرا دیر سے کھلی تھی۔" اس نے شرمندگی بھرے لہجے میں کہا۔ میں نے رضیہ کی جانب دیکھا وہ بھی کچھ نادم سی تھی۔ اُس نے نظریں جھکا لیں۔

"پھر اب کیا ہو گا ملک جی؟ راجی کا کیا بنے گا؟ اس کے لیے تو کوئی پیر فقیر ڈھونڈنا پڑے گا۔ کوئی سید ہی اس کے سر پر سے آسیب کا سایہ ہٹا سکتا ہے۔"

"میں خود سید ہوں۔" میں نے رُعب دار آواز میں کہا اور آنکھیں نکال کر اُسے گھورنے لگا۔ وہ ڈر کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ "میں نے اس پر عمل پڑھ کر پھونک دیا ہے اور اب اسے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ تھوڑی دیر میں یہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔"

لالی سمٹ کر پیچھے ہٹتی ہوئی رضیہ کے نزدیک پہنچ کر رُک گئی اور سوالیہ نظروں سے اسکو دیکھنے لگی۔ اس کی حالت دیکھ کر رضیہ کے لیے بھی ہنسی کو روکنا مشکل ہو رہا تھا اس لیے وہ راجی کو دیکھنے کے بہانے اس پر جھک گئی اور شانے تھام کر اُسے اُٹھاتے ہوئے بولی۔ "اللہ نے بڑا فضل کر دیا ہے۔ اب یہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔"

راجی خاموشی سے اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں اور بے حد تھکی تھکی نظر آنے لگی تھی۔ وہ مجھ سے اور رضیہ سے آنکھیں ملاتے ہوئے گھبرا رہی تھی۔ یکایک لالی کی نگاہ سامنے زمین پر پڑے ہوئے موٹے ڈنڈے پر پڑی اور اس کی آنکھیں خوف سے پھٹ گئیں۔ "بی بی جی۔ یہ۔ یہ۔ یہ تو۔۔۔۔ یہ تو۔۔۔۔" وہ کہتے کہتے رُک گئی۔ الفاظ اس کے منہ سے نہیں نکل رہے تھے۔

"تم ٹھیک سمجھی ہو لالی۔" میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "یہ آسیبی ڈنڈا ہے جو راجی کے ہاتھ میں تھا۔ وہ تو شکر ہے کہ مجھے ایک عمل یاد تھا جو میرے اباجی نے سکھا دیا تھا کہ بُرے وقت میں کام آئے گا۔"

لالی ڈنڈے سے دُور ہٹ گئی مگر میں نے بڑھ کر ڈنڈا اُٹھا لیا اور اُسے زور سے گھما کر جھیل میں پھینک دیا۔ لالی کی خوفزدہ نظریں جھیل کی سطح پر جمی ہوئی تھیں۔ شاید وہ یہ توقع کر رہی تھی کہ چند لمحے بعد جھیل کے اندر سے کوئی جن یا بھوت برآمد ہو گا۔ اسی لیے وہ مزید سہم کر رضیہ کی اوٹ میں کھڑی ہو گئی تھی۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی ظاہر ہے کہ جھیل میں سے کوئی نادیدہ چیز برآمد نہیں ہو سکتی تھی مگر لاشعوری طور پر ہم سب کی نگاہیں اسی طرف لگی ہوئی تھیں۔ یہاں تک کہ راجی بھی اُسی طرف دیکھ رہی تھی۔ جب کچھ دیر تک جھیل میں کوئی چیز نظر نہ آئی تو لالی نے مایوسی سے میری جانب دیکھا۔ اتنی دیر میں رضیہ راجی کا ہاتھ تھام کر اُسے لینڈ روور کی طرف لے جانے لگی۔ لالی پہلے تو سہمی کھڑی رہی پھر تیزی سے بھاگتی ہوئی رضیہ کے ساتھ ساتھ قدم ملا کر چلنے لگی۔

اب سب سے پہلا کام ناشتے سے فارغ ہونا تھا۔ میں نے لینڈ روور کے پاس پہنچ کر جلدی سے کھانے پینے کا کچھ سامان نکال کر سب کو پیش کیا۔ چائے کی خواہش بھی تھی، لیکن دن زیادہ چڑھ آیا تھا اور چائے بنانے میں مزید وقت ضائع ہو جاتا اس لیے چائے کی جگہ پانی پی کر گزارہ کیا گیا اور ہم سب ایک بار پھر لینڈ روور میں سوار ہو گئے۔ راجی اب کافی پُرسکون نظر آ رہی تھی۔ میرا خیال ہے کہ زور زور سے چیخنے اور رونے کی وجہ سے اس کے کشیدہ اعصاب کو خاصا سکون ملا تھا اور وہ رات بھر جس ہیجانی کیفیت اور اعصابی تناؤ کا شکار رہی تھی اب اس کو اس سے نجات مل گئی تھی۔ اُس نے ایک بار بھی میری طرف نگاہ اُٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ رضیہ سے نظریں ملاتے ہوئے بھی وہ ہچکچا رہی تھی، لیکن صاف ظاہر تھا کہ اب وہ قریب قریب نارمل ہو چکی تھی۔

گاڑی کو موڑ کر میں نے دوبارہ اسی سڑک پر ڈال دیا تھا جس پر ہم گزشتہ روز سفر کرتے رہے تھے۔ رضیہ مجھ سے

کئی بار پوچھ چکی تھی کہ آخر ہم کون سے راستے پر جا رہے ہیں اور ہماری منزل کون سی ہے؟ لیکن میں نے جواب میں خاموشی اختیار کیے رکھی کیونکہ اس سوال کا جواب تو میں خود بھی نہیں جانتا تھا۔ لالی راجی سے دُور ہٹ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ شاید احتیاطاً وہ اس آسیب سے محفوظ رہنا چاہتی تھی جو راجی پر آ گیا تھا حالانکہ میں نے اسے کئی بار یقین دلانے کی کوشش بھی کی تھی "آسیب ہر جگہ نہیں پائے جاتے اور نہ ہی وہ لڑکی پر مہربان ہوتے ہیں، لیکن وہ پریشانی سے بار بار کہہ رہی تھی کہ ملک صاحب۔ جوان اور سوہنی تو میں بھی ہوں۔ کوئی آسیب مجھ پر عاشق ہو گیا تو میں کیا کروں گی؟ اس آسیب زدہ علاقے سے جلدی بہت دُور چلے چلیں۔"

آسیب کی پرابلم سے قطع نظر خود مجھے کسی آباد علاقے میں پہنچنے کی جلدی تھی اس لیے میں نے گاڑی کی رفتار بہت تیز کر دی تھی۔ ہم نے بمشکل تیس چالیس میل کا فاصلہ طے کیا ہو گا کہ فضا میں ایک بار پھر بھن بھناہٹ سی گونجنے لگی۔ سب سے پہلے ہیلی کاپٹر کی یہ آواز میں نے سُنی تھی اور فوراً گاڑی کو درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف لے جا کر پارک کر دیا تھا۔ وہ تینوں حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگیں مگر جب ہیلی کاپٹر کی آواز کچھ واضح اور صاف ہوئی تو وہ بھی خاموش ہو کر دُبکی بیٹھی رہیں۔ ہیلی کاپٹر ہمیں نظر تو نہیں آیا تھا لیکن آواز سے اندازہ ہوا کہ وہ ہمارے اوپر سے پرواز کرتا ہوا گزر گیا تھا۔ میں نے کچھ دیر اس کے واپس آنے کا انتظار کیا، لیکن جب اس کی آواز بالکل معدوم ہو گئی تو ہم نے دوبارہ سفر کا آغاز کر دیا۔ مجھے کوئی اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ یہ ہیلی کاپٹر کس کا تھا اور کیوں پرواز کر رہا تھا؟ لیکن اس دُور دراز علاقے میں ہیلی کاپٹر کی پرواز بے مقصد اور بے مطلب نہیں ہو سکتی تھی۔ مجھے یہ اندیشہ تھا کہ ممکن ہے پولیس میری تلاش میں سرگرداں ہو اور اس مقصد کے لیے انہوں نے ہیلی کاپٹر کا استعمال ضروری سمجھا ہو۔ ہیلی کاپٹر کے رُخصت ہونے کے بعد ہمارا سفر دوبارہ شروع ہو گیا۔ اس دوران میں سوائے لالی کی آواز کے کسی اور کی آواز سُنائی نہیں دے رہی تھی۔ راجی اور رضیہ اپنے خیالوں میں گم تھیں۔ رضیہ کے پاس بھی سوچنے اور فکر کرنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ مثلاً یہ کہ وہ اپنے شوہر سے دُور تھی اور ایک جگہ ایک ایسے اجنبی کے ساتھ رہ چکی تھی جسے اس کا شوہر ظاہر کیا گیا تھا اور خود رضیہ نے بھی اس کی تردید نہیں کی تھی بلکہ ایک بیوی کی حیثیت سے اس کے ساتھ زندگی بسر کرتی رہی تھی جبکہ اس کا اصلی شوہر بدستور اس کی کھوج میں لگا ہوا تھا۔ جہاں تک رحمت چوہدری کا تعلق ہے اس میں کوئی شک و شبہے کی گنجائش نہیں تھی کہ ملک منصور نے اس کے ڈیرے کی اینٹ سے اینٹ بجا دی ہو گی۔ چوہدری اگر ملک منصور کے ہاتھ زندہ لگا ہو گا تو اس نے میرے اور رضیہ کے بارے میں بھی ملک منصور کو بہت کچھ بتا دیا ہو گا۔ پھر جب ہم لوگ وہاں سے رُخصت ہو کر ہیرا ڈاکو کے علاقے میں اغوا کر لیے گئے تو غالباً ملک منصور کو اس کی اطلاع ملی ہو گی یا ہو سکتا ہے وہ کسی اور مقصد سے ہیرا ڈاکو کے ڈیرے پہ آیا تھا؟ ہیرا ڈاکو نے اسے کیا بتایا ہو گا اور ہم لوگوں کو وہاں سے غائب پا کر ملک منصور کے تاثرات کیا ہوں گے؟ یہ سب باتیں یقیناً رضیہ کے سوچنے کی تھیں اور خاصی پریشان کُن بھی تھیں، لیکن اس بارے میں فی الحال میں یا رضیہ کچھ بھی نہیں کہہ سکتے تھے۔ دوسری طرف راجی تھی جو ہیرا ڈاکو کو ٹھکرا کر اس کے قبضے سے بھاگ نکلی تھی۔ ہیرا ڈاکو انتقاماً اس کے اہلِ خاندان سے کیا سلوک کرے گا؟ یہ خیال اس کے لیے خاصا تشویشناک ہو گا۔ لیکن ان دونوں کے مسائل کے علاوہ خود میرے مسائل کیا کم تھے؟

میرے لیے اُلجھن اور پریشانی کا سبب یہ تھا کہ میرے ذاتی مسائل جوں کے توں تھے جبکہ میں بلاوجہ دوسروں کے مسائل میں اُلجھتا جا رہا تھا۔ میرے پیچھے پولیس لگی ہوئی تھی۔ غنڈوں کے طاقتور اور خطرناک گروہ میری کھوج میں تھے۔ پھر یہ بھی حقیقت تھی کہ میری غیر موجودگی میں فائدہ اُٹھا کر ٹونی نے خدا جانے اور کتنے جرائم میرے سر منڈھ دیے ہوں گے۔ لیکن میں حالات کے جال میں اس بُری طرح پھنسا تھا کہ اس میں سے نکلنے کے لیے جتنے ہاتھ پیر مارتا تھا۔

اس جال کا شکنجہ اتنا ہی زیادہ تنگ ہوتا جا رہا تھا۔

ہم لوگ قریب قریب تین گھنٹے تک مسلسل سفر کرتے رہے یہاں تک کہ رضیہ اور لالی نے خواہش ظاہر کی کہ کسی جگہ رُک کر ٹانگیں سیدھی کر لیں اور تھوڑی بہت پیٹ پوجا بھی کر لیں۔ خیال بُرا نہیں تھا۔ خود میں نے بھی ناشتے کے نام پر صرف چند بسکٹ ہی کھائے تھے اور چائے کا سامان ہونے کے باوجود چائے سے محروم رہا تھا جس کی وجہ سے ہم سب کسلمندی اور تھکان کا شکار ہو رہے تھے۔ میں نے سفر کے دوران کوئی ایسی جگہ نہیں دیکھی تھی جہاں ہم لوگ کچھ دیر قیام کر سکیں۔ سب سے زیادہ کوفت اس بات کی تھی کہ ہمیں کچھ پتہ نہیں تھا کہ ہم کس علاقے میں ہیں اور کس طرف جا رہے ہیں۔ راستے میں ہمیں نہ کوئی سواری نظر آتی تھی نہ کوئی آدمی۔ عجیب ویران اور غیر آباد علاقہ تھا۔ حالانکہ موسم اور آب و ہوا کے اعتبار سے یہ بہت خوبصورت اور دلکش تھا، لیکن انسانوں نے اس طرف کا رُخ نہیں کیا تھا۔ حالانکہ یہاں ریسٹ ہاؤس اور تفریح گاہیں بنائی جا سکتی تھیں جو تھکے ماندے شہریوں کے لیے بے حد پُرسکون اور آرام دہ ثابت ہو سکتی تھیں۔

یکایک ایک کچی سڑک سے کچھ فاصلے پر ایک اونچے ٹیلے پر مجھے ایک پرانی سی عمارت نظر آئی اور میں احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر میں نے لینڈ روور کا رُخ اُس طرف موڑ دیا۔ یہ ایک پرانی اور بوسیدہ سی عمارت تھی جسے کھنڈر بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اس کے سامنے ایک مختصر سا برآمدہ تھا۔ اسکی کھپریل کی چھت تھی اور یہ عمارت ایک اونچے ٹیلے پر بنی ہوئی تھی جس کے آس پاس بارہ پندرہ کینال زمین تھی۔ عمارت تک پہنچنے کے لیے کوئی باقاعدہ راستہ نہیں تھا اس لیے میں نے گاڑی ٹیلے کے نیچے روک دی اور تینوں خواتین کو گاڑی میں چھوڑ کر جائزہ لینے کی غرض سے اُس عمارت کی طرف بڑھ گیا۔ احتیاطاً میں نے ریوالور ہاتھ میں لے لیا تھا۔ تھوڑی سی چڑھائی کے بعد کھلا میدان تھا اور سامنے عمارت کا برآمدہ نظر آ رہا تھا۔ دیکھنے میں بظاہر یہ کسی ریسٹ ہاؤس کی عمارت نظر آتی تھی۔ اور آثار بتا رہے تھے کہ یہ غیر آباد ہے۔ میں نے برآمدے میں پہنچ کر بند دروازوں کو دیکھا اور ایک دروازے کو ہاتھ سے بجایا۔ جواب میں کوئی باہر نہیں نکلا۔ میں نے ایک دروازے کو زور سے دھکیلا۔ باہر سے اس کی کنڈی نہیں لگی ہوئی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ عمارت کے اندر کوئی موجود تھا۔ دروازہ زیادہ زور لگائے بغیر ہی کھُل گیا۔ میں نے ریوالور سنبھال کر اندر قدم رکھا۔ یہ ایک خاصا بڑا کمرا تھا جس میں پرانا فرنیچر لگا ہوا تھا۔ زمین پر دری کا فرش تھا۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر بوسیدہ اور بدرنگ پردے لٹکے ہوئے تھے میں نے با آوازِ بلند کہا "اندر کوئی ہے؟" میں دو تین بار پکارنے کے باوجود کوئی جواب نہیں ملا۔ میں نے آگے قدم بڑھایا۔ یہ کمرہ غالباً ڈرائنگ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ سامنے دو اور کمروں کے دروازے نظر آ رہے تھے۔ میں نے ایک دروازہ کھٹکھٹایا۔ کوئی جواب نہیں ملا تو میں نے دروازہ کھول کر اندر قدم رکھا اور وہیں ٹھٹک کر رہ گیا۔ سامنے ایک پرانی طرز کی نواری مسہری پر ایک میلا سا بستر بچھا ہوا تھا اور اس بستر پر ایک درمیانہ عمر کا صحت مند شخص مسہری کے سرہانے سے ٹیک لگائے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ کھلی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ اُس کے سینے پر تھے جس میں ایک خنجر پیوست تھا اس کے ہاتھ اور سامنے کا لباس خون میں تربتر تھا۔ میں جھجکتا ہوا آگے بڑھا یہ شخص کافی دیر پہلے مر چکا تھا کیونکہ اس کا خون اب جمنے لگا تھا۔ میں نے گھبرا کر چاروں طرف نظر دوڑائی۔ برابر والا کمرہ خالی تھا۔ باورچی خانے میں گندے اور بغیر ڈھلے ہوئے برتن بکھرے ہوئے تھے۔ میں دوبارہ مقتول کے کمرے میں گیا۔ کمرے میں مسہری اور چند پرانی کرسیوں کے علاوہ کوئی اور سامان موجود نہیں تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر لاش کی آنکھیں بند کرنے کی کوشش کی مگر وہ اکڑ چکی تھیں۔ ان بے نور آنکھوں کو دیکھنا ایک خوفناک تجربہ تھا۔ اس لیے میں نے قریب کرسی پر پڑا ہوا میلا سا تولیہ اُٹھا کر لاش کا چہرہ ڈھانپ دیا۔ سوال یہ تھا کہ یہ شخص اگر اس گھر کا مالک تھا تو گھر کے دوسرے مکین کہاں چلے گئے تھے؟ اور اسے کس نے اور کس مقصد کے لیے ہلاک کیا تھا؟

میں اس کے لیے اب کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے واپس لوٹنا ہی مناسب تھا۔ میں نے پلٹ کر دروازے کی طرف

قدم بڑھایا لیکن ایک کار کے تیز ہارن کی آواز سن کر ٹھٹک گیا۔ یہ میری لینڈ روور کے ہارن کی آواز نہیں تھی۔ تو پھر یہ کس کی گاڑی تھی؟ میں تیزی سے لپک کر باہر نکلا مگر برآمدے میں پہنچ کر میرے قدم خود بخود رُک گئے۔ سیڑھی کے نیچے کچھ فاصلے پر جہاں میں لینڈ روور چھوڑ کر آیا تھا وہاں ایک اور جیپ کھڑی ہوئی تھی۔ جیپ کی اگلی سیٹ پر پولیس کا ایک سپاہی بیٹھا ہوا تھا اور اس کے تھوڑے فاصلے پر دو پولیس والے لالی، رضیہ اور راجی کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے کھڑے تھے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں خودکار جدید رائفلیں تھیں۔ میں نے ریوالور تھام کر آگے قدم بڑھایا لیکن ایک کرخت اور تحکمانہ آواز نے میرے قدموں میں زنجیر ڈال دی۔

"خبردار۔ ہتھیار پھینک کر ہاتھ اوپر اُٹھا لو ورنہ بھون دیے جاؤ گے۔"

یہ آواز ایک لحیم شحیم قد آور تھانیدار کی تھی۔ پستول اس کے ہاتھ میں تھی جس کا نشانہ میں تھا۔ تھانے دار کے چہرے پر مختصر سی سیاہ ڈاڑھی اور نوکدار مونچھیں تھیں اور دیکھنے میں وہ ایک بے رحم اور خونخوار آدمی نظر آتا تھا۔ میں چاہتا تو اپنے ریوالور کو استعمال کر کے ایک موقع حاصل تو کر سکتا تھا، لیکن اس طرح پولیس کے سپاہیوں کی زد میں آئی ہوئی تینوں لڑکیوں کی جان یقیناً خطرے میں پڑ جاتی۔ پھر بھی میں نے خطرہ مول لینے کا ارادہ کر لیا۔ رضیہ پر مجھے پورا بھروسہ تھا کہ اگر میں تھانیدار کو قابو کرنے میں کامیاب ہو گیا تو وہ ان دونوں سپاہیوں پر قابو پا سکتی تھی۔ میں نے اپنے ریوالور کو حرکت دیے بغیر تھانیدار کے عقب میں نگاہیں دوڑائیں اور مایوسی کی ایک سرد لہر میرے تمام جسم میں دوڑ گئی۔ کیونکہ تھانیدار سے دس بارہ فٹ کے فاصلے پر ایک بڑے سے درخت کی آڑ میں ایک اور پولیس کا سپاہی موجود تھا جس کے ہاتھ میں شین گن تھی۔ وہ ایک ایسے مقام پر متعین تھا جہاں سے وہ نہایت آسانی کے ساتھ ہم سب کو گولیوں کا نشانہ بنا سکتا تھا۔ گویا میرے لیے بچاؤ اور فرار کا کوئی راستہ باقی نہیں رہا تھا اور آخرکار میں پولیس کے قابو میں آ گیا تھا۔

میں نے ریوالور کو اپنے سامنے فرش پر پھینک دیا اور دونوں ہاتھ بلند کیے ہوئے برآمدے سے باہر نکل آیا۔ تھانیدار پستول کو اپنی پیٹی میں ڈال کر مسکرایا اور اُس نے کمر سے لٹکی ہوئی ہتھکڑی کھول کر میری جانب قدم بڑھاتے ہوئے اپنی بھاری اور کرخت آواز میں بولا۔

"شاباش جوان۔ تم نے بہت اچھا کیا کہ مقابلے کے بغیر ہی گرفتاری پیش کر دی ورنہ پولیس مقابلے میں کام آ جاتے۔ ہاتھ آگے پھیلا دو۔"

میں نے اس کے حکم کے مطابق دونوں ہاتھ آگے پھیلا دیے۔ وہ مضبوط اور بھاری قدموں سے آگے بڑھا اور اُس نے میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں۔ خوف، مایوسی اور غصے کی ایک لکیر میرے خون کو گرماتی ہوئی سارے جسم میں گھوم گئی۔ یوں لگا جیسے میرا تمام جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے۔ میری تمام بھاگ دوڑ اور تگ و دو ناکام ثابت ہو گئی تھی اور میرا ہم شکل بالآخر اپنے منصوبے میں ہو گیا تھا۔ پولیس کا پھندہ مجھے اپنی گرفت میں لے چکا تھا اور وہ وقت دُور نہیں تھا۔ جب پھانسی کا پھندہ میری تمام مشکلیں آسان کرنے والا تھا۔ یہ روح فرسا خیالات میرے ذہن میں گشت کر رہے تھے جب تھانیدار نے ایک موٹی سی گالی دے کر مجھے دھکیل کر جیپ کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔ دونوں سپاہیوں نے لالی۔ رضیہ اور راجی کو دھکیل کر پولیس کی کھلی جیپ میں بٹھا دیا اور خود بھی اس میں سوار ہو گئے۔ مشین گن بردار سپاہی بھی جیپ میں چڑھ گیا تھا۔ تھانیدار نے پستول نکال کر میری گردن پر رکھتے ہوئے مجھے لینڈ روور کی جانب چلنے کا حکم دیا۔ میرے لیے اس کی تعمیل کرنے کے سوا کوئی اور چارہ باقی نہیں رہا تھا۔

میرا اور لینڈ روور کا درمیانی فاصلہ چند قدم سے زیادہ نہیں تھا لیکن میرے لیے یہ ایک طویل اور لامتناہی فاصلہ بن گیا تھا۔ میرے پاؤں مَن مَن بھر کے ہو گئے تھے اور تمام جسم سنسنا رہا تھا۔ چند لمحے کے لیے تو یوں محسوس ہوا جیسے اب میرے رہنے کی جگہ نہیں رہی اور میں نے اپنی زندگی پوری

کر لی۔ کیوں کہ اس کے بعد پیش آنے والے واقعات کا مجھے بخوبی اندازہ تھا۔ میں جو کہ ایک خوددار، عزتِ نفس کا پرستار اور اچھی شہرت رکھنے والا شخص تھا۔ تقدیر کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس کر بے قابو ہو چکا تھا۔ پولیس کے قبضے میں آ جانے کا مطلب پوری طرح واضح تھا۔ اگلا قدم رُسوائی، مقدمہ بازی اور بالآخر ذلت آمیز موت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ کاش میں نے پے در پے رونما ہونے والے واقعات میں خود کو اُلجھا کر اپنا وقت ضائع نہ کیا ہوتا اور جس ارادے سے اپنے گھر سے نِکلا تھا اپنی تمام تر توجہ اور جدّوجہد اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے صرف کر دی ہوتی تو آج یوں بے بس اور مجبور نہ ہوتا۔ مجھے صرف یہ ثابت کرنا تھا کہ میں ایک قانون پسند اور شریف شہری ہوں اور میری جگہ میرے گھر میں رہنے والا اور میرے کاروبار کو چلانے والا میرا ہم شکل ایک بدترین مجرم، ڈاکو اور قاتل ہے۔ رفتہ رفتہ ٹونی کے بارے میں میری نگاہوں کے سامنے سے تمام پردے ایک ایک کر کے ہٹ چکے تھے اور اب میں اس بدباطن شخص کی اصلیت اور قبیح ارادوں سے پوری طرح واقف ہو چکا تھا۔ وہ ایک چالاک اور منصوبہ باز جعلساز تھا جس نے میری بے وفا بیوی اور غدار دوست کی حمایت اور اشتراک سے مجھے برباد کرنے کا ایک جامع اور مکمل منصوبہ بنا کر ایک طویل عرصے تک مناسب موقعے کا انتظار کیا تھا۔ یہاں تک کہ میں اُن لوگوں کے چُنگل میں پوری طرح پھنس گیا اور جب مجھے حقیقتِ احوال کا علم ہوا تو پانی سر سے گزر چکا تھا۔ میری بے وفا بیوی روزی جس کی وفا شعاری اور خدمت گزاری پر مجھے ناز تھا۔ اپنی ناپاک سازش میں کامیاب ہو چکی تھی۔ وہ میرے قابلِ اعتماد دوست شوکت کی محبت میں مبتلا تھی اور مجھ سے شادی کرنے سے پیشتر ہی وہ دونوں گناہ کی دلدل میں دھنسے ہوئے تھے۔ مجرموں کے سرغنہ ٹونی کو میری جگہ بٹھانے کا منصوبہ بھی اُن دونوں کی باہمی سازش ہی کی ایک کڑی تھی۔ میں نے شوکت اور روزی کی راز و نیاز بھری گفتگو سُن لی تھی اور ان کے ارادوں اور منصوبوں سے پوری طرح واقف ہو چکا تھا۔ اُن دونوں کا یہ خوفناک اور گھناؤنا روپ ابھی تک ٹونی کی نگاہوں سے بھی پوشیدہ تھا اور بہت ممکن ہے وہ ان کی حقیقت سے کبھی آگاہ ہی نہ ہو سکے۔ کیونکہ اپنی تمام تر چالاکی اور مکاری کے باوجود وہ شوکت اور روزی کے مکر و فریب کی گہرائیوں کا راز پانے سے قاصر تھا۔ ٹونی کا انجام روزی اور شوکت کے باہمی اشتراک اور سازش کے نتیجے میں جو بھی ہونے والا تھا اس سے مجھے قطعی دلچسپی نہ تھی۔ اس لیے کہ اگر میں اپنی اصلیت اور بے گناہی ثابت کرنے میں ناکام رہا اور ٹونی قرار دے کر ناکردہ گناہوں کی سزا بھگتنے کے لیے جیل کی تاریک چار دیواری میں ڈال دیا گیا یا پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا گیا تو پھر میرے لیے یہ بات بالکل بے معنی اور بے مقصد تھی کہ خود ٹونی ان دونوں شیطان صفت لوگوں کے باعث کس ہولناک انجام کو پہنچتا ہے۔ میری نجات کا صرف ایک ہی راستہ تھا اور وہ یہ تھا کہ میں کس طرح قانون کے سامنے یہ ثبوت پیش کر دوں کہ دراصل میں ہی یوسف ہوں اور ٹونی جو میرا ہم شکل ہے دراصل پورے درجے کا گناہگار اور جرائم پیشہ انسان ہے۔ لیکن یہ ثابت کرنا ہی بے حد مشکل تھا کیونکہ دُنیا میں جب اپنے ہی بیگانے اور دشمن بن جائیں تو پھر کوئی کہاں تک تقدیر کے وار سے بچ کر اپنی بریت میں کامیاب ہو سکتا ہے! ٹونی نے روزی اور شوکت کے ساتھ مل کر ایک مکمل اور تفصیلی سازش کی تھی اور سازش کا یہ جال کافی عرصے پہلے پھیلایا گیا تھا۔ دراصل جیسا کہ مجھے روزی اور شوکت کی گفتگو سے معلوم ہو چکا تھا۔ روزی کے ساتھ میری شادی کرانے کی مہم بھی اسی سازش کا حصہ تھی۔ شوکت نے میرے خلوص، بھروسے اور دوستی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے پہلے تو میری بے لوث محبت کو ٹھکانے لگایا اور عاشی اور میرے مابین ایسی غلط فہمیاں پیدا کر دیں کہ میں اور عاشی نہ صرف ایک دوسرے کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے بلکہ ایک دوسرے کو بے وفا اور عہد شکن سمجھ کر نفرت کی آگ میں جلنے لگے تھے۔ اس کے بعد دوسرا قدم یہ تھا کہ روزی کو انتہائی رنگین اور حسین لڑکی کے روپ میں مجھ سے متعارف کرایا گیا۔ روزی نے اپنی محبت اور قربانی کا مظاہرہ کرنے میں اس قدر مہارت کا ثبوت دیا کہ کوئی بڑے سے بڑا عقلمند اور ہوشیار شخص بھی اس کی بے داغ

اداکاری سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اُس نے اپنے حسن وجمال کی چاندنی میرے چاروں طرف بکھیر دی۔ اپنی خدمت اور بے لوث محبت کے باعث میرے دل میں اپنے لیے ایک مقام پیدا کر لیا۔ کاروبار میں شوکت کا حصہ دار بننے کے لیے مجھے نقد سرمایہ فراہم کیا اور اس کے جواب میں کسی چیز کی خواہش نہیں کی۔ میں بھی آخر ایک گوشت پوست کا حساس انسان تھا۔ اس کی ان وفا شعاریوں اور قربانیوں سے کیسے مرعوب اور متاثر نہ ہوتا! پھر شوکت اس تمام عرصے میں انتہائی چالاکی اور مہارت کے ساتھ میرے اردگرد سازش کے تانے بانے کو مضبوط کرتا رہا یہاں تک کہ میں اس میں جکڑ کر بالکل بے بس ہو کر رہ گیا۔ روزی میری بیوی بن گئی۔ اگرچہ میرے دل اور ذہن سے عاشی کی محبت اور خیال محو نہیں ہو سکا تھا لیکن بنیادی طور پر میں روزی کا شوہر تھا اور اس کے اظہار محبت و خلوص کے نتیجے میں اس کو اپنی تمام تر محبت اور توجہ نہ دینے کی وجہ سے خود کو اس کا مجرم خیال کرنے لگا تھا۔ دوسری طرف عاشی جو مجھے بے وفا اور عہد شکن سمجھنے میں بالکل حق بجانب تھی۔ میری ہی طرح پیار کے اس جذبے کو دل سے مٹانے میں ناکام رہی تھی اور چپکے چپکے میری پرستش کر رہی تھی۔ بظاہر وہ میری بے وفائی کا شکار ہونے کی وجہ سے مجھ سے نفرت کرنے لگی تھی لیکن پیار کی شمع ہمیشہ اس کے دل کے نہاں خانے میں روشن رہی تھی اور وہ میری دغابازی کے بعد کسی اور مرد کو اپنے دل اور زندگی میں کوئی مقام دینے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اگرچہ لوٹی اور روزی کی سازش کا شکار ہونے کے بعد جب مجھے کوئی اور ہمدرد اور آسرا نظر نہ آیا تھا تو میں نے عاشی ہی کے دامن میں پناہ لینے کی کوشش کی تھی اور اس کو اپنی بے گناہی اور معصومیت کا یقین دلانے میں کامیاب بھی ہو گیا تھا لیکن اُس وقت حالات ایسا رُخ اختیار کر چکے تھے کہ میری وجہ سے خود عاشی کی زندگی تلخیوں اور مصائب کا شکار ہو سکتی تھی۔ جس کے لیے میں قطعی تیار نہیں تھا۔ میری زندگی اور جدوجہد کا واحد مقصد یہ باقی رہ گیا تھا کہ خود کو معاشرے میں اور دنیا میں ایک معزز شخص ثابت کرنے کے لیے کسی طرح لوٹی، روزی اور شوکت کی سازش کو ناکام بنا دوں اور ساری دنیا اور قانون کو یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو جاؤں کہ میں ہی حقیقت میں یوسف ہوں اور میری جگہ لینے والا خبیث شخص پرلے درجے کا گھٹیا اور انتہائی سنگین جرائم میں ملوث انسان ہے۔ کہنے کو یہ ایک معمولی سی بات تھی لیکن ہر ثبوت کیونکہ لوٹی کے حق میں تھا اور میری اصل شناخت اُس وقت تک نہیں ہو سکتی تھی جب تک کہ لوٹی کو میرے قریب ترین اور انتہائی قابل اعتماد لوگوں کی تائید اور حمایت حاصل تھی اس لیے میں ایک برگِ آوارہ کی مانند اِدھر سے اُدھر مارا مارا پھر رہا تھا۔ اور ایک کے بعد دوسری مشکل میں گرفتار ہونا میرے لیے ایک معمول بن چکا تھا۔ میں نے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کی کوشش میں کیا پاپڑ نہیں بیلے تھے۔ اور کن کٹھن مراحل سے نہیں گزرا تھا۔ یہ واقعات قارئین سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ لیکن پیہم ناکامیاں اور مسلسل مایوسیاں میرا مقدر بن چکی تھیں۔ اپنی شناخت ثابت کرنے کی کوشش میں مجھے لاتعداد حوادث کا نشانہ بننا پڑا تھا۔ بے شمار دشوار گھاٹیوں سے گزرنا پڑا تھا اور اس کے باوجود میری منزل نگاہوں سے بدستور اوجھل تھی بلکہ اب تو میں ایک گم کردہ راہ انسان تھا جسے اپنے مستقبل اور آئندہ زندگی کے بارے میں مطلق اندازہ اور علم نہیں تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اتنے طویل عرصے اپنے بدترین دشمنوں سے دور رہنے کی وجہ سے میں اور کن مزید مشکلات میں پھنس چکا ہوں۔ وہ ہر لمحہ میری تاک میں تھے، انھیں ہر دم میری گرفتاری یا موت کی خبر کا انتظار تھا اور میں جو کہ خود کو ایک جری، جی دار اور تجربہ کار انسان سمجھتا تھا ایک ایسے بے بس شکار کی مانند جگہ جگہ بھاگتا پھر رہا تھا جس کے تعاقب میں خونخوار شکاری لگے ہوئے تھے اور جس کے گرد صیاد کے جال کا پھندا تنگ سے تنگ تر ہوتا جا رہا تھا۔

میں ان خیالات میں کھویا ہوا کس وقت لینڈ رُوور تک پہنچا اور میں نے کب گاڑی کو سٹارٹ کر کے راستہ

پر ڈالا، مجھے اس کا کوئی احساس نہیں ہوا یہاں تک کہ تھانیدار کے پستول کی سرد اور آہنی نالی سختی سے میری گردن کے پچھلے حصے میں چبھنے لگی۔ میں نے ہڑبڑا کر اپنے برابر والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھانیدار کو دیکھا جو خونخوار نگاہوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ نہ جانے وہ کب سے مجھے مخاطب کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میں اپنے خیالات کے سمندر میں گم اور دنیا و مافیہا سے قطعی بے خبر تھا۔

اوئے اُلو کے کان۔ کیا تم بہرے ہو؟" وہ آنکھیں نکال کر مجھ سے پوچھ رہا تھا۔

میں نے حیران اور اجنبی نگاہوں سے اسکو دیکھا اور چند لمحے تک یہ احساس ہی نہیں کر سکا کہ میں اس وقت پولیس کی حراست میں ہوں اور گاڑی چلا رہا ہوں۔ میں یادوں اور تلخیوں کی اُس دھند سے باہر نکلا تو مجھے صورت حال کا پوری طرح احساس اور آگہی ہوئی۔ "معاف کرنا انسپکٹر صاحب!" میں نے اپنے ہتھکڑی لگے ہوئے ہاتھوں سے سٹیرنگ کو قابو میں کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "میں کچھ سوچنے لگا تھا۔" اسے میرا انسپکٹر کہہ کر مخاطب کرنا اسے بہت بھلا لگا تھا۔ اس کے خونخوار چہرے پر ایک خوفناک مسکراہٹ نمودار ہوئی جس کی وجہ سے اس کی نوکدار مونچھیں اور زیادہ نوک دار نظر آنے لگیں۔

"سنو کھوتے۔" وہ ہنس کر بولا۔ "وہ دیکھو! جیپ کدھر جا رہی ہے اور تم کدھر جا رہے ہو۔ ہمیں ان لوگوں کے پیچھے پیچھے چلنا ہے۔ اور دیکھو ذرا سی بھی چالاکی کرو گے تو ہیبت خاں کے اُٹنگے میں ایسے پھنسو گے کہ جتنی تھوڑی بہت زندگی باقی رہے گی اس کے جلدی سے جلدی ختم ہونے کی دعا کرو گے۔ کیا سمجھے؟" اس کے چہرے پر ناراضی کے تاثرات بھی تھے لیکن وہ بہت زیادہ غضب ناک نہیں تھا ورنہ اب تک دو چار ہاتھ میرے جڑ چکا ہوتا۔

میں نے آس پاس تیزی سے نظریں دوڑائیں اور دیکھا کہ جیپ گاڑی کسی اور کچے راستے پر رواں دواں تھی اب پتھریلا علاقہ زیادہ سنگلاخ ہو گیا تھا اور آس پاس پہاڑیوں کا سلسلہ سرسبز اور خوش منظر لگتا تھا۔ خشک اور بے آب و گیاہ پہاڑی سلسلے کی جگہ جن کوہستانی علاقوں نے لی تھی وہ جاذب نظر اور دلکش تھے۔ ہوا میں بھی تازگی اور اَن جانی خوشبو کا احساس ہونے لگا تھا اور ماحول کی اس خوبصورتی نے میرے دل کی اُداسی اور مایوسی کو وقتی طور پر کم کرنے میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ میں نے پھرتی سے سٹیرنگ گھمایا اور نہایت تیزی اور مہارت سے لینڈ رُوور کو کچے پیچ دار راستوں سے گزار کر اس سڑک پہ لے جانے میں کامیاب ہو گیا جس پر جیپ گاڑی نہایت تیز رفتاری سے محوِ سفر تھی۔ جیپ کو چلانے والا نہایت تیز رفتاری سے راستہ طے کر رہا تھا اور وہ اس بات سے قطعی لاتعلق اور بے پروا معلوم ہوتا تھا کہ پچھلی گاڑی میں بھی ان کا ایک مجرم (بلکہ اصلی مجرم) موجود ہے اور اس پر نگاہ رکھنی بہت ضروری ہے۔ یا شاید اُن لوگوں کو یہ اعتماد تھا کہ اُس بارعب اور خونخوار تھانے دار کے ہوتے ہوئے انھیں میرے بارے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔

میں نے کنکھیوں سے تھانیدار کو دیکھا جو جیپ کو اپنے سامنے پا کر مطمئن نظر آنے لگا تھا۔ ابھی تک اُس نے مجھ سے کوئی براہ راست مطلب کی بات نہیں کی تھی۔ نہ مجھ پر کوئی الزام عائد کیا تھا اور نہ ہی مجھے گرفتاری کا سبب بتانے کی زحمت گوارا کی تھی لیکن میں پولیس والوں کے طریقۂ کار سے بخوبی واقف تھا۔ چار مسلح سپاہیوں پر مشتمل جیپ کی معیت میں تھانے دار کا اس دُور دراز جنگل میں میری تلاش اور جستجو میں پہنچنا صاف ظاہر تھا کہ وہ لوگ اپنے گرفتار شدہ مجرم کی حیثیت اور اہمیت سے بخوبی آگاہ ہیں۔ اگر وہ کسی معمولی مجرم کی کھوج میں ہوتے تو اتنے بہت سے مسلح سپاہیوں کی ضرورت نہ تھی۔ پھر یہ بات بھی خاص طور پر قابل ذکر تھی کہ پولیس والے محض بندوقوں سے مسلح نہیں تھے بلکہ اُن میں سے ایک کے پاس مشین گن بھی تھی اور وہ اس کے استعمال کے طریقے سے بھی پوری طرح واقف نظر آتا تھا۔

"یہ عورتیں کون ہیں؟" تھانے دار نے اچانک سوال کیا اور میں گھبرا کر رہ گیا۔ یہ سچ ہے کہ میرے ساتھ تین جوان

اور خوبصورت عورتوں کی ٹولی تھی جن کا میرے ساتھ کوئی باضابطہ اور باقاعدہ رشتہ بھی نہیں تھا۔ میں اپنی سوچوں میں اس قدر کھویا رہا تھا کہ میں نے اس متوقع سوال کا جواب سوچنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی تھی۔ حالانکہ پولیس کو دیکھتے ہی مجھے یہ فیصلہ کرلینا چاہیئے تھا کہ میں ان عورتوں کے بارے میں کیا وضاحت دوں گا اور اگر ان عورتوں کے بارے میں پولیس والوں کو مطمئن نہ کرسکا تو اُن بے گناہ اور بے بس عورتوں کی زندگی اور عزت بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔ سوال یہ تھا کہ کیا میں رضیہ، لالی اور راجی کے بارے میں تھانے دار کو سب کچھ سچ سچ بتا دوں یا کوئی من گھڑت کہانی سناؤں؟ پولیس کے سامنے رضیہ کی اصلیت ظاہر کرنے کا مطلب یہ تھا کہ ملک منصور کی آبرو کو خطرے میں ڈال دیا جائے اور خود رضیہ کے لیے بھی بدنامی اور جگ ہنسائی کا سامان فراہم کیا جائے۔ لالی تو ایک ملازمہ تھی جس کی عزت اور حرمت زیادہ بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ جہاں تک راجی کا تعلق تھا وہ ایک پیشہ ور ناچنے گانے والی طوائف تھی۔ اسے رسوائی کا کوئی خطرہ نہیں ہوسکتا تھا لیکن کیا میں اس کے بارے میں پولیس کو سب کچھ صاف صاف بتا دوں؟ یا دروغ مصلحت آمیز سے کام لوں؟

شاید میری طویل خاموشی تھانیدار کو ناگوار گزری تھی۔ اس نے اُلٹے ہاتھ کی ایک ضرب میرے چہرے پر لگائی اور میں بوکھلا کر اسے دیکھنے لگا: "اوئے۔ تم کوئی نشہ وشہ تو نہیں کرتے ہو؟"

"نہیں جی۔" میں نے جلدی سے کہا: "میں تو سگریٹ بھی نہیں پیتا۔"

"تو پھر افیمیوں کی طرح اونگھتے کیوں رہتے ہو؟ ہر وقت خیالوں میں کھوئے رہتے ہو۔ ارے تم سوچتے کیا رہتے ہو آخر۔" وہ اب اپنی تھانیداری پر اُتر آیا تھا۔

"اپنی پریشانیوں میں کھویا رہتا ہوں جی۔" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا اور شاید اس لہجے اور زخم خوردہ آواز نے یہ احساس دلا دیا کہ میں واقعی ایک مصیبت زدہ اور پریشان حال شخص ہوں جس کے پاس سوچنے کے لیے بہت کچھ ہے۔

"ہوں؟" اس نے ایک لمبا سا ہنکارا بھرا پھر اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہنے لگا "پریشان ہونے والے کام کیوں کرتے ہو؟"

میں اس کا کیا جواب دیتا لیکن یہ جانتا تھا کہ خاموش رہنا میرے حق میں بہتر نہ ہوگا اس لیے بولا: "بس جی تقدیر کا چکر ہے اور کیا کہہ سکتا ہوں۔" یہ حقیقت کا بیان تھا لیکن تھانے دار پر اس فقرے کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے سر سے پیر تک میرا گہری نظروں سے جائزہ لیا اور اپنی کرخت آواز میں کہنے لگا

"ہر آدمی اپنی غلطیوں کو تقدیر کے حساب میں ڈال دیتا ہے۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہوتی۔ تقدیر کو کسی سے دشمنی تو نہیں ہوتی کہ خواہ مخواہ اسے چکر میں ڈال دے۔ جیسی کرنی ویسی بھرنی۔"

شاید وہ کچھ اور گوہر افشانی کرتا مگر عین اس وقت سامنے جانے والی جیپ نے تیزی سے ایک موڑ کاٹا اور مجھے بھی مجبوراً اس کی تقلید کرنی پڑی۔ تھانیدار اس اچانک افتاد کی وجہ سے زور سے اپنے برابر والے دروازے سے ٹکرایا مگر پھر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ شکر ہے کہ اس نے مجھے خونخوار نظروں سے گھورنے کے سوا کوئی اور حرکت نہیں کی۔ سامنے والی جیپ ایک اور موڑ کاٹنے کے بعد اب سڑک سے ہٹ کر ایک اور کچے راستے کی جانب چل پڑی تھی۔ جس کے آس پاس اونچے اونچے درختوں کا سایہ تھا۔ چند ہی لمحے بعد ہم تھوڑی چڑھائی چڑھتے ہوئے ایک عمارت کے سامنے پہنچ گئے۔ یہ ایک قدیم بیرک قسم کی عمارت تھی جس کے آگے ایک طویل برآمدہ تھا۔ عمارت کی حالت خاصی خراب تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ علاقے کا تھانہ تھا اور ایسے دور دراز علاقے میں تھانے کے لیے کسی بہتر عمارت کی توقع رکھنا غلط فہمی ہی تھی۔

"لو جی۔ تھانہ آگیا۔" تھانے دار نے اپنی گونجدار آواز میں میرے اندازے کی تصدیق کر دی۔ اس عمارت کی یقینی کا

یہ عالم تھا کہ "پولیس اسٹیشن" کی ایک چھوٹی سی تختی کے سوا رُعب داب کی کوئی اور علامت وہاں موجود نہ تھی۔ جیپ اور لینڈ روور کی آوازیں سنتے ہی اندر سے ایک شخص دھوتی اور کرتے میں ملبوس بھاگا ہوا باہر نکلا اور جیپ کے ساتھ ایک لینڈ روور کو دیکھ کر حیران کھڑا رہ گیا۔ یہ شاید کوئی کانسٹیبل یا چھوٹا موٹا ملازم تھا اور حلیے سے ایک خاص دیہاتی نظر آرہا تھا۔

جیپ کے رُکتے ہی پولیس والے کود کر باہر نکلے اور تینوں عورتوں کے باہر نکلنے کا انتظار کرنے لگے۔ تھانے کی عمارت سے نکلنے والا سپاہی منہ پھاڑے کھڑا اپنے سامنے تین خوبصورت اور دلکش عورتوں کو جیپ سے باہر نکلتے ہوئے دیکھ کر اپنی حیرت اور سراسیمگی کو نہیں چھپا سکا تھا۔ شاید بیک وقت ایک چھوڑ تین تین خاتون مجرموں کی گرفتاری کا واقعہ اس نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ یا پھر ان تینوں کے حسن و جمال نے اسے مرعوب کر دیا تھا۔ جیپ سے باہر نکلنے والے مسلح سپاہی بھی تینوں دراز قد عورتوں کو جیپ سے بل کھاتے ہوئے نکلتے دیکھ کر مسحور سے رہ گئے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک انتہائی خوشگوار آئند اور دلفریب نظارہ تھا جس نے اس دیہاتی تھانے کے سپاہیوں کی نگاہوں کو خیرہ کر دیا تھا۔ تینوں عورتیں باری باری جیپ سے باہر نکل کر کھڑی ہوگئی تھیں اور پریشانی کے عالم میں لینڈ روور کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ مشین گن والا سپاہی پھرتی سے عمارت کے برآمدے میں ایک گول ستون کے نزدیک پوزیشن سنبھال کر کھڑا ہوگیا تھا اور اس نے ہم سب کو اپنی زد میں لے لیا تھا۔ دوسرے سپاہی بھی رفتہ رفتہ ہوش میں آگئے تھے اور انھوں نے اپنی بندوقیں کندھوں پر رکھ لی تھیں۔

جیپ سے تھوڑے فاصلے پر میں نے بھی لینڈ روور کھڑی کر دی تھی اور لحیم شحیم تھانے دار اپنے بھاری بھرکم جسم کے باوجود انتہائی چستی اور پھرتی کے ساتھ لینڈ روور سے باہر کود چکا تھا اور بظاہر میری موجودگی سے بے پروا ہو کر اُن تینوں عورتوں کی طرف متوجہ ہوا۔

میں نے لینڈ روور کی چابی گاڑی میں لگی چھوڑ دی اور گاڑی سے باہر نکل کر کھڑا ہوگیا۔ میں پولیس والوں کی عادت اور خصلت سے بخوبی واقف تھا اور تھانے دار کی ہدایت کے بغیر کوئی حرکت کرنے کی کوئی غلطی نہیں کرنی چاہتا تھا۔ چنانچہ لینڈ روور کے برابر سر جھکا کر کھڑا ہوگیا۔ اُن تینوں عورتوں نے اب پہلی بار میری دونوں کلائیوں کو آہنی ہتھکڑیوں میں جکڑا ہوا دیکھا تھا اور حیرانی کے ساتھ ساتھ پریشانی ان کے چہروں سے ہویدا تھی۔

رضیہ سے نہ رہا گیا اور وہ بے اختیار تیز قدم اٹھاتی ہوئی میری طرف بڑھی: "یہ ہتھکڑیاں!!" اس نے تشویش بھری نگاہوں سے مجھے دیکھا اور پھر اس کی نظریں تھانے دار کی طرف چلی گئیں۔ جس کی تمام تر توجہ کا مرکز اس وقت رضیہ بنی ہوئی تھی۔ وہ ایک سرو قد اور متناسب جسم کی عورت تھی اور اس کے سراپا میں ایک خاص قسم کا بانکپن تھا اور اس کی شخصیت میں دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کرلینے کی تمام خوبیاں موجود تھیں۔ چنانچہ تھانے دار اور دوسرے تمام پولیس والے منہ کھولے اسے دیکھنے میں مصروف تھے۔

رضیہ تھانے دار کے پاس جاکر اپنے مخصوص تحکمانہ انداز میں مخاطب ہوئی: "آپ نے انھیں ہتھکڑی کیوں پہنائی ہے؟ انھوں نے کیا جرم کیا ہے؟"

تھانے دار نے چونک کر خود کو سنبھالا اور ایک کرخت سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر نمودار ہوئی: "پولیس والوں سے جرم اور قصور نہیں پوچھا کرتے سوہنیئے۔" وہ دانت نکال کر مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے ہنسا: "اس کا جرم کیا ہے یہ ہم جانتے ہیں یا مجرم خود جانتا ہے۔ یا پھر وقت آنے پر عدالت جان لے گی اور اس کے بعد جب اسے سزا ہوگی تو ساری دنیا کو پتہ چل جائے گا۔ کیوں۔ ٹھیک ہے نا؟" وہ بے ڈھنگے انداز میں فلک شگاف قہقہہ لگا کر ہنسا اور پھر تیز اور لمبے قدم اُٹھاتا ہوا تھانے کی عمارت کی طرف چل پڑا

"چلو!" ایک سپاہی نے چلّا کر کہا اور ہم سب خاموشی سے تھانیدار کے پیچھے چل پڑے۔ تھانیدار کے پُرسکون اور مطمئن رویئے سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ میرے بارے میں سب کچھ جانتا ہے۔

ہم لوگ تھانے کی عمارت میں داخل ہوئے جس کی کسمپرسی اور بے سروسامانی کا باہر ہی سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ برآمدے میں ایک ٹوٹی ہوئی لکڑی کی کرسی کے علاوہ کوئی اور فرنیچر موجود نہیں تھا۔ برآمدے سے گزر کر ہم ایک کمرے میں پہنچے جو بظاہر تھانے دار کا دفتر تھا۔ اس کمرے میں لکڑی کی ایک شکستہ سی میز اور چند شکستہ حال کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ ہر چیز خاک آلود تھی۔ ایک طرف لکڑی کی بوسیدہ سی الماری تھی اور فرش پر کوئی دری یا قالین نہیں تھا۔ کھڑکیاں بھی پردوں سے محروم تھیں۔ تھانیدار صاحب ہم سب سے پہلے ہی اپنے کمرے میں پہنچ کر ایک بڑی سی کرسی پر بیٹھ چکے تھے۔ ہم چاروں ایک قطار میں ان کے سامنے حاضر ہوئے تو ان کی تمام تر توجہ میری بجائے تینوں عورتوں کی طرف تھی جنھیں وہ حریصانہ نگاہوں سے تک رہے تھے اور تو اور ان کے عملے کے لوگوں کی توجہ کا مرکز بھی مجھ سے زیادہ وہ عورتیں ہی تھیں۔ اس علاقے میں غالباً کافی طویل عرصے کے بعد تھانے والوں کو بیک وقت تین خوبصورت عورتوں کو قیدی بنانے کا موقع ملا تھا۔ ایک لحاظ سے یہ بات میرے لیے اطمینان بخش بھی تھی کہ میں اپنے جرائم کی سنگینی کے باوجود ان لوگوں کی تمامتر توجہ حاصل نہیں کر سکا تھا اور وہ تینوں عورتیں ان سب کی مکمل توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھیں۔ حالانکہ انھیں دراصل میری تلاش تھی۔ دوسری طرف عورتوں کی جانب پولیس والوں کا اس قدر التفات قابلِ غور اور تشویشناک بھی تھا۔ ایسے دُور افتادہ اور ویران علاقے کے تھانے میں ایسی صرف ایک عورت کی موجودگی بھی فساد اور پریشانی کا سبب بن سکتی تھی اور یہاں تو تین تھیں۔

تھانیدار کچھ دیر کرسی سے ٹیک لگائے رُعب دار انداز میں بیٹھا اپنی مونچھوں کو تاؤ دینے میں مصروف رہا اور باری باری رضیہ، لالی اور راجی کو گھور گھور کر دیکھتا رہا۔ دو مسلح سپاہی بھی اس اثنا میں بڑی بے تکلفی سے دروازے کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑے رہے اور دانت نکال نکال کر عورتوں کو دیکھتے اور مسکراتے رہے۔ لگتا تھا کہ تھانے میں ڈسپلن اور نظم و ضبط پر زیادہ سختی سے عمل نہیں کیا جاتا تھا کیونکہ تھانے دار کی موجودگی کے باوجود سپاہی مؤدّب اور اٹینشن کھڑے رہنے کی کوشش نہیں کر رہے تھے۔ تھانے میں ایک تھانیدار، چار سپاہی اور ایک اردلی نما شخص کے علاوہ کوئی اور افسر بھی موجود نہیں تھا۔ ممکن ہے باقی لوگ اپنے فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں گئے ہوئے ہوں؟ میں نے جلدی جلدی کمرے کا جائزہ لیا۔ میز پر چند بکھری ہوئی فائلوں کے سوا کوئی کاغذات موجود نہیں تھے۔ میز پر ٹیلی فون بھی نہیں تھا اور مجھے یاد آیا کہ عمارت کے باہر بھی میں نے ٹیلی فون کا کوئی تار نہیں دیکھا تھا۔ یہ امر میرے لیے اطمینان بخش تھا کہ فوری طور پر اس پولیس اسٹیشن کے لوگ دوسرے علاقوں سے رابطہ قائم کرنے سے قاصر تھے جو میرے لیے ایک حوصلہ افزا بات تھی۔

تھانے دار نے اپنی مونچھوں پر سے انگلیاں ہٹائیں اور باری باری ہم چاروں کو دیکھنے کے بعد ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ میں نے اُس کے سوالات اور جرح کے لیے خود کو تیار کر لیا تھا اور اس کی جانب سے الزامات کی بوچھاڑ کا انتظار کر رہا تھا۔ تھانے دار نے یکایک آنکھیں کھول کر دروازے کے ساتھ کھڑے ہوئے سپاہیوں کو دیکھا اور حکم دیا: "ان سب کو لے جا کر بند کر دو۔ تھوڑی دیر بعد ان سے بات کریں گے۔ کیوں۔ ٹھیک ہے؟"

"چلو" ایک سپاہی نے درشتی سے کہا اور ہم سب کمرے سے باہر جانے کے لیے مڑے۔ یکایک تھانیدار کی آواز گونجی: "رُک جاؤ" ہم سب سہم کر رُک گئے۔

"ٹھہرو" وہ کرسی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور سپاہی سے مخاطب ہُوا "اوئے اُلّو کے کان۔ پہلے ان کی تلاشی لے۔ گدھا نہیں تو"

ایک سپاہی نے بندوق دیوار سے ٹکا کر کھڑی کر دی اور میری طرف بڑھا۔ میری جیب میں ایک پستول کے سوا کچھ اور نہیں تھا۔ یہ پستول جلد ہی سپاہی نے برآمد کر لیا اور فاتحانہ انداز میں میز پر رکھنے کے بعد تھانیدار کی طرف دیکھا۔

"اوئے، یہ پستول!؟" تھانیدار نے ہاتھ بڑھا کر پستول اُٹھا لیا اور اس کا جائزہ لینے کے بعد مجھے دیکھا "یہ واردات کے لیے رکھا ہے؟"

"جی نہیں" میں نے سٹپٹا کر جواب دیا "حفاظت کے لیے۔"

"ٹھیک ہے بھئی" وہ معنی خیز انداز میں لڑکیوں کی طرف دیکھ کر ہنسا "واقعی تمہارے پاس حفاظت کے لیے سامان بھی کافی ہے" "اوئے کھوتے۔ اپنی ماں بہن کی تلاشی نہیں لے گا؟" یہ آخری فقرہ اُس نے سپاہی کو مخاطب کر کے کہا تھا۔

کھوتے نے دانت نکال دیئے اور بے تابی سے ہاتھ پھیلا کر رضیہ کی طرف بڑھا "خبردار"۔ رضیہ نے ڈانٹ کر کہا۔ "میرے قریب مت آنا۔"

"یہ ہماری ڈیوٹی ہے" سپاہی نے ڈھٹائی سے کہا "قیدیوں کی تلاشی تو لینی ہی پڑتی ہے۔"

"ہم قیدی نہیں ہیں۔ ہم نے کوئی جُرم نہیں کیا ہے اور یاد رکھو۔ اگر ہمیں بلاوجہ تنگ کیا تو اچھا نہیں ہو گا" رضیہ کے لہجے میں رُعب اور تحکّم تھا جس نے سپاہی کو بے اختیار رُکنے پر مجبور کر دیا۔

"دھمکیاں دینے کی ضرورت نہیں ہے" تھانے دار کی آواز بُلند ہوئی "سرکاری ڈیوٹی میں مداخلت کی سزا سخت ہوتی ہے۔ ہم نے بڑے بڑے دیکھ لیے ہیں۔ ادھر کوئی رُعب نہیں چلتا۔ سیدھی طرح تلاشی دو ورنہ....." وہ جملہ نامکمل چھوڑ کر اپنی مونچھوں پر تاؤ دینے لگا۔

"ٹھہرو۔ عورتوں کی تلاشی مرد نہیں لے سکتے۔"

"تو پھر کیا کریں جی!؟ اِدھر تو کوئی زنانہ پولیس نہیں ہے" سپاہی نے لقمہ دیا۔

"ہم خود اپنا سامان تلاشی کے لیے رکھ دیتے ہیں" یہ کہہ کر رضیہ نے اپنی کلائی سے سونے کی چوڑیاں اُتار کر رکھ دیں اُس کے گلے میں ایک لاکٹ تھا وہ بھی اُس نے تھانے دار کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ اور کانوں سے ٹاپس بھی اُتار دیئے۔ اس کے دیکھا دیکھی راجی نے بھی اپنے زیورات انگوٹھی اور گھڑی اُتار کر تھانے دار کی میز پر رکھ دی۔ لالی کے پاس بُندے اور انگوٹھی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اس نے بھی یہ اشیاء میز پر رکھنے میں دیر نہیں لگائی۔

"اور بھی کچھ ہے تمہارے پاس" تھانے دار نے مشکوک انداز میں سوال کیا "کوئی ہتھیار۔ کوئی نقد۔ کوئی خطرناک آلہ؟"

"جو کچھ تھا تمہارے سامنے ہے" رضیہ ان سب کی ترجمانی کر رہی تھی۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے" تھانے دار نے سر ہلایا "لے جاؤ انہیں"

سپاہی نے انتہائی مایوسی اور غصّے سے تھانیدار کو دیکھا۔ وہ تین خوبرو عورتوں کی تلاشی کے سنہری موقعے سے محروم ہو گیا تھا اور اس کی ناراضی چہرے سے ظاہر تھی۔

"ہمیں اس سامان کی فہرست بنا دو" رضیہ نے قانونی نُقطہ اُٹھایا۔

"فہرست؟!" تھانے دار نے حیران ہو کر اُسے دیکھا "اچھا اچھا فکر مت کرو۔ تمہیں اس کی رسید مل جائے گی۔ یہ تھانہ ہے کوئی جُوئے کا اڈّہ تو نہیں ہے۔ ہم سرکاری بندے ہیں کوئی مذاق تو نہیں ہے"

تھانے دار کو رضیہ کی بات پسند نہیں آئی تھی۔

پھر وہ سپاہی سے مخاطب ہوا "اوئے کھوتے۔ کھڑا منہ کیا دیکھ رہا ہے۔ لے جا کر بند کر دو۔ ان سے اطمینان سے بات

ہوگی۔ اس کا لہجہ اور نگاہوں کی گرسنگی میرے لیے تشویشناک تھی۔ خصوصاً ایسے حالات میں جبکہ چاروں طرف ویرانی اور تنہائی تھی اور بیرونی دُنیا سے رابطے کا کوئی آسان اور جدید طریقہ بھی موجود نہیں تھا۔ دیہاتی تھانے داروں کے اختیارات یوں بھی بے پناہ ہوتے ہیں۔ اور دور دراز علاقوں میں انہیں حاکمِ مُطلق کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ پھر میں تو کافی عرصے سے پولیس کو مطلوب تھا اور ان کے پاس میرے سنگین جرائم اور گناہوں کی ایک لمبی فہرست موجود تھی۔ ان تین عورتوں کی موجودگی میں مجھے ایک عجیب قسم کی بے بسی اور مجبوری کا احساس ہو رہا تھا۔ لیکن فوری طور پر ان مشکلات کا کوئی حل مجھے نہیں سوجھ رہا تھا۔ اس لیے خاموشی اور صبر و شکر کے سوا کوئی اور چارہ نہیں تھا۔

ہمیں جس کمرے میں لے جا کر بند کیا گیا تھا اُسے حوالات نہیں کہا جا سکتا تھا۔ یہ ایک بڑا سا کمرہ تھا جس میں دو ٹوٹی ہوئی بان کی چارپائیاں پڑی تھیں۔ ایک طرف ٹین کا ایک صندوق رکھا ہوا تھا۔ کھونٹی پر چند میلے کپڑے لٹکے ہوئے تھے۔ اس کے سوا کمرے میں کوئی اور سامان موجود نہیں تھا۔ ہمیں کمرے کے اندر دھکیل کر سپاہی واپس چلا گیا۔ باہر سے انہوں نے کنڈی چڑھا دی تھی۔ ممکن ہے تالا بھی لگا دیا ہو۔ اس کمرے میں صرف ایک کھڑکی تھی جس پر لوہے کی سلاخیں نصب تھیں۔ میں نے نزدیک جا کر آہنی سلاخوں کا جائزہ لیا۔ ان سلاخوں کو ہلانا بھی ممکن نہیں تھا۔ اس طرف سے مایوس ہو کر میں ٹین کے صندوق پر بیٹھ گیا اور حالات پر غور کرنے لگا۔ رضیہ ایک چارپائی پر بیٹھ گئی تھی اور لالی نے اس کے پیروں کے نزدیک جگہ سنبھال لی۔ جبکہ دوسری چارپائی پر راجی نے ڈیرہ جما لیا تھا اور بڑی بے تکلفی سے انگڑائیاں لے رہی تھیں ہم لوگوں نے زیادہ طویل اور تھکا دینے والا سفر تو نہیں کیا تھا لیکن شاید حالات اور واقعات کی سنگینی نے ان سب کو تھکا دیا تھا۔ رضیہ کے چہرے سے افسردگی اور پریشانی کا اظہار ہو رہا تھا۔ اور وہ گہری سوچ میں مُبتلا تھی۔ لالی حسبِ معمول ہر قسم کی سوچ اور فکر سے آزاد تھی اور رضیہ کے پیر دبانے میں لگ گئی تھی۔ راجی چند تو برشکن انگڑائیاں لینے کے بعد چارپائی پر نیم دراز ہو گئی تھی۔ اس کے بشرے سے اندازہ ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ ذرا بھی پریشان اور فکرمند ہے۔ اس نے کوئی جرم بھی نہیں کیا تھا۔ پھر اُسے پولیس سے خوفزدہ ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ رضیہ بھی پولیس سے خائف نہیں لگتی تھی۔ اس نے تھانیدار سے جس انداز میں بات کی تھی وہ اس بات کی علامت تھی کہ وہ پولیس سے مرعوب ہونے والی نہیں ہے۔ دوسری طرف کیونکہ لالی کو ان معاملات کا سرے سے علم ہی نہیں تھا اور نہ ہی کبھی اس کا پولیس سے واسطہ پڑا ہوگا۔ اس لیے وہ بھی بے فکر اور بے پرواہ نظر آتی تھی۔ گویا سب سے زیادہ فکرمند اور پریشان حال میری ہی ذات تھی اور اس کی معقول وجہ بھی تھی۔

یکایک رضیہ کو احساس ہوا کہ میں ٹین کے صندوق پر بے آرام بیٹھا ہوا ہوں۔ اس نے راجی سے کہا۔ "راجی تم اس چارپائی پہ میرے پاس آ جاؤ۔ انہیں بھی چارپائی پہ آرام کرنے دو۔ لالی کا کیا ہے، یہ تو زمین پر بھی بیٹھ جائے گی۔"

اس کا جملہ پورا ہوتے ہی لالی خاموشی سے اُٹھ کر زمین پر رضیہ کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ راجی نے بے تعلقی سے مجھ پر ایک نظر ڈالی اور بیزاری سے چارپائی سے اُٹھ کر رضیہ کے پاس چلی گئی۔

رضیہ نے میری ہتھکڑی کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ "تم نے یہ نہیں پوچھا کہ پولیس نے تمہیں گرفتار کر کے ہتھکڑی کیوں لگائی ہے؟"

میں نے ایک لمبی آہ بھری اور اُٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔

راجی بولی۔ "کوئی جرم کر کے آئے ہوں گے۔ تب ہی تو پولیس نے پکڑا ہے۔"

لالی نے کہا۔ "پکڑا تو انہوں نے ہم سب کو ہی ہے۔ کیا ہم نے بھی جرم کیا ہے؟"

"مگر ہمیں ہتھکڑی تو نہیں لگائی اور ہمیں وہ کچھ بھی کیا سکتے ہیں۔ ہم نے کوئی جرم تو نہیں کیا ہے۔ میں تو سوچ رہی ہوں کہ انسپکٹر کو پیرا ڈاکو کے بارے میں بتا دوں۔" راجی کی زبان اچانک تیزی سے چلنے لگی تھی جو ہم سب کے لیے اور خصوصاً

میرے لیے بہت پریشان کُن بات تھی۔ اس کا رویّہ کبھی سرد مہری اور عدم دوستی کا تھا۔ شاید وہ مجھ سے اپنے ٹھکرائے جانے کا بدلہ لینا چاہتی تھی۔ عورت کی اس نفسیات کے اس پہلو سے میں ناواقف نہیں تھا۔ اس کی پیش کش کو نظرانداز کرنا عورت کے پندار کی توہین ہوتی ہے اور بعض عورتیں اس بے عزتی کو معاف نہیں کرتیں۔ پھر راجی تو تھی بھی ایک مختلف قسم کی عورت۔ ایک پیشہ ور طوائف جس نے ہمیشہ ناز و انداز دکھانے اور مردوں کو اپنے سامنے جُھکانے کا منظر ہی دیکھا تھا۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کوئی مرد اس کی رعنائیوں کو نظرانداز کر سکتا ہے۔

راجی کچھ دیر تو چارپائی پر لیٹی جمائیاں اور انگڑائیاں لیتی رہی پھر نہ جانے اس کے جی میں کیا آئی کہ یکایک اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ ایک نظر ہم پر ڈالی اور پھر اُٹھ کر دروازے پر دستک دینی شروع کر دی۔

"کیا بات ہے!" باہر سے سپاہی کی آواز سنائی دی۔ "کیا تکلیف ہے بھئی؟" دروازہ کُھل گیا اور سامنے ایک سپاہی خودکار بندوق تانے ہوئے نمودار ہوا۔

"میں تھانیدار صاحب سے ملنا چاہتی ہوں۔" راجی نے کہا اور میں اور رضیہ حیرت اور تشویش سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

"خیراں بھئی خیراں۔" یہ آئیڈیا کانسٹیبل کو بھی بہت پسند آیا تھا۔ "چلو بادشاہو۔ ابھی چلو۔ وہ تمہارے ساتھ مل کر بہت خوش ہوں گے۔" راجی اس کا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی کمرے کے دروازے سے باہر نکل چکی تھی۔ کانسٹیبل نے ایک حسرت بھری نگاہ رضیہ اور لالی پر ڈالی اور مایوسی سے باہر جا کر پھر دروازہ بند کر دیا۔

کچھ دیر ہم سب خاموش رہے پھر لالی کی آواز سنائی دی۔ "اپنی اصلیّت دکھا دی ہے اس نے۔"

"تم چپ رہو۔" رضیہ نے اُسے ڈانٹا۔ "اچھا ہی ہوا چلی گئی۔ خس کم جہاں پاک۔ خواہ مخواہ کی مصیبت ہمارے گلے پڑ گئی تھی۔"

"مگر مصیبت تھی خوبصورت۔" میں نے رضیہ کو چھیڑا۔ رفتہ رفتہ میری مدافعت اور برداشت کی قوت واپس آنے لگی تھی۔ پھر سب سے بڑھ کر اطمینان بخش بات میرے لیے یہ تھی کہ راجی میرے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ نہ ہی وہ رضیہ اور لالی کی حقیقت سے واقف تھی۔ اس وقت تھانے دار کے پاس ملاقات کے لیے جانے کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ وہ اپنی جان بچانے اور مراعات حاصل کرنے کے لیے تھانے دار کو پرچانا چاہتی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ ہم سب سے علیحدہ ہونا چاہتی تھی۔

رضیہ نے مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ "یہ ہتھکڑی انہوں نے تمہیں کیوں پہنائی ہے؟ اور ہم سب کو گرفتار کیوں کیا ہے؟ تم نے تھانیدار سے پوچھا تو ہوتا۔"

"پولیس والوں کے اختیارات بہت وسیع ہوتے ہیں اور دیہاتی علاقوں کے تھانے دار تو بادشاہوں سے زیادہ مختار ہوتے ہیں۔ اس لیے بلاوجہ بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔" میں نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔ "مگر جہاں تک میرا خیال ہے انہوں نے مجھے قتل کے الزام میں پکڑا ہے۔"

"قتل؟" رضیہ اور لالی دونوں نے مجھے پریشانی سے دیکھا۔

"ہاں۔" میں نے انہیں پہلی بار مطلع کیا۔ "جب میں وہاں اُس کی حویلی کے اندر گیا تو کمرے میں ایک شخص کی لاش پڑی ہوئی تھی جسے کسی نے کچھ ہی دیر پہلے ہلاک کیا تھا۔"

"اوہ۔" رضیہ واقعی پریشان ہو گئی۔ "مگر تم پر الزام کیسے آ سکتا ہے؟ تم تو ہمارے ساتھ تھے۔ ہم اس بات کے گواہ ہیں۔"

"وقت آنے پر گواہی بھی دے دینا۔ ابھی تو پولیس نے ہمارے خلاف نہ کوئی جُرم عائد کیا ہے اور نہ ہی رپورٹ درج کی ہے۔ مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ اس شخص کو کس نے قتل کیا اور اتنے مختصر عرصے میں موقعۂ واردات سے

غائب بھی ہوگیا۔ کافی عمر کا بے ضرر آدمی معلوم ہوتا تھا۔ بھلا کسی کو اسے مارنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"پرانی دشمنی ہوگی۔" رضیہ نے تجربہ کارانہ انداز میں کہا۔ "دیہاتی علاقوں میں دشمنیاں خاندان در خاندان چلتی رہتی ہیں یا پھر ہوسکتا ہے کہ کسی چور یا ڈاکو نے اسے قتل کر دیا ہو۔ ہاں یاد آیا۔ کمرے میں چیزیں بے ترتیب پڑی ہوئی تھیں یوں لگتا تھا جیسے کسی نے تلاشی لی ہو۔"

ایک اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ جب پولیس نے مجھے گرفتار کیا۔ اس وقت انہوں نے حویلی کے اندر جانے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ پولیس والوں کو یہ علم ہی نہ ہو کہ حویلی کے اندر کوئی قتل ہو چکا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ تھانے دار ہیبت خاں نے مجھے محض ٹونی کا ہمشکل اور ایک مفرور مجرم سمجھ کر گرفتار کیا تھا حالانکہ اس نے ایک مرتبہ بھی اس قسم کا کوئی اشارہ نہیں دیا تھا۔ غالباً وہ مجھے سسپنس میں رکھنا چاہتا تھا۔ پولیس والے عام طور پر ایذا پسند ہوتے ہیں۔

میں ایک بار پھر خیالوں میں گم ہوگیا تھا اور میرا ذہن نہ جانے کہاں کہاں بھٹکتا پھر رہا تھا۔ کبھی روزی کے تصور میں تو کبھی عاشی کی یادیں گزرے ہوئے لمحات، گزرے ہوئے واقعات، بچھڑے ہوئے کردار، سب میری یادوں کو گدگدا رہے تھے۔ ان میں کچھ کو یاد کر کے میں ایک کرب اور اذیت سے گزرا تھا اور بعض کردار اور واقعات نے مجھے دل گرفتہ اور جذباتی کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ سوچتے سوچتے میرا ذہن شل ہوگیا اور یادوں کے بوجھ سے میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ خدا جانے کب میں نیند کی آغوش میں کھو گیا۔

کسی کے زور سے چلانے سے میری آنکھ کھلی اور میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میرے سامنے ایک کانسٹیبل کھڑا تھا اور مجھے جھنجوڑ کر بیدار کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ میں شاید چند گھنٹے سویا تھا کیونکہ اب دن کی روشنی کم ہونے لگی تھی۔ دوسری چارپائی پر رضیہ بے سدھ پڑی سو رہی تھی۔ اس کے پیروں میں لالی اپنے بازوؤں پر سر رکھے سوئی پڑی تھی۔ ان دونوں کی گہری نیند کانسٹیبل کے شور و غل سے ذرا بھی خراب نہیں ہوئی تھی۔ میں آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ "کیا بات ہے؟"

"سنو، تم کوئی نشہ تو نہیں کرتے ہو؟ کب سے تمہیں جگا رہا ہوں۔ چلو۔ تمہیں خاں جی بلاتے ہیں۔" کانسٹیبل کا لہجہ خاصا تلخ تھا۔

"خان جی؟!" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ "کون خاں صاحب؟"

"تمہارے مامے۔" وہ غصے میں گرجا۔ "اٹھو جلدی۔ میں تمہارا نوکر نہیں ہوں۔ چلو۔"

اس کا اشارہ یقیناً تھانے دار کی طرف ہوگا۔ اس کے ساتھ رخصت ہونے سے پہلے میں نے کمرے کا بغور جائزہ لیا۔ کمرے میں راجی کے کوئی آثار نہیں تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اب تک واپس نہیں لوٹی تھی۔ رضیہ اور لالی کو بے خبر سوتا ہوا چھوڑ کر میں کانسٹیبل کے ساتھ چل پڑا۔

تھانے دار ایک اور کمرے میں میرا منتظر تھا۔ یہ کمرہ بیڈروم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ کمرے کے شمالی کنارے پر ایک لواڑی مسہری رکھی ہوئی تھی جس پر تھانے دار نیم دراز تھا۔ اس وقت وہ صرف بنیان اور نیکر میں ملبوس تھا۔ مسہری کے بائیں جانب دو پرانی قسم کی بید کی کرسیاں پڑی تھیں۔ ان میں سے ایک پر راجی آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور لباس بھی بے ترتیب تھا۔ کرسیوں کے سامنے ایک بید کی چھوٹی میز پر شراب کی بوتل اور دو گلاس رکھے ہوئے تھے۔ یہ منظر کسی مزید تشریح اور وضاحت کا محتاج نہیں تھا۔ مجھے دیکھا تو راجی کے چہرے پر ایک خالی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس کی نگاہوں میں نفرت کا زہر تھا اور وہ مجھے یوں دیکھ رہی تھی جیسے اس کا بس چلے تو مجھے گولی ہی مار دے۔ سچ کہا ہے کسی نے، اصلیت اپنا رنگ دکھائے بغیر نہیں رہ سکتی۔

یہ وہی راجی تھی جس نے اپنی خودداری اور غیرت مندی کے بارے میں ہمیں ایک لمبی کہانی سنائی تھی اور جو بقول خود اس کے ہیرا ڈاکو جیسے جابر اور ظالم ڈاکو کے مطالبے کو بھی ٹھکرا چکی تھی۔ وہی راجی اب ایک تھانے دار کے عشرت کدے میں جشن منانے میں مصروف تھی۔ اس نے اپنی تمام تر متاع اس کے سامنے پیش کر دی تھی اور اب وہ غالباً اس بات کی منتظر تھی کہ مجھے اُس گستاخی کی سزا دلائے جو اس کی خواہش کو ٹھکرانے کی وجہ سے مجھ سے سرزد ہوئی تھی۔۔۔!

"آؤ جوان۔" تھانے دار نے مجھے دیکھ کر آواز لگائی۔ "ادھر بیٹھ جاؤ۔ اس لوٹی ہوئی کرسی پر۔ اور اپنا بیان دو۔"

"بیان۔۔۔؟" میں نے ماحول پر ایک نظر ڈالی۔ "یہاں تو کوئی رجسٹر یا کاغذ بھی نہیں ہے۔ کون لکھے گا میرا بیان؟"

"بکواس بند کرو۔" وہ گرجا۔ "ہم جو کہہ رہے ہیں کہ اپنا بیان لکھواؤ۔ تمہیں کسی اور سے کیا مطلب ہے؟" اس پر نشے نے کافی اثر ڈالا تھا اور وہ بہکا بہکا سا لگ رہا تھا۔ "چلو۔ بس شروع ہو جاؤ۔"

"مگر میرا بیان کس سلسلے میں لیا جا رہا ہے؟ میں نے تو نہ کوئی جرم کیا ہے اور نہ ہی کسی اور کے خلاف رپورٹ لکھوانے آیا ہوں۔ بلکہ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ مجھے زبردستی حراست میں لینے کی کیا وجہ ہے؟ میں نے کون سا جرم کیا ہے؟"

"دیکھو الو کے کان۔ میرے ساتھ زیادہ چالاکی مت کرو۔ میرا نام ہیبت خاں ہے۔ میں اڑتی چڑیا کے پر گن لیتا ہوں۔ یہ بتا ان عورتوں کا کیا چکر ہے؟ یہ راجی کہتی ہے کہ تم انہیں بھگا کر لائے ہو؟"

"کیا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "راجی کو بھگا کر لایا ہوں؟!"

"ارے راجی کو بھلا کون بھگا سکتا ہے۔ یہ تو خود ہی ساری دنیا کو آگے لگا سکتی ہے۔ یہ بڑی شے ہے۔ کیوں۔ سمجھے کہ نہیں؟" وہ ایک آنکھ بند کر کے راجی کو دیکھ کر مسکرایا۔ راجی بھی مسکرانے لگی۔ صاف ظاہر تھا کہ راجی تھانیدار کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا چکی تھی اور ہم لوگوں کے خلاف اس نے خدا جانے اس کے کیا کان بھرے تھے؟ لیکن اس گفتگو سے مجھے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ پولیس کو ابھی تک میرے ٹونی ہونے کے بارے میں کوئی شبہ نہیں ہوا تھا اور یہ ایک انتہائی اطمینان بخش احساس تھا۔

"میں نے کسی کو نہیں بھگایا۔" میں نے آہستگی سے کہا۔ "وہ دونوں عورتیں اس بات کی گواہی دیں گی۔ یہ راجی تو ہمیں راستے میں اتفاق سے مل گئی تھی۔"

"راجی کی بات چھوڑو۔ ان دونوں عورتوں کی بات کرو۔"

"دیکھئے انسپکٹر صاحب۔" میں نے پرزور انداز میں کہا۔ "میں ایک شریف آدمی ہوں اور یہ دونوں عورتیں بھی اچھے خاندان کی شریف عورتیں ہیں۔"

"شریف عورتیں ہیں تو پھر تمہارے ساتھ کیا کر رہی ہیں؟" اس کا لہجہ زہریلا تھا۔

"میں انہیں لے کر ان کے گھر جا رہا ہوں۔ ان کے گھر والے کے پاس۔"

"کون ہے ان کا گھر والا؟"

"میں اس کا نام بتانا ضروری نہیں سمجھتا۔" میں نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ دراصل میں یہ فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ ملک منصور اور رضیہ کے بارے میں اصلیت کا بتانا مناسب ہوگا یا نہیں۔ کیونکہ علاقے کی پولیس کے ساتھ ملک منصور کے تعلقات کی نوعیت کا مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا۔ میں بلاوجہ ملک منصور اور رضیہ کو کسی سکینڈل کا نشانہ بنانا نہیں چاہتا تھا۔

"کیا ضروری ہے اور کیا ضروری نہیں ہے یہ فیصلہ کرنا ہمارا کام ہے۔" تھانے دار غصے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "جھوٹ
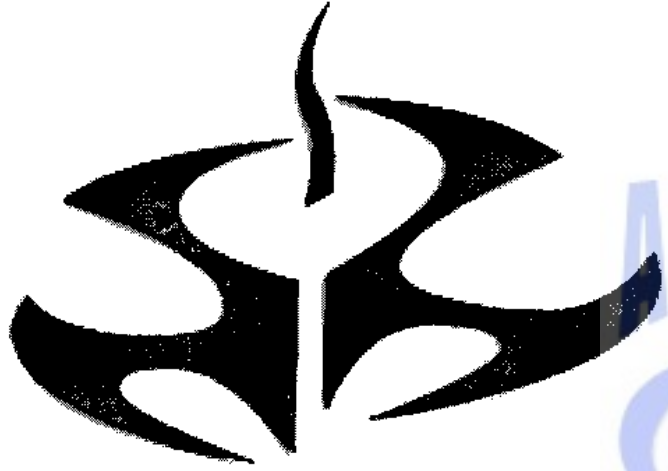
بولنے کی کوشش مت کرو، تم مجھے بیوقوف نہیں بنا سکتے۔"

"دیکھئے انسپکٹر صاحب!" میں نے بڑے اطمینان سے کہا۔"میں ایک بار پھر آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے اور نہ ہی ان عورتوں کے بارے میں آپ کی اطلاع درست ہے۔ان میں سے ایک بہت بڑے گھر کی عورت ہے۔دوسری اس کی ملازمہ ہے۔"

"اور تم ان کے کون ہو؟" اس نے بات کاٹی۔

"میں!" میں بوکھلا گیا۔"میرا اُن سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔میں ان کا کارندہ ہوں۔ان دونوں کے بارے میں مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔البتہ اس عورت کا مجھے علم ہے۔یہ ابھی اتفاق سے مل گئی تھی اور وہاں سے بھاگنا چاہتی تھی اس نے مجھے جو کہانی سنائی وہ یہ تھی کہ یہ ایک ناچنے گانے والی عورت ہے جسے ڈاکو نے اغوا کر لیا تھا....."

"چپ کرو۔" وہ دھاڑا۔"میں نے اسکی کہانی سنانے کو نہیں کہا تھا۔میں تم سے یہ پوچھ رہا ہوں کہ وہ عورتیں کون ہیں اور تم انہیں کہاں لے جا رہے تھے۔اگر تم سیدھی طرح نہیں بتاؤ گے تو میں اُن سے خود پوچھ لوں گا۔ہمیں ایسی عورتوں سے بات کرنے کا ڈھنگ بھی آتا ہے۔"

اس کے بار بار دھمکانے پر مجھے غصہ آ گیا۔"دیکھو انسپکٹر صاحب تم صرف ایک پولیس انسپکٹر ہو۔یہ مت بھولو کہ اگر تم نے ان عورتوں سے یا مجھ سے کوئی زیادتی کی تو بہت بُرا ہوگا۔تمہاری پیٹی اُتر جائے گی۔اس عورت کا آدمی بہت بڑا آدمی ہے۔"

تھانیدار نے زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا۔"پیٹی؟ کیسی پیٹی؟" وہ اپنے موٹے پیٹ کی طرف اشارہ کر کے ہنسنے لگا۔"تمہیں کوئی پیٹی نظر آ رہی ہے؟" دروازے کے ساتھ کھڑے ہوئے کانسٹیبل نے بھی زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا۔میں حیرانی سے اُسے دیکھنے لگا۔میں نے بظاہر ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی جس پر وہ یوں ہنسنا شروع کر دیتے۔راجی بھی ان کی دیکھا دیکھی مسکرانے لگی۔

تھانیدار ٹہلتا ہوا میری طرف بڑھا۔اُس نے میرے نزدیک آ کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہنے لگا۔"سُن لو کھوتے۔کان کھول کر سُن لو۔اِدھر کوئی پولیس ہے نہ تھانہ ہے۔یہ سب ڈرامہ ہے۔" یہ کہہ کر وہ پھر ہنسنے لگا۔"آئی جی۔ڈی آئی جی۔ایس پی۔کوئی مائی کا لال میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔میں ان کا ملازم نہیں ہوں نہ گورنمنٹ سے تنخواہ لیتا ہوں۔سمجھے کہ نہیں؟"

میں واقعی کچھ نہیں سمجھا تھا۔اس نے کانسٹیبل سے کہا۔"گامے تو اس کو سمجھا دے۔"

کانسٹیبل نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور پھر بولا۔"ان کا نام خان ہیبت خان ہے بڑے بڑے ان کے رعب سے کانپتے ہیں۔تھانیدار تو کیا بڑے بڑے ایس پی ان کا نام سُن کر کانوں پر ہاتھ رکھ لیتے ہیں۔یہ پولیس کے بھی باپ ہیں۔کبھی ہیبت خاں کا نام نہیں سنا تم نے؟"

میں نے واقعی کبھی یہ نام نہیں سنا تھا۔

"اوئے کھوتے۔میں پولیس والا نہیں ہوں۔ہم سب ڈکیت ہیں کرائے کے قاتل ہیں۔بڑے بڑے زمیندار ہم سے ڈاکے ڈلواتے ہیں۔رسہ گیری کراتے ہیں۔قتل کراتے ہیں۔ہم کسی کی نوکری نہیں کرتے نہ کسی لاٹ صاحب کے محتاج ہیں۔بلکہ وہ سب وڈیرے۔جاگیردار اور زمیندار ہمارے محتاج ہیں۔"

میں ہیبت خاں کے اس انکشاف پر حیرت سے اسکو تکنے لگا اور رفتہ رفتہ صورتِ حال مجھ پر پوری طرح واضح ہو گئی۔یہ مجرموں کا ایک گروہ تھا جو پولیس کے بھیس میں وارداتیں کر رہا تھا اور واقعی انہوں نے اپنی کارروائیوں کے لیے ایک نہایت مؤثر طریقہ اختیار کیا تھا۔مجھے حیران پا کر ہیبت خاں پر ایک بار پھر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔

"کیوں؟ کیسی ترکیب ہے؟ ہمارا کام کتنا آسان ہو گیا ہے؟"

راجی ابھی تک حیرانی سے منہ کھولے ہیبت خاں کی باتیں سن رہی تھی اس کے چہرے کا رنگ ایک دم اُڑ گیا تھا اور وہ اب خوف زدہ ہو گئی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ پولیس انسپکٹر کو مٹھی میں کرنے کے بعد وہ دوسروں پر حکومت کرے گی، لیکن اس انکشاف نے اس کے ہاتھوں کے طوطے اُڑا دیئے تھے۔ اسے خود اپنی زندگی اور مستقبل خطرے میں نظر آنے لگا تھا۔

"اب ٹھیک ٹھیک بتا دو کہ تم کون ہو اور وہ عورتیں کون ہیں؟" ہیبت خاں نے اپنی مونچھوں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے دریافت کیا۔

میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ میں اب تک ان لوگوں کو پولیس والے سمجھ رہا تھا اور مجھے ڈر تھا کہ شاید وہ میری گرفتاری کے لیے بھیجے گئے ہیں۔ یہ جان کر کہ وہ میری اصلیت کے بارے میں کچھ نہیں جانتے کچھ دیر پہلے مجھے جو خوشی ہوئی تھی اب وہ خاک میں مل گئی تھی۔ میں ایک اور جرائم پیشہ، خوفناک اور سنگدل گروہ کے چنگل میں پھنس گیا تھا جن سے کسی رحم یا معقولیت کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ انہوں نے میرے ہاتھوں میں پہلے ہی ہتھکڑیاں ڈال کر مجھے مجبور اور بے بس کر دیا تھا۔ میرا پستول ان کے قبضے میں تھا اور میں اُن کے قابو میں۔ تقدیر نے ایک بار پھر مجھ سے مذاق کیا تھا اور مجھے ایک نئی مصیبت سے دوچار کر دیا تھا۔ مجھے رضیہ اور لالی کا خیال آیا۔ راجی کی حفاظت کی ذمہ داری سے کچھ دیر پہلے میں خود کو مبرا سمجھنے لگا تھا، لیکن اس نئی صورتحال میں راجی بھی ان کے پاس محفوظ نہیں تھی۔ وہ کتنی ہی بُری عورت سہی میرا ضمیر اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا تھا کہ اسے میں ان ظالموں کے رحم و کرم پر چھوڑ دوں۔ اور پھر رضیہ اور لالی کی حفاظت کی ذمہ داری تو ایک لحاظ سے میرا اخلاقی فرض تھی۔ ویسے بھی اُن دونوں سے ایک وابستگی سی ہو گئی تھی اور شاید کچھ اَن جانے سے غیر محسوس جذباتی رشتے بھی قائم ہو چکے تھے، لیکن وہ دونوں اس تمام بدلی ہوئی صورتِ حال سے یکسر بے خبر تھیں اور ظاہر ہے کہ اُن کی زندگی اور عزت شدید خطرے میں تھی۔ راجی آہستگی سے اپنی کرسی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی اور دیوار سے لگی بے یقینی کے عالم میں ہیبت خاں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہوں سے خوف کے ساتھ ساتھ ایک پچھتاوا بھی جھلک رہا تھا۔ وہ جو خود کو پولیس انسپکٹر کی تحویل میں محفوظ اور بالاتر محسوس کر رہی تھی اب ایک ایسی کبوتری کی طرح سہمی ہوئی اور بے بس تھی جس کے پَر کاٹ کر پنجرے میں ڈال دیا گیا ہو۔ غالباً ہیبت خاں کو بھی اس کے بدلے ہوئے خیالات کا اندازہ ہو چکا تھا۔ اُس نے میز پر رکھے ہوئے گلاسوں میں بوتل سے شراب اُنڈیلی اور ایک گلاس اٹھا کر ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔ پھر دوسرا گلاس اُٹھا کر وہ جھومتا ہوا راجی کی طرف بڑھا۔

"جانِ من۔ تم کیوں ڈر گئیں؟ تم تو ہماری مہمان ہو۔ ہماری دل اور جان ہو۔ لو اسی خوشی میں ایک اور لگا لو۔"

اس نے گلاس راجی کے ہونٹوں کی طرف بڑھایا۔ وہ سہم کر سمٹ کر پیچھے ہٹ گئی اور ڈری ڈری نظروں سے کبھی اس کو اور کبھی مجھے دیکھنے لگی۔

"شرمانے کی کیا بات ہے سوہنی۔" ہیبت خاں کا قہقہہ گونجا۔ "پرہیز کیوں کرتی ہو۔ تھوڑی دیر پہلے تو چھل کی طرح میرے ساتھ پی رہی تھیں۔ ان سے کیا پردہ ہے؟ یہ تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ لو۔ میرے کہنے سے ایک لگا لو۔" اُس نے گلاس راجی کے ہونٹوں سے لگا دیا مگر اُس نے منہ دوسری طرف پھیر۔ اچانک وہ حد درجہ خوفزدہ نظر آنے لگی تھی۔

"کوئی بات نہیں۔ کوئی بات نہیں۔ پھر سہی۔" یہ کہہ کر ہیبت خاں نے ایک ہی سانس میں پورا گلاس خالی کر کے اُچھال دیا۔ گلاس مسہری پر جا گرا اور ہیبت خاں پر ایک بار پھر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ ہنستے ہنستے اس کی نظر

مجھ پر پڑی اور وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے وہ میری طرف بڑھا اور میری ٹھوڑی کو چھو کر بولا۔ "دیکھو جوان..... اب تم سچ سچ بک دو۔ یہ عورتیں کون ہیں؟ راجی نے تو خود ہی بتا دیا ہے سب کچھ۔ اب تم بھی بتا دو کہ یہ کہاں کی طوائفیں ہیں اور تم کب سے ان کی کمائی کھا رہے ہو؟" یہ کہہ کر اس نے ایک تھپڑ میرے منہ پر جڑ دیا۔

اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ اس سے پہلے وہ میرے صبر و ضبط کا بہت امتحان لے چکا تھا، لیکن اس کی یہ بدکلامی اور تھپڑ مجھ سے برداشت نہیں ہو سکا۔ میں نے اپنے ہتھکڑی بندھے ہاتھوں کو بجلی جیسی سُرعت سے حرکت دی اور اس کے چہرے پر دے مارا۔ وہ اس غیر متوقع اور زوردار حملے سے نہ صرف بھونچکا رہ گیا بلکہ لڑکھڑا بھی گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا میں نے دونوں ہاتھوں کو یکجا کر کے دوسری ضرب اس کے سینے پر لگائی یوں لگا جیسے میرے ہاتھ کسی چٹان سے ٹکرا گئے ہیں، لیکن میرے تمام جسم کی طاقت اس ضرب کے پیچھے تھی۔ وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح فرش پر گر گیا۔ مگر میرا غیض و غضب جو دیر تک دبائے رکھنے کے بعد اچانک بھڑک اُٹھا تھا پھر بھی کم نہ ہوا تھا۔ میں اس کو ٹھوکر لگانے کے ارادے سے آگے بڑھا کہ اچانک یوں لگا جیسے قیامت ٹوٹ پڑی ہو۔

کسی نے بندوق کا بٹ میری کنپٹی پہ مارا اور پھر مجھے کسی چیز کا ہوش نہیں رہا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک گندی اور اندھیری کوٹھڑی میں اینٹوں کے فرش پر لیٹا ہوا تھا اور میرا تمام جسم پھوڑے کی طرح دُکھ رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ میرے بے ہوش ہونے کے بعد بھی اُن لوگوں نے میری خاصی مرمّت کی تھی۔ میں نے اُٹھ کر چاروں طرف دیکھا۔ اس کمرے میں کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ نہ کوئی روشندان تھا۔ صرف ایک پرانی طرز کا مضبوط سا لکڑی کا دروازہ تھا۔ چھت کافی اونچی تھی۔ کمرے میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا اور واضح طور پہ کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے دیواروں کو ٹٹول کر بجلی کا سوئچ تلاش کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ غالباً اس کوٹھڑی میں بجلی کی روشنی کا بندوبست ہی نہیں تھا۔ کمرے میں ایک عجیب قسم کی ناگوار بدبو پھیلی ہوئی تھی اور گندگی کا احساس ہو رہا تھا۔ غالباً یہ کمرہ مویشیوں کو رکھنے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ ہر طرف سے مجبور ہو کر میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور حالات پر غور کرنے لگا۔ فی الحال سب سے بڑا مسئلہ ان جنگلی لٹیروں سے نجات حاصل کرنے کا تھا۔ جس کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہوش میں آنے کے بعد سب سے پہلے مجھے رضیہ اور پھر لالی کا خیال آیا۔ ان درندوں سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ عورتوں کا احترام کریں گے۔ نہ ہی وہ کسی سے خوفزدہ اور مرعوب ہو سکتے تھے۔ اس دور دراز اور غیر آباد علاقے میں ان کی بادشاہت تھی۔ قانون کے ہاتھ بھی یہاں تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ جب ہی تو وہ دیدہ دلیری سے قانون کے محافظوں کا روپ دھارے اپنی غیر قانونی اور مجرمانہ سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ ان حالات میں چھٹکارے کی کیا تدبیر ہو سکتی تھی؟

دروازے پر آہٹ سنائی دی اور پھر کسی نے دروازہ کھول دیا۔ ہوا کا ایک جھونکا اور روشنی کی تھوڑی سی رمق اندر آئی۔ میری آنکھیں ٹھیک طور پر دیکھنے کے قابل نہیں ہوئی تھیں، لیکن اس کے باوجود مجھ کو وہ انسانی ہیولا نظر آ گیا جو بندوق ہاتھ میں تھامے دروازے میں کھڑا تھا۔ "اوئے" ایک کرخت آواز نے مجھے مخاطب کیا۔ "چل اُٹھ سیدھی طرح باہر آ جا۔" میں لڑکھڑاتا ہوا اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میرے ہاتھ پیر اور سارا جسم اکڑ گیا تھا اور مجھے سیدھے کھڑے ہونے میں خاصی دِقت پیش آ رہی تھی۔ لیکن جب میں قدم اُٹھاتا ہوا دروازے پر پہنچا تو محسوس ہوا کہ میرے ہاتھ پاؤں رفتہ رفتہ کھلنے لگے تھے۔ دروازے کے باہر ہیبت خاں کا ایک ساتھی پولیس کی وردی میں ملبوس کھڑا تھا۔ اس نے بندوق کی نالی سے مجھے دھکیل کر آگے چلنے کا اشارہ کیا لیکن میں نے خاص طور پر یہ

بات نوٹ کی کہ اس نے اپنے اور میرے درمیان خاصا فاصلہ رکھا ہوا تھا۔

اب شام ہو چکی تھی اور ملگجا اندھیرا چاروں طرف پھیلنے لگا تھا۔ درختوں پر پرندے بسیرا لینے کے لیے پہنچ رہے تھے اور اپنے اپنے آشیانوں میں پناہ لینے کے بعد چہچہا رہے تھے۔ جب کہ میں اپنے بسیرے اور آشیانے سے 'بہت دور تھا۔ میرے دل میں بے اختیار ایک ہُوک سی اُٹھی۔ خدا جانے کن گناہوں کی پاداش میں مجھے یہ سب مصائب جھیلنے پڑ رہے تھے۔ میرا بسا بسایا گھر اُجڑ چکا تھا۔ نظامِ زندگی درہم برہم ہو چکا تھا۔ میرے لیے اب سکون' آسائش اور خوشی نام کی کوئی چیز شاید دنیا میں باقی نہیں رہی تھی۔ میں نے زندگی میں جسے ٹوٹ کر چاہا تھا وہ مجھ سے بچھڑ چکی تھی اس کے دل میں اور ذہن میں میرے خلاف تلخ و ترش یادوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ دوسری طرف وہ عورت جسے میں اپنے گھر کی عزت بنا کر لایا تھا وہ مجھے بے وفائی کا داغ دے کر ہمیشہ کے لیے مایوس اور دُکھی کر گئی تھی۔ انھوں نے بیگانوں کا روپ دھار لیا تھا۔ دوستوں نے دشمنوں جیسا سلوک کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہ میرے اعمال کی سزا تھی۔ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا؛ سُنا ہے اللہ تعالیٰ اس زندگی ہی میں انسانوں کو اچھے کاموں کا اَجر اور بُرے کاموں کی سزا دے دیتے ہیں، شاید میں بھی اپنے گناہوں اور غلط کاموں کا خمیازہ بھگت رہا تھا مگر یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا؛ دُکھ' درد' مایوسی اور مصائب کی لہر کب ختم ہوگی؟ زندگی میں جو اندھیرے سے گھل چکے ہیں وہ کب چھٹیں گے۔

یکایک بندوق کی نالی کی ایک ضرب نے مجھے خیالات کے سمندر میں غوطہ زن رہنے سے روک دیا۔ میرا محافظ مجھے بندوق سے ضرب لگا کر ایک اور راستے کی جانب چلنے کی ہدایت کر رہا تھا۔ غالباً وہ پہلے زبانی طور پر بھی مجھے کہہ چکا ہوگا لیکن میں خیالات اور یادوں کے ہجوم میں اس طرح کھویا ہوا تھا کہ اس کی آواز پر دھیان نہ دے سکا۔

'اُدھر نہیں کھوتے۔ اِدھر چلو۔' اس نے پُرزور آواز میں ڈانٹ کر کہا۔ میں نے اپنے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں۔ ہم اصل عمارت کے عقبی حصے میں تھے جو غالباً کسی زمانے میں مویشی خانے اور شاگرد پیشے کے طور پر استعمال ہوتا ہو گا۔ مجھے جس کوٹھری میں بند رکھا گیا تھا وہ مویشیوں کے بند کرنے کی جگہ تھی۔ اب ہم بیرک نما کئی کوارٹروں اور جھونپڑیوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے اصل حویلی کی طرف جا رہے تھے۔ یہ ایک نہایت وسیع و عریض حویلی تھی۔ اگرچہ امتدادِ زمانہ کی وجہ سے اب خاصی شکستہ اور بوسیدہ حالت میں تھی لیکن اس کا شکوہ اور شان و شوکت بتا رہے تھے کہ کسی زمانے میں یہ کسی بہت بڑے جاگیردار کی آماجگاہ اور عشرت گاہ ہوگی۔ یہ شاگرد پیشہ اصل عمارت سے خاصی دُور تھی۔ اس کے اور حویلی کے درمیان میں کسی وقت باغ ہوگا جو اَب اُجڑ چکا تھا۔ لیکن اس کے آثار ابھی تک باقی تھے۔ ہم حویلی کی جانب گامزن تھے۔ سامنے حویلی کے عقبی برآمدوں کا ایک حصہ نظر آنے لگا تھا۔ تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم ایک راہداری میں پہنچ گئے اور درمیانی برآمدے کی جانب چل پڑے۔ یکایک مجھے ایک چیخ کی آواز سنائی دی اور میرے قدم ٹھٹک کر رہ گئے۔ یہ کسی عورت کی چیخ کی آواز تھی۔ اس کے بعد ایک کرخت مردانہ قہقہے کی آواز گونجی اور میرے قدموں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ میرا جسم یکایک پسینے میں شرابور ہو گیا تھا اور دل کی دھڑکن اچانک بے حد تیز ہو گئی تھی۔ میرے ذہن میں فوری طور پر بہت سے وسوسے اور اندیشے پیدا ہوئے۔ چیخ کی آواز دوبارہ گونجی اور اس بار میں نے اس کی کھوج لگانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس سے پہلے کہ میرا محافظ مجھے روکتا میں بے تحاشہ بھاگتا ہوا راہداری میں واقع ایک کمرے کے دروازے پر پہنچ چکا تھا۔ یہ دروازہ اندر سے بند تھا اور میرے پاس زیادہ وقت تھا نہ مہلت۔ میں پوری قوت کے ساتھ دروازے سے ٹکرایا۔ دروازہ زور کی آواز سے کھلا اور میں خود اپنے زور میں کافی دُور تک اندر چلا گیا اور ایک دیوار سے ٹکرا کر رُک گیا۔ پلٹ کر دیکھا تو میں ایک درمیانہ سائز کے کمرے میں کھڑا تھا جس کے ایک گوشے میں دو چارپائیاں پڑی ہوئی تھیں۔ کمرے میں چند ٹوٹی پھوٹی لکڑی کی کرسیوں کے علاوہ کوئی اور فرنیچر نہیں تھا۔ کمرے میں روشنی زیادہ نہیں تھی لیکن میں جو کچھ دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ میں نے

دیکھ لیا تھا۔ میری نگاہوں کے سامنے ایک ہوش رُبا منظر تھا۔ کمرے کے ایک گوشے میں راجی سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ اس کے بال اور لباس بے ترتیب تھے۔ آنکھیں خوف سے پھٹی ہوئی تھیں اور وہ پھٹی سامنے۔ دیکھ رہی تھی جہاں چارپائی کی پٹی پر ایک تنومند آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چمڑے کا ہنٹر تھا اور سامنے لکڑی کی ایک ٹوٹی ہوئی میز پر شراب کی ایک بوتل اور دو گلاس بھرے ہوئے تھے۔ میں آناً فاناً کمرے میں داخل ہوا تھا اس لیے پہلے تو وہ دونوں بھونچکے رہ گئے مگر پھر راجی نے مجھے پہچان لیا اور دوڑ کر میرے پاس آگئی۔

"مجھے بچا لو۔ مجھے ان بدمعاشوں سے بچا لو۔" اس کی آواز خوف اور دہشت سے کانپ رہی تھی۔ اس نے میرا بازو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اس کے ہاتھ برف کی طرح ٹھنڈے ہو رہے تھے جو اس کے حد سے زیادہ خوفزدہ ہونے کی علامت تھی۔

سامنے بیٹھا ہوا آدمی اَب اُٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ میں نے پہچان لیا تھا کہ وہ ہیبت خاں کے نام نہاد پولیس والوں میں سے ایک تھا لیکن اس وقت وہ محض پتلون اور بنیان پہنے ہوئے تھا۔ وہ اپنے ہاتھ میں چمڑے کے ہنٹر کو تولتا ہوا میری جانب بڑھنے لگا۔ اسی لمحے دروازے پر آہٹ ہوئی اور میرا مسلح محافظ نمودار ہوا۔

'خبردار۔ ہاتھ اوپر اُٹھا دو نہیں تو گولی مار دوں گا۔" وہ چلّا کر میری جانب بڑھا۔

'رُک جا بابے۔' ہنٹر والے شخص نے ہاتھ کے اشارے سے اس کو روک دیا۔ 'پہلے میں اسے بدتمیزی کا مزا تو چکھا لوں۔' پھر وہ میری طرف بڑھتے ہوئے بڑبڑایا۔ 'بڑا تیس مار خاں بن کر آیا ہے اپنی ماں بہن کو بچانے کے لیے۔" یہ کہہ کر اس نے زور سے ہنٹر زمین پر مارا۔ ایک تڑاخے کی آواز پیدا ہوئی اور راجی ڈر کر اُچھل پڑی۔ دوسری بار اس نے چمڑے کو ہوا میں حرکت دی اور شوں شوں کی آوازوں سے کمرہ گونج اُٹھا۔ یکایک اس نے میری جانب رُخ کیا اور بازو کے ایک جھٹکے سے ہنٹر میری طرف گھمایا۔ ہنٹر کی نوک بجلی کے کرنٹ کی طرح میرے بازو میں لگی اور تکلیف سے زیرِ لب آہ نکل گئی۔ میں نے اپنا بازو تھام لیا۔ اس کا دوسرا حملہ میرے دوسرے بازو پر ہوا اور میں بچنے کی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ تیسری بار اس نے ہنٹر کو لہرایا اور پھندے کی صورت میں میرے جسم کے گرد پھینکا۔ شاید یہی اس کی غلطی تھی۔ ہنٹر نے ضرب لگانے کے بعد میرے جسم کو سانپ کی طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا لیکن میں نے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا اور اس سے پہلے کہ ہنٹر میرے جسم سے علیحدہ ہوتا ہتھکڑی میں جکڑے ہوئے دونوں ہاتھوں سے ہنٹر کو مضبوطی سے تھام کر پوری قوت سے جھٹکا مارا۔ وہ اس کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ ہنٹر کے دستے پر اس کی گرفت مضبوط تھی۔ دوسری طرف میرا جھٹکا بھی بھرپور تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایک زوردار جھٹکے کے ساتھ کھنچا ہوا میری طرف آیا اور میں نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اُٹھا دیئے۔ وہ پوری قوت کے ساتھ میرے سینے سے ٹکرایا اور میں نے پھرتی کے ساتھ اس کے سر اور گردن کے گرد اپنے بازو حمائل کر دیئے۔ اب وہ میری گرفت میں تھا اور میں اس کی گردن کے گرد اپنا دباؤ مسلسل بڑھا رہا تھا۔ اس کے منہ سے عجیب و غریب کرخت آوازیں نکلنے لگیں۔ مسلح محافظ اس صورتِ حال سے بوکھلا گیا تھا۔ اس نے بندوق سے نشانہ لیا اور ایک فائر کیا لیکن میں اتنی دیر میں اپنے شکار سمیت گھوم کر بندوق کے سامنے آچکا تھا۔ گولی میرے سامنے والے کے جسم میں پیوست ہوگئی۔ اس کے منہ سے ایک چیخ کی آواز نکلی اور دوسرے ہی لمحے اس کا بھاری بھرکم جسم میرے دونوں ہاتھوں کے درمیان آگے کو جھک گیا۔ بندوق سے فائر کرنے والے نے یہ منظر دیکھا تو گھبرا گیا۔ میں اس کی حماقت اور پریشانی سے پورا پورا فائدہ اُٹھانا چاہتا تھا۔ میں نے اُسے سوچنے کا ایک لمحہ بھی نہیں دیا۔ میرے دونوں بازو جو ہار کی طرح میرے سامنے والے کے گرد حمائل تھے میں نے انھیں بڑی تیزی سے اوپر کی جانب اُٹھایا اور پوری طاقت سے اس کے زخمی جسم کو سامنے والے مسلح محافظ کی جانب دھکیل دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ صورتِ حال کو سمجھتا ایک بھاری بھرکم جسم اس
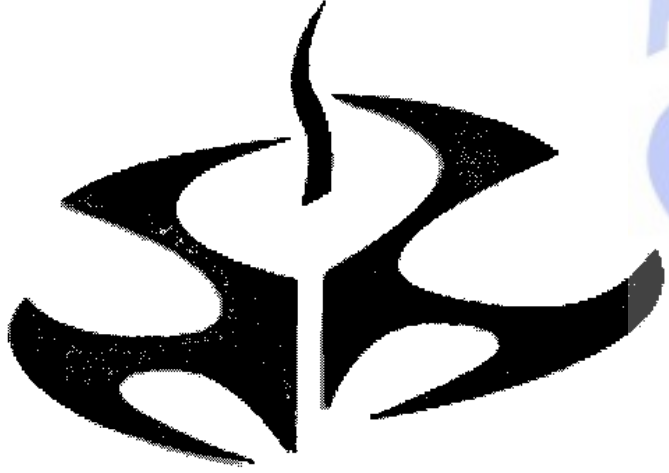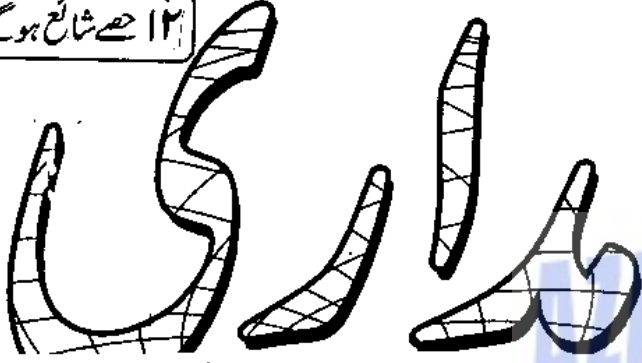
سے ٹکرایا اور وہ اس کے وزن سے توازن قائم نہ رکھتے ہوئے پیچھے کی جانب گر گیا۔ مَیں کوئی لمحہ ضائع کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اس لیے اس کے زمین پر گرتے ہی مَیں گولی کی طرح لپک کر اس کے پاس گیا۔ وہ زخمی کے بھاری جسم تلے دبا ہوا تھا اور بندوق چھوڑ کر اس کو ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مَیں نے جھک کر فرش پر پڑی ہوئی بندوق دونوں ہاتھوں میں تھام کر اُٹھالی اور پلٹ کر راجی کی طرف دیکھا۔

"راجی۔ تم باہر چلو' جلدی۔" مگر میرا دروازے کی جانب سے رُخ مُڑنا قیامت ثابت ہوا۔ پیچھے سے ایک زوردار ضرب میرے سر پر لگی اور مَیں بندوق سمیت اوندھے منہ فرش پر گر گیا۔ مَیں نے تیزی سے پلٹ کر کروٹ لگائی اور ہتھکڑی میں بندھے ہوئے دونوں ہاتھ زمین پر ٹیک کر اُٹھنے کی کوشش کی مگر ایک زوردار ٹھوکر نے مجھے پیچھے کی طرف گرا دیا۔ مَیں نے دونوں کہنیاں فرش پر ٹیک کر اپنی گردن اُونچی اُٹھائی اور اپنے سامنے ہیبت خاں کو دیکھ کر وہیں ساکت رہ گیا۔ ہیبت خان کے ہاتھ میں بندوق تھی اور وہ حزن آلود نگاہوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ اس کے عقب میں اس کے دو اور ساتھی کھڑے تھے اور مجھے یوں دیکھ رہے تھے جیسے بس چلا تو مجھے کچا ہی چبا ڈالیں گے

ہیبت خان رعونت سے قدم اُٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور میرے نزدیک آکر رُک گیا۔ اتنی دیر میں اس کا ساتھی بالا اپنے مُردہ ہمراہی کی لاش کے نیچے سے نکلنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس نے جھپٹ کر بندوق دوبارہ مجھ سے چھین لی اور خوں خوار انداز میں گھورتے ہوئے مجھے ٹھوکر مارنے کے لیے اپنا پیر اُٹھایا مگر ہیبت خان کی ایک گرجدار ڈانٹ نے اسے ساکت کر دیا۔ "خبردار!" ہیبت خان نے للکار کر کہا۔ اور بالا بے حس و حرکت کھڑا ہو گیا۔

ہیبت خان نے کمرے میں چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ اس کی نگاہیں مُردہ غنڈے پر جا کر رُک گئیں اور پھر اس نے استفہامی انداز میں بالے کو دیکھا۔ "اس نے گھمن کو مار دیا ہے اُستاد۔" وہ بولا۔

"یہ جھوٹ ہے۔" مَیں اس اثنا میں زمین پر سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر مَیں زمین ہی پر پڑا رہا تو ان سب کی ٹھوکروں کا نشانہ بن جاؤں گا اور وہ میرا حال فٹ بال سے بھی بدتر کر دیں گے۔ "اسے مَیں نے نہیں مارا۔ یہ اسی کی گولی سے مرا ہے۔ پوچھ لو بندوق کس کے پاس تھی اور گولی کس نے چلائی تھی۔"

ہیبت خان نے گھور کر بالے کو دیکھا۔

وہ پریشانی سے سٹپٹا کر بولا۔ "مَیں نے گولی تو چلائی تھی مگر گھمن پر نہیں اسی پر چلائی تھی۔ پر اس نے گھمن کو پکڑ کر آگے کر دیا۔"

ہیبت خاں کا بایاں ہاتھ اچانک تیزی سے حرکت میں آیا اور ایک زوردار طمانچے کی آواز سے کمرہ گونج اُٹھا۔ "اُلّو کے کان۔ کس نے کہا تھا اس پر گولی چلانے کو؟"

بالا اپنا گال سہلاتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا۔ "اس نے گھمن پر حملہ کر دیا تھا۔ مَیں نے تو اس کو بچانے کے لیے گولی چلائی تھی۔"

"شرم کرو نامردو۔ چوڑیاں پہن کر بیٹھ جاؤ۔" ہیبت خان نے نفرت اور حقارت سے زمین پر تھوک دیا۔ "ہتھکڑیوں سے بندھا ہوا ایک بندہ بھی تمہارے قابو میں نہیں آتا؟ بے غیرتو۔ ڈوب کر مر جاؤ۔" پھر وہ غصے سے پیچ و تاب کھاتا ہوا میری طرف مڑا۔ "تو نے گھمن پر حملہ کیوں کیا تھا؟ تجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ میرا آدمی ہے؟"

اس کے سوال سے اچانک مجھے احساس ہوا کہ راجی بھی اسی کمرے میں موجود ہے اور اسی کو بچانے کے لیے مَیں نے گھمن سے ٹکر لی تھی۔ راجی اس وقت ایک طرف دیوار سے پُشت ٹیکے کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ لباس جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا اور چہرے پر خوف کے آثار تھے۔ ہیبت خان نے ایک لمحے میں معاملہ بھانپ لیا۔ "کیوں بھئی تجھے کیا تکلیف ہے؟ یہ تیری ماں بہن لگتی ہے کیا جس کو بچانے کے لیے تو نے اپنی جان

کی بازی لگادی ؟"

میری قوّت برداشت تیزی سے جواب دیتی جارہی تھی۔ مَیں نے پھر بھی جذبات کو قابو میں رکھنے کی کوشش کی اور کہا "یہ عورتیں میرے ساتھ ہیں اس لیے ان کی حفاظت کرنا بھی میرا ہی فرض ہے۔ سنو ہیبت خاں یہ ٹھیک ہے کہ تم پولیس کا بہروپ بھر کر ڈاکے مارتے ہو۔ قتل کرتے ہو کمزور اور بے بس لوگوں کو لوٹ لیتے ہیں مگر یاد رکھو۔ یہ عورتیں بے آسرا اور یتیم نہیں ہیں۔ یہ ایک بہت بڑے آدمی کی امانت ہے۔ مَیں ان کو لے کر اُسی کے پاس جا رہا ہوں۔ یاد رکھو اگر تم نے انہیں اُنگلی بھی لگائی تو تمہاری خیر نہیں ہے۔"

ہیبت خان چند لمحے خاموش مجھے دیکھتا رہا۔ پھر یکایک ایک زوردار قہقہہ لگا کر بولا "اوئے کھوتے۔ مجھے دھمکی دیتا ہے ؟ ہیبت خان کو ؟ جس کے نام سے بڑے بڑے کانپ جاتے ہیں۔ یہاں میرا راج ہے مَیں تیری بوٹیاں بھی نوچ کر پرندوں کو کھلا دوں تو کوئی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور یہ تیری امانت ....." وہ بات کو ادھورا چھوڑ کر راجی کی طرف متوجہ ہوا "یہ تیرے پاس کس کی امانت ہے ؟ ارے یہ تو بہتی گنگا ہے۔ تو اس کو شریف زادی کہتا ہے ؟ اس ناچنے والی بیوہ کو ؟ جو پیسے کی جھنکار پر، طبلے کی تھاپ پر ناچتی ہے اور سب کا دل بہلاتی ہے۔ اس شریف زادی کو تو ہر کوئی خرید سکتا ہے۔ بس جیب میں پیسہ ہونا چاہیے۔"

مَیں نے رسانیت سے کہا "ہیبت خان۔ راجی طوائف ہے۔ یہ مانتا ہوں۔ یہ ہمارے ساتھ نہیں تھی۔ راستے میں مِل گئی۔ مگر کیونکہ ہمارے ساتھ ہے اس لیے اس کی دیکھ بھال میرا فرض ہے۔"

وہ پھر ہنسنے لگا "اوّارے اس کی حفاظت کرے گا ؟ اس کی ؟ جو خود اپنی مرضی سے چل کر میرے پاس آئی تھی ؟ تُو نے اس شریف زادی کو روک کیوں نہیں لیا تھا ؟ تیرا فرض اس وقت کہاں سو گیا تھا ؟" اُس کی بات میں کافی وزن تھا اور راجی کے بارے میں کہا ہُوا اُس کا ایک ایک لفظ درست تھا۔ یہ سچ ہے کہ راجی خود اپنی رضامندی سے اس کے پاس گئی تھی۔ خدا جانے اس نے ایسا کیوں کیا تھا ؟ وہ اپنی جان بچانے کے لیے زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کرنے کی خواہشمند تھی یا مجھ سے انتقام لینے کی غرض سے اُس نے یہ قدم اُٹھایا تھا۔ یوں تو راجی جس پیشے اور طبقے سے تعلق رکھتی تھی اس سے تعلق رکھنے والی عورتوں کے نزدیک عزّت اور آبرو بے معنی الفاظ تھے۔ پھر بھی اُس نے اپنی جلد بازی یا غیر ذمہ داری سے دوسری عورتوں کے لیے خطرات پیدا کر دیے تھے۔ مَیں نے ہیبت خان کو رضیہ اور لالی کی اصلیت بتانے سے گریز کیا تھا۔ وہ ان کی حقیقی حیثیت سے ناواقف تھا اور بہت ممکن ہے کہ راجی کے طرزِ عمل کے باعث اس کو رضیہ اور لالی کے بارے میں بھی یہ گمان ہو گیا ہو کہ وہ بھی راجی ہی کی ہم پیشہ ہیں۔ یہی تاثر ان دونوں عورتوں کے حق میں زہرِ قاتل ثابت ہو سکتا تھا اور میری حتی الامکان یہ کوشش رہی تھی کہ ہیبت خاں اُن عورتوں کی بے بسی اور مجبوری سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کی کوشش نہ کرے۔

اب ہیبت خاں کی اصلیت ہم پر پوری طرح واضح ہو چکی تھی۔ وہ ایک بے رحم اور سنگدل ڈاکو اور لٹیرا تھا جو اس دور دراز علاقے میں پولیس کی وردی پہن کر اور اپنے ساتھیوں کو پولیس کے سپاہی ظاہر کر کے وارداتیں کرنے میں مصروف تھا۔ غالباً اس کے خلاف قانون نافذ کرنے والے اداروں نے اس سے پہلے کوئی مؤثر اقدام نہیں کیا تھا جس کی وجہ سے اس کی ہمت بڑھ گئی تھی اور وہ کھلّم کھلّا بے گناہ لوگوں کو لوٹنے میں مصروف تھا۔ اس سے کسی قسم کے رحم یا شائستگی کی توقع کرنا لاحاصل تھا۔ مشکل یہ تھی کہ مَیں اس کو دھمکیاں دے کر بھی کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں کر سکتا تھا۔ اس وقت ہم سب اس کے قبضۂ اختیار میں تھے۔ مَیں اس گروہ میں واحد مرد تھا جس کو بے قابو کر کے اُن لوگوں نے ہتھکڑیوں میں جکڑ دیا تھا۔ اس ظالم گروہ کے سامنے باقیماندہ تین عورتوں کی حیثیت ہی کیا تھی ؟

پھر ہیبت خاں کو اس کے مذموم ارادوں سے باز رکھنے کے لیے میں ہر ممکن ذریعہ استعمال کرنا چاہتا تھا۔

اس سلسلے میں نے ایک نیا حربہ آزمانے کی کوشش کی۔

"سنو ہیبت خاں۔ اگر تمہیں روپے کی ضرورت ہے تو مَیں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اگر ان عورتوں کو حفاظت اور عزّت کے ساتھ ان کے گھر پہنچانے میں میری مدد کرو گے تو تمہیں مُنہ مانگا روپیہ مل جائے گا۔"

وہ خاموشی سے مجھے گھورتا رہا۔ مَیں نے موقع مناسب جان کر ایک اور قدم آگے بڑھایا۔ اور کہا "تمہاری یہ بات بھی سچ ہے کہ راجی اپنی نادانی میں خود ہی پکے ہوئے پھل کی طرح تمہاری گود میں جاگری تھی مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ تم اسے اپنے دوسرے ساتھیوں کے لیے بھی کھلونا سمجھنے لگو۔ یہ ظلم اور ناانصافی ہے۔ تم تو ایک بہادر اور جی دار آدمی ہو۔ بے بس اور مجبور عورتوں کی مجبوری سے فائدہ اُٹھانا تمہیں زیب نہیں دیتا اور یہ بھی مت بھولو کہ یہ کوئی گری پڑی اور بے سہارا عورتیں نہیں ہیں۔ اگر انہیں انگلی بھی لگائی تو تمہیں زندگی بھر پچھتانا پڑے گا۔"

وہ اتنی تیزی سے میری طرف بڑھا کہ مَیں پلک بھی جھپکانے نہیں پایا اور اُس کا اُلٹے ہاتھ کا تھپّڑ پوری قوّت سے میرے رُخسار پر پڑا۔ مَیں لڑکھڑا کر رہ گیا۔ اسکا ہاتھ بہت بھاری۔ کھُردرا اور سخت تھا۔ یوں لگا جیسے کسی نے میرے مُنہ پر لوہے کا ہتھوڑا کھینچ مارا ہو۔ اس کے تھپّڑ کی ضرب سے میرا سارا وجود ہِل گیا۔ اگر میری جسمانی قوت اور میری قوّتِ ارادی کام نہ کرتی تو شاید مَیں اُلٹ کر دُور جا گرتا۔

"اوئے کھوتے" وہ غرّایا "مجھے سبق پڑھانے آیا ہے۔ لالچ دیتا ہے ؟ ارے تُو اور تیرا مالک مجھے کیا دے گا۔ مَیں جو چاہتا ہوں خود ہی چھین لیتا ہوں۔ مَیں کسی کی مہربانی کا محتاج نہیں ہوں۔ تیری وجہ سے میرا ایک بہت کارآمد بندہ ضائع ہُوا ہے۔ مَیں تجھے کبھی معاف نہیں کروں گا۔ مَیں تجھے ایسا سبق دوں گا کہ ساری عمر یاد کرے گا اور تیری یہ شریف زادیاں بھی اس کا تماشہ دیکھ لیں گی۔" پھر وہ بالے سے مخاطب ہو کر بولا "بالے۔ اسے کھوتے اُدھر کھڑا ہوا کیا دیکھ رہا ہے ؟ لے چل اس سورما کو گول کمرے میں اور ذرا جھری کس دے اس کی !"

بالے تو جیسے اس کے حکم کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ اُس نے پیچھے سے میرے ایک تھپّڑ جڑ دیا اور دھکّا دے کر بولا "چل بے۔ آگے کو لگ جا۔"

ان لوگوں کا ہتک آمیز برتاؤ میرے لیے ناقابلِ برداشت ہو چکا تھا۔ مَیں نے بالے کی طرف رُخ کیے بغیر اپنی ٹانگ کو پیچھے کی جانب حرکت دی اور میرا پیر پوری قوّت سے اُس کے پیٹ کے زیریں حصّے میں لگا۔ تو وہ تکلیف سے دوہرا ہو گیا مَیں نے اس کو مارنے کے لیے ہتھکڑی میں بندھے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اُٹھائے مگر اس سے پہلے کہ وہ اس کے سر پر لگتے ہیبت خاں نے ایک زوردار گالی کے ساتھ بندوق کا بٹ پوری قوت سے میرے سر پر مارا اور مَیں ایک بار پھر بے ہوش ہو کر زمین پر گر گیا۔

نہ جانے کتنی دیر بعد مَیں ہوش میں آیا۔ آنکھیں کھول کر مَیں نے ایک انتہائی قابلِ اعتراض نظارہ دیکھا۔ ایک بہت بڑے ہال نما کمرے میں ان لوگوں نے مجھے ایک گول ستون کے ساتھ رسّی سے باندھ دیا تھا۔ سامنے صوفوں پر ہیبت خاں اور اس کے چند ساتھی براجمان تھے۔ اور ہم سب کے سامنے، ہال کمرے کے وسط میں راجی۔ رضیہ اور لالی سہمی ہوئی کھڑی تھیں۔ راجی کو مَیں نے جس حال میں دیکھا تھا اب وہ اُس سے بھی گئے گزرے حال میں تھی۔ لباس کے نام پر اس کے جسم پر چند دھجیوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ جبکہ رضیہ اور لالی اگرچہ اپنے پورے لباس میں ملبوس تھیں لیکن ان کے دوپٹے غائب تھے۔ ہیبت خاں اور اس کے ساتھیوں کے سامنے شراب کی بوتلیں اور گلاس رکھے ہوئے تھے اور وہ قالین پر پیر پھیلائے بیٹھے زور زور سے ہنس رہے تھے۔ ان کے ہتھیار ان کے نزدیک ہی قالین پر رکھے ہوئے تھے لیکن وہ اُن کی ضرورت اور موجودگی سے بے نیاز نظر آتے تھے۔ ان کی

حریصانہ نگاہیں سامنے کھڑی ہوئی تینوں عورتوں پر جمی ہوئی تھیں اور وہ نشے میں بدمست بلند آواز سے قہقہے لگا رہے تھے۔

ہیبت خاں نے مجھے ہوش میں آتے دیکھا تو گلاس تھام کر اُٹھ کھڑا ہوا اور میری طرف بڑھا۔ اس نے شراب سے لبریز گلاس میرے ہونٹوں کی طرف بڑھایا تو میں نے نفرت سے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ اس نے گلاس میرے چہرے پر پھینک دیا اور میری آنکھیں الکحل کی تیزی سے جلنے لگیں۔ میں اپنے ہاتھوں سے اپنی آنکھوں کو صاف بھی نہیں کر سکتا تھا۔ غصے سے خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ ہیبت خاں کی اس حرکت پر اس کے ساتھی اور زیادہ بلند آواز میں ہنسنے لگے۔ ہیبت خاں شراب کا خالی گلاس لیے ہوئے عورتوں کی طرف بڑھا اور راجی کو مخاطب کر کے بولا۔ "طوائف زادی۔ ہم سب کو اپنا ناچ دکھاؤ۔ جلدی کرو جلدی۔" اُس نے مُڑ کر بالے کی طرف دیکھا اور فرش پر سامنے پڑے ہوئے چرمی ہنٹر کی طرف اشارہ کیا۔ بالے ہنٹر سنبھال کر کھڑا ہو گیا۔

ہیبت خاں نے کہا۔ "بالے جب تک ہم حکم نہ دیں ناچ جاری رہنا چاہیے۔ اگر یہ ناچتے ہوئے رُک جائے تو تم اپنا کام شروع کر دینا۔ ٹھیک ہے؟ سمجھے کہ نہیں؟"

یہ کہہ کر وہ دوبارہ قالین پر جا بیٹھا اور اپنے گلاس میں بوتل سے شراب اُنڈیلنے میں مصروف ہو گیا۔ بالے نے ہنٹر کو ایک جھٹکا مارا اور اس کی آواز سے سارا ہال گونج اُٹھا۔ راجی کے چہرے پر خوف اور دہشت کے آثار اور زیادہ نمایاں ہو گئے۔ اس سے پہلے کہ بالے کا ہنٹر دوبارہ حرکت میں آتا اُس نے تیزی سے رقص کرنا شروع کر دیا۔ ہیبت خاں اور اس کے ساتھی بے تحاشہ چیخ چیخ کر ہنسنے لگے۔ رضیہ اور لالی سہمی ہوئی یہ منظر دیکھ رہی تھیں اور خوف سے چند قدم پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ راجی یوں تو ایک دلکش عورت تھی اور پیشہ ور طوائف ہونے کی وجہ سے وہ یقیناً رقص کا فن بھی جانتی ہو گی۔ مگر اس موقعے پر سازوں کی غیر موجودگی اور صورتِ حال کی نزاکت کے پیشِ نظر وہ جو حرکتیں کر رہی تھی اِن میں ذرا بھی دلکشی نہیں تھی اور اسے رقص کہنا کسی طرح بھی مناسب نہ تھا مگر صاف ظاہر ہے کہ ان لوگوں کو نشے کی بدمستی میں رقص کی نزاکتوں اور لطافتوں سے کوئی سروکار بھی نہیں تھا۔ وہ تو محض صورتِ حال کی سنگینی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

خدا جانے کتنی دیر تک یہ ہنگامہ جاری رہا اور راجی رقص کرتی رہی۔ یکایک ہیبت خاں نے چلّا کر اسے رقص بند کرنے کا حکم دیا۔ اور وہ یک لخت کسی کٹھ پتلی کی مانند ساکت کھڑی ہو گئی۔

ہیبت خاں نے سر اُٹھا کر رضیہ کی جانب دیکھا اور پھر لالی پر ایک نگاہ ڈالی۔ غالباً وہ یہ فیصلہ کر رہا تھا کہ ان دونوں میں سے کس کا رقص اسے زیادہ محظوظ کرے گا؟ پھر اس نے رضیہ کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔ "اب تم اپنا ناچ دکھاؤ گی۔"

رضیہ خوف و دہشت کے باوجود اپنے غصے پر قابو نہ پا سکی اور جوش سے کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ "تم مجھے کیا سمجھتے ہو؟ میں کوئی ڈانسر نہیں ہوں۔ عزّت دار عورت ہوں۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔" ہیبت خاں نے اس کی بات کاٹ دی اور ہاتھ نچا کر بولا۔ "تم عزّت دار عورت ہو تو عزّت داروں کی طرح ناچو۔ بس شروع ہو جاؤ۔"

"مجھے ناچنا نہیں آتا۔" وہ چلّا کر بولی۔

"کوئی بات نہیں۔" ہیبت نے اطمینان سے کہا۔ "اتنی خوبصورت اور لچک دار عورت ہو۔ جو بھی حرکت کرو گی اچھی لگے گی۔ تھوڑے دن بعد راجی تمہیں سب کچھ سکھا دے گی۔ چلو ناچو۔"

رضیہ غصے اور بے اعتباری کے عالم میں اُسے گھورنے لگی۔

"اوئے کھوتے۔" ہیبت خاں نے بالے کو مخاطب کیا۔ "دیکھتا نہیں ہے۔ ارے اس کو ڈانس کرا۔"

بالے نے ہنٹر کو حرکت دی مگر ہیبت نے اُسے روک دیا۔ "ارے یہ ہنٹر کے اشاروں پر ناچنے والی نہیں ہے۔ اسے پیار محبت سے سمجھا دے۔ چل میرے لال۔" وہ ہنسنے لگا۔

بالا رضیہ کی طرف بڑھا تو اُس نے بے بسی سے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ اس کی نگاہ میرے چہرے پر ایک لمحے کے لیے رُکی مگر شاید اسے اندازہ تھا کہ میں اس کی مدد کرنے سے قاصر تھا۔ اگر میرا بس چلتا تو میں ان لوگوں کو بھون کر رکھ دیتا۔ مگر میں انتہائی بے بسی کے عالم میں تھا۔ میرے دونوں ہاتھ ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے اور انہوں نے مجھے ایک مضبوط رسّی کی مدد سے ستون سے باندھ رکھا تھا جس کی وجہ سے میرے لیے حرکت کرنا بھی دوبھر تھا۔ رضیہ کی مایوس نگاہیں ہر طرف سے گھوم کر پھر بالے کی طرف چل گئیں جو ایک معنی خیز مسکراہٹ اپنے چہرے پر سجائے رضیہ کی جانب بڑھ رہا تھا اور وہ سمٹ کر پیچھے ہٹ رہی تھی۔

"رُک جاؤ۔" میں اچانک چلّایا۔ "خبردار کوئی بدتمیزی نہیں کرنا۔ ورنہ بہت بُرا ہو گا۔"

میری دھمکی کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا بلکہ یوں لگا جیسے میری آواز اُن لوگوں نے سُنی ہی نہیں تھی۔ بالے ایک شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ رضیہ کے پاس پہنچ گیا اور اس نے جھک کر اس کی کلائی پکڑ کر اُسے اپنے پاس کھینچنا چاہا۔ مگر یہ اس کی بہت بڑی غلطی تھی۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر رضیہ نے خود اپنے زورِ بازو سے کام لینے کا فیصلہ کر لیا تھا اور ظاہر ہے کہ اس کے سوا اس کے لیے اپنی عزّت اور آبرو کو بچانے کا کوئی اور طریقہ نہیں تھا جیسے ہی رضیہ کی کلائی بالے کے ہاتھ میں آئی اُس نے اپنے ہاتھ کو ہلکی سی جنبش دی اور تیزی سے پلٹ کر بالے کا بازو تھام کر اسے اپنے اُوپر سے اُٹھا کر زمین پر پھینک دیا۔ یہ سب کچھ بالے کے علاوہ ہیبت خاں اور اس کے دوسرے ساتھیوں کے لیے بھی حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین تھا۔ وہ سب بھونچکے رہ گئے اور حیرت سے کبھی رضیہ کو اور کبھی زمین پر گرے ہوئے بالے کو دیکھنے لگے۔ بالے اتنی دیر میں خفت بھرے انداز میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا اور دانت پیستا ہُوا رضیہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کی زبان سے گالیوں کا ایک چشمہ جاری تھا اور وہ غصے میں پاگل ہو گیا تھا۔ رضیہ کے پاس جا کر اُس نے اسے بالوں سے پکڑنا چاہا مگر رضیہ نے اس کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے تھام کر اپنی طرف جھٹکا دیا۔ وہ تکلیف سے چلّا کر آگے بڑھا تو رضیہ کی لات اس کے پیٹ پر لگی اور اس کے ساتھ ہی رضیہ نے پھرتی سے زمین پر بیٹھ کر اپنے اوپر سے بالے کو پیچھے کی جانب اُچھال دیا۔ وہ ایک دھماکے کے ساتھ دوبارہ فرش پر گر گیا اور اس بار جلدی اُٹھ بھی نہ سکا۔ ہیبت خاں کا نشہ یہ منظر دیکھ کر ہرن ہو گیا تھا اور وہ بے یقینی سے اس تماشے کو دیکھ رہا تھا۔ رضیہ اپنی جگہ خاموش کھڑی بالے کو کن انکھیوں سے دیکھ رہی تھی جو زمین سے اُٹھنے کی کوشش میں مصروف تھا مگر غالباً اس کے جسم پر شدید ضربیں آئی تھیں اور وہ خاصی تکلیف میں مبتلا نظر آ رہا تھا۔

رضیہ کی تمام تر توجہ ہیبت خاں اور اس کے باقیماندہ ساتھیوں کی جانب مبذول تھی جو شراب نوشی بھول کر تعجب سے رضیہ کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے وہ کوئی اور سرزمین کی مخلوق ہو۔ بالے ایک مضبوط جسم اور کڑیل نوجوان تھا۔ ایک نرم و ملائم لڑکی کے ہاتھوں اس کی جو درگت بنی تھی وہ ان سب کے لیے ناقابلِ یقین تھی۔ انہوں نے اپنے اپنے گلاس رکھ دیے تھے اور منہ کھولے رضیہ کو تک رہے تھے۔ یہ سب کچھ چند لمحوں کے اندر رونما ہوا تھا۔ اور انہیں سوچنے اور غور کرنے کی مہلت بھی نہیں مل سکی تھی۔ لالی جو ایک بار پہلے بھی ہیرا ڈاکو کے اڈے پر رضیہ کی مہارت کا نظارہ کر چکی تھی خاموش کھڑی ہوئی تھی مگر خوف نے اس کا خوبصورت چہرہ مسخ کر دیا تھا۔ وہ صورتِ حال کی سنگینی سے واقف تھی اور شاید یہ سوچ کر خوفزدہ تھی کہ رضیہ جوڈو کراٹے کے فن میں خواہ کتنی

ہی ماہر کیوں نہ ہو۔ ان مسلح ڈاکوؤں کے گروہ سے مقابلہ کرکے فتح حاصل نہیں کرسکتی تھی۔ جبکہ میں اُن کے لیے بہت بڑی تقویت کا سبب بن سکتا تھا مجبورِ محض بنکر رہ گیا تھا اور بے بسی سے خاموش تماشائی بنا ہوا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

یکایک ہیبت خاں کا فلک شگاف قہقہہ بلند ہوا اور وہ بے ساختہ ہنستا ہوا اپنی جگہ سے اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

"ویری گڈ۔ ویری گڈ۔" وہ تالیاں بجاتے ہوئے بولا۔ "آج تک ہمیں فاختاؤں سے واسطہ پڑتا رہا ہے۔ آج پہلی بار ایک جنگلی بلی ہمارے قابو آئی ہے۔ یہ بھی ایک اچھا تماشہ رہے گا۔" وہ زور زور سے ہنسا اور تالیاں بجاتا رہا۔ وہ چند قدم آگے بڑھا اور رضیہ کا سر سے پیر تک جائزہ لینے لگا۔ رضیہ کی آنکھوں سے اب خوف کی جگہ غصہ جھلک رہا تھا اور اس کا چہرہ بھی جوشِ غضب کی وجہ سے تمتما رہا تھا۔ اس کے بال اس کے شانوں پر بکھر گئے تھے اور وہ لمبی لمبی سانسیں لے رہی تھی۔ اس عالم میں بھی وہ بے حد دلکش اور خوبصورت لگ رہی تھی۔ اس کا دراز قد کچھ اور زیادہ کشیدہ نظر آرہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ "تنگ آمد۔ بجنگ آمد" کے مطابق اپنی جان کی بازی لگانے کا تہیہ کرچکی تھی۔ رضیہ کا یہ ایک اور انوکھا اور قابلِ تعریف رُوپ تھا۔ اُس نے ایک بار پھر ہمت و جرأت کا ثبوت دے کر یہ ثابت کردیا تھا کہ وہ حالات سے بددل اور مایوس ہوکر حوصلہ ہارنے والی عورت نہیں تھی میری نگاہوں میں اس کی قدر و منزلت کچھ اور بڑھ گئی۔ مگر افسوس کہ مَیں کسی طرح بھی اس کی مدد کرنے کے قابل نہیں تھا وہ ایک تن تنہا عورت تھی، جو بھیڑیوں کے اس گروہ کا مقابلہ کرنے کے لیے بالکل تیار اور کمربستہ نظر آرہی تھی۔ اس کے چہرے پر بے خوفی کے تاثرات تھے اور اس لمحے وہ ایک قابلِ پرستش دیوی کے مجسّمے کی طرح ایستادہ تھی۔ کاش مَیں اس کی مدد کرنے کے قابل ہوتا! مَیں نے بے بسی سے سوچا اور خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

ہیبت خان نے اس بار رضیہ کو براہِ راست مخاطب کیا۔ "شاباش مجھے تمہاری جیسی عورت ہی کی تلاش تھی۔ تمہارے مقابلے میں یہ راجی جیسی عورتیں کیا چیز ہیں۔ اُف یہ خوبصورتی۔ یہ غصہ۔ یہ بہادری۔ یہ جی داری۔ کیا نام ہے تمہارا؟"

رضیہ خاموش کھڑی اُسے گھورتی رہی۔

"مَیں نے تمہارا نام پوچھا ہے!"

رضیہ پھر بھی خاموش رہی۔ ہیبت خان کے چہرے پر درشتی کے آثار نمودار ہوئے مگر پھر وہ مسکرانے لگا۔ "کوئی بات نہیں۔ نام سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہم خود تمہارا نام رکھ دیں گے۔ آج سے تمہارا نام ہے شیرنی۔ کیوں اچھا نام ہے نا؟"

رضیہ پھر بھی کچھ نہ بولی۔

"تمہارا نام شیرنی کے سوا اور کچھ ہونا بھی نہیں چاہیئے۔ شاباش میری شیرنی۔ اس کچھار میں ایک شیرنی کی کمی تھی جو تم نے پوری کردی۔ آج سے تم میری بیوی ہو۔ کیوں۔ ٹھیک ہے؟" یہ کہہ کر وہ رضیہ کی طرف بڑھا۔

"خبردار میرے نزدیک نہ آنا۔" وہ غرّائی۔ مگر ہیبت خاں اُس کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔ اُس نے پچکارنے کے سے انداز میں اس کے چہرے کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا مگر رضیہ نے بجلی کی طرح اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر ایک جھٹکا دیا مگر شاید ہیبت خاں بالے کے ساتھ اس کا یہی داؤ دیکھ چکا تھا اور پوری طرح چوکس تھا یا پھر وہ خود بھی جوڈو کراٹے جانتا تھا۔ بہرحال اُس نے اپنے ہاتھ کو ڈھیلا چھوڑ کر تیزی سے ایک قدم آگے بڑھایا اور رضیہ کے پہلو میں جا پہنچا۔ اس کا دوسرا ہاتھ رضیہ کی گردن کی طرف بڑھا مگر اتنی دیر میں رضیہ اس کا ہاتھ چھوڑ کر پھرتی سے ایک چکر کھا چکی تھی۔ وہ پھرکی کی طرح گھومی اور اسی اثنا میں اس کے کھڑے ہاتھ کی ایک ضرب ہیبت خاں کے گردے پر لگی اور ضبط کرنے کے باوجود اس کے مُنہ سے ایک کراہ نکل گئی۔ وہ اپنی کمر پر ہاتھ رکھ کر زمین پر دو زانو بیٹھ گیا اور ستائش بھری نظروں سے رضیہ کو ایک نئے روپ میں دیکھ رہا تھا۔ رضیہ نے کوئی مزید حملہ کرنا مناسب نہیں سمجھا بلکہ دو قدم پیچھے ہٹ کر کھڑی ہوگئی۔ وہ عقابی نگاہوں سے باری باری ہیبت خاں اور اس کے ساتھیوں کا جائزہ لے رہی تھی اور کسی بھی جانب سے حملے کی صورت میں مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح تیار نظر آرہی تھی۔

اچانک ہیبت خاں اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس کے چہرے پر شرمندگی کے آثار نمودار ہوئے۔ اس جیسے جابر ڈاکو کے لیے ایک نرم و نازک اور حسین لڑکی کے ہاتھوں یوں ذلت اٹھانے کا یہ شاید پہلا موقع تھا اور سب سے زیادہ شرمناک بات یہ تھی کہ یہ تماشہ اس کے ساتھیوں کے روبرو ہوا تھا۔ وہ چند لمحے رضیہ کو گھورتا رہا جو بے خوفی سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑی تھی۔ پھر ہیبت خان نے اپنی نگاہیں جھکا لیں اور تیزی سے پلٹ کر ایک بڑے صوفے پر جاکر بیٹھ گیا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے اور چہرے پر ایک مجوب سی مسکراہٹ تھی۔ اس نے ایک نظر بالے پر ڈالی جواب زمین پر سے اُٹھ کر کھڑا ہوگیا تھا۔

ہیبت خاں نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوکر بولا "ایسا تماشہ پہلے نہیں دیکھا مگر آج دیکھیں گے ان کے کپڑے نوچ کر پھینک دو۔ پھر ان کا ناچ ہوگا۔ اگر کوئی نہ مانے تو اسے گولیوں سے بھون دو۔۔۔ ہم ان کی لاشوں کا ناچ دیکھ لیں گے۔"

وہ دونوں ہاتھ صوفے پر رکھ کر بیٹھ گیا اور حریصانہ نگاہوں سے رضیہ اور لالی کو دیکھنے لگا۔ ہیبت خاں کا یہ حکم ایک لحاظ سے اس کا اعترافِ شکست بھی تھا۔ یہ ایک شرمناک بات تھی کہ اُن میں سے کوئی شخص بھی رضیہ کے نزدیک جانے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔ اسی لیے اُس نے آتشیں اسلحہ استعمال کرنے کی دھمکی دی تھی مَیں اس کا یہ حکم سُن کر دم بخود رہ گیا۔ رضیہ کے باغیانہ تیور صاف بتا رہے تھے کہ وہ جان دینے اور جان لینے پر تُل گئی ہے۔ اور صاف ظاہر تھا کہ وہ کسی ہتھیار کی موجودگی کے بغیر ان درندوں پر قابو پانے سے معذور تھی۔ ایسی صورت میں ہیبت خاں یہ حکم دے چکا تھا کہ اُسے گولی کا نشانہ بنا دیا جائے۔ اس قدر خوبصورت، دلیر، بے باک اور مضبوط ارادے والی عورت کا یہ انجام انتہائی افسوسناک تھا مگر اس کا یوم حساب سامنے آچکا تھا اور اس کی مدد کے لیے کوئی بھی موجود نہ تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ رضیہ ایک ناقابلِ فراموش عورت تھی۔ وہ ایسی خوبیوں کی مالک تھی جو بہت مشکل سے کسی ایک شخص میں یکجا ہوتی ہیں اور کسی عورت میں ان کا پایا جانا تو قریب قریب ناممکن اور ناقابلِ تصور ہے۔ مَیں نے پچھلے چند روز کے دوران اسے مختلف حالات میں دیکھا تھا اور ہر حال میں اسے قابلِ تعریف پایا تھا۔ وہ ایک لاثانی عورت تھی۔ یہ اس کے شوہر ملک منصور کی بدنصیبی تھی کہ وہ اس یکتا عورت کا دل جیتنے میں ناکام رہا تھا اور اب وہ میری نگاہوں کے سامنے ایک المناک اور ہولناک انجام سے دوچار ہونے والی تھی اور مَیں ایک خاموش تماشائی کی طرح بے بسی سے یہ سب کچھ دیکھنے پر مجبور تھا۔

ہیبت خاں اب صوفے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہوگیا تھا اور اپنے حکم کی تعمیل کا انتظار کر رہا تھا۔ بالے اور اس کے دو مسلح ساتھیوں نے اپنی سٹین گن کا رُخ رضیہ اور لالی کی طرف کردیا تھا اور ہیبت خاں کے دوسرے حکم کے منتظر تھے۔ ہیبت خاں کی آواز گونجی۔ "مَیں تین تک گنتی گنوں گا۔ اگر تم نے میرا حکم نہ مانا تو گولیاں تمہیں چھلنی کردیں گی۔"

رضیہ کے چہرے کے تاثرات میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی مگر لالی کا جسم لرز کر رہ گیا۔ اس کا چہرہ سفید

ہو چکا تھا جیسے اس کے جسم میں خون کی ایک بوند بھی موجود نہ ہو۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہیبت خان کی جانب دیکھا اور پھر رضیہ کو دیکھا جو عزم و ارادے کا پیکر بنی ہوئی کھڑی تھی۔ یکایک وہ لڑکھڑائی اور غش کھا کر فرش پر گر گئی۔ رضیہ نے صرف ایک نگاہ اس پر ڈالی اور پھر ہیبت خاں کی جانب دیکھنے لگی۔ اس کے پائے استقامت میں ذرا بھی جنبش نظر نہیں آ رہی تھی۔

"ایک" ہیبت خاں کی آواز گونجی اور ایک سرد یخ بستہ لہر میرے تمام جسم میں دوڑ گئی۔ میں نے زندگی میں پہلے کبھی خود کو اس قدر لاچار اور مجبور نہیں محسوس کیا تھا۔

"دو" ہیبت خاں نے پکار کر کہا مگر رضیہ پر کوئی اثر نظر نہیں آیا۔ اس کے ساتھیوں نے اپنی سٹین گنوں کا رُخ رضیہ کے جسم کی طرف کر لیا تھا مگر صاف ظاہر تھا کہ اس قدر دلکش اور متناسب جسم کو اس طرح گولیوں کا نشانہ بنانا انھیں بھی بار گزر رہا تھا لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا وہ خوبصورت اور پُرکشش جسم ان کی دسترس سے باہر تھا۔ صرف لاش کی صورت میں ہی ان کی رسائی اس پیکر تک ہو سکتی تھی۔

میں نے رضیہ کے بے خوف اور روشن چہرے کو دیکھا اور یہ سوچ کر مجھے دلی مسرت اور طمانیت کا احساس ہوا کہ یہ ناقابلِ شکست عورت جو کسی کے سامنے سر جھکانے اور ہار ماننے کے لیے تیار نہیں تھی جسے کوئی دھمکی اور کوئی لالچ متاثر نہیں کر سکا تھا جو ایک دولت مند اور بارسوخ شخص کی بیوی ہو کر بھی اُسے اپنا شوہر تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھی۔ کچھ عرصے میرے ساتھ رہ چکی تھی اور دنیا والوں کی نگاہوں میں ہم ایک دوسرے کے جیون ساتھی تھے۔ مجھے یہ بھی اندازہ تھا کہ رضیہ کے دل میں میرے لیے ایک نرم گوشہ موجود تھا اور خود میرا دل بھی اس کا خیال آتے ہی تیزی سے دھڑکنے لگتا تھا۔ کیا یہ محبت کا جذبہ تھا یا محض پسندیدگی کا؟ اور اس نازک لمحے میں مجھے یکایک پہلی بار یہ احساس ہوا کہ میں رضیہ سے پیار کرتا تھا۔ کاش زندگی اور حالات نے مہلت دی ہوتی اور میں اس کے سامنے اپنے اس جذبے کا اظہار کر سکتا؟! لیکن اب وقت گزر چکا تھا۔ ہم دونوں اس جنم میں ایک دوسرے سے ملنے سے قاصر تھے۔ وہ اپنی زندگی کے آخری سانس پورے کر رہی تھی اور یہ امر میرے لیے انتہائی فخر کا باعث تھا کہ اس نے ظالموں کے ظلم اور بدمعاشوں کی درندگی کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر دیا تھا اور اپنے ناموس کی حفاظت پر اپنی زندگی قربان کرنے کو ترجیح دی تھی۔

ہیبت خان اپنی گنتی کا آخری ہندسہ بولنے سے پہلے رضیہ کو ایک آخری موقع دینا چاہتا تھا اور نفسیاتی حربے کے طور پر اس لمحے کو طول دے رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید رضیہ اس ذہنی اور اعصابی دباؤ کا مقابلہ نہیں کر سکے گی اور اس کا مطالبہ منظور کر لے گی لیکن یہ اس کا خیالِ خام تھا۔ رضیہ بدستور ایک چٹان کی طرح اپنے ارادے پر قائم تھی اور کوئی نفسیاتی حربہ اس کو سرنگوں نہیں کر سکتا تھا۔ سٹین گنوں کی نالیوں نے اب اس نازک اندام وجود کو اپنا نشانہ بنا لیا تھا اور ان سب کی انگلیاں لبلبی دبانے کے لیے بے تاب تھیں۔ اس انتہائی اعصابی تناؤ کے ماحول میں اچانک ہلچل پیدا ہو گئی۔ جب باہر سے بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ ہیبت خاں اور اس کے ساتھیوں نے مضطرب ہو کر دروازے کی طرف دیکھا جس میں ان کا ایک ساتھی پولیس کی وردی پہنے ہوئے داخل ہو رہا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹک کر رُک گیا اور اپنے سامنے کا منظر دیکھنے لگا۔

"بشیرے۔ کیا بات ہے۔ گھبرایا ہوا کیوں ہے؟" ہیبت خاں صوفے سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"سردار۔ اُدھر تین جیپیں آ رہی ہیں۔ کافی لوگ ہیں۔ ان کے پاس ہتھیار بھی ہیں۔"

"مگر وہ ہیں کون؟"

"میں تو انھیں دیکھتے ہی آپ کو خبر دینے بھاگ پڑا۔ پر میں سمجھتا ہوں کہ وہ پولیس والے ہیں۔"

میرا تمام جسم سنسنا کر رہ گیا۔ پھر وہی پولیس۔ وہ میرے تعاقب میں یہاں بھی آ گئی تھی مگر پولیس کی آمد اس موقعے پر ایک رحمت سے کم نہ تھی۔ ہم سب جن ناممکن حالات کا شکار تھے ان میں وہ لوگ ہماری نجات کا ذریعہ بن کر آئے تھے لیکن سوال یہ تھا کہ وہ پولیس کہاں سے آئی تھی اور اس دُور دراز علاقے میں پولیس کی آمد کا مقصد کیا تھا؟ کہیں وہ میری تلاش اور جستجو میں تو یہاں تک نہیں آئے تھے؟! یہ خیال آتے ہی میرا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ ہیبت خاں سے نجات حاصل کرنا ضروری تھا لیکن کیا اس سے چھٹکارہ حاصل کر کے پولیس کے قبضے میں چلے جانا میرے حق میں بہتر ثابت ہو سکتا تھا؟ یہ تصور ہی میرے لیے انتہائی سوہانِ روح تھا۔ میں فی الحال خود کو پولیس کے حوالے کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ابھی مجھے اپنی جان اور نام کو بچانے کے لیے بہت سے ضروری کام کرنے تھے۔ بلکہ درحقیقت دیکھا جائے تو ابھی تک میں نے خود اپنی ذات کے لیے ایک بھی کام نہیں کیا تھا۔ میں گھر سے تو اپنے مسائل کا حل تلاش کرنے اور انھیں نمٹانے کے لیے نکلا تھا لیکن یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ میں اب تک خود اپنی ذات کے لیے ایک بھی مرحلہ حل نہیں کر سکا تھا اور دوسروں کے معاملات میں اُلجھ کر رہ گیا تھا۔

ابھی ایک کا پرابلم حل نہیں ہوتا تھا کہ کوئی دوسرا کردار خود کو مجھ پر ٹھونس دیتا تھا۔ اور میں اس کی دادرسی کے لیے نکل کھڑا ہوتا تھا۔ اب اچانک رضیہ، لالی اور راجی میرے پاؤں کی زنجیریں بن گئیں تھیں۔ ورنہ دیکھا جائے تو میرا ان سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ نہ مجھ پر کسی بھی اعتبار سے ان کی ذمہ داری تھی۔ پھر بھی میں اس جنجال میں پھنس گیا تھا۔ پولیس کی آمد میرے حق میں کسی طرح بھی مفید ثابت نہیں ہو سکتی تھی۔ میں قانون سے اور قانون شکنی کرنے والوں سے بھاگ رہا تھا۔ مگر یہ پتہ نہیں تھا کہ میری یہ بھاگ دوڑ کب ختم ہو گی اور اس تگ و دو کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ میں کسی منزل پر پہنچنے کے قابل بھی ہو سکوں گا یا راہ میں ہی فنا ہو جاؤں گا؟! یہ سوالات میرے لیے پریشان کُن تھے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ فی الوقت میں جس صورتِ حال سے دوچار تھا اس میں میرے لیے بچاؤ کی کوئی صورت بھی نہیں تھی اور اس موقعے پر پولیس میرے لیے نجات دہندہ بن کر نمودار ہوئی تھی۔ جو کچھ میرے سامنے ہو رہا تھا اس میں میری حیثیت ایک خاموش تماشائی کی سی تھی۔ میں ہر طرح سے بے بس اور لاچار تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے خود کو اس قدر لاچار اور مجبور اس سے پہلے کبھی نہیں پایا تھا۔

یہ تمام گڈمڈ خیالات چشم زدن میں میرے ذہن میں بجلی کی طرح کوند گئے تھے۔

ہیبت خاں اس اثنا میں تیزی سے مُڑ کر اپنے ساتھیوں کی جانب متوجہ ہو چکا تھا جو فوری طور پر یوں حرکت میں آ گئے تھے جیسے کسی نے یکلخت کھلونوں کو چابی دے دی ہو۔ انھوں نے مجھے اور رضیہ وغیرہ کو قطعی طور پر نظر انداز کر دیا تھا اور اب بڑی تیزی سے ہال کے دروازے کی طرف جا رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں خودکار بندوقیں تھیں اور وہ ان کو بلا دریغ استعمال کرنے پر آمادہ نظر آ رہے تھے۔

ہیبت خاں خاصا پُرسکون نظر آ رہا تھا۔ اس نے اپنے سامنے کھڑے مخبر سے پوچھا: "ہمارے باقی ساتھی کہاں ہیں؟"

"سب اپنی اپنی جگہ پر تیار ہیں......" ابھی اس کا فقرہ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ باہر سے اچانک فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں۔ یوں لگا جیسے اچانک قیامت ٹوٹ پڑی ہو۔ خودکار بندوقوں کے ساتھ ساتھ مشین گن فائر کی آواز بھی آ رہی تھی۔ فائرنگ کا یہ سلسلہ کافی دیر تک جاری رہا۔ راجی جو پہلے سہم کر ایک دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس موقعے سے فائدہ اُٹھا کر تیزی سے لپک کر میرے نزدیک آ گئی۔ خوف کے مارے اس کا بُرا حال تھا۔ اس کی آنکھیں بے نور اور چہرہ لٹھے کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ اس کی نگاہیں اور توجہ باہر کی جانب تھی۔ رضیہ اور لالی بھی اس ہنگامے کی آڑ میں موقع غنیمت جان کر ہال کے وسط سے ہٹ کر میرے نزدیک

کھنچی چلی آئی تھیں۔ رضیہ نے میرے قریب آتے ہی ہمدرد اور زخم خوردہ نگاہوں سے مجھے دیکھا اور اپنا ہاتھ میرے بازو پر رکھ دیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی کے ساتھ ساتھ ایک پیغام بھی تھا۔ اس کی بولتی ہوئی آنکھیں مجھے بہت کچھ بتا رہی تھیں۔ مجھ سے سوال کر رہی تھیں۔ مجھے دلاسہ دے رہی تھیں۔ لالی بھی کچھ کم پریشان نظر نہیں آ رہی تھی۔ "آپ ٹھیک ہیں نا ملک جی؟" اس نے تشویش بھری آواز میں مجھ سے پوچھا اور میں اس کے ملک کہنے پر مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا۔ اس نے شاید غیر شعوری طور پر مجھے ملک تسلیم کر لیا تھا۔ میں نے سر ہلا کر اسے اطمینان دلانے کی کوشش کی۔

ہیبت خاں ہال کی کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا۔ باہر فائرنگ اور دھماکوں کی آوازیں بڑھتی جا رہی تھیں اور ساتھ ہی زخمی ہونے والوں کی چیخیں بھی گونج رہی تھیں۔ ہیبت خاں کو اطلاع دینے والا شخص بھی غائب ہو گیا تھا۔ ہیبت خاں نے مڑ کر ہم لوگوں کی جانب دیکھا اور پھر منہ سے کوئی لفظ کہے بغیر تیزی سے ہال سے باہر چلا گیا۔ راجی نے اس کے جاتے ہی ایک لمبی اور ٹھنڈی سانس لی اور میرے شانے پر سر رکھ کر رونے لگی۔ اس کی زبان سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے مگر اس کے آنسو بہت سی داستانیں بیان کر رہے تھے۔ اس کے آنسوؤں کا ہر قطرہ اس کا اعتراف گناہ تھا اور معافی کا خواستگار تھا۔ مجھے اس لڑکی پر بے اختیار ترس آ گیا۔ وہ فطری طور پر کوئی بری عورت نہیں تھی لیکن ماحول اور تربیت نے اُسے ایک عام عورت سے مختلف بنا دیا تھا۔ اس نے ہمارے ساتھ جو رویہ برتا تھا وہ انتہائی مہلک اور خطرناک تھا اور ہم سب اس کی وجہ سے ناقابلِ بیان مشکلات اور مصائب کا شکار بھی ہو سکتے تھے۔ لیکن اس نے یہ سبق سیکھ لیا تھا کہ اپنوں سے غداری اور بیوفائی کرنے کا انجام کبھی اچھا نہیں ہوتا۔ کاش وہ اس غلط رویے کا مظاہرہ نہ کرتی تو اس حالت کو نہ پہنچتی۔ اس نے ایک سنگدل اور بے رحم ڈاکو سے وفاداری اور دوستی کی توقع باندھی تھی جو نقش بر آب ثابت ہوئی تھی۔ رضیہ کی نگاہوں میں اس کے لیے ترحم آمیز تاثرات تھے لیکن لالی اسے خونخوار نفرت بھری نظروں سے گھور رہی تھی اور اگر اس کا بس چلتا تو وہ غصے سے اس کا منہ نوچ لیتی۔ باہر سے آنے والی فائرنگ کی آوازوں میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ میرے لیے اپنی کلائیوں میں بندھی ہوئی ہتھکڑیوں سے فوری طور پر نجات حاصل کرنا بے حد ضروری تھا لیکن فی الحال اس کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہیبت خاں اور اس کے ساتھیوں میں سے کوئی بھی ہمارے آس پاس موجود نہیں تھا۔ ان حالات میں ہمارے لیے بہترین طریقہ یہی تھا کہ ہال کمرے میں آنے والے مصائب و آلام کا انتظار کرنے کی بجائے وہاں سے نکلنے کی کوشش کریں۔ رضیہ بھی یہی سوچ رہی تھی۔ میں نے چاروں طرف کا ایک بار پھر جائزہ لیا اور رضیہ کا ہاتھ پکڑ کر ہال کمرے کی بڑی کھڑکی کی جانب لپکا۔ لالی اور راجی خود بخود ہمارے پیچھے چل پڑیں۔ یہ ایک بڑے سائز کی کھڑکی تھی۔ میں نے اس کے پٹ کھولے تو یہ دیکھ کر میری مسرت کی انتہا نہ رہی کہ اس میں آہنی سلاخوں کی رکاوٹ موجود نہیں تھی۔ کھڑکی سے باہر جھانکنے پر معلوم ہوا کہ وہ عقبی پائیں باغ میں کھلتی تھی۔ جہاں کوئی موجود نہ تھا۔ میں نے رضیہ کو اشارہ کیا اور کھڑکی پر چڑھ کر باہر کود گیا۔ رضیہ، لالی اور راجی نے بھی میری پیروی کی۔ فائرنگ کی آوازیں ہر جانب سے آ رہی تھیں اس لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ ہمیں کس طرف جانا چاہیے؛ لیکن پھر اندازہ لگانے کے بعد میں نے اس جانب کا رخ کیا جدھر عمارت کا شکستہ حصہ نمایاں طور پر نظر آ رہا تھا۔

ہم چاروں دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے عمارت کے آخری کنارے پر پہنچ گئے۔ میں نے گردن نکال کر جھانکا تو ایک گولی سنسناتی ہوئی میرے سر پر سے گزر گئی۔ میں دوبارہ پیچھے ہو کر کھڑا ہو گیا۔ کوئی دوسری گولی نہیں آئی تو یہ پتہ چلا کہ وہ گولی کسی نے خاص طور پر مجھے نشانہ بنانے کے لیے نہیں چلائی تھی بلکہ اتفاقیہ آ گئی تھی۔

اب سوال یہ تھا کہ گولیوں کی اس بارش میں ہم لوگوں کا کھلی فضا میں باہر نکلنا کہاں تک مناسب اور محفوظ تھا۔ لیکن ہم جس جگہ کھڑے تھے وہ بھی محفوظ نہیں تھی۔ ہم سب کے لیے ضروری تھا کہ ہم کسی مناسب پناہ گاہ تک پہنچ جائیں تاکہ کم از کم برستی ہوئی گولیوں کا نشانہ تو نہ بنیں ——— میں نے اُن تینوں کو خاموشی سے وہیں دیوار کے ساتھ چپاں رہنے کی ہدایت کی اور خود اللہ کا نام لے کر پھونک پھونک کر قدم اُٹھاتا ہوا آگے کی جانب بڑھا۔ احتیاط کے طور پر میں نے جھک کر چلنا مناسب جانا اور دوڑتا ہوا عمارت اور کھنڈر کا درمیانی راستہ طے کر لیا۔ یہ کھنڈر کسی زمانے میں اسی عمارت کا حصہ رہا ہوگا لیکن مسلسل عدم توجہ کی وجہ سے اب ایک شکستہ عمارت میں تبدیل ہو کر رہ گیا تھا۔ یہ غالباً کسی زمانے میں اصطبل یا فیل گاہ ہوگی کیونکہ ایک جانب کمرے بنے ہوئے تھے اور ان کے سامنے ایک لمبی سی راہداری تھی جس کی چوڑائی بمشکل پانچ فٹ ہوگی۔ اس کی چھت جگہ جگہ سے ٹوٹ کر اٹک گئی تھی۔ میں اس کے درمیان سے گزرتا ہوا کھنڈر کے دوسرے کنارے پر پہنچ گیا مگر سامنے نگاہ ڈالتے ہی ٹھٹک کر رہ گیا۔ میری نگاہوں کے سامنے ایک میدان جنگ تھا۔ کافی فاصلے پر میری لینڈ روور اور دو جیپیں کھڑی ہوئی تھیں اور اُن سے کچھ فاصلے پر تین اور جیپ گاڑیاں تھیں۔ جن میں کوئی موجود نہ تھا۔ ان گاڑیوں اور حویلی کی عمارت کے درمیانی حصے میں گھمسان کی لڑائی جاری تھی۔ حملہ آوروں کی تعداد نو دس کے قریب تھی۔ جن میں سے دو تین زخمی ہو چکے تھے یا ہلاک ہو گئے تھے۔ ان کے جسم زمین پر پڑے ہوئے تھے اور یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ ان میں زخمی کون ہے اور مردہ کون ہے! باقی چھ افراد ٹیلوں اور زمین پر جا بجا پڑے ہوئے اینٹوں کے ڈھیروں کے پیچھے پناہ لیے اکا دکا فائر کر رہے تھے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ہیبت خاں کے بیشتر ساتھی عمل کے قابل نہیں رہے تھے۔ حملہ آور شلوار قمیصوں میں ملبوس تھے اور ان کے چہروں پر ڈھاٹے بندھے ہوئے تھے۔ یکایک میری نظر ایک قد آور اور لحیم شحیم شخص پر پڑی۔ جو اُن سب کے آگے تھا۔ اس نے بھی اپنا چہرہ کپڑے سے چھپایا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں شین گن تھی اور وہ گھٹنوں کے بل قدم بقدم آگے بڑھ رہا تھا۔ یکایک اس نے عمارت کی طرف فائرنگ کی ایک بوچھاڑ کی۔ اس کے ساتھیوں نے بھی اس کی پیروی کی۔ عمارت کی جانب سے کوئی جواب نہ ملنے پر وہ سب اندھا دھند عمارت کی طرف دوڑ پڑے۔ اسی لمحے میں نے ہیبت خاں کو دیکھا جو عمارت کی چھت پر منڈیر کے پیچھے سے سر اُٹھا کر جھانک رہا تھا اور غالباً تنہا رہ گیا تھا۔ اپنی جانب سے سب کو غافل اور بے خبر پا کر وہ ایک دم اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے اپنی گن کا رُخ نیچے کی طرف کیا لیکن اسے گولی چلانے کا موقع نہیں مل سکا۔ ایک حملہ آور کی نگاہ اُس پر پڑ چکی تھی اور اُس نے گولی چلانے میں زیادہ عجلت کا مظاہرہ کیا تھا۔ کئی گولیاں ہیبت خاں کے جسم میں پیوست ہو گئیں۔ وہ لڑکھڑایا اور سنبھلنے کی کوشش کی مگر ایک اور برسٹ اسکو لگا اور وہ چھت پر سے نیچے زمین پر جا گرا۔ حملہ آوروں نے چند لمحے انتظار کیا اور پھر اُن کے لیڈر کے اشارے پر اس کے دو تین ساتھی بھاگ کر عمارت کی طرف گئے۔ چند لمحے بعد وہ دوبارہ نمودار ہوئے اور انھوں نے ہاتھوں کے اشارے سے بتایا کہ اندر کوئی زندہ باقی نہیں ہے۔ خوشی کے نعرے لگاتے ہوئے وہ سب حویلی کی عمارت کی طرف چلے گئے۔

یہ موقع ہمارے لیے بہترین تھا۔ میں پلٹ کر واپس پلٹا اور کھنڈر کے اندر سے گزر کر میں نے رضیہ کو آہستگی سے پکارا۔ وہ شاید میرے پیغام کی منتظر ہی تھی۔ میرا اشارہ پاتے ہی وہ تینوں دبے پاؤں لپکتی ہوئی کھنڈر کی جانب آئیں اور ہم جلد ہی کھنڈر کے آخری کنارے پر پہنچ گئے۔

" رضیہ، یہ لوگ پولیس کے آدمی نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے ان کی آپس میں کوئی دشمنی ہو۔ لیکن ہمارے لیے بہتر یہی ہے کہ ہم ان کی نگاہوں سے بچنے کی کوشش کریں۔"

"ٹھیک ہے۔" رضیہ نے میری تائید کی۔ "ہم یہیں چھپ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ واپس چلے جائیں گے تو ہم بھی یہاں سے بھاگنے کی سوچیں گے۔"

"لیکن اگر یہ ساری گاڑیاں اپنے ساتھ لے گئے تو ہمارے پاس واپس جانے کی کیا صورت ہوگی؟ بہتر یہی ہے کہ ہم موقعے سے فائدہ اُٹھا کر اسی وقت بھاگنے کی کوشش کریں۔"

"لیکن اس میں خطرہ ہے۔" یہ لالی کی آواز تھی

"اور پھر وہ فوراً ہمارا پیچھا شروع کر دیں گے۔" رضیہ نے کہا۔

دونوں کی تجاویز معقول تھیں لیکن مَیں خواہ مخواہ وہاں رُک کر بھی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے وہ ہمیں دیکھ لیں تو پھر ہمارا کیا انجام ہوگا؟ ہمیں تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ لوگ کون تھے اور کیا چاہتے تھے۔ اور یہ کہ ہمارے ساتھ ان کا کیا برتاؤ ہوگا؟

اسی وقت ہمیں عمارت کی جانب سے لوگوں کے بولنے کی آوازیں آنے لگیں اور پھر قدموں کی چاپ سُنائی دی۔ کم سے کم دو آدمی اُس طرف آرہے تھے جہاں ہم کھڑے تھے۔ مَیں نے فوراً سب کو کھنڈر کے اندر چھپ جانے کا اشارہ کیا۔ اور ہم ایک ایسے کمرے میں داخل ہوگئے جس کی چھت ٹوٹ کر سامنے کو لٹک گئی تھی۔ اگر کوئی خاص طور پر اندر داخل نہ ہو تو ہمارا دیکھا جانا ممکن نہیں تھا۔ قدموں کی آوازیں نزدیک تر ہوتی جارہی تھیں اور ہم سب نے اپنے سانس روک لیے تھے۔ پھر دو آدمیوں کی آوازیں سُنائی دیں۔ وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

"یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے وہ سب کے سب مارے گئے۔"

"مگر یار یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ پولیس چوکی میں بس آٹھ ہی پولیس والے تھے۔" دوسرے نے کہا۔

"پولیس کا ایک آدمی بھی خطرناک ہوتا ہے استاد۔ یہ اچھا ہوا کہ ہم نے بے خبری میں انھیں چھاپ لیا۔ تم نے دیکھا نہیں ان کے پاس تو اسٹین گن بھی تھے۔"

"ٹھیک ہے۔ خس کم جہاں پاک۔ یہ مشین گن اب اپنے کام آئے گی۔"

ان کی آوازیں ہلکی ہوتے ہوتے معدوم ہوگئیں۔ جس سے ظاہر ہوا کہ وہ واپس لوٹ گئے تھے۔ میں صورت حال کی ستم ظریفی پر ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔ رضیہ نے چونک کر حیرت سے مجھے دیکھا۔ ان حالات میں یکایک ہنسنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔

مَیں نے اپنی ہنسی روک لی اور کہا: "قدرت کا انصاف بھی خوب چیز ہے رضیہ۔ یہ لوگ پولیس کے بھیس میں بے گناہوں کو لوٹتے تھے اور اب ان کی موت کا سبب بھی یہی بن گیا ہے۔ ایک اور جرائم پیشہ گروہ نے انھیں پولیس سمجھ کر ان کا خاتمہ کرنا ضروری سمجھا۔"

احتیاطاً ہم نے کچھ دیر اسی پناہ گاہ میں رُکے رہنا مناسب سمجھا۔ ہم سب ایک دوسرے کے بالکل نزدیک ہو کر بیٹھے تھے۔ اس سے پہلے ہنگامی حالات کی بنا پر مَیں نے لڑکیوں کے حلیئے اور لباس پر توجہ نہیں دی تھی۔ لیکن اب اطمینان کا ایک لمحہ میسر آیا تو مَیں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا اور مجھے راجی کی کم لباسی کا احساس ہوا۔ اس کا بیشتر جسم لباس سے محروم تھا۔ ظاہر ہے کہ وہاں سے اچانک بھاگتے ہوئے وہ اپنا لباس سمیٹنے میں ناکام رہی تھی۔ یکایک ایک خیال کوندے کی طرح میرے ذہن میں لپک گیا اور میرے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ معاً مجھے خیال آیا کہ اگر حملہ آوروں کی توجہ راجی کے زنانہ لباس کی طرف چلی گئی تو وہ یقیناً اُس عورت کو بھی تلاش کریں گے۔

مَیں نے راجی کو اور پھر رضیہ کو دیکھا۔ رضیہ کی توجہ بھی راجی کے نیم عُریاں جسم کی طرف تھی اور وہ تشویش بھری نگاہوں سے میری جانب دیکھ رہی تھی۔ ہم دونوں کی نگاہیں دوبارہ راجی کے جسم پر مرکوز ہوئیں تو اُسے بھی اپنی کم

لباسی کا احساس ہوا اور وہ بے اختیار سمٹ گئی۔ اُس کا کند ذہن ابھی تک خطرے کی طرف مبذول نہیں ہوا تھا۔ چند لمحے پہلے مَیں مطمئن اور پُرسکون تھا لیکن اب اس اچانک صورت حال نے مجھے مضطرب کر دیا تھا۔ میری پیشانی پسینے میں بھیگ گئی جو اس بات کی علامت تھی کہ مَیں فضا میں کسی آنے والے شدید خطرے کی بُو سونگھ رہا تھا لیکن ایک بے بس بطخ کی طرح ہم سب اسی جگہ خاموشی سے چھپے رہنے پر مجبور تھے۔ لالی کو بھی صورت حال کی نزاکت کا احساس ہو چکا تھا۔ اس نے دانت پیس کر راجی کو دیکھا اور دبی زبان میں بولی: "ذلیل بے شرم وہاں سے آتے ہوئے اپنے کپڑے تو ساتھ لے آتی۔"

راجی تنک کر جواب میں کچھ کہنے ہی والی تھی کہ ایک بھاری آواز نے ہم سب کو پتھر کے مجسمے بنا دیا۔

"چُپ چاپ باہر آجاؤ سوہنیو۔"

مَیں نے گردن موڑ کر دیکھا تو ٹوٹی ہوئی چھت کے ایک موکھے میں سے ایک کرخت بے ہنگم موٹا تازہ چہرہ سامنے مسکرا رہا تھا۔ اس کی موٹی موٹی مونچھیں خوشی سے پھڑک رہی تھیں اور آنکھوں میں سُرخ ڈورے نمایاں تھے۔ اس کے خونخوار چہرے کے ساتھ ہی مَیں نے سٹین گن کی وہ نالی بھی دیکھ لی تھی جو ہمیں اپنے نشانے پر لیے ہوئے تھی۔ راجی ایک بار پھر ہم سب کے لیے مصیبت کا سبب بن گئی تھی۔ کمرے میں اُس کے بکھرے ہوئے زنانہ لباس نے حملہ آوروں کی توجہ ہماری طرف مبذول کرا دی تھی اور وہ اسی کی بدولت سونگھتے ہوئے ہماری پناہ گاہ تک پہنچ گئے تھے۔ یہ حسین اور بے چین لڑکی ایک بار پھر ہمارے پیروں کی زنجیر بن گئی تھی۔

میں نے خاموشی سے سر جُھکا کر باہر نکلنے میں ہی عافیت جانی اور اپنی عارضی پناہ گاہ سے نکل کر موٹی موٹی مونچھوں اور سُرخ آنکھوں والے کرخت چہرہ شخص کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اس کی مسکراہٹ میں کمی واقع نہیں ہوئی تھی اور اس کا سبب بھی بہت جلد مجھ پر منکشف ہو گیا۔ اس کی توجہ میری جانب متعلق نہیں تھی بلکہ وہ میرے عقب میں سہم کر دُبکی ہوئی تین خوش اندام عورتوں کو دیکھ کر خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ اُس کی نگاہیں باری باری ان تینوں کے چہروں کا طواف کر رہی تھیں۔ یہ موقع اس پر قابو پانے کے لیے بہت مناسب تھا۔ لیکن مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اگر مَیں نے کسی طرح اس پر قابو پا بھی لیا تو اس کے دوسرے مسلح ساتھیوں سے چھٹکارا حاصل کرنا بہت دشوار ہوگا۔ جنھوں نے چشمِ زدن میں ہیبت خاں اور اس کے ساتھیوں کو بھون کر رکھ دیا تھا۔ یہ بھی واضح ہو چکا تھا کہ یہ لوگ بھی ڈاکوؤں کی برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لیے اُن سے کسی قسم کی بھلائی یا رحم کی اُمید نہیں رکھی جا سکتی تھی۔ چنانچہ مَیں نے حالات کا بغور اندازہ لگانا ہی مناسب جانا اور اپنے کمر کے پیچھے ہاتھ باندھ کر کھڑا رہا۔ ... ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے ہاتھوں کو باندھے ہوئے خاموش کھڑا ہو گیا۔ میرے بعد رضیہ نے باہر قدم نکالا اور اس کے حسن و جمال کو دیکھ کر سُرخ آنکھوں والے کی نگاہوں کی سُرخی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ پھر لالی باہر نکلی لیکن جب سہمی سمٹائی راجی نکل کر باہر آئی تو یوں لگتا تھا جیسے اس کی آنکھوں کے دیدے باہر نکل پڑیں گے۔ مارے خوشی کے اس کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں اور اس کی نگاہیں راجی کے جسم پر چپک کر رہ گئی تھیں۔ وہ حریصانہ نظروں سے باری باری اُن تینوں کو دیکھ رہا تھا۔ شاید اس نے زندگی میں اتنی بہت سی خوش جمال عورتیں یکجا نہیں دیکھی ہوں گی۔

یکایک بھاری قدموں کی آواز نے ہم سب کو چونکا دیا اور ہمیں گرفتار کرنے والا بھی ہوش میں آگیا۔

"کیا بات ہے حیرت خاں؟" ایک بھاری آواز سنائی دی۔ "کچھ پتہ نشان ملا؟"

حیرت خاں جو اس وقت اسم بامسمّٰی بنا ہوا تھا خوشی سے دانت نکال کر ہنسا اور بولا۔ "ادھر آجاؤ پارٹنر۔ بڑا زبردست مال ہاتھ لگا ہے۔"

"دو چار من جل گیا ہے کیا؟" یہ کہتے ہوئے دوسرا آدمی ہمارے نزدیک آگیا۔ اپنے سامنے ہم لوگوں کو دیکھ کر اسکی حیرانی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ بھی آنکھیں پھاڑ کر باری باری تینوں عورتوں کو دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔

"کیوں اُستاد؟" حیرت خاں نے پوچھا: "خزانہ ہے کہ نہیں؟"

جذبات کی شدت کے باعث وہ کچھ بولنے سے قاصر تھا، لیکن اُس کی نگاہیں اور چہرے کے تاثرات اس کے خیالات کی ترجمانی کرنے کے لیے کافی تھے۔ چند لمحے وہ ہکا بکا کھڑا ان تینوں کو دیکھتا رہا پھر سنبھل کر کہنے لگا۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ یہ پولیس والے تو یہاں خوب عیش کر رہے تھے۔"

"ارے عیش کیسے۔ یہ تو راجہ اندر بنے ہوئے تھے ایک سے ایک خوبصورت پری موجود ہے یہاں۔"

ان دونوں کی توجہ لڑکیوں کی طرف سے ہٹانے کے لیے میں نے زور سے کھنکار کر گلا صاف کیا اور وہ یوں چونک اُٹھے جیسے ابھی تک میری موجودگی سے قطعی لاعلم تھے۔

"پریوں کی دیکھ بھال کے لیے ایک دیو بھی موجود ہے جناب۔" میں نے خوش مزاجی کا مظاہرہ کیا۔

"تُو کون ہے اوئے؟" حیرت خاں نے کرخت آواز میں سوال کیا۔ "تیرا ان کے ساتھ کیا کام ہے بھئی؟"

"میں ان کا محافظ ہوں۔ یہ میرے باس کی امانت ہیں۔ میں انہیں گھر پہنچانے جا رہا تھا کہ راستے میں...."

"بس بس۔" وہ بے تابی سے بات کاٹ کر بولا۔ "زیادہ لمبی بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے پارٹنر۔ اپنی یہ کتھا کہانی باس کو سنانا۔ اب تم سیدھے سادے ہاتھ سر کے اوپر اُٹھالو اور ہمارے آگے آگے چلو۔ اگر ذرا بھی ہوشیار بننے کی کوشش کی تو چھلنی بنا دوں گا۔"

میں نے دونوں ہاتھ اُوپر اُٹھائے تو ان دونوں کو میرے ہاتھوں میں بندھی ہوئی ہتھکڑیوں کی موجودگی کا احساس ہوا۔

"یہ تو قیدی معلوم ہوتا ہے۔" حیرت خاں نے اپنے ساتھی کو مطلع کیا۔ "تُو نے کیا جرم کیا تھا استاد؟"

"میرا جرم یہی تھا کہ میں ان کے قبضے میں آگیا تھا۔"

وہ دونوں ہنس پڑے۔ "سچ کہتے ہوئے استاد۔ پولیس والے بے گناہ اور گناہگار کو نہیں دیکھتے۔ جو اُن کے سامنے آجائے بس اس کو دھر لیتے ہیں۔"

"بس تم خاموشی سے ہمارے آگے لگ جاؤ اور کوئی چالاکی مت کرنا ورنہ میں بہت جلدی گھبرا جاتا ہوں اور مجھ سے خواہ مخواہ گولی چل جاتی ہے۔" حیرت خاں کا ساتھی چہرے سے بھی خاصا نروس نظر آرہا تھا یا شاید وہ اُن لوگوں میں سے تھا جو خوبصورت عورتوں کو دیکھ کر ایک دم ہوش و حواس کھو بیٹھتے ہیں۔ بہر حال میں نے وقتی طور پر خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا اور ان کی ہدایت پر بلا چوں و چرا عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ہم لوگ اس شکستہ اصطبل نما عمارت سے ایک جلوس کی شکل میں برآمد ہوئے اور حویلی کی جانب گامزن ہو گئے۔ میں سب سے آگے تھا۔ میرے پیچھے بالترتیب رضیہ، راجی اور لالی تھیں۔ یہ بندوبست غالباً رضیہ کے ذہن کا کرشمہ تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر راجی سب سے پیچھے ہوگی تو حیرت خاں اور اس کے ساتھی کی حریصانہ للچائی ہوئی میلی نظریں اس کے جسم میں کچوکے لگاتی رہیں گی۔ اس لیے اُس نے بڑی ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے راجی کو ان کی نگاہوں سے محفوظ رکھنے کا بندوبست کر لیا تھا۔ ظاہر ہے کہ رضیہ کے اس بندوبست سے حیرت خاں اور اس کے ساتھی کو بہت مایوسی ہوئی ہوگی، لیکن فی الوقت ان کی نگاہوں کے سامنے جو منظر تھا وہ بھی خاصا خوشنما اور دلکش تھا۔ چنانچہ اُنہوں نے زیادہ اختلاف کا اظہار نہیں کیا۔ محض مُنہ بنانے پر اکتفا کرتے

ہوئے عقب میں چلنے لگے۔

حویلی کی عمارت تک پہنچتے پہنچتے مجھ پر صورتِ حال پوری طرح واضح ہو چکی تھی۔ ہیبت خاں کو تو میں نے خود اپنی آنکھوں سے سٹین گن کی گولیوں سے چھلنی ہوتے ہوئے دیکھا تھا، لیکن اس کے دوسرے ساتھیوں کا انجام بھی ہماری آنکھوں کے سامنے تھا۔ اُن میں سے دو کی لاشیں حویلی کے سامنے والے میدان میں پڑی ہوئی تھیں۔ دوسرے لوگوں کی لاشوں کو میں نہیں دیکھ سکا تھا۔ لیکن یقیناً وہ بھی ٹھکانے لگ چکے تھے۔ حویلی کے سامنے والے برآمدے میں مجھے چند مسلح افراد نظر آئے جو بڑی چوکسی کے ساتھ چاروں طرف نگران تھے۔ ان میں سے ایک شخص کے پاس میں نے وہ مشین گن بھی دیکھ لی جس پر ہیبت خان اور اُس کے ساتھیوں کو بہت ناز تھا۔ انسان کی بے اختیاری اور بے بضاعتی کا ایک اور ثبوت میرے سامنے تھا۔ وہ شخص جو خود کو اس علاقے کا بے تاج بادشاہ اور مختارِ مطلق سمجھتا تھا کتے کی موت مارا جا چکا تھا اور اس کی بے گور و کفن لاش حویلی کے سامنے والے چبوترے پر پڑی ہوئی تھی۔ ہم سب کو دیکھ کر مسلح محافظ بھی اسی طرح بھونچکے رہ گئے جس کا مظاہرہ حیرت خاں اور اس کے ساتھی نے کیا تھا۔ وہ سب مجھے کوئی اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ان سب کی نگاہیں لڑکیوں پر جمی ہوئی تھیں۔ خاص طور پر راجی ان کی توجہ کا ہدف بنی ہوئی تھی۔

برآمدے سے گزر کر ہم اُس کمرے میں داخل ہو گئے جسے ہیبت خاں دفتر کے طور پر استعمال کیا کرتا تھا۔ یہاں ہم نے پہلی بار اُس لحیم شحیم شخص کا چہرہ دیکھا جس نے اپنی سٹین گن کا برسٹ مار کر ہیبت خاں کو موت کا نشانہ بنایا تھا۔ وہ ایک قد آور اور تنومند آدمی تھا اور اپنی ٹانگیں سامنے والی میز پر پھیلائے ہوئے کرسی پر پیچھے کی جانب ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ سٹین گن اس کے سامنے میز پر رکھی ہوئی تھی اور اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ اس گروہ کا لیڈر ہے۔ ہم لوگوں کا قافلہ کمرے میں داخل ہوا تو اُس نے ایک بےنیازی کی نگاہ سے دیکھا لیکن جب میرے عقب میں لڑکیاں اندر داخل ہوئیں تو وہ بے اختیار میز پر سے پیروں کو سمیٹ کر کرسی پر سیدھا ہو گیا اور اپنی بڑی بڑی چمک دار آنکھوں سے ہمیں گھورنے لگا۔ اس کی محویت اس وقت دور ہوئی جب حیرت خاں نے اُسے مخاطب کیا۔

"یہی وہ لڑکی ہے جس کے کپڑے اِدھر کمرے میں پڑے ہوئے ہیں۔" اس نے راجی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ راجی کا مختصر برائے نام لباس ہی اس بات کی علامت تھا کہ حویلی کے کمرے میں پڑا ہوا زنانہ لباس اس کے سوا کسی اور کا نہیں ہو سکتا۔

وہ کرسی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ قد میں وہ مجھ سے بھی ایک آدھ انچ زیادہ تھا اور بھاری ڈیل ڈول کے باوجود انتہائی پھرتیلا اور چست و چالاک آدمی نظر آتا تھا۔

"تم کون ہو بھئی؟" اُس نے اپنی بھاری اور خمار زدہ آواز میں مجھ سے سوال کیا۔ "تمہارا ان لڑکیوں سے کیا تعلق ہے؟"

"میں ان تینوں کو لے کر ان کے گھر جا رہا تھا جب راستے میں ہیبت خاں اور اس کے ساتھیوں نے ہمیں گھیر لیا۔"

"اچھا۔" وہ ٹہلنے لگا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ تم پولیس کو مطلوب تھے۔ تمہارا جرم کیا ہے اور ان لڑکیوں نے کون سا جرم کیا ہے؟"

"میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔" میں نے جھنجلاتی ہوئی آواز میں کہا۔ "اور یہ عورتیں بھی بے گناہ ہیں۔"

"تو پھر پولیس نے تمہیں کیوں پکڑا تھا؟" اس نے کڑک دار آواز میں پوچھا۔

"مزے اڑانے کے لیے" جبرت خاں شاید زیادہ دیر تک خاموش رہنے کا عادی نہیں تھا۔ "آخر پولیس والوں کے پاس بھی دل ہوتا ہے اُستاد"

"یہ بڑے بدمعاش ہوتے ہیں۔ میں جانتا ہوں" اُس نے فیصلہ سُنا دیا۔ "انہوں نے تم لوگوں کے ساتھ کوئی زیادتی تو نہیں کی" میرا مطلب ہے کوئی تشدد یا مار پیٹ"

"آپ جو سمجھ رہے ہیں وہ درست نہیں ہے" میں نے رسانیت سے جواب دیا۔ "ہیبت خاں اور اس کے ساتھی پولیس والے نہیں تھے"

وہ ایک دم ٹہلتے ٹہلتے رُک گیا۔ "پولیس والے نہیں تھے؟ تو پھر کیا تھے؟"

"ڈاکو تھے۔ لُوٹ مار کیا کرتے تھے"

وہ حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگا "کیا بکتے ہو۔ دیکھا نہیں باہر بورڈ لگا ہوا ہے۔ یہ پولیس سٹیشن ہے۔ مرنے والے بھی پولیس والے تھے۔

میں نے کہا "وہ پولیس کی وردیوں میں ضرور تھے مگر پولیس والے نہیں تھے۔ وہ لوگوں کو پولیس کے بھیس میں ہی دھوکہ دیا کرتے تھے۔ لیکن پولیس سے اِن کا تعلق بس اتنا ہی تھا جتنا آپ کا ہے"

وہ بے اعتباری سے مجھے دیکھنے لگا پھر اُس نے رضیہ کی طرف دیکھا "یہ ٹھیک کہہ رہا ہے؟"

"بالکل ٹھیک ہے" رضیہ نے حسب معمول بے خوف اور پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔ "پہلے تو ہم بھی یہی سمجھتے تھے کہ وہ پولیس والے ہیں۔ مگر بعد میں پتہ چلا کہ وہ، ڈاکو ہیں اور پولیس کا روپ بدل کر لوگوں کو لُوٹتے ہیں"

"باپ رے!" وہ دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ "یہ تو بہت بُرا ہُوا۔ ہم نے اپنے ہی برادری والوں کو مار دیا۔ اب کیا ہو گا؟"

"ہو گا کیا۔ ایسے کاموں میں ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ اگر ہم اُنہیں نہ مارتے تو وہ پولیس کے ہاتھوں مارے جاتے۔ اُستاد جی۔ بُرے کاموں کا بُرا انجام ہوتا ہے" جبرت خاں خاصا حقیقت پسند اور بے تکلف شخص معلوم ہوتا تھا۔ مجھے رفتہ رفتہ اُس کردار سے دلچسپی ہونے لگی تھی۔ "اب یہاں سے چھوٹ لو سکندر خاں۔ جو ہونا تھا وہ ہو گیا ہے"

سکندر خاں اُن میں سب سے زیادہ بارُعب اور سمجھ دار نظر آتا تھا۔ بلکہ مجھے تو اُس کے اطوار دیکھ کر یوں لگا جیسے وہ کسی اچھے خاندان کا تعلیم یافتہ شخص ہو۔

"تم سب کو کہو کہ ہر طرف کی تلاشی لے لیں اور جو بھی مال و اسباب ہاتھ لگے اُسے ساتھ رکھ لیں۔ ہم ابھی چلیں گے"

جبرت خاں اور اُس کا ساتھی کمرے سے باہر چلے گئے تو سکندر نے ہم سب کی طرف توجہ دی "آپ لوگ بیٹھ جائیں" اُس نے خشک آواز سے کہا۔

ہم سب کرسیوں پر بیٹھ گئے مگر راجی بار بار پہلو بدل رہی تھی۔ "آپ کو کس چیز کی ضرورت ہے؟" وہ راجی سے مخاطب ہوا۔ راجی چُپ رہی لیکن رضیہ حسب عادت خاموش نہ رہ سکی۔ اور بے اختیار بول پڑی "آپ دیکھ نہیں رہے کہ اسکو کپڑوں کی ضرورت ہے"

"ہاں۔ ٹھیک تو ہے" سکندر ہنس پڑا۔ "آپ کے کپڑے اُدھر کمرے میں پڑے ہوئے ہیں۔ آپ وہاں جا کر کپڑے بدل لیں۔ فکر نہ کریں۔ کوئی آپ کو نہیں لُوٹے گا" اُس کا اخلاق مجھے متاثر کرنے لگا۔

راجی نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور میں نے سر کے اشارے سے اسے جانے کا مشورہ دیا، لیکن شاید وہ تنہا جاتے ہوئے جھجک رہی تھی۔ اس کی تمام بے خوفی، بے باکی اور تیزی وطراری غائب ہو چکی تھی اور وہ ایک سہمے ہوئے خوفزدہ پرندے کی مانند گھبرائی ہوئی تھی۔

"چلو، میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔" رضیہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی اور بازو سے تھام کر راجی کو اپنے ہمراہ لے کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ سکندر کی نظریں اُن دونوں کے تعاقب میں گئیں اور پھر واپس لوٹ آئیں۔ میری نظروں سے نظریں ملیں تو وہ کچھ مجوب سا ہو گیا۔ وہ یقیناً کسی اچھے گھرانے کا فرد تھا۔

"آپ لوگ کون ہیں؟" میں نے اچانک اسے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہم؟!" وہ شرمندہ سی ہنسی ہنسنے لگا: "ہم لوگ بھی ڈاکو ہیں مگر پولیس کے بھیس میں لوگوں کو نہیں لوٹتے۔ ہمارا طریقہ اور ہے۔" میں خاموش اُسے دیکھتا رہا: "ہماری دُشمنی کسی سے نہیں ہے۔ بس ہم پولیس کے دُشمن ہیں۔ خبر ملی تھی کہ اس ویران جگہ میں ایک پولیس سٹیشن ہے۔ بس اس کو لوٹنے چلے آئے۔ انہوں نے اگر مقابلہ نہ کیا ہوتا تو ہم اُن کو کچھ نہ کہتے۔"

میں نے بے تکلفی سے کہا: "مگر آپ کو دیکھ کر اندازہ نہیں ہوتا کہ آپ ڈاکو ہیں۔ آپ تو اچھے خاصے پڑھے لکھے اور معقول آدمی نظر آتے ہیں۔"

وہ ہنسنے لگا: "پڑھا لکھا تو ہوں اور معقول بھی ہوں مگر کیا ڈاکو معقول نہیں ہو سکتے؟"

"کوئی معقول آدمی ڈاکو بننا کیسے پسند کر سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"جس طرح میں بن گیا ہوں۔ آپ کے سامنے ایک زندہ مثال موجود ہے۔ موقع ملا تو آپ کو اور بھی مثالیں مل جائیں گی۔"

اس کا جواب برجستہ اور شگفتہ تھا۔ میں حالات اور اردگرد کے ماحول کو فراموش کر کے مسکرانے لگا۔

"آپ سے مل کر سچ مچ بہت خوشی ہوئی ہے۔" میں نے بڑے خلوص سے کہا۔ "اب اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میری ہتھکڑیاں کھلوا دیجئے۔"

"ہاں ہاں، کیوں نہیں؛ مگر اس کی چابیاں کس کے پاس ہیں؟"

"یہ تو میں نہیں جانتا۔"

"اے پہاڑی!" اُس نے بلند آواز میں پکارا اور ایک بندوق بردار کارندہ اندر آ گیا: "دیکھو، یہ پولیس والے جو مرے پڑے ہیں ان سب کی جیبوں کی تلاشی لو اور ہتھکڑیوں کی چابیاں ڈھونڈ کر لاؤ۔"

پہاڑی خاموشی سے سر ہلا کر باہر چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد حیرت خاں کمرے میں داخل ہوا۔ "سارا مال سیٹ کر گاڑیوں میں رکھوا دیا ہے۔ اب ہمیں واپس چلنا چاہیئے سکندر خاں۔"

سکندر کے جواب دینے سے پیشتر ہی رضیہ اور راجی دوبارہ کمرے میں داخل ہو گئیں۔ راجی اب پورے لباس میں تھی لیکن اس کی دلکشی میں اس سے کوئی کمی پیدا نہیں ہوئی تھی بلکہ قدرے اضافہ ہی ہو گیا تھا۔ سکندر اور حیرت خاں دونوں نے ستائشی نگاہوں سے راجی کو دیکھا۔ خلافِ معمول راجی کے چہرے پر ایک حیا آلود مسکراہٹ تھی اور اسکی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ حیرت خاں کا کمرے سے باہر جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا مگر سکندر خاں نے اسے باہر جا کر انتظار کرنے کی ہدایت کی تو وہ طوعاً وکرہاً باہر چلا گیا، لیکن آخر وقت تک اسکی نظریں راجی کے چہرے سے چپٹی رہیں۔ اسی اثناء میں پہاڑی ہتھکڑیاں کھولنے کے لیے چابیاں لے کر

آ گیا جو اس نے کسی لاش کی جیب سے ڈھونڈ کر نکالی تھیں۔ سکندر نے خود آگے بڑھ کر میری ہتھکڑیاں کھول دیں تو میں نے اطمینان کا لمبا سانس لیا اور اپنے بازو گھما کر اُنہیں آزادی کی نعمت سے لطف اندوز ہونے کا موقع بخشا جو اُنہیں ایک طویل عرصے بعد نصیب ہوا تھا۔

"باہر کھڑی لینڈروور آپ ہی لوگوں کی ہے؟" سکندر نے بڑا خلاق لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

"جی ہاں۔ اور مجھے اُمید ہے کہ اب آپ ہم لوگوں کو اپنی منزل کی طرف جانے کی اجازت دے دیں گے۔ ہمیں بہت لمبا سفر طے کرنا ہے۔"

سکندر کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "افسوس ہے کہ میں آپ کو جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔"

"کہاں؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"ہمارے ہیڈ کوارٹر۔" مسکراہٹ بدستور اس کے چہرے پر موجود تھی: "مجھے یقین ہے کہ ہمارا باس بھی آپ لوگوں سے مل کر بہت خوش ہوگا۔ انکی اجازت کے بغیر میں آپ لوگوں کو آزاد نہیں کر سکتا۔"

میری ساری خوشی خاک میں مل گئی۔ میرا خیال تھا کہ سکندر نے اب تک جس خوش اخلاقی اور معقولیت کا مظاہرہ کیا تھا اس کے بعد وہ ہمیں بھی اپنی راہ پر جانے کی اجازت دے دے گا، لیکن وہ بھی اپنی جگہ حق بجانب تھا۔ وہ ایک مشن پر آیا ہوا تھا اور اس کے لیے اپنے باس کو واپس جا کر رپورٹ کرنا ضروری تھی۔ ہمارے بارے میں قطعی فیصلہ کرنے کا اختیار بھی اس کے باس کے سوا کسی اور کو نہ تھا، لیکن اب تک وہ جس حکمانہ انداز میں اپنے ساتھیوں کو ہدایات دیتا رہا تھا اور جس سعادت مندی سے وہ اس کے احکام کی تعمیل کر رہے تھے اس کے پیش نظر مجھے یہ خوش فہمی پیدا ہو گئی تھی کہ ممکن ہے وہی ہمارے بارے میں آخری فیصلہ کرنے کا مجاز ہو اور اس کی بلند اخلاقی اور شائستگی کے پیش نظر یہ توقع بے جا نہیں تھی کہ وہ ہمیں جانے کی اجازت دے دے گا۔ لیکن اب یکایک حالات تبدیل نظر آ رہے تھے اور ہماری امیدیں خاک میں مل کر رہ گئی تھیں۔ مجھ سے زیادہ مایوسی رضیہ، لالی اور راجی کو ہوئی تھی جو سکندر کے شریفانہ طرزِ عمل کے پیش نظر یہ سمجھ بیٹھی تھیں کہ ان کی مصیبت کا وقت اب گزر چکا ہے، لیکن ہم سب اس حقیقت کو فراموش کر بیٹھے تھے کہ سکندر اپنی تمام تر خوبیوں کے باوجود بالآخر ایک ڈاکو تھا جس سے کسی خیر کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس کا بدلا ہوا روپ اور لہجہ دیکھ کر ہم نے اس کی بات ماننے ہی میں عافیت جانی اور چپ چاپ اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

حویلی کے باہر سکندر کے ساتھی جیپوں میں بیٹھ چکے تھے۔ انہوں نے ہیبت خاں کی دو جیپوں پر بھی قبضہ جما لیا تھا۔ لینڈروور ابھی تک خالی تھی۔ حیرت خاں اس کے نزدیک کھڑا تھا۔ سکندر نے ہم چاروں کو لینڈروور میں سوار ہونے کا اشارہ کیا اور خود بھی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ہمارا سفر ایک بار پھر شروع ہو گیا۔ اگرچہ ہم اپنی آنکھوں کے سامنے گزر جانے والے منظر کو بخوبی دیکھ رہے تھے، لیکن اس علاقے سے مکمل ناواقفیت کی بنا پر ہمیں کچھ اندازہ نہیں تھا کہ ہم کس سمت میں سفر کر رہے ہیں اور ہماری منزل کون سی ہے۔

دورانِ سفر تو کچھ دیر خاموشی رہی لیکن اس کے بعد سکندر نے باتوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ وہ ہمارے بارے میں تفصیلات جاننے کا خواہش مند تھا لیکن اب ہم لوگ بھی محتاط ہو گئے تھے اور بہت سوچ سمجھ کر اس کے سوالوں کا جواب دے رہے تھے۔ میں نے ابھی اسکو رضیہ کی اصلیت بھی نہیں بتائی تھی۔

اس نے: رے میں صرف یہی کہا کہ وہ علاقے کے بہت دولت مند اور بااثر شخص کی بیوی ہے اور لالی اس کی ملازمہ ہے۔ میں نے خود اپنے آپ کو بھی ان کا ملازم ظاہر کیا تھا۔ راجی کے بارے میں ہم نے اسے حقیقت بتا دی تھی۔ دراصل ہماری خواہش یہ تھی کہ اگر راجی کو وہ لوگ اس کے گھر پہنچا سکیں تو نہ صرف راجی مشکلات سے بچ جائے گی بلکہ ہم لوگوں کو بھی اس کی حرکتوں سے نجات مل جائے گی۔ سکندر تمام معلومات اور اطلاعات کو خاموشی سے سنتا رہا تھا۔ اس نے کسی تاثر یا ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اس لیے اس کے بارے میں یہ اندازہ لگانا دشوار تھا کہ اس نے راجی کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے؟ موقع پا کر میں نے سکندر کے بارے میں اس سے کریدنا شروع کر دیا۔

"سکندر صاحب۔ آپ تو اچھے خاصے پڑھے لکھے اور تجربہ کار آدمی نظر آتے ہیں جبکہ آپ کے ساتھی جاہل مطلق ہیں۔"

وہ ہنسا اور کہنے لگا۔ "اب میں آپ کو کیا بتاؤں کہ میں گریجویٹ ہوں اور ہمیشہ اچھے اور امتیازی نمبروں سے پاس ہوتا رہا ہوں۔" اس کی گفتگو بھی اس دعوے کی تصدیق کر رہی تھی۔

"مگر پھر آپ نے ڈاکو بننا کیوں پسند کیا؟"

"پسند نہیں کیا۔ مجھے مجبوراً ڈاکو بننا پڑا ورنہ شاید میری تمام زندگی جیل خانوں میں ہی گزر جاتی۔"

اس نے اپنے بارے میں صرف اتنا بتایا کہ وہ ایک غریب کسان کا اکلوتا بیٹا ہے جسے اس کے ماں باپ نے بڑے لاڈ اور چاؤ سے پالا اور تعلیم دلائی تھی۔ باپ نے اپنی استطاعت سے بڑھ کر اس کے تعلیمی اخراجات برداشت کیے تھے۔ محض اس اُمید پر کہ ایک دن وہ پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بن جائے گا تو ماں باپ کی مصیبت کی سیاہ رات ختم ہو جائے گی اور وہ بھی خوشحالی اور دلی سکون سے مالا مال ہوں گے۔ محنت مزدوری کر کے اور قرضے اُٹھا کر انہوں نے سکندر کو پڑھایا تھا اور سکندر نے بھی ان کی آرزوؤں کو پایۂ تکمیل پر پہنچانے کے لیے پوری کوشش کی تھی۔

بی اے کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کرنے کے بعد سکندر کو یہ آس تھی کہ اسے بہت اچھی نوکری مل جائے گی۔ لیکن اسے لبا آرزو کہ خاک شدہ۔ اس کے پاس کوئی سفارش تھی نہ رشوت۔ اُدھر باپ کے قرض خواہ اپنا قرضہ وصول کرنے کے لیے اس پر زور ڈال رہے تھے۔ جب وہ مجبوری کے باعث قرضہ ادا نہ کر سکا تو ایک روز زمیندار نے اس کے اور اس کے باپ کے خلاف چوری اور اقدامِ قتل کا مقدّمہ بھی بنا دیا تھا۔ سکندر کے پاس وکیلوں کی فیس دینے کے لیے بھی روپیہ نہیں تھا۔ بالآخر ایک روز پولیس اسے پکڑ کر لے گئی۔ اس پر ظلم و ستم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ زمیندار نے اس کے خلاف ایسے ثبوت بھی فراہم کر دیے تھے جن کی وجہ سے اسے بارہ سال قید بامشقت کی سزا ہو سکتی تھی۔ سکندر کے پاس جان بچانے کا صرف ایک ہی راستہ تھا۔ وہ جیل سے فرار ہو گیا۔ جیل میں قیام کے دوران ہی میں اس کی ملاقات جرائم پیشہ لوگوں سے ہو گئی تھی جنہوں نے جیل سے فرار ہونے کے بعد اسکی ہر طرح سے امداد کی۔ اور اسے پناہ دی۔ رفتہ رفتہ سکندر ان سے متاثر ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ ان کے گروہ میں شامل ہو گیا۔ اور اب وہ ایک جرائم پیشہ گروہ کا رُکن تھا۔ اسکی خاندانی شرافت، تعلیم و تربیت، بلند ارادے سب خاک میں مل گئے تھے۔ وہ اب ایک ڈاکو تھا جو مختلف جرائم کے سلسلے میں پولیس کو مطلوب تھا۔ اس کی گرفتاری پر انعام مقرر کیا جا چکا تھا۔ ایک مفرور مجرم کے طور پر اس کی تصاویر پولیس کے تھانوں میں چسپاں تھیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ جن لوگوں نے اس کے باپ کے خلاف جُرم کا ارتکاب کیا تھا وہ بڑے آرام اور اطمینان

سے تھے اور شریف، امن پسند اور قانون پر عمل کرنے والے شہریوں کی طرح زندگی بسر کر رہے تھے جبکہ وہ ایک شہری سے ڈاکو کے روپ میں ڈھل چکا تھا۔

سکندر کی داستان خاصی دلچسپ اور متاثر کرنے والی تھی۔ وہ اپنی بھاری اور گمبھیر آواز میں، زیر و بم کے ساتھ اپنی کہانی کے واقعات بیان کرتا رہا اور درمیان میں کسی نے اسے ٹوکنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ہم سبھی اس کی المناک داستان سے متاثر نظر آ رہے تھے۔ خواتین بھی خاموش اور اُداس ہو گئی تھیں۔ راجی بڑے درد بھرے انداز میں سکندر کی طرف دیکھ رہی تھی اور اُس کی نگاہوں سے ایک عجیب قسم کی جذباتی کیفیت جھلک رہی تھی۔

یہ ایک خاصی طویل کہانی تھی۔ اس دوران میں ہماری گاڑیوں کا قافلہ مختلف کچے پکے راستوں سے گزرتا رہا۔ میں نے اردگرد کے ماحول پر توجہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ وجہ صاف ظاہر تھی۔ میں اس علاقے سے قطعی ناواقف تھا۔ اگر آس پاس کے مناظر کو دیکھ کر لیتا تو یہ میرے لیے کسی طرح کارآمد ثابت نہ ہوتا میں ان راہوں سے گزر کر اپنی منزل کا نشان نہیں پا سکتا تھا۔ پھر سکندر کی کہانی اور انداز بیان اس قدر مسحور کن تھا کہ میری توجہ کسی اور جانب منعطف نہیں ہو سکی تھی۔

قریب قریب ڈھائی تین گھنٹے بعد ہم ایک پُر فضا اور سرسبز علاقے میں پہنچ گئے۔ ہر طرف ہریالی تھی۔ خوبصورت درخت آسمان کی جانب سر اُٹھائے کھڑے پہرہ دے رہے تھے۔ درمیان میں یہاں وہاں گھاس کے سرسبز میدان تھے۔ کہیں کہیں کھیت بھی لہلہا رہے تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہاں لوگ کھیتی باڑی بھی کرتے ہیں۔ اگرچہ کھیتوں میں کوئی کسان نظر نہیں آیا تھا۔ ان خوبصورت اور ہرے بھرے علاقوں سے ایک کچی سڑک خم کھاتی ہوئی ایک بڑی سی عمارت کے بڑے آہنی گیٹ کے سامنے پہنچ گئی۔ دروازہ بند تھا۔ گاڑی کے ہارن کی آواز سن کر ایک چھوٹے سے دریچے میں سے ایک مونچھوں والے چوکیدار نے جھانک کر دیکھا اور سکندر کے اشارے پر گیٹ کھول دیا۔ گیٹ کے اندر ایک پتھریلی سڑک قریباً دو سو گز تک سیدھی چلی گئی تھی اور پھر ایک بڑے سے لان کے مقابل ایک پتھروں کی دو منزلہ پرانی وضع کی وسیع عمارت ایستادہ تھی۔ عمارت کے سامنے ایک گول ستونوں والا برآمدہ تھا اور برآمدے کے آگے ایک خوبصورت کشادہ پورچ بنا ہوا تھا۔ سکندر نے پورچ میں لینڈ روور کھڑی کر دی اور کود کر باہر نکل گیا۔ اس کی ہدایت پر ہم چاروں بھی گاڑی سے نکل کر کھڑے ہو گئے۔ سکندر نے حیرت خاں کو ہاتھ کے اشارے سے کچھ ہدایات دیں اور اُن لوگوں کی جیپیں جو لینڈ روور سے کچھ فاصلے پر رُک گئی تھیں مُڑ کر عمارت کے عقب کی جانب چلی گئیں۔ پتھروں کی ڈرائیو وے سے نکل کر ایک بجری کی سڑک پچھلے حصے کی طرف جاتی تھی جس سے ظاہر ہوا کہ اس طرف موٹر کاروں کے گیراج اور کچھ دوسری عمارتیں بھی موجود ہیں۔ میں نے آس پاس کا جائزہ لیا۔ یہ ایک پُرشکوہ عمارت تھی جو کئی ایکڑ زمین میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی وسعت کا اندازہ اس بات سے لگا لیجئے کہ بڑے گیٹ سے عمارت تک آنے کے لیے قریباً دو سو گز کا فاصلہ طے کرنا پڑتا تھا۔ اور عمارت کے عقب میں بھی دُور دُور تک زمین اور درخت نظر آ رہے تھے۔ گیراج اور دوسری عمارتیں کئی سو گز کے فاصلے پر واقع ہونے کی وجہ سے اس جگہ سے نظر نہیں آ رہی تھیں۔ عمارت کے آس پاس خوش وضع لان اور پھولوں کے تختے تھے۔ پھلوں اور پھولوں کے درخت اور پودے خاصی بڑی تعداد میں لگے ہوئے تھے۔ عمارت کے اردگرد سامنے والے گیٹ اور دیوار کے علاوہ کسی اور جانب احاطے کی دیوار موجود نہیں تھی جو ایک عجیب سی بات تھی۔

حیرت خاں اور اس کے ساتھی ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو چکے تھے۔ اور اس اثناء میں عمارت کے اندرونی حصے سے دو مسلح افراد نکل کر باہر آ گئے تھے۔ انہوں نے سکندر کو دیکھ کر گردن ہلائی اور برآمدے میں ستونوں کے پاس کھڑے ہو گئے۔ سکندر نے ہم لوگوں کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور برآمدے میں داخل ہو گیا۔ ایک اونچے چوبی دروازے سے گزر کر ہم ایک وسیع ہال میں پہنچ گئے جس کے کونے سے کشادہ چوبی سیڑھیاں دوسری منزل کی جانب چڑھ رہی تھیں۔ سیڑھیوں کے عقب میں ایک برآمدہ نما راہداری بھی تھی جو حدِ نگاہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس راہداری کے دونوں اطراف کمروں کے دروازے نظر آ رہے تھے۔

ہال کے وسط میں ایک قالین بچھا ہوا تھا جس کے چاروں طرف پرانی طرز کے صوفے رکھے ہوئے تھے۔ ہال کی کھڑکیوں پر موٹے سرخ رنگ کے پردے لٹک رہے تھے۔ اس کے سوا ہال میں آرائش کا کوئی اور سامان موجود نہیں تھا۔ سکندر نے ہم لوگوں کو صوفوں پر بیٹھنے کے لیے کہا اور خود راہداری میں جا کر ایک کمرے میں گم ہو گیا۔

رضیہ نے پہلی بار زبان کھولی اور چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہوئے کہا: "یہ ہم کہاں آ گئے ہیں اب کیا ہو گا؟"

"جو ہونا ہے ہو کر رہے گا۔ پھر بلاوجہ قبل از وقت پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔"

راجی نے سرگوشی کی: "یہ جگہ ڈاکوؤں کے رہنے کی تو نہیں لگتی۔"

لالی بھی خاموش نہ رہ سکی۔ کہنے لگی: "ہم تو اپنے گھر سے نکل کر رُل گئے ہیں۔ نہ جانے قسمت میں اور کتنی ٹھوکریں لکھی ہیں؟!" اُس نے ایک لمبی سرد آہ بھری اور رضیہ کی جانب دیکھنے لگی۔

راجی کا خیال بالکل درست تھا۔ یہ جگہ واقعی ڈاکوؤں کی آماجگاہ نہیں لگتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہم کسی جاگیردار کی رہائش گاہ میں آ گئے ہیں۔ ابھی میں کوئی رائے قائم کرنے بھی نہیں پایا تھا کہ سکندر نے آ کر اطلاع دی کہ باس نے ہمیں طلب کیا ہے۔ تینوں لڑکیوں نے پریشانی سے میری جانب دیکھا لیکن میں بھی بے بس تھا۔ اور حکمِ حاکم، مرگِ مناجات کے بموجب اس ہدایت پر عمل کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ سکندر کی سربراہی میں ہم چاروں کا قافلہ راہداری میں سے گزر کر ایک کمرے کے دروازے کے سامنے پہنچ گیا۔ سکندر نے دروازے پر دستک دی اور ہم جس کمرے میں داخل ہوئے وہ خاصا کشادہ تھا فرش پر قیمتی قالین بچھا ہوا تھا اور دیواروں پر دو قدیم زمانے کی پینٹنگز آویزاں تھیں۔ ایک دیوار پر بندوقیں تلواریں اور پرانے زمانے کی ڈھالیں سجی ہوئی تھیں۔ اس کے سامنے والی دیوار پر ایک بارہ سنگھے کا سر سجا ہوا تھا۔

دیواروں کے ساتھ ساتھ الماریوں میں کتابیں سلیقے سے لگی ہوئی تھیں۔ کمرے کے وسط میں ایک آبنوسی میز تھی جس پر ایک سنہری قلمدان اور چند سادہ کاغذ پڑے ہوئے تھے۔ میں نے حیران ہو کر سکندر کی جانب دیکھا۔ یہ کمرہ کسی ڈاکو کی پناہ گاہ سے زیادہ کسی پڑھے لکھے باذوق رئیس کی لائبریری کا تاثر دے رہا تھا۔ میز کے ایک جانب آبنوس کی بڑی سی گھومنے والی کرسی تھی اور دوسری جانب چار خوبصورت چرمی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ کمرے کا تمام فرنیچر قدیم طرز کا تھا۔ ہم جس دروازے سے داخل ہوئے تھے۔ اس کے بالکل سامنے ایک اور دروازہ تھا جس کے برابر ایک بڑی سی کھڑکی پر سرخ مخمل کا پردہ لٹکا ہوا تھا۔ چھت میں ایک خوبصورت فانوس آویزاں تھا۔ تمام سیٹ اپ انتہائی مرعوب کن اور پُرسکون تھا۔

کمرہ بالکل خالی تھا۔ ہم سب میز کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے۔ سکندر بھی ہمارے ساتھ ہی کھڑا ہوا تھا۔ اور ہمیں حیران دیکھ کر لطف اندوز ہو رہا تھا۔

یکایک سامنے والا دروازہ کھلا اور ہم سب کی نگاہیں اس پر مرکوز ہو گئیں۔ کمرے میں داخل ہونے والا شخص درمیانی عمر کا ایک مضبوط اور باوقار آدمی تھا۔ اپنی رعب دار مونچھوں اور بڑی بڑی آنکھوں کے باعث وہ کسی ریٹائرڈ فوجی افسر کی تصویر پیش کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک رائفل تھی جسے اس نے بے پروائی سے اپنے بائیں ہاتھ میں لٹکا رکھا تھا۔ اس کی نظریں ہم لوگوں پر پڑیں تو وہ ٹھٹک کر رُک گیا۔ بڑی دلچسپی اور حیرت سے ہم لوگوں کو دیکھنے لگا۔ پچھلے چند گھنٹوں کی بھاگ دوڑ اور پریشانی کے باعث تینوں عورتوں کے حلیے خاصے بگڑے ہوئے تھے اس کے باوجود وہ پُرکشش اور خوبصورت نظر آ رہی تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ تینوں خوبرو اور دلکش عورتیں تھیں جن کی شخصیت میں ایک مسحور کر دینے والی کیفیت تھی جس نے سکندر کے باس کو بھی اپنی گرفت میں لے لیا تھا اور وہ باری باری رضیہ، لالی اور راجی کو تک رہا تھا۔ وہ شکاری لباس میں تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے یا تو وہ شکار پر سے واپس آیا ہے یا شکار پر جانے والا ہے۔

اس کی محویت کو سکندر کی آواز نے توڑا: "سر میں نے آپ کو ان لوگوں کے بارے میں بتایا تھا۔ اب ان کے لیے کیا حکم ہے؟"

اس نے چونک کر سکندر کو دیکھا۔ پھر ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر نمودار ہوئی اور غالباً پہلی بار اُس نے غور سے میری طرف دیکھا۔

"ان لوگوں کو آرام سے مہمان خانے میں رکھو یہ ہمارے مہمان ہیں۔" اس کی آواز میں نرمی کے ساتھ تحکم بھی تھا۔

"اگر اجازت ہو تو میں کچھ کہوں جناب؟" میں نے اسے مخاطب کیا۔

"ضرور۔" وہ کرسی پر بیٹھ کر رائفل کا جائزہ لینے لگا۔

"ہم لوگ پہلے ہی کافی پریشانیاں اور تکلیفیں اُٹھا چکے ہیں۔ شاید آپ کو سکندر صاحب نے بتایا ہو گا کہ میں ان عورتوں کو لے کر اپنے مالک کے پاس جا رہا تھا کہ بدقسمتی سے ڈاکوؤں کے نرغے میں پھنس گئے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میری مالکہ بہت معزز خاتون ہیں اور میرے مالک ان کی گمشدگی کے باعث بے حد پریشان ہو رہے ہوں گے۔ آپ کی بڑی مہربانی ہو گی اگر ہم لوگوں کو اپنے گھر جانے کی اجازت دے دی جائے۔" اپنی جرأت پر میں خود بھی حیرت زدہ تھا۔ اس شخص کو دیکھ کر خود بخود بھروسے اور یقین کا احساس پیدا ہوتا تھا۔ ورنہ اس قدر سادگی اور بے تکلفی سے میں اسے مخاطب نہ کرتا۔

اُس نے نظریں اُٹھا کر مجھے دیکھا پھر زیرِ لب مسکراتے ہوئے پوچھا: "ان میں تمہاری مالکہ کون ہیں؟"

میرے جواب دینے سے پہلے رضیہ بول پڑی: "میں ہوں۔" وہ بڑے وقار کے ساتھ ایک قدم آگے بڑھ کر کھڑی ہو گئی۔

باس نے ایک بھرپور نظر رضیہ کے سراپا پر ڈالی۔ اس کی آنکھوں میں مرعوبیت اور دلچسپی کے تاثرات صاف نمایاں تھے۔

"آپ کرسی پر بیٹھے خاتون۔ آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟"

رضیہ بڑے اعتماد کے ساتھ ایک چرمی کرسی پر بیٹھ گئی اور بولی: "میرا نام رضیہ ہے۔" پھر اُس نے

لالی کی جانب اشارہ کیا۔ "یہ میری ملازمہ لالی ہے اور یہ راجی ہے۔ راجی ہمیں راستے میں مل گئی تھی۔ اس کے علاوہ ہمارا کوئی اور رشتہ نہیں ہے۔ یہ بھی مصیبت میں ہے اور اپنے گھر واپس جانا چاہتی ہے ـــ"

باس رضیہ کی گفتگو اور پُر اعتماد لہجے سے خاصا متاثر معلوم ہو رہا تھا۔ "آپ کے شوہر کا کیا نام ہے ـــ ؟"

اس سوال پہ میں نے اپنا سانس روک لیا۔ دراصل ابھی تک میں خود بھی یہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ رضیہ اور ملک منصور کی اصلیت کے بارے میں اِن لوگوں کو مطلع کرنا مفید ثابت ہوگا یا نقصان دہ ؟ یہ سب کچھ اس قدر اچانک اور غیر متوقع طور پر ہوا تھا کہ ہمیں آپس میں مشورہ کرنے اور کوئی فیصلہ کرنے کی مہلت ہی نہیں مل تھی۔ مگر رضیہ بالکل مطمئن اور پُر سکون تھی۔ اُس نے بہت شائستہ اور پُر وقار انداز میں اپنی ٹانگ پر ٹانگ رکھتے ہوئے کہا۔ "میرے شوہر کا نام ملک منصور ہے۔ وہ گمنام آدمی نہیں ہیں۔ نہ جانے آپ اُن کو جانتے ہیں یا نہیں ؛"

باس کے چہرے پر تیزی سے بدلتے ہوئے تاثرات میری نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہے تھے۔ ملک منصور کے نام پر وہ قدرے چونکا ضرور تھا، لیکن پھر اُس نے اپنے جذبات پر قابو پا لیا تھا، لیکن وہ ایک دم کرسی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اسکی نظریں رضیہ کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ "اوہ !" اس کے مُنہ سے آواز نکلی مگر اس کے بعد وہ کچھ بولتے بولتے رُک گیا۔

"تو کیا آپ انہیں جانتے ہیں ؟" رضیہ نے بڑے اطمینان سے سوال کیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے دو ملاقاتی کسی کلب میں سوشل گفتگو میں مصروف ہیں۔

"انہیں کون نہیں جانتا۔" اس نے مختصر جواب دیا اور پھر یک لخت راجی کی جانب متوجہ ہو گیا۔ "ان کا گھر کہاں ہے ؟"

راجی نے میری جانب دیکھا پھر رضیہ پر نگاہ ڈالی۔ وہ بھی گومگو کے عالم میں تھی، لیکن اب جبکہ ہم نے اپنے پتے باس کے سامنے کھول کر رکھ دیئے تھے۔ راجی کے بارے میں بھی کسی غلط بیانی سے کام لینے کی ضرورت نہیں تھی۔

"یہ بازارِ حسن سے تعلق رکھتی ہیں۔" میں نے اس کی مشکل آسان کر دی۔ "ان کو ہیرا ڈاکو نے اغوا کر لیا تھا۔ وہاں سے فرار ہوتے ہوئے یہ ہمیں مل گئیں اور اس طرح ہمارے ساتھ یہ بھی ایک نئی مصیبت میں گرفتار ہو گئیں۔"

اس اثناء میں راجی کی خود اعتمادی بھی واپس آ گئی تھی۔ "میرا نام راجی ہے۔" وہ دلکشی سے مسکرائی۔ "میرے ناچ گانے کی بڑی دھوم ہے۔"

"اچھا !!" باس کے چہرے پر مصنوعی حیرت کے آثار پیدا ہوئے۔ "تو پھر ہمیں بھی اس سے لُطف اُٹھانے کا موقع دیجئے نا۔"

راجی نے کہا۔ "آپ کہیں گے تو میں انکار نہیں کروں گی۔"

"ٹھیک ہے۔" باس یکایک سکندر سے مخاطب ہُوا۔ "ان لوگوں کو ہم مہمان رکھے بغیر تو نہیں جانے دیں گے۔ ویسے بھی یہ تھکے ہوئے ہیں۔ انہیں آرام سے مہمان خانے میں لے جاؤ اور پوری خاطر کرو۔ آپ لوگ سکندر کے ساتھ جائیں۔ یہ آپ کے آرام کا پورا پورا بندوبست کر دیں گے۔" اس کی آنکھوں میں ایک معنی خیز چمک پیدا ہوئی جس نے مجھے تشبہ اور پریشانی میں مبتلا کر دیا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ کچھ سوچ رہا ہے۔ لیکن اس نے ہمیں کچھ اور کہنے سُننے کا موقعہ ہی نہیں دیا۔

"آپ لوگوں سے پھر ملاقات ہو گی۔" اتنا کہہ کر وہ اسی دروازے میں غائب ہو گیا جس میں سے کمرے میں داخل ہوا تھا۔

ہم حیرت اور پریشانی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے۔ وہ جس طرح نمودار ہوا تھا ہمیں حیرت زدہ کر کے اسی طرح اچانک غائب ہو گیا تھا۔ سکندر ہم لوگوں کا منتظر تھا۔ اس نے میں نے رضیہ کو کرسی سے اُٹھنے کا اشارہ کیا اور ہم سب سکندر کے پیچھے پیچھے کمرے سے باہر چل پڑے۔ راہداری سے گزر کر ہم ایک اور برآمدے میں پہنچے جس کے آخری کنارے پر ایک مختصر سے فاصلے کے بعد ایک خوبصورت دو منزلہ عمارت بنی ہوئی تھی جو ان لوگوں کا مہمان خانہ تھا۔ مہمان خانہ ایک لحاظ سے اس بڑی عمارت سے علیحدہ تھا لیکن دیکھا جائے تو اسی کا ایک حصہ معلوم ہوتا تھا۔ دونوں عمارتوں کی بناوٹ اور طرزِ تعمیر بھی یکساں تھا اور جب ہم کمرے میں داخل ہوئے تو پتہ چلا کہ کمروں کی سجاوٹ وغیرہ میں بھی وہی انداز کارفرما تھا جو ہم بڑی عمارت میں دیکھ چکے تھے۔ مہمان خانہ چار پانچ کمروں پر مشتمل تھا جن میں سے تین نچلی منزل پر تھے ایک ہال کمرے سے خوبصورت چوبی سیڑھیاں اوپر کی طرف بل کھاتی ہوئی جا رہی تھیں۔ ہال کمرہ بڑے سلیقے سے آراستہ کیا گیا تھا۔ ہال کمرے کے دونوں طرف بیڈ روم تھے اور یہ بھی خوش ذوقی سے سجے ہوئے تھے۔ قالین، صوفے، کھڑکیوں پر رنگین اور قیمتی پردے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بتایا یہ سب کچھ کسی جرائم پیشہ ڈاکوؤں کے گروہ کی رہائش گاہ سے زیادہ کسی خاندانی رئیس کے محلسرا کا منظر پیش کرتا تھا۔

سکندر نے ہال کمرے میں ایک بیڈ روم کا دروازہ کھول کر ہمیں دکھایا اور بولا۔ "نیچے کی منزل پر تین کمرے ہیں۔ آپ لوگ انھیں جس طرح چاہیں استعمال کریں۔ اوپر کی منزل میں کچھ اور مہمان ٹھہرے ہوئے ہیں لیکن وہ آپ کے لیے کسی مشکل یا پریشانی کا سبب نہیں بنیں گے۔ ملازم کو بلانے کے لیے ہر کمرے میں بجلی کی گھنٹی موجود ہے۔ میرا خیال ہے آپ لوگ تازہ دم ہونا پسند کریں گے اس لیے میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ مسکراتا ہوا رخصت ہو گیا اور ہم چاروں تشویش اور پریشانی کے عالم میں ایک دوسرے کا منہ تکتے رہ گئے۔

"یہ سب کیا ہے ؟ میری تو سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا دنیا میں کہیں ایسے ڈاکو بھی ہوتے ہیں۔" رضیہ نے ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے اپنی حیرت کا اظہار کیا۔

"واقعی۔ اس قسم کے ڈاکو نہ کبھی دیکھے نہ سُنے۔ مگر یہ تو ماننا پڑے گا کہ یہ لوگ واقعی ڈاکو ہیں۔ ان کا کارنامہ تو ہم خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔" میں نے بھی اپنی اُلجھن کا اظہار کرنا ضروری سمجھا۔ "مگر پہلے ہم لوگوں کو تازہ دم ہو کر اپنے ہوش و حواس ٹھیک کرنے چاہئیں۔ اس کے بعد جو ہونا ہے دیکھا جائے گا۔"

کمروں کی تقسیم اس طرح کی گئی کہ ایک کمرے میں تینوں عورتیں رہیں گی اور میں ان سے الگ دوسرے کمرے میں رہوں گا لیکن رضیہ اِس تجویز سے متفق نہیں معلوم ہوتی تھی۔

وہ سر جھکا کر خاموش ہو گئی .... پھر بولی۔ "کمرے تو خالی پڑے ہیں۔ ان کے بارے میں بعد میں سوچ لیں گے۔ فی الحال اپنا حُلیہ ٹھیک کرنا چاہیئے۔"

چنانچہ میں نے سامنے والے ایک کمرے کا رُخ کیا۔ یہ کمرہ خاصا کُشادہ اور خوبصورتی سے سجا ہوا تھا۔ غسل خانے میں سفید ٹائیلز لگے ہوئے تھے۔ صابن اور تولیہ بھی موجود تھا۔ کافی عرصے بعد غسل کر کے تازگی اور بشاشت کا احساس ہونے لگا۔ میرے پاس دوسرا لباس نہیں تھا اس لیے وہی لباس پہننے کی مجبوری تھی۔ جسے پہننے کو میرا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ میں تولیہ لپیٹ کر بڑے صوفے پر نیم دراز ہو گیا اور اب تک بیٹھ

آنے والے واقعات کے بارے میں غور کرنے لگا۔ سوال یہ تھا کہ آئندہ کے لیے ہماری تقدیر میں کیا لکھا تھا اور ان عجیب و غریب ڈاکوؤں سے نجات حاصل کرنے کا کیا طریقہ ہو سکتا تھا! ستم ظریفی یہ تھی کہ میں جس مقصد کے حصول کی خاطر گھر سے نکلا تھا وہ کہیں راستے میں گم ہو چکا تھا اور میں نت نئے مسائل اور الجھنوں کا شکار ہو گیا تھا۔ اب یہ تین عورتیں مجھ سے وابستہ ہو گئی تھیں اور ہم سب ایک نئی مشکل سے دوچار تھے۔

رضیہ نے درست کہا تھا سکندر اور اس کے باس کو دیکھ کر کوئی انھیں ڈاکو نہیں کہہ سکتا تھا۔ پھر جس محل نما عمارت میں ان لوگوں کا اڈہ تھا اور جس انداز سے اس میں وہ بود و باش رکھتے تھے اس کے پیش نظر یہ گورکھ دھندا اور زیادہ الجھ گیا تھا۔ یہ انتہائی پُراسرار اور گہرے لوگ معلوم ہوتے تھے اور یہ سوچنا ضروری تھا کہ ان سے کیوں کر عہدہ برا ہونا چاہیے؟ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اپنی تمام تر شائستگی اور اخلاق کے باوجود وہ ڈاکو تھے اور ڈاکو بھی انتہائی خونخوار اور سخت دل۔ اس گروہ نے ہیبت خاں اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ جو سلوک کیا تھا وہ ان کی بے رحمی اور درندہ خصلت ہونے کا واضح ثبوت تھا۔ ہیبت خاں کا جرم صرف یہ تھا کہ ان لوگوں کی دانست میں وہ پولیس افسر تھا اور یہ اپنے آس پاس کے علاقے میں پولیس کا وجود برداشت کرنے کو تیار نہ تھے اسی لیے انھوں نے ہیبت خاں اور اس کے گروہ کو نیست و نابود کر دیا تھا۔ ایسے شقی القلب اور قانون کے دشمنوں سے کسی نیکی، رحمدلی یا بھلائی کی توقع کیسے کی جا سکتی تھی؟

دروازے پر دستک ہوئی اور میں چونک کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

"کون ہے؟"

"اندر آ سکتی ہوں؟" ایک زنانہ آواز سنائی دی۔

میں نے حیران ہو کر دروازے کی جانب دیکھا جو آہستہ آہستہ کھل رہا تھا۔ سامنے ایک سانولی سلونی، قبول صورت صحت مند لڑکی ادب سے کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کچھ سامان تھا۔

"کیا بات ہے؟ کون ہو تم؟" میں نے ڈانٹ کر پوچھا۔

"نوکرانی ہوں صاحب۔ بھاگاں نام ہے میرا۔" اس نے سہم کر جواب دیا۔

میرا دل بے اختیار ہنسنے کو چاہا۔ وہ تقدیر کی اتنی کھوٹی تھی کہ ڈاکوؤں کے پاس ملازمت کرنے پر مجبور تھی مگر نام تھا بھاگاں۔ بہت خوب۔ قدرت کی ستم ظریفیاں بھی عجیب ہوتی ہیں اور اپنی مصلحتیں وہی جانتی ہے۔ میں نے خاموشی سے بھاگاں کا جائزہ لیا۔ وہ لمبے قد کی صحت مند لڑکی تھی۔ اپنے برتاؤ اور گفتگو کے انداز سے دیہاتی اور اُجڈ نہیں لگتی تھی۔

"آپ کے لیے کپڑے لے کر آئی ہوں۔" اس نے مجھے خاموشی سے اپنی طرف تکتے ہوئے پا کر کہا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں ایک حیوانی کشش تھی۔ شرم و حیا کی جگہ بے باکی تھی ظاہر ہے جس ماحول اور جس حیثیت میں وہ زندگی گزار رہی تھی، وہ ایک ملازمہ تھی اور اپنے آقاؤں کے ہر حکم اور خواہش کی تعمیل کرنے کی عادی معلوم ہوتی تھی۔ میں نے اس کی نگاہوں کی چمک اور حدّت سے گھبرا کر اپنی نظریں ہٹا لیں۔

"یہ کپڑے صاحب؟!" اُس نے میرے تولیے میں لپٹے ہوئے نیم عریاں جسم کو دیکھتے ہوئے کہا تو مجھے معاً احساس ہوا کہ میں صرف ایک بڑا تولیہ جسم پر لپیٹے ہوئے کھڑا ہوں۔ ایک مرد کے لیے یہ خاصا معقول لباس تھا لیکن پھر بھی صورت حال کے پیشِ نظر میں جھینپ گیا۔

"ٹھیک ہے اُدھر رکھ دو" میں نے نظریں دوسری جانب ہٹاتے ہوئے کہا۔

اس نے کپڑوں کا بنڈل صوفے پر رکھ دیا اور پھر خاموش کھڑی ہو گئی۔ لیکن زبان کی خاموشی کے باوجود وہ مجسم گفتگو تھی۔

"اب تم جاؤ۔" میں نے سٹپٹا کر کہا۔ نہ جانے کیوں مجھے اس لڑکی سے اُلجھن سی محسوس ہونے لگی تھی۔ اس نے مجھے مایوسی سے دیکھا اور اپنے جسم کو جھٹکا دے کر کمرے سے رخصت ہو گئی۔ میں خاموش کھڑا اُس کو جاتے دیکھتا رہا۔ غالباً اس کو بھی یہ احساس تھا کیونکہ دروازے پر پہنچ کر اس نے ایک بار پھر پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر نمودار ہوئی اور پھر وہ غائب ہو گئی۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ بند کر دیا۔ اور کپڑوں کے بنڈل کا جائزہ لینے لگا۔ سلیقے سے تہہ کیے ہوئے شلوار قمیص کے دو جوڑے صوفے پر رکھے ہوئے تھے۔ دونوں کا رنگ سفید تھا اور کپڑا خاصا قیمتی۔ یہ بالکل نیا لباس نہیں تھا مگر قریب قریب نیا ضرور تھا۔ میں نے یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ یہ لباس کس کا ہو سکتا ہے۔ وقتی طور پر میری ایک بہت بڑی اور فوری ضرورت پوری ہو گئی تھی۔ لباس زیب تن کیا تو یوں لگا جیسے وہ میرے ہی لیے سلا تھا۔ ممکن ہے وہ سکندر کا لباس ہو کیونکہ وہ قد و قامت اور ڈیل ڈول سے میری ہی طرح تھا۔ لباس پہننے کے بعد میں وقتی طور پر مطمئن ہو کر صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔ اور خالی الذہن ہو کر کھڑکی سے باہر کا نظارہ کرنے لگا۔ اور پھر خود بخود میری آنکھیں بند ہو گئیں۔ جب میری آنکھ کھلی تو کمرے میں مکمل اندھیرا تھا۔ میں بہت گہری نیند سویا تھا جس نے میرے ذہن اور جسم کو پُرسکون اور آسودہ کر دیا تھا۔ ایک طویل انگڑائی لے کر میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ یکایک مجھے احساس ہوا کہ تین جوان اور خوبصورت عورتیں میری حفاظت میں ہیں اور میں نے کافی دیر سے ان کی خبر نہیں لی۔ تیزی سے نکل کر میں ہال کمرے میں پہنچا جو بجلی کی روشنی میں سحرانگیز لگ رہا تھا۔ ہال کے وسط میں لٹکا ہوا فانوس نہیں جلایا گیا تھا۔ پھر بھی ہال میں خاصی روشنی تھی مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ رضیہ وغیرہ کون سے کمرے میں ہوں گی۔ میں نے ایک کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ چند لمحے بعد دروازہ کھلا اور میں اپنے سامنے لالی کو ایک نئے روپ میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ گھگھرا چولی پہنے ہوئے تھی اور بہت دلکش لگ رہی تھی۔ بالوں کی ایک موٹی سی چوٹی اس کی پشت پر لہرا رہی تھی۔ نہا دھو کر وہ خاصی چست اور ہشاش بشاش نظر آ رہی تھی۔

"کیوں ملک صاحب میں ان کپڑوں میں کیسی لگ رہی ہوں؟" اُس نے اِٹھلا کر پوچھا۔

"لو۔ میں تو تمہیں پہچانا ہی نہیں۔" میں نے سٹپٹا کر کہا۔ میں نے اُسے جس محویت سے دیکھا تھا اس کا احساس لالی کو بھی ہو گیا تھا اور وہ اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں داب کر مسکرا رہی تھی۔ یہ اس کی ایک مخصوص ادا تھی۔

"رضیہ اور راجی کہاں ہیں؟" میں نے سوال کیا۔

"اندر تو آئیں یا ساری باتیں باہر کھڑے کھڑے ہی کر لیں گی۔" اس نے میرے لیے راستہ چھوڑ دیا۔ اندر داخل ہوا تو دیکھا کہ یہ کمرہ بھی میرے کمرے ہی کی طرح تھا۔ آرام دہ اور آراستہ۔ ایک فرق یہ تھا کہ یہاں ایک جانب سیاہ رنگ کی ایک بڑی سی سنگھار میز بھی رکھی ہوئی تھی جو میرے کمرے میں نہیں تھی۔ رضیہ سنگھار میز کے سامنے کھڑی بال سنوار رہی تھی۔ آئینے میں ہم دونوں کی نگاہیں ملیں تو وہ مسکرائی۔ غسل نے اسے بھی تازہ دم اور شگفتہ کر دیا تھا۔ وہ ایک خوبصورت پھول دار شلوار قمیص پہنے ہوئے تھی جو اس کے جسم پر خوب سج رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ لالی اور رضیہ کے لیے بھی میزبان ہی نے لباس فراہم کیا تھا جو موجودہ حالات میں ہماری بہت بڑی ضرورت تھا۔ میں نے اپنے میزبان کی اس مہمان نوازی کو دل ہی دل میں سراہا۔

" آپ نے بھی کپڑے بدل لیئے ؟" رضیہ نے سر سے پیر تک میرا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ اُس کی نگاہوں میں ستائش کی جھلک تھی۔

" ان لوگوں کی مہربانی ہے۔ ورنہ میں تو ان کپڑوں سے بیزار ہو گیا تھا۔" میں صوفے پر بیٹھ گیا: " راجی کہاں ہے ؟"

لالی شرارت سے مسکرائی: "کیا بات ہے ملک جی۔ بار بار آپ راجی کو یاد کر رہے ہیں۔"

" وہ نظر جو نہیں آ رہی ہے یہاں۔" میں نے عذر پیش کیا۔

" وہ سامنے والے کمرے میں ہے۔ اُدھر بھی غسل خانہ ہے۔ اس لیے وہ اُس کمرے میں چلی گئی۔"

" سنو رضیہ۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔" تم کو یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ ہم لوگ ڈاکوؤں کے قبضے میں ہیں۔ احتیاط اور حفاظت ہمارا فرض ہے۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ اگر ہم سب ایک ہی کمرے میں رہیں تو زیادہ بہتر ہے اس طرح ہم ایک دوسرے کے حال سے باخبر رہ سکتے ہیں اور خدا نخواستہ کسی مصیبت کی صورت میں ایک دوسرے کے کام بھی آ سکتے ہیں۔"

رضیہ اور لالی نے میرے خیال سے اتفاق کیا۔ میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

" میں راجی کی خبر لے کر آتا ہوں۔"

سامنے والا کمرہ زیادہ دور نہیں تھا۔ میں نے دستک دیئے بغیر دروازے کو دھکیلا اور اندر داخل ہو گیا۔ لیکن ایک لمحے کے لیے ٹھٹک کر رہ گیا۔ راجی سامنے ایک صوفے پر بیٹھی ہوئی مسکرا رہی تھی اور سکندر اپنے ہاتھ سے اس کو بسکٹ کھلا رہا تھا۔ سامنے میز پر چائے کا سامان رکھا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ دونوں سٹپٹا گئے۔

" اوہ" میں رُک گیا: " بلا اجازت اندر آنے کی معافی چاہتا ہوں۔"

" کوئی بات نہیں۔" راجی مسکراتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی۔" آیئے چائے پیجئے۔"

" نہیں۔ تم چائے پی کر اُس کمرے میں آ جانا۔" میں اُلٹے قدموں لوٹ گیا۔ راجی میری توقع سے کہیں زیادہ تیز اور چالاک ثابت ہو رہی تھی اور ساتھ ہی اس کا دل پھینک انداز بھی میرے لیے پریشان کن تھا۔ نجانے کس وقت اُس نے سکندر کو اپنی تیز نگاہ کا شکار بنا لیا تھا۔ اس مختصر وقت میں نوبت یہاں تک پہنچ جائے گی یہ مجھے بالکل احساس نہیں تھا۔

رضیہ نے میرے چہرے پر پھیلی ہوئی پریشانی کو بھانپ لیا اور میرے نزدیک چلی آئی: "کیا ہوا۔ راجی کہاں ہے ؟"

" چائے پی کر ابھی آ رہی ہے۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

اسی لمحے دروازے پر کسی نے دستک دی اور بھاگاں نے اندر داخل ہو کر اطلاع دی کہ باس کھانے پر ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔

" کھانا کہاں ہے ؟" میں نے پوچھا۔

" کھانے کے کمرے میں۔ آپ میرے ساتھ آیئے۔" وہ سر جھکا کر ہم سے پہلے کمرے کے دروازے سے باہر نکل گئی۔ ہم تینوں ہال کمرے میں پہنچے تو راجی بھی اپنے کمرے سے نکل کر آ گئی تی۔ سکندر اس کے ساتھ نہیں تھا۔ راجی کے چہرے پر شفق پھوٹی ہوئی تھی اور انگ انگ سے مسرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ میں نے اس پر ایک گہری نظر ڈالی تو وہ معنی خیز انداز میں مسکرا کر رہ گئی۔ میں نے جان بوجھ کر لالی اور رضیہ کو آگے جانے کا موقعہ دیا اور خود راجی کے ساتھ چلنے لگا۔

" کیا کوئی نیا گل کھلانے کا ارادہ ہے ؟" میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے دبی آواز میں کہا: " ایک

بار پہلے ہی مصیبت میں پڑ چکی ہو۔"

" یہ بات نہیں ہے۔" اس نے سرگوشی میں جواب دیا۔" سکندر بہت اچھا آدمی ہے۔ وہ ہماری مدد کر سکتا ہے۔"

میں نے اس انداز سے غور نہیں کیا تھا۔ گویا وہ مصلحتاً سکندر سے دوستی کی پینگیں بڑھا رہی تھی اور یہ بات میرے لیے بہت اطمینان بخش تھی۔ اس کی چالاکی اور دانائی پر میں دل ہی دل میں داد دیئے بغیر نہیں رہ سکا۔ سکندر کو اس گروہ میں جو نمایاں اور ممتاز حیثیت حاصل تھی اس کا اندازہ راجی کی تجربہ کار نگاہوں نے لگا لیا تھا۔ وہ ایک پیشہ ور طوائف تھی جسے مردوں کی نفسیات کا اندازہ لگانے اور اُن کو بیوقوف بنا کر ان سے فائدہ حاصل کرنے کی تربیت خاص طور پر دی گئی تھی۔ میں دل ہی دل میں راجی کی اس ہوشمندی اور معاملہ فہمی پر اُس کو خراجِ تحسین پیش کرنے لگا۔

چند راہداریوں سے گزر کر ہم ایک لمبے سے وسیع کمرے میں داخل ہوئے جس میں آبنوس کی ایک لمبی سی میز بچھی ہوئی تھی۔ کھانے کی میز اور کرسیاں انتہائی قیمتی اور دیدہ زیب تھیں۔ چھت پر قیمتی فانوس لٹکے ہوئے تھے اور دیواروں پر بیش قیمت اور دلآویز مصوری کے شاہکار آویزاں تھے۔ دو باوردی ملازم ایک دروازے کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ میز پر کھانے کے برتن بھی انتہائی قیمتی اور خوبصورت تھے۔ میز کو انگریزوں کے انداز میں بہت نفاست اور خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ یہ کسی ڈاکو کے ڈائننگ ہال کے مقابلے میں کسی والیٔ ریاست کا ڈائننگ ہال نظر آ رہا تھا۔ ہمارے کمرے میں داخل ہوتے ہی سامنے والے دروازے سے باس نے اندر قدم رکھا۔ اس وقت وہ سفید قمیص اور سیاہ پتلون میں ملبوس تھا۔ گلے میں ایک سیاہ بوٹائی بندھی ہوئی تھی۔ وہ سرتاپا ایک مغربی ارسٹوکریٹ کا تاثر پیش کر رہا تھا۔ اس کی بارعب اور مرعوب کن شخصیت کچھ اور زیادہ بااثر ہو گئی تھی۔ ہم لوگوں کو دیکھ کر وہ مسکرایا اور ہاتھ اُٹھا کر ہمیں خوش آمدید کہا۔ اس نے میز کے مرکزی حصے میں جگہ سنبھالی جو غالباً اسی کے لیے مخصوص تھی۔ ہم لوگ بھی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اس اثناء میں سکندر بھی کمرے میں داخل ہو چکا تھا اور ہمارے مقابل والی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ کسی مزید بات چیت کے بغیر کھانا شروع ہو گیا۔ تربیت یافتہ اور تیز دار بیروں نے بڑے سلیقے اور خوش اسلوبی سے پہلے سوپ اور پھر مختلف کھانوں سے ہماری تواضع کی یہاں تک کہ کافی کا دَور شروع ہو گیا۔ ایک بیرے نے سائڈ ٹیبل سے سگار کا ڈبہ نکال کر باس کو پیش کیا۔ جس نے ایک موٹا سا قیمتی سگار انتخاب کر کے منہ سے لگایا تو دوسرے بیرے نے میز پر رکھے ہوئے سنہری لائیٹر سے آگ دی اور کمرے میں سگار کی خوشبو پھیل گئی۔ باس کے اشارے پر ملازم کمرے سے رخصت ہو گئے تو اُس نے پہلی بار اپنی زبان کھولی۔" مجھے امید ہے مہمانوں کو کھانا پسند آیا ہو گا۔"

وہ رضیہ کی جانب مخاطب تھا۔ رضیہ نے موزوں الفاظ میں اس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ کہنے لگا۔" میں ملازموں کو اپنے ساتھ میز پر بیٹھا کر کھانا کھلانے کا عادی نہیں ہوں مگر کیونکہ آپ سب میرے مہمان ہیں اس لیے اس اصول کو فراموش کر دیا گیا ہے۔ یہ بتایئے کہ آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہے ؟" اس کی آواز میں ٹھہراؤ اور بھاری پن تھا لیکن یہ ایک تعلیم یافتہ اور مہذب انسان کی آواز تھی۔ اس کا لہجہ بھی انتہائی شائستہ اور پُرتکلف تھا۔

یکایک وہ بولا:" کھانے کے بعد آج رات ہم راجی کا ڈانس دیکھیں گے۔"

ہم سب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بدستور مسکرا رہا تھا:" میں نے ان کی بہت تعریف

سُنی ہے۔ کیوں نا سکندر؟"

سکندر نے چونک کر اس کی جانب دیکھا اور اثبات میں سر کو جنبش دیکر نظریں جھکا لیں۔ باس کی نگاہیں راجی پر جمی ہوئی تھیں۔ " اس میں کوئی زبردستی یا مجبوری نہیں ہے۔ اگر تم نہ چاہو تو یہ پروگرام ملتوی ہو سکتا ہے۔ اور ہاں۔ یہ نہ سمجھنا کہ تمہیں اس کا مناسب معاوضہ نہیں ملے گا۔ ہم آرٹسٹوں کی قدر کرتے ہیں۔"

راجی کچھ جھجکتے ہوئے بولی۔" اگر آپ کو ناگوار نہ ہو تو یہ پروگرام کل کے لیے رکھ لیں۔ دراصل آج میں بہت زیادہ تھکی ہوئی ہوں۔"

باس نے راجی کو دیکھا اور مسکرانے لگا۔" واقعی۔ یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔" یہ کہکر وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔" اچھا۔ پھر ملاقات ہو گی۔" یہ کہہ کر وہ جس طرح اچانک کمرے میں آیا تھا۔ اسی طرح رخصت ہو گیا۔

ہم لوگ ڈائننگ روم سے باہر نکلے تو بھاگاں ہماری منتظر تھی۔ سکندر نے بھی ہم سے رخصت لے لی اور بھاگاں ہماری راہنمائی کے لیے مہمان خانے تک ہمارے ساتھ آئی۔ اگرچہ راستے زیادہ پیچیدہ نہیں تھے۔ پھر بھی میں نے ذہنی طور پر اس راستے کو یاد کر لیا۔ ہم لوگ ڈرائنگ روم میں رُک کر بھاگاں کے جانے کا انتظار کرتے رہے۔ اس کے جاتے ہی راجی نے دونوں ہاتھ اوپر اُٹھا کر ایک قیامت خیز انگڑائی لی اور نیم خوابیدہ آواز میں بولی۔" میرا تو سارا بدن ٹوٹ رہا ہے۔ میں تو جا کر سوتی ہوں۔" اتنا کہا اور سامنے والے کمرے میں داخل ہو کر اندر سے دروازہ مقفل کر لیا۔ رضیہ کو راجی کا یہ رویہ پسند نہیں آیا تھا مگر میں نے فوراً پیش بندی کی۔" ٹھیک ہی تو ہے۔ شاید وہ علیحدگی میں سکون کی نیند سونا چاہتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب تم دونوں بھی اپنے کمرے میں جا کر سو جاؤ۔ فی الحال خطرے یا تشویش کی کوئی بات نہیں ہے۔"

رضیہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر پھر اُس نے اپنا ارادہ تبدیل کر دیا اور خاموشی سے لالی کے ساتھ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں نے صوفے پر بیٹھ کر حالات پر غور کرنا شروع کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان ڈاکوؤں کا طرزِ عمل بالکل نرالا تھا۔ اور میں انھیں سمجھنے سے قاصر رہا تھا۔ اس قدر مہذب اور شائستہ لوگ بھلا ڈاکو کیسے ہو سکتے ہیں!؟ لیکن یہ بھی ایک کھلی حقیقت تھی جس کا میں بذاتِ خود چشم دید گواہ تھا۔ باس دیکھنے میں انتہائی معقول اور شریف آدمی لگتا تھا۔ ہم لوگوں کے ساتھ اس کا برتاؤ اور رکھ رکھاؤ بھی بہت اچھا تھا۔ لیکن پھر بھی ایک نامعلوم سا خوف میرے دل و دماغ میں چھپا ہوا تھا۔ اس کی آواز کی مٹھاس نے مجھے اور زیادہ فکرمند کر دیا تھا۔ ابھی تک میں اس کے بارے میں یہ بھی نہیں جان سکا تھا کہ وہ کس قسم کی ذہنیت کا مالک ہے اور پھر یہ کہ وہ ہمارے بارے میں کیا سوچ رہا ہے اور آیا وہ ہمیں آسانی اور حفاظت سے جانے کی اجازت دے دیگا یا اس خوش اخلاقی کے پردے میں ہم کسی بڑے طوفان سے دوچار ہونے والے ہیں؟

میں کافی دیر سوچتا رہا۔ اس لیے اپنے کمرے میں جا کر سونے کی ناکام کوشش کرنا فضول تھا۔ چنانچہ میں نے موقعے سے فائدہ اُٹھا کر اردگرد کے ماحول کا جائزہ لینے کا فیصلہ کیا۔ ڈرائنگ روم کی ایک کے سوا باقی تمام روشنیاں بُجھانے کے بعد میں نے باہر برآمدے میں قدم رکھا تو خاموشی، تنہائی اور تاریکی کے علاوہ کچھ اور نہ پایا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس قدر وسیع علاقے میں نہ تو بظاہر کسی پہرے کا بندوبست تھا اور نہ ہی روشنی کا۔ حویلی اور مہمان خانے کے آس پاس کا تمام علاقہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے آہستگی سے اپنا قدم برآمدے سے باہر نکالا اور عمارت کی مخالف سمت میں بڑھا۔ یکایک یوں محسوس ہوا جیسے شور

قیامت ہو گیا ہو۔ تاریکی کے پردے میں سے ایک سیاہ رنگ کا قدآور کتا جو غالباً تاک لگا کر بیٹھا ہوا تھا ایک دم خوفناک آواز میں بھونکتا ہوا میری جانب لپکا۔ چند لمحے تو میں اندازہ ہی نہیں لگا سکا کہ یہ آفت کیا ہے۔ مگر پھر میں بے اختیار نہایت تیزی سے برآمدے کی طرف لپکا اور ایک ستون کی آڑ لے کر کھڑا ہو گیا۔ کتا جس طرح اچانک بھونکا تھا اس طرح ایک دم خاموش ہو کر ایک بار پھر تاریکی میں مدغم ہو گیا۔ غالباً اسے یہی تربیت دی گئی تھی کہ کسی کو برآمدے سے باہر نکلنے کی اجازت نہ دے اور اُس نے اپنا یہ فرض نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ سرانجام دیا تھا۔ ابھی میں اپنی سانس بھی درست نہ کرنے پایا تھا کہ ایک دھماکے کی آواز آئی اور تاریکی میں کوئی شخص ایک درخت پر سے کود کر برآمدے کی جانب بڑھا۔ وہ ایک تنومند آدمی تھا۔ اس کا لباس بھی سیاہی مائل تھا جس کی وجہ سے وہ تاریکی ہی کا ایک حصہ بن گیا تھا۔ میں نے سانس روک لی اور خود کو موٹے ستون کے پیچھے سمیٹ لیا۔ وہ شخص آگے بڑھ کر برآمدے کے نزدیک آیا تو میں نے اس کے ہاتھ میں سٹین گن بھی دیکھ لی۔ چند لمحے رُک کر وہ چاروں طرف کا جائزہ لیتا رہا اور پھر اُسی خاموشی سے واپس لوٹ گیا اور تاریکی کے دامن میں چھپ گیا۔ میں نے کچھ دیر انتظار کیا اور پھر دبے پاؤں مہمان خانے کے برآمدے سے گزر کر بڑی عمارت کی جانب بڑھا۔ مجھے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ میری حد حویلی اور مہمان خانے کی عمارت تک ہی ہے۔ اگر اس کے آگے قدم بڑھاؤں گا تو محافظوں کی نظر میں آ جاؤں گا۔ عمارت کے اندر بھی روشنی برائے نام ہی تھی اور باہر بھی ہر طرف تاریکی کا راج تھا اس لیے مجھے عمارت کے بڑے ہال کمرے تک پہنچنے میں کوئی دُشواری پیش نہیں آئی۔ عمارت کی بیشتر روشنیاں بُجھا دی گئی تھیں اور ہر طرف نیم تاریکی پھیلی ہوئی تھی جو میرے مشن کے لیے بیحد کارآمد تھی۔ تعجب انگیز بات یہ تھی کہ کتے کے بھونکنے کی آواز پر سوائے ایک شخص کے کسی اور جانب سے کسی نے نوٹس لینے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ غالباً یہ لوگ اپنے حفاظتی انتظامات کے بارے میں ضرورت سے زیادہ پُراعتماد تھے۔ یا بے پرواہ۔

بڑے ہال میں حسبِ توقع کوئی نہیں تھا۔ میں نے آہٹ یا آواز سننے کی کوشش کی اور پھر دبے پاؤں سیڑھیوں سے گزر کر بالائی عمارت میں پہنچ گیا۔ دونوں جانب بل کھاتی ہوئی راہداریاں تھیں۔ میرے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ کس سمت میں قدم بڑھاؤں لیکن پھر خود بخود میری یہ مشکل آسان ہو گئی۔ بائیں جانب سے مجھے ہلکی سی بھن بھناہٹ سنائی دی تو میں اسی جانب چل پڑا۔ چند قدم آگے جانے کے بعد مجھے مدھم آوازیں سنائی دینے لگیں۔ یہ ایک مرد اور عورت کی آوازیں تھیں۔ پھر عورت کے ہنسنے کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ اس راہداری میں چار کمروں کے دروازے تھے اور سبھی بند تھے۔ ہر دروازے کے نزدیک جا کر میں نے کان لگا کر سُنا اور پھر آخری دروازے پر پہنچ کر رُک گیا۔ آوازیں اسی کمرے سے آ رہی تھیں۔ پھر مجھے آوازوں کا ذریعہ بھی نظر آ گیا۔ ہر دروازے سے کچھ فاصلے پر روشندان بنے ہوئے تھے۔ اس کمرے کے روشندان کی دَرز سے روشنی کی پتلی سی لکیر چھَن کر باہر آ رہی تھی اور آوازیں بھی اسی ذریعے سے باہر سنائی دے رہی تھی۔

میں نے جستجو اور تلاش کے جوش میں برآمدے کے ستونوں پر پیر رکھ کر اپنا سر اونچا کیا۔ اگرچہ یہ ایک تکلیف دہ امر تھا لیکن اندر کا نظارہ دیکھنے کے لیے اس کے سوا کوئی اور طریقہ بھی نہیں تھا اور میں ہر قیمت میں ان پُراسرار آوازوں کی حقیقت جاننے کا خواہش مند تھا۔ میں نے کان لگا کر سُنا۔ ایک مرد کے بولنے کی آواز سنائی تو دے رہی تھی لیکن واضح نہیں تھی پھر ایک زنانہ ہنسی کی آواز سنائی دی جو

اگرچہ بہت دھیمی تھی۔ اس کے باوجود میرے کانوں میں گھنٹیاں سی بجنی شروع ہوگئیں۔ میں اس آواز سے اچھی طرح مانوس تھا۔ میرے ہاتھ پیروں میں لرزش پیدا ہوگئی تھی لیکن میں نے کانپتے ہوئے پیروں کو ستون پر جما کر بے تابی اور اشتیاق کے عالم میں سر اونچا اٹھایا اور تمام حسیات سمٹ کر میری آنکھوں میں پہنچ گئیں اور پھر میری آنکھوں نے وہ منظر دیکھا جس نے مجھے سرتاپا جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ایک بے حد خوبصورتی سے سجے ہوئے بیڈ روم میں جس کی دیواروں' قالین اور پردوں تک ہر چیز کا رنگ گلابی تھا' گلابی نائٹی میں ملبوس ایک عورت بستر پر نیم دراز شخص پر جھکی ہوئی اس کا سگار سُلگا رہی تھی۔ میں عورت کا چہرہ نہ دیکھنے کے باوجود اُسے پہچان گیا تھا۔ اور مجھے اپنے جذبات پر قابو پانے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ پھر میں چھپکلی کی طرح دیوار سے چپکا ہوا کمرے کے اندر جھانک رہا تھا۔ عورت ابھی تک ہنس رہی تھی اور پھر جب اُس نے اپنا چہرہ اُوپر اُٹھایا تو میرے خیال کی تصدیق ہوگئی۔ یہی وہ چہرہ تھا جس کے باعث میری زندگی میں انقلاب عظیم برپا ہوا تھا جس کی وجہ سے میں اپنا پُرسکون گھر اور پُر آسائش زندگی چھوڑ کر ایک مفرور کی طرح زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوگیا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے روزی کھڑی تھی۔

بیڈ پر نیم دراز باس اب اُٹھ کر بیٹھ گیا تھا اور اپنی بھاری مگر مدھم آواز میں روزی سے مخاطب تھا مگر میرے کانوں میں سیٹیوں کے سوا کوئی اور آواز نہیں تھی۔ میرے تمام جسم کا خون سمٹ کر آنکھوں میں آگیا تھا۔ پہلے ہر چیز خون کی طرح سُرخ ہوگئی اور پھر نگاہوں کے سامنے اندھیرا سا پھیل گیا۔ دیوار اور ستون پر میری گرفت کمزور پڑ گئی اور میں آہستہ آہستہ نیچے کی جانب پھسلنے لگا۔ میری سانس میرے سینے میں نہیں سما رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے دَم گھُٹ جائے گا۔ کسی کوشش کے بغیر میرے پیر فرش تک پہنچ گئے۔ میں نے دیوار کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور اُس سے سَر ٹیک کر کھڑا ہوگیا۔ یہ دیوار میرے لیے دیوارِ گریہ بن گئی تھی۔

اچانک میرے کاندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا۔ پہلے تو میں اس کے احساس سے بے خبر رہا مگر پھر جب ہاتھ کا دباؤ بڑھا اور مجھے ایک آہنی گرفت کا احساس ہوا تو میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے پھیلی ہوئی سُرخ دھند کو جھٹک کر دیکھنے کی کوشش کی۔ پہلے ایک ہیولا سا میری نگاہوں کے سامنے نظر آیا پھر آہستہ آہستہ اُس نے ایک قدآور اور تنومند انسان کا رُوپ اختیار کر لیا۔ میرے پیچھے ایک مسلح محافظ کھڑا خون مار نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ زبان سے کوئی آواز نکالتا میری کھوئی ہوئی طاقتیں یک لخت بحال ہوگئیں۔ میرے ذہن نے مجھے اطلاع دی کہ اگر کوئی فوری تدبیر نہ کی گئی تو بہت دیر ہو جائے گی۔ اور پھر نجات کی کوئی راہ میرے لیے کھُلی نہیں رہے گی۔ وہ خونخوار نظروں سے مجھے گھور رہا تھا مگر شاید میری خود فراموشی کی کیفیت نے اُسے قدرے حیران کر دیا تھا۔ اس کی یہی کمزوری میرے لیے کارآمد ثابت ہوئی۔ اُس نے اپنا منہ کھولا مگر کوئی آواز پیدا ہونے سے پہلے میرا دایاں ہاتھ بجلی کی طرح کوندا اور اس کی گردن پر تلوار کی مانند جا گرا۔ اس کی سُرخ آنکھوں میں حیرت کے تاثرات نمودار ہوئے۔ عام حالات میں یہ ایک ضرب ہی بہت کافی تھی لیکن اب میں پوری طرح ہوشیار ہو چکا تھا اور ذرا سا بھی خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میرے دونوں ہاتھ ایک بار پھر بُلند ہوئے اور آہنی ہتھوڑوں کی طرح اُس کی کنپٹیوں سے ٹکرائے۔ اپنے منہ سے کوئی آواز نکالے بغیر وہ کٹے ہوئے درخت کی مانند زمین پر گرنے لگا۔ مجھے احساس تھا کہ اس کے بھاری بھرکم جسم کے فرش پر گرنے سے جو دھماکہ ہوگا وہ اس سناٹے میں ساری عمارت کو جھنجھوڑنے کے لیے کافی ہوگا۔ اس لیے زمین پر گرنے سے پہلے میں نے اسے دونوں ہاتھوں میں سنبھال

کر بڑی آہستگی سے زمین پر لٹا دیا۔ میں نے چوکنا ہو کر چاروں طرف نظر ڈالی۔ اُس کے سوا دُور دُور تک کوئی اور شخص موجود نہیں تھا۔ جلدی جلدی میں نے اُس کی تلاشی لی اور ایک پستول برآمد کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ دو تین گھنٹے سے پہلے ہوش میں نہیں آ سکتا تھا لیکن وہ بہت نزدیک سے مجھے دیکھ چکا تھا اور موقع پڑنے پر بڑی آسانی سے مجھے پہچان سکتا تھا۔ اس لحاظ سے اس کا ہوش میں آنا میرے ہی نہیں ہم سب کے لیے انتہائی نقصان دہ اور خطرناک تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہماری موت کا پیغام ثابت ہو سکتا تھا۔ ان حالات میں اسے موت کے گھاٹ اُتارے بغیر اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ ایک بے ہوش اور بے بس انسان کو جان سے مارنا مجھے کسی طرح بھی گوارا نہیں ہوتا لیکن حالات کا تقاضا یہی تھا میں نے اپنے دل پر جبر کر کے دونوں ہاتھ اُس کے گلے کی طرف بڑھائے لیکن مجھے اس کا گلا گھونٹنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ کیونکہ میری بھرپور ضربوں نے پہلے ہی اُسے زندگی سے بیگانہ کر دیا تھا۔ میں نے ایک بار پھر سر اُٹھا کر چاروں طرف کا جائزہ لیا اور پھر اُس کے بے جان جسم کو اُٹھا کر راہداری کے ایک نسبتاً زیادہ تاریک گوشے میں ڈال دیا۔ پستول ہاتھ میں تھامنے کے بعد میرے اعصاب اور دل و دماغ میں ایک نئی زندگی اور ولولہ پیدا ہو گیا تھا۔ دل تو کہتا تھا کہ کمرے کا دروازہ توڑ کر اندر گھس جاؤں اور اُس بے وفا عورت کو گولیوں سے چھلنی کر دوں۔ مگر پھر یہ احساس مانع ہوا کہ یہ میرے مسائل کا حل نہیں تھا بلکہ اُس کو جان سے مار کر میں زیادہ بڑی مشکل میں گرفتار ہو سکتا تھا لیکن اُس سے میری نفرت اتنی شدید تھی کہ اُس کا چہرہ دیکھنے کے بعد میرے لیے اس کو نیست و نابود کر دینے کی خواہش پر قابو پانا ممکن نہیں رہا تھا۔ میرے تمام مصائب اور آلام کا سبب یہی بے وفا اور آوارہ عورت تھی۔ میں اُس سے پہلے اُس کے مختلف رُوپ دیکھ چکا تھا لیکن آج اُس کا ایک انوکھا اور نیا رُوپ دیکھ رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اُس نے مجھ سے بے وفائی کی تھی لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ وہ جانی کے ساتھ بھی وفادار نہیں تھی اور اس کی ساری وفائیں اور محبتیں میرے منافق دوست شوکت کے لیے وقف تھیں مگر آج وہ مجھے ایک تیسرے شخص کے شبستان میں ناز و ادا کا مظاہرہ کرتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ آخر اُس بظاہر خوبصورت اور بھولی بھالی عورت کے اور کتنے روپ ہیں؟ اور وہ اپنی بے وفائی کے زہر سے اور کس کس کو ڈس چکی ہے؟ یہ فیصلہ کرنا میرے لیے دشوار تھا۔ میرے جسم کا تمام لہو سمٹ کر میرے دماغ اور آنکھوں میں آ گیا تھا۔ میرا خون کھول رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے میں سرتاپا آگ کے شعلوں میں جل رہا ہوں۔ خدایا مجھے کن گناہوں کی سزا مل رہی ہے۔ اور یہ ناگن آخر کہاں کہاں تک میرا پیچھا کرے گی؟

فی الفور اُس کا سر کچل دینے کی خواہش نے مجھے بے چین اور بے قرار کر دیا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میرے قدم اُس دروازے کی طرف اُٹھنے کے لیے بے تاب تھے جس کے پیچھے وہ ناگن کسی اور انسان کو ڈسنے کے لیے موجود تھی اور اُس کو اپنی حسین اداؤں اور جسمانی رعنائیوں سے شکار کر رہی تھی۔

میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ روزی کا اُس گروہ کے باس سے کیا رشتہ ہو سکتا ہے؟ اور یہ کہ وہ دونوں کب سے ایک دوسرے کے واقف ہیں اور ان کے سامنے مشترک مقصد کیا ہو سکتا ہے؟ کیونکہ یہ سوچنا کہ روزی کسی مطلب یا لالچ کے بغیر کسی سے پینگیں بڑھا سکتی ہے ناقابلِ یقین تھا۔

شاید میں تمام احتیاط اور حفاظتی تدابیر کو فراموش کر کے اس کمرے میں گھس جاتا جہاں روزی اپنے حسن کا جادو جگا رہی تھی اور بعد میں اُس کے نتائج بھگتتا رہتا۔ لیکن میرے کانوں نے ایک آواز سُنی اور میری تمام تر توجہ اُس آہٹ کی جانب مبذول ہو گئی۔ کان لگا کر سُنا تو معلوم ہوا کہ وہ بھاری قدموں کی آوازیں تھیں اور

یہ بھی طے تھا کہ وہ ایک سے زیادہ آدمیوں کے قدموں کی آہٹ تھی۔ گزشتہ مختصر عرصہ میں میں جن مراحل سے دوچار ہو چکا تھا اُس کے پیشِ نظر میرے لیے اپنی حفاظت کا بندوبست کرنا بے حد ضروری تھا۔ سوال یہ ہے کہ اُس وقت میں عمارت کی دوسری منزل کی ایک راہداری کے بالکل آخری سرے پر تھا۔ جو لوگ اس طرف آ رہے تھے وہ ان سیڑھیوں سے گزر کر ہی آ رہے تھے جن کے علاوہ نیچے جانے کا کوئی اور راستہ موجود نہ تھا۔ یہ درست ہے کہ میرے پاس ایک بھرا ہوا پستول تھا لیکن اُس کے استعمال کا مطلب یقینی تباہی اور موت تھا۔ اگرچہ سامنے لوگ نظر نہیں آ رہے تھے لیکن اس میں شُبہ کی کوئی گنجائش نہ تھی کہ یہ جگہ مسلح افراد سے بھری ہوئی تھی۔ جن سے مقابلہ کرنا ایک دو آدمیوں کے بس میں نہیں تھا۔ آوازیں نزدیک تر آ رہی تھیں اور اب میں سیڑھیوں پر آنے والوں کے قدموں کی دھمک بھی سُن رہا تھا۔ اب واضح طور پر میں بتا سکتا تھا کہ یہ کم سے کم تین افراد تھے جو ظاہر ہے کہ پوری طرح مسلح بھی ہوں گے۔

میں نے بے تابی سے چاروں طرف کا جائزہ لیا اور پھر راہداری کے بالکل آخر میں واقع بالکونی کی طرف لپکا۔ بالکونی کی مختصر سی چار دیواری سے کود کر میں چھجے پر پہنچ گیا جو دو فٹ سے زیادہ چوڑا نہیں تھا۔ اس چھجے پر چھپنا مشکل تھا۔ نہ ہی میں اُس پر بھاگ سکتا تھا۔ اُس لیے میں چھجے سے لٹک کر نیچے والی راہداری میں پہنچ گیا۔ فرش پر میرے پیروں کے لگنے سے مدھم سی آواز ضرور پیدا ہوئی لیکن آس پاس کے لوگوں نے یہ آواز نہیں سُنی ہو گی۔

یہ راہداری بھی سنسان تھی اور قریب قریب تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی لیکن یکایک راہداری کی تمام بتیاں جل اُٹھیں۔ غالباً ان کا سوئچ کسی اور جگہ پر تھا۔ روشنی سے راہداری جگمگا اٹھی تھی۔ اُس کے ساتھ ہی بھاری قدموں کی آہٹ سُنائی دینے لگی۔ خدا جانے اچانک حویلی میں یہ نقل و حرکت کیوں شروع ہو گئی تھی۔ حالانکہ کچھ دیر پہلے ہر طرف خاموشی اور سناٹا چھایا ہوا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے یہاں کوئی رہتا ہی نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے یہ سب میری حماقت کا نتیجہ ہو اور میں نے برآمدے سے باہر میدان میں قدم رکھ کر اُن سب کو چوکنا اور باخبر کر دیا ہو؟ یا پھر انھوں نے حویلی میں آمد و رفت رکھنے والوں کو دیکھنے کے لیے کسی جگہ کوئی پوشیدہ اور خفیہ سسٹم لگا رکھا ہو؟

آوازیں نزدیک آ گئیں۔ یوں لگتا تھا جیسے برآمدے میں سے کسی بھی لمحے وہ لوگ راہداری میں وارد ہو جائیں گے۔ میں نے گھبراہٹ میں آگے پیچھے دیکھا اور پھر بدحواس ہو کر پاس والے کمرے کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ یہ دروازہ مقفل تھا۔ دوسرا دروازہ بھی اندر کی جانب سے بند تھا اور اسے کھٹکھٹانا اپنی موت کو دعوت دینے کے برابر تھا۔ مایوس ہو کر میں نے تیسرے دروازے کو دھکیلا اور خوش قسمتی سے وہ ہلکے سے دھکے سے کھل گیا۔ میں نے فوراً اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا اور احتیاط کے طور پر اندر سے کھٹکا بھی لگا لیا۔ مطمئن ہو کر میں نے پلٹ کر کمرے کی جانب رُخ کیا اور اپنی جگہ ٹھٹک کر رہ گیا۔

کمرے میں نیم تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اُس کے باوجود میں کچھ فاصلے پر بچھے ہوئے بیڈ پر سے ایک انسانی ہیولے کو بلند ہوتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ میرے پاس اتنی مہلت نہ تھی کہ اس کی شناخت کرتا۔ نہ میں اُسے روشنی جلانے کا موقع دے سکتا تھا۔ پھر یہ بھی ممکن تھا کہ وہ مسلح ہو اور سرہانے رکھا ہوا پستول اُٹھا کر مجھے گولیوں سے بھون کر رکھ دے۔ یہ تمام خیالات بجلی کی طرح میرے ذہن میں کوند گئے۔ میں نے ہوا میں جست لگائی اور اُس ہیولے پر جا گرا۔ میں نے اُسے پوری طرح اٹھ کر بیٹھنے کا موقع بھی نہیں دیا تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ نیند کے خمار سے ہوشیار ہو کر صورتِ حال کا اندازہ لگاتا میں نے اسے چھاپ لیا اور دوسرے ہی لمحے وہ میری گرفت میں تھا۔ میرا ایک ہاتھ اس کے جسم کے گرد آہنی زنجیر کی طرح شکنجہ بنا ہوا تھا اور دوسرے ہاتھ سے میں نے اس کا منہ دبا رکھا تھا تاکہ اس کے منہ سے نکلنے والی آواز باہر راہداری سے گزرنے والوں کو اپنی طرف متوجہ نہ کرے۔ میری گرفت بڑی مضبوط تھی۔ جواب میں وہ جسم کسمسایا، تھوڑی سی جدوجہد بھی کی لیکن مجھے جس شدید مزاحمت کی توقع تھی اس کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ پھر اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے کسی نرم اور ملائم مخملیں شئے کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ اس جسم کی حرارت اور گداز نے مجھے حیرت زدہ کر دیا تھا اور دوسرے ہی لمحے مجھے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ میرے حملے کا نشانہ بننے والا کوئی مرد نہیں بلکہ عورت تھی اور وہ بھی ایک صحت مند، جاندار اور گداز جسم عورت۔ میری گرفت خود بخود ہلکی پڑ گئی۔ اُس نے موقعے سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ایک جھٹکا مارا اور مچھلی کی طرح میری گرفت سے پھسل کر نکل گئی۔ اس کا رُخ دروازے کی جانب تھا۔ شکر ہے کہ پریشانی اور بوکھلاہٹ کے عالم میں اُس کے منہ سے کوئی چیخ نہیں نکلی لیکن میں ذرا سا بھی چانس نہیں لینا چاہتا تھا۔ اس کے دروازے تک پہنچنے سے پہلے میں نے لپک کر اسے دبوچ لیا۔ اس بار اگرچہ میری گرفت بہت زیادہ شدید نہیں تھی۔ لیکن اتنی ضرور تھی کہ وہ میرے قابو سے نہیں نکل سکتی تھی۔ دوسرے ہاتھ سے میں نے دوبارہ اُس کا منہ دبا لیا تھا اور اُسے بے دست و پا کرنے کے بعد کان لگا کر غور سے باہر کی آوازیں سُن رہا تھا۔ بھاری قدموں کی آوازوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ تین چار مرد تھے اور بہت جلدی اور پریشانی میں معلوم ہوتے تھے۔ ان کے قدموں کی آہٹ اُن کی بے چینی اور اضطراب کا مظہر تھی۔ وہ تیزی سے کمرے کے سامنے سے گزر کر چلے گئے۔ اُن کا رُخ غالباً بالائی منزل کی جانب تھا۔ قدموں کی آہٹ ہلکی پڑی تو میں نے اپنا چہرہ اُس کے نزدیک لے جا کر سرگوشی کی: "اگر ذرا سی بھی آواز نکالی تو جان سے مار دوں گا۔ اگر تمہیں زندگی پیاری ہے تو بالکل خاموش اور پُرسکون رہو۔"

اس نے سر کی جنبش سے مجھے بتا دیا تھا کہ وہ میری ہدایات پر پوری طرح عمل کرے گی۔ اس کا جسم اب ساکت تھا اور وہ مزید جدوجہد یا زور آزمائی کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھی۔ اس لیے میں نے پہلے اس کے منہ سے اور پھر جسم پر سے اپنی گرفت ڈھیلی کر دی اور اُسے آزاد کر دیا لیکن میں اس کی طرف سے کسی کشمکش کی صورت میں فوری طور پر دوبارہ اُسے بے دست و پا کرنے کے لیے بالکل تیار تھا۔

اس نے بکھرے ہوئے سانسوں کو سنبھالتے ہوئے سر آگے بڑھا کر مجھے دیکھنے کی کوشش کی اور دھیمی آواز میں پوچھا: "کون ہو تم؟ اس وقت یہاں کیوں آئے ہو؟"

یہ آواز مجھے مانوس سی لگی اور غور سے دیکھنے پر میں نے بھاگاں کو پہچان لیا۔ شاید وہ بھی مجھے پہچان گئی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ اب مجھ سے خوفزدہ نہیں ہے۔

"بھاگاں!" میں نے آہستہ سے پوچھا: "پہچانا مجھے؟"

"پہچان لیا۔" وہ اپنے بکھرے ہوئے بالوں کو جھٹک کر بولی: "مگر ملاقات کے لیے ہی آنا تھا تو یوں چوروں کی طرح آنے کی کیا ضرورت تھی؟ مجھے بتا دیا ہوتا میں خود ہی تمہارے پاس چلی آتی۔ ہمارا تو کام ہی سرکار کے مہمانوں کو خوش رکھنا ہے۔"

بھاگاں نے مجھے ایک معقول بہانہ فراہم کر دیا تھا۔ وہ یہ سمجھ رہی تھی کہ وہ شاید اس سے ملنے کی خاطر بطورِ خاص تمام خطرات مول لے کر اتنی رات گئے آیا ہے۔ اس کا یہ گمان وقتی طور پر میرے تحفظ کی ضمانت بن

سکتا تھا۔

"مجھے کیا پتہ تھا کہ یہاں اتنی گڑبڑ ہو جائے گی۔" میں نے اپنی گرفت کچھ اور ڈھیلی کرتے ہوئے کہا۔

"کیسی گڑبڑ؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"میں جب حویلی میں آیا تو ہر طرف سناٹا تھا۔ چاروں طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ ایک دم ساری روشنیاں جل گئیں۔ ہر طرف جاگ ہو گئی۔ بہت سے لوگ اِدھر سے اُدھر بھاگنے لگے۔ میں تو گھبرا ہی گیا۔ مجھے یہ خیال ہوا کہ کہیں یہ لوگ کسی غلط فہمی میں مجھے پکڑ ہی نہ لیں۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ قدرے مطمئن ہو کر بولی: "مگر میرے ساتھ زور آزمائی کرنے کی کیا ضرورت تھی بھلا؟"

"میں تو بوکھلا گیا تھا۔" میں نے بات بنائی: "یہ سب کچھ میرے لیے نیا ہے۔ اجنبی لوگ ہیں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ بستر پر کون ہے۔ میں سمجھا کوئی اور ہی نہ ہو۔"

بھاگاں کو میری بات کا یقین آ گیا۔ بلکہ دیکھا جائے تو وہ میرے یوں اچانک آ جانے سے بہت خوش تھی۔ فرطِ مسرت میں وہ مجھ سے یہ دریافت کرنا بھی بھول گئی تھی کہ اُس کے کمرے کا پتہ نشان مجھے کس نے بتایا تھا۔ وہ بالکل مطمئن ہو چکی تھی۔ ہاتھ بڑھا کر اُس نے دیوار میں لگا ہوا بجلی کا سوئچ دبا دیا اور سارے کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ میری آنکھیں جھپک گئیں اور میں نے بے اختیار ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔

"منہ کیوں چھپانے لگے؟" وہ شوخی سے مسکرائی۔

میں نے آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹا کر دیکھا۔ وہ بڑی بے تکلفی سے مسکرا رہی تھی۔ میں نے اب روشنی میں کمرے کا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ وہ درمیانے سائز — کا معمولی سا کمرہ تھا۔ سجاوٹ بہت زیادہ نہیں تھی لیکن پھر بھی ضرورت کی تمام چیزیں موجود تھیں۔ وہ کمرہ ایک ملازمہ کی حیثیت سے بڑھ کر لگ رہا تھا۔

باہر سے گڑبڑ اور بھاگ دوڑ کی آوازیں اب زیادہ نمایاں ہو گئی تھیں۔ "یہ کون لوگ ہیں اور اتنی رات گئے کیا کرتے پھر رہے ہیں؟" میں نے بھاگاں سے دریافت کیا۔

"تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے اطمینان سے بیڈ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا: "یہاں تو یہ سب ہوتا ہی رہتا ہے۔"

میں نے کہا: "وہ تو ٹھیک ہے لیکن اگر کسی نے مجھے اس کمرے میں دیکھ لیا تو کیا ہو گا؟"

"آسمان نہیں گر پڑے گا۔" وہ مسکرا کر بولی: "میں نے بتایا تو ہے کہ مہمانوں کی خدمت چاکری کے لیے ہی تو ہمیں رکھا گیا ہے۔ اب تم آرام سے آکر اِدھر بیٹھو۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ مگر میرا دھیان کسی اور طرف تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اوپر کی منزل پر ایک محافظ کی لاش پڑی ہوئی تھی اور میں اپنے کمرے سے نہ صرف غائب تھا بلکہ جائے واردات سے نزدیک بھی تھا مگر بھاگاں

ان تمام تفکرات سے آزاد تھی۔ مجھے اپنے کمرے میں پا کر وہ خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھی۔ اس کی نگاہوں میں اپنے لیے پسندیدگی کے جذبات میں نے اسی وقت دیکھ لیے تھے جب وہ مجھے نئے جوڑے دینے کے لیے میرے کمرے میں آئی تھی۔ اس کی نظروں کا پیغام بہت واضح تھا مگر میں نے اس وقت جان بوجھ کر اسے نظر انداز کر دیا تھا لیکن اب بات کچھ اور تھی۔ میں نے پہلی ہی ملاقات میں اس کی بے باک اور آزاد فطرت کا اندازہ لگا لیا تھا اور یہ بھی واضح تھا کہ اُس نے مجھے پسند کر لیا تھا۔ بقول اس کے وہ حویلی میں "بڑے سرکار" کے مہمانوں کی خدمت کے لیے رکھی گئی تھی اور ویسے بھی ایک بھرپور عورت تھی

اور کسی دنیاوی تکلف اور رسم و رواج کی پابند نہیں معلوم ہوتی تھی۔ اس کی یہ بے دھڑک فطرت ہی اس نازک موقعے پر میرے لیے راہِ نجات بن گئی تھی اور میں ایک مشکل صورتِ حال سے دوچار ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" اس نے بڑے اطمینان سے بیڈ پر بیٹھ کر دریافت کیا۔

"یوسف۔ مگر....."

"سنو یوسف جی۔ تم نے بڑی مہربانی کی ہے جو بھاگاں سے ملنے چلے آئے ہو۔"

"مگر بھاگاں....." میں باہر کی آوازوں سے خائف تھا۔

"فکر نہ کرو۔ میرے جیتے جی تم کسی مشکل میں نہیں پھنسو گے بابو۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر وہاں باہر....."

"باہر والوں کو دفع کرو۔ یہاں تو یہی کچھ ہوتا رہتا ہے۔ رات دن طرح طرح کے تماشے چلتے رہتے ہیں تم بلاوجہ کیوں پریشان ہو رہے ہو۔"

"بھاگاں۔ میں اس جگہ بالکل نیا ہوں۔ مجھے یہاں کے قاعدوں کا کچھ پتہ نہیں ہے اس لیے پریشانی ہو رہی ہے۔ تم میرے لیے ایک کام کر سکتی ہو؟"

"تم حکم تو کرو۔" وہ سینہ ٹھونک کر بولی۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم ذرا باہر جا کر دیکھو کہ وہاں کیا ہو رہا ہے اور پھر مجھے آکر بتاؤ۔ ورنہ میری پریشانی کم نہیں ہو گی۔"

"دیکھنے میں تو بڑے جی دار لگتے ہو مگر بہت چھوٹے دل کے بندے ہو۔" اس نے ناک سکوڑی "اچھا ٹھہرو۔ میں باہر جا کر خبر لاتی ہوں ورنہ تم اسی جھنجھٹ میں پھنسے رہو گے۔"

یہ کہہ کر وہ دروازے سے باہر نکل گئی۔ میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ کمرے کی روشنی بجھا کر جائے مگر وہ ایک بے چین روح کی مانند تیزی سے باہر نکل گئی تھی۔ میں نے دروازے کے نزدیک جا کر کان لگائے اور باہر کی آوازیں سننے لگا۔ مگر اب وہاں خاموشی تھی جو میرے لیے کسی متوقع خطرے کا پیش خیمہ بن سکتی تھی۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ یوں لگا جیسے کلیجہ باہر آجائے گا۔ موقعہ کی نزاکت اور سنگینی کا مجھے پورا پورا احساس تھا۔ ایک طرف مجھے روزی کی فکر تھی۔ اوپر کے ایک کمرے میں وہ دشمنِ جاں موجود تھی۔ جس کی زندگی کا واحد مقصد مجھے صفحۂ ہستی سے مٹا دینا تھا۔ دوسری طرف اسی منزل پر ایک محافظ کی لاش تھی جو زیادہ دیر تک پنہاں نہیں رہ سکتی تھی۔ چاروں طرف سے میں ڈاکوؤں کے نرغے میں تھا جن کی نظروں میں انسانی زندگی کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ ان سنگین حالات کے پیشِ نظر کسی لمحہ بھی میں کسی مشکل میں پڑ سکتا تھا۔ میری زندگی تو خطرے میں تھی ہی مگر میری ذرا سی کوتاہی اُن تین بے گناہ عورتوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار سکتی تھی جن کی حفاظت کے لیے میں خود کو ذمّہ دار سمجھتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں ایک چوہے دان میں پھنس چکا ہوں۔ خدایا! میں نے سوچا کیا میں یوں ہی بے نیل و مرام دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا! کیا میری بے وفا بیوی اور فریبی دوست سے میں انتقام لیے بغیر ہی مر جاؤں گا؟ یہ میری ذاتی انا اور ذہنی تسکین کا مسئلہ تھا۔ اپنے خلاف سازشیں کرنے والوں کو کیفرِ کردار تک پہنچائے بغیر میں دنیا سے رخصت نہیں ہونا چاہتا تھا۔ لیکن تمام انسانی خواہشات اور آرزوئیں پوری کہاں ہوتی ہیں؟ غالباً میرے ساتھ بھی یہی صورتِ حال پیش آنے والی تھی۔

یکایک کمرے کا دروازہ کھلا اور میں چونک پڑا۔ بھاگاں کمرے میں داخل ہوئی تو اس کی سانس بے ترتیب تھی اور وہ قدرے گھبرائی ہوئی بھی تھی۔ معلوم ہوتا تھا وہ تیز دوڑتی ہوئی آئی ہے۔

"غضب ہو گیا یوسف بابو۔" اس نے پھولی ہوئی سانسوں کو قابو میں کرتے ہوئے کہا: "اپنے جمالے کو کسی نے مار دیا ہے۔"

"جمالے کو؟ کون جمالا؟" میں نے سوال کیا۔

"بڑے سرکار کا لاڈلا ملازم تھا۔ اسے کسی نے مار کر ڈال دیا ہے۔ اس لیے تو یہ ساری گڑبڑ ہو رہی ہے۔" میرے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔

وہ بولتی رہی۔ "ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا۔ اس حویلی کے آس پاس کوئی دشمن قدم نہیں رکھ سکتا۔ چاروں طرف کڑا چوکی پہرہ ہے۔ چپّے چپّے پر بندوق والے بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ تو پوری چھاؤنی ہے۔ بڑے سرکار نے پوری فوج رکھی ہوئی ہے یہاں۔ ادھر پرندہ پَر نہیں مار سکتا۔"

"تو پھر جمالے کو کون مار گیا؟" میں نے معصومیت سے پوچھا۔

"یہی تو حیرانی کی بات ہے۔ سب لوگ اسی لیے پریشان ہو رہے ہیں۔ بڑے سرکار بھی بہت غصّے میں ہیں۔ آج بہت سے لوگوں کی شامت آجائے گی۔" یہ کہتے کہتے وہ بستر کی طرف بڑھ گئی۔ میں اس کے ساتھ ہی کھنچا چلا گیا۔

"بھاگاں۔ پھر اب کیا ہو گا؟" میں نے پریشان ہو کر پوچھا اور چاروں طرف نظریں دوڑائیں تاکہ مقابلے کی صورت میں اس کمرے کے نقشے سے تو واقف ہو سکوں۔

"تمہیں کس بات کی فکر ہو رہی ہے۔" وہ پیار سے ڈانٹ کر بولی۔ "تم آرام سے ادھر آکر بیٹھو۔" اس نے اپنے برابر ہاتھ سے تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

مگر میرے کان بدستور باہر سے آنے والی آوازوں پر لگے ہوئے تھے۔ ایک بار پھر بھاری قدموں کی آوازوں سے راہداری گونجنے لگی تھی۔ اس بار زور زور سے دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ قدموں اور باتوں کی آوازیں نزدیک تر ہوتی جا رہی تھیں۔ میں نے اپنے نیفے میں اُڑسے ہوئے پستول کو چھو کر اطمینان کر لیا کہ میں بالکل نہتا نہیں ہوں۔ جمالے کا پستول میں نے احتیاطاً اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ اور اب یہ میرے لیے بہت بڑی تقویت کا سبب تھا۔ یہ اس بات کا ضامن تھا کہ ضرورت پڑنے پر میں خاموشی سے ہاتھ پیر ہلائے بغیر جان نہیں دوں گا بلکہ اپنے ساتھ کچھ اور لوگوں کو بھی لے کر مروں گا۔ آوازیں بالکل نزدیک آگئی تھیں۔ پھر بہت سے قدم ہمارے کمرے کے سامنے آکر رُک گئے اور کسی نے زور زور سے دروازے پر دستک دینی شروع کر دی: "دروازہ کھولو۔" باہر سے کسی نے [illegible] اور کرخت آواز میں کہا۔ میں نے بھاگاں کی طرف دیکھا اور پھر ایک عزم کے ساتھ دو قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ بھاگاں نے یکایک میرا بازو تھام لیا اور مجھے گھسیٹ کر بستر کی جانب لے گئی۔ اس نے دھکیل کر مجھے بستر پر گرا دیا۔ میرے سر کے بال دونوں ہاتھوں میں تھام کر بکھیر دیئے اور اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ سکوں میری قمیص کے بٹن کھول کر مجھے بستر پر لٹا دیا۔ پھر اس نے کمبل اٹھا کر میرے اوپر ڈال دیا اور خود اپنے بال بکھیر کر دروازے کی جانب بڑھی۔ میں نے تکیے پر سر رکھ دیا تھا لیکن میری نگاہیں اور کان بدستور دروازے پر مرکوز تھے۔ پستول کو میں نے مضبوطی سے تھام لیا تھا اور کسی تاخیر کے بغیر اس کا استعمال کرنے کے لیے تیار تھا۔ دروازے پر شور میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اس بار ایک دھمکی آمیز لہجے میں کسی نے چلّا کر کہا: "بھاگاں

دروازہ کھول دے۔ کیا بہری ہوگئی ہے ؟"

بھاگاں نے دروازے کے پاس رُک کر ایک نظر مجھے دیکھا اور پھر دروازے کا کھٹکا کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی چند مسلح افراد کمرے میں گھس آئے۔ وہ سب خوفناک اور خونخوار شکلوں کے تھے اور انداز سے ظاہر تھا کہ وہ بلا تامل انسانوں کا شکار کرنے کے عادی ہیں۔

بھاگاں نے خمار میں ڈوبی ہوئی آواز میں پوچھا: "کیا مصیبت ہے ؟ آرام سے لیٹنے بھی نہیں دیتے۔" یہ کہکر اُس نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر ایک تو بہ شکن جمائی لی۔ مَیں خوب سمجھ رہا تھا کہ وہ جان بوجھ کر اداکاری کر رہی ہے۔

بھاگاں کی جانب توجہ دیئے بغیر وہ ہجوم بستر کی طرف بڑھا۔ "یہ کون ہے ؟" ان میں سے ایک شخص نے آٹو میٹک رائفل سے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"سرکار کا مہمان ہے۔" بھاگاں نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

"سرکار کا مہمان ؟ مگر یہاں کیا کر رہا ہے ؟"

"سمجھا کرو۔" بھاگاں کی آواز خمار میں بھیگی ہوئی تھی۔

اس شخص نے آگے بڑھ کر کمبل کو رائفل کی نالی سے ہٹا دیا اور پھر میری طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں آنکھیں گھما کر بولا: "اوہو۔ تو یہ بات ہے۔ سرکار کے مہمانوں کی خاطر ہورہی ہے ؟!" وہ گہری نظروں سے میرا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔

"کب سے مہمان داری کر رہی ہے ؟" اُس نے مجھے گھورتے ہوئے بھاگاں سے سوال کیا۔

یہ بہت اہم سوال تھا جس کے جواب پر میری زندگی یا موت کا انحصار تھا۔ ایک ثانئے کے لیے میرے دل کی دھڑکن رُک گئی۔ مگر پھر بھاگاں کی حاضر دماغی نے مجھے مصیبت میں گرفتار ہونے سے بچا لیا۔ "بہت دیر ہوگئی۔" اس نے بے شرمی اور ڈھٹائی سے کہا: "یہ تو کھانا کھانے کے بعد ہی میرے ساتھ چلے آئے تھے۔" یہ کہہ کر وہ بے باکی سے مسکرانے لگی۔ وہ شخص میرا جائزہ لینے سے فارغ ہو چکا تھا اور غالباً بھاگاں کے جواب نے اسے میری طرف سے پوری طرح مطمئن کر دیا تھا۔ اس نے بھاگاں کی طرف دیکھا اور اس کے کرخت چہرے پر پہلی بار ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

"معاف کرنا جی۔ آپ کو بے وقت تکلیف دی۔ بڑی مہربانی جناب کی۔" یہ کہکر وہ دروازے کی جانب مڑ گیا۔ مگر ابھی وہ کمرے سے باہر نہیں نکلا تھا کہ بھاری بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی اور ایک مسلح شخص نمودار ہوا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی اور وہ بے حد جوش میں نظر آرہا تھا: "ٹھیکے دار۔ سب کی گنتی کر لی ہے ہم نے۔ سب پورے ہیں۔ مگر ایک مہمان اپنے کمرے میں نہیں ہے۔ پتہ نہیں کب سے غائب ہے۔"

اُس نے جس شخص کو ٹھیکے دار کہہ کر مخاطب کیا تھا وہ میری جانب دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرایا اور بولا: "مہمان کی فکر مت کر بندو۔ وہ بڑے مزے میں ہے اور حفاظت سے ہے۔" اور وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے پیچھے دوسرے لوگ بھی کمرے سے رخصت ہوگئے۔ بھاگاں نے آگے بڑھ کر دروازہ بند کر کے اندر سے چٹخنی چڑھا دی اور پھر مسکراتی ہوئی میری جانب بڑھی۔ مَیں نے اطمینان کی ایک لمبی سانس لی اور بستر سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ بھاگاں نے میرا بہت بڑا مسئلہ حل کر کے مجھے ایک ناگہانی آفت سے بچا لیا تھا ورنہ مَیں تو سخت پریشان تھا کہ اب نجات کی کیا صورت ہوگی۔ فی الوقت تو اس مشکل سے چھٹکارا ہو گیا تھا لیکن اب اس جگہ پر مزید ٹھہرنا ہم سب کے لیے انتہائی خطرناک تھا۔ مجھے یہ اندازہ بھی ہو چکا تھا کہ

ان کا باس اگرچہ بظاہر بہت مہذب اور خوش اخلاق انسان تھا لیکن اس مخملیں نرم و ملائم جسم کے اندر ایک انتہائی کرخت، ظالم اور گھناؤنی روح آباد تھی۔ اس کے چنگل سے نکلنا آسان نہ تھا۔ وہ اتنا گہرا آدمی تھا کہ اس کے کسی اقدام کے بارے میں اندازہ لگانا بھی دشوار تھا۔ ایسے تہہ در تہہ اور پیچ دار انسان بے حد خطرناک ہوتے ہیں اور ان کا کاٹا ہوا پانی بھی نہیں مانگتا۔

یکایک مجھے اپنے نزدیک ایک سرسراہٹ کا احساس ہوا اور میں خیالات کے بھنور سے باہر نکل آیا۔ موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بھاگاں میرے برابر آکر بیٹھ گئی تھی اور مَیں نہ صرف اس کے لباس میں بسی ہوئی تیز خوشبو سونگھ سکتا تھا بلکہ اس کے بدن کی حرارت بھی محسوس کر رہا تھا۔

"کیوں یوسف بابو، کس سوچ میں ہو ؟" وہ بڑی اپنائیت سے مسکرائی۔ اس عورت میں ایک خوبی یہ تھی کہ وہ کسی قسم کے رکھ رکھاؤ یا بناوٹ کی قائل نہیں تھی۔ وہ ایک کھری اور خالص رومانٹک مزاج کی عورت تھی اور اس کے ذمے یہاں جو فرائض کئے گئے تھے ممکن ہے کسی اور عورت کے لیے وہ جھجک اور اعتراض کا باعث ہوتے لیکن کم از کم بھاگاں اُن عورتوں میں شامل نہیں تھی۔ وہ اپنے فرائض کو ایک دلچسپ مشغلے کے طور پر سرانجام دیتی تھی بلکہ اس سے لطف اندوز بھی ہوتی تھی۔ زندگی گزارنے کا یہ بھی ایک حقیقت پسندانہ طریقہ تھا۔

مَیں نے پہلی بار نظر بھر کر اُسے دیکھا۔ وہ ایک قبول صورت اور ذہین عورت تھی اور خوب بن سنور کر رہنے کی عادی معلوم ہوتی تھی۔ پھر اس ماحول میں اس کی اہمیت اس کے کام کی نوعیت کے اعتبار سے بھی خاصی نمایاں تھی جس کا مظاہرہ کچھ دیر پہلے مَیں دیکھ چکا تھا۔ جیسا کہ بعد میں اس کی گفتگو سے پتہ چلا وہ مہمانوں کی دلبستگی کے ساتھ ساتھ صاحبہ خانہ کے دل بہلانے کا فرض بھی ادا کرتی تھی۔ اسی وجہ سے خاصی منہ چڑھی بھی تھی۔ جب سے اُس نے یہ سُنا تھا کہ مَیں اُس اندھیری رات میں بطور خاص اس سے ملاقات کرنے کے لیے اس کے پاس آیا ہوں، وہ میری انتہائی شکرگزار ہوگئی تھی اور اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ میرے آگے اپنی پلکیں بچھا دے۔ اس کو اپنی دلکشی کا بخوبی احساس تھا۔ اور اس قسم کی دوسری عورتوں کی مانند وہ اپنے پرستاروں کی خاصی قدردان بھی معلوم ہوتی تھی۔ اس کی سیاہ آنکھیں ہر دم مسکراتی رہتی تھیں اور اس کے لبوں پر بھی ایک ہلکی سی مسکراہٹ ہر وقت نمایاں رہتی تھی۔ مَیں اس اثناء میں ذہنی طور پر ایک فیصلہ کر چکا تھا اور بھاگاں کے ذریعے زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کا خواہاں تھا جبکہ وہ گفتگو کو مختصر کرنے کی خواہش مند تھی۔ مَیں نے باتوں باتوں میں اس سے باس کے بارے میں دریافت کیا۔ اور مجھے اتنا پتہ چل گیا تھا کہ وہ کسی جاگیر نما چھوٹی موٹی ریاست کا والی تھا جسے عام طور پر باس کہہ کر پکارا جاتا تھا مگر قریبی لوگوں کے لیے وہ "رانا صاحب" تھا۔ اس کی رہائش اس حویلی کے علاوہ کسی شہر میں بھی تھی جس کے بارے میں بھاگاں کچھ نہیں جانتی تھی۔ بھاگاں نے جب سے ہوش سنبھالا تھا اسی حویلی میں تھی۔ اس کی طرح کچھ اور عورتیں بھی حویلی میں موجود تھیں جو خدمت گزاری کے علاوہ حویلی کے مالکوں اور گاہے بگاہے حویلی میں آنے والے مہمانوں کی دلبستگی کے فرائض بھی سرانجام دیا کرتی تھیں۔ رانا صاحب کے پاس درجنوں مسلح افراد کی ایک فوج کی فوج تھی جسے وہ اپنے حریفوں اور دشمنوں کو نقصان پہنچانے کے علاوہ ڈکیتی وغیرہ کے لیے بھی استعمال کیا کرتے تھے۔ شہر میں رانا صاحب کے اور کیا کاروبار تھے اس بارے میں بھاگاں کچھ نہیں جانتی تھی۔ سکندر کے بارے میں اس کی رائے بہت اچھی تھی۔ اس کا بیان تھا کہ کوشش کے باوجود وہ سکندر کو اپنی طرف مائل کرنے میں ناکام رہی تھی۔ وہ پڑھا لکھا بابو ٹائپ کا آدمی تھا جس

پیر رانا صاحب کو مکمل اعتماد تھا۔ ایک لحاظ سے وہ رانا صاحب کا نمبر ٹو تھا جس کا دوسرے تمام لوگ حکم مانا کرتے تھے۔ خود رانا صاحب بھی اس کا بہت خیال رکھتے تھے اور اکثر معاملات میں اس کا مشورہ بھی مان لیا کرتے تھے۔ بھاگاں نے یہ بھی بتایا کہ رانا صاحب کو پولیس سے سخت عداوت تھی۔

"مگر اس کا سبب کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ ہنسنے لگی۔ پھر بولی: "رانا صاحب نے ایک پولیس والے کے ہاتھوں بہت گہرا زخم کھایا ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

وہ کہنے لگی: "رانا صاحب جوانی میں جس لڑکی سے پیار کرتے تھے۔ اس کی شادی کسی پولیس افسر سے ہو گئی تھی۔ پھر ان دونوں میں ایسی دشمنی ہو گئی کہ رانا صاحب نے اس لڑکی کو اغوا کرا لیا اور جب وہ لڑکی کسی طرح رانا صاحب سے شادی کرنے پر تیار نہ ہوئی تو اسے قتل کر دیا۔ پولیس افسر کے پاس رانا صاحب کے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا پھر بھی اسے یقین تھا کہ اس واردات میں ان ہی کا ہاتھ ہے۔ وہ ان کے پیچھے پڑ گیا۔ وہ رانا صاحب کے خلاف جتنی تفتیش کرتا رانا صاحب کی مجرمانہ سرگرمیوں میں اتنا ہی اضافہ ہوتا گیا۔ بعد میں پولیس افسر ریٹائر ہو گیا مگر وہ یہ کھوج لگانے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ رانا صاحب دوہری زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ایک طرف تو وہ دنیا والوں کے لیے ایک ریاست کے والی تھے اور دوسری طرف ان کی زیرِ سرپرستی ڈاکوؤں کا ایک گروہ مختلف مجرمانہ کارروائیوں میں مصروف تھا لیکن جس رات اس کو یہ بات معلوم ہوئی رانا صاحب کے آدمیوں نے اسے گولیوں کا نشانہ بنا دیا۔ اس طرح رانا صاحب اپنے رقیب سے بدلہ چکانے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن پولیس والوں سے ان کی دشمنی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔

میں نے پوچھا: "بھاگاں۔ کیا رانا صاحب اپنے دشمنوں کو بھی یہاں لاتے ہیں؟"

وہ ہنس پڑی: "بڑے سرکار میں لاکھ روپے کی ایک بات یہ ہے کہ دوست ہو یا دشمن جو بھی یہاں حویلی میں ان کا مہمان ہوتا ہے اس کی مہمان داری اور خاطر مدارت میں کوئی کمی نہیں کرتے۔ لیکن..." اتنا کہہ کر وہ اچانک خاموش ہو گئی۔

"لیکن کیا؟" میں نے اسے کریدا۔

"بابو جی۔ میں نے آپ سے بہت باتیں کر لی ہیں پہلے کبھی کسی مہمان سے میں نے اتنی باتیں نہیں کیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے، میں اس مہربانی کے لیے تمہارا شکر گزار ہوں۔"

"مہربانی تو آپ کی ہے جی کہ آپ بھاگاں پر مہربان ہو گئے۔ پہلے جو بھی مہمان اس حویلی میں آیا وہ مجھے اپنے پاس بلاتا تھا مگر آپ تو خود ہی میرے پاس چلے آئے۔ مجھے تو یوں لگا جیسے کیڑی کے گھر بھگوان آ گئے ہیں۔"

"تمہیں اپنی یہ زندگی پسند ہے بھاگاں؟" میں نے پوچھا۔

"سچ بتا دوں؟" وہ شرارت سے مسکرائی۔

"ہاں۔ ہاں"

"مجھے تو یہ سب بہت اچھا لگتا ہے۔ دیکھو نا یوسف بابو۔ اگر میں حویلی میں بڑے سرکار کے پاس نہ ہوتی تو میرے جیسی غریب لڑکی کے نصیب میں یہ سب عیش آرام کہاں ہوتا؟ یہاں مجھے کوئی کچھ نہیں کہتا۔ سب ہی مجھے پیار کرتے ہیں، میری بات مانتے ہیں۔ مجھے نئے نئے لوگوں سے ملنا بہت اچھا لگتا ہے۔ بڑے سرکار کے

پاس ہر طرح کے لوگ آتے ہیں۔ ان میں کوئی کوئی تمہاری طرح بہت اچھا بھی ہوتا ہے۔" وہ میرے کچھ اور نزدیک سرک آئی۔

"بھاگاں۔ کیا کوئی مہمان بڑے سرکار کی مرضی کے بغیر یہاں سے واپس بھی جا سکتا ہے؟" میں حرفِ مطلب زبان پر لے آیا تھا۔

"توبہ کرو بابو صاحب۔ ادھر سے تو چڑیا کا بچہ بھی بڑے سرکار کی مرضی کے بغیر نہیں جا سکتا۔ میں نے بتایا تو ہے۔ یہاں تو جو مہمان ایک بار آ جاتا ہے وہ پھر اِدھر سے کبھی نہیں جاتا۔ بس مر کر ہی یہاں سے جا سکتا ہے"

میرے تمام جسم میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ باس کے متعلق میرا اندازہ بالکل درست تھا۔ "اگر کوئی جانا چاہے تو کیا ہوتا ہے؟" میں نے مزید تفصیلات حاصل کرنے کے لیے نرمی سے پوچھا۔

"کیا ہوتا ہے؟" وہ آنکھیں گھما کر بولی: "بس سمجھ لو کہ وہ ہے نہیں۔ یہ جو حویلی کے آس پاس اتنے بہت سے درخت ہیں نا ان سب پر بڑے سرکار کے پہریدار موجود ہیں جو کسی کو نظر نہیں آتے۔ خوفناک اور جنگلی درندوں سے بھی زیادہ خونخوار شکاری کتے بھی ہر وقت تاک میں رہتے ہیں۔ جہاں کسی نے باہر قدم نکالا وہ شور مچا کر اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اس طرح سب کو خبر ہو جاتی ہے۔ پھر کون بچ کر جا سکتا ہے؟"

وہ مسکراتی ہوئی میری جانب جھکی اور کہنے لگی: "مگر یہ سب باتیں آپ کیوں پوچھ رہے ہو؟ آپ کو یہاں کیا تکلیف ہے جی؟ میں تو کہتی ہوں چھوڑو سب کچھ۔ ادھر ہی رہ جاؤ۔ بڑے سرکار تم جیسے لوگوں کی بہت قدر کرتے ہیں۔ میں تو سمجھتی ہوں بہت جلدی تم سکندر کی جگہ لے سکتے ہو۔ ہاں!"

"کیسی باتیں کرتی ہو بھاگاں۔ میں کسی اور کا نوکر ہوں۔ اپنی مالکن کو لے کر مالک کے پاس جا رہا تھا کہ اس دلدل میں پھنس گیا۔ ان عورتوں کو ان کے ٹھکانے پر پہنچائے بغیر یہاں کیسے رک سکتا ہوں؟"

وہ ہنس پڑی: "بڑے سیدھے ہو بابو صاحب۔ اب تم کسی کے نوکر نہیں ہو نہ کوئی ہمارا مالک ہے۔ سوائے بڑے سرکار کے۔ اور میری مانو تو اب اُن عورتوں کو بھول جاؤ۔"

میں نے حیرانی سے اسکی طرف دیکھا۔

وہ مسکرانے لگی: "ایسی خوبصورت عورتیں ایک بار اس حویلی میں قدم رکھنے کے بعد یہاں سے پھر اور کہیں نہیں جا سکتیں۔"

وہ بالکل سنجیدہ تھی اور میری چھٹی حس بھی اس کے بیان کی تصدیق کر رہی تھی۔ مجھے اچانک ایک انجانے اندیشے اور خوف نے جکڑ لیا۔ یوں لگا جیسے میرے پاس وقت بہت کم ہے اور مجھے کام بہت سے کرنے ہیں۔ کتنا عجیب اتفاق تھا کہ جس عورت کی وجہ سے میں تمام مشکلات کا شکار ہوا تھا اور جس کی تلاش اور جستجو میں مارا مارا پھر رہا تھا وہ مجھ سے چند گز کے فاصلے پر اسی عمارت میں موجود تھی۔ جتنی مجھے اس کو پانے کی جستجو تھی اس سے کہیں زیادہ شدت سے اس کو مجھے پانے کی آرزو تھی۔ اس نے جو ڈرامہ شروع کیا تھا۔ اس کا ڈراپ سین اس وقت تک نہیں ہو سکتا تھا جب تک میں اپنی جان سے نہ گزر جاؤں یا ان لوگوں کے قابو میں نہ آ جاؤں جو میرے خون کے پیاسے تھے یا پھر قانون کے بے رحم ہاتھ مجھے اپنے شکنجے میں جکڑ لیں اور میں ناکردہ گناہوں کی بناء پر کسی اور کے جرائم کی پاداش میں طویل عرصہ جیل میں گزارنے کے لیے مجبور کر دیا جاؤں گا۔ مجھے بھاگاں کے کمرے میں بے چینی کا احساس ہونے لگا۔ میں یکایک بستر سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس ماحول میں میرا دم گھٹنے لگا۔ سانس رُکنے لگی تھی۔ مجھے تازہ ہوا اور کھلی فضا کی ضرورت تھی۔ میرے قدم بے اختیار دروازے کی جانب اُٹھ

گئے۔ بھاگاں حیران ہو کر میری اس وابستگی کو دیکھ رہی تھی۔ وہ بھی ایک سحر زدہ معمول کی طرح میرے ساتھ ہی کھینچی ہوئی دروازے کے پاس پہنچ گئی۔

"کیا بات ہے یوسف بابو۔ ایکا ایکی آپ کو کیا ہو گیا۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" وہ خاصی تشویش اور پریشانی سے مجھے تک رہی تھی۔

میں خاموش سوچ میں گم کھڑا رہا۔ پھر رفتہ رفتہ میری کیفیت معمول پر آنے لگی۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور بستر کی طرف چل پڑی۔ میں کسی تامل اور پس و پیش کے بغیر اس کے اشارے پر چلنے لگا۔

قریباً دو گھنٹے بعد بھاگاں نیند کی آغوش میں چلی گئی تھی اور اس کے ہلکے ہلکے خراٹے کمرے کی فضا میں ارتعاش پیدا کر رہے تھے لیکن میری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ میں جاگ رہا تھا اور منصوبے بنا رہا تھا۔ بھاگاں کی رفاقت نے مجھے کچھ کارآمد راہیں سجھا دی تھیں۔ مجھے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ گاڑیوں کا گیراج کس طرف واقع ہے اور رات کے وقت اس کی حفاظت پر کتنے لوگ مامور ہوتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے مجھے یہ راز بھی بتا دیا تھا کہ حویلی میں رہنے والوں کی بُو کو حفاظتی کتے اچھی طرح پہچانتے ہیں اور ان پر حملہ آور نہیں ہوتے، چنانچہ میں بھاگاں کے سونے کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ گہری نیند سو چکی ہے تو میں نے چپکے سے اس کے سرہانے سے اس کا دوپٹہ اُٹھایا اور اپنی کمر کے گرد لپیٹ لیا۔ یہ اہتمام میں نے کتوں کو مانوس کرنے کی غرض سے کیا تھا۔ بھاگاں کو سلانا آسان کام نہ تھا لیکن میں نے یہ کٹھن مرحلہ بھی طے کر لیا تھا۔ وہ یہ سمجھ رہی تھی کہ اب صبح تک میں اس کے پاس ہی رہوں گا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مطمئن ہو کر سو چکی تھی۔ دبے پاؤں بستر سے اُٹھ کر میں دروازے کے پاس گیا اور کھٹکے کی آواز پیدا کیے بغیر دروازہ کھول دیا، لیکن یہ سب احتیاط غیر ضروری تھی۔ بھاگاں بہت سکون کی نیند سو رہی تھی۔ کم از کم دو گھنٹے تک اس کے بیدار ہونے کا خطرہ نہیں تھا۔

برآمدہ نیم تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اور حسبِ معمول وہاں کوئی موجود نہیں تھا، لیکن مجھے احساس تھا کہ ایک محافظ کے پُراسرار قتل کے بعد ہر طرف حفاظتی انتظامات پہلے سے کہیں زیادہ سنگین کر دیے گئے ہوں گے۔ میں چاروں طرف سے خطرات میں گھرا ہوا تھا لیکن یہ غالباً میرے لیے پہلا اور آخری موقع تھا جس سے فائدہ اٹھا کر میں اس قید خانے سے نجات حاصل کر سکتا تھا۔ برآمدے اور راہداری سے دبے پاؤں گزرتا ہوا میں بڑی حویلی کی عمارت سے نکل کر مہمان خانے تک پہنچ گیا۔ حسبِ توقع راستے میں مجھے کوئی رکاوٹ نہیں ملی۔ ہال کمرہ بدستور تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے اس کمرے کا رُخ کیا جس میں رضیہ اور لالی تھیں۔ دروازے پر دو بار ہلکی سی دستک دینے کے بعد میں نے کمرے کے اندر نقل و حرکت کی آوازیں سنیں اور پھر دروازے کے نزدیک سے رضیہ کی نرم اور دھیمی آواز آئی: "کون ہے؟"

"یوسف!"

دروازہ کسی تاخیر کے بغیر کھل گیا۔ میں نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔ رضیہ تعجب سے آنکھیں پھاڑے مجھے دیکھتی رہی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ابھی تک جاگ رہی تھی۔ لالی قالین پر سو رہی تھی۔

"کیا بات ہے۔ تم سوئی نہیں؟"

"نیند نہیں آئی۔ مگر تم.....؟"

"سنو رضیہ! ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ ہم لوگ شدید خطرے میں گھر چکے ہیں اور دن کی روشنی پھیلنے تک ہمارے پاس صرف چند گھنٹے کی مہلت ہے۔ میں جان کی بازی لگانے کو تیار ہوں۔ تم اپنی سناؤ، اس جگہ زندگی بھر رہنے کے لیے تیار ہو یا تم بھی بازی لگانا چاہتی ہو؟"

وہ خاصی پریشان ہو گئی۔ پھر بولی: "میں جانتی ہوں کہ حالات بہت نازک ہیں ورنہ تم ایسا نہ کہتے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

اس کے لہجے اور آواز سے آہنی عزم جھلک رہا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک بہادر صاحبِ عزم اور باعمل عورت تھی جو ذہانت کی دولت سے مالا مال تھی اور میں جانتا تھا کہ اس کا جواب یہی ہو گا۔

"ٹھیک ہے۔ مگر لالی؟!"

"لالی میرے ساتھ ہے۔ اس کا یہی فیصلہ ہے۔ وہ ہر حال میں میرے ساتھ رہے گی۔"

"تم لالی کو جگا کر بتا دو اور کان کھول کر سن لو۔ میں گیراج کی طرف جا رہا ہوں جیسے ہی گاڑی کی آواز سنو ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر باہر نکل کر اس میں سوار ہو جانا۔ یہ ہمارے لیے آزادی کا واحد موقع ہے ——!"

"تو کیا تم گاڑی یہاں تک لانے میں کامیاب ہو جاؤ گے؟"

"مجھے معلوم نہیں۔" میں نے صاف گوئی سے کہا۔ "میں ایک داؤ لگا رہا ہوں۔ اگر گاڑی لے کر آ گیا تو امید کی صورت نظر آ جائے گی۔ نہ آیا تو سمجھ لینا کہ ناکام ہو گیا ہوں اور ناکامی کا مطلب تم سمجھتی ہو۔ یعنی موت۔"

وہ خاموش ٹکٹکی لگائے مجھے دیکھتی رہی۔

"اور سنو۔ اگر میں تم تک نہ پہنچ سکوں تو ان لوگوں پر کسی طرح بھی ظاہر نہ ہونے دینا کہ میری اس کوشش کا تمہیں کوئی علم تھا۔ پھر حالات کے مطابق فیصلہ کرنا تمہارا کام ہو گا۔"

وہ پلک جھپکے بغیر مجھے دیکھتی رہی۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کا تاثر نہیں تھا۔ کہنے لگی: "راجی کا کیا ہو گا؟"

"میں ابھی اس کے پاس بھی جاؤں گا۔ ہمارے ساتھ چلنا چاہے گی تو وہ بھی شامل ہو جائے گی ورنہ اُس کی مرضی۔ اچھا۔ خدا حافظ۔"

میں تیزی سے پلٹ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ چٹخنی کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو رضیہ نے آہستگی سے میرا بازو تھام لیا۔ "سنو" وہ بہت دھیمی اور پُرسکون آواز میں بولی۔ "ہم بہت نازک مرحلے سے گزر رہے ہیں ہو سکتا ہے پھر ایک دوسرے سے ملاقات نہ ہو۔"

"یہ تو درست ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"میں تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔ یقین جانو میں تمہاری دل سے قدر کرتی ہوں۔ کاش تم جیسے لوگ اس دنیا میں اتنے کم تعداد میں نہ ہوتے تو یہ بہت شاندار اور اچھی جگہ بن جاتی۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ مجھ سے ایک قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی لیکن اس کی سانسوں کی گرمی مجھے اپنے چہرے پر محسوس ہو رہی تھی۔

"اگر ہم دوبارہ نہ مل سکیں تو ایک بات سن لو۔ شاید پھر یہ موقع نہ ملے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "کہو۔ میں سن رہا ہوں۔"

"تم بہت اچھے آدمی ہو۔" وہ رُکتے رُکتے بولی۔ "اور مجھے بہت اچھے لگتے ہو۔" اُس نے اپنی نگاہیں

جھکالیں۔ ایک لمحہ وہیں کھڑی رہی پھر پلٹ کر تیزی سے دوسری جانب چلی گئی۔ "اب تم جاؤ۔" اُس نے دھیمی آواز میں کہا۔ اُس کی آواز پُرسکون تھی لیکن اُس میں ہلکی سی لرزش محسوس ہو رہی تھی۔ کہنے کو میرے پاس بہت کچھ تھا۔ مگر وقت نہیں تھا۔ نہ ہی موقع تھا۔ اس لیے میں تیزی سے کمرے سے نکل کر باہر چلا گیا۔ وہ صحیح معنوں میں ایک غیر معمولی عورت تھی جسے اپنے جذبات اور اعصاب پر پوری طرح قابو تھا۔

راجی کے دروازے کے سامنے پہنچ کر میں رُک گیا۔ پھر آہستہ سے دستک دی۔ دو تین بار دستک دینے کے بعد اسکی آواز سنائی دی "کون ہے؟"

"میں ہوں یوسف۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"کیا بات ہے؟" وہ دروازے کے پاس پہنچ کر پوچھنے لگی۔

"دروازہ کھولو۔ مجھے تم سے ایک بات کرنی ہے۔"

"مگر اس وقت؟ اتنی رات گئے؟"

اس کا پس و پیش تعجب انگیز تھا۔ لیکن پھر بھی اس سے بات کرنی بے حد ضروری تھی۔

"دیر نہ کرو راجی۔ یہ بہت ضروری ہے۔"

چند لمحے کے بعد اس نے دروازہ کھول دیا مگر دروازے کے آگے سے نہیں ہٹی۔ یوں لگا جیسے وہ کمرے کے اندر مجھے نہیں بلانا چاہتی۔ میں نے اس کے بکھرے ہوئے بالوں اور لباس کی بے ترتیبی کو دیکھا تو پھر میری نظریں کمرے کے اندر پہنچ گئیں۔ میرا اندازہ درست ہی تھا۔ وہ کمرے میں تنہا نہیں تھی۔ بستر پر کوئی اور بھی موجود تھا۔ میں نے ایک لمحہ سوچا مگر پھر اُسے ہٹا کر اندر داخل ہو گیا۔ دروازے کی چٹخنی لگانے کے بعد میں نے بستر کی طرف نگاہ کی۔ وہاں سکندر سویا ہوا تھا۔

"ایسی کون سی ضروری بات ہے؟" راجی نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

میں نے اس اثنا میں فیصلہ کر لیا تھا۔ "راجی میں یہاں سے جا رہا ہوں۔ تم میرے ساتھ چلو گی یا نہیں؟"

"اس وقت؟" اُس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں۔ یہ وقت دوبارہ لوٹ کر نہیں آئے گا۔ اور یہ بھی سن لو کہ ہو سکتا ہے میرا یہ ارادہ پورا نہ ہو سکے۔ جان پر کھیلنا ہو گا۔ کامیابی ناکامیابی اللہ کے ہاتھ ہے۔"

وہ پس و پیش میں پڑ گئی۔ اس کی نظریں بے اختیار سکندر کی جانب اُٹھ گئیں۔

"جلدی جواب دو۔ میں انتظار نہیں کر سکتا۔ یہ کام آسان نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے زندگی سے ہاتھ بھی دھونے پڑیں۔ مگر کیونکہ میرے ساتھ یہاں آئی ہو اس لیے تم سے دریافت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔"

"سکندر مجھے اچھا لگتا ہے۔" اُس نے اپنا فیصلہ سنانے میں ذرا بھی دیر نہیں لگائی۔ "ہم دونوں ساتھ رہنا چاہتے ہیں مگر وہ میری دُنیا میں نہیں جا سکتا۔"

"گویا تم یہیں ٹھہرو گی؟"

"ہاں۔ ہم مرتے دم تک ایک ساتھ رہیں گے۔"

میں نے اس کے چہرے پر طمانیت اور عزم کی روشنی چمکتی ہوئی دیکھ لی تھی۔ اُس نے فیصلہ کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگائی تھی۔ مگر اس کا یہ فیصلہ تبدیل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس بات کا مجھے

اندازہ ہو چکا تھا۔

"تو پھر خدا حافظ۔ شاید یہ ہماری آخری ملاقات ہو۔ مگر ایک بات کا وعدہ کرو۔"

"کس بات کا؟"

"کمرے کے باہر چاہے کتنا بھی شور و غل ہو تم باہر نہیں نکلو گی۔ نہ سکندر کو باہر نکلنے دو گی۔"

"مگر....." وہ پریشان ہو گئی۔

"میں رضیہ اور لالی کو لینے آؤں گا۔ ہو سکتا ہے یہاں تک نہ پہنچ سکوں۔ اگر یہاں تک پہنچ بھی گیا تو خاصا خون خرابہ ہو گا۔ ظاہر ہے تم بلا وجہ یہ خطرہ مول لینا نہیں چاہو گی۔ سکندر کو روکے رکھنا تمہارا کام ہے۔"

"مگر یہ کیسے ممکن ہے؟ یہ تو بہت مشکل کام ہے۔"

"اگر تم کہو تو میں تمہاری یہ مشکل آسان کر دوں؟"

"کر دو مگر کیسے؟"

میں تیزی سے سکندر کے قریب گیا۔ وہ کسی میٹھے خواب سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ میں اسے پسند کرنے لگا تھا۔ میں نے پستول کے دستے سے اس کی کنپٹی پر ایک ضرب لگائی۔ اس کے منہ سے ایک آہ نکلی اور پھر وہ بے سُدھ ہو گیا۔

"یہ چوٹ سکندر کی بے گناہی کا ثبوت بھی بن جائے گی۔ اچھا خدا حافظ۔" میں اسے حیران اور افسردہ چھوڑ کر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

مہمان خانے کے برآمدے میں پہنچ کر میں رُک گیا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں سے قدم آگے بڑھانے پر مجھے ایک خوفناک کتے سے واسطہ پڑا تھا۔ میں نے پستول نکال کر اپنے ہاتھ میں تھام لیا اور اپنی پنڈلی میں بندھے ہوئے خنجر کو ٹٹول کر اطمینان کر لیا کہ وہ اپنی جگہ موجود ہے۔ سامنے گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا اور غور سے دیکھنے کے باوجود کوئی متنفس نظر نہیں آ رہا تھا، لیکن میں جانتا تھا کہ اس تاریکی کے دامن میں کم از کم ایک سیاہ خوفناک کتا اور ایک مسلح محافظ موجود ہے۔ ان کے علاوہ اور کون سے حشرات الارض اپنے شکار کی تلاش میں منتظر ہیں یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا۔ چند منٹ برآمدے میں ایک ستون کے پاس رُک کر میں اپنی آنکھوں کو اندھیرے میں دیکھنے کی صلاحیت کا عادی کرتا رہا۔ پھر میں نے احتیاطاً خنجر بھی نکال کر اپنے بائیں ہاتھ میں تھام لیا اور اللہ کا نام لے کر تاریکی کے سمندر میں اُتر گیا۔

بھاگاں کا دوپٹہ میری کمر سے بندھا ہوا تھا۔ اس کے باوجود میں انتہائی محتاط اور چوکنا تھا۔ اچانک ایک سیاہ ہیولا ایک جانب سے نمودار ہوا اور غرّاتا ہوا میری جانب لپکا۔ میں اس کا استقبال کرنے کے لیے تیار تھا اور پستول کی بجائے خنجر سے مقابلہ کرنے کے لیے کمر بستہ ہو گیا تھا کیونکہ پستول کی آواز سے اور دُور دُور تک محافظ باخبر ہو سکتے تھے۔ کتا تیزی سے میری طرف لپکا تھا، لیکن نزدیک پہنچ کر اس کی غرّاہٹ پیار کی آواز میں بدل گئی اور وہ مجھ پر حملہ آور ہونے کی بجائے دُم ہلانے لگا۔ ظاہر ہے کہ یہ تبدیلی بھاگاں کے دوپٹے کی بدولت تھی۔ ایک مانوس بُو سونگھ کر کتے کا رویہ تبدیل ہو گیا تھا۔ وہ مجھے دشمن کی بجائے دوست سمجھنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ میں نے اطمینان کی ایک لمبی سانس لی۔ بھاگاں کے کمرے میں گزارے ہوئے لمحات کی قیمت ابدی زندگی کی صورت میں پوری طرح وصول

ہو چکی تھی اور اب تک میرا منصوبہ کامیابی سے پایۂ تکمیل کو پہنچ رہا تھا۔

کتا میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اب اس کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی، وہ بالکل خاموش اور مستعد تھا۔ میں بجری کی سڑک سے ہٹ کر چل رہا تھا، لیکن میرا رُخ گیراج کی جانب تھا۔ میں درختوں سے کچھ فاصلہ رکھ کر چل رہا تھا۔ یکایک ایک درخت پر سے سیٹی کی آواز سنائی دی جس پر کتے کے کان کھڑے ہو گئے۔ کسی نے سرگوشی میں پوچھا۔

"کون ہے۔ امانت علی؟!"

میں نے جواب میں ہنکارا بھرا اور آگے چل پڑا۔ درخت پر موجود محافظ کتے کو میرے ساتھ دیکھ کر یقیناً مجھے اپنا ہی ایک ساتھی سمجھا تھا۔ ایک اور مرحلہ کامیابی سے طے ہو گیا اور میں پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ میں نے اب بھاگاں کا دوپٹہ اپنی کمر سے کھول کر سر پر ڈھاٹے کی طرح باندھ لیا تھا جس کی وجہ سے میرا چہرہ چھپ گیا تھا۔ قریباً آدھا راستہ اور گزر گیا تھا اور اب مجھے گیراج کے باہر جلنے والے مدھم بلب کی روشنی نظر آنے لگی تھی۔ یکایک ایک درخت پر سے کسی نے چھلانگ لگائی اور میرے پاس آ کر ٹھہر گیا۔ اس کے ہاتھ میں آٹومیٹک رائفل تھی اور اس نے بھی میری طرح ڈھاٹا باندھ رکھا تھا۔

"امانت۔" وہ میری طرف بڑھتے ہوئے بولا "کدھر جا رہے ہو۔ کچھ پتہ لگا؟"

"نہیں۔" میں نے مبہم جواب دیا۔

"پھر یہ تو بتاؤ کہ وہ بھوت تھا یا چھلاوہ۔ ہم میں سے کسی نے نہ اسکو آتے ہوئے دیکھا نہ وہ جاتے ہوئے نظر پڑا۔ آخر وہ کہاں سے آیا تھا اور کہاں غائب ہو گیا؟"

وہ میرے پاس پہنچ کر میرے ساتھ چلنے لگا۔ میں جواب دینے میں تامل کر رہا تھا کیونکہ وہ میری آواز پہچان سکتا تھا۔ یکایک وہ چلتے چلتے رُک گیا اور اس نے میرا بازو تھام کر اپنی طرف کھینچا۔ "تم بولتے کیوں نہیں ہو؟ اور یہ تمہارے سفید کپڑے ....."

اس کی گرفت میرے بازو پر مضبوط ہو گئی اور اُس نے مجھے اپنی جانب گھسیٹا۔

اس کو مجھ پر شک ہو چکا تھا اور اگلا لمحہ میرے لیے انتہائی اہم اور نازک تھا۔ میں تیزی سے اُس کی طرف پلٹا اور اس کے ساتھ ہی میرا پستول والا ہاتھ حرکت میں آیا۔ پستول پوری قوت سے اسکے جبڑے پر لگا اور وہ کراہ کر زمین پر گرنے لگا۔ گرتے گرتے بھی اُس نے رائفل کا رُخ میری جانب موڑ دیا مگر میں نے اسے لبلبی دبانے کی مہلت نہیں دی تھی۔ میرا خنجر والا ہاتھ تیزی سے بائیں سے دائیں جانب ایک دائرے کی شکل میں گھوما اور اسکی گردن پر سے گزرتا ہوا نکل گیا۔ اتنی دیر میں اس کی شہ رگ کٹ چکی تھی۔ وہ کوئی آواز نکالے بغیر زمین پر گر گیا۔ کتا جواب تک خاموشی سے یہ سب دیکھ رہا تھا چوکنا ہو کر اُس کی جانب بڑھا۔ اُس نے اُسے سونگھا اور پھر غرا کر میری طرف بڑھا۔ اُس کی دُم کی دوستانہ حرکت اب رُک چکی تھی اور اُس کی غراہٹ میں خونخواری پیدا ہو گئی تھی۔ وہ جان چکا تھا کہ میں ایک اجنبی ہوں۔ شاید وہ اس لیے بھی زیادہ ناراض تھا کہ میں اُسے دھوکہ دینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھلتا اس نے فضا میں ایک جست لگائی اور مجھ پر آن گرا۔ وہ ایک بہت بڑے سائز کا بھاری بھرکم کتا تھا پوری قوت سے مجھ سے ٹکرایا تو میں سنبھل نہ سکا اور زمین پر گر گیا۔ پستول میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا لیکن خنجر کے دستے پر میری گرفت مضبوط ہو گئی تھی۔ کتا مجھ پر سوار

ہو چکا تھا۔ اور اس کا خونخوار جبڑا اور نوکدار دانت میرے چہرے سے محض چند انچ کے فاصلے پر تھے۔ اُس نے مجھے کاٹنے کے لیے منہ بڑھایا مگر میں نے چہرہ دوسری جانب موڑ لیا۔ میں نے دائیں ہاتھ سے اس کی گردن پکڑ لی اور بائیں ہاتھ میں دبے ہوئے خنجر کو اوپر اُٹھایا مگر وہ زور لگا کر میری گرفت سے نکل گیا اور مجھے زمین پر سے اُٹھنے کی مہلت دیئے بغیر ہی مجھ پر دوبارہ لوٹ پڑا۔ وہ ایک طاقتور قوی ہیکل کتا تھا اور انسانوں کو شکار کرنے کے لیے یقیناً اسے تربیت دی گئی ہو گی۔ اس کے منہ سے پیدا ہونے والی غراہٹ بھی میرے لیے خطرے کا باعث بن سکتی تھی۔ وہ منہ بڑھا کر مجھے بھنبھوڑ دینا چاہتا تھا لیکن اس بار میرا بایاں ہاتھ پھر برق رفتاری سے حرکت میں آیا اور اس کی گردن پر سے گزر گیا۔ اس سے پہلے کہ اس کا گرم خون مجھے شرابور کر دیتا میں تیزی سے زمین پر لوٹ لگا کر دوسری جانب نکل گیا۔ اس نے چند مدھم سی آوازیں منہ سے نکالیں اور پھر ساکت ہو گیا۔

خنجر زنی کا یہ داؤ مجھے فوجی کمانڈو کے طور پر تربیت کے دوران سکھایا گیا تھا اور یہ انتہائی مؤثر اور کارگر ہتھیار تھا۔ ہاتھ کی حرکت، خنجر کے زاویے اور کلائی کے ہلکے سے خم کے ذریعے ہاتھ میں تھاما ہوا خنجر ایک انتہائی مہلک اور خطرناک ہتھیار کی شکل اختیار کر لیتا تھا اور یہ وار کبھی خالی نہیں جاتا تھا۔ اس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ یہ تیز دار خنجر ایسی نفاست اور نزاکت کے ساتھ اپنا کام کرتا تھا کہ چشم زدن میں شہ رگ کو کاٹ کر رشتۂ جاں منقطع کر دیتا تھا اور شکار کسی تکلیف کے بغیر چند لمحے میں ختم ہو جاتا تھا۔ اب تک اس خنجر کی مدد سے میں دو شکار کر چکا تھا اور دونوں میں سے کسی کو سنبھلنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ اس سے نجات حاصل کرنے کے بعد میں نے تاریکی میں اپنا پستول تلاش کرنے کی کوشش کی جو زمین پر گر کر گم ہو چکا تھا مگر بہت جلد مجھے اپنی حماقت کا احساس ہو گیا۔ اس اندھیرے میں پستول کا ملنا بہت دشوار بلکہ قریب قریب ناممکن تھا اور پھر جبکہ میرے پاس زیادہ وقت بھی نہیں تھا۔ مرنے والے محافظ کی آٹومیٹک رائفل میرے سامنے پڑی ہوئی تھی اور میں بے وقوفی سے اپنا گمشدہ پستول تلاش کرنے میں وقت ضائع کر رہا تھا۔ غلطی کا احساس ہوتے ہی میں نے پستول تلاش کرنے کا ارادہ ترک کر دیا اور آٹومیٹک رائفل تھام کر گیراج کی جانب چل پڑا۔ اس اثناء میں مجھے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ ایک محافظ کا نام امانت تھا اور میں بوقت ضرورت یہ نام استعمال کر سکتا ہوں۔

گیراج کی مدھم روشنیاں اب زیادہ واضح اور نمایاں طور پر نظر آنے لگی تھیں۔ راستے میں میدان صاف تھا۔ چند درختوں کے سوا درمیان میں کوئی اور رکاوٹ نہ تھی، لیکن میں جانتا تھا کہ اس تھوڑے سے فاصلے کو بھی میں پہریداروں کی روک ٹوک کے بغیر طے نہیں کر سکوں گا۔ اس لیے پہلے سے بھی زیادہ محتاط ہو کر دبے پاؤں رُکتا اور ٹھٹک کر ٹوہ لیتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔

ایک درخت کے نزدیک پہنچ کر میں تنے کی آڑ میں رُک گیا اور سامنے گیراج کا جائزہ لینے لگا۔ یکایک مجھے محسوس ہوا کہ میرے علاوہ کوئی اور بھی وہاں موجود ہے۔ گرم سانسیں میرے ہاتھ سے ٹکرا رہی تھیں۔ میں نے حرکت کیے بغیر نظریں گھمائیں اور یہ دیکھ کر میری سانس رُک گئی کہ میرے پیروں کے پاس ایک بہت بڑے سائز کا سیاہ کتا کھڑا ہوا تھا وہ پہلے سے وہیں موجود تھا یا دبے پاؤں چلتا ہوا آیا تھا اس بارے میں کوئی اندازہ لگانا مشکل تھا لیکن کم از کم یہ طے تھا کہ وہ دشمنی کے موڈ میں نہیں تھا

ورنہ میری بے خبری میں بڑی آسانی سے مجھ پر حملہ آور ہو سکتا تھا اور میں شاید اس غیر متوقع حملے سے بچاؤ بھی نہ کر پاتا۔ یہ سب بھاگاں کے دوپٹے کی برکت تھی۔ دوسری بات یہ تھی کہ میں جن مخالفوں سے نبرد آزما ہوا تھا غالباً ان کے جسموں کی بُو بھی میرے لباس کا حصّہ بن گئی تھی اور کُتّے کو اجنبیت اور دُشمنی کا احساس نہیں تھا۔ ڈرتے ڈرتے میں نے خنجر کو مُنہ میں دبا کر آہستگی سے کُتّے کے سر پر ہاتھ پھیرا اور وہ بے اختیار دُم ہلانے لگا۔ یہ اس کی جانب سے مکمل اعتماد اور دوستی کا اظہار تھا اور میرے لیے یہ تصور بے حد اطمینان بخش تصور تھا۔ گویا اس کُتّے کی جانب سے مجھے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے پیار سے اس کو چمکارا اور اس کے جسم کے لمس نے میرے دل میں محبّت کا جذبہ پیدا کر دیا۔ میں غیر ضروری طور پر خون بہانے کا قائل نہیں تھا۔ خواہ وہ خون جانور کا ہو یا انسان کا۔ حتی الامکان میری کوشش ہوا کرتی تھی کہ اپنے مقابل کی جان لیے بغیر اسے راستے سے ہٹا دیا جائے لیکن بعض اوقات حالات اس بات کے متقاضی ہوتے ہیں کہ سامنے والے کی جان لیے بغیر اپنی جان بچانا ممکن نہیں رہتا۔ ایسی صورت میں لامحالہ خون خرابہ کرنا پڑتا ہے۔ حالانکہ کسی بھی ذی روح کی جان لے کر مجھے بعد میں ہمیشہ افسوس ہی ہوا ہے۔

میں نے آہستہ سے گیراج کی جانب قدم بڑھائے اور کُتّا محض دُم ہلا کے رہ گیا۔ مجھے اس بات کا اعتراف کرنا پڑا کہ ان لوگوں نے پہریداری اور حفاظت کے سلسلے میں نہایت منظم طور پر منصوبہ بندی کی تھی اور بظاہر کسی پہریدار کی عدم موجودگی کے باوجود ہر جگہ محافظ موجود تھے۔ خاص طور پر کُتّوں کو جس انداز سے تربیت دی گئی تھی وہ قابلِ تعریف تھا۔ کُتّا بدستور اس درخت کے تنے کے ساتھ لگا بیٹھا رہا اور محبّت کے اظہار کے طور پر دُم ہلاتا رہا۔ میں اسے وہیں چھوڑ کر آگے بڑھا اور جھکتا ہوا گیراج کی عمارت کی جانب بڑھنے لگا۔

گیراج خاصا بڑا اور وسیع تھا جس میں کم سے کم چھ گاڑیاں کھڑی کرنے کی گنجائش تھی۔ میں نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ میری لینڈ روور بھی گیراج میں موجود تھی، لیکن اس کے عقب میں کچھ فاصلے پر دو جیپ گاڑیاں کھڑی تھیں۔ گویا لینڈ روور کو نکالنے کے لیے ان دونوں جیپوں کا راستے سے ہٹانا ضروری تھا۔ ان کے علاوہ چار جیپیں اور بھی تھیں۔ جیپوں کے پہلو بہ پہلو دو بیش قیمت کاریں بھی موجود تھیں۔ بظاہر گیراج کے آس پاس کوئی شخص موجود نہیں تھا، لیکن یقیناً وہ لوگ موٹر گاڑیوں کی حفاظت کی طرف سے بے پرواہ نہیں ہو سکتے تھے۔

سامنے سے جانے کی بجائے میں نے چکّر کاٹ کر پیچھے کی جانب سے کارروائی کرنے کا فیصلہ کیا۔ گیراج کے عقب میں بھی کھلا میدان تھا اور کافی فاصلے پر ایک منزلہ عمارت بنی ہوئی تھی جو غالباً عملے کے بعض افراد کی رہائش گاہ تھی۔ میں گیراج کی دیوار کے ساتھ لگ کر کھسکتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ چند گز کا سفر طے کرنے کے بعد میں نے اُن دو آدمیوں کو دیکھ لیا جو کھلی جگہ پر بیٹھے گپ شپ کرنے میں مصروف تھے۔ ان کے سامنے شراب کی ایک بوتل رکھی ہوئی تھی اور وہ باری باری اس سے مُنہ لگا کر دو چار گھونٹ اپنے حلق سے اُتار لیتے تھے۔ ان کی رائفلیں پاس ہی رکھی ہوئی تھیں۔ وہ زور زور سے باتیں کرنے اور قہقہے لگانے میں مصروف تھے۔ میں نے زمین پر سے ایک پتھر اُٹھا کر گیراج کے سامنے پھینکا۔ پتھر گرنے کی آواز کے ساتھ ہی اُن دونوں کا نشہ ہرن ہو گیا اور انہوں نے چونک کر گیراج کی جانب دیکھا۔ چند لمحے وہ خاموش کان لگا کر سننے کی کوشش کرتے رہے۔ پھر دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے۔

اور ان میں سے ایک نے اُدھر کا رُخ کیا جس طرف سے کھٹکے کی آواز آئی تھی۔ دوسرا شخص چوکنّا ہو کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھی کے اوجھل ہوتے ہی ضروری تھا کہ میں اس پر قابو حاصل کر لوں۔ درمیانی فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ میں چھلانگ لگا کر اس تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ نہ ہی میں فائر کرنے کا خطرہ مول لے سکتا تھا۔ فوراً ہی میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ میں نے جُھک کر زمین پر سے ایک بڑا سا پتھر اُٹھایا اور اُسے اپنے ہاتھ میں تول کر پوری قوّت سے محافظ کی طرف پھینکا۔ پتھر نشانے پر پڑا اور کنپٹی پر بھرپور ضرب لگتے ہی وہ کوئی آواز پیدا کیے بغیر زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ میں نے تیزی سے گیراج کے اگلے حصّے کا رُخ کیا جہاں دوسرا محافظ گاڑیوں کے آس پاس گھوم کر جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ میں تیزی سے جست لگا کر اس کے نزدیک پہنچا۔ وہ جُھک کر ایک جیپ کے نیچے جھانک رہا تھا۔ آہٹ سُنتے ہی وہ تیزی سے اُٹھ کھڑا ہوا لیکن اس پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ میری آٹومیٹک رائفل کی نالی پوری قوّت سے اس کی گردن کے پچھلے حصّے میں لگی اور وہ ایک آہ کی آواز کے ساتھ سامنے والی جیپ پر گر گیا۔ میں چند لمحے چوکنّا ہو کر چاروں طرف کا جائزہ لیتا رہا اور اس انتظار میں رہا کہ اگر کوئی اور محافظ آس پاس موجود ہے تو آواز سُن کر نمودار ہو جائے، لیکن جب کوئی شخص نہ آیا تو میں لپک کر لینڈ روور کی جانب بڑھا۔

لینڈ روور میں چابیاں لگی ہوئی تھیں اور یہ میرے لیے حد سے زیادہ خوشی کا موقعہ تھا۔ میں نے لینڈ روور کے پیچھے کھڑی ہوئی ایک جیپ کو دھکیل کر راستے سے ہٹانے کی کوشش کی اور وہ ایک جانب کھسک گئی۔ اب دوسری جیپ کی باری تھی۔ میں نے اُسے دھکّا دیا مگر اس نے حرکت بھی نہیں کی۔ شاید وہ گیئر میں تھی یا ہینڈ بریک لگا ہوا تھا۔ میں جیپ میں بڑھ کر دیکھنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ قدموں کی آہٹ نے مجھے چوکنّا کر دیا۔ میں لپک کر لینڈ روور کی طرف بڑھا اور کوئی آواز پیدا کیے بغیر اس میں سوار ہو گیا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر سیٹ کے نیچے خفیہ خانے کو ٹٹولا اور یہ جان کر ایک نئی زندگی کا احساس ہوا کہ وہاں تمام اسلحہ موجود اور محفوظ تھا۔ میں نے آٹومیٹک رائفل فرش پر ڈال دی اور مشین گن سیٹ کے نیچے سے نکال کر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ خنجر دوبارہ میری پنڈلی پر اپنی جگہ پہنچ چکا تھا۔ ابھی میں لینڈ روور کو اسٹارٹ کرنے بھی نہیں پایا تھا کہ میں نے اپنے سامنے سے دو مسلح افراد کو گیراج کی جانب آتے ہوئے دیکھا۔ وہ آپس میں باتیں کرتے ہوئے آ رہے تھے، لیکن ان کی نگاہیں چاروں طرف کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔ ابھی ان کے اور لینڈ روور کے درمیان میں ایک جیپ حائل تھی اور مجھے اندیشہ تھا کہ اگر وہ جیپ سے گزر کر آگے بڑھے تو پھر مجھے ضرور دیکھ لیں گے۔ چنانچہ میں نے لینڈ روور کا انجن اسٹارٹ کر دیا۔ انہوں نے حیران ہو کر دیکھا اور تیزی سے لینڈ روور کی جانب بڑھے۔ جیسے ہی وہ جیپ کی اوٹ سے نکل کر سامنے آئے میں نے یکایک فل لائٹس کھول دیں۔ وہ روشنی کے سمندر میں نہا گئے اور یک لخت اتنی تیز روشنی کی وجہ سے ان کی آنکھیں میں چکا چوند پیدا ہو گئی، لیکن ان کے ہاتھ بے اختیار سٹین گنوں کی جانب گئے اور وہ سٹین گنوں کا رُخ لینڈ روور کی طرف کرتے ہوئے للکارے۔

"کون ہے، رُک جاؤ۔"

میں انہیں سوچنے سمجھنے یا صاف طور پر دیکھنے کا موقعہ نہیں دینا چاہتا تھا۔ گاڑی کو گیئر میں ڈالتے ہوئے کھڑکی سے باہر منہ نکال کر میں نے کہا۔ "امانت!"

انہوں نے حیران ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا، اتنی دیر میں لینڈ روور حرکت میں آ چکی تھی اور

طوفانی رفتار سے ان کی جانب بڑھ رہی تھی۔ ان کے چہروں پر حیرت اور خوف کے تاثرات بیک وقت نمودار ہوئے۔ انہیں سامنے تیز روشنیوں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا پھر بھی خطرے کو سونگھتے ہوئے انہوں نے اپنے دائیں بائیں چھلانگ لگانی چاہی، لیکن اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ سکتے یا آواز نکالتے لینڈ روور کے بھاری فریم نے انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ کوئی آواز نکالے بغیر کچلے گئے۔

میرے پاس پیچھے مڑ کر دیکھنے کا وقت نہیں تھا۔ اب تک میں اپنی کوشش میں کامیاب رہا تھا۔ فائرنگ یا کسی اور آواز کے بغیر میں چار محافظوں اور دو کتوں پر قابو پانے میں کامیاب رہا تھا۔ لینڈ روور کی آواز سناٹے میں سارے جنگل میں گونجنے لگی لیکن یہ میرے حق میں فائرنگ کی آواز کے مقابلے میں زیادہ محفوظ تھی۔ فائرنگ کی آواز سارے علاقے کو باخبر اور چوکنا کر سکتی تھی جبکہ موٹر کے انجن کی آواز اُن کے لیے اس قدر تشویش کا باعث نہیں تھی۔ لینڈ روور تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی مگر راستے میں ایک جیپ گاڑی حائل تھی۔ میں نے کسی پس و پیش کے بغیر ایکسی لیٹر دبایا۔ لینڈ روور کا طاقتور انجن غرّایا اور آفتِ ناگہانی کی مانند آگے لپکا۔ میں نے سر جھکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ جیپ کے اور لینڈ روور کے درمیان چند فٹ کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ پھر دوسرے لمحے مضبوط لینڈ روور نے جیپ کو ایک جھٹکے سے راستے سے ہٹا کر دُور پھینک دیا۔ میں نے ایکسی لیٹر پر اپنے پیر کے دباؤ کو مزید بڑھایا۔ اب میرا رُخ حویلی کی عمارت کے برآمدے کی جانب تھا۔

گیراج اور حویلی کی عمارت کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ پھر بھی میں نے ایکسی لیٹر کو پوری قوت سے دبایا اور وہ ایک غضبناک دیو کی مانند چنگھاڑتی ہوئی حویلی کی جانب بڑھنے لگی۔ لینڈ روور کی فل لائٹس میں حویلی کی سفید عمارت انڈے کی طرح چمک رہی تھی اور اس وقت تک عمارت میں کوئی شخص نظر نہیں آیا تھا، لیکن جوں ہی میں نے برآمدے کے پاس پہنچ کر بریک لگائی بائیں جانب سے دو مسلح آدمی بھاگتے ہوئے آگے بڑھے۔ وہ ابھی تک صورتِ حال کو پوری طرح سمجھ نہیں پائے تھے، لیکن اتنا جان چکے تھے کہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ ورنہ حویلی کی عمارت کے نزدیک عقبی میدان سے گزر کر کسی گاڑی کا رات کے وقت آ جانا ایک بالکل غیر معمولی بات تھی۔ انہوں نے اپنی رائفلیں تان کر فائرنگ کا ارادہ کیا، لیکن اس اثنا میں مجھے موقع مل چکا تھا۔ گاڑی کو نیوٹرل گیئر میں ڈال کر میں نے اپنے زانو پر رکھی ہوئی مشین گن اُٹھالی تھی۔ انہیں گولی چلانے کا موقع بھی نہیں ملا اور میری مشین گن سے اُگلنے والی گولیوں کی بوچھاڑ نے انہیں زمین بوس کر دیا۔ ظاہر ہے کہ وہ زمین پہ گرنے سے پیشتر ہی مردہ ہو چکے ہوں گے۔ رات کی تاریکی اور سناٹے میں لینڈ روور کی آواز ہی کافی بھیانک لگ رہی تھی، لیکن مشین گن کی فائرنگ نے یک لخت ہنگامہ برپا کر دیا۔ یہ آواز میلوں دُور تک گئی ہوگی۔ اس کے بعد مجھے جوابی کارروائی کے لیے پوری طرح تیار ہو جانا چاہیے تھا، لیکن مشکل یہ تھی کہ میں اکیلا تھا اور لینڈ روور میرے لیے بہت محفوظ پناہ گاہ ثابت نہیں ہو سکتی تھی۔ مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ اتنی دیر تک رضیہ اور لالی کو میری آمد کی خبر کیوں نہیں ہو سکی تھی، لیکن میرا اندازہ درست نہیں تھا۔ رضیہ کو جب میں نے برآمدے کے ایک موٹے ستون کے پیچھے سے برآمد ہوتے ہوئے دیکھا تو دل ہی دل میں اُس کی پھرتی اور ہوشیاری کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کے عقب میں لالی تھی جو قدرے سہمی ہوئی تھی، لیکن مشکل یہ تھی وہ دونوں مہمان خانے والی عمارت کے برآمدے میں تھیں جبکہ میں بڑی حویلی کے برآمدے کے سامنے پہنچا تھا۔ رضیہ نے ایک لمحہ کی تاخیر کے بغیر تیزی سے دوڑ لگا دی اور لینڈ روور کی طرف بڑھی، لیکن اس کے بالکل سامنے والی راہداری میں بھی اسی لمحے چہل پہل

پیدا ہو چکی تھی۔ اور میں تین قوی ہیکل رائفل برداروں کو بھاگ کر اپنی جانب بڑھتے ہوئے صاف اور واضح طور پر دیکھ سکتا تھا۔ انہوں نے حالات کی نزاکت کے پیشِ نظر جم کر کھڑے ہونے اور نشانہ باندھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی۔ ان کی رائفلوں سے بیک وقت گولیاں نکلیں، لیکن وہ مجھ تک نہیں پہنچ سکیں۔ یہ ان کی حماقت تھی اگر ان میں سے کوئی ایک بھی پوزیشن لے کر کھڑا ہو جاتا اور مجھ پر فائرنگ کرتا تو مجھے گولیوں سے بچنے کے لیے سر جھکانا پڑتا اور اس طرح میں انہیں اپنا نشانہ بنانے سے محروم رہ جاتا۔ ان کی نادانی میرے لیے رحمت ثابت ہوئی تھی۔ مجھے بخوبی علم تھا کہ وہ جس انداز میں فائرنگ کر رہے ہیں اس کے پیشِ نظر ان کی گولیاں کسی صورت میں بھی مجھ تک نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ چنانچہ میں نے بے خوف و خطر مشین گن کا رُخ اُن کی جانب موڑ کر ایک برسٹ مارا اور وہ بے بس مرغابیوں کی طرح ڈھیر ہو گئے۔

درحقیقت اس اچانک اور خلافِ توقع حملے نے ان سب کو بوکھلا دیا تھا۔ اس سے پہلے انہیں کبھی ایسی صورتِ حال سے دوچار نہیں ہونا پڑا تھا۔ بلکہ وہ تو شاید یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ کوئی مائی کا لال اُن کی محفوظ پناہ گاہ کا رُخ کرنے کی جرأت بھی کرے گا۔ لیکن اب اَن ہونی، ہونی بن چکی تھی اور نوشتۂ تقدیر انہیں سامنے نظر آ رہا تھا۔ اُن کی ہلاکت نے رضیہ اور لالی کو یہ موقع فراہم کر دیا تھا کہ وہ مہمان خانے اور بڑی حویلی کی عمارت کا درمیانی فاصلہ کسی رکاوٹ یا خطرے کے بغیر ہی طے کر لیں چنانچہ وہ برآمدوں میں سے گزرتی ہوئیں اس عمارت کے برآمدے تک پہنچنے میں کامیاب ہو چکی تھیں۔ جہاں تک اپنی لینڈ روور میں اُن کا منتظر تھا۔ رضیہ نے لالی کا ایک ہاتھ مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا اور وہ دونوں انتہائی تیز رفتاری سے بھاگتی ہوئی میری جانب بڑھ رہی تھیں۔ وہ جیسے ہی برآمدے کے آخری ستون کے پاس پہنچیں۔ ان کے عقب میں ایک محافظ نمودار ہوا۔ اُس کو یہ فیصلہ کرنے کے لیے مناسب وقت نہیں ملا کہ وہ پہلے لڑکیوں کو قابو میں کرے یا لینڈ روور پر حملہ آور ہو۔ اس کی یہ ہچکچاہٹ میرے لیے خوش نصیبی کا پیامبر اور خود اس کے لیے موت کا پیغام ثابت ہوئی۔ اُس نے غلطی یہ کی کہ عورتوں کو نظر انداز کر کے لینڈ روور کو نشانہ بنانے کا فیصلہ کیا، لیکن اسے یہ فیصلہ کرنے میں تاخیر ہو چکی تھی۔ وہ جن عورتوں کو صنفِ نازک سمجھ کر نظر انداز کر رہا تھا وہی اس کے لیے قیامت خیز ثابت ہوئیں۔ رضیہ نے پھرتی سے پلٹ کر اپنی بائیں ٹانگ کو فضا میں حرکت دی جو اُس کے پیٹ سے ٹکرائی۔ وہ پوری رفتار سے بھاگتا ہوا آ رہا تھا۔ رضیہ کی بھرپور ضرب کا ردِّعمل دُگنا ہو گیا اور وہ ایک چیخ مار کر دوہرا ہو گیا۔ رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دُور جا گری تھی۔ رضیہ نے جھک کر رائفل اُٹھائی اور جست لگا کر لینڈ روور کے نزدیک آ گئی۔ لالی اس سے چند فٹ کے فاصلے پر تھی اور اب اُس کی آنکھوں میں بھی اعتماد کی جھلک صاف دیکھی جا سکتی تھی۔ اس سے پہلے غالباً اسے یقینِ کامل تھا کہ وہ زندہ سلامت میری گاڑی تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہو سکے گی۔ میں نے لینڈ روور کا دروازہ کھولا اور رضیہ لپک کر اس میں سوار ہو گئی۔ لالی بھی آگے بڑھی، لیکن اتنی دیر میں تین اور محافظ سامنے سے نمودار ہو چکے تھے۔ اور اپنی رائفلوں کا رُخ ہماری طرف کر کے فائرنگ کرنے کے لیے بالکل تیار تھے۔ ان کی گولیوں کی پہلی بوچھاڑ گاڑی کے اوپر اور آس پاس سے گزر گئی۔ اتنی دیر میں رضیہ کھلی کھڑکی میں سے نشانہ لے چکی تھی اور اس کی پہلی ہی گولی نشانے پر بیٹھی تھی۔ میں نے لالی کو ایک پودے سے اُلجھ کر گرتے ہوئے دیکھا تو مشین گن ایک طرف رکھ کر اس کی جانب جُھکا اور اُسے تھام کر اپنی جانب کھینچنا شروع کر دیا۔ اس طرح رضیہ ان دو حملہ آوروں کے مقابلے میں اکیلی رہ گئی تھی۔ ان میں سے ایک کی گولی میرے کان کے پاس سے سنسناتی ہوئی گزر گئی۔ دوسری گولی لینڈ روور کی چھت سے چھو کر نکل گئی۔ لیکن تیسری گولی چلانے سے پہلے رضیہ کی رائفل سے نکلی ہوئی گولی نے حملہ آور کے جسم میں سوراخ کر دیا تھا اور وہ اوندھے منہ فرش پر گر گیا۔ اتنی

دیر میں لالی اپنے لباس کے دامن کو پودے سے آزاد کرانے میں کامیاب ہوچکی تھی اور میرا سہارا لے کر وہ گاڑی میں سوار ہوگئی۔ رضیہ کی توجہ سامنے سے ایک لمحے کے لیے ہٹی اور حملہ آور نے تاک کر نشانہ لگایا۔ رضیہ نے تیزی سے آگے کی جانب جھک کر خود کو بچایا، لیکن گولی اُس کی رائفل کی نالی سے ٹکرائی۔ ایک سنسناتی ہوئی آواز کے ساتھ ہی ایک شعلہ سے چمکا اور رائفل رضیہ کے ہاتھ سے گر گئی۔ رضیہ نے رائفل پر اپنی گرفت جان بوجھ کر ہلکی کردی تھی جو اُس کے حق میں ایک نعمت ثابت ہوئی ورنہ رائفل کی گولی کا پُرزور دھکا خود رضیہ کو بھی نقصان پہنچا سکتا تھا۔ رضیہ کے منہ سے ہلکی سی سسکاری نکلی اور وہ اوندھے مُنہ آگے گر گئی۔

یہ سب کچھ اتنے کم وقت میں ہوگیا تھا کہ میرے پاس یہ جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ رضیہ کو کتنی چوٹ آئی ہے؟ فوری طور پر تو مجھے یہ گمان گزرا کہ غالباً رضیہ گولی سے زخمی ہوگئی ہے، لیکن مجھے مشین گن سنبھالنے اور استعمال کرنے کا موقعہ مل چکا تھا اور رائفل کی دوسری گولی چلنے سے پہلے ہی میری مشین گن سے برسنے والی گولیوں نے حملہ آور کو بے جان کر دیا تھا۔ رضیہ نے سر اٹھا کر دیکھا اور اطمینان کا سانس لیا۔

"چوٹ تو نہیں آئی؟" میں نے مختصراً دریافت کیا۔

"بال بال بچ گئی۔" اُس کے چہرے پر دہشت زدگی کے آثار نمایاں تھے۔

"تم مشین گن استعمال کرسکتی ہو؟" میں نے دریافت کیا اور اُس کے اثبات میں سر ہلانے پر مشین گن اس کی جانب بڑھا دی۔

مجھے ڈرائیونگ کرنی ہے اور میری تمام تر توجہ اسی جانب رہے گی۔ اب فائرنگ اور جوابی فائرنگ کا کام تمہارے ذمے ہے۔"

میں نے سٹیئرنگ سنبھالا اور ریورس گیئر لگا دیا۔ گاڑی شور مچاتی ہوئی تیزی سے پیچھے دوڑی اور وہ شخص کچلا گیا جو عقب میں نمودار ہوکر فائرنگ کے لیے نشانہ باندھ رہا تھا اور ابھی تک ہماری نظروں سے اوجھل تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اس کی ذات کرشمہ ساز ہے اور جب وہ کسی کی حفاظت کا ذمہ لے تو اسے محفوظ رکھنے کے طریقے خود بخود نکل آتے ہیں۔

ہمیں اُس شخص کی چیخ سنائی دی اور پھر گاڑی کو ایک جھٹکا سا لگا، لیکن بھاری بھر کم گاڑی پر یہ معمولی حادثہ مطلق اثرانداز نہیں ہُوا۔ ایک اندازے کے مطابق ہم اب تک درجن بھر کے قریب حریفوں کا صفایا کرچکے تھے، لیکن میرے اندازے کے مطابق اس حویلی میں اور اس کے گردونواح میں موجود مسلح افراد کی تعداد چالیس پچاس کے لگ بھگ ہونی چاہیئے تھی۔ یہی وجہ ہے کہ میں انہیں اچانک حملے سے سنبھلنے کی مہلت نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اگر وہ پوری طرح چوکنا اور مستعد ہوگئے تو ہم لوگوں کا اُس میدانِ کارزار سے زندہ بچ کر نکلنا محال ہوجائے گا۔ میں نے گاڑی کو مُوڑنے کے بعد ڈرائیو وے پر ڈال دیا۔ یہ راستہ عمارت کے صرف ایک جانب تعمیر کیے جانے والے آہنی گیٹ کی طرف جاتا تھا۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں اس حویلی کی ایک انوکھی بات یہ تھی کہ اس کے تین اطراف میں کوئی دیوار نہیں تھی۔ صرف سامنے ایک اونچی سی دیوار اور آہنی گیٹ تھا۔ یہ عجیب و غریب بات میں نے حویلی میں آتے وقت بھی محسوس کی تھی اور اب یہاں سے رخصت ہوتے وقت بھی مجھے رہ رہ کر یہ خیال آرہا تھا کہ میں آہنی دروازے سے گزرنے کی کوشش کروں یا حویلی کے آس پاس پھیلے ہوئے علاقے کی جانب گاڑی کا رُخ کروں۔ ڈرائیو وے کے وسط میں پہنچ کر مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا اور میرے ذہن نے مجھے فوری طور پر یہی مشورہ دیا کہ مجھے آہنی دروازے سے ہی باہر نکلنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ یہ فیصلہ بروقت اور مناسب تھا۔ جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا حویلی کے آس پاس یا تو پہاڑی اور پتھریلا ناہموار

علاقہ تھا یا پھر درختوں کے ذخیرے اور نالے وغیرہ تھے۔ بظاہر یہی اندازہ ہوتا تھا کہ ارد گرد کا علاقہ چٹیل میدان ہے، لیکن اگر میں وہ راستہ اختیار کرتا تو کچھ دُور جاکر تمام راہیں مسدود ہوجاتیں...... اور مجھے لامحالہ واپس اُسی راستے کی جانب لوٹنا پڑتا جو حویلی کے واحد گیٹ سے گزر کر باہر کی طرف جا رہا تھا۔ میں پہلے گاڑی کو موڑ کر ایک سمت جانے کا تصور کر رہا تھا، لیکن اچانک یہ خیال آتے ہی میں نے گاڑی کا ایکسی لیٹر پوری رفتار سے دبا دیا اور اب لینڈ روور طوفانی رفتار سے حویلی کے گیٹ کی جانب رواں دواں تھی۔ اس دوران میں مجھے اپنے عقب میں حویلی میں رونما ہونے والے واقعات سے باخبر رہنا بھی ضروری تھا اور میری نگاہیں سائیڈ مرر پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے اچانک گیراج کے سامنے کھڑی ہوئی جیپ گاڑیوں کی روشنیاں جلتی ہوئی دیکھیں۔ فوری طور پر یہ اندازہ نہیں کرسکا تھا کہ وہ کتنی جیپ گاڑیاں تھیں لیکن اُن کی تعداد کم سے کم تین ضرور تھی جو اس بات کی علامت تھی کہ میرے شکاریوں کو یہ احساس ہوچکا ہے کہ اُن کے قیدی قفس سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہے ہیں اور وہ جوابی کارروائی کے لیے تیار ہوچکے ہیں مگر مجھے اتنا اطمینان ضرور تھا کہ سکندر میرا تعاقب کرنے والوں میں شامل نہیں تھا۔ کیونکہ میری لگائی ہوئی بھرپور ضرب اسے کم سے کم دو تین گھنٹے تک بے ہوش رکھنے کے لیے کافی تھی۔ وہ ایک بہادر اور دلکش آدمی تھا۔ اور اس کی تمام تر مجرمانہ سرگرمیوں کے باوجود میں اسے پسند کرنے لگا تھا۔ اس کے اندر انسانیت ابھی تک زندہ تھی اور وہ مکمل طور پر اپنے ضمیر کا گلا گھونٹنے میں کامیاب نہیں ہوسکا تھا۔ وہ حالات کی ستم ظریفی کے باعث یہ مجرمانہ زندگی اختیار کرنے پر مجبور ہوا تھا اور بظاہر مہذب دُنیا میں اُسکی واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

یکایک اپنے عقب میں جیپ گاڑیوں کی روشنیوں کے ساتھ ہی مجھے فائرنگ کی آوازیں بھی سنائی دیں اور میں نے تیزی سے لینڈ روور کو دائیں، بائیں لہرانا شروع کر دیا تاکہ اپنے تعاقب میں آنے والوں کی گولیوں سے محفوظ رہ سکوں۔ میرے لیے اطمینان بخش امر یہ تھا کہ میرا تعاقب کرنے والے عام جیپ گاڑیوں میں سوار تھے اور راستے کی ناہمواری کے باعث یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ فائرنگ کرتے ہوئے اطمینان سے اپنے ہدف کو نشانہ بنا سکیں۔ جبکہ لینڈ روور کی رفتار زیادہ ہموار اور پُرسکون تھی۔ رضیہ کو یقیناً ان پر یہ فوقیت حاصل تھی۔ اور اُس نے فوری طور پر اسکا یہ فائدہ بھی اُٹھا لیا۔ اُس کی مشین گن سے نکلنے والی گولیوں نے ایک جیپ کی ایک لائٹ کو بجھا دیا۔ انہوں نے تعاقب سے تو منہ نہیں موڑا، لیکن ظاہر ہے کہ انہیں یہ احساس ہوگیا کہ وہ ہماری زد پر ہیں اور ہم بلا روک ٹوک انہیں نشانہ بنانے کی قدرت رکھتے ہیں۔ آہنی گیٹ اب نزدیک آچکا تھا اور میں نے اپنی تمام توجہ گیٹ کی جانب مرکوز کردی تھی۔ میں نے رضیہ اور لالی کو سنبھل کر اور مضبوطی سے جم کر بیٹھنے کی ہدایت کی اور سٹیئرنگ پر میری گرفت اور زیادہ مستحکم ہوگئی۔ آہنی گیٹ توقع کے عین مطابق بند تھا اور اس کے سامنے ایک مسلح پہرے دار رائفل تھامے ہوئے کھڑا تھا۔ مجھے یہ پتہ نہیں چلا کہ اُس نے کب فائرنگ کا آغاز کیا تھا، لیکن اُس کی رائفل کی گولیاں ہمارے آس پاس سے شور کرتی ہوئی گزر رہی تھیں۔ پھر ایک دھماکہ ہوا اور ایک گولی نے ونڈسکرین کے پرخچے اُڑا دیے۔ اگر ہم لوگ بروقت اپنے سر نہ جھکا لیتے تو یقیناً زخمی ہوجاتے۔ ہمارے عین سامنے آہنی گیٹ تھا۔ لینڈ روور پوری قوت کے ساتھ گیٹ سے ٹکرائی اور رُک گئی۔ دروازہ بہت زیادہ وزنی تو نہیں تھا مگر پھر بھی آہنی سلاخوں سے بنا ہوا تھا۔ ایک زبردست جھٹکے سے ہم سب کے سر سامنے ٹکرائے لیکن کوئی گہرا زخم نہیں آیا۔

دروازے پر متعین چوکیدار کی ہمت اور بہادری کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی۔ گاڑی کو انتہائی تیز رفتار سے اپنی جانب آتے ہوئے دیکھنے کے باوجود وہ اپنی جگہ سے نہیں ہٹا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لینڈ روور اور آہنی

گیٹ کے درمیان سینڈوچ بن کر رہ گیا تھا۔ ایسے بے جگر اور بے خوف جاں نثاروں کی موت کا مجھے ہمیشہ بہت گہرا صدمہ ہوا کرتا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر یہ لوگ کسی بلند مقصد کی خاطر سینہ سپر ہوتے تو کتنا اچھا ہوتا؟ بہرحال چوکیدار اللہ کو پیارا ہو چکا تھا اور ہماری گاڑی کا انجن اس زبردست تصادم کی وجہ سے بند ہو گیا تھا۔ اُدھر ہمارے تعاقب میں آنے والی جیپ گاڑیوں کا اور ہمارا درمیانی فاصلہ تیزی سے سمٹ رہا تھا۔ میں نے اپنے اعصاب کو قابو میں رکھتے ہوئے گاڑی کو دوبارہ سٹارٹ کرنے کی کوشش کی اور انتہائی حیرت انگیز اور خلاف توقع طور پر انجن چالو ہو گیا۔ میرے پاس سوچنے اور عمل کرنے کے لیے زیادہ مہلت نہ تھی۔ میں نے ریورس گیئر لگایا اور اس کے ساتھ ہی گاڑی کو تیزی سے بائیں جانب کاٹا۔ گاڑی سپرنگ کی طرح گیٹ کو چھوڑ کر تیزی سے بائیں جانب ہٹ گئی اور اس کی رفتار میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی، لیکن تعاقب میں آنے والی دو جیپ گاڑیوں کے ڈرائیوروں کے پاس اتنا موقع نہیں تھا کہ وہ اپنی گاڑیوں کو روک سکتے یا اُن کا رُخ دوسری جانب موڑ دیتے نتیجہ یہ ہُوا کہ دونوں جیپ گاڑیاں پوری قوت کے ساتھ آہنی گیٹ سے ٹکرائیں۔ ایک خوفناک دھماکے کی آواز پیدا ہوئی اور آہنی دروازہ جو لینڈ روور کے دھچکے سے پہلے ہی کمزور ہو چکا تھا اُکھڑ کر زمین پر گر گیا۔ میں نے یہ جاننے کی کوشش ہی نہیں کی کہ جیپ میں سوار لوگوں پر کیا گزری۔ میں نے تیزی سے لینڈ روور کو آگے کی جانب دوڑایا اور وہ نہایت تیز رفتاری کے ساتھ آہنی دروازے کو کچلتی ہوئی باہر سڑک پر نکل گئی۔ دروازے کے ساتھ ہونے والے تصادم کی وجہ سے لینڈ روور کی ایک لائٹ ٹوٹ گئی تھی۔ سامنے کے حصے کو اور بھی شدید نقصان پہنچا تھا لیکن اطمینان کی بات یہ تھی کہ اس کے باوجود وہ چل رہی تھی۔ اور بزرگ فرما گئے ہیں کہ چلتی کا نام ہی گاڑی ہے۔ رات کی تاریکی میں محض ایک لائٹ کے ساتھ تیز رفتاری کے ساتھ ایک انجانے اور ناہموار راستے پر سفر کرنا ایک دشوار کام ہے لیکن میرے پاس اس کے سوا کوئی اور چارہ بھی نہیں تھا۔ اس کے علاوہ لینڈ روور کی تنہا لائٹ کی روشنی بھی دوسری گاڑیوں کی دو روشنیوں کے مساوی تھی۔ میں نے گردن موڑ کر ایک سرسری نگاہ اپنے عقب میں حویلی پر ڈالی جو اب اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ہمارے تعاقب میں آنے والی تیسری جیپ شاید اپنے ساتھیوں کی خبرگیری کے لیے رُک گئی تھی۔ وقتی طور پر ہمارے تعاقب میں کوئی نہیں تھا اور اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر ہم اُن لوگوں کے اور اپنے درمیانی فاصلے میں خاطر خواہ اضافہ کر سکتے تھے۔

میں نے اس رات اپنی ڈرائیونگ کی تمام صلاحیتیں صَرف کر دیں جبکہ رضیہ نہایت چوکس اور مستعد مشین گن ہاتھ میں تھامے بیٹھی رہی۔ لالی خاموش تماشائی تھی۔ اور اس ایڈونچر کے آغاز میں خاصی سہمی ہوئی نظر آتی تھی لیکن رفتہ رفتہ اس کے خوف میں کمی واقع ہو گئی اور جب ہم نے چالیس پچاس میل سفر طے کر لیا تو وہ قریب قریب نارمل ہو چکی تھی۔ ہمارے پیچھے کسی تعاقب کے آثار نہیں تھے۔ یا پھر شاید وہ لوگ بہت زیادہ فاصلے پر رہ گئے تھے۔ اسی خیال کے پیش نظر میں نے لینڈ روور کی رفتار میں کمی کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ہم برق رفتاری کے ساتھ سفر کرتے رہے اور آگے بڑھتے رہے۔ یہ جانے بغیر کہ ہم کس سمت میں جا رہے ہیں اور آیا یہ راستہ ہمیں منزل پر لے جائے گا یا کسی نئی مصیبت کے دہانے پر پہنچا دے گا؟!

یہ ایک غیر آباد اور ویران علاقہ تھا۔ سڑک پختہ تو نہیں تھی، لیکن پتھریلی اور مضبوط تھی اور زیادہ ناہموار نہیں تھی۔ ہم قریباً تین گھنٹے مسلسل سفر کرتے رہے اور اس عرصے میں ہم نے سو میل سے زیادہ فاصلہ طے کر لیا۔ اس دوران میں ہمیں اس سڑک پر کوئی اور ٹریفک نظر نہیں آیا جو اس بات کا ثبوت تھا کہ یہ ایک دور دراز اور غیر آباد سرزمین تھی جہاں تک قانون تو کیا انسانوں تک کی رسائی نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہیبت خاں جیسے ڈاکو اور رانا صاحب جیسے قانون شکن اور خونخوار مجرم بڑے اطمینان سے اپنی سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ رانا کے بارے میں مجھے جو

اطلاعات بھاگاں نے فراہم کی تھیں۔ وہ حیرت انگیز تھیں لیکن ان پر یقین نہ کرنے کی بھی کوئی وجہ نہیں تھی۔ رانا کی حویلی میں روزی کے خلافِ توقع موجودگی نے مجھے سوچ میں ڈال دیا تھا۔ مجھے یہ اندازہ تو ہو چکا تھا کہ روزی ایک اوباش طبیعت، رنگین مزاج اور مجرمانہ خصلت رکھنے والی عورت ہے لیکن اس کی رسائی کتنی دُور تک ہے؟ اس کا مجھے صحیح ادراک نہیں تھا۔ رانا کی حویلی میں اسے اپنی رعنائیاں اور پُرفریب ادائیں لٹاتے ہوئے دیکھا تو اس کی زندگی کا ایک اور رُخ میرے سامنے آ گیا۔ وہ بیک وقت مختلف بااثر جرائم پیشہ گروہوں کے سربراہوں کو اپنی رنگین اداؤں سے شکار کر رہی تھی۔ آخر اس کا مقصد کیا تھا؟ کیا لوٹنی اور شوکت کی دولت اور اثر و رسوخ اس کے لیے کافی نہیں تھا کہ اُس کی مہم جُو، جاہ طلب فطرت اپنے لیے نت نئے شکار اور راستے تلاش کرنے میں مصروف تھی؟ سب سے زیادہ پچھتاوا مجھے اس بات پر تھا کہ لوٹنی اور شوکت کے ساتھ مل کر وہ عورت میری آنکھوں میں دھول جھونکتی رہی تھی اور میں اسے ایک مکمل وفاشعار اور خدمت گزار بیوی کے روپ میں دیکھنے کا عادی ہو چکا تھا، حالانکہ وہ اس کے بالکل برعکس تھی۔

کچھ دیر بعد دن کا اُجالا پھیلنے لگا اور مجھے اردگرد کا علاقہ قدرے واضح طور پر نظر آنے لگا۔ یہ ایک پہاڑی علاقہ تھا جس میں سبزہ کم تھا لیکن درختوں کی کمی نہیں تھی۔ یہاں وہاں پتھریلے ٹیلے بھی تھے لیکن ان کے درمیان درختوں کے ذخیرے بھی موجود تھے۔ یہ پہاڑ زیادہ خطرناک نہیں تھے لیکن پھر بھی جرائم پیشہ لوگوں کے لیے بہت اچھی پناہ گاہ بن سکتے تھے۔ ہمیں سفر کرتے ہوئے کافی وقت گزر چکا تھا اور تعاقب کرنے والوں کا دور دور تک پتہ نہیں تھا جو اس بات کی علامت تھی کہ غالباً انھوں نے اس قدر بھاری نقصان اُٹھانے کے بعد ہمارا تعاقب کرنے کا ارادہ ہی ترک کر دیا تھا ورنہ اتنی دیر میں تعاقب کرنے والوں کے کچھ نہ کچھ آثار ضرور نظر آ جاتے۔ ویسے بھی ہم ان کے علاقے سے اتنی دُور نکل گئے تھے کہ ان کے لیے ہم پر قابو پانا ممکن نہیں تھا خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ ان کی جارحانہ صلاحیتوں کی کمر ٹوٹ چکی تھی۔ جیپ گاڑیوں کی تباہی کے بعد ان کے پاس محض دو قیمتی اور پُرآسائش موٹر کاریں رہ گئی تھیں اور انھیں یہ بخوبی احساس ہو چکا تھا کہ جن لوگوں سے ان کا واسطہ پڑا ہے وہ مارنے مرنے کے لیے تیار بیٹھے ہیں اور کسی طرح بھی نرم تر ثابت نہیں ہوں گے۔

یکایک رضیہ کے منہ سے ایک خوشی کا نعرہ بلند ہوا اور میں نے اچانک گاڑی روک دی۔ خوشی کا اظہار اور اس قدر نامساعد حالات میں اس کا سبب جاننے کے لیے میں نے گاڑی کو ایک جانب پتھریلی ہموار جگہ پر کھڑا کر دیا اور رضیہ کی جانب متوجہ ہوا۔ رضیہ کی نگاہیں اپنے دائیں جانب ایک خوبصورت منظر کو دیکھنے میں مصروف تھیں۔ یہ ایک انتہائی دلفریب منظر تھا۔ ہماری نگاہوں کے سامنے پہاڑیوں میں گھرا ہوا ایک شفاف پانی کا چشمہ تھا جس کا جھلملاتا، جھاگ اُڑاتا ہوا پانی چھوٹے چھوٹے آبشاروں کی صورت میں نیچے ایک چھوٹی سی جھیل میں گر رہا تھا۔ جھیل کے آس پاس سرسبز قد آور درخت سر اُٹھائے کھڑے تھے جیسے پہریدار ہوں۔ میں اپنے خیالات کی رَو میں کھویا رہا تھا اور پھر شاید مسلسل ڈرائیونگ اور تعاقب کے اندیشے نے میری دوسری حسیات کو اس طرح مفلوج کر دیا تھا کہ میں آس پاس کے مناظر کی طرف سے قطعی بے خبر تھا۔ یہ منظر ایک انتہائی مسرور کن تصویر پیش کر رہا تھا اور ہم لوگ تھوڑی دیر پہلے جس کشیدہ اور ہیجان انگیز تجربے سے گزر چکے تھے اس کے بعد یہ نظارہ ہمارے تھکے ہوئے ذہن اور اعصاب کے لیے سکون بخش تھا۔ میں نے گاڑی کی رفتار کم کی اور پھر انجن بند کر کے اسے ایک جانب روک دیا۔ اپنی ٹانگیں سیدھی کرنے اور نظاروں سے زیادہ اچھی طرح لطف اندوز ہونے کے خیال سے میں گاڑی سے باہر نکل کر جھیل کی طرف

بڑھا۔ ماحول کے سناٹے میں چشمے اور ننھے ننھے آبشاروں کا پانی ایک مدھم نغمے کی سی کیفیت پیدا کر رہا تھا۔ ہر طرف ایک تازگی بخش خوشبو پھیلی ہوئی تھی جو غالباً خود رُو پھولوں اور سبزے کی وجہ سے ماحول میں رَچ بس گئی تھی۔ اپنے خیالات کو ذہن سے جھٹک کر میں خالی الذہن ہو کر جھیل کی جانب چل پڑا۔ ایک طویل عرصے کے بعد میں نے ایک قدرتی منظر کو دیکھ کر دل میں لُطف اور تازگی محسوس کی تھی۔ شاید اس سے پہلے کشمکشِ روزگار نے مجھے ان چیزوں کی طرف متوجہ ہونے کا موقعہ ہی نہیں دیا تھا۔ اس لمحے میرے دل میں یہ خواہش بڑی شدّت سے پیدا ہوئی کہ کاش میری زندگی میں کوئی ایسا وقت بھی آئے جب میں اپنے آس پاس بکھرے ہوئے قدرتی حسن اور پُر فضا مقامات سے لُطف اندوز ہونے کے لیے مہلت نکال سکوں اور دوسرے لاکھوں انسانوں کی طرح ایک نارمل زندگی بسر کر سکوں۔ لیکن خدا جانے میرے کن گناہوں کا خمیازہ تھا یا کسی فقیر کی بددُعا تھی جو مجھے مسلسل پریشانیوں میں مبتلا رکھتی تھی اور میں زندگی کی ہر آسائش سے لُطف اندوز ہونے کے مواقع سے محروم ہو چکا تھا۔ میری زندگی ایک بے مہم جدّوجہد اور زندہ رہنے کی مسلسل تگ و دو بن کر رہ گئی تھی۔ جب کہ دنیا میں بے شمار خوش نصیب لوگ دولت سے محروم رہنے کے باوجود ایک پُر سکون اور راحت آمیز زندگی بسر کر رہے تھے۔ کتنے خوش قسمت تھے وہ لوگ۔ کاش مجھے بھی ساری دولت اور آسائش لے کر خدا ایسی ہی زندگی عنایت کر دے۔

اپنے عقب میں آہٹ سُن کر میں خیالات سے چونکا۔ رضیہ بھی میری دیکھا دیکھی لینڈ روور سے باہر نکل آئی تھی اور میرے قریب پہنچ چکی تھی۔ لالی غالباً ابھی تک سہمی ہوئی تھی اس لیے اس نے گاڑی میں بیٹھے رہنے کو ہی ترجیح دی تھی۔ رضیہ ہولے ہولے میری جانب آ رہی تھی۔ اس کا دوپٹہ صبح کی تازہ اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے بادلوں کی طرح اُڑ رہا تھا اور وہ خود بھی شبنم کی طرح تر و تازہ اور پاکیزہ نظر آ رہی تھی۔ اس کے بال بے ترتیب ہو کر عارض اور شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے پر ایک طمانیت بخش مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں خوابوں کی سی کیفیت۔ یہ رضیہ کا ایک نیا روپ تھا۔ وہ عورت آہستہ آہستہ بتدریج میرے سامنے کھل رہی تھی اور ہر بار میں اس کا ایک نیا رُخ دیکھ کر حیران رہ جاتا تھا۔ حویلی سے فرار ہوتے وقت رضیہ نے جس بہادری اور عزم کا مظاہرہ کیا تھا وہ میرے لیے ناقابلِ یقین تھا۔ اس نے ایک آہنی اعصاب رکھنے والی عورت کا کردار ادا کیا تھا۔ جس پامردی اور مہارت سے اُس نے مشین گن کا استعمال کیا تھا اس کے پیشِ نظر یہ اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا تھا کہ وہ ایک عام' نازک سی گھریلو عورت ہے۔ یوں معلوم ہوا جیسے اسکی ساری زندگی جنگ و جدل اور خوں ریزی میں ہی گزر چکی ہے۔ حالانکہ میرے خیال میں وہ اس کی زندگی میں خوں ریزی کا پہلا واقعہ ہو گا۔ وہ بے دریغ گولیاں برساتی رہی تھی اور میں نے جو ذمے داری اس کو سونپی تھی۔ وہ اس نے بطریقِ احسن پوری کی تھی۔ لیکن ایک گھر گرہستی عورت سے اس قسم کے کارنامے کی توقع رکھنا عام حالات میں ناممکن اور ناقابلِ تصوّر ہے۔

میں رضیہ کو اپنی جانب بڑھتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ میرے نزدیک آ کر کھڑی ہو گئی۔

"کتنی خوبصورت جگہ ہے!" اس نے چاروں طرف کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "جی چاہتا ہے بس یہیں رہ پڑو۔"

اس کی طبیعت کی رومانی کیفیت پر مجھے کوئی تعجب نہیں ہوا۔ وہ ایک اچھے خاندان کی تعلیم یافتہ' روشن خیال عورت تھی اور بہت اچھے ذوق کی مالک تھی۔ وہ اپنی خوبیوں کے باعث رفتہ رفتہ مجھے متاثر کرنے لگی تھی۔ ایک لمحے کے لیے میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ کیا ہی خوب ہوتا اگر قسمت روزی کی جگہ رضیہ کو

میرا جیون ساتھی بنا دیتی تو زندگی کس قدر حسین اور مسرور کُن ہوتی؟ لیکن پھر اس خیال کے بیلے میں خود کو نفریں کرنے لگا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ مجھے زندگی میں پہلی بار عاشی کے سوا کسی اور عورت کو زندگی کا شریک بنانے کا خیال آیا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے میں نے اپنی شادی شدہ زندگی میں بھی عاشی کے سوا کسی اور کے بارے میں کبھی نہیں سوچا تھا۔ روزی بظاہر میری باوفا اور انتہائی محبّت کرنے والی بیوی رہی تھی لیکن اس کے باوجود میں نے کبھی اس کے ساتھ طمانیت، سکون، خوشی اور آسودگی محسوس نہیں کی تھی مگر یہ عورت رضیہ پُر اسرار انداز میں رفتہ رفتہ نہایت آہستگی سے میرے وجود میں سماتی جا رہی تھی۔ اپنی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے وہ میرے دل میں اپنا مقام بنانے لگی تھی جو میرے لیے عاشی کے ساتھ بیوفائی کے مترادف تھا لیکن کیا میں عاشی کے بارے میں اس انداز سے سوچنے میں حق بجانب تھا جبکہ وہ کبھی میری زندگی کا حصہ ہی نہیں بن سکتی تھی؟ لیکن پھر بھی یہ کیسی عجیب و غریب بات تھی۔ میں خوشی اور غم کے کسی بھی لمحے میں — عاشی کے خیال سے غافل نہیں رہ سکا تھا۔ میرے خواب و خیال پر ہمیشہ اسی کی حکمرانی رہی تھی۔ تو پھر رضیہ کو میں اپنی زندگی میں کیا درجہ دوں؟

رضیہ خاموشی سے میرا چہرہ تکتی رہی۔ وہ میرے بولنے کا انتظار کر رہی تھی۔ میری نگاہیں اس کے درخشاں چہرے پر جمی ہوئی تھیں لیکن خیالات کی رَو کہیں سے کہیں جا پہنچی تھی۔ غالباً میری نگاہوں میں کوئی ایسی کیفیت تھی جس نے یکایک رضیہ کو شرما کر نگاہیں جھکانے پر مجبور کر دیا تھا۔ ہو سکتا ہے اس کو وہ الوداعی لمحہ یاد آ گیا ہو جب میں اس سے رخصت ہو کر گیراج کی جانب گیا تھا اور وہ بے اختیار میرے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار کر بیٹھی تھی!؟

"رضیہ" میں نے نرمی سے اسے مخاطب کیا۔ "ہم دونوں انجان مسافروں کی طرح ملے تھے لیکن اب کتنے عرصے سے ہم سفر بنے ہوئے ہیں۔ ہمارا یہ سفر نہ جانے کب ختم ہو گا اور اس سفر کے خاتمے پر خدا جانے ہماری منزلیں کتنی مختلف ہوں گی۔"

وہ خاموش مجھے دیکھتی رہی۔ ظاہر ہے اس کو بھی کم از کم یہ معلوم ہو چکا تھا کہ میں ایک آوارہ مسافر ہوں جو انجانی منزلوں کی تلاش میں بھٹکتا پھر رہا ہے اور وہ خود کسی اور شخص کی بیوی ہے جو اسے حد سے زیادہ چاہتا ہے۔ وہ اپنے شوہر کو ناپسند کرتی تھی اور مجھے اب اس بات کا بخوبی احساس ہو چکا تھا کہ میرے ساتھ گزرنے والا ہر لمحہ اس ناپسندیدگی میں اضافہ کرنے کا باعث تھا۔ رفتہ رفتہ وہ مجھے پسند کرنے لگی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ ایک مشرقی، شادی شدہ عورت تھی اور اس حیثیت میں اس کا اور میرا ملاپ ممکن نہیں تھا۔ پھر میری زندگی جس نشیب و فراز سے گزر رہی تھی اس میں فی الحال سکون سے کسی جگہ قیام کرنے اور آرام سے زندگی گزارنے کا کوئی امکان ہی نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ عاشی کے بعد وہی ایک ایسی ہستی تھی جس کے سامنے اپنا دل کھولنے کو جی چاہتا تھا۔ اس لمحے میں نے فیصلہ کیا کہ اپنے بارے میں اس کو کسی اور فریب میں مبتلا کرنے کی بجائے بہتر ہو کہ میں اسے اپنی اصلیت بتا دوں۔

میں نے کہا۔ "رضیہ۔ میں تمہارے بارے میں قریب قریب سب کچھ جانتا ہوں۔ لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ اب تک تم میرے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی ہو۔ کیا تم میرا احوال سننا پسند کرو گی؟"

وہ اداسی سے مسکرائی اور کہنے لگی "مجھے پتہ ہے کہ یقیناً یہ کوئی اداس کرنے والی کہانی ہو گی۔ لیکن بہتر ہو کہ تم مجھے ضرور سُنا دو اور کچھ نہیں تو شاید اس طرح تمہارے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔" اس کا خیال بالکل دُرست تھا۔ میں اپنے دل و دماغ پر جن اَن گنت صدموں کے نشانات لیے پھر رہا تھا ان کا بوجھ ہلکا

کرنے کے لیے کسی نہ کسی کو ہمراز بنانا ضروری تھا۔ اور یہ حقیقت تھی کہ رضیہ کی شکل میں پہلی بار مجھے ایک قابلِ اعتماد اور ہمدرد رفیق ملا تھا۔ وہ ایک شائستہ اور سلیقہ مند عورت تھی اور اس نے بڑی خوبصورتی اور خوش اسلوبی سے ساتھ میرے بارے میں اپنی دلچسپی اور اشتیاق کا اظہار کیا تھا جو اس کی ذہانت اور سمجھ داری کا ایک اور ثبوت تھا۔

میں نے لینڈ روور کی طرف دیکھ کر کہا: "اس وقت کافی یا چائے کی خواہش شدت سے محسوس ہو رہی ہے گاڑی میں چلئے اور کافی کا سامان بھی موجود تھا۔ میرا خیال ہے کہ کافی پیتے ہوئے میں تمہیں اپنی کہانی سناؤں گا تو تمہیں کیسا لگے گا؟"

"بہت تلخ۔" وہ مسکرائی۔ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ کہنے لگی: "دیکھئے ایک تو کافی بہت تلخ ہوتی ہے۔ اوپر سے آپ کی کہانی بھی کچھ کم نہیں ہوگی۔ ایسا نہ ہو کافی کی وجہ سے اس کی کڑواہٹ اور بڑھ جائے۔"

"پھر بھی میں یہی چاہوں گا کہ میری کہانی کی کڑواہٹ میں کمی نہ ہونے پائے۔" یہ کہہ کر میں نے گاڑی کے پاس پہنچ کر لالی کو کافی کا سامان، پیالیاں اور چینی نکال کر دی۔ تیل کا چولہا بھی گاڑی میں موجود تھا۔ لالی کافی بنانے میں مصروف ہوگئی اور ہم دونوں ٹہلتے ہوئے جھیل کی طرف چلے گئے۔ وہاں ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر میں نے رضیہ کو شروع سے آخر تک اپنی داستانِ حیات بلا کم و کاست سنا دی۔ اپنی کتابِ زندگی کا کوئی ورق بھی اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں رہنے دیا۔ مجھ پر نہ جانے کس قسم کی ذہنی کیفیت طاری تھی کہ میں نے اس کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا تھا۔ ایسا واقعہ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ میں نے اپنے تمام دکھ، مصائب اور مسائل اپنی ذات تک ہی محدود رکھے تھے۔ رضیہ خاموش، گم صم سنتی رہی تھی۔ اس دوران میں لالی کافی بنا کر لے آئی تھی اور خاموشی سے واپس چلی گئی تھی۔ میں نے اپنی کہانی بہت مختصر الفاظ میں رضیہ کو سنائی تھی پھر بھی کافی وقت لگ گیا۔ اس اثنا میں وہ بہت انہماک سے سنتی رہی تھی۔ میں نے اسے عاشی کے بارے میں بتایا۔ اپنے دوست شوکت کی بے مہریوں اور اپنی بیوی روزی کی بے وفائیوں کا قصہ بیان کیا۔ میرے ہم شکل لوٹی کے اچانک وارد ہو جانے کے واقعات نے اسے حیرت زدہ کر دیا تھا۔ میرے ساتھ جو کچھ بھی پیش آیا تھا وہ سب کچھ میں نے مختصر لفظوں میں اسے سنا دیا۔ یہ داستان سنتے ہوئے اس کے چہرے پر مختلف رنگ آتے اور جاتے رہے۔ جب کہانی ختم ہوئی تو میں نے اس کی آنکھوں میں نمی محسوس کی۔ وہ بہت دکھ بھرے انداز میں مجھے دیکھتی رہی۔ منہ سے ایک لفظ بھی نہیں بولی۔ مگر اس کے چہرے پر بکھرے ہوئے تاثرات اس کی کیفیت بیان کرنے کے لیے بہت کافی تھے۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر میں اچانک گھڑی کی طرف دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "اب ہمیں چلنا چاہیے مانا کہ رانا اور اس کے ساتھی ہمارے تعاقب میں نہیں ہیں پھر بھی ہمیں زیادہ وقت گزارنے سے پہلے کسی محفوظ مقام پر پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔"

وہ بھی اٹھ کر کھڑی ہوگئی لیکن یوں لگتا تھا جیسے وہ ان لمحات کو مزید طول دینا چاہتی تھی۔ ایک لمبی سرد آہ اس کے منہ سے نکل گئی۔ پھر وہ کہنے لگی۔ "قدرت کے کھیل بھی انوکھے ہوتے ہیں۔ انسانوں کو کیسے کیسے امتحانوں میں ڈالتی ہے۔ تمہاری کہانی واقعی حیرت انگیز ہے۔ ایسی کہانیاں تو افسانوں میں بھی نہیں ملتیں۔"

میں نے کہا۔ "افسانے بھی تو زندگی کے واقعات کا پرتو ہوتے ہیں۔ ان میں بھی کوئی نہ کوئی حقیقت ضرور ہوتی ہے۔"

وہ میرے ساتھ لینڈ روور کی جانب چلنے لگی جہاں تنہائی سے اکتا کر لالی نہ جانے کب سو گئی تھی۔

"اگر اس وقت میں تمہاری جگہ ہوتی تو پتہ ہے سب سے پہلے کیا کرتی؟" رضیہ نے اپنی مسکراتی ہوئی سیاہ خوبصورت آنکھوں سے دیکھتے ہوئے مجھ سے کہا۔

"کیا؟"

"سب سے پہلے میں یہ جاننے کی کوشش کرتی کہ ہم اس وقت کس جگہ ہیں۔ یہ کون سا علاقہ ہے؟ اور یہ سڑک ہمیں آخر کہاں لے جائے گی؟"

"بات تو ٹھیک ہے۔" میں نے تسلیم کر لیا۔ "لیکن ہم نے ابھی تک کسی دوسرے ذی روح کی شکل تک نہیں دیکھی ہے۔ پھر یہ معلومات کس سے حاصل کر سکتے ہیں؟"

وہ پھر مسکرائی: "میں تمہاری جگہ ہوتی تو اس سڑک سے ہٹ کر آس پاس کوئی بستی یا مکان تلاش کرتی۔ جھونپڑیاں، بستیاں، ریسٹ ہاؤس تو ہر علاقے میں ہوتے ہیں۔"

اس نے واقعی درست کہا تھا۔ مجھے کسی بستی، مکان یا ریسٹ ہاؤس کی کھوج لگانی چاہیئے تھی اور ظاہر ہے کہ میں جس راستے پر معروفِ سفر تھا اس کے ساتھ لبِ سڑک کسی ریسٹ ہاؤس یا بستی کا ہونا ضروری نہیں تھا۔ ہم دونوں نے بے خبر سوئی ہوئی لالی کو بیدار کیا تو وہ آنکھیں ملتی ہوئی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے کہا۔

"پتہ ہے۔ میں کیا خواب دیکھ رہی تھی؟"

"ہمیں بھلا کیسے پتہ ہو سکتا ہے؟" رضیہ نے مسکرا کر کہا۔

"میں ایک بہت رنگین خواب دیکھ رہی تھی۔ اپنی شادی کے بارے میں۔"

"اچھا اچھا۔ اس کی تفصیل بتانے نہ بیٹھ جانا۔" رضیہ نے اسے چھیڑا۔ "ہم لوگوں کے پاس وقت نہیں ہے اور ہمیں جلد ہی کسی ٹھکانے تک پہنچنا ضروری ہے۔ اس طرح آخر ہم کب تک بھٹکتے اور مصیبتوں کا شکار ہوتے رہیں گے۔"

رضیہ نے کافی کا سامان دوبارہ گاڑی میں رکھ دیا اور ہم نے ایک بار پھر اپنے اگلے سفر کا آغاز کر دیا۔ رضیہ کا خیال بالکل درست تھا۔ تھوڑے فاصلے کے بعد ہی ہمیں ایک کچا راستہ نظر آ گیا جو درختوں کے درمیان سے ہو کر بلندی کی طرف جاتا تھا۔ میں نے چپ چاپ اس راستے پر گاڑی کا رخ موڑ دیا۔ راستہ کچا ضرور تھا لیکن پتھریلا اور صاف تھا جس کی وجہ سے ہمیں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ تقریباً ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم نے اس عمارت کو دیکھ لیا۔ وہ ایک پرانی وضع کی ریسٹ ہاؤس کی عمارت تھی۔ اس کے آس پاس درخت تھے۔ ایک جانب پہاڑیاں تھیں اور بائیں جانب گہرے کھڈ تھے۔ عمارت کے اردگرد پتھروں سے بنی ہوئی چار دیواری تھی اور ایک لکڑی کا گیٹ اس میں نصب تھا۔ جب کچھ اور قریب پہنچے تو میں نے ایک جانب درختوں کے سائے میں کھڑی ہوئی جیپ گاڑی کو بھی دیکھ لیا۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ ایک ایسی جگہ تھی جہاں گزرنے والے مسافر تمام طور پر قیام کیا کرتے تھے۔ رضیہ نے مسکرا کر مجھے ٹہوکا دیا اور کہنے لگی: "دیکھا آپ نے؟ آخر ایک عمارت مل ہی گئی نا۔ اس کے اندر کچھ آدمی بھی مل جائیں گے جن سے ہم ضروری معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔"

"واقعی۔ مان گیا ہوں آج تو۔ ورنہ میں عورتوں کی عقلمندی کا قائل نہیں تھا۔" رضیہ اور لالی دونوں ہنس پڑیں۔

ہم نے گیٹ کے اندر داخل ہو کر اس جیپ گاڑی کے نزدیک ہی اپنی گاڑی پارک کر دی۔ میں نے گاڑی

سے باہر قدم نکالا اور اُن دونوں کو وہیں بیٹھے رہنے کا اشارہ کر کے ریسٹ ہاؤس کی عمارت کی طرف چل پڑا۔ برآمدے میں کوئی موجود نہ تھا۔ اس لیے مَیں نے عمارت کے عقب کا رُخ کیا۔ کچھ فاصلے پر مجھے شکستہ سی کوارٹر عمارت بھی نظر آگئی۔ یقیناً یہ چوکیدار کا مکان ہو گا۔ مَیں نے اطمینان سے کوارٹر کی طرف قدم بڑھایا لیکن پھر اچانک ٹھٹک کر رہ گیا۔ ایک بندوق کی نالی میری پشت کو سہلا رہی تھی۔

مَیں نے کسی گھبراہٹ یا عجلت کا مظاہرہ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ آہستگی سے گردن موڑ کر دیکھا۔ میرے سامنے ایک قد آور مضبوط دیہاتی کھڑا ہوا تھا۔ اس کے سر پر اُونی ٹوپی رکھی ہوئی تھی اور اس کی سُرخ آنکھیں چمک رہی تھیں۔

"کون ہو جی۔ کیا مانگتے ہو؟" اُس نے کھُردری دیہاتی آواز میں سوال کیا۔

مَیں نے نرمی سے کہا: "مَیں تو مسافر ہوں۔ مگر تم کون ہو اور مسافروں کو بندوق سے کیوں ڈراتے ہو؟"

اس نے بندوق کی نالی فوراً ہٹا لی اور دوسرے ہاتھ سے مجھے سلیوٹ مارتے ہوئے کہا: "معاف کرنا صاحب مَیں آپ کو پہچانا نہیں تھا۔ اِدھر مسافر بہت کم آتے ہیں اور بہت سنسان جگہ ہے اس لیے ہوشیار رہنا ہی پڑتا ہے۔" اُس کا لہجہ خاصا مؤدبانہ تھا۔

"تم چوکیدار ہو شاید۔" مَیں نے بڑے مربیانہ انداز میں پوچھا۔

"جی صاحب۔" اس نے دانت نکال دیئے۔ "آپ کدھر سے آرہے ہو صاحب۔ کیا سرکاری افسر ہو؟"

"ارے نہیں۔ افسری سے ہمارا دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ ہم تو تھوڑی دیر سستانے کے لیے اِدھر چلے آئے ہیں۔"

"کوئی اور بھی آپ کے ساتھ ہے سر؟" وہ مستعدی سے پوچھنے لگا۔

"ہاں۔ گھر والے بھی ہیں۔ تم یہ بتاؤ۔ کوئی کمرہ بھی خالی ہے تمہارے ریسٹ ہاؤس میں؟ وہاں باہر مَیں نے ایک اور جیپ گاڑی بھی کھڑی دیکھی ہے۔" مَیں نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے ریسٹ ہاؤس میں مقیم لوگوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنی چاہیں۔

"ایک اور صاحب بھی ٹھہرے ہوئے ہیں جناب۔ وہ دو دن پہلے اپنے ڈرائیور اور بیگم صاحب کے ساتھ آئے تھے۔ پھر بیگم صاحب تو ڈرائیور کے ساتھ چلی گئیں۔ صاحب لوگ اِدھر ہی ٹھہرے ہوئے ہیں۔ بیگم صاحب کا انتظار کرنا مانگتے ہیں شاید۔"

"ٹھیک ہے۔" مَیں اس کے ساتھ عمارت کی طرف بڑھا: "مجھے فی الحال ایک کمرے کی ضرورت ہے۔"

"آیئے سر میرے ساتھ۔" وہ بندوق کو کندھے میں لٹکا کر آگے آگے چل پڑا۔ برآمدے میں پہنچ کر اس نے کچھ دُور کھڑی ہوئی لینڈ روور کو بھی دیکھ لیا اور اس میں بیٹھی ہوئی خواتین کو بھی۔ بائیں جانب ایک دروازہ کھولتے ہوئے اس نے مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ میرے سامنے ایک خاصا صاف ستھرا اور کشادہ کمرہ تھا۔ ایک مسہری اور تین کُرسیاں بھی اس میں فرنیچر کے طور پر موجود تھیں۔ کھڑکی پر سستے کپڑے کے رنگین پردے لٹک رہے تھے۔

"آپ آرام کریں سر۔ مَیں بیگم صاحب کو اور سامان کو لے کر آتا ہوں۔"

مَیں مسہری پر بیٹھ گیا اور اپنی بے سروسامانی اور مسافرت کے بارے میں سوچنے لگا۔ تھوڑی دیر میں چوکیدار، لالی اور رضیہ کو لے کر واپس آگیا۔ سامان انھوں نے گاڑی میں سے نکالنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ اور ہمارے پاس سامان تھا بھی کیا؟ ظاہر ہے ہتھیاروں کی نمائش تو کی نہیں جا سکتی تھی۔ رضیہ نے

چوکیدار کو گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا تو مشین گن اور رائفل کو سیٹوں کے پیچھے چھپا کر اس کے نزدیک پہنچنے سے پہلے ہی گاڑی سے نکل آئی تھیں۔

"تمہارا نام کیا ہے۔" مَیں نے چوکیدار سے پوچھا۔

"گُل خان جناب۔"

"بیوی بچّے بھی ہیں تمہارے؟"

"وہ اپنی ماں کے گھر گئی ہوئی سر۔ بچّہ تو ابھی کوئی نہیں ہے۔"

"اچھا گُل خان۔ تم یہ بتاؤ کہ اس ریسٹ ہاؤس کا کیا نام ہے اور اس کے آس پاس کون کون سے علاقے ہیں؟"

گُل خان نے فوراً معلومات کا خزانہ کھول دیا۔ مجھے تو اس علاقے کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ مگر رضیہ مقامات اور سڑکوں کے نام سُن کر معنی خیز انداز میں سر ہلا رہی تھی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے اشارہ کر رہی تھی کہ وہ سب سمجھ گئی ہے۔ گُل خان کی تقریر تین چار منٹ تک جاری رہی جس کے بعد مَیں نے جیب سے ایک سو روپے کا نوٹ نکال کر اس کے حوالے کیا اور اچھی سی چائے اور آملیٹ بنانے کی فرمائش کی تو وہ فوراً غائب ہو گیا۔

رضیہ نے مجھے بتایا کہ ہم اب تک مخالف سمت میں سفر کرتے رہے ہیں۔ ملک منصور کے ڈیرے پر جانے کے لیے ہمیں چند میل واپس جانا پڑے گا اور اس کے بعد ایک کچّی سڑک ہمیں اپنی منزل کی طرف لے جائے گی۔ اب سوال یہ تھا کہ کیا ہمیں ملک منصور کے پاس جانا چاہیئے؟ ہم کچھ نہیں جانتے تھے کہ ہیرا ڈاکو کے اڈّے پر ملک منصور پر کیا بیتی تھی اور اُس نے ہم لوگوں کے بارے میں اسے کیا معلومات فراہم کی تھیں! پھر چوہدری کے ڈیرے پر ملک منصور نے ہمارے متعلق کیا سُنا تھا یہ بھی ہمیں معلوم نہیں تھا۔ بہت ممکن تھا کہ وہ غصّے میں پیچ و تاب کھا رہا ہو اور خاص طور پر میرے خون کا پیاسا ہو۔ رضیہ کے متعلق اس کے تاثرات اور جذبات کا اندازہ لگانا بھی قطعی ناممکن تھا۔ لیکن اگر اُس کے پاس نہ جائیں تو رضیہ اور لالی کا کیا بنے گا؟ ظاہر ہے کہ مَیں ان دونوں کو اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا تھا۔ مجھے اپنی مشکل کو آسان کرنے کی راہ تلاش کرنا تھی اور مَیں ان دونوں کو بلاوجہ جان جوکھوں میں نہیں ڈال سکتا تھا۔ دوسری صورت میں یہ علم نہیں تھا کہ اگر ہم ملک منصور کے پاس چلے گئے تو وہ ہمارے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟

رضیہ بھی خاموشی سے اس مسئلے پر غور کرتی رہی پھر اچانک سَر اٹھا کر بولی: "ہمیں کوٹھی پر جانا چاہیئے۔ ہماری مشکلات کا آسان حل یہی ہے۔"

"مگر رضیہ۔" مَیں نے زبان کھولی۔

"سنو یوسف۔ تم خود اپنی مصیبت میں گرفتار ہو۔ مَیں تمہیں راہ سے ہٹانا نہیں چاہتی۔ اس کے علاوہ تم ہمیں لے کر جاؤ گے بھی کہاں؟"

مَیں خاموشی سے اس کا چہرہ تکتا رہا۔

"تمہاری داستان سننے کے بعد ہمارے لیے اس کے سوا کوئی اور چارہ بھی نہیں ہے۔"

"مگر رضیہ۔ ملک منصور....."

اس نے میری بات کاٹ دی۔ "ملک منصور میری پرابلم ہے۔ مَیں جانتی ہوں کہ اس سے کیوں کر نمٹا جا سکتا ہے اور پھر ملک منصور کسی حالت میں بھی مجھے تکلیف نہیں پہنچا سکتا۔"

مَیں رضیہ کی بات کا مفہوم پوری طرح سمجھ چکا تھا۔ واقعی حالات کے مطابق اس کے علاوہ کوئی اور صورت بھی نہیں تھی۔ اتنی دیر میں چوکیدار گرما گرم آملیٹ اور چائے لے کر آگیا۔ ہم پہلے بھی کافی چائے پی چکے تھے۔ لیکن آملیٹ کے ساتھ اس گرما گرم کڑک چائے کا لطف ہی کچھ اور تھا۔ مجھے سوچنے کے لیے کچھ اور مہلت درکار تھی اس لیے میں کمرے سے باہر نکل گیا۔ بظاہر مَیں آس پاس کا نظارہ کر رہا تھا لیکن درحقیقت مَیں کسی فیصلے پر پہنچنے کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنا چاہتا تھا۔ مَیں ٹہلنے کے انداز میں عمارت کے اردگرد گھومتا رہا پھر برآمدے میں داخل ہو کر اس کمرے کی جانب چلا گیا جسے ڈرائنگ روم کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ سستے مگر آرام دہ صوفے یہاں بھی موجود تھے۔ ڈرائنگ روم کے اندر ہی ایک دروازہ تھا جو ساتھ والے بیڈ روم میں جاتا تھا۔ مَیں بید کے صوفے پر ٹانگیں پھیلا کر نیم دراز ہو گیا۔

یکایک سامنے والے بیڈ روم سے ایک آواز بلند ہوئی "چوکیدار۔ کدھر مر گیا؟" آواز خوابیدہ اور نشے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے مَیں اس آواز سے مانوس ہوں۔ اسے کہیں سُن چکا ہوں مگر کہاں؟

آواز دوبارہ بُلند ہوئی "اُلّو کے پٹھے، گدھے کے کان۔ کدھر چلا گیا ہے؟"

اسی وقت چوکیدار تیزی سے اندر آیا۔ مگر مَیں نے اسے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اور اس کا ہاتھ تھام کر برآمدے میں لے گیا۔ "گُل خان۔ تم اپنے کوارٹر میں جاؤ۔"

"مگر صاحب۔ وہ والا صاحب بہت گرم ہو رہا ہے۔"

"اس کی تم فکر مت کرو۔ وہ ہمارا رشتے دار ہے۔ ہم اس سے باتیں کریں گے۔ تم جا کر آرام کرو۔"

"مگر سر۔ وہ ناراض ہو گیا تو ....."

مَیں نے سو سو کے دو نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے اور وہ خاموشی سے سر ہلاتا ہوا رُخصت ہو گیا۔

مَیں دوبارہ ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا۔ مگر میرے تمام جسم میں ایک عجیب وغریب سنسنی سی پھیلی ہوئی تھی۔ دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا اور مَیں یکایک اپنی ٹانگوں میں کمزوری محسوس کرنے لگا تھا۔ ایک گرم لہر سر سے پیر تک میرے جسم میں دوڑنے لگی تھی، اس لیے کہ اندر سے پکارنے والے شخص کی آواز کو مَیں بخوبی پہچان گیا تھا۔ وہ میرے دغا باز دوست شوکت کی آواز تھی۔

شوکت، میرا بہترین دوست، میرا بدترین دشمن جسے میں کسی زمانے میں اپنا ہمراز، دم ساز اور ہمدرد سمجھتا تھا۔ جس کی دوستی پر مجھے ناز تھا۔ جس کے خلوص پر مجھے پورا اعتماد تھا۔ لیکن بعد میں مجھے پتہ چلا کہ وہ ایک بدنیت، بددیانت اور خود غرض شخص تھا۔ میرے ساتھ اس کی دوستی اور محبت محض دکھاوے کی تھی۔ وہی تھا جس نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت میری محبت، عاشی کو ہمیشہ کے لیے مجھ سے دُور کر دیا تھا۔ اسی نے روزی سے میری شادی کرائی تھی لیکن میرے ہم شکل مجرم لوٹی کے ساتھ مل کر مجھے برباد کرنے پر تُلا ہوا تھا۔ پچھلے دنوں میں شوکت کے بارے میں سوچنے کا مجھے بہت کم وقت ملا تھا لیکن اپنے اس "دوست" کی مہربانیوں کے لگائے ہوئے زخم مَیں سینے سے لگائے بیٹھا تھا۔ اس کا بخشا ہوا درد شاید زندگی بھر کے لیے پیرِ تسمہ پا کی طرح میرے کاندھوں پر سوار ہو گیا تھا۔ عجیب اتفاق تھا۔ چند گھنٹے قبل مَیں نے رانا صاحب کی حویلی میں روزی کو ناز و ادا لٹاتے ہوئے دیکھا تھا اور اب اس دور دراز اور سنسان ریسٹ ہاؤس میں شوکت کی موجودگی کا پتہ چلا تھا۔ یہ دونوں ایک ہی کہانی کے دو کردار تھے اور ظاہر ہے کہ اس ریسٹ ہاؤس میں شوکت کی موجودگی کا تعلق یقیناً رانا کی حویلی میں روزی کی موجودگی سے بھی تھا۔ وہ ایک چالاک، خود غرض اور سازشی ذہن

کا آدمی تھا۔ جرائم اس کی گھٹی میں پڑے تھے۔ یہ وہ شخص تھا جس نے پہلے لوُنی کی خاطر مجھے دھوکہ دیا لیکن بعد میں مجھے پتہ چلا کہ وہ لوُنی سے بھی مخلص نہیں تھا۔ یہی کیفیت روزی کی بھی تھی۔ وہ دونوں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تھے اور لوُنی کو میری جگہ پر متمکن کرانے کے بعد اس تاک میں تھے کہ جیسے ہی میرا کانٹا ہمیشہ کے لیے نکل جائے وہ دونوں لوُنی کو بھی ٹھکانے لگا دیں اور اس کی دولت اور جائیداد کے ساتھ ساتھ جرائم کی دنیا میں اس کی جو پوزیشن بنی ہوئی تھی اس پر بھی قابض ہو جائیں۔ یہ تمام باتیں مجھے روزی اور شوکت کی باہمی رازو نیاز کی گفتگو سے معلوم ہوئی تھیں۔ میں نے اس وقت بھی ان دونوں کی خودغرضانہ ذہنیت اور دولت پرستی کے رجحان پر حیرت محسوس کی تھی اور اس وقت بھی میں یہ سوچ کر حیران تھا کہ میری اور لوُنی دونوں کی مجموعی دولت بھی شاید روزی اور شوکت کے لیے کافی نہیں تھی اور وہ اس کے باوجود مزید دولت اور اختیار حاصل کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ رات کے وقت ان کے بیڈروم میں روزی کی موجودی اس کا کھلا ثبوت تھا۔

یہ تمام خیالات فلم کی ریل کی طرح میرے ذہن کے سامنے سے گزر گئے۔ اتنی دیر میں ایک بار پھر شوکت کی نشے میں ڈوبی ہوئی غصہ بھری آواز سنائی دی۔ اس بار وہ چوکیدار کو پکارنے کے ساتھ ساتھ اس کی شان میں قصیدہ گوئی بھی کر رہا تھا اور اس کے اہلِ خاندان کے ساتھ گالیوں کے ذریعے اپنا رشتہ جوڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چوکیدار گل خاں کو میں نے پہلے ہی روانہ کر دیا تھا۔ یہ آوازیں رضیہ اور لالی نے بھی ضرور سنی ہوں گی لیکن وہ اس آواز کے مالک کی گھناؤنی شخصیت سے آگاہ نہیں تھیں۔ اس لیے ان کے نزدیک یہ صدائیں ریسٹ ہاؤس میں مقیم ایک مسافر کے اظہارِ ناراضی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھیں جب کہ میں اس کے راز کے پیچھے چھپی ہوئی شخصیت کو نہ صرف اچھی طرح جانتا اور پہچانتا تھا بلکہ اس کا زخم خوردہ بھی تھا۔ پہلی مرتبہ شوکت کی آواز پہچاننے کے بعد مجھ پر غیض و غضب اور جوش و نفرت کی کیفیت طاری ہو گئی تھی لیکن رفتہ رفتہ میں خود کو سنبھالنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ چنانچہ میں نے آہستگی سے بیڈروم کا دروازہ کھولا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔ شوکت ایک بستر پر نیم دراز تھا۔ اس کے سرہانے ایک چھوٹی میز پر شراب کی بوتلیں اور گلاس رکھا ہوا تھا۔ اس کا رُخ دروازے کی مخالف سمت میں تھا۔

"کہاں مر گئے تھے بدذات؟ کتنی دیر سے آوازیں دے رہا ہوں۔" اس نے دروازے کھلنے کی آواز سن کر پلٹ کر دیکھنے کی زحمت گوارا کیے بغیر ہی اپنی دانست میں چوکیدار پر غصے کا اظہار شروع کر دیا تھا۔ "ٹھنڈا پانی لے کر آؤ الو کے کان۔"

یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف پلٹا مگر وہاں چوکیدار کی بجائے کسی اور شخص کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کے ہاتھ میں شراب کا نصف بھرا ہوا گلاس تھا اور چہرے پر حیرت کے تاثرات۔ وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید میری اچانک اور غیر متوقع وہاں موجودی نے اسے ششدر کر دیا تھا۔ چند لمحے بعد حیرت کی جگہ

خوف کے آثار نے اس کے چہرے پر جگہ لے لی۔ شراب کا گلاس یک لخت اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر گیا اور چور چور ہو گیا۔ لیکن اس نے میرے چہرے پر سے اپنی نگاہیں نہیں ہٹائیں۔

"تم؟" بمشکل اس کے منہ سے ایک سہمی ہوئی آواز نکلی۔ اس کا چہرہ ایک دم سفید ہو گیا تھا۔ لگتا تھا جیسے اس نے کوئی بھوت دیکھ لیا تھا۔ "تم۔ یہاں؟؟" لکنت کے ساتھ اس نے یہ تین الفاظ بولے اور پھر بے دم ہو کر بیڈ پر گر گیا۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھٹی ہوئی تھیں۔ "نہیں نہیں۔" وہ گھگھیا کر کہنے لگا: "خدا کے لیے

مجھے معاف کر دو۔ میں بے قصور ہوں۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ سارا قصور روزی کا ہے۔ اس نے مجھے بہکایا تھا اور ہم دونوں کے خلاف سازش کا جال پھیلایا تھا۔ قسم لے لو کہ مجھے آج بھی اس کا صدمہ ہے۔ مگر میں مجبور تھا دوست۔ بہت زیادہ مجبور تھا۔ ان لوگوں نے مجھے جان سے مار دینے کی دھمکی دی تھی۔ وہ قاتل اور خونی ہیں۔ اگر میں ان کی بات نہ مانتا تو وہ مجھے ہلاک کر دیتے۔"

"اس لیے تم نے مجھے ہلاک کرنے کا فیصلہ کر لیا؟!" میں نے طنز بھرے لہجے میں سوال کیا۔

"بالکل نہیں۔ میں تمہارا دشمن تو نہیں ہوں۔ بھلا میں تمہیں ہلاک کرنے کے متعلق سوچ سکتا ہوں؟!"

اس شخص کی ڈھٹائی اور بے غیرتی نے مجھے حیران کر دیا۔ وہ جو میری بربادی اور تباہی کا ذمہ دار تھا۔ جس نے مجھے میری ملکیت کی ہر چیز سے محروم کر کے مجھ سے زندہ رہنے کا حق بھی چھین لیا تھا۔ وہ مجھے اپنی معصومیت، بے گناہی اور خلوص کا یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اپنی نفرت ——— اور غیض و غضب کے باوجود میں ہنسے بغیر نہیں رہ سکا۔ بے اختیار میرے منہ سے ایک قہقہہ بلند ہوا اور وہ بے یقینی سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں بے اختیار قہقہے لگانے لگا۔ یوں لگا جیسے ہنسی اور قہقہے خود بخود میرے منہ سے اُبلنے لگے ہیں۔ میں ہنسنا نہیں چاہتا تھا اس کے باوجود بے اختیار ہنس رہا تھا۔ بلند آواز سے قہقہے لگا رہا تھا۔ مگر میری ہنسی میں کوئی نہ کوئی ایسی بات تھی جس نے شوکت کو اور زیادہ خوفزدہ کر دیا تھا۔ اس نے بے بسی سے اپنے دونوں ہاتھ مدافعانہ انداز میں اُوپر اُٹھائے اور خوف میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہنے لگا: "پھر تمہیں دوستی کا واسطہ۔ مجھے معاف کر دو۔ یقین کرو میں بے گناہ ہوں۔ سارا قصور اس حرام زادی کا ہے۔ وہ زہریلی ناگن جسے ایک بار ڈس لے وہ اس کے زہر سے نجات حاصل نہیں کر سکتا۔ میرا بس چلے تو میں اس کا سر کچل دوں۔ مگر کیا کروں۔ میں بے بس اور لاچار ہوں۔"

میں نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا شوکت کی طرف بڑھا۔ وہ خوف سے لرزنے لگا۔ اس کے دونوں ہاتھ معافی مانگنے کے انداز میں اٹھے ہوئے تھے اور دہشت کی وجہ سے اس کے منہ سے آواز تک نہیں نکل رہی تھی۔ وہ مجسم التجا بنا ہوا تھا اور مجھ سے اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔

میں کمرے میں داخل ہوا تو میرا خون کھول رہا تھا۔ میں اسے جان سے مار دینے کے ارادے سے اندر داخل ہوا تھا۔ مگر رفتہ رفتہ میرے اعصاب پُرسکون ہو چکے تھے اور میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو استعمال کرنے کے قابل ہو چکا تھا۔ میری نظریں اس حقیر اور قابلِ رحم انسان کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں، لیکن میرے دل میں اس کے خلاف غصہ اور نفرت کی بجائے کراہیت اور رحم کے جراثیم کلبلانے لگے تھے۔ یکایک میں اسے قابلِ معافی سمجھنے لگا تھا۔ صورتِ حال ایک دم اتنی تیزی سے بدلی تھی کہ میں خود بھی حیران رہ گیا تھا، لیکن میرے ذہن میں پیدا ہونے والے خیالات کی نوعیت سے شوکت مطلق بے خبر تھا۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا اور اس توقع میں تھا کہ اگلا لمحہ اس کی زندگی کا آخری لمحہ ہو گا۔ میرے ہاتھ میں کوئی ہتھیار نہیں تھا مگر وہ مجھے بخوبی جانتا تھا۔ اسے علم تھا کہ کسی انسان کو ہلاک کرنے کے لیے میں اسلحہ کا محتاج نہیں ہو سکتا۔

"شوکت!" جب میں نے اسے ٹھہری ہوئی پُرسکون آواز میں مخاطب کیا تو مجھے خود بھی اپنی آواز پر کسی مردے کی آواز کا گمان ہونے لگا۔

"میں نے تمہاری کسی بات پر یقین نہیں کیا ہے اور نہ کر سکتا ہوں، لیکن تمہیں اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ میں تمہارے خون سے اپنے ہاتھ رنگین نہیں کروں گا۔ میں نے کسی زمانے میں تمہیں دوست کہا تھا۔ اگرچہ تم اس رشتے کے لیے گالی بن چکے ہو پھر بھی میں نے تمہاری جان بخشی کا فیصلہ کیا ہے۔ میں تمہیں جان سے مار کر کوئی مقصد حاصل نہیں کر

سکتا۔ تم نے مجھے جس ہلاکت خیز پوزیشن میں ڈال دیا ہے تمہیں قتل کرنے کے بعد بھی اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اس لیے میں تمہیں زندہ رہنے دوں گا۔ روزی کو تم ایک زہریلی ناگن کہتے ہو۔ تمہارا خیال بالکل ٹھیک ہے مگر تم اس سے بھی بدتر ہو۔ تم گندگی میں رینگنے والے ایسے غلیظ کیڑے ہو جو بذاتِ خود کسی کو اپنے زہر سے ہلاک کرنے کی قدرت بھی نہیں رکھتا۔ میں تم سے کوئی جواب طلبی بھی نہیں کروں گا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے جھوٹ بولو گے۔ تم اُٹھ کر سیدھے بیٹھ جاؤ اور میری ایک بات کا جواب دو۔"

اسے کچھ دیر تو اپنی سماعت پر یقین ہی نہیں آیا۔ مگر پھر وہ آہستگی سے اُٹھ کر بیٹھ گیا اور بے یقینی سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے پوچھا: "روزی رانا کی حویلی میں کیا کرنے گئی ہے؟"

وہ ایک دم اُچھل پڑا۔ "تمہیں کس نے بتایا؟!"

"میں تم سے سوال کا جواب چاہتا ہوں۔ سوال نہیں۔"

"روزی کی حرص اور لالچ کی کوئی انتہا نہیں رہی ہے۔ وہ ایک آبرو باختہ عورت بن چکی ہے جو دولت اور اختیار حاصل کرنے کے لیے اور اپنے مقصد کے حصول کی خاطر سب کچھ کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ رانا ایک دولت مند، بااثر اور جرائم کی دُنیا میں جانا پہچانا شخص ہے اور روزی لوٹی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے شیطان تک سے دوستی کر لے گی۔" اس کے الفاظ کی سچائی کا مجھے احساس تھا۔ اس کا ہر لفظ صداقت میں ڈوبا ہوا تھا۔ ویسے بھی کیونکہ اس کی اپنی ذات زیرِ بحث نہیں تھی اس لیے وہ سارا الزام روزی کے سر تھوپ کر خود بری الذمہ ہونا چاہتا تھا۔

"اور تمہارے دوست اور روزی کے شوہر لوٹی کا کیا حال ہے؟" میں نے بڑے مطمئن انداز میں سوال کیا۔ "مجھے راستے سے ہٹانے کے بعد وہ کیا سوچ رہا ہے اور اگر میں پولیس کے یا اس کے آدمی کے ہاتھ نہ آیا تو وہ کتنی دیر تک خود کو محفوظ سمجھے گا؟"

جواب میں وہ جوشیلے انداز میں لوٹی کی کم ظرفی کی داستان بیان کرنے لگا۔ اس نے بتایا کہ مجھے زندہ چھوڑ دینے کی غلطی پر وہ حد سے زیادہ پشیمان ہے اور بار بار اس کا اظہار بھی کرتا ہے کہ اُس نے تمہیں اپنے گھر سے زندہ سلامت جانے کی اجازت کیوں دے دی تھی۔"

"حیرت کی بات ہے کہ تم نے اور روزی نے بھی اسے یہ عقل کی راہ نہیں دکھائی۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"بس۔ کبھی کبھی ہوشیار سے ہوشیار آدمی بھی غلطی کر بیٹھتا ہے۔" بے اختیار اس کے مُنہ سے نکلا۔ مگر پھر اسے اپنے الفاظ کی اہمیت کا احساس ہوا تو وہ ڈر کر مجھے دیکھنے لگا۔

میں پھر بے اختیار ہنسنے لگا اور وہ ایک بار پھر اپنی زندگی اور موت کے بارے میں فکر مند ہو گیا....

میں نے کہا: "یاد رکھو چالاک سے چالاک مجرم بھی غلطی ضرور کرتا ہے شوکت۔ یہ قانونِ قدرت ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو کوئی مجرم پکڑا نہ جائے۔ اور ساری دنیا قانون پسند لوگوں کے لیے زنداں اور قتل گاہ بن کر رہ جائے۔ بہرحال میں تمہیں زندہ چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ روزی کو مار کر بھی مجھے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ اس لیے اسے بھی میری طرف سے جان بخشی کا پروانہ پہنچا دینا۔ البتہ تمہارے دوست لوٹی کے بارے میں یہ وعدہ نہیں کر سکتا۔ وہ میرا حریف اور دُشمن ہے۔ دشمنی اور جنگ کا آغاز بھی اسی کی طرف سے ہوا ہے۔ اس لیے وہ کسی رعایت کا مستحق نہیں ہے مگر اسے میری طرف سے یہ پیغام پہنچا دینا کہ اگر خود میری بیوی روزی اور میرے دوست شوکت کی سازش اس کے منصوبے میں شامل نہ ہوتی اور تم دونوں کو میرا بھرپور اعتماد حاصل نہ رہا ہوتا تو وہ اپنی چال میں ہرگز کامیاب نہ ہوتا، لیکن اب میں جان چکا ہوں کہ نہ تو روزی مجھ سے مخلص تھی نہ ہی اپنے آپ کو میری بیوی سمجھتی تھی۔ تم بھی درحقیقت میرے دوست نہیں تھے۔ اس لیے تم دونوں ہی قابلِ معافی ہو۔ تم دونوں کو میں نے قدرت کی عدالت کے سپرد کر دیا ہے۔ اس

لیے تمہارا فیصلہ بھی اوپر والا ہی کرے گا۔ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے تم دونوں کی اصلیت کا جلد ہی علم ہو گیا ورنہ میں شدید اذیت اور ذہنی عذاب میں مبتلا تھا۔ اب میں مطمئن ہوں۔

مجھے صرف یہ ثابت کرنا ہے کہ اصلی یوسف میں ہوں اور میری جگہ جو شخص میرے گھر میں روزی کا شوہر اور دفتر میں تمہارا پارٹنر بن کر زندگی گزار رہا ہے وہ نقلی یوسف ہے اور یاد رکھو بہت جلد میں قانونی طور پر یہ ثابت کر کے اپنا حق واپس لے لوں گا۔"

یہ کہہ کر میں اس کمرے سے واپس نکل آیا۔ شوکت کی بزدلی کے پیشِ نظر مجھے یقین تھا کہ وہ دو تین گھنٹے تک کمرے سے باہر نکلنے کی جرأت نہیں کر سکے گا۔ میں نے رضیہ کے کمرے کا رُخ کیا۔ وہ اور لالی بستر پر نیم دراز باتوں میں معروف تھیں۔ مجھے دیکھا تو سنبھل کر بیٹھ گئیں۔

"کہاں چلے گئے تھے آپ؟" رضیہ نے پیار بھرے انداز میں ڈانٹا۔

"رضیہ۔ ہم اب یہاں نہیں ٹھہریں گے۔ فضول وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ تم دونوں بھی کافی سستا چکی ہو۔ سفر کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

وہ دونوں مستعد سپاہیوں کی طرح فوراً اُٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ ہم اپنی لینڈ روور کے پاس پہنچے تو میں نے ان دونوں کو گاڑی میں بیٹھنے کی ہدایت کی اور خود جیپ گاڑی کا رُخ کیا۔ جیپ میں چابی لگی ہوئی تھی۔ میں نے اس کا بونٹ کھول کر کاربوریٹر باہر نکالا اور اپنی گاڑی میں سیٹ کے پیچھے رکھ لیا۔ رضیہ حیران ہو کر مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے کوئی وضاحت ضروری نہیں سمجھی۔ گاڑی سٹارٹ کی اور ریسٹ ہاؤس کو خیر باد کہہ دیا۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد میں نے جیپ کا کاربوریٹر اُچھال کر درختوں کے ایک جھنڈ میں پھینک دیا۔ یہ احتیاطی تدبیر تھی۔ مقصد صرف یہ تھا کہ اگر شوکت ارادہ بھی کرے تو ہمارا تعاقب نہ کر سکے۔ رضیہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا نہ میں اسے یہ طویل کہانی سنانے کے موڈ میں تھا۔

گل خان کے بتائے ہوئے راستے پر ہم تیس چالیس میل سفر کرنے کے بعد ایک اور پہاڑی سلسلے میں داخل ہو گئے۔ یہاں پہاڑیاں زیادہ اونچی نہیں تھیں۔ درخت وغیرہ بھی کم تھے لیکن آس پاس پتھریلا اور بنجر علاقہ حدِ نگاہ تک پھیلا ہوا تھا۔ ابھی میں یہ فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ ہمیں ملک منصور کی کوٹھی کی جانب سفر کرنا چاہیے یا مخالف سمت میں! میں رضیہ کو اپنے ساتھ رکھنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اس کے باوجود میں اس کی رفاقت سے بھی محروم نہیں ہونا چاہتا تھا۔ وہ خاموش تھی لیکن اس کی نگاہیں مجھ سے مسلسل مصروفِ گفتگو تھیں۔ رفتہ رفتہ وہ میرے ہوش و حواس پر چھا گئی تھی۔ اس کی ذہنی اور جسمانی کشش اتنی زیادہ تھی کہ میں آسانی کے ساتھ خود کو اس سے علیحدہ کرنے کا تصور کرتے ہوئے بھی اذیت محسوس کر رہا تھا۔ ہر طرف خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔ لالی ایک بار پھر غنودگی کے عالم میں قریب قریب سو چکی تھی۔

یکایک خاموشی میں ایک بہت ہلکی سی آواز کا احساس ہوا۔ میں نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ آواز میں بتدریج ہو رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ بھن بھناہٹ میں تبدیل ہو گئی اور مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہیں رہی کہ وہ ایک ہیلی کاپٹر کی آواز تھی۔ میں نے پریشانی سے چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور محفوظ پناہ گاہ تلاش کرنے لگا۔ ہیلی کاپٹر سے چھپنے کا بظاہر کوئی امکان نہیں تھا۔ ہم ایک کھلے مقام پر تھے، لیکن کچھ فاصلے پر درخت اور ٹیلے موجود تھے جو ہماری موجودی پر پردہ ڈال سکتے تھے۔ میں نے اس طرف گاڑی کا رُخ موڑ دیا، لیکن اس اثنا میں تیزی سے پرواز کرتا ہوا ہیلی کاپٹر ہمارے نزدیک آ چکا تھا اور اب میں اسے واضح طور پر دیکھ سکتا تھا۔ یہ وہی ہیلی کاپٹر تھا جو رانا کی حویلی تک پہنچنے سے پہلے بھی ہمیں ایک بار نظر آیا تھا لیکن ہم ہیلی کاپٹر میں موجود لوگوں کی نگاہوں

سے بالکل محفوظ رہے تھے۔ یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ اس ہیلی کاپٹر میں سوار لوگ کون ہیں اور یہ ہمارے حق میں دوست ثابت ہوں گے یا دشمن ؛ لیکن احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ ہم ان کی دست برد سے محفوظ رہیں۔ اس اثنا میں ہیلی کاپٹر شور مچاتا ہوا ہمارے سروں پر پہنچ گیا اور یہ معلوم ہو گیا کہ اس کا تعلق فوج یا کسی سرکاری محکمے سے نہیں تھا بلکہ یہ ایک شہری استعمال میں آنے والا ہیلی کاپٹر تھا۔ میری انتہائی کوشش یہی تھی کہ کم سے کم وقت میں کسی محفوظ مقام تک پہنچ جاؤں لیکن مہلت نہ مل سکی۔ اچانک سٹین گن کا ایک برسٹ ہماری لینڈروور سے چند گز آگے زمین کو چھیلتا ہوا گزر گیا۔ میں نے گاڑی کو اور زیادہ تیز رفتاری سے لہراتے ہوئے درختوں اور ٹیلوں کی جانب دوڑانا شروع کر دیا۔ محفوظ پناہ گاہ ہم سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی، لیکن سوال یہ تھا کہ کیا ہیلی کاپٹر میں بیٹھے ہوئے شکاری ہمیں اتنی مہلت دیں گے کہ ہم درختوں اور ٹیلوں کی آڑ میں پہنچ جائیں ؟ ہیلی کاپٹر کی رفتار زیادہ نہیں تھی پھر بھی وہ گولیاں برساتا ہوا ہمارے اوپر سے گزر گیا۔ اب ہمارے پاس اتنا وقت تھا کہ اس کے واپس آنے تک خود کو محفوظ کر لیں یا مقابلے کے لیے تیار ہو جائیں۔

"رضیہ" میں نے اپنی توجہ ڈرائیونگ اور ہیلی کاپٹر کی جانب مرکوز رکھتے ہوئے کہا "سیٹ کے نیچے سے مشین گن نکال لو اور میرے لیے بھی ایک برین گن تیار رکھو۔"

مگر رضیہ کی مستعدی میری کسی ہدایت کی محتاج نہیں تھی۔ وہ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی مشین گن سنبھال کر کھڑکی سے باہر جھانک رہی تھی اور ہیلی کاپٹر کے دوبارہ نمودار ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔

لالی بھی اب پوری طرح ہوشیار اور چوکنا تھی اور رضیہ کی ہدایت پر اس نے اگلی سیٹ کے نیچے سے ایک برین گن اور ایک پستول نکال لیا تھا۔

تیز رفتاری کے باعث ہماری گاڑی بہت تیزی سے اچھل رہی تھی۔ اگر میں مہارت سے کام نہ لیتا تو بہت ممکن تھا کہ ہم کسی پتھریلے ٹیلے یا درخت سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتے، لیکن میں نے اپنی تمام صلاحیتیں گاڑی پر مرتکز کر دی تھیں اور گاڑی کو کسی اچانک حادثے سے محفوظ رکھنے کی کوشش میں ابھی تک کامیاب رہا تھا۔

ہیلی کاپٹر کچھ فاصلے پر جا کر پلٹ کر ہماری جانب آ رہا تھا۔ میں نے ایک نظر آسمان پر ڈالی اور پھر پیڈل پر اپنے پیر کی ساری طاقت صرف کر دی۔ گاڑی ایک بپھرے ہوئے طوفان کی مانند برق رفتاری سے درختوں کے جھنڈ کی جانب چلی اور اسی وقت ہیلی کاپٹر نے ہمیں دوبارہ گولیوں کا نشانہ بنایا ہے، لیکن فاصلہ زیادہ رہنے کی بنا پر گولیاں نشانے پر نہ لگ سکیں۔ اتنی دیر میں رضیہ نے پوزیشن سنبھال لی تھی۔ تیزی سے اچھلتی اور دائیں بائیں حرکت کرتی ہوئی لینڈروور سے فائر کرنا بہت دشوار نہ تھا، لیکن رضیہ نے اسکی پرواہ نہیں کی اور مشین گن کا فائر کھول دیا۔ تڑاخوں کی آوازوں کے ساتھ مشین گن کی گولیاں سنسناتی ہوئی ہیلی کاپٹر کی جانب لپکیں اور ہیلی کاپٹر میں سوار لوگوں کو پہلی بار احساس ہوا کہ ہم بھی نہ صرف مسلح ہیں بلکہ جدید ترین ہتھیاروں سے لیس ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہیلی کاپٹر نے اچانک فضا ہی میں اپنا رُخ تبدیل کر لیا۔ یہ میرے لیے ایک نادر اور قیمتی موقع تھا۔ میں چند ہی لمحے بعد اس پتھریلے علاقے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا جہاں سے درختوں کا ایک مختصر سا ذخیرہ شروع ہوتا تھا اور اونچے نیچے ٹیلوں اور چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کی وجہ سے ہمیں ایک قدرتی پناہ گاہ میسر آ سکتی تھی۔

قریباً دو سو گز آگے چلنے کے بعد میں نے لینڈروور کو روک دیا اور تیزی سے کود کر باہر نکل گیا۔ میں نے مشین گن رضیہ کے ہاتھ سے چھین لی اور اسے برین گن سنبھالنے کی ہدایت کرتے ہوئے اپنے پیچھے آنے کی ہدایت کی۔ لالی نے بھی اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں پستول تھام رکھا تھا، لیکن مجھے اندازہ تھا کہ وہ اسے استعمال کرنے سے قاصر تھی۔ پھر بھی وہ خاصی جرأت مندی کا ثبوت دے رہی تھی۔ درختوں کے سائے تلے کچھ دور چلنے کے بعد

ہم نے ایک نسبتاً اونچے مقام پر مورچہ بنانے کا فیصلہ کیا۔ یہاں نہ صرف ہم درختوں کی وجہ سے محفوظ تھے بلکہ نیچے نیچے ناہموار ٹیلوں نے بھی ہماری حفاظت کا بندوبست کر دیا تھا۔ یہ ایک ایسا مقام تھا جہاں سے سامنے پھیلی ہوئی وادی کا منظر ہماری آنکھوں کے سامنے تھا۔ ہیلی کاپٹر ایک مختصر سا دائرہ بناتے ہوئے مخالف سمت میں پرواز کرنے لگا تھا۔ غالباً وہ لوگ ہمارے اور اپنے مابین مناسب فاصلہ قائم رکھنا چاہتے تھے اور پھر اِن نے درختوں کے ایک چھوٹے سے جھنڈ کے عقب میں ہیلی کاپٹر کو زمین پر اُترتے ہوئے دیکھا۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ ہیلی کاپٹر میں موجود لوگوں کی تعداد کتنی تھی اور وہ کس قسم کے ہتھیاروں سے لیس تھے ؟ لیکن یہ ضرور واضح ہو چکا تھا کہ وہ ہمیں گھیرنے اور ہم پر قابو پانے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔

ہیلی کاپٹر کی آواز رفتہ رفتہ بند ہو گئی اور ماحول پر سناٹا طاری ہو گیا۔ یہ ہمارے لیے خاصی تشویشناک صورتِ حال تھی۔ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں تھی کہ ان لوگوں کی تعداد پانچ یا چھ سے کم نہیں تھی۔ اگر وہ پوری طرح مسلح نہ ہوتے تو ہمارے پاس مشین گن کی موجودگی کا علم ہو جانے کے باوجود مائل پیکار نہ ہوتے۔ ہمارے چاروں طرف حدِ نگاہ تک وادی تھی یا پھر درختوں اور ٹیلوں کا سلسلہ تھا جس میں لوگوں کی نقل و حرکت کو دیکھنا قریب قریب ناممکن تھا۔ میری مشکل یہ تھی کہ میرے ساتھ کوئی مددگار نہیں تھا لے دے کر ایک رضیہ تھی۔ وہ برین گن بالفعل استعمال تو کر سکتی تھی، لیکن صاف ظاہر تھا کہ اسے اس قسم کی جنگوں اور کارروائیوں میں حصہ لینے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ ایک جی دار اور بہادر عورت ہونے کے باوجود بالآخر وہ ایک نرم و نازک عورت تھی۔ اس کے ساتھ لالی کا وجود اور عدمِ وجود میرے لیے یکساں تھا۔ ایسے میں اگر وہ لوگ ہمیں چاروں طرف سے گھیرنے کی کوشش کرتے تو یہ ان کے لیے ناممکن نہیں تھا۔ جب تک ہیلی کاپٹر کی خوفناک آواز فضا میں گونجتی رہی ہمارے اندر مدافعت اور مقابلے کا جذبہ پورے عروج پر تھا، لیکن چاروں طرف بھیانک اور پُراسرار خاموشی پھیلتے ہی وسوسوں اور اندیشوں نے گھیر لیا۔ میرے ساتھ والی عورتیں بھی غالباً اسی نفسیاتی دباؤ کے باعث پریشان اور مضطرب نظر آ رہی تھیں۔

"یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں ؟" رضیہ نے میرے عقب میں سرگوشی کی تو میں اچانک اچھل پڑا۔

میرے اس طرح چونکنے پر وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ خود میں بھی اپنی حماقت پر ہنس پڑا۔ لالی نے بھی مجھے چونکتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ بھی ہماری ہنسی میں شریک ہو گئی۔ یہ ہنسنے کا موقع تو نہیں تھا، لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس ہنسی نے یکایک ہمارے کشیدہ اعصاب کو پرسکون کر دیا تھا اور خوف و ہراس کی کیفیت خود بخود کم ہو گئی تھی۔

"خدا جانے کون لوگ ہیں ؟" میں نے آہستگی سے کہا "ہو سکتا ہے رانا کے ساتھی ہوں۔ یا پھر لوٹی اور روزی کے بھیجے ہوئے بھی ہو سکتے ہیں۔"

"لوٹی اور روزی ؟" وہ حیران ہو کر بولی، مگر پھر اسے یاد آ گیا۔ کیونکہ میں اپنی داستانِ حیات اُسے سنا چکا تھا۔

"مگر لوٹی یا روزی کو تمہارے بارے میں کیونکر علم ہو سکتا ہے کہ تم اس علاقے میں موجود ہو ؟"

"روزی رانا کی حویلی میں موجود تھی۔ وہ وائرلیس کے ذریعے بھی لوٹی کو باخبر کر سکتی تھی اور لوٹی بہت زیادہ رسوخ اور وسائل کا مالک ہے۔"

رضیہ سوچ میں پڑ گئی۔ میری توجہ پھر سامنے کی جانب مبذول ہو گئی۔ جہاں مکمل خاموشی تھی اور کسی قسم کی نقل و حرکت نظر نہیں آ رہی تھی۔ میرے دل میں اچانک یہ خیال پیدا ہوا کہ شوکت کو تو میں بے دست و پا سمجھ کر ریسٹ ہاؤس میں چھوڑ آیا تھا۔ اس کی گاڑی کو میں نے ناکارہ بنا دیا تھا لیکن روزی یا لوٹی تو اس کے پاس پہنچ سکتے تھے۔ یا پھر ممکن ہو کہ شوکت نے وائرلیس کے ذریعے لوٹی سے رابطہ قائم کر لیا ہو۔ اگر میرا اندازہ درست تھا تو گویا ہم

لوگ چاروں طرف سے اُن لوگوں کے جال میں پھنس چکے تھے۔

خاموشی کی چادر کو ایک دور سے آتی ہوئی گاڑی کی آواز نے تار تار کر دیا۔ جس راستے سے ہم سفر کرتے ہوئے آئے تھے اسی جانب سے ایک جیپ گاڑی نہایت تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی۔ یہ جیپ کسی عام مسافر کی بھی ہو سکتی تھی اور اس کا تعلق ہیلی کاپٹر میں سوار لوگوں سے بھی ہو سکتا تھا۔ اگر وہ ایک عام مسافر جیپ ہوتی تو اپنی راہ پر سفر کرتی رہتی، لیکن اس نے کچی سڑک سے ہٹ کر اس جانب کا رُخ کر لیا جدھر ہیلی کاپٹر کھڑا تھا۔ گویا اِن لوگوں کے لیے مزید کمک بھی پہنچ گئی تھی اور اس کے بعد بھی مزید امدادی گروہوں کی آمد کا امکان تھا۔ اس احساس نے مجھے مضطرب کر دیا کہ رفتہ رفتہ صورتِ حال ہمارے لیے زیادہ پُر خطر ہوتی جا رہی تھی۔ ایک ہیلی کاپٹر ہماری نگرانی پر مامور تھا اور اس کے ہوتے ہوئے ہم آزادانہ سفر نہیں کر سکتے تھے۔ اب اس جیپ گاڑی کی آمد کے بعد ہمارے لیے اپنی پناہ گاہ سے باہر نکل کر آگے بڑھنا قریب قریب ناممکن ہو چکا تھا، لیکن اس جگہ پر بیٹھے رہنا بھی مناسب نہ تھا۔ اگرچہ لینڈ روور میں کھانے پینے کا سامان اور کافی مقدار میں اسلحہ موجود تھا مگر ظاہر ہے کہ ہم اس غیر محفوظ جگہ پر اپنا پڑاؤ ڈال کر زیادہ دیر نہیں رہ سکتے تھے۔ اُن لوگوں کو اندازہ تھا کہ ہم نے کس طرف کا رُخ کیا ہے اور کچھ دیر بعد ہمارے گرد ان کا گھیرا تنگ ہونے والا تھا۔ میں اس کشمکش میں گرفتار تھا کہ اگر اس پناہ گاہ کو چھوڑنے کا ارادہ بھی کر لیتا تو میری تحویل میں دو عورتیں بھی تھیں اور میں ان کے ساتھ کہاں اور کتنی دور جا سکتا تھا! نہ جائے ماندہ، نہ پائے رفتن والا معاملہ تھا۔ بہرحال بھاگنے کی کوشش میں ان کی زد میں آ جانے کے مقابلے میں بہتر تھا کہ میں اپنی اس پناہ گاہ کے مورچے میں بیٹھا رہوں۔ یہاں ہم نسبتاً زیادہ محفوظ تھے اور اپنے دشمنوں کی نقل و حرکت کا جائزہ لے سکتے تھے۔ پھر ہمارے پاس یہاں اسلحہ اور کھانے پینے کا سٹاک بھی موجود تھا۔ چنانچہ میں نے ذہنی طور پر اسی جگہ چھاؤنی ڈالنے کا ارادہ کر لیا۔

ہمارے عقب میں درختوں کا سلسلہ تھا۔ یہ ایک پتھریلا علاقہ تھا جس میں اونچے نیچے ٹیلے دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ یہاں وہاں درختوں کے ذخیرے بھی تھے۔ وہ لوگ کسی طرف سے بھی آ سکتے تھے، لیکن آسانی یہ تھی کہ ہم براہِ راست ان کی گولیوں کا نشانہ بننے سے محفوظ تھے۔ میں نے رضیہ کو سٹین گن دے کر پچھلے حصے کی جانب نظر رکھنے کی ہدایت کی اور خود سٹین گن سنبھال کر باقی اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ ابھی میں اپنی پناہ گاہ سے باہر نکل کر موقعہ محل کا جائزہ لینے کی کوشش کر سکتا تھا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ ابھی میرے دشمنوں نے پوری طرح صف بندی کر کے جنگ کا نقشہ بھی نہیں بنایا ہوگا۔

رضیہ بظاہر پُرسکون اور بے خوف تھی، لیکن لالی ہاتھ میں پستول رکھنے کے باوجود خوفزدہ اور پریشان نظر آ رہی تھی۔ مجھے اِن دونوں عورتوں پر ترس بھی آ رہا تھا جو بلا وجہ پے در پے مختلف حوادث کا شکار ہو رہی تھیں اور ایسے حالات سے دوچار تھیں جو کسی مرد کے اعصاب کو بھی پگھلا سکتے تھے۔ پھر وہ تو نازک اندام عورتیں تھیں۔

میں نے آہستگی سے باہر نکل کر اس طرف کا رُخ کیا جہاں ہیلی کاپٹر موجود تھا۔ ہمارے درمیان میں درخت اور ٹیلے حائل تھے۔ وہ اگر ہماری طرف بڑھتے تو ہماری نگاہوں سے پوشیدہ رہنا ممکن نہیں تھا، لیکن مسئلہ یہ تھا کہ میں تن تنہا ہر طرف نگرانی نہیں کر سکتا تھا۔ ایک درخت سے ٹیک لگا کر میں نے اپنے آپ کو تعزیں کرنی شروع کر دی۔ خدا جانے مجھے کن گناہوں کی پاداش میں ان مراحل سے گزرنا پڑ رہا تھا۔ ہر لمحہ ایک امتحان تھا اور ہر قدم مشکلات کی دلدل میں اور زیادہ پھنسانے کا موجب بن رہا تھا۔ یکایک میں نے اپنے عقب میں ہلکی سی آہٹ سنی اور چونکنا ہو کر تیزی سے گھوم گیا۔ میری انگلی ٹریگر پر تھی اور ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر سٹین گن گولیاں اُگلنے کے لیے تیار تھی، لیکن اپنے سامنے رضیہ کو موجود پا کر میں نے اطمینان کی سانس لی۔ وہ ہولے ہولے قدم اُٹھاتی ہوئی میرے

نزدیک آ گئی۔ اس کے چہرے پر خوف و ہراس نہیں تھا، لیکن اندرونی کشمکش کے باعث اس کا چہرہ تمتما رہا تھا اور وہ پہلے سے زیادہ حسین نظر آ رہی تھی۔ میں نے اس کی بکھری زلفوں کو اور بے ترتیب لباس کو دیکھا۔ اس نے بھلا اس قسم کی آرام بھری زندگی کا کہاں تصور کیا ہوگا جو اس کا مقدر بن کر رہ گئی تھی۔ اس کی آنکھیں کسی انجانے جذبے کے تحت چمک رہی تھیں اور لبوں پر تھرتھراہٹ تھی۔

"سنو" اس نے میرے پاس آ کر دھیمی آواز میں کہا۔ "ہم اس چوہے دان میں کب تک پھنسے رہیں گے؟ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں؟"

میں نے تلخی سے مسکرا کر اس کے سراپا کا جائزہ لیا اور کہا۔ "رضیہ یہ نہ بھولو کہ کھلے میدان میں ہم آسانی سے ان کا شکار بن سکتے ہیں اور پھر مجھے ان کی تعداد کے بارے میں بھی کوئی اندازہ نہیں ہے۔ خدا جانے وہ کتنے لوگ ہیں۔ جبکہ میرے ساتھ صرف دو عورتیں ہیں۔"

"مگر کیا مجھے اپنی بہادری کا ثبوت دینے کی ضرورت ہے؟"

تم بہادر اور بے خوف ہو، لیکن فنِ حرب سے واقف نہیں ہو۔ نہ ہی تم مردوں کی طرح سخت جان ہو۔ مشین گن اٹھا کر سفر کرنا مذاق نہیں ہے۔ بے خوفی اپنی جگہ ہے، لیکن محض بے خوفی کے ذریعے تم اپنے طاقتور دشمن سے مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ وہ لوگ اس قسم کے کاموں کے عادی ہیں۔ وہ ہر لحاظ سے ہم پر حاوی ہیں۔"

اس نے اپنی سیاہ آنکھیں پھیلا کر مجھے دیکھا اور کہنے لگی۔ "یوسف۔ میں نے تمہاری زبان سے پہلی بار مایوسی کی بات سنی ہے۔"

"یہ مایوسی نہیں حقیقت کا اعتراف ہے۔" میں نے اداسی سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا جس پر خوف کی پرچھائیں تک نہیں تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک منفرد اور انوکھی قسم کی عورت تھی۔ اس کی یہی خوبیاں اسے دوسری عورتوں سے ممتاز کرتی تھیں۔ اس کی سنجیدگی، متانت، بہادری، قوتِ برداشت اور حوصلے کی وجہ سے اس کے نرم و نازک وجود اور دلکش چہرے کی کشش کچھ اور زیادہ ہو گئی تھی۔

"رضیہ۔ خاموشی اور سنجیدگی سے میری بات سنو۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ دیکھو۔ وہ جو کوئی بھی ہیں ظاہر ہے کہ وہ میری کھوج میں ہیں۔ تم دونوں سے انہیں کوئی دشمنی نہیں ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم ان کے پاس چلی جاؤ......"

اس نے اپنا ہاتھ میرے منہ پر رکھ دیا۔

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟" وہ غصے بھرے لہجے میں کہنے لگی۔ "ان جانے لوگوں کے پاس جانے کو کہہ رہے ہو۔ وہ کون لوگ ہیں۔ کیا چاہتے ہیں اور ہمارے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟ یہ جانے بغیر ہی تم ہمیں یہ مشورہ دے رہے ہو؟" وہ بہت برہم تھی۔

"لیکن رضیہ......"

اُس نے میری بات کاٹ دی۔ "سنو یوسف۔ ذلت اور بے عزتی کی زندگی سے بہتر ہے کہ ہم اپنی جان دے دیں۔ تم نے دیکھ لیا ہے کہ یہاں قدم قدم پر انسانوں کے روپ میں بھیڑیئے اور حیوان موجود ہیں۔ ان کے ہاتھوں آہستہ آہستہ سسک سسک کر جان دینے کے مقابلے میں یہ بہتر ہے کہ ایک ہی بار مقابلہ کرتے ہوئے مر جائیں۔" اس کی آواز کی توانائی اور لہجے کا عزم مجھے حیران کرنے کے لیے کافی تھا۔ میں بے اختیار اس کے غصے سے تمتماتے ہوئے چہرے کو دیکھتا رہ گیا یہاں تک کہ اس نے اپنی شعلہ بار نظریں جھکا لیں۔

پھر وہ ہولے سے کہنے لگی۔ "رانا کی حویلی میں تم نے ایک بات کہی تھی۔ اب میری باری ہے۔ مجھے معلوم نہیں

ہے کہ اگلے لمحے ہمارا انجام کیا ہوگا؟ ہم زندہ بھی رہیں گے یا نہیں، لیکن میری خواہش، بلکہ درخواست ہے کہ جب تک ہمارے دم میں دم ہے مجھے اپنے ساتھ رہنے دو۔ اور...... اور......" اس نے اپنے دانتوں میں ہونٹ دبالیا۔

"اور کیا؟ بولو۔ رُک کیوں گئیں؟" میں نے والہانہ انداز میں کہا۔

اس نے اپنی چمکیلی سیاہ آنکھیں اُٹھا کر مجھے دیکھا اور پھر نگاہیں جھکا کر دھیمی آواز میں بولی۔

"یوسف۔ یہ سچ ہے کہ میں ایک شادی شدہ عورت ہوں، لیکن یہ محض ایک کاغذی رشتہ ہے۔ میرے اور منصور کے درمیان آج تک کوئی جسمانی، ذہنی یا روحانی رشتہ قائم نہیں ہو سکا۔ خدا جانے۔ قصور میرا ہے یا کسی اور کا۔ لیکن یہ سچ ہے کہ میں نے کبھی اسے اپنا نہیں سمجھا نہ ہی اس پر اپنا حق سمجھا، لیکن نہ جانے کیوں میں تمہیں اپنا سمجھنے لگی ہوں۔ تم پر بھروسہ کرنے لگی ہوں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تم پر میرا حق ہے۔ میں ضد کرکے بھی تم سے اپنی بات منوا سکتی ہوں۔ شاید یہ ہمارے زیادہ عرصے تک کٹھن حالات میں ساتھ رہنے کی وجہ ہے کہ تم نے اپنی خوبیوں کی وجہ سے مجھے متاثر کیا ہے۔ وجہ کچھ بھی ہو، لیکن یہ ایک حقیقت ہے۔" اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔

میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگی تھیں اور جی چاہتا تھا کہ میں خوشی کے مارے چیخ چیخ کر سارے جنگل کو سر پر اُٹھا لوں۔ وہ ایک منتخب عورت تھی جس کا معیار انتہائی بلند تھا۔ پھر بھی میں نے اس کا دل جیت لیا تھا۔ حالانکہ اس مقصد کے لیے میں نے کوئی پیش قدمی یا کوشش نہیں کی تھی۔ وہ ایک ایسی بے مثال عورت تھی جسے چاہنے اور چاہے جانے کی تمنا ہر ایک دل میں کروٹیں لے سکتی تھی۔ میرے دل میں بہت سی خواہشیں مچلنے لگیں، لیکن میں نے اپنے جذبات کو قابو میں رکھا اور خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کا چہرہ جھکا ہوا تھا اور وہ غیر ارادی طور پر اپنے پیروں سے زمین کرید رہی تھی۔

"میں صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ اگر زندگی نے وفا نہ کی تو تم اتنا یاد رکھنا کہ میرے دل میں تمہارے لیے وہ سب کچھ ہے۔ جو میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی۔ میں تمہاری اعلیٰ ظرفی اور بلند اخلاقی کی معترف ہوں۔ ہم اس زندگی میں شاید کبھی ایک نہ ہو سکیں، لیکن خیالوں پر کوئی پابندی نہیں ہوتی جذبات کسی قانون اور ضابطے کے محتاج نہیں ہوتے۔ اچھا۔ خدا حافظ۔"

وہ اچانک ہی پلٹ کر چلی گئی اور میں اس کے قدموں کی معدوم ہوتی ہوئی آہٹ سنتا رہا۔ وہ عجیب عورت تھی۔ اسے اپنے جذبات پر مکمل کنٹرول تھا اور وہ اپنے ذہن اور دل کے ساتھ ساتھ اپنے اعصاب پر قابو پانے کی مہارت بھی رکھتی تھی۔ میں پہلے ہی اعتراف کر چکا ہوں کہ رضیہ وہ پہلی عورت تھی جس نے میرے دل میں بسی ہوئی عاشی کی یادوں کے باوجود اس نہاں خانے میں اپنی جگہ بنا لی تھی، لیکن اس کا کہنا بالکل درست تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے نزدیک ہوتے ہوئے بھی بہت دور تھے۔ کم از کم جن حالات سے ہم دوچار تھے ان میں کسی جذباتی وابستگی کی گنجائش نہیں تھی اور نہ ہی یہ ممکن تھا۔

میرے حساس کانوں نے یکایک مجھے چوکنا کر دیا اور میری نگاہوں نے کافی فاصلے پر درختوں کے پیچھے کسی کی نقل و حرکت کو دیکھنے میں ذرا بھی کوتاہی نہیں کی۔ سٹین گن پر میری گرفت مضبوط ہو گئی اور میں نے آہستہ سے پیچھے ہٹ کر دو درختوں کے درمیان میں پوزیشن لے لی۔ حرکت ایک دم بند ہو گئی۔ مگر میں دم سادھے کھڑا رہا۔ حالانکہ اتنے فاصلے پر میرے سانس کی آواز جانے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

چند لمحے بعد درختوں کے پیچھے پھر ایک جھلک سی نظر آئی اور ایک شخص مجھے درخت پر چڑھتا ہوا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ وہ میرے نشانے پر تھا، لیکن سوال یہ تھا کہ میں اس پر گولی چلا کر اُن لوگوں کو اپنی موجودگی کی اطلاع دوں یا خاموشی سے انتظار کروں؟ لیکن انتظار کرنا بے سود تھا۔ جلد یا بدیر انہیں آگے ہی بڑھنا تھا اور

پھر شاید ان کو چیک کرنا میرے لیے ممکن نہ رہتا۔ یہ سوچ کر میں نے سٹین گن اٹھائی اور نشانہ باندھ کر فائر کر دیا۔ گولی اپنے ہدف پر لگی اور وہ ایک چیخ کے ساتھ زمین پر گر گیا۔ اس کے گرتے ہی ایک اور شخص نے میری جانب فائر کھول دیا۔ اگر میں گولی چلانے کے فوراً بعد درختوں کے پیچھے نہ پہنچ گیا ہوتا تو میرا جسم چھلنی ہو جاتا۔ میں نے اسے راؤنڈ ختم کرنے کا موقع دیا اور پھر ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر گولی چلا دی۔ اس بار پھر میرا نشانہ ٹھیک جگہ پر لگا اور دوسرا شخص بھی اُچھل کر زمین پر گر گیا۔ میں نے پھرتی سے اپنی جگہ تبدیل کر لی، لیکن اس طرف سے دوبارہ فائرنگ نہیں ہوئی۔ اتنی دیر میں رضیہ بے آواز دبے قدموں سے چلتی ہوئی میرے پاس پہنچ گئی تھی۔ مجھے محفوظ پا کر اس کے چہرے پر اطمینان اور خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

"تم یہاں کیوں آئی ہو؟" میں نے اسے ڈانٹا۔ "فوراً اپنی جگہ پر جاؤ۔ ایکشن شروع ہو چکا ہے ہمیں ہر لمحہ ہر طرف سے ہوشیار اور چوکس رہنا ہوگا۔"

اس نے روٹھے ہوئے بچے کی طرح منہ بنایا اور میں ہنس پڑا۔ وہ بھی مسکرانے لگی۔ "لالی کا کیا حال ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ بے چاری تو پہلے ہی پریشان تھی۔ فائرنگ کی آواز سن کر اور زیادہ ڈر گئی ہے۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ رضیہ کی حد تک تو خیر ٹھیک تھا، لیکن لالی تو سچ مچ ایک بوجھ ہی ثابت ہو سکتی تھی یکایک مجھے ایک خیال سوجھا۔

"رضیہ۔" میں نے کہا۔ "بہترین بچاؤ یہ ہے کہ حملہ کر دیا جائے۔ تم اس اصول سے متفق ہو نا؟"

"سنا تو میں نے بھی یہی ہے۔"

"میرے خیال میں اس جگہ بیٹھ کر حملہ آوروں کا انتظار کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ ان کے مورچے میں گھس کر انہیں مدافعت پر مجبور کر دیا جائے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" وہ تشویش سے مجھے دیکھنے لگی۔

"اس سے پہلے کہ ان کی ہماری پناہ گاہ تک رسائی ہو میں خود ہی قیامت بن کر ان پر ٹوٹ پڑوں تو کیسا رہے؟"

وہ پریشان ہو گئی۔ "بہت خطرہ ہے اس میں۔"

"خطرہ تو دونوں صورتوں میں ہے۔ وقت بہت کم ہے۔ تم میری جگہ سنبھالو۔ میں آگے جاتا ہوں۔ اس وقت وہ لوگ بوکھلائے ہوئے ہیں۔ ان کے دو آدمی کم ہو گئے ہیں۔"

رضیہ کے بولنے سے پہلے ہی میں خاموشی سے آگے کھسک گیا مگر میں ابھی چار پانچ قدم بھی نہیں چلا تھا کہ اچانک رُک گیا۔ سامنے سے میگا فون کے ذریعے کوئی ہمیں مخاطب کر رہا تھا۔

"سنو۔ تم جو کوئی بھی ہو۔ میری بات غور سے سنو۔"

میرے قدم ٹھٹھک کر رہ گئے۔ آواز خاصی بارعب اور تحکمانہ تھی اور یوں لگتا تھا جیسے اس شخص کو اپنا حکم منوانے کی عادت ہے۔ "میرے پاس ابھی آٹھ مسلح آدمی موجود ہیں اور دو جیپیں بھر لوگ ابھی پہنچنے والے ہیں۔ تم اس جگہ سے باہر نکل کر کہیں نہ جا سکو گے۔ ہم نے تمہیں چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔"

میں نے مڑ کر رضیہ کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا اور وہ ساکت کھڑی پھٹی پھٹی نگاہوں سے سامنے دیکھ رہی تھی جدھر سے آواز آ رہی تھی۔

میگا فون پر آواز پھر گونجی۔ "میری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ جو دو عورتیں تمہارے قبضے میں ہیں انہیں میرے حوالے کر دو تو میں اپنے آدمیوں کو لے کر یہاں سے واپس چلا جاؤں گا اور وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں تمہارے

حال پر چھوڑ دوں گا یہ ملک منصور کا وعدہ ہے۔"

ملک منصور کا نام سنتے ہی میں چونک پڑا۔ رضیہ کی جانب دیکھا تو وہ ابھی تک ساکت و جامد کھڑی تھی۔ اس کا ردِ عمل اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ ملک منصور کی آواز پہچان چکی ہے۔ لیکن پھر بھی میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے تصدیق چاہی تو اس نے گردن ہلا کر تصدیق کر دی۔ اب میری حیران اور پریشان ہونے کی باری تھی۔ ملک منصور اس طرح اچانک ہماری کھوج لگاتا ہوا یہاں پہنچ جائے گا یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔ میں تو بذاتِ خود رضیہ اور لالی کو ملک منصور کے حوالے کر دینا چاہتا تھا مگر اب وہ خود ہی میرے پاس پہنچ گیا تھا۔ میرا کام آسان اور مختصر ہو چکا تھا لیکن اسکے باوجود میں بجائے خوش ہونے کے پریشان ہو گیا تھا۔ آخر اس کا سبب کیا تھا؟ کیا میں ذہنی طور پر رضیہ کو اس کے حوالے کرنے کے لیے تیار نہیں تھا؟ یا پھر رضیہ سے فوری جدائی کے احساس نے مجھے مجبور کر رکھ دیا تھا؟

"میری طرف سے لڑائی بند ہو چکی ہے۔ میں تم سے بات کرنے کے لیے خود وہاں آ رہا ہوں۔" میگا فون پھر بول پڑا تھا۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا رضیہ کے پاس چلا گیا۔ وہ حیران اور ویران نگاہوں سے سامنے تک رہی تھی۔ منصور سے اس اچانک اور غیر متوقع مُڈبھیڑ نے شاید اسے بھی بوکھلا دیا تھا۔

"کیوں، کیا خیال ہے؟" میں نے بڑی ہمت کر کے پوچھا۔

وہ خاموش رہی لیکن معلوم ہوتا تھا کہ وہ رفتہ رفتہ اپنے جذبات اور احساسات پر قابو پانے کی کوشش میں کامیاب ہو رہی ہے۔

"رضیہ" میں نے اسے دوبارہ مخاطب کیا۔ "اب تو جھگڑا ہی ختم ہو گیا۔ میں بھی تو تمہیں لے کر ملک منصور کی حویلی ہی جا رہا تھا۔"

رضیہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے آنسو زمین پر گرنے لگے۔ میں نے تڑپ کر اسے تسلی دینی چاہی لیکن اس وقت درختوں کی جانب سے میں نے ایک شخص کو نمودار ہو کر اپنی جانب آتے ہوئے دیکھا تو اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔ پہلے وہ ایک ہیولا تھا لیکن رفتہ رفتہ ہیولا انسانی شکل اختیار کر گیا۔ اب میں ملک منصور کو صاف واضح طور پر دیکھ سکتا تھا وہ سفید رنگ کا سفاری سُوٹ پہنے ہوئے تھا اور بالکل نہتّا تھا۔ اس بھیانک اور ویران ماحول میں اس کا وجود رفتہ رفتہ انسانی پیکر کی صورت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ میں دل ہی دل میں اس کی بہادری اور بے جگری کا اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک جیدار اور بے خوف آدمی تھا ورنہ ایسی جرأت نہ کرتا۔ یہ نہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کا واسطہ کس قسم کے لوگوں سے پڑا ہے وہ نڈر ہو کر کسی ہتھیار کے بغیر میری جانب بڑھتا آ رہا تھا۔ میں دل ہی دل میں اس کی خود اعتمادی کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ کچھ اور نزدیک آیا تو اس کی باوقار شخصیت اور زیادہ اُجاگر ہو گئی۔ میں اسے پہلے بھی دیکھ چکا تھا اور ایک بار پھر بالکل بدلے ہوئے حالات میں اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک پُرکشش شخصیت رکھنے والا وجیہہ شخص تھا اور میں نے دل ہی دل میں یہ بھی اعتراف کیا کہ وہ رضیہ جیسی دلکش اور انوکھی عورت کا شریکِ حیات بننے کا پوری طرح اہل تھا۔ وہ بڑے آرام، سکون اور اطمینان سے آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ خوف و خطر سے بے نیاز تھا۔ اسے یہ ڈر بھی نہیں تھا کہ وہ لوگ جو کچھ دیر پہلے اس کے دو آدمیوں کو گولیوں سے چھلنی کر چکے تھے خود اس کے ساتھ بھی یہی سلوک کر سکتے ہیں۔ میں نے کنکھیوں سے رضیہ کی جانب دیکھا۔ وہ ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں اور لرزتے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ ملک منصور کو قدم بہ قدم بڑھتے ہوئے دیکھ رہی تھی اور میں نے اس کی نگاہوں میں ملک منصور

کے لیے ستائش اور احترام کا جذبہ محسوس کیا تھا۔ یکایک مجھے یوں لگا جیسے میں جیتی ہوئی بازی ہار چکا ہوں اور اب میری زندگی بے مقصد اور بے معنی ہو کر رہ گئی ہے۔ یک لخت رقابت کا اذیت بخش احساس میری رگ و پے میں دوڑ گیا۔ میں جو کچھ دیر پہلے ملک منصور کا معترف تھا ایکا ایکی اپنے دل میں اس کے لیے نفرت اور ناپسندیدگی کے جذبات محسوس کرنے لگا۔ ہو سکتا ہے رضیہ کے غیر متوقع تاثر نے میرے ذہن کو مجروح کر دیا ہو۔ بے اختیار میرے ہاتھ میں سٹین گن کا رُخ ملک منصور کی طرف ہو گیا اور اگر رضیہ بے اختیار لپک کر میرے اور ملک منصور کے درمیان نہ آ گئی ہوتی تو غالباً میں ملک منصور پر گولیوں کی بارش کر دیتا۔ رضیہ کی اس حرکت نے مجھے چونکا دیا۔ یوں لگا جیسے میں گہری نیند سے بیدار ہو گیا ہوں۔ رضیہ ابھی تک میری طرف چہرہ کئے کھڑی تھی اور اس کے دونوں بازو فضا میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس کا مقصد تو ملک منصور کے لیے حفاظت اور پناہ طلب کرنا تھا۔ مگر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ ایک پنچھی ہے اور پرواز کرنے کے لیے اپنے پَر تول رہی ہے۔ میرے چہرے اور آنکھوں کے بدلتے ہوئے تاثرات دیکھ کر اس نے اپنے بازو نیچے گرا دیئے اور اُداسی سے مسکرائی۔ پھر اس کی آواز سرگوشی کے انداز میں میرے کانوں سے ٹکرائی: "تم یہی چاہتے تھے نا؟ تمہارا کام خود بخود آسان ہو گیا ہے۔"

میرے جواب دینے سے پہلے اس نے پلٹ کر ملک منصور کی جانب دیکھا جو اُس وقت تک نصف سے زیادہ درمیانی راستہ طے کر چکا تھا اور اب ہم سے زیادہ دُور نہیں تھا۔ رضیہ پر اس کی نگاہ پڑی تو میں نے اس کے فکر مند چہرے کو یکایک اس طرح جگمگاتے ہوئے دیکھا جیسے فانوس اچانک روشن ہو جاتے ہیں۔ اس کا چہرہ اس کے جذبات کا عکاس بن گیا تھا اور اس ایک خاموش لمحے میں اس نے زبان سے کوئی ایک لفظ بھی ادا کئے بغیر وہ سب کچھ بیان کر دیا تھا جسے کہنے کے لیے ایک لمبا عرصہ درکار ہوتا ہے۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ خاموشی کی اپنی ایک زبان ہوتی ہے جو زبان کے مقابلے میں انسانی جذبوں کی ترجمانی زیادہ بہتر طریقے سے کرتی ہے۔

رضیہ کو دیکھتے ہی اس کی باوقار، ٹھہری ہوئی چال میں یک بیک تیزی پیدا ہو گئی اور وہ تقریباً بھاگتا ہوا اس کی جانب لپکا: "رضیہ!" اس نے اپنی باہیں پھیلا کر کہا اور رضیہ کو آغوش میں سمیٹنے کی نیت سے قریب پہنچ گیا لیکن رضیہ نے اچانک آہستگی سے اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کے بازو پر رکھ دیا اور اگر اس نے اچانک اپنا منہ موڑ نہ لیا ہوتا تو ملک منصور اسے یقیناً باہوں میں لے لیتا۔ رضیہ نے اپنا رُخ میری جانب موڑ لیا تھا اور ملک منصور جس کی نگاہیں اُس وقت تک رضیہ پر ہی جمی ہوئی تھیں غالباً پہلی بار اسے میری موجودگی کا احساس ہوا۔ رضیہ کی اس غیر اختیاری حرکت کو غالباً اس نے شرم و حیا پر محمول کیا ہو گا۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر کوئی تاثر پیدا نہیں ہوا۔ وہ جذبات جو چند لمحے پہلے اس کے چہرے کو دمکائے ہوئے تھے دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو گئے اور اس نے اپنے تاثرات کو چشم زدن میں ایسے تبدیل کر لیا جیسے چہرے پر کوئی نقاب پہن لی ہو۔ اس کی چال میں وقار اور انداز میں رکھ رکھاؤ پیدا ہو گیا۔ شخصیت کی مکمل تبدیلی اتنے کم وقت میں میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ میں اس کے بدلتے ہوئے رنگوں کو دیکھنے میں کھویا ہوا تھا کہ ایک دم میرے عقب سے کسی نے میرے بازو پر ضرب لگائی اور سٹین گن میرے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر گئی۔ میری بے خبری میں ملک منصور کا کوئی کارندہ جان ہتھیلی پر رکھ کر پیچھے کی جانب سے مجھے بے قابو کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں زمین سے سٹین گن اٹھانے یا جوابی حملہ کرنے کے لیے کوئی کارروائی کرتا رائفل کی نالی میرے پہلو میں اٹک گئی۔ میری خود فراموشی بہت مہنگی پڑی تھی اور میں جیتی

ہوئی جنگ ہار چکا تھا۔

ملک منصور کے چہرے پر کوئی تاثر نمودار نہیں ہوا۔ رضیہ اب اسے غصّے سے گھُور رہی تھی۔ طیش کے مارے اس کا چہرہ گلنار ہو گیا تھا اور منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔ ملک منصور کی اس حرکت پر شاید وہ بھی ششدر رہ گئی تھی۔

ملک منصور اپنی باوقار چال چلتا ہوا میرے نزدیک پہنچ گیا۔ اس نے ایک نظر میرے چہرے کو دیکھا اور پھر اس کا دایاں ہاتھ تیزی سے حرکت میں آیا۔ ایک طمانچے کی آواز جنگل میں گونجی اور مجھے رائفل کی زد میں لینے والا ہٹا کٹا شخص قلابازی کھا کر دُور گر گیا۔

"قاسم خاں" ملک منصور نے نہایت ٹھہرے ہوئے لہجے اور پُرسکون آواز میں اسے مخاطب کیا۔ "کیا تم نے میرا اعلان نہیں سُنا تھا؟"

"سرکار" اس کے لب کانپ کر رہ گئے اور وہ خوف کے مارے لرزنے لگا۔

"تم نے ہمیں رُسوا کر دیا ہے۔ اگر تم ہمارے قریبی معتمد نہ ہوتے تو ہم تم سے زندہ رہنے کا حق چھین لیتے۔" اتنا کہہ کر وہ مجھ سے مخاطب ہوا اور بارُعب آواز میں کہنے لگا: "مجھے افسوس ہے کہ میری لا علمی میں اس شخص نے وفاداری کے جوش میں ایسی گری ہوئی حرکت کر دی جس کے لیے مَیں تم سے بہت شرمندہ ہوں۔ لیکن اس کے لیے مَیں اپنے آپ کو قصور وار سمجھتا ہوں اور معافی چاہتا ہوں۔" وہ اس بات پر نادم تھا کہ اس کے وعدے کے باوجود اس کے ایک کارندے نے مجھ پر حملہ کر کے اس کی بات جھوٹی کر دی تھی۔

"کوئی بات نہیں۔" مَیں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور جھُک کر زمین پر گری ہوئی مشین گن اُٹھا لی۔ ملک منصور نے میری اس حرکت کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ وہ مجھے نظر انداز کر کے رضیہ کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ رضیہ اپنے جذبات اور اعصاب پر قابو پانے میں کامیاب ہو چکی تھی اور ایک نارمل عورت کی مانند خاموش کھڑی مجھے اور اپنے شوہر کو دیکھ رہی تھی۔ ملک منصور کی نگاہوں میں رضیہ کے لیے بے پناہ محبت کا تاثر تھا۔ مَیں نے رضیہ سے اس کے بارے میں بہت کچھ سُنا تھا۔ لیکن یہ پہلا موقعہ تھا کہ مَیں نے اسے اور رضیہ کو آمنے سامنے دیکھا تھا۔ اس کے چہرے کا تاثر صاف بتا رہا تھا کہ وہ اس عورت کو پرستش کی حد تک چاہتا ہے رضیہ اس سے پہلے شدید جذباتی کشمکش میں مبتلا رہی تھی اور اس کی سانس بے ترتیب تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ اس نے ہیجانی کیفیت پر قابو پالیا اور ایک ایسی عورت کا روپ دھار لیا جو ایک رئیس، با اختیار اور دولت مند شخص کی بیگم تھی۔ اس کے انداز میں خود بخود خود اعتمادی اور شان و شکوہ پیدا ہو گیا تھا۔ اپنے دراز قد اور حسین سراپا کی وجہ سے وہ ایک ممتاز شخصیت نظر آ رہی تھی۔

ملک منصور نے اس کے نزدیک پہنچ کر پوچھا۔ "بیگم۔ کیا یہی وہ شخص ہے جو آپ کو اغوا کر کے لایا تھا اور جس نے آپ کو یرغمال بنا رکھا ہے؟"

رضیہ کے چہرے پر ناراضی کے آثار پیدا ہو گئے۔ "آپ سے یہ کس نے کہا؟" اس کے لہجے میں غصّے کی جھلک نمایاں تھی۔

"مجھے ہیرا ڈاکو نے بتایا تھا اور پھر میری لینڈ روور بھی اس کے پاس ہے۔" پھر وہ میری طرف رُخ کر کے بولا۔ "لیکن اطمینان رکھو۔ مَیں اپنے وعدے کے مطابق تمہیں کوئی سزا دینے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ میرے لیے یہی کافی ہے کہ مجھے رضیہ بخیر و عافیت مل گئی ہے۔"

"ملک صاحب" رضیہ نے تلخ آواز میں کہا۔ "آپ بہت بڑی غلط فہمی کا شکار ہیں۔ آپ کو یہ علم نہیں

کہ میری زندگی اور آپ کی عزت صرف اسی شخص کی بدولت برقرار رہی ہے۔ یہ ایک قابلِ قدر شخص ہے جس نے مجھے بہت احترام اور عزّت کے ساتھ رکھا اور ہر آفت اور مصیبت سے بچایا۔ اس نے بارہا مجھے نئی زندگی دی ہے۔ مَیں اس کا احسان زندگی بھر نہیں بھول سکوں گی۔"

جب تک رضیہ بولتی رہی ملک منصور ایک سحر زدہ انسان کی طرح اس کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ وہ خاموش ہوئی تو ملک منصور کے چہرے پر پہلی مرتبہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں غلط اطلاعات دی گئی ہیں اور ہم ان کے بارے میں غلط فہمی کا شکار رہے۔" وہ میری طرف پلٹا اور بے تکلفی سے بولا: "یقین کیجیے مَیں آپ کا احسان مند ہوں۔ مَیں ہی نہیں مجھ سے وابستہ ہر چیز پر آپ کا اختیار ہے۔ رضیہ بیگم نے آپ کے بارے میں چند لفظوں میں جو کچھ کہا ہے اس کے بعد آپ میرے لیے دُنیا بھر میں سب سے زیادہ قابلِ عزّت شخص ہیں۔ اس احسان کے بدلے آپ جان بھی مانگیں گے تو مجھے انکار نہ ہو گا۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔

وہ عجیب و غریب شخص اپنی ہر ادا اور ہر حرکت سے مجھے حیران کر رہا تھا۔ اب تک مَیں اس کی شخصیت سے متاثر تھا لیکن اب وہ مجھے مرعوب کرنے لگی تھی۔ مجھے یاد نہیں کہ ساری عمر میں مجھے کبھی کسی شخص نے اس طرح متاثر اور مرعوب کیا ہو۔ اس کے لیے میرے دل میں پیدا ہونے والی ناپسندیدگی اب رفتہ رفتہ غائب ہو چکی تھی۔ اس کی جگہ میرے دل میں اس کے لیے ستائش اور تحسین کے جذبات کلبلانے لگے تھے۔ مَیں نے جب اس کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اس میں پورا خلوصِ نیّت شامل تھا۔ اس کا ہاتھ گرم اور ملائم تھا لیکن اس کی گرفت آہنی اور مضبوط تھی۔ اس نے نہایت گرمجوشی سے میرے ہاتھ کو دبایا اور بولا

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"یوسف" مَیں نے مختصر جواب دیا۔

"مَیں تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ مگر بہت کچھ جاننا چاہتا ہوں۔ تمہارے ساتھ اور کتنے لوگ ہیں؟"

"دو عورتیں۔" مَیں نے رضیہ کی جانب اشارہ کیا۔ "ایک آپ کی بیگم اور ایک ملازمہ۔"

اس نے حیرت اور بے یقینی سے مجھے دیکھا: "مَیں نے تمہارے بارے میں جو کچھ سُنا ہے کیا وہ سب تم نے تنہا ہی کیا ہے؟ تمہارے ساتھ کوئی گروہ نہیں تھا؟"

مَیں نے مسکرا کر اپنے سر کو نفی میں حرکت دی اور وہ بے اعتباری سے مجھے دیکھنے لگا۔

"مَیں نے اتنا بہادر اور جنگجو آدمی پہلے کبھی نہیں دیکھا۔" رضیہ نے اچانک ہماری گفتگو میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ "انھوں نے جو حیرت انگیز کارنامے کئے ہیں اگر کوئی اور مجھے بتاتا تو مَیں اسے کہانی سمجھ کر نظر انداز کر دیتی۔ مگر مَیں نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اس پر یقین کرنا ہی پڑتا ہے۔ ایسے لوگ تو صرف کہانیوں ہی میں ہوتے ہیں۔ مگر یہ جیتے جاگتے، سچ مچ انسان ہیں۔"

ملک منصور تعریفی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

"یقین کیجئے۔ آپ کی بیگم کو مَیں نے انتہائی نڈر اور آہنی اعصاب کی عورت پایا ہے۔ انھوں نے کبھی ہمت نہیں ہاری۔ کبھی ہار نہیں مانی۔ کسی سے خوفزدہ نہیں ہوئیں۔ بڑے بڑوں کے دانت کھٹے کر دیئے ہیں انھوں نے۔" مَیں نے ملک منصور کو بڑے خلوص سے بتایا اور مجھے بالکل یقین نہیں آیا جب انھوں نے مشین گن سنبھال کر ایک پورے گروہ کو تہس نہس کر دیا۔ مَیں نے اپنی زندگی میں ہر قسم کے لوگ اور ہر

قسم کی عورتیں دیکھی ہیں مگر ملک صاحب یقین کیجیے۔ آپ کی بیگم بالکل انوکھی اور یکتا ہیں۔"
رضیہ نے مسکرا کر اپنی نگاہیں جھکا لیں۔ ملک منصور چند لمحے محبت بھرے انداز میں اپنی بیوی کو دیکھتا رہا۔ پھر مسکرانے لگا اور بولا۔ "معلوم ہوتا ہے آپ دونوں نے ایک دوسرے کی تعریف کرنے کا معاہدہ کر لیا ہے۔" اس کا لہجہ انتہائی شوخ اور بے تکلفانہ تھا۔ میں اور رضیہ دونوں ہنس پڑے اور ملک منصور نے حیران ہو کر اپنی بیوی کو دیکھا جس کا حسین چہرہ مسکراہٹ کے باعث اور زیادہ دلکش ہو گیا تھا۔ شاید اس نے بھی کبھی رضیہ کو ہنستے یا مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ خود میرے لیے بھی یہ ایک نیا تجربہ اور مشاہدہ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہنستے ہوئے اس کے چہرے کی ملاحت اور کشش دو چند ہو گئی تھی۔
"کیا ہم اب یہیں کھڑے رہیں گے؟" رضیہ نے اچانک سوال کیا اور ملک منصور جو بڑی محویت سے اسے دیکھ رہا تھا چونک پڑا۔ "اوہ۔ آئی ایم سوری۔ یوسف صاحب آپ کی ساتھی دوسری عورت کہاں ہے؟"
میں نے اپنے عقب میں دیکھا جہاں ہم لالی کو چھوڑ آتے تھے۔ اتنی دیر تک ہم اسے فراموش ہی کر بیٹھے تھے۔ لیکن میرے پکارنے سے پہلے ہی لالی ہاتھ میں پستول لیے ہوئے نمودار ہو گئی۔ وہ کسی درخت کے پیچھے سہمی ہوئی کھڑی تھی اور اس دوران میں ہماری گفتگو سنتی رہی تھی۔ جب حالات کو بہتر اور خوشگوار پایا تو وہ اپنی پناہ گاہ سے باہر نکل آئی۔ ملک منصور نے حیران مگر مسکراتی ہوئی آنکھوں سے لالی کو دیکھا اور پھر رضیہ کی جانب نگاہ کی جو مشین گن ہاتھ میں اٹھائے کھڑی تھی: "بہت خوب۔" وہ مزاحیہ انداز میں کہنے لگا: "آپ کی ساری فوج کو دیکھ لیا۔ اب ہمیں یہاں سے چلنا چاہیے۔"
واپسی کا سفر میں نے اور رضیہ نے ملک منصور کے ساتھ ہیلی کاپٹر میں طے کیا۔ لالی کو لینڈ روور میں سفر کرنے کی ہدایت کر دی گئی تھی۔ ہیلی کاپٹر نے ملک منصور کی "کوٹھی" تک کا فاصلہ قریب قریب ایک گھنٹے میں طے کیا۔ یہ نہایت وسیع و عریض جگہ میں تعمیر شدہ ایک شاندار دو منزلہ عمارت تھی جسے "کوٹھی" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ اس کے گرد دُور دُور تک خوبصورت باغات اور پھلوں کے درختوں کا جال پھیلا ہوا تھا۔ ایک جانب چھوٹی سی پہاڑی تھی جس کے ساتھ ایک جھیل بنی ہوئی تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ دراصل وہ ایک بہت بڑا سوئمنگ پول تھا جسے جھیل کی شکل دے دی گئی تھی۔
یہ عمارت کسی محل سے کم شاندار اور پُرشکوہ نہیں تھی اور بہت وسیع علاقے میں پھیلی ہوئی تھی۔ ساری عمارت میں سنگ مرمر کا فرش تھا۔ مختلف مقامات پر خوبصورت قیمتی قالین بھی بچھے ہوئے تھے۔ اس کی نفاست اور آرائش دیکھ کر یوں لگا جیسے کسی بیرونی ملک کے رئیس کی رہائش گاہ میں پہنچ گئے ہیں۔ رضیہ نے بعد میں بتایا کہ اس عمارت کی تعمیر، آرائش اور تزئین کے لیے یورپ کے ماہرین کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ عمارت کے چاروں طرف درجنوں کنال میں پھیلے ہوئے باغات تھے اور چاروں کناروں پر اونچے اور مضبوط مینار بنے ہوئے تھے جن پر سرچ لائٹس نصب تھیں اور یہاں رات دن حفاظت کے لیے جدید ترین اسلحہ سے لیس محافظ چوکس رہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ نجی ملازمین کی بھی ایک بہت بڑی تعداد خدمت کاروں کے طور پر موجود تھی جن میں عورتیں اور مرد شامل تھے۔ یہ سب خوبصورت یونیفارموں میں ملبوس ہوا کرتے تھے۔ اور انتہائی مہذب، مؤدب اور شائستہ تھے۔ بعد میں پتہ چلا کہ ان کی تربیت کے لیے خاص طور پر ایک انگریز خاتون کی خدمات مہیا کی گئی تھیں۔
کوٹھی پہنچ کر مجھے ایک خوبصورت اور آرام دہ کمرے میں ٹھہرا دیا گیا جہاں فوراً ہی پہننے کے لیے لباس

بھی فراہم کردیا گیا تھا۔ ملک منصور بذاتِ خود مجھے اس کمرے تک پہنچانے گیا اور جاتے ہوئے بتایا کہ ہم لوگ رات کے کھانے پر اکٹھے ہوں گے۔ اس کمرے میں ہر چیز شاہانہ تھی۔ ایک طویل غسل کے بعد میں بستر پر لیٹ گیا اور جب آنکھ کھلی تو رات کی تاریکی چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ کمرے میں کسی خدمتگار نے نہ جانے کس وقت آکر ایک آسمانی رنگ کا نائٹ بلب روشن کردیا تھا۔ جس کی ٹھنڈی ٹھنڈی پُرسکون روشنی بہت بھلی اور دل خوش کن تھی۔

کھانے پر ملک منصور اور رضیہ سے ملاقات ہوئی۔ وہ دونوں ہی تازہ دم اور شگفتہ نظر آرہے تھے۔ پُرتکلف کھانے کے بعد کافی کا دَور چلا اور اس کے بعد ہم لوگ ایک مختصر سے گول کمرے میں چلے گئے۔ کھانے کے دوران بھی باتوں کا سلسلہ جاری رہا اور مجھے پتہ چلا کہ اس درمیان میں رضیہ نے میرے بارے میں ملک منصور کو بہت کچھ بتا دیا ہے۔ یہ بات میرے لیے تسلّی کا باعث تھی کہ رضیہ اور ملک منصور کے درمیان کشیدگی اور ربخ بستگی کی فضا باقی نہیں رہی تھی اور وہ دونوں خاصے گرمجوشی اور بے تکلف انداز میں ایک دوسرے کو مخاطب کررہے تھے۔ انھیں ہنستے اور باتیں کرتے ہوئے دیکھا تو ایک لمحے کے لیے میرے دل کے کسی گوشے میں رقابت کے جذبے نے سر اُٹھایا مگر پھر اس کی جگہ خوشی اور اطمینان نے لے لی۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ میرے اور رضیہ کے راستے بالکل جُدا تھے اور ہم مختلف سمتوں کے مسافر تھے اور اس میں بھی کوئی شک نہیں تھا کہ وہ دونوں اپنی گوناگوں خوبیوں اور صلاحیتوں کی بناء پر ایک دوسرے کے مستحق بھی تھے۔ میں نے غیر جانبداری سے ان دونوں کو دیکھا تو مجھے اندازہ ہوا کہ اتنا مثالی اور مکمل جوڑا شاید ہی دنیا میں کوئی اور ہوگا۔ خوشی اور فخر کے اس احساس نے مجھے سرشار کردیا کہ ان دونوں کو ایک دوسرے کے نزدیک لانے میں میری کوششیں بھی شامل تھیں۔

کافی کے دوران میں ملک منصور نے ایک قیمتی سگار سُلگا لیا اور مجھے بھی اصرار کرکے ایک سگار تھما دیا۔ میں نے بہت کہا کہ سگار نوشی میں سالہا سال پہلے چھوڑ چکا ہوں مگر ملک کا اصرار بے پناہ تھا۔ رضیہ نے بھی اس کا ساتھ دیا اور بولی: "یوسف صاحب۔ ایسے دن اور ایسے موقعے زندگی میں بار بار نہیں آتے۔ چلیے۔ آج کے دن کی یادگار کے طور پر ہی سہی۔" اور میں نے سگار سلگا لیا۔

"یوسف" ملک منصور نے اچانک سنجیدگی سے مجھے مخاطب کیا۔ "میں تمہارے اور اپنے درمیان اجنبیت اور فاصلہ محسوس نہیں کرتا۔ لگتا ہے جیسے ہم ہمیشہ سے ایک دوسرے کے دوست رہے ہیں۔ اس لیے کسی تکلیف اور رسمی آداب کے بغیر تمہیں مخاطب کررہا ہوں۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟"

"بالکل نہیں۔" میں نے سگار کا دھواں فضا میں پھیلاتے ہوئے کہا۔ "ہم زندگی بھر کے لیے ایک دوسرے کے دوست بن چکے ہیں اور یہ تعلق ہمیشہ قائم رہے گا۔"

"تو پھر میری دو باتوں میں سے ایک تمہیں ماننی پڑے گی۔" وہ صوفے پر سیدھا ہوکر بیٹھ گیا: "مجھے اللہ نے بہت کچھ دیا ہے۔ دولت، عزت، حیثیت، رسوخ، کوئی دنیاوی شے ایسی نہیں ہے جو مجھے قدرت نے نہیں بخشی۔ میں چاہتا ہوں کہ اب تم میرے ساتھ ہی رہو۔"

میں نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر اس نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا اور بولا: "دوسری بات یہ ہے کہ رضیہ تمہاری پرابلم کے بارے میں مجھے سب کچھ بتا چکی ہے۔ تمہارا دشمن اور حریف لوُنی ایک طاقت ور اور صاحبِ اختیار شخص ہے۔ اس کے ہاتھ پیر بہت دُور دُور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اسے کچلنے کے لیے تمہیں جتنی طاقت کی ضرورت ہے وہ میں تمہیں فراہم کرسکتا ہوں۔ میں لوُنی کو اس کی بدمعاشی کی سزا دینے کی

قدرت رکھتا ہوں۔ میں اسے کچل کر رکھ دوں گا۔ تم آرام سے دیکھتے رہو۔ مجھے صرف چند دن کی مہلت درکار ہے۔ بس اب تم بولو۔ تمہاری باری ہے۔"

میں نے رضیہ کی جانب دیکھا۔ وہ مسکراتے ہوئے کافی کا گھونٹ بھر رہی تھی۔ ملک منصور مجھے خضر کی صورت ملا تھا۔ وہ میری تمام مشکلات دُور کرنے کے قابل تھا اور اس کا خواہش مند بھی۔ میں کشمکش و پیچ میں پڑ گیا۔

مجھے حالات کی ستم ظریفی پر ہنسی آگئی۔ واقعی وقت اور حالات کو بدلتے دیر نہیں لگتی اور کوئی انسان سوچ بھی نہیں سکتا کہ اگلے چند گھنٹوں یا دِنوں میں حالات کون سا رُخ اختیار کرلیں گے؛ اس وقت میں ملک منصور کی کوٹھی میں بیٹھا ہوا اس کا پیش کیا ہوا سگار پی رہا تھا اور اس کی میزبانی کا لُطف اُٹھا رہا تھا۔ کچھ عرصے پہلے ملک منصور کے نام ہی سے میرے جسم میں خون کی گردش تیز ہوجاتی تھی اور میں اسے دنیا کا بدترین انسان سمجھتا تھا۔ حالانکہ میں نے اسے کبھی دیکھا تک نہیں تھا۔ میں نے اپنے تصوّر میں جس شخص کا نقشہ مرتب کیا تھا ملک منصور درحقیقت اس کے برعکس تھا۔ اس کی کشادہ دلی، ذہانت، بہادری اور اعلیٰ ظرفی نے میرا دل موہ لیا تھا اور وہ شخص جو میرے نزدیک دنیا کا بدترین ولین تھا۔ اب ایک بالکل مختلف شکل میں میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

پھر میں نے رضیہ پر ایک نظر ڈالی۔ اس کی صلاحیت، ذہانت اور حُسن میں کوئی کلام نہیں تھا۔ وہ ایک بہادر اور جراٗت مند عورت تھی لیکن کیا یہ وہی رضیہ تھی جسے میں پچھلے چند ہفتوں سے جانتا تھا۔ جس کو اپنے شوہر کے نام ہی سے چڑ ہوا کرتی تھی۔ جو اپنے شوہر کی محبت، پرستش اور دریا دلی کے باوجود اس کو سخت ناپسند کرتی تھی۔ یہ وہی رضیہ تھی جس نے کڑے سے کڑے وقت میں میرے شانہ بشانہ کھڑے ہوکر حالات کا مردانہ وار مقابلہ کیا تھا۔ جس کے بارے میں میرے دل میں ایک نرم گوشہ پیدا ہوچکا تھا اور جس نے اشاروں کنایوں میں مجھے اپنی پسندیدگی کا یقین دلایا تھا۔ وہ زندگی کا باقی ماندہ سفر میری ہمراہی میں طے کرنے کی خواہش مند تھی۔ مگر اب وہی رضیہ میرے سامنے ایک مطمئن اور آسودہ گھریلو بیوی کی تصویر بنی بیٹھی تھی۔ وہ اپنی موجودہ زندگی اور بدلے ہوئے حالات سے قطعی مطمئن اور آسودہ نظر آرہی تھی۔ وہ کنکھیوں سے پیار بھری نظروں سے ملک منصور کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ دونوں ایک بے انتہا مسرور اور محبت کرنے والا جوڑا ہیں جن کے درمیان مکمل ہم آہنگی اور افہام و تفہیم ہے۔ جو ایک دوسرے کے بغیر چند لمحے بھی زندگی بسر کرنے کا تصوّر نہیں کرسکتے۔

اور یہ میں تھا۔ ایک قانون اور انصاف سے بھاگا ہوا مفرور شخص۔ جو پناہ کی تلاش میں دنیا بھر میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ جسے اپنی بے گناہی اور معصومیت ثابت کرنے کے لیے بہت کچھ کرنا تھا مگر جو بار بار دوسروں کے مسائل میں گرفتار ہوجاتا تھا۔ ہر بار اپنے مقصد سے ہٹ کر کسی نئی آفت میں مبتلا ہوجاتا تھا۔ مجھے یہ مان تھا کہ میں اپنے تمام مسائل سے بذاتِ خود ہی نمٹ سکتا ہوں۔ میں وہ شخص تھا جس نے بارہا اپنی دلیری اور بے جگری کا ثبوت فراہم کیا تھا جو ہر مصیبت کے سامنے سینہ سپر ہوکر موت کی بھی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے للکار سکتا تھا۔ جس نے تن تنہا دشمنوں کی پوری پوری فوجوں کا مقابلہ کیا تھا اور انھیں تہس نہس کردیا تھا۔ لیکن جو خود اپنے اردگرد پھیلائے ہوئے مکر و فریب کے جال سے چھٹکارا حاصل کرنے سے معذور تھا اور اب رضیہ کی سفارش پر ملک منصور مجھے اپنی امداد اور تعاون کا یقین دلا رہا تھا اس کے خلوص اور محبت بھرے جذبے کو میں سراہے بغیر نہیں رہ سکتا تھا مگر کیا یہ میرے لیے مناسب اور احسن بھی ہوگا کہ میں دوسرے کے کاندھوں پر سوار ہوکر اپنے حریفوں سے جنگ کرنے جاؤں اور اپنی نجی لڑائی کے لیے اُن لوگوں کی امداد اور تعاون حاصل کروں جو کچھ دیر پہلے تک میرے لیے نہ صرف اجنبی تھے بلکہ جن کے لیے میں اپنے دل میں نفرت اور دشمنی کے سوا اور کوئی جذبہ نہیں پاتا تھا۔ اب بدلے ہوئے

حالات میں ہم ایک دوسرے کے محسن اور رفیق تھے۔ مَیں نے نہ چاہتے ہوئے بھی ملک منصور کے ناموس کی حفاظت کے لیے جو خدمات سرانجام دی تھیں وہ غیرت مند شوہر اب ان کا بدلہ اتارنا چاہتا تھا۔ پھر رضیہ اور ملک منصور کی زندگی اور خیالات میں جو انقلاب رونما ہو چکا تھا بہت حد تک اس کا سہرا بھی میرے ہی سر تھا۔ چنانچہ ایک منتقم مزاج حساس اور احسان شناس شخص کی مانند وہ میرا حساب چکانا چاہتا تھا۔ اس کا انداز انتہائی دوستانہ اور اس کی پیشکش خلوص اور محبت سے بھرپور تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ میں دنیا بھر کے آلام سے منہ موڑ کر خود کو اس کے لیے وقف کردوں اور ایک شریکِ کار اور دوست کی طرح اس کے ساتھ رہوں۔ یا پھر اس کی دولت اور رُسوخ کے بل پر اپنے سب سے بڑے دشمن کو کچلنے کی طاقت پیدا کرلوں۔

میرے لیے یہ دونوں صورتیں ناقابلِ قبول تھیں۔

"کس سوچ میں پڑ گئے ہیں آپ؟" رضیہ کی شوخی بھری آواز نے مجھے خیالات کے ہجوم سے باہر نکلنے میں مدد دی۔ وہ میری طرف معنی خیز انداز میں دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ گزشتہ چند گھنٹوں میں رضیہ سرتاپا بدل گئی تھی۔ اب وہ ایک ہنس مکھ، شوخ و طرار اور زندہ دل عورت تھی جو زندگی کی تمام خوشیوں سے بہرہ ور نظر آ رہی تھی۔

"شاید آپ کو میری بات پسند نہیں آئی!" ملک منصور نے سگار کو ایش ٹرے میں کچلتے ہوئے کہا۔ "سچ جانیے میں نے محض مخلص دوست اور احسان کے بوجھ سے دبے ہوئے آدمی کی حیثیت میں آپ کو یہ آفر کی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں اپنی جان دے کر بھی آپ کے احسانوں کا بدلہ نہیں چکا سکتا اور میں نے جو کچھ پیش کیا ہے یہ آپ کی مہربانیوں کا عشرِ عشیر بھی نہیں ہے۔ آپ ٹھنڈے دل سے سوچیے اور آرام سے فیصلہ کیجیے۔ کوئی جلدی نہیں ہے۔"

میں ہنس پڑا۔ "ملک صاحب! آپ نے مجھے غلط سمجھا۔ آپ کی بات کا بُرا ماننے کا تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ نہ جانے کیوں میں خود کو آپ سے بہت نزدیک محسوس کرتا ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے ہم ہمیشہ سے ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ جب زبان سے دوست کہا ہے تو دل نے بھی اقرار کیا ہے اور یہی بات میں آپ کے بارے میں بھی کہہ سکتا ہوں۔ کیونکہ آپ بھی میری طرح کھلے دل کے آدمی ہیں۔ لگی لپٹی رکھنے کے قائل نہیں ہیں۔"

"یہ ہوئی نا بات۔" ملک منصور نے اپنے صوفے کے ہتھے پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "رضیہ، دیکھا میں کیا کہتا تھا۔ یوسف بھائی ہیرا ہیں ہیرا۔"

رضیہ کے چہرے پر بھی مسکراہٹ کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ "اور میں نے آپ سے کیا کہا تھا؟ جناب میں انسانوں کی پرکھ میں دھوکہ نہیں کھاتی۔"

"ٹھیک کہتی ہو۔" ملک منصور نے چھیڑ خانی کی۔ "بس صرف مجھے سمجھنے میں غلطی ہو گئی تھی۔"

"یہ بات نہیں ہے۔ دراصل وہ میری ضد تھی، ورنہ آپ کے بارے میں مجھے کبھی کوئی غلط فہمی نہیں تھی۔"

"یوسف بھائی! آپ میرے لیے بہت بھاگوان ثابت ہوئے ہیں۔ یقین مانیے آپ کے آنے سے میری تو زندگی ہی بدل گئی ہے۔"

"بدل گئی ہے یا سنور گئی ہے؟" رضیہ نے کھنکتی ہوئی شریر آواز میں پوچھا۔

"آپ مہربان ہو گئی ہیں تو پھر سنورنے میں کیا دیر لگتی ہے۔" اس نے برجستہ کہا اور وہ دونوں ہنسنے لگے۔ میں بھی مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا۔ ملک منصور نے کہا۔ "تو پھر کیا سوچا آپ نے؟"

"ارے ارے۔" رضیہ بول پڑی۔ "آپ نے تو سود خوروں کی طرح تقاضے شروع کر دیئے۔ انھیں سوچنے کا موقع تو دیجیے۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔"

"نہیں۔" میں سنجیدگی سے صوفے سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "مجھے سوچنے کے لیے وقت درکار نہیں ہے۔ میں فیصلہ کر چکا ہوں۔"

وہ دونوں پُرامید نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔ میں نے سگار کا ایک لمبا کش لے کر سگار کو ایش ٹرے میں مسل دیا اور ملک منصور کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ "میرا فیصلہ یہ ہے کہ مجھے تمہاری دونوں باتیں منظور نہیں ہیں۔"

ملک منصور بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔ رضیہ بھی چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔

"مگر۔"

"شانتی۔ شانتی۔" میں نے دونوں ہاتھ اُٹھا کر انھیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ "میری پوری بات سنے بغیر کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ دیکھیں، یہ تو آپ لوگ جانتے ہیں کہ میں ایک مقصد کی تلاش میں دنیا بھر میں مارا مارا پھر رہا ہوں۔ ایک شخص نے بیٹھے بٹھائے میری خوشیوں پر شب خون مارا ہے۔ اس نے میرا سب کچھ لُوٹ لیا ہے یہاں تک کہ میری عزت بھی۔ اگر میں یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلی دوں کہ میری بیوی روزی تو پہلے ہی اُن کے ساتھ ملی ہوئی تھی اور اس نے اگر میرے ساتھ بیوفائی کی تو اس سے میری غیرت پر کوئی زد پڑی تو یہ دُرست نہیں ہوگا۔ یہ محض دل کو بہلانے کا بہانہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ روزی جیسی بھی تھی بہرحال میری بیوی تھی اور ساری دُنیا اسے میری بیوی کے طور پر جانتی ہے۔ پھر اگر وہ کسی اور کے قبضۂ قدرت میں چلی گئی تو یہ میرے لیے شرمساری کا مقام ہے۔ کوئی بھی باحمیت اور غیرت مند مرد اپنی عزت اور ناموس کو یوں لُٹتے اور بے آبرو ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ میرا بھی یہی حال ہے۔"

یہ کہہ کر میں دم لینے کو رُک گیا۔ اچانک فرطِ جذبات سے مجھے اپنی سانس رُکتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھی۔ میری آواز گلوگیر ہو گئی تھی۔ دل بھر آیا تھا۔ شاید اس کا سبب یہ تھا کہ آج پہلی بار میں ایسی ہستیوں کے سامنے اپنا حالِ دل بیان کر رہا تھا۔ جنھیں میں درحقیقت اپنا ہمدرد اور دوست سمجھتا تھا۔ آج میرے گھٹے گھٹے جذبات اور دبے ہوئے احساسات کو باہر نکلنے کا راستہ مل گیا تھا اور میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کا خواہشمند تھا۔ رضیہ اور منصور بالکل خاموش، دم سادھے ہوئے بیٹھے میرے تمتمائے ہوئے چہرے کو دیکھ رہے تھے۔ میں اپنے جذبات کے آتش فشاں کو اُبلنے سے روکنے کی کوشش کر رہا تھا اور انھیں احساس تھا کہ میرے دل پر کیسی قیامت گزر رہی ہے۔

میں نے ایک طویل سانس لی اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ "دوسری بات یہ ہے کہ لوٹنی نے مجھے ذاتی طور پر نقصان پہنچایا ہے۔ صدمہ پہنچایا ہے، اذیت پہنچائی ہے۔ یہ محض میری دولت اور جائیداد کا مسئلہ نہیں ہے۔ اس نے دراصل میری ذات کو ایک چیلنج دیا ہے۔ اپنی طاقت اور چالاکی کے زعم میں مجھے للکار کر یہ بتایا ہے کہ وہ کس قدر طاقت ور اور بااختیار ہے۔ یہ ایک ذاتی چیلنج ہے۔ اگر میں نے اس چیلنج کو قبول نہ کیا تو یہ میری شکست اور ذلت ہوگی اور اگر میں نے اس چیلنج کو قبول کرنے اور اُس سے بدلہ لینے کے لیے دوسروں کی مدد اور سہارا حاصل کیا تو یہ میرے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہوگا۔ میں اس جنگ کو خالص نجی اور ذاتی جنگ سمجھتا ہوں۔ اُس نے مجھے للکارا ہے۔ اس کا جواب دینے کے لیے مجھے بھی محض اپنے زورِ بازو پر ہی بھروسہ کرنا ہوگا۔ ورنہ میں ساری زندگی احساسِ شکست اور احساسِ کمتری کے بوجھ سے نجات حاصل نہیں کر سکوں گا۔ میرا ضمیر ہمیشہ مجھے کچوکے دیتا رہے گا۔ اس کی ایک مثال میں پیش کرتا ہوں۔ چوہدری نے رضیہ کو اغوا کرا لیا تھا۔ یہ تمہارے لیے ایک چیلنج تھا۔ اگر تم خاموش بیٹھ جاتے تو یہ تمہاری موت ہوتی۔ تم نے قہر بن کر اُس پر ٹوٹ پڑنے کا فیصلہ کیا۔ تم چاہتے تو یہ کام اپنے ملازموں کے ذریعے بھی کرا سکتے تھے۔ مگر تم خود بےتاب ہو کر وہاں پہنچ گئے۔ آخر کیوں؟! اس لیے کہ یہ تمہارا ذاتی معاملہ تھا۔ اگر وہ تمہاری جائیداد پر قبضہ کر لیتا تو شاید تم اسے اپنی ذاتی اَنا کا مسئلہ نہ بناتے۔"

میں نے صوفے پر بیٹھ کر میز پر رکھے ہوئے سگار کے ڈبے میں سے ایک قیمتی سگار نکال کر سُلگا لیا۔ ملک منصور اور رضیہ ابھی تک خاموش اور بےحس و حرکت بیٹھے میری جانب تک رہے تھے اور میں اپنے بھڑکے ہوئے جذبات کو قابو میں کرنے کے لیے سگار کے کش پر کش لگا رہا تھا۔ چند لمحے تک کوئی بھی کچھ نہ بولا۔ پھر ملک منصور اپنے صوفے

پرسے اُٹھ کر میرے صوفے کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ اس نے محبت سے اپنا ہاتھ میرے بازو پر رکھا اور گرمجوشی سے بولا۔

"یوسف! مَیں تمہارے جذبات کا اندازہ لگا سکتا ہوں۔ اگر انجانے میں تمہیں تکلیف پہنچائی ہے تو معافی چاہتا ہوں۔ مگر قسم سے مَیں نے تمہیں اپنا سمجھ کر یہ پیشکش کی تھی۔ تمہیں زبان سے بھائی کہا ہے تو دل سے بھی بھائی سمجھتا ہوں۔ تم جس طرح مناسب سمجھو کرو۔ مگر یہ مت بھولنا کہ جس وقت اور جس طرح بھی میری ضرورت محسوس ہو بلا تکلّف مجھے اطلاع دے دینا۔"

مَیں نے مسکرا کر اس کا ہاتھ دبایا مگر منہ سے کچھ نہیں کہا۔ ماحول ایک دم بوجھل اور اُداس ہو گیا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ اُن دونوں کو ایک طویل عرصے بعد اچانک اور غیر متوقع خوشی حاصل ہوئی تھی مگر مَیں نے انھیں خواہ مخواہ دل گرفتہ کر دیا تھا۔ مَیں نے ایک لمبی جماہی لی اور کہا: "میرے خیال میں اب سب سے اچھا پروگرام یہ ہے کہ اتنے لمبے عرصے کی تھکن اُتارنے کے لیے سو جائیں۔"

"خیال بُرا نہیں ہے۔" ملک منصور بھی مسکرانے لگا۔ "کیوں رضیہ؟"

رضیہ نے بھی مسکرا کر سر جھکا لیا۔

میرا بیڈ روم انتہائی پُرتعیش اور آرام دہ تھا مگر مجھے نرم و ملائم بستر پر نیند نہیں آ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے پُرانے زخم تازہ ہو گئے ہوں۔ مَیں بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا اور سوچتا رہا۔ آخر اس مسئلے کا حل کیا ہے؟ مَیں کب تک اپنی پہچان کی تلاش میں زمانے بھر کی خاک چھانتا پھروں گا؟ یکا یک برق کی طرح ایک خیال میرے ذہن میں کوندا اور مَیں بے اختیار بستر سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ واقعی مَیں نے سوچا۔ مَیں بھی کتنا احمق ہوں کہ یہ خیال مجھے پہلے نہیں سُوجھا۔ بزرگوں کا قول ہے کہ بہترین دفاع یہ ہے کہ جارحیت اختیار کی جائے۔ مَیں جو اتنے عرصے سے ایک جگہ سے دوسری جگہ ٹھوکریں کھاتا پھر رہا ہوں۔ آخر اپنے دشمن پر حملہ آور کیوں نہیں ہوتا؟ مَیں اِدھر اُدھر بھاگتا پھر رہا ہوں اور وہ اطمینان سے میری بے سروسامانی کا تماشا دیکھ رہا ہے حالانکہ مجھے سب سے پہلے اُس کے ٹھکانے کا رُخ کرنا چاہیے تھا!

مجھے یوں لگا جیسے مجھے ایک بہت مشکل سوال کا جواب مل گیا ہے اور مَیں خود بخود پُرسکون اور مطمئن سا ہو گیا۔

دروازے پر ہلکی سی دستک کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ مَیں نے دروازہ کھول دیا۔ سامنے لالی کو دیکھ کر مَیں چونک سا گیا: "لالی۔ تم؟ اور اس وقت؟" وہ سیاہ ریشمی شلوار قمیض میں بالکل بدلی بدلی لگ رہی تھی۔

"صاحب جی! مَیں اندر آ جاؤں؟" اُس نے چھوٹی سی آواز میں پُوچھا۔

مَیں ہنسنے لگا: "ارے جب یہاں تک آ گئی ہو تو اندر بھی آ جاؤ۔"

وہ کمرے میں داخل ہو کر صوفے کے پاس سہمی سہمی اور خاموش کھڑی ہو گئی۔

"کہو۔ کیا بات ہے؟" مَیں نے پوچھا۔

"مَیں آپ سے اتنی رات گئے ضروری باتیں کرنے آئی ہوں۔ آپ مجھے دیکھ کر غصّے تو نہیں ہوئے؟"

"فضول باتیں مت کرو اور قالین پر بیٹھ جاؤ۔" وہ چُپ چاپ بیٹھ گئی۔ "اب بولو کیا بات ہے؟"

"صاحب جی! مَیں نے سُنا ہے کہ آپ یہاں سے جا رہے ہیں؟"

"اس میں حیرانی کی کیا بات ہے۔" مَیں ہنس پڑا: "بھئی آخر مجھے اپنے گھر تو جانا ہی ہے۔ شکر ہے کہ مَیں نے تم لوگوں کو ٹھکانے پر پہنچا دیا۔"

"مگر یہ میرا ٹھکانہ تو نہیں ہے۔" وہ سادگی سے بولی: "مجھے تو آپ اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ اب مجھے پرائے گھر میں چھوڑ کر کیوں جا رہے ہیں۔"

"پرائے گھر میں؟" اب میرے حیران ہونے کی باری تھی: "ارے یہ رضیہ کا گھر ہے۔ تیری رضیہ بی بی کا۔"

"تو کیا ہوا۔ یہ میرا گھر تو نہیں ہے نا۔"

مَیں نے شرارت سے کہا: "ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ مَیں رضیہ سے کہوں گا وہ تیری شادی کر دیں گی۔ پھر تیرا گھر بھی ہو جائے گا۔"

مگر اس کے چہرے پر مسکراہٹ یا شادابی پیدا نہیں ہوئی۔ وہ بدستور غمزدہ تھی اور انگلیوں سے قالین کے نقش و نگار کُرید رہی تھی۔ اس نے نگاہیں اُٹھا کر اُداسی سے مجھے دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔ مجھے احساس تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتی تھی مگر مَیں اس کی بات پر کان نہیں دھر سکتا تھا۔

"دیکھو لالی۔" مَیں نے اسے سمجھایا: "میرا بھی کوئی گھر نہیں ہے۔ مَیں ایک آوارہ گرد شخص ہوں۔ جس کی زندگی ہر وقت خطرے میں رہتی ہے۔ مگر تم ایک عورت ہو۔ تمہیں سائبان کی ضرورت ہے۔ ایک مضبوط سہارے کی ضرورت ہے۔ تم میری طرح آوارہ گرد اور خانہ بدوش بن کر زندگی نہیں گزار سکتیں اور پھر تم رضیہ کو پسند کرتی ہو اور وہ بھی تمہیں پسند کرتی ہے۔ یہ گھر تمہارے لیے بہترین ٹھکانہ اور پناہ گاہ ثابت ہو سکتی ہے۔"

"میری طرف سے بھی سارے فیصلے خود ہی کرنے لگے۔" اس نے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔

مَیں نے کہا: "یہ فیصلہ نہیں میرا مشورہ ہے۔ آگے تمہاری مرضی!"

وہ قالین پر کھسکتی ہوئی میرے صوفے کے نزدیک آ گئی اور میری طرف چہرہ اُٹھا کر بہت ادا سے بولی۔

"ایک وعدہ کرو صاحب جی!"

"کیا وعدہ؟"

"جب آپ اپنے گھر میں جا کر رہنے لگیں گے تو مجھے بھی اپنے پاس نوکری دے دیں گے۔ مَیں آپ کے سارے کام کر دیا کروں گی۔ کبھی شکایت نہیں ہو گی آپ کو مجھ سے۔"

"مَیں تم سے یہ وعدہ نہیں کر سکتا۔" مَیں نے بہت سنجیدگی سے کہا۔

اُس نے تڑپ کر مجھے دیکھا: "کیوں صاحب جی؟"

"تم جانتی ہو لالی کہ گھر میں گھر والی کا حکم چلتا ہے۔ اگر میری بیوی نے تمہیں رکھنا پسند نہیں کیا تو پھر؟"

"ان کی خیر ہے۔" وہ مسکرا کر بولی: "انھیں تو مَیں ہاتھ پیر جوڑ کر بھی منا لوں گی۔ آپ اپنی بات کرو جی۔" اس نے اپنے گداز بازو میرے گھٹنے پر رکھ دیئے اور معصومیت سے میری جانب دیکھنے لگی۔

اس وقت وہ مجھے اُس معصوم بچّے کی مانند لگی جو ٹافی یا مٹھائی کی فرمائش کرتے ہوئے اپنی بات منوانے کے لیے اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لاتا ہے اور جواب میں انکار سُننا نہیں چاہتا۔ مَیں نے اپنی نگاہوں سے چند انچ کے فاصلے پر اس کے شاداب اور شگفتہ چہرے کو غور سے دیکھا جو میک اَپ سے محروم ہونے کے باوجود انتہائی دلکش اور پُرکشش تھا۔ وہ ایک بھرپور اور صحت مند عورت تھی۔ اپنے دلکش نقش و نگار اور طرحدار سراپا کی وجہ سے وہ نوکرانی نہیں بلکہ کسی اچھے گھر کی عورت لگتی تھی۔ اس کے گداز بازوؤں کی حرارت مجھے اپنے رگ و پے میں سرایت کرتی ہوئی محسوس ہونے لگی تو مَیں نے آہستگی سے اس کے بازو اپنے گھٹنوں پر سے ہٹا دیئے۔ لالی کی صلاحیتوں اور خلوص کا مَیں شروع دن سے ہی قائل ہو چکا تھا۔ چوہدری صاحب کے ڈیرے پر اگر لالی میری مدد نہ کرتی تو شاید مَیں اس عقوبت خانے سے زندہ بچ کر نہ نکلتا۔

"اچھا ایک بات تو بتاؤ۔" مَیں نے ماضی کو کُریدنے کی غرض سے پوچھا: "تم چوہدری صاحب کے ڈیرے پر اتنے عرصے رہیں مگر اپنے مالک سے تمہیں کوئی ہمدردی نہیں ہوئی۔ اس کی کیا وجہ ہے؟"

"وہ اچھا آدمی نہیں تھا صاحب جی۔ ہم غریب عورتوں سے کون سیدھے منہ بات کرتا ہے اور گھریلو نوکرانیوں کو تو

بھی لُوٹ کا مال سمجھتے ہیں مگر چوہدری جی تو ہمیں انسان بھی نہیں سمجھتے تھے۔ وہ خود بھی بہت بڑے شیطان تھے۔"

"اور میرے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟" مَیں نے پوچھا۔

"آپ کا اور ان کا کیا مقابلہ ہے صاحب جی۔ کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگوا تیلی۔" یہ مثال پیش کرنے کے بعد وہ خود بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔

"اچھا لالی!" مَیں نے آہستگی سے اس کا ہاتھ تھپکا۔ "رات بہت ہوگئی ہے اب تم جاؤ۔"

وہ اُٹھ کر کھڑی ہوگئی اور کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر فیصلہ کن انداز میں پوچھنے لگی۔ "تو پھر آپ نے وعدہ کرلیا ہے نا صاحب جی؟"

"ہاں بابا۔ بالکل کیا وعدہ۔ اب تم جاؤ۔"

وہ ایک دم جھکی اور میرا ہاتھ پکڑ کر چوم لیا۔ "مہربانی صاحب جی۔" پھر وہ جس طرح اچانک آئی تھی اسی طرح واپس لوٹ گئی۔ مَیں ساکت بیٹھا بند دروازے کو دیکھتا رہا۔ میرے ہاتھ کی پُشت پر، جہاں اس کے ہونٹوں نے چُوما تھا، یوں لگا جیسے ایک سلگتے ہوئے انگارے نے چھُو لیا ہو۔ میری زندگی میں عجیب عجیب انوکھی قسم کی عورتیں داخل ہوتی رہی تھیں۔ لالی بھی ان ہی میں سے ایک تھی۔

مَیں اس رات بہت سکون کی گہری نیند سویا۔ صبح نو بجے کے قریب آنکھ کھُلی تو جلدی جلدی ہاتھ منہ دھو کر باہر نکلا۔ دروازے کے باہر ہی ایک باوردی ملازم نہ جانے کب سے میرا منتظر تھا۔

"سَر۔ صاحب لوگ گارڈن میں آپ کا انتظار کررہے ہیں۔" اُس نے بہت مہذّب اور مؤدّب لہجے میں کہا اور پھر راہنمائی کے لیے میرے آگے آگے چلنے لگا۔

ملک منصور اور رضیہ باغ میں سفید براق کُرسیوں پر بیٹھے باتوں میں مصروف تھے۔ یہ ایک پُرفضا اور کشادہ باغ تھا۔ ہر طرف پھول کھلے ہوئے تھے۔ سنگتروں کی خُوشبو سے فضا مہکی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی ملک منصور کُرسی سے اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

"لو۔ وہ آگئے۔ بھئی ہمیں تو بھوکا ہی مروا دیا آپ نے۔" اس نے میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے۔ گزشتہ روز کے مقابلے میں وہ بالکل بدلا ہوا آدمی لگ رہا تھا، شگفتہ اور خوش و خرم۔ رضیہ بھی ہلکے گلابی لباس میں نکھری ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے سُرخ و سفید چہرے پر بھی گلابی رنگ بکھر گیا۔ اس کی سیاہ آنکھیں ہیرے کی طرح چمک رہی تھیں۔

"کہیئے۔ تھکن دُور ہوگئی آپ کی؟" اس نے شوخی بھرے لہجے میں پوچھا۔ اور پھر پیچھے کھڑے ہوئے نوکر سے کہا۔ "بھئی اب جلدی سے ناشتہ منگواؤ۔" وہ اُلٹے قدموں واپس پلٹ گیا۔

"کہیئے۔ کیا مزاج ہے؟" منصور نے ایک کُرسی پر مجھے بٹھاتے ہوئے پُوچھا۔

مَیں اُن دونوں کو دیکھتا رہا جو مسرّت اور بے فکری کی مجسّم تصویریں نظر آرہے تھے۔ کاش ان کی زندگی میں اب کوئی پریشانی اور دُکھ نہ آئے اور وہ یوں ہی ہنستے کھیلتے رہیں۔ مَیں نے سوچا۔

ناشتہ خاصا پُرتکلّف تھا اور کافی دیر تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ لالی ایک ٹرے میں کافی لے کر آگئی۔ وہ اس وقت گلابی لاچے کُرتے میں ملبوس تھی اور سیاہ لمبے بالوں کی دو چوٹیاں اس کی کمر تک لٹک رہی تھیں۔ منصور نے قیمتی سگار سلگا کر میری جانب بڑھایا۔ ہم تینوں پھُولوں سے گھرے ہوئے اس خوبصورت اور پُرسکون باغ میں بیٹھے ہنس رہے تھے۔ باتیں کررہے تھے اور دنیا بھر کے تفکّرات اور پریشانیوں سے یکسر بے پرواہ تھے۔

"یوسف بھائی۔ اب کیا پروگرام ہے؟" منصور نے میری طرف جھُک کر پوچھا۔ "شکار پر چلیں گے؟" وہ ایک بے فکرا

کھلنڈرا رئیس زادہ لگ رہا تھا۔

"میرا پروگرام کچھ اور ہے۔" مَیں نے سگار کا جائزہ لیتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ "مَیں واپس جارہا ہوں۔"

"کہاں؟!" بے ساختہ ان دونوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"اپنی دنیا میں۔ جہاں سے آیا تھا۔"

وہ دونوں پریشان ہوکر مجھے دیکھنے لگے۔

"مجھے چند ذاتی مسائل حل کرنے ہیں۔ یاد ہے نا؟" مَیں نے منصور کو مسکرا کر دیکھا۔

"ہاں ہاں۔ مگر اتنی جلدی کیا ہے؟"

"مجھے پہلے ہی بہت دیر ہوچکی ہے۔ اس لیے اس بارے میں بحث کرنے کی کوشش مت کرنا۔" مَیں بدستور مسکراتا رہا۔ مگر وہ دونوں بے حد سنجیدہ ہوکر مجھے دیکھ رہے تھے۔

"ملک صاحب۔ میرا وعدہ ہے کہ لوٹنی سے اپنا حساب چُکاتے ہی آپ کے پاس آؤں گا۔ اگر زندہ رہا تو!"

"خدا نہ کرے۔" رضیہ کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"کہ مَیں زندہ رہوں؟" مَیں نے اس کا فقرہ پورا کردیا۔

"ارے نہیں، میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ مَیں تو یہ کہہ رہی تھی کہ خدا نہ کرے، جو آپکو کوئی نقصان پہنچے۔"

"مَیں تو یوں ہی چھیڑ رہا تھا مگر اب ایک وعدہ آپ سے بھی لینا چاہتا ہوں۔" مَیں نے منصور کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"حکم کرو سائیں۔ جان حاضر ہے۔"

"جان کو رضیہ کے لیے سنبھال کر رکھو اور میری بات غور سے سنو۔"

وہ ہمہ تن گوش ہوگیا اور کرسی پر آگے کو جھُک کر بیٹھ گیا۔

"ملک صاحب! مَیں کافی دنوں سے اس علاقے میں آوارہ گردی کررہا ہوں۔ مَیں نے دیکھا کہ یہاں بہت بڑے بڑے زمینداروں کی حکومت ہے۔ جن کے پاس اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ سونا اگلنے والی زمینیں، نوٹوں کے انبار لگانے والی فیکٹریاں۔ دن رات مشقّت کرنے والے کارندے۔ ایک اشارے پر جان قربان کردینے والے خدمت گار۔ کون سی نعمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے یہاں کے بڑے لوگوں کو نہیں دی ہے مگر پھر بھی ان کی ہوس اور لالچ نے انھیں دیوانہ بنا رکھا ہے۔ انھیں حلال اور حرام کی تمیز بھی نہیں رہی ہے۔ دوست اور دُشمن کی پہچان سے بھی قاصر ہیں۔ آخر اس کا سبب کیا ہے؟ یہ تمام دولت، قوّت، اختیار، اثر و رسوخ پاکر بھی وہ آسودہ اور مطمئن نہیں ہیں۔ اپنے دشمنوں کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں۔ اپنے ملک کو کھوکھلا اور اپنی قوم کو اپاہج اور معذور بنانے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ قانون اور انصاف ان کے سامنے بے بس ہیں۔ انسانیت اور اخلاق ان کے لیے بے معنی چیزیں ہیں۔ یہ سونا اگلنے والی قیمتی زمینیں جو اناج کا ڈھیر لگاسکتی ہیں بنجر پڑی ہیں اور وہ سمگلنگ میں مصروف ہیں۔ ملکی سرحدیں تو بہت مقدّس ہوتی ہیں۔

یہاں کا تو ایک ایک چپّہ پاکیزہ ہوتا ہے۔ غیوّر اور خود دار قومیں تو اپنی سرزمین پر دشمن کا سایہ بھی نہیں دیکھنا چاہتیں، مگر یہ قوم کے کیسے فرزند ہیں جو دشمنوں کے ساتھ مل کر موت اور ہلاکت کی تجارت کررہے ہیں۔"

ملک منصور بے چینی سے پہلو بدلتا رہا اور پھر کرسی سے اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ "یوسف بھائی۔" وہ بھاری اور بھرّائی ہوئی آواز میں بولا۔ "مَیں آپ کا مطلب سمجھ گیا ہوں۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ یہ سرحدی علاقے سمگلروں کی جنّت بن گئے ہیں اور اس میں بہت بڑا ہاتھ علاقے کے بڑے لوگوں کا بھی ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو چہرے بدل کر ملک و قوم کے

ناخدا بھی بن جاتے ہیں اور قانون کا ہاتھ ان کے دامن تک پہنچنے سے قاصر رہتا ہے اس لیے کہ حکومت کے اونچے اونچے ایوانوں تک ان کی رسائی ہے۔ یہ دولت اور طاقت کے نشے میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ دوسروں کو کیا کہوں خود میں بھی ان ـــــ سرگرمیوں میں ملوث ہوں۔"

میں نے رضیہ کی جانب نگاہ ڈالی۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا اور اس کی نگاہوں میں نفرت کی ایک وحشیانہ چمک پیدا ہوگئی تھی۔ شاید اس گفتگو نے اُسے بھولی ہوئی باتیں یاد دلا دی تھیں۔ اس نے مجھے خود بتایا تھا کہ ملک منصور کی ایسی سرگرمیوں کی بنا پر ہی وہ اس سے متنفر تھی۔ ایک چھت کے نیچے رہتے ہوئے بھی اس سے بیگانہ تھی۔ ملک منصور نے بھی رضیہ کے بدلتے ہوئے رنگ کو دیکھ لیا تھا۔

"منصور۔ میں تم سے یہ وعدہ لینا چاہتا ہوں کہ تم اپنے ملک، اپنی قوم۔ اپنی آنے والی نسلوں اور خود اپنی ذاتی خوشیوں کی خاطر اپنی زندگی کے چلن کو بدلو گے۔ کوئی ایسا کام نہیں کرو گے جو ایک محب وطن شہری کے ماتھے پہ کلنک کا ٹیکہ بن کر چپک جائے۔ تم اس تمام علاقے کو آستین کے ان سانپوں سے پاک کر دو گے۔ اپنی قوت اور اختیار کو ملک و قوم کی بھلائی کے لیے استعمال کرو گے۔"

"خدا کی قسم۔ آپ کی زبان سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ پہ عمل کروں گا۔ آج کے بعد ان سب سے میری لڑائی ہے۔ جب تک ان کے وجود سے سارے علاقے کو پاک نہیں کروں گا، چین سے نہیں بیٹھوں گا۔"

میں نے فرطِ خوشی سے اس کو گلے لگا لیا۔ "خدا تمہیں خوش رکھے۔ وہ تم کو آخرت ہی میں نہیں۔ اس دنیا میں بھی اس کا اجر دے گا۔"

رضیہ کا چہرہ بھی خوشی سے چمکنے لگا تھا۔ وہ خوشی اور فخر کے ملے جُلے جذبات کے ساتھ اپنے شوہر کو دیکھ رہی تھی۔ لگتا تھا کہ ان کے درمیان اختلاف اور نفرت کی تمام دیواریں ٹوٹ گئی ہیں اور زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز ہو رہا ہے۔

"میں آج ہی جا رہا ہوں۔" میں نے اعلان کیا۔ وہ دونوں بھونچکے ہو کر میری طرف دیکھنے لگے۔ "حیران ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور دیکھو مجھے روکنے کی کوشش نہ کرنا۔ میں پہلے ہی بہت دیر کر چکا ہوں۔ اب مزید دیر کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔"

"مگر کب؟ چند دن تو ٹھہرو؟" منصور ہاتھ پھیلا کر میری طرف بڑھا۔

"نہیں ملک صاحب۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "پلیز۔ مجھے روکنے کی کوشش نہ کیجئے، بلکہ دعا کیجئے کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں۔ اگر کامیاب رہا تو سب سے پہلے آپ کے پاس آؤں گا۔ اگر ناکام رہا تو میری گمشدگی خود بخود آپ کو باخبر کر دے گی۔"

منصور اور رضیہ بے چینی سے اُٹھ کر میرے پاس آ گئے تھے۔ "آپ کو ساتھیوں کی ضرورت ہو گی۔ اسلحہ کی ضرورت ہو گی۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے صرف ایک درخواست ہے۔ مجھے راہبری کے لیے ایک آدمی کی ضرورت ہے اور اگر مجھے وہ لینڈ روور مل جائے....."

"آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔" منصور کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ "یہاں کی ہر چیز آپ کی ہے۔ مانگنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو چاہیں اور جب چاہیں بلا تکلف اُٹھا کر لے جائیں۔"

"تو پھر لینڈ روور منگا دیجئے۔ اس میں جو سامان اور اسلحہ موجود تھا مجھے اس کی بھی ضرورت ہو گی اور راستہ دکھانے کے لیے ایک مددگار مہیا کر دیجئے۔"

رضیہ اور منصور کو اندازہ ہو گیا تھا کہ مزید گفتگو کرنا فائدہ مند نہ ہو گا چنانچہ کچھ دیر بعد ہی میری خواہش کے مطابق لینڈ روور ڈرائیو روے پہ کھڑی ہوئی تھی۔ میری فرمائش پہ ایک مضبوط اور توانا ڈرائیور بھی اس میں موجود تھا میں نے رضیہ کو خدا حافظ کہا۔ ملک منصور بے اختیار مجھ سے لپٹ گیا۔ اس کی آنکھیں نمناک تھیں۔ "یوسف بھائی۔ بڑے افسوس کی بات ہے مجھے کسی خدمت کا موقع نہیں دیا۔" وہ دُکھ بھری آواز میں شکایت کرنے لگا۔

"تم بھول رہے ہو منصور۔" میں نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ دیا۔ "میں نے ایک بڑا فرض تمہارے سپرد کیا ہے یاد ہے نا؟" میں نے مسکرا کر کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر۔"

"تم اپنا کام کرو۔ مجھے اپنا کام کرنے دو۔" میں نے اس سے مصافحہ کیا اور پلٹ کر لینڈ روور کی طرف چل دیا۔ گاڑی کے نزدیک لالی اسی گلابی لباس میں لپٹی کھڑی تھی، اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ زبان خاموش تھی، لیکن نگاہیں بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔

"میرے لیے دُعا کرنا لالی۔" میں نے اس کے پاس پہنچ کر کہا۔ "سُنا ہے گلابی کپڑے والوں کی دعا قبول ہو جاتی ہے۔" اسکی آنکھوں میں آنسو تھے مگر وہ بے اختیار ہنس پڑی۔ "جلدی آنا صاحب جی۔" اس نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے آہستگی سے کہا۔ "اپنا وعدہ یاد رکھنا۔"

میں چُپ چاپ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ڈرائیور اگلی سیٹ پر مستعد بیٹھا تھا۔ ہاتھ کے اشارے سے خدا حافظ کہہ کر میں نے گاڑی کا رُخ صدر دروازے کی جانب موڑ دیا اور ایک بار بھی پلٹ کر نہیں دیکھا۔

ـــــ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہاں رہنے والوں سے میں نے جذباتی رشتے قائم کر لیے تھے مگر اب پھر مجھ پر ایک اور ہی دُھن سوار تھی۔ کوئی جذبہ، کوئی رکاوٹ میرا راستہ نہیں روک سکتی تھی۔ مجھے بہت دیر کے بعد ہی سہی مگر مجھے یاد آ گیا تھا کہ مجھے لوٹی کا قرض چکانا ہے یا پھر فنا ہو جانا ہے۔

ایک بار پھر میں پتھریلی، پہاڑی سڑک پہ سفر کر رہا تھا۔ درخت۔ ٹیلے۔ پہاڑ بہت تیزی سے پیچھے کی جانب بھاگے جا رہے تھے۔ یہ راستہ بھی میرے لیے نامانوس تھا، لیکن اس بار مجھے اپنی منزل سے پوری آگاہی تھی۔ ایک مصمم ارادے اور پختہ عزم نے میرے سوئے ہوئے جذبوں کو جگا دیا تھا۔ مجھے علم تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے مگر سوال یہ تھا کہ کیسے؟

کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد میں نے ڈرائیور سے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

"دلدار سر۔"

میں دل ہی دل میں ہنس پڑا۔ میری دلداری کے لیے منصور نے صحیح شخص میرے حوالے کیا ہے۔ "تم نے گاڑی کا سامان چیک کر لیا ہے؟"

"بالکل سر۔ سارا اسلحہ رکھ دیا ہے۔ کھانے پینے کا سامان بھی موجود ہے۔" پھر وہ پوچھنے لگا۔ "ہمیں جانا کہاں ہے سر؟"

میں نے اسے گیسٹ ہاؤس چلنے کے لیے کہا جہاں میرا دیرینہ ہمدم اور دوست شوکت ایک طویل عرصے کے بعد مجھے ملا تھا۔

"سمجھ گئے نا؟"

"بالکل سر۔ سامنے سے لیفٹ کو موڑ لیجئے۔" دلدار اس علاقے کے تمام راستوں سے واقف تھا۔ وہ راہنمائی کرتا ہوا شارٹ کٹ سے مجھے گیسٹ ہاؤس تک لے گیا۔ کچھ فاصلے پر میں نے گاڑی روک دی اور کہا۔ "تم یہاں انتظار کرو۔"

وہ حکم ماننے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔ کوئی سوال کیے بغیر وہ تن کر بیٹھ گیا۔

میں درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ میں گیسٹ ہاؤس کی طرف بڑھا۔ پستول میری پتلون کی پیٹی میں لگا ہوا تھا۔ اس کے سوا میں نے کسی ہتھیار کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ شاید شوکت اس اثنا میں واپس چلا گیا ہوگا۔ گیسٹ ہاؤس کے سامنے درختوں کے نیچے اسکی گاڑی بدستور کھڑی ہوئی تھی، لیکن اس کے باوجود وہاں اسکی موجودگی یقینی نہیں تھی۔ کیونکہ میں نے اس گاڑی کا کاربوریٹر نکال کر پھینک دیا تھا۔

پھر بھی میں احتیاط سے پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا گیسٹ ہاؤس کی طرف بڑھا۔ عمارت کے سامنے کوئی اور گاڑی موجود نہ تھی وہاں کا ماحول بڑا پُراسرار اور معنی خیز معلوم ہو رہا ہے —— اور نہ ہی عمارت کے اندرونی حصے میں کوئی چہل پہل نظر آ رہی تھی۔ میں برآمدے میں سے گزر کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوا اور پھر میں نے اس بیڈروم کا رُخ کیا جہاں میری شوکت سے ملاقات ہوئی تھی۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ میں نے آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ اور اطمینان کی ایک لمبی سانس لی۔ بستر پر شوکت نشے میں دُھت اوندھا پڑا تھا۔ میں نے تیزی سے اس کے پاس جا کر پکارا مگر اسے کچھ ہوش نہیں تھا۔ میں نے اسے جھنجھوڑنے کے لیے اس کا بازو پکڑ کر جھٹکا دیا اور اس وقت مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ وہ مر چکا تھا۔ اس کا بازو بے جان ہو کر گر گیا۔ میں نے جلدی جلدی سے اس کا جائزہ لیا۔ اس کے جسم پر کسی زخم کا نشان نہیں تھا۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ مر چکا تھا اور اُسے مرے ہوئے زیادہ دیر بھی نہیں ہوئی تھی کیونکہ اس کا جسم اس وقت تک اکڑنا شروع نہیں ہوا تھا۔ میں بستر پر اس کے قریب بیٹھ گیا اور اس کے خاموش اور بے جان چہرے کو دیکھنے لگا۔

کسی زمانے میں وہ ایک خوبصورت اور صحت مند آدمی تھا۔ میری اور اس کی دوستی کا ایک بڑا سبب بھی یہی تھا کہ پہلی ہی ملاقات میں اس کی جامہ زیبی، خوش قامتی اور خوش مزاجی مجھے پسند آ گئی تھی اور پہلے ہی روز ہم ایک دوسرے کے نزدیک آ گئے تھے۔ یہ مجھے بہت بعد پتہ چلا تھا کہ یہ سب ایک سوچی سمجھی سکیم کا حصہ تھا جس کے تحت وہ مجھ سے دوستی بڑھانا چاہتا تھا۔ پھر اس نے میری ملاقات روزی سے کرائی اور وہ بھی بظاہر میری محبت میں گرفتار ہو گئی۔ لیکن یہ بھی ایک جال تھا جو میرے اردگرد بُنا گیا تھا تاکہ میں اُن دونوں پر بھروسہ کر کے غیر محسوس طریقے پر اُن کا آلۂ کار بن جاؤں اور پھر یہی ہوا۔ عاشی کے اور میرے درمیان شوکت نے نہایت چالاکی اور مکاری سے غلط فہمی اور فاصلہ پیدا کر دیا اور میں مکمل طور پر اُن لوگوں کے چنگل میں پھنس گیا۔ یہ تمام کارروائی اس مقصد سے کی گئی تھی کہ جب ایک ڈیڑھ سال بعد میرا ہم شکل لوٹی جیل سے نکلے تو سوچے سمجھے منصوبے کے تحت وہ میری جگہ لے لے۔ لیکن یہ حقیقت تھی کہ شوکت پر مجھے مکمل بھروسہ تھا۔ میں نے اس کی دوستی اور خلوص پر کبھی شک نہیں کیا تھا۔ اس کے ہر مشورے پر میں آنکھیں بند کر کے عمل کرنے کا عادی ہو گیا تھا۔ اس کی خواہش میرے لیے حکم کا درجہ رکھتی تھی۔ میں کبھی اس پر شک کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ میری محویت اور خود فراموشی سے فائدہ اٹھا کر روزی کے ساتھ بھی پیار کا کھیل کھیلتا رہا اور مجھے کبھی اس پر شبہ تک نہیں گزرا۔ شبہ تو میں نے کبھی روزی کی وفاؤں پر بھی نہیں کیا تھا، حالانکہ وہ سرتاپا مکروفریب اور حد سے زیادہ بے وفا عورت تھی۔ مگر شوکت اور خود روزی کی اداکاری اور ہنرمندی کی وجہ سے میں ان دونوں کی اصلیت نہیں جان سکا تھا۔ ہم دونوں نے یکجا بہت اچھا وقت گزارا تھا۔

وہی شوکت اس وقت گیسٹ ہاؤس کے اس کمرے میں بے جان لاش کی شکل میں میرے سامنے بستر پر پڑا ہوا تھا۔ مجھے ایک ایک کر کے وہ تمام باتیں یاد آ رہی تھیں جو کسی زمانے میں اس کی اور میری دوستی کا سرمایہ تھیں۔ وہ لمحے میری نگاہوں کے سامنے تصویروں کی طرح نمودار ہو رہے تھے جو ہم نے یکجا ہنستے کھیلتے ہوئے گزارے تھے۔ اس کی رفاقت ہی اس زمانے میں میری زندگی کی سب سے بڑی مسرت ہوا کرتی تھی۔ یہ وہی شوکت تھا جس کی بیوفائی

کا انکشاف ہونے کے بعد انسانوں پر سے میرا اعتماد اُٹھ گیا تھا۔ نہ جانے کتنی دیر تک میں خیالوں میں کھویا ہوا اسکی لاش کے برابر بیٹھا رہا۔

اس خلافِ توقع واقعے نے میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو ماؤف کر دیا تھا مگر پھر رفتہ رفتہ میرے حواس واپس لوٹنے لگے۔ مجھے اچانک یاد آ گیا کہ میں کس مقصد کے لیے شوکت کے پاس آیا تھا۔ میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ اس کا سوٹ کیس ایک جانب کھلا پڑا تھا جس میں سے اس کے بے ترتیب کپڑے باہر نکلے ہوئے تھے۔ یہ اسکی پرانی عادت تھی۔ وہ کپڑوں کو بے ترتیبی کے ساتھ سوٹ کیس میں ٹھونسنے کا عادی تھا۔ اس کی تمام زندگی ہی بدنظمی اور افراتفری میں گزری تھی۔ اسکی بیوی مجھ سے ہمیشہ اسکی ان عادتوں کا رونا رویا کرتی تھی۔

کمرے میں ذاتی سامان کے سوا کوئی اور چیز موجود نہ تھی۔ پرانی سی سنگھار میز کے نزدیک اس کا بریف کیس رکھا ہوا تھا۔ میں نے بریف کیس کھول کر دیکھا وہ کاغذات سے بھرا ہوا تھا جو انتہائی بے پرواہی سے اس میں رکھے گئے تھے۔ کاغذات پر جلدی جلدی نظر ڈالی مگر مجھے کوئی خاص کار آمد کاغذ نظر نہیں آیا۔ یہ سب کاروباری کاغذات تھے مگر پھر ان کاغذات کے پلندے میں مجھے ایک ایسی دستاویز نظر آ گئی جو میرے لیے کار آمد ثابت ہو سکتی تھی۔ شوکت ہر کاروبار میں میرا پارٹنر رہا تھا لیکن اس کاغذ کی رو سے ہم دونوں کی پارٹنرشپ ختم کر دی گئی تھی۔ معاہدے پر شوکت کے اور میرے دستخط تھے۔ میں نے ذرا غور سے دیکھا تو مجھے اپنے اور ان کے جعلی دستخطوں کا معمولی فرق نظر آ گیا: ایس کی گولائی میں خفیف سے فرق کے سوا کوئی اور غلطی نہیں تھی۔ گویا لوٹی نے شوکت کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے بعد اس سے منہ موڑ لیا تھا اور اس کے ذاتی مکان کے علاوہ ہر چیز اپنے نام لکھوا لی تھی۔ اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ میں نے شوکت کے پاس پہنچنے میں دیر کر دی تھی۔ وہ لوٹی کی طرف سے برگشتہ اور مایوس ہو چکا تھا اور میں معمولی سا لالچ دے کر اسے اپنے ساتھ ملا سکتا تھا۔ لہٰذا اس معاہدے میں میرے مطلب کی کوئی بات نہیں تھی پھر بھی میں نے اسے تہہ کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ یکایک میری نظر ایک تُڑے مُڑے کاغذ کے ٹکڑے پر پڑی جو بریف کیس کے ایک کونے میں پڑا ہوا تھا۔ روزی کے ہینڈ رائٹنگ کو میں ہزاروں کاغذوں میں بھی پہچان سکتا تھا یہ روزی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر تھی۔ اور بہت جلدی میں لکھی گئی تھی۔ محض چند سطریں تھیں۔ جس میں لکھا تھا۔

"ڈیئر شوکت۔ تمہیں ہوشیار رہنا ہوگا۔ اب تمہارا مجھ سے ملنا خطرناک ہے۔ لوٹی کو کچھ شک ہو گیا ہے۔"

"روزی۔"

میں خوشی سے اچھل پڑا۔ یہ کاغذ کا پُرزہ اس بات کا ثبوت تھا کہ روزی کے تعلقات لوٹی نام کے کسی شخص سے بھی تھے۔ جو شوکت کا بھی واقف کار تھا۔ یہ چند سطریں روزی اور شوکت کے باہمی تعلقات کے بارے میں بھی بہت کچھ بیان کر رہی تھیں۔ میں نے وہ پُرزہ احتیاط سے تہہ کیا اور سنبھال کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔ میں نے ایک الوداعی نگاہ شوکت کے بے جان چہرے پر ڈالی اور رخصت ہونے کے لیے کھڑا ہو گیا معاً ایک اور خیال آتے ہی میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ شوکت کے تعلقات لوٹی سے خراب ہو چکے تھے۔ لوٹی کو روزی اور شوکت کے تعلقات کے بارے میں شک ہو گیا تھا۔ شاید اسی لیے وہ دونوں لوٹی کے ساتھ اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگے تھے اور دوسرے مضبوط سہاروں کی تلاش میں تھے۔ گویا رانا کی حویلی میں روزی کی موجودگی محض اتفاقیہ نہیں تھی۔ وہ آنے والے وقت میں لوٹی سے مقابلہ کرنے کے لیے مضبوط حلیفوں اور دوستوں کی تلاش میں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اور شوکت ایک ساتھ رانا سے ملنے کے مقصد سے یہاں آئے تھے۔ لیکن لوٹی کی چالاکی اور احتیاط پسندی کے پیش نظر یہ کیسے ممکن تھا کہ اس نے ان دونوں کو اپنے خلاف سازش کا جال بچھانے کی کھلی چھٹی دے دی ہو۔ خاص طور پر ایسے حالات میں جبکہ اس کا سب سے
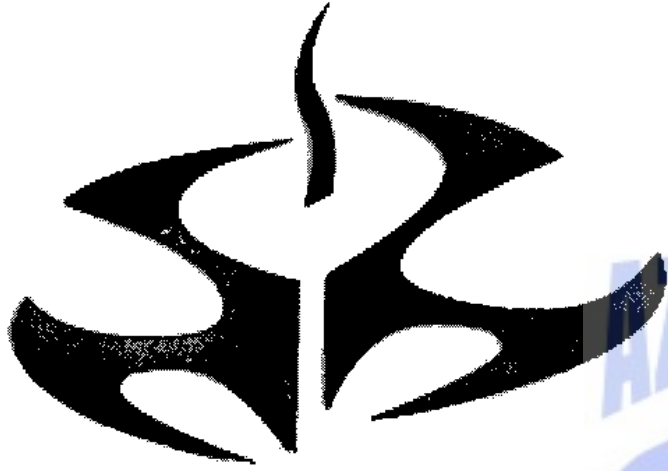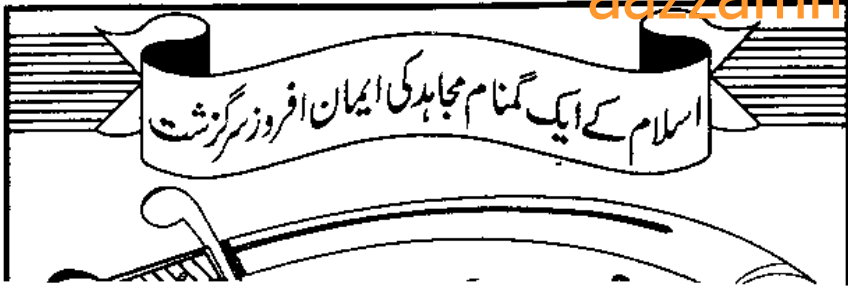
بڑا حریف یعنی اصلی یوسف اس وقت تک بقیدِ حیات تھا۔

میرا ذہن بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ ان حالات میں شوکت کا اچانک خود بخود ہلاک ہو جانا مصلحت سے خالی نہیں تھا۔ شوکت ایسا آدمی نہ تھا جو زندگی سے تنگ آکر خودکشی کر لیتے ہیں۔ وہ آخر دم تک زندگی سے ایک ایک قطرہ حاصل کرنے کا قائل تھا۔ میں نے اس کی قمیص کے بٹن کھول کر بغور اس کے جسم کا جائزہ لینا شروع کیا اور بہت جلد اس کی موت کا سبب مجھے معلوم ہو گیا۔ اس کے سینے پر عین دل کے مقام پر ایک باریک سا سوراخ تھا جو بظاہر سوئی جیسی کسی باریک چیز سے کیا گیا تھا۔ قاتل نے بڑی مہارت سے اس کے دل کو چھید کر شوکت کو قتل کیا تھا۔ آلۂ قتل اس قدر باریک تھا کہ خون کی ایک بوند تک جسم کے باہر نظر نہیں آئی۔

باہر سے ایک کار کی آواز سن کر میں چوکنا ہو گیا۔ کار گیسٹ ہاؤس کے سامنے آکر رک گئی تھی۔ پھر مجھے کار کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ کوئی تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا گیسٹ ہاؤس کے برآمدے میں آ رہا تھا۔ میں نے ڈرائینگ روم میں جانے کی بجائے برآمدے میں کھلنے والے دروازے سے باہر نکلنا زیادہ محفوظ جانا اور تیزی سے پردہ ہٹا کر دروازے سے باہر نکل گیا مگر باہر نکلتے ہی کسی سے ٹکراتے ٹکراتے رہ گیا۔ ایک باریک چیخ کی آواز پر میں نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا اور میرے قدم فرش پر قدم جم کر رہ گئے۔ میری نگاہوں کے سامنے روزی کھڑی تھی۔ تیز تیز قدموں سے چلنے کی وجہ سے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا اور اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ وہ بہت گھبراہٹ اور عجلت میں معلوم ہوتی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کا چہرہ ایک دم سفید پڑ گیا۔ اس کے منہ سے ایک دہشت زدہ آواز نکلی اور ہاتھ میں پکڑا ہوا پرس زمین پر گر گیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے۔ میں اس خلافِ توقع ملاقات پہ حیران تھا جبکہ وہ حد سے زیادہ خوفزدہ نظر آ رہی تھی۔

"اوہ" اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "ٹونی!!؟"

لمحے بھر میں ساری بات میری سمجھ میں آگئی۔ وہ مجھے ٹونی سمجھ رہی تھی۔

صورتِ حال کی سنگینی کے باوجود ایک مسکراہٹ میرے چہرے پر دوڑ گئی۔

"روزی!" میں نے زیرِ لب کہا۔ "تم یہاں؟"

وہ ڈر کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ "میں۔ میں" گھبراہٹ کے مارے اس کی زبان سے آواز تک نہیں نکل رہی تھی۔

"ٹونی۔ میں تو...."

قریب تھا کہ وہ بے ہوش ہو کر گر جائے کہ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کا بازو تھام کر ایک جھٹکا دیا اور اسے کھینچتا ہوا کمرے کی جانب لے چلا۔ وہ ایک معمول کی طرح کسی پس و پیش کے بغیر میرے ساتھ چل پڑی۔ دوبارہ کمرے میں داخل ہو کر میں نے بیڈ کی طرف اشارہ کیا۔ وہ شوکت کو دیکھ کر بالکل حیرت زدہ نہیں ہوئی اور ہوتی بھی کیوں کر؟ وہ گیسٹ ہاؤس میں شوکت کی موجودگی سے باخبر تھی۔ اس لیے کہ وہ شوکت کے ساتھ ہی یہاں تک آئی تھی اور پھر رانا سے معاملات طے کرنے کے لیے اس کی حویلی میں چلی گئی تھی جبکہ شوکت اس کے انتظار کی بے چینی میں شراب کی بوتلوں پر بوتلیں خالی کر رہا تھا۔

"یہ شوکت.... مگر ٹونی۔ مجھے کچھ پتہ نہیں....."

"جھوٹ" میں نے اسے ڈانٹ دیا۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں۔ شوکت نے تمہیں جو بتایا ہے وہ جھوٹ ہے۔ یہ مجھ سے اور تم سے انتقام لینا چاہتا ہے۔ ہمیں بلیک میل کرنا چاہتا ہے۔ ہمیں ایک دوسرے سے بدگمان کرنا چاہتا ہے۔ یہ جھوٹا ہے ٹونی۔ بالکل جھوٹا ہے۔"

صورتِ حال ڈرامائی انداز اختیار کر چکی تھی۔ شوکت اگرچہ مر چکا تھا مگر روزی نہ صرف میرے سامنے تھی بلکہ

میرے قبضۂ اختیار میں بھی تھی۔ شوکت کے بریف کیس سے برآمد ہونے والے کاغذات اور روزی کے بیان کی روشنی میں میرے لیے اپنی اصلیت ثابت کرنا کچھ مشکل نہیں تھا۔ میں صورت حال سے لطف اندوز ہونے لگا تھا۔

"تو پھر یہ کیا ہے؟" میں نے کاغذ کا وہ پرزہ نکال کر اسے دکھایا جو اس نے شوکت کو تحریر کیا تھا۔ اس نے دو قدم آگے بڑھ کر کاغذ کو غور سے دیکھا۔ اگر وہ کسی بھوت کو بھی دیکھ لیتی تو شاید اس قدر خوفزدہ نہ ہوتی۔ اس کے مُنہ سے بے اختیار ایک ہسٹریائی چیخ نکل گئی۔ اس نے جھپٹ کر وہ پرزہ میرے ہاتھ سے چھین لیا۔

"یہ خط تمہاری بے وفائی کا کھلا ثبوت ہے۔" میں نے کہا۔ "اب کچھ نہیں ہو سکتا روزی تم بازی ہار چکی ہو۔" اس نے سہمی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا اور کاغذ کے ٹکڑے کو اپنے منہ میں ڈال لیا۔ میں گھبرا کر تیزی سے اسکی طرف بڑھا "یہ کیا کر رہی ہو؟ یہ مجھے دے دو۔" میں نے آگے بڑھ کر اسکی گردن پکڑ لی۔ یہ کاغذ میری شناخت کا پروانہ اور بے گناہی کا مُنہ بولتا ثبوت بن سکتا تھا۔ اس کی بنا پر میں روزی کو ڈرا دھمکا کر سچ بولنے پر مجبور کر سکتا تھا۔ میں نے زور سے اس کی گردن دبائی "یہ مجھے دے دو روزی۔ مجھے دے دو۔" مگر اتنی دیر میں وہ اُسے چبا کر نگل چکی تھی۔ میں نے جھلا کر زور سے جھٹکا دیا اور اسے بیڈ پر پھینک دیا۔ وہ شوکت کی لاش پر جا گری۔ اسکی خوفزدہ وحشی نظریں بدستور میرے چہرے پر لگی ہوئی تھیں۔ تو پھر ایکا ایکی اُسے شوکت کے ٹھنڈے یخ بستہ جسم کا احساس ہوا۔ اس نے گبھرائی ہوئی نظروں سے شوکت کو دیکھا اور پل بھر میں حقیقت اس پر منکشف ہو گئی۔ اس نے بے اختیار ایک فلک شگاف چیخ ماری اور ڈر کر بیڈ پر سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی "یہ... یہ..." اُس نے ہکلاتے ہوئے شوکت کی طرف اشارہ کیا۔ دہشت کی وجہ سے الفاظ بھی اس کے منہ سے نہیں نکل رہے تھے "یہ... مر... مر گیا!؟" میرے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ آندھی کی طرح کمرے سے باہر نکل گئی۔ وہ مسلسل چلّا رہی تھی "وہ۔ وہ۔ وہ مر گیا۔ مرگیا۔ شوکت مرگیا۔ لوٹی نے اسے مار دیا۔ مار دیا۔"

میں اس کے پیچھے بھاگا اور برآمدے میں اُسے جا لیا۔ میں نے بازو تھام کر اُسے رُوکنے کی کوشش کی مگر نہ جانے کس طرح اس کے جسم میں بے انتہا قوت آ گئی تھی۔ اس نے جھٹکا دے کر اپنا بازو چھڑانا چاہا مگر میری گرفت بہت مضبوط تھی۔

"چھوڑ دو مجھے۔ چھوڑ دو۔" اُس نے ہسٹریائی انداز میں چیخیں مارنی شروع کر دیں اور اسی وقت میری نگاہوں نے ان چار غنڈہ نما دیو قامت انسانوں کو دیکھا جو نہ جانے کہاں سے نمودار ہوئے تھے۔

ان میں سے ایک برآمدے کے آخری کنارے پر کھڑا ہوا تھا۔ دوسرا ڈرائنگ روم کے دروازے میں تھا۔ باقی دو برآمدے میں آہستہ آہستہ قدم بڑھاتے ہوئے ہماری جانب بڑھ رہے تھے۔ مجھے یہ فکر نہیں تھی کہ وہ بہت تنومند اور خوفناک صورت تھے بلکہ اس سے زیادہ پریشان کن بات یہ تھی کہ وہ چاروں پوری طرح مسلح تھے۔ ان میں سے ایک کے پاس برین گن تھی جبکہ باقی تینوں پستولوں سے مسلح تھے۔ اُن کے چہروں پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ وہ خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے ہماری جانب بڑھ رہے تھے۔

روزی جو اس سے پہلے میری گرفت سے آزاد ہونے کے لیے سخت جدّوجہد کر رہی تھی انہیں دیکھ کر ایک لمحے کے لیے ساکت رہ گئی۔ یوں جیسے وہ نہ صرف ان سے واقف ہو بلکہ ان کی آمد کا مقصد بھی جانتی ہے چند لمحے وہ بالکل بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ پھر یک لخت اس نے ایک زوردار جھٹکا دے کر اپنا بازو میری گرفت سے چھڑا لیا اور بے تحاشا چیختی ہوئی برآمدے میں مخالف سمت دوڑنے لگی۔

"نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔" اس کے مُنہ سے بار بار صرف یہی لفظ نکل رہا تھا اور وہ دیوانہ وار برآمدے سے باہر کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں نے ایک نظر چیختی چلّاتی ہوئی روزی پر ڈالی اور پھر گردن موڑ کر اُن چار خوفناک انسانوں کو دیکھا۔ وہ سب اب اپنی اپنی جگہ رُک گئے تھے۔ اِن کے چہروں پر اب بھی کوئی تاثر نہیں تھا۔ یکایک اُن میں سے ایک نے اپنی برین گن کا رُخ روزی کی طرف کیا اور اس سے پہلے کہ میری زبان سے ایک لفظ بھی نکلتا برین گن سے تابڑ توڑ گولیاں نکلنے لگیں اور پھر میں نے روزی کو چھلنی ہو کر زمین پر گرتے ہوئے دیکھا۔ میرے سوچنے سمجھنے کی قوتیں بالکل سلب ہو گئی تھیں میں حیرت سے منہ کھولے ہوئے روزی کو فرش پر گرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ مجھے صرف یہ احساس تھا کہ فرش پر گرنے سے پہلے اس کا جسم بے جان ہو چکا تھا۔ کاغذ کا پُرزہ وہ پہلے ہی چبا کر نگل چکی تھی۔ اب اس کی موت کی شکل میں میری بے گناہی کا دوسرا جیتا جاگتا ثبوت بھی صفحۂ ہستی سے مٹ گیا تھا۔

میں پل بھر میں جیتی ہوئی بازی ہار گیا تھا۔ اور میرے سامنے چار خوفناک دیو قامت انسانوں کے روپ میں موت بھیانک منہ کھولے کھڑی تھی۔

پستول میری جیب میں تھا، لیکن اس کا استعمال کا موقع نہیں ملتا تھا۔ میرے سامنے چار خونخوار اور ماہر نشانہ باز موجود تھے جن میں سے ایک کے پاس برین گن تھی اور اس کی خون آشامی کا مظاہرہ میں کچھ دیر پہلے دیکھ چکا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ میں اپنی پھرتی اور ہنر مندی کی وجہ سے ان میں سے ایک یا دو کو گولی کا نشانہ بنانے میں کامیاب ہو جاتا، لیکن ان چاروں کی آگ برساتی ہوئی گولیوں سے محفوظ رہنا میرے لیے قریب قریب ناممکن تھا۔ میں نے کن انکھیوں سے اپنے اِردگرد دیکھا۔ میں برآمدے کے عین وسط میں کھڑا ہوا تھا۔ میرے پاس اتنی مہلت بھی نہ تھی کہ بھاگ کر یا چھلانگ لگا کر کمرے میں داخل ہو جاتا گویا میں قطعی غیر متوقع طور پر اپنے حریف کے چنگل میں پھنس کر بے قابو ہو چکا تھا۔ مجھے حالات اور قدرت کی ستم ظریفی پر ہنسی آنے لگی۔ چند لمحے پہلے میں ایک مطمئن اور خوش و خرم انسان تھا۔ تقدیر مجھ پر مہربان تھی۔ میرا پرانا دوست جس نے میرے ساتھ غداری کی تھی خود بخود موت کا شکار ہو گیا تھا۔ میری بیوی روزی جو میری بے گناہی کا سب سے بڑا اور جیتا جاگتا ثبوت تھی میرے قبضے میں تھی۔ وہ میرے حق میں قانون کے سامنے گواہی دے سکتی تھی۔ خصوصاً ان حالات میں جبکہ جس شخص کی خاطر اس نے میرے ساتھ بے وفائی کی تھی وہ بھی اس کی جانب سے مشکوک ہو چکا تھا۔ بلکہ اسے یہ یقین ہو چکا تھا کہ روزی اور شوکت دوستی کے پردے میں اس کے ساتھ دغا کر رہے ہیں اور وہ دونوں اس کے ساتھ وہی کھیل کھیل رہے ہیں جو خود لوٹی کی خاطر میرے ساتھ کھیلتے رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ لوٹی جیسا ظالم اور جرائم پیشہ شخص ان دونوں کے اس جُرم کو معاف نہیں کر سکتا تھا۔ جرائم کی دنیا میں دوستی اور دشمنی انتہائی ناپائیدار ہوتی ہے پل میں دوستی اور دوستی دشمنی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس دُنیا میں تعلقات کا انحصار محض موقعہ و محل اور ضرورت کے مطابق ہوتا ہے اور بدلتے ہوئے حالات اور مصلحتوں کے ساتھ ساتھ رشتے بھی بدلتے رہتے ہیں۔ روزی اور شوکت کسی زمانے میں لوٹی کے معتبر اور قابلِ اعتماد ساتھی تھے۔ اُنھوں نے اُسی کی خاطر مجھے دھوکہ دیا تھا۔ مجھے میری بیوی، دولت، جائیداد یہاں تک کہ اپنی شناخت تک سے محروم کر دیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ بظاہر مخلص تھے اور اس کی بچھائی ہوئی بساط پر اس کے حسبِ منشا چالیں چلتے رہے تھے۔ بلکہ دیکھا جائے تو وہ زندگی کی بساط پر اس کے مہرے تھے جنہیں وہ اپنی خواہش اور مرضی کے مطابق استعمال کرتا رہا تھا۔ لیکن ایک دن اچانک اسے یہ پتہ چلا تھا کہ وہ اس سے بیوفائی اور غداری کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ انہوں نے اس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ پھر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ میرے خلاف منصوبہ بندی اور سازش میں بھی وہی دونوں اس کے پاس سب سے زیادہ مُؤثر مہرے تھے۔ وہ بھلا اُن کے اس جُرم کو کیوں کر نظر انداز کر سکتا تھا اور ظاہر ہے کہ کرنا بھی نہیں چاہیے تھا۔ اس کی جگہ کوئی دوسرا بھی

ہوتا تو وہی فیصلہ کرتا جو لوٹی نے کیا تھا۔ لوٹی اُنہیں زندہ رکھ کر اپنے مستقبل اور اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالنے کی حماقت نہیں کر سکتا تھا چنانچہ اُس لیے اُن دونوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کا فیصلہ کر لیا اور میری نگاہوں کے سامنے اِس فیصلے کو عملی جامہ بھی پہنا دیا گیا۔ اُن دونوں کو مجھ سے بیوفائی کرنے کی سزا قدرت کی جانب سے مل چکی تھی اور اُس شخص کے ذریعے ملی تھی جس کی خاطر اُنہوں نے مجھ ایسے مخلص دوست اور شریکِ حیات کو دغا دی تھی۔ واقعی قدرت کا انصاف خود بخود اپنے راستے تلاش کر لیتا ہے۔ اِسی کو مکافاتِ عمل کا نام دیتے ہیں۔ انسانوں کے بنائے ہوئے قانون تو بعض اوقات قانونی نکات کی باریکیوں کی بنا پر مجرموں کو معاف کر دیتے ہیں لیکن قدرت کا قانون سزاوار کو کبھی نہیں بخشتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بازی پلٹ چکی تھی۔ کچھ دیر پہلے میں اپنی خوش نصیبی پر ناز کر رہا تھا اور قدرت کی کارسازی کا شکر گزار تھا جس نے بیٹھے بٹھائے حُسنِ اتفاق سے میرے تمام مسائل کا حل خود بخود جتا کر دیا تھا۔ مگر محض چند لمحوں کے اندر میں پھر ایک بے بس اور مجبور انسان بن کر رہ گیا تھا۔ بلکہ غور کیا جائے تو صورتِ حال پہلے سے بھی زیادہ مخدوش اور تشویشناک تھی۔ شوکت اور روزی کے زندہ رہنے کی صورت میں میرے لیے ایک امکان تو تھا کہ میں اُنہیں اپنے حق میں گواہی کے لیے استعمال کر سکتا تھا۔ مگر اب وہ موہوم اُمید بھی غائب ہو چکی تھی۔ حالات نے اِس انداز سے رُخ بدلا تھا کہ اُمید نا اُمیدی میں بدل چکی تھی اور چار دیوقامت خونی انسانوں کے روپ میں موت میرے سامنے اپنے خوفناک جبڑے کھولے ہوئے کھڑی تھی۔

میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ مجھے فوری طور پر کوئی فیصلہ کرنا تھا جو میں نے کر لیا تھا۔ اِن حالات میں ہتھیار اُٹھانا قطعی بے معنی اور بے کار تھا۔ چنانچہ میں نے مدافعت اور جدوجہد کے بغیر ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے یہ بھی یقین تھا کہ اگر میں نے ان چاروں موت کے سوداگروں کو بہانہ فراہم نہیں کیا تو وہ مجھے زندہ سلامت گرفتار کر کے اپنے آقا کے سامنے پیش کرنے کو ترجیح دیں گے۔

مگر عین اُس وقت جب میں مایوسیوں کے گرداب میں پھنس چکا تھا قدرت ایک بار پھر میری دستگیری کے لیے موجود ہو گئی۔ اُن میں سے برین گن سے مسلح شخص دو قدم آگے بڑھا اور بھاری آواز میں بولا: "چیف۔ آپ نے یہاں آنے کی تکلیف کیوں کی؟ ہم نے سارا کام پورا کر لیا تھا۔ اندر والے کمرے میں مسٹر شوکت کی لاش پڑی ہے۔"

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ لوگ مجھے لوٹی سمجھ رہے تھے اور اس سلسلے میں اُنہیں الزام دینا بھی درست نہ تھا۔ مجھ میں اور لوٹی میں قطعی فرق نہ تھا اور پھر وہ اُس وقت اس جگہ میری یعنی یوسف کی موجودگی کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ اُنہیں موت کے اس مشن پر روانہ کرنے کے بعد لوٹی خود بھی ایکشن کی نگرانی کرنے کے لیے موقع پر پہنچ گیا تھا۔

قدرت کی کارفرمائیاں بھی عجیب ہیں۔ انسان تو اس کے سامنے مجبورِ محض ہے۔ چند لمحوں کے اندر حالات کچھ سے کچھ صورت اختیار کر چکے تھے۔ میری یقینی موت اور ناکامی یک لخت کامیابی میں تبدیل ہو کر رہ گئی تھی اور اس میں شائبہ خوبیِ تقدیر کے سوا اور کسی چیز کا دخل نہیں تھا۔ میرے رگ و پے میں خوشی اور اطمینان کی ایک لہر سی دوڑ گئی اور کشیدہ عذاب کا تناؤ ایک دم دُور ہو گیا۔ غیر ارادی طور پر میرے مُنہ سے ایک اطمینان بھری سانس نکل گئی۔ اور میں خود بخود مسکرانے لگا۔

"ویری گڈ۔" میں نے تعریف کے انداز میں کہا۔ "تم انعام کے حقدار ہو۔"

"تھینک یو چیف۔" وہ سراپا عجز و نیاز بن گیا۔ اپنے باس کی زبان سے اپنی کارکردگی کی تعریف سُن کر وہ خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ "اب کیا حکم ہے سر؟"

میں نے اُس کے پیچھے کھڑے ہوئے تینوں پستول برداروں پر ایک نظر ڈالی اور پھر رعب دار آواز میں کہا: "ان

لاشوں کو یہاں سے اٹھوا کر ٹھکانے لگا دو۔"

"او کے چیف!" اُس نے اپنے پیچھے کھڑے ہوئے لوگوں کو اشارہ کیا۔ اور وہ تینوں تیزی سے بیڈروم کی طرف چلے گئے۔ دوسرے ہی لمحے وہ شوکت کی لاش کو اٹھا کر لے آئے اور دو آدمی اُسے لے کر برآمدے سے باہر چلے گئے۔ اُن کی سواری کہیں آس پاس ہی موجود ہو گی۔ تیسرے شخص نے آگے بڑھ کے روزی کی لاش کا ہاتھ پکڑا اور اُسے بے دردی سے فرش پر گھسیٹنے لگا۔

"رُک جاؤ۔" میں نے اُسے درشت لہجے میں ڈانٹا اور وہ سہم کر میری صورت دیکھنے لگا۔ میں نے نرمی سے کہا: "لاش کی اس طرح بے حرمتی نہیں کرنی چاہیئے اسے آرام سے اُٹھا کر لے جاؤ۔"

اس نے چابی کے کھلونے کی مانند میرے حکم کی تعمیل کی۔ جھک کر روزی کی لاش کو اُٹھا کر کندھوں پر ڈالا اور خاموشی سے باہر چلا گیا۔ میں بوجھل دل کے ساتھ اُسے عمارت کی اوٹ میں غائب ہوتے ہوئے دیکھتا رہا۔ روزی کے اس المناک انجام نے مجھے غمگین کر دیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے اِن حالات کو بذاتِ خود دعوت دی تھی مگر وہ جیسی بھی تھی، بہرحال میری بیوی تھی۔

ہم دونوں ایک ہی چھت کے نیچے شوہر اور بیوی کے طور پر زندگی گزارتے رہے تھے۔ مصلحتاً اور کسی منصوبہ بندی کے تحت ہی سہی مگر وہ جب تک میری بیوی رہی اس نے میری خدمت گزاری میں کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی۔ اور مجھے شکایت کا موقع بھی نہیں دیا تھا۔ اس کی بے وفائی اور بے غیرتی کا راز مجھ پر کافی عرصے بعد فاش ہوا تھا لیکن اس کے باوجود میں اس کا انجام دیکھ کر دل گرفتہ ہو گیا تھا۔ بہرحال دنیا ایک مکافاتِ عمل ہے۔ ہر شخص اپنے اعمال کا صلہ زندگی میں بھی پالیتا ہے اور اس نے اپنے اعمال کا فیصلہ پالیا تھا۔

ایک اور بات یہ تھی کہ وہ آج بھی میری قانونی بیوی تھی۔ لوٹی کے روپ میں وہ میں ہی تھا جسے وہ دنیا والوں کے سامنے اپنا شوہر تسلیم کرتی تھی۔ کاش روزی اور شوکت نے مجھ سے بے وفائی نہ کی ہوتی یا کم از کم یہ بات میرے علم میں نہ آتی۔ تو میری زندگی زیادہ خوشگن، پُرسکون اور مطمئن ہوتی۔ اگر میں نے روزی سے ملنے کے لیے اس روز اپنے گھر پر جا کر خود اپنے کانوں سے شوکت اور روزی کی گفتگو نہ سُن لی ہوتی تو شاید میں اس بارے میں کسی اور کے کہنے پر ہرگز یقین نہ کرتا شوکت نے بطورِ دوست اور روزی نے بطورِ بیوی مجھے فریب دیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود میرے دل کے کسی گوشے میں ان کے لیے ایک نرم گوشہ موجود تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا یہ غیر متوقع اور حسرت ناک انجام دیکھ کر میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ اِن دونوں نے اپنی بے وفائی، غداری اور لالچ کا صلہ پالیا تھا۔ کاش لوٹی کے ساتھ مل کر میرے خلاف سازش کا جال نہ بچھاتے اور دولت کی ہوس میں یوں اندھے نہ ہو جاتے۔

یکایک برین گن والے قد آور شخص کی آواز نے مجھے خیالات کے بھنور سے نکال لیا۔ وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا۔ "میرے لیے کیا حکم ہے چیف؟"

"تم وہیں جا کر میرا انتظار کرو۔" اس کے سوا مجھے کوئی اور بات نہیں سوجھ سکی تھی۔ وہ جھک کر مؤدب انداز میں پیچھے ہٹتا ہوا رخصت ہو گیا۔ میں فوری طور پر سوچنے اور فیصلہ کرنے کے لیے مہلت چاہتا تھا۔ میں یہ سوچنا چاہتا تھا کہ اچانک بدلے ہوئے حالات میں اب مجھے اِن لوگوں سے کس طرح عہدہ برآ ہونا چاہیئے۔ اس میں شک نہیں تھا کہ تقدیر ایک بار پھر مجھ پر مہربان ہو گئی تھی اور میں انتہائی مایوس کُن صورتِ حال میں گرفتار ہونے کے بعد اس مشکل سے نجات حاصل کر چکا تھا۔ وقتی طور پر میری جان تو بچ گئی تھی مگر روزی اور شوکت کی موت نے میری اُمیدوں کو ایک بار پھر خاک میں ملا دیا تھا۔

شوکت اور روزی دو ایسے افراد تھے جن کے ذریعے میں اپنی اصلیت اور بے گناہی ثابت کر کے لوٹی کو کیفرِ کردار

تک پہنچا سکتا تھی۔ وہ دونوں ہی میری کہانی کے گواہ بن سکتے تھے۔ مگر اب اُن دونوں میں سے کوئی ایک بھی دنیا میں موجود نہیں رہا تھا۔ روزی کا غذ کا وہ ٹکڑا بھی ہضم کر چکی تھی جو میری بے گناہی کا ثبوت بن سکتا تھا۔ مگر یہ بھی مقامِ شکر تھا کہ میری جان ایک بار پھر بچ گئی تھی۔ خدا جانے اس میں خدا کی کیا مصلحت تھی۔ یا تو میری مشکلیں آسان ہونے کا وقت آ گیا تھا یا پھر مصائب کا ایک نیا طوفان میری گھات میں تھا۔ میں اس دور دراز علاقے کے ایک ویران ڈاک بنگلے کے برآمدے میں تنہا کھڑا سوچ رہا تھا کہ اپنے منصوبے کے ملیامیٹ ہو جانے کے بعد اب میرا آئندہ اقدام کیا ہونا چاہیئے؟

میں خاموش اور خالی الذہن کھڑا ہوا برآمدے کے اینٹوں کے فرش پر روزی کے خون کے دھبّے دیکھ رہا تھا۔ یہ خون کسی زمانے میں مجھے بہت عزیز تھا اور میں اس کی حفاظت اور احترام کی خاطر جان کی بازی بھی لگا سکتا تھا مگر اس وقت میں ایک انجان اور بیگانے کی طرح بے تعلق کھڑا ہوا تھا چونکہ اب وہ میرے لیے ایک اجنبی عورت کا خون تھا۔ یہ درست ہے کہ قانونی طور پر روزی آخری وقت تک میری ہی بیوی تھی مگر وہ مجھ سے بیوفائی کر کے دوسروں سے شناسائی بڑھا چکی تھیں اور ایک غیر اخلاقی، گناہ کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ جس روز میں نے پہلی بار روزی اور شوکت کو باتیں کرتے ہوئے سُنا تھا اور خود روزی کی زبانی اس کی آوارگی اور بے حیائی کا اعتراف سُنا تھا ذہنی طور پر میں نے اس عورت سے اپنا ہر طرح کا تعلق توڑ لیا تھا۔ اس دن کے بعد وہ میرے لیے ایک غیر اور اجنبی عورت تھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے موت کا نشانہ بنتے ہوئے دیکھ کر میں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر اسے بچانے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ بظاہر ایسی کوئی کوشش کامیاب بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن اگر میں اسے بدستور اپنی بیوی اور ناموس سمجھتا تو اسے بچانے کے لیے اپنی جان کی بازی بھی لگا سکتا تھا۔ اپنی عزت و آبرو کی حفاظت کی خاطر لوگ جان قربان کر ہی دیا کرتے ہیں۔

آہستگی سے قدم اُٹھاتا ہوا میں ڈاک بنگلے کے ڈرائنگ روم اور پھر بیڈ روم میں داخل ہو گیا۔ یہ ایک غیر ارادی اور لایعنی عمل تھا۔ میں بالکل خالی الذہن تھا حالانکہ میں آئندہ اقدام کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا چاہتا تھا ــــ اچانک اور پے بہ پے حوادث نے میرا دماغ ماؤف کر دیا تھا۔ بیڈ روم میں شوکت کا سامان بکھرا پڑا تھا۔ بریف کیس میں اس کے کاروباری کاغذات اور چیک بکیں بے ترتیبی سے بھری ہوئی تھیں۔ ان ہی کاغذات میں اس کے اور یوسف (یعنی لوٹی) کے درمیان معاہدے کی منسوخی کی دستاویز بھی تھی۔ مگر اب یہ میرے لیے ایک ردی کاغذ کے ٹکڑے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ پھر بھی میں نے اُسے تہہ کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا کیونکہ کسی موقعے پر یہ کاغذ میرے لیے کارآمد ثابت ہو سکتا تھا۔ اب اس جگہ میرا ٹھہرنا بے معنی تھا۔ چنانچہ میں نے کمرے میں ایک آخری نگاہ ڈالی اور برآمدے میں نکل کر عمارت کے عقبی حصے کا رُخ کیا جہاں میرے اندازے کے مطابق لوٹی کے فرستادہ چار موت کے فرشتے موجود تھے۔ سوال یہ تھا کہ میں ان سے کیونکر نجات حاصل کر سکتا تھا؟ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر ان کے پاس کوئی وائرلیس سیٹ موجود ہے اور لوٹی نے اس کے ذریعے ان سے رابطہ قائم کر لیا تو انہیں میری اصلیت کا علم ہو جائے گا۔ ایسی صورت میں وہ میری جان کے درپے ہو سکتے تھے۔ دوسری طرف میں لوٹی تک رسائی حاصل کرنے کے سلسلے میں ان لوگوں کو درمیانی پُل کے طور پر استعمال کر سکتا تھا۔ مگر اس مقصد کے لیے ایک جامع اور مکمل منصوبے کی ضرورت تھی جو میرے پاس موجود نہیں تھا۔ ان ہی خیالات میں کھویا ہوا میں اس جگہ پہنچ گیا جہاں گھنے درختوں کے سائے میں دو جیپ گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ وہ چاروں مسلح افراد اُن میں سوار تھے اور ظاہر ہے کہ انہوں نے روزی اور شوکت کی لاشوں کو بھی ان ہی گاڑیوں میں رکھ لیا ہو گا۔ وہ میرے اگلے حکم کے منتظر تھے۔ جبکہ میں خود ابھی تک شدید ذہنی الجھن اور کشمکش میں مبتلا تھا۔

میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا جیپ گاڑیوں کی طرف بڑھنے لگا۔ میرے اور گاڑیوں کے درمیان دو ڈھائی سو گز کا فاصلہ حائل تھا جو میرے لیے اس لحاظ سے مفید تھا کہ مجھے آئندہ اقدام کے بارے میں سوچنے کے لیے کچھ اور وقت بھی مل سکتا تھا۔ یکایک فضا میں موٹروں کے انجنوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ میں نے چونک کر چاروں طرف دیکھا۔ وہ چاروں بھی چوکنّا ہو کر جیپ گاڑیوں سے باہر نکل آئے تھے اور مستعد ہو کر اس طرف دیکھ رہے تھے جدھر سے یہ آوازیں آ رہی تھیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے چار جیپ کاریں نمودار ہوئیں۔ وہ ڈاک بنگلے کے سامنے سے نہیں بلکہ عقب سے نمودار ہوئی تھیں۔ اس سے پہلے کہ لوٹی کے آدمیوں کو سوچنے کا موقعہ ملتا آنے والی جیپ کاروں سے برین گنوں کی بارش ہونے لگی اور وہ چاروں قدآور افراد بے جان لاشوں میں تبدیل ہو کر زمین پر گر گئے۔ یہ سب کچھ اس قدر غیر متوقع تھا کہ اُن کے ساتھ ساتھ مجھے بھی سنبھلنے کی مہلت نہیں مل سکی تھی۔ اب ان جیپ کاروں کا رُخ میری جانب تھا۔ ان کی رفتار میں قدرے کمی پیدا ہو گئی تھی مگر میں اُن میں سے سوار مسلح افراد کی برین گنوں کی نالیاں واضح طور پر دیکھ سکتا تھا۔ جنھوں نے مجھے اپنا حریف بنایا ہوا تھا۔ میرے پاس ایک پستول کے سوا کوئی اور ہتھیار نہیں تھا اور ان حالات میں پستول ایک بے حیثیت اور بے کار چیز تھا۔ اگر میں اُن میں سے ایک دو لوگوں کو پستول کا نشانہ بنانے میں کامیاب ہو بھی جاتا پھر بھی میرے بچنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ میرے آس پاس دور دور تک کوئی حفاظتی پناہ نہیں تھی۔ چنانچہ میں نے خود کو حالات کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا اور بے حس و حرکت خاموش کھڑا ہو گیا۔ میری زبان پر کلمہ تھا اور میں کسی بھی لمحے اپنی موت کو گلے لگانے کے لیے تیار تھا۔ جیپ کاریں اب اور بھی آہستہ ہو گئی تھیں۔ یہاں تک کہ مجھ سے دس بارہ گز کے فاصلے پر پہنچ کر وہ رُک گئیں۔ اب میں اُن کے حصار میں تھا اور جیپ کاروں میں سوار خونخوار لوگوں کو واضح طور پر دیکھ سکتا تھا۔ انہوں نے اپنے چہروں پر ڈھاٹے باندھ رکھے تھے اور سیاہ رنگ کی قمیصیں اور شلواریں پہنے ہوئے تھے۔ یکایک ایک کرخت اور بھاری آواز نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"خبردار۔ حرکت نہ کرنا ورنہ گولیوں سے چھلنی کر دیے جاؤ گے۔" لیکن اس وارننگ سے پہلے ہی میں کوئی حرکت نہ کرنے کا ارادہ کر چکا تھا۔

ایک جیپ میں سے ایک تنومند شخص کود کر باہر نکلا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں برین گن تھی جو اس نے بے پروائی سے لٹکائی ہوئی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے باقی ماندہ ساتھیوں نے مجھے اپنا ہدف بنا رکھا ہے اور میری ذرا سی حرکت پر وہ مجھے گولیوں سے بھون ڈالیں گے۔ وہ چپے تُلے قدم اُٹھاتا ہوا میرے نزدیک آ کر کھڑا ہو گیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ مجھے احساس ہوا کہ اس شخص کو میں نے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ مگر کہاں اور کن حالات میں؟ یکایک میرے ذہن میں ایک کوندا سا لپک گیا۔ مجھے یاد آ گیا تھا کہ وہ کون شخص تھا۔ میں اپنے دوست اور مہربان رانا کو یکسر فراموش کر بیٹھا تھا۔ حالانکہ میں نے اس کے ساتھ جو سلوک روا رکھا تھا اس کے بعد مجھے اس کی جانب سے جوابی کارروائی کے لیے تیار رہنا چاہیئے تھا۔ اگر ملک منصور مجھے نہ مل جاتا اور میں اس کے ساتھ اس کی مہمانداری سے لطف اندوز ہونے کے لیے نہ جاتا تو بہت ممکن تھا کہ میں اس علاقے سے کہیں دُور جا چکا ہوتا جہاں رانا کے ہاتھ مجھ تک نہ پہنچ سکتے۔ لیکن تقدیر نے مجھے ایک بار پھر رانا کے زیرِ نگیں علاقے میں لا کر پھینک دیا تھا اور میں ایک بار پھر اس کے چنگل میں پھنس چکا تھا۔ رانا کے خونخوار ساتھیوں کے روپ میں موت ایک بار پھر میرے سامنے اپنے خوفناک جبڑے کھولے کھڑی تھی۔

میرے سامنے کھڑے ہوئے ڈاکو نے دو قدم آگے بڑھائے اور پھر نہایت مہذب انداز میں مجھے مخاطب کیا۔
"آپ کو جیپ میں سوار ہونا پڑے گا۔"

رانا کی حویلی میں رہ کر مجھے بخوبی اندازہ ہوگیا تھا کہ اُس نے ڈاکوؤں کا ایک گروہ ترتیب ضرور دیا تھا مگر انہیں بڑے معقول انداز میں تربیت دی تھی۔ رانا کی حویلی میں پہنچ کر یہ تصور بھی ذہن میں نہیں آسکتا تھا کہ وہ ایک قانون شکن اور جرائم پیشہ ڈاکوؤں کے گروہ کا سرغنہ ہے۔ بہرحال، میرے سامنے اُس درخواست کو منظور کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا۔ میں چُپ چاپ آگے بڑھا اور سامنے کھڑی ہوئی جیپ میں سوار ہوگیا۔ جیپیں حرکت میں آئیں تو میں نے اِن جیپوں کی طرف دیکھا جن میں ٹولی کے چار مسلح کارندے بے جان پڑے تھے۔ اِن کے پہلو بہ پہلو روزی اور شوکت کی لاشیں بھی تھیں اور اس میں کوئی شک وشبہ نہیں تھا کہ وہ تمام لاشیں اب بے گوروکفن ہی رہیں گی۔ انہیں کفنانے، دفنانے کے لیے اُس بیابان جنگل میں کوئی ایک ذی روح بھی موجود نہیں تھا۔ اپنی بیوی اور دوست کی لاشوں کو بے یارومددگار چھوڑ کر میں خاموشی سے سرجھکائے ایک جیپ میں بیٹھا ہوا اَن جانی منزل کی جانب جارہا تھا۔ معاً مجھے دلدار کا خیال آیا جسے میں کچھ فاصلے پر لینڈروور میں چھوڑ کر آیا تھا اور جسے میں نے حکم دیا تھا کہ وہ میرے اگلے حکم تک وہیں منتظر رہے۔ میرے لیے یہ جاننے کی کوئی صورت نہیں تھی کہ دلدار کے ساتھ اِن لوگوں نے کیا سلوک کیا تھا؟ اگر اُس پر اِن کی نظر پڑے گی تو یقیناً انہوں نے اسے بھی نہیں بخشا ہوگا۔ کیونکہ وہ جس لینڈروور میں بیٹھا ہوا تھا وہ اِن ڈاکوؤں کے لیے اجنبی اور غیر مانوس نہیں تھی۔ اور اگر وہ کسی صورت اِن سے محفوظ تھا تو پھر وہ اپنی ڈیوٹی فراموش کرکے وہاں سے چلا جانے والا آدمی نہیں تھا۔ ہم وہاں سے واپس روانہ ہوئے تو جیپوں نے پھر ڈاک بنگلے کے سامنے والا راستہ چھوڑ کر عقبی سمت میں سفر شروع کر دیا۔ اِس طرح دلدار اِن کی نگاہوں میں آنے سے محفوظ رہ سکتا تھا۔ بشرطیکہ وہ ابھی تک زندہ اور سلامت ہو۔

جیپیں تیز رفتاری سے سفر کرنے لگیں۔ مجھے جس جیپ میں جگہ دی گئی تھی اُس میں ڈرائیور کے علاوہ ایک اور مسلح ڈاکو بھی سوار تھا۔ میں ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا اور میرے پیچھے مسلح ڈاکو برین گن تھامے مستعد بیٹھا ہوا تھا۔ اگر میں کسی نہ کسی طرح اُس پر قابو پانے میں کامیاب ہو بھی جاتا پھر بھی اپنے عقب میں آنے والی دو جیپوں میں سوار مسلح ڈاکوؤں کی فائرنگ سے محفوظ نہیں رہ سکتا تھا۔ میرے لیے کوئی راہِ فرار نہیں تھی اس لیے میں نے راضی برضا ہوکر چپ چاپ سفر کرنے میں ہی عافیت جانی۔ مختلف پہاڑی علاقوں اور پتھریلے راستوں سے گزرتا ہوا یہ مختصر سا قافلہ تیزی سے اپنی منزل کی جانب گامزن تھا۔ یہ راستے میری نظر سے پہلے نہیں گزرے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ ہم کسی نئی منزل کی طرف جارہے تھے۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ کسی نے میری تلاشی لینے کی کوشش نہیں کی تھی اور نہ ہی میرے ہاتھ پیر باندھ کر مجھے بے دست وپا کیا گیا تھا۔ جو اُن لوگوں کی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی خود اعتمادی کا بیّن ثبوت تھا۔

دو ڈھائی گھنٹے سفر کرنے کے بعد آس پاس کے مناظر میں تبدیلی آنے لگی۔ اب ہم ایک سرسبز وشاداب علاقے سے گزر رہے تھے۔ اسے پہاڑی تو نہیں کہا جاسکتا مگر نشیب وفراز اور چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کی بنا پر یہ میدانی علاقہ بھی نہیں تھا۔ جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے گئے ماحول اور مناظر کی دلکشی میں اضافہ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ہم خوبصورت درختوں اور باغات سے گھرے ہوئے ایک علاقے میں داخل ہوگئے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہاں شجرکاری کسی نظم وضبط کے تحت کی گئی ہے اور گردونواح کو خوبصورت اور خوشنما بنانے میں انسانی ہاتھوں کی کاریگری کا بھی دخل ہے۔ پُرفضا باغوں سے گزرتے ہوئے ہماری جیپیں ایک بڑے سے آہنی گیٹ کے پاس پہنچ کر رُک گئیں۔ سیاہ رنگ کا آہنی گیٹ بند تھا۔ اس کے چاروں طرف اینٹوں کی چار دیواری نہیں تھی بلکہ اُس کی جگہ آہنی تاروں کی مدد سے حد بندی کی گئی تھی۔ مجھے یہ اہتمام دیکھ کر مغربی فلموں میں دیکھے ہوئے جنگی قیدیوں کے کیمپ یاد آگئے۔ آہنی تاروں کی یہ چار دیواری بہت دُور تک پھیلی ہوئی تھی۔ گویا اُس کے آگے محفوظ اور مخصوص علاقہ تھا۔ آہنی دروازے کے پیچھے سے

ایک محافظ نے جھانک کر دیکھا اور پھر دروازہ کھول دیا۔ اُس سے پہلے ہم کچی پتھریلی سڑک پر سفر کرتے رہے تھے مگر اب یہاں بجری کی نیم پختہ سڑک موجود تھی۔ ٹریک کے دورویہ یوکلپٹس اور سَرو کے اونچے اونچے خوبصورت درخت لگے ہوئے تھے اور اطراف میں چمن بندی کی گئی تھی۔ قریباً آدھے فرلانگ کے بعد عمارتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ بائیں جانب فوجی بیرکس کے انداز کی ایک منزلہ عمارتیں بنی ہوئی تھیں جن کے سامنے چھوٹے چھوٹے سرسبز لان تھے۔ ان کے باہر کی جانب کوئی برآمدہ نہیں تھا محض کھڑکیاں نظر آرہی تھیں۔ دس بارہ عمارتوں کا یہ سلسلہ ختم ہوا تو ایک وسیع وعریض میدان کے بعد ایک دو منزلہ عمارت نظر آئی جو خاصی بڑی تھی۔ اس کے سامنے اونچے اونچے ستونوں والے برآمدے تھے۔ یہ ایک قدیم وضع کی عمارت تھی جو انگریزی عہدِ حکومت میں عام طور سے افسروں کے کلبوں یا جم خانہ کلب کے طور پر استعمال کی جاتی تھیں۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ واقعی ایک زمانے میں یہاں انگریز افسروں کا کلب تھا۔ جیپوں سے اُتر کر دو محافظوں کی نگرانی میں برآمدے سے گزر کر ہم ایک بہت بڑے اور خوبصورت ہال میں داخل ہوگئے جس کا فرش لکڑی کا تھا اور پالش کی وجہ سے خوب چمک رہا تھا۔ کسی زمانے میں یہ ہال رقص پارٹیوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہوگا۔ ہال میں جگہ بجگہ خوبصورت اور قیمتی قالینوں کا فرش تھا جن میں بیش قیمت اور آرام دہ صوفے رکھے ہوئے تھے۔ دوسرے کنارے پر ایک بار تھا جس کے عقب میں شیشے کی الماری میں مختلف قسم کی شرابوں کی بوتلیں سجی ہوئی تھیں — بار کاؤنٹر پر ایک خوبصورت لڑکی موجود تھی۔ ہم لوگوں کو داخل ہوتے ہوئے دیکھا تو وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ وہ ایک خوش اندام نوجوان لڑکی تھی اور بلاؤز اور اسکرٹ پہنے ہوئے تھی۔ دیکھنے میں وہ اینگلو انڈین لگتی تھی۔ مجھے بار کے سامنے ایک صوفے پر بٹھانے کے بعد ایک محافظ نے بار کا رُخ کیا جبکہ دوسرا برین گن سنبھالے میرے سرہانے چوکس کھڑا رہا۔ محافظ نے لڑکی سے دبی زبان میں کچھ گفتگو کی اور پھر میرے بائیں جانب آکر کھڑا ہوگیا۔ بارگرل کاؤنٹر کے پیچھے سے مسکراتی ہوئی میری جانب بڑھی تو میں نے اُس کے سراپا کا جائزہ لیا۔ وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی مسکراتے ہوئے اُس کے دونوں رخساروں میں خوبصورت گڑھے پڑجاتے تھے جس کی وجہ سے اسکی مسکراہٹ اور زیادہ دلکش ہوجاتی تھی۔ وہ میرے سامنے آکر کھڑی ہوئی تو خوشبو کے ایک جھونکے نے مجھے شگفتہ کردیا۔

"آپ کیا پینا پسند کریں گے سر؟" اس نے سُریلی آواز میں دریافت کیا۔

"تمہارے پاس کیا ہے؟"

جواب میں اُس نے بہت سی شرابوں کے نام گنوا دیے۔

"سوری" میں نے انگریزی میں کہا "میں شراب نہیں پیتا۔ اگر کوئی جوس ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔"

اس نے مایوس ہوکر مجھے دیکھا اور چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتی ہوئی واپس چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ ایک ٹرے میں جوس کا ایک گلاس رکھ کر لائی اور بڑے مہذب انداز میں مسکراتے ہوئے مجھے پیش کیا۔

"بس یا کچھ اور؟" اُس نے دلنواز انداز میں پوچھا۔

وہ ساقی گری کے فن میں خاصی مشاق معلوم ہوتی تھی۔ میں نے سَر کے اشارے سے اس کا شکریہ ادا کیا اور نفی میں سر ہلا دیا۔ میں نے جوس کا گلاس ایک ہی گھونٹ میں خالی کرکے تپائی پر رکھ دیا۔

یکایک ایک عقبی دروازہ کھلا اور ایک مسلح شخص نے اندر کر دروازے کے سامنے جگہ سنبھال لی۔ اس کے بعد میں نے رانا کو ہال میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ وہ شکاری کپڑوں میں ملبوس تھا۔ سر پر پی کیپ تھی اور آنکھوں میں سرد مہری۔ اس کو دیکھتے ہی میرے دونوں محافظ اٹین شین ہوکر فوجی انداز میں کھڑے ہوگئے۔ بارگرل کے چہرے سے بھی مسکراہٹ ختم ہوگئی تھی۔ رانا نپے تُلے قدم اُٹھاتا ہوا میرے صوفے کی جانب بڑھا۔ میں بدستور خاموش بیٹھا اُسے دیکھتا رہا۔ رانا کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ میرے پاس پہنچ کر وہ کوٹ کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈال کر کھڑا ہوگیا۔

اور مجھے گھورنے لگا۔ ابھی تک اس کے مُنہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا تھا۔ ہم دونوں خاموشی ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ اسی اثنا میں میرے دونوں محافظ اُلٹے قدموں پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ اس طرح ان کے اور ہمارے درمیان ایک قابلِ احترام فاصلہ قائم ہو گیا تھا۔ رانا چند لمحے مجھے گھورتا رہا۔ پھر اس نے ہاتھ کے اشارے سے دونوں محافظوں کو کمرے سے باہر جانے کا اشارہ کیا مگر دروازے پر مامور مسلح شخص بدستور اپنی جگہ کھڑا رہا۔ رانا کی سرد آنکھوں میں نیزے کی تیز اَنی جیسی کیفیت تھی۔ کچھ دیر ہم دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے رہے پھر اس نے سکوت کو توڑا اور اس کے منہ سے غراہٹ نما ایک آواز برآمد ہوئی۔

"ہوں" وہ زیرِ لب بولا۔ "آخر آ ہی گئے نا!!"

مَیں نے جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔ بلکہ بڑے اطمینان سے ٹانگ پر ٹانگ رکھ لی۔ ان حالات میں جبکہ مَیں پوری طرح اس کے چنگل میں پھنس چکا تھا مَیں بولنے سے زیادہ سُننے کی کوشش میں مصروف تھا۔ حالات میرے لیے انتہائی مخدوش اور مایوس کُن تھے مگر مَیں اپنے حریف پر اپنی کمزوری یا گھبراہٹ کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے مَیں نے خاموش رہنے کو ترجیح دی تھی۔ ویسے بھی مَیں رانا سے یہ توقع نہیں رکھتا تھا کہ وہ میرے ساتھ کوئی مہربانی برتے گا۔ مَیں نے رانا کی حویلی میں جو قیامت مچائی تھی اور جس قدر تباہی پھیلائی تھی۔ اس کے بعد وہ میرے ساتھ جو بھی سلوک کرتا کم تھا۔ میرے پاس اپنی صفائی میں کہنے کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ مَیں نے نہ صرف اسے شدید مالی اور جانی نقصان پہنچایا تھا بلکہ اسے دو خوبصورت عورتوں سے بھی محروم کر دیا تھا جنہیں وہ ہر قیمت پر اپنی حویلی میں رکھنے پر تُلا ہوا تھا۔ ان حالات میں اس سے کسی رعایت یا مروّت کی اُمید رکھنا حماقت سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مَیں بدسے بدتر حالات کا سامنا کرنے کے لیے بھی تیار تھا۔ میری ہمیشہ سے یہ عادت رہی ہے کہ مایوس کُن اور خراب حالات میں میرے اعصاب میرا ساتھ نہیں چھوڑتے۔ بلکہ میرے اندر اور زیادہ خود اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس وقت بھی مَیں بڑے اطمینان اور سکون کے ساتھ بیٹھا ہوا اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہا تھا اور بالکل خوفزدہ نہیں تھا۔ صورتِ حال کا تقاضا بھی یہی تھا کہ مَیں خود کو کسی مزاحمت کے بغیر اس کے حوالے کر دوں کیونکہ مَیں پوری طرح اس کے قبضۂ اختیار میں تھا۔ اور بظاہر اس عقوبت خانے سے فرار کی کوئی راہ نظر نہیں آ رہی تھی۔

"ہوں!" رانا نے ایک بار پھر غرّا کر کہا اور پھر بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ "مجھے تم سے ہرگز یہ اُمید نہ تھی۔" وہ درشت لہجے میں بولا۔

مَیں نے بڑے اطمینان سے قالین پر دونوں ٹانگیں پھیلا دیں اور کہا — "اس کے سوا میرے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔"

"مگر تم مجھ سے بات تو کر سکتے تھے۔ اتنا بڑا قدم اُٹھانے سے پہلے تم نے مجھ سے مشورہ لینا بھی ضروری نہیں سمجھا۔"

"مشورے کی گنجائش نہیں تھی۔" مَیں نے جواب دیا۔ "اُن حالات میں بھلا تم مجھے کیا مشورہ دے سکتے تھے؟"

رانا نے بے چینی سے بار گرل کو اشارہ کیا۔ اور وہ ایک ٹرے میں شراب کی بوتل اور دو گلاس رکھ کر تیزی سے ہمارے پاس چلی آئی۔

رانا کے اشارے پر اُس نے ایک گلاس میں شراب اُنڈیلی اور رانا کو پیش کر دی۔ "یہ کیا بدتمیزی ہے۔" وہ غصّے سے دھاڑا۔ "پہلے مہمان کو پیش کرتے ہیں۔ تمہیں تمیز کب آئے گی؟"

لڑکی سہم گئی۔ ہولے سے کہنے لگی۔ "سر۔ وہ کچھ پینا پسند نہیں کرتے۔ جوس کا ایک گلاس پیش کر چکی ہوں۔"

"پینا پسند نہیں کرتے؟" رانا نے بے اعتباری سے میری جانب دیکھا۔ "یہ حادثہ کب ہوا؟"

"تم تو جانتے ہو......" مَیں نے بات شروع کی مگر اس نے میرا فقرہ کاٹ دیا۔ "مَیں سب جانتا ہوں تمہارے بارے

میں۔ بتانے کی اور یاد دلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بہرحال۔ نہیں پینا چاہتے تو تمہاری مرضی۔" اُس نے اپنے گلاس کو ایک ہی سانس میں خالی کر کے ٹرے میں رکھ دیا تھا۔ جسے لڑکی نے دوبارہ بھر دیا۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔" اس نے لڑکی کو ہاتھ سے چلے جانے کا اشارہ کیا۔ "ٹرے میز پر رکھ دو اور یہاں سے گم ہو جاؤ۔ مَیں تنہائی چاہتا ہوں۔"

لڑکی سہمے ہوئے انداز میں ہال سے باہر چلی گئی۔ مَیں آنے والے طوفان کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنے لگا۔ مَیں نے ایک ہی نگاہ میں سارے ہال کا جائزہ لے لیا۔ ایک دروازے پر مسلح محافظ برین گن تھامے مستعد کھڑا تھا۔ اس کے سوا کمرے میں کوئی دوسرا نہیں تھا۔ رانا کے پاس بھی بظاہر کوئی ہتھیار نظر نہیں آتا تھا۔ گویا میرا سب سے خطرناک حریف وہ مسلح محافظ ہی تھا۔ رانا پر قابو پانا میرے لیے کوئی مشکل نہ تھا مگر برین گن سے مسلح خونخوار شخص میری رسائی سے باہر تھا۔ صورتِ حال خاصی مایوس کُن تھی۔ لیکن مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ مَیں صوفے پر بیٹھے بیٹھے بے خبری کے عالم میں ان کا نشانہ بننے کی حماقت نہ کروں۔ مَیں آہستگی سے صوفے سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میرا ذہن تیزی سے دفاعی منصوبے بنا رہا تھا۔ لیکن میرے لیے سب سے مؤثر حربہ یہی ہو سکتا تھا کہ جوں ہی ایکشن کا آغاز ہو مَیں رانا کو اپنے قابو میں کر لوں اور برین گن والے محافظ کے سامنے ڈھال کے طور پر استعمال کروں۔ اگرچہ رانا بھی اتنی آسانی سے میرے قابو میں آنے والا نظر نہیں آتا تھا مگر بچاؤ کی اس کے سوا کوئی اور سبیل نہیں تھی۔

رانا نے ٹرے میں سے شراب کی بوتل اٹھا کر گلاس میں اُنڈیل کر دوسرا پیگ بنایا اور مَیں اس موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے اور قریب چلا گیا۔

"ماسٹر لوٹی۔" اس نے گلاس اُٹھا کر مجھے مخاطب کیا۔ "جو ہوا مَیں اُسے بھول جانے کو تیار ہوں اور چاہتا ہوں کہ تم بھی بھول جاؤ۔"

"لوٹی!؟!" مَیں اپنی جگہ ساکت کھڑا رہ گیا۔ ایک گرم لہر میرے دماغ سے نکل کر سارے جسم میں دوڑ گئی اور یک لخت میرے اعصاب جو غیر ارادی طور پر شدید کشیدگی کا شکار رہتے پُرسکون ہو گئے۔ میرے مُنہ سے بے اختیار اطمینان کی ایک آہ نکلی اور مَیں پاس ہی پڑے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا۔ حالات اتنی تیزی سے رونما ہو رہے تھے کہ مجھے یہ سوچنے کا موقعہ ہی نہیں ملا تھا کہ رانا اور اس کے آدمی مجھے لوٹی بھی سمجھ سکتے ہیں۔ یہ راز مجھ پر اب منکشف ہوا تھا کہ وہ لوگ مجھے لوٹی سمجھ رہے تھے جس کا مجھے وہم وگمان بھی نہ تھا۔ میرے مُنہ سے بے ساختہ ایک زوردار قہقہہ بلند ہوا اور رانا حیرت زدہ ہو کر مجھے تکنے لگا۔ اس کا گلاس والا ہاتھ اُٹھا کا اُٹھا ہی رہ گیا۔ اس کے چہرے پر بے یقینی کے آثار تھے اور وہ حیران ہو کر مجھے زور زور سے قہقہے لگاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ اس کی حیرانی پر میرے قہقہوں میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ ہنستے ہنستے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میری ذہنی کیفیت کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں تھا۔ چند لمحے پیشتر مَیں موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہا تھا اور اپنی جان بخشی کا تصور ہی میرے لیے پریشان کُن تھا مگر اب حالات یکسر بدل گئے تھے۔ وقتی طور پر میرے جسم کا تناؤ اور اعصاب کی کشیدگی بالکل ختم ہو چکی تھی۔ رانا مجھے لوٹی سمجھ رہا تھا۔ میرا ہم شکل۔ میرا رقیب۔ میرا جانی دُشمن۔ وہ میرے خون کا پیاسا تھا مگر حالات کی ستم ظریفی دیکھیے کہ اس کی وجہ سے مَیں ایک بار پھر موت اور ہلاکت سے دوچار ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔

نہ جانے کتنی دیر تک مَیں بے اختیار قہقہے لگاتا رہا۔ رانا پہلے تو حیران نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔ یوں لگا جیسے اس کو میری ذہنی کیفیت کے بارے میں شک وشبہ ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ میرے قہقہے رفتہ رفتہ کم ہونے لگے اور پھر بالکل رُک گئے۔ مَیں نے ہاتھ سے اپنی آنکھوں کے آنسو پونچھے اور صوفے پر سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"سوری۔" مَیں نے رانا کو مخاطب کیا۔ "دراصل مجھے ایک بہت پرانا لطیفہ یاد آگیا تھا۔"

"پرانا لطیفہ؟" وہ حیران ہو کر بولا۔ "مگر اس وقت تو ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔"

"لطیفے خود بخود بھی ہو جاتے ہیں اور کئی بار بہت بے وقت یاد آجاتے ہیں۔" مَیں نے ہاتھ کی پشت سے اپنی آنکھوں کو خشک کرتے ہوئے کہا۔ "تم نے مجھے پچھلی باتوں کو بھول جانے کے لیے کہا تو مجھے کچھ اور پرانی باتیں یاد آگئیں۔"

"تم کس قدر سنگدل ہو۔" رانا میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ کر مجھے حیران نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ "تمہارے اندر کوئی بھی انسانی جذبہ نہیں ہے؟ ٹونی مَیں تمہیں اتنا بے حس نہیں سمجھتا تھا۔ روزی تمہاری محبوبہ تھی۔ تم نے اس کے ساتھ اپنی زندگی کے رنگین لمحات گزارے تھے۔ شوکت تمہارا بہت پرانا دوست اور ساتھی تھا۔ تم نے ان دونوں کو بے رحمی سے ہلاک کر دیا اور تمہارے ماتھے پر بل تک نہیں پڑا۔ کیا تمہارے ماتھے پر کوئی انسانی جذبہ موجود نہیں ہے۔ تم اُن دونوں کی موت پر ہنس رہے ہو؟ وہ جو ایک زمانے میں تمہارے قریب ترین رفیق تھے۔"

مَیں نے نگاہیں پھیلا کر اُسے دیکھا۔ "حیرت کی بات ہے کہ تم مجھے سنگدلی کا طعنہ دے رہے ہو۔ ایک ایسا شخص جس کے پاس شاید دل ہی نہیں ہے۔"

"واقعی مَیں نرم دل انسان نہیں ہوں مگر تمہارا نمبر مجھ سے بڑھ گیا ہے۔ روزی نے میرے ساتھ زیادہ وقت نہیں گزارا تھا پھر بھی مجھے اس کی ہلاکت کا افسوس ہے۔ البتہ شوکت کے بارے میں مجھے قطعی تاسف نہیں ہے۔"

"خیر چھوڑو ان باتوں کو۔" مَیں نے اس کی بات کاٹ دی۔ مَیں خوامخواہ اس موضوع کو طول نہیں دینا چاہتا تھا جس کے بارے میں میری معلومات صفر کے برابر تھیں۔ "مَیں دغا بازی اور بیوفائی پسند نہیں کرتا۔ مجھے ایسے لوگوں سے سخت نفرت ہے جو اپنے دوستوں اور چاہنے والوں کے اعتماد کو دھوکہ دیتے ہیں۔ میرے نزدیک ایسے انسانوں کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

"بہت ناراض ہو اُن دونوں سے؟" وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ "خود تم نے کتنے لوگوں کے اعتماد کو مجروح کیا ہے؟"

"مگر وہ میرے بہترین اور قریبی دوست نہیں تھے۔ بزنس، جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے۔" مَیں نے بات کو گول کرنا چاہا۔

رانا نے شراب کا گلاس خالی کر کے تپائی پر رکھ دیا۔ "اور میرے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

"تمہیں میرا قریبی دوست ہونے کا شرف کبھی حاصل نہیں ہوا۔" مَیں نے اسے چھیڑا۔ "اگر تم میرے دوست ہوتے تو روزی اور شوکت کے ساتھ پوشیدہ طور پر ساز باز نہ کرتے۔"

وہ ہنس پڑا اور تالی بجا کر بولا۔ "واقعی۔ تم نے مجھے لاجواب کر دیا۔ یہ درست ہے کہ ہم کبھی قریبی دوست نہیں رہے اور پھر تم نے خود ہی تو کہا ہے کہ بزنس، محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔"

مَیں نے مصلحتاً بات کا رُخ بدلنے کی کوشش کی۔ "یہ بتاؤ کہ تم نے طاقت کے بل پر مجھے اپنے پاس کیوں بلایا ہے؟ کیا مَیں اپنے آپ کو تمہارا قیدی سمجھوں؟"

وہ مسکراتا ہوا میرے نزدیک آگیا۔ "یہ بات نہیں ہے ٹونی۔ مَیں اور تمہیں گرفتار کرنے کی کوشش کروں گا۔ یہ خیال تمہیں کیسے آیا۔ دراصل مَیں تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا تھا اور مجھے شوکت نے وائرلیس پر بتایا تھا کہ ریسٹ ہاؤس میں تم اُس سے مل چکے ہو۔ وہ اپنی زندگی کو خطرے میں سمجھ رہا تھا۔ روزی بھی یہ بات سن کر پریشان ہو گئی تھی۔ روزی کا خیال تھا کہ تم دوبارہ ریسٹ ہاؤس میں ضرور لوٹ کر جاؤ گے۔ وہ شوکت کے اور خود اپنے بارے

میں تمہاری جانب سے خطرہ محسوس کر رہی تھی اور فوری طور پر شوکت کو وہاں سے لے جانے کی غرض سے ریسٹ ہاؤس گئی تھی۔ اب مَیں سوچتا ہوں کہ اچھا ہوتا اگر مَیں روزی کو ریسٹ ہاؤس نہ جانے دیتا۔ اس طرح کم از کم اس کی جان تو بچ سکتی تھی۔"

مَیں اب خود کو زیادہ پُر اعتماد محسوس کرنے لگا تھا۔ اس لیے بڑے اطمینان سے صوفے پر اور زیادہ پھیل کر لیٹ گیا تھا۔ مَیں نے مسکراتے ہوئے رانا کو مخاطب کیا۔ "روزی کے بارے میں تمہاری دلچسپی نے مجھے فکرمند کر دیا تھا۔ اب جب کہ وہ اس دنیا میں نہیں رہی کیا تم بتا سکتے ہو کہ تم نے اچانک روزی میں دلچسپی لینی کیوں شروع کر دی تھی اور مجھ سے پوشیدہ طور پر اس کے ساتھ ملاقاتیں شروع کرنے کا مطلب کیا تھا؟"

رانا کے چہرے پر پہلی بار مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ہمارے درمیان تناؤ کی کیفیت اب رفتہ رفتہ کم ہونے لگی تھی اور ہم دونوں ہی پہلے کے مقابلے میں زیادہ پُر اعتماد اور بے تکلف ہو چکے تھے۔ وہ مسکرایا اور بولا۔ "ٹونی، بہتر ہو کہ مَیں تمہارے سامنے سچ سچ واقعات بیان کر دوں اور اپنے سارے پتّے تمہارے سامنے رکھ دوں۔" یہ کہہ کر اس نے چند گھونٹ بھرے۔ اور بہت آسودہ لہجے میں کہنے لگا۔ "اب جب کہ روزی اس دنیا میں نہیں رہی اور تم اس کے خلاف اپنے غصّے اور نفرت کا اظہار کر چکے ہو مَیں تمہیں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ روزی کو مَیں آج سے نہیں کئی سال پیشتر سے پسند کرتا تھا اور ہمارے درمیان بہت گہرے تعلقات قائم تھے۔ وہ ایک دلکش اور پُر بہار عورت تھی اور تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ خوبصورت اور خوش انداز عورتیں میری کمزوری ہیں۔ اسی کے ذریعہ میری ملاقات شوکت سے ہوئی تھی وہ دونوں اُس زمانے میں بھی ایک دوسرے کے رومانی ساتھی تھے۔ حالانکہ تمہیں اس بات کا مطلق علم نہیں تھا۔ بہ حقیقت تم مجھ سے زیادہ اچھی طرح جانتے ہو کہ روزی ایک جاہ پسند اور لالچی عورت تھی۔ تمہارے ساتھ اس کے تعلقات کی بنیادی وجہ بھی یہی تھی کہ تمہارے ذریعے وہ دولت اور اثر و رسوخ حاصل کرنے کے خواب دیکھ رہی تھی۔ پھر تم جیل چلے گئے اور شوکت کو اتفاقاً تمہارے ہمشکل یوسف سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ یہ خیال سب سے پہلے شوکت کو سوجھا تھا کہ اگر وہ یوسف سے دوستی کر لے اور کسی طرح اسے اپنے دام میں پھانس لے تو نہ صرف تمہیں جیل سے رہائی مل سکتی ہے بلکہ یوسف کو راستے سے ہٹا دینے کے بعد تم بڑے اطمینان سے یوسف بن کر معاشرے میں بظاہر ایک معزز اور قانون پسند شہری کے طور پر اپنی مجرمانہ سرگرمیاں جاری رکھ سکتے ہو۔ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ شوکت کے دماغ نے بہت اعلیٰ منصوبہ سوچا تھا اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ آج اگر تم اس قدر اطمینان اور بے خوفی کے ساتھ آزاد گھوم رہے ہو تو یہ بھی شوکت اور روزی کے منصوبے کا ہی کارنامہ ہے۔ بعد میں شوکت نے روزی کے ذریعے تمہارے ہمشکل یوسف کو اپنے چنگل میں پھنسا لیا۔ وہ بیوقوف کسی اور لڑکی سے محبت کرتا تھا اور وہ دونوں آپس میں شادی کرنے کا خواب دیکھ رہے تھے مگر شوکت نے سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق پہلے تو اس لڑکی کے ساتھ یوسف کا رابطہ ختم کیا اور پھر اس کے بارے میں یوسف کے ذہن میں بدگمانی پیدا کر دی۔ اس کے بعد روزی نے یوسف کو اپنی محبت کے سحر میں گرفتار کر لیا اور ان دونوں کی شادی ہو گئی۔ روزی اور شوکت نے بڑی ذہانت اور ہوشیاری سے باقی منصوبے پر عملدرآمد کیا تھا۔ یوسف کے کتّے کے ساتھ ہی اُس جیسا ایک اور کتّے کا بچّہ حاصل کر کے جیل میں تمہیں پہنچا دیا گیا۔ پھر انھوں نے یوسف کے دستخطوں کی نقول جیل میں تمہیں فراہم کر دیں۔ اس کے ساتھ ہی یوسف کے بارے میں پل پل کی معلومات تمہیں پہنچاتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب تم جیل سے باہر آئے تو تمہیں یوسف کی جگہ لینے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ جن دنوں روزی یوسف کی بیوی کا ڈھونگ رچائے بیٹھی تھی اس زمانے میں بھی اس نے مجھے فراموش نہیں کیا تھا۔ گاہے گاہے وہ مجھ سے ملتی رہتی تھی اور اس بات کا علم شوکت کو بھی تھا مگر جیسا کہ تم بھی جانتے ہو

شوکت ایک لالچی اور آزاد خیال انسان تھا۔ اسے روزی کی ان سرگرمیوں پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ دراصل وہ کسی کا بھی سچا دوست نہیں تھا۔ نہ یوسف کا نہ تمہارا۔ نہ روزی کا اور نہ ہی میرا۔ وہ ایک خود غرض اور مطلب پرست انسان تھا اور روزی اس کا ذریعہ بنی ہوئی تھی۔ شاید تم کو تو یہ بھی معلوم نہیں ہوگا کہ شوکت اور روزی بچپن ہی سے ایک دوسرے کو جانتے تھے اور درحقیقت روزی ہی شوکت کی بیوی تھی۔"

رانا کی بہت سی باتیں میرے علم میں تھیں لیکن روزی اور شوکت کے کردار کے بارے میں اس کے بعض انکشافات میرے لیے چونکا دینے والے تھے۔ خصوصاً یہ بات کہ روزی اور شوکت کے مابین شوہر اور بیوی کا رشتہ تھا میرے لیے انتہائی حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین تھی۔ میں بے اختیار اپنے پیر سمیٹ کر صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"رانا۔ یہ تم مجھے کیسی داستان سنا رہے ہو۔ یہ کیوں کر سکتا ہے؟"

رانا معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ "ٹونی۔ ہم اور تم کسی اور دنیا کے رہنے والے لوگ ہیں۔ ہم جرائم کے رسیا ہیں اس لیے ہماری ساری توجہ اسی طرف رہتی ہے۔ مگر کچھ لوگ دوسرے میدانوں کے کھلاڑی ہوتے ہیں۔ روزی اور شوکت کا مقصد دولت اور طاقت حاصل کرنا تھا۔ اور آج کے دور میں یہ دونوں چیزیں جرائم کے ذریعے بہت آسانی سے حاصل ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ ان دونوں نے اپنے مقصد کے حصول کی خاطر جرائم کی دنیا میں میل جول بڑھایا۔ شاید تم یہ بھی نہیں جانتے کہ شوکت اور روزی دونوں کزن تھے۔ اس سے پہلے وہ اور بھی کئی نام بدل چکے تھے۔ ان دونوں نے کورٹ میرج کی تھی جس کا ثبوت ان دونوں کے سوا کسی اور کے پاس نہیں تھا۔ روزی نے کسی جذباتی لمحے میں مجھے اس بارے میں بتا دیا تھا مگر ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اب وہ شوکت کی بیوی نہیں ہے لیکن شوکت شراب کے نشے میں میرے سامنے یہ اقرار کر چکا تھا کہ وہ دونوں اب بھی ازدواجی رشتے میں بندھے ہوئے ہیں اور روزی نے مصلحت اور ضرورت کے تحت یوسف کے علاوہ کچھ اور لوگوں سے بھی شادیاں کی تھیں۔"

میری آنکھوں پر سے یقین کے پردے ایک ایک کر کے اٹھتے جا رہے تھے۔ روزی اور شوکت کی جو تصویر میرے ذہن میں بن چکی تھی۔ رانا کے بیان نے اسے کچھ اور مسخ کر دیا تھا۔ وہ اس قدر گھناؤنے کردار کے مالک تھے! یہ میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اگر اس سے پہلے میں نے خود اپنے کانوں سے روزی اور شوکت کی باتیں نہ سن لی ہوتیں تو شاید رانا کی باتوں پر یقین نہ کرتا لیکن مجھے ان دونوں کے بارے میں کوئی خوش فہمی باقی نہیں رہی تھی۔ رانا نے اس وقت ان کے بارے میں مجھے جو کچھ بتایا تھا دراصل یہ سب کچھ اسی داستان کی ایک کڑی تھی جو پہلے بھی میرے علم میں آ چکی تھی۔ جو کچھ اب تک ہو چکا تھا اس کے بعد یہ نئے انکشافات میرے لیے حیران کن تو ضرور تھے مگر ناقابلِ یقین ہرگز نہیں تھا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ رانا کی زبانی یہ واقعات سن کر مجھے کوئی ذہنی یا جذباتی صدمہ نہیں پہنچا تھا جو اس بات کی دلیل تھی کہ میرے دل کے کسی گوشے میں بھی روزی اور شوکت کے لیے ہمدردی یا محبت کی رمق بھی باقی نہیں رہی تھی۔ میں شوکت اور روزی کے انجام کو دیکھ کر بھونچکا اور دل برداشتہ رہ گیا تھا مگر رانا نے ان دونوں کے چہروں سے جس طرح نقاب اٹھائی تھی اس کے بعد میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ ان کا انجام دراصل قدرت کی طرف سے ان کے کرتوت اور گناہوں کی سزا تھی جو پہلی قسط کے طور پر اس دنیا ہی میں اللہ تعالیٰ نے انھیں دے دی تھی۔ لیکن میرے ذہن پر اب کوئی بوجھ باقی نہیں رہا تھا اور میں نہ جانے کیوں خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا تھا۔

میں نے رانا کی طرف دیکھا تو وہ بہت غور سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ میرے دلی تاثرات اور جذبات کو بھانپنے کی کوشش میں تھا۔ میں اچانک مسکرانے لگا اور بڑی بے تکلفی سے میں نے رانا کے شانے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"رانا صاحب!" میں نے شگفتہ لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ "یہ تمام باتیں مجھے پہلے ہی معلوم ہیں۔ اگر روزی اور شوکت یا تم اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ تم لوگ میری لاعلمی سے فائدہ اٹھا رہے ہو تو اپنا یہ خیال درست کر لو۔ روزی اور شوکت کی ایک ایک نقل و حرکت میرے علم میں رہی ہے لیکن مصلحت اور ضرورت کا تقاضا یہ ہے کہ میں ان کو نظر انداز کر دوں ان سے انجان بن جاؤں۔ سچ پوچھو تو تمہارے ساتھ اس کے رومانی تعلقات پر مجھے کبھی اعتراض نہیں ہوا۔ وہ ایک ہرجائی اور کاروباری عورت تھی اور اصلیت میں میرے ساتھ اس کا کوئی قانونی اور خونی رشتہ نہیں تھا۔ ہم دونوں محض ایک دوسرے کی سہولت کی خاطر میاں بیوی بن کر رہا کرتے تھے۔ اس کی رومانی سرگرمیوں کو میں نے ہمیشہ نظر انداز کیا لیکن جب مجھے پتہ چلا کہ وہ مجھ سے بالا ہی بالا تمہارے ساتھ کوئی اور معاہدہ بھی کرنے والی ہے تو میں اسے کس طرح معاف کر دیتا۔ میں نے بذاتِ خود ان دونوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے کیفرِ کردار تک پہنچانے کا فیصلہ کیا اور نتیجہ تم دیکھ ہی چکے ہو۔" یہ کہہ کر میں نے سامنے کھڑی ہوئی بار گرل کو انگلی سے اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا اور جب وہ سہمے ہوئے انداز میں آئی تو اسے جوس کا ایک اور گلاس لانے کی ہدایت کی۔

اب رانا کے حیران ہونے کی باری تھی۔ وہ خود کو ایک چالاک اور بارسوخ شخص سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وسائل کے اعتبار سے وہ مجھ پر فوقیت رکھتا ہے مگر میری گفتگو سن کر اس کے اعتماد کے غبارے میں سے ہوا خارج ہو گئی تھی اور وہ اب قدرے تحسین اور رشک کی نگاہوں سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔ میرے لیے یہ خیال فرحت بخش تھا کہ میں بالآخر اسے مرعوب کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور یہ میری بہت بڑی کامیابی اور برتری تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اب میں ایک بلند اور افضل مقام سے اس کے ساتھ معاملات طے کرنے کی پوزیشن میں تھا۔

بار گرل نے جوس کا گلاس ٹرے میں رکھ کر میرے سامنے پیش کیا اور میں اسے ایک ہی سانس میں پی گیا۔ میں نے خالی گلاس بڑے زور سے تپائی پر رکھ دیا اور شرارت آمیز نگاہوں سے رانا کو دیکھا۔

"بہرحال۔ تمہیں یہ معلوم ہو جانا چاہیئے کہ میرے ہاتھ بہت لمبے ہیں اور کان بھی۔ میرے بارے میں ہونے والی ہر سازش کا مجھے علم ہو جاتا ہے اور میں اپنے مجرموں کو سزا دینے پر پوری طرح قادر ہوں خواہ وہ کسی جگہ بھی ہوں۔"

رانا خاموش کسی سوچ میں گم تھا۔

"بہتر ہو کہ اب ہم بزنس کے بارے میں بات چیت کر لیں۔" میں نے رانا کو سوچنے کا موقع دیئے بغیر اس پر ایک اور وار کر دیا۔ "کیا تم مجھے بتاؤ گے کہ محبت کے راز و نیاز کے علاوہ تمہارے اور روزی کے درمیان اور کس سلسلے میں بات چیت ہوئی تھی؟"

رانا اپنے خیالات سے چونکا اور سر اٹھا کر بولا۔ "ٹونی۔ مجھے پہلی بار یہ احساس ہو رہا ہے کہ میں واقعی ایک غلطی کا مرتکب ہوا ہوں۔ مجھے جو بھی بات چیت کرنی تھی وہ براہِ راست خود تمہارے ساتھ کرنا چاہیئے تھی۔ روزی کا سہارا لینے کی مطلق کوئی ضرورت نہیں تھی۔"

"اوکے۔" میں نے خوش دلی سے کہا۔ "میں بھی پچھلی باتوں کو یاد رکھنے کا قائل نہیں ہوں۔"

"بہت بہت شکریہ۔" اس نے گرمجوشی سے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ "مجھے امید ہے کہ آئندہ ہمارے درمیان کوئی غلط فہمی پیدا نہیں ہوگی۔ دراصل مجھے تم سے بہت اہم معاملے پر بات چیت کرنی تھی۔" وہ مجھ سے خاصا مرعوب نظر آتا تھا۔
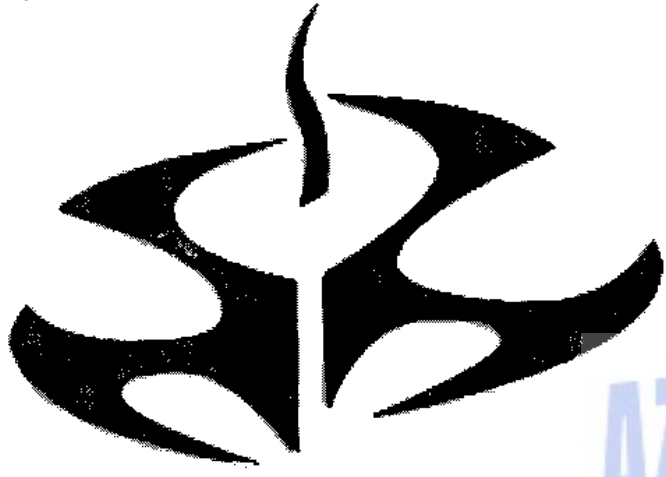
میں نے کہا: "اب تم میرے اشتیاق کو اور زیادہ نہ بڑھاؤ۔ بتاتے کیوں نہیں کہ تم چاہتے کیا ہو؟"

"ٹونی!" وہ مضطرب انداز میں بولا۔ "یہ تو میں جانتا ہوں کہ تم بھی میری طرح بنیادی طور پر ایک جرائم پسند انسان ہو۔ جرائم سے محبت ہماری گھٹی میں پڑی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اپنی تمام تر صلاحیتوں کے باوجود جرائم کی دنیا میں رہنے کو ترجیح دیتے ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جرائم پسند لوگ اُس اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی معیار کے پابند نہیں ہوتے جو دوسرے لوگوں کے نزدیک بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں لیکن پھر بھی مجھے تم سے جس موضوع پر بات کرنی ہے وہ اس قدر اہم اور نازک ہے کہ گفتگو شروع کرنے سے پہلے میں تم سے یہ وعدہ لینا چاہتا ہوں کہ اگر تم میرے خیالات سے متفق نہیں ہو گے تب بھی ہمارے درمیان میں ہونے والی ان باتوں کو یکسر فراموش کر دو گے اور پھر کبھی اس کا حوالہ بھی نہیں دو گے۔ دوسرے لفظوں میں یہ بات یہیں ختم ہو جائے گی۔"

"اوکے" میں نے دونوں ہاتھ اُٹھا کر پُرزور لہجے میں کہا: "میں تم سے وعدہ کرتا ہوں اور کچھ؟"

اس نے خوش ہو کر دانت نکال دیئے۔ "اب جب کہ ہم دونوں ایک بار پھر دوست ہو گئے ہیں میرا خیال ہے کہ باقی باتوں کو اگلی ملاقات کے لیے ملتوی کر دینا چاہیئے۔ تم بھی تھکے ہوئے ہو اور مجھے بھی کچھ ضروری معاملات طے کرنے ہیں۔ تم فی الحال میری مہمان نوازی کا لطف اٹھاؤ۔ ہم شام کو زیادہ خوشگوار اور پُرلطف ماحول میں دوستانہ بات چیت کریں گے۔"

میں نے کہا: "دوستانہ یا کاروباری؟"

وہ ہنس پڑا۔ "کاروباری مگر دوستانہ انداز میں۔ اب تو مطمئن ہو گئے نا؟"

میں نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔ اس نے دروازے پر تعینات مسلح شخص کو اشارہ کیا اور وہ ایک دم متحرک ہو گیا۔ اب تک وہ شخص ایک بے جان مجسّمے کی مانند بے حس و حرکت کھڑا ہوا تھا مگر اس کی عقابی نگاہیں ایک بار بھی مجھ پر سے نہیں ہٹی تھیں۔ وہ مؤدبانہ انداز میں آگے بڑھا۔ رانا میرے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر دروازے کی طرف بڑھا اور ہم دونوں اُس دروازے کی جانب بڑھے جس میں سے رانا ہال کمرے میں داخل ہوا تھا۔

"صاحب کو مہمانوں والے خالی کمرے میں لے جاؤ۔" یہ کہہ کر رانا نے خود آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا اور ایک بار پھر نہایت گرمجوشی سے میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں دباتے ہوئے کہا: "اچھا دوست۔ اب شام کو ملاقات ہو گی۔ اُس وقت تک کے لیے خدا حافظ۔"

میں دروازے سے باہر نکلا تو مسلح محافظ تیزی سے قدم بڑھا کر مجھ سے آگے نکل گیا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا برآمدے سے گزر کر ایک اور تنگ گیلری میں پہنچا جہاں بالکل سامنے والا دروازہ کھول کر وہ مؤدب کھڑا ہو گیا تھا۔ میں جب کمرے میں داخل ہوا تو خنکی اور خوشبو نے میرا خیر مقدم کیا۔ کمرہ انتہائی نفیس اور شاندار انداز میں سجا ہوا تھا اور بے حد آرام دہ، وسیع اور پُرتکلف تھا۔ میں ابھی کمرے کا جائزہ لینے میں ہی مصروف تھا کہ اپنے عقب میں دروازہ بند ہونے کی آواز سُنی۔ مُڑ کر دیکھا تو وہ دروازہ بند کر کے رخصت ہو چکا تھا۔ میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ وہ مقفّل نہیں تھا۔ دراصل میں یہ اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ اب میری حیثیت قیدی کی تھی یا مہمان کی؟ مجھے یہ جان کر اطمینان ہوا کہ میرے میزبان نے مجھے مقفّل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ میری حیثیت فی الحال ایک مہمان جیسی ہی تھی۔ اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے بیڈ کا رُخ کیا اور انتہائی آرام دہ بیڈ پر لیٹتے ہی میری آنکھیں بند ہو گئیں۔ اس قدر مطمئن، آسودہ اور گہری نیند مجھے ایک طویل عرصے بعد نصیب ہوئی تھی۔

میں نیند سے بیدار ہوا تو کمرے میں تاریکی پھیل گئی تھی۔ میں بہت دیر تک سوتا رہا تھا اور اس دوران میں

کسی نے مجھے جگانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ منہ ہاتھ دھو کر میں بالکل تازہ دم ہو گیا تھا۔ ابھی میں کمرے سے باہر نکلنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے کہا "کون ہے۔ اندر آجاؤ۔"

دروازہ کھلا اور ایک قبول صورت لڑکی اندر داخل ہوئی۔

"سلام صاحب" اس نے مہذب انداز میں مجھے مخاطب کیا: "کسی چیز کی ضرورت ہو تو حکم کیجئے؟"

وہ سادہ سا لباس پہنے ہوئے تھی مگر خاصی دلکش سراپا کی مالک تھی۔ رانا کے بارے میں مجھے پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا کہ وہ خوش ذوق اور حسن پرست انسان تھا اور اپنے آس پاس خوبصورت چہروں کا جمگھٹا پسند کرتا تھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میرا نام گوری ہے صاحب۔" وہ شائستگی سے بولی۔

"مگر تمہارا رنگ تو گورا نہیں ہے۔" میں نے شرارت آمیز لہجے میں کہا۔ "تمہارا نام تو سانولی ہونا چاہیے تھا۔"

وہ شرما گئی اور سر جھکا کر بولی: "میرا نام تو میرے ماں باپ نے رکھا ہے صاحب۔ میں کیا کہہ سکتی ہوں۔"

"تم اسی جگہ رہتی ہو یا کبھی رانا صاحب کی حویلی میں بھی جاتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"حویلی میں تو کبھی نہیں گئی صاحب۔" وہ نرمی سے بولی: "پر حویلی کے ملازم یہاں آتے رہتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے گوری۔" میں نے کہا۔ "میرے لیے چائے لا سکتی ہو؟"

"کیوں نہیں صاحب۔" وہ بے ساختہ ہنس پڑی: "آپ جو بھی کہیں گے آجائے گا۔"

"تو پھر مجھے چائے لا دو۔"

وہ سر جھکا کر رخصت ہوئی اور میں نے بڑی تیزی سے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ اب میرا طریقۂ کار کیا ہونا چاہیے۔ یہ تو طے تھا کہ رانا مجھ سے پوری طرح مرعوب ہو چکا تھا اور ذہنی طور پر مجھے اس پر برتری حاصل ہو گئی تھی۔ وہ مجھے ٹونی تسلیم کر چکا تھا اور اس کو میرے لیوست ہونے کا ذرا سا بھی شک نہیں تھا گویا میں بڑی آسانی سے اس کے چنگل سے آزادی حاصل کر سکتا تھا۔ بشرطیکہ میری بدنصیبی سے خود اصلی ٹونی وہاں نہ آجائے۔ گویا میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ جتنی جلد ممکن ہو مجھے یہاں سے رخصت ہو جانا چاہیے تھا۔ رانا کے بارے میں جو کچھ مجھے جاننا چاہیے تھا وہ میں پہلے ہی جان چکا تھا۔ روزی اور شوکت کی زندگی کے ڈھکے چھپے پہلو رانا کی زبانی مجھ پر منکشف ہو چکے تھے۔ اب میرے لیے بہتر یہی تھا کہ میں رانا کے اعتماد اور بھروسے پر پورا اتروں اور وہ ٹونی سمجھ کر مجھ سے جو بات چیت کرنا چاہتا تھا اس سلسلے میں اسے مطمئن کر دوں۔ مگر سوال یہ تھا کہ کیا میں اس کی آنکھوں میں اتنی آسانی کے ساتھ دھول جھونکنے میں کامیابی حاصل کر سکتا تھا؟ وہ اس قدر سادہ لوح اور سیدھا سادا شخص نہیں تھا۔ جسے اتنی آسانی کے ساتھ بیوقوف بنایا جا سکتا۔ یہ قدرت کی مہربانی تھی کہ ابھی تک حالات میرے حق میں انتہائی سازگار ثابت ہوئے تھے۔ ہر مرحلے پر خود بخود واقعات کا رخ اس طرح بدلا تھا کہ مجھے کچھ کہنے یا کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی تھی۔ اب تک قدرت میرے اوپر مکمل طور پر مہربان رہی تھی مگر آئندہ واقعات کیا رخ اختیار کریں گے؟ اس بارے میں مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی اور گوری ایک سنہری ٹرالی میں چائے اور کھانے کا سامان لے کر اندر داخل ہوئی۔ میں نے صرف ایک پیالی چائے پی اور گوری کو بھی چائے پینے کی دعوت دی جو اس نے بڑی ملائمت، ادب اور شکریے کے ساتھ لوٹا دی۔ کہنے لگی۔ "ہمیں مہمانوں کے ساتھ کھانے پینے کی اجازت نہیں ہے صاحب۔"

میں اسے باتوں میں لگا کر اس سے رانا کے اس ٹھکانے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی فکر میں تھا۔ "سنو گوری۔ تم کو اس جگہ رہتے ہوئے کتنا عرصہ ہو چکا ہے؟"

"تین سال ہو گئے ہیں صاحب۔" اس کے بولنے کا انداز بہت دلکش اور انوکھا تھا۔ وہ الفاظ کو توڑ توڑ کر اور جھٹکا دے کر بولنے کی عادی تھی۔

"کیا یہ کوئی تفریح گاہ ہے جہاں رانا صاحب شکار کھیلنے کے لیے آتے ہیں؟"

"ارے نہیں صاحب۔ شکار وکار یہاں نہیں ہوتا۔ رانا صاحب یہاں آرام کرنے کے لیے آتے ہیں یا پھر اُن کے مہمانوں کے دل بہلانے کے لیے انھیں یہاں لایا جاتا ہے۔"

"مگر راستے میں ایک جگہ میں نے لمبی لمبی سی عمارتیں بھی دیکھی ہیں۔ کیا وہاں رانا صاحب اپنے محافظوں کو رکھتے ہیں؟"

وہ ایک دم خوفزدہ ہو گئی۔ "ہم اور کچھ نہیں جانتے ہیں صاحب۔ ہم تو نوکر ہیں۔ جو کوئی آپ جیسا مہمان یہاں آتا ہے بس اس کی خدمت کرتے ہیں۔ آپ کچھ اور لیں گے صاحب؟"

میں سمجھ گیا کہ وہ یا تو کچھ اور جانتی نہیں ہے یا پھر بتانا نہیں چاہتی۔ "نہیں گوری۔ اور کچھ نہیں چاہیے۔"

میں کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ کھڑکی بند تھی مگر اس کے شیشوں میں سے مجھے باہر باغیچے کا خوشنما منظر صاف طور پر نظر آ رہا تھا۔ باغ کے درمیان میں لان اور ٹینس کورٹ بھی تھے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کھڑکی کے سامنے احتیاطی تدابیر کے طور پر لوہے کی سلاخیں یا آہنی جنگلہ نہیں تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ یا تو ان کمروں میں رانا کے بھروسے کے دوستوں کو مہمان رکھا جاتا ہے یا پھر اُن کی نگرانی کے لیے کوئی دوسرا بندوبست کیا گیا ہے۔ گوری چائے کی ٹرالی لے کر کمرے سے رخصت ہو چکی تھی مگر میں کھڑکی میں کھڑا باہر دیکھتا رہا۔ کمرے میں ہلکا سا اندھیرا تھا مگر باہر ابھی تک روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ گوری نے بھی کمرے کی روشنیاں جلانا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ یا شاید بے دھیانی میں اس نے اس طرف توجہ نہیں دی تھی۔ میرے دیکھتے ہوئے باغ کی ایک سمت سے ایک عورت نمودار ہوئی اور ٹینس کورٹ کی جانب بڑھی۔ وہ ایک کشیدہ قامت اور متناسب جسم کی لڑکی تھی۔ فاصلے کے باعث میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اور نہ ہی اس کی عمر کے متعلق کوئی اندازہ قائم کر سکتا تھا۔ مگر جب وہ کچھ اور آگے بڑھی تو میں نے واضح طور پر اس کا چہرہ دیکھا اور چونک پڑا۔ میری نگاہوں کے سامنے سفید نیکر اور قمیض میں ملبوس میگی موجود تھی۔ اس کی حشر سامانیوں سے میں بخوبی واقف تھا۔ وہ ایک سمارٹ اور خوبصورت عورت تھی اور صنفِ مخالف کو رجھانے کے سبھی گروں سے واقف تھی۔ اس کے ساتھ میری پہلی ملاقات قطعی مختلف ماحول میں ہوئی تھی جب میں ایک کاروباری معاہدے پر دستخط کرنے کے سلسلے میں دوسرے شہر میں گیا تھا اور وہاں اغوا کر کے میڈم کے ٹھکانے پر پہنچا دیا گیا تھا۔ دراصل میری تمام بدنصیبیوں کا آغاز ہی اُس شہر سے ہوا تھا۔ میں وہاں جا کر پروگرام کے مطابق اپنے پارٹنر اور دوست شوکت کا انتظار کرتا رہا تھا مگر وہ نہیں آیا تھا۔ وہاں سے واپسی پر میں اپنے گھر پہنچا تو وہاں میرا ہمشکل ٹونی میری جگہ لے چکا تھا اور طے شدہ پروگرام کے مطابق شوکت اس کے حق میں گواہی دینے کے لیے میرے گھر میں موجود تھا۔ وہ میری زندگی کا سب سے منحوس، تاریک اور یادگار دن تھا۔ اسی روز میں اپنے مکان، اپنے کاروبار، اپنی جائیداد، اپنی بیوی یہاں تک کہ اپنی شناخت تک سے محروم کر دیا گیا تھا لیکن اس سے پہلے مجھے میڈم کے کارندے پُراسرار انداز میں اغوا کر کے لے گئے تھے۔ دراصل میڈم کو مجھ پر ٹونی کا گمان ہوا تھا اور میرے یقین دلانے کے باوجود وہ یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھی کہ میں ٹونی نہیں ہوں۔ بطور ٹونی میڈم نے مجھے اپنا شریک کار بنانے کے لیے دلکش پیشکش بھی کی تھی جو میں نے ٹھکرا دی تھی۔ میڈم کے ٹھکانے پر ہی میری ملاقات میگی سے ہوئی تھی جو میڈم کی آلۂ کار تھی اور آفت کی پرکالہ تھی۔ وہی میگی اس وقت رانا کے مہمان خانے میں میری نگاہوں

کے سامنے تھی۔ میں حیران کھڑا اسے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس کا رانا سے کیا تعلق ہے اور وہ رانا کی پناہ گاہ میں کیا کر رہی تھی؟

میرے دیکھتے ہی دیکھتے ایک اور شخص جو سفید نیکر اور سفید قمیص میں ملبوس تھا وہاں آگیا اور اُن دونوں کے درمیان کھیل کا آغاز ہوگیا۔ یہ جاننا کچھ مشکل نہ تھا کہ میگی کی طرح وہ شخص بھی غیر ملکی تھا۔ اس کا رنگ سفید اور بال سنہرے تھے ـــــ وہ درمیانہ عمر کا ایک صحت منداور سمارٹ آدمی تھا اور چند لمحوں میں ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ ٹینس کا بھی اچھا کھلاڑی تھا مگر جب میں نے ٹھنڈے دل سے غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ رانا جیسے جرائم پسند اور شوقین مزاج آوارہ دولت مند کے ٹھکانے پر میگی کی موجودگی حیرت انگیز اور خلافِ توقع نہیں تھی۔ میگی کے پاس حسن، جوانی، ذہانت اور صلاحیت تھی تو دوسری طرف رانا کے پاس دولت، اثر و رسوخ اور جرائم کا سرمایہ تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں ہی ایک مشترکہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور زندگی کے کسی مرحلے میں ان دونوں کا یکجا ہو جانا کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔

دروازے پر ہونے والی دستک نے ایک بار پھر مجھے چونکا دیا۔ اس بار ایک مسلح اور تنومند شخص رانا کا پیغام لے کر آیا تھا۔ اُس نے مجھے اطلاع دی کہ رانا صاحب مجھے گول کمرے میں یاد کر رہے ہیں۔ میں نے ایک نگاہ کھڑکی سے باہر میگی اور اس کے یوروپین ساتھی پر ڈالی اور پیغام بر کے ساتھ چل پڑا۔ ہم تنگ گیلری سے نکل کر ایک کشادہ برآمدے میں پہنچ گئے جس کے آخر میں لکڑی کی خوبصورت مگر تنگ سیڑھیاں نیچے کی طرف جاتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ سیڑھیوں پہ قیمتی سُرخ پھولدار قالین بچھا ہوا تھا اور مختصر سی سیڑھیوں کے خاتمے پہ ایک ہال نما کمرہ تھا۔ یہ کمرہ انتہائی قیمتی فرنیچر سے آراستہ تھا۔ یہاں ہر چیز سُرخ رنگ کی تھی۔ دیواروں پہ قدِ آدم تصاویر اور پینٹنگز لگی ہوئی تھیں جو سب کی سب عُریاں اور نیم عُریاں تھیں۔ کمرے میں مدھم سی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور ہلکی ہلکی مغربی موسیقی کی آواز پھیلی ہوئی تھی۔ میں اپنے راہبر کے پیچھے اس کمرے سے بھی گزر گیا اور ہم دوبارہ ایک راہداری میں داخل ہوگئے۔ یہ بھی خاصی کشادہ جگہ تھی اور یہاں قالین کا فرش تھا۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ انتہائی بیش قیمت اور خوبصورت مجسمے رکھے ہوئے تھے۔ سنگِ مرمر اور سنگِ سیاہ میں تراشے ہوئے یہ مجسمے بھی تقریباً عُریاں تھے اور ان میں سے بیشتر مشہور و معروف مغربی مجسموں کے نمونے پر بنائے گئے تھے۔ فضا میں ایک خاص قسم کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی جو عطر، شراب اور تمباکو کے امتزاج سے پیدا ہوتی ہے۔ ہم اس راہداری سے گزر کر ایک اُونچے دروازے کے سامنے پہنچ گئے جہاں پہنچ کر محافظ نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی اور دروازہ فوراً کھُل گیا۔ اُس نے مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا اور ادب سے تعظیم دیکر خود رخصت ہوگیا۔

میں جس وسیع و عریض آراستہ کمرے میں داخل ہوا یہ گولائی میں تو نہیں تھا مگر بیضوی تھا۔ شاید اسی لیے گول کمرے کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اس کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھے سکون اور طمانیت کا احساس ہوا۔ بیش قیمت قدیم انداز کے فرنیچر سے آراستہ یہ ہال کمرہ زیبائش اور سجاوٹ کا شاہکار تھا۔ یہاں قالین، پردے، فرنیچر بھی کچھ آسمانی رنگ کا تھا۔ کمرے میں پُرانی وضع کے قیمتی فانوس لٹکے ہوئے تھے جن سے ہلکی نیلی روشنی چھن چھن کر نکل رہی تھی جس کی وجہ سے ہال میں ایک خوابیدہ رومانی ماحول پیدا ہوگیا تھا۔ یہ کمرہ بہت وسیع و عریض تھا مگر فرنیچر کی سجاوٹ کے ذریعے اسے مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ بظاہر کمرے میں کوئی شخص موجود نہ تھا مگر میرے داخل ہوتے ہی ایک آواز نے مجھے متوجہ کر لیا: اوہ۔ ٹونی آؤ۔ اِدھر آجاؤ۔"

میں نے آواز کی سمت میں دیکھا جہاں رانا بڑے خلوص سے ہاتھ پھیلائے کھڑا ہوا مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر دوستانہ مسکراہٹ تھی اور وہ بڑے خلوص سے میری پذیرائی کے لیے چشم براہ تھا۔ اس نے بڑے خلوص سے

آگے بڑھ کر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔

"کہو۔ اچھی طرح آرام کر لیا نا؟ میں نے تمہیں بے وقت تو تکلیف نہیں دی؟"

"ارے بالکل نہیں؟" میں نے بھی مسکرا کر اس کا ہاتھ دبایا۔ میں تو تمہارا انتظار ہی کر رہا تھا۔"

"میں نے تمہیں ادھر ہی بلا لیا۔ آؤ بیٹھو۔ کیا پیو گے؟" وہ ایک آرام دہ صوفے میں دھنس گیا اور مجھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں اس کے برابر ہی بیٹھ گیا۔

"شکریہ۔ میں ابھی ابھی چائے پی کر آیا ہوں۔"

"چائے؟" وہ ہنسا "یہ چائے کا وقت ہے؟ ارے بھئی کسی اچھی سی چیز کی بات کرو۔"

"رانا۔ ہمیں کچھ ضروری اور سیریس باتیں کرنی ہیں اس لیے کیا یہ بہتر نہیں کہ ہم کاروباری ماحول میں پہلے باتیں کریں اس کے بعد دیکھا جائے گا۔"

"بات تو تم ٹھیک کرتے ہو۔" وہ سنجیدگی سے سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"پہلے کچھ تمہاری باتیں کر لیں، پھر اپنی بات کروں گا۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

"میری باتیں؟!" میں نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔

"ٹونی۔ استاد تم بہت ہوشیار اور سمجھدار آدمی ہو مگر یہ بتاؤ کہ تم نے اتنی بڑی حماقت کیسے کر دی؟"

"کون سی حماقت؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"یوسف کو کھُلا اور آزاد چھوڑ دینے کی۔ وہ تمہارے قابو میں آچکا تھا۔ جب وہ گھر آگیا تھا تو تم نے اُسے زندہ کیوں جانے دیا۔ اگر اسی دن اس کو ختم کر دیتے تو سب کچھ ٹھیک ہو جاتا۔ وہ کوئی معمولی شخص نہیں ہے۔ بہت غیر معمولی آدمی ہے۔ اس نے ہر جگہ مصیبت اور تباہی مچا دی ہے۔ وہ خود تمہارے لیے بھی ہر دم خطرے کی گھنٹی بن کر زندہ ہے۔ جانتے ہو میری حویلی میں اس نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔ بالکل برباد کر دیا ہر چیز کو۔"

"اچھا؟!" میں نے بظاہر متفکر ہو کر کہا۔ "واقعی مجھ سے غلطی ہوگئی۔ میں اس کو اتنا چالاک اور خطرناک نہیں سمجھتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ گھر سے جاتے ہی یا تو وہ پولیس کے ہاتھ لگ جائے گا یا میرے دشمنوں کے قابو میں آجائے گا۔ بس میرا اندازہ غلط نکل گیا۔" میں نے رانا کو وہ بات بتا دی جو میری دانست میں ٹونی نے میرے بارے میں سوچی ہوگی۔

"کبھی کبھی اندازے کس قدر غلط ثابت ہوتے ہیں۔" رانا نے ہمدردانہ لہجے میں مجھے تسلی دی۔ "چلو۔ اب تو جو ہونا تھا ہو چکا۔ مگر میری مانو تو اُسے کمزور اور بے بس مت سمجھو۔ جتنی جلد ہو سکے اب اس کو ٹھکانے لگانے کا بندوبست کرو۔ وہ ہم سب کے لیے مصیبت بن سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "اب میں اس کا کوئی مناسب بندوبست کروں گا۔ یہ بات تو ختم ہوئی۔ اب تم کہو۔ کون سی ایسی ضروری بات ہے جس کے لیے تم اس قدر پریشان ہو؟"

رانا صوفے پر سے اُٹھ کر کھڑا ہوگیا مگر پھر دوبارہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ کسی الجھن میں گرفتار نظر آرہا تھا۔

"سوچتا ہوں تمہیں اپنا رازدار بناؤں یا نہ بناؤں؟ میں جو بات تم سے کہنے جا رہا ہوں۔ یہ بہت زیادہ اہم ہے اور میں تم سے ایک بار پھر یہ وعدہ بھی لینا چاہتا ہوں کہ اگر تم نے میری بات سے اتفاق نہیں کیا پھر اسے راز ہی رہنے دو گے۔ بلکہ اسے ایک دم بھول جاؤ گے۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے" میں نے فوراً حامی بھر لی۔ "تم خواہ مخواہ میرا اشتیاق بڑھا رہے ہو۔ آخر بتاتے

کیوں نہیں کر قصہ کیا ہے؟"

"تو سنو" اس نے اپنی آواز میں قدرے دھیما پن پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "ٹونی۔ یہ تو تم جانتے ہو ناکہ ہم سب مجرم ہیں۔ قانون اور سوسائٹی کے مجرم انسانیت اور اخلاق کے مجرم۔ ہم وہ تمام دھندے کرتے ہیں جن کی سزا بہت سنگین ہے۔ سمگلنگ، ڈاکے، منشیات کا دھندہ، کالا دھندہ۔ یہاں تک کہ کتنے ہی انسانوں کے خون سے ہاتھ بھی رنگے ہیں ہم نے۔ ہمارے نزدیک سب سے بڑا اصول دولت اور سب سے بڑا قانون طاقت اور رسوخ ہے۔ یہ تو تم مانتے ہو نا؟"

"ہاں ہاں، بات تو تم ٹھیک کہتے ہو۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"ٹونی۔ ہم نے بہت ہاتھ پیر پھیلائے ہیں۔ ہمارے پاس دولت اور رسوخ کی بھی کمی نہیں ہے۔ مگر پھر بھی یہ حقیقت ہے کہ ہم بہت چھوٹے پیمانے پر کام کرتے ہیں۔"

"چھوٹے پیمانے پر؟" میں نے حیران ہو کر کہا۔ "میں تمہارے دھندے سے واقف ہوں۔ اسے تم چھوٹے پیمانے کا دھندہ کہتے ہو؟ اور میرے بارے میں بھی تم جانتے ہو۔ میں نے بھی کافی ہاتھ پیر پھیلا رکھے ہیں۔"

"وہ تو میں جانتا ہوں مگر ابھی ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ ہماری حیثیت سمندر میں مچھلی جیسی ہے۔ ابھی ہم مگرمچھ نہیں بن سکے ہیں۔"

"تو پھر؟" میں نے قصہ مختصر کرنے کی غرض سے کہا۔ "لمبی چوڑی تمہید کی ضرورت نہیں ہے مطلب کی بات کرو۔"

اس نے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں اور پھر سرگوشی کے انداز میں کہنے لگا۔ "ٹونی تم جانتے ہو کہ میری کارروائی کا مرکز سرحدی علاقے ہیں۔ میری طرح اس علاقے میں اور لوگ بھی کاروبار میں مصروف ہیں۔ سمگلنگ ان کا بنیادی پیشہ ہے۔ جرائم بھی ساتھ چلتے ہیں۔ تمہارے کارندے بھی اس علاقے میں مصروف کار رہتے ہیں اور میں جانتا ہوں کہ تم بھی سمگلنگ میں حصہ لیتے ہو۔ اس علاقے میں شراب، سونا، گھی، گندم اور ہیروئن کی بہت بڑے پیمانے پر سمگلنگ ہوتی ہے اور ہم اتنے بہت سے لوگ اسی کام میں لگے ہوئے ہیں پھر بھی سب کے حصے میں کچھ نہ کچھ آ ہی جاتا ہے۔"

"ہاں۔ یہ تو ہے۔" میں نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

"مگر یہ سب کچھ اس کام کے مقابلے میں ماند ہے جو میں نے سوچا ہے۔" وہ خاموش ہو کر میرا چہرہ دیکھنے لگا۔

"بولو بولو۔ چپ کیوں ہو گئے!"

"ٹونی۔ یہ سب کام منافع بخش ضرور ہیں مگر ان میں اتنا پیسہ نہیں ہے۔ اصل مال تو اسلحہ کی سمگلنگ میں ہے۔"

"اسلحہ کی سمگلنگ؟!" میں نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔

"ہاں۔" وہ سر ہلا کر بولا۔ "یہ بہت وسیع اور فائدہ مند کاروبار ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس میں بڑی بڑی حکومتوں میں رسوخ بھی ہو جاتا ہے۔"

"مگر یار" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "یہ تو اپنے ملک کے لیے بھی نقصان دہ ہو سکتا ہے۔ یہ اپنے ملک سے غداری نہیں ہے؟"

"یہ سب فضول باتیں ہیں۔ یہ غداری نہیں کاروبار ہے۔ ہم جو کام پہلے کر رہے ہیں وہ بھی تو ملک کے لیے نقصان دہ ہے۔"

"مگر رانا۔ یہ بہت خطرناک اور جوکھوں کا کام ہے۔"

"اس کی تم فکر نہ کرو۔" وہ مسکرایا۔ "میں نے سارا بندوبست کر رکھا ہے۔ غیر ملکیوں کے ساتھ میرا معاہدہ ہونے والا

ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو؟ یہ سیرگاہ جو تم دیکھ رہے ہو یہ محض شکار کھیلنے اور تفریح کرنے کے لیے تو نہیں ہے۔ یہاں میں غیر ملکیوں کو مہمان رکھتا ہوں بلکہ اب تم سے کیا چھپانا میں پہلے ہی اسلحہ کا دھندہ کر رہا ہوں۔ اُدھر بیرکس میں اسلحہ کا بہت بڑا ذخیرہ رہتا ہے۔ اِدھر کا مال اُدھر اور اُدھر کا مال اِدھر کرتا رہتا ہوں۔ کوئی حکومت مناسب معاوضہ دے تو کرائے کے فوجی بھی دہشت گردی یا حملے کے لیے فراہم کر دیتا ہوں۔ مختلف ملکوں میں مختلف تنظیمیں اور ممالک تخریب کاری پھیلانا چاہتے ہیں میں بہت چھوٹے پیمانے پر ان کو کرائے کے فوجی اور اسلحہ فراہم کرتا ہوں۔ مگر تم جیسے دوستوں کی مدد سے ہم یہ کام بہت زیادہ بڑھا بھی سکتے ہیں۔"

"اور کون دوست اس میں شامل ہیں؟" میں نے محتاط ہو کر پوچھا۔

وہ مسکرایا۔ "غیر ملکیوں کے علاوہ میڈم زیڈ بھی میرے ساتھ شامل ہونے کو تیار ہے۔ بعض اور چھوٹے گروہ بھی کمر باندھے ہوئے تیار بیٹھے ہیں۔ بس ہمارے ایک اشارے کی دیر ہے!"

میرا ذہن سنسنانے لگا۔ میرے ملک، میرے پیارے وطن کے خلاف گھناؤنے اور مطلب پسند لوگ سازشوں اور ریشہ دوانیوں میں مصروف تھے۔ وہ اس کی حفاظت اور سلامتی کی طرف سے بالکل بے پرواہ تھے۔ مجھے رانا پر غصہ آنے لگا۔ جی چاہا اس کا گلا اپنے ہاتھوں سے گھونٹ کر اسے ہلاک کر دوں۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ زندہ رہنے کے قابل نہیں تھا۔ مگر وہ اکیلا نہیں تھا۔ اسے دوسرے ملکوں اور بے شمار جرائم پیشہ لوگوں کی امداد اور تعاون حاصل تھا۔

"تم تو جانتے ہو کہ بہت سے بارسوخ لوگ زمینداری کی آڑ میں اس علاقے میں اس دھندے کے بارے میں سوچ رہے ہیں مگر ہمیں ان سے پہلے یہ کام شروع کر دینا چاہیے۔ چند مہینوں میں ہی وارے نیارے ہو جائیں گے۔" وہ مسکرایا اور مصافحے کے لیے میری جانب ہاتھ بڑھایا مگر میں خاموش اور ساکت کھڑا بے یقینی سے اس کا چہرہ تک رہا تھا۔ "ہمارے ساتھ بہت بڑے بڑے اور مالدار لوگ بھی شامل ہیں۔ لو۔ ایک تو وہ سامنے ہے۔" اس نے کہا اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو کھلے ہوئے دروازے میں سے میڈم اندر داخل ہو رہی تھی۔ اس نے ایک خوش وضع ساڑھی انتہائی ہیجان انگیز انداز میں باندھ رکھی تھی اور ہر قدم پر قیامت اُٹھاتی ہوئی ہماری جانب بڑھ رہی تھی۔ میں اس کی حشر سامانیاں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ وہ ایک سنگدل اور ظالم عورت تھی جو اپنے مقصد کے حصول کے لیے سب کچھ کر گزرنے پر قادر تھی۔ جرائم کی دنیا میں اس کا مقام خاصا بلند تھا۔ وہ لگ بھگ تیس بتیس سال کی ایک کشیدہ قامت، متناسب اعضاء اور دلکش عورت تھی اور اگر وہ جرائم میں مہارت حاصل نہ کرتی تو اپنے حسن و شباب کی رعنائیوں اور کافر اداؤں کے ذریعے بھی بہت کچھ حاصل کر سکتی تھی۔ وہ اِٹھلاتی اور مسکراتی ہوئی ہماری جانب بڑھی آ رہی تھی اور اس کے عقب میں ایک اور عجیب الخلقت شے بھی متحرک تھی۔ غور سے دوبارہ دیکھنے پر میں اسے بھی پہچان گیا۔ وہ چاشی تھا جو چاروں ہاتھوں پیروں کے بل چوپایوں کی طرح چلتا ہوا میڈم کے عقب میں ایک پالتو کتے کی مانند چل رہا تھا۔ اس کی کمر پر ایک نقرئی ٹرے رکھی ہوئی تھی جس میں شراب کی ایک بوتل اور دو گلاس رکھے ہوئے تھے۔ میڈم اس شخص کو چلتی پھرتی میز کے طور پر استعمال کرتی تھی اور وہ ایسا انسان تھا جو رفتہ رفتہ انسانیت کے تمام جذبوں اور عادتوں سے محروم ہو چکا تھا اور فطرتاً بھی ایک مکمل خونخوار جانور بن چکا تھا۔

میڈم نے مجھے دیکھ کر بڑے دلنواز انداز میں دونوں بازو آگے پھیلائے اور لچکتی ہوئی میری جانب بڑھی۔ "اوہ ٹونی۔ ڈارلنگ۔ کیا بتاؤں تم سے ملنے کے لیے میں کتنی تڑپ رہی تھی۔" آگے بڑھ کر اس نے میرے دونوں ہاتھ اپنے نرم گرم اور ملائم ہاتھوں میں تھام کر دبائے اور معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ "شکر ہے کہ تم بھی مل گئے۔" پھر وہ رانا سے مخاطب ہوئی۔ "رانا صاحب، یہ آپ کو کہاں سے مل گئے؟"

جواب میں رانا نے زوردار قہقہہ لگایا۔ "دل کو دل سے راہ ہوتی ہے میڈم۔" وہ ایک آنکھ میچ کر مسکرایا۔ میڈم

میرے برابر ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کے جسم کی حرارت اور لباس کی خوشبو کسی کو بھی دیوانہ بنانے کے لیے کافی تھی۔

"اور سناؤ ٹونی ڈارلنگ۔" اس نے چاشی کی پشت پر رکھی ہوئی ٹرے میں سے اپنا آدھا بھرا ہوا گلاس اُٹھا کر ایک گھونٹ بھرا "آج کی شام تو تمہیں میرے نام لکھنی پڑے گی۔"

"آج کی شام اور اس کے بعد بھی بے شمار شامیں۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بس تو پھر ہو گئی بات پکی۔" اس نے میرے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "بولو۔ تم میرا برانڈ پیئو گے؟"

"نہیں۔ شکریہ۔" میں نے جلدی سے کہا۔

یکایک فضا میں ایک بھن بھناہٹ کی آواز گونجی جو رفتہ رفتہ بڑھنی شروع ہو گئی۔ یقیناً یہ کسی ہیلی کاپٹر کی آواز تھی۔ رانا نے اس طرف کان لگا کر سُنا اور پھر خوشی سے مسکرانے لگا۔ میڈم نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"مبارک ہو میڈم۔ ٹونی ہمارے لیے بہت بھاگوان ثابت ہو رہا ہے ہمارے دوست آ گئے ہیں۔"

"دوست؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"سرحد پار کا پولیس چیف اور ایک منسٹر۔ بس سمجھو کام شروع ہو گیا۔" وہ خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ اس کی باچھیں کھِلی جا رہی تھیں۔

میں خاموشی اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا اور بڑی مشکل سے اپنی نفرت اور غصے پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔

میڈم بھی بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ "مال تو تیار ہے نا؟" اس نے رانا سے پوچھا۔

اسلحہ، گولہ بارود، ہیروئن کا سٹاک سب کچھ پیک کر کے رکھا ہوا ہے۔ بس اب تو مال ہی مال ہے۔"

باہر ہیلی کاپٹر کی آواز بہت زیادہ بلند ہو گئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ زمین پر اُتر رہا ہے۔ پھر باہر سے اچانک فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں اور ہم سب چونک کر ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگے۔

سب سے پہلے رانا نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور نہایت پھُرتی کے ساتھ اپنے صوفے سے اُٹھ کر تیزی سے باہر کی جانب بڑھا۔ میڈم نے اپنے ہاتھ میں تھاما ہوا مشروب کا گلاس دوبارہ چاشی کی کمر پر رکھی ہوئی میز پر رکھ دیا اور سوالیہ انداز میں میری جانب دیکھنے لگی۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ مجھے اس تمام قصے کے بارے میں الف ب تک کا علم نہیں تھا۔ وہ کون لوگ تھے جو رانا کے مہمان کے طور پر آنے والے تھے؟ کون سے ملک کا پولیس چیف اور منسٹر آج اس علاقے میں رانا کا مہمان تھا۔ ہیلی کاپٹر میں کون سوار تھا اور فائرنگ کا مقصد کیا تھا؟ ان سوالات کے بارے میں مجھے کوئی علم نہیں تھا۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ رانا کے اس دُور دراز مہمان خانے میں میڈم کیوں اور کس طرح آ گئی تھی اور میگی اپنے غیر ملکی سفید فام دوستوں کے ساتھ وہاں کیا کر رہی تھی؟

میڈم بڑے دلفریب انداز میں مسکرائی اور مجھے مخاطب ہو کر بولی۔ "معلوم ہوتا ہے کچھ گھپلا ہو گیا ہے؟"

"ہمیں چل کر دیکھنا چاہیے۔" میں نے صوفے پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"ارے نہیں۔ جو کچھ ہے خود بخود ہمیں پتہ چل جائے گا۔ ابھی رانا صاحب ساری رپورٹ لے کر آتے ہوں گے۔"

مگر رانا صاحب کی بجائے ان کا ایک کارندہ ہال میں داخل ہوا اور مودب انداز میں اس نے ہمیں اطلاع دی کہ رانا صاحب ہمیں باہر یاد فرما رہے ہیں۔ میڈم نے ایک ادا کے ساتھ اپنی ساڑھی کا پلّو سنبھالا اور اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ میں بھی اس کے ہمراہ چل پڑا۔ چاشی اپنے چاروں ہاتھوں پیروں کے بَل ہمارے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ یہ متحرک انسانی میز ہر دم میڈم کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ اگرچہ یہ ایک انتہائی غیر انسانی حرکت تھی۔ لیکن میڈم اب

اس کی عادی ہو چکی تھی۔ لیکن دیکھنے والوں کے لیے یہ ایک حیرت انگیز اور عجیب و غریب نظارہ تھا کہ ایک دو پیروں پر چلنے والا انسان چوپائے کی طرح چاروں ہاتھ پیروں سے چلنے لگے اور اس کی پشت کو بطور ٹیبل استعمال کیا جائے۔ چاشی میڈم کی سنگدلی، حیوانیت اور جذبۂ انتقام کا جیتا جاگتا نمونہ تھا۔ مگر اب شاید وہ خود بھی اپنی حقیقت اور اصلیت فراموش کر چکا تھا اور رفتہ رفتہ ایک حیوان بن چکا تھا۔ اس کی حیوانیت کی داستانیں میں پہلے بھی سُن چکا تھا جو میرے لیے انتہائی تعجب خیز اور روح فرسا تھیں۔

رانا کے ملازم کی راہنمائی میں ہم چند راہداریوں سے گزر کر ایک وسیع و عریض برآمدے میں پہنچ گئے جو اُونچے اُونچے پتھروں کے گول ستونوں کے باعث بے حد پُرشکوہ اور خوبصورت نظر آتا تھا۔ اس کا فرش سنگِ مرمر کا تھا یہ عمارت کا عقبی حصہ تھا۔ ہمارے سامنے ایک بہت وسیع لان اور پھر حدِ نگاہ تک سبزہ زار اور باغات کا سلسلہ نظر آ رہا تھا۔ برآمدے میں پہنچتے ہی میری نگاہ کچھ فاصلے پر کھڑے ہوئے ایک ہیلی کاپٹر پر پڑی۔ یہ ایک سرکاری محکمے کا ہیلی کاپٹر تھا جس پر باقاعدہ اس کا نام لکھا ہوا تھا اور محکمے کے امتیازی نشانات بھی صاف طور پر دیکھے جا سکتے تھے۔ کچھ دیر بعد ہی مجھے پتہ چل گیا کہ یہ سب جعلی کارروائی تھی۔ ہیلی کاپٹر دراصل ان جرائم پیشہ لوگوں کی ملکیت تھا لیکن سرکاری محافظوں کی نگاہوں میں دُھول جھونکنے کی غرض سے اس کو ایک سرکاری محکمے سے منسوب کر دیا گیا تھا۔

ہیلی کاپٹر سے کچھ فاصلے پر میں نے چند لوگوں کو برآمدے کی جانب بڑھتے ہوئے دیکھا۔ ان میں رانا سب سے نمایاں تھا۔ اس کے ساتھ چھ دیگر افراد بھی تھے جن میں سے دو عورتیں تھیں۔ چار مردوں میں سے ایک خاصی پختہ عمر کا تھا جبکہ باقی تینوں جوان العمر تھے اور خاصے تنومند اور پھرتیلے نظر آ رہے تھے۔ عورتوں میں سے ایک پختہ عمر کی لیکن خوش شکل خاتون تھی۔ اس نے بسنتی رنگ کی ساڑھی زیبِ تن کر رکھی تھی اور خاصی شائستہ اور بارعب نظر آتی تھی جب کہ دوسری عورت عمر میں کم تھی۔ وہ ۲۴۔ ۲۵ سال کی ایک دلکش اور دلنواز عورت تھی۔ اس نے جینز اور ہلکے نیلے رنگ کی قمیص پہن رکھی تھی اور اس لباس نے اسے اور زیادہ سمارٹ اور پُرکشش بنا دیا تھا۔ ان سب کے ساتھ چلتا ہوا رانا بھی بذاتِ خود ایک نمایاں شخصیت نظر آ رہا تھا۔ "اوہ" میڈم کی زبان سے بے اختیار خوشی کی آواز بلند ہوئی: "آج تو بگ باس بھی آ گئے ہیں!"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے قدم اُٹھاتی ہوئی آگے بڑھی۔ میں اپنی جگہ خاموش اور محتاط کھڑا رہا۔ میڈم اور آنے والوں کی ملاقات خاصی پُرجوش اور دوستانہ تھی۔ میڈم نے مردوں کے ساتھ ہاتھ ملانے پر اکتفا کیا لیکن دونوں عورتوں کے ساتھ بڑے خلوص کے ساتھ بغلگیر ہوئی۔ ان کے مابین چند دوستانہ فقروں کا تبادلہ ہوا جس کے بعد وہ سب ہنستے ہوئے برآمدے کی جانب بڑھے۔

میں انجانوں کی طرح یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر پہنچ کر آنے والوں کے قدم بھی رُک گئے اور وہ متلاشی اور متجسس نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔

"سر۔ یہ ٹونی ہے۔" رانا نے آگے بڑھ کر پختہ عمر آدمی سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا "بہت توپ قسم کی چیز ہے۔ اپنا پُرانا اور بہت گہرا یار ہے اور بہت کام کی ہستی ہے۔ اس کے ہاتھ اور پیر دونوں بہت لمبے ہیں اور بہت دُور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ہمارے مقصد کے لیے یہ آئیڈیل شخص ثابت ہو سکتا ہے اور ٹونی۔ یہ پڑوسی ملک کے بہت بڑے لیڈر ہیں۔ کوئی چیز ان کے اختیار سے باہر نہیں ہے۔ راؤ صاحب سے ملو۔"

میں نے راؤ صاحب کی جانب ہاتھ بڑھایا جسے انھوں نے بڑے جوشیلے انداز میں تھام کر زور سے دبایا۔ مجھے یہ اندازہ کرنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ ایک سخت جان اور طاقتور شخص تھا اور اس کے ہاتھ کی مضبوطی اور

سنگینی ظاہر کر رہی تھی کہ وہ سخت کوش زندگی گزارنے کا عادی رہا ہے۔ راؤ صاحب نے میرا ہاتھ پوری طاقت سے دبایا اور اسے محبت بھرے انداز میں دو تین جھٹکے بھی دیئے۔ اگر کوئی کمزور شخص ہوتا تو اس گرفت کے نتیجے میں چلا اٹھتا۔ غالباً راؤ صاحب میری جسمانی قوت کا جائزہ لینا چاہتے تھے۔ اس آزمائشی مصافحے کے بعد انھوں نے پسندیدگی کے انداز میں میرا بازو تھپکا اور بولے: "آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے۔"

"میں آپ کا شکرگزار ہوں۔" میں نے دبی زبان میں کہا۔ اور اپنی گرفت میں کوئی اضافہ کیے بغیر اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ اس دوستانہ بلکہ فدویانہ رویے کو راؤ صاحب نے بہت پسند کیا اور ایک زوردار قہقہہ لگا کر بولے: "واقعی یہ بہت کام کے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔"

رانا نے کہا: "سر، ہمارے پاس آپ کو سب ایسے ہی لوگ ملیں گے۔"

پھر اس نے باقی لوگوں سے بھی مجھے متعارف کرایا۔ ان میں سے ایک راؤ صاحب کا باڈی گارڈ جیکی تھا۔ وہ ایک قدآور شخص تھا اور بہت پھرتیلا اور مستعد بھی تھا۔ باقی دو راؤ صاحب کے مصاحب تھے۔ عورتوں میں پختہ عمر کی خوش شکل خاتون کا نام مادھوری تھا۔ اس نے بلاتکلف مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا اور خاصی گرمجوشی سے دبایا۔ اس کے ہاتھ کی حرارت اور گرفت اس کی جارحانہ شخصیت کی عکاس تھی۔ مادھوری نے مسکراتی ہوئی آنکھوں سے میرا جائزہ لیا اور پھر بولی: "آپ سے مل کر بہت زیادہ خوشی ہوئی ہے۔ امید ہے اب ہم ملتے رہیں گے۔"

نوجوان خاتون کا نام مالا تھا اور وہ بے باک اور مغرب زدہ نظر آتی تھی۔ اس نے اپنے ترشے ہوئے بالوں کو جھٹک کر بڑی لگاوٹ کے ساتھ ایک نرم و گرم ہاتھ میرے ہاتھ میں دیدیا اور انگریزی میں مزاج پرسی کرنے کے بعد اس ملاقات پر مسرت کا اظہار کیا۔ پھر انگریزی میں کہنے لگی: "آپ سے پہلے کبھی ملاقات نہیں ہوئی؟"

میں نے انگریزی میں کہا: "اسے میں اپنی بدقسمتی ہی کہہ سکتا ہوں۔"

اس برجستہ فقرے پر سبھی لوگ ہنس پڑے۔ خود مالا کا چہرہ بھی ہنسی سے گلگوں ہوگیا اور وہ ہنستے ہوئے کہنے لگی: "تم بہت شریر ہو۔" گویا پہلی ہی ملاقات میں اس نے بے تکلفی اور اپنائیت کا اظہار کردیا۔

"ان کی شرارتوں سے تو ہم بھی تنگ ہیں۔" میڈم نے بھی انگریزی میں فقرہ کسا۔

مادھوری کہنے لگی: "بعض لوگ شرارت کرتے ہوئے ہی اچھے لگتے ہیں۔" اور پھر بڑی بے تکلفی سے میرے بازو پر ہاتھ رکھ کر بولی: "آپ بھی یقیناً ان لوگوں میں شامل ہیں۔"

یہ سب لوگ میرے اندازے اور قیاس کے عین مطابق تھے۔ ظاہر ہے کہ رانا اور میڈم کے ساتھیوں اور دوستوں میں اس سے مختلف قسم کے لوگوں کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔

اس تعارفی رسم کے بعد ہم سب برآمدے کی جانب چل پڑے۔ یکایک میڈم نے رک کر رانا کی طرف دیکھا اور پوچھا: "مگر وہ فائرنگ کی آواز کیسی تھی؟"

"فکر نہ کرو۔" رانا مسکرا کر بولا۔ "کچھ دیر میں سب معلوم ہو جائے گا مگر یہ بات طے ہے کہ پریشانی کی کوئی وجہ نہیں ہے۔"

ہم سب دوبارہ گول کمرے کے عشرت زدہ ماحول میں پہنچ گئے اور رانا کے اشارے پر باوردی ملازموں نے مہمانوں کے سامنے مشروبات پیش کرنے شروع کر دیئے۔ میرے سوا سبھی شراب سے شغل کرنے لگے۔

مادھوری نے حیران ہو کر مجھے دیکھا اور پوچھا: "ڈونی۔ کیا تم نہیں پیتے؟"

"ارے یہ تو مچھلی کی طرح پیتے ہیں۔" میڈم بول پڑی۔ "مگر شاید آجکل پرہیز کر رہے ہیں۔"

میں نے فوراً موقعے سے فائدہ اٹھایا اور کہا: "یہ ٹھیک کہتی ہیں۔ پچھلے دنوں مجھے ہارٹ کی تکلیف ہوگئی تھی اس لیے ڈاکٹر کے مشورے پر فی الحال سگریٹ اور شراب سے پرہیز کرتا ہوں۔"

راؤ صاحب نے کہا: "شکر ہے کہ آپ نے فی الحال کہہ کر ہم سب کو امید دلادی ہے کہ ہم بھی آپ کیساتھ ہم پیالہ ہونے کا شرف حاصل کریں گے۔"

"اور ہارٹ کی تکلیف کی وجہ سے بالکل دل چھوٹا نہ کرنا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ بھی دل والے ہیں۔" یہ فقرہ تسلی کے طور پر میڈم نے کہا تھا۔

مادھوری صوفے پر میری جانب جھکی اور نیم سرگوشی میں پوچھنے لگی: "صرف دو ہی چیزوں کا پرہیز بتایا ہے ڈاکٹر نے؟"

اس نے یہ بات اتنی سنجیدگی کے ساتھ پوچھی تھی کہ محفل میں موجود سب لوگ بے ساختہ ہنس پڑے۔

یکایک کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک باوردی مسلح شخص کمرے میں داخل ہو کر رانا کے سامنے جھک گیا۔

"ہاں ہاں۔ بولو۔ کیا بات ہے؟" رانا نے پوچھا۔

"سر آموں کے باغ میں ہمارے آدمیوں نے دو اجنبیوں کو دیکھا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ جب ہیلی کاپٹر نظر آیا تو وہ مشکوک انداز میں اُسے دیکھنے لگے۔ محافظوں نے فائر کھول دیا۔ وہ دونوں موقعے پر ہی مر گئے۔"

"مگر وہ تھے کون لوگ۔ یہاں کیسے آئے تھے اور ان کا مقصد کیا تھا؟" رانا نے سوال کیا۔

"سر اُن کے پاس سے کوئی بھی چیز برآمد نہیں ہوئی۔ وہ شکاری لباس پہنے ہوئے تھے۔ ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ اُن کی جیبوں سے کوئی ایسی شناختی چیز نہیں نکلی جس سے ان کی پہچان ہو جاتی۔ دونوں ہی جوان اور مضبوط آدمی تھے۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ شکاری ہوں گے۔ شکار کی تلاش میں اس طرف آنکلے ہوں گے جہاں تمہارے ہوشیار آدمیوں نے انھیں ٹھکانے لگا دیا۔" میڈم ایک چٹکی لے کر بولی۔

"اگر وہ شکاری تھے تو کسی کی نگاہ میں آئے بغیر ریسٹ ہاؤس تک کیسے آگئے؟ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ چھپ کر یہاں تک پہنچے ہوں گے۔ شاید وہ کسی چیز کی کھوج لگانے کے لیے آئے ہونگے؟" رانا خاصا متفکر نظر آنے لگا تھا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری مخبری ہو چکی ہے اور اب کڑی نگرانی ہو رہی ہے۔" مادھوری نے خیال ظاہر کیا۔

"یہ تو بڑی خطرناک بات ہے رانا صاحب۔" راؤ صاحب نے اپنی بارعب آواز میں کہا اور اپنی موٹی موٹی مونچھوں پر انگلیاں گھمانے لگے۔ یہ اُن کی عادت تھی۔ وہ جب بھی کسی مسئلے پر غور کرتے تھے تو اپنی مونچھوں پر بہت تیزی سے انگلیاں گھمانے لگتے تھے۔

رانا ایک دم زور سے میز پر گلاس رکھ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اطلاع دینے والے شخص کو غصہ بھری نظروں سے دیکھا اور کہا: "سنو لالو۔ کان کھول کر سُن لو اور اپنے دوسرے لوگوں کو بھی بتا دو۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے وہ کون لوگ تھے؟ کہاں سے آئے تھے؟ کس ارادے سے آئے تھے اور کیا اُن کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی اس علاقے میں آئے ہیں اور اگر آئے ہیں تو وہ کتنے ہیں اور کہاں ہیں؟ یہ سب معلومات آج رات تک مجھے مل جانی ضروری ہیں اور تم یہ جانتے ہو کہ نالائق لوگوں کے ساتھ میں ذرا بھی رعایت نہیں کرتا۔ دو انجان اور اجنبی مسلح آدمیوں کا ہمارے ریسٹ ہاؤس کے باغ تک پہنچ جانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ یہ محافظوں کی نالائقی اور کوتاہی ہے۔ اس بارے میں پوری چھان بین کرو اور مجھے مفصل رپورٹ دو۔ جو لوگ بھی اس کے ذمہ دار ہیں انھیں معاف نہیں

کیا جائے گا۔ سن لیا تم نے ؟"

لالو کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہوگئے تھے اور وہ خاصا پریشان نظر آرہا تھا۔ "ایسا ہی ہوگا جناب!" اس نے مستعدی سے جواب دیا اور فوجی انداز میں سلام کرکے رخصت ہوگیا۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر میڈم نے کہا۔ "یہ سچ ہے کہ ہمیں پوری احتیاط سے کام کرنا ہوگا اور اس بات کی کھوج لگانی ہوگی کیونکہ یہ کسی گہری سازش کا نتیجہ بھی ہوسکتا ہے۔"

"اس سے پہلے ہمارے علاقے میں کبھی ایسا واقعہ نہیں ہوا۔" رانا نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔ "بہرحال، جو بھی اصل بات ہے وہ رات تک ہمیں معلوم ہوجائے گی۔ آپ لوگ اس معمولی واقعے کو بھول جائیں اور اپنی محفل کو بدمزہ نہ کریں۔"

اس دوران میں راؤ صاحب کی نظریں ایک دوبار میری جانب اُٹھیں مگر جب ہماری نظریں چار ہوئیں تو انھوں نے اپنی نگاہیں دوسری جانب موڑ دیں۔ پھر میں نے مادھوری کو بھی ایک بار کنکھیوں سے اپنی جانب دیکھتے ہوئے پایا تھا۔ چنانچہ صورتِ حال کی وضاحت ضروری خیال کرتے ہوئے میں نے رانا کو مخاطب کیا۔ "رانا صاحب مجھے افسوس ہے کہ میں آج پہلی بار اس جگہ آیا ہوں اور آج ہی ایک عجیب واقعہ پیش آگیا۔ میرا خیال ہے کہ آپ میں سے کچھ لوگ میرے بارے میں شکوک وشبہات کا شکار ہیں ویسے بھی میں آپ سب کی محفل میں ایک نووارد اور اجنبی کی حیثیت رکھتا ہوں۔ اس لیے مناسب یہی ہے کہ آپ لوگوں کی گفتگو میں رکاوٹ نہ بنوں۔"

یہ کہہ کر میں اپنی جگہ سے اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ میرے لہجے اور الفاظ میں کوئی تلخی نہیں تھی۔ مگر میرے چہرے پر ناخوشگواری اور ناگواری کے آثار نمایاں تھے۔ سب لوگوں نے چونک کر میری جانب دیکھا اور سب سے پہلے رانا نے اُٹھ کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ "کیسی باتیں کرتے ہو ٹونی۔ تم پر ہمیں پورا بھروسہ ہے۔ تم پر اور شک؟ یہ کیسے ممکن ہے؟"

راؤ صاحب نے بھی اپنا جام میز پر رکھ دیا اور کسی قدر شرمندگی کے ساتھ مجھے یقین دلانے کی کوشش کی کہ میرا یہ تاثر غلط فہمی پر مبنی ہے۔ لیکن میں نے جان بوجھ کر ماحول کو کشیدہ رکھنے کے لیے بظاہر اپنی ناراضی کو کم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور ان سب کے اصرار کے باوجود آرام کا بہانہ کرکے گول کمرے سے چلا آیا۔ دروازے کے باہر مؤدب کھڑے ہوئے محافظ نے میری راہنمائی کرتے ہوئے مجھے میرے کمرے تک پہنچا دیا۔ اپنے کمرے کی تنہائی میں پہنچ کر میں نے صورتِ حال کا جائزہ لینے کی کوشش کی تو مجھے احساس ہوا کہ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے میں ایک ایسے گروہ میں پھنس گیا تھا جو نہ صرف جرائم پیشہ کارروائیوں میں پیش پیش تھا بلکہ اس کی سرگرمیاں ملکی اور قومی مفاد کے بھی خلاف تھیں۔ رانا اور میڈم کو میں مجرم ضرور سمجھتا تھا مگر میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ وہ اسلحہ کی اسمگلنگ میں بھی ملوث ہوں گے اور غیر ملکیوں کے ہاتھوں اپنے ملک کو نقصان پہنچانے کی جسارت کریں گے۔ لیکن یہ ایک تلخ حقیقت تھی۔ ان لوگوں کی سرگرمیاں اب مجھ سے پوشیدہ نہیں رہی تھیں۔ اگرچہ میں تفصیل سے واقف نہیں تھا مگر یہ حقیقت تھی کہ میں ان کی شرمناک کارروائیوں کا اندازہ لگانے کے قابل ہوگیا تھا اور میرا ذہن ان بدبختوں کی حرکتوں کے نتائج اور مضمرات کا بخوبی اندازہ لگا سکتا تھا۔ وہ لوگ ٹونی سمجھ کر مجھے اپنی سرگرمیوں میں شامل کرنے پر آمادہ کر رہے تھے۔ اگر میری جگہ اصلی ٹونی ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ وہ یہ سنہری موقع ہاتھ سے گنوانے کی حماقت کبھی نہ کرتا۔ اس کا مطمحِ نظر اور مقصدِ زندگی بھی محض دولت اور اختیار کا حصول ہی تھا۔ اپنے ان مقاصد کے حصول کی راہ میں وہ کسی قسم کی رکاوٹ پسند نہیں کرتا اور ظاہر ہے کہ دل وجان سے ان کا معاون اور شریکِ کار بننے کے لیے آمادہ ہوجاتا۔ میڈم، رانا اور ٹونی کے گھناؤنے چہرے اب میرے سامنے بے نقاب ہوچکے تھے میرے

دل میں ان لوگوں کے لیے نفرت اور دشمنی کے سوا کوئی اور جذبہ نہیں تھا اور ظاہر ہے کہ ایک محبِ وطن پاکستانی کی حیثیت سے میرا یہی ردِ عمل ہونا چاہیے تھا۔ ابھی تک مجھے وثوق سے ساتھ یہ پتہ نہیں چلا تھا کہ یہ لوگ محض اسلحہ کی اسمگلنگ ہی کرتے ہیں یا تخریب کاری اور دہشت گردی کی سرگرمیوں میں بھی ملوث ہیں۔ ممکن ہے کہ میرے ساتھ گہرے روابط نہ ہونے کی وجہ سے انھوں نے اپنے بارے میں مجھے تمام تفصیل سے آگاہ کرنا ضروری نہ سمجھا ہو اور وہ تخریب پسندوں کو بھی کسی غیر ملک کے اشارے پر اسلحہ فراہم کرنے میں مصروف ہوں۔ ان لوگوں کی خودغرضی اور لالچ پر ماتم کے سوا اور کیا کیا جا سکتا تھا۔

میں اسی ادھیڑبن میں تھا کہ یکایک دروازے پر دستک کی آواز آئی۔ میں نے بے دلی سے "اندر آجاؤ" کہا مگر جب دروازہ کھلا تو میں بستر سے اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اپنی نگاہوں کے سامنے مادھوری کو موجود دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ گیا۔ وہ مسکراتے ہوئے میری جانب بڑھی۔

"مسٹر ٹونی" اس نے پیار بھرے انداز میں مجھے مخاطب کیا۔ "کیا آپ ہم لوگوں سے ناراض ہوگئے ہیں؟" یہ کہتے ہوئے وہ میرے نزدیک آکر کھڑی ہوگئی۔ پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ کمرہ خوشبو اور رنگینی سے معمور ہوگیا ہے۔ اس نے بہت اچھی خوشبو استعمال کی تھی اور خود اس کا وجود بھی رنگینی سے خالی نہ تھا۔ "اگر آپ نے ہم لوگوں کی کسی بات یا حرکت کا بُرا منایا ہے تو میں آپ سے معافی چاہتی ہوں۔ یقین کیجیے ہم میں سے کسی نے ایک پل کے لیے بھی آپ کی ذات پر شک نہیں کیا۔ بلکہ ہمیں تو خوشی ہے کہ قسمت نے ہمیں آپ جیسے آدمی سے ملا دیا ہے جو ہمارے لیے بہت مفید ثابت ہوسکتا ہے۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ پوری طرح تعاون کرسکتے ہیں اور آپ کو اندازہ ہوجائے گا کہ ہماری دوستی خود آپ کے لیے بھی کارآمد ہوگی۔" یہ کہہ کر اس نے میرا ہاتھ تھام کر مجھے صوفے پر بٹھا دیا اور خود میرے مقابل بستر پر بیٹھ گئی۔ وہ ۲۵، ۲۶ سال کی ایک خوبرو اور دلکش عورت تھی اور اپنے حسن وجمال کی حشر سامانیوں سے پوری طرح آگاہ بھی تھی۔ اس کی آواز میں مٹھاس اور لہجے میں بلا کی اپنائیت تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ اپنی خوبیاں وہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے سلسلے میں استعمال کرتی ہوگی۔

میں نے بے تکلفی سے اسے مخاطب کیا۔ "مادھوری۔۔۔ مگر پہلے یہ بتائیں کہ میں آپ کو مس کہوں یا مسز؟"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "اطمینان رکھو۔ میں آج تک شادی کے چکر میں نہیں پڑی۔"

"اور آئندہ کیا ارادہ ہے؟" میں نے شوخی سے پوچھا۔

"یہ تو تقدیر ہی جانتی ہے۔ مگر کوئی اچھا سا جیون ساتھی مل جائے تو کون اکیلا رہنا پسند کرتا ہے۔" اس نے معنی خیز انداز میں مجھے دیکھا۔

"آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ آج تک آپ کو ایسا آدمی ملا ہی نہیں جو آپ کا جیون ساتھی بننے کے لائق ہوتا۔ پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کی پسند کا معیار کیا ہے؟ میرا مطلب ہے آپ کے ذہن میں جیون ساتھی کا تصور کیا ہے؟"

وہ بے باکی سے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرائی۔ "کوئی آپ جیسا مل جائے تو میری قسمت سنور جائے۔"

"یہ کہیے کہ اس کی قسمت سنور جائے گی۔ وہ تو زندگی بھر اپنی [illegible] خوش نصیبی پر فخر کرے گا۔"

"تو پھر کیا خیال ہے ہوجائے شادی؟" میں اس کی [illegible] تجویز پر حیران رہ گیا اور بوکھلا کر بولا۔

"مگر آپ نے میرے بارے میں تو کچھ پوچھا ہی نہیں کہ میں شادی شدہ ہوں یا اکیلا؟"

"اس کی مجھے پروا نہیں ہے۔ مجھے اپنے اوپر اعتماد ہے۔ جو شخص جیون ساتھی بنے گا پھر کسی اور کی طرف نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔" وہ مسکرائی۔

"اسداللہ۔ بہت اعتماد ہے اپنے آپ پر؟!"

"ہونا بھی چاہیئے" وہ بستر سے اُٹھ کر صوفے پر میرے برابر آکر بیٹھ گئی "آپ کا کیا خیال ہے؟"

میں اس اثناء میں ذہنی طور پر ایک فیصلہ کر چکا تھا اور صورت حال سے نمٹنے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ وہ ایک شیطان صفت عورت تھی جو کسی بھی مرد کو اپنی اداؤں کے سنہرے جال میں پھنسانے کی قدرت رکھتی تھی میں اس کی حشر سامانیوں کا اندازہ بخوبی کر چکا تھا مگر شاید اسے احساس نہیں تھا کہ اس کا واسطہ جس شخص سے پڑا تھا وہ اس قسم کی صورت حال سے عہدہ برا ہونے کی تمام صلاحیتیں رکھتا تھا۔

"خیال بُرا نہیں" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں "مگر کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ پہلے ہی چند روز ایک دوسرے کو سمجھنے اور پہچاننے کی کوشش کریں؟"

"یہ سب بیکار باتیں ہیں" وہ سنجیدگی سے بولی "میں ان پر یقین نہیں رکھتی۔ بس دل کے مشورے پر عمل کرتی ہوں" وہ مجھ سے اور نزدیک ہوگئی۔

میں نے ایک دم موضوع تبدیل کر دیا "مادھوری۔ میرا اس ریسٹ ہاؤس میں آنے کا یہ پہلا اتفاق ہے بلکہ اسے حسین اتفاق کہنا زیادہ درست ہوگا کہ تم جیسے حسین سے یہاں ملاقات ہوگئی مگر کیا تم بھی پہلی بار یہاں آئی ہو؟"

"ارے نہیں" وہ میری طرف جھک گئی "میں تو یہاں آتی جاتی رہتی ہوں اور مسٹر رانا کی مہمان نوازی کا لطف اٹھاتی ہوں۔ وہ بہت اچھے اور مخلص دوست ہیں"

"دوست یا کاروباری ساتھی؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

وہ ہنستے ہنستے سنجیدہ ہوگئی اور بہت غور سے میرا چہرہ دیکھنے لگی۔ میں نے جلدی سے کاروبار کا رشتہ آج کے زمانے میں سب سے بڑا دوستی کا رشتہ ہوتا ہے۔ میری مسٹر رانا سے کوئی لمبی ... ہیں ہے مگر میں نے اندازہ لگایا ہے کہ وہ مجھے اپنے کاروبار میں شریک کرنا چاہتے ہیں اور کیونکہ تم انہیں پہلے سے جانتی ہو اس لیے میں اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر تم سے رانا کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں"

وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی "مگر میں تو تم سے پہلی بار ہی ملی ہوں۔ پھر تم میری رائے پر کیسے بھروسہ کر سکتے ہو۔ میں بھی تو تمہارے لیے بالکل نئی ہوں"

"مگر پھر بھی بہت پرانی شناسا اور اپنی اپنی سی لگتی ہو" میں نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

"کیا سچ مچ؟!" وہ حیران ہو کر مجھے تکنے لگی۔

"بالکل سچ۔ تم شاید میری بات پر یقین نہ کرو مگر یہ سچ ہے کہ میں تم پر رانا سے زیادہ بھروسہ کرتا ہوں اور تمہارے مشورے کو اس کے مقابلے میں زیادہ اہمیت دیتا ہوں"

وہ کتنی ہی چالاک اور جہاندیدہ سہی لیکن بالآخر ایک عورت تھی۔ میرے پُرخلوص انداز سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ رانا صاحب منشیات کی سمگلنگ کے ساتھ ساتھ اب اسلحہ کی سمگلنگ بھی شروع کرنا چاہتے ہیں اور مجھے بھی اس کام میں شریک کرنا چاہتے ہیں مگر جب تک مجھے تمام صورت حال معلوم نہ ہو جائے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک جان جوکھوں میں ڈالنے والا کام ہے اور میں اس کے تمام پہلوؤں سے واقفیت حاصل کیے بغیر اس میں ہاتھ نہیں ڈال سکتا"

وہ میری صاف گوئی اور سادگی سے بہت متاثر نظر آ رہی تھی "تم ایک محتاط اور سمجھدار آدمی ہو اور مجھے یقین ہے کہ اگر تم ہمارے ساتھی بن جاؤ گے تو ہم بہت بڑے بڑے کام کرنے کے قابل ہو جائیں گے"

"مگر میں صاف گو آدمی ہوں اور اپنے سارے پتے کھول کر سامنے رکھنے کا قائل ہوں"

وہ اب مجھ سے زیادہ مرعوب نظر آنے لگی تھی "مجھے ایسے آدمی بہت اچھے لگتے ہیں لوٹی۔ میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ ہم دونوں زندگی کے سفر میں بھی بہت اچھے جیون ساتھی بن سکتے ہیں"

"کیا تم مجھے لینے آئی ہو؟" میں نے اچانک پوچھا اور وہ اس غیر متوقع سوال سے پریشان ہوگئی "میرا مطلب ہے اُس محفل میں لے جانے کے لیے"

"ارادہ تو یہی تھا مگر اب میں نے خیال بدل دیا ہے۔ اب تک وہ سب کے سب نشے میں مدہوش ہو چکے ہوں گے اس لیے مناسب یہی ہے کہ میں تمہارے کمرے میں ہی ٹھہروں اور تمہیں ساری بات سمجھا دوں"

میں نے بہت مشکل سے اپنی خوشی کے اظہار کو روکا۔ مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ وہ چالاک عورت اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے میری چال میں آجائے گی۔ جب وہ میرے نزدیک آئی تو میں اس کے سانسوں میں شراب کی مہک صاف طور پر محسوس کر سکتا تھا۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ وہ کتنی بلانوش تھی۔ لیکن پھر بھی اس بات کا خاصا امکان تھا کہ اگر میں اسے باتوں میں لگانے میں کامیاب ہوگیا تو اس کی زبان سے بہت سے سربستہ راز اگلوا لوں گا۔

"ٹھیک ہے" میں نے بڑی خوشدلی سے اس کو خوش آمدید کہا "میرے لیے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہوگی کہ تم اس ڈرنک پارٹی کی رنگینی پر میرے کمرے کی ویرانی کو ترجیح دو"

"تمہیں باتیں بنانی تو خوب آتی ہیں" وہ شرارت سے مسکرائی "مگر اطمینان رکھو۔ میں اس کمرے میں بھی ہر چیز منگا سکتی ہوں" یہ کہہ کر اس نے دیوار پر نصب برقی گھنٹی بجائی اور چند لمحے بعد ایک باوردی ملازم حاضر ہوگیا۔ ملازم کو ڈرنکس لانے کی ہدایت کرنے کے بعد وہ دوبارہ میری طرف متوجہ ہوگئی اور کچھ دیر بعد مختلف قسم کی شرابوں سے لدی ہوئی ایک ٹرالی کمرے میں آگئی۔ مادھوری نے مجھے بھی پیشکش کی مگر میں نے بہت سلیقے سے انکار کر دیا۔ چند پیگ اس کے ذہن کو تیز کرنے اور زبان کو کھولنے کے لیے بہت کافی تھے۔ ہم کافی دیر تک باتیں کرتے رہے اور وہ آہستہ آہستہ تمام گرہیں کھولتی رہی۔ وہ مجھے اعتماد میں لے کر ساری تفصیلات بتا رہی تھی۔ اس کی گفتگو میرے لیے انتہائی تشویشناک اور پریشان کن تھی۔ اس نے مجھے ایسی باتیں بتائیں جو میرے وہم و گمان سے باہر تھیں۔ اس کی فراہم کردہ معلومات کا خلاصہ یہ تھا کہ رانا چند سال پہلے تک سرحد پار والوں کے ساتھ سمگلنگ کے کاروبار میں مصروف تھا مگر پھر اچانک بیرونی دباؤ اور زیادہ منافع کے لالچ میں اس نے ہتھیاروں کی سمگلنگ بھی شروع کر دی۔ سرحد پار سے آنے والا اسلحہ وہ بعض پُراسرار اور گمنام لوگوں کے ہاتھ بہت مہنگے داموں فروخت کرنے لگا تو اس کی ہوس میں اور اضافہ ہوگیا۔ اس نے رفتہ رفتہ میڈم کو بھی اپنے اس کاروبار میں شریک کر لیا لیکن اب بہت بڑے پیمانے پر اسلحہ کی ناجائز درآمد کے پیش نظر اسے کچھ اور ساتھیوں اور معاونین کی ضرورت پیش آگئی تھی جس کے پیش نظر وہ لوٹی کو بھی اپنا شریک کار بنانا چاہتا تھا۔

مادھوری نے بتایا کہ راؤ صاحب سرحد پار کے ایک با اثر اور متمول شخص ہیں جن کا رسوخ سرکاری حلقوں میں بھی ہے۔ کئی وزیر اور پولیس کے اعلیٰ ترین افسر بھی ان کے حلقۂ اثر میں شامل ہیں۔ شاید اسی لیے مجھے رانا نے بتایا تھا کہ ایک منسٹر اور پولیس چیف اس کے ریسٹ ہاؤس میں بطور مہمان آنے والے ہیں۔ اگرچہ اس بار کوئی منسٹر یا پولیس چیف تو نہیں آیا تھا مگر مادھوری کے بیان کے مطابق وہ لوگ پہلے کئی بار رانا کی میزبانی کا لطف اُٹھا چکے تھے۔ میرا یہ خیال بالکل درست تھا کہ اس ریسٹ ہاؤس کو رانا اپنے مہمانوں کے لیے عشرت گاہ کے طور پر استعمال کیا کرتا تھا۔ مادھوری کے بیان کے مطابق اس وقت بھی بہت سے سرحد پار سے آئے ہوئے اہلکار اور کارندے اس جگہ پر مقیم تھے۔ بیرکس نما عمارتیں دراصل اسلحہ اور گولہ بارود کا ذخیرہ رکھنے کے لیے استعمال کی جاتی تھیں اور مادھوری کی فراہم کردہ اطلاع کے مطابق اس وقت بھی وہاں اسلحہ کا ایک بہت بڑا ذخیرہ موجود تھا۔ ان بیرکس سے کافی فاصلے پر لمبی سی ایک منزلہ عمارت

تی جو نچلے درجوں کے مہمانوں کی دلبستگی کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔ اونچے اور بلند پایہ لوگوں کی مہمانداری کا اہتمام رانا کی حویلی نما عمارت میں کیا جاتا تھا جہاں خود میں بھی اس وقت موجود تھا۔ یہ تصور کہ رانا اپنے وطن کی لڑکیوں کو چائے کے طور پر اپنے غیر ملکی مہمانوں کی خدمت میں پیش کرتا تھا۔ میرے لیے انتہائی اذیت ناک تھی۔

مادھوری نے نشے کی ترنگ میں مجھے اور بھی بہت سی باتیں بتا دی تھیں۔ اس نے بتایا تھا کہ رانا اور اس کے ہم پیشہ لوگوں کے نزدیک عزت و ناموس اور اخلاق بے معنی چیزیں تھیں۔ سرحد پار سے آئے ہوئے مہمان خود اپنے ساتھ بھی خوبرو عورتیں لے کر آیا کرتے تھے جن میں سے کچھ تو کرائے پر حاصل کی جانے والی پیشہ ور عورتیں ہوا کرتی تھیں اور بعض مادھوری اور مالا کی طرح ان کی شریکِ کار بھی تھیں۔ ان محفلوں میں میڈم کو خاص طور پہ مدعو کیا جاتا تھا۔ وہ نہ صرف اپنی رعنائیوں کے ساتھ آیا کرتی تھی بلکہ اپنے ساتھ سفید فام میگی کو بھی لیکر آتی تھی جو اسکی شریک کار تھی۔

مادھوری ترنگ میں آکر بولتی رہی اور میں خاموشی سے سنتا رہا اور اس دوران میں باقاعدگی کے ساتھ اسے مسلسل جام بنا کر پیش کرتا رہا۔ ہر جام اس کے نشے میں اضافہ کرتا رہا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن کے پرت کھلتے رہے اور وہ کسی لگی لپٹی کے بغیر مجھے اصل اور صحیح حالات بتاتی رہی۔ اگر وہ پوری طرح نشے میں مدہوش نہ ہوتی تو شاید اتنی آزادی اور صاف گوئی سے مجھے تمام حالات سے آگاہ نہ کرتی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ میں نے اپنی چاپلوسی اور خوشامدانہ گفتگو سے مادھوری کا دل جیت لیا تھا۔ وہ میری صاف گوئی اور سادگی سے بہت متاثر ہوئی تھی۔ اس کے اندازے کے مطابق میں ایک کھرا اور قابلِ تعریف انسان تھا اور پھر میں نے اسے یہ غلط فہمی بھی دلا دی تھی کہ میں اپنے دل کی گہرائیوں سے اس کو پسند کرتا ہوں اور اسے ہر قیمت پر حاصل کرنے کا خواہش مند ہوں۔ مادھوری نے اپنی باتوں کا سلسلہ سرِ شام شروع کیا تھا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے وہ میرے کریدنے پر مختلف واقعات سناتی رہی اور میں ٹرالی میں رکھے ہوئے بیش قیمت شراب کے ذخیرے میں سے اسکو مختلف شرابوں کے جام بنا بنا کر دیتا رہا۔ جنہوں نے تیز کاک ٹیل کا کام کیا اور وہ بہت جلد نشے کے اثر میں آ گئی۔ اپنی دھن اور ترنگ میں اسے یہ احساس بھی نہیں رہا کہ میں اس بلانوشی میں اس کا ساتھ نہیں دے رہا تھا اور وہ مجھے ایسی باتیں بھی بتا رہی تھی جو بقائمی ہوش و حواس کسی قیمت پر بھی بتانے پر آمادہ نہیں ہو سکتی تھی۔

رفتہ رفتہ شراب نے اپنا اثر دکھایا اور مادھوری کی زبان میں لڑکھڑاہٹ پیدا ہونے لگی یہاں تک کہ رات کے دس بجے وہ بالکل خاموش اور بے حس و حرکت ہو گئی۔ میں نے بڑے سکون اور احتیاط کے ساتھ اسے اپنے بستر پر لٹا دیا اور خود اس کے سرہانے بیٹھ کر صورتِ حال پر غور کرنے لگا۔ میرا ذہن تیزی سے منصوبہ بندی میں مصروف تھا۔ میں بیک وقت کئی منصوبے بنا بنا کر مسترد کرتا رہا۔ غالباً جذبات کی شدت نے میرے سوچنے کی صلاحیت کو متاثر کر دیا تھا جسکی بنا پر میں ذہنی ارتکاز اور یکسوئی سے محروم ہو کر رہ گیا تھا۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ میرے ذہن پر چھائی ہوئی دھند چھٹنے لگی اور میں نے فوری طور پر ایک منصوبہ تیار کر لیا جس پر عمل درآمد کرنا اسی رات ضروری تھا۔ میں نے جھک کر مادھوری کے سانس کی آمدورفت کا جائزہ لیا۔ وہ لمبے لمبے سانس لے رہی تھی اور بے سدھ ہو کر بستر پر پڑی ہوئی تھی۔ میں نے اسکو جھنجھوڑا مگر وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر تھی۔ اس وقت کمرے کا دروازہ اچانک زور کی آواز کے ساتھ کھلا اور میں چونک کر اچھل پڑا۔ دروازے پر رانا اور مالا ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالے ہوئے کھڑے تھے مجھے چونک کر تیزی سے بستر سے اٹھتے ہوئے دیکھا تو وہ دونوں بے تحاشا ہنسنے لگے۔

کوئی بات نہیں ڈارلنگ "رانا نے نشے میں ڈوبی ہوئی آواز میں مجھے مخاطب کیا " تم اپنے کام میں مصروف رہو۔ ہم اپنے کام میں۔ کیوں نا ڈارلنگ ؟" اس نے مالا کی طرف دیکھا۔

مالا نے جھومتے ہوئے جواب دیا " بالکل بالکل ڈارلنگ " اس کی آواز لڑکھڑا رہی تھی اور وہ صاف اور واضح

طور پر الفاظ ادا کرنے سے قاصر تھی۔ ظاہر ہے کہ اُن لوگوں نے بہت کثرت سے شراب نوشی کی تھی جو میرے لیے ایک حوصلہ افزا اور خوشی کی بات تھی۔

"رانا نے دروازے سے باہر جانے کا ارادہ کیا مگر پھر واپس پلٹ کر مجھے دیکھا اور مالا سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ مائی ڈیئر۔ یہ دونوں بے چارے اس کمرے میں بالکل اکیلے ہیں۔ یہ میرے مہمان ہیں مگر پھر بھی اکیلے ہیں۔ انہیں کمپنی کی ضرورت ہے۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔" مالا کے لیے اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہنا بھی دشوار تھا مگر وہ رانا کے سہارے کھڑی جھوم رہی تھی۔

"ٹھیک ہے تو پھر ٹھیک ہے۔" رانا نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "ہم بھی اکیلے یہ بھی اکیلے۔ ہم دونوں بھی اسی کمرے میں رہیں گے۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

مالا نے ایک بار پھر "ٹھیک ہے ٹھیک ہے" کہہ کر اس کی تصدیق کر دی۔

"اوکے۔" رانا جب کمرے میں داخل ہونے لگا تو میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ میں نے سوچا کہ اگر ان دونوں نے میرے کمرے میں رہنے کا ارادہ کر لیا تو میرے لیے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا کوئی طریقہ نہیں رہے گا۔ میں رانا کو منع کرنے سے بھی قاصر تھا۔ ظاہر ہے میں اس کو خود اس کے گھر کے کسی کمرے میں رہنے سے منع نہیں کر سکتا تھا۔ اگر وہ اپنے ہوش میں ہوتا تو میں کوئی معقول بہانہ بنا کر اسے جانے پر مجبور کر سکتا تھا مگر مشکل یہ تھی کہ اس وقت وہ نشے میں چُور تھا اور کسی شرابی کو اس عالم میں کوئی بات سمجھانا یا اس کی مرضی کے خلاف کسی کام پر آمادہ کرنا قریب قریب ناممکن ہوتا ہے۔

رانا اور مالا ایک دوسرے کے سہارے لڑکھڑاتے ہوئے اندر داخل ہوئے تو میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا یکایک رانا رُک گیا اور مالا کی طرف دیکھ کر بولا۔ "فلم؟ کہاں رہ گئی جو داؤد صاحب میرے لیے لائے ہیں؟"

مالا نے خاموشی سے دونوں ہاتھ ہلا کر اپنی لاعلمی کا اظہار کر دیا

"ارے۔ وہ فلم تو اُدھر کمرے میں ہی رہ گئی۔" وہ خاصا پریشان نظر آ رہا تھا۔ "اس کے بغیر تو ہماری شام پھیکی رہ جائے گی۔" پھر اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ "لونی تمہارے پاس کوئی اچھی سی چٹ پٹی فلم ہے؟"

میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔ "فلم بھی نہیں ہے اور وی سی آر بھی نہیں ہے۔"

اُس نے میرے کمرے کا جائزہ لیا اور بولا۔ "او مائی گاڈ۔ اِدھر تو وی سی آر بھی نہیں ہے۔ میرے یار۔ تم اس کے بغیر کیا کرتے ہو؟"

"کچھ بھی نہیں۔" میں نے سادگی سے جواب دیا۔ "مجھے اس کمرے میں آئے ہوئے ابھی ایک دن بھی نہیں ہوا ہے اور پھر میں ویڈیو فلمیں دیکھنے کا شوقین بھی نہیں ہوں۔"

"تعجب کی بات ہے۔ تم تو ایک دم بور آدمی ہو۔ تمہارا کمرہ بھی تمہاری طرح بور ہے۔ خیر کوئی بات نہیں ہے۔ تم دھوری کے ساتھ گپ شپ لگاؤ۔ وہ تمہارا انتظار کر رہی ہے بے چاری۔" وہ بستر کی جانب دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرایا پھر وہ مالا سے کہنے لگا۔ "چلو ڈارلنگ ہم اپنے کمرے میں چلیں گے۔ اوکے؟"

"اوکے۔ اوکے۔" مالا نے ایک بار پھر اس کی تصدیق کر دی اور وہ دونوں "بائی بائی" کہہ کر ایک دوسرے کے بازو میں بازو ڈال کر لڑکھڑاتے ہوئے کمرے سے باہر چلے گئے تو میری جان میں جان آئی۔ میں نے اطمینان کی ایک لمبی سانس لی اور چند لمحے خاموش کھڑا منصوبہ بندی کرتا رہا۔ میرا ذہن کافی دیر سے پلاننگ میں مصروف تھا اور میں نے ذہنی طور پر ایک فیصلہ کر لیا تھا۔ کمرے سے باہر گیلری میں جھانک کر میں نے آس پاس کا جائزہ لینے کی کوشش

کی۔ گیلری بالکل سنسان پڑی ہوئی تھی۔ کسی قسم کی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ چند لمحے دروازے میں کھڑے رہنے کے باوجود میں نے کسی محافظ کو نہیں دیکھا نہ ہی کسی پہریدار کے قدموں کی آواز سُنی تھی۔ اپنے کمرے میں داخل ہو کر میں نے ایک بار پھر بغور مادھوری کا جائزہ لیا۔ وہ بالکل مدہوش پڑی تھی اور سکون سے سو رہی تھی۔ اس نے جس مقدار میں شراب نوشی کی تھی اس کے پیشِ نظر میرے اندازے کے مطابق اسے کم از کم صبح تک ہوش میں نہیں آنا چاہیے تھا۔ میں نے اس پر کمبل ڈال دیا اور پھر تیز تیز مگر دبے قدموں سے چلتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ لیکن کمرے کا دروازہ بہت احتیاط سے بند کرنا نہیں بھولا۔

عمارت میں یہاں وہاں ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی تھی لیکن گیلریاں اور راہداریاں بالکل ویران اور خالی پڑی ہوئی تھیں۔ رانا کی حویلی میں بھی میں ایک بار یہی مشاہدہ کر چکا تھا۔ عموماً عمارت کے اندر محافظوں یا پہریداروں کی ڈیوٹیاں مقرر کرنے کا وہ بالکل قائل نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو اس کی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی خود اعتمادی تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ عمارت کے ارد گرد اس نے حفاظت کا مکمل بندوبست کر رکھا تھا۔ پھر ایک بات یہ بھی تھی کہ وہ عمارت کے اندر عموماً اپنے بھروسے کے انتہائی معزز مہمانوں کو ہی میزبانی کا شرف بخشا کرتا تھا ان مہمانوں کی دل شکنی کے خیال سے بھی غالباً وہ کسی قسم کے پہرے چوکی کا اہتمام کرنے سے گریز کرتا تھا۔ بہرحال وجہ خواہ کچھ بھی ہو۔ اس کی یہ عادت ایک بار پہلے بھی میرے لیے مفید ثابت ہو چکی تھی اور مجھے پورا یقین تھا کہ اس بار بھی بلا روک ٹوک اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ میں دبے پاؤں لیکن اپنی معمول کی چال سے چلتا ہوا ریسٹ ہاؤس کی بلند و بالا اور پُرشکوہ عمارت سے گزر کر اس کے عقبی حصے میں پہنچ گیا۔ سامنے لان اور پھر باغوں کا سلسلہ تھا۔ اس جگہ بظاہر روشنی کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ میں نے اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر ٹہلنے کے انداز میں قدم آگے بڑھائے اور لان سے گزر کر درختوں کے جھنڈ تک پہنچ گیا۔ مجھے کسی نے روکنے کی کوشش نہیں کی اور دور تک کسی شخص کا نام و نشان نہیں تھا پھر بھی میں پوری طرح محتاط تھا۔ درختوں کے سائے اور تاریکی نے میرے لیے حفاظت کا سامان فراہم کر دیا تھا میں زیادہ آزادی اور تیز قدمی سے بیرکس کی جانب بڑھتا چلا گیا۔ کچھ دور چلنے کے بعد مجھے ایک منزلہ بیرکس کی عمارت نظر آنے لگے۔ کسی زمانے میں فوجی چھاؤنی کے علاقے میں اس قسم کی عمارتیں بہت کثرت سے دیکھنے میں آیا کرتی تھیں۔ ان عمارتوں کو مختلف مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا تھا مگر رانا نے ان کا ایک بالکل انوکھا اور نیا استعمال دریافت کر لیا تھا۔

بیرکس کے سامنے پوری لمبائی میں برآمدہ تھا اور یہاں بہت کم روشنی تھی۔ برآمدے کے چوکور ستونوں کے آس پاس بھی کسی قسم کی روشنی کا بندوبست نہیں تھا۔ برآمدہ جس جگہ سے شروع ہوتا تھا وہاں پہنچ کر میں رُک گیا۔ میرے تمام حواس بیدار اور چوکنا تھے اور میں پھونک پھونک کر قدم اُٹھاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ بیرکس کے بند کمروں میں ہنسنے بولنے کی ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں ان میں مردوں اور عورتوں دونوں کی ملی جلی آوازیں شامل تھیں، لیکن پھر بھی میرے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ کون سا کمرہ خالی ہے اور کس کمرے میں لوگ موجود ہیں میں اس کھوج میں تھا کہ یکایک میں نے اپنے پیچھے بھاری جوتوں کی دھمک سُنی۔ میں تیزی سے ایک ستون کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ اس جگہ روشنی بھی کم تھی اور ستون کی چوڑائی مجھے اپنے پیچھے چھپا لینے کے لیے کافی تھی۔ برآمدے کے کنارے پر دو طویل القامت آدمی نمودار ہوئے۔ وہ خاصی بلند آواز میں باتیں کر رہے تھے اور ان کے لب و لہجے اور زبان کی ساخت سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ دونوں غیر ملکی تھے۔ وہ ہنستے بولتے ہوئے میرے نزدیک سے گزر گئے۔ مجھے صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ وہ لوگ صبح واپس چلے جائیں گے۔ وہ کچھ فاصلے پر ایک کمرے کے دروازے پر رُکے اور پھر دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔ دروازہ دوبارہ بند ہو گیا لیکن اس

سے پہلے میں نے کمرے کے اندر سے کچھ زنانہ سرگوشیوں اور ہنسی کی آوازیں سن لی تھی۔ مادھوری نے مجھے درست ہی اطلاع دی تھی کہ اس عمارت کو رانا اپنے نچلے درجے کے مہمانوں کی عشرت گاہ کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ غم و غصّے کی ایک لہر میرے رگ و پے میں دوڑ گئی۔ میرا جی چاہا کہ بلا تامّل دروازہ کھول کر اُن دونوں پر ٹوٹ پڑوں، مگر موقعہ محل کا یہ تقاضا نہیں تھا۔ اس لیے میں نے بمشکل اپنے جذبات پر قابو پایا۔ ابھی میں نے اپنی جگہ سے حرکت بھی نہیں کی تھی کہ مخالف سمت سے ایک اور شخص نمودار ہوا۔ وہ ہلکے سُروں میں سیٹی بجا رہا تھا اور ساتھ میں گنگناتا بھی جا رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں اپنی جگہ تبدیل کرتا ہم دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے تھے۔ وہ موٹی موٹی مونچھوں والا ایک تومند شخص تھا اور قدوقامت میں قریب قریب میرے برابر ہی تھا۔ اس کی کمر میں پستول لٹکا ہوا تھا اور ہاتھ میں شراب کی بوتل تھی جس میں سے نصف کے قریب وہ پی چکا تھا اور نشے میں جھوم رہا تھا۔ مجھے اپنے سامنے دیکھ کر اُس نے کسی قسم کی حیرت کا اظہار نہیں کیا۔ "چسکی لوگے پارٹنر؟" یہ کہتے ہوئے اس نے بڑی فراخ دلی سے بوتل میری طرف بڑھا دی۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اس کا شکریہ ادا کیا۔

"جیسی تمہاری مرضی۔ شاید تم اپنا کوٹہ پورا کر چکے ہو۔ میرا کوٹہ بھی خلاص ہو گیا ہے۔ یہ تو بلبل کا حصہ ہے۔ وہ اُدھر میرے انتظار میں بیٹھی ہے۔" اس نے کچھ فاصلے پر ایک بند دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تمہارا کدھر کا پروگرام ہے؟ کلب میں جاؤ گے یا موج کرو گے؟" وہ ایک آنکھ بند کر کے معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

اس کا چہرہ میرے چہرے کے بالکل نزدیک تھا اور اس کے منہ سے اُٹھنے والی بدبو مجھے پریشان کرنے لگی تھی۔ اس کے اس غیر متوقع سوال کا مجھے فوری طور پر کوئی جواب نہیں سوجھا اور میں بوکھلا کر رہ گیا۔ اس نے چونک ہو کر میری طرف غور سے دیکھا۔ سر سے پیر تک میرا جائزہ لیا اور پھر آنکھیں پھیلا کر گھورتے ہوئے پوچھا۔

"بائی دی وے۔ تم ہو کون پارٹنر۔ کون سے گروپ سے تعلق ہے؟"

میں ہکلا کر رہ گیا۔ "وہ۔ میں..... گروپ؟!"

اس کا سارا النشپل بھر میں ہرن ہو گیا۔ اس کے چہرے کے دوستانہ جذبات اچانک تبدیل ہو گئے اور وہ مشتبہ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے کرخت لہجے میں بولا۔ "اپنی شناخت کراؤ پارٹنر" اس کا دوسرا ہاتھ کمر میں لٹکے ہوئے پستول کی طرف بڑھنے۔ "ورنہ....."

اس کا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے میرا ہاتھ حرکت میں آ چکا تھا۔ میں نے اپنا بایاں ہاتھ اوپر اُٹھایا تو اس نے چونک کر میرے بائیں ہاتھ کو دیکھا اور اس کی ضرب سے بچنے کے لیے تیار ہو گیا۔ مگر اسی لمحے میرا دایاں ہاتھ تیزی سے حرکت میں آ گیا اور ایک کلہاڑی کی مانند اس کی گردن کے پچھلے حصّے پر لگا۔ وہ کوئی آواز منہ سے نکالے بغیر زمین پر گرنے لگا مگر میں نے لپک کر اسے تھام لیا اور جلدی سے اس کے ہاتھ سے شراب کی بوتل پکڑ لی تاکہ فرش پر گر کر آواز پیدا نہ کرے۔ وہ خاصا بھاری بھرکم اور ضرورت سے زیادہ صحت مند آدمی تھا۔ میں نے بمشکل اس کے بازوؤں میں ہاتھ ڈال کر اسے کھینچا اور گھسیٹتا ہوا باہر برآمدے سے ملحق تاریک تر حصّے میں لے گیا۔ اس کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ میں نے ایک نزدیکی جھاڑی کی آڑ میں اسے حفاظت کے ساتھ زمین پر لٹا دیا اور احتیاطاً اس کی بے ہوشی کو طول دینے کے لیے اس کی کنپٹی پر ایک اور ہاتھ رسید کر دیا۔ مجھے یقین تھا کہ اب وہ صبح تک ہوش میں نہیں آئے گا۔ اس کا پستول میں نے قبضے میں لے کر اپنی جیب میں ڈال لیا اور شراب کی آدھی بھری ہوئی بوتل تھام کر برآمدے کی جانب بڑھا۔ اس نے جس بند دروازے کی طرف اشارہ کیا تھا اس کے پاس جا کر میں نے دروازے کو دھکیلا تو وہ کسی آواز کے بغیر کھل گیا۔ میں نے قدم کمرے کے اندر رکھنے سے پہلے اپنا سر اندر ڈال کر کمرے میں جھانکا یہ ایک درمیانی سائز کا کمرہ تھا اور اس وقت

نیم تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ چند لمحے تک تو میں کچھ بھی دیکھنے کے قابل نہ ہو سکا مگر پھر مجھے کمرے میں رکھا ہوا فرنیچر اور ڈبل بیڈ دھندلا دھندلا سا نظر آنے لگا۔ بیڈ خالی تھا اور کمرے میں کوئی موجود نہ تھا۔ میں نے اپنا قدم اندر رکھا مگر پھر ٹھٹھک کر رُک گیا۔ کسی نے عقب سے میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔ میں نے کسی تاخیر کے بغیر دایاں پیر آگے بڑھا کر پوری قوت سے جھٹکا دیا اور میری کلائی تھامنے والا فضا میں پرواز کرتا ہوا بیڈ کے اوپر جا پڑا۔ میں نے کسی تاخیر کے بغیر اس پر چھلانگ لگا دی اور اس پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ اس نے پوری قوت سے مزاحمت کی مگر میں نے مضبوطی کے ساتھ اسے جکڑے رکھا۔ اس کی گردن پر وار کرنے کے لیے میں نے اپنا بایاں ہاتھ اوپر اُٹھایا اور اسی لمحے مجھے محسوس ہوا کہ میری گرفت میں کوئی سخت اور پتھریلا جسم نہیں بلکہ ایک نرم و گداز بدن ہے۔ اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے میں نے اپنی گرفت کو ہلکا کر کے بغور دیکھا تو اپنی نظروں کے سامنے ایک خوفزدہ مگر خوبرو عورت کو سہما ہوا پایا۔ وہ رحم طلب نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میری گرفت یک لخت ڈھیلی ہو گئی اور اسی لمحے وہ عورت پھسل کر میرے قابو سے نکل گئی۔ وہ بیڈ کے دوسرے کنارے پر سہمی ہوئی میری جانب دیکھ رہی تھی۔ جبکہ میں کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے۔

"کون ہو تم؟" اس نے ڈری ہوئی آواز میں کہا۔ "کشن کہاں ہے؟"

وہ خوف کے مارے اپنی آواز پر قابو پانے میں ناکام ہو چکی تھی اور اس کی بلند آواز کمرے میں گونج رہی تھی جو یقیناً میرے لیے خطرے کی گھنٹی تھی۔

"ڈرو نہیں۔" میں نے نرمی سے اسے دلاسہ دیا۔ "میں دوست ہوں۔ کشن ہی نے مجھے یہاں بھیجا ہے۔"

"اوہ" وہ اپنا بازو سہلاتی ہوئی بیڈ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ "تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔"

میں نے اپنی آواز میں خوش مزاجی کا عنصر پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے نہیں۔ تم نے ڈرا دیا ہے مجھے۔ اس طرح چپکے سے چوروں کی طرح پیچھے سے آ کر میرا ہاتھ پکڑنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"سچ کہتے ہو۔" وہ ہنس پڑی اور اپنا بازو سہلاتے ہوئے بولی۔ "غلطی میری ہی تھی۔ پر تم کون ہو؟"

"میں؟..... میں کشن کا دوست ہوں۔ اس نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے۔ یہ دیکھو۔ تمہارے لیے سوغات بھی لے کر آیا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے شراب کی بوتل اسے دکھائی۔ اس کی سہمی ہوئی آنکھیں یکایک خوشی اور اضطراب سے چمکنے لگیں۔

"ویل ڈن۔" اس نے چہکتے ہوئے کہا۔ "یہ ہوئی نا بات! اب کشن آئے گا تو پارٹی ہو گی۔"

"کشن نہیں آئے گا۔" میں نے اپنی آواز کو بالکل پُرسکون رکھا۔

"کیوں؟" اس نے پوچھا۔ "پھر کوئی خطرہ پیدا ہو گیا جو اس کی ایک دم ڈیوٹی لگ گئی؟"

"یہی سمجھ لو۔" میں نے بات ٹالتے ہوئے کہا۔ "گلاس لے کر آؤ یا بوتل ہی کو منہ لگا کر پینے کا ارادہ ہے؟"

اس نے جھپٹ کر بوتل میرے ہاتھ سے چھین لی۔ "بوتل کا اپنا ہی مزہ ہوتا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے بوتل کھول کر اس میں سے ایک لمبا گھونٹ بھرا۔ "بہت اچھی ہے۔" وہ تعریفی انداز میں کہنے لگی۔ پھر اس نے بوتل میری جانب بڑھا دی۔ میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔

"کیا بات ہے؟" وہ حیران ہو کر بولی۔ "کیا تمہارا کوٹہ پورا ہو گیا یا کلب جانے کے لیے گنجائش رکھ چھوڑی ہے۔"

میں نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔ "تم موج اُڑاؤ۔ دوسروں کی فکر مت کرو۔"

اس نے حریصانہ نظروں سے بوتل کی طرف دیکھا۔ میں اس کی فطرت سے آگاہ ہو چکا تھا۔ اس لیے مزید اطمینان دلانے کے لیے کہا۔ "ویسے بھی میں اپنے حصّے سے زیادہ پی چکا ہوں۔ کشن نے مجھے قسم دی تھی کہ تمہارے حصّے میں

سے ایک بوند بھی نہ لوں۔"

"گڈ بوائے۔" وہ خوشی سے مسکرائی۔ "وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کا بھی خیال رکھتا ہے۔ بہت گریٹ آدمی ہے وہ۔" یہ کہتے ہوئے وہ بیڈ پر نیم دراز ہوگئی اور مدیرے پن سے بوتل کو منہ لگا لیا۔

"تم ہو کون؟ کرشن کے دوست ہو کیا؟" اس نے یکایک سوال کیا۔

"ہاں۔"

"مگر پہلے تمہیں کبھی نہیں دیکھا۔"

"میں پہلی بار ادھر آیا ہوں۔ بالکل نیا پنچھی ہوں۔"

وہ ہنسنے لگی۔ "نئے تو ہو مگر پنچھی نہیں لگتے۔" وہ کچھ بہکنے لگی تھی مگر بلا نوشی سے بھی باز نہیں آ رہی تھی۔ "تمہارا نام کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"بادل۔ اور تمہارا؟" میں نے جواب دیا۔

"مجھے بجلی کہتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ بے اختیار ہنسنے لگی یہاں تک کہ ہنستے ہنستے کھانسنے لگی۔ "مائی ڈیئر مجھے ڈولی کہتے ہیں۔ کیوں کیسا نام ہے؟"

میں نے اس کے نام کی بھی تعریف کی اور خود اس کی بھی۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ درحقیقت ایک دلکش عورت تھی۔ ظاہر ہے جن مقاصد کے لیے اسے استعمال کیا جا رہا تھا اس کے لیے خوبصورت اور پُرکشش عورتیں ہی درکار ہوتی ہیں۔ رفتہ رفتہ اس کا نشہ تیز ہو رہا تھا اور مجھے اس بات کا انتظار تھا۔ میں اس کے ذریعے اس جگہ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کا خواہش مند تھا۔ مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ اس نے جھومتے ہوئے میرے تمام سوالات کا جواب دیا اور مجھے وہ تمام باتیں بتا دیں جن کی مجھے ضرورت تھی۔ اس نے بتایا کہ اس عمارت میں بیس سے زائد کمرے ہیں جن میں سے ہر کمرے میں ایک عورت موجود رہتی ہے۔ ان میں سے کچھ عورتیں تو رانا نے فراہم کی ہیں لیکن زیادہ تر عورتیں اس کے غیر ملکی رفیق کار مہیا کرتے ہیں اور ان عورتوں کو عموماً ان لوگوں کی تفریح کے لیے رکھا گیا ہے جو رانا کے ہم وطن ہیں اور وقتاً فوقتاً رانا کی مہمان داری سے لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں۔ ان سے رانا مخبری اور جاسوسی کا کام بھی لیتا ہے اور انہیں شیشے میں اتارنے کے لیے بھی استعمال کرتا ہے۔ رانا اپنے مہمانوں کو عیش و عشرت کے لمحات فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی کمزوریاں بھی معلوم کر لیتا ہے اور اسی پر بس نہیں کرتا بلکہ انہیں مختلف قسم کی منشیات کا عادی بنانے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ لوگ ہر طرح رانا کے تابعدار ہو جاتے ہیں اور کسی وقت بھی اس کے حلقۂ اثر سے باہر نہیں ہو سکتے۔ ڈولی نے بتایا کہ ایسے لوگوں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ وہ رانا کے مستقل گاہک اور کارندے بن چکے ہیں۔ ان کے علاوہ نئے نئے لوگ بھی اس فہرست میں شامل ہوتے رہتے ہیں۔ ان عورتوں کو رانا نے انتہائی معقول ماہانہ معاوضوں پر رکھا ہے اور ان کے حصے کی رقم ہر ماہ بڑی باقاعدگی سے ان کے گھروں کو بھیج دی جاتی ہے۔

"مگر یہ عورتیں آتی کہاں سے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

وہ ہنسنے لگی۔ "جہاں سے دوسری سب عورتیں آتی ہیں۔ یعنی آکاش سے۔"

"میرا مطلب ہے کہ کیا انہیں زبردستی ان کی مرضی کے خلاف یہاں لا کر رکھا جاتا ہے یا وہ اپنی مرضی سے آتی ہیں؟"

"تم بہت بھولے بادشاہ ہو۔" اس نے پیار سے مجھے جھڑکا۔ "ارے جنہیں ڈھیر سارا پیسہ ملے گا وہ تو اپنی خوشی سے آئیں گی۔ ہمارے ماں باپ تو منت سماجت کر کے رانا کی ٹولی میں اپنی لڑکیوں کو بھیجتے ہیں۔ انہیں بہت بھاری رقم دی جاتی ہے مگر شرط یہ ہے کہ وہ خوبصورت اور سمجھدار ہوں اور انہیں جو کہا جائے ویسا ہی کریں۔ جو لڑکیاں

بے وقوف ہوتی ہیں اور رانا کے لیے کارآمد نہیں ثابت ہوتیں انہیں واپس بھیج دیا جاتا ہے مگر جو لڑکیاں رانا کے بتائے ہوئے راستے پر کامیابی سے چلتی ہیں اور اسے زیادہ سے زیادہ خبریں معلوم کر کے بتاتی ہیں انہیں انعام بھی دیا جاتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "تم تو بہت ہوشیار اور چالاک لگتی ہو اور بہت زیادہ سندر بھی ہو۔ تم نے بھی کبھی رانا کے لیے کوئی راز معلوم کیا؟"

اپنی تعریف سن کر وہ مسکرانے لگی۔ یہ ہر ایک عورت کی کمزوری ہوتی ہے۔ بولی۔ "ابھی چار دن پہلے ہی میں نے رانا کو ایک ایسی خبر بتائی ہے کہ وہ خوشی سے اُچھل پڑا اور مجھے اس نے پانچ ہزار روپیہ انعام بھی دیا۔ ایک بہت بڑے ہیروئن کے بیوپاری کا کھوج لگا کر دیا ہے اسکو۔ وہ ایک بہت بڑے شہر میں لوگوں کو ہتھیار بھی بیچتا ہے خوب کام چل رہا ہے اس کا۔ اب اُس نے ہتھیاروں کے لیے رانا سے ایگریمنٹ کر لیا ہے۔"

میں چوکنا ہو کر بیٹھ گیا۔ "ہتھیار کہاں سے آئیں گے رانا کے پاس؟" میں نے پوچھا۔

"ادھر سے۔" اس نے اپنی گردن کو ایک ادا کے ساتھ جنبش دی۔ "جدھر سے دوسرا مال آتا ہے۔ مال کی پہلی کھیپ تو رانا کو مل بھی گئی ہے۔ یہ کرشن بھی تو اُسی کے ساتھ یہاں آیا ہے۔ تم تو جانتے ہو گے۔"

"ہاں ہاں۔ خوب اچھی طرح۔" میں نے اس کی تائید کی مگر اس کی فراہم کردہ اطلاعات نے مجھے انتہائی مضطرب کر دیا تھا۔ "کرشن اُدھر کلب میں موج میلہ کرنے گیا ہوگا۔ وہ سب اُدھر ہی اکٹھے ہوتے ہیں۔ اسی لیے تو تمہیں میرے پاس بھیج دیا ہے۔"

"یہ تو میری قسمت ہے کہ اس نے مجھے تمہارے پاس بھیج دیا اور اس بہانے ہم دونوں کی ملاقات ہوگئی۔"

"تو کیا تم کلب میں نہیں جاؤ گے؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔ "تم کو کلب جانے کا کوئی شوق نہیں ہے؟"

"شوق تو ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "مگر تم سے ملنا بھی قسمت والوں کو ہی نصیب ہوتا ہے۔"

"ویری گڈ۔" وہ خوشی سے پھول گئی۔ "اسی خوشی میں ایک ہو جائے۔" اس نے بوتل میری جانب بڑھائی مگر میرے انکار پر خود اپنے ہی منہ سے لگا کر غٹاغٹ پی گئی۔ بوتل قریب قریب خالی ہو چکی تھی اور وہ خود بھی اس کے ساتھ ہوش و حواس سے قریب قریب بیگانہ ہو چکی تھی۔ چند لمحے بعد خالی بوتل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر قالین پر گر گئی اور خود بھی اوندھے منہ بستر پر گر کر بالکل بیہوش ہوگئی۔ میں نے جلدی جلدی کمرے کا جائزہ لیا۔ وہاں کوئی قابلِ ذکر چیز مجھے نظر نہیں آئی۔ مجھے ڈولی کی زبانی کلب کے بارے میں جو معلومات حاصل ہوئی تھیں۔ میں فوری طور پر ان کی تصدیق کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ ڈولی کو مدہوش چھوڑ کر میں کمرے سے باہر نکل گیا۔ برآمدے سے گزر کر میں نے عقبی حصے کی طرف قدم بڑھاتے تو یکایک مجھے موسیقی کی مدھم سی آواز سنائی دی۔ میں نے آواز کے رُخ پر چلنا شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ موسیقی کی آواز زیادہ بلند ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ میں ایک پرانی سی عمارت کے نزدیک پہنچ گیا۔ یہ بھی ایک بیرکس نما عمارت تھی لیکن چاروں طرف سے خوب روشن تھی۔ اس کے اندر سے سازوں اور گانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یہی غالباً کلب کی وہ عمارت تھی جس کے بارے میں ڈولی مجھے بہت کچھ بتا چکی تھی۔ لیکن میں کلب کے اندر جانے سے پہلے پوری طرح اطمینان کرنا چاہتا تھا کہ مجھے کوئی اجنبی اور نوارد جان کر پکڑ نہ لے۔ میں نے لمبا چکر کاٹ کر عمارت کے پچھلے حصے کا رُخ کیا۔ اس طرف ایک باغیچہ تھا جس کے درمیان میں ایک چھوٹی سی بارہ دری نما عمارت بنی ہوئی تھی۔ یہ ایک پرانی عمارت تھی۔ جس کے چاروں طرف پانی کے حوض تھے۔ کسی زمانے میں یہ پانی سے بھرے رہتے ہوں گے لیکن اس وقت بالکل سوکھے پڑے تھے۔ میں ابھی بارہ دری سے چند گز کے فاصلے پر ہی تھا کہ اچانک سامنے کے درخت سے ایک شخص کود کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ وہ ایک بلند قامت اور مضبوط

جسم کا آدمی تھا اور نیلی فوجی نما وردی میں ملبوس تھا۔ اس کے ہاتھ میں برین گن تھی جسے اُس نے بڑی مہارت کے ساتھ اُٹھا رکھا تھا۔

"رُک جاؤ جوان" وہ اکھڑ لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوا "کون ہو تم؟ ادھر کیوں آئے ہو؟" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا اور میرا درمیانی فاصلہ اور کم کر دیا۔

"بھائی ناراض کیوں ہوتے ہو۔ کیا کہیں سے لڑ کر آئے ہو؟" مَیں نے خوش دلی سے کہا "مَیں تو تازہ ہوا کھانے کے لیے باہر آ گیا ہوں۔ اور وہ دیکھو میرے جوڑی دار بھی آ گئے ہیں میرے پیچھے۔" مَیں نے اس کے عقب میں دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ بے اختیار مُڑ کر دیکھنے لگا اور یہی اس کی سب سے بڑی حماقت تھی اس کا اور میرا درمیانی فاصلہ پہلے ہی برائے نام تھا۔ مَیں نے تیزی سے چھلانگ لگائی اور دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن پر ضرب لگائی۔ وہ فی الفور زمین پر گر گیا۔ مَیں کسی تاخیر کے بغیر اسے گھسیٹ کر بارہ دری کی جانب لے گیا۔ میرا اندازہ بالکل صحیح تھا یہ ایک غیر آباد قدیم عمارت تھی جس کے فرش پر گھاس پھونس پڑا ہوا تھا۔ مَیں نے بہت تیزی سے اس کا لباس اتار کر خود پہنا اور اپنا لباس سنبھال کر احتیاط سے ایک طاقچے پر رکھ دیا۔ اس کی برین گن ہاتھ میں تھام کر مَیں باہر نکلا تو میرا رُخ کلب کی جانب تھا۔

کلب کے دروازے تک مَیں بے دھڑک پہنچ گیا۔ دروازہ خاصا بلند اور کشادہ تھا اور پُرانی طرز کا بنا ہوا تھا۔ مَیں نے ہاتھ سے دھکیل کر دروازہ کھولا اور ایک دم شور و غُل اور موسیقی کے مِلے جُلے شور نے مجھے بوکھلا دیا۔ اس کے ہمراہ شراب، تمباکو، چرس اور دوسرے منشیات کی ملی جُلی بُو نے بھی میرا استقبال کیا اور مَیں ایک لمحہ کے لیے تو اپنی جگہ کھڑا ہی رہ گیا۔ میری نگاہوں کے سامنے ایک عجیب منظر تھا۔ اندر ایک خاصا وسیع اور کشادہ ہال تھا جو مختلف قسم کے دھوؤں کی وجہ سے دھواں دھار ہو رہا تھا۔ ایک چبوترے نما سٹیج پر ایک لڑکی مغربی لباس پہنے ہوئے رقص میں مصروف تھی۔ اس کے برابر میں ایک نوجوان گٹار بجا رہا تھا۔ ہال میں موجود لوگوں کی تعداد تیس سے زیادہ ہو گی۔ ایک جانب شراب کے لیے بار بنا ہوا تھا مگر وہاں کوئی بار گرل نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہال میں موجود لوگ مختلف قسم کی دلچسپیوں میں مصروف تھے۔ ایک میز پر چار پانچ باوردی لوگ تاش کی بازی جمائے ہوئے تھے۔ دوسرے کونے میں ایک میز پر شراب کا دَور چل رہا تھا اور وہاں موجود آٹھ دس آدمی بلند آواز میں باتیں کرنے اور ہنسنے میں مصروف تھے۔ ہال کے ایک اور گوشے میں چرس اور ہیروئن کے رسیا موجود تھے۔ ایک شخص سرنج سے اپنے بازو میں کسی نشہ آور چیز کا انجکشن لگا رہا تھا۔ ڈولی نے سچ ہی کہا تھا۔ وہ سب کے سب غیر ملکی تھے اور ہتھیاروں کی کھیپ لے کر آئے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ سب اسلحہ کے استعمال سے بھی واقف ہوں گے اور اس میں بھی کوئی شک نہیں تھا کہ وہ سب پیشہ ور لوگ تھے۔

یکایک کسی نے میری کمر پر ایک لات رسید کی اور مَیں اوندھے منہ سامنے فرش پر گر گیا۔ سَر اٹھا کر دیکھا تو ایک بن مانس نما قوی ہیکل اور بدصورت آدمی دروازے کے عین درمیان میں کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔ وہ نشے میں چُور تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک برین گن تھی جسے اس نے لاپروائی سے لٹکا رکھا تھا۔ میرے گرنے کا کسی نے نوٹس نہیں لیا۔ دراصل ہال میں شور و غل اتنا زیادہ تھا اور سب لوگ اپنی اپنی دلچسپیوں میں اس قدر کھوئے ہوئے تھے کہ کسی دوسرے کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھنے کی بھی انھیں فرصت نہیں تھی۔ مَیں تیزی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اپنے مدِ مقابل کو گھورنے لگا۔

"ارے گدھے۔ تم جانتے نہیں پانڈے صاحب آ رہے ہیں راستے میں کیوں کھڑے ہو گئے؟" اس نے مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "سیلوٹ کرو گدھے کے بچے۔" وہ غصّے میں دھاڑا اور مجھے مارنے کے لیے اس نے اپنا ہاتھ اوپر اُٹھایا۔

مگر اس سے پہلے میری برین گن کا بٹ پوری قوّت سے اس کے پیٹ پر لگا۔ اس کے ہاتھ سے گن چھوٹ کر فرش پر گر گئی اور وہ پیٹ پکڑ کر دوہرا ہو گیا۔ تکلیف سے اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا مگر دوسرے ہی لمحے اس نے اپنی تکلیف پر قابو پا لیا اور جب غصّے سے بھرپور انداز میں سر اُٹھا کر مجھے دیکھا تو اس کا چہرہ مارے غصّے کے تمتما رہا تھا اور سُرخ ہو گیا تھا۔

"کتے کے پلّے" وہ کسی جنگلی درندے کی مانند مجھ پر جھپٹا اور اس کا زوردار گھونسہ میرے جبڑے پر پڑا تو مَیں چکرا کر رہ گیا۔ اس نے ایک ٹھوکر میرے گھٹنے پر ماری مگر مَیں پھرتی سے اُچھل کر دوسری جانب چلا گیا۔ وہ دانت پیستا اور گالیاں دیتا ہوا میری طرف بڑھا تو مَیں اس کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح تیار ہو چکا تھا۔ غصّے نے اسے اندھا کر دیا تھا اور یہ میرے لیے ایک موافق اور سازگار موقعہ تھا۔ مَیں نے تیزی سے اس پر چھلانگ لگا دی۔ وہ پھرتی سے دائیں جانب ہٹ گیا۔ مَیں یہی توقع کر رہا تھا۔ اس کے نزدیک سے گزرتے ہوئے میرا بھرپور گھونسہ اس کی کنپٹی پر لگا اور اس کے ساتھ ہی میری کہنی پوری قوّت سے اس کے پیٹ سے ٹکرائی تو اس کے منہ سے بے اختیار ایک چیخ نکل گئی۔ مَیں نے اسے سنبھلنے کا موقعہ نہیں دیا اور گھونسوں پر رکھ لیا۔

ایک منٹ کے بعد وہ بے حس و حرکت میرے قدموں میں پڑا ہوا تھا لیکن اس دوران میں ہال میں موجود سب لوگوں کی توجہ میری جانب مبذول ہو چکی تھی۔ اُن کی مداخلت سے پہلے ہی مَیں نے پانڈے کو ٹھکانے لگا دیا تھا۔ وہ کسی گینڈے سے کم نہیں تھا مگر مَیں نے اسے طاقت آزمانے کا کوئی موقعہ نہیں دیا تھا۔ اب جبکہ وہ شکست کی تصویر بنا ہوا میرے قدموں میں پڑا تھا۔ ہال میں موجود سب لوگ خونخوار نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ پانڈے ان سب کا افسر تھا اور شاید وہ سب اس کی گھُرکیاں گالیاں اور ٹھوکریں کھانے کے عادی تھے۔ پانڈے کا یہ حشر ان سب کے لیے خلافِ توقع اور قابلِ گردن زدنی تھا۔ مَیں نے ان سب کی نظروں میں غیض و غضب کے شرارے دیکھ لیے تھے۔ اُن میں سے ایک تاش کی میز پر سے اُٹھ کر میری طرف بڑھا "یہ تم نے کیا کر دیا باسٹرڈ۔ تمہارا کورٹ مارشل ہو گا۔" پھر وہ مجھے اچھی طرح پہچانے بغیر مُڑ کر اپنے قریب کھڑے ہوئے آدمی سے مخاطب ہو کر بولا "گرفتار کر لو اسے۔"

ایک مسلح باوردی شخص میری جانب بڑھا مگر میری برین گن حرکت میں آ چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ دوسرے لوگ ہوشیار ہو کر اپنی حفاظت کا بندوبست کر دیں۔ میری برین گن سے نکلنے والی گولیوں کی بوچھاڑ نے ان سب کو بے جان لاشوں میں بدل دیا۔ سٹیج پر رقص کرنے والی لڑکی پہلے تو ساکت کھڑی رہ گئی اور پھر ہسٹریائی انداز میں چیختی ہوئی بھاگی۔ اس کے ساتھ گٹار بجانے والا بھی بھاگنے کی فکر میں تھا مگر مَیں نے اُسے موقعہ نہیں دیا۔ چند لمحے کے اندر ہال کے اندر موجود کوئی شخص بھی زندہ باقی نہیں بچا تھا۔ رقاصہ کو مَیں نے جان بوجھ کر بھاگنے کا موقعہ دیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مجھے پہچان نہیں سکی تھی اور نہ ہی آئندہ مجھے شناخت کر سکتی تھی۔ ہال میں ہر طرف موت کا سناٹا چھا چکا تھا۔ مَیں نے وہاں رُکنا مناسب نہ سمجھا اور تیزی سے عمارت سے باہر نکل کر مہمان خانے کی جانب چل پڑا لیکن اس سے پہلے بارہ دری میں جا کر اپنا لباس اُٹھانا نہ بھولا۔ مَیں نے درختوں سے ڈھکا ہوا نسبتاً تاریک راستہ اختیار کیا تھا۔ مَیں کسی رکاوٹ یا روک ٹوک کے بغیر اپنے کمرے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ کمرے کے اندر مادھوری بدستور مدہوشی کے عالم میں پڑی ہوئی تھی۔ مَیں نے تیزی سے جُوتے اتارے، یونیفارم اتار کر اپنا لباس پہنا، اپنے بال بے ترتیب کیے اور یونیفارم کو پوٹلی کی صورت میں اپنے بستر کے نیچے رکھ لیا۔

کچھ دیر بعد مجھے باہر سے بھاگ دوڑ اور شور و غل کی آوازیں سنائی دیں اور پھر میرے دروازے پر کسی نے زور زور سے دستک دینی شروع کر دی۔ مَیں آنکھیں ملتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔ شراب کی قریب قریب خالی بوتل میں بچی کھچی

شراب کے قطروں کو مَیں نے دونوں ہاتھوں میں اُنڈیل کر اپنے منہ پر مَل لیا۔ اب مَیں ایک ایسے شرابی کے روپ میں تھا جو ابھی گہری نیند سے بیدار ہوا تھا۔

"کون ہے بھئی"؟ مَیں نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ میرے سامنے رانا اور راؤ صاحب کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے عقب میں چار مسلح اور مستعد محافظوں کی قطار تھی۔ ان سب کی نگاہیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

رانا

کی عقابی نگاہوں نے میرے عقب میں کمرے کا جائزہ لیا اور پھر وہ ایک قدم آگے بڑھ کر دروازے تک پہنچ گیا۔ اس اثنا میں راؤ صاحب مجھے یوں گھورتے رہے جیسے نظروں کے ذریعے میرا ایکسرے لینے کی کوشش کر رہے ہوں۔ رانا کو کمرے کی نیم تاریکی میں کچھ نظر نہیں آرہا۔ تو اس نے ایک اور قدم آگے بڑھایا، لیکن اب مَیں اس کی راہ میں حائل تھا اور جب تک وہ مجھے نہ ہٹا دے کمرے کے اندر داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے مقابل اس طرح کھڑے تھے کہ ہمارے چہروں کے درمیان چند انچ سے زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ رانا نے ناک سکوڑ کر کچھ سونگھنے کی کوشش کی۔ کمرے کے اندر سے سینٹ اور شراب کی ملی جلی بو آرہی تھی اور یہی بو میرے لباس اور چہرے میں بھی گھل مل گئی تھی۔ میری پریشان آنکھوں اور بکھرے ہوئے بالوں کے ساتھ ساتھ میرے بے ترتیب مسلے ہوئے لباس کو وہ اور راؤ صاحب دونوں بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔

مَیں نے بیزاری سے رانا کو دیکھا اور کہا "آخر مطلب کیا ہے آپ کا؟ اتنی رات گئے آکر مجھے جگایا کیوں ہے اور پھر خاموش کیوں کھڑے ہو گئے؟ بات کیا ہے؟"

رانا نے یکایک چونک کر مجھے دیکھا اور اسے احساس ہوا کہ وہ ایک معزز مہمان سے مخاطب ہے جو اس کا کاروباری حلیف بھی بن سکتا ہے، لیکن غالباً صورتِ حال کی سنگینی نے اسے بوکھلا کے رکھ دیا تھا۔ وہ کچھ نہیں بولا مگر راؤ صاحب نے اپنی موٹی موٹی مونچھوں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے ایک قدم آگے بڑھایا اور بولے "معاف کرنا لوٹی ماسٹر۔ ہم لوگ بہت پریشان ہیں"

"کس لیے پریشان ہیں؟" مَیں نے حیران ہو کر پوچھا۔

وہ دونوں معنی خیز انداز میں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ پھر رانا نے کھانس کر گلا صاف کیا اور بولا "آپ کے کمرے میں کون ہے؟"

مَیں نے جواب دیا "مادھوری۔ مگر مَیں نے اُسے نہیں بُلایا تھا۔ وہ خود اپنی خوشی سے آئی ہے۔"

"ہم اس سے بات کر سکتے ہیں جناب" راؤ نے بڑے اخلاق سے جھکتے ہوئے پوچھا۔

"بالکل نہیں" مَیں نے جواب دیا۔

وہ حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔ "کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ بالکل بات نہیں کر سکتے اس سے۔"

"مگر اس کی وجہ؟"

"وجہ یہ ہے کہ وہ مدہوشی کے عالم میں بے سُدھ پڑی ہے۔ دیکھ سکتے ہو تو خود دیکھ لو۔ اگر بات کرنے کے قابل ہو گی تو بات بھی کر لے گی" مَیں نے اسے اندر آنے کے لیے راستہ دے دیا۔

وہ جھجکتا ہوا اندر آگیا۔ مادھوری بے ہوش اور بے سُدھ پڑی تھی۔ راؤ نے اسے پکارا۔ جھنجوڑا مگر وہ کسی اور دُنیا میں پہنچی ہوئی تھی۔

"اوہ!" راؤ غصے سے بولا "یہ تو اس کی بہت پُرانی عادت ہے" یہ کہہ کر اس نے کمرے میں چاروں

طرف نگاہیں دوڑائیں "اور کوئی تو نہیں ہے یہاں؟"

مَیں نے کہا "ہے تو"

"کون ہے؟" اس نے چونک کر پوچھا وہ خاصا گھبرا گیا تھا۔

"آپ ہیں۔ اُدھر دروازے پر رانا صاحب ہیں" مَیں نے سادگی سے کہا۔

"یار تم کو مذاق سوجھ رہا ہے۔ ادھر ہم پر مصیبت ٹوٹ پڑی ہے۔"

"مگر ہوا کیا؟ بتاتے کیوں نہیں ہیں آپ لوگ۔ پہیلیاں کیوں بُھجوا رہے ہیں؟"

راؤ نے رانا کو دیکھا اور پھر اپنے پیچھے کھڑے ہوئے لوگوں کو پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا۔ ان کے جاتے ہی رانا بھی کمرے میں آگیا۔ اُن دونوں نے کمرے کی روشنیاں جلا دیں اور صوفوں پر بیٹھ گئے۔

"لوٹی۔ بہت غضب ہو گیا ہے یار۔ غضب ہو گیا ہے" رانا بولا۔

"کچھ بولو گے بھی؟" مَیں نے بیزار ہو کر کہا۔

"ہمارے دُشمن ہمارے ٹھکانے تک پہنچ گئے ہیں۔ اُنہوں نے ہمارے خلاف ایکشن شروع کر دیا ہے۔"

"کون دُشمن؟ کیا کر دیا ہے انہوں نے؟"

"خدا جانے کون ہیں وہ۔ حکومت کے آدمی ہوتے تو ہم سب اب تک اس طرح نہ بیٹھے ہوتے۔ ابھی تک اُن کے قبضے میں ہوتے یا پھر آسمان پر پہنچ چکے ہوتے۔"

"تو پھر وہ کون ہو سکتے ہیں؟" رانا نے جھلا کر کہا۔

"ہمارا کوئی کاروباری حریف۔ جو ہماری جگہ لینا چاہتا ہے۔ دیکھو نا۔ اگر حکومت نے یہ کارروائی کی ہوتی تو ہم کو بھی نہ چھوڑتی۔"

"ہو سکتا ہے وہ ابھی تھوڑے سے لوگ ہوں۔ کھوج لگاتے آگئے ہوں اور انہوں نے ایکشن شروع کر دیا ہو۔ یار سرکاری محکموں میں بھی تو سر پھرے اور منچلے لوگ ہوتے ہیں۔ جو اپنی جان کی بھی پروا نہیں کرتے۔"

"سرکار سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ یہ کسی اور کی حرکت ہے" راؤ نے بڑے وثوق سے کہا "یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ خود آپس میں ہی لڑ پڑے ہوں اور انہوں نے ایک دوسرے کو مار دیا ہو۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو۔ ایسا کبھی ہوا ہے؟ وہ سب آپس میں لڑ پڑے اور ان میں سے ایک بھی زندہ نہیں بچا۔"

مَیں نے تنگ آکر کہا "بھئی آپس میں ہی بولتے رہو گے یا مجھے بھی کچھ بتاؤ گے۔ یہ کہو کہ ہوا کیا ہے آخر؟"

رانا نے کہا "اِدھر ہمارے مہمانوں کے لیے ایک کلب بنا ہوا ہے۔ رات گئے اُدھر سے بیرن گن اور مشین گن کی فائرنگ کی آواز آئی۔ میرے آدمی اُدھر بھاگے ہوئے گئے تو دیکھا کہ کلب میں گانے ناچنے اور کھیلنے والے سب لوگ مُردہ پڑے ہیں۔ کسی نے اُن کو بھون ڈالا ہے۔ ایک بھی نہیں بچا۔"

"ڈانسر تو بچی ہے۔" راؤ بولا۔ "مگر وہ بہکی بہکی باتیں کر رہی ہے۔ اس کا تو دماغ ہی خراب ہو گیا ہے شاید۔"

"کوئی تو گواہ ہوگا۔" مَیں نے کہا "کسی نے تو دیکھا ہوگا۔!"

"کوئی بھی نہیں ہے۔ نہ جانے کون لوگ تھے۔ کتنے لوگ تھے، کہاں سے آئے تھے اور کہاں چلے گئے صرف ڈانسر ہی جان بچا کر بھاگی تھی مگر وہ اتنی ڈری ہوئی ہے کہ زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکالتی۔ بس

"وہ۔ وہ۔ وہ" کہہ رہی ہے۔ اس کے ساتھ کے سازندے بھی مرے ہوئے پڑے ہیں۔"

"یہ تو بہت عجیب بات ہے" میں نے پریشانی کا اظہار کیا۔ یکایک میں نے سوچتے ہوئے کہا "سنو رانا صاحب۔ مجھے ایک خیال آیا ہے؟"

وہ دونوں میری طرف متوجہ ہو گئے۔

"اس سے پہلے تمہارے آدمیوں نے جنگل میں دو مسلح اجنبیوں کو دیکھا تھا اور انہیں گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ لوگ بھی اسی گروہ کے ہوں اور اپنے دونوں ساتھیوں کو تلاش کرتے ہوئے آ گئے ہوں۔"

"اور انہوں نے بدلہ لینے کے لیے ہمارے سب آدمیوں کو مار دیا ہو" رانا نے جملہ پورا کرتے ہوئے کہا۔ "مگر سوال تو یہ ہے کہ وہ ہیں کون اور اب کہاں چلے گئے ہیں۔ دیکھو نا۔ اگر سرکاری لوگ ہوتے تو ہم سب ہی کو گھیر لیتے۔"

"یہ تو واقعی سوچنے اور فکر کرنے کی بات ہے" میں نے کہا "مگر تم یہاں کیا لینے آئے تھے۔ کیا تمہارا خیال تھا کہ یہ کارروائی میں نے کی ہے؟"

"ارے نہیں۔ ہم تو احتیاطاً تلاش کرتے ہوئے آ گئے تھے" رانا بولا۔

"یہ بات نہیں ہے جی" راؤ صاحب نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا "یہ سچ ہے کہ ہمیں تم پر ہی شبہ تھا۔ اس لیے کہ ایک تم ہی ایسے نئے آدمی ہو جو پہلی بار ادھر آیا ہے اور ہمارا مہمان بنا ہے۔ دیکھو نا پہلے دو اجنبی مارے گئے۔ پھر کلب میں قتل عام ہو گیا۔ مجھے خیال ہوا کہ ہو سکتا ہے یہ تمہاری کارستانی ہو۔ معاف کرنا۔ میری اس سچی اور کڑوی بات کا بُرا مت منانا دوست۔"

میں نے ہنس کر کہا "میں آپ کی صاف گوئی کی قدر کرتا ہوں راؤ صاحب۔ اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو میں بھی یہی سوچتا۔"

یکایک باہر سے بھاری قدموں کی آوازیں آنے لگیں اور پھر چند مسلح آدمی کمرے کے دروازے میں نمودار ہوئے۔ ان کے آگے ایک موٹا اور لمبا سا شخص تھا۔ "کیا بات ہے امرت؟" رانا نے پوچھا۔

"سر۔ بیرک کے پاس ایک جوان بے ہوش پڑا ہوا ہے۔ وہ نشے میں معلوم ہوتا ہے مگر کوئی اور چوٹ بھی لگی ہے اسکو۔"

رانا اور راؤ نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ امرت نے کہا "اور سر۔ اُدھر کلب کے پاس بھی ایک گارڈ پڑا ہوا ملا ہے۔ اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ وہ مر چکا ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ وہ بالکل ننگا ہے۔"

"ننگا ہے" راؤ نے حیران ہو کر کہا۔

"یس سر کسی نے اس کے کپڑے اتار لیے ہیں۔ ہم نے بہت ڈھونڈا مگر کپڑے کہیں نہیں ملے۔"

"اور اس لیے تم کپڑے تلاش کرتے ہوئے اس کمرے میں آ گئے" رانا نے تلخی سے کہا "ارے گدھے کپڑے تمہیں کیسے ملیں گے۔ وہ تو کسی نے اپنے قبضے میں کر لیے ہیں۔"

میں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا "اجازت ہو تو میں بھی رائے ظاہر کر دوں؟"

"ضرور ضرور۔"

"میرے خیال میں تو اب بات بالکل صاف ہو گئی ہے۔ کسی شخص نے محافظ کو جان سے مار کر اس کا

لباس اُتار لیا اور پھر وہی یونیفارم پہن کر اس کی گن لے کر کلب میں داخل ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ اسے کسی نے بھی نہیں روکا ہو گا۔ سب لوگ اپنے اپنے دھندوں میں لگے ہوں گے۔ اُس نے کلب کے اندر جا کر ایک دم فائر کھول دیا ہو گا اور اس طرح پل بھر میں سب کے سب ختم ہو گئے ہوں گے۔ ان سب کو ٹھکانے لگانے کے بعد وہ بڑے اطمینان سے چلا گیا ہو گا کیونکہ اس کو روکنے والا کوئی نہیں تھا۔"

وہ دونوں سوچ میں پڑ گئے۔ "بات تو ٹھیک ہے" رانا نے کہا "کیوں راؤ صاحب؟"

راؤ صاحب پُرخیال انداز میں سر ہلا کر بولے "ہاں عقل میں آتی ہے۔ پر سوال یہ ہے کہ وہ آدمی کون تھا اور پھر وہ کہاں چلا گیا؟"

"وہ جو کوئی بھی تھا ابھی تک ہمارے آس پاس موجود ہے" میں نے کہا "وہ زیادہ دور نہیں جا سکتا۔ یا تو وہ بھیس بدل کر آپ کے آدمیوں میں چھپ گیا ہے یا پھر اور کہیں چھپا ہوا ہے۔ وہ اپنی اگلی کارروائی کے لیے موقعے کا منتظر ہو گا۔"

وہ دونوں تشویشناک انداز میں سر ہلانے لگا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ بہت خطرہ ہے" رانا نے کہا۔

راؤ صاحب کھڑے ہو گئے۔ "میرا اب ادھر ٹھہرنا بہت خطرناک ہو گیا ہے۔ رانا صاحب۔ میرا خیال ہے کہ ہم لوگ چلتے ہیں۔"

رانا انہیں حیران ہو کر دیکھنے لگا۔ "راؤ صاحب۔ آپ تو خوامخواہ پریشان ہو گئے۔"

"خواہ مخواہ؟! آپ اسے خواہ مخواہ کہتے ہیں؟ اتنی ڈینجرس سچویشن ہے۔ دُشمن ہماری گھات میں ہے اور ہمیں یہ بھی نہیں پتہ کہ وہ کون ہے۔ کہاں ہے اور کیا چاہتا ہے؟ ہو سکتا ہے کہ وہ سرکاری بندہ ہو اور واپس رپورٹ دینے چلا گیا ہو۔ اگر ایسا ہوا تو سرکاری مشینری حرکت میں آ جائے گی اور بہت جلد وہ لوگ ہمیں گھیر لیں گے۔ اس لیے مہاراج ہمیں تو معافی دو۔ ہم چلتے ہیں۔" یہ کہہ کر راؤ صاحب تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئے۔

رانا حیران پریشان انہیں دیکھتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔ "یار لوٹی۔ یہ تو بہت چھوٹے دل کا بندہ نکلا۔ کام اتنے بڑے بڑے کرتا ہے مگر دل کا اس قدر چھوٹا ہے۔ مجھے تو یہ راجپوت بھی نہیں لگتا۔"

میں نے کہا "رانا صاحب۔ راجپوتی اور بہادری کی بات نہیں ہے۔ سوچیں تو اس کی بات بھی درست ہے۔ احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ ادھر سے سارے غیر ملکی رُخصت ہو جائیں اور آپ بھی اپنے کاروبار پر پردہ ڈالنے کی کارروائی شروع کر دیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ حکومت کے بندے بے خبری میں آ کر آپ کو گھیر لیں۔"

"یہ نہیں ہو سکتا مسٹر لوٹی" رانا نے وثوق بھرے لہجے میں کہا "میں نے بہت پکا انتظام کر رکھا ہے۔"

"جب کام خراب ہوتا ہے تو سارا بندوبست چوپٹ ہو جاتا ہے۔ اتنا زیادہ بھروسہ بھی اچھا نہیں ہوتا۔ بندے کو احتیاط ضرور کرنی چاہیئے۔"

رانا مجھے گھورتا رہا۔ پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو۔ مجھے اپنا بندوبست کر لینا چاہیے۔ اب تم سے صبح ملاقات ہو گی۔ تکلیف کی معافی۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلا گیا جو لوگ اطلاع لے کر آئے تھے وہ بھی رُخصت ہو گئے اور باہر کھڑے ہوئے چاروں مسلح افراد کے جوتوں کی چاپ سے اندازہ ہوا کہ وہ بھی رانا کے ساتھ ہی چلے گئے ہیں۔ میں نے ایک لمبی سانس لی اور کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ کمرے میں اب بالکل خاموشی اور تنہائی تھی۔ مادھوری کی بے ترتیب سانسوں کی آواز کے سوا کوئی اور آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ صبح سے پہلے ہوش میں نہیں آئے گی اور ہوش میں آنے کے بعد

بھی کافی دیر تک اس کا ذہن صاف نہ ہوگا۔ سنتری کی یونیفارم میرے تکیے کے سرہانے رکھی ہوئی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ ان میں سے کسی کی نظر سرہانے کی طرف نہیں پڑی تھی ورنہ وہ پوٹلی کی وجہ سے اونچا اُٹھا ہوا تکیہ دیکھ کر شک وشبہ کا شکار ہو سکتے تھے، لیکن وہ بذاتِ خود انتہائی بوکھلائے ہوئے اور خوفزدہ تھے اور میں نے ان کی پریشانی اور بے سکونی میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ میرا ذہن اب بالکل صاف ہو چکا تھا اور بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اب تک جو ہو چکا تھا وہ میرے لیے اطمینان بخش تھا۔ راؤ صاحب کو میں خوفزدہ کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا مگر اس کا فوری طور پر رُخصت ہو جانا قابلِ غور و فکر تھا۔ میں اس شکار کو اتنی آسانی سے بچ نکلنے کا موقعہ فراہم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ ایک موٹی آسامی تھا اور اس وقت جال میں پھنسا ہوا تھا، مگر سوال یہ تھا کہ اُسے روکنے کے لیے کیا بہانہ اور بندوبست کیا جائے؟

کمرے کے باہر مجھے قدموں کی آمد و رفت سنائی دے رہی تھی اور یہ جگہ جو چند گھنٹے پہلے خاموشی اور سکون میں ڈوبی ہوئی اور سوئی ہوئی لگتی تھی اچانک بیدار اور متحرک ہو گئی تھی۔ ہر طرف سے نقل و حرکت اور بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ رانا نے اپنے عملے کو فوری طور پر چاق و چوبند اور کمربستہ کر دیا تھا۔ وہ ہر قسم کے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے خود کو بھی تیار کر رہا تھا۔ حالات خاصے نازک تھے اور وہ خود بھی نہیں جانتا تھا کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے؟ لیکن اتنا معلوم تھا کہ آنے والے لمحات میرے لیے پُرسکون نہیں ہوں گے اور مجھے ہر طرح کے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ یہ سوچ کر میں نے مناسب یہی سمجھا کہ کچھ دیر نیند پوری کر لی جائے۔

باہر کی دنیا میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ وہ سب اَن جانے اور اَن دیکھے دشمن سے خوفزدہ تھے مگر میرے لیے ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ مجھے اپنے دُشمن کی پہچان بھی تھی اور اس کے عزائم کا بھی علم تھا۔ مسئلہ صرف یہ تھا کہ وہ آئندہ کون سی چال چلنے والا تھا اور مجھے اس کا توڑ کرنے کے لیے کیا کرنا تھا۔ بہرحال آج رات کی کارگزاری سے میں کافی مطمئن تھا۔

میں نے رانا اور راؤ کے ٹھکانے کا پتہ لگا لیا تھا۔ میں نے یہ بھی جان لیا تھا کہ وہ ملک دُشمن لوگ کس قسم کی گھناؤنی اور خطرناک کارروائیوں میں معروف ہیں۔ ان کے ساتھیوں اور ہمدردوں کے بارے میں مجھے علم ہو چکا تھا اور اُن کا طریقۂ کار بھی مجھ پر واضح تھا۔ میں نے ابتدائی کارروائی میں حوصلہ افزا نتائج حاصل کیے تھے۔ اس گروہ کے درجنوں چیدہ چیدہ لوگوں کو بیک وقت ٹھکانے لگانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں دشمنوں کو وسوسے اور اندیشوں کا شکار بنانے میں بھی کامیاب ہو گیا تھا۔ اب وہ ایک گھبرایا ہوا اور خوفزدہ حریف تھا جس کو میں نے بے یقینی اور شک وشبہ میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس اعتبار سے میری کارگزاری اب تک خاصی اطمینان بخش اور مسرور کُن تھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ صوفے کی پشت سے سر ٹکاتے ہی میں فی الفور گہری نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

میری آنکھ اس وقت کھلی جب دن کی روشنی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ دروازے پر کوئی دستک دے رہا تھا۔ گھڑی کی طرف نگاہ کی تو معلوم ہوا کہ دن کے آٹھ بج رہے تھے۔ مادھوری بدستور مدہوشی کے عالم میں سو رہی تھی۔ دروازہ کھولا تو سامنے ایک مستعد اور مؤدب ملازمہ کھڑی ہوئی تھی۔ اُس نے بتایا کہ رانا صاحب ساڑھے آٹھ بجے ناشتے پر ہمارا انتظار کریں گے۔

میں نے دروازہ بند کر کے مادھوری کو بیدار کرنا ضروری سمجھا۔ پکارنا لاحاصل تھا لیکن پھر مجھے عین وقت پر یونیفارم کا خیال آ گیا۔ مادھوری کے بیدار ہونے سے پہلے اُس یونیفارم کو ٹھکانے لگانا ضروری تھا۔ مگر سوال یہ تھا کہ

میں اسے کہاں اور کیسے ٹھکانے لگاؤں؟ چاروں طرف نظریں دوڑانے کے بعد مجھے صرف ایک مناسب طریقہ نظر آیا۔ میں نے یونیفارم کو بیڈ کے میٹریس کے نیچے پھیلا دیا۔ اب کوئی اس کے بارے میں نہیں جان سکتا تھا جب تک کہ بیڈ کے میٹریس کو اٹھا کر نہ دیکھا جائے اور فی الحال مجھے یقین تھا کہ وہ لوگ میرے بارے میں مشکوک نہیں تھے اس لیے کمرے کی تلاشی کا امکان نہیں تھا۔ اس کے بعد میں نے مادھوری کی طرف توجہ دی۔ اسے بیدار کرنے اور ہوش میں لانے کے لیے آوازیں دیں۔ خوب جھنجھوڑا، یہاں تک کہ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ چند لمحے وہ مجھے دیکھتی رہی پھر اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے ایک نظر اپنے آپ پر ڈالی اور پھر اپنے بے ترتیب لباس کو دیکھا۔ وہ معنی خیز انداز میں مسکرا کر اٹھ بیٹھی اور ایک لمبی انگڑائی لے کر بولی۔

"اتنی جلدی کیوں جگا دیا۔ رات کا خمار تو اُتر نے دیا ہوتا۔"

"ہمیں آدھے گھنٹے بعد رانا صاحب کے ساتھ ناشتے پر پہنچنا ہے جلدی سے تیار ہو جاؤ۔"

یہ کہہ کر میں نے غسل خانے کا رُخ کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ پوری طرح ہوشیار ہونے کے لیے ابھی مادھوری کو کچھ اور وقت درکار ہوگا۔ چنانچہ جب میں تیار ہو کر غسل خانے سے باہر نکلا تو وہ بستر پر نیم دراز جمائیاں لے رہی تھی۔ میں نے اسے دھکیل کر غسل خانے میں پہنچا دیا۔ اس نے تیار ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔ منہ ہاتھ دھو کر بال اور لباس درست کرنے کے بعد وہ غسل خانے سے باہر نکلی تو خاصی شگفتہ اور خوبصورت لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر رات کی مے نوشی کی کوئی علامت نظر نہیں آ تی تھی۔ آنکھوں میں پڑے ہوئے ہلکے گلابی ڈوروں کے سوا وہ ہر طرح سے ایک نارمل عورت نظر آ رہی تھی۔ ہم نے کمرے سے باہر قدم نکالا تو ساڑھے آٹھ بجنے میں صرف تین منٹ باقی رہ گئے تھے۔ مادھوری نے میری راہنمائی کی۔ ہم دونوں کھانے کے کمرے میں پہنچے تو دوسرے سبھی لوگ وہاں موجود تھے۔ رانا۔ راؤ۔ مالا۔ میڈم۔ میگی اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے پھلوں کا جوس پینے میں مصروف تھے۔

ہم دونوں کو دیکھ کر میڈم کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی مگر دوسرے تمام لوگ خاموش اور متفکر نظر آ رہے تھے۔ ہمیں میز پر بیٹھتے ہی ملازموں نے ناشتہ کا سامان میز پر پہنچا دیا۔ ناشتہ بالکل خاموشی سے کیا گیا اور کسی نے ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا۔ چائے اور کافی کا دور چلا تو گفتگو کا بھی آغاز ہوا۔ مادھوری رات کو رونما ہونے والے واقعات سے قطعی بے خبر تھی چنانچہ اس کو مالا نے مختصر طور پر تمام واقعات سنا دیے۔ اب سوال یہ تھا کہ آئندہ کیا اقدامات کیے جائیں؟ رانا اور راؤ خاصے پریشان نظر آ رہے تھے۔ راؤ کی تجویز تھی کہ اس کو اپنے دیگر ہمراہیوں کے ساتھ فوراً رخصت ہو جانا چاہیے۔ مگر میڈم اس جلد بازی کے خلاف تھی۔ اس کا خیال تھا کہ فی الحال جب تک حملہ آور کے بارے میں پوری معلومات حاصل نہ ہوں سب لوگوں کو وہیں موجود رہنا چاہیے۔

میگی نے ایک لفظ بھی مُنہ سے نہیں نکالا تھا مگر صاف ظاہر تھا کہ وہ میڈم کی ہم خیال تھی۔ مالا نے پہلے تو راؤ صاحب کے ساتھ اتفاق ظاہر کیا تھا مگر بعد میں وہ بھی اسی نتیجے پر پہنچی تھی کہ سب لوگوں کو وہیں موجود رہنا چاہیئے۔ اس گفتگو سے مجھے یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ یہ سب لوگ رانا کے شریکِ کار اور اس کے کاروبار میں پوری طرح حصہ دار تھے۔ راؤ صاحب کی حیثیت کسی قدر بلند تھی کیونکہ وہ منشیات کے علاوہ ہتھیاروں کی سپلائی کے سلسلے میں بھی شریک تھے اور مسلح اور تربیت یافتہ لوگوں کی کھیپ بھی ان ہی کے توسط سے آیا کرتی تھی۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ کلب میں ہلاک ہونے والے تمام افراد اُن ہی کے کارندے تھے اور اسی لیے وہ دوسروں سے زیادہ متفکر اور پریشان تھے۔ میڈم کی حیثیت بھی ایک سینئر پارٹنر کی تھی۔

راؤ سرحد پار سے تعلق رکھتا تھا جبکہ میڈم کی سرگرمیاں ملکی سرحدوں کے اندر ہی محدود تھیں۔ لیکن اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں تھی کہ اس کے پاس بھی تربیت یافتہ اور مسلح لوگوں کا ایک منظم گروہ موجود تھا۔ اس کا مشاہدہ کچھ عرصہ قبل بذاتِ خود میں بھی کر چکا تھا اور اس کی جرأت تنظیمی صلاحیتوں اور ظالمانہ سرگرمیوں کا عینی شاہد تھا۔ مادھوری اور مالا، راؤ صاحب کی نمائندگی کرتی تھیں اور منشیات کے علاوہ بااثر اور بارسوخ لوگوں کو پرچانے اور موم کرنے کے سلسلے میں راؤ صاحب کا بہت مؤثر ذریعہ تھیں۔ اس کے علاوہ یہ دونوں خوبصورت عورتیں اپنے حسن کا جادو جگا کر کارآمد لوگوں سے مفید اور کارآمد معلومات اور راز بھی حاصل کر لیا کرتی تھیں۔ اس اعتبار سے وہ راؤ صاحب اور رانا کی انتہائی معتمد ساتھی تھیں۔

کافی دیر تک بحث جاری رہی۔ رانا نے بتایا کہ حفاظتی انتظام اور زیادہ مستحکم اور سخت کر دیے گئے ہیں اس لیے فی الحال پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ آس پاس کے علاقے میں مشتبہ دشمن کی تلاش کے لیے مسلح دستے بھی گشت کر رہے ہیں اور ان کی بہت جلد کوئی مفید اطلاع لے کر واپس آنے کی توقع ہے۔ کلب میں ہلاک ہونے والوں کی لاشوں کو ٹھکانے لگا دیا گیا تھا اور باقی ماندہ لوگوں کی حفاظت کے لیے مزید احتیاطی اقدامات کر لیے گئے ہیں۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم سب اپنی دلچسپیوں میں مصروف رہیں۔" یہ میڈم کی آواز تھی۔

"ہمارے پروگراموں میں کوئی فرق نہیں آنا چاہیے!"

"بالکل۔" رانا نے پُرزور آواز میں کہا۔ "اگر ہم نے زیادہ پریشانی اور گھبراہٹ کا اظہار کیا تو مجھے ڈر ہے کہ ہمارے کارندے ہم سے بھی زیادہ خوفزدہ ہو جائیں گے اور ان میں اگر ایک بار بھی بے یقینی اور خوف پیدا ہو گیا تو پھر یہ ہم پر اپنا اعتماد اور بھروسہ کھو بیٹھیں گے۔"

ناشتے کے بعد گول کمرے میں محفل جمائی گئی۔ میڈم اور میگی ۔۔ ایک طرف تاش لے کر بیٹھ گئیں۔ دوسری طرف مالا اور مادھوری مے نوشی میں مصروف ہو گئیں۔ رانا اور راؤ صاحب کسی ضروری اور اہم گفتگو میں مصروف تھے۔ وہ دونوں خاصے فکرمند نظر آ رہے تھے اور بار بار اٹھ کر باہر چلے جاتے تھے۔ غالباً وہ اپنے آدمیوں کو ضروری ہدایات دینے میں مصروف تھے۔ انہوں نے بظاہر تو بے پروائی کا رویہ اپنا رکھا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ وہ حد سے زیادہ فکرمند اور پریشان تھے اور انہیں اپنے ان جانے اور گمنام دشمن سے سخت خوف محسوس ہو رہا ہے۔ میں ایک صوفے پر نیم دراز بظاہر آنکھیں بند کیے ہوئے لیٹا تھا مگر میرا ذہن بہت تیزی کے ساتھ آئندہ کے پروگرام بنانے میں مصروف تھا۔ مجھے یہ تو معلوم ہو چکا تھا کہ اب وہ لوگ انجانے حریف کو کسی قسم کا موقع فراہم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے اور انہوں نے چاروں طرف حفاظتی انتظامات پہلے سے بھی زیادہ مضبوط کر دیے تھے، لیکن اس کے باوجود میرے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ ان لوگوں کی احتیاطی تدابیر کو کس طرح ناکام بناؤں اور اس شیطانی گروہ کی ہلاکت خیزی اور تباہ کاری سے اپنے ملک اور قوم کو کیونکر محفوظ رکھ سکوں۔ یہ واضح ہو چکا تھا کہ انہیں مجھ پر مطلق شبہ نہیں تھا لیکن یہ بھی ممکن نظر نہیں آ رہا تھا کہ میں اُن کی حفاظتی تدابیر کے باوجود اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ اس کے باوجود میں نے مصمم ارادہ کر رکھا تھا کہ خواہ کچھ بھی ہو جائے میں ان کی کوششوں کو ناکام بنا کر دم لوں گا۔ مگر کیسے؟ یہ سب سے اہم اور قابلِ غور مسئلہ یہی تھا۔

یکایک خوشبو کے ایک جھونکے نے مجھے چونکا دیا اور اس کے ساتھ ہی مجھے اپنے نزدیک کسی انسانی وجود کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ میرے برابر مالا اور مادھوری آ کر بیٹھ

گئی تھیں اور بہت پُراسرار اور معنی خیز انداز میں میری جانب دیکھتے ہوئے مسکرا رہی تھیں۔

"مسٹر ٹونی"۔ مالا نے اپنے گلے میں پڑے ہوئے ہیرے کے نیکلس سے کھیلتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔ "آپ نے کل رات مادھوری کی بہت خاطر مدارت کی۔ ایسی مہمان نوازی ہر کوئی تو نہیں کر سکتا۔ وہ بہت تعریف کر رہی تھی آپ کی۔"

"یہ ہیں بھی تعریف کے قابل۔" مادھوری نے دلنوازی سے مجھے دیکھا۔

"واقعی ٹھیک کہتی ہو تم۔ یہ ہر طرح تعریف کے قابل ہیں۔ کیوں مادھوری؟"

مادھوری سرشار انداز میں مجھے دیکھنے لگی۔

"کیوں نہ ہم تینوں کہیں گھومنے چلیں؟" مالا نے تجویز پیش کی۔

"حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ اس موقع پر ہم کہاں گھومنے جا سکتے ہیں اور کیا یہ مناسب بھی ہوگا؟" میں نے جان بوجھ کر اس تجویز کو پسند نہیں کیا تھا۔

"ارے زیادہ دور نہیں جائیں گے۔ آس پاس سے گھوم کر آ جائیں گے۔" یہ تجویز میرے دل کو لگی تھی۔ میں اس کی مخالفت کرتا رہا اور پھر ان کے اصرار پر میں بادل نخواستہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رانا کو ہمارے ارادے کا علم ہوا تو اس نے کہا۔ "میں اِن لوگوں کی حفاظت کے لیے کچھ لوگ ساتھ کر دیتا ہوں۔"

"ہرگز نہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم اپنی حفاظت خود کر سکتے ہیں۔"

"مگر زیادہ دُور نہ جانا۔" راؤ صاحب نے بڑے پیار سے مالا کو مخاطب کیا۔ "تمہاری زندگی ہمیں بہت پیاری ہے۔ ڈارلنگ۔"

مالا نے شوخی سے راؤ صاحب کو مسکرا کر گھونسہ دکھایا اور ہنستی ہوئے میرے اور مادھوری کے ساتھ گول کمرے سے باہر نکل گئی۔

گول کمرے سے باہر نکلتے ہی مجھے گزشتہ روز اور آج کے ماحول کا نمایاں فرق نظر آ گیا۔ کہاں تو رانا کے مہمان خانے میں محافظ نام کی کوئی شے نظر نہیں آتی تھی اور کہاں اب یہ عالم تھا کہ راہداریوں — گیلریوں اور برآمدوں میں مسلح محافظ مستعدی سے گھومتے ہوئے نظر آ رہے تھے یوں لگتا تھا کہ وہ ہر آہٹ اور ہر حرکت پر پوری نظر رکھے ہوئے ہیں اور ذرا سا موقعہ ملنے پر اپنی بندوق سے گولیوں کی بارش شروع کر دیں گے۔

ہم برآمدے سے نکل کر باہر لان میں پہنچ گئے۔ اب سوال یہ تھا کہ کدھر جائیں اور کیوں کر جائیں؟ میڈم کی رومان انگیز طبیعت کا تقاضا یہ تھا کہ کچھ فاصلے پر پہاڑیوں کے دامن میں ایک خوبصورت جھیل ہے وہاں جا کر کشتی کی سیر کی جائے جبکہ مادھوری پہاڑی کی چوٹی پر جا کر تازہ اور ٹھنڈی ہوا سے لُطف اندوز ہونا چاہتی تھی۔ میری مصلحت اس میں تھی کہ وہ جھیل کی طرف جائیں کیونکہ اسلحہ اور گولہ بارود کا ڈپو اس کے راستے میں واقع تھا اور میں اس کے محل وقوع اور آس پاس کے جغرافیے کا تفصیل سے پتہ کرنا چاہتا تھا۔ میڈم کے اشارے پر ایک جیپ گاڑی ہمارے سامنے پہنچ گئی۔ ڈرائیور کی سیٹ میڈم نے سنبھالی۔ مجھے اور مادھوری کو برابر والی سیٹ پر جگہ ملی۔ میڈم کی ہوشربا ڈرائیونگ کا مزا میں ایک بار پہلے بھی چکھ چکا تھا لیکن وہ میدانی علاقہ تھا۔ اس کوہستانی علاقے میں جب اس نے جیپ کو ہوا کی رفتار سے دوڑانا شروع کیا تو مادھوری کی چیخیں نکل گئیں۔ میں اپنی مردانگی اور بہادری کا بھرم رکھنے کی خاطر خاموش تھا ورنہ حقیقت یہ تھی کہ اس خطرناک ڈرائیونگ کے نتیجے میں نہ صرف ہم لوگ بے تحاشا اُچھل رہے تھے بلکہ کسی وقت بھی خوفناک

حادثے سے دوچار ہو سکتے تھے۔

میڈم انتہائی پُرسکون تھی بلکہ مادھوری کا مذاق اُڑا رہی تھی اور زور زور سے قہقہے لگا رہی تھی۔ اس کی بے خوفی اور بے جگری واقعی قابل داد تھی اور اسکی ڈرائیونگ کی مہارت کو تسلیم نہ کرنا بھی زیادتی ہوگی۔ مجھے سب سے بڑی مشکل یہ پیش آ رہی تھی کہ جیپ کے بے تحاشہ اُچھلنے اور مسلسل جھٹکے کھانے کی بنا پر میں سکون اور یکسوئی کے ساتھ آس پاس کے مناظر اور مقامات کا بغور جائزہ نہیں لے سکتا تھا۔ پھر بھی راستے کو اپنے ذہن میں محفوظ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

تقریباً نصف گھنٹے کی ڈرائیونگ کے بعد مجھے بائیں جانب بیرکس کی عمارت کا سلسلہ نظر آنے لگا جسے اسلحہ اور گولہ بارود کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ عمارتیں سڑک سے تین چار سو گز کے فاصلے پر تھیں اور درمیان میں خاردار تار بھی لگا ہوا تھا۔ مزید حفاظت کے خیال سے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اونچی چوٹیوں پر محافظوں کے لیے چوکیاں بھی بنی ہوئی تھیں۔ بظاہر ان چوکیوں میں جو لوگ بیٹھے ہوئے نظر آ رہے تھے وہ سادہ لباس میں تھے اور دور سے دیکھنے پر ان کے ہتھیار بھی نہیں دیکھے جا سکتے تھے مگر حقیقت یہ تھی کہ وہ سب انتہائی فوجی تربیت یافتہ لوگ تھے اور یقیناً جدید ترین اسلحے سے لیس بھی ہوں گے۔

مادھوری کی چیخوں اور میڈم کے قہقہوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور اس موقعے سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے میں بیرکس کی عمارتوں اور ارد گرد کے علاقے کا بغور جائزہ لینے کے قابل ہو گیا تھا۔ اس تمام علاقے کو ایک باقاعدہ اور مستحکم فوجی چھاؤنی کی حیثیت حاصل تھی۔ مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ یہ قانون کے دُشمن کس قدر آزادی اور سہولت کے ساتھ وطنِ عزیز کی سرزمین کے اندر اپنی وطن دشمن سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ اتنے بڑے پیمانے پر فوجی تیاریوں کے باوجود کسی کو ان کے بارے میں علم نہیں تھا۔ یا اگر تھا تو ان کو جان بوجھ کر نظر انداز کیا جا رہا تھا ورنہ ان کی حیثیت ریاست کے اندر ایک ریاست کی سی تھی۔ انہوں نے اپنی مسلح فوج بنا رکھی تھی۔ ان کے پاس ہر قسم کے اسلحہ کا بہت بڑا ذخیرہ موجود تھا جسے خود استعمال کرنے کے علاوہ مہنگے داموں وطن دشمن سرگرمیوں میں موجود عناصر کو بھی فراہم کیا جا رہا تھا۔ میں حیرت کے سمندر میں ڈوب کر رہ گیا تھا۔

یکایک ایک زوردار جھٹکے سے جیپ رُک گئی اور میرا سر چھت سے ٹکرایا۔ اس کے ساتھ ہی میں اپنے خیالوں اور سوچوں کی دُنیا سے باہر نکل آیا۔ مادھوری جھٹکے سے باہر جا پڑی تھی اور پتھریلی زمین پر اوندھی پڑی تھی لیکن میڈم اس سے اظہار ہمدردی کرنے کی بجائے اسے دیکھ کر خوشی کے مارے چیخیں مار رہی تھیں۔ میں نے جیپ سے باہر کود کر مادھوری کو سہارا دے کر اُٹھانے کی کوشش کی تو وہ بے اختیار لپٹ کر رونے لگی۔ میں نے جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ اسے بہت زیادہ چوٹ تو نہیں آئی لیکن کہنیاں اور گھٹنے ضرور چھل گئے تھے اور ان سے خون رس رہا تھا۔ اس کا لباس بھی خاک آلودہ ہو گیا تھا۔ وہ بُری طرح خوفزدہ اور سہمی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ میڈم بھی اس دوران میں جیپ سے نکل کر ہمارے پاس آ گئی اور پہلی بار اس نے سنجیدگی سے مادھوری کے خوفزدہ چہرے اور زخمی جسم کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر ندامت یا پشیمانی کا کوئی تاثر نہیں تھا بلکہ وہ اُلٹا مادھوری کو الزام دے رہی تھی۔

"ڈیم فول۔ تمہیں جیپ میں بیٹھنا بھی نہیں آتا۔ اچھا چلو اب وقت ضائع مت کرو۔ ہم جھیل میں سوئمنگ کریں گے۔" اس کی بے حسی اور بے پروائی حیرت انگیز تھی مگر میرے لیے یہ کوئی نیا تجربہ نہیں تھا۔ مادھوری منہ بسورتی ہوئی اُٹھ کر کھڑی ہو گئی اور لنگڑاتی ہوئی آہستہ آہستہ چلنے کی کوشش میں مصروف تھی۔

میڈم نے معنی خیز انداز میں اسے دیکھا اور پھر مجھ سے کہنے لگی "تم بھی پورے ڈیم فول ہو۔ سمجھتے کیوں نہیں ہو۔ وہ تمہارے سہارے کی طلب گار ہے"۔

مادھوری نے گھور کر میڈم کو دیکھا مگر وہ واقعی سہارے کی محتاج تھی۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا جسے تھام کر وہ لنگڑاتی ہوئی میرے ساتھ چلنے لگی۔ میڈم پر ایک عجیب سی خوشی کی کیفیت طاری تھی۔ وہ بے تحاشا دوڑتی ہوئی جھیل کی جانب بڑھی اور اپنے اردگرد نظر ڈالے بغیر اس نے جھیل کے نیلگوں پانی میں چھلانگ لگا دی۔ ہم دونوں حیران ہو کر اسے دیکھتے رہے اور وہ کسی جل پری کی مانند تیرتی اور چھینٹے اڑاتی رہی وہ بار بار مجھے اور مادھوری کو بھی جھیل میں نہانے کی دعوت دے رہی تھی مگر میرا کوئی ایسا ارادہ نہیں تھا جبکہ مادھوری اپنی تکلیف کی وجہ سے مجبور تھی۔ وہ آہستگی سے چلتی ہوئی ایک چھوٹے سے ٹیلے پر بیٹھ گئی اور میں نے بھی اسی طرف کا رخ کیا۔ میڈم ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو چکی تھی مگر اس کے ہنسنے اور چلانے کی آوازیں بدستور ہمارے کانوں میں آ رہی تھیں۔ میں نے اس سے پہلے کبھی میڈم کو ایسے موڈ میں نہیں دیکھا تھا۔

"معلوم ہوتا ہے یہ پاگل ہو گئی ہے"۔ مادھوری نے دانت پیس کر کہا

"مگر کیوں؟ یہ کس بات سے اتنی خوش ہے؟" میں نے پوچھا۔

"شاید ان بہت سے انسانوں کے مرنے کی وجہ سے"۔ مادھوری نے تلخی سے کہا۔ "میں نے ہمیشہ یہی دیکھا ہے کہ قتل و خون اور ہلاکت دیکھ کر اسے بہت خوشی ہوتی ہے۔ اس کے سینے میں دل تو ہے ہی نہیں"۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میرا ذہن دوسرے منصوبوں کی جانب مرکوز تھا اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس قدر سخت احتیاطی تدابیر کے بعد میں اپنے مقصد میں کیوں کر کامیاب ہو پاؤں گا؟

یکایک ایک گولی چلنے کی آواز فضا میں گونجی اور ساتھ ہی ایک چیخ بلند ہوئی۔ یہ ایک زنانہ چیخ کی آواز تھی اور صاف ظاہر تھا یہ میڈم کے علاوہ کسی اور کی آواز نہیں تھی۔ میں تیزی سے لپک کر ٹیلے کی دوسری جانب پہنچا کچھ فاصلے پر جھیل میں میڈم کا کوئی وجود نہیں تھا۔ پانی کے تموج سے ایسا ضرور ظاہر ہوتا تھا کہ وہ زیر آب چلی گئی ہے مگر کیا وہ زندہ تھی یا مر چکی تھی؟ میں جھیل کی طرف بڑھنے لگا مگر اس وقت ایک گولی سنسناتی ہوئی میرے پاس سے گزر گئی۔ اگر میں سر جھکا کر زمین پر نہ گر گیا ہوتا تو شاید وہ گولی میرے دماغ میں پیوست ہو چکی ہوتی۔ اتفاق سے میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ جیپ کے اندر بھی کوئی اسلحہ موجود تھا یا نہیں؟ اچانک میں ایک پریشان کن صورتِ حال کا شکار ہو گیا تھا۔ لیکن اپنی جگہ پر ٹھہرے رہنا بھی میرے لیے موت کا پیغام ثابت ہو سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے انتہائی تیزی سے زمین پر لوٹ لگائی اور قلابازیاں کھاتا ہوا ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں پہنچ گیا۔ اگر مجھے حرکت کرنے میں چند لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو میرا جسم گولیوں سے چھلنی ہو چکا ہوتا، لیکن کسی خودکار رائفل سے نکلنے والی گولیاں پتھریلی زمین سے ٹکرا کر شعلے اڑا کر رہ گئی تھیں۔ لیکن میں اس کے باوجود محفوظ نہیں تھا۔ مجھے پتھر کے پیچھے عارضی پناہ ضرور مل گئی تھی مگر یہ جگہ میرے لیے مستقل پناہ گاہ ثابت نہیں ہو سکتی تھی۔ مجھے یہ بھی علم نہیں تھا کہ میرے دشمنوں کی تعداد کتنی ہے؟ وہ صرف ایک شخص تھا یا ایک سے زیادہ لوگ۔ تھے اور ان کا اس فائرنگ سے مقصد کیا تھا۔

یہ تو صاف ظاہر تھا کہ وہ میرے ہی نہیں میڈم وغیرہ کے دوست اور حلیف بھی نہیں ہو سکتے تھے۔ ورنہ میڈم پر فائرنگ نہ کرتے۔ پھر میں نے [illegible] فاصلے پر ایک آہٹ سنی اور بہت سے پتھر لڑھکتے ہوئے نیچے گہرائیوں میں چلے گئے۔ گویا حملہ آور اس بلند جگہ پر ہماری گھات میں موجود تھے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ مجھے کم از کم حملہ آور کی پوزیشن معلوم ہو گئی۔ میں نے مخالف سمت میں ایک اور ٹیلے کے عقب میں پناہ لینے کے ارادے سے تیزی سے دوڑ

لگائی اور اپنی منزل پر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی گولیوں کی ایک بوچھاڑ نے میرا تعاقب کیا۔ میں فوری طور پر اس فائرنگ کی زد میں نہیں تھا اس لیے خاموش اپنی جگہ چھپا ہوا بیٹھا رہا اور پھر دوسرے لمحے میں نے سرخ قمیص اور نیلی جینز میں ملبوس ایک قد آور آدمی کو بلندی پر ٹیلے کی آڑ سے برآمد ہوتے دیکھ لیا۔ اس کے ہاتھ میں آٹومیٹک رائفل تھی اور وہ بالکل تنہا تھا۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی اور پھر تیزی سے نیچے ڈھلانی علاقے کی طرف بڑھا۔ اس کی اتنی زیادہ بڑھی ہوئی خود اعتمادی کا ایک سبب غالباً یہ بھی تھا کہ اسے جوابی فائر کی عدم موجودگی کے باعث یقین ہو چکا تھا کہ ہم میں سے کسی کے پاس اسلحہ موجود نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی بے باکی اور بے پروائی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور وہ کھلے عام ہمارے شکار کے لیے بے خوفی سے باہر نکل کر آ چکا تھا اور جہاں تک اسلحہ کا تعلق ہے اس کا اندازہ غالباً درست بھی تھا۔ کیونکہ میں کسی قسم کا ہتھیار اپنے ساتھ نہیں لایا تھا جسے میری ضرورت سے زیادہ بڑھی ہوئی خود اعتمادی یا حماقت کا نام ہی دیا جا سکتا ہے۔

میں نے پتھروں اور ٹیلوں کی آڑ میں آہستہ آہستہ مخالف سمت میں کھسکنا شروع کر دیا تھا۔ ابھی تک میں نے صرف ایک ہی آدمی کو دیکھا تھا اور کسی دوسرے فائر کی آواز بھی نہیں سنی تھی اس کے باوجود میں احتیاط کے طور پر رسک لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اور یہ امکان میں نے بالکل مسترد نہیں کیا تھا کہ کوئی دوسرا شخص بھی اس جگہ موجود ہے۔ میں نے آہستگی سے حرکت کرنے کے دوران — اپنی نگاہ سے اس شخص کو ایک لمحے کے لیے بھی اوجھل نہیں ہونے دیا تھا۔ زیادہ فاصلے کی وجہ سے میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن اس کا سراپا میرے سامنے تھا اور وہ پھرتی اور مستعدی کا مجسمہ نظر آ رہا تھا۔ جھیل کی جانب سے میری توجہ بالکل ہٹ چکی تھی اس لیے میں نے پلٹ کر مادھوری کی طرف دیکھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی۔ یقیناً وہ بھی اس نازک موقعے پر کسی محفوظ جگہ پہنچنے میں کامیاب ہو چکی ہو گی۔ جہاں تک مادھوری کا تعلق تھا میرے اندازے اور مشاہدے کے مطابق وہ ایک خوبصورت اور نازک اندام عورت تھی جس میں کرختگی یا جنگجوئی کا شائبہ تک نہیں تھا جب کہ اس کے مقابلے میں میڈم اپنے تمام تر حسن و جمال کے باوجود ایک جیدار اور نڈر عورت ثابت ہو چکی تھی۔ وہ جس قدر نرم و ملائم تھی وقت آنے پر میں نے اس کو اسی قدر زیادہ پتھر دل اور ظالم بھی پایا تھا۔ پھر وہ اپنے پیشے اور کاروبار کی ضرورت کے پیش نظر عموماً اپنے پاس پستول وغیرہ بھی رکھا کرتی تھی۔ یہ اور بات تھی کہ اس روز وہ بھی میری طرح احتیاطی تدابیر کو نظر انداز کر کے چلی آئی تھی۔ میں نے حملہ آور کی طرف نظر دوڑائی۔ وہ غالباً میری موجودگی سے اب تک بے خبر تھا کیونکہ ایک بار پھر میں نے اس کو جھیل کی جانب متوجہ پایا تھا۔ اس کی نگاہیں جھیل کے پرسکون پانی کا جائزہ لے رہی تھیں۔ کچھ دیر پہلے میں نے اس جھیل کے نیلگوں پانی میں میڈم کو ایک جل پری کی مانند تیرتے اور اٹھکیلیاں کرتے ہوئے دیکھا تھا لیکن اس کے بعد پھر اس پر کیا گزری یہ مجھے معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ فائرنگ کی آواز میں نے بھی سنی تھی اور پھر جھیل کو میڈم کے حسین وجود سے خالی پایا تھا۔ وہ زخمی یا ہلاک ہو کر ڈوب چکی تھی یا کسی محفوظ مقام پر چھپ گئی تھی؟ اس بارے میں مجھے مطلق کوئی اندازہ نہیں تھا لیکن مجھے یہ حیرانی ضرور تھی کہ حملہ آور جو کوئی بھی شخص تھا اسے ایک غسل کرتی اور تیرتی ہوئی نازک اندام عورت کو گولیوں کا نشانہ بنانے کی کیا ضرورت تھی؟

یکایک میں نے جھیل کے ساکن پانی کی سطح میں ہلچل پیدا ہوتے ہوئے دیکھی اور پھر دوسرے ہی لمحے میڈم کا سر پانی کی سطح سے بلند ہوا۔ وہ کافی دیر تک پانی کے اندر غوطہ زن رہی تھی اور اس کی یہ صلاحیت اس سے پہلے میرے علم میں نہیں آئی تھی۔ کوئی ماہر پیراک اور غوطہ زن ہی اتنی دیر تک دم سادھے پانی کے اندر رہنے کا مظاہرہ کر سکتا ہے اور میڈم کی غوطہ زنی کی صلاحیت واقعی قابلِ تعریف تھی۔ میں یہ جاننے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھا کہ کیا فائرنگ سے وہ زخمی ہو چکی تھی یا محض جان بچانے کی خاطر زیر آب چلی گئی تھی۔ میڈم ابھی پانی سے باہر سر نکال کر اپنے بالوں کو

کسی خوبصورت بھیگے ہوئے پرندے کی مانند جھٹک ہی رہی تھی کہ حملہ آور کی نگاہوں نے بھی اسے تاڑ لیا۔ اس کا پستول بلند ہوا اور پے در پے فائر کی دو آوازیں فضا میں گونجیں۔ اس کے ساتھ ہی میں نے میڈم کی چیخ کی آواز سنی۔ اس بار گولیاں یا کم از کم ایک گولی اپنے ہدف تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ اس ناگہانی آفت نے میڈم کو بوکھلا دیا تھا۔ اسے دوبارہ غوطہ کھانے کا خیال تک نہیں آسکا تھا یا پھر حملہ آور نے اسے اس بات کا موقعہ ہی نہیں دیا تھا کیونکہ دوسرے ہی لمحے میں نے حملہ آور کو پانی میں چھلانگ لگاتے ہوئے دیکھا۔ وہ جھیل میں میڈم کے نزدیک جاکر گرا تھا اور اس سے پہلے کہ میڈم سنبھل سکتی وہ تیزی سے تیرتا ہوا میڈم کے نزدیک پہنچ گیا تھا۔ میڈم نے اسے دیکھ کر ایک اور چیخ ماری تھی اور پانی کے اندر جانے کا ارادہ کیا لیکن حملہ آور نے میڈم کو اس کی مہلت نہیں دی۔ وہ ایک بھوکے باز کی مانند اس پر ٹوٹ پڑا اور ان دونوں کے مابین جھیل کے اندر کشمکش اور زور آزمائی شروع ہوگئی۔

میں میڈم کی جسمانی قوت اور لڑائی کی صلاحیتوں سے واقف تھا۔ وہ ایک طاقتور مرد کا بڑی بے جگری سے مقابلہ کر رہی تھی۔ حملہ آور کی کوشش یہ تھی کہ اس کی گردن کو اپنے ہاتھوں کے شکنجے میں کس لے اور میڈم اس کے خلاف پوری قوت سے جدوجہد کر رہی تھی۔ یکایک فضا میں ایک اور فائر کی آواز گونجی۔ میرے ساتھ ہی اُن دونوں نے بھی پلٹ کر دیکھا۔ جھیل کے ایک قدرے بلند کنارے پر مادھوری ایک چھوٹا سا پستول لیے ہوئے کھڑی تھی۔

میں اتنی دیر تک مادھوری کو بھولا ہوا تھا اور مجھے اس کے مسلح ہونے کا بھی یقین نہیں تھا۔ وہ اتنی دیر تک خاموش اور بے عمل کیوں رہی تھی اور اس نے اس سے بیشتر پستول کا استعمال کیوں نہیں کیا تھا؟ یہ جاننے کا میرے پاس نہ کوئی ذریعہ تھا اور نہ ہی وقت اور موقعہ۔ لیکن اب وہ میری نگاہوں کے سامنے پستول تانے ہوئے کھڑی تھی۔ اس کے پستول کی دونوں گولیوں نے میڈم اور حملہ آور کے نزدیک پانی میں چھینٹیں اڑانے کے سوا اور کچھ نہیں کیا تھا۔ میڈم نے اس سے مزید حوصلہ پاکر اپنی جدوجہد میں اضافہ کر دیا تھا لیکن اب حملہ آور میڈم کی گردن کو اپنی گرفت میں لینے میں کامیاب ہوچکا تھا۔ وہ دونوں پانی میں گتھم گتھا ہو رہے تھے اور اس لڑائی میں اتنی تیزی آچکی تھی کہ مادھوری کے لیے یہ ممکن نہیں رہا تھا کہ میڈم کو محفوظ رکھتے ہوئے حملہ آور کو گولی کا نشانہ بنا سکے۔ اس اثنا میں میڈم کے زخمی جسم سے نکلنے والے خون نے ان دونوں کے آس پاس پانی کو گلابی کر دیا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا میڈم کی جدوجہد کمزور پڑتی جا رہی تھی۔ اس نے حملہ آور کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش میں اپنے زخمی وجود کی تمام قوت صرف کر دی تھی لیکن اس کی گرفت سے آزاد ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ یہاں تک کہ اس کی جدوجہد اور کشمکش رفتہ رفتہ بالکل معدوم ہوگئی۔ حملہ آور نے اس کا جسم ساکت ہوجانے کے بعد بھی اپنی گرفت کو ہلکا نہیں کیا تھا۔ غالباً وہ میڈم کو زندہ رہنے کا ایک موہوم موقعہ تک نہیں دینا چاہتا تھا۔ کچھ دیر بعد میڈم کا جسم بالکل ساکت ہوگیا۔ حملہ آور نے غصے اور نفرت سے اسے دیکھا اور پانی میں دُور دھکیل دیا۔

میں جھیل کے نیلے پانی کی سطح پر میڈم کے بے جان جسم کو ایک کھلونے کی مانند تیرتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ شاید میری طرح مادھوری بھی اس خلافِ توقع اور اچانک ڈرامائی واقعے سے مبہوت اور حیرت زدہ ہو کر رہ گئی تھی اور خوف، حیرت اور بے یقینی کی آنکھیں پھاڑے ہوئے اُس خونی ڈرامے کا آخری منظر دیکھنے میں مصروف تھی جو ہماری آنکھوں کے سامنے کچھ دیر پہلے رونما ہوچکا تھا۔ یکایک اسے ہوش آیا اور اُس نے اپنے ہاتھ کو حرکت دی۔ اس کے پستول سے پے در پے تین گولیاں نکلیں جن میں سے دو گولیاں حملہ آور کے جسم میں پیوست ہوگئیں۔ وہ کسی شکار ہونے والی مجروح مچھلی کی طرح پانی میں اُچھلا اور پھر بے حس و حرکت ہوگیا۔ غالباً مادھوری کی گولی صحیح مقام پر جا لگی تھی۔ جس نے چند لمحوں میں قاتل کا کام تمام کر دیا تھا۔ اب ہماری نگاہوں کے سامنے ایک کی بجائے دو لاشیں پانی کی سطح پر تیرتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ مادھوری بھاگتی ہوئی میرے پاس آئی اور میرا بازو جھنجھوڑ کر بولی "دیکھ کیا رہے ہو لوٹنی۔ اس کی

لاش کو نکالو۔"

میں یکایک چونک کر اپنے بے نام خیالوں سے آزاد ہوگیا اور میں نے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ اس وقت قاتل اور مقتول دونوں کی لاشیں پہلو بہ پہلو بے حرکت پڑی ہوئی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے دو تیراک پانی میں پیراکی کی مشقت سے تھک کر تھوڑی دیر سستانے کی غرض سے خاموش اور ساکت پانی کی سطح پر دراز ہیں۔ میں چند سٹروکس کے بعد ہی اُن دونوں کے نزدیک پہنچ گیا۔ میری نظر حملہ آور کے چہرے پر پڑی تو میں چونک گیا اور میڈم کے خلاف اس کی نفرت کا سبب میری سمجھ میں آگیا۔ یہ وہی مظلوم اور بے بس قیدی تھا جسے میں نے کسی زمانے میں میڈم کے گھر میں دیکھا تھا۔ وہ میڈم کا کارندہ تھا لیکن جب اُس کی نوجوان بہن کو میڈم کے ملازمین نے ہوس کا نشانہ بنایا تو آگ بگولہ ہو کر ان پر ٹوٹ پڑا تھا جس کے نتیجے میں انھوں نے اس پر میڈم کی تنظیم کے خلاف مخبری کے الزامات عائد کر کے اسے میڈم کے سامنے ایک مخبر، غدار اور چور کے طور پر پیش کیا تھا۔ یہ اس وقت کا ذکر ہے جب میں محض یوسف ہی تھا اور ایک کاروباری معاہدے پر دستخط کرنے کی غرض سے دوسرے شہر میں گیا تھا جہاں میرے دوست اور پارٹنر شوکت کو بھی پروگرام کے مطابق معاہدے پر دستخط کرنے کی غرض سے پہنچنا تھا لیکن وہ نہیں پہنچا تھا۔ اس اثناء میں مجھے پُراسرار طور پر اغوا کر لیا گیا اور میڈم کے ٹھکانے پر پہنچا دیا گیا۔ میڈم مجھے لوٹنی سمجھ کر میرے ساتھ کاروباری معاہدہ کرنے کی خواہش مند تھی۔ وہ مجھے اپنا دستِ راست، کاروباری حلیف اور زندگی کا ساتھی تک بنانے پر آمادہ ہوگئی تھی لیکن مجھے اس وقت تک یہ بھی معلوم نہیں ہوا تھا کہ لوٹنی نامی کوئی مجرم میرا ہمشکل بھی تھا اور میڈم غلط فہمی میں مجھے لوٹنی سمجھ رہی تھی۔ وہیں میڈم کے عشرت کدے میں پہلی بار میں نے اس شخص کو دیکھا تھا۔ جو اس وقت میڈم کا قیدی تھا۔ میرے دیکھتے دیکھتے میڈم نے بڑی بے دردی سے جلتا ہوا سگار اس کے بازو پر مسل کر بجھا دیا تھا۔ اس کے علاوہ بھی اسے تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ اب اسے ایک عرصے بعد دوبارہ اس حالت میں اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھا تو گذشتہ واقعات ایک فلم کی طرح میری نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے۔ خدا جانے وہ کب اور کس طرح میڈم کے عقوبت خانے سے فرار ہونے میں کامیاب ہوچکا تھا اور انتقام لینے کی غرض سے میڈم کی تاک میں لگا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ اسے اپنی انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کا موقعہ مل گیا تھا۔

میں خاموش اس کے مردہ چہرے کو تکتے ہوئے، گزرے ہوئے واقعات کو اپنے ذہن میں تازہ کر رہا تھا کہ مادھوری کی آواز میرے کانوں میں گونجی۔ "دیکھ کیا رہے ہو اسے باہر لے آؤ نا۔"

میں نے چونک کر دیکھا تو میڈم کی لاش تیرتی ہوئی کسی قدر فاصلے پر چلی گئی تھی۔ میں نے اس کے پاس جاکر اس کی ٹانگ کو تھام لیا اور پھر تیرتا ہوا کنارے کی طرف چلا جہاں مادھوری بے تابی سے میری منتظر تھی۔ میڈم کے زخمی بازو اور پیٹ سے خون بہنا اب قریب قریب بند ہو چکا تھا۔ وہ اپنے تمام تر غرور، اختیار اور بے پناہ دولت کے باوجود اس وقت ایک بے جان اور بے بس لاشے کی صورت میں ہمارے سامنے پڑی ہوئی تھی۔ وہ ایک طرحدار، دلکش اور ذہین عورت تھی جو اگر اپنی صلاحیتوں کو بھلائی اور ترقی کے کاموں میں لگاتی تو بہت کارنامے سرانجام دے سکتی تھی مگر افسوس کہ وہ گناہ اور جرم کی دلدل میں پھنس کر رہ گئی اور بالآخر اپنے انجام کو پہنچ گئی۔

مادھوری بہت پریشان اور غمگین تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ وہ بار بار مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ وہ کون شخص تھا جس نے میڈم کو قتل کیا تھا اور اس کا مقصد کیا تھا؟ میں سب کچھ جاننے کے باوجود خاموش اور انجان تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔

"قاتل کی لاش بھی لے آؤ۔ ہمیں اس کی شناخت کرنی ہوگی تاکہ اس کے جرم کی وجہ جان سکیں۔ یہ ضرور کوئی

خطرناک سازش ہے۔"

میں نے کہا۔ "مادھوری۔ بچوں جیسی باتیں مت کرو۔ سازش کا کیا سوال ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ کوئی میڈم کا ذاتی دشمن تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے ہم دونوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دی اور محض میڈم ہی کو ہلاک کرنے کی کوشش کی۔ ہوسکتا ہے وہ میڈم کا کوئی کاروباری رقیب یا پُرانا شناسا ہو جو میڈم کی بے وفائی کا شکار ہوچکا ہو۔"

اتنی دیر میں اس شخص کی لاش ہماری نظروں سے قریب قریب اوجھل ہوچکی تھی۔ میں نے کہا۔ "اب اُسے واپس لانا آسان کام نہ ہوگا اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آس پاس ہی اس کے کچھ اور ساتھی بھی موجود ہوں اور اسے تلاش کرتے ہوئے یہاں آجائیں۔ ایسی صورت میں ہماری جانیں بھی خطرے میں پڑجائیں گی۔"

یہ بات مادھوری کی سمجھ میں آگئی اور اس نے قاتل کی لاش کو قابو میں کرنے پر اصرار ترک کردیا۔ ہم دونوں نے میڈم کی لاش کو اُٹھا کر جیپ کے پچھلے حصّے میں ڈال دیا اور میں نے سٹیرنگ سنبھالا۔ راستہ زیادہ پیچیدہ نہیں تھا اور کیونکہ میں بیرکس کے محلِ وقوع کے بارے میں جاننا چاہتا تھا اس لیے اور بھی زیادہ غور اور توجہ سے مشاہدہ کیا تھا۔ کچھ دیر بعد ہم بیرکس کے سامنے سے گزرنے لگے تو میں نے جیپ روک دی اور اس کے انجن میں خرابی کے بہانے بونٹ کھول کر اردگرد کا بغور جائزہ لینا شروع کردیا۔ میرے پہلے اندازے کے مطابق یہاں حفاظت کا مکمل انتظام کیا گیا تھا۔ نہ صرف خاردار تار لگا کر آس پاس کے علاقے کو محفوظ تر بنا دیا گیا تھا بلکہ جگہ جگہ مسلح محافظوں کے لیے چوکیاں بھی بنی ہوئی تھیں جہاں سے وہ فوجیوں کی طرح چوکسی سے حفاظت کے فرائض سرانجام دیا کرتے تھے۔ مجھے حیرت تھی کہ ملک کے ایک حصے میں جرائم پیشہ اور قانون شکن گروہوں نے اس قدر قوت حاصل کرلی تھی اور وہ اپنی من مانی کارروائیاں کرنے کے لیے مکمل طور پر آزاد تھے۔ میرا ذہن ان سوچوں میں گم تھا جب کہ میری نگاہیں کچھ فاصلے پر واقع بیرکس کے گردو نواح کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔ یکایک ایک ہلکی سی آہٹ ہوئی اور پھر ایک نوکدار چیز میری کمر میں پیوست ہوگئی۔

"خبردار۔" کسی نے کرخت لہجے میں کہا۔ "ہاتھ اُوپر اُٹھالو۔"

میں نے خاموشی سے حکم کی تعمیل کی۔ میرے عقب میں کھڑا ہوا شخص آہستگی سے میرے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ وہ ایک بلند قامت اور مضبوط جسم کا وردی پوش آدمی تھا جو خودکار رائفل کی نالی میرے پیٹ سے لگائے ہوئے کھڑا مجھے خونخوار نظروں سے گھور رہا تھا۔ "کون ہو تم؟" وہ غرّایا۔ "اِدھر کیا کررہے ہو؟"

میں نے بے پروائی سے اس کو دیکھا اور کہا۔ "تم کون ہو اور یہاں کیا کررہے ہو؟ تم نے رانا صاحب کے مہمانوں کی بے عزتی کی ہے۔"

اس کا چہرہ قدرے نرم ہوگیا۔ "تم رانا صاحب کے مہمان ہو؟"

"ظاہر ہے۔" میں نے کہا۔ "تم رانا صاحب کی جیپ نہیں پہچانتے۔ یہ میرے ساتھ ایک عدد مہمان بھی بیٹھی ہوئی ہیں۔" میں نے مادھوری کی طرف اشارہ کیا۔

اس نے گہری نظروں سے مادھوری کو دیکھا اور پھر گھوم کر جیپ کے عقب میں چلا گیا مگر اس کی رائفل کا رُخ بدستور میری جانب تھا اور ٹریگر پر اس کی اُنگلی جمی ہوئی تھی۔ "یہ کیا ہے؟" اس نے میڈم کی لاش کو دیکھ کر مشکوک انداز میں پوچھا۔

"یہ بھی رانا صاحب کی مہمان ہیں، میرا مطلب ہے مہمان تھیں۔"

اس کے چہرے پر ایک بار پھر کرختگی کے آثار نمودار ہوگئے تھے۔ "کیا بول رہے ہو؟ یہ تو لاش ہے۔"

"اس لیے تو کہا ہے کہ یہ پہلے مہمان تھیں اب دوسرے جہان میں پہنچ گئی ہیں۔"

"اسے کس نے مارا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"جھیل پر ایک آدمی نے انھیں ہلاک کردیا تھا۔" میں نے مادھوری کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "انھوں نے اپنے پستول سے گولی چلا کر اس کو مار دیا اور اس کی لاش جھیل میں غائب ہوگئی۔ اب ہم یہ لاش لے کر رانا صاحب کے گیسٹ ہاؤس جارہے ہیں۔"

وہ بے یقینی اور بے اعتباری سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میرا بیان اسے ایک من گھڑت داستان لگ رہا تھا اور وہ اپنے اس قیاس میں حق بجانب بھی تھا۔ اس کی مستعدی اور پھرتی قابلِ تعریف تھی کیونکہ وہ میری لاعلمی میں کسی درخت پر سے کود کر میرے عقب میں آکر کھڑا ہوگیا تھا اور مجھے خبر تک نہیں لگی تھی۔

"یہ تو گڑبڑ ہے۔" وہ بڑبڑایا۔ "تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔"

"کہاں؟"

"میرے ساتھ۔" اس نے ڈانٹ کر کہا۔

میں نے سختی سے کہا۔ "دیکھو مسٹر۔ زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش مت کرو۔ یاد رکھو۔ تم رانا صاحب کے مہمانوں کی بے عزتی کررہے ہو اور اسکا انجام شاید تم جانتے ہوگے۔"

"مگر تمہاری باتوں کا مجھے یقین نہیں ہے۔"

"تو پھر میں کیا کرسکتا ہوں۔" میں نے بے پروائی سے شانے ہلائے۔ "مگر میرا مشورہ یہ ہے کہ تم مجھے رانا صاحب کے پاس ہی لے چلو ورنہ بہت بڑی مشکل میں پھنس جاؤ گے۔"

اس نے ایک لمحے سوچا۔ پھر سیٹی بجائی۔ ایک نزدیکی درخت کے موٹے سے تنے کی اوٹ سے ایک اور مسلح پہریدار نکل کر ہمارے سامنے آگیا۔

"چلو میرے ساتھ۔" اس نے مجھ سے کہا اور اس شخص کو جیپ میں سوار ہونے کا اشارہ کیا۔ میرے ساتھ ہی وہ خود بھی جیپ میں سوار ہوگیا اور اس طرح ہمارا یہ مختصر قافلہ رانا کے گیسٹ ہاؤس کی جانب روانہ ہوگیا۔ مادھوری بہت بیزاری اور پریشانی سے یہ سب دیکھ رہی تھی۔ دوسرے محافظ نے میڈم کی لاش پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالی اور پھر یوں بیٹھ گیا جیسے کوئی غیر معمولی بات ہی رونما نہ ہوئی ہو۔ وہ بڑے اطمینان سے جیپ کی ایک سیٹ پر ٹک گیا تھا۔

باقی راستہ خاموشی سے گزرا یہاں تک کہ ہم عمارت تک پہنچ گئے۔ میں نے برآمدے سے گزر کر ہال کمرے کا رُخ کیا تو مادھوری اور محافظ ہمارے ساتھ تھے جبکہ دوسرا آدمی جیپ کے پاس ہی کھڑا ہوگیا تھا۔ میں نے ایک گزرتے ہوئے پہریدار سے کہا۔ "رانا صاحب کہاں ہیں؟ ہمیں فوراً ان کے پاس لے چلو۔"

وہ خاموشی سے ہمارے آگے چلنے لگا۔ رانا ایک عقبی آرام گاہ میں موجود تھا۔ اتفاق سے راؤ صاحب بھی وہیں موجود تھے۔ مجھے دیکھا تو دونوں کے چہروں پر رونق آگئی۔ "ارے بھئی تم کہاں غائب ہوگئے تھے۔ ہم لوگ تو بہت پریشان تھے۔"

میں نے کہا۔ "پہلے تو آپ اپنے پہریدار کو یہ بتا دیں کہ میں واقعی آپ کا مہمان ہوں اور مادھوری بھی آپ کی مہمان ہے۔"

رانا نے ناگواری سے محافظ کو دیکھا۔ "ٹھیک ہے ٹھیک ہے تم جاؤ۔" وہ خاصا پریشان نظر آرہا تھا۔ خاموشی سے پلٹ کر چلا گیا۔

میں نے کہا۔ "باہر جیپ میں میڈم کی لاش موجود ہے۔ اب اس کا بھی کوئی بندوبست کرا دیں۔"

وہ دونوں چونک کر مجھے دیکھنے لگے۔ میں نے مختصر طور پر انھیں تمام واقعہ سنایا۔ مگر یہ نہیں بتایا کہ حملہ آور کون تھا اور یہ کہ میں نے اُسے پہچان لیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ محض ذاتی دُشمنی کا شاخسانہ تھا مگر میں رانا اور راؤ پہ مطلوبہ تاثر قائم کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ وہ دونوں بے حد پریشان نظر آ رہے تھے۔

" رانا صاحب! میں نے تو پہلے ہی بولا تھا۔ ادھر بہت گڑبڑ اور چکر ہے، بہت خطرہ ہے۔ ہم سب بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہو گئے ہیں۔" راؤ صاحب انتہائی خوفزدہ اور گھبرائے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

" دیکھو نا۔ ہر طرف سے بُری خبریں آ رہی ہیں۔ نہ بابا۔ اب ہم اِدھر نہیں ٹھہریں گے۔ مادھوری۔ چلو۔ ہم لوگ ابھی واپس جا رہے ہیں۔" وہ تیزی سے پلٹ کر جانے لگا۔

" رکیے راؤ صاحب۔ میری بات تو سنئے۔" رانا نے اس کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "تھوڑی دیر میں اصل بات معلوم ہو جائے گی۔"

"کیا بات معلوم ہو گی۔ ارے بابا ابھی تک تو کوئی بات بھی معلوم نہیں ہوئی ہے۔ پہلے دو آدمی اُدھر جنگل میں کام آ گئے۔ کسی کو پتہ نہیں چلا۔ پھر کلب میں اتنے آدمی مارے گئے۔ کوئی بھید نہیں کھلا۔ اب میڈم کو کسی نے مار دیا ہے اور آپ کہتے ہیں تھوڑی دیر میں اصل بات معلوم ہو جائے گی۔ نہ بابا۔ نہ ہم اب اِدھر نہیں ٹھہریں گے۔ رانا صاحب۔ سارا کام گڑبڑ ہو گیا ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ بھی اِدھر سے چلے جائیں۔ کوئی اور اچھا بندوبست کریں۔ چلو مادھوری۔ ہم ابھی چلیں گے۔"

وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا چلا گیا۔ مادھوری بھی ایک سہمی ہوئی فاختہ کی مانند اس کے ساتھ ہی رخصت ہو گئی۔ رانا کسی گہری سوچ میں تھا اور وہ بھی خاصا پریشان اور گھبرایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ان پے در پے پُراسرار واقعات نے اسے بھی دہشت زدہ کر دیا تھا۔

" یہ سب کیا ہو رہا ہے لوٹی؟" وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "یہ سب کیا ہو رہا ہے؟"

" میں تو خود حیران ہوں۔" میں نے کہا۔ "مگر یہ تمہارا علاقہ ہے تمہاری حکومت میں ہے تم کو معلوم ہونا چاہیئے۔ تمہیں اس کی کھوج لگانی چاہیئے۔ میرا خیال کچھ اور ہے۔" اتنا کہہ کر میں جان بوجھ کر چُپ ہو گیا۔

" تمہارا خیال کیا ہے؟" اس نے بے تابی سے پوچھا۔

" میرا خیال یہ ہے کہ یہاں سازش ہو رہی ہے۔ تمہارے مخالف تمہارے خلاف کارروائیاں کر رہے ہیں۔ تمہارے اپنے آدمی بھی ان کے ساتھ ملے ہوئے معلوم ہوتے ہیں ورنہ کوئی اتنی دیدہ دلیری سے یہ سب کارروائیاں نہیں کر سکتا تھا۔"

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ میں اس کے دماغ میں شک و شبہ اور وسوسے کا بیج بونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف اور گھبراہٹ کے آثار اور زیادہ نمایاں ہو گئے۔ وہ ایک جہاں دیدہ بہادر اور مضبوط اعصاب کا انسان تھا مگر میرا تیر نشانے پر بیٹھ چکا تھا۔ میں نے گرم لوہے پر بروقت ضرب لگائی تھی۔

" مگر یہ سب میرے بھروسے کے آدمی ہیں۔"

" بھروسے والے ہی دغا کرتے ہیں۔ اب دیکھو نا۔ تم اور ہم جن کاموں میں لگے ہوئے ہیں کیا کسی دوسرے کو اس کا پتہ ہے؟ دوسرے لوگ تو ہمیں شریف، پُرامن اور عزّت دار آدمی ہی سمجھتے ہیں۔"

" کیا مطلب ہے تمہارا؟" وہ غصّے سے بولا۔ "کیا ہم شریف اور عزّت دار نہیں ہیں؟"

" اس کا جواب اپنے دل سے پوچھو۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "خود کو دھوکہ دینے سے کوئی فائدہ نہیں ہے رانا۔ ہم چاہے جو بھی سمجھیں حقیقت یہی ہے کہ ہم اپنے وطن کے دشمن اور اپنے لوگوں کے غدّار ہیں۔ ہم اچھے لوگ تو

نہیں ہیں۔ پیسے کی خاطر ہم اپنے ملک میں غیروں اور ملک دشمنوں کی مدد کر رہے ہیں۔ منشیات کا زہر سارے ملک میں پھیلا رہے ہیں اور اب تو تم اسلحہ اور بارود کا دھندہ بھی کر رہے ہو۔ یہ بارود اور ہتھیار کس کے خلاف استعمال ہوگا؟ خود ہمارے خلاف۔ ہمارے اپنے لوگوں کے خلاف۔ جن میں ہمارے ہم وطن، دوست، رشتے دار بھی ہوں گے۔ جب آگ بھڑکتی ہے تو اپنا پرایا نہیں دیکھتی ہر چیز کو راکھ کا ڈھیر بنا دیتی ہے۔" اتنا کہہ کر میں اطمینان سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ رانا کا منہ پھٹا ہوا تھا۔ میری زبان سے یہ بے وقت، بے موقع اور خلافِ توقع الفاظ سُن کر وہ دم بخود رہ گیا تھا۔ وہ لفظوں کی اس اچانک یلغار سے اس قدر بوکھلا گیا تھا کہ ایک لفظ تک اس کے منہ سے نہیں نکل سکا تھا۔

تیز قدموں کی آواز گونجی اور پھر راؤ صاحب ہال میں داخل ہوئے۔ مادھوری بھی ان کے ہمراہ تھی۔ وہ دونوں سفر کے لیے تیار ہو چکے تھے۔ "گڈبائی رانا صاحب۔ گڈبائی لوٹی۔ ہمیں اجازت دو۔ آپ کی مہمان نوازی کا بہت شکریہ۔ پھر ملیں گے۔"

رانا کے کچھ بولنے سے پہلے میگی بھی کمرے میں آ گئی۔ وہ پورے میک اپ میں تھی اور بالکل مطمئن اور پُرسکون نظر آتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک بریف کیس تھا۔ "میں بھی جا رہی ہوں مسٹر رانا۔" اس نے رانا کو مطلع کیا۔ "میڈم کی موت کا مجھے افسوس ہے۔"

"مگر" رانا حیرت سے اس کو دیکھ رہا تھا۔ "تم کہاں جا رہی ہو میگی؟ تم تو میڈم کی پارٹنر ہو۔ ہمارا ساتھ چھوڑ کر کہاں جا رہی ہو؟"

" سوری۔ ادھر میں ڈوبتے ہوئے جہاز میں نہیں بیٹھوں گی۔ رانا صاحب تم جانتے ہو۔ میں غیر ملکی ہوں میرے لیے کوئی پرابلم نہیں ہے۔ ہر ملک میرا ملک بن جاتا ہے۔ بائی۔" اتنا کہا اور تیز تیز چلتی ہوئی رخصت ہو گئی۔ اس کی اونچی ایڑی کی جوتی کی آواز بعد میں بھی گونجتی رہی۔ راؤ صاحب اور مادھوری بھی ہاتھ ملا کر رخصت ہو گئے۔ وہ سب لوگ ایک لمحہ بھی وہاں رکنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ جاتے جاتے راؤ صاحب نے کہا۔ "تم سے پھر بات ہو گی رانا۔ اوکے؟" اور وہ دونوں بھی رخصت ہو گئے۔ ہال بالکل خالی اور سنسان ہو گیا تھا۔

رانا نے زیرِ لب انھیں ایک گالی دی اور پلٹ کر میری طرف دیکھا تو ساکت کھڑا رہ گیا میرے ہاتھ میں پستول دیکھ کر وہ ہواس باختہ ہو گیا تھا۔ "یہ۔ یہ۔ یہ کیا حرکت ہے؟" خوف اور حیرت کے مارے الفاظ اس کے منہ سے نہیں نکل رہے تھے۔ اسے پہلی بار یہ علم ہوا کہ اس کی لاعلمی میں میز پر رکھا ہوا اس کا پستول میرے قبضے میں پہنچ چکا تھا۔

" رانا۔ تمہارے دوستوں کے ساتھ ساتھ تقدیر نے بھی تمہارا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ تمہارے دن پورے ہو چکے ہیں۔ مجھے تمہارے اس انجام پر کوئی افسوس نہیں ہے جس کا مجھے واقعی افسوس ہے۔"

وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔ "مگر لوٹی۔ تم تو....."

میں نے اس کی بات کاٹ دی "تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے رانا۔ میں لوٹی نہیں ہوں۔ میرا نام یوسف ہے۔ اب پہچانے مجھے؟؟"

اس کا چہرہ ایک دم سفید پڑ گیا۔ "یوسف؟! تو کیا تم.....؟" مارے حیرت کے فقرہ اس کے منہ میں نامکمل رہ گیا تھا۔ "ہاں رانا۔ میں وہی یوسف ہوں جس نے تمہاری حویلی میں قیامت برپا کر دی تھی مگر اس دن تم بچ نکلے تھے، مگر مجھے یقین ہے کہ تم آج بچ کر نہیں جا سکو گے۔ یہ تمہاری زندگی کا آخری دن ہے۔ تم جیسے گھناؤنے اور بے غیرت انسان کو صفحۂ ہستی پر موجود رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔" میرے ذہن میں غصّے اور نفرت کا الاؤ بھڑک رہا تھا مگر

میری آواز بالکل سرد اور نارمل تھی۔

رانا نے تیزی سے حرکت کرنے کی کوشش کی مگر اس کے کچھ بولنے سے پہلے پستول کی گولی اس کے سینے میں پیوست ہوگئی۔ میں نے یہ سوچے سمجھے بغیر گولی چلائی تھی کہ اگر اس کی آواز چاروں طرف گونج اٹھی تو ہر طرف سے محافظ اور پہریدار مجھے گھیر لیں گے۔ میں شدتِ جذبات اور طیش کے عالم میں یہ پہلو بالکل فراموش کر بیٹھا تھا لیکن قدرت میری مددگار تھی۔ عین اسی وقت باہر سے ہیلی کاپٹر کے سٹارٹ ہونے کا شور بلند ہوا اور گولی کی آواز اس شور میں گم ہوکر رہ گئی۔ رانا نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا اور دم توڑ دیا۔ ہم دونوں کے علاوہ کسی تیسرے کو اس واردات کی کانوں کان خبر بھی نہیں ہوئی۔

میں تیزی سے باہر کی جانب لپکا۔ ہیلی کاپٹر کچھ فاصلے پر کھلے لان میں پرواز کے لیے تیار تھا اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے فضا میں بلند ہونے لگا۔ میں جانتا تھا کہ اس ہیلی کاپٹر میں راؤ مادھوری اور میگی سفر کر رہے ہیں اور ان وطن کے دشمنوں کا یوں بچ کر نکل جانا مجھے کسی طرح بھی گوارا نہیں تھا لیکن سوال یہ تھا کہ میں ان حالات میں کیا کرسکتا ہوں؟ یکایک ایک خیال کوندے کی طرح میرے ذہن میں لپکا اور میں دوڑ کر سامنے کھڑی ہوئی جیپ کی جانب بڑھا۔ جیپ میں سے میڈم کی لاش اٹھوائی جا چکی تھی مگر ایک مسلح محافظ برین گن ہاتھ میں لیے وہاں تھا۔ میں نے اسے جیپ میں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی تیزی سے جیپ میں سوار ہوکر انجن سٹارٹ کردیا۔ میرے اندازے اور خواہش کے مطابق ہیلی کاپٹر کا رُخ جھیل کی جانب ہی تھا۔ میں نے جیپ کی رفتار کو اور زیادہ تیز کردیا۔ یہاں تک کہ میں ہیلی کاپٹر سے پہلے بیرکس تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ بیرکس کے نزدیک پہنچ کر میں نے جیپ روک دی۔ بیرکس میں متعین پہریداروں کی تمامتر توجہ ہیلی کاپٹر کی جانب مبذول تھی جو بہت کم بلندی پر پرواز کرتا ہوا بیرکس کی جانب بڑھ رہا تھا۔ پہریدار اور محافظ غالباً اس ہیلی کاپٹر کی آمدورفت کو دیکھنے کے عادی تھے اس لیے اطمینان سے کھڑے دیکھ رہے تھے۔ میں نے مسلح محافظ کو جیپ سے باہر نکلنے کا اشارہ کیا اور ساتھ ہی خود بھی باہر نکل آیا۔ محافظ کی توجہ بھی ہیلی کاپٹر ہی کی جانب تھی جس کا فائدہ یہ ہوا کہ جب میں نے عقب سے اس کی گردن پر ضرب لگائی تو وہ کسی مدافعت کے بغیر بیہوش ہوکر زمین پر گر گیا۔ میں نے جھپٹ کر برین گن اس کے ہاتھ سے چھین لی اور برین گن اٹھا کر ہیلی کاپٹر کو اپنا ہدف بنایا۔ ہیلی کاپٹر بیرکس کے عین اوپر پہنچ چکا تھا جب میری برین گن نے گولیاں اگلنی شروع کردیں۔ فضا فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔ اس سے پہلے کہ محافظ اپنی جگہ سے حرکت کرتے چند گولیوں نے ہیلی کاپٹر کو جا لیا۔ ایک زوردار دھماکہ ہوا اور ہیلی کاپٹر آگ کے ایک گولے کی مانند بیرکس کی چھت پر جا گرا۔ میں نے بہت تیزی سے جیپ کو مخالف سمت میں دوڑایا اور اندھا دھند جیپ چلاتا ہوا زیادہ سے زیادہ فاصلے پر جانے کی کوشش میں مصروف ہوگیا۔ میری تمام تر توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز تھی اور میں نے ایک بار بھی مڑ کر بیرکس کی جانب دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی لیکن میری توقع کے عین مطابق چند منٹ بعد ایک فلک شگاف دھماکہ ہوا اور میلوں تک کا ماحول مرتعش ہوکر رہ گیا۔ دھماکوں، گولیوں اور چیخ و پکار کی آوازیں چاروں طرف گونجنے لگیں۔ میں نے پھر بھی پیچھے پلٹ کر دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ مجھے یقین تھا کہ بیرکس کے اندر رکھا ہوا گولہ بارود اور ہتھیاروں کا ذخیرہ خود بخود اس تمام ذخیرے کو آگ اور تباہی کے ڈھیر میں تبدیل کردے گا۔ پے درپے دھماکے ہو رہے تھے اور فضا میں دُور تک ان کی آوازیں پھیل گئی تھیں۔ میں نے اپنی جیپ کی رفتار اور تیز کردی۔ میرے دل کو ایک فرحت بخش سکون میسّر آگیا تھا۔ کیونکہ میں نے وطن دشمن گروہ کے تمام سرکردہ لوگوں کو ایک ہی دار میں جہنم واصل کردیا تھا جو بظاہر ایک ناممکن بات نظر آتی تھی لیکن قدرت نے خودبخود میرے لیے سازگار حالات پیدا کردیئے تھے۔ جس کے لیے میں سراپا ربّ العزت کا سپاس گزار تھا۔

مجھے اپنے تعاقب کا کوئی ڈر نہیں تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ کسی بھی شخص کو میری طرف توجہ دینے کی فرصت نہیں ہوگی۔ وہ قیامت کا عالم تھا۔ نفسا نفسی پھیلی ہوئی تھی اور ہر ایک کو اپنے بچاؤ کی فکر پڑی ہوئی تھی۔ ظاہر ہے ایسے میں میرا تعاقب کرنے کی مُہلت اور ضرورت کس کو تھی؟ اس کے باوجود میں نے اپنی جیپ کی رفتار میں اور اضافہ کردیا اور انتہائی تیزی سے ریسٹ ہاؤس کی جانب سفر شروع کردیا۔ ریسٹ ہاؤس ایسی جگہ تھی جہاں پہنچ کر میں اپنی منزل کے بارے میں معلومات حاصل کرسکتا تھا۔ وہاں پہنچ کر میں خود بھی راستوں کے متعلق اندازہ لگا سکتا تھا۔ یا پھر چوکیدار یا دوسرے آنے جانے والوں کی مدد سے بھی اپنی منزل کا پتہ پوچھ سکتا تھا۔ ریسٹ ہاؤس کا راستہ مجھے یاد بھی تھا۔ اس پر سفر کرتے ہوئے میں کم ازکم اپنے راستے سے نہیں بھٹک سکتا تھا۔

ریسٹ ہاؤس کی عمارت نظر آئی تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ رانا کے ٹھکانے پر برپا ہونے والی قیامت یہاں سے بہت دُور تھی پھر بھی میں گاہے گاہے دھماکوں کی ہلکی سی آواز سُن سکتا تھا جو غور سے کان دھرنے کے بعد ہی سنی جاسکتی تھی۔ میرے سوا کوئی نہیں جانتا تھا کہ ان موہوم آوازوں کا مطلب کیا ہے۔

ریسٹ ہاؤس کے سامنے دو کاریں اور ایک پک اَپ کھڑی ہوئی تھی لیکن بیرونی حصّہ بظاہر ویران اور غیر آباد لگ رہا تھا۔ میں براہِ راست ریسٹ ہاؤس میں جانے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا اس لیے چکر کاٹ کر اس کے عقب میں پہنچ گیا جہاں چوکیدار کا کوارٹر واقع تھا۔ میں نے جھاڑیوں کے نزدیک جیپ روکی اور خود کوارٹر کے نزدیک چلا گیا۔ کوارٹر کا دروازہ بند تھا۔ میرے دستک دینے پر ایک کریہہ صورت شخص نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ وہ پتلون اور قمیص پہنے ہوئے تھا اور اس کی کمر میں بندھی ہوئی کارتوس کی پیٹی بھی مجھے صاف نظر آگئی تھی۔ ایک نظر دیکھنے میں ہی وہ ایک شہری باشندہ معلوم ہورہا تھا۔ چوکیدار کو میں پہلے دیکھ چکا تھا ظاہر ہے کہ یہ وہ چوکیدار نہیں تھا۔ پھر یہ شخص اس کوارٹر میں کیوں موجود تھا اور بنیادی سوال یہ تھا کہ وہ تھا کون؟ میری چھٹی حِس نے فضا میں خطرے کی بُو سونگھ لی۔

"کون ہو تم۔ کیا بات ہے؟" اس نے کرختگی سے پوچھا۔

"چوکیدار سے بات کرنی ہے۔" میں نے لجاجت آمیز لہجے میں کہا۔

"وہ ادھر نہیں ہے۔ تم ادھر سے چلے جاؤ سمجھے۔" یہ کہہ کر اس نے دروازہ بند کردیا۔ مگر میری ایک لات نے نہ صرف دروازے کو چوپٹ کھول دیا بلکہ دروازے کے پٹ کی ضرب اس کے چہرے پر لگی اور وہ پیچھے کی جانب گر گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ فرش سے اُٹھتا میری ایک ٹھوکر نے اسے دوبارہ لٹا دیا۔ میں نے اس پر پوری قوت سے حملہ کر دیا۔ اسے مدافعت کی مہلت ہی نہیں مل سکی تھی۔ چند لمحے بعد وہ میرے سامنے بیہوش پڑا ہوا تھا۔ میں نے اس کے بھاری بھرکم جسم کو گھسیٹ کر صحن کے ایک گوشے میں ڈال دیا جہاں کباڑ اور فالتو سامان کا ڈھیر پڑا ہوا تھا۔ اس کے پستول کو اپنے قبضے میں لینے کے بعد میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ یہ ایک مختصر سا صحن تھا جس میں ایک طرف کچا سا باورچی خانہ بنا ہوا تھا۔ سامنے دو کمروں کے دروازے نظر آ رہے تھے جو دونوں باہر سے بند تھے۔ میں نے قریبی دروازے کے پاس پہنچ کر کُنڈی کھولی اور پستول ہاتھ میں تھام کر اچانک دروازہ کھول دیا۔ کمرہ نیم تاریک تھا جسکی وجہ سے میں واضح طور پر کچھ دیکھ نہ سکتا تھا مگر پھر آنکھیں اس تاریکی سے مانوس ہوگئیں تو میں نے سامنے چارپائی پر ایک انسانی وجود کو دیکھ لیا۔ وہ بے حس و حرکت اور خاموش پڑا ہوا تھا۔ نزدیک جاکر میں نے اس کا چہرہ اپنی جانب گھمایا اور چونک کر رہ گیا۔ مجھے اپنی بصارت پر یقین نہیں آرہا تھا۔ میری نظروں کے سامنے عاشی کے بھائی کا چہرہ تھا۔ وہ رسیوں سے بندھا ہوا تھا اور اس کے مُنہ میں رومال ٹھونس کر خاموش رکھنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اسے خاصے تشدّد کا نشانہ بنایا گیا تھا جس کی وجہ سے وہ خاصا زخمی بھی ہوگیا تھا۔ میں نے اس کے منہ سے

رومال نکال کر اس کو پکارا مگر اس کی آنکھیں نہیں کھلیں۔ میں نے اسے رسیوں کی بندش سے آزاد کر دیا۔ صحن میں جا کر میں نے ایک مشکے سے پانی نکالا اور اس کے چہرے پر چھینٹے مارنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں کھول دیں مگر وہ مجھے پہچاننے سے قاصر تھا۔ میں نے اسے جھنجھوڑ کر ہوشیار کرنے کی کوشش کی تو کچھ دیر بعد وہ دیکھنے اور سوچنے سمجھنے کے قابل ہو گیا۔ مجھے دیکھ کر اس کی حیرت دیدنی تھی۔ وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتا رہا پھر اس نے بولنے کی کوشش کی مگر الفاظ بہت مشکل سے اس کی زبان سے ادا ہو رہے تھے۔

"یوسف !؟" اس کے آگے وہ کچھ نہیں بول سکا تھا۔

میں نے پوچھا: "تمہیں یہاں کون لے کر آیا ہے ؟"

اس نے بہت کوشش کے بعد کہا۔ "لوٹی .... تمہارا ہم شکل۔" اس پر نیم بیہوشی اور غنودگی طاری تھی مگر میری تمام حسیات ایک دم زندہ ہو گئی تھیں۔ میں نے اسے ہوش میں لانے کی بہت کوشش کی مگر وہ صرف کراہ کر رہ گیا۔ چند لمحے بعد اس پر دوبارہ بیہوشی طاری ہو گئی۔

میں چند لمحے تو سوچنے سمجھنے اور عمل کرنے کی تمام صلاحیتوں سے محروم ہو گیا۔ اس اچانک اور غیر متوقع ملاقات نے مجھے بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ مجھ پر صورتِ حال کی سنگینی کا احساس واضح ہونے لگا۔ میں چارپائی سے اچھل کر کھڑا ہو گیا اور دیوانہ وار کوارٹر سے باہر کی طرف لپکا۔ چوکیدار کے کوارٹر اور ریسٹ ہاؤس کی عمارت کے درمیان قریباً سو گز کا فاصلہ تھا۔ میں بھاگتا ہوا ریسٹ ہاؤس کے عقب میں پہنچ گیا۔ برآمدے کی جانب قدم بڑھایا ہی تھا کہ مجھ پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ ایک زور دار ضرب میرے سر پر لگی اور میں اوندھے منہ زمین پر گر گیا۔ میری کمر پر ایک اور ٹھوکر رسید کی گئی مگر میں اتنی دیر میں سیدھا ہو چکا تھا۔ میں نے حملہ آور کی ٹانگ پکڑ کر جھٹکا دیا اور وہ میرے اوپر ہی گرنے لگا۔ اس کے گرنے سے پہلے ہی تیزی سے لوٹ لگا کر میں دوسری طرف نکل چکا تھا۔ وہ اپنی جھونک میں فرش پر گر گیا اور میں نے دوبارہ اسے اُٹھنے کا موقعہ نہیں دیا۔ اس کے منہ سے ایک آواز بھی نہیں نکلی اور وہ نیم جان ہو کر رہ گیا۔ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر برین گن فرش پر گر گئی تھی جو میں نے اپنے قبضے میں کر لی۔ پستول کو میں نے اپنی جیب میں رکھ لیا اور برین گن سنبھال کر بے آواز قدموں سے برآمدے کی جانب آگے بڑھا۔

برآمدہ غیر آباد اور سنسان تھا۔ ڈرائنگ روم کا دروازہ بند تھا جو میں نے آہستگی سے دھکیل کر کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی ایک شخص یوں سامنے نمودار ہوا جیسے میرا ہی منتظر تھا۔ مگر اب مجھے اس کے بارے میں کچھ جاننے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ اس کے سامنے آتے ہی میری برین گن کی نالی پوری قوت کے ساتھ اس کی کنپٹی سے ٹکرائی اور وہ ایک چیخ مار کر پیچھے گر گیا۔ میں اس وقت کوئی رسک لینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اس کی چیخ اور ضرب کی دھمک کمرے میں گونج اٹھی تھی اور اس کے ساتھی کسی وقت بھی نمودار ہو سکتے تھے وہ خود کس ہتھیار سے مسلح تھا یہ جاننے کی بھی میرے پاس مہلت نہیں تھی۔ میرے برین گن کی گولیوں نے اسے سانس لینے کا موقعہ بھی نہیں دیا۔ دوسرے ہی لمحے میں تیزی سے پلٹ کر بیڈ روم کے دروازے پر پہنچ چکا تھا۔ میری زور دار لات نے دروازہ چوپٹ کھول دیا۔ خلافِ توقع دن ہونے کے باوجود کمرے میں بجلی کی روشنی پھیلی ہوئی تھی جو میرے لیے نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوئی۔ کیونکہ میں نے اپنے سامنے بیڈ پر جھکے ہوئے شخص کو اُٹھتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ میرے تمام جسم کا خون یکایک سمٹ کر میرے دماغ اور چہرے تک پہنچ گیا۔ میرا جسم سنسنانے لگا اور اگر میں قوتِ ارادی سے کام نہ لیتا تو شاید یہ اچانک جذباتی اور اعصابی صدمہ مجھے ماؤف بھی کر سکتا تھا۔ میری نگاہوں کے سامنے میرا سب سے بڑا دشمن، حریف اور میرا ہمشکل لوٹی کھڑا ہوا تھا۔ فائرنگ کی آواز نے اسے خبردار اور چوکنا ضرور کر دیا ہوگا مگر میں

نے اتنی تیزی سے نقل و حرکت کی تھی کہ اسے سنبھلنے اور سوچنے کے لیے مطلق وقت نہیں مل سکا تھا۔ وہ مجھے اپنے سامنے دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔ ہماری نگاہیں ایک دوسرے پر جمی ہوئی تھیں اور ہم دونوں بیک وقت ایک ہی جیسی ذہنی اور جذباتی کیفیت سے دوچار تھے۔

کمرے میں سسکی کی ایک اور آواز بھی بلند ہوئی تھی میری نگاہیں بیڈ کی جانب چلی گئیں۔ بیڈ کے ایک گوشے میں عاشی سمٹی اور سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ بھی حیرت زدہ رہ گئی تھی۔ مگر اس ایک لمحے کی غفلت نے مجھے سبق سکھا دیا۔ ایک پستول کی نالی میری پشت پر چبھنے لگی اور اس کے ساتھ ہی ایک کرخت آواز نے مجھے برین گن پھینک دینے کا حکم دیا۔ میرے پاس تعمیل کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ منزل میرے عین سامنے آ کر مجھ سے دور ہو گئی تھی مگر تقدیر کے اس فیصلے کے سامنے سر جھکانا بھی ایک بہت بڑی مجبوری تھی۔ میں نے برین گن ہاتھ سے گرا دی اور دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لیے۔ بازی پلٹ چکا تھا اور میرا ہم شکل لوٹی اپنے مخصوص حیوانی انداز میں مسکرا کر دانت نکالتے ہوئے میری جانب حقارت سے دیکھ رہا تھا۔

"گڈ۔ ویری گڈ۔" اس نے کہا۔ "خرگوش خود ہی باورچی خانے میں چلا آیا۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ تم اور تمہاری محبوبہ کے بارے میں ایک ہی وقت میں فیصلہ کرنا آسان ہو جائے گا۔"

"اس نے مجھے دھوکہ دیا ہے یوسف۔ میں اسے یوسف سمجھ کر اس کی باتوں میں آ گئی تھی، اس نے میرے بھائی کو بھی اپنے قبضے میں کر لیا ہے۔" یہ عاشی کی آواز تھی۔

"یہ سب باتیں فرصت میں ہوں گی۔ پہلے تو مجھے اپنا ادھورا کام مکمل کرنا ہے، تم دیکھ رہے ہو کہ میں اس وقت رومانٹک موڈ میں ہوں اور اس موقعے پر کسی دوسرے کی مداخلت پسند نہیں کرتا کیونکہ فی الحال میں ہی یوسف ہوں اس لیے تمہاری محبوبہ پر بھی میرا حق ہے۔ تم کچھ دیر انتظار کرو۔ تمہاری تقدیر کا فیصلہ بھی سُنا دیا جائے گا۔" لوٹی یہ کہہ کر چند قدم آگے بڑھا اور میرے پیچھے کھڑے ہوئے کارندے سے مخاطب ہو کر بولا۔ "انھیں لے جاؤ۔ بلاؤں گا تو لے کر آ جانا۔"

لوٹی نے اپنی جگہ سے حرکت کر کے میری بہت بڑی مشکل آسان کر دی تھی۔ میرے دونوں ہاتھ اُوپر اٹھے ہوئے تھے۔ میں نے انھیں حرکت دی اور بہت تیزی سے ہٹ کر ایک جانب چھلانگ لگا دی۔ میرے پیچھے کھڑے ہوئے محافظ کی پستول گولیاں اگلنے لگی مگر لمحوں کے فرق سے میں اس کی زد سے باہر نکل چکا تھا۔ گولیاں میرے سامنے کھڑے ہوئے لوٹی کے جسم میں پیوست ہو گئیں۔ اگر وہ اپنی جگہ سے حرکت نہ کرتا تو میں یہ تدبیر اختیار نہیں کر سکتا تھا کیونکہ ایسی صورت میں خود عاشی بھی پستول سے نکلنے والی گولیوں کا نشانہ بن سکتی تھی۔ مگر لوٹی کی حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی نے اس کی زندگی کا سب سے اہم اور آخری فیصلہ کر دیا تھا۔ وہ قالین پر گرنے لگا۔ میں نے چھلانگ تو لگا دی تھی مگر خود بھی سنبھل نہیں سکا تھا اور ایک صوفے سے جا ٹکرایا تھا۔ مگر آج شاید تقدیر پوری طرح مجھ پر مہربان ہو چکی تھی۔ محافظ نے لوٹی کو اپنی گولیوں کا نشانہ بنتے ہوئے دیکھا تو اس کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ چکے تھے۔ وہ غیر ارادی طور پر بے اختیار "باس" کہتا ہوا لوٹی کی جانب لپکا۔ لوٹی اتنی دیر میں قالین پر گر چکا تھا مگر اس کا چہرہ میری جانب تھا اور میں نے اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی پستول دیکھ لی تھی جو اس نے نہ جانے کس وقت اپنی جیب سے نکال لی تھی۔ اس کی دانست میں اس وقت میں بالکل نہتا اور بے بس تھا مگر حقیقت یہ تھی کہ ایک پستول میری جیب میں محفوظ تھا جو صوفے تک پہنچتے ہوئے میرے ہاتھ میں منتقل ہو چکا تھا۔ ہم دونوں نے بیک وقت فائر کیے مگر میرا نشانہ اپنے ہدف پر بیٹھا جب کہ لوٹی کے پستول سے نکلی ہوئی گولیاں صوفے میں دھنس کر رہ گئیں۔ غالباً تکلیف کے باعث وہ صحیح طور پر نشانہ لگانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ میرے پستول نے

معمولی سا رخ بدلا اور باقی گولیاں محافظ کے جسم میں اتر گئیں۔

میں نے پستول پھینک دیا اور صوفے پر سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میرا ہم شکل، میرا دشمن ٹونی جو میرے تمام مصائب کا ذمہ دار تھا میری آنکھوں کے سامنے بے جان پڑا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ میری راہ کی تمام رکاوٹیں خود بخود ہٹ چکی تھیں۔ میرے سامنے میرے بدترین دشمن کی لاش پڑی ہوئی تھی اور اس سے چند فٹ کے فاصلے پر میری زندگی کی سب سے بڑی آرزو عاشی کی صورت میں موجود تھی۔ وہ بے اختیار میری طرف لپکی اور میرے بازوؤں میں سما گئی۔

کچھ دیر تک ہم دونوں ایک عجیب طلسماتی اور غیر یقینی کی کیفیت میں مبتلا رہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو گیا ہے اور آئندہ کیا ہوگا؟ سنا تھا کہ لوگ فرطِ خوشی سے مر بھی جاتے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ ہم دونوں زندہ کیوں کر رہے؟

جب ہوش ٹھکانے آئے تو عاشی کی کانپتی ہوئی آواز میرے کانوں میں سنائی دی "یوسف، اب کیا ہوگا؟"

مگر اس اثناء میں میری تمام صلاحیتیں اور خود اعتمادی واپس لوٹ آئی تھی۔ اس سوال کا جواب دینے میں مجھے کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔

"کچھ نہیں ہوگا عاشی۔ صرف یہ ہوگا کہ ہم چپکے سے گاڑی میں بیٹھ کر یہاں سے رخصت ہو جائیں گے۔ یہ لاش مجرم ٹونی کی ہے۔ ظاہر ہے اس سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ کیونکہ میں تو یوسف ہوں اور ایک پُرامن شہری کی زندگی گزارتا رہا ہوں۔ میری بیوی مر چکی ہے اس لیے میری نئی شادی پر کسی کو تعجب یا اعتراض نہ ہوگا۔ کیوں، کیا خیال ہے تمہارا؟"

عاشی کی نگاہیں شرم سے جھک گئیں مگر اس پر میری بات کا مفہوم بالکل واضح ہو چکا تھا۔ میرے تمام دشمن فنا ہو چکے تھے۔ ہر وہ مجرمانہ شخصیت صفحۂ ہستی سے مٹ چکی تھی جس کا بطور ٹونی مجھ سے واسطہ رہ چکا تھا۔ دنیا کے لیے میں صرف یوسف تھا۔ ایک قانون کا پابند، شریف اور ذمہ دار شہری۔ جو کچھ گزر چکا تھا اس کے بارے میں سوچنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں اسے ایک ڈراؤنا خواب سمجھ کر بھلا چکا تھا۔ قدرت نے انسان کو عجیب و غریب صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ آدمی کو حیرت انگیز اور ناقابلِ فہم قوتوں سے سرفراز کیا ہے۔ وہ لمحوں میں موم کی مانند پگھل سکتا ہے مگر وہ پل بھر میں سنگ و آہن کا روپ بھی دھار سکتا ہے۔ یقین نہ ہو تو میری طرف دیکھ لیجیے۔ آپ کو میری اس بات پر یقین آ جائے گا۔

(ختم شد)

محی الدین نواب

○ سرپرست	(چار جلدیں)	۶۰۰/=
○ اندھیر نگری	(چار جلدیں)	۶۰۰/=
○ پتھر	(دو جلدیں)	۳۰۰/=
○ شعلوں کی سیج		۱۵۰/=
○ آبلہ بدن		۱۵۰/=
○ ادھورا ادھوری		۲۰۰/=
○ شارٹ کٹ	(زیر طبع)	۱۵۰/=
○ دل پارہ پارہ		۱۵۰/=
○ اجازت		۱۵۰/=
○ جرم وفا		۲۰۰/=
○ کمبل		۱۸۰/=
○ اجل نامہ		۲۲۵/=
○ ایمان والے		۲۲۵/=
○ پل صراط		۱۲۵/=
○ خالی سیپ		۱۵۰/=
○ یوم حساب		۱۵۰/=
○ راہ خارزار		۱۰۰/=
○ آخری موسم		۱۰۰/=
○ بدی الجح		۱۰۰/=
○ بند مٹھی		۱۲۵/=
○ جوڑے کا پھول		۱۵۰/=
○ آخری وعدہ		۱۵۰/=
○ پیاسے کو شبنم		۱۲۵/=
○ خوش دامنی		۱۰۰/=
○ گندی گلی		۱۰۰/=
○ طاعون		۸۰/=
○ قدیم رشتہ	(زیر طبع)	۱۲۵/=

○ آنچل		۱۰۰/=
○ جلوہ نمائی		۱۰۰/=
○ خوف خدا		۱۰۰/=
○ نیک کمائی		۱۰۰/=
○ عذاب آگہی		۱۰۰/=
○ علاج		۹۰/=
○ نوسرباز		۹۰/=
○ کاغذی پیرہن		۱۵۰/=
○ عذاب آخر		۹۰/=
○ قصہ نصف صدی کا		۹۰/=
○ باسی پھول		۹۰/=
○ بیٹے سب اپنے		۱۰۰/=
○ چلمن		۱۰۰/=
○ شجر ممنوعہ		۱۰۰/=
○ ناگزیر		۱۰۰/=
○ ممتا کا عذاب		۱۰۰/=
○ دور اندیش		۹۰/=
○ محبت کا عذاب		۱۲۵/=
○ سحر شب گزیدہ		۱۵۰/=
○ کچے رشتے	(زیر طبع)	۱۵۰/=
○ مخاطرہ		۱۵۰/=
○ انہونی		۱۵۰/=
○ اندھی چال		۱۵۰/=
○ زہریلا پھول		۱۵۰/=
○ پتھر کا شیشہ		۱۵۰/=
○ انسان اور شیطان		۲۰۰/=
○ حیا کی سولی پر		۱۵۰/=
○ بے نام رشتے		۲۵۰/=
○ خریدار وفا		۱۲۵/=

علی میاں پبلی کیشنز

20- عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور فون: 7247414

علیم الحق حقی

- ○ عشق کا عین (نیا گٹ اپ ایڈیشن) ۱۵۰/=
- ○ مٹی سے عشق (زیرِ طبع) ۱۰۰/=
- ○ شناخت ۱۰۰/=
- ○ الاؤ ۱۰۰/=
- ○ گھروندا ۱۰۰/=
- ○ اسمِ اعظم (زیرِ طبع) ۱۰۰/=
- ○ اماوس کا دیا ۱۵۰/=
- ○ ببول ۱۵۰/=
- ○ پرماتما ۱۶۰/=
- ○ تاش کے پتے ۱۵۰/=
- ○ ہٹلر کی واپسی ۱۵۰/=
- ○ آنکھوں میں دھنک ۱۰۰/=
- ○ میر کارواں (زیرِ طبع) ۱۰۰/=
- ○ کلاکار ۱۰۰/=
- ○ برف کے پاٹ (زیرِ طبع) ۱۰۰/=
- ○ انسانی قیامت ۱۰۰/=
- ○ زنداں نامہ ۱۰۰/=
- ○ طوفان کے بعد ۱۵۰/=
- ○ اچھوت ۸۰/=
- ○ ہزاروں خواہشیں ۱۰۰/=
- ○ لہو کے تاجر ۱۵۰/=
- ○ نسلوں کا قرض ۱۰۰/=
- ○ شب احتساب ۱۰۰/=
- ○ چوتھی سمت ۱۰۰/=
- ○ چہار درویش ۱۰۰/=
- ○ کارِ مسلسل ۱۰۰/=
- ○ تحریکِ مزاحمت (زیرِ طبع) ۸۰/=
- ○ پسِ نقاب (زیرِ طبع) ۱۰۰/=
- ○ شفتالو کا پیڑ (زیرِ طبع) ۱۰۰/=
- ○ فسادِ قامت (زیرِ طبع) ۱۰۰/=
- ○ حسابِ دشمناں (زیرِ طبع) ۸۰/=

- ○ شاہ چور (زیرِ طبع) ۱۰۰/=
- ○ خوابوں کے عذاب (زیرِ طبع) ۱۲۵/=
- ○ تنگ آمد ۱۰۰/=
- ○ نقاب چہرے ۱۰۰/=
- ○ آکاش بیل ۱۰۰/=
- ○ بادشاہ گر ۱۵۰/=

طاہر جاوید مغل

- ○ تاوان (۱۷ حصے) ۱۰۴۰/=
- ○ اباقہ (دو جلدیں) ۵۰۰/=
- ○ پرستش ۱۵۰/=
- ○ الاؤ انگارے آنچ انسپکٹر نواز خان ۴۰/=
- ○ آندھی (زیرِ طبع) (دو جلدیں) ۳۰۰/=
- ○ نور کی یلغار (دو جلدیں) ۳۰۰/=
- ○ تابان ۲۰۰/=
- ○ جستجو ۱۰۰/=
- ○ فیصلہ ۱۰۰/=
- ○ تاخیر پسند ۱۰۰/=
- ○ صدقے واری ۱۰۰/=

انور احسن صدیقی

- ○ ٹوٹے تارے ۲۵۰/=
- ○ اینڈمن ۲۰۰/=
- ○ لہو پھر ٹپکا ۱۵۰/=
- ○ اس دشت کی تنہائی ۱۵۰/=
- ○ رقصاں سرِ بازار ۱۵۰/=
- ○ کتنی شمعیں بے نور ہوئیں ۱۵۰/=

اقبال کاظمی

- ○ وارث ۱۲۵/=
- ○ دہشت گرد ۱۵۰/=
- ○ شاطر ۱۰۰/=
- ○ موساد ۱۵۰/=
- ○ پیادہ ۱۵۰/=

ایم اے راحت

- ○ دیوالی ۳۰۰/=
- ○ تاریک کائنات کے مسافر (دو جلدیں) ۵۰۰/=
- ○ بچھو ۳۰۰/=
- ○ اکال ساگر ۲۰۰/=
- ○ معصوم چڑیل (دو جلدیں) ۴۰۰/=
- ○ کالی قبر (دو جلدیں) ۴۰۰/=
- ○ فرعون (دو جلدیں) ۴۵۰/=
- ○ کالے چراغ ۲۰۰/=
- ○ روپ کنڈ کی روپا ۱۸۰/=
- ○ مقدس عہد ۹۰/=
- ○ مقدس نشان ۹۰/=
- ○ سنہری جونک ۹۰/=
- ○ آگ کا جزیرہ (زیرِ طبع) ۹۰/=
- ○ مجسمہ (زیرِ طبع) ۹۰/=
- ○ ناگ دیوتا ۱۰۰/=
- ○ مقدس خنجر ۱۲۵/=
- ○ ہم جو ۱۵۰/=
- ○ محافظ ۱۵۰/=
- ○ جن زادی ۲۰۰/=
- ○ دھند (زیرِ طبع) (دو جلدیں) ۳۰۰/=
- ○ نایاب ۱۰۰/=
- ○ احساس ۱۰۰/=
- ○ دہشت کدہ ۱۲۵/=
- ○ آسیب ۲۰۰/=
- ○ سوکھے گلاب ۱۸۰/=
- ○ کھلاڑی ۲۲۵/=
- ○ سرفروش (دو جلدیں) ۳۲۰/=
- ○ رازداں (دو جلدیں) ۳۰۰/=
- ○ ساموں (تین حصے) ۱۸۰/=
- ○ سمندر کا بیٹا (زیرِ طبع) (تین حصے) ۱۸۰/=

- ○ جھرنے (زیرِ طبع) (تین حصے) ۱۸۰/=
- ○ شہزور (دو حصے) ۱۲۰/=
- ○ ہمالیہ (چار حصے) ۲۴۰/=
- ○ بساط (چار حصے) ۲۴۰/=
- ○ اژدھا (پانچ حصے) ۳۰۰/=
- ○ لاوا (تین حصے) ۱۸۰/=
- ○ بائی ۸۰/=
- ○ پارس (زیرِ طبع) ۶۰/=
- ○ پرواز ۶۰/=
- ○ خون آشام ۶۰/=

سیما غزل

- ○ کال تتل (دو جلدیں) ۳۰۰/=
- ○ کمند (دو جلدیں) ۲۴۰/=
- ○ کوری آنکھیں (دو جلدیں) ۳۰۰/=
- ○ اندھی رات کا بیٹا (دو جلدیں) ۳۰۰/=
- ○ زرد پتوں کا بھنور (دو جلدیں) ۳۰۰/=
- ○ آدھا وجود (زیرِ طبع) ۱۵۰/=

ابن آدم

- ○ لاوارث (زیرِ طبع) ۶۰/=
- ○ سیاہ عقاب (زیرِ طبع) ۱۰۰/=
- ○ عنوشہ (زیرِ طبع) ۱۰۰/=
- ○ شعلہ حریت (دو جلدیں) ۲۵۰/=
- ○ چرغ (دو جلدیں) ۲۵۰/=

میناناز

- ○ پکار ۸۰/=
- ○ انتقام ۸۰/=
- ○ آپ کی قسم ۸۰/=
- ○ میرے حضور ۸۰/=
- ○ مہرو ۶۰/=
- ○ شوق آوارگی ۶۰/=
- ○ آرزوِ دل دیبا خانم ۸۰/=

محمود احمد مودی

کتاب		قیمت
لہو کا سراغ		۸۰/=
سمندر		۱۵۰/=
کنارہ	(زیر طبع)	۱۵۰/=
ہیرو	(زیر طبع)	۸۰/=
خلش		۱۵۰/=

بلقیس کنول

کتاب	قیمت
نقش قدم	۱۵۰=
مہندی رچے ہاتھ	۱۵۰/=
وفا	۱۵۰/=
گرداب	۱۵۰/=
سیپ	۴۰۰/=

ایم الیاس

کتاب	قیمت
آفت	۱۸۰=
پُراسرار شکاری	۱۰۰/=
دشمن	۱۰۰/=
شکنجے	۱۵۰/=
بازی	۱۰۰/=
کالا منتر	۲۰۰/=
تتلی	۱۰۰/=
شرارہ	۲۰۰/=
اسیر خواب	۲۰۰/=
پیاس	۱۰۰/=

کمانڈو سیریز پر ابو جواد کے بہترین ناول

کتاب	مصنف / کیفیت	قیمت
جودھ پور کا راکھشس	(زیر طبع)	۱۵۰/=
دیوا سنگھ کا سپوت	(زیر طبع)	۱۲۵/=
جے پور کے پوتر پاپی	(زیر طبع)	۸۰/=
ہمہ قرآن	پروفیسر خالد پرویز	۱۵۰/=
ائمہ حدیث	پروفیسر خالد پرویز	۱۰۰/=
تعبیر الرویا	ابن سیرین	۲۲۰/=
بے پتوار	ڈاکٹر عبدالرب بھٹی	۱۵۰/=
برگ خزاں	ڈاکٹر عبدالرب بھٹی	۱۵۰/=

کتاب		مصنف	قیمت
پکار		شمیم نوید	۱۵۰/=
زنجیر		شمیم نوید	۲۵۰/=
سرباز		شمیم نوید	۱۰۰/=
دیدبان	(سات حصے)	شمیم نوید	۴۲۰/=
جن زاد	(سات حصے)	سنجیدہ خاتون	۴۲۰/=
مداری	(۱۲ حصے)	احمد اقبال	۷۲۰/=
ہزار داستان		انوار علیگی	۲۵۰/=
پاتال	(دو جلدیں)	مشتاق احمد قریشی	۳۵۰/=
چیل کوٹھی		ابن حسن عثمان آبادی	۱۰۰/=
انکا	(زیر طبع)	سید غوث علی	۶۰/=
سائرس اعظم	(زیر طبع)	اختر حسین شیخ	۱۵۰/=
داستان شہہ زوراں		اختر حسین شیخ	۵۰۰/=
سحر زادہ		وجیہہ سحر	۱۰۰/=
راکھ		وجیہہ سحر	۱۰۰/=
زنداں میں پھول		ناہید سلطانہ اختر	۳۰۰/=
کفن پوش		ناہید سلطانہ اختر	۱۲۵/=
راکھشس		ساحر جمیل سید	۱۲۵/=
صدیوں بعد		عبدالستار آکاش	۲۰۰/=
ہیرے غیرے		علی رضا احمد	۱۲۰/=
بابل و نینوا		اسلم راہی	۲۵۰/=
بدروحوں کے پجاری		اسلم راہی	۱۵۰/=
روح کی پیاس		محمد علی قادری	۱۲۰/=
ہفت طلسم		اے ایچ گیلانی	۱۰۰/=
ڈالڈا کے ۳۰۰ ذائقے		شازیہ سلطانہ	۱۵۰/=
خوش ذائقہ پکوان		عذرا سعید بھٹی	۱۲۰/=
لذیذ کھانا پکانا		عطرت بھٹی	۱۰۰/=
کھانوں کے لذیذ ذائقے		عنبرین	۱۰۰/=
چٹ پٹے ذائقے		عنبرین	۱۲۰/=
امریکی مارشل لاء		شاہد نذیر چوہدری	۱۵۰/=
رستم زماں		شاہد نذیر چوہدری	۲۵۰/=